دھندلی راہیں

ایک آپ بیتی، طلسمِ ہوشربا، خونچکاں، ولولہ انگیز!



وقاص

JBD Press

پیش لفظ

"دھندلی راہیں" بڑی لمبی کہانی ہے۔ اتنی لمبی کہ قاری دیکھ کر گھبرا جائے لیکن ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ایک بار آپ یہ کہانی پڑھنے بیٹھ گئے تو دو ہزار سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کہانی ختم کر کے ہی اُٹھنا چاہیں گے۔

اس طویل داستان کو ہم نے پانچ جلدوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

یہ پہلی جلد ہے۔

محترم وقاص کی لکھی ہوئی اس کہانی کو افسانہ بھی کہا جا سکتا ہے اور حقیقی کہانی بھی۔ افسانہ اس لئے کہ اندازِ تحریر افسانوی ہے اور اس لئے بھی کہ آج کے دَور میں بعض واقعات حقیقی ہوتے ہوئے افسانہ لگتے ہیں۔ یہ اُس دَور کی کہانی ہے جب معاشرتی اقدار بہت ہی مختلف تھیں اور لوگ اِن اقدار کی پابندی ایسے کرتے تھے جیسے یہی ان کا دین و ایمان ہو۔ آج کے پُر آشوب دَور میں جسے ریاکاری، عیاری، خود غرضی اور جنس پرستی کا دَور کہنا غلط نہ ہوگا، کم ہی لوگ تسلیم کریں گے کہ ایک عام سا انسان بھی اتنا بلند کردار ہو سکتا ہے جیسا اس کہانی میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ کہانی سراپا افسانہ نہیں، حقیقی آپ بیتی ہے۔ اس میں انگریزوں کے دَور کے ایک نواب، اُس کے محل کی اندر کی پُر اسرار اور طلسماتی دُنیا کا اور اُس کے ایک ہولناک قید خانے کا ذکر آتا ہے۔ جب یہ کہانی ماہنامہ "حکایت" میں قسط وار شائع ہو رہی تھی تو بعض قارئین نے لکھا تھا کہ انہیں یقین نہیں آتا کہ ایسا قید خانہ بھی ہو سکتا ہے۔

انگریزوں کے دورِ حکومت کے جو لوگ ابھی زندہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ قید خانہ افسانوی نہیں۔ انگریزوں نے ان نوابوں اور راجوں مہاراجوں کو کھُلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ اپنی ریاستوں کی رعایا کو کیڑے مکوڑے سمجھ کر انہیں اپنے پاؤں کے نیچے رکھیں اور من مانی کریں، جسے چاہیں انعام واکرام سے مالا مال کر دیں اور جسے چاہیں موت کے گھاٹ اُتار دیں۔

ایسے ہی ایک قید خانے کے کھنڈرات پاکستان میں بھی موجود ہیں۔ انگریزوں کے دَور میں یہ ایک نواب کی ریاست تھی۔

اس کہانی ——"دُھندلی راہیں"—— میں صرف اس قید خانے کا ہی قصہ نہیں۔ یہ تو سینکڑوں واقعات میں سے ایک ہے۔ یہ محبت اور نفرت کے تصادم کی نیکی اور بدی کی کشمکش کی داستان ہے۔ اس میں آپ کو اور بھی بہت کچھ ملے گا۔ کہیں جذبات میں زلزلے بپا ہوں گے، کہیں خون کھول اُٹھے گا اور آپ چونک اُٹھیں گے۔

یہ کہانی کیا ہے؟ کیسی ہے؟ —— آپ خود دیکھ لیں اور ہمیں رائے سے نوازیں۔

عنایت اللہ
مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

وہ آگئی۔

شاید میں نے غلط کہا ہے۔ وہ نہیں آئی تھی۔ میں اُس کے پاس گیا تھا۔ میں نے شاید یہ بھی ٹھیک نہیں کہا۔ دو سال سے کچھ زیادہ ہی عرصہ ہو گیا ہے جب اُس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، پھر ہماری ملاقاتیں ہوتی ہی رہیں۔ آپ یہ سُن کر ضرور حیران ہوں گے کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ آئی تھی یا میں اُس کے پاس گیا تھا۔ حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ میرا دماغ میرا نہیں رہا۔ میرا دل میرا نہیں رہا۔ میں خود اپنا نہیں رہا۔ میں اُس کی ذات میں تحلیل ہو چکا ہوں۔ میرے وجُود میں اگر روح ہے تو یہ اُس کی ہے۔ اگر میرا وجُود روح سے خالی ہے تو میری روح اُس کے وجُود میں چلی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بتا نہیں سکتا کہ وہ میرے پاس آئی تھی یا میں اُس کے پاس گیا تھا۔

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں عشق و محبت کی کوئی فلمی یا افسانوی داستان سنانے لگا ہوں تو مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کو مایوس کر دوں۔ اگر آپ مایوس نہیں ہونا چاہتے تو پھر غور سے، مکمل انہماک سے اور یکسوئی سے میری آپ بیتی سُنیں۔ خود بھی سوچیں، مجھے بھی کچھ بتائیں۔

میں نے تین چار کہانیاں سُنی تھیں اور ایسی ایک پاگل اور مجذوب عورت دیکھی بھی تھی۔ میں نے سُنا تھا کہ لاکھوں میں بلکہ بیسیوں لاکھوں میں کوئی آدمی یا عورت ایسی ہوتی ہے جس میں اپنے آپ ہی مافوق الفطرت طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا انسان غیب کی خبریں دینے لگتا ہے اور ایسے کام کر گزرتا ہے جو عام انسانی طاقت اور ذہن کے دائرے میں نہیں آتے۔

یہ تو سُنی سنائی کہانیاں ہیں، میں آپ کو ایک پاگل عورت کے متعلق بتاتا ہوں جسے میں نے خود دیکھا تھا۔ میری عمر اُس وقت بھی کوئی چھ سات برس ہو گی۔

معلوم نہیں وہ کہاں سے ہمارے شہر میں آگئی تھی۔ گلیوں میں پھرتی رہتی تھی۔ چلتے چلتے رُک جاتی، مُنہ آسمان کی طرف کر کے بڑی زور سے "ہُو" کی آواز نکالتی جیسے کُتا بعض اوقات مُنہ آسمان کی طرف کر کے بڑی لمبی آواز نکالتا ہے اور لوگ اس آواز کو منحوس سمجھتے ہیں۔ سُنا تھا کہ بھیڑیئے رات کو جنگل میں اسی طرح مُنہ اوپر کر کے آوازیں نکالا کرتے ہیں۔

اس آواز کی وجہ سے لوگ اس عورت کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن دو تین ہی دنوں بعد یہ خبر پھیل گئی کہ یہ پگلی آنے والے وقت کے حالات بتاتی ہے۔ لوگ بیچارے اپنے حالات سے مجبور اُس کے گرد جمع ہونے لگے۔ وہی عورت جو منحوس تھی اب مقدس بن گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایسے لوگوں نے بھی اُس کی اس طاقت کو تسلیم کیا جو اس قسم کی باتوں کو شرک سمجھا کرتے تھے۔ جو کوئی اُس کے سامنے جاتا تھا اُسے دیکھ کر ہی وہ ایک آدھ بات پوچھے کی اور ایک آدھ بات آنے والے وقت کی بتا دیتی تھی۔

یہ تو میں نے دوسروں سے سُنا تھا، میں آپ کو اپنی سناتا ہوں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میری عمر اُس وقت چھ سات سال تھی۔ میں ماں باپ کا ایک ہی بیٹا تھا اور پھر ایک ہی رہا۔ ماں مجھے سینے سے ہی لگائے رکھتی تھی۔ ایک روز میری ماں اس پاگل عورت کو اپنے گھر لے آئی۔ جوں ہی وہ صحن میں آئی، رُک گئی اور اُس نے کھڑے کھڑے گھوم کر مکان پر نگاہ گھمائی۔ پھر اُس نے مُنہ آسمان کی طرف کر کے بڑی زور سے "ہُو" کی آواز نکالی۔

"کون لایا ہے اسے یہاں؟" — میرے اباجان کی آواز گرجی۔ وہ کمرے میں سے باہر آ گئے۔ بڑے غصے میں بولے —— "اس کی یہ آواز بڑی منحوس ہے۔"

میں بچّہ تھا، ڈر کر اپنی ماں کے ساتھ جا لگا۔ بات تو بڑی پرانی ہے لیکن وہ لمحے ابھی تک یاد ہیں۔ میری ماں کا اتنا دِل کش رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ میرے اباجان ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے۔ مجھے توقع تھی کہ یہ پاگل عورت میرے اباجان سے ڈر کر بھاگ جائے گی لیکن وہ یوں صحن میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی

جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔

اُس نے دایاں بازو اُٹھا کر میرے اباجان کی طرف کیا اور اُنگلی کا اشارہ کر کے بولی —— "یہ شخص راستہ بھول جائے گا.... بھول جائے گا.... بالکل بھول جائے گا۔ پھر وہ راستہ بھی جو ٹھیک نہیں ہوگا اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل جائے گا۔"

لیسے پہ چلتا تھا جیسے وقت اور سورج وہیں رُک گئے ہوں اور دُنیا خاموش ہو گئی ہو۔ ایک سناٹا تھا جس نے خوف طاری کر دیا۔ میرے اباجان جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے۔ اُن کا غصہ، اُن کی ڈانٹ ڈپٹ دھوپ میں رکھی ہوئی برف کی طرح پگھل گئی تھی۔

میرے اباجان نے جیب سے اٹھنی نکالی اور اُس کی طرف پھینکی۔ اٹھنی کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ اُس وقت بھکاریوں کو جو ایک پیسہ دیا کرتا تھا اُسے لوگ سخی سمجھا کرتے تھے۔ پاگل عورت نے اٹھنی اٹھالی اور میرے اباجان کی طرف پھینک دی۔

"بے سمجھ انسان!" — پگلی نے میرے اباجان کی طرف دیکھ کر کہا —— "پیسے سے تُو قسمت کو لگام نہیں ڈال سکتا۔ پیسہ ہی تجھے راہ سے بے راہ کرے گا۔"

میری ماں نے مجھے اُٹھا لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ پاگل عورت کی طرف بڑھی اور اُس کے سامنے جا بیٹھی۔ پگلی کا چہرہ اتنا بھیانک تھا کہ میں نے بازو اپنی ماں کے گلے میں ڈال لئے اور اُس کے ساتھ چپک گیا۔ اُس کے دو دانت اُس کے دوسرے دانتوں سے لمبے تھے جو اُس کے نچلے ہونٹ پر صاف نظر آ رہے تھے۔ یہ دانت گہرے بادامی ہو چکے تھے۔ اُس کی آنکھیں گوشت کی بوٹیوں کی طرح سُرخ تھیں۔ بال رسیوں جیسے تھے جن پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اُس کے ناخن بڑھے ہُوئے تھے۔ اگر چڑیلوں کا کوئی وجود تھا تو وہ چڑیل تھی۔ میرے اباجان جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے۔

"میرے بچے کو دیکھ" —— میری ماں نے پگلی سے کہا۔

"اِس کا مُنہ اِدھر کر۔"

ماں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر میرا مُنہ اُس کی طرف کیا۔ میں بہت ہی ڈر رہا تھا۔

"یہ ..... یہ بچّہ!" — پگلی نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا اور بولی — "تُو اس بچّے کو کہاں سے لاتی ہے؟"

"یہ میرا اپنا بچّہ ہے" — میری ماں نے کہا۔

"یہ تیرے پاس امانت ہے" — پگلی بولی — "یا تُو اس گھر میں امانت ہے" — وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی اور چل پڑی۔

"رُک جا" — میری ماں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا — "میں تجھے کھانا کھلاؤں گی.... کچھ تو بتا دے تُو نے یہ کیا کہا ہے؟"

"مت پوچھ" — پگلی نے رُک کر اور بغیر گھُومے پیچھے دیکھ کر کہا — "تُو کچھ نہیں دیکھ سکے گی۔ جو دیکھے گا یہ بچّہ دیکھے گا۔"

"میں کیوں نہیں دیکھ سکوں گی؟" — ماں نے ذرا گھبراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جو اندھیرے میں چلے جاتے ہیں انہیں کیا نظر آتا ہے!" — پاگل عورت نے کہا — "یہ بچّہ تیرا نہیں پر غم نہ کر..... اس کا غم نہ کر۔ یہ دلوں کو تڑپائے گا اور خود بھی تڑپے گا۔ بڑا لمبا سفر ہے بی بی!..... اس کا سفر بڑا لمبا ہے۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ، پر تجھے کیا نظر آئے گا! جو میں نے دیکھا ہے وہ اور کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ جس کی طرف اور جس طرف دیکھے گا، میں بتا نہیں سکتی اُدھر کیا قیامت ٹوٹے گی۔ اس کی آنکھوں میں وہ طاقت ہے جو ہر کسی میں نہیں ہو سکتی۔ جنّات اور پریاں اس کے آگے سجدے کریں گے لیکن یہ آگ میں سے گزر کر وہاں تک پہنچے گا۔"

وہ چلی گئی اور ہمارے گھر پر سناٹے کی سی کیفیت طاری کر گئی۔ میرے اباجان بار بار کہتے تھے کہ اس پگلی مجذوب کی باتوں پر دھیان مت دو لیکن مجھے آج بھی یاد ہے کہ اباجان کی آواز میں لرزہ سا تھا۔ دو سال بعد جب اس

پگلی کو شہر کے لوگ بھُول چکے تھے، اس کے وہ الفاظ جو اُس نے ہمارے صحن میں بیٹھ کر اور پھر جاتے جاتے کہے تھے، عملی شکل میں سامنے آنے لگے۔

*

میرے اباجان راستہ بھُول گئے۔

میرا وہ سفر شروع ہو گیا جس کی رُوداد میں آپ کو سُنا رہا ہوں۔

میری ماں کچھ بھی نہ دیکھ سکی کیونکہ وہ اُن اندھیروں میں چلی گئی تھی جہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

یہ پگلی مجذوب ہر وقت پیشین گوئیاں نہیں کرتی رہتی تھی۔ پیشین گوئیوں کی کیفیت اُس پر کبھی کبھی طاری ہوتی تھی ورنہ اس سے کوئی بات پوچھتا تھا تو وہ ہاتھ کے اشاروں سے ٹالتی تھی۔ اگر وہ نہ ٹلتا تو ننگی گالیاں دینے اور چیخیں مارنے لگتی تھی۔ اُسے شاید اپنے انجام کا علم تھا یا نہیں، اس کا انجام بہت بُرا ہُوا۔ ہُوا یوں کہ وہ شہر کی ایک گلی میں جا رہی تھی۔ سامنے سے ایک آدمی آ رہا تھا۔ پگلی اُسے دیکھ کر اُس کے راستے میں آ گئی اور اُسے روک لیا۔

"تم نے!" — اُس نے اپنی انگلی اس آدمی کی دونوں آنکھوں کے درمیان رکھ کر پوچھا — "تم نے کِسے قتل کیا ہے؟"

اس آدمی نے اسے ہاتھ سے ایک طرف ہٹانے کی کوشش کی لیکن پگلی نے اُس کا گریبان پکڑ لیا۔

"تمہاری آنکھوں میں ایک قاتل ہے" — پگلی نے یوں کہا جیسے اُس نے چیخ ماری ہو — "تمہاری آنکھوں میں خون ہے۔"

یہ ہمارے شہر کا مشہور واقعہ ہے۔ وہ آدمی اُسے دھکے دے دے کر ایک طرف کر رہا تھا اور پگلی اُس کا گریبان نہیں چھوڑ رہی تھی۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ پگلی یہی کہے جا رہی تھی — "اس کی آنکھوں میں خون ہے۔"

ان ہی دنوں ہمارے شہر میں ایک آدمی شہر سے باہر کھیتوں میں قتل ہو گیا تھا۔ پولیس تفتیش کر رہی تھی۔ قاتل کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ جو قتل ہو گیا تھا وہ اس آدمی کے دُور پار کے رشتہ داروں میں سے تھا۔ پگلی

نے اتنا شور مچایا کہ مقتول کے کچھ رشتہ دار بھی وہاں تماشہ دیکھنے پہنچ گئے اور یہ بات تھانے تک جا پہنچی۔ پگلی کو تو لوگوں نے وہاں سے ہٹا دیا لیکن پولیس نے اس آدمی کو تھانے بلا لیا۔

بعض لوگوں کو پہلے ہی شک تھا کہ یہ آدمی قاتل ہو سکتا ہے تیسرے روز یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ پاگل عورت کی لاش کھیتوں میں پڑی ہے۔ اُسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ دوسری خبر اُسی شام یہ پھیلی کہ پولیس نے اُس آدمی سے اقبال جرم کروا لیا ہے جو یہ تھا کہ پہلا قتل اسی نے کیا تھا اور اس پگلی کو بھی اسی نے قتل کیا ہے۔

پھر اس شہر نے بھی قیامت دیکھی جس شہر میں وہ مُنہ آسمان کی طرف کر کے بھیڑیوں اور کُتوں کی طرح بڑی لمبی آواز نکالا کرتی تھی۔ یہ بہت عرصے بعد ہُوا۔ اگست ۱۹۴۷ء آپ سب کو یاد ہو گا۔ اس شہر کی گلیوں میں مسلمانوں کا اتنا زیادہ خون بہایا گیا کہ نالیوں میں خون بہنے لگا تھا۔ مسلمانوں کے محلّے لاشوں سے اٹ گئے تھے۔ آگ جو لگی وہ کتنے ہی دن لگی رہی۔ بجھانے والا کوئی نہ تھا، خود ہی بُجھ گئی اور اس میں مسلمانوں کے بچے زندہ راکھ ہو گئے۔

✲

میں نے آپ کو اس پگلی کی کہانی اس لئے سنائی ہے کہ میں اپنے اندر کوئی طاقت محسوس کرنے لگا تھا جس کی نشاندہی اس پگلی نے سات آٹھ برس پہلے کی تھی۔ میری عمر سولہ سال ہو چکی تھی۔

میں آپ کو سُنا رہا تھا کہ وہ آ گئی۔ وہ یہ پگلی عورت نہیں تھی۔ وہ ایک بڑی ہی حسین لڑکی تھی جس کی عمر بیس برس سے کچھ کم تھی۔ وہ دو سالوں سے میرے پاس آ رہی تھی یا شاید میں اُس کے پاس جا رہا تھا۔ میں اُس کے حُسن کو بیان نہیں کر سکتا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ جنت میں حوریں ملیں گی، اگر آپ جنت کی حور کے حُسن کو تصور میں لا سکتے ہیں تو میں کہوں گا کہ آپ اس لڑکی کے حُسن کو بیان کر سکتے ہیں۔

"آؤ چلیں" ــــ اُس نے کہا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے بازو لمبا کیا۔

ہماری ہر ملاقات اُس کے انہی دو الفاظ سے شروع ہوتی تھی۔ میں اُس کا ہاتھ تھام کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔ سب دیکھ رہے تھے اور وہ ہمیشہ ہمیں دیکھتے تھے۔ پہلے پہل میں سوچا کرتا تھا کہ یہ لوگ ہمیں روکتے کیوں نہیں۔ مجھے یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ پرائی لڑکی کو اپنے ساتھ کہاں لئے جا رہا ہے۔ میں جانتا تھا وہ مجھے کہاں لے جا رہی ہے۔

وہ کھیت بہت ہی سہانے ہوتے تھے جنہیں میں ہر روز دیکھا کرتا تھا۔ اُس کے بغیر یہ کھیت اتنے خوبصورت نہیں لگتے تھے۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ان میں سے گُزر گئے۔ آگے ہریالی نہیں تھی۔ پتھریلی زمین تھی۔ کہیں اونچی کہیں نیچی، لیکن یہ پتھر مجھے پھولوں کی طرح نظر آتے۔ زمین و آسمان پر حُسن کا عجیب سا تاثر چھا گیا۔

"سکندر!" ــــ اُس نے مُسکرا کر کہا ــــ "تم میرے پاس ہی کیوں نہیں آجاتے؟"

"آ نہیں سکتا مینا!" ــــ میں نے جواب دیا ــــ "اور میں یہ بات تمہیں کتنی بار کہہ چکا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی۔ اُس کی ہنسی ویسی ہی تھی جیسے شاعر اور افسانہ نویس جلترنگ کہا کرتے ہیں۔

"تمہیں آخر میرے پاس ہی آنا ہے" ــــ مینا نے کہا اور اُس نے میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"مینا!" ــــ میں نے رُک کر اُس سے پوچھا ــــ "کبھی کبھی مجھے تم سے ڈر سا آتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟"

"اپنے آپ میں مردانگی پیدا کرو نا!" ــــ مینا نے کہا ــــ "مجھے ایک شک ہے۔ تم آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہو گے تو سمجھتے ہو گے کہ یہ کسی بڑی خوبصورت عورت کا چہرہ ہے۔ تم مجھ سے زیادہ حسین ہو سکندر، تم اپنے آپ کو شاید عورت سمجھتے ہو۔ دل سے خوف اُتار دو۔"

معلوم نہیں میں اپنے آپ کو عورت سمجھتا تھا یا نہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ

مکمل طور پر اُس کی ذات میں تحلیل ہو جانے کے باوجود میرے دل پر ایک خوف موجود رہتا تھا۔ کئی بار مجھے یہ خیال آیا کہ وہ اس دنیا کی مخلوق میں سے نہیں۔ یہ کوئی آسمانی مخلوق ہے۔ میں اُس کے ہاتھ اور پاؤں بھی دیکھا کرتا تھا۔ سُنا تھا کہ چڑیلوں کے ہاتھ اور پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں۔ میں نے یہ بھی سُنا تھا کہ کوئی چڑیل کسی انسان پر عاشق ہو جائے تو وہ بڑی خوبصورت عورت کے روپ میں آ جاتی ہے لیکن اُس کے ہاتھ پاؤں سیدھے تھے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مجھے لوگوں سے ڈرنا چاہئے تھا یا مجھے اُن لوگوں کا خوف ہونا چاہئے تھا جن کی یہ بیٹی تھی لیکن اُن لوگوں کے لئے میں پوری طرح دلیر تھا۔ میں ڈرتا اس لڑکی سے تھا جس کا نام مینا تھا۔

*

اُس روز وہ مجھے ندی کی طرف لے گئی۔ ندی کے کنارے ہرے بھرے پیڑ پودے تھے۔ بعض پودے پھولوں والے بھی تھے۔ ایک جگہ سے ندی مُڑتی تھی اور وہاں کچھ گہری بھی ہو جاتی تھی۔ مینا نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے ندی کی طرف اشارہ کیا کہ ادھر دیکھو۔ میں نے آگے ہو کر اور جُھک کر دیکھا۔ ندی کا پانی شفاف تھا۔ پہلے تو مجھے چھوٹی چھوٹی چند ایک مچھلیاں اِدھر اُدھر پھُدکتی نظر آئیں۔ انہیں دیکھتے دیکھتے میری نظر نیچے گئی تو وہاں تہہ میں ایک آدمی مرا پڑا تھا۔ وہ بالکل برہنہ تھا۔ اُس کا مُنہ کھُلا ہوا تھا اور اُس کی آنکھیں بھی کھُلی ہوئی تھیں۔ میرے دل پر خوف کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔

"مینا!" — میں نے کہا — "پانی میں کسی کی لاش پڑی ہے۔"

"پڑی رہنے دو" — مینا نے بے پروائی سے کہا — "کوئی ڈوب مرا ہو گا۔"

"لیکن دیکھیں تو سہی یہ کون ہے۔"

"انسان ہے" — مینا نے یوں کہا جیسے اُسے کسی انسان کے ڈوب مرنے کا ذرا سا بھی غم نہ ہو — "کیا انسان مرا نہیں کرتے؟..... آؤ چلیں، میں تمہیں اپنے گھر لے جا رہی ہوں۔"

میں پانی کی طرف دیکھتا اُس کے ساتھ آگے کو چل پڑا۔ کچھ دُور تک ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ میں نے ایک بار پھر اُدھر دیکھا جدھر پانی میں لاش پڑی تھی لیکن میری نظروں کے آگے بڑی اونچی گھاس اور درخت آ گئے تھے۔ وہیں سے مینا مجھے دوسری طرف لے گئی۔ درخت زیادہ گھنے ہوتے جا رہے تھے اور زمین نیچے کو جا رہی تھی۔

نیچے جاتے جاتے ہم ایک وسیع نشیب میں پہنچ گئے جس کے دونوں طرف اونچی چٹانیں تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے دنیا سے ہمارا تعلق ٹوٹ گیا ہو۔ کوئی آبادی نہیں تھی اور کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔

اچانک بڑی بلند پھڑپھڑاہٹ کی آواز اُٹھی اور اس کے ساتھ ہی چیخیں سنائی دیں۔ میں نے ڈر کر اُوپر دیکھا۔ درخت جو بڑے ہی گھنے تھے اور بہت پھیلے ہوئے تھے ان پر بے شمار گدھیں بیٹھی چیخ رہی تھیں، کچھ آپس میں لڑ رہی تھیں۔ اُن کے پھیلے اور تیزی سے ہلتے ہوئے پر جھکڑ کے تھپیڑوں جیسی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ ان کی سفید گردنوں پر خون کی لالی تھی جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ یہ کسی مُردار کو کھا کر آئی ہیں۔

"مینا!" — میں نے پوچھا — "آج تم مجھے کہاں لے آئی ہو؟ اُدھر کیوں نہیں چلتیں جدھر ہم کئی بار گئے ہیں؟"

"وہ جگہ زیادہ خوبصورت ہے نا!" — مینا نے کہا — "میں جانتی ہوں تم ڈر رہے ہو لیکن میں تمہیں بڑی خوبصورت جگہ لے جا رہی ہوں۔"

"ایک بات بتاؤ مینا!" — میں نے پوچھا — "میں نے سُنا ہے کہ یہ گدھیں رات کو چڑیلیں بن جاتی ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

مینا ہنس پڑی۔

"کیا تم اپنی دُنیا سے بھی واقف نہیں؟" — اُس نے کہا — "گدھیں پرندے ہیں۔ یہ چڑیلیں نہیں بنا کرتیں البتہ بعض انسان گدھیں بن جاتے ہیں اور بعض عورتیں چڑیلوں کے روپ میں آ جاتی ہیں۔"

میں چُپ رہا۔ اُس کے آگے بولنے کی یا اُس پر کوئی شک کرنے کی مجھ

میں جرأت نہیں تھی۔ شاید میں ایک کمزور انسان تھا لیکن بینا میری بہت بڑی کمزوری بن گئی تھی۔ میں اُس کے قبضے میں تھا۔ میں خاموشی سے اُس کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ اب ہم درختوں اور پتھروں میں سے راستہ بنا کر چل رہے تھے۔ کچھ اور آگے گئے تو وہ بائیں طرف مُڑ گئی۔ اُدھر بڑے خوبصورت پودے تھے۔ مجھے یہ کہہ کر کہ میرے پیچھے آؤ، وہ پودوں کو ہاتھوں سے ہٹا کر ان میں سے گزرنے لگی۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔

*

پودوں سے گزر کر میں نے سامنے دیکھا تو ایسے لگا جیسے سرمئی رنگ کی اس چٹان نے جس نے ہمارا راستہ روک رکھا تھا منہ کھول دیا ہو۔ یہ غار کا دہانہ تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہ کاریگروں نے چٹان کو تراش کر بنایا ہو۔ میں نے سُنا تھا کہ قدیم زمانے میں ہندوؤں نے چٹانوں کو اندر اندر سے تراش کر اس طرح مندر بنائے تھے جس طرح زمین کے اُوپر مندر نظر آتے ہیں۔

بینا چٹان کے اس گول دروازے میں داخل ہو گئی اور میں بھی اُس کے پیچھے چلا گیا۔ میں اسے قدیم دَور کا مندر سمجھ رہا تھا لیکن وہ مندر نہیں تھا اور وہ قدرتی غار بھی نہیں تھا۔ باقاعدہ کمرہ تھا جس کی دیواریں اور چھت کمرے جیسی تھی۔ میں ان دیواروں اور چھت کو دیکھ رہا تھا کہ مجھے دوڑتے قدموں کی ہلکی ہلکی دھمک سنائی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ مجھے ایک عورت کی پیٹھ نظر آئی جو بڑی تیز چلتی دوسرے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ کچھ ایسے یاد آتا ہے کہ دو تین بچے بھی دوڑتے ہوتے اس غار کے کسی اور حصّے میں چلے گئے تھے۔

"بینا!" — میں نے پوچھا — "یہ کون ہیں؟"

"میرے خاندان کے لوگ ہیں" — بینا نے جواب دیا — "تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

"خاندان نہ کہو" — میں نے کہا — "قبیلہ کہو۔ سُنا ہے خانہ بدوشوں کے قبیلے ہوتے ہیں۔"

"کیا میں تمہیں خانہ بدوش لگتی ہوں؟" — بینا نے ہنستے ہوتے پوچھا

— "اگر میں کسی خانہ بدوش قبیلے کی ہی لڑکی ہوں تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟ خانہ بدوشوں کو تم شہری لوگ جاہل اور جنگلی کہا کرتے ہو نا!"

"سچ پوچھتی ہو بینا!" — میں نے رُک کر کہا — "شاید دو سال گزر گئے ہیں، میں نے تم سے نہیں پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں سے آتی ہو اور کہاں چلی جاتی ہو، تم جو کچھ بھی ہو میں بھی وہی کچھ بنتا جا رہا ہوں۔ وہی کچھ بن چکا ہوں۔"

"دو سال ہو گئے ہیں" — بینا نے کہا — "اور تم ابھی تک نہیں جان سکے کہ میں کون ہوں۔ تم میں یہی ایک خرابی ہے کہ تم بچّہ بنے رہتے ہو۔ مجھے تمہاری اس خرابی سے بھی پیار ہے۔"

پیار کا پیاسا تو میں بھی تھا۔ یہی پیاس مجھے اُس کے ساتھ لے آئی تھی مگر اُس روز وہ مجھے ایسی جگہ لے گئی تھی جہاں پیار تو کم نہیں ہُوا تھا لیکن خوف زیادہ ہو گیا تھا۔ دل پر خوف اور ذہن میں شکوک اُبھرنے لگے۔ یہ غار یا چٹان کے اندر بنایا ہُوا کمرہ ایسا ڈراؤنا تو نہیں تھا۔ کسی زمانے میں انسانوں نے ہی بنایا ہو گا۔ اس میں تاریکی بھی نہیں تھی۔ بدبُو بھی نہیں تھی لیکن یہ جو کچھ تھا، پُراسرار تھا۔

"بینا!" — میں نے رُک کر کہا — "میں آگے نہیں جاؤں گا۔ وہیں چلو جہاں ہم پہلے جایا کرتے تھے، نہیں تو مجھے گھر جانے دو۔"

"جاؤ" — اُس نے مُسکراتے ہُوتے دھیمی سی آواز میں کہا — "راستہ تو تمہیں معلوم ہے .... جاؤ۔"

اُس کے انداز اور اس کے لہجے میں طنز سی تھی .... پیاری سی طنز.... جیسے میں کہوں گا کہ نہیں بینا، میں نہیں جاتا، لیکن میں گھوما اور آہستہ آہستہ چل پڑا۔ تین چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ میں یوں رُک گیا جیسے میں رُکا نہیں بلکہ کسی نے روک لیا ہو۔ مقناطیس لوہے کے ٹکڑے کو اسی طرح اپنی طرف کھینچا کرتا ہے۔ میرے عقب سے ایک لہر سی آئی تھی جو میرے وجود میں بھر گئی اور اپنے اوپر میرا اختیار نہ رہا۔ میں نے گھوم کے دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی مُسکرا رہی تھی۔

میں نے اُسے دیکھا۔ چند ثانیے دیکھتا رہا۔

"جاؤ نا!"___ اُس نے کہا اور وہ ہنسی۔

میں دوڑ کر اُس تک پہنچا اور اُس کے سامنے دو زانو بیٹھ کر بازو اُس کی کمر کے گرد لپیٹ دیئے۔ میرا سر اُس کے پیٹ کے ساتھ لگا ہُوا تھا۔ اُس نے جُھک کر میرے گال اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لئے اور میرا چہرہ اُوپر اُٹھایا۔ اُس کا ذرا سا لمس مجھ پر نشہ طاری کر دیا کرتا تھا۔ اُس روز تو اُس نے مجھے اس طرح اپنے ساتھ لگا لیا تھا جیسے اپنے وجود کا اور اپنی ذات کا حصّہ بنا لیا ہو۔ سب خطرے میرے ذہن سے نکل گئے۔

میں شاید وہم کا مریض بن گیا تھا۔ بینا سے پہلی ملاقات سے پہلے بھی میں کسی نہ کسی وہم میں مبتلا رہا کرتا تھا۔ یہ مرض بڑھتے بڑھتے خوف سا بن گیا تھا ورنہ بینا سے ڈرنے کی کوئی وجہ تو نہیں تھی۔ اُسے میں کہتا کہ میرے آگے سجدہ کرو، میری عبادت کرو تو وہ کنواری پجاریوں کی طرح میری پوجا شروع کر دیتی، مگر میں وسوسے اور انجانے خوف سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر وہ میرے محلّے کی، میرے شہر کی کوئی لڑکی ہوتی، کالج کی لڑکی ہوتی تو میں اس طرح نہ ڈرتا۔ اجنبیّت نہ ہوتی، بیگانگی نہ ہوتی مگر میرا دل اُس کا اسیر ہو گیا جو اسی زمین کی لڑکی ہوتے ہوئے بھی کسی اور جہان کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ محبت کی انتہا کے باوجود میں اگر بیگانگی نہیں تو اجنبیّت ضرور محسوس کرتا تھا۔

پھر مجھے اس سے ہٹ جانا چاہیئے تھا.... یہی تو میری مشکل تھی۔ میں نے کہا ہے کہ میں پیار کا پیاسا تھا۔ یہ تو ہر کوئی ہوتا ہے۔ پیار کی پیاس کون محسوس نہیں کرتا، لیکن میرا معاملہ ذرا جدا ہو جاتا ہے۔ میں پیار کا پجاری تھا اور محبت میرا مذہب تھا۔ محبت کو میں نے مذہب اُس روز کہا تھا جس روز میں نے بینا سے پوچھا تھا کہ وہ مسلمان ہے؟ ہندو ہے؟ کیا ہے وہ؟

"کون سا مذہب ہے جو کہتا ہے ایک دوسرے سے محبت نہ کرو؟"___ اُس نے جواب دیا اور کہا تھا ___"مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھا کرو۔"

"پوچھنا پڑتا ہے نا، بینا!"___ میں نے کہا تھا ___"کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی روحوں میں اُتر جائیں اور اس حد تک پہنچ

جائیں جہاں سے واپسی ناممکن ہو جاتی ہے تو تم کہہ دو کہ اپنا مذہب چھوڑ دو اور آؤ ہم ایک ہو جائیں۔ میں اپنے مذہب کو قربان نہیں کر سکوں گا بینا!"

"اگر تم بات مذہب کی ہی کرنا چاہتے ہو سکندر! تو سُن لو"___ بینا نے کہا تھا ___"میں محبت کو اپنا مذہب سمجھتی ہوں۔ تم بھی یہی سمجھو.... اور سنو سکندر! تمام راستے ایک خدا کی طرف جاتے ہیں اور یہ سب راستے محبت کے ہیں۔ نفرت انسانوں نے پیدا کی ہے۔ خدا محبت کا دوسرا نام ہے۔"

میں اتنی اچھی باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ عمر ہی کیا تھی! سولہ سال کی عمر میں تو انسان اپنی خواہشوں اور اپنے جذبات کی زنجیروں میں بندھا ہُوا ہوتا ہے۔ یہ تو مجھے حالات، حادثات اور واقعات نے پختہ عمر میں جا کر سبق دیا تھا کہ کامیابی، کامرانی اور مسرتیں اُنہیں ملتی ہیں جو سولہ سال کی عمر میں خواہشوں خوابوں اور جذبات کی زنجیریں توڑ کر حقیقی زندگی کے میدان میں اُتر جاتے ہیں۔

بینا میری عمر سے تین چار سال آگے چلی گئی تھی اس لئے اس کی سوچیں زندگی کے کونوں کھدروں تک پہنچ جاتی تھیں۔ اُس نے جب مجھے کہا تھا کہ محبت اُس کا مذہب ہے، اُس وقت میری عمر سولہ سال بھی نہیں ہوتی تھی۔ یہ سوا یا ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔ معلوم نہیں وہ اتنی عقلمند تھی یا نہیں، میں نادان تھا۔

خدا محبت ہے ___محبت خدا ہے!

یہی میرا عقیدہ بن گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی خدا میرے دل میں اُتر آیا تھا۔

*

"آؤ!"___ میرے کانوں میں اُس کی آواز پڑی اور اپنی کلائی پر اُس کی اُنگلیوں کا لمس محسوس ہُوا۔

ایک لہر سی میرے وجود میں بھر گئی اور میں یوں اُس کے ساتھ چل پڑا جیسے میں کوئی الگ چیز نہیں ہوں، جو کچھ ہوں اُسی کا ہوں۔ خوف اور وہم کے باوجود یہی ایک ارادہ ذہن پر قابض ہو گیا تھا کہ اب میں یہاں سے واپس

نہیں جاؤں گا۔ گھر میں میرے لئے کیا رکھا ہے۔

ہم اس غار کے ایک کمرے میں چلے گئے۔ غار جو میں سُنا کرتا تھا کہ بڑے ڈراؤنے ہوتے ہیں، مگر یہ بڑا ہی خوبصورت غار تھا۔ جُوں جُوں میں آگے بڑھتا جاتا تھا، غار کا تاثر ختم ہوتا جاتا تھا۔

"میں غار کا نام سن کر ڈر جایا کرتا تھا" ــــ میں نے کہا۔

"میں تمہیں وہ بھی دکھا سکتی ہوں" ــــ اُس نے کہا ــــ "یہ ہماری دنیا ہے جو تمہارے شہر کے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دُور لگتی ہے۔ شہر کے لوگ حُسن اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں۔ یہ ایک پردہ ہے جو وہ قدرت کے دیتے ہُوئے حُسن پر اور اپنی بُری نیتوں پر ڈال دیتے ہیں .... ہماری دنیا میں قدرت کا حُسن ہمیں بناتا ہے۔ ہماری نیتوں پر کوئی پردہ نہیں .... تم نے اُن غاروں کی بات کی ہے جن سے تمہیں ڈر آتا ہے، وہ نفرتوں کے غار ہیں۔ اب بھی اُن سے ڈرو۔"

"تمہارے لوگ کہاں ہیں؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "وہ اِدھر اُدھر کیوں ہو گئے ہیں؟"

"اس لئے کہ ہم آ گئے ہیں" ــــ اُس نے کہا ــــ "انہوں نے ہمیں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ یہاں کوئی کسی کے راستے میں نہیں آتا۔ اب ہم یہیں آیا کریں گے۔"

چاہتا تو میں بھی تھا کہ یہیں آیا کریں، پھر یہ خواہش کہ یہیں رہوں لیکن خواہشیں کبھی پوری نہیں ہُوا کرتیں۔

میں بڑے امیر باپ کا بیٹا تھا۔ وہ بنگلوں اور کوٹھیوں کا نہیں، حویلیوں اور چوباروں کا زمانہ تھا۔ شہر میں میرے باپ کا شمار اُنہی لوگوں میں ہوتا تھا جن کی حویلیاں بہت بڑی اور چوبارے بہت اونچے تھے اور جن کے گھروں میں سونے چاندی کی افراط تھی۔ میرے گھر میں پلنگ بہت خوبصورت اور بستر بڑے آرام دہ تھے۔ بیٹھنے والے کمرے میں جسے آج کل ڈرائنگ روم کہتے ہیں، قالین اور صوفے بھی تھے۔

مینا مجھے غار کے جس کمرے میں لے گئی تھی وہاں پلنگ نہیں تھے، نرم و گداز ریشمی بستر نہیں تھے، صوفے اور قالین نہیں تھے۔ وہاں تو جیسے کچھ بھی نہیں تھا لیکن ایسے لگتا تھا جیسے وہاں سب کچھ ہے اور ہر آسائش موجود ہے۔ غار کا فرش نرم لگتا تھا۔ اس کمرے میں روشنی کم تھی بلکہ کمرہ نیم تاریک تھا۔ فرش پر ایسے لگتا تھا جیسے بڑی نرم گھاس بچھی ہوتی ہو۔ اس پر چلتے قدموں کی آواز نہیں آتی تھی۔

مینا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف لے جا کر بٹھا دیا۔ یہ نرم و گداز بستر تھا۔ وہ میرے پاس میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں ہلکی ہلکی بھینی بھینی خوشبو تھی۔ شاید یہ مینا کے وجود کی خوشبو تھی۔ مجھ پر مدہوشی سی طاری ہو رہی تھی۔ میں سرک کر مینا کے اور زیادہ قریب ہو گیا اور سر اُس کے کندھے پر پھینک دیا۔ اُس کے بازُو کا گھیرا جو میرے گرد لپٹا ہُوا تھا وہ اور تنگ ہو گیا اور اُس نے گال میرے سر پر رکھ دیا۔

*

معلوم نہیں، کچھ یاد نہیں کتنا وقت گزر گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے میں بڑے ہی حسین سپنے میں گم ہو گیا تھا۔ ایسا سکون اور ایسا قرار کبھی مینا کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی نہیں آیا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھ پر اُداسی سی چھانے لگی جو ایک سوال میں سمٹ آتی۔

"مینا!" ــــ میں نے پوچھا ــــ "ہماری محبت کا انجام کیا ہو گا؟ ہمارے دلوں کو کون سی منزل ملے گی؟"

"میں آج تمہیں محبت کی منزل دکھانے یہاں لاتی ہوں" ــــ مینا نے کہا ــــ "منزل کیا ہوتی ہے؟ محبت کی منزل کیا ہوتی ہے؟"

"جو ایک دوسرے کو چاہتے ہیں وہ ایک ہو جائیں" ــــ میں نے کہا ــــ "ان کے درمیان سے ہوا بھی نہ گزر سکے۔"

"ہمارے درمیان سے صدیاں گزر گئی ہیں سکندر!" ــــ مینا نے کہا ــــ "آج میں تمہیں اس سوال کا جواب دینے کے لئے لائی ہوں کہ میں کون ہوں

اور ہم ایک دوسرے کو دیکھتے ہی کیوں ایک ہو گئے تھے۔ تم مجھے کہا کرتے ہو کہ میں نے تم پر نشہ اور خمار طاری کر دیا ہے اور میں تمہیں کہا کرتی ہوں کہ تم نہ ہوتے تو میرے لئے پھولوں میں خوشبو نہ ہوتی۔ نہ تم نے کچھ سوچا نہ میں نے اور ہم مقناطیس کے ٹکڑوں کی طرح ایک دوسرے سے چپک گئے .... یہ صدیوں کا سفر ہے جو ہم دونوں نے ایک دوسرے سے دُور دُور طے کیا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو بینا!" — میں نے جھنجھلا کر کہا — "جس طرح آج تم مجھے اس عجیب سی جگہ لے آئی ہو، اسی طرح باتیں بھی عجیب سی کر رہی ہو۔"

"تم مانو گے نہیں" — اُس نے کہا — "لیکن میں بتاؤں گی ضرور۔ تم میرے پچھلے جنم کے رفیق ہو۔"

"تم نے ٹھیک کہا تھا کہ میں نہیں مانوں گا" — میں نے کہا — "میرا خیال ہے کہ جو مر جاتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔"

"میں نے کوئی کتاب نہیں پڑھی" — بینا نے کہا — "تم نے دس جماعتیں پڑھ لی ہیں۔ شاید تم نے کتابوں میں کچھ پڑھا ہو لیکن میں اپنی یادوں کو کیسے جھٹلا سکتی ہوں۔ تیئس صدیاں پرانی باتیں میرے ذہن میں کیسے آ سکتی ہیں؟ کون جان سکتا ہے ان پرانی باتوں کو؟ وہی جان سکتا ہے جو اُس وقت زندہ تھا۔ میں اُس وقت زندہ تھی اور میں جوان بھی تھی ....

"کیا تم نے اپنے نام پر غور نہیں کیا؟ یہ نام تمہارے ماں باپ نے رکھا تھا۔ انہیں یہ نام اچھا لگا تھا لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ غیب کی ایک طاقت ہے جو کسی انسان کو نظر نہیں آتی لیکن انسان کی ہر سوچ اور ہر ارادے پر اسی طاقت کا اثر ہوتا ہے۔ تم نے دوسرا جنم لیا ہے۔ تم نے پہلا جنم اُس وقت لیا تھا جب سکندرِ اعظم پیدا ہوا تھا۔"

"میں کہاں پیدا ہوا تھا؟"

"یونان میں!" — بینا نے جواب دیا — "میں نے تمہیں پہلی بار اُس وقت دیکھا تھا جب تم یونان کی فوج میں افسر تھے۔"

میری ہنسی نکل چلی تھی لیکن بینا کی طرف دیکھا تو مجھ پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں ایسا تاثر آ گیا تھا جیسے وہ بہت دُور کسی چیز کو دیکھ رہی ہو، یا جیسے اُس کی نگاہیں اُفق سے بھی آگے نکل گئی ہوں۔

"اُس زمانے میں فوجیں طوفان کی مانند آیا کرتی تھیں" — بینا نے کہا — "بستیاں اُجاڑ دی جاتی تھیں۔ سب سے زیادہ ظلم جوان اور خوبصورت عورتوں پر ہوتا تھا۔ سکندرِ اعظم کی فوجیں تو اور زیادہ زبردست تھیں۔ سکندرِ اعظم کا نام ایک خوف اور ایک تباہی کا نام بن گیا تھا۔ یونان کی سرحد سے کچھ دُور میں اپنے ایک قافلے کے ساتھ جا رہی تھی۔ یہ میرے قبیلے کا قافلہ تھا۔ ہم کہیں اور آباد ہونے کے لئے جا رہے تھے۔ ہمارا قبیلہ ایک جگہ ایک سال سے زیادہ نہیں ٹھہرا کرتا تھا ....

"وہ ایک پہاڑی اور سرسبز علاقہ تھا جہاں سے ہم گزر رہے تھے۔ مجھے تیئس صدیاں پہلے کا وہ وقت ابھی تک یاد ہے۔ پہاڑیوں کے اندر سے ایسا شور سا اُٹھنے لگا جیسے اچانک وادیوں میں سیلاب آ گیا ہو اور اس کے آگے درخت اور بڑے بڑے پتھر گرتے اور لڑھکتے جا رہے ہوں۔ ہمارے دادا نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا — 'ادھر اُدھر چھپ جاؤ۔ سکندر کی فوج آ رہی ہے .... یونان کے دیوتا آ رہے ہیں'....

"ہمیں اپنے مال و متاع کا اتنا غم نہ تھا جتنا عورتوں کا تھا۔ میں اُس وقت بیس اکیس سال کی کنواری لڑکی تھی۔ مجھ جیسی پانچ اور تھیں۔ دس گیارہ جوان عورتیں تھیں۔ ہمارا خطہ بہت حسین تھا۔ ایسا ہی حُسن قدرت نے انسانوں کو دیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ سکندر کی فوج عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ ہمارے ساتھ ستر اسّی مرد تھے لیکن وہ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ہم سب اِدھر اُدھر ہونے لگے تو فوج کے پہلے گھوڑسوار وادی میں سے نکل آتے ....

"مجھے گھوڑے دوڑنے کی آوازیں اور اپنے قافلے کے لوگوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔ میں اکیلی ایک طرف بھاگ اُٹھی۔ زیادہ دُور نہیں

گئی ہوں گی کہ مجھے ٹھوکر لگی اور میں اوندھے مُنہ گر پڑی۔ میں بڑی تیزی سے اُٹھ رہی تھی تو مجھے ایک گھوڑے کی ٹانگیں نظر آئیں جو میرے سامنے میرے سَر پہ کھڑا تھا۔ میں اُوپر دیکھنے سے ڈر رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ سیدھی ہونے لگی۔ میرے سامنے گھوڑے کی رکاب تھی جس میں ایک پاؤں تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اُوپر دیکھا۔ گھوڑسوار نیچے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ یونان کا کوئی دیوتا لگتا تھا....

"اپنے قافلے والوں کا واویلا اور اُن کی آہ و بکا مجھے سنائی دے رہی تھی۔ فوجی نہتے شکار پر جھپٹ رہے تھے۔ میرا انجام بھی ایسا ہی ہونا تھا۔ میں خوفزدگی کے عالم میں سوار کو دیکھ رہی تھی۔ ہم لوگ یونانی زبان سمجھ لیا کرتے اور یہ زبان ٹوٹے پھوٹے انداز میں بول بھی لیا کرتے تھے۔ میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں گھوڑسوار سے کہا —— 'مجھ پر رحم نہیں کرو گے؟' —— وہ جتنا خوبصورت تھا اتنا ہی طاقتور تھا۔ وہ میری طرف جھکا اور دونوں ہاتھ میری بغلوں میں رکھ کر مجھے اُٹھا لیا اور گھوڑے پر اپنے آگے بٹھا لیا۔ کہنے لگا —— 'رحم نہیں میں محبت کروں گا۔ کلیوں کو مسلا نہیں جاتا۔ دل سے خوف نکال دو'....

"اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور بولا —— 'اپنے لوگوں کو بھول جاؤ۔ تم میرے ساتھ چلو گی اور باقی عمر میرے ساتھ گزارو گی۔ میں سپاہی نہیں، سپاہیوں کا حاکم ہوں' —— میں نے اُس سے پوچھا —— 'کیا تم مقدونیہ کے فیلقوس کے بیٹے سکندر رہو؟' —— اُس نے کہا کہ میں سکندر ہی ہوں لیکن میں فیلقوس کا بیٹا نہیں ہوں۔ یونان کا بادشاہ سکندر کل یہاں سے گزرے گا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ تم مجھے کہاں لے جاؤ گے؟ اُس نے کہا کہ پیچھے عورتوں کی گھوڑا گاڑیاں آ رہی ہیں۔ میں تمہیں ان میں سوار کر دوں گا اور جب ہم واپس جائیں گے تو عبادت گاہ میں جا کر ہم میاں بیوی بن جائیں گے....

"میں نے اُسے کہا —— 'پھر تم ایسی محبت کے قابل ہو جیسے عبادت کی جاتی ہے۔ میں تمہیں دیوتا سمجھوں گی' —— وہ جوان آدمی تھا۔ اُس نے مجھے کلی

کہا تھا اور وہ مجھے مسل سکتا تھا۔ مسلی ہوئی کلی کو وہ مٹی میں پھینک جاتا تو اُسے کون روک سکتا تھا۔ اُس نے مجھے گھوڑے پر ہی بٹھائے رکھا اور اُس کے دونوں بازو میرے گرد لپٹے ہوتے تھے۔ پہلے میں اپنے آپ کو اُس کی قیدی سمجھ رہی تھی پھر مجھے ایسا سکون محسوس ہونے لگا جیسے اُس نے مجھے پناہ میں لے لیا ہو....

"فوجی میرے قبیلے پر ہاتھ صاف کر چکے تھے اور سکندر کے حکم سے فوج پھر چل پڑی تھی۔ سکندر مجھے بازوؤں میں لئے سب سے آگے جا رہا تھا۔ میں نے اُدھر دیکھا جدھر مجھے اپنے قبیلے کی دو نیم برہنہ عورتیں زمین پر پڑی نظر آ رہی تھیں۔ وہ شاید مر گئی تھیں۔ سکندر نے اپنا ایک ہاتھ میرے چہرے کے ایک طرف رکھ کر میرا مُنہ دوسری طرف پھیر دیا کہ میں انہیں نہ دیکھ سکوں....

"سکندر! عورت اُس زمانے میں بھی مظلوم تھی، عورت آج بھی مظلوم ہے۔ حملہ آور فوج کا پہلا نشانہ عورت بنا کرتی تھی۔ وہ عورت اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھا کرتی تھی جسے فوج کا کوئی افسر اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اُس کے ساتھ وہ شادی کر لے یا بغیر شادی کے اُسے ساتھ رکھے، اُسے یہ سہولت حاصل ہوتی تھی کہ وہ ایک آدمی کی ملکیت ہوتی تھی، کوئی دوسرا اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا....

"میں اُس خدا کو ہمیشہ یاد کرتی رہی ہوں جس نے مجھے ایسا حُسن دیا تھا کہ ایک بڑے جابر فوجی نے مجھے پناہ میں لے لیا اور اُس کی زبان سے پہلا لفظ محبت کا نکلا... جانتے ہو وہ کون تھا؟"

"میں کیسے جان سکتا ہوں؟" —— میں نے کہا۔

"وہ تم تھے" —— مینا نے کہا —— "تم مشکل سے یقین کرو گے۔ نہ کرو۔ میری بات سن لو.... وہ سکندر مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ کچھ اور آگے جا کر اُس نے مجھے گھوڑے سے اُتارا اور اُن عورتوں میں شامل کر دیا جو فوج کے ساتھ جا رہی تھیں۔ بہت دنوں بعد جب فوج واپس مقدونیہ آئی تو سکندر نے یعنی تم نے

میرے ساتھ باقاعدہ شادی کر لی لیکن چھ سات مہینوں بعد ہی ہمارا ساتھ ٹوٹ گیا۔ موت نے ہمیں جدا کر دیا۔ وہ فوج کے ساتھ گیا اور اُس کا آہنی خود واپس آیا۔ اس کے ساتھ اُس کی تلوار تھی۔ یہ دونوں چیزیں مجھے شاہی دربار میں بلا کر اعزاز کے ساتھ دی گئیں۔ تلوار پر خون جما ہُوا تھا....

"وہ میری پہلی محبت تھا۔ تم جانتے ہو کہ محبت ایک ہی بار ہوتی ہے۔ وہ نہ رہے جسے تم چاہتے تھے تو پیچھے جسم رہ جاتا ہے۔ میں بھی اب جسم تھی اور جسم میں جس کی روح تھی وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کا آہنی خود اپنے سر پر رکھا اور اُس کی تلوار کی نوک اپنے پیٹ پر رکھ دی۔ درباری میری طرف دوڑے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ تلوار کے دستے پر رکھ کر پوری طاقت سے تلوار اپنے پیٹ میں اُتار لی اور میں آگے کو جھک کر اس طرح گری کہ پہلے تلوار کا دستہ فرش پر لگا۔ اوپر میرے جسم کا وزن پڑا تو تلوار پوری کی پوری میرے جسم میں چلی گئی۔"

*

رینا کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ نہ مانتے ہوتے بھی میرا دل کہتا تھا کہ یہ لڑکی جو کہہ رہی ہے اسے سچ مان لوں۔ اُس کے نقش و نگار ایسے تھے جو ہمارے خطے میں کم ہی کبھی دیکھنے میں آتے تھے۔ اُس کی آنکھوں کا اور اُس کے بالوں کا رنگ ہمارے ملک کا رنگ نہیں تھا۔ وہ تصوروں سے زیادہ حسین تھی۔ وہ ایک طلسم تھی اور یہ طلسم میرے دل اور میری روح پر طاری تھا۔

"پھر مجھے اس ماں نے جنم دیا" — رینا کہہ رہی تھی — "میری یادیں اس عمر میں بیدار ہو گئی تھیں جب بچوں کا ابھی شعور بھی بیدار نہیں ہُوا کرتا۔ میں نے بولنے کی عمر سے پہلے بولنا شروع کر دیا تھا اور شعور بیدار ہونے کی عمر تک ذہن میں وہ سوچیں بیدار ہو گئی تھیں جو اُس وقت بیدار ہُوا کرتی ہیں جب لڑکپن جوانی میں تحلیل ہونے لگتا ہے....

"ایک خیال مجھے بار بار آتا تھا۔ میں نے شاید اپنے ہی بطن سے جنم لیا تھا۔ میں نے جب سکندرِ اعظم کے دربار میں اپنے آپ کو اپنے خاوند کی تلوار سے ختم

کر لیا تھا، اُس وقت میرے پیٹ میں پانچ ماہ کا بچہ سانس لے رہا تھا۔ اُس کی پیدائش سے پہلے ہی میں اُسے اپنے ساتھ وہیں لے گئی تھی جہاں اُس کا باپ چلا گیا تھا۔ خیال آتا ہے کہ میں یہ بچہ ہوں اور میں نے اپنی کوکھ سے جنم لیا ہے۔"

"ایسی سوچ کسی پاگل کے ہی دماغ میں آ سکتی ہے" — میں نے کہا۔

"میں پاگل نہیں سکندر!" — اُس نے پہلے کی سی متانت سے کہا — "اگر میری کوکھ میں لڑکی تھی تو یہ میں ہوں جس نے دوسرا جنم لیا ہے اور اگر یہ لڑکا تھا تو تم تھے جس نے کسی اور عورت کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور تم نے کسی دوسری عورت کے بطن سے اس لئے جنم لیا ہے کہ میں تمہاری ماں نہ کہلاؤں۔ میں تمہاری بیوی ہوں....

"مجھے گزرے ہوئے اُس وقت تک وہ لمحے یاد آتے ہیں جب میں مقدونیہ کی عبادت گاہ میں دیوتاؤں کے دیوتا کے بُت کے سامنے ایک بوڑھے راہب کے پاس بیٹھی ہوتی تھی.... آہ! دو ہزار تین سو سال گزر گئے ہیں لیکن راہب کا عمر خوردہ اور جلالی سا چہرہ مجھے اس طرح نظر آ رہا ہے جس طرح میں تمہارا چہرہ دیکھ رہی ہوں.... میں نے اُسے کہا تھا — 'مقدس ہستی! میرے لئے دعا کریں مر جاؤں میری محبت نہ مرے'....

"راہب نے اپنے رعشہ گیر ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام کر اپنی طرف کیا۔ اُس کی بے نُور آنکھوں نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ یک لخت اُس نے میرے چہرے سے اپنے ہاتھ ہٹا لئے اور یوں اپنا چہرہ پیچھے کر لیا جیسے اُس نے میری آنکھوں میں کوئی ایسی چیز دیکھ لی ہو جس نے اُسے حیران کر دیا۔ اُس نے ہاتھ اُوپر کر کے اور شہادت کی انگلی میری آنکھوں کی طرف کر کے بڑھاپے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا — 'نہ تم مرو گی نہ تمہاری محبت مرے گی' — میں نے خوشی سے بے قابو ہو کر کہا — 'تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میری اور میرے خاوند کی عمر بہت لمبی ہے' — اُس نے ذرا بوجھل سی آواز میں کہا — 'نہیں تم دونوں کی عمر ختم ہو چکی ہے لیکن مجھے یوں نظر آ رہا ہے جیسے یہ محبت جو تمہاری روح کی غذا ہے تمہیں اور تمہارے سکندر کو ایک بار پھر اس مٹی سے اٹھائے گی' —

میں اُس کی یہ بات نہ سمجھ سکی۔"

"مینا!"— میں نے دبی دبی سی آواز میں کہا — "جس طرح تم اُس کی بات نہیں سمجھ سکی تھیں اسی طرح میں تمہاری بات نہیں سمجھ رہا۔"

"میں مجبور ہوں نا سکندر!"— مینا نے کہا — "میں اس طرح بات نہیں کر سکتی جس طرح مقدونیہ کے راہب نے کی تھی۔ اُس نے کہا تھا — 'لوگ اسی دنیا کی زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں، اور جو اس دنیا کی لذّتوں میں ڈوب جاتے ہیں وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔ ایک وہ ہیں جن کے دلوں میں ایک ابدی محبت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ دنیا کی رنگینیوں سے محبت نہیں کرتے۔ ان کی محبت زمین پر چلنے پھرنے والے ہر انسان کے لئے ہوتی ہے۔ میں نے وہ محبت تمہاری آنکھوں میں دیکھی ہے۔ تمہیں یہ دنیا چھوڑنے کا ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوگا۔ ایک طاقت ہے جو تمہیں پھر اس مٹی سے اٹھائے گی گناہگاروں کو مت دیکھ کہ وہ عیش کرتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ سکندر کے باپ فیلقوس کو سکندر کی ماں اولمپیاس نے اپنے ایک غلام سے قتل کروایا تھا۔ اب دیکھ، اولمپیاس جو ملکہ تھی اب کہاں ہے'....

"یہ اُس وقت کی بات ہے جب تم کہیں حملہ کرنے گئے ہوتے تھے۔ سکندرِ اعظم ساری دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ راہب نے یہ باتیں کیں تو میرے دل پر بڑا سخت بوجھ پڑ گیا۔ دو تین روز بعد ہی مجھے تمہاری موت کی اطلاع ملی اور میں نے تمہاری تلوار سے اپنے آپ کو مٹی کے سپرد کر دیا.... تم بھی سوچو سکندر! کہاں ہے وہ سکندرِ اعظم جو ساری دنیا کو فتح کرنے نکلا تھا؟ اسے اپنے اس ارادے سے ہی محبت تھی۔ اُس کے دل میں کسی انسان کا پیار نہ تھا۔ وہ خالی ہاتھ اس دنیا سے گیا۔"

"لیکن مینا!"— میں نے اُس سے پوچھا — "تم یہ باتیں مجھے کیوں سُنا رہی ہو؟"

"کیا تم نے مجھ سے پوچھا نہیں تھا کہ ہماری محبت کا انجام کیا ہوگا؟"— مینا نے کہا — "میں آج تمہیں محبت کے انجام پر لاتی ہوں۔ پہلی ملاقات یاد کرو جب ہم دونوں دو سوا دو سال پہلے اتفاقیہ ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے ہم نے ایک دوسرے کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سچ بتاؤ سکندر! کیا تم نے محسوس نہیں کیا تھا کہ تم مجھے پہلے بھی کہیں مل چکے ہو اور ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟"

"ہاں مینا!"— میں نے کہا — "میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے یوں لگا تھا جیسے ہم ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہُوتے ہوں۔"

"تم مجھے دیکھ کر مُسکراتے تھے"— مینا نے کہا — "اور ایسی ہی مُسکراہٹ میرے ہونٹوں پر بھی آ گئی تھی.... ایسا کیوں ہُوا تھا سکندر؟ اس لئے کہ جنم جنم کے ساتھیوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ تم نے یہ دوسرا جنم مجھ سے تین چار سال بعد لیا.... تم میرے خاوند ہو سکندر! ہماری محبت پہلے ہی انجام کو پہنچ چکی ہے۔"

مجھ پر خاموشی سے طاری ہو گئی۔ مینا نے مجھے الف لیلہ کی کہانی سنا دی تھی لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں اسے جھٹلاتا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اُس نے دو ہزار تین سو سال پہلے کا جو منظر لفظوں میں مجھے دکھایا تھا وہ میرا تصور بن گیا اور میں تصور ہی تصور میں تیئس صدیاں پیچھے چلا گیا۔ بہت حسین تصور تھا۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ میں گھوڑے سے اُتر رہا ہوں۔ مینا دوڑتی آ رہی ہے اور میرے ساتھ لپٹ جاتی ہے۔ میں اپنے جسم میں اُس کے جسم کی حرارت اور اپنے گالوں پر اُس کے سانسوں کی تپش محسوس کر رہا ہوں۔ مینا نے مجھے اس طرح اپنے بازوؤں میں لے رکھا ہے جیسے اُس کا وجود میرے وجود میں سما جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ آہستہ آہستہ ایک دھند سی چھانے لگی جو تاریک ہوتی اور فوراً ہی تاریکی چھٹ گئی۔ میں نے اپنے آپ کو اُسی غار میں مینا کے بازوؤں کے شکنجے میں پایا۔ میں اپنے جسم میں اُس کے جسم کی حرارت محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی سانسیں میری سانسوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں خمار تھا۔ اُس کے گالوں پر سُرخی سی آ گئی تھی۔

"تم میرے خاوند ہو سکندر!" — مینا نے مخمور آواز میں کہا — "تیئس سو سال بعد یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ میں اس ملاقات کو شبِ عروسی کا رنگ دوں گی۔ یاد کرو، اُس رات کو یاد کرو۔"

"نہیں مینا!" — میں نے اُکھڑی ہوئی سی آواز میں کہا — "نہیں نہیں۔ میں اتنی خوبصورت محبت کو ناپاک نہیں ہونے دوں گا۔ جس محبت نے مجھے زندگی دی ہے۔ اس محبت کو میں ایسی موت نہیں مرنے دوں گا.... میں تمہیں اپنی ماں کا تقدس دینا چاہتا ہوں ...."

"اوہ پاگل لڑکے!" — مینا نے کہا — "میں تمہاری ماں نہیں ہو سکتی۔ بیس اکیس برس تو کُل میری عمر ہے۔"

وہ مجھے جھنجھوڑ رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اُس کے بازوؤں سے آزاد کرا لیا تھا۔ مجھ پر ایک دَورے کی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میں اُٹھنے لگا تو دو بڑے خوبصورت بازوؤں نے مجھے پھر جکڑ لیا۔ میں آخر مرد تھا۔ میرے بازوؤں میں عورت سے زیادہ طاقت تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ اُس کے سینے پر رکھ کر دھکا دیا۔ مجھے تو جیسے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اُس کے گرنے کی دھمک سنائی دی۔ وہ جب اُٹھی تو مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے میرے دل کی دھڑکنیں رُک گئی ہوں۔ وہ مینا نہیں تھی۔ وہ اسی جیسی خوبصورت اور دلکش کوئی اور لڑکی تھی۔ میں نے دائیں بائیں اور اوپر نیچے دیکھا۔ وہ تھا تو کمرہ لیکن وہ غار کا کمرہ نہیں تھا۔ میں پلنگ پر تھا۔ بڑا نرم و گداز بستر تھا۔ کمرہ سجا ہُوا تھا جیسے امیر شہریوں کے کمرے ہوتے ہیں۔

"مینا!" — میں نے گھبرائی ہُوئی آواز میں مینا کو پکارا۔

"کون مینا؟" — میرے سامنے جو لڑکی کھڑی تھی اُس نے پوچھا۔

"مینا کہاں ہو؟" — میں نے اس عورت کی بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے مینا کو پھر پکارا۔

"چلو یہی بتا دو مینا کون ہے؟" — اس لڑکی نے میرے پاس بیٹھ کر اور ایک بازو میرے گلے میں ڈالتے ہُوئے کہا — "بتاؤ وہ کون ہے۔"

"تم کیوں پوچھتی ہو؟"

"تم شاید خواب دیکھ رہے تھے" — اُس نے کہا اور مجھے لٹاتے ہُوئے میرے پاس نیم دراز ہو کر بولی — "چلو لیٹو۔ معلوم نہیں مجھ سے ڈرتے کیوں ہو۔"

وہ میرے ساتھ لگ کر لپٹ گئی۔ میں اوپر سے پھینکی ہوئی گیند کی طرح اچھل کر بستر سے نکلا اور فرش پر کھڑا ہو گیا۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور ہنس پڑی۔

"پگلے سکندر!" — اُس نے مینا جیسی مخمور آواز میں کہا — "میرا نکاح تیرے باپ کے ساتھ پڑھا گیا ہے لیکن میں تجھے چاہتی ہوں۔ کیا تُو دیکھ نہیں رہا کہ میں تیری محبت میں کتنی بے تاب رہتی ہوں؟"

"تم میری ماں ہو" — میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی میرے آنسو نکل آتے۔ میں نے کہا — "اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ تم نے پھر ایسی حرکت کی تو میں ابا جان کو بتا دوں گا۔"

"ایسی غلطی نہ کرنا سکندر!" — اُس نے کہا — "وہ تیری نہیں میری مانے گا۔ میں نے اُسے اتنا ہی کہا کہ رات کو آپ کی غیر حاضری میں سکندر میرے پلنگ پر چڑھ آیا تھا تو وہ اس سے آگے کچھ نہیں سُنے گا۔ تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دے گا۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ وہ کس طرح میری انگلیوں پر ناچ رہا ہے؟"

"ابا جان نہیں سنیں گے تو میں اوروں کو سناؤں گا" — میں نے کہا

"میری سننے والے اور بہت ہیں۔"

وہ ہنس پڑی اور کچھ دیر ہنستی ہی رہی۔

"معلوم ہوتا ہے تمہارا ذہن بڑا گندہ ہے" — اُس نے ہنستے ہنستے کہا — "نوجوان ہونا! میں تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ تم خواب میں مینا مینا پکار رہے تھے۔ میں جب تمہارے پاس بیٹھی تو تم نے لیٹے لیٹے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ میں نے اس خیال سے تمہیں اپنے ساتھ لگا لیا کہ تم شاید خواب میں ڈر رہے ہو۔"

میں نے اُس کی اس بات کو فوراً قبول کر لیا۔ آج جب کہ میرا ذہن پختہ،

پرانا اور جہاندیدہ ہو گیا ہے تو میں اپنی اُس وقت کی ذہنی کیفیت کو سوچتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ میں بھی اپنے آپ کو یہ فریب دینا چاہتا تھا کہ میری اس جواں سال سوتیلی ماں نے جو حرکت کی ہے اس کا مطلب وہ نہیں تھا جو میں سمجھا تھا۔

"کیا تم خواب میں کسی مینا کو دیکھ رہے تھے؟" — اُس نے پوچھا۔

"مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں نے خواب میں کیا دیکھا تھا" — میں نے کہا — "مجھے اتنا پتہ ہے کہ خواب ڈراؤنا نہیں تھا۔ تم جاؤ۔ اب میں سو جاؤں گا۔"

وہ پلنگ سے اُٹھی۔ میں لیٹ گیا۔ اُس نے میرے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور سگی ماؤں کی طرح "سو جاؤ" کہہ کر چلی گئی۔

*

یہ میری سوتیلی ماں تھی اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں سویا ہُوا نہیں تھا اور میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ رات کا پہلا پہر تھا۔ میں سونے کے لئے لیٹ گیا تھا۔ مجھے نیند ذرا دیر سے آیا کرتی تھی۔ مینا اور وہ ماحول جہاں مجھے مینا لے گئی تھی وہ خواب بھی نہیں تھا اور وہ میرا اپنا تخلیق کیا ہُوا تصوّر بھی نہیں تھا۔ مجھے آج بھی مینا کے جسم کی بُو یاد ہے۔ ندی کے شفاف پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیاں اور اُن کے نیچے پڑی ہوئی لاش مجھے یاد ہے۔ میں مینا کو چھُو سکتا تھا۔ اُس کا جسم ایسا ہی تھا جیسے ہر انسان کا جسم ہوتا ہے۔ شاید میں آپ کو اچھی طرح بتا نہیں سکا کہ وہ کیا تھا۔ میں بتا دیتا ہوں۔ اگر آپ اسے سمجھ سکتے ہیں تو اپنے آپ کو سمجھا لیں۔ میں آپ کو آپ بیتی سُنا رہا ہوں۔ اس سے پہلے یہ سُن لیں کہ یہ حسین اور دلکش لڑکی جو میری سوتیلی ماں بنی تھی وہ کس طرح میری ماں کی جگہ آئی تھی۔

میں نے ایک پگلی کا ذکر کیا ہے۔ میری ماں نے مجھے اس کے سامنے کر کے اس سے میری قسمت پوچھی تھی۔ پگلی نے میری قسمت کی جو پیشین گوئی کی تھی اس سے میرے اباجان کو غصّہ آ گیا تھا۔ پگلی نے میری ماں سے کہا تھا —

"تُو کچھ نہیں دیکھ سکے گی جو دیکھے گا یہ بچّہ دیکھے گا ... جو اندھیرے میں چلے جاتے ہیں انہیں کیا نظر آتا ہے" — پگلی کی یہ پیشین گوئی جلد ہی پوری ہو گئی۔ میری ماں کچھ روز بیمار رہ کر اُس اندھیرے میں چلی گئی جہاں وہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ اُس کا اکلوتا بچّہ دنیا میں کیا دیکھے گا۔ دنیا تو میری بھی اندھیر ہو گئی تھی لیکن میرے باپ نے اور ایک خالہ نے مجھے سینے سے لگا لیا مگر ماں کے سینے کا نعم البدل کوئی نہیں ہو سکتا۔

میرا باپ جوان تو نہیں تھا لیکن کسی نے اُسے ایک جوان اور بڑی ہی خوبصورت لڑکی کی جھلک دکھا کر جوان کر دیا۔ میرے باپ کے سر کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہ لڑکی جس کا نام شہناز تھا اور میرا باپ جسے نازی کہتا تھا، ہمارے شہر کے کسی اور محلّے کی رہنے والی تھی۔ مَیں نے یہ باتیں دو تین عورتوں سے اُس وقت سنی تھیں جب میری عمر بارہ تیرہ سال ہو گئی تھی۔ جب میری ماں فوت ہوئی اُس وقت میں یہی کوئی چھ سات سال کا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ کچھ لوگوں نے میرے باپ کو اس شادی سے روکا تھا۔ روکنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میرا باپ بوڑھا تھا اور ایک نوخیز لڑکی کے ساتھ شادی کر رہا تھا بلکہ مجھے اصل وجہ یہ بتائی گئی کہ لڑکی کا خاندان مشکوک ہے۔

اس خاندان کے کچھ لوگ دیہات میں یا کہیں اور بھی رہتے تھے۔ اُن کا آنا جانا ان کے ہاں لگا رہتا تھا۔ بعض لوگ تو صاف الفاظ میں کہتے تھے کہ یہ لوگ در پردہ مجرم سے لوگ ہیں۔ ان کی کچھ خفیہ سرگرمیاں تھیں جنہیں لوگ مجرمانہ سرگرمیاں کہتے تھے۔ بڑے خوشحال لوگ تھے۔ اس خاندان کے آدمیوں کا اُٹھنا بیٹھنا بڑے اچھے لوگوں کے ساتھ تھا جن میں پولیس کے افسر بھی شامل تھے۔

شہناز، جیسا کہ میں نے بتایا ہے، بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ ہو گئی تھی لیکن اُس کا رشتہ مانگنے اُن کے ہاں کوئی نہیں جاتا تھا۔ اُس زمانے میں مسلمانوں کے ہاں پردے کی بڑی سخت پابندی تھی لیکن اس خاندان کی عورتیں اس پابندی سے آزاد تھیں۔ میرے باپ

کو اس خاندان نے ایسا گھیرا کہ اس نے اپنے قریبی لوگوں کو ناراض کر کے شہناز کے ساتھ شادی کر لی ۔

میں نے جس رات کا واقعہ سنایا ہے اُس رات تک شہناز تیئس چوبیس سال کی ہو چکی تھی اور اُس نے مجھے ٹھیک کہا تھا کہ میرا باپ اُس کی اُنگلیوں پر ناچ رہا تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا چکا ہوں کہ میرا باپ خاصا امیر آدمی تھا۔ اُس کا کام ایسا تھا کہ اُسے سارا دن تو ہر روز گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا، کبھی کبھی وہ دو تین دنوں کے لئے شہر سے باہر چلا جاتا تھا۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ دو تین آدمی باری باری اکیلے اکیلے شہناز کے پاس آیا کرتے تھے۔ شہناز مجھے بتایا کرتی تھی کہ یہ میرا چچا ہے، یہ میرا ماموں ہے، یہ میرا نانا ہے اور اگر کوئی جوان سا آدمی آجاتا تو وہ مجھے بتاتی کہ یہ دیہات میں رہنے والا میرا چچازاد یا ماموں زاد بھائی ہے۔ یہ لوگ عموماً اُس وقت آیا کرتے تھے جب میرا باپ گھر سے غیر حاضر ہوتا تھا۔ جو کوئی بھی آتا وہ شہناز کے ساتھ الگ تھلگ ضرور بیٹھتا تھا۔

کہتے ہیں سوتیلی مائیں سوتیلے بچوں پر بڑا ظلم کرتی ہیں لیکن یہاں معاملہ اُلٹ تھا۔ شہناز میرے ساتھ میری مری ہوئی ماں جیسا پیار کرتی تھی۔ اب میں جوان ہو گیا تھا تو بھی اس کا پیار ویسا ہی تھا جیسا میرے بچپن میں ہوتا تھا۔ اس کے پیار پر میں نے ایک شک کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اب بچہ نہیں نوجوان تھا۔ میں اُس کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتا۔ اپنے باپ کے خلاف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُس نے میرا بھی پیار شہناز کو دے دیا تھا۔ میں صرف پیار کی محرومی محسوس کرتا تھا، اس کے علاوہ مجھے کوئی محرومی اور کوئی تنگی نہیں تھی۔ میری جیب میں ہر وقت خاصے پیسے رہتے تھے۔ شہناز میرے لئے اچھے سے اچھے کپڑے سلواتی تھی۔

میرے جوان ہونے تک شہناز میں بچہ پیدا کرنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ میرا خیال ہے کہ میرا باپ اس قابل رہا ہی نہیں تھا۔ وہ شہناز کے آگے جھکا جھکا سا رہتا تھا۔ شہناز کی ماں تو اکثر ہمارے ہاں آتی رہتی تھی۔ ماں میرے ساتھ شہناز سے بڑھ کر پیار کرتی تھی۔

اُس رات جب میں نے شہناز کو اپنے پلنگ سے اُٹھایا تھا، مجھے اس پر یہ غصہ بھی تھا کہ اس کی وجہ سے مینا غائب ہو گئی تھی۔

*

آپ بھی کہتے ہوں گے کہ میں نے مینا کو خواب میں دیکھا تھا۔ نہیں۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں جاگ رہا تھا۔ مینا مجھے پہلی بار تو نہیں ملی تھی۔ البتہ اُس روز وہ مجھے پہلی بار اُس غار میں لے گئی تھی۔

یہ میرا تصوّر بھی نہیں تھا۔ یہ بیداری کا خواب بھی نہیں تھا۔ لوگ بیداری میں بھی خواب دیکھتے رہتے ہیں جو تصوّر ہی ہوتے ہیں، لیکن مینا میرا بیداری کا خواب بھی نہیں تھی۔

میں پھر اُس پاگل عورت کا ذکر کروں گا۔ اُس نے میرے ابا جان کو دیکھ کر کہا تھا کہ یہ شخص راستہ بھول جائے گا اور یہ جس راستے پر چلے گا وہ راستہ بھی اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل جائے گا۔ اُس نے میرے باپ کو یہ بھی کہا تھا —"بے سمجھ انسان! پیسے سے تو قسمت کو لگام نہیں ڈال سکتا۔ پیسہ ہی تجھے راہ سے بے راہ کرے گا"— مجذوب اور انتہائی غلیظ پگلی کی یہ پیشین گوئی بھی پوری ہو گئی۔ میرے ابا جان راستہ بھول گئے تھے۔

پگلی نے میری آنکھوں میں دیکھا تھا اور اُس نے حیران ہو کر میری ماں سے پوچھا تھا کہ اس بچے کو کہاں سے لائی ہو؟ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس بچے کی آنکھوں میں وہ طاقت ہے کہ جنّات اور پریاں اس کے آگے سجدے کریں گے لیکن یہ آگ میں سے گزر کر وہاں تک پہنچے گا۔

میں آگ میں سے گزر رہا تھا۔ ماں کے مرتے ہی میرا یہ سفر شروع ہو گیا تھا۔ میں ماں کی یاد میں جلتا رہتا تھا۔ سوتیلی ماں کا پیار اس آگ کو سرد نہیں کر سکتا تھا۔ میری حالت یہ ہو گئی تھی کہ میرا گھر، میرا محلہ اور دنیا کی ہر چیز مجھے ڈراؤنے خواب کی طرح نظر آتی تھی، پھر یہ دنیا میرے لئے ایک بھیانک تصوّر بن گئی۔ اگر مجھ میں واقعی کوئی ایسی طاقت تھی جو جنّات اور پریوں کو اپنے آگے سجدے میں گرا سکتی تھی تو وہ بیدار ہو گئی تھی اور اُس نے مینا کو میرے سامنے

لاکھڑا کیا تھا۔

یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایسی ہی کوئی مافوق الفطرت طاقت بینا میں تھی جس نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ میں بینا کے پاس کس طرح چلا جاتا تھا اور وہ کس طرح میرے پاس آجاتی تھی۔ میں اس کے متعلق بھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میں اور بینا واقعی پہلے جنم میں میاں بیوی تھے یا نہیں۔

جو کچھ بھی تھا وہ ایک راز تھا اور میں اس راز کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اپنے متعلق میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ عورت کے جسم کے ساتھ مجھے صرف یہ دلچسپی تھی کہ میری ماں کا جسم ایسا ہی تھا۔ عورت کے متعلق میرا ذہن کوئی اور تصور قبول ہی نہیں کرتا تھا۔

اُس رات شہناز مجھے پلنگ پر لٹا کر چلی گئی تو میں باقی رات سو نہ سکا۔ میں رویا بھی تھا۔ میں اپنے لئے ایک معمہ بنتا جا رہا تھا۔

*

صبح کا اُجالا نکھر رہا تھا جب میں بستر سے نکلا۔ ذہن میں یہی ایک خیال تھا کہ ماں کی قبر پر جاؤں گا۔ وہاں مجھے تسکین سی مل جاتی تھی۔ کمرے سے نکلنے کے لئے میں چلا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور میری سوتیلی ماں آگئی۔ اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر ساتھ لگا لیا۔ سولہ سال کی عمر میں میرا قد اُس سے ایک دو انچ اوپر ہو گیا تھا۔ قد کاٹھ اُس کا بھی کھڑا اور نہایت موزوں تھا۔ اُس زمانے میں قدبُت ایسے ہی ہُوا کرتے تھے۔ چہرے جن کے حسین نہیں ہوتے تھے، اُن میں تندرستی اور صحت مندی کی دل کشی ہوتی تھی۔

"رات تجھے کیا ہو گیا تھا؟" — اُس نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا — "شادی کرا دوں تیری؟"

"اتنی جلدی؟"

"بیوقوف!" — اُس نے مجھے اور زیادہ اپنے ساتھ لگاتے ہوئے

کہا — "تُو اپنی عمر سے زیادہ جوان ہو گیا ہے ۔۔۔ بینا سے شادی کرا دوں گی، لیکن وہ ہے کون؟ ہندوؤں کی لڑکی ہے؟"

"معلوم نہیں وہ لڑکی کون ہے" — میں نے کہا — "مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہتی ہے۔"

میں چپ ہو گیا۔ پتہ نہیں چل رہا تھا کیا کہوں، شہناز کو بتاؤں یا نہ بتاؤں، لیکن آپ خود سوچیں کہ میری عمر کیا تھی اور میں ماں کے غم کا مارا ہُوا تھا۔ ایک عمر کچی اور دوسرے دل دُکھی اور پیار کا پیاسا۔ میں عقلمندی سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ شہناز نے مجھے پلنگ پر بٹھا لیا اور خود بھی پلنگ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے مجھے اپنی گود میں گرا لیا۔ مجھے ماں کی گود کا سکون اور گداز ملا۔ یہی میری کمزوری تھی۔ شہناز پہلی بار پیار کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔ سچ پوچھیے تو اُس نے مجھے پیار کی محرومی کبھی بھی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ فرق یہ تھا کہ وہ میری ماں نہیں تھی۔

اُس کے پیار کا جادو چل گیا اور میں نے اُسے بتانا شروع کر دیا کہ بینا کون ہے اور وہ مجھے کیسے اور کہاں ملتی ہے۔ میرا باپ تین چار دنوں کے لئے باہر گیا ہُوا تھا۔ گھر میں شہناز اور میں اکیلے تھے۔ وہ بھی فارغ تھی، میں بھی فارغ تھا۔ میں میٹرک کا امتحان دے چکا تھا۔

"سکندر!" — شہناز نے میری ساری بات سن کر کہا — "تمہاری یہ حالت ٹھیک نہیں۔ میں اکثر دیکھتی ہوں کہ تم گم سُم بیٹھے ہوتے ہو اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ تم مسکرا رہے ہوتے ہو۔ میں نے تمہیں اپنے آپ سے باتیں کرتے بھی دیکھا ہے۔ میں نے پہلے توجہ نہیں دی تھی۔ اب تم نے بینا اور اُس کی ملاقاتوں کے متعلق بتایا ہے تو مجھے خیال آیا ہے کہ تم انہی تصوروں میں گم ہو جاتے ہو۔"

"لیکن خالہ!"

اُس نے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ہنس پڑی۔ ہنسنے والی بات ہو نہ ہو، وہ ہنستی ضرور تھی۔

"مجھے خالہ کہنا چھوڑ دو"— اُس نے کہا۔

"کیوں؟"— میں نے پوچھا — "اور کیا کہا کروں؟"

"نازی"— اُس نے کہا — "تمہارے ابّا مجھے نازی کہا کرتے ہیں، تم بھی نازی کہا کرو"۔

"اور ابّا جان سے جُوتے کھاؤں"— میں نے کہا۔

"اُن کے سامنے خالہ کہہ دیا کرو"— اُس نے کہا — "تم اور مجھ میں فرق ہی کتنا ہے سکندر! تم عمر میں مجھ سے دو چار سال چھوٹے ہو تو کیا ہُوا۔ تم مرد ہو۔ مرد عورت پر حاوی ہوتا ہے .... مجھے غلط نہ سمجھو سکندر! میں تمہارے ساتھ ہجولیوں جیسی بے تکلفی پیدا کرنا چاہتی ہوں"۔

میں اُس کی گود سے اُٹھ کر اُس کے سامنے پلنگ پر بیٹھ گیا اور میرے مُنہ سے پھر "خالہ" نکل گیا۔ اُس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنی طرف گھسیٹا اور اپنا ایک بازو میری کمر میں ڈال دیا۔

"میں تمہیں کچھ سمجھا رہی تھی"— اُس نے کہا — "مجھے خود زندگی کا کوئی تجربہ نہیں۔ تھوڑی سی تعلیم ہے۔ میں تمہیں اچھی طرح نہیں سمجھا سکوں گی۔ خود سمجھنے کی کوشش کرو .... اس عمر میں ایسے ہی تصوّر آیا کرتے ہیں۔ مجھے بھی آتے رہے ہیں۔ میں نے پندرہ سال کی عمر میں ہی تم جیسے ایک بڑے ہی خوبصورت اور جوان آدمی کا تصوّر بنا لیا تھا اور میں اسی میں گُم رہتی تھی۔ ایسے بھی ہُوا کہ برتن دھوتے میرے تصوّروں کا شہزادہ آگیا اور میں نے اُس کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ میرے ہاتھ اپنے آپ برتن دھوتے رہتے تھے اور میں تصوّر میں کھوئی رہتی تھی اور ایک آدھ برتن ہاتھ سے گِر کر ٹوٹ جاتا تھا"۔

"تم تصوّر کی بات کرتی ہو خالہ!..."

"نازی کہو سکندر!"— اُس نے پیاری سی بے تکلفی سے کہا — "ابّا گھر ہوں گے تو خالہ کہہ لینا"۔

"میں کہنے لگا تھا کہ تم جو کچھ بھی دیکھتی تھیں وہ تمہارا تصوّر تھا"— میں

نے کہا — "تمہیں خود بھی معلوم تھا کہ یہ تصوّر ہے اور یہ تمہارے ذہن نے خود بنایا ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں یہ میرے ذہن کا بنایا ہُوا نہیں۔ جس طرح میں تمہیں اپنے پاس بیٹھا ہُوا محسوس کر رہا ہوں، بالکل ایسے ہی میں مینا کے جسم کو محسوس کرتا ہوں۔ وہ مجھے اسی طرح اپنے پاس بٹھاتی ہے جس طرح تم نے بٹھایا ہُوا ہے۔ میں تمہیں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تمہارے اور اُس کے جسم کی بُو میں فرق ہے"۔

"کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟"— شہناز نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

میری ہنسی نکل گئی۔

"سچ بتاؤ"— اُس نے اب دونوں بازو میرے گرد لپیٹ دیئے اور بولی — "وہ کیسی ہے؟ مجھ سے اچھی ہے؟"

"اُس کی خوبصورتی اپنی قسم کی ہے"— میں نے کہا — "اور تمہاری خوبصورتی اور قسم کی ہے۔ اُسے میں چاہتا ہوں اس لئے میں اُسے زیادہ خوبصورت سمجھتا ہوں .... لیکن .... لیکن نازی! میں ایک بات نہیں سمجھتا۔ کیا مر کر انسان دوسرا جنم لے سکتا ہے؟"

"نہیں"— اُس نے جواب دیا — "ہم مسلمان دوسرے جنم کو نہیں مانتے۔ ہندو مانتے ہیں"۔

"شاید میں بھی مانتا ہوں"— میں نے کہا — "میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا تو میں نے یاد کرنے کی کوشش کی تھی کہ اُسے میں نے پہلے کہاں دیکھا تھا"۔

"تم جوان ہو گئے ہو سکندر!"— اُس نے کہا — "لیکن نادان بھی ہو.... میں ناشتہ بنا لوں۔ رات کو بیٹھیں گے"۔

*

اُس صبح شہناز مجھے بڑی اچھی لگی۔ کچھ افسوس سا بھی ہُوا کہ میں نے رات کو اس کی نیّت پر شک کیا تھا۔ ناشتے کے دوران بھی شہناز نے بڑی باتیں کیں

پھر میں اپنی امّی کی قبر پر چلا گیا۔ فاتحہ پڑھ کر میں قبرستان میں گھومنے پھرنے لگا۔ نئی اور پرانی قبریں دیکھتے دیکھتے میں اُس طرف چلا گیا جہاں تقریباً تمام قبریں پرانی تھیں۔ ان میں جو پکی تھیں وہ بھی ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ بعض بیٹھ گئی تھیں، اور جو کچی تھیں وہ ذرا ذرا سی ڈھیریاں رہ گئی تھیں۔ عجیب سی ویرانی تھی۔

مجھے اپنی امّی کا خیال آیا کہ ایک روز اس کی قبر بھی پرانی قبروں میں شامل ہو جائے گی مگر مجھے یہ خیال نہ آیا کہ ایک روز لوگ مجھے بھی زمین میں اتار کر اُوپر مٹی ڈال دیں گے اور پھر میری قبر بھی پرانی ہو کر بیٹھ جائے گی۔ میں امّی کے خیال میں ڈوبتا گیا اور میں تصوّر میں امّی کی قبر میں اُتر گیا۔

"سکندر!" — کچھ دُور سے ایک نسوانی آواز آئی۔

میں نے اُدھر دیکھا۔ دھند سی تھی، سفید سی دھند۔ زمین سے بھاپ جیسا دھواں اُٹھنے لگا۔

"سکندر!" — آواز پھر آئی — "آگے آجاؤ۔"

اب میں نے آواز کو پہچان لیا۔ یہ مینا کی آواز تھی۔ میں قبرستان میں نہیں تھا۔ میں چلا تو کسی قبر سے مجھے ٹھوکر نہ لگی۔ زمین سے بھاپ سی اُٹھ رہی تھی۔ ٹھوکر نہ لگنے سے میں کہتا تھا کہ میں قبرستان میں نہیں۔ دھند میں سے درختوں کی چوٹیاں اور ان کے اُوپر آسمان نظر آ رہا تھا جس کا رنگ ہلکا نیلا نہیں بلکہ گہرے اور ہلکے نیلے کے درمیان کا رنگ تھا۔

گھوڑے دوڑنے کا شور سنائی دینے لگا۔ پہلے تو صاف پتہ چلتا تھا کہ چار پانچ گھوڑے دوڑے جا رہے ہیں پھر ان کی تعداد بڑھتی گئی اور ایسا شور سنائی دینے لگا جیسے بلندی سے آبشار گر رہی ہو۔ میں رُک گیا۔ یہ شور اس طرح زیادہ اور پہلے سے بلند ہوتا جا رہا تھا جیسے سینکڑوں گھوڑوں کا طوفان میری طرف آ رہا ہو۔

پھر زمین سے اُٹھتی بھاپ کے اُوپر سے مجھے تیس چالیس گھوڑوں کے سر اور سوار نظر آنے لگے۔ سواروں کے سروں پر سکندرِ اعظم کے زمانے

کے آہنی خود تھے۔ میں نے ایسے خود تصویروں میں دیکھے تھے۔ میں کھڑا دیکھتا رہا اور ہزاروں گھوڑے میرے سامنے سے گزر گئے اور شور کم ہونے لگا۔

"سکندر!" — مجھے مینا کی پکار ایک بار پھر سنائی دی — "کہاں ہو؟ .... واپس کیوں نہیں آتے؟"

میں پھر چل پڑا اور دھند میں مجھے ایک نسوانی پیکر دکھائی دینے لگا۔ قد بُت مینا جیسا تھا۔ چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اُس کی طرف بڑھتا جاتا تھا اور وہ دھند میں پیچھے ہی پیچھے ہٹتی جاتی تھی۔ میں اور تیز چل پڑا۔ چلتے چلتے ایسی ٹھوکر لگی کہ میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ سنبھلنے کے لئے دو تین قدم آگے بڑھائے لیکن میں آگے کو گرتے جسم کو اٹھا نہ سکا اور ہاتھ زمین پر لگ گئے۔

"کیا ہو گیا سکندر!" — مینا کے دو بازوؤں نے مجھے سہارا دے کر سیدھا کر دیا۔ وہ کہہ رہی تھی — "اُٹھتی جوانی نے تمہیں مدہوش کر دیا ہے۔"

میں اُس کے ساتھ لپٹ گیا۔ اُس کے بازوؤں کا گھیرا میرے گرد اور تنگ ہو گیا۔

"امّی کی قبر پر گئے تھے؟"

میں نے اُس کے بازوؤں سے نکل کر دیکھا۔ وہ مینا نہیں شہناز تھی۔ میں چونکا اور وہ ہنس پڑی۔

"میں امّی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے چلا گیا تھا" — میں نے کھسیانے سے لہجے میں کہا۔

"سکندر!" — شہناز نے اُداس سے لہجے میں کہا — "تم امّی کو نہ کبھی بھول سکو گے نہ کبھی اُسے پا سکو گے۔ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرو۔ مرے ہوؤں کے پیچھے کوئی مر نہیں جایا کرتا۔ کتنی ہی جانیں قربان کر دو، ان کے عوض خدا کسی مرے ہوئے کو زندگی نہیں دیتا۔"

اُس کی ایسی باتیں مجھے اچھی لگا کرتی تھیں۔ اُس روز تو اُس کے ہمدردی

کے الفاظ مجھے بہت ہی اچھے لگے۔

*

اُس رات کا واقعہ ہے۔ کھانے کے بعد شہناز میرے کمرے میں آگئی۔ اُس نے مجھے پلنگ پر اپنے ساتھ بٹھا لیا اور اس طرح باتیں کرنے لگی جیسے دو سہیلیاں یا دو دوست آپس میں کیا کرتے ہیں۔ یہ کوئی سنجیدہ باتیں نہیں تھیں۔ یہ دو بچوں کی باتیں تھیں۔ مثلاً چھوٹی سی ایک کہانی اُس نے مجھے سنائی اور ایسی ہی ایک کہانی میں نے اُسے سُنا دی۔ لطیفوں کا بھی تبادلہ ہُوا۔

سردیوں کی راتیں تھیں۔ ہم ایک ہی رضائی میں بیٹھے ہوتے تھے شہناز نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ میں اُسے ہم عمر اور ہمجولی سمجھنے لگا تھا۔ میں آپ کو پھر یاد دلا دیتا ہوں کہ میری عمر سولہ سال تھی اور یہ عمر غیر ذمہ داری اور لاپرواہی کی اور ہنسنے کھیلنے کی عمر ہوتی ہے۔ شہناز مجھے گدگدی کر رہی تھی اور میں تڑپتا اور ہنستا تھا۔ کھیل ہی کھیل اور ہنسی ہنسی میں وہ لیٹ گئی اور مجھے اپنے اوپر گرا لیا — اور اُس نے ایک دو ایسی حرکتیں کیں کہ مجھے یاد آگیا کہ میں مرد ہوں اور یہ عورت ہے — وہ مجھے یہی احساس دلانا چاہتی تھی اور یہ بھی کہ وہ مجھے، بلکہ یوں کہیں کہ وہ میرے جسم کو چاہتی ہے۔

میں تڑپ کر الگ ہو گیا۔ میں نے اُس کا چہرہ دیکھا، اُس کی آنکھیں دیکھیں، لگتا تھا اُس کے جسم کا سارا خون اُس کے چہرے پر آ گیا ہو۔ اُس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔

"تم میرے باپ کی بیوی ہو" — میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "تم میری ماں ہو۔"

"نہ میں تمہارے باپ کی بیوی ہوں نہ میں تمہاری ماں ہوں" — اُس نے ایسے لہجے میں کہا جس میں غصہ بھی تھا۔

"تو اور کیا ہو؟" — میں نے پوچھا۔

"میں تمہیں یہ بھی بتا دوں گی" — اُس نے کہا — "اگر تم میری بات

پر نہ آتے سکندر! .... بہت پچھتاؤ گے۔ میرے پیار کی تم یہ قیمت دے رہے ہو؟"

"تم میرے باپ سے پوری قیمت وصول کر رہی ہو" — میں نے کہا اور میں مردوں کی طرح دلیر ہو گیا۔ میں نے کہا — "تم مجھ سے جو قیمت مانگ رہی ہو وہ تمہیں کبھی نہیں ملے گی۔ مجھے زیادہ پریشان کرو گی تو میں خالہ کے پاس چلا جاؤں گا اور اُسے بتاؤں گا کہ تم ....."

"جاؤ" — اُس نے چیلنج کے لہجے میں کہا — "ابھی چلے جاؤ۔ بتا کے تو دیکھو خالہ کو۔ کیا میرے مُنہ میں زبان نہیں؟ کیا میں تمہارے باپ کو نہیں کہہ سکتی کہ یہ لڑکا رات کو میرے بستر پر چڑھ آیا تھا؟"

تب مجھے یاد آیا کہ یہ لڑکی کس خاندان کی ہے اور اس خاندان کی شہرت کیسی ہے۔ میری خالہ نے مجھے کتنی بار کہا تھا کہ شہناز پر نظر رکھا کرو۔ یہ تمہارا گھر لُوٹ رہی ہے اور اپنی ماں کی جھولی بھر رہی ہے۔

"اگر اس کی کوئی ایسی ویسی حرکت دیکھو تو فوراً اپنے ابا جان کو بتا دینا" — خالہ نے کہا تھا۔ پھر خالہ نے آہ لے کر کہا تھا — "لیکن تیرے ابا جان تو اس کے غلام بنے ہوتے ہیں۔ وہ اس لڑکی کے خلاف کچھ سنیں گے نہیں۔"

اب میں نے ضرورت محسوس کی کہ شہناز کی یہ حرکت ابا جان کو بتاؤں لیکن میں ڈر گیا کہ اُلٹا مجھ پر ہی الزام لگے گا۔ شہناز بہت چالاک لڑکی تھی۔ وہ شاید جان گئی تھی کہ میں اپنے باپ سے ڈر رہا ہوں۔ وہ پلنگ سے اُٹھ کر میرے قریب آگئی۔

"آؤ" — اُس نے ذرا نرمی سے کہا اور میرا بازو پکڑ کر بولی — "مت ڈرو۔ مجھے مرد بن کر دکھاؤ۔"

میں نے ایسے سوچا تو نہیں تھا لیکن اپنے آپ ہی ایسے ہو گیا کہ میرا ہاتھ دائیں طرف بڑی تیزی سے ہوا میں گھوما اور اُس کے مُنہ پر جا لگا۔ بڑا سخت تھپڑ تھا۔ وہ تین چار قدم پرے جا پڑی۔

"اب میرے ابا کو بتانا" — میں نے کہا — "میں اس طرح تجھے مرد

بن کر دکھاؤں گا۔"

وہ آہستہ آہستہ اُٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ پہلے تو مجھے رونا آیا لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور سوچا کہ اب مجھے مرد بن کر ہی دکھانا چاہیئے۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور لیٹ گیا۔ کئی سوچیں آئیں، کئی خیال آتے لیکن میں آج بھی حیران ہوں کہ میں نے مردوں والا حوصلہ قائم رکھا۔ اپنی ماں یاد آئی پھر بھی میں نہ رویا۔ میں سوچ یہ رہا تھا کہ باپ کو بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ بار بار دماغ یہاں آکر رک جاتا تھا کہ میرا باپ شہناز کی ہی سُنے گا۔ جب یہ خیال آیا کہ جو طاقت شہناز کی زبان میں ہے وہ میری زبان میں نہیں تو میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

یہ فیصلہ کیا کہ شہناز نے میرے باپ سے میرے خلاف کچھ کہا تو میں اُسے بتا دوں گا کہ اصل میں کیا ہُوا تھا۔ اگر باپ نے مجھ پر ہاتھ اُٹھایا تو میں خالہ کے پاس چلا جاؤں گا۔

صبح شہناز نے ناشتے کے لئے مجھے باورچی خانے میں بلایا۔ کچھ دیر ہمارے درمیان خاموشی طاری رہی جو شہناز نے توڑی۔

"تم نے میرا دل توڑ کر اچھا نہیں کیا" — اُس نے سنجیدگی سے کہا — "زبان بند رکھنا۔ کسی کے ساتھ رات کا ذکر نہ ہو.... پھر سوچ لو تصوّروں میں لڑکیوں کو دیکھتے ہو۔ میں جو موجود ہوں۔"

میں نے کچھ بھی نہ کہا۔ خاموشی سے ناشتہ کیا اور خاموشی سے باہر آ گیا۔

*

دو روز اور گزر گئے۔ میرے باپ کو آ جانا چاہیئے تھا لیکن اُس کا پیغام آگیا کہ وہ مزید دو دن باہر رہے گا۔ میں باہر نکل گیا۔ شہناز دیکھ رہی تھی۔ میں ایک دوست کے گھر گیا تھا۔ وہ نہ ملا تو میں واپس آ گیا۔ معلوم نہیں میں کیوں بالائی منزل کے ایک کمرے میں چلا گیا۔ شہناز نے مجھے واپس آتے اور اُوپر جاتے نہ دیکھا۔

پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے صحن میں مردانہ قدموں کی آہٹ

سنائی دی۔ میں جس بالائی کمرے میں تھا اس کی ایک کھڑکی صحن کی طرف تھی جس میں جالی لگی ہوئی تھی۔ میں نے جالی میں سے دیکھا۔ ایک آدمی جس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہو گی صحن میں کھڑا مُسکرا رہا تھا۔ شہناز کسی کمرے سے نکلی اور بڑی تیز چلتی اُس کے ساتھ لپٹ گئی پھر اُسے اندر لے گئی۔

اس آدمی کو میں نے پہلے کئی بار دیکھا تھا۔ شہناز اُسے اپنا چچازاد بھائی بتایا کرتی تھی، اور وہ ہمارے شہر کا رہنے والا نہیں تھا۔ میں جالی میں سے دیکھتا رہا۔ شہناز باہر آئی اور دوڑتی ہوئی ڈیوڑھی میں چلی گئی۔ وہ دروازہ بند کرنے گئی تھی۔ اُسے غلط فہمی تھی کہ میں گھر میں نہیں ہوں۔ وہ پھر کمرے میں چلی گئی۔

میں اس سوچ میں کھو گیا کہ میں کیا کروں۔ کچھ ذہن میں کوئی بات نہیں آتی تھی اور میں نے جو دیکھا تھا وہ میری برداشت سے بھی باہر تھا۔ آخر ذہن میں ایک سوچ آ گئی۔ مجھے ڈر تھا کہ شہناز میرے ابا سے یہ نہ کہہ دے کہ میں نے اُس پر دست درازی کی تھی۔ مجھے اُس کا مُنہ بند کرنے کا بڑا اچھا موقع مل گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے موقع پر پکڑ لوں۔ یہ تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ آدمی اچھی نیت سے نہیں آیا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ شہناز نے اُس کا استقبال کس طرح کیا تھا۔

میں چند منٹ گزار کر دبے پاؤں نیچے آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ شہناز اپنے مہمانوں کو کس کمرے میں بٹھایا کرتی تھی۔ دروازہ کھُلا تھا۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں کمرے میں چلا گیا۔ وہ وہاں نہیں تھے۔ وہ یقیناً سونے والے کمرے میں تھے جو آگے تھا۔ انہیں تسلی تھی کہ باہر کا دروازہ اندر سے بند ہے اور گھر میں کوئی نہیں اس لئے اُنہوں نے سونے والے کمرے کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

میں سونے والے کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہُوا۔ انہیں اُسی حالت میں دیکھا جس کی مجھے توقع تھی۔ چونکہ میرے ذہن میں پہلے ہی یہ منظر تھا اس لئے میں نے اپنے آپ میں ذرا سا دھچکہ بھی محسوس نہ کیا اور مجھے افسوس

بھی نہ ہُوا۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔ میرے بوڑھے باپ نے ایک نوجوان لڑکی کو اپنا قیدی بنا لیا تھا۔ لڑکی اگر شریفوں کی ہوتی تو شاید میرے باپ کا کچھ بھرم رہ جاتا مگر یہ لڑکی مجرمانہ ذہنیت والے خاندان کی تھی۔

ان دونوں نے میری طرف دیکھا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ لیں۔ جب اُنہوں نے مجھے دیکھ لیا تو وہاں سے ہٹ آیا اور اُوپر چلا گیا۔ میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ شہناز کو میں کیا کہہ کر اپنے پاؤں میں بٹھاؤں گا اور وہ کیا کہے گی۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہ دونوں اُوپر آ گئے۔

"دیکھو سکندر!" — اس آدمی نے مجھے کہا — "زبان بند رکھنا۔"

"اگر میں نے زبان بند نہ رکھی تو؟"

"ساری عمر پچھتاتے رہو گے" — اُس نے کہا۔

"اگر اس کے ساتھ میرا خون کا کوئی رشتہ ہوتا" — میں نے شہناز کی طرف اشارہ کر کے کہا — "تو میں دیکھتا کہ تم یہاں سے زندہ کس طرح نکلتے ہو۔ سب جانتے ہیں یہ بدکار لڑکی ہے اور جب میرا باپ گھر نہیں ہوتا تو یہ ...."

"زبان روک لے" — اُس نے کہا — "اگر تم نے کسی کے ساتھ ذکر کیا تو تمہارا باپ تمہیں ڈھونڈتا پھرے گا۔"

"کسی کے ساتھ ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے!" — میں نے کہا — "اپنے باپ کے ساتھ اپنی خالہ اور اپنی پھوپھی کے ساتھ ذکر ہو گا۔ ان کے گھروں کے تمام آدمیوں کو یہاں بلا کر اور اسے ان کے درمیان بٹھا کر بتاؤں گا کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے اور عزت کے علاوہ اس گھر میں اور کیا لُوٹ مچی ہوئی ہے۔"

شہناز اُس کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ اُس نے اُس کے ذرا پیچھے ہو کر اُسے کہنی ماری۔ میں نے اُس کا یہ اشارہ دیکھ لیا۔ اس آدمی نے مجھے گھُور کر دیکھا اور چلا گیا۔ شہناز وہیں کھڑی رہی۔ میں نے اُس سے نظریں ہٹا لیں۔ وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آ گئی۔

"میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ آئندہ یہاں نہ آئے" — اُس نے کہا — "بڑا بدمعاش آدمی ہے۔ میں اس کے ہاتھوں میں مجبور ہوں۔"

"یہ بات تم نے اُس کے سامنے کیوں نہ کہی؟" — میں نے کہا۔

"کہتی تو اُس کے ساتھ تمہاری لڑائی ہو جاتی" — شہناز نے کہا — "اُس کے پاس بہت بڑا چاقو ہوتا ہے۔ یہ تمہارا پیٹ پھاڑ دیتا۔"

"او بے غیرت!" — میں نے کہا — "خدا نے میرے جسم کو طاقت کس لئے دی ہے؟ یہ تم جیسی عورتوں کو خوش کرنے کے لئے نہیں، یہ انہی بدمعاشوں کو سیدھا کرنے کے لئے خدا نے دی ہے .... جھوٹ نہ بولو۔"

اُس نے مجھے لالچ دینے شروع کر دیئے۔ پہلے روپے پیسے کا لالچ دیا پھر ایک بڑی خوبصورت لڑکی کا لالچ دیا۔ مجھے نہ روپے پیسے کی ضرورت تھی نہ کسی خوبصورت لڑکی کی۔ روپے پیسے کی میرے پاس کمی نہیں تھی۔ مجھ میں کوئی ایسی بُری عادت بھی نہیں تھی جس کے لئے روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔

"اگر مجھے کسی لڑکی کی ضرورت ہوتی تو تم سے زیادہ خوبصورت کونسی لڑکی ہو سکتی تھی!" — میں نے کہا — "تم نہیں جانتیں کہ میرے دل میں عورت کا کتنا احترام ہے۔"

مرد ایک خوبصورت عورت کو بہت بڑا انعام سمجھا کرتے ہیں میں عورت کو کچھ اور سمجھتا رہا۔

"تم اگر کوئی دھمکی دینا چاہتی ہو تو دے لو" — میں نے کہا۔

"سکندر!" — اُس نے آہ بھر کر کہا — "مجھے تم سے اتنا پیار ہے کہ میں تمہیں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتی باہر نکل گئی۔

٭

میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اپنے باپ کو بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ اتنا تو میں نے سوچ لیا تھا کہ خالہ اور پھوپھی کو ابھی نہیں بتاؤں گا۔ اگر میں انہیں بتاتا تو باپ بہت ناراض ہوتا۔ انہیں وہ اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ شہناز نے اُسے اُن کے خلاف کر رکھا تھا۔

میں پریشان سا ہو گیا۔ دوسری کھڑکی کھولی جو ساتھ والے مکان کی چھت

کی طرف کھلتی تھی۔ اس مکان کے صحن میں نیم کے دو درخت تھے جو خاصے اونچے اور بہت پھیلے ہوتے تھے۔ انہوں نے مکان کی منڈیروں کو ڈھانپ رکھا تھا بلکہ چھت کا کچھ حصّہ بھی ان کی ڈالیوں کے نیچے آیا ہُوا تھا۔

ان گھنی ڈالیوں کے پیچھے کوئی عورت تھی جو آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ دبے پاؤں چل رہی ہو۔ میں اُسے دیکھنے لگا۔ وہ جلدی سامنے آگئی ——— وہ مینا تھی ——— مجھے دیکھ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھتی تیزی سے چل پڑی اور میری کھڑکی کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ وہ تو جیسے پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگئی تھی۔ میں اسے اس طرف سے آتا دیکھ کر حیران ہوگیا۔

"تم شاید اس لئے حیران ہو رہے ہو کہ میں اِدھر سے کیسے آگئی ہوں" ——— اُس نے کہا ——— "بڑا اچھا راستہ مل گیا تھا ... ہٹو آگے سے!"

وہ کھڑکی میں سے اندر آگئی اور اُس کی نظریں کمرے میں گھومتے گھومتے مجھ پر رُک گئیں۔ مجھ پر ایسے خمار سا طاری ہوگیا جیسے اُس کی نظروں نے کمرے میں خوشبوئیں بکھیر دی ہوں۔ اُس کا دوپٹہ ایک طرف سے سرک گیا تھا۔ گہرے بادامی رنگ کے ریشم جیسے بالوں میں جو قدرتی چمک تھی وہ اس دنیا کی کسی لڑکی میں نہیں ہوسکتی۔

"کیا تم مجھ سے بھاگنا چاہتے ہو سکندر؟"

"نہیں مینا!" ——— میں نے کہا ——— "میں تو تمہاری راہ دیکھتا رہتا ہوں لیکن میں تمہیں اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔"

"تم کون ہوتے ہو ایسا فیصلہ دینے والے؟" ——— اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر چُومتے ہوتے کہا ——— "کیا تم دیوتاؤں کے فیصلے کو بدل سکتے ہو؟"

"کیا تم اب بھی دیوتاؤں کو مانتی ہو؟" ——— میں نے کہا ——— "کیا ہمارے مذہب نے دیوتاؤں کو ختم نہیں کر دیا تھا؟ کیا تم خدا کو نہیں مانتیں؟ ..... میں شاید اس لئے تم سے بھاگ آیا تھا کہ تم نے اگر میرے ساتھ شادی کی ہی تھی تو وہ دیوتاؤں کی عبادت گاہ میں ہوئی تھی۔ ہمیں اپنے مذہب کے طریقے سے شادی کرنی ہوگی۔"

"میں خدا کو مانتی ہوں" ——— اُس نے کہا ——— "لیکن ایک دیوتا کو میں نہیں مرنے دوں گی۔ یہ محبت کا دیوتا ہے۔ میں اس کا حکم ضرور مانوں گی۔"

"مینا!" ——— میں نے کہا ——— "میں بہت پریشان ہوں۔"

"تم اس لئے پریشان ہو کہ تم نے ابھی اپنے آپ کو نہیں پہچانا" ——— اُس نے کہا ——— "اِس گھر میں تم امانت ہو۔ تم کسی اور کے بچے ہو۔ تمہاری آنکھوں میں وہ طاقت ہے کہ جدھر دیکھو گے اُدھر قیامت بپا ہو جاتے گی۔ جنّات اور پریاں تمہارے آگے سجدے کریں گی۔"

"مینا!" ——— میں نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا ——— "تم نے یہ الفاظ کہاں سُنے تھے؟ یہ ایک پاگل عورت کے الفاظ ہیں جو آٹھ نَو سال پہلے اُس نے میرے متعلق میری ماں سے کہے تھے۔"

"وہ پاگل نہیں تھی" ——— مینا نے کہا ——— "اُسے پاگل کہنے والے پاگل تھے۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ تمہارے باپ نے اُسے اس لئے ڈانٹ دیا تھا کہ اس نے کہا تھا کہ یہ شخص راستہ بھول جاتے گا اور یہ روپے پیسے سے اپنی قسمت بنانے کی کوشش کرے گا؟"

مجھے ایسے لگا جیسے یہ آواز مینا کی نہیں بلکہ میرے اپنے ذہن کی صدائے بازگشت ہے۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شہناز نے مجھے کہا تھا کہ جوانی کے آغاز میں ذہن بڑے حسین تصوّر بنا لیا کرتا تھا اور مینا ایک تصوّر ہے۔ میں نے یہ یقین کرنے کے لئے کہ مینا تصوّر نہیں، میں نے مینا کے دونوں بازو پکڑے۔ میں اُسے محسوس کرنا چاہتا تھا۔

اُس نے مجھے اپنا آپ یوں محسوس کرا دیا کہ میں نے تو اُس کے بازو پکڑے تھے اور وہ اس طرح میرے ساتھ چپک گئی جس طرح لوہے کا چھوٹا سا ٹکڑا بڑے سخت مقناطیس سے جا لگتا ہے۔ پھر ایسے محسوس ہُوا جیسے ہم ایک دوسرے میں تحلیل ہو گتے ہوں۔ اپنے آپ کو مینا سمجھنے لگا۔ کبھی ایسے لگتا جیسے بادل کا دُھنی ہوئی روئی جیسا بہت بڑا ٹکڑا ہے، میں اس پر لیٹا ہُوا ہوں اور یہ سپید بادل مجھے کہکشاں پر اڑاتے لئے جا رہا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اُسے کھڑکی میں سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ مجھ پہ مدہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے جب کھڑکی میں سے دیکھا تو ایسے لگا جیسے وہ نیم کے گھنے درخت میں کہیں غائب ہو گئی ہو۔

"تم کہیں جا تو نہیں رہے؟" — مجھے آواز سنائی دی۔

اُدھر دیکھا۔ دروازے میں شہناز کھڑی تھی اور میرے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔

"نہیں" — میں نے جواب دیا۔

"میں امّی کے ہاں جا رہی ہوں" — اُس نے کہا — "کچھ دیر ہو جائے گی۔"

اُسے جہاں کہیں بھی جانا ہوتا یہی کہا کرتی تھی کہ امّی کے ہاں جا رہی ہوں، اور کچھ دیر کا مطلب ہوتا تھا پانچ چھ گھنٹے۔ اُس کی واپسی تک گھر رہنا میری ڈیوٹی تھی۔

❋

سورج غروب ہونے کے قریب تھا جب وہ واپس آئی۔ ہم کھانا اکٹھے کھایا کرتے تھے۔ باتیں بھی ہوتی تھیں لیکن اُس شام ہم خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ اُس کی خاموشی مجھے عجیب سی لگ رہی تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ پریشان سی ہے۔ دن کو جو واقعہ ہو گیا تھا اس سے اُسے پریشان ہی ہونا چاہیے تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ ایک بار پھر مجھے کہے گی کہ میں اپنے باپ کو کچھ نہ بتاؤں لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں اور میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

سردیوں کی راتیں تھیں۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ کچھ پڑھتا رہا پھر میں سو گیا۔ میرا خیال ہے کہ تین یا زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے گزرے ہوں گے کہ اپنے دروازے پر دستک سے میری آنکھ کھل گئی۔ شہناز کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ میں اُس کے آنے کا مقصد بھی جانتا تھا۔

"سکندر!" — شہناز کی آواز سنائی دی — "دروازہ کھولو۔ تیرے ابا

آ گئے ہیں۔"

اگر شہناز اکیلی ہوتی تو میں دروازہ نہ کھولتا۔ اپنے باپ سے ملنے کے لئے میں نے دروازہ کھول دیا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ ایک آدمی نے مجھے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا۔ میں پیچھے ہٹا۔ وہ آدمی کمرے میں آ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اُس کے پیچھے ایک اور آدمی تھا۔ وہ بھی اندر آ گیا۔ شہناز مجھے نظر نہ آئی۔ میں گہری نیند سے اُٹھا تھا۔ پوری طرح بیدار ہوتے چند سیکنڈ لگ گئے۔ میں اتنی آسانی سے ان کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ میرے سنبھلتے سنبھلتے دونوں نے مجھے اپنے قابو میں لے لیا اور پلنگ پر پیٹھ کے بل گرا دیا۔ ایک نے میری ٹانگیں دبا لیں اور دوسرا میرے پیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کمرے کی بتی دروازہ کھولنے سے پہلے جلا دی تھی۔ میں نے ایک آدمی کو پہچان لیا۔ یہ وہی تھا جسے میں نے شہناز کے ساتھ اُس روز پلنگ پر دیکھا تھا۔

"لا، وہ دے مجھے" — میرے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔

اُس نے ایک ہاتھ اپنے پیچھے کر دیا۔ میرا خیال ہے وہ شہناز تھی جس نے اس آدمی کے ہاتھ میں ایک کپڑا یا رومال دیا۔ اس شخص نے یہ رومال میرے مُنہ اور ناک پر رکھ دیا پھر مجھے کچھ یاد نہیں کیا ہُوا۔

❋

میں ہوش میں آیا، آنکھ کھلی تو میں بستر پر پیٹھ کے بل پڑا تھا لیکن یہ چھت میرے کمرے کی چھت نہیں تھی۔ سر بوجھل تھا۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ یہ معمولی سے گھر کا کمرہ تھا۔ میں ایک چارپائی پر بیٹھا ہُوا تھا جس پر معمولی سا بستر تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایسی ہی ایک چارپائی تھی جس پر بستر بچھا ہُوا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ میں اُٹھا تو مجھے چکر سا آ گیا۔ میں رُک گیا اور چکر ختم ہو گیا۔ پہلا خیال یہ آیا کہ مجھے شہناز نے اغوا کرایا ہے۔ مجھے امید تھی کہ اُس نے مجھے ڈرانے کے لئے یہ انتظام کیا ہے اور مجھے چھوڑ دیا جائے گا۔

میں نے دروازہ کھولنا چاہا۔ یہ باہر سے بند تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو تین منٹ بعد دروازہ کھُلا اور ایک عورت اندر آئی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ میری

نظر کا دھوکہ ہے لیکن اس عورت نے دھوکے کو یقین میں بدل دیا۔

"پہچانا نہیں مجھے؟" — اُس نے پوچھا۔

"یہ تمہارا گھر ہے؟" — میں نے پوچھا — "ہمارے گھر کا نمک حرام کر رہی ہو؟"

"بیٹھ جاؤ سکندر!" — اُس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے ماں باپ کا نمک حرام نہیں کروں گی۔"

اُس نے مجھے چارپائی پر بٹھا دیا۔ یہ عورت ہماری نوکرانی ہوا کرتی تھی۔ میرا شعور بیدار ہُوا تو میں نے اسے اپنے گھر میں دیکھا تھا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ میری ماں نے اسے میری پیدائش سے دو سال پہلے رکھا تھا۔ امّی کی وفات کے دو اڑھائی سال بعد تک ہمارے گھر میں رہی۔ میرے باپ نے جب شہناز کے ساتھ شادی کی تو اس کے تین چار ماہ بعد اس نے ہمارے گھر کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ اب اتنے برسوں بعد میں اُسے دیکھ رہا تھا۔

اُس نے جب ہمارے گھر کی نوکری چھوڑی تھی تو مجھے گلے لگا کر بہت روئی تھی۔ اسے میرے ساتھ سگی ماؤں جیسا پیار تھا۔ میں زیادہ تر اسی کی گود میں سوار رہتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ کہاں کی رہنے والی ہے۔ ہمارے شہر کی رہنے والی نہیں تھی۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ نوکرانی ہے۔ صاف ستھرے اور اچھی قسم کے کپڑے پہنتی تھی۔ میری ماں اسے اپنے پھٹے پرانے کپڑے نہیں بلکہ وہ کپڑے دیا کرتی تھی جو ابھی کچھ عرصے تک پہننے کے قابل ہوتے تھے۔ اس کا رنگ صحت مند اور صاف ستھرا تھا اور نقش تیکھے تھے۔ پھرتیلی اور خوبصورت عورت تھی۔ میرا باپ بھی اسے پسند کرتا تھا۔

اس کا نام عائشہ تھا اور عشو کہلاتی تھی۔ اب اُس کی عمر چالیس کے قریب پہنچ رہی تھی لیکن چہرے اور جسم سے پہلے کی طرح جوان لگتی تھی۔

"میں کہاں ہوں عشو؟" — میں نے جھنجھلا کر پوچھا — "میرے ساتھ کیا ہُوا ہے؟ کچھ بتاؤ، کچھ بولو۔"

وہ میرے سامنے والی چارپائی پر بیٹھی اپنے نیچے والے ہونٹ کو

دانتوں میں دبا رہی تھی۔

"تمہیں بہت بُری جگہ پہنچا دیا گیا ہے" — اُس نے کہا — "یہاں سے معلوم نہیں تمہیں کہاں پہنچایا جائے گا۔"

"کیا یہ انتظام شہناز نے کرایا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "یہ اُسی کا کام ہے لیکن میرا اُس فاحشہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں" — وہ بولتے بولتے چُپ ہو گئی اور اُس نے نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

وہ اچانک اُٹھی اور ایک ہی جست میں میرے پاس چارپائی پر آ بیٹھی۔ اُس نے مجھے اپنی گود میں گرا لیا۔ بڑی بے تابی سے میرے سر، میرے ماتھے اور میرے گالوں کو چُوما اور مجھے بازوؤں میں بھینچ کر ایسی روئی کہ سسکیاں لینے لگی۔ پھر اچانک اُس نے مجھے جھنجھوڑا۔

"سکندر!" — اُس نے جذباتی لہجے میں کہا — "تم ایسے تنور میں آ پڑے ہو جہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے۔ میں تمہیں یہاں سے نکال سکتی ہوں لیکن مجھے اپنی جان دینی پڑے گی .... میں جان دے دوں گی۔ تمہاری ماں کی روح کے آگے میں شرمسار نہیں ہوں گی۔ دو دن باقی ہیں۔"

دو دن ... صرف دو دن!

"کیا عشو مجھے دو دنوں میں یہاں سے نکال دے گی؟" — ایک تو یہ سوال تھا جو مجھے پریشان کرنے لگا اور دوسرا سوال یہ — "عشو میرے لئے اپنی جان کیوں قربان کرے گی؟"

ماں اور باپ کے بعد مجھے عشو سے پیار تھا۔ عشو نے مجھے اپنی گود میں لٹا لیا اور دیوانہ وار مجھے جو چوما چاٹا تھا، اس میں دکھاوا نہیں تھا۔ یہ اُس دلی محبت کا اظہار تھا جو اُسے مجھ سے تھی۔ میں اُس کے پیار میں ماں کے پیار کا ذائقہ محسوس کر رہا تھا لیکن وہ وقت پیار اور محبت کا نہیں تھا۔ مجھے اغوا کیا گیا تھا اور میں اس مکان میں قیدی تھا۔

اگر مجھے ان لوگوں کے ہاتھوں قتل ہونا تھا تو مجھے کوئی غم نہ تھا۔ ماں کی موت کا غم میرے دل و جگر کو کھا رہا تھا۔ باپ زندہ تھا مگر میرے لئے مر گیا تھا۔ وہ میرے لئے جو نئی ماں لایا تھا اُسے ماں بیٹے کا رشتہ قبول نہیں تھا اور مجھے جسموں کا رشتہ قبول نہیں تھا۔ اس کی اُس نے مجھے سزا دے دی تھی۔ میں مرنے کے لئے تیار تھا۔ زندگی میں میرے لئے کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ میں اس وجہ سے بھی قتل ہو جانے کو ترجیح دیتا تھا کہ میں ابھی لڑکا تھا اور خوبصورت تھا۔ میری تو ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔

"کیا یہ لوگ مجھے قتل کریں گے؟" — میں نے عشو سے پوچھا۔

"شاید نہیں" — اُس نے جواب دیا — "اگر قتل کرنا چاہتے تو تمہیں یہاں نہ لاتے، پھر بھی میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟" — میں نے پوچھا — "میری سوتیلی ماں کے ساتھ ان کا کیا تعلق ہے؟"

"اغوا، بردہ فروشی اور ڈکیتی ان لوگوں کا پیشہ ہے" — عشو نے جواب دیا — "شہناز کے خاندان کے ساتھ ان لوگوں کا تعلق ہے۔ میں ان کی نوکرانی تو نہیں لیکن میرا کام نوکرانیوں یا حکم ماننے والیوں جیسا ہی ہے۔"

مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ عشو ان جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ کیوں ہے اور ان میں اُس کی حیثیت کیا ہے۔ میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ مجھے واقعی یہاں سے نکال دے گی یا مجھے دھوکہ دے رہی ہے۔

"عشو!" — میں نے کہا — "تم میرا دل نہ پرچاؤ تو میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں؟ مجھے بتا دو کہ میرا انجام کیا ہو گا تو میں تم پر حملہ تو نہیں کر دوں گا۔"

"کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں؟"

"بھروسہ ہو کیسے سکتا ہے؟" — میں نے کہا — "میں تمہارے گروہ کا قیدی ہوں۔"

"سکندر!" — اُس نے آہ بھری اور اُس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آ گئی جو المناک تھی۔ کہنے لگی — "یہ بتانے کے لئے کہ تمہیں مجھ پر بھروسہ کرنا چاہئے، مجھے بڑی لمبی بات سنانی پڑے گی۔ میں آج اس سے بھی زیادہ لمبی بات کر سکتی ہوں کیونکہ میں آج یہاں اکیلی ہوں۔ دو آدمی ہر وقت یہاں ہوتے ہیں۔ دن کو اگر کہیں چلے جائیں تو ایسا پکا انتظام کر جاتے ہیں کہ میں بھی باہر نہیں نکل سکتی۔ آج وہ صبح ہوتے ہی چلے گئے ہیں۔ شام کو آئیں گے۔ میں تمہارے ساتھ اکیلی ہوں۔"

"تمہیں میرے پاس اکیلا چھوڑنے والوں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ میں پھرتیلا لڑکا ہوں اور میرے جسم میں طاقت ہے؟" — میں نے کہا — "میں مرد ہوں اور تم عورت ہو۔ کیا میں تمہیں مار مار کر بیہوش نہیں کر سکتا؟"

"نہیں" — اُس نے کہا — "میں خالی ہاتھ نہیں۔ میرے پاس ہتھیار ہے۔ مجھے بیہوش کرنے سے پہلے تم خود بیہوش ہو چکے ہو گے۔ اگر مجھے مار بھی ڈالو گے تو نکلو گے کدھر سے؟ .... پہلے میری بات سن لو۔ تمہیں دیکھ کر میرے وہ جذبات جاگ اُٹھے ہیں جو میں سمجھتی تھی کہ مر گئے ہیں۔ تمہاری ماں نے مجھے اُس وقت پناہ دی تھی جب مرد بھیڑیوں کی طرح میری عصمت

کے شکاری ہو گئے تھے اور میں بھاگتی اور چھپتی پھرتی تھی۔ اُس وقت میں جوان تھی سکندر! اور میں خوبصورت تھی لیکن میں اتنی خوبصورت نہیں تھی جتنی غریب تھی ....

" مجھے ایک گناہ کی سزا ملی تھی۔ میں اُس وقت تیری عمر میں تھی اور ایک ایسے آدمی کے پیچھے گھر سے بھاگ آئی تھی جو کہیں اور کا رہنے والا تھا۔ وہ میرے باپ جیسے مفلس باپ کا بیٹا نہیں تھا۔ وہ مجھے لے آیا اور میرے ساتھ شادی بھی کر لی لیکن اُس کے تمام رشتہ دار اُس سے ناراض ہو گئے اور میرے دشمن بن گئے۔ دو سال ہی گزرے ہوں گے کہ وہ بیمار ہو گیا۔ دن بدن اُس کا جسم خشک ہوتا چلا گیا ....

" مجھے شک تھا کہ اُسے کسی نے دھوکے میں کچھ کھلا دیا ہے۔ نہ مرض کا پتہ چلتا تھا نہ کوئی دوائی اثر کرتی تھی۔ میں خدا کے آگے بہت روتی کہ میری زندگی اُسے دے دے لیکن خدا کا فیصلہ میرے خلاف گیا۔ ایک سال بیمار رہ کر وہ کبھی جُدا نہ ہونے کا وعدہ توڑ گیا اور لوگ اُسے میرے گھر سے اُٹھا کر قبر میں چھوڑ آئے"— عشو نے ہچکی لی اور بہت روئی۔ اُس کا جسم ہچکیوں کے ساتھ ہل رہا تھا۔

*

"مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں بھی اُس کے ساتھ مر نہ گئی"— اُس نے دوپٹے سے آنسو پونچھ کر کہا — "ابھی تو میری جوانی شروع ہوئی تھی اور میں بیوہ ہو گئی۔ مجھے امید تھی کہ راستے میں کھڑے ہو کر دیکھنے والے مجھے شادی کے پیغام دیں گے لیکن وہ میری عصمت کے خریدار بن گئے تھے۔ شادی تو میں نے کرنی نہیں تھی، میں کسی کی داشتہ کیسے بن جاتی؟ مجھے محبت کے پیغام ملے لیکن ان کی نیت کچھ اور تھی۔ تحفے بھی آتے، نقد کے بھی وعدے آئے لیکن میں پتھر بن چکی تھی ....

" دوسری طرف میرے سسرال تھے جو پہلے ہی میرے دشمن تھے۔ انہوں نے دشمنی یہ سوچ کر زیادہ کر دی کہ میں جائداد میں سے خاوند کا حصّہ

مانگوں گی۔ میرے دل میں جائداد اور حصّے کا خیال تو کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ میری جائداد اور میرا سب کچھ وہی تھا جو مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا تھا۔ اُس کی محبت میرا ورثہ تھا۔ میں اسی کو سینے سے لگائے ہوتے تھی۔ مجھے جائداد کو کیا کرنا تھا لیکن سکندر! ان لوگوں کو جائداد سے محبت تھی۔ اس محبت کو وہ سمجھتے ہی نہیں جو دل اور روح کو پھولوں کی طرح کھلا دیتی ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ غریب گھر کی لڑکی ہے اور یہ اپنا حصّہ نہیں چھوڑے گی۔ یہی کچھ سوچ کر انہوں نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا۔"

"کیا کرتے تھے وہ؟"— میں نے پوچھا۔

"کیا کیا بتاؤں!"— اُس نے کہا — "ایک تو انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ یہ بدکار لڑکی ہے۔ اس نے کسی کے ساتھ یاری لگا کر ہمارے بیٹے کو زہر دیا ہے۔ رات کو میرے گھر میں پتھر پھینکتے تھے۔ مجھے کبھی اپنے خاوند کی قبر پر بیٹھا دیکھتے تو وہاں سے ڈرا دھمکا کر اُٹھا دیتے تھے۔ پھر ایسے ہُوا کہ دو بڑے بدمعاش آدمی میرے گھر آجاتے اور اپنی بُری نیت کا اظہار کرتے تھے۔ میری فریاد سُننے والا کوئی نہ تھا۔ میں تو ڈرتی باہر نہیں نکلتی تھی۔ سارا گاؤں میرا دشمن ہو گیا تھا۔ اگر میں اپنے خاوند کی امانت ان دو بدمعاشوں اور نمبردار کے آگے رکھ دیتی تو میری طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا لیکن میں محبت کے ورثے کو نیلام نہیں کر سکتی تھی ....

"اور کیا بتاؤں سکندر! کیا کچھ سنو گے۔ میرے لئے خدا کی زمین تنگ ہو گئی۔ میری جوانی اور میری خوبصورتی میرے لئے عذاب بن گئی۔ ایک رات میرے خاوند کا چھوٹا بھائی میرے گھر آ گیا۔ وہ مجھے اپنی داشتہ بنانے آیا تھا۔ اُس نے بڑے صاف لفظوں میں اپنی نیّت بیان کی اور کہنے لگا کہ پھر مزے سے رہو۔ میں نے اُسے دھتکار دیا اور میں بہت روئی۔ وہ مجھے یہ دھمکی دے کر میرے گھر سے نکلا کہ وہ مجھے اغوا کرا کے رنڈیوں کے بازار میں پہنچا دے گا۔ اُس کے جانے کے بعد میرے صحن میں پتھر گرنے لگے۔ پتھر پھینکنے والے جن بھوت نہیں تھے ....

"اُس رات تک میرا حوصلہ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ جب پتھر گرنے بند ہوتے تو میں گھر سے نکل کھڑی ہوتی۔ اس گھر میں میرا تھا ہی کیا جو میں اپنے ساتھ لے جاتی۔ یہ مکان میرے خاوند کا تھا اور میں جانتی تھی کہ کسی بھی روز میرا سُسر آتے گا یا ساس آتے گی اور مجھے حکم ملے گا کہ اس مکان سے نکلو، یہ ہمارا ہے۔ میں اُس وقت سے پہلے ہی گھر سے نکل گئی۔ میرا زیور دو جھمکے اور ایک انگوٹھی تھی۔ میری شادی اس طرح ہوتی ہوتی جس طرح لڑکیوں کی ہُوا کرتی ہے تو میرے پاس زیور زیادہ ہوتا۔ مجھے نہ میکے سے زیور ملا تھا نہ سُسرال سے۔ جھمکے میرے اپنے تھے اور انگوٹھی خاوند نے دی تھی۔ تین جوڑے کپڑے تھے۔ وہ ساتھ لئے اور میں ڈرتی کانپتی گاؤں سے نکل آتی۔۔۔۔

"مت پوچھ سکندر! میں جس حال میں ڈیڑھ دو میل دُور پکّی سڑک تک پہنچی وہ بیان کروں گی تو بھی میرا دل کانپ جاتے گا۔ اندھیری رات جنگل بیابان اور میں اکیلی جوان لڑکی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ میں جاؤں گی کہاں صرف اس سوچ نے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا کہ گاؤں میں سارے انسان بھیڑیئے بن گئے تھے۔ گاؤں سے نکلی تو دُور سے بھیڑیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے دعا کی، خدایا، ان بھیڑیوں کو بھیج کہ مجھے چیر پھاڑ کر میرا نام اور میرا نشان مٹا دیں۔ میں چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی مگر اونچی آواز نہیں نکالتی تھی کہ کسی نے سُن لیا تو مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتے گا۔۔۔۔

"ریلوے سٹیشن بہت دُور تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اتنی رات گئے کوئی گاڑی کسی طرف جاتی ہے یا نہیں۔ سڑک پر پہنچی تو ایک لاری آتی دکھائی دی۔ مجھے صرف بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سر اور مُنہ پر اچھی طرح چادر لے لی۔ لاری میرے اشارے کے بغیر ہی رک گئی۔ کسی نے پوچھا — کہاں جانا ہے مائی؟ — میں اگلے شہر کا نام جانتی تھی۔ یہ تمہارا شہر ہے۔ میں نے اسی شہر کا نام کہہ دیا اور لاری مجھے اپنے ساتھ لے کر چل پڑی۔۔۔۔

"لاری تین چار جگہوں پر رُکی۔ کوئی سواری اُتری کوئی سوار ہُوئی۔ میں

عورتوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک شہر آیا اور لاری رُکی۔ میں اُترنے کے لئے اُٹھی تو میرے ساتھ بیٹھی ہوتی عورت نے کہا کہ تمہارا شہر تو ابھی دُور ہے۔ اُس نے اُس شہر کا نام لے کر پوچھا، تم وہیں جا رہی ہو نا؟۔۔۔۔

"میں بیٹھ گئی اور کہا کہ میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اسی کو اپنا شہر سمجھ لیا۔ لاری میں اندھیرا تھا۔ اس عورت نے بتایا کہ وہ بھی وہیں جا رہی ہے۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں وہاں کیوں جا رہی ہوں۔ میں نے جھوٹ بول دیا اور وہ چُپ ہو گئی۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی اور بات نہ کی۔۔۔۔

"لاری جب تمہارے شہر میں جا کر رُکی تو سب سے پہلے میں ہی اُتری اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ صبح طلوع ہونے والی تھی۔ مجھے اس طرح محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے میری چادر کھینچ کر اُتار دی ہو اور ساری دنیا مجھے بے پردہ دیکھ رہی ہو۔ اب مجھ پر جو خوف سوار ہُوا وہ اُس خوف سے کہیں زیادہ تھا جو گاؤں سے نکل کر جنگل بیابان میں بے حال کر رہا تھا۔ اس خیال نے میرا سانس بھی روک دیا کہ میں جاؤں گی کہاں۔ اپنے قریب سے مجھے ایک عورت کی آواز سنائی دی — 'تمہیں کوئی لینے آتے گا؟' — میں نے آواز پہچان لی۔ یہ اُسی عورت کی آواز تھی جس نے رات لاری میں مجھے کہا تھا کہ تمہارا شہر ابھی آگے ہے۔۔۔۔

"اب اتنی روشنی ہو گئی تھی کہ قریب سے چہرے پہچانے جاتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بڑی خوبصورت اور جوان لڑکی تھی۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ لئے۔ اُس نے پوچھا کہ میں کسی ماتم پر آتی ہوں؟ میرے مُنہ سے نکل گیا کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ تب اُس عورت نے مجھ سے زیادہ دلچسپی سے پوچھا کہ میں کہاں سے آ رہی ہوں اور مجھے کہاں جانا ہے۔ میں نے اُسے صاف صاف بتا دیا کہ مجھ پر کیا بیتی ہے۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ میرا آگے پیچھے کوئی نہیں"۔

میں کسی اور کیفیت میں وہاں بیٹھا ہُوا تھا اور عشو نے اس طرح کہانی شروع کر دی تھی جیسے میں اس کے گھر میں مہمان آیا ہُوا ہوں اور ایک دو

دن رُک کر چلا جاؤں گا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ مجھے کہے کہ اُٹھو اور چلے جاؤ لیکن وہ بڑے اطمینان سے اپنی بات سناتے چلی جا رہی تھی۔

"وہ کسی امیر کبیر باپ کی بیٹی تھی" — عشو کہہ رہی تھی — "اُس کے دل میں میرا درد پیدا ہو گیا۔ اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ لڑکی ایسی ویسی بھی ہو سکتی ہے۔ چور اُچکی بھی ہو سکتی ہے۔ اُس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے اپنے گھر لے جا سکتی ہے۔ گھر میں نوکری دے گی، گھر میں ہی رکھے گی۔ تنخواہ اور روٹی کپڑا بھی دے گی۔ میرا تو وہ حال تھا جو ڈوبنے والے کا ہوتا ہے۔ مجھے تو سہارا چاہیئے تھا خواہ وہ جھوٹا ہی ہوتا۔ اُس عورت نے یہ نہ سوچا کہ میں کیسی ہوں، میں نے بھی نہ سوچا کہ یہ عورت کیسی ہے اور یہ مجھے کسی اور جال میں نہ پھینک دے۔ میں اُس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا خاوند آ لے تو چلتے ہیں....

"اُس نے اپنے خاوند کو آنے کی اطلاع دے رکھی تھی۔ وہ جلدی ہی پہنچ گیا اور تانگہ لے آیا۔ اس عورت نے اپنے خاوند کو میرے متعلق بتایا۔ وہ بھی اپنی بیوی کی طرح خوبصورت جوان تھا۔ اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر اُس کی نظریں میری آنکھوں میں جم گئیں۔ میں نے اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھی۔ اس سے مجھے کچھ شک سا ہُوا۔ میں مردوں کی نظریں پہچانتی تھی لیکن شک جو دل میں آیا تھا اپنے آپ ہی نکل گیا۔ اُس نے ہمدردی کے لہجے میں کہا کہ اس بے چاری کو اپنے ساتھ ہی رکھیں گے....

"اتنے بڑے شہر میں تانگہ گھومتا پھرتا ایک کشادہ گلی میں داخل ہُوا اور ایک بہت بڑی حویلی کے سامنے رُک گیا۔ میں نے دیہات کی حویلیاں دیکھی تھیں۔ شہر کی یہ حویلی دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ لوگ اتنے امیر بھی ہوتے ہیں۔ اتنی بڑی حویلی میں بھی دو میاں بیوی رہتے تھے۔ یہ عورت دُور پار کے کسی رشتہ دار کے ماتم پر گئی تھی اور اب واپس آئی تھی۔ ان دونوں نے اپنے ساتھ بٹھا کر مجھے جس پیار سے ناشتہ کرایا اس سے میرے دل سے خوف اور وہم نکل گئے۔"

"عشو!" — میں نے اُکتا کر کہا — "تم نے تو بڑی لمبی بات شروع کر دی ہے اور میں اس انتظار میں ہوں کہ تم کب اور کس طرح مجھے یہاں سے نکالو گی۔"

"میں تمہیں نکالوں گی ضرور" — اُس نے کہا — "لیکن رات کو۔ میں نے بات اس لئے لمبی شروع کر دی ہے کہ ایک مدت بعد ایک ایسا انسان مجھے ملا ہے جس کے دل میں میرا درد ہے۔ اپنے دل کو ہلکا کر رہی ہوں اور یہ وجہ بھی ہے کہ آج سارا دن ہم دونوں یہاں اکیلے ہیں۔ باتیں نہ کریں تو اور کیا کریں گے۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جو تم نہیں جانتے۔ یہ تمہیں معلوم ہونی چاہیئں..."

"میں اس گھر میں نوکرانی بن گئی لیکن اس عورت نے اور اس کے خاوند نے مجھے کبھی بھی احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اس گھر میں نوکرانی ہوں۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس خدا ترس بی بی نے مجھے اپنے ساتھ کے لئے گھر میں رکھا ہے۔ وہ میرے دل کی باتیں سنتی تھی اور اپنے دل کی مجھے سناتی تھی۔ اُس کے خاوند کا برتاؤ میرے ساتھ ایسا تھا جیسے میں اس کی بیوی کی بہن ہوں۔ میں ان دونوں کی خدمت دل و جان سے کرتی تھی....

"اُن کے اس سلوک برتاؤ سے مجھ میں یہ تبدیلی آئی کہ میں جو دبی دبی اور گھُٹی گھُٹی رہتی تھی، اب اس طرح رہنے لگی جیسے اس دنیا میں میری بھی کوئی حیثیت ہے اور میری عزت کرنے والے لوگ بھی ہیں۔ اُن کے سلوک کی بدولت اُن کا سارا محلّہ میرے ساتھ اس طرح اچھا سلوک کرتا تھا جیسے میں ان کی قریبی رشتہ دار ہوں....

"دیکھتے ہی دیکھتے دو سال گزر گئے اور اس عورت کے بطن سے تم پیدا ہُوئے۔ تم میرے ہاتھوں میں پیدا ہُوئے تھے۔ دائی کے بعد میں نے تمہیں اُٹھایا اور پیار کیا تھا۔ تم مجھے ایسے لگے تھے جیسے تم میرے بطن سے پیدا ہوئے ہو۔"

"اچھا!" — میں نے حیرت سے چونک کر کہا — "تو وہ میری ماں تھی جو تمہیں اپنے گھر لے گئی تھی، اور وہ میرا باپ تھا۔ اُس وقت تو وہ بڑا اچھا آدمی ہو گا۔"

"ہاں سکندر!" — عشو نے آہ لے کر کہا — "اُس وقت تو وہ بہت اچھا تھا لیکن آگے چل کر.... پہلے میری بات سُن لو پھر تمہیں بتاتی ہوں کہ تمہارا باپ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ تم تو مجھے ایک کھلونہ مل گئے تھے۔ تمہاری ماں نے مجھے کتنی بار کہا تھا کہ میں شادی کرنا چاہوں تو اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے لیکن سکندر! شادی کے نام سے مجھے خوف آتا تھا۔ ایک دو بار اُس نے مجھے مجبور بھی کیا۔ کہنے لگی کہ مرد کے بغیر عورت کی نہ کوئی ذات ہے نہ کوئی حیثیت ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ جس مرد کو میرے دل نے قبول کیا تھا وہ مر کر بھی میرے دل میں زندہ ہے۔ اس کے بعد تمہاری ماں نے میری شادی کا نام نہ لیا۔ اُس نے اتنا ضرور کہا کہ مرد اتنی پوجا کے قابل نہیں ہوتا جتنی تم کر رہی ہو۔ وہ کہتی تھی کہ مرد کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ میں نے اُس کی اس بات کو ہنس کر ٹال دیا لیکن کچھ عرصے بعد میں نے خود محسوس کیا کہ اُس نے غلط نہیں کہا تھا....

"میں تمہیں ہر وقت اٹھائے اٹھائے پھرتی تھی۔ تم اپنی ماں کے پاس اُس وقت جاتے تھے جب اُس نے تمہیں دودھ پلانا ہوتا تھا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ اُس کی ذات نے مجھ پر کتنا کرم کیا ہے کہ مجھے اتنی پیاری پناہ دے دی ہے.... تم نے کہا ہے کہ اُس وقت تمہارا باپ اچھا آدمی تھا۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتی ہوں۔ تم ایک سال کے تھے۔ تمہاری ماں کو تمہارے ننھیال چار پانچ دنوں کے لئے اکیلے جانا پڑا۔ میں تمہارے باپ کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ اُسی رات اُس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ پہلے اُس نے میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ مسلا۔ پھر ترسی ہوئی سی نگاہوں سے میری آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگا، کون کہتا ہے تم نوکرانی ہو۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس شخص نے کسی بُری نیت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر یہ بات کہی ہے۔ میں ہنس پڑی اور کہا کہ میں جو کچھ بھی ہوں میں اپنی ساری عمر آپ کی خدمت میں گزار دوں گی....

"تمہارا باپ ہنس کر بولا — 'نہیں عشو! تم میری خدمت نہیں کر سکو

گی' — میں نے اُسے کہا کہ اُس نے ایسی بات کیوں کہی ہے۔ میں تو اُس کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہوں۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں نے اُس وقت بھی کوئی شک نہ کیا لیکن جب اُس نے میرے گلے میں بازو ڈالا اور اُس کی سانسیں میرے ایک گال سے ٹکرانے لگیں تو میں اُس کے احترام کو قائم رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ اُس سے الگ ہو گئی۔ جب اُس نے صاف الفاظ میں اپنی نیت کا اظہار کیا تو میں نے اُسے کہا — 'آپ اپنی بیوی کو دھوکہ دے سکتے ہیں میں نہیں۔ آپ کی بیوی نے جو احسان مجھ پر کیا ہے اُس کا صِلہ یہ تو نہیں کہ میں اُس کے اتنے پاکیزہ گھر کو ناپاک کر دوں'....

"تمہارا باپ عقل والا ہے۔ میں تو اُس سے ڈر گئی تھی۔ مجھے خیال یہ آیا تھا کہ میں نے اسے مایوس کیا تو یہ مجھے گھر سے نکال دے گا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا۔ پھر میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ تمہارے باپ نے مجھے بڑے سخت امتحان میں ڈال دیا۔ میں نے کہا ہے کہ وہ عقل والا ہے۔ اُس نے غصے میں آنے کی بجائے ہنس کر بات کی۔ کہنے لگا — 'مجھے ایک خوشی تو یہ ہوئی ہے کہ تم ویسی ہی ہو جیسی تم اپنے آپ کو بتایا کرتی ہو۔ میں تمہیں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تم اس گھر میں نوکرانی نہیں ہو اس لئے میں تم پر اپنا حکم نہیں چلاؤں گا۔ بات یہ ہے عشو! اپنی بیوی اور بچے کے بغیر میرا دل اداس سا ہو گیا تھا۔ دل میں آئی تھی کہ تمہیں بلا کر پاس بٹھا لوں'....

"اُس نے یہ بات ایسے جذباتی الفاظ اور لہجے میں کہی کہ میرا دل پسیج گیا۔ دل نے مجھے کہا کہ میں اس کے پاس بیٹھی رہوں۔ گزرے ہُوئے تین سالوں میں تمہارے باپ نے کبھی مَیلی نظر سے مجھے دیکھا بھی نہیں تھا۔ ایسے کئی موقعے آئے تھے کہ تمہاری ماں اڑوس پڑوس میں کہیں چلی گئی اور میں تمہارے باپ کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ میں اُس کے کمرے میں بھی گئی۔ ایک بار ایسے بھی ہُوا کہ وہ اکیلا تھا۔ اُس کے سر میں دَرد تھا۔ وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا ہُوا تھا۔ میں اُس کے کہے بغیر اپنی خوشی سے اُس کا سر دبانے لگی۔ میں اُس کے پلنگ پر بیٹھ گئی تھی لیکن اُس نے مجھے روک دیا۔ اُس نے کہا کہ وہ

ایسی خدمت کرانے کو اچھا نہیں سمجھتا۔ میں نہیں اُٹھنا چاہتی تھی لیکن اُس نے مجھے اُٹھا دیا۔ اُس رات جب اُس نے تنہائی سے تنگ آکر میرے ساتھ کی ضرورت محسوس کی تو یہ جانتے ہُوئے کہ اُس کی نیت کیا ہے میں نے اُس کے پاس بیٹھے رہنے کا فیصلہ کر لیا....

"اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں ناراض تو نہیں؟ میں نے اُسے کہا کہ مجھے ناراض ہونے کا حق کس نے کبھی دیا ہے۔ میرے دل میں جو آتی تھی وہ میں نے کہہ دی ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اُسے میرے ساتھ کی ضرورت ہے تو میں ساری رات اُس کے پاس بیٹھی رہوں گی۔ وہ عجیب سی ہنسی ہنس پڑا اور بولا —— 'تم نے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے اور میں نے اپنے دل کی بات کہی تھی'۔"

*

اس کے بعد عشو نے اُس رات کا جو واقعہ سنایا وہ میں آپ کو اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔ ایک طرف اُس کا کردار تھا اور دوسری طرف وہ میرے باپ کے احسان تلے اتنی دبی ہوتی تھی کہ اُسے مایوس کرنے سے ڈرتی تھی اور جب اُسے خیال آتا تھا کہ اس گھر سے بھی وہ نکل گئی تو معلوم نہیں کہاں جا پہنچے۔ یہ چکّی کے دو پاٹ تھے جن کے درمیان عشو آ گئی۔

"اگر میں ویسے ہی آپ کے پاس بیٹھی رہوں تو آپ کو اچھا نہیں لگے گا؟" —— عشو نے میرے باپ سے پوچھا۔

"تین سال گزر گئے ہیں عشو!" —— میرے باپ نے اُسے کہا —— "کیا ان تین سالوں میں تم نے کبھی محسوس کیا ہے کہ میں تمہیں کسی اور نگاہ سے دیکھتا ہوں؟"

"کبھی نہیں" —— عشو نے جواب دیا —— "میں خود حیران ہوں کہ آج آپ کدھر بھٹک گئے ہیں"۔

"میں خود حیران ہوں" —— میرے باپ نے کہا —— "مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا۔ میں نے تمہاری ضرورت پیاس کے مارے ہُوئے

ایک آدمی کی طرح محسوس کی ہے"۔

عشو نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ وہ میرے باپ کے احسان کا صلہ دے دے لیکن اُسے میری ماں یاد آگئی۔ اُس نے سوچا کہ نیکی اور بدی کے درمیان صرف ایک جھجک حائل ہوتی ہے۔ اس جھجک پر قابو پا لیا جائے تو انسان اشرف المخلوقات بن جاتا ہے اور اگر اس جھجک کو بے معنی سمجھ کر الگ پھینک دیا جائے تو پھر انسان گناہوں میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ عشو تیار ہوگئی تھی کہ اس جھجک کو اُٹھا کر باہر پھینک دے لیکن اس ارادے سے ہی اُسے اپنے سینے میں اور دماغ میں ایسی تلخی محسوس ہونے لگی کہ وہ بے چین ہوگئی۔ وہ اُٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی کمرے سے نکل گئی اور اپنے کمرے میں جا بیٹھی۔ تنہائی میں جب اُس نے اس مسئلے کو اپنے سامنے رکھا تو اُس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اُس کا خاوند پلنگ پر بیٹھا ہُوا ہے اور اُس کے ساتھ میری ماں آکر بیٹھ گئی ہے۔

"سکندر بیٹا!" —— عشو نے یہ بات مجھے سناتے ہوئے کہا —— "یہ جانتے ہوتے کہ یہ میرا تصور تھا، میں آج بھی یقین سے کہتی ہوں کہ میں آگے بڑھ کر ہاتھ لگاتی تو میں دونوں کے جسموں کو محسوس کر لیتی۔ وہ جیتے جاگتے میرے پلنگ پر بیٹھے ہوتے تھے۔ انہیں میری موجودگی کا ذرا سا بھی احساس نہ تھا۔ میرے خاوند نے بالکل اُس طرح جس طرح مجھے تمہارے باپ نے اپنے ایک بازو میں لے لیا تھا، تمہاری ماں کو اپنے بازو میں لے لیا۔ میرا وجود بڑی زور سے کانپا۔ میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ جب ہاتھ ہٹائے تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنی آواز سُنی۔ میں کہہ رہی تھی کہ نہیں، ایسے نہیں ہوگا۔ میں اپنے مرے ہوتے خاوند اور تمہاری فرشتہ جیسی ماں کو دھوکہ نہیں دے سکتی تھی"۔

عشو پر کسی دَورے کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے نکلی اور میرے باپ کے کمرے میں پہنچی۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ جب عشو دوڑتی ہوئی اُس کمرے میں گئی تو

اُس نے گھبرا کر ادھر دیکھا۔ عشو اُس کے پاؤں میں جا بیٹھی اور سر اُس کی گود میں رکھ کر سِسک سِسک کر رونے لگی۔ میرے باپ نے اُس کا سر اُٹھایا اور پوچھا کہ اُسے کیا ہو گیا ہے۔

"مجھ سے میری جان لے لیں" —— عشو نے روتے ہوئے کہا —— "میرے خون کی آپ کو ضرورت ہے تو ایک ایک قطرہ نچوڑ لیں لیکن مجھے اُس راستے پر نہ لے جائیں جہاں آپ کے احسان کا صلہ تو آپ کو مل جائے گا لیکن بی بی کے ساتھ احسان فراموشی ہو گی۔ جس طرح آپ پسند نہیں کریں گے کہ بی بی آپ کی امانت میں خیانت کرے اسی طرح میرے خاوند کی رُوح کسی اور آدمی کے ساتھ مجھے دیکھ کر بے چین ہو گی۔"

روحیں بے چین ہوتی ہیں یا نہیں، میرا باپ ایسا بے چین ہُوا کہ اُس کے ہاتھ کانپنے اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ اُس نے ندامت اور خفت کو مٹانے کے لئے بہت کچھ کیا۔ اُس نے عشو سے معافی بھی مانگی۔

"نہیں نہیں" —— عشو نے میرے باپ کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا —— "مجھ سے معافی نہ مانگیں۔ میں آپ کے پاؤں کی خاک بھی نہیں اور یہ بھی سوچیں کہ آپ کتنے عزت دار ہیں۔ مجھ جیسی بے آسرا اور بے ٹھکانہ عورت کے ساتھ اپنی عزت کو خراب نہ کریں۔"

میرے باپ نے بڑی مشکل سے اُسے بہلایا۔ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُسے کہا کہ وہ جو کچھ بھی ہُوا ہے بھول جائے اور جا کر سو جائے۔

*

عشو اپنے کمرے میں چلی گئی لیکن سو نہ سکی۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح وہ میرے باپ کے سامنے ناشتہ لے کر کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے باپ نے کوئی ایسی بات نہ کہی جس کا تعلق رات کے واقعہ سے ہوتا۔ اس کا رویّہ ویسا ہی تھا جیسے عموماً ہوتا تھا۔

"آپ ناراض تو نہیں؟" —— عشو نے پوچھا۔

"بھول جاؤ عشو!" —— میرے باپ نے شفقت کے لہجے میں کہا —— "رات معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا.... ایک بات کہوں گا عشو! تم بہت خوبصورت

ہو۔ آدمی کبھی بھٹک ہی جاتا ہے۔ دل سے اُتار دو۔"

"میں بی بی سے زیادہ خوبصورت تو نہیں" —— عشو نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

میرا باپ ہنس پڑا اور اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس طرح یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ پھر میری ماں واپس آ گئی۔ عشو نے یہ واقعہ میری ماں سے چھپائے رکھا۔ اس کے بعد میں بڑا ہوتا گیا اور عشو میرے بھاگنے دوڑنے کی عمر تک مجھے اٹھائے اٹھائے پھرتی رہی۔ اس کے بعد اُس نے مجھے جو باتیں سنائیں ان میں بہت سی مجھے یاد تھیں۔

"عشو!" —— میں نے اُس سے پوچھا —— "اس کے بعد میرے باپ نے کبھی تمہارے ساتھ ایسی حرکت کی تھی؟"

"نہیں سکندر!" —— عشو نے جواب دیا —— "اُس نے ایسی بات تو نہیں کی تھی لیکن میں نے یہ صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ اُس کی نظروں میں کچھ فرق آگیا ہے۔ میرے ساتھ اُس کا رویّہ پہلے سے زیادہ اچھا ہو گیا تھا لیکن کبھی کبھی وہ ایسی بات کہہ ہی دیتا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ اب وہ مجھے کسی اور رنگ میں چاہتا ہے۔ میں نے کبھی بُرا نہیں منایا۔ دل میں یہ ڈر سا بیٹھ گیا تھا کہ کسی وقت وہ اُسی حرکت پر نہ اُتر آئے جو وہ ایک بار کر بیٹھا تھا.... اور میں تمہیں ایک اور بات بتاتی ہوں سکندر! اگر وہ مجھے کبھی ایسی بات کہہ بھی دیتا تھا تو مجھے بُرا نہیں لگتا تھا۔ میں ہنس پڑتی تھی۔"

پھر وہ وقت آیا کہ میری ماں بیمار پڑ گئی۔ کوئی بھی نہ جان سکا کہ یہ اُس کی آخری بیماری ہے۔ ایک رات میری آنکھ کھلی۔ میں نے گھر میں بہت سی عورتوں کو دیکھا۔ سب رو رہی تھیں۔ میری ماں مر گئی تھی۔ مجھے عشو نے گلے لگا لیا۔

مجھے گلے لگانے کے لئے میرا باپ تھا، خالہ تھی، پھوپھی تھی لیکن ماں کے بعد مجھے عشو سے پیار تھا.... میری بات چھوڑیئے۔ میں عشو کی سُنا رہا ہوں کہ وہ ان جرائم پیشہ لوگوں میں کیسی آ گئی تھی۔ عشو نے مجھے جو بات

سناتی وہ میرے لئے عجیب وغریب انکشاف تھا۔ اُس نے سنایا کہ میری ماں کے مرنے کے تین چار مہینے بعد باپ نے عشو کے ساتھ بے تکلفی پیدا کر لی جیسی میاں بیوی میں ہوتی ہے۔ میں آپ کو یاد دلا دوں کہ اُس وقت میرے باپ کی عمر پنتالیس اور پچاس سال کے درمیان تھی۔ میری ماں اُس سے آٹھ نو سال چھوٹی تھی۔ میں ان کی شادی کے کئی سال بعد پیدا ہوا تھا۔

"عشو!" — ایک رات میرے باپ نے عشو کو اپنے کمرے میں بٹھا لیا اور کہا — "میرے دوست اور عزیز مجھے کہتے ہیں کہ دوسری شادی کر لو۔"

"کر لیں" — عشو نے کہا — "سکندر کا سوچ لیں۔ کوئی سوتیلی ماں اسے اپنی ماں والا پیار دے گی؟"

"یہی تو میں سوچتا ہوں" — میرے باپ نے کہا — "تمہارے سوا اسے ماں والا پیار کوئی عورت نہیں دے سکے گی۔"

"تو کیا آپ مجھے سکندر کی سوتیلی ماں بنانا چاہتے ہیں؟" — عشو نے پوچھا۔

"میں نے سوچا تو یہی ہے" — میرے باپ نے کہا — "لیکن سوچنا کچھ اور بھی پڑتا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ اس شخص نے ذرا سا بھی انتظار نہ کیا اور اپنی نوکرانی کے ساتھ بیاہ رچا لیا۔ لوگوں کی زبانیں روکی نہیں جا سکتیں عشو! لوگ یہ بھی کہنا شروع کر دیں گے کہ میں نے تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لئے اپنی بیوی کو ایسا زہر دیا ہے جو آہستہ آہستہ اثر کرتا رہا ہے۔"

"لوگ ایسا نہیں کہیں گے" — عشو نے کہا — "میں بی بی کے مقابلے میں کیا تھی!"

"تم؟" — میرے باپ نے کہا — "تم نے اس گھر میں آتے ہی میرے دل پر ایسا قبضہ کیا تھا کہ میں اپنے آپ پر جبر کر کے اپنی توجہ بی بی کی طرف کرتا تھا.... وہ رات تمہیں یاد ہے عشو؟ وہ رات جب تمہاری بی بی گھر نہیں تھی؟ تم کچھ اور سمجھ بیٹھی تھیں لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا

تھا۔ میں نے آخر شادی تمہارے ساتھ کرنی ہے۔"

"میں تو ٹاٹ کا پیوند ہوں" — عشو نے کہا — "یہ پیوند ریشم میں کیسے لگ سکتا ہے۔"

"تم میرے دل کی رانی ہو" — میرے باپ نے کہا — "آج سے اپنے آپ کو نوکرانی سمجھنا چھوڑ دو۔ تم اب اس گھر کی مالکہ ہو" — اُس نے ہنس کر کہا — "اب تم میری بیوی ہو۔ نکاح بھی پڑھا جاتے گا۔"

*

عشو کیا تھی؟ غریب گھر کی لڑکی اور دیہاتن۔ اُس نے کبھی اچھا کپڑا نہیں پہنا تھا۔ کبھی اچھا کھانا نہیں کھایا تھا۔ ایک کھاتے پیتے آدمی کے ساتھ شادی کی تو اُس کے دن پھر گئے لیکن قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ وہ ڈری ہوئی بھیڑ بکری بن گئی جو درندوں سے چھپتی پھرتی تھی۔ خدا نے اُس کی سُن لی اور اُسے ایسی پناہ مل گئی جو اُس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ اور اب اتنا معزز اور اتنا امیر آدمی اُس کی محبت کا دم بھرتا اور اُسے اتنی بڑی حویلی کی ملکہ بنا رہا تھا۔

عشو فرشتہ نہیں تھی۔ اُس کا دماغ چکر میں آگیا اور وہ اپنے آپ کو نوکرانی کی بجائے ایک امیر گھرانے کی مالکن سمجھنے لگی۔ میرے باپ نے میری ماں کے بڑے قیمتی کپڑے اُس کے حوالے کر دیئے اور اُسے کہا کہ وہ ہر روز کپڑے بدلا کرے۔ میرے باپ کو معلوم تھا کہ عشو کہیں بھاگ کے نہیں جا سکے گی۔ اُس نے عشو کے آگے نوٹوں کا ڈھیر لگا دیا۔

میں اُس وقت نہیں سمجھ سکا تھا۔ سولہ سترہ سال سمجھنے کی عمر نہیں ہوتی۔ اب جبکہ میں اُستادوں کی عمر کو پہنچ گیا ہوں، مجھے خیال آتا ہے کہ میرا باپ کتنا چالاک اور استاد آدمی تھا۔ عشو جیسی سیدھی لڑکی پر اُس نے ریشم اور سونے کے تاروں کا جال پھینکا تھا۔ عشو اس میں سے نہیں نکل سکتی تھی۔ میرے باپ نے اُسے پوری طرح بے بس کرنے کے لئے محبت کی رٹ لگانی شروع کر دی۔

عشو نے مجھے بتایا کہ بعض اوقات وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لے آتا اور عشو سے محبت کی بھیک مانگتا۔ ایک رات اُس نے عشو سے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں نہ سویا کرے، وہ نوکروں کا کمرہ ہے۔ اُس نے عشو کو اپنے سونے والے کمرے میں سُلایا پھر وہ وہیں سونے لگی۔ میرے باپ نے کتنی راتیں شرافت سے گزار دیں۔ عشو بہت متاثر ہوتی، پھر ایک رات نیکی اور بدی کے درمیان نظر نہ آنے والی جو ایک لکیر ہوتی ہے اور جو جھجک ہوتی ہے وہ عشو نے بصد خوشی مٹا ڈالی۔

"نکاح تو ایک رسم ہوتی ہے عشو!" — میرے باپ نے اُسے کہا — "اصل چیز تو ایجاب و قبول ہے جو دلوں سے اُمڈتا ہے۔"

عشو کو اب ایسی ہی باتیں اور ایسے ہی جواز تسکین دے سکتے تھے۔ گناہ کے بعد گناہگار کو اپنے حق میں جواز کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ ضمیر لعنتیں بھیجتا ہے۔ عشو کی یہ ضرورت میرے باپ نے پوری کر دی اور وہ اپنے آپ کو میرے باپ کی پکّی بیوی سمجھنے لگی مگر جان نہ سکی کہ اُس کی صرف نوکری پکّی ہوتی ہے۔

میں اُس وقت چھوٹا تھا، کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے یہ یاد تھا کہ عشو میری ماں کے کپڑے پہنا کرتی تھی اور ان کپڑوں میں وہ مجھے اور زیادہ اچھی لگا کرتی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میرے ساتھ اس کا پیار پہلے سے زیادہ ہو گیا تھا۔

*

اڑھائی تین سال میرا باپ عشو سے کہتا رہا کہ اس نے زمین ہموار کر لی ہے اور اپنے دوستوں وغیرہ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا ہے کہ وہ اپنی نوکرانی کے ساتھ شادی کر رہا ہے اور اب وہ جلدی ہی نکاح کی رسم بھی پوری کر دے گا۔ عشو نے مجھے سنایا کہ وہ پوری طرح بے حیا اور بے شرم ہو چکی تھی اور نکاح کو مذاق سمجھتی تھی۔ میرا باپ اُسے داشتہ بنا کر زیورات، قیمتی کپڑوں کی صورت میں اور اُس کی ہر فرمائش پوری کر کے اُسے بے تحاشہ اُجرت دے رہا تھا۔

ایک روز ہماری حویلی میں یہ دھماکہ ہُوا کہ میرا باپ شہناز نام کی ایک لڑکی کے ساتھ شادی کر رہا ہے۔ اس دھماکے نے عشو کا دماغ ماؤف کر دیا۔ اُس نے رو رو کر میرے باپ کو اس شادی سے روکا۔

"تم کیوں فکر کرتی ہو عشو!" — میرے باپ نے اُسے کہا — "اس گھر میں تمہاری حیثیت یہی رہے گی جو میں نے بنا دی ہے۔ نوکرانی تو یہ ہو گی جو میری بیوی بن کر آ رہی ہے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد تمہارے ساتھ بھی نکاح پڑھا لوں گا۔ ہم مسلمان ہیں۔ میں چار بیویاں رکھ سکتا ہوں۔"

عشو نے پھر اپنا حق جتایا اور اس خوش فہمی میں میرے باپ کو بُرا بھلا کہا کہ اُسے عشو کے ساتھ دلی محبت ہے۔

"اگر تمہیں یہ صورت منظور نہیں عشو! تو یہاں سے چلی جاؤ" — میرے باپ نے اُس کی دُکھتی رگ پکڑ کر کہا — "اگر یہاں رہنا ہے تو اسی طرح رہو گی جس طرح رہ رہی ہو۔ میں تمہارا حق ادا کرتا رہوں گا۔"

"میں سوکن کو برداشت نہیں کروں گی۔"

"نہ کرو" — میرے باپ نے کہا — "یہ کپڑے اور زیورات یہاں رکھو۔ اپنے کپڑے پہنو اور جاؤ۔"

عشو بُجھ کے رہ گئی۔ وہ کہاں جاتی؟ برسوں بعد جب میں اُس کا قیدی تھا وہ مجھے سنا رہی تھی کہ وہ شہناز کو بھی جانتی تھی اور اُس کے خاندان کو بھی۔ وہ بدنام لوگ تھے۔ میں نے پہلے سنایا ہے کہ وہ بظاہر معزز لوگ تھے اور سرکاری افسروں اور تھانیداروں کے ساتھ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا تھا لیکن وہ جرائم پیشہ تھے۔ اس خاندان کی کوئی عورت نیک نام نہیں تھی۔ یہ لوگ اپنی بیٹیوں کے ذریعے امیر لوگوں کی جیبیں خالی کرا لیا کرتے تھے۔ عشو ابھی تک میرے باپ کو مخلص سمجھ رہی تھی اور میرے ساتھ تو اُسے پیار تھا ہی۔ اپنی عزّت و عصمت لُٹا کر بھی اُسے میرے باپ کے نفع و نقصان کا بہت خیال تھا۔

عشو نے مجھے سنایا کہ میرے باپ کو میری خالہ اور پھوپھی نے بھی

شادی سے روکا تھا۔ آخر اُسے یہ کہا تھا کہ اُس نے شادی کرنی ہی ہے تو اس خاندان سے نہ کرے اور شہناز کا تو زبان پہ نام بھی نہ لاتے لیکن عشو دیکھ رہی تھی (اور یہ تو مجھے بھی یاد تھا) کہ شہناز کی ماں ہمارے گھر آتی اور میرے باپ کی خوب مٹھی چاپی کرتی تھی۔ وہ عشو پر حکم چلاتی اور اُسے لڑکتی تھی کہ وہ گھر کی صفائی وغیرہ کا خیال نہیں رکھتی۔ یہ عورت میرے ساتھ بھی پیار کرتی تھی۔

میرے باپ کا دماغ ایسا خراب ہُوا کہ وہ شہناز کو بیاہ کر لے ہی آیا اور اُسے پیار سے نازی کہنے لگا۔ بہت خوبصورت لڑکی تھی اور اتنی تیز اور چُست جیسے اُسے سپرنگ لگے ہوتے ہوں۔ اُس کی عمر پچیس سال یا اُس سے کچھ کم ہو گی اور میرا باپ پچاس سال تک پہنچ گیا تھا۔ وہ باپ بیٹی لگتے تھے۔

*

"جب شہناز آئی تو میں نے دو دنوں میں ہی محسوس کر لیا کہ تمہارا باپ لٹیرا ہے اور میں اپنا آپ لُٹا بیٹھی ہوں"۔۔۔ عشو نے مجھے سنایا۔۔۔ "تمہارے باپ کا رویہ تو ٹھیک تھا لیکن شہناز نے مجھے نوکرانی کا درجہ دے دیا۔ میری حالت تو یہ ہو گئی کہ میں نہ تمہارے باپ کو ناراض کر سکتی تھی نہ شہناز کو۔ میری مجبوری تم سمجھتے ہو۔ کوئی آسرا اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ تمہارے باپ کے متعلق میرا ذہن اس طرح کا بن گیا تھا کہ کبھی وہ مجھے اچھا لگتا اور کبھی بہت بُرا۔ شہناز کو مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ تمہارا باپ مجھے آواز دیتا تو شہناز مجھ سے پہلے اُس کے پاس پہنچ جاتی۔ اس بدبخت کو معلوم نہیں تھا کہ وہ جب اپنی ماں کے پاس جاتی ہے اُس وقت میں اُس کے خاوند کے پاس ہوتی ہوں۔ تم اُس وقت سکول گئے ہوتے تھے"۔

میرا گھر کتنا پاک اور کتنا صاف اور شفاف ہُوا کرتا تھا مگر ایک مرد نے ہوس کا غلام ہو کر اس پاکیزہ گھروندے کو ابلیس کا آشیانہ بنا ڈالا۔ عشو کے پاس سونے کا زیور دو جھمکے تھا اور ایک انگوٹھی تھی لیکن اس سے زیادہ قیمتی

جو زیور اُس کے پاس تھا وہ اُس کی عصمت تھی۔ میرے ہوس کار باپ نے وہ بھی اُس سے چھین لی۔ اب تو میرے گھر میں ابلیس کا بسیرا تھا۔ خیر اور برکت اُٹھ گئی تھی اور نحوست نے اس پہ گھناؤنے سائے ڈال دیئے تھے ۔۔۔ اور میں اس سے بے خبر اس ماحول میں پرورش پا رہا تھا۔

باپ کے گناہ کی سزا اُس کے اکلوتے بیٹے کو ملی۔

شہناز کو آئے ڈیڑھ دو مہینے گزر گئے۔ عشو مجھے سنا رہی تھی کہ ایک روز شہناز اپنے گھر چلی گئی۔ وہ اتنی جلدی واپس نہیں آیا کرتی تھی مگر اُس روز وہ گئی اور آ گئی۔ میں سکول گیا ہُوا تھا۔ میرے باپ نے عشو کو اپنے کمرے میں کسی کام سے بلایا اور اچانک شہناز آ گئی۔ دروازے کھُلے تھے۔ شہناز نے میرے باپ اور عشو کو ایسی بے تکلفی کی حالت میں دیکھا جو کوئی بیوی برداشت نہیں کر سکتی۔

اُس روز پہلی بار شہناز اور عشو کا آمنا سامنا ہُوا۔ شہناز عشو کو ایک اور کمرے میں لے گئی اور بٹھا لیا۔ عشو نے مجھے سنایا کہ اُس وقت تک وہ مکمل طور پر ڈھیٹ ہو چکی تھی اور دلیر بھی۔ میرا باپ اُسے اُس مقام تک لے گیا تھا جہاں اُس نے اپنے آپ کو شریف عورت سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بے حجاب ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ شہناز کی ایک دُکھتی رگ اُس کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ شہناز کو معلوم نہیں تھا کہ عشو اُس کے کسی راز سے واقف ہے۔

"عشو!"۔۔۔ شہناز نے اُسے کہا۔۔۔ "دیکھو، میں نے تمہاری عزت کی ہے کہ تمہیں اپنی برابری میں بٹھایا ہے۔ یہ نہ بھولو کہ تم اس گھر کی نوکرانی ہو۔ تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم میاں صاحب کے گلے میں باہیں ڈال کر اُن کی گود میں بیٹھی ہوتی تھیں؟"

"میاں صاحب کی باہیں کہاں تھیں؟"۔۔۔ عشو نے پوچھا۔۔۔ "کیا وہ میری کمر میں نہیں تھیں؟"

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تم انہیں خراب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں"

—— شہناز نے کہا —— "وہ شریف انسان ہیں۔"

"میں ان سے زیادہ شریف ہُوا کرتی تھی" —— عشو نے کہا —— "اس راستے پر مجھے میاں صاحب نے ہی چلایا ہے۔"

"میں تمہیں زیادہ بک بک کرنے کی اجازت نہیں دوں گی" —— شہناز نے اپنے آپ کو مالکن سمجھتے ہوتے رعب سے کہا —— "میں کہتی ہوں وہ شریف انسان ہیں۔ جب یہ اکیلے تھے تو تم نے ان پر اپنا جادو چلا لیا اور اب تک ...."

"شہناز!" —— عشو نے اُس کی بات پوری نہ ہونے دی اور بولی —— "[illegible] رعب نہیں مانوں گی۔ اگر میاں صاحب شریف ہوتے تو تمہارے ساتھ شادی نہ کرتے۔ میں تمہاری یہ غلط فہمی دُور کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہیں کروں گی کہ کس نے کس پر جادو چلایا ہے۔ میں نے میاں صاحب پر یا میاں صاحب نے مجھ پر۔"

"کیا بکواس کی ہے تم نے کہ میاں صاحب شریف ہوتے تو میرے ساتھ شادی نہ کرتے؟" —— شہناز نے غصّے سے کہا —— "معلوم ہوتا ہے میاں صاحب نے تمہیں سر چڑھایا ہُوا ہے۔ تمہارا ان کے ساتھ تعلق ہی کیا ہے!"

"یہ وہی تعلق ہے شہناز، جو تمہارا جلیل کے ساتھ ہے" —— عشو نے مُسکراتے ہوتے کہا —— "میں نے تمہیں اُس کے ساتھ سونے والے کمرے میں اسی حالت میں دیکھا ہے جس حالت میں تم نے مجھے میاں صاحب کے ساتھ دیکھا ہے۔"

"او بیوقوف!" —— اب شہناز نے بدلے ہوتے لہجے میں کہا —— "وہ تو میرا چچازاد بھائی ہے۔"

"اور میں نے تمہیں چچازاد بھائی کے ساتھ اُس حالت میں بھی دیکھا ہے" —— عشو نے کہا —— "میں تمہیں پکڑوا سکتی ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ تمہارا چچازاد بھائی نہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارا اگر کبھی بچہ پیدا ہُوا تو وہ میاں صاحب کا نہیں ہوگا" —— عشو اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی۔ اُس نے کہا —— "شہناز بیگم! میں میاں صاحب کو لُوٹ نہیں

رہی۔ اُن کی آمدنی اپنی ماں کے گھر نہیں پہنچا رہی۔ میری ماں بھی نہیں، میرا کوئی گھر بھی نہیں۔ میاں صاحب کا سب کچھ اسی گھر میں رہے گا۔"

"کیا تم مجھے روک سکتی ہو؟" —— شہناز نے بڑے رعب سے پوچھا۔

"اگر مجھے اس طرح للکار کر کہو گی تو میں روک کر بھی دکھا دوں گی" —— عشو نے رُعب کا جواب رُعب سے دیا اور بڑی دھیمی سی آواز میں کہا —— "شہناز! اپنی آنکھوں سے پٹی اتار دو۔ مجھے نوکرانی سمجھنا چھوڑ دو۔ اگر اپنی چالبازیاں جاری رکھنا چاہتی ہو تو میرے بغیر کامیاب نہیں ہو سکو گی۔"

"عشو!" —— شہناز نے بڑے غصّے سے اپنے زانو پر ہاتھ مار کر کہا —— "تم میرے ساتھ یوں بات کر رہی ہو جیسے میاں صاحب تمہارے خاوند ہیں اور میں اس گھر میں نوکرانی ہوں۔"

عشو ہنس پڑی جیسے شہناز نے کوئی احمقانہ بات کی ہو۔

"میں تمہاری یہی غلط فہمی رفع کرنا چاہتی ہوں شہناز!" —— عشو نے کہا —— "اس گھر میں تمہاری حیثیت ویسی ہی ہے جیسی ایک بیوی کی ہوتی ہے۔ بیوی نوکرانی سے ذرا ہی بہتر ہوتی ہے لیکن میں نوکرانی ہوتے ہوتے میاں صاحب کی بیوی ہوں۔"

"کیا بک رہی ہو؟" —— شہناز نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا —— "کیا تم اپنے آپ کو اتنا اونچا سمجھنے لگی ہو کہ میاں صاحب جیسے اونچے آدمی کو اپنا خاوند کہتی ہو؟ کیا خواب دیکھ رہی ہو تم؟"

"یہ بتا دوں تو مجھے اُستاد کون کہے" —— عشو نے کہا —— "میں تمہیں کہہ رہی ہوں کہ میرے ساتھ مل کے چلو۔ میں تمہاری ماں کو بھی جانتی ہوں اور تمہاری بڑی بہن کو بھی جانتی ہوں۔"

شہناز کی جھاگ بیٹھنے لگی۔

عشو جب مجھے یہ بات سنا رہی تھی تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ تو بڑی پیاری عورت تھی۔ میں شاید اس لئے اسے پیاری سمجھتا تھا کہ اس سے مجھے ماں کا [illegible] تھا۔ میرے ساتھ اس نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی جس

سے مجھے شک ہوتا کہ یہ کوئی چالاک اور ہوشیار عورت ہے۔ اب جب وہ مجھے اُس وقت کی داستان سنا رہی تھی تو میں نے اُسے کہا کہ تم ایسی تو نہیں ہُوا کرتی تھیں۔

"میرے پگلے بیٹے!" — اُس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر اور ذرا سا ہلا کر کہا — "میں صرف یہ جانتی تھی کہ شہناز بدچلن لڑکی ہے اور اُس پر یہ اثر اُس کے اپنے خاندان کا ہے۔ میں نے صرف یہ دیکھا تھا کہ جلیل نام کا ایک آدمی اُس کے پاس آتا ہے اور اسے وہ اپنا چچازاد بھائی کہتی ہے۔ میں جانتی تھی کہ اس شخص کا شہناز کے ساتھ کیا تعلق ہے اور اُس وقت کیوں آتا ہے جب میاں صاحب گھر نہیں ہوتے اور شہناز اُسے اُس کمرے میں کیوں بٹھاتی ہے جس میں کبھی کسی مہمان کو نہیں بٹھایا گیا۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ شہناز تمہارے گھر کے پیسے اپنے گھر پہنچا رہی ہے۔ میں یہ جانتی تھی کہ یہ خاندان اسی قسم کی وارداتیں کرتا ہے۔ میں نے شہناز اور جلیل کو کبھی بھی ایسی ویسی حالت میں نہیں دیکھا تھا لیکن تمہارے باپ نے مجھے مجرموں والی عقل دے دی تھی۔ میں نے شہناز کو یہ جو باتیں کہی تھیں وہ سب ہوا میں چلاتے ہوئے تیر تھے جو نشانے پر بیٹھے اور شہناز کا جو رعب تھا وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔"

میں نے آپ کو پہلے سنایا ہے کہ میں نے ایک آدمی کو شہناز کے پاس آتے دیکھا تھا اور انہیں عین موقع پر پکڑا تھا۔ وہ یہی جلیل تھا۔ اسی کے پیچھے میں اغوا ہو کر عشو کے سامنے بیٹھا ہُوا تھا اور عشو کو مجھ پر پہرا دینے کے لئے بٹھا گئے تھے۔ عشو نے مجھے یہ کہانی یوں سنائی:

"عشو!" — شہناز نے اُس سے رازداری کے لہجے میں پوچھا — "اس گھر میں تم کہاں سے آئی تھیں؟ میں نے سنا تھا کہ سکندر کی ماں تمہیں لائی تھی۔ تم معمولی سی عورت نہیں لگتیں۔"

"ہاں شہناز!" — عشو نے کہا — "میں اگر معمولی سی عورت ہوتی تو اپنی مالکن کے ساتھ اس طرح سر چڑھ کر بات نہ کرتی۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ

میاں صاحب پر میرا بھی حق ہے .... اور شہناز! یہ جھوٹ تو نہیں کہ میاں صاحب کے ساتھ تمہاری کوئی روحانی اور جسمانی دلچسپی نہیں۔ تم جس چکر میں آئی ہو وہ میں نے بھی چلاتے ہیں لیکن اس گھر میں نہیں اور اس گھر میں تمہیں بھی کوئی چکر نہیں چلانے دوں گی۔"

"عشو!" — شہناز نے دبی سی آواز میں پوچھا — "کہیں ایسا تو نہیں کہ میاں صاحب نے تمہارے ساتھ درپردہ شادی کر رکھی ہو؟"

"کیا تم شادی کو ضروری سمجھتی ہو؟" — عشو نے جواب دیا۔

شہناز شاید یہ بات سمجھ گئی تھی۔ اُس کا سر جھک گیا۔

"تمہیں اس کا افسوس نہیں ہونا چاہیئے شہناز!" — عشو نے کہا — "جلیل موجود ہے .... میں تمہیں صرف یہ کہتی ہوں کہ مجھے نوکرانی نہ سمجھو۔"

"پھر میرا ساتھ دو گی؟" — شہناز نے پوچھا۔

"دیکھو شہناز!" — عشو نے کہا — "تم جس کسی کے ساتھ بھی جھک مارنا چاہتی ہو مارو، لیکن میں یہ برداشت نہیں کروں گی کہ تم اس گھر کی کوئی چیز یہاں سے اُڑا کر لے جاؤ۔"

عشو نے مجھے بتایا کہ شہناز پر خاموشی طاری ہو گئی اور اُس کے چہرے پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ یکلخت اُس نے عشو کی طرف دیکھا اور ہنس کر اُسے کہنے لگی کہ آج سے ہماری دوستی پکی ہے۔

"تم میرے راستے میں نہیں آؤ گی" — شہناز نے کہا — "اور میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔"

پندرہ بیس روز اس طرح گزرے جیسے شہناز عشو کی گرویدہ ہو گئی ہو۔

*

ایک روز اچانک شہناز نے میرے باپ کی موجودگی میں کہا کہ اُس نے اپنا ہار اُتار کر سنگھار میز پر رکھا تھا، اب وہاں نہیں ہے۔ اُس نے عشو سے پوچھا کہ اُس نے تو نہیں دیکھا۔ عشو نے کہا کہ وہ اُس کے کمرے میں گئی ہی نہیں۔

"کیوں جھوٹ بولتی ہو عشو!" ـــ شہناز نے اُسے کہا ـــ "میں نے دو مرتبہ تمہیں اس کمرے میں جاتے اور نکلتے دیکھا ہے۔"

"میں کہتی ہوں" ـــ عشو نے کہا ـــ "میں تمہارے کمرے میں گئی ہی نہیں۔"

"میاں صاحب!" ـــ شہناز نے میرے باپ سے کہا ـــ "اس کے جھوٹ سے مجھے شک ہوتا ہے کہ یہی ہاتھ صاف کر گئی ہے۔ اس سے پہلے میرے سنگھار میز کی دراز سے پیسے بھی صاف ہو چکے ہیں۔ میں اس لئے نہ بولی کہ کسی پر بغیر ثبوت کے الزام لگانا ٹھیک نہیں لیکن اب مجھے شک ہے کہ چور یہی ہے۔"

یہ بات بڑی لمبی ہے جو میں آپ کو اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ عشو نے کتنا شور شرابہ کیا ہوگا۔ شہناز نے جال پوری طرح بچھایا تھا۔ جب ہمارے گھر میں شور شرابہ ہو رہا تھا، عین اُس وقت شہناز کی ماں اور بڑا بھائی آ گئے۔ انہیں بھی بتایا گیا کہ کیا ہوا ہے۔ اُن دونوں نے عشو کی طرف دیکھا۔

"عشو!" ـــ شہناز کے بڑے بھائی نے بڑے پیار سے عشو سے کہا ـــ "کوئی بات نہیں انسان سے غلطی ہو جاتی ہے۔ ہار واپس کر دو۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

عشو اپنے آپ کو بڑی ہوشیار اور چالاک سمجھ بیٹھی تھی لیکن وہ اس چکر میں آئی تو اُسے پتہ چلا کہ اُس میں تو ذرا سی بھی چالاکی نہیں۔ وہ کبھی روتی تھی اور کبھی شہناز کو گالیاں دیتی تھی اور اُس کی کوئی نہیں سُنتا تھا۔

"میاں صاحب!" ـــ شہناز نے کہا ـــ "یہ بدچلن کہتی ہے کہ میاں صاحب بغیر نکاح کے میرے خاوند ہیں۔"

"ہاں میاں صاحب!" ـــ شہناز کی ماں بولی ـــ "یہ بکواس تو اس نے سارے محلّے میں پھیلا رکھی ہے۔"

میرا باپ آگے بڑھا اور اُس نے بڑی زور سے عشو کے مُنہ پر تھپڑ

مارا اور اُسے گالیاں دینے لگا۔ ایسا ہی ایک تھپڑ اُسے شہناز کے بھائی نے بھی جڑ دیا۔ اس بے چاری کا واویلا کسی نے بھی نہ سُنا۔ شہناز کی ماں نے کہا کہ اس کے کمرے کی تلاشی لو۔ عشو کی چیخ و پکار سُن کر اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی آ گئیں۔ شہناز اور اس کی ماں نے چلاّ چلاّ کر ان عورتوں کو سنایا کہ اس نمک حرام کو دیکھو اپنی مالکن کا اتنا قیمتی ہار اڑا لیا ہے۔

میرے باپ نے اور شہناز کے بھائی نے عشو کے کمرے میں جا کر اس طرح تلاشی لی کہ چارپائی پر بچھا ہُوا اُس کا بستر بھی اٹھا کر جھاڑا۔ پھر اُس کا سوٹ کیس کھول کر دیکھا تو کپڑوں کے نیچے ایک تو شہناز کا ہار پڑا تھا، اس کے علاوہ سو سو کے کئی نوٹ برآمد ہوئے۔ اب تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

"اسے پولیس کے حوالے کر دو" ـــ میرے باپ نے فیصلہ سنایا۔ عشو اُس کے پاؤں میں گر پڑی۔ میرے باپ نے اُسے اتنی زور سے لات ماری کہ وہ کمرے کے دروازے میں جا پڑی۔ ہر کسی کے مُنہ سے یہی ایک بات نکل رہی تھی کہ اسے پولیس کے حوالے کر دو۔

"میاں صاحب!" ـــ شہناز کی ماں نے کہا ـــ "معلوم نہیں کتنے ہزار روپے اب تک آپ کے یہ اُچکی ہضم کر چکی ہوگی۔"

"تمہارا میاں مجھے خود پیسے دیتا رہا ہے" ـــ عشو نے جوابی حملہ کیا۔ اُس نے چلاّ کر کہا ـــ "اس شخص نے مجھے اب تک اپنی بے نکاحی بیوی بنا کر رکھا ہُوا ہے۔"

عشو پر گھونسوں اور تھپڑوں کا مینہ برس پڑا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہار اور نوٹ شہناز نے اُس کے سُوٹ کیس میں رکھے تھے اور اُس نے یہ ناٹک اپنی ماں اور اپنے بھائی سے مل کر بنایا تھا جو ان سب نے بڑی کامیابی سے کھیلا۔

یہ واقعہ مجھے بھی اچھی طرح یاد تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ عشو کو مارا پیٹا گیا ہے۔ میں جب سکول سے آیا تو شہناز نے مجھے گلے لگا لیا تھا اور

مجھے میرے باپ کے پاس لے گئی تھی۔ دونوں نے مجھے کہا تھا کہ عشو کے ساتھ نہ بولنا، وہ چور ہے۔ میرے دل کو بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ عشو کو اپنے کمرے میں بند رہنے دو پھر سوچیں گے کہ اسے گھر سے نکالا جائے یا پولیس کے حوالے کیا جائے۔ میں صرف اتنا محسوس کر رہا تھا کہ میں عشو کے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن مجھے اُس کے پاس نہیں جانے دیتے تھے۔ اس کے بعد بڑوں نے جو کچھ کیا وہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا وہ اب عشو مجھے سُنا رہی تھی۔

*

عشو دن بھر کمرے میں بند رہی۔ رات کے وقت شہناز اُس کے کمرے میں گئی۔ عشو واہی تباہی بکنے لگی لیکن شہناز نے ہمدردی اور دوستی کے لہجے میں باتیں کر کے اُسے ٹھنڈا کر لیا۔ عشو نے اُسے کہا کہ اُسے اس سازش کے ذریعے میرے باپ کی نظروں سے گرایا گیا ہے۔

"اور سنو شہناز!" — عشو نے کہا — "میں ذلّت کی آخری حد تک پہنچ سکتی ہوں۔ میں اس گھر سے نکل جاؤں گی۔ مجھے اپنی قیمت کا اندازہ ہو گیا ہے۔ یہ میاں واقعی شریف ہُوا کرتا تھا لیکن مجھے دیکھ کر اس نے اپنے دل میں شیطان کو بٹھا لیا۔ خدا کی قسم! تم دیکھنا، میں کیسا انتقام لوں گی۔ مجھے پولیس کے حوالے کراؤ۔"

شہناز نے اپنا دوستانہ رویّہ ہی قائم رکھا اور عشو کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اُٹھ کر چلی گئی۔ عشو کو طیش آئی تو وہ میرے باپ کے کمرے میں چلی گئی۔ شہناز بھی وہیں تھی۔

"سُن بڈھے کھوسٹ، عورتوں کے شکاری!" — عشو نے میرے باپ کے مُنہ میں ہاتھ دے کر کہا — "کیا میرے مُنہ میں زبان نہیں؟ مجھے پولیس کے حوالے کر کے دیکھ یا مجھے گھر سے نکال۔ تجھے معلوم نہیں میں نے پکا انتظام کر رکھا ہے" — اس نے اسی طرح شہناز کے مُنہ میں ہاتھ دیا اور بولی — "تُو بھی دیکھ لینا۔ میں تجھے کس طرح تھانے اور کچہری میں ذلیل کرتی ہوں۔"

عشو کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن اُس نے سوچ لیا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ انہی کی طرح کا رویّہ اختیار کرنا ٹھیک رہے گا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اندر سے وہ خود بہت ڈری ہوتی تھی۔ وہ اس گھر سے نکلنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی لیکن میں نے زندگی میں آگے چل کے دیکھا ہے کہ حالات اچھے بھلے انسان کو وحشی اور درندہ بنا دیا کرتے ہیں۔ عشو کو ایسے ہی حالات کی بھٹی میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس بھٹی میں سے وہ نکلی تو نام تو اُس کا عشو ہی تھا لیکن ایسے لگتا جیسے اُس نے دوسرا جنم لیا ہو۔

اس کو بھٹی میں ڈالنے اور نکالنے والی شہناز تھی۔ شہناز کے پیچھے کوئی اور دماغ بھی کام کر رہا تھا۔ شہناز نے دو تین مرتبہ پھر اُس کے کمرے میں جا کر اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"عشو!" — شہناز نے اُسے کہا — "میں تمہیں اس گھر سے نکلنے نہیں دوں گی لیکن اس گھر میں اب تم رہ بھی نہیں سکتیں۔ تم جتنا بھی چیخو چلاؤ، کوئی نہیں سُنے گا۔ اگر تم پر چوری کا یہ الزام جھوٹا ہی ہے تو بھی تم ایسے شکنجے میں آگئی ہو کہ نکل نہیں سکو گی۔ سارے محلّے میں تمہاری رُسوائی ہو چکی ہے اور میاں صاحب دو ہی باتیں کہتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسے پولیس کے حوالے کر دو۔ دوسری یہ کہ اسے گھر سے نکال دو۔ مجھے دونوں باتیں منظور نہیں۔"

"ایک بات بتاؤ شہناز!" — عشو نے کہا — "تمہارے دل میں اگر میری اتنی ہمدردی تھی تو میرے خلاف یہ چکر چلایا ہی کیوں تھا؟"

"تمہارا دماغ درست کرنے کے لئے" — شہناز نے کہا — "لیکن میں تمہیں در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے نہیں چھوڑوں گی۔"

ان دونوں کے درمیان اسی طرح باتیں ہوتی رہیں۔ شہناز عشو کو ڈراتی بھی تھی اور ہمدردی بھی جتاتی تھی۔ عشو اتنی تجربہ کار تو نہیں تھی، وہ اُس کی باتوں میں آتی چلی گئی اور آخر یہ طے ہُوا کہ شہناز عشو کو ایسے گھرانے میں بھیج دے گی جہاں وہ ہر لحاظ سے مطمئن رہے گی۔ عشو نے جب حالات پر غور کیا تو اُسے یہی صورت بہتر نظر آئی کہ وہ یہاں سے نکل جائے۔ اُس نے نکل جانا ہی بہتر سمجھا کہ

ان لوگوں نے آج چوری کا الزام لگایا ہے، کل معلوم نہیں کس چکر میں ڈال دیں۔ اُس کے سامنے مسئلہ صرف یہ تھا کہ وہ جائے گی کہاں۔ شہناز نے اس کا نہ صرف انتظام کر دیا بلکہ اُسے میری ماں کے تمام کپڑے دے دیئے اور اچھی خاصی رقم بھی دے دی۔

دو تین دنوں بعد ایک عورت آئی اور شہناز نے عشو کو اس کے حوالے کر دیا۔ یہ عورت عشو کو اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اُسی روز اسے دُور کے ایک گاؤں میں لے گئی۔

*

اس گاؤں سے عشو کا یہ سفر شروع ہُوا اور اب وہ اسی کو اپنی منزل سمجھ رہی تھی۔ یہ عورت ایک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔ عشو کو جب ان لوگوں کی اصلیت معلوم ہوئی تو وہ یہ سوچ کر بہت گھبرائی کہ وہ ابھی جوانی کی عمر میں ہے اور خوبصورت بھی ہے اس لئے یہ لوگ اسے عصمت فروشی کے راستے پر ڈال دیں گے۔ اُس نے اس عورت سے اس خدشے کا ذکر کیا تو اس عورت نے اُسے کہا کہ بے شک یہ مجرم لوگ ہیں لیکن اُس کی آبرو کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

اس گروہ میں تین چار عورتیں اور بھی تھیں۔ اُنہوں نے چند دنوں میں ہی عشو کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ عشو کے ساتھ جو بیتی تھی اُس کا اثر یہی ہونا تھا۔ وہ فرشتہ تو تھی نہیں کہ اخلاق اور کردار کو سینے سے لگائے رکھتی۔ اُس نے صرف ایک چیز کو محفوظ رکھا تھا اور وہ میرا پیار تھا جو اُس کے دل میں ابھی تک زندہ تھا۔

دو تین سالوں سے عشو اس گروہ کو چھوڑ کر اس گروہ میں آگئی تھی۔ یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ بردہ فروشوں اور رہزنوں کا گروہ تھا۔ عشو نے اب تک اس گروہ میں اچھی خاصی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ گروہ کا سرغنہ اور اس کے تمام آدمی اس پر بھروسہ کرتے تھے لیکن اب وہ میری محبت کی خاطر اس بھروسے کو ٹھیس پہنچانے کا تہیہ کر چکی تھی۔

"لیکن تم مجھے نکالو گی کس طرح؟" — میں نے پوچھا — "تم کہتی ہو کہ رات کو دو آدمی ڈیوڑھی میں سوتے ہیں۔"

وہ ہنس پڑی۔ اُس نے بڑے پیار سے مجھے قریب کر لیا اور منہ میرے کان کے ساتھ لگا کر مجھے بتایا کہ میں یہاں سے کس طرح نکلوں گا۔

شام کے بعد دو آدمی جنہوں نے ڈیوڑھی میں سونا تھا آ گئے، کچھ دیر میرے پاس بیٹھے اور عشو کے ساتھ باتیں کرتے رہے اور ڈیوڑھی میں سونے کے لئے چلے گئے۔ آدھی رات کے قریب عشو نے مجھے جگایا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا تھا جو اُس نے میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اُس کے ہاتھ میں رسیاں تھیں جو اُس نے اپنے پاس رکھیں۔ وہ مجھے ڈیوڑھی کی طرف لے گئی۔ ڈیوڑھی میں جا کر اُس نے ماچس جلائی۔ دونوں آدمی الگ الگ چارپائیوں پر سوتے ہوتے تھے۔ عشو نے مجھے اشارہ کیا۔ وہ مجھے طریقہ بتا چکی تھی۔ ایک آدمی پہلو کے بل سویا ہُوا تھا اور دوسرا پیٹھ کے بل۔ میں نے ایک کی کنپٹی پر پوری طاقت سے ڈنڈا مارا اور فوراً بعد ایسا ہی ڈنڈا دوسرے کی پیشانی پر مارا۔ پھر دونوں کو ایک ایک ڈنڈا اور مارا۔ عشو نے مجھے بتایا تھا کہ سر پر اتنی شدید ضرب لگے تو آدمی فوراً بے ہوش ہو جاتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ دونوں ہلے تک نہیں۔ بے ہوش ہو چکے تھے۔

عشو نے جو رسیاں اٹھا رکھی تھیں وہ مجھے دیں اور کہنے لگی کہ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔ اُس نے خود بھی میری مدد کی اور دونوں کو ہم نے باندھ دیا۔ پھر عشو مجھے کہنے لگی کہ اُسی کمرے میں چلو اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔ میں اُس کے ساتھ ہو گیا۔ وہ اوندھے منہ چارپائی پر لیٹ گئی اور میں نے اُس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے۔ اُس نے کہا کہ ڈیوڑھی میں جاؤ اور دروازہ کھول کر نکل جاؤ۔

"جا بیٹا سکندر!" — عشو نے جذباتی سے لہجے میں کہا — "میری دعائیں اور خدا تمہارے ساتھ ہے۔ یہ سوچ لینا کہ اپنے گھر جاؤ گے یا کہاں جاؤ گے۔ زندہ رہے تو پھر کہیں ملیں گے۔"

مجھ پر رقت طاری ہو گئی لیکن وہ وقت جذبات کے اظہار کا نہیں

تھا۔ میں ڈیوڑھی میں گیا۔ دونوں آدمی بے سُدھ پڑے تھے۔ میں نے ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر اُتار دی۔ کواڑ دھماکے سے کُھلے۔ ایک کواڑ مجھے بڑی زور سے لگا اور باہر ایسی چیخیں سنائی دیں جیسے چڑیلیں چیخ رہی ہوں۔ ایک اور طوفان میرے لئے تیار تھا۔

*

"دیکھ پگلی!" — میں نے بڑی بلند چیخ جیسی آواز میں کہا — "میں تیری آگ میں سے گزُر رہا ہوں۔ آ اور مجھے وہ طاقت دکھا جو جنات اور پریوں کو میرے قدموں میں ڈال دے گی" — مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں پھیپھڑوں کی پوری طاقت صرف کر کے چلایا اور چیخا تھا۔ میں طوفان کو بدروحوں، چڑیلوں، جنوں اور پریوں کو للکار رہا تھا لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ میں خوف کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا یا میں خوفزدہ تھا ہی نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ میں نے محسوس کیا تھا کہ میں وہ نہیں رہا جو کبھی تھا۔ میں اب ماں کا شہزادہ بیٹا نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ مجھے بینا یاد آئی تھی اور میں نے اُسے پکارا تھا۔ اُسے اِس لئے پکارا تھا کہ میں اُسے مافوق الفطرت ہستی سمجھتا تھا لیکن وہ جو میرے پاس بن بلائے آجاتی تھی اور مجھے کہاں کہاں لئے پھرتی تھی، میری پکار پر بھی نہ آئی۔
مٹی اگر مافوق الفطرت تھی تو اُس کی فطرت رومانوں، خوشنما پھولوں اور طلسماتی نغموں ارت تھی۔ یوں کہہ لیں کہ وہ ایک حسین اور مخمور کر دینے والا تصور تھی لیکن رات حقیقت کے تیز اور تُند طوفانوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔
سامنے آگ

*

معلوم تھا اور کی تُندی اور مٹی کی موجوں نے مجھے روکنے کی بہت کوشش
سے فرار ہو رہا تھا چیخ کر مجھے ڈرایا لیکن میں چلتا گیا۔ میری آنکھیں گرد سے
میں نے درو
گیا۔ اگر مجھ پر کوئی خوف طاری تھا تو وہ اتنا سا تھا کہ جنہیں
پڑا۔ ایک تو رات اندھیرا گا ہوں کہیں وہ میرے پیچھے نہ آجائیں۔ میں نے
مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ ارد گرد اؤں تو باندھ دیتے تھے لیکن ایسا ہو سکتا تھا کہ اُن
سے ٹکرا گیا۔ دونوں ہاتھ آگے آگیا ہو اور اُس نے اُن کے ہاتھ پاؤں کھول
سے بے خبر، میں دیوار کے سا اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اور
دھکیل رہا تھا اس لئے میری رفتار چلنے نہیں دے رہا تھا۔
مجھے ٹھوکریں راستہ دکھا رہی تھ
میں آئیں۔ میں اُن سے ٹکرایا اور اُن کے ر ور وہیں رُک گیا۔ اُس درخت کا تنا بہت
نے مجھے اُس راستے پر ڈال دیا جہاں کوئی د ستانا اور کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ پہلا
ایک پہلو سے دھکیل رہا تھا اور میں قدم جو آگے ر باپ کا گھر تھا۔ اُس اتنی بڑی
طوفان مجھے دھکیل رہا تھا۔

تھا۔ میں ڈیوڑھی میں گیا۔ دونوں آدمی بے سُدھ پڑے تھے۔ میں نے ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر اُتار دی۔ کواڑ دھماکے سے کُھلے۔ ایک کواڑ مجھے بڑی زور سے لگا اور باہر ایسی چیخیں سنائی دیں جیسے چڑیلیں چیخ رہی ہوں۔ ایک اور طوفان میرے لئے تیار تھا۔

✻

ے

—

اس اثر کو
و، میں اُس
نا چاہیئے تھا لیکن
ہوں کہ خوف اور
جاتا ہے، لیکن اُس
ے مجھے وہ پنگلی یاد آتی تھی
اور میری ماں سے پوچھا تھا

ہے کہ جنّات اور پریاں اُس
ن کی آواز سنائی دی۔ اُس نے یہ بھی
نر کر وہاں تک پہنچے گا اور اُس طاقت

یں جب مجھے پنگلی یاد آتی تو بدروحوں اور چڑیلوں
غیں بھی سنائی دینے لگیں۔

"دیکھ پنگلی!" — میں نے بڑی بلند چیخ جیسی آواز میں کہا — "میں تیری آگ میں سے گزر رہا ہوں۔ آ اور مجھے وہ طاقت دکھا جو جنّات اور پریوں کو میرے قدموں میں ڈال دے گی" — مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں پھیپھڑوں کی پوری طاقت صرف کر کے چلایا اور چیخا تھا۔ میں طوفان کو، بدروحوں، چڑیلوں، جنوں اور پریوں کو للکار رہا تھا لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ میں خوف کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا یا میں خوفزدہ تھا ہی نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ میں نے محسوس کیا تھا کہ میں وہ نہیں رہا جو کبھی تھا۔ میں اب ماں کا شہزادہ بیٹا نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ مجھے مینا یاد آئی تھی اور میں نے اُسے پکارا تھا۔ اُسے اِس لئے پکارا تھا کہ میں اُسے مافوق الفطرت ہستی سمجھتا تھا لیکن وہ جو میرے پاس بن بلائے آجاتی تھی اور مجھے کہاں کہاں لئے پھرتی تھی، میری پکار پر بھی نہ آئی۔ وہ اگر مافوق الفطرت تھی تو اُس کی فطرت رومانوں، خوشنما پھولوں اور طلسماتی نغموں سے عبارت تھی۔ یوں کہہ لیں کہ وہ ایک حسین اور مخمور کر دینے والا تصور تھی لیکن حسین تصورات حقیقت کے تیز اور تُند طوفانوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔

✻

طوفان کی تُندی اور مٹی کی موجوں نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی۔ درختوں نے چیخ چیخ کر مجھے ڈرایا لیکن میں چلتا گیا۔ میری آنکھیں گرد سے بھر گئی تھیں۔ میں چلتا گیا۔ اگر مجھ پر کوئی خوف طاری تھا تو وہ اتنا سا تھا کہ جنہیں میں بے ہوش کر کے بھاگا ہوں کہیں وہ میرے پیچھے نہ آجائیں۔ میں نے اور عشو نے اُن کے ہاتھ پاؤں تو باندھ دیئے تھے لیکن ایسا ہو سکتا تھا کہ اُن کا کوئی ساتھی میرے نکلتے ہی آگیا ہو اور اُس نے اُن کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے ہوں۔ اگر وہ آجاتے تو میں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اور تیز چلنا شروع کر دیا لیکن طوفان چلنے نہیں دے رہا تھا۔

میں ایک درخت سے ٹکرا گیا اور وہیں رُک گیا۔ اُس درخت کا تنا بہت بڑا تھا۔ میں اُس کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں ذرا سستانا اور کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ پہلا خیال یہ آیا کہ میں جاؤں گا کہاں۔ میرے اپنے ماں باپ کا گھر تھا۔ اُس اتنی بڑی

حویلی کا وارث میں ہی تھا۔ مجھے وہیں جانا چاہیے تھا لیکن وہاں میرے لیے اتنے زیادہ خطرے تھے جن کے مقابلے میں یہ طوفان کوئی خطرہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس محل جیسے مکان پر شہناز کا قبضہ تھا اور جس باپ کے بازوؤں میں مجھے پناہ مل سکتی تھی اُس باپ پر بھی شہناز کا قبضہ تھا۔ مجھے اغوا کرنے والے وہیں تھے۔ میں وہاں جاتا تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑتے۔

پھر کہاں؟ ..... میں تو کبھی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ میری دنیا میرا گھر تھی یا میں نے بینا کی دُنیا دیکھی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ تم نے دوسرا جنم لیا ہے اور تم کسی اور جہان کی مخلوق ہو لیکن اُس نے کبھی بتایا نہیں تھا کہ وہ جہان کون سا ہے اور کہاں ہے۔ معلوم ہوتا تو میں وہاں چلا جاتا۔

کوئی رہبر نہ تھا۔ کسی کا ساتھ نہ تھا۔ میں خود ہی تھا اور میرا دماغ تھا جو میری رہبری کر سکتا تھا۔ میری عمر کیا تھی؟ ..... سترہ سال پوری نہیں ہوتی تھی۔ یہ تو ہنسنے کھیلنے کی نادان عمر تھی۔ جب مجھے یہ خیال آیا کہ میں خوبصورت لڑکا ہوں تو مجھے خطرے کا احساس ہُوا۔ میں نے اپنا جائزہ لیا تو اپنے آپ کو یقین دلایا کہ میں لڑکا ہوں لڑکی تو نہیں اور میں کمزور بھی نہیں۔

"مرد بنو سکندر!" —— مجھے اپنی آواز سنائی دی۔

میں مرد تو بن گیا لیکن اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا کہ میں جاؤں گا کہاں۔ سوچ سوچ کر یہی خیال آتا تھا کہ اپنے آپ کو طوفان کے حوالے کر دوں لیکن یہ خیال بھی آتا تھا کہ یہ تو ہار ماننے والی بات ہے۔ ایک بار اپنے آپ کو طوفان کے، حالات کے یا کسی انسان کے حوالے کر دیا تو میری اپنی طاقت مفلوج ہو جائے گی، پھر میں طوفان میں تنکے کی طرح اُڑتا پھروں گا۔

طوفان کا زور ایسا بڑھا کہ جس درخت کے نیچے میں کھڑا تھا، اُس کے ٹہنوں اور ٹہنیوں میں کڑ کڑ کڑ کی ایسی آواز آئی جیسے رعد کڑکی ہو۔ طوفان کی چیخوں کے ساتھ میرے اوپر درخت میں ایسا شور اُٹھا جیسے دو تین منزلہ عمارت گر رہی ہو۔ میں دُوڑ کر درخت کے نیچے سے نکل آیا۔ بہت بڑا ٹہن ٹوٹ کر گرا تھا۔

میں چل پڑا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں ہوں کہاں۔ عشو نے اپنی کہانی سنانی شروع کر دی تھی اور اُس کا ذہن اس مسئلے میں اٹکا ہُوا تھا کہ وہ مجھے اس مکان سے نکالے گی۔ نہ میں نے اُس سے پوچھا تھا نہ اُس نے بتایا تھا کہ میں کہاں ہوں اور یہ جگہ شہر سے کتنی دُور ہے۔ اس گاؤں کا محلِ وقوع بھی معلوم نہیں تھا۔

میں چلتا گیا اور میرے پاؤں پانی میں پڑے۔ میں پیچھے ہٹ آیا۔ معلوم نہیں یہ جوہڑ تھا، ندی تھی یا دریا تھا۔ میں نے پانی میں سے گزرنے کی جرأت نہ کی۔ یہ دریا تھا نہ ندی۔ میں اس کے کنارے کنارے چل پڑا۔ اب طوفان پھر میرے پیچھے تھا اور مجھے آگے کو دھکیل رہا تھا۔

*

اکٹھے ہی کئی درخت آ گئے۔ میں جب ان کے قریب سے گزر رہا تھا تو ایک بار پھر مجھے ویسی ہی کڑ کڑ کڑ کی آواز سنائی دی جیسی میں نے ایک درخت میں سے سنی تھی۔ کوئی اور درخت یا کسی درخت کا ایک ٹہن ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چیخ سنائی دی جو کسی عورت کی معلوم ہوتی تھی۔ وہاں تو چیخیں ہی چیخیں تھیں اور کئی چیخیں عورتوں جیسی تھیں۔

میں چند قدم اور چلا ہوں گا کہ کوئی چیز میرے ساتھ بڑی زور سے ٹکرائی اور اس چیز سے وہی چیخ نکلی جو میں نے ابھی ابھی سنی تھی۔ یہ انسانی چیخ تھی۔ میں رُک گیا۔

"تم اب آتے ہو؟" —— طوفان کے ہیبت ناک شور میں مجھے عورت کی آواز سنائی دی —— "کب سے اس آندھی میں کھڑی خوف سے مر رہی ہوں"۔

"بینا!" —— میں نے بازو پھیلا کر آگے بڑھتے ہوئے کہا —— "میں تمہیں پکارتا رہا ہوں۔ آگے آؤ، میں اندھیرے میں تمہیں دیکھ نہیں سکتا"۔

"نہیں ..... نہیں!" —— اُدھر سے ڈری ہوئی نسوانی آواز آئی —— "میں بینا نہیں ہوں۔ تم کوئی اور ہو"۔

اندھیرا —— اور اُڑتی گرد میں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بینا نہیں تھی

اور میں وہ نہیں تھا جس کے انتظار میں وہ قیامت کی آندھی میں کھڑی تھی۔

"میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا" — میں نے چلّا کر کہا — "مجھے صرف یہ بتا دو میں کہاں ہوں؟ مجھے کسی شہر تک پہنچنے کا راستہ بتا دو۔"

"تم تو یہاں کسی بینا کے انتظار میں کھڑے ہو" — اُس نے کہا — "مجھے دھوکہ دے رہے ہو۔"

"میں دھوکہ کھا کر آیا ہوں" — میں نے کہا۔

طوفان کی تُندی میں ایسا اضافہ ہُوا کہ اُس نے جیسے مجھ کو دھکہ دے کر اُس پر پھینک دیا ہو۔ میں اُس کے ساتھ جا ٹکرایا۔ وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ وہ شاید اُلٹے قدم پیچھے ہٹ رہی تھی کہ اُس کی پیٹھ ایک درخت کے تنے سے جا لگی۔

"کون ہو تم؟" — اُس نے روتے ہوتے پوچھا۔

وہ آواز سے نوجوان لڑکی لگتی تھی۔ ایسی طوفانی رات میں اکیلی نوجوان لڑکی انسان نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے اُس سے ڈرنا چاہیئے تھا لیکن وہ مجھ سے ڈر رہی تھی۔ میں نے اُسے تنے کی اوٹ میں کر لیا۔ تنا خاصا چوڑا تھا۔ اُس کی اُوٹ میں طوفان کے تند و تُند تھپیڑوں سے بچا جا سکتا تھا۔

"مجھ پر رحم کرو گے؟" — اُس نے پوچھا۔ وہ رو رہی تھی۔ کہنے لگی — "تم آدمی ہو اور میں جوان لڑکی ہوں۔"

"میں اُن آدمیوں میں سے نہیں ہوں جو اکیلی عورت کو دیکھ کر اُس پر رحم نہیں کیا کرتے" — میں نے کہا — "کیا مصیبت تمہیں اس ہولناک رات میں یہاں لے آئی ہے؟ راستہ بھول گئی ہو؟ یا ساتھ آگے نکل گیا ہے؟"

"پہلے تم بتاؤ" — اُس نے کہا — "تم کون ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں میں کہاں جا رہا ہوں" — میں نے کہا — "شاید ہر تم سے پوچھوں گا کہ میں کہاں جاؤں۔ میں بڑی دُور کا رہنے والا ہوں۔"

"تم شاید نوجوان ہو" — اُس نے کہا — "اندھیرے میں تمہارا

چہرہ نظر نہیں آتا۔"

"تمہاری عمر کتنی ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"انیس بیس سال" — اُس نے جواب دیا — "اور تمہاری؟"

"سترہ سال پوری نہیں ہوتی" — میں نے جواب دیا۔

"لیکن مرد ہو" — اُس نے کہا — "ہو تو بہت چھوٹے .... گھر سے بھاگے ہُوتے ہو؟"

"تم اپنی بات کرو" — میں نے کہا — "اور مجھ پر اعتبار کرو۔ مدد خدا کیا کرتا ہے۔ خدا نے مجھے تمہاری مدد کے لئے یا تمہیں میری مدد کے لئے بھیجا ہے۔"

"میں تم پر اعتبار کر لوں گی" — اُس نے کہا — "تم بار بار خدا کا نام لیتے ہو۔ مرد اکیلی عورت کو دیکھ کر خدا کو بھول جاتے ہیں۔"

*

مرد، عورت — عورت، مرد — سب کچھ سمجھتے ہُوتے بھی میں نہیں سمجھنا چاہتا تھا کہ مرد اور عورت کا رشتہ یہی ہوتا ہے جو یہ لڑکی کہہ رہی تھی۔ میں اُس وقت نہیں جانتا تھا کہ خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات کہا ہے۔ میں صرف یہ جانتا تھا کہ میرے باپ کی شرافت مشہور تھی لیکن اُس نے اُس عورت کا دامن داغدار کیا جو عصمت کو اپنی جان سے زیادہ سمجھتی تھی، پھر اُس نے شہناز جیسی لڑکی کے آگے ہتھیار ڈال دیتے جس کی نگاہ میں عصمت کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ شہناز نے عشو کو ڈاکوؤں اور رہزنوں تک پہنچا دیا۔ سارا فتور میرے باپ کا تھا جو ایک مرد تھا۔

یہ تھا وہ انسان جسے خدا نے اشرف المخلوقات کہا تھا۔

اُس لڑکی نے صرف اس لئے مجھ پر اعتبار کر لیا تھا کہ وہ اکیلی تھی، مجبور تھی۔

"کچھ کہو" — میں نے اُسے کہا — "کچھ بتاؤ۔"

"میں ایک دھوکے میں یہاں آگئی ہوں" — اُس نے کہا — "وہ کہتا

تھا کہ میں تم سے پہلے وہاں موجود ہوں گا۔ اُس نے یہی جگہ بتائی تھی۔ اُس سے پہلے میں پہنچ گئی۔ وہ نہیں آیا۔"

وہی فریب، وہی دھوکہ جسے محبت کہتے ہیں۔

"تم دونوں گھر سے بھاگ رہے تھے؟"

"ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "گاؤں میں ہماری شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ میری ذات چھوٹی ہے۔"

"اور وہ بڑی ذات کا ہے۔"

"ہاں!" — اُس نے کہا — "وہ قسمیں کھاتا تھا کہ جیئوں گا تیرے ساتھ اور مروں گا تیرے ساتھ.... تم دیکھ رہے ہو، میں اکیلی مر رہی ہوں۔ وہ نہیں آیا.... شاید آیا ہو اور اس طوفان میں مجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہو لیکن اُسے پہلے یہاں آنا چاہیے تھا۔ وہ نہیں آیا.... وہ مجھے دھوکہ دے گیا ہے۔"

میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ کیسی محبت تھی تو اُس نے وہی محبت بتائی جو میرے باپ نے عشو کے ساتھ کی تھی — "ایجاب و قبول دلوں کا ہوتا ہے، نکاح تو ایک رسم ہے جو بعد میں بھی پوری کی جا سکتی ہے" — وہ لُٹ چکی تھی۔

"وہ نہیں آئے گا" — میں نے اُسے کہا — "وہ کسی اور سے کہہ رہا ہو گا کہ جیئوں گا تیرے ساتھ اور مروں گا تیرے ساتھ.... اگر تمہارا گھر کہیں قریب ہے تو واپس چلی جاؤ اور جو تم پر گزر چکی ہے اُسے بھول جاؤ۔"

"یہ تو میں بھی سوچ سکتی تھی" — طوفان کے زناٹوں، چیخوں اور درختوں کے خوفناک شور میں اُس نے میرے کان کے ساتھ مُنہ لگا کر کہا — "لیکن میرے گھر والے کیا مجھے زندہ چھوڑ دیں گے؟ میں شام کے بعد جب اندھیرا گہرا ہو گیا تھا، گھر سے نکل آئی تھی۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ یہ طوفان نہ آتا تو وہ مجھے ڈھونڈ چکے ہوتے اور مجھے قتل کر کے میری لاش یہیں پھینک جاتے.... میں اب گھر نہیں جا سکتی۔"

"پھر کہاں جاؤ گی؟"

"تم کہاں جا رہے ہو؟" — جواب دینے کی بجائے اُس نے مجھ سے پوچھا — "کیا تم گھر سے بھاگے ہوئے نہیں ہو؟"

میں اُسے تو نہیں بتا سکتا تھا کہ میں کہاں سے بھاگا ہوا ہوں۔ میں نے کہا کہ مجھے کچھ پتہ نہیں میں کہاں جا رہا ہوں۔

"جہاں بھی جا رہے ہو مجھے ساتھ لے چلو" — اُس نے کہا — "اپنے گھر میں رکھ لینا۔ تمہارے گھر کی نوکری کر لوں گی۔"

میں نے اپنے شہر کا نام لے اُس سے پوچھا کہ یہ شہر یہاں سے کتنی دُور ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ تو بہت دُور ہے۔ تیس میل سے زیادہ ہو گا۔ اُس کا اپنا گاؤں وہاں سے ایک میل دُور تھا۔

"نہیں" — میں نے کہا — "میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

میں اُٹھا تو وہ بیٹھے بیٹھے میری ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اُس نے پہلے سے زیادہ رونا شروع کر دیا۔ میں نے اُس سے آزاد ہونے کی بہت کوشش کی لیکن وہ مجھے نہیں چھوڑ رہی تھی۔ میں ایک ٹانگ چھڑاتا تو وہ دوسری ٹانگ سے لپٹ جاتی تھی۔

"وہ آجائیں گے" — وہ بار بار کہتی تھی — "وہ مجھے قتل کر دیں گے۔"

"یہ زیادہ اچھا ہو گا" — میں نے کہا — "زندہ رہو گی تو ہر کوئی تمہیں طعنے دیتا رہے گا تم دھتکاری جاؤ گی۔ قتل ہو جاؤ۔ قریب کوئی دریا ہے تو اُس میں کُود جاؤ۔ ختم کر لو اپنے آپ کو۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان پکڑ لیا۔ وہ تو بالکل ہی بدل گئی تھی۔

"تم کہتے ہو میں قتل ہو جاؤں" — اُس نے کہا۔ طوفان کے شور کی وجہ سے وہ چلّا رہی تھی۔ کہنے لگی — "میں تمہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔ وہ میرے پیچھے آگئے تو میں کہوں گی کہ میں اِس کے پیچھے آئی تھی۔ وہ تمہیں بھی قتل کر دیں گے۔ میرے شکنجے سے نکل کر دکھاؤ۔"

میں ہنس پڑا اور اپنا دامن نہ چھڑایا۔

"بیوقوف لڑکی!" ــــ میں نے کہا ــــ "اگر میں ڈرنے والا ہوتا تو تمہاری پہلی چیخ سے ہی ڈر کر بھاگ جاتا۔ ہوش میں آؤ۔ کیا میں یہ نہیں کہہ سکوں گا کہ اس لڑکی کو میں نے پکڑا ہے؟"

طوفان کی قیامت سے کسی آدمی کی آواز اُٹھی ــــ "اُوتے، اِدھر کہاں آتی ہوگی۔"

"دیکھ لو ..... ذرا ٹھہرو" ــــ یہ آواز ہمارے قریب سے آتی۔

لڑکی میرے ساتھ لپٹ گئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔

"آواز دوں انہیں؟" ــــ میں نے اُس کے کان میں کہا۔

"نہیں" ــــ اُس نے اپنا مُنہ میرے کان سے لگایا اور بولی ــــ "مجھے چھپالو۔ جو کہو گے مانوں گی۔ میرے پاس زیور ہے۔ پیسے بھی ہیں۔ گھر سے لاتی ہوں۔ سب لے لینا۔ میں تمہاری لونڈی بنی رہوں گی" ــــ وہ رو رہی تھی۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے" ــــ میں نے کہا ــــ "خدا کو یاد کرو۔ انسانوں کے سہارے جھوٹے ہوتے ہیں۔"

"اُوتے دُور نہ نکل جانا" ــــ درخت کے تنے کی دوسری طرف سے آواز آتی۔

ایسے لگا جیسے یہ درخت جس کے نیچے ہم کھڑے تھے، بول پڑا ہو۔ اس آدمی اور ہمارے درمیان درخت کا صرف یہ تنا حائل تھا۔ ڈر یہ تھا کہ اس شخص کے دوسرے ساتھی بھی اِدھر ہی آجائیں گے۔ ہمارا پکڑا جانا کوئی مشکل نہیں رہا تھا۔

لڑکی اس طرح میرے ساتھ چپک گئی تھی جیسے میرے وجود میں سما جانے کی کوشش کر رہی ہو۔ مشکل یہ تھی کہ میں اس آدمی کے قدموں کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔ پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ وہ چل پڑا ہے یا وہیں کھڑا ہے۔ اور اگر چل پڑا ہے تو کس طرف چلا ہے۔

میرے دماغ میں ایک ترکیب آگئی۔ اس علاقے میں بھیڑیئے ہُوا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ کبھی کبھی دھاری دار شیر بھی نظر آتا ہے۔ اُس آدمی نے اپنے ساتھیوں کو پھر پکارا۔ میں بھیڑیئے کی طرح غرّایا پھر بھونکا۔ میں بھیڑیئے کی آواز

سے واقف تھا۔

اس شخص کے مُنہ سے عجیب سی آواز نکلی۔ ایسی آوازیں خوف یا اچانک صدمے سے بے اختیار مُنہ سے نکلا کرتی ہیں۔ مجھے اُس کے دوڑنے کی آہٹ سنائی دی۔ آپ نے کُتّے کو دیکھا ہوگا۔ کبھی کبھی کُتّا آسمان کی طرف مُنہ کر کے بڑی لمبی "ہُو" جیسی آواز نکالا کرتا ہے۔ کہتے ہیں کُتّا رو رہا ہے۔ بھیڑیئے رات کو اکٹھے ہوتے ہیں تو اسی طرح مُنہ اوپر کر کے آوازیں نکالتے اور چیختے ہیں۔

اُس آدمی کے بھاگ جانے کے بعد میں نے اُسی قسم کی آواز نکالی تاکہ وہ دُور نکل جاتے۔ میری یہ آوازیں کامیاب رہیں۔

"چلو نکلو اوتے!" ــــ مجھے بڑی بلند آواز سنائی دی ــــ "بھیڑیئے ہیں۔"

میں نے بہت وقت انتظار کیا۔ اُن میں سے کسی کی آواز نہ آتی۔

"یہ جو یہاں تک پہنچ گیا تھا یہ آواز سے میرا چچا معلوم ہوتا تھا" ــــ لڑکی نے کہا۔

"یہ جو کوئی بھی تھے، تمہیں ڈھونڈ رہے تھے" ــــ میں نے کہا ــــ "تم اس علاقے سے واقف ہوگی۔ کیا آگے کوئی ندی یا دریا ہے؟"

"دریا ہے" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "معلوم نہیں تم مجھے کس طرف لے جاؤ گے۔ دریا ایک طرف مڑ جاتا ہے۔"

*

میں اُس سے گلو خلاصی کرا سکتا تھا۔ معلوم نہیں میں مردانگی کی شیخی میں آگیا تھا یا جانے مجھے کیسا جوش آگیا تھا کہ میں نے اُسے اپنے ساتھ رکھنے کا تہیہ کر لیا اور کچھ بھی نہ سوچا کہ طوفان گزر جانے اور اندھیرا چھٹ جانے کے بعد کیا ہوگا اور میں کہاں ہوں گا۔ خطرہ مُول لینا بُرا نہیں ہوتا بشرطیکہ خطرہ سوچ سمجھ کر مول لیا جاتے۔ میں نے صرف خطرہ مول لیا تھا، سوچا کچھ بھی نہیں تھا۔

"اب اُس طرف چلو جس طرف تمہارا گاؤں نہیں" ــــ میں نے اُسے کہا ــــ "کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں ڈھونڈنے والے راستے میں مل جائیں۔"

"کہاں چلیں گے؟"

"یہ مجھے بھی معلوم نہیں" — میں نے جواب دیا — "میں اپنے گھر نہیں جاؤں گا۔"

طوفان کا زور ٹوٹنے لگا تھا۔ اب ذرا آسانی سے چلا جا سکتا تھا۔ دُور چمک سی ہوتی تھی۔ یہ شاید بجلی چمکتی تھی۔ یہ ایک اور رکاوٹ چلی آ رہی تھی۔ بارش تھی۔ میں نے لڑکی سے کہا تیز چلے۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں" — اُس نے کہا — "تم کہاں سے آ رہے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

"گھر سے بھاگ آیا ہوں" — میں نے جواب دیا — "مجھے اپنا کوئی فکر نہیں۔ فکر صرف تمہارا ہے۔ تمہارے ساتھ بہت بُرا دھوکہ ہُوا ہے۔ میرا بس چلے تو میں ایسے آدمی کو قتل کر دوں۔"

"مجھے اب خیال آتا ہے کہ وہ بدمعاش آدمی تھا" — اُس نے کہا — "میری ایک سہیلی کو ہمارے تعلق کا علم تھا۔ اُس نے مجھے کئی بار کہا تھا کہ اس آدمی کے ساتھ تعلق توڑ لو کیونکہ اس کا دوستانہ چوروں بدمعاشوں کے ساتھ ہے۔ میری سہیلی ٹھیک کہتی تھی۔ ہمارے گاؤں میں ایک مکان ہے جس میں باہر کے آدمی آتے جاتے رہتے ہیں۔ گاؤں کا کوئی آدمی اس مکان میں نہیں جاتا۔ یہ آدمی جس کے ساتھ میرا تعلق تھا، وہاں جاتا تھا۔"

"یہ بدمعاشوں کا اڈہ ہوگا" — میں نے کہا — "وہاں باہر کی عورتیں بھی آتی ہوں گی۔"

"سنا ہے رات کو آتی ہیں" — اُس نے کہا — "ایک عورت تو ہر وقت وہاں رہتی ہے۔ اسے سب خراب عورت کہتے ہیں لیکن میں اُسے بدمعاش نہیں سمجھتی۔ ایک روز مجھے باہر مل گئی اور کہنے لگی کہ اس آدمی کا خیال دل سے نکال دو، یہ تمہیں نہ جانے کس طرح خراب کرے گا .... میں نے اُسے کہا کہ یہ دل کا معاملہ ہے، میں مجبور ہوں۔ عشو نے کہا کہ تم ابھی بچی ہو، نادان ہو۔"

"کیا نام لیا ہے اُس عورت کا؟" — میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"عشو!" — اُس نے جواب دیا — "سب اُسے خراب عورت کہتے ہیں

اور اُس کی عزّت بھی کرتے ہیں۔ اُس کے متعلق مشہور ہے کہ آسمان سے تارے توڑ لاتی ہے اور آسمان پر تارے لگا بھی آتی ہے" — اُس نے آہ لے کر کہا — "میں نے اُس وقت اُس کی بات نہ سنی اور آج بھگت رہی ہوں۔ وہ کہتی تھی کہ مرد اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ حیوان کو کسی کے ساتھ محبّت نہیں ہوتی۔ وہ جسم ہی جسم ہوتا ہے اور جسم کو ہی پہچانتا ہے اور تم دل کی بات کرتی ہو۔ وہ کوئی کوئی اللہ والا ہوتا ہے جو دوسروں کے دل کی طلب کو سمجھتا ہے .... اُس وقت مجھے عشو بُری لگی تھی اور میں کہتی کہ یہ بدمعاش عورت محبت کو کیا جانے۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لڑکی اُسی گاؤں کی رہنے والی تھی جس گاؤں کے ایک مکان سے میں فرار ہو کر آ رہا تھا اور یہ لڑکی اُسی مکان کا ذکر کر رہی تھی۔ میں اُسے بتانا مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ میں عشو کو جانتا ہوں۔

"اس مکان کے متعلق لوگ کیا باتیں کرتے تھے؟" — میں نے پوچھا۔

"بڑی ڈراؤنی باتیں کرتے ہیں" — اُس نے جواب دیا — "ایک بات تو یہ بتاتے ہیں کہ کسی زمانے میں اس مکان میں دو جوان لڑکیوں کو قتل کیا گیا تھا۔ دونوں کی بدروحیں اس مکان میں آیا کرتی تھیں اور گھر والوں کو اتنا تنگ کرتی تھیں کہ وہ یہاں سے بھاگ گئے اور مکان غیر آباد پڑا رہا ....

"پھر کوئی بزرگ یہاں آئے اور انہوں نے بدروحوں کو مکان سے نکالا۔ دوسری بات یہ مشہور ہے کہ اس مکان میں کوئی اور آسیب ہے جو ہر کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہی اندر جا سکتا ہے جسے یہ آسیب خود بلاتا ہے۔ یہ خاص قسم کے چند ایک آدمی ہیں ....

"لوگ اونچی آواز میں تو نہیں کہتے، گھروں میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں کہ اس مکان میں ڈاکو اور ٹھگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اغوا کی ہوئی لڑکیوں کو بھی یہاں لایا اور بیچا جاتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ بچوں کو بھی اغوا کر کے یہاں لایا جاتا ہے اور انہیں اُلٹا لٹکا کر اُن کے سروں سے مومیائی نکالی جاتی ہے۔"

میں تو دیکھ آیا تھا کہ اس مکان میں کیا ہوتا ہے۔ یہ نامی گرامی ڈاکوؤں اور رہزنوں کا اڈہ تھا۔ ان ڈاکوؤں نے ہی لوگوں کو ڈرانے کے لئے اس مکان کے متعلق مختلف ڈراؤنی باتیں مشہور کر رکھی ہوں گی۔

*

اُس مکان میں جو کچھ بھی ہوتا تھا اور ہو رہا تھا اور جس طرح میں وہاں پہنچا تھا، وہ تو گزرے ہوئے وقت کی باتیں بن گئی تھیں۔ مجھے تو آنے والے وقت کے متعلق سوچنا تھا لیکن مجھے کچھ تجربہ نہ تھا۔ صرف یہ احساس تھا کہ مجھ میں کوئی ایسی طاقت موجود ہے جو ہر کسی میں نہیں ہوتی، ورنہ میری عمر کا لڑکا خوف سے ہی مر جاتا۔

طوفان کا زور کم ہو گیا تھا۔ ہوا میں ذرا سی تیزی رہ گئی تھی لیکن گھٹاؤں کی گرج سنائی دینے لگی تھی اور اب بجلی چمکتی تھی تو ارد گرد کا سارا علاقہ نظر آجاتا تھا۔ ہم بہت دُور نکل آتے تھے۔ دریا نے ہمارا راستہ روک لیا اور لڑکی کے کہنے پر ہم دریا کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ دریا مُڑ رہا تھا۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا" — میں نے لڑکی سے کہا۔

"فیروزاں!" — اُس نے جواب دیا — "مجھے فجی بھی کہتے ہیں.... اور تمہارا؟"

"سکندر!"

"ہم کہاں جائیں گے؟" — اُس نے ایک بار پھر پوچھا۔

"جہاں خدا لے جائے گا" — میں نے جواب دیا — "رات گزر جاتے تو دیکھیں گے کہ ہم کہاں ہیں۔ چلتی چلو۔"

مجھے اپنے باپ کا خیال آگیا اور اس کے ساتھ یہ سوال، کیا میرا باپ مجھے ڈھونڈ رہا ہو گا؟ شہناز نے اُسے میرے متعلق کوئی اُلٹی ہی بات بتائی ہو گی۔ شہناز کی یاد آتے ہی میں اپنے خون میں حرارت سی محسوس کرنے لگا۔ یہ حرارت غصے کی صورت اختیار کر گئی۔ خون گرم ہوتا گیا۔ ایک سوچ یہ آئی کہ کسی کو بھی پتہ نہیں چلے گا کہ مجھے شہناز نے اغوا کرایا ہے۔ وہ میرے باپ کی عقل پر چھاتی

ہوتی ہو گی۔

"میں انتقام لوں گا" — میں نے اپنی ہتھیلی پر دوسرے ہاتھ کا گھونسہ مار کر کہا۔

"کیا کہا تم نے؟" — فجی نے پوچھا۔

میری زبان سے یہ الفاظ ذرا بلند آواز میں نکل گئے تھے۔

"تم نے انتقام کہا تھا" — فجی نے کہا۔

"تمہاری بے آبروئی کا انتقام" — میں نے کہا — "وہ شخص میرے سامنے آگیا تو انتقام لوں گا۔"

بارش کے بڑے موٹے قطرے کنکریوں کی طرح گرے اور فوراً بعد بارش تیز ہو گئی۔ یہ بھی اچھا ہُوا کہ جھکڑ نرم پڑ گئے تھے ورنہ چلنا محال ہو جاتا۔ فجی میرے ساتھ لگ گئی اور ہم چلتے گئے۔ بارش بڑی خوفناک صورت اختیار کرتی گئی اور میں نے اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا۔ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں ذہنی طور پر کوئی اتنا بالغ نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کے خوفناک حالات کا مقابلہ کر سکے لیکن میں صاف طور پر محسوس کیا کرتا تھا کہ میں ذہنی طور پر وقت سے پہلے بالغ ہو گیا تھا۔ میں یہ نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہُوا تھا۔

میں فلاسفر ہوتا تو آپ کو بتاتا کہ خوف کیا اور ذہنی بلوغت کیا ہوتی ہے اور یہ کس طرح حاصل کی جاتی ہے۔ خوف کے متعلق میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ خوف اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے جتنا اسے قبول کرو۔ بعض لوگ صرف اس لئے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس خوفناک صورت میں لوگ خوفزدہ ہُوا کرتے ہیں لہٰذا خوفزدہ ہونا چاہیئے۔

میں اپنی آپ بیتی کو دردناک بنا سکتا تھا۔ میں مظلوم تھا۔ میں اسے مظلومیت کی داستان بنا سکتا تھا۔ اگر میں درد کے رنگ میں بات کروں تو آپ کے آنسو نکال دوں۔ خود ہی غور کریں۔ ماں کی گود میں پلنے والا اکلوتا بچہ اندھیری رات میں طوفان میں گھرا ہُوا اپنا ہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ اُس کا باپ تھا، گھر تھا مگر یہ گھر

اُس کے لئے جلتا ہُوا تنور بن گیا تھا۔ وہاں اُس کے لئے گناہ تھا یا موت۔ اُسے گناہ منظور نہ تھا اور وہ مرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

پھر بھی میں اس داستان کو دردناک نہیں بناؤں گا۔ کسی اور دُکھ زدہ کا ذکر آیا تو اُس کے دُکھ اور آلام آپ کو سناؤں گا۔

*

بہت صدیاں پہلے وہ چھوٹا سا قلعہ ہُوا کرتا تھا۔ یہ سکندرِ اعظم کے زمانے کا تھا یا مغل شہنشاہوں کے زمانے کا، یہ کبھی قلعہ تھا اور اب کھنڈر تھا۔ یہ بہت پہلے کے مہاراجوں کا بھی ہو سکتا تھا اور بہت پہلے کے کسی بادشاہ کا بھی۔ یہ تھا بہت پُرانا۔ اس کے پتھر سیاہی مائل ہو گئے تھے۔ اس کے جس دروازے سے میں اور فجی داخل ہو گئے تھے اس میں کبھی دشمن کی فوج داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاتھی بھی اس دروازے کو نہیں توڑ سکتے تھے۔

اب وہاں وہ دروازہ نہیں تھا جسے ہاتھی بھی نہیں توڑ سکتے تھے۔ اُسے پہلے دیمک نے کھایا ہو گا اور جب یہ کمزور ہو گیا تو اُسے انسانوں نے اکھاڑ کر اپنے چُولہوں میں جلایا اور روٹیاں پکاتی ہوں گی۔ انہی انسانوں پر بادشاہوں نے حکمرانی کی تھی اور اُن بادشاہوں کو اپنے قلعوں پر کتنا گھمنڈ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ پتھروں کی یہ دیواریں اور لکڑی کے یہ دروازے اور ان پر چڑھے ہوئے لوہے کے مضبوط ٹکڑے اُن کی بادشاہی کو ہمیشہ محفوظ رکھیں گے اور لوگ ان قلعوں کی ہیبت سے مرعوب ہو کر اُن کے آگے سجدے کرتے رہیں گے مگر آج لوگ موجود ہیں اور بادشاہ زمین کے نیچے ہڈیوں کے پنجر بن چکے ہیں اور اُن کے قلعوں کے کھنڈر اُن کے عبرت ناک انجام کی عبرت ناک داستان سنا رہے ہیں۔ جس رعایا کو اس قلعے والے بادشاہ نے بھوکا اور ننگا رکھا ہو گا، اُس رعایا کی اگلی نسلیں قلعے کے تمام دروازے نکال کر لے گئیں اور انہیں جلا کر روٹی پکا لی۔

کتنا خون بہہ گیا ہو گا اس قلعے کو سر کرنے اور سر کرنے والوں سے قلعے کو بچاتے ہوتے۔ اس قلعے کے اندر کتنی معصوم عصمتیں پامال ہوتی ہوں گی۔

بادشاہوں کے کارندوں نے اور اُن کے فوجی سرداروں نے یہاں بڑی ظالمانہ اور شرمناک من مانیاں کی ہوں گی۔ قلعے کے اندر بیٹھ کر وہ خدا کو بھی بھول گئے ہوں گے۔ حکومت کا نشہ ہوتا ہی ایسا ہے کہ دل سے خدا کا نام اور خدا کے بندوں کا پیار نکل جاتا ہے۔

اب دو کیڑے مکوڑے — میں اور فجی — اُس قلعے میں بے دھڑک داخل ہو رہے تھے اور ہمیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ رات کے اندھیرے اور موسلا دھار بارش میں مجھے شک ہُوا کہ یہ کسی قلعے کے کھنڈر ہیں۔ اسے دیکھا تو صبح تھا۔ پہلے رات کی بات سُن لیں۔

گھٹا چمکتی تھی تو کچھ نظر آجاتا تھا۔ ہمارے دائیں اور بائیں دیواریں تھیں اور اوپر شاید چھت تھی۔ یہ قلعے کی ڈیوڑھی تھی۔ ایک بار بجلی اتنے زور سے چمکی کہ ڈیوڑھی صاف نظر آگئی۔ دائیں طرف ایک دروازہ تھا۔ کواڑوں والا دروازہ نہیں، محراب تھی۔ ہم پر اب بارش نہیں پڑ رہی تھی۔

میں دائیں طرف کو چل پڑا۔ ہوا بڑی تیز اور ٹھنڈی تھی۔ اس سے بچنا تھا۔ ہم دونوں کے کپڑوں اور جسموں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ سردی سے دانت بجنے لگے تھے۔ یہ کمرہ سا تھا۔ دو اطراف سے کھُلا ہونے کی وجہ سے ہوا وہاں بھی آتی تھی لیکن تیز نہیں لگتی تھی۔ بڑی اچھی اوٹ مل گئی۔

میں نے اندھیرے میں یہ فائدہ اٹھایا کہ پہلے اپنی قمیض اُتار کر نچوڑی۔ یہ پہن کر شلوار اتاری اور نچوڑ لی۔ فجی سے میں نے کہا کہ وہ مجھ سے ڈرے نہیں اور کپڑے اتار کر نچوڑ لے۔

"تم سے ڈروں یا نہ ڈروں، کیا فرق پڑتا ہے" — اُس نے کہا — "میں تمہارے ہاتھ میں ہوں"۔

"میں کہہ رہا ہوں کپڑے اتار کر نچوڑ لو" — میں نے ذرا رعب سے کہا — "نہ تم میرے ہاتھ میں ہو نہ میں تمہارے ہاتھ میں ہوں۔ ہم دونوں ایک اور ہاتھ میں ہیں جو ہم دونوں کو نظر نہیں آرہا"۔

اندھیرے میں مجھے آوازوں سے پتہ چلتا رہا کہ وہ کپڑے اتار رہی ہے،

نچوڑ رہی ہے اور پہن رہی ہے۔ میں نے اندھیرے کے باوجود مُنہ پھیر لیا تھا۔

"کہاں ہو؟" — اُس کی آواز سنائی دی۔

"یہاں" — میں نے ہاتھ اُس کی طرف کر کے کہا — "آؤ بیٹھ جائیں۔"

ہمارے ہاتھ ملے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ میرے ساتھ آ لگی۔ ہم فرش پر بیٹھ گئے۔

"ایک خیال بار بار آتا ہے" — اُس نے کہا — "جس وقت سے تمہارے ساتھ آئی ہوں اور تمہاری باتیں سنی ہیں، یہ خیال مجھے پریشان کر رہا ہے.... تم بہت ہی شریف لڑکے ہو یا بہت ہی چالاک اور فریبی ہو۔"

"مجھ میں کیا دیکھا ہے تم نے؟"

"میں جوان لڑکی ہوں اور تم مرد ہو" — اُس نے کہا — "میں نے کپڑے اُتارے اور تم دُور کھڑے رہے۔ کبھی شک ہوتا ہے کہ تم مجھے کسی دھوکے میں لے جا رہے ہو جہاں سے میں نکل نہیں سکوں گی۔ مرد اتنے شریف اور بے حس تو نہیں ہوتے جتنے تم بن رہے ہو۔"

معلوم نہیں کیوں میری ہنسی نکل گئی۔

"فجی!" — میں نے کہا — "میں خود دھوکے کے جال میں آیا ہُوا ہوں، اور یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

"میرے پاس زیور ہے" — اُس نے کہا — "اور کچھ پیسے بھی ہیں۔ ان سے کچھ سہارا مل جائے گا۔ زیور بیچ ڈالیں گے۔"

زیور، پیسے۔ انسان کیسے جھوٹے سہاروں پر زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے.... زیور، پیسے، عورت .... ان تین چیزوں نے اتنے انسانوں کا خون بہایا ہے جتنا جنگل کے درندوں نے نہیں بہایا۔ درندوں نے جتنے انسانوں کو چیرا پھاڑا، ان سے کہیں زیادہ انسان نے انسانوں کو چیرا پھاڑا ہے۔

اب میں عمر کے اُس مقام پر آ گیا ہوں جہاں آدمی فلسفیوں کی طرح باتیں کرتا ہے خواہ اپنی عمر اُس کی حماقتوں میں ہی گزری ہو۔ میں داستان سناتے سناتے اُونگھنے لگتا ہوں یا فلسفی بن جاتا ہوں۔ بڑھاپے میں صحت بھی نہیں رہتی، اپنے

آپ پر قابو بھی نہیں رہتا۔ یہ میری مجبوریاں ہیں یا بڑھاپے کی مجبوریاں ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو صرف واقعات سناتا چلوں۔ آگے آپ کا اپنا فلسفہ ہے۔ جس ترازو میں آپ تولنا چاہیں تول لیں۔ جس پیمانے سے آپ ناپنا چاہیں ناپ لیں۔

فجی نے ایک پوٹلی میرے ہاتھ میں دے دی۔ یہ زیور اور پیسے تھے۔ زیور تھوڑا سا تھا اور پیسے بھی تھوڑے سے تھے۔ میں نے پوٹلی اپنے نیفے میں اُڑس لی۔

میرا ہاتھ نیفے سے ہٹا ہی تھا کہ کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ یہ دو تین آدمی ہنسے تھے۔ ایک کی آواز دوسروں سے اونچی تھی۔ یہ ہنسی انسانوں کی ہی تھی لیکن وہاں کوئی انسان نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو میں نے ابھی دیکھا ہی نہیں تھا کہ ہم کیسی جگہ میں ہیں۔ یہ صبح پتہ چلا تھا کہ کوئی بڑا پرانا قلعہ ہے۔ رات بجلی کی چمک میں یہ کھنڈر لگتا تھا۔

"تم نے آواز سُنی ہے؟" — فجی نے پوچھا اور ڈر کر میرے ساتھ ہو گئی۔

"سنی ہے" — میں نے کہا — "شاید ہماری طرح کوئی اور بھی بارش سے بچنے کے لئے یہاں آ گیا ہو۔ دو تین آدمی لگتے ہیں۔"

"یہ میرے پیچھے آئے ہوں گے" — فجی نے کہا — "ہو سکتا ہے یہ انسان نہ ہوں۔ یہ جگہ ویران ہے۔"

ہنسی پھر بلند ہوئی۔ مجھے بھی شک ہونے لگا کہ یہ انسان نہیں ہوں گے۔ بدروحیں ہو سکتی تھیں۔ اس کے بعد اُن کے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"چلو بھاگ چلیں" — فجی نے کہا۔

معلوم نہیں وہ کیا طاقت تھی جو میرے اندر بیدار ہو گئی۔ میں اُٹھ کھڑا ہُوا اور فجی سے کہا کہ میں جا کر دیکھتا ہوں۔

"نہیں" — اُس نے میری ایک ٹانگ کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا —

”تم واپس نہیں آسکو گے۔ وہ انسان نہیں۔ کوئی شر شرار ہے۔ انسان ہوتے تو ہم دونوں کو پکڑ لیں گے۔ نہ جاؤ۔“

”تم یہاں اندھیرے میں دبکی رہو“— میں نے کہا —”میں اُن کے سامنے نہیں جاؤں گا۔ ذرا پیچھے رہ کر دیکھوں گا۔“

”یہیں رہو“— اُس نے بڑی اونچی میں کہا —”مجھ پر رحم کرو سکندر!“

میں نے اُس سے ٹانگ چھڑا لی اور اُس طرف چل پڑا جدھر سے آواز آئی تھی۔ میں نے اسے ایک طاقت کہا ہے جو میری ذات میں بیدار ہو گئی تھی لیکن آپ اسے حماقت کہہ سکتے ہیں۔ میں شاید اُن لوگوں میں سے تھا جو بڑی دلیری سے حماقت کرتے اور اسے دلیری یا طاقت کہتے ہیں۔

میں ایک برآمدے میں جا رہا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ کمرے تھے۔ بجلی چمکتی تھی مجھے نظر آتا تھا۔ ان کمروں کے دروازوں میں کواڑ نہیں تھے۔ میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا چوروں کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ اپنے پیچھے مجھے ایک چیخ اور دوڑتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

”ٹھہر جاؤ سکندر!“— فجی ڈر کے مارے چیختی چلاتی اور دوڑتی آرہی تھی— ”میں اکیلی نہیں بیٹھ سکتی۔“

میں مُڑا اور بڑی تیزی سے اُس تک پہنچا۔

”خدا کے لئے چُپ رہو“— میں نے کہا —”انہوں نے سُن لیا تو ....“

کسی کے دوڑتے قدموں نے اور روشنی نے مجھے بات پوری نہ کرنے دی۔ اسی ڈر سے میں فجی سے کہنے لگا تھا کہ وہ خاموش رہے۔ میں جنہیں چھپ کر دیکھنا چاہتا تھا وہ فجی کی آواز سے باہر نکل آتے تھے۔ روشنی جو ہم پر پڑی تھی وہ ٹارچ کی تھی۔ میں جہاں تھا وہیں بُت بن گیا۔ روشنی کے پیچھے قدموں کی آہٹ آہستہ آہستہ ہماری طرف آگئی تھی۔ آہٹ ہمارے قریب آکر رُک گئی۔

”کون ہو تم دونوں؟“— بھاری سی آواز سنائی دی —”یہاں کیوں آئے ہو؟“

”گھر سے بھاگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں“— ایک اور نے کہا۔

ٹارچ کی روشنی میری آنکھوں پر پڑ رہی تھی اس لئے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ فجی میرے پیچھے ہو گئی تھی۔

”بھاگے ہوئے ہو؟“— ایک نے پوچھا۔

”ہاں!“— میں نے کہا —”ہم بھاگے ہوئے ہیں۔ کہیں بیٹھو۔ ہمیں بھی بٹھاؤ پھر ہم تمہیں کچھ بتائیں۔“

”لڑکا ہوشیار معلوم ہوتا ہے“— اُن میں سے کسی نے کہا —”انہیں نیچے لے چلو۔“

*

قریب ہی ایک کمرہ تھا۔ وہ دو آدمی تھے جو ہم دونوں کو اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جس کی روشنی میں ہم جا رہے تھے۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ چار پانچ قدم چل کر وہ دائیں طرف والی دیوار میں داخل ہو گئے۔ ایک رُک گیا۔

”دھیان سے!“— اُس نے کہا —”آگے تہہ خانے کی سیڑھیاں ہیں۔“

یہ تنگ سیڑھیاں تھیں جن میں سے دو یا تین ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ٹارچ والے نے نیچے جا کر روشنی اوپر کو کر دی تھی جس سے ہمیں سیڑھیاں اچھی طرح نظر آرہی تھیں ورنہ ہم پھسل کر بُری طرح گرتے۔

یہ تہہ خانہ تھا جس میں سات آٹھ چارپائیاں بچھ سکتی تھیں۔ اس کے درمیان میں ڈیڑھ دو فٹ چوڑے پتھروں کا ستون تھا۔ وہاں کوئی چارپائی نہیں تھی۔ میں نے تہہ خانے کی لمبائی چوڑائی بتانے کے لئے چارپائیوں کا ذکر کیا ہے۔ فرش پر دو تین کمبل بچھے ہوئے تھے۔ دیوار کے ایک سوراخ میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ کمبلوں پر چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں دو وہ تھے جو ہمیں ساتھ لاتے تھے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر تھا۔ اُس نے اُس زمانے کے سب سے زیادہ قیمتی کپڑے دو گھوڑا بوسکی کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ خوبرو آدمی تھا۔

”تم تو بچے لگتے ہو“— اس خوبرو آدمی نے مسکراتے ہوئے مجھے کہا —”اسی عمر میں لڑکی کو گھر سے بھگا لاتے ہو؟ .... کیوں لڑکی؟“— اُس نے فجی

سے پوچھا — "اس کے ساتھ گھر سے بھاگی ہو؟"

نجی سرک کر میرے قریب ہو گئی۔

"تم چار آدمی ہو" — میں نے کہا — "اور میں اکیلا ہوں۔ میں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں اگر کہوں گا کہ میں تمہیں کچھ نہیں بتاتا تو تم مجھے اور اسے بھی مار و بیٹھو گے۔ اگر اصل مرد ہو تو ہماری مجبوری سے کوئی فائدہ اٹھانے کی نہ سوچنا۔ میں سب کچھ سچ بتاؤں گا .... یہ لڑکی میرے ساتھ نہیں بھاگی۔ یہ کسی اور کے دھوکے میں آئی تھی اور میں کسی اور کے جال میں آ گیا تھا۔ ہم طوفان میں ملے اور اس نے بتایا کہ یہ کس طرح گھر سے نکلی ہے۔ میرا اپنا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا پھر بھی میں نے اسے کہا کہ میری پناہ میں آ جاؤ۔ تم سے تو میں اچھا ہوں۔"

"کیا تم ہم سے ڈر نہیں رہے؟" — خوبرو آدمی نے پوچھا۔

"نہیں" — میں نے کہا — "میں تمہارا مقابلہ کر سکوں یا نہ کر سکوں، تم سے ڈروں گا نہیں۔"

"میں وہ شیر ہوں جو کسی کا مارا ہوا شکار نہیں کھایا کرتا" — اس نے کہا — "دل سے نکال دو کہ اس لڑکی کے ساتھ کوئی زیادتی ہو گی۔ تم اس لڑکی سے زیادہ خوبصورت اور نوعمر ہو۔ مجھ پر اعتبار کرو اور سچ بولو۔"

"سچ سن کر کیا کرو گے؟" — میں نے پوچھا — "ہماری مدد کر سکو گے؟"

"کچھ نہ کچھ تو کروں گا" — اس نے کہا۔

"تم ہو کون؟" — میں نے پوچھا۔

"یہ بھی بتا دوں گا" — اس نے کہا — "میں مارے ہوؤں کو نہیں مارا کرتا۔ بولو، پوری بات سناؤ۔"

میں نے جھوٹ بولنا ٹھیک نہ سمجھا اور یہ بھی نہ سوچا کہ یہ اسی گروہ کے آدمی نہ ہوں جس گروہ کے آدمیوں نے مجھے اغوا کیا تھا۔ میں نے اس وقت تک جو مجھ پر بیتی تھی انہیں سنا ڈالی۔

"یہ لڑکی اسی گاؤں کی ہے" — میں نے کہا — "اس نے اس مکان

کا ذکر کیا تھا جس میں مجھے بند کیا گیا تھا۔ یہ عشو کو بھی جانتی ہے۔ میں نے ابھی اسے نہیں بتایا تھا کہ میں اسی کے گاؤں سے فرار ہوا ہوں۔"

"اب تم بتاؤ لڑکی!" — خوبرو آدمی نے نجی سے کہا۔

نجی نے میری طرف دیکھا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ بولتی ہی نہیں تھی۔ میں نے ان آدمیوں سے کہا کہ نجی نے جو بات مجھے بتائی تھی، وہ میں سنا دیتا ہوں۔ میں نے انہیں سنایا کہ نجی کس طرح اپنے گھر سے نکلی ہے اور میرے ساتھ کس طرح آ رہی ہے۔

"اب اسے کہاں لے جاؤ گے؟"

"معلوم نہیں" — میں نے جواب دیا — "لیکن میں اسے اکیلا بھی تو نہیں چھوڑ سکتا تھا.... اب کہو ہمارے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟"

"سلوک اچھا ہی ہو گا" — اس نے کہا — "پہلے یہ سوچو کہ جاؤ گے کہاں!"

"میں نے کہا ہے کہ میں نے سوچا ہی نہیں کہاں جاؤں گا" — میں نے کہا۔

خوبرو آدمی نے اپنے ساتھیوں کی طرف اور ساتھیوں نے اس کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی تھی۔ خوبرو آدمی نے بڑی دھیمی آواز میں ان سے کچھ کہا اور کسی کا نام بھی لیا۔ میں نام تو اچھی طرح سن نہ سکا۔ صرف یہ الفاظ اچھی طرح سنے — "یہ اس کا ٹھکانہ ہے نا!" — اس کے ساتھیوں نے سر ہلائے۔ اس آدمی نے آہستہ سے کہا — "چلا دو۔"

"تم کہتے ہو تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں" — خوبرو آدمی نے کہا اور پوچھا — "تم اسے بھی ساتھ لیے پھرتے ہو۔ تم اتنے نادان ہو کہ سمجھ ہی نہیں رہے کہ تم دونوں کتنے بڑے خطرے میں ہو۔ اگر میں تمہارا ٹھکانہ بنا دوں تو قبول کر لو گے؟"

"کہاں؟"

"جہاں تم دونوں کی عزت محفوظ رہے گی" — اس نے کہا — "نوکری ملے گی۔ پیسے ملیں گے۔ رہنے کو بڑی اچھی جگہ ملے گی۔"

"کام کیا ہو گا؟"

"کوئی محنت اور مشقت کا کام نہیں ہو گا" — اُس نے کہا — "جو بھی کام ہو گا تم آسانی سے کر سکو گے ..... اِسے (فجی کو) بھی وہیں نوکری مل جائے گی۔"

"وہاں جا کر اپنے گھر کو اور ماں باپ کو بھول جاؤ گے" — اُس کے ایک ساتھی نے کہا۔

"یہ کوئی دھوکہ تو نہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"بیوقوف لڑکے!" — خوبرو آدمی نے کہا — "دھوکہ دینے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تم دونوں ہمارے قبضے میں نہیں ہو؟ کیا تم اپنے آپ کو اور اس لڑکی کو ہم سے بچا سکتے ہو؟"

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم ہمارے ساتھ اتنی نیکی کیوں کر رہے ہو" — میں نے کہا — "کیا تم اتنے زیادہ شریف اور نیک ہو؟"

"میں شریف بھی نہیں ہوں نیک بھی نہیں ہوں" — اُس نے کہا — "میں بہت بڑا پاپی ہوں۔ پولیس بھی مجھ سے تنگ ہے۔ میں اُس پر وار کیا کرتا ہوں جس میں وار کا جواب وار سے دینے کی طاقت ہوتی ہے۔ میں پولیس کا مقابلہ کیا کرتا ہوں اور پولیس کو ہی میں دھوکہ دیا کرتا ہوں۔ میں نے جس روز کمزوروں پر اور بچوں پر ہاتھ اُٹھایا اُس روز میری طاقت ختم ہو جائے گی .... تم دونوں میرے قبضے میں نہیں میری پناہ میں ہو۔"

میں اُس سے پوچھنے ہی لگا تھا کہ تم ڈاکو ہو لیکن اس خیال سے نہ پوچھا کہ وہ خفا ہو گا۔ اُس نے اپنی جو صفتیں بیان کی تھیں وہ ڈاکوؤں اور رہزنوں والی تھیں۔ وہ کوئی فقیر اور درویش نہیں تھا۔ اُس زمانے میں ہمارے علاقے میں دو ڈاکو بہت مشہور ہوتے تھے — موسلے اور ناجا — لوگ ان سے ڈرنے کی بجائے ان کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔

"میرے قریب آ لڑکے!" — اُس نے مجھے اپنے پاس بلایا۔

میں سرک کر اُس کے سامنے جا بیٹھا تو اُس نے میرا چہرہ اپنے دونوں

ہاتھوں میں لے کر میری آنکھوں میں دیکھا پھر میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہتھیلیاں دیکھیں۔

"میں جوتشی نہیں ہوں" — اُس نے کہا — "جوگی اور نجومی بھی نہیں ہوں لیکن آگے کا کچھ حال نظر آ جاتا ہے۔ دیکھ پُتر! میں نے تیری باتیں سنی ہیں۔ تُو اپنی عمر سے بہت آگے چلا گیا ہے۔ تیرے چہرے پر اور تیری آنکھوں میں مجھے کوئی عجیب چیز نظر آ رہی ہے۔ تُو کچھ بن کے رہے گا۔ تیرا راستہ کوئی اور ہے۔ یہ عام لوگوں کا راستہ نہیں۔ اپنے دل اور دماغ کو خراب نہ کرنا۔ اپنی نیّت کبھی خراب نہ کرنا۔ کسی عورت کے جال میں نہ آنا .... اِس لڑکی پر تُو نے احسان کیا ہے۔ اگر تیری نیّت صحیح نہیں تو صحیح کر لے۔ اپنے آپ کو پتھر بنا لے .... اپنے سے کمزور پر کبھی ہاتھ نہ اُٹھانا۔"

مجھے اپنے بچپن کی پگلی یاد آ گئی۔ اُس نے بھی مجھے دیکھ کر کچھ ایسی ہی پیشین گوئی کی تھی۔ میری نیّت تو پہلے ہی صحیح تھی۔ شاید مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ نیّت خراب کس طرح کی جاتی ہے۔ اس خوبرو آدمی نے جو یقیناً کوئی ڈاکو تھا، ایسی باتیں کر کے میرا حوصلہ اور زیادہ مضبوط کر دیا۔

میں نے فجی کو اس تہہ خانے میں آ کر دیے کی روشنی میں دیکھا تھا۔ اس لڑکی میں خاص قسم کی کشش تھی۔ وہ بہت خوبصورت نہیں تھی۔ اُس کا رنگ گورا چٹا نہیں تھا، گندمی رنگ تھا جس میں ہلکی ہلکی سفیدی تھی۔ کشش اُس کی آنکھوں میں اور چہرے کے نقوش میں اور قد کاٹھ میں تھی۔ اُس کے چہرے پر بھولپن تھا جس سے وہ اصلی عمر سے کم لگتی تھی۔

"آج رات تم دونوں یہیں رہو گے" — خوبرو آدمی نے کہا — "ہم تمہیں کھانے کے لیے کچھ دے دیں گے۔ کل دن بھی تم یہیں رہو گے۔ کل رات تم میرے ایک آدمی کے ساتھ یہاں سے جاؤ گے۔ تم جب اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ گے تو دُنیا کو بھول جاؤ گے۔"

"لیکن کہاں؟" — میں نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا۔

"ایک نواب کے محل میں" — اُس نے جواب دیا — "وہ بادشاہوں

کی دُنیا ہے۔"

اُس نے مجھے بتایا کہ بادشاہوں کی یہ دُنیا کیسی ہے۔ مجھ پر اس کا تو کچھ اثر نہ ہُوا، میں نے یہ محسوس کر لیا کہ مجھے اس شخص کی بات مان لینی چاہیئے۔ مجھے اُس پر اعتبار آ گیا تھا۔ میں نے اُسے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ فجی چُپ بیٹھی ہوتی تھی جیسے اُس کا اپنا کوئی فیصلہ ہی نہیں تھا یا جیسے اُس نے اپنی قسمت میرے ساتھ وابستہ کر دی تھی۔

*

ہم دونوں کی باقی رات ایک اور کمرے میں گزُری۔ بھیگے ہوئے کپڑوں نے سونے نہ دیا۔ کپڑے خشک کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ فجی نے تین چار مرتبہ کہا ——— "سکندر! تم تو بہت خوبصورت ہو" ——— اور میں نے اُسے کہا تھا ——— "فجی! اس کی بجائے یہ کہا کرو، سکندر! تم بڑے دل والے مرد ہو۔ خوبصورتی لڑکیوں کی دیکھی جاتی ہے۔ میں مرد ہوں۔ معلوم نہیں آنے والے دن ہمارے لئے کیسے ہوں گے۔ ایسی ویسی ہو گئی تو مجھے اپنی خوبصورتی کی نہیں مردانگی کی ضرورت ہو گی۔"

صبح طلوع ہوئی تو اِن لوگوں نے ہمیں دُودھ پلایا اور کہا کہ ہم باہر نہ نکلیں۔ میں نے اُس خوبرو آدمی کے متعلق پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ صبح سے بہت پہلے چلا گیا تھا۔ اب وہاں صرف دو آدمی رہ گئے تھے۔ انہوں نے ہمیں نواب کے محل تک پہنچانا تھا۔

دن بھی گزر گیا۔ ان دونوں آدمیوں نے ہمیں بھوکا اور پیاسا نہ رہنے دیا۔ شام تاریک ہو گئی تو انہوں نے ہمیں باہر نکالا اور ہم دونوں کو کھیس دے کر کہا کہ اس طرح اُوپر لے لیں کہ ہمارے چہرے نظر نہ آئیں۔

"کچھ دُور تک ہم تانگے میں جائیں گے" ——— ان میں سے ایک نے ہم دونوں سے کہا ——— "تانگے میں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ ایک جگہ سے ہم لاری میں سوار ہوں گے۔ وہاں سے تم اپنے چہرے چھپا کر رکھنا۔ خطرہ یہ ہے کہ تم پہچانے گئے تو پکڑے جاؤ گے۔ دونوں مارے جاؤ گے۔"

میں خود اس خطرے کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ احتیاط لازمی تھی۔ یہ تو بہت بعد میں پتہ چلا تھا کہ یہ لوگ یہ احتیاط اپنے لئے کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں کمبل اوڑھا دیئے اور باہر لے گئے۔ ایک تانگہ کھڑا تھا۔ ہم دونوں کو پچھلی سیٹ پر بٹھایا گیا۔ ایک آدمی اگلی سیٹ پر اور دوسرا ہمارے ساتھ بیٹھ گیا اور تانگہ چل پڑا۔

دونوں آدمی تانگے والے کے ساتھ باتیں کرتے گئے۔ یہ محض گپ شپ تھی۔ تانگے والے نے اُن سے پوچھا تھا ——— "اُستاد جی بھی آتے تھے؟"

"رات اِدھر ہی تھے" ——— اِن دو آدمیوں میں سے ایک نے جواب دیا تھا ——— "بڑی سویرے نکل گئے تھے۔"

تانگہ پگڈنڈی پر دوڑتا گیا اور پکی سڑک پر جا چڑھا۔ بہت دُور جا کر تانگہ رُک گیا اور ہم سب کو اُتار کر چلا گیا۔ بہت انتظار کے بعد ایک بس آئی جو ہمارے پاس آ کر رُکی اور ہم چاروں کو اپنے پیٹ میں ڈال کر چل پڑی۔ بس میں بہت سی سواریاں بیٹھی تھیں اور اندر اندھیرا تھا۔

بڑا ہی لمبا سفر تھا۔ میں بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ فجی بھی شاید سو گئی تھی۔ بینا آئی اور مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں چلی گئی تھی۔

"میں نہیں گئی تھی" ——— اُس نے کہا ——— "تم چلے گئے تھے .... بڑا سخت طوفان آ رہا ہے۔ وہ دیکھو، اُفق سے کالی گھٹا اوپر اُٹھ رہی ہے اور گرد کی دیوار چلی آ رہی ہے۔"

گرد کی دیوار اور گھٹا اکٹھی آ گئیں اور بڑی تیزی سے آئیں۔ وہ جنگل تھا جہاں ہم کھڑے تھے۔ درخت دوہرے ہونے لگے، ان کے ٹہن ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ بینا مجھے ایک چٹان کی ایسی اُوٹ میں لے گئی جو طوفانِ باد و باراں سے محفوظ تھی۔

"یہ طوفان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے" ——— بینا نے کہا ——— "یہ اس دُنیا

کے طوفان میں تم کسی اور دُنیا کی مخلوق میں سے ہو .... اور تم میرے خاوند ہو۔ میرے قریب ہو جاؤ۔"

اُس نے اپنا بازو میرے گلے میں ڈالا اور زلزلے کا اتنا شدید جھٹکا آیا کہ چٹان بڑی زور سے کانپی۔ تاریکی اور گہری ہوگئی۔

"آؤ، اُترو!" — مجھے ایک مردانہ آواز سنائی دی — "لڑکی!"

میں فوراً ہوش میں آگیا۔ مجھے اور فجی کو بس سے اتارا جا رہا تھا معلوم نہیں ہم نے کتنا لمبا سفر کیا تھا۔ وہ دونوں ہم دونوں کو پیدل اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ کوئی شہر تھا۔

"یہ میرا شہر تو نہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"نہ یار!" — اُن دو آدمیوں میں سے ایک نے کہا — "وہ تو اب خوابوں کا شہر بن گیا ہے۔"

"وہ بہت دُور رہ گیا ہے بچے!" — دوسرے نے کہا — "یہاں تمہیں ڈھونڈنے کوئی نہیں آئے گا۔"

"ماں تمہاری اس دنیا سے اُٹھ گئی ہے" — پہلے نے کہا — "اور باپ کو تم نے دیکھ لیا ہے۔ سمجھ لو وہ بھی مر گیا ہے۔ اب خود باپ بنو۔ یہ لڑکی تمہارے ساتھ ہے، اسی سے شادی کر لینا۔ یہ ساری عمر تمہاری غلام رہے گی۔"

فجی ہنس پڑی۔ میں نے اس کے ساتھ شادی کرنی تھی یا نہیں، اُس کی ہنسی نے میرے ذہن کو گھٹن اور جکڑن سے آزاد کر دیا۔

*

جس گھر میں ہمیں لے جایا گیا وہ کسی نواب کا محل نہیں تھا۔ وہ تو میرے گھر جیسا بھی نہیں تھا لیکن گھر اچھا تھا۔ پکا مکان تھا۔ جس کمرے میں بٹھایا گیا اُس میں فرنیچر اچھا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ اس گھر والے لوگ خوش حال اور سلیقہ شعار ہیں۔ ایک آدمی کمرے میں آیا۔ وہ بھی معزز لگتا تھا۔ اُس نے مجھے اور فجی کو بڑے غور سے دیکھا، پھر ہمیں کھڑے

ہونے کو کہا، پھر ذرا گھومنے کو کہا۔ میں اور فجی اُس کے اشاروں پر اِدھر اُدھر ہوتے رہے۔ آخر اُس نے ہمیں بیٹھ جانے کو کہا۔

ہم دونوں کے آگے ایک نوکر نے جو ناشتہ رکھا وہ امیر گھر کا ناشتہ تھا۔ وہ آدمی ہمارے ساتھ آتے ہوتے دونوں آدمیوں کو باہر لے گیا۔ میں اور فجی ناشتہ کرنے لگے۔ وہ لوگ باہر دروازے کے قریب ہی کھڑے تھے۔ اُن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے اُٹھ کر دروازے کے ساتھ کان لگائے مجھے اُن کی باتیں سنائی دینے لگیں۔ اس سے پہلے معلوم نہیں وہ کیا کچھ کہہ سُن چکے تھے۔ میں نے جب قریب جا کر باتیں سُنیں تو وہ کہہ رہے تھے۔

"بھائی میرے! میں نے کب کہا ہے کہ مال ٹھیک نہیں۔ تم تو بڑے کام کی چیزیں لاتے ہو۔ میں تو پیسوں کی بات کر رہا ہوں۔ تم بہت زیادہ بتا رہے ہو۔"

"ہم بتا چکے ہیں کہ یہ پیسے اُستاد نے مانگے ہیں۔"

"پھر میں اُس کے ساتھ بات کر لوں گا۔"

"وہ ہم دونوں کو آگے پیچھے کھڑا کر کے پستول کی ایک ہی گولی ہم دونوں کے سینوں سے پار کر دے گا۔ دوسری گولی ضائع نہیں کرے گا۔"

"وہ کہے گا کہ مال پر ہماری مُہر تو نہیں لگی ہوتی تھی کہ تم اُدھار پر وہاں چھوڑ آتے ہو۔"

"اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم زیادہ مانگ رہے ہیں تو ہم ان دونوں کو واپس لے جاتے ہیں۔"

"استاد نے یہ کام تو کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ یہ تو ہم دونوں ہیں جو کبھی کبھار یہ کام کرتے ہیں۔ خدا کی قسم، یہ چیزیں بڑی مشکل سے حاصل کی ہیں۔"

"واپس لے جانے کو کون کہہ رہا ہے بھائی! تم تو ایسی باتیں کرتے ہو جیسے آج پہلی بار یہاں آتے ہو .... مجھے مال بہت پسند آیا ہے۔"

"پھر لائیں نکالیں رقم۔ ہم روشنی سے پہلے پہلے شہر سے نکل جائیں تو اچھا ہے۔"

"جاؤ بھائیو، جاؤ۔ تم نکلو، میں رقم لاتا ہوں۔"

اُن کے قدموں کی آہٹ پر میں بڑی تیزی سے دروازے سے ہٹا اور فجی کے پاس آبیٹھا۔ باہر ہمارا سودا ہو رہا تھا اور ہم دونوں فروخت ہو گئے تھے۔ میرے دل کی دھڑکن بڑی تیز ہو گئی تھی۔ میں نے فجی کو نہ بتایا۔ میں اکیلا ہی پریشان ہونے لگا۔ پریشانی یہ تھی کہ یہ لوگ عصمت فروش ہوں گے۔ اگر ایسا ہی تھا تو فجی کی دُنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ میں فجی کو بچا سکوں گا؟ کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہو؟" — فجی نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں یہ لوگ کون ہیں" — میں نے کہا۔

اتنے میں ہمارے ساتھ والے دو آدمی ہمارے خریدار کے ساتھ اندر آئے۔ دونوں نے ہمیں تسلیاں اور دلاسے دیئے اور چلے گئے۔ مجھے اب ان کی تسلیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارا خریدار ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ میں اسے معزز آدمی سمجھا تھا مگر اب مجھے اس شخص سے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

"گھبراتے ہوتے تو نہیں تم دونوں؟" — اُس نے پیارے سے لہجے میں پوچھا۔

"اگر ہم گھبراتے ہوتے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟" — میں نے پوچھا — "ہم دونوں کیا کریں گے؟ آپ نے ہمیں خریدا ہے۔ صرف یہ بتا دیں کہ آپ نے ہمیں کیوں خریدا ہے؟"

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ میں نے تمہیں خریدا ہے؟" — اُس نے پوچھا — "کیا تمہیں پہلے سے معلوم تھا کہ تم کسی کے ہاتھ بکنے کے لئے جا رہے ہو؟"

"نہیں!" — میں نے جواب دیا — "ہم بک چکے ہیں۔ اس سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم یہاں تک اپنی مرضی سے پہنچے ہیں یا پہنچائے گئے ہیں۔ میں آگے کا پوچھ رہا ہوں کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔"

"اچھا ہی ہو گا" — اُس نے شگفتہ لہجے میں کہا — "تم خود دیکھو گے کہ تمہاری قسمت چمک اُٹھی ہے۔"

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں جوانی سے بھی آگے نکل گیا ہوں جہاں انسان ذہنی طور پر نہ صرف بالغ ہو جاتا ہے بلکہ وہ تجربے اور دانش سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ ذہن اور عقل کے اُس مقام پر آنے کے لئے مجھے ذرا سی بھی کاوش نہیں کرنی پڑی تھی۔

"محترم!" — میں نے کہا — "معلوم نہیں قسمت چمکنے سے آپ کا مطلب کیا ہے۔ اگر پیسے سے آپ سمجھتے ہیں کہ قسمت چمکتی ہے تو میں ایسی قسمت کو نہیں مانوں گا۔ اگر میری اور اس لڑکی کی عزت اور آبرو رہتی ہے تو میں اسے خوش نصیبی ہی کہوں گا، لیکن ہماری قسمت آپ نے خرید لی ہے۔ میرے پاس صرف باتیں رہ گئی ہیں۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہمیں ایک نواب کے محل میں نوکری دلائی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ نواب آپ نہیں۔"

"میں تمہیں محل میں ہی لے جا رہا ہوں" — اُس نے کہا — "تمہارا حلیہ بُری طرح بگڑا ہوا ہے۔ میں تم دونوں کو کپڑے دوں گا۔ تم نہا کر وہ کپڑے پہنو گے۔ کچھ دیر آرام کرو گے پھر میں تمہیں محل میں لے جاؤں گا۔"

*

وہ واقعی محل تھا جہاں ہم دونوں کو لے جایا گیا۔ چھ سات ایکڑ وسیع و عریض جگہ تھی جس کے اردگرد دیوار تھی۔ ہم جس گیٹ سے اندر گئے تھے اُس پر چار رائفل بردار آدمیوں کا پہرہ تھا۔ ہم دن کی روشنی میں وہاں گئے۔ دیوار کے اندر درخت اور سبزہ زار تھا۔ پھولدار پودوں کی قطاریں تھیں۔ کئی مکان تھے جو ایک دوسرے سے دُور دُور تھے اور ایک عمارت تو بہت ہی لمبی چوڑی تھی۔ وہ نواب کا محل تھا۔

ہمارے ساتھ وہی آدمی تھا جس نے ہمیں خریدا تھا۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں لگتا تھا۔ اُس کے سر کے بال دودھ کی طرح سفید اور لمبے تھے۔ سر کی چوٹی بالوں سے خالی تھی۔ اُس کے چہرے پر عمر کی چند ایک گہری لکیریں تھیں۔ اُس کا رنگ گورا اور آنکھیں سفید تھیں۔

”دیکھتے خواجہ صاحب!“ — ہمیں اپنے ساتھ لے جانے والے نے بوڑھے سے کہا — ”آپ کے لئے کیا لایا ہوں۔“

بوڑھے نے مجھے بڑے غور سے دیکھا پھر فجی کو دیکھا۔

”اس لڑکے کو دیکھیں“ — ہمارے خریدار نے کہا — ”لڑکی بیگم گلشن آرا کے لئے ہے۔“

”پھر لے جاؤ اسے!“ — بوڑھے نے کہا — ”لڑکے کو میرے پاس رہنے دو.... تم جاؤ۔ لڑکا ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔“

وہ آدمی فجی کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ بوڑھے نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ تب میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں ایک ستار رکھی تھی۔ طبلہ تھا اور ہارمونیم بھی۔ یہ ساز دیکھ کر مجھے کچھ شک ہوا۔

”ناچ گانا جانتے ہو؟“ — بوڑھے نے پوچھا۔

”ناچ گانا؟“ — میں نے حیران ہو کر پوچھا — ”آپ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں؟ جو آدمی مجھے آپ کے حوالے کر کے گیا ہے، کہتا تھا کہ مجھے اور اس لڑکی کو بڑی اچھی نوکری ملے گی .... لڑکی کو وہ کہاں لے گیا ہے؟“

”یہ لڑکی تمہاری کچھ لگتی ہے؟“ — اس نے پوچھا۔

”نہیں“ — میں نے جواب دیا — ”لیکن اس کی بے عزتی مجھ سے برداشت نہیں ہوگی۔“

”اس کی بے عزتی نہیں ہوگی“ — اس نے کہا — ”میں شاید تمہاری بات سمجھ گیا ہوں۔ گلشن آرا نواب صاحب کی ایک بیگم ہے۔ اسے خوبصورت اور نوجوان نوکرانیاں رکھنے کا شوق ہے۔ وہ بیک وقت تین نوکرانیاں رکھتی ہے۔ اسے اپنی پسند کی کوئی لڑکی نظر آجاتی ہے تو وہ اسے اپنے پاس رکھ لیتی ہے اور ایک نوکرانی کو محل میں کسی اور کام پر لگا دیتی ہے۔ جو آدمی تم دونوں کو لایا ہے وہ اس لڑکی کو بیگم گلشن آرا کے پاس لے گیا ہے۔ وہاں لڑکی بالکل محفوظ رہے گی۔ وہاں کوئی آدمی نہیں جا سکتا۔ آدمی وہی جا سکتا ہے جسے بیگم کسی کام سے بلاتی ہے۔“

”اور میرا کام کیا ہوگا؟ — میں نے پوچھا۔

”رقص!“ — اس نے جواب دیا — ”اسی لئے میں نے پوچھا تھا کہ ناچ گانا جانتے ہو؟“

”نہیں!“ — میں نے کہا — ”میں ناچنا نہیں جانتا اور میں ناچوں گا بھی نہیں۔“

”بیوقوف نہ بنو لڑکے!“ — اس نے کہا — ”میں سکھا دوں گا۔ تمہیں ناچنا پڑے گا .... پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں تک پہنچے کیسے ہو؟“

”بتانے سے کچھ حاصل ہوگا؟“

”شاید کچھ حاصل ہو جائے“ — اس نے کہا۔

میں نے اسے من و عن سنا دیا کہ میں کون ہوں اور مجھ پر کیا بیتی ہے اور میں کس طرح اغوا ہوا اور کس طرح فرار ہوا ہوں۔ فجی کے متعلق بھی میں نے سچی بات بتا دی۔ اس نے یہ داستان بڑی دلچسپی سے سنی۔

”تم یہاں آگئے ہو یہاں سے اپنی مرضی سے نہیں نکل سکو گے“ — اس نے کہا — ”نکل بھی گئے تو کہاں جاؤ گے؟ .... یہیں رہو۔ میں تمہیں اپنی سرپرستی میں رکھوں گا۔“

”لیکن میں عورتوں کی طرح ناچوں گا نہیں“ — میں نے کہا۔

”نہیں لڑکے!“ — اس نے کہا — ”تم عورتوں کی طرح نہیں ناچو گے، تم مردوں کی طرح ناچو گے۔ معلوم نہیں رقص کو تم کیا سمجھ رہے ہو۔ یہ ناچنے گانے والی طوائفوں جیسا رقص نہیں۔ تم مرد رہو گے۔ تمہارے ہاتھ میں تلوار ہو گی۔ رقص کی اداؤں میں تم اپنے دشمن کو یا رقیب کو مارو گے۔ یہ رقص میں نے تیار کیا ہے۔ میں محل کا موسیقار ہوں اور موسیقی کے ساتھ ساتھ نیا سے نیا رقص تخلیق کرتا ہوں۔“

وہ مجھے بتاتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اس کی عمر ستّر برس سے اوپر ہو چکی تھی۔ میں اس سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے اپنے آپ میں رقص کی دلچسپی پیدا کر لی۔



اُس نے جب مجھے اس خاص قسم کے رقص کی ٹریننگ دینی شروع کی تو یہ رقص مجھے اچھا لگا۔ اُس نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ مردوں کا رقص ہے جس میں میرے ہاتھ میں تلوار ہوگی۔ اس رقص میں آٹھ لڑکے تھے جن کی عمریں چودہ پندرہ سال تھیں۔ ہر لڑکا خوبصورت تھا اور اُن کے جسموں میں ربڑ جیسی لچک تھی۔ وہ لڑکوں کے ہی روپ میں ناچتے تھے۔

بوڑھا موسیقار جسے سب خواجہ صاحب کہتے تھے، مجھ میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ ہر رات ناچ نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھار ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کی تو یہ حالت تھی جیسے موسیقی اُس کی رُوح ہو اور اُس کے جسم کی غذا بھی موسیقی ہو۔ لڑکوں کو رقص کی مشق اس طرح کراتا تھا جیسے وہ کٹھ پُتلیاں ہوں۔ آٹھ دس لڑکے ایک جسم کی طرح حرکت کرتے تھے۔ خواجہ صاحب سازندوں کے لئے مصیبت بنا رہتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہوتی تھی۔ کوئی سازندہ کہیں سے ذرا سا سُر تال سے اِدھر اُدھر ہو جاتا تو خواجہ صاحب کی چھڑی اُس کی پیٹھ پر پڑتی تھی۔

اُس نے جس رقص کی مجھے ٹریننگ دی وہ عجیب سا تھا۔ اس میں مجھے نیام سے تلوار رقص کی اداؤں سے نکالنی ہوتی تھی۔ اپنے حریف پر حملہ رقص کی اداؤں سے کرنا تھا۔ حریف کے پینترے رقص کی اداؤں جیسے تھے۔ میرے اور حریف کے اِرد گرد دس نوعمر لڑکوں کا ناچ تھا جیسے وہ ہماری لڑائی کے تماشائی ہوں۔

میں خواجہ صاحب کے پیار اور شفقت اور اُس کے فن سے اتنا متاثر تھا کہ میں اُس کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ میں اُس کی ذات اور اُس کے فن میں تحلیل ہو گیا تھا۔ مجھے خواجہ صاحب کے قریب ہی الگ کمرہ دے دیا گیا تھا جس میں ہر سہولت موجود تھی اور ایک نوکر بھی تھا۔ کھانا نہایت اچھا اور دودھ اور فروٹ خاص طور پر دیا جاتا تھا۔

ذرا ہٹ کر رقاص لڑکوں کے کمرے تھے۔ اس طرف محل کے یا باہر کے کسی آدمی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ کوئی لڑکا سگریٹ نہیں پی سکتا تھا۔ اُن

کی بڑی سخت نگرانی ہوتی تھی۔

مجھے یہاں لانے والوں نے ٹھیک بتایا تھا کہ وہاں جاؤ گے تو بہشت کو بھول جاؤ گے۔ خواجہ صاحب سے جب مجھے شفقت ملی تو میں نے محسوس کیا کہ میں شفقت کا پیاسا تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں والے اس بوڑھے نے مجھے شفقت کیا دی کہ نئی زندگی اور زندہ رہنے کی اُمنگ دے دی۔ محبت ایک جادو ہے۔ پیار اور شفقت میں طلسماتی اثر ہوتا ہے۔ پیار پتھر سے بھی دُودھ نکال لیتا ہے۔ خواجہ صاحب کے پیار نے میرے ذہن سے میرا ماضی دھو ڈالا۔ ایک روز تو میں نے خواجہ صاحب کی گود میں سر پھینک دیا اور میں بہت رویا۔

"کیوں؟ خواجہ صاحب کیوں؟" — میں نے سِسک سِسک کر کہا — "میری ماں مجھے اکیلا کیوں چھوڑ گئی تھی؟ میرے باپ کی دوسری بیوی نے مجھے کیوں اغوا کرایا تھا؟ خدا نے مجھے اتنے خوفناک طوفان اور ایسی سیاہ کالی رات میں کیوں پھینک دیا تھا؟ ... کیوں؟ خواجہ صاحب کیوں؟ میرا گناہ کیا تھا؟ میرے باپ کے گناہ کی سزا مجھے کیوں ملی؟"

"خدا نے جو کچھ کیا بہتر کیا" — خواجہ صاحب نے میرا سر اپنی گود سے اُٹھا کر مجھے اپنے سامنے بٹھا کر کہا — "تم اغوا نہ ہوتے تو تمہاری سوتیلی ماں تمہیں قتل کرا دیتی۔ آگے وہ عورت موجود تھی جس کے دل میں تمہارا پیار تھا۔ اُس نے تمہیں بڑے بُرے انجام سے بچا لیا اور قید سے آزاد کر دیا۔ تم نجی کے لئے رحمت کا فرشتہ بنے اور اس کی عزت اور اس کی جان بچا کر لے آئے۔ آگے تمہیں ناجا ڈاکو مل گیا جو کمزوروں کا دوست اور طاقت اور دولت کے گھمنڈ والوں کا دشمن ہے۔"

"ناجا ڈاکو؟" — میں نے حیران ہو کے کہا — "وہ تو بڑا زبردست ڈاکو ہے۔ میں نے اس کے بہت سے قصّے سنے ہیں۔"

"ہاں، ناجا ڈاکو!" — خواجہ صاحب نے کہا۔

"اُس نے تو مجھے بیچا ہے" — میں نے کہا۔

"تمہارے ساتھ یہ جو اتنی خوبصورت لڑکی تھی" — خواجہ صاحب نے

کہا —"اِس پر تو اُس نے بُری نظر نہیں رکھی؟"

"نہیں!"

"اگر تاجا نہ ہوتا تو اُس کے آدمی تم دونوں کے ساتھ نہ جانے کیسا بُرا سلوک کرتے"— خواجہ صاحب نے کہا —"تمہیں میرے پاس لانے والا مجھے سب کچھ بتا گیا ہے۔ اُس کے حکم پر تم میرے پاس پہنچے ہو لیکن یہاں لڑکے اور لڑکیاں خریدی جاتی ہیں اس لئے اُس نے تم دونوں کی قیمت لے لی۔ اُس کا یہ پیشہ نہیں۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو اِس سودے کی اجازت دے دی تھی۔ تمہارے لئے اس جگہ سے بہتر اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہو سکتا تھا۔"

"یہ تو میں تسلیم کرتا ہوں"— میں نے کہا۔

"میرے عزیز سکندر!"— خواجہ صاحب نے کہا —"میرا تجربہ ہے اور میں نے اتنی لمبی عمر میں بڑے عجیب اور ناقابلِ یقین واقعات دیکھے ہیں یہ لڑکی جسے تم بچا کر لائے ہو، کسی روز تمہارے کام آئے گی .... ایسا ہو سکتا ہے اور میں نے ایسے ہوتے دیکھا ہے .... اور تمہارا باپ اور اُس کی خوبصورت اور جوان بیوی! .... وہ حرص و ہوا کے بندے ہیں۔ اُن کے دماغوں پر جہالت چڑھی ہوئی ہے اور اُن کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ سزا پائیں گے۔ اِسی دنیا میں خراب اور برباد ہوں گے .... تم پیار اور محبت کے پیاسے ہو۔ پیار دیا جاتا ہے پھر پیار ملتا ہے۔ دے اور پھر تجھے ملے گا۔"

خواجہ صاحب ایسے پُراثر اور پیارے انداز سے بول رہا تھا کہ اُس کا ایک ایک لفظ میری رُوح میں اُترتا جا رہا تھا۔

"کیا یہ نواب صاحب کسی ملک کے بادشاہ ہیں؟"— میں نے پوچھا۔

"نہیں"— خواجہ صاحب نے جواب دیا —"یہ نواب اسی دنیا کا بادشاہ ہے۔ اس دیوار کے اندر اور اس کے اِرد گرد بہت سے گاؤں اور دو بڑے قصبے ہیں۔ یہ اِس محدود سی دنیا کا بادشاہ ہے۔ اس کی عمر میری عمر جتنی ہو گئی ہے۔ اس کا جسم سُوکھا پیڑ بن چکا ہے جس کا اب کوئی پتہ ہرا نہیں ہوگا۔ اس کی جڑیں اب زمین سے پانی چوسنے کے قابل نہیں رہیں۔ اب یہ اپنے آپ کو

مصنوعی پتوں اور پھولوں سے دھوکہ دے رہا ہے کہ ابھی سوکھا نہیں۔ اس کی رعایا سُوکھ گئی ہے۔ رعایا اپنی محنت سے زمین سے جو اُگاتی ہے اُس کا نصف اِس دیوار کے اندر آجاتا ہے۔ لوگ جو کماتے ہیں وہ سارے کا سارا اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ اس کا ایک حصہ اس محل میں آجاتا ہے۔"

"کیا یہاں انگریزوں کی حکومت نہیں؟"

"حکومت انگریزوں کی ہی ہے"— خواجہ صاحب نے جواب دیا —"یہ نواب، ایسے کئی اور نواب، راجے اور مہاراجے انگریزوں کے گماشتے ہیں۔ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ مکمل کرنے کے لئے انہوں نے انگریزوں کی بہت مدد کی تھی۔ اپنی قوم سے غداری کی تھی۔ انگریزوں نے انہیں یہ ریاستیں انعام میں دی ہیں اور انہیں کھُلی چھٹی دے دی کہ اپنی رعایا کا خون چُوسو اور عیش کرو اور انگریزوں کو بھی عیش کراؤ۔ عیش و عشرت ہی ان کی زندگی ہے۔ بڑے بڑے انگریز افسر یہاں عیش کرنے آتے ہیں اور یہ نواب ان انگریزوں کو خوش کرنے کے کئی ڈھنگ اختیار کرتے ہیں۔ نئے سے نئے طریقے سوچتے ہیں۔"

"پھر تو یہاں گناہ ہوتے ہوں گے۔"

"گناہوں کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں ہوتا"— خواجہ صاحب نے کہا —"نواب صاحب کی منکوحہ بیویاں تین ہیں اور غیر منکوحہ کئی ہیں۔ نواب اُن کے قابل نہیں رہا لیکن حرم میں نئی سے نئی لڑکی کو لانا اور اُسے قید میں ڈال دینا اُس کا شغل ہے۔ ایک نشہ ہے۔ یہ لڑکیاں انگریز مہمانوں کو پیش کی جاتی ہیں۔"

"نواب کی اولاد تو بہت ہو گی!"

"لڑکا ایک بھی نہیں"— خواجہ صاحب نے کہا —"دو بیویوں سے ایک ایک لڑکی ہے۔ دونوں جوان ہیں اور غلام قسم کے خاوندوں کی بیویاں ہیں خاوندوں کو ساتھ لئے اکثر یہیں رہتی ہیں۔ تینوں بیگمات وراثت کو ذہن میں رکھ کر ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتی ہیں اور

نواب ولائتی شراب سے بڑھاپے کو دھوکہ دیتا رہتا ہے۔ وہ اُس وقت بیدار ہوتا ہے جب یہاں انگریز افسر آتے ہیں"۔

"آپ ناچ گانا انگریزوں کے لئے کراتے ہوں گے؟"

"ہاں!" ___ خواجہ صاحب نے کہا ___ "نواب شروع سے ناچ گانے کا دلدادہ رہا ہے۔ اب بھی ہے لیکن رقص سے انگریز افسروں کو خوش کرتا ہے۔ لڑکوں کا رقص ایک جدید ناچ ہے جو ایک مہاراجے نے شروع کیا تھا بڑے خوبصورت جسموں والے نوعمر لڑکے کپڑوں کے بغیر یہ رقص کرتے ہیں۔ اُن کے ستر خوشنما پتوں اور پھولوں سے ڈھکے ہوتے ہوتے ہیں۔ یہ رقص خاص قسم کے رنگوں کی روشنیوں میں ہوتا ہے .... میں نے اس رقص میں کچھ اضافے کئے ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم آ گئے ہو۔ تمہارا قد اور جسم میرے اس رقص کے لئے موزوں ہے۔ تمہارا نام سکندر ہے اور میں تمہیں اس رقص میں سکندر ہی بناؤں گا"۔

"یہ رقص کب ہو رہا ہے؟"

"پندرہ سولہ دنوں بعد" ___ اُس نے جواب دیا ___ "تین چار انگریز افسر آ رہے ہیں۔ ان میں ایک بہت بڑا افسر ہے۔ نواب صاحب نے مجھے کہا کہ ایسا رقص دکھانا جو ان انگریزوں نے بھی کبھی نہ دیکھا ہو .... میں تمہیں ایک احتیاط آج ہی بتا دیتا ہوں۔ تم بہت خوبصورت ہو اور تمہارے جسم کی ساخت میں خاص قسم کی کشش ہے۔ تم پر جال پھینکے جائیں گے .... بڑے حسین جال .... ان سے بچ کے رہنا"۔

"جال کون پھینکے گا؟"

"بیگمات!" ___ خواجہ صاحب نے جواب دیا ___ "دو بیگمات جوان ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤ"۔

"میں نجی سے ملنا چاہوں گا" ___ میں نے کہا ___ "مل سکتا ہوں؟"

"معلوم ہوتا ہے تمہیں اس لڑکی سے ...."

"نہیں خواجہ صاحب!" ___ میں نے کہا ___ "اس لڑکی کے ساتھ

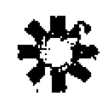
میرا اور کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی عزت اور آبرو کی حفاظت کروں گا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کس حال میں ہے"۔

"یہ کام آسان نہیں" ___ خواجہ صاحب نے کہا ___ "میں ملوانے کی کوشش کروں گا" ___ میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر خواجہ صاحب نے میری آنکھوں میں جھانکا اور کہا ___ "سکندر بیٹا! اپنے آپ کو معمولی آدمی نہ سمجھنا۔ تم جو کچھ بھی بنو گے غیر معمولی بنو گے۔ اگر تم گمراہ ہو گئے تو معمولی سے گمراہ نہیں ہو گے۔ تم گناہوں کے دیوتا بن جاؤ گے اور اگر تم نیک اور پاک راستے پر چل پڑے تو کسی مریض کو ہاتھ لگاؤ گے تو وہ شفا پائے گا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ تم کس راستے پر جاؤ گے"۔

"میں خود بھی محسوس کرتا ہوں کہ میرے وجود میں کوئی خاص چیز ہے" ___ میں نے کہا ___ "بعض باتیں بغیر سوچے میرے مُنہ سے نکل جاتی ہیں اور مجھے اس طرح محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بات آپ کی عمر کے کسی دانشمند آدمی نے کہی ہے۔ کبھی محسوس کرتا ہوں کہ مجھ میں ایسی بے خوفی ہے جو مجھے نقصان پہنچائے گی"۔

"اِسے ایک فالتو حس کہہ لو" ___ خواجہ صاحب نے کہا ___ "اِسے اُبھرنے دو لیکن ایک شرط ہے۔ ذہن کو پاک رکھنا۔ ضمیر کو صاف رکھنا۔ عورت کو ذہن پر سوار نہ کرنا۔ مجھے یقین سا ہو رہا ہے کہ تمہارے اندر کوئی طاقت اُبھر رہی ہے"۔

کوئی طاقت اُبھر رہی تھی یا نہیں، میں اب اس نواب کا قیدی تھا۔ یہ کہہ کر کہ مجھ میں کوئی پُراسرار طاقت ہے، میں شاید اپنے آپ کو خوش فہمی میں مبتلا کر رہا تھا یا مجھے خوش فہمی میں مبتلا کیا جا رہا تھا۔ آنے والا وقت میرے لئے اپنے ساتھ کیا لا رہا تھا، یہ تو کوئی اور بھی نہیں جانتا تھا۔ میں اتنا ہی جانتا تھا کہ میں نے باقی عمر اس نواب کے محل میں ناچتے نہیں گزارنی، یہاں سے نکلنا ہے۔ سوال یہ تھا ___ کب اور کیسے!



آنے والے پندرہ سولہ دنوں میں خواجہ صاحب نے مجھے اِس مخصوص رقص میں طاق کر دیا۔ اُس نے دس لڑکوں کے ساتھ پورے رقص کی مشقیں کرائیں۔ اس رقص نے مجھ میں برتری کا احساس پیدا کر دیا۔ اس میں میرا رول ہی ایسا تھا۔

ان پندرہ دنوں میں ایک رات فجی آگئی۔ یہ خواجہ صاحب کا خُفیہ انتظام تھا۔ کوئی عورت خواہ وہ نوکرانی ہی ہو مردانہ حصّے میں نہیں جاسکتی تھی اور کوئی مرد زنانہ حصّے کی طرف نہیں جاسکتا تھا۔ عیش و عشرت اور گناہوں کی اِس دنیا میں یہ پابندی بڑی عجیب لگتی تھی۔

فجی ڈری ڈری آئی تھی۔ اُس نے قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ بنی سنوری ہوئی تھی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ خوبصورت لڑکی ہے۔ وہ نواب کی تیسری بیگم گلشن آرا کی خادمہ تھی، اور وہ خوش نظر آرہی تھی۔

"اتنے بوڑھے نواب کی بیگم تو بہت بوڑھی ہوگی"—میں نے فجی سے کہا۔

"بالکل جوان ہے"—فجی نے کہا—"اُس کی عمر تیس سال سے ذرا کم ہوگی۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ وہ کتنی خوبصورت عورت ہے، لیکن سکندر! ذرا غور کرو۔ ہمیں یہاں آتے ہوتے دو مہینوں سے اُوپر ہو گئے ہیں، نہ میں نے نواب کو اُس کے پاس آتے دیکھا ہے نہ یہ کبھی نواب کے پاس گئی ہے مگر بیگم خوش ہے۔ میں جانتی ہوں وہ کیوں خوش ہے۔ وہ دو آدمیوں کی وجہ سے خوش ہے۔ وہ چوری چھپے خطرہ مول لے کر اُس کے پاس آتے ہیں۔ کبھی ایک آتا ہے کبھی دوسرا۔ میرے ساتھ وہ بہت پیار کرتی ہے۔"

فجی نے میرے ساتھ ایسی باتیں شروع کر دیں جیسے مجھے اُس کے ساتھ عشق والی محبت ہوگئی ہو۔ میں نے اُس کی غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ جلدی میں تھی۔ مجھے اُس کے ساتھ ہمدردی تھی، اُس کی عزت کے ساتھ ہمدردی تھی۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ان لوگوں نے اُسے کسی اور راستے پر تو نہیں ڈال دیا! اس کا مجھے اطمینان ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ اُس کے

ساتھ بُرا سلوک ہوتا تو میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں صرف اپنی تسلّی کے لئے اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ تھوڑے سے وقت کے لئے میرے پاس رہی اور چلی گئی۔

رقص کی رات آگئی۔ اُس روز محل کے باہر گہما گہمی اور بھاگ دوڑ لگی رہی۔ انگریز افسر جب آئے تو میں دُور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ نواب جو اپنی رعایا کا بادشاہ بنا ہُوا تھا، ایک گھنٹہ پہلے ہی بڑے گیٹ پر جا کھڑا ہُوا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کے باڈی گارڈ تھے۔ چھ گھوڑوں کی بگھی تیار کھڑی تھی۔ انگریز افسروں کو دیکھ کر نواب جُھک کر دوہرا ہو گیا۔ وہ اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ اُس کے لئے سیدھا ہونا محال تھا لیکن وہ سیدھا ہو گیا۔ ہر افسر نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور نواب نے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا اور ہر افسر کے سامنے وہ جُھکا۔

ضیافت کا انتظام باہر لان میں کیا گیا تھا۔ مجھے خواجہ صاحب نے بتایا تھا کہ چند ایک نوابوں، مہاراجوں اور شہر کے رئیسوں کو مدعو کیا گیا ہے۔ رقص کے لئے مجھے اور لڑکوں کو سورج غروب ہوتے ہی تیار کرنا شروع کر دیا گیا تھا۔ لڑکوں کے جسم مرمر جیسے تھے۔ اُن کے کپڑے اُتار دیتے گئے تھے۔ اُن کا لباس چند ایک پتے اور پھول تھے۔ پھولوں کا ایک ایک ہار ہر لڑکے کے سر پر بندھا ہُوا تھا۔

میری کمر کے گرد باریک چمڑے کی جھالریں باندھی گئی تھیں اور ان کے ساتھ تلوار لٹک رہی تھی۔ میرے سر پر سکندرِ اعظم والا خود تھا جس کے اوپر پروں کا گُچھا لگا ہُوا تھا۔ یہ خود ہلکا پُھلکا تھا لیکن فولاد کا لگتا تھا۔ میرا باقی تمام جسم ننگا تھا۔ اڑھائی تین مہینوں میں مجھے بڑی مقوی غذا کھلائی گئی اور رقص کی مشق کرائی گئی تھی۔ اس سے میرا جسم بڑی اچھی شکل میں آگیا تھا۔ جسم پھُرتیلا بھی ہو گیا تھا۔

رقص ہری گھاس پر ہُوا۔ اس کے لئے خواجہ صاحب نے خاص دُھن بنائی تھی۔ پہلے میرا حریف رقص کی اداؤں سے گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چل

نہیں رہا بلکہ موسیقی کی لہروں پر تیر رہا ہو۔ اس کے بعد لڑکے ایک دوسرے کے پیچھے رقص کے لئے گئے۔ رنگین روشنیوں میں وہ ایسے لگتے تھے جیسے شفاف پانی میں جل پریاں تیرتی جارہی ہوں۔ لڑکے دائرے میں آہستہ آہستہ رقص کرنے لگے۔

میرا حریف اِن سے ذرا دُور الگ قسم کا رقص کر رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ لڑکوں کو تنگ کرنا چاہتا ہو۔ یہ رقص کی ادائیں تھیں۔ لڑکے اس سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بھی رقص کی ادائیں تھیں۔ کبھی ایسے لگتا جیسے ایک بھیڑیا ہرنوں کے درمیان یہ دیکھتا پھر رہا ہو کہ وہ کس پر حملہ کرے۔

اب میری باری تھی۔ میں نے بہت مشق اور محنت کی تھی۔ میں رقص کے انداز سے آگے بڑھا۔ موسیقی جو پہلے ہی پُرسوز تھی، اب جنگی قسم کی ہوگئی۔ اس میں جوش وخروش پیدا ہوگیا۔ میں اس رقص اور اس منظر کو الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ میری اپنی یہ حالت تھی کہ میں مدہوش سا ہوگیا تھا اور میں نے یہ رقص خمار کی کیفیت میں مکمل کیا تھا۔

میرا رقص یہ تھا کہ میں رقص کے انداز سے آگے گیا اور اُس آدمی پر حملہ کیا۔ میرے ہاتھ میں تلوار تھی اور اُس نے خنجر نکال لیا تھا۔ اُس نے میرا مقابلہ کیا۔ میں نے آخر اُسے مار ڈالا۔

جب رقص ختم ہُوا تو دیکھنے والوں نے خوب داد دی۔ بہت تالیاں بجیں۔ انگریزوں افسروں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور ہر ایک نے پانچ پانچ روپے دیئے۔ خواجہ صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ اس رقص میں ایک یونانی کہانی بیان کی گئی تھی۔ مجھے وہ کہانی یاد نہیں رہی۔ اتنا ہی یاد ہے کہ اس رقص نے دیکھنے والوں کو مسحور کر لیا تھا۔ یہ نصف گھنٹہ جاری رہا تھا۔

رقص دیکھنے والوں میں نواب کی تینوں بیگمات اور چند اور عورتیں بھی تھیں۔ اُن میں سے تین چار نے بھی روپے پھینکے تھے جو خواجہ صاحب نے اُٹھاتے تھے۔ اُس رات ہم پر روپوں کی بارش ہوتی تھی۔ بعد میں خواجہ صاحب

نے یہ ہم سب میں تقسیم کر دیتے تھے۔

ایک بڑی خوبصورت عورت نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ اُس نے پانچ روپے کا نوٹ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دبایا تھا۔ میں نے اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ میں شکریہ ادا کرکے خواجہ صاحب کے پاس چلا گیا۔

"جانتے ہو یہ کون ہے؟" — خواجہ صاحب نے پوچھا۔

"میں یہاں کسی کو بھی نہیں جانتا" — میں نے جواب دیا۔

"یہ گلشن آرا ہے" — خواجہ صاحب نے کہا — "نواب کی تیسری بیگم۔ فجی اسی کی خادمہ ہے۔"



دوسرے ہی دن خواجہ صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔

"تم پر ایک جال آرہا ہے" — خواجہ صاحب نے کہا — "بیگم گلشن آرا نے تمہیں بلایا ہے لیکن تم نہیں جاؤ گے۔"

"آپ نہ کہتے تو بھی میں نہ جاتا" — میں نے کہا۔

"اُس نے مجھے خفیہ پیغام بھیجا ہے کہ میں تمہیں اُس کے پاس بھیجوں" — خواجہ صاحب نے کہا۔

"میں وہاں جا بھی تو نہیں سکتا" — میں نے کہا — "اجازت ہی نہیں۔"

"بلکہ یہ جُرم ہے" — خواجہ صاحب نے کہا — "نواب صاحب کو پتہ چل گیا تو وہ تمہیں ایسی سزا دیں گے کہ تمہارا حال اور حُلیہ بگڑ جائے گا۔"

"آپ نے کیا جواب دیا ہے؟"

"میں نے کہا ہے کہ کوشش کروں گا" — خواجہ صاحب نے کہا — "لیکن میں کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ میں نے تمہیں یہ کہنے کے لئے بلایا ہے کہ اُس کا پیغام براہِ راست تمہارے پاس آجائے تو انکار کر دینا۔ کہنا نواب صاحب کا حکم بڑا سخت ہے۔"

پیغام دوسرے ہی دن آگیا۔ وہ ایک خواجہ سرا تھا۔ کہنے لگا کہ تمہیں بیگم گلشن آرا یاد کراتی ہیں۔ اُس نے ایک جگہ بتا کر کہا کہ تم آج رات وہاں تک پہنچ جانا۔ آگے تک لے جانے کا انتظام کر لیا ہے۔"

"بیگم صاحبہ سے کہنا کہ میں نہیں آسکتا"— میں نے کہا —"نواب صاحب سے حکم لے دیں تو میں آجاؤں گا۔"

اس سے اگلے روز اور اس سے اگلے روز بعد بیگم گلشن آرا کا پیغام آیا۔ میں نے دونوں بار وہی جواب دیا جو میں پہلے دے چکا تھا۔

دو دن گزر گئے۔ کوئی پیغام نہ آیا۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ بیگم ٹل گئی ہے۔ اُسی شام کا واقعہ ہے۔ شام گہری ہو گئی تو میں کھانا کھا کر باہر نکل گیا۔ باغ کا ایک حصّہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں شام کے بعد وہاں جایا کرتا تھا۔ اُن راتوں کی چاندنی بڑی شفاف تھی۔ میں باغ میں ٹہلتا اور پھول سُونگھتا رہا۔

ایک جگہ پودے اُونچے اور گھنے تھے۔ میں اُن کے قریب گیا تو قریب سے آواز آئی —"سکندر!"— آواز کسی عورت کی تھی۔ میں رُک گیا۔ دائیں طرف سے ایک عورت میری طرف آئی۔ چاندنی اُس پر پڑ رہی تھی۔

"سکندر!"— اُس نے آتے آتے کہا —"کیا تم اپنے آپ کو اتنا نڈر اور آزاد سمجھتے ہو؟"

"تم آگئیں مینا!"— میں نے کہا —"اتنے دنوں بعد آئی ہو۔"

"میں مینا نہیں"— اُس نے کہا —"میں گلشن آرا ہوں .... مینا کون ہے؟"

"کوئی ہے"— میں نے کہا —"بیگم صاحبہ! آپ مجھے کیوں بار بار بلاتی ہیں؟"

"تم آتے کیوں نہیں؟"

"اوہ، بیگم صاحبہ!"— میں نے کہا —"میں نہیں آؤں گا۔ کوئی کام ہے یہاں بتا دیں۔"

"کیا تم میں اتنی جرأت ہے کہ جن کا نمک کھاتے ہو انہی کی حکم عدولی

کرو؟"— بیگم گلشن آرا نے کہا۔

"ہاں بیگم صاحبہ!"— میں نے کہا —"میں اسی لئے نہیں آتا تھا کہ مجھ میں غلط حکم نہ ماننے کی جرأت ہے۔ میں نہیں آؤں گا۔"

"تم آؤ گے سکندر!"— اُس نے کہا —"نہیں آؤ گے تو بہت بُرے انجام کو پہنچو گے۔"

وہ چلی گئی۔

وہ چلی گئی اور میں وہیں کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ دُور جاکر چاندنی میں تحلیل ہوگئی۔ اُس کی آواز مجھے سنائی دیتی رہی ——"بہت بُرے انجام کو پہنچو گے .... بہت بُرے انجام کو پہنچو گے۔"

پھر یہ آواز شہناز کی آواز بن گئی۔ اُس نے بھی مجھے کہا تھا ——"بہت بُرے انجام کو پہنچو گے"—— اور اُس نے مجھے بہت بُرے انجام تک پہنچا دیا۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے عشو مل گئی تھی۔ اب نواب کی بیگم مجھے وہی دھمکی دے کر چلی گئی تو مجھے خیال آیا کہ ہر جگہ مجھے عشو نہیں ملے گی۔

میں وہاں سے چل پڑا اور خواجہ صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ لیٹے ہُوئے تھے۔ مجھے اشارہ کیا کہ ان کے پاس پلنگ پر بیٹھ جاؤں۔

"خواجہ صاحب!"—— میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہی کہا ——"بیگم گلشن آرا مجھے بہت بُرے انجام کی دھمکی دے گئی ہے۔"

"دھمکی دے گئی ہے؟"—— خواجہ صاحب نے حیرت سے کہا اور اُٹھ بیٹھے ——"گلشن آرا؟ .... وہ کہاں مل گئی تھی تمہیں؟"

میں نے بتایا کہ وہ مجھے کہاں ملی تھی اور اُس نے مجھے اور میں نے اُسے کیا کہا تھا اور وہ کیا کہہ کر چلی گئی ہے۔ خواجہ صاحب پر خاموشی طاری ہو گئی۔ میں نے دیکھا، اُن کے چہرے پر تشویش کا گہرا تاثر تھا۔ اس سے میں بھی کچھ گھبرایا۔

"خواجہ صاحب!"—— میں نے پوچھا ——"میں اُس کے بُلانے پر نہیں جاؤں گا تو کیا ہوگا؟"

"بہت کچھ ہوسکتا ہے سکندر!"—— خواجہ صاحب نے کہا ——"اور یہاں کچھ بھی ہوجاتا ہے، کسی کو قتل کر دیا جاتا ہے، کسی کے ہاتھ پاؤں توڑ دیتے

جائیں، اس دیوار کے باہر کسی کو پتہ نہیں چل سکتا۔"

"میری سوتیلی ماں نے بُرے انجام تک پہنچانے کے لئے مجھے اغوا کرا دیا تھا"—— میں نے کہا ——"کیا یہ بیگم بھی مجھے اغوا کرا دے گی یا قتل کرا دے گی؟"

خواجہ صاحب نے اپنی کسی سوچ میں ڈوب کر سر ہلایا جیسے کہہ رہے ہوں کہ وہ مجھے قتل کرا سکتی ہے۔

"اگر میں اُس کے ہاں چلا جاؤں تو کیا ہوگا؟"—— میں نے پوچھا۔

"یہ بھی قتل ہوگا"—— خواجہ صاحب نے کہا ——"تمہارا جسم زندہ رہے گا مگر تم مرجاؤ گے ..... تم صرف جسم نہیں ہو سکندر! تم اصل میں کچھ اور ہو۔ بیگم گلشن آرا اُس سکندر کو مار ڈالے گی جسے میں تمہاری ذات میں دیکھ رہا ہوں۔ میرا تجربہ اور میری نگاہیں مجھے بتاتی ہیں کہ تم یہ نہیں ہو جو تم اپنے آپ کو آئینے میں نظر آتے ہو۔ اسے گناہ کا زہر ختم کر دے گا۔ ہلاک کر دے گا .... لیکن سکندر! تم اس عورت سے بچ نہیں سکو گے۔ میں تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے ایک خطرہ اور بھی دکھائی دے رہا ہے۔ تم اگر اس عورت کے کمرے میں کبھی پکڑے گئے تو تم اُس سزا کو تصوّر میں نہیں لا سکتے جو تمہیں اور اس بیگم کو ملے گی۔"

"کیا ہے وہ سزا؟"

"تم نے دیکھ لیا ہوگا کہ نواب کے محل کے اردگرد جو دیوار ہے یہ کتنی دُور تک گئی ہوئی ہے"—— خواجہ صاحب نے کہا ——"اس کے اندر ایک بڑا گاؤں آباد ہو سکتا ہے"—— خواجہ صاحب نے ایک طرف اشارہ کرکے کہا ——"دیوار کے اُس طرف، تقریباً ایک میل دُور ایک ویرانہ ہے۔ وہاں چٹانیں اور ٹیکریاں ہیں۔ ہر طرف سبزہ ہے لیکن ان چٹانوں اور ٹیکریوں کے علاقے میں گھاس کی ایک ہری پتی بھی نظر نہیں آتی۔ وہاں کی زمین کٹی پھٹی ہے۔ وہ ڈراؤنا سا علاقہ ہے۔ وہاں ایک اونچی دیوار ہے جس نے کم و بیش ایک ایکڑ کا رقبہ گھیر رکھا ہے۔ یہ چار دیواری ہے ....

"اس کے ایک طرف لوہے کا ایک دروازہ ہے جس کے باہر وزنی تالا لگا رہتا ہے۔ اس کے اندر ایک کمرہ بنا ہُوا ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں۔ دیوار کے اُوپر کانٹوں والی تاریں لگی ہوتی ہیں۔ اس پر اکثر دو چار گدھ بیٹھے رہتے ہیں اور اس چار دیواری کے اُوپر گدھ اُڑتے بھی رہتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہاں انہیں انسانوں کا گوشت کھانے کو ملتا ہے" ـــ خواجہ صاحب نے جواب دیا ـــ "نواب کسی ایسے مجرم کو جس نے محل کی حدود میں جُرم کیا ہو، سزائے موت دینا چاہے تو اُسے اس چار دیواری میں چھوڑ آتے اور باہر تالا چڑھا دیتے ہیں۔ اندر پانی کا نام ونشان نہیں۔ کھانے کو بھی کچھ نہیں ملتا۔ مجرم بھوک اور پیاس سے مر جاتا ہے۔ مرتے مرتے ایک ہفتہ گزر جاتا ہے۔ وہاں سانپ بھی ہوتے ہیں۔"

"اس کے باہر پہرہ ہوگا۔"

"رات کو" ـــ خواجہ صاحب نے کہا ـــ "صرف رات کو چار سنتریوں کی گشت ہوتی ہے۔ اس کی بھی ضرورت نہیں۔ نہ کوئی باہر سے اندر جا سکتا ہے نہ اندر سے کوئی باہر آسکتا ہے۔ آج تک وہاں سے کوئی نہیں نکل سکا۔ دو دنوں میں قیدی کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ بھوک اور پیاس اُسے پاؤں پر کھڑا رہنے کے قابل نہیں چھوڑتی۔"

"آپ نے اندر جا کر کبھی دیکھا ہے؟"

"ایک بار" ـــ خواجہ صاحب نے جواب دیا ـــ "اندر ہڈیاں اور کھوپڑیاں بکھری ہوتی ہیں۔ وہاں سے کسی کی لاش نکالی نہیں جاتی۔ لاشیں گِدھوں کی خوراک بنتی ہیں۔"

"انگریزوں کی بادشاہی میں تو ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا" ـــ خواجہ صاحب نے کہا ـــ "یہ نواب، راجے اور مہاراجے انگریزوں کے گماشتے ہیں۔ انگریزوں نے انہیں ریاستیں دی ہوتی ہیں۔ ان ریاستوں کا بادشاہ تو انگریز ہی ہے لیکن قانون نوابوں اور

مہاراجوں کا چلتا ہے۔ یہ نواب اور مہاراجے ہندوستان میں انگریزوں کی بادشاہی کے محافظ ہیں۔ انہوں نے رعایا کو مویشی بنا رکھا ہے۔ ریاستوں کے لوگوں میں وقار اور آزادی کی تڑپ رہی ہی نہیں .... میں تمہیں بتا رہا تھا کہ تم پکڑے گئے تو نواب تمہیں موت کی اس چار دیواری میں بھیج دے گا۔"

"یہ بڑی عجیب بات لگتی ہے" ـــ میں نے کہا ـــ "میرے ابّا جان سنایا کرتے تھے کہ انگریزوں کی بادشاہی میں ہر کسی کو انصاف ملتا ہے اور کوئی شخص قانون توڑنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔"

"یہ بات بالکل عجیب نہیں" ـــ خواجہ صاحب نے کہا ـــ "تم ابھی بچے ہو۔ بڑے ہو کر اس سے زیادہ عجیب اور بھیانک چیزیں دیکھو گے۔ یہ درست ہے کہ انگریز کی بادشاہی میں ہر کسی کو انصاف ملتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انگریز ہندوستانیوں کا ہمدرد ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ انگریز ہمیں غلامی کی زنجیروں میں باندھ کر رکھے ہُوئے ہے۔ ان زنجیروں کو اور مضبوط کرنے کے لئے اس نے نوابوں اور مہاراجوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ ان نوابوں کے طور طریقے اُن بادشاہوں جیسے ہیں جن کی تم کہانیاں پڑھتے ہوگے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے" ـــ میں نے کہا ـــ "کہ بیگم گلشن آراء مجھے بُلاتے، میں نہ جاؤں تو وہ اس طرح مجھ سے انتقام لے کہ مجھ پر کوئی تہمت لگا کر اسی قید خانے میں پہنچا دے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔"

"سکندر بیٹے!" ـــ خواجہ صاحب نے آہ بھر کر کہا ـــ "نظر آتا ہے تمہیں وہاں جانا ہی پڑے گا .... جانے میں کوئی حرج نہیں۔ میں تمہیں گناہ سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"اور میں گناہ سے اس لئے بھی بچنا چاہتا ہوں کہ ایک لڑکی مجھے ایسے پاگل پن سے چاہتی ہے کہ وہ مجھے اپنا خاوند سمجھتی ہے" ـــ میں نے کہا ـــ "میں اپنے آپ کو اُس لڑکی کی امانت سمجھتا ہوں۔"

"تم فجی کی بات کر رہے ہو؟" ـــ خواجہ صاحب نے پوچھا۔

"نہیں خواجہ صاحب!" — میں نے جواب دیا — "اُس لڑکی کا نام بینا ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کہاں رہتی ہے، کہاں سے آتی ہے اور میں اُن جگہوں کو بھی نہیں جانتا جہاں وہ مجھے لے جاتی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو سکندر!" — خواجہ صاحب نے ذرا حیران سا ہو کر پوچھا — "تم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ ہے کون اور کہاں سے آتی ہے؟"

میں نے خواجہ صاحب کو بینا کی باتوں، اُس کی ملاقاتوں اور اُن جگہوں کے متعلق جہاں وہ مجھے لے جاتی تھی پوری تفصیل سے بتایا۔ خواجہ صاحب نے تھانیداروں یا وکیلوں کی طرح جرح کی اور مُسکرا دیئے۔

"اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ یہ محض تمہارا تصوّر ہے تو تم نہیں مانو گے" — خواجہ صاحب نے کہا — "مجھے یہ بتاؤ اس قسم کے غار اور اُن کے رہنے والے اس قسم کے لوگ تم نے کبھی حقیقی زندگی میں دیکھے ہیں اور کیا تمہارے علاقے میں اتنے شفّاف چشمے اور ان کے اِرد گرد رنگا رنگ پھول اور ایسا طلسماتی ماحول موجود ہے جیسا تم بیان کر رہے ہو؟"

"میں سوچ میں کھو گیا۔ خواجہ صاحب نے بات پتے کی کہی تھی۔

"یہ تمہارا تصوّر ہے سکندر بیٹا!" — خواجہ صاحب نے کہا۔

"لیکن میں اُسے چھُو سکتا ہوں" — میں نے کہا — "میں اُس کے جسم کو محسوس کرتا ہوں۔ وہ جب چلی جاتی ہے تو میں بہت دیر تک اُس کے جسم کی خوشبو اپنے اندر محسوس کرتا رہتا ہوں۔"

"میرے لئے یہ معاملہ عجیب یا مافوق الفطرت نہیں" — خواجہ صاحب نے کہا — "یہ تصوّر پرستی کی انتہا ہے۔ تمہارے ذہن میں عورت کا تصوّر نہ جانے کب سے بیٹھا ہُوا ہے۔ اس کا آخری مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ تصوّر پرست انسان اپنے تصوّر کی عورت کو فی الواقع بیوی بنا لیتا ہے .... ذہن پر زور دو، یاد کرنے کی کوشش کرو اور مجھے بتاؤ کہ تم نے یہ تصوّر کب ذہن میں ڈالا تھا۔"

میں نے یاد کرنے کی کوشش کی تو مجھے خواجہ صاحب کے آگے تسلیم کرنا پڑا کہ کم و بیش تین سال پہلے میں نے اپنے ذہن میں ایک بڑی ہی حسین

لڑکی کا تصوّر آراستہ کیا تھا اور میں نے اُس میں اپنی ماں کی خوبیاں اور پیار ڈالا تھا۔ جب میری ماں مر گئی تو یہ حسین لڑکی بینا بن گئی اور مجھے جیتے جاگتے پیکر کی صورت میں ملنے لگی۔

"اسے ذہن سے جھٹک ڈالو" — خواجہ صاحب نے کہا — "میں نے تین آدمی اسی قسم کے تصوّر میں تباہ ہوتے دیکھے ہیں۔ اُن کے جسم سُوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے تھے۔ تینوں کا یہ حال تھا کہ وہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ یہ تصوّر ہے۔ تینوں کہتے تھے کہ یہ ایک مخلوق ہے جو اُن پر عاشق ہو کر عورت کے رُوپ میں اُن کے پاس آتی ہے .... تم ابھی نوعمر ہو۔ اسی عمر میں حقیقت میں واپس آ جاؤ۔"

"لیکن کیسے خواجہ صاحب؟"

"تسلیم کر لو کہ یہ تصوّر ہے" — خواجہ صاحب نے جواب دیا — "اور میں تمہیں ایک اور بات بتاتا ہوں۔ تمہارے ذہن میں یا تمہاری ذات میں کوئی ڈھکی چھُپی قوّت ہے جس نے تمہارے تصوّر کو حقیقت بنا دیا ہے لیکن یہی قوّت آگے چل کر تمہاری کمزوری بن جائے گی۔ تصوّر پرستی سے آزاد ہو کر اپنی اُس ڈھکی چھُپی قوّت کو ابھارو۔"

"آپ نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا ہے؟"

"تم جیسے انسانوں سے" — خواجہ صاحب نے جواب دیا — "میں تو بہت تھوڑا لکھا پڑھا ہوں۔ جو پڑھا تھا وہ کبھی کا ذہن سے اُتر گیا ہے۔ میں نے حالات کو اور انسانوں کو پڑھا ہے۔ سکندر بیٹا! کتابیں دھوکا دیتی ہیں۔ علم وہ ہے جو تم اپنی آنکھوں دیکھو اور اس کو سمجھو۔ ذہن بیدار رہنا چاہیئے .... میں تمہیں اس قسم کی خشک باتوں سے پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ تم ابھی چھوٹے ہو۔ آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گے لیکن دُنیا کو، زندگی کی حقیقتوں کو اور انسانوں کو سمجھنے سے پہلے اپنے آپ کو سمجھو۔"

"میں نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ بینا ایک تصوّر ہے" — میں نے کہا — "میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ کوئی بھی عورت یا نوجوان لڑکی

خواہ وہ کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو میرے سامنے آتی ہے تو میں اُسے بینا کے مقابلے میں دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے بینا جیسی نہیں لگتی اس لئے میں اُسے اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ اُس کے ساتھ کوئی تعلق رکھوں۔ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ میں بیگم گلشن آرا کے پاس نہیں جانا چاہتا۔"

"تمہیں جانا پڑے گا"—خواجہ صاحب نے کہا—"مجھے سوچنے دو.... تم جاؤ سو جاؤ۔ صبح میرے پاس آنا۔"



میں صبح خواجہ صاحب کے کمرے میں گیا تو وہ تان پورے پر ریاض کر رہے تھے۔ یہ اُن کی ایک طرح کی عبادت تھی جس میں کسی کو مخل ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ میں ایک طرف بیٹھ کر انہیں دیکھتا رہا۔ ان کی لمبی لمبی، مرجھائی مرجھائی سی اُنگلیاں تان پورے کے تاروں پر رقص کر رہی تھیں اور تان پورے کی گونج کچھ ایسا تاثر پیدا کر رہی تھی کہ میں خواجہ صاحب کو کسی اور ہی جہان کی مخلوق سمجھنے لگا۔ میں نہیں جانتا فرشتے کیسے ہوتے ہیں۔ اُس روز مجھے یوں لگا جیسے فرشتے خواجہ صاحب جیسے ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب کا وجود ایک کتاب کی مانند تھا جسے میں ابھی سمجھ نہیں سکا تھا۔

کچھ دیر بعد اُن کا ریاض ختم ہُوا۔ انہوں نے تان پورہ الگ رکھا اور وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"میں رات سو نہیں سکا"—اُنہوں نے کہا—"رات بھر سوچتا رہا ہوں کہ تم وہاں جاؤ یا نہ جاؤ۔ میں نے جانے کے نتائج پر بھی غور کیا ہے اور نہ جانے کے نتائج پر بھی۔ جانے میں یہی ہو گا نا، کہ وہ تمہیں ایک گناہ کا ذریعہ بنا لے گی۔ نیکی اور بدی کے درمیان بال جیسی ایک لکیر ہے جو کسی بھی وقت ذہن سے مٹائی جا سکتی ہے۔ گناہگار سوچتا ہے کہ یہی زندگی ہے اور یہی جنت ہے۔ اُس کے ذہن سے جہنم کا تصور مٹ جاتا ہے۔"

"آپ میری عاقبت کی باتیں کر رہے ہیں"—میں نے ویسے ہی

کہہ دیا۔

"نہیں بیٹا!"—خواجہ صاحب نے کہا—"میں اس دُنیا کی بات کر رہا ہوں۔ اگر تم نے اپنے آپ کو گناہ سے آلودہ کر لیا تو تمہاری وہ خداداد قوت مر جائے گی جو ابھی تم نہیں دیکھ رہے، میں دیکھ رہا ہوں اور اگر تم اُس کے پاس نہ گئے تو اس کا نتیجہ بڑا ہی خوفناک ہو سکتا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"اب وہ تمہیں بلائے تو چلے جانا"—خواجہ صاحب نے کہا—"اور یوں کرنا کہ اُس کے سامنے بیٹھ کر اُس کی آنکھوں میں نظریں جما لینا۔ ذہن میں اِدھر اُدھر کا کوئی خیال، کوئی وہم اور کوئی خوف نہ آنے دینا۔ آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال کر اپنے آپ سے یہ الفاظ کہنا کہ تم بُری عورت نہیں ہو اور میں تمہارے کسی کام نہیں آؤں گا۔ . . . یہ بات اپنے دل میں اس طرح کہنا جیسے تم اُس سے مخاطب ہو۔ میرا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ تمہاری نظروں سے بچنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھے گی لیکن تم نظریں اُس کی آنکھوں میں ڈالے رکھنا اور اپنے آپ سے یہ کہتے رہنا کہ ہم گناہ نہیں کریں گے۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"مجھے امید ہے کہ وہی ہو گا جو میں نے سوچا ہے"—خواجہ صاحب نے کہا—"میں نے ایسے ہوتے دیکھا ہے .... میری آنکھوں میں دیکھو۔"

خواجہ صاحب میرے سامنے ہو گئے اور میں نے اُن کی آنکھوں میں دیکھنا شروع کر دیا۔ شاید آدھا منٹ گزرا ہو گا کہ خواجہ صاحب کا جسم ذرا سا لرزا اور انہوں نے اپنے زانو پر بڑی زور سے ہاتھ مارا۔

"ایسے ہی ہو گا"—انہوں نے پُرجوش لہجے میں کہا—"بالکل اسی طرح اُس کی آنکھوں میں دیکھنا۔ تم اُس پر غالب آجاؤ گے۔"

"خواجہ صاحب!"—میں نے کہا—"میں اپنے متعلق یہ سُن سُن کر پریشان ہو گیا ہوں کہ تم میں ایک قوت ہے، تم میں کوئی مافوق الفطرت طاقت ہے۔ بچپن میں ایک پگلی نے مجھے دیکھ کر میری ماں سے یہی کہا

تھا۔ یہ طاقت کیا ہے۔ آپ بھی اسی طاقت کی نشاندہی کرتے ہیں؟"

"یہ قوت ہر انسان میں ہوتی ہے" ـــــ خواجہ صاحب نے کہا ـــــ "اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو ان قوتوں سے محروم نہیں رکھا۔ یہ انسان کا اپنا کام ہے کہ ان قوتوں کو اُبھارتا اور ان سے کام لیتا ہے انہیں تسلیم ہی نہیں کرتا یا ان سے بے خبر رہ کر انہیں زنگ خوردہ کر دیتا ہے۔ گناہ عملاً کیا جائے یا تصور میں، یہ ان قوتوں کو کھا جاتا ہے۔ تم جیسا کوئی انسان ایسا بھی ہوتا ہے جس کی قوتیں از خود بیدار ہو کر مرکوز ہو جاتی ہیں.... تم دیکھتے ہو کہ دھوپ کسی چیز کو آگ نہیں لگا سکتی۔ اگر تم آتشی شیشے میں اسی دھوپ کو کسی چیز پر مرکوز کر دو تو اُس چیز کو آگ لگ جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ سورج کی بکھری ہوئی کرنیں ایک مقام پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور سب کی تپش مل کر آگ بن جاتی ہے....

"اس اصول کو سامنے رکھو اور اپنی قوتوں کو مرکوز کر دو۔ کسی وجہ سے، شاید تمہاری معصومیت کی وجہ سے تمہاری یہ طاقت جس کی میں نشاندہی کر رہا ہوں سامنے آگئی ہے۔ اپنے ذہن کو صاف رکھو۔ تم بدی پر غالب آجاؤ گے۔ یہ چیزیں روحانیت کے علم میں ملتی ہیں۔ یہ علم حاصل کرنے کے لئے تمہیں کوئی کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ تم گلشن آراء کے پاس چلے جانا اور جیسے میں نے کہا ہے ویسے کرنا۔"



اگلے روز فجی آگئی۔ اُس نے کہا کہ مجھے گلشن آراء نے آج رات بلایا ہے۔ اُس نے مجھے ایک جگہ بتائی جہاں میں نے پہنچنا تھا اور فجی نے مجھے آگے لے جانا تھا۔

فجی جب جانے لگی تو میں تھوڑی دُور تک اُس کے ساتھ گیا۔ وہ اچانک رُک گئی اور میرے سامنے آکر میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اُس کے چہرے پر اُداسی اور بے چارگی کا تاثر تھا۔

"سکندر!" ـــــ اُس نے جذباتی سے انداز میں کہا ـــــ "جس کے پاس

تم جا رہے ہو وہ ملکہ ہے۔ اُس سے تمہیں سب کچھ مل جائے گا۔ انعام بھی مل جائے گا لیکن اُس سے تمہیں وہ محبت نہیں ملے گی جو میرے دل میں ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ میرے دل میں تمہاری کتنی محبت ہے؟ اگر مجھ میں کچھ طاقت ہوتی اور میری کوئی حیثیت ہوتی تو میں تمہیں کسی دوسری عورت کے پاس نہ جانے دیتی۔ مجھے بھول جانا.... میں نے جسے محبت سمجھا تھا وہ ایک دھوکہ تھا۔ اب پتہ چلا ہے کہ محبت کیا ہوتی ہے۔"

میں نے اُس سے کچھ بھی نہ کہا۔ میں نے اُس کے گالوں پر ہلکی سی تھپکی دی اور میں مُسکرایا۔

"تم جاؤ فجی!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اگر تمہاری محبت سچی ہوتی تو وہ میری مدد کرے گی۔"

رات کو میں باغ کے اُس گوشے میں چلا گیا جہاں فجی میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ میں نے اُس سے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ بھی خاموش رہی۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور چل پڑی۔ میں ڈر رہا تھا کہ راستے میں ہی پکڑا جاؤں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ محل کے زنانہ حصے میں کوئی مرد نہیں جا سکتا۔ میں نے سوچا کہ وہ آخر نواب کی بیگم ہے، اُس نے مجھے بچانے کا کوئی انتظام کر ہی رکھا ہوگا۔ فجی مجھے ایک راہداری میں لے گئی جو تاریک تھی۔ اتنی تاریک کہ مجھے فجی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ چلتے چلتے فجی رُک گئی اور میرے ساتھ لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں اونچا بول نہیں سکتا تھا کیونکہ وہاں پکڑے جانے کا ڈر تھا۔ میں اُسے تھپکیاں دیتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ آنسوؤں اور سسکیوں کی زبان میں وہ کیا کہہ رہی ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ مجھے ساتھ لے کر چل پڑی۔ آگے ہلکی ہلکی روشنی آگئی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت آہستہ آہستہ چلتی سامنے سے آرہی تھی۔ لباس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ خادمہ ہے۔ قریب آکر وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ اُس نے سَر سے فجی کو کوئی اشارہ کیا۔

"اسے معلوم ہے" ـــــ فجی نے آہستہ سے مجھے کہا ـــــ "بیگم نے

اسے انعام واکرام دے رکھا ہے۔ یہ مجھے اشارہ کر گئی ہے کہ میدان صاف ہے۔"

محل کی گلیاں بھول بھلیوں جیسی تھیں۔ کئی موڑ کاٹ کر فجی نے مجھے ایک دروازے کے سامنے روک لیا۔ اُس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور مجھے اشارہ کیا کہ میں اندر چلا جاؤں۔



کمرے کی خوشبو نے میرا استقبال کیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہ خوشبو مجھ پر نشہ طاری کر دے گی اور میں اس میں بھٹک جاؤں گا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی سبز رنگ کی روشنی تھی۔ بیگم سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اُس نے ایسا لباس پہن رکھا تھا جس میں سے اُس کا جسم نظر آتا تھا۔ یہ غالباً اُس کا شب خوابی کا لباس تھا۔ اُس کے کھلے ہوئے اور سپید کاندھوں پر بکھرے ہوئے بال اتنے دل کش تھے کہ مصنوعی لگتے تھے اس روشنی اور اس لباس میں وہ اپنی عمر سے بہت ہی کم لگتی تھی۔ اُس کی عمر خواجہ صاحب کے کہنے کے مطابق تیس سال سے ایک آدھ سال اُوپر ہی ہو گی لیکن وہ میری ہم عمر لگتی تھی۔

"تم آ ہی گئے" — اُس نے ایسی مسکراہٹ سے کہا جس میں وہ تاثر نہیں تھا جو بینا اور فجی کی مسکراہٹوں میں نظر آتا تھا۔

"آپ کا حکم ہی ایسا تھا" — میں نے نوکروں کے لہجے میں کہا۔

"مجھے آپ نہ کہو" — گلشن آرا نے مسکراہٹ کو اور زیادہ اشتعال انگیز کرتے ہوئے کہا — "آؤ، بیٹھو۔"

میں اُس کے سامنے چھوٹے صوفے پر بیٹھ گیا لیکن اُس نے دونوں ہاتھ آگے کر کے مجھے کہا کہ میں اُس کے پاس بیٹھوں۔ میں اُٹھا اور اُس کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس کا ریشمی لباس میرے ننگے بازو کے ساتھ لگا تو میں نے یوں دھچکا سا محسوس کیا جیسے بجلی کے تار میرے جسم کو چھو گئے ہوں میں اعتراف کرتا ہوں کہ ہلکی سبز روشنی میں اُس کا حسن، اُس کا جسم اور وہ ماحول

مجھے طلسم ہوشربا لگتا تھا۔ اگر مجھ میں کوئی طاقت تھی تو وہ اُونگھنے لگی تھی۔ اُس عورت کی مسکراہٹ، اُس کی آنکھوں کا خمار اور اُس کے گالوں کی ہلکی ہلکی لالی جادو بن کر مجھ پر طاری ہونے لگی۔ میرے ہوش و حواس متاثر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اچانک مجھے خواجہ صاحب کی بات یاد آ گئی۔ عین اُس وقت گلشن آرا نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

اُس کا چہرہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے نظریں اُس کی آنکھوں میں جما دیں۔ اپنے آپ پر قابو پانے کے لئے مجھے خاصی جدوجہد کرنی پڑی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں نظریں جما کر اپنے دل میں کہا —

"ایسے نہیں ہو گا۔ تم گناہ نہیں کرو گی۔ ہماری محبت پاک ہے۔"

آج مجھے وہ لمحے بڑی اچھی طرح یاد ہیں۔ آج بھی مجھے یقین نہیں آتا کہ پری جیسی اُس حسین عورت کا ردِ عمل یہ تھا کہ اُس کے ہاتھ جنہوں نے میرے چہرے کو تھام رکھا تھا، نیچے ہوتے اور اُس کی اپنی رانوں پر گر پڑے۔ اُس کا چہرہ جو میری طرف بڑھ رہا تھا، پیچھے ہٹنے لگا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو پہلے کی طرح رہی لیکن مسکراہٹ کا تاثر بدل گیا۔

"تم مجھ سے کیوں بھاگ رہے تھے؟" — اُس نے پوچھا — "کیا میں تمہیں کھا جاؤں گی؟"

اُس کا لب و لہجہ اب وہ نہیں رہا تھا جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ اس لہجے میں اب گناہ کی دعوت نہیں تھی، وہ اشتعال بھی نہیں تھا بلکہ اب اس میں کچھ اپنائیت سی تھی جو اکثر چاہنے والوں میں ہوتی ہے۔

میں نے اُس کی آنکھوں میں سے اپنی نظریں نہ ہٹائیں۔ خواجہ صاحب نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ میری نظروں سے بچنے کی کوشش کرے گی۔ اُس نے ایسی کوشش کی لیکن میں نے اپنی نظروں کو اِدھر اُدھر نہ کیا۔

"مجھے یہاں آنے کی اجازت نہیں" — میں نے کہا — "کیا آپ نے کوئی انتظام کر رکھا ہے؟"

"تم نے پھر مجھے آپ کہا" — اُس نے ہمجولیوں کے لہجے میں کہا —

"یہ دیوار توڑ دو۔"

"چلو ایسے ہی سہی" — میں نے کہا — "لیکن میں یہ نہیں بھولوں گا کہ تم مجھ سے بڑی ہو۔ اس کے علاوہ یہاں میری جو حیثیت ہے میں اسے بھی نہیں بھولنا چاہتا۔"

"یہ سب کچھ ذہن سے نکال دو" — اُس نے ایک بار پھر میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

اُس کا چہرہ بڑی تیزی سے میری طرف آیا۔ اُس کے ہونٹوں نے میرے سر کو چُوما اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اب اُس کا انداز بالکل ہی بدلا ہُوا تھا۔ سر کو ماں چُوما کرتی ہے یا بہن لیکن میں یہ اعتراف کرنے سے جھجکوں گا نہیں کہ میں سرتاپا لرز گیا تھا۔ ایک کمزوری میرے اندر سے اُٹھ آئی تھی۔ میں نے تو یہاں تک محسوس کیا کہ میری کوئی طاقت اس عورت کی دلکشی کے آگے مزاحمت نہیں کر سکے گی۔ خواجہ صاحب نے جو طریقہ مجھے بتایا تھا وہ اُس پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے تھا۔ وہ تو میں نے کر لیا تھا لیکن اپنے آپ پر غلبہ حاصل کرنا بھی میرے لئے ضروری اور کسی حد تک مشکل بھی ہو گیا تھا۔

"تم کیا کہہ رہے تھے؟" — اُس نے پوچھا اور خود ہی جواب دیا — "ہاں، تم کیا کہہ رہے تھے کہ یہاں تمہیں آنے کی اجازت نہیں .... میں نواب صاحب کے قانون کو بدل نہیں سکتی۔ میں نے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا کہ ہم پکڑے جائیں گے تو معافی مل جائے گی۔ میں نے اتنا کیا ہے کہ یہاں جو پکڑنے والے ہیں اُن کے مُنہ بند کر رکھے ہیں۔ روپے میں بڑی طاقت ہے سکندر! تم فکر نہ کرو، پکڑے گئے تو ساری سزا میں اپنے سر لے لوں گی .... اب یہاں آنے سے یا مجھے ملنے سے انکار تو نہیں کرو گے؟"

"نہیں" — میں نے کہا — "لیکن احتیاط ضروری ہے۔"

اس کے بعد گلشن آراء کا رویّہ بالکل ہی ویسا ہو گیا جیسا مِینا کا ہُوا کرتا تھا۔ مِینا تصوّر ہی تھی لیکن میں اُس کی مثال ایک پاکیزہ محبت کی مثال سمجھ کر

دے رہا ہوں۔ گلشن آراء کی بے تابی اور وارفتگی پاک محبت کرنے والی اُس لڑکی جیسی تھی جسے چاہنے والے سے نوچ کر کسی اور کے حوالے کیا جا رہا ہو۔ وہ شاید رات بھر مجھے اپنے کمرے سے نکلنے نہ دیتی لیکن میں وہاں سے جلدی نکلنا چاہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ پکڑا جاؤں گا اور دوسری وجہ یہ کہ میں نے اپنے اُوپر جو غلبہ حاصل کیا تھا وہ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ میرے لئے اس کمرے سے بھاگ جانا ضروری ہو گیا تھا۔

"گلشن!" — میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا — "اب مجھے جانا چاہیئے۔"

"کاش یہاں میرا حکم چلتا" — اُس نے آہ بھر کر کہا — "تمہیں چلے ہی جانا چاہیئے۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر میں اُٹھا۔ اُس نے اپنا ایک بازو میری کمر میں ڈال لیا اور دروازے کی طرف چل پڑی۔ دروازے پر پہنچ کر وہ رُک گئی۔ اُس نے میرا سر اپنے سینے سے لگایا اور مجھے چھوڑ دیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولا۔

میں فجی کے ساتھ ایک بار پھر باغ کے اُس گوشے تک پہنچا جہاں سے فجی مجھے لائی تھی۔

"مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے؟" — فجی نے بھکاریوں کے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں فجی!" — میں نے جواب دیا اور وہاں سے چل پڑا۔

میری ذہنی حالت صحیح نہیں تھی۔ ایسا تجربہ مجھے پہلی بار ہُوا تھا۔ میں خواجہ صاحب کے کمرے میں گیا۔ وہ میرے انتظار میں تھے۔

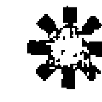
"خواجہ صاحب!" — میں نے انہیں کہا — "آپ کا طریقہ پوری طرح کامیاب رہا ہے۔"

میں نے انہیں وہ سب کچھ بتا دیا جو میرے اور گلشن آراء کے درمیان ہُوا تھا۔

"کیا اب جان گئے ہو کہ وہ طاقت کیا ہے جس کی میں نے تم میں

نشاندہی کی ہے؟" — خواجہ صاحب نے پوچھا۔

"ہاں خواجہ صاحب!" — میں نے جواب دیا — "میں جان گیا ہوں۔"



دوسرے دن خواجہ صاحب نے رقص کرنے والے تمام لڑکوں کو بُلا کر رقص کی مشق کرائی۔ گانا اور رقص ایسے فن ہیں جن کے لئے مشق بڑی ضروری ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب مشق کرانے میں بڑے سخت تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی مشق کے بعد انہوں نے ہمیں چھُٹی دی۔ لڑکے بھاگتے دوڑتے چلے گئے اور خواجہ صاحب نے مجھے اپنے پاس روک لیا۔ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور اُن کے کہنے پر اُن کا نوکر دُودھ کا ایک گلاس لے آیا۔

"خواجہ صاحب!" — میں نے اُن سے پوچھا — "آپ کب سے یہاں ہیں؟"

"زمانہ گزر گیا ہے بیٹے!" — اُنہوں نے جواب دیا۔

"مجھے آپ کی ایک بات پر یقین نہیں آتا" — میں نے کہا — "آپ کہتے ہیں کہ آپ نے کچھ بھی نہیں پڑھا لیکن میں آپ کو بہت بڑا عالم اور فلسفی مانتا ہوں۔ رقص کی بجائے مجھے اسی علم میں ڈال دیں جو خدا نے آپ کو عطا کیا ہے۔"

"تمہارا شک غلط ہے سکندر!" — انہوں نے کہا — "میں نے کہا ہے کہ زمانہ گزر گیا ہے۔ میں نے اسی زمانے سے علم حاصل کیا ہے۔ وہ اس طرح کہ میں نے زمانے کو یوں ہی گزر جانے نہیں دیا۔ اس کے ایک ایک لمحے کو دیکھا اور پرکھا ہے۔"

"موسیقی آپ کا خاندانی پیشہ ہو گا؟"

"نہیں بیٹے!" — انہوں نے جواب دیا — "موسیقی میری روح کی غذا ہے۔ یہ میرا خاندانی پیشہ نہیں۔ یہ تو مجھے ویسے ہی پتہ چل گیا تھا کہ مجھ میں یہ فن بھی چھُپا ہُوا ہے، ایسے ہی جیسے میں تمہاری ذات میں کوئی فن یا خوبی دیکھ رہا ہوں۔ میں کئی راستوں پر چلا ہوں۔ منزل نہیں ملی۔ جس راستے پر

گیا کچھ دُور جا کر بھٹکا اور بھٹک بھٹک کر لَوٹ آیا۔ میں تمہاری عمر میں گھر سے نکلا تھا۔ شاید ایک آدھ سال عمر زیادہ ہو۔ تم نے تو تصوروں میں محبت کی ہے، میں ایک حقیقی لڑکی سے محبت کر بیٹھا تھا۔ میں غریب باپ کا بیٹا تھا سکندر، اور لڑکی بھی غریبوں کی تھی۔ اپنی اور اس لڑکی کی غریبی سے میرا مطلب یہ ہے کہ ہم نواب یا جاگیر دار نہیں تھے۔ میرا باپ مر چکا تھا۔ ماں ہی ماں تھی۔ کچھ زمین تھی جو ہمیں کافی دانے دے دیا کرتی تھی۔ باپ نے سکول بھیج کر کچھ پڑھا بھی دیا تھا۔ ماں نے نہ جانے میرے لئے کیا کیا خواب دیکھے تھے لیکن میں محبت کے چکر میں پڑ گیا....

"میں نے ماں سے کہا کہ میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ماں نے میرے لئے ایک اور لڑکی دیکھ رکھی تھی۔ میں نے اُسے اپنی پسند بتائی تو ماں اُسی روز اس لڑکی کی ماں سے ملی اور بات پکی کر آئی۔ پھر یہ بات مشہور ہو گئی۔ گاؤں میں سب کو پتہ چل گیا اور یہیں سے میری مصیبت کا آغاز ہُوا....

"اس گاؤں میں ایک بہت بڑا زمیندار تھا۔ گاؤں پر اُسی کی حکومت تھی۔ اُس وقت اُس کی عمر میرے باپ جتنی تھی۔ ایک روز اُس نے میری ماں کو اپنے گھر بلایا۔ ماں واپس آئی تو اُس نے مجھے بتایا کہ اس لڑکی کا رشتہ مجھے نہیں ملے گا کیونکہ زمیندار اُس کے ساتھ خود شادی کرے گا۔ مجھے طیش آئی اور میں گاؤں میں ہر کسی سے جو مُنہ میں آیا کہنے لگا۔ یہ باتیں زمیندار تک پہنچیں۔ اُس نے مجھے اپنے گھر بُلا کر اپنے نوکروں سے پٹوایا۔ میرے مُنہ میں جو آیا میں نے کہہ ڈالا لیکن خدا نے لاٹھی اُس کے ہاتھ میں دے رکھی تھی اس لئے گاؤں کی ساری بھینسیں اُسی کی تھیں۔ میں ہڈیاں تڑوا کر وہاں سے نکل آیا....

"تین چار روز بعد زمیندار نے اس لڑکی سے شادی کر لی۔ میں نے کیا کیا نہ سوچا۔ میں نے تو یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اس زمیندار کو قتل کر کے لڑکی کو ساتھ لے کر کہیں دُور نکل جاؤں گا۔ میں تو پاگل ہو چکا تھا۔ تیسرے روز ایک عورت

نے مجھے اس لڑکی کا پیغام دیا۔ لڑکی نے کہا تھا کہ زمیندار میرے جسم کا مالک بن گیا ہے لیکن میں اُس سے یہ جسم چھین لوں گی اور گاؤں کے لوگ اس جسم کو مٹی میں دفن کر دیں گے۔ لڑکی نے یہ بھی کہلا بھیجا تھا کہ میں تمہاری نہیں ہو سکی۔ دیکھ لینا کہ میں کسی اور کی ہو کے نہیں رہوں گی۔ تم زندہ رہنے کی کوشش کرنا۔ اپنی ماں کا دل نہ دُکھانا ....

"اگلے ہی روز گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ زمیندار کی نئی دلہن نے زہر پی لیا ہے اور وہ مر گئی ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ میری حالت کیا ہوئی۔ اگر میری ماں بھی مر چکی ہوتی اور میں اکیلا ہوتا تو سارے گاؤں کے سامنے اس زمیندار کو قتل کر دیتا۔ میں پاگل پن میں یہ کہتا پھرا کہ زمیندار نے لڑکی کو خود زہر دیا ہے کیونکہ لڑکی اُسے قبول نہیں کر رہی تھی۔ میرا یہ الزام بھی زمیندار تک پہنچا۔ لڑکی کو ابھی دفن نہیں کیا گیا تھا۔ شام کے وقت پولیس آگئی۔ گاؤں کے لوگ کہتے تھے کہ لڑکی نے خودکُشی کی ہے تو پولیس کیوں آئی ہے۔ اس کی وجہ اُس وقت معلوم ہوئی جب پولیس کا ایک سپاہی مجھے پکڑ کر وہاں لے گیا جہاں تھانیدار بیٹھا ہُوا تھا۔ تھانیدار نے مجھے کہا کہ میں نے اس لڑکی کو زہر دیا ہے ....

"مجھ پر زمیندار نے الزام لگایا تھا کہ میں نے لڑکی کو زہر دیا ہے کیونکہ پہلے میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ زمیندار نے پولیس کو یہ بھی کہا تھا کہ میں اُسے بھی زہر دینا چاہتا تھا۔ میں کم عمر تھا۔ کوئی تجربہ نہ تھا۔ میں سمجھا کہ پولیس مجھے گرفتار کر کے لے جائے گی اور پھانسی چڑھا دے گی۔ میں نے تھانیدار کی ایک ہی بات سُنی تو میں نے وہیں سے ایک جست لگائی اور بھاگ کھڑا ہُوا۔ میرا جسم پھُرتیلا تھا۔ شام خاصی گہری ہو چکی تھی۔ جسم کی پھُرتی، پھانسی کے خوف اور تاریکی نے میری بہت مدد کی۔ میں کسی کے ہاتھ نہ آیا اور غائب ہو گیا ....

"میں یہ بات بہت مختصر سُنا رہا ہوں۔ اگر ایک ایک قدم اور ایک ایک منٹ کی تفصیل سناؤں تو کئی دِنوں میں بھی میری کہانی ختم نہ ہو۔ یہ سمجھ

لو کہ میں بھاگتا رہا اور پھر مہینے اور سال گزرتے رہے اور میں بھاگتا ہی رہا۔ میرا زیادہ تر سفر اپنے پاؤں پر طے ہُوا۔ اُس وقت سواری کا کوئی ایسا زیادہ انتظام نہیں تھا جتنا آج کل ہے۔ میں ملک کے دوسرے سرے میں جا نکلا۔ اس سفر کے دوران بہت لوگ ملے۔ اچھے بھی، بُرے بھی۔ بہت اچھے اور بہت بُرے بھی۔ میں پناہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ لوگ جو کچھ کہتے تھے وہ میں دھیان سے سُنتا تھا اور وہ جو حرکتیں کرتے تھے وہ میں بڑی غور سے دیکھتا تھا۔ میں نے ہر مذہب کے لوگوں کو دیکھا۔ لوگوں کے مذہب مُختلف تھے لیکن فطرت میں سب لوگ ایک جیسے تھے۔ میں چونکہ مسلمان تھا اس لئے میں نے ایک مسجد میں جا پناہ لی ....

"چونکہ یہ مسجد تھی، خانۂ خدا تھا اور امام مذہبی پیشوا تھا اس لئے میں نے اُسے سچ بتا دیا کہ میں مفرور ہوں۔ مجرم ہونا اور بات ہے اور مفرور ہونا بالکل ہی اور بات ہے۔ پولیس کی حراست سے بھاگنا بھی ایک جُرم ہے۔ اس امام نے کہا کہ وہ مجھے اپنے پاس رکھ لے گا اور میں اُس کی اور اُس کے گھر کی خدمت گزاری کروں گا۔ اس کے ساتھ ہی اس امام نے مجھے ڈرایا کہ میں نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی تو میں یہ یاد رکھوں کہ میں مفرور ملزم ہوں۔ میں نے اُسے کہا کہ میں خانۂ خدا میں اس لئے آیا ہوں کہ مجھے مذہب کی پناہ اور راہنمائی مل جائے۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا نہ میں کسی کا ملزم تھا۔ میں نے اس امام کی مدد سے مذہب میں ڈوب جانے کی کوشش کی لیکن امام اپنی خدمت کے لئے مجھے اس طرح استعمال کر رہا تھا جس طرح اُسے مالِ غنیمت میں ایک غلام مل گیا ہو۔"

"مذہب کی پناہ تو یوں سمجھو کہ خدا کی پناہ ہوتی ہے" — میں نے کہا۔

"نہیں بیٹا!" — خواجہ صاحب نے کہا — "مذہب کچھ اور چیز ہے اور اکثر مذہبی پیشوا بالکل ہی مختلف چیزیں ہوتے ہیں۔ میں نے یہی خرابی اس مسجد کے امام میں دیکھی۔ میں نے بڑی مشکل سے وہاں چھ سات مہینے گزارے اور وہ شہر چھوڑ کر نکل کھڑا ہُوا۔ میں نے کئی گھروں میں نوکری کی

لیکن سب مجھے مسجد کے امام کی طرح نوکر اور اپنا غلام ہی سمجھتے رہے۔ مجھے نہ کہیں پیار ملا نہ سکون۔ اس طرح بھٹکنے اور مارے مارے پھرنے کے بعد ایک روز میں ایک اور دروازے پر جا گرا۔ ایک بوڑھا باہر نکلا جس کی عمر اتنی ہی تھی جتنی آج میری ہے۔ میں اُس کے آگے بہت رویا۔ وہ ایک مسلمان موسیقار تھا۔ میں نے سب سے پہلے تو اُس سے کچھ کھانے کو مانگا۔ میں دو دنوں کے فاقے سے تھا۔ اُس نے مجھے کھانا کھلایا اور کہنے لگا کہ میری آواز میں اُسے لوچ سی نظر آتی ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ گاؤں میں کبھی کبھی میں گایا کرتا تھا ....

"کھانے کے بعد اُس کے کہنے پر میں نے اُسے ایک دو شعر گا کر سناتے تو اُس نے مجھے کہا کہ میرے اندر ایک خزانہ چھپا ہوا ہے اور میں در در ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہوں۔ مختصر یہ کہ اُس نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ خدا نے اُس کے دل میں میرا پیار اور میری ہمدردی پیدا کر دی تھی ورنہ اُس کا یہ عالم تھا کہ گانے بجانے کے شوقین اُس کی شاگردی میں بیٹھنے کے لئے اُس کی منتیں کرتے تھے اور وہ انہیں قبول نہیں کرتا تھا۔ وہ موسیقی کا بہت بڑا استاد تھا۔ اُس نے مجھے اپنے گھر میں رکھ لیا اور اپنی شاگردی میں بٹھا لیا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں کہ میری ماں کب تک زندہ رہی اور کب مر گئی تھی۔ میں اُدھر کبھی نہیں گیا ....

"میرے استاد نے ٹھیک کہا تھا کہ میرے اندر خزانہ چھپا ہوا ہے۔ اُس کی رہنمائی سے یہ خزانہ باہر آنے لگا۔ وہ مجھے باقاعدہ ریاض کراتا تھا۔ اُس نے مجھے راگ راگنیاں بھی سکھا دیں۔ میری شادی بھی اُسی نے کرائی۔ پھر موسیقی میرا ذریعہ معاش بھی بنی اور میری روح کی غذا بھی۔ خدا نے مجھ کو ایک بیٹا دیا۔ میں نے اُس کا نام ممتاز احمد رکھا۔ میں رقص اور نغموں میں ایسا ڈوبا جیسے پتہ ہی نہ چلا ہو کہ بیس برس گزر گئے ہیں۔ میرا استاد مر چکا تھا۔ اب میں اُس کی گدی پر بیٹھا تھا ....

"میرا بیٹا اٹھارہ انیس برس کا ہو چکا تھا۔ اُس نے وہی غلطی کی جو

میں کر بیٹھا تھا۔ وہ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا بیٹھا جس پر ایک جاگیردار کی نظر تھی"۔

"کیا آپ کا بیٹا بھی گانے بجانے میں دلچسپی رکھتا تھا؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"نہیں" ــــ خواجہ صاحب نے جواب دیا ــــ "وہ اس فن کی طرف نہ آیا۔ اُس کی دلچسپیاں کچھ اور تھیں۔ وہ پہلوانی کرتا تھا، کبڈی کھیلتا تھا اور گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اُس کی یاری دوستی اچھی قسم کے لوگوں کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ بدنام قسم کا بدمعاش تو نہیں تھا لیکن بدمعاشوں کے ساتھ نمٹنا اور بدمعاشی کے رنگ ڈھنگ جانتا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ فلاں لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اپنا وقت یاد آ گیا۔ میں نے اُس کی ضد پر اُس لڑکی کے رشتے کی بات کی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ لڑکی کے ماں باپ نے رشتہ دے دیا ....

"کچھ دنوں بعد میرا بیٹا اس حالت میں گھر آیا کہ اُس کے کپڑے پھٹے ہوتے تھے اور چہرے پر ایک دو چوٹوں کے نشان تھے۔ اُس نے بتایا کہ فلاں جاگیردار کے ساتھ اُس کی لڑائی ہو گئی ہے۔ میں نے تو زمیندار سے مار کھالی تھی لیکن میرے بیٹے نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ جاگیردار کو بھی مارا پیٹا اور اُس کے آدمیوں کو بھی۔ میرا بیٹا پہلوان تھا۔ مار اُس نے بھی کھائی لیکن اُس نے مارا پیٹا بھی بہت۔ تھوڑی ہی دیر بعد پولیس کے دو سپاہی آئے اور میرے بیٹے کو پکڑ کر تھانے لے گئے۔ وہ رات بھر تھانے رہا۔ صبح دو سپاہی پھر میرے گھر آئے اور مجھ سے پوچھا کہ تمہارا بیٹا کہاں ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اُسے تھانے لے گئے تھے۔ وہ کہنے لگے کہ وہ تھانے سے بھاگ گیا ہے۔ اُنہوں نے میرے گھر کی تلاشی لی، میری اور میری بیوی کی بہت بے عزتی کی۔ میرے دوسرے بچوں کو بھی ڈرایا دھمکایا اور چلے گئے اور اس کے ساتھ ہی میرا بیٹا بھی معلوم نہیں کہاں چلا گیا ....

"وقت گزرتا گیا۔ میری بیوی اپنے جوان بیٹے کے غم میں فوت ہو گئی۔

ایک بیٹا اور تھا وہ بھی زندہ نہ رہا اور دو بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئیں۔ اس غم نے مجھے اتنا بڑا موسیقار بنا دیا کہ میری آواز اس نواب کے دربار تک پہنچی اور اس نے مجھے اپنے ہاں بُلا لیا۔ یہ نواب ہے۔ یہ میری موسیقی سے مسحور ہُوا لیکن یہ نہ جان سکا کہ میری آواز میں اور میرے ساز کے انگ انگ میں کیسا غم اور کیسا دُکھ بھرا ہُوا ہے۔ میں موسیقی میں ہی ڈوب گیا۔ میرے سامنے اس فن کے نئے سے نئے راستے کھلتے چلے گئے۔ پھر ایسے ہُوا کہ میرا بیٹا جو تھانے سے بھاگ گیا تھا مجھے مل گیا۔ اُس وقت اُس کی عمر تیس اور چالیس سال کے درمیان تھی لیکن وہ اب ممتاز احمد نہیں تھا، اب وہ تاجا ڈاکو تھا اور لوگ اُسے اسی نام سے یاد کرتے تھے۔"

"تاجا ڈاکو؟" — میں نے حیران ہو کر پوچھا — "کیا وہ یہی ...."

"ہاں" — خواجہ صاحب نے جواب دیا — "وہ یہی تاجا ڈاکو ہے جس نے تمہیں اور فجی کو یہاں تک پہنچایا ہے۔"

"پھر وہ اچھا آدمی تو نہ ہُوا نا!" — میں نے کہا۔

"وہ بہت اچھا آدمی ہے سکندر!" — خواجہ صاحب نے کہا — "اُس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تم دونوں کو نہ جانے کہاں پہنچا دیتا .... فجی نوجوان لڑکی تھی۔ کیا میرے بیٹے نے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تھی؟ نہیں کی تھی نا!"

"اُس نے تو اس لڑکی کو نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا" — میں نے کہا اور اُن سے پوچھا — "وہ آپ کو کس طرح ملا تھا؟ کہاں ملا تھا؟"

"خدا نے باپ بیٹے کو ملانا تھا" — خواجہ صاحب نے جواب دیا — "وہ مجھے اُس وقت ملا جب اُس کی شہرت دُور دُور تک پہنچ چکی تھی۔ اُس کی تصویر ہر تھانے میں لگی ہوئی تھی۔ ہندو ساہوکاروں کے لئے، غریب کسانوں اور دیہاتیوں پر حکومت کرنے والے زمینداروں اور جاگیرداروں کے لئے وہ دہشت ناک ڈاکو اور پولیس کے لئے وہ چھلاوہ بن چکا تھا ....

"ایک روز اُس نے مجھے راستے میں روک لیا۔ مجھے کسی نے رقص کرنے

والی دو لڑکیوں کے متعلق بتایا تھا۔ میں نواب سے اجازت لے کر بگھی میں ان دونوں کو لا رہا تھا۔ دیہاتی علاقے سے گزرنا تھا۔ واپس آتے راستے میں شام ہو گئی۔ میرے ساتھ محل کے دو محافظ تھے۔ اس قسم کی بگھیوں میں بڑے امیر لوگ سفر کیا کرتے ہیں۔ چار آدمیوں نے ہمیں روک لیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ان چاروں میں ایک کا چہرہ مجھے مانوس سا نظر آیا جیسے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔ میں بگھی سے اُترا اور اُن کے سامنے جا کھڑا ہُوا....

"اس شخص نے جس کا چہرہ مجھے مانوس لگا تھا، مجھے کہا — 'آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ میں تاجا ڈاکو ہوں۔ ان کے زیورات اور آپ کے پاس جتنی نقدی ہے مجھے دے دیں' — اُس کے ایک ساتھی نے کہا — 'اور یہ دونوں لڑکیاں بھی ہمارے حوالے کر دیں۔ اگر یہ آپ کی بیٹیاں ہوتیں تو ہم ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ یہ ناچنے والی طوائفیں ہیں' ....

"میں نے اپنے دونوں محافظوں کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی عالی شان وردیاں پہنے ہوئے تھے اور اُن کے پاس تلواریں بھی تھیں لیکن اب ان کی تلواریں تاجے کے دو ساتھیوں کے پاس تھیں اور وہ دونوں کھڑے کانپ رہے تھے۔ میں تاجے سے کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ اُس نے نظریں میرے مُنہ پر جما لیں۔ میں نے بھی اُسے غور سے دیکھا۔ اُس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے نام بتایا تو اُس نے پوچھا — 'ممتاز نام کا آپ کا کوئی بیٹا ہُوا کرتا تھا؟' ....

"میں پہلے ہی اُس کے چہرے کو مانوس سمجھ رہا تھا۔ میں اُس کے سوال کے جواب میں اُس کے ساتھ لپٹ گیا۔ خون نے خون کو پہچان لیا۔ باپ بیٹا بہت روئے۔ اُس کے ساتھی اور میرے ساتھی ہمیں دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ ہم دونوں سب سے الگ ہو کر پرے چلے گئے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں کہاں ہوں۔ اُسے تو میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کہاں پہنچ گیا ہے۔ وہاں سے اُس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ نواب کے محل میں اُس

کی رسائی ہے اور ایک بار وہ وہاں جا بھی چکا ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ مجھے ملنے آئے گا....

"اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ میرے محافظوں کی تلواریں واپس دے دیں۔ ہم ایک بار پھر بغلگیر ہوئے اور میں وہاں سے چل پڑا۔ میں نے کچھ دُور آ کر محافظوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہا کہ میں نواب سے شکایت کروں گا۔ انہوں نے اور کوچوان نے بھی میری منت سماجت شروع کر دی۔ میں نے اُنہیں یہ نہ بتایا کہ تاجا ڈاکو میرا بیٹا ہے۔ مجھے خیال آگیا کہ یہ میرے خلاف شکایت کر سکتے ہیں کہ میں تاجے ڈاکو سے گلے لگ کے ملا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ کسی کے ساتھ ذکر نہ کریں کہ ہمیں ڈاکوؤں نے روکا تھا۔"

"پھر تاجا آپ کے پاس آیا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"ایک بار نہیں کئی بار!" — خواجہ صاحب نے جواب دیا — "میں نے اُسے کہا تھا کہ کسی کی بہو بیٹی پر بُری نظر نہ رکھنا اور کسی عورت پر ہاتھ نہ اُٹھانا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا شکار بڑے امیر لوگ ہوتے ہیں۔ اُس نے جب پکّا ڈاکو بن کر اپنا گروہ بنا لیا تھا تو اُس نے اُس جاگیردار کے گھر کا صفایا کر دیا تھا جس کے ساتھ اُس کی لڑائی ہوئی تھی اور اُسے تھانے لے گئے تھے۔"

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ڈاکہ زنی بھی ایک پیشہ ہُوا کرتا تھا۔ ڈاکوؤں کے کچھ اصول ہوتے تھے۔ پولیس انہیں ڈھونڈتی پھرتی تھی اور وہ آج یہاں کل وہاں اپنا کام کر جاتے تھے۔ آج کل کے جرائم پیشہ لوگوں کی طرح وہ ہر کسی کو نہیں لُوٹتے پھرتے تھے۔ تاجا ڈاکو انہی ڈاکوؤں میں سے تھا جنہوں نے تاریخ میں نام پیدا کیا تھا۔ یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس سطح کے ڈاکو کس کو لُوٹتے اور کس طرح لُوٹتے تھے۔ دیہات کے لوگ ان کی عزّت کرتے اور انہیں پولیس سے بچا لیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ڈاکو غریب پرور تھے۔

"میں نے تمہیں اتنی لمبی بات اس لئے سنائی ہے کہ تم جان سکو کہ یہ دُنیا اور یہ زندگی ایک کتاب ہے" — خواجہ صاحب نے کہا — "انسان کی فطرت کے یہ دو پہلو دیکھو۔ مجھ پر ظلم ہُوا تو میں نے مذہب میں، لوگوں کی خدمت اور محبت میں اور پھر موسیقی میں پناہ لی اور سکُون پایا۔ ویسا ہی ظلم میرے بیٹے پر ہُوا تو وہ ایسا ڈاکو بنا کہ اُس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اُسے یاد کیا کریں گے۔ میں تمہیں بتا رہا تھا کہ ہر انسان کو خدا نے قوّت عطا کی ہے۔ یہی قوّت کسی کو ڈاکو اور کسی کو موسیقار بنا دیتی ہے۔"

خواجہ صاحب بولتے بولتے چپ ہو گئے جیسے انہیں کچھ اور یاد آ گیا ہو۔ پھر کہنے لگے — "میں تمہارے ذہن پر اتنا بوجھ ڈال رہا ہوں جو تم ابھی نہیں اُٹھا سکتے۔ ابھی تم شاید نہ سمجھ سکو۔ انسان اور حالات تمہیں سمجھا دیں گے۔ آنکھوں، کانوں اور دماغ کو کھُلا رکھنا۔"

خواجہ صاحب نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ میرے ذہن پر بوجھ ڈال رہے تھے۔ میں جب اُن کے کمرے سے نکلا تو میرے ذہن پر اتنا بوجھ تھا کہ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میری جذباتی دُنیا کو زلزلوں کے جھٹکے جھنجھوڑ رہے تھے۔ گلشن آرا میرے ذہن سے نکل گئی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے خواجہ صاحب اور تاجا ڈاکو پھر رہے تھے۔ باپ بیٹا کہاں سے چلے تھے اور کہاں پہنچ گئے۔

اور مجھے اپنا تو پتہ ہی نہیں تھا کہ میری منزل کہاں ہو گی اور گلشن آرا مجھے کہاں تک پہنچا کر دم لے گی۔ خواجہ صاحب کہتے تھے کہ اس عورت سے ملتے بھی رہو اور اپنا دامن بھی بچا کے رکھو۔



زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ گلشن آرا کا بلاوا پھر آ گیا اور میں پھر پہلے کی طرح اُس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اُس رات میرے دل پر پہلی ملاقات والا بوجھ نہیں تھا۔ خطروں کو جانتے ہوتے بھی میں ڈرا ہُوا نہیں تھا۔ گلشن آرا اُسی لباس میں تھی جس میں اُسے پہلے دیکھا تھا۔ اُس نے پہلی ملاقات

کی طرح مجھے اپنے پاس بٹھایا اور میں نے اُس کی آنکھوں میں نظریں جما دیں۔

ایک بڑی خوبصورت تپائی پر چھوٹی سی صراحی رکھی تھی جس کی گردن خاصی لمبی تھی اور اس کے ساتھ دو گلاس رکھے تھے۔ یہ بھی صراحی کی طرح خوشنما تھے۔

"میں آج تمہیں اور اپنے آپ کو مدہوش کر دوں گی"—اُس نے نشیلی آواز میں کہا۔

وہ میرے قریب ہو گئی اور میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُس کا چہرہ میرے اتنا قریب آگیا کہ اُس کی سانسیں تیز اور گرم جھونکوں کی طرح میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔

"کبھی ولائتی شراب پی ہے؟"—اُس نے سرگوشی کی۔

میں مسکرایا اور نظریں اُس کی آنکھوں میں ڈالے رکھیں۔

"نہیں!"—میں نے دل میں کہا—"تم شراب نہیں پیو گی۔ تم مجھے شراب نہیں پلاؤ گی"—میں یہی الفاظ دہراتا رہا۔

اُس کا چہرہ پیچھے ہٹنے لگا، پھر اُس کے ہاتھ بھی میرے چہرے سے ہٹ گئے۔

"شراب نہیں پیو گے؟"—اُس نے پھر پوچھا۔

"نہیں!"—میں نے جواب دیا۔

"نہ پیو"—اُس نے کہا—"میں بھی نہیں پیو گی۔ تمہارا ہی نشہ بہت ہے۔"

میں اُس پر غالب آچکا تھا لیکن میں اُس کے حُسن کا نشہ محسوس کرنے لگا تھا۔ میرا چونکہ ایسا کوئی ارادہ نہ تھا اس لئے از خود ہی ایک راستہ نکل آیا۔ میں گلشن آرا کے چہرے پر نظریں جماتے ہوتے تھا۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ یہ چہرہ میری ماں کا چہرہ بن گیا۔ مسکراہٹ میری ماں کی مسکراہٹ بن گئی۔ میرے جسم نے جھرجھری لی پھر گلشن آرا کا یا میری ماں کا چہرہ جھلملانے

لگا جیسے شفاف جھیل میں کسی نے کنکری پھینک دی ہو۔

"کیوں؟"—مجھے گلشن کی آواز سنائی دی—"تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں آگئے ہیں سکندر!"

یہ آواز پیار سے لبریز تھی۔ میری آنکھوں کے آگے آنسوؤں کا پردہ آگیا تھا۔ دو بازو میرے گرد لپٹ گئے اور میں نسوانی سینے کا گداز اور اپنی پیشانی پر نسوانی ہونٹوں کا لمس محسوس کرنے لگا۔ نرم و ملائم ایک کپڑے نے میرے آنسو پونچھ ڈالے اور مجھے گلشن آرا کا چہرہ نظر آیا۔

"کیوں روتے تھے سکندر؟"—اُس نے ماں کے لہجے میں پوچھا—"کچھ یاد آگیا تھا؟ ....تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ کہاں سے آتے ہو؟"

"اُس پیار کی تلاش میں جو میری ماں اپنے ساتھ قبر میں لے گئی ہے، بھٹکتا یہاں آن پہنچا ہوں"—میں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ مجھ سے بہت چھوٹی ہو۔ میں نے کہا—"لیکن تم نہیں سمجھ سکو گی گلشن! تم ایک جسم ہو اور جسم کو ہی پہچانتی ہو۔ یہ جگہ بڑے خوبصورت اور خوشنما پتھروں کی منڈی ہے۔ نواب نے تمہارے جسم کو خریدا تھا۔ اپنی روح کا سودا کر دو۔ وہ میں خرید لوں گا۔"

"سکندر!"—اُس نے حیرت کے لہجے میں کہا—"تم وہ نہیں جسے میں نے یہاں بلایا تھا۔ وہ سکندر تو نوجوان لڑکا ہے اور اُس کا جسم مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"وہ میں ہی ہوں"—میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور اپنے دل میں کہا—"میں جسم نہیں رُوح ہوں، تم رُوح کو ناپاک نہیں کرو گی۔"

میں نے اُس کے چہرے پر بوکھلاہٹ سی دیکھی اور اُسے بتا دیا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے تلسے ڈاکو کا ذکر تو کیا لیکن یہ نہ بتایا کہ وہ ہمارے موسیقار خواجہ صاحب کا بیٹا ہے۔ میں نے فجی کے متعلق بتایا کہ یہ کس طرح میرے ساتھ آئی ہے تو وہ حیران سی ہو گئی۔

"فجی تو بہت اچھی لڑکی ہے" ــــ گلشن آرا نے کہا ــــ "اسے میں نے اپنی سہیلی بنا لیا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ میرے راز میں شریک ہے۔ میں اس کے ساتھ باتیں کیا کرتی ہوں اور یہ میری باتیں سمجھتی ہے۔"

"کیا نواب صاحب تمہارے ساتھ باتیں نہیں کیا کرتے؟" ــــ میں نے کہا ــــ "میں نے سُنا ہے کہ تم اُن کی چہیتی بیگم ہو۔"

"نواب صاحب!" ــــ وہ اداس ہو گئی اور آہ بھر کر بولی ــــ "میں اُس کی بیگم تو ہوں لیکن قیدی ہوں ..... آزاد قیدی ..... نواب وہ چشمہ ہے جو سُوکھ چکا ہے۔ اب اس چشمے میں پتھر رہ گئے ہیں۔ یہ پتھر بڑے خوشنما ہیں۔ بڑے قیمتی ہیں۔ میں اب ان پتھروں سے دل بہلایا کرتی ہوں۔ یہ پتھر سونا بھی بن جاتے ہیں ..... سکندر!"

"کہو گلشن!"

"کچھ نہیں!" ــــ اُس نے میری طرف دیکھا اور بولی ــــ "کچھ نہیں

آنا چھوڑ دیا تھا۔"

"تم پر بھی اُس نے غصہ جھاڑا ہو گا" ــــ میں نے کہا۔

فجی نے بتایا کہ اُس پر بیگم نے غصہ نہیں جھاڑا۔ وہ ڈرتی اُس کے کمرے میں جاتی ہی نہیں تھی۔ گلشن آرا نے سب پر غصہ جھاڑ کر فجی کو اندر بلایا۔ فجی ڈرتے ڈرتے گئی۔ گلشن آرا صراحی میں سے گلاس میں شراب ڈال رہی تھی۔ اُس نے فجی کو بیٹھنے کو کہا۔ فجی قالین پر بیٹھ گئی۔

"کیا تم سکندر کو اتنا ہی چاہتی ہو جتنا میں چاہتی ہوں؟" ــــ گلشن آرا نے اُس سے پوچھا۔

"نہیں بیگم صاحبہ!" ــــ فجی نے جواب دیا ــــ "میں اس قابل کہاں تھی۔ وہ تو آپ کا شہزادہ ہے۔"

"کیا تم اُسے پہلے سے جانتی تھیں؟"

"نہیں بیگم صاحبہ!" ــــ فجی نے جواب دیا اور اُسے سُنایا کہ ہماری ملاقات کہاں ہوتی تھی۔ فجی نے کہا ــــ "میں سکندر کا احسان ساری عمر نہیں

بھولوں گی۔"

گلشن آرا اس دوران شراب پیتی رہی۔ یہ جذبات کا اُبال بھی تھا اور میرا خیال ہے کہ گلشن آرا نے اس کیفیت میں شراب زیادہ پی لی تھی کہ اُس کے ذہن میں جو کچھ تھا وہ اُس نے اُگل ڈالا۔

"دیکھ فجی!" ــــ گلشن آرا نے فجی سے کہا ــــ "سکندر سے کہہ دینا کہ میرے ساتھ وہ جذباتی باتیں نہ کیا کرے۔ وہ جسم اور رُوح کی باتیں شروع کر دیتا ہے۔ یہاں آ کر وہ اپنی اصلیت اور حیثیت بھول جاتا ہے۔ میں اُسے کسی اور مقصد کے لئے پسند کرتی ہوں۔"

فجی نے مجھے بتایا کہ گلشن آرا نے ایسی اور بھی بہکی بہکی باتیں کیں۔ اُس کی زبان اُس کے قابو میں نہیں رہی تھی اور اُس کا سَر ڈولنے لگا تھا۔ اُس نے فجی سے جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے ایک خوبصورت جسم سمجھ کر بلاتی ہے مگر اُس کا یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ یہ صرف مجھے معلوم تھا کہ اُس کے دل سے میرے ایک پُراسرار اثر سے شیطان نکل جاتا ہے اور اس کی جگہ پاکیزہ خیال آ جاتے ہیں۔ میں جب وہاں سے آ جاتا ہوں تو میرا اثر اُترتے ہی اُس پر شیطان کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت میں آتے ہی اُسے غصہ آتا ہے کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

"سکندر!" ــــ فجی نے مجھے اُس کی یہ کیفیت سناتے ہوئے کہا ــــ "اُسے غصہ تم پر آتا ہے۔ معلوم نہیں تم اسے کیا سمجھتے ہو۔ میں اُسے ایک خوبصورت ڈائن سمجھنے لگی ہوں۔ اس سے بچنے کی کوشش کرو یا اس کے غلام بن جاؤ اور یہ جس طرح تمہیں نچانا چاہے اسی طرح ناچتے رہو۔"

فجی چلی گئی تو میں نے خواجہ صاحب کو یہ باتیں سنائیں۔

"کچھ دن دیکھ لو" ــــ خواجہ صاحب نے کہا ــــ "کچھ دن اور دیکھ لو۔ مجھے سوچنے دو۔ نواب صاحب کے دل میں میری بڑی عزت ہے۔ اگر میں نے مناسب سمجھا تو میں نواب صاحب کو بتا دوں گا ..... مجھے ڈر ہے کہ اس عورت کا ردِ عمل بڑا ہی خطرناک ہو گا۔ اس میں پاکیزہ محبت آ ہی نہیں سکتی۔

سکندر!.... تم رات میرے پاس تو نہیں گزار سکتے!"

"خود سوچ لو!"

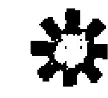
"نہیں!" — اُس نے کہا — "یہاں میرے دشمن بھی ہیں۔"

وہ کمرے کے دروازے تک میرے ساتھ آئی۔ مجھے اپنے گلے لگایا پھر تیزی سے کمرے میں گئی اور صوفے پہ گر پڑی۔

فجی مجھے واپس لا رہی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کی بھیک مانگ رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ بیگم گلشن آرا اُس کے ساتھ کیا باتیں کیا کرتی ہے۔

"معلوم نہیں بیگم کو میرے ساتھ اتنا پیار کیوں ہو گیا ہے" — فجی نے جواب دیا — "تین چار دنوں بعد ہی اس نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ تم پہلی نوکرانی ہو جس کے ساتھ میں دل کی باتیں کر سکتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں یہ تمہیں کیوں بلاتی ہے۔ اس نے صرف مجھے اور ایک اور نوکرانی کو جو دراصل پہرہ دار ہے، اپنا رازدار بنایا ہے۔ بیگم مجھے انعام دے رہی تھی۔ میں نے نہیں لیا۔"

"اب اسے پتہ چل گیا ہے کہ تم نوکری کرنے والی عورتوں میں سے نہیں" — میں نے کہا — "میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں تمہیں کس طرح یہاں لایا تھا۔"



فجی کی باتیں اتنی اہم نہیں کہ میں آپ کو ساری سناؤں۔ نواب کی اس بیگم کی باتوں پر غور کریں۔ وہ جسے چاہتی قتل کرا کے لاش غائب کرا سکتی تھی۔ بے مثال حسن کی بدولت وہ نواب پر چھائی ہوئی تھی۔ اُس کا حکم چلتا تھا لیکن میرے ساتھ باتیں کرتے اُس کا انداز ایسا ہو گیا جیسے میرے سامنے اُس کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ وہ معمولی سی ایک عورت بن گئی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے ذہن نے میرا غلبہ قبول کر لیا تھا۔

دو دنوں بعد فجی نے یہ خطرہ مول لیا کہ رات کو میرے کمرے میں آ گئی۔ میں نے اُسے کمرے میں نہ بیٹھنے دیا۔ باغ کے اندھیرے گوشے میں لے

گیا۔ اُس نے محبت کا والہانہ اظہار کیا۔ میں نے رسمی طور پر اُس کا دل رکھ لیا۔ میں اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میرے دل میں اُس کی وہ محبت نہیں جو اُس نے اپنے دل میں پیدا کر لی ہے۔

"سکندر! تمہیں ایک بات بتاؤں" — اُس نے کہا — "آج بیگم گلشن آرا کو میں نے بڑی عجیب حالت میں دیکھا ہے۔ وہ غصے سے پھٹ رہی تھی۔ میں نے پہلی بار اُسے غصّے میں دیکھا ہے۔ ایک نوکر کے مُنہ پر اُس نے تھپڑ بھی مار دیا۔ وہ پرانا نوکر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بیگم کو کبھی غصہ آیا ہی نہیں تھا، معلوم نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔ دونوں نوکرانیوں کو اُس نے بہت بُری گالیاں دی ہیں۔ ایک آدمی جو یہاں کا حاکم ہے اور سُنا ہے نواب صاحب کا مُنہ چڑھا ہُوا ہے، بیگم کے کمرے میں کبھی کبھی آتا ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ کیوں آتا ہے۔ بیگم نے اُس کے ساتھ دوستی لگا رکھی ہے۔ وہ آیا تو بیگم نے اُس کی بے عزتی کر کے اُسے اپنے کمرے سے نکال دیا۔ بیگم کے پاس آنے والا ایسا ہی ایک اور آدمی بھی تھا۔ اُس نے پہلے ہی۔

میں پہلی بار گلشن آرا کے بلانے پر گیا تھا۔ وہ راہداری میں میرے قریب سے گزر گئی تھی۔

رات کو میں خواجہ صاحب کو بتا کر چل پڑا۔ اب میں اکیلا گلشن آرا کے کمرے تک چلا جاتا تھا۔ فجی وہاں نہیں تھی۔ وہ گلشن آرا کے کمرے کے باہر بیٹھی ملا کرتی تھی۔ میں اندر چلا گیا۔ گلشن آرا صوفے پر بیٹھی ہوتی تھی۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جایا کرتی تھی لیکن اُس رات وہ مسکراتی نہیں۔ تپائی پر دو گلاس رکھے تھے۔ دونوں میں لال رنگ کا پانی تھا۔ اُس نے ایک گلاس اُٹھا کر میرے آگے کیا۔ میں نے ہاتھ نہ بڑھایا۔

"شراب نہیں سکندر!" — اُس نے کہا — "شربت ہے پی کے دیکھو۔"

مجھے شک تھا کہ یہ شراب ہے اس لئے میں گلاس نہیں لے رہا تھا۔

"تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ شراب کڑوی ہوتی ہے" — اُس نے کہا — "یہ ذرا چکھ کر دیکھو۔ ایسا شربت تم نے کبھی نہیں پیا ہوگا اور ساری عمر ایسا شربت کہیں پیو گے بھی نہیں"۔

میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوتی۔ اُس نے گلاس تپائی پر رکھ دیا اور دوسرا گلاس خود اُٹھا لیا۔ اُس نے گلے شکوے کے لہجے میں کہا کہ میں اُس پر اعتبار نہیں کرتا۔

میں نے گلاس اُٹھا لیا اور اس میں شراب تھی، یا شربت، میں اسے دیکھنے لگا۔ کمرے میں جو خاموشی ہوگئی تھی اس سے مجھے ڈر سا آنے لگا۔ میں اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کرنے لگا۔ بعض اوقات آنے والے کسی واقعے یا حادثے کا اشارہ مل جاتا ہے۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ اگر شربت میں مجھے شراب پلائی جا رہی تھی تو یہ میرے لئے حادثہ تھا۔

میں آہستہ آہستہ گلاس اپنے منہ کی طرف لے جانے لگا۔ گلاس میرے ہونٹوں تک پہنچ گیا کہ مجھے گلشن آرا کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"رُک جا سکندر!"

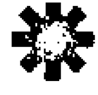
میں نے بدک کر گلاس مُنہ سے دُور کر دیا۔ گلشن آرا نے جھپٹ کر گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں اپنا گلاس تھا۔ اُس نے دونوں گلاس تپائی پر رکھ دیئے اور مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھا لیا۔

"نہیں سکندر!" — اُس نے رندھی ہوئی اور ذرا کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "میں یہ تمہیں نہیں پلا سکتی۔ میں اپنا دل نہیں کاٹ سکتی" — اُس نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر بازو میرے گرد لپیٹ دیئے۔ وہ سسکنے لگی تھی۔ اُس نے روتی ہوئی آواز میں کہا — "تم میری محبت ہو ..... نہیں ..... نہیں!"

اچانک دروازہ کھلا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی جو لباس اور شکل و شباہت سے نواب کے خاندان کا فرد لگتا تھا، دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ وہ طنزیہ ہنسی ہنس پڑا۔

"تو یہ ہے وہ لڑکا جس کی خاطر تُو نے ....."

گلشن آرا جب یہاں آئی تھی تو بھی شریف عورت نہیں تھی۔ اسے یہاں کوئی زبردستی نہیں لایا تھا۔ خود آئی تھی۔ اس نے نواب صاحب کو بھی چکر دے دیتے تھے"۔



اب تو میں چکر میں آیا ہوا تھا۔ خدا کے بعد میرا سہارا خواجہ صاحب تھے۔ چار چار پانچ پانچ دنوں کے وقفے سے گلشن آرا نے مجھے پانچ مرتبہ اپنے کمرے میں بلایا۔ ہماری ہر ملاقات ویسی ہی تھی جیسی پہلے سنا چکا ہوں۔ میں ہر ملاقات میں اُس پر غالب آگیا اور اُس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں نے ہر بار اُس کے پیار میں مامتا کی جھلک بڑی صاف دیکھی۔

میں جانتا ہوں آپ کے ماتھے پر شکن آگئے ہیں۔ آپ کو یقین نہیں آرہا کہ ایسا ہُوا ہوگا۔ اگر آپ کی سوچ یہی ہے تو میں کہوں گا کہ آپ انسان کی فطرت سے واقف نہیں جو سو بھیس بدل لیتی ہے۔ آپ اپنی فطرت سے بھی واقف نہیں۔ اپنے ضمیر کی آنکھوں سے اپنے آپ کو دیکھیں۔ آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ آپ کی شخصیت دوغلی ہے۔ آپ کی ذات کا ایک حصہ ہے جس پر آپ پردہ ڈالے رکھتے ہیں۔

میں آپ کو انسانی فطرت کی کہانی سُنا رہا ہوں۔

پانچویں ملاقات کے بعد فجی مجھے ملی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی اور بہت پریشان تھی۔

"سکندر!" — اُس نے کہا — "وہ بدبخت پاگل ہوگئی ہے۔ رات کو تم اُس کے کمرے سے واپس آتے تو کچھ وقت کے بعد اُس نے مجھے بلایا۔ وہ پھنکار رہی تھی۔ کہنے لگی — اس لڑکے نے مجھے اذیت میں ڈال رکھا ہے۔ میں جل رہی ہوں۔ یہ مجھے جلا رہا ہے۔ میں نے اس کے لئے اپنے دو دوستوں کو ناراض کیا ہے۔ اب اسے نہیں بلاؤں گی۔ اگر قسمت کا مارا آگیا تو زندہ نہیں جائے گا'....

"میں نے اُسے کہا —— بیگم صاحبہ! میں کیا کر سکتی ہوں؟ وہ یہاں آتا ہے تو آپ ٹھیک رہتی ہیں۔ وہ چلا جاتا ہے تو آپ کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ میں کیا بتاؤں ایسا کیوں ہوتا ہے"—— بیگم کو میری اس بات پر اور زیادہ غصہ آگیا۔ سکندر! میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ یہ عورت تو مجھے پاگل لگتی ہے۔ شاید اسی لئے نواب نے اُسے الگ پھینکا ہوا ہے "تم یہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کرو یا یہ جو کہتی ہے ویسے کرو .... ہم کہاں آگئے ہیں سکندر! یہ کیسے لوگ ہیں؟ مجھے تو یہ کوئی اور ہی مخلوق لگتے ہیں۔ یہ انسان نہیں۔"

"تم اپنا دل مضبوط رکھو فجی!"—— میں نے کہا —— "یہ عورت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

فجی بہت ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اُسے چلے جانے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ وہ بار بار مجھ تک پہنچنے کا خطرہ مول نہ لیا کرے۔ وہ پریشانی کے عالم میں چلی گئی۔

دو ہی راتیں گزری تھیں کہ گلشن آرا کا بلاوا آگیا۔ اب فجی کی بجائے ایک ادھیڑ عمر عورت آئی۔ یہ وہی عورت تھی جسے میں نے اُس وقت دیکھا تھا جب

"اوہ!"—— گلشن آرا نے مجھے ایک طرف کر کے اُسے کہا —— "آپ؟ کیا آپ مجھے موقعہ پر پکڑنے آئے ہیں؟"

وہ اندر آگیا۔

"ناچنے والے ایک لڑکے کی خاطر تُو نے مجھے دھتکارا ہے"—— اُس نے کہا —— "کیا تو بھول گئی تھی کہ میری حیثیت کیا ہے اور میں کیا کر سکتا ہوں؟ کہہ دے کہ تُو نواب صاحب سے میری شکایت کرے گی۔ میں دو سپاہی ساتھ لایا ہوں۔ دیوان صاحب بھی ساتھ ہیں۔ تُو شاید سزا سے بچ جائے۔ آخر تُو نواب صاحب کی بیگم ہے۔ اس لڑکے کو تُو کیسے بچائے گی؟ اس کا ادھر کام ہی کیا ہے؟ جانتی ہو اسے کہاں پھینک دیا جائے گا اور یہ ابھی پوری طرح مرا نہیں ہوگا کہ اسے گدھ کھانا شروع کر دیں گے؟"

"نہیں .... نہیں خان صاحب!"—— گلشن آرا نے لپک کر مجھے اپنے

بازوؤں میں لے لیا اور روتی ہوئی آواز میں التجا کرنے لگی —— "اِس کا کوئی قصور نہیں۔ اسے میں نے حکم دے کر بلایا تھا۔ اِسے چھوڑ دو۔ مجھے وہاں بھجوا دو۔ اسے نہیں .... اِسے نہیں!"—— وہ مجھے چھوڑ کر اُس کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی —— "آپ کی ہر شرط پوری کروں گی۔ کہتے، اپنی زبان سے کہتے۔ اسے جانے دیں۔"

"اب یہ وہیں جائے گا"—— اُس نے کہا —— "تم اپنی بات کرو۔ اسے اب بھول جاؤ۔"

"آج ہی اسے بلایا ہے۔"

"یہ سات آٹھ مرتبہ یہاں آچکا ہے"—— اس آدمی نے رُعب سے کہا —— "اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

"وہ ہیرا جو آپ کو بہت اچھا لگتا ہے لے لیں"—— گلشن آرا نے کہا —— "نقد رقم لے لیں۔ آپ کے لئے میرا دروازہ ہر وقت کھلا رہے گا۔"

یہ تھا گناہ کا انجام۔ گلشن آرا نواب کی بیگم تھی اور یہ شخص جو اُس کے ساتھ کوتوالوں جیسا سلوک کر رہا تھا اُس کا ملازم تھا۔ اُس کا عہدہ یا رتبہ خواہ کچھ بھی تھا، وہ اُسے اپنی داشتہ سمجھ رہا تھا۔ گلشن آرا خود ہی اُس کی داشتہ بنی رہی تھی اور اب اپنے ملازم پر اُس کا حکم نہیں چل سکتا تھا۔

میں زیادہ حیران تو اس پر ہو رہا تھا کہ گلشن آرا مجھے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیا اُس کے دل میں میری محبت پیدا ہو گئی تھی؟

"میں تم سے کچھ بھی نہیں لوں گا"—— اس شخص نے کہا —— "میں اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"

گلشن آرا نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑے اور وہ رو پڑی۔

"اِسے جانے دو"—— اُس نے اس آدمی سے کہا۔

"یہ زندہ رہا تو یہ ہمارے درمیان حائل رہے گا"—— اُس نے کہا —— "یہ تمہارا کچھ نہیں لگتا۔ اسے بچانے کی کوشش نہ کرو"—— اُس نے تپائی کی طرف دیکھا اور بولا —— "اوہ! شراب بھی چل رہی تھی"—— وہ تپائی

کی طرف بڑھا۔

گلشن آرا نے آگے بڑھ کر وہ گلاس جو اُس نے مجھے پینے کو دیا پھر مجھ سے چھین لیا تھا، وہ اٹھا کر اُس آدمی کو دیا۔

"پی کے دیکھیں" ــــ گلشن آرا نے پیار سے کہا ــــ "شراب نہیں شربت ہے۔ پی کے مجھے بتائیں کہ آپ نے ایسا شربت پہلے کبھی پیا ہے؟"

گلاس اُس آدمی کے ہاتھ میں تھا۔ گلشن آرا گلاس کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اُس کے مُنہ کے قریب لے گئی۔

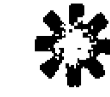
"چلیئے، مان جائیں" ــــ گلشن آرا نے کہا ــــ "میرے ہاتھ سے پی لیں اور غصہ تھوک دیں۔"

اُس شخص نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی بار آدھا گلاس خالی کر دیا۔ سانس لے کر اُس نے باقی شربت بھی پی لیا۔

"اس لڑکے کو میرے حوالے کر دو" ــــ اُس نے کہا ــــ "تمہارے خلاف کوئی کارروائی اور کوئی بات نہیں ہوگی۔"

"بیٹھ تو جائیں ذرا!" ــــ گلشن آرا نے اُس کا بازو پکڑ کر کہا۔

اُس نے گلشن آرا کی طرف دیکھا۔ میں نے اُس کے چہرے پر ایسا تاثر دیکھا جیسے اُس نے کوئی بدمزہ چیز پی لی ہو۔



اُس نے پہلے ایک ہاتھ اپنے گلے پر رکھا اور بُرا سا منہ بنایا پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ لیا۔ وہ لڑکھڑایا اور صوفے پر یُوں بیٹھ گیا جیسے گر پڑا ہو۔ اُس کے چہرے پر تکلیف کا تاثر آگیا۔

"تم نے.... تم نے" ــــ اُس نے ہکلاتے ہکلاتے کربناک لہجے میں کہا ــــ "یہ کیا پلا دیا ہے مجھے؟"

"اب اپنا انجام دیکھ!" ــــ گلشن آرا نے اُس پر جُھک کر اور دانت پیس کر کہا ــــ "یہ زہر تھا جو میں نے تیرے اندر انڈیل دیا ہے۔"

"زہر؟" ــــ اُس نے تڑپ کر اور خوفزدہ آواز میں کہا ــــ "زہر؟

.... گلشن! حکیم صاحب کو بلاؤ۔"

وہ اُٹھا۔ گلشن نے اُس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر دھکا دیا۔ وہ صوفے پر گر پڑا اور بڑی زور سے ہڑبڑایا۔

"خان عثمان علی خان صاحب!" ــــ گلشن آرا نے طنزیہ لہجے میں کہا ــــ "تم میرے زرخرید غلام تھے۔ تم میرے حکم سے میرے پاس آیا کرتے تھے۔ کیا تم نے مجھے اپنی لونڈی سمجھ لیا تھا؟.... نواب صاحب ڈھونڈتے رہیں گے اپنے خان صاحب کو.... صبح تک تمہاری لاش غائب ہو چکی ہوگی۔"

یہ وہ زہر تھا جو گلشن آرا مجھے پلا رہی تھی لیکن اُس نے گلاس میرے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ وہ زہر اب اس شخص کے جگر کو کاٹ رہا تھا۔ وہ تڑپتے تڑپتے صوفے پر لڑھک گیا۔

"جل رہا ہوں" ــــ یہ خان عثمان علی خان کی آخری آواز تھی۔ زہر بڑی تیزی سے کام کر گیا تھا۔

میری تو زبان گنگ ہو گئی تھی۔ کبھی خیال آتا یہ زہر میں پی لیتا تو میں اسی طرح تڑپ تڑپ کر اور جل جل کر مرتا، پھر خیال آتا کہ یہ تو قتل ہے۔ مَیں بھی پکڑا جاؤں گا۔ میری کیفیت ایسی ہو گئی جیسے جسم سے سارا خون نکل گیا ہو۔

"گلشن!" ــــ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "یہ مر گیا ہے۔ اب کیا کرو گی؟"

"تم چلے جاؤ" ــــ اُس نے کہا ــــ "نکل جاؤ یہاں سے۔ یہاں قتل ہونے والا یہ پہلا آدمی نہیں۔ تم جاؤ۔"

"نہیں گلشن!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں نہیں جاؤں گا۔ تمہیں اس لاش کے پاس اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"تم اپنی دُنیا کی باتیں کر رہے ہو سکندر!" ــــ گلشن نے اطمینان سے کہا ــــ "یوں سمجھ لو کہ ایک کُتا مر گیا ہے۔ یہ نوابوں کی دُنیا ہے اور میں ایک نواب کی بیگم ہوں۔ لاش ابھی بوری میں بند ہو جاتے گی" ــــ اُسے جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ دروازے کی طرف گئی اور بولی ــــ "یہ کہتا تھا اس کے ساتھ

دو سپاہی ہیں۔"

اُس نے دروازہ کھولا اور کہا ——— "اندر آؤ تم دونوں!"

دونوں سپاہی اندر آ گئے اور بیگم کو انہوں نے جھک کر سلام کیا۔ گلشن آرا دونوں کو کمرے کے ایک کونے میں لے گئی اور سرگوشیوں میں انہیں کچھ کہا۔ دونوں لاش کو ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھتے باہر نکل گئے۔ انہوں نے مجھے بھی دیکھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ جب کمرے سے نکل رہے تھے تو انہوں نے گھوم کر مجھے دیکھا تھا۔

گلشن آرا نے مجھے پلنگ پر بٹھا لیا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر کہا کہ میں چلا جاؤں۔ میں نے چلے آنا ہی بہتر سمجھا لیکن گلشن آرا نے خان عثمان علی خان کے متعلق کوئی بات شروع کر دی اور میں بیٹھا رہا۔ اُس کی بات ختم ہوئی تو میں اُٹھا۔

"ذرا ٹھہرو" ——— گلشن آرا نے کہا ——— "اکیلے نہ جاؤ۔ میں کسی کو تمہارے ساتھ بھیجوں گی ..... یہ خیال رکھنا کہ کسی کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر نہ ہو۔ خواجہ صاحب کے ساتھ بھی نہیں ..... لاش یہ دونوں سپاہی ابھی غائب کر دیں گے۔ میں انعام سے ان کی جھولیاں بھر دوں گی۔"

کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ ہم دونوں نے دیکھا۔ دروازے میں نواب کھڑا تھا۔ اُس نے ہم دونوں کو دیکھا۔ اُس کی عمر پچھتر برس کے قریب ہو گئی تھی اور اُس کی بیگم گلشن آرا کی عمر تیس سال سے کچھ ہی اُوپر تھی۔ عمر کے اِس فرق نے ایک آدمی کو قتل کرا دیا تھا۔

نواب کو اپنے بڑھاپے کا جیسے احساس ہی نہیں تھا۔ وہ اندر آیا۔ دونوں سپاہی جنہیں گلشن آرا نے لاش غائب کرنے کو کہا تھا، اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ ان سپاہیوں نے گلشن آرا کو دھوکہ دیا ہے۔ نواب کے پیچھے تین چار اور آدمی تھے۔

"تم شاید رقاص ہو؟" ——— نواب نے مجھ سے پوچھا ——— "یہاں کیوں آئے تھے؟"

"اسے میں نے بلایا تھا" ——— گلشن آرا نے کہا۔ اُس نے لاش کی طرف اشارہ کر کے کہا ——— "اور یہ اس لڑکے کو میرے ساتھ پکڑ کر میری عزت کا سودا کرنے آیا تھا۔"

"عزت!" ——— نواب نے گلشن آرا کے مُنہ پر تھپیڑ مار کر کہا ——— "عزت ..... کیا اس لونڈے کو تُو نے اپنی عزت کی خاطر بلایا تھا؟ ..... ہمیں دھوکہ دے رہی ہے بدکار! ..... اسے اپنے کمرے میں کیوں بلایا تھا؟"

"اس لئے کہ تم بڈھے کھوسٹ ہو" ——— گلشن آرا نے بڑی دلیری سے کہا ——— "تم میرے لئے لاش ہو۔"

نواب نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور اشارہ کیا۔

"دونوں کو!" ——— نواب نے کہا۔



اور ہم دونوں پتھروں کی اُس ہیبت ناک دیوار کے آہنی دروازے کے سامنے کھڑے تھے جس کے متعلق خواجہ صاحب نے مجھے بڑی بھیانک باتیں سنائی تھیں۔ جن مجرموں کو سزائے موت دینی ہوتی تھی، انہیں ان دیواروں کے اندر کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ مجرم بھوکا پیاسا مرتا تھا اور یہ موت بڑی ہی اذیت ناک ہوتی تھی۔

ہم دونوں کو رات کی تاریکی میں چھ آدمی وہاں لے گئے تھے۔ ان کے پاس دو لالٹینیں تھیں۔ ہمیں کم و بیش ایک میل پیدل چلنا پڑا تھا۔ راستے میں چٹانیں آئی تھیں۔ کھڈ اور نالے بھی آتے تھے۔ گھاٹیاں بھی تھیں پھر انہوں نے ہمیں ایک دروازے سامنے روک لیا تھا۔ راستے میں کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ انہوں نے لالٹینوں کی روشنی میں تالا کھولا، دروازہ کھولا اور ہم دونوں کو اندر دھکیل دیا گیا۔ دروازہ بڑی خوفناک آواز سے بند ہو گیا۔

یہ ایک خاموش دنیا تھی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی چیز ہمارے پاؤں کے قریب سے سرسراتی گزر گئی۔ گلشن آرا میرے ساتھ لپٹ گئی۔ میں اس کے دل کی دھڑکن صاف محسوس کر رہا تھا۔

"اب ڈرو نہیں گلشن!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "خواجہ صاحب نے اس جگہ کے متعلق مجھے بتایا تھا۔ ہمیں اب مرنا ہے۔"

"بڑی بُری اذیت میں مریں گے" ـــــ گلشن آرا نے کہا ـــــ "سکندر!" ـــــ اُس نے میرے آگے ہو کر میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور جذباتی لہجے میں بولی ـــــ "مجھے بخش دینا۔ مجھے مرنے کا کوئی غم نہیں۔ غم یہ ہے کہ تمہیں اسی عمر میں موت کے مُنہ میں پھینک دیا ہے۔ تم نے دنیا میں ابھی دیکھا ہی کیا تھا۔"

"اگر یہی دُنیا ہے جو میں نے دیکھی ہے تو اِس دنیا سے اُٹھ جانا ہی بہتر ہے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "ایک بات بتاؤ گلشن! تم نے یہ کیا کیا ہے۔ تم مجھے زہر کیوں پلا رہی تھیں پھر تم نے یہ زہر اُس شخص کو کیوں پلا دیا؟"

"تم نے مجھے کانٹوں پر تڑپایا تھا" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "تم جانتے تھے میں تمہیں اپنے پاس کیوں بلاتی تھی لیکن تم جب میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے تھے تو میں حیوان سے انسان بن جاتی تھی۔ مجھ میں ایسی تبدیلی آجاتی تھی جسے میں نہیں سمجھ سکتی تھی کہ یہ کیسے آجاتی ہے۔ میری نظروں میں تمہارا روپ بدل جاتا تھا مگر تم چلے جاتے تھے تو میں آہستہ آہستہ اپنے آپ میں آجاتی اور جل اٹھتی تھی کہ تم مجھے دھوکہ دے گئے ہو....

"میں اس طرح جلتی ہی رہی ہوں سکندر! میں مر رہی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ مرنے سے پہلے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لوں۔ شاید خدا مجھے بخش دے۔ میری اس قسم کی دوستی خان عثمان کے ساتھ تھی۔ میں نے تمہاری خاطر اُس کی دوستی ترک کر دی بلکہ اُسے دھتکار دیا۔ اُس کی طرف سے مجھے دھمکیاں ملتی رہیں۔ اِدھر تم مجھے جلاتے رہے۔ مجھے کبھی غصہ نہیں آیا تھا لیکن اب غصہ بھی مجھے کھانے لگا۔ اپنے آپ پر غصہ کہ تم میرے سامنے ہوتے ہو تو میں بجھ کے رہ جاتی ہوں....

"میں انسانیت کے درجے سے گر چکی تھی سکندر! میرے جذبات مر گئے تھے مگر تم نے انہیں نئی زندگی دی۔ اس سے مجھ میں کشمکش شروع ہو گئی۔ میں اپنے آپ میں کٹنے لگی اور میں اُس ذہنی حالت تک پہنچ گئی

کہ اس اذیت سے بچنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ تمہیں زہر دینے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے سوچا تھا تمہارا وجود ہی نہیں رہے گا تو میں اپنے آپ میں واپس آکر اُسی راستے پر چل پڑوں گی جس پر میں چلی جا رہی تھی۔ میں نے تمہارے لئے شربت میں زہر ملا دیا مگر گلاس جب تمہارے ہونٹوں کے قریب پہنچا تو میرے وجود میں ایک دھماکہ ہُوا اور ایسے لگا جیسے میرے بچے کو کوئی عورت زہر پلا رہی ہو۔ میرا کوئی بچہ نہیں سکندر! میں ماں نہیں بن سکی۔ نہ جانے یہ کیسے ہُوا کہ میرے دل نے تمہیں اپنا بچہ سمجھ لیا۔ میرا خیال ہے کہ پہلے روز ہی میرے دل میں تمہاری محبت پیدا ہو گئی تھی جسے میں دبانے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ میں تمہیں مرتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔"

ہم زمین پر بیٹھ گئے اور اُس نے میرا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ میں نے موت کو قبول کر لیا تھا۔ مجھے ایسا قرار اور چین آنے لگا جیسے میں اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

آنکھ کھلی تو دنیا روشن ہو چکی تھی۔ میرا سر گلشن آرا کے زانو پر تھا اور وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ یہ ایک وسیع میدان تھا۔ اس کے اردگرد پتھروں کی بہت اونچی دیوار تھی۔ دیوار کے اُوپر خاردار تار تھی۔ دیوار میں گھری ہوئی اس جگہ میں تین درخت تھے اور تینوں سُوکھ چکے تھے۔ ان کی شاخیں جھڑ گئی تھیں۔ ایک جگہ ایک چھپّر سا تھا۔

میں نے میدان میں نگاہ دوڑائی۔ مجھے کئی خشک انسانی کھوپڑیاں دکھائی دیں۔ یہاں آکر مرنے والوں کے سینوں کے پنجر بھی نظر آتے۔ کچھ ہڈیاں ہمارے قریب پڑی ہوئی تھیں۔ میں ٹہلتا ٹہلتا ایک سُوکھے پیڑ کے قریب جا کھڑا ہُوا۔ اُوپر پھڑپھڑ کی آواز سنائی دی۔ میں نے اُوپر دیکھا۔ دو گدھ پیڑ کے خشک ٹہن پر آ بیٹھے تھے اور دونوں گردنیں جُھکا کر مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں انہیں دیکھنے لگا اور میں نے کہا ـــــ "دو چار دن انتظار کرو دوستو!"

یہ دو گدھ ہمارے مرنے کے انتظار میں آ بیٹھے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ یہاں جو کوئی آتا ہے مرنے کے لئے آتا ہے۔

گدھ تو مرے ہوئے انسان کو کھاتے ہیں لیکن انسان زندہ انسان کو نوچ نوچ کر کھا جاتے ہیں۔ یہ نواب انگریزوں کا پالا ہوا گدھ تھا۔ معلوم نہیں کتنے انسانوں کو کھا گیا تھا۔ اُس نے کتنی ہی عورتوں کی جوانی کھا لی تھی۔

"وہ دیکھو" — گلشن آرا نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے اُدھر دیکھا جدھر وہ دیکھ رہی تھی۔ دو اور گدھ اُسی درخت پر آ بیٹھے تھے۔ ایک اور آ گیا۔ وہ زمین پر اُتر آیا۔ اُس نے نظریں ہم پر جما دیں اور آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھنے لگا۔ ہم دونوں بے حس بیٹھے تھے۔ یہ گدھ دیکھنے آ رہا تھا کہ ہم مر چکے ہیں یا ابھی زندہ ہیں۔

گلشن میرے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ وہ میرے اور قریب ہو گئی جیسے میرے وجود میں چھُپ جانا چاہتی ہو۔ اُس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اگر موت کی شکل و صورت گدھوں جیسی تھی تو وہ ہماری طرف آ رہی تھی۔

"اُٹھو سکندر!" — گلشن نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "اُٹھ کر اسے اُڑاؤ۔ یہ ہم زندہ کو نوچنا شروع کر دیں گی۔"

میں اُٹھا اور گدھ کی طرف دوڑا۔ وہ اتنے بڑے بڑے پَر پھیلا کر چند قدم دوڑی پھر اُڑ گئی مگر کہیں گئی نہیں۔ دیوار پر بیٹھ گئی۔ اُس کی نظریں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ ہم دونوں کو مرنا ہے۔ اُس میں انتظار کی تاب نہیں تھی۔ میں نے وہاں سے گلشن آرا کو دیکھا۔ وہ موت سے پہلے مر رہی تھی۔ اُس کا رنگ بڑا ہی دلکش تھا۔ اُس کے جسم کی دلکشی میں تو جادو کا اثر تھا۔ وہ تو سراپا طلسم تھی۔ وہ میں ہی تھا جو اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا تھا

تو اُس کا ذہن میرے قبضے میں آ جاتا تھا ورنہ کوئی جابر آدمی بھی اُس کی آنکھوں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔

وہ حُسن کی ملکہ تھی۔ وہ دلوں پر راج کرنے کے لئے پیدا ہوئی تھی مگر اُس کے حُسن پر موت نے اپنا سایہ ڈال دیا تھا۔

"سکندر!" — اُس نے بے جان آواز میں مجھے بلایا — "یہاں آ جاؤ۔"

میں اُس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ یوں سرک کر میرے ساتھ لگ گئی جیسے میں اُسے موت سے بچا لوں گا۔

"تم ڈر نہیں رہے؟" — اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"ڈرنے سے موت ٹل تو نہیں جاتے گی" — میں نے کہا — "خدا کو یاد کرو۔ گناہوں کی معافی مانگو۔"

وہ چُپ چاپ میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں اور ہونٹوں پر بھی سفیدی سی آ گئی تھی۔ اُس کی نظریں میرے چہرے سے ہٹ کر ذرا ایک طرف ہو گئیں۔ میں لے اُدھر دیکھا۔ دیوار پر گدھ بیٹھا ہمیں دیکھ رہا تھا۔

"گناہ تو انسان کرتا ہی ہے" — اُس نے مری ہوئی اور ذرا کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "اور سُنا ہے خدا گناہ معاف بھی کر دیا کرتا ہے لیکن میرا ایک گناہ ایسا ہے جو خدا معاف نہیں کرے گا .... ایک آدمی کو تو میں نے رات کو زہر پلا کر مار دیا ہے لیکن ایک جوان آدمی کو جو اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا تھا میں نے کچھ اور ہی طریقے سے مارا تھا .... میرے دل میں کانٹے اُترے ہوئے ہیں۔ آج یہ کانٹے زہریلے ہو گئے ہیں" — وہ چُپ ہو گئی۔

"بولتی رہو گلشن!" — میں نے کہا — "اونچا بولو۔ جتنا اُونچا بولو گی اتنا ہی ڈر کم ہو گا۔"

"تمہاری عمر تو اتنی نہیں لیکن تم باتیں بڑوں جیسی کرتے ہو" — اُس نے کہا — "تم کس طرح جانتے ہو کہ ...."

"یہ میرا تجربہ ہے" — میں نے کہا — "میں جس رات ڈاکوؤں کی قید سے بھاگا تھا، وہ رات اندھیری اور طوفانی تھی۔ میں نے اونچی آواز میں اپنے آپ سے باتیں کی تھیں اور میں نے پاگلوں کی طرح قہقہے بھی لگائے تھے۔ ان سے ڈر دب گیا تھا۔ میں دلیر ہو گیا تھا .... بولتی رہو اور اونچا بولو۔"

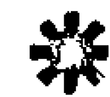
"کیا تم اندازہ کر سکتے ہو میں کتنی خوبصورت ہوں؟" — اُس نے کہا — "مجھے اپنی خوبصورتی پر اتنا ناز تھا کہ میں انسان کو انسان سمجھا ہی نہیں کرتی تھی" — اُس کی آہ نکل گئی۔ گھونٹ سا نگل کر بولی — "اور میں نے یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ حسن و جوانی کو زوال بھی آیا کرتا ہے۔"

"اب پچھتانے سے تو کچھ نہ ہوگا" — میں نے کہا — "لیکن میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ نواب کی بیگم بن کر تم نے اپنے آپ کو افسانوں کی دیوی سمجھ لیا تھا۔ تم سمجھتی تھیں کہ اس محل کے احاطے کے اندر جو لوگ رہتے ہیں، ان کی زندگی اور موت تمہارے ہاتھ میں ہے، اور تم نے اپنے آپ کو یہ یقین بھی دلا لیا تھا کہ تم سے موت بھی ڈرتی ہے۔"

"ہاں سکندر!" — اُس نے کہا — "میں نے یہی سمجھا تھا .... اور .... اور .... میں کچھ محسوس کر رہی ہوں سکندر! درد کی ایسی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں جیسے میرے وجود میں بچھو رینگ رہے ہیں اور مجھے ڈس رہے ہیں" — اُس نے لپک کر میرا ہاتھ تھام لیا اور بولی — "میں اذیت سے مر رہی ہوں۔ میں موت کی تلخی محسوس کر رہی ہوں .... یہاں .... اوہ! یہاں پانی نہیں ہوگا۔"

"یہ تلخی پانی سے نہیں بجھے گی" — میں نے اُسے کہا — "اسے اُگل دو۔"

اور وہ تلخیاں اُگلنے لگی۔



"میں کسی امیر ماں باپ کی بیٹی نہیں تھی" — اُس نے کہا — "وہ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ عزت کی روٹی کھاتے تھے اور شہر میں میرے باپ کی شرافت مشہور تھی۔ مجھے خدا نے حُسن کی دولت دے دی اور آج یہ دولت مجھے یہاں لے آئی ہے۔ بچپن میں ہی مجھ میں اُڑتے پنچھی جیسی خصلت پیدا ہو

گئی تھی۔ میں لڑکوں کے کھیل کھیلا کرتی تھی لیکن اپنے آپ کو ایک خوبصورت لڑکی ہی سمجھا کرتی تھی ....

"میں پندرہ سولہ سال کی تھی جب میرے ایک ماموں زاد کے ساتھ میری بات پکی کر دی گئی۔ وہ مجھے بہت چاہتا تھا۔ اُس کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی۔ میں اُس کی آنکھوں میں اپنی محبت دیکھا کرتی تھی۔ وہ مجھے اچھا لگنے لگا اور ایک روز میں نے اُسے اپنے دل میں بٹھا لیا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی اور اب اُس کے پاس آنے کو بے تاب ہوں۔ میں اُس پر ایک خمار اور ایک نشہ بن کر طاری ہو گئی ....

"شہر سے کچھ دُور ایک گاؤں میں میرا ننہال تھا۔ نانی کو مجھ سے بہت پیار تھا۔ وہ گاؤں مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ گاؤں سے باہر آموں کے پیڑ تھے۔ کھیتوں کا سبزہ تھا۔ وہاں مور بہت ہوتے تھے۔ جس طرح یہ گدھ بیٹھے ہوتے ہیں اس طرح وہاں مور بیٹھتے اور اُڑتے نظر آتے تھے۔ قریب سے ایک ندی گزرتی تھی۔ وہاں چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں۔ ندی اِن کے درمیان سے بَل کھاتی گزرتی تھی۔ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ میں اکثر اس گاؤں میں جاتی اور نانی مجھے کئی کئی دن اپنے پاس رکھتی تھی۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ ساری عمر وہیں رہوں ....

"ایک بار میں اس گاؤں میں گئی۔ میری عمر اُنیس سال ہو چکی تھی اور شادی ابھی نہیں ہوتی تھی کیونکہ لڑکے والے ابھی پورا زیور نہیں بنا سکے تھے۔ میرے جہیز کی بھی کچھ چیزیں کم تھیں۔ میرا ہونے والا دُولہا میری محبت میں دیوانہ ہُوا جا رہا تھا۔ میں پردہ نہیں کرتی تھی۔ پردے کو میں نے قبول ہی نہیں کیا تھا۔ ماموں زاد کے ساتھ میری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا، آؤ اپنے اپنے ماں باپ سے کہیں کہ ہمارے لئے اور کچھ نہ بنائیں۔ بس شادی کر دیں لیکن ایسا ہو نہیں سکتا تھا ....

"میں کہہ رہی تھی کہ میں نانی کے گاؤں میں گئی ہوتی تھی۔ دو لڑکیوں کے ساتھ میں ندی پر چلی گئی۔ وہاں کئی جگہ ندی کا پانی کنارے سے باہر آجاتا ہے

اور اس کے ارد گرد ذرا اُونچی ٹیکریاں ہیں جن پر درخت بھی ہیں اور اُونچی گھاس بھی۔ یہ جگہ مجھے زیادہ اچھی لگا کرتی تھی۔ میری دونوں سہیلیاں مجھ جیسی ہی آزاد خیال اور کھلنڈری تھیں۔ وہ کپڑوں سمیت ندی میں اُتر گئیں۔ میں اُس طرف چل پڑی جہاں پانی ٹیکریوں کے اندر چلا جاتا ہے ....

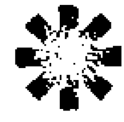
"ایک ٹیکری سے بائیں کو مُڑی تو میرے قدم رُک گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی۔ موڑ مُڑتے ہی ایک گھوڑا میرے آگے آگیا تھا۔ سوار نے گھوڑے کو روک لیا تھا۔ میرا سر گھوڑے کے مُنہ کے ساتھ لگ گیا تھا۔ میں ایک طرف ہوگئی اور سوار کو دیکھا۔ وہ کوئی خوبصورت جوان تھا۔ میرے ہونے والے دُولہا سے زیادہ خوبصورت تو نہیں تھا لیکن اتنے اچھے گھوڑے پر وہ مجھے زیادہ اچھا لگا ....

"اُس کی عمر چوبیں پچیس برس ہو گی۔ اُس کی مُسکراہٹ نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ میں نے چاہا کہ وہ گھوڑے پر بیٹھا رہے اور میں اُسے دیکھتی رہوں اور وقت یہیں رُک جائے۔ اُس کی آواز نے مجھے بیدار کر دیا اور میں نے دیکھا کہ گھوڑے کے پیچھے دو آدمی کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ دونوں کے پاس ایک ایک بندوق تھی۔ سوار نے پوچھا تھا ——— 'ڈر گئی ہو؟' ....

"میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوتے جواب دیا ——— 'نہیں تو .... میں کسی سے ڈرنے والی نہیں' ——— پھر میں نے اُس پر یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ میں واقعی ڈرنے والی نہیں۔ وہ گھوڑے سے اُترا اور اُس کے ساتھ جو دو آدمی تھے انہیں کہا کہ وہ گھوڑا اُوپر لے جائیں .... اب میں ڈرنے لگی۔ ڈر یہ تھا کہ یہ کوئی ڈاکو ہو گا۔ ڈاکو نہ ہُوا تو کوئی عیاش، بدکردار امیرزادہ ہو گا، لیکن وہ ڈاکو لگتا نہیں تھا۔ میرے ذہن میں ڈاکوؤں اور رہزنوں کا تصوّر کچھ اور تھا .... ڈراؤنی اور مکروہ شکلوں والے .... وہ ایسی شکل والا نہیں تھا ....

"وہ میرے قریب آیا تو میں پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے کہا ——— 'تم تو کہتی تھیں کہ تم کسی سے ڈرنے والی نہیں ہو' ——— میں زیادہ دلیر ہو گئی اور اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اُس نے کہا ——— 'میں وہ ہوں جس کی خدمت میں

لونڈیاں کھڑی رہتی ہیں لیکن تمہارا غلام ہوں .... کہاں کی رہنے والی ہو؟' ....



"میں نے اُسے بتایا اور یہ بھی بتایا کہ میں اس گاؤں میں آتی رہتی ہوں۔ میں نے چاہا کہ میری سہیلیاں آجائیں اور یہ شخص چلا جائے لیکن میں نے یہ بھی چاہا کہ سہیلیاں نہ آئیں اور یہ شخص کچھ دیر اور یہیں رہے۔ اُس نے میرے متعلق سب کچھ ہی پوچھ لیا اور اپنے متعلق یہ بتایا کہ وہ اس نواب کا بیٹا ہے جس کی میں بیگم بنی تھی۔"

نواب کے شہر اور گلشن آرا کے شہر میں تقریباً ایک سَو میل کا فاصلہ تھا۔ اُس نے اپنا نام نواب زادہ حمید اللہ خان بتایا تھا۔ وہ شکار کا شوقین تھا اور اکثر اُس طرف شکار کھیلنے جایا کرتا تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی وہ گلشن آرا کے اعصاب پر چھا گیا۔ اُس نے گلشن آرا کے ساتھ کوئی ایسی بات نہ کی جس سے اُسے شک ہوتا کہ یہ کوئی بدکار آدمی ہے۔

اگر میں اور گلشن آرا کہیں اور بیٹھے ہوتے ہوتے تو وہ پُرلطف انداز اور لہجے میں مجھے اپنی محبت کا یہ قصّہ سناتی مگر ہم موت کے انتظار میں بیٹھے تھے اور گلشن آرا مجھے یہ قصّہ اقبالِ جُرم کے لہجے میں سنا رہی تھی۔ اُس کے انداز میں شرمساری تھی، پچھتاوا اور تاسُف تھا۔



پھر وہیں کہیں، ندی کے قریب ایک ہری بھری اوٹ میں اُن کی دوسری ملاقات ہوئی۔ پہلی اور دوسری ملاقات میں مہینے ڈیڑھ مہینے کا وقفہ تھا۔ اب نواب زادہ حمید اللہ نے گلشن آرا کو اپنے متعلق بہت کچھ بتایا اور اُسے ایسے سبز باغ دکھائے جو گلشن آرا نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

اِس بوڑھے نواب کی تین بیویاں منکوحہ تھیں جن میں سے ایک گلشن آرا تھی۔ غیر منکوحہ بیویوں کا کوئی حساب نہیں تھا۔ یہ بدلتی رہتی تھیں۔ ان میں دو تین ایسی تھیں جنہیں نواب نے جھانسہ دے رکھا تھا کہ اُس کی منکوحہ ہیں لیکن

وہاں سب کی حیثیت یہی تھی جو گلشن آرا کی تھی، یعنی جس نے کوئی غلط حرکت کی، نواب نے اُسے مرنے کے لئے اس قید خانے میں ڈال دیا یا اُسے زہر دلوا کر اُس کی موت کا اعلان کر دیا اور باقاعدہ جنازہ پڑھا اور محل میں اُس کا سوگ بھی منایا گیا۔

بیویوں اور داشتاؤں سے جو اولاد تھی وہ نواب صاحب کی اولاد کہلاتی تھی، یعنی نواب زادے اور نواب زادیاں۔ نواب زادہ حمید اللہ خان نواب کی ایک منکوحہ بیوی کا بیٹا تھا۔ چونکہ وہ جائز بیٹا تھا اور خود سر اور جرأت مند بھی تھا اس لئے نواب سے اپنے پورے حقوق لیتا تھا۔ دوسرے بیٹوں میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ حمید اللہ نے شکار کا شوق پیدا کیا تو نواب سے پوری مراعات اور اخراجات لینے لگا۔ وہ شکار کھیلنے وہاں سے ایک سو میل دُور جایا کرتا تھا۔ وہاں ہرن، ہڑیال اور نیل گائے کا شکار عام تھا۔

گلشن آرا کے ننھیال اور اُس کے شہر کے درمیان ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ یہ انگریزوں نے اپنے لئے اور نوابوں اور مہاراجوں کے قیام کے لئے بنوایا تھا۔ یہ لوگ شکار کھیلنے آتے تو اس ڈاک بنگلے میں ٹھہرتے تھے۔ حمید اللہ بھی وہیں ٹھہرتا تھا۔ اُس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔

"میں شاید تمہارے انتظار میں تھا گلشن!" ــــ اُس نے دوسری ملاقات میں گلشن آرا سے کہا ــــ "تم اس محل کی رانی بنو گی۔ نواب صاحب عمر کے آخری دنوں میں ہیں اور اُن کا سب سے پہلا وارث میں ہوں۔"

"والد صاحب کی جگہ تم نواب بنو گے؟" ــــ گلشن آرا نے پوچھا۔

"ہاں" ــــ حمید اللہ نے جواب دیا ــــ "اور تم میری بیگم ہو گی۔"

"سُنا ہے نوابوں کی بہت سی بیگمات ہوتی ہیں" ــــ گلشن آرا نے کہا ــــ "تم مجھے اپنے حرم میں قید کر دو گے۔"

"میں ایسی نوابی کے سخت خلاف ہوں" ــــ حمید اللہ نے کہا ــــ "اور تم وہ چاند ہو جس کے سامنے ستاروں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔"

"سکندر!" ــــ گلشن آرا نے مجھے اس ملاقات کی تفصیلات سناتے

ہوئے کہا ــــ "اُس نے جب مجھے بتانا شروع کیا کہ کسی نواب یا نواب زادے کی بیگم بننے والی کیا سے کیا بن جاتی ہے تو میں نے محسوس کیا کہ میں کسی نواب کی بیگم بننے کے لئے پیدا ہوئی ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے ہیرے جواہرات چمکنے لگے اور مجھے تخت و تاج نظر آنے لگا۔ اس کے ساتھ حمید اللہ نے محبت کا جو دیوانہ وار اظہار کیا تو میں اپنے آپ کو بھلا بیٹھی۔"

حمید اللہ نے اُس سے پوچھا کہ وہ اُس کے باپ سے رشتہ مانگے؟

"نہیں" ــــ گلشن آرا نے کہا ــــ "میرا باپ شریف اور با اصول انسان ہے۔ وہ نہیں مانے گا ..... اور وہ اس لئے بھی نہیں مانے گا کہ میری بات پکی ہو چکی ہے۔"

"کیا تم بھی اسی بات کو پکا سمجھو گی؟" ــــ حمید اللہ نے پوچھا۔

"کوئی راستہ بتاؤ" ــــ گلشن آرا نے پوچھا۔

"راستہ صاف ہے" ــــ حمید اللہ نے کہا ــــ "تم نے کسی کے گھر تو جانا ہی ہے۔ اپنے ماں باپ کے گھر تو نہیں بیٹھی رہنا۔ میرے ساتھ آجاؤ۔ محل میں لے جا کر نکاح پڑھا جائے گا۔"

گلشن آرا تیار ہو گئی۔ یہ ملاقات اس وعدے پر ختم ہو گئی کہ گلشن آرا اس کے ساتھ گھر سے نکل آئے گی۔



"پھر مجھ سے وہ گناہ سرزد ہُوا جس کے متعلق میں نے تمہیں کہا تھا کہ خدا کبھی نہیں بخشے گا" ــــ گلشن آرا نے مجھے سنایا ــــ "میں دوسرے دن گاؤں سے شہر گئی تو میرا ماموں زاد جس کے ساتھ میری شادی طے پاتی تھی، موقع پیدا کر کے بڑی بے تابی سے مجھے ملا۔ کہنے لگا اتنے دنوں کے لئے نہ چلی جایا کرو، میں اتنی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ اُس نے کئی اور جذباتی باتیں کیں .....

"وہ جذبات میں بہہ رہا تھا اور مجھے اپنے اندر سے اُٹھتی ہوئی ایک آواز کہہ رہی تھی ــــ نہ گلشن! یہ تو بہت چھوٹا آدمی ہے۔ اس سے اچھے

تو محل میں تمہیں نوکر مل جاتیں گے۔ ایک نواب زادہ تمہاری راہ دیکھ رہا ہے،
—— میں نے اپنے اس ماموں زاد کے جذبات کا جواب ایسی سرد مہری سے دیا جسے اُس نے صاف طور پر محسوس کیا۔ اُس کی سادگی کا یہ عالم کہ اُس نے پریشان ہو کر مجھ سے پوچھا کہ میری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ میں نے سر درد کا بہانہ کر کے اُسے ٹال دیا۔ وہ ٹل تو گیا لیکن بہت پریشان ہو گیا ....

"وہ مجھے آزادی سے نہیں مل سکتا تھا۔ تین چار دنوں بعد اُس نے ملنے کا موقع پیدا کر لیا۔ ان تین چار دنوں میں میرے اندر بہت بڑا انقلاب آچکا تھا۔ میں نواب زادہ حمید اللہ، ہیرے جواہرات اور اُس کی محبّت کی دیوانگی کی باتوں میں کھوئی رہی تھی۔ میرے حسن و جوانی کی جو تعریف اُس نے کی تھی وہ اور کوئی نہیں کر سکتا تھا، یا کم از کم میرا ماموں زاد نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو تصوّر میں نوابزادی اور شہزادی بن گئی تھی۔"

گلشن آرا اقبالِ جُرم کے انداز میں مجھے سُنا رہی تھی کہ اُس کے دماغ میں اپنے حُسن کا اور ایک نواب زادے کی محبت کا تکبّر سما گیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اپنے ماں باپ کو بھی حقیر سمجھنے لگی تھی۔ اُس کا ماموں زاد دوسری بار آیا تو اُس نے سب سے پہلے گلشن آرا کی صحت کی پوچھی۔

"اکرام!" —— گلشن آرا نے اُسے کہا —— "مجھے اب دل سے اُتار دو۔"

ماموں زاد نے اُسے حیرت سے پھٹی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں اکرام!" —— گلشن آرا نے کہا —— "اپنے ابّا اور امّی سے کہو کہ تمہارے لیئے کوئی اور لڑکی دیکھ لیں۔"

"کیا کہہ رہی گلشن؟" —— ماموں زاد نے اُکھڑی ہوئی آواز میں پوچھا —— "تمہارا دماغ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔"

"میں وہی کہہ رہی ہوں جو تم سُن رہے ہو" —— گلشن آرا نے لفظوں پر زور دے کر کہا —— "میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔"

"تم میرے ساتھ شادی نہیں کرو گی!" —— ماموں زاد نے اُس کے

الفاظ آہستہ آہستہ دُہراتے اور اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"ہاں!" —— گلشن آرا نے کہا —— "سمجھ گئے ہونا؟ .... جاؤ اور آج کی ملاقات کو آخری ملاقات سمجھو۔"

"لیکن گلشن!" —— ماموں زاد نے اپنے آپ کو سنبھال کر اور ذرا دلیر ہو کر کہا —— "تم کون ہوتی ہو شادی سے انکار کرنے والی؟ یہ تو ہمارے بزرگوں کا فیصلہ ہے جو ہم دونوں کو ماننا پڑے گا۔ اپنی امّی اور اپنے ابّوجی سے کہو کہ وہ میرے باپ کو جواب دے دیں۔"

"میں تمہیں جواب دے رہی ہوں" —— گلشن آرا نے کہا —— "اسی کو کافی سمجھو .... یہ بھی سن لو کہ تمہارے ساتھ میری شادی ہو بھی گئی تو میں تمہیں قبول نہیں کروں گی۔ نہ دل سے تمہیں چاہوں گی نہ اپنے جسم کو ہاتھ لگانے دوں گی۔"

ماموں زاد مِنّت سماجت پر اُتر آیا، پھر اُس کے آنسو نکل پڑے۔

"یہ کیا ہے؟" —— اُس نے گلشن آرا سے پوچھا —— "کیا تمہارے امّی ابّو مجھے پسند نہیں کرتے؟"

"میں .... میں!" —— گلشن آرا نے اُونچی اور طنزیہ آواز میں کہا —— "میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔"

"تو کیا اتنے دن مجھے دھوکہ دیتی رہی ہو؟"

"جو جی میں آتے سمجھ لو" —— گلشن آرا نے کہا —— "اور اب چلے جاؤ .... یہ بھی سن لو، شادی رُکوانا تمہارا کام ہے۔ شادی ہو گئی تو میں تمہیں دُھتکار دوں گی۔"

وہ چلا گیا۔ اُس نے دوسرے دن تین چار صفحوں پر اپنے دل کا حال لکھا۔ ان کاغذوں کو تہہ کیا۔ کسی بہانے گلشن آرا کے گھر آیا اور یہ کاغذ اُس کے پاس پھینک کر چلا گیا۔ گلشن آرا نے یہ طویل تحریر پڑھی۔ اُس کے ماموں زاد نے محبّت کی شدت کا اظہار کیا اور محبت کی بھیک مانگی تھی۔ آخر میں اُس نے لکھا تھا کہ گلشن آرا نے محبّت کا جواب محبّت سے نہ دیا تو وہ خودکشی

کرے گا۔

گلشن آراء نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر صرف یہ الفاظ لکھے ——

"خودکشی کرلو گے تو یہ مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا" —— اور وہ کاغذ کا یہ ٹکڑا اپنے ماموں زاد کے ہاتھ میں دے آئی۔



اُسی شام سورج غروب ہونے کو تھا کہ گلی سے کسی کی آواز آئی ——

"اکرام گاڑی کے نیچے آکر کٹ گیا ہے"۔

پھر یہ آواز سارے محلے میں پھیل گئی۔ لوگ دوڑتے جا رہے تھے۔ وہ اکرام کی کٹی ہوئی لاش دیکھنے جا رہے تھے۔ بہت بڑا حادثہ تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا اکرام کٹ گیا تھا۔

"اُس کے مرنے کا مجھے ذرا سا بھی افسوس نہ ہُوا" —— گلشن آراء مجھے سُنا رہی تھی —— "البتہ ایک پریشانی نے مجھے گھیر لیا۔ خیال آیا کہ اکرام نے گھر میں یا اپنی جیب میں رقعہ ضرور چھوڑا ہوگا کہ وہ مجھ سے مایوس ہو کر خودکشی کر رہا ہے .... میں اپنی امی کے ساتھ اُس کے گھر چلی گئی۔ اُس کی ماں بیہوش پڑی تھی۔ محلے کی عورتوں کا ہجوم تھا۔ میں اتنی پتھر دل ہو گئی تھی کہ مرنے والے کی ماں کی بے ہوشی نے بھی مجھ پر کچھ اثر نہ کیا۔ مجھے اطمینان سا تھا کہ میرے راستے سے رکاوٹ ہٹ گئی ہے۔ میں ڈرتی تھی کہ حمید اللہ کے پیچھے گھر سے بھاگ جانے سے پہلے میری شادی ہو جائے گی"۔

گلشن آراء بولتے بولتے چُپ ہو گئی۔ اُس کے آنسو بہہ نکلے تھے اور وہ سامنے دیوار پر دیکھ رہی تھی جہاں اب ایک کی بجائے دو گِدھ بیٹھے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

"میں نے ماں کے اکلوتے بیٹے کو قتل کر دیا تھا" —— گلشن آراء نے سِسکی سی لے کے کہا —— "اُسے ریلوے لائن تک میں نے پہنچایا تھا .... مجھے سزائے موت سات آٹھ سال بعد ملی ہے۔ میں نے اکرام کو ایسی ہی اذیت میں ڈالا تھا جس میں آج خود پڑی ہوں۔ اکرام کا تو لوگوں

نے جنازہ پڑھا تھا۔ ہر کسی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میرا تو جنازہ بھی نہیں پڑھا جائے گا۔ میرے غم میں آنسو بہانے والا کوئی نہیں ہوگا اور میری لاش کو ...."

"اب پچھتاؤ نہیں گلشن!" —— میں نے اُسے کہا —— "باتیں کرتی رہو ورنہ تڑپ تڑپ کر مرو گی .... آگے سناؤ کیا ہُوا تھا؟"

"زیادہ تر لوگ یہی کہتے تھے کہ اکرام نے خودکشی کی ہے" —— گلشن آراء نے کہا —— "لیکن کچھ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ ریل کی پٹڑی سے گزرتا مارا گیا ہے۔ صرف مجھے معلوم تھا کہ اکرام نے خودکشی کی ہے اور اس کی وجہ کیا ہے۔ اکرام نے اپنے پیچھے کوئی تحریر نہیں چھوڑی تھی"۔

وہ پھر چپ ہو گئی اور خلا میں ایسے دیکھنے لگی جیسے اُسے کوئی چیز نظر آ رہی ہو۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ اُلٹی طرف سے اپنے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ وہ پیچھے کو سرکنے لگی پھر میرے پیچھے ہو گئی۔ وہ تو خوف سے مر رہی تھی۔

"وہ دیکھو سکندر!" —— اُس نے بازو ایک طرف بڑھا کر کہا —— "وہ آ رہی ہے۔ وہ میری طرف آ رہی ہے"۔

"ذرا سا حوصلہ کرو گلشن!" —— میں نے کہا اور اُسے سنبھالنے کے لئے پیچھے کو مُڑا۔

"تم دیکھ نہیں رہے؟" —— اُس نے کہا —— "وہ دیکھو اکرام کی ماں آ رہی ہے"۔

میں نے اُدھر دیکھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہاں اکرام کی ماں کسی طور نہیں آ سکتی تھی۔ گلشن آراء کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔

"اسے روکو سکندر!" —— گلشن آراء نے کہا —— "اس کے ناخن دیکھو، اس کے دانت دیکھو۔ یہ کوئی درندہ ہے عورت نہیں"۔

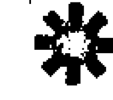
وہ واہمہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اکرام کی ماں کا مجرم سمجھ رہی تھی۔ اُس کے گناہ اُس کے سامنے ناچ رہے تھے۔ اُسے اکرام کی ماں

اُس کے گناہوں کی صورت میں نظر آرہی تھی۔ یہ اس کے ضمیر کا ننگا ناچ تھا۔

"یہاں کچھ بھی نہیں گلشن!" — میں نے کہا۔

"وہ دیکھو" — اُس نے کہا — "وہ رُک گئی ہے اور مجھے گھُور رہی ہے۔"

وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہی تھی۔ دیوار پر اور درختوں پر چار پانچ اور گِدھ آبیٹھے تھے۔ میں بڑی جان لیوا کوشش سے گلشن آراء کو نارمل حالت پر لایا مگر میں اُس کے رونے پر قابو نہ پا سکا۔ اُس میں جرأت آہی نہیں سکتی تھی۔ گناہ جرأت کو کھا جاتے ہیں۔



اکرام کی خودکشی کے بیس پچیس روز بعد گلشن آراء رات کو جب اُس کے گھر والے گہری نیند سوتے ہوتے تھے، گھر سے نکلی۔ گلی کی نکڑ پر نواب زادہ حمیداللہ کا آدمی کھڑا تھا۔ وہ اُسے اُس زمانے کے سفید برقعے میں چھپا کر ساتھ لے گیا۔ وہ برقعہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

"یہ آدمی دن کو بھکاری فقیر کے بھیس میں آیا تھا" — گلشن آراء نے مجھے بتایا — "حمیداللہ دوسری ملاقات میں مجھے بتا گیا تھا کہ کسی روز ایک فقیر تمہارے دروازے پر صدا لگائے گا۔ اُسے تم کچھ دینے کے بہانے باہر آجانا۔ وہ تمہیں بتا دے گا کہ کیا کرنا ہے .... میں نے یہ سارے دن اس فقیر کے انتظار میں گزارے اور ایک روز وہ آگیا۔ میں دروازے تک گئی اور اُس نے مجھے پیغام دے دیا۔"

"تمہیں گھر چھوڑنے کا افسوس تو ہُوا ہوگا" — میں نے کہا۔

"ذرا سا بھی نہیں" — اُس نے جواب دیا — "مجھ پر نشہ سا طاری تھا۔"

گلشن آراء رات کی گاڑی سے روانہ ہوئی اور صبح نواب کے محل میں پہنچ گئی۔ حمیداللہ نے اُسے ایک شاہانہ کمرے میں رکھا اور اُسے کہا

کہ وہ نواب صاحب سے شادی کی اجازت آج ہی لے لے گا۔ گلشن آراء کے آگے جب کھانا رکھا گیا تو وہ حیران رہ گئی۔ اُس کے لئے بعض کھانے عجیب و غریب تھے۔ اُسے بڑی خوبصورت نوکرانیوں نے نہلایا اور ریشمی لباس پہنایا تھا۔ عطر جو اُسے لگایا گیا اس سے تو وہ مدہوش ہونے لگی۔

حمیداللہ اُس کے ساتھ رہا اور شام سے کچھ پہلے اُسے یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ اپنے باپ نواب صاحب سے شادی کی اجازت اور انتظامات کی بات کرنے جارہا ہے۔ گلشن آراء اس کا انتظار کرتی رہی مگر شام کے بعد اُس کی بجائے ایک عورت یہ پیغام لے کر آئی کہ نواب صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ گلشن آراء اس عورت کے ساتھ چلی گئی۔ اتنے قیمتی لباس میں اُس کی چال ہی بدل گئی تھی۔ اُسے نواب کے کمرے میں داخل کر دیا گیا۔

"آ، میرے پاس بیٹھ لڑکی!" — نواب نے اُسے کہا — "ہمارا بیٹا واقعی ہیرا لایا ہے۔ وہ ہمارے ذوق کو جانتا ہے۔ بڑا برخوردار بیٹا ہے۔"

گلشن آراء اُس کے پاس بیٹھ گئی اور نواب نے اُسے اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے کر اپنے قریب کر لیا۔

"نام؟"

"گلشن آرا!"

"بہت پیارا نام ہے" — نواب نے کہا — "تُو ہمارے دل کا گلشن ہے۔ ہمارے بیٹے نے ہمیں جوان کر دیا ہے۔"

"نواب صاحب!" — گلشن آراء نے جھجکتے شرماتے پوچھا — "آپ نے اُنہیں شادی کی اجازت دے دی ہے؟"

"اُنہیں کون؟"

"اپنے بیٹے کو!" — گلشن آراء نے کہا — "نواب زادہ حمیداللہ خان کو آپ نے میرے ساتھ شادی کرنے کی ...."

نواب کا قہقہہ بلند ہُوا۔

"احمق لڑکی!" — نواب نے ہنستے ہوئے کہا — "تُو نوابوں کی

چیز ہے نواب زادوں کی نہیں۔ تیری شادی ہمارے ساتھ ہوگی۔ تجھے ہم حرم میں نہیں اپنے سینے سے لگا کر رکھیں گے۔"

"تو کیا نواب زادہ حمید اللہ خان مجھے دھوکے سے یہاں لایا ہے؟"

"جیسے بھی لایا ہے لے آیا ہے" — نواب نے کہا — "لیکن ہیروں کے قدر دان ہم ہیں۔ ہم تجھے ایک اوباش نواب زادے کی بیوی بنا کر تجھ پر ظلم نہیں کرنا چاہتے۔"

گلشن آرا کو چکر آنے لگے لیکن جس چکر میں وہ آ گئی تھی اس سے اب نکل نہیں سکتی تھی۔ رات کو نکاح خواں آ گیا اور نکاح ہو گیا۔ نواب کا خزانہ بھرا ہوا تھا لیکن اس کا جسم کھوکھلا ہو چکا تھا۔ جسم کا خزانہ خالی ہو چکا تھا۔

نواب زادہ حمید اللہ لاپتہ ہو گیا۔

گلشن آرا پنجرے میں پنچھی کی مانند کچھ دن تڑپی پھر اس کا دل لگ گیا۔ نواب نے اسے اپنی چہیتی بیگم بنا لیا تھا۔ وہ دن رات اسے اپنے ساتھ رکھتا۔ اپنے کئی حکم اس کی زبان سے دلواتا تھا۔ اس نے گلشن آرا کو صحیح معنوں میں ملکہ بنا دیا تھا۔ سیر و تفریح کے لئے چار گھوڑوں کی بگھی تھی۔ وہ باہر نکلتی تھی تو دو گھوڑ سوار محافظ برچھیوں اور تلواروں سے مسلح اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ راستے میں آنے والے لوگ رک جاتے اور جھک جاتے تھے۔

"میں تو آسمان پر پہنچ گئی تھی" — گلشن آرا نے مجھے سنایا — "ایک روز محل کے دو ملازم چوری کرتے پکڑے گئے۔ نواب نے مجھے کہا کہ میں گواہوں کے بیان سنوں اور انہیں سزا دوں.... سکندر! میں اچھے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی کہ میں جب بادشاہوں جیسی کرسی پر بیٹھی ایک ایک گواہ کے بیان سنتی تھی تو میں نے اپنے آپ کو کیا سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ہر گواہ میرے سامنے آتا تھا تو وہ دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر اتنا جھک جاتا کہ اس کا ماتھا فرش کے قریب پہنچ جاتا تھا....

"پھر میں آج افسانے اور من گھڑت قصے لگتی ہیں۔ مثلاً آج کے دور
کہنے پر میں۔ ت ہی عجیب لگتی ہے کہ پچاس سال عمر کا آدمی تندرست و توانا
تو مجھے لطف سے ے چہرے پر صحت اور جوانی کی سرخی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ
اور میرا قد اونچ ں چھ فٹ عام قد ہوا کرتا تھا اور صحت اور تندرستی کا معیار
کوڑے برداشت نے بیان کیا ہے۔
بتایا کہ ایک تو م "نواب کا قصہ سنا رہا ہوں، یہ بھی آج کے دور میں الف لیلہ
جاتے گا.... یہ کیہ ایک باب لگتا ہے۔ صرف وہ لوگ اسے حقیقت سمجھتے
بن گئی۔" دور دیکھا ہے۔ ایسے لوگ ابھی زندہ ہیں۔ نوابوں، مہاراجوں
"تمہارے ذ اگست ۱۹۴۷ء میں ختم ہوا تھا جب انگریز یہاں سے
ہے" — میں نے کہا۔ اور مہاراجے اپنی ریاستوں میں کالا قانون چلاتے تھے۔
"ہاں!" — گلشن ں الفظ قانون ہوتا تھا۔ ان میں سے بعض اپنی رعایا
کے پیار کو ہی میں کافی سے کراتے تھے۔ رعایا سے بیگار لیتے تھے۔ ان میں
کھیلتا تھا جیسے بچہ چابی وا سے زیادہ ظالم تھا اور اس کے ظلم کا نشانہ مسلمان

گلشن آرا اس جہنم میں جو اب بھی ہو گزرے ہیں جن کی ریاستوں میں
پاس بیٹھی مجھے محل میں گزاری ہوئی ر پہلی رات نواب کے ساتھ گزارتی تھی۔ یہ
عورت انسانی فطرت کی کھلی ہوئی کتاب ہے مقہور رعایا اسے جائز سمجھتی تھی۔ ایسے
پر حکومت کا موقع مل جاتا ہے تو وہ ان کا خدا ت آ جاتی تھی یعنی وہ لڑکی نواب
بھول جاتا ہے جس کے ہاتھ میں ہر بندے کی عزت آ تھی۔
کے ہاتھ میں ہر بندے کی زندگی اور موت ہے۔ ، ایسے بہیر موجود
گلشن آرا مجسم عبرت تھی لیکن میں عبرت حاصل کرتا نہ کرتا جلاتے ہیں
دل کی
نہیں پڑتا تھا۔ میری عمر ختم ہو چکی تھی۔ دل میں اتنا سا اطمینان ضر نہیں
کہ خدا نے مجھے تھوڑی سی جو زندگی دی تھی، میں نے اس میں کسی کا د
نہیں دکھایا تھا اور کوئی ایسا گناہ نہیں کیا تھا کہ مرتے وقت مجھے اپنے
اللہ کے آگے شرمسار ہونا پڑتا۔

چیز ہے نواب زادوں کی نہیں۔ تیری شادی ہمارے ساتھ" میں نے پوچھا
حرم میں نہیں اپنے سینے سے لگا کر رکھیں گے"۔ ب اُس کی
"تو کیا نواب زادہ حمید اللہ خان مجھے دھوکے سے" تھا کہ وہ محل
"جیسے بھی لایا ہے لے آیا ہے"۔۔۔ نواب نے کہا۔۔۔
کے قدر دان ہم ہیں۔ ہم تجھے ایک اوباش نواب زادے کی دن حمید اللہ
تجھ پر ظلم نہیں کرنا چاہیئے"۔ عمان پر پہنچا دیا۔
گلشن آرا کو چکر آنے لگے لیکن جس چکر میں وہ آگئی" زور اور تکبر بھر
اب نکل نہیں سکتی تھی۔ رات کو نکاح خوان آگیا اور نکاح ع سے حمید اللہ
کا خزانہ بھرا ہوا تھا لیکن اُس کا جسم کھوکھلا ہو چکا تھا۔ جونیت میں گھل مل
ہو چکا تھا۔ لی ہے اور اُسے اپنے
نواب زادہ حمید اللہ لاپتہ ہو گیا۔ تو نکیل ڈال کر رکھتی
گلشن آرا پنجرے میں پنچھی کی مانند کچھ دن تڑپ نہ سکی کہ انسان کتنا ہی
گیا۔ نواب نے اُسے اپنی چہیتی بیگم بنا لیا تھا۔ وہا ہے۔
ساتھ رکھتا۔ اپنے کسی حکم اُس کی زبان سے دل آدمی کے ساتھ درپردہ دوستی
صحیح معنوں میں ملکہ بنا دیا تھا۔ سیر و تفریح کے
وہ باہر نکلتی تھی تو دو گھوڑسوار محافظ بر سے رتبہ حاصل تھا یہ تھا خان عثمان
کے ساتھ ہوتے تھے۔ راستے میں بہر پلا دیا تھا۔ یہ شخص نواب کا رازدان
جاتے تھے۔ شخص کے ہاتھ میں تھیں۔ میں نے اسے
"میں تو آسمان ر.. بر گلشن آرا کے کمرے میں دیکھا تھا اور وہ میرے
روز محل کے دو ما
عمان علی خان کی عمر پچاس سال کے قریب تھی مگر اُس کا چہرہ
گواہوں کے یہ تھا۔ اُس کا قد چھ فٹ سے کم نہیں تھا۔ اُس کے چہرے پر بڑھاپے
ہیں بیان بھی آثار نہیں تھے۔ اُس کا جسم بھرا بھرا تھا۔ اُس کی عمر تیس سال سے
گوا یک دن بھی اُوپر نہیں لگتی تھی۔
ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں اُس دَور کی کہانی سُنا رہا ہوں

جس کی کئی باتیں آج افسانے اور من گھڑت قصے لگتی ہیں۔ مثلاً آج کے دَور میں اتنی سی بات ہی عجیب لگتی ہے کہ پچاس سال عمر کا آدمی تندرست و توانا تھا اور اُس کے چہرے پر صحت اور جوانی کی سُرخی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے میں چھ فٹ عام قد ہُوا کرتا تھا اور صحت اور تندرستی کا معیار یہی تھا جو میں نے بیان کیا ہے۔

میں جس نواب کا قصہ سنا رہا ہوں، یہ بھی آج کے دَور میں الف لیلیٰ کی داستان کا ایک باب لگتا ہے۔ صرف وہ لوگ اسے حقیقت سمجھتے ہیں جنہوں نے وہ دَور دیکھا ہے۔ ایسے لوگ ابھی زندہ ہیں۔ نوابوں، مہاراجوں اور راجاؤں کا دَور اگست ۱۹۴۷ء میں ختم ہُوا تھا جب انگریز یہاں سے چلے گئے تھے۔ نواب اور مہاراجے اپنی ریاستوں میں کالا قانون چلاتے تھے۔ اُن کی زبان سے نکلا ہُوا لفظ قانون ہوتا تھا۔ ان میں سے بعض اپنی رعایا سے اپنے آگے سجدے کراتے تھے۔ رعایا سے بیگار لیتے تھے۔ ان میں کشمیر کا ڈوگرہ مہاراجہ سب سے زیادہ ظالم تھا اور اُس کے ظلم کا نشانہ مسلمان ہوتے تھے۔

ہندوستان میں ایسے نواب بھی ہو گزرے ہیں جن کی ریاستوں میں کسی لڑکی کی شادی ہوتی تھی تو وہ پہلی رات نواب کے ساتھ گزارتی تھی۔ یہ حکم ایک رواج بن گیا تھا اور مجبور اور مقہور رعایا اسے جائز سمجھتی تھی۔ ایسے بھی ہوتا تھا کہ دلہن کی بجائے اُس کی قیمت آجاتی تھی یعنی وہ لڑکی نواب صاحب کو پسند آجاتی اور حرم میں داخل کر لی جاتی تھی۔

شاید بعض حضرات کو یقین نہ آئے، پاکستان میں ایسے پیر موجود ہیں جو سال میں ایک مرتبہ مریدوں کے گاؤں میں دَورے پر جاتے ہیں اور جس گاؤں میں جاتے ہیں وہاں انہیں رات کو ٹھہرایا جاتا اور گاؤں کی ایک کنواری لڑکی رات کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ مرید اسے معیوب نہیں سمجھتے بلکہ پیر کو پیش کی ہوتی لڑکی کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔

مجھے احساس ہے کہ میری کہانی پڑھنے والوں میں اکثریت ایسے

خواتین وحضرات کی ہے جنہوں نے وہ وقت نہیں دیکھا اور اُس وقت کے واقعات اور حالات کو ناقابلِ یقین سمجھتے ہیں۔ میں اُن کی تسلّی کے لئے عرض کر دیتا ہوں کہ میری آپ بیتی جلدی ہی اس ماحول سے نکل آئے گی جو آپ کے لئے عجیب اور ناقابلِ یقین ہے، پھر میں آپ کو وہ باتیں سُناؤں گا جو پرانی ہونے کے باوجود آپ کو پُرانی نہیں لگیں گی۔ جب تک اس زمین پر انسان موجود ہے وہ اپنی فطرت کا غلام رہے گا اور اس قسم کی کہانیاں جنم لیتی رہیں گی۔



میں گلشن آراء اور خان عثمان علی خان کی درپردہ دوستی کی بات سُنا رہا تھا۔ ایسا ہونا ہی تھا۔ گلشن آراء جوان لڑکی تھی۔ اُس نے کسی نہ کسی کو دوست بنانا ہی تھا۔ عثمان علی نے اُس کی یہ ضرورت پوری کر دی تو وہ نواب کے ساتھ پہلے سے زیادہ پیار اور محبت کرنے لگی۔ اُس وقت تک گلشن آراء خاصی ہوشیار اور چالاک ہو چکی تھی۔ اُسے جو نوکرانیاں دی گئی تھیں، وہ تجربہ کار عورتیں تھیں۔ انہوں نے گلشن آراء کو کچھ ڈھنگ اور کچھ راستے بتا دیے تھے۔ اگر کچھ کسر رہ گئی تھی تو وہ خان عثمان علی خان نے پوری کر دی۔

اِس شخص نے گلشن آراء کو بتایا کہ نواب زادہ حمید اللہ کہاں ہے۔ حمید اللہ نے نواب سے شادی کی اجازت مانگی تھی۔ نواب نے اُسے کہا تھا کہ وہ لڑکی کو دیکھ کر فیصلہ کرے گا۔ حمید اللہ گلشن آراء کو نواب کے پاس لے جانا چاہتا تھا لیکن نواب کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ اُس نے گلشن آراء کو بلایا تو یہ اُسے پسند آگئی۔ اُس نے رات ہی رات گلشن آراء سے نکاح کر لیا اور صبح حمید اللہ کے ساتھ سودا کیا۔

نوابزادے ہوتے ہی اوباش تھے لیکن حمید اللہ کچھ اور قسم کا اوباش بلکہ بدمعاش تھا۔ اُس کے متعلق یہ بھی سُنا گیا تھا کہ نامی گرامی اور بڑے زبردست قسم کے دو ڈاکوؤں کے ساتھ اُس کے دوستانہ مراسم تھے۔ اُس زمانے میں ایسے ڈاکو ہوتے تھے جو ریل گاڑیاں تک لُوٹ لیتے تھے۔ وہ

ڈاکہ زنی کی بہت بڑی اور بڑی ہی دلیرانہ وارداتیں کیا کرتے تھے۔

حمید اللہ باپ کو پریشان کرتا رہتا تھا۔ خزانچی سے بے تحاشہ پیسے لے جاتا اور عیش وعشرت کرتا تھا۔ اُس کا شکار کا شوق بھی بہت مہنگا تھا۔ وہ نواب کی جانشینی کی اُمید بھی لگائے بیٹھا تھا بلکہ اپنے آپ کو ولی عہد سمجھتا تھا۔ عثمان علی خان نے گلشن آراء کو بتایا کہ نواب نے اسے کہا کہ وہ تین سو ایکڑ زرعی زمین لے لے اور وہاں جاکر آباد ہو جائے اور ولی عہدی کا خیال ذہن سے نکال دے اور گلشن آراء کو بھول جائے۔

حمید اللہ نے یہ سودا منظور نہ کیا اور باپ بیٹے میں لڑائی جھگڑا ہُوا۔ باپ نے اُسے اپنے ہاتھ یوں دکھائے کہ اُسے پٹوایا اور اپنی حوالات میں بند کر دیا۔ دو دن اُسے پانی تک نہ دیا۔ تیسرے دن اُسے پانی کا صرف ایک گلاس دیا گیا۔ چوتھے روز اُسے بیہوشی کی حالت میں حوالات سے نکالا گیا۔ نواب نے اُسے کہا کہ وہ سودا قبول کر لے ورنہ اُس کی موت کی کسی کو خبر تک نہیں ملے گی

اُس نے سودا قبول کر لیا اور وہاں سے نوّے پچانوے میل دُور زرعی اراضی پر چلا گیا۔

"اُس کے متعلق مجھے پتہ چلتا رہا۔ وہاں وہ بہت بڑا جاگیردار بن گیا تھا" — گلشن آراء نے مجھے سنایا — "دو اڑھائی سال بعد مجھے کسی نے بتایا کہ حمید اللہ نے اپنی جاگیر کو ایک بڑے مشہور ڈاکو کا اڈہ بنا رکھا ہے اور وہاں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو وہاں اور کیا کچھ ہوتا ہوگا۔"

پانچ ساڑھے پانچ سال گزر گئے اور نواب کی نظرِ کرم پھر گئی۔ اب گلشن آراء کو نواب کبھی کبھی نظر آتا تھا۔ اُسے اُس کی خادماؤں نے ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا کہ ایک دن آئے گا کہ نواب اُسے پُرانی جُوتی کی طرح پھینک دے گا اور ذہن سے اُتار دے گا کہ گلشن آراء نام کی کسی عورت کو وہ کبھی جانتا تھا۔

اس دوران محل کے ایک اور آدمی کے ساتھ اُس نے دربردہ دوستی کر لی تھی جس کا خان عثمان علی خان کو کبھی بھی پتہ نہ چل سکا۔ اُس کے ساتھ تو اُس کی دوستی بڑی پکی تھی۔

"تم میرے دماغ پر ایسے غالب آ گئے کہ میں نے اِن دونوں سے تعلقات توڑ لئے"۔۔۔ گلشن آرا نے کہا۔۔۔"حالانکہ تعلقات توڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شاید مجھ سے یہ غلطی کروا کے خدا نے مجھے پکڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ میرا حکم پہلے کی طرح چلتا ہے اور سب مجھ سے ڈرتے ہیں لیکن میں یہ بھول گئی تھی کہ عثمان علی خان نواب پر چھایا ہُوا ہے اور حکم نواب کا کم اور اُس کا زیادہ چلتا ہے۔ اُسے کسی نے بتا دیا کہ میں ناچنے والے ایک لڑکے کو اپنے پاس بلاتی ہوں۔ اُس نے اپنے مخبروں کے ذریعے مجھ پر نظر رکھی اور مجھے پکڑ لیا.... کیا خدا میرا یہ گناہ بخش دے گا کہ میں نے ایک نواب زادے کی خاطر اپنے ماموں زاد کا دل توڑا، اُسے حقارت سے دھتکارا اور اُس کی خودکشی کا باعث بنی؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔"میرا خیال ہے توبہ اور بخشش کا وقت گزر گیا ہے"۔

"میں کم از کم ایک اطمینان دل میں لئے مر رہی ہوں"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔"میں نے تمہیں اپنے گناہ سے آلودہ نہیں کیا۔ یہ تمہارے اثر کا نتیجہ تھا یا اس کی کوئی بھی وجہ تھی۔ میں تم سے شرمسار نہیں۔ اب تم مجھے ایسے لگتے ہو جیسے تم نے میری کوکھ سے جنم لیا ہو.... سکندر! اب ہم کیا کریں گے؟"

"موت کا انتظار!"۔۔۔ میں نے کہا۔

"یہ تو بڑی بے رحمی کی موت ہوگی"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔"مجھے پیاس لگی ہے۔ مُنہ سوکھ رہا ہے"۔

"تین یا چار دن اور!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔"اگر جلدی مرنا چاہتی ہو تو آؤ دوڑیں۔ پیاس لگے گی، بھوک لگے گی، ہم دوڑتے رہیں گے اور پسینے سے جسموں کی نمی جلدی ختم ہو جائے گی"۔

"میں فوراً مر جانا چاہتی ہوں"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔"میں اذیت سے تڑپ تڑپ کر مرنے سے ڈرتی ہوں.... کوئی طریقہ سوچو"۔۔۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولی۔۔۔"وہ دیکھو کتنا بڑا پتھر پڑا ہے۔ میں اُلٹی لیٹ جاؤں گی۔ پتھر اپنے سر سے اُوپر لے جا کر میرے سر پر پھینک دینا۔ میں فوراً مر جاؤں گی"۔

"نہیں گلشن!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔"میں قاتل ہو کر نہیں مرنا چاہتا۔ میں اکیلا بھی تو رہ جاؤں گا"۔

"ہاں!"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔"سُنا ہے یہاں بڑے زہریلے سانپ اور بچھو ہوتے ہیں۔ اگر ہم دونوں کو سانپ ڈس لے تو ہم اُس موت سے بچ جائیں گے جو ہماری جان بڑی آہستہ آہستہ نکالے گی"۔

"ڈرو نہیں گلشن!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔"خدا کو جس طرح منظور ہُوا ہم اُسی طرح مریں گے"۔

"میں فوراً مرنا چاہتی ہوں"۔۔۔ اُس نے کہا۔

میں اُسے تسلی دیتا رہا لیکن اُس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔



گدھ سُوکھے پیڑوں پر اور دیوار پر بیٹھے ہمیں دیکھتے رہے اور ہم اُنہیں دیکھتے رہے اور دن گزر گیا، پھر سورج غروب ہو گیا۔ ہم تھوڑا سا چلے پھرے بھی تھے۔ بھوک اور پیاس اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ گلشن آرا لیٹ گئی۔ شام تک اُس کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اُس کے مُنہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ میں اندھیرے میں دیکھ نہ سکا کہ وہ جاگ رہی ہے یا سو گئی ہے۔ میں اُٹھا اور ٹہلتا ٹہلتا اُس سے دُور چلا گیا۔

ایک جگہ رُک کر میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور میری آہ نکل گئی۔ گزری ہوئی زندگی کے لمحے میری آنکھوں کے سامنے سے اُلٹے قدم گزرنے لگے۔ مجھے ماں یاد آئی تو میں نے لمحوں کے قافلے کو وہیں روک لیا۔ میری ماں گلشن آرا کی طرح خوبصورت عورت تھی۔

"او خدایا!"—— میرے منہ سے نکل گیا —— "میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا! کس گناہ کی مجھے اتنی سخت سزا دے رہا ہے۔ جان واپس لینی ہے تو فوراً لے لے۔ میں گھر سے ایک گناہ سے بھاگا تھا اور یہاں خود بھی ویسے ہی ایک گناہ سے بچا ہوں اور اس عورت کو بھی گناہ سے بچایا ہے۔ کیا یہ ہے تیری خدائی؟ ..... پھر بھی تیری خدائی کو مانتا ہوں"۔

میں نے شاید کچھ اور بھی کہا تھا۔ بہت ساری باتیں کی تھیں خدا کے ساتھ۔ آدھی صدی سے زیادہ عمر گزر گئی ہے۔ منہ سے نکلے ہوئے کئی لفظ یاد نہیں رہے۔ البتہ یہ یاد ہے اور بڑی اچھی طرح یاد ہے کہ خدا کے ساتھ اتنی ساری باتیں کر کے مجھے سکون اور قرار سا آ گیا تھا جو اُس بھیانک اور ہیبت ناک جگہ نہیں آنا چاہیئے تھے۔

مجھے موت کی دبی دبی آہٹ سنائی دینے لگی۔ سر سر کی آوازیں بھی آئیں پھر یہ آوازیں میرے پاؤں کے قریب سے گزر گئیں۔ شاید بڑا لمبا سانپ میرے قریب سے گزر گیا تھا۔ رات خاموش تھی اور یہ خاموشی بڑی ڈراؤنی تھی۔ بڑی ہلکی سی آہٹ بھی بڑی اونچی سنائی دیتی تھی اور جب گلشن آرا کی چیخ سنائی دی تو ایسے لگا جیسے تین چار تیر اکٹھے میری کھوپڑی میں سے گزر گئے ہوں۔ میں دوڑ کر گلشن آرا تک پہنچا۔ وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اُس کے پاس رُکا اور بیٹھ گیا۔

"کہاں چلے گئے تھے تم!"—— اُس نے ہانپتی کانپتی آواز میں کہا اور مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا —— "مجھے اپنے مرنے کا غم نہیں، تمہارا غم ہے۔ اب نہ جانا۔ کہیں نہ جانا۔ میں تمہیں اپنی گود میں لے کر مرنا چاہتی ہوں"۔

اُس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ میں جیسے اُس کی آواز سُن رہا تھا۔

"تم تو سو گئی تھیں"۔

"ہاں، میں سو گئی تھی"—— اُس نے میرے گرد بازوؤں کا شکنجہ اور زیادہ تنگ کرتے ہوئے کہا —— "کوئی تمہیں مجھ سے چھین رہا تھا۔ ماں

سے اُس کے بچے کو نوچ رہا تھا ..... میرے پاس رہو۔ اب نہ جانا"۔

اُس کا ذہن اُس کے قابو سے نکل گیا تھا۔ میں نے اُسے تسلی نہ دی۔

اب تو لمحہ بہ لمحہ حالت زیادہ خراب ہونی تھی۔

"لیٹ جاؤ گلشن!"—— میں نے کہا۔

وہ زمین پر لیٹ گئی اور مجھے گھسیٹ کر اپنے قریب کر لیا۔



سورج کی تپش سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں زمین پر پڑا تھا۔ مجھے چُر چُر چُر کی بڑی کرخت آوازیں سنائی دیں۔ میں نے لیٹے لیٹے اُدھر دیکھا۔ چار پانچ گدھ ہم سے بیس پچیس قدم دُور زمین پر بیٹھے ہمیں دیکھ رہے تھے اور وہ شاید اس بات پر لڑ پڑے تھے کہ ان میں سے ہر ایک ہم تک دوسروں سے پہلے پہنچنے کی کوشش میں تھا۔ گلشن آرا مجھ سے ایک ہاتھ دُور پیٹھ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ مر گئی ہو۔

"گلشن!"—— میں نے اُسے ہلایا۔

اُس نے مُنہ آہستہ آہستہ میری طرف کیا۔ اُس کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔

"عمر کا ایک دن اور کم ہو گیا ہے"—— میں نے کہا۔

اُس نے مُنہ پھیر لیا۔

وہ دن اس طرح گزرا کہ ہم زیادہ وقت بیٹھے رہے۔ کل تو گلشن نے بڑی لمبی کہانی سنا ڈالی تھی مگر اب وہ بول بھی نہیں سکتی تھی۔ میں کوئی بات کرتا تھا تو وہ میری طرف دیکھتی تھی پھر اُس کا سر جھک جاتا تھا۔ ایک بار اُس نے میری طرف دیکھا تو اُس کے آنسو بہنے لگے۔

گدھ جو درختوں اور دیوار پر بیٹھے تھے وہ اب نیچے آ گئے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہاں مرنے کے لئے لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ میں بکھری ہوئی کھوپڑیوں اور ہڈیوں کو دیکھنے لگا۔

گلشن آرا کو دیکھا۔ وہ پھر لیٹ گئی تھی۔ میں اُٹھا اور آہستہ آہستہ چل پڑا۔ گِدھ اُڑے نہیں۔ کُودتے ہوتے ایک طرف ہو گئے۔ دیوار کے قریب ایک کھوپڑی پڑی تھی۔ وہاں کھوپڑیوں کی کمی نہیں۔ یہ میرے قریب تھی۔ میں اسی کے پاس چلا گیا اور بیٹھ گیا۔ ناک اور آنکھوں کی جگہ سوراخ تھے۔ دانت سلامت تھے۔ میں اسے کچھ دیر دیکھتا رہا۔

نگاہ اس کے اردگرد زمین پر گھومی تو مٹی میں چمکتا ہُوا کچھ نظر آیا۔ اُٹھایا تو یہ سونے کا ہار تھا۔ پھر مٹی میں مجھے سونے کی ایک انگوٹھی دکھائی دی۔ اُٹھا کے دیکھی۔ اس میں ہیرا جڑا ہُوا تھا۔

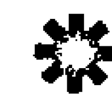
"آہ انسان!" — خیال آیا — "اِس سونے کی خاطر قتل کرتا ہے اور قتل ہوتا ہے۔ انسان اس سونے کے عوض اپنا ایمان دے دیتا ہے مگر انجام کیا ہوتا ہے؟ ہڈیاں بھی مٹی میں پڑی ہیں اور سونا اور ہیرے بھی"۔

ہار اور انگوٹھی دیکھ کر خیال آیا کہ یہ کوئی عورت تھی۔ گلشن آرا جیسی ہو گی۔ اس نے بھی سونے ہیروں سے اندھی ہو کر گھر کو چھوڑا ہو گا۔ اس نے بھی گلشن آرا کی طرح اپنے آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا کر لیا ہو گا کہ سدا جوان رہے گی اور اسی کا حکم چلتا رہے گا۔

اگر انسان اتنی سی بات سمجھ جاتے کہ سدا حکم اُسی کا چلتا ہے جو مٹی کے پُتلے میں جان ڈالتا ہے اور جب چاہتا ہے اس مٹی سے جان نکال کر مٹی کو بکھیر دیتا ہے تو انسان کا انجام اتنا بھیانک نہ ہو۔

میں ٹہلتے ٹہلتے دُور نکل گیا۔ ٹانگوں میں پہلے والی طاقت نہیں رہی تھی۔

وہ دن بھی گزر گیا۔



رات شاید آدھی سے کچھ زیادہ گزر گئی تھی۔ گلشن آرا لاش کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ میں بیٹھا ہُوا تھا۔ پہلے لیٹا رہا تھا لیکن جسم کے اندر سُوئیاں چُبھنے لگی تھیں۔ بے چینی لیٹنے نہیں دیتی تھی۔ پیاس کی شدت سے مُنہ بند

نہیں ہوتا تھا۔ جسم کی نمی تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ اب تھوک نگلنے حلق میں کانٹے چبھتے تھے۔

"کل شام تک گلشن!" — میں نے کہا — "کل شام تک ہم اِس دنیا سے لاتعلق ہو جائیں گے"۔

"مر جائیں گے؟" — گلشن آرا کی سرگوشی سُنائی دی۔

"نہیں" — میں نے جواب دیا — "بے ہوش ہو جائیں گے۔ اذیت کا احساس مٹ جائے گا۔ ہر تکلیف سے نجات مِل جائے گی"۔

وہ خاموش رہی۔ میں بھی خاموش ہو گیا — اور اس خاموشی سے دھمک جیسی آواز اُٹھی۔ میں چونکا۔ کسی آدمی کی آواز بھی آئی۔ میں نے توجہ نہ دی۔ یہ میرے ذہن کی آوازیں تھیں۔ تصوّر بھٹک رہا تھا۔ گلشن آرا تو جیسے دُنیا سے لاتعلق ہو چکی تھی۔

چاند آدھی رات کے بعد اُوپر آتا تھا۔ ابھی اس ہیبت ناک قید خانے کے ساتھ والی پہاڑی کے پیچھے تھا۔ آسمان روشن ہو چکا تھا۔ دیوار کے اُوپر جو خاردار تار لگے ہوتے تھے وہ کالی لکیروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ جن ڈنڈوں کے ساتھ یہ لگے ہوتے تھے وہ بھی نظر آتے تھے۔ میری نظریں تاروں کی لکیروں کو دیکھتے ہوتے چلنے لگیں اور ایک جگہ رُک گئیں۔ وہاں سے تار غائب تھے۔ ان کی لکیریں ٹوٹی ہوئی اور مُڑی مُڑی سی تھیں۔

ایک خیال آیا۔ وہاں سے بھلا دیوار پر چڑھ کر باہر کو اُترا جا سکتا ہے؟ — نہیں۔ دیوار بہت اونچی تھی۔ جسم میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔ باہر چار سنتریوں کا گشتی پہرہ بھی تھا۔

میں وہیں دیکھ رہا تھا۔ وہاں سے کوئی چیز اُوپر کو اُٹھ رہی تھی۔ وہ سیاہ سایہ سا تھا جو کسی انسان کا ہیولہ بن گیا۔ سَر اور کندھے صاف نظر آتے تھے۔ وہ پھر دیوار پر بیٹھ گیا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ کوئی آدمی تھا۔ تب مجھے خیال آیا کہ میں نے اس سے ذرا پہلے دھمک سُنی تھی۔ وہ کوئی اس کا ساتھی ہو گا جو دیوار پر بیٹھ گیا ہے۔ وہ اس سے پہلے

دیوار سے کودا ہوگا۔

مجھے یہ سوال پریشان کرنے لگا کہ یہ کون ہیں اور کیوں دیوار پھاند رہے ہیں؟

پہلا خیال یہ آیا کہ ان آدمیوں کو نواب نے بھیجا ہوگا کہ ہم دونوں کو قتل کر دیا جاتے۔ وہ اتنے غصے میں ہوگا کہ ہمارا ایک دو روز اور زندہ رہنا بھی اُس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی خیال آیا کہ یہ آدمی اگر نواب کے حکم سے آتے ہیں تو انہیں دیوار پھاندنے کی کیا ضرورت تھی؛ دیوار پھاندنا کوئی آسان کام تو نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھلوا کر آ سکتے تھے۔

پھر یہ خیال آیا کہ یہ گلشن آرا کا کوئی خفیہ دوست ہے جس نے گلشن آرا کو زندہ نکال لے جانے کا انتظام کیا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو گلشن آرا کو نواب کی ریاست سے نکال لے جاتے گا۔ میں نے سوچا کہ گلشن آرا کیا مجھے بھی ساتھ لے جاتے گی؟

وہ آدمی ابھی دیوار پہ ہی بیٹھا تھا۔ چاند کچھ اُوپر آگیا تھا لیکن وہ آدمی پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اُس کے بازوؤں کی حرکت سے پتہ چلتا تھا کہ رسّہ کھینچ رہا ہے اور اُوپر کہیں باندھ رہا ہے۔

"گلشن!" — میں نے گلشن آرا کو ہاتھ سے ہلا کر پوچھا — "تمہارا تعلق کسی ایسے دلیر آدمی کے ساتھ تھا جو تمہیں یہاں سے نکال لے جانے کے لئے آجاتے؟"

"کیوں پوچھ رہے ہو؟" — اُس نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"دیوار سے ایک آدمی اُترا ہے اور ایک اُترنے والا ہے" — میں نے کہا — "وہ دیکھو۔"

وہ اُٹھی اور اُدھر دیکھنے لگی۔

"نہیں سکندر!" — اُس نے نحیف آواز میں کہا — "مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ آنکھیں پوری کھلتی نہیں۔"

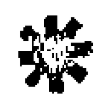
وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ آنکھیں کھول نہ سکنا بہت زیادہ کمزوری

کی علامت تھی۔

"مجھے یہاں سے نکال لے جانے کے لئے کوئی نہیں آتے گا" — اُس نے کہا — "ایسی جرأت کرنے والا صرف ایک آدمی تھا۔ اُسے میں زہر دے کر مار آئی ہوں .... عثمان علی خان .... دوسرے دو تو خوش ہوں گے کہ مجھے یہ سزا ملی ہے۔ میں نے انہیں تمہاری خاطر دھتکار دیا تھا .... کوئی نہیں آتے گا سکندر! تمہارا وہم ہے" — اُس کی آواز دبتی گئی اور وہ اس طرح لیٹ گئی جیسے بیہوش ہو کر لڑھک گئی ہو۔

میں جو دیکھ رہا تھا وہ میرا وہم نہیں تھا۔ دیوار پر جو آدمی تھا وہ بھی نیچے آرہا تھا۔ ایک اور خیال آیا جو بڑا ہی تلخ تھا۔ اس قید خانے کے باہر سنتری گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک بڑی خوبصورت عورت کو مرنے کے لئے بند کیا گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ وہ گلشن آرا کو خراب کرنے، ورا اُس کا زیور اُتار لے جانے کے لئے آرہے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ یہاں مرنے والوں کی لاشیں اندر ہی رہتی ہیں۔

دوسرے خیال نے آکر میرے اس شک کو رَد کر دیا۔ میں نے ایک لاش کی ہڈیوں کے قریب ایک ہار اور ہیرے والی انگوٹھی پڑی دیکھی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اندر آنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا ورنہ یہ زیورات وہاں نہ ہوتے۔



دو سائے سے چلے آرہے تھے۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ ان کا استقبال کروں یا مقابلہ۔ میں نے مقابلہ اُس صورت میں کرنا تھا کہ گلشن آرا خطرے میں ہوتی۔ میرے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ نواب کی دنیا میں میری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ میں خالی ہاتھ تھا اور میرا جسم کمزور بھی ہو گیا تھا، پھر بھی میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ خالی ہاتھ مقابلہ کروں گا۔ اگر انہوں نے مجھے مار ڈالا تو یہ اور زیادہ اچھا ہوگا۔

"سکندر!" — کسی نے مجھے دبی ہوئی آواز میں پکارا — "سکندر!"

میں دبکا بیٹھا رہا۔ میں نے دیکھنا تھا کہ یہ ہیں کون۔

"سکندر!" — اب کے آواز قریب سے آئی — "زندہ ہو تو بولو۔"

میں نہ بولا۔

"مر گیا ہے" — بھیانک سناٹے میں دھیمی سی آواز آئی۔

"دوسرے ہی دن کہاں مر گیا ہے" — دوسرے آدمی نے کہا — "کہیں سویا ہُوا ہو گا۔"

"جلدی کرو بھائی!" — پہلے آدمی نے کہا — "کہیں دیکھو اُسے۔"

"نہ گھبرا!" — دوسرے نے کہا — "سنتری تو اُٹھ نہیں سکیں گے۔ کوئی اور ادھر آتا نہیں ہو گا۔"

"سکندر!" — اب کے آواز قریب اور بلند تھی — "زندہ ہو؟ ہم تمہیں لینے آتے ہیں۔"

"یہ کس کی آوازیں ہیں؟" — گلشن آرا نے پوچھا جیسے وہ بہت دُور سے بول رہی ہو۔

میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اب دو آدمی مجھے نظر آ رہے تھے۔

"کون ہو تم؟" — میں نے پوچھا — "میرے ہمدرد کہاں سے آ گئے ہو؟"

"آ گئے آ لڑکے!" — اُدھر سے آواز آئی — "اِدھر آ اور چل ہمارے ساتھ۔"

اس آواز میں دھمکی یا طنز نہیں تھی۔ انہوں نے میرے پاس آ ہی جانا تھا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں آگے چلا گیا اور ہم آمنے سامنے آ گئے۔

"پہچان رہے ہو؟" — ایک نے پوچھا — "تاجا ہوں۔"

"تاجا؟" — میں نے ذرا حیران سا ہو کے پوچھا — "تاجا ڈاکو؟"

"ہاں!" — اُس نے بڑی شگفتہ آواز میں جواب دیا — "چلو۔"

"لیکن تمہیں مجھ سے کیا ہمدردی ہے؟"

"میں کہتا ہوں یہاں سے جلدی نکلو" — اُس نے کہا — "اپنے

آپ کو اتنا قیمتی لڑکا نہ سمجھو جسے میں خود لینے آیا ہوں" — اُس نے میرا بازو پکڑا اور ذرا اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا — "زیادہ نہ رُکو۔ باہر چل کر بتاؤں گا یہ کیا معاملہ ہے۔ ڈرو نہیں۔"

"میں اکیلا تو نہیں" — میں نے کہا — "میرے ساتھ ایک عورت ہے۔"

"میں تمہارے لئے آیا ہوں" — تاجے نے کہا — "میں جانتا ہوں یہ عورت کون ہے۔ مرنے دو اسے۔"

"نہیں تاجے!" — میں نے کہا — "میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"اسی خوبصورت چڑیل نے تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے" — تاجے نے کہا — "اور تم اس کے ہمدرد بنے ہوتے ہو۔"

میں اسی ضد پر اَٹک گیا کہ میں گلشن آرا کو ساتھ لے کر یہاں سے نکلوں گا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے اس جہنم میں اپنے ساتھ لانے والی گلشن آرا ہی تھی، پھر بھی میں اپنے آپ کو مجبور سمجھ رہا تھا کہ اسے یہاں پھینک کر نہ جاؤں۔

"میں نہیں سمجھ سکا کہ تمہیں میرے ساتھ کیا ہمدردی ہے" — میں نے کہا — "مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ دل میں ہمدردی لے کر آتے ہو۔ اسے بھی لے چلو تاجے! بڑی نیکی کا کام ہے۔"

"میں کسی کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں سکندر!" — اُس نے کہا۔

"اس دنیا میں میرا ہمدرد کون ہے؟"

"خواجہ صاحب کو نہیں جانتے تم؟" — تاجے نے کہا — "میں اُن کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا۔ تم نہیں جانتے میرا اُن کے ساتھ کیا تعلق ہے۔"

میں جانتا تھا۔ وہ باپ بیٹا تھے لیکن میں نے تاجے کو نہ بتایا کہ میں جانتا ہوں۔

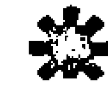
"اسے خُدا کے حکم سے لے چلو تاجے!"

تاجا مان گیا۔ میں گلشن آراء کے پاس دوڑا گیا اور اسے ہیجانی لہجے میں بتایا کہ ہمیں رہا کرانے والے آگئے ہیں۔ اُس نے جیسے میری بات سُنی ہی نہ ہو۔ میں نے اُسے جھنجھوڑا۔

"اُٹھو گلشن اُٹھو"—— میں نے اُس کے کان کے ساتھ مُنہ لگا کر کہا ——"ہم جا رہے ہیں۔ موت ٹل گئی ہے۔"

"اِس لاش کو کون اُٹھاتے گا سکندر ا"—— تاجے نے جھنجھلاتے ہوتے لہجے میں کہا——"اسے پڑا رہنے دو یہیں۔ یہ تو مر رہی ہے۔"

اس آواز پر گلشن اُٹھ بیٹھی۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑا تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے ایک بار پھر کہا کہ ہم یہاں سے نکل رہے ہیں لیکن اُسے ہمت کرنی پڑے گی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے آپ میں آگئی تھی۔ وہاں تیز چلنا تھا۔ وہ چلنے میں دشواری محسوس کر رہی تھی لیکن اُس نے ہمارا ساتھ دیا اور تیز چل پڑی۔ جسم تو میرا بھی نڈھال ہو چکا تھا لیکن میرا ذہن بیدار تھا۔



انہوں نے دیوار پر رسّے کی کمند پھینکی تھی۔ اُس زمانے کے ڈاکو کسی بڑے گھر میں یا قلعے جیسی حویلی میں داخل ہونے کے لئے کمند پھینکا کرتے تھے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ڈاکو اس کے ماہر تھے۔ تاجے کی پھینکی ہوئی کمند دیوار کے اوپر خار دار تار والے ایک ڈنڈے کے ساتھ اٹک گئی تھی۔ تاجا خود اوپر آیا اور اُس نے تار کاٹ کر رسّہ اندر کی طرف لٹکا دیا تھا۔ اس سے دونوں نیچے اُترے تھے۔

ہمیں رسّے کو پکڑ کر اور پاؤں دیوار کے ساتھ لگا کر اوپر چڑھنا تھا۔ میں تو چڑھ سکتا تھا، مشکل گلشن آراء کے لئے تھی۔ اُس کے جسم میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی۔ رسّے کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پورے جسم کا بوجھ بازوؤں اور کندھوں پر اُٹھانا اور اوپر جانا تھا۔ رسّے پر ہاتھوں کی گرفت مضبوط رکھنی تھی۔

تاجے نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ گلشن آراء رسّہ نہیں چڑھ سکے گی۔ اُس

کے ساتھی نے جو تاجے سے زیادہ طاقتور لگتا تھا، بیٹھ کر گلشن آراء کو اپنے کندھوں پر اس طرح بٹھا لیا کہ اُس کی ایک ٹانگ اس آدمی کے ایک کندھے سے آگے لٹک رہی تھی اور دوسری دوسرے کندھے سے آگے۔

"دیکھ لڑکی!"—— اُس نے گلشن آراء سے کہا——"میری گردن اور کندھوں پر اسی طرح بیٹھی رہنا اور رسّہ مضبوطی سے پکڑے رکھنا۔ کوشش کرنا کہ میں جب رسّے کو پکڑ کر اُوپر کو اُٹھوں تو تم رسّے پر اپنے بوجھ کو اُوپر اُٹھانے کی کوشش کرنا۔"

گلشن آراء پوری طرح ہوش میں آچکی تھی۔ وہ جس کے کندھے پر بیٹھی ہوئی تھی وہ اُٹھا اور اُس نے رسّہ پکڑ لیا۔ گلشن آراء نے بھی رسّہ پکڑ لیا۔ وہ آدمی اُوپر اُٹھا اور اُس نے دیوار کے ساتھ پاؤں لگا لئے پھر وہ اپنے بازوؤں پر اپنے اور گلشن آراء کے جسم کو اُوپر ہی اُوپر اُٹھاتا گیا اور دیوار پر جا پہنچا۔

اس کے بعد میں رسّہ چڑھنے لگا۔ دیوار میرے اندازے کے مطابق چالیس فٹ کے لگ بھگ اونچی تھی۔ یہ پتھروں کی دیوار تھی۔ پتھروں پر پاؤں بڑی اچھی طرح جمتا تھا لیکن میں تقریباً نصف بلندی تک پہنچا تو میرے بازو اور کندھے جواب دینے لگے۔ میں نے ارادے کو مضبوط کیا۔ لمبا سانس لیا اور اندر کی ایک قوت کو بیدار کر کے اُوپر کو اُٹھنے لگا۔ یہ قوّت شاید یہی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو یقین دلا لیا تھا کہ میرے جسم کی پوری طاقت تر و تازہ ہے اور میں اُوپر جا سکوں گا، پھر ایسے ہی ہُوا کہ میں دیوار تک پہنچ گیا۔

"اُس وقت تاجے کا ساتھی گلشن آراء کے ساتھ دوسری طرف اُتر گیا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے تاجا بھی آگیا۔ میں دیوار سے باہر کی طرف اُترا تو تاجے نے دیوار پر آکر اندر والا رسّہ سمیٹا اور باہر کی طرف لٹکا دیا۔ تاجا اب دو رسّوں کی مدد سے نیچے آرہا تھا۔ نیچے آکر اُس نے ایک طرف سے رسّہ کھینچا اور سارا رسّہ نیچے آگیا۔ تاجے کے دو آدمی اور آگئے۔ وہ باہر کھڑے رہے تھے۔ انہوں

نے رسّہ اُٹھا لیا اور ہم سب چل پڑے۔ گلشن آرا میرے ساتھ تھی۔ موت کے پیٹ سے نکل کر اُس کے جسم میں جان آ گئی تھی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ سب کون ہیں۔

"تاجا ڈاکو!" — میں نے سرگوشی میں کہا۔

"تاجا ڈاکو؟" — گلشن آرا نے حیرت کے لہجے میں کہا — "یہ تو بڑا خطرناک آدمی ہے۔ تمہارا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

میں نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"میں سمجھ گئی ہوں" — گلشن آرا چُپ نہ رہ سکی۔ کہنے لگی — "اسے کسی نے بتا دیا ہو گا کہ نواب نے ایک بڑی خوبصورت اور جوان عورت کو یہاں مرنے کے لئے بند کر دیا ہے۔ اِس نے مجھے بیچنے کے لئے وہاں سے نکال لیا ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ تاجا پہلے مجھے نواب کے ہاں بیچ چکا ہے۔ کہا یہ گیا تھا کہ تاجا ایسا آدمی نہیں، مجھے اس کے ساتھیوں نے بیچا ہے۔ اب مجھے شک ہونے لگا کہ تاجا مجھے بیچنے کے لئے لے جا رہا ہے اور اس نے جھوٹ بولا ہے کہ اسے خواجہ صاحب نے کہا ہے کہ مجھے وہاں سے نکالے۔ یہ سب قیاس تھے۔ آگے جو کچھ ہونے والا تھا، اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔

"سنبھل کر پاؤں رکھنا" — تاجے کی آواز آئی — "دائیں طرف نہ ہو جانا۔"



چاند اُوپر آ گیا تھا اور اس کی چاندنی بڑی صاف تھی۔ میں نے دائیں طرف دیکھا۔ یہ جھیل تھی یا جوہڑ۔ اس کے پانی میں ٹھہراؤ تھا۔ چاندنی میں چمک رہا تھا۔ ہم اس کے کنارے پر جا رہے تھے۔ کنارا اُونچا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بائیں طرف گہرے کھڈ تھے۔ چلنے کا راستہ بمشکل ڈیڑھ دو فٹ چوڑا تھا۔ یہ ایک چٹان تھا جس پر ہم جا رہے تھے۔

ہم اوپر ہی اوپر ہوتے گئے اور جھیل پیچھے رہ گئی۔ اب ہم چٹان سے اُتر رہے تھے۔ گلشن آرا دوبارہ پھسلی۔ ایک بار تو میں نے اُسے سنبھال لیا لیکن دوسری بار وہ گر پڑی اور لڑھکنے لگی۔ اُس کے آگے تاجے کا ایک آدمی اُتر رہا تھا۔ اُس نے گلشن آرا کو روک کر اُٹھا لیا۔ اُس آدمی نے بتایا کہ تھوڑا اور آگے ان کے گھوڑے کھڑے ہیں۔ گھوڑوں کو آگے نہیں لایا جا سکتا تھا۔

یہ علاقہ بہت دشوار گزار تھا۔ دو پہاڑیوں کے درمیان سے ہم بڑی ہی مشکل سے گزرے۔ درخت بھی تھے، جھاڑیاں اور ہرے سرکنڈے بھی تھے اور کہیں کہیں دلدل بھی تھی۔ گلشن میرے سہارے اس طرح چلی جا رہی تھی کہ اس کے جسم کا بوجھ میرے اُوپر تھا۔ وہ قدم گھسیٹ رہی تھی۔ یہ لوگ گھوڑے بہت دُور چھوڑ آتے تھے۔ وہاں تک پہنچتے گلشن آرا بے ہوش ہو چکی تھی اور میں اپنی قوتِ ارادی سے ہوش میں تھا۔ میں نے تاجے کو بتایا کہ ہم کب کے بھوکے اور پیاسے ہیں اور وہ ہمیں جلدی کہیں پہنچا دے۔

اُن چاروں کے پاس گھوڑے تھے۔ ایک گھوڑا فالتو تھا جو میرے لئے لاتے تھے۔ گلشن آرا کے لئے گھوڑا نہیں تھا۔ اُسے میرے آگے بٹھا دیا گیا۔ وہ غشی میں تھی۔ اُس کی پیٹھ میرے ساتھ لگی ہوتی اور اُس کا سر میرے ایک کندھے پر تھا۔ اُس کے ریشمی کپڑوں سے عطر کی جو بُو اُٹھ رہی تھی وہ مجھے مدہوش کرنے لگی۔ اُس کے بال ریشم جیسے تھے۔ اُس کے گال ریشم جیسے تھے۔ گھوڑے کی چال کے ساتھ اُس کے بال اور اُس کے گال میرے گالوں سے مَس ہوتے اور کبھی ٹکراتے تھے۔ مجھ پر ایسی نشیلی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی جس سے میں آشنا نہیں تھا اور آشنا ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔

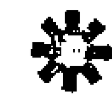
سفر بہت طویل تھا۔ ہم جب تاجے کے ٹھکانے پر پہنچے تو رات بیت چکی تھی۔ یہ ایک گاؤں تھا جو چھوٹا بھی نہیں اور بڑا بھی نہیں تھا۔ مجھے اور

گلشن آرا کو ایک مکان میں لے گئے۔ گلشن ابھی تک غشی میں تھی۔ اُس کے ہونٹ ذرا کھُلے ہوتے تھے۔ ایک آدمی اُس کے مُنہ میں قطرہ قطرہ پانی ٹپکانے لگا۔ چند قطرے اُس کے مُنہ میں گئے تو اُس نے پانی حلق سے نیچے اُتار لیا۔

کچھ اور پانی پلا کر اُس کے مُنہ میں دُودھ ٹپکانے لگے اور وہ دُودھ حلق سے اُتارتی گئی۔ اس دوران مجھے بھی پہلے تھوڑا سا پانی پھر دُودھ پلایا گیا۔ ذرا سی دیر میں میرے جسم میں طاقت عود کر آئی۔ گلشن آرا نے آنکھیں کھولیں تو میں نے اُس کی پیٹھ کے نیچے ہاتھ رکھ کر اُسے بٹھا دیا اور دُودھ کا پیالہ اُس کے مُنہ سے لگا دیا۔ آدھا دُودھ پی کر اُس نے پیالہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سارا دُودھ پی لیا۔ میں اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اُس کا رنگ لاش جیسا ہو گیا تھا۔ پانی اور دُودھ پیٹ میں گیا تو اُس کے چہرے پر اُس کا اپنا رنگ آنے لگا۔

"تم دونوں اب سو جاؤ" — تاجے نے کہا — "ابھی تمہیں کھانا نہیں ملے گا۔ تمہیں کچھ کھاتے پیتے تین راتیں اور دو دن ہو گئے ہیں۔ اتنی فاقہ کشی کے بعد پیٹ بھر گیا تو بیمار ہو جاؤ گے .... میں اب جا رہا ہوں۔ تمہاری دیکھ بھال کے لئے یہاں آدمی موجود ہیں"

"یہ تو بتاتے جاؤ کہ تم ہمیں وہاں سے نکالنے کے لئے کیسے پہنچ گئے تھے!" — میں نے پوچھا۔ — "تم نے کہا تھا کہ خواجہ صاحب نے تمہیں کہا تھا"



میں نے اب بھی تاجے کو نہ بتایا کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ خواجہ صاحب کا بیٹا ہے۔

"خواجہ صاحب کو میں اپنا مُرشد مانتا ہوں" — تاجے نے کہا — "یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اُنہیں معلوم تھا میں کہاں ہوں۔ اُن کا ایک آدمی پیغام لے کر آیا۔ میں بھیس بدل کر وہاں گیا۔ خواجہ صاحب کی آنکھوں

میں آنسو دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ میرے آدمیوں نے جو لڑکا نواب کے ہاں بیچا تھا وہ موت کے مُنہ میں پڑا ہے، اُسے نکالنا ہے۔ انہوں نے تمہاری بہت تعریف کی اور تمہارے کچھ اوصاف بتاتے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ تمہیں یہ سزا کیوں دی گئی تھی۔ وہ تمہیں بچانا چاہتے تھے۔"

"اُنہوں نے میرے متعلق بھی کہا ہو گا کہ اسے بھی نکالنا ہے" — گلشن آرا نے کہا۔

"نہیں!" — تاجے نے کہا — "ناراض نہ ہونا گلشن! انہوں نے کہا تھا کہ سکندر کو سزائے موت دلانے والی تم ہو۔ سزا صرف تمہیں ملنی چاہیئے تھی۔"

"پھر مجھے کیوں لے آتے؟" — گلشن آرا نے پوچھا۔

"یہ اس لڑکے کی ضد تھی" — تاجے نے کہا — "یہ تمہارے بغیر وہاں سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی خاطر تمہیں بھی لے آتے ہیں۔"

وہ بُجھ سی گئی اور اُس کا سر جُھک گیا۔

"گھبراؤ نہیں گلشن!" — تاجے نے اُسے کہا — "میں تمہیں لے آیا ہوں۔ میرا ہاتھ تمہارے سر پر رہے گا۔"

تاجے نے بتایا کہ اُس نے اس قید خانے کے اِرد گرد کا علاقہ دیکھا۔ بہت مشکل علاقہ تھا۔ خواجہ صاحب نے تاجے کو بتایا تھا کہ چار آدمی دیوار کے باہر گھوم پھر کر پہرہ دیتے ہیں۔ تاجا تجربہ کار ڈاکو تھا۔ اُس نے کمند پھینک کر اندر جانے کا طریقہ سوچ لیا۔ رات کو وہ تین آدمی ساتھ لے کر چلا گیا۔ گھوڑے بہت دُور چھوڑے اور اس راستے سے قید خانے تک گیا۔

وہ چاروں ایک جگہ چُھپ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد دو سنتری باتیں کرتے ان کے قریب سے گزر گئے۔ تاجے کے دو آدمیوں نے پیچھے سے انہیں دبوچ لیا۔ اُن کے سروں پر پگڑیاں تھیں۔ تاجا انہیں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ ان کی پگڑیوں سے ان کے ہاتھ

اور پاؤں باندھ دیں اور ان کے مُنہ میں ان کی پگڑیوں سے کپڑا پھاڑ کر ٹھونس دیں۔

دوسرے دو سنتری کہیں دُور تھے۔ انہیں بھی اسی طرح دبوچ لیا گیا اور اُن کی پگڑیوں سے اُن کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتے گئے۔ دونوں کے مُنہ کپڑوں سے بند کر دیتے گئے اور مجھے اور گلشن آراء کو جس طرح نکالا گیا وہ میں آپ کو سُنا چکا ہُوں۔

صبح کی روشنی ابھی سفید نہیں ہوتی تھی جب تاجا مجھے اور گلشن آراء کو اُسی کمرے میں بیٹھا چھوڑ کر چلا گیا۔

"یہ کوئی دھوکہ ہی نہ ہو" ــــ گلشن آراء نے مجھے آہستہ سے کہا ــــ "تم بھی میری طرح اس شخص سے ڈرتے ہو گے؟"

"نہیں گلشن!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں نہیں جانتا ڈر کیا ہوتا ہے، خوف کیا ہوتا ہے۔"

"تم تو شاید وہاں بھی نہیں ڈرے تھے جہاں گدھ ہمیں نوچنے کے لئے ہمارے قریب آ گئے تھے" ــــ گلشن آراء نے کہا ــــ "تم کیوں نہیں ڈرے تھے؟"

"کیوں کہ میں نے قبول کر لیا تھا کہ اب ہمیں مرنا ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "تم مرنا نہیں چاہتی تھیں .... چھوڑو ان باتوں کو .... تاجے سے نہ ڈرو۔ تم اس کے ساتھ شادی کر لو۔ یہ نہ کہنا کہ میں تو نواب کی بیوی تھی، ایک ڈاکو کی بیوی کیسے بن جاؤں!"

"ڈاکو شادی نہیں کیا کرتے سکندر!" ــــ اُس نے کہا ــــ "تاجے جیسے ڈاکو بھی نواب ہوتے ہیں۔ تاجا مجھے بیوی بنا کر رکھ لے گا، میرے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔"

"شادی کے بغیر تمہیں بیوی بنا کر رکھ لے گا تو تم کیا کرو گی؟"

"کچھ بھی نہیں" ــــ اُس نے کہا ــــ "اپنی قسمت کو روؤں گی۔"

معلوم نہیں اس جواں سال عورت کے ساتھ مجھے کیوں ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے بڑی تھی لیکن اُسے اس حالت میں دیکھ کر ایسے لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے چھوٹی ہو۔ میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ ڈری سہمی

ہوتی حالت میں وہ مجھے اُس سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی جتنی وہ تھی۔ میں نے یہ اُس قید خانے میں بھی محسوس کیا تھا جس میں ہمیں بڑی ہی بھیانک موت مرنے کے لئے پھینک دیا گیا تھا۔

میں گلشن آراء میں ایک تبدیلی دیکھ رہا تھا۔ اس کا اثر تو اُس پر تھا ہی کہ وہ محل کی بیگم جس کا حکم چلتا تھا اور جس کے اشارے پر انسان قتل بھی ہو جاتے تھے، کس بے کسی کی حالت میں آگری تھی۔ اس اثر کے علاوہ بھی اُس میں کوئی تبدیلی دیکھ رہا تھا۔ وہ چُپ چاپ بیٹھی خلاؤں میں دیکھتی رہتی تھی۔

ہم دونوں چار روز اس کمرے میں تنہا رہے۔ ہم کسی کے قیدی نہیں تھے۔ دروازے کھلے رہتے تھے۔ ہمارے لئے کھانا پینا اندر ہی آجاتا تھا۔ یہ کچا سا دیہاتی مکان تھا۔ ہم صحن میں بھی نکل جاتے تھے لیکن زیادہ دیر کے لئے نہیں۔ تاجے کے جو آدمی وہاں تھے، انہوں نے بتایا تھا کہ کچھ دن احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ یہ آدمی ہمیں اور کچھ بھی نہیں بتاتے تھے۔

"ہم سے کچھ نہ چھپاؤ" ---- ایک روز میں نے تاجے کے ان آدمیوں سے کہا ---- "تاجا ہمارا اپنا آدمی ہے۔ تم نے دیکھا ہے کہ وہ ہمیں کہاں سے نکال لایا ہے"۔

"ابھی نہیں" ---- ایک آدمی نے جواب دیا ---- "تم دونوں تھکے ہو۔ ابھی تمہیں راز کی کوئی بات نہیں بتائیں گے"۔

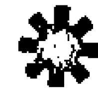
میں نے ان چار دنوں میں دیکھا کہ گلشن آراء راتوں کو سوتی بھی کم ہی تھی۔ ایک رات میری آنکھ کھلی تو وہ فرش پر دو زانو بیٹھی ہوتی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھ ہندوؤں کی طرح جوڑے ہوتے تھے اور وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ کھڑکی میں سے آتی ہوئی چاندنی اُس پر پڑ رہی تھی۔ وہ حسین تو تھی ہی لیکن اس چاندنی میں اُس کے حسن میں عجیب سا اضافہ ہو گیا تھا۔ اُس کے بال جو بکھرے بکھرے سے تھے سونے کے تاروں کی طرح چمکدار لگتے تھے۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ اُسی طرح بیٹھی رہی اور میری آنکھ پھر لگ گئی۔

"رات کو تم عبادت کر رہی تھیں؟" ---- صبح کو میں نے گلشن سے پوچھا۔

"نہیں تو" ---- اُس نے کہا ---- "میں تو ساری رات سوتی رہی تھی"۔

میں نے اُسے یاد دلایا کہ وہ کس طرح ہاتھ جوڑ کر بیٹھی ہوئی تھی لیکن اُس نے تسلیم نہ کیا۔ میں نے زیادہ زور نہ دیا۔ ایک رات پھر اُسے اسی حالت میں بیٹھے دیکھا۔ اگلی صبح پوچھا تو اُس نے پھر انکار کر دیا۔ میں نے اُس سے نہ پوچھا کہ وہ انکار کیوں کر رہی ہے۔

چار روز بعد تاجا واپس آگیا۔



"تم بتاؤ لڑکے!" ---- رات کو تاجے نے مجھ سے پوچھا ---- "کیا ارادہ ہے؟ گھر جاؤ گے؟"

"نہیں تاجے!" ---- میں نے کہا ---- "میں اپنے گھر کس طرح جا سکتا ہوں۔ کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ سوتیلی ماں نے مجھے اغوا کرایا تھا؟ اب جاؤں گا تو وہ مجھے قتل نہ کرا دے گی؟"

تاجا سوچ میں پڑ گیا۔ گلشن بھی پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

"اور تم؟" ---- تاجے نے گلشن سے پوچھا۔

"میرا کوئی ٹھکانہ نہیں" ---- گلشن نے اُداس سے لہجے میں جواب دیا۔

"تمہارا گھر تو ہے!" ---- تاجے نے کہا ---- "تمہارے ماں باپ ہیں"۔

"وہ تو کبھی کے میرے نام پر تھوک چکے ہوں گے" ---- گلشن نے جواب دیا۔

"اُس بوڑھے نے مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے" ---- تاجے نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا ---- "میں اُس کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا۔ چاہئے تو یہ کہ میں تم دونوں کو اُس کے حوالے کر دوں لیکن تم وہاں گئے تو سمجھو مارے گئے"۔

"بیٹا اپنے اتنے اچھے باپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہے!" ----

میں نے کہا۔

تاجے نے چونک کر میرے مُنہ کی طرف دیکھا۔

"خواجہ صاحب نے خود بتایا تھا" — میں نے کہا — "اُنہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ تم کبھی کبھی بھیس بدل کر وہاں جاتے ہو۔"

"کیوں تاجے!" — گلشن آراء نے حیرت زدہ لہجے میں تاجے سے پوچھا — "کیا تم خواجہ صاحب کے بیٹے ہو؟"

"خواجہ صاحب مجھے کبھی مروادیں گے" — تاجے کہا — "دیکھو تو، کس کچے سے لڑکے کو اُنہوں نے اتنا بڑا راز دے دیا ہے۔"

"فکر نہ کرو تاجے!" — میں نے کہا — "یہ راز اس کمرے سے باہر نہیں جائے گا۔"

"تم دونوں اس کمرے سے باہر جاؤ گے تو سمجھو راز بھی گیا" — تاجے نے کہا۔

"ایسا نہیں ہوگا تاجے!" — گلشن آراء نے کہا — "تم نے مجھے موت کے منہ سے نکالا ہے۔ میں تمہیں موت کے مُنہ میں کیسے دھکیل سکتی ہوں۔"

"ہم اِس کمرے سے جا ہی کہاں رہے ہیں" — میں نے کہا — "باقی زندگی تمہارے ساتھ گزرے گی۔"

"میری زندگی پھانسی کے تختے پر رکھی ہوئی ہے" — تاجے نے کہا — "تم کب تک میرے ساتھ رہو گے۔"

"میں تمہارے ساتھ رہوں گا" — میں نے کہا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں؟" — تاجے نے کہا — "تمہیں ابھی محسوس نہیں ہُوا کہ میرے ساتھ رہنے کا مطلب کیا ہے۔ تم میرے ساتھ مل کر ڈکیتی کی وارداتیں نہیں کر سکتے۔"

"کچھ بتاؤ گے اور مجھے سمجھاؤ گے تو میں تمہارے اشاروں پر سب کچھ کر لوں گا" — میں نے کہا — "لیکن ڈکیتی کی وارداتیں نہیں کر

سکوں گا۔"

"اگر کرنا چاہو تو بھی نہیں کرنے دوں گا" — تاجے نے کہا — "خواجہ صاحب نے مجھے کہا تھا کہ وہ تمہیں گناہوں کی زندگی سے نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تم میں کوئی ایسا وصف یا کوئی ایسی طاقت ہے جو ہر انسان میں نہیں ہوتی۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس لڑکے نے کبھی بھولے بھٹکے سے کوئی گناہ کر لیا تو اس کی یہ طاقت ختم ہو جائے گی۔"

خواجہ صاحب نے میرے متعلق جو باتیں میرے ساتھ کی تھیں وہ تاجے کے ساتھ بھی کیں۔ تاجے نے مجھ سے پوچھا کہ مجھ میں وہ کون سی طاقت ہے۔

"میں نہیں جانتا" — میں نے جواب دیا — "میں نے خواجہ صاحب سے ہی سُنا ہے یا مجھے یہ یاد ہے کہ میں بہت چھوٹا سا تھا تو ایک پگلی بھکارن نے میری ماں سے کہا تھا کہ یہ بچّہ دلوں کو تڑپائے گا اور خود بھی تڑپے گا۔ اس کا سفر بڑا لمبا ہوگا۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسا تاثر ہے کہ یہ جس طرف دیکھے گا اُدھر قیامت ٹوٹے گی۔ اُس نے کہا تھا کہ اِس کی آنکھوں میں وہ طاقت ہے جو ہر کسی میں نہیں ہو سکتی اور جنّات اور پریاں اِس کے آگے سجدے کریں گے لیکن یہ آگ میں سے گزر کر وہاں تک پہنچے گا۔"

"کیا وہ کوئی پگلی تھی؟" — تاجے نے پوچھا۔

"ہاں" — میں نے جواب دیا — "لوگ اُسے پگلی پگلی کہتے تھے۔"

"وہ تھی ہی پگلی" — تاجے نے طنزیہ سی ہنسی ہنس کر کہا — "انسان اپنی طاقت خود بناتا ہے۔ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ لڑکا گناہ کرے گا تو اس کی یہ طاقت ختم ہو جائے گی ... خواجہ صاحب کو معلوم نہیں کہ جو طاقت گناہ میں ہے وہ شرافت میں نہیں۔ معلوم نہیں اُنہوں نے تمہیں اپنی اور میری کہانی سنائی تھی یا نہیں۔"

"سنائی تھی" — میں نے کہا — "میں نے یہ سبق انہی سے سیکھا ہے کہ محبت اور شرافت بہت بڑی طاقت ہے۔ تم میرے لئے گناہوں

میں کشش پیدا کرنا چاہتے ہو۔"

"گناہ سے میری مراد وہ گناہ نہیں جو لوگ شرافت کے پردے میں کرتے پھرتے ہیں" — تاجے نے کہا — "میں جو کچھ کر رہا ہوں اسے میں گناہ نہیں سمجھتا ..... تم ابھی بچے ہو۔ ذرا اور بڑے ہو کر سمجھو گے۔ ابھی شیطانیت اور شرافت کے جھنجھٹ میں نہ پڑو۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم میں وہ کون سی ایسی عجیب و غریب طاقت ہے جو اور کسی میں نہیں۔"

"نہیں تاجے!" — گلشن آرا بول پڑی — "اس لڑکے میں کوئی ایسی بات ہے جو شاید اور کسی میں نہیں ہو گی۔"

"تمہارے لئے اس میں بہت کشش ہے" — تاجے نے مُسکرا کر کہا — "یہ بہت خوبصورت لڑکا ہے اور تمہاری نظروں کو میں پہچانتا ہوں۔"

"میں اپنی ان نظروں سے انکار نہیں کرتی" — گلشن آرا نے کہا — "لیکن یہ لڑکا میری نظروں پر اور میری نیّت پر بھی ایسا غالب آیا تھا کہ میں تو جیسے اندھی ہو گئی تھی اور میری عقل وہی سوچنے لگتی تھی جو یہ لڑکا سوچتا ہے۔"

تاجا کچھ دیر اُس کی طرف دیکھتا رہا پھر اُس نے میری طرف دیکھا۔

"میں کوئی دعویٰ نہیں کرتا تاجے!" — میں نے کہا — "میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ میں ڈرتا نہیں ہوں۔ میں نے خوف اور دہشت جیسے لفظ سُنے ہیں لیکن میں نہیں جانتا کہ خوف کیا ہوتا ہے اور دہشت کیا ہوتی ہے۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں شاید آگ میں سے بھی گزر سکتا ہوں اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میرے ذہن میں گناہ کا صرف تصوّر آ گیا تو میں وہ نہیں رہوں گا جو ہوں۔"

"تمہیں زندگی کا کوئی تجربہ نہیں" — تاجے نے کہا — "اور میں عالم اور فلسفی نہیں۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم میرے ساتھ رہے تو ڈکیتی کی وارداتیں کرو گے؟"

"اگر رکھنا چاہو گے تو تمہارے ساتھ رہوں گا" — میں نے جواب دیا

— "لیکن کوئی واردات نہیں کروں گا۔ میرا ٹھکانہ میرا اپنا گھر تھا لیکن وہاں میرے لئے موت ہے۔ دوسرا ٹھکانہ خواجہ صاحب کا گھر ہے۔"

"وہاں بھی موت ہے" — تاجے نے کہا — "جاتے ہی پکڑے جاؤ گے۔ اب وہ تمہیں اُس قید خانے میں نہیں پھینکیں گے بلکہ فوراً گولی مار دیں گے اور تمہاری لاش زمین کے حوالے کر دیں گے۔"

"تو کیا مجھے اپنے ساتھ رکھو گے؟" — میں نے پوچھا۔

"میں تمہیں ذلیل و خوار ہونے کے لئے نہیں چھوڑوں گا" — تاجے نے جواب دیا — "تم میری پناہ میں ہو اور یہ میرے باپ کا حکم ہے کہ میں تمہیں اپنی پناہ میں رکھوں، لیکن یہ سوچ لو کہ تمہارا کچا دماغ کبھی مجھے پھانسی کے تختے پر نہ کھڑا کر دے۔"

"اسے بھی اپنے ساتھ رکھو گے؟" — میں نے گلشن آرا کے متعلق اُس سے پوچھا اور ساتھ ہی کہا — "میں جانتا ہوں تم اسے بوجھ سمجھ رہے ہو۔ اگر اس کے ساتھ شادی کر لو تو یہ انکار نہیں کرے گی۔"

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے آج تک کوئی عورت نہیں ملی؟" — تاجے نے کہا — "ایک سے ایک حسین عورت میرے راستے میں آتی ہے لیکن میں کسی کا غلام بن کے نہیں رہا۔ شادی ایک زنجیر ہے اور عورت مرد کو آسمان سے گھسیٹ کر زمین پر پٹخ سکتی ہے۔ گلشن بہت خوبصورت عورت ہے بلکہ بڑی حسین اور جوان لڑکی ہے۔ میں اپنے آپ کو سونے چاندی کی سلاخوں میں قید نہیں کرنا چاہتا۔"

"پھر اس کا کیا بنے گا؟"

"میں اسے اُٹھا کر باہر تو نہیں پھینک دوں گا" — تاجے نے کہا — "تم مرد ہو۔ تمہارے متعلق مجھے کوئی فکر نہیں۔ اس کا مجھے کوئی ٹھکانہ بنانا پڑے گا۔"

"اگر یہ بھی میرے ساتھ رہے تو کیا ہو جائے گا؟"

"تم نہیں جانتے" — تاجے نے کہا — "تم نے ابھی زندگی میں کچھ

نہیں دیکھا۔ تم نے تو ابھی اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھا ... تم اپنے متعلق سوچ لو۔ میرے ساتھ رہنا ہے تو تمہیں میرا پُورا پُورا ساتھ دینا پڑے گا۔ گلشن کے متعلق سوچ لیں گے۔ تم دونوں یہ خیال رکھنا کہ ان دونوں آدمیوں کے سوا کسی تیسرے آدمی کے ساتھ کوئی بات نہ کرنا۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ کس وقت ہمیں اس مکان سے بھاگنا پڑے۔"

مجھے اور گلشن کو شش و پنج میں ڈال کر ناجا چند دنوں کے لئے پھر غائب ہو گیا۔



میں یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ گلشن آرا اپنے مستقبل کے متعلق میرے ساتھ کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے اسے اپنے مستقبل کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں یا اسے یقین ہے کہ اس کا مستقبل بڑا اچھا ہو گا۔ وہ اپنے آپ میں گم رہنے لگی۔ میں نے آپ کو سنایا ہے کہ موت کے قید خانے میں اُس نے دو تین بار مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ چپکا لیا تھا اور مجھے اُس نے کئی بار اپنا بچہ کہا تھا لیکن اب وہ میری طرف دیکھتی ہی نہیں تھی۔ اگر دیکھتی تھی تو اُس کی نظروں کا تاثر کچھ اور ہوتا تھا۔ اس تاثر میں بے بسی بھی ہوتی تھی اور یہ بھی جیسے وہ کسی بہت دُور کی چیز کو دیکھ رہی ہو۔ اب اُس نے باقاعدہ نماز پڑھنی شروع کر دی تھی لیکن صرف رات کو۔ آدھی رات کے لگ بھگ میری آنکھ ضرور کھلتی تھی اور میں اُسے کچے فرش پر سجدے کرتے دیکھتا تھا۔

"گلشن!" —— ایک روز میں نے اُس سے پوچھا —— "کیا سوچتی رہتی ہو؟ کہاں کھو گئی ہو؟"

وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی اور اس طرح چُپ رہی جیسے اُس نے میری بات سُنی ہی نہ ہو یا سمجھ ہی نہ سکی ہو کہ میں نے کیا پوچھا ہے۔

"کیا خدا سے گناہوں کی بخشش مانگ رہی ہو؟" —— میں نے پوچھا۔

"خدا کی پناہ مانگ رہی ہوں" —— گلشن نے جواب دیا —— "لیکن یوں لگتا ہے جیسے خدا مجھے بخشے گا نہیں۔ میں نے کل رات خدا سے موت مانگی تھی۔"

"مرنا چاہتی ہو؟" —— میں نے پوچھا۔

"اگر مجھے یقین ہو جائے کہ خدا نے مجھے بخش دیا ہے تو میں آج ہی اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دوں" —— گلشن آرا نے اُداس لہجے میں جواب دیا —— "تم بھی خدا کو یاد کیا کرو۔"

ایک وہ وقت تھا کہ یہی عورت خطرہ مول لے کر مجھے اپنے کمرے میں بلایا کرتی تھی اور میں اس سے دُور بھاگتا تھا۔ اب میرے دل سے یہ خواہش اُبھرنے لگی کہ یہ مجھے اپنے پاس بٹھائے لیکن وہ تو کسی اور ہی دنیا میں جا پہنچی تھی۔ اُسی رات میں نے اسے ایک بار پھر نماز کے بعد دعا مانگتے دیکھا۔ اب اُس نے ہاتھ ہندوؤں کی طرح جوڑے ہوئے نہیں تھے بلکہ اُس کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ اُس کے سر اور چہرے پر چاندنی پڑ رہی تھی۔ میں نے اُس میں ایک عجیب سی کشش محسوس کی۔ بے اختیار جی چاہا کہ میں اُس کے پاس جا بیٹھوں لیکن خیال آ گیا کہ وہ عبادت میں مصروف ہے۔ میری یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ میں اُسے فوراً دبا نہ سکا اور میں سو بھی نہ سکا۔ میں نے اُسے صبح دیکھا تو مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے وہ بالکل ہی بدل گئی ہے یا میں بدل گیا ہوں۔

پانچ سات روز بعد ناجا آدھی رات کو واپس آیا۔ صحن میں کچھ شور شرابا ہُوا جس سے میری آنکھ کُھل گئی۔ گلشن عبادت میں مصروف تھی۔ میں نے دروازے میں سے دیکھا۔ صحن میں مجھے چاندنی میں چار پانچ آدمی نظر آئے۔ اُن میں ناجا بھی تھا۔ وہ کوئی سامان اُٹھا اُٹھا کر کہیں رکھ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ناجا کہیں ہاتھ مار کر واپس آیا ہے۔ وہاں شاید کوئی تہہ خانہ ہو گا۔ سب آدمی وہیں کہیں غائب ہو گئے۔

ناجا اگلے روز ہمارے پاس آیا اور رسمی سی دو چار باتیں کر کے

چلا گیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد وہ پھر آ گیا۔ اُس کے ساتھ ایک آدمی تھا۔ اُس کا قد بُت، شکل وصورت، چہرے کی رنگت اور لباس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اُس کی عمر تیس سال سے کم ہی لگتی تھی۔ وہ کوئی نواب لگتا تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ یہ گلشن آراء کا گاہک ہے اور تاجا گلشن آراء کا سودا کرے گا۔

"گلشن؟" ــــ اُس آدمی نے گلشن کو دیکھ کر حیرت زدہ لہجے میں پوچھا ــــ "تم یہاں؟ ..... وہاں سے بھاگ آئی ہو؟"

"میں بھاگی ہوں یا نہیں، بھاگے تو تم تھے" ــــ گلشن آراء نے طنزیہ سے لہجے میں کہا ــــ "اُس محل کی قید میں مجھے تم نے ڈالا تھا۔ مجھے محبت کا دھوکہ دے کر اپنے بوڑھے باپ کے حوالے کر دیا تھا اور تم نے میرے عوض اپنے باپ سے جاگیر لے لی۔ میں ساری عمر تمہیں نہیں بخشوں گی۔ تم سے یہ تاجا اچھا ہے جو فخر سے کہتا ہے کہ میں ڈاکو ہوں۔ تم نواب زادے بنے پھرتے ہو لیکن تم نے مجھے دھوکا دیا" ــــ گلشن آراء نے مجھے اور تاجے سے کہا ــــ "یہ ہے نواب زادہ حمید اللہ جس کی خاطر میں نے اپنے ماں باپ کو اور اپنے گھر کو چھوڑا تھا۔"

حمید اللہ اپنا سر جھکا کر پلنگ پر بیٹھ گیا تھا۔

"دھوکا میرے ساتھ ہوا تھا گلشن!" ــــ حمید اللہ نے کہا ــــ "میں اپنے باپ سے تمہارے ساتھ شادی کرنے کی اجازت لینے گیا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ تمہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ اُس نے تمہیں بلایا اور تم پر قبضہ کر لیا۔ مجھے تو وہ قتل کروا دینا چاہتا تھا۔ قتل کے ساتھ اُس نے یہ شرط رکھی کہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو فلاں جاگیر لے لو اور اس محل کو، جانشینی کو اور اس لڑکی کو بھول جاؤ۔ میں اگر اس کی یہ شرط نہ مانتا تو میں آج تمہارے سامنے کھڑا نہ ہوتا۔"

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو میں موت کو قبول کر لیتی" ــــ گلشن آراء نے کہا۔

گلشن آراء کا لہجہ تلخ اور طنزیہ ہوتا گیا۔ وہ بار بار حمید اللہ سے کہتی تھی کہ تم نے جاگیر لینے کے لئے مجھے اپنے بوڑھے باپ کے حوالے کیا ہے۔

"تو اب اس کے ساتھ چلی جاؤ" ــــ تاجے نے کہا ــــ "کیوں نوابزادے! اسے لے جا رہے ہو ساتھ؟"

"اگر یہ وہاں سے خود بھاگ کر آتی تو میں کہتا کہ اس نے میری خاطر یہ خطرہ مول لیا ہے اور میں اسے ساتھ لے جاتا" ــــ حمید اللہ نے کہا ــــ "اب یہ تمہاری چیز ہے۔"

تاجے نے حمید اللہ کو بتایا کہ وہ گلشن آراء کو کہاں سے اور کس طرح لایا ہے۔ حمید اللہ نے گلشن آراء کو اپنے ساتھ لے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ گلشن آراء پھر اُس پر برس پڑی کہ اُس نے اسے محبت کا دھوکا دیا ہے۔

"تم نے اپنا گھر بار میری خاطر نہیں میری نوابی کی خاطر چھوڑا تھا" ــــ حمید اللہ نے گلشن آراء سے کہا ــــ "تم جس جس آدمی کے ساتھ عیش وعشرت میں پڑی رہی ہو میں وہ تمہیں گن کر سنا سکتا ہوں۔ تم اس لڑکے کو اپنے کمرے میں بلاتی رہی ہو۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ وہ تمہیں کس طرح سزائے موت دی گئی تھی۔"

"تم یہاں آئے کیوں ہو نوابزادے؟" ــــ تاجے نے اُس سے پوچھا ــــ "یہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم آئے کیسے۔"

"بڑے ضروری کام سے آیا ہوں تاجے!" ــــ نوابزادہ حمید اللہ نے جواب دیا ــــ "ذرا باہر آ جاؤ۔"

تاجا اُس کے ساتھ باہر چلا گیا اور کم وبیش ایک گھنٹے بعد اکیلا واپس آیا۔ تاجے اور حمید اللہ کی غیر حاضری میں گلشن آراء چُپ چاپ آنسو بہاتی رہی اور میں اُسے تسلیاں دیتا رہا۔

"اس شخص کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوتی تھی کہ خدا نے مجھے پناہ

دے دی ہے" ——گلشن آرا نے کہا —— "لیکن خدا مجھے پوری پوری سزا دینا چاہتا ہے۔ اب میں خدا سے گناہوں کی بخشش اور موت کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔"

*

"کہاں ہے وہ؟" ——گلشن آرا نے تابجے سے پوچھا۔

"چلا گیا ہے" ——تابجے نے جواب دیا —— "تمہارے نواب نے اس پر یہ شک کیا ہے کہ تمہیں اس نے قید خانے سے فرار کرایا ہے۔ نواب نے اسے دھمکی بھیجی ہے کہ گلشن آرا کو محل میں واپس بھیج دو ورنہ گلشن بھی اور تم بھی کسی کو پھر کبھی نظر نہیں آؤ گے۔"

"اس نے کیا جواب دیا ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"جواب دینے کے لئے یہ میرے پاس آیا تھا" ——تابجے نے جواب دیا۔

"کیا یہ تمہاری زبانی جواب دینا چاہتا ہے؟"

"یہ اس دھمکی کا جواب زبانی نہیں دینا چاہتا" ——تابجے نے کہا —— "ایسی باتیں ہم کسی کو بتایا نہیں کرتے سکندر! لیکن تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تمہیں میں اپنا ساری عمر کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارا دل مانے تو ہمارے ساتھ چلے چلنا .... حمید اللہ نواب کو یعنی اپنے باپ کو قتل کرنا چاہتا ہے لیکن میں نے اسے روک دیا ہے۔ محل کے اندر جا کر نواب کو قتل کرنا آسان کام نہیں۔ اگر اُسے قتل کر بھی دیا جائے تو نواب کی اپنی اور انگریزوں کی پولیس سے قاتل کا بچنا ممکن ہی نہیں۔ پولیس سب سے پہلے حمید اللہ کو پکڑے گی۔ وہ دو آدمی جو نواب کا پیغام حمید اللہ کے پاس لائے تھے، حمید اللہ کو پکڑا دیں گے۔"

"اب یہ کیا کرے گا؟" ——گلشن آرا نے پوچھا۔

"یہ نواب کا شکار کا موسم ہے" ——تابجے نے کہا —— "نواب بڑے شکار کا شوقین ہے۔ یہاں کے جنگل میں ہرن، چیتل، نیل گائے اور دھاری دا

شیر ہیں۔ دس بارہ دنوں بعد نواب شکار کھیلنے جاتے گا اور آٹھ دس دن جنگل میں ہی ڈیرہ ڈالے رکھے گا۔ اُس کے ساتھ بہت سے آدمی ہوں گے۔ جہاں وہ ٹھہرے گا وہاں رات کو پہرہ بھی ہوگا۔ حمید اللہ اُس کے خیمے میں داخل ہونے کی کوشش کرے گا اور میں اپنے دو آدمیوں کے ساتھ اُس کی مدد کے لئے اُس کے ساتھ جاؤں گا۔"

"تم کیوں اس کے ساتھ جاؤ گے؟"

"حمید اللہ میرا دوست ہے" ——تابجے نے کہا —— "کئی بار یہ شخص میرے کام آیا ہے۔ میں نے کئی بار اس کی جاگیر میں پناہ لی ہے۔ مجھ جیسے دو اور استاد بھی اس کے دوست ہیں اور حمید اللہ انہیں بوقتِ ضرورت پناہ بھی دیتا ہے اور ان کا مال بھی اپنے ہاں چھپا لیتا ہے .... اور یہ خود بھی کچھ کم اُستاد نہیں۔"

"پھر یہ تمہاری مدد لینے کیوں آیا ہے؟"

"یہ کام جو وہ کرنا چاہتا ہے، یہ میں اور میرے دو تین آدمی ہی کر سکتے ہیں" ——تابجے نے جواب دیا۔

"اگر میں اس آدمی کو قتل کرنا چاہوں تو میری مدد کرو گے تابجے؟" ——گلشن آرا نے پوچھا۔

"پاگلوں کی سی باتیں نہ کرو گلشن!" ——تابجے نے کہا —— "نوابوں اور نوابزادوں کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس شخص کو بھول جاؤ۔ میں تمہارے لئے کچھ نہ کچھ سوچ لوں گا" ——تابجے نے مجھے کہا —— "میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے، اب پھر کہتا ہوں کہ میرے ساتھ چلو اور دو ہاتھ سیکھ لو۔"

"نہیں تابجے!" —— میں نے کہا —— "میں ایسا کام نہیں کروں گا۔"

تابجے نے مجھے بہت اُکسایا، بہت ورغلایا، بڑی دلچسپ باتیں سنائیں لیکن میں اُس کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہو سکا۔ اُس نے میرے انکار کو بُرا نہ جانا بلکہ ہنستا رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اُس وقت سمجھ سکا تھا یا نہیں، آج اُس وقت کو یاد کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ تابجے کی ہنسی بے معنی نہیں

تھی، وہ مجھے بھی اپنے گروہ میں شامل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے شاید مجھ میں کوئی خوبی دیکھ لی تھی جو اُس کے کام آسکتی تھی۔

"گلشن!" ___ تاجے نے گلشن سے کہا ___ "میں تمہیں اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں لیکن تمہیں کچھ کام کرنا پڑے گا۔ تم کر سکتی ہو؟"

"اگر یہ شریفوں والا کوئی کام ہے تو میں ضرور کروں گی" ___ گلشن آراء نے کہا۔

"یہاں کوئی بچہ نہیں ہے جسے تم سپارے پڑھاؤ گی" ___ تاجے نے کہا ___ "یہاں تمہیں وہی شرافت ملے گی جو تم نواب کے محل میں دیکھ آئی ہو۔ میں تمہیں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ یہاں تمہیں طوائف نہیں بننے دوں گا۔ تمہارا رُعب اور وقار قائم رہے گا۔"

"یہ تو بتاؤ" ___ گلشن نے پوچھا ___ "کام کیا ہو گا؟"

"تم رضامند ہو جاؤ تو کام بتا دوں گا" ___ تاجے نے جواب دیا ___ "تمہیں اچھے لوگوں میں بھیجا کروں گا اور تم اچھے لوگوں کو پھانس کر میرے حوالے کر دیا کرو گی۔"

گلشن آراء نادان تو نہیں تھی کہ وہ سمجھ نہ سکتی کہ تاجے کا مطلب کیا ہے۔ وہ سب جانتی تھی۔ اُس نے ایسا کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

"پھر کیا کرو گی؟"

"خدا کو یاد کروں گی" ___ گلشن آراء نے جواب دیا۔

تاجے نے اپنے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمہیں بھٹکنے کے لئے چھوڑ نہیں دوں گا گلشن!" ___ تاجے نے جاتے جاتے کہا ___ "شرافت کو دماغ سے نکال دو" ___ اور وہ باہر نکل گیا۔

میں نے گلشن کو دیکھا۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

*

چار پانچ دن اور گزر گئے۔ ہمارے معمول میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ گلشن آراء پہلے سے زیادہ خاموشی اور عبادت میں ڈوبی رہنے لگی۔ تاجا دو تین مرتبہ ہمارے پاس آیا اور ہر بار تھوڑی سی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ پھر وہ ایسا غائب ہوا کہ تین چار روز بعد واپس آیا۔ اُس نے بڑی دلچسپ بات بتائی۔ میں نے اُس سے اپنی دلچسپی کے لئے کئی باتیں پوچھیں۔ اُسے حمید اللہ کا پیغام ملا تھا کہ نواب شکار پر چلا گیا ہے۔ وہ جگہ حمید اللہ کی جاگیر سے کم و بیش بیس میل دُور تھی اور جس گاؤں میں ہم تھے وہاں سے حمید اللہ کی جاگیر دس گیارہ میل دُور تھی۔ تاجا اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لے کر حمید اللہ کے پاس گیا۔

وہاں سے وہ گھوڑوں پر اُس جنگل میں گئے جہاں نواب شکار کھیلنے گیا تھا اور جہاں اُسے چند روز قیام کرنا تھا۔

بڑے شکار کے لئے ہانکا کرایا جاتا ہے۔ بیس پچیس اور کبھی اس سے بھی زیادہ آدمی پھیل کر ہاتھوں میں کنستر اور ڈنڈے یا ڈھول لے کر آگے بڑھتے ہیں اور خوب شور شرابہ کرتے ہیں۔ اس شور سے جانور آگے ہی آگے بھاگے چلے آتے ہیں۔ شکاری گھوڑوں یا ہاتھیوں پر سوار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مطلب کا شکار مار لیتے ہیں۔

حمید اللہ اور تاجا نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے گھوڑے شکار گاہ سے ذرا دُور ایک گہری جگہ باندھ دیئے۔ وہ رات کو وہاں پہنچے تھے۔ اگلے روز صبح سویرے تاجے کے دونوں آدمی اُس علاقے کے مزدوروں کے بھیس میں وہاں چلے گئے جہاں نواب کا خیمہ تھا۔ ہانکا کرنے والے آدمی وہاں پہنچ گئے تھے۔ ان دونوں آدمیوں نے بھی نواب کے کسی آدمی کی منت سماجت کر کے ہانکے کی مزدوری حاصل کر لی۔ وہ دراصل دیکھ رہے تھے کہ نواب کی رہائش کس طرح کی ہے اور اُس کے ارد گرد کیا خطرے ہیں۔ یہ انہوں نے دیکھ لیا۔ پھر وہ ہانکا کرنے والے لوگوں کے ساتھ جنگل میں چلے گئے اور وہاں سے کھسک آئے۔ انہوں نے تاجے اور حمید اللہ کو بتایا کہ نواب کا خیمہ بڑا ہے اور اُس سے تقریباً بیس پچیس گز دُور تین اور

خیمے ہیں۔ ان خیموں سے خاصا ہٹ کر قناتیں اور شامیانے لگے ہُوتے ہیں جو باورچی خانہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ نواب کے باڈی گارڈ بھی اُس کے ساتھ ہیں جو چھ سے زیادہ نہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ رات کو پہرہ ہوتا ہے یا نہیں۔

آدھی رات کے بعد تاجا، حمیداللہ اور تابجے کے دو ساتھی چھپتے چھپاتے نواب کے خیموں کے قریب چلے گئے۔ اُس وقت چاندنی بڑی صاف تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ خیموں کے ارد گرد دو پہریدار ایک دوسرے سے دُور دُور ٹہل رہے ہیں۔ اُن کے پاس بندوقیں تھیں۔ تاجا پیٹ کے بل رینگتا ہُوا آگے چلا گیا۔ آگے جھاڑیاں تھیں تاجا ان میں چھُپ گیا۔ سنتری کا راستہ یہی معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک سنتری اُس کے آگے اور بالکل قریب سے گزُرا۔ تابجے نے اُسے گزُر جانے دیا۔

اس کے کچھ دیر بعد دوسرا پہریدار چلا آرہا تھا۔ وہ تابجے کے قریب سے گزُرنے کی بجائے دس بارہ قدم دُور سے گزُرا۔ تابجے نے اپنے سامنے ایک پتھر پھینکا۔ پہریدار پتھر کی آواز پر پیچھے مُڑا لیکن وہیں رُکا رہا۔ تابجے نے ایک اور پتھر اپنے سامنے پھینکا۔ سنتری وہاں تک آگیا اور تابجے کے بالکل قریب رُک کر ہر طرف دیکھنے لگا۔ جونہی اُس کی پیٹھ تابجے کی طرف ہوئی تابجے نے پھُرتی سے آگے ہو کر اُس کے دونوں ٹخنوں کو پکڑا اور پیچھے کھینچا۔ پہریدار مُنہ کے بل گرا۔ تاجا اُچھل کر اُس کی پیٹھ پر جا چڑھا اور خنجر کی نوک اُس کی گردن پر رکھ کر ذرا سی دبائی اور اُسے کہا کہ وہ خاموش رہے اور اپنی بندوق اُس کے حوالے کردے۔

تابجے کے پاس پورا بندوبست تھا۔ اُس نے اپنے گلے میں ڈالا ہُوا بڑا سا رومال اُتار کر پہریدار کے مُنہ میں ڈالا اور گردن کے پیچھے گرہ لگا دی۔ اُس کے دونوں آدمی کچھ دُور پیچھے تیار تھے۔ تابجے نے مُنہ سے اُلّو کی آواز نکالی۔ اُس کے دونوں آدمی چھپتے چھپاتے اُس تک پہنچ گئے۔ انہوں نے اُس پہریدار کے پاؤں اور ہاتھ رسیوں سے باندھ دیئے۔ تابجے نے اس پہرہ دار

کی بندوق اپنے ایک آدمی کو دے کر کہا کہ دوسرے پہرہ دار کو پکڑو۔ حمیداللہ پیچھے چھُپا ہُوا تھا۔

تابجے کا آدمی بندوق اُٹھا کر اس طرح چل پڑا جیسے وہ نواب کے ملازموں کے گروہ کا آدمی ہو۔ دوسرا پہریدار آہستہ آہستہ ٹہلتا جا رہا تھا۔ اُس نے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سُنی تو رُک کر پیچھے دیکھا۔ وہ سمجھا ہوگا کہ یہ اُس کا ساتھی ہے۔ تابجے کا آدمی اُس کے قریب گیا تب پہریدار نے دیکھا کہ یہ تو کوئی اور ہے۔ اُس کے مُنہ سے صرف اتنا نکلا، کون ہو۔ بندوق کا بٹ اُس کے مُنہ پر پڑا۔ تابجے کے آدمی نے اُسے اوندھے مُنہ گرا دیا اور تابجے کی ہی طرح اُس کا مُنہ باندھا پھر اُس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے اور اُس کی بندوق لے لی۔

دونوں بندوقیں تابجے کے پاس پہنچ گئیں جن میں سے ایک حمیداللہ نے لے لی۔ تابجے کے آدمی خیمے کے قریب کھڑے رہے۔ تاجا اور حمیداللہ نواب کے خیمے تک پہنچ گئے۔ حمیداللہ کو شک تھا کہ نواب کے خیمے کے باہر ایک یا دو دربان ضرور موجود ہوں گے۔ نواب اپنی چھوٹی سی ریاست کا شہنشاہ تھا اس لئے اُس نے اپنی حفاظت کا اہتمام شہنشاہوں جیسا کر رکھا تھا۔ حمیداللہ اور تاجا خیمے کے پچھواڑے میں جا رُکے۔ یہ عام قسم کا خیمہ نہیں تھا۔ یہ چوکور خیمہ تھا۔ حمیداللہ جانتا تھا کہ یہ اندر سے کتنا خوشنما ہوگا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اندر نواب اکیلا نہیں ہوگا۔ اُس کے ساتھ ایک جوان عورت کا ہونا لازمی تھا۔ تابجے نے حمیداللہ کو بتایا کہ کس طرح آگے بڑھنا ہے۔ خیمے کا دروازہ دوسری طرف تھا۔

تابجے کی سکیم کے مطابق دونوں اس طرح دروازے کی طرف گئے کہ ایک دائیں طرف سے اور دوسرا بائیں طرف سے دبے پاؤں آگے بڑھا۔ دربان خیمے کے دروازے کے ساتھ سٹول پر بیٹھا تھا اور اُس کے ہاتھ میں برچھی تھی۔ پہلے حمیداللہ آگے ہُوا۔ دربان نے اُسے دیکھا تو برچھی تان کر اُس کی طرف بڑھا۔ وہ اتنا بھی نہ پوچھ سکا کہ وہ کون ہے جو اُس کی طرف

آرہا ہے کیونکہ تلجے نے پیچھے سے اُس کی گردن اپنے ایک بازو کے شکنجے میں جکڑ لی تھی۔ حمید اللہ نے ایک کپڑا جو وہ اسی مقصد کے لئے ساتھ لے گیا تھا، دربان کے مُنہ میں سے گزار کر پیچھے باندھ دیا۔ پھر دربان کے ہاتھ اور پاؤں بھی باندھ دیے گئے۔

خیمے کا دروازہ کپڑے کا تھا۔ خیمے میں لالٹین جل رہی تھی جس کی بتی بہت مدھم تھی۔ تاجا باہر کھڑا رہا اور حمید اللہ خیمے کے اندر چلا گیا۔ پلنگ پر نواب گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ اُس کے ساتھ ملے ہُوئے پلنگ پر ایک بڑی خوبصورت اور جوان عورت سوئی ہوئی تھی۔ حمید اللہ نے لالٹین اُٹھا لی تھی اور اس کی بتی اوپر کر دی تھی۔ اُس نے لالٹین ایک تپائی پر رکھ دی اور بندوق کی نالی سے نواب کے پہلو میں ٹھوکر دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا۔ عورت بھی جاگ پڑی اور وہ بھی اُٹھ بیٹھی۔ دونوں نے اپنے سامنے ایک نقاب پوش کو کھڑے دیکھا جس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ حمید اللہ نے دونوں کو چُپ رہنے کو کہا۔ خوف سے دونوں کی آنکھیں باہر کو آرہی تھیں۔

"مجھے پہچان بوڑھے نواب!"— حمید اللہ نے اپنے چہرے سے نقاب اُتارتے ہُوئے کہا۔

"حمید اللہ!"— نواب نے ایسے لہجے میں کہا جس میں حیرت بھی تھی اور مسرت بھی۔ کہنے لگا— "تم تو میرے عزیز بیٹے ہو۔ آؤ بیٹھو"— اُس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا— "وہ دیکھو فرانس سے وہسکی منگوائی ہے" — اُس نے عورت سے کہا— "اُٹھو اور میرے بیٹے کو وہسکی پلاؤ۔"

"میں وہسکی پینے نہیں آیا میرے بوڑھے باپ!"— حمید اللہ نے بندوق کی نالی اُس کے اور قریب کر کے کہا— "میں تمہارے پیغام اور دھمکیوں کا جواب دینے آیا ہوں۔ بتا تجھے میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے اگر میں گلشن آرا کو تم سے واپس لینا چاہتا تو اتنے سال انتظار نہ کرتا۔ تمہارے دماغ میں یہ آتی کیسے کہ گلشن آرا میرے پاس ہے؟ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ بھاگ گئی ہے یا اغوا ہوئی ہے اور کب سے لاپتہ ہے۔"

"مجھے معاف کر دے حمید اللہ بیٹے!"— نواب نے کانپتی ہوتی آواز میں کہا— "مجھے ویسے ہی شک ہُوا تھا کہ اُسے ....."

"اپنی حالت دیکھ!"— حمید اللہ نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا — "اپنی عمر دیکھ۔ تجھ سے بولا نہیں جاتا۔ اپنے آپ کو تُو خُدا سمجھتا ہے جیسے انسانوں کی زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں تجھے قتل کر سکتا تھا۔ نیند سے تیری آنکھ نہ کھلتی اور میرا خنجر تیرے دل میں اُتر چکا ہوتا"— حمید اللہ نے بندوق ایک طرف کر کے خنجر نکال لیا اور اس کی نوک نواب کی طرف بڑھاتے ہوتے کہا— "میں تیرا خون بہاؤں گا، قطرہ قطرہ .... تجھے فوراً نہیں ماروں گا۔ تجھے تڑپاؤں گا تو سِسک سِسک کر پیاسا مرے گا۔"

نواب پلنگ پر بیٹھے بیٹھے پیچھے کو سرکنے لگا۔ اُس نے دونوں ہاتھ حمید اللہ کی طرف بڑھاتے پھر ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ جان کی بخشش مانگ رہا تھا۔ اُس کے قریب بیٹھی ہوتی عورت بھی کانپ رہی تھی۔ حمید اللہ نے اُس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں"— نواب نے حمید اللہ سے کہا— "تمہیں یہ اچھی لگتی ہے تو اسے لے جاؤ۔ کچھ اور چاہیئے تو وہ بھی لے جاؤ۔"

"او بے وقوف انسان!"— حمید اللہ نے کہا— "میں اگر کچھ لینا چاہتا تو تمہارے کہنے کے بغیر ہی لے سکتا تھا۔ میں تمہیں تمہارے پیغام کا جواب دینے آیا ہوں۔ اگر پھر تم نے مجھ سے گلشن آرا کے متعلق پوچھا تو میں تمہیں تمہارے محل میں قتل کروں گا اور جن ہیروں سے تمہیں پیار ہے وہ اُٹھا کر لے آؤں گا .... یہ بندوق دیکھو۔ یہ تمہارے ایک پہریدار کی ہے۔ دوسرے پہریدار کی بندوق میرے ایک اور آدمی کے پاس ہے۔ اُٹھ کر اپنے دربان کو دیکھنا۔ اگر میری طاقت دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے تمام آدمیوں کو جگا لو۔ پھر دیکھنا کہ اُن کی لاشیں کس طرح تڑپتی ہیں۔"

"میں پھر کبھی نہیں پوچھوں گا"— نواب نے بڑھاپے اور خوف سے لرزتی ہوتی آواز میں کہا— "میں گلشن آرا کو بھول جاؤں گا۔"

"میں یہ بندوقیں تمہارے پہریداروں کو واپس کر کے جاؤں گا"—— حمیداللہ نے کہا ——"اور یہ بھی یاد رکھ لو کہ تمہاری گدّی کا جانشین میں ہوں گا۔ وصیّت لکھتے وقت یاد رکھنا"

حمیداللہ اپنے باپ کو خوفزدہ حالت میں چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا۔

تابجے نے مجھے یہ واقعہ بڑا دلچسپ بنا کر سنایا تھا۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ میں بھی ان دلچسپیوں کا حصّہ بن جاؤں، لیکن میں سوچ رہا تھا کہ انسان اپنے آپ کو انسانوں کا دیوتا بنالیتا ہے لیکن موت کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے پاؤں میں ماتھا رگڑنے پر آجاتا ہے۔

"سدا شہنشاہ اللہ ہے"—— گلشن آرا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں نے اور تابجے نے گھبرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ مُنہ چھت کی طرف کئے ہوئے تھی اور ایک بازو اُوپر اُٹھائے ہوئے تھی۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنی اصلی حالت میں نہیں۔

"سدا شہنشاہ اللہ ہے"—— اُس نے ایک بار پھر کہا۔ پھر اسی کا وِرد شروع کر دیا۔

انسان کمزوریوں کا پُتلا ہے۔ وہ اپنے آپ کو نواب سے بھی زیادہ طاقتور بنا لیتا ہے لیکن صرف ایک کمزوری خواہ وہ ایک خیال کی صورت میں ہی سامنے آئے تو اُسے گھٹنوں کے بل بٹھا دیتی ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنی پُراسرار طاقت کو سمجھنے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ اسے گلشن آرا پر آزمایا بھی تھا اور یوں سمجھ لیں کہ شیطان کو میں نے زیر کر لیا تھا۔ پھر بھی میں نے اس کی طرف اتنی توجّہ نہیں دی تھی۔ شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ میں اپنے آپ کو کھو بیٹھا۔

ایک وہ راتیں تھیں جب گلشن آرا مجھے بلاتی تھی اور میں اُسے مایوس کر کے واپس آجاتا تھا۔ اب یہ راتیں آئیں کہ گلشن آرا ایک ہی کمرے

میں راتوں کو بھی میرے ساتھ تنہا ہوتی تھی لیکن وہ میری طرف ذرا سی بھی توجّہ نہیں دیتی تھی۔ میں پہلے یہ کہتا رہا ہوں کہ گلشن آرا حسین عورت تھی جو اپنی عمر سے کئی سال چھوٹی لگتی تھی مگر اب اُس کا حُسن جو مجھے رات کو کھڑکی میں سے آتی ہوئی چاندنی میں نظر آتا تھا مجھ پر غالب آنے لگا۔ تین چار مرتبہ میں اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا تو بھی اُس نے میری طرف توجّہ نہ دی۔

میں نے کہا ہے کہ ڈری سہمی ہوئی حالت میں وہ مجھے مجھ سے چھوٹی نظر آتی تھی۔ میرے ذہن میں یہ خیال بیٹھنے لگا کہ یہ خوبصورت عورت میری ملکیت ہے اور میں اسے اپنے اشاروں پر نچا سکتا ہوں۔ ایک رات اسی خیال نے مجھ پر غلبہ پا لیا اور میں اُس کے پلنگ پر جا بیٹھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"گلشن!"—— میں نے اُس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا ——"اب تم مجھے اپنے پاس کیوں نہیں بٹھاتیں؟"

"اس لئے کہ اب تم ہر وقت میرے قریب ہوتے ہو"—— اُس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکال لیا پھر بولی ——"جاؤ سو جاؤ"

اُس کے لہجے میں اور اُس کے انداز میں بے رُخی یا بے گانگی نہیں تھی بلکہ ایسا تاثر تھا جیسے ماں اپنے بچّے کو سو جانے کے لئے کہہ رہی ہو، لیکن مجھے بہت بُرا لگا جیسے ایک نوکرانی نے اپنے آقا کی حکم عدولی کی ہو۔ مجھے غصّہ سا آگیا اور میں اپنے پلنگ پر جا بیٹھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ غصّہ بہت بڑی کمزوری ہے۔ میں نے غصّے کو دبانے کی کوشش نہ کی۔

اگلے دن گلشن آرا نے میرے ساتھ کوئی بات کی تو میں نے ایسی بے رُخی کا اظہار کیا جیسے میں نے اُس کی بات سُنی ہی نہ ہو۔ اُس نے دوبارہ وہ بات نہ کہی اور مُنہ پھیر لیا۔ میں یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ اپنی بات کو دُہرائے اور میں بڑے رُعب سے اُسے جواب دوں لیکن اُس نے میری پرواہ

ہی نہ کی۔

میں اُس عمر میں نہیں جانتا تھا کہ انسان کی کمزوریاں کیا کیا ہوتی ہیں۔ عمر میں بہت آگے جاکر مجھے انسانی فطرت کی خوبیوں اور خامیوں کا پتہ چلا تھا۔ گلشن نے جب میری طرف سے مُنہ پھیر لیا تو انسانی فطرت کی یہ کمزوری اُبھر آئی کہ میں اُس پر ظاہر کرتا کہ وہ میرے رحم وکرم پر ہے۔ اُسی رات کا ذکر ہے۔ وقت شاید آدھی رات کا ہوگا۔ حسبِ معمول میری آنکھ کُھلی۔ گلشن آراء عبادت سے فارغ ہوکر اُٹھ رہی تھی۔

"گلشن!" — میں نے حکم کے لہجے میں کہا — "اِدھر آؤ۔"

وہ اس طرح آہستہ آہستہ چلتی میرے پلنگ کے قریب آکر رُک گئی جیسے کسی پُراسرار طاقت کے زیرِ اثر ہو۔

"بیٹھ جاؤ" — میں نے کہا۔

وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"میرے ساتھ کوئی بات کرو" — میں نے کہا۔

"میری بات ختم ہوچکی ہے سکندر!" — گلشن نے مری مری سی آواز میں کہا — "اب کیا باتیں کروں!"

"وہی باتیں کرو جو تم مجھے اپنے کمرے میں بُلا کر کیا کرتی تھیں" — میں نے بڑی رُعب دار آواز میں کہا۔

"مجھے وہ وقت یاد نہ دلاؤ سکندر!" — اُس نے بڑے ہی اُداس لہجے میں کہا — "اب وہ باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ میں صرف ایک بات یاد رکھنا چاہتی ہوں کہ میں نے تمہیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔"

"میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں" — میں نے ایسی غصیلی آواز میں کہا کہ کمرہ گُونج اُٹھا — "اُس نیت کی باتیں کرو جس نیت سے تم مجھے اپنے کمرے میں بُلایا کرتی تھیں۔"

"نہ سکندر!" — اُس نے بڑے اچھے لہجے میں کہا — "ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔"

مجھ پر نہ جانے کیا اثر ہوگیا تھا۔ ذہن میں یہی ایک خیال تڑپنے لگا کہ گلشن آراء میرے ساتھ اُسی طرح کی باتیں کرے لیکن وہ اُن باتوں کی طرف نہ خود آتی تھی نہ مجھے آنے دے رہی تھی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوتی۔

"کہاں جارہی ہو؟" — میں نے اُسے اپنی لونڈی سمجھتے ہُوئے پوچھا۔

"اِن باتوں سے بہت دُور جارہی ہوں" — اُس نے جواب دیا پھر جُھک کر میرے سَر کو چُوما، میرے سر پر ہلکی سی تھپکی دی اور اپنے پلنگ پر جا بیٹھی۔

اچانک میرے وجود کے اندر بگولے اُٹھنے لگے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ان بگولوں کی لپیٹ میں آکر چکر کھاتا ہُوا دُور اُوپر جارہا ہوں۔ پھر اپنے وجود میں ہی ایک دھماکہ سا ہُوا جیسے میں دُور اُوپر آسمان سے زمین پر آپڑا ہوں۔ شرمندگی اور پچھتاوے کے احساس نے مجھے تڑپا دیا گلشن آراء پلنگ پر جاکر لیٹ گئی۔ مجھے اُس پر رشک آنے لگا کہ وہ کتنی پُرسکون ہے اور میں نے اپنا سکون تباہ کرلیا ہے۔ میرے جی میں آئی کہ میں اُس سے جاکر معافی مانگوں اور اُسے کہوں کہ ایک بار پھر میرا سَر چُومو اور میرے سَر پر تھپکی دو۔

وہ آرام اور سُکون سے سوگئی۔ میں سو نہ سکا۔

*

وہاں میرے لئے مشکل یہ تھی کہ میں اس گھر سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ باہر کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔ یہ چھوٹے سے اس گاؤں کے لوگوں کی اور مویشیوں کی آوازیں ہوتی تھیں۔ یہ سب لوگ تاجے کے جاسوس اور چوکیدار تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ تاجے کا سلوک اتنا اچھا تھا کہ وہ رات دن خیال رکھتے تھے کہ تاجا پکڑا نہ جائے۔ یہ باتیں مجھے تاجے کے اُن دو آدمیوں نے بتائی تھیں جو ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ اگر میں باہر نکل سکتا تو میری دلچسپیاں کچھ اور بھی ہوجاتیں اور میرے ذہن میں یہ گُھٹن سی پیدا نہ ہوتی۔ ایک ہی کمرے میں یا ایک ہی مکان میں بند رہ کر خیالات محدود سے ہوگئے

تھے اور طبیعت میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ اس بند اور محدود ماحول کا مزاج پر بُرا اثر پڑ رہا تھا۔

دوسرے دن گلشن آراء کا رویّہ ایسا رہا جیسے اُسے یاد ہی نہ ہو کہ رات میں نے اُسے کوئی ناگوار بات کہی تھی۔ اگر تھوڑی سی دیر کے لئے میرے پاس بیٹھ جاتی اور یہی کہہ دیتی کہ میں نے رات کو جو باتیں کی تھیں وہ اچھی نہیں تھیں تو میری یہ حالت نہ ہوتی۔ گلشن آراء میرے سامنے کبھی کمرے میں اور کبھی صحن میں آہستہ آہستہ ٹہلتی رہی۔ کبھی وہ لیٹ جاتی اور زیادہ تر وقت وہ عبادت میں گزارتی تھی۔ اُس روز بھی اُس نے اپنا یہی معمول جاری رکھا۔

میں اُس سے معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن اُس کا یہ رویّہ دیکھا تو مجھے پھر غصّہ آنے لگا۔ میں نے غصّے پر قابو پاتے رکھا اور دن اسی کشمکش میں گزر گیا۔

رات آئی۔ میں روزمرّہ کی طرح سو گیا اور روزمرّہ کی طرح آدھی رات کے لگ بھگ میری آنکھ کھلی۔ گلشن اپنے پلنگ پر پیٹھ کے بل سوئی ہوئی تھی۔ باہر سے آتی ہوئی چاندنی اُس پر پڑ رہی تھی۔ گلشن آراء کا سینہ آہستہ آہستہ اُٹھ اور بیٹھ رہا تھا۔ کمرے کی خاموشی میں مجھے اُس کی سانسیں سُنائی دے رہی تھیں۔ میں اُٹھا اور اُس کے پلنگ کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ اُس کے چہرے پر بالوں کی ایک لٹ آئی ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے کی سپیدی پر یہ چند ایک بال اُس کے حُسن میں طلسماتی سا تاثر پیدا کر رہے تھے۔ میں اُسے کچھ دیر دیکھتا رہا۔ پھر میں اُس کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اُس کے بکھرے بکھرے سے ریشم جیسے بال مجھے اتنے اچھے لگے کہ میرا ہاتھ اپنے آپ اُس کے بالوں پر چلا گیا۔ اُس کی آنکھ کُھل گئی۔

"نیند نہیں آ رہی؟" —— اُس نے پیار سے پوچھا۔

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اُسے کوئی جواب نہ دیا۔

"میرا خیال ہے تم ڈر رہے ہو!" —— اُس نے کہا اور سرک کر پرے ہو گئی۔ کہنے لگی —— "اگر ڈر آتا ہے تو میرے پاس لیٹ جاؤ۔"

مجھے ایسے لگا جیسے اُس نے میری مردانگی پر طنز کی ہو۔

"کیا تم مجھے اتنا بُزدل سمجھتی ہو؟" —— میں نے قدرے غصیلی آواز میں کہا —— "میں مرد ہوں۔"

"لیکن میرے لئے تم بچے ہو" —— اُس نے ہلکی سی مُسکراہٹ سے کہا —— "جاؤ سو جاؤ۔"

میں نے ایسے محسوس کیا جیسے اُس نے میرے مُنہ پر تھپڑ مارا ہو اور مجھے دُھتکار دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی پھر شرمندگی اور پچھتاوے کی آندھی اُٹھی جو اتنی تیز اور تُند تھی کہ میں اپنے پلنگ پر جا گرا۔ مجھے اپنی آوازیں سنائی دینے لگیں —— "تم بزدل ہو سکندر، تم بچے ہو" —— ان آوازوں نے مجھے سونے نہ دیا۔ میں پلنگ پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اتنے میں گلشن آراء اُٹھی اور باہر چلی گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ وضو کرنے گئی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ آئی اور قبلہ رُو ہو کر نفل پڑھنے لگی۔ مجھے ایسی چوٹ پڑی کہ میں پلنگ پر اُٹھ بیٹھا اور اُسے دیکھنے لگا۔ پھر میں لیٹ گیا اور میری آنکھ لگ گئی۔

*

اگلے روز میری ذہنی اور جذباتی حالت ایسی ہو گئی کہ گلشن آراء کو دیکھ کر مجھے غصّہ آ جاتا اور کبھی شرمندگی کا احساس مجھے پریشان کرنے لگتا۔ میرے اپنے ہی خیالات مجھ پر واضح نہیں ہو رہے تھے، نہ مجھے یہ پتہ چل رہا تھا کہ میں چاہتا کیا ہوں۔ صرف یہ خیال واضح تھا کہ گلشن آراء مجھے پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آنے لگی تھی اور یہ بھی کہ وہ میرے رحم و کرم پر تھی۔ مجھے اُس کی عبادت اور خاموشی بُری لگنے لگی تھی۔

اُسی شام تاجا آ گیا۔ وہ جلدی میں تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ دونوں آدمیوں کو ساتھ لے جا رہا ہے۔

"آج رات تم دونوں اکیلے رہو گے" —— اُس نے کہا —— "ڈرنا نہیں۔ اگر پولیس نے چھاپہ مارا تو تم دونوں کو پہلے ہی یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ میں نے پورا بندوبست کر دیا ہے۔ کل دوپہر تک یہ دونوں آدمی اگر زندہ

رہے تو واپس آجائیں گے، نہیں تو کوئی نہ کوئی آکر تمہیں یہاں سے لے جائے گا۔"

میں نے ذرا سا بھی ڈر اور خوف محسوس نہ کیا۔ تاجا اور اُس کے آدمی چلے گئے۔

رات وہی وقت تھا جب میری آنکھ کھلی۔ گلشن آراء فرش پر دو زانو بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کے ہاتھ دُعا کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ پھر وہ اُٹھی اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ میں اُٹھا اور اُس کے پلنگ پر جا چڑھا۔ وہ ہلکی سی ہنسی ہنس پڑی۔

"میں جانتی ہوں تم ڈرتے ہو" — اُس نے کہا۔

"تم بکواس کرتی ہو" — میں نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا — "آج میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں بچّہ ہوں یا جوان مرد۔"

میں اُس پر جھپٹ پڑا۔ میں وحشی بن چکا تھا۔ مجھ پر حیوانیت غالب آ گئی تھی۔ گلشن آراء اب میری نظر میں ایک خوبصورت عورت تھی۔ خیال جو مجھ پر واضح نہیں ہو رہا تھا اچانک واضح ہو کر سامنے آگیا۔ وہی گلشن آراء جو مجھے ایک خوبصورت جسم سمجھ کر چاہتی تھی اور جس نے اپنے حیوانی جذبات کی تسکین کے لئے خطرے مول لے کر مجھے کئی بار بلایا تھا وہ اب اتنی طاقتور ہو گئی تھی کہ وہ تیزی سے اُٹھی اور میری گرفت سے نکل گئی۔ اُس نے میرے سامنے بیٹھ کر میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"میں نے تمہیں اپنا بیٹا کہا ہے" — گلشن آراء نے پیار سے کہا — "تم کس طرف چل پڑے ہو؟"

"تم میری ماں نہیں ہو" — میں نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے بازوؤں پر مار کر کہا — "تم ایک خوبصورت جسم ہو اور یہ جسم اب میری ملکیت ہے۔"

"خُدا سے ڈرو سکندر!"

لیکن میرے دل سے خدا کا خوف نکل چکا تھا۔ معلوم نہیں کیسی کیسی

کمزوریاں میرے وجود میں سے اُٹھ کر مجھ پر غالب آ گئی تھیں۔ گلشن آراء میرے ارادوں کو سمجھ گئی تھی۔

"اب نہیں سکندر!" — اُس نے التجا کے لہجے میں کہا — "اب نہیں۔ اب میں وہ نہیں رہی۔ مجھ سے میرے خُدا کو الگ نہ کرو۔"

میں اُس پر پھر جھپٹا۔ اُس نے مجھے اتنی زور سے دھکّا دیا کہ میں پلنگ سے گر کر فرش پر آ پڑا۔ میں غصّے سے باؤلا ہو گیا۔ اُٹھ کر اُس کی طرف بڑھنے لگا تو وہ تیزی سے اُٹھی اور صحن کی طرف دوڑی۔ میں اُس کے پیچھے گیا۔ وہ باہر کا دروازہ کھول کر نکل گئی۔ مجھے ایسا خیال نہ آیا کہ وہ اکیلی باہر نکل گئی ہے اور اُسے کوئی اور پکڑ لے گا۔ میں اس خیال سے اُس کے پیچھے دوڑا کہ وہ مجھے دھتکار کر چلی گئی ہے اور میں اُسے بتا دوں گا کہ وہ مجھے نہیں دھتکار سکتی۔

یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ سب لوگ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ میں نے گلشن آراء کو دیکھ لیا۔ وہ گاؤں سے نکل گئی تھی۔ میں اُس کے پیچھے گیا۔ وہ رُک گئی جیسے میرے انتظار میں رُکی ہو۔ میں اُس کے قریب جا پہنچا۔

"واپس چلو" — میں نے اُسے کہا — "نہیں چلو گی تو تمہارے کپڑے پھاڑ ڈالوں گا۔"

اُس نے اتنی زور سے میرے مُنہ پر تھپّڑ مارا کہ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ چونکہ توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے تھپّڑ مارے گی اس لئے مجھے ایسے لگا جیسے میرے جسم میں خون جم گیا ہو اور طاقت سلب ہو گئی ہو۔ میں سُن ہو کے رہ گیا۔ گلشن پھر دوڑ پڑی۔ وہ گاؤں کی طرف نہ گئی۔ وہ گاؤں سے اُلٹے رُخ دوڑی جا رہی تھی۔ میں اُس کے پیچھے گیا مگر وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ پورے چاند کی چاندنی بڑی صاف تھی۔

میری حالت اب بھوکے بھیڑیئے جیسی ہو گئی تھی جو بھیڑ کے پیچھے دوڑا جا رہا ہو۔ رات کی خاموشی میں مجھے اُس کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ کھیت ختم ہو گئے تھے۔ آگے زمین کٹی پھٹی تھی۔ گھاٹیاں

بڑے بڑے چوڑے کھڈوں میں اُترتی اور چڑھتی تھیں اور ٹیلے بھی تھے۔ دو تین جگہوں پر بارشوں کا پانی جمع تھا۔

*

میں ایک گھاٹی پر جا کر رُک گیا۔ میرے نیچے بڑا چوڑا نشیب تھا جس کے وسط میں پانی جمع تھا۔ چند ایک درخت بھی تھے۔ گلشن آرا نظر نہ آتی۔ اُس کے قدموں کی آہٹ بھی خاموش ہو گئی تھی۔

"گلشن!" ـــ میں نے بڑی بلند آواز سے اُسے پکارا ـــ "میرے سامنے آجاؤ"۔

خاموشی۔ رات کا گہرا سکوت!

"مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گی؟" ـــ میں نے للکار کر کہا۔

مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور کچھ دُور آگے گلشن آرا زمین سے اُبھری۔ وہاں بھی کھڈ تھا جس میں وہ چھُپ گئی تھی اور میری للکار پر نکل بھاگی تھی۔ میں جس چوڑے نشیب پر کھڑا تھا، اس میں اُترنے اور آگے جانے کی بجائے میں اس کے کنارے پر دوڑ پڑا۔ وہ مجھے دکھائی دیتی رہی۔ کبھی زمین میں غائب ہو جاتی کبھی اُبھر آتی۔ وہ کھڈوں کو پھلانگتی جا رہی تھی۔

آخر عورت تھی۔ مجھ جتنا تیز نہیں دوڑ سکتی تھی۔ میں نے اُسے جا لیا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ میں اُسے پکڑنے کے لئے لپکا تو وہ گر پڑی اور پیٹھ کے بل ہو گئی۔ وہ چلّا رہی تھی۔

"نہیں، نہیں سکندر! ..... میں تمہاری ماں ہوں"۔

میں اُس پر گر کر اُس کے کپڑے اس طرح نوچ رہا تھا جیسے بھیڑیا بھیڑ کو پکڑ کر اُسے بھنبھوڑ رہا ہو۔

"میرے سجدے ضائع نہ کرو..... سکندر!"

مجھ پر اُس کی آہ وزاری کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اچانک میرے سر پر بڑی زور سے ضرب لگی۔ میرے ہاتھ جو ابھی اُس کے کپڑے ہی نوچ رہے تھے، بے جان ہو گئے۔ چاندنی تاریک ہو گئی۔

تارے ناچتے نظر آتے پھر میں بے ہوش ہو گیا۔ گلشن کے ہاتھ شاید پتھر آ گیا تھا جو اُس نے پوری طاقت سے میرے سر پر مارا تھا۔ اُس نے اپنے سجدوں کو ضائع ہونے سے بچا لیا تھا۔

یہ میں نے تجربہ کیا ہے کہ ذہن میں گناہ کا خیال نہ ہو تو جسم میں اتنی زیادہ طاقت آجاتی ہے کہ انسان بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ میں اپنے آپ کو گلشن آرا سے کہیں زیادہ طاقتور سمجھتا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں روحانی قوت سے محروم ہو چکا ہوں اور میں جسم کی طاقت کو ہی اصل طاقت سمجھ رہا ہوں لیکن گلشن آرا مجھے شکست دے چکی تھی اور میں بے ہوش پڑا تھا۔

*

آہستہ آہستہ میرے ہوش و حواس بحال ہوتے۔ میرا سر کسی نرم و گداز چیز پر رکھا تھا جو تکیہ ہی ہو سکتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے چاند نظر آیا۔ سر میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی پیشانی پر مجھے نمی سی اور ایک لمس محسوس ہوا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ مجھے گلشن آرا کا چہرہ اپنے چہرے پر جھکا ہوا دکھائی دیا۔ تب میں نے دیکھا، میرا سر گلشن آرا نے اپنی آغوش میں رکھا ہوا تھا۔ اُسی نے میرے ماتھے کو چوما تھا۔

میں اچک کر اُٹھ بیٹھا اور گلشن آرا کا سامنا کیا۔ چاندنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ مجھے اور زیادہ دلکش دکھائی دی۔ وہ مجھے چُپ چاپ دیکھ رہی تھی۔ میرے سر میں درد کی ٹیس اُٹھی۔ میرے ذہن میں شور سا ہونے لگا جیسے لڑائی ہو رہی ہو۔

"اب بھی وقت ہے سکندر!" ـــ اُس نے ہارے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

"وقت گزر جانے کے بعد کیا ہو گا؟" ـــ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"پھر بخشش کے دروازے بند ہو جائیں گے" ـــ اُس نے کہا ـــ

"یہیں سے واپس ہو جاؤ۔"

"تم پاکباز عورت نہیں ہو"— میں نے کہا —"مجھ سے اپنا دامن پاک رکھنے کی کوشش کیوں کرتی ہو؟"

مجھ پر تو جیسے کسی نے شیطانی عمل کر دیا تھا۔ میں اُس وقت نوجوان تھا۔ اس عمر کا فتور بھی تھا۔ میں نے اس طرف دھیان ہی نہ دیا کہ گلشن آرا مجھے پتھر مار کر بھاگی نہیں بلکہ میرا سر اپنی آغوش میں رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے تو ایک ہی بار محسوس کیا تھا کہ اُس نے میری پیشانی چُومی ہے، معلوم نہیں، اُس نے کتنی بار اس طریقے سے پیار کا اظہار کیا تھا۔ مجھے یہ خیال آیا کہ یہ چالاک عورت ہے۔ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں اس لئے مجھ پر پاکبازی کا رُعب جما کر میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ اس لیے مجھے تھپڑ مارا تھا پھر میرے سر پر پتھر مار کر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔

یہ سب سوچیں پلک جھپکتے ذہن میں آئیں اور انتقام کا شعلہ بن گئیں۔ میں بیٹھے بیٹھے اُس کی طرف لپکا۔ وہ بڑی تیزی سے اُٹھی اور دوڑ پڑی۔ اُس نے بھانپ لیا تھا کہ مجھ پر اُس کی کسی بات کا اثر نہیں ہُوا نہ میں نے اُس کے پیار کو قبول کیا ہے اور میری نیتِ بد اور شیطانی ارادے میں تبدیلی نہیں آئی۔

اب میں اُس کے پیچھے دوڑا تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے سر پر چوٹیں پڑنے لگیں۔ جہاں میرے سر پر پتھر لگا تھا وہاں ہر قدم کے ساتھ درد ہوتا تھا اس لئے میں زیادہ تیز نہ دوڑ سکا۔ اپنی مردانگی کا بھرم قائم رکھنے کے لئے میں دوڑتا گیا۔ گاؤں سے ہم تقریباً دو میل دُور چلے گئے تھے۔ گلشن مجھے نظر آ رہی تھی۔

وہ رک گئی۔ میں بیس پچیس قدم دُور تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے نیچے زمین سخت ہو گئی ہے۔ وہاں زمین پتھریلی تھی۔ گلشن آرا وہیں کھڑی رہی اور میں اُس کی طرف بڑھتا گیا۔ فاصلہ جب تین چار قدم رہ گیا تو اُس نے میری طرف دیکھا پھر دوسری طرف دیکھا اور وہ غائب ہو گئی جیسے اُسے زمین نے

نگل لیا ہو۔ مجھے اُس کے گرنے کی آواز کچھ اس طرح آئی جیسے وہ پانی کے تالاب میں گری ہو۔ میں جب وہاں پہنچا تو آگے زمین غائب تھی۔ نیچے دیکھا۔ دریا بہہ رہا تھا اور میں اس کے بڑے اُونچے کنارے پر کھڑا تھا۔ گلشن آرا دریا میں کُود گئی تھی۔ وہاں دریا چوڑا نہیں تھا اس لئے گہرائی یقیناً زیادہ تھی۔ وہ مجھے دریا میں نظر نہ آئی۔ مجھے یقین ہے کہ اُس نے دریا میں پناہ لی تھی۔ وہ خُدا سے پناہ مانگتی رہی تھی۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا نیچے دیکھتا رہا۔ لہروں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔

اچانک یوں لگا جیسے کسی نے میری گردن دبوچ لی ہو۔ میں نے اپنی گردن پر ہاتھ رکھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ جیسی گرفت میں نے اپنی گردن پر محسوس کی تھی ویسی ہی گرفت میں میرا دل آ گیا۔ مجھے پہلی بار معلوم ہُوا کہ ڈر، گھبراہٹ، خوف اور دہشت کیا ہوتے ہیں۔ ایک بار تو ذہن میں ارادہ آیا کہ میں بھی دریا میں کُود جاؤں، لیکن موت سے بھی ڈر آنے لگا۔

*

وہاں سے مجھے واپس گاؤں کو آنا تھا۔ مجھ پر خوف کا ایسا غلبہ طاری ہو گیا کہ مجھے ہر طرف جن اور چڑیلیں نظر آنے لگیں۔ کبھی خیال آتا کہ ابھی بھیڑیئے آئیں گے اور مجھے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔ میں نے ایک بار پھر نیچے دریا کی طرف دیکھا۔ ایسے لگا جیسے لہریں مجھے پکڑ کر اپنے ساتھ بہا لے جانے کو اچھل رہی ہوں۔ میں آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف چل پڑا۔

"اپنے ذہن کو بدی سے پاک رکھنا، پھر تم گناہوں پر غالب آ جاؤ گے"— مجھے خواجہ صاحب کی آواز سنائی دینے لگی —"تمہاری یہ قوت جس سے تم ابھی تک واقف نہیں اُبھر کر سامنے آ جائے گی۔"

خواجہ صاحب کی اس آواز نے میرے پاؤں جکڑ لئے۔ میں اپنی اس مافوق الفطرت قوت کو جانے بغیر کھو چکا تھا۔

"اس کی آنکھوں میں وہ طاقت ہے جو ہر کسی میں نہیں ہو سکتی"----

یہ اُس پگلی کی آواز تھی جس نے میرے بچپن میں میرے متعلق میری ماں سے کہا تھا ــــ "لیکن یہ آگ میں سے گزر کر..."

پگلی یاد آئی تو وہ ایک چڑیل کی طرح میرے سامنے آن کھڑی ہوئی پھر وہ اپنی خشک اُنگلیاں میری طرف کر کے آگے بڑھنے لگی۔

"تم نے مجھے جھٹلا دیا ہے" ــــ اُس نے چڑیلوں کی طرح دانت باہر نکال کر کہا ــــ "تم پاپی ہو۔ اب ساری عمر آگ میں جلتے رہو"۔

میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور وہیں بیٹھ گیا۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ آنکھوں کے آگے سے انگلیاں ہٹائیں۔ پگلی وہاں نہیں تھی لیکن میرا دل کانپ رہا تھا۔ میں اُٹھا اور دریا کی طرف دیکھ کر "گلشن گلشن" پکارنے لگا جیسے چھوٹا سا بچہ اپنی ماں کو پکار رہا ہو۔

گناہ کے صرف ارادے نے مجھے ختم کر دیا تھا۔ میں کسی بھی صورتحال میں نہیں ڈرا تھا۔ میں تو موت کے قید خانے میں بھی پُرسکون رہا تھا لیکن اب میری روح بھی کانپ رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف چل پڑا۔ یہ خیال مجھے ڈسنے لگا کہ میں نے گلشن کو دریا میں پھینک کر مار دیا ہے۔ میرے قدم اتنے بوجھل ہو گئے تھے کہ اُٹھتے ہی نہیں تھے۔ اچانک کوئی چیز پھڑپھڑاتی ہوئی میرے اُوپر سے گزر گئی۔ یہ تو میں آج کہتا ہوں کہ وہ چمگادڑ تھا لیکن اُس وقت میں اسے بھی کوئی شرشرار جیسی چیز سمجھا اور میں دوڑ پڑا۔ تین چار جگہ ٹھوکر کھائی، میں گرا، اُٹھا اور پھر دوڑ پڑا۔

میں اتنا تھک گیا کہ ایک درخت کے نیچے گر پڑا۔ سانسوں کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ ایک بار تو ایسے لگا جیسے میں مر رہا ہوں۔ اگر میں گناہگار نہ ہوتا تو موت سے میں کبھی نہ ڈرتا۔ میں شرم اور خوف کے مارے خدا کو بھی نہیں پکارتا تھا۔ اتنی سی بھی ہمت نہیں رہ گئی تھی کہ میں اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اپنے قریب ہی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے اُدھر دیکھا۔ گہرے رنگ کا ایک سانپ جس کی لمبائی ایک گز سے زیادہ تھی، مجھ سے تین چار قدم دُور رینگتا جا رہا تھا۔ میرا خوف ایک طاقت بن گیا۔ میں گیند کی طرح اُچھلا اور دوڑ پڑا۔

گاؤں نظر آنے لگا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا رہا پھر میں ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا کیونکہ مجھے ایک آدمی کھڑا نظر آ رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ وہ ایک طرف کو ہو کر آہستہ آہستہ چل پڑا۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ پولیس کا آدمی تھا اور اُس نے پولیس کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے آگے نکل گیا تو میں اس درخت کی اوٹ سے نکل کر دس بارہ قدم آگے ایک اور درخت کی اوٹ میں جا رُکا۔ وہاں مجھے گاؤں سے اُٹھتا ہُوا شور سنائی دینے لگا۔

میں نے اس شور کو سمجھنے کی کوشش کی تو مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ تاجا ڈاکو معلوم نہیں کب سے اس گاؤں میں ڈیرے ڈالے ہُوئے تھا۔ کسی نے مُخبری کر دی ہو گی اور پولیس چھاپہ مارنے آئی ہو گی۔ مجھے آگے نہیں جانا چاہیئے تھا۔ میں نے اُوپر دیکھا۔ درخت گھنا تھا۔ میں درخت پر چڑھ گیا اور ایک ٹہن پر بیٹھ گیا۔ مجھ میں اتنی عقل نہیں ہونی چاہیئے تھی لیکن ایک گناہ نے مجھے گناہگاروں کی دنیا میں دھکیل دیا تھا اور اپنے آپ ہی مجھ میں چوروں اور ڈکیتوں جیسی سُوجھ بُوجھ آ گئی تھی۔

میں نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر میں درخت کی اوٹ میں کھڑا سوچتا رہتا تو میں پکڑا جاتا۔ پندرہ بیس منٹ بعد پولیس کا وہ آدمی جسے میں نے دیکھا تھا ایک اور آدمی کے ساتھ اس درخت کے نیچے آن کھڑا ہُوا جس پر میں چڑھا ہُوا تھا۔

"ہمارا تھانیدار کم عقل ہے" ــــ ایک نے کہا ــــ "تاجا اتنی آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں"۔

"گاؤں والوں نے اسے پہلے ہی نکال دیا ہو گا" ــــ دوسرے نے کہا۔

"نمبردار بھی اُس سے ملا ہُوا ہے"۔

"گاؤں والے بیچارے دونوں طرف سے ڈرتے ہیں"۔

"سُنا ہے وہ ایک عورت اور بڑے خوبصورت لڑکے کو کہیں سے لایا ہے"۔

"یہی تو مخبر نے رپورٹ دی ہے۔"

"لیکن ملے گا کچھ نہیں۔"

"تاجا بادشاہ ہے یار! تم اُس کے پاس چلے جاؤ۔ تمہاری جیب بھر دے گا۔"

دونوں وہاں کھڑے تاجے کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ مجھے یہ اطمینان ہُوا کہ میں اور گلشن وہاں نہیں تھے۔ تاجا تو پہلے ہی اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں سے نکل گیا تھا۔ اگر اُسے معلوم ہوتا کہ چھاپہ پڑے گا تو وہ مجھے اور گلشن کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔

گاؤں سے کسی نے ان دونوں سپاہیوں کو پکارا۔ وہ دونوں دوڑے گئے۔ میں درخت پر ہی بیٹھا رہا۔ آدھے پونے گھنٹے کے بعد گاؤں میں سے پولیس والے نکلے اور اسی درخت کے نیچے سے گزرے۔ گھوڑے پر جو سوار تھا وہ تھانیدار ہو گا۔ باقی آٹھ دس پولیس کے سپاہی تھے۔

"گاؤں والوں کی بدمعاشی ہے" — ان میں سے کوئی کہہ رہا تھا۔

"وہ جو مکان خالی تھا" — کسی اور نے کہا — "شاید تاجا اُس پر رہتا رہا ہے۔"

وہ باتیں کرتے اور گالیاں بکتے دُور نکل گئے اور میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ تاجے نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ اُس نے میری اور گلشن کی حفاظت کا بندوبست کر لیا ہے۔ بندوبست یہی ہو سکتا تھا کہ اُس نے گاؤں والوں کو اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ میرے لئے یہی ایک صورت تھی کہ میں گاؤں میں چلا جاتا۔ میں اور تو کہیں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے خطرہ مول لیا اور درخت سے اُترا۔

میں پہلے کی طرح ہی خوف زدہ تھا لیکن پولیس کو دیکھ کر مجھ میں ذرا سی دلیری آگئی اور میں گاؤں کے قریب جا پہنچا۔ میں ڈرتے ڈرتے گاؤں میں داخل ہُوا۔

"ٹھہر جا ذرا" — مجھے آواز سنائی دی۔

میں خوف سے سُن ہو گیا اور میں وہیں رُک گیا۔ یہ پولیس کا کوئی آدمی ہو سکتا تھا جسے تھانیدار پیچھے چھوڑ گیا ہو گا۔ میں ڈر کے مارے پیچھے دیکھتا بھی نہیں تھا۔ ایک آدمی میرے پاس آ رُکا۔ وہ پولیس کا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔

"تاجے کے ساتھ تم ہی تھے نا!" — اُس نے پوچھا۔

"ہاں" — میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

اُس نے ادھر اُدھر دیکھ کر رازداری کے لہجے میں پوچھا — "کوئی عورت بھی تھی؟"

میں اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا لیکن میرے دماغ نے اپنے آپ ہی بدمعاشی کی باتیں سوچنی شروع کر دی تھیں۔

"تاجا اُسے ساتھ لے گیا ہے" — میں نے جواب دیا۔

"کیا تجھے پتہ چل گیا تھا کہ پولیس آ رہی ہے؟" — اُس نے پوچھا۔

"ہاں" — میں نے جواب دیا — "میں نے کھڑکی میں سے آوازیں سُنی تھیں اور میں کھڑکی میں سے ہی کُود کر باہر نکل گیا تھا۔"

"یہ تُو نے اچھا کیا" — اُس نے کہا — "ہماری عزّت رہ گئی ہے ورنہ تاجے کے سامنے ہم شرمسار ہوتے .... آ میرے ساتھ۔"

میں اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور خوف نے ایک بار پھر میرے دل کو جکڑ لیا۔ یہ دھوکا بھی ہو سکتا تھا لیکن میں اب کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اُسے نمبردار نے کہا تھا کہ وہ ادھر اُدھر دیکھے۔ ایک لڑکا اور ایک عورت کہیں مل جائیں تو اُنہیں اُس کے پاس پہنچا دے۔

ایک سکھ ایک مکان کے باہر کھڑا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہی نمبردار ہے۔ اُس نے بھی مجھ سے وہی کچھ پوچھا جو مجھ سے اُس کے پاس لے جانے والا پہلے ہی پوچھ چکا تھا۔

"تم کہتے ہو عورت کو تاجا اپنے ساتھ لے گیا تھا"— نمبردار نے کہا —"لیکن تاجے کے ساتھ میں نے کسی عورت کو جاتے نہیں دیکھا تھا۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے"— میں نے کہا — "وہ جا چکی ہے۔"

"چلو جا ہی چکی ہوگی"— نمبردار نے کہا — "ہمارا فرض ادا ہو گیا ہے ورنہ تاجے کو ہم مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ تم میرے گھر چلو۔"

میں اُس کے ساتھ چل پڑا لیکن خوف سے میں مرا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تاجے کو جب پتہ چلے گا کہ گلشن آرا نہیں ہے تو وہ مجھ سے پوچھے گا، پھر میں اُسے کیا جواب دوں گا۔ مجھے تاجے سے ڈر آنے لگا۔ نمبردار نے مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھایا جہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر بڑا اچھا بستر تھا۔ چھوٹی سی ایک میز بھی پڑی ہوتی تھی۔ اس پر شراب کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہوتے تھے۔ بوتل میں تھوڑی سی شراب باقی تھی۔

میں نے شراب اس سے پہلے دیکھی تھی اور یہ سُنا تھا کہ اس سے نشہ ہو جاتا ہے اور انسان سارے دُکھ اور غم بھول جاتا ہے۔ میں نے اپنے شہر میں کئی بار دو تین سکھوں کو شراب کے نشے میں بدمست دیکھا تھا۔ گلشن جب مجھے اپنے کمرے میں بلایا کرتی تھی تو اُس نے بھی مجھے شراب پینے کو کہا تھا۔ اب میں نے نمبردار کے گھر میں شراب پڑی دیکھی تو سوچے سمجھے بغیر لپک کر بوتل اُٹھالی اور گلاس میں شراب انڈیلی۔

"اوئے کاکا!"— سکھ نمبردار نے کہا — "کیا تُو اتنا پکّا شرابی ہے کہ اتنی ساری دیسی شراب بغیر پانی کے پی لے گا؟"

میں اُسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں نے شراب کبھی سُونگھی بھی نہیں۔ میں نے اُسے پانی لانے کو کہا۔ وہ پانی لینے گیا تو میں نے گلاس میں سے کچھ شراب واپس بوتل میں ڈال دی۔ اُس کی بات سے مجھے پتہ چل گیا تھا کہ دیسی شراب ایک ہی بار اتنی زیادہ نہیں پی جاتی۔ شراب کی بُو نے ہی مجھے چکرا دیا تھا۔ سکھ پیالے میں پانی لایا جو اُس نے گلاس میں ڈال دیا۔ میں نے جب ایک گھونٹ پیا تو مجھے ایسا دھکا لگا جیسے گلاس میرے

ہاتھ سے چھوٹ جاتے گا۔ میں نے گلاس رکھ دیا۔ نمبردار میرے ساتھ تاجے کی دوستی کی باتیں کر رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ شراب پیتا رہا۔ میرے ذہن سے وہ ڈر نکل گیا جس نے میرے دل کو اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے یہ سکھ نمبردار چھوٹا سا بچّہ ہو یا مجھ سے بہت کمزور ہو۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیسی کیسی باتیں کیں۔ اتنا یاد ہے کہ سکھ میری باتیں سُن کر ہنستا رہا۔ شراب میں یہی وصف ہے کہ گناہگاروں کو نیا حوصلہ اور نیا ولولہ دیتی ہے۔ اس نے مجھے ایسی جرأت دی کہ میں اپنے آپ کو دنیا کا بادشاہ سمجھنے لگا۔

مجھے پتہ ہی نہ چلا اور میں گہری نیند سو چکا تھا۔

*

دوسرے دن میری آنکھ کُھلی تو سورج بہت اُوپر آچکا تھا۔ سکھ نے مجھے کہا کہ دن کے وقت میں باہر نہیں نکل سکوں گا۔ میرے کہنے پر اُس نے مجھے تھوڑی سی شراب اور پلا دی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں گہری نیند سو گیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ گلشن آرا دریا کے اس اُونچے کنارے پر کھڑی مجھے بلا رہی تھی۔ میں تیزی سے اُس کی طرف بڑھتا گیا۔ جب قریب پہنچا تو وہ غائب ہو گئی اور میں بلندی سے گرنے لگا۔ پھر اندھیرا چھا گیا اور میری آنکھ کُھل گئی۔ میرے دل پر گھبراہٹ تھی لیکن میں نے گھبراہٹ پر قابو پا لیا۔

آج میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ گلشن آرا گناہوں سے بھاگ کر گہرے اور تیز دریا میں کُود گئی تھی اور میں گناہوں کے سیلاب میں کُود گیا۔ یہ سیلاب اتنا تیز و تُند تھا کہ میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیلاب نے مجھے بہت دُور پہنچا دیا۔ وہ اس طرح کہ کسی کے کہنے اور اُکسانے کے بغیر ہی میں نے شراب پی لی اور ایک سکھ کے گھر کا پکّا ہُوا گوشت جو حلال ہو ہی نہیں سکتا تھا، کھا لیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان شرم و حجاب، حلال اور حرام اور اخلاق کی زنجیریں توڑ کر پھینک دیتا ہے۔ مثلاً یوں ہُوا کہ میں کمرے میں بند تھا کہ ایک جوان سی لڑکی کمرے میں آئی تو مجھے دیکھ کر ٹھٹھک

گئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ وہ اس نمبردار کی کنواری بیٹی تھی۔ وہ کھانے کے برتن اُٹھانے آئی تھی لیکن اُس کی نظریں مجھ پر لگی ہوتی تھیں۔ وہ برتن اُٹھانے لگی تو میں نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ہم دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور وہ مُسکرائی۔

"باپو دیکھ لے گا" ــــ اُس نے کہا۔

"باپو باہر نہیں جاتا؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"رات کو تم اس کمرے میں اکیلے ہو گے" ــــ اُس نے سرگوشی میں کہا ــــ "موقع ملا تو...."

صحن میں اُس کے باپ کی کھانسی کی آواز آئی تو وہ تیزی سے نکل گئی۔

رات کو اُس کی بجائے نمبردار ایک آدمی کو ساتھ لئے میرے کمرے میں آیا۔ میں اُسے جانتا تھا۔ وہ ایک اور آدمی کے ساتھ اُس مکان میں رہتا تھا جہاں میں اور گلشن رہ چکے تھے۔

"چاچا کاکا!" ــــ سکھ نمبردار نے کہا ــــ "فیقا تجھے لینے آگیا ہے۔"

"وہ کہاں گئی؟" ــــ فیقے نے مجھ سے گلشن آراء کے بارے میں پوچھا۔

میں نمبردار کو بتا چکا تھا کہ اُسے تاجا اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اب میں کوئی اور جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ میں نے فیقے کو آنکھ کا اشارہ کیا اور کہا کہ وہ استاد کے ساتھ چلی گئی تھی۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور خاموش رہا۔

فیقا گھوڑے پر آیا تھا اور میرے لئے بھی گھوڑا لایا تھا۔ ہم چل پڑے۔ راستے میں فیقے نے مجھ سے گلشن آراء کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔

"رات کو جب پولیس آئی اُس وقت میں اور گلشن جاگ رہے تھے" ــــ میں نے جھوٹ بولا ــــ "میں سمجھ گیا کہ یہ پولیس ہے۔ میں گلشن آراء کو ساتھ لے کر کھڑکی سے باہر کود گیا اور ہم دونوں گاؤں سے بہت دُور چلے گئے۔ میں اُسے دُور بٹھا کر خود گاؤں کے قریب آگیا۔ جب پولیس چلی گئی تو میں گلشن آراء کو ساتھ لانے کے لئے گیا لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔"

"ابھی بہت چھوٹے ہو سکندر!" ــــ فیقے نے ہنس کر کہا ــــ "جھوٹ

بولنے کے لئے عقل چاہیئے۔ پولیس کا جب چھاپہ پڑتا ہے تو پولیس سب سے پہلے گاؤں کو گھیرے میں لیتی ہے۔ یہ تو چھوٹا سا گاؤں ہے۔ پولیس کے گھیرے سے ایک چوہا بھی بچ کر نہیں نکل سکتا۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ تمہیں کس طرح پتہ چلا تھا کہ یہ پولیس کی آواز ہے؟ ــــ پولیس خاموشی سے آیا کرتی ہے .... کہیں ایسا تو نہیں کہ پولیس اُسے پکڑ کر لے گئی ہو؟"

"نہیں" ــــ میں نے کہا ــــ "یہ تسلّی رکھو۔ وہ پولیس کے ہاتھ میں نہیں۔"

"پھر کہاں ہے؟"

"تم نہیں مانتے تو میں تاجے اُستاد کو بتاؤں گا" ــــ میں نے جواب دیا۔

"یہ سوچ لو" ــــ اُس نے کہا ــــ "کہ اُستاد تمہارے جھوٹ کو سچ نہیں مانے گا۔"

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟" ــــ میں نے اُس سے پوچھا۔

"نواب زادے کی جاگیر پر۔"

"نواب زادہ حمید اللہ؟"

"ہاں" ــــ فیقے نے جواب دیا ــــ "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ چھاپہ اُس وقت پڑا جب ہم گاؤں میں نہیں تھے۔ ہمیں آج دن کو نمبردار نے اطلاع بھیجی تھی کہ رات چھاپہ پڑا ہے۔ ہمیں تمہارا اور گلشن آراء کا غم لگ گیا تھا۔"

*

ہم نواب زادہ حمید اللہ کی جاگیر پر صبح ہونے سے پہلے پہنچ گئے۔ تاجا کہیں سویا ہُوا تھا۔ فیقا مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور میں بھی سو گیا۔ صبح تاجا میرے پاس آیا۔ اُسے دیکھتے ہی میں اُٹھ کھڑا ہُوا اور آگے بڑھ کر اُس سے بغلگیر ہو گیا۔

"تاجے!" ــــ میں نے اُسے کہا ــــ "آج سے میں تمہیں اُستاد تاجا

کہا کروں گا۔ مجھے اپنی شاگردی میں لے لو۔ اگر چاہو تو آزما لو۔"

"اچھی طرح سوچ لیا ہے تم نے؟" ——— تاجے نے پوچھا۔

"ہاں اُستاد!" ——— میں نے جواب دیا ——— "میرا اور کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اب تمہیں اپنا اُستاد ہی نہیں، اپنا باپ بھی مانوں گا۔"

"گلشن کو کہاں چھوڑ آتے ہو؟" ——— تاجے نے پوچھا۔

"دریا میں ڈوب مری ہے" ——— میں نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟"

میں نے لفظ بلفظ اُسے سُنا دیا کہ وہ کیسے ڈوبی ہے۔

"چلو جان چھوٹی" ——— تاجے نے سکون کا سانس لے کر کہا ——— "اگر وہ مان جاتی تو میں اُسے اپنے پیشے میں بڑے اچھے طریقے سے استعمال کر سکتا تھا لیکن میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ہمارے ساتھ ثابت قدم نہیں رہ سکے گی.... اگر تم نے مجھے اپنا استاد اور اپنا باپ مان لیا ہے تو ایک بات بڑی غور سے سُن لو۔ یہ ہمارے پیشے کی بنیاد ہے۔ وہ یہ کہ تم اگر خوبصورت عورت کو دیکھ کر اس طرح بے قابو ہو گئے تو کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ پھر تم نے جس طرح نمبردار کے ہاں شراب پی تھی یہ بڑا غلط طریقہ ہے۔ دیکھ بچے! کہتے ہیں خُدا نے شیطان کو پیدا کیا تھا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ شیطان نے اپنے سے زیادہ خطرناک دو چیزیں پیدا کی ہیں۔ ایک ہے شراب اور دوسری ہے گلشن جیسی عورت۔"

"نہ اُستاد!" ——— میں نے کہا ——— "میری ماں بھی عورت تھی، تمہاری ماں بھی عورت تھی۔ میں یہ تو کبھی نہیں مانوں گا کہ وہ بھی شیطان کی پیداوار تھیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو" ——— تاجے نے کہا ——— "میں جو تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں وہ میں ذرا بہتر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ عورت خدا کی بہت خوبصورت مخلوق ہے لیکن اس میں شراب جیسا خطرہ ہے۔ تم اس خطرے کا تجربہ کر چکے ہو۔ گلشن آرا نے شیطان سے نجات حاصل کر لی تھی لیکن تم نے اُس شیطان کو اپنے اوپر سوار کر لیا۔ خوبصورت عورت

اس طرح تنہا مل جاتی ہے جس طرح گلشن آرا تمہیں مل گئی تھی تو شیطان اپنا کام کر جاتا ہے۔ وہ مرد کی عقل کو بیکار کر دیتا ہے۔ اس عورت نے تمہیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ وہ تم سے بارہ تیرہ سال بڑی بھی تھی لیکن تم نے اپنا آپ شیطان کے سپرد کر دیا اور جب تمہارے سامنے شراب آئی تو تم نے لپک کر اُسے اُٹھایا اور حلق میں انڈیل لیا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ عورت اور شراب میں دلچسپی ختم کر دو۔"

"کیا ڈاکو اور رہزن اتنے مومن ہوتے ہیں کہ وہ عورت اور شراب سے پرہیز کرتے ہیں؟"

"وہ ان دونوں چیزوں کو اپنے ذہن پر سوار نہیں کرتے" ——— تاجے نے کہا ——— "ڈاکو اور رہزن تو کچھ بھی نہیں ہوتے۔ یہ تو جب بھی پکڑے جاتے ہیں، عورت اور شراب کے پھندے میں آ کر پکڑے جاتے ہیں۔ ان دونوں چیزوں نے بادشاہیوں کو تباہ کیا ہے۔ انہیں اپنے اوپر غالب نہیں کرنا بلکہ ان پر اپنے آپ کو غالب کرنا ہے۔ یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے کہ اکیلی عورت ہاتھ چڑھ جاتے تو اُسے خراب کیا جائے۔ تم نے دیکھا ہے کہ گلشن جیسی دلکش عورت میں مَیں نے یا میرے آدمیوں نے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں لی۔ اُس گھر کو نہیں لُوٹا جس میں حلال کی کمائی ہو۔ ہم لُٹیرے ہیں لیکن ہمارے کچھ اصول ہیں۔"

تاجا مجھے اس طرح کی اور بھی ہدایات دیتا رہا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے مجھ میں ایسی کون سی خوبی دیکھی تھی کہ وہ میرے پیچھے ہی پڑ گیا تھا کہ میں اُس کے گروہ میں شامل ہو جاؤں۔

"میں نے تم میں کوئی خوبی ضرور دیکھی ہے" ——— تاجے نے کہا ——— "ایک خوبی میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ تم اسے بڑی اچھی طرح استعمال کر سکتے ہو۔ تم بہت خوبصورت لڑکے ہو اور تمہارا رنگ روپ بڑا دلکش ہے۔ کسی وقت میں تمہیں عورتوں کا لباس پہنا کر ایک جال کے طور پر استعمال کروں گا۔ میں یہ طریقہ گلشن پر آزمانا چاہتا تھا لیکن وہ نہ مانی۔"

"ہاں اُستاد!" — میں نے کہا — "میں یہ کام کر دوں گا لیکن مجھ سے مردوں والا کام بھی لینا۔"

*

میں نے حمیداللہ کی جاگیر دیکھی۔ بہت دُور دُور تک اُس کی کھیتیاں تھیں۔ پھلوں کا بڑا وسیع باغ تھا۔ تین چار رہٹ چل رہے تھے۔ اُس نے چھوٹا سا ایک محل بنا رکھا تھا۔ کچھ مکان معمولی سی قسم کے الگ الگ بنے ہُوتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ کہیں کہیں ایک تہہ خانہ بنا ہُوا ہے جس کا تاجے جیسے دو تین ڈاکوؤں کے سوا کسی کو پتہ نہیں۔ حمیداللہ سے بھی ملاقات ہوتی تو اُس نے سب سے پہلے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ گلشن آراء مر گئی ہے۔

چار پانچ دن اور گزر گئے۔ میں جاگیر کے اندر گھوم پھر سکتا تھا۔ ایک روز میں ذرا دُور نکل گیا۔ شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ اُفق پر شفق کے رنگ بڑے اچھے لگ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھنے لگا۔ اچانک خیال آگیا کہ میں ڈاکوؤں کے گروہ کا فرد ہوں۔ مجھے دھچکا سا لگا جیسے گلشن آراء نے میرے مُنہ پر ایک بار پھر تھپڑ مارا ہو۔ مجھے خیال آیا کہ قدرت کے ایسے طلسماتی حُسن میں رہ کر میں ڈاکو کہلاؤں گا۔

"نہیں" — میرے اندر سے ایک آواز اُٹھی — "نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔"

گلشن آراء میرے سامنے آگئی اور اس کے ساتھ ہی نواب یاد آگیا۔ پھر مجھے وہ بھیانک قید خانہ یاد آیا۔ پھر جس طرح گلشن آراء نے مجھے دُھتکارا تھا وہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ اُس وقت تو میری جذباتی کیفیت اور زیادہ بگڑ گئی جب یہ یاد آیا کہ میں جب بیہوش تھا اُس وقت گلشن آراء نے میرا سَر اپنی آغوش میں رکھا ہُوا تھا۔ تلخیاں، غصہ اور نہ جانے کیسے کیسے زہر میرے ذہن میں اُبلنے لگے کہ میرا دماغ پھر گیا۔

آج جب میں عمر کے آخری حصے میں پہنچ چکا ہوں، اپنی اُس وقت

کی کیفیت کو یاد کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میں بُزدل اور ڈرپوک بن گیا تھا اور اسی بُزدلی اور خوف زدگی کو چھپانے کے لئے ڈاکو بنا تھا۔ میں نے اُس شام شفق کو دیکھتے ہوتے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ میں بہت دلیر آدمی ہوں اور مجھے ڈاکو ہی بننا چاہیئے۔

"اُستاد!" — میں نے اُس رات تاجے سے کہا — "ڈکیتی کی اگلی واردات میں مجھے اپنے ساتھ لے چلنا۔"

"نہیں بیٹے!" — تاجے نے کہا — "ابھی نہیں۔ میں تمہارے لئے آسان جگہ دیکھوں گا۔"

"ایک آسان جگہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں اُستاد!" — میں نے کہا — "میں اپنے باپ کا گھر خالی کرنا چاہتا ہوں جو دراصل میری سوتیلی ماں کا گھر بن چکا ہے۔ مجھ سے باپ کا پیار اور گھر کا سکون اس جوان اور خوبصورت لڑکی نے چھینا تھا جو میرے گھر میں میرے باپ کی بیوی بن کر آئی تھی۔ اس نے مجھے اغوا کرایا تھا۔ میں اسے اغوا کر کے لے آؤں گا۔"

"اُسے اغوا نہیں کرنا" — تاجے نے کہا — "مصیبت بن جائے گی۔ لُوٹ مار کر سکتے ہو.... میرا خیال ہے یہ واردات تمہارے لئے آسان ہو گی کیونکہ تم اس گھر سے واقف ہے۔ چلو، وہیں سے تمہاری آزمائش ہو جائے گی۔ میں تمہیں تین آدمی دوں گا۔"

"میں تم سے ایک کام کی اجازت مانگتا ہوں اُستاد!" — میں نے کہا — "میں اپنے باپ کو قتل کروں گا" — اتنی سی بات میرے مُنہ سے نکلی تو میرا جسم اندر سے جلنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ میرا چہرہ بھی سُرخ ہو گیا ہو گا اور میری آنکھیں بھی۔ غصے اور انتقام کے جذبے کی شدّت سے میرے دانت پسنے لگے اور میری مُٹھیاں اپنے آپ بند ہو گئیں۔ میں نے دانت پیس کر کہا — "میں اس بدکار باپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اُس نے اپنی بدکاری پر شرافت کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ اُسے اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ اُس کا اکلوتا بیٹا کس حال میں ہے۔ اُسے یہ بھی ہوش نہ تھا کہ جسے وہ اپنی

دوسری بیوی بنا کر لایا ہے۔ وہ اُس کے گھر میں کتنے آدمیوں کی بیوی بنتی ہے؟"

"میں تمہیں اس ایک قتل کی اجازت دیتا ہوں" — تاجے نے کہا — "لیکن ایک بات سُن لو۔ اپنی عقل کو ٹھکانے رکھنا۔ اگر تم وہاں بے قابو ہو گئے تو پکڑے بھی جا سکتے ہو۔"

تاجے نے مجھے تین آدمیوں کے نام بتاتے جنہیں میرے ساتھ جانا تھا۔ میرا شہر وہاں سے تقریباً ایک سو بیس میل دُور تھا۔ ہمیں ریل گاڑی پر وہاں تک جانا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ مجھے پہچانا جا سکتا تھا۔ تاجے نے اس کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اُس وقت کا سفید بُرقعہ منگوا لیا۔ بھیس بدلنے کے لئے اس قسم کی چیزیں ان لوگوں کے پاس موجود رہتی تھیں۔

*

پھر وہ وقت آیا کہ میں تین آدمیوں کے ساتھ ریلوے سٹیشن پہنچا۔ میں سفید برقعے میں تھا۔ میرے پاؤں میں دیسی جُوتی تھی اور میں زنانہ ڈبے میں بیٹھ گیا۔ ان ہی دنوں میری مسیں بھیگی تھیں جو اُسترے سے صاف کروا دی تھیں۔ اُن دنوں ریل گاڑیوں میں رش نہیں ہوتا تھا۔ میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس ڈبے میں پانچ چھ عورتیں بیٹھی ہوتی تھیں۔ میں نے چہرے سے برقعہ اس طرح ہٹایا کہ میری صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ عورتوں نے میری طرف بار بار دیکھا۔ ان میں سے ایک دو سرک کر میرے پاس آ گئیں اور پوچھنے لگیں کہ میں کہاں جا رہی ہوں، شادی ہو گئی ہے یا ابھی کنواری ہوں۔

میرے سامنے یہ مسئلہ آ گیا کہ میری آواز مردانہ تھی بلکہ اتنی بھاری تھی جتنی میری عمر کے نوجوانوں کی نہیں ہُوا کرتی۔ میں آواز کو باریک کر سکتا تھا لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ باریک آواز میں زیادہ باتیں کرتا۔ آواز کو عورتوں جیسا بنا کر اسے ایک جیسا رکھنا بہت ہی مشکل تھا۔ یہ عورتیں مجھ سے میرے متعلق پوچھتی رہیں اور میں مسکراتا رہا اور شرمانے کی ایکٹنگ بھی کرتا رہا

لیکن میں سوچتا یہ رہا کہ ان عورتوں سے نجات کس طرح حاصل کروں۔ مجھے مسکراتا شرماتا دیکھ کر دوسری عورتیں بھی میرے قریب آ گئیں۔ اچانک میرے دماغ میں ایک ترکیب آ گئی۔

"اری تُو بولتی کیوں نہیں؟" — ایک ادھیڑ عمر عورت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے ہلا کر کہا — "یا کانوں سے بہری ہے!"

"پٹھان!" — میں نے عورتوں جیسی آواز میں کہا — "پشتو" — پھر ان کی طرف اُنگلی کر کے کہا — "نہ نہ .... پشتو۔ پشتو!"

میں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ اَن پڑھ اور انتہائی معمولی عورتیں ہیں۔ یہ تھرڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔ عورتیں سمجھ گئیں کہ میں پٹھان لڑکی ہوں اور میں پشتو کے سوا اور کوئی زبان نہیں جانتی۔ ہندوستان کے اس علاقے میں پٹھان کبھی کبھار نظر آتا تھا، پٹھانوں کی باتیں مشہور تھیں، مثلاً یہ کہ پٹھان اپنے علاقے میں انگریزوں کے خلاف لڑ رہے ہیں اور یہ کہ پٹھان جنگجو ہیں اور وہ غیرت مند اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ پٹھانوں کے متعلق ایسی کہانیاں سنی سنائی جاتی تھیں جیسے وہ دوسرے انسانوں سے بہت مختلف اور برتر مخلوق ہوں۔

ان عورتوں نے میرے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ وہ سب ہندو تھیں۔

"میں حیران تھی کہ اتنی خوبصورت آنکھیں کس کی ہو سکتی ہیں" — ایک عورت نے کہا — "پٹھان عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔"

"رنگ دیکھو" — ایک اور بولی — "اتنا پیارا رنگ روپ پٹھان عورت کا ہی ہو سکتا ہے۔"

"اس کے پاس خنجر یا چاقو ضرور ہو گا" — ایک اور عورت نے کہا — "کہتے ہیں کہ پٹھان عورت کو کوئی چھیڑے تو وہ خنجر یا چاقو نکال کر اس آدمی کا پیٹ پھاڑ دیتی ہے۔"

وہ مجھ سے دُور ہٹ گئیں اور اکٹھی جا بیٹھیں۔ گاڑی کے شور کی وجہ سے اتنی دُور سے میں اُن کی باتیں نہیں سُن سکتا تھا۔ تھوڑی دیر

بعد ان میں سے ایک دو عورتیں میری طرف دیکھتی اور مُنہ پھیر لیتی تھیں۔

گاڑی پہلے سٹیشن پر رُکی تو میرا ایک ساتھی مجھے دیکھنے آیا۔ تب مجھے ایک اور خطرے کا احساس ہُوا۔ میرے ساتھیوں نے میرے ساتھ اردو یا پنجابی زبان میں بات کرنی تھی جس سے میرا بھانڈہ پھوٹ جاتا۔ میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا ہُوا تھا۔ اپنے ساتھی کو آتا دیکھ لیا۔ برقعے میں سے ہاتھ نکال کر میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ وہ گھبرا گیا۔ میں نے سر کے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلایا اور سرگوشیوں میں اُسے بتایا کہ میں نے ان عورتوں کو بتایا ہے کہ میں پٹھان ہوں اور پشتو کے سوا کوئی اور زبان نہیں سمجھتی۔

"میرے ساتھ کوئی بات نہ کرنا" — میں نے کہا — "اونچا نہ بولنا اور میری فکر نہ کرو۔ بار بار اِدھر نہ آنا"

وہ چلا گیا تو عورتوں نے اشاروں سے میرے ساتھی کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا — "خاوند؟ بھائی؟ باپ؟" — میں مسکراتی رہی۔ میں نے آخر کہا — "غلام۔ نوکر" — میں نے یہ دونوں الفاظ اس طرح کہے جیسے بڑی مشکل سے کہے ہوں۔

"کسی بڑے خاندان کی بیٹی ہے" — ایک عورت نے کہا — "نوکر کو ساتھ لاتی ہے"

گاڑی چلتی رہی۔ عورتیں سٹیشنوں پر اُترتی اور نئی عورتیں سوار ہوتی رہیں۔ پہلے سے بیٹھی ہوئی کوئی عورت نئی عورتوں کو بتا دیتی کہ یہ پٹھان لڑکی ہے، پشتو کے سوا کوئی زبان نہیں جانتی۔ اس طرح میں کئی گھنٹے سفید برقعے میں لپٹا ہُوا عجوبہ بنا رہا۔

*

میرے شہر میں گاڑی رات نو بجے کے لگ بھگ پہنچی۔ ریلوے سٹیشن کے باہر چھوٹے چھوٹے ہوٹل تھے۔ میں اپنے ساتھیوں کو وہاں لے گیا اور اُس ہوٹل میں چلے گئے جس میں الگ کمرے تھے۔ دو تین ہی کمرے تھے۔ میرے ساتھیوں نے ہوٹل والے کو بتایا کہ ساتھ ایک عورت ہے اور رات

بارہ بجے کے کچھ بعد تک رُکیں گے۔

کھانا کھا کر میں نے اپنے ساتھیوں کو بتانا شروع کر دیا کہ میرا مکان کیسا ہے اور وہاں سے کیا کیا ملنے کی توقع ہے۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں برقعے میں اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ ہوٹل سے نکلا۔ اپنے شہر کی اندھیری گلیوں سے میں واقف تھا۔ میں انہیں ایسی ہی ایک گلی میں لے گیا جہاں میں نے برقعہ اُتار کر لپیٹا اور اپنے ایک ساتھی کو دے دیا، پھر میں نے اپنے نیفے پر ہاتھ پھیر کر خنجر کو محسوس کیا جو نیفے میں اُڑسا ہُوا تھا۔ دل میں اس ارادے کو پختہ کیا کہ اپنے باپ کو قتل کرنا ہے، شہناز کو میرے تینوں ساتھیوں کے ہاتھوں بے آبرو ہونا ہے پھر اس گھر میں سے زیور اور جتنی رقم ملی اُٹھا لانی تھی۔

میرے دماغ پر شیطان کا قبضہ ہو چکا تھا اور شراب نے اس قبضے کو پکا کر دیا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، اپنے آپ ہی دماغ سوچتا اور فیصلے کرتا جا رہا تھا۔ مجھے ایک بار نویں جماعت کے ایک ماسٹر نے کہا تھا کہ مجھ میں اپنے باپ کی عمر جتنے آدمیوں کی عقل ہے۔ اُس نے ایک بار مجھے عمر سے زیادہ دانشمند کہا تھا۔ خواجہ صاحب نے میرے متعلق یہی رائے دی تھی، اور اب جب میں قتل اور ڈکیتی کی پہلی واردات کرنے جا رہا تھا تو میں خود محسوس کر رہا تھا کہ میں اپنی عمر سے زیادہ دانشمند ہوں لیکن اس دانشمندی کو شیطان استعمال کر رہا تھا۔

کیا میں شیطان کے ہاتھوں مجبور تھا؟ ....نہیں ....میں نے اپنے آپ کو خود ہی شیطان کے سُپرد کر دیا تھا۔ میں آپ کو اپنی مجبوریوں کی اور اپنی مظلومیت کی کہانی نہیں سُنا رہا۔ میں کوئی رونا نہیں رو رہا۔ میں بتا رہا ہوں کہ انسان جو راستہ اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ انسان اپنی دانشمندی کو اور خدا کی دی ہوئی قوتوں کو کس طرح ضائع کرتا ہے۔

جذبات کا کھیل دیکھیں کہ جب میں اپنی گلی میں داخل ہُوا تو مجھے ہچکی سی آئی اور کوئی چیز اُچھل کر میرے حلق میں اٹک گئی۔ میں اس گلی میں کھیلا

کرتا تھا۔ دیر ہوجاتی تو ماں دروازے میں آکر مجھے آواز دیا کرتی تھی۔ میں باپ کی اُنگلی پکڑ کر اس گلی میں سے گزرا کرتا تھا۔ لوگ مجھے محلے کا سب سے پیارا بچہ کہا کرتے تھے۔

مجھے گلی میں داخل ہوتے ہی اپنے ہمجولیوں کا شور و غل سنائی دیا، اُن کے قہقہے سنائی دیتے، اپنے دل کے آئینے میں مجھے اپنا بچپن، لڑکپن اور ہمجولی نظر آتے۔ مجھے ہچکی سی آتی۔ جذبات طوفان کی مانند اُٹھے اور ایک گولہ سا میرے دل میں اٹک گیا۔ یہ کشادہ گلی تھی۔ دوسرے سرے پر ایک بلب اپنی زرد پیلی روشنی سے پوری گلی کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

بلب جھلمل کرنے لگا جیسے جھیل میں کسی نے کنکری پھینک دی ہو۔ میرے قدم رُکنے لگے۔

"کہاں ہے یار تیرا گھر؟" — میرے ایک ساتھی نے پوچھا۔

اس آواز نے مجھے جذبات کی جھیل سے نکال لیا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ میری آنکھوں میں آنسو ہیں اور بلب ان میں تیر رہا ہے۔ میرے وجود میں چھناکا سنائی دیا۔ آئینۂ دل ٹوٹ گیا۔ بچپن، لڑکپن، کدکڑے، قہقہے ٹوٹ پھوٹ گئے اور ان کے ٹکڑے گلی میں بکھر گئے اور ان ٹکڑوں سے میرے باپ کی شبیہہ نکلی۔ میرا خون اُبلنے لگا۔ اس شخص نے میرے دل کا آئینہ توڑ ڈالا تھا۔

"آگیا ہے" — میں نے اپنے ساتھی سے کہا — "وہ پانچواں مکان ہمارا ہے۔"

میرا وجود جذبات کی جھیل سے نکل آیا اور میری آواز میں اور میرے وجود میں جان آگئی تھی۔

"کیا نام بتایا ہے اُس کا؟" — میرے ایک ساتھی نے پوچھا — "شہناز؟ .... وہ بہت خوبصورت ہے؟"

"گلشن آرا سے زیادہ خوبصورت ہے" — میں نے جواب دیا —

"اب وہ ہماری ملکیت ہوگی۔ اُس پر رحم نہیں کرنا۔"

"رحم!" — ایک اور ساتھی نے کہا — "رحم کیا ہوتا ہے؟"

تینوں ہنس پڑے۔

"اپنے باپ کو میں خود قتل کروں گا" — میں نے کہا — "میں اُسے ترسا کر اور تڑپا کر ماروں گا۔"

"تم شہناز کو ہمارے حوالے کر دینا پھر چاہے سارے محلے کو قتل کر دینا" — میرے ایک اور ساتھی نے کہا۔

*

ہمارے مکان کے دو طرف گلی تھی اور پچھواڑے میں کھنڈر جیسا ایک مکان تھا۔ اس کی ایک دیوار عجیب طریقے سے ٹوٹی اور گری ہوتی تھی۔ میں جب چھ سات سال کا ہوا تو میں اُدھر جا کر اس دیوار پر ہاتھ اور پاؤں جما کر اپنے مکان کی چھت پر چلا جایا کرتا تھا۔ دو تین بار میری ماں نے دیکھ لیا تو مجھے بہت ڈانٹا تھا اور ایک بار اُس نے میرے باپ کو بتایا کہ میں اتنی خطرناک دیوار پر چڑھ جاتا ہوں۔ باپ نے مجھے دو تھپڑ مارے تھے اور پچھواڑے جا کر وہ دیوار دیکھی تھی۔

"او تے شیطان!" — واپس آکر باپ نے مجھے کہا تھا — "تُو اتنی مشکل اور خطرناک دیوار پر چڑھ کس طرح جاتا ہے؟" — اُس نے میری ماں سے کہا تھا — "یہ تو ڈاکوؤں کے کرتب دکھا رہا ہے۔"

اس کے چار پانچ ماہ بعد میری ماں مر گئی تھی۔ اُس عمر میں ڈاکوؤں کے متعلق میں اتنا ہی جانتا تھا کہ درندوں جیسے انسان ہوتے ہیں جو مال اسباب لُوٹ کر اور سب کو قتل کر کے جنگلوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ میری ماں نے میرے باپ سے کہا تھا کہ اس مکان کے مالکوں سے کہے کہ اِس دیوار کو گرا دیں۔ یہ ہمارے مکان کے لئے خطرناک تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے باپ نے اس مکان کے مالکوں سے بات کی تھی یا نہیں۔ اُس وقت یہ مکان غیر آباد تھا۔

میں اُسی دیوار سے اُوپر جانا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ ان اڑھائی تین برسوں میں وہ مکان گرا دیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر گرا دیا گیا تھا تو پھر اپنے مکان میں داخل ہونے کا کوئی اور راستہ دیکھنا تھا۔ میں مکان کے پیچھے گیا۔ مکان ابھی تک کھنڈر پڑا تھا اور وہ دیوار بھی ویسی ہی تھی۔ اپنے دروازے کو دیکھنا کہ کھلا ہے یا بند بیکار تھا۔ دروازہ اندر سے بند ہی ہوگا۔

میں ٹوٹی ہوئی دیوار پر چڑھ کر اپنی چھت پر چلا گیا۔ ہمارا آدھا مکان دو منزلہ تھا۔ اس طرف ایک ہی منزل تھی۔ میں اس کی چھت پر گیا۔ آگے سیڑھیاں تھیں۔ ان سے اُتر کر نیچے گیا۔ میں نے خنجر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شہناز کا وہ آشنا جس نے مجھے اغوا کرایا تھا، شہناز کے پاس آیا ہُوا ہو تو کتنا اچھا ہو۔

میں صحن میں سے گزرا۔ میرا گھر خاموش تھا۔ چاندنی کے سوا کوئی روشنی نہیں تھی۔ میں ڈیوڑھی میں گیا اور باہر والے دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ میرے تینوں ساتھی اندر آ گئے۔ میں نے انہیں برآمدے میں کھڑا کیا اور باپ کے سونے والے کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ کھُل گیا۔

"کون ہو؟"— بالکل نحیف سی مردانہ آواز آئی جیسے یہ بہت دُور کی آواز ہو۔

مجھے معلوم تھا سوئچ کہاں ہے۔ میں نے اس پر ہاتھ مارا اور بلب نے کمرہ روشن کر دیا۔ کمرے میں بدبُو تھی۔ اس کمرے میں تو عطر کی خوشبو ہونی چاہیئے تھی۔ اس گھر میں جوان، خوبصورت اور شوباز بیوی تھی لیکن وہ بیوی نظر نہ آئی۔ ایک پلنگ خالی تھا۔ دوسرے پلنگ پر لاش سی پڑی تھی۔ اس سے آواز آئی تھی —"کون ہو؟ .....شہناز .... اِدھر آؤ"— اتنی قریب سے آتی ہوئی آوازیں بہت دُور کی آوازیں لگتی تھیں۔

میں نے آگے ہو کر دیکھا .... اُف میرے خدا! میں کیا دیکھ رہا تھا۔ وہ میرا باپ تھا۔ چہرہ لاش کی مانند سفید اور سُوکھا ہُوا، ڈاڑھی بڑھی ہوئی۔ اُس سے اُٹھا نہیں جاتا تھا۔

"کون ہو؟"

"سکندر!"— میں نے کہا —"تمہارا اکلوتہ بیٹا! کہاں ہے تمہاری لاڈلی دلہن؟"

"سکندر؟"— اب اُس نے جاندار آواز میں کہا —"اوہ! میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرا ذہن مجھے دھوکہ دے رہا ہے۔ سکندر زندہ نہیں"۔

"میں زندہ ہوں"— میں نے کہا —"دیکھ، تمہارے سامنے کھڑا ہوں .... کہاں ہے وہ؟ .... میں انتقام لینے آیا ہوں"۔

میرے باپ نے دونوں بازُو پھیلا دیئے لیکن اُٹھ نہ سکا۔ جذبات کی شدّت سے وہ رو پڑا۔ وہ مجھے اپنے بازوؤں میں لینا چاہتا تھا لیکن میں آگے نہیں ہو رہا تھا۔

"اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہوں"— میرے باپ نے بڑی مشکل سے کہا —"وہ بھاگ گئی ہے۔ گھر خالی کر گئی ہے۔ سب کچھ لُوٹ کر لے گئی ہے .... پندرہ سولہ دن ہو گئے ہیں۔ میں ایک مہینے سے بیمار پڑا ہوں۔ مر رہا ہوں"۔

میں نے اپنے ساتھیوں کو اندر بلا کر کہا کہ تمام کمروں میں گھوم جائیں، ٹرنک کھول کر دیکھیں اور شہناز کو ڈھونڈیں۔

میرے باپ کے بازو ابھی تک اوپر اُٹھے ہُوئے تھے اور بازو کانپ رہے تھے۔

"اپنا گھر سنبھالو سکندر!"— اُس نے سرگوشی کی —"وہ اس مکان کے کاغذات بھی لے گئی ہے۔ تمہاری ماں نہیں رہی، تم نہ رہے، میرے بعد مکان اُسی کا ہوگا .... نہیں بولا جاتا۔ باپ کے سینے سے لگ جاؤ اور کہہ دو، ابا جان! میں نے آپ کو بخش دیا ہے"۔

باپ کو دیکھتے دیکھتے میری چیخ نکل گئی۔ ہاتھ سے خنجر گر پڑا اور میں باپ کے بازوؤں میں جا پڑا۔ اُس نے مجھے بازوؤں کے شکنجے میں لے لیا اور میرا سر چُومنے لگا۔ مجھے اُس کی ہچکی سنائی دی اور اُس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے اُس کے بازوؤں میں سے نکل کر دیکھا۔ اُس کی آنکھیں پتھرا

گئی تھیں۔ وہ مر گیا تھا۔

میرا دل اُس کی آنکھوں کی طرح پتھرا گیا۔ میرے آنسو خشک ہو گئے۔ میں نے خنجر اُٹھایا اور اپنے ساتھیوں کی طرف گیا۔ وہ ٹرنک کھول چکے تھے۔ ان میں پرانے کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ گھر میں ایک پیسہ نہ تھا۔ وہ میری ماں کے کپڑے بھی لے گئی تھی۔ میں تمام کمروں میں گیا — ویرانی اور محض ویرانی!

میرے ساتھی بہت مایوس ہوئے۔ میں نے بڑی تیزی سے انہیں بتایا کہ کیا ہوا ہے۔

"اب مجھے اپنے باپ کے خون کا اور اپنا گھر لُٹ جانے کا انتقام لینا ہے" — میں نے کہا۔

میں نے انہیں بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔

"تم بچے ہو" — ایک نے کہا — "ہمیں مرواؤ گے۔"

میں نے انہیں منوا لیا۔ ہم چاروں وہاں سے نکلے۔ میں نے باپ کی لاش دوبارہ نہ دیکھی۔ ہم شہناز کے گھر جا رہے تھے۔ میرے ایک تجربہ کار ساتھی نے بتایا کہ اُس گھر میں کس طرح داخل ہوں گے۔

*

شہناز کا گھر ایک اور محلے میں تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک پر دروازہ کھلا۔ ڈیوڑھی کی بتی جل رہی تھی۔ دروازہ شہناز کے چھوٹے بھائی نے کھولا تھا۔ میں خنجر آگے کر کے اندر چلا گیا۔ میرے پیچھے تین نقاب پوش ساتھی اندر آ گئے۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔

"اُونچی آواز نہ نکلے" — میں نے شہناز کے بھائی سے کہا — "شہناز کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"وہ تو پندرہ سولہ دنوں سے لاپتہ ہے" — اُس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اندر چلو" — میں نے اُسے دھکا دے کر کہا — "سب کو

جگا دو۔"

ہم اُس کے پیچھے اندر چلے گئے اور گھر کے سب افراد کو گالیاں دے کر اُٹھایا۔ شہناز کا ایک اور بھائی اور اُس کا باپ بھی تھا۔ میں نے اُس کی ماں کا گریبان پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔

"شہناز کہاں ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے" — اُس نے جواب دیا۔

"کس کے ساتھ، کہاں؟"

"یہ تو معلوم نہیں" — اُس نے جواب دیا۔

میں نے بڑے زور سے اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارا۔

"تمہیں معلوم ہے" — میں نے اُسے تھپڑ مار کر کہا — "فوراً بتاؤ۔"

گھر کے مرد کانپ رہے تھے۔ ڈاکوؤں کی دہشت تو بے ہوش کر دیا کرتی ہے ان سب نے قسمیں کھا کر بتایا کہ شہناز کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اُس کی ماں سے میں نے کہا کہ میرے مکان کے کاغذات مجھے دے دے۔

"ہاں بیٹا سکندر!" — اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "اُس نے کاغذات مجھے دے دیئے تھے۔"

وہ کاغذات لے آئی اور مجھے دے دیئے۔

"میری ماں کا زیور؟"

"سارے گھر کی تلاشی لے لو" — اُس نے کہا — "وہ تو گھر کا سارا زیور بھی لے گئی ہے۔"

"اب سُن لو" — میں نے کہا — "ہم اس گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ ہمارے جانے کے بعد ذرا سا بھی شور نہ ہو۔ میرا باپ مر گیا ہے۔ صبح اُس کا کفن دفن بڑی عزت سے تم لوگوں نے کرنا ہے۔ اگر ذرا سی بھی کمی بیشی ہوئی تو سب قتل ہو جاؤ گے۔ میرے مکان کو تالا لگا دینا.... اور اپنی زبانوں کو بھی تالے لگا لینا۔"

انہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے اور ہم وہاں سے نکل آئے۔

"چلو دوستو!" — میں نے ساتھیوں سے کہا — "واپس چلتے ہیں۔ میں اب شہناز کو ڈھونڈوں گا۔"

میرے ساتھی خوش نہیں تھے۔ ہم ریلوے سٹیشن پر چلے گئے۔ میرے ذہن پر شہناز سوار تھی۔ اُسے ڈھونڈنا تھا۔

واپسی کے سفر میں میرے اُوپر برقعہ نہیں تھا۔ میں اب پٹھان عورت نہیں مرد تھا لیکن گاڑی کے مسافر پھر بھی مجھے گھور گھور کر دیکھتے تھے۔ بعض کی نظریں ویسی ہی تھیں جیسی اُن کی ہوتی ہیں جو شہروں میں راہ جاتی لڑکیوں کو دیکھا کرتے ہیں۔ میں جب اُن کی طرف دیکھتا تھا تو وہ مُنہ پھیر لیتے تھے جیسے میں نے انہیں چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔ وہ مجھے خوبصورت لڑکا سمجھ رہے تھے۔

چہرے اور جسمانی ڈھانچے سے میں لڑکا ہی لگتا تھا لیکن میں بالغ ہو چکا تھا۔ جسمانی لحاظ سے میں اتنا ہی بالغ ہُوا تھا جتنا ہونا چاہیئے تھا، ذہنی طور پر میں عمر کے لحاظ سے بہت بالغ ہو گیا تھا بلکہ کبھی تو مجھے شک ہوتا تھا کہ میں پختہ کار ہو گیا ہوں اور یہ جو دو آدمی میرے ساتھ ہیں یہ میرے شاگرد ہیں۔ وہ دونوں تجربہ کار ڈکیت اور رہزن تھے۔

وہ دونوں بھی مجھے گھور رہے تھے لیکن اُن کی نظریں دوسرے مسافروں سے مختلف تھیں۔ ان دونوں کی نظروں میں وہ غصّہ تھا جو وہ اپنے اندر دبائے ہُوئے تھے۔ انہیں کچھ بھی وصول نہیں ہُوا تھا۔ میں انہیں ساتھ لایا تھا تو انہیں شہناز کے حسن و جمال کی تفصیل سنائی تھی جو انہوں نے بڑے اشتیاق سے سنی تھی۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ شہناز تمہاری ہوگی۔ مجھے تو شہناز سے انتقام لینا تھا۔ میں نے اُسے قتل نہیں کرنا تھا بلکہ اذیت ناک موت مارنا تھا، ایسی موت کہ وہ مرے بھی نہیں اور زندہ بھی نہ رہے۔

میرے ان ساتھیوں کو توقع تھی کہ نقد مال ملے گا اور زیورات کی شکل میں کچھ سونا بھی مل جائے گا مگر کچھ بھی نہ ملا۔ میں اپنا ہی گھر لُوٹنے گیا تھا۔ وہاں مرتے ہُوئے باپ کے سوا کچھ نہ ملا۔ شہناز کے گھر گئے تو وہاں سے

بھی خالی ہاتھ نکلے۔ اگر ہم پکڑے جاتے تو چور اور ڈکیت کہلاتے۔ میرے ساتھیوں نے مجھے بڑی سخت اور طنزیہ باتیں کہی تھیں۔ اگر تاجے کی مجھ پر نظرِ کرم نہ ہوتی تو یہ دونوں میرے ساتھ نہ جانے کیسا سلوک کرتے۔ ان کا غصہ بے جا نہیں تھا۔

پہلے تو میں نے شہناز سے اپنے اغوا کا اور ذلیل و خوار ہونے کا انتقام لینا تھا لیکن اب میں اپنی ذلت بھول گیا تھا۔ اب مجھے اپنے باپ کا انتقام لینا تھا۔ میں دل میں اپنے باپ کے لئے دشمنی اور نفرت لے کر گیا تھا مگر اُسے جس حالت میں دیکھا اور جس طرح اُس نے جان دی، اس سے میرے دل سے نفرت نکل گئی اور اس کی جگہ محبت آگئی اور یہ محبت انتقام کی ایسی آگ بن گئی جو باتوں سے اور اپنے آپ کو سمجھانے سے سرد نہیں ہو سکتی تھی۔

مجھے باپ یاد آنے لگا۔ میں نے اُس کی یادوں کو ذہن سے اُتارنے کی بہت کوشش کی لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ایک معمر آدمی میرے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ عمر کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ اُس کی داڑھی کا ایک بھی بال کالا نہیں تھا۔ اُس کی آنکھیں سفید ہو چکی تھیں لیکن لباس اور سر پر لپٹی ہوئی پگڑی سے وہ بڑا آدمی نہیں لگتا تھا۔ وہ بڑا آدمی ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ تھرڈ کلاس میں سفر کر رہا تھا۔

وہ میرے قریب سرک آیا۔ اُس نے میری آنکھوں میں شاید آنسو دیکھ لئے تھے۔ میرے دونوں ساتھی مجھ سے دُور بیٹھے تھے۔ ڈبے میں بہت تھوڑے مسافر تھے۔ اُس زمانے میں ریل گاڑیوں میں رش ہوتا ہی نہیں تھا۔ ہر ڈبہ آدھا خالی ہوتا تھا۔

"کیوں بیٹا!" — اس بزرگ نے پوچھا — "تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں؟"

اس بوڑھے کے پوچھنے کے انداز میں نہ جانے کیا اثر تھا کہ جن آنسوؤں کو میں روکنے کی کوشش کر رہا تھا وہ بہہ نکلے۔

"یتیم ہو گیا ہوں بابا جان!" — میں نے ہتھیلیوں سے آنکھیں پونچھ کر کہا — "ماں بھی نہیں رہی .... کوئی بھی نہیں رہا۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

میں نے جھوٹ بولا اور ویسے ہی ایک قصبے کا نام لے دیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"دُور پار کے عزیز ہیں" — میں نے ایک اور جھوٹ بولا — "کچھ دن اُن کے پاس رہوں گا۔"

"رونے سے ماں باپ واپس نہیں آجائیں گے بیٹا!" — بزرگ نے پیار سے کہا۔

"یہ غم مجھے کبھی ہنسنے مسکرانے نہیں دے گا" — میں نے کہا — "سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔"

"اللہ کو یاد کرو" — اُس نے کہا — "یا پتھر بن جاؤ ..... ایسے ہی ہوتا آیا ہے، ایسے ہی ہوتا جائے گا۔ دُکھی اور مظلوم انسان اللہ کے حضور گرتا ہے یا پتھر بن کر اُن کے سروں پر گرتا ہے جنہوں نے اُسے دُکھ دیئے اور اُس پر ظلم کئے۔"

"اگر دُکھ اللہ نے دیئے ہوں؟" — میں نے پوچھا — "اور ظلم اللہ کی طرف سے آیا ہو؟"

"اللہ کے دیئے ہوئے دُکھ قبول کرو" — سفید ریش بزرگ نے کہا — "ظلم انسانوں کی طرف سے آتا ہے۔ اللہ ظالم نہیں۔"

"بابا جان!" — میں نے کہا — "میں پتھر بننا چاہتا ہوں۔ میں اُن کے سروں پر گرنا چاہتا ہوں جنہوں نے مجھ پر ظلم و ستم کئے ہیں۔"

"لیکن مظلوم کا خیال رکھنا" — اُس نے کہا — "آنسو پی جاؤ۔"

اگلے سٹیشن پر گاڑی رُکی۔ اس بزرگ کو یہیں اُترنا تھا۔ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر گاڑی سے اُتر گیا۔ جب انجن نے چلنے کے لئے وسل دی تو مجھے یوں لگا جیسے یہ چیخ میرے سینے سے نکلی ہو، اور جب گاڑی چلی تو

اس کے پہیّوں کی ٹھکا ٹھک سے مجھے بھی ایک آواز سنائی دینے لگی — "پتھر بن جا، پتھر بن جا" — اور میں پتھر بنتا چلا گیا۔

اور دل میں شہناز کو ڈھونڈنے کا ارادہ پختہ ہوتا گیا۔

*

ہم جب تاجے کے پاس پہنچے تو اُس نے پہلا سوال یہ کیا — "کہاں ہے وہ؟"

"نہیں ملی" — میں نے جواب دیا — "کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اُس کی ماں کو بھی معلوم نہیں۔ اپنی ماں کا گھر بھی خالی کر گئی ہے" — اس کے بعد میں نے اُسے تفصیل سے سنایا کہ اپنے باپ کے ساتھ میری پہلی ملاقات کس طرح ہوئی اور کس طرح اُس نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر جان دی ہے۔

میں نے دیکھا کہ جب اپنے باپ کی وفات کا ذکر کر رہا تھا تو تاجے کے چہرے کا تاثر بدل گیا تھا اور اُس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں۔

"وہ میری ماں کے زیورات اور اُس کے کپڑے بھی لے گئی ہے" — میں نے کہا — "میرے باپ کو وہ بیماری کی حالت میں بھوکا اور پیاسا مرنے کے لئے چھوڑ گئی تھی .... تاجے اُستاد! میں تجھے اپنا پیر مانوں گا۔ مجھے شہناز کو ڈھونڈنے سے نہ روکنا۔ میں انتقام لئے بغیر نہیں رہوں گا۔ معلوم نہیں میرا باپ کس طرح دفن ہوگا۔ دفن ہوگا بھی یا نہیں۔"

"اُستاد!" — میرے ایک ساتھی نے کہا — "یہ لڑکا ہمیں مروائے گا۔ اس کے مکان میں تو ہم داخل ہو گئے تھے۔ اگر پکڑے جاتے تو یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ میرا اپنا گھر ہے اور میں اپنے باپ کے پاس آیا ہوں اور یہ دونوں میرے دوست ہیں، لیکن یہ ہمیں ایک اور گھر میں لے گیا۔ اگر وہ خاندان شور مچا دیتا تو ہم پکڑے جاتے۔ تم نے کہا تھا کہ اس کی مدد کرنا ورنہ ہم دوسرے گھر میں نہ جاتے۔"

"اور اب کہتا ہے شہناز کو ڈھونڈوں گا" — دوسرے ساتھی نے کہا۔

"ڈھونڈنے دو یارو!" — تاجے نے کہا — "میرا باپ نواب کے پاس ہے اور وہاں اُس کی بہت عزت ہے۔ اگر مجھے پتہ چل جائے کہ میرے باپ کی ذرا سی بھی بے عزتی ہوتی ہے اور نواب کے حکم سے ہُوتی ہے تو میں نواب کو قتل کر دوں .... میں اس لڑکے کے دل کی حالت کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں میرے دوستو!"

"لیکن اسے ذرا پکا تو ہو لینے دے تاجے اُستاد!" — ایک ساتھی نے کہا — "اس کی تھوڑی سی سکھلائی ہی کر دے۔"

"خود ہی سیکھ لے گا" — تاجے نے کہا اور مجھ سے پوچھا — "کہاں ڈھونڈو گے اُسے سکندر؟"

"عشو کو معلوم ہوگا" — میں نے کہا — "لیکن مجھے وہ گاؤں یاد نہیں رہا نہ یہ پتہ ہے کہ وہ گاؤں ہے کس طرف!" — مجھے ایک خیال آگیا۔ میں نے کہا — "لیکن وہاں تو میرے لئے خطرہ ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں وہاں سے کس طرح فرار ہُوا تھا۔ وہ مجھے پکڑ لیں گے۔"

"وہ اتنی جرأت نہیں کریں گے" — تاجے نے کہا — "وہاں جو کوئی بھی ہُوا اُسے کہنا میں تاجے کے ساتھ ہوں۔"

"میرے ساتھ کوئی جائے گا؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں!" — تاجے نے کہا — "تم اکیلے جاؤ گے۔ اب سہارے کے بغیر چلو گے۔ میں تمہیں اُس گاؤں کا راستہ اور کچھ اور باتیں بتاؤں گا۔ اب سو جاؤ۔"

صحن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم سب سو گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھ کُھل گئی۔ میں نے کوئی ڈراؤنا خواب نہیں دیکھا تھا لیکن مجھ پر گھبراہٹ اور خوف کا غلبہ تھا۔ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ میں کبھی ڈرا نہیں تھا۔ مجھ میں یہ وصف اللہ کی طرف سے آیا تھا کہ ڈر، خوف اور گھبراہٹ سے میں صرف واقف تھا اور واقف اس لئے تھا کہ میں لوگوں کی زبان سے یہ الفاظ سُنا کرتا تھا۔ اُس رات ان تینوں نے مجھے دبوچ لیا تو نیند اُڑ گئی۔ میں نے صحن میں دائیں بائیں دیکھا۔ چار آدمی سو تے

ہُوتے تھے۔ ان میں تاجا تھا اور تین اُس کے ساتھی تھے۔ وہ تاجے جیسے ہی اُستاد ڈاکو، رہزن اور قاتل تھے۔

مجھے ایسے خوف آنے لگا جیسے یہ تینوں مجھے بکرے کی طرح ذبح کریں گے۔ میری کھال اُتاریں گے پھر یہ میرا گوشت کھائیں گے۔ مجھے ایسے محسوس ہُوا جیسے میں کانپ رہا ہوں۔ میں اُٹھ بیٹھا اور ان چاروں کو باری باری دیکھا۔ آدھی رات کے پورے چاند کی چاندنی میں مجھے ان کے چہرے صاف نظر آرہے تھے۔ وہ تھے تو انسان لیکن اُن کے چہرے مجھے بھیڑیوں جیسے دکھائی دیتے۔ انسانوں کے لئے وہ بھیڑیئے ہی تھے جہاں حملہ کرتے تھے وہاں صفایا کر آتے تھے۔

میں اپنے آپ کو ان کا شکار سمجھنے لگا جیسے یہ مجھے کہیں سے پکڑ لاتے ہوں۔ میں نے صحن کے اردگرد دیوار دیکھی۔ میں بھاگ جانے کا راستہ دیکھ رہا تھا۔ خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر دیوار کی طرف دیکھا۔ ایک سایہ جو دیوار کے نصف جتنا چوڑا تھا، دیوار سے اُترتا دکھائی دیا۔ وہاں سے صحن میں آیا۔ یہ کسی بھوت کا سایہ تھا مگر بھوت نظر نہیں آتا تھا۔ سایہ صحن میں رینگتا آرہا تھا۔ میں نے اپنے کپڑوں کے اندر پسینے کی نمی محسوس کی۔

سایہ ہماری چارپائیوں کی طرف آرہا تھا۔ اس نے ہم سب کو چارپائیوں سمیت نگل جانا تھا۔ میں نے بھاگ جانے کی سوچی لیکن دیوار اونچی تھی۔ اس خوفناک سائے نے مجھے بھاگنے کی مہلت نہیں دینی تھی۔ میرا وجود کانپنے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں، بڑی تیزی سے لیٹ گیا اور چادر اپنے اوپر ڈال کر چہرہ چھپا لیا۔

کچھ بھی نہ ہُوا۔ میں نے آہستہ آہستہ مُنہ سے چادر ہٹائی اور آنکھیں کھولیں۔ سب سے پہلے جو چیز مجھے نظر آئی وہ چاند تھا۔ بادل کا چھوٹا سا ایک ٹکڑا چاند سے ذرا آگے نکل گیا تھا۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ وہ ہیبت ناک سایہ کہیں بھی نہیں تھا۔ خیال آیا کہ بادل کے اس ٹکڑے کا سایہ تھا جو آہستہ آہستہ چاند

کے آگے سے گزر گیا ہے۔

پھر بھی میرے دل پر جو خوف تھا وہ کم نہ ہُوا۔ میں نے ایک بار پھر تاجے اور اُس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ اُن کے چہرے بھیڑیوں سے زیادہ ہیبت ناک نظر آنے لگے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ سوتے ہُوتے ہیں۔ ان سب کو قتل کر دوں اور یہاں سے نکل بھاگوں۔

میں چارپائی سے اُٹھا۔ کمرے میں چار پانچ کلہاڑیاں رکھی تھیں۔ میرے پاس بڑا چاقو تو تھا لیکن چاقو کلہاڑی جیسا کام نہیں کر سکتا تھا۔ میں کمرے میں چلا گیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ اندھیرے میں دل پر خوف کا پنجہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا اور جسم کے اندر اور باہر کا لرزہ بڑھ گیا۔ میں نے جلدی جلدی ٹٹول کر کلہاڑی اٹھالی اور باہر نکلا۔

"کیا کر رہے ہو سکندر!" — مجھے دروازے کے قریب سے آواز آئی۔ آواز تاجے کی تھی۔

میں گھوما اور اس کے ساتھ ہی کلہاڑی تاجے نے پکڑ لی اور کلہاڑی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ میرے ہاتھ کی گرفت بہت ڈھیلی تھی۔

"کلہاڑی کو کیا کرو گے؟" — تاجے نے پوچھا۔

"ڈر آتا ہے تاجے!" — میری آواز کانپ رہی تھی۔ میں نے جھوٹ نہ بولا اور کہا — "میں تم سب کو قتل کرنے لگا تھا!"

وہ مجھے کمرے میں لے گیا اور دیا جلا کر مجھے چارپائی پر بٹھا دیا۔

"کیسا ڈر آتا ہے؟"

میں نے اُسے بتا دیا۔

"یہی ڈر تمہیں مجھ جیسا اُستاد بنائے گا" — تاجے نے کہا — "میں جب اس لائن میں آیا تھا تو میں بھی ڈرا کرتا تھا۔ میرے اُستاد کو پتہ چلا تو اُس نے کہا تھا کہ ڈر اور خوف کو دبانے کا یہ طریقہ ہے کہ دوسروں کے لئے ڈر اور خوف بن جاؤ۔ لوگوں کے لئے دہشت بن جاؤ پھر خوف بھی تم سے ڈرنے لگے گا۔ جن کے ڈر سے تم بھاگے بھاگے پھرتے ہو، اُن پر خوف بن کر چھا

جاؤ۔ تم تو انتقام لینے کی باتیں کرتے ہو اور راتوں کو ڈرتے ہو، اندھیرے سے ڈرتے ہو۔ اب تو تمہاری زندگی اندھیروں میں ہی گزرے گی۔ دن کی روشنی تمہیں کبھی کبھی دیکھا کرے گی۔ اب چاند اور ستارے تمہارے ہمسفر ہوں گے۔"

"یہی تو میں کرنے لگا تھا"۔۔۔ میں نے کہا۔

"کر کے دیکھ لو"۔۔۔ تاجے نے کہا۔۔۔ "اُٹھاؤ کلہاڑی، جاؤ، وہ سوتے ہوتے ہیں۔ ان پر کلہاڑی چلا کے دیکھو۔ نہیں چلے گی کلہاڑی۔ تمہارے ہاتھ کانپیں گے اور کلہاڑی تمہارے ہاتھ سے گر پڑے گی۔ تم اپنے ساتھیوں کو قتل نہیں کر سکو گے۔ تم ظالموں سے انتقام لو گے لیکن صرف اپنا، ہر مظلوم کا انتقام۔ ہر مظلوم کو تم یوں سمجھو گے جیسے اُس کے ساتھ تمہارا خون کا رشتہ ہے..... یہ خوف تمہارے اندر موجود رہے گا اور یہ تمہیں خوفزدہ نہیں بلکہ خوفناک بنائے گا۔ تمہارے لئے ضروری یہ ہے کہ اپنے اور پرائے کو پہچانو، اچھے اور بُرے کو پہچانو، ظالم اور مظلوم کو پہچانو۔"

اچانک میرے آنسو نکل آئے پھر میری سسکیاں نکلنے لگیں۔ تاجا میرے پاس آ بیٹھا اور اُس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں اُس وقت اتنا رویا تھا جب میری ماں فوت ہوئی تھی۔ اس کے بعد اُس رات رویا جب تاجا میرے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

"میں بھی ایسے ہی رویا تھا سکندر!"۔۔۔ تاجے نے کہا۔۔۔ "مجھے تو بہلانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ میرے سر پر ہاتھ رکھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ میری حالت اُس بلی جیسی تھی جسے بھیڑیوں سے بھرے ہوئے جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس حال میں مجھے ایک اُستاد ملا تھا اور اُس نے کہا تھا کہ بلی سے بھیڑیا بن جاؤ..... پھر میں نے بھیڑیوں کے مُنہ نوچے اور میں خوفزدہ سے خوفناک بن گیا..... تمہارے سر پر تو میں موجود ہوں۔ تم میرے بیٹے ہو، میرے بھائی ہو سکندر! تم میرے پاس میرے باپ کی امانت ہو۔ میں نے اُسے پیغام بھیج دیا تھا کہ تم میرے پاس ہو..... اُٹھو اور سو جاؤ۔"

*

صبح سورج کی تپش نے مجھے جگایا۔ میرے ساتھی کبھی کے جاگ اُٹھے تھے۔ میرے دل پر رات کے خوف کا کوئی اثر نہیں تھا۔ تاجے کی باتوں کا اثر غالب تھا۔ مجھے ایک سوچ آئی۔ میں نے شاید پہلے بھی کبھی سوچا تھا کہ یہ ڈاکو، لٹیرے اور قاتل کہاں سے آتے ہیں؟ کیا کوئی ایسا جنگل یا ویرانہ ہے جہاں یہ پیدا ہوتے ہیں؟ انہیں میں جنگلوں میں رہنے والے درندے سمجھا کرتا تھا جو انسانوں کے روپ میں آ کر انسانوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ اس سوال کا جواب مجھے اُس رات ملا جب میں خوف سے مر رہا تھا۔

اس خوف کی کوکھ سے ایک ڈاکو جنم لے رہا تھا۔

یہ سلسلہ چل رہا ہے، چلتا آیا ہے، چلتا جائے گا۔ ایک رسہ ایک قاتل ڈاکو کو پھانسی دے رہا ہوتا ہے اور ایسا ہی ایک رسہ کمند بن کر ایک قاتل ڈاکو کو ایک مکان پر چڑھا رہا ہوتا ہے۔

دوسروں سے اینٹھی ہوئی دولت، حرام کا روپیہ پیسہ، رشوت سے بنائے ہوئے زیورات لُٹ جاتے ہیں تو قانون لوٹنے والے کے خلاف حرکت میں آ جاتا ہے۔

کیا کس طرح ہوتا ہے؟ سیاہ سفید اور سفید سیاہ کس طرح ہو جاتا ہے؟ میں فلسفیوں کی زبان میں ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکتا۔ مجھ پر جو گزری ہے، وہ سُنا دیتا ہوں۔ تجزیہ کرنا ہے تو کر لینا۔ فتویٰ دینا ہے تو دے لینا۔

میں ایک تنکا تھا اور طوفان بہت تیز و تُند تھا۔

پھر ایسے ہُوا کہ تنکا طوفان بن گیا۔

میں نے کھویا بہت، پایا کچھ بھی نہیں۔

گلشن میری ہوس سے بچنے کے لئے دریا میں ڈوب گئی۔

مجھے ہوس نے ایسا ڈبویا کہ میں ڈوب ڈوب کر اُبھر

"اب کہو"۔۔۔ تاجے نے مجھ سے پوچھا۔۔۔ "ڈر باقی ہے؟"

"نہیں اُستاد!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "آج ہی وہاں چلا جاؤں،....

عشو کے پاس؟

"پہلے میری باتیں سُن لو" — تابجے نے کہا اور اُس نے مجھے بتانا شروع کر دیا کہ میں نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔

"وہ ٹھکانہ مالوے کا ہے" — تابجے نے کہا — "اُس کا نام مالوا ہے۔ آج تک پتہ نہیں چلا کہ اُس کا مذہب کیا ہے۔ مجھ سے ڈرتا ہے۔ اُس کے ساتھ ایسے دو تین آدمی بھی ہیں جو شہروں کے رہنے والے ہیں۔ ان سے اُسے شہروں میں وارداتیں کرنے میں مدد مل جاتی ہے۔ وہ مل جاتے تو اُسے کہنا کہ میں تابجے کا آدمی ہوں۔ وہ تم سے پوچھے تابجا کہاں ہے تو کہنا یہیں ہے۔ یہ جگہ نہ بتانا۔"

ایسی اور بہت سی باتیں سمجھا بجھا کر تابجے نے ایک گھوڑی منگوائی۔ اُس نے مجھے گاؤں کا نام بتا دیا اور راستہ بھی سمجھا دیا۔

*

میں جب مالوے کے ٹھکانے والے گاؤں کی طرف جا رہا تھا تو میرے نیچے ایک اعلیٰ گھوڑی تھی۔ میرے نیفے میں خنجر تھا اور میری گردن تنی ہوتی تھی۔ مجھے دنیا بدلی بدلی سی دکھائی دے رہی تھی۔ کھیتوں، درختوں اور گھاس کی ہریالی تو میں نے پہلے بھی دیکھی تھی لیکن اب ہریالی کا رنگ کچھ زیادہ ہی نکھرا ہُوا تھا۔ میں اپنے آپ میں ایک نئی طاقت محسوس کر رہا تھا۔ اپنے قریب سے گزرتے ہوتے لوگوں کو میں حقارت سے تو نہیں دیکھ رہا تھا لیکن وہ مجھے چھوٹے چھوٹے لگ رہے تھے۔

گھوڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ میں دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک گھوڑی رُک گئی اور بڑے زور سے ہنہنائی۔ میں نے لگام کو جھٹکا دیا لیکن گھوڑی آگے ہونے کی بجائے پیچھے ہٹنے لگی۔ گھوڑی کانپ بھی رہی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے گھوڑی نے ہنہنا کر اگلی ٹانگیں اُٹھا دیں۔ میری وہ طاقت جس پر مجھے گھمنڈ تھا، وہ نہ جانے کہاں چلی گئی۔ میں ڈر گیا اور گھوڑی کی گردن کو بازوؤں میں لے لیا۔ گھوڑی نے اگلے پاؤں زمین پر رکھے اور پیچھے کو مُڑی۔

"اس نے سانپ دیکھ لیا ہے" — مجھے کسی کی آواز سنائی دی اور اُس نے گھوڑی کے مُنہ کے قریب سے لگام پکڑ کر اسے روک دیا۔

میں نے کبھی گھوڑے کی سواری نہیں کی تھی۔ یہ گھوڑی بڑی تندرست تھی اور کسی اچھے سوار کے قابل تھی۔ اگر یہ ڈر کر دوڑ پڑتی تو اس سے گرنے کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جس آدمی نے گھوڑی کو پکڑ لیا تھا اُس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ میرے مُنہ سے نکل گیا کہ میں اچھا سوار نہیں ہوں۔

"سانپ ہے" — دوسرے آدمی نے کہا — "لیکن مرا ہُوا ہے۔ بڑا زہریلا سانپ تھا۔"

میں نے اُدھر دیکھا۔ پگڈنڈی کے کنارے پر کالے رنگ کا ایک سانپ جس پر سفید داغ دھبے تھے، مرا پڑا تھا۔ یہ ڈیڑھ بالشت ہو گا۔ اُس نے اتنی بڑی گھوڑی کو ڈرا دیا۔ گھوڑا جسے طاقت کی علامت سمجھا جاتا ہے، ڈیڑھ بالشت سانپ کو دیکھ کر کمزور سا جانور بن جاتا ہے۔

ایک آدمی نے آگے جا کر پاؤں سے مرے ہُوتے سانپ کو راستے سے دُور ہٹا دیا۔ دوسرے نے جس نے لگام پکڑ رکھی تھی، گھوڑی کو موڑ دیا۔ چار پانچ قدم گھوڑی کے ساتھ چلا۔ گھوڑی اب بھی ڈر رہی تھی۔

"اب فکر نہ کرو" — اُس نے گھوڑی کی لگام چھوڑ کر کہا — "اب نہیں ڈرے گی۔"

اُس نے گھوڑی کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا تو گھوڑی تیز چل پڑی اور اس کے ساتھ میرا دماغ بھی چل پڑا۔ طاقت کیا ہے؟ جسامت کے بڑے پن میں تو طاقت نہیں ہوتی۔

کیا خدا نے ڈیڑھ بالشت مرے ہوتے سانپ سے میری گھوڑی کو ڈرا کر مجھے یہ سبق دیا تھا کہ اتنا اکڑ اکڑ کے نہ چل؟

کیا طاقت زہر میں ہے؟

زہر تو مجھ میں بھی بھر گیا تھا اور میں کسی کو ڈسنے جا رہا تھا۔ مجھے اطمینان

اور سکون سا محسوس ہونے لگا۔

*

وہ گاؤں بارہ تیرہ میل دُور تھا۔ میں وہاں تک پہنچ گیا۔ میں اس گاؤں کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ وہاں سے میں رات کو فرار ہُوا تھا اور طوفان ایسا تیز و تُند تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں دیواروں سے ٹکراتا اور ان پر ہاتھ رکھ رکھ کر نکلا تھا۔ گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن میں نے وہ مکان باہر سے تو دیکھا ہی نہیں تھا جس میں مجھے قید رکھا گیا تھا۔

گاؤں کے لوگ مجھے رُک رُک کر دیکھتے تھے۔ میں کسی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ مالوا کہاں رہتا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے کوئی نہیں بتائے گا۔

"چاچا جی!" — میں نے ایک ادھیڑ عمر آدمی سے پوچھا — "عشو کہاں رہتی ہے؟"

اُس نے مجھے بڑی غور سے دیکھا، پھر سر ہلایا اور کہنے لگا کہ وہ نہیں جانتا۔ پھر میں نے ایک اور آدمی سے پوچھا۔ اُس نے بھی یہی جواب دیا۔ تاجے نے مجھے بتایا تھا کہ مجھے مالوے کا ٹھکانہ کوئی نہیں بتائے گا۔ یہ مجھے خود ہی ڈھونڈنا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مکان پکا یعنی اینٹوں کا ہے۔ میں گاؤں میں پکے مکان صرف دو دیکھ رہا تھا۔ ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ اُس مکان کے صحن میں ایک درخت تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ درخت کیا تھا۔ میں نے اس کے اندر جو کچھ دیکھا رات کو دیکھا تھا۔

میں نے ایک پکے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ یہ اندر سے بند تھا۔ دیہات میں دن کے وقت لوگ باہر والے دروازے یوں بند نہیں رکھا کرتے تھے۔ دروازہ دیہاتی سے ایک آدمی نے کھولا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اندر آنا چاہتا ہوں۔ اُس نے مجھے غور سے دیکھا تو میں نے اُس کے چہرے پر تبدیلی سی دیکھی۔ مجھے یہ چہرہ ذرا ذرا یاد تھا۔

"اکیلے ہو؟" — اُس نے بڑی دھیمی آواز میں پوچھا۔

"ڈرو نہیں بھائی!" — میں نے کہا — "اکیلا ہوں۔ پولیس کو تو

نہیں لایا۔"

"کیوں آئے ہو؟" — اُس نے پوچھا۔

"انتقام لینے نہیں آیا" — میں نے کہا اور میں اُسے ایک طرف کر کے اندر چلا گیا — "گھوڑی پکڑ لو" — لگام اُس کے ہاتھ میں دے دی۔

اندر سے آواز آئی — "کون ہے اوتے؟"

میں اندر چلا گیا۔ عشو صحن میں کچھ کر رہی تھی۔ میں اُسے ایک سال سے زیادہ عرصے کے بعد دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس کا خطرہ بجا تھا۔ وہ دونوں آدمی وہیں تھے جنہیں میں باندھ کر بھاگا تھا۔ انہوں نے مجھے نہیں چھوڑنا تھا۔

وہ مجھے اندر لے گئے۔ ایک آدمی پلنگ پر لیٹا ہُوا تھا۔ عشو میرے پیچھے پیچھے آگئی۔ اُسے یہ ڈر بھی ہو گا کہ میں یہ ظاہر نہ کر دوں کہ اُس نے مجھے بھاگنے میں مدد دی تھی۔

"یہ تھا وہ مالوے!" — ایک آدمی نے کہا — "عشو کو اور ہم دونوں کو باندھ کر بھاگ گیا تھا۔ پتہ نہیں اب کیا لینے آیا ہے۔"

"تُو یہاں اپنی لاش دفن کرانے آیا ہے؟" — مالوا نے اُٹھ کر بیٹھتے ہُوئے پوچھا۔

"تاجے نے بھیجا ہے مالوے اُستاد!" — میں نے کہا — "ایک کام سے آیا ہوں۔"

"تاجے نے؟" — اُس نے حیران ہو کر پوچھا — "تیرا اُس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟"

میں نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ تاجے کے ساتھ میرا کیا تعلق ہے۔ تب میں نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر اور اُس کے ساتھیوں کے چہروں پر جو کھچاؤ آگیا تھا وہ اُتر گیا۔ مالوے نے پوچھا کام کیا ہے۔

"تم نے مجھے ایک لڑکی کے کہنے پر اغوا کرایا تھا" — میں نے کہا — "مجھے اب وہ لڑکی چاہیئے۔"

"وہ میرے پاس تو نہیں کاکا!" — مالوا نے کہا — "وہ اپنے گھر

میں ہو گی۔"

"وہاں نہیں ہے۔"

"یہاں بھی نہیں ہے" — مالوا نے کہا۔

"تم بتاؤ عشو!"

"سچ مانو سکندر!" — عشو نے کہا — "اُس کا وہ دوست بھی اُس کی پوچھنے آیا تھا جس نے تمہیں اغوا کیا تھا .... وہ اُڑتا پنچھی تھی۔"

ان لوگوں کو معلوم نہیں تھا۔ مجھے شک تھا کہ انہوں نے ہی اُسے اُڑا لیا ہو گا۔

"ایک بات بتا کاکا!" — مالوا نے پوچھا — "یہاں سے تُو نکل کیسے گیا تھا؟"

"پہلے عشو کے مُنہ میں کپڑا دیا اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھے تھے" — میں نے کہا — "پھر ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھے تھے۔ پہلے اس کے پھر اُس کے۔ یہ سوتے ہوتے تھے۔"

"یقین نہیں آتا" — مالوا نے کہا۔

"کہو تو آج رات یہ تماشہ پھر کر کے دکھا دوں!" — میں نے کہا — "تاجے نے مجھے ویسے ہی اپنے ساتھ نہیں رکھ لیا!"

وہاں سے میں مایوس واپس آیا۔

*

تاجے نے کہا کہ میں شہناز کو بھول جاؤں۔ میں نے اُس کی بات مان لی، وہ ٹھیک کہتا تھا۔ ایک عورت کو اتنے بڑے ملک میں کہاں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ میں نے انتقام کی آگ سرد کرنے کی کوشش کی لیکن رات کو اس کوشش پر ایک خواب نے پانی پھیر دیا۔ میں نے خواب میں اپنے باپ کو دیکھا۔ وہ ایک کھنڈر میں کھڑا تھا۔ اُس کے کپڑے پھٹے ہوتے تھے۔ اُس کا چہرہ ویسا ہی تھا جیسا میں نے اُس کے آخری وقت دیکھا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھ کر بازو پھیلا دیتے۔ میں دوڑ کر اُس تک پہنچا۔

"وہ سب کچھ لُوٹ کر لے گئی ہے" — مجھے اُس کی سرگوشی سنائی دی اور اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

میری آنکھ کُھل گئی۔ میں نے اپنے بازو اپنے سینے پر باندھے ہوتے تھے۔ دل پر گھبراہٹ آگئی۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ گھبراہٹ خوف بن گئی۔ میں بیدار تھا مگر باپ مجھے نظر آ رہا تھا۔ وہ صحن کی دیوار میں نمودار ہوتا، آگے آتا اور میرے قریب آکر غائب ہو جاتا۔ مجھے سرگوشی سنائی دیتی — "وہ سب کچھ لُوٹ کر لے گئی ہے۔"

اس طرح تین چار بار ہُوا۔ دیوار میں شگاف ہو جاتا تھا اور اس میں سے وہ بازو پھیلاتے میری طرف آتا تھا۔ خوف سے میرا پسینہ پھُوٹ آیا۔

"خوفزدہ نہ ہو بیٹے!" — اب کے باپ نے یہ سرگوشی کی — "خوفناک بن جا۔ پتھر بن جا۔"

اس سرگوشی نے مجھ میں کوئی اور ہی رُوح پھونک دی۔ میں نے انتقام کی جس آگ کو سرد کرنے کی کوشش کی تھی وہ بڑی زور سے بھڑکی۔ خوف نہ رہا، گھبراہٹ نہ رہی۔ اس آگ سے ارادے نے جنم لیا اور یہ ارادہ خوفناک تھا۔

"تاجے اُستاد!" — میں نے صبح تاجے کو کہا — "اجازت دو اپنے شہر ہو آؤں۔"

"پھر اُس بدعورت کو دماغ پر سوار کر لیا ہے؟"

"نہیں اُستاد!" — میں نے کہا — "باپ کی قبر پر فاتحہ تو پڑھ آؤں۔ پہلے وہاں ڈاکہ ڈالنے گیا تھا۔ اب بیٹا بن کر جاؤں گا۔ دوستوں سے ملوں گا۔"

"باپ کی قبر کو زیارت سمجھو سکندر!" — تاجے نے کہا — "ماں کی قبر پر بھی جاؤ گے" — تاجا اس سے آگے نہ بول سکا۔ اُس نے مُنہ پھیر لیا۔ اُس نے مجھ سے آنسو چھپا لئے تھے۔

*

میں ایسی گاڑی پر گیا جو صبح وہاں پہنچتی تھی۔ اب میں چور اور ڈکیت نہیں تھا لیکن میرے پاس ڈکیتوں کا خنجر موجود تھا۔ سٹیشن سے نکلتے ہی اپنے محلے کا ایک آدمی مل گیا۔ اُس نے مجھے گلے لگا لیا اور ایسا سوال پوچھا جو پہلے میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے سکندر؟"—— اُس نے پوچھا —— "اتنا عرصہ کہاں رہے؟ اپنے ابّو کی وفات پر بھی نہ آئے۔"

"سوتیلی ماں نے گھر سے بھگا دیا تھا"—— میں نے کہا —— "مجھے پرسوں پتہ چلا ہے کہ ابا جان فوت ہو گئے ہیں"—— میں نے انجان بن کر کہا —— "معلوم نہیں سوتیلی ماں اب بھی گھر میں داخل ہونے دے گی یا نہیں۔"

"وہ تو مرحوم کی وفات سے پہلے ہی کہیں غائب ہو گئی تھی"—— اُس نے کہا —— "اچھا ہُوا تم آ گئے ہو۔ اپنا گھر سنبھالو۔"

میں شہر میں جانے کی بجائے باہر سے چکر کاٹ کر قبرستان میں چلا گیا۔ پہلے اپنی ماں کی قبر پر گیا۔ فاتحہ پڑھی اور میں چھوٹے سے بچے کی طرح بلک بلک کر رو دیا۔ میرا بچپن تو ماں کے ساتھ ہی اُس کی قبر میں دفن ہو گیا تھا۔

وہاں سے ہٹا تو مجھے خیال آیا کہ اپنے باپ کی قبر کا تو مجھے پتہ ہی نہیں۔ یہ معلوم کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ قبرستان میں فقیر اور ملنگ رہتے تھے۔ وہ چرس پیتے، جُوا کھیلتے اور قبروں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ میں اُن کے پاس چلا گیا۔ اپنے باپ کا نام لے کر اُن سے پوچھا کہ اُس کی قبر کہاں ہے۔ انہوں نے بتا دی۔ یہ کچی قبر تھی۔ اسے کس نے پکا کرانا تھا۔ اُس کا تو نام و نشان ہی مٹ جانا تھا۔ مٹی کی یہ لمبوتری ڈھیری مجھے اچھی لگی۔ اس نے میرے باپ کو پناہ میں لے لیا تھا۔ میں نے اس قبر پر فاتحہ پڑھی اور وہیں بیٹھ گیا۔ تصوّر مجھے دُور پیچھے لے گیا جب میں چھوٹا سا بچہ تھا اور میں سمجھا کرتا تھا کہ میرے ماں باپ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور میں اسی طرح بے فکری میں ہنستا کھیلتا رہوں گا۔

میں اِس تصور سے نکلا تو دنیا نے مجھے جو رنگ دکھائے تھے وہ سامنے آنے لگے۔ ایسے لگا جیسے میں ایک بار پھر اُس طوفان کی لپیٹ میں آ گیا ہوں جس میں مجھے عشو نے فرار کرایا تھا۔ اپنے آپ کو اس طوفان سے نکالا اور میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ ایک نظر قبرستان پر ڈالی۔ ظالم اور مظلوم، بدکار اور نیکوکار یہاں آ کر ایک ہو گئے تھے۔ امیر اور غریب کو ایک جیسے کیڑے کھا رہے ہیں۔

میں قبرستان سے آہستہ آہستہ چلتا نکل آیا۔ باہر آ کر پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ مجھے اپنے باپ کی قبر نظر آ رہی تھی۔ میرے مُنہ سے یہ الفاظ نکل گئے —— "انتقام لوں گا ابا جان! چین نہیں لوں گا۔"

لیکن وہ گئی کہاں؟

یہ سوال مجھے پریشان کر رہا تھا۔ اگر وہ گھر سے بھاگی ہے تو کسی ایسے آدمی کے ساتھ بھاگی ہے جو اِس شہر کا رہنے والا نہیں۔ شہناز سے انتقام لے کر میں نے اُس شخص کی طرف توجہ دینی تھی جو میرے گھر میں شہناز کے پاس آیا کرتا تھا۔

*

میں اپنی خالہ کے گھر چلا گیا۔ وہاں تک پہنچتے مجھے یاد نہیں کتنے لوگ ملے۔ اِن میں آدمی بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ صرف دو بوڑھے یاد ہیں۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا تھا —— "ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، کتنے خوبصورت جوان نکلے ہو"—— ہر ایک نے کچھ نہ کچھ کہا تھا اور یہ تو ہر کسی نے پوچھا تھا —— "اتنا عرصہ کہاں گزار آئے ہو؟"

خالہ نے مجھے گلے لگایا تو ایسے لگتا تھا کہ باقی عمر مجھے گلے سے ہی لگائے رکھے گی۔ اُس کی ہچکیوں نے میرے جگر کو کاٹ کر رکھ دیا۔ وہ جب سنبھلی تو اُس نے بھی وہی سوال پوچھا کہ میں اتنا عرصہ کہاں رہا ہوں۔

"بڑی اچھی نوکری مل گئی ہے"—— میں نے جواب دیا۔ پھر اُس سے پوچھا —— "خالہ! کیا آپ کو کچھ پتہ ہے کہ میری سوتیلی ماں کہاں چلی گئی ہے؟"

"کہنے کو تو کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے" — خالہ نے کہا — "لیکن یہ پتہ نہیں گئی کہاں ہے۔ وہ تو تیرے ابّو کی وفات سے پہلے ہی غائب ہوگئی تھی"

"آپ نے اتنا بھی نہ کیا کہ اباجان کو جاکے دیکھ ہی لیتیں" — میں نے کہا۔

"انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں آنے سے منع کر دیا تھا" — خالہ نے کہا — "شہناز اور اُس کی ماں نے انہیں ہمارے خلاف بھڑکا رکھا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی اُس گھر میں نہیں جاتا تھا۔ جس طرح اِس ماں بیٹی نے تیرا گھر لُوٹا ہے وہ سارے محلّے نے دیکھا ہے۔"

"خالہ جان!" — میں نے پوچھا — "مجھے کس سے پتہ چل سکتا ہے شہناز کہاں ہے؟"

"کیا کروگے پوچھ کر؟" — خالہ نے کہا — "کسی اور کا گھر اُجاڑ رہی ہوگی۔"

"اپنے گھر کی بربادی کا انتقام لوں گا۔"

خالہ مجھے منع کر رہی تھی کہ میرا خالہ زاد بھائی آگیا۔ مجھ سے چھ سات سال بڑا تھا۔ اُس نے بھی مجھے گلے لگا لیا۔ خالہ نے اُسے بتایا کہ میں شہناز کا اتا پتہ پوچھتا پھر رہا ہوں۔

"رشیدو کو جانتے ہو؟" — میرے خالہ زاد بھائی نے پوچھا — "رشیدو داتی .... اُس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔"

"ہاں ہاں!" — خالہ نے کہا — "عورتیں بتایا کرتی تھیں کہ رشیدو ہی ایک عورت ہے جو شہناز کے ہاں جایا کرتی تھی۔"

"شہناز کو نکلوانے میں اُسی کا ہاتھ ہے" — خالہ زاد بھائی نے کہا — "بڑی چالاک اور خطرناک عورت ہے۔ تم جانتے نہیں اُسے؟"

میں نے خالہ سے کہا کہ اپنے گھر کو دیکھ آؤں۔ میں شہناز کی ماں کے پاس چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ڈر گئی۔ میں نے اُسے کہا کہ میرے مکان کی چابی

دے دے۔ اُس نے فوراً چابی دے دی۔ اُس پر ابھی تک میرا خوف سوار تھا۔ وہ میری بلائیں لے رہی تھی۔ مجھے بیٹھنے کو کہہ رہی تھی۔ اُس نے مجھے بتانا شروع کر دیا کہ اُس نے میرے باپ کی تجہیز و تکفین کس طرح کی تھی۔ میں نے کچھ بھی نہ کہا، شکریہ بھی ادا نہ کیا۔

وہ ڈیوڑھی میں کھڑی میرے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ اندر سے رشیدو داتی نکلی۔ اُس نے شہناز کی ماں سے کہا کہ وہ جا رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی اور میں اُسے دیکھ کر بہت خوش ہُوا۔ میں نے تو اس کے گھر جانا اور شہناز کے متعلق پوچھنا تھا۔ وہ مجھے وہیں مل گئی۔ پہلے حیران ہوئی پھر لپک کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرا سر پکڑ لیا اور سر کو چُوما۔ اُس نے وہ تمام باتیں پوچھیں جو ایسے موقع پر رسمی طور پر پوچھی جاتی ہیں۔ اُس نے رسمی ہمدردی کا اظہار کیا اور اپنی خشک آنکھوں کو دوپٹے سے یوں پونچھنے لگی جیسے اُس کے آنسو نکل آئے ہوں۔

میں شہناز کی ماں کے سامنے رشیدو سے نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ میرے مکان تک چلے۔ میں باہر نکل آیا اور آہستہ آہستہ چل پڑا۔ کچھ دُور جاکر پیچھے دیکھا تو رشیدو آ رہی تھی۔ میں رُک گیا۔ وہ قریب آئی تو اُسے کہا کہ میرے ساتھ میرے گھر تک چلے۔

*

میں تالا کھول کر اندر گیا تو وہ میرے پیچھے پیچھے اندر آئی۔ میں نے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ میں کچھ دن پہلے چوروں کی طرح اِس گھر میں داخل ہُوا تھا، آج میں مالک کی حیثیت سے اِس گھر میں آیا تھا۔ یہ میری ہمت تھی کہ میں اس گھر میں آگیا تھا۔ یہ اب گھر نہیں تھا مکان تھا۔ گھر تو جب تھا جب یہاں میرے لئے پیار اور شفقت تھی۔ یہ گھر میری جنت تھا۔ اب تو ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی مجھے ایسا دھکا لگا جیسے کسی کی بدرُوح نے مجھے اندر جانے سے روک دیا ہو۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو ڈر کر بھاگ آتا یا میری چیخیں نکل جاتیں۔ دلیری اور بے حسی میں بہت فرق ہے۔ میں دلیر ہو سکتا تھا بے حس نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے اُس کمرے کا دروازہ کھولا جس میں برسوں پہلے میری ماں

نے اور کچھ دن پہلے میرے باپ نے جان دی تھی۔ میرا بچپن اسی چار دیواری میں تڑپ تڑپ کر مر گیا تھا۔

"رشیدو! بیٹھ جاؤ" —— میں نے کہا۔ اُسے ایک پلنگ پر بٹھا کر اور خود کرسی گھسیٹ کر اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا —— "شہناز کہاں ہے؟"

"اللہ جانے!" —— اُس نے کہا —— "ماں جانے، اُس کی بیٹی جانے۔"

"تم بھی تو کچھ جانتی ہو۔"

"نہ بیٹا!" —— اُس نے کہا —— "میں کیا جانوں!"

اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ مجھ سے چھپا رہی ہے۔ بڑی گہری اور چالباز عورت تھی۔ اُس کی عمر چالیس سال کے قریب ہو گئی تھی۔ میں اُسے بچپن سے دیکھ رہا تھا۔ بڑی خوبصورت عورت تھی۔ یہ اُس کا دوسرا خاوند تھا۔ سُنا تھا اُس نے پہلے خاوند کو زہر دیا تھا۔ چونکہ وہ فوراً مرنے کی بجائے دس بارہ دن بیمار رہ کر مرا تھا اس لئے کسی کو شک نہ ہُوا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ بعد میں مشہور ہو گیا تھا کہ رشیدو نے خاوند کو زہر دے کر مارا ہے۔

میں اُس سے شہناز کے متعلق پوچھ رہا تھا اور وہ کارنس پر رکھے ہوتے برتنوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی کمرے میں رکھے ہوتے فرنیچر کو دیکھتی تھی۔

"تم اب واپس آ گئے ہو نا!" —— اُس نے پوچھا —— "شادی کر لو.... یہ اتنا سامان ...."

"تمہیں چاہیئے تو لے لو رشیدو!" —— میں نے کہا —— "جو چیز تمہیں پسند ہے لے لو۔"

اُس نے میری طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر حیرت کا اور مسرّت کا بھی تاثر تھا۔ میں نے اُسے ایک بار پھر کہا کہ اُسے جو چیز اچھی لگتی ہے لے لے۔

"شہناز کے متعلق کچھ بتا دو رشیدو!" —— میں نے کہا —— "اُس کے پاس ایک آدمی آیا کرتا تھا۔"

"اُسے بھی لات مار گئی ہے" —— رشیدو نے کہا —— "وہ کسی اور کے ساتھ گئی ہے .... لیکن تم پوچھ کر کیا کرو گے؟"

"سیدھی بات سُن لو رشیدو!" —— میں نے کہا —— "میں تمہیں اسی لئے اپنے ساتھ لایا ہوں کہ مجھے شہناز کے متعلق کچھ بتاؤ۔ بات صحیح ہو۔ اُس کا اتا پتہ صحیح بتا دو، پھر اس گھر کی جو چیز اچھی لگتی ہے، لے جاؤ، ایک شرط یہ بھی ہے کہ مجھ سے یہ نہ پوچھنا کہ میں کیوں پوچھ رہا ہوں۔"

"مجھے ایک ٹی سیٹ چاہیئے" —— اُس نے کہا —— "میرے گھر میں ...."

"میں نے کہا ہے جو چاہے لے جاؤ" —— میں نے کہا —— "ٹرنکوں والے کمرے میں چلی جانا۔ ایک ٹرنک خالی کر لینا اور اپنی پسند کے برتن اس میں ڈال لینا۔ میں جو پوچھتا ہوں ٹھیک ٹھیک بتا دینا۔ اگر تم نے جھوٹ بولا" —— میں نے نیفے سے خنجر نکال کر کہا —— "زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے وہ پہلے والا اسکندر نہ سمجھنا۔"

"اُس کی ماں کو تو نہیں بتاؤ گے؟" —— اُس نے پوچھا۔

"اُسے کیوں بتاؤں گا؟" —— میں نے پوچھا —— "میں اپنے لئے پوچھ رہا ہوں۔ کیا اُس کی ماں کو معلوم نہیں وہ کہاں ہے؟"

"اُسے معلوم ہے اور مجھے معلوم ہے" —— اُس نے کہا —— "اور کوئی نہیں جانتا۔ میں کہہ رہی ہوں کہ اُس کی ماں کو نہ بتانا کہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے .... شہناز بِک گئی ہے۔ اپنے خاوند کی موجودگی میں بِکی ہے۔ وہ بِکنا چاہتی تھی اور اُس کی ماں اُسے بیچنا چاہتی تھی۔ تمہارے ابّو بوڑھے ہو گئے تھے اور وہ شریف آدمی تھے۔ شہناز اُن کے پاس ٹھہر ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ تو ماں بیٹی نے اس گھر کو خالی کرنا تھا۔ وہ کر گئی ہیں۔"

"تو کیا اُس کی ماں کو معلوم ہے کہ شہناز کہاں ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"معلوم کیوں نہیں؟" —— رشیدو نے جواب دیا —— "اس نے قیمت

وصول کی ہے۔"

رشیدو نے بتایا کہ دلی کا ایک تاجر کبھی کبھی ہمارے شہر کی منڈی میں آیا کرتا تھا۔ اُس نے شہناز کو کہیں دیکھ لیا۔ وہ ہمارے شہر کے ایک تاجر کے ہاں مدعو تھا۔ وہاں سے نکلا تو اُسے شہناز گلی میں سے گزرتی نظر آئی۔ شہناز کالے برقعے میں باہر نکلا کرتی اور برقعے کا نقاب اُٹھا کر رکھتی تھی۔ بھرے اور نقش و نگار کے لحاظ سے وہ خوبصورت تو تھی ہی، اُس کی جسمانی ساخت اور لمبوترے قد میں طلسماتی سا تاثر تھا۔

دلی کے تاجر نے اپنے میزبان سے ازراہ مذاق پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے۔ میزبان نے پہلے کئی بار اِدھر سے شہناز کو گزرتے دیکھا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کس کی بیٹی ہے اور کون سے محلے میں رہتی ہے۔ شہناز گھومنے پھرنے والی لڑکی تھی اور اُس کی ذہنیت مجرمانہ تھی جسے وہ زندہ دلی اور آزادی کہا کرتی تھی۔ ایک تو یہ وجہ تھی کہ وہ سارے شہر میں مشہور ہو گئی تھی اور اس کی شہرت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کی شادی ایک بوڑھے کے ساتھ کر دی گئی تھی۔

رشیدو کو اس سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ ہمارے شہر کے اس تاجر کے گھر بھی جایا کرتی تھی۔ یہ تاجر خود بھی عیاش آدمی تھا۔ اُس نے رشیدو سے کہا کہ باہر کا ایک مسلمان سیٹھ آیا تھا اور اُس نے شہناز کو دیکھا تھا۔

"شہناز کے ساتھ بات کرو"۔۔۔ تاجر نے کہا۔۔۔ "دلی کا سیٹھ اُس کے ساتھ باقاعدہ شادی کرے گا۔ کوئی جہیز نہیں ہوگا بلکہ سیٹھ مُنہ مانگی رقم دے گا۔"

"شہناز کو خاوند طلاق دے گا تو ہی وہ دوسری شادی کر سکے گی نا!" ۔۔۔ رشیدو نے کہا۔

"میں اس کی ماں کو بھی جانتا ہوں اور اسے بھی جانتا ہوں"۔۔۔ شہر کے تاجر نے کہا ۔۔۔ "تم بات کرو۔ اُن کا کوئی مذہب نہیں۔ یہ سوچو

کہ بات شہناز کے ساتھ کرنی ہے یا اُس کی ماں کے ساتھ۔ ہمیں لڑکی چاہئے۔ سیٹھ تمہاری جھولی بھر دے گا۔"

رشیدو آسمان سے تارے توڑ کر لانے والی عورت تھی۔ اُس نے پہلے شہناز کے ساتھ پھر اُس کی ماں کے ساتھ بات کی اور انہیں منوا لیا۔ شہناز کی ماں نے قیمت بتائی اور یہ شرط کہ شہناز کبھی کبھار اپنے گھر آیا کرے گی۔ سودا شہر کے تاجر نے طے کیا۔ اس تاجر کا اور شہناز اور اُس کی ماں کا آمنا سامنا نہیں ہُوا۔ سودا بازی رشیدو کی معرفت ہوتی اور شہناز کے دلی جانے کا پروگرام طے ہو گیا۔ رقم کی ادائیگی کے متعلق یہ طے ہُوا تھا کہ شہناز ریلوے سٹیشن پر پہنچ جائے گی تو رقم ادا کر دی جائے گی۔

*

"تمہارے ابا جان کی تو وہ نام کی بیوی تھی"۔۔۔ رشیدو نے مجھے سنایا ۔۔۔ "مجھے شک ہے کہ وہ تمہارے ابا جان کو دھوکے میں کچھ کھلاتی رہتی تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ دن بدن تیزی سے گرتے ہی جا رہے تھے۔ میں تو شہناز کی خاص رازدار تھی۔ دلی کے سیٹھ سے سودا طے ہو گیا تو ماں بیٹی نے اس گھر کے ٹرنک خالی کرنے شروع کر دیئے۔ دو تین بار تو میں نے یہاں سے کپڑوں اور بڑی خوبصورت چادروں کی گٹھڑیاں ان کے گھر تک پہنچائی ہیں....

"تمہارے ابا جان بستر پر پڑے رہتے تھے۔ انہیں تو ہوش ہی نہیں تھی کہ دیکھتے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ تم سُن کر حیران ہو گے کہ ان بدمعاش عورتوں نے تمہارے ابا جان سے طلاق نامے پر دستخط کرا لئے تھے۔ یہ میری موجودگی میں ہُوا۔ شہناز نے انہیں کہا کہ یہ کوئی سرکاری کاغذ آتے ہیں، ان پر دستخط کر دیں۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں۔ انہوں نے دستخط کر دیئے۔ اُنہوں نے سرگوشی میں پوچھا ۔۔۔ 'سکندر نہیں آیا؟' ۔۔۔ شہناز نے کہا ۔۔۔ 'آ جاتے گا'۔۔۔ اس سے پہلے انہوں نے شاید تمہارا نام کبھی نہیں لیا تھا۔ میری غیر حاضری میں شاید تمہارا نام لیتے ہوں....

"میں گناہگار ہوں سکندر بیٹا! لیکن میں نے ایک گناہ نہیں کیا۔ شہناز

اور اُس کی ماں مجھے کہتی رہیں کہ یہاں سے جو کچھ لینا ہے لے جاؤ۔ وہ مجھے برتن اور کپڑے دیتی تھیں۔ کپڑے تمہاری ماں کے تھے۔ میں نے نہیں لئے۔ میں ان سے نقدی لے لیتی تھی، اس گھر کی کوئی چیز نہیں اُٹھاتی۔ یہ تمہاری ماں کی نشانیاں ہیں۔ اب تم اپنے ہاتھ سے جو دو گے لے لوں گی۔"

"تم اپنے ہاتھوں سے جو جی میں آئے اُٹھا لینا" ——— میں نے اُسے کہا ——— "پھر کیا ہُوا؟"

"اِن بدمعاش عورتوں نے طلاق نامے پر دستخط لے لئے" ——— رشیدو نے کہا ——— "تمہارے اباجان کو انہوں نے ایسا اندھا کر دیا تھا کہ تمہارے کسی رشتہ دار مرد یا عورت کو اس گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں دیکھتا کون؟ یہ تو شہناز کی ماں نے لوگوں کو بتایا کہ وہ مر گئے ہیں۔"

"شہناز گئی کس طرح؟" ——— میں نے پوچھا۔

"میں اُس کے ساتھ سٹیشن تک گئی تھی" ——— اُس نے کہا ——— "آدھی رات والی گاڑی سے گئی تھی۔ سیٹھ خود نہیں آیا تھا۔ اُس نے اپنا ایک آدمی بھیجا تھا۔ وہ اسی تاجر کے گھر ٹھہرا تھا جس نے سودا طے کرایا تھا۔ شہناز کی ماں اُسے وہاں خود ملی تھی۔ شہناز کو میں رات کو پرانے اور مَیلے سے سفید برقعے میں سٹیشن تک لے گئی تھی۔ سیٹھ کا آدمی وہاں موجود تھا اور ہمارے شہر والا تاجر بھی موجود تھا۔ اُس نے مجھے کہا کہ اس نے رقم لے لی ہے۔ اس طرح شہناز چلی گئی۔"

رشیدو یہ قصہ سناتی رہی اور میرا خون کھولتا رہا۔

"رشیدو!" ——— میں نے اُسے کہا ——— "ٹرنکوں والے کمرے میں جاؤ۔ کوئی سا ٹرنک خالی کرو اور جو چیز اچھی لگتی ہے ٹرنک میں ڈال کر لے جاؤ۔"

"نہیں" ——— اُس نے کہا ——— "مجھے صرف برتنوں کی ضرورت ہے وہ میں بوری میں ڈال کر لے جاؤں گی۔"

اُس کے لئے مجھے وہاں رکنا پڑا۔ وہ بوری میں برتن ڈال کر چلی گئی تو میں نے دروازوں کو تالے لگائے اور وہاں سے نکل آیا۔ اب مجھ پر غم

اور دُکھ کا بوجھ نہیں تھا۔ میں پتھر بن گیا۔ میں خوفزدہ ہونے کی بجائے خوفناک بن گیا تھا۔

*

میں شہناز کے گھر میں دستک دیئے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ شہناز کی ماں بڑی تیز چلتی میری طرف آئی۔

"اپنا گھر دیکھ آئے ہو؟" ——— اُس نے بڑے پیار سے پوچھا اور سگی ماؤں جیسے لہجے میں بولی ——— "اب شادی کر لو اور اس حویلی کو آباد کرو۔"

اُس کے بیٹے گھر میں نہیں تھے۔ اُس کا خاوند مُرداروں کی طرح اندر پڑا ہُوا ہو گا۔ اُس کے بیٹے ہوتے بھی تو کیا تھا۔ میں نے تو سارے شہر کے بیٹوں سے ٹکر لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں نے شہناز کی ماں کو بازو سے پکڑا اور ایک کمرے میں لے گیا۔ اُسے گھما کر دھکا دیا تو وہ پلنگ پر گری۔ میں نے نیفے سے خنجر نکال لیا۔ وہ سیدھی ہو کر اُٹھنے لگی تو میں نے خنجر کی نوک اُس کی شہ رگ پر رکھ کر ذرا دبائی۔ میں اُس وقت انسان نہیں رہا تھا۔ میرے نتھنوں سے نکلی ہوئی سانسیں میرے ہونٹوں کو جلا رہی تھیں۔

"مُنہ سے آواز نکالو اور اپنی شہ رگ سے ٹپکتا ہُوا خون دیکھ لینا" ——— میں نے کہا ——— "تم نے اُس رات مجھے دیکھا نہیں تھا جب میں دو ڈاکوؤں کو ساتھ لے کر اس گھر میں آیا تھا؟ میں اس گھر کو لوٹ کر آگ لگا دوں گا۔"

اُس کے مُنہ سے گھُٹی گھُٹی سی آواز نکلتی تھی لیکن سمجھ نہیں آتی تھی کیا کہہ رہی ہے۔

"میری ماں کے تمام زیورات اور کپڑے میرے حوالے کر دو" ——— میں نے کہا ——— "گھر میں جتنی رقم ہے مجھے دے دو۔ نہیں دو گی تو میں خود لے جاؤں گا پھر اس گھر کو جلتا ہُوا دیکھ لینا۔ اب کہو تمہیں اپنی بیٹی کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں چلی گئی ہے۔ بولو جھوٹ" ——— میں نے خنجر ہٹا کر کہا ——— "چلو، میں نے جو کچھ مانگا ہے وہ مجھے دے دو۔"

میں پیچھے ہٹا اور وہ اٹھی۔ مجھے گھورتی ہوئی ساتھ والے کمرے میں

چلی گئی۔ چابیاں لاکر اُس نے ایک ٹرنک کھولا اور اس میں سے ٹین کا ایک ڈبہ نکالا۔ اس کا ڈھکنا کھول کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے دیکھا۔ اس میں زیورات تھے۔

"یہ تمہاری ماں کا زیور ہے" —— اُس نے کہا۔

"یہ تھوڑا ہے" —— میں نے کہا —— "پورا زیور دو۔ میرے اباجان نے تمہاری بیٹی کے لئے جو زیور بنایا تھا وہ بھی نکالو اور میری امی کے کپڑے ....."

کبھی وہ میرے آگے ہاتھ جوڑتی اور کبھی قہر کی نظروں سے مجھے گھورتی۔ تھوڑے سے وقت میں سارے زیورات، کپڑے اور تقریباً چار ہزار روپیہ رقم میرے آگے آگئی۔

"اب بتاؤ تمہاری بیٹی کہاں ہے" —— میں نے پوچھا —— "جس سیٹھ کے ہاتھ بیچی ہے اُس کا نام اور پتہ بتاؤ۔"

"میں نے تمہیں سب کچھ دے دیا ہے" —— اُس نے ہاتھ جوڑ کر منّت کے لہجے میں کہا —— "میری بیٹی کو جاکر پریشان نہ کرنا۔"

"بدکار عورت!" —— میں نے خنجر کی نوک اُس کی طرف کر کے اور دانت پیس کر کہا —— "میں جو پوچھتا ہوں وہ بتاؤ۔"

اُس نے کچھ پس و پیش کی اور مجھے دِلّی کے ایک سیٹھ کا نام اور پتہ بتادیا۔ میں وہاں سے نکل آیا اور خالہ کے گھر چلا گیا۔ میں نے تمام رقم اپنے پاس رکھی۔ آدھے زیورات بھی اپنے پاس رہنے دیئے۔ یہ میں کسی غریب کی بچی کو دینا چاہتا تھا۔ امی کے کپڑے اور آدھے زیورات خالہ کو دے دیئے۔ مکان کی چابی بھی اُسی کو دے دی۔

"مکان کو سنبھالیں خالہ!" —— میں نے کہا —— "چاہیں تو کرائے پر دے دیں اور کرایہ خود کھائیں۔ مجھے نہیں چاہیئے۔ یہ زیور آپ کی بچیوں کے کام آئے گا۔ میں جا رہا ہوں، زندہ رہا تو ضرور آؤں گا۔"

مجھے دِلّی جانا تھا۔ اگر میرے پاس اتنا زیور اور اتنی زیادہ رقم نہ ہوتی تو میں وہیں سے سیدھا دِلّی چلا جاتا اور شہناز کے سر پر جا دھمکتا لیکن اب

تاجے کے پاس جانا ضروری ہو گیا تھا۔ مجھے رات کی گاڑی ملی۔ رات گاڑی میں گزری۔ اگلا دن ریل گاڑی سے تانگے میں اپنے دیہاتی ٹھکانے تک پہنچتے گزر گیا۔ پتہ چلا تاجا تین چار دنوں کے لئے کہیں چلا گیا ہے۔

وہ چوتھے دن آیا۔ میں نے زیور اور رقم اُسے دے دی۔ اُسے بتایا کہ میں شہناز کے تعاقب میں دِلّی جا رہا ہوں۔

"وہاں بھی اکیلے جاؤ" —— تاجے نے کہا —— "تمہارا دماغ اسی طرح کھلے گا۔ یہ خیال رکھنا کہ اُسے دیکھتے ہی قتل نہ کر دینا۔ دِلّی بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں قتل کر کے نکل نہیں سکو گے۔"

"قتل تو کرنا ہی نہیں ہے اُستاد!" —— میں نے کہا —— "قتل کرنا تو رحم دلی ہے۔ میں اُسے اغوا کر کے لاؤں گا۔ یہ کام مجھ اکیلے سے نہیں ہو گا۔ پہلے جا کر دیکھ تو آؤں کہ وہ اس پتے پر موجود ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو واپس آکر تمہیں بتاؤں گا۔"

میں اگلی رات کو دِلّی پہنچ گیا۔ اپنے شہر سے واپس آتے سات دن گزر گئے تھے۔ میں نے باقی رات سٹیشن کے قریب ہی چھوٹے سے ایک ہوٹل میں گزاری۔ وہیں میں نے دِلّی کے سیٹھ ابراہیم کا پتہ دکھا کر معلوم کر لیا کہ یہ جگہ کہاں ہے۔

صبح ہوتے ہی میں نکل کھڑا ہوا۔ تانگہ لیا جس نے مجھے منزل پر پہنچا دیا۔ مکان تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے دروازے پر دستک دی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ دروازہ کون کھولے گا۔ یہ مکان نہیں محل تھا۔

دروازہ کھلا تو میری آنکھیں ٹھہر گئیں —— وہ فجی تھی —— طوفانی رات کی ہمسفر —— نواب کے محل میں فجی کو گلشن آراء کی خادمہ بنا دیا گیا تھا۔

"سکندر!" —— اُس نے حیران ہو کر پوچھا —— "تم یہاں کیسے؟

.... میں محل کی نوکری چھوڑ آئی تھی۔ یہاں سیٹھ صاحب کے گھر نوکری مل

گئی ہے"۔

"شہناز ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"اوہ!" —— اُس نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا —— "شہناز کی ماں کی اطلاع آچکی ہے۔ اُس نے سیٹھ صاحب کو لکھا ہے کہ سکندر نام کا ایک جوان آدمی آرہا ہے۔ اس سے ہوشیار رہنا، بلکہ اُسے گرفتار کرا دینا.... تم چلے جاؤ سکندر! واپس چلے جاؤ.... تم یہاں سے دُور چلے جاؤ۔ میں تمہارے پاس آتی ہوں"۔

دُنیا کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ زندگی تو ایک ڈرامہ ہے اور مجھ جیسے جنہیں دُھندلی راہوں پر ڈال دیا جاتا ہے، اُن کی زندگی تو ڈراموں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ دُھند میں اُنہیں نظر تو کچھ آتا نہیں، چلتے ہی جاتے ہیں، ٹھوکریں کھاتے ہیں، گرتے ہیں، اُٹھتے ہیں۔ پیچھے دیکھتے ہیں تو پیچھے دُھند، آگے دیکھتے ہیں تو آگے دُھند، دائیں بھی، بائیں بھی دُھندلاہٹ کے پردے پڑے ہوتے ہیں اور مسافر آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے۔

ایک وہ ہیں جو دم توڑ کر، تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اُن کی زندگی اُنہیں صرف ایک تبدیلی دکھاتی ہے۔ وہ زمین پر بیٹھے بیٹھے زمین میں اُتر جاتے ہیں۔ ایک مجھ جیسے ہیں جو حالات کا اور تاریکیوں کا چیلنج قبول کر لیتے ہیں۔ نظر کچھ بھی نہ آئے تو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سنائی کچھ بھی نہ دے تو کان کھڑے رکھتے ہیں۔ اندھیرے میں اُجالے کو اور خاموشی میں آواز کو ڈھونڈتے ہیں۔ اس سعی میں اور اس بھاگ دوڑ اور تعاقب میں حالات انہیں بہت رنگ دکھاتے ہیں۔ میری زندگی میں ایسے وقت بھی آئے کہ میں سمجھ نہ پایا کہ میں تعاقب میں ہوں یا کوئی میرے تعاقب میں ہے۔

میں نے راستہ ہی ایسا اختیار کر لیا تھا کہ اگلے قدم کا پتہ نہیں ہوتا تھا کہ پتھر پر پڑے گا یا پھول پر یا ایسی کھائی کے منہ میں جا پڑے گا جس کی تہہ ہی نہیں ہوگی۔

فجی کو سیٹھ ابراہیم کے دروازے میں کھڑے دیکھا تو میں اسے اڑھائی تین سال پرانی یاد سمجھا اور ایسے بھی لگا جیسے فجی کو میں دُھند میں دیکھ رہا ہوں۔ خواب بھی تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بھولی بسری یادیں تازہ کر جاتے ہیں۔ فجی کی یاد اتنی پُرانی تو نہیں ہوتی تھی کہ ذہن سے اُتر جاتی۔ وہ تو ایک روز پہلے کی بات لگتی تھی جب فجی مجھے رات کے طوفان باد و باراں میں ملی تھی۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ سکندر! ..... یہاں سے دُور چلے جاؤ، میں تمہارے پاس آتی ہوں" — خواب کی سی آواز تھی۔ آواز فجی کی تھی اور وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

اُس کی گھبراہٹ نے مجھے بیدار کر دیا اور میں خواب و خیال کی دُنیا سے حقیقت میں آگیا۔ میں کُند ذہن تو نہیں تھا۔ میرا دماغ مجھ سے آٹھ دس قدم آگے چلتا تھا۔ بعض اوقات مجھے اپنے دماغ تک پہنچنے کے لئے دوڑنا پڑتا تھا۔ وہ لڑکپن اور جوانی کے سنگم کے دن تھے جب میرا ذہن مینا کے قبضے میں آگیا تھا اور میں ایک تصوّر کو حقیقت سمجھ بیٹھا تھا۔ اللہ نواب کے موسیقار، خواجہ صاحب کو کروٹ کروٹ رحمت میں رکھے جنہوں نے مجھے مینا کی حقیقت سے آگاہ اور خبردار کیا تھا ورنہ میں تصوّروں میں ہی اِس دُنیا سے گُزر جاتا جیسے جاڑے کا چاند دبے پاؤں گُزرتا جاتا ہے اور اسے کوئی دیکھتا ہی نہیں۔

میں فجی کے کہنے پر محل جیسے اُس مکان کے دروازے سے ہٹ آیا جس تک میں شہناز کے تعاقب میں پہنچا تھا۔ میں بار بار پیچھے دیکھتا تھا۔ کچھ دُور آکر مجھے فجی دروازے سے نکلتی نظر آئی۔ میں رُکا نہیں، آہستہ آہستہ چلتا رہا اور وہ مجھ سے آن ملی۔

"رُکنا نہیں" — اُس نے کہا — "چلتے رہیں۔ رُکے تو شک ہوگا"۔

"اندر کیا بتایا ہے دستک کس نے دی تھی؟" — میں نے پوچھا۔

"کہا تھا بھکاری ہے" — فجی نے کہا — "بڑا اچھا بہانہ کر کے آئی ہوں۔ دو گھنٹے تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں ..... تم مجھے دیکھ کر حیران ہو گئے تھے؟"

"میں نے تو یقین ہی نہیں کیا تھا کہ یہ تم ہو" — میں نے کہا۔

"میں نے دیکھتے ہی یقین کر لیا تھا کہ یہ تم ہو" — فجی نے کہا — "یہ یقین تو میرے دل میں سمایا ہُوا تھا کہ تم کہیں نہ کہیں مل جاؤ گے"۔

"وہ تو تمہارے سامنے مجھے اور گلشن کو اُس قید خانے میں لے گئے

تھے جہاں سے کبھی کوئی زندہ نہیں نکلا" — میں نے کہا — "پھر تمہیں کیسے یقین تھا کہ میں تمہیں کہیں نہ کہیں مل جاؤں گا؟"

"میری دعاؤں نے اور میرے آنسوؤں نے خدا کو ہلا کر رکھ دیا تھا" — فجی نے کہا — "خدا نے میرے کان میں ایک روز یہ آواز ڈالی کہ گلشن آراء اور سکندر رقاص قید خانے سے فرار ہو گئے ہیں۔ لوگ مانتے نہیں تھے۔ کہتے تھے فرار کا مطلب موت ہے۔ دونوں مر گئے ہیں اور مشہور کیا جا رہا ہے کہ فرار ہو گئے ہیں ..... تم کس طرح فرار ہوئے تھے سکندر؟ گلشن آراء کہاں ہے؟"

"یہ بھی بتا دوں گا" — میں نے کہا — "پہلے تم اپنی سُنا لو۔ میں حیران ہو رہا ہوں کہ تم شہناز کے پاس کس طرح پہنچ گئی ہو"۔

"سب سناؤں گی" — اُس نے کہا — "مجھے تو پتہ نہیں چل رہا کہ بات کون سی پہلے سُناؤں۔ ایک طرف سے شروع کروں تو بہتر ہوگا"۔

*

مَیں فجی میں جو تبدیلی دیکھ رہا تھا وہ مجھے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اُس کی عمر اب اکیس بائیس سال ہوگئی تھی۔ میں اُس سے ڈیڑھ ایک سال چھوٹا تھا۔ فجی کا قد کچھ اور اونچا ہو گیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ وہ گلشن آراء اور شہناز کی طرح خاص طور پر یا غیر معمولی طور پر خوبصورت نہیں تھی لیکن اُس کے نقش و نگار اور قد کاٹھ میں جو کشش تھی اُسے کوئی آدمی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

وہ فجی جو مجھے طوفانی رات میں ملی تھی وہ خوف زدہ لڑکی تھی۔ اُس کی ہوائیاں اُڑی ہوتی تھیں۔ میں نے نواب کے محل میں جب بھی اُسے دیکھا، دُکھی اور مایوس دیکھا۔ میرے ساتھ بات کرتی تھی تو اُس کی آواز میں ہلکا سا لرزہ سا ہوتا تھا اور اُس کا انداز کچھ مانگنے والوں کا سا ہوتا تھا۔ اب میں جس فجی کو دِلّی میں دیکھ رہا تھا، یہ ذہنی طور پر نہ صرف بالغ تھی بلکہ اُس کی آواز میں اور انداز میں پختہ کار عورتوں والی خود اعتمادی تھی۔ اب وہ بات ایسے

کرتی تھی جیسے آخری فیصلہ سُنا رہی ہو۔

وہ گردن کو جس طرح خم دیتی اور آنکھوں کے جو زاویے بدلتی تھی، اس سے میں نے یہ تاثر لیا جیسے وہ میری اُستاد اور میں اُس کا شاگرد ہوں۔ یہ نوابوں کی گناہکار اور فریب کار دُنیا کے اثرات تھے جو اُس نے عقلمندی سے قبول کئے تھے۔

میں بھی اب بچہ یا سولہ سال کا چھوکرا نہیں تھا۔ جسمانی لحاظ سے تو میں قدآور جوان بن گیا تھا لیکن ذہن اور عقل کے لحاظ سے میں جوانی سے آگے نکل گیا تھا اور پختہ عمر میں داخل ہو گیا تھا۔

"تمہیں معلوم نہیں ہوگا" ــــ میں نے کہا ــــ "نواب نے ہمیں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہو گی!"

"میں نے نظر رکھی تھی" ــــ فجی نے کہا ــــ "جس رات تم دونوں فرار ہوتے تھے اُس سے اگلی صبح، سورج نکلنے سے پہلے میں نے دس بارہ گھوڑ سوار گھوڑے دوڑاتے وہاں سے نکلتے دیکھے تھے۔ زنان خانے میں نواب کی بیویاں اور داشتائیں اس کے سوا کوئی اور بات ہی نہیں کرتی تھیں کہ گلشن آراء اپنے آشنا سکندر رقاص کے ساتھ قید خانے سے فرار ہو گئی ہے۔ خوشی کا اظہار بھی کرتی تھیں اور ڈرتی بھی تھیں کہ ان میں سے جو بھی آشنائی میں پکڑی گئی اُسے یہی سزا ملے گی اور ہر کوئی اُس قید خانے سے فرار نہیں ہو سکتا۔"

"اگر میں اب پکڑا جاؤں تو نواب مجھے قید خانے میں ڈالنے کی بجائے مروا دے گا" ــــ میں نے کہا۔

"نواب کا حکم ریاست کے اندر ہی چلتا ہے" ــــ فجی نے کہا ــــ "اس کی ریاست کے باہر تمہیں کوئی نہیں پکڑ سکتا .... اب تو اتنا عرصہ گزر گیا ہے۔ نواب کو یاد بھی نہیں رہا ہو گا کہ کوئی سکندر بھی تھا اور کوئی گلشن بھی تھی۔"

"نواب کے سوار ہمیں نہیں پکڑ سکتے تھے" ــــ میں نے کہا ــــ "صبح

تک ہم ایسے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے جہاں انگریزوں کی پولیس بھی نہیں پہنچ سکتی۔"

"سوار شام کو واپس آتے تھے" ــــ فجی نے کہا ــــ "اس کے بعد نہیں گئے۔ میں نے سُنا تھا کہ تمہارے فرار کی سزا اُن پہریداروں کو ملی تھی جو رات کو وہاں پہرہ دیا کرتے تھے۔ انہیں باندھ کر بید مارے گئے پھر انہیں نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔"

"گلشن آراء کے بعد تم وہاں کیا کرتی رہی ہو؟"

"مجھے گلشن آراء جیسی ایک اور بیگم کی خادمہ بنا دیا گیا تھا" ــــ فجی نے کہا ــــ "وہ بھی ویسی ہی تھی جیسی گلشن آراء تھی۔ خریدی ہوئی آئی تھی۔ دو چار مہینے نواب نے اُسے ملکہ بنائے رکھا پھر اُسے حرم کے سرد خانے میں ڈال دیا۔ کبھی کبھار اُسے بلا لیتا تھا لیکن نواب کا دل بھر گیا تھا۔ مجھے خفیہ طور پر حکم دیا گیا تھا کہ تم اس بیگم کی خادمہ ہی نہیں ہو، اس کی پہرہ دار اور جاسوس بھی ہو۔ مجھے یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس بیگم نے گلشن آراء جیسی بدمعاشی کی تو سزا تمہیں ملے گی ....

"میں نے اس بیگم کو گلشن آراء کی باتیں سُنا سُنا کر بہت ڈرایا تھا۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ گلشن آراء فرار نہیں ہوئی۔ وہ قید خانے میں بھوکی اور پیاسی مری ہے اور ویسے ہی مشہور کر دیا گیا ہے کہ وہ فرار ہو گئی ہے۔ اس طرح ایک سال گزر گیا اور وہ دبکی رہی لیکن وہ کب تک دبکی رہ سکتی تھی۔ گناہوں اور فریب کاریوں کے اُس ماحول کے اثرات سے وہ بچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اُس نے مجھے اعتماد میں لینا شروع کر دیا۔ کبھی تو ایسے لگتا تھا جیسے میں اُس کی نہیں بلکہ وہ میری خادمہ ہو۔ اُس کے دماغ میں ہوس کاری کے سوا کچھ اور آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اُسے نواب کے حوالے زبردستی نہیں کیا گیا تھا۔ وہ پہلے ہی ایسی تھی اور گلشن آراء کی طرح نواب کی ملکہ بننے آئی تھی ....

"میں کیا تھی؟ نوکرانی ہی تو تھی۔ جس طرح گلشن آراء کو نواب کی بادشاہی کا ایک حاکم مل گیا تھا، ویسا ہی اُسے مل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھے کیا حکم ملا ہے

لیکن اُس نے مجھے اپنا حکم دیا کہ میں نے زبان کھولی تو میرا انجام بڑا خوفناک ہوگا .... تم جانتے ہو سکندر! سچ بات حاکموں کی ہی سمجھی جاتی ہے۔ نوکر اس لئے جھوٹے سمجھے جاتے ہیں کہ وہ حاکموں کے نوکر ہوتے ہیں ....

"بیگم میری ٹہل سیوا کرتی رہی اور میں اُس کی رازدار بنی رہی۔ کچھ عرصہ گزر گیا تو نواب پہاڑ پر چلا گیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ وہ ہر سال شملہ یا ڈلہوزی یا مسوری جایا کرتا تھا۔ اب گیا تو ہر سال کی طرح تین بیگمات کو ساتھ لے گیا۔ ان میں میرے والی بیگم بھی تھی لیکن اس کے ساتھ مجھے نہ لے جایا گیا۔ میں بیگم کے کمرے کے ساتھ ہی اپنے کمرے میں رہی ....

"دس بارہ دن گزرے تو بیگم کا آشنا حاکم آیا اور اُس نے مجھے بلایا۔ کہنے لگا کہ بیگم کا کمرہ کھولو۔ میں اُس کی صفائی دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کمرہ کھولا اور اُس کے ساتھ اندر گئی تو اُس نے دروازہ اندر سے بند کر کے میرا ایک بازو پکڑ لیا۔ وہ مجھے بیگم کے پلنگ کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں رُک گئی۔ اُس کا ارادہ صاف نہیں تھا ....

"میں نے پلنگ پر جانے سے انکار کر دیا تو اُس نے مجھ پر افسری کا رُعب جھاڑا۔ میں تو نوکرانی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اُس کی حکم عدولی کر سکتی ہوں۔ اُس نے مجھے پیسے دکھائے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ رُعب اور دھمکیوں سے میری عزت کے ساتھ زبردستی کھیل تو جائے گا لیکن میں بیگم کو ضرور بتاؤں گی اور اُن تک بھی خبر پہنچاؤں گی جنہوں نے مجھے بیگم کی جاسوسی کا بھی حکم دے رکھا ہے۔ اُسے میری اس ڈیوٹی کا علم تھا ....

"میں یہ تو نہیں کہتی کہ وہ میری دھمکی سے ڈر گیا ہوگا، اتنا ضرور ہوا کہ وہ ٹل گیا اور جاتے جاتے اُس نے مجھے دھمکی دی کہ میں نے پھر کبھی اُس کا حکم نہ مانا تو وہ مجھے کسی نہ کسی جُرم میں سزا دلائے گا۔"

ہم ابھی چلتے ہی جا رہے تھے۔ لوگ ہمارے قریب سے گزرتے اور ہمیں دیکھتے جا رہے تھے۔ رجی گھر سے دو گھنٹے غیر حاضر رہ سکتی تھی۔ میں نے ایک تانگہ روکا اور رجی کو اُس ہوٹل میں لے گیا جس میں میں ٹھہرا ہُوا تھا۔

رجی اُس جگہ اپنی عصمت کو پاک رکھنے کی کوشش کر رہی تھی جو گناہوں کا دریا تھا۔ وہاں تو عصمتیں لُٹتی تھیں، پیش کی جاتی تھیں، خریدی اور بیچی جاتی تھیں۔ رجی وہاں پاک رہ ہی نہیں سکتی تھی۔

"پھر سکندر، یوں ہُوا" — رجی مجھے سُنا رہی تھی — "میں نے خطرہ بھانپ لیا اور میں خواجہ صاحب کے پاس چلی گئی۔ کبھی کبھار اُن سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ تمہارا ذکر آتا تھا لیکن کوئی زیادہ بات نہیں ہوتی تھی۔ مجھے اپنی بیٹی سمجھتے تھے۔ میں نے انہیں یہ واقعہ سُنایا اور میں رو بھی پڑی۔ میں نے اُنہیں کہا کہ وہ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں تو کریں۔ عصمت ہی میری دولت تھی۔ یہ بھی نہ رہی تو میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ خواجہ صاحب نے میری بات بڑی توجہ اور ہمدردی سے سُنی۔ کہنے لگے کہ وہ حاکم پھر آئے تو اُسے ٹالنے کی کوشش کرو اور ایسا تاثر دو کہ اگلی بار تم اُسے نہیں ٹالو گی، پھر مجھے بتانا ....

"اگلی بار جلد ہی آ گئی۔ میں اُس وقت تک وہ سیدھی سادی اور بھولی بھالی لڑکی نہیں رہی تھی جسے تم نے دیکھا تھا۔ میں نے بڑا اچھا بہانہ کر کے اُسے اس طرح ٹال دیا کہ وہ ناراض نہ ہُوا بلکہ جاتے جاتے دس روپے مجھے دے گیا جو میں نے لے لئے۔ تین ہی دن گزرے تھے کہ نواب اپنی بیگمات کے ساتھ واپس آ گیا۔ مجھے بیگم کے آنے کی بہت خوشی ہوئی کیونکہ میں نے اپنی عصمت بچالی تھی اور خطرہ ٹل گیا تھا۔ دو تین دنوں بعد یہ حاکم مجھے راستے میں مل گیا اور مجھے روک کر کہنے لگا کہ تم نے بیگم کے ساتھ اس معاملے پر بات بھی کی تو اپاہج بنا کر باہر پھینک دوں گا ....

"کچھ دن گزرے تو خواجہ صاحب کا خفیہ پیغام ملا کہ تھوڑی سی دیر کے لئے آؤ۔ میں موقع محل دیکھ کر گئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ مجھے یہاں سے نکلوا رہے ہیں اور دِلّی میں کسی کے گھر میں نوکری دلا دیں گے۔ پھر انہوں نے مجھے وہاں سے نکال بھی دیا۔ تم نے دیکھا تھا کہ وہاں خواجہ صاحب کا کتنا اثر و رسوخ تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں مردانہ کپڑے

پہناتے تھے۔ انہوں نے یہاں تک انتظام کر دیا تھا کہ ایک عورت میرے کمرے میں جاکر میرے کپڑے وغیرہ ایک گٹھڑی میں باندھ کر لے آتی۔ خواجہ صاحب کے پاس ایک آدمی آیا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے اُس کے ساتھ کر دیا.....

"وہ میرے لئے اجنبی تھا لیکن وہ چونکہ خواجہ صاحب کا آدمی تھا اس لئے میں نے کوئی خطرہ محسوس نہ کیا۔ ہم ریل گاڑی میں بیٹھے اور وہ مجھے دِلّی لے آیا۔ وہ خواجہ صاحب کا کوئی مرید معلوم ہوتا تھا۔ آج تک مجھے اُس کا نام معلوم نہیں نہ اُس نے میرا نام پوچھا تھا بلکہ اُس نے میرے ساتھ کوئی فالتو بات کی ہی نہیں۔ یہاں سٹیشن پر اُترے تو وہ مجھے سیٹھ ابراہیم کے پاس لے گیا۔ اس سیٹھ کی یہاں اپنی بہت سی دکانیں ہیں اور معلوم نہیں کتنی ہی دکانیں اُس نے کرائے پر چڑھا رکھی ہیں۔ یہ سیٹھ نواب تو نہیں لیکن نوابوں سے کم بھی نہیں۔ سیٹھ نے مجھے دیکھا اور اپنے گھر کے لئے ملازم رکھ لیا۔"

"خواجہ صاحب انسان نہیں" ــــ میں نے فجی سے کہا ــــ "یہ تو کوئی فرشتہ ہے جو معلوم نہیں کیوں انسانوں کے روپ میں زمین پر اُتر آیا ہے۔"

"میں تو سوتے جاگتے انہیں دعائیں دیتی ہوں" ــــ فجی نے کہا ــــ "میں سیٹھ کے گھر آئی تو مجھے ایسے لگا جیسے اُسی نواب کے محل میں واپس چلی گئی ہوں لیکن ماحول بالکل مختلف پایا۔ سیٹھ ابراہیم کی دو بیویاں تھیں۔ ایک تو پرانی تھی اور دوسری کوئی تیس سال کی۔ دونوں اچھی عورتیں ہیں۔ گھر میں ایک پرانی نوکرانی بھی ہے۔ ان دونوں بیگمات نے مجھے بتایا کہ میرے لئے ایک اور بیگم آرہی ہے۔ میں نے ان سے نہ پوچھا کہ تیسری بیگم کہاں سے آرہی ہے۔ مجھے تو نوکری کرنی تھی۔"

*

فجی کو جس تیسری بیگم کے متعلق بتایا گیا تھا، وہ شہناز تھی جو دو ہی روز بعد آگئی۔ فجی کو اُس کے حوالے کر دیا گیا۔ یہاں سے فجی کی زندگی ایک بار

پھر اُسی ڈگر پر چل پڑی جو ڈگر وہ نواب کے محل میں چھوڑ آئی تھی۔ فجی نے مجھے بتایا کہ شہناز، گلشن آرا اور نواب کی دوسری بیگم جس کی وہ خادمہ رہ آئی تھی، کی طرح بلکہ کچھ زیادہ ہی خوبصورت نکلی۔ پہلے پہل تو شہناز نے فجی کے ساتھ اور سارے گھر میں رویہ ایسا رکھا جیسے وہ آسمان سے اُتری ہو اور اس محل کی مالک وہی ہو۔ فجی کے ساتھ وہ حکم کے لہجے میں بات کرتی تھی لیکن ڈیڑھ ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ وہ ٹھکانے آنے لگی۔ سیٹھ ابراہیم نے اپنی جو توجہ اُسی پر مرکوز کر دی تھی وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ پھر ایسی کم ہوئی کہ تین تین چار چار راتیں سیٹھ شہناز کو اپنی صورت بھی نہیں دکھاتا تھا۔

"یہی شہناز ہے نا جو تمہاری سوتیلی ماں بنی تھی؟" ــــ فجی نے مجھ سے پوچھا ــــ "اور اسی نے تمہیں اغوا کرایا تھا نا!"

"یہی ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "اب میں اسے اغوا کروں گا۔ تم پہلے مجھے پوری بات سُنا لو۔"

"باتیں تو بڑی لمبی ہیں سکندر!" ــــ فجی نے کہا ــــ "مختصر یہ کہ شہناز کو جب سیٹھ ابراہیم ٹھکانے پر لے آیا تو وہ اُکتاہٹ اور تنہائی محسوس کرنے لگی۔"

"پہلی بیگمات کا اُس کے ساتھ رویہ کیسا ہے؟"

"وہ تو اسے مُنہ بھی نہیں لگاتیں" ــــ فجی نے جواب دیا ــــ "اُس نے پہلی بیگمات کے ساتھ دوستی لگانے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ شہناز کی دوستی تک قبول نہ کیا بلکہ اسے دُھتکار دیا۔ پرسوں ترسوں کا واقعہ ہے، شہناز نے نہ جانے کیا کہہ دیا کہ بڑی بیگم نے اسے کہا ــــ 'تُو ہم سے کیا بات کرے گی! تُو تو داشتہ ہے۔ ہم منکوحہ تو ہیں' ــــ شہناز کی زبان بند ہو گئی اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔"

"کیا شہناز واقعی داشتہ ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"ہاں" ــــ فجی نے جواب دیا ــــ "مجھے یہ بات شہناز نے یہاں آنے

کے تین ماہ بعد بتاتی تھی کہ سیٹھ نے ابھی تک اُس کے ساتھ نکاح نہیں کیا۔ میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ شہناز کسی اچھے خاندان کی لڑکی معلوم نہیں ہوتی۔ اُس کی عادتوں میں چھچھوراپن سا تھا۔ اُس نے میرے ساتھ بے تکلفی پیدا کر لی پھر اُس نے مجھے اپنا ہمراز بنا لیا بلکہ یہ میری چالاکی سمجھ لو کہ میں اُسے مالکن سے سہیلی کی سطح پر لے آئی۔ اُس کی کمزوری یہ تھی کہ گھر میں اُس کے ساتھ بات کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا اور سیٹھ نے بھی اُسے پہلے والی اہمیت اور توجہ دینی چھوڑ دی تھی۔ ایک میں ہی تھی جس کے ساتھ وہ بات چیت کر سکتی تھی۔ میرے متعلق وہ سمجھ گئی تھی کہ میں عام سی قسم کی نوکرانی نہیں ہوں۔ ایک روز اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں کی رہنے والی ہوں اور میں نوکرانی کس طرح بن گئی ہوں ....

"میں نے وہ سب سُنا دی جو مجھ پر بیتی تھی۔ گھر سے نکلنے سے لے کر نواب کے محل سے نکلنے تک کی پوری داستان سناتی۔"

"تم نے یہ بھی سنایا تھا کہ نواب کے محل تک تم کس طرح اور کس کے ساتھ پہنچی تھیں؟"

"ہاں سکندر!" — رنجی نے جواب دیا — "میں نے تمہارا نام لیا تھا۔ میں نے تمہارا اتنا ذکر کیا تھا جتنا اپنا بھی نہیں کیا۔ اب تو پتہ چل گیا ہے کہ یہی وہ سوتیلی ماں تھی جس نے تمہیں تباہی کے راستے پر ڈالا تھا لیکن مجھے یاد آتا ہے کہ جب میں نے تمہارا اور تمہارے شہر کا نام لیا تھا تو شہناز نے چونک کر بلکہ بدک کر مجھے دیکھا اور مجھ سے پوچھا تھا کہ میں اُسے اس سکندر کے متعلق سب کچھ بتاؤں۔ میں نے اُسے تمہارے متعلق سب کچھ بتا دیا۔"

"یہ بھی بتا دیا تھا کہ عشو نے مجھے وہاں سے فرار کرایا تھا؟"

"ہاں سکندر!" — رنجی نے جواب دیا — "میں نے یہ بھی بتا دیا تھا۔ عشو کا نام سُن کر وہ تو گھبرا سی گئی تھی۔ میں نے محسوس نہیں کیا تھا کہ تمہارے ساتھ یا عشو کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ میں نے تو تمہارے متعلق

اُسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ تمہیں نواب نے قید خانے میں ڈال دیا تھا جہاں سے تم فرار ہو گئے تھے ..... اس کے بعد میرے ساتھ شہناز کا پیار کچھ اور بڑھ گیا۔"

باقی باتیں بعد میں سُنوں گا" — میں نے کہا — "مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں یہ اطلاع کس طرح پہنچی ہے کہ میں آ رہا ہوں۔"

"یہ کل دوپہر کی بات ہے" — رنجی نے جواب دیا — "سیٹھ دوپہر کے کھانے کے لئے آیا۔ کھانے پر سیٹھ کے ساتھ شہناز تھی۔"

"کیا دوسری بیگمات ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتیں؟"

"نہیں" — رنجی نے جواب دیا — "انہوں نے تو ڈیڑھ دو مہینوں سے شہناز کے پاس بیٹھنا بھی ترک کر رکھا ہے اور انہوں نے میری موجودگی میں سیٹھ سے کہا تھا کہ وہ شہناز کے ساتھ بیٹھ کر کبھی کھانا نہیں کھائیں گی ....

کل دوپہر کے کھانے پر میں بھی حسبِ معمول کھانے کے کمرے میں حاضر تھی سیٹھ نے شہناز سے پوچھا کہ سکندر کون ہے۔ میں نے دیکھا کہ شہناز کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور اُس نے سیٹھ سے پوچھا کہ وہ کیوں پوچھ رہا ہے۔ سیٹھ نے اُسے بتایا کہ اُس کی ماں کا خط آیا ہے کہ سکندر نام کا ایک جوان آدمی شاید تمہارے گھر آئے اور تمہیں یا شہناز کو پریشان کرے۔ سیٹھ نے یہ بھی بتایا کہ شہناز کی ماں نے لکھا ہے کہ سکندر اُن کے گھر ایک رات دو ڈاکوؤں کو ساتھ لے کر آ چکا ہے اور اس کے بعد اکیلا آیا تھا اور خنجر دکھا کر گھر سے زیورات اور کچھ رقم لے گیا ہے۔"

"شہناز نے کیا بتایا تھا؟"

"اُس نے سیٹھ کو بتایا کہ سکندر اُس کے خاوند کا بیٹا ہے" — رنجی نے جواب دیا — "شہناز نے یہ بھی بتایا کہ سکندر نے اُس کی عزّت پر حملہ کیا تھا جس سے وہ بڑی مشکل سے بچی تھی اور اُس کے باپ کو بتایا تھا۔ باپ نے سکندر کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد اُس کا کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ شہناز نے کہا کہ وہ ڈاکوؤں سے جا ملا ہو گا۔ وہ تھا ہی ایسا۔

سیٹھ نے کہا کہ یہاں آکر وہ مار کھائے گا اور اس کے بعد گرفتار ہوگا۔ ایسے ڈاکو میں نے بہت دیکھے ہیں۔ آنے دو اُسے۔"

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ سیٹھ نے کوئی پرواہ ہی نہیں کی" —— میں نے کہا۔

"ظاہری طور پر تو اُس نے پروا نہیں کی" — فجی نے کہا — "لیکن اُسی رات اُس نے ساری رات جاگنے کے لئے ایک اور چوکیدار رکھ لیا تھا۔ یہ گذشتہ رات کی بات ہے۔ ایک چوکیدار تو رسمی طور پر موجود رہتا ہی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ آج وہ نہیں تھا اس لئے دروازہ میں نے کھولا۔ اسے تو میں تمہاری خوش قسمتی سمجھتی ہوں .... سیٹھ تو دوپہر کے کھانے کے بعد چلا گیا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ رات کو بھی گھر سے غائب رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ نوابوں کی طرح عیاش آدمی ہے۔ روپیہ پیسہ تو وہاں برستا ہے، شراب پیتا ہے اور دلّی کی اعلیٰ درجے کی ناچنے گانے والیوں کے ہاں جاتا ہے....

"پندرہ بیس روز پہلے کا واقعہ ہے۔ کھانے پر ہی شہناز نے سیٹھ سے شکایت کی تھی کہ اُس کے دل میں پہلی سی محبت نہیں رہی۔ سیٹھ نے اُسے محبت کا یقین دلایا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ شہناز کو ٹال رہا تھا۔ شہناز نے اُسے کہا کہ ابھی تک اُس نے اُس کے ساتھ باقاعدہ نکاح بھی نہیں کیا۔ بغیر نکاح کے شہناز اپنا حق بھی نہیں جتا سکتی۔ حق کے لفظ پر سیٹھ بگڑ گیا۔ شہناز بھی بھری بیٹھی تھی۔ وہ سیٹھ پر بگڑی تو سیٹھ نے اُسے کہا کہ میں نے تمہیں خریدا ہے۔ اپنی ماں سے کہو کہ میری رقم واپس کر دے پھر تم اپنی ماں کے پاس چلی جانا۔ اگر زیادہ رُعب دکھاتی ہو تو جاؤ عدالت میں چلی جاؤ۔ شہناز کے پاس سوائے رونے کے اور جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔"

*

"گذشتہ رات سیٹھ گھر سے غائب تھا" — فجی نے مجھے سُنایا — "میں نے شہناز سے پوچھا کہ یہ وہی سکندر ہے جس نے مجھے اُس رات کے طوفان سے نکالا اور اپنی پناہ میں لے کر جہاں خود گیا وہاں ساتھ لے گیا تھا؟ شہناز

نے کہا، ہاں یہ وہی سکندر ہے اور یہ عشو جس نے سکندر کو وہاں سے فرار کرایا تھا میری نوکرانی رہ چکی تھی۔ بہت ہوشیار عورت ہے۔ میں نے شہناز سے کہا کہ پھر یہ بھی سچ ہے کہ سکندر کو آپ ہی نے اغوا کرایا تھا۔ شہناز نے آہ لے کر کہا — 'ہاں فجی! میں نے یہ گناہ کیا تھا اور شاید اسی کی سزا بھگت رہی ہوں۔ اب سکندر آرہا ہے۔ اُس نے مجھ سے کیا لینا ہے۔ میں جانتی ہوں، وہ میری جان لے گا۔ مجھے اب اُس کے ہاتھوں قتل ہونا ہے' — میں نے اُسے جھوٹی تسلی دی کہ اتنے بڑے گھر میں، چوکیداروں کی موجودگی میں کسی کو قتل کر جانا آسان نہیں، لیکن سکندر! شہناز بہت پریشان ہے۔ اگر اس میں ذرا سی بھی شرم اور حیا ہوتی تو وہ خودکشی کر لے گی۔ سیٹھ نے اُسے قیدی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ سیر سپاٹے کے لئے نکلتی ہے لیکن اکیلی نہیں جا سکتی۔ میں ساتھ جاتی ہوں۔ میرے ساتھ سیٹھ کا سلوک بہت اچھا ہے۔ مجھے تنخواہ کے علاوہ بھی پیسے دیتا ہے۔"

"ایسے عیاش آدمی سے فالتو پیسے لینا اچھا تو نہیں فجی!"

"اس میں خرابی والی کوئی بات نہیں" — فجی نے کہا — "وہ مجھے فالتو پیسے ایک اور کام کے دیتا ہے۔ اُس نے یہ ڈیوٹی بھی مجھے دے رکھی ہے کہ میں شہناز پر نظر رکھوں اور جب بھی وہ باہر نکلے میں اُس کے ساتھ رہوں اور وہ کسی اور آدمی کے ساتھ بات تک نہ کرنے پائے۔ میں اس سیٹھ کی نظر میں کچھ بھی نہیں۔ اُس کے پاس دولت ہے۔ ایک سے ایک حسین عورت اُس کے قدموں میں آگرتی ہے .... اب بتاؤ سکندر! کیا کرو گے؟"

"فجی!" — میں نے کہا — "پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ میں تم پر کتنا بھروسہ کر سکتا ہوں؟"

"مجھ پر تم پُورا پُورا بھروسہ کر سکتے ہو" — فجی نے کہا — "یہ پوچھ کر تم نے میرا دل دکھا دیا ہے۔ کیا میں تمہیں دھوکہ دے سکتی ہوں؟ تم نے میری عزت اور عصمت کی حفاظت کی تھی۔ تم نہ ہوتے تو میں شاید آج دلّی

کے بازار میں کسی کوٹھے پر بیٹھی ہوتی۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ یہ میری دعاؤں اور میری آہوں کا اثر ہے کہ تم زندہ ہو اور زندہ میرے پاس آ گئے ہو.... کہو کیا کرنا چاہتے ہو؟ مجھے جس امتحان میں بھی ڈالو گے، اُس میں پوری اُتروں گی لیکن میں تمہیں کسی امتحان میں نہیں پڑنے دوں گی۔ میری مانو سکندر! واپس چلے جاؤ۔ پکڑے جاؤ گے۔ تم شہناز سے انتقام لینے آئے ہو نا!.... نہیں لے سکو گے۔"

"اب میری بات غور سے سنو فجی!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "میں آج شہناز کا گھر صرف دیکھنے آیا ہوں۔ پھر جب آؤں گا تو میں اکیلا نہیں آؤں گا۔ اُسے اغوا کروں گا اور میں ڈاکوؤں کے جس گروہ کے ساتھ ہوں شہناز کو ان کے حوالے کر دوں گا۔ کچھ مہینے وہ اُسے اپنے پاس رکھیں گے۔ جب یہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جائے گی تو وہ اسے بردہ فروشوں کے ہاتھ بیچ ڈالیں گے۔"

"تمہیں کیا مل جائے گا سکندر!"۔۔۔ فجی نے کہا۔۔۔ "اسے پہلے ہی بہت سزا مل رہی ہے۔ فائدے میں اس کی ماں رہی ہے جس نے اس کی قیمت وصول کر لی ہے۔ میری دلچسپی اور ہمدردی تمہارے ساتھ ہے۔ تم پکڑے گئے تو میں جیتے جی مر جاؤں گی.... اور سکندر! کیا تم واقعی ڈاکوؤں کے پاس چلے گئے ہو اور ڈاکو بن گئے ہو؟"

"جانتی ہو وہ ڈاکو کون ہے جس کے پاس میں چلا گیا ہوں؟"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "وہ تاجا ڈاکو ہے۔ وہی تاجا جو اُس رات ہمیں قلعے کے کھنڈروں میں ملا تھا.... اور میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں گا.... تاجا خواجہ صاحب کا بیٹا ہے۔"

فجی اس قدر حیران ہوئی جیسے اُسے سکتہ ہو گیا ہو۔ میں نے اُسے بتایا کہ تاجے کو میں اپنا باپ سمجھتا ہوں اور اللہ کے بعد اُسی کو اپنا سہارا سمجھتا ہوں۔

فجی مجھے شہناز کے اغوا سے روکتی تھی اور میں اُسے کہہ رہا تھا

کہ وہ میری اس انتقامی کارروائی میں میری مدد کرے۔ فجی اتنی چالاک اور ہوشیار ہو گئی تھی کہ مجھ پر وہ چھا گئی۔ معلوم نہیں اُسے کیا سوجھی کہ مجھے کہنے لگی کہ وہ شہناز کے ساتھ میری ملاقات کرا سکتی ہے۔"

"پھر تم اسے اغوا بھی کرا سکتی ہو!"۔۔۔ میں نے کہا۔

"یہ بعد کی بات ہے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "میں نے جو سوچا ہے مجھے وہ کر لینے دو۔ میں اُس کے سامنے تمہارا نام لوں گی پھر اُسے بتاؤں گی کہ تم دلی میں ہو اور تمہارے ساتھ میری ملاقات اتفاقیہ ہو گئی تھی۔ پھر میں دیکھوں گی کہ وہ کیا کہتی ہے اور کرتی کیا ہے۔"

"اگر تم اُس کے ساتھ میری ملاقات کراؤ گی تو اس میں ایک خطرہ ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "وہ مجھے گرفتار کرا سکتی ہے۔"

"میرے بغیر تو باہر نہیں نکلے گی"۔۔۔ فجی نے کہا۔۔۔ "میں زیادہ نہیں رُک سکتی۔ میرے ساتھ چلو۔ تانگہ پکڑو۔ میں راستے میں اُتر جاؤں گی۔ کل اسی وقت تم مجھے وہیں ملنا۔ شاید میں تمہیں کام کی کوئی بات بتا سکوں۔"

ہم باہر جا کر تانگے میں بیٹھے۔ فجی نے تانگے والے کو بتایا کہاں جانا ہے۔ وہ راستے میں اُتری۔ اگلے روز میں نے اُسے اس جگہ ملنا تھا۔

*

دوسرے دن میں وہاں پہنچا۔ فجی جلدی آگئی۔

"میں زیادہ دیر نہیں رُکوں گی"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "میرے ساتھ ساتھ چلو.... وہ تم سے ملنا چاہتی ہے.... آج شام۔ ہمایوں کے مقبرے سے تم واقف نہیں ہو گے۔ میں تمہیں بتا دوں گی کہ وہاں تک کس طرح پہنچنا ہے۔"

"مجھے پکڑنے کے لئے پولیس کہاں موجود ہو گی؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "ہمایوں کے مقبرے میں؟"

"کہیں بھی نہیں"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "پولیس کا انتظام کرنے والا سیٹھ ہے۔ وہ رات کو بھی نہیں آیا۔ شہناز خود تو پولیس کا انتظام نہیں کر

سکتی۔ وہ میرے بغیر باہر نہیں نکل سکتی۔ گھر میں کسی کے ساتھ بات نہیں کر سکتی۔ میں اُس کے ساتھ رہتی ہوں ..... وہ تو روتی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ سکندر کو میں نے دیکھا تھا اور اُس سے ملی بھی تھی اور وہ پریشان ہونے کی بجائے خوش ہوئی۔ اُس نے پوچھا کہ تم نے بتا دیا ہے کہ اُس کے آنے کی اطلاع مل چکی ہے؟ میں نے کہا کہ میں نے نہیں بتایا۔ پھر اُس نے پوچھا کہ سکندر تمہیں پھر نہیں ملے گا؟ میں نے گول سا جواب دیا، شاید مل جائے...

"سکندر! تم شاید یقین نہ کرو۔ وہ زار و قطار رونے لگی پھر اُس نے کہا — 'سکندر سے کہو کہ مجھے قتل کرنے آئے ہو تو جہاں کہو گے آجاؤں گی اور تمہارے ہاتھوں بڑی خوشی سے قتل ہوں گی' — وہ بے تاب ہو گئی اور میرے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی — 'مجھے سکندر کی آہیں سزا دے رہی ہیں .... میں اُس کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگوں گی' ....

"میں تمہیں اچھی طرح سمجھا نہیں سکتی کہ اُس کی کیا حالت ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں تمہاری ملاقات کرا سکتی ہوں، مجھے باہر جانے دو۔ سکندر نے ایک جگہ بتائی تھی، شاید وہاں مل جائے۔"

"کیا تم نے اُسے بتا دیا ہے کہ سکندر مل گیا تو ملاقات آج شام ہمایوں کے مقبرے میں ہو گی؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں سکندر!" — اُس نے کہا — "میں اُسے اتنی مہلت نہیں دینا چاہتی کہ وہ تمہیں پکڑوانے کا انتظام کر سکے۔ وہ ایسا کرے گی تو نہیں پھر بھی میں احتیاط کر رہی ہوں۔ میں اُسے تھوڑی دیر پہلے کہوں گی کہ میرے ساتھ آؤ۔"

اُس نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا کہ مجھے ہمایوں کے مقبرے تک لے جانے والی بس کہاں ملے گی۔

"وہاں دروازے پر انتظار کرنا" — اُس نے کہا — "شام ساڑھے چار بجے۔"

فجی چلی گئی۔

*

میں ایک کشمکش میں اُلجھ گیا — "فجی دھوکہ نہ دے جائے .... فجی دھوکہ نہیں دے گی .... مجھے شہناز کی ملاقات کے لئے نہیں جانا چاہئے .... چلا جاؤں .... لیکن میں اُسے بخشوں گا نہیں۔ وہ میری مجرم ہے۔ میرے باپ کی مجرم ہے۔"

میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وقت گزارنے کے لئے گھومتا پھرتا رہا۔ ہوٹل میں کھانا کھایا اور ٹہلتے ٹہلتے، پوچھتے پوچھتے وہاں چلا گیا جہاں مجھے ہمایوں کے مقبرے کی طرف جانے والی بس ملنی تھی۔ میں بس میں بیٹھا۔ ابھی بہت وقت تھا لیکن میں نے کچھ سوچ کر وہاں جلدی پہنچنا چاہا تھا۔

بس نے مجھے وہاں تک پہنچا دیا اور میں ہمایوں کے مقبرے تک پہنچ گیا۔ میں دروازے سے دُور رہا اور نظر دروازے پر اور اس کے سامنے کے علاقے پر رکھی۔ مجھے توقع تھی کہ پولیس موجود ہو گی یا وقت پر آجائے گی۔ میں خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ پولیس پرائیویٹ کپڑوں میں نہ ہو۔ میں اس انداز سے باہر ہی ٹہلتا رہا کہ کوئی شک نہ کرے۔ میرے نیفے میں خنجر تھا اور میں سوچنے لگا کہ پولیس مجھ پر آ پڑی تو میں اُس سے کس طرح بھاگوں گا۔

مقبرے کے اندر لوگ جا رہے تھے۔ باہر بھی نکل رہے تھے۔ اتنے میں ایک تانگہ آیا اور اس میں سے فجی اُتری۔ اُس کے ساتھ کالے برقعے میں شہناز ہی ہو سکتی تھی۔ چہرے پر نقاب تھا۔ فجی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ اور کالے برقعے والی مقبرے کے اندر چلی گئیں۔ میں کچھ فاصلہ رکھ کر اُن کے پیچھے گیا۔

مقبرے کا احاطہ بہت ہی وسیع ہے جہاں ایک قصبے کی آبادی دفن ہو سکتی ہے۔ وہاں صرف ایک آدمی دفن ہے۔ یہ تو قلعہ ہے۔ وہ دونوں ایک طرف مُڑ گئیں اور میں چوکس ہو کر اُن سے دُور دُور چلتا رہا۔ آگے ایسی

جگہ آگئی جہاں لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایک جگہ وہ رُک گئیں۔ میں قریب گیا تو فیجی وہاں سے ہٹ کر کچھ دُور جا رُکی۔ شہناز نے نقاب اُٹھا دیا۔

آنسوؤں سے اُس کا مُنہ دُھلا ہُوا تھا اور آنسو بہے جا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اُس کے ہونٹ کانپنے اور اُس کی سسکیاں نکلنے لگیں۔ وہ بیٹھ گئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ فیجی خاصی دُور ٹہل رہی تھی۔ شہناز نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں بیٹھ گیا۔ اُس کے آنسوؤں اور سسکیوں نے مجھ پر کوئی اثر نہ کیا۔ وہ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کا چہرہ اُترا ہُوا تھا، پھر بھی وہ خوبصورت لگ رہی تھی لیکن اتنی اچھی صورت کو دیکھ کر مجھے جیسے آگ لگ گئی ہو۔

"مجھ سے انتقام لینے آئے ہو؟" — اُس نے پوچھا۔

"اور تم نے مجھے گرفتار کرانے کے لئے جال بچھایا ہے؟" — میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں سکندر!" — اُس نے سسکیاں لیتے ہُوئے کہا — "میں تمہارے ہاتھوں قتل ہونے آئی ہوں۔ میں نے کوئی جال نہیں بچھایا۔"

"پھر مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"بخش سکتے ہو تو بخش دو سکندر!" — اُس نے کہا — "یا وہ طریقہ بتاؤ کہ میں گناہوں کا کفارہ ادا کرسکوں۔ میں تمہارے اباجان کی قاتل ہوں۔"

اُس کی ذہنی حالت اتنی زیادہ بگڑی ہوئی تھی کہ میں کچھ کہنے لگا تو اُس نے مجھے روک دیا۔

"پہلے میری بات سن لو سکندر!" — اُس نے آنسو بہاتے ہُوئے کہا — "تم مجھے اپنا دشمن سمجھتے ہو لیکن تمہیں دیکھ کر مجھے ایسے محسوس ہونے لگا ہے جیسے میرا ایک ہمدرد آگیا ہے۔ میرے دل اور میری زبان کو تالے لگے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی نہیں جسے میں اپنی سنا سکوں۔ تمہیں اس لئے نہیں سُنا رہی کہ تم میرے ساتھ ہمدردی کرو۔ میں اس قابل نہیں رہی کہ میرے

ساتھ کوئی ہمدردی کرے۔ میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔ یہ کانٹے میرے وجود کو اور میری رُوح کو زخمی کرتے رہتے ہیں۔"

"اگر تمہاری ماں کا یہ تیر نشانے پر نہ بیٹھتا تو نہ تمہارا وجود زخمی ہوتا نہ رُوح!" — میں نے کہا — "سیٹھ ابراہیم کو تم نے موٹا شکار سمجھا تھا لیکن وہ بہت بڑا شکاری نکلا۔ تمہاری ماں نے اسے بھی میرے اباجان جیسا سمجھ لیا ہوگا۔"

"خدا نے پکڑ لیا ہے سکندر!" — اُس نے دوپٹے سے آنسو پونچھ کر کہا — "لیکن سزا صرف مجھے مل رہی ہے۔ میری برداشت ختم ہوگئی ہے۔"

"ماں کو لکھو" — میں نے کہا — "کہ آؤ اور مجھے چھڑاؤ۔"

"خط لکھنے کی بھی مجھے اجازت نہیں" — اُس نے کہا — "لکھوں گی تو کیا ہوگا؟ وہ جواب دے گی، بیٹی صبر کرو .... یہاں یہ حال ہے کہ سیٹھ نے میرے ساتھ شادی کی ہی نہیں۔ بغیر نکاح کے مجھے بیوی بنایا ہُوا ہے۔ کہتا ہے واپس جانا چاہتی ہو تو رقم واپس کردو اور چلی جاؤ۔"

"میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں آئے کیوں ہو؟" — اُس نے پوچھا — "مجھ سے انتقام لینا ہے؟"

میں نے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس کے چہرے پر نظریں جمائے ہُوئے چُپ رہا۔

"تمہیں انتقام لینا چاہیئے" — اُس نے کہا — "میں نے تمہیں اغوا کرایا تھا۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہاری دوستی ڈاکوؤں کے ساتھ ہوگئی ہے اور تم اپنے دوستوں کو ساتھ لے کر میرے گھر گئے تھے اور وہاں سے زیور اور رقم لے آئے ہو۔"

"وہ زیور میری ماں کا ہے جو میں لایا ہوں" — میں نے کہا — "اور رقم میرے ...."

"میں کوئی گلہ نہیں کر رہی سکندر!" — اُس نے میری بات کاٹ کر کہا — "میں تو کہتی ہوں کہ میری ماں کے گھر کو آگ لگا دو۔ اُس حرام خور کو زندہ جلا دو ..... میری سُنو سکندر! پہلے میری سُن لو۔ مجھے اپنے گناہ اُگل لینے دو ... میں کہہ رہی تھی کہ میں تمہارے ابّاجان کی قاتل ہوں۔"

"اُنہیں دُودھ میں کچھ پلاتی رہی ہو؟"

"ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "اُنہیں آہستہ آہستہ مارتی رہی اور اُن کا گھر خالی کرتی رہی۔ اتنے میں میری ماں نے میرا یہ سَودا کر لیا۔ طلاق نامہ میرے ایک بھائی نے لکھا تھا اور تمہارے ابّاجان سے دستخط اس طرح کرائے تھے کہ وہ نیم غشی میں تھے اور اُنہیں بتایا کچھ اور تھا۔"

"تمہیں اُن کی وفات کی اطلاع کسی نے دی تھی؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "مجھے یقین تھا کہ وہ فوت ہو جائیں گے۔ کب فوت ہُوئے ہیں؟"

"وہ اس طرح فوت ہُوئے کہ میں اُن کے بازوؤں میں تھا" — میں نے کہا — "اللہ کو ہماری ملاقات منظور تھی اور میں وہاں چلا گیا۔"

میں اُسے اور کچھ بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ بتا بھی نہ سکا کیونکہ مجھ پر رقّت طاری ہو گئی تھی۔ شہناز کے آنسو بھی ایک بار پھر بہنے لگے۔ کچھ دیر ہم خاموش رہے۔

"تم میرے ساتھ جو سلوک کرنا چاہو کر سکتے ہو" — اُس نے کہا — "اگر میرے گناہ معاف کر سکتے ہو تو اپنی زبان سے کہو کہ شہناز! میں نے تجھے معاف کیا۔ پھر میں خوشی سے اپنی جان خود ہی لے لوں گی۔"

"خودکُشی کر لو گی؟"

"نجات کا کوئی اور راستہ ہے تو بتا دو!" — اُس نے کہا — "میں تم سے یہ امید تو نہیں رکھ سکتی کہ مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔"

"میں اپنے گھر سے تو نہیں آیا" — میں نے کہا — "نہ میں اپنے گھر جاؤں گا۔ میرا اب کوئی گھر نہیں، کوئی ٹھکانہ نہیں۔"

"یہ بھی میرا گناہ ہے" — اُس نے کہا — "لیکن سکندر! اپنے ٹھکانے پر واپس آ جاؤ۔ دیکھو تم کتنے خوبصورت جوان ہو۔ ڈاکوؤں کی دوستی چھوڑ دو۔"

میں نے طنزیہ ہنسی کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔

*

وہ روتی بھی رہی، بولتی بھی رہی۔ کبھی مجھے اُس پر غصّہ اور کبھی ترس آ جاتا۔ اگر سیٹھ ابراہیم میرے ابّاجان کی طرح اُس کا غلام بن جاتا تو اُسے ان گناہوں پر ذرا سا بھی افسوس نہ ہوتا جن کا وہ میرے سامنے اعتراف کر رہی تھی۔ میں اُس کے حُسن اور اُس کے آنسوؤں سے متاثر ہونے والا نہیں تھا، پھر بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ میں اپنے آپ میں تقسیم ہوتا جا رہا ہوں اور میرا ارادہ متزلزل ہو رہا ہے۔

"پتھر بن جاؤ" — مجھے ایک آواز سُنائی دی — "ایسا ہوتا آیا ہے، ہوتا چلا جائے گا .... پتھر بن جاؤ اور گرو اُن کے سروں پر جنہوں نے ظلم کئے ہیں۔"

یہ آواز اُس بزرگ کی تھی جو مجھے ریل گاڑی میں ملا تھا۔ میں ابّاجان کی وفات کے بعد اپنے شہر سے واپس آ رہا تھا تو یہ بزرگ ملا تھا۔ اُس نے میرے آنسو دیکھ لئے اور مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کیوں رو رہا ہوں۔

شہناز کی باتیں سُنتے سُنتے میں پتھر بن گیا اور میرا دماغ ایک مجرم کا دماغ بن گیا۔ میں نے شہناز کو قتل نہیں کرنا تھا۔ اسے اغوا کرنا تھا اور یہ کام آسان نہیں تھا۔ میں نے واپس جا کر تاجے سے بات کرنی تھی اور اُس نے مجھے کوئی مشورہ دینا تھا لیکن شہناز نے ابھی ابھی ایک بات کہی تھی میرے دماغ میں آئی کہ اسے دھوکے میں کیوں نہ ساتھ لے جاؤں۔

اُس نے کہا تھا کہ میں تم سے یہ توقع تو نہیں رکھ سکتی کہ مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے .... میں نے پہلے آپ کو بتایا ہے کہ میرا دماغ غیر معمولی بلکہ غیر قدرتی طور پر تیز تھا۔ مجھ سے کئی قدم آگے چلتا تھا۔

"اب میری سنو شہناز!" — میں نے پکے استادوں کی طرح کہا — "میں بڑا خوفناک ارادہ لے کر آیا تھا لیکن تمہارے آنسوؤں نے اور تمہاری اس حالت نے میرا دل موم کر دیا ہے۔ تم عورت ہو اور میں مرد ہوں۔ مرد ایک عورت سے انتقام لیتا اچھا نہیں لگتا۔ میرا خیال ہے کہ تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

"ہاں سکندر!" — اُس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور بھکاریوں کے لہجے میں کہنے لگی — "مجھے یہاں سے نکالو۔ میں تمہاری نوکری کر لوں گی۔ ساری عمر تمہاری خدمت میں گزار دوں گی۔"

"لیکن تم اپنی ماں کے پاس تو نہیں جا سکو گی" — میں نے کہا — "سیٹھ ابراہیم تمہیں پریشان کرے گا۔ ایسا نہ ہُوا تو بھی تمہارے لئے اچھا نہیں ہوگا۔ سارے شہر میں مشہور ہو گیا ہے کہ تم آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہو اور میرے ابا جان کو تم مرتا چھوڑ گئی ہو۔ تم ابھی جوان ہو، خوبصورت بھی ہو لیکن تمہاری جوانی اور خوبصورتی اب کسی کام نہیں آئے گی۔ کوئی بھی تمہارے ساتھ شادی نہیں کرے گا .... میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں لیکن تمہیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ ہمیشہ اپنے ساتھ نہیں رکھوں گا۔ کسی اچھے آدمی کے ساتھ شادی کرا دوں گا۔"

"مجھے اس جہنم سے نکالو سکندر!" — شہناز نے کہا — "میں یہاں سے خالی ہاتھ نہیں نکلوں گی۔ بہت سی رقم اور زیور ساتھ لاؤں گی۔"

"میں حیران ہوں کہ تم جیسی عورت تنگ آ گئی ہے" — میں نے کہا — "نکاح نہیں ہُوا تو کیا ہُوا۔ دولت میں کھیلو، عیش کرو۔"

"میں نے تمہیں ساری باتیں نہیں بتائیں سکندر!" — اُس نے کہا — "سیٹھ کی دونوں بیگمیں میرے خلاف بڑی خطرناک سازش کر رہی ہیں۔ اس کا علم فجی کو نہیں نہ میں نے اسے بتایا ہے۔ بڑی بیگم کا ایک بیٹا جوان ہے۔ تمہاری عمر کا ہے۔ اس سے کہلوایا گیا ہے کہ میں اُس کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اُنہوں نے مجھے بُرا بھلا کہا ہے اور یہ دھمکی

بھی دی ہے کہ وہ سیٹھ کو بتا دیں گی۔"

"میرے ساتھ تم نے یہی حرکت کی تھی" — میں نے کہا — "یہاں بھی کی ہوگی۔"

"نہیں سکندر!" — اُس نے کہا — "میرا تو من ہی مارا گیا ہے۔ میں تو بھول ہی گئی ہوں کہ میں جوان عورت ہوں۔ بڑی بیگم کا بیٹا سازش کے تحت میرے کمرے میں آ کر بیٹھتا ہے اور میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں، اس لئے فجی کو میں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ دونوں بیگمیں مجھے اس لڑکے کے ساتھ سیٹھ سے پکڑوانا چاہتی ہیں۔ سیٹھ سے میں اس لئے ڈرتی ہوں کہ وہ مجھے طوائفوں کے ہاتھ بیچ ڈالے گا۔ یہ تو مجھے یہاں آکر پتہ چلا ہے کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔"

"اب سوچو کہ میرے ساتھ کس طرح چلو گی" — میں نے کہا — "تمہیں اس برقعے میں نہیں ہونا چاہئے اور فجی کو شک تک نہ ہو کہ تم میرے ساتھ جا رہی ہو۔ گھر سے تم اسی برقعے میں نکلنا، اور نکلنا اُس وقت جب فجی گھر میں نہ ہو۔ میرے پاس سفید بُرقعہ ہے جو میں اپنے بہروپ میں استعمال کیا کرتا ہوں .... کیا تم فجی کے بغیر گھر سے نکل سکتی ہو؟"

"اجازت تو نہیں" — اُس نے جواب دیا — "لیکن نکل آؤں گی۔ تم وقت اور جگہ بتا دو۔"

میں دلّی سے واقف نہیں تھا۔ اسی ایک سڑک کو جانتا تھا جس پر میں فجی کے ساتھ تانگے میں بیٹھا تھا یا اُس کے ساتھ تھوڑی دُور تک چلا گیا تھا۔ میں نے اگلے روز دس بجے صبح کا اُسے وقت بتایا اور کہا کہ فلاں طرف اس سڑک پر چلتی آئے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے وہ فجی کو کسی کام سے باہر بھیج دے۔

میں نے فجی کو بلایا اور اُسے کہا کہ شہناز کو گھر لے جاتے۔

*

اگلے روز میں اُس سڑک پر پہنچ گیا اور شہناز کے گھر سے تھوڑی دُور

ٹہلتا رہا۔ شہناز نے زیادہ انتظار نہ کرایا۔ وہ کل والے برقعے میں نہیں تھی۔ وہ سلیٹی رنگ کے برقعے میں آئی تھی۔ یہ اُس نے عقلمندی کی تھی۔ کالے برقعے کا کپڑا چمکدار اور قیمتی تھا۔ لوگوں کی نظروں کو کھینچتا تھا۔ سلیٹی رنگ کا برقعہ میلا میلا سا تھا۔ میں نے اُسے تانگے میں بٹھایا اور ہوٹل میں لے گیا۔

وہ درمیانے درجے کا ایک ہوٹل تھا۔ پہلے بھی میرے ساتھ اس ہوٹل میں آئی تھی۔ اب ایک اور عورت کو میں لے گیا تو ہوٹل والے مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ میں نے شہناز کو کمرے میں بٹھایا اور ہوٹل والے کو بل دینے کے لئے چلا گیا۔ اُس نے کہا کہ جناب، ہوٹل میں عورتوں کا آنا ٹھیک نہیں۔

"میں جا رہا ہوں جناب!" ـــ میں نے اُسے کہا ـــ "اور عورت بھی میرے ساتھ ہی جا رہی ہے۔ آپ مجھ سے پیسے وصول کریں۔"

میں شہناز کو ساتھ لے کر ہوٹل سے نکلا اور ریلوے سٹیشن کے لئے ایک تانگہ لیا۔ نہ اُسے معلوم تھا نہ مجھے کہ اس وقت ہماری منزل کی طرف کوئی ریل گاڑی جاتی ہے یا نہیں۔ خطرہ صرف ایک تھا کہ سیٹھ ابراہیم کو بر وقت پتہ نہ چل جائے کہ شہناز گھر سے غائب ہے۔ میں نے شہناز سے پوچھا کہ سیٹھ اگر اچانک سامنے آجائے اور ہمیں پکڑ لے تو کیا ہوگا۔

"ہوگا کیا!" ـــ شہناز نے بڑی دلیری سے کہا ـــ "میں اُس کی بیوی تو نہیں .... اور وہ ہے کہاں، پرسوں سے غائب ہے۔"

اس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی تو شہناز گھبرائے گی نہیں اور میرا ساتھ دے گی۔ بہر حال یہ تو ایسا وقت آنے پر دیکھنا تھا کہ کون کیا کرتا ہے۔ ہم سٹیشن پر جا اُترے اور اپنی منزل کا سٹیشن بتا کر ایک ریلوے بابو سے پوچھا کہ اُس طرف گاڑی کس وقت جاتی ہے۔ اُس نے بتایا کہ بیس منٹ تک گاڑی آرہی ہے۔ میں نے سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ لئے۔ اُس زمانے میں سیکنڈ کلاس میں کوئی روپے پیسے والا ہی سفر کیا کرتا تھا۔ وہ سیکنڈ کلاس آج کل فسٹ کلاس بنا دی گئی ہے۔ اس سے اُس زمانے کی سیکنڈ کلاس بہت

بہتر تھی اور اسے امیرانہ کلاس سمجھا جاتا تھا۔

پلیٹ فارم پر گئے تو چند منٹ بعد گاڑی آگئی۔ دن کا وقت تھا اس لئے سیٹ بُک کرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں شہناز کو سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے کے سامنے لے گیا۔ شہناز نے چہرے سے نقاب اٹھا دیا تھا۔ رش زیادہ نہیں تھا۔ اُس زمانے میں رش ہوتا ہی نہیں تھا۔ میں نے ڈبے کے دروازے میں قدم رکھا تو مجھے احساس ہُوا کہ شہناز کو اپنا چہرہ بے نقاب نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ میں نے قدم رکھا ہی تھا کہ کسی نے میرا دایاں بازو پکڑا اور آواز آئی ـــ "نیچے اُترو" ـــ میں نے اُدھر دیکھا۔ وہ پولیس کا حوالدار تھا۔ اُتر کر شہناز کی طرف دیکھا تو ایک پولیس کانسٹیبل نے اُس کا بھی بازو پکڑ رکھا تھا۔ ایک اور پولیس کانسٹیبل نے میرا دوسرا بازو پکڑ لیا۔ ان کے ساتھ ادھیڑ عمر کا ایک آدمی تھا جس نے کوٹ پتلون پہن رکھا تھا۔

"میری بیوی کو اغوا کر کے لے جا رہے ہو؟" ـــ اس آدمی نے مجھے کہا۔

"میں تمہاری بیوی نہیں ہوں" ـــ شہناز نے اُسے کہا۔

"یہی ہے سیٹھ ابراہیم؟" ـــ میں نے شہناز سے پوچھا۔

"ہاں یہی ہے" ـــ شہناز نے بڑی دلیری سے کہا۔

"حوالدار صاحب!" ـــ میں نے پولیس حوالدار سے کہا ـــ "میرے بازو چھوڑ دو۔ یہ سیٹھ اپنی دولت کے نشے میں لڑکیوں کو زبردستی اپنے گھر رکھتا ہے" ـــ میں نے اپنے رنگ روغن اور خدا نے مجھے جو دلکش چہرہ دیا تھا، اس کا فائدہ اُٹھاتے ہُوئے کہا ـــ "یہ سیٹھ ہے تو میں بھی کسی نواب جیسے سیٹھ کا بیٹا ہوں۔ میں کوئی جرم نہیں کر رہا۔ مجھے سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالو۔"

"ارے جا نواب کے بیٹے!" ـــ سیٹھ ابراہیم نے طنزیہ لہجے میں کہا ـــ "میں تیری اوقات جانتا ہوں۔"

سوچے سمجھے بغیر میرا دایاں ہاتھ بڑی تیزی سے گھوما اور سیٹھ کے

مُنہ پر پڑا۔ وہ تیورا کر گھوما اور گرتے گرتے بچا۔ حوالدار اور کانسٹیبل نے میرے بازو چھوڑ دیتے تھے۔ انہوں نے مجھے پھر پکڑ لیا۔

"چلو تھانے!" — میں نے حوالدار سے کہا — "میں پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے تو کوئی بیان نہیں دوں گا۔ اس سیٹھ کو میں اندر کروا کے واپس آؤں گا۔"

لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایک پولیس انسپکٹر بھی آگیا۔ وہ غالباً سب انسپکٹر تھا۔ اُس نے مداخلت کی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اندر سے کانپ رہا تھا کیونکہ میں کسی نواب کا بیٹا نہیں، ایک مجرم تھا اور میں نے اپنے نیفے میں وہ خنجر اُڑسا ہُوا تھا جو پاس رکھنا جرم تھا، لیکن اُستاد نے مجھے بتایا تھا کہ ڈر گئے تو مارے گئے۔ لوگوں کے لئے بڑا دلچسپ تماشا بن گیا۔ ایک آدمی کہہ رہا ہے کہ یہ میری بیوی ہے۔ بیوی کہہ رہی ہے کہ میں اس کی بیوی نہیں اور ایک آدمی کہہ رہا ہے کہ میں نے اسے اس عصمت فروش آدمی سے آزاد کرایا ہے۔

"بہتر ہے آپ لوگ پولیس سٹیشن چلیں" — سب انسپکٹر نے کہا — "یہاں کھڑے کھڑے تو کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔"

"انسپکٹر صاحب!" — میں نے کہا — "میں تھانے چلتا ہوں۔ میں اس خاتون کو اغوا کر کے نہیں لے جا رہا، لیکن آپ یہ سوچ لیں کہ میری گاڑی نکلی جا رہی ہے۔ مجھے اور اس خاتون کو اگر پریشان کیا گیا تو میں دِلّی سے اُس وقت نکلوں گا جب اس جعلی سیٹھ کو اور ہمیں پریشان کرنے والوں کو اندر کرا دوں گا۔ اس سے یہیں پوچھو کہ اس کے پاس نکاح نامہ ہے؟ اگر نکاح نامہ نہیں تو یہی بتا دے کہ نکاح کہاں ہُوا تھا، کس نے نکاح پڑھایا تھا، گواہ کون تھا۔"

سب انسپکٹر نے سیٹھ کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں اُسے گھُور گھُور کر دیکھ رہا تھا۔ اُس کے مُنہ سے اتنا ہی نکلا کہ پولیس سٹیشن چل کر بات کرتے ہیں۔

ریلوے سٹیشن سے ذرا ہی دُور پولیس سٹیشن تھا۔ وہاں کا انچارج ایک مسلمان انسپکٹر تھا۔ اُس کے سامنے یہ معاملہ پیش ہُوا تو اُس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ لڑکی میری کیا لگتی ہے۔

"ہماری آپس میں محبت ہے" — میں نے کہا — "ہم نے شادی کرنی تھی۔ اس کی ماں رضامند نہیں تھی۔ ایک روز پتہ چلا کہ لڑکی گھر میں نہیں ہے۔ راز یہ کھُلا کہ اس کی ماں نے اس سیٹھ سے رقم وصول کی اور لڑکی کو اس کے حوالے کر دیا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے یہ پتہ چلایا کہ لڑکی کہاں ہے۔ مجھے پتہ چلا، میں یہاں آگیا۔ لڑکی کو میں نے اطلاع دی۔ یہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ آگئی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اسے ثابت کرنے کے لئے اپنے شہر کے گواہ پیش کروں گا۔ پھر میں اس کی دو بیویوں کو یہاں بلواؤں گا جو بیان دیں گی کہ اس شخص نے اس لڑکی کو بغیر نکاح کے گھر میں رکھا ہُوا تھا۔ اس سیٹھ سے پوچھیں کہ نکاح کہاں پڑھا گیا تھا، کس نے پڑھا تھا اور گواہ کون کون تھا۔"

انسپکٹر نے شہناز کی طرف دیکھا۔

"سکندر نے جو کچھ کہا ہے بالکل سچ کہا ہے" — شہناز نے کہا — "یہ سیٹھ مجھے اس وعدے پر لایا تھا کہ دِلّی جاتے ہی نکاح پڑھا لوں گا۔ چھ مہینے ہو گئے ہیں اس نے مجھ پر پہرے بٹھائے ہُوئے ہیں اور نکاح ابھی تک نہیں کیا اور مجھے اس نے زبردستی اپنی داشتہ بنایا ہُوا ہے۔ مجھے کسی بھی عدالت میں لے جائیں میں بیان دوں گی کہ میں سکندر کے ساتھ خود اپنی مرضی سے جا رہی ہوں۔"

"کیوں صاحب!" — انسپکٹر نے سیٹھ سے پوچھا — "کیا آپ شادی کا کوئی تحریری یا زبانی ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟"

"میں کوشش کروں گا" — سیٹھ نے کہا — "میرا خیال ہے نکاح نامہ کہیں گم ہو گیا ہے۔"

"نکاح خوان کا نام ہی بتا دیں" — انسپکٹر نے کہا — "میں ابھی اُسے

بلوائوں گا .... اور مجھے یہ بتائیں کہ آپ ان کے پیچھے ریلوے سٹیشن تک کیسے پہنچے؟"

"مجھے جلدی پتہ چل گیا تھا کہ لڑکی گھر سے نکل گئی ہے" — سیٹھ ابراہیم نے جواب دیا — "میں بھاگم بھاگ اِن کے پیچھے آیا۔"

"صاحب، جھوٹ نہ بولیں" — پولیس حوالدار جو ہمارے پیچھے کھڑا تھا بول پڑا — "اتفاق کی بات ہے کہ میں نے آپ کو اسی گاڑی سے اُترتے دیکھا ہے۔ پھر سٹیشن سے باہر نکلتے آپ نے اپنا ٹکٹ ٹکٹ کلکٹر کو دیا تھا۔"

میں نے سیٹھ کی طرف دیکھا۔ اُس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ میں نے انسپکٹر سے کہا کہ اگر وہ اجازت دے تو میں اس سیٹھ سے ایک بات ذرا الگ ہو کر کر لوں۔

"سیٹھ صاحب!" — انسپکٹر نے اُسے کہا — "ایک جھوٹ تو آپ کا یہیں پکڑا گیا ہے۔ اگر مزید ذلیل ہونے کا ارادہ ہے تو میں ان دونوں کے خلاف کارروائی شروع کر دیتا ہوں لیکن یہ سوچ لیں کہ آپ کا الزام غلط ہُوا تو ان کی بجائے آپ حوالات میں بند ہوں گے .... ان کی بات سُن لیں۔"

"سیٹھ صاحب!" — میں نے سیٹھ کو کمرے سے باہر لا کر کہا — "آپ کو شہناز کی ماں نے لکھا ہے کہ سکندر ہمارے گھر ڈاکوؤں کو لے کر آیا تھا۔ اُس نے ٹھیک لکھا ہے۔ آپ مجھے جانتے نہیں۔ اگر پولیس کی اور اپنی دولت کی دھونس جما کر آپ شہناز کو گھر لے گئے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی زندگی زیادہ سے زیادہ دو دن اور ہے۔ اگر آپ اپنا گھر لُٹوانا چاہتے ہیں تو وہ میں آج ہی رات کر کے دکھا سکتا ہوں۔ آپ جھوٹے ہیں۔ میں آپ کو عصمت فروشی میں پکڑوا سکتا ہوں۔ آپ کی دونوں بیگمات اس انتظار میں ہیں کہ آپ کسی جال میں پھنسیں۔ یہ سوچیں کہ یہ بات مجھے کیسے پتہ چلی ہے۔"

سیٹھ کا سر جُھک گیا اور وہ مجھے کچھ جواب دیئے بغیر انسپکٹر کے کمرے میں چلا گیا۔ میں بھی اُس کے پیچھے گیا۔ انسپکٹر نے اپنے کمرے میں نظر گھمائی۔ پولیس حوالدار اور تینوں کانسٹیبلوں کو باہر نکال دیا۔

"اگر تم واقعی سیٹھ ہو تو میری بات سُن لو" — انسپکٹر نے کہا — "میں اس کیس کو یہیں ختم کرنا چاہتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ تم مسلمان ہو اور میرے دل میں مسلمانوں کا کچھ درد ہے۔ اگر یہ لڑکا اور لڑکی ٹھیک کہہ رہے ہیں تو خاموشی سے کھسک جاؤ ورنہ بہت پچھتاؤ گے یا لکھو کہ شادی کے کاغذات اور دیگر شہادت پیش کر سکو گے .... بولو کیا کہتے ہو؟"

سیٹھ نے سر ہلایا اور کمرے سے نکل گیا۔

"جاؤ بھائی!" — انسپکٹر نے مجھے کہا — "جو جی میں آتے کرو۔"

اور ہم دونوں نکل آئے۔ نقصان یہ ہُوا کہ گاڑی کبھی کی جا چکی تھی۔ پتہ چلا کہ اگلی گاڑی کی روانگی میں تین گھنٹے لگیں گے۔

اب شہناز بہت خوش تھی۔ میں اپنے متعلق نہیں بتا سکتا کہ میں بھی خوش تھا یا نہیں۔ اس بات کی خوشی تو مجھ کو بھی تھی کہ میں گرفتاری سے یا پولیس اور کچہریوں کے لمبے چکر سے بچ گیا تھا لیکن شہناز کو میں جس نیت سے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا اس کے متعلق ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ میں فطری یا ذہنی طور پر جرائم پیشہ تو نہیں تھا۔ شہناز کو میں انتقامی طور پر خراب کرنا چاہتا تھا لیکن جس طرح وہ مجھ پر بھروسہ کر رہی تھی اس سے مجھے شک ہُوا کہ میں اسے لے تو جاؤں گا لیکن اپنا ارادہ شاید پورا نہ کر سکوں۔

*

ہم نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور سٹیشن پر چلے گئے۔ جب گاڑی آئی تو ہم سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ اس میں صرف ایک مسافر بیٹھا تھا۔ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لینے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ میں شہناز کو اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ انجن نے جب پہلی وسل دی تو تین اور مسافر ہمارے ڈبے میں داخل ہُوئے۔ ان میں سے ایک کو میں نے ذرا غور سے دیکھا۔ مجھے خیال آیا کہ جب میں اور شہناز ہوٹل میں سے کھانا کھا کر نکلے تھے تو یہ آدمی ہوٹل کے باہر کھڑا تھا۔ جب ہم ریلوے سٹیشن میں داخل ہوتے تو میں نے پھر اس آدمی کو ایک طرف کھڑے دیکھا۔ وہ ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں

جب سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں داخل ہُوا اور دروازے میں کھڑے ہو کر میں نے پیچھے دیکھا تو یہ آدمی مجھے پھر نظر آیا۔ وہ شاید کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ جب ہم دونوں ڈبّے میں سوار ہونے لگے تو وہ تیز تیز ایک طرف چلا گیا۔ اب وہ ہمارے ڈبّے میں دو آدمیوں کے ساتھ آگیا تھا۔ میں نے تینوں کو دیکھا۔ اُن کے حُلیے اور کپڑے سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے والے نہیں تھے۔

گاڑی چل پڑی۔ یہ میل ٹرین تھی جس نے چھوٹے چھوٹے سٹیشنوں پر نہیں رُکنا تھا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی اور دِلی کا شہر دُور پیچھے رہ گیا۔ میرا خیال ہے کہ دِلی سے گاڑی پچیس تیس میل دُور گئی ہو گی جب ان تین آدمیوں میں سے ایک اُٹھا اور میرے سامنے آن کھڑا ہُوا۔ اُس وقت ریل گاڑی بیابان اور سُنسان علاقے میں سے گزر رہی تھی۔

"یہ لڑکی ہمارے حوالے کر دو"۔۔۔ اُس نے کہا اور شہناز سے کہنے لگا ۔۔۔ "اُٹھو اور سامنے والی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔"

یہ سیکنڈ کلاس کا ڈبّہ تھا جس میں آمنے سامنے دو لمبی سیٹیں تھیں۔ ایک لمبی سیٹ ایک طرف تھی۔ اُوپر تین برتھ تھے اور درمیان میں جگہ کھُلی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ تین آدمی سیٹھ ابراہیم کے بھیجے ہوئے ہیں۔ تین گھنٹوں میں اُس نے یہ انتظام کر لیا تھا کہ اپنے غنڈوں کو بھیج دیا اور یہ آدمی جسے میں نے تین بار دیکھا تھا مجھے اور شہناز کو دیکھ رہا تھا کہ ہم کہاں جاتے ہیں اور اگر ہم سفر کرتے ہیں تو کون سے ڈبّے میں بیٹھیں گے۔ یہ آدمی میرے سامنے کھڑا تھا چونکہ گاڑی انتہائی رفتار پر جا رہی تھی اس لئے پاؤں پر کھڑا رہنا ذرا مشکل تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ برتھ پر رکھا ہُوا تھا۔ اُس کے دونوں ساتھی ابھی سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہُوئے تھے۔

میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ میں تیزی سے اُٹھا اور اس آدمی کے پیٹ میں پوری طاقت سے ٹکّر ماری۔ وہ آگے کو جھُکا۔ میں نے بڑی پھُرتی سے اپنے نیفے سے خنجر نکالا اور اس آدمی کے سر پہ خنجر کا دستہ بڑی زور سے

مارا۔ وہ گر پڑا۔ اُس کے ساتھی خالی ہاتھ نہیں تھے۔ وہ جیبوں سے یا نیفوں سے کچھ نکالنے لگے۔ میں نے ایک کے مُنہ پر اُچھل کر کِک ماری۔ وہ ابھی بیٹھا ہُوا تھا۔ کِک اُس کی ٹھوڑی کے نیچے لگی۔ اس ضرب کو وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ نے مجھے جوانی کی پوری طاقت عطا کر رکھی تھی۔ میں خنجر نہیں چلانا چاہتا تھا کیونکہ خنجر سے آدمی مر سکتا تھا۔

تیسرا ساتھی اُٹھ چکا تھا اور اُس کے ہاتھ میں لمبا چاقو تھا۔ مسافر جو پہلے ہی اس ڈبے میں بیٹھا تھا اُس نے گھبرا کر زنجیر کھینچ دی۔ چاقو والا مجھ پر وار کرنے کو پر تول رہا تھا لیکن زنجیر کھینچتے ہی گاڑی کی رفتار یکلخت کم ہوتی تو جھٹکے سے وہ پیچھے کو گرا۔ میں اُسی کی طرف گرنے لگا تو میں نے ایک ہاتھ اُوپر برتھ پر رکھ دیا۔ میں نے چاقو والے کی ناک پر پوری طاقت سے ٹکّر مارا۔ وہ وار کرنے کے قابل نہیں تھا۔

اتنے میں گاڑی رُک گئی۔ جس مسافر نے زنجیر کھینچی تھی وہ اتنا ڈرا ہُوا تھا کہ وہ دروازے کی طرف دوڑا اور اُس نے دروازہ کھول دیا۔ یہ تینوں آدمی کھُلے ہُوئے دروازے میں سے بڑی تیزی سے نکل گئے۔ مسافر جو کوئی ہندو لالہ لگتا تھا نیچے کھڑا شور مچا رہا تھا۔ گارڈ آیا تو اُس ہندو مسافر نے اُسے بتایا کہ ڈبّے میں تین ڈاکو قسم کے آدمی آ گئے تھے اور اُنہوں نے لُوٹنے کے لئے حملہ کر دیا تھا۔

گارڈ نے تین آدمی بھاگتے دیکھ لئے تھے۔ اس طرح اللہ نے ہماری مدد کی اور شہناز میرے ہاتھ سے چھن جانے سے بچ گئی۔ گارڈ کو جب یقین ہو گیا کہ گاڑی ان ڈاکوؤں کی وجہ سے روکی گئی تھی تو اُس نے گاڑی چلا دی۔ ہندو لالہ جتنی دیر گاڑی میں رہا وہ عجیب وغریب حرکتیں اور باتیں کرتا رہا۔ خوفزدگی کے معاملے میں شہناز کی حالت بھی غیر ہو گئی تھی۔

یہ ہندو اگلے سٹیشن پر اُتر گیا۔ وہاں سے گاڑی چلی تو میں اور شہناز اکیلے رہ گئے۔ خوفزدہ عورت اُس مرد کو ساری دنیا کا سب سے بڑا بہادر آدمی سمجھتی ہے جو اُس کی حفاظت کا مظاہرہ کرے۔ شہناز کو غالباً توقع نہیں

تھی کہ میں تین آدمیوں کو مار بھگاؤں گا۔ میں نے اور کچھ ریل گاڑی کے دھکے نے اور اس کے بعد ہندو لالے نے ان بدمعاشوں کو بھگا دیا تو شہناز مجھے ہرکولیس سمجھنے لگی۔ اُس نے اچانک مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور میرے سر اور چہرے کو دیوانہ وار چُومنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ روتی بھی جاتی تھی۔ اُس کی اس دیوانگی نے مجھے ہلا ڈالا۔

"میں ساری عمر تم سے جدا نہیں ہوں گی" ___ اُس نے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ___ "سکندر! میں نے کہہ دیا ہے میں ساری عمر تم سے جدا نہیں ہوں گی"۔

اُس نے مجھ پر بھی جذباتیت طاری کر دی۔

"شہناز!" ___ میں نے اُسے ذرا پرے کر کے کہا ___ "تم جو کچھ محسوس کر رہی ہو وہ میں جانتا ہوں لیکن میں عورت کے وجود سے ذرا دُور ہی رہنا چاہتا ہوں۔ میں ایک ایسی غلطی کر چکا ہوں اور اس کی سزا ابھی بھگت رہا ہوں" ___ میں نے اُسے وہ واقعہ سُنا دیا کہ میں کس طرح گلشن کو بُری نظر سے دیکھ بیٹھا تھا اور اُس کا اور میرا انجام کیا ہُوا۔

"غلط نہ سمجھو سکندر!" ___ شہناز نے کہا ___ "وہ وقت کچھ اور تھا جب میں نے تمہیں کسی اور رنگ میں چاہا تھا۔ اب نہیں۔ اب سکندر کا نام میری رُوح میں اُتر گیا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے تمہارا روپ ہی بدل گیا ہے.... سکندر! اگر تمہارے دل میں میری ذرا سی بھی محبت ہے یا تھوڑی سی بھی ہمدردی ہے تو میری ایک بات مان لو۔ میری اُن پہلی یادوں کو ذہن سے نکال دو"۔

اُس کی یہ بات سُن کر میرے دل کو یہ تسکین ہوتی کہ اس جھٹکے نے شہناز کے بل نکال دیئے ہیں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ شہناز کی یہ وارفتگی اور خود سپردگی مجھے میرے ارادوں کے راستے سے ہٹا ہی نہ دے۔ گلشن آراء کے حُسن و جوانی نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ شہناز بھی اُسی جیسی جوان اور حسین تھی۔ یہ میرا امتحان تھا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ شہناز نے مجھے اس

امتحان میں نہیں ڈالا۔

گاڑی نے ہمیں منزل پر پہنچا دیا۔ وہاں سے کچھ فاصلہ لاری پر طے کیا۔ پھر تانگہ لیا اور ہم تاجے کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

*

تاجا وہاں نہیں تھا۔ اُس کے دو آدمی موجود تھے۔ وہ دو آدمی تاجے کے ساتھ ہی چلے گئے تھے جنہیں میں اپنے گھر لے گیا تھا۔ تاجا اپنے ساتھیوں کے ساتھ دو روز بعد آیا۔ اُس نے شہناز کو دیکھا تو حیرت سے میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ میں شہناز کو اپنے ساتھ لا سکوں گا۔ وہ مجھے الگ لے گیا۔

"کیا جادُو چلایا ہے پٹھے!" ___ تاجے نے مجھ سے پوچھا ___ "میں تو بہت فکرمند تھا کہ تم واپس بھی آتے ہو یا نہیں کس طرح لاتے ہو؟"

میں نے اُسے ایک ایک لفظ کر کے ساری رُوداد سنائی۔ گاڑی میں ہم پر جو حملہ ہُوا تھا وہ بھی سنایا۔

"تم شیر ہو" ___ اُس نے مجھے گلے لگا لیا ___ "خواجہ صاحب سچ کہتے تھے کہ خدا نے تمہیں ایک فالتو طاقت دی ہے .... لیکن پٹھے! ایک بات سُن لو۔ تم اسے اس لئے لاتے ہو کہ اپنے آدمیوں سے اسے خراب کراؤ گے پھر یہ لوگ اسے کہیں بیچ آئیں گے لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا"۔

"کیوں اُستاد!"

"اس لئے کہ لڑکی نے اپنے آپ کو تمہاری پناہ میں پھینکا ہے" ___ تاجے نے کہا ___ "اور تم جس طرح سناتے ہو کہ ریل گاڑی میں اس لڑکی نے کس طرح تمہیں بہت بڑا بہادر آدمی سمجھ کر پیار کیا تھا بلکہ یہ کہو کہ چاٹا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمہیں بہت بڑا بہادر آدمی سمجھتی ہے .... میرے بیٹے! بہادر آدمی دھوکا نہیں دیا کرتے۔ ہاں اگر کسی مرد سے انتقام لینا ہوتا تو میں تمہیں خود کہتا کہ میرے سامنے اس کا پیٹ چاک کرو اور اسے باہر پھینک آؤ لیکن یہ عورت ہے۔ میں اپنے پیر اُستاد کو ناراض نہیں

کروں گا۔"

"کیا کہہ رہے ہو اُستاد!" — میں نے حیرت سے کہا — "اگر میں اسے اپنا اغوا بخش دوں تو میں یہ تو کبھی نہیں کر سکتا کہ اسے اپنے باپ کا خون بھی بخش دوں۔"

"اگر میرے شاگرد رہنا چاہتے ہو تو تمہیں باپ کا خون بھی بخشنا پڑے گا" — تاجے نے کہا — "اور میں تمہیں ایک بات اور بتا دیتا ہوں۔ تم اسے اپنے ساتھیوں کے حوالے کرو گے تو دیکھا دیکھی تمہاری اپنی نیت بھی بگڑ

*

جائے گی۔ مجھے خواجہ صاحب نے بڑی سختی سے کہا تھا کہ اس لڑکے کو عورت، شراب اور دنیا کی حرص سے دُور رکھنا۔ وہ کہتے تھے کہ اس لڑکے نے اپنے آپ کو سنبھال کر رکھا تو اس کی نظریں زمین کا سینہ چاک کر کے چھپے ہوئے خزانے بھی دیکھ لیں گی.... میں تمہیں تباہی سے بچانا چاہتا ہوں .... سچ بات ہے سکندر! میں اپنے آپ کو بھی بچانا چاہتا ہوں۔ لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ میں نے اس سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں دیکھی ہیں لیکن اس میں معلوم نہیں کیا کشش ہے .... جادو سا لگتا ہے سکندر! میں اسے یہاں نہیں رہنے دوں گا۔"

میں نے تاجے کو بتایا نہیں تھا کہ میں ایک عورت کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کر چکا ہوں۔ میں نے گناہ کا صرف ارادہ کیا تھا۔ گلشن دریا میں کُود نہ جاتی اور میں گناہ کر بیٹھتا تو معلوم نہیں میرا کیا حال ہوتا اور میں کس انجام کو پہنچتا۔ صرف ارادہ کرنے اور گلشن کے پیچھے بھاگنے سے ہی میں اپنے مقام سے گر پڑا اور مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ یہ تو میری عقل تھی جو مجھے راستے دکھا رہی تھی یا تاجے کی اُستادی تھی جو مجھ پر اپنا رنگ چڑھا رہی تھی، ورنہ میں تو ختم ہو گیا تھا۔

"مان لیا اُستاد!" — میں نے تاجے سے کہا — "مان لیا کہ شہناز کو یہاں نہیں رکھیں گے لیکن اسے کریں گے کیا۔ کہاں غائب کریں گے؟

میں تمہارے حکم کے خلاف تو نہیں چلوں گا۔"

"کسی اچھے آدمی کے ساتھ شادی کرا دیں گے" — تاجے نے کہا — "میرے ہاتھ میں اچھے اچھے لوگ ہیں۔"

"اُستاد!" — میں نے کہا — "جب میں اسے اغوا کرنے دِلّی جانے لگا تھا تو مجھے اُس وقت روک لیا ہوتا۔ مجھے خراب کرنا تھا؟"

"ہاں پٹھے!" — تاجے نے قہقہہ لگا کر کہا — "میں تمہیں خراب کرنا چاہتا تھا۔ تمہارا اکیلے اتنی دُور جانا بہت ضروری تھا۔ یہ راستے جو تم دیکھ آئے ہو، تمہیں میرے سہارے کے بغیر دیکھنے تھے۔ اسے ٹریننگ اور تجربہ کہتے ہیں۔ تم نے گاڑی میں جس طرح تین آدمیوں کا مقابلہ کیا ہے اس سے مجھے تسلی ہو گئی ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ مجھے یقین ہی نہیں تھا کہ تم شہناز تک پہنچ جاؤ گے اور اگر پہنچ بھی گئے تو واپس آؤ گے اور مجھے کہو گے کہ دو چار آدمی دو، پھر میں سوچوں گا کہ کیا کروں۔ تم نے کمال ہی کر دکھایا ہے اور میرے لئے مصیبت کھڑی کر دی ہے۔"

"اسے کہاں رکھیں؟"

"ساتھ والے کمرے میں!" — تاجے نے جواب دیا — "میں خود اس پر نظر رکھوں گا .... یہ اپنے ساتھ کچھ رقم یا زیور لائی ہے؟"

"نہیں" — میں نے جواب دیا — "لانا چاہتی تھی لیکن ڈر گئی اور نہیں لائی۔"

"خوش قسمت ہو پٹھے!" — تاجے نے کہا — "اگر لے آتی تو سیٹھ تم دونوں کو چوری میں پکڑوا دیتا .... چلو اچھا ہوا۔ اب اسے بخش دو اور خون کا بدلہ خون دل سے نکال دو۔"

*

کیا بھیڑیا بھیڑوں کا رکھوالا ہو سکتا ہے؟ — تاجا بھیڑیا تھا لیکن وہ بعض بھیڑوں کی رکھوالی کیا کرتا تھا۔ آج کے دَور کے لوگ شاید حیران ہوتے ہوں گے کہ ایک ڈاکو کا یہ کردار تھا۔ اُن کی حیرت بجا ہے۔ آج کل بھیڑیئے

بھیڑوں کی کھالیں پہنے ہُوتے ہیں اور بھیڑوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دھوکہ دیتے اور شکار کھیلتے ہیں۔ میں شاید پہلے بتا چکا ہوں کہ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اُس زمانے میں ڈاکہ زنی ایک پیشہ تھا اور ان پیشہ وروں کے کچھ اصول تھے۔ وہ اس طرح نہیں کرتے تھے کہ راستے میں کوئی اکیلا مسافر مل گیا تو اُسے لُوٹ لیا یا کسی گھر میں دیکھا کہ مرد کوئی نہیں اور عورتیں اور بچے ہیں تو انہیں خنجر اور پستول دکھا کر لُوٹ لیا۔ وہ بسوں اور ریل گاڑیوں کے مسافروں کو بھی نہیں لُوٹتے تھے۔ وہ بڑے موٹے شکار پر ہاتھ ڈالتے اور اس مال میں سے غریبوں کا حصہ نکالتے تھے۔

"تاجا جس گاؤں میں رہتا تھا اُس گاؤں کا وہ نواب نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ تاجا ڈاکو ہے لیکن سب نظر رکھتے تھے کہ پولیس کو کسی طرح اطلاع مل جائے کہ تاجا یہاں ہے اور پولیس چھاپہ مارنے آجائے تو تاجے اور اُس کے ساتھیوں کو قبل از وقت اطلاع دے دیں۔ نمبردار سرکاری حیثیت رکھتے تھے لیکن وہ بھی گاؤں میں آتے ہُوئے ڈاکو کی حفاظت کرتے تھے اور ڈاکو گاؤں والوں کا خیال رکھتے تھے۔

"تاجا اشتہاری مجرم تھا اور اُس کے سر کی قیمت دس ہزار روپے تھی، یعنی حکومت نے اُسے زندہ یا مُردہ پکڑنے والے کو دس ہزار روپے دینے کا اعلان کر رکھا تھا۔ یہ سب کو معلوم تھا لیکن کوئی بھی اس انعام کے لالچ میں نہیں آتا تھا۔ ڈاکوؤں اور دیہاتیوں کے باہمی تعاون کے علاوہ دیہاتی یہ خطرہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اُنہوں نے کسی ڈاکو کو پکڑوا دیا تو اُس کے ساتھی انتقام لیں گے۔ ایسے واقعات ہو چکے تھے۔

بہرحال تاجے کے اپنے اصول تھے جو بہت سخت تھے لیکن میں نے اُسے ایک اور رُوپ میں بھی دیکھا تھا۔ اُس پر جب جذبات کا غلبہ ہوتا تھا تو وہ ایک کمزور آدمی بن جاتا تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے تھے۔

میں شہناز کے پاس چلا گیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اب کیا ہو گا۔

"تم اپنی ماں کے پاس جانا چاہو گی؟" — میں نے اُس سے پوچھا — "یہ سوچ لو کہ تمہارا سیٹھ وہاں تک پہنچے گا۔ اگر تم وہاں ہوئیں تو معلوم نہیں وہ کیا کارروائی کرے۔"

"میں وہاں نہیں جانا چاہتی" — اُس نے کہا — "کیا میں یہاں رہ سکتی ہوں؟ مجھے یہ علاقہ بہت ہی اچھا لگا ہے۔ یہ کھیت، ہرے بھرے درخت اور خاموش سا یہ علاقہ میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ میں دیہاتی علاقے میں کبھی نہیں آئی تھی۔"

"لیکن شہناز!" — میں نے کہا — "تم جہاں بیٹھی ہوئی ہو، اسے بھی تم پسند کرو گی لیکن اس جگہ کی سادگی، خاموشی اور حُسن موت کا پھندہ بن سکتا ہے۔ یہ ان لوگوں کا مسکن ہے جنہیں شہر کے لوگ جن بھوت سمجھتے اور ڈرتے ہیں۔ پولیس ان کی ٹوہ میں لگی رہتی ہے۔ کوئی پتہ نہیں کس وقت پولیس کا چھاپہ پڑ جائے اور گولیاں برسنے لگیں۔"

"یہ تاجا کیسا آدمی ہے جسے تم اپنا اُستاد کہتے ہو؟" — شہناز نے پوچھا اور یہی رائے دی — "بہت ظالم ہو گا۔ ڈاکو ہے نا! ڈاکو کسی پر رحم تو نہیں کرتے ... اور سکندر! میں دراصل یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ یہ مجھ پر بُری نظر رکھے گا۔ میں اس کے قبضے میں ہوں۔"

میں نے اسے بتایا کہ تاجا کس قسم کا آدمی ہے اور اُس نے اس کے متعلق مجھے کیا کچھ کہا ہے۔

"تاجا تم پر بُری نظر نہیں رکھے گا" — میں نے کہا — "بلکہ اُس نے تمہاری عزت کی حفاظت کا ذمہ خود اُٹھا لیا ہے۔"

ظاہر ہے کہ میرے اور شہناز کے درمیان بہت باتیں ہوئی ہوں گی۔ شہناز کے لئے یہ صورتِ حال اور یہ ماحول صرف اجنبی ہی نہیں تھا بلکہ خوفناک اور عجیب و غریب تھا۔ اُس نے تو باتیں پوچھنی ہی تھیں، خود میرے لئے صورتِ حال ایک معمہ سی بن گئی تھی کہ میں شہناز کو انتقامی کارروائی کے لئے لایا تھا لیکن تاجے نے مجھے روک دیا اور یہ مسئلہ کھڑا کر دیا تھا کہ شہناز

کو رکھیں کہاں اور اسے بھیجیں تو کہاں بھیجیں۔

*

رات کو وہ دو آدمی جو میرے ساتھ میرے گھر تک گئے تھے تاجے کے پاس بیٹھے ہُوتے تھے۔ میں بھی اُن کے ساتھ گپ شپ کے لئے اُن کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ اندر سے بڑی اونچی اور کچھ غصیلی باتیں سنائی دیں۔ میں باہر کھڑا سُننے لگا۔

"میرے دوستو!" — تاجا کہہ رہا تھا — "ایک عورت کے پیچھے دوستی خراب نہ کرو۔"

"تمہاری دوستی پر ہم جان بھی دے دیں گے استاد!" — ان دونوں میں سے ایک کی آواز آئی — "تمہیں یاد ہے کہ ہم دونوں اسی لڑکی کی خاطر سکندر کے ساتھ اُس کے شہر گئے تھے۔ ہم اس لڑکی کو اپنا مال سمجھتے تھے اور اب کہتے ہو کہ اس کی طرف دیکھو بھی نہیں۔"

"وہاں اس کے گھر میں اسے خراب کر لیتے تو کوئی بات نہیں تھی" — تاجے نے کہا — "یہاں یہ ہماری پناہ میں ہے۔ اپنے کاروبار میں بے برکتی نہ ڈالو۔"

"اتنے مولوی نہ بنو اُستاد! یہ مسجد نہیں۔"

"اور تمہاری لگتی ہی کیا ہے استاد! ہمیں موج میلہ کر لینے دو۔"

تاجا نہیں مان رہا تھا لیکن اُس کے دونوں ساتھی ضد کر رہے تھے۔ پھر وہ غصے میں آ گئے لیکن تاجے نے اپنا رُعب جما لیا۔ یہ دونوں آدمی کچھ غصے میں وہاں سے اُٹھے اور صحن میں جا کر چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ میں نے تاجے کے پاس جانا مناسب نہ سمجھا۔ سوچا کہ وہ بھی غصے میں ہوگا۔ تاجے نے کہا تھا کہ شہناز الگ کمرے میں اکیلی سویا کرے۔ تاجے نے گاؤں کے نمبردار کو خاص طور پر کہا تھا کہ شہناز کے لئے نہایت اچھا کھانا بھیجا کرے۔ دیہات میں نہایت اچھا کھانا مکھن کے پراٹھے ہی ہو سکتے تھے جو شہناز کے لئے آتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ تاجے نے دونوں آدمیوں کو کسی کام سے

دیا۔ پھر اُس نے کہا کہ تم شہناز سے بہت دُور سویا کرو۔ تیسرے چوتھے دن میں شہناز کے کمرے میں گیا تو اُس نے ایسی بات سنائی جسے میں نے سچ نہ مانا۔

"سکندر!" — اُس نے کہا — "تم تو کہتے تھے کہ تاجا اپنے درمیان عورت کو پسند نہیں کرتا، لیکن وہ دو مرتبہ رات کو اُس وقت میرے پاس آ چکا ہے جب تم سب سوتے ہُوتے ہوتے تھے۔ کل دن کو بھی آیا تھا۔"

"میں نہیں مانتا" — میں نے کہا — "وہ ایسا آدمی نہیں۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ وہ ایسا آدمی ہے" — شہناز نے کہا — "اس نے میرے ساتھ کوئی بیہودہ حرکت یا بات نہیں کی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ میرے پیار کا ہی پیاسا نہیں بلکہ وہ پیار اور محبت کے لئے ترس رہا ہے۔ پہلے تو میں یہ سمجھی کہ وہ مجھے محبت کا دھوکہ دے رہا ہے پھر مجھے خیال آیا کہ اسے دھوکہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس کے قبضے میں ہوں اور یہ بڑا جابر آدمی ہے لیکن ایک بار تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے جس انداز سے میرے ساتھ باتیں کیں وہ اُس تاجے کی باتیں نہیں تھیں جسے تم ڈاکو اور زبردست آدمی کہتے ہو۔"

تاجا تو ایک بار میرے سامنے بھی رو پڑا تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اُس پر جب جذبات کا غلبہ ہوتا تھا تو وہ بڑا ہی کمزور آدمی بن جاتا تھا۔ وہ کوئی بدصورت آدمی نہیں تھا۔ اُس کے چہرے پر مردانہ رُعب تھا۔ نقش و نگار بھی بڑے اچھے تھے۔ شہناز کی باتوں سے معلوم ہُوا کہ اُس نے تاجے کی محبت کو قبول کر لیا ہے۔

"شہناز، ایک بات کہوں" — میں نے کہا — "اگر تاجا تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہے تو مان جاؤ گی؟"

"ایک ڈاکو کے ساتھ؟" — شہناز نے کہا لیکن اُس کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ نیم رضامند ہے۔ کہنے لگی — "میں نے ابھی سوچا نہیں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ مجھے یہ یقین آ گیا ہے کہ تاجا مجھے بُری نیت سے نہیں

چاہتا"—— شہناز نے لمبا سانس لیا اور کہنے لگی —— "سکندر! انساں کتنی کمزور چیز ہے۔ تم نے مجھے تاجے کی باتیں اور ایک دو وارداتیں سنائی تھیں تو میں یہ سمجھی تھی کہ یہ شخص وحشی اور درندہ ہے، لیکن کل اُس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی آنکھوں سے لگا لئے اور کہنے لگا، شہناز! میری رُوح پیاسی مر رہی ہے ..... میں نے اُس سے پوچھا کہ تم تو اپنی دنیا کے بادشاہ ہو، کیا تمہیں پہلے کبھی کوئی عورت نہیں ملی؟ کہنے لگا، میری بادشاہی میں عورتوں کی کمی نہیں، پیار کی کمی ہے۔ تم جیسی کوئی نہیں ملی۔ تم سے زیادہ خوبصورت بھی ملتی رہی ہیں، لیکن میں نے جو کشش یا جو اثر تم میں دیکھا ہے وہ مجھے کسی میں نظر نہیں آیا۔ میں سمجھا تھا کہ میرے اندر پیار کے چشمے خشک ہو گئے ہیں لیکن تمہیں دیکھ کر وہ پھر پھُوٹ پڑے ہیں۔ اگر مجھے تمہارے جسم کی ضرورت ہوتی تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ مجھے تمہارے پیار کی ضرورت ہے۔"

یہ سُن کر مجھے خوشی ہوئی کہ تاجا شہناز کو چاہنے لگا ہے اور اس طرح ہمارا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا کہ شہناز کا کیا کیا جائے لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ تاجے کا پیار کیا رنگ لائے گا اور یہ رنگ خون کا ہو گا۔

*

یہ خوفناک حادثہ اس طرح ہُوا کہ دو تین روز بعد آدھی رات کے لگ بھگ مجھے گھر میں شور سنائی دیا۔ میں اُٹھا تو دیکھا کہ تاجا اور اُس کے وہی دو ساتھی آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ اُس رات گھر میں تاجے کے دو ساتھی اور بھی تھے۔ وہ بھی جاگ اُٹھے تھے۔ معلوم ہُوا کہ تاجا شہناز کے کمرے میں گیا تو اُن میں سے کسی نے دیکھ لیا۔ یہ دو آدمی جو شہناز کے طلبگار تھے، تاجے کے پیچھے پیچھے شہناز کے کمرے میں چلے گئے۔ یہ تو صرف میں جانتا تھا کہ [illegible] اُس مقصد کے لئے شہناز کے پاس نہیں گیا تھا جو اُس کے ساتھی سمجھ رہے تھے۔ تاجا اپنی اُستادی کے رُعب میں آ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بُری نیت سے شہناز کے کمرے میں نہیں گیا تھا۔

"کیا یہ تمہاری ماں لگتی ہے؟"—— ایک نے کہا۔

"ہمیں نصیحت کرتے ہو اور خود جھک مارتے ہو"—— دوسرے نے تاجے سے کہا۔

"دیکھتے کیا ہو!"—— اُن میں سے ایک نے کہا —— "چلو اندر اور اُتار دو کپڑے اس لڑکی کے۔ ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے۔"

وہ دونوں کمرے کی طرف بڑھے تو تاجا دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا کہ جس نے دروازے کے اندر قدم رکھا اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس بات پر اُن میں ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ میں درمیان میں آیا تو اُن دونوں نے اپنے نیفوں سے خنجر نکال لئے۔ دوسرے دو ساتھی میری طرح کچھ بھی نہ کر سکے۔ پہلا وار تاجے نے اپنے ایک ساتھی کے پیٹ میں کیا اور زخمی کے ساتھی نے خنجر تاجے کے پیٹ میں اُتار دیا۔

میں نے تاجے کو بچانا تھا اور اُسی کا ساتھ دینا تھا۔ میرا خنجر میرے تکیے کے نیچے تھا۔ میں خنجر لینے گیا لیکن اتنے سے وقت میں بساط اُلٹ چکی تھی۔ تاجا اور اُس کا ایک ساتھی نیچے پڑے تھے۔ عجیب سی بھگدڑ تھی۔ میں نے تاجے کو زمین پر پڑے دیکھا تو اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کے کپڑے خون سے لال ہو گئے تھے۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے سہارا دیا۔ ہمارا زخمی ساتھی بالکل قریب پڑا تھا۔ تاجے کا خنجر ان دونوں کے درمیان گرا تھا۔ میں سمجھا کہ تاجا اُٹھنا چاہتا ہے۔ میں نے اُسے سہارا دے کر بٹھایا تو اُس نے خنجر اُٹھا لیا اور پوری طاقت سے اپنے ساتھی کے سینے میں اُتار دیا اور خنجر وہیں رہنے دیا۔ تاجا پھر لیٹ گیا۔

میں نے تاجے کو اس حالت میں دیکھا تو گرد و پیش کو بھُول گیا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا باپ ایک بار پھر مر رہا ہو۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ کمرے اور صحن میں میں نے دوڑتے قدموں کی آہٹیں سُنی تھیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ شہناز کی آواز سُنائی دی تھی —— "سکندر، تم بھی آ جاؤ۔ بھاگو یہاں سے"—— اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے کسی ساتھی کی آواز سُنائی دی تھی ——

"لعنت بھیج اس پر۔ تُو نکل یہاں سے۔ پکڑی جائے گی"— لیکن میں نے اُس وقت ان آوازوں کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ میں تاجے کو اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کہانی ختم ہو گئی ہے سکندر!"— تاجے نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا — "پیٹ اور سینہ کٹ گیا ہے۔ تم چلے جاؤ۔ پکڑے جاؤ گے۔ شہناز کو ساتھ لے جاؤ۔ اُسے کہنا کہ ایک پتھر تیرے پیار سے موم ہو گیا تھا۔ مرتے مرتے پیار کا ذائقہ بھی چکھ لیا ہے۔ ایک کام کرو۔ شہناز کو ساتھ لے کر سیدھے تھانے جاؤ اور بتاؤ کہ میں نے تاجے کو قتل کر دیا ہے۔ دس ہزار روپیہ وصول کر لو۔"

"اُستاد اُٹھو"— میں نے اُس کی گردن کے نیچے ہاتھ رکھ کر کہا — "ٹھہرو، میں انہیں بلاتا ہوں۔ تمہیں اُٹھا کر چارپائی پر ڈال دیتے ہیں۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟"— تاجے نے سسکی لینے کے انداز سے کہا — "تم نے دیکھا نہیں، سب بھاگ گئے ہیں۔ میں نے کہا نہیں تھا کہ عورت سے دُور رہنا۔ ایک عورت کے پیچھے یہ دیکھ لو، دو دوست لہولہان پڑے ہیں۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں خاموشی تھی۔ باہر مجھے ایک یا دو گھوڑے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں شہناز کے کمرے میں گیا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ وہاں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ تاہما اور اُس کا ساتھی صحن میں پڑے تھے اور اُن کا خون اکٹھا ہو کر صحن کی مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ میں نے دونوں کو باری باری دیکھا۔ دونوں مر چکے تھے لیکن میں ماننا نہیں چاہتا تھا کہ تاجا بھی مر سکتا ہے۔ وہ میرے لئے عظیم ہستی تھا۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا اور اُسے پکارنے لگا۔

*

میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے اُوپر دیکھا۔ دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک کو میں جانتا تھا۔ وہ اس گاؤں کا نمبردار تھا۔ دوسرا بھی اسی

گاؤں کا آدمی ہو گا۔

"اُٹھو لڑکے!"— نمبردار نے مجھے کہا — "یہاں سے نکل جاؤ۔"

"کیوں نکل جاؤں؟"— میں نے غصیلی آواز میں کہا — "میرا اُستاد مر رہا ہے۔ اسے اُٹھا کر چارپائی پر ڈالو۔"

"یہ مر چکا ہے"— نمبردار نے کہا — "مجھے اپنا فرض ادا کرنے دو۔ جس طرح دوسرے لوگ یہاں سے نکل گئے ہیں اسی طرح تم بھی نکل جاؤ گے تو میں تھانے میں اطلاع دوں گا۔ تاجے کے ساتھ میرا وعدہ تھا کہ میں اُسے یا اُس کے کسی آدمی کو گرفتار نہیں ہونے دوں گا۔"

میرا دماغ میرے قابو میں نہیں رہا تھا۔ یہ صدمہ میری برداشت سے باہر تھا۔ تاجا اگر مر بھی گیا تھا تو میں اُس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ شہناز اگر چلی گئی تھی تو مجھے اُس کا کوئی غم نہیں تھا۔ نمبردار مجھے زبردستی اُٹھا رہا تھا لیکن میں نہ اُٹھا۔

"پاگل مت بنو لڑکے!"— نمبردار نے کہا — "میں نمبردار ہوں۔ یہ میری ڈیوٹی ہے کہ تھانے میں اطلاع دوں کہ میرے گاؤں میں دو لاشیں پڑی ہیں۔ مجھے وہاں جھوٹ بولنا پڑے گا کہ یہ لوگ معلوم نہیں کس طرح یہاں آ گئے تھے اور کیوں آپس میں لڑ جھگڑ کر مارے گئے ہیں۔"

"جاؤ... جاؤ"— میں نے چلا کر کہا — "جہنم میں جاؤ۔ جو جی میں آئے کرو۔ اگر تاجا مر گیا ہے تو میں اسے دفن کر کے یہاں سے نکلوں گا۔"

نمبردار کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ وہ سرکاری آدمی تھا۔ اُس کا تھانے جانا ضروری تھا۔ میں اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ اُس نے اور انتظار نہ کیا اور چلا گیا۔

*

مجھے یاد نہیں کتنا وقت گزر گیا ہو گا۔ اتنا یاد ہے کہ رات گزر گئی تھی۔ میں ابھی تک تاجے کی لاش پر ہاتھ پھیرتا اور روتا تھا۔ اُس کا ساتھی قریب ہی مرا پڑا تھا۔ تاجے کا خنجر اُس کے سینے میں دستے تک اُترا ہوا تھا۔ سورج

نکل آیا لیکن میں نے اُس کی تپش محسوس نہ کی۔ آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں وہاں کتنی دیر بیٹھا رہا تھا۔ اچانک دو آدمیوں نے پیچھے ہو کر مجھے اُٹھایا۔ میں نے دیکھا۔ وہ پولیس کے باوردی آدمی تھے۔ وہ مجھے صحن میں کھُرلی کے قریب لے گئے۔

"اسے ہتھکڑی لگا لو" ——— یہ شاید تھانیدار کی آواز تھی۔ اُس نے کہا ——— "جلدی کرو۔ ڈی ایس پی صاحب آرہے ہیں۔"

مجھے ہتھکڑی لگ گئی۔ میری زبان بند تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے بڑا ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے اردگرد لوگ باتیں کر رہے تھے۔ گاؤں میں ہلکا ہلکا شور تھا لیکن میں جیسے ان آوازوں سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ وقت کا کوئی احساس نہ تھا۔

"صاحب آرہا ہے" ——— یہ آواز باہر سے آئی ——— "گورا صاحب آرہا ہے۔"

گورا صاحب اندر آگیا۔ وہ درمیانے قد کا انگریز تھا۔ یہی وہ ڈی ایس پی صاحب تھا جس کے متعلق تھانیدار نے کہا تھا کہ ڈی ایس پی صاحب آرہے ہیں۔ میں نے کسی انگریز کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی۔ میں انگریزی بول نہیں سکتا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ اُردو نہیں بول سکے گا، لیکن وہ بولا تو پتہ چلا کہ وہ تو مجھ جیسی اُردو بول سکتا ہے۔

"تم ان کے ساتھی ہو؟" ——— ڈی ایس پی نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر بتایا کہ میں ان کا ساتھی ہوں۔

"تاجے کی لاش کون سی ہے؟" ——— اُس نے پوچھا۔

میں نے اشارے سے بتایا۔

وہیں دو پلنگ بمعہ بستر آگئے۔ ان کے ساتھ تین چار کرسیاں اور چھوٹی سی ایک میز بھی آگئی۔ ڈی۔ ایس۔ پی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اُس نے اشارہ کیا کہ مجھے اُس کے سامنے پیش کیا جائے۔ مجھے اُس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ صرف ایک کانسٹیبل میری ہتھکڑی پکڑ کر کھڑا رہا اور باقی سب باہر نکل گئے۔

"تم سچ بولو گے؟" ——— ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"ہاں صاحب!" ——— میں نے جواب دیا ——— "جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا اور میرے لئے پانی منگوایا۔

"پورا بیان دو" ——— ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا

"صاحب بہادر!" ——— میں نے کہا ——— "آپ تنگ تو نہیں آجائیں گے؟ میرا بیان بہت لمبا ہے۔"

"تم دس دن بولتے رہو" ——— ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا ——— "ہم تسلی سے سُنیں گے۔"

میں نے بولنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنا بیان اُس دن سے شروع کیا جس دن شہناز میری سوتیلی ماں بن کر آئی تھی۔ اپنے اغوا کا اور فرار کا پورا واقعہ سنایا۔ طوفان میں جس طرح مجھے نجی ملی تھی وہ بھی سُنایا۔ نواب کے محل میں جو کچھ بھی ہُوا اور میں جس طرح وہاں سے نکلا، وہ سب بیان کیا۔ پھر میرا باپ جس طرح مرا اور میں جس طرح شہناز کی ماں کے گھر گیا، وہ بھی کہہ سُنایا۔ دلّی جانے اور شہناز کو ساتھ لانے اور سیٹھ کے راستے میں آجانے کا قصہ بھی سُنا دیا اور جس طرح تاجا مارا گیا وہ بیان کیا۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ شہناز نے مجھے تاجے کی محبت کن الفاظ میں سنائی تھی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ ڈی۔ ایس۔ پی بڑی توجہ سے میرا بیان سُن رہا تھا۔ اس دوران اُس نے میرے لئے دُودھ منگوایا اور مجھے پلایا۔

"تم کبھی تاجے کے ساتھ کسی واردات میں شامل ہوتے ہو؟" ——— ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"نہیں صاحب!"

"ہم کیسے یقین کریں گے؟" ——— ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"صاحب بہادر!" ——— میں نے کہا ——— "اگر میں بے ایمان ہوتا تو فوراً

تھانے پہنچتا اور تاجے کے سر کی قیمت دس ہزار روپیہ وصول کر لیتا۔ میں کہتا کہ تاجے کو میں نے قتل کیا ہے اور اس کے ساتھی کو بھی۔"

اس کے بعد پولیس کی اپنی کچھ کارروائیاں تھیں۔ کئی لوگوں کے بیان لئے گئے۔ مجھے آج بھی نمبردار کا افسوس ہوتا ہے کہ میں اسے بچا نہ سکا۔ بیان دیتے وقت مجھ پر ایسی جذباتی کیفیت طاری ہو گئی تھی کہ مجھے خیال ہی نہ رہا کہ میں بجائے یہ کہنے کے کہ ہم سب رات کو یہاں آتے تھے میں نے یہ کہہ دیا کہ ہم بہت دنوں سے یہاں ہیں۔ بہت بعد میں خیال آیا کہ میں نے نمبردار کو مروا دیا ہے۔

سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے مجھے ہتھکڑیوں میں ڈی۔ ایس۔ پی اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں سے تھانہ آٹھ میل دور تھا۔ تھانے جا کر ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھ سے ایک اور بات پوچھی تب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے اسے مالوہ ڈاکو کے ٹھکانے سے فرار کی کہانی سنائی تھی۔

"مالوہ ڈاکو کون سے گاؤں میں ہے؟" —— ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"معلوم نہیں صاحب!" —— میں نے حاضر دماغی سے جواب دیا —— "مجھے بے ہوشی کی حالت میں وہاں لے گئے تھے اور میں رات کے وقت وہاں سے بھاگا تھا جب طوفان بہت ہی تند اور تیز تھا۔"

خدا کا شکر ہے کہ ڈی۔ ایس۔ پی مان گیا۔ اس طرح عشو گرفتاری سے بچ گئی۔

پندرہ بیس دن مجھے پولیس کی حراست میں رکھا گیا۔ کبھی تھانے کی حوالات میں رکھتے۔ کبھی پولیس ہیڈ کوارٹر لے جاتے اور دو تین راتیں سی آئی ڈی کی حوالات میں گزر جاتی تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ کتنے پولیس افسروں نے میرے بیان لئے۔ معلوم نہیں پولیس نے کیا کیا کارروائیاں کیں۔ آخر میں یہ ہوا کہ مجھے اسی ڈی۔ ایس۔ پی کے سامنے لے جایا گیا۔ اس نے میری ہتھکڑی اتروا دی اور مجھے اپنے سامنے کرسی پر بٹھا

لیا۔ اس کا دفتر شاہانہ تھا۔

"تمہارے خلاف کوئی کیس نہیں" —— ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا —— "اب کہاں جاؤ گے؟"

"صاحب بہادر!" —— میں نے کہا —— "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ میں نے تو یہ سوچ لیا تھا کہ باقی عمر قید خانے میں گزرے گی.... میرا اپنا مکان ہے لیکن وہاں جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"اگر ہم تمہیں نوکری دے دیں تو کرو گے؟"

"کیسی نوکری صاحب؟" —— میں نے پوچھا۔

"پولیس کی نوکری" —— ڈی ایس پی نے کہا —— "لیکن یہ پولیس نہیں جو تھانوں میں ہوتی ہے۔ ہم تمہیں پولیس کے ایک اور شعبے میں رکھیں گے جو خاص شعبہ ہے۔ تم بہت عقلمند جوان ہو۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم اس نوکری کے لئے فٹ ہو اور بہت ترقی کرو گے۔ ہم تمہیں خاص ٹریننگ دیں گے۔ تنخواہ عام پولیس سے دگنی ہو گی۔ فالتو الاؤنس ملے گا.... دیکھو جوان! اپنی زندگی تباہ نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" —— میں نے کہا۔

اس نے مجھے ایک اور انگریز افسر کے حوالے کر دیا جس نے مجھے کچھ کاغذات تیار کر کے باقاعدہ طور پر ملازم رکھ لیا۔

"آج سے تم پولیس کی سپیشل برانچ کے ملازم ہو" —— اس انگریز افسر نے کہا —— "تمہیں خاص ٹریننگ کے لئے کل صبح بھیج دیا جائے گا.... ایک بات بتاؤ۔ کیا تم جانتے ہو کہ تاجے کے باقی ساتھی، جس عورت پر ان کی لڑائی ہوتی تھی، اس عورت کو لے کر کہاں گئے ہوں گے؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں صاحب!"

"ٹھیک ہے جوان!" —— اس نے کہا —— "ہم انہیں پکڑ لیں گے" —— وہ مسکرایا اور بولا —— "انہیں تم پکڑو گے۔"

میں باہر نکلا تو ایک پولیس کانسٹیبل مجھے پولیس لائنز لے گیا۔ اس نے مبارک دے کر کہا کہ پولیس کا یہ شعبہ کسی خوش قسمت کو ملتا ہے۔

دھندلی راہیں

ایک آپ بیتی، طلسمِ ہوشربا، خونچکاں، ولولہ انگیز!



وقاص

JBD Press

پیش لفظ

"دُھندلی راہیں" کا دوسرا حصّہ پیشِ خدمت ہے۔

ہم نے پہلے حصّے کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ اس کہانی کو ہم پانچ حصّوں میں تقسیم کرکے پیش کر رہے ہیں لیکن پہلا حصّہ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچا تو خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ کہانی ایسی ہے کہ قارئین کم سے کم عرصے میں پوری کہانی پڑھ لینے کو بے تاب ہو گئے ہیں۔ اِس وقت تک ہمیں سینکڑوں خطوط مل چکے ہیں۔ ہر خط میں یہی ایک مطالبہ کیا گیا ہے کہ کہانی کے حصّے کم کیے جائیں۔

ہمیں اندازہ تھا کہ یہ کہانی جس کسی نے بھی پڑھنی شروع کر دی وہ خواہ پتھر دل ہی کیوں نہ ہو، مسحُور ہو جائے گا اور مطالبہ کرے گا کہ مکمل کہانی فوراً پیش کی جائے۔

ہم نے قارئین کی یہ تشنگی اور بے تابی دیکھ کر فیصلہ کیا ہے کہ باقی کہانی چار کی بجائے تین حصّوں میں پیش کی جائے۔ اس کے نتیجے میں ہر حصّے کے صفحات زیادہ کیے جا رہے ہیں۔ کاغذ اور چھپائی کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ لاگت بڑھ جانے سے باقی حصوں کی قیمت پہلے حصّے کی نسبت زیادہ ہونی چاہیئے لیکن ہم نے قیمت میں اضافہ نہیں کیا۔ ہمارے اِس نقصان کو قارئین اس طرح پورا کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب اپنے دوستوں کو بھی دکھائیں اور انہیں کتاب خریدنے کی ترغیب دیں۔

ہم پہلے حصّے میں اس کہانی اور اس کے کرداروں کے متعلق بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ یہ دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہم اتنا ہی کہیں گے کہ یہ کہانی

شروع کرنے سے پہلے سوچ لیں کہ آپ اپنی تمام مصروفیات اور کام کاج کو بھول جائیں گے۔ اس میں جو سسپنس ہے، جو سنسنی خیزی ہے اور اس میں آپ کی جذباتی دنیا میں زلزلے برپا کر دینے کی جو طاقت ہے، اس سے آپ بچ نہیں سکیں گے۔

یہ کہانی صرف کہانی ہی نہیں، اس میں آپ کو اخلاقیات کی روشنی ملے گی۔ اس میں ڈاکو اور خطرناک مجرم بھی ہیں مگر آپ کو اور آپ کے بچّوں کو جرائم کی ترغیب نہیں ملے گی۔ اس میں آپ کو قوسِ قزح کا ہر رنگ ملے گا۔ ایکشن ملے گا اور کچھ ایسے واقعات ملیں گے جو آپ کے رونگٹے کھڑے کر دیں گے۔ دراصل یہ کہانی مکالموں سے نہیں بلکہ واقعات کے تسلسل اور تواتر سے بنی ہے۔

کہانی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ پڑھیں اور خود فیصلہ کریں کہ ہمارے اِس تبصرے میں صداقت ہے یا نہیں۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

پولیس لائنز میں جس کسی کو پتہ چلتا تھا کہ مجھے پولیس کے اس خاص شعبے میں بھرتی کیا گیا ہے تو وہ میرے پاس آکر مجھے کوئی عجیب چیز سمجھ کر دیکھتا تھا۔ کوئی اسے سپیشل برانچ کہتا، کوئی سی۔ آئی۔ ڈی، کوئی سی۔ آئی۔ اے اور زیادہ تر اسے خفیہ پولیس کہتے تھے جو ایک عام اصطلاح ہے۔ جو بھی ملتا، بات ان سوالوں سے شروع کرتا:

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"مسلمان ہو؟"

"نام کیا ہے؟"

"ذات؟"

"باپ کا نام؟ ..... زندہ ہے؟"

"کتنا پڑھے ہو؟"

"کس کی سفارش سے بھرتی ہوئے ہو؟"

"اگر تم اس برانچ میں کامیاب ہو گئے" ——— ایک مسلمان ہیڈ کانسٹیبل نے کہا ——— "اگر انگریز افسروں کو تم نے کچھ کر کے دکھایا تو سرکار تمہیں نہری زمین کے مربعے دے گی۔ تمہاری سات پشتیں عیش کریں گی۔"

میں تو ابھی سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ میری قسمت اچھی ہے یا بُری، البتہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا کہ میں ڈاکوؤں کا ساتھی ہونے کے جُرم کی سزا سے بچ گیا تھا اور میری گلوخلاصی بڑی جلدی ہو گئی تھی۔ میں ابھی اس سوال کا بھی جواب نہیں دے سکتا تھا کہ میں نے پولیس میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟ اچھا کیا ہے یا بُرا کیا ہے؟

پھر ایک اور شخص مجھ سے ملنے بلکہ مجھے دیکھنے آیا جو چند قدم دُور سے مجھے دیکھ کر رُک گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر آگیا۔ میں بھی اُسے

دیکھ کر چونکا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ اُس کے بازو پھیلتے گئے پھر میں اُس کے بازوؤں میں جکڑا گیا۔

"سکندر؟" —— اُس نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹا کے کہا —— "یار! یقین نہیں آتا یہ تم ہو۔ تم یہاں تک کس طرح پہنچے؟ میں پچھلے مہینے چھٹی کاٹ کر آیا ہوں۔ پتہ چلا کہ تم گھر سے بھاگ گئے ہو.... یار! بہت افسوس ہے تمہارے والد صاحب فوت ہو گئے ہیں .... اور وہ.... کیا کہوں سکندر! وہ جو تمہاری سوتیلی ماں بنا دی گئی تھی.... شہناز نام تھا نا! .... وہ سُنا ہے پہلے ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔"

اس شخص کا نام ایوّب تھا۔ عمر میں مجھ سے سات آٹھ سال بڑا تھا۔ میرے شہر کا رہنے والا تھا۔ محلہ ایک ہی تھا لیکن ہمارے گھر ذرا دُور دُور تھے۔ زندہ دل آدمی تھا۔ میں اُس وقت سکول میں پڑھتا تھا جب وہ پولیس میں ڈائریکٹ اسسٹنٹ سب انسپکٹر بھرتی ہو گیا تھا اور اب وہ سب انسپکٹر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے باپ نے شہناز کے ساتھ شادی کر لی تھی جب ایوّب چھٹی آیا تھا اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے اُسے دو بار شہناز کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک روز میں اپنے گھر کو آتے ہوئے شہناز کے گھر والی گلی سے گزرا تو ایوّب شہناز کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ میں اپنے گھر آیا تو میرے پیچھے پیچھے رشیدو دائی آ گئی اور اُس نے شہناز سے کچھ کہا۔

"سکندر!" —— شہناز نے مجھے کہا —— "میری امی کو ذرا تکلیف سی ہو گئی ہے۔ رشیدو بلانے آئی ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ جلدی آ جاؤں گی" —— اور وہ رشیدو کے ساتھ نکل گئی۔

اب اپنے گھر سے اتنی دُور پولیس لائنز میں ایوّب سے ملاقات ہوئی تو مجھے وہ دن یاد آ گئے۔ یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگی کہ ایوّب شہناز کی خاطر اُس کے گھر جایا کرتا تھا اور ان کے تعلقات میں، جو شریفانہ ہو ہی نہیں سکتے تھے، شہناز کی ماں بھی شامل تھی۔

ایوّب اب سب انسپکٹر تھا اور پولیس لائنز میں الگ کمرے میں رہتا تھا۔

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور پوچھا کہ میں گھر سے بھاگ کر کہاں چلا گیا تھا اور میں نے یہ تین چار سال کہاں گزارے ہیں اور مجھے پولیس کی اس برانچ میں کس طرح بھرتی کیا گیا ہے؟

اُس نے بڑی حیرت سے ایک ہی بار اتنے سارے سوال کر ڈالے۔ میں نے بڑے تحمل اور اطمینان سے ایک جھوٹی کہانی گھڑ کر اُسے سُنا دی۔ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرے دل میں ایوّب کے خلاف ناراضگی یا ناپسندیدگی نہیں تھی، بلکہ اُسے وہاں دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی کہ اپنے شہر کا ایک آدمی مل گیا ہے۔

"آپ چھٹی گئے تھے" —— میں نے ایوّب سے پوچھا —— "شہناز سے آپ ملے تھے؟ اب تک واپس آ چکی ہو گی۔"

"نہیں!" —— ایوّب نے جواب دیا —— "وہ واپس آنے کے لئے نہیں گئی تھی۔ ایک افواہ یہ بھی مشہور ہوتی تھی کہ اُس کی ماں نے کسی سیٹھ یا نواب سے اچھی خاصی رقم لے کر شہناز کو اُس کے حوالے کر دیا تھا.... سکندر! مجھے اب تک افسوس ہے کہ تمہارے والد صاحب جیسے معزز آدمی نے اس کے ساتھ شادی کر لی تھی۔"

"جیسی ماں تھی ویسی بیٹی نکلی" —— میں نے کہا —— "دونوں بدکار ہیں۔"

"تمہیں ایک بات بتاؤں سکندر!" —— ایوّب نے کہا —— "شہناز بدکار نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے کہ وہ ایسی بدکار نہیں تھی کہ جو اُسے روپے پیسے کی جھلک دکھاتا یا جو آدمی اُسے پسند آتا وہ اُس کے ساتھ تعلقات قائم کر لیتی۔ وہ تو آدمیوں پر اپنا جادو کر کے اُنہیں نچا دیتی تھی۔ کسی خاص آدمی کی دوستی قبول کرتی تھی۔ بہت چالاک اور مکار عورت ہے۔ وہ چھوٹا موٹا جرم کرنے والی عورت نہیں۔ وہ چاہے کہیں بھی ہوتی اپنی اُستادی دکھا رہی ہو گی۔ تم اُسے نہیں جانتے تھے سکندر! اُس نے تمہارا گھر اُجاڑ دیا ہے .... میں تو کہا کرتا ہوں کہ وہ اگر جرائم پیشہ لوگوں میں چلی جاتے تو پولیس کو چکر میں ڈال دے۔"

اُس نے مجھے شہناز کے متعلق چند اور باتیں بتائیں۔ وہ مجھے بتا رہا

تھا کہ شہناز کے متعلق صرف یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ اُس کا چال چلن خراب تھا۔ وہ بڑی ماہر جرائم پیشہ تھی۔

"اللہ کو یہی منظور تھا سکندر!" —— ایوبؔ نے کہا —— "جو ہو گیا سو ہو گیا تم اب اپنی زندگی اور اپنا مستقبل بنانے کی کوشش کرو۔ تمہیں ایسی نوکری مل گئی ہے جس میں محنت اور خطرے تو بہت ہیں لیکن ترقی اور انعام و اکرام کے مواقع بھی بہت ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ تم جاسوس اور سراغرساں ہو گے۔ ٹریننگ پوری توجہ سے کرنا۔"

"یہ جاسوسی اور سراغرسانی کیسی ہو گی؟" —— میں نے پوچھا۔

"ہر قسم کی جاسوسی!" —— ایوبؔ نے کہا —— "کبھی تم بھیس بدل کر ڈاکوؤں کی دنیا میں پھر رہے ہو گے اور کبھی سوسائٹی کا بڑا معزز آدمی بن کر تم بڑے لوگوں کی محفلوں اور ضیافتوں میں جاؤ گے۔ ایک روز تم نواب اور اگلے روز بھکاری بنے ہوتے ہو گے۔ ٹریننگ میں تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم دنیا میں اکیلے رہ گئے ہو۔ اگر مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھ لو تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔ اللہ نہ کرے کبھی کوئی مشکل آ پڑی تو مجھے اطلاع دینا۔ میں پہنچوں گا۔"

"مجھے سروس کے متعلق کچھ بتائیں" —— میں نے کہا۔

"اپنے کام میں دلچسپی لینا" —— ایوبؔ نے کہا —— "دیانتدار رہنا۔ بُری عادتوں اور عیاشی میں نہ پڑ جانا۔"

ایوبؔ نے مجھے نصیحتیں بھی کیں اور مجھے یقین دلایا کہ وہ میرا بڑا بھائی بن کر دکھائے گا۔



ٹریننگ بڑی سخت تھی۔ پہلے دو مہینے تو اُنہوں نے ہمیں جانور بنائے رکھا۔ ہم آٹھ نوجوان تھے۔ تین مسلمان، تین عیسائی اور دو ہندو۔ صبح کاذب کے وقت جگا لیتے تھے۔ دوڑاتے ہوئے جنگل میں لے جاتے، کبھی کپڑوں سمیت غلیظ پانی میں سے اور کبھی کیچڑ میں سے گزارتے۔ پہاڑیوں پر اور درختوں

پر چڑھاتے، بلندی سے چھلانگیں لگواتے، سیدھی دیواروں پر چڑھاتے اور اس طرح اُنہوں نے ہمیں بندر بنا دیا۔

ٹریننگ کے متعدد مرحلے تھے۔ ہر مرحلہ بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ٹریننگ پورے ایک سال کی تھی۔ اس میں ہمیں اداکاری سکھائی گئی۔ ہمارے ذہنوں سے مذہب اور جذبات نکال دیئے گئے۔ ہماری برین واشنگ کی گئی۔ ہمارے دلوں سے مسجد، مندر، گرجے اور دیگر عبادت گاہوں کا احترام نکال دیا گیا۔ ہمیں جسمانی اور ذہنی لحاظ سے چُست اور ہر دم تیار بنا دیا گیا۔ ہمیں ذہن نشین کرایا گیا کہ ہماری زد میں اپنا سگا باپ اور بھائی بھی آجائے تو ہم اُسے اپنا دشمن سمجھیں۔ ہمارے دلوں میں صرف ایک چیز کا احترام رہنے دیا گیا۔ یہ تھا تاجِ برطانیہ، یعنی انگریزوں کی بادشاہی۔ ہمیں اسی بادشاہی کے لئے جینا اور اسی کے لئے مرنا تھا۔

میں اپنے متعلق بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نوجوانی کی اس عمر میں جسمانی لحاظ سے طاقتور ہو سکتا تھا، دماغی لحاظ سے میں اتنا تیز نہیں ہو سکتا تھا جتنا میں ہو گیا تھا۔ یہ اللہ کی دین تھی۔ میرے اندر شاید ایک حِس فالتو تھی جسے چھٹی حِس کہتے ہیں۔ مجھ میں ایک وصف یہ بھی قدرتی طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ جس قسم کے بھی حالات مجھے گھیر لیتے تھے یا جس صورتِ حال میں بھی مجھے پھینک دیا جاتا تھا، میں انہی حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتا تھا۔ مجھے کوئی زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑتی تھی۔

کیا یہ کمزوری تھی کہ میں ہر رنگ میں رنگا جاتا تھا؟ اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیتا تھا؟ کیا میں ہتھیار ڈال دیتا تھا؟ —— میں اِن سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ میں اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ مجھ میں کوئی ایسی خوبی یا کوئی خاص بات ضرور تھی جو مجھے تو نظر نہیں آتی تھی، میرے افسر دیکھ لیتے تھے اور مجھے زیادہ توجہ دیتے تھے۔

میں اپنے متعلق یہی کچھ جانتا تھا کہ میں بڑا خوبصورت جوان تھا۔ میرا چہرہ، میرا رنگ اور میرا جسم بہت خوبصورت تھا لیکن اپنی طرف کبھی توجہ نہیں

دی تھی۔ دوسرے مجھے اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتے تھے۔ میں ٹریننگ کے دوران افسروں کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔



آخر ٹریننگ بھی ختم ہوگئی۔ میں اپنے آپ میں ایسی تبدیلی محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے دوسرا جنم لیا ہو۔ میرا جسم پہلے سے زیادہ پھرتیلا اور دماغ اور زیادہ تیز ہوگیا تھا اور کچھ کرنے یا کچھ کر گزرنے کو جی چاہتا تھا۔

ایک انگریز ایس۔ پی نے ہمیں لیکچر دیا:

"ہندوستان تمہارا اپنا ملک ہے اور شہنشاہِ برطانیہ اس ملک کا محافظ ہے۔ ہم تمہیں تنخواہ دیتے ہیں۔ روٹی اور کپڑا دیتے ہیں۔ تاجِ برطانیہ کے وفاداروں کو ہم انعام دیتے ہیں۔ ہم نے تمہیں جو ٹریننگ دی ہے یہ تمہارے اپنے ملک کے کام آئے گی۔ تم اپنے دشمنوں سے اپنے ملک کو بچاؤ گے....

"تمہارے ملک کے دشمن تمہارے ملک میں موجود ہیں۔ تم سنتے رہتے ہو کہ دہشت گردوں کے گروہ ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وہ ریل گاڑیوں کو تباہ کرنے کے لئے ریلوے لائن میں بم رکھ دیتے ہیں۔ سرکاری عمارتوں کو تباہ کرنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ اعلیٰ انگریز افسروں کو قتل کرنے کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ تم خود سوچو کہ اس ملک کا انتظام چلانے والے انگریز افسروں میں سے ایک بھی مارا جاتے تو تمہارے ملک کو بہت نقصان پہنچے گا....

"ان دہشت گردوں اور تخریب کاروں میں مسلمان بھی ہیں، ہندو اور سکھ بھی ہیں۔ ان میں جو سکھ ہیں وہ روس سے تخریب کاری اور تباہ کاری کی ٹریننگ لے کر آتے ہیں۔ یاد رکھو۔ تمہارا کوئی مذہب نہیں۔ ہندوستان کی سلامتی اور شہنشاہِ برطانیہ کے ساتھ وفاداری تمہارا عقیدہ ہے۔ یہ لوگ دراصل ڈاکو اور لٹیرے ہیں۔ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ وہ ہندوستان کو برطانیہ کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے ہیں لیکن وہ لوگوں کو لوٹتے ہیں اور اُن کی

بیٹیوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں....

"اِن دہشت گردوں کے علاوہ ڈاکوؤں اور رہزنوں کے گروہ ہیں جنہوں نے مسافروں کا چلنا پھرنا حرام کر رکھا ہے۔ وہ لوگوں کے گھروں میں ڈاکے ڈالتے ہیں۔ تم خود جانتے ہو وہ کیا کرتے ہیں۔ دہشت گرد ہوں یا ڈاکو، یہ پکڑے نہیں جاتے۔ ان کے ٹھکانوں اور اڈوں کا سراغ نہیں ملتا۔ کسی ڈاکو کی موجودگی کی اطلاع پر پولیس وہاں چھاپہ مارتی ہے تو ڈاکو وہاں نہیں ہوتا۔ گاؤں کے لوگ اُسے پہلے ہی خبردار کر کے بھگا دیتے ہیں....

"اِن دہشت گردوں، تخریب کاروں اور ڈاکوؤں کو تم پکڑو گے۔ اس کام کے لئے تمہیں خود ڈاکو اور دہشت گرد بننا پڑے گا۔ تمہیں بھیس بدلنے پڑیں گے اور تمہیں اپنی جان خطرے میں ڈالنی پڑے گی۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ تم جب سروس پوری کر کے نکلو گے تو تم ایک ایک سوا ایکڑ اور اس سے بھی زیادہ زرخیز زمین کے مالک ہو گے۔ شہنشاہِ برطانیہ تمہیں زمین انعام میں دیں گے.... اس ملک میں کہیں جعلی نوٹ بن رہے ہیں اور کہیں بم بن رہے ہیں۔ اسلحہ بھی بن رہا ہے۔ ان مجرموں کا بھی سراغ نہیں ملتا۔ انہیں بھی پکڑنا تمہارے فرائض میں شامل ہے۔"

اس انگریز ایس۔ پی کا لیکچر بہت لمبا تھا۔ وہ اردو ہماری طرح روانی سے بولتا تھا۔ ایک سال میں ہمیں ذہنی طور پر شہنشاہِ برطانیہ کا غلام بنا لیا گیا تھا۔ آج جب اُن لمحوں کا قافلہ دُور، بہت دُور، اُفق پر متحرک دھبّوں کی طرح نظر آ رہا ہے اور میرے اور اُس کے درمیان آدھی صدی سے زیادہ عرصہ حائل ہوگیا ہے، مجھے یاد آ رہا ہے کہ انگریز اپنے قانون کا احترام اپنے مذہب جیسا کرتے تھے۔ وہ قانون توڑنے والوں کا وجود برداشت نہیں کرتے تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ ہندوستانی رعایا کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن اسی رعایا میں سے کسی پر کسی مجرم کی زد پڑتی تھی تو انگریزوں کی پولیس بڑی تیزی سے حرکت میں آتی اور مجرم کو سزا دے کر دم لیتی تھی۔

انگریزوں میں شاید یہی خوبی تھی کہ اُنھوں نے صرف ہندوستان کو ہی نہیں، کتنی اور ملکوں کو غلام بنا رکھا تھا۔

ہم آزاد ہوئے اور سب سے پہلا کام یہ کیا کہ قانون کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرنا سیکھا اور قانون شکنی پر ملک کی سیاست کی بنیاد رکھی — کیا ہم سب قانون کی توہین کی سزا نہیں بھگت رہے؟

میں سیاستدان نہیں، میں فلسفی بھی نہیں، میں عالم اور فاضل بھی نہیں۔ میرے پاس تو تجربہ ہے۔ میں نے حالات، واقعات اور انسانوں کو پڑھا ہے اور یہی میرا علم ہے۔ میں یہی پیش کر رہا ہوں۔ یہ تصویریں ہیں جو آپ کو دکھا رہا ہوں۔



لیکچر کے بعد ایس۔ پی مجھے اور میرے ایک مسلمان ساتھی سلطان احمد کو اپنے دفتر میں لے گیا اور کرسیوں پر بٹھایا۔

آپ ضرور سوچیں گے کہ میں نے کرسیوں کا ذکر کیوں کیا ہے۔ اگر میں کہتا کہ اپنے دفتر میں بٹھایا تو یہی کافی تھا۔ میں ذرا اس کی وضاحت کر دوں۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں کسی ہندوستانی کا کسی انگریز افسر کے سامنے کرسی پر بیٹھنا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ انگریز افسر اپنی برابری میں کرسی پر صرف اُس ہندوستانی کو بٹھاتے تھے جسے وہ اتنے بڑے اعزاز کے قابل سمجھتے تھے۔

مجھے اور سلطان احمد کو اسسٹنٹ سب انسپکٹر کا عہدہ دیا گیا تھا لیکن ہم نے پولیس کی وردی نہیں پہننی تھی۔ یہ عہدہ تنخواہ کی خاطر دیا گیا تھا۔ تنخواہ کے علاوہ ہمارے جو الاؤنس مقرر کئے گئے تھے وہ تنخواہ جتنے ہی تھے۔ اس طرح میری تنخواہ اے۔ ایس۔ آئی کی تنخواہ سے دُگنی تھی۔

"سکندر!" — ایس پی نے کہا — "تم نے ابھی ابھی ٹریننگ ختم کی ہے اور میں تمہیں ایک ایسا کام دے رہا ہوں جس کے لئے تجربہ چاہیے۔ تم ناتجربہ کار ہو، پھر بھی میں تمہیں یہ کام دے رہا ہوں۔ تجربہ اسی طرح حاصل

ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ کام کر لو گے۔"

"آپ کام بتائیں صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کر لوں گا۔"

"تم اکیلے نہیں ہو گے" — ایس۔ پی نے کہا — "سلطان احمد تمہارے ساتھ ہوگا.... دو ڈاکوؤں کے گروہ توڑنے ہیں۔ ایک گروہ مالوہ کا ہے اور دوسرا تاجا کا۔"

"تاجا تو اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مارا جا چکا ہے صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "ایک سال ہو گیا ہے۔ میں اُن کے ساتھ تھا۔"

"مجھے معلوم ہے" — ایس۔ پی نے کہا — "تم تاجا کے ٹھکانے پر پکڑے گئے تھے۔ ڈی۔ ایس۔ پی کلارک نے تمہیں سزا سے بچایا اور تمہاری سفارش کی تھی کہ تمہیں سپیشل برانچ میں بھرتی کر لیا جائے .... تاجا مارا گیا تھا لیکن اُس کا گروہ نہیں ٹوٹا تھا۔ اُس کے ایک ساتھی خادم شاہ عرف خادا نے ایک ہی مہینے بعد گروہ کو پھر اکٹھا کر لیا تھا اور یہ گروہ پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گیا ہے.... کیا تم خادا کو جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں صاحب بہادر!" — میں نے جواب دیا۔

میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ میں تاجے کی اجازت سے اپنے شہر شہناز کو اغوا کر لانے گیا تھا تو تاجے نے اپنے دو آدمی میرے ساتھ بھیجے تھے۔ ان میں ایک خادا تھا۔ شہناز نہ ملی تو میں شہناز کی ماں کے گھر گیا تھا۔ میرے ساتھ خادا اور ایک آدمی اور تھا۔

"کیا تم ان لوگوں کے ساتھ کسی واردات میں شریک ہوتے تھے؟" — ایس۔ پی نے پوچھا۔

"نہیں صاحب بہادر!" — میں نے جواب دیا — "میں خود ایک واردات کرنے گیا تھا اور تاجے نے خادا اور ایک اور آدمی کو ساتھ بھیجا تھا لیکن میرا کام واردات کے بغیر ہی ہو گیا تھا۔ میں نے لڑکی بن کر ریل گاڑی میں سفر کیا تھا اور مسافر عورتیں مجھے پٹھان لڑکی سمجھتی رہی تھیں۔"

"لیکن اب تم لڑکی نہیں بن سکتے" — ایس۔پی نے کہا — "تمہارا چہرہ ایک رُعب دار مرد کا چہرہ بن گیا ہے ....خادا تاجا سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ ایک سال میں خادا کا گروہ پچیس سنگین وارداتیں کر چکا ہے۔ ان میں پانچ وارداتوں میں قتل بھی شامل ہے .... دوسرا گروہ مالوہ کا ہے .... کیا تم مالوہ کو جانتے ہو؟"

"میں اُس کا قیدی رہ چکا ہوں" — میں نے جواب دیا — "لیکن میں فرار ہو گیا تھا۔ میں تاجے کے ٹھکانے پر پہنچ گیا تو مالوہ کے ساتھ ایک ملاقات ہوئی تھی۔ میں اُس کے ٹھکانے پر گیا تھا۔"

"وہ اب تمہیں وہاں نہیں ملے گا" — ایس۔پی نے کہا — "اور خادا بھی وہ ٹھکانہ چھوڑ گیا تھا جہاں تاجا مارا گیا تھا لیکن دونوں کہیں دُور نہیں گئے۔"

"صاحب بہادر!" — میرے ساتھی سلطان احمد نے کہا — "گستاخی معاف! کیا پولیس انہیں گرفتار نہیں کر سکتی؟ کیا پولیس کے مخبر انہیں گرفتار نہیں کرا سکتے؟ ....اگر آپ ہمارا امتحان لینا چاہتے ہیں تو ہم اس میں پورے اُتریں گے۔ میں اپنے تجربے کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ عام پولیس کو ان کی گرفتاری کے لئے ...."

"جنگل میں تم شیر کا شکار آسانی سے کھیل سکتے ہو" — ایس۔پی نے مسکرا کر کہا — "کیونکہ یہ بڑا درندہ ہے۔ تم اُسے دُور سے دیکھ سکتے ہو اور وہ تمہارے سامنے آجاتا ہے لیکن جنگل میں تم ایک چوہے کو نہیں مار سکتے کیونکہ وہ دکھائی نہیں دیتا۔ فوراً غائب ہو جاتا ہے .... تم نے بڑے ڈاکو سنے ہوں گے۔ اُن کے گروہوں میں ایک ایک سو اور بعض میں اس سے بھی زیادہ آدمی ہوتے تھے۔ انہیں ہم نے ختم کر دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو چھپا تو لیتے تھے لیکن پولیس کو پتہ چل جاتا تھا۔ پولیس جاتی تھی تو ڈاکو باقاعدہ مقابلہ کرتے تھے اور کسی نہ کسی مقابلے میں زخمی ہو کر پکڑے جاتے یا مارے جاتے تھے ....

"مالوہ، تاجا اور خادا جیسے ڈاکوؤں اور رہزنوں کے گروہوں میں دس دس بارہ بارہ آدمی ہیں۔ یہ چوہوں کی طرح چھُپ جاتے ہیں۔ جس گاؤں میں قیام کرتے ہیں وہاں کے لوگ اُن کی مدد کرتے ہیں۔ پولیس کے مخبر بھی پولیس کو دھوکہ دیتے ہیں۔"

"یہ تو میں نے تاجا کے ساتھ رہ کر دیکھا ہے صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "نمبردار اُن کی بہت مدد کرتے ہیں۔"

"اب اِن دونوں گروہوں کو توڑنا بہت ضروری ہو گیا ہے" — ایس۔پی نے کہا — "دونوں کی وارداتیں شہروں تک آگئی ہیں۔ یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ خادا دہشت گردوں کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر مالوہ اور خادا زندہ گرفتار ہو جاتے ہیں تو اچھا ہے اور اگر انہیں ہلاک کر دیا جاتے تو بہتر ہے .... لیکن تم دونوں انہیں گرفتار بھی نہیں کر سکتے ہلاک بھی نہیں کر سکتے .... تم بتاؤ کیا کرو گے؟ تمہیں ٹریننگ دی جا چکی ہے۔"

"کسی طرح انہیں پھندے میں لائیں گے!" — میں نے کہا — "پولیس کو ہم پہلے اطلاع دے دیں گے۔"

"اگر وہ ہمارے پھندے میں آ گئے" — سلطان احمد نے کہا — "تو ہم پولیس کو بہت وقت پہلے اطلاع دیں گے .... صاحب بہادر! اُن دونوں کے ٹھکانے الگ الگ بتاتے جا رہے ہیں۔ دونوں پر الگ الگ کام کرنا پڑے گا۔ یہ خطرہ بھی ہے کہ ایک کو ہم نے پھانس لیا تو دوسرا ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"تمہیں دونوں کے گروہ توڑنے کا کام دیا جا رہا ہے" — ایس۔پی نے کہا — "تم آج سے ہی یہ کام شروع کر دو۔ ڈی۔ایس۔پی کلارک اُسی علاقے کا ڈی۔ایس۔پی ہے جس علاقے میں وہ تاجا کی موت کے وقت تھا۔ وہ شہر میں ہو گا۔ اُس کے ساتھ تمہارا رابطہ رہے گا۔ تمہیں جتنے پیسوں کی ضرورت پڑے گی وہ تمہیں اُدھر سے ملیں گے اور جیسی مدد چاہو گے مل جائے گی۔"

ایس۔پی نے ہمیں کچھ ہدایات دیں، کچھ طریقے بتائے، خطروں سے

آگاہ کیا اور سلطان احمد کو باہر بھیج دیا۔ میں اُس کے پاس اکیلا رہ گیا۔



"سکندر!" — ایس۔ پی نے کہا — "ڈی۔ ایس۔ پی کلارک نے مجھے تمہاری ساری کہانی سنائی تھی۔ تم ڈاکو بننا چاہتے تھے، بلکہ بن گئے تھے۔ میں نے تمہاری ذہانت کو بہت غور سے دیکھا ہے۔ ذہانت اور عقل جو تم میں ہے وہ ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ تم نے اس غیر معمولی عقل کا استعمال غلط شروع کر دیا تھا۔ اب اِسے صحیح طریقے سے استعمال کرو۔ تم میں ڈاکو اور ٹھگ بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ اگر تم اِس راستے پر چل پڑے تو تم امیر علی ٹھگ اور سلطانہ ڈاکو سے زیادہ شہرت حاصل کرو گے لیکن سکندر! تمہاری ساری زندگی جنگلوں میں گزرے گی۔ آخر تم اپنے کسی ساتھی کے ہاتھوں یا پولیس یا فوج کی گولی سے مارے جاؤ گے یا گرفتار ہو کر پھانسی پاؤ گے۔"

"صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "آپ نے مجھے جو فرض سونپا ہے، اس کے ساتھ وفاداری کروں گا۔ دھوکہ نہیں دوں گا۔"

"میں صرف اس فرض کی بات نہیں کر رہا" — ایس۔ پی نے کہا — "میں تمہارے مستقبل کی بہتری کی بات کر رہا ہوں۔ تم ڈاکو نہیں بنو گے بلکہ ڈاکوؤں کو ختم کرو گے۔ تم گناہ نہیں کرو گے، تم گناہگاروں کو ختم کرو گے۔ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ اپنے آپ کو بچا کر رکھنا۔ ان جرائم پیشہ لوگوں کی دنیا میں بڑے حسین پھندے ہیں۔ انہیں پھندے میں لاتے لاتے خود کسی پھندے میں نہ پھنس جانا۔"

میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ انگریز افسر اپنے ہندوستانی ماتحتوں سے اِس طرح دوستانہ باتیں نہیں کیا کرتے تھے جس طرح یہ انگریز ایس۔ پی میرے ساتھ کر رہا تھا۔ وہ مختصر الفاظ میں حکم دیا کرتے تھے اور ہندوستانیوں کو اپنے فرعونوں جیسے لہجے اور انداز میں احساس دلایا کرتے تھے کہ وہ غلام اور انگریز اُن کے آقا ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کو اُس ذہنی مقام پر لے آتے تھے جہاں ہندوستانی اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کو اپنا مذہب سمجھ بیٹھے تھے۔

ہندوستانی افسر، تاجر اور جاگیردار وغیرہ جو کسی کے محتاج اور دستِ نگر نہیں تھے، انگریزوں کی خوشامد اس طرح کرتے تھے جسے جُوتے چاٹنا کہتے ہیں۔

ایک انگریز اور وہ بھی پولیس کا ایس۔ پی فرعونوں سے کم نہیں ہو سکتا لیکن وہ میرے ساتھ مشفق دوست کی طرح باتیں کر رہا تھا۔ اُسے میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی نہ اُسے میرے مستقبل کا غم تھا۔ میں اُس کی شفقت کی دو وجوہات سمجھتا تھا۔ ایک یہ کہ اُس نے مجھے اور سلطان کو جو مہم دی تھی وہ بہت دشوار تھی اور اُس میں خطرے زیادہ تھے۔ ایس۔ پی مجھ میں جذبہ پیدا کر رہا تھا۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اُس پر میری وہ خفیہ طاقت اثر انداز ہو رہی تھی جو مجھے مختلف آدمیوں نے بتایا تھا کہ مجھ میں ہے۔ تاجے کے والد خواجہ صاحب موسیقار نے میری اس طاقت کا یا میری شخصیت کے اس پُراسرار اثر کا مجھے خاص طور پر احساس دلایا تھا۔ اُنہوں نے مجھے عورت کے حسن و جوانی سے اور گناہوں سے بچے رہنے کے لئے کہا تھا۔ میں نے اپنی اس طاقت کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا اور میں گلشن آرا کے حسن و جوانی سے اندھا ہو گیا تھا۔ علاوہ آپ کو سنا چکا ہوں کہ گناہ کی لذت سے بھی محروم رہا اور اپنی پُراثر اور پُراسرار طاقت بھی کھو بیٹھا۔ پھر بھی مجھ میں کچھ نہ کچھ اثر باقی رہا تھا۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ جو خوف مجھ پر طاری ہونے لگا تھا وہ جلدی ختم ہو گیا تھا اور مجھ میں دلیری اور جرأت ایک بار پھر پیدا ہو گئی تھی۔

اتنا تو میں خود محسوس کرتا تھا کہ میری آنکھوں میں کوئی اثر تھا۔ میں آئینے میں اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا تھا تو میں اپنے آپ سے کہتا تھا کہ ان آنکھوں میں کوئی بات ہے جو ہر کسی کی آنکھوں میں نہیں ہوتی۔ میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ میں جب ایس۔ پی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا تو اُس کی آنکھیں جن کا رنگ شفاف آسمان کی طرح نیلا تھا، بے چین ہو جاتی تھیں جیسے میری آنکھوں کا سامنا نہ کر سکتی ہوں — آقا کی آنکھیں اپنے غلام کی آنکھوں سے بچنے کی کوشش کرتی تھیں۔

ٹریننگ سے فارغ ہونے والے ہم آٹھ جوان تھے۔ مجھے اور سلطان احمد کو ایس۔پی نے اس کام کے لئے روک لیا تھا۔ باقی چھ کو کہیں اور بھیج دیا گیا تھا۔ ایس۔پی نے دوسرے دن ہمیں ڈی۔ایس۔پی کلارک کے ہیڈ کوارٹر کو روانہ کر دیا۔ وہاں تک ریل گاڑی کا ساڑھے چار گھنٹوں کا سفر تھا۔

کلارک کو پہلے ہی معلوم تھا کہ ہم آرہے ہیں۔ ہمارے مشن کی تفصیلات سے بھی وہ آگاہ تھا۔ اُس نے ہماری رہائش کا ایسا بندوبست کیا کہ پولیس والوں کو بھی شک نہیں ہوتا تھا کہ ہمارا تعلق پولیس کے محکمے کے ساتھ ہے۔ فوراً ہی مشن پر روانگی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

یہ تیاریاں اِس قسم کی نہیں تھیں کہ ہم نے سامان باندھنا تھا۔ ان تیاریوں میں ایک سکیم کی تیاری شامل تھی کہ میں اور سلطان خادے اور مالوے تک رسائی کس طرح حاصل کریں گے۔ میں نے کلارک کو بتا دیا تھا کہ مجھے کیا سہولت حاصل ہے۔ اس سکیم کا اہم اور خطرناک کام میرے ذمے تھا۔ سلطان کا اس سکیم میں کچھ اور رول تھا۔

اس سکیم میں پانچ چھ دیہاتی بھی شامل تھے جن کے گاؤں اسی علاقے میں تھے۔ مجھے اور سلطان کو ان سے ملوایا گیا۔ سلطان اِن دیہاتیوں کے ساتھ شام کے بعد چلا گیا۔ میں علی الصبح پہلی لاری سے نوابزادہ حمید اللہ خان کی جاگیر کو روانہ ہو گیا۔ میں آپ کو ایک بار پھر بتا دیتا ہوں کہ حمید اللہ خان اُس نواب کا بیٹا تھا جس کے محل میں مجھے رقاص بنایا گیا تھا اور ناچے کے والد خواجہ صاحب میرے اُستاد تھے۔ نواب نے اپنے اس بیٹے کو اپنی ریاست سے بہت دُور ایک وسیع و عریض جاگیر دے رکھی تھی۔ اور اسے کہا تھا کہ وہ ریاست کی وراثت سے نظریں ہٹا لے۔

نوابزادہ حمید اللہ خان کا دوستانہ ناچے کے ساتھ تھا۔ میں اس جاگیر پر جا چکا تھا۔ حمید اللہ خان مجھے چاہتا تھا۔ اُس نے ناچے جیسے ڈاکوؤں کو اپنا اِس حد تک دوست بنا رکھا تھا کہ اُن کا مال اپنے ہاں چھپا لیتا اور یہ مال وہاں سے اِدھر اُدھر جاتا تھا۔

حمید اللہ خان کی جاگیر بھی ایک ریاست ہی تھی۔ اُس نے وہاں

چھوٹا سا ایک محل بنا رکھا تھا۔ اس کے اِردگرد گھنے سایہ دار درخت تھے اور وسیع باغ تھا۔ ہرے فصل کا سمندر دُور دُور تک چلا گیا تھا۔ محل سے تھوڑی ہی دُور کچھ علاقہ ٹیلوں، گھاٹیوں اور چٹانوں کا تھا۔ یہ بھی سبزہ زار تھا۔ ایک راستہ اس میں سے گزر کر محل تک جاتا تھا۔

میں جاگیر تک پہنچ گیا اور اِس راستے سے گیا۔ میں حمید اللہ خان سے ملنے جا رہا تھا۔



وہ جگہ بہت دلنشیں تھی۔ وہاں درختوں کے جھنڈ تھے۔ سرسبز گھاس تھی اور پھولدار پودے بھی تھے۔ ٹیلوں اور چٹانوں کے درمیان بارشوں کے پانی نے جمع ہو کر جھیل کی شکل اختیار کر رکھی تھی۔ اس میں آبی گھاس اور کنول کے پھول تھے۔ جھیل کے اردگرد درخت تھے۔

"سکندر!"— جھیل کے قریب سے گزرتے مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

آواز کچھ دُور سے آئی تھی۔ میں حیران سا ہو کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہاں مجھے جاننے والی کون ہو سکتی تھی۔ پھر مجھے عورت کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اُس جگہ کا حُسن مجھے پُراسرار محسوس ہونے لگا۔ یہ کوئی زندہ عورت یا کوئی انسان نہیں ہو سکتی تھی۔

"تم سکندر ہی ہو نا!"— آواز پھر آئی۔ اب آواز قریب سے آتی تھی۔

میں نے اُدھر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ شہناز تھی جو بڑی تیز تیز میری طرف آرہی تھی۔ اُس جگہ شہناز؟ .... یہ شہناز کی بدرُوح ہی ہو سکتی تھی۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے ڈرنا چاہیئے یا آگے بڑھ کر اُس کا استقبال کرنا چاہیئے۔

میں ابھی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ میں اُس کے بازوؤں میں جکڑا گیا اور اُس کی سانسیں جو دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں، میرے گالوں سے ٹکرانے

گئیں۔ وہ مجھ تک اتنی تیز چلتی آئی تھی کہ ہانپ رہی تھی۔ اُس کے سینے کے اتار چڑھاؤ کو میں شدّت سے محسوس کر رہا تھا۔ میرا قد بہت اونچا تو نہیں تھا لیکن اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا۔ چھ فٹ سے صرف دو اِنچ کم تھا۔ اُس دَور میں عورتوں کے قد آج کی طرح چھوٹے چھوٹے نہیں ہُوا کرتے تھے۔ لمبوترا قد اور چھریرا بدن عورت میں دلکشی پیدا کرتا تھا۔ شہناز کا قد اور بدن ایسا ہی تھا اور اُس کے چہرے کے نقش و نگار کی جاذبیت کا اندازہ اس سے کریں کہ تاجے جیسا پتھر انسان موم کی طرح پگھل گیا اور اسی شہناز کی خاطر اپنے بڑے پیارے دوستوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ تاجا تو مجھے کہا کرتا تھا کہ عورت سے دُور رہنا ورنہ پٹ جاؤ گے۔

وہ شہناز ایسے والہانہ انداز سے میرے ساتھ لپٹ گئی تھی کہ اُس کے جسم کی تپش میرے جسم میں سرایت کرنے لگی۔ اُس کا قد مجھ سے ایک ڈیڑھ اِنچ ہی کم ہوگا۔ اُس کا ریشمی دوپٹہ اور ریشم جیسے بال میرے گالوں اور ہونٹوں کو چھُو رہے تھے اور مجھ پر سُرور سا طاری ہوتا جا رہا تھا۔ اگر میں اپنے آپ پر قابو نہ پالیتا تو مجھ پر خود فراموشی پھر خود سپردگی طاری ہو جاتی۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ یہ جواں سال عورت جس کا حُسن طلسم ہوشربا سے کم نہیں، میرے باپ کی قاتل ہے اور میں نے اس سے انتقام لینا تھا۔

اُسے حمیداللہ خان کی جاگیر میں دیکھ کر میں ذرا سا بھی حیران نہیں ہُوا تھا۔ اُسے یہیں ہونا چاہیے تھا۔ جب تاجا اور اُس کے ساتھی مارے گئے تھے تو شہناز بھی غائب ہوگئی تھی۔ اُسے خادا ہی لے جاسکتا تھا۔ خادے نے شہناز کو یہاں پہنچا دیا ہوگا۔ میرے مشن کے لئے وہاں شہناز کی موجودگی نقصان دہ بھی ہو سکتی تھی فائدہ مند بھی۔

"تم آگئے سکندر!" ——— اُس نے مجھے اپنی گرفت سے آزاد کر کے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بچّوں کے سے اشتیاق اور شوخی سے کہا ——— "میں تمہیں ہر وقت یاد کرتی رہی ہوں۔ مجھے کوئی بتاتا نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔ کوئی کہتا تھا کہ تمہیں دس سال کی قید ہوگئی ہے اور

کوئی بتاتا تھا کہ تمہارے خلاف مقدمہ بنا ہی نہیں۔ حمید مجھے تسلیاں دیتا تھا کہ سکندر اگر قید نہ ہُوا اور وہ زندہ رہا تو میرے پاس ضرور آئے گا..... تم آگئے سکندر!" ——— اور وہ ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

وہ اتنی تیز بول رہی تھی جیسے اُس پر دیوانگی طاری ہوگئی ہو۔ اُس کی وارفتگی کا یہ عالم تھا جیسے میرے وجود کو اپنے جسم کا حصّہ بنا لینا چاہتی ہو۔ میں نے خاص طور پر اُس کی ایک بات پر دھیان دیا۔ اُس نے نواب زادہ حمیداللہ خان کو حمید کہا تھا اور ایسے بات کی تھی جیسے وہ اُس کا ہمجولی ہو۔ حمیداللہ تو اپنے باپ سے بڑھ کر نواب تھا۔ مجھے خیال آیا کہ حمیداللہ نے اُس کے ساتھ شادی کر لی ہوگی اسی لئے یہ بیگمات کے انداز سے اُسے حمید کہہ رہی ہے۔

اُس نے مجھے جھیل کے کنارے بٹھا لیا۔ کبھی اُس کا بازو میرے کندھوں پر آجاتا کبھی میری کمر کے گرد لپٹ جاتا اور وہ مجھے ایک جھٹکے سے اپنے ساتھ لگا لیتی۔

"کہاں رہے تم؟" ——— شہناز نے مجھ سے پوچھا ——— "یہاں کیسے آئے ہو؟ .... جلدی تو نہیں چلے جاؤ گے؟"

"معلوم ہوتا ہے حمیداللہ نے تمہیں اپنی بیگم بنا لیا ہے" ——— میں نے کہا۔

"بیگم تو بنا لیا ہے سکندر" ——— اُس نے کہا ——— "لیکن شادی کے بغیر!" ——— اُس نے آہ بھر کر کہا ——— "لیکن اب مجھے پروا نہیں۔ شادی ہو نہ ہو۔ حمید اچھا آدمی ہے .... تم اپنی سناؤ نا!" ——— اُس نے میرے بازوؤں اور میری ایک ران کو دبا دبا کر کہا ——— "تم کتنے خوبصورت اور تنومند جوان نکلے ہو۔ خدا تمہیں نظرِ بد سے بچائے .... کہاں سے آ رہے ہو؟"

"مجھے دس سال نہیں، صرف چھ مہینے قید کی سزا ہوئی تھی" ——— میں نے جھوٹ بولا ——— "میرا مقدمہ تین ماہ لمبا چلا تھا۔ میرا جرم صرف یہ تھا کہ میں ڈاکوؤں کے ساتھ تھا۔ میں رہا ہُوا اور ویسے ہی آوارہ پھرتا رہا سوچ

سوچ کر یہاں آگیا۔"

"یہاں کیا کرو گے؟" — شہناز نے پوچھا — "اپنے گھر کیوں نہ چلے گئے؟"

"میں نے اب ڈاکو ہی بننا ہے شہناز!" — میں نے کہا — "میں گھر جانا چاہتا تھا۔ ایک اس وجہ سے نہ گیا کہ اپنے گھر کی ویرانی کو دیکھ کر مجھ پر وحشت طاری ہوجاتی گی، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک پولیس انسپکٹر نے مجھے کہا تھا کہ اپنے گھر نہ جانا، وہاں تمہاری بہت بے عزتی ہو گی۔ وہ کہتا تھا کہ تم پر پولیس کی نظر رہے گی کہ یہ شخص خطرناک ڈاکوؤں کے ساتھ تھا، پھر شہر میں جہاں کہیں چوری یا ڈکیتی کی واردات ہوتی وہ تمہیں مشتبہ سمجھ کر پکڑ لیں گے۔ تم جانتی ہو شہناز! میرا وہاں ہے ہی کون! میں بے گناہ پکڑا گیا تو مجھے ضمانت پر رہا کرانے والا بھی کوئی نہیں۔"

"تم اس انسپکٹر کی نہ مانتے" — شہناز نے کہا۔

"یہ انسپکٹر میرا ہمدرد تھا" — میں نے کہا — "تم بھی اُسے جانتی ہو۔ اُس کا نام ایوب ہے۔ تمہارے گھر اُس کا آنا جانا تھا۔"

"اوہ!" — شہناز نے چونک کر کہا — "وہ ایوب! ..... اُس نے میرے متعلق کچھ کہا تھا؟"

"سب کچھ کہا تھا اُس نے!" — میں نے مسکرا کر کہا — "مجھ سے پوچھتا تھا شہناز کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو گھر سے پہلے سے چلا گیا تھا۔"

"تم نے اُسے بتایا تھا کہ میں نے تمہیں ....؟"

"نہیں شہناز!" — میں نے کہا — "میں نے اُسے کچھ نہیں بتایا۔ .... وہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر تھا۔ میں جیل سے نکل کر اُسے ملا تو وہ سب انسپکٹر ہو چکا تھا۔"

میں جھوٹ بول رہا تھا۔ سچ صرف یہ بولا کہ ایوب سب انسپکٹر ہو گیا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ اب اُسے کسی تھانے میں لگایا جائے گا۔ اپنے

متعلق میں شہناز کو ہر بات جھوٹی بتا رہا تھا۔ اُس کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں اور ہیروں جیسی اُس کی چمکتی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"سکندر!" — اُس نے سسکی لے کر کہا — "تم میرے ایک گناہ کی سزا بھگت رہے ہو۔ مجھے جو بھی سزا دینا چاہو میں قبول کر لوں گی۔ مجھ سے جو قیمت مانگو، دوں گی۔ میرا جسم مانگو۔ میری جان مانگو۔ زہر دو، پی لوں گی۔ تم تو بڑی عزت والے خاندان کے لڑکے تھے۔ میں نے تمہیں ڈاکوؤں تک پہنچا دیا۔"

"ہو گیا جو ہونا تھا شہناز!" — میں نے کہا — "مجھے یہ بتاؤ تم یہاں کیسے پہنچی تھیں؟"

"خادے نے پہنچایا تھا" — شہناز نے جواب دیا — "وہ تو تمہیں یاد ہو گا کہ تاجے اور اُس کے دوستوں میں لڑائی ہو گئی تھی۔ میں کمرے میں تھی اور میں بہت ہی ڈری ہوئی تھی کہ میں کن وحشیوں کے ہاتھ چڑھ گئی ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تاجا مارا جا چکا ہے۔ خادا دوڑتا ہوا کمرے میں آیا اور اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا کہ نکلو یہاں سے، باہر خون ہو گیا ہے۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی تھی لیکن باہر نکل کر دیکھا کہ تاجا اور ایک آدمی خون میں لت پت صحن میں پڑے تھے۔ مجھے تمہاری ہوش ہی نہ رہی اور میں خادے کے ساتھ دوڑتی باہر نکل گئی ....

"خادے نے ایک گھر سے گھوڑا لیا۔ اسے تیار کر کے مجھے اس پر سوار کیا خود میرے پیچھے بیٹھا اور گھوڑے کو دوڑا دیا۔ صبح سے بہت پہلے ہم یہاں پہنچ گئے۔ خادے نے حمید اللہ کو جگایا اور اُسے بتایا کہ تاجا اور ہمارا ایک یار اس لڑکی پر ایک دوسرے کو قتل کر بیٹھے ہیں۔ خادے کو ابھی یہ یقین نہیں تھا کہ دونوں زندہ ہیں یا مر گئے ہیں۔ حمید اللہ نے مجھے دیکھا تو اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی وہ مسکراہٹ آگئی جسے میں بڑی اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ اُس نے خادے کو تسلی دی اور کہا کہ تاجا یا کوئی اور مر بھی

گیا ہے تو وہ پروا نہ کرے۔ خادے نے کہا کہ وہ مر گئے تو نمبردار لاشوں کو نہیں چھپا سکے گا۔ پولیس آئے گی اور پکڑ دھکڑ ہو گی۔ حمید اللہ نے اُسے کہا کہ تمہیں پکڑنے کے لئے یہاں کوئی نہیں آئے گا....

"مجھے اُنہوں نے الگ کمرے میں رکھا۔ وہاں دو عورتیں اور بھی تھیں جو مجھے ملیں لیکن میرے پاس بیٹھی نہیں۔ حمید اللہ نے دو تین روز میری بہت خاطر تواضع کی۔ خادا میرے پاس آتا رہا، لیکن وہ اس قدر ڈرا ہُوا تھا کہ اُس نے میرے ساتھ بدنیتی یا بدتمیزی نہ کی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ حمید اللہ کون ہے۔ اُس نے مجھے اس کے متعلق سب کچھ بتایا۔ حمید اللہ اکیلا بھی میرے پاس آتا تھا اور کہتا تھا کہ پولیس کو شک ہو گیا ہے کہ اُس نے ڈاکوؤں کو پناہ دے رکھی ہے۔ وہ مجھے کہتا تھا کہ پولیس آگئی تو میں بھی گرفتار ہو جاؤں گی۔ میں گرفتاری سے بہت ڈرتی تھی اور اُس کی منتیں کرتی تھی کہ مجھے پولیس سے بچائے رکھے....

"آخر ایک روز خادا اور حمید اللہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ خادا یہاں سے جا رہا ہے اور میں حمید اللہ کے پاس رہوں گی اور اگر گرفتاری کا خطرہ ہُوا تو میں اور حمید اللہ یہ ظاہر کریں گے کہ ہم میاں بیوی ہیں۔ میں گرفتاری سے بچنے کے لئے تو ہر طرح کی قیمت ادا کرنے کو تیار تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ مجھ سے جو چاہے کہلا لو، مجھے پولیس سے بچائے رکھو۔ خادا چلا گیا اور میں حمید اللہ کے پاس رہ گئی۔"



اس کے بعد شہناز نے مجھے جو باتیں سُنائیں وہ مختصراً یہ تھیں کہ حمید اللہ نے شہناز کو باقاعدہ داشتہ بنا لیا۔ شہناز نے میرے آگے اعتراف کیا کہ اُس نے جب حمید اللہ خان کی جاگیر دیکھی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ وہاں پہلے ہی جو دو عورتیں تھیں، وہ بھی خوبصورت تھیں لیکن وہ شہناز سے آٹھ دس سال بڑی تھیں۔ اُنہیں بھی حمید اللہ نے بن بیاہی بیویاں بنا رکھا تھا۔ شہناز کے سامنے دونوں کی حالت یہ ہو گئی جیسے چاند کو گرہن لگ

جاتا ہے۔ میں شہناز کا حُسن اور اُس کا طلسماتی اثر بیان کر چکا ہوں۔ اس اثر کو حمید اللہ نے ایسا قبول کیا کہ شہناز اس پر غالب آگئی اور دونوں عورتیں باندیاں بن کر رہ گئیں۔

"حمید اللہ نے مجھے ایک خوبصورت کھلونا سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا تھا"—— شہناز نے کہا —— "لیکن وہ میرے ہاتھ میں کھلونا بن گیا۔ ہوس کار مرد کی کوئی شخصیت نہیں ہوتی۔ حمید اللہ نوابزادہ ہے۔ اتنی بڑی جاگیر کا مالک ہے لیکن میری انگلیوں پر ناچتا ہے۔ تم شاید یقین نہیں کرو گے کہ وہ میرے کمرے میں اُس وقت داخل ہوتا ہے جب میں اُسے داخل ہونے دیتی ہوں۔"

"خادا پھر بھی آیا تھا؟"—— میں نے پوچھا۔

"ہاں"—— شہناز نے جواب دیا —— "وہ تو آتا ہی رہتا ہے۔"

"وہ بھی تو تمہارے چاہنے والوں میں سے تھا"—— میں نے کہا۔

"لیکن وہ مجھے لے جاتا کہاں!"—— شہناز نے کہا —— "اُس نے مجھے قیمت کے طور پر حمید اللہ کے حوالے کیا تھا۔ خادے کو پناہ کی اور وارداتوں کا مال چھپانے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ حمید اللہ نے اُس سے عوضانے کے طور پر مجھے مانگا تو خادے نے مجھے اس کے حوالے کر دیا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ حمید اللہ ڈاکوؤں کو پناہ دیتا ہے"—— میں نے کہا —— "اسی لئے تو میں اس کے پاس آیا ہوں .... خادے کے علاوہ یہاں اور کون کون آتا ہے؟"

"یہاں کوئی شریف آدمی نہیں آتا"—— شہناز نے جواب دیا۔

"ایک بات کہو شہناز!"—— میں نے پوچھا —— "تم حمید اللہ کی بیوی نہیں۔ یہ ایک عیاش نوابزادے اور ڈاکوؤں کی دنیا ہے۔ کیا تم یہاں گھبراتی نہیں اور کیا تمہیں اپنا گھر اور عزّت کی وہ زندگی یاد نہیں آتی؟"

"نہیں"—— شہناز نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا —— "میں وہ دن

یاد کرتی ہوں جب میں اپنے گھر میں رہتی تھی تو ایسے لگتا ہے جیسے میں ڈاکوؤں اور فریب کاروں کی دنیا میں پیدا ہوئی تھی .... میری ماں کو تم عزت دار عورت سمجھتے ہو جس نے مجھے پہلے تمہارے باپ کے ہاتھ بیچا، پھر اُس کا گھر مجھ سے خالی کروایا پھر میرے ہاتھوں اُسے زہر دلوایا، پھر مجھے سیٹھ ابراہیم کے ہاتھ بیچا؛ میں ایک مجرم ماں کی آلۂ کار بنی رہی ہوں۔ اب تو میں رانی نہیں تو رانیوں سے کم بھی نہیں۔ میں نے اس ماحول کو اور یہاں کے ہر فرد کو دِلی طور پر قبول کر لیا ہے، لیکن سکندر!" ــــ اُس نے آہ لے کر کہا ــــ "تمہیں دیکھا ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے میری ذات میں انسانیت کی کچھ رمق ابھی باقی ہے اور میرے جذبات مر نہیں گئے۔ تم بھی میرے ہاتھوں میری ماں کی مجرمانہ ذہنیت کا نشانہ بنے تھے، لیکن میرے اندر یہ احساس زندہ ہے کہ میں نے تم سے جو کیا، بہت بُرا کیا۔"

شہناز جذباتی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اُس کے بولنے کے انداز میں پختہ کاری تھی۔ میں ایسے محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ مجھ پر بھی چھا جائے گی۔ میں ہوس کار تو نہ تھا لیکن جوان آدمی تھا۔ تندرست اور توانا تھا۔ مجھے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ میں اپنے مشن سے اور اپنے کردار سے ہٹ نہ جاؤں۔ میں نے باتوں کا رُخ پھیر دیا۔

"یہاں اکیلی کیوں گھوم پھر رہی ہو؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"یہ جگہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے" ــــ شہناز نے جواب دیا ــــ "حمید یہاں نہیں ہوتا تو میں اِدھر آجاتی ہوں۔ وہ شام کو واپس آجائے گا۔ میں اُسے کہوں گی کہ تمہیں اپنے ساتھ رکھے۔"

"تم مجھے اُس کے ہاتھوں مرواؤ گی" ــــ میں نے کہا ــــ "جونہی اُسے پتہ چلا کہ تم مجھے پسند کرتی ہو تو وہ مجھے غائب کر دے گا یا چلتا کرے گا۔"

"وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتا" ــــ شہناز نے کہا۔

"شہناز!" ــــ میں نے کہا ــــ "ان نوابزادوں پر اتنا بھروسہ نہ کرو۔

تمہیں دیکھ کر پہلی دونوں عورتوں کو بھول گیا ہے۔ تم سے زیادہ خوبصورت کوئی آگئی تو تمہیں کباڑخانے میں پھینک دے گا۔"

شہناز کو اپنے آپ پر اتنا اعتماد تھا کہ اُس نے کوئی اور جواب دینے کی بجائے قہقہہ لگایا۔

"آؤ چلیں" ــــ اُس نے کہا۔

"ہم دونوں اُٹھے اور چل پڑے۔ وہ مجھے اُس مکان میں لے گئی جسے میں نے محل لکھا ہے۔ وہاں اُس نے جس طرح نوکروں کو حکم دیے اور میں نے جب اُس کا کمرہ دیکھا تو اس میں کوئی شک نہ رہا کہ شہناز یہاں کی رانی ہے۔ مجھے وہ وہاں شہزادہ بنا کر رکھنا چاہتی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ مجھ میں اتنی دلچسپی نہ لے۔ میں نے اُسے وجہ یہ بتائی کہ جن عورتوں کو حمید اللہ نے اُس کی وجہ سے الگ پھینک دیا ہے وہ اُس کے خلاف کوئی سازش تیار کر کے اُسے حمید اللہ کی نظروں سے گرا دیں گی۔ پھر بھی شہناز نے میری رہائش کا انتظام ایک شاہانہ کمرے میں کیا۔

"سکندر!" ــــ شہناز نے کہا ــــ "میری ایک بات مان لو.... یہ تو حمید اللہ کو معلوم ہو گا یا ہو جائے گا کہ مجھے تم تاجے کے پاس لاتے تھے، لیکن حمید اللہ کو یہ پتہ نہ چلے کہ میں تمہاری سوتیلی ماں رہ چکی ہوں۔"

"نہیں شہناز!" ــــ میں نے کہا ــــ "ہمیں یہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں تمہارے اور تمہاری ماں کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے گیا تھا تو خادا بھی میرے ساتھ تھا۔ ڈرومت۔ حمید اللہ کو صحیح بات معلوم ہو بھی گئی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"



سورج غروب ہونے کے بعد حمید اللہ خان آگیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہُوا۔ اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔

"تم سکندر ہو نا!" ــــ حمید اللہ نے کہا ــــ "دیکھو میں تمہیں بھولا نہیں میں شہناز سے کہتا رہا ہوں کہ سکندر یہاں ضرور آئے گا .... پہلے یہ بتاؤ کہ

تم جیل سے آئے ہو یا کہیں اور سے۔"

"چھ مہینے قید کاٹ کر آ رہا ہوں" — میں نے کہا — "اب آپ بتائیں کیا کروں۔"

اُس نے بھی مجھ سے پوچھا کہ میں اپنے گھر کیوں نہیں گیا اور اُسے بھی میں نے وہی غلط جواب دیا جو میں نے شہناز کو دیا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ تاجے کے یار دوست کہاں ہیں" — میں نے کہا — "اگر غادا کہیں مل جاتے تو اُس کے ساتھ لگ جاؤں، لیکن تاجے کے مرنے کے بعد وہ سب بکھر گئے ہوں گے۔"

"میں نے تمہیں بتایا نہیں سکندر!" — شہناز بول پڑی — "غادا یہاں آتا رہتا ہے" — اُس نے حمیداللہ کی طرف دیکھا اور کہنے لگی — "گھبراؤ نہیں حمید! سکندر سے کچھ نہ چھپاؤ۔ اسے میری ذمہ داری پر یہاں رہنے دو۔"

"شہناز!" — حمیداللہ نے کہا — "معلوم ہوتا ہے تمہیں سکندر پر پورا پورا اعتماد ہے۔"

"غادے نے آپ کو بتایا ہوگا کہ میں سکندر کی سوتیلی ماں تھی" — شہناز نے کہا — "میں اب بھی اسے اپنا سوتیلا بیٹا سمجھتی ہوں۔ یہ یہاں پناہ لینے آیا ہے اور میں اسے پناہ دوں گی اور تم کسی اور شک میں نہ پڑ جانا۔"

حمیداللہ نے شہناز کی بات ہنسی میں ٹال دی۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ حمیداللہ کو شہناز پر پورا اعتماد ہے۔

شام کا کھانا ہر لحاظ سے نوابی کھانا تھا اور اس کے ساتھ شراب بھی تھی۔ حمیداللہ تو پینے والا تھا۔ شہناز نے بھی تھوڑی سی شراب پی لیکن میں اپنے آپ کو ہوش میں رکھنا چاہتا تھا اس لئے میں نے شراب پینے سے انکار کر دیا۔ کھانے کے بعد حمیداللہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔

"اب بتاؤ سکندر!" — حمیداللہ نے پوچھا — "کیا تم واقعی تاجے

کے گروہ میں شامل ہونے کے لئے آتے ہو؟"

"میں اتنی دُور سوچے سمجھے بغیر نہیں آیا" — میں نے کہا — "جیل میں مجھے دو آپ کے علاقے کے دو اُستاد ملے تھے۔ میں نے اُنہیں بتایا تھا کہ میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ پکڑا گیا ہوں۔ دونوں بڑے اُستاد تھے۔ اُنہوں نے مجھے کہا تھا کہ مجھ میں ایسا ڈاکو بننے کی صلاحیت ہے جسے سارے ہندوستان میں شہرت حاصل ہوگی۔ اُن میں ایک تو بہت بوڑھا تھا۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ مجھ میں ایک خاص قسم کی عقل موجود ہے جو مجھے ہر میدان میں فتح دے گی۔"

"یہ تو میں نے بھی دیکھا ہے" — حمیداللہ خان نے کہا — "کہ تم میں کوئی خاص بات ہے جو دوسروں کو متاثر کرتی ہے۔ تمہاری عمر کے نوجوانوں پر کوئی اعتبار نہیں کیا کرتا لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ تم پر اتنا ہی اعتبار کروں جتنا اعتبار مجھے تاجے پر تھا۔"

"اگر آپ کو پھر بھی کچھ شک ہو تو شہناز سے پوچھ لیں" — میں نے کہا — "بے شک یہ میرے باپ کی بیوی تھی لیکن اس کا حُسن اور اس کی جوانی دیکھیں۔ یہ میرے ساتھ تاجے کے اڈے پر بھی رہی ہے۔ اس سے پوچھیں۔ میں نے اِس کے ساتھ کبھی مذاق میں بھی بدتمیزی یا بیہودہ بات نہیں کی۔"

"میں نے تمہیں تاجے کے ساتھ دیکھا تھا" — حمیداللہ نے کہا — "میں نے تاجے سے پوچھا تھا کہ اُس نے تمہیں کیوں ساتھ رکھا ہُوا ہے۔ اس سطح کے ڈاکو نوعمر لڑکوں کو ساتھ نہیں رکھا کرتے۔ تاجے نے کہا تھا کہ اُسے کسی بزرگ نے تمہارے متعلق بتایا تھا کہ یہ لڑکا کوئی معمولی لڑکا نہیں، اِسے اپنے ساتھ رکھنا ... تاجے نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہیں امیر کبیر والدین کی بیٹیوں کو پھانسنے اور انہیں گھروں سے بھگا کر لانے کے لئے استعمال کرے گا۔ وہ تمہیں افسروں اور پولیس انسپکٹروں کے بہروپ میں بھی نوسربازی اور دھوکہ دہی کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو تمہیں

خدا کی نعمت سمجھتا تھا۔"

"بے چارے کو موت نے مہلت ہی نہ دی" — میں نے کہا۔

"تم خادا کے پاس جانا چاہتے ہو؟" — حمیداللہ نے پوچھا۔

"جانا تو میں اُسی کے پاس چاہتا ہوں" — میں نے کہا — "لیکن خان صاحب! میری ایک تجویز پر غور کریں۔ یہ پیشہ ور لوگ آپ کی جاگیر کو اپنی پناہ گاہ بنا لیتے ہیں اور مال یہاں رکھتے ہیں۔ ان پر مصیبت آپڑتی ہے تو آپ کے پاس دوڑے آتے ہیں۔ آپ ان سے کچھ وصول کرتے ہیں یا نہیں، یہ الگ بات ہے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ آپ خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ اگر کبھی مخبری ہوگئی اور پولیس نے یہاں چھاپہ مارا تو پکڑے آپ جائیں گے۔ مال آپ کے قبضے سے برآمد ہوگا۔ مال لانے والے تو کہیں اور ہوں گے۔ گرفتار آپ ہوں گے۔"

"ابھی تک تو یہاں تک نوبت نہیں آئی" — حمیداللہ نے کہا — "تم کہنا یہ چاہتے ہو کہ میں ان سے تعلق توڑ لوں؟"

"نہیں!" — میں نے کہا — "تعلق نہ توڑیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کیوں نہ ہم اپنا گروہ بنا لیں اور یہی کام بڑے پیمانے پر کریں۔ نوابوں اور مہاراجوں پر ہاتھ صاف کریں۔ ریلوے کی مال گاڑیوں کو روک کر ان سے مال نکال لائیں۔ شہروں میں بنک ہیں۔ لکھ پتی اور کروڑ پتی تاجر اور ساہوکار ہیں۔ مال تو اپنا ہو۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں" — حمیداللہ نے کہا — "لیکن اس کے لئے تجربہ کار آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔"

"خادے کے ساتھ بات کریں" — میں نے کہا — "آپ مجھے اُس کا ٹھکانہ بتائیں۔ میں اُسے یہاں لے آؤں گا یا اُس کے ساتھ بات کر لوں گا۔ وہ اپنی وارداتیں کرتا رہے لیکن ہم کوئی بہت موٹا شکار دیکھیں تو خادا اور اُس کے آدمیوں کو استعمال کر لیا کریں گے۔ اُس کے ساتھ سودا کر لیں گے۔"

"میرا خیال ہے وہ نہیں مانے گا" — حمیداللہ نے کہا۔

"اگر مان جاتے تو آپ میری تجویز پر عمل کریں گے؟" — میں نے پوچھا اور اُس کا جواب سُنے بغیر کہا — "خان صاحب! میں اب اس راستے سے ہٹوں گا نہیں۔ میں نے بہت بڑا پروگرام بنا رکھا ہے۔ آپ میرا ساتھ دیں گے۔ مجھے خادا کے ساتھ بات کرنے دیں۔"

"کر کے دیکھ لو" — حمیداللہ خان نے کہا — "اگر وہ مان گیا تو میں پہلے تمہارا پروگرام سُنوں گا۔"

"میرا پروگرام بعد میں سُننا خان صاحب!" — میں نے کہا — "پہلے میرے خواب سُن لیں جو میں دیکھ رہا ہوں .... اپنی اس جاگیر کو دیکھیں۔ آپ کے لئے میں اسے کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ اس جاگیر کو اور زیادہ پھیلانا ہے۔ اس کے اردگرد کی زمینیں خرید لیں گے۔ ہم دس گُنا قیمت مالکوں کو دیں گے۔ اتنی زیادہ قیمت کے لالچ میں زمینوں کے مالک ہمارے پاس دوڑے آئیں گے اور ہمیں اپنی زمینیں پیش کریں گے۔ آپ گاؤں کے گاؤں خریدیں گے۔ میں چھوٹی چھوٹی وارداتوں کی بات نہیں کر رہا۔"

نوابزادہ حمیداللہ خان بچہ یا نادان نہیں تھا کہ میں اُسے سبز باغ دکھا رہا تھا۔ میں اُسے جانتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی ڈاکوؤں کو پال رہا تھا۔ میں اپنے مشن پر کام کر رہا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میرے آگے بھولا بنا ہُوا ہے۔

"ہاں بھئی سکندر!" — اُس نے کہا — "تاجے نے بتایا تھا کہ گلشن مر گئی ہے۔"

"اُس نے خودکشی کر لی تھی" — میں نے کہا — "دریا میں کود گئی تھی۔"

"کبھی کبھی وہ یاد آتی ہے تو افسوس ہوتا ہے" — اُس نے کہا — "میرے باپ نے مجھے دھوکہ دیا تھا۔"

"آپ باپ جیسے نواب بن سکتے ہیں" — میں نے کہا — "مجھے

بتائیں خادا کہاں ہے، یا اُسے یہاں بلالیں۔"

"خادے کے ہاں تمہارا جانا ٹھیک نہیں" ــــ حمید اللہ نے کہا ــــ "وہ گلہ کرے گا کہ ایک نئے آدمی کو میں نے اُس کا ٹھکانہ بتا دیا ہے۔ وہ ایک دو دنوں میں یہاں نہ آیا تو اُس کا کوئی نہ کوئی آدمی آجائے گا۔ میں اُسے بلالوں گا۔"

میں نے انتظار کرنا ہی بہتر سمجھا۔

❀

صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی۔ میں خود نہیں جاگا تھا۔ مجھے کسی نے جگایا تھا۔ آنکھ کھلی تو سب سے پہلی چیز جو مجھے نظر آئی، وہ شہناز کا چہرہ تھا جو مجھے بہت ہی بڑا اور پھیلا ہُوا لگ رہا تھا کیونکہ وہ میری آنکھوں کے بالکل قریب تھا۔ یہ چہرہ اُوپر اُٹھا اور میں انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھا۔ شہناز مجھ سے پانچ چھ سال بڑی تھی لیکن اُس کا انداز اور میرے ساتھ پیار ایسا تھا جیسے وہ مجھ سے دو چار سال چھوٹی ہو۔ وہ میرے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"سکندر!" ــــ اُس نے سنجیدگی سے پوچھا ــــ "کیا تم نے واقعی ڈاکو بننے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"تو کیا میں یہاں تم سے یا حمید اللہ سے ملنے آیا ہوں؟" ــــ میں نے کہا ــــ "لیکن تایا جے اور خادے جیسا نہیں، بلکہ میں بہت بڑا ڈاکو بنوں گا۔ حمید اللہ کے ساتھ رات کو...."

"اُس نے مجھے رات کی ساری باتیں سنائی ہیں" ــــ شہناز نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ "پھر سوچ لو سکندر!"

"حمید اللہ کیا کہتا ہے؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "کیا اُسے میرا پروگرام پسند نہیں؟"

"پسند تو ہے" ــــ شہناز نے کہا ــــ "لیکن کہتا ہے کہ سکندر اناڑی ہے۔ کہیں پھنسا نہ دے۔"

"یہ میں بھی جانتا ہوں کہ مجھے تجربہ نہیں" ــــ میں نے کہا ــــ "اسی

لئے میں خادے کو ساتھ ملانا چاہتا ہوں۔"

میں نے شہناز کو بھی اِس جاگیر کو ریاست بنانے کے خواب دکھانے شروع کر دیے۔

"اور تم اس ریاست کی رانی ہو گی" ــــ میں نے کہا ــــ "حمید اللہ تو تم پر جان نثار کرتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ شادی کرے گا۔ وہ تمہیں اس ریاست کی بیگم بنانا چاہتا ہے" ــــ حالانکہ حمید اللہ نے شہناز کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔

حمید اللہ کی طرح شہناز کی بھی ذہنیت مجرمانہ تھی۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ حمید اللہ نوابزادہ تھا اور شہناز نوابزادی بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے شہناز کو شیشے میں اُتار لیا۔ حمید اللہ نے مجھے خادے کا ٹھکانہ نہیں بتایا تھا۔ وہ شہناز نے بتا دیا۔ وہ جگہ کم و بیش بیس میل دُور تھی۔

"حمید اللہ نے کہا تھا کہ خادا خود ہی آجائے گا" ــــ میں نے کہا ــــ "لیکن شہناز! میں زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہتا۔ میں خادے کے پاس نہیں جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے مجھے دیکھ کر اِدھر اُدھر ہو جائے۔ کیا تم اُسے ملا سکتی ہو؟"

"وہ اُڑ کر آئے گا" ــــ شہناز نے کہا ــــ "میں آج ہی اُسے پیغام بھیج دوں گی۔"

"تم حمید اللہ کو تیار کرو شہناز!" ــــ میں نے کہا ــــ "ایک خزانہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ یہ کسی ہندو ساہوکار کی تجوری نہیں جس میں سے ہم چند ہزار روپے نکال لائیں گے۔ لاکھوں اور کروڑوں کی بات کرو۔"

شہناز نے اُسی وقت خادے کو بلا لانے کے لئے اپنا ایک خاص آدمی بھیج دیا۔

❀

میں ناشتے سے فارغ ہُوا ہی تھا کہ حمید اللہ میرے کمرے میں آگیا۔

"میں رات بہت دیر تک سوچتا رہا ہوں" — حمید اللہ نے کہا — "سکندر! تم دانش مند ہو۔ اب میرے دل کی بات سنو، تم کسی اور نیّت اور کسی اور مقصد کے لئے یہ لائن اختیار کرنا چاہتے ہو لیکن میری نیّت اور میرا مقصد کچھ اور ہے ..... میں ایک نواب کا بیٹا ہوں، لیکن سکندر! میں اپنے نواب باپ کے ورثے کا وارث نہیں بن سکتا۔"

"کیا یہ جاگیر آپ کا کافی حصّہ نہیں؟" — میں نے کہا — "میرا تو خیال ہے کہ آپ کو یہ جو حصّہ ملا ہے، یہ بہت ہے۔"

"تم نہیں جانتے سکندر!" — حمید اللہ خان نے کہا — "اس جاگیر کا آدھا رقبہ کبھی اور کسانوں کی ملکیت تھا جو میرے باپ نے نوابی دھونس اور دھاندلی سے اپنے ناجائز قبضے میں لیا۔ کسی کو چند روپے دے دیئے، کسی کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا۔ اسے کچھ زمین انگریزوں نے انعام کے طور پر دے دی۔"

"انعام کس بہادری کا؟"

"انعام نہ کہو سکندر!" — حمید اللہ خان نے کہا — "ایمان کی قیمت کہو۔ میرا باپ نام کا مسلمان ہے۔ وہ انگریزوں سے بڑھ کر کافر ہے۔ بڑے بڑے انگریز افسر اُس کے ہاں آتے ہیں۔ بعض شکار کھیلنے آتے ہیں۔ میرا باپ انہیں اپنے حرم کی لڑکیاں پیش کرتا ہے۔ اپنی نئی نویلی بیویاں اُن کے حوالے کر دیتا ہے" — حمید اللہ چپ ہو گیا پھر گھونٹ سا نگل کر کہنے لگا — "میری آنکھیں دیکھو سکندر! یہ نیلی اور کچھ سبز ہیں۔ اکثر لوگوں کو میری آنکھیں بہت اچھی لگتی ہیں لیکن کچھ دنوں سے یہ آنکھیں مجھے بے چین کرنے لگی ہیں۔"

"کیوں خان صاحب!" — میں نے پوچھا — "آپ کی آنکھیں تو مجھے بھی اچھی لگتی ہیں ..... آپ کو ان سے بے چینی کیوں محسوس ہوتی ہے؟"

"کیونکہ ان آنکھوں میں خنزیر کا تاثر ہے" — حمید اللہ نے کہا — "یہ کسی انگریز کی آنکھیں ہیں۔ میری رگوں میں خنزیر کھانے والوں کا خون

دوڑ رہا ہے۔"

"خان صاحب!" — میں نے حیران سا ہو کے پوچھا — "کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ پہلے بھی آپ کی یہی آنکھیں تھیں۔ اب آپ کو اچانک ان آنکھوں سے کیوں نفرت ہو گئی ہے؟"

"تمہاری آنکھیں دیکھ کر!" — حمید اللہ نے کہا — "تم مجھ سے دس گیارہ سال چھوٹے ہو لیکن تمہارے سامنے بیٹھ کر میں نے ایسی کمتری محسوس کی تھی جیسے میں تم سے دس گیارہ سال چھوٹا ہوں۔ یہ تمہاری آنکھوں میں کوئی اثر ہے کہ تمہاری ہر بات میرے دل میں اُتر گئی تھی۔ میرا باپ یقیناً کوئی انگریز افسر ہے۔ میرے باپ نے میری ماں کو ایک دو راتوں کے لئے اُسے پیش کیا ہو گا۔ اسی لئے میرے باپ نے اپنے محل سے اور اپنی ریاست سے مجھے چلتا کیا تھا۔ میں نے جرائم اور گناہ کے سوا کچھ اور سوچا ہی نہیں۔"

وہ اب اس قسم کی باتیں کر رہا تھا تو میں نے خود محسوس کیا جیسے وہ مجھ سے دس بارہ سال چھوٹا ہو۔ میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا اُسے وہ ابھی طرح بیان نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی خیال اُسے پریشان کر رہا تھا جس کے اظہار کے لئے اُسے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے، یا وہ دو متضاد خیالوں کے درمیان بٹ گیا تھا۔

"خان صاحب!" — میں نے کہا — "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ آپ محسوس کیا کر رہے ہیں؟"

"کچھ سمجھ نہیں آتی سکندر!" — اُس نے کہا — "کبھی خیال آتا ہے کہ میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہوں اور میں خوش قسمت ہوں، پھر خیال آتا ہے کہ میں گناہوں میں ڈوب گیا ہوں اور یہ کوئی زندگی نہیں یہیں سے ذہن میں ایک اور خیال اُٹھتا ہے کہ مجھے گناہوں میں پھینکا گیا ہے اور یہ بھی کہ اپنے باپ کے گناہ کی پیداوار ہوں۔ اب میرے اندر ایک اور تلخی پیدا ہو رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ میرے باپ نے اپنے آپ کو

انسانوں کا خدا سمجھ رکھا ہے۔ اُس نے مجھ سے گلشن آراء لے لی تھی اور مجھے قتل کی دھمکی اور لالچ دے کر چلتا کیا تھا۔ اس وقت تک معلوم نہیں وہ کتنے آدمیوں اور کتنی عورتوں کو مروا چکا ہے۔ تم خوش قسمت تھے جو موت سے بچ نکلے تھے۔ اُسے اتنا اختیار کس نے دیا ہے؟"

"انگریزوں نے اُسے اختیارات دے رکھے ہیں"۔۔۔ میں نے کہا۔

"انگریزوں نے کسی کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ اُن کا قانون اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے"۔۔۔ حمید اللہ نے کہا۔۔۔ "لیکن انگریزوں نے ان نوابوں اور مہاراجوں سے نگاہیں پھیری ہوتی ہیں۔ انگریز چاہتے ہی یہی ہیں کہ ان کے یہ گماشتے جو ریاستوں کے نواب اور مہاراجے بنے ہوتے ہیں، انسانوں کو چوس چوس کر انہیں تاجِ برطانیہ کا غلام بنائے رکھیں۔ یہ برطانیہ کی شہنشاہی کے ستون بنے ہوتے ہیں"۔

"خان صاحب! آپ ان کے خلاف کر ہی کیا سکتے ہیں؟"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "لعنت بھیجو ان پر۔ میں نے رات آپ کو ایک راستہ دکھایا ہے۔ میں آپ کو نواب بنا دوں گا"۔

"اِسی تجویز پر غور کر رہا ہوں"۔۔۔ حمید اللہ نے کہا۔۔۔ "اِسی کا نتیجہ ہے کہ مجھے یہ خیال آتے جو مجھے پتہ نہیں چل رہا کہ بیان کس طرح کروں"۔۔۔ وہ میری طرف جھکا اور راز کی بات کہنے کے لہجے میں بولا۔۔۔ "میں انگریزوں کی شہنشاہی کی جڑیں کاٹوں گا۔ میں اپنے باپ کے محل کو لوٹوں گا اور اُسے آگ لگا دوں گا، لیکن سکندر! اس کے لئے ہمیں تجربہ کار آدمیوں کی ضرورت ہے۔ مجھے تمہاری تجویز پسند آتی ہے کہ ہم بہت بڑے پیمانے پر ڈاکے ڈالیں گے لیکن ہمیں اپنا مقصد بدلنا ہو گا۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟"

"تجویز میں نے ہی پیش کی ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "ساتھ کیوں نہیں دوں گا! آپ اپنا مقصد بیان کریں"۔

"وہ میں بیان کر چکا ہوں"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "انگریزوں اور نوابوں اور مہاراجوں کی حکومت بلکہ فرعونیت ختم کرنی ہے۔ اس کے لئے ہمیں خزانے چاہئیں۔ رائفلیں، ریوالور اور مشین گنیں چاہئیں۔ ان چیزوں کو ہم ڈاکے ڈال کر حاصل کریں گے۔ ڈاکو میرے ہاتھ میں ہیں۔ یوں کہہ لو کہ ڈاکو تو میں پہلے ہی ہوں"۔

"آپ نے یہ بھی سوچا ہو گا کہ ڈاکے کہاں کہاں ڈالے جائیں گے!"۔۔۔ میں نے کہا۔

"ہاں!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "تمہیں شاید معلوم نہ ہو۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں کسی ایک دن ایک ریل کار گزرتی ہے۔ یہ دِلی تک جاتی ہے۔ اس میں سرکاری خزانہ جاتا ہے۔ تم شاید جانتے ہو گے کہ ریلوے لائن یہاں سے تقریباً پندرہ میل دُور سے گزرتی ہے۔ میں نے کئی بار اسے دیکھا ہے۔ تقریباً اتنی ہی دُور کچھ پہاڑی علاقہ آتا ہے جس میں بہت سے موڑ ہیں۔ وہاں ریل کار کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ اگر ہمارے ساتھ دس بارہ آدمی بھی ہوتے تو ہم اسے روک کر اس میں سے مال بڑی آسانی سے نکال سکتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے ساتھ صرف تین گورے سپاہی گارڈ کے طور پر ہوتے ہیں۔ اس کا مال یہاں تک پہنچ گیا تو کوئی شک نہیں کر سکتا کہ اس ڈکیتی میں میرا بھی ہاتھ ہے"۔



میں جانتا تھا کہ یہ سرکاری ریل کار بمبئی سے دِلی تک جاتی ہے اور اس میں صرف نقد خزانہ ہی نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی سونا بھی ہوتا ہے۔ ٹریننگ کے دوران ہمیں دہشت گردوں کی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ بتایا گیا تھا۔ اس میں اس ریل کار کا بھی ذکر تھا۔ ریل کار کی روانگی خفیہ رکھی جاتی تھی اور یہ بہت تیز چلتی تھی اور کسی بہت بڑے سٹیشن پر دو چار منٹ کے لئے رُکتی تھی۔ یہ آج کل کی ریل کاروں سے بہت چھوٹی ہوتی تھی۔ اسے ریل موٹر بھی کہا جاتا تھا۔

میں نے اس کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا نہ میں نے کہیں اور ڈکیتی کی واردات کرنی تھی۔ میں نے تو ڈاکوؤں کو پکڑوانا تھا۔ میں نے تو ابھی یہ بھی سوچنا تھا کہ خادا اور مالوہ مجھے مل جائیں تو میں انہیں کس طرح اکٹھا کروں اور انہیں پکڑواؤں۔ انہیں کسی ایک واردات پر اکٹھا کرنا تھا جو بہت ہی مشکل کام تھا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل تھی کہ حمیداللہ خان نے خود ہی بڑا اچھا موقع پیدا کر دیا۔ میں نے اسی پر اُسے پکّا کرنا شروع کر دیا۔

"خان صاحب!" — میں نے کہا — "میں ڈاکہ زنی کی بات کر رہا تھا اور آپ دہشت گردی کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔ اس سے میرا حوصلہ دُگنا ہو گیا ہے۔ ڈاکہ زنی ایک جُرم ہے جسے ہمارے مذہب کے مطابق گناہ کہتے ہیں، لیکن دہشت گردی انگریزوں کی نظر میں جُرم ہوگا، ہم اسے گناہ نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں اس پر فوری طور پر عمل کرنا چاہیئے۔"

"میں تمہاری یہ مدد کر سکتا ہوں کہ یہ معلوم کرا دوں گا کہ ریل کار کون سی تاریخ کو یہاں سے گزرے گی" — حمیداللہ نے کہا — "میری ملاقات بہت دُور تک ہے۔ میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اگر میں بھی پکڑا گیا تو تمہارے لئے نہ کوئی اڈہ رہے گا نہ کوئی پناہ۔"

"یہی مشورہ میں آپ کو دینا چاہتا تھا" — میں نے کہا — "آپ یہیں رہیں گے۔"

"لیکن تمہارے ساتھ جائے گا کون؟"

"میں نے رات کو جتنی باتیں کی تھیں وہ سوچ سمجھ کر کی تھیں" — میں نے جواب دیا — "میں نے کہا تھا کہ مجھے خادے سے ملوا دیں۔ میں آپ سے یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ مالوہ بھی مجھے مل جائے تو میں دونوں کو اکٹھا کر کے ان سے کوئی بڑی واردات کرواؤں گا۔ اب آپ نے ریل کار کی بات کی ہے تو پہلا کام یہ کریں کہ خادے اور مالوے کو یہاں بلائیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بارہ سے زیادہ آدمی اپنے ساتھ لے آئیں گے۔"

"لیکن وہ ہمارے مقصد کو قبول نہیں کریں گے" — حمیداللہ نے

کہا — "وہ ڈاکہ زنی کی خاطر ڈاکہ زنی کرتے ہیں۔"

"خان صاحب!" — میں نے کہا — "آپ بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ انہیں ہم حصّہ دیں گے۔ سارا مال یہاں رکھیں گے۔ اگر وہ کوئی گڑبڑ کریں گے تو کیا آپ کسی اور طریقے سے اُن کا مُنہ بند نہیں کر سکتے؟"

"منہ بند کرنے کی کہتے ہو؟" — حمیداللہ نے کہا — "میں دونوں کی سانس بند کر دوں گا۔ اُن کی لاشیں یہیں اپنی جاگیر میں دفن کر دوں گا۔ اُن کا کون ہے جو انہیں ڈھونڈنے یہاں آئے گا! وہ تو یوں سمجھو جیسے ہم نے دو کُتّے مار کر پھینک دیئے۔"

"واہ خان صاحب!" — میں نے حمیداللہ کی ران پر بڑی زور سے ہاتھ مار کر کہا — "یہ بات کی آپ نے۔ اُن کے آدمیوں کو اپنا مرید بنا لینا میرا کام ہے۔ آپ دونوں کو بلوا لیں۔"



یہ باتیں اتنی لمبی ہو گئیں کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ شہناز نے پہلے ہی خادے کو بلانے کے لئے ایک آدمی بھیج دیا تھا لیکن میں نے حمیداللہ کو یہ بات نہ بتائی۔ ہم دونوں کچھ دیر اور ریل کار کی ڈکیتی کی سکیم بناتے رہے۔ میں نے ڈی۔ ایس۔ پی کلارک کو رپورٹ دینی تھی کہ میں نے کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے اور کیا سکیم بنی ہے۔ میرے پاس کوئی بہانہ نہیں تھا جو میں پیش کر کے حمیداللہ سے کہتا کہ میں فلاں کام سے فلاں جگہ جا رہا ہوں۔ ایک ذریعہ تھا لیکن وہ ابھی بن نہیں رہا تھا۔

"خان صاحب!" — میں نے ویسے ہی گپ شپ کے انداز میں پوچھا — "آپ نے مجھے اپنا مقصد تو سمجھا دیا ہے لیکن میں ایک بات نہیں سمجھ سکا۔ آپ کے ذہن میں یہ مقصد اچانک کس طرح آ گیا ہے؟"

"سچی بات بتاؤں سکندر؟" — حمیداللہ نے لمبا سانس لیا اور کہنے لگا — "خوبصورت عورت کو میں کھلونا سمجھتا ہوں۔ میری عادت بچوں جیسی ہے۔ ایک کھلونے کے ساتھ کچھ دن کھیلتا ہوں اور توڑ مروڑ کر پھینک دیتا

ہوں۔ میں تمہیں صحیح گنتی نہیں بتا سکتا کہ کتنی عورتیں میری راتوں کی تاریکی میں سے گزر گئی ہیں۔ مجھ جیسا آدمی محبت کرنا نہیں جانتا لیکن سکندر! شہناز میرے سامنے آئی تو مجھے بڑی شدّت سے محسوس ہُوا کہ میری روح پیاسی مر رہی ہے۔ تم بھی جوان ہو۔ روح کی پیاس کو سمجھتے ہو گے۔ اس پیاس کا اثر تھا کہ شہناز مجھ پر طلسم کی طرح طاری ہو گئی۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ محبت کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں شہناز کے سامنے نادان سا بچّہ بن جاتا ہوں۔"

"آپ نے اس کے ساتھ شادی نہیں کی" —— میں نے کہا۔

"محبت اور شادی دو مختلف چیزیں ہیں" —— اُس نے کہا —— "میں نے شادی کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ میں نے شہناز کو اپنا قیدی نہیں بنایا بلکہ کبھی محسوس ہوتا ہے جیسے میں شہناز کا قیدی ہوں .... ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے۔ میں شہناز سے اُکتایا نہیں بلکہ اسے میں اپنی زندگی کی ایک اہم ضرورت سمجھتا ہوں۔ یقین کرنا سکندر! یہ ضرورت جسمانی نہیں .... تم نے پوچھا تھا کہ میرے ذہن میں یہ مقصد اچانک کس طرح آیا ہے۔ مجھ میں یہ تبدیلی شہناز کی محبت نے پیدا کی ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہُوا" —— میں نے کہا —— "کہ شہناز کو آپ کی اس سکیم کا علم ہے۔"

"نہیں" —— اُس نے جواب دیا —— "اسے اس سکیم کا تو علم نہیں، باقی سب باتیں یعنی ڈاکوؤں کے ساتھ میرے تعلقات، اسے معلوم ہیں۔"

"تو کیا ہم شہناز کو بتا دیں؟"

"بتا دینے میں کوئی حرج نہیں" —— حمیداللہ نے کہا —— "لیکن ابھی نہ بتائیں تو اچھا ہے۔"

"خان صاحب!" —— میں نے کہا —— "تاجا شہناز کی محبت میں مارا گیا تھا۔"

"شہناز نے تو نہیں مروایا تھا" —— حمیداللہ نے کہا —— "اور میرا

یہاں کوئی رقیب بھی تو نہیں .... جب سے شہناز آئی ہے میں اپنے خیالوں میں اور سوچوں میں تبدیلی سی محسوس کرنے لگا ہوں۔ یوں کہہ لو کہ مجھ میں انسانی جذبات بیدار ہونے لگے ہیں۔ یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ میں انسانیت میں واپس آنے لگا۔ کرتے کرتے میرے خیالات یہاں تک آ گئے جو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"آپ کے پاس شاید دو تین عورتیں اور بھی ہیں؟"

"وہ صرف دو ہیں" —— حمیداللہ نے کہا —— "اگر میں پہلے والا حمیداللہ ہوتا تو انہیں کبھی کا اِدھر اُدھر کر چکا ہوتا لیکن اب انہیں دھتکارنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں کہتا ہوں یہ ظلم ہو گا۔ انہیں کسی اچھے طریقے سے کسی اچھی جگہ بیاہ دوں گا۔"

"خان صاحب!" —— میں نے ہنستے ہُوئے کہا —— "آپ ضرورت سے زیادہ نرم مزاج ہوتے جا رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی دشمن آپ کے سامنے آ جائے جس پر گولی چلانی پڑے تو آپ اس خیال سے گولی نہ چلائیں کہ وہ ہلاک یا زخمی ہو جائے گا۔"

"نہیں سکندر!" —— اُس نے کہا —— "میں صرف شہناز کے معاملے میں نرم مزاج ہُوا ہوں یا ان دو عورتوں کے معاملے میں جن کے ساتھ میں نے کچھ عرصہ گزارا ہے ورنہ تم مجھے فولاد کی طرح سخت پاؤ گے۔"

حمیداللہ جب روح کی پیاس اور شہناز کی محبت کی باتیں کر رہا تھا تو میں خود ایسی ہی پیاس محسوس کرنے لگا۔ میں کوئی فرشتہ تو نہیں تھا۔ عام سا انسان تھا اور جوان تھا۔ مجھے اپنی ماں یاد آ گئی۔ گھر بھی یاد آیا اور مجھے ماں کے یہ الفاظ بھی یاد آئے —— "میں اپنے بیٹے کے لئے بیٹے جیسی خوبصورت دُلہن لاؤں گی" —— میں اُس وقت بہت چھوٹا تھا جب میری ماں میرے لئے دُلہن لاتے لاتے خود بھی مجھ سے ہمیشہ کے لئے روٹھ گئی تھی۔ وہ میرے دل میں اپنا پیار اور میرے ذہن میں ایک خوبصورت دُلہن کا تصوّر چھوڑ گئی۔ شاید یہی تصوّر تھا جو مینا کی صورت میں میرے سامنے آ رہا تھا۔ مینا کو میں تصوّر نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے اسے حقیقت سمجھ لیا تھا مگر جب دنیا

کی تلخ حقیقتیں میرے سامنے آئیں اور مجھے خواجہ صاحب کی شفقت ملی تو جس بینا کو میں حقیقت سمجھتا تھا وہ بھاپ بن کر اُڑ گئی۔

حمید اللہ نے میرے جذبات میں ہلچل مچادی۔ دُھندلا سا ایک خیال آیا کہ شہناز تو مجھے چاہتی ہے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ کس دیوانگی سے وہ مجھے چاہتی تھی۔ میں نے اپنے آپ میں رقابت محسوس کی لیکن فوراً ہی شہناز کی اصلیت یاد آگئی۔ پھر اپنا مشن یاد آگیا۔ میں نے اس حقیقت کو ذہن سے نکال دیا کہ شہناز کسے چاہتی ہے اور اس کا مستقبل کیا ہوگا لیکن میرے جو جذبات بھڑک اُٹھے تھے انہیں سرد کرنے میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی۔



شہناز نے آکر بتایا کہ کھانا لگ گیا ہے۔

"شہناز!" — کھانے کے دوران حمید اللہ نے اُسے کہا — "خادے کو بلانا ہے۔"

"آجائے گا" — شہناز نے جواب دیا اور میری طرف دیکھا۔

مجھے توقع تھی کہ حمید اللہ شہناز سے پوچھے گا کہ اُسے کیسے پتہ ہے کہ خادا آئے گا لیکن حمید اللہ نے کچھ بھی نہ کہا اور ہم دوسری باتیں کرنے لگے۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ شہناز مکمل طور پر حمید اللہ پر چھائی ہوئی ہے۔ کھانے کے بعد حمید اللہ نے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے جا رہا ہے۔ شاید یہ اُس کی روزمرّہ کی عادت تھی کہ وہ دوپہر کے کھانے کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے سویا کرتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور شہناز میرے ساتھ میرے کمرے میں آگئی اور اُس نے دروازہ بند کر دیا۔ اُس نے مجھے لیٹ جانے کو کہا اور میرے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اُس کا ایک ہاتھ میرے سر پر آگیا اور اُس کی اُنگلیاں میرے بالوں میں رینگنے لگیں۔ میں لیٹا نہیں تھا۔ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اُس کا ہاتھ میرے سر سے نیچے آکر ٹھوڑی کے نیچے پہنچ گیا اور اُس نے ہاتھ سے میرا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ اُس کی نظریں میری

نظروں سے ٹکرائیں تو میں نے اپنے وجود میں برقی جھٹکا سا محسوس کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میں باریک سے ایک تار پر چلا جا رہا ہوں اور اگر میرا پاؤں ذرا سا بھی پھسل گیا تو میں ایسی کھائی میں گروں گا جس کی تہہ ہوتی ہی نہیں۔

"شہناز!" — میں نے کہا اور محسوس کیا کہ میری آواز میں لرزہ سا ہے — "کیا تم جانتی ہو کہ حمید اللہ تمہیں کتنا چاہتا ہے؟ تم شاید نہیں جانتیں کہ اُس کے دل میں تمہاری محبت پیدا ہوگئی ہے اور وہ تمہیں داشتہ نہیں سمجھتا۔"

"جانتی ہوں سکندر!" — اُس نے ایسے کہا جیسے سسکی لی ہو — "وہ جب محبت کا اظہار کرتا ہے تو مجھے شک سا ہونے لگتا ہے کہ میرے ساتھ کھیل رہا ہے۔"

"تمہارا خیال غلط ہے" — میں نے کہا — "اُسے کیا ضرورت ہے تمہیں دھوکے میں رکھنے کی؟ کیا تم ان دو عورتوں کو نہیں دیکھتیں جو اس گھر میں قید ہیں؟ وہ تمہیں بھی انہی جیسی حیثیت میں رکھ سکتا ہے۔"

"تم نے یہ بات کیوں کہی ہے سکندر؟"

"میں حمید اللہ کو دوست بنانے آیا ہوں" — میں نے کہا — "اور وہ میرا دوست بن چکا ہے۔ میں اُس کے گھر میں خیانت نہیں کرنا چاہتا۔"

"میری بات پر یقین کرو گے سکندر؟" — شہناز نے کہا — "میں اب تمہیں اُن نظروں سے نہیں دیکھتی جو تمہیں ابھی تک یاد ہیں۔ اپنے ابّاجان کو ذرا دل سے نکال دو اور یہ سوچو کہ میں ایک بوڑھے آدمی کی بیوی تھی اور تم جیسا خوبصورت نوجوان میرے پاس موجود تھا..... میں اب اُس وقت کو یاد نہیں کرنا چاہتی۔ جب سے تم مجھے دِلّی سے نکال کر لائے ہو میں تمہیں کچھ اور سمجھنے لگی ہوں۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ تم مجھے اپنی ماں یا بہن سمجھو۔ میں تمہاری نظروں میں اتنی مقدّس نہیں ہو سکتی لیکن اب میں تمہیں اُس مقام تک نہیں لے جاؤں گی جہاں تم یہ شک کرو کہ شہناز ناپاک عورت ہے۔ ایک بات

صاف طور پر کہہ دیتی ہوں کہ مجھے پیار سے نہ روکنا ..... میں ..... میں ..... کیا کہوں سکندر! ..... میں .....“ اُس کی زبان ہکلانے لگی۔

میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہوگئی تھیں۔ اُس نے اچانک مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور ایک جھٹکے سے میرا سینہ اپنے سینے سے لگا لیا۔ اُس کا ایک رخسار میرے گال سے لگ گیا۔ پھر وہ ایسی روئی کہ سسکنے لگی پھر اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ میں اُس کے بازوؤں میں اُس کے جسم کے ساتھ لگا ہُوا بے بس ہوگیا۔ اُس کے آنسو میری گردن پر گرنے لگے اور بہتے ہُوئے میری قمیض کے اندر چلے گئے۔ اُس کی یہ کیفیت ایسی تھی کہ میں سمجھ ہی نہ پایا، کیا کروں۔ پھر میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

اُس کے سینے کا غبار آنسوؤں کے رستے بہہ گیا تو وہ ذرا پیچھے ہٹی اور دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگی۔ جب اُس نے اپنی آنکھوں سے دوپٹہ ہٹایا تو میں نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ آنسوؤں سے دُھل گیا تھا۔

”کیا ہوگیا ہے تمہیں شہناز!“ ــــ میں نے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اُس کا چہرہ اوپر اُٹھایا اور پوچھا ــــ ”کیا ہوگیا ہے تمہیں؟“

”مجھے بتاؤ سکندر، میں کیا کروں“ ــــ شہناز نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ــــ ”میں نے اپنے گناہ کی سزا بھگت لی ہے لیکن مجھے چین نہیں آرہا۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کروں کہ میں گناہ کا کفارہ ادا کرسکوں“۔

”کچھ بھی نہ کرو شہناز!“ ــــ میں نے کہا ــــ ”صرف اتنا کیا کرو کہ مجھے اپنے اتنا قریب نہ کر لیا کرو“۔

”کیوں؟“ ــــ اُس نے اُداس سی آواز میں پوچھا ــــ ”کیا اب بھی تمہیں میری نیّت پر شک ہے؟“

”نہیں“ ــــ میں نے کہا ــــ ”مجھے اپنے آپ پر شک ہونے لگا ہے ..... میں جوان آدمی ہوں اور تم بہت خوبصورت ہو شہناز!“

”سکندر!“ ــــ اُس نے پہلے سے زیادہ دکھی آواز میں کہا ــــ ”تم مجھے

ناپاک عورت سمجھتے ہو اور مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ میں تمہارے جسم کو ہاتھ بھی لگاؤں۔ میرے جذبات کو اتنی بیدردی سے نہ کچلو سکندر!“

وہ اتنی زیادہ جذباتی ہوگئی تھی کہ مجھے بھی اُس نے جذباتی کر ڈالا اور جو بات میں نہیں کہنا چاہتا تھا وہ ازخود ہی میرے مُنہ سے نکل گئی۔

”شہناز!“ ــــ میں نے کہا ــــ ”ایک عورت خود دریا میں کُود کر مجھے ڈبو گئی ہے“۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“

”وہ بھی تم جیسی خوبصورت تھی“ ــــ میں نے کہا ــــ ”میں نے اُسے موت کے مُنہ سے نکالا تھا ..... یہ ایک کہانی ہے شہناز! ..... ایک رات ہم تنہا تھے۔ میں نے اُسے دیکھا تو میں اپنے قابو سے نکل گیا لیکن اُس نے کہا کہ تم پاک انسان ہو سکندر! میں تمہیں ناپاک نہیں کروں گی لیکن شہناز! میرے خیالات میں ناپاکی آچکی تھی۔ اُس کی عظمت دیکھو کہ وہ ناپاک عورت تھی لیکن مجھے پاک رکھنا چاہتی تھی۔ مجھ پر شیطان کا غلبہ طاری ہوچکا تھا، لیکن میں اس عورت پر غالب نہ آسکا۔ وہ مجھے گناہ سے بچانے کے لئے بھاگ اُٹھی۔ میں بھوکے بھیڑیے کی طرح اُس کے پیچھے دوڑا۔ جب اُس تک پہنچا تو وہ دریا میں کُود چکی تھی اور دریا اُسے اپنی آغوش میں لے کر بہت آگے نکل گیا تھا۔ اس کے بعد مجھ میں جو تبدیلیاں آئیں وہ تم خود دیکھتی رہنا، تمہیں نظر آتی رہیں گی“۔

”کون تھی وہ؟“

”اُس کا نام گلشن آرا تھا“۔

”گلشن آرا؟“ ــــ شہناز نے کہا اور سوچنے لگی پھر بولی ــــ ”میں نے یہ نام پہلے بھی سُنا ہے“۔

”حمید اللہ سے تو نہیں سُنا؟“

”ہاں“ ــــ شہناز نے کہا ــــ ”اسی سے سُنا تھا“۔

”کیا کہتا تھا؟“

”کہتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ مجھے بڑی محبت تھی“ ــــ شہناز نے

کہا ——"پھر اس نے بتایا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ گھر سے نکل آئی تھی لیکن حمیداللہ کے باپ نے اُس لڑکی پر قبضہ کر لیا تھا...تمہیں کہاں ملی تھی؟"

"کیا تمہیں فجی نے بتایا نہیں تھا؟"

"ہاں ہاں"——شہناز نے کہا——"فجی نے کچھ سنایا تو تھا لیکن سیٹھ ابراہیم کے ہاں میری ذہنی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ میں نے غور سے پوری بات سُنی ہی نہیں تھی۔ کیا حمیداللہ کو معلوم ہے کہ گلشن آراء کا انجام کیا ہُوا تھا؟"

"گلشن آراء حمیداللہ سے ملی بھی تھی"——میں نے کہا——"لیکن اس نے گلشن آراء سے نظریں پھیر لی تھیں....حمیداللہ کو گلشن آراء کا انجام معلوم نہیں۔ نہ ہی اسے بتانا۔"

"یہ شخص کہیں مجھ سے بھی نظریں نہ پھیر لے"——شہناز نے کہا۔

"نہیں"——میں نے کہا——"یہ میں تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ تم سے نظریں نہیں پھیرے گا۔"

کچھ دیر ہم گلشن آراء کی باتیں کرتے رہے لیکن میرا ذہن ٹھکانے نہیں رہا تھا۔ میں اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ شہناز پھر ویسی ہی جذباتی فضا پیدا نہ کر سکے۔ البتہ مجھے یہ اطمینان تھا کہ یہاں کوئی تو ہے جس کے دل میں میری ہمدردی ہے۔



ہم شام کا کھانا کھا رہے تھے جب خادا آ گیا۔ خادا خوبصورت جوان تھا۔ اُس کی عمر چالیس سال سے کچھ کم تھی لیکن وہ اس سے بھی کم عمر کا لگتا تھا۔ لباس اور شکل وصورت کے لحاظ سے وضعدار آدمی لگتا تھا۔ اُسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پیشہ ور ڈاکو ہے۔ حمیداللہ اُٹھ کر اُسے گلے لگ کر ملا۔ پھر خادے نے مجھے گلے لگا لیا۔

"تم یہاں کیسے سکندر!"——خادے نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے پاس آیا ہوں خادے!"——میں نے کہا——"بڑا خراب

ہو کر آیا ہوں۔"

"یار، تمہاری ایک تعریف ضرور کروں گا"——خادے نے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا——"تم نے پولیس کو ہمارے پیچھے نہیں ڈالا۔"

"خادے!"——میں نے کہا——"احسان والی بات نہیں لیکن تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ پورے دو مہینے پولیس نے اُلٹا لٹکائے رکھا تھا۔ لال مرچوں کی دھونی دیتے رہے۔ ایسی ایسی اذیتیں انہوں نے دی تھیں کہ میں دن رات میں کئی کئی مرتبہ مرتا تھا۔ وہ پوچھتے تھے کہ تلجے کے ساتھ اور کون کون تھا۔ وہ کہتے تھے صرف نام بتا دو۔ میں نے زبان ایسی بند کی کہ اُن کی مار کھا کر بے ہوش ہوتا تھا تو بھی زبان نہیں کُھلتی تھی۔ معلوم نہیں کس نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں مالوے کا ٹھکانہ بھی جانتا ہوں۔ اس پر انہوں نے میری ہڈیاں توڑ ڈالیں لیکن میں نے ایک ہی بات زبان پر رکھی کہ میں مالوے کو جانتا ہی نہیں۔ پھر انہوں نے دو تین پیشیوں میں مجھے چھ مہینوں کے لئے اندر کر دیا۔ جیل میں جا کر طبیعت ٹھکانے آئی اور رہا ہوتے ہی یہاں آ گیا ہوں۔"

"تم شیر ہو"——خادے نے کہا——"خدا کی قسم! جو تم نے ہمارے لئے کیا ہے اس کی جو قیمت مانگو گے دیں گے۔"

"نہیں خادے!"——میں نے کہا——"یار یاروں سے قیمت نہیں لیا کرتے۔"

ان باتوں سے مجھے یہ اطمینان ہُوا کہ خادے کو بھی معلوم نہیں کہ میں کیا سے کیا بن کر آیا ہوں اور اگر میں کامیاب ہو گیا تو یہی خادا مجھے کہے گا کہ یار، تُو نے تو یاری کی بہت بڑی قیمت لی ہے۔ میں نے خادے کو پہلے بھی دیکھا تھا۔ اس نے میرا ساتھ بھی دیا تھا مگر اب میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور سوچنے لگا، کیا اس شخص کو میں اپنے پھندے میں لا سکوں گا؟ خادا بہت ہوشیار آدمی تھا۔

کھانے کے بعد میں اور حمیداللہ خادے کو دوسرے کمرے میں

لے گئے۔ حمید اللہ نے اُسے وہ ساری باتیں کہیں جو میں نے حمید اللہ سے کہی تھیں۔ البتہ حمید اللہ نے اسے اپنا مقصد نہ بتایا۔ واردات کو واردات تک ہی رہنے دیا۔

"اپنا اور کام ہی کیا ہے خان صاحب!" — خادے نے کہا۔

"لیکن ہم بڑی وارداتیں کرنا چاہتے ہیں" — حمید اللہ نے کہا۔

"کتنی بڑی واردات کراؤ گے؟" — خادے نے پوچھا۔

"سرکاری ریل کار کو روک کر سرکاری خزانہ نکالنا ہے" — حمید اللہ نے کہا۔

"وہ ریل کار جو کبھی کبھی گزرا کرتی ہے؟" — خادے نے پوچھا۔

حمید اللہ نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ اس ریل کار میں کیا جاتا ہے اور اسے کس طرح روک کر لُوٹا جاتے گا۔

"اِس وقت میرے پاس کُل چھ آدمی ہیں" — خادے نے کہا — "آدمی تو جتنے کہو گے لے آؤں گا لیکن واردات ایسی ہے جس میں اناڑی نہیں چل سکیں گے۔ چھ آدمی پکّے اُستاد ہیں۔ گولی کھا کر بھی نہیں بھاگیں گے۔ ریل کار کے آگے لیٹ کر بھی اسے روک لیں گے۔"

"چھ آدمی کافی ہونے چاہئیں" — حمید اللہ نے کہا — "تم دو مِلا کر آٹھ ہو جاؤ گے۔"

"نہیں خان صاحب!" — میں نے کہا — "آٹھ آدمی کچھ نہیں کر سکیں گے۔ ریل کار میں صرف خزانہ نہیں جاتا۔ ہو سکتا ہے اس میں کوئی اور سامان بھی ہو۔ اس میں رائفلیں اور پستول بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہے۔"

"زیادہ آدمی کہاں سے لائیں گے؟" — حمید اللہ نے پوچھا۔

"مالوے کو ساتھ ملاؤ" — میں نے کہا۔

"پھر تو بہت حصّے دار ہو جائیں گے" — خادے نے کہا۔

"ہونے دو" — میں نے کہا — "اپنا ہاتھ تو کُھل جاتے گا۔ کچھ

تجربہ تو ہو جاتے گا .... یہ بتاؤ خادے! مالوے کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟"

"ناجے کے مرنے کے بعد جب میں اُس کی جگہ میدان میں آیا تو پہلا کام یہ کیا کہ مالوے کے ساتھ دوستی کر لی" — خادے نے جواب دیا — "میں نے سوچا کہ ایک ہی پیشے کے آدمیوں کو ایک دوسرے کا دشمن نہیں ہونا چاہیئے۔"

آج کل تمام کرنسی نوٹوں کی شکل میں ہے لیکن میں جس وقت کی کہانی سنا رہا ہوں اُس وقت سِکّے زیادہ چلتے تھے۔ یہ سِکّے مثلاً روپے، اٹھنّیاں، چوّنیاں وغیرہ الگ الگ تھیلیوں میں بندھے ہوتے تھے۔ دس ہزار روپیہ اٹھانے کے لئے چار یا پانچ آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ خادا اور حمید اللہ مان گئے کہ زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہے اور آدمی تجربہ کار ہونے چاہئیں۔ خادے سے پوچھا کہ مالوہ کہاں مل سکتا ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ اُسے کل ہی اپنے ساتھ لے آتے گا۔

خادا بہت خوش ہُوا کہ ہم نے اُسے ایک موٹا شکار دکھا دیا ہے۔ حمید اللہ نے اُسے بتایا کہ یہ واردات کس طرح کی جاتے گی۔ کچھ مشورے خادے نے بھی دیئے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ دو ریوالور ساتھ لا سکتا ہے۔

"دو ہی کافی ہیں" — حمید اللہ نے کہا — "ایک ریوالور اور دو دونالی بندوقیں میرے پاس ہیں۔ ان کی ہمیں بہت ضرورت ہو گی کیونکہ ریل کار کے ساتھ تین چار گورے فوجیوں کی گارد ہوتی ہے۔"

اس طرح ہم نے ساری سکیم طے کر لی اور خادا جانے کے لئے اُٹھ کھڑا۔ حمید اللہ نے اُسے رات رکنے کے لئے کہا لیکن وہ کہتا تھا کہ رات ہی رات اُسے واپس چلے جانا چاہیئے کیونکہ ٹھکانے پر کچھ مال رکھا ہے۔ پھر صبح سویرے سویرے مالوے تک بھی پہنچنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ باہر نکلا، گھوڑے پر بیٹھا اور چلا گیا۔

اب میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ حالات اور عناصر میرے حق میں ہوتے جا رہے تھے۔ پھندہ بڑی آسانی سے تیار ہو گیا تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ میں خود اس پھندے کی نذر ہو جاؤں گا۔ اسے بڑی عقل مندی سے کامیاب بنانا تھا۔ میں نے اپنے دماغ پر زور ڈالنا شروع کر دیا۔

میں شہناز کو اعتماد میں نہیں لینا چاہتا تھا لیکن حمید اللہ خان نے اُسے بتا دیا۔ شہناز میرے پاس آئی اور اُس نے ریل کار کو روکنے اور لُوٹنے کے متعلق بے شمار سوالات کر ڈالے۔ میں اُسے بچ بچ کر جواب دیتا رہا۔ اس دوران مجھے خیال آیا کہ میرا پھندہ کامیاب ہو گیا تو حمید اللہ بھی پکڑا جائے گا اور اس کے ساتھ شہناز بھی پکڑی جائے گی، پھر تو یہ تباہ ہو جائے گی۔ یہ خیال بھی آیا کہ اسے سزائے قید ہو گئی تو اس کا مستقبل بڑا ہی بھیانک ہو گا لیکن میں اسے بچا نہیں سکتا تھا۔ میں اسے یہ تو کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔ اب تو مجھے اپنا بھی کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا ہو گا۔

اُس شام ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو میرا دوسرا شکار، مالوہ بھی آ گیا۔ وہ عمر میں خادے سے چند سال بڑا تھا۔ اس کے متعلق پہلے بتا چکا ہوں کہ اُس کے مذہب کا کسی کو علم نہیں تھا کیا ہے۔ ان لوگوں کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا پھر بھی یہ تو معلوم ہوتا تھا کہ فلاں مسلمان ہے اور فلاں سکھ ہے۔ بعض سکھ ڈاکو سر کے بال کٹوا دیتے تھے لیکن وہ کہلاتے سکھ ہی تھے۔ مالوے کے مذہب سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔

مالوہ خادے کی طرح وضع دار نہیں تھا۔ اُس کا لباس بھی معمولی اور میلا تھا اور اُس کا چہرہ کھُردرا اور کرخت تھا۔ اُس کی باتیں بھی اپنے چہرے جیسی تھیں۔ بولتا تھا تو لگتا تھا لڑ جھگڑ رہا ہو۔

"سنا اوئے نوابزادے!" ___ اُس نے آتے ہی حمید اللہ سے کہا اور میری طرف دیکھ کر بولا ___ "اوئے، تُو بھی یہیں ہے۔ ہاں بھئی نوابزادے! خادے نے مجھے بتایا ہے کہ واردات کرنی ہے۔ ولائتی

ڈبے (ریل کار) کو روکنا ہے۔ وہ تو کبھی کبھی گزرتا ہے۔ ہمیں کون بتائے گا کب گزرے گا؟"

"یہ لے مالوے!" ___ حمید اللہ نے ایک گلاس میں شراب ڈال کر گلاس مالوے کی طرف کر کے کہا ___ "پہلے حلق ذرا کڑوا کر لے .... وہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ ڈبہ کب گزرے گا اور کس وقت کہاں ہو گا۔ یہ سوچ لے کہ واردات دن دیہاڑے کرنی ہے، لیکن میں نے جو جگہ دیکھی ہے وہ پہاڑیوں میں ہے۔ بالکل جنگل بیابان ہے۔ گھوڑے اپنے ساتھ ہوں گے۔ مال گھوڑوں پر رکھ کر نکل آئیں گے۔"

"پھر سوچ لے نوابزادے!" ___ مالوے نے کہا ___ "گھوڑوں پر مال لائیں گے تو راستے میں جس کسی نے دیکھا وہ شک کرے گا۔ عقل سے کام لے۔ سات آٹھ اونٹوں کا انتظام کر لے۔ تجھ سے نہیں ہوتا تو میں کر لوں گا۔ اگر واردات کامیاب ہو گئی تو مال بوریوں میں ڈال کر اونٹوں پر لاد دیں گے۔ مال سات آٹھ اونٹوں جتنا تو نہیں ہو گا۔ رقم کی تھیلیاں ہوں گی۔ وہ ایک ہی اونٹ اُٹھا لے گا۔ باقی اونٹوں پر اناج کی بوریاں ہوں گی۔ واپسی پر اونٹوں کے ساتھ دو تین آدمی ہوں گے جن کے کپڑے اونٹوں والوں جیسے ہوں گے۔ باقی آدمی واردات کے فوراً بعد بکھر جائیں گے اور مختلف راستوں سے اپنے اپنے ٹھکانے کو چلے جائیں گے .... اور نوابزادے! ذرا حصے کا خیال رکھنا۔ بندر بانٹ نہ ہو۔"

مالوہ منجھا ہُوا اُستاد تھا۔ شراب پیتا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ اُس کی کوئی بات فالتو اور بے معنی نہیں تھی۔ خادا بھی اُستاد ہی تھا لیکن مالوے کے سامنے وہ بچہ لگتا تھا۔ مالوے نے جب ہماری بنائی ہوئی سکیم سُنی تو اس میں کچھ ردّ و بدل کی اور ہم سب کو بیوقوف اور اناڑی کہا۔ خادے کو دو تین گالیاں دیں اور سکیم کو درست کر دیا۔

مالوہ اور خادا اتنی خطرناک واردات کے متعلق اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے بازار سے کچھ خریدنے جا رہے ہوں۔ ان کے انداز میں ڈر نہیں تھا،

ہلکی سی گھبراہٹ بھی نہیں تھی۔ مالوہ تو بالکل ہی نڈر تھا۔

"نوابزادے!" — مالوے نے کہا — "تُو نے میرے دل کی سوچی ہے۔ انگریزوں کے اِس ڈبے کو میں نے کئی بار دیکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس میں کیا جا رہا ہے لیکن اتنے بڑے شکار پر ہاتھ نہیں پڑتا تھا۔"

"کوئی بندوق پستول بھی ہے مالوے؟" — حمیداللہ نے اُس سے پوچھا۔

"پستول تو ایک ہی ہے" — اُس نے جواب دیا — "ایک نالی بندوقیں دو ہیں۔"

"ساتھ لیتے آنا" — حمیداللہ نے کہا — "میں کل صبح چلا جاؤں گا اور معلوم کروں گا کہ ریل کار کس روز کس وقت گزرے گی۔ تم اور خادا اپنے اپنے ٹھکانے پر موجود رہنا۔"

مالوہ اور خادا رات کو ہی چلے گئے۔



صبح حمیداللہ خان یہ کہہ کر چلا گیا کہ ہو سکتا ہے وہ دو تین دنوں بعد واپس آئے۔ میں اور شہناز اکیلے رہ گئے۔ اس محل نما مکان میں دو عورتیں اور بھی تھیں لیکن اُن کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ شہناز پریشان ہوتی جا رہی تھی۔

"سکندر!" — اُس نے پوچھا — "تمہیں یقین ہے کہ تم پکڑے نہیں جاؤ گے؟"

میں نے رات کو بھی اُسے کہا تھا کہ وہ اتنا نہ گھبرائے۔ اب وہ پھر وہی سوال پوچھ رہی تھی۔

"میرے ساتھ دو اُستاد جا رہے ہیں" — میں نے کہا — "حمیداللہ یہیں رہے گا۔"

"تم بھی یہیں رہو" — اُس نے کہا — "میرا دل گھبرا رہا ہے .... مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم کامیاب واپس آؤ گے۔ انگریز اتنے کچے نہیں

کہ ریل کار کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ہوگا۔"

"وہ کچے تو نہیں" — میں نے کہا — "لیکن انہیں یقین ہے کہ ہندوستانیوں میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ سرکاری خزانے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھیں۔"

شہناز کی پریشانی کم نہ ہوئی۔ ہم باہر بیٹھے ہوتے تھے۔ ماحول حسین تھا۔ میرے پاس بیٹھی ہوئی شہناز ماحول سے زیادہ حسین تھی۔ میں جوان تھا۔ وہاں پھولوں کی مہک تھی لیکن میرا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ دل پر بوجھ تھا۔ اعصابی تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں شہناز کے ساتھ کوئی بات کرتا یا اُس کی کسی بات کا جواب دیتا تھا تو زبان بھی ساتھ نہیں دیتی تھی۔ مجھ پر ہیجانی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

ایک مسئلہ مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں نے ابھی تک اپنے ساتھی سلطان کو رپورٹ نہیں دی تھی کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیا کر چکا ہوں۔ اُس نے یہ رپورٹ ڈی۔ ایس۔ پی کلارک کو پہنچانی تھی۔ اب تو مجھے کسی نہ کسی بہانے وہاں سے نکلنا ہی تھا۔ سلطان مجھ سے کچھ دُور تھا۔

ہم وہاں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک سادھو سا آگیا۔ اُس نے جوگیا رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اُس کے گلے میں موٹے اور بھدّے سے موتیوں کی مالا تھی۔ اُس کے ہاتھ میں سلیٹ اور پھٹی پرانی ایک کتاب تھی۔ کندھے سے اُس نے تھیلا سا لٹکا رکھا تھا۔ وہ ہمارے سامنے آن رُکا اور ہمیں سلام کیا۔

"خیر ہو نواب کے خاندان کی" — اُس نے اپنے سے لہجے میں کہا — "حکم ہو تو جوتشی کچھ بتائے؟ جوتشی بابا فال نکالے گا۔ مانگے گا کچھ بھی نہیں۔ تیرے مَن کی موج ہے۔ کچھ دان کرے گا تو جوتشی کا مَن راضی ہو جائے گا۔"

وہ میرے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا اور میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر میرا ہاتھ پھیلایا۔

"کیوں انتظار کراتا ہے اُسے نوابزادے مہاراج؟" — اُس

نے مجھے کہا — "وہ اکیلی بیٹھی تجھے یاد کر رہی ہے اور تیرا دل اتنا کٹھور ہے کہ اُدھر دھیان ہی نہیں دیتا۔ کیا چلتا ہے تیرے مَن میں؟"

"جوتشی بابا!" — میں نے اُسے کہا — "اُسے کہو تھوڑا اور انتظار کرے۔"

"تیرے محل کھڑے رہیں، تیری ماڑیاں آباد رہیں" — اُس نے پیشہ ور جوتشیوں کے لہجے میں کہا — "یہ تو پوچھ وہ ہے کون۔ کہے گا تو ملا دیں گے۔"

"جوتشی جی!" — شہناز نے کہا — "اِس کا ہاتھ دیکھ کر بتائیں کہ جس کاروبار میں اِس نے ہاتھ ڈالا ہے اس میں اسے نقصان تو نہیں ہوگا؟"

"جانے دو شہناز!" — میں نے جوتشی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ کر کہا — "یہ کیا بتائے گا۔ اسے تو اپنی قسمت کی خبر نہیں کیسی ہے۔ کوئی کس طرح مانگتا ہے، یہ اس طرح مانگ رہا ہے۔"

"نفع نقصان سوچ لے نوابزادے جی!" — جوتشی نے کہا — "جو ہم جانتے ہیں وہ تو نہیں جانتا۔"

"جوتشی مہاراج!" — میں نے طنزیہ کہا — "تم کہو گے کہ کاروبار خطرے میں ہے۔ پانچ روپے دو اور میں سب خطرے ٹال دوں گا۔ سنو مہاراج! میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ نقصان کا کوئی ڈر نہیں .... اور وہ جو میرا انتظار کر رہی ہے، اُسے کہہ دے کہ شادی کی تیاری کرے۔ میں بارات لے کر آ رہا ہوں۔"

"سوچ سمجھ کر قدم رکھ نوابزادہ جی!" — جوتشی نے کہا — "لا، کچھ دے دے۔ خالی ہاتھ چلتا نہ کر .... پھر سوچ لے۔ کل پرسوں ہم پھر آئیں گے۔ جوتشی بابا نے تیرے ہاتھ پر ایک لکیر دیکھی ہے۔ تجھ کو بتائیں گے یہ لکیر کیا کہتی ہے۔ چاہے ڈبو دے چاہے بیڑہ پار کر دے۔ ہنسی میں نہ ٹال شہزادے!"

"یہ لے" — میں نے اُسے ایک اٹھنی دے کر کہا — "اِس وقت ٹل جا۔ پھر آجانا۔ میرا بیڑہ یہ لکیریں نہیں ڈبو سکتیں۔"

"سکندر!" — شہناز نے کہا — "میں اِسے ہاتھ دکھانا چاہتی ہوں۔"

"پھر آئے گا تو دکھا دینا" — میں نے اُکتاہٹ سے کہا — "پرسوں آجانا جوتشی مہاراج!"

اُس وقت میری ذہنی کیفیت کچھ اور تھی۔ میں نے جوتشی کو چلتا کیا۔

"تم یہ تو اِس سے پوچھ لیتے کہ تم جس کام کے لئے جا رہے ہو...."

"یہ پیسے مانگنے کا ڈھنگ ہے شہناز!" — میں نے اُس کی بات پوری نہ ہونے دی اور کہا — "پرسوں یہ آگیا تو میں اسے بہت ذلیل کروں گا۔"

"کیا تم ہاتھ کی لکیروں کو نہیں مانتے؟"

"مانتا ہوں شہناز!" — میں نے کہا — "یہ ایک علم ہے مگر سمندر جیسا۔ اسے حاصل کرنے کے لئے راتوں کا ریاض کرنا پڑتا اور عمر گالنی پڑتی ہے .... اور شہناز! خدا بعض انسانوں کو ایسی طاقت دے دیتا ہے کہ وہ آنے والے وقت کی خبر دے دیتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے ہمارے محلے میں کبھی کبھی ایک پگلی آیا کرتی تھی۔ میں اُس وقت بہت چھوٹا تھا۔ امی ابھی زندہ تھی۔ میں یہی کوئی پانچ چھ سال کا ہوں گا۔"

"ہاں ہاں!" — شہناز نے کہا — "مجھے تو وہ پگلی اِس طرح یاد ہے جیسے اب بھی میرے سامنے گھوم پھر رہی ہو۔ میں اُس کی ہُوک سن کر ڈر جایا کرتی تھی۔ میں اُس وقت تیرہ چودہ سال کی ہو گئی تھی۔ وہ پگلی چلتے چلتے رُک جاتی اور مُنہ آسمان کی طرف کر کے بڑی زور سے 'ہُو' کی آواز نکالا کرتی تھی۔"

"وہ ایک روز میرے گھر آگئی تھی" — میں نے کہا — "میرے آبا جان کو غصہ آگیا۔ پگلی نے انہیں دیکھ کر میری امی سے کہا کہ یہ شخص راستہ بھول جائے گا پھر وہ راستہ بھی جو ٹھیک نہیں ہوگا اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل جائے گا۔"

"ہاں سکندر!" — شہناز نے آہ لے کر کہا — "پگلی کی یہ پیشین گوئی

تو بالکل صحیح نکلی۔"

"میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ خدا نے ہر انسان میں ہر طاقت ڈال رکھی ہے" ——— میں نے کہا ——— "کوئی نہیں کہہ سکتا کس وقت کون سی طاقت اُبھر آتے .... مجھے دیکھ کر پگلی نے کہا تھا کہ یہ دلوں کو تڑپاتے گا اور خود بھی تڑپے گا لیکن اس کا سفر بڑا لمبا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ جس طرف دیکھے گا اُدھر قیامت لوٹے گی لیکن یہ آگ میں سے گزر کر وہاں تک پہنچے گا .... دیکھو شہناز! میں تمہیں سُنا چکا ہوں کہ میں کس آگ میں سے گزرا ہوں اور معلوم نہیں کتنا عرصہ اور آگ میں سے ہی گزرتا رہوں گا۔"

"اُس نے مجھے بھی دیکھا تھا" ——— شہناز نے کہا ——— "اور میری ماں سے کہا تھا کہ اس لڑکی کا حُسن اسے کسی گھر میں بسنے نہیں دے گا۔ اس کی خوبصورتی اسے ڈبوتے گی اور جس کسی کا وجود اس کے وجود سے لگ گیا وہ تباہ ہوگا۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ بڑا قیمتی ہیرا ہے، کتنے ہاتھوں میں بکے گا .... میری ماں نے پگلی کو گالیاں دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ ماں کہتی تھی یہ پگلی ہے، جو مُنہ میں آتا ہے کہہ ڈالتی ہے .... اُس کی ہر بات پوری ہوتی ہے۔ تمہارے اباجان کا انجام وہی ہُوا، تاجے کا انجام تم نے دیکھ لیا ہے۔"

"اب مجھے کس انجام کو پہنچاؤ گی؟" ——— میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ تو میری رُوح ہے جو تمہاری رُوح سے محبت کرتی ہے" ——— شہناز نے کہا ——— "میں نے تمہارے اباجان کو بھی دل سے قبول نہیں کیا تھا اور تاجے کو بھی میں نے پسند نہیں کیا تھا۔"

"اور حمید اللہ خان کا کیا بنے گا؟"

شہناز کو دھچکا سا لگا اور جب اُس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اُس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی سی نظر آئی۔ میں نے ہنس کر اس موضوع کو ٹال دیا اور کہا کہ سب وہم ہے، لیکن میں اپنے ذہن سے اِس وہم کو نہ نکال سکا۔ پگلی کی پیشین گوئیاں صحیح ہوتی جارہی تھیں اور مجھے حمید اللہ خان

کا انجام اچھا نظر نہیں آرہا تھا۔

شہناز کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ میری ایک بات کا جواب دیتے اُس کی زبان میں ہکلاہٹ سی آگئی۔

"شہناز!" ——— میں نے اُس کے ایک گال پر ہاتھ رکھ کر اُس کا چہرہ اپنی طرف کیا اور کہا ——— "آؤ اندر چلیں۔ تم اتنی اداس کیوں ہو گئی ہو؟"

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ کچھ اور سمجھی۔

"نہیں سکندر!" ——— اُس نے گھبراہٹ کے لہجے میں کہا ——— "نہیں .... میں تمہیں اُس انجام تک نہیں پہنچنے دوں گی .... نہیں .... مجھے اپنے ساتھ کمرے میں نہ لے جاؤ۔"

میں نے اُس کا یہ وہم دُور کرنے کے لئے کہ میں اُسے کسی اور مقصد کے لئے کمرے میں نہیں لے جارہا، بہت کچھ کہا۔

"معلوم نہیں" ——— اُس نے اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز میں کہا ——— "پتہ نہیں یہ ہیرا اور کتنے ہاتھوں میں بکے گا!"



حمید اللہ خان اگلے روز سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے آگیا اور آتے ہی مجھے الگ کمرے میں لے گیا۔ اُس نے ریل کار کا صحیح دن اور وقت معلوم کر لیا تھا اور اُس نے یہ حساب بھی کر لیا تھا کہ ریل کار اُن پہاڑیوں میں سے کس وقت گزرے گی جہاں ہم نے اسے روکنا تھا۔ وہاں سے اُسے سورج غروب ہونے سے تھوڑا ہی وقت پہلے گزرنا تھا۔

"اس میں کیا آرہا ہے؟" ——— میں نے پوچھا۔

"یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا" ——— حمید اللہ نے جواب دیا ——— "یہ بڑی سختی سے راز میں رکھا جاتا ہے .... اب یہ دیکھ لو کہ صرف چار دن رہ گئے ہیں۔"

"مالو اور خادے کو بلالیں" ——— میں نے کہا ——— "وہ اپنے

آدمیوں کے ساتھ رات کے وقت یہاں پہنچیں۔ دن کی روشنی میں کوئی حرکت نہ ہو۔"

رات کو ہی حمیداللہ خان نے اپنا ایک خاص آدمی خادے کی طرف بھیج دیا۔ اسی آدمی کو خادے سے مل کر مالوسے کے پاس جانا تھا۔ میں اور حمیداللہ خان شام کے کھانے کے بعد پھر الگ بیٹھ گئے اور باتوں باتوں میں واردات کا ریہرسل کرنے لگے۔ حمیداللہ کو جاتے واردات پر نہیں جانا تھا۔ میں باتیں تو اس کے ساتھ کر رہا تھا لیکن ذہن میں اپنے مشن کی ریہرسل کر رہا تھا۔

میرا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ حمیداللہ نے تو اپنی دونوں پارٹیوں کو اکٹھا کرنے کا انتظام کر لیا تھا لیکن میں نے ڈی۔ ایس۔ پی کلارک کو ابھی اطلاع دینی تھی کہ دونوں مطلوب ڈاکو اور گروہ کیسی واردات میں اور کہاں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اس اطلاع پر ڈی۔ ایس۔ پی نے انہیں پکڑنے کا بندوبست کرنا تھا۔ میں نے باہر جانے کا ایک بہانہ سوچ لیا۔

"خان صاحب!" ___ میں نے کہا ___ "صبح مجھے ایک گھوڑا دیں۔ میں واردات والی جگہ دیکھ آؤں۔"

"اکیلے کیوں جاؤ گے!" ___ حمیداللہ نے کہا ___ "میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

میں نے سوچا تھا کہ میں اس بہانے اپنے اُس ذریعے تک پہنچ جاؤں گا جو میرے اور ڈی۔ ایس۔ پی کے رابطے کے لئے اس علاقے میں موجود تھا لیکن حمیداللہ خان بھی تیار ہو گیا۔ اُسے ٹالنا ممکن نہیں تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں احتیاط کرنی چاہیئے" ___ میں نے کہا ___ "نہ ہی جائیں تو بہتر ہے۔ کسی نے ہمیں وہاں گھومتے پھرتے یا کھڑے دیکھ لیا تو واردات کے بعد ہماری نشاندہی اور شناخت ہو سکتی ہے۔"

میں نے رات خاصے اضطراب میں گزاری۔

صبح طلوع ہوئی۔ حمیداللہ خان دیر سے جاگا کرتا تھا۔ میں نے شہناز کے ساتھ ناشتہ کیا اور کچھ وقت گزار کر میں نے شہناز سے کہا کہ یہ علاقہ بہت خوبصورت ہے، میں گھوم پھر آؤں۔ شہناز بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔

"نہیں شہناز!" ___ میں نے اُسے کہا ___ "حمیداللہ جاگ اُٹھا اور اُسے پتہ چلا کہ تم میرے ساتھ کہیں نکل گئی ہو تو وہ شک میں پڑ جائے گا۔ میں اسے شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا۔"

شہناز مان گئی اور میں اکیلا چل پڑا۔ میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ آہستہ ہی چلنا ضروری تھا۔ دُور دُور تک سبزہ ہی سبزہ تھا اور یہ صحت افزا سیرگاہ تھی لیکن میرے اعصاب کھچے تنے ہوئے تھے۔ جاگیر کا کچھ حصہ پھل دار درختوں کا تھا۔ میں اس حصے میں چلا گیا۔ میں دیکھنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نظروں سے اوجھل ہو گیا اور دُور جا کر اُس تنگ سی پگڈنڈی پر ہو گیا جو اُونچے فصلوں اور درختوں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ ایک گھنٹے سے کچھ اُوپر وقت ہو گیا اور میں خراماں خراماں جا رہا تھا۔ دُور سے مجھے وہی جوتشی آتا نظر آیا جسے میں نے کہا تھا کہ پرسوں آنا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے قدم تیز کر دیئے اور میں نے بھی ذرا تیز چلنا شروع کر دیا۔ چند قدم دُور رہ گیا تو جوتشی نے بولنا شروع کر دیا۔

"تیرے بلاوے پر آیا ہوں نوابزادے!" ___ اُس نے کہا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا ___ "کیا خبر ہے یار! صاحب نے جان کھا لی ہے۔"

"تمہارے انتظار میں ادھر آ گیا ہوں" ___ مَیں نے کہا ___ "دیکھو سلطان! فوراً صاحب کو اطلاع دینے چلے جاؤ۔ پھندہ تیار ہو گیا ہے اور دونوں پارٹیاں آ رہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ پرسوں تم آتے تو میرے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی، اُس کی وجہ سے میں اشاروں میں تمہیں پیغام دیتا رہا تھا۔ کیا تم میرا پیغام سمجھ گئے تھے؟"

"ہاں سکندر!" — سلطان نے جو جوتشی کے بہروپ میں میرے پاس آیا تھا، کہا — "میں نے تمہیں کہا تھا کہ ایک رُوح تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ میں تمہاری عقل کی تعریف کرتا ہوں کہ تم نے میری اس بات کو مذاق کے رنگ میں لیا اور اسی لہجے میں جواب دیا کہ اُسے کہو کہ انتظار کرے، میں بارات لے کر آؤں گا .... میں تمہارے سارے اشارے سمجھ گیا تھا اور میں نے یہاں سے جاتے ہی کلارک صاحب کو پیغام بھیج دیا تھا کہ سکندر کافی حد تک کامیاب ہو چکا ہے اور اُس نے دو دن انتظار کرنے کو کہا ہے۔ میں آج کچھ شش و پنج میں آیا تھا کہ تم اکیلے مل بھی سکو گے یا کوئی اور چکر چلانا پڑے گا۔"

یہ جوتشی میرا ساتھی سلطان احمد تھا۔ میں نے پہلے سنایا ہے کہ چند ایک دیہاتیوں کو بھی اعتماد میں لیا گیا تھا۔ یہ میرا نہیں، یہ ہمارے ڈی۔ ایس۔ پی کا بندوبست تھا۔ سلطان کو انہوں نے اپنے پاس رکھا ہوا تھا اور پہلے روز ہی اُسے جوتشی بنا دیا تھا اور وہ ان دو چار دنوں میں ہی جوتشی کی حیثیت سے مشہور ہو گیا تھا۔ ابتدا میں طے یہ ہُوا تھا کہ میں اُس کے پاس پہنچوں گا اور رپورٹ دوں گا لیکن میں نہ جا سکا جس کی وجہ بیان کر چکا ہوں۔ وہ انتظار کرتے کرتے میرے پاس آ گیا۔

"اب پوری رپورٹ دو" — سلطان نے کہا۔

میں نے اُسے یہ ساری تفصیل سنائی جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ میں نے اُسے ریل کار کے دن اور وقت کے متعلق بھی بتایا۔ ہم دونوں تجربہ کار تو نہیں تھے لیکن ٹریننگ حاصل کی تھی اور ایس۔ پی اور ڈی۔ ایس۔ پی نے ہمیں بہت سی ہدایات دی تھیں۔ ہم ان کی روشنی میں کام کر رہے تھے۔ سلطان یہ کہہ کر چل پڑا کہ وہ قبل از وقت مجھے اطلاع دے دے گا کہ کلارک صاحب نے کیا بندوبست کیا ہے اور میں نے کیا کرنا ہے۔

سلطان کو پیغام دے کر میرا اعصابی تناؤ ختم ہو گیا۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میں ہلکا پھلکا ہو کر واپس آ گیا۔ حمید اللہ جاگ اُٹھا تھا۔ شہناز اُس کے کمرے میں تھی۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ریل کار کی آمد میں ایک دن رہ گیا تھا۔ مالوے اور رخادے نے اپنے آدمیوں کے ساتھ رات کو آنا تھا۔ جوتشی بابا پھر آ گیا۔ میں چونکہ اُس کے انتظار میں تھا اس لئے میں اس کوشش میں رہتا تھا کہ شہناز یا حمید اللہ مجھے کمرے میں نہ بٹھائیں بلکہ میرے ساتھ باہر بیٹھیں۔ ہم تینوں باہر بیٹھے ہوئے تھے جب جوتشی آیا۔ اُس نے جوتشیوں جیسی باتیں کیں اور ہم تینوں کے درمیان اکڑوں بیٹھ گیا۔

"شہزادے!" — جوتشی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا — "تُو نے مجھے پرسوں آنے کو کہا تھا پر لوگ مجھے ہلنے ہی نہیں دیتے۔ آج آیا ہوں .... بول، تیری اُس لکیر کا حال بتا دوں؟"

"خان صاحب!" — میں نے حمید اللہ سے کہا — "اُس روز اس شخص سے بڑی مشکل سے جان چھڑائی تھی۔ آج پھر آ گیا ہے" — میں نے جوتشی سے کہا — "بتا کیا بتاتا ہے"۔

"لے سُن" — جوتشی نے میرا ہاتھ پھیلا کر دیکھتے ہوئے کہا — "ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں نہ مار۔ تیرے سب کام سُدھ ہیں۔ قسمت نے تیرا سارا بندوبست کر دیا ہے۔ اُس روز تُو نے جوتشی بابا کو مذاق میں ٹال دیا تھا کہ برات لے کر آؤں گا۔ اب جوتشی بابا کی سُن لے .... برات کے ساتھ آنا تھوڑی گڑبڑ ہو گی۔ ذرا ادھر اُدھر ہو جانا پر دُلہن تجھے مل جائے گی" — اور اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پلکوں کو ہلکی سی جنبش دی۔

میں پیغام سمجھ گیا۔ پھندہ تیار تھا اور مجھے وہاں تک جانا تھا پھر ادھر اُدھر ہو جانا تھا۔

"جوتشی بابا!" — میں نے طنزیہ لہجے میں کہا — "تم نشے سے ٹوٹے ہُوئے معلوم ہوتے ہو" — میں نے ایک روپیہ نکال کر اُسے دیتے ہُوئے کہا — "جاؤ اور سُوٹا لگا لو۔ مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں آتی"۔

"ٹھہرو سکندر!" — شہناز نے کہا — "میں نے اُس روز اس سے پوچھا تھا کہ جس کاروبار میں تم لوگوں نے ہاتھ ڈالا ہے اس میں نقصان تو نہیں ہو گا۔ مجھے اس سے اس سوال کا جواب لینے دو"۔

"رانی!" — جوتشی نے جھومتی ہوئی آواز میں کہا — "جوتشی بابا نے تیرے ہی سوال کا جواب دیا ہے۔ اس کاروبار میں نفع ہی نفع ہے۔ تُو چنتا نہ کر۔"

کچھ دیر اور گپ شپ ہوتی رہی۔ حمید اللہ نے اپنا ہاتھ سلطان کے آگے کر دیا۔ سلطان کو میں نے پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ میں حمید اللہ کے پاس ٹھہروں گا اور اُسے حمید اللہ کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ سلطان نے حمید اللہ کے ساتھ ایسی باتیں کیں کہ حمید اللہ حیران ہُوا اور اُس نے مان لیا کہ یہ جوتشی، جوتش کا علم رکھتا ہے۔

سلطان کو حمید اللہ نے پانچ روپے دیئے اور سلطان چلا گیا۔

رات کو پہلے خادا اپنے چھ آدمیوں کے ساتھ پہنچا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد مالوہ سات آدمی لے کر آگیا۔ رات کو ان دونوں کو اور ان کے آدمیوں کو بڑی اچھی طرح سمجھا دیا گیا کہ ریل کار کس طرح روکی جائے گی۔

مالوے نے پہلے ہی مشورہ دیا تھا کہ رقم کی تھیلیاں گھوڑوں پر نہیں لائی جائیں گی بلکہ ایک اونٹ پر بوریوں میں لائی جائیں گی۔ اونٹ سات آٹھ ہوں گے جن پر اناج کی بوریاں لدی ہوئی ہوں گی۔ صرف ایک اونٹ خالی ہو گا۔ ریل کار کا مال بوریوں میں ڈال کر اُس پر لادا جائے گا۔

مالوہ اپنے سات آدمی لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا ایک آدمی چھ اونٹ لا رہا ہے۔



اگلے روز دونوں پارٹیوں کے آدمی ایک ایک دو دو کر کے مختلف اطراف سے جاگیر سے نکلے۔ چھ اونٹوں پر حمید اللہ کے گودام سے، جو اُس نے وہاں بنا رکھا تھا گندم اور دالوں کی بوریاں لادی گئیں۔ ایک اونٹ پر خالی بوریاں رکھی گئیں۔ دو آدمی ان اونٹوں کو ساتھ لے کر کسی اور طرف چل پڑے۔ میں ایک گھوڑے پر بیٹھا۔ میرے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی اور میں اس انداز سے نکلا جیسے میں شکار پر جا رہا ہوں۔

وہاں ہمیں دیکھنے والا حمید اللہ کے مزارعوں، اُن کی عورتوں اور بچوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اُس زمانے میں آبادیاں بہت کم تھیں۔ گاؤں دُور دُور تھے۔ ان تمام ڈاکوؤں کو ایسے راستے معلوم تھے جن کے دُور دُور تک کسی گاؤں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ سب تجربہ کار تھے۔ اپنی شناخت چھپانے کے بھی ماہر تھے۔ یہاں میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ عام شہریوں کو اس قسم کے ڈاکوؤں کے متعلق اتنا ہی معلوم ہوگا کہ وہ بڑے وحشی اور اُجڈ لوگ ہوتے ہیں لیکن اُن کی دُنیا میں جا کر دیکھیں تو آپ کی رائے بدل جائے۔ میں نے ان لوگوں میں خاص قسم کی ذہانت دیکھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کی عقل کسی اور طرف استعمال ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں عقل غیر معمولی ہوتی ہے۔

میں نے اُن کی عقل میں یہ باریکی دیکھی تو مجھے خطرہ سا محسوس ہونے لگا کہ انہیں عین موقع پر پتہ چل جائے گا کہ یہ پھندہ ہے اور یہ سب مل کر میرے جسم کا قیمہ بنا دیں گے۔ میں تنہائی محسوس کرنے لگا۔

آخر ہم جائے واردات پر پہنچ گئے۔ یہاں میں نے حمید اللہ کی عقل کی داد دی۔ اُس نے واردات کی جگہ کا انتخاب نہایت اچھا کیا تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ پہاڑیاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ ان پر درخت بھی تھے اور کہیں کہیں اونچی گھاس بھی تھی۔ ارد گرد یا اس علاقے کے اندر کوئی چھوٹا سا گاؤں بھی نہیں تھا۔ بالکل ویرانہ تھا۔ چھُپنے کی جگہ ایسی تھی کہ میں جب وہاں پہنچا تو میں یہ سمجھا کہ مالوے اور خادے کا کوئی بھی آدمی ابھی نہیں آیا۔ میں شکاریوں کے روپ میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چھوٹا سا ایک پتھر میرے گھوڑے کے اگلے پاؤں کے قریب گرا جس سے گھوڑا ذرا بدک گیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے کوئی انسان نظر نہ آیا۔ پھر ایک اور پتھر آیا جو میرے گھوڑے کی گردن پر لگا۔ اب میں نے ہر طرف دیکھا تو مجھے ایک سر نظر آیا، پھر ایک اور سر ایک ٹیکری کے پیچھے سے اُبھرا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ سب پہنچ چکے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مالوہ اور خادا میرے پاس آ گئے۔

وہ مجھے دو چٹانوں کے درمیان لے گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ سب لوگ کہاں ہیں۔

"او تے کاکا!" —— مالوے نے کہا —— "آدمی وقت پر سامنے آیا کرتے ہیں۔ آدمیوں کی نمائش نہیں کی جاتی۔"

مجھے اب ایک اور خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پولیس کی خاصی نفری پہنچ جائے گی۔ خطرہ یہ تھا کہ ان لوگوں نے علاقے پر نظر رکھنے کے لئے کوئی آدمی کہیں بلندی پر بٹھا رکھا ہوگا۔ میں نے بہت سوچا کہ ان لوگوں نے اگر ایسا انتظام کر رکھا ہے تو انہیں کہہ کر کچھ گڑبڑ کرا دوں لیکن میں اس لئے ایسا کوئی مشورہ نہیں دیتا تھا کہ مجھ پر ہی شک نہ ہو جائے۔ میں نے سوچا کہ کوئی نہ کوئی خطرہ تو قبول کرنا ہی پڑے گا۔

سورج اُفق کی طرف جا رہا تھا۔ جاتے جاتے سب سے اونچی پہاڑی کے پیچھے چلا گیا۔ خادے نے کہا کہ ریلوے لائن پر بڑے بڑے پتھروں کی دیوار سی کھڑی کرنی ہے، وہ فوراً شروع کر دی جائے۔ مجھے اچانک ایک خیال آ گیا۔ یہ مین لائن تھی۔ ریل گاڑیاں دونوں طرف سے آتی جاتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ہم اگر وقت سے پہلے لائن کو پتھروں سے بند کر دیں اور دوسری طرف سے کوئی ریل گاڑی آجائے تو وہ رُک جائے گی اور جب تک یہ ریل گاڑی اگلے سٹیشن پر نہیں پہنچے گی وہاں سے ریل کار نہیں چلے گی۔ یہ تھوڑا سا علاقہ تھا جس میں ریلوے لائن ابھی ڈبل نہیں بنی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے خادے سے کہا کہ ابھی لائن روکنے کا بندوبست نہ کرو۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے یہ خیال آ گیا تھا۔ پانچ سات منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دُور سے ہمیں سیاہ دھواں اُٹھتا نظر آیا اور ریل گاڑی کی ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ بھی سنائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک مسافر گاڑی بڑی تیز رفتار سے آتی نظر آئی۔ میں اور خادا وغیرہ پہاڑیوں کے اندر ہو گئے۔ ریل گاڑی طوفان کی طرح گزر گئی۔ اس کے بعد میں نے خادا وغیرہ سے کہا کہ اب ریلوے لائن پر پتھر رکھ دو۔ اتنا تو میں جانتا تھا کہ جب تک

یہ ریل گاڑی اگلے سٹیشن پر نہیں پہنچ جائے گی تب تک نہ اُدھر سے ریل کار آئے گی نہ اِدھر سے کوئی اور گاڑی جائے گی۔

خادے کے پکارنے پر سات آدمی سامنے آ گئے۔ پھر اُس کے کہنے پر وہ بڑے بڑے پتھر لانے لگے۔ آدھے گھنٹے تک انہوں نے ریلوے لائن پر دو فٹ سے اونچی دیوار کھڑی کر دی جو پٹڑی کے باہر سے شروع ہو کر دوسری طرف پٹڑی کے باہر ختم ہوتی تھی۔ اس دیوار کی چوڑائی بھی دو فٹ کے ہی لگ بھگ تھی۔ دیوار سے پندرہ بیس قدم پر لائن کا موڑ تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں تھا کہ پولیس فورس اپنے مقام پر پہنچی ہے یا نہیں یا پہنچ بھی سکے گی یا نہیں۔ مجھے اب یہ دھڑکا لگا ہُوا تھا کہ مالوہ اور خادا پھندے میں پھنستے ہیں یا نہیں۔

حمید اللہ نے ریل کار کے گزرنے کا جو وقت بتایا تھا اس میں کچھ منٹ ہی باقی تھے۔ مالوہ اور خادا میرے ساتھ تھے۔

"اب تم سنبھالو چاچا!" —— میں نے مالوہ سے کہا —— "اب ہم تمہارے حکم پر چلیں گے۔"

"حکم کیسا!" —— مالوے نے کہا —— "ڈبہ آئے گا اور رُک جائے گا۔ ڈرائیور نے پتھر نہ دیکھے تو اُن کے ساتھ ٹکرا کر رُک جائے گا۔ پھر سب اُس پر دھاوا بول دینا۔"

دُور سے ایک وِسل سنائی دی۔ یہ ریل کار ہی ہو سکتی تھی۔ ریل گاڑیوں کے اِنجنوں کی وِسل کچھ اور طرح کی ہوتی تھی۔ مالوے نے اپنے ساتھیوں کو تیار ہونے کے لئے پکارا۔ ان پہاڑیوں میں صرف آدمی ہی نہیں، گھوڑے اور اونٹ بھی چھُپ گئے تھے۔ میں نے اپنے لئے ایک جگہ منتخب کر لی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں گولیاں چلیں گی اور بے طرح چلنے والی گولیوں سے بچنا آسان نہیں ہوگا۔

پھر ایسے ہُوا جیسے ایک بڑے ہی خوفناک منظر کا پردہ اُٹھ گیا ہو۔ یہ منظر اس طرح شروع ہُوا کہ موڑ پر آکر ریل کار کی وِسل ایک چیخ کی طرح

سناتی دی۔ اس کے فوراً بعد ڈرائیور نے پتھروں کی دیوار دیکھ کر اتنی سخت بریک لگائی کہ پہیوں کی چیخیں سنائی دیں۔ ریل کار ابھی پوری طرح رُکی نہیں تھی کہ پہاڑیوں کے دونوں طرف سے ڈاکو نکلے۔ میں نے اتنا دیکھا کہ ریل کار کی تمام کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوتے تھے۔ ڈاکوؤں نے ریل کار کے ڈرائیور اور فوجیوں وغیرہ کو ڈرانے کے لئے ہوائی فائر کئے۔

مالوے اور خادے کے آدمی ریل کار سے ابھی دو دو چار چار قدم دُور ہی تھے کہ چھوٹی سی اس ریل کار کی کھڑکیوں کے تمام شیشے اُتر گئے۔ ہر کھڑکی میں سے رائفلیں باہر آئیں اور ان رائفلوں نے ڈاکوؤں پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ ان میں دو مشین گنیں بھی تھیں۔ ڈاکوؤں میں ایسی ہڑبونگ مچی کہ وہ چیخنے اور چلانے لگے اور بھاگنے بھی لگے۔ میں گھوڑے سے اُتر کر ذرا بلند جگہ چڑھ گیا تھا جہاں کوئی گولی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکو گرتے اور تڑپتے تھے۔ میں نے مالوے کو بھی اور خادے کو بھی گرتے دیکھا۔ دونوں کے سینوں سے خون چشمے کی طرح پھوٹا۔ دونوں کو شاید مشین گن کی گولیاں لگی تھیں۔ اُنہیں تڑپنے کی مہلت نہ ملی۔

میرے عقب میں ایک دھماکہ ہوا۔ اوپر سے سبز روشنی کا چھوٹا سا گولا نیچے آنے لگا۔ یہ روشنی راؤنڈ تھا جو رات کو فائر کیا جاتا ہے۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ ابھی روشنی تھی۔ روشنی راؤنڈ کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ سبز راؤنڈ پولیس فورس نے چلایا تھا جو ریل کار کے فوجیوں کے لئے اشارہ تھا کہ ہم آگئے ہیں۔ پولیس کی اچھی خاصی نفری اتنی خوبی سے قریب ہی کہیں چھپی ہوئی تھی۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی یہ نفری آگئی۔ اس نفری نے جائے واردات کو گھیرے میں لے لیا اور سپاہی تیزی سے آگے بڑھنے لگے لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا جسے وہ گرفتار کرتے۔ زیادہ تر ڈاکو مارے جا چکے تھے۔ جو شدید زخمی تھے وہ مر رہے تھے۔ صرف دو ڈاکو

ایسے نکلے جنہیں ایک ایک گولی اس طرح لگی تھی کہ اُن کے مرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ان کے زخموں پر پولیس کے سپاہیوں نے کپڑے لپیٹ دیئے۔

میں یہ دیکھ کر حیران ہوا اور خوش بھی کہ ساٹھ سپاہیوں کی اس پولیس فورس کا کمانڈر ایوب تھا جو اب سب انسپکٹر ہو چکا تھا۔ اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔

"سکندر!" — اُس نے جوشیلے لہجے میں کہا — "تم نے دل خوش کر دیا ہے۔ تم نے سروس کی ابتدا اتنے بڑے کارنامے سے کی ہے جو تمہارے مستقبل کو روشن کر دے گا۔ تم پولیس کے بہت بڑے افسر بنو گے۔ میں فخر سے سب کو بتاؤں گا کہ سکندر میرے شہر کا لڑکا ہے" — اُس نے آہستہ سے مجھ سے پوچھا — "نوابزادہ کہاں ہے؟"

"وہ تو گھر میں ہے" — میں نے جواب دیا اور اُس کے کان میں کہا — "ایوب بھائی! آپ کو ایک خیال رکھنا پڑے گا ... شہناز بھی وہیں ہے۔"

"کون سی شہناز؟"

"وہی آپ کی شہناز!" — میں نے کہا — "اُسے یہاں سے نکالنا ہے۔"

"وہ یہاں کس طرح پہنچ گئی؟" — ایوب نے پوچھا — "کیا نوابزادے نے اُسے بیگم بنا لیا ہے؟"

"نہیں" — میں نے جواب دیا — "بیگم تو نہیں بنایا لیکن اُسے بیگموں سے اونچا درجہ دے رکھا ہے ... آخر اپنے شہر کی عورت ہے۔ وہ یہاں نہ ہوتی تو میں شاید اپنا مشن اتنی آسانی سے پورا نہ کر سکتا۔ کہیں اُسے نہ پکڑوا دینا۔"

"بچا لوں گا یار!" — ایوب نے آنکھ مار کر کہا — "کچھ دن اپنے پاس رکھوں گا پھر اُسے گھر چھوڑ آؤں گا۔ یہ تو تم نے میری سوچ بنا دی ہے۔"

زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں تھا۔ زخمی ڈاکوؤں کو ایوب نے کہا۔ وہ فوراً بول پڑیں ورنہ اُن کے زخموں سے پٹیاں اُتار دی جائیں گی اور ان

نمک چھڑکیں گے۔ دونوں نے کہہ دیا کہ وہ پورا بیان دیں گے۔ ابھی اتنا ہی کہیں گے کہ انہوں نے رات نوابزادہ حمید اللہ خان کے ہاں گزاری تھی اور یہ ساری واردات اُسی نے کرائی تھی اور اُس کے ساتھ ایک اور بڑا خوبصورت جوان تھا جو کسی وقت تاجے ڈاکو کے ساتھ رہا تھا۔

اُن کے یہ بیان مجھے ایوب نے سناتے تھے۔ میں اُس وقت ایک طرف ہو گیا تھا۔ سلطان بھی اس پولیس فورس کے ساتھ آیا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی کلارک نے اس پھندے کو مکمل طور پر مُہلک بنانے کے لئے بڑی تیزی سے کارروائی کی تھی۔ میری اُس اطلاع پر جو میں نے سلطان کے ذریعے بھیجی تھی، ڈی ایس پی نے خود جا کر یہ انتظام کیا کہ ریل کار میں خزانے کی بجائے کم و بیش چالیس فوجی بھر کر ریل کار بھجوا دی۔ ڈرائیور کو معلوم تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ وہ بار بار اس لئے وِسلیں دیتا آ رہا تھا کہ ڈاکوؤں کو پتہ چل جائے کہ ریل کار آ رہی ہے۔ پولیس فورس بھاگنے والے ڈاکوؤں کو گھیرے میں لینے کے لئے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔

"سکندر بھائی!" —— سب انسپکٹر ایوب نے مجھے کہا —— "نوابزادے کی جاگیر کے قریب جا کر میں تمہیں ہتھکڑی لگا لوں گا تاکہ اُسے یہ شک نہ ہو کہ یہ سب تمہاری کارستانی تھی۔"

"ایوب بھائی!" —— میں نے کہا —— "یہ آپ کا کام ہے جو جی چاہے کریں۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ شہناز کو اس چکر سے پہلے ہی نکال لینا۔"

"نکال لوں گا یار!" —— ایوب نے بدمعاشی کے لہجے میں کہا —— "تمہارے لئے نہیں، اپنے لئے تو ضرور نکالوں گا۔"

"لیکن ایک خیال رکھنا" —— میں نے کہا —— "اب شہناز وہ شہناز نہیں رہی۔ اگر مجھے کسی نے یہ خبر سنائی کہ شہناز نے سب انسپکٹر ایوب کا پیٹ چاک کر دیا ہے تو مجھے ذرا سی بھی حیرت نہیں ہوگی۔ میں آپ کو خبردار کر رہا ہوں، مذاق نہیں کر رہا۔"

"دیکھا جائے گا یار!" —— ایوب نے کہا —— "اس ہیرے کو قانون کے حوالے نہیں کروں گا۔"

میں اور سب انسپکٹر ایوب ذرا بلند جگہ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ شہناز کے ساتھ مجھے ایسی دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے تھی کہ میں ایوب سے یہ کہتا کہ شہناز کو گرفتاری سے بچا لینا۔ اُس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا کہ وہ ڈاکوؤں کی ساتھی ہے۔ وہ اس واردات میں شامل بھی نہیں تھی لیکن اُس کی گرفتاری لازمی تھی۔ اُسے گرفتار کر کے شاملِ تفتیش کرنا تھا اور اس میں شہناز جیسی دلکش لڑکی کے لئے بہت خرابیاں تھیں۔

مجھے شہناز سے محبت تو نہیں تھی۔ میں نے تو اُسے ڈاکوؤں سے خراب کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن ایوب نے جب اُس کے متعلق بدنیتی سے باتیں کیں اور اُس نے خوشی کا اظہار کیا کہ اُسے شہناز مل گئی ہے تو مجھے ایوب پر غصہ سا آنے لگا۔ میں اپنے آپ کو شہناز کا محافظ سمجھنے لگا تھا اور کچھ ایسا احساس پیدا ہو گیا تھا جیسے شہناز کی آبرو میری آبرو ہو

ایسا کیوں ہوا؟ —— میں سمجھ نہیں سکا۔ میں آج بھی اس کا جواب نہیں دے سکتا کہ میرے دل میں شہناز کی اتنی ہمدردی کیوں پیدا ہو گئی تھی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ شہناز کو میں بہت خوبصورت لڑکی سمجھتا تھا۔ میں نے اُس سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں دیکھی تھیں لیکن شہناز کی آنکھوں میں، اُس کے چہرے اور سراپا میں جو تاثر تھا وہ میں نے آج تک اُس سے زیادہ حسین لڑکیوں میں بھی نہیں دیکھا۔

شہناز کو دیکھ کر تو پتھر بھی موم ہو جاتے تھے۔ تاجا بھی پتھر ہی تھا۔ اُس نے مجھے پہلا سبق یہ دیا تھا کہ عورت سے دُور رہنا لیکن شہناز اُس کے سامنے آئی تو یہ پتھر ٹوٹ گیا۔ ٹوٹا بھی ایسا کہ دوستیاں ٹوٹ گئیں اور دوستوں

نے ایک دوسرے کا خون بہادیا۔ تاجے نے شہناز سے پیار کی بھیک مانگی تھی۔

نوابزادہ حمید اللہ خان کے لئے خوبصورت لڑکیوں کی کیا کمی تھی لیکن وہ تو ایسے لگتا تھا جیسے شہناز نے اُسے ہپناٹائز کر لیا تھا اور وہ اُس کی اُنگلیوں پر ناچتا تھا۔ یہ شہناز کے سراپا کا تاثر تھا۔

میں شہناز کو لڑکی کہہ رہا ہوں۔ وہ تو اُس وقت ستائیس سال کی عورت بن چکی تھی لیکن لگتی مجھ سے چھوٹی تھی۔ اگر کوئی مجھے کہے کہ میں اُس کے حُسن کا اسیر ہو گیا تھا تو شاید میں انکار نہیں کروں گا لیکن میں اقرار بھی نہیں کروں گا۔ البتہ اُس نے اپنے دل میں میری محبت پیدا کر لی تھی جس کا رنگ پہلے کچھ اور تھا مگر اب اس میں اُس نے پاکیزگی پیدا کر لی تھی۔ میرے دل میں اس پاکیزگی کی قدر ضرور تھی —— جو کچھ بھی تھا، مجھے اس سے انکار نہیں کہ شہناز کے ساتھ میری وابستگی سی پیدا ہو گئی تھی اور میں اُسے گرفتاری سے اور شاملِ تفتیش ہونے سے ہی نہیں بلکہ سب انسپکٹر ایوب کی ہوس کاری سے بھی بچانا چاہتا تھا۔

✖

ایوب میرے پاس کھڑا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ ایک خوشی تو یہ تھی کہ اُس کا آپریشن کامیاب رہا تھا اور دوسری خوشی یہ کہ اُسے شہناز ملنے والی تھی۔ ایک انگریز لفٹیننٹ ہماری طرف آرہا تھا۔ یہ اُن فوجیوں کا کمانڈر تھا جو ریل کار میں آئے تھے۔ وہ سب گورے سپاہی تھے اور ان کی تعداد تیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ سب ریل کار سے اُتر آتے تھے اور ڈاکوؤں کی لاشوں کو دیکھتے پھر رہے تھے۔

ایوب ہندوستانی سب انسپکٹر تھا۔ اُس نے گورے لفٹیننٹ کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اُس کی طرف دوڑ پڑا اور اُس کے سامنے رُک کر ایڑیاں زور سے جوڑیں اور صاحب بہادر کو سیلوٹ کیا۔ اُس دَور میں گورے صاحب بہادر کو سیلوٹ یا سلام کرنا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ ایوب نے

میری طرف اشارہ کیا تو لفٹیننٹ صاحب بہادر نے سر کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔

میں دوڑا تو نہیں، تیز چلتا اُس تک پہنچا۔ اُس نے انگریزی میں بات کی۔ ہندوستانی فوج کے انگریز افسر اُردو بولا کرتے تھے لیکن یہ لفٹیننٹ گورا رجمنٹ کا تھا اس لئے اُردو نہیں جانتا تھا۔ ہمیں ٹریننگ کے دوران انگریزی بول چال کی بہت مشق کرائی گئی تھی۔

اُس نے مجھے شاباش دی۔ ایوب نے اُسے بتایا تھا کہ میں پولیس کی سپیشل برانچ کا آدمی ہوں اور اس آپریشن کی کامیابی دراصل میری کامیابی ہے کہ میں نے ڈاکوؤں کے دو خطرناک گروہوں کو اُن کے سرغنوں سمیت اکٹھا کیا اور مروا دیا ہے۔

لفٹیننٹ مجھے بادشاہوں کی طرح خراجِ تحسین پیش کر کے چلا گیا۔

ایوب ایک قدم پیچھے رہ کر اُس کے ساتھ ساتھ گیا اور میں ایک ٹیکری پر چلا گیا۔ میرے سامنے بڑا بھیانک منظر تھا۔ ریلوے لائن کے دونوں طرف ڈاکوؤں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ کوئی لاش اوندھے مُنہ پڑی تھی، کوئی پیٹھ کے بل اور کوئی پہلو کے بل پڑی تھی۔ گورے سپاہی لاشوں کو دیکھتے اور انہیں ٹھُڈ مارتے تھے۔ ایک آدمی ابھی مرا نہیں تھا۔ اُس نے سر اٹھایا۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ناکام رہا۔ ایک گورے نے اُس کے سر کے ساتھ رائفل کی نالی رکھی اور گولی چلا دی۔ اس کے بعد اس لاش میں حرکت نہ ہوئی۔

میں نے ایوب کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ چٹانوں کے اندر چھ سات اونٹ کھڑے ہوں گے جن پر گندم اور دالوں کی بوریاں لدی ہوں گی اور ایک اونٹ خالی ہوگا۔ ان اونٹوں کو پکڑ لیا گیا اور اس کے بعد لاشوں کو ایک جگہ اکٹھی کرنے کا کام شروع ہو گیا۔

میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایوب نے خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ انگریز لفٹیننٹ نے مجھے شاباش دی تھی۔ ابھی مجھے ڈی۔ ایس۔ پی اور ایس۔ پی

سے شاباش ملنی تھی لیکن میں ابھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ میں نے اچھا کیا ہے یا بہت بُرا کیا ہے۔ میں جب ڈاکوؤں کی لاشوں کو اور اُن کے درمیان گورے فوجیوں کو ایسے فاتحانہ انداز سے گھومتے پھرتے دیکھتا تھا کہ وہ لاشوں کو ٹھُڈ مارتے تھے تو مجھے کچھ ایسے بھی محسوس ہُوا جیسے میں نے فرنگی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنے لوگوں کے ساتھ غداری کی ہو۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ مجھے اپنے آپ پر غصّہ بھی آگیا تھا، افسوس سا بھی ہُوا تھا۔ پھر میرا دھیان شہناز کی طرف چلا گیا تھا۔

میرا ذہن کبھی بھٹک جاتا جیسے راستہ بھول گیا ہو اور کبھی یہ احساس بیدار ہو جاتا جیسے یہی میرا راستہ ہے اور منزل دُور نہیں لیکن دُھند سی تھی جو مجھے اچھی طرح دیکھنے نہیں دیتی تھی کہ آگے کیا ہے — میں دُھندلی راہوں پر چلا جا رہا تھا۔

✖

سب انسپکٹر ایوّب میرے پاس آیا۔ اُس کے ساتھ دس کانسٹیبل اور دو ہیڈ کانسٹیبل تھے۔ میرے پاس دونالی بندوق تھی اور میرا گھوڑا ایک طرف کھڑا تھا۔ میں شکاریوں کے روپ میں وہاں تک گیا تھا۔

"آجا سکندرا!" — ایوّب نے کہا — "اب یہ بندوق مجھے دے دے" — اُس نے میرے ہاتھ سے بندوق اور کارتوسوں کی بیلٹ لے لی اور کہنے لگا — "آؤ تمہارے یار کے پاس چلیں۔ قریب جا کر تمہیں ہتھکڑی لگاؤں گا۔"

"ایوّب بھائی!" — میں نے کہا — "مجھے ہتھکڑی لگائیں، میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈالیں، میں آپ کو آخری بار کہتا ہوں کہ شہناز کو اِدھر اُدھر کر دینا .... اور ایوّب بھائی! میں آپ کو یہ بھی آخری بار کہہ رہا ہوں کہ شہناز سے بچ کر رہنا۔"

ایوّب نے قہقہہ لگایا۔ اُس پر فتح کا موڈ طاری تھا۔ اُسے یقین تھا کہ جس طرح یہ آپریشن کامیاب رہا تھا اسی طرح وہ شہناز پر بھی فتح حاصل کر لے

گا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ شہناز اس قدر بدل گئی ہو گی کہ ایوّب کو دھتکار دے گی۔ یہ میرا اپنا احساس تھا۔ میں نے اُس میں کچھ تبدیلی دیکھی ضرور تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شہناز ایوّب کو اپنا محافظ سمجھ لے۔

"کلارک صاحب کو اطلاع دے دی ہے؟" — میں نے ڈی۔ ایس۔ پی کے متعلق پوچھا۔

"وہ آ رہا ہو گا" — ایوّب نے جواب دیا — "اُس نے وقت کا حساب رکھا ہُوا ہو گا۔"

پولیس کی یہ نفری دو پرائیویٹ لاریوں میں لائی گئی تھی۔ لاریوں کو کسی کچے راستے سے لایا گیا تھا تاکہ کوئی ڈاکو یا اُن کا کوئی مخبر پولیس کو نہ دیکھ سکے۔ لاریوں کو کہیں دُور کھڑا کیا گیا تھا۔ میں اور ایوّب اُس کے ہیڈ کانسٹیبلوں اور کانسٹیبلوں سے کچھ دُور کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

میری اصلیّت سے صرف ایوّب واقف تھا۔ پولیس کے باقی آدمی مجھے ڈاکوؤں کا آدمی سمجھ رہے تھے۔ ایوّب نے ایک لاری منگوائی۔ ان دو ہیڈ کانسٹیبلوں اور دس کانسٹیبلوں کو اس میں سوار کرایا اور مجھے بھی اپنے ساتھ لاری میں بٹھا لیا۔

✖

کچھ وقت بعد یہ لاری نوابزادہ حمید اللہ خان کی جاگیر میں داخل ہوئی۔ پھر اُس کے مکان کے سامنے جا رُکی۔ اُس وقت سب انسپکٹر ایوّب نے مجھے ہتھکڑی لگا لی تھی۔ وہ ہتھکڑی کی زنجیر ایک کانسٹیبل کے ہاتھ میں دے کر خود لاری سے اُتر گیا۔ وہ مکان کے برآمدے میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ اندر سے حمید اللہ نکل آیا۔ اُس نے ایوّب کے ساتھ اس طرح مسکرا کر ہاتھ ملایا جیسے وہ دونوں بڑے گہرے دوست ہوں۔ میں لاری میں برآمدے کی طرف بیٹھا ہُوا تھا۔ حمید اللہ اور ایوّب میرے اتنے قریب تھے کہ میں اُن کی باتیں اچھی طرح سُن سکتا تھا۔

"کیا خوبصورت جوان ہو تم بھائی!" — اُس ہیڈ کانسٹیبل نے جس نے میری ہتھکڑی کی زنجیر پکڑی ہوئی تھی، مجھے کہا — "پولیس میں بھرتی ہو

جاتے۔ فوج میں چلے جاتے ضرور ڈاکے مارتے تھے! تم جیسے خوبصورت جوانوں کی انگریز بہت قدر کرتے ہیں.... تم مالوے کے ساتھ تھے یا خانے کے ساتھ؟"

"اب بھرتی کرا دو حوالدار صاحب!" — میں نے بناوٹی سی سنجیدگی سے کہا

اُس نے معلوم نہیں کیا جواب دیا، میرے کان حمید اللہ اور ایوب کی طرف لگے ہوتے تھے۔

"کیا آپ کا دماغ ٹھکانے ہے انسپکٹر صاحب!" — حمید اللہ ایوب کی اس بات کا جواب دے رہا تھا جو میں نے نہیں سنی تھی۔ حمید اللہ نے کہا — "آپ کو شاید کسی نے بتایا نہیں کہ میں نام کا نوابزادہ نہیں۔"

"جانتا ہوں نوابزادہ صاحب!" — ایوب نے کہا — "میں آپ کے والد صاحب کو بھی بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ نواب ہیں اور آپ اُن کے فرزند ہیں لیکن میں کسی کی نشاندہی پر آیا ہوں۔"

"کون ہے میری نشاندہی کرنے والا؟" — حمید اللہ نے بڑے رُعب سے پوچھا۔

"ایک تو زندہ سلامت میرے ساتھ ہے" — ایوب نے کہا — دو شدید زخمی ہیں۔ وہ آپ کی نشاندہی کر کے بے ہوش ہو گئے ہیں۔ انہیں ریل کار پر آگے بھیج دیا گیا ہے تاکہ انہیں فوری طور پر ہسپتال پہنچا کر انہیں زندہ رکھا جاسکے کیونکہ وہ اس کیس میں نہایت اہم گواہ ہیں۔ اگر آپ خود نہیں مانیں گے تو اُن میں سے کسی ایک کو سلطانی گواہ بنا لیا جائے گا۔"

"کیا آپ وہ انسپکٹر ہیں جو اس علاقے کے تھانے میں ایس ایچ او لگے ہیں؟" — حمید اللہ نے پوچھا۔

"جی ہاں!" — ایوب نے جواب دیا — "میں وہی نیا ایس ایچ او ہوں اور میں وہ سب انسپکٹر ہوں جس نے سوا تین کے آپ کے تمام آدمی مار ڈالے ہیں.... آپ غالباً اس اطلاع کے انتظار میں ہوں گے

کہ ریل کار کو بڑی کامیابی سے لُوٹ لیا گیا ہے اور مال آپ کے پاس پہنچ رہا ہے لیکن آپ کی قسمت ایسی اُلٹی کہ ریل کار میں خزانے کی بجائے گورا رجمنٹ کے بیس پچیس آدمی آگئے جن کا کمانڈر ایک انگریز لفٹیننٹ تھا۔ ریل کار رُکی۔ آپ کے آدمی اُس کی طرف دوڑے۔ آگے سے رائفلیں اور مشین گنیں چلیں۔ پیچھے سے میری پولیس فورس نے آپ کے آدمیوں کو گھیرے میں لے لیا اور سب کو ختم کر دیا۔"

میں نے دیکھا کہ حمید اللہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا اور وہ باتوں اور حرکتوں سے اپنی نوابی برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایوب کو ڈانٹ رہا تھا۔ ایوب اسی علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او لگا تھا۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوتے تھے اس لئے حمید اللہ کے ساتھ اُس کی پہلے ملاقات نہیں ہوتی تھی ورنہ اپنے علاقے کے تھانیدار کو حمید اللہ اپنی مٹھی میں رکھا کرتا تھا۔ تھانہ حمید اللہ کی جاگیر سے کتنی میل دُور تھا۔ اُس کے تحت پولیس چوکیاں تھیں۔ ایسی ایک چوکی جاگیر کے قریب تھی۔

"اسے ادھر لاؤ" — ایوب نے ہیڈ کانسٹیبل سے میرے متعلق کہا۔ مجھے لاری سے اُتار کر حمید اللہ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔

"کیوں اوئے!" — ایوب نے مجھے کہا — "تم لوگ پہلے یہاں اکٹھے ہوتے تھے؟ نواب صاحب کو پہچانتے ہو؟"

"انسپکٹر صاحب!" — میں نے احتجاج کے لہجے میں کہا — "میں نہ آپ کو جانتا ہوں نہ نواب صاحب کو جانتا ہوں" — میں نے حمید اللہ سے کہا — "نواب صاحب! میں دلی سے اپنے ایک دوست کے ہاں آیا تھا۔ آج بدقسمتی سے اِدھر شکار پر آنکلا۔ مجھے ریلوے لائن کے قریب فائرنگ کی آواز آئی۔ میں نے گھوڑا اُس طرف دوڑا دیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ گورا رجمنٹ کے گوروں اور پولیس کی آپس میں لڑائی ہو گئی ہے لیکن وہ شاید ڈاکوؤں اور ان لوگوں کا مقابلہ تھا۔"

"اور آپ کو اس سب انسپکٹر نے دھر لیا" — حمید اللہ نے میری

بات کاٹ کر کہا۔

"دھر کیا لیا نواب صاحب!" —— میں نے کہا —— "یہ دیکھئے ہتھکڑی لگا کر یہاں لے آتے ہیں اور مجھ سے زبردستی منوانا چاہتے ہیں کہ میں ڈاکوؤں کا ساتھی ہوں اور ہم سب ڈاکو آپ کے گھر اکٹھے ہوتے تھے۔"

"لے جاؤ اسے!" —— ایوب نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا —— "تین چار سپاہی نیچے آؤ اور نوابزادہ کو پرے لے جاؤ" —— اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا —— "تم خود بولو گے۔ تمہاری زبان اپنے آپ اقبالی بیان دے گی..... لے جاؤ اسے لاری میں بٹھاؤ۔"

مجھے ڈی۔ ایس۔ پی کلارک نے کہا تھا کہ میں آپریشن کی کامیابی کی صورت میں حمیداللہ کے سامنے انجان اور بے گناہ بن جاؤں۔ یہ مجھے اس لئے کرنا تھا کہ مجھے گواہ یا ملزم کی صورت میں عدالت میں پیش نہیں ہونا تھا۔ میری اصلیت کو چھپانا مقصود تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ میری اصلیت ظاہر ہو گئی تو ڈاکوؤں کا کوئی آدمی یا مالوے اور خادے کا کوئی دوست مجھے قتل کر دے گا۔ حمیداللہ کے جرم میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ یہ تو میری جاسوسی تھی۔

✖

مجھے ہیڈ کانسٹیبل لاری میں لے گیا۔ دوسرا ہیڈ کانسٹیبل اور تین کانسٹیبل حمیداللہ کو دھکیلتے ہوئے برآمدے کے ایک کونے میں لے گئے۔ اِدھر میں پولیس کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا اُدھر حمیداللہ ایوب کو دھمکیاں دے رہا تھا کہ وہ اُس کی اس بدتمیزی کو معاف نہیں کرے گا اور اُسے پولیس سروس سے نکلوا دے گا۔

"ڈی۔ ایس۔ پی صاحب آنے والے ہیں نواب صاحب!" —— ایوب نے کہا —— "اب جو بات کرنی ہے اُن کے ساتھ کرنا۔ میں نے اس مکان کی تلاشی لینی ہے۔"

"تم میرے مکان میں داخل نہیں ہو سکتے" —— حمیداللہ خان چلانے لگا —— "تم دو ٹکے کے سب انسپکٹر میرے مکان کی تلاشی کی جرأت نہ

کرنا۔ اپنے ڈی۔ ایس۔ پی کو آنے دو۔"

ایوب اندر جا چکا تھا۔ وہ واپس آ گیا اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو آواز دی۔

"دو تین کانسٹیبلوں کو ساتھ لو" —— اُس نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا "یہاں جتنے مزارعے اور نوکر چاکر ہیں، سب کو یہاں لے آؤ۔"

وہ پھر اندر چلا گیا۔ تلاشی کا یہ طریقہ صحیح نہیں تھا۔ اُسے دو تین کانسٹیبلوں کو ساتھ رکھنا چاہیئے تھا۔ حمیداللہ کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔ برآمدگی کے دو گواہوں کی موجودگی بھی لازمی تھی، بلکہ اُسے ڈی۔ ایس۔ پی کا انتظار کرنا چاہیئے تھا۔ اُس نے غلط کارروائی کا خطرہ مول لیا تھا جس کی وجہ صرف میں جانتا تھا۔ وہ شہناز کو کہیں چھپانے کے لئے یا اُس کے ساتھ سودا بازی کرنے گیا تھا۔

ایوب پندرہ بیس منٹ بعد باہر آیا اور اُس نے حمیداللہ کو اپنے پاس بلایا۔

"نوابزادہ صاحب!" —— ایوب نے حمیداللہ سے کہا —— "میں آپ کی کچھ نہ کچھ عزت افزائی کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی ریوالور، رائفل یا بندوق بلا لائسنس رکھی ہوتی ہے تو خود ہی نکال دیں۔ اگر مسروقہ مال گھر میں موجود ہے تو اُس کی بھی نشاندہی کر دیں۔"

حمیداللہ نے اب غصے کا اظہار نہ کیا۔ وہ ایوب کو ذرا پرے لے گیا اور دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ ایوب جس طرح سر ہلا رہا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ حمیداللہ خان اُسے رشوت پیش کر رہا ہے اور وہ نہیں مان رہا۔ وہ مان ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ ایوب کا کیس نہیں تھا۔ یہ سپیشل برانچ کا کیس تھا اور یہ کوئی معمولی سی واردات نہیں تھی۔

ایوب نے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور پانچ کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور ایک بار پھر مکان کے اندر چلا گیا۔ اب اندر سے جو آوازیں آنے لگیں، ان سے پتہ چلتا تھا کہ اب ایوب صحیح تلاشی لے رہا ہے۔

وہ باہر آیا ہی تھا کہ ڈی۔ ایس۔ پی کلارک گھوڑے پر سوار آ گیا۔ اُس کے ساتھ اپنا سٹاف تھا۔ ایوب نے آگے بڑھ کر ڈی۔ ایس۔ پی کو سیلوٹ کیا،

پھر مجھے لاری سے اُتار کر اُس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ میں نے بولنا شروع کر دیا کہ اس سب انسپکٹر نے مجھے صرف اس لئے ہتھکڑی لگا لی ہے کہ میں وہاں کھڑا تھا جہاں ڈاکوؤں اور پولیس کا مقابلہ ہُوا تھا۔

"خانہ تلاشی ہو گئی ہے؟" — ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"ہو گئی ہے صاحب بہادر!" — ایوب نے کہا۔

"کچھ ملا؟"

"نہیں صاحب بہادر!" — ایوب نے جواب دیا — "اِس مکان میں بہت قیمتی سامان ہے لیکن یہ کہتا ہے کہ میں نوابزادہ ہوں اور بہت بڑا جاگیردار ہوں، یہ سب قیمتی سامان، زیورات وغیرہ میرے اپنے ہیں۔ اندر تین عورتیں ہیں۔"

"باہر لے آؤ" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا — "اور انہیں سی۔ آئی۔ اے کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچاؤ۔"

اس کے بعد کی کارروائی پولیس کی تفتیش اور دیگر کارروائی تھی۔ حمیداللہ کی جاگیر پر جو کوئی بھی موجود تھا اُسے لاری میں بٹھا لیا گیا۔ شہناز اور دوسری دو عورتوں کو بھی باہر لا کر لاری میں سوار کرا دیا گیا۔ مکان پر پانچ چھ کانسٹیبلوں اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کی گارد بٹھا دی گئی۔ مجھے سب سے الگ ڈرائیور کے پیچھے بٹھایا گیا۔ میں نے شہناز کو ایک ہی بار دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

لاری چل پڑی۔ اس میں ابھی بہت جگہ تھی۔ جائے واردات پر جا کر کئی اور کانسٹیبلوں کو اس لاری میں بھر دیا گیا اور لاری ہیڈ کوارٹر کو روانہ ہو گئی۔

×

پولیس کی سپیشل برانچ کا ہیڈ کوارٹر ملزموں اور مشتبہوں کے لئے جہنم سے کم نہیں تھا۔ وہاں خیریت سے وہی رہتا تھا جو شرافت سے اقبالِ جرم کر کے صحیح نشاندہیاں کر دیتا تھا اور جو پولیس کو چکر دینے کی کوشش کرتا تھا

اُس کا سر ساری عمر چکراتا رہتا تھا۔ جاگیر سے لاتے جانے والوں کو تفتیشی کمروں میں لے گئے۔ مجھے ایوب ڈی۔ ایس۔ پی کے دفتر میں لے گیا اور میری ہتھکڑی کھول دی گئی۔ کچھ دیر بعد ڈی۔ ایس۔ پی بھی آ گیا۔ اُس نے مجھے اِس طرح خراجِ تحسین پیش کیا کہ مجھے گلے لگا لیا۔

"تم نے ایک ہی بار ڈاکوؤں کے دو گروہ تباہ کرا دیتے ہیں" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا — "ہم سفارش کریں گے کہ تمہیں اور سلطان احمد کو سب انسپکٹر بنا دیا جاتے ..... ہم تم دونوں کو نقد انعام بھی دلائیں گے ..... سب انسپکٹر ایوب! تمہارا کام ختم ہو گیا ہے۔ تمہیں مقدمہ تیار کرنے اور عدالت میں چالان پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔"

"کیوں صاحب بہادر؟" — ایوب نے پوچھا۔

"جن زخمی ڈاکوؤں نے بتایا تھا کہ یہ دونوں گروہ نوابزادہ حمیداللہ کی جاگیر پر اکٹھے ہوتے تھے وہ دونوں زخمی ہسپتال میں پہنچتے ہی مر گئے ہیں" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا — "باقی سب مشتبہ ہیں۔ سپیشل برانچ ان کی چھان بین کر لے گی۔ یہ کام میرا اور تمہارا نہیں لیکن کیس ہمارے علاقے کا ہے اس لئے ہمیں کچھ دن سپیشل برانچ کے ساتھ رہنا پڑے گا۔"

"گستاخی معاف صاحب بہادر!" — سب انسپکٹر ایوب نے ڈی۔ ایس۔ پی سے پوچھا — "نوابزادہ حمیداللہ خان کا کیا بنے گا؟ ..... صاحب بہادر! میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ یہ شخص اور اس کی جاگیر میرے علاقے میں ہے۔"

"تم فکر نہ کرو" — ڈی۔ ایس۔ پی نے جواب دیا — "اس کے متعلق بعد میں حکم ملے گا۔"

نوابزادہ کے متعلق بعد میں جو حکم ملا وہ یہ تھا کہ وہ تینوں عورتوں کو جن میں شہناز بھی شامل تھی اپنے ساتھ لے کر اپنی جاگیر پر واپس چلا جاتے اور آئندہ مجرموں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ رکھے لیکن یہ فیصلہ پانچ چھ دنوں بعد ہُوا تھا۔ ان پانچ چھ دنوں میں نوابزادے کا حال حلیہ اس قدر بگڑ چکا تھا کہ وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ مجھے اور سلطان احمد کو تو بالکل ہی الگ تھلگ

کر دیا گیا تھا لیکن وہاں جو کچھ ہُوا وہ پتہ چلتا رہا۔

حمیداللہ خان کے باپ کو بلایا گیا تھا اور اُسے بتایا گیا کہ اُس کا بیٹا ڈاکوؤں کی پرورش کر رہا ہے اور اپنی جاگیر کو اُس نے ڈاکوؤں کا اڈہ بنا رکھا ہے۔ اُس کے باپ نے کہا تھا کہ اپنے اس بیٹے کے اعمال کا وہ ذمہ دار نہیں۔ نواب سے آئی جی باز پُرس کر رہا تھا۔ اُس نے جب کہا کہ وہ اپنے بیٹے کے اعمال کا ذمہ دار نہیں تو آئی جی اُس پر برس پڑا۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ نواب اور مہاراجے اپنی رعایا کے لئے فرعون سے کم نہیں ہوتے تھے لیکن یہ انگریزوں کی جوتیاں چاٹتے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان پر اپنے پنجے گہرے اتارے رکھنے کے لئے انہیں ریاستوں کی حکومتیں دی تھیں یہ نواب اور مہاراجے اپنی رعایا کا خون محصولات اور دیگر ٹیکسوں اور بیگار کے ذریعے نچوڑتے رہتے اور صحیح معنوں میں قارون کے خزانے اکٹھے کئے رکھتے تھے۔ انگریز اپنی قسم کی بنیا قوم تھی۔ حکومتِ برطانیہ ان سے کسی نہ کسی بہانے رقم بٹورتی رہتی تھی۔

"دیکھو نواب!" ـــــ انگریز آئی جی نے آنکھیں دکھا کر کہا ـــــ "تمہیں ہائی نس ہم نے بنایا ہے .... وہ تمہارا بیٹا ہے۔ ہم اُس کے ساتھ تمہیں بھی جیل میں بند کر سکتے ہیں۔ یہ کیس گورنر صاحب بہادر تک گیا ہے اور وہاں سے حکم آیا ہے کہ تم ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ سرکاری خزانے میں بطور تاوان جمع کرا دو۔ پھر یہ کیس ختم کر دیا جائے گا، لیکن یہ کیس تمہارے اور تمہارے بیٹے کے خلاف کاغذوں میں درج رہے گا۔"

یہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ آج کے حساب سے پچاس ساٹھ لاکھ روپے کی رقم بنتی تھی۔ انگریز افسروں نے دیکھا کہ جو گواہ تھے وہ مارے گئے ہیں اور کیس عدالت میں نہیں لے جایا جا سکتا اس لئے انہوں نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ وصول کر لیا۔ نواب کے لئے اتنی رقم کی ادائیگی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اُس نے اپنے خزانے کا یہ نقصان اپنی رعایا کا خون چوس کر پورا کر لینا تھا۔ اُس کے پاس رقم بٹورنے کا ایک ذریعہ اور بھی تھا۔ اُس کے حرم میں ایک سے ایک

خوبصورت عورت موجود تھی۔ وہ خود آخری عمر کو پہنچ گیا تھا۔ تین چار عورتوں کو بیچ کر اُس نے اپنا خزانہ پھر بھر لینا تھا۔

یہ تاوان تو حمیداللہ کے باپ نے ادا کرنا تھا جو اُس نے مقررہ وقت سے پہلے ادا کر بھی دیا تھا لیکن سپیشل برانچ کے تفتیشی کمرے میں جو حالت حمیداللہ کی کر دی گئی تھی وہ اتنی بُری تھی کہ اُس کے دماغ سے نوابی کیڑا نکل گیا تھا۔ اُس نے ڈی۔ ایس۔ پی اور ایس۔ پی کے ساتھ بھی اُسی طرح بدتمیزی سے بات کی تھی جس طرح ایوب کے ساتھ کرتا رہا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی کلارک نے پولیس کے ایک گورے انسپکٹر اور ایک گورے سارجنٹ سے کہا تھا کہ اس کا دماغ درست کریں لہٰذا انہوں نے اُس کا دماغ ضرورت سے زیادہ صحیح کر دیا تھا۔

✖

مجھے صرف شہناز کے متعلق فکر تھا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ شہناز جیسی حسین عورت تفتیش کے دوران تفتیش کرنے والوں سے اپنی آبرو بچا رکھتی۔ ڈی۔ ایس۔ پی کلارک مجھ سے متاثر تھا اور اب اس کامیابی کے بعد وہ اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ مجھ سے مشورے بھی لیتا تھا۔ یہ مجھ پر اللہ کا خاص کرم تھا جس کی ذاتِ باری نے مجھے اتنی ذہانت عطا فرماتی تھی۔ اس کیس کی صورت ایسی بن گئی تھی کہ تفتیش تحقیقات کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ یہ تحقیقات یعنی انکوائری ایس۔ پی اور ڈی۔ ایس۔ پی کلارک کر رہے تھے۔ اس میں میرا بیان سب سے اہم تھا۔ مجھے تو یہ نظر آ رہا تھا کہ حمیداللہ خان کی جاگیر بحق سرکار ضبط ہو جائے گی۔ اُس کے باپ کی نوابی ختم ہو جانے کا خطرہ بھی نظر آ رہا تھا لیکن انگریز بادشاہ نے یہ سوچ کر کہ ڈاکو اپنے سرداروں سمیت مارے گئے ہیں یعنی اصل مقصد پورا ہو گیا ہے، اپنے خزانے کے لئے ڈیڑھ لاکھ روپیہ حاصل کر لیا۔

انگریزوں نے تو اپنا مقصد پورا کر لیا تھا لیکن میرا مقصد ابھی ادھورا تھا۔ میں نے شہناز کو بچانا تھا۔ میں نے اس کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ڈی۔ ایس۔ پی

کلارک سے کہا کہ وہ مجھے کوئی انعام نہ دیں۔ میں نے جو کر دکھایا ہے یہ میرا فرض تھا۔ میری ایک بات سُن لیں۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے پوری توجہ سے میری بات سُنی۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" —— ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ شہناز نام کی جو عورت جاگیر سے برآمد ہوئی ہے اُسے شاملِ تفتیش نہ کیا جائے" —— میں نے کہا —— "میں اس کے متعلق پوری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

ڈی۔ ایس۔ پی ذرا سا چونکا اور میں نے اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی۔

"نہیں صاحب بہادر!" —— میں نے کہا —— "غلط نہ سمجھیں۔ ایسی کوئی بات نہیں .... آپ کو میری وہ کہانی یاد ہوگی جو میں نے اپنے متعلق آپ کو سنائی تھی۔ اُس وقت میں نے آپ کو یہ بتایا تھا کہ میری سوتیلی ماں نے مجھے اغوا کرایا اور مالوے کے اڈے تک پہنچایا تھا۔ اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ سوتیلی ماں یہی شہناز تھی۔"

ڈی۔ ایس۔ پی ایک بار پھر چونکا لیکن اب اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ چہرے پر سنجیدگی کا گہرا تاثر آگیا تھا۔

"تم فکر مت کرو سکندر!" —— ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا —— "میں اس عورت کو ایسی سزا دوں گا کہ تمہارا انتقام پورا ہو جائے گا۔"

"نہیں صاحب بہادر!" —— میں نے کہا —— "میں انتقام نہیں لینا چاہتا۔ میں اُسے بچانا چاہتا ہوں۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اُسے شاملِ تفتیش کیا جائے۔"

"کیا کہہ رہے ہو سکندر!" —— کلارک نے حیران سا ہو کے پوچھا —— "کیا تم ایک مجرم عورت کو بچانا چاہتے ہو جس نے تمہیں مالوہ جیسے ڈاکو تک پہنچایا تھا اور اب حمید اللہ جیسے مجرم کے ساتھ ہے؟ یہ معمولی مجرم عورت نہیں۔"

"صاحب بہادر!" —— میں نے آہ بھر کر کہا —— "میں اس عورت کو مجرم بننے سے بچا رہا ہوں۔ اگر سزا دینی ہے تو اس کی ماں کو دی جائے جس نے اس لڑکی کو دھوکے اور فریب سے پیسہ کمانے کا ذریعہ بنایا تھا اور اس کے ہاتھوں میرے باپ کو زہر دلوایا تھا۔ اس کی ساری سزا اس لڑکی کو ملی" —— میں نے ڈی۔ ایس۔ پی کو تفصیل سے بتایا کہ ماں نے شہناز کو کس طرح سیٹھ ابراہیم کے ہاتھ بیچا تھا اور میں کس ڈرامائی طریقے سے اور کس ارادے سے شہناز کو وہاں سے نکال لایا تھا اور اس پر کس طرح تاجا قتل ہُوا اور یہ حمید اللہ کے قبضے میں آئی۔

"صاحب بہادر!" —— میں نے کہا —— "میں اپنے مشن پر حمید اللہ کے ہاں گیا تو شہناز مجھے وہاں ملی۔ میں نے دیکھا کہ شہناز کا دماغ درست ہو چکا تھا اور اس کے سارے بل نکل گئے تھے۔ اسے وہاں کوئی پریشانی نہیں تھی بلکہ حمید اللہ اس پر اس حد تک فریفتہ ہو گیا کہ یہ اس کے دماغ پر، دل پر اور اعصاب پر چھا گئی۔ اس کے باوجود یہ مطمئن نہیں تھی۔ گناہ جو اس سے ماں نے کراتے تھے وہ اسے ڈس رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر یہ میرے پاؤں میں تو نہ گری لیکن اس نے اپنے انداز میں ماؤں والا تقدس پیدا کر لیا اور میرے ساتھ اس طرح پیار کیا جس میں بدی کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہے ....

"صاحب بہادر! میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں ایک دو موقعوں پر اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا لیکن شہناز نے مجھے احساس دلا دیا کہ اب اُس کی محبت میں وہ بات نہیں رہی جو اُس وقت تھی جب میرے باپ کے گھر میں اُس نے مجھے اپنی ہوس کے جال میں پھانسنے کی کوشش کی تھی۔"

"کیا تمہارے مشن میں اس نے تمہاری مدد کی تھی؟" —— ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"نہیں صاحب بہادر!" —— میں نے کہا —— "میں ایسا کچا تو نہیں کہ ایک عورت کو اپنے مشن میں شامل کر لیتا۔ میں نے اسے بھی یہی یقین

دلایا تھا کہ میں ڈاکوؤں کا گروہ بنانے کے لئے آیا ہوں۔"

"کیا یہ تیار ہو گئی تھی؟"

"ہاں صاحب بہادر!" ——— میں نے جواب دیا ——— "یہ اس لئے تیار ہو گئی تھی کہ اس کا اور کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔"

"اپنے ماں باپ کے پاس کیوں نہ چلی گئی؟"

"کیونکہ اُس کی ماں نے اُسے پھر کسی کے ہاتھ بیچ دینا تھا"... میں نے جواب دیا ——— "یہ تو اپنی ماں کو کوستی ہے۔ اُس کا نام تک نہیں سننا چاہتی۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ یہ حمید اللہ کے پاس رہی تو اسے سیدھے راستے پر لے آئے گی۔ میں اسے اس مقصد کے لئے استعمال کر سکتا ہوں۔"

"سکندر!" ——— ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا ——— "تم میں ایک عام آدمی کی نسبت زیادہ عقل ہے اور تم میں ذہانت اوسط درجہ سے زیادہ ہے لیکن تجربے کے لحاظ سے تم ابھی بچے ہو۔ تم حمید اللہ کو سیدھے راستے پر لانا چاہتے ہو لیکن یہ نوابزادے کُتے کی دُم کی طرح کبھی سیدھے نہیں ہو سکتے۔ ہوگا یہ کہ لڑکی سیدھے راستے پر چلتے چلتے حمید اللہ کے راستے پر آجائے گی۔"

"میرا خیال ہے صاحب بہادر!" ——— میں نے کہا ——— "حمید اللہ جس حالت میں یہاں سے جائے گا یہ اُسے سیدھے راستے پر رکھے گی۔"

"نہیں" ——— ڈی ایس پی نے ہنس کر کہا ——— "تم نہیں جانتے۔ اس شخص کی ہم ہڈیاں توڑ کر گھر بھیجیں گے تو یہ بستر پر پڑا بدمعاشیاں کرے گا۔"

انگریز افسر، اور وہ بھی پولیس کے انگریز افسر کسی بڑے سے بڑے ہندوستانی کو اتنی بحث کا موقع نہیں دیا کرتے تھے جو یہ انگریز ڈی ایس پی مجھے دے رہا تھا۔ میں نے پہلے بھی اس کی وجہ بیان کی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ میں پولیس کے ان انگریز افسروں کے لئے مُشک لینے والا وہ کُتا تھا جو مُشک سے کر شکار تک پہنچتا ہے اور اُسے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ کلارک نے مجھ میں یہ خوبی دیکھ لی تھی۔ اُس نے میری بات مان لی اور شہناز کو

تفتیش سے الگ کر دیا۔ میں شہناز سے نہیں مل سکتا تھا۔ میں تو اُس کے سامنے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ سوچ رہی ہو گی کہ میں حوالات میں بند ہوں اور نہ جانے کتنے برسوں کے لئے جیل چلا جاؤں گا۔ بہرحال میں نے پتہ کروا لیا تھا۔ شہناز کو الگ کمرے میں رکھا گیا جہاں اُس کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں ہوتی تھی اور اُسے کھانا بھی اچھا دیا جا رہا تھا۔

"ایک بات ابھی سُن لو سکندر!" ——— ڈی ایس پی کلارک نے کہا ——— "حمید اللہ وغیرہ کو ذرا سا بھی شک نہیں ہونے دیا گیا کہ تم ان کے ساتھی نہیں بلکہ ہمارے آدمی ہو۔ میرا خیال ہے کہ حمید اللہ کو چھوڑ دیا جائے گا لیکن اُس سے اور اُس کے باپ سے کچھ تاوان وصول کیا جائے گا، اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو چند دنوں بعد تم اُس کے پاس اُس کی جاگیر میں جاؤ گے اور یہ تاثر دو گے کہ کوئی گواہ نہ ہونے کی وجہ سے تمہیں بھی چھوڑ دیا گیا ہے اور تم اُس سے پوچھو گے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ اس طرح تم کچھ دن اُس کے پاس رہ کر جائزہ لو گے کہ اس کے ارادے کیا ہیں.... یہ حکم تمہیں بعد میں ملے گا۔"

×

شہناز کے متعلق مجھے اطمینان ہو گیا۔ اس کے بعد حمید اللہ کو بھی تاوان کی وصولی کے بعد چھوڑ دیا گیا اور وہ تینوں عورتوں کو اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔

اس دوران ایوب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اُس نے مجھے وہ باتیں بتائیں جو اُس کے اور شہناز کے درمیان حمید اللہ کے ہاں ہوتی تھیں۔ ایوب اکیلا حمید اللہ کے گھر میں چلا گیا تھا۔

"تم بھی بدمعاش ہو گئے ہو سکندر یار!" ——— اُس نے کہا ——— "تم نے دیکھا تھا کہ میں حمید اللہ کے گھر خانہ تلاشی کے لئے چلا گیا تھا؟"

"میں سمجھ گیا تھا" ——— میں نے کہا ——— "آپ شہناز کے ساتھ بات کرنے گئے تھے۔"

"ہاں" ——— ایوب نے کہا ——— "میں تو کوئی اور نیت لے کر بھی

گیا تھا لیکن پتہ چلا کہ اُس پر تمہارا جادو سوار ہے۔ مجھے تو امید تھی کہ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے ساتھ لپٹ جائے گی اور میرے اشاروں پر ناچے گی لیکن اُس نے مجھے دیکھتے ہی غصّے میں پوچھا کہ سکندر کہاں ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ پکڑا گیا ہے اور میں نے اُسے ہتھکڑی لگا لی ہے اور وہ باہر لاری میں بیٹھا ہے۔"

سب انسپکٹر ایوب نے مجھے یہ ملاقات تفصیل سے سنائی اور وہ بہت حیران ہو رہا تھا کہ شہناز میں یہ تبدیلی کیسے آگئی ہے۔ ایوب کا خیال تھا کہ شہناز مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہوگی اور وہ خوش ہوگی کہ سکندر گرفتار ہو گیا ہے۔ جونہی ایوب نے اُسے بتایا کہ اُس نے مجھے ہتھکڑی لگا لی ہے، شہناز کے چہرے سے جیسے شعلے نکلنے لگے ہوں۔

"پہلے اُس کی ہتھکڑی کھولو" ـــ شہناز نے ایوب سے کہا ـــ "پھر میرے سامنے آنا ..... مجھے معلوم تھا کہ تم کہیں تھانیدار لگ گئے ہو۔ تمہیں اپنے ہی شہر کے آدمی کو گرفتار کرتے شرم آنی چاہئے تھی۔"

"کیا تم خوش نہیں ہوتیں کہ میں نے تمہارے دشمن کو گرفتار کیا ہے؟" ـــ ایوب نے پوچھا۔

"سکندر کو گرفتار کرنے والا میرا دشمن ہے" ـــ شہناز نے کہا ـــ "جب تک اُس کی ہتھکڑی نہیں کھولو گے میں تمہاری صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کروں گی۔"

"ہوش میں آؤ شہناز!" ـــ ایوب نے کہا ـــ "میں نے تو نوابزادہ حمید اللہ کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔ میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں ایک طرف کر دوں۔ یہ میری اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ سکندر کے مُنہ سے نکل گیا تھا کہ تم یہاں ہو۔ میں تمہیں اس طوفان سے نکالنے آیا ہوں جو اُس جاگیر کو اپنے ساتھ اُڑا لے جائے گا۔ تمام ڈاکو، خادا اور مالوہ بھی مارے گئے ہیں۔ اُن کا ریل کار پر حملہ ناکام رہا ہے۔ فوج اور پولیس نے ان سب کو وہیں ختم کر دیا ہے۔ سکندر زندہ پکڑا گیا ہے۔"

"کیا سکندر تمہیں یہاں لایا ہے؟" ـــ شہناز نے پوچھا۔

"نہیں" ـــ ایوب نے جواب دیا ـــ "وہ تو کچھ بتاتا ہی نہیں۔ دو زخمی ڈاکوؤں نے بتایا ہے کہ یہ تمام آدمی رات حمید اللہ کے گھر یعنی اُس مکان میں رہے ہیں۔"

ایوب نے مجھے بتایا کہ شہناز پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو چکی تھی جیسے اُس کا ذہن اُس کے قابو سے نکل گیا ہو۔ اُس نے لپک کر دونوں ہاتھ ایوب کے کندھوں پر رکھے اور اُسے زور زور سے جھنجھوڑا۔

"کیا سکندر بھی زخمی ہے؟" ـــ شہناز نے بے قرار اور پریشان ہو کر پوچھا ـــ "کہاں ہے سکندر؟ خدا کے لئے مجھے دکھا دو۔ میں اُس کے خون کے ایک قطرے کی جگہ اپنا سارا خون قربان کر دوں گی" ـــ وہ پاگلوں کی طرح ایوب کو جھنجھوڑ رہی تھی۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے" ـــ ایوب نے اُسے بتایا ـــ "کیا تم اُس کے لئے اتنی پاگل ہو رہی ہو؟ آخر میرے ساتھ بھی تمہارا کوئی تعلق کبھی رہا ہے۔"

"ہاں ہاں" ـــ شہناز نے غصیلی آواز میں کہا ـــ "تمہارے ساتھ میرا ناجائز تعلق رہا ہے لیکن سکندر کے ساتھ میرا ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"خدا کے لئے شہناز!" ـــ ایوب نے اُسے کہا ـــ "کہیں چھپ جاؤ۔ مجھے تمہاری عزّت کا خیال ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں بھی گرفتار کیا جائے۔"

"میں کہتی ہوں سکندر کو چھوڑ دو، مجھے گرفتار کر لو" ـــ شہناز نے کہا ـــ "میں چھپوں گی نہیں۔"

ایوب نے اُسے شاملِ تفتیش ہونے سے بچانے کی کوشش تو کی تھی لیکن ایوب کی نیّت نیک نہیں تھی۔ وہ شہناز سے معاوضہ لینا چاہتا تھا۔ شہناز کوئی شریف لڑکی تو نہیں تھی لیکن میں یہ سُن کر حیران رہ گیا کہ میرے متعلق شہناز کے جذبات اس قدر شدید تھے۔ اُس نے چھپ جانے کی بجائے ایوب کو مجبور کر دیا کہ وہ اُس کے گھر سے نکل جائے۔

"شہناز کو جب یہاں لایا گیا تو بھی میں نے اُس کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی"— ایوب نے مجھے بتایا —"لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تمہارا اثر ورسوخ چل گیا تھا۔ اُسے شہزادیوں کی طرح الگ کمرہ دے دیا گیا اور اُس کی خاطر تواضع شروع ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ کلارک صاحب پر شہناز کا اپنا جادو چل گیا ہو گا۔"

"اگر یہ جادو ہی تھا"— میں نے کہا —"تو ہر طرف اور ہر کسی پر میرا ہی جادو چلا ہے۔ اب آپ شہناز کو دل سے اُتار دیں۔"

"تم کہتے ہو دل سے اُتار دوں"— ایوب نے کہا —"وہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ اُس نے میری توہین کی ہے۔ میں اُسے اُسی سطح پر لے آؤں گا جہاں وہ اپنے شہر میں میرے ساتھ ہوا کرتی تھی۔"

"اس کے لئے تو آپ کو حمید اللہ کی جاگیر پر جانا پڑے گا"— میں نے کہا۔

"وہ تو میں جاؤں گا ہی"— ایوب نے کہا —"وہ جاگیر میرے علاقے میں ہے۔ میں اِن نوابزادوں کو جانتا ہوں۔ بدمعاشی کرنے سے یہ لوگ باز نہیں آسکتے۔ میں ان سے کھاؤں پیوں گا اور شہناز کو مٹھی میں لے لوں گا۔"

✖

آخر یہ معاملہ بالکل ہی ختم ہو گیا۔ ایوب واپس اپنے تھانے میں چلا گیا۔ میری اور سلطان احمد کی جوڑی پکی ہو گئی۔ سپیشل برانچ کے لئے ہم دونوں ہیرو بن گئے۔

دس بارہ دن گزرے ہوں گے کہ سپیشل برانچ کے ایس۔ پی صاحب کی طرف سے بلاوا آگیا۔ سلطان احمد کو بھی بلایا گیا تھا۔

"تم دونوں کو ہم سب انسپکٹر بنا چکے ہیں"— ایس پی نے کہا —"رینک بڑھ جانے سے ذمہ داریاں بھی بڑھ جایا کرتی ہیں۔ ہم بہت خوش ہیں کہ تم دونوں نے پہلا ہی کام پوری کامیابی سے کیا ہے۔ اب جو کام ہم تمہیں دے رہے ہیں یہ مشکل نہیں، تھوڑا سا خطرہ ضرور ہے ..... خطرہ تمہارے لئے

ہے سکندر! تمہیں ہم اُسی جگہ بھیج رہے ہیں جہاں تم نے پہلا مشن مکمل کیا تھا۔ کسی کو تمہاری اصلیت کا علم تو نہیں پھر بھی تمہیں اپنی حفاظت خود کرنی پڑے گی۔ سلطان احمد پہلے کی طرح تمہارے اِرد گرد اُسی بہروپ میں رہے گا۔ تم دونوں کے کپڑوں کے اندر ریوالور ہوں گے۔ جان کے خطرے کی صورت میں تم جسے ضرورت محسوس کرو، گولی مار سکتے ہو۔"

ہمیں کام یہ بتایا گیا کہ مجھے حمید اللہ کے ہاں جا کر یہ دیکھنا تھا کہ اب وہ کیا کر رہا ہے۔ خطرہ یہ تھا کہ وہ پھر ڈاکوؤں کا کوئی اور گروہ بنا رہا ہو گا یا کوئی انتقامی کارروائی سوچ رہا ہو گا۔ ایس۔ پی نے ہمیں ہدایات دیں۔ ڈی۔ ایس۔ پی کلارک اپنے علاقے کے ہیڈ کوارٹر میں تھا۔ ہمیں اُس کے پاس جانا تھا۔ ہم دوسرے ہی دن روانہ ہو گئے اور کلارک کے پاس پہنچ گئے۔

"ہمیں حمید اللہ خان کے متعلق تھانے کے مخبر کوئی صحیح رپورٹ نہیں دے رہے"— ڈی۔ ایس۔ پی کلارک نے ہمیں کہا —"کچھ مشکوک سی رپورٹیں ملی ہیں۔ حمید اللہ خان کوئی نہ کوئی کارروائی ضرور کر رہا ہے۔ اگر وہ ڈاکوؤں کا کوئی اور گروہ نہیں بنا رہا تو ہمیں شک ہے کہ اُس نے دہشت گردوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق ضرور پیدا کر لیا ہے ..... دہشت گردوں کے متعلق تمہیں ٹریننگ میں بھی سب کچھ بتایا گیا تھا اور ٹریننگ کے بعد بھی۔ ہمیں یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ اُسے تمہارے متعلق ابھی تک معلوم نہیں کہ ڈاکوؤں کو موت کے جال میں لانے والے تم تھے۔"

میں معمولی سے کپڑے پہن کر روانہ ہو گیا اور حمید اللہ کی جاگیر پر جا پہنچا۔ سلطان احمد نے جوتشیوں والا بھیس بدل لیا اور وہ بھی روانہ ہو گیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی کے انتظام کے تحت سلطان احمد کو ایک گاؤں کے نمبردار کے ساتھ رابطہ رکھنا تھا۔

✖

میں جب حمید اللہ کے ہاں پہنچا تو وہ گھر نہیں تھا۔ شہناز برآمدے میں کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر میری طرف دوڑ پڑی اور دوسرے ہی لمحے میں

اُس کے بازوؤں میں تھا۔ اُس کا انداز بالکل اُس ماں جیسا تھا جس کا جوان بیٹا جنگ سے واپس آیا یا بہت مدت بعد چھٹی آیا ہو۔ اُس نے مجھے سَر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ میں ٹھیک تو ہوں۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ حمیداللہ کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ گزشتہ شام سے کسی کام سے شہر چلا گیا تھا اور آج شام اُس نے واپس آنا ہے۔ شہناز کی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ ایک بات شروع کرتی اور اسے چھوڑ کر کچھ اور کہنے لگتی۔ اُس کا ذہن سوالوں اور باتوں سے بھرا پڑا تھا اور وہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی کہ کون سی بات پہلے کرے۔

"مجھے تو کسی نے بتایا تھا کہ تمہیں دس سال جیل ہو گئی ہے"—— شہناز نے کہا۔

"کس نے بتایا تھا؟"—— میں نے پوچھا —— "ایوب نے تو نہیں بتایا؟"

"ایوب نے کھُل کر تو نہیں بتایا"—— شہناز نے کہا —— "لیکن اُس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ تم یہیں کہیں گھوم پھر رہے ہو اور تمہیں سزا نہیں ہوتی۔ میں نے ایوب سے کئی بار تمہارے متعلق پوچھا تھا۔ ہر بار وہ گول مول سا جواب دیتا تھا۔ صرف ایک بار اُس نے کہا کہ سکندر کو اگر ابھی تک سزا نہیں ہوتی تو جلدی ہی ہو جائے گی اور یہ سزا دس سال سے کم نہیں ہو گی۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ سکندر کو بھول جاؤ۔ اُسے اب تم ساری عمر نہیں دیکھ سکو گی۔"

"اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ وہ یہاں آتا رہتا ہے"—— میں نے کہا۔

"وہ کل بھی آیا تھا"—— شہناز نے کہا —— "یہ کیس ختم ہونے کے بعد وہ کئی مرتبہ آ چکا ہے اور حمیداللہ کئی بار تھانے اُس کے پاس گیا ہے۔ حمیداللہ نے تو اُس کا ماہوار وظیفہ لگا دیا ہے جیسا وہ علاقے کے ہر تھانیدار کا لگا دیا کرتا ہے۔"

شہناز نے مجھے اُس وقت کی باتیں سنائیں جب ایوب مجھے گرفتار کر کے اُس کے پاس لے گیا تھا۔ یہ وہی باتیں تھیں جو ایوب مجھے پہلے سُنا

چکا تھا۔

"میں اُس کی نیت اُسی وقت بھانپ گئی تھی"—— شہناز نے کہا —— "تمہیں چھڑانے کے لئے میں نے سوچا تھا کہ اُسے ناراض نہ کروں اور جیسے وہ کہتا ہے ویسے ہی کروں لیکن صرف یہ سوچنے سے ہی مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے تمہیں میں نے گرفتار کرایا ہے اور میں کسی غیر کے ساتھ عیاشی کر رہی ہوں۔ اس سے مجھے غصہ آ گیا۔"

"اب بھی وہ اسی نیت سے آتا ہو گا"—— میں نے کہا اور پوچھا —— "حمیداللہ نے اس کے ساتھ دوستی کیسے کر لی ہے؟ اس نے تو حمیداللہ کو بڑے توہین آمیز طریقے سے پکڑا تھا۔ پھر پولیس کے پاس جا کر حمیداللہ کے ساتھ جو سلوک ہُوا، یہ اُسے نہیں بھولنا چاہیے تھا۔ حمیداللہ نے یہ سب کیسے برداشت کر لیا ہے؟"

"یہ تو میں نے بھی حمیداللہ سے کہا تھا کہ اس شخص سے مُنہ نہ لگاؤ"—— شہناز نے کہا —— "لیکن کچھ ایوب کی اپنی چالاکی ہے کہ اُس نے حمیداللہ کو دوست بنا لیا اور کچھ حمیداللہ کی یہ مجبوری ہے کہ ایوب اسی علاقے کا تھانیدار ہے جو کسی بھی وقت حمیداللہ کو پریشان کر سکتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد حمیداللہ کو پولیس کے ساتھ دوستی لگانے کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے.... لیکن سکندر! میں کوئی ایسی بچی تو نہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ میری خاطر آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُس میں ذرا سی بھی غیرت ہوتی تو اب نہیں آئے گا۔"

"کیوں نہیں آئے گا؟"—— میں نے پوچھا —— "کیا تمہارے ساتھ اُس کی لڑائی ہوتی تھی؟"

"لڑائی کیا ہونی تھی!"—— شہناز نے کہا —— "میں نے تو اُسے پہلے روز ہی دھتکار دیا تھا۔ وہ اُس وقت یہاں آتا رہا جب حمیداللہ گھر نہیں ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی مُخبر اُسے خبر دے دیتا ہے کہ اس وقت حمیداللہ گھر میں نہیں ہے۔ ایک روز ایسے ہُوا کہ حمیداللہ شہر گیا ہُوا تھا اور اکثر ایسے ہُوا کہ وہ جاگیر پر ہی ہوتا تھا۔ اس طرح میرے پاس اُسے اکیلے بیٹھنے کا

موقع ملتا رہا۔ اُس نے اپنی نیت کا اظہار پہلے دن ہی کر دیا تھا اور میں نے اُسے صاف جواب دے دیا تھا، لیکن وہ بالکل ڈھیٹ بنا رہا۔ دو مرتبہ اُس نے دست درازی بھی کی۔ ایک بار اُس نے ہنسی ہنسی میں مجھے پلنگ پر گرا دیا۔ میں نے اُس روز اس شخص کو ماں بہن کی گالیاں تو نہ دیں لیکن جس قدر بے عزتی میں کر سکتی تھی وہ کی۔ دو تین دن گزرے وہ آیا۔ حمید اللہ نہیں کہیں نکل گیا تھا۔ ایوب نے فضول سی ایک حرکت کی تو میں نے اُسے کھری کھری سنا ڈالیں اور اُسے یہ بھی کہا کہ وہ یہاں آنا چھوڑ دے یا مجھے پریشان کرنا چھوڑ دے نہیں تو میں حمید اللہ کو بتا دوں گی۔ یہ سُن کر وہ ہنستا رہا۔ اتنے میں حمید اللہ آ گیا اور وہ دونوں الگ بیٹھ گئے۔ اگر اُس میں شرم ہوتی تو اب نہیں آئے گا۔"

"ایوب کو یہ فائدہ حاصل ہے کہ وہ تھانیدار ہے" — میں نے شہناز سے کہا — "اگر تم حمید اللہ کو بتاؤ گی تو وہ ایوب سے باز پُرس نہیں کرے گا۔ مجرموں اور پولیس کی دُنیا کو تم نہیں سمجھتیں شہناز! حمید اللہ مجرم ہے بلکہ یہ اُس کا پیشہ ہے اور ایوب علاقے کا تھانیدار ہے جس سے حمید اللہ کو تحفظ مل سکتا ہے۔ تم حمید اللہ کی بیوی تو نہیں، وہ تو تمہیں اُکسا در غلا کر رشوت کے طور پر ایوب کو پیش کر دے گا۔"

"نہیں سکندر!" — شہناز نے کہا — "میرے ساتھ حمید اللہ ایسا سلوک نہیں کرے گا۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میرے ساتھ وہ کس طرح محبت کرتا ہے۔ کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے میرے سامنے اُس کی شخصیت ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس شخص میں وہ غیرت نہیں جو شریف لوگوں میں ہوتی ہے۔ اگر تم یہ سمجھ سکتے ہو کہ میرے دل میں تمہاری کتنی محبت ہے تو تم یہ بھی سمجھ جاؤ گے کہ حمید اللہ کے دل میں میری محبت کس دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوتی ہے..... میں نے تو اپنی باتیں شروع کر دی ہیں سکندر! مجھے اپنی بتاؤ۔ تمہارے ساتھ کیا گزری ہے اور اب تم کہاں ہو؟"

"مجھے جلدی ہی چھوڑ دیا گیا تھا" — میں نے کہا — "اور اب ویسے ہی گھومتا پھر رہا ہوں۔ روزگار کی تلاش ہے۔ اسی سلسلے میں حمید اللہ سے ملنے آیا ہوں۔"

"سکندر!" — شہناز نے کہا — "اب کوئی باعزت روزگار تلاش کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بچ گئے ہو۔"

اتنے میں حمید اللہ آ گیا۔ میں اس پریشانی میں گرفتار تھا کہ مجھے دیکھ کر حمید اللہ کا ردِ عمل اور رویّہ کیا ہو گا اور میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر حمید اللہ کو کسی نے اس شک میں ڈال رکھا ہے کہ میں پولیس کا آدمی ہوں تو حمید اللہ کا ردِ عمل بڑا ہی شدید ہو گا اور اُس صورت میں مَیں کیا کروں گا۔ میں نے اپنے کپڑوں کے اندر ریوالور چھپا رکھا تھا لیکن حمید اللہ نے مجھے دیکھا ہی تھا کہ دوڑ کر میری طرف آیا اور مجھے گلے لگا لیا۔

"یار، تم نے مجھے بڑی لمبی قید سے بچا لیا ہے" — حمید اللہ نے کہا — "اگر تم یہ نہ کہتے کہ تم مجھے جانتے ہی نہیں تو میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا تھا۔"

"اور آپ یہ تو نہیں جانتے کہ اس کی مجھے کیا قیمت دینی پڑی ہے" — میں نے کہا — "تین دن اور تین راتیں پولیس نے مجھے اُلٹا لٹکائے رکھا تھا..... کیا وہ بندوق اور گھوڑا جو میں شکار کا ڈھونگ رچانے کے لئے لے گیا تھا، آپ کو واپس مل گیا ہے؟"

"ہاں یار!" — حمید اللہ نے جواب دیا — "وہ ایوب نے واپس دلا دیا تھا۔ بندوق بھی واپس مل گئی تھی۔"

مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ حمید اللہ میری اصلیت سے ابھی تک واقف نہیں ہوا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اب میرے لئے کوئی ذریعۂ معاش تلاش کرو۔

"میرے پاس آ جاؤ" — حمید اللہ نے کہا۔

"نہیں خان صاحب!" — میں نے کہا — "میں کوئی کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہی کام شروع کرنے کا ارادہ تو نہیں؟" — حمید اللہ نے پوچھا۔

"اگر آپ کہیں گے تو وہی شروع کر دوں گا" — میں نے کہا — "لیکن پہلے یہ معلوم کرنا ہے کہ مخبری کس نے کی تھی۔"

"وہ تو سب مارے گئے ہیں" — حمید اللہ نے کہا — "مخبر اُنہی میں ہوگا۔"

"کیا بھولے بادشاہوں والی بات کر رہے ہیں خان صاحب!" — میں نے کہا — "مخبر مرنے کے لئے آگے نہیں جایا کرتے۔ وہ جو کوئی بھی ہے زندہ اور سلامت ہے۔ میرے دل کی بات پوچھیں تو میں یہی کام نیا گروہ بنا کر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کی کیا رائے ہے۔"

"نہیں سکندر!" — شہناز بیتابی سے بولی — "میں تم دونوں کو پھر اُس خطرے میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"میں پولیس سے انتقام تو ضرور لوں گا" — حمید اللہ خان نے کہا۔

میں بہت دیر تک اسی موضوع پر حمید اللہ کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ یہاں آنے کا میرا مقصد ہی یہی تھا کہ اس کے ارادے معلوم کروں۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ وہ مجرمانہ راستے کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ شہناز ہمیں روک رہی تھی۔ اتنے میں کھانے کا وقت ہوگیا۔ شہناز نے بڑا پُر تکلف کھانا تیار کروایا تھا۔

❖

کھانے کے بعد بھی کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ پھر سونے کا وقت ہوگیا۔ میں اُس کمرے میں جاکر لیٹ گیا جو مجھے دیا گیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ شہناز میرے پاس آئے گی لیکن وہ نہ آئی۔ اُسے حمید اللہ نے اپنے ساتھ لگا لیا ہو گا۔ میری آنکھ لگ گئی۔

اچانک میری آنکھ کھلی۔ میرے جسم کو کوئی جھنجھوڑ رہا تھا۔ شہناز کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ میرے ساتھ باقاعدہ دھینگا مُشتی ہو رہی تھی۔ میں مکمل طور پر بیدار ہُوا تو مجھے پتہ چلا کہ میرے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو دیکھا کہ میرے پاؤں بھی بندھے ہوتے تھے۔ میرے ہاتھ پیچھے نہیں آگے کو باندھے گئے تھے۔ میں نے ہاتھ اپنی قمیص کے نیچے

کرنے کی کوشش کی۔ میں نے رات کو بھی ریوالور اپنے نیفے میں اُڑس کر رکھا ہُوا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ میں بندھے ہوتے ہاتھوں سے ہی ریوالور نکال لوں۔ میرے ہاتھ وہاں تک پہنچ گئے جہاں ریوالور تھا لیکن اب وہاں ریوالور نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میرا راز کُھل چکا ہے اور اب یہ لوگ مجھے قتل کریں گے۔ ذہن میں ایک ہی بار بہت سی سوچیں آگئیں۔

ایوب کا خیال بھی آیا کہ اُس نے مجھے خراب کرنے کا بندوبست کیا ہے۔ یہ خیال بھی آیا کہ یہ کام حمید اللہ کا ہے اور یہ خیال بھی آیا کہ میرا راز تو نہیں کُھلا، حمید اللہ کو شہناز کے ساتھ میری بے تکلفی اچھی نہیں لگی اس لئے وہ مجھے ڈرا رہا ہے کہ میں شہناز کا خیال دل سے نکال دوں یا یہاں آنا چھوڑ دوں۔ شہناز پر بھی شک کیا جا سکتا تھا کہ وہ مجھے پیار اور محبت کا جھانسہ دیتی رہی ہے اور اب خراب کرنے پر آگئی ہے۔

مجھے اور زیادہ سوچنے کا موقع نہ ملا کیونکہ وہ جو کوئی بھی تھے، انہوں نے میرے منہ اور سر پر کپڑا لپیٹ کر مجھے اٹھا لیا تھا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ کسی کسی وقت ایک ٹارچ روشن ہوتی اور بجھ جاتی تھی۔ میں سوتے میں پکڑا اور باندھا گیا تھا ورنہ میں اتنی جلدی ان لوگوں کے قابو میں نہ آتا۔

وہ مجھے اُٹھا کر لے جا رہے تھے۔ میرے حساب کے مطابق وہ چار آدمی تھے۔ میں نے ذہنی طور پر موت کو قبول کر لیا۔ وہ مجھے اٹھاتے ہُوتے چلتے گئے۔ اُن میں سے کوئی بھی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد محسوس کیا کہ وہ کسی مکان میں داخل ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے زمین پر لٹا دیا۔

"دیکھو، خان صاحب آ رہے ہیں؟" — ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔

"آ رہے ہیں" — ایک اور نے کہا — "تم اندر سے رسّہ لاؤ۔"

اس سے مجھے پتہ چلا کہ یہ بندوبست حمید اللہ نے کیا ہے اور رسّہ مجھے پھانسی دینے کے لئے لایا جا رہا ہے۔ یہ خیال بھی آیا کہ پھانسی کے تردّد کی کیا ضرورت ہے۔ یہ حمید اللہ کی اپنی بادشاہی تھی، وہ مجھے خنجر سے، ریوالور یا

بندوق سے مروا دیتا تو اُسے کون پکڑ سکتا تھا۔ بہرحال میں نے اپنے آپ کو مرنے کے لئے اور مرنے سے پہلے ہر اذیّت کو قبول کرنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔

✖

لے آئے ہو ہمارے مُرغے کو؟" — میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ یہ حمید اللہ کی آواز تھی۔

"ہاں حضور!" — دو تین اکٹھی آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک نے کہا — "یہ پڑا ہے آپ کا مُرغا۔"

"شاباش" — حمید اللہ نے کہا — "لٹکا دو جیسے میں نے پہلے بتایا تھا۔"

حمید اللہ کے سب آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے اور مجھے اس طرح اٹھا لیا کہ میرا سر نیچے تھا اور پاؤں اُوپر کو۔ اس سے پہلے کی آہٹوں اور آوازوں سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ کوئی درخت پر یا سیڑھی پر چڑھ رہا ہے اور اوپر کہیں رسہ باندھا جا رہا ہے۔ رسّے کا ایک سرا میرے پاؤں والی رسّی کے ساتھ باندھ دیا گیا اور مجھے اوپر کھینچا جانے لگا۔ پھر رسہ اُوپر باندھ دیا گیا۔

"اس کے ہاتھ کھول دو" — حمید اللہ کی آواز سنائی دی — "مُنہ سے بھی کپڑا ہٹا دو۔"

میرے ہاتھ کھُل گئے۔ مُنہ سے بھی کپڑا ہٹ گیا۔ میں اُلٹا لٹکا ہوُا تھا۔ قریب ہی ایک لالٹین جل رہی تھی۔ مجھے اپنے سامنے ایک کچی دیوار نظر آ رہی تھی۔ میرے ساتھ دائیں ہاتھ درخت کا تنا تھا۔ میں جان گیا کہ یہ حمید اللہ کے کسی مزارعہ کا مکان ہے اور مجھے درخت کے ٹہن کے ساتھ لٹکایا گیا ہے۔ میرا سر زمین سے بمشکل دو فٹ اُوپر تھا۔ میرے سامنے حمید اللہ کا چہرہ آیا۔ وہ میرے سامنے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

"اب کہو انگریز کے مُخبر!" — اُس نے انتہائی تلخ اور طنزیہ لہجے میں

کہا — "کیا میں تمہیں اپنے آدمیوں کا خون بخش دوں گا؟"

میں چُپ رہا۔ سب سے پہلے مجھے ایوب پر شک ہُوا۔ اُس کے سوا میرا راز فاش کرنے والا اور ہو ہی کون سکتا تھا۔

"میں تجھے اتنی جلدی ماروں گا نہیں" — حمید اللہ نے کہا — "تمہیں تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ بھوکا اور پیاسا ماروں گا۔ مرنے لگو گے تو تمہارے مُنہ میں پانی ڈال کر زندہ رکھوں گا۔ مرنے بھی نہیں دوں گا، جینے کے قابل بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

"تم بُزدل ہو حمید اللہ!" — میں نے اُسے خان صاحب نہ کہا — "میری رسّیاں کھول دو اور یہی چار پانچ آدمی جو سوتے میں مجھے باندھ لاتے ہیں انہیں میرے مقابلے میں اُتار دو۔ میں خالی ہاتھ ہوں گا۔ اگر یہ مجھے گرا لیں تو میرے جسم کی بوٹی بوٹی کر دیں۔"

"واہ رے رستم ہند!" — اُس نے میرے مُنہ پر تھپیڑ مار کر کہا — "میں نے یہاں مقابلہ نہیں کروانا.... اب یہاں کیا لینے آتے تھے؟ ... کیا تم یہ دیکھنے آتے تھے کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ .... نہیں .... تم شہناز کے پیچھے آتے تھے۔ وہ تمہارے مُنہ پر تھوکنے کے لئے بھی تیار نہیں" — وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور بولا — "تمہاری عمر کے باقی دن اسی طرح لٹکے ہوئے گزریں گے۔ میں صبح آؤں گا.... انگریزوں کے جاسوس! نہ تجھے کفن نصیب ہوگا نہ تیرا جنازہ پڑھا جائے گا" — وہ پھر بیٹھ گیا اور میرے مُنہ پر اُلٹا ہاتھ مار کر کہا — "کہو یہ جھوٹ ہے کہ تم سپیشل برانچ کے اے۔ ایس۔ آئی تھے اور میرے دوستوں کو مروا کر سب انسپکٹر بن گئے ہو۔"

"بالکل جھوٹ ہے" — میں نے کہا — "اگر بتا دو کہ میرے متعلق یہ جھُوٹ کس نے بولا ہے تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ اُس شخص کا ذاتی مفاد کیا ہے۔"

اُس نے میرے مُنہ پر ایک اور تھپیڑ مارا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میں تو اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا، مجھے سلطان احمد کا غم کھانے لگا۔ مجھے خیال آیا کہ حمید اللہ

کو میری اصلیت بتانے والا سلطان احمد کی اصلیت سے بھی واقف ہو گا۔
سلطان احمد اُسی بہروپ میں اس علاقے میں آیا تھا جس میں وہ پہلے آیا تھا۔
سب انسپکٹر ایوب سلطان احمد اور اُس کے بہروپ کو جانتا تھا، اور اُس کے
اس بہروپ کو وہ نمبردار بھی جانتا تھا جس کے ذمّے یہ کام تھا کہ سلطان احمد
کو رات اپنے پاس رکھے۔ یہ نمبردار شاید میرے متعلق بھی جانتا ہو گا لیکن مجھے
یقین نہیں تھا۔ انگریز افسر ایسے اناڑی نہیں تھے کہ اپنے خفیہ آدمیوں کو
اس طرح بے نقاب کرتے پھرتے۔

مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ سلطان احمد جوتشی بن کر اِدھر آ نکلے گا اور
میرے انجام کو پہنچا دیا جائے گا۔ میں اب اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا
سوائے دُعا کے۔

✱

مجھے وقت کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ حمید اللہ اپنے آدمیوں کو یہ حکم دے کر
چلا گیا کہ دو آدمی یہاں موجود رہیں اور باری باری مجھ پر پہرہ دیں۔

میرے پاس دو آدمی رہ گئے۔ انہوں نے صحن میں ایک چارپائی بچھا لی۔
اس پر بستر بچھا کر ان میں سے ایک لیٹ گیا اور دوسرا کہیں بیٹھ گیا ہو گا۔ وہ
آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے پھر خاموش ہو گئے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ
ایک سو گیا ہے۔ مجھے ایسے شک ہُوا جیسے دوسرا بھی سو گیا ہے۔

مجھے اللہ کے سوا کوئی بھی بچا نہیں سکتا تھا اور میں اللہ کے فضل و کرم
سے مایوس بھی نہیں تھا۔ میرے کرنے کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ اس اذیت
کو برداشت کروں۔ اذیّت سے بچنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ میں نے اپنے ذہن
سے غصّہ نکال دیا جو حمید اللہ پر آ رہا تھا۔ مایوسی اور تکلیف کا احساس بھی ختم کر دیا۔
اپنی تمام قوتوں کو اپنے قبضے میں لے کر مرکوز کر لیا اور دل میں اللہ کا نام رکھ لیا۔

اس سے مجھے یہ فائدہ ہُوا کہ میرا دماغ کسی ناگوار یا تکلیف دہ بوجھ کے
بغیر سوچنے لگا۔ میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میرے ہاتھ آزاد تھے۔ میں ہاتھ نیچے
کرتا تھا تو میری انگلیاں زمین سے دو اِنچ اُوپر رہتی تھیں۔ اگر میں اپنا اُوپر

والا دھڑ جو اُس وقت نیچے تھا، اُوپر اُٹھا سکتا تو میرے ہاتھ پاؤں تک پہنچ
سکتے تھے اور میں رسّے کی گانٹھ کھول سکتا تھا۔ میرے پاؤں رسّی سے
بندھے ہُوئے تھے۔ رسّہ دونوں پاؤں کے درمیان رسّی کے ساتھ باندھا
گیا تھا۔

میں نے سر اُوپر کیا، کندھے بھی اُوپر ہو گئے۔ دونوں ہاتھ اپنے کولہوں
پر رکھ کر سر، کندھوں اور سینے کو اور اُوپر اُٹھانے کے لئے بہت زور لگایا
لیکن ہاتھ گھُٹنوں تک ہی گئے اور اس سے آگے نہ جا سکے۔

مجھے خیال آیا کہ میرے قریب درخت کا تنا ہے۔ فاصلہ اڑھائی تین فٹ ہو
گا۔ میرا دایاں پہلو تنے کی طرف تھا۔ میں نے زور سے اپنے جسم کو گھمایا تو جسم اتنا
گھوم گیا کہ جسم کا آگے والا حصّہ تنے کی طرف ہو گیا۔ میں نے جسم کو آگے کی طرف
ہلایا تو تھوڑا سا ہلا۔ میں نے پھر زور لگایا تو جسم کچھ زیادہ ہلا جھٹکے کی طرح زور
لگاتے لگاتے جسم پینگ کی طرح آگے پیچھے ہونے لگا اور میرے ہاتھ تنے
تک پہنچنے لگے۔ میں اس کوشش میں تھا کہ تنے کو پکڑ لوں اور ہاتھ اُوپر کو
سرکاتا جاؤں اور ہاتھ پاؤں تک پہنچ جائیں۔

"کیا کر رہے ہو بھائی!" — اپنے پہرہ دار کی آواز سنائی دی —
"اس طرح کرو گے تو ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیں گے۔ سیدھا لٹکا رہ!"

میں نے اپنے آپ کو ہلارے دینے چھوڑ دیئے۔

✱

مجھے اپنا سر اور چہرہ بھاری معلوم ہونے لگا۔ وہ تو ہونا ہی تھا۔ سارے
جسم کا خون سر میں آ رہا تھا۔ وقت بھی شاید میرے ساتھ اُلٹا لٹک گیا تھا۔ آگے
بڑھتا ہی نہیں تھا۔ ایک منٹ ایک گھنٹے کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔

مجھے کواڑ کھُلنے کی آواز آئی۔ میں نے سر اُدھر گھمایا۔ لالٹین کی روشنی میں
مجھے شہناز دکھائی دی۔ میرا پہرہ دار اُس کی طرف دوڑا۔

"سلام بیگم حضور!" — پہرہ دار نے کہا — "میں جاگ رہا ہوں۔ یہ
کچھ بدمعاشی کر رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ ..."

”سونہ جانا“ ___ شہناز نے کہا ___ ”یہ اُلٹا لٹکا ہوا ابھی خطرناک ہے“ ___

شہناز میرے قریب آگئی اور بڑے رُعب سے مجھ سے کہا ___ ”تمہاری بدمعاشیاں ابھی ختم نہیں ہوئیں؟ ... حرام خور! یہاں سے تمہاری لاش اُترے گی“۔

میں نے دیکھا کہ شہناز کے ہاتھ میں ایک گز سے زیادہ لمبا ڈنڈہ تھا۔ اُس نے مجھے بڑے بُرے طعنے دیئے۔

”اِس کے سامنے بیٹھ جاؤ“ ___ شہناز نے میرے پہرہ دار سے کہا۔

پہرہ دار جو حمید اللہ کا مزارعہ ہی ہوسکتا تھا، میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے سر پر پگڑی لپٹی ہوئی تھی۔ شہناز اُس کے پیچھے ہوگئی۔ اُس نے ایک عجیب حرکت کی۔ ہاتھ مار کر پہرہ دار کی پگڑی اُتار دی اور ذرا پیچھے ہٹ کر بڑے ہی زور سے ڈنڈہ پہرہ دار کے سر پر مارا۔ سر پر اتنی شدید چوٹ فوراً بے ہوش کردیتی ہے۔ وہ آدمی وہیں لڑھک گیا۔

دوسرا پہرہ دار بڑی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ شہناز نے سوتے ہوتے کے سر پر دو تین ڈنڈے مارے اور دوڑتی میرے پاس آئی۔

”رسہ کیسے کھولوں سکندر؟“ ___ اُس نے مجھ سے پوچھا ___ ”درخت پر چڑھ جاؤں؟“

”لالٹین اُٹھاؤ اور کلہاڑی یا ٹوکہ دیکھو“ ___ میں نے کہا ___ ”اگر درخت پر چڑھ سکتی ہو تو چڑھ جاؤ اور رسہ کاٹ دو ... لیکن شہناز! اپنے آپ کو مصیبت میں نہ ڈالو۔ وہ آگیا تو تمہیں بھی میرے ساتھ لٹکا دے گا“۔

”وہ نہیں آسکتا“ ___ شہناز نے کہا۔

اُس نے لالٹین اُٹھائی تو اُسے چارپائی کے قریب پڑی ہوئی کلہاڑی مل گئی۔ میں نے بعد میں دیکھا تھا کہ یہ چھوٹی کلہاڑی تھی اور درخت پر آسانی سے چڑھا جاسکتا تھا۔ شہناز کلہاڑی کا دستہ مُنہ میں لے کر درخت پر چڑھ گئی اور مجھے کلہاڑی کی ضربیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے ہاتھ پھیلا کر زمین کی طرف کر دیئے۔

اچانک میرا جسم نیچے آپڑا۔ میں ہاتھوں کے بل ہوگیا اور میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

”نکل جاؤ سکندر!“ ___ شہناز نے کہا ___ ”وہ سورج نکلنے کے بعد ہی جاگے گا“۔

”وہ جاگ کر سب سے پہلے یہاں آئے گا“ ___ میں نے کہا ___ ”یہ دونوں ابھی ہوش میں آجائیں گے اور صبح اُسے بتائیں گے کہ مجھے تم نے بھگایا ہے“۔

”ہاں سکندر!“ ___ شہناز نے کہا ___ ”ایسا تو ہوگا پھر کیا کیا جائے؟“

”میں پکا بندوبست کردیتا ہوں“ ___ میں نے کہا ___ ”اپنا دل مضبوط رکھنا“۔

وہ دونوں بے ہوش تھے۔ میں بڑی آسانی سے انہیں کلہاڑی سے قتل کرسکتا تھا لیکن میں نے یہ طریقہ اختیار نہ کیا۔ مجھے اپنے کپڑوں پر خون کے چھینٹے پڑنے کا کوئی ڈر نہ تھا۔ مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میں حمید اللہ کو بڑا موزوں جواب دینا چاہتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ جو کچھ کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔

اس مکان میں مجھے لاکر میرے ہاتھوں کی رسی کھول دی گئی تھی۔ یہ رسی صحن میں پڑی تھی۔ میرے پاؤں جس رسی سے باندھے گئے تھے وہ بھی موجود تھی۔ میں نے ایک رسی ایک آدمی کے گلے سے کس کر باندھ دی اور ایک سرا لمبا رکھا۔ دوسری رسی دوسرے آدمی کے گلے سے اِسی طرح باندھ دی۔ انہوں نے اسی سے مرجانا تھا لیکن میں جواب پورا دینا چاہتا تھا۔ میں نے وہ رسہ دیکھا جس سے مجھے لٹکایا گیا تھا۔ بڑا مضبوط اور بہت لمبا رسہ تھا۔

میں رسے کا ایک سرا پکڑ کر درخت پر چڑھ گیا اور ایک ٹہن کے ساتھ باندھ کر لٹکا دیا۔ نیچے آکر میں چارپائی گھسیٹ کر رسے کے نیچے لے گیا۔ اس پر جو آدمی بے ہوش پڑا تھا۔ اُسے چارپائی پر چڑھ کر اور کمر سے پکڑ کر اُوپر اُٹھایا۔ شہناز بھی چارپائی پر چڑھ آئی اور اُس آدمی کو اُوپر اُٹھانے میں میری مدد کی۔ میں نے اُس کے گلے میں بندھی ہوئی رسی کا سرا رسے کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر دوسرے آدمی کو اُٹھایا اور اُسے بھی چارپائی سے اُٹھا کر اُس کے

ساتھی کے ساتھ رسّے سے لٹکا دیا۔ چارپائی سے اُتر کر چارپائی گھسیٹی اور پرے کر دی۔ دونوں آدمی پھانسی پر لٹک گئے۔

مجھے ان آدمیوں کے مرنے پر بہت افسوس تھا۔ یہ بے گناہ تھے۔ وہ تو اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ ان کا آقا معمولی سا آدمی نہیں تھا۔ وہ نوابزادہ بھی تھا جاگیردار بھی اور وہ ڈاکوؤں کا پالنہار بھی تھا اور علاقے کی پولیس بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اُس کے نزدیک یہ مزارعے اور نوکر چاکر انسان نہیں پتھر تھے۔ ایک دو پتھر اُٹھائے اور جسے چاہا اُس پر پھینک دیئے۔ پھر کسی دوسرے کا سر پھوڑیں یا خود ٹوٹیں، یہ پتھروں کی قسمت ہے۔

پیٹ اور مفلسی انسان سے کیا کچھ نہیں کروا لیتی۔ یہ مزارعے اپنے آقاؤں کے گناہوں کی گٹھڑی اپنے سروں پر اٹھا لیتے ہیں اور ان میں سے بعض دنیا میں سزا بھگت جاتے ہیں۔ سزا جو آقا کے گناہ کی ہوتی ہے وہ اُس کے غلاموں کے حصے میں آتی ہے۔

حمیداللہ کے ان دو مزارعوں کی بھی مجبوریاں ایسی تھیں کہ وہ خدا کی نسبت اپنے اُس آقا کو اپنے قریب تر سمجھتے تھے جس کے اناج سے وہ اپنے پیٹ بھرتے تھے۔

اگر میں انہیں بے گناہ سمجھ کر ان پر رحم کرتا تو شہناز ماری جاتی۔ یہ مجھے منظور نہ تھا۔ اُس نے مجھے موت کے مُنہ سے نکالا اور اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ مجھے یہی خطرہ نظر آ رہا تھا کہ حمیداللہ اُسے گھر سے غیر حاضر دیکھ کر اِدھر آ جائے گا اور میں تو نکل چکا ہوں گا شہناز کو وہ زندہ نہیں چھوڑے گا۔

✖

"تم نے اپنے آپ کو خطرے میں کیوں ڈالا ہے شہناز!" — مکان سے باہر آ کر میں نے شہناز سے کہا — "اُس کمبخت کو پتہ چل گیا تو ...."

"تم نکلو یہاں سے سکندر!" — شہناز نے تیزی سے بولتے ہوئے کہا — "میری اب جان جاتی ہے، میں اب تمہاری جگہ لٹکی ہوں، تم نہ سوچو۔ نکل جاؤ، جلدی کرو۔ اس جاگیر سے نکلتے نکلتے بہت وقت لگے گا.... وہ نہیں

جاگے گا۔"

میں پولیس کا آدمی تھا۔ مجھے وہ ڈنڈہ یاد آ گیا جو شہناز اپنے ساتھ لاتی تھی۔ اس سے اُس نے دونوں آدمیوں کو اُن کے سروں پر ضربیں لگا کر بیہوش کیا تھا۔ یہ ڈنڈہ اندر رہ گیا تھا۔ میں اِسے عام سا ڈنڈہ سمجھتا تھا لیکن اسی سے شہناز کی نشاندہی ہو سکتی تھی۔

میں اندر جا کر ڈنڈہ اُٹھا لایا۔ میں نے سوچا یہ تھا کہ ڈنڈہ اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور راستے میں کہیں پھینک دوں گا لیکن ڈنڈہ ہاتھ میں لیا تو پتہ چلا کہ یہ کوئی عام ڈنڈہ نہیں۔ یہ ایک طرف سے کم و بیش ایک سیر وزنی تھا۔ یہ موٹے بید کا چمکدار ڈنڈہ تھا اور اس کے ایک سرے پر چمکتے ہوئے پیتل کا سات آٹھ انچ لمبا خول چڑھا ہُوا تھا۔ یہاں سے یہ وزنی تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس خول میں کیا بھرا ہُوا ہے۔ اس میں سیسہ بھرا ہُوا تھا۔

"یہ تم گھر سے لائی تھیں؟" — میں نے شہناز سے پوچھا۔

"یہ حمیداللہ کا اپنا ڈنڈہ ہے" — شہناز نے جواب دیا — "اسے سونے کے کمرے میں رکھتا ہے اور اکثر ہاتھ میں لے کر باہر جایا کرتا ہے۔"

"اور تم اسے یہاں بھول چلی تھیں" — میں نے کہا — "وہ صبح یہ ڈنڈہ یہاں پڑا دیکھتا تو فوراً تمہیں پکڑ لیتا۔ یہ لے جاؤ۔ جہاں سے اُٹھایا تھا وہیں رکھ دینا .... نہیں شہناز! تم اکیلی نہیں جاؤ گی۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ وہ تمہارے انتظار میں کھڑا ہو گا۔ میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا .. .... چلو!"

"خدا کے واسطے سکندر!" — اُس نے میرے آگے آ کر میرے گالوں پر ہاتھ رکھے اور بولی — "تم چلے جاؤ۔ وہ نہیں جاگے گا۔"

"تمہیں کس نے بتایا تھا کہ میں یہاں لٹکا ہُوا ہوں؟"

"میں کہتی ہوں چلے جاؤ" — شہناز نے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا — "سکندر چلے جاؤ، پھر کبھی اِدھر نہ آنا۔ کبھی ملاقات ہوتی تو بتاؤں گی کہ میں یہاں تک کس طرح پہنچی تھی" — وہ ڈنڈہ میرے ہاتھ سے لے کر مجھے دھکیلنے لگی۔

میں چل پڑا۔ قدم بڑی مشکل سے اُٹھتے تھے جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں کتنی گھنٹے لٹکا رہا تھا جس سے میرا سر چکرا رہا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شہناز کو اکیلا چھوڑنے میں میرا دل میرا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ میں بوجھل قدموں سے چلنے کی کوشش کرتا رہا۔

"سکندر!" — مجھے شہناز کی آواز سنائی دی۔

میں نے رُک کر پیچھے دیکھا۔ شہناز میری طرف دوڑی آرہی تھی۔ میں اُس کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ کسی خطرے میں تھی۔ میرے قریب آکر وہ رُکی نہیں۔ میرے ساتھ ٹکرائی اور میرے ساتھ لپٹ گئی۔ اُس نے ڈنڈہ پھینک دیا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔

"سکندر!" — اُس نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر روتے ہوئے کہا — "کیا تم نے مجھے بخش دیا ہے؟ ناراض تو نہیں ہو؟ کہہ دو سکندر، میں نے تجھے اپنے باپ کا خون معاف کر دیا ہے۔"

"ہوش میں آؤ شہناز!" — میں نے اُسے جذبات سے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا — "جلدی اپنے گھر پہنچو۔"

"چلی جاؤں گی .... چلی جاؤں گی" — اُس نے دیوانگی کے عالم میں کہا — "نہ جانے پھر کبھی تمہیں دیکھ سکوں گی یا نہیں۔"

کبھی وہ میرے ہاتھوں کو چومتی، کبھی گال میرے سینے سے لگا کر رگڑتی۔ کتنی بار اُس نے میرا سینہ چوما۔ اُس کی حالت بالکل اُس مادہ جانور کی سی تھی جو اپنے نوزائیدہ بچے کو چاٹا کرتی ہے۔ میں اُس کے سامنے بے بس ہو گیا۔

"جاؤ!" — آخر اُس نے کہا — "سکندر جاؤ۔"

میرے پاؤں میں جیسے بیڑیاں پڑ گئی تھیں یا زمین نے میرے پاؤں جکڑ لیے تھے۔ میں نے کچھ اپنی کوشش سے اور زیادہ تر شہناز کے دھکیلنے سے پاؤں اُٹھائے اور چل پڑا۔

کچھ دُور آکر میں نے پیچھے دیکھا۔ اُس پگڈنڈی پر جو حمید اللہ کے مکان کی طرف جاتی تھی، ایک سایہ سا جاتا نظر آرہا تھا۔ میں رُک کر اُسے دیکھنے لگا پھر وہ اندھیرے میں تحلیل ہو گیا۔

میں آگے کو چل پڑا۔ کچھ ایسا احساس پیدا ہو گیا جیسے میں بزدل اور بھگوڑا ہوں اور اُس عورت کو تنہا چھوڑے جا رہا ہوں جس نے مجھے زندہ رکھنے کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ میرا ذہن شہناز کے قبضے میں آگیا پھر ایسے ہوا جیسے شہناز میرے ساتھ ساتھ چلتی مجھے بہت دُور پیچھے لے جا رہی ہو۔ میں گزرے ہوئے وقت کے اُن لمحات میں جا پہنچا جب میری ماں زندہ تھی۔ مجھے ماں کے جسم کی، بالوں اور اُس کے بوسوں کی بُو آنے لگی اور ایسے لگا جیسے میری ماں یہیں کہیں موجود ہو۔ میں نے بھولے بھالے بچے کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا جیسے مجھے اپنی ماں قریب ہی کہیں کھڑی نظر آ جائے گی۔

وہ مجھے نظر آنے لگی۔ میرے سامنے کھڑی تھی مگر میں جتنی تیز چلتا تھا وہ اتنی ہی تیزی سے پیچھے ہٹتی جاتی تھی۔ اُس کا چہرہ روشن ہوتا گیا اور یہ شہناز کا چہرہ بن گیا۔ بُو جو میری ماں کے جسم کی تھی وہ مجھے شہناز کے جسم کی محسوس ہونے لگی۔ یہ بُو تر و تازہ تھی۔ اس میں عطر کی خوشبو تھی اور یہ شہناز کے جسم، بالوں اور کپڑوں کی تھی اور اس بُو نے مجھے اپنی مری ماں تک پہنچا دیا۔

ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخ میرے مُنہ سے ٹکرائی تو میں بدک کر بیدار ہو گیا۔ میں تو جذبات اور یادوں میں ڈوب گیا تھا۔ حقیقت سے میرا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ ایک درخت نے مجھ پر کرم کیا کہ اپنی ایک ٹہنی میرے مُنہ پر مار کر مجھے جگا دیا۔ میں تو جاگتے میں خواب دیکھ رہا تھا۔

ایک ہی بار کئی سوال میرے ذہن میں آگئے۔ کیا شہناز کو بھی حمید اللہ کی طرح پہلے پتہ چل گیا تھا کہ میں سپیشل برانچ کا آدمی ہوں؟ اگر اُسے معلوم ہو گیا تھا تو اُس نے مجھ سے پہلے کیوں نہ پوچھ لیا؟ وہ مجھ تک کس طرح پہنچی اور اور اب اُس کا اپنا انجام کیا ہو گا؟

اُس سے یہ سب کچھ پوچھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ یہ معلوم کر لوں گا کہ شہناز پکڑی تو نہیں گئی۔ میرے پاس ایسے ذرائع تھے جن سے میں جاسوسی کرا سکتا تھا۔ میں نے یہ تہیہ بھی کر لیا تھا کہ شہناز پکڑی گئی اور حمید اللہ

اُسے پریشان کر رہا ہے یا اُس نے شہناز کو قتل کر دیا ہے تو حمید اللہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

مجھے سلطان احمد کا خیال آنے لگا۔ صبح تک اُس تک پہنچنا اور اُسے خبردار کرنا ضروری تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کون سے گاؤں میں ہو گا۔ سب انسپکٹر ایوب کو بھی معلوم تھا۔

میں چلتا گیا۔ دماغ کو چکر آ رہے تھے۔ وہ کم ہوتے گئے۔ کم نہ ہوتے تو بھی مجھے چلتے رہنا تھا اور مجھے تیز چلنا تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ حمید اللہ کو پتہ چل گیا کہ اُس کا قیدی فرار ہو گیا ہے تو وہ میرے پیچھے گھوڑے دوڑا دے گا۔

✖

جس گاؤں تک مجھے پہنچنا تھا وہ وہاں سے کم و بیش تین میل دُور تھا۔ میرے پاس کوئی سواری نہیں تھی اور میں خالی ہاتھ بھی تھا۔ میں حمید اللہ کی جاگیر سے نکل گیا تھا لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر لی۔ میں جب اُس گاؤں تک پہنچا تو صبح طلوع ہو رہی تھی۔ ایک آدمی سے نمبردار کا گھر پوچھ کر اُس کے ہاں جا پہنچا — نمبردار مجھے پہچانتا تھا۔ وہ مجھے اندر لے گیا۔ سلطان احمد ابھی تک سویا ہوا تھا۔ میں نے اُسے جگا دیا۔

"تم تو آ گئے ہو" — سلطان احمد نے پوچھا — "کیا اتنی جلدی کام ہو گیا ہے؟"

"کام کچھ بگڑ گیا ہے" — میں نے جواب دیا — "لیکن ہُوا ہی سمجھو ..... میں تمہیں یہ کہنے آیا ہوں کہ اب اُدھر نہ جانا۔ ہم یہیں سے واپس جا رہے ہیں۔"

میں نے تفصیل سے بتایا کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ ہمیں یہاں سے جلدی نکل جانا چاہیئے۔ چنانچہ ہم اُسی وقت روانہ ہو گئے۔ ریلوے سٹیشن تک نمبردار نے دو گھوڑوں کا انتظام کر دیا تھا۔ ریل گاڑی کے لئے کوئی ایک گھنٹے کا انتظار کرنا پڑا۔ خوش قسمتی سے میل ٹرین آ رہی تھی۔ اُس نے ہمیں سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر بعد منزل پر

پہنچا دیا۔

ریلوے سٹیشن سے ہم اپنے ٹھکانے پر جانے کی بجائے سیدھے ایس پی سپیشل برانچ کے بنگلے پر چلے گئے۔ اُس کو جب ہماری اطلاع ملی تو وہ کھانا چھوڑ کر باہر آ گیا۔

"تم لوگ اتنی جلدی کیوں آ گئے ہو؟" — اُس نے ہم سے پوچھا۔

"صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "میں تو موت کے مُنہ سے نکل کر آیا ہوں۔"

"کیا ہُوا؟" — ایس پی نے پوچھا اور کہنے لگا — "اندر آ جاؤ اور پوری رپورٹ دو۔"

اندر کمرے میں بیٹھ کر میں نے ایک ایک منٹ کی رپورٹ دی اور پوری تفصیل سے بتایا کہ مجھے دیکھ کر حمید اللہ کا رویّہ کیسا دوستانہ تھا اور ہم دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ پھر رات کو اچانک میں باندھ لیا گیا۔ میں نے اُسے یہ بھی سنایا کہ شہناز نے کس طرح مجھے وہاں سے اُتارا اور باہر نکالا تھا۔

"شہناز کون ہے؟" — ایس پی نے پوچھا۔

"یہ حمید اللہ خان کی داشتہ ہے صاحب بہادر!" — میں نے جواب دیا — "وہ ریل کار والے کیس میں شاملِ تفتیش بھی رہی ہے۔"

"اچھا، وہ لڑکی" — ایس پی نے کہا — "جسے ہم نے تفتیش سے خارج کر دیا تھا۔ ہم نے اُس کی سفارش کی تھی کہ اس کیس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں" — وہ ہنس پڑا اور بولا — "ہمارا خیال ہے کہ یہ لڑکی تم پر بہت مہربان ہے۔"

"یہ ایک الگ کہانی ہے صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "ڈی۔ ایس۔ پی کلارک صاحب اِس کہانی سے پوری طرح واقف ہیں۔ بات یہ ہے کہ شہناز میری سوتیلی ماں رہ چکی ہے" — اب میری ہنسی نکل گئی اور میں نے کہا — "اُس وقت بھی وہ مجھ پر مہربان تھی لیکن میں اُس کی یہ مہربانی قبول نہیں کرتا

تھا.... صاحب بہادر! یہ ذرا لمبی کہانی ہے۔ آپ میری رپورٹ سُن لیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ ہمیں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ میں وہاں دو آدمیوں کو پھانسی پر لٹکا آیا ہوں۔ وہ مر چکے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ حمیداللہ خان نے کسی کو بتائے بغیر اُن کی لاشیں غائب کر دی ہوں گی۔"

میں نے اُسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مجھے اُلٹا لٹکا کر حمیداللہ نے جن دو آدمیوں کا مجھ پر پہرہ بٹھایا تھا اُن دونوں کو میں پھانسی پر لٹکا آیا ہوں۔ ایس۔ پی اُچھل کر اُٹھا اور ہمیں یہ کہہ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا کہ تم لوگ یہیں انتظار کرو، میں ابھی آتا ہوں۔

×

"فوراً اُٹھو"— ایس پی نے کمرے میں واپس آکر کہا —"گاڑی آرہی ہے۔ پولیس کی گارد علاقے کے تھانے میں سے لیں گے۔ ہمیں رات ہی رات حمیداللہ کی جاگیر پر پہنچنا ہے۔"

نصف گھنٹے کے اندر اندر اُس زمانے کی ایک چھوٹی سی ایک سرکاری گاڑی جو فوج میں بھی استعمال ہوتی تھی، آگئی۔ اس میں ایک انگریز پولیس انسپکٹر اور دو تین ہندوستانی کانسٹیبل تھے۔ ایس۔ پی ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر ہمیں ساتھ لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی چل پڑی۔ اُس علاقے کے ریلوے سٹیشن تک سڑک پکی تھی۔ وہاں سے آگے کچی پگڈنڈیاں تھیں۔ گاڑی انتہائی رفتار پر جا رہی تھی۔

گاڑی نے ہمیں سب انسپکٹر ایوب کے تھانے تک صبح تین بجے سے ذرا بعد پہنچا دیا۔ ایس پی کے حکم سے ایوب کو گھر سے بلایا گیا۔ وہ جن کپڑوں میں تھا اُنہی میں تھانے آگیا اور سپیشل برانچ کے ایس پی کو اور ایک باوردی انگریز پولیس انسپکٹر کو دیکھ کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

"آدھے گھنٹے کے اندر اندر خود بھی تیار ہو جاؤ اور دس کانسٹیبلوں کی گارد تیار کرو"— ایس۔ پی نے اُسے حکم دیا۔

گارد آدھے گھنٹے سے پہلے تیار ہوگئی۔ ایوب بھی آگیا۔ ان سب کو گاڑی میں بٹھا کر روانہ ہوگئے اور ایک گھنٹے سے پہلے پہلے گاڑی حمیداللہ

کی جاگیر میں داخل ہو کر اُس کے مکان کے برآمدے کے ساتھ جا رُکی۔ پہلے ایک نوکر دوڑتا ہوا باہر آیا۔ ایس۔ پی نے اُس سے پوچھا کہ نواب صاحب کہاں ہیں۔

"سوتے ہوتے ہیں صاحب بہادر!"— نوکر نے جواب دیا۔

ایس پی انگریز پولیس انسپکٹر اور ایوب کو ساتھ لے کر بغیر دستک یا اطلاع دیئے اندر چلا گیا۔ اُس نے نوکر کو اپنی رہنمائی کے لئے بازوؤں سے پکڑ کر ساتھ لے لیا تھا۔ دس منٹ گزر رہے ہوں گے کہ ایوب باہر آیا اور اُس نے مجھے آواز دے کر کہا کہ ایس پی صاحب اندر بلاتے ہیں۔

میں اُس کے ساتھ اندر گیا تو مجھے حمیداللہ کے سونے کے کمرے میں لے گیا۔ وہاں منظر یہ بنا ہُوا تھا کہ حمیداللہ اور شہناز اکٹھے ایک طرف کھڑے تھے۔ ایس پی کے ہاتھ میں وہی ڈنڈہ تھا جس سے شہناز نے مجھے رہائی دلائی تھی۔ ایس پی نے یہ ڈنڈہ مجھے دکھا کر پوچھا کہ یہی استعمال ہُوا تھا؟

"یہی تھا"— میں نے جواب دیا اور کہا —"میرا ریوالور اِس کے پاس ہوگا۔"

"اس کا ریوالور دے دو"— ایس پی نے حمیداللہ سے کہا۔

"میرے پاس اپنا ریوالور ہے"— حمیداللہ نے کہا لیکن اُس کی زبان اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"نواب کے بچے!"— ایس پی نے کڑک کر کہا —"اس کا ریوالور فوراً نکالو۔"

حمیداللہ نے آہ بھری اور ایک الماری کھول کر ریوالور نکالا۔ اُس نے شہناز کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھا پھر ایس پی کی طرف دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اُس نے ریوالور کی نالی اپنی کنپٹی پر رکھ دی۔ ایس پی ذرا قریب ہی کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بید کا ڈنڈہ تھا۔ اُس نے بڑی تیزی سے ڈنڈہ گھمایا جس کا پیتل والے خول کا سرا حمیداللہ کی کلائی پر لگا۔ ریوالور اُس کے ہاتھ سے اُڑا اور اُوپر جا کر فرش پر آپڑا۔ حمیداللہ کلائی پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں

اندازہ کر سکتا تھا کہ اس ڈنڈے کی چوٹ کس قدر شدید ہو گی۔

"اُٹھو" — ایس پی نے ڈنڈے کا سرا حمید اللہ کے پہلو میں دبا کر کہا — "فوراً اُٹھو اور ہمیں اُس کچے مکان میں لے چلو جہاں تم نے سکندر کو درخت کے ساتھ اُلٹا لٹکایا تھا۔"

شہناز خاموش کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ایس پی نے اُس کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا اُس کے پہلو میں جا رُکا۔

"کیوں روتی ہو؟" — ایس پی نے اپنا بازو اُس کے کندھوں پر رکھ کر کہا — "ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ ہم تمہیں انعام دلائیں گے" — ایس پی نے شہناز کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

"صاحب بہادر!" — حمید اللہ نے طنزیہ لہجے میں کہا — "اسے میں انعام دوں گا۔ مجھے پہلے بھی اسی پر شک تھا۔ اب آپ نے تصدیق کر دی ہے۔"

میں جانتا تھا کہ ایس پی نے شہناز کو شفقت سے اپنے ساتھ لگا لیا تھا لیکن اُس کی یہ حرکت مجھے کچھ بُری لگی۔ وہ یقیناً شہناز کے حُسن اور اُس کے دلکش سراپے سے متاثر ہو گیا تھا، ورنہ وہ ایسی حماقت نہ کرتا کہ حمید اللہ کی موجودگی میں شہناز کو شاباش دینی شروع کر دیتا۔ یہ تو ابھی ظاہر کرنا ہی نہیں تھا کہ مجھے رہا شہناز نے کیا تھا کیونکہ حمید اللہ ابھی گرفتار نہیں ہُوا تھا۔ وہ چلتے چلتے اشارے سے شہناز کو مروا سکتا تھا یا خود جس طرح ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھ لیا تھا، موقع دیکھ کر شہناز کی گردن دبوچ لیتا یا کسی اور طریقے سے اُسے نقصان پہنچا دیتا۔

"اُس مکان میں چلو" — ایس پی نے کہا اور شہناز کو اُسی طرح اپنے بازو میں لیتے ہوئے کہنے لگا — "تمہیں بھی ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

ایس پی شہناز کے ساتھ کچھ زیادہ ہی چپکتا جا رہا تھا جس سے میرے دل میں تلخی سی پیدا ہو رہی تھی۔ اگر وہ ایس پی نہ ہوتا تو میں شہناز کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف گھسیٹ لیتا۔ مکان سے نکل کر شہناز غالباً خود ہی اُس کے بازو سے نکل آئی اور پیچھے ہٹ کر میرے ساتھ چلنے لگی۔ ایس پی نے پیچھے دیکھا

اور مُسکرایا۔

"میں جانتا ہوں" — ایس پی نے انگریزی میں مجھے کہا — "یہ تمہیں چاہتی ہے۔"

✖

حمید اللہ کچے سے ایک مکان کے دروازے پر جا رُکا۔ میں نے حمید اللہ کے مکان سے اس مکان تک ہاتھ پاؤں بندھے ہوتے تین چار آدمیوں کے بازوؤں میں اڑھائی تین فرلانگ کا یہ سفر طے کیا تھا۔ ایس پی اندر چلا گیا۔

"آ گئے آؤ سکندر!" — ایس پی نے مجھے بلایا اور پوچھا — "تمہیں کس جگہ اُلٹا لٹکایا گیا تھا؟"

میں اُس جگہ جا کھڑا ہُوا اور اُوپر دیکھا۔ ایس پی کو بتایا کہ اس ٹہن کے ساتھ رسّہ باندھا گیا تھا۔

"حمید اللہ خان!" — ایس پی نے اُسے کہا — "رسّیاں اور رسّہ نکال دو.... اور اُن دو آدمیوں کو ادھر بلاؤ جو اس آدمی کو (مجھے) اُٹھا کر یہاں لائے تھے۔"

حمید اللہ چُپ چاپ خالی خالی نظروں سے ایس پی کی طرف دیکھتا رہا۔

"جواب دو" — انسپکٹر نے اُس کے پہلو میں اپنی چھڑی چبھو کر کہا — "رسّہ اور رسّیاں کہاں ہیں اور وہ دو آدمی کون ہیں؟"

حمید اللہ پھر بھی بُت بنا کھڑا رہا۔ اچانک ایس پی کا گھونسہ اس قدر زور سے حمید اللہ کے مُنہ پر پڑا کہ وہ پیچھے گرتے گرتے دیوار کے ساتھ جا لگا اور ایک پہلو پر گر پڑا۔ انگریز انسپکٹر نے تیزی سے اُس تک جا کر اُس کے سَر کے بال مُٹھی میں لیے اور جھٹکا دے کر اُسے اُٹھایا۔ حمید اللہ کے چہرے پر دَرد کا بڑا گہرا تاثر آ گیا۔ اُس کی نوابی شان اور جاگیرداری کا رُعب ختم ہو چکا تھا۔ یہ جاگیر اُس کی ایک طرح کی ریاست بنی ہوتی تھی جہاں اُس کا اپنا

حکم اور اپنا قانون چلتا تھا۔

"رسّے اور رسّیوں کا مجھے کچھ پتہ نہیں"—— حمید اللہ نے مری مری سی آواز میں کہا —— "مکان کی تلاشی لے لیں۔"

چھوٹا سا تو وہ مکان تھا۔ ایک کمرے میں گئے تو رسّہ سامنے پڑا نظر آیا۔ دونوں رسّیاں کھُرلی کے قریب پڑی مل گئیں۔ رسّہ دو حصّوں میں کٹا ہُوا تھا۔ میں نے ایس پی کے کان میں کہا کہ یہاں سے رسّہ شہناز نے کلہاڑی سے کاٹا تھا۔ فوراً حمید اللہ نے اُن دو آدمیوں کے نام بتا دیئے۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر وہ آدمی آ گئے۔ چونکہ پولیس نے حمید اللہ کے مکان میں اچانک چھاپہ مارا تھا اس لئے وہ ان آدمیوں کو غائب نہ کر سکا۔

"اُن دو آدمیوں کی لاشیں کہاں ہیں جو اس درخت کے ساتھ لٹک کر مرے ہیں؟"—— ایس پی نے پوچھا۔

"صاحب بہادر!"—— حمید اللہ نے کہا —— "انہیں نہ میں نے مارا ہے نہ میرے کسی آدمی نے۔ میں اقبال کرتا ہوں کہ سکندر کو میرے حکم سے اس درخت کے ساتھ لٹکایا گیا تھا لیکن میرے دو آدمیوں کو اس شخص نے قتل کیا ہے جس کا نام سکندر ہے۔"

"بکومت، قاتل تم ہو"—— ایس پی نے کہا —— "فوراً لاشیں برآمد کراؤ۔"

حمید اللہ بہت تڑپا۔ اُس نے وکیلوں جیسی دلیل بازی بھی کی لیکن ایس پی کے ایک اور گھونسے نے جو پہلے کی ہی طرح زوردار تھا اُس کی تمام تر دلیل بازی رد کر دی۔ اُس نے اپنے اُن دو آدمیوں کو جنہیں بلایا گیا تھا، اشارہ کیا۔ دونوں کھُرلی کے پیچھے چلے گئے۔ وہاں ہری گھاس کا ایک بڑا سا ڈھیر لگا ہُوا تھا۔ انہوں نے گھاس اٹھانی شروع کر دی۔ ہم سب اُن کے قریب جا رُکے۔ گھاس ہٹ گئی تو نیچے کچی مٹی نظر آئی۔

"کھودو"—— ایس پی نے کہا۔

دونوں نے کدالوں سے بڑی تیزی سے مٹی کھودنی شروع کر دی

جو دراصل پہلے ہی کھُدی ہوئی تھی۔ یہ ایک ہی گڑھا تھا جو قبر کی طرح کھودا گیا تھا۔ اس کی گہرائی کم و بیش چار فٹ تھی۔ جب مٹی ہٹ گئی تو دو لاشیں نظر آئیں جو اُوپر نیچے پڑی ہوئی تھیں۔ لاشوں کو باہر نکال کر ایک ہی چارپائی پر ڈال دیا گیا۔

میں لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ شہناز قریب ہی کہیں کھڑی تھی۔ اچانک اُس کی چیخ نکلی۔ سب نے بدک کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھے ہُوئے چلّا رہی تھی۔

"میں نہیں دیکھ سکتی"—— وہ پھر چلّائی —— "مجھے جانے دو۔"

میں ایک ہی جست میں اُس تک پہنچا اور اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ چیختی چلّاتی میرے ساتھ لپٹ گئی۔ میں اُسے مکان سے باہر لے گیا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ رات کو اُس نے میرے ساتھ مل کر ان دونوں آدمیوں کو قتل کیا تھا یہ میری محبت کی انتہا تھی جس نے اُسے دلیر اور ظالم بنا دیا تھا، لیکن لاشیں دیکھ کر وہ ڈرپوک عورت بن گئی۔

"خدا کے لئے شہناز، اپنے آپ کو سنبھالو"—— میں نے کہا —— "یہ دونوں انگریز افسر یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ان دونوں کو حمید اللہ نے قتل کیا ہے۔ نہ مجھے کوئی پکڑے گا نہ تمہیں۔ یہ تو تمہیں پتہ چل ہی چکا ہے کہ میں پولیس کا افسر ہوں اور خفیہ پولیس میں ہوں۔ میں نے اپنے افسروں کو بتا دیا ہے کہ ان آدمیوں کو میں نے اور تم نے قتل کیا ہے۔ یہ ایس پی تمہیں شاباش دے چکا ہے۔"

شہناز کو یہی ڈر تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے سنبھالا اور اُس کے ذہن میں یہ خیال پیدا کیا کہ اُس نے بہت بڑا کارنامہ کیا ہے۔

"پھر حمید اللہ پھانسی چڑھ جائے گا؟"—— شہناز نے پوچھا۔

"چڑھ جانے دو"—— میں نے کہا —— "تمہیں اس سے کیا؟ تم اب یہاں نہیں رہو گی۔"

میں پھر اُسے اندر لے آیا۔

✖

ایس پی حمید اللہ سے کہہ رہا تھا کہ ان دو آدمیوں کو اُس نے قتل کیا ہے اور قتل کا باعث یہ ہے کہ ان دونوں کو اُس نے میرے پہرے پر بٹھایا تھا اور انہوں نے مجھے کھول کر بھگا دیا تھا۔ قتل کا یہ باعث بڑا اچھا سوچا گیا تھا۔ دراصل ایس پی حمید اللہ کو انتہائی سزا دلانا چاہتا تھا۔ حمید اللہ کے وہ دو آدمی جو مجھے باندھنے اور لٹکانے کے جُرم میں شامل تھے وہ اقبالِ جُرم پر آمادہ ہو چکے تھے اور ایس پی نے انگریز انسپکٹر کو آہستہ سے کہہ دیا کہ ان میں سے ایک کو سلطانی گواہ بنا کر اپنے مطلب کا بیان لے لیں گے۔

پولیس کی تفتیشی کارروائی خاصی لمبی اور کچھ پیچیدہ تھی۔ پیچیدہ اس لئے کہ حمید اللہ مجرم تو تھا ہی لیکن اُس کے خلاف کچھ جھوٹ کی آمیزش بھی کرائی تھی۔ پھر پیچیدگی یہ بھی تھی کہ شہناز کو گواہ کے طور پہ پیش نہیں کرنا تھا۔ حمید اللہ کو ہتھکڑی لگا لی گئی۔ لاشوں کے پوسٹ مارٹم کا انتظام کر دیا گیا۔ دونوں مزارعوں کو بھی باقاعدہ طور پر گرفتار کر لیا گیا۔

ایس پی سب کو حمید اللہ کے مکان میں لے گیا اور اُس نے مجھے کہا کہ میں شہناز کو اُس کے سامنے لاؤں۔ میں شہناز کو اُس کے پاس لے گیا تو اُس نے شہناز سے پوچھا کہ یہ سارا واقعہ کس طرح ہُوا تھا۔

شہناز نے بتایا کہ میں جب اپنے کمرے میں چلا گیا تو وہ حمید اللہ کے ساتھ سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ حمید اللہ حسبِ معمول وسکی رکھ کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ شہناز کو وہ دل و جان سے چاہتا تھا۔ پینے کے دوران وہ اُسے اپنے پاس بٹھاتا اور اپنے اُوپر رومانی کیفیت طاری کر لیتا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد حمید اللہ نے شہناز سے کہا کہ وہ ذرا باہر جا رہا ہے اور ابھی آ جائے گا۔ اس نے مزارعوں کا کوئی مسئلہ بتایا تھا۔

شہناز کی آنکھ لگ گئی۔ بہت دیر بعد کمرے کی بتی جلی تو اُس کی آنکھ کھل گئی۔ بتی حمید اللہ نے جلائی تھی۔ شہناز نے اُسے کہا کہ وہ بہت دیر لگا کر آیا ہے۔

"کام ہی ایسا تھا" — حمید اللہ نے جواب دیا — "بڑا موٹا شکار

مارا ہے۔"

"کسی کو قتل کروا دیا ہوگا؟" — شہناز نے کہا۔

"نہیں" — حمید اللہ نے کہا — "اُسے قتل ہوتے دو چار دن لگیں گے .... جانتی ہو وہ کون ہے؟ .... ہمارا مہمان سکندر۔"

"کیوں؟" — شہناز نے گھبرا کر پوچھا — "اُس نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟"

"بگاڑا نہیں" — حمید اللہ نے طنزیہ لہجے میں کہا — "اس نے ہمارا بیڑہ غرق کیا ہے۔ یہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ میں اس کے دھوکے میں آگیا اور اپنے پندرہ آدمی مروا لئے۔ میں تو ساری عمر کے لئے جیل چلا گیا تھا۔ اگر نواب صاحب ڈیڑھ لاکھ تاوان نہ دیتے تو مجھے عمر قید ہو جاتی۔ اب وہ پھر بھید لینے آیا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔"

"یہ آپ کو کس نے بتایا ہے؟" — شہناز نے پوچھا — "اگر وہ خفیہ پولیس میں ہوتا تو مجھے ضرور بتا دیتا۔"

"سب انسپکٹر ایوب سے زیادہ معتبر آدمی کون ہو سکتا ہے" — حمید اللہ نے کہا — "ایوب نے مجھے پکی خبر دی تھی اور وہ جو نجومی یہاں آیا تھا وہ بھی خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔ اُس کے ذریعے سکندر نے اپنے محکمے کو اطلاع بھجوائی تھی کہ ڈاکوؤں کے دونوں گروہ آ گئے ہیں۔ آگے جو کچھ ہُوا وہ تم نے دیکھ لیا تھا۔ سب انسپکٹر ایوب انگریزوں کی پولیس کا نہیں، میرا آدمی ہے۔ میں نے روپوں سے جس طرح اُس کا پیٹ بھرا ہے اس طرح کون بھر سکتا ہے۔ وہ میرے آگے جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

شہناز نے میری موجودگی میں بیان دیتے ہُوئے جب ایوب کا نام لیا تو ایس پی کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ شہناز نے اپنے بیان میں کہا کہ ایوب اُن کے ہاں آتا رہتا تھا اور اُسے پھانسنے کی کوشش کرتا تھا۔ شہناز نے پہلے تو اُسے دھتکارا، پھر ایک روز اُس کی اچھی خاصی بے عزتی کر دی۔ ایوب کا خیال تھا کہ شہناز مجھے چاہتی ہے۔ اُس نے اپنی بے عزتی کا انتقام اس طرح لیا کہ

حمید اللہ کو بتا دیا کہ سکندر پولیس کی سپیشل برانچ کا آدمی ہے۔

"حمید اللہ نے مجھے بتا دیا کہ وہ سکندر کو کہاں لٹکا آیا ہے"۔۔۔ شہناز نے ایس پی کو بیان دیتے ہوئے کہا ۔۔۔ "حمید اللہ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہاں دو دو آدمی پہرے پر چھوڑ آیا ہے۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں نے سکندر کو بچانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ حمید اللہ کو شراب پلانی شروع کر دی۔ میں بظاہر خوشی کا اظہار کر رہی تھی کہ ہم نے اپنے ایک بڑے ہی خطرناک دشمن کو پکڑ لیا ہے۔ میں اُس کے ساتھ چھیڑ خانی بھی کرتی رہی اور وہ کچھ مجھ سے متاثر کچھ فتح کی خوشی میں پیتا چلا گیا۔ وہ جو پہلے بھی نشے میں تھا، بے سُدھ اور بے خبر سو گیا....

"میں جانتی تھی کہ اب وہ صبح دس بجے سے پہلے نہیں اُٹھے گا۔ وہ بید کا یہ ڈنڈہ سونے کے کمرے میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ میں نے یہ ڈنڈہ اُٹھایا اور اُس مکان میں پہنچ گئی جہاں سکندر کو لٹکایا گیا تھا۔ میں اتنی دلیر تو نہیں تھی نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ کسی کے سر پر ڈنڈہ مارو تو وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ یہ مجھے حمید اللہ نے ایک بار بتایا تھا۔ وہ اس طرح کہ میں نے ایک روز یہ ڈنڈہ اُٹھایا تو بڑا وزنی لگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ اتنا وزنی کیوں ہے۔ اُس نے بتایا کہ اس کے آگے سیسہ بھرا ہوا ہے۔ اگر یہ گھوڑے کے سر پر مارو تو وہ بھی بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے....

"اُس رات جب میں سکندر کو چھڑانے گئی تو یہی ڈنڈہ ہاتھ میں لے لیا اُس مکان میں گئی تو جو مزارعہ پہرے پر جاگ رہا تھا وہ سمجھا ہو گا کہ میں اپنے قیدی کو دیکھنے آئی ہوں۔ وہ مجھ سے شاباش کی توقع رکھتا تھا لیکن میں نے اُس کی توجہ سکندر کی طرف کر کے پہلے اُس کی پگڑی گرائی پھر اُس کے سر پر ڈنڈہ مارا"۔

اس کے بعد شہناز نے اپنے بیان میں وہی کچھ کہا جو میں تفصیل سے سُنا چکا ہوں۔ اُس نے بتایا کہ وہ جب مجھے رخصت کر کے واپس آئی تو حمید اللہ بے سُدھ پڑا تھا۔ وہ اس قدر غصے میں تھی کہ حمید اللہ کے سر پر بھی ڈنڈہ مارنے لگی تھی لیکن اُسے خیال آ گیا کہ وہ پھر جاتے گی کہاں۔ اگلی صبح ایک

مزارعہ جو اس جُرم میں شامل تھا گھبرایا ہوا آیا اور اُس نے بتایا کہ سکندر غائب ہے اور اُس کی جگہ دونوں پہرہ دار لٹکے ہوتے ہیں اور وہ مر چکے ہیں۔

شہناز کا بیان ختم ہوا تو ایس پی نے ایوب کو اندر بلا لیا۔

"تم بے ایمان آدمی!" ۔۔۔ ایس پی نے دانت پیس کر کہا ۔۔۔ "تم نے پولیس افسر ہوتے ہوئے جو جرم کیا ہے وہ اتنا معمولی نہیں کہ تمہیں صرف لائن حاضر کیا جاتے یا نوکری سے نکال دیا جاتے۔ تم نے حکومتِ برطانیہ کا راز فاش کیا ہے اور دو آدمیوں کے قتل کا باعث بنے ہو اور پولیس کے ایک افسر کو تم نے مجرموں کے ہاتھوں قتل کروانے کی کوشش کی ہے"۔۔۔ ایس پی نے انگریز انسپکٹر کو بلا کر انگریزی میں کہا ۔۔۔ "اس سب انسپکٹر کو ہتھکڑی لگا لو"۔

ایوب پر یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ اُسے اپنی صفائی میں جھوٹ بولنے کی بھی مہلت نہ ملی اور اُسے ہتھکڑی لگ گئی۔ اُسے جب باہر لے گئے تو ایس پی شہناز کی طرف متوجہ ہوا۔

"دیکھو لڑکی!" ۔۔۔ ایس پی نے شہناز سے کہا ۔۔۔ "تمہیں ہم عدالت میں پیش نہیں کریں گے لیکن تم جاؤ گی کہاں؟ سکندر نے بتایا ہے کہ تمہارا اپنا گھر ہے اور تمہارے ماں باپ زندہ ہیں۔ ہم تمہیں سرکاری خرچ پر ایک آدمی کی حفاظت میں تمہارے گھر بھیج دیں گے"۔

"نہیں" ۔۔۔ شہناز نے میری طرف دیکھ کر کہا ۔۔۔ "میں اُس ماں کے پاس نہیں جاؤں گی جس نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے"۔

"پھر کہاں جاؤ گی؟" ۔۔۔ ایس پی نے پوچھا۔

"میں سکندر کے ساتھ رہوں گی" ۔۔۔ شہناز نے جواب دیا۔

"نہیں لڑکی!" ۔۔۔ ایس پی نے کہا ۔۔۔ "تم اس کے ساتھ نہیں رہ سکتیں"۔

"صاحب بہادر!" ۔۔۔ میں نے ایس پی سے کہا ۔۔۔ "یہ ایک الگ کہانی ہے کہ یہ اپنے گھر کیوں نہیں جانا چاہتی۔ پھر کبھی آپ کو سناؤں گا۔ آپ

یہ سمجھ لیں کہ اس کا کوئی ٹھکانہ ہے ہی نہیں۔ میری مجبوری آپ جانتے ہیں۔"

اچانک ایس پی ہنس پڑا۔ اُس نے بازو لمبا کیا اور شہناز کی کمر کے گرد بازو لپیٹ کر اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"اتنی خوبصورت لڑکی کو ہم ضائع نہیں ہونے دیں گے" — ایس پی نے شہناز کو اپنے بازوؤں میں بھینچتے ہوئے کہا — "یہ ہمارے ساتھ رہے گی۔"

میرا خون کھول اُٹھا۔ میں پہلے ہی دیکھ رہا تھا کہ انگریز ایس پی اس گوری چٹی حسین لڑکی پر فریفتہ ہُوا جا رہا ہے۔ اب اُس نے اپنی نیّت کا اظہار کر دیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے یہ انگریز مجھ سے میری عزیز ترین چیز چھین رہا ہو۔ میں اُس کے سامنے بول نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا کہ میں نے پولیس کی سروس قبول ہی کیوں کی تھی۔ میں نے تہیّہ کر لیا کہ مجھے نوکری چھوڑنی پڑی یا ایس پی کو قتل کرنا پڑا، میں شہنانہ کو اس کے حوالے نہیں کروں گا۔

ایس پی نے کرُسی پر بیٹھے بیٹھے بازو شہناز کی کمر کے گرد لپیٹ کر اُسے اپنے قریب کیا اور اُس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر اُس نے میری طرف دیکھا۔ مجھے جو دھچکا لگا تھا وہ ایک تاثر بن کر میرے چہرے پر آگیا ہوگا۔ ایس پی نے یہ تاثر پڑھ لیا ہوگا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس نے بازو شہناز کی کمر سے ہٹا دیا۔ اُس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔ وہ روانی سے اُردو بولا کرتا تھا لیکن اُس نے انگریزی میں بات کی۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں اِس لڑکی سے بہت محبت ہے" — اُس نے کہا — "اور اس لڑکی کو بھی!" — اُس نے شہناز کی طرف دیکھا اور اُس سے بھی انگریزی میں پوچھا — "ایسا ہی ہے نا!"

شہناز نے میری طرف دیکھا۔

"یہ انگریزی نہیں سمجھتی صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "صرف اُردو لکھ پڑھ سکتی ہے۔"

"ولایت (انگلستان) میں ایسا حُسن کم ہی دیکھنے میں آتا ہے" — ایس پی نے کہا — "اگر اس لڑکی کا لباس بدل دیا جائے، اس لباس کی بجائے یورپین لباس پہن لے اور بالوں میں اتنا زیادہ تیل نہ ڈالے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ہندوستانی لڑکی ہے۔"

میں نے دیکھا ہے کہ جس انسان پر شیطان کا غلبہ ہو جاتا ہے، اُس کی شخصیت کتنی ہی رعب دار کیوں نہ ہو مسخ ہو کے رہ جاتی ہے۔ عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور سوچوں میں گہرائی ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کسی کے ساتھ آنکھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتا۔

یہ ایس پی جس کا نام ایل۔ بی میڈوز تھا، انگریز تھا اور وہ پولیس کا

سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اُس کا تو صرف انگریز ہونا ہی کافی تھا کیونکہ انگریز ہمارا بادشاہ تھا اور پولیس کا ایک کانسٹیبل بھی خواہ وہ ہندوستانی ہی ہوتا پبلک کے لئے بادشاہوں سے کم نہیں ہوتا تھا، میڈوز تو ایس۔پی تھا۔ میں اُس کے آگے فالتو بات کرنے کی یا اُسے ٹوکنے کی جرآت نہیں کر سکتا تھا لیکن اُس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ وہ میری نظروں کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔

"سکندر!" — اُسے جیسے اچانک یاد آ گیا ہو کہ وہ انگریز ایس پی اور میں ہندوستانی سب انسپکٹر اور اُس کا غلام ہوں۔ اُس نے کہا —
"یہ لڑکی جہاں بھی جانا چاہے جا سکتی ہے لیکن ابھی جا نہیں سکے گی۔ حمیداللہ خان اور سب انسپکٹر ایوب کے کیس عدالت میں جا رہے ہیں۔ ہم اس لڑکی کو عدالت میں پیش تو نہیں کریں گے لیکن حمیداللہ نوابزادہ ہے، وہ سب سے زیادہ قابل وکیل لائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی صفائی مضبوط کر لے۔ اس صورت میں ہم شہناز کو اپنے مطلب کے بیان یاد کرا کے عدالت میں پیش کر دیں گے۔"

میں اُس کی نیت بھانپ گیا تھا اور وہ شاید میری نظریں بھانپ گیا تھا۔

"تم اس لڑکی کا فکر نہ کرو سکندر!" — اُس نے کہا۔

"صاحب بہادر!" — میں نے اُسے کہا — "اگر آپ اجازت دیں تو شہناز کو دوسرے کمرے میں بٹھا دیں۔ میں آپ کے ساتھ کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اُس کے دفتر کا ایک کمرہ اور بھی تھا جس میں وہ مخبروں سے اور ماتحتوں سے رپورٹیں لیا کرتا تھا۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں شہناز کو ساتھ والے کمرے میں بٹھا دوں۔ میں نے شہناز کو دوسرے کمرے میں لے جا کر بٹھایا اور اُس کے ساتھ کوئی بات کئے بغیر واپس آ گیا۔ درمیان والا دروازہ بند کیا اور ذرا سا وہیں رُک کر اپنی اندرونی قوتوں کو مرکوز کیا اور گہرا سانس لے کر اپنے آپ کو یقین دلایا کہ میں اس انگریز پولیس آفیسر پر غالب آ جاؤں گا۔ اتنے بڑے انگریز افسر کو صرف آمادہ کر لینا کہ وہ پوری بات سنے، بہت بڑا کارنامہ ہوا کرتا تھا۔ میں اُس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

مجھے توقع تھی کہ وہ کہے گا کہ جلدی بولو کیا کہنا ہے اور جاؤ اپنا کام کرو۔

"معلوم ہوتا ہے اس لڑکی کے متعلق تم بہت جذباتی ہو" — ایس۔پی میڈوز نے مسکرا کر کہا — "تم شاید اس کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہو۔"

"بات لمبی ہے صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "آپ کا وقت ضائع ہو گا۔"

"پوری بات کرو" — اُس نے کہا — "ہم سنیں گے سکندر!"

"ڈی۔ایس۔پی کلارک صاحب بہادر کو میں نے ساری کہانی سنائی تھی" — میں نے کہا — "میں شہناز کے متعلق اتنا جذباتی نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں اور مجھے اس کے ساتھ وہ محبت بھی نہیں۔ یہ تو میری دشمن تھی اور میں انتقام لینے کے لئے اسے دھوکے میں تلہجے ڈاکو کے پاس لایا تھا لیکن حالات نے ایسا رُخ بدلا کہ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے انسانوں کی شکلیں بدل گئی ہوں۔ ان کے روپ بہروپ ایک ہو گئے ہوں۔ سانپوں اور بچھوؤں میں جیسے زہر رہا ہی نہ ہو۔"

"مجھے پوری بات سناؤ" — ایس۔پی نے کہا — "یہ معاملہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے اُسے شہناز کی اور اپنی ساری کہانی سنائی۔ کہانی وہاں سے شروع کی جہاں شہناز میری سوتیلی ماں بن کر آئی تھی۔ اُس وقت کو یاد کر کے میرے آنسو نکل آتے۔ میں نے کہانی یہاں ختم کی جہاں شہناز ایس۔پی میڈوز کے دفتر کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "میں اس کے ساتھ وہ محبت کر ہی نہیں سکتا جو آپ سمجھتے ہیں۔ میں اسے صلہ دینا چاہتا ہوں۔ صلہ اس کا کہ میرے متعلق اس کی نیت صاف ہو گئی ہے اور اب آپ نے دیکھ لیا ہے کہ اس نے کس طرح مجھے مرنے سے بچایا ہے .... صاحب بہادر! میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ اس کے ساتھ میرا روحانی سا تعلق پیدا ہو گیا ہے اور اس

کی حفاظت کو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

"اگر میں اسے اپنے بنگلے کے سرونٹ کوارٹرز میں رکھوں تو اس کی حفاظت ہو سکے گی" ــــ ایس۔ پی نے کہا ــــ "اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اسے حمید اللہ اور ایوب کے مقدمے ختم ہونے تک یہیں رہنا پڑے گا۔"

"صاحب بہادر!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں آپ کو ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں جو سُن کر آپ مجھے پسماندہ اور جاہل ہندوستانی کہیں گے لیکن میں آپ کو خبردار کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں.... شہناز کے ساتھ جس کا بھی تعلق پیدا ہُوا یا جس کسی نے اِسے بُری نیت سے دیکھا اُس کا انجام بہت بُرا ہُوا۔ میرے باپ نے اس کے ساتھ شادی کی تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ کیسی اذیت ناک موت مرا۔ میرا گھر ہی اُجڑ گیا۔ سیٹھ ابراہیم نے اسے خریدا تو اُس کی رقم جو یقیناً بہت زیادہ ہو گی، ضائع ہوتی اور یہ میرے ساتھ آ گئی۔ تاجے جیسے سخت آدمی نے اس سے محبت کی بھیک مانگی اور اسے اپنے پاس رکھنا چاہا تو وہ بھی قتل ہو گیا اور اُس کا دوست بھی۔ نواب زادہ حمید اللہ خان نے اسے داشتہ بنا کے رکھ لیا تو وہاں دو آدمی قتل ہو گئے اور حمید اللہ کا انجام دیکھ لیں۔ سب انسپکٹر ایوب کے ساتھ شہناز کے کبھی تعلقات رہے تھے۔ اب اُس نے پھر شہناز کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایوب کا انجام دیکھ لیں۔ حوالات میں بند ہے اور وہ جیل سے بچ نہیں سکتا۔"

"تم نے بھی اس کے ساتھ تعلق پیدا کر رکھا ہے۔"

"لیکن صاحب بہادر!" ــــ میں نے کہا ــــ "میری نیت بُری نہیں اور میں اِسے اپنے ساتھ تو نہیں رکھنا چاہتا۔ میں تو اسے اِس کے گھر بھیجوں گا۔"

"کیا تم مجھے ڈرا رہے ہو؟" ــــ ایس۔ پی میڈوز نے مسکراتے ہوئے پوچھا ــــ "ہندوستانیوں میں یہی خرابی ہے کہ اتفاقات سے ڈرتے ہیں شہناز

بدروح تو نہیں۔"

"صاحب بہادر!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں تو اسے بدرُوح ہی سمجھنے لگا ہوں .... اور صاحب بہادر! آپ یقین نہیں کریں گے لیکن میں یہ بات بھی آپ کو بتا دیتا ہوں .... ہمارے شہر میں ایک پاگل عورت کبھی کبھی آیا کرتی تھی۔ ہم اُس وقت چھوٹے تھے۔ وہ ڈراؤنی سی شکل والی عورت تھی۔ کبھی وہ اپنے آپ ہی پیشین گوئیاں کرنے لگتی تھی۔ میرے باپ کے متعلق اُس نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل صحیح ثابت ہُوا۔ اُس نے میرے متعلق جو پیشین گوئی کی تھی وہ بھی صحیح ثابت ہو رہی ہے۔"

"کیا بتانا چاہتے ہو مجھے؟" ــــ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"صاحب بہادر!" ــــ میں نے کہا ــــ "شہناز کے متعلق اُس نے کہا تھا کہ اس لڑکی کا حُسن اسے کسی گھر میں آباد نہیں ہونے دے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کی خوبصورتی اسے ڈبوتے گی اور جس کسی کا وجود اس کے وجود کے ساتھ لگ گیا وہ تباہ ہو جاتے گا اور اُس پاگل عورت نے شہناز کے متعلق یہ بھی کہا تھا کہ یہ بڑا قیمتی ہیرا ہے، کئی ہاتھوں میں بِکے گا۔"

"او، شٹ اَپ!" ــــ ایس۔ پی نے انگریز افسروں کے لہجے میں کہا ــــ "مت فکر کرو۔ تم جاؤ۔ اس لڑکی کے متعلق تمہیں بعد میں حکم ملے گا" ــــ اس کے بعد اُس نے مجھے دو تین سرکاری کام بتا دیتے اور مجھے چلتا کیا۔ مجھے شہناز کے متعلق اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ وہ میری کچھ نہیں لگتی تھی اور وہ شریف لڑکی بھی نہیں تھی، پھر بھی میں اُسے ایس پی کے پاس چھوڑ کر آگیا تو میں نے اپنے آپ میں تلخی سی محسوس کی۔ اپنے کمرے میں آیا تو میرا ساتھی سلطان احمد میرے انتظار میں تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں اتنی دیر کہاں رہا ہوں۔ میں نے اُسے بتایا اور یہ بھی بتایا کہ میں تلخی سی محسوس کر رہا ہوں۔

"سکندر!" ــــ سلطان نے کہا ــــ "شہناز کہاں کی پاکباز ہے؟ تم

کب تک اس کی حفاظت کرو گے؟ کیا تم انگریز افسروں سے ٹکر لو گے؟ تم دیکھ لینا. ایس. پی میڈوز کے ساتھ وہ خوش رہے گی. دل سے اُتار دو اسے!"

"میں چاہتا ہوں کہ اُسے اُس کے گھر پہنچا دوں" — میں نے کہا — "میرا فرض ادا ہو جاتے گا"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ میڈوز صاحب اُسے ڈاکوؤں کے حوالے کر دے گا؟" — سلطان نے کہا — "کیا وہ اسے عصمت فروشوں کے ہاں بیچ آتے گا؟ دو چار روز بعد صاحب تمہیں کہے گا کہ اسے گھر چھوڑ آؤ. تمہارا فرض ادا ہو جائے گا۔"

میں نے اپنے آپ کو تسلی دے لی اور اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ حالات میرے بس سے باہر ہیں اور ان حالات کے ساتھ میرا کوئی تعلق ہونا بھی نہیں چاہیے۔

×

شہناز کے متعلق پتہ چلا کہ ایس. پی میڈوز اُسے اپنے بنگلے میں لے گیا ہے. یہ ایس. پی جس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی، رنگین مزاج انگریز تھا اور اُس میں خاصیت یہ تھی کہ ہندوستانی لڑکیوں کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ انگریزوں میں یہ خوبی تھی کہ اپنی ڈیوٹی اور اپنے فرائض میں اس قدر مخلص اور دیانتدار ہوتے تھے کہ اپنے ماں باپ اور ذاتی دلچسپیوں کو نظر انداز کر دیتے اور ڈیوٹی کو اپنا ذاتی کام سمجھتے تھے. بیماری کی حالت میں بھی وہ کام میں جُتے رہتے تھے۔ میڈوز بھی انہی انگریز افسروں میں سے تھا لیکن ان سب سے زیادہ جنونی تھا. اپنے فرائض کی تکمیل میں دیوانہ ہو جاتا تھا. ایسے لگتا تھا جیسے ہندوستان میں برطانیہ کی شہنشاہی کے تحفظ کی ساری ذمہ داری اس اکیلے کے کندھوں پر ہو۔

"ہم قاتل اور ڈاکو کو معاف کر سکتے ہیں" — وہ ہمیں جب بھی لیکچر دیتا تو یہ الفاظ ضرور کہا کرتا تھا — "کوئی چور میرے گھر کو خالی کر جاتے تو میں اُسے بھی معاف کر سکتا ہوں لیکن میں دہشت گرد اور تخریب کار کو کسی قیمت پر معاف

نہیں کروں گا۔"

میں نے لفظ ٹیررسٹ سب سے پہلے اسی کی زبان سے سنا تھا. اُسے جب بھی کسی واردات میں یہ شک ہو جاتا کہ یہ واردات دہشت گردوں کی ہے تو وہ بڑا خطرناک ٹیررسٹ بن جاتا تھا. مشتبہوں کی ہڈیاں توڑ دیتا تھا. تھانوں میں اچانک جا دھمکنا اور کاغذات دیکھنا اور تھانیداروں کے لئے مصیبت بن جانا اُس کے فرائض میں شامل نہیں تھا کیونکہ وہ سپیشل برانچ کا افسر تھا لیکن وہ اپنے آپ کو پولیس کے ہر شعبے کا انچارج سمجھتا تھا. یہ فرض کی لگن کی دیوانگی تھی. فرض کی تکمیل کے بعد میڈوز رنگیلا بادشاہ تھا. عیاش اور رنگین مزاج۔

اُس کی بیوی تھی، دو بچے بھی تھے. انہیں وہ سال میں تین مہینے اپنے ساتھ رکھتا تھا. اُن کے باقی نو مہینے انگلستان میں گزرتے تھے. میں نے اُس کی میم دیکھی تھی. پہلوان قسم کی عورت تھی. سُنا تھا کہ نوجوانی میں دُبلی پتلی تھی اور اُس کے جسم میں کشش تھی. دو بچوں کی پیدائش کے بعد اُس کا جسم ایسا پھُولا کہ اُس کا حُسن چربی میں دفن ہو گیا تھا. اُس کا صرف رنگ گورا تھا. اس کے سوا اُس میں کوئی خوبی نہیں رہی تھی. میڈوز نے اپنے دل میں اُس کی محبت کو زندہ رکھنے کا یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ اُسے نو مہینے انگلستان اور تین مہینے اپنے پاس ہندوستان میں رکھتا تھا. یہاں پانچ چھ کنال کے بنگلے میں اکیلا رہتا تھا اور عیش کرتا تھا۔

اُن دنوں وہ خود کسی سراغرسانی میں مصروف تھا. میں اور سلطان حمید اللہ خان اور ڈاکوؤں والی ڈیوٹی میں مصروف تھے. سُنا تھا کہ ایس. پی میڈوز شک کی بنا پر ذاتی طور پر سراغرسانی میں مصروف ہے. اس کی تفصیل کا مجھے پتہ نہیں تھا. ہمارا کیس بھی اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا. اُس کے ماتحت انگریز اور ہندوستانی پولیس انسپکٹر بھی تھے جو خاص طور پر تجربہ کار تھے لیکن اہم وارداتوں کی سراغرسانی وہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا. میرا جی چاہتا تھا کہ وہ کہیں چلا جاتے تو میں شہناز کو ایک نظر دیکھوں کہ وہ کس حال میں ہے. حقیقت یہ تھی کہ میں بغیر کام اور اجازت کے اُس کے بنگلے پر جا ہی نہیں سکتا تھا میں لے

بہت کوشش کی کہ شہناز کو ذہن سے نکال دوں لیکن کچھ ایسی وابستگی ہو گئی تھی کہ شہناز میرے ذہن میں چپکی رہی۔

×

شہناز کو ایس۔پی کے بنگلے میں گئے دو دن ہو گئے تھے۔ میں ٹہلتا ٹہلتا ایس۔پی میڈوز کے بنگلے کے قریب سے گزرا۔ اُس کا بنگلہ اتنا بڑا تو نہیں تھا لیکن اُس کے اردگرد بہت سی جگہ خالی چھوڑی ہوئی تھی جس میں درخت اور پودے تھے اور اردگرد تقریباً چار فٹ اونچی فصیل تھی۔ میں نے برآمدے میں بڑے اچھے اور دلکش قد کی ایک عورت کھڑی دیکھی جس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اُس کے بال کھُلے ہوتے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ اس عورت کی موجودگی میں بھی میڈوز نے شہناز کو اپنے بنگلے میں رکھ لیا ہے۔

یہ عورت ہندوستانی نہیں لگتی تھی۔ دُور سے صاف نظر آتا تھا کہ یہ انگریز عورت ہے جس نے شوقیہ ساڑھی باندھ رکھی ہے۔ اُس کے بالوں کا رنگ ہندوستانی عورتوں کی طرح کالا نہیں ذرا گہرا بادامی تھا۔ وہ دو نوکروں کو سامنے کھڑا کئے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں آگے چلتا گیا اور اُسے دیکھتا گیا۔ جب اُس کا چہرہ کچھ اور سامنے آیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ شہناز تھی۔

مجھے یاد آیا کہ میڈوز نے کہا تھا کہ یہ لڑکی اگر بالوں میں اتنا زیادہ تیل نہ ڈالے اور بالوں کو ہندوستانی طرز پہ نہ سنوارے اور اس کا لباس بدل دیا جائے تو کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ یہ ہندوستانی لڑکی ہے۔ میڈوز نے اپنی طبیعت کی رنگینی کا یہ مظاہرہ کیا تھا کہ اُس نے شہناز کے بالوں سے تیل دُھلوا کر اور اُسے بڑی قیمتی ساڑھی میں لپیٹ کر ہندوستانی نہیں رہنے دیا تھا۔ میں خود شک میں پڑ گیا تھا کہ یہ یورپین عورت ہے۔

میرے قدم رُکنے لگے۔ شہناز نے میری طرف نہ دیکھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں ایس پی کے بنگلے میں بغیر کسی سرکاری کام کے داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں بنگلے کی فصیل سے دُور ہٹتا ہٹتا دوسری طرف نکل گیا۔ اسی روز کے پچھلے پہر میڈوز نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔

"بیٹھو سکندر!" ــــ اُس نے مجھے بٹھا کر کہا ــــ "تم شہناز کے متعلق پریشان تھے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں شہناز کے ساتھ شادی کر رہا ہوں تو کیا تمہاری پریشانی ختم ہو جاتے گی؟"

"ہاں صاحب بہادر!" ــــ میں نے کہا ــــ "بعض انگریزوں نے ہندوستانی عورتوں کے ساتھ شادیاں کی ہیں لیکن آپ پہلے ہی شادی شدہ ہیں اور آپ کے دو بچے بھی ہیں۔"

"یہ میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں" ــــ اُس نے بے رُخی کے انداز میں جواب دیا ــــ "میں دراصل کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھا جو میرے معیار کے مطابق ہو۔ شہناز کے رُوپ میں وہ لڑکی مجھے مل گئی ہے۔"

"میں کوئی اعتراض نہیں کر سکتا صاحب بہادر!" ــــ میں نے کہا ــــ "میری وہ کچھ بھی نہیں لگتی۔ اتنی دلچسپی ضرور ہے کہ وہ کسی گھر میں آباد ہو جائے۔ آپ اُسے انگریزی بول چال سکھا دیں تو وہ ہر لحاظ سے آپ کے قابل ہے... صاحب بہادر! میں نے دو روز پہلے آپ کو جو بات کہی تھی وہ پھر کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے کہ آپ مجھے توہم پرست ہندوستانی کہیں گے، میں اپنا فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اُس پاگل عورت کی کوئی بھی پیشین گوئی غلط ثابت نہیں ہوئی۔ شہناز کا جو مستقبل اُس نے بتایا تھا وہ ویسا ہی سامنے آتا جا رہا ہے۔ میں ڈرتا ہوں ...."

"سب انسپکٹر سکندر!" ــــ ایس۔پی کا لہجہ ذرا سخت اور سنجیدہ تھا۔ اُس نے افسروں کے لہجے میں کہا ــــ "تم پولیس کے آفیسر ہو اور تم سپیشل برانچ کے سراغرساں ہو۔ اگر تم کسی بھی وہم میں مبتلا رہے تو ہم سمجھیں گے کہ تم سپیشل برانچ تو دُور کی بات ہے، تم پولیس کے بھی قابل نہیں .... اور تم بہت ذہین اور عقلمند جوان ہو۔ میں نے تم میں ایک دو ایسی خوبیاں بھی دیکھی ہیں جو انگریز افسروں میں بھی کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ عقل سے کام لو۔"

"ٹھیک ہے صاحب بہادر!" ــــ میں نے کہا ــــ "مجھ میں ایک خوبی یا خامی اور بھی ہے جو شاید آپ نے محسوس نہیں کی۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے

ایک نہیں دو بہن رگیں مجھ میں فالتو ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں آنے والے وقت کو دیکھ لیتا ہوں لیکن مجھے احساس سا ہو جاتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے اور جو ہونے والا ہے وہ اچھا نہیں ہوگا اور اس کی پیش بندی کر لینی چاہیئے۔ مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ شہناز ایک بڑے افسر کی بیوی بن رہی ہے لیکن میں اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کرتا ہوں اور یہ بوجھ مجھے ڈرا رہا ہے۔"

"تم عقل مند ہو سکتے ہو سکندر!"۔۔۔ میڈوز نے کہا۔۔۔ "اور تم عقلمند ہو بھی لیکن تمہیں عملی زندگی کا ابھی اتنا تجربہ حاصل نہیں ہُوا جتنا میں نے حاصل کیا ہے۔ بوجھ جو تم اپنے دل پر محسوس کر رہے ہو وہ یہ ہے کہ یہ چاہتے ہُوئے بھی کہ شہناز کی شادی کسی اچھے آدمی کے ساتھ ہو جاتے، تم نہیں چاہتے کہ وہ تم سے جدا ہو جاتے۔ میں جانتا ہوں کہ تم اپنے اسلامی قانون کے مطابق سوتیلی ماں کے ساتھ صرف ماں بیٹے کا ہی تعلق رکھ سکتے ہو۔۔۔ فکر مت کرو سکندر! مجھے تمہارے ساتھ بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تم میرے ماتحت ہو اور سب سے جونیئر سب انسپکٹر ہو لیکن تمہارا کام اور تمہاری عقل دیکھ کر میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔"

"شہناز کے ساتھ آپ نے بات کی ہوگی صاحب بہادر!"

"وہ بہت خوش ہے"۔۔۔ میڈوز نے جواب دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد کہنے لگا۔۔۔ "ٹھیک ہے سکندر! تم جاؤ۔۔۔ اور دیکھو۔ حمید اللہ خان اور ایوب کے کیسوں میں جو گواہ تیار کئے جا رہے ہیں وہ تم جانتے ہو کہ پیڈنگ والے ہیں۔ خیال رکھو کہ کوئی گواہ گڑبڑ نہ کرے۔ اُن کو ڈرا کر رکھو۔ اُن کو انعام ہم دیں گے۔"

"ٹھیک ہے صاحب بہادر!"۔۔۔ میں سیلوٹ کر کے میڈوز کے دفتر سے نکل آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھے خوشی تھی کہ شہناز کو خدا نے ایسا حُسن دیا تھا کہ اتنا بڑا انگریز افسر اُسے اپنی بیوی بنا رہا تھا۔ ویسے بھی مجھے شہناز کو اپنے لئے ایسا ٹیڑھا مسئلہ نہیں بنا لینا چاہیئے تھا۔

✖

حمید اللہ اور ایوب کے کیسوں کی تیاری پر دوسرے افسر معمور تھے لیکن مجھے اور سلطان احمد کو بھی اُن کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ ایوب کا کیس تو صاف تھا پیچیدگی حمید اللہ کے کیس میں تھی کیونکہ اُس پر زیر دفعہ ۳۰۲ فرد جرم عائد کروائی تھی اور کورٹ میں یہ ثابت کرنا تھا کہ اپنے دونوں مزارعوں کو اُسی نے قتل کیا ہے۔ قتل کا باعث ظاہر کرنے کے لئے مجھے بھی گواہ کے طور پر پیش ہونا تھا۔ بتانا یہ تھا کہ ملزم نے مجھے قتل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اُلٹا لٹکا دیا اور میں نے دونوں مزارعوں کو بے شمار رقم پیش کی تو انہوں نے مجھے کھول کر بھگا دیا اور حمید اللہ نے اس جرم میں انہیں جان سے ہی مار ڈالا۔ اُس کے ایک مزارعہ کو وعدہ معاف گواہ بنایا گیا تھا جسے بیان یاد کرایا جا رہا تھا۔ دوسرے گواہ بھی جھوٹے تھے۔ انہیں بھی بیان یاد کراتے جا رہے تھے۔ یہ ایک قسم کی ریہرسل تھی۔ بعض اوقات پوری پوری رات ہی مغز کھپائی میں گزر جاتی تھی۔

جس روز ایس۔ پی میڈوز نے مجھے اپنی اور شہناز کی شادی کے متعلق بتایا وہ دن اور وہ رات بھی گواہوں کے ساتھ اور مقدمہ تیار کرنے والوں کی مدد کرتے گزر گئی۔ اگلی صبح طلوع ہوتی تو ایک کانسٹیبل میرے کان میں کہنے لگا کہ مجھے ایوب بلا رہا ہے۔ وہ ابھی سپیشل برانچ کی حوالات میں ہی تھا۔ جب سے وہ بند ہُوا تھا میں نے اُس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میں کسی بھی وقت اُس کے پاس تفتیش وغیرہ کے بہانے جا سکتا تھا۔ اس نے بلایا تو میں چلا گیا۔ حوالات کے جس کمرے میں اُسے رکھا گیا تھا اُس میں وہ اکیلا تھا۔

"سکندر!"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "مجھے بچانے کے لئے کچھ کر رہے ہو؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں ایوب بھائی!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اگر مقدمہ میں نے تیار کرنا ہوتا تو کہیں تھوڑی سی بھول رکھ دیتا۔"

"کچھ کرو سکندر!"۔۔۔ ایوب نے کہا۔۔۔ "میں یہ سزا قبول کر لوں گا کہ مجھے نوکری سے برطرف کر دیا جاتے۔ اگر مجھے سزا ہو گئی جو دو سال سے کم کسی

صورت نہیں ہوگی تو میں شریف اور مہذب آدمی نہیں رہوں گا۔ میں ڈکیت بن کر جیل سے نکلوں گا اور ان انگریزوں کے لئے مصیبت بن جاؤں گا۔"

"آپ یہ دھمکیاں کسے دے رہے ہیں؟" ــــ میں نے کہا ــــ "میں انگریز تو نہیں۔ اب آپ کی قسمت میں جو کچھ ہے وہ قبول کریں۔"

"میں دھمکیاں نہیں دے رہا سکندر!" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں مجرمانہ ذہنیت کا آدمی ہوں اس لئے میں ڈرتا ہوں کہ پکا مجرم بن کر باہر آؤں گا۔ میں کہہ یہ رہا ہوں کہ میرے مستقبل کو بچالو۔ میں نے دیکھا ہے کہ انگریز افسر تمہیں بہت چاہتے ہیں .... کچھ کرو .... شہناز کہاں ہے؟"

"ایس۔ پی میڈوز اُس کے ساتھ شادی کر رہا ہے۔"

"کیا؟" ــــ ایوب نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا ــــ "مذاق کر رہے ہو؟"

"سچ کہہ رہا ہوں ایوب بھائی!" ــــ میں نے کہا ــــ "شہناز میڈوز صاحب کے بنگلے میں ہے۔ اگر آپ اُسے دیکھیں تو پہچان نہ سکیں۔ وہ نہایت خوبصورت میم بن گئی ہے۔"

"سکندر!" ــــ ایوب نے سلاخوں میں سے ہاتھ باہر کر کے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا ــــ "شہناز مجھے چھڑوا سکتی ہے۔ اُسے کہو کہ میڈوز صاحب سے میری سفارش کر دے۔"

"کہوں گا" ــــ میں نے کہا ــــ "اب مجھے جانا چاہیئے۔"

"جاؤ سکندر!" ــــ ایوب نے کہا ــــ "شہناز سے کہو کہ میرا مستقبل اُس کے ہاتھ میں ہے۔"

میں ایوب کے ساتھ جھوٹا وعدہ کر کے آگیا۔ کوئی بھی انگریز افسر کسی ملزم کی سفارش نہیں مانا کرتا تھا، سفارش کرنے والا خواہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہوتا۔ ایس۔ پی میڈوز تو اور زیادہ سخت افسر تھا۔ اس کے علاوہ مجھے کیا پڑی تھی کہ جس شخص نے میرے قتل کا اہتمام کیا تھا میں اُس کی سفارش کرواتا۔ میں اتنا ضرور محسوس کر رہا تھا کہ ایوب کے روپ میں انگریزوں کے

لئے ایک اور ڈکیت تیار ہو رہا تھا۔ ایوب نے قانون کے شکنجے میں آکر محسوس کیا تھا کہ وہ مجرمانہ ذہنیت کا آدمی ہے۔ اُس نے ڈکیت ہی بننا تھا۔ اس زمانے میں پولیس سے اگر کوئی بھگوڑا ہوتا تھا تو وہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں جا شامل ہوتا تھا۔

✖

ایک اور رات آئی۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے فرصت ملی اور میں جا کر سو گیا۔ بمشکل نصف گھنٹہ گزرا ہوگا کہ میرے شعبے کے ایک اے۔ ایس۔ آئی نے جھنجھوڑ کر مجھے جگایا۔

"سکندر! اُٹھو" ــــ وہ سخت گھبرایا ہُوا تھا کہہ رہا تھا ــــ "اُٹھو اُٹھو۔ میڈوز صاحب قتل ہوگیا ہے۔"

میں فرش پر پھینکے ہُوئے گیند کی طرح اُچھل کر اُٹھا۔

"میڈوز صاحب کے بنگلے تک پہنچو" ــــ اُس نے کہا۔

میں جن کپڑوں میں تھا، اُنہی میں سائیکل پر سوار ہُوا اور ایس۔ پی میڈوز کے بنگلے کی طرف چلا گیا۔ ذہن پر صرف شہناز سوار تھی۔ میں نے میڈوز کو بار بار خبردار کیا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ جسمانی تعلق قائم کرنے سے گریز کرے۔ پھر مجھے یہ خیال آتا تھا کہ میڈوز کو شہناز نے قتل کیا ہے۔ بیشک شہناز شریف عورت نہیں تھی۔ حمید اللہ خان نے اُسے داشتہ بنایا تھا تو بھی وہ خوش تھی لیکن میں نے اُس میں ایک تبدیلی دیکھی تھی۔ ایک یہ کہ مجھے اُس نے اپنے اعصاب پر سوار کر لیا تھا۔ دوسری تبدیلی یہ کہ اُس کے خیالوں میں پاکیزگی سی آ رہی تھی۔ مجھے یہ سوال پریشان کر رہا تھا ــــ کیا شہناز اتنی زیادہ غیرت مند اور پاک دامن ہوگئی ہے کہ اُس نے میڈوز کو قتل کر دیا ہے؟ ــــ یہ خیال بھی آتا تھا کہ میڈوز نے اُسے اسلام ترک کر کے عیسائی بن جانے کو کہا ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شہناز اغوا ہی نہ ہوگئی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہُوا ہو کہ شہناز کو اغوا کرنے کے لئے میڈوز کو قتل کر دیا گیا ہو۔ یہی کچھ سوچتا ہُوا میں میڈوز کے بنگلے کے پھاٹک میں داخل ہُوا۔ وقت دیکھا۔ رات

کے دو بج رہے تھے۔ بنگلے کے تمام کمروں اور برآمدوں کی بتیاں جل رہی تھیں میں بنگلے کے برآمدے میں سائیکل پھینک کر اندر گیا۔ پولیس کے افسر پہنچے ہوتے تھے۔ مجھے بلایا گیا تھا۔

میں اُس کمرے میں گیا جہاں سے مجھے باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بیڈ روم تھا۔ دو پلنگ ساتھ ساتھ ملے ہوتے تھے۔ ایک پلنگ پر ایس۔ پی میڈوز کی لاش پڑی تھی۔ پلنگوں کی چادریں صاف تھیں۔ لاش والے پلنگ کی چادر خون سے لال تھی اور خون کے چھینٹے دوسرے پلنگ پوش پر بھی پڑے ہوتے تھے۔ میڈوز کو خنجر یا چاقو مارے گئے تھے۔ اُس کا پیٹ چاک تھا۔ سینے پر بھی زخم تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ مقتول کو اُٹھنے کی مہلت نہیں ملی۔ میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ شہناز کہاں ہے لیکن انگریز پولیس افسروں کی موجودگی میں کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ یہی ہو سکتا تھا کہ شہناز میڈوز کو قتل کر کے لاپتہ ہو گئی ہے یا اُسے اغوا کر لیا گیا ہے۔

میری برانچ کے ایک انگریز پولیس انسپکٹر نے مجھے دیکھا۔ وہ میرے قریب آیا اور مجھے باہر لے گیا۔ باہر جا کر میں نے دیکھا کہ کچھ پولیس افسر بنگلے کے ارد گرد فصیل تک خالی جگہ میں گھوم پھر رہے تھے۔ اُن کے پاس ٹارچیں تھیں۔ وہ کھُرے ڈھونڈ رہے تھے۔

"سکندر!"—— انگریز انسپکٹر نے مجھے کہا —— "میڈوز صاحب کے ساتھ ایک عورت تھی جس کا نام شہناز بتایا گیا ہے۔ پتہ چلا ہے کہ تمہارا اُس کے ساتھ کوئی تعلق ہے"۔

"ہاں صاحب!"—— میں نے کہا —— "میرا اُس کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کہاں ہے وہ؟"

"یہیں ہے"—— اُس نے جواب دیا —— "میں تمہیں اُس کے پاس کمرے میں لے جا رہا ہوں۔ ہمیں اُس پر بھی شک ہے۔ اُس کی ذہنی حالت بہت خراب ہے۔ تم اُس کے پاس بیٹھو اور معلوم کرو کہ میڈوز صاحب کے قتل میں اس کا کتنا کچھ ہاتھ ہے، لیکن سکندر! مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہارا

اُس کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ اس عورت نے تمہیں نوابزادہ حمید اللہ خان کی قید سے آزاد کرایا تھا اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ یہ عورت تمہارے شہر کی رہنے والی ہے اور اس کے ساتھ تمہارا کوئی رشتہ بھی ہے"۔

"بڑا پاک رشتہ ہے صاحب!"—— میں نے کہا —— "یہ میری سوتیلی ماں ہے۔ میرا باپ مر گیا ہے"۔

"اوہ!"—— انگریز انسپکٹر نے کچھ حیران سا ہو کر کہا —— "مجھے یہ معلوم نہیں تھا.... میڈوز صاحب کے قتل کی تفتیش علاقے کا ایس۔ ایچ۔ او نہیں کرے گا۔ تفتیش مجھے دی گئی ہے اور مجھے کہا گیا ہے کہ اس عورت کو تم اچھی طرح جانتے ہو اس لئے میں تمہیں اپنی مدد کے لئے ساتھ رکھوں۔ بات بڑی صاف ہے۔ میڈوز صاحب کو اس عورت کی خاطر ہی قتل کیا گیا ہے اور قاتلوں کا تعلق نواب زادہ حمید اللہ خان کے ساتھ ہے۔ ان نوابوں کو ہم جانتے ہیں۔ ہم نے انہیں جاگیریں دے کر اتنا دولت مند بنا دیا ہے کہ ان کے دماغ خراب ہو گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارا شک اگر درست ہے تو یہ عورت صاف بات بتا دے۔ تم اسے سمجھاؤ کہ تشدّد کے بغیر بول پڑے"۔

"آپ نے مجھ پر شک کیوں نہیں کیا؟"—— میں نے پوچھا —— "اس عورت کا گہرا تعلق تو میرے ساتھ بھی ہے"۔

"بے شک ہم پہلے ہی صاف کر چکے ہیں"—— اُس نے ہنس کر کہا —— "جونہی ہمیں اس واردات کی اطلاع ملی تو ایک افسر کے کہنے پر سب سے پہلے تمہیں دیکھا گیا تھا۔ تم اپنے کمرے میں گہری نیند سوتے ہوتے تھے۔ اس کے بعد تمہیں بلایا گیا ہے"۔

"میڈوز صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ وہ شہناز کے ساتھ شادی کر رہے ہیں"—— میں نے کہا —— "اس سے مجھے بہت خوشی ہوتی تھی"۔

"یہ میرے لئے ایک نئی خبر ہے"—— اُس نے کہا —— "مجھے یہ بتاؤ کہ شہناز اس شادی پر خوش تھی؟"

"بہت خوش تھی" ـــــ میں نے جھوٹ بولا۔

مجھے شہناز سے یہ پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ وہ اس شادی پر خوش ہے یا نہیں۔ اگر میں اس انگریز انسپکٹر سے کہہ دیتا کہ مجھے معلوم نہیں تو شہناز کے خلاف شک کی ایک وجہ پیدا ہو جاتی۔ ایسی ہی چند اور باتیں پوچھ کر انسپکٹر نے مجھے اُس کمرے میں داخل کر دیا جہاں شہناز صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے سر اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا اور وہ آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ اُس نے ریشمی نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔ اُس کے بال کُھلے ہوتے تھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شہناز ہے۔ میرے قدموں کی آہٹ پر اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں دروازہ بند کر کے آگے ہُوا۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر لال ہو چکی تھیں اور اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے اُٹھی اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ رو رو کر اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ میں اُسے تسلیاں دے رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اُسے چُپ کرایا اور بٹھایا۔

"ہوش میں آؤ شہناز!" ـــــ میں نے اُسے کہا ـــــ "حالات بہت بُری طرح تمہارے خلاف ہو رہے ہیں۔ جو کچھ بھی ہُوا ہے اور جس طرح ہُوا ہے مجھے لفظ بلفظ بتا دو..... پہلے یہ بتاؤ کہ ان افسروں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟"

"ہاں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "اُنہوں نے پوچھا تھا کہ صاحب کو کون مار گیا ہے۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے وہی جواب دیا جو میں نے دیکھا ہے" ـــــ شہناز نے کہا ـــــ "ہُوا یہ کہ میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ ساتھ والے پلنگ پر ایسے لگا جیسے دو آدمی کُشتی لڑ رہے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے صاحب کے مُنہ سے نکلی ہوئی ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے وہ سخت تکلیف میں ہو۔ میں بہت تیزی سے اُٹھی اور بلب جلایا۔ صاحب اپنے پلنگ پر تڑپ رہا تھا۔ اُس کے سارے جسم سے خون پھوٹ رہا تھا۔ دوسری چیز یہ دیکھی کہ کھڑکی میں سے کوئی آدمی

باہر نکل رہا تھا۔ مجھے اُس کی پیٹھ نظر آئی۔ اُس کے سر اور گردن پر کپڑا یا پگڑی لپٹی ہوئی تھی۔ میں دوڑ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ وہ برآمدے میں سے اُتر کر پچھلی طرف بھاگ گیا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ برآمدے کے باہر ایک اور آدمی کھڑا تھا۔ وہ بھی اُس کے ساتھ بھاگ گیا۔ اندھیرے میں انہیں پہچاننا مشکل تھا اور مجھ پر ایسا خوف طاری تھا کہ مُنہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ کمرے میں دیکھا۔ صاحب کا جسم ساکت ہو چکا تھا۔ میری چیخیں نکلنے لگیں اور نوکر دوڑے آئے۔ انہی میں سے کسی نے پولیس کو ٹیلیفون کیا۔"

شہناز نے جس لہجے اور جس انداز میں مجھے یہ بات سنائی اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ قتل میں اس کا ہاتھ نہیں۔ پھر بھی میں نے اس سے پوچھا کہ اگر ذرا سا بھی اُس کا ہاتھ ہے تو وہ مجھے بتا دے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!" ـــــ شہناز نے جھنجلا کر کہا ـــــ "تم خود سوچو سکندر! صبح صاحب نے میرے ساتھ شادی کرنی تھی۔"

"کیا تم صاحب کے اس فیصلے پر خوش تھیں؟"

"ہاں سکندر!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں بہت خوش تھی۔"

"کیا تم اپنا مذہب چھوڑ دیتیں؟"

"میں کہاں کی مسلمان رہ گئی ہوں!" ـــــ شہناز نے کہا ـــــ "میں کسی شریف مسلمان گھر میں بسنے کے قابل نہیں رہی۔ صاحب نے مجھے نئی ساڑھی پہنائی اور اپنے ہاتھوں میرا بناؤ سنگھار کیا اور جب میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو میں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ یہ میں ہوں یا یہ وہ دھتکاری ہوئی شہناز ہے جسے اب کوئی مسلمان گھرانہ قبول نہیں کرے گا۔"

"کیا تمہیں یہ شک نہیں ہُوا کہ صاحب تمہیں دھوکا دے رہا ہے؟"

"نہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "اُسے دھوکا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ میں اُس کے قبضے میں تھی۔ میں اُس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ صاحب نے مجھے شادی سے پہلے ہی بیوی بنا لیا تھا لیکن اس میں میری رضامندی شامل تھی۔ میں تو بڑے خوبصورت خواب دیکھنے لگی تھی"

— وہ اچانک چُپ ہو گئی۔ ایک دو لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر لپک کر مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر رونے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی —— "میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے سکندر! خدا نے میرے گناہ معاف نہیں کئے۔ مجھے اب مر جانا چاہیئے۔"

"ہوش میں آؤ شہناز!" —— میں نے اُسے کہا —— "ابھی ان جذباتی باتوں کو ذہن میں نہ لاؤ اور اتنا زیادہ ڈرو بھی نہیں۔ تفتیش ہو رہی ہے۔ تم نے جذبات سے مغلوب ہو کر ذرا سی بھی ایسی ویسی بات کہہ دی تو یہ انگریز افسر شک میں تمہیں پریشان کریں گے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ تم بہت خوبصورت ہو۔ تفتیش کرنے والے شریف لوگ نہیں ہوتے۔ میں تمہیں خراب ہونے سے بچانا چاہتا ہوں۔"

میں نے تفتیش کے انداز میں اُس سے کئی سوال پوچھے اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس واردات میں شہناز کا ہاتھ نہیں اور اس واردات کا شہناز کے ساتھ کوئی تعلق بھی نہیں۔ اگر تعلق ہوتا تو وہ یہاں نہ ہوتی۔

✖

میں باہر نکلا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے جا رہی تھی۔ میں تفتیشی افسر سے ملنا چاہتا تھا لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پتہ چلا کہ وہ لوگ فصیل کے ساتھ ساتھ کھُرے دیکھتے پھر رہے ہیں۔ میں اُن کی طرف چلا تو مجھے روک دیا گیا اور بتایا گیا کہ دو بڑے صاف کھُرے ملے ہیں۔ میں واپس بنگلے کے برآمدے میں آن کھڑا ہوا۔ اس کے بعد جو تفتیش ہوئی اور جو سراغ ملے وہ میں مختصر سنا دیتا ہوں تاکہ میری اس آپ بیتی کا تسلسل قائم رہے۔

تمام نوکروں کو سب سے پہلے الگ بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ چار تھے —— اردلی جو کانسٹیبل تھا، خانساماں، اُس کے گھر میں آیا ہوا ایک مہمان اور ایک نوکر —— ان سے پوچھا گیا تھا۔ سب نے ایک جیسا بیان دیا —— وہ شہناز کی چیخیں سُن کر دوڑے آتے تھے۔ سب نے یہی دیکھا تھا کہ میڈوز کی لاش پلنگ پر پڑی ہے اور شہناز کمرے میں کھڑی چیخ چلّا رہی تھی۔

دو آدمیوں کے کھُرے مل گئے۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے۔ دونوں کھُرے فصیل سے بنگلے کی طرف آتے تھے۔ کھُروں کے لئے زمین بہت اچھی تھی۔ فصیل کے قریب پودے لگانے کے لئے زمین نرم کی گئی تھی۔ اس میں کھُرے اتنے صاف تھے کہ ان کے مولڈ تیار کر لئے گئے۔ یہ دونوں آدمی بنگلے تک آتے۔ پھر یہ دونوں کھُرے واپس اُسی جگہ پہنچے جہاں سے یہ فصیل پھلانگ کر آتے تھے۔ فصیل کے باہر دیکھا۔ فصیل سے تھوڑا پرے کچا راستہ تھا۔ وہاں ایک تانگہ کھڑا رہا تھا۔ صرف ایک کھُرا یعنی ایک آدمی کے پاؤں کے نشان فصیل کے باہر گئے۔ یہ آدمی تانگے میں سوار ہوا اور چلا۔

دوسرا کھُرا پھر اندر کی طرف آیا لیکن بنگلے کی طرف آنے کی بجائے اس کا رخ سرونٹ کوارٹروں کی طرف تھا۔ کچھ آگے آ کر یہ کھُرا بنگلے کی طرف گھوم گیا اور ایک اور طرف سے بنگلے تک آیا۔ یہ بڑا صاف اشارہ تھا کہ قاتل کو بنگلے کے کسی نوکر کی مدد حاصل تھی۔

نوکروں سے تفتیش شروع ہوئی، تو ہر ایک نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ سویا ہوا تھا اور وہ شہناز کی چیخوں کی آواز پر اُٹھا اور بنگلے میں دوڑتا ہوا آیا۔ پھر ہر ایک نوکر سے یہ پوچھا گیا کہ اُنہوں نے کوئی ایسا آدمی دیکھا ہو گا جو بنگلے کے پچھواڑے سے، فصیل کی طرف سے آ رہا ہو گا اور شور سُن کر بنگلے میں چلا گیا ہو گا۔

خانساماں اور اردلی نے بتایا کہ اُنہوں نے نئے نوکر کو فصیل کی طرف سے آتے دیکھا تھا اور راستے سے ہی وہ بنگلے کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نوکر سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آ رہا تھا تو اُس نے کہا کہ وہ سینما دیکھنے چلا گیا تھا۔ واپس پچھلی طرف سے آیا۔ وہ کہتا تھا کہ اُس نے پھاٹک کی طرف سے آنے کا چکر بچا لیا تھا۔ اُس کے جوتے دیکھے گئے۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔

"کیا تم ننگے پاؤں سینما گئے تھے؟" —— تفتیشی افسر نے اُس سے پوچھا۔

وہ گھبرا گیا۔ ایک دو لمحوں بعد بولا —— "میں نے شور سُنا تو جوتے اُتار

کر دوڑا کیونکہ ایک پاؤں کا جوتا پاؤں کو تنگ کر رہا تھا اور بھاگنے نہیں دیتا تھا۔"

"چلو" ـــــ اُسے کہا گیا ـــــ "چل کے دکھاؤ کہ اپنے جوتے کہاں اُتار پھینکے تھے۔"

وہ ساتھ چل پڑا اور ایک جگہ رُک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اب ٹارچوں کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ صبح طلوع ہو چکی تھی۔

"صاحب بہادر!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "معلوم ہوتا ہے جوتے کوئی اُٹھا کر لے گیا ہے۔"

جہاں وہ کہتا تھا کہ اُس نے جوتے اُتارے ہیں وہاں سے جوتوں کا کھرا بنگلے کی طرف آتا تھا۔ دوسری بات یہ نوٹ کی گئی تھی کہ جب اُس نے کہا تھا کہ اُس نے جوتے اُتار دیتے تھے، اُسی وقت اُس کے پاؤں دیکھے گئے تھے جو بالکل صاف تھے۔ ان پر ذرا سی بھی گرد نہیں تھی۔ وہ کم و بیش تیس قدم اپنے بیان کے مطابق ننگے پاؤں دوڑا تھا۔ تفتیشی افسر ایسا اناڑی نہیں تھا کہ اُس کی ہر بات مانتا چلا جاتا۔ یہ نوکر ہندو تھا۔ رام سروپ اُس کا نام تھا اور اُس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی۔

"اپنے جوتے فوراً پیش کرو" ـــــ انگریز انسپکٹر نے اُسے کہا۔

انگریز انسپکٹر نے نوکروں کو اپنے پاس بلایا اور اُن سے پوچھا کہ یہ جب بنگلے میں آیا تھا تو اُس کے پاؤں میں شوز تھے یا نہیں۔ نوکروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان میں سے کسی نے بڑی اچھی نشاندہی کر دی۔

"صاحب بہادر!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "اُس وقت کسی کو اتنی ہوش نہیں تھی کہ دیکھتا کہ کس نے کیا پہن رکھا ہے اور کون کس حالت میں ہے۔ میں نے برآمدے کے نیچے ایک جگہ شوز کا ایک جوڑا پڑا دیکھا ہے۔"

"کیا تم میں سے کسی نے رام سروپ کو ذرا سی دیر کے لئے اُس طرف جاتے دیکھا تھا؟"

"ہاں صاحب بہادر!" ـــــ ایک نے کہا ـــــ "یہ ٹہلتے ٹہلتے اُس طرف گیا تو میں نے اسے کہا کہ یہیں بیٹھے رہو، صاحب خفا ہوں گے لیکن یہ برآمدے سے اترا اور واپس آ گیا۔ میں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ ننگے پاؤں واپس آیا ہے۔"

وہاں جا کر دیکھا۔ تسموں والے ایک شوز کا جوڑا پڑا تھا۔ اُس کے تلوے دیکھے۔ کھروں سے ملاتے تو کھرے انہی شوز کے تھے۔ انگریز انسپکٹر نے رام سروپ کے مُنہ پر بڑی زور سے مُکّہ مارا۔ وہ تین چار قدم پیچھے کو گیا۔ اُدھر ایک اور انگریز سب انسپکٹر کھڑا تھا۔ اُس نے اُس کی گردن پر مُکّہ مارا اور رام سروپ نیورا کر گرا۔ انگریز انسپکٹر نے اُس کی گردن پر پاؤں رکھ کر دبایا۔

"بولو" ـــــ انسپکٹر نے پوچھا ـــــ "بولو، کہو یہ شوز تمہارے ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ شوز اُسی کے تھے لیکن اُس نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اُسے اُٹھا کر اُس کے کوارٹر میں لے گئے اور تلاشی لی گئی۔ اس کوارٹر کا ایک ہی کمرہ تھا جس میں ایک سوٹ کیس بڑا اور ایک چھوٹا پڑا تھا۔ بڑی باریکی سے تلاشی لی گئی تھی۔ بڑے سوٹ کیس میں سے ایک خنجر برآمد ہوا اور روپے کے سکے جتنی بڑی اور اس سے ذرا موٹی ڈسک برآمد ہوئی۔ یہ مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے درمیان ہندی کا ایک حرف کھدا ہوا تھا۔ اردو میں یہ حرف "دھ" بنتا ہے۔ پولیس کے لئے یہ ڈسک اس حرف کے ساتھ بہت اہم تھی۔ یہ کسی دہشت گرد گروہ کا نشان تھا۔

✖

اس ڈسک اور اس قسم کے نشانات سے آج کے دَور میں بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ میں ذرا اس کی وضاحت کر دوں۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہندوستانیوں کے کچھ گروہ پیدا ہو گئے تھے جو دہشت گردی (ٹیررازم) کے ذریعے ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ یہ لوگ تباہ کاری کی وارداتیں کرتے تھے۔ مثلاً کسی ایسی ریل گاڑی کے راستے میں ریل کی پٹڑی میں بم دبا دینا جس میں وائسرائے یا گورنر یا کوئی ایسا ہی بڑا انگریز حاکم سفر کر رہا ہوتا۔ بڑے بڑے انگریز افسروں کو قتل کرنے کی کوشش

بھی ان گروہوں کے پروگرام میں شامل ہوتی تھی۔ بعض گروہ سرکاری خزانہ لوٹنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ وہ درپردہ عوام کو اپنے ساتھ ملانے کی ترکیبیں بھی کرتے تھے لیکن انگریز کی حفاظتی اور انسدادی مشینری اتنی تیز تھی کہ قبل از وقت تباہ کاری یا تخریب کاری کا پتہ چلا لیتی تھی۔

یہ سلسلہ بالکل ایسا تھا جیسے آج کل جگہ جگہ دھماکے اور تخریب کاری کی وارداتیں ہوتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج کل شاید ہی کوئی پکڑا جاتا ہو لیکن اُس وقت تخریب کار فوراً پکڑے جاتے تھے۔ اس کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ پکڑنے والے مخلص اور دیانتدار تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں میں سے ہی غدار پیدا کر رکھے تھے لیکن یہ اُن کے حفاظتی انتظامات کا ایک حصّہ تھا۔ آج کل اپنے فرائض کے ساتھ خلوص کم ہی رہ گیا ہے اس لئے تخریب کاری کی وارداتیں بڑھ رہی ہیں۔

تین چار دہشت گرد گروہ زیادہ مشہور ہوتے تھے جن میں ایک "ریشمی رومال" کہلاتا تھا۔ ایک گروہ "بگ فائر" کے نام سے مشہور ہُوا تھا۔ اس گروہ کا خفیہ نشان انگریزی کا لفظ MOTHER تھا جو چھوٹے سے ایک پتھر پر لکھا ہُوا ہوتا تھا۔ اس کے ممبر جو ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوتے تھے ایک دوسرے کو اس پتھر سے پہچانتے تھے۔ ایک دوسرے کو پتھر دکھانے کا اُن کا ایک خفیہ طریقہ ہوتا تھا۔ روس نے پنجاب کے سکھوں کو روس میں بلا کر دہشت گردی کی باقاعدہ ٹریننگ دی تھی۔ وہاں سے آکر سکھ تخریب کاری کی مختلف وارداتیں کرتے تھے۔ دو دہشت گرد، بھگت سنگھ اور دت بہت مشہور ہُوتے تھے۔ انہیں پھانسی دی گئی تھی۔ بھارت میں اب تک ان کی برسی منائی جاتی ہے۔

ان میں بعض گروہ بہت چھوٹے اور گمنام تھے۔ ان میں زیادہ تر نوجوان شامل تھے جو عقل سے نہیں جذبات سے کام لیتے تھے اس لئے جلدی پکڑے جاتے تھے۔ ان کے لیڈر بھی ناتجربہ کار اور جذباتی ہوتے تھے۔ ان تمام گروہوں میں اکثریت ہندوؤں کی ہوتی تھی۔ سکھ اور مسلمان بھی ان میں شامل

ہوتے تھے۔ یوں کہہ لیں کہ آزادی کی جدوجہد ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی مشترکہ تھی۔ آگے چل کر پردے اُٹھ گئے تھے۔ وہ بعد میں سناؤں گا۔

ایس۔ پی میڈوز کے نوکر رام سروپ کے سوٹ کیس سے مٹی کی ڈسک برآمد ہوئی اور اس پر ہندی کا حرف کھُدا ہُوا دیکھا تو اس میں کوئی شک نہ رہا کہ یہ کسی دہشت گرد گروہ کا نشان ہے اور رام سروپ اس کا ممبر ہے۔ فوراً ہی معلوم کر لیا گیا کہ یہ حرف کیا ہے۔ جب حرف کا پتہ چلا تو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ "دھرتی" کا پہلا حرف ہے۔ دھرتی سے مراد دھرتی ماتا تھی جسے دوسرے لفظوں میں بھارت ماتا کہا جاتا ہے۔ رام سروپ گٹھے ہوئے قدبت کا جوان آدمی تھا۔ اُس نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے صاف انکار کر دیا۔

"رام سروپ!" — انگریز انسپکٹر نے اُسے کہا — "صرف یہ کہہ دو کہ میڈوز صاحب کو تم نے قتل کیا ہے۔"

"نہیں کہوں گا" — اُس نے جواب دیا۔

"تم ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہو" — انسپکٹر نے اُسے کہا — "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ تمہیں محبت ہے لیکن تم اتنے خود غرض ہو کہ قتل کا اعتراف نہیں کر رہے اور اس کوشش میں ہو کہ تمہاری جگہ کوئی بے گناہ ہندوستانی پھانسی چڑھ جائے ..... کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میڈوز صاحب کے ساتھ جو شہناز نام کی عورت تھی اس پر قتل کا شک کیا جائے؟ کیا تم پسند کرو گے کہ ایک ہندوستانی عورت کو ہم اس طرح تفتیش کے چکر میں ڈالیں کہ اس کو ننگا کریں اور اس کو خراب کریں؟ اگر تم غیرت مند ہندوستانی ہو تو صحیح جواب دو۔"

"یہ عورت بے گناہ ہے" — اُس نے کہا — "اسے ہاتھ نہ لگانا۔"

"پھر یہ گناہ اپنے سر لے لو" — انسپکٹر نے کہا۔

"نہیں لوں گا" — اُس نے کہا۔

اس مقام پہ آکر مجھے یہ اطمینان ہوگیا کہ شہناز اس جرم میں شامل نہیں اور مُشتبہ بھی نہیں۔

×

رام سروپ کو سپیشل برانچ کے تفتیشی مرکز میں لے گئے جہاں کی دیواریں بھی خوف سے لرزا کرتی تھیں۔ رام سروپ پر اذیت کا ہر طریقہ آزمایا گیا۔ وہ بیہوش ہوجاتا تھا۔ بعض اوقات کئی گھنٹے بیہوش رہتا تھا۔ اسے صرف دو باتیں کہی جاتی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ قاتل کی نشاندہی کردے اور دوسری یہ کہ اپنے گروہ کے لیڈر اور دوسرے ممبروں کے اَتے پتے بتادے لیکن یہ شخص کئی گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد جب ہوش میں آتا تھا تو اُس کا سر انکار ہی میں ہلتا تھا۔ چار پانچ دنوں میں ہی اُس کی جسمانی حالت لاش جیسی ہوگئی تھی۔ یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا کہ اُسے مار ہی ڈالا جائے لیکن ایک آدمی کو ختم کردینے سے گروہ ختم نہیں ہوسکتا تھا۔

رام سروپ کے متعلق خانساماں اور اردلی نے بتایا کہ اُسے بنگلے کی نوکری میں آتے ابھی ایک ہی مہینہ گزرا تھا۔ اس سے پہلے میڈوز کے پاس کبھی کبھی ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی آیا کرتی تھی۔ دوبار اُسے علی الصبح بنگلے میں سے واپس جاتے دیکھا گیا تھا اور دو بار رام سروپ بھی اس لڑکی کے ساتھ آیا تھا۔ پھر رام سروپ کو میڈوز نے اپنا نوکر رکھ لیا اور وہ میڈوز کا منظورِ نظر بن گیا۔ گزرتے ہوئے ایک مہینے میں وہ لڑکی دو بار میڈوز کے پاس آئی تھی۔ وہ آخری بار شہناز کے آنے سے تین چار روز پہلے آئی تھی۔
اب رام سروپ اس لڑکی کے متعلق بھی کچھ نہیں بتاتا تھا۔

یہ شخص فولاد کا بنا ہُوا ثابت ہُوا۔ افسروں کو باقاعدہ میٹنگ بلانی پڑی کہ اس سے سراغ کس طرح حاصل کیا جائے۔ میں اب اس تفتیش سے لاتعلق ہوچکا تھا۔ آپ کو یہ بتادوں کہ میڈوز کو بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ اُس کا پیٹ ہی چاک نہیں کیا گیا تھا، اُس کے سینے میں خنجر یا بڑے چاقو کے چار گہرے زخم تھے۔ دل ایک طرف سے کٹا ہُوا تھا۔

میں نوابزادہ حمید اللہ خان کے خلاف کیس تیار کرنے والوں کے ساتھ پہلے سے زیادہ مصروف ہوگیا۔ ایک دو دن اور گزرے تو کیس تیار ہوگیا اور چالان بھی اور یہ کاغذات عدالت میں پیش کر دیئے گئے۔ ایوب کا کیس بھی عدالت میں چلا گیا۔ شہناز ابھی تک شاملِ تفتیش تھی۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور واقعہ ہوگیا جس نے بڑے دبیز پردے چاک کر دیئے۔ اس کی تفصیلات بعد میں کئی ذرائع سے مجھے معلوم ہوئیں۔ یہ میں ایک تسلسل میں سنا دیتا ہوں۔ رام سروپ کو جس حوالات میں بند کیا گیا وہ صحیح معنوں میں کال کوٹھڑی تھی۔ اس کے اندر روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ برآمدے میں ایک بلب ساری رات روشن رہتا تھا۔ اس کی کچھ روشنی اس کوٹھڑی میں جاتی تھی۔ ایسی تین چار کوٹھڑیاں ساتھ ساتھ تھیں۔ یہ ہماری برانچ کے ہیڈکوارٹر کا پچھلا حصّہ تھا جہاں ملزموں کے سوا کوئی نہیں جاتا تھا۔ زیرِ تفتیش ملزموں کو وہاں لے جاکر بند کر دیا جاتا اور ایک سنتری ہر وقت رائفل سے مسلح وہاں موجود رہتا تھا۔

ایک شام سورج غروب ہوجانے سے کچھ دیر بعد رام سروپ کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور کسی کو دھکا دے کر کوٹھڑی کے اندر پھینک دیا گیا۔ دروازہ پھر بند ہوگیا۔ دروازہ کیا تھا، لوہے کا مضبوط فریم تھا جس میں لوہے کی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ رام سروپ دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں کراہ رہا تھا۔ جس کسی کو اُس کی کوٹھڑی میں پھینکا گیا تھا اُس کا سَر رام سروپ کے قریب فرش پر جا لگا۔ فرش پر گرنے والا سِسک رہا تھا اور یہ سِسکیاں عورت کی معلوم ہوتی تھیں۔

برآمدے کے بلب کی اتنی روشنی کوٹھڑی میں آتی تھی جس میں آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ رام سروپ کی آنکھیں بند تھیں۔ اُس کی تو جیسے ہڈیاں ہی ٹوٹ گئی تھیں۔ اُسے ایسی ایسی اذیت دی گئی تھی کہ وہ سانس بھی اچھی طرح نہیں لے سکتا تھا۔ اُسے ہسپتال میں ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ ایک کال کوٹھڑی میں پڑا تھا جہاں اُسے پانی بھی ترسا ترسا کر دیا جاتا تھا۔

اُس نے اپنے سامنے گرے والے کی سِسکیاں سُنیں تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ عورت تھی جس سے اُٹھا نہیں جاتا تھا۔ رام سروپ نے ایسی بُری جسمانی حالت میں بھی آگے ہو کر اس عورت کو سہارا دے کر اٹھایا۔ تب اُس نے دیکھا کہ یہ بالکل جوان عورت ہے اور خوبصورت بھی ہے۔

عورت رام سروپ کی طرح بہت بُری جسمانی حالت میں تھی۔ اُس کے بال اس طرح بکھرے ہوتے تھے جیسے نوچے گئے ہوں۔ چہرے پر جو نشان تھے وہ بھی تشدّد کے تھے۔ اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اُس سے بیٹھا بھی نہیں جاتا تھا۔ رام سروپ کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ یہ عورت اس حالت تک کس طرح پہنچی ہے۔

"کس الزام میں پکڑی گئی ہو؟" ــــ رام سروپ نے اُس سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟" ــــ عورت نے سِسکتے ہوتے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگی ــــ "میں جانتی ہوں مجھے اس کوٹھڑی میں کیوں پھینکا گیا ہے۔ چار دنوں سے انہوں نے مجھے کہیں اور بند رکھا تھا۔ آج رات یہاں اس لئے چھوڑ گئے ہیں کہ تم کوئی خطرناک مجرم ہو۔ تم میرے ساتھ وحشیوں جیسا سلوک کرو گے۔ ایک عورت کو کسی مرد کے ساتھ بند کرنے کا اور مطلب کیا ہو سکتا ہے! .... کیا تم مجھ پر رحم نہیں کرو گے؟"

"کیوں نہیں!" ــــ رام سروپ نے کہا ــــ "میں وحشی نہیں، اور میں خطرناک مجرم بھی نہیں۔ میری حالت تم سے زیادہ بُری ہے۔ میں تمہارے لئے کیا کروں؟ یہاں تو پانی بھی نہیں ملتا۔ فکر نہ کرو۔ ہم اکٹھے مریں گے .... کیا الزام ہے تم پر؟"

"ایک انگریز ایس۔پی قتل ہو گیا ہے" ــــ عورت نے کہا ــــ "پولیس نے اُس کے ایک نوکر کو پکڑا تھا۔ دو روز بعد مجھے پکڑ لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال جُرم کر لو"

"تم ایس۔پی میڈوز کی بات کرتی ہو؟"

"ہاں" ــــ عورت نے جواب دیا ــــ "وہ سپیشل برانچ کا ایس۔پی تھا۔"

"تمہیں پولیس نے کہاں سے پکڑا ہے؟"

"میں اُس کے بنگلے میں رہتی تھی" ــــ عورت نے کراہتے ہوتے جواب دیا ــــ "قتل کے وقت میں اُس کے پلنگ کے ساتھ والے پلنگ پر سوتی ہوتی تھی۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" ــــ اپنا چہرہ روشنی کی طرف کرو" ــــ رام سروپ نے کہا ــــ "روشنی کم ہے اور میرا سر چکرا رہا ہے۔ اچھی طرح نظر نہیں آتا۔"

عورت دروازے کی طرف گھومی۔ اُدھر سے برآمدے کے بلب کی روشنی آتی تھی۔ رام سروپ نے اُسے غور سے دیکھا۔

"اوہ!" ــــ رام سروپ نے ایسے کہا جیسے اُسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو ــــ "تم تو شہناز ہو.... تم نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں رام سروپ ہوں۔ تمہارا نوکر.... اوہ! تم پر انہیں کیوں شک ہُوا ہے؟"

"آہ، رام سروپ!" ــــ شہناز نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چُوما اور کہا ــــ "تم ہندوستان کے سپُوت ہو۔ تم نے ایک انگریز ایس۔پی کو قتل کر کے اتنا بڑا کارنامہ کیا ہے کہ ہندوستانیوں کی جنگِ آزادی کی تاریخ تمہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔"

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا شہناز!" ــــ رام سروپ نے کہا۔

"ڈرو نہیں رام سروپ!" ــــ شہناز نے کہا ــــ "مجھے اسی کام کے لئے اِس ایس۔پی کے بنگلے میں بھیجا گیا تھا لیکن تم بازی لے گئے۔ میں نے اسے زہر دینا تھا لیکن زہر مجھ تک نہ پہنچ سکا۔ کوئی وجہ ہو گئی تھی۔ وہ قتل ہو گیا تو میں سمجھی کہ میری پارٹی کے آدمی کام کر گئے ہیں لیکن انہوں نے تمہیں پکڑ لیا۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ تمہاری تلاشی میں کیا برآمد ہُوا ہے۔ مجھے خوشی ہوتی کہ تم بھی اُسی میدان کے سپاہی ہو جس کی میں ہوں۔"

"لیکن تم پر شک کیسے ہُوا؟"

"کوئی غداری کر گیا ہے" ــــ شہناز نے کہا ــــ "میرے متعلق پولیس

کو پتہ چل گیا تھا کہ میرا تعلق ایک دہشت گرد پارٹی کے ساتھ ہے۔ سپیشل برانچ نے کسی طرح میری پارٹی کے کسی آدمی کو خرید لیا اور اُس نے یہ انکشاف کیا ہے کہ میں ایس۔ پی میڈوز کو قتل کرنے کے لئے اُس کی داشتہ بنی ہوں۔ تفتیش کرنے والے مجھے کہتے ہیں کہ میں یہ اقبالی بیان دوں کہ میں نے اور رام سروپ اور اُس کے ایک اور ساتھی نے مل کر ایس۔ پی کو قتل کیا ہے، اور میں جانتی ہوں رام سروپ! ایس۔ پی کو تم نے اپنے ایک ساتھی سے قتل کرایا ہے لیکن میں اپنی زبان سے تمہارا نام نہیں لوں گی۔ میں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے بہت قربانیاں دی ہیں۔ اپنی جان بھی دے دوں گی۔"

"تمہاری پارٹی کا نام کیا ہے؟" — رام سروپ نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" — شہناز نے جواب دیا — "ابھی نہیں بتاؤں گی۔ پہلے میری بات سُن لو۔ میں اپنی قربانیوں کی بات کر رہی تھی۔ ہماری پارٹی میں دو آدمی ایسے ہیں جو چار پانچ سالوں سے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں اور روپوش ہیں۔ تصور کرو اُن کی کیا زندگی ہے۔ رات کو ذرا باہر نکلتے ہیں اور وہ بڑے خطرناک کام کرتے ہیں لیکن ان کی جذباتی حالت کبھی کبھی بگڑ جاتی ہے۔ ایسی کیفیت میں میرا وجود اُن کے کام آتا ہے۔ میں اور دو اور لڑکیاں اُن کے جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنتی ہیں ..... رام سروپ!" — شہناز نے رام سروپ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر مسلتے ہوئے کہا — "میں تمہیں اپنی پارٹی میں لاؤں گی۔ میں نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ تم نوکر نہیں، تم کچھ اور ہو۔ تم نے ایس۔ پی کے دل پر قبضہ کر لیا تھا۔"

"ہم تو پھانسی کے تختے پر جا رہے ہیں" — رام سروپ نے کہا — "تم مجھے اپنی پارٹی میں کس طرح شامل کرو گی؟"

شہناز پہلے تو اُس کے ساتھ لگ گئی تھی، اب اُس نے سر رام سروپ کی گود میں پھینک دیا۔ رام سروپ کی اُنگلیاں شہناز کے بالوں میں رینگنے لگیں پھر اس کا ہاتھ شہناز کے گالوں پر چلا گیا۔

"نہیں شہناز!" — رام سروپ نے اپنا ہاتھ کھینچ کر جذباتی لہجے میں کہا — "نہیں .... میں تمہیں پھانسی نہیں چڑھنے دوں گا۔ تم جوان لڑکی ہو۔ تم ہندوستان کی عزت ہو۔ تم دھرتی ماتا کی مانگ کا سندور ہو۔ میں تم سے قربانی نہیں مانگوں گا۔ تم مجھ سے قربانی لو۔"

شہناز نے اپنے بازو اس طرح اُوپر کئے جیسے انگڑائی لی ہو۔ اُس نے رام سروپ کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر نیچے کیا۔ اُس کا اپنا چہرہ رام سروپ کی گود میں تھا۔ دونوں کی سانسیں ٹکرانے لگیں۔

"تم ہندو نہیں، میں مسلمان نہیں" — شہناز نے جذبات اور جسمانی درد سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "ہم ہندوستانی ہیں۔ ہمارا مذہب، ہمارا کلچر، ہمارا سب کچھ ہندوستان ہے۔"

سنتری کے قدموں نے انہیں اس کیفیت سے نکال لیا۔ اس سے پہلے سنتری کہیں اِدھر اُدھر تھا۔ شہناز رام سروپ سے الگ ہو گئی۔

✖

رائفل سے مسلح سنتری جو پولیس کا ہندوستانی کانسٹیبل تھا، سلاخوں کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستہ سے تین بار کھانسا۔ شہناز اور رام سروپ نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے سر کا ہلکا سا اشارہ کیا۔ شہناز بڑی مشکل سے اُٹھی اور دروازے تک اُس نے اس طرح قدم اُٹھائے جیسے گر پڑے گی۔ اُس نے سلاخیں پکڑ لیں۔ اُس کے اور سنتری کے درمیان یہی سلاخیں حائل تھیں۔ سنتری نے اُس کے ساتھ کھسر پھسر کی اور شہناز پھر رام سروپ کے پاس جا بیٹھی۔

"وہ آ رہے ہیں" — شہناز نے کہا۔

"کون؟"

"مجھے یہاں سے رہا کرانے والے!" — شہناز نے کہا — "میرے فرار کا انتظام مکمل ہو گیا ہے۔ یہ سنتری ہمارا آدمی ہے۔ اس کی اگلی ڈیوٹی رات دو بجے ہو گی۔ اُس وقت میری پارٹی کے آدمی پیچھے والی دیوار کی دوسری

طرف پہنچ جائیں گے۔ ایک تانگہ موجود ہوگا.... انتظام جو بھی ہُوا ہے اسے تم پوچھ کر کیا کرو گے۔ ابھی شاید دس بجے ہوں گے۔ چار گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔"

"تمہارے نکل جانے سے مجھے بہت خوشی ہوگی"— رام سروپ نے کہا —"میں نے تو یہیں مرنا ہے۔"

"میں تمہیں بھی نکلوا سکتی ہوں"— شہناز نے کہا —"سنتری کہہ رہا تھا کہ اس ملزم کی موجودگی میں تمہیں نکالنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ میں نے اُسے بتا دیا ہے کہ رام سروپ اپنا ہی آدمی ہے.... سنتری ہمارے لئے کھانے اور پانی کا بندوبست کرنے گیا ہے۔ میں نے چوبیس گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا۔ شیطان کی اولاد نے پانی بھی نہیں دیا۔"

"مجھے تیس گھنٹے ہو گئے ہیں کچھ کھائے ہوئے"— رام سروپ نے کہا —"دو گھونٹ پانی نہ ملا تو میں ہوش میں نہیں رہ سکوں گا۔"

"پانی بھی مل جائے گا"— شہناز نے کہا —"مجھے یہ بتاؤ کہ تم فرار کی جرأت کرو گے؟ جرأت کے علاوہ تمہارے جسم میں کچھ طاقت رہ گئی ہے کہ دیوار پھاند سکو؟"

"یہاں بھی مرنا ہے، پکڑے گئے تو بھی مرنا ہے"— رام سروپ نے کہا —"بھاگ جانے کی کوشش کر ہی لی جائے تو اچھا ہے۔ کیا تمہارے آدمی مجھے اپنے ساتھ لے چلیں گے؟"

"ضرور لے چلیں گے"— شہناز نے کہا —"آج رات اس تفتیشی مرکز میں کوئی افسر نہیں ہوگا۔"

سنتری ایک بار پھر سلاخوں کے سامنے آن کھڑا ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی اور ایک بڑی بوتل تھی۔ شہناز اُس تک قدم گھسیٹتی ہوئی گئی۔

"جلدی جلدی کھا لو"— سنتری نے کہا —"اس بوتل میں پانی ہے۔ کپڑا اور بوتل جلدی دے دینا۔ پانچ روٹیاں ہیں۔ کافی ہوں گی۔"

شہناز اُس کے ہاتھ سے روٹیوں والا کپڑا اور پانی والی بوتل لے

آئی۔ روٹیوں میں انڈے اور آلو تھے۔ شہناز اور رام سروپ بھوک سے مر رہے تھے۔ انہوں نے بڑی تیزی سے کھانا کھا لیا اور بوتل کے ساتھ مُنہ لگا کر باری باری پانی پی لیا۔ سنتری کپڑا اور پانی کی بوتل لے گیا۔

"اس سنتری کو تمہاری پارٹی نے بہت زیادہ رقم دی ہوگی"— رام سروپ نے کہا —"اگر ہم فرار ہو گئے تو اس کا کیا بنے گا؟ اگر ہم فرار ہو گئے تو اسے بہت زیادہ سزا ملے گی۔"

"یہ بھی ہمارے پیچھے پیچھے آجائے گا"— شہناز نے کہا —"یہ رائفل سمیت بھاگے گا اور ہماری پارٹی اسے ہمیشہ روپوش رکھے گی۔ اسے عام قسم کا کانسٹیبل نہ سمجھو۔ مالی مجبوریوں کے تحت پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا۔ تعلیم یافتہ ہے۔ ایک سال سے ہماری پارٹی کا ممبر ہے۔ جسمانی اور دماغی لحاظ سے بہت تیز ہے۔ اسے ہم نے پولیس کے خلاف جاسوسی کا فرض سونپا ہُوا تھا لیکن میری گرفتاری نے اس کے لئے صورتِ حال بدل ڈالی ہے۔ کسی کو توقع نہیں تھی کہ یہ اتنی بڑی قربانی دے گا لیکن اس نے میری خاطر بلکہ آزادی کی تحریک کی خاطر اپنا مستقبل قربان کر دیا ہے۔"

یہ سنتری بدل گیا۔ تین گھنٹوں کے لئے دوسرا سنتری آگیا۔

"ایک دوسرے سے دُور دُور بیٹھو اوئے"— نئے سنتری نے آتے ہی حکم دیا —"کوئی گڑبڑ نہ ہو"— اس طرح تھوڑی تھوڑی دیر بعد سنتری انہیں دیکھتا اور بلا وجہ ڈانٹ دیتا۔

"او لڑکی!"— سنتری نے شہناز کو پکارا —"اِدھر آ میرے پاس!"

"کیوں؟"— شہناز نے نحیف سی آواز میں نفرت سے کہا —"کیوں آؤں تیرے پاس؟"

"آجا ذرا!"— سنتری نے کہا —"میں تجھے کھا تو نہیں جاؤں گا۔"

"صورت دیکھ اپنی"— شہناز نے کہا۔

"میں آجاتا ہوں بھائی!"— رام سروپ بولا۔

"بیٹھا رہ" — سنتری نے کہا — "تو بیٹھا رہ جہاں بیٹھا ہے۔"

شہناز اور رام سروپ نے سنتری کو بہت ذلیل کیا اور وہ بڑبڑاتا ہوا پرے ہٹ گیا۔

"رام سروپ!" — تھوڑی دیر بعد شہناز نے کہا — "میں اُس لڑکی سے ملنا چاہوں گی جو سنا ہے میڈوز کے پاس آتی رہتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اُسی کے ذریعے تمہیں میڈوز نے اپنے بنگلے میں نوکر رکھا تھا۔"

رام سروپ خاموش رہا۔

"وہ کوئی پیشہ ور عورت تو نہیں تھی؟" — شہناز نے پوچھا۔

"نہیں شہناز!" — رام سروپ نے جواب دیا — "وہ بڑے امیر ہندو گھرانے کی لڑکی ہے۔ گورنمنٹ کالج میں فورتھ ایئر کی سٹوڈنٹ ہے۔ بڑی ذہین، جذباتی اور وطن پرست لڑکی ہے۔"

"فورتھ ایئر میں؟" — شہناز نے پوچھا — "کیا کہا تھا تم نے؟ گورنمنٹ کالج میں؟"

"ہاں" — رام سروپ نے جواب دیا۔

"شاید میں اُسے جانتی ہوں" — شہناز نے کہا — "وطن پرستی اور اپنی مُوومنٹ کے سلسلے میں شاید اُس سے ملاقات ہوتی تھی .... کیا نام ہے اُس کا؟"

"سرلا دیوی" — رام سروپ نے جواب دیا۔

"مجھے نام یاد نہیں رہا" — شہناز نے کہا — "کہاں رہتی ہے؟"

رام سروپ نے سرلا دیوی کے باپ کا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔

"میں اُس کی ذہانت کی داد دیتی ہوں" — شہناز نے کہا — "میڈوز نے میرے ساتھ دو تین بار اُس کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ بھی اُسے بہت یاد کرتا تھا۔"

"شہناز!" — رام سروپ نے پوچھا — "کیا تمہیں واقعی یقین ہے کہ ہم فرار ہو سکیں گے؟"

"انتظامات کے مطابق تو مجھے یقین ہے" — شہناز نے کہا — "میں نے سنتری کے کان میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ تم بھی میرے ساتھ یہاں سے نکل رہے ہو۔ سنتری کہتا تھا کہ وہ تمہیں یہاں سے نکال لیں گے۔"

"میڈوز کے قتل میں تم کس حد تک شامل تھے؟" — شہناز نے پوچھا۔

"قتل کرنے والا دوسرا آدمی تھا" — رام سروپ نے جواب دیا — "میں نے اپنا کام کر دیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ بیڈروم کی کھڑکی کی چٹخنیاں کھُلی رکھنی تھیں۔ تم نے شاید نوٹ نہیں کیا تھا کہ شام کے بعد تمام کمروں کی کھڑکیاں بند کرنے کی ذمہ داری میں نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ پہلے تو میں نے میڈوز پر اپنا اعتماد جمایا پھر تم بھی مجھے پسند کرنے لگیں کہ یہ اچھا نوکر ہے۔ آخر قتل کی رات مقرر ہو گئی۔ تم اُس وقت کمرے میں موجود تھیں۔ بالوں میں برش کر رہی تھیں جب میں نے بیڈروم کی دونوں طرف کی کھڑکیاں بند کر کے چٹخنیاں چڑھاتی تھیں سوائے ایک کھڑکی کے جس کے میں نے صرف کواڑ بند کئے تھے۔ قتل کرنے کے لئے ایک سکھ نے آنا تھا۔ جو وقت مقرر کیا گیا تھا اُس وقت میں فصیل کے پاس جا کھڑا ہوا۔ قاتل صحیح وقت پر آ گیا۔ میں اُسے بنگلے تک لے آیا اور اُسے کھڑکی دکھائی لیکن میں برآمدے میں چلا گیا اور کھڑکی اپنے ہاتھ سے کھولی ....

"میں اُس وقت تک جاگتا رہا اور اپنے کوارٹر کے دروازے میں کھڑے ہو کر بنگلے کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ بیڈروم کے اندر بہت دیر تک روشنی رہی۔ آخر روشنی بجھ گئی۔ قاتل کے آنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ایک گھنٹے میں تم اور میڈوز گہری نیند سو چکے ہو گے۔ میں نے سکھ کو بتا دیا تھا کہ اس انگریز ایس۔ پی کے ساتھ ایک عورت ہو گی۔ اُسے وہ میڈوز کی میم نہ سمجھ لے اور اُسے بھی قتل نہ کر دے، وہ ہندوستانی ہے .... میں تمہیں یہ بھی بتا دوں شہناز! تم جب میڈوز کے بنگلے میں آتی تھیں تو میرا غصہ اور آزادی کا جذبہ آگ کی طرح تیز ہو گیا تھا۔ مجھے خیال یہ آیا تھا کہ یہ انگریز افسر ہندوستانیوں کو اس حد تک غلام سمجھتے ہیں کہ ہماری لڑکیوں کو سبز باغ دکھا کر اور کچھ رقم

پیش کرکے انہیں خرید لاتے ہیں۔ میں کہتا تھا کہ اس انگریز افسر کو میں اپنے ہاتھوں قتل کروں لیکن یہ سکیم کے خلاف تھا....

"میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میں نے کھڑکی کھولی اور ہاتھ لمبا کرکے پردہ ذرا ایک طرف ہٹایا۔ سکھ نے ٹارچ روشن کی۔ میڈوز پیٹھ کے بل گہری نیند سویا ہوا تھا اور تم ساتھ والے پلنگ پر مُنہ دوسری طرف کئے سو رہی تھیں۔ سکھ اندر چلا گیا اور میں برآمدے سے اُتر کر کھڑا ہو گیا۔ سکھ نے دو منٹ بھی نہیں لگائے ہوں گے کہ وہ باہر آگیا۔ سکھ نے کہا کہ کام ہو گیا ہے۔ میں اُس کے ساتھ فصیل تک گیا۔ اتنے میں تمہاری چیخیں سنائی دیں۔ میں اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ اُدھر سے اردلی وغیرہ دوڑتے نکلے۔ میں راستے میں سے ہی بنگلے کی طرف دوڑ پڑا۔"

"تم پر شک کس طرح ہُوا؟" — شہناز نے پوچھا۔

"میں نے ایسا کام پہلے کبھی نہیں کیا تھا" — رام سروپ نے جواب دیا — "میں نے دھیان ہی نہ دیا کہ میں جدھر بھی گیا ہوں اُدھر اپنے پاؤں کے نشان چھوڑتا آیا ہوں۔ اس کا احساس مجھے کچھ دیر بعد ہُوا تب میں نے اپنے جُوتے ایک طرف جاکر اُتار دیئے لیکن میرے قدموں کے نشانات نے اور میرے اُترے ہُوئے جُوتوں نے مجھے پکڑوا دیا۔"

"اب میں تمہیں جدھر لے جاؤں گی اُدھر تمہارے قدموں کا کوئی نشان پیچھے نہیں رہے گا" — شہناز نے کہا — "تمہارے ایڈریس کا بھی کسی کو علم نہیں ہوگا۔"

"ایک بات بتاؤ شہناز!" — رام سروپ نے پوچھا — "تمہاری پارٹی میڈوز کو کیوں قتل کرنا چاہتی تھی؟"

"ہمارا جاسوس یہاں موجود ہے" — شہناز نے کہا — "یہی سنتری جو ہمیں کھانا کھلا گیا ہے۔ اس نے کسی ذریعے سے معلوم کر لیا تھا کہ میڈوز نے دہشت گرد گروہوں میں غدار پیدا کر لئے ہیں جنہوں نے ہمارے دو لیڈروں کی نشاندہی کر دی ہے۔"

"ایک ریل کار پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا تھا" — رام سروپ نے کہا۔ "لیکن تمام حملہ آور مارے گئے تھے کیونکہ حملے کی اطلاع قبل از وقت پولیس کو مل گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں ریل کار میں خزانے وغیرہ کی بجائے گورا رجمنٹ کے فوجی آتے تھے.... کیا تم نے پہلے یہ واقعہ سنا ہے؟"

"بڑی اچھی طرح سنا ہے" — شہناز نے کہا — "حملہ آوروں کو مروانے والے بھی غدار تھے جن کی میں بات کر رہی ہوں۔ مشہور یہ کیا گیا کہ حملہ آور ڈاکو تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس حملے میں ڈاکوؤں کی مدد لی گئی تھی لیکن اس کے لیڈر میری پارٹی کے آدمی تھے۔ اسی واقعہ کے بعد میڈوز پہلے سے تیز اور ہوشیار ہو گیا تھا۔ یہ انگریز بھیس بدل کر ہماری پارٹی کے لیڈروں کے پیچھے گھومتا پھرتا رہا ہے لیکن پتہ اُس وقت چلتا تھا جب یہ نکل جاتا تھا ورنہ اسے بنگلے میں قتل کرنے کے لئے میرے آنے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"میرے گروہ نے بھی اسے اسی وجہ سے قتل کرنے کا پروگرام بنایا تھا" — رام سروپ نے کہا — "اس کی بھیجی ہوتی سی آئی ڈی ہمارے ٹھکانے کے ارد گرد پہنچ گئی تھی۔ ابھی ٹھکانے کی صحیح نشاندہی نہیں ہوتی تھی۔ میرے لیڈر نے کہا کہ اس شخص کو جلدی ختم کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اور کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ آخر یہ موقع پیدا کیا گیا۔"

"تمہارا گروہ بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے" — شہناز نے کہا — "اور نیا بھی ہے۔"

"ہاں شہناز!" — رام سروپ نے کہا — "یہ ہماری ایک کمزوری ہے۔ ہمارے جو ممبر ہیں ان میں زیادہ تر نوجوان ہیں جو سوچتے کم ہیں اور اندھا دُھند بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ خود میرا اناڑی پن دیکھ کہ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ میں اپنے قدموں کے نشان اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہوں۔"

"تم نے خطرناک غلطی ایک اور بھی کی تھی" — شہناز نے کہا — "تم نے اپنے گروہ کا خفیہ نشان اور خنجر جو اپنے پاس رکھنا غیر قانونی ہے، کوارٹر میں رکھا ہُوا تھا.... چلو جو ہُوا سو ہو گیا۔ اب آئندہ محتاط رہو گے۔ تم قتل کی سزا سے

بچ گئے ہو البتہ اپنی غلطی کی تمہیں بہت سزا مل چکی ہے۔"

✖

وہ دونوں اپنے اپنے گروہ کی اور دہشت پسندی کے ذریعے ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کی باتیں کرتے رہے اور سنتری کے بدلنے کا وقت ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ سنتری آ گیا جس نے انہیں فرار کرانا تھا۔ اُس نے شہناز کو دروازے کے قریب بلایا اور سرگوشیوں میں اُسے کچھ بتاتا رہا۔ تقریباً نصف گھنٹہ گزرا ہو گا کہ سنتری نے جیب سے ایک چابی نکالی۔ حوالات کی چابیاں سنتریوں کے پاس نہیں ہوا کرتیں بلکہ ذمہ دار افسر کے پاس تالے میں رکھی جاتی ہیں۔ یہ چابی جو سنتری کے پاس تھی خاص طور پر بنوائی گئی تھی۔ یہ چابی ایسی تھی جو اس قسم کے ہر تالے میں لگ سکتی تھی۔

سنتری نے برآمدے کا بلب بجھا دیا اور تالا کھول دیا۔ شہناز اور رام سروپ آہستہ آہستہ چلتے دروازے میں سے نکلے۔ انہوں نے کھانا کھا لیا تھا اور پانی بھی پی لیا تھا جس سے اُن کے جسموں میں کچھ جان واپس آ گئی تھی۔ اگر انہیں کھانا نہ ملتا تو وہ اُٹھتے ہی گر پڑتے۔ سنتری نے دروازہ بند کر کے تالا پھر لگا دیا اور چابی اپنی جیب میں ڈال لی۔

"میرے پیچھے پیچھے آؤ" ——— سنتری نے کہا ——— "کسی قسم کی آواز پیدا نہ ہو۔ کھانسنا بھی نہیں۔"

وہ چلتے گئے اور اس ہیڈ کوارٹر کے پچھواڑے جا پہنچے۔ اُن کے سامنے ایک اونچی دیوار تھی۔ دیوار کے اوپر خاردار تار لگی ہوئی تھی۔ یہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس دیوار سے وہ دوسری طرف چلے جائیں گے لیکن انتظام کرنے والوں نے بڑا پکا انتظام کیا تھا۔ باہر سے ایک رسہ اندر کی طرف آیا۔ دیوار کی بلندی دس بارہ فٹ تھی۔ پہلے سنتری اپنی رائفل دیوار کے ساتھ رکھ کر اُوپر گیا۔ اُس نے جیب میں سے تاریں کاٹنے والا کٹر نکالا اور ایک جگہ سے تین چار تار [illegible] انہیں واپس باندھ دیا۔ یہ کام ختم کر کے وہ نیچے آیا۔

اُس نے شہناز کو اُٹھا کر اُوپر کیا اور اُسے کہا کہ وہ رسہ مضبوطی سے پکڑ لے۔ کچھ سنتری نے اُسے اوپر کیا کچھ شہناز رسّے کی مدد سے اُوپر ہوتی گئی۔ اُس کے جسم میں اتنی جان نہیں تھی کہ اُس کے بازو اُس کا بوجھ اُوپر اُٹھا سکتے۔ سنتری نے اُسے اتنا اوپر کر دیا کہ اُس کے پاؤں سنتری کے کندھوں تک آ گئے۔ سنتری نے اُس کے پاؤں اپنے کندھوں پر رکھ لئے۔ اب شہناز دیوار پر تھی۔ دوسری طرف کے آدمیوں نے شہناز کو نیچے اُتار لیا۔

اس کے بعد رام سروپ اُوپر گیا اور سنتری اور رسّے کی مدد سے دیوار پر چلا گیا۔ اس کے بعد سنتری رائفل اُٹھا کر بڑی آسانی سے رسّے پر چڑھ کر دیوار پر چلا گیا۔ وہ تازہ دم تھا۔ دوسری طرف اُترنے کے لئے اُسے دیوار سے کُودنا پڑا کیونکہ اندر کی طرف رسہ پکڑ کر اور کھینچ کر رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

دیوار سے بارہ چودہ قدم دُور ایک تانگہ کھڑا تھا جس میں ایک آدمی گھوڑے کی باگیں تھامے بیٹھا تھا۔ اُس کے علاوہ دو آدمی تھے جنہوں نے فرار ہونے والوں کو دیوار عبور کرائی تھی۔ سنتری، رام سروپ اور شہناز تانگے میں بیٹھ گئے اور تانگہ چل پڑا۔ دوسرے دو آدمی سائیکلوں پر تانگے سے کچھ دُور دُور پیچھے پیچھے چل پڑے۔

✖

تانگہ ایسی سڑک پر چلا گیا جہاں روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ سنتری نے رائفل سیٹوں کے نیچے رکھ دی۔ جس کے ہاتھ میں گھوڑے کی باگیں تھیں اُس نے سنتری کو کپڑے دیئے۔ سنتری نے چلتے چلتے قمیض بدل لی، پھر اُس نے نیکر کے اُوپر شلوار پہن لی۔ اُس کے پاؤں میں موٹے تلے والے پشاوری چپل تھے۔ وہ اُتار کر اُس نے سیٹ کے نیچے کر دیئے اور دیسی جُوتی جو اُس کے لئے کوچوان لایا تھا، پہن لی۔

سحر کے تین بج رہے تھے۔ تانگہ ایک ایسی جگہ جا کر رُکا جہاں کسی کے گزرنے کا امکان نہیں تھا۔ دونوں سائیکل سوار بھی اُن سے آ ملے۔

"تم بتاؤ بھائی رام سروپ!" — ان میں سے ایک آدمی نے پوچھا — "تم کہاں جاؤ گے؟"

"اپنے گھر" — اُس نے جواب دیا۔

"تم تو بالکل ہی اناڑی ہو یار!" — سنتری نے اُسے کہا — "میری ڈیوٹی پانچ بجے ختم ہوتی تھی۔ پانچ بجے دوسرا سنتری آئے گا تو وہ مجھے وہاں نہ دیکھ کر اور دونوں ملزموں کو بھی غائب پاکر رپورٹ کر دے گا۔ ہمارے فرار کا انکشاف ہو جائے گا۔ پولیس سیدھی تمہارے گھر پہنچے گی۔"

"پولیس میرے گھر سے واقف نہیں" — رام سروپ نے کہا۔

"یہ تمہاری بھول ہے" — سنتری نے کہا — "کل ہی پولیس کو ایک آدمی ملا ہے جس نے تمہارے گھر کی نشاندہی کر دی ہے۔ بہتر ہے کہ تم اپنے کسی لیڈر کے گھر چلے جاؤ۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم نے اپنا کوئی خفیہ اڈہ بنا رکھا ہے تو وہاں چلے چلو۔"

"میں یہیں نہ اُتر جاؤں؟" — رام سروپ نے کہا — "میں خود ہی پہنچ جاؤں گا۔"

"بیوقوف انسان!" — ایک اور آدمی نے اُسے کہا — "تم میں تو ذرا سی بھی عقل نہیں۔ چلتے چلتے پکڑے جاؤ گے۔ ہم نے تمہیں نکالا ہے تو اپنا فرض اس طرح پورا کر کے جائیں گے کہ تمہیں کسی محفوظ ٹھکانے پر چھوڑ دیں۔"

"ہم نے ابھی کوئی خفیہ ٹھکانہ نہیں بنایا" — رام سروپ نے کہا — "عام طور پر ہم اپنے ایک لیڈر کے گھر اکٹھے ہوتے ہیں۔ وہیں چلے چلو۔"

تانگہ چل پڑا۔ رام سروپ رہنمائی کرتا رہا اور تانگہ ایک کشادہ گلی تک پہنچ گیا۔ کوچوان نے تانگہ وہیں روک لیا۔

"تانگہ گلی میں نہیں جانا چاہیئے" — کوچوان نے کہا — "صرف ایک آدمی اس کے ساتھ جاؤ اور اسے کسی ذمہ دار آدمی کے حوالے کر کے آؤ.... تم سب یہیں ٹھہرو۔ میں خود اس کے ساتھ جاتا ہوں۔"

کوچوان اُس کے ساتھ چل پڑا۔ گلی کے وسط میں رام سروپ رُک گیا

اور ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ وہ نوکر تھا۔

"سُندر کہاں ہے؟" — رام سروپ نے پوچھا۔

"وہ تو سو رہے ہوتے ہیں۔"

"انہیں جگاؤ" — رام سروپ نے کہا — "اور کمرے کا دروازہ کھولو۔ ہم اندر بیٹھیں گے۔"

نوکر نے بیٹھنے والے کمرے کا دروازہ کھول کر بتی جلا دی۔ کوچوان اور رام سروپ اندر جا کر بیٹھ گئے۔ چند منٹ بعد رام سروپ کی عمر کا ہی ایک آدمی آنکھیں ملتا ہوا آیا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ سی تھی۔ رام سروپ اور اُس کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ اور زیادہ گھبرایا۔ رام سروپ نے اُٹھ کر سندر کو گلے لگا لیا۔

"تم یہاں کیسے؟" — سندر نے رام سروپ سے پوچھا — "اور یہ کون صاحب ہیں؟"

"گھبراؤ نہیں سندر!" — رام سروپ نے کہا — "انہوں نے مجھے پولیس کی سپیشل برانچ کی حوالات سے فرار کرایا ہے۔ ان کی اپنی ایک لڑکی اسی تفتیش کے چکر میں آگئی تھی۔ یہ اُسے فرار کرانے گئے تھے۔ انہیں میرا پتہ چلا تو مجھے بھی نکال لائے۔"

"یقین نہیں آتا" — سُندر نے کہا۔

"رام سروپ بھائی!" — کوچوان نے کہا — "لمبی کہانیاں سننے سنانے کا وقت نہیں۔ یہ اسے بعد میں سناتے رہنا۔ میں جاتا ہوں۔ میرے آدمی گلی سے باہر کھڑے ہیں .... سُندر دوست! کوئی وہم نہ کرو۔ ہم بھی تمہاری لائن کے آدمی ہیں لیکن ہم تمہاری پارٹی سے زیادہ مضبوط ہیں۔ ہمارا تمہارا مقصد ایک ہے۔ میری ایک بات بڑے غور سے سنو اور اس پر سختی سے عمل کرنا .... رام سروپ کو کم از کم دو دن اور دو راتیں اس گھر سے باہر نہ نکلنے دینا۔ اس کے گھر پر نظر رکھنا۔ تمہارے متعلق پولیس کو کچھ پتہ نہیں۔ اگر کسی

کے کہنے پر پولیس کا رُخ تمہاری طرف ہوجاتا ہے تو رام سروپ کو اس شہر سے ہی باہر نکال دینا لیکن تم لوگ اناڑی معلوم ہوتے ہو۔ گھبرا کر کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا۔"

"آپ کے گروہ کا کیا نام ہے؟" — سُندر نے پوچھا۔

"مت پوچھو یار!" — کوچوان نے جواب دیا — "اب ہماری تمہاری ملاقاتیں جاری رہیں گی۔ ہمارے متعلق تمہیں ہر ایک بات معلوم ہوجاتے گی .... ہاں ضروری بات رہ گئی تھی۔ اُس انگریز افسر کا اصل قاتل جو کوئی بھی ہے، اُسے شہر سے کہیں دُور بھیج دو۔"

"کہاں جاتے گا؟" — رام سروپ نے کہا — "ہم تو شہر سے باہر کسی کو جانتے ہی نہیں۔"

"پھر ایک کام کرو" — کوچوان نے کہا — "ہم نے تمہاری اتنی مدد کی ہے۔ تھوڑی سی مدد اور کر دیتے ہیں .... وہ ہے کون اور کہاں رہتا ہے؟"

سُندر نے سکھ کا نام اور محلہ وغیرہ بتا دیا۔

"اُسے اپنے گھر میں نہیں رہنا چاہیئے" — کوچوان نے کہا — "سُندر! اُسے بھی اپنے گھر میں بلا لو اور اُسے بھی کم از کم دو دن اپنے گھر میں چھپاتے رکھو۔ میں شاید آج شام کسی نہ کسی بھروپ میں یا انہی کپڑوں میں یہاں آؤں گا۔ اگر تم تینوں خطرے میں ہوئے تو میں کچھ نہ کچھ بندوبست کر دوں گا۔ تم لوگوں نے اس انگریز ایس۔ پی کو قتل کر کے کوئی معمولی کام نہیں کیا۔ یہی کام ہم نے کرنا تھا۔ ہم تمہیں اس کا یہ صلہ دیں گے کہ تم چونکہ ناتجربہ کار ہو اِس لئے ہم تمہاری حفاظت کریں گے اور ہر طرح مدد کریں گے۔ گھبرا کر اور ڈر کر کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا۔ اُس سکھ کو ابھی جا کر یہاں لے آؤ۔"

✖

اُس وقت جب کوچوان سُندر داس کے گھر میں بیٹھا ہوا اُسے اور رام سروپ کو ہدایات دے رہا تھا اور اُن کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ میں سپیشل برانچ کے ہیڈکوارٹر میں بڑی سخت پریشانی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ پریشانی شہناز کی تھی۔ مجھ پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ اعصابی کھچاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی انگلیوں میں رعشہ محسوس کیا۔ یہ اعصاب زدگی کی علامت تھی۔

"شہناز کا کیا بنے گا؟"

یہ ایک سوال تھا جو میرے وجود کے اندر رینگ رہا تھا اور میں بے چین ہوتا چلا جا رہا تھا۔

میں وہاں اکیلا نہیں تھا۔ وہ انگریز انسپکٹر جو میڈوز کے قتل کی تفتیش کر رہا تھا، وہاں موجود تھا۔ ایک انگریز سب انسپکٹر بھی تھا۔ ایک ہندو اے ایس آئی بھی میرے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ باہر بارہ ہندوستانی کانسٹیبلوں کی گارد کھڑی تھی جس کے ساتھ دو ہیڈ کانسٹیبل تھے۔

صبح کے چار بجے ہم ہیڈکوارٹر میں آئے تھے۔ ہمیں اطلاع مل گئی تھی کہ رام سروپ، شہناز اور کانسٹیبل جو حوالات پر سنتری تھا، فرار ہو گئے ہیں۔ ہم پولیس آفیسر خاموش بیٹھے تھے۔ کوئی کسی کے ساتھ بات نہیں کرتا تھا۔ انگریز انسپکٹر اور سب انسپکٹر سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے جا رہے تھے۔

پانچ بج گئے۔ سب بار بار اپنی گھڑیاں دیکھ رہے تھے۔

پندرہ بیس منٹ اور گزرے تو باہر گھوڑے کے ٹاپ سنائی دیتے۔ یہ تانگے کا گھوڑا تھا۔ ہم سب اُچھل کر اُٹھے اور دوڑتے ہوتے باہر نکلے۔ وہ تانگہ ہی تھا — اور یہ وہی تانگہ تھا جس کے انتظار میں بیٹھے ہم بے چین ہو رہے تھے اور یہ وہی تانگہ تھا جس میں رام سروپ، شہناز اور سنتری فرار ہوتے تھے۔

کوچوان وہی تھا جو اُن تینوں کو بٹھا کر لے گیا تھا اور سُندر کے گھر آیا تھا کہ قاتل کو بھی اپنے گھر میں چھپا لو۔

"تانگے کی اگلی سیٹ پر فرار ہونے والا سنتری بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹ پر شہناز بیٹھی تھی۔

دونوں سائیکل سوار جنہوں نے باہر سے رستہ پھینکا تھا تانگے کے

پیچھے آ رہے تھے۔

تانگے کا اصل مالک برآمدے میں بینچ پر بیٹھا تھا۔ اُسے کہا کہ وہ اپنا تانگہ سنبھال لے اور دفتر کھلتے ہی اُسے پیسے مل جائیں گے۔

کوچوان اور سنتری تانگے سے اُترے، سائیکل سواروں نے سائیکل الگ کھڑے کیے اور سب نے آگے آ کر سیلوٹ کیا۔ شہناز تانگے سے اُتر رہی تھی۔ میں دوڑتا اُس تک پہنچا اور اُس کا ایک ہاتھ پکڑ کر تانگے سے اُتارا۔

"تم نے بڑے مشکل امتحان میں ڈال دیا تھا سکندر!" — شہناز نے کہا — "اتنی گندی کوٹھڑی تھی وہ کہ بدبُو سے دماغ چکرا گیا تھا۔"

"وہاں زیرِ تفتیش ملزموں کو بند کرتے ہیں" — میں نے کہا — "تم نے رام سروپ کی حالت دیکھی تھی۔ ملزموں کا خون بھی بہتا ہے، پسینہ بھی اور اُن کے جسموں کی بُو بھی کوٹھڑی میں رہتی ہے۔ یہ چار کوٹھڑیاں ہیں جنہیں مہینے میں صرف ایک بار صاف کیا جاتا ہے ..... کہو کیسی رہی؟"

"خدا نے پوری کامیابی دی ہے" — شہناز نے کہا — "لیکن سر ابھی تک چکرا رہا ہے۔"

"سکندر!" — انگریز پولیس انسپکٹر نے مجھے بلایا — "اسے دفتر میں لے آؤ۔"

میں شہناز کو دفتر میں لے گیا۔ سب اندر آتے اور بیٹھ گئے۔ سب اپنی اپنی رپورٹ دینے لگے۔

✖

کوچوان دراصل سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر اللہ داد خان تھا۔ وہ بہت سینئر سب انسپکٹر تھا اور انسپکٹر ہونے والا تھا۔ جس سنتری نے شہناز اور رام سروپ کو حوالات سے نکالا تھا، وہ کانسٹیبل نہیں تھا بلکہ میرا ساتھی سلطان احمد تھا۔ وہ بھی سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر تھا۔ دونوں سائیکل سوار جنہوں نے باہر رستہ پھینکا تھا، ہماری برانچ کے اے ایس آئی تھے۔

یہ جال انگریز انسپکٹر وِلکاکس نے تیار کیا تھا۔ قتل کی تفتیش وہی کر رہا تھا۔ رام سروپ اگر اقبالِ جرم کر لیتا اور سکھ قاتل کو بھی پکڑوا دیتا تو ان دونوں کو تو سزا ہو جاتی لیکن ان کا گروہ محفوظ رہتا اور بڑے بڑے افسروں کے قتل کی وارداتیں ہوتی رہتیں۔ ہم اس کوشش میں تھے کہ رام سروپ اپنے گروہ کے لیڈروں اور اپنے خفیہ ٹھکانے کی نشاندہی کر دے مگر وہ اپنی ہڈیاں تڑوا کر یہ بھی نہیں مانتا تھا کہ وہ ہمارے ایس۔ پی کے قتل میں شامل تھا۔

"سب انسپکٹر سکندر!" — ایک روز انسپکٹر وِلکاکس نے مجھے بلا کر کہا — "مجھے یہ پورا گروہ یا اُن کے لیڈر چاہئیں۔ قاتل کوئی اور تھا اور اس ملزم نے اُس کی مدد کی ہے مگر وہ نہیں مانتا۔ مجھے اس لڑکی کی ضرورت ہے جو قتل کے وقت مقتول کے ساتھ سوئی ہوئی تھی ..... شہناز ..... یہ تمہاری لڑکی ہے۔ اسے تم تیار کر سکتے ہو؟"

"صاحب!" — میں نے کہا — "آپ کام بتائیں۔ میں اسے تیار کر لوں گا۔"

"کام یہ ہے" — اُس نے کہا — "ایک رات ہم شہناز کا حلیہ ایسا بنائیں گے جس سے پتہ چلے کہ اسے پولیس نے بہت اذیتیں دی ہیں اور اس پر میڈوز کے قتل کا شبہ کیا گیا ہے۔ شہناز ایک کام یہ کرے کہ اسے ہم رام سروپ کی کوٹھڑی میں پھینک دیں اور وہ ادھ موئی بلکہ بے جان لڑکی کی ایکٹنگ کرے۔ پھر وہ رام سروپ کو بتائے کہ وہ ایک بڑے مضبوط ٹیررسٹ گروہ کی اہم اور سرگرم رکن ہے۔ شہناز اُس پر اپنے حُسن کا بھی جادو چلائے اور آزادی اور وطن پرستی کی جذباتی باتیں کرے۔ مقصد یہ ہے کہ رام سروپ پر اپنا اعتماد پیدا کر کے اُس سے اُس کے گروہ کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ اُس سے یہ بھی معلوم کرے کہ قاتل کون ہے اور وہ لڑکی کون ہے جو شہناز سے پہلے ایس۔ پی میڈوز کے بنگلے میں آیا کرتی تھی ..... کیا تم سمجھتے ہو کہ شہناز یہ کام کر سکے گی؟"

✖

"ریہرسل کرا کے دیکھ لیں"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "میرا خیال ہے کہ کر لے گی۔ آپ اپنی پوری سکیم بتائیں۔ میں اسے تیار کر لوں گا۔"

"یہ سوچ لو، کام خطرناک ہے"۔۔۔ انسپکٹر ڈولکاکس نے کہا ۔۔۔ "اگر باہر جا کر اس سے ذرا سی بھی غلطی ہو گئی تو یہ پھنس جاتے گی۔"

"لڑکی ذہین ہے صاحب!"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

"اگر اس نے یہ کام میری سکیم کے مطابق کر دیا تو میں اسے بہت انعام دلاؤں گا ....شہناز رام سروپ کو بتاتے گی کہ اُس کے گروہ نے اسے فرار کرانے کا انتظام کر لیا ہے اور یہ کانسٹیبل جو سنتری ہے ہمارا اپنا آدمی ہے .... اُس رات سب انسپکٹر سلطان احمد کانسٹیبل کی وردی پہن کر اور رائفل ہاتھ میں لے کر کوٹھڑی کے سامنے سنتری کھڑا ہو گا۔ میں اُسے بتا دوں گا کہ وہ کیا کرے گا۔"

اسی طرح سب انسپکٹر اللہ داد خان کو کوچوان اور دو اسسٹنٹ سب انسپکٹروں کو فرار کروانے کا کام سونپا۔ شہناز کو تیار کرنے اور ریہرسل کرانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی۔

میں نے شہناز سے بات کی تو وہ کچھ گھبرائی۔ میں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی اور اُسے ایسی عورت کی ایکٹنگ کر کے دکھائی جس پر اتنا زیادہ تشدّد کیا گیا ہو کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی رہنے کے قابل نہ رہے۔ دو چار بار کوشش کرنے سے اس نے یہ ایکٹنگ کر لی۔

شہناز کو فیملی کوارٹروں کے قریب ایک کوارٹر دے دیا گیا تھا اور اُسے ایک نوکرانی بھی دے دی گئی۔ میں اور سلطان اُس کے کوارٹر میں جا سکتے تھے۔ میں اُس کے پاس اکیلا جاتا رہا۔ آخری روز میں نے اُس سے ریہرسل کرائی۔ میں رام سروپ بن کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ وہ اس طرح میرے سامنے آکر گری کہ اُس کا سر میرے پاؤں میں آپڑا۔

میں کراہتے ہوتے اُسے اس طرح اُٹھانے لگا کہ اپنا بازو اُس کی گردن

کے نیچے کیا اور دوسرا بازو اُس کے پیٹ کے اُوپر سے جا کر اُس کی پیٹھ کے نیچے رکھا۔ جب اُس کا اُوپر کا دھڑ اوپر اُٹھا تو اُس کا سینہ میرے سینے سے لگ گیا اور اُس کا مُنہ میرے مُنہ کے بہت قریب آگیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں اور اُس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بیٹھنے کی پوزیشن میں آگئی تھی۔

اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اپنا مُنہ میری گردن اور کندھے کے درمیان کر لیا۔ وہ رو رہی تھی پھر اُس کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ اُس کا سارا جسم سسکیوں کے ساتھ ہلتا تھا۔

"شہناز!"۔۔۔ میں نے اس سے الگ ہونے کی کوشش کرتے ہوتے کہا ۔۔۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"اپنے گناہ یاد آ گئے ہیں"۔۔۔ اُس نے مجھے اپنے بازوؤں سے آزاد کرتے ہوتے کہا ۔۔۔ "تمہاری آنکھیں میری آنکھوں کے بہت قریب آگئی تھیں۔ یہ مجھے تمہارے ابا جان کی آنکھیں لگیں۔ میں نے ان آنکھوں میں اُن کی بڑی صاف جھلک دیکھی۔ شاید دو چار سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے لیکن مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے تمہارے ابا جان کی آنکھیں دیکھتے پورا دن گزرا ہے .... تمہاری آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے مجھے تمہارا لڑکپن یاد آگیا۔"

"اُتار دو ان یادوں کو ذہن سے شہناز!"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "ہم دونوں کا ماضی تلخیوں سے بھرا پڑا ہے۔ میں نے ذہن کو پیچھے کبھی نہیں جانے دیا۔ کیوں اپنے دل اور اپنی رُوح کو کانٹوں سے چھلنی کروں؟"

"دل میں جو آتی ہے وہ کہہ لینے دو سکندر!"۔۔۔ شہناز نے جذباتی لہجے میں کہا ۔۔۔ "کانٹے اُگل لینے دو مجھے۔ تمہیں دیکھتی ہوں تو یہ کانٹے میری رُوح میں گہرے اُتر جاتے ہیں .... تم میرے اتنا قریب نہ آیا کرو۔ ایک وہ وقت تھا کہ تمہاری ان جادو بھری آنکھوں نے مجھے بھلا دیا تھا کہ میں تمہاری ماں ہوں اور تم میرے بیٹے ہو۔ آج میں اس اذیت میں مبتلا ہوں کہ تمہاری

آنکھوں میں دیکھتی ہوں تو میرے اُس وقت کے گناہ مجھے ڈستے ہیں۔ میں کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں سکندر! بتاؤ میں کیا کروں!"

"میں جو کہتا ہوں وہ کرو" — میں نے اُس کی ذہنی حالت کو بدلنے کے لئے مسکراتے ہوئے کہا — "یہ ذہن میں رکھ لو کہ ہم ریہرسل کر رہے ہیں۔ ہم اپنی گزری ہوئی زندگی کا ڈرامہ نہیں کھیل رہے۔"

"کچھ سمجھ نہیں آتی سکندر!" — اُس نے دوپٹے سے آنسو پونچھ کر کہا — "کبھی خیال آتا ہے کہ میں تمہاری خاطر جان دے دوں تو خدا میرے گناہ معاف کر دے گا۔ میں اپنا وجود، اپنی ذات، اپنا سب کچھ تمہارے قدموں میں ڈال دینا چاہتی ہوں۔"

"اگر تم میرے باپ کی بیوہ نہ ہوتیں تو میں تمہارے ساتھ شادی کر لیتا" — میں نے کہا — "یہ بھی نہ دیکھتا کہ تم مجھ سے پانچ چھ سال بڑی ہو۔"

"اگر میں تمہاری سوتیلی ماں نہ ہوتی اور تمہاری عمر کی ہوتی پھر بھی میں تمہارے ساتھ شادی نہ کرتی" — شہناز نے کہا۔

"کیوں؟"

"میں تمہیں زندہ رکھنا چاہتی ہوں سکندر!" — اُس نے کہا — "میں نے دیکھ لیا ہے کہ موت میرے آنچل کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔ میرے ساتھ جس نے بھی تعلق پیدا کیا وہ مارا گیا یا ایسی مصیبت میں گرفتار ہوا کہ مرا بھی نہیں زندہ بھی نہ رہا۔ میری دو سہیلیاں ہندو تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ کوئی عورت قدرتی طور پر ایسی زہریلی ہوتی ہے کہ اُس کی سانس بھی کسی مرد کی سانس سے ٹکرا جاتے تو مرد زندہ نہیں رہتا۔ وہ طبعاً حلیم ہو اور کتنی ہی مخلص اور محبت کرنے والی کیوں نہ ہو، اُس کا وجود کسی مرد کے وجود سے ملے تو مرد کی موت لازمی ہوتی ہے ..... میں بھی ایسی ہی عورت معلوم ہوتی ہوں۔ مجھے ناگن کے روپ میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ کوئی مجھے خوبصورت عورت سمجھ کر میرے قریب تو نہ آتا۔ تم شاید اس لئے بچے ہوئے ہو کہ تمہاری نیت صاف ہے اور میں نے تمہارے ساتھ تعلق میں اپنی نیت کو پاک کر

لیا ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں پاکباز ہوں بلکہ اس لئے کہ میں تمہیں آفات سے محفوظ اور زندہ رکھنا چاہتی ہوں۔"

وہ وقت ان جذباتی باتوں کا نہیں تھا۔ میں نے شہناز کو مکمل ریہرسل کرائی تھی۔ اگلی ہی شام اُسے رام سروپ کی کوٹھڑی میں بند کر دینا تھا جہاں سے اُسے رات دو بجے کے بعد فرار ہونا تھا۔

"شہناز!" — میں نے اُسے کہا — "یہ باتیں پھر کسی وقت کریں گے۔ پہلے یہ کام کر لیں۔"

"پھر تم اپنی آنکھیں میری آنکھوں کے اتنے قریب نہ لانا کہ تمہاری پُتلیاں مجھے پھیلتی ہوئی نظر آئیں" — اُس نے کہا — "اپنا چہرہ مجھ سے ....."

میں نے اُس کی بات پوری نہ ہونے دی اور میں ہنس پڑا۔ اُس سے ریہرسل کروائی، ضروری باتیں سمجھائیں اور مجھے تسلی ہو گئی کہ وہ اس سکیم کے لئے تیار ہو گئی ہے۔

اس سکیم میں جو دوسرے آدمی تھے وہ اپنی ریہرسل کر رہے تھے۔

اگلی رات رام سروپ کے لئے یہ جال بچھا دیا گیا۔ شہناز کو رام سروپ کی کوٹھڑی میں پھینک دیا گیا۔ سب انسپکٹر سلطان احمد کانسٹیبل کی وردی پہن کر کوٹھڑی کے سامنے پہلے ہی جا کھڑا ہو گیا تھا۔ روٹی جو رام سروپ اور شہناز کو کھلائی گئی تھی وہ ساتھ والے کمرے میں پہلے ہی رکھ دی گئی تھی۔ اس روٹی اور پانی کی ضرورت یہ تھی کہ رام سروپ دو دنوں سے بھوکا تھا۔ اُسے بھوکا رکھا گیا تھا۔ خطرہ تھا کہ وہ فرار کے دوران بے ہوش ہو جائے گا۔

✖

یہ دیکھ لیا گیا تھا کہ رام سروپ جذباتی جوان تھا۔ آپ نے آج کل ایسے نوجوان دیکھے ہوں گے جو سیاسی لیڈروں کی جذباتی تقریروں سے متاثر ہو کر جلوس نکالتے اور توڑ پھوڑ شروع کر دیتے ہیں۔ وہ دَور جلسوں اور جلوسوں کا نہیں تھا لیکن بعض نوجوان جوش میں آ کر دہشت گرد بن جاتے اور بڑی خطرناک

کارروائیاں کرگزرتے تھے لیکن عقل سے کام نہ لینے کی وجہ سے پکڑے جاتے تھے۔ شہناز کو اس کے مطابق تیار کیا گیا اور اُسے موزوں مکالمے یاد کرائے گئے تھے۔

یہ پارٹی واپس آگئی تھی۔ "کوچوان" چونکہ سینئر سب انسپکٹر تھا اس لئے اُس نے اِس کارروائی کی پوری رپورٹ دی۔

"اِس لڑکی کا رول کیسا تھا؟" ۔۔۔ انسپکٹر وِلکاکس نے سلطان احمد سے پوچھا۔

"بہت اچھا صاحب!" ۔۔۔ سلطان احمد نے جواب دیا ۔۔۔ "اس کی ایکٹنگ اتنی اچھی تھی کہ میں نے دو تین بار محسوس کیا کہ اس لڑکی کو واقعی مار پیٹ کر یہاں بند کیا گیا ہے۔"

شہناز نے بتایا کہ رام سروپ کے مُنہ سے اُس نے کیا کچھ اُگلوایا ہے۔ رام سروپ نے شہناز کو تفصیل سے سنایا تھا کہ میڈوز کو کس طرح اور کیوں قتل کیا گیا تھا۔

یہ جال کامیابی سے بچھایا گیا تھا اور مطلوب مجرم اس میں آگئے تھے۔ اب انہیں پکڑنا تھا۔ پولیس کی گارد تیار تھی۔ کم از کم دو گھنٹے کا وقفہ دینا تھا تاکہ سکھ قاتل بھی سُندر داس کے گھر آجاتے۔

شہناز کا کام ابھی ختم نہیں ہُوا تھا۔ اُس ہندو لڑکی کو بھی پکڑنا تھا جو میڈوز کے بنگلے میں آیا کرتی تھی۔ رام سروپ نے شہناز کو اُس کا نام سرلا دیوی بتایا تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج میں فورتھ ایئر کی سٹوڈنٹ تھی۔ انسپکٹر وِلکاکس نے کہا کہ اِس لڑکی کو شہناز کی مدد سے پکڑا جا سکتا ہے۔

"دیکھو شہناز!" ۔۔۔ وِلکاکس نے اُسے کہا ۔۔۔ "سکندر تمہیں میڈوز صاحب کے بنگلے میں لے جائے گا۔ شاید تمہارے بڑے اچھے کپڑے وہاں ہوں گے۔"

"ایک ساڑھی ہے" ۔۔۔ شہناز نے کہا۔

"ٹھیک ہے" ۔۔۔ وِلکاکس نے کہا ۔۔۔ "وہاں جا کر اپنا حلیہ دُرست

کرو۔ ساڑھی پہنو۔ بال ٹھیک کرو۔ میک اپ کرو اور سکندر تمہیں تانگے میں بٹھا کر گورنمنٹ کالج بھیج دے گا ۔۔۔۔ اور سکندر! تم دو کانسٹیبل ساتھ لیتے جاؤ۔ شہناز کے تانگے کے پیچھے تم کانسٹیبلوں کے ساتھ تانگے میں کالج تک جاؤ ۔۔۔۔ اور تم شہناز! کالج کے اندر جاکر پرنسپل کے دفتر میں جاؤ اور اُسے کہو کہ تم فورتھ ایئر کی سٹوڈنٹ سرلا دیوی کی بڑی بہن ہو اور اس سے تھوڑی دیر کے لئے ملنا چاہتی ہو۔۔۔۔

"سرلا دیوی آجائے تو اُسے باہر لے آنا اور اُسے کہنا کہ میں رام سروپ کی طرف سے آئی ہوں اور رام سروپ باہر کھڑا ہے۔ اگر یہی سرلا دیوی ہوتی تو وہ ضرور کہے گی کہ رام سروپ تو گرفتار ہو چکا ہے۔ تم کہنا کہ پولیس نے اُسے چھوڑ دیا ہے اور وہ تمہارے گھر آگیا تھا۔ اگر سرلا دیوی تم پر شک کرے یا باہر نہ آئے تو کوئی بات نہیں۔ تم باہر آکر سکندر کو بتانا۔ یہ اندر جاکر سرلا دیوی کو گرفتار کرلے گا۔ اگر وہ باہر آگئی تو بھی اُسے گرفتار کرلیا جائے گا ۔۔۔۔ جاؤ، زیادہ وقت نہ لگانا۔"

میں شہناز کو میڈوز کے بنگلے میں لے گیا۔

دوسری پارٹی نے جو کام کیا وہ مجھے پوری طرح سنایا گیا تھا۔ میں اُسی طرح آپ کو سناتا ہوں۔

سب انسپکٹر اللہ داد خان کوچوان کے بہروپ میں ہی رہا۔ وہ تانگہ ابھی باہر کھڑا تھا جو رات کو فرار میں استعمال ہُوا تھا۔ اُس نے وہ تانگہ لے لیا اور سُندر داس کے گھر کو چل پڑا۔ پولیس کی گارد اُس کی روانگی سے کچھ دیر بعد روانہ ہوتی۔ اس کی راہنمائی کے لئے سلطان احمد ساتھ گیا۔ گارد کو سُندر داس کے گھر سے دُور رہنا اور اللہ داد کے اشارے پر آگے جانا تھا۔

اللہ داد خان نے تانگہ وہیں روکا جہاں رات کو کھڑا کیا تھا۔ تانگہ وہیں چھوڑ کر وہ سُندر داس کے گھر گیا اور دروازے پر دستک دی۔ نوکر نے دروازہ کھولا۔

"سُندر جی ہیں؟" ۔۔۔ اللہ داد خان نے پوچھا۔

"نہیں"—— نوکر نے کہا —— "باہر نکل گئے ہیں"۔

"وہ کہیں نہیں گئے"—— اللہ داد خان نے کہا —— "انہیں کہو تانگے والا آیا ہے۔ تمہیں یاد نہیں میں کچھ دیر پہلے بھی آیا تھا؟ انہوں نے تانگہ منگوایا ہے۔ وہ میرے ساتھ جائیں گے"۔

"تم پھر انتظار کرو"—— نوکر نے کہا —— "وہ سوتے ہوئے ہیں"۔

"تمہیں انہوں نے کہا نہیں تھا کہ وہی تانگے والا آئے تو اُسے اندر لے آنا اور کوئی اور ہو تو کہنا گھر نہیں ہیں؟"—— اللہ داد نے پوچھا۔

"کہا تو یہی تھا"—— نوکر نے کہا —— "لیکن وہ سوتے ہوتے ہیں"۔

اللہ داد خان تجربہ کار پولیس آفیسر تھا اور اُس کا دماغ غیر معمولی طور پر تیز تھا۔

"ابھی نہ جگاؤ"—— اللہ داد خان نے کہا —— "میرے ساتھ اُن کے جو مہمان آئے تھے وہ بھی سوتے ہوتے ہوں گے"۔

"ہاں"—— نوکر نے کہا —— "وہ بھی سوتے ہوتے ہیں"۔

"اور اُن کا سکھ دوست بھی آیا ہوگا"۔

"وہ اوپر والے کمرے میں ہے"—— نوکر نے کہا۔

"میں اپنے تانگے میں انتظار کرتا ہوں"—— اللہ داد خان نے کہا —— "گلی کے باہر تانگہ کھڑا ہے۔ سُندر جی نے اپنے مہمانوں کو کہیں لے جانا ہے۔ وہ جاگیں تو انہیں بتا دینا کہ تانگہ وہاں کھڑا ہے"۔

معلوم یہی کرنا تھا کہ تینوں ملزم اس گھر میں موجود ہیں۔ اللہ داد خان آہستہ آہستہ چلتا گلی سے نکل گیا اور سڑک پر پہنچا جہاں پولیس گارد آئی ہوئی تھی۔ اللہ داد خان ان سب کو اپنے ساتھ لے آیا۔ پولیس کے اتنے زیادہ کانسٹیبلوں کو دیکھ کر گلی میں آتے جاتے لوگ رُک گئے اور گھر گھر خبر ہو گئی۔ گھروں سے لوگ باہر آ گئے۔ عورتیں دروازوں میں اور چھتوں پر کھڑی ہو گئیں۔

سُندر داس کے گھر کا بھی دروازہ کھلا اور دو تین عورتیں اور ایک دو بچے باہر آ کر پولیس کو دیکھنے لگے۔ پولیس گارد دوڑنے کی حد تک تیز آ رہی تھی۔

اس کے آگے آگے ایک "کوچوان" تھا جو سُندر کے گھر کے دروازے پر رُک گیا۔ اس کے اشارے پر کانسٹیبل سیلاب کی طرح اندر چلے گئے۔ اللہ داد خان (کوچوان) آگے آگے تھا۔

یہ دو منزلہ مکان تھا اور اس کے بہت سے کمرے تھے۔ کانسٹیبل، ایک ایک دو دو، کمروں میں چلے گئے۔ کچھ کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل اوپر چلے گئے۔ جس کمرے میں جو کوئی نظر آیا اُسے باہر لا کر صحن میں کھڑا کر دیا تھا۔ عورتوں اور بچوں نے رونا چلانا شروع کر دیا۔ محلے کے لوگ اس مکان کے باہر اکٹھے ہو گئے۔

لوگوں نے تو اکٹھے ہونا ہی تھا۔ یہ چوروں، ڈکیتوں یا بدمعاشوں کا گھر نہیں تھا۔ یہ ہندوؤں کا ایک معزز گھرانہ تھا۔ سُندر داس کا باپ امیر کبیر تاجر اور سوشل شخصیت تھا۔ اُس کا نام اونچے حلقوں میں مشہور تھا۔ اُس کے گھر میں پولیس کا چھاپہ ایک معاشرتی اور سیاسی واقعہ بلکہ حیران کُن اور سنسنی خیز واقعہ تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد سُندر داس، رام سروپ اور ایک سکھ جو انہی کا ہم عمر تھا، گلی میں ہتھکڑیوں میں بندھے کھڑے تھے۔ گھر سے ایک ریوالور اور دو خنجر برآمد ہوتے تھے۔ ریوالور بلا لائسنس تھا۔

سُندر داس کا باپ تھوڑی ہی دیر پہلے گھر سے نکلا تھا۔ اُسے کسی نے بتایا تو وہ دوڑا آیا۔ اُس کی پریشانی اور گھبراہٹ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سب انسپکٹر اللہ داد خان نے اُسے بھی حراست میں لے لیا لیکن ہتھکڑی نہ لگائی۔

رام سروپ اور سُندر داس، اللہ داد خان کو ابھی تک کوچوان ہی سمجھ رہے تھے۔

"اوتے تانگے والے!"—— سُندر داس نے اللہ داد خان کو دو تین گالیاں دے کر کہا —— "ذرا سا تو حوصلہ کیا ہوتا۔ اتنی جلدی سلطانی گواہ بن گئے ہو؟"

"سُندر جی!"—— اللہ داد خان نے کہا —— "غریب آدمی ہوں۔ انہوں

لے میرا تانگہ بحق سرکار ضبط کر لیا ہے اور سزا کے طور پر مجھے سب انسپکٹر بنا دیا ہے" —— اُس نے سلطان احمد کو آگے کیا اور رام سروپ سے کہا —— "اسے پہچانتے ہو گے رام سروپ! یہ رات کو تمہارے سیل کے باہر سنتری کھڑا تھا۔ یہ بھی سب انسپکٹر ہے۔"

"سردار جی!" —— اللہ داد خان نے سکھ سے کہا —— "ہمیں اپنے گھر لے چلو اور جس خنجر سے انگریز ایس۔ پی کو قتل کیا تھا وہ بھی برآمد کرا دو۔"

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا" —— سکھ نے جواب دیا۔

"لالہ جی!" —— اللہ داد خان نے سُندر داس کے باپ سے کہا —— "اگر آپ اس سکھ کا گھر جانتے ہیں تو ہمیں وہاں لے چلیں۔ اگر یہ نہیں مانے گا تو اس کے ساتھ آپ کا بیٹا اور اس کا یہ دوست رام سروپ بھی پھانسی چڑھیں گے۔ اگر آپ اپنے بیٹے کو بچانا چاہتے ہیں تو اس خالصے سے کہیں کہ ہمارے آگے لگ جائے۔ آپ کے پاس مقدمہ لڑنے کی ذرا بھی گنجائش نہیں .... کیوں سردار جی!" —— اللہ داد خان نے سکھ سے کہا —— "اپنے دوستوں کو بھی اپنے ساتھ پھانسی کے تختے پر لے جاؤ گے؟ سکھ تو اپنے یاروں کی پھانسی کا رسہ اپنے گلے میں ڈال لیا کرتے ہیں۔"

سکھ پھونک میں آ گیا۔ اُدھر سُندر داس کا باپ اُس کے آگے ہاتھ جوڑ رہا تھا اور اُسے رو رو کر کہہ رہا تھا کہ اُس کے جوان بیٹے کو بے گناہ نہ مروائے۔

"آ اوئے تھانیدارا!" —— سکھ نے جوشیلی آواز میں کہا —— "ہم نے ڈاکہ نہیں ڈالا۔ دھرتی ماتا کی خاطر پھانسی کے تختے پر جا رہا ہوں" —— اُس نے نعرے لگانے شروع کر دیئے —— "دھرتی ماتا کی جے .... انقلاب زندہ باد .... بھارت ماتا کی جے .... میں نے ایک انگریز حاکم کو قتل کیا ہے۔"

"شرم کرو پولیس والو!" —— رام سروپ بڑی بلند آواز میں بولنے لگا —— "تم بھی ہندوستانی ہو۔ انگریز کے دیتے ہوئے روٹی کپڑے کی خاطر اپنی دھرتی سے غداری کر رہے ہو۔ ہندوستان تمہارا وطن ہے۔ انگریز کی

غلامی کی زنجیریں توڑو۔ اپنے بھائیوں کو زنجیریں نہ باندھو .... شرم کرو غدارو! بے غیرتو!"

ان تینوں کو ہتھکڑیوں میں اور سُندر داس کے باپ کو ہتھکڑیوں کے بغیر ساتھ لے گئے۔ لوگوں کا ہجوم پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ تینوں ملزم باری باری جوشیلی تقریریں کرتے جا رہے تھے۔ ہجوم نے بھی "بھارت ماتا کی جے" اور "جے ہند" کے نعرے لگائے۔ پولیس گارد کا انچارج سب انسپکٹر رُک گیا۔

"تمام لوگ یہاں سے غائب ہو جاؤ" —— اُس نے ہجوم سے کہا —— "ہم بڑا سخت حکم لے کر آئے ہیں۔ تم لوگوں نے ذرا سی بھی گڑبڑ کی تو سپاہیوں کی رائفلیں دیکھ لو، میں بغیر وارننگ گولی چلانے کا حکم دے دوں گا۔"

اُس کے حکم پر چھ سات کانسٹیبل رائفلیں آگے کر کے ہجوم کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ہجوم پیچھے کو بھاگ اُٹھا۔ دو تین آدمی گر پڑے۔ لوگ انہیں کچلتے ہوئے دوڑ گئے۔ ایک منٹ میں گلی خالی ہو گئی۔ گلی میں چند ایک چپلیاں اور سلیپر رہ گئے۔

سکھ، سُندر داس اور رام سروپ "انقلاب زندہ باد" اور "گورا راج مُردہ باد" کے نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ انہیں روکا نہ گیا۔ ضرورت یہ تھی کہ وہ اور زیادہ جوش میں آ جائیں تاکہ اسی جوش میں اپنے اپنے جرم کا اقبال کر لیں۔

سکھ پولیس کو اپنے گھر لے گیا اور خنجر نکال دیا۔ وہ تو "انقلاب" کے جوش میں تھا لیکن اُس کا باپ، اُس کی ماں اور اُس کی دو بہنیں اس طرح رو رہی تھیں جیسے وہ مر گیا ہو۔ وہ مر ہی گیا تھا۔ تین چار مہینوں کے اندر اس کی لاش پھانسی کے تختے سے اُتر کر گھر آنی تھی۔ وہ اقبالِ جرم نہ کرتا تو بھی اُسے سزائے موت ملنی تھی۔

✖

اِدھر شہناز ساڑھی میں ملبوس اور بن سنور کر باہر نکلی تو وہ کسی نواب کی بیگم یا کسی مہاراجے کی رانی لگتی تھی۔ میں نے اس کی یہ شان دُور سے دیکھی

تھی جب وہ میڈوز کے بنگلے کے برآمدے میں کھڑی تھی۔ اب میں اُسے بہت قریب سے دیکھ رہا تھا لیکن مجھے اُس کے اس تروتازہ حُسن اور مسحور کر دینے والی جوانی سے ڈر سا آنے لگا اور وہ مجھے پُراسراری سی نظر آنے لگی۔

میں نے تانگہ بلا لیا۔ اُسے تانگے میں سوار کر کے تانگے والے سے کہا کہ بیگم صاحبہ کو گورنمنٹ کالج لے جاؤ۔ میں نے دو کانسٹیبل اپنے ساتھ رکھے ہُوتے تھے۔ شہناز کا تانگہ اگلا موڑ مڑ گیا تو میں نے ایک تانگہ روکا اور کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر اس میں سوار ہو گیا۔

شہناز نے مجھے بعد میں بتایا تھا کہ وہ پرنسپل کے کمرے میں گئی تو اُس کی سج دھج دیکھ کر پرنسپل اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس کالج میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ لڑکیاں ہندو، سکھ اور عیسائی ہوتی تھیں اور وہ سب امیر باپوں کی بیٹیاں تھیں۔

شہناز نے پرنسپل سے جو اینگلو انڈین تھا کہا کہ وہ فورتھ ایئر کی سٹوڈنٹ سرلا دیوی کی بڑی بہن ہے اور اُس سے ملنا چاہتی ہے۔

"اگر آپ سرلا کی بڑی بہن ہیں تو میں آپ کو اس کے متعلق کچھ کہنا چاہوں گا" — پرنسپل نے کہا — "میں آپ کے والد صاحب کو بلانا چاہتا تھا۔ اچھا ہُوا کہ آپ آ گئی ہیں .... میں سرلا کو کالج میں زیادہ دن نہیں رکھ سکوں گا۔ میں اُسے دو بار وارننگ دے چکا ہوں لیکن اس لڑکی نے اپنا دماغ زیادہ خراب کر لیا ہے۔"

"کیا کرتی ہے؟" — شہناز نے پوچھا۔

"انقلابی لیڈر بنی ہوتی ہے" — پرنسپل نے کہا — "ہندوستان کی آزادی کی باتیں کرتی رہتی ہے اور اس کے نظریات روسی ہیں۔ کمیونزم کا پروپیگنڈہ کرتی رہتی ہے۔ حکومتِ برطانیہ کے خلاف اشتعال انگیز باتیں کرتی ہے اور سٹوڈنٹس کو بھڑکاتی اور اُکساتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا چال چلن بھی مشکوک ہے۔ میں اس صاف گوئی کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ یہ دیکھیں کہ یہ سناتن دھرم، خالصہ یا اسلامیہ کالج نہیں، یہ گورنمنٹ کالج ہے۔ میں اینگلو انڈین

ہوں لیکن ہندوستانی ہوں۔ میں آپ کی بہن کو ہندوستانی لڑکی سمجھ کر اس کوشش میں ہوں کہ اسے تباہی سے بچا لوں لیکن میں کب تک اسے بچاؤں گا۔ کیا آپ کے کہنے سے یہ اپنے آپ کو سدھار لے گی؟"

"انشاء اللہ" — شہناز کے مُنہ سے نکل گیا۔

"انشاء اللہ؟" — پرنسپل نے مسکرا کر کہا — "آپ مسلمان تو نہیں۔ آپ نے انشاء اللہ کیوں کہا ہے؟"

"ویسے ہی مُنہ سے نکل گیا ہے" — شہناز نے کہا۔

شہناز تجربہ کار پولیس آفیسر تو نہیں تھی کہ مُنہ سے نکلے ہوتے کسی غلط لفظ پر چالاکی اور استادی سے پردہ ڈال لیتی۔ اُسے مُسکرا کر یا ہنس کر کہنا چاہیئے تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ رہ رہ کر اُن کا یہ لفظ زبان پر آ گیا ہے لیکن شہناز گھبرا گئی اور ایسی بوکھلائی کہ وہ کچھ کہنے لگی تو اُس کی زبان ہکلانے لگی۔

"محترمہ خاتون!" — پرنسپل نے اُسے کہا — "معاف رکھنا۔ آپ سرلا کی کوئی مسلمان سہیلی معلوم ہوتی ہیں اور آپ اُس کی ہم خیال ہوں گی۔ اگر ایسی بات ہے تو میں اُسے آپ سے نہیں ملنے دوں گا۔ آپ تشریف لے جا سکتی ہیں۔"

"محترم!" — شہناز نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا — "آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ میں مسلمان ہوں اور میں سرلا دیوی کو اپنے ساتھ لے جانے آئی ہوں۔ وہ ہمیشہ کے لئے اس کالج سے جا رہی ہے۔ میں پولیس کی طرف سے آئی ہوں۔ ایک سب انسپکٹر اور دو کانسٹیبل باہر کھڑے ہیں۔"

"سرلا نے کیا کیا ہے؟" — پرنسپل نے پوچھا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایک انگریز ایس۔ پی قتل ہو گیا تھا؟"

"مسٹر میڈوز!" — پرنسپل نے کہا — "اخباروں میں خبر چھپی تھی۔"

"سرلا دیوی اُس کے بنگلے میں جاتی رہی ہے" — شہناز نے کہا — "ایس۔ پی کے قتل میں اُس کا بھی ہاتھ ہے۔"

پرنسپل نے چپڑاسی کو بلا کر کہا کہ باہر گیٹ کے پاس پولیس کے آدمی کھڑے ہیں، انہیں یہاں لے آؤ۔ اس طرح میں دونوں کانسٹیبلوں کے ساتھ پرنسپل کے دفتر میں پہنچا۔

"آپ وردی میں نہیں" — پرنسپل نے مجھے کہا۔

"میں سپیشل برانچ میں ہوں" — میں نے اُسے کہا اور اپنا کارڈ دکھایا۔

"سرلا کے خلاف شہادت ملی ہوگی" — پرنسپل نے کہا — "کیا شہادت ملی ہے؟"

"ابھی میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا" — میں نے کہا — "شہادت مکمل ہے۔ آپ اُسے بلا دیں۔"

چپڑاسی سے سرلا دیوی کو دفتر میں لانے کے لئے کہا تو میں نے چپڑاسی سے کہا کہ سرلا کو یہ نہ بتائے کہ دفتر میں پولیس کے آدمی بیٹھے ہیں۔ پرنسپل نے بھی یہی کہا۔

چند منٹ بعد شہناز جیسی ایک خوبصورت اور دلکش جسم والی لڑکی پرنسپل کے دفتر میں داخل ہوئی۔ کانسٹیبلوں کو دیکھ کر اُس کا اتنا دلنشیں رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"سرلا دیوی" — میں نے اُس سے پوچھا — "تمہارے والد صاحب کا نام کیا ہے؟"

"جگدیش رائے!" — اُس نے جواب دیا۔

میں نے اُسے اُس کے گھر کا ایڈریس دکھا کر پوچھا کہ یہ اُسی کا ایڈریس ہے؟

"ہاں" — اُس نے جواب دیا — "یہ میرے گھر کا ایڈریس ہے۔"

"تم ذرا ہمارے ساتھ چلو" — میں نے کہا۔

"کہاں؟" — اُس نے پوچھا — "کیوں چلوں؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اُس کا بازو پکڑ کر اُسے باہر لے جانے لگا۔ اُس نے واویلا بپا کر دیا۔ وہ پرنسپل سے کہتی تھی کہ ہم اُسے بلا وجہ

لے جا رہے ہیں لیکن پرنسپل خاموش تھا۔

"سرلا دیوی!" — باہر لے جا کر میں نے اُسے کہا — "ہم تمہیں گھسیٹ کر بھی لے جائیں گے۔ اٹھا کر بھی لے جائیں گے۔ اپنی عزت چاہتی ہو تو آرام سے ہمارے ساتھ چلو۔ لوگوں کو اپنا تماشہ نہ دکھاؤ۔ تمہارے دوست رام سروپ نے تمہاری نشاندہی کی ہے۔"

ہم اُسے اپنے ہیڈ کوارٹر میں لے آئے۔ اسی وقت انسپکٹر ورکا کس اُسے اُس کے گھر خانہ تلاشی کے لئے لے گیا۔

اس دوران نوابزادہ حمید اللہ خان اور ایوب کے مقدموں کی سماعت شروع ہو چکی تھی۔ حمید اللہ سب سے سینئر اور بہت قابل وکیل لایا تھا جو بال کی کھال اُتار رہا تھا لیکن اُس کے خلاف کیس سپیشل برانچ کے انگریز افسروں نے تیار کیا تھا۔ یہ جھوٹے گواہوں کی مدد سے تیار کیا ہوا ایسا جال تھا جس میں سے کوئی بھی وکیل حمید اللہ کو نہیں نکال سکتا تھا۔

میری گواہی بند کمرے میں ہوئی کیونکہ میں سپیشل برانچ کا افسر تھا۔ میری حیثیت اور اصلیت کو عام پبلک سے چھپا کر رکھنا تھا۔ حمید اللہ کے وکیل نے اپنی جرح میں مجھے چکرا دیا لیکن میری زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکلی جو حمید اللہ کی صفائی میں کام آ سکتی۔

اس مقدمے کی سماعت روز بروز جاری رہی۔ ایک مہینہ گزر گیا اور فیصلہ سنا دیا گیا۔ حمید اللہ کو دو مزارعوں کے قتل میں عمر قید دی گئی اور مجھے قتل کرنے کی کوشش میں سات سال قید دی گئی۔

ایوب کو تین سال سزائے قید دی گئی۔

ان دونوں مقدموں میں شہناز کو پیش نہیں کیا گیا تھا۔

جس روز حمید اللہ خان کے مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا، اُس سے اگلے روز میری برانچ کا ایک مسلمان ہیڈ کانسٹیبل میرے پاس آیا۔

"سکندر صاحب!" — اُس نے کہا — "کل جو کانسٹیبل حمید اللہ خان کے ساتھ تھا، اُس نے مجھے بتایا ہے کہ حمید اللہ خان فیصلہ سن کر باہر آیا تو اُس کانسٹیبل

سے جس نے اُس کی ہتھکڑی پکڑی ہوئی تھی، کہا کہ سکندر کو کہہ دینا کہ تیری زندگی تھوڑے سے دن رہ گئی ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ سکندر سے کہنا کہ اپنی اس ماں شہناز کو کہیں چھپا کر رکھنا، میرا وار کبھی خطا نہیں گیا۔ جیل کے اندر سے بھی وار کروں گا اور بڑی جلدی انتقام لوں گا۔"

"اُس نے کچھ تو کہنا ہی تھا" — میں نے کہا — "ایسی دھمکیاں کئی بار سُنی ہیں۔"

"سکندر صاحب!" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "اسے خالی دھمکیاں نہ سمجھیں۔ ان نوابوں کی دنیا سے آپ واقف نہیں۔ اپنا ذرا خیال رکھیں اور شہناز صاحبہ کو کہیں اکیلے باہر نہ جانے دیا کریں۔"

مَیں اُس آگ میں سے گزر رہا تھا جس کی پیشین گوئی میرے بچپن میں پگلی نے کی تھی۔ میں اُسے بھول گیا تھا، لیکن وہ اچانک یاد آگئی اور ایک رات اُسے خواب میں بھی دیکھا۔ عجیب سا خواب تھا۔ میرے سامنے ایک راستہ تھا۔ پگڈنڈی سی تھی۔ دونوں طرف درخت تھے اور روشنی ایسی تھی جیسے سورج ہے بھی اور نہیں بھی یا جیسے سورج کو گرہن لگا ہُوا ہو۔ کچھ دُور نیلی سی دُھند تھی اور پگڈنڈی اس دُھند میں گم ہو گئی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ آگے جا کر میں بھی پگڈنڈی کے ساتھ اس نیلی دُھند میں لاپتہ ہو جاؤں گا۔ میرے دل پر خوف سا طاری ہونے لگا اور قدم رُکنے لگے۔ سورج کی پھیکی پھیکی روشنی ذہن کو اُداس اور افسردہ کر رہی تھی۔ اچانک ایک لمبی "ہُو" کی ویسی ہی آواز سنائی دی جیسے کُتے آسمان کی طرف مُنہ کر کے آواز نکالا کرتے ہیں۔ کُتّے کی اس آواز کو لوگ منحوس سمجھتے ہیں۔ اس آواز نے مجھے میرے بچپن والی پگلی یاد دلا دی۔ وہ گلی میں چلتے چلتے رُک جاتی اور مُنہ آسمان کی طرف کر کے اسی قسم کی آواز نکالا کرتی تھی۔

اس آواز پر میں اندر سے کانپنے لگا۔ دُھند کا ایک گولہ سا آگے بڑھا اور مجھ سے بارہ چودہ گز دُور میرے راستے میں رُک گیا۔ فوراً ہی یہ فضا میں پگھل گیا اور وہاں میرے بچپن والی پگلی کھڑی تھی۔ میں رُک گیا۔ وہ چُپ تھی۔ میں چُپ تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا۔

اُس کے ہونٹ نہ ہلے لیکن مجھے اُس کی آواز سنائی دی — "یہ بچہ دِلوں کو تڑپاتے گا، خود بھی تڑپے گا۔ اس کا سفر بڑا لمبا ہو گا۔ یہ جس طرف دیکھے گا اُدھر قیامت ٹوٹے گی۔ جنات اور پریاں اس کے آگے سجدے کریں گی لیکن یہ آگ سے گزر کر وہاں تک پہنچے گا۔"

وہ میرے راستے سے ہٹ گئی جیسے اُس نے مجھے اشارہ دیا ہو کہ

میں آگے چلا جاؤں اور بے خوف وخطر راستے میں آنے والی دُھند میں داخل ہو جاؤں۔

"میرے ساتھ بات کر پگلی!" —— میں نے اُسے کہا —— "اُس وقت میں بچہ تھا۔ اب جوان ہوں۔ اب تیری بات سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے بتا میری راہ کی دُھند کب چھٹے گی؟ میں کب تک آگ میں سے گزرتا رہوں گا؟ وہ ماں نہیں رہی جو مجھے گود میں چھپا لیا کرتی تھی۔"

اُس نے جواب نہ دیا۔ وہ دُھند کا پیکر بن گئی اور ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ پھر ماحول دُھند میں چھپ گیا اور مجھے ایک مرتبہ پھر بڑی لمبی "ہُو" سنائی دی۔

"سکندر!" —— کسی نے مجھے پکارا —— "او سکندر!" —— کوئی مجھے جھنجھوڑ رہا تھا —— "کروٹ بدل لے یار!"

میں بیدار ہو گیا۔ سلطان میرے پاس کھڑا مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میں ڈر رہا تھا۔

"کیا ہے سلطان؟"

"تمہاری آواز نے مجھے بھی جگا دیا ہے" —— سلطان نے کہا —— "تم خواب میں نہ جانے کیا بڑبڑ کر رہے تھے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ تم کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے۔"

"ہاں یار!" —— میں نے کہا —— "بڑا فضول خواب دیکھ رہا تھا.... بتی بجھا دو اور سو جاؤ۔"

میں اور سلطان ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ ہم دونوں میں ایسی محبت پیدا ہو گئی تھی جیسے ہم ایک کمرے میں نہیں، ایک جسم میں رہتے ہوں۔ وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ میں نے اُسے اپنی زندگی کی کہانی سنائی تھی۔ یہ تو محرومیوں کی داستان تھی۔ میرا کوئی گھر نہیں تھا، کوئی منزل نہیں تھی اور پتہ نہیں چلتا تھا میں جا کہاں رہا ہوں، کما رہا ہوں تو کس کے لئے کما رہا ہوں۔

میں بہت بڑی حویلی کا مالک تھا لیکن وہ میرا گھر نہیں تھی، وہ تو

مکان تھا۔ اب تو میں اُسے آسیب زدہ مکان سمجھنے لگا تھا۔

میں نے سلطان کو ایک ہی بار وہ سب سنا دی تھی جو مجھ پر بیتی تھی، اس کے بعد گھر کی، ماں کی، باپ کی اور اپنے شہر کی کبھی بات نہیں کی تھی۔ سلطان مطمئن تھا۔ کسی محرومی سے دوچار نہیں ہوا تھا۔

اُس نے بتی بجھا دی اور تھوڑی ہی دیر میں اُس کے ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دینے لگے اور میں مکمل طور پر بیدار ہو گیا۔ نیند ایسی اُڑی کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ اندھیرے میں مجھے پگلی دکھائی دے رہی تھی اور کبھی ایسے لگتا تھا جیسے میں اُس کی بڑی لمبی "ہُو" سن رہا ہوں۔

وہ میرے خواب میں کیوں آئی تھی؟ —— میں سوچنے لگا اور میں سوچتا ہی رہا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں پگلا ہوں اور جسے ہم پگلی کہا کرتے تھے اُس کا دماغ حاضر تھا، نارمل تھا اور وہ عقل و دانش کی بات کرتی تھی۔

میرا بچپن ماضی بعید میں جا چھپا تھا۔ میرا ذہن مجھے وہاں لے گیا۔ دل میں آئی کہ میں مُنہ آسمان کی طرف کر کے بڑی لمبی "ہُو" کی آواز پیدا کروں میں اپنے ذہن لاشعور کے قبضے میں آ گیا تھا۔ دل ڈوبتا جا رہا تھا گھبراہٹ ایسی بڑھی کہ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ آہستہ سے کھولا کہ سلطان کی آنکھ نہ کھل جائے، پھر آہستہ سے ہی دروازہ بند کر دیا۔

مجھے اُس رات کے تاریک لمحے آج بھی یاد ہیں۔ میں بغیر سوچے آہستہ آہستہ چل پڑا۔ میں چلتا گیا۔ ایسے لگا جیسے میں خواب کی پگڈنڈی پر چلا جا رہا ہوں اور میرے آگے دُھند ہے۔

میرے قدم رُک گئے اور میرا ہاتھ اُٹھا۔ اچانک میں اپنے آپ میں آ گیا —— میں شہناز کے کوارٹر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ میرا ہاتھ دروازے پر دستک دینے کے لئے اُٹھا تھا —— اگر میں دستک دے بیٹھتا تو بہت بُرا ہوتا۔ شہناز دروازہ کھولتی تو آدھی رات کے وقت مجھے اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر کیا سوچتی؟

کیوں؟ میں اُس کے دروازے پر کیوں جا پہنچا تھا؟ میں شاید نیم بیداری کی حالت میں تھا۔ میں نے اچھا نہیں کیا تھا۔ میں وہاں سے مُڑا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا واپس آ گیا۔ میں حقیقی دنیا میں واپس آ چکا تھا۔

باقی رات کچھ سوتے کچھ جاگتے گزری۔ صبح ہوتے ہی میں شہناز کے کوارٹر میں چلا گیا۔ اُسے دیکھنا اور اُس کی دیکھ بھال میری ڈیوٹی تھی لیکن اُس صبح میں کسی اور ذہنی کیفیت میں گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

"کہاں آ پھنسی ہوں سکندر!" — اُس نے کہا — "اب کیا ہو گا؟"

"جنہیں ہم نے پکڑا تھا اُن پر مقدمہ چلے گا" — میں نے کہا — "اِن کے مقدمے کے لئے سپیشل ٹربیونل بن گیا ہے۔ انسپکٹر وِلکاکس نے کیس تیار کر لیا ہے ...."

"وہ تو ہو گا ہی!" — شہناز نے اُکتائے ہوتے لہجے میں کہا — "میں پوچھتی ہوں میرا کیا بنے گا۔ یہ مقدمہ بھی ختم ہو جائے گا پھر کیا ہو گا؟ میں شاید یہاں تو نہیں رہ سکوں گی"۔

"ہاں شہناز!" — میں نے کہا — "تمہیں یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ اور تم اپنے گھر جاؤ گی"۔

"کون سا گھر؟" — شہناز نے کہا — "میرا کوئی گھر نہیں۔ میں اب اُس ماں کے پاس نہیں جانا چاہتی جس نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے"۔

"وہ وقت آنے دو" — میں نے کہا — "تم دہشت گردوں کے خلاف جج کے سامنے بیان دینے کی تیاری کر لو.... کیا انسپکٹر وِلکاکس نے تمہیں بتایا ہے کہ تم کیا بیان دو گی؟"

"بتایا ہے" — شہناز نے کہا — "وہ تو بڑی صاف اردو بولتا ہے۔ وہ دو بار مجھے اپنے دفتر میں بلا چکا ہے"۔

"اُس کی نظریں کیسی ہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"صرف کام کی بات کرتا ہے" — شہناز نے کہا — "اُسے تو جیسے احساس ہی نہیں کہ میں عورت ہوں"۔

"یہی ان انگریزوں میں خوبی ہے" — میں نے کہا — "ایس۔ پی میڈوز کو تم پسند آ گئی تھیں لیکن اپنے کام کے ساتھ وہ اتنا مخلص تھا کہ اسی میں اُس نے جان دے دی"۔

میں شہناز کے ساتھ بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ سب جذباتی باتیں تھیں۔ میں اُس کے ساتھ کوئی بات نہ کر سکا۔ کر لیتا تو اچھا تھا۔ باتیں دل میں رہ جانے سے میری ذہنی کیفیت کچھ اور ہو گئی۔ میں وہاں سے آ گیا لیکن ایک نیا سوال میرے ذہن میں پیدا ہو گیا — "کیا میں شہناز کے سراپا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہوں؟"

مجھے اپنے آپ پر شک ہونے لگا تھا جیسے شہناز ایک سحر یا طلسم کی مانند مجھ پر طاری ہوتی جا رہی ہو۔ ابھی یہ واضح نہیں تھا کہ میری نیت اور میری نظر کیسی ہے۔ میں کوئی فرشتہ تو نہ تھا۔ عالمِ شباب تھا اور میں کسی دینی مدرسے کا معلم نہ تھا۔ میں پولیس کے اس شعبے کا سب انسپکٹر تھا جو اپنے باپ کو بھی نہیں بخشتا تھا لیکن یہ احساس بھی تھا کہ مجھے شہناز کے اتنا قریب نہیں ہونا چاہیئے۔ اُس سے مجھے اتنا دُور رہنا چاہیئے جہاں میں اُس کے جذبات اور جسم کی تپش محسوس نہ کر سکوں۔

مجھے اپنے آپ پر اعتماد اور بھروسہ تھا لیکن آگ میں ہاتھ ڈال کر جلنے سے کون بچ سکتا ہے!

مجھے بچنا تھا اور شہناز کو تنہا بھی نہیں چھوڑنا تھا۔

میں تو بڑی سخت مشکلوں میں سے بھی کامیاب گزر آیا تھا۔ بڑے بھیانک خطرے بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے لیکن میرے جذبات میرے لئے جو مشکل پیدا کر رہے تھے، ان سے گزرنا مجھے آسان نظر نہیں آتا تھا۔ اس مشکل کا ایک ہی حل تھا کہ شہناز جلدی اپنے گھر چلی جاتے مگر ابھی مقدمہ شروع ہی نہیں ہُوا تھا۔ مقدمے کے فیصلے تک شہناز کو وہیں رہنا تھا۔

✖

پندرہ سولہ دنوں بعد مقدمہ سپیشل ٹربیونل کے سامنے گیا۔ یہ خاص

عدالت بنانے کا مطلب یہ تھا کہ ہر روز مقدمے کی سماعت ہوگی۔ ملزموں کے وکیل آتے تھے جنہوں نے عام عدالتوں جیسا طریقہ کار اختیار کیا تھا لیکن ٹربیونل کے انگریز افسر اُن کی بات ذرا کم ہی سُنتے تھے۔ وکیل ایک آدھ دن کی مہلت مانگتے تھے تو وہ بھی انہیں نہیں ملتی تھی۔

ملزم کوئی چور اور ڈاکو تو نہیں تھے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے متوالے تھے۔ اخباروں نے انہیں قومی ہیرو بنا دیا تھا اور وہ خود بھی اپنے آپ کو ہندوستان کا ہیرو سمجھتے تھے۔ انہیں جیل سے بند گاڑی میں لایا جاتا تو راستے میں "انقلاب زندہ باد" اور "جے ہند" کے نعرے لگاتے آتے تھے۔ عدالت کے کمرے میں داخل ہو کر وہ مل کر "انقلاب زندہ باد" اور "جے ہند" کا نعرہ لگاتے تھے۔ ایس۔ پی میڈوز کو قتل کرنے والا سکھ ایک نعرہ فالتو لگاتا تھا ——"راج کرے گا خالصہ.... ست سری اکال"—— یہ نعرہ وہ اکیلا لگاتا تھا اور یہ نہیں دیکھتا تھا کہ اُس کے ساتھی اُس کا ساتھ نہیں دے رہے۔

انسپکٹر وِلکاکس اپنی گواہی دینے کے لئے پیش ہُوا تو ملزموں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے ——"گورا راج مُردہ باد" —— "واپس جاؤ.... واپس جاؤ"—— اور جب کوئی ہندوستانی گواہ پیش ہوتا تو اُسے ملزموں کی لعن طعن سننی پڑتی۔ عدالت کی یہ دھمکی کہ توہینِ عدالت کی سزا ملے گی، ان پر کچھ اثر نہیں کرتی تھی۔ اس کے جواب میں عدالت کو مزید نعرے سننے پڑتے تھے۔

"ہم پھانسی چڑھنے آتے ہیں"۔

"بھارت ماتا کے نام پر ہمیں گولی مار دو"۔

"انگریزو، تمہیں جانا پڑے گا"۔

جب میری گواہی کا وقت آیا اور میں عدالت میں گیا تو ایک ملزم نے کہا ——"ایک اور غدار آ گیا"۔

"یہ دھرتی تیری ماں ہے لونڈے!"—— دوسرے نے کہا۔

"ماں کی عصمت گوروں کو نہ دے چھوکرے!"—— ایک اور نے کہا۔

اور اس سے بھی زیادہ توہین آمیز الفاظ تھے جو مجھ پر سلطان اور سب انسپکٹر

اللہ داد خان پر تیروں کی طرح برسائے گئے۔ ہمارے لئے حکم تھا کہ برداشت کریں۔ وکیلوں کی جرح اور زیادہ تکلیف دہ تھی۔ مجھے فکر شہناز کا تھا۔ اُسے تو بے ہوش ہو جانا چاہیئے تھا لیکن وہ گواہی دے کر ہوش و حواس میں باہر نکلی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور رنگ زرد تھا۔

"اب اپنے آپ میں آجاؤ"—— میں نے اُسے ہنستے ہوئے کہا —— "مشکل کا وقت گزر گیا ہے"۔

"یہ تو بہت بدتمیز ہیں"—— شہناز نے کہا —— "اگر باہر آ کر مجھے ایسی ایک بھی بات کہیں تو میں انہیں مُنہ پر جُوتے ماروں"۔

"کیا کہتے تھے؟"

"بار بار کہتے تھے کہ یہ میڈوز صاحب کی دیسی میم ہے"—— شہناز نے جواب دیا —— "ایک وکیل نے مجھ سے پوچھا کہ تم رات کو مقتول میڈوز کے بنگلے میں کیا کر رہی تھیں؟ .... میں نے جواب دیا، وہی جو تمہاری سرلا دیوی کرنے جایا کرتی تھی .... دوسرے وکیل نے پوچھا، کیا تم وہاں اکیلی جایا کرتی تھیں یا وہیں رہتی تھیں؟ .... میں نے جواب دیا کہ میں اکیلی جاتی اور اکیلی رہتی تھی کیونکہ رام سروپ جیسا میرا کوئی دلال نہیں تھا"۔

شہناز پریشان بھی تھی اور غصے میں بھی۔ بہر حال اُس نے بیان ٹھیک دیا تھا۔

سپیشل ٹربیونل نے دو ہفتوں میں سماعت مکمل کر لی اور صرف ایک دن میں فیصلہ بھی لکھ لیا۔ ایس۔ پی میڈوز کو قتل کرنے والے سکھ اور رام سروپ کو سزائے موت دی گئی۔ سرلا دیوی کو پانچ سال اور سُندر داس کو دس سال سزائے قید دی گئی۔ کسی کو بھی اپیل کا حق نہ دیا گیا۔ پانچویں دن سکھ اور رام سروپ کو پھانسی دے دی گئی۔

اس کے ساتھ ہی مجھے حکم ملا کہ میں شہناز کو اُس کے گھر چھوڑ آؤں۔ میں جب یہ حکم لے کر شہناز کے پاس گیا تو اُس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اُس کے وہاں رہنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہ گیا تھا۔ وہاں وہ کسی کی بیوی ہی بن کے

رہ سکتی تھی لیکن اُس کا خاوند کون ہوتا؟

×

میں اور شہناز ریل گاڑی کے سیکنڈ کلاس ڈبے میں اپنے شہر کو جا رہے تھے۔ شہناز خالی ہاتھ نہیں جا رہی تھی۔ انگریز بادشاہ نے اُسے اڑھائی ہزار روپیہ انعام دیا تھا اور اپنے گھر جانے کے لئے سیکنڈ کلاس کا پاس دیا تھا۔

شہناز بہت اُداس تھی۔ اُس کی تو جیسے زبان بند ہی ہو گئی تھی۔ اُس کا سر جھکا ہُوا تھا۔ کبھی سر اٹھاتی، میری طرف دیکھتی اور دیکھتی ہی رہتی تھی۔ کبھی اُس کے آنسو پھوٹ آتے۔

"کیا سوچ رہی ہو شہناز؟"—— میں نے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں میرا انجام کیا ہوگا"—— شہناز نے جواب دیا—— "میرے لئے سفر ہی سفر ہے، منزل کوئی نہیں۔"

اُس کے خدشے بجا تھے اور میری تسلیاں رسمی اور جھوٹی تھیں لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ میں اُسے تسلیاں ہی دیتا چلا گیا۔ کبھی ایسے لگتا تھا جیسے میں اپنے آپ کو تسلی دے رہا ہوں۔ ایسے لمحے بھی آتے کہ میں نے اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کیا کہ شہناز مجھ سے جُدا ہو رہی ہے۔ پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو ملامت کی کہ میں مجرمانہ ذہنیت کی ایک عورت کو جس نے میرا گھر اُجاڑا ہے، اپنا سمجھ رہا ہوں۔ اگر میں گہرائی میں جا کر دیکھتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ اب شہناز پہلے سے کہیں زیادہ بے اعتبار اور خطرناک ہو گئی ہے۔ پہلے تو اُس کا ذہن اپنی ماں کا آلۂ کار تھا اور وہ اپنے گھر اور محلّے تک محدود دنیا میں گھومتی پھرتی تھی، مگر اب اُس نے دنیا کی وسعت دیکھ لی تھی۔ دنیا بھی ایسی جس میں جُرم اور گناہ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اُس نے باقاعدہ مجرموں کو دیکھ لیا تھا بلکہ انہیں پکڑوایا بھی تھا۔ اُسے یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ وہ کسی شریف گھرانے کی بہو بیٹی نہیں بن سکتی۔ اُس نے اب مکر و فریب سے ہی زندگی گزارنی تھی۔

مجھے اُس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ پھر بھی وہ جب مجھے ٹکٹکی باندھ کے دیکھتی تھی تو میں ایک دو لمحوں کے لئے اپنے آپ کو اُس کا اسیر سمجھتا تھا۔

خدا خدا کر کے گاڑی نے ہمیں ہمارے شہر پہنچا دیا۔ وہاں سے تو ہم رات کی گاڑی سے چلے تھے۔ مجھے خاص طور پر حکم ملا تھا کہ میں دن کی گاڑی سے نہ جاؤں۔ خطرہ تھا کہ دہشت گردوں کے ساتھی اپنی کوئی کارروائی نہ کر جائیں لیکن اپنے شہر میں گاڑی دوپہر کے وقت پہنچی۔ ہم دونوں جب سٹیشن سے نکلے اور پہلا ہی واقف آدمی ملا تو میں نے محسوس کیا کہ شہناز کو میرے ساتھ دیکھ کر سب حیران ہوں گے اور دل ہی دل میں مجھے بُرا بھلا کہیں گے۔ اُس وقت مجھے خیال آیا کہ شہناز کو بُرقعے میں ہونا چاہئے تھا۔ اُس نے چادر لے رکھی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ چادر میں ہی اپنا چہرہ چھپا لے۔

مجھے توقع تھی کہ شہناز کے گھر میں داخل ہوں گے تو اُس کی ماں دوڑ کر اپنی بیٹی کو، پھر مجھے گلے لگاتے گی اور بلائیں لے گی، لیکن اُس گھر میں داخل ہوتے تو یوں لگا جیسے ہم کسی اُجڑے ہُوئے مکان میں آ گئے ہوں۔ دروازے کھُلے ہوتے تھے لیکن رہنے والے نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ شہناز میرے آگے آگے تھی۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہُوئی۔ میں ذرا رُک کر اُس کمرے میں گیا۔ مجھے رونے کی اور سسکیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے دیکھا، شہناز ایک پلنگ پر کسی کے اُوپر گری ہوئی تھی۔ وہ اُس کی ماں تھی۔ مجھے ایسی بدبُو محسوس ہوئی جیسے شہناز کی ماں مر چکی ہو اور اُس کی لاش خراب ہو رہی ہو۔ میں جب اُس کے اُوپر جھکا تو ذرا مشکل سے اُسے پہچانا۔

پتہ چلا کہ اُس کے سارے جسم پر چھوٹی چھوٹی پھنسیاں نکلی ہوئی ہیں۔ بدبُو اُس مواد کی تھی جو ان پھنسیوں سے رِستا تھا اور اُن دیسی دوائیوں کی جو ان پر لگائی جاتی تھیں۔ وہ سسک رہی تھی۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور دایاں ہاتھ اوپر کیا۔ میں نے سر نیچے کیا اور اُس نے ہاتھ میرے سر پر پھیرا۔ اتنے میں برآمدے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے دروازے میں جا کر دیکھا، شہناز کا باپ آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اس طرح ٹھٹھک گیا جیسے میں نے اُس کے سینے پر پستول رکھ دیا ہو۔ اُس نے بے دلی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ شہناز دوڑ کر اُس کے گلے لگ گئی لیکن باپ کا انداز رسمی سا تھا جیسے شہناز کے ساتھ

اُس کا کوئی گھر ارشتہ نہ ہو۔

"شہناز!" —— میں نے اسے الگ کر کے کہا —— "میں اپنی خالہ کے گھر سے ہو آؤں۔"

"واپس آجاؤ گے نا!" —— شہناز نے کہا —— "میرے پاس ہی ٹھہرو گے نا! وہیں نہ رُک جانا!"

"آجاؤں گا" —— میں نے کہا —— "لیکن اچھا نہیں لگتا کہ خالہ خالو کو چھوڑ کر یہاں ٹھہروں۔ یہ پولیس ہیڈ کوارٹر تو نہیں۔ ہمارا آبائی شہر ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔"

✖

میں جب شہناز کے گھر سے نکلا تو مجھ پر کچھ ایسا بوجھ تھا جیسے میں قبرستان میں کسی عزیز کو دفن کر کے نکل رہا ہوں۔ یہ نہ سمجھیں کہ میں شہناز کی جدائی کی بات کر رہا ہوں۔ شہناز کی ماں میرے دل اور دماغ پر ایک عبرت بن کر طاری ہو گئی تھی۔ میں نے اس عورت کے متعلق سب کچھ سُنا دیا ہے۔ معلوم نہیں آپ اندازہ کر سکے ہیں یا نہیں کہ یہ عورت کس قدر عیّار اور فریب کار تھی۔ جس عورت نے اپنی بیٹی کو بیچ ڈالا تھا، اُس سے آپ اور کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ یہ بدی کی آخری حد ہے۔ اُس نے یہ حد بھی پھلانگ لی تھی۔ اُس نے شہناز کی جھلک دکھا دکھا کر رشتے کے کئی امیدواروں کو خوب لُوٹا تھا۔

پھر میرا گھر جس طرح اس عورت نے خالی کرایا اور میرے باپ کو مروایا وہ میں پہلے سُنا چکا ہوں۔ اب وہ خدا کی بے آواز لاٹھی کی ضربیں سہہ رہی تھی۔ وہ بڑی خوبصورت ناگن تھی مگر اب اُس کے زہر کی تھیلیاں خالی ہو چکی تھیں اور وہ مری ہوتی بھی نہیں تھی، زندہ بھی نہیں تھی۔

یہی نہیں، اُسے ایک سزا اور بھی مل رہی تھی۔ یہ مجھے خالہ کے ہاں جا کر پتہ چلا۔ وہ یہ کہ شہناز کے دونوں بھائی بالکل آوارہ اور نکھٹو نکلے۔ وہ جوان تھے۔ خالہ نے مجھے بتایا کہ ان کے سگے رشتہ دار بھی ان لڑکوں کو رشتے سے جواب دے چکے ہیں۔ شہناز کا باپ تو ایسے تھا جیسے مفلوج ہو، جسمانی لحاظ

سے بھی، ذہنی لحاظ سے بھی۔ اس گھر کی رونق خواہ بدی سے ہی قائم تھی، وہ شہناز کی ماں کی بدولت تھی۔ اُسے خدا نے پکڑ لیا تو یہ گھر لوگوں کے لئے جاتے عبرت بن گیا۔

میں نے جب خالہ کو بتایا کہ میں شہناز کو چھوڑنے آیا ہوں تو وہ کچھ دیر حیرت سے میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ میں نے اُسے اور خالو کو مختصراً بتایا کہ شہناز مجھے کس طرح ملی تھی اور کیا کیا ہُوا تھا۔ میں نے انہیں تفصیل سے کچھ نہ بتایا۔ تھوڑا سا سچ، ذرا زیادہ جھوٹ ملا کر انہیں ایک کہانی سنا دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کچھ باتیں ویسے بھی بتانے والی نہیں تھیں اور دوسری وجہ یہ کہ میں چاہتا تھا شہناز بدنام نہ ہو۔

خالہ نے مجھے الگ بٹھا لیا۔

"سکندر بیٹا!" —— خالہ نے جذباتی لہجے میں کہا —— "تم میری بہن کی نشانی ہو۔ تم نہیں جانتے کہ میں تمہیں کس طرح یاد کرتی رہی اور تمہارے لئے کتنا پریشان رہی ہوں۔ اب تم نے بتایا ہے کہ تم سی۔ آئی۔ ڈی کے سب انسپکٹر ہو تو میری روح بھی خوش ہو گئی ہے۔ اب میری دو باتیں سن لو معلوم نہیں پھر کبھی آؤ گے یا نہیں۔"

"کیوں نہیں آؤں گا خالہ!" —— میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا —— "آپ کے سوا میرا ہے ہی کون!"

"اپنا مکان دیکھ آئے ہو؟" —— خالہ نے پوچھا۔

میں اُس گلی سے ہی نہیں گزرا تھا جس گلی میں میرا مکان تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اس گلی میں قدم رکھا تو مجھ پر ہَول طاری ہو جائے گا۔ اپنا گھر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میرا مکان تو اب میرے بچپن کا اور میری یادوں کا مقبرہ تھا۔ کبھی خیال آتا کہ میری ماں اُس گھر میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہو گی پھر بڑا ہی زہریلا خیال آتا کہ اُس گھر میں میرے باپ کی لاش پڑی ہو گی۔ مجھ جیسا دلیر آدمی جسے خدا نے خود اعتمادی جیسی نعمت عطا فرمائی تھی، اپنے گھر کی سوچ کر ڈرپوک سا بچہ بن گیا۔ اُدھر جانے کا میرا کوئی

ارادہ نہیں تھا، ہمت ہی نہیں تھی۔

"میں تو شہناز کے گھر سے آیا ہوں خالہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "اپنے مکان کی طرف ابھی نہیں گیا... کیا وہ خالی پڑا ہے؟"

"نہ بیٹا!" ــــ خالہ نے بڑے پیار سے کہا ــــ "تم وہ مکان ہمیں دے گئے تھے لیکن ہم لیے تو نہیں۔ وہ مکان تمہارا ہے۔ تمہارے خالو نے کرائے پر چڑھا دیا تھا اور کرایہ الگ رکھ رہے ہیں۔ اب اتنے برسوں کا کرایہ ہمارے پاس جمع ہو گیا ہے۔ یہ تمہاری امانت ہے۔ اب تم آ گئے ہو تو اپنی امانت لے جاؤ۔"

"نہیں خالہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں نہیں لوں گا۔ اگر آپ یا خالو پسند کریں تو میں یہ مکان آپ کے نام کر دوں گا۔"

خالہ نے بڑی شدت سے انکار کیا۔ کہنے لگیں کہ یہ تمہاری دولت ہے تمہاری جائداد ہے لیکن میرے اندر کچھ ایسا احساس پیدا ہو گیا تھا کہ اس گھر کا کرایہ مجھے کانٹوں کی طرح چبھتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے میں نے اپنی ماں کا پیار اور باپ کی شفقت کرائے پر دے دی ہو۔ خالہ کی ایک بیٹی جوان تھی۔ میرا دھیان اُس کی طرف چلا گیا۔

"خالہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "کرائے کی رقم آپ اپنی سمجھیں۔ اگر آپ اسے قبول کرنے سے جھجک رہی ہیں تو میری طرف سے اس رقم سے عذرا کے جہیز کی کچھ چیزیں بنا لینا۔ عذرا کو یہ تو پتہ چلے کہ اُس کا ایک پردیسی بھائی بھی ہے۔"

"کیا کفر بک رہے ہو سکندر!" ــــ خالہ نے پیار بھرے غصے سے کہا ــــ "عذرا تمہاری بہن تو نہیں۔ بے شک تمہارے ساتھ بات نہیں ہوئی لیکن میں اور تمہارا خالو عذرا کو تمہاری منگیتر سمجھتے ہیں۔"

مجھے یوں دھچکا لگا جیسے خالہ نے میرے پیٹ میں بڑی زور سے مُکّہ مارا ہو۔ میری خالہ زاد عذرا خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کے رشتے سے انکار کرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہ تھا لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں عذرا کے ساتھ شادی کروں گا۔ اب خالہ نے یہ بات صاف الفاظ میں کہہ دی تو مجھے چُپ

لگ گئی۔

"کیوں؟" ــــ خالہ نے کہا ــــ "تم تو چُپ ہو گئے ہو۔ کہیں شادی کر تو نہیں لی؟"

"نہیں خالہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں نے ابھی شادی کے متعلق سوچا ہی نہیں۔"

"اب سوچ لو" ــــ خالہ نے کہا ــــ "اور یہ بھی سوچ لو کہ میں رشتوں کے تین پیغام ٹھکرا چکی ہوں .... اور یہ بھی سوچ لو کہ عذرا تمہاری پیدائش کے دو سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ تمہاری امی نے اُسی روز مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اس لڑکی کا نام عذرا ہو گا اور یہ میری بہو ہو گی۔ میری بیٹی کا نام تمہاری امی نے رکھا تھا اور میں اُسی روز سے اسے تمہاری منگیتر سمجھ رہی ہوں .... تم آزاد ہو سکندر! جو فیصلہ چاہو کر سکتے ہو لیکن میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ میری اپنی بیٹی جوان ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو بھی تمہاری شادی کو میں اپنی ذمہ داری سمجھتی تھی" ــــ خالہ کی آواز بھر آگئی۔ وہ کہہ رہی تھی ــــ "آج میری بہن زندہ ہوتی تو ...." اُس نے ہچکی لی اور چُپ ہو گئی۔

"وہ زندہ ہوتی تو میں اتنی دیر پردیس میں خجل خراب نہ ہوتا پھرتا" ــــ میں نے کہا۔

"اب اپنا گھر آباد کرو" ــــ خالہ نے کہا ــــ "مجھے اپنا فیصلہ سُنا جاؤ۔"

"میں آؤں گا خالہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "اب تو میں سمجھو کہ ڈیوٹی پر آیا ہوں۔ شہناز کو اس کے ماں باپ کے حوالے کرنا تھا۔ میں چھٹی لے کر آؤں گا .... یہیں آنا ہے خالہ! مجھے یہیں آنا ہے۔"

میں نے اب عذرا کو دوسری نظر سے دیکھا۔ پہلے تو میں اس کا ایک رُوپ دیکھا کرتا تھا اور اس رُوپ میں وہ مجھے اچھی لگا کرتی تھی۔ اس دوسرے رُوپ میں بھی وہ مجھے اچھی ہی لگی۔ جب تک میں گھر رہا اُس وقت اُس کے ساتھ میری بے تکلفی تھی۔ ہم اکٹھے کھیلا بھی کرتے تھے لیکن وہ ابھی جوان نہیں ہوئی تھی۔ میں جب گھر سے نکلا بلکہ مجھے جب گھر سے اُٹھا کر نکالا گیا، اُس وقت

اُس کی عمر چودہ سال تھی۔ اب وہ بھرپور جوان تھی۔ اُس میں جوانی کی خود اعتمادی اور کنوارپن کی حیا تھی اور اُس کے ہونٹوں کے تبسم میں حجاب تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اُس کی ماں نے میرے ساتھ کیا بات کی ہے۔ یہ میں نے اس طرح محسوس کیا کہ میں باہر نکلا تو اُس نے مجھے دیکھا اور وہ شرما کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

✖

یہ موقع اُس کی ماں نے دانستہ پیدا کیا ہو گا کہ عذرا دُودھ کا پیالہ اُٹھائے اُس کمرے میں آگئی جس میں مَیں بیٹھا ہُوا تھا۔ خالہ اور خالو کہیں باہر چلے گئے تھے۔ عذرا نے پیالہ میرے آگے رکھا اور کھڑی رہی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چاہتی ہے کہ میں اُسے بیٹھنے کو کہوں۔ میں نے کہہ دیا۔

"جانتی ہو تمہاری امّی نے مجھے کیا کہا ہے؟" — میں نے کہا۔

اُس کا چہرہ شرم وحیا سے سُرخ ہو گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور وہ مُسکرانے لگی۔

"خالہ نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے" — میں نے کہا۔

اُس نے آہستہ سے اپنا چہرہ میری طرف کیا لیکن چہرہ آدھے راستے میں رُک گیا۔

"میرے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے" — میں نے کہا — "میں نے تو کبھی ...."

"پھر امّی کو صاف جواب دے دو سکندر!" — عذرا نے سخت لہجے میں کہا — "مجھے بتا دو .... کیا مشکل ہے سکندر؟ میں نے یہ تو سوچا ہی نہ تھا کہ تم باہر باہر گھوم پھر رہے ہو، اتنے خوبصورت جوان ہو اور تم نے کسی لڑکی کے ساتھ تعلق پیدا کر لیا ہو گا۔ میں تو سپنے دیکھتی رہی ہوں .... کوئی مشکل نہیں سکندر!"

"نہیں عذرا!" — میں نے کہا — "یہ بات نہیں۔ میرا تعلق کسی لڑکی کے ساتھ نہیں اور ہو گا بھی نہیں۔ مشکل کچھ اور ہے .... میں نے کبھی سوچا بھی

نہیں کہ میں نے شادی بھی کرنی ہے۔ اب خالہ نے بات کی ہے تو مجھے خیال آیا ہے کہ میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔"

"سکندر!" — عذرا نے کہا — "بات گول نہ کرو، کُھل کر کرو۔"

"کیا تم سمجھنے کی کوشش کرو گی؟"

"بات صاف کرو گے تو سمجھ میں آجائے گی" — عذرا نے کہا — "اگر خفیہ پولیس والوں کی طرح بات کرو گے تو سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔"

"میں آگ میں سے گزر رہا ہوں عذرا!" — میں نے کہا — "نہ جانے کب تک آگ میں سے ہی گزرتا رہوں گا۔"

"یہ کس کی لگائی ہوئی آگ ہے؟" — عذرا نے کہا — "تم خفیہ پولیس کی طرح بات کر رہے ہو۔"

"تم نے اپنے ذہن میں جو وہم بٹھا لیا ہے اسے ذہن سے نکال دو" — میں نے کہا — "اگر تم ساری رات میرے پاس بیٹھ سکو تو میں تمہیں وہ سب سنا سکتا ہوں جو اس شہر سے نکلنے سے لے کر آج اس شہر میں آنے تک مجھ پر بیتی ہے۔ اتنے برسوں کی داستان سنانے میں کچھ وقت لگے گا۔ کبھی ایسے لگتا ہے جیسے میں پتھر ہوں، کبھی ایسے جیسے میں موم ہو گیا ہوں جو ذرا سی حرارت سے پگھل جاتا ہے۔"

"میرے لئے پتھر ہو یا موم؟"

"موم" — میں نے جواب دیا — "اگر میں پتھر ہوں تو خالہ نے ایسی بات کہہ دی ہے کہ پتھر ٹوٹ گیا ہے۔"

"کیا کہا ہے امّی نے؟"

"کہتی ہیں میری امّی نے تمہاری پیدائش پر ہی کہہ دیا تھا کہ اس بچی کا نام عذرا ہو گا اور یہ میری بہو ہو گی" — میں نے کہا — "امّی کے نام پر تو میں اپنی گردن بھی کٹوا دوں۔"

"امّی کے نام پر نہیں" — عذرا نے کہا — "میرے نام پر دل سے ہاں کہہ دو تو بات ہے۔ دل پر پتھر رکھ کر نہیں۔"

میں نے اُسے انتہائی مختصر الفاظ میں سنایا کہ میں کیسی آگ میں سے گزر رہا ہوں اور میرے لئے آگے کیا آگ ہے۔

"میں کسی دہشت گرد کی گولی کا نشانہ بن سکتا ہوں" — میں نے کہا — "مجھے ڈاکو اغوا کر سکتے ہیں۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ بڑے بڑے انگریز افسر عزت کرتے ہیں اور اپنے پاس بٹھاتے ہیں لیکن دہشت گرد اور ڈاکو میرے دشمن ہیں۔ ایوب میرا دشمن ہے۔"

"کون سا ایوب؟" — عذرا نے پوچھا — "یہ تو نہیں منشی مراتب حسین کا بیٹا؟ وہ تو پولیس میں تھانیدار لگا ہوا ہے۔"

"وہی!" — میں نے کہا — "اُس کی تھانیداری ختم ہو چکی ہے۔ وہ تین سال کے لئے اندر ہو گیا ہے۔ بدمعاش آدمی ہے ..... اس کے گھر والوں کو ابھی نہ بتانا... میں تمہیں یہ سمجھا رہا ہوں عذرا، میری زندگی خطروں میں گزر رہی ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دے سکتی ہو تو سوچ لو۔"

"میرا دل کسی اور کو قبول نہیں کرے گا" — عذرا نے کہا — "تم آگ میں سے گزر رہے ہو یا سیلاب میں سے، میں تمہارا ساتھ دوں گی۔"

"کچھ مہلت دو گی؟" — میں نے پوچھا — "انتظار کرو گی؟"

"ساری عمر تمہارے انتظار میں گزار دوں گی" — عذرا نے کہا — "سکندر! تم دھوکہ نہ دے جانا۔"

میں نے اُسے تسلی دی اور اپنے مستقبل کے متعلق اسے اور بھی بہت کچھ بتایا اور اسے بچپن والی لڑکی کی پیشین گوئی بھی بتائی جو مجھ پر ایک وہم یا آسیب کی طرح طاری تھی۔

"تم نے مجھ پر ایک اور وہم طاری کر دیا ہے" — عذرا نے کہا — "شہناز! اس کے ساتھ تمہارا تعلق مجھے پریشان کر رہا ہے۔ بہت خوبصورت ہے اور چالاک بھی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ تمہیں اپنا بیٹا نہیں سمجھا کرتی تھی۔"

"اب اُس نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا ہے" — میں نے کہا — "یہ وہم ذہن سے نکال دو۔"

یہ تو ایک زنجیر تھی جس سے میرے ہاتھ پاؤں باندھے جا رہے تھے۔ میں اس سے بھاگ نہیں رہا تھا لیکن اس میں جکڑے جانے سے بھی جھجک رہا تھا۔ میں نے عذرا کو ایسا جواب دیا جیسے میں نے کہا ہو کہ یہ زنجیر مجھے دے دو، میں خود ہی اپنے ہاتھ پاؤں باندھ لوں گا۔ خالہ تک میرا جواب پہنچا تو وہ مطمئن ہو گئی۔

✖

رات خالہ کے ہاں گزری۔ خالہ اور خالو کے اصرار کے باوجود میں نے اُن سے اپنے مکان کے کرائے کی رقم نہ لی۔ میں صبح ہی ان کے گھر سے نکل گیا اور قبرستان میں جا پہنچا۔ امّی اور ابا جان کی قبروں کو دیکھ کر میں کمزور سا بچہ بن گیا۔ امیّ کی قبر کے پاس تو میں بیٹھ ہی گیا اور خاصی دیر بعد مجھے پتہ چلا کہ میں باتیں کر رہا ہوں۔ میں اپنی اس بات پر چونکا — "امی! تم نے خالہ سے کہا تھا کہ عذرا تمہاری بہو ہو گی، عذرا کا نام تم نے رکھا تھا امیّ!"

قبر نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ میں چونک پڑا اور مجھے اپنی آواز سنائی دی — "تم جوان آدمی ہو سکندر! پولیس کی سپیشل برانچ کے سب انسپکٹر ہو۔"

"تم تو جوان ہو گئے ہو سکندر!"

"ماشاء اللہ! کتنے خوبصورت جوان نکلے ہو۔"

"ارے، سکندر ہو تم؟ اتنے بڑے ہو گئے ہو!"

"اللہ نظر بد سے بچاتے۔ کیا جوانی آئی ہے!"

"تم جوان ہو گئے ہو۔"

"ماشاء اللہ! اب تو جوان ہو گئے ہو۔"

"اری، وہ دیکھ۔ سکندر جا رہا ہے۔"

"یہ تو لڑکا سا ہوتا تھا۔ کیسا لٹھا جوان نکلا ہے!"

اپنے شہر میں یہی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ گلیوں میں، بازاروں میں، منڈیروں سے، کھلے ہوئے دروازوں سے یہی آوازیں مجھے احساس دلاتی رہیں

کہ میں جوان ہو گیا ہوں۔

قبرستان سے آکر میں شہناز کے گھر چلا گیا۔ وہ بہت اُداس اور پریشان تھی۔ اُس نے مجھے الگ کمرے میں بٹھایا اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔

"گھر میں کچھ نہیں رہا"—— اُس نے کہا ——"امّی کی حالت تم نے دیکھ لی ہے۔ ابو کو تم جانتے ہو۔ دونوں بھائیوں نے گھر میں کچھ نہیں چھوڑا۔ کچھ پیسہ تھا، اتنا زیادہ زیور تھا، بھائیوں نے جُوئے میں ہار دیا ہے۔"

"کہاں ہیں وہ؟"—— میں نے پوچھا ——"کل بھی نہیں ملے۔"

"رات کو آتے ہیں اور صبح نکل جاتے ہیں"—— شہناز نے جواب دیا ——"وہ تو پکّے بدمعاش بن گئے ہیں۔ گھر کی دال روٹی وہی چلا رہے ہیں۔ یہ خدا کی پکڑ ہے سکندر!"

"مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں"—— میں نے کہا ——"میں جو کچھ کر سکتا ہوں کروں گا۔"

"کچھ بھی نہیں سکندر!"—— شہناز نے کہا ——"تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگر ممکن ہو تو مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ نوکرانی بنا کر لے چلو۔ میں یہاں نہیں رہ سکوں گی۔ پہلے ماں نے مجھے بیچ ڈالا تھا، اب بھائی مجھے خراب کریں گے۔"

"شادی کر لو"—— میں نے کہا ——"تم جسے اشارہ کرو گی وہ تمہارے قدموں میں بیٹھ جائے گا۔"

"میرے بھائیوں جیسا کوئی لُچا لفنگا ہی ہو گا جو مجھے اپنی بیوی بنائے گا"—— شہناز نے کہا ——"میں کسی شریف گھر کے قابل تو نہیں رہی۔ کل سے مجھے ایک ہی سوال کا سامنا ہے —— 'کہاں چلی گئی تھیں شہناز؟' —— جو عورت آئی اُس نے سب سے پہلے یہی سوال کیا۔ میں کل سے جھوٹ بول رہی ہوں۔ میں انہیں یہ تو نہیں بتا سکتی کہ میں ڈاکوؤں کے پاس اور پولیس کے پاس رہی ہوں۔"

"تم خود سوچو شہناز!"—— میں نے کہا ——"میں تمہیں اپنے ساتھ تو لے جا سکتا ہوں، لیکن رکھوں گا کہاں؟ اگر کہیں رکھ بھی لوں تو یہاں باتیں بنیں گی اور میرے لئے وہاں مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔ میری ڈیوٹی سے تم واقف ہو۔ میں کیسے

تمہاری دیکھ بھال کر سکوں گا۔"

"یہاں بھی دیکھ لو"—— شہناز نے کہا ——"بہنوں کے رکھوالے بھائی ہوتے ہیں۔ میرے بھائی تم نے دیکھ لئے ہیں۔ یہاں میری رکھوالی کون کرے گا؟"

"تم بچّی تو نہیں شہناز!"—— میں نے کہا ——"اپنی حفاظت خود کرو اور اپنے اللہ سے لَو لگا لو۔ اگر تم سچّے دل سے توبہ کر لو تو اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔"

"اللہ ہی ہے"—— شہناز نے کہا ——"تم چلے جاؤ گے تو پھر کبھی واپس نہیں آؤ گے۔"

"آنا پڑے گا شہناز!"—— میں نے کہا ——"خالہ نے مجھے اپنی زنجیر میں باندھ لیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"کہتی ہے میں نے عذرا تمہارے لئے جوان کی ہے"—— میں نے کہا ——"عذرا کے ساتھ بھی باتیں ہوتی ہیں۔ اُس نے تو کھُلے لفظوں میں مجھے کہہ دیا ہے کہ وہ کسی اور کو قبول نہیں کرے گی۔"

مجھے توقع تھی کہ شہناز اس خبر سے خوش ہو گی کہ اس شہر کے ساتھ میرا رشتہ قائم ہو جائے گا اور میں یہاں آتا رہوں گا لیکن میں نے دیکھا کہ شہناز کا سر جھُک گیا تھا۔ میں خود ہی بولتا رہا اور وہ جیسے سُن ہی نہیں رہی تھی۔ میں چُپ ہو گیا تو اُس نے سر اُٹھایا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کیوں شہناز!"—— میں نے پوچھا ——"تمہیں خوشی نہیں ہوتی؟"

شہناز نے آہستہ آہستہ سر ہلایا کہ نہیں۔

"کیوں؟"

"سچی بات بتاؤں سکندر!"—— شہناز نے آہ لے کر کہا ——"میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کر سکتی لیکن میں تمہیں کسی دوسری عورت کے ساتھ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے تم میری ملکیت ہو۔ تم کسی اور کے خاوند بن گئے تو میں اُس خوشنما انگوٹھی کی طرح رہ جاؤں گی جس کا نگینہ کہیں کھو گیا ہو۔ نگینے کے بغیر

انگوٹھی بھدّی لگتی ہے۔"

"تم پاگل ہو شہناز!" —— میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہاری راتوں میں اگر کوئی اور لڑکی داخل ہو گئی تو میں اور زیادہ پاگل ہو جاؤں گی" —— شہناز نے کہا۔

"ہوش میں آؤ شہناز!" —— میں نے کہا —— "تم نے بات صاف کہہ دی ہے۔ اب مجھے بھی بات صاف ہی کہنے دو .... بات کوئی انوکھی نہیں۔ تم خود محسوس کرتی ہو گی کہ تمہارا ذہن مجرمانہ ہے اور اس میں تمہارا اپنا قصور نہیں۔"

"ہاں سکندر!" —— شہناز نے میری پوری بات سُنے بغیر کہا —— "یہی تو میری بدنصیبی ہے۔ میری تربیت ہی مجرمانہ انداز سے ہوئی ہے .... کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تم نے جو کہا ہے کہ تم مجھے کسی اور عورت کی ملکیت میں نہیں دیکھ سکو گی۔ اس سے مجھے ایک خدشہ محسوس ہونے لگا ہے" —— میں نے کہا —— "عذرا یہاں رہے گی۔ میں بہت دُور ہوں گا۔ ایسا نہ ہو کہ تم عذرا کے دل میں کوئی ایسا وہم ڈال دو کہ وہ مجھ سے متنفر ہو جائے۔"

"تم نے بہت دُور کی سوچی ہے" —— شہناز نے دُکھی ہوئی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"تم جانتی ہو میں پولیس کے کون سے محکمے کا آدمی ہوں" —— میں نے کہا —— "بال کی کھال اُتارنے اور بہت دُور کی سوچنے کی ہی تو مجھے ٹریننگ ملی ہے .... ایسا ہو سکتا ہے تم یہاں اکیلی ہو گی اور ماحول بھی ایسا ہے کہ تمہارا ذہن اُکھڑا اُکھڑا رہے گا۔ اس کا اثر یہی ہو گا کہ تم کوئی محبت پیار کی بات سوچ ہی نہیں سکو گی۔"

"میں تمہاری بات سمجھ گئی ہوں سکندر!" —— شہناز نے کہا —— "ایک کام کر کے جانا۔ عذرا سے کہنا کہ میرے پاس کبھی نہ آئے۔ وہ میرے سامنے آگئی تو مجھے سب سے پہلا خیال یہ آئے گا کہ اس لڑکی نے مجھ سے میرا سکندر چھین لیا ہے۔"

ہو سکتا ہے میری کہانی سننے والے ان باتوں کو جو میرے اور شہناز کے درمیان ہوئیں، عجیب سمجھیں۔ میں ایسے لوگوں سے یہی کہوں گا کہ یہ جرم و گناہ کی دنیا کی باتیں ہیں۔ شہناز نے جس طرح دہشت گردوں کو پکڑوا دیا تھا اس طرح کوئی شریف عورت نہیں کر سکتی۔ ایسا کام وہی عورت کر سکتی ہے جس کے ذہن میں جرائم کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ جس طرح لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے اسی طرح مجرم کو مجرم ہی پکڑ سکتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ شہناز کی ذہنیت کس قدر مجرمانہ تھی۔

میں بھی تو مجرموں کی دنیا کا ہی آدمی تھا۔ میں مجرم تو نہیں تھا لیکن پولیس کے آدمیوں کو ذہنی طور پر مجرم بننا پڑتا ہے۔ شہناز مجھے سمجھتی تھی اور میں اُسے سمجھتا تھا۔ یہ باتیں جو میں نے صاف الفاظ میں کی ہیں یہ میں شہناز کے ساتھ اشاروں میں بھی کر سکتا تھا۔ وہ اشارے بھی سمجھ لیتی تھی۔ مجرم کی ذہنیت اور فطرت کی وسعت اور گہرائی کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ کوئی حد ہی نہیں ہوتی۔ شہناز کی ماں نے شہناز کو بیچ ڈالا تھا اور شہناز بکنے پر راضی تھی لیکن مجرمانہ ذہنیت کی یہ آخری حد نہیں تھی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ شہناز مجھے اپنی ملکیت سمجھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ شہناز مجھے کسی دوسری عورت کی ملکیت سے نکالنے کے لئے مجرمانہ حرکت ہی کرے گی۔

بہرحال شہناز میری بات سمجھ گئی اور میں اُس کی بات سمجھ گیا لیکن میرے دل میں جو خدشہ پیدا ہو چکا تھا وہ قائم رہا۔

میں نے اُسی رات کی گاڑی سے واپس آنا تھا۔ شہناز کی ضد تھی کہ میں شام کا کھانا اُس کے ساتھ کھاؤں۔ کھانا اُس کے ساتھ ہی کھایا لیکن اُس کی جذباتی کیفیت یہ تھی کہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے لمبا سانس لیتی یا آہ بھرتی تھی۔ کھانے کے فوراً بعد مجھے سٹیشن پر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ میں جانے کے لئے اُٹھا تو وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ بہت دیر میرا سر اپنے کندھے پر رکھ کر مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑے رکھا۔ پھر اُس نے کئی بار میری پیشانی اور میرے سر کو چوما۔ اُس کے آنسوؤں کا یہ حال تھا کہ اُس کا مُنہ آنسوؤں سے

دُھل گیا تھا۔ جذبات کی شدت کے اُس نے ایسے ایسے مظاہرے کئے کہ میرے بھی آنسو نکل آتے۔

ریل گاڑی نے مجھے رات بھر اور اگلے آدھے دن کے سفر کے بعد اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیا لیکن مجھے اس طرح محسوس ہُوا جیسے میں ذہن کی پرواز کے ساتھ پہنچا ہوں۔ ریل کے انجن کی طرح میرا دماغ چلتا رہا۔ زیادہ تر خیالات عذرا کے آتے جن میں کچھ رومانی سا تاثر تھا۔ وہ ذہن سے نکلی تو شہناز آگئی جس کے ساتھ خدشے، افسردگی اور تلخیاں وابستہ تھیں۔ میں اپنے تلخ و شیریں خیالات میں گُم اس طرح اپنے ٹھکانے پر پہنچا، جیسے ایک سٹیشن سے سوار ہُوا اور اگلے سٹیشن پر اُتر گیا۔ یہ سوچ بار بار آتی رہی کہ کوئی بھلا آدمی مل جاتے تو اُس کے ساتھ شہناز کی شادی کرا دوں۔

✖

وہاں پہنچتے ہی میں پولیس کے روزمرّہ کے کام کاج میں گُم ہو گیا۔ ایک روز سپیشل برانچ کے نئے ایس پی نے جو میڈوز کی جگہ آیا تھا، مجھے، سلطان اور اللہ داد خان کو بلایا۔

"تمہارا کارنامہ قابلِ تعریف تھا" ــــ ایس پی جانسن نے کہا ــــ "لیکن ہمارا شکار ابھی مرا نہیں۔ مُخبروں نے جو اطلاعیں دی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ باقی گروہ زمین دوز ہو گیا ہے اور وہ جلدی ہی کوئی تخریبی کارروائی کرے گا۔ ضروری نہیں کہ وہ آئندہ کارروائی اس شہر میں یا اس علاقے میں کرے۔ یہ لوگ کہیں بھی حملہ کر سکتے ہیں۔ تم تینوں کے سامنے دو کام ہیں۔ ایک یہ کہ تمہیں اپنے آپ کو اس گروہ سے بچا کر رکھنا ہوگا۔ یہ گروہ انتقامی کارروائی کر سکتا ہے۔ تمہارا دوسرا کام یہ ہے کہ اس گروہ کا سراغ لگاؤ۔"

"صاحب بہادر!" ــــ سب انسپکٹر اللہ داد خان نے کہا ــــ "یہ مُخبر جن کا آپ حوالہ دے رہے ہیں اس گروہ کے اگر ٹھکانے کو نہیں جانتے تو کسی آدمی کو تو جانتے ہوں گے۔"

"نہیں" ــــ ایس پی جانسن نے کہا ــــ "مُخبر شک میں بات کرتے ہیں

اور اُن کا شک پختہ ہے .... تم تینوں کو میں ایک اور بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ سپیشل برانچ میں تم جیسے ہندو اور سکھ انسپکٹر بھی ہیں لیکن ایس پی میڈوز نے، انسپکٹر وِلکاکس نے اور میں نے تم تینوں کو خاص طور پر اور خاص وجہ سے اس کام پر لگایا ہے۔ تم تینوں مسلمان ہو۔ ہمیں جو بھروسہ مسلمان پر ہے وہ ہندو یا سکھ انسپکٹر پر نہیں ہو سکتا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ دہشت گرد گروہوں میں زیادہ تر ہندو ہیں، اس کے بعد سکھوں کا نمبر آتا ہے۔ یاد رکھو، ہندو اس ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو وہ مسلمانوں کو اپنا غلام بنا لیں گے۔ تم یہ سمجھو کہ تم لوگ اس ملک کو ہندوؤں سے بچا رہے ہو۔"

ایس پی جانسن نے ہمیں کچھ اور احکام دیتے اور ہمیں فارغ کر دیا۔

"دیکھا لڑکو!" ــــ اللہ داد نے جس کی عمر چالیس سال سے اُوپر ہو گئی تھی، باہر آکر کہا ــــ "یہ انگریز کتنی عقلمند قوم ہے۔ جانسن صاحب نے ہمیں اپنے مطلب کے لئے ہندوؤں کے خلاف بھڑکا دیا ہے۔ یہ ہے انگریز کی پالیسی ... پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔"

میں نے تو ابھی سوچا بھی نہیں تھا کہ دہشت گرد گروہ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کا مقصد کیا ہے۔ مقصد بھی میں جانتا تھا۔ وہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا چاہتے تھے لیکن میں اسے بے مقصد اس لئے کہتا تھا کہ اس طرح چند ایک آدمیوں کی تخریبی کارروائیوں سے ملک کو انگریزوں جیسی طاقتور قوم سے آزاد نہیں کرایا جا سکتا تھا۔ میں نے ملکی سطح پر کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ میں ڈیوٹی کو ڈیوٹی سمجھتا تھا۔

✖

میں اور سلطان ہر روز شام کے وقت ذرا باہر نکل جایا کرتے تھے۔ وہ سڑک ذرا سنسان سی تھی۔ اُس سے آگے چھوٹا سا ایک بازار تھا۔ سردیوں میں ہم وہاں جا کر ایک دکان سے دُودھ پیا کرتے اور گرمیوں میں لسّی۔ ایک شام ہم آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے کہ ایک عورت نے ہمیں روک لیا۔ چہرے سے اُس کی عمر چالیس سال کے قریب لگتی تھی۔ سَر کے کچھ بال سفید تھے۔ شکل و صورت

سے وہ کسی اچھے خاندان کی عورت لگتی تھی لیکن اُس کے کپڑے غریبانہ تھے۔ اُس نے جب بات کی تو اُس کا انداز نوکرانیوں جیسا تھا۔

"میرے بھائیو!" — اُس نے بھکاریوں کے لہجے میں کہا — "مجھے بھکاری نہ سمجھ لینا۔ بڑی مشکل میں گرفتار ہوں۔ یہاں بات کی تو تم مجھے بھکاری ہی سمجھو گے۔ ذرا میرے گھر تک چلو۔ میرے گھر کی حالت دیکھو۔ میری جوان بیٹی کو دیکھو پھر میں بات کروں گی تو تم پر میری بات کا صحیح اثر ہوگا۔"

"بات کرو" — میں نے کہا — "ہم یہیں سُن لیتے ہیں۔"

"سیدھی بات کرو مائی!" — سلطان احمد نے کہا — "ہم اتنے شوقین نہیں۔"

سلطان احمد نے یہ بات شرارتی سے لہجے میں اس لئے کہی تھی کہ عصمت فروشی کے بازار سے ہٹ کر بھی اُس شہر میں یہ دھندا چلتا تھا۔ سلطان احمد کی طرح میں بھی یہی سمجھا تھا کہ یہ عورت کسی طوائف کی دلاّل ہے اور یہ ہمیں اپنے گھر لے جانا چاہتی ہے۔ ایسے دلالوں کے جال میں ہم جیسے جوان آدمی ہی پھنسا کرتے تھے۔ فوج اور پولیس کے آدمی تو ذرا سے اشارے پر پیچھے پیچھے چل پڑتے تھے۔ ہم دونوں میں ابھی کچھ شرافت یا شاید جھجک باقی تھی۔ ہمارا اُس کے ساتھ جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"میرے بھائیو!" — اس عورت نے پہلے سے زیادہ دُکھی ہوئی سی آواز میں کہا — "غریب عورت کے ساتھ مذاق نہ کرو۔ میں تو خدا کے نام پر تمہیں اپنی حالت بتانا چاہتی ہوں۔ بھیک مانگنی ہوتی تو فوراً کہتی کہ اللہ کے نام پر کچھ دے دو.... میں بیوہ ہوں۔ تین گھروں میں کام کرتی ہوں اور ماں بیٹی کی دال روٹی چلتی ہے۔"

"بیٹا کوئی نہیں؟" — سلطان احمد نے پوچھا۔

"نہ ہی سمجھو" — اُس نے جواب دیا — "ایک ہی بیٹا ہے۔ وہ بھی آوارہ نکلا۔ چار ایک مہینوں سے گھر سے ہی غائب ہے۔ بیٹی جوان ہے۔ سوچتی ہوں اُس کی شادی ہو جائے تو میری سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ وہ شادی کی عمر سے

آگے ہوتی جا رہی ہے۔ شادی جلدی ہو جانی چاہیئے۔"

"جلدی کیا ہے اماں؟"

"جلدی یہ ہے بھائیو!" — اُس نے جواب دیا — "لڑکی پر ایک بدمعاش نے اور روپے پیسے والے ایک ہندو سیٹھ نے نظر رکھ لی ہے۔ لڑکی بھی ایک گھر میں کام کرتی ہے۔ غریب کی بیٹی کا چال چلن کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ جس نے ذرا روپے پیسے کی جھلک دکھائی وہ جال میں آجاتی ہے۔ مجھے اپنی بیٹی پر بھی شک ہونے لگا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ کچھ اِدھر اُدھر سے مدد امداد ہو جائے تو اُس کی شادی کر دوں۔"

"ہم اتنی مدد کرنے کے قابل تو نہیں" — میں نے کہا — "ہم تھوڑی تھوڑی تنخواہوں والے لوگ ہیں۔ ایک ایک روپے سے زیادہ ہم دے ہی نہیں سکتے۔"

"میں ساری مدد تم دونوں سے ہی تو نہیں مانگ رہی" — اُس نے کہا — "تم دونوں سب انسپکٹر ہو۔ تمہارا حکم اور اثر و رسوخ چلتا ہے۔ اگر چاہو تو سَو دو سَو روپیہ اکٹھا کر سکتے ہو۔ مجھ غریب کا اسی میں کام ہو جائے گا۔ تین ساڑھے تین سَو تو میں نے جمع کر رکھا ہے .... میرا خیال ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں آیا۔ یہ سوچ لو کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان بہن کے سر پر دوپٹہ رکھنا مسلمان بھائی کا فرض ہے۔ میرے گھر چلو۔ گھر کیا ہے، جُھگی سی ہے۔ میری بیٹی کو دیکھو گے تو خود محسوس کرو گے کہ اس کی شادی فوراً ہو جانی چاہیئے۔ اگر مجھ پر تمہیں اعتبار نہیں تو میں یہاں کھڑی رہتی ہوں۔ یہاں سے گزرنے والوں سے اور بازار کے دکانداروں سے پوچھ لو کہ اُنہوں نے مجھے پہلے کبھی دیکھا ہے؟"

"لیکن تم نے ہمیں کیوں اس قابل سمجھا ہے کہ تمہاری امداد کر ہی دیں گے؟" — سلطان نے کہا۔

"میں تمہیں ادھر سے گزرتے دیکھا کرتی تھی" — اس عورت نے کہا — "تمہاری چال ڈھال سے مجھے پتہ چلتا تھا کہ تم خاندانی آدمی ہو۔ تم میرے گھر چلو.... لیکن اس وقت نہیں۔ رات کو چلو تو بہتر ہے۔ دن کی روشنی میں گئے تو لوگ اُلٹی باتیں

بنائیں گے۔"

ہم اُسے ٹال رہے تھے۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ اس کی کچھ مدد کر ہی دی جاتے لیکن وہ اس ضد پر اڑی ہوئی تھی کہ ہم اُس کے گھر چلیں۔ یہاں تک کہ اُس نے ایک بازو میرا اور ایک سلطان کا پکڑ لیا اور منت سماجت کے ساتھ ساتھ ہمیں گھسیٹنے لگی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایسے لگا جیسے سلطان احمد نے بھی وہی سوچا ہے جو میں نے سوچ لیا تھا۔

"اچھا یوں کرو"—— میں نے کہا —— "کل اسی وقت یہیں پر آجانا۔ ہم تمہاری کچھ نہ کچھ مشکل آسان کر دیں گے۔"

"نہیں"—— اُس نے کہا —— "تم ایک غریب عورت کو ٹرخا رہے ہو۔ تم چاہے نہ آنا لیکن مجھے بھکارن نہ سمجھ لینا۔"

"ہم کچھ نہ کچھ تو لے کر ہی آئیں گے"—— میں نے کہا۔

"اگر دو چار روپے لانے ہیں تو نہ آنا"—— اُس نے کہا —— "اگر آ ہی گئے تو میں تمہیں اپنے گھر ضرور لے جاؤں گی۔ اپنی آنکھوں دیکھ لینا۔ تمہیں یہ اعتبار تو آ ہی جائے گا کہ اس عورت نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔"

✖

اگلے روز اُسی وقت میں اور سلطان اُسی جگہ گئے۔ ایک آدھ منٹ بعد وہ آگئی۔

"تم ہمیں اپنے گھر لے جانا چاہتی ہو"—— میں نے کہا —— "لیکن ہم تمہیں اپنے گھر لے جائیں گے۔ تم بُرا نہ جاننا۔ ہمارے دوست تمہاری توقع سے زیادہ مدد کریں گے لیکن وہ یقین کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کی مدد صحیح جگہ جا رہی ہے۔ وہ سب تو یہاں نہیں آ سکتے تھے۔ ہم تمہیں وہاں لے جائیں گے۔ بات ہم کر چکے ہیں۔ وہ جو کچھ دیں گے وہ ہم لے کر تمہارے گھر چلیں گے تاکہ ہمیں بھی یقین ہو جائے۔"

وہ ذرا سوچ میں پڑ گئی۔

"گھبراؤ نہیں"—— سلطان نے کہا —— "وہ سب مسلمان ہیں اور تم

ہماری بہن ہو۔ وہاں تمہیں بٹھا نہیں لیں گے۔ پانچ سات منٹ میں ہم تمہیں ساتھ لے کر واپس آجائیں گے۔"

اُس میں ابھی تک کچھ جھجک تھی۔ ہم دونوں نے اُس کا ایک ایک بازو پکڑ لیا اور کہا کہ وہ ہمارے ساتھ چلے۔ وہ ہمارے ساتھ چل پڑی۔ ہم اُسے اپنے کمرے میں لے آئے۔ وہاں ہمارا کوئی دوست نہیں تھا جو اُس کی مدد کرتا نہ ہم نے کسی کو کہا تھا کہ ایک عورت کی مدد کرنی ہے۔ سلطان نے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ تب وہ چونکی۔

"دروازہ کیوں بند کر رہے ہو؟"—— اُس نے ذرا گھبراہٹ سے پوچھا —— "کہاں ہیں وہ آدمی جو تم کہتے تھے کہ میری مدد کریں گے؟"

"ہم تمہاری مدد کریں گے"—— میں نے کہا —— "پہلے اپنا نام بتاؤ۔"

"رضیہ"—— اُس نے فوراً جواب دیا۔

"نہیں"—— سلطان احمد نے کہا —— "وہ نام بتاؤ جو تمہارے ماں باپ نے رکھا تھا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"—— اُس نے پوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ تم ہندو ہو"—— سلطان احمد نے کہا —— "ہم تمہیں وہیں لے جائیں گے جہاں تم ہمیں لے جا رہی تھیں۔"

"غریب عورت کو پریشان کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی"—— اُس نے کہا —— "مجھے کوئی اور گالی دے لو، ہندو نہ کہو۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کس نے بتایا ہے کہ ہم دونوں سب انسپکٹر ہیں" —— میں نے کہا۔

"میں نے کسی سے پوچھا تھا"—— اُس نے جواب دیا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم پولیس کے ہاتھوں میں ہو؟"

"ہاں ہاں"—— اُس نے جواب دیا —— "اتنا تو میں جانتی ہوں۔"

"ہم پولیس کے دو تین سپاہیوں کو بلا رہے ہیں"—— میں نے کہا —— "وہ ہمارے ساتھ چلیں گے۔ تم ہمیں اُن دو تین گھروں میں لے چلو جہاں تم کام

کرتی ہو، پھر ہم تمہارے گھر چلیں گے اور تمہاری بیٹی کو دیکھیں گے" — میں نے سلطان سے کہا — "چار کانسٹیبلوں کو تیار کر کے لے آؤ۔"

اب وہ گھبرا گئی۔ میں نے اُس کے سر سے دوپٹہ اُتار دیا۔ اُس کی گردن دیکھی۔ پھر اُس کی آستین اُوپر کر کے اس کے پورے بازو دیکھے۔ میں نے تولیے کا ایک کونہ بھگویا اور اُس کے جو بال سفید تھے اُن پر بھیگا ہُوا تولیہ زور سے رگڑا۔ پھر اُس کے سفید بال دوسرے بالوں سے الگ کر کے اُن پر تولیہ رگڑا تو وہ بالکل کالے ہو گئے۔ میں نے اُس سے کہا کہ وہ اُٹھے اور صابن سے مُنہ دھوئے۔

اب اُس کی صورت ایک رونی صورت تھی۔ وہ مُنہ دھونے سے پس و پیش کرنے لگی۔ میں نے اور سلطان نے اُس کا مُنہ کپڑے دھونے والے صابن سے دُھلایا۔ تولیے کا ایک کونہ پانی میں ڈبو کر اس پر صابن ملا اور تولیے کا یہ حصّہ اُس کے مُنہ پر پھر ہاتھوں پر رگڑا۔ خشک تولیے سے اُس کا مُنہ صاف کیا۔ ہاتھ بھی خشک کئے — یہ چہرہ اور یہ ہاتھ ادھیڑ عمر عورت کے نہیں بلکہ ایک جوان عورت کے تھے جس کی جوانی عروج پر تھی۔

"اب بتاؤ" — سلطان نے اُس سے پوچھا — "تمہاری عمر کیا ہے؟"

"سچ بولو گی تو یہاں سے نکل سکو گی" — میں نے کہا — "جس لڑکی کا ہمیں جھانسہ دے رہی تھیں، تم اس کی عمر کی ہو۔ کیا اس عمر کی لڑکی تمہاری بیٹی ہو سکتی ہے؟"

اُس کی زبان تو جیسے اکڑ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں۔ اُس کا رنگ گورا تھا۔ ہم نے جب صابن والا تولیہ اُس کے چہرے پر رگڑا تو اس کا رنگ سُرخ ہو گیا۔

"ابھی تم ہمارے کمرے میں ہو" — میں نے کہا — "اپنے کسی بڑے افسر کو ہم نے اطلاع نہیں دی۔ یہ معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے تمہارا بہروپ اُتار دیا ہے۔ تم اب یہ نہیں کہہ سکتیں کہ تم شریف عورت ہو۔ تمہارا جھوٹ

پکڑا گیا ہے۔ اب یہ بتا دو کہ تمہاری اصلیت کیا ہے اور تمہارا ارادہ کیا تھا۔"

"پھر مجھے چھوڑ دو گے؟" — اُس نے پوچھا۔

"پہلے ہمارے سوال کا جواب دو" — سلطان نے کہا — "پھر دیکھیں گے کہ تمہیں چھوڑنا ہے یا نہیں۔"

"مجھے دیکھ لیا ہے تم دونوں نے!" — اُس نے کہا — "کیا میں خوبصورت اور جوان لڑکی نہیں؟"

"بہت خوبصورت ہو" — سلطان نے کہا — "یہ کیوں پوچھا ہے تم نے؟"

"اس سے زیادہ خوبصورت رشوت اور کیا ہو گی!" — عورت نے مسکرا کر کہا — "یہ رشوت قبول کرو اور مجھے جانے دو۔"

"تم ہمارے قبضے میں ہو" — میں نے کہا — "ہمیں تمہارے ساتھ اس قسم کی دلچسپی ہوتی تو تم سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

"ابھی تو شام ہے" — اُس نے کہا — "صبح تک تمہارے پاس رہوں گی۔"

"اب تم رہو گی ہی ہمارے پاس!" — سلطان نے کہا — "ہم تمہیں وہاں لے چلیں گے جہاں ملزموں سے اقبالی بیان لیتے جاتے ہیں۔"

اُس نے ہمارے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے کچھ بے ہُودہ حرکتیں کیں لیکن اُس کا یہ داؤ چل نہ سکا۔

"سلطان!" — میں نے کہا — "لے چلو اسے۔ دس منٹ میں اس کا دماغ ٹھکانے آجاتے گا۔"

سلطان اُٹھا۔ عورت نے دونوں ہاتھ آگے کر دیئے۔

"ٹھہر جاؤ" — اُس نے کہا — "میری ایک بات سُن لو۔"

✖

"میں اُس قسم کی ملزم نہیں جیسی تم سمجھ رہے ہو" — اُس نے کہا — "میں انگریزوں کی مجرم ہوں، تمہاری نہیں۔ تم ہندوستانی ہو۔ میں نے اپنا نام غلط بتایا

تھا۔ میرا نام رضیہ نہیں لاجونتی ہے۔ میں ہندو ہوں۔ تم مسلمان ہو لیکن ہم سب ہندوستانی ہیں اور انگریزوں کے ایک ہی جیسے غلام ہیں۔ مجھ میں اور تم دونوں میں یہ فرق ہے کہ میں غلامی کی زنجیریں توڑنے والوں میں سے ہوں اور تم انگریزوں کی نوکری میں آکر مجھے مجرم سمجھ رہے ہو۔ اس طرح تم مجھ سے زیادہ غلام ہو۔ میں اپنے دیس کی خاطر اپنی جان اور اپنی عزت بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر تم آزادی کا مطلب سمجھتے ہو تو ایک ہندوستانی عورت کی عزت کا ضرور خیال کرو گے۔"

"ہم پہلے تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی عورت نے ہمیں دھوکہ کیوں دیا ہے؟" — میں نے کہا — "تمہارا لیکچر بعد میں سُنیں گے۔"

"تمہیں شاید ابھی یہ احساس نہیں ہُوا کہ دو پولیس افسروں کو دھوکہ دینا کتنا بڑا جُرم ہے اور اس کی سزا کیا ہے" — سلطان نے کہا — "اس جُرم کے بعد ہمارے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ تم سے معلوم کریں کہ تم نے یہ جُرم کیوں کیا ہے۔"

اُس نے پھر ہندوستان کی آزادی کی بات بلکہ لیکچر شروع کر دیا۔ ہمارے سامنے سیدھا راستہ تھا۔ اُسے ہم تفتیشی کمرے میں لے جاتے اور انسپکٹر ولکاکس کو بلا لیتے لیکن میں نے اس عورت کے ذریعے بہت بڑا شکار خود مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں کمرے میں ہی سلطان کو ذرا پرے لے گیا اور اُسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

"یہ اُسی گروہ کی معلوم ہوتی ہے جسے ہم نے توڑا ہے" — سلطان نے کہا — "اس عورت کو انتقامی کارروائی کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اس سے ہم گروہ کا خفیہ اڈہ معلوم کریں گے اور پورا شکار مار کر ایس۔ پی جانسن کو اطلاع دیں گے۔ اگر ہم نے اسے ولکاکس کے حوالے کر دیا تو یہ اُسی کا کارنامہ بن جائے گا۔ انعام اور ترقی ہم کیوں نہ لیں؟"

میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن ہمارے سامنے ایک مشکل تھی۔ کسی گھریلو یا شریف عورت سے اقبالِ جُرم کرانا ہو جو وہ کسی مجبوری کے تحت کر بیٹھی ہو

تو اُسے کوئی اذیت دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اُسے صرف یہ کہہ دو کہ اُس کی عزت برباد کر دی جائے گی تو وہ اسی دھمکی سے ہتھیار ڈال دیتی ہے، لیکن ہمارے ہاتھ ایسی عورت آئی تھی جسے اپنی عصمت کا کوئی خیال نہ تھا بلکہ وہ اپنا اتنا خوبصورت جسم رشوت کے طور پر پیش کر رہی تھی۔ اُس پر تشدّد ہم اپنے کمرے میں اپنے طور پر ہی نہیں کر سکتے تھے۔ باقاعدہ کاغذی کارروائی کر کے اُسے اپنے بالائی افسروں کے حوالے کرنا تھا جو ہم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ میں بتا چکا ہوں کہ ہم یہ کارنامہ پورے کا پورا اپنے کھاتے میں ڈالنا چاہتے تھے۔

"دیکھو لاجونتی!" — میں نے اُسے کہا — "جو رشوت تم نے پیش کی ہے وہ ہم ٹھکرا چکے ہیں اور کسی قیمت پر قبول نہیں کریں گے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ جُرم تم سے کروایا جا رہا ہے۔ یہ تمہارا ذاتی جُرم نہیں۔ نہیں بتاؤ گی تو ایک گھنٹے کے اندر اندر تمہارا حُلیہ بگڑ چکا ہو گا۔ تم مر جاؤ گی تو بھی ہم سے باز پُرس نہیں ہو گی اور جنہوں نے تمہیں بھیجا ہے اُنہیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ تم کہاں غائب ہو گئی ہو۔"

سلطان احمد نے اُس کا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ اپنی ایک اُنگلی اُس کی شہادت اور درمیانی اُنگلی کے درمیان رکھ کر اُس کی اُنگلیوں کو دبایا۔ اُس کی اُنگلیاں پتلی پتلی سی تھیں۔ لاجونتی کی چیخ نکل گئی۔ سلطان نے اُس کی اُنگلیوں کو اور زیادہ دبایا تو وہ تڑپنے اور منتیں کرنے لگی کہ اُسے چھوڑ دیا جائے۔ سلطان نے تھوڑی دیر بعد اُسے چھوڑ دیا۔ اس عورت نے اپنی اُنگلیوں کو یوں دبایا اور دیکھا جیسے یہ کٹ گئی ہوں۔

"یہ کچھ بھی نہیں" — میں نے کہا — "اسے تو ہم پولیس کا پیار کہا کرتے ہیں۔ تمہارے بالوں کے ساتھ رسّہ باندھ کر تمہیں چھت کے ساتھ لٹکا دیا جائے گا" — میں نے اُسے ایذا رسانی کے تین چار اور طریقے ایسے لہجے میں سُنائے کہ اُس کی آنکھیں کھُل گئیں۔ سلطان نے اُس کی گردن اور کندھے کے درمیان ایک رگ پکڑ لی۔ بکرا ذبح ہوتے وقت کیا تڑپتا ہو گا کسی توی ہیکل

پہلوان کی یہ رگ پکڑ کر دباؤ تو وہ اسی طرح تڑپنے لگتا ہے۔ سلطان نے چند سیکنڈ بعد اُس کی رگ چھوڑ دی۔ اتنے سے قلیل وقت میں ہی لاجونتی کے جسم کا سارا خون اُس کے چہرے پر آگیا۔ اب تو اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ اُس میں برداشت کا اتنا مادہ نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ وہ بولنے پر آگئی۔

✖

"بالکل سچ بولنا" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "ذرا سا بھی جھوٹ نہ ہو۔"

"پھر مجھے چھوڑ دو گے؟" ۔۔۔ اُس نے التجا کے لہجے میں پوچھا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی ۔۔۔ "میں ایک دُکھیاری عورت ہوں .... بیوہ ہوں۔ مجھ سے یہ جرم کروایا جا رہا ہے۔ میں تم سے رحم کی بھیک مانگتی ہوں۔"

"پہلے اپنا جُرم سناؤ" ۔۔۔ سلطان نے کہا۔

"سُن لو" ۔۔۔ اُس نے بڑی لمبی آہ بھر کر کہا ۔۔۔ "تم نے ہمارے تین آدمیوں اور ایک لڑکی کو گرفتار کر کے سزا دلائی ہے۔ ہمارے لیڈروں نے تمہیں اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ ایک شام ہمارے لیڈر نے مجھے اپنے ساتھ لیا۔ تم دونوں بازار کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے کہا گیا کہ میں تم دونوں کو اچھی طرح پہچان لوں۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ تم دونوں اس وقت ہر روز بازار کی طرف جاتے ہو اور ایک دکان سے دُودھ یا لسّی پیا کرتے ہو....

"مجھے یہ کام سونپا گیا کہ میں تم دونوں کو اس دھوکے میں اپنے ساتھ لے آؤں جو میں نے تمہیں دینے کی کوشش کی تھی۔ چھوٹا سا ایک مکان جو اس کام کے لئے بڑا اچھا تھا، خالی کرا لیا تھا۔ میں نے تم دونوں کو وہاں اس دھوکے میں لے جانا تھا کہ آکر خود دیکھو کہ میری بیٹی جوان ہے اور میں بہت غریب ہوں۔ اس مکان میں چھ آدمی موجود تھے۔ اُنہوں نے تم دونوں کو پکڑ لینا تھا۔"

"ہمیں قتل کرنا تھا؟" ۔۔۔ سلطان نے پوچھا۔

"میں یہ نہیں جانتی" ۔۔۔ لاجونتی نے جواب دیا ۔۔۔ "کوئی سی قسم لے لو۔ اُنہوں نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا۔ قتل ہی کرنا ہوگا۔"

"کیا تم سرلا دیوی کی طرح اس گروہ میں کام کرتی ہو؟"

"نہیں" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "میں سرلا دیوی کو جانتی ہوں، لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ کام کیا کرتی تھی۔ مجھے انہوں نے پہلی بار اتنا مشکل اور خطرناک کام دیا تھا۔ اس سے پہلے میرا کام یہی کچھ تھا کہ خفیہ پیغام اِدھر اُدھر پہنچاتی تھی۔ اب اُنہوں نے میرا حُلیہ اس طرح تبدیل کیا کہ میرے چند ایک بالوں کو سفید کیا اور میرے مُنہ پر ایسی دوائی مل دی کہ میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو یہ مجھے اپنی ماں کا چہرہ معلوم ہُوا۔"

"وہ سب بیوقوف ہیں" ۔۔۔ سلطان نے کہا ۔۔۔ "چہرے کو بگاڑنا تھا تو وہی دوائی گردن پر بھی لگاتے۔ اُنہوں نے صرف مُنہ اور ہاتھوں پر دوائی لگائی اور بازو ویسے ہی رہنے دیتے۔ اُنہوں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ وہ پولیس سے ٹکر لے رہے ہیں حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ہم عام پولیس کے آدمی نہیں۔ یہ سپیشل پولیس ہے جسے ایسی ٹریننگ دی جاتی ہے کہ زمین کے اندر جو کچھ ہے وہ بھی نظر آجاتا ہے۔ تمہارے جاہل لیڈروں نے چہرے اور ہاتھوں سے تو تمہیں چالیس پنتالیس سال کی عورت بنا دیا لیکن کندھے بازو اور باقی جسم ایک جوان لڑکی کا رہنے دیا۔"

"لاجونتی!" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "ان لوگوں نے تمہیں پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا ہے۔ تم جب ہمیں ملی تھیں تو یہ ظاہر کرتیں کہ تم ہمیں جانتی ہی نہیں کہ ہم کون ہیں۔ تم نے کہا کہ تم پولیس کے سب انسپکٹر ہو اس لئے میری مدد کر سکتے ہو۔ بہت کم لوگ ہیں جنہیں پولیس کے عہدوں کا علم ہوتا ہے۔ وہ ہر پولیس افسر کو تھانیدار کہتے ہیں۔ ہمیں اسی سے تم پر شک ہو گیا تھا کہ تمہیں پتہ کیسے چلا کہ ہم سب انسپکٹر ہیں۔ ہم نے تو کبھی وردی پہنی ہی نہیں۔"

"انہوں نے مجھے ایسے ہی بتایا تھا" ۔۔۔ لاجونتی نے بے بسی کے لہجے میں کہا۔

"تم اپنی عقل استعمال کرتیں" ۔۔۔ میں نے کہا اور پوچھا ۔۔۔ "تم کتنا پڑھی ہو؟"

"میٹرک تک پڑھی ہوں" — اُس نے جواب دیا — "تم میری عقل کی بات کرتے ہو.... میری عقل ماری گئی ہے۔ میں ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہوں مجھے تو اتنی ہوش ہی نہیں کہ ہندوستان کی آزادی کی سوچ بھی سکوں" — اُس نے بڑی لمبی سانس لی اور بولی — "عجیب مجبوری ہے۔ اگر تم لوگوں نے چھوڑ دیا تو میں شاید خودکشی کر لوں۔"

"مجبوری کیا ہے؟" — میں نے پوچھا — "اور خودکشی کی وجہ؟"

"میں بیوہ ہوں" — اُس نے کہا — "میں نے یہ تو جھوٹ بولا تھا کہ میری بیٹی جوان ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں خود جوان ہوں اور دو سال سے بیوہ ہوں .... یہ تو تم جانتے ہو گے کہ ہندو لڑکی شادی کے خواہ اگلے روز ہی بیوہ ہو جاتے تو اُسے دُھتکار کر الگ پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ شادی نہیں کر سکتی۔ وہ چوڑیاں نہیں پہن سکتی۔ وہ ڈھلا ہُوا دوپٹہ اپنے سر پر نہیں لے سکتی۔ وہ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کے لئے بھی اچھوت اور منحوس بن جاتی ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ میرے اپنے باپ نے میرے ساتھ بولنا بھی چھوڑ رکھا ہے؟ ماں کے دل میں کچھ پیار ہے، لیکن دوسروں کے سامنے وہ مجھے پیار سے نہیں بلا سکتی۔"

"ہر ہندو بیوہ کے ساتھ تو ایسا سلوک نہیں ہوتا" — سلطان نے کہا۔

"میرا خاندان کٹر برہمن ہے" — اُس نے کہا — "اور دقیانوسی بھی۔ اُنہوں نے تو مجھے مندر کی داسی بنا دیا تھا لیکن میں وہاں سے بھاگ آئی۔"

"کیوں؟"

"ان پنڈتوں سے تو تم اچھے ہو جنہیں ہم ملیچھ سمجھتے ہیں" — لاجونتی نے کہا — "مندروں میں جو بیوہ جاتی ہے اُسے پنڈت اپنی داشتہ بنا لیتے ہیں۔ میں اُس مندر سے جہاں لوگ اپنے آپ کو پاک کرنے کے لئے جاتے ہیں، ناپاک ہو کر نکلی۔ پھر میرا باپ مجھے ایک آشرم میں چھوڑ آیا۔ تم جانتے ہو کہ آشرم کیا ہوتا ہے۔ وہاں مجھ جیسی بیوہ لڑکیوں کو اس طرح رکھا جاتا ہے کہ

اُنہیں باہر کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی، لیکن آشرم کے کرتا دھرتا آدمی اور بڑا پنڈت ان لڑکیوں سے عصمت فروشی کا باقاعدہ کاروبار چلاتا ہے۔ میں نے آشرم میں چھ مہینے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ وہاں مجھے مارا پیٹا گیا پھر بھی میں اُن کے راستے پر نہ چلی۔ آخر ایک روز وہاں سے بھاگ آئی۔ گھر آئی تو باپ نے مارا پیٹا بھی اور میرے ساتھ بول چال بند کر دی۔"

"دہشت گردوں کے پاس تم خود آئی تھیں؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "مجھے ادھر گھسیٹا گیا۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ تمہاری کوئی زندگی نہیں رہی۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس پر چلو گی تو تمہارے سارے پاپ کٹ جائیں گے۔ میں جب ان میں شامل ہوتی تو میں نے محسوس کیا کہ وقت گزارنے کے لئے یہ اچھی مصروفیت ہے۔"

"یہ لوگ بھی تمہارے ساتھ پنڈتوں والا سلوک کرتے ہوں گے" — سلطان نے کہا — "تم آخر خوبصورت اور جوان لڑکی ہو۔"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "یہ کچھ اور قسم کے لوگ ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تم ان کے ساتھ مطمئن اور خوش ہو" — میں نے کہا۔

"بالکل نہیں" — لاجونتی نے کہا — "میری جوانی اگر ڈھل گئی ہوتی تو میں اس کام میں خوش رہتی، لیکن تم میری عمر دیکھ رہے ہو۔ میں اپنی اس خواہش کو کہ میرا اپنا ایک گھر ہو، خاوند ہو، بچے ہوں، کیسے دبا سکتی ہوں۔ شاید ایسے انسان ہوتے ہوں گے جو اپنی فطرت کا گلا گھونٹ دیتے ہوں گے، میں فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوتی جا رہی ہوں۔ میں نے خودکشی کی بات اس لئے کی تھی کہ میرا کوئی مستقبل نہیں۔ اگر ہے تو یہی ہے کہ میں قابلِ نفرت انسان بنی رہوں اور پردے پردے میں کسی کو اپنا آشنا بنا لوں۔"

"اگر کوئی مسلمان تمہیں پسند کر لے تو کیا تم اپنا مذہب چھوڑ کر اُس کے ساتھ شادی کر لو گی؟" — سلطان نے پوچھا۔

"ایک مسلمان نے مجھے پسند کیا تھا" — لاجونتی نے کہا — "وہ میری محبت کا دم بھرتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں مسلمان ہو جاؤں گی اور وہ میرے ساتھ شادی کرے لیکن وہ مجھے بیوی نہیں داشتہ بنانا چاہتا تھا ... سب جانتے ہیں کہ جو لڑکی دو سال سے بیوہ ہے وہ چال چلن کی صاف نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسی وجہ ہے کہ میرے ساتھ کوئی مسلمان، عیسائی یا سکھ شادی نہیں کرتا۔ میں کہتی ہوں میرے ساتھ کوئی شادی کرے تو ساری عمر اُس کی جوتیاں چاٹتی رہوں گی۔"

"اگر میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہوں تو راضی ہو جاؤ گی؟" — سلطان نے پوچھا۔

میں نے ذرا چونک کر سلطان کی طرف پھر لاجونتی کی طرف دیکھا۔ سلطان کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ میں اُس کی اُستادی سمجھ گیا۔ وہ لاجونتی کو شادی کا جھانسہ دے کر اُس سے راز کی باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ لاجونتی کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس کے سوا اُس کا کوئی ردِ عمل نہیں تھا۔

"مذاق نہ کرو" — لاجونتی نے کہا — "میں نے ٹھیک سنا تھا کہ پولیس والوں کے دل میں جذبات ہوتے ہی نہیں۔ تم ایک مظلوم لڑکی کے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔"

"لاجونتی!" — سلطان نے کہا — "اگر ہم میں جذبات نہ ہوتے تو جس طرح تم نے اپنے آپ کو پیش کیا تھا، ہم انکار نہ کرتے بلکہ انتظار ہی نہ کرتے کہ تم خود اپنے آپ کو پیش کرو۔ میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم میرے ساتھ وفا کرو گی یا نہیں۔ کہتے ہیں ہندوؤں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔"

"سچ پوچھتے ہو؟" — لاجونتی نے کہا — "مجھے ہندوؤں سے نفرت ہو گئی ہے۔ وجہ بتا چکی ہوں۔ اگر تم مذاق نہیں کر رہے تو میں تیار ہوں۔ جب کہو گے آ جاؤں گی۔"

"اپنے لیڈروں کے نام اور پتے بتا دو" — سلطان نے کہا —

"اپنے گھر کا پتہ بتا دو ... یہ بھی سوچ لو کہ ہم خفیہ ذریعے سے معلوم کر لیں گے کہ تم نے اپنا گھر اور دوسروں کے گھر صحیح بتاتے ہیں۔"

"پھر شادی کا دھوکہ دینے کی کیا ضرورت تھی؟" — لاجونتی نے اُداس سے لہجے میں کہا — "یہ میں جانتی تھی کہ تم مجھ سے یہی پوچھو گے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ تم اگر پکڑی گئیں تو پولیس تمہیں دھمکیاں دے گی، لالچ بھی دے گی اور ہم سب کے نام پتے پوچھے گی۔ تمہاری بہادری یہ ہو گی کہ اپنے دیس پر قربان ہو جانا کسی کا نام نہ بتانا ... تم دھمکیاں دے چکے ہو، اب شادی کا لالچ دیتے ہو۔"

"پولیس صرف دھمکیاں نہیں دیا کرتی" — میں نے کہا — "اگر چاہتی ہو تو ہم تمہیں گرفتار کر لیتے ہیں اور آدھی رات تک تمہیں پتہ چل جائے گا کہ پولیس صرف دھمکیاں اور لالچ نہیں دیا کرتی۔"

سلطان نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا اور میں باہر نکل گیا۔ یہ بھی پولیس کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے کہ اس قسم کے ملزم کے پاس صرف ایک تفتیشی افسر رہتا ہے اور وہ ایک خاص انداز سے پوچھ گچھ جاری رکھتا ہے، پھر دوسرا جاتا ہے اور وہ مختلف انداز سے تفتیش کرتا ہے۔ سلطان نے وہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ یہ تو میں مان نہیں سکتا تھا کہ سلطان واقعی اس ہندو لڑکی کے ساتھ شادی کر لے گا۔

عام ذہن کے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اُسے ڈرا دھمکا کر اور تشدد سے تمام باتیں پوچھ سکتے تھے۔ اگر ہم پوچھ لیتے تو کیا ہو جاتا؟ ان سب کو گرفتار کر لیتے تو کس الزام پر ان کے خلاف مقدمہ چلاتے؟ اس لڑکی کو گرفتار کرتے تو یہ کہہ دیتی کہ میں اور سلطان اسے زبردستی اپنے کمرے میں گھسیٹ لاتے ہیں اور اسے خراب کرنا چاہتے ہیں۔ جاسوسوں اور تخریب کاروں کو عین موقعہ پر پکڑا جاتا ہے اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ ان کے گروہ کے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو کسی جگہ اکٹھا ہونے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اگر ہم اس لڑکی پر اعتبار کر لیتے اور یہ مختلف نام بتا دیتی تو ہو سکتا تھا کہ یہ ذاتی دشمنی کی وجہ سے ایک دو غلط آدمیوں

کے نام بتا دیتی۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ اس گروہ کا خفیہ اڈہ معلوم ہو جاتے اور مزید خفیہ معلومات مل جائیں۔

میں نصف گھنٹے سے زیادہ دیر باہر گھومتا پھرتا رہا۔ آخر سلطان باہر آیا اور اُس نے مجھے بلایا۔

"تم یہیں ٹھہرو" —— سلطان نے مجھے کہا —— "اسے چھوڑ آؤں۔"

وہ لاجونتی کو ساتھ لے کر چلا گیا اور میں بیوقوفوں کی طرح مُنہ دیکھتا وہیں کھڑا رہا۔ مجھے سلطان پر ایسا شُبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ لاجونتی کی خوبصورتی کا شکار ہو رہا ہے۔ وہ سروس میں مجھ سے سینئر تھا۔ میں تو سیدھا بھرتی ہو گیا تھا۔ سلطان پہلے ہی پولیس میں اے۔ ایس۔ آئی تھا۔ اُسے اسی عہدے میں بھرتی کیا گیا تھا۔ اُس کی سروس دو اڑھائی سال ہو گئی تھی جب اُس کی ذہانت اور جسمانی چُستی کو دیکھتے ہوتے اُسے سپیشل برانچ میں لے لیا گیا تھا۔ عمر میں وہ مجھ سے تین ساڑھے تین سال بڑا تھا۔ عمر اور تجربے کے لحاظ سے میں اُسے اپنا اُستاد سمجھتا تھا۔ خدا نے اُس کی شکل و صورت میں بھی کشش پیدا کی تھی اور اُس کی زبان میں تو جادو کا اثر تھا۔

اُس کی اِن خوبیوں کو دیکھتے ہوتے میں اُس کی کسی بات یا عمل کو غلط نہیں کہہ سکتا تھا اور وہ اتنے پختہ کردار کا آدمی تھا کہ لاجونتی سے مات نہیں کھا سکتا تھا۔

❊

وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آیا۔ بہت خوش نظر آتا تھا۔

"شادی طے ہو گئی؟" —— میں نے ہنستے ہوتے پوچھا۔

"ہو گئی جی ہو گئی" —— سلطان نے کہا —— "اُس نے اپنے گھر کا اور چار اور آدمیوں کے پتے دے دیتے ہیں۔ اب یہ معلوم کرانا ہے کہ یہ پتے صحیح بھی ہیں یا نہیں۔"

"وہ تو کرا لیں گے" —— میں نے کہا —— "لیکن اُسے تم چھوڑ آتے ہو۔ وہ پھر تو نہیں رہے گی؟"

"ایک جُوا کھیلا ہے" —— سلطان نے کہا —— "کل شام کے بعد اُس نے مجھے ملنے کا وعدہ کیا ہے" —— سلطان نے مجھے وہ جگہ بتائی جہاں اُن کی ملاقات طے ہوتی تھی۔

"مارے جاؤ گے سلطان!" —— میں نے کہا —— "اس جال میں نہ آؤ۔"

"اُس کے ساتھ میری بہت باتیں ہوتی ہیں" —— سلطان نے کہا —— "وہ تو روتی رہی ہے۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ہم نے اُسے چھوڑ دیا ہے۔ اُسے خوش ہونا چاہیتے تھا لیکن وہ رو رہی تھی۔ یہاں تو اُس نے اتنی زیادہ باتیں نہیں کی تھیں۔ باہر جا کر اُس نے ایک ہی رَٹ لگاتے رکھی کہ مجھے مسلمان کر لو، میرے ساتھ شادی کر لو۔ ایک بار تو اُس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ لڑکی مجبور ہے، ویسے وہ اخلاق والی معلوم ہوتی ہے۔"

"سلطان یار!" —— میں نے کہا —— "مجھے تمہارے اخلاق پر شُبہ ہونے لگا ہے۔ مجھے تمہارے اخلاق کا کوئی غم نہیں۔ وہ تباہ ہوتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہیں تم اپنے آپ کو تباہ نہ کر بیٹھو۔"

"نہ بھائی! میں اتنا کچا تو نہیں" —— سلطان نے کہا —— "یہ میرے پھانسے کا نتیجہ ہے کہ اُس نے اپنے اور اتنے سارے آدمیوں کے گھروں کی نشاندہی کر دی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ میں سلطان احمد کے اس طریقہ کار کو خطرناک سمجھ رہا تھا۔ سلطان احمد نے مجھے یقین دلایا کہ وہ اس گروہ کی جڑوں میں اسی لڑکی کی مدد سے اُتر جاتے گا۔

صبح ہوتی تو ہم نے اپنی برانچ کے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو یہ سارے نام اور پتے دیتے اور کہا کہ وہ معلوم کر کے آتے کہ یہ صحیح ہیں یا غلط۔ ہیڈ کانسٹیبل کو ہم نے اچھی طرح سمجھا دیا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ وہ پولیس کا آدمی ہے اور یہ بھی پتہ نہ چلے کہ ان گھروں کے پتوں کی تصدیق کرائی جا رہی ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل کی زیادہ تر سروس سی آئی ڈی کی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اس طرح کی تصدیق کس

طرح کرائی جاتی ہے۔

میں اور سلطان اپنے دفتر چلے گئے۔ دن کے پچھلے پہر ہیڈ کانسٹیبل نے آکر ہمیں بتایا کہ جن لوگوں کے یہ نام ہیں اُن کے پتے بھی ہیں۔ لاجونتی نے اپنے باپ کا نام لکھوایا تھا۔ اُس کا پتہ بھی صحیح نکلا۔ ہیڈ کانسٹیبل یہ تمام گھر دیکھ آیا تھا۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ان آدمیوں کو گرفتار کرنے کا یا ان کے گھروں پر چھاپہ مارنے کا ہمارے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ اس کے علاوہ کوئی کارروائی فوری طور پر نہ کرنے کی وجہ بھی میں بتا چکا ہوں۔ ہم اُس جگہ کی تلاش میں تھے جہاں یہ لوگ اپنے پلان بنانے کے لئے اکٹھے ہوتے تھے۔

اُس رات سلطان لاجونتی کے وعدے کے مطابق کمرے میں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد واپس آیا۔ میں نے خاص طور پر دیکھا کہ اُس کے چہرے پر ایسی رونق تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"کچھ حاصل ہُوا؟" — میں نے پوچھا۔

"ہو جائے گا" — اُس نے جواب دیا — "مجھے شک ہونے لگا ہے کہ اسے اس گروہ کا خفیہ ٹھکانہ معلوم ہے لیکن ڈرتی ہے کہ وہ پکڑے گئے تو اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"اگر تم میں عقل ہے" — میں نے سلطان سے کہا — "تو تم نے لاجونتی سے ضرور پوچھا ہوگا کہ اُس نے کل اپنے لیڈروں کو کیا بتایا تھا کہ وہ ہم دونوں کو لاتی لاتی خود کہاں غائب ہو گئی تھی۔"

"یہ بات تو اُس سے سب سے پہلے پوچھی تھی" — سلطان نے کہا — "اُس نے بتایا کہ اُسے ادھر بھیجنے والے اُس کے لئے بہت پریشان تھے۔ اُنھوں نے اسے ہمارے ساتھ آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اُنہیں بتایا کہ اس نے ہمیں کسی اور چکر میں لاکر اپنے جال میں پھانس لیا ہے اور وہ ہمیں ورغلا کر ایک نہ ایک دن اُن کے پاس لے جائے گی .... لڑکی ہوشیار ہے۔ آنکھوں میں دُھول جھونکنا جانتی ہے۔"

"مجھے اب بھی شک سا ہے سلطان!" — میں نے کہا — "چونکہ تم اکیلے اُس سے ملتے ہو اس لئے تم ہی بہتر سمجھتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ کھیل رہی ہے یا تم نے اُسے اپنے جادو میں لے رکھا ہے۔ میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ہوشیار ہو کر رہنا۔ اگر پسند کرو تو میں بھی تمہارے پیچھے پیچھے، لاجونتی کو پتہ لگے بغیر آجایا کروں۔"

"نہیں" — سلطان نے جواب دیا — "میں ایسی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔"



سلطان سات آٹھ راتیں مسلسل اُس سے ملتا رہا۔ ایک روز وہ آیا تو اس طرح خوش تھا جیسے وہ کوئی مُلک فتح کر کے آیا ہو۔ وہ آتے ہی مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

"آج میدان مار لیا ہے" — اُس نے کہا اور جیب سے مٹی کی ایک ڈِسک نکال کر مجھے دکھائی۔ کہنے لگا — "یہ دیکھو۔ اُس نے اپنے گروہ کے ٹھکانے کا دروازہ کھول دیا ہے۔"

میں نے اس ڈِسک کو دیکھا۔ یہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی رام سروپ کے اٹیچی کیس سے برآمد ہوئی تھی۔ اس پر بھی حرف "دھ" کندہ تھا۔

"یہ تو وہی ہے" — میں نے کہا۔

"بالکل وہی" — سلطان احمد نے کہا — "لاجونتی اب مکمل طور پر میرے قبضے میں ہے۔ اُس نے تصور میں میرے ساتھ شادی کر لی ہے۔ آج ہی کی بات ہے کہ اُس نے کہا، سلطان شادی کی کیا ضرورت ہے؛ یہ دلوں کا میل ہوتا ہے۔ مذہب بھی دل کا ہی معاملہ ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلی چلتی ہوں۔ میں دل سے اپنے آپ کو مسلمان اور تمہاری بیوی تسلیم کر چکی ہوں۔"

"تم نے اُسے خاوند بن کر دکھا دیا ہوگا" — میں نے کہا۔

"نہ یار!" — سلطان نے کہا — "ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے اپنی نیّت کو اپنے قبضے میں رکھا ہُوا ہے۔ جس روز میں لاجونتی جیسی کسی عورت کا بغیر

نکاح کے خاوند بن گیا اُس روز سلطان تو زندہ رہ جاتے گا لیکن سی آئی ڈی کا سب انسپکٹر اور سراغرساں مر جاتے گا.... تم یہ سنو کہ میں کیا خزانہ لے کر آیا ہوں.... اس گروہ کے کسی آدمی سے کسی دوسری جگہ کا رہنے والا اسی گروہ کا ممبر ملنا چاہے وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں تو وہ اپنا تعارف اِس ڈِسک کے ذریعے کرلتے ہیں۔ ان میں سے ایک آدمی کو کوئی جگہ بتا کر یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں جاکر وہ اِس ڈِسک کو اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں آہستہ آہستہ اُچھالتا رہے جس طرح بعض لوگ عادتاً چابی ہاتھ میں اُٹھاتے اس کے ساتھ کھیلتے رہتے ہیں۔ ایک آدمی اُس کے قریب آکر لیسے کھڑا ہو جاتے گا جیسے کسی کے انتظار میں آن رُکا ہو اور ڈِسک والے کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ وہ آدمی آہستہ سے کہے گا —— 'معلوم نہیں ڈاک خانہ کدھر ہے' —— ڈِسک والا جواب دے گا —— 'زیادہ دُور نہیں' —— اس کے بعد وہ اکٹھے چلے جائیں گے.... ان لوگوں نے اپنے دستی بم بھی بنا کر رکھے ہوتے ہیں"۔

یہ اس گروہ کے خفیہ (کوڈ) الفاظ تھے۔ یہ اتنا قیمتی راز ہوتا ہے جو کسی قیمت پر نہیں بتایا جاتا۔ لاجونتی نے یہ سلطان کو بتا دیا تھا۔

"سلطان!" —— میں نے کہا —— "میں تو اب بھی خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم جاؤ اور جس آدمی سے ملو وہ تمہیں اپنے ساتھ اُسی انجام کو لے جاتے جہاں لاجونتی لے جانا چاہتی تھی"۔

"تم نے لاجونتی کی بے تابی نہیں دیکھی" —— سلطان نے کہا —— "مجھے ایسے ملتی ہے جیسے ماں کو کئی دنوں کا کھویا ہوا بچہ مل گیا ہے۔ وہ تو میرے لئے پاگل ہوتی جا رہی ہے"۔

"میں نے بھی لڑکیوں کی بے تابیاں دیکھی ہیں" —— میں نے کہا —— "بہرحال اگلا قدم تم اکیلے تو نہیں اُٹھاؤ گے"۔

"ہاں ہاں" —— سلطان نے کہا —— "صبح وِلکاکس صاحب اور ایس پی صاحب کو پوری رپورٹ دیں گے۔ اس گروہ میں داخل ہونے کی سکیم تو وہی بنائیں گے"۔

صبح ہم دفتر گئے تو انسپکٹر وِلکاکس کو یہ پوری رُوداد سنائی۔ لاجونتی کے متعلق بھی سب کچھ بتایا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ سلطان کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔

"صاحب بہادر!" —— میں نے کہا —— "ہو سکتا ہے کہ لاجونتی کا یہ فیصلہ چالبازی ہو۔ یہ سلطان کے لئے بلکہ میرے لئے بھی خطرہ ہوگا"۔

"فکر نہ کرو" —— انسپکٹر وِلکاکس نے کہا —— "تم دونوں اکیلے نہیں ہو گے... جالسن صاحب کے پاس چلو"۔

ہم دونوں نے وہی کہانی جو وِلکاکس کو سُنائی تھی، ایس پی جالسن کو سُنا دی۔ وہ تجربہ کار پولیس آفیسر تھا۔ اُس نے دنیا کے یعنی مجرموں کی دنیا کے بڑے کردار اور بہت سے رنگ دیکھے تھے۔ اُس نے بال کی کھال اُتارنی شروع کر دی۔ اُسے بھی یہی شک تھا کہ لاجونتی دھوکہ دے رہی ہے۔ آخر اُس نے اپنی ہر طرح سے تسلی کر لی۔

"اس مہم میں تم دونوں نہیں ہو گے" —— ایس پی جالسن نے کہا —— "اور سب انسپکٹر اللہ داد کو بھی اس میں شامل نہیں کیا جاتے گا۔ یہ گروہ تم تینوں کو پہچانتا ہے.... انسپکٹر وِلکاکس! تم کسے بھیجنا چاہو گے!"

"کوئی مسلمان ہی ہو گا" —— وِلکاکس نے کہا —— "یہ گروہ ہندوؤں کا ہے اس لئے اس مہم میں کسی ہندو افسر کو شامل نہیں کرنا چاہیے" —— اُس نے ذرا سوچ کر —— "اے۔ ایس۔ آئی عتیق بہتر رہے گا"۔

"وہ اسی علاقے کا رہنے والا ہے" —— سلطان نے کہا —— "ہندوؤں کی طرح بول سکتا ہے اور ان کے مذہب اور طور طریقوں سے بھی واقف ہے"۔

اے۔ ایس۔ آئی عتیق الرحمان کو اُسی وقت بلا لیا گیا۔ عقلمند آدمی تھا۔ اگر وہ فلمی دنیا میں یا کسی تھیٹر کمپنی میں چلا جاتا تو کامیاب ایکٹر ہوتا۔ ایس پی جالسن اور انسپکٹر وِلکاکس نے اُسی وقت سکیم تیار کر لی اور جن آدمیوں نے اِس میں شامل ہونا تھا انہیں بلا لیا گیا۔ انہیں تفصیل سے بتایا گیا کہ یہ کیا اپریشن ہے اور کس آدمی کی کیا ڈیوٹی ہے۔ سلطان احمد کو حکم ملا کہ وہ عتیق کو ڈِسک اور

کوڈ الفاظ اچھی طرح سمجھا دے۔

وہ دن احکام، ہدایات اور ریہرسل میں گزر گیا۔ ریہرسل کی ضرورت عتیق کو بھی کیونکہ خطرناک کام اُسی نے کرنا تھا۔ باقی آدمیوں نے عتیق کی حفاظت کے لئے اور آخر میں چھاپہ مارنے کے لئے پرائیویٹ کپڑوں میں اُس جگہ کے اردگرد رہنا تھا۔

اُس رات بھی سلطان لاجونتی سے ملنے چلا گیا۔ واپس آکر اُس نے بتایا کہ لاجونتی بہت پریشان تھی۔ گروہ کے دو لیڈروں نے اُسے ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی تھی کہ وہ سُستی اور کوتاہی کر رہی ہے۔ وہ اُسے کہتے تھے کہ ہم دونوں کو وہ جلدی لاتے۔ لاجونتی جھوٹ بول بول کر اُنہیں تسلیاں دے رہی تھی۔ اب وہ سلطان سے کہتی تھی کہ شادی کرنی ہے تو بہت جلدی کرو۔

"کیا تم میرے گروہ کے آدمیوں کو پکڑنے کا بندوبست کر رہے ہو؟" —— لاجونتی نے سلطان سے پوچھا۔

"نہیں" —— سلطان نے جواب دیا —— "اگر اُنہیں پکڑا تو خطرہ ہے کہ وہ تم پر شک کریں گے اور تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ میں تمہاری خاطر ان لوگوں کو دل سے اُتار رہا ہوں ....اگر وہ لوگ تمہیں پریشان کرتے ہوں اور تم اُن سے انتقام لینا چاہتی ہو تو میں اُنہیں گرفتار کرا سکتا ہوں۔"

"رہنے دو سلطان!" —— لاجونتی نے کہا —— "میں تمہارے پاس آ جاؤں گی۔ اگر اُس وقت انہوں نے میرے خلاف کوئی کارروائی کی تو پھر تم ان کے خلاف جو کچھ بھی کر سکتے ہو کرنا۔"

یہ سلطان کی احتیاطی تدبیر تھی۔ اگر وہ لاجونتی کو بتا دیتا کہ وہ ان آدمیوں کو ایک دو دنوں میں پکڑ لیں گے تو لاجونتی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کسی نہ کسی کے ساتھ اس کا ذکر کر سکتی تھی۔

دو روز بعد اس مہم کی کارروائی شروع ہو گئی۔ بعد میں مجھے جو تفصیلات معلوم ہوئیں وہ اس طرح تھیں۔ عتیق ہندوؤں کے لباس میں اس گروہ کے ایک سرکردہ فرد کے پاس گیا۔ یہ لاجونتی سے معلوم کیا گیا تھا کہ جو اُس نے نام

بتاتے ہیں ان میں لیڈر قسم کا آدمی کون ہے۔ یہاں میں دو چیزوں کی وضاحت کروں گا۔ ایک ہے ہندوؤں کا لباس۔ آج کل ہندوؤں نے اپنا روایتی لباس پہننا کم کر دیا ہے۔ اُس زمانے میں ہندوؤں کی اکثریت ایک خاص قسم کی دھوتی باندھتی تھی۔ کُرتا لمبا ہوتا ہے اور سر پر خاص قسم کی کپڑے کی ٹوپی رکھتے تھے۔

دوسری بات جو میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں یہ تھی کہ دہشت گرد گروہوں میں زیادہ تر آدمی نوجوان یا جوانی کی عروج کی عمر کے تھے۔ ان میں سوچ کی گہرائی بہت کم تھی۔ وہ جوشیلے اور جذباتی تھے۔ پولیس اُن کے اسی وصف سے فائدہ اٹھاتی تھی۔

عتیق اس گروہ کی مخصوص ڈِسک اپنے ساتھ لے گیا۔ جس شخص سے اُس نے ملنا تھا وہ ایک جنرل سٹور میں مل سکتا تھا۔ یہ اُس کے باپ کی دکان تھی اور وہ بھی اسی دکان میں ہوتا تھا۔ اُس کی تعلیم ایف اے تک تھی۔ عتیق سٹور کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ لاجونتی نے اس آدمی کا حلیہ سلطان کو بتایا تھا۔ عتیق نے ڈِسک کو دونوں ہاتھوں میں باری باری اُچھالنا شروع کر دیا۔ اُس نے اپنا کھڑا ہونے کا انداز ایسا رکھا جیسے وہ کسی کے انتظار میں ہو۔ دو تین مرتبہ دکان کے اندر کی طرف دیکھا۔ اُسے ایک جواں سال آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ اُس آدمی نے باہر دیکھا۔ اُس وقت عتیق اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ عتیق نے اُس شخص کے چہرے پر بڑا نمایاں تاثر دیکھا۔ وہ باہر آ گیا اور عتیق کے پاس آکر رُک گیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"معلوم نہیں ڈاک خانہ کدھر ہے" —— عتیق نے ایسے کہا جیسے اپنے آپ کے ساتھ بات کی ہو۔

"زیادہ دُور نہیں" —— اُس جواں سال آدمی نے کہا۔

"دھرمیندر!" —— عتیق نے کہا۔

اس جواں سال دکاندار کا نام دھرمیندر تھا۔ وہ عتیق کی طرف مڑا تو عتیق نے اپنا نام پرشوتم بتایا۔ دھرمیندر نے عتیق کے ہاتھ میں ڈِسک دیکھ لی تھی جو

دراصل عتیق نے اُسے خاص طور پر دکھائی تھی۔ دھرمیندر دکان میں کسی کو یہ کہہ کر کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے کہیں جا رہا ہے، عتیق کے ساتھ چل پڑا۔

"آپ کہاں سے آرہے ہیں؟" — دھرمیندر نے پوچھا۔

"یہ پوچھنے اور بتانے کی ضرورت نہیں" — عتیق نے بارُعب لہجے میں کہا جیسے وہ بڑا لیڈر ہو — "میں بہت جلدی میں ہوں اور بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔"

وہ چلتے گئے اور ایک ایسی سڑک پر جا نکلے جہاں آتے جاتے لوگ بہت ہی کم تھے۔

"دیکھو دھرمیندر!" — عتیق نے کہا — "تم لوگوں نے جو بم بنا کر رکھے ہوتے ہیں وہ ناقص ہیں۔ میں ایک نمونہ لایا ہوں۔ اس کا طریقہ بھی بتا دوں گا اور چیزیں بھی لکھوا دوں گا۔ یہ خیال رکھو کہ یہاں کے تین آدمی اور ایک لڑکی پکڑے گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ رازداری سے کام نہیں لیتے اور جذباتی ہو کر بے عقلی کی حرکتیں کرتے ہو .... تم لوگ ایک اور خطرناک غلطی کر رہے ہو۔ لاجونتی کون ہے؟"

"ایک بیوہ لڑکی ہے" — دھرمیندر نے جواب دیا۔

"اور تم اُسے سی آئی ڈی کے آدمیوں کو پھانسنے کے لئے استعمال کر رہے ہو؟" — عتیق نے کہا — "اُسے روک دو۔ وہ کسی بھی وقت پکڑی جا سکتی ہے۔ وہ آخر لڑکی ہے۔ پکڑی گئی تو تمام آدمیوں کے نام پتے بتا دے گی۔"

"روک دیں گے" — دھرمیندر نے جواب دیا — "پرشوتم جی! میں بڑی مشکل میں پھنسا ہُوا ہوں۔ ہمارے آدمی بعض اوقات لیڈر کے حکم کے بغیر اُوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔"

"مجھے اُن کے نام بتاؤ" — عتیق نے کہا — "اب مجھے یہ بتاؤ کہ ہمارے یہاں کے دوست کتنی جلدی اور کہاں اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ میں اُنہیں نیا بم دکھاؤں گا۔ بم میرے تھیلے میں ہے۔ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ لگیں گے۔ میں اس جگہ

کا واقف نہیں۔ مجھے وہ جگہ دکھا دو جہاں سب نے اکٹھے ہونا ہے۔ میں اِدھر اُدھر انتظار کروں گا اور تم جس قدر جلدی ہو سکے اور جتنے زیادہ آدمی ہو سکیں وہاں اکٹھے کر لو۔"

"جگہ ذرا دُور ہے" — دھرمیندر نے کہا — "تانگہ پکڑ لیتے ہیں۔"

وہ تھوڑی دُور آگے گئے تو اُنہیں ایک تانگہ مل گیا۔ دھرمیندر نے تانگے والے کو بتایا کہ کہاں تک جانا ہے۔ دونوں تانگے میں بیٹھے اور شہر کے ایک ایسے حصّے میں چلے گئے جہاں مزدور قسم کے لوگ رہتے تھے۔ دھرمیندر نے اُن تین سائیکل سواروں کی طرف توجہ نہ دی جو عام سے لباس میں تانگے سے تھوڑی دُور پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ تانگہ رُکا تو تینوں سائیکل سوار تانگے کے قریب سے گزر کر آگے چلے گئے۔ دھرمیندر تانگے والے کو پیسے دینے لگا تو عتیق نے اُسے یہ کہہ کر روک دیا اور خود پیسے دیئے کہ اخراجات میرے ذمے ہیں۔ تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔

دھرمیندر نے عتیق کو ایک مکان دکھایا اور کہا کہ آدمی وہاں آجائیں گے۔ دھرمیندر چلا گیا اور عتیق وہاں ٹہلنے لگا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس میں اُس نے بم ڈال رکھا تھا اور اسی میں اس کا ریوالور تھا جس میں چھ گولیاں بھری ہوتی تھیں۔

✖

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک تانگہ وہاں آکر رُکا۔ اس میں چھ آدمی سوار تھے۔ اُن کی عمریں بیس سے تقریباً چھبیس سال تک تھیں۔ وہ سب اُس مکان میں چلے گئے۔ چند منٹ بعد عتیق بھی اندر چلا گیا۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ یہ مہم اتنی آسان ہو گی۔ اُسے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ وہ کہیں خود ہی تو اس جال میں نہیں پھنس رہا۔ اُسے یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔ اُس کے پاس ریوالور تھا اور کم و بیش پندرہ کانسٹیبلوں کی گارد جن کے ساتھ ایک اے۔ ایس۔ آئی تھا کہیں موجود تھی۔ تین سائیکل سوار پولیس کے ہی آدمی تھے جو عتیق کے ساتھ ساتھ آتے رہے تھے۔

عتیق اندر گیا تو دیکھا کہ ایک نہایت معمولی سا مکان ہے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس مکان میں کوئی کنبہ نہیں رہتا۔ غالباً ایک آدمی وہاں موجود ہوگا۔ عتیق کے اندر جاتے ہی ایک آدمی نے اندر سے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور وہ عتیق کو ایک کمرے میں لے گیا جہاں سات آدمی تھے۔ چھ تو تانگے پر آئے تھے اور ایک پہلے ہی موجود تھا۔

"اپنا بنایا ہُوا ایک بم دکھاؤ" —— عتیق نے کہا۔

ایک آدمی اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا اور ٹین کا گول سا ایک ڈبہ اُٹھا لایا۔ عتیق نے اسے ہاتھ میں لے کر ہر طرف سے دیکھا۔

"ایسے کتنے بنا چکے ہو؟" —— عتیق نے پوچھا۔

"چھ بالکل تیار ہیں" —— ایک نے جواب دیا۔

"اور کیا کچھ ہے تمہارے پاس؟"

"دو شکاری بندوقیں ہیں" —— دھرمیندر نے جواب دیا —— "ہم کوشش کر رہے ہیں کہ بندوقیں اور ریوالور زیادہ اکٹھے کر لیں"۔

عتیق نے تھیلے میں سے ایک ڈبہ سا نکالا جو تقریباً تین انچ چوڑا اور چار ساڑھے چار انچ لمبا تھا۔ اُس نے یہ سامنے رکھ دیا۔

"یہ ہے وہ بم جو ہم نے بنایا ہے" —— عتیق نے کہا۔

"ٹھہرو دوستو!" —— ایک آدمی جو عمر میں ان سب میں بڑا معلوم ہوتا تھا، بولا —— "پرشوتم جی! آپ آتے کہاں سے ہیں؟"

"میں دھرمیندر کو بتا چکا ہوں کہ یہ پوچھنا اور بتانا بالکل ضروری نہیں" —— عتیق نے جواب دیا۔

"کیا آپ اس شہر کے رہنے والے ہیں؟" —— اُس آدمی نے پوچھا۔

"نہیں" —— عتیق نے جواب دیا —— "بہت دُور سے آیا ہوں۔ اگر تمہیں شک ہے تو یہ تم بھی دیکھ لو"۔

اُس نے ڈِسک نکال کر سب کو دکھائی۔

چھوٹی عمر کے نوجوان اپنے اُس ساتھی کو جو عتیق سے سوال پوچھ رہا تھا، ٹوکنے لگے کہ وہ پرشوتم جی کو پریشان نہ کرے۔

"رام سروپ اسی بے احتیاطی کی وجہ سے پھانسی چڑھ گیا ہے" —— اُس آدمی نے کہا —— "ہمارے پاس باہر کے آدمی آتے ہیں تو سب سے پہلے بتاتے ہیں کہ وہ کہاں سے آتے ہیں .... پرشوتم جی! آپ یہ بتائیں کہ آپ کہاں سے آتے ہیں، صرف اُس لیڈر کا نام بتا دیں جس نے آپ کو بھیجا ہے"۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ میں نہیں بتاؤں گا" —— عتیق نے کہا۔

وہ آدمی جو عتیق سے تصدیق کروا رہا تھا، اُٹھا اور آہستہ آہستہ عتیق کی طرف بڑھا اور اُس کے سامنے آکر رُک گیا۔

"تم پولیس کے آدمی ہو" —— اُس شخص نے کہا —— "میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے .... اور تم ہندو نہیں، مسلمان یا عیسائی ہو" —— اُس نے دوڑ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور اندر سے زنجیر چڑھا دی۔ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا —— "دوستو! رام سروپ اور ہرچرن سنگھ کی پھانسی کا بدلہ لے لو۔ اس غدار کو ختم کرو اور کوٹھڑی کا فرش کھود کر لاش دبا دو"۔

اس کمرے کی ایک بھی کھڑکی نہیں تھی۔ دو روشندان تھے۔ ان سے روشنی آ رہی تھی۔

"پکڑ لو اسے!" —— اُس آدمی نے کہا۔

عتیق نے بڑی تیزی سے تھیلے میں سے ریوالور نکال لیا۔

"میں سی۔آئی۔ڈی کا انسپکٹر ہوں" —— عتیق نے کہا —— "ایک بھی آدمی اپنی جگہ سے ہل کر دیکھے۔ سب دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ مُنہ دیوار کی طرف .... مُنہ دیوار کی طرف!"

ریوالور کی نالی اپنی طرف دیکھ کر سب دیوار کے ساتھ لگ کر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ سب کے مُنہ دیوار کی طرف تھے۔

"یہاں تمہارا اپنا بم رکھا ہُوا ہے" —— عتیق نے کہا —— "میں باہر نکل

کر اس پر ریوالور کی ایک گولی فائر کر دوں گا۔ تمہاری لاشیں اس مکان کے ملبے سے نکالی جائیں گی۔"

"ذرا ٹھہرو انسپکٹر صاحب!" ــــ اُسی جوان سال آدمی نے جس نے عتیق کو پہچان لیا تھا، پیچھے مڑ کر کہا ــــ "آپ بھی ہندوستانی ہیں۔ آپ انگریز تو نہیں، انگریزوں کے غلام ہیں۔ ہم آپ کو غلامی سے نکالنے کے لئے اپنے آپ کو خطروں میں ڈال رہے ہیں۔ ہم نے آپ کو کیا نقصان پہنچایا ہے؟ غدار نہ بنو۔ آپ کے آباؤ اجداد اس ملک کے بادشاہ رہ چکے ہیں۔ یہ ملک آپ کا ہے۔"

عتیق دروازے کی طرف پیٹھ کر کے پیچھے ہٹتا گیا اور بائیں ہاتھ سے زنجیر کھول دی۔ وہ باہر نکلا اور کواڑ بند کر کے باہر سے زنجیر چڑھا دی۔ صحن میں جا کر اُس نے ہوا میں ریوالور کی ایک گولی فائر کی اور دوڑ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ پندرہ کانسٹیبل دوڑے آتے۔ سائیکلوں والے کانسٹیبلوں نے اس گارڈ کو جا کر اطلاع دے دی تھی کہ عتیق ایک مکان میں چلا گیا ہے۔ وہ فوراً پہنچے اور مکان میں داخل ہو گئے۔

عتیق نے کمرے کا دروازہ کھولا اور تمام آدمیوں کو پکڑ لیا گیا۔ اب عتیق تفتیشی افسر بن گیا۔ مکان کی تلاشی لی گئی۔ دیسی ساخت کے چھ بم اور دو شکاری بندوقیں برآمد ہوئیں۔ ایک الماری میں سے ایک ہزار سے زیادہ پمفلٹ برآمد ہوئے۔ یہ انگریزی حکومت کے خلاف لکھے گئے تھے اور لوگوں کو بغاوت کے لئے بھڑکایا گیا تھا۔

مکان کو تالا لگا کر سربمہر کر دیا گیا اور تمام ملزموں کو سپیشل برانچ کے ہیڈ کوارٹر میں لے آئے۔ ہم نے بہت بڑا شکار مارا تھا۔ نیا بم جو عتیق اپنے ساتھ لے گیا تھا وہ صرف ڈبہ تھا اور اس میں مٹی بھری ہوئی تھی۔

✖

اُس شام سلطان نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"سکندر!" ــــ اُس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا ــــ "میں لاجونتی کے ساتھ شادی کر رہا ہوں۔"

میں نے حیران سا ہو کر اُس کے مُنہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں سکندر!" ــــ سلطان نے کہا ــــ "میں جانتا تھا تم حیران ہو گے۔ تم میرے عزیز دوست ہو۔ بھائی کہوں تو ٹھیک ہو گا۔ میں اتنے دن تمہارے ساتھ ایک جھوٹ بولتا رہا ہوں۔ میں ہر رات لاجونتی سے ملنے جایا کرتا اور تمہیں بتایا کرتا تھا کہ میں اُس سے راز لینے کی کوشش کر رہا ہوں اور میں اُسے شادی کا جھانسہ دے رہا ہوں .... نہیں سکندر! یہ جھانسہ نہیں، یہ میرا فیصلہ تھا۔ میں نے سراغرسانی تو دوسری ہی ملاقات میں کر لی تھی۔ باقی ملاقاتیں محبت کی ملاقاتیں تھیں۔ یہ لڑکی پہلے روز ہی میرے دل میں اُتر گئی تھی۔"

"تم تو عقل والے ہو سلطان!" ــــ میں نے کہا ــــ "کیا تمہارے لئے یہی لڑکی رہ گئی ہے؟ تم اپنے رشتہ داروں میں کیوں نہیں شادی کرتے؟ اپنے جیسے کسی معزز خاندان کی کنواری لڑکی کے ساتھ شادی کرو۔"

"میرا کوئی رشتہ دار نہیں" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں نے تمہیں کبھی بتایا نہیں۔ میں گھر سے بھاگا ہُوا یتیم بچہ ہوں۔ تمہاری طرح میں بھی ماں باپ کا اکیلا بیٹا تھا۔ میں بارہ سال کا تھا جب میرے والد صاحب فوت ہو گئے اور چھ سات مہینوں بعد والدہ بھی فوت ہو گئیں۔ مجھے اپنے ماموں نے پالا۔ اُس نے مجھے دس جماعتیں تو پڑھا دیں لیکن میری ساری جائیداد، میرا مکان بمع سامان اپنے قبضے میں لے لیا۔ اُس نے بہت زیادہ قیمت لی ہے سکندر! ....

"اگر مجھے ماموں کے گھر میں صرف پیار مل جاتا تو مجھے اپنی جائیداد کا دُکھ نہ ہوتا۔ وہاں میری حیثیت نوکر کی سی رہ گئی تھی۔ میں تمہیں سناؤں کہ میرے ساتھ کیا سلوک ہوتا تھا تو تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ چاہتے تھے کہ میں اس گھر سے بھاگ جاؤں۔ میرے دو ماموں زاد بھائی مجھے مارتے پیٹتے تھے۔ ایک روز تنگ آ کر میں گھر سے بھاگ کھڑا ہُوا۔ میں تو ان انگریزوں کو دعائیں دیتا ہوں جنہوں نے مجھے پولیس میں بھرتی کر لیا اور کانسٹیبل کی بجائے اے۔ ایس۔ آئی بھرتی کیا .... میں بھی تم جیسا ہوں سکندر!"

سلطان کو میں مطمئن اور مسرور سمجھا کرتا تھا۔ اُس نے اپنے گھر کے متعلق

کبھی نہیں بتایا تھا۔ اُس نے پہلی بار بتایا تو میرے آنسو نکل آئے۔ اُس کا دل میری طرح زخمی تھا۔ مجھے اپنے ماں باپ اور اپنا گھر یاد آگیا۔

"مجھے سچا پیار لاجونتی سے ملا ہے" ــــ سلطان نے کہا ــــ "اور وہ پیار کی ہی پیاسی ہے۔ یہ پیار کا ہی کرشمہ ہے کہ وہ اس گروہ کے متعلق جو کچھ جانتی تھی وہ اُس نے بتا دیا .... وہ کل رات اس کمرے میں ہو گی۔ وہ کہتی تھی کہ اپنا زیور اور بہت سی رقم بھی ساتھ لائے گی۔ میں نے اُسے منع کر دیا۔ یہ چوری ہو گی۔"

ایسے ہی ہُوا۔ اگلی رات لاجونتی ہمارے کمرے میں آگئی۔ دن کے وقت میں نے اور سلطان نے انسپکٹر وِلکاکس کے ساتھ بات کر لی تھی۔ سلطان نے جذباتی لہجے میں وِلکاکس کے ساتھ بات کی تھی۔ وِلکاکس بہت خوش تھا کہ ہم نے اُسے دہشت گردوں کا ایک گروہ پکڑوا دیا تھا۔ اُس نے سلطان کو لاجونتی کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دے دی اور فیملی کوارٹر دینے کا بھی وعدہ کیا۔

ایک مولوی کو بلا کر لاجونتی کو مسلمان کیا گیا پھر سلطان کے ساتھ اس کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ وہ دونوں کوارٹر میں چلے گئے اور میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔

سب انسپکٹر اللہ داد خان، عتیق اور ہمارے دو ساتھی افسروں نے مجھے کہا کہ سلطان نے پولیس والی عقل استعمال نہیں کی، جذبات سے فیصلہ کیا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو بہت بڑے خطرے میں ڈال دیا ہے۔

سلطان احمد لاجونتی کے ساتھ کوارٹر میں چلا گیا۔ میں اپنے کمرے میں تنہا رہ گیا۔ وہ رات جو سلطان کی شبِ عروسی تھی، میرے لئے شبِ غم بن گئی۔ سلطان میرا عزیز دوست تھا۔ وہ میری تنہا اور مہجور زندگی کا ساتھی تھا۔ میرے جذبات کا سہارا تھا۔ اتنے عرصے کی دوستی میں اُس نے ایک دو روز پہلے مجھے بتایا تھا کہ میری طرح وہ بھی دنیا میں تنہا اور مظلوم ہے۔ اُس کے اس انکشاف سے مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے ہم دونوں ایک ہی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوتے ہوں۔

وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ میرے شب و روز میں ایک خلا چھوڑ گیا ہے جو اُس کے سوا اور کوئی پُر نہیں کر سکے گا۔ میں نے اُس رات محسوس کیا کہ میں ایک خلا میں معلق ہو گیا ہوں اور اب اس خلا میں ہی بھٹکتا رہوں گا۔ لاجونتی حسین لڑکی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو وہ مجھے اچھی لگی تھی لیکن سلطان اُس کے ساتھ چلا گیا تو لاجونتی مجھے یُوں بُری لگنے لگی جیسے وہ سلطان کو مجھ سے چھین کر لے گئی ہو جیسے اُس نے سلطان کو میرے وجود سے نوچ لیا ہو۔ وہ تو مجھے پہلے سے زیادہ اچھی لگنی چاہیئے تھی کیونکہ اُس نے اسلام قبول کر لیا تھا مگر ایسا نہ ہُوا۔

کچھ ہی دیر پہلے سب انسپکٹر اللہ داد خان اور میرے دو تین ساتھی انسپکٹروں نے کہا تھا کہ سلطان نے اس ہندو لڑکی کے ساتھ شادی کر کے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال لیا ہے۔ یہ خطرہ مجھے بھی نظر آنے لگا لیکن یہ خیال بھی آیا کہ سلطان ایسا بُدھو اور اناڑی تو نہیں کہ اس ہندو لڑکی کے ہاتھوں پٹ جائے گا۔

میرے اس خیال کو میرے ایک اور خیال نے رَد کر دیا۔ سلطان آخر

جوان آدمی تھا اور میری ہی طرح وہ پیار کا ترسا ہُوا تھا۔ میں بھی گلشن آرا کے ساتھ رات کی تنہائی میں بھٹک گیا تھا۔ مجھ جیسے اور سلطان جیسے تشنہ آدمیوں کے جذبات کو وہی سمجھ سکتا ہے جو ہم جیسی تشنگی سے کبھی دوچار ہُوا ہو۔ یہ تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرا کردار سلطان کی نسبت زیادہ پختہ تھا اور خواجہ صاحب نے مجھے عورت کو اپنے آپ پر سوار کرنے سے روکا بھی تھا۔ پھر بھی میں اپنا راستہ گم کر بیٹھا تھا۔ سلطان کا ذہن تو اوسط درجے کا ذہن تھا جس میں اب پولیس کی ٹریننگ شامل ہو گئی تھی۔ اُس سے میں کردار کی پختگی کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہی سوچ کر مجھے یہ خطرہ شدّت سے محسوس ہونے لگا تھا کہ لاجونتی اسے پیار اور اپنے جسم کی دل کشی کے جادو میں لا کر کہیں پھنسا دے گی یا مروا دے گی اور یہ لاجونتی کی انتقامی کارروائی ہو گی۔

پھر خیال آتا کہ نہیں، سلطان اتنا کچا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے وہ رات یاد آتی جب لاجونتی کو ہم دونوں دھوکے میں اپنے کمرے میں لاتے تھے۔ لاجونتی نے جب اپنی بیوگی کی، اپنے ماں باپ اور دہشت گردوں کے سلوک کی داستان سنائی تھی تو وہ بہت روتی تھی۔ وہ پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اگر اُس نے دھوکہ دینا ہوتا تو شادی جیسے لمبے چکر کی کیا ضرورت تھی۔ سلطان اُسے ملنے تو جاتا ہی رہتا تھا۔ وہ اُسے اغوا کرا سکتی تھی، مروا سکتی تھی۔ پھر اُس نے پورے گروہ کی نشاندہی کر دی تھی۔

میں متضاد خیالوں اور سوچوں کی کشمکش میں پڑا رہا۔ میں محسوس کرنے لگا کہ میری اپنی جذباتی کیفیت اُکھڑ گئی ہے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ میرے ذہن میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ میں اپنی اس ذہنی کیفیت سے پریشان ہونے لگا۔ یہ پریشانی افسردگی بن گئی اور مجھے تنہائی کا احساس ڈسنے لگا۔ اس کیفیت میں مجھے شہناز یاد آ گئی۔ یاد بھی ایسے آئی جیسے وہی میری زندگی کی ساتھی ہو۔ میں اُس کے تصوّر میں گم ہونے لگا۔

"سکندر!" ــــ میں اس آواز پر چونک پڑا۔

دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ نظریں کمرے کی وسعت

میں گھوم گئیں۔ میں اکیلا تھا۔ آپ کو شاید کبھی ایسا تجربہ ہُوا ہو گا کہ آپ کو کسی نے پکارا ہے لیکن پکارنے والا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ یہ اپنے اندر کی آواز ہوتی ہے۔ میں بھی اسے اپنی آواز سمجھا۔ یہ آواز ایک خیال بن گئی۔

"کسے یاد کیا ہے تُو نے سکندر!" ــــ مجھے سوچ آئی ــــ "شہناز تیری زندگی کی ساتھی نہیں ہو سکتی۔ وہ تجھے چاہتی رہی ہے، اس لئے کہ وہ تنہا تھی اور تیرے رحم و کرم پر تھی۔"

"پھر اس تنہائی میں وہ مجھے کیوں یاد آتی ہے؟"

"کیونکہ وہ حسین عورت ہے" ــــ شاید یہ بھی میری ہی آواز تھی ــــ "تُو جوان ہے اور شہناز تجھ جیسے جوانوں کو پاگل کر دینے والی حسین عورت ہے۔"

بات کچھ ایسی ہی تھی ورنہ شہناز کے ساتھ میرا کیا رشتہ تھا۔ میں نے اُسے ذہن سے نکالنے کی کوشش کی تو مجھے ذرا زور لگانا پڑا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ شہناز میرے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ یہ تو میرے اندر کوئی ایسی قوت تھی جس کی نشاندہی دوسروں نے کی تھی کہ میں اپنے اُلٹے سیدھے خیالوں پر قابو پا لیا کرتا تھا۔ میں نے اس قوت کی موجودگی کو خود بھی محسوس کیا۔ اگر یہ نہ ہوتی تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔

میں لیٹتا تھا تو آنکھ لگ جاتی تھی مگر وہ رات آدھی گزر گئی تو بھی نیند نہ آئی۔

×

صبح سلطان نے مجھے جگایا۔ ڈیوٹی پر جانے کا وقت ابھی نہیں ہُوا تھا۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں ناشتہ اس کے گھر کروں۔ میں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹلنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔

"تم نے لاجونتی کا کوئی نام رکھا ہے؟" ــــ میں نے راستے میں پوچھا۔

"اُس نے مسلمان ہونے سے پہلے ہی اپنا نام رکھ لیا تھا" ــــ سلطان نے کہا ــــ "میں جب اُسے ملنے جایا کرتا تھا تو دو مرتبہ اُس نے کہا تھا کہ وہ مسلمان ہو جائے گی تو اپنا نام چاند بی بی رکھے گی۔ کہتی تھی کہ یہ نام اُسے بہت اچھا لگتا

ہے۔ میں نے اسی نام کو پکا کر دیا ہے لیکن میں نے اُسے کہا ہے کہ میں اُسے لاجو کہا کروں گا۔ یہ نام مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"رات کیسی گزری؟" — میں نے پوچھا۔

"یہ تو بڑی جذباتی لڑکی ہے سکندر!" — سلطان نے کہا — "بات بات پر اس کے آنسو نکل آتے تھے۔ ایک بار تو ایسی روئی کہ میں پریشان ہو گیا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر مجھے کہنے لگی کہ میں ایک دن کے لئے اُس کا رونا برداشت کر لوں۔ کہتی تھی کہ یہ خوشی اور اطمینان کا رونا ہے۔ وہ یہ بھی کہتی تھی کہ وہ ایسے محسوس کر رہی ہے جیسے بڑے ظالم قید خانے سے رہا ہوئی ہو۔ پھر وہ ہندوؤں کو اور پنڈتوں کو بُرا بھلا کہتی رہی۔"

سلطان کا کوارٹر دُور نہیں تھا۔ اُس نے بات لمبی شروع کر دی تھی۔ راستے میں وہ رُک گیا اور پوری بات سنائی۔ اُس نے بتایا کہ ایک بار تو لاجو نے سلطان کے پاؤں میں سر رکھ دیا۔

"مجھے جان سے مار ڈالنا" — لاجو نے سلطان کے پاؤں پر سر رکھ کر کہا — "دھوکا نہ دینا!"

"بیوقوف لڑکی!" — سلطان نے اُس کا سر اُٹھا کر جذباتی لہجے میں کہا — "دھوکا کیوں دوں گا۔ میں تمہیں دکھا دوں گا کہ ہندو اور مسلمان میں کیا فرق ہے.... تم پر جو بھی وہم سوار ہے وہ اُتار پھینکو۔"

"یہ وہم نہیں سلطان!" — لاجو نے کہا — "میں ایک ناپاک عورت ہوں۔ تم نے مجھے اسلام میں لا کر پاک تو کر دیا ہے لیکن میں یہ تو نہیں بھول سکتی کہ تین چار آدمیوں نے مجھے بلا اُجرت طوائف بنا لیا تھا۔"

"خدا کے لئے بھول جاؤ کہ آج رات تک کیا ہُوا تھا" — سلطان نے کہا — "اگر میں نے تمہارے ساتھ شادی کر کے نیکی کی ہے تو میری نیکی برباد نہ کرو اور اگر تم نے میری محبت کی خاطر اسلام قبول کیا ہے تو اپنی محبت کو مجروح نہ کرو۔"

وہ دونوں رات بھر جاگتے رہے۔ ذرا سی دیر کے لئے سلطان کی آنکھ

لگ گئی۔ لاجو نے اُسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ سلطان گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

"سلطان!" — لاجو نے اُس سے پوچھا — "میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟"

"کیا تم سو گئی تھیں؟" — سلطان نے پوچھا۔

"نہیں" — لاجو نے جواب دیا — "نیند نہیں آتی۔"

"سوؤ گی تو خواب آئیں گے نا!" — سلطان نے جھنجھلاتے ہوتے لہجے میں کہا — "جاگتے میں کیسے خواب دیکھو گی؟"

"نہیں سلطان!" — لاجو نے معصوم سے بچوں کی طرح کہا — "ایسے لگتا ہے جیسے یہ بڑا سہانا خواب ہے۔ میں اتنی خوش قسمت تو نہیں ہو سکتی۔"

"لاجو!" — سلطان نے کہا — "خوش قسمتی کا ماتم نہ کرو۔ اب تم مسلمان ہو۔ ہمارا خدا پتھر کا بنا ہُوا نہیں۔ تم ہمارے خدا کو چھُو نہیں سکو گی۔ اُسے محسوس کرو گی۔"

سلطان مجھے رات کی رُوداد سنا رہا تھا اور میں پولیس والوں کی طرح اُس کا ایک ایک لفظ اس طرح سن رہا تھا کہ لاجو کے کون سے الفاظ پر شُبہ کیا جا سکتا ہے۔ سلطان کی اتنی لمبی بات سے میں یہی سمجھ سکا کہ لاجو جس پناہ کے خواب دیکھتی تھی وہ اُسے مل گئی ہے اور وہ دھوکا نہیں دے گی۔

"پھر بھی سلطان!" — میں نے اُسے کہا — "ہوشیار رہنا۔ ہر وقت خاوند ہی نہ بنے رہنا۔ کبھی کبھی لاجو کے ساتھ باتیں کرتے سپیشل برانچ کے سب انسپکٹر بھی بن جایا کرنا..... مجھے انگریزوں کی بادشاہی کا غم نہیں یار! مجھے تمہارا غم ہے۔ یہ بھی نہ بھولنا کہ تم نے ایک ہندو لڑکی کو مسلمان کر لیا ہے۔ ہندو اس کے جواب میں کچھ نہ کچھ کریں گے۔ وہ تمہیں نہیں تو لاجو کو ہی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ وہ اسے اغوا کر سکتے ہیں۔ اسے ساتھ لے کر کہیں سیر سپاٹے کے لئے نہ نکل جانا۔"

"اللہ کو جو منظور ہو گا" — سلطان نے کہا — "میں نے لاجو کو اللہ

نام پر مسلمان کیا ہے۔ اللہ اپنے نام کی لاج تو ضرور رکھے گا ۔۔۔۔ جانے دو ان باتوں کو سکندر! میں احتیاط کروں گا۔ تم اب یوں کیا کرو کہ کھانا میرے گھر کھایا کرو۔ تمہارا ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا میرے گھر ہُوا کرے گا۔"

میں نے اُس کی یہ پیشکش قبول نہ کی۔ اُن کی ازدواجی زندگی میں مخل ہونا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اُس نے بہت اصرار کیا، بہت ضد کی لیکن میں نہ مانا۔ اُس کے گھر گیا تو لاجو نے بھی یہی ضد کی۔ میں نے اُس کی بھی ضد قبول نہ کی۔

"لاجو!" ــــ میں نے اُسے مذاق کے رنگ میں کہا ــــ "اِس سلطان کی کون سی خوبی تمہیں اچھی لگی ہے کہ اِس کے پیچھے تم نے اپنا مذہب ہی چھوڑ دیا ہے؟ میں نے تو اِس میں کوئی بات نہیں دیکھی۔"

میرا خیال تھا کہ لاجو مذاق کا جواب مذاق سے دے گی اور اگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا تو ہنس پڑے گی یا مسکرا دے گی یا شرما جائے گی لیکن اُس کے کھلے ہوئے چہرے پر سنجیدگی آگئی۔

"بھائی میرے!" ــــ اُس نے سنجیدہ لہجے میں کہا ــــ "مجھے وہ رات یاد ہے جب تم مجھے اپنے کمرے میں لاتے تھے۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم دونوں مجھے بہت خراب کرو گے۔ میں حیران ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو پیش بھی کر دیا تھا لیکن تم نے مجھ جیسی خوبصورت اور جوان عورت کو بُری نظر سے نہ دیکھا۔ میں جس طرح تمہارے پاس آئی تھی تم نے اُسی طرح مجھے بھیج دیا۔ تم دونوں مجھے اچھے کیوں نہ لگتے۔ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ میں کیسی زندگی گزار رہی ہوں لیکن تم نہیں سمجھ سکے تھے۔ وہ میں جانتی ہوں۔"

لاجو نے ناشتہ ہمارے آگے رکھا اور خود الگ بیٹھ گئی۔

"لاجو!" ــــ سلطان نے اُسے کہا ــــ "ہندوؤں والے طور طریقے چھوڑ دو۔ ہمارے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرو۔"

اُس نے سلطان کی طرف دیکھا تو اُس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔

"ہاں بھابی!" ــــ میں نے کہا ــــ "مسلمانوں میں یوں نہیں ہوتا۔ اپنا ذہن کھول دو۔"

وہ جھجکتی ہوئی ہمارے ساتھ ناشتے کے لئے بیٹھی۔

×

ہمارے ہیڈ کوارٹر میں، کانسٹیبلوں کی بارک اور ہندوستانی انسپکٹروں کے کمروں میں بہت دن سلطان اور لاجو کی شادی کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہاں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہیں یہ باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ سٹاف کے مسلمان یہ باتیں بڑھ چڑھ کر کرتے تھے۔ مجھے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اپنے سٹاف کے ہندو کانسٹیبل، ہیڈ کانسٹیبل اور انسپکٹر ہی سلطان کے خلاف کوئی زمیں دوز وار کر گزریں گے۔ ہندوؤں کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔

جن سات آدمیوں کو پکڑا گیا تھا، ان کا مقدمہ بھی سپیشل ٹریبونل کے پاس بھیجا گیا۔ ملزموں کی طرف سے بڑے قابل وکیل پیش ہوتے۔ انہوں نے قانون کے حوالے دے دے کر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ملزموں کی گرفتاری غیر قانونی ہے اور مکان کی تلاشی قانون کے مطابق نہیں ہوئی لیکن ٹریبونل نے ایک نہ سُنی اور بیس بائیس روز کی روز بروز سماعت کے بعد تمام ملزموں کو مختلف دفعات میں دس دس سال سزائے قید دے دی۔

مقدمے کے دوران مجھے شہناز کا خط ملا۔ خط مختصر تھا۔

"میرے پیارے سکندر! السلام علیکم۔ تمہارا وقت تو بڑا اچھا گزر رہا ہوگا، میں جہنم میں پڑی تڑپ رہی ہوں۔ ماں کی حالت تم دیکھ گئے تھے۔ اُس کی حالت ویسی ہی ہے۔ اگر یہ میری ماں نہ ہوتی تو میں اپنے ہاتھوں اس کا گلا گھونٹ دیتی۔ وہ بڑی غلیظ اور اذیت ناک بیماری میں مبتلا ہے لیکن اُس نے عبرت حاصل نہیں کی۔ مجھے کہتی ہے کہ کسی دولت مند آدمی کے ساتھ شادی کر لو۔ اُس کا مطلب یہ ہے کہ میں کسی دولت مند کو پھانس لوں اور جس طرح تمہارے اباجان کے گھر سے پیسے اپنے گھر پہنچاتی رہتی تھی اسی طرح اب بھی کروں۔ ماں نے ایک دولت مند آدمی میرے پیچھے ڈال دیا ہے اور میں بچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں تنہا

ہوں۔ میرے بھائیوں کو میری عزت کا کوئی خیال نہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ لوگوں نے میرے متعلق عجیب وغریب کہانیاں گھڑ لی ہیں۔ میں تو گھر سے نکلتی ہی نہیں۔ میری پُرانی سہیلیاں موجود ہیں لیکن اُن کے ماں باپ نے انہیں میرے گھر آنے سے منع کر دیا ہے۔ تم آؤ اور مجھے لے جاؤ۔ جہاں رکھو گے، جس حالت میں رکھو گے، میں رہوں گی۔ تم میری دستگیری نہیں کرو گے تو میرے سامنے ایک راستہ اور ہے۔ یہ ہے خودکُشی۔ میں تمہارے خط کا انتظار کروں گی۔"

میں اُسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا اور میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ خودکُشی کر لے۔ میں نے اُسے جواب لکھا جس میں جھوٹی تسلیاں لکھیں۔ اس کے سوا میں اور کر ہی کیا سکتا تھا۔ جھوٹا وعدہ کر دیا کہ میں آؤں گا۔ میں نے شہناز کا خط سلطان کو دکھایا اور کہا کہ میں پریشان ہوں۔

"تم کیوں پریشان ہو؟" — سلطان نے کہا — "اس لئے کہ اُس نے تمہارے باپ کو زہر پلا پلا کر مار ڈالا تھا یا اس لئے کہ اُس نے تمہیں اغوا کرایا تھا؟... میں مانتا ہوں کہ اُس نے تمہیں نوابزادہ حمید اللہ خان کی جاگیر میں قتل ہونے سے بچایا تھا پھر اُس نے ہمارا ساتھ دیا تھا لیکن وہ اس قابل نہیں کہ تم اُس کے لئے پریشان ہوتے رہو اور اُس کے بلانے پر چلے جاؤ۔ اُسے اب ذہن سے اُتار دو سکندر! وہ اُڑتا پنچھی ہے۔ اُس کا کوئی آشیانہ نہیں، کوئی ٹھکانہ نہیں۔"

ٹھکانہ تو میرا ابھی کوئی نہیں تھا۔ آشیانہ بھی نہیں تھا، لیکن شہناز کے ساتھ مل کر تو میں آشیانہ نہیں بنا سکتا تھا۔ سلطان ٹھیک کہتا تھا۔ شہناز کو بھُول جانا ہی بہتر تھا۔

اُس رات میں کمرے میں تنہا تھا۔ سلطان اور لاجو کی شادی کو بہت دن ہو گئے تھے۔ میں ایک بار پھر اُلٹے سیدھے خیالوں کی بھول بھلیوں میں گُم ہو گیا۔ میں رویا نہیں، آہیں نہ بھریں لیکن ذہن پر اُداسیوں کی گھٹائیں چھائی رہیں۔ اس ذہنی کیفیت میں مَیں نے کاپی لی اور ایک خط لکھنا شروع کر دیا۔ میں بغیر سوچے لکھتا گیا، پھر لفافے پر ایڈریس لکھا، خط اس میں ڈالا، لفافہ بند کیا اور

لیٹر بکس میں ڈالنے کے لئے چل پڑا۔

اپنی وہ جذباتی حالت مجھے آج بڑی اچھی طرح یاد ہے۔ میں اس طرح چلا جا رہا تھا جیسے مجھ پر کوئی پُراسرار اثر ہو گیا ہو اور مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا ہو۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے لفافہ لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ لیٹر بکس باہر سڑک پر تھا۔ جب خط لیٹر بکس کے اندر گرا تو اس کی ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ اس آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔ میں اُس ذہنی کیفیت سے جو مجھ پر طاری ہو گئی تھی، اس طرح نکل آیا جیسے کسی نے مجھے گہرے پانی میں سے نکال کر باہر کھڑا کر دیا ہو۔

پہلا خیال یہ آیا کہ نہ چاہتے ہوتے بھی میں نے شہناز کو خط لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ بقائمی ہوش وحواس نہیں لکھا۔ میں نے تو سلطان کی بات مان لی تھی کہ شہناز کو ذہن سے اتار دوں گا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شہناز کے خط کا جواب نہیں دوں گا لیکن میں نے خط لکھ دیا۔ یہ میرا ارادہ نہیں تھا، مجھ سے خط کسی اور قوّت نے لکھوایا تھا۔

میں پریشان سا ہو گیا اور میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اپنے اوپر قابو پانا چاہیئے۔ شہناز نے تو میرا کچھ نہیں بگاڑنا تھا میرا کام ایسا تھا جس میں مجھے ذہنی یکسوئی اور حاضر دماغی کی ضرورت تھی۔ میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ میں نے شہناز کو کیا لکھا ہے۔ مجھے یاد آ گیا۔

"میں آج رات تنہا ہوں" — میں نے لکھا تھا — "سلطان کا ساتھ یوں چھُوٹ گیا ہے کہ اُس نے ایک ہندو لڑکی کو مسلمان کر کے اُس کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ اس تنہائی اور اُداسی میں تمہارا خط ملا تو تنہائی کی تلخی کچھ کم ہو گئی جیسے تم میرے پاس آ بیٹھی ہو۔ میں شاید تمہارے خط کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا پھر بھی جواب دے رہا ہوں۔ یہ تمہاری محبت کی شدّت ہی ہو سکتی ہے جس نے مجھ سے خط لکھوا لیا ہے۔"

میں نے ایسی چند اور جذباتی باتیں لکھی تھیں جو مجھے نہیں لکھنی چاہیئے تھیں۔ شہناز کو تو میرے جذبات اچھے لگے ہوں گے لیکن میں نے اپنے آپ کو

اُس کے آگے جُھکا دیا تھا۔ مجھے یہ تاثر نہیں دینا چاہیئے تھا کہ میں اُس کے بغیر اُداس ہوں۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا" —— میں نے لکھا تھا —— "یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں تمہیں اپنی یا کسی اور کی نوکرانی بنا کر رکھ لوں۔ تم مجھ سے اتنی دُور ہو پھر بھی مجھے اپنے ساتھ سمجھو۔ کسی دولت مند کے ساتھ شادی نہ کرنا۔ کوئی نہ کوئی شریف آدمی مل جائے گا۔ یہ یاد رکھنا کہ جو آدمی شریف ہوتا ہے وہ دولت مند نہیں ہوگا۔ دولت اور شرافت اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ اپنے آپ کو حسین سمجھنا چھوڑ دو۔ تمہارا حُسن تمہیں یہ دھوکہ دے رہا ہے کہ تم شہزادی ہو اور تمہارے لئے نواب یا نوابزادہ ہونا چاہیئے۔ تم نہ بتاؤ تو بھی میں جانتا ہوں کہ لوگ تمہارے متعلق کیا باتیں کرتے ہوں گے۔ تم اپنی ماں اور میرے باپ کے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہو۔ برداشت کرو۔ اپنے آپ کو پتھر بنا لو۔ مجھے ایک بزرگ نے کہا تھا کہ پتھر بن جاؤ اور اُن کے سروں پر گرو جنہوں نے تم پر ظلم کیا ہے۔ اسی لئے میں ڈاکو بننے چلا گیا تھا۔"

مجھے اور جو کچھ یاد آیا وہ یہ لکھا تھا —— "تمہاری ماں نے جس دولت مند آدمی کو تمہارے پیچھے ڈال دیا ہے اُسے اپنے پیچھے پڑا رہنے دو اور اُسے انگلیوں پر نچاتی رہو۔ ایک نہ ایک دن وہ مایوس ہو کر تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا۔ اگر کوئی مشکل آ پڑی تو مجھے لکھنا، میں آ جاؤں گا۔"

خط لیٹر بکس کے پیٹ میں جا چکا تھا۔ اب واپس نہیں آ سکتا تھا۔

✚

تقریباً ایک مہینہ اور گزرا تو ایک خط سلطان کو ملا۔ لکھنے والے کا نام نہیں لکھا تھا نہ اُس جگہ کا نام لکھا تھا جہاں سے خط لکھا گیا تھا۔ ٹکٹ پر ڈاکخانے کی جو مُہر لگی ہوئی تھی وہ اتنی مدھم تھی کہ اس کے الفاظ پڑھے نہیں جاتے تھے۔ آخر کے دو حروف —— اے اور آر —— ذرا واضح تھے۔ ان دو حروف پر ختم ہونے والے بے شمار شہر تھے۔ لکھا تھا:

"لاجونتی کو اُس کے باپ کے حوالے کر دو ورنہ تمہارے باپ کو لاجونتی

کی جو قیمت دینی پڑے گی وہ تمہاری جان سے کم نہیں ہوگی۔ اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو ہمارے حکم کی تعمیل فوراً کرو۔"

سلطان نے یہ خط انسپکٹر وِلکاکس کو دے دیا۔ وِلکاکس نے خط ایس پی جانسن کو دکھایا اور سراغرسانی شروع ہو گئی لیکن سپیشل برانچ میں کوئی ایسا جادوگر نہیں تھا جو یہ معلوم کر لیتا کہ یہ خط کس نے لکھا ہے اور کہاں سے لکھا ہے۔

چند دنوں بعد انگریز افسروں نے یہ رائے دی کہ یہ خط دہشت گردوں کا نہیں بلکہ یہ ہندوؤں کا ہے اور اس کا تعلق ان کے مذہب کے ساتھ ہے۔ وہ اپنی لڑکی اپنے مذہب میں واپس لینا چاہتے ہیں۔

یہ اُس دَور کا واقعہ ہے جب انگریزوں کے پنجے ہندوستان میں بڑے گہرے اُترے ہوئے تھے۔ انگریز اپنی بادشاہی کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کیا کرتے تھے۔ ایس پی جانسن نے حکم دیا کہ لاجونتی کے باپ کو طلب کیا جائے۔

ایک گھنٹے کے اندر ایک ہندو اس طرح برآمدے میں داخل ہوا جیسے اُس کے کندھوں پر اتنا بوجھ رکھا ہوا ہو جو اُس کی ہمت سے باہر ہو۔ اُس نے ہندوؤں کا روائتی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر کپڑے کی کشتی نما ٹوپی، کُرتہ اور دھوتی جس کا ایک پلّو ٹانگوں میں سے آگے سے گزار کر پیچھے کمر کے ساتھ اُڑسا ہوا تھا۔

انسپکٹر وِلکاکس اُسے تفتیش والے کمرے میں لے گیا۔ دو گھنٹوں بعد وہ اِس کمرے سے نکلا۔ اُس پر تشدّد نہیں کیا گیا تھا لیکن اُس کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ سر ڈول رہا تھا، وہ پہلے سے زیادہ جُھک گیا تھا اور وہ چلتا اس طرح تھا کہ قدم رکھتا کہیں اور پڑتا کہیں اور تھا۔

اُس کے پیچھے انسپکٹر وِلکاکس مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا۔ لاجونتی کے باپ کو پابند کرنے کے لئے ایک اور کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ اُس نے چند ایک نام بتائے تھے۔ ان سب کو طلب کرنا تھا۔

ہندوستان میں آج یوں ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان یا عیسائی لڑکی ہندو ہو

جاتے تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اگر ایک ہندو لڑکی مسلمان ہو جاتے تو سارے ہندوستان میں بھونچال آجاتا ہے اور ہندو مسلمانوں کو قتل کرنے لگتے ہیں۔ اب تو اُن کی اپنی بادشاہی ہے۔ مسلمانوں کو وہ اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ انگریزوں کے دَور میں بھی ہندوؤں کا رویّہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

لاجونتی کے باپ کو پوچھا گیا کہ اُسے کس کس آدمی نے کہا تھا کہ وہ لاجونتی کو واپس لائیں گے اور کہاں کہاں یہ باتیں ہوتی رہی ہیں۔ ہمیں معلوم ہُوا کہ وہ ٹالنے کی کوشش کرتا رہا۔ اُسے احساس نہیں تھا کہ وہ انگریزوں کی خُفیہ پولیس کے ہاتھ میں ہے۔ انسپکٹر وِلکاکس نے اُسے یہ احساس دلا دیا اور جب تفتیشی انداز میں سوال وجواب کا سلسلہ شروع کیا تو یہ ہندو جو محض ایک دُکاندار تھا، چکرانے لگا اور اُس نے سارا راز اُگل دیا۔ اُس نے اپنے پنڈت اور چند ایک سرکردہ ہندوؤں کے نام بتاتے جو لاجونتی کو اپنے مذہب میں واپس لانے کی کوشش میں شامل تھے۔

اُن تمام ہندوؤں کو جن کی تعداد پانچ یا چھ تھی، ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا گیا۔ ان میں شہر کا ایک پنڈت بھی تھا۔ اُن سے پوچھ گچھ وِلکاکس اور ایک اور انگریز سب انسپکٹر کرتے رہے۔ آخر میں اُس ہندو کی نشاندہی ہو گئی جس نے ہردوار جا کر یہ خط لکھا اور پوسٹ کیا تھا۔ وہ ہندو ان میں شامل تھا۔ اُسی روز ہردوار سے واپس آیا تھا۔

"تم لوگوں نے ایک پولیس آفیسر کو قتل کی دھمکی دی ہے" — ایس. پی جانسن نے اُنہیں کہا — "اس جُرم کی سزا کم از کم دو سال ہے۔ اگر ہم تم لوگوں کو پوری طرح خراب کرنا چاہیں تو دس دس سال کے لئے سب کو سزائے قید دلا سکتے ہیں لیکن ہم تمہیں ایک موقع دیتے ہیں۔ ہم کسی کے مذہب میں داخل نہیں دیتے لیکن یہ مذہب کا معاملہ نہیں۔ جس لڑکی کو تم لوگ اپنے مذہب میں واپس لانا چاہتے ہو اُس کی حفاظت حکومت کر رہی ہے کیونکہ اُس نے دہشت گردوں کا ایک گروہ پکڑوایا ہے۔ اگر تم لوگ اس لڑکی کے ساتھ یا اس کے خاوند سب انسپکٹر سلطان احمد کے ساتھ کوئی بدمعاشی کرو گے تو ہم تمہیں دہشت گرد

قرار دے کر سزائے موت بھی دلا سکتے ہیں۔ ابھی ہم آپ سے نیک چلنی کی ضمانت لیں گے۔ آپ اس کی تحریر دیں گے۔ ذرا سی بھی گڑبڑ ہوئی تو تم سب کو گرفتار کر لیں گے۔"

ان سے نیک چلنی کی ضمانت لے لی گئی اور انہیں چھوڑ دیا گیا۔ ایس. پی نے سلطان احمد کو بُلایا اور اُسے کہا کہ وہ احتیاط کرے اور ان لوگوں سے چوکنا رہے۔

"تم شاید ہندو ذہنیت کو پوری طرح نہیں سمجھتے" — ایس. پی نے سلطان احمد سے کہا — "انہوں نے ہمارے آگے ہاتھ جوڑے تھے اور پورا یقین دلایا تھا کہ وہ کوئی بدمعاشی نہیں کریں گے لیکن ہم ان پر کبھی بھی یقین نہیں کریں گے۔ یہ ہندو لوگ پیٹھ پر یا زمین کے نیچے سے وار کیا کرتے ہیں۔ ہندو اگر تمہارا گہرا دوست ہو تو بھی اُس پر بھروسہ نہ کرو۔"

سلطان اب بھی دلیری کی باتیں کرتا تھا لیکن مجھے اُس کے متعلق فکر پیدا ہو گیا تھا۔ ان دو تین مہینوں میں مجھے بہت حد تک یقین ہو گیا تھا کہ لاجو مکمل طور پر وفادار ہے۔

✖

کچھ دن اور گزرے تو شہناز کا ایک اور خط آگیا۔ خط مختصر تھا۔

"خدا کے لئے جلدی پہنچو" — شہناز نے لکھا تھا — "میرے دونوں بھائی گرفتار ہو گئے ہیں۔ اگر وہ کسی اور جُرم میں پکڑے جاتے تو مجھے ذرا سا بھی دُکھ اور غم نہ ہوتا اور میں تمہیں اتنی دُور سے نہ بُلاتی۔ تم یہ سُن کر حیران ہو گے کہ وہ میری عزت پر مر مٹے ہیں۔ انہوں نے مجھے اُس دولت مند آدمی سے بچایا ہے جسے میری ماں نے میرے پیچھے ڈالا تھا۔ میں خود حیران ہوں کہ میرے بھائی اچانک غیرت مند کس طرح ہو گئے ہیں۔ بات بڑی لمبی ہے۔ میں لکھ نہیں سکتی۔ ایک تو میرے بھائی گرفتار ہو گئے ہیں دوسرے یہ کہ تھانیدار میرے پیچھے پڑ گیا ہے اور میں اُس سے بچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

یہ خط پڑھ کر مجھے یوں لگا جیسے ایک شعلہ بھڑک کر مجھے جلا گیا ہو۔ میں نے کبھی کوئی قدم سوچے بغیر نہیں اُٹھایا تھا، لیکن شہناز کے خط نے میری یہ حالت کر دی کہ نہ میں نے خود کچھ سوچا نہ سلطان سے مشورہ لیا، خط اُٹھاتے انسپکٹر وِلکاکس کے دفتر میں جا پہنچا۔

"صاحب بہادر!" — میں نے اُسے کہا — "میں ایک خط پڑھ کر آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔"

"کس کا خط ہے؟"

"شہناز کا صاحب بہادر!" — میں نے جواب دیا — "وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی ہے اور اُس نے مجھے بُلایا ہے۔"

"اُس نے کیا لکھا ہے؟"

میں نے اُسے خط پڑھ کر سُنایا۔

"صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "میں نے آپ کو شہناز کے متعلق تمام ضروری باتیں بتا دی تھیں لیکن ایک بات شاید پوری طرح نہیں بتا سکا تھا۔ اُس کی ماں اُسے روپیہ پیسہ کمانے کا ذریعہ بنانا چاہتی ہے اور شہناز اُس کی بات مان نہیں رہی۔ ماں نے کسی آدمی کو اُس کے پیچھے ڈالا ہُوا ہے۔ اس سے پہلے میں نے آپ کو سنایا تھا کہ ماں نے شہناز کو دِلّی کے ایک سیٹھ کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔"

"ہاں، وہ مجھے یاد ہے" — انسپکٹر وِلکاکس نے کہا — "تم اُسے وہاں سے نکال کر لاتے تھے۔"

"شہناز نے ساری بات نہیں لکھی صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "معلوم ہوتا ہے کہ جس آدمی کو اُس کی ماں نے اُس کے پیچھے ڈالا ہے اُس نے شہناز کو زبردستی اُٹھانے کی یا بے آبرو کرنے کی کوشش کی ہو گی اور شہناز کے بھائیوں نے اُسے مارا پیٹا ہو گا۔ ہو سکتا ہے اُسے قتل ہی کر دیا ہو۔ مجھے پریشانی اس بات کی ہے کہ تھانیدار شہناز کو پریشان کر رہا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ وہ کتنی دلکش عورت ہے ... صاحب بہادر! یہ بھی سوچیں کہ

شہناز نے اپنے آپ کو رشوت کے طور پر پیش کر دیا تو تھانیدار انصاف نہیں ہونے دے گا اور اگر شہناز نے تھانیدار کو مایوس کیا تو اُس کے بھائیوں کو اُس سے کہیں زیادہ سزا ہو جائے گی جو اس جُرم کی لکھی ہوئی ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں وہاں جانا چاہتا ہوں صاحب بہادر!" — میں نے کہا — "آپ مجھے چھُٹی دیں۔ وہاں شہناز کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ یہ تو آپ کبھی نہیں بھولیں گے کہ شہناز نے حکومتِ برطانیہ کے لئے کتنا بڑا کام کیا ہے۔ ہمیں اُس کی مدد کرنی چاہیئے۔"

"ہم اُس کی مدد کریں گے" — انسپکٹر وِلکاکس نے کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد کہنے لگا — "تم آج ہی دس دن کی چھُٹی پر چلے جاؤ۔ علاقہ تھانیدار سے ملو اور دیکھو کہ کیس کی صحیح پوزیشن کیا ہے ... سکندر! میں ایک بات صاف طور پر کہہ دیتا ہوں کہ شہناز کے بھائیوں نے کسی کو اگر قتل کر دیا ہے تو اُن کی کوئی مدد نہیں ہو سکے گی۔ اگر یہ کیس لڑائی جھگڑے کا ہے اور شہناز کے بھائیوں کے ساتھ بے انصافی ہو رہی ہے تو متعلقہ تھانیدار کو بتانا کہ تم سپیشل برانچ کے سب انسپکٹر ہو اور یہ کیس اور اس کی تفتیش دیکھنے کے لئے آتے ہو۔ اُسے یہ بھی بتانا کہ شہناز تاجِ برطانیہ کی طرف سے انعام یافتہ ہے۔ اگر اُس کے بھائیوں کا جُرم معمولی ہے تو شہناز کی خدمات کے پیشِ نظر انہیں بذریعہ راضی نامہ چھوڑ دیا جائے ... یہ بھی خیال رکھنا سکندر! قانونی کارروائیوں میں دخل اندازی نہ کرنا۔"

مجھے صرف چھُٹی کی اور کسی انگریز افسر کی اجازت کی ضرورت تھی کہ میں اس کیس کو دیکھ سکوں۔ اس سے آگے جو کچھ کرنا تھا، وہ میں نے خود ہی کرنا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے چھُٹی کے کاغذات تیار کرائے اور سلطان کو بتا کر شام کی گاڑی سے روانہ ہو گیا۔



بڑے لمبے سفر کے بعد میں جب شہناز کے گھر میں داخل ہُوا تو وہ برآمدے

میں بیٹھی رو رہی تھی۔ قریب ہی چارپائی پر اُس کا باپ حسبِ معمول لیٹا ہُوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مر چکا ہو۔ شہناز نے مجھے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جیسے اُسے توقع نہیں تھی کہ میں آؤں گا۔ وہ اُٹھی اور میرے گلے لگ گئی۔ وہ تو بلک بلک کر رو رہی تھی۔ میں اُسے بار بار کہتا تھا کہ پہلے یہ بتاؤ کہ ہُوا کیا ہے لیکن اُس کے بازوؤں کا گھیرا میرے گرد اس طرح تنگ ہوتا جا رہا تھا جیسے ماں کو بچھڑا ہُوا بچہ خلافِ توقع مل گیا ہو۔

جب اُس کا رُکا ہُوا غبار آنسوؤں کے راستے نکل گیا تو وہ میرے لئے کھانا تیار کرنے باورچی خانے میں چلی گئی میں وہیں اُس کے پاس جا بیٹھا۔ اُس نے کھانا تیار کرتے کرتے جو واقعہ سُنایا وہ اس طرح تھا۔

وہ ہمارے شہر کا ہی ایک آدمی تھا۔ میں اُسے جانتا تھا۔ ایک تو اُس کی شہر میں خاصی جائیداد تھی اور شہر سے تھوڑی ہی دُور اُس کی بڑی زرخیز زمینیں تھیں۔ اچھا خاصا مالدار آدمی تھا۔ ویسے تو تیز طرار اور چلتا پُرزہ قسم کا آدمی تھا لیکن اُس پر بدمعاشی کا شُبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اُس کے دو بیٹے جوان تھے۔ بڑا بیٹا میرا ہم عمر تھا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس آدمی کی عمر کیا ہو گی۔ اُس کی بیوی کچھ عرصہ پہلے مر گئی تھی۔ شہناز تو پہلے بھی اسی شہر کی رہنے والی تھی لیکن اس آدمی کو جس کا نام ملک سرفراز خان تھا جیسے شہناز کی موجودگی کا علم ہی نہیں تھا۔ اب اس عمر میں وہ اچانک شہناز کے پیچھے پڑ گیا تو یہ شہناز کی ماں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

شہناز کی ماں انسان نہیں، اندر باہر سے شیطان تھی۔ وہ تو پھوڑے پھنسیوں کی ماری ہوتی بستر پر لاش کی طرح پڑی رہتی تھی لیکن اُس کا دماغ شیطانیت سے باز نہیں آتا تھا۔ اس حالت میں بھی اُس نے اس مالدار آدمی کو پھانس لیا۔ شہناز نے مجھے بتایا کہ اُس کی ماں نے ملک سرفراز کو کسی اور بہانے گھر بُلایا تھا۔ ماں نے شہناز کو خاص طور پر کہا تھا کہ وہ ملک سرفراز کی خاطر تواضع کرے کیونکہ یہ بہت مدد کرتا ہے۔

شہناز نے خاطر تواضع اس طرح کی کہ اُس کے پاس بیٹھ کر گپ شپ بھی

لگاتی رہی۔ اُسے الگ کمرے میں بھی بٹھایا۔ وہ اس لئے اُس کے پاس بیٹھی تھی کہ اُس کے باپ کو تو مہمانوں میں اُٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ ہی نہ تھا اور ماں معذور پڑی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ ماں نے ملک سرفراز کے ساتھ بیٹی کا سَودا چُکا لیا تھا۔ شہناز کو معلوم نہیں تھا۔

ملک سرفراز تقریباً ہر روز شہناز کے گھر آنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ تماشا ہُوا کہ ملک سرفراز چلا جاتا تو اُس کا بڑا بیٹا جو شادی شدہ تھا وہ آجاتا اور شہناز کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا۔ تھوڑے دِنوں بعد باپ اور بیٹے کا سلوک ایک جیسا ہو گیا۔ دونوں شہناز کو الگ کمرے میں بٹھاتے اور ہنسی مذاق میں چھیڑ چھاڑ کرتے۔ شہناز بچّی تو نہیں تھی۔ اُس نے صرف دُنیا نہیں دیکھی تھی بلکہ پولیس اور مجرموں کی دُنیا بھی دیکھ لی تھی۔ وہ دونوں کی نیّت بھانپ گئی۔ اُس نے کمال یہ کیا کہ انہیں دھتکارا نہیں لیکن اپنے آپ کو اُن سے دو ہاتھ دُور رکھا۔

ایک روز یوں ہُوا کہ ملک سرفراز آیا۔ تھوڑی دیر شہناز کی ماں کے پاس بیٹھا۔ اُس نے ناک پر رُومال رکھے رکھا کیونکہ اُس کمرے میں بدبُو بہت ہوتی تھی۔ پھر وہ شہناز کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ شہناز الگ ہو کر بیٹھا کرتی تھی لیکن اُس روز ملک سرفراز نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ شہناز اُس سے ذرا دُور کرسی پر بیٹھی تو ملک سرفراز نے اُسے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ پلنگ پر بیٹھے۔ شہناز نے انکار کر دیا۔

"تم ابھی تک نہیں سمجھیں شہناز!" — ملک سرفراز نے اُسے کہا — "میں یہاں صرف تمہارے لئے آتا ہوں۔ تم نے میرا چَین اور سکون تباہ کر دیا ہے۔"

"لیکن میں آپ کو اپنا باپ سمجھتی ہوں۔"

"اور میں تمہیں اپنی بیوی سمجھتا ہوں" — ملک سرفراز نے کہا — "صرف نکاح پڑھنا رہ گیا ہے۔"

"کیا یہ آپ کا حکم ہے؟" — شہناز نے پوچھا۔

"حکم نہیں لڑکی!" — ملک سرفراز نے کہا — "یہ سودا ہے۔ میں رقم

دے چکا ہوں۔ یوں سمجھو کہ میں نے حق مہر ادا کر دیا ہے۔"

"پھر آپ اُسی کو بیوی بنائیں جسے آپ نے حقِ مہر ادا کیا ہے" ——— شہناز نے کہا۔

"پاگل نہ بنو شہناز!" ——— ملک سرفراز نے ہنستے ہوتے بڑے پیار سے کہا اور اُٹھ کر شہناز کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اُس کا بازو پکڑ کر اُسے اُٹھانے لگا اور بولا ——— "پلنگ پر آجاؤ ذرا۔"

شہناز اُٹھ کھڑی ہوتی اور پلنگ کی طرف جانے کی بجائے اُس نے دروازہ کھول دیا۔ ملک سرفراز نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ شہناز نے اُسے جو دھکا دیا وہ ملک سرفراز کا بوڑھا جسم سہہ نہ سکا۔ وہ کُرسی کے ساتھ جا ٹکرایا۔ کُرسی گری تو وہ اُس پر گرا۔ اُٹھا تو پھر شہناز پر لپکا لیکن شہناز باہر نکل گئی تھی۔

"شہناز!" ——— ملک سرفراز نے چیلنج کے انداز میں کہا ——— "میں تمہیں بیوی بنا کر ہی جاؤں گا۔ دیکھوں گا تم کس طرح انکار کی جرأت کرتی ہو۔ کیا تم اپنے آپ کو شریف عورت سمجھتی ہو؟ میرے سامنے پاکباز بننے کی کوشش کرتی ہو۔"

"ملک صاحب!" ——— شہناز نے بڑے تحمّل سے کہا ——— "گھر جا کر اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ بات کر لیں پھر مجھے بتائیں کہ میں آپ کی بیوی بنوں گی یا آپ کے بیٹے کی۔ وہ بھی اسی توقع پر میرے پاس آتا ہے۔ آپ چلے جائیں گے تو تھوڑی دیر بعد وہ آجائے گا۔"

"کیا بکواس کرتی ہو؟" ——— ملک سرفراز گرج کر بولا۔

"اپنے بیٹے سے جا کر پوچھنا" ——— شہناز نے کہا ——— "وہ نہ مانے تو اُسے میرے سامنے لے آنا۔"

شہناز کی ماں اندر لیٹی لیٹی شہناز کو کوس رہی تھی۔ ماں کے ہاتھ سے بڑی موٹی اسامی نکلی جا رہی تھی۔ شہناز کا باپ کچھ سمجھے بغیر شہناز کو چُپ کرا رہا تھا۔

"میں تجھے اغوا کرا دوں گا بدمعاش لڑکی!" ——— ملک سرفراز نے دھمکی دی اور چلا گیا۔

ملک سرفراز کے جانے کے تقریباً گھنٹہ بعد اُس کا بڑا بیٹا آگیا اور شہناز کو الگ کمرے میں لے گیا۔

"تم نے مجھے اور میرے باپ کو آپس میں لڑا دیا ہے" ——— اُس نے شہناز کو بڑے رُعب اور غصّے سے کہا ——— "تم نے اپنی ماں جیسی حرکت کی ہے میرے باپ کو بتانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت یہ تھی کہ وہ بھی اُسی نیّت سے یہاں آتا تھا جس نیّت سے تم آتے ہو" ——— شہناز نے کہا ——— "کیا اس گھر کو تم نے کسی طوائف کا کوٹھا سمجھ لیا ہے کہ دندناتے چلے آتے ہو؟"

"طوائف نہیں ہو تو اور کیا ہو تم؟" ——— ملک سرفراز کے بیٹے نے کہا۔

"تمہارا باپ اس عمر میں میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے" ——— شہناز نے کہا ——— "اُسے کہو کہ طوائف کے ساتھ شادی نہ کرے۔"

"کیا تم میرے باپ کو اتنا ذلیل آدمی سمجھتی ہو کہ وہ تم جیسی عورت کے ساتھ شادی کرے گا جو طوائفوں سے بدتر ہے؟"

ملک سرفراز کے بیٹے اور شہناز کے درمیان تُرش کلامی ہوتی، پھر دونوں کے مُنہ میں جو آیا انہوں نے ایک دوسرے کو کہا۔ ملک سرفراز کا بیٹا بھی شہناز کو دھمکی دے کر چلا گیا۔

×

شہناز کے دونوں بھائی رات کو گھر آتے۔ معمول کے مطابق اُن کے گھر آنے کا وقت یہی تھا۔ شہناز جلی بیٹھی تھی۔ وہ اپنی ماں کی بہت بے عزتی کر چکی تھی۔ بھائی آتے تو شہناز دونوں کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔

"میں تمہیں زہر لا دوں گی" ——— شہناز نے بھائیوں سے کہا ——— "یہ زہر خود کھا لو یا مجھے کھلا دو۔"

دونوں بھائیوں نے شہناز کی پوری بات نہ سُنی اور اُسے ٹالنے لگے۔

"بے غیرتو!" ——— شہناز نے کہا ——— "لوگ تمہاری بہن کو طوائف سمجھ کر تمہارے گھر میں دندناتے چلے آتے ہیں اور تم بدمعاش بنے پھرتے ہو۔ جانتے ہو آج اس گھر میں کیا ہُوا ہے؟"

اُس نے بھائیوں کو سنایا کہ کیا ہُوا ہے۔

"اِدھر ہماری ماں ہے جو میرے لئے گاہک پھانستی رہتی ہے" ——— شہناز نے کہا ——— "تم دونوں پیدا ہی نہ ہوتے یا مر جاتے تو میں بازار میں جا کر بیٹھ جاتی۔ بھائیوں کے جیتے جی بہن کے پاس لوگ آرہے ہیں اور دھمکیاں دے کر اُسے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہیں۔"

شہناز بہت روئی اور اُس نے ملک سرفراز اور اُس کے بیٹے کی دیدہ دلیری اور بدمعاشی ایسے انداز سے سنائی کہ بھائیوں کی غیرت بیدار ہو گئی۔ دونوں بھائی اتنی جرأت والے تو تھے ہی نہیں لیکن بدمعاشوں اور غنڈوں کے ساتھ اُٹھ بیٹھ کر وہ دلیر اور بدمعاش ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے پہلے تو ماں کی بے عزتی کی۔ چھوٹے بھائی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ماں کا گلا ہی کیوں نہ گھونٹ دیں۔ یہ مرتی بھی نہیں اور اپنی کرتوت سے باز بھی نہیں آتی۔

"اسے مار کر کیوں پھانسی چڑھو گے" ——— شہناز نے کہا ——— "یہ اپنی موت مر رہی ہے۔ اسے سزا بھگتنے دو۔"

"صبح ہو لینے دو شہناز!" ——— بڑے بھائی نے کہا ——— "دیکھنا تیرے بھائی کیا کرتے ہیں۔"

صبح ہوئی تو بڑے بھائی نے چھوٹے سے کہا کہ وہ ملک سرفراز کو جا کر کہے کہ ان کی ماں نے اُسے بلایا ہے۔ چھوٹے بھائی نے ملک سرفراز کے گھر جا کر یہ کہا کہ اُس کی ماں نے کہا ہے کہ شہناز مان گئی ہے، تھوڑی دیر کے لئے آجاؤ۔

ملک سرفراز جھانسے میں آگیا اور شہناز کے گھر چلا آیا۔ دونوں بھائیوں نے گھونسوں سے اُسے پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ گرا تو اُسے ٹھڈے مار مار کر ادھ مُوا کر دیا۔ پھر اُسے مارتے پیٹتے باہر گلی میں لے گئے اور وہاں بھی خوب پٹائی کی۔

محلّے کے لوگ اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے ملک سرفراز کو چھڑایا۔ کسی نے اُس کے گھر اطلاع دے دی۔ اُس کے دو بیٹے تھے۔ دونوں دوڑے آئے۔

شہناز کے بھائی اپنے گھر سے ایک ہاکی اور ایک ڈنڈہ اُٹھا لائے۔

ملک سرفراز کے بیٹوں کے ہاتھوں میں جو آیا اس سے انہوں نے مقابلہ کیا۔ اگر یہ سب دیہاتی ہوتے تو معاملہ قتل تک جا پہنچتا لیکن وہ شہری تھے، دیہاتیوں کی طرح لڑنا نہیں جانتے تھے۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ بھی کرایا۔ لڑائی کا نتیجہ یہ رہا کہ سرفراز کی پٹائی تو ہوئی ہی تھی، اُس کے بیٹوں کو بھی ہاکی اور ڈنڈے کی چوٹیں آئیں۔ ایک بیٹے کے سر سے خون بھی نکلا جو اُس کے کپڑوں پر پڑا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اُس کا سر کھل گیا ہو لیکن چوٹ معمولی تھی جس سے جلد ذرا سی پھٹ گئی تھی۔

ملک سرفراز اپنے بیٹوں کو ساتھ لے کر تھانے چلا گیا۔ شہناز اور اُس کی ماں پہلے ہی بدنام تھیں اس لئے زیادہ تر لوگوں نے ملک سرفراز کا ساتھ دیا۔ ملک سرفراز کا شمار معززین میں ہوتا تھا۔ یہ تو کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ لڑائی جھگڑے میں مضروب اور مظلوم اُسے سمجھا جاتا ہے جس کے کپڑے خون سے لال ہوں۔ ملک سرفراز کے بڑے بیٹے کا یہی حال ہو گیا تھا۔ لوگ بھی اُسی کے ساتھ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ تھانیدار نے شہناز کے دونوں بھائیوں کو گرفتار کر لیا۔

میں جب وہاں گیا تو دونوں حوالات میں بند تھے۔ یہ ریمانڈ کا دسواں یا گیارھواں دن تھا۔ تھانیدار نے شہناز کو دیکھ لیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ اس گھر میں مقدمے کی پیروی کرنے والا کوئی آدمی نہیں تو اُس نے شہناز کے گھر آنا شروع کر دیا اور کبھی اُسے تھانے بُلا لیتا، پھر اُس نے شہناز پر یہ مہربانی کی کہ اُسے تھانے بُلانا چھوڑ دیا۔ وہ رات کو بھی شہناز کے گھر آجاتا تھا اور شہناز اُس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تمہارے بھائیوں کا جُرم معمولی نہیں شہناز!" ——— تھانیدار نے اُسے کہا ——— "یہ دفعہ ۳۰۷ کے ملزم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ ملک سرفراز

اور اُس کے بیٹوں کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اس جُرم میں انہیں پانچ چھ سال سزا ہوجاتے گی۔ یہ میرے ہاتھ میں ہے کہ انہیں صاف بچا لوں یا زیادہ سے زیادہ سزا والی فردِ جُرم لگوا دوں .... تم یُوں سمجھو کہ یہ میرے ہاتھ میں نہیں بلکہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"لیکن میری عزت بھی میرے ہی ہاتھ میں ہے" ـــ شہناز نے کہا ـــ "میں اپنی عزت کی رشوت نہیں دوں گی۔"

"تم کہاں کی شریف عورت ہو!" ـــ تھانیدار نے کہا ـــ "لوگ مجھے تمہارے متعلق سب کچھ بتا چکے ہیں۔ تمہاری کوئی عزت نہیں۔ تم تو شریف گھرانوں کی کنواری لڑکیوں جیسی باتیں کرتی ہو۔"

تھانیدار نے اُس پر دست درازی بھی کی اور اُسے دھمکیاں بھی دیتا رہا۔ یہ سلسلہ اُس نے پہلے روز ہی شروع کر دیا تھا اور اُسی رات شہناز نے مجھے خط لکھ دیا۔

شہناز کی ماں کی حالت یہ ہوگئی تھی کہ اُسے غشی پہ غشی آتی تھی۔ ایک تو اُس کے ہاتھ سے بڑا موٹا شکار نکل گیا تھا دوسرے یہ کہ اُس کے دونوں بیٹے حوالات میں بند ہو گئے تھے اور اُس پر سب سے بڑی چوٹ تو یہ پڑی تھی کہ شہناز نے اُس کی تیمارداری چھوڑ دی تھی اور اُسے بڑی نفرت سے کوستی رہتی تھی۔ میں نے اس عورت کی حالت دیکھی تو وہ مجھے دو چار دن کی مہمان نظر آئی۔

میں شہناز سے ساری بات سُن کر تھانے چلا گیا اور تھانیدار سے ملا۔

✖

میں نے جب اُس کے ساتھ اس کیس کی بات کی تو اُس نے یہ معلوم کئے بغیر کہ میں کون ہوں بڑی بے رُخی سے مجھے کیس سُنایا۔

"۳۰۷ کا کیس ہے جی!" ـــ اُس نے کہا ـــ "ضربوں کی جو رپورٹ ڈاکٹر نے لکھی ہے وہ دیکھو تو پتہ چلتا ہے کہ جُرم کتنا سنگین ہے۔ یہ سارا خاندان بدمعاش ہے .... آپ اِن کے کچھ لگتے ہیں یا کوئی سفارش لے کر آتے ہیں؟ .... سفارش نہیں چلے گی بھائی!"

"میں اِن کا تو کچھ نہیں لگتا، میں آپ کا قریبی رشتہ دار ہوں" ـــ میں نے کہا ـــ "میں سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر ہوں اور یہ کیس دیکھنے آیا ہوں" ـــ میں نے اپنا شناختی کارڈ اُسے دکھایا اور کہا ـــ "مجھے سیدھا آپ کے ڈی۔ ایس۔ پی کے پاس جانا چاہیئے تھا لیکن آپ میرے مسلمان بھائی ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ کیس کیا ہے اور تھانے میں آکر یہ کیا بن گیا ہے۔ پہلے میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ شہناز کون ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ کون ہے لیکن آپ کو کسی نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کیا ہے۔ اسے بھی آپ سپیشل برانچ کی عورت سمجھ لیں۔"

میں نے اُسے شہناز کا کارنامہ سُنایا اور یہ بھی کہا کہ اُسے انعام ملا ہے۔ تھانیدار جو عمر میں مجھ سے دس بارہ سال بڑا تھا، بھیگی بلّی بن گیا۔ میں اُسے اور زیادہ ڈرانے میں مبالغہ بھی شامل کر رہا تھا۔

"شہناز نے سپیشل برانچ کے ایس۔ پی کو خط لکھا تھا" ـــ میں نے کہا ـــ "آپ جانتے ہوں گے کہ جہاں سے میں آیا ہوں وہاں کی سپیشل برانچ کا آپ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں صحیح صورتِ حال دیکھنے آیا ہوں۔ میری رپورٹ کے مطابق اُوپر سے کارروائی ہو گی۔ پہلے مجھے یہ بتائیں کہ اِن لوگوں کی لڑائی کہاں ہوئی تھی؟"

"اس عورت کے بھائی بدمعاش ہیں جی!" ـــ تھانیدار نے کہا ـــ "ملک سرفراز شہر کا معزز آدمی ہے۔ اُسے بھی انہوں نے زدوکوب کیا ہے۔"

"کہاں؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "کس جگہ؟"

"اپنے گھر کے سامنے!" ـــ تھانیدار نے جواب دیا۔

"محترم!" ـــ میں نے کہا ـــ "عمر اور سروس کے لحاظ سے آپ میرے اُستاد ہیں۔ اس سے پہلے کہ آپ غلط بیانی کریں، میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے اور ہُوا کیا ہے .... ملک سرفراز شہناز کے گھر جا کر اُس پر دست درازی کرتا رہا ہے۔ اُس نے شہناز کی ماں کو کچھ رقم دی تھی۔ وہ شہناز کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔"

میں نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ پھر کیا ہُوا اور کہا کہ ملک سرفراز کے بیٹوں

نے شہناز کے گھر پر حملہ کیا تھا۔

"اِن دونوں کے پاس چاقو تھے"— میں نے جھوٹ بولا —"اور ملک سرفراز اپنے گھر سے کلہاڑی اُٹھا لایا۔ شہناز کے بھائیوں نے اپنی بہن کی عزّت اور اپنی جانیں بچانے کے لیے حفاظتِ خود اختیاری میں لڑائی کی ہے۔ آپ نے ۳۰۷ کا پرچہ کیوں کاٹا ہے؟"

"میں آپ کو سچّی بات بتاؤں؟"— اُس نے کہا —"میں نے ابھی دفعہ تو کوئی بھی نہیں لگائی۔"

"یہ آپ اُس وقت لگائیں گے جب شہناز آپ کو وہ رشوت دے دے گی جو آپ اُس سے مانگ رہے ہیں"— میں نے کہا —"آپ کو وہ رشوت نہیں ملے گی۔ اس کی بجائے آپ کو لائن حاضری کے پھر محکمانہ کارروائی کے احکام مل جائیں گے۔ پرچہ ملک سرفراز کے خلاف ہونا چاہیئے تھا لیکن اُدھر سے آپ کی مُٹھی گرم ہو گئی ہے۔"

اُس نے قسمیں کھانی شروع کر دیں کہ اُس نے رشوت نہیں لی۔ میں نے اُس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔ گناہگار کے نیچے ویسے بھی زمین بڑی کچّی ہوتی ہے۔ وہ اب مجھ سے پوچھنے لگا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ میں نے اُسے بتایا کہ راضی نامے کے ذریعے کیس تھانے میں ہی ختم کر دے۔ وہ اس طرح چُپ ہو گیا جیسے وہ راضی نامہ نہیں کرا سکے گا۔

"اگر آپ نے ملک سرفراز سے کچھ وصول کیا ہے تو میں اُسے راضی نامے کے لئے تیار کر لوں گا"— میں نے کہا —"میں بھی سب انسپکٹر ہوں، آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں۔"

اُس کی مجبوری یہی تھی کہ اُس نے ملک سرفراز سے رشوت لے کر لڑائی جھگڑے کے معمولی سے کیس کو ارادۂ قتل کی واردات بنا ڈالا تھا۔ وہ میری منّت سماجت پر اُتر آیا۔ اُس نے ایک دھاندلی یہ بھی کی تھی کہ شہناز کے بھائیوں کو دس گیارہ دنوں سے حوالات میں رکھا ہُوا تھا اور تفتیش اتنی ہی کر رہا تھا کہ شہناز کے پیچھے پڑا ہُوا تھا۔

میں ملک سرفراز کے گھر چلا گیا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی شہناز اور اُس کے بھائیوں کے خلاف واہی تباہی بکنی شروع کر دی۔ اُس نے تین بار کہا —"وہ تمہارے رشتہ دار ہیں"— وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ میں اُس کے سامنے جنا پلا تھا۔

"میرا ان کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ملک صاحب!"— میں نے کہا —"میں پولیس کی سپیشل برانچ کا جسے آپ لوگ خفیہ پولیس کہا کرتے ہیں سب انسپکٹر ہوں اور میں ڈیوٹی پر آیا ہوں۔ پہلے تو آپ کو یہ بتا دوں کہ جس شہناز کی عزّت پر آپ نے حملہ کیا تھا وہ کون ہے اور اُس کے صرف ایک خط پر انگریز افسروں نے مجھے کیوں بھیج دیا ہے کہ دیکھوں کہ یہ کیس کیا ہے!"

میں نے اُسے بھی تفصیل سے شہناز کے متعلق بتایا اور جو باتیں تھانیدار کے ساتھ کی تھیں وہ اُس کے ساتھ بھی کیں۔ وہ تھانیدار ہوتے ہُوئے ڈر گیا تھا، ملک سرفراز تو عام قسم کا شہری تھا۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"آپ نے شہناز کے گھر میں اُس پر دست درازی کی"— میں نے کہا —"پھر آپ کے بیٹوں نے اُس کے گھر جا کر اُس کے بھائیوں پر حملہ کیا۔ تھانے میں شہادت پہنچ گئی ہے کہ آپ کے بیٹوں کے پاس لمبے لمبے چاقو تھے اور آپ کے پاس کلہاڑی تھی۔"

وہ تڑپنے لگا۔ بلک بلک کر کہتا تھا کہ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

"ملک صاحب!"— میں نے کہا —"کیا عدالت آپ کی بات مان لے گی اور آپ کے خلاف شہادت کو باہر پھینک دے گی؟ آپ عدالت میں شہناز کا سامنا کس طرح کریں گے؟ ....ملک صاحب! ہوش میں آئیں۔ پولیس کے انگریز افسر شہناز کے حق میں ہیں"— میں نے ذرا آہستہ سے کہا —"اور ملک صاحب! میں عدالت میں آپ کے خلاف جھوٹے گواہ پیش کر رہا ہوں۔ یہ نہ بھی کروں تو بھی کیس آپ کے اور آپ کے بیٹوں کے خلاف جا رہا ہے۔ تھانیدار نے آپ سے رشوت تو لے لی ہے لیکن وہ آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ قانون انگریز کا چلتا

ہے ملک صاحب! آپ کا نہیں۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"تھانے جاکر درخواست دیں کہ آپ راضی نامہ کرنا چاہتے ہیں" ––– میں نے کہا ––– "میں اپنی رپورٹ بعد میں لکھوں گا۔ میں یہاں انکوائری کے لئے آیا ہوں۔ مجھے اس لئے یہاں بھیجا گیا ہے کہ میں یہیں کا رہنے والا ہوں اور ہر کسی کو جانتا ہوں۔"

"تم تو میرے بیٹے ہو" ––– اُس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا ––– "اللہ مغفرت کرے، تمہارے والد صاحب بڑے نیک اور مخلص انسان تھے۔ میری تو اُن کے ساتھ گہری یاری تھی .... صرف ایک کرم کر دینا بیٹا! پردے پردے میں راضی نامہ کرا دینا اور رپورٹ ذرا میری پوزیشن کا خیال رکھ کر لکھنا۔"

✖

راضی نامہ ہو گیا۔ تھانیدار نے مجھے الگ لے جاکر بہت منت سماجت کی اور رشوت بھی پیش کی کہ میں اُس کے خلاف رپورٹ نہ لکھوں۔

"نہیں لکھوں گا" ––– میں نے کہا ––– "میں آپ سے کچھ نہیں لوں گا۔ آپ ایک کام کریں۔ اپنے مخبروں کے ذریعے سارے شہر میں یہ بات پھیلا دیں کہ ملک سرفراز نے شہناز کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور اُسے شہناز کے بھائیوں نے مارا پیٹا تھا اور یہ بھی کہ شہناز نے ملک سرفراز کے سر پر دو جوتے مارے تھے۔"

پولیس کے لئے افواہیں پھیلانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ تھانیدار نے کہا کہ کل شام تک شہر کے بچے بچے کی زبان پر یہی چرچے ہوں گے اور ملک سرفراز کا گھر سے نکلنا بند ہو جائے گا۔

میں شہناز کے دونوں بھائیوں کو حوالات سے نکلوا کر اُن کے گھر لے گیا۔ شہناز نے باری باری دونوں کو گلے لگایا اور وہ بہت روئی۔

"شہناز!" ––– چھوٹے بھائی نے اُسے کہا ––– "جو ہو گیا سو ہو گیا، اب تمہاری طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔"

دونوں بھائی شہناز سے چھوٹے تھے لیکن اُسے نام سے بلاتے تھے

باجی نہیں کہتے تھے۔ میں نے دونوں کو بہت شرمسار کیا، بہت ذلیل کیا اور وہ خاموشی سے سُنتے رہے۔ بہن کی بے عزتی نے اُن میں غیرت بیدار کر دی تھی۔ اب وہ جس طرح باتیں کرنے لگے تھے اس طرح اُنہوں نے کبھی نہیں کی تھیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ راہِ راست پر آ گئے ہیں۔

ایسا ہوتا ہے، ایسا ہوتا آیا ہے کہ سینکڑوں وعظ اور لیکچر جو کام نہیں کر سکتے وہ عملی زندگی کا ایک جھٹکا یا صدمہ کر دیتا ہے۔ غیرت تو ہر کسی میں ہوتی ہے۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ غیرت کو سُلاتے رکھے یا جگاتے رکھے۔ ان دونوں بھائیوں نے غیرت کو جگا لیا۔

"لیکن کرو گے کیا؟" ––– میں نے کہا ––– "اگر تم فارغ رہے تو لوفر لفنگے ہی بنے رہو گے۔"

اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ ان کی ماں نے بہت سا زیور رکھا ہُوا تھا۔ شہناز نے کہا کہ وہ بیچ کر انہیں دے دے گی اور یہ کوئی دکان کھول لیں گے۔

"نہیں" ––– میں نے کہا ––– "اگر انہوں نے اس شہر میں دکان کھولی تو ان کے آوارہ دوست انہیں پھر خراب کریں گے" ––– میں نے سوچ کر پوچھا ––– "پولیس میں نوکری کرو گے؟"

"ہم جیسے اور کر ہی کیا سکتے ہیں!" ––– بڑے بھائی نے کہا ––– "ہمارے لئے پولیس کی نوکری ہی اچھی رہے گی۔"

چھوٹے نے بھی یہی کہا۔

"پھر تیار رہنا" ––– میں نے کہا ––– "میں تمہیں بھرتی کرا دوں گا۔"

✚

میری جواب طلبی تو خالہ کے ہاں ہُوئی۔ وہاں گیا تو خالہ اور خالو نے پوچھا کہ میں یہاں کیوں آیا تھا؟ میں نے انہیں بتا دیا لیکن یہ بتانے کی بجائے کہ شہناز نے مجھے بلایا تھا، یہ بتایا کہ شہناز نے پولیس کے بڑے افسروں کو خط لکھا تھا اور مجھے سرکاری طور پر بھیجا گیا ہے۔

"ہمیں کچھ اور شک ہے" — خالہ نے کہا — "شہناز کے بھائی پکڑے گئے اور تم ان کی اطلاع پر آتے ہو .... دیکھ بیٹا! ہم تمہیں اپنی بیٹی دے رہے ہیں اور تم ہمارے بھانجے بھی ہو۔ ہمیں یقین ہونا چاہیئے کہ تمہارا اخلاق صحیح ہے۔"

"آپ کو یہ شک ہے کہ میں شہناز کی خاطر آیا ہوں" — میں نے کہا — "اور اُس کے ساتھ میرے تعلقات ہیں۔"

"شک تو یہی ہے" — خالہ نے کہا۔

"میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ میں کیوں آیا ہوں" — میں نے کہا — "اگر آپ کو یقین نہیں آیا تو میں کیا کروں! آپ مجھے اپنی بیٹی نہ دیں۔"

خالہ کو دھچکا لگا۔ اُس نے غالباً یہ سوچا تھا کہ وہ مجھے مشتبہ بنائے رکھے گی اور میں اُس کے آگے سر جھکائے رکھوں گا۔ میرے جواب نے اُسے پریشان کر دیا۔ اتنی سی بات تو میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ مجھے ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ اُس نے اور خالو نے دانستہ ایسا موقع پیدا کر دیا کہ میری اور عذرا کی الگ ملاقات ہو گئی۔

"عذرا!" — میں نے کہا — "کیا تمہیں بھی میرے چال چلن پر شُبہ ہے؟"

"نہیں سکندر!" — عذرا نے جواب دیا — "میں نے سب کچھ اللہ پر اور اپنی محبت پر چھوڑ دیا ہے۔"

"اپنی امّی اور ابّو کو سمجھاؤ عذرا!" — میں نے کہا — "اگر وہ مجھے داماد بنانا چاہتے ہیں تو انہیں مجھ پہ اعتبار کرنا پڑے گا۔"

"ایک بات کہوں سکندر!" — عذرا نے کہا — "میری امّی تمہیں جو کچھ بھی کہے وہ سن لیا کرو لیکن اس پر اعتماد نہ کرنا۔"

"کیوں؟"

"ہے تو میری ماں" — عذرا نے کہا — "اور اس میں خرابی والی کوئی بات بھی نہیں، لیکن تمہارے متعلق جب بھی بات کرتی ہے تو ایسے کرتی ہے جیسے اُس نے بہت بڑا شکار مار لیا ہو۔ مجھے تم اس سے مختلف پاؤ گے۔ میری امّی کچھ لالچی سی بھی ہے۔"

"اگر بُرا نہ جانو تو ایک بات کہوں" — میں نے کہا۔

"ایسے نہ کہا کرو سکندر!" — عذرا نے کہا — "میں اپنے امّی ابّو کی تو کہہ نہیں سکتی، اپنے متعلق یقین دلا سکتی ہوں کہ تم کچھ بھی کہہ ڈالو گے میں بُرا نہیں جانوں گی۔ میں تو چاہتی ہی یہی ہوں کہ دل کی ہر بات میرے ساتھ کرو... ہاں کہو کیا کہہ رہے تھے تم۔"

"کہنا یہ تھا" — میں نے کہا — "تمہاری امّی شہناز کی ماں جیسی تو نہیں؟"

"نہیں" — عذرا نے جواب دیا — "اللہ محفوظ رکھے۔ ویسی تو نہیں، لیکن یہ خرابی ہے کہ سب سے پہلے اپنا فائدہ دیکھتی ہے۔ تم ذرا ہوشیار رہنا۔"

عذرا نے اپنی محبت کا اظہار بڑی بے تابی سے اور بے قابو ہو کر کیا۔ اُس نے پوچھا کہ میں کتنے دن اور رہوں گا۔ میں نے جب اُسے بتایا کہ میں دو دنوں بعد چلا جاؤں گا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے بے اختیار ہو کر بازو اُس کی کمر میں ڈال کر اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس لڑکی کے دل میں میری چاہت ہے۔ میں اپنے دل میں ابھی تک اس قسم کی چاہت کسی بھی لڑکی کے لئے نہیں رکھتا تھا۔ عذرا نے جب اس طرح وارفتگی کا اظہار کیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں کتنا تشنہ ہوں۔ اس تشنگی کو میں نے پہلے کبھی بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ عذرا گلشن آراء اور شہناز جیسی خوبصورت نہیں تھی لیکن مجھے یہ اُن دونوں سے کہیں زیادہ دلکش نظر آنے لگی۔

"سکندر!" — اُس نے سسکنے کے لہجے میں پوچھا — "دھوکا تو نہیں دے جاؤ گے؟"

"نہیں عذرا!" — میں نے اُس کو اپنے اتنا قریب کر کے کہا کہ اُس کی آنکھیں مجھے اپنی آنکھیں معلوم ہونے لگیں — "میں دھوکا کھا سکتا ہوں، دھوکا دینا نہیں جانتا۔"

میرے دل نے عذرا کو قبول کر لیا۔

میں اپنی امی اور ابو کی قبروں پر گیا اور فاتحہ پڑھی۔ اچانک ایسا رونا آیا کہ میں رو رو کر ہلکان ہونے لگا۔ جذبات کی ایسی شدت مجھ پر کبھی طاری نہیں ہوئی تھی لیکن اس روز نہ جانے کیا ہوا کہ قبروں سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میری جڑیں اس مٹی میں تھیں۔ میں تو بھاگا بھاگا پھر رہا تھا لیکن اُس روز اس مٹی نے میرے پاؤں جکڑ لئے تھے۔ بڑی مشکل سے وہاں سے آیا۔ میری چھٹی کا ابھی پورا ایک ہفتہ باقی تھا۔ میں اتنے دن وہاں نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ سوچا کہ دوستوں سے ملاقات کر لی جائے۔

میں خالہ یا شہناز کے گھر کی طرف جانے کی بجائے دوسری گلی میں چلا گیا جہاں میرے ایک دو بچپن کے دوست رہتے تھے۔ میں ابھی کسی دوست کے گھر تک نہیں پہنچا تھا کہ شہناز کا چھوٹا بھائی آتا نظر آیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔

"سکندر بھائی، میں تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں" — اُس نے کہا — "کسی نے بتایا کہ تم قبرستان کی طرف چلے گئے تھے۔ میں اُدھر ہی جا رہا تھا.... امی کی حالت بگڑ گئی ہے۔ شہناز نے کہا ہے کہ سکندر کو بلا لاؤ"۔

"ڈاکٹر کو گھر لے جانا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "ڈاکٹر کو دکھانے کا وقت گزر گیا ہے۔ وہ اب بچ نہیں سکے گی"۔

میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر گیا۔ جس کمرے میں اُس کی ماں تھی اُس کمرے میں کھڑا نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ ناک پر رومال رکھنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ شہناز کا دوسرا بھائی باہر صحن میں بیٹھا تھا۔ میں نے رسماً اس سے پوچھا کہ امی کی حالت کیسی ہے۔ اُس نے ایسی بے رُخی سے جواب دیا جیسے اُسے کوئی دلچسپی نہ ہو اور کوئی لاوارث عورت مر رہی ہو۔ شہناز باورچی خانے میں تھی۔ اُس سے میں نے پوچھا۔

"آج کا دن مشکل سے ہی گزارے گی" — شہناز نے ایسے لہجے میں کہا جس میں دُکھ یا غم کی جھلک بھی نہیں تھی۔ کہنے لگی — "ختم ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ اس نے بہت سزا بھگت لی ہے"۔

"پھر مجھے کیوں بلایا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"وہ بار بار تمہارا نام لیتی ہے" — شہناز نے کہا — "میں نے سوچا کہ آخری وقت کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھ ہی جاؤ"۔

میں اُس کی ماں کے پاس جا بیٹھا۔ اُس کی آنکھیں اَدھ کھلی تھیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ ختم ہو چکی ہے لیکن اُس نے آہستہ آہستہ چہرہ میری طرف کیا۔

"تم سکندر ہو؟" — اُس نے بڑی نحیف آواز میں پوچھا۔

"ہاں خالہ!" — میں نے کہا — "میں سکندر ہوں"۔

وہ کچھ دیر چپ رہی۔ اُس سے بولا نہیں جاتا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ایک ایک لفظ بڑی مشکل سے کہتی اور ہانپ جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک اور لفظ کہتی تھی۔ بعض اوقات رُک رُک کر دو تین لفظ ذرا تیزی سے کہہ لیتی تھی۔ اس طرح اُس نے جو بات کہی اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ اُسے اپنے بیٹوں کا غم نہیں۔ وہ مرد ہیں۔ اچھا یا بُرا، اپنا آپ سنبھال لیں گے۔ اُسے غم شہناز کا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ شہناز کو تم اچھا نہیں سمجھتے" — اُس نے بڑی مشکل سے خاصا وقت لگا کر یہ الفاظ کہے — "اس آخری وقت میں اپنے گناہ اپنی روح سے جھاڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تم سب مجھے بخش دینا۔ تمہارے باپ کو میں نے شہناز کے ہاتھوں بڑی آہستہ آہستہ مروایا تھا۔ اپنے باپ کی قبر پر جا کر میرے گناہ بخشوانا"۔

"خالہ!" — میں نے کہا — "آپ کو بولتے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ خدا کو یاد کریں اور اس تکلیف میں ایسی باتیں نہ سوچیں"۔

"تم تکلیف کہتے ہو" — اُس نے الفاظ توڑ توڑ کر اپنا مدعا یوں بیان کیا — "یہ تکلیف نہیں۔ یہ ایک اذیت ہے۔ ایسی اذیت گناہگاروں کو دوزخ میں بھی نہیں ملتی ہو گی۔ مجھے یہ اذیت ملنی ہی تھی اور جس طرح تمہارا باپ تڑپ تڑپ کر پیاسا مرا ہے، اُس کا یہی انجام ہونا تھا۔ ہم دونوں نے جو گناہ کیا تھا اُس کی سزا ہمیں اسی دنیا میں ملنی چاہئے تھی .... اُسے بھی مل گئی، مجھے بھی مل گئی"۔

"میں کہتا ہوں خالہ، ایسی باتیں نہ کرو" ——— میں نے کہا ——— "میرے ابا جان نے آپ کی بیٹی کے ساتھ شادی کی تھی اور اس میں آپ کی رضامندی شامل تھی۔ یہ کوئی گناہ نہ تھا۔"

"بہت بڑا گناہ تھا" ——— اُس نے کہا ——— "کہتے ہیں خدا ہر گناہ بخش دیتا ہے لیکن یہ گناہ ایسا ہے جو خدا شاید کبھی بھی نہیں بخشتا ہوگا۔"

"کیسا گناہ؟" ——— میں نے پوچھا۔

"شہناز تمہارے باپ کی اپنی بیٹی ہے" ——— اُس نے کہا ——— "شہناز کی رگوں میں تمہارے باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔"

"خالہ؟" ——— میں نے کہا ——— "آپ بہت تکلیف میں ہیں۔ آپ کو یہ بھی پتہ نہیں چل رہا کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں بیٹا!" ——— اُس نے کہا ——— "ابھی ہوش میں ہوں۔ مجھے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لینے دو .... میری بیٹی کا باپ تمہارا باپ ہے .... ابھی تمہارے باپ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میری شادی ہو چکی تھی۔ میں شہناز کی ہی طرح خوبصورت تھی۔ تمہارا باپ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ ہماری پردے پردے میں دوستی چل رہی تھی۔ جب میری شادی ہوئی تو ہماری دوستی کا رنگ بدل گیا۔ اس دوستی کی یادگار شہناز ہے۔ پھر تمہارے باپ کی بھی شادی ہو گئی۔ اس کے بعد بھی کبھی کبھی ہماری ملاقات ہو جاتی تھی۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ شہناز کا باپ میرا باپ ہے تو تم نے اپنی بیٹی کو اُس کی بیوی کیوں بنایا تھا؟" ——— میں نے پوچھا ——— "کیا میرے باپ کو معلوم نہیں تھا؟"

"اُس نے تمہاری ماں کی موت کے بعد مجھ سے شہناز مانگی تھی تو میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ یہ تو تمہاری اپنی بیٹی ہے" ——— شہناز کی ماں نے کہا ——— "لیکن وہ نہیں مانتا تھا۔ کہتا تھا یہ تمہارے خاوند کی بیٹی ہے، میری نہیں۔ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ وہ اس حقیقت کو جانتا تھا۔ پہلے اُس نے میرے ساتھ اس کا ذکر کیا بھی تھا پھر ایسے ہوا کہ میں بھی بے ایمان ہو

گئی۔ کون نہیں جانتا کہ میں کتنی فریب کار ہوں اور میرے اندر روپے پیسے اور جائیداد کا کتنا لالچ ہے۔ میں آج اپنی زبان سے کہہ رہی ہوں کہ تمہارے باپ کی طرح میں نے بھی اپنے آپ کو دھوکا دے لیا تھا کہ شہناز میرے خاوند کی بیٹی ہے۔ میری نظر تمہاری اتنی بڑی حویلی پر اور اس حویلی کے سامان اور تمہاری ماں کے زیور پر تھی۔ لوگ آج بھی کہتے ہیں کہ تمہارے باپ کو میں نے گھیرا تھا کہ وہ میری بیٹی کے ساتھ شادی کر لے لیکن حقیقت یہ تھی جو میں نے تمہیں سُنا دی ہے۔"

"اگر اب بھی یہ حقیقت مجھے نہ سناتیں تو میرے لئے اچھا ہوتا" ——— میں نے کہا ——— "اس راز کو اپنے ساتھ لے جاتیں۔ تمہیں احساس نہیں کہ یہ بات سُنا کر تم نے مجھے اُسی قسم کا زہر پلا دیا ہے جو تم شہناز کے ہاتھوں میرے باپ کو پلاتی رہی ہو۔"

"پریشان نہ ہو بیٹا!" ——— اُس نے اُکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ بڑی ہی مشکل سے یہ الفاظ کہے ——— "میں نے اس راز سے اس لئے پردہ اُٹھایا ہے کہ تمہارے دل میں شہناز کی ذرا سی بھی عداوت نہ رہے اور تم اسے اپنی بہن سمجھو۔ بے شک ایسی اولاد حلال نہیں ہوتی ——— لیکن تم یہ سوچ لو کہ تم دونوں کا خون ایک ہے۔"

مجھے ایسے لگا جیسے کمرے کی بدبو بڑھ گئی ہو۔ میں نے اپنے آپ کو یہ دھوکا دینے کی کوشش نہ کی کہ یہ بدکار عورت جھوٹ بول رہی ہے۔ اس سے پہلے عشو مجھے بتا چکی تھی کہ میرے باپ نے اُس کے ساتھ بھی ایسے ہی تعلقات پیدا کر رکھے تھے۔ اُس وقت عشو ہمارے گھر کی نوکرانی ہوا کرتی تھی۔ اگر یہ بھی جھوٹ تھا تو میرے باپ کا کردار اسی سے بے نقاب ہو جاتا تھا کہ اُس نے اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی اور اُس کے ہاتھوں میں اس طرح کھیلتا رہا تھا کہ اُسے یہ دیکھنے کی بھی ہوش نہ رہی کہ اُس کا گھر خالی ہو رہا ہے۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ میری ذہنی حالت کیا سے کیا ہو گئی۔ میں اپنے

آپ کے لئے اجنبی ہوگیا۔ ذہن کبھی خالی ہوجاتا اور کبھی خیالوں کا ہجوم آجاتا۔

یہ عورت مجھے پُراسرار نظر آنے لگی۔ جب اپنے باپ کا خیال آیا تو وہ بھی پُراسرار لگا۔ میرا گھر یقیناً آسیب زدہ تھا۔ پھر ایسے لگا جیسے ساری دنیا آسیب زدہ ہو۔

میں وہاں سے اُٹھا اور شہناز کے پاس جا بیٹھا۔ اُس نے مجھے کھویا کھویا دیکھ کر پوچھا کہ میں اُس کی ماں کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگیا ہوں یا کوئی اور بات ہے۔ میں نے جواب دینے کی بجائے شہناز کے چہرے کو غور سے دیکھا جیسے وہ کوئی اور ہو جسے میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

"کیا سوچ رہے ہو سکندر!" —— شہناز نے پوچھا۔

میں نے اُسے بتا دیا۔

"ایک مہینہ گزرا امی نے مجھے یہ بات سنائی تھی" —— شہناز نے کہا —— "میں تمہیں نہیں بتانا چاہتی تھی لیکن امی نے تمہیں بھی بتا دیا۔"

"کیا میرا باپ اتنا پاپی تھا؟" —— میں نے کہا۔

"اس سے بھی زیادہ!" —— شہناز نے کہا —— "اپنے دل پر اتنا بوجھ نہ ڈالو سکندر! دوسروں کے گناہوں پر تم نہ پچھتاؤ۔"

شہناز میرا دل بہلا رہی تھی۔ وہ خود اس انکشاف پر پریشان نظر آتی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اپنے باپ کے گناہوں کا پچھتاوا میرے حصے میں آیا ہے۔ شہناز کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں پھر میں باہر نکل گیا۔ اپنے بچپن کے تین چار ساتھیوں سے ملا۔ ان کے ساتھ گپ شپ لگا کر دل کی حالت سنبھل گئی۔

اب مجھے اس سوال کا جواب مل گیا کہ میں شہناز سے اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینا چاہتا تھا لیکن اس کا ہمدرد کیوں بن گیا؟ اُس نے نوابزادہ حمید اللہ خان کی جاگیر میں مجھے موت سے بچایا تھا لیکن میں نے اس کی قیمت ادا کر دی تھی۔

وہ تو میرے دل اور میری روح پر غالب آگئی تھی۔ مجھے صاف پتہ چل رہا تھا کہ میرے دل میں شہناز کی محبت پیدا ہو چکی ہے جسے میں زبردستی دبانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اب پتہ چلا کہ یہ خون کی کشش تھی۔ خون کو خون پہچان لیتا ہے۔

+

وہ رات اپنی خالہ کے گھر گزری۔ شہناز کے بھائی تو میرے مرید بن گئے تھے۔ اُن کا اصرار تھا کہ میں اُن کے گھر رہوں لیکن اپنی خالہ کا گھر موجود تھا میں کسی اور کے ہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

صبح سویرے اطلاع ملی کہ شہناز کی ماں مر گئی ہے۔ میں وہاں گیا۔ شہناز سے میں نہیں مل سکتا تھا۔ وہ اندر عورتوں میں تھی۔ میں باہر مردوں میں جا بیٹھا اور سب کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ بعض خوش ہوتے اور بعض حیران کہ میں سب انسپکٹر ہوں۔ سب انسپکٹر کو لوگ بڑا تھانیدار کہا کرتے تھے۔

شہناز کی ماں کو اُسی روز دفن کر دیا گیا۔ معلوم ہُوا کہ میت کو نہلانے والی پیشہ ور عورت نے شہناز کی ماں کو غسل دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس کا جسم قبر میں جانے سے پہلے ہی گل سڑ گیا تھا۔ نہلانے والی عورت کو زیادہ پیسے دے کر غسل کی رسم پوری کی گئی۔ میت پر چار بالٹیاں پانی پھینک دیا گیا تھا۔

میں رات کو شہناز سے ملا۔ اُس نے کہا کہ میں چھٹی پوری کر کے جاؤں۔ اِدھر عذرا نے بھی یہی ضد کی کہ اگر رُک سکتا ہوں تو رُکا رہوں اور اُس کے گھر رہوں۔ میں مان گیا۔

چار دن خالہ کے گھر گزارے۔ اس عرصے میں مجھے پتہ چلا کہ عذرا کی طبیعت خوشگوار ہے اور میرے معاملے میں وہ بہت جذباتی ہے۔ اُس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنے کا بھی موقع ملا اور خلاف توقع زیادہ موقع ملا۔

پانچواں دن میری چھٹی کا آخری دن تھا۔ میں شہناز کے گھر کو چل دیا۔ میں اُسے ان چار دنوں میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ اُس کے بھائیوں نے بتایا تھا کہ اب عورتیں کم آتی ہیں اور وہ بھی صبح دس بجے سے پہلے پہلے۔ میں دن کے پچھلے پہر گیا۔ پتہ چلا شہناز کمرے میں ہے۔ میں کمرے میں چلا گیا لیکن دہلیز پر ہی رُک گیا۔

کمرے میں پلنگ پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ کوئی بڑی معزز عورت تھی۔ کوئی عام سی عورت ہوتی تو میں دہلیز پر نہ رُک جاتا۔

+

"آجاؤ سکندر!" —— شہناز نے کہا —— "انہیں سلام کرو۔"

میں نے سلام کیا لیکن اس معزز عورت کا چہرہ ذرا غور سے دیکھا تو مجھے دھچکا سا لگا۔ اُس کی شکل وصورت گلشن آرا جیسی تھی۔ کوئی فرق نہ تھا۔ اگر کوئی فرق تھا تو یہ تھا کہ گلشن آرا حسین عورت تھی۔ عورت یہ بھی گلشن آرا کی ہی طرح حسین تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر جلال تھا اور یہ چہرہ نورانی سا تھا۔ اُس نے چادر اس طرح اوڑھی ہوئی تھی کہ اُس کے سر کا ایک بھی بال نظر نہیں آتا تھا۔

ایسا تو ہوتا ہی ہے کہ دو انسانوں کی شکلوں میں ذرا سا بھی فرق نہیں ہوتا۔

"آگے آ سکندر!"—— اس عورت نے کہا —— "مجھ سے نہ جھجک۔ میں گلشن آرا ہوں۔ اُس نے اپنا دایاں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر میری طرف کیا اور بولی —— "آگے آ سکندر!"

میں کھچا ہُوا اُس کے قریب چلا گیا اور ارادے کے بغیر ہی اُس کے آگے جُھک گیا۔ اُس نے اپنا آگے بڑھا ہُوا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور پیار سے سر پر پھیرا۔ اُس نے ہاتھ ہٹایا تو میں سیدھا ہُوا اور اُس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ وہ گلشن آرا ہی تھی۔ وہی گلشن آرا جو میرے ساتھ نواب کی قید سے آزاد ہوئی اور میں نے اُسے ہوس کا نشانہ بنانا چاہا تھا۔ آخر وہ دریا میں کُود گئی تھی۔

اُس گلشن آرا کے بولنے کا انداز کچھ اور ہُوا کرتا تھا لیکن اس گلشن آرا کے انداز اور لہجے میں بزرگی تھی۔ میں تو اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اسے میں مرا ہُوا سمجھ رہا تھا۔ جہاں وہ دریا میں کُودی تھی وہاں دریا گہرا تھا۔ اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اگر پانی گہرا نہ ہوتا تو بھی گلشن آرا کو مرنا ہی تھا۔ وہ دیہات کی جفاکش عورت نہیں تھی کہ اس کا جسم دریا کا مقابلہ کر سکتا۔ وہ تو ملکہ تھی جس نے عیش وعشرت دیکھی تھی اور وہ تیرنا تو یقیناً نہیں جانتی تھی، پھر یہ معجزہ کیسے ہُوا کہ وہ زندہ وسلامت میرے سامنے تھی؟

میری حیرت میں یہ دیکھ کر اضافہ ہُوا کہ میں تو گلشن آرا کو دیکھ کر سُن ہو کے رہ گیا تھا لیکن گلشن آرا کا ردِ عمل ایسا نہیں تھا بلکہ اس کا ردِ عمل کچھ بھی نہ تھا۔ اُس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اُس نے میرا نام لیا تھا لیکن مجھے دیکھ کر وہ

ذرا سی بھی حیران نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے بولنے کے انداز میں ٹھہراؤ سا تھا جس طرح برگزیدہ آدمی اپنے مریدوں اور معتقدوں کے ساتھ بات کیا کرتے ہیں۔

"بیٹھ جاؤ سکندر!"—— شہناز نے کہا۔

"میرے پاس بیٹھ سکندر!"—— گلشن آرا نے پُر وقار اور نرم وملائم لہجے میں کہا —— "ہم موت کی راہ کے مسافر ہیں .... سب موت کے مسافر ہیں۔ منزل سب کی ایک ہے، راستے جدا جدا ہیں۔ کوئی کسی راستے پر نکل جاتا ہے کوئی کسی راستے پر .... جو اللہ کے راستے پر چلتے ہیں، وہ بھی اور جو نفس کے راستے پر چلتے ہیں، وہ بھی جاتے ایک ہی منزل پر ہیں .... منزل ایک ہے .... تیری بھی، میری بھی .... تیرا راستہ وہاں سے بدل گیا تھا جہاں سے پانی شروع ہُوا تھا اور میرا راستہ وہاں سے شروع ہُوا تھا جہاں پانی ختم ہو گیا تھا۔ پانی میں کُود جانے سے پہلے میں گمراہ تھی، میں بھٹک رہی تھی، اور تُو پانی سے ڈر گیا .... پانی نے میرے وجود کو اور میری روح کو دھو کر پاک کیا اور کنارے پر اُگل دیا تھا، اور تُو شاید ...."

"نہیں گلشن!"—— میں نے کہا —— "مجھے اُس پانی نے راستہ دکھا دیا تھا جس میں تُو نے اپنے وجود اور اپنی رُوح کو پھینک دیا تھا۔ میں آج تک بھٹکا نہیں .... شہناز سے پوچھ لو۔"

گلشن آرا نے اپنا دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔

"ہاں، میں دیکھ رہی ہوں"—— اُس نے کہا —— "تیرا چہرہ بتا رہا ہے۔ گناہ چہرے پر بڑی بھدی اور بے رنگ روشنائی سے لکھ دیئے جاتے ہیں۔ تیرے چہرے کے رنگ نکھرے ہُوئے ہیں۔ کوئی رنگ پھیکا نہیں پڑا .... چہرہ رُوح کا آئینہ ہے سکندر! تیرا آئینہ صاف اور شفاف ہے .... اُس خدا کو بھولے تو نہیں ہو جس نے فرشتے بھیج کر ہمیں موت کے جبڑوں سے نکال لیا تھا؟"

"نہیں گلشن!"—— میں نے نادان سے بچے کی طرح کہا۔ اچانک میری زبان بے قابو ہو گئی۔ گلشن نے اپنا ہاتھ میرے سر سے ہٹا لیا تھا۔ میں نے لپک کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بے تابی سے پوچھا —— "اپنی کہو گلشن!

کچھ اپنی بتاؤ۔ تم دریا سے زندہ کیسے نکل آئی تھیں؟ کہاں رہیں؟ یہاں کیسے پہنچیں؟ گلشن! کچھ بتاؤ....."

اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہنے دیا اور دوسرا ہاتھ اُوپر کر کے شہادت کی اُنگلی آسمان کی طرف کی۔ اُس کے ہونٹوں پر نہایت خوبصورت مُسکراہٹ آگئی۔ اُس نے بڑی آہستہ سے کہا ــــ "وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ جو ہُوا اُسی کے حکم سے ہُوا۔ اللہ نے مجھ پر صرف یہ کرم نہیں کیا کہ مجھے دریا سے اُٹھا کر باہر پھینک دیا بلکہ اُس کی ذاتِ باری نے میری رُوح سے سارے گناہوں کی سیاہی دھو ڈالی..... یہ کیسے ہُوا، یہ کیوں ہُوا، میں نہیں جانتی۔ جو ہُوا میری ہوش میں ہُوا۔ خدا مجھے ایک بڑے ہی پاک آدمی کے پاس لے آیا جو شاید میرے ہی انتظار میں تھا۔ اُس نے میرے ساتھ شادی کر لی..... میری بات نہ کر سکندر! میں کچھ نہیں تُو بھی کچھ نہیں۔ ہم تو مٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرّے ہیں۔ جو ہے اُس کی ذات ہے" ــــ اُس نے ایک بار پھر شہادت کی اُنگلی آسمان کی طرف کی۔

"بی بی جی!" ــــ شہناز نے گلشن آراء سے پوچھا ــــ "ایسے لگتا ہے جیسے آپ سکندر کو جانتی ہیں"۔

"ہاں شہناز!" ــــ گلشن آراء نے میرے سَر سے ہاتھ ہٹا کر میرے کندھے پر رکھا اور مجھے ذرا اپنی طرف کر کے بڑے پیار سے کہا ــــ "میں اسے صرف جانتی ہی نہیں۔ یہ تو میرے وجود کا ایک حصّہ ہے اور یہ میری روح میں بسا ہُوا ہے۔ یہ مجھ سے جدا ہو گیا تھا تو میں اسے یاد کرتی اور اس کے لئے دعا کیا کرتی تھی"۔

"یہ تمہاری دعاؤں کا ہی نتیجہ ہے کہ میں پولیس کا سب انسپکٹر ہوں" ــــ میں نے کہا۔

گلشن آراء نے ہاتھ میرے کندھے سے ہٹا کر میری ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور ایک جھٹکے سے میرا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے چہرے کا رنگ لال ہو گیا تھا جیسے اُسے میری بات اچھی نہ لگی ہو۔

"تُو دنیا کے عہدوں کی بات کرتا ہے" ــــ گلشن آراء نے کہا ــــ "میں تیری روح کی بات کرتی ہوں۔ تیرے لئے میری دعا صرف یہ ہوتی تھی کہ اس

لڑکے کو گناہوں سے بچانا یا ربّ! اسی نے مجھے باپ کے قید خانے سے رہائی دلائی تھی"۔

"شہناز!" ــــ میں نے شہناز سے کہا ــــ "میں نے تمہیں ایک گلشن آراء کے قصّے سناتے تھے۔ وہ یہی تھی..... لیکن اب یہ سمجھو کہ وہ گلشن آراء ایک جسم تھی اور یہ گلشن آراء جو تمہارے سامنے بیٹھی ہے یہ رُوح ہے"۔

"تم شاید نہیں جانتے کہ یہ روح کتنی پاک ہے" ــــ شہناز نے کہا ــــ "یہ ہمارے پیر صاحب کی بی بی جی ہیں"۔

"گلشن!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں تمہیں ایک شہناز کی باتیں سُناتا رہا تھا"۔

"وہ یہی شہناز ہے؟" ــــ گلشن آراء نے پوچھا۔

"ہاں" ــــ میں نے جواب دیا ــــ "لیکن یہ تم جیسا معاملہ ہے۔ وہ شہناز ایک جسم تھی۔ یہ شہناز کچھ اور ہے"۔

"اِس کی رُوح بے چین ہے" ــــ گلشن آراء نے کہا ــــ "اللہ کرم کرے گا..... مجھے اب جانا چاہیئے" ــــ وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی اور کہنے لگی ــــ "پیر صاحب انتظار کر رہے ہوں گے"۔

"ابھی نہیں گلشن!" ــــ میں نے اُس کے راستے میں کھڑے ہو کر کہا ــــ "پیر صاحب تھوڑا سا اور انتظار کر لیں گے"۔

"نہیں سکندر!" ــــ اُس نے کہا ــــ "وہ ٹھیک حالت میں نہیں۔ کچھ دن ہُوتے وہ گھوڑے سے گر پڑے تھے۔ ایک ٹانگ کی ہڈی دو جگہوں سے ٹوٹ گئی ہے۔ وہ تو ایک جرّاح نے جوڑ دی ہے لیکن ان کے سَر کو ایسی چوٹ لگی ہے کہ ہوش میں ہیں۔ ہر کسی کو دیکھتے ہیں۔ پہچانتے کسی کو بھی نہیں۔ میرے ساتھ باتیں کرتے ہیں لیکن مجھے بھی نہیں پہچانتے۔ کتنی بار مجھ سے پوچھ چکے ہیں کہ تم کون ہو۔ میں انہیں بتاتی ہوں تو وہ ذرا سا مُسکراتے ہیں پھر ان کی مُسکراہٹ غائب ہو جاتی ہے۔ کچھ وقت گزرتا ہے تو پھر پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو۔ میں انہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ شہناز کی والدہ فوت ہو گئیں تو بھی میں نہ آ سکی۔ آج ہمّت کی

ہے اور آگئی ہوں۔ مجھے جانے دو۔"

وہ جب چلی گئی تو مجھے شک ہُوا کہ یہ وہ گلشن آراء نہیں۔ یہ گلشن آراء بزرگوں کی سی پُروقار چال چل رہی تھی۔

+

گلشن آراء چلی گئی اور میں بُت بنا کمرے میں کھڑا رہا۔ شہناز اُس کے ساتھ دروازے تک چلی گئی تھی۔ وہ آئی اور اُس نے مجھے گم سُم کھڑے دیکھا تو میری کمر میں بازو ڈال کر پلنگ تک لے گئی اور مجھے بٹھا دیا۔

"گلشن آراء کو دیکھ کر تم ٹھکانے نہیں رہے"۔۔۔ شہناز نے کہا ۔۔۔ "تم جب اُس کے ساتھ گلشن گلشن کہہ کر باتیں کر رہے تھے تو مجھے غصّہ آ رہا تھا کہ تم میرے پیر صاحب کی بی بی جی کی بے ادبی کر رہے ہو.... اسے تو تمہارے ساتھ ناراض ہونا چاہیئے تھا لیکن اس کے دل میں تمہارا بہت پیار ہے۔"

"ہاں شہناز!" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "میں نے تمہیں ساری بات سنائی تھی۔ میں اس سے شرمسار تھا لیکن میں مان گیا ہوں کہ یہ اب مقدس اور بزرگ عورت ہے۔ اس نے مجھے میری بدتمیزی یاد نہیں دلائی اور کوئی طعنہ نہیں دیا۔"

میں نے شہناز کی طرف دیکھا۔ نہ جانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔ وہ خلاء میں گھُور رہی تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا اور اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں جیسے وہ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کیا ہُوا شہناز!"

اُس نے میری طرف دیکھا اور آہ بھری۔ پھر میرے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"سنو گے سکندر؟"

"سناؤ" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "کیا سناؤ گی؟"

"اپنی نحوست کی ایک اور داستان۔"

میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"ہاں سکندر!" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میں تم سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔ میں

بی بی گلشن کے خاوند کی مریدنی ہوں۔"

"یہ پیر کوئی اچھے لوگ تو نہیں ہوتے" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "مریدوں کی بجائے مریدنیوں میں زیادہ خوش رہتے ہیں۔"

"پھر تم انہیں پیر نہ کہو" ۔۔۔ شہناز نے کہا ۔۔۔ "یہ پیر صاحب تعویذ نہیں لکھتے نہ پھونکیں مارتے ہیں۔ میں خود پیروں سے دُور رہا کرتی تھی۔ اپنے شہر میں واپس آکر میری جو حالت ہوتی وہ تم سے چھپی ہُوئی نہیں۔ ماں کو اس حالت میں دیکھا۔ اتنے خوبصورت اور جوان بھائی آوارہ اور بدمعاش ہو چکے تھے۔ میں تنہا تھی۔ سر لوگوں کے طعنے اور وہ قصّے کہانیاں جو وہ میرے متعلق ایک دوسرے کو سناتے تھے، میری بچپن کی سہیلیاں مُنہ موڑ گئیں۔ لوگوں نے مجھے طوائف تک کہہ ڈالا۔ سچی بات یہ ہے کہ اپنے اور ماں کے گناہ بھوتوں اور چڑیلوں کی طرح میرے سامنے ہر وقت ناچنے اور چیخنے لگے۔ میں تو پاگل ہو چلی تھی۔ ایک روز محلے کی ایک عورت آئی۔ پرانی عمر کی عورت ہے۔ اُس کے دل میں میرا کچھ پیار اور کچھ درد زندہ تھا۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ لئے۔ وہ تجربہ کار عورت تھی۔ میرے دل کا حال جان گئی۔ اُس نے مجھے ان پیر صاحب کے گھر کا راستہ دکھایا۔"

شہناز نے مجھے بڑی لمبی بات سنائی۔ اس عورت نے اُسے اس پیر کے گھر کا راستہ دکھایا تو شہناز کشمکش و پیچ میں پڑ گئی۔ اُسے اپنی خوبصورتی اور جوانی کا احساس تھا اور اُس نے پیروں کے کئی قصّے سُن رکھے تھے۔ اُس نے اس عورت کے سامنے اس خدشے کا اظہار کیا۔

"یہ وہ پیر نہیں کا کی!" ۔۔۔ اس عورت نے اُسے کہا ۔۔۔ "یہ تو اللہ لوک ہیں۔ تمہیں اللہ کے راستے پر ڈال دیں گے اور کچھ پڑھنے پڑھانے کو بتا دیں گے۔ یہ تو عالم ہیں۔ تم جاؤ۔ اگر ان کی نیت میں خرابی دیکھو تو جانا چھوڑ دینا۔"

شہناز کی ذہنی حالت اتنی بُری تھی کہ اس پہ وہ قابو نہیں پا سکتی تھی۔ وہ تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک روز اُس پیر کے گھر جا پہنچی اور اس کے سامنے بیٹھ کر بہت روئی۔

"کس کے گناہوں کا بوجھ اپنی رُوح پر اُٹھائے پھرتی ہو؟" ۔۔۔ پیر نے

اس سے پوچھا۔

شہناز انہی الفاظ سے متاثر ہو گئی کہ پیر نے اُس کے چہرے سے جان لیا تھا کہ یہ عورت گناہگار ہے۔ شہناز نے پیر کے چہرے کی طرف دیکھا لیکن بول نہ سکی۔

"مت گھبرا لڑکی!" ــــ پیر نے کہا ــــ "اپنے ضمیر کی جھولی میں جو کچھ ہے میرے سامنے پھینک دے۔ تیری آنکھوں میں لکھا ہے کہ تُو اپنے جسم کی مراد لے کر نہیں آئی، تیری روح روگی ہے .... بول .... اللہ کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے؟"

شہناز کے آنسوؤں جاری ہو گئے جیسے ندی کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ وہ سسکیاں لینے لگی۔ پھر اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ پیر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر اسے تسلی دلاسہ دیا۔ آخر شہناز نے اپنے آپ پر قابو پایا اور اُس نے اپنی زندگی کی ساری داستان سنا ڈالی۔ اُس نے کچھ بھی نہ چھپایا۔

"اور اب تُو ایک اور گناہ کر رہی ہے" ــــ پیر نے کہا ــــ "تُو شاید نہیں جانتی کہ اللہ کی ذات سے مایوس ہونا کتنا بڑا گناہ ہے۔ اللہ کسی کے گناہ کسی دوسرے کے کھاتے میں نہیں لکھا کرتا۔ تُو اپنی ماں کے گناہ اپنی جھولی میں اٹھاتے پھرتی ہے۔ پھینک دے انہیں۔ تُو نے اپنی ماں کی جو حالت سنائی ہے یہ اُس کی سزا ہے۔ اُسے کوئی حکیم، کوئی جراح اور کوئی ڈاکٹر ٹھیک نہیں کر سکے گا۔ ہے تو تیری ماں، تجھے بُرا تو لگے گا لیکن میں تجھے بتا دیتا ہوں کہ وہ گل سڑ کر قبر میں اُترے گی۔ اُس نے جو گناہ تجھ سے کراتے تھے ان کی بھی سزا اُسے مل رہی ہے۔"

شہناز نے اُسے بتایا کہ جن حالات میں وہ گھر گئی ہے ان سے نجات کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے۔ پیر نے اُسے بتایا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنی نیّت کو پاک رکھو۔

پیر نے اُسے کئی اور باتیں بتائی تھیں۔ شہناز کو ایسے ہی ایک ہاتھ کی ضرورت تھی جو اُسے تھام لیتا۔ پیر کی باتوں نے اُسے بہت حوصلہ دیا۔ وہ وہاں

سے آئی تو اُسے ایسے محسوس ہُوا جیسے وہ بڑا ہی ناگوار بوجھ جو وہ اپنے اوپر اٹھاتے اٹھاتے پھرتی تھی وہ پیر نے اُتار پھینکا ہے۔

+

شہناز نے اس پیر کے پاس باقاعدہ جانا شروع کر دیا۔ کبھی ایک روز چھوڑ کر، کبھی دو تین روز چھوڑ کر اُس کے پاس جاتی اور وہ اسے اللہ اور رسولؐ کی باتیں ایسے انداز سے ذہن نشین کراتا کہ شہناز کو سکون سا آجاتا۔ اس پیر کی یہی خوبی مشہور تھی کہ وہ روایتی یا پیشہ ور پیروں کی طرح نہ تعویذ دیتا تھا نہ پھونکیں مارتا تھا، نہ بے اولاد عورتوں کو اولاد دیتا تھا، نہ وہ کاروباری دعائیں کرتا تھا۔ وہ کوئی عالم تھا لیکن ایسا عالم جس نے صرف کتابیں نہیں پڑھی تھیں بلکہ انسانوں کو بھی پڑھا تھا۔ الفاظ کی دُنیا کی نسبت وہ حقیقی دنیا کو حقیقی رنگ میں دیکھتا تھا۔

اُس کے بولنے کا انداز اتنا پُر اثر تھا کہ شہناز روحانی سکون محسوس کرتی تھی۔ شہناز کو یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ یہاں وہ بات نہیں جس سے وہ ڈرتی تھی۔ اُس نے کئی اور عورتوں کو پیر کے ہاں جاتے دیکھا تھا۔ پیر نے شہناز کو یہ اعزاز بھی بخشا کہ اپنی بیوی سے اُس کا تعارف کرا دیا اور بیوی سے کہا کہ اس لڑکی کو روحانی سکون کی ضرورت ہے۔ اس طرح شہناز گلشن آراء سے ملی لیکن اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ وہ گلشن آراء ہے جس کے قصے میں نے شہناز کو سناتے تھے۔ گلشن آراء کے پاس بیٹھ کر شہناز کو اور زیادہ سکون محسوس ہونے لگا۔

ایک روز شہناز پیر کے ہاں گئی۔ اُس کے ہاں جاتے ڈیڑھ مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا تھا۔ اب وہ پیر کے ساتھ پوری بے تکلفی کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی۔ پیر نے اس کے ساتھ یہ بے تکلفی پیدا کر لی تھی کہ اسے اپنے پاس بٹھا لیتا تھا اور کبھی ہلکا پھلکا اور پاکیزہ سا مذاق بھی کر لیا کرتا تھا۔

"سکندر!" ــــ شہناز نے مجھے یہ باتیں سناتے ہوئے کہا ــــ "شاید تم اچھا نہیں سمجھو گے لیکن میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی۔ اس بزرگ شخصیت نے جو سکون مجھے دیا وہ مجھے کہیں اور سے نہیں مل سکتا تھا۔ میں ان کی اتنی

گرویدہ ہوچکی تھی کہ میں انہیں ہر قیمت دینے کے لئے تیار ہوگئی۔ شاید یہ میرے اپنے ذہن کا فتور ہے۔ میری پرورش ہی ایسی ہوتی تھی۔ میں نے یہاں تک سوچا تھا کہ پیر صاحب کو اگر میرا یہ حسین جسم اچھا لگتا ہے تو میں یہ قیمت بھی دے دوں گی۔ وہ بوڑھے نہیں۔ یہ شاید میری فطرت کا فتور تھا کہ میں اُن کے اور زیادہ قریب ہونے لگی۔"

شہناز ٹھیک کہتی تھی۔ ماں نے اُس کی فطرت کو جس سانچے میں ڈھالا تھا وہ اُسی کے مطابق سوچنے لگی تھی۔ وہ باعصمت تو نہیں تھی۔ وہ خلوص دل سے اس شخص کو صلہ دینا چاہتی تھی جس نے اُس پر اتنا بڑا احسان کیا تھا کہ اُسے روحانی سکون دے دیا تھا۔

ایک رات شہناز ماں کی حالت، باپ کی بے حسی اور گھر سے دونوں بھائیوں کی غیر حاضری سے اتنا گھبرائی کہ وہ باپ یا ماں کو بتائے بغیر چادر اوڑھ کر گھر سے نکل گئی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ملک سرفراز اُس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ ایسی صورت پیدا ہوگئی تھی کہ شہناز پر ڈوبنے کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ اپنے پیر و مرشد کے ہاں جا پہنچی۔

"اِس وقت؟"— پیر نے اس سے پوچھا —"اِس وقت آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"گھر میں دم گھٹ رہا تھا"— شہناز نے کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ بلک بلک کر رونے لگی اور اُس نے سر پیر کی گود میں پھینک دیا۔

پیر اُس کے نرم و ملائم بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ شہناز سسکتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ سنبھل کر اُٹھی تو پیر نے اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ پیر اپنے انداز سے باتیں کرتا رہا۔ باتیں کرتے کرتے پیر یوں بدک گیا جیسے کسی چیز نے اُسے ڈس لیا ہو۔ اُس نے شہناز کو ذرا پرے کیا لیکن اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"شہناز!"— پیر نے ایسے لہجے میں کہا جو اُس کے عام لہجے سے بالکل ہی مختلف تھا —"میرے پاس نہ آیا کرو۔ خدا کے لئے میرے پاس

آنا چھوڑ دو۔"

"کیوں میرے مُرشد!"— شہناز نے خوفزدہ سے لہجے میں پوچھا —"کیا مجھ سے کوئی بھول ہوتی ہے؟"

"نہیں لڑکی!"— پیر نے کہا —"میں راستہ بھولتا جا رہا ہوں۔ کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم اگر چلی جاتی ہو تو میں جیسے ادھورا رہ جاتا ہوں۔ میں اپنے آپ کو تمہارے بغیر مکمل نہیں سمجھتا۔"

"نہ جایا کروں؟"— شہناز نے پوچھا —"کیا آپ قبول کریں گے کہ میں یہیں رہوں اور آپ کی اور آپ کی بی بی جی کی خدمت کرتی رہوں؟"

"نہیں"— پیر نے کہا —"میں تمہیں نوکرانی نہیں بناؤں گا.... ذرا ٹھہرو شہناز! میں تمہیں یقین نہیں دلا سکتا کہ میں ایسا آدمی نہیں۔ میرے پاس ایک سے ایک حسین لڑکی آتی ہے۔ میں سب کو اپنی بیٹیاں سمجھتا ہوں لیکن میں تمہیں بیٹی کہنے سے گھبراتا ہوں.... نہیں.... نہیں شہناز! میں اس عمر تک اپنے دامن کو گناہوں سے بچاتا آیا ہوں مگر اب ایسے لگتا ہے جیسے میں اپنے اختیار میں نہیں رہا۔ مجھے بچالو۔"

"ایسا نہ سوچیں میرے مُرشد!"— شہناز نے کہا —"میں آپ کی باندی ہوں، جو حکم دیں گے تعمیل کروں گی۔"

پیر شہناز کو چلے جانے کو کہہ رہا تھا لیکن شہناز جانے پر آمادہ نہیں تھی۔ وہاں سے اُٹھنے کی بجائے وہ اُس کے اور قریب ہوگئی۔

"میں گناہ نہیں کروں گا"— پیر نے کہا —"میری راتوں کے چلّے ضائع ہو جائیں گے.... لیکن شہناز! میں دو حصوں میں کٹ گیا ہوں۔ اگر میں تمہیں کہوں کہ میرے ساتھ شادی کر لو تو مان جاؤ گی؟"

"کیوں نہیں مان جاؤں گی!"— شہناز نے کہا —"اگر آپ کی یہ خواہش ہے تو مجھے اپنی بیوی سمجھیں.... لیکن بی بی جی کیا کہیں گی؟"

"وہ کچھ نہیں کہے گی"— اُس نے جواب دیا —"اُس نے دل اللہ سے لگا رکھا ہے۔"

شہناز بہت خوش ہوئی کہ اتنا عالم اور مخلص آدمی اُسے اپنی بیوی بنا رہا ہے۔ اُس نے اپنا سر پیر کے سینے کے ساتھ لگا دیا اور پیر نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ پیر نے اس اطمینان کا اظہار کیا کہ جسے وہ چاہتا تھا وہ اس کی بیوی بننے پر رضامند ہو گئی ہے۔ دونوں نے طے کر لیا کہ ایک دو دنوں میں وہ شادی کر لیں گے۔

میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ شہناز کے جسم اور حُسن میں کوئی ایسا تاثر تھا کہ جو کوئی اُس کے قریب بیٹھتا تھا وہ مسحور ہو کے رہ جاتا تھا یہی حالت اس پیر کی ہُوئی۔

شادی چار روز بعد ہونی تھی۔ شہناز نے اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اجازت لے لی تھی۔ شادی میں ایک ہی دن باقی تھا۔ شہناز باورچی خانے میں تھی۔ ایک عورت دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ ہاتھ مل رہی تھی۔

"کہاں ہو شہناز!" ــــ اُس نے کہا ــــ "پیر صاحب گھوڑے سے گر پڑے ہیں اور اُنہیں اُٹھا کر ہسپتال لے گئے ہیں .... اللہ رحم کرے .... کہتے ہیں حالت بہت خراب ہے۔ ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ سر پھٹ گیا ہے۔"

شہناز کو چکر آ گیا۔ وہ اُٹھی تو اُسے دیوار کا سہارا لینا پڑا۔ یہ عورت اور اُس کا اپنا گھر اس کے سامنے ایک چکر میں گھوم رہے تھے۔ اُسے سب سے پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ یہ اُس کی نحوست کا اثر ہے۔ شہناز پر نیم غشی طاری ہو گئی۔ اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ عورت اتنی بُری خبر سُنا کر کس وقت گھر سے نکل گئی۔

آٹھ دس روز بعد شہناز نے اپنے پیر و مُرشد کو دیکھا۔ یہ آٹھ دس دن اُس نے روتے ہوتے گزارے تھے۔ وہ ہر روز پیر کے گھر جاتی تھی اور گلشن آراء سے پوچھتی تھی کہ پیر صاحب کیسے ہیں۔ پیر ابھی ہسپتال میں تھا۔ وہ ہسپتال سے آیا تو شہناز نے اُسے دیکھا۔ وہ رہا تو ہسپتال میں لیکن اس کی ہڈیاں ایک جراح نے جوڑی تھیں اور ڈاکٹر نے پلستر لگایا تھا۔ پیر ٹھیک ٹھاک تھا لیکن اُس نے شہناز کو کیا پہچاننا تھا۔ سر کو ایسی چوٹ آئی تھی کہ اُس کی یادداشت ختم ہو

گئی تھی۔

✚

"مجھے اب پتہ چلا ہے کہ میرا وجود اتنا منحوس کیوں ہے" ــــ شہناز نے مجھے یہ سارا واقعہ سُنا کر کہا ــــ "اس کی وجہ وہی ہے جو میری ماں تمہیں اور مجھے بتا کر مری ہے۔ میں ڈرتی ہوں کہ میرا بھی انجام تمہارے باپ اور اپنی ماں جیسا ہو گا۔"

میں تو کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ لوگ مجھے دانشمند سمجھتے تھے اور یہ میں خود بھی محسوس کرتا تھا کہ مجھ میں کوئی حس فالتو ہے اور میری ذہانت عام آدمیوں کی نسبت زیادہ تیز ہے لیکن یہ جو حالات میرے سامنے آئے اور گلشن آراء جس طرح میرے سامنے آ بیٹھی، ان سب نے مجھے چکرا دیا۔ میں نے شہناز کو جھوٹی تسلیاں دیں اور اُسی رات کی گاڑی سے اپنے شہر سے نکل آیا۔ گاڑی کے پہیے ٹھک ٹھک کرتے تھے تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے کوئی میرے سر پر ہتھوڑے مار رہا ہو۔ ایسے لگا جیسے پورے ایک سال بعد اپنی منزل پر پہنچا ہوں۔ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے سلطان کے کوارٹر میں چلا گیا۔ وہ وہاں موجود تھا۔

"آ گئے سکندر!" ــــ اُس نے اُٹھ کر میرے گلے لگتے ہُوئے پوچھا ــــ "دن اچھے گزرے؟"

"جہنم میں دن کیسے اچھے گزر سکتے ہیں؟" ــــ میں نے کہا ــــ "معلوم نہیں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے" ــــ میں نے اُسے ان دنوں کی رُوداد سنائی۔ سلطان اور لاہو نے مجھے تسلیاں دے کر ذرا بہلا لیا۔ اس کے بعد پھر سپیشل برانچ کے روزمرّہ کا معمول شروع ہو گیا۔

بارہ چودہ دن گزرے ہوں گے کہ انسپکٹر ڈورنکاکس نے مجھے اور سلطان احمد کو اپنے دفتر میں بلایا۔

"وہ فرار ہو گیا ہے" ــــ انسپکٹر ڈورنکاکس نے کہا۔

"کون صاحب بہادر؟"

"نواب زادہ حمید اللہ خان" ــــ انسپکٹر ڈورنکاکس نے کہا ــــ "وہ جیل سے

فرار ہو گیا ہے۔ اسے ڈھونڈنا پولیس کا کام ہے لیکن ہمیں بھی اس میں شامل ہونا پڑے گا کیونکہ اُس کا تعلق ہمارے ساتھ تھا۔ خطرہ یہ ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا گروہ بنائے گا یا دہشت گردوں کے ساتھ مل جائے گا۔"

"صاحب بہادر!" —— میں نے کہا —— "وہ شہناز کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ یہ اُس کی انتقامی کارروائی ہوگی۔ شہناز نے ہی اُسے پکڑوایا تھا۔"

"اگلے حکم کا انتظار کرو" —— ولکاکس نے کہا —— "ایس پی صاحب سب کو بلا کر کوئی حکم دیں گے۔"

میرے ذہن میں صرف شہناز تھی۔ وہ خطرے میں آگئی تھی۔

شہناز خطرے میں آگئی تھی تو یہ شہناز کا مسئلہ تھا یا یہ میرا مسئلہ تھا جس نے اپنے آپ کو شہناز کا محافظ سمجھ لیا تھا، میرے محکمے کے انگریز افسروں کا مسئلہ کچھ اور تھا۔ انسپکٹر ولکاکس نے اس کا اظہار کر دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ نوابزادہ حمید اللہ خان ڈاکوؤں کا گروہ بنائے گا یا دہشت گردوں سے مل جائے گا۔ انگریزوں کا مسئلہ ہندوستان میں اپنی حکومت اور اپنے قانون کا تحفظ تھا۔ میں نے اُسے یہ کہہ کر کہ شہناز خطرے میں آگئی ہے، بڑی چھوٹی بات کی تھی۔ شہناز اس ملک کی معمولی سی ایک فرد تھی۔ انگریزوں کو کیا پڑی تھی کہ اُس کی حفاظت کا خاص طور پر اہتمام کرتے!

شہناز حمید اللہ خان کے ساتھ رہ چکی تھی۔ اس دوران اُس نے حمید اللہ خان کو یقیناً بتایا ہوگا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔ حمید اللہ خان وہاں تک پہنچ کر شہناز کو اغوا کرا سکتا تھا۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ حمید اللہ خان نواب کا بیٹا اور بہت بڑا جاگیردار تھا۔ وہ اپنی دنیا کا بادشاہ تھا۔ اُسے اگر سزائے قید ہوگئی تھی تو بھی وہ بادشاہ تھا اور یہ اُس کی بادشاہی کا کرشمہ تھا کہ وہ جیل سے فرار ہو گیا تھا۔

وہ چونکہ نواب زادہ اور جاگیردار تھا اس لئے جیل میں اُسے بہتر کلاس میں رکھا گیا تھا جسے بی کلاس کہتے تھے۔ جیل کے اندر کوئی کسی بھی کلاس میں کیوں نہ ہو، جیل سے فرار ممکن نہیں تھا لیکن حمید اللہ خان نکل گیا۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ، ایک اور افسر اور دو سنتریوں کو معطل کر دیا گیا تھا۔ اُس کے فرار کا طریقہ ایسا تھا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ صرف اپنی سکیم سے فرار نہیں ہوا بلکہ جیل کے افسروں یا سنتریوں نے اُس کی مدد کی ہے۔

وہ دن کے وقت فرار ہوا تھا اور فرار کا طریقہ بڑا ہی دلیرانہ تھا۔ ہر جیل کے ارد گرد کی دیوار بہت اونچی ہوتی ہے۔ اس کے اندر دو تین سنتری گھوم

پھر کر پہرہ دیتے ہیں۔ ہندوستان کی عام جیلوں کی دیواروں کے اوپر کوئی پہرہ نہیں ہوتا تھا نہ ہی سنتریوں کے لئے کوئی پوسٹ یا مچان بنی ہوتی ہوتی تھی۔ حمید اللہ خان اس طرح فرار ہوا کہ وہ جیل کے اندر دیوار سے کم و بیش ایک سو گز دُور اس طرح ٹہلتا رہا کہ اُس پر کسی کو شک نہ ہُوا۔ دیوار کے اُوپر سے ایک رسّہ نیچے آیا جو باہر سے کسی نے پھینکا تھا۔ حمید اللہ خان دوڑتا ہُوا گیا۔ اُس نے رسّے کو پکڑا اور پاؤں دیوار کے ساتھ لگاتا دیوار کے اُوپر پہنچ گیا۔ اُس جگہ دیوار پر پتھروں کا اُبھار سا بنا ہُوا تھا۔ حمید اللہ خان نے اُس کے ساتھ رسّہ باندھا اور دوسری طرف اُتر گیا۔

وہ دیوار پر چڑھا جس میں خاصا وقت لگا ہوگا۔ دیوار کے اُوپر اُس نے رسّہ باندھا۔ اس میں وقت لگا۔ دوسری طرف اُترنے میں وقت لگا۔ کیا یہ سوچا جا سکتا ہے کہ اتنے وقت میں کسی کو پتہ ہی نہ چلا ہو کہ ایک قیدی دیوار پھاند رہا ہے؟ سنتریوں نے وِسلیں اُس وقت بجائیں جب حمید اللہ خان باہر سے بھی غائب ہو چکا تھا۔ تعاقب بیکار تھا۔ دیوار کے باہر کچھ لوگ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دیوار کے قریب دو گھوڑ سوار کھڑے تھے جن کے ساتھ ایک گھوڑا بغیر سوار کے تھا۔ اُوپر سے ایک آدمی آیا۔ وہ خالی گھوڑے پر سوار ہُوا اور تینوں سوار گھوڑے سرپٹ دوڑاتے غائب ہو گئے۔ رسّہ دیوار کے ساتھ لٹکتا رہ گیا۔

اس کے بعد پولیس کے محکمے نے اپنی جاسوسی اور مخبری کی مشینری کو سرگرم کر دیا۔ گاؤں گاؤں میں مُخبر موجود تھے۔ تین گھوڑ سوار چُھپ نہیں سکتے تھے لیکن پندرہ سولہ دن گزر گئے۔ کسی طرف سے کوئی خبر نہ آئی کہ ان سواروں کو کہیں دیکھا گیا ہے۔

میرے محکمے نے حمید اللہ خان کی تلاش کا کام دوسرے انسپکٹروں کو دے دیا تھا۔ میرا اور سلطان احمد کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ حمید اللہ کے ساتھ میرا جو ذاتی تعلق تھا وہ آپ جانتے ہیں۔ میں اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا جس طرح شہناز خطرے میں تھی اسی طرح میں بھی اس خطرے میں آگیا تھا

کہ حمید اللہ خان مجھ پر بھی اِنتقامی وار کرے گا۔ اسے اتنی لمبی سزا دلانے میں سب سے زیادہ میرا ہی ہاتھ تھا۔ ایک روز ہمارے شعبے کے ایس پی نے مجھے اور سلطان کو بلایا۔

"تم دونوں کو بہت ہوشیار اور چوکنا رہنا پڑے گا"—— ایس پی نے ہمیں کہا —— "خاص طور پر سکندر کو زیادہ خطرہ ہے .... تم دونوں ڈیوٹی کے سوا شہر سے باہر نہ نکلنا"—— ایس پی نے ذرا سوچ کر کہا —— "سکندر! ہو سکتا ہے ہم تمہیں کسی وقت اس طرح استعمال کریں جس طرح شیر کے شکار کے لئے بکرا باندھا جاتا ہے لیکن یہ اس پر منحصر ہے کہ ہمیں پتہ چل جائے کہ حمید اللہ خان کس علاقے میں موجود ہے"۔

"میں ہر طرح حاضر ہوں صاحب بہادر!"—— میں نے کہا —— "ہر طرح کے خطرے میں جانے کے لئے تیار ہوں"۔

مجھے سلطان احمد نے بھی خبردار کیا کہ میں اپنے آپ کو سنبھال کر رکھوں۔ مجھے اپنے آپ کو سنبھال کر ہی رکھنا چاہیئے تھا لیکن میری ایک عادت سی ہو گئی تھی کہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر خوشی سی محسوس ہوتی تھی۔ میرے جی میں آتی تھی کہ پتہ چل جائے حمید اللہ خان کہاں ہے تو میں کسی کے حکم کے بغیر اُس علاقے میں پہنچ جاؤں اور للکار للکار کر کہوں، حمید اللہ سامنے آؤ۔ میں تمہیں پکڑنے آیا ہوں، لیکن میں حکم کا پابند تھا۔ میں اپنے طور پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔

✤

انسپکٹر وِلکاکس کے ساتھ ہر روز حمید اللہ خان کے فرار کے متعلق بات ہوتی رہتی تھی۔ وِلکاکس نے مجھے بتایا تھا کہ حمید اللہ کی جاگیر پہ مُخبر بھیج دیئے گئے ہیں۔ اُس کی جاگیر کا کچھ حصّہ جو انگریزوں نے اُس کے باپ کی خدمات کے صِلے میں دیا تھا ضبط کر لیا گیا تھا پھر بھی باقی جاگیر کچھ کم نہیں تھی۔ وہاں نواب نے اپنے آدمی بھیج دیتے تھے۔ وہاں کے دو آدمیوں کو انگریزوں نے غیر معمولی طور پر زیادہ معاوضے پر اپنا مُخبر بنا لیا تھا۔

"لیکن حمید اللہ ایسا بیوقوف نہیں" —— انسپکٹر ڈِلکاکس نے ایک روز مجھے اور سلطان احمد سے کہا —— "وہ چالاک آدمی ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ اُس کی جاگیر اب اُس کے لئے جال بن چکی ہو گی۔ وہ وہاں نہیں جائے گا اور وہ بہت دُور بھی نہیں جائے گا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں صاحب بہادر!" —— میں نے پوچھا۔

"تین بار رپورٹ ملی تھی کہ وہ فلاں علاقے میں موجود ہے" —— انسپکٹر ڈِلکاکس نے کہا —— "تینوں بار ہم نے اپنے جاسوس یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجے کہ وہ واقعی وہاں موجود ہے یا نہیں ...... وہ وہاں موجود نہیں تھا۔"

"صاحب بہادر!" —— سلطان نے کہا —— "وہ اپنے باپ کے ہاں بھی جا سکتا ہے۔"

"ابھی تک وہاں نہیں گیا" —— ڈِلکاکس نے کہا —— "جس روز وہاں گیا اُس کا باپ ہمیں خود اطلاع دے گا ...... تم لوگوں کو شاید معلوم نہیں۔ تمام نوابوں اور مہاراجوں کے محلات میں اور اُن کی ریاستوں میں ہم نے اپنے جاسوس رکھے ہُوتے ہیں۔ اس نواب کے وہ دو افسر جن پر وہ سب سے زیادہ اعتماد کرتا ہے ہمارے جاسوس ہیں۔"

ایک مہینہ اور گزر گیا۔

چند دن اور گزرے تو مجھے پتہ چلا کہ حمید اللہ خان کی موجودگی کی اطلاع کہیں سے آتی ہے۔ پولیس کا طریقہ کار تو یہ ہوتا تھا کہ کسی مفرور ملزم کی کہیں سے اطلاع ملتی تھی تو پولیس کی گارد بھیج کر اُس علاقے کو گھیرے میں لے لیا جاتا اور چھاپہ مارا جاتا تھا لیکن حمید اللہ کے معاملے میں انگریز افسر یہ طریقہ اختیار نہیں کر رہے تھے۔

مجھے پتہ چلا کہ حمید اللہ خان کی کہیں سے اطلاع آتی ہے تو مجھے جوش سا آگیا اور میں انسپکٹر ڈِلکاکس کے پاس جا پہنچا۔ اُس سے پوچھا کہ یہ خبر کہاں تک سچ ہے۔ اُس نے بتایا کہ خبر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اُس نے جو علاقہ بتایا وہ شہر سے بمشکل چار میل دُور تھا۔ اس سے اُس کی جرأت کا اندازہ ہوتا تھا اور یہ

بھی شک ہوتا تھا کہ اُس کے عزائم بڑے خطرناک ہیں۔ وہ اپنا پہلا وار اسی شہر میں کرنا چاہتا ہو گا۔

"صاحب بہادر!" —— میں نے ڈِلکاکس سے کہا —— "اگر آپ چھاپہ مارنے کا انتظام کر رہے ہیں تو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اگر آپ پہلے کی طرح کسی کو بھیج کر تصدیق کرانا چاہتے ہیں کہ حمید اللہ خان وہاں موجود ہے تو اب مجھے جانے دیں۔"

"کیسے جاؤ گے؟"

"بھیس بدل کر" —— میں نے کہا —— "آپ چیک کر لینا ...... میں رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔"

"سوچ لو سکندر!" —— اُس نے کہا —— "تمہیں وہ پہچانتا ہے اس لئے خطرہ ہے کہ وہ تمہیں بہروپ میں بھی پہچان لے گا۔ اُسے ذرا سا بھی شک ہُوا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"لیکن صاحب بہادر!" —— میں نے کہا —— "آپ نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ آپ نے جتنے بھی آدمی بھیجے ہیں اُن میں شاید کوئی ایک بھی آدمی ایسا نہیں تھا جو حمید اللہ خان کو پہچانتا ہو۔ اُسے صرف میں پہچانتا ہوں یا سلطان۔ آپ جنہیں بھیجتے رہے ہیں وہ نمبرداروں وغیرہ سے پوچھ کر آجاتے تھے۔ کیا آپ ان نمبرداروں، ذیلداروں وغیرہ کو نہیں جانتے؟ حکومت کی طرف سے انہیں جو کچھ ملتا ہے اُس سے کئی گُنا زیادہ حمید اللہ خان انہیں دے دیتا ہو گا۔"

"ہم نے جو کچھ کیا سوچ کر کیا تھا" —— ڈِلکاکس نے کہا —— "اور تمہیں یا سلطان کو بھی ہم نے کچھ سوچ کر ابھی تک حمید اللہ خان کے تعاقب میں استعمال نہیں کیا۔"

"میں اپنے آپ کو استعمال کرنا چاہتا ہوں صاحب بہادر!" —— میں نے کہا۔

"میں جانسن صاحب کے ساتھ بات کر لوں" —— انسپکٹر ڈِلکاکس نے کہا

——"تم انتظار کرو۔"

وِلکاکس ایس پی کے دفتر میں جانے کی بجائے کسی اور طرف چلا گیا۔ میں اُس کے انتظار میں اپنے دفتر میں جا بیٹھا۔ سلطان کو پتہ چل چکا تھا کہ میں اپنے آپ کو پیش کر رہا ہوں۔ سلطان آ گیا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا سکندر!" —— سلطان احمد نے کہا —— "کیا یہ تمہارے تایا کی بادشاہی ہے؟"

"کچھ سمجھ نہیں آتی یار!" —— میں نے سلطان سے کہا —— "میں کچھ اس طرح محسوس کرتا ہوں جیسے حمید اللہ خان میرا ذاتی دشمن ہو۔ جب یاد آتا ہے کہ اُس نے مجھے الٹا لٹکا دیا تھا تو میرے خون میں ایسا اُبال آتا ہے کہ میں انتقام لینے کی سوچنے لگتا ہوں۔ اسے عمر قید ہو گئی تو میرا سینہ کچھ ٹھنڈا ہو گیا تھا لیکن وہ بھاگ نکلا۔"

"اگر وہ تمہارے سامنے آ گیا تو تم اُسے اپنے ہاتھوں مار تو نہیں سکتے" —— سلطان نے کہا —— "واپس آ کر اطلاع دو گے کہ وہ فلاں جگہ موجود ہے۔ پھر یوں ہو گا کہ پولیس چھاپہ مارنے جائے گی تو وہ وہاں نہیں ہو گا۔ وہ جو اس شہر کے اتنا قریب جس میں پولیس ہیڈکوارٹر ہے، موجود ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اکیلا نہیں اور اُسے بہت بڑی مدد حاصل ہے۔ وہ اتنی جلدی ہاتھ نہیں آئے گا سکندر!"

"انتقام کے علاوہ ایک خیال اور آتا ہے" —— میں نے کہا —— "میں اُسے جلدی پکڑنا یا پکڑوانا چاہتا ہوں۔ پیشتر اس کے کہ وہ یا اُس کے آدمی شہناز تک پہنچیں، میں اُسے پکڑوا دوں یا اپنے ریوالور کی گولی کا نشانہ بنا دوں۔"

سلطان میرا بڑا عزیز دوست تھا۔ وہ مجھے زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے اور بھی بہت سی دلیلیں دیں۔ پھر اپنی دوستی کا واسطہ دیا کہ میں نہ جاؤں لیکن میرے سینے سے جو ارادہ اُٹھ آیا تھا وہ مجھ پر اس طرح غالب آ گیا تھا کہ ہر دلیل میرے سامنے بیکار ہوتی چلی گئی۔

یہ میری خامی تھی یا اسے خوبی کہہ لیں، ارادہ جو میرے دل سے اُٹھ آتا تھا وہ ٹلتا نہیں تھا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ میں شاید اس لئے حمید اللہ خان کے تعاقب میں جانے کی ضد کر رہا ہوں کہ میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ بزرگ کہا کرتے تھے کہ دن پورے ہو جائیں تو انسان کو موت تک یا کسی مصیبت تک پہنچنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ اس کے باوجود میں اپنے آپ کو روک نہ سکا۔

+

حمید اللہ خان کو فرار ہوتے دو مہینے سے کچھ زیادہ دن گزر گئے تھے اور میں شہناز کے متعلق پریشان تھا کہ وہ اُس پر وار کرے گا لیکن میں نے اتنا بھی نہ کیا کہ شہناز کو اطلاع ہی دے دیتا۔ اب جب کہ میں اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہا تھا تو میں نے شہناز کو خط لکھا:

"..... تمہارے لئے یہ خبر نئی اور عجیب ہو گی کہ حمید اللہ خان جیل سے فرار ہو گیا ہے۔ دو مہینے سے زیادہ دن گزر گئے ہیں۔ تم جن دنوں اُس کے ساتھ تھیں اُسے تم نے بتایا ہو گا کہ تم کہاں کی رہنے والی ہو۔ مجھے یہ فکر ہے کہ حمید اللہ خان تم سے انتقام لینے کی کوشش کرے گا۔ فکر یہ ہے کہ عورت ہو۔ کسی مرد سے انتقام لیا جاتا ہے تو اُسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ تم خود سمجھ سکتی ہو کہ تم جیسی عورت سے کس طرح انتقام لیا جائے گا۔ اپنے بھائیوں کو بھی بتا دینا کہ وہ تمہاری حفاظت کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت گھر میں رہیں۔ رات کو ہوشیار رہنا زیادہ ضروری ہے۔ تم گلشن آرا کے ہاں جاتی رہتی ہو گی۔ اگر وہاں جانا چھوڑ دو تو بہتر ہو گا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اکیلی نہ جانا۔ دو چار عورتیں ساتھ ہوں تو بہتر ہے۔ اپنی خیریت کی اطلاع دینا۔ اتنا زیادہ ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اُسے پکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ میرے ہی ہاتھوں پکڑا یا مارا جائے۔ میرے لئے دعا کرنا۔"

میں نے یہ خط دفتر میں ہی بیٹھ کر لکھا۔ لفافہ میں بند کیا اور اتنی دیر میں انسپکٹر وِلکاکس کا بلاوا آ گیا۔ میں دوڑتا ہوا اُس کے پاس گیا۔

"ٹھیک ہے سکندر!" — ولکاکس نے کہا — "ایس پی صاحب نے کہا ہے کہ تم جو بھیس بدلو گے وہ دیکھیں گے۔ تم کتنی جلدی اُس بھیس میں میرے پاس آ سکتے ہو؟"

"میرے پاس سب کچھ تیار ہے" — میں نے جواب دیا — "میں ابھی جاتا ہوں۔"

ایک گھنٹے کے اندر اندر میں تیار ہو گیا۔ اپنے آپ کو چیک کرنے کے لئے ایک قدِ آدم آئینہ ہمیں ملا ہُوا تھا۔ میں جب اس آئینے کے سامنے کھڑا ہُوا تو آئینے میں جو عکس تھا وہ میرا نہیں تھا۔ وہ کوئی جواں سال پیر تھا۔ سَر پر لال ٹوپی، اس کے اُوپر رومال ڈالا ہُوا تھا جو کندھوں تک اور پیچھے پیٹھ کے بالائی حصے تک گِرا ہُوا تھا۔ سیاہ داڑھی تقریباً دو اِنچ لمبی سلیقے سے تراشی ہوئی تھی۔ مونچھیں اُوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں۔ لٹھے کا کُرتہ تھا۔ اُس پر واسکٹ اور اُس پر چوغہ پہنا ہُوا تھا۔ لٹھے کی شلوار تھی اور اس کے نیچے زری جُوتی۔ یہ حُلیہ کسی ایسے پیرزادے کا تھا جو باپ کے مرنے کے بعد ابھی ابھی گدّی پر بیٹھا ہو۔ ایک ہاتھ میں چھڑی تھی جس کا دستہ ہاتھی دانت کا تھا۔

میں نے جب آئینے میں اس شخص کو دیکھا تو میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ مجھے اپنے آپ کو احترام سے دیکھنا چاہیئے۔ میں باتیں اور ایکٹنگ پیروں جیسی کر سکتا تھا۔ اگر میں نوکری نہ کرنا چاہتا تو بڑی کامیاب نوسَر بازی کر سکتا تھا۔

میں انسپکٹر ولکاکس کے دفتر کے دروازے پر جا رُکا۔ اُس کا اردلی دروازے پر کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے ویسے ہی سلام کیا جیسے دیہات میں یہ لوگ اپنے پیروں کو سلام کیا کرتے تھے، حالانکہ اردلی مجھے بہت اچھی طرح جانتا تھا اور ایک گھنٹہ پہلے یہی مجھے بلانے آیا تھا۔

"وِلکاکس صاحب سے کہو شاہ صاحب آ گئے ہیں" — میں نے اپنی آواز بدل کر اردلی سے کہا — "صاحب نے مجھے ٹائم دیا تھا۔"

اردلی بڑی جلدی اندر گیا اور باہر آ کر اُس نے کہا کہ صاحب بلاتے ہیں۔

میں شاہ صاحبوں کی طرح اندر گیا۔

"ہم نے آپ کو ٹائم نہیں دیا تھا شاہ صاحب!" — انسپکٹر وِلکاکس نے کہا — "بیٹھ جائیں۔ کیا کام ہے؟"

"آپ کو یاد نہیں رہا صاحب بہادر!" — میں نے بدلی ہوئی آواز میں کہا — "آپ نے کہا تھا کہ جلدی تیار ہو کر آؤ۔"

ولکاکس نے بڑی زور سے میز پر ہاتھ مارا اور اپنے مخصوص الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا — "یُو ڈَیم فُول!"

وہ مجھے ایس پی کے دفتر میں لے گیا۔ ایس پی بھی مجھے نہ پہچان سکا۔ مجھے بٹھا کر اُس نے اور انسپکٹر وِلکاکس نے ہدایات دیں اور اُس علاقے کے متعلق تفصیل سے بتایا جہاں نوابزادے کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی۔

"تم کیا کرو گے؟" — ایس پی جالنسن نے مجھ سے پوچھا۔

"میں گھوڑی پر جاؤں گا" — میں نے جواب دیا — "وہاں کسی گاؤں میں پانی پینے کے لئے رُکوں گا۔ میں پیروں جیسی باتیں اور ایکٹنگ کر سکتا ہوں۔ لوگ مجھ سے پوچھیں گے کہ میں کہاں سے آیا ہوں تو میں یہ بات ایسے طریقے سے گول کر دوں گا جیسے یہ بھی کوئی روحانی راز ہے۔ پھر کہوں گا کہ ایک اشارہ ملا ہے۔ میں وہاں تک جا رہا ہوں۔ کوہ قاف کے جنّات وہاں آتے ہیں۔ شاید اُنھوں نے بلایا ہے۔ ابھی تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ وہ جگہ کتنی دُور ہے۔ چلتا جاؤں گا۔ وہ جگہ آ گئی تو وہ مجھے خود روک لیں گے۔"

آج تعلیم کی روشنی گھر گھر پہنچ چکی ہے۔ سائنس نے لوگوں کی کایا پلٹ دی ہے۔ کائنات کا کون سا وہ راز ہے جو سائنس نے کھول کر انسان کے آگے نہیں رکھ دیا لیکن انسان کی کم فہمی اور بے بسی کہ جنّات کا، کسی غیبی قوّت کا نام سُنتا ہے تو ہزاروں سال پہلے کا خوفزدہ، جاہل اور کمزور انسان بن جاتا ہے۔ پھر وہ مجھ جیسے اُس انسان کے آگے سجدے کرنے لگتا ہے جو اُسے جھانسہ دیتا ہے کہ جنّات اور غیبی قوّت میرے ہاتھ میں ہے۔ پیر پرستی تو ہندوستان کی قسمت میں لکھ دی گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میں نے پُراثر انداز سے بات کی

تو یہ لوگ میرے راستے میں آنکھیں بچھائیں گے۔

"کیا تم لوگوں کو متاثر کر لو گے؟" — ایس پی نے پوچھا۔

"کیا آپ ان لوگوں کو نہیں جانتے حضور؟" — میں نے کہا اور ایک بات زبان پر آتی ہوتی نگل لی کہ ہماری قوم میں عقل ہوتی تو کیا وہ بندر کی نسل کی غلام بن جاتی!

ایس پی جانسن اور انسپکٹر ولکاکس نے مجھ سے اور کچھ نہ پوچھا۔ انگریزوں کی بادشاہی کا استحکام اس وجہ سے تھا کہ وہ جس خطے میں جاتے تھے وہاں کے لوگوں کی نفسیات، ان کے مذہب اور اُن کے رسم ورواج سے پوری واقفیت حاصل کر لیتے تھے۔ پھر وہ ان کے مطابق ان لوگوں کے ساتھ سلوک برتاؤ کرتے تھے۔ مثلاً ولکاکس نے کسی شاہ صاحب کو ٹائم نہیں دیا تھا پھر بھی اُس نے اندر بلا لیا اور احترام سے بات کی۔ اگر شاہ صاحب کی بجائے کوئی اور آدمی ہوتا تو ولکاکس اُسے اندر نہ بلاتا۔ اگر بلا بھی لیتا تو پہلے اُسے ڈانٹ پلاتا کہ اُس نے اُسے ٹائم نہیں دیا اور وہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے۔ میرا حلیہ دیکھ کر اُس نے غصہ پی لیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ شاہ صاحب اسی حلیے کے لوگ ہوتے ہیں اور مسلمان ان کا احترام کرتے ہیں۔ لہٰذا اُس نے شاہ صاحب کا احترام کیا۔

یہ دونوں انگریز افسر جانتے تھے کہ جو بہروپ میں نے دھار رکھا ہے، یہ دیہاتی مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کے لئے بہت کافی ہے۔ میری بدلی ہوئی آواز اُنھوں نے سُن لی تھی جس سے وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

✚

وہ گھوڑوں کا زمانہ تھا۔ مجھے ایک گھوڑا دیا گیا جو میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ فوج اور پولیس کے گھوڑے صاف پہچانے جاتے تھے کیونکہ وہ عام گھوڑوں کی نسبت نمایاں طور پر تندرست اور قد کاٹھ میں بڑے ہوتے تھے۔ میں نے انسپکٹر ولکاکس سے کہا کہ مجھے گھوڑی چاہیئے جو عام قسم کے دیہاتیوں کے پاس ہوتی ہے۔ عام لوگ گھروں میں گھوڑیاں رکھا کرتے

تھے۔ سرکاری گھوڑا میرے لئے اس لئے بھی قابل قبول نہیں تھا کہ ہر سرکاری گھوڑے پر نشان لگا ہوا ہوتا تھا۔ میرے لئے میرے مطلب کی ایک گھوڑی منگوائی گئی اور میں اُسی وقت چل پڑا۔ ریوالور میرے چوغے کے نیچے واسکٹ کی جیب میں تھا جس میں چھ گولیاں بھری ہوئی تھیں اور بارہ گولیاں واسکٹ کی دوسری جیب میں تھیں۔ ایک خنجر نیفے میں اُڑس لیا تھا۔

مجھے کہا گیا تھا کہ میں دو کانسٹیبل مریدوں کے طور پر ساتھ لے جاؤں جو ریوالوروں سے مسلح ہوں کیونکہ میرا مشن بہت خطرناک تھا لیکن میں نے اکیلے جانا پسند کیا۔ وجہ یہ تھی کہ میں تو ایکٹنگ کر سکتا تھا اور میں ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتا رہا ہوں کہ اُس نے مجھے اوسط درجے سے کچھ زیادہ عقل دی تھی اور مجھ میں ایک آدھ حس فالتو بھی تھی لیکن کانسٹیبلوں کو بہروپ میں ساتھ لے جانے میں خطرہ یہ تھا کہ وہ ایکٹنگ صحیح طور پر نہیں کر سکیں گے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ذرا سی غلطی کر کے مجھے بھی پھنسا دیتے۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ میں بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں لیکن میں ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا۔

میں شہر میں سے گزرا۔ بعض لوگوں نے مجھے رُک کر دیکھا۔ شاید ہی کوئی ایسا مسلمان ملا ہو جس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے سلام نہ کیا ہو۔ ایک بوڑھے نے تو رُک کر دونوں ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھے اور سلام کیا۔ میں پیروں کی طرح سلاموں کا جواب دیتا شہر سے نکل گیا اور اُس علاقے کی طرف ہو لیا جو میرے مشن کا علاقہ تھا۔

آج یاد آتا ہے تو اُس علاقے کا حُسن بھی یاد آ جاتا ہے۔ لہلہاتی کھیتیاں، ہرے بھرے درخت، کچھ دُور پرے سرسبز پہاڑیاں اور اس خوبصورت ماحول کے اوپر منڈلاتے ہوتے بادلوں کے سائے، لیکن اُس وقت مجھ پر ایسی ہیجانی کیفیت طاری تھی کہ میں قدرت کے اس سرسبز حُسن سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکا تھا۔ کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے موت نے میرے لئے جال بچھا رکھا ہے اور میں سیدھا اُس میں جا رہا ہوں۔

میں اپنے ذہن میں ریہرسل کرتا جا رہا تھا۔ ایک خیال آیا جسے میں نے

تصوّر کی شکل دے دی۔ وہ اس طرح کہ حمید اللہ خان میرے سامنے کھڑا ہے۔ میں ایک دو لمحوں کے لئے سوچتا ہوں کہ اسے زندہ پکڑوں یا واسکٹ سے ریوالور نکال کر اس کا پورا سلنڈر اس پر خالی کر دوں۔

"نہیں سکندر!" —— میری آواز نے مجھے کہا —— "تم ایسا نہیں کرو گے۔ وہ حکومت کا مجرم ہے، تمہارا نہیں۔ تم اُسے زندہ پکڑو گے۔ تم اُس صورت

+

میں اُس پر گولی چلاؤ گے جب وہ تم پر کسی ہتھیار سے حملہ کرے گا۔"

میں نے اپنی اس آواز پر بہت غور کیا۔ سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میں نے اُسے دیکھ لیا تو اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکوں گا۔ مجھے عقل سے کام لینا تھا۔

اچانک میرے دماغ میں ایک لہر سی آئی —— "حمید اللہ نے مجھے کچھ دن پناہ میں رکھا تھا جب تاجا مجھے نواب کے اُس ہولناک قید خانے سے فرار کرا کے لایا تھا۔ اُس وقت حمید اللہ مجھے اچھا لگا تھا۔ اس کے بعد بھی جب میں اُس کے پاس گیا تو اُس نے میری بہت عزت کی تھی۔ اگر میں اسے بخش دوں تو کیا ہو جاتے؟"

میرے دل و دماغ سے رحم کا چشمہ پھوٹا لیکن اچانک دو خیال آ گئے۔ ایک یہ کہ اُس نے تو مجھے قتل ہی کر دیا تھا۔ اگر قتل کر دیتا تو میں دنیا کے جھنجھٹ سے آزاد ہو جاتا۔ اُس نے تو مجھے اُلٹا لٹکا دیا تھا۔ یہ مجھے بڑی اذیت ناک موت مارنا چاہتا تھا۔ دوسرا خیال یہ آیا کہ اُس نے شہنانہ کو بیوی بنانے کی بجائے داشتہ بنا لیا تھا۔

میری گھوڑی چلتی جا رہی تھی اور دماغ متضاد سوچوں کا اکھاڑہ بنتا جا رہا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں ڈر رہا ہوں۔ میں آخر اکیلا تھا۔ ایسے ہو جانا حیران کُن نہیں تھا کہ میں حمید اللہ اور اُس کے چند ایک آدمیوں کے نرغے میں آ جاتا۔ مجھے احساس تھا کہ ایسا ہو گیا تو وہ لوگ مجھے فوراً قتل نہیں کر دیں گے بلکہ تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ایسی صورت آ گئی تو

میں اپنے آپ کو گولی مار لوں گا۔

میں محسوس کرنے لگا کہ مجھ پر جو ہیجانی کیفیت طاری تھی وہ بڑھتی جا رہی ہے اور مجھے اس پر قابو پانا چاہیئے۔ میں نے دل ہی دل میں ریہرسل شروع کر دی۔ پھر ایسے ہُوا جیسے میں گاؤں میں نہیں پہنچا بلکہ گاؤں میرے پاس پہنچ گیا ہو۔

+

یہ چھوٹا سا ایک گاؤں تھا جس میں پچیس تیس گھر تھے۔ سب سے پہلے دو عورتوں نے مجھے دیکھا۔ وہ میری طرف آ رہی تھیں۔ اُنہوں نے سَروں پر دوپٹے سرکا کر آگے کر لئے اور میرے راستے سے ہٹ کر رُک گئیں۔ پھر ایک بوڑھا آدمی سامنے آیا۔ اُس نے جھک کر مجھے سلام کیا اور میرے راستے میں رُک گیا۔

"کسی کے گھر تشریف لا رہے ہیں حضور؟" —— بوڑھے نے بھکاریوں جیسی آواز میں پوچھا —— "غریب خانہ حاضر ہے۔"

"پانی پینے کے لئے دم بھر کو رُکیں گے" —— میں نے جلالی سے لہجے میں کہا۔

"بسم اللہ حضور، بسم اللہ" —— بوڑھے نے کہا اور گھوڑی کی باگ پکڑ کر آگے آگے چل پڑا۔

یہ ایک چھوٹی سی گلی تھی جس سے نکل کر میں آگے گیا تو آگے کچھ جگہ خالی تھی اور اس کے اِرد گِرد مکان تھے۔ خالی جگہ کے درمیان بڑ کا درخت تھا۔ اس کے نیچے دو چار چارپائیاں بچھی تھیں جن پر چند ایک آدمی بیٹھے ہوتے تھے۔ مجھے دیکھ کر سب اُٹھے اور میری طرف آئے۔ یہ اُس دَور کا رواج تھا۔ کسی گاؤں میں سے کوئی اجنبی مسافر پیدل یا سوار گزرتا تھا تو گاؤں والے اُسے روکنا، پانی، کھانا اور حُقّہ پیش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ میں تو پکا گدی نشین تھا۔ تعارف کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سب مجھے برگزیدہ سمجھ رہے تھے۔

وہ جب میرے قریب آتے تو سب نے ماتھوں پر ہاتھ رکھ کر اور جھک

کر سلام کیا۔ میں اُن کے چہروں کے تاثرات سے اندازہ کر رہا تھا کہ اُن پر میرا رُعب طاری ہے اور وہ اپنے آپ میں اتنی ہمت نہیں پا رہے کہ مجھ سے کچھ پوچھیں۔ وہ سب مسلمان تھے۔

"حضور پانی پیئیں گے"— بوڑھا جو مجھے ساتھ لایا تھا اعلان کرنے کے انداز میں بولا۔

بوڑھے کے اس اعلان کے ساتھ ہی ان چند ایک آدمیوں میں ہڑبونگ سی مچ گئی اور اس کے ساتھ ہی گاؤں کے گھروں سے مرد، عورتیں اور بچے نکل نکل کر میرے اردگرد جمع ہونے لگے۔ ایک آدمی آیا جو لباس سے معزز لگتا تھا۔ اُس کی مونچھوں کا تاؤ دوسروں سے جُدا تھا۔ میں نے کسی سے پوچھے بغیر جان لیا کہ یہ نمبردار ہے یا ذیلدار۔ وہ لوگوں کو دھکیل دھکیل کر راستہ بناتا آ رہا تھا۔ اتنی دیر میں میں گھوڑی سے اُترا۔ وہ آدمی مجھ تک پہنچا۔ میرے گھٹنے چھُوتے، میرے ساتھ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا، میرا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگایا اور خواہش ظاہر کی کہ میں چل کر اُس کے گھر بیٹھوں۔

"اللہ تیری ہر مراد پوری کرے"— میں نے کہا —"ہم نے بڑی دُور جانا ہے۔ ہم مٹی کے کورے پیالے میں پانی پیئیں گے اور اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں گے.... دم بھر کو یہیں بیٹھ جاتے ہیں"۔

یہ بان کی چارپائیاں تھیں۔ میں نے دونوں چارپائیوں کو دیکھا اور ایک پر بیٹھنے لگا۔ دو آدمی مجھ پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ایک نے دائیں سے دوسرے نے بائیں سے مجھے پکڑ لیا اور دونوں نے اپنے بازو میری کمر پر رکھ دیئے۔ ہجوم میں بھگدڑ سی مچ گئی۔

"ایک منٹ حضور!"— مجھے کسی کی آواز سنائی دی —"بستر آ لینے دیں"۔

ذرا سی دیر میں سُتلی کی ایک چارپائی آ گئی جس کے پائے رنگین تھے۔ اُس کے اوپر جو بستر بچھا وہ بالکل نیا تھا۔ چار پانچ تکئے رکھ دیئے گئے تب مجھے ان لوگوں نے بیٹھنے دیا۔ میں ٹانگیں لٹکا کر نہ بیٹھا۔ جُوتی اُتار کر پیروں کی طرح

چوکڑی مار کر بیٹھا۔ یکلخت چار پانچ تکئے میرے دائیں بائیں اور پیچھے رکھ دیئے گئے۔ ایک خیال تو یہ آیا کہ پولیس کی نوکری کی بجائے میں پیری مریدی کا دھندا شروع کر دوں تو دولت کے ساتھ ساتھ عزت کا خزانہ مل جائے گا۔ اچانک میرا دل بجھ سا گیا۔ خیال آیا کہ یہ مظلوم اور مجبور لوگ کتنی جلدی فریب کے پھندے میں آ جاتے ہیں۔ یہ بے بسی، کسمپرسی اور پسماندگی کی انتہا ہے۔ میں مذہب سے نماز روزے کی حد تک ہی واقف تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ سلسلہ اللہ کی نگاہ میں بھی ناجائز اور قابلِ نفرت ہو گا۔

جی میں آتی تھی کہ ان لوگوں سے کہوں کہ میں ایک گناہگار بندہ ہوں اور پیٹ کی خاطر ایسے فرائض سرانجام دے رہا ہوں جن میں اپنے سگے باپ کو دھوکا دینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ میں انہیں کہنا چاہتا تھا کہ جن پیروں کے وہ مرید ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُن کی قسمت ان پیروں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ سب مجھ جیسے بہروپیئے ہیں لیکن میں وہاں کسی اور مقصد کے لئے گیا تھا۔ مجھے یہ ڈھونگ پوری کامیابی سے رچانا تھا۔

"حضور!"— اُس معزز آدمی نے جسے میں نمبردار سمجھتا تھا پوچھا —"کیا پیش کروں؟ دودھ؟ کھانا؟...."

"صرف پانی!"— میں نے کہا —"مٹی کے کورے پیالے ہیں"۔

"میٹھا پانی حضور؟"

"نہیں"— میں نے نشے کی سی حالت میں کہا —"میٹھا پانی ہمیں منع ہے"۔

دو آدمی پانی لانے کے لئے دوڑ پڑے۔

"حضور قیام فرمائیں گے؟"— نمبردار نے پوچھا —"اس غریب کو یہ سعادت بخشیں گے؟"

"ہم مجبور ہیں"— میں نے بزرگ پیروں جیسی مسکراہٹ سے کہا —"ہم ایک حکم کی تعمیل میں جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں"۔

ایک کی بجائے دو کورے پیالوں میں پانی آ گیا۔ میں نے ایک پیالہ

لے کر پانی کے چند گھونٹ پیتے۔ دوسرے آدمی کے ہاتھ سے بھی پیالہ لے لیا اور اپنا جھُوٹا پانی اُس میں ملا دیا۔ دونوں پیالوں میں آدھا آدھا پانی رکھا۔

"یہ لو" ــــ میں نے پیالے ان لوگوں کی طرف کر کے کہا ــــ "ایک ایک گھونٹ سب کو پلاؤ۔ اللہ اس گاؤں پر کرم کرے گا جس نے ہماری پیاس بجھاتی ہے"۔

پورا گاؤں ان دو پیالوں پر ٹوٹ پڑا۔ یہ تماشا آج کل بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ پیر صاحب اپنے دَورے پر جاتے ہیں تو اُن کے آگے پلاؤ پکا کر رکھا جاتا ہے۔ پیر صاحب اس میں سے صرف ایک لُقمہ مُنہ میں ڈالتے ہیں۔ پلاؤ کا تھال اُن کے آگے سے اُٹھا دیا جاتا ہے اور وہاں جو لوگ موجود ہوتے ہیں وہ پیر صاحب کے جھُوٹے پلاؤ میں سے دو چار دانے چاول حاصل کرنے کے لئے تھال پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ آدھے سے زیادہ پلاؤ بکھر جاتا ہے مریدوں کا عقیدہ ہے کہ پیر صاحب کا جھوٹا کھاؤ تو گناہ معاف اور مرادیں پوری ہو جاتی ہیں۔ یہی تماشہ میں نے کیا۔

جب ہجوم دونوں پیالے توڑ کر پُرسکون ہُوا اور سب میرے اِردگرد بیٹھ گئے تو میں نے اپنی آنکھوں میں نشے کا سا تاثر پیدا کر کے مُنہ ہی مُنہ میں اوٹ پٹانگ الفاظ بڑبڑانے شروع کر دیئے۔ پھر پوچھا کہ اس گاؤں کا کیا نام ہے۔ تقریباً ہر فرد نے میرے اس سوال کا جواب دیا۔ میں ہر کسی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ حمید اللہ خان ان میں نہیں۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ان لوگوں میں مشکوک قسم کا کوئی آدمی ہے یا نہیں۔

یہ معلوم کرنا آسان نہیں تھا۔ میں دراصل یہ دیکھ رہا تھا کہ یہ شخص جسے میں نمبردار سمجھتا تھا، اور وہ واقعی نمبردار نکلا، تو وہ قابلِ اعتماد ہے یا نہیں۔ مجھے کسی سرکاری آدمی یعنی نمبردار، چوکیدار، ذیلدار یا سفید پوش کو اعتماد میں لینا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ میں ان میں سے کسی کے گھر رُکنے کا کوئی پُراسرار جواز پیدا کر لیتا۔

میں الفاظ میں آپ کو سمجھا نہیں سکوں گا کہ چہرے کس طرح پڑھے

جاتے ہیں اور میں کس طرح اندازہ کر رہا تھا کہ ان لوگوں میں کوئی مشکوک ہے یا نہیں اور نمبردار قابلِ اعتماد ہے یا نہیں۔ چہرہ شناسی کا فن عمر کے ساتھ آتا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس فن کے لئے میں ابھی نوعمر تھا۔ میں کچھ دشواری محسوس کر رہا تھا۔ یہ موقع میری عقل اور فہم و فراست کے لئے بڑے سخت امتحان کا تھا۔



گاؤں کے تمام مرد اور بچے میرے سامنے زمین پر بیٹھے ہوتے تھے۔ عورتیں ان سے کچھ دُور کھڑی تھیں۔ ایک آدمی جس نے رنگدار چادر باندھ رکھی تھی، لمبا کُرتہ پہنا ہُوا تھا اور اُس نے کھیس اپنے سر پر اس طرح لے رکھا تھا کہ اُس کا مُنہ بھی اس سے ڈھکا ہُوا تھا، آہستہ آہستہ چلتا آیا اور لوگوں میں سے گزر کر میرے سامنے آرُکا۔ اُس نے میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا۔ میں نے ہاتھ آگے کیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ پھر میرے سامنے چارپائی کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے خاص طور پر نوٹ کیا کہ اُس کے چہرے پر ویسی مرعوبیت نہیں تھی جیسی دوسرے لوگوں کے چہروں پہ اور اُن کے انداز میں تھی۔ یہ شخص میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی دیکھتا تھا۔

میں ایسا شک نہیں کر سکتا تھا کہ یہ میرا مفرور قیدی ہوگا لیکن مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ کوئی عام سا آدمی نہیں۔ اُس کی صرف پیشانی، آنکھیں اور ناک کھیس میں سے نظر آتی تھیں۔ بہرحال یہ کوئی بڑا زمیندار ہو سکتا تھا۔

"حضور کہاں سے آرہے ہیں؟" ــــ نمبردار نے لجاجت سے پوچھا ــــ "اور کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

میں اس طرح آہستہ سے ہنسا جیسے اُس کا مذاق اُڑایا ہو یا جیسے وہ میرے مقام سے بہت ہی نیچے ہو۔

"تم کیسے سمجھو گے؟" ــــ میں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے نمبردار بچہ ہو اور میں اُس کا باپ ہوں حالانکہ وہ میرے باپ کی عمر کا تھا۔ میں نے جھُومتی ہوتی آواز میں کہا ــــ "بڑی دُور سے آتے ہیں۔ اشارہ ملا تھا کہ حاضری دو"۔

"کسی بڑی درگاہ پر حاضری دینی ہے حضور؟" ــــ ایک بوڑھے آدمی نے پوچھا۔

"جو مخلوق نظر نہیں آتی اُس کی درگاہ بڑی ہی ہوتی ہے" ــــ میں نے وجد کی سی حالت میں کہا ــــ "وہ حضرت سلیمانؑ کی اُمت کا دربار ہے.... کوہ قاف سے ایک بزرگ آتے ہیں۔ ہمیں اشارہ ملا کہ حاضری دو۔ ہم اُدھر ہی جا رہے ہیں۔"

"کہاں حضور؟"

"یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں" ــــ میں نے کہا ــــ "جس سمت اشارہ ہُوا ہے ہم اُس سمت کو جا رہے ہیں۔ وہ جگہ آئے گی تو حضرت سلیمانؑ کے دربار کے سنتری خود روک لیں گے۔"

"حضور!" ــــ نمبردار نے کہا ــــ "اس گاؤں میں ایک لڑکی ہے جس پر جنّات کا قبضہ ہے۔"

"کس نے کہا ہے کہ یہ کوئی جنّ ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"ایک عامل نے بتایا تھا حضور!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "لیکن دو بزرگوں نے بتایا ہے کہ یہ کچھ اور چیز ہے۔ آپ کرم کریں یا سرکار!"

"ابھی نہیں" ــــ میں نے کہا ــــ "واپسی پر دیکھیں گے۔ اگر یہ جن ہُوا تو اُس دربار میں ہمیں ملے گا جس میں حاضری دینے ہم جا رہے ہیں۔ ہم معلوم کر لیں گے۔ واپسی پر انشاء اللہ اس لڑکی کو نجات دلا دیں گے۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ ان لوگوں پر میرا کس قدر رُعب طاری ہو گیا تھا۔ یہ میری ایکٹنگ کا کمال نہیں تھا بلکہ یہ اُن لوگوں کی پسماندگی اور جہالت کی بدولت تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں جیسے میں مراقبے میں چلا گیا ہوں۔ میں دراصل سوچ رہا تھا کہ میرا اگلا قدم کیا ہو۔ یہ نمبردار مجھے اپنے کام کا معلوم نہ ہُوا۔ میری رائے یہ تھی کہ یہ مشکوک سا آدمی ہے۔ مجھے تین گاؤں بتائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ ایک جگہ اور تھی جہاں دو کچے اور ویران مکان بتائے گئے۔ ان تینوں

گاؤں کا علاقہ قدرے پہاڑی تھا اور نشیب و فراز زیادہ تھے۔ میں نے اگلے گاؤں کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا۔ میں نے تھوڑا سا گھوم پھر کر مشاہدہ کرنا تھا کسی نمبردار یا کسی سُلجھے ہُوئے آدمی کو اپنی پیری کے جال میں لینا تھا یا کوئی اور چکّر چلانا تھا جو میں نے سوچ رکھا تھا۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ آپ کو یہ چکّر بتاؤں۔ اُس چکّر تک نوبت نہ آئی۔

+

میں وہاں سے اُٹھا۔ میں نے پاؤں چارپائی سے نیچے کئے تو پانچ چھ آدمی میری جُوتی پر ٹوٹ پڑے۔ ہر آدمی اس کوشش میں تھا کہ وہ مجھے جوتا پہنائے۔ میرے لئے جوتا پہننا مشکل ہو گیا۔ آخر جُوتی پہنی گئی اور میں گھوڑی پر سوار ہُوا۔ میں نے ان لوگوں پر مزید جعلی عکس اس طرح ڈالا کہ گھوڑی پر سوار ہو کر میں نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ تمام لوگوں نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا لئے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ہونٹ ہلانے شروع کر دیئے۔ میں کوئی دعا نہیں مانگ رہا تھا۔ میرے دل میں یہی ایک دعا تھی کہ خدایا، حمید اللہ خان کا کوئی سراغ دے دے۔

میں نے پیروں کی طرح پہلے ایک ہاتھ اپنے مُنہ اور مصنوعی داڑھی پر پھیرا پھر دوسرا اور میں چل پڑا۔ لوگ گاؤں سے باہر تک میرے ساتھ آئے۔ میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور گھوڑی کو ایک سمت ڈال دیا۔

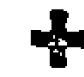
خاصی دُور جا کر پیچھے دیکھا۔ کچھ آدمی ابھی تک گاؤں کے باہر کھڑے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ میرے متعلق ہی باتیں کر رہے ہوں گے۔ میں نے دائیں طرف دیکھا۔ کچھ دُور ایک آدمی اُسی سمت جاتا نظر آیا جدھر میں جا رہا تھا۔ فصل اتنی اونچی تھی کہ اُس آدمی کا اوپر کا دھڑ ہی نظر آ رہا تھا۔ وہاں ایک اونچی باڑ بھی تھی جس کے پیچھے وہ چھپ گیا تھا۔

اُس آدمی کے سر پر کھیس تھا اور وہ سر جھکائے ہُوئے چلا جا رہا تھا۔ وہ آگے گیا تو وہ مجھے پورا نظر آیا۔ اُس نے چادر باندھ رکھی تھی۔ مجھے ایسے

شک ہُوا جیسے وہ وہی آدمی ہے جو سب سے آخر میں میرے پاس آیا تھا اور میرے سامنے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتا رہا تھا۔ مجھے وہ کوئی پُراسرار آدمی لگا تھا۔ میں نے اس کے متعلق معلوم کرنا تھا کہ وہ کون ہے۔

وہ حمید اللہ خان کا آدمی ہو سکتا تھا اور وہ پولیس کا جاسوس بھی ہو سکتا تھا۔

میری گھوڑی چلتی گئی۔ کھیتیاں ختم ہو گئیں اور ایک گھاٹی آگئی جو نشیب میں اُترتی تھی۔ دونوں طرف مٹی کی دیواریں سی کھڑی تھیں جو آگے چل کر چٹانیں بن گئیں۔ چٹانیں ننگی تھیں اور زمین پر اُونچی گھاس تھی۔ میں جس گاؤں کو جا رہا تھا وہ ایک میل کے قریب آگے تھا۔ کچھ اور آگے جا کر راستہ اوپر چڑھتا تھا۔



میری گھوڑی چلتی گئی۔ میں دُنیا کی نظروں سے اوجھل ہو کر جا رہا تھا۔ میرے دونوں طرف ریتلی سی چٹانیں تھیں۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ پچاس ساٹھ قدم آگے دائیں طرف سے ایسی ہی گلی جس میں مَیں جا رہا تھا، اس سے ملتی تھی۔

میں جب اس جگہ کے قریب پہنچا، ایک آدمی اچانک دوسری طرف سے سامنے آگیا اور وہ میرے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی آدمی تھا جس کے سر پر کھیس تھا۔ اب بھی اُس کا مُنہ کھیس میں تھا۔ وہ بالکل میرے راستے میں کھڑا تھا اس لئے مجھے گھوڑی روکنی پڑی۔ مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ یہ کوئی حاجتمند ہے اور مجھے پیر یا برگزیدہ آدمی سمجھ کر مجھ سے اپنی کوئی مراد پوری کرانا چاہتا ہے۔

"کیا ہماری واپسی تک تُو ہمارا انتظار نہیں کر سکتا؟" ——— میں نے پیروں کے جلال اور ذرا رُعب سے کہا ——— "ہماری منزل کے راستے میں نہ آ۔"

وہ چُپ چاپ کھڑا رہا۔

"کیا چاہتا ہے تُو؟"

اُس کے کھیس کے اندر ذرا حرکت ہوئی۔ اُس نے کھیس کا پردہ اُٹھا دیا۔ کھیس اُس کے سامنے سے ہٹ گیا، سَر سے بھی اُتر گیا۔ اُس کا چہرہ بے نقاب

ہو گیا۔

وہ تو نوابزادہ حمید اللہ خان تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نالی میری طرف تھی۔

"گھوڑی سے اُتر آ سکندر!" ——— اُس نے کہا ——— "ہاتھ چوغے کے اندر نہ لے جانا۔"

میں نے بڑی تیزی سے سوچا کہ میں گھوڑی سے اُترتے اُترتے چوغے کے نیچے پہنی ہوئی واسکٹ کی جیب سے ریوالور نکال سکتا ہوں یا نہیں۔ میں نکال سکتا تھا لیکن وہ میرے قریب آگیا۔ اُس کے ریوالور کی نالی مجھ سے بمشکل ایک فٹ دُور تھی۔

میں گھوڑی سے اُتر آیا اور میں ریوالور نہ نکال سکا۔

"مجھے پکڑنے آتے ہو؟" ——— اُس نے پوچھا۔

"ہاں خان صاحب!" ——— میں نے کہا۔

"دیکھ لو!" ——— اُس نے کہا ——— "کون پکڑا گیا ہے .... اپنا حُلیہ جو بھی بنا لو، اپنی آنکھوں اور اپنی پیشانی کو تم نہیں بدل سکتے۔"

اُس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ہونی چاہیئے تھی۔ مسکراہٹ نہیں تھی۔

"کیا تم میرے ہاتھ سے بچ سکتے ہو؟" ——— اُس نے ایسے لہجے میں پوچھا جس میں رعب نہیں تھا، طنز بھی نہیں تھی ——— "جب سے تم ان چٹانوں میں اُترے ہو، دو بار میرے ریوالور کے نشانے میں آتے ہو لیکن میری اُنگلی نے ٹریگر دبانے سے انکار کر دیا۔ میں تمہیں گولی مار کر اسی گھوڑی پر سوار ہو جاتا اور کہاں سے کہاں جا پہنچتا .... ریوالور ہے؟"

"ہے!"

"میں تم سے ریوالور نہیں لوں گا" ——— اُس نے کہا ——— "یہ بھی نہیں کہوں گا کہ ریوالور نکال کر نیچے پھینک دو۔"

"نوابزادے!" ——— میں نے کہا ——— "گولی مارنی ہے تو ٹریگر دبا دو۔

مجھے زندگی سے پیار نہیں۔ اگر مجھے کہو گے کہ میں تمہارے ساتھ چلوں اور تم مجھے ریوالور کی نالی پر اپنے ساتھ لے جاؤ گے تو میں نہیں جاؤں گا۔ تمہیں آخر گولی چلانی پڑے گی۔"

"نہ تم میرے ساتھ چلو گے نہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا" — اُس نے کہا — "میں اپنے ٹھکانے پر جاؤں گا تم اپنے ٹھکانے پر جاؤ گے۔ اگر تمہیں مارنا ہوتا تو دس منٹ پہلے تمہیں اُڑا چکا ہوتا۔"

"مرد بنو نوابزادہ صاحب!" — میں نے کہا — "گولی چلاؤ یا کہو میرے ساتھ چلو۔"

"تمہارے انگریز افسر مجھے نہیں پکڑ سکیں گے سکندر!" — اُس نے کہا — "جو آئے گا مارا جائے گا، اور جو ہندوستانی میرے تعاقب میں آئے گا وہ اسی طرح واپس جائے گا جس طرح میں تمہیں واپس بھیج رہا ہوں .... جاؤ سکندر! میں نے تمہاری زندگی تمہیں واپس دے دی۔"

"میں پیٹھ پھیروں گا اور تم مجھ پر گولی چلا دو گے" — میں نے کہا — "کیوں نہیں میرے سینے میں گولی مار دیتے؟ میں نے تم سے کونسی نیکی کی ہے کہ تم مجھ پر گولی نہیں چلاؤ گے؟ کیا میں نے تمہیں عمر قید نہیں دلاتی؟ وہ میں ہی تھا جس نے ...."

"مت یاد دلاؤ مجھے وہ باتیں!" — اُس نے دبدبے سے کہا — "کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں واپس بھیجنے کی بجائے گولی چلا دوں" — اُس کی آواز دب گئی۔ اُس نے پوچھا — "شہناز کہاں ہے؟"

"کیا اُس سے انتقام لو گے؟" — میں نے پوچھا۔

"میں اُس سے بہت بُرا انتقام لوں گا" — اُس نے کہا۔

"مجھ سے ہی انتقام لے لو خان صاحب!" — میں نے کہا — "تمہارا اصل مجرم میں ہوں، شہناز نہیں۔"

"اُس کا جُرم یہ نہیں جو تم بتا رہے ہو" — اُس نے کہا — "اُس نے مجھے نہیں میری محبت کو دھوکہ دیا ہے۔ وہ میری محبت کی قاتل ہے۔ تم نہیں

سمجھتے سکندر! شہناز پہلی عورت ہے جس سے مجھے دلی محبت ہوتی ہے۔ اُس نے محبت کا یہ جواب دیا کہ مجھے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا .... جیب سے ریوالور نکالو اور اُدھر پھینک دو۔"

میں نے ریوالور نکال کر پرے پھینک دیا۔ اُس نے اپنا ریوالور پھینک دیا۔ اُس کا ریوالور میرے ریوالور کے قریب جا پڑا۔ میں حیران ہونے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" — میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" — اُس نے کہا — "تم مجبور ہو۔ اپنے آقا کے حکم کے پابند ہو۔ تم نے مجھے اپنی گزری ہوتی زندگی کی کہانی سناتی تھی۔ میں تم پر رحم کرتا ہوں۔ پھر کبھی میرے سامنے نہ آنا۔"

"نہیں آؤں گا" — میں نے کہا — "لیکن شہناز پر وار کرو گے تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا۔"

"ایسی حماقت نہ کرنا" — اُس نے کہا۔

"ایک طرف تمہاری یہ مردانگی کہ تم نے مجھ جیسے دشمن کو بخش دیا ہے" — میں نے کہا — "اور دوسری طرف تمہاری یہ بزدلی کہ ایک عورت سے انتقام لو گے۔"

"سوچ لوں گا" — اُس نے کہا — "یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا ہے .... ہمیں زیادہ دیر یہاں کھڑا نہیں رہنا چاہیئے۔"

وہ اُس طرف گیا جہاں دونوں ریوالور پڑے تھے۔ فاصلہ دس بارہ قدم ہو گا۔ وہ اُدھر ریوالور اُٹھانے کو مڑا تو اُس کی پیٹھ میری طرف ہو گئی۔ میں نے نیفے میں خنجر اُڑس رکھا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ بڑی تیزی سے خنجر تک گیا۔ حمید اللہ خان ریوالور اُٹھانے کے لئے جھکا۔ وہ میرے لئے بہت ہی آسان شکار تھا۔ خنجر کا ایک ہی وار کافی تھا۔ اُوپر سے وار کرنے سے خنجر دستے تک اُس کی پیٹھ میں اُتر جاتا۔

میرا ہاتھ خنجر تک گیا مگر ہاتھ رُک گیا اور اس طرح آہستہ آہستہ ہاتھ واپس

آگیا جیسے اسے خنجر نہ ملا ہو۔ حمید اللہ خان ابھی تک جھکا ہُوا تھا اور میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ریوالور اُٹھا کر سیدھا ہُوا۔ اُس نے اپنا ریوالور چادر کی ڈب میں اُڑس لیا اور میرا ریوالور مجھے دے دیا۔ میں اُسے آسانی سے گولی مار سکتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کو قتل نہیں کر سکیں گے" — حمید اللہ خان نے کہا — "جاؤ سکندر! .... کیا مجھے بتانا پسند کرو گے کہ واپس جا کر اپنے افسروں کو کیا رپورٹ دو گے؟"

میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور میری آہ نکل گئی۔ میں نے ایسے محسوس کیا جیسے میں ایک نادان بچّہ ہوں اور وہ پیرِ کامل!

"کیا رپورٹ دوں؟" — میں نے پوچھا۔

"کہنا حمید اللہ خان اِس علاقے میں نہیں ہے" — اُس نے کہا — "اگر تم اپنی ماں کے خاوند کے بیٹے نہیں ہو تو کہہ دینا کہ حمید اللہ خان اسی علاقے میں موجود ہے اور نمبردار کو اُس کی موجودگی کا علم ہے۔"

"نہیں!" — میں نے ایسے کہا جیسے یہ بات کسی انجانی قوّت نے مجھ سے کہلواتی ہو — "میں ایسے نہیں کہوں گا۔"

"کہہ بھی دو گے تو کیا ہو جائے گا" — اُس نے کہا — "پولیس چھاپہ مارنے آئے گی تو میں یہاں نہیں ہوں گا۔ نمبردار کے خلاف کارروائی ہوگی تو تمہیں کیا ملے گا!"

"پولیس چھاپہ مارنے نہیں آئے گی" — میں نے کہا۔

"تم جاؤ" — اُس نے کہا — "رپورٹ دینا کہ تم نے اپنے خفیہ طریقوں سے معلوم کیا ہے۔ حمید اللہ خان اِدھر نہیں آیا۔"

"میں کہیں اور تو گیا نہیں" — میں نے کہا۔

"سمجھ لو کہ تم نے سارا علاقہ چھان مارا ہے" — اُس نے کہا — "اگر تمہارے محکمے نے اپنے مخبروں کے ذریعے معلوم کرنا چاہا کہ تم نے کیا کیا ہے تو تمہارے متعلق یہی رپورٹ جائے گی کہ تمہارا بہروپ کامیاب تھا اور تم نے

میرا سراغ لگانے کی پوری کوشش کی ہے۔ یہ بندوبست میرا ہوگا کہ رپورٹ تمہارے حق میں جائے .... جا سکندر! زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔"

"اور شہناز؟"

"کیا غم ہے تمہیں شہناز کا؟" — اُس نے کہا — "میں شاید اُسے معاف نہیں کر سکوں گا .... یہ بھی ممکن ہے کہ وہ میرے سامنے آئے تو میرے دل سے انتقام کا خیال ہی نکل جائے .... میں کچھ کہہ نہیں سکتا .... ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا سکندر!"

"تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیئے" — میں نے کہا — "شہر کے اتنی قریب رہنا تمہارے لئے ٹھیک نہیں۔ دیکھ لو۔ تمہاری موجودگی کی مُخبری ہو گئی ہے اور بالکل صحیح مُخبری ہوتی ہے۔"

"مُخبر نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے" — حمید اللہ خان نے کہا — "مجھ کو پتہ چل جائے گا وہ کون ہے۔ اُس کی زندگی کے ایک دو دن ہی باقی ہیں۔"

"اب کیا کرو گے خان صاحب؟" — میں نے پوچھا — "کب تک چھُپے رہو گے؟ آئندہ کے لئے کیا سوچا ہے؟ .... میں اپنی دلچسپی کے لئے پوچھ رہا ہوں۔"

"ذرا سنبھل لوں سکندر!" — اُس نے کہا — "کچھ تو کروں گا .... طوفان کی طرح آؤں گا" — اُس نے ذرا سوچ کر کہا — "مجھے تمہاری ضرورت ہے سکندر!"

"ڈاکو بناؤ گے مجھے؟"

"نہیں" — اُس نے ایسے کہا جیسے آہ بھری ہو، پھر بولا — "جاؤ سکندر! رُکو نہیں۔"



میں گھوڑی پر سوار ہُوا۔ گھوڑی کا رُخ موڑا تو میری پیٹھ اُس کی طرف ہو گئی۔

میں نے کلمۂ طیّبہ کا وِرد شروع کر دیا۔ یہ وِرد ڈر کی وجہ سے شروع نہ کیا بلکہ میں مرتے وقت زبان پر اللہ اور رسولؐ کا نام رکھنا چاہتا تھا۔ دنیا کی آخری آواز جو

میں نے سنی تھی وہ حمید اللہ خان کے ریوالور کا دھماکہ تھا۔ میں کیسے یقین کر سکتا تھا کہ حمید اللہ خان مجھے گولی نہیں مارے گا؟ اُس سے مجھے یہی توقع تھی کہ وہ مجھ پر پیچھے سے فائر کرے گا۔ وہ میرے ساتھ کھیل رہا تھا یا وہ مجھ سے ڈر رہا تھا۔

میں نے اندازہ کیا کہ میں ریوالور کے رینج سے نکل آیا ہوں۔ میں نے پیچھے نہ دیکھا۔ کچھ اور آگے جا کر چٹانوں کی یہ گلی مُڑتی تھی۔ وہاں سے مُڑتے میں نے پیچھے دیکھا۔ حمید اللہ خان وہیں کھڑا تھا۔ اتنی دُور سے مجھے اُس کی چلائی ہوئی گولی نہیں لگ سکتی تھی۔ اُس نے ہاتھ اُوپر کر کے ہلایا۔ میں نے بھی ہاتھ ہلایا اور رُکی ہوئی گھوڑی باگ کے ہلکے سے جھٹکے سے چل پڑی۔ حمید اللہ خان میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ان نشیبی جگہوں سے نکل کر میں نے گھوڑی کو اُس راستے پر ڈال دیا جو اُس گاؤں سے بہت دُور سے گزرتا تھا جس میں میں رُکا تھا۔ گھوڑی کو تو میں نے اُس راستے پر ڈال دیا لیکن میرا ذہن کسی اور راستے پر چل پڑا۔ حمید اللہ خان میرے لئے معمہ بن گیا تھا۔

"اس نے مجھے کیوں زندہ رہنے دیا ہے؟"

"میں نے موقع ملنے کے باوجود اسے کیوں چھوڑ دیا؟"

"ہمارے درمیان کون سا رشتہ ہے؟"

یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگے۔ بہت سوچا۔ کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا جواب وقت دیا کرتا ہے۔

کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔

حمید اللہ خان میرے لئے ایسا ہی ایک سوال بن گیا۔

انہی سوچوں، انہی سوالوں میں بھٹکتا ہوا میں اپنے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گیا۔ میں آہستہ آہستہ آیا تھا۔ میرا یہ مشن ایسا تھا جس نے مجھے اتنی جلدی فارغ نہیں کرنا تھا۔ جلدی واپس آکر میں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں نے مشن مکمل نہیں کیا۔

گھوڑی کو میں نے اصطبل میں بھیجنے کی بجائے اپنے کمرے کے پیچھے باندھ دیا۔ بہروپ اُتارا۔ نہایا اور لیٹ گیا۔ میں اس قدر الجھاؤ میں تھا کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں دن بھر کا بھوکا ہوں۔

سلطان احمد آ گیا۔ وہ میرے متعلق بہت پریشان رہا تھا۔ ہماری محبت سگے بھائیوں کا رنگ اختیار کر گئی تھی۔

"کیا کر آئے ہو؟" — اُس نے پوچھا۔

"بچ کر آ گیا ہوں" — میں نے کہا۔

"کس سے؟"

"حمید اللہ خان سے!" — میں نے جواب دیا اور اُسے سارا واقعہ سُنا دیا۔

سلطان پر خاموشی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"وہ تمہیں اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے" — سلطان نے کہا — "میں تو یہی سمجھتا ہوں .... دوسری بات جو مجھے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تمہاری آنکھوں میں ایسا تاثر ہے جو مدِمقابل کے دماغ پر اثر کرتا ہے۔ یہ تو تم خود ہی جانتے ہو۔"

"اب مسئلہ یہ ہے کہ میں رپورٹ کیا دوں؟" — میں نے پوچھا۔

ہم دونوں نے بحث مباحثہ کر کے رپورٹ تیار کر لی۔ صبح انسپکٹر ڈولکاکس کی موجودگی میں ایس پی جانسن کو زبانی رپورٹ دی۔ میں نے کامیابی سے جھوٹ بولا اور بتایا کہ حمید اللہ خان اس علاقے میں نہیں آیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ان دونوں انگریز افسروں نے میری رپورٹ کو قابلِ قبول سمجھا۔

+

سپیشل برانچ کے پاس صرف حمید اللہ خان کے فرار کا ہی کیس نہیں تھا، اور بھی کئی کیس تھے۔ میری اور اُس کی ملاقات کے بعد تین ساڑھے تین مہینے گزر گئے۔ حمید اللہ خان کے فوٹو تمام تھانوں کو بھجوا دیئے گئے تھے۔ اس کے تعاقب کی گرما گرمی خاصی کم ہو گئی تھی۔ حمید اللہ خان کو زمین نے تو نہیں نگل لیا

تھا۔ اُس کے سامنے پورا ہندوستان پڑا تھا۔ اب اس کی تلاش معمول کی کارروائی بن گئی۔ پہلے والا جوش و خروش نہیں رہا تھا۔

ان تین ساڑھے تین مہینوں میں شہناز کے دو خط آئے تھے۔ دونوں خط بڑے جذباتی تھے۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے وہ اس زندگی سے جو وہ گزار رہی تھی، تنگ آچکی تھی۔ شہناز پنجرے میں جینے والا پنچھی نہیں تھی۔ اُس نے یہ تو لکھا تھا کہ گلشن آراء نے اُس کی سوچوں میں انقلاب بپا کر دیا ہے لیکن اُس کی تحریروں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے آپ میں بٹ گئی ہے اور اُسے راستہ نظر نہیں آرہا۔ میں نے اُسے ایک بار پھر لکھا تھا کہ وہ اپنی حفاظت کا خیال رکھے۔

ایک روز شہناز کے بڑے بھائی کا خط آیا۔ خط کیا تھا بم کا دھماکہ تھا — لکھا تھا کہ شہناز لاپتہ ہوگئی ہے۔ وہ گلشن آراء کے گھر گئی تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود اکیلی چلی گئی تھی۔ شام کے بعد تک واپس نہ آئی تو بھائی گلشن آراء کے گھر گیا۔ گلشن آراء نے بتایا کہ وہ اُس کے گھر سے چلی گئی تھی۔ وہ سورج غروب ہونے سے ذرا ہی پہلے گلشن آراء کے گھر سے نکلی تھی۔

حمید اللہ خان وار کر گیا تھا۔

اُس کے سوا اور کون ہوسکتا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ شہناز خود کسی کے ساتھ نہیں گئی، اُسے اغوا کیا گیا ہے اور اغوا حمید اللہ خان نے کرایا ہے۔ میرا خون جوش میں آگیا۔ میں نے حمید اللہ خان کو صحیح معنوں میں مرد سمجھ لیا تھا جس طرح اُس نے مجھے زندہ چھوڑ دیا اور رخصت کیا تھا ایسے کوئی عام یا اوچھا آدمی نہیں کرسکتا۔ ایسی فیاضی کا مظاہرہ وہی کرسکتا ہے جو بڑے مضبوط دل اور بڑے ہی اُونچے کردار کا مالک ہو، لیکن شہناز کی گمشدگی کی اطلاع ملی تو حمید اللہ خان کی فطرت کا اصل پہلو میرے سامنے آگیا۔ اُس نے عورت پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

اب میں اپنی اور حمید اللہ خان کی ملاقات کے متعلق سوچنے لگا تو خیال آیا

کہ اُس نے مجھے اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ اُسے یہ خطرہ بھی نظر آرہا تھا کہ اُس کی گولی خطا گئی تو میں اُسے نہیں چھوڑوں گا۔ میں اپنی طبیعت کی گرما گرمی میں خط اُٹھائے انسپکٹر وِلکاکس کے پاس چلا گیا اور اُسے بتایا کہ شہناز اغوا ہوگئی ہے اور یہ کارستانی حمید اللہ کی ہے۔

"اگر یہ کام حمید اللہ کا ہے تو جیل سے فرار کے بعد یہ اُس کا پہلا جرم ہے" — انسپکٹر وِلکاکس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اُسے شہناز کے اغوا کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ ہو۔ وہ کہنے لگا — "شہناز کے باپ نے تھانے میں رپورٹ کر دی ہو گی" — وہ چونک پڑا جیسے اُسے کچھ یاد آگیا ہو۔ کہنے لگا — "ہم اپنی برانچ کی طرف سے اُس تھانے کو چِٹھی بھیج دیں گے کہ اغوا کا ملزم مفرور قیدی حمید اللہ خان ہوسکتا ہے اس لئے تفتیش پوری محنت کے ساتھ کی جائے۔ ہم یہ بھی لکھیں گے کہ حمید اللہ خان کی فوٹو اگر اُس تھانے میں نہیں ہے تو ہم سے منگوالیں .... ٹھیک ہے سکندر؟"

"ٹھیک ہے صاحب بہادر!" — میں نے کہا اور اُس کے دفتر سے نکل آیا۔

میں اتنا زیادہ بھڑکا ہُوا آگیا تھا لیکن وِلکاکس نے بڑے ٹھنڈے طریقے سے میری بات سُنی اور مجھے ٹرخا دیا۔ مجھے خیال آیا کہ شہناز جتنی میرے لئے اہم ہے اتنی سپیشل برانچ کے لئے نہیں ہوسکتی۔ وِلکاکس تو اُسے بھول ہی چکا ہوگا۔ میں پریشان ہونے لگا کہ میں کیا کروں۔ ذرا سا بھی سراغ ہوتا کہ حمید اللہ خان کسی جگہ موجود ہے تو میں اپنی نوکری کی بھی پروا نہ کرتا اور وہاں پہنچتا، لیکن اب میں تڑپنے اور غصّے سے اپنا خون جلانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ سلطان کے ساتھ بات کی۔

"ایک طرف تم بزرگوں جیسی عقل رکھتے ہو" — سلطان نے کہا — "اور دوسری طرف تم بالکل جاہل اور جذباتی ہو۔ شرط لگا لو۔ شہناز اغوا نہیں ہوتی۔ وہ خود کسی کے ساتھ گئی ہے .... میں تمہیں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ اس عورت کو دماغ سے اتار دو۔ وہ تمہاری کچھ نہیں لگتی۔"

میں سلطان کی باتوں اور اپنے جذبات کے درمیان بھٹکنے لگا۔ میں نے شہناز کے بھائی کو خط لکھا کہ وہ مجھے تفصیلات لکھیں اور اگر ابھی تک تھانے میں رپورٹ درج نہیں کرائی تو اب کرا دیں۔

+

بیس بائیس روز گزرے ہوں گے کہ مجھے ایس پی جالنس کے دفتر میں بلایا گیا۔ میں گیا تو انسپکٹر وِلکاکس بھی وہاں موجود تھا۔

"دیکھو سکندر!" —— ایس پی جالنس نے کہا —— "ہم تمہیں اُس جگہ ایک ڈیوٹی پر بھیج رہے ہیں جس سے تم واقف ہو۔"

"حکم صاحب بہادر!" —— میں نے کہا —— "وہ کون سی جگہ ہے؟"

"حمید اللہ کے باپ کا محل" —— ایس پی جالنس نے کہا —— "ہمیں شک ہے کہ حمید اللہ وہاں جاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ ہمارے جو دو آدمی محل میں موجود ہیں انہیں پتہ ہی نہیں چلتا۔ تم وہاں سپیشل برانچ کے سب انسپکٹر کی حیثیت سے جاؤ گے۔ نواب سے ملو گے اور اُس سے پوچھو گے کہ یہ شک کہاں تک سچ ہے۔ نواب کو نواب نہیں بلکہ ایک مشتبہ سمجھنا ہے۔ تمہیں پورا اختیار حاصل ہے کہ اس نواب کو دھمکی دو یا اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی سفارش لکھو۔ ہمارا خیال ہے کہ حمید اللہ خان وہاں رُکتا نہیں۔ نواب کو دھمکی دے کر کہنا کہ حمید اللہ اُس کے پاس آتے تو اُسے کوئی دھوکہ دے کر وہیں رکھے اور مقامی پولیس کو اطلاع دے کر اُسے گرفتار کراتے یا اپنی ریاستی پولیس کے حوالے کر دے۔... تم اگر چاہو تو نواب سے تحریری وعدہ لے لو کہ وہ ایسا کرنے کا پابند ہو گا۔"

میں اُسی شام کی گاڑی سے سپیشل برانچ کے دو کانسٹیبل جو بغیر وردی کے تھے، ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ رات ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ ریل گاڑی نے مجھے منزل پر پہنچا دیا۔ میں وہاں کے پولیس سٹیشن چلا گیا۔ تھانیدار کو گھر سے بلوا لیا اور اُسے بتایا کہ میں سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر ہوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ تھانے میں ہر وقت حاضر رہے شاید مجھے اُس کی ضرورت پڑ جائے۔

وہ بھی سب انسپکٹر تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے اُسے تفصیل سے بتایا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ حمید اللہ کی فوٹو اُس کے تھانے میں موجود ہے۔

باقی رات اس سب انسپکٹر کے گھر میں گزری۔ میں نے آرام کر لیا اور صبح نواب کے محل کو روانہ ہو گیا۔

میں جب نواب کے محل کے احاطے میں داخل ہُوا تو مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب تاجا مجھے یہاں لایا تھا۔ وہ رقص بھی یاد آئے جو مجھ سے کرواتے گئے تھے۔ اچانک میرے جسم نے جھرجھری لی۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب اسی گیٹ میں سے مجھے گلشن آراء کے ساتھ گزار کر ایک رات موت کے قید خانے میں پھینک آئے تھے۔

گیٹ کے پہریدار نے مجھے روکا۔ میں نے اُسے دھتکار کر بتایا کہ میں کون ہوں۔ مجھے روکنے والے اس طرح پیچھے ہٹ گئے جیسے میں انہیں کاٹ کھاؤں گا۔ میں دو کانسٹیبلوں کے ساتھ بادشاہوں کی طرح اندر چلا گیا۔ میں سپیشل برانچ کے دستور کے مطابق پولیس کی وردی میں نہیں تھا۔

بے اختیار جی چاہا کہ نواب کے پاس جانے سے پہلے خواجہ صاحب کے پاس جاؤں۔ خواجہ صاحب کو تو میں اپنا پیر و مُرشد سمجھتا تھا، لیکن میری ڈیوٹی ایسی تھی کہ مجھے سب سے پہلے نواب کے پاس جانا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں میں چوروں کی طرح چھُپ چھُپ کر گلشن آراء کے کمرے میں جایا کرتا تھا مگر اب ایسے لگتا تھا جیسے بوڑھے نواب کی اس دنیا میں میری بادشاہی ہو۔

میں چلتا گیا۔ میرے دونوں طرف کیاریوں میں پھُول کھلے ہوتے تھے۔ ہر طرف سبزہ زار تھا۔ سامنے نواب کا محل تھا۔ میں نے جب برآمدے میں قدم رکھا تو دائیں طرف سے کسی کے پاؤں کی آہٹ بڑی اونچی سنائی دی۔ میں نے اُدھر دیکھا۔ لمبوترے اور بڑے متناسب قد اور جسم کی ایک جوان عورت جو غیر معمولی طور پر حسین تھی، ساڑھی میں ملبوس نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ اور تیز چلنے لگی۔ ادھر دربان میرے سامنے آن کھڑا ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں برچھی تھی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا

کہ میں کون ہوں میں اُسے جواب دینے ہی لگا تھا کہ میرے کانوں سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی ___ "سکندر!"

میں نے اُدھر دیکھا۔ وہ جب اور میرے قریب آئی تو پتہ چلا کہ یہ تو شہناز ہے۔ وہ جیسے دوڑ پڑی ہو۔ دوسرے لمحے میں اُس کے بازوؤں کے شکنجے میں تھا۔

"اُس نے تمہیں یہاں پہنچا دیا ہے"___ میں نے شہناز سے کہا۔

"کس نے؟"

"حمیداللہ کی بات کر رہا ہوں"___ میں نے کہا۔

"نہیں سکندر!"___ شہناز بولی ___ "اُس کی تو صورت ہی نہیں دیکھی۔ میں ایک اور جال میں آگئی تھی .... تم یہاں کیسے؟"

"ڈیوٹی پر آیا ہوں"___ میں نے جواب دیا ___ "نواب صاحب سے ملنا ہے"

"مل لو"___ شہناز نے کہا ___ "پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ میں یہاں تک کس طرح پہنچی ہوں"

+

شہناز کو وہاں دیکھ کر ایک دو لمحوں کے لئے تو میں نے اسے خواب سمجھا اور مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شہناز میرے ذہن پر اس حد تک غالب آگئی ہے کہ مجھے اس کا واہمہ نظر آنے لگا ہے لیکن جس والہانہ انداز سے وہ مجھے ملی اس سے خواب کا تاثر صاف ہو گیا۔ میں بھول ہی گیا کہ میں یہاں کیوں آیا تھا۔ شہناز ایک دروازے میں غائب ہو گئی۔ میں ابھی تک اُس کے جسم کی بُو اپنی ناک میں محسوس کر رہا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے شہناز جوانی سے نوجوانی کی طرف آرہی ہو۔ وہ اپنی عمر سے کم لگتی تھی۔ اُس کا حُسن پہلے سے زیادہ نکھر آیا تھا۔ اُس کی مسکراہٹ پہلے سے زیادہ روح پرور ہو گئی تھی۔

مجھے شہناز کی جوانی اور خوبصورتی پُراسرار دکھائی دینے لگی۔ مجھ پر ایسا تاثر طاری ہو گیا جس میں ہلکا ہلکا ڈر بھی تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ ایک اور جال میں آگئی تھی لیکن وہ مجھے مسرور اور مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

"آپ کیوں آتے ہیں؟"___ دربان نے مجھے بیدار کر دیا ___ "یہاں زیادہ دیر کھڑے نہ رہیں"

میں نے دربان کو دیکھا۔ لمبا تڑنگا اور گٹھا ہُوا جوان تھا۔ اُس کی وردی زرق برق تھی۔ کمر سے تلوار لٹک رہی تھی اور ہاتھ میں برچھی تھی جس کی اَنی چمک رہی تھی۔ وہ بارُعب اور خُوبرو جوان تھا۔

"نواب صاحب کو اطلاع دو کہ سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر سکندر آیا ہے" ___ میں نے دربان سے کہا۔

"نواب صاحب نے آپ کو ٹائم دیا تھا؟"___ دربان نے پوچھا۔

"اندر جاؤ"___ میں نے دبدبے سے کہا ___ "اور نواب صاحب کو میرے آنے کی اطلاع دو"

آداب کے مطابق میرے آنے کی اطلاع نواب کو پہلے ملنی چاہیئے تھی لیکن مجھے اچانک جانا تھا۔ میرا کام ایسا تھا کہ نواب کو پہلے اطلاع دے دی جاتی تو کام بگڑ سکتا تھا۔ میں ایک طرح کا چھاپہ مارنے آیا تھا۔

دربان اندر چلا گیا تھا۔ میں ایک کام بھول گیا تھا۔ دو کانسٹیبل جو میرے ساتھ آتے تھے، کچھ دُور کھڑے تھے۔ میں نے انہیں اپنے پاس بلایا۔ وہ بھی بغیر وردی تھے۔ وہ تھے تو کانسٹیبل لیکن عام پولیس کے کانسٹیبلوں سے زیادہ ذہین، تعلیم یافتہ اور چُست و چالاک تھے۔ انہی خوبیوں کی بدولت انہیں سپیشل برانچ میں لیا گیا تھا۔

"تم دونوں باہر والے گیٹ پر چلے جاؤ" ——— میں نے انہیں کہا ——— "نواب زادہ حمید اللہ خان کو تم پہچانتے ہو۔ وہ گیٹ سے نکلتا نظر آئے تو اُسے پکڑ لینا۔"

دربان نے باہر آکر کہا کہ میں اندر چلا جاؤں۔

میں اندر گیا۔ نواب میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں اُسے تین ساڑھے تین سال بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ بوڑھا تھا لیکن نوابی نے اُس کے بڑھاپے میں بھی تازگی پیدا کر رکھی تھی۔ اُس کے انداز میں جوانی قائم تھی۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔

اُس کے پاس تین آدمی بیٹھے ہُوتے تھے۔ وہ مجھے گھُور رہے تھے۔ انہیں شاید یہ بدتمیزی لگ رہی تھی کہ میں نواب کے آگے جُھکا نہیں تھا اور فرشی سلام نہیں کیا تھا۔ نواب کے ماتھے پر بڑھاپے کی جو لکیریں تھیں وہ اور زیادہ گہری اور ٹیڑھی ہو گئی تھیں۔ وہ بھی مجھے بدتمیز سمجھ رہا تھا۔ میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اُس نے کچھ دیر بعد ہاتھ ذرا سا آگے کیا۔ میں نے اپنا ہاتھ اور آگے کیا۔ اُس نے میرے ہاتھ کو چھُوا اور اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"کسی ایس۔ پی وغیرہ کا کوئی پیغام لاتے ہو؟" ——— نواب نے مجھ سے پوچھا ——— "کیا کوئی صاحب شکار کھیلنے آ رہا ہے یا کچھ دنوں کے لئے میرے پاس آنا چاہتا ہے؟"

"نواب صاحب!" ——— میں نے کہا ——— "میں کسی انگریز افسر کا پیغام نہیں لایا۔ میں آپ کے پاس آیا ہوں اور تنہائی میں بات کرنی ہے .... بڑی اہم بات ہے۔"

انگریزوں کا پروردہ نواب ایک ہندوستانی سب انسپکٹر کو چپڑاسی سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ اُس نے بے دلی سے اپنے دربار میں بیٹھے ہُوتے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ تینوں اُٹھے اور جُھک کر نواب کو سلام کر کے اُلٹے پاؤں چل پڑے۔ دروازے تک پہنچنے تک اُنھوں نے نواب کی طرف پیٹھ نہ کی۔ نواب نے سر سے اشارہ کیا کہ میں بیٹھ جاؤں۔

"کہو کیا بات ہے؟" ——— اُس نے کہا ——— "بات ذرا جلدی ختم کرنا میں نے اِن آدمیوں کو ضروری کام سے بلایا تھا۔"

"میں اِس سے زیادہ ضروری کام سے آیا ہوں" ——— میں نے کہا ——— "اپنے بیٹے نوابزادہ حمید اللہ خان کو میرے حوالے کر دیں۔"

"میں نے اُسے یہاں تو نہیں بٹھا رکھا" ——— نواب نے طنزیہ کہا ——— "وہ یہاں نہیں آیا۔"

"نواب صاحب!" ——— میں نے کہا ——— "میں آپ سے کچھ مانگنے نہیں آیا۔ میں نے بتا دیا ہے میں کیوں آیا ہوں۔ آپ کہہ دیں کہ حمید اللہ خان یہاں نہیں آیا۔ میں اپنی تسلّی کر کے چلا جاؤں گا۔"

"میں کہہ چکا ہوں وہ یہاں نہیں آیا" ——— اُس نے جھنجھلا کر کہا ——— "وہ جیل سے فرار ہُوا ہے۔ جیل میری نہیں انگریزوں کی ہے۔ اُسے میں نے فرار نہیں کرایا اور میرے ساتھ اُس کا تعلق اچھا نہیں۔ کسی بڑے انگریز افسر کو خود آنا چاہیئے تھا۔ ایک ہندوستانی سب انسپکٹر کو بھیج کر انہوں نے میری توہین کی ہے۔"

"میں انگریز افسروں کے حکم سے آیا ہوں" ——— میں نے کہا ——— "حمید اللہ خان یہاں آیا تھا۔"

◆

"میں کہتا ہوں نہیں آیا تھا" — اُس نے کہا — "انگریزوں نے مجھے سمجھ کیا لیا ہے! ایک سب انسپکٹر کو بھیج دیا ہے .... میں نے جو جواب دینا تھا دے دیا ہے"۔

میں نے دیکھا کہ وہ میرے ساتھ رعونت سے بولتا تھا اور میرے ہر سوال کا جواب اس طرح دیتا تھا کہ کچھ دیر میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہتا پھر چہرے پر طنز اور ناپسندیدگی کا تاثر پیدا کر کے مختصر بلکہ ادھورا سا جواب دیتا تھا۔

"دیکھو میاں!" — اُس نے کہا — "تم کم عمر ہو اور محض سب انسپکٹر ہو۔ تمہیں تو ابھی سب انسپکٹروں کی طرح بات کرنی بھی نہیں آتی"۔

میں اس کے محل میں رقاص رہ چکا تھا۔ اِس نے مجھے اُس وقت بھی دیکھا تھا جب مجھے سزائے موت سنائی اور مرنے کے لئے اپنے ہیبت ناک قید خانے میں بھیجا تھا لیکن اب وہ مجھے پہچان نہیں رہا تھا۔ پہچان سکتا بھی نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کے سامنے مجھ جیسے نہ جانے کتنے رقاص لڑکے گزر گئے تھے۔ وہ رقص میں لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھتا تھا۔ اُسے چہرے یاد رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ اُس نے جب کہا کہ تمہیں سب انسپکٹروں کی طرح بات کرنی بھی نہیں آتی تو میں اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکالنے لگا۔

"نواب صاحب!" — میں نے کہا — "آپ نے اپنا دین اور ایمان انگریزوں کے قدموں میں رکھا ہُوا ہے۔ آپ خدا کی بجائے انگریز کی عبادت کرتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو آپ قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ آپ پر صرف یہ الزام نہیں کہ آپ نے اپنے بیٹے کو جو مفرور قیدی ہے پناہ دی ہے۔ آپ قاتل بھی ہیں"۔

"کس کا قاتل ہوں؟" — اُس نے غصّے سے گرج کر کہا۔

"آپ کی بیگم گلشن آراء کہاں ہے؟" — میں نے پوچھا — "آپ نے ایک رقاص لڑکے کو گلشن آراء کے کمرے میں پکڑا تھا۔ دونوں کو آپ نے کس طرح مروایا تھا؟ .... اُس قید خانے میں جتنی عورتوں اور مردوں کو آپ نے مروایا ہے وہ میں جانتا ہوں۔ کیا میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ میں سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر ہوں؟ انگریزی حکومت نے آپ کو نواب بنایا ہے۔ آپ کو یہ اختیار نہیں دیا کہ آپ کسی کو سزائے موت بھی دے سکتے ہیں"۔

اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور بیٹھے بیٹھے کروٹیں بدلنے لگا۔

"آپ کو معلوم نہیں کہ جو لوگ آپ کو فرشی سلام کرتے ہیں ان میں ہمارے جاسوس اور مُخبر بھی ہیں" — میں نے کہا — "میں آپ کے جرائم آپ کو سُنا سکتا ہوں۔ مجھے یہ اختیار بھی ملا ہُوا ہے کہ ضرورت محسوس کروں تو آپ کو حراست میں لے کر اپنے ہیڈ کوارٹر لے جا سکتا ہوں .... میں پوچھ رہا ہوں حمید اللہ خان کہاں ہے؟ میں کسی کی اطلاع پر آپ کے پاس بھیجا گیا ہوں"۔

"اوہ میرے خدا" — اُس نے آہ بھر کر کہا — "اِس بیٹے نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اس نے مجھے مشتبہ اور ملزم بنا دیا ہے .... میں نے تمہاری توہین نہیں کی۔ میں اِس بیٹے کے ہاتھوں پریشان ہوں"۔

"مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملا نواب صاحب!" — میں نے کہا — "حمید اللہ خان یہاں ہے تو اُسے میرے حوالے کریں"۔

"وہ صرف ایک بار یہاں آیا تھا" — اُس نے کہا — "جیل سے فرار ہو کر سیدھا یہاں آیا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ فرار ہو کر آیا ہے اور اُسے روپے پیسے کی ضرورت ہے۔ میں اُسے ایک پیسہ نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اُس نے مجھے دھمکیاں دیں اور میں نے اُسے بیس ہزار روپیہ دے دیا اور اُسے کہا کہ وہ آئندہ یہاں نہ آئے۔ وہ رات کو چلا گیا تھا، پھر نہیں آیا"۔

بیس ہزار؟ مجھے تو جیسے چکر آ گیا ہو۔ بیس ہزار روپے سے تو وہ ایک پورا گاؤں خرید سکتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اُس نے اتنی زیادہ رقم کیوں مانگی تھی۔ وہ اپنی نئی زندگی کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس نے کوئی شریفانہ کاروبار کرنا تھا۔ جس علاقے میں اُس کے ساتھ میری ملاقات ہوئی، اُس کے تمام نمبرداروں کو اُس نے اپنے اثر میں لے رکھا تھا۔ یہ سب پیسے کی بدولت تھا۔ نواب کے ہاں دولت کی کمی نہیں تھی۔ انگریزوں نے جس

رعایا کو اس کے رحم و کرم پر ڈال رکھا تھا اُس مخلوقِ خدا سے اُس نے ایک مہینے میں بیس ہزار وصول کر لیے تھے۔

"وہ یہاں کتنے دن ٹھہرا تھا؟" —— میں نے پوچھا۔

"رقم لے کر چلا گیا تھا" —— نواب نے جواب دیا —— "میں نے اُسے اتنی زیادہ رقم بیٹا سمجھ کر نہیں دی تھی، میں نے اُسے پناہ دینے کی یا گرفتاری سے بچانے کی کوئی ترکیب سوچی تھی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ یہاں سے چلا جائے اور میرے لئے کوئی اور مشکل پیدا نہ کر دے۔"

"اس کے بعد نہیں آیا؟"

"نہیں" —— نواب کے جواب دیا۔

"مجھے ایک دو دن یہاں رہنا پڑے گا" —— میں نے کہا —— "میں نے اپنے طور پر مختلف لوگوں سے تفتیش کرنی ہے۔"

"ضرور کرو" —— نواب نے کہا —— "میں خود بھی چاہتا ہوں کہ تم دو چار روز میرے ہاں مہمان ٹھہرو ..... میرے عزیز ..... نام کیا ہے تمہارا؟"

"سکندر!"

"سکندر بیٹا!" —— اُس نے مشفقانہ سے لہجے میں کہا —— "تم نے ایک عورت کا اور کسی لڑکے کا ذکر کیا تھا کہ انہیں میں نے سزائے موت دی تھی، وہ ریکارڈ پر نہ لانا۔ کسی بھی نواب اور مہاراجے کے ہاں چلے جاؤ ہر جگہ یہی کچھ ہوتا ہے۔ ہم اُن لوگوں کو اپنے ہاں شہزادے اور شہزادیاں بنا کر رکھتے ہیں لیکن یہ لوگ اپنی اصلیت بھول کر بدکاری شروع کر دیتے ہیں۔"

میری ہنسی نکل گئی اور وہ جھینپ سا گیا۔ اُسے احساس ہو گیا تھا کہ اُس نے بہت بڑا جھوٹ بولا ہے۔

"نواب صاحب!" —— میں نے کہا —— "جس ماحول میں جو کچھ ہوتا ہے وہاں پر آنے والا وہی کچھ کرتا ہے۔ بہرحال میں آپ کی فرمائش کا احترام کروں گا اور اس واقعہ کو کاغذات پر نہیں لاؤں گا۔ میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے محل کے اندر اور اس احاطے کے اندر جو کچھ بھی ہوتا ہے اُس کی اطلاع

سپیشل برانچ کو ملتی رہتی ہے۔"

"تمہاری بیوی تمہارے ساتھ رہتی ہے؟" —— نواب نے پوچھا۔

"میں نے ابھی شادی نہیں کی" —— میں نے جواب دیا۔

"عجیب بیوقوف ہو" —— نواب نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا —— "اتنے خوبصورت اور اتنے طاقتور جوان ہو۔ شادی کرو۔ جلدی شادی کرو۔ میں تو حیران ہوں کہ تم عورت کے بغیر زندہ کیسے ہو۔ میں تمہیں تم جیسی خوبصورت عورت کے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔"

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اپنی رعایا کا یہ فرعون کس ذہنی سطح پر اُتر آیا تھا۔ وہ مجھے رشوت میں عورت پیش کر رہا تھا۔

مجرم ضمیر ایک سب انسپکٹر کے آگے ہتھیار ڈال رہا تھا۔

میں نے اُس کے جرائم اُس کے آگے رکھ دیئے تھے۔

مجھے یاد آیا کہ خواجہ صاحب موسیقار نے مجھے کہا تھا کہ ذہن کو گناہوں کے تصوروں سے پاک رکھنا پھر اپنی ایک ایسی قوت کے معجزے دیکھنا جو تم سمجھتے ہو کہ تم میں ہے ہی نہیں۔

میں نے شہناز سے ملنا تھا۔ شہناز نے کہا تھا کہ وہ مجھے ملے گی لیکن مجھے اُس کے ساتھ لمبی ملاقات کی کوئی ترکیب نہیں سوجھ رہی تھی۔ جی میں آئی کہ نواب سے کہوں کہ تمہارے پاس ایک نئی لڑکی آئی ہے وہ مجھے ایک رات کے لئے دے دو لیکن مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ میں اُسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ شہناز کو میں جانتا ہوں۔ میں نے اُسے یہ بھی نہ بتایا کہ میں یہاں رقاص رہ چکا ہوں۔

اُس نے میری تنخواہ پوچھی جو میں نے بالکل صحیح بتا دی۔

"اوہ!" —— اُس نے کہا —— "اتنی تھوڑی تنخواہ؟ اس سے زیادہ تو میں اپنے دربان کو تنخواہ دیتا ہوں جو باہر کھڑا ہے ..... سکندر بیٹا! اِسے رشوت نہ سمجھنا۔ میں کچھ پیش کروں گا۔ قبول کر لینا۔"

میں یوں مسکرایا جیسے میں نے اُس کی رشوت قبول کر لی ہو۔

سپیشل برانچ کے کچھ مُخبر وہاں موجود تھے۔ دو اچھے عہدوں پر تھے اور ایک باہر والے گیٹ پر تھا۔ میں نواب سے اُٹھ کر اُن سے ملا۔ ملنے کا طریقہ ایسا تھا جیسے میں اُن سے پوچھ گچھ کر رہا ہوں اور میں انہیں نہیں جانتا۔ میں دراصل ان سے رپورٹ لے رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان میں سے کسی نے بھی ہمارے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع نہیں دی کہ حمید اللہ خان یہاں آیا ہے۔ اُن کے علاوہ دو اور مُخبر تھے۔ انہوں نے بھی بتایا کہ انہوں نے ایسی کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔

مجھے خیال آیا کہ نواب کے محل کو اچانک آکر چیک کرنا تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ حمید اللہ خان وہاں موجود ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ اس علاقے کا تھانیدار بھی ایک بار محل میں چھاپہ مار چکا ہے۔ یہ پولیس کا طریقہ کار تھا کہ جہاں جہاں کسی مفرور کی موجودگی کا شک ہوتا تھا وہاں پولیس چھاپے مارتی رہتی تھی۔ مجھے بھی اسی طریقہ کار کے تحت نواب کے محل میں بھیجا گیا تھا۔

میں آزادی سے محل کے اندر باہر اور احاطے میں گھوم پھر رہا تھا۔ میں خواجہ صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے جیسے پہچاننے میں غلطی کر رہے ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھے۔ اُن کی نظریں میرے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔

"اتنی جلدی بھول گئے ہیں خواجہ صاحب!"— میں نے کہا۔

خواجہ صاحب سپرنگ کی طرح اُچھلے اور مجھے بازوؤں میں جکڑ کر اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ وہ مجھے بھینچتے ہی چلے جارہے تھے۔ وہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے تھے لیکن جذبات کی ایسی شدّت کہ میری ہڈیاں ٹوٹنے لگیں۔

"تم کہاں آنکلے ہو سکندر!"— خواجہ صاحب نے مجھے الگ کرتے ہوئے کہا۔

میرے جذبات کی شدّت کا یہ عالم تھا کہ مجھ پر رقّت طاری ہوگئی جیسے میں نے اپنے باپ کو ڈھونڈ لیا ہو۔ انہوں نے مجھے بٹھایا اور اُن سے جدا ہونے سے لے کر اس ملاقات تک مجھ پر جو گزری تھی اور میری زندگی جن نشیب و فراز سے گزری تھی وہ انہیں سنائی۔ میں انہیں اپنا باپ کیوں نہ سمجھتا۔ انہوں

نے ہی مجھے نواب کے بناتے ہوئے موت کے قید خانے سے نکالا تھا۔ گلشن آرا بھی میرے ساتھ ہی آزاد ہوگئی تھی۔

وہ بہت خوش ہوئے کہ میں اس عہدے اور رُتبے تک پہنچ گیا ہوں۔ اُن کا چہرہ مسرّت سے چمک اُٹھا تھا۔ مجھے ایک خیال آیا اور میرے آنسو نکل آئے۔ خیال مجھے اپنے باپ کا آگیا تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا اور میں سب انسپکٹر بن کر اُس کے سامنے جاتا تو وہ خواجہ صاحب سے زیادہ خوش ہوتا۔ امّی زندہ ہوتی تو وہ خوشی سے پاگل ہوجاتی۔

میں نے پہلی بار یہ محرومی محسوس کی۔ میں نے دل میں درد کی کیفیت محسوس کی۔ اس کیفیت میں خواجہ صاحب مجھے بہت ہی پیارے اور بہت ہی عظیم لگے۔

"اللہ نے تمہیں بڑی لمبی عمر عطا کی ہے سکندر!"— خواجہ صاحب نے کہا — "جب تمہیں اور گلشن آرا کو اُس قید خانے میں لے جارہے تھے تو مجھے اُسی وقت پتہ چل گیا تھا۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ اُٹھ کے چلنا پڑتا ہے تو سوچتا ہوں کہ چلوں یا نہ چلوں لیکن تمہیں موت کے مُنہ میں پھینکنے کے لئے لے گئے تو میرے جسم میں جوانی عود کر آئی۔ میں نے جوانی میں بھی شاید کبھی اتنی تیز حرکت نہیں کی تھی جتنی تمہیں وہاں سے نکالنے کے لئے کی۔ اللہ نے تمہیں میرے ہاتھوں بچانا تھا اس لئے اُس کی ذاتِ باری نے مجھے طاقت دے دی ....

"میری نظر اپنے بیٹے تاجے پر تھی لیکن اُس کا فوراً مل جانا مخدوش تھا۔ اللہ نے یہ بندوبست بھی کر دیا۔ مجھے وہ آدمی بھی جلدی مل گیا جو میرے اور تاجے کے درمیان رابطے کا کام کرتا تھا۔ اسے ڈھونڈ کر تاجے کی طرف دوڑایا تو تاجا مل گیا اور وہ اگلی شام تک میرے پاس آگیا۔"

"وہ بھیس بدل کر آیا ہوگا"— میں نے کہا۔

"بھیس بھی ایسا جس میں اُسے میں بھی نہیں پہچان سکا تھا"— خواجہ صاحب نے کہا — "گیٹ پر کوئی میرا نام لے تو اُسے میرے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ تاجے کو بھی میرے پاس آنے کی اجازت دے دی گئی۔ میں نے اُسے قید خانے

کا نقشہ سمجھایا اور کہا کہ ایک لڑکے کو نکالنا ہے"۔

"آپ نے گلشن آراء کے متعلق نہیں کہا تھا کہ اُسے بھی نکالنا ہے؟"

"نہیں کہا تھا" — خواجہ صاحب نے جواب دیا — "کیونکہ گلشن آراء گناہوں کی پیداوار تھی، گناہوں کا ایک ذریعہ تھی، وہ گناہوں کی مٹی کا بنا ہُوا اتنا حسین مجسمہ تھی جسے جو بھی دیکھتا اُس کا پجاری بن جاتا تھا۔ وہ سراپا دعوتِ گناہ تھی۔ میں اُسے کیوں بچاتا؟ اُس کا جینا مرنا ایک برابر تھا۔ اللہ نے تمہیں بچانا تھا وہ اُس کی ذاتِ باری نے میرے ہاتھوں کرا دیا۔ پھر حمید اللہ نے تمہیں موت کے مُنہ میں لٹکا دیا تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اُس عورت کے ہاتھوں نکالا جو تمہاری دشمن تھی۔ یہ اللہ کا اشارہ ہے کہ تم بڑی لمبی عمر جیئو گے۔ اللہ تمہیں کسی بہت بڑے کام کے لئے زندہ رکھنا چاہتا ہے"۔

"خواجہ صاحب!" — میں نے کہا — "گلشن آراء کی مٹی بدل گئی ہے" — میں نے اُنہیں بتایا کہ گلشن آراء اب کہاں ہے اور اُس میں کیا انقلاب آیا ہے۔

اس پر وہ حیران ہو ہی رہے تھے کہ میں نے انہیں یہ بتا کر اور زیادہ حیران کر دیا کہ جس شہناز نے مجھے اغوا کرایا اور اس راستے پر ڈال دیا تھا جو مجھے اس نواب کے محل تک لے آیا اور موت تک پہنچایا تھا وہ شہناز نواب کے پاس پہنچ گئی ہے۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ شہناز میرے باپ کی بیٹی ہے۔

"کچھ سمجھے ہو سکندر؟" — خواجہ صاحب نے کہا — "یہ ہے انسان.... حالات کی آندھیوں میں سوکھے گھاس کی پتّی .... آندھی اِسے جہاں چاہے لے جاتے۔ آسمان تک پہنچا دے یا زمین پر پٹختی پھرے۔ نیکی اور بدی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ انسان پھسل کر کبھی اِدھر کبھی اُدھر جا گرتا ہے۔ لذّت اور سرُور جو بدی میں ہے وہ نیکی میں نہیں۔ کوئی بڑا ہی سخت جھٹکا بدی میں سے نکالتا ہے یا اپنے کسی خیال کی قوّت بدی میں سے نکال لیتی ہے۔ لذّت بدی میں ہے لیکن قوت نیکی یعنی اخلاق اور کردار میں ہے .... تم پہلی بار میرے پاس آتے تھے تو میں نے تمہیں کہا تھا کہ گناہ سے ہی نہیں گناہ کے تصوّر اور گناہ کے خیال

سے بھی اپنے آپ کو بچاتے رکھو گے تو تمہاری نظروں میں وہ قوّت پیدا ہو جائے گی کہ یہ چٹانوں کے جگر چاک کر دے گی"۔

"آپ نے مجھے کہا تھا کہ مجھ میں کوئی خاص طاقت ہے" — میں نے کہا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ کمزور پڑ گئی ہے" — خواجہ صاحب نے کہا۔

"میں پھسل گیا تھا خواجہ صاحب!" — میں نے کہا اور انہیں اُس رات کا واقعہ سُنایا جس رات گلشن آراء اور میں اکیلے تھے اور میں شیطان کے ورغلانے میں آ گیا تھا۔ میں نے کہا — "گلشن آراء نے بھاگ کر اور دریا میں کُود کر مجھے اور اپنے آپ کو گناہ سے بچا لیا لیکن میری جس قوّت کی آپ نے نشاندہی کی تھی وہ نہ رہی۔ میرے دل پر عجیب سے خوف نے قبضہ کر لیا تھا۔ میں خوابوں میں بھی ڈر جاتا تھا"۔

"وہ تمہارا اپنا ضمیر تھا جو تمہیں ڈرا رہا تھا" — خواجہ صاحب نے کہا — "ضمیر پر گناہ کا یا گناہ کے خیال کا بوجھ پڑ جائے تو ضمیر جنّ اور بھُوت بن جاتا ہے۔ یہ انسانوں کے خیالی روپ میں آ کر بھی ڈراتا ہے اور یہ خوابوں میں بھی ایک خوف بن کر آتا ہے۔ اپنے خیالوں کو اپنی سوچوں اور اپنے تصوّروں کو عورت کے حُسن سے نہ سجاؤ۔ اس پھول کے ساتھ جو کانٹے ہیں، اِن کی چُبھن سے تم بچ نہیں سکتے۔ .. سکندر! تم ابھی نادان ہو۔ زندگی کو اور زندہ انسانوں کو غور سے دیکھتے رہو گے تو انسان کی فطرت کو اور زندگی کے فلسفے کو سمجھ جاؤ گے....

"اور تمہاری وہ قوّت ابھی اُبھر نہیں سکے گی۔ تم انگریزوں کے نوکر ہو۔ تمہاری وفاداری اپنی قوم اور اپنے ملک کے دوسرے لوگوں کے ساتھ نہیں بلکہ انگریزوں کے ساتھ ہے۔ تم یہ کام اپنے دین اور اپنے ایمان کے خلاف کر رہے ہو لیکن تم میں کوئی ایسا فالتو وصف موجود ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتا"۔

◆

خواجہ صاحب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ وہ اب ہر بات فلسفے کے رنگ میں کرتے تھے۔ مجھے اُن کا فلسفہ اس لئے اچھا لگتا تھا کہ وہ خود مجھے اچھے لگتے تھے۔ میں جوان تھا۔ میں کچھ کر گزرنے کو بے تاب رہتا تھا۔ خواجہ صاحب جوانی بہت دُور پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ وہ اب جوانوں کو سبق دینے کو بے تاب رہتے تھے۔

جسم جوان ہو کر بوڑھا ہوتا ہے۔

رُوح بوڑھی ہو کر جوان ہوتی ہے۔

خواجہ صاحب کی رُوح جوان ہو گئی تھی۔ یہ میں نے اُس وقت محسوس کیا جب نوابزادہ حمید اللہ خان کی بات چلی۔

"کیا کہا تھا تم نے؟" — خواجہ صاحب نے پوچھا — "حمید اللہ خان یہاں آیا ہُوا ہے؟ .... وہ ملا؟"

"نواب صاحب کہتے ہیں یہاں نہیں آیا" — میں نے جواب دیا — "اطلاع یہی ملی تھی"

"کیا میں تم پر اعتبار کروں کہ مجھے دھوکہ نہیں دو گے؟"

خواجہ صاحب کے اس سوال نے مجھے حیران کر دیا۔ پولیس آفیسر ہونے کی وجہ سے وہ مجھے قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے تھے۔ میرا سر جُھک گیا۔ مجھے اُن کے اس سوال پر افسوس ہُوا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ اُن کا یہ سوال تیر کی طرح میرے سینے میں اُتر گیا ہے، انہیں یہ بات نہیں کہنی چاہیئے تھی۔

"تم انگریزوں کے نمک خوار ہو سکندر!" — انہوں نے کہا — "بات جو میں نے پوچھی ہے وہ میں نے پوچھنی ضروری سمجھی تھی۔ اگر تمہیں میری شفقت زیادہ عزیز ہے تو سنو.... حمید اللہ کا تعاقب چھوڑ دو۔"

"کیا میں مارا جاؤں گا؟"

"نہیں!" — خواجہ صاحب نے کہا — "وہ مارا جائے گا .... میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم مارے جاؤ لیکن میں حمید اللہ کو بچانا چاہتا ہوں۔ اگر وہ جال میں آ بھی جائے تو آنکھیں بند کر لینا۔ وہ مجھے اتنا ہی عزیز ہے جتنے تم ہو۔ وہ

تمہارے ریوالور کی زد میں آجائے تو نالی ذرا اُوپر کر کے گولی چلا دینا۔"

"کیوں خواجہ صاحب؟" — میں نے پوچھا — "میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ حمید اللہ کے ساتھ آپ کو اتنا پیار ہو گا۔"

"ایک وجہ اتنے پیار کی یہ ہے کہ حمید اللہ خان نے ہمیشہ میرے بیٹے تاجے کے سر پر ہاتھ رکھا ہے" — خواجہ صاحب نے کہا — "تاجا ڈاکو تھا۔ اگر حمید اللہ خان اُسے پناہ نہ دیتا تو وہ کئی بار گرفتار ہوتا۔ وہ پولیس کی گولی سے مرتا یا جیل میں مر جاتا۔ اُسے حمید اللہ خان کی پناہ حاصل تھی۔ حمید اللہ خان تاجے کا مال اپنی جاگیر میں چُھپا لیا کرتا تھا۔ گرفتاری کا خطرہ ہوتا تو حمید اللہ خان اُسے مہینہ دو مہینے اپنے پاس رکھتا تھا۔ تمہیں اور گلشن کو قید خانے سے نکال کر تاجا حمید اللہ خان کے پاس ہی لے گیا تھا....

"میرا بیٹا ڈاکو تھا لیکن سکندر! وہ میرا بیٹا تھا۔ وہ ڈاکو پیدا نہیں ہُوا تھا۔ میں نے تمہیں سنایا ہے کہ وہ کس طرح ڈاکو بنا تھا۔ تم بھی تو ڈاکو بن گئے تھے۔ کسی کو ڈاکو بننے کا شوق تو نہیں ہوتا بیٹے! کیا میرے بیٹے نے کسی مجبور اور بے بس عورت کی عزت پر کبھی ہاتھ ڈالا تھا بیٹے؟ .... اُس نے تمہیں بھی روکا تھا۔"

"ہاں خواجہ صاحب!" — میں نے کہا — "اُس نے مجھے بھی روکا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ عورت تو ہوتی ہی مجبور ہے۔ گھر میں ہو تو بھی مجبور، باہر ہو تو بھی مجبور۔ مجبور پر ہاتھ اُٹھانا مردانگی تو نہیں۔"

"اور سکندر بیٹا!" — خواجہ صاحب نے کہا — "نوابزادہ حمید اللہ خان بھی اب ڈاکو بنے گا لیکن اس کے ڈاکے کچھ اور قسم کے ہوں گے۔ اس کے ڈاکے اُسی قسم کے ہوں گے جس قسم کے ڈاکے میں وہ پکڑا گیا تھا یعنی انگریز کی ریل گاڑیوں کو لُوٹنا۔ ریل گاڑی کے مسافروں کو نہیں، انگریزوں اور ہندو تاجروں کے مال کو لُوٹنا۔"

"میں حیران ہوں خواجہ صاحب!" — میں نے کہا — "اتنی بڑی جاگیر کے مالک کو ڈاکو بننے کی کیا ضرورت تھی!"

"کبھی اُس کی زبان سے سُننا" — خواجہ صاحب نے کہا — "وہ اپنے نواب باپ کا ستایا ہُوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ایک شخص مخلوقِ خدا کا بادشاہ بنا ہُوا ہے۔ یہ عیاش اور بدکار نواب اللہ کے نیک بندوں پر حکومت کر رہا ہے اور اس نے بے شمار بے نکاحی بیویاں رکھی ہوتی ہیں .... حمیداللہ خان انگریزوں کا دشمن ہے جنہوں نے آدھا ہندوستان نوابوں اور مہاراجوں کو دے رکھا ہے۔ یہ نواب اور مہاراجے اپنی رعایا کا خون نچوڑ کر انگریز سرکار کا خزانہ بھر رہے ہیں۔"

"پھر وہ دہشت گرد کیوں نہیں بن جاتا؟" — میں نے پوچھا اور خواجہ صاحب کو بتایا — "ہم نے دہشت گرد گروہوں کے کچھ آدمی پکڑے ہیں۔"

"وہ آخر یہی کام کرے گا" — خواجہ صاحب نے کہا — "وہ دہشت گرد ہی بنے گا لیکن بڑا پکّا اور تجربہ کار گروہ بنا کر۔ وہ انگریزوں کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کا تہیّہ کئے ہوتے ہے۔ کسی وقت اُس کا اپنا باپ اُس کا نشانہ بنے گا.... سکندر! ایک سوال کا جواب دو.... کبھی کسی دہشت گرد کارروائی کے دوران تم پولیس کی گارد لے کر پہنچ جاؤ اور حمیداللہ خان کا اور تمہارا آمنا سامنا ہو جاتے تو تم کیا کرو گے؟"

"میں حکم کی پابندی کروں گا خواجہ صاحب!" — میں نے کہا اور میں سوچ میں پڑ گیا پھر میں نے کہا — "میرا اور اُس کا آمنا سامنا ہو چکا ہے۔ اُس نے مجھ پر گولی نہیں چلائی تھی۔ میں آپ کو یہ واقعہ سُنا چکا ہوں۔ میں شاید اُس پر گولی نہیں چلا سکوں گا۔"

"اور یہ مجھ پر تمہارا احسان نہیں ہوگا سکندر!" — خواجہ صاحب نے کہا — "یہ تمہارا پورے ہندوستان پر احسان ہوگا" — وہ میرے قریب سرک آتے اور مدھم آواز میں کہنے لگے — "ہندوستان مسلمانوں کا ہے۔ انگریزوں نے یہ ملک مسلمانوں سے لیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی مسلمان تھا جس نے مرہٹوں کو پانی پت کے میدان میں شکست دی تھی۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ ہندوستان میں اسلام کی حکمرانی کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ سلطان حیدر علی، سلطان ٹیپو، سیّد احمد شہید نے

اپنی عمریں میدانِ جنگ میں کیوں گزار دی تھیں؟ صرف اس لئے کہ ہندوستان کی سرزمین پر اسلام کا پرچم لہراتا رہے مگر انگریزوں کو ہندوؤں اور سکھوں کی مدد حاصل تھی۔ مسلمان ہار گئے اور اب ہم انگریز کے غلام ہیں .... کیا تم اُس آدمی کو گرفتار کرنا یا گولی مارنا پسند کرو گے جو جاگیر اور نوابی سلطنتِ اسلامیہ کو فرنگیوں سے آزاد کرانے کے لئے چھوڑ کر اپنی جان کی بازی لگاتے ہوتے ہے؟"

"لیکن میں نے حمیداللہ خان کو کسی اور رنگ میں دیکھا ہے" — میں نے کہا۔

"اب تم اس کا یہ رنگ بھی دیکھ لینا" — خواجہ صاحب نے کہا — "میں تمہیں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمہیں حمیداللہ خان کا کبھی سراغ ملے یا کہیں موجودگی کی اطلاع ملے تو اپنے محکمے کو گمراہ کرنا" — وہ چُپ ہو گئے۔ کچھ دیر میرے مُنہ کی طرف دیکھتے رہے پھر کہنے لگے — "معلوم نہیں میں تم سے یہ امید کیوں لگاتے بیٹھا ہوں کہ تم میری یہ بات مان جاؤ گے۔ تم میرے کیا لگتے ہو؟ .... کچھ بھی نہیں۔ مجھے تو یہ امید رکھنی چاہیئے کہ تم سپیشل برانچ میں میرا نام مشتبہوں میں لکھوا دو گے۔ تمہیں نوکری بھی تو...."

"خواجہ صاحب!" — میں نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار ہو کے کہا — "میرا اس دنیا میں ہے ہی کون، میں کسی کی خاطر نوکری نہیں کر رہا۔ اتفاق سے اس نوکری میں آ گیا ہوں۔ مجھے شرمندہ نہ کریں خواجہ صاحب! آپ کا ایک ایک لفظ میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ مجھے تنخواہ نہیں چاہیئے، انعام نہیں چاہیئے، میں شراب نہیں پیتا، سگریٹ نہیں پیتا، صرف شفقت اور پیار کی تشنگی ہے۔ اس تشنگی کی تسکین انگریز نہیں کر سکتے۔ یہ تسکین آپ نے دی ہے۔ آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں، مجھے بتائیں۔ میرا کام آپ کے حکم کی تعمیل ہے۔"

"عہد کرو کہ حمیداللہ تمہارے ہاتھوں گرفتار نہیں ہوگا" — خواجہ صاحب نے کہا — "اور پولیس مقابلہ ہُوا تو وہ تمہاری گولی سے نہیں مرے گا۔"

"خواجہ صاحب!" — میں نے کہا — "میں عہد کر لوں گا۔ میں سوچتا ہوں کہ حمید اللہ خان کو پتہ چل گیا کہ شہناز نواب کے پاس ہے تو وہ کیا کرے گا؟"

"مت سوچو سکندر!" — خواجہ صاحب نے کہا — "شہناز تمہاری کچھ نہیں لگتی۔ کچھ لگتی بھی ہے تو اُسے ذہن سے اُتار دو۔ میں اُسے اتنا ہی جانتا ہوں جتنا تم نے بتایا ہے۔ وہ اُڑتا پنچھی ہے۔ بھول جاؤ اُسے سکندر! بھول جاؤ۔"



کوشش کے باوجود میں اُسے ذہن سے نہ اُتار سکا اور اُسے نہ بھول سکا۔ میں رات کو اُس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ شام کے کھانے کے ساتھ شہناز میرے ساتھ تھی۔ میں یہ توقع نہیں رکھ سکتا تھا کہ نواب بھی میرے ساتھ کھانا کھائے گا۔ پولیس کا ایک سب انسپکٹر اس نواب کے لئے اتنا بڑا آدمی نہیں تھا کہ نواب اُسے اپنے ساتھ کھانے پر بٹھاتا۔ مجھے وہ اس لئے اتنی اہمیت دے رہا تھا کہ میں سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر تھا اور دوسرے یہ کہ میں اُس کے ایسے جرائم سے واقف تھا جو وہ سمجھتا تھا کہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ وہ مجھے خوش کرنا چاہتا تھا۔

اس کا اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ شہناز کو میرے ساتھ کھانے کے لئے بھیج دیا تھا۔

"تم نے اُسے بتایا تو نہیں کہ میرا اور تمہارا کچھ تعلق ہے؟" — میں نے شہناز سے پوچھا۔

"نہیں" — شہناز نے جواب دیا — "میں بتانے لگی تھی۔ اس لئے نہ بتایا کہ تم سے پوچھ لوں۔"

"نہ بتانا" — میں نے کہا اور پوچھا — "کیا اس نے تمہارے ساتھ باقاعدہ شادی کی ہے؟"

"نہیں" — شہناز نے جواب دیا — "کہتا ہے شادی تو فضول سی رسم ہے .... مجھے یہاں کی عورتوں اور نوکرانیوں نے بتایا ہے کہ جب تک

میرے چہرے پر جوانی کی کشش ہے یہ مجھے اپنے سامنے رکھے گا اور ملکہ کا درجہ دے گا۔ جوانی ڈھلتے ہی یہ مجھے حرم کے کباڑ خانے میں پھینک دے گا۔"

"کیا تم اپنی مرضی سے میرے ساتھ کھانے پر آتی ہو؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "نواب نے کہا تھا کہ یہ جو آیا ہے یہ پولیس کا افسر ہے۔ اس پر ایسا جادو چلاؤ کہ تمہاری انگلیوں پر ناچنے لگے اور بھول ہی جائے کہ یہاں آیا کیوں ہے" — شہناز نے مجھے اپنے پہنے ہوئے زیورات اور ہیرے کی انگوٹھی دکھا کر کہا — "یہ چیزیں تو میں خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کہتا تھا کہ یہ انسپکٹر بہت خوبصورت جوان ہے، کہیں اسی کی نہ ہو کے رہ جانا۔"

میں شہناز کے زیورات اور ہیروں کو نہیں بلکہ اُس کے حُسن کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کا حُسن تو میں پہلے بیان کر چکا ہوں لیکن نواب کے ہاں میں نے اُس کے حُسن میں جو نکھار دیکھا، اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تو ہوش گم کر دینے والی حسینہ ہے۔ اپنے گھر میں تو یہ مرجھا گئی تھی۔ نواب کے ہاں وہ عمر سے سات آٹھ سال کم عمر کی لگتی تھی۔

اُس نے مجھے بتایا کہ اُسے یہاں کی دو عورتوں نے خاص قسم کی ٹریننگ دی تھی اور وہ بہت جلدی تیار ہو گئی تھی۔ اُسے جو تجربے ہوتے تھے اور اُس نے جو رنگ ڈھنگ دیکھے تھے اُنہوں نے اُسے جرأت اور خود اعتمادی دی تھی۔

"اگر تم کوئی اور ہوتے تو تمہارے ساتھ میرا طور طریقہ کچھ اور ہوتا" — شہناز نے کہا — "میں تمہیں کہتی کہ نواب صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے اور ڈاکٹروں نے انہیں کھانا کھانے سے منع کر دیا ہے اور مکمل آرام کرنے کو کہا ہے اس لئے میں اُن کی جگہ پُر کرنے آئی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ نواب کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔"

"کیا تم یہاں خوش ہو؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں" — شہناز نے جواب دیا — "میں بھلا یہاں کیسے خوش رہ سکتی ہوں"۔

"پھر یہاں آئیں کیسے؟"

"میں خود تھوڑا ہی آئی ہوں" — اُس نے جواب دیا — "میری قسمت میں ایک چکر ہے جو مجھے ابھی معلوم نہیں کہاں کہاں پہنچائے گا"۔



اُس نے ایک لمبی داستان سُنا ڈالی۔ اپنے گھر میں وہ مطمئن رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اُس کی شادی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ سارے شہر میں اتنی بدنام ہو چکی تھی کہ اُسے کوئی بھی اپنی بیوی بنانے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ البتہ چاہنے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ وہ دِلّی کے بازارِ حُسن میں جا بیٹھتی تو نوابزادے اور شہزادے اُس کے گاہک ہوتے۔ یہ صورت شہناز کو منظور نہیں تھی۔

گھر میں اُس کے لئے کچھ نہیں رہا تھا مُردہ سا ایک باپ تھا۔ ماں اُسے ذلیل و رسوا کر کے دفن ہو چکی تھی اور دونوں بھائی جو تھوڑی دیر کے لئے غیرت میں آ گئے تھے، پھر بے غیرتی کے راستے پر چل پڑے تھے۔ یہ گھر اُس کے لئے قیدخانہ بن گیا تھا۔ اُس نے باہر کی دنیا دیکھ لی تھی۔ ایک انگریز ایس پی اور نوابزادہ حمید اللہ خان جیسے جاگیردار کی داشتہ رہ چکی تھی۔ پولیس کے ساتھ مل کر اُس نے مجرم پکڑوائے تھے۔ ماں نے پہلے ہی اُس کی فطرت کو اپنے سانچے میں ڈھال رکھا تھا۔ اس پر یہ جوانی اور یہ حُسن جس کا اُسے پورا احساس تھا اُسے ایک پل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔

شہناز نے مجھے اُس وقت جو باتیں سنائی تھیں وہ مجھے آج بھی یاد ہیں اور یاد بھی ایسے جیسے وہ میرے سامنے بیٹھی مجھے اپنی رُوداد سُنا رہی ہو اور میں لکھتا جا رہا ہوں۔ اُس وقت میں جوان تھا، تجربہ نہیں تھا، علم نہیں تھا۔ میں کوئی واقعہ، کوئی کہانی اور کوئی واردات سن لیا کرتا تھا لیکن اس کے کرداروں کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ آج جب میں انسانی فطرت اور نفسیات کی گہرائیوں سے نکل

کر آیا ہوں، انسانوں کے ذہن لاشعور میں چھپے ہوئے بھید پا سکتا ہوں اور انہیں بیان کر سکتا ہوں۔ شہناز کی بات تو میں اس طرح سُنا سکتا ہوں جیسے اُس کا ضمیر میرا ضمیر ہو۔

شہناز اپنی اُس فطرت کے چکر میں آ گئی تھی جو اُس کی ماں نے اپنے سانچے میں ڈھالی تھی۔ اُس نے اپنی ماں کو بہت بڑی مجرم قرار دے کر ذہن و دل سے اُتار دیا تھا اور اپنے آپ میں یہ احساس بھی بیدار کر لیا تھا کہ میں اُسے بڑے خطرناک اور شرمناک راستے پر چلاتی رہی ہے اور یہ راستہ کسی منزل کو نہیں جاتا۔ شہناز نے عہد کر لیا تھا کہ وہ اپنا راستہ خود بنائے گی، لیکن اُس کی جوانی اُس کے قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اُس کی زندگی کے بہت سے دن مرد کی رفاقت میں گزر رہے تھے۔ وہ بیوی بھی رہ چکی تھی، داشتہ بھی۔ یہ تو جسمانی پہلو تھا۔ اُس کے ساتھ ایک پہلو نفسیاتی بھی تھا۔ وہ یہ کہ وہ تنہا نہیں رہ سکتی تھی۔ ابھی وہ اُس فلسفے کو نہیں سمجھتی تھی کہ عورت کو بیوی بننا ہوتا ہے پھر ماں۔ وہ اپنے ذہن میں ایک خلش سی، تشنگی سی محسوس کر رہی تھی۔

خدا نے اُسے ایک ایسے شخص کے پاس پہنچا دیا جو کہلاتا تو پیر تھا لیکن روایتی پیروں جیسا نہیں تھا۔ وہ ایک دردمند انسان تھا۔ دوسروں کے دلوں کی دھڑکنوں کو سمجھتا تھا۔ وہ تھا گلشن آراء کا خاوند۔ وہاں شہناز کو گلشن آراء مل گئی۔ وہ سُنا چکا ہوں کہ گلشن آراء میں کیا انقلاب آیا تھا اور شہناز نے گلشن آراء کی بدلی ہوئی فطرت کا اپنے اوپر کیا اثر لیا۔ گلشن آراء نے شہناز کے خیالوں کا رُخ ہی بدل ڈالا تھا۔

"اس کے باوجود میں یوں محسوس کرتی رہی جیسے میری ذات میں کہیں ایک کانٹا اُتر ہوا ہے" — شہناز نے اپنی داستان سناتے ہوئے کہا — "میں اپنے ضمیر میں یا اپنی رُوح میں چبھن سی محسوس کرتی رہتی تھی۔ تنہائی کا احساس تو بعض اوقات راتوں کو بھی جگا دیتا تھا۔ کبھی غنودگی کے عالم میں یوں لگتا تھا جیسے آج کی رات میں اکیلی نہیں۔ میں چونک کر بیدار ہو جاتی تھی اور جب پلنگ پر اپنے آپ کو تنہا پاتی اور جب یہ حقیقت میرے سامنے آتی کہ میں کس قدر غلیظ اور

گناہ آلود چار دیواری میں جی رہی ہوں تو ایسے لگتا تھا جیسے کسی نے کمرے کی تاریکی میں میری گردن بے رحم ہاتھوں میں جکڑ لی ہو۔ میں ہاتھ لمبا کر کے بلب جلا لیتی تھی۔"

یہ بے رحم ہاتھ انسانی فطرت کے تھے جو مرد اور عورت کو الگ الگ نہیں رہنے دیتے۔ شہناز کے لئے مرد کی دوستی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اُس کے چاہنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ جسے چاہتی اُس کے ساتھ تعلقات پیدا کر سکتی تھی لیکن گلشن آراء اور اُس کے خاوند نے اُسے ایسے راستے پر ڈال دیا تھا جس پر وہ ایسے مرد کی ہمسفر نہیں بننا چاہتی تھی جو دو قدم چل کر اُس کا ساتھ چھوڑ جاتا۔ وہ اب عمر بھر کے رفیق کی تلاش میں تھی۔ اُس نے مجھے جو تفصیلات سنائیں ان سے میں یہ سمجھا کہ وہ کئی بار پھسل گئی لیکن اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس طرح تین چار ایسے آدمی اُس سے مایوس ہو گئے جو حیثیت والے اور اثر و رسوخ والے تھے۔ اُنہوں نے شہناز کو اور زیادہ بدنام کر دیا۔

شہناز کے لئے ایک مشکل یہ بھی پیدا ہو گئی کہ گلشن آراء کا خاوند ایک حادثے میں ذہنی طور پر مفلوج ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ بیہوشی میں پڑا رہا۔ اس کے بعد وہ بیہوشی سے تو نکل آیا لیکن وہ سب کو دیکھتا تھا، پہچانتا کسی کو نہیں تھا۔ اس کی یادداشت ختم ہو چکی تھی۔ اُس نے شہناز کے زخمی دل پر مرہم رکھ دیا تھا لیکن اب وہ شہناز کو بھی نہیں پہچانتا تھا۔ وہ تو اپنی بیوی کو بھی نہیں پہچانتا تھا یہی شہناز کا روحانی سہارا تھا۔ وہ بھی نہ رہا۔ گلشن آراء کے پاس وعظ اور پند و نصیحت تھی۔

گلشن آراء تو خود سہارے پر چل رہی تھی۔ وہ خود بھٹکی ہوئی رُوح تھی۔

ان حالات میں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا۔ یہ تھی عشو۔ میں نے اپنی زندگی کی اس کہانی کی ابتدا میں عشو کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ میری امی کی وفات کے بعد وہ ہمارے گھر میں نوکرانی تھی۔ اُس وقت جوان تھی۔ عشو نے میرے باپ کی وفات کے بعد مجھے بتایا تھا کہ وہ میری امی کے بعد میرے باپ کی داشتہ بن گئی تھی۔

شہناز میرے باپ کی بیوی بن کر آئی تو وہ جان گئی کہ اس گھر میں عشو کی حیثیت صرف نوکرانی کی نہیں۔ شہناز نے اُسے چلتا کیا۔ عشو وہاں پہنچ گئی جہاں مجھے اغوا

کر کے پہنچایا گیا تھا۔ یہ تھا مالوہ ڈاکو کا ٹھکانہ۔

وہاں عشو نے مجھے بتایا کہ اُسے مجھ سے کتنا پیار تھا۔ وہیں اُس نے مجھے وہ ساری باتیں بتائی تھیں جن سے مجھے اپنے باپ کے کردار کا پتہ چلا تھا۔

"شہناز!" — میں نے اُس سے پوچھا — "وہ کہاں گئے جو ہمارے گھر تمہارے پاس آیا کرتے تھے؟ شاید اُنہوں نے ہی مجھے اغوا کرایا تھا۔"

"سکندر!" — شہناہ نے آہ بھر کر کہا — "وہ میرے ہمدرد تھوڑے ہی تھے۔ وہ میری ماں کے ایجنٹ تھے۔ اُنہوں نے جب دیکھا کہ سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے یا کسی شکاری کے جال میں پھنس گئی ہے تو وہ منہ موڑ گئے ...سکندر!" — شہناز نے دُکھیارے سے لہجے میں کہا — "مجھے وہ وقت اور وہ انسان یاد نہ دلاؤ۔ کبھی وہ یاد آجاتے ہیں تو کانٹا جو میری رُوح میں اُترا ہوا ہے تھر تھرانے لگتا ہے۔ پھر درد کی ایسی ٹیسیں اُٹھتی ہیں کہ میں اندر ہی اندر تڑپنے لگتی ہوں ....ہاں، اتنا بتا دیتی ہوں کہ ان میں سے ایک آیا تھا۔ کہنے لگا شہناز! ہماری مدد کی ضرورت ہے تو بتاؤ۔ میں نے پوچھا، کیا مدد کرو گے۔ اُس نے جو جواب دیا، وہ ماں بہن کی گالی سے کم نہیں تھا۔ وہ مجھے کہیں اور پہنچانا چاہتا تھا۔ صحیح لفظوں میں یوں کہہ لو کہ وہ مجھے بیچنا چاہتا تھا" — اُس نے جھنجھلا کر کہا — "لعنت بھیجو سکندر! اُن سب پر لعنت بھیجو!"



رات گزرتی جا رہی تھی۔ بہت سا وقت گزر گیا تھا جس کا ہم دونوں کو احساس نہ ہُوا۔ بوڑھا نواب شراب پی کر اور نیند کے لئے افیم کھا کر سو گیا ہو گا۔ وہ اس اطمینان سے سویا ہو گا کہ اُس کی ایک داشتہ ایک سب انسپکٹر کو اپنے حسین جال میں پھانس چکی ہو گی۔

یہ تھے انگریزوں کے مہاراجے اور نواب جو اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے ایک قسم کے دلال بن جاتے تھے۔

آج اسلامی مملکت میں وہ مہاراجے اور نواب تو نہیں رہے لیکن اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے انگریزوں کے مہاراجوں اور نوابوں جیسی حرکتیں کرنے والے موجود ہیں۔ انہیں مہاراجہ اور نواب نہیں کہا جاتا۔ عام فہم زبان میں انہیں خوشامدی اور درباری کہا جاتا ہے۔

میں اور شہناز یوں ایک دوسرے میں منہمک ہو گئے تھے جیسے بچپن کے بچھڑے ہوتے جوانی میں ملے ہوں۔

"میں عشو کی بات سُنا رہی تھی" — شہناز نے کہا — "ایک روز وہ میرے گھر میں آگئی۔ اُس کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ میں نے جب اُسے گھر سے نکالا تھا اُس وقت اُس کے چہرے پر وہی چمک دمک تھی جو آج تم میرے چہرے پر دیکھ رہے ہو حالانکہ اُس کی عمر کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ تمہارے ابو تو اُسے چہیتی بیویوں کی طرح پال پوس رہے تھے۔ اب اُس کے چہرے پر وہ بات نہیں رہی تھی بلکہ بڑھاپے کی ابتدا کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے پھر بھی اُسے پہچان لیا اور میں بہت حیران ہوئی کہ یہ کدھر آنکلی"۔

شہناز نے مجھے سُنایا کہ عشو پہلے تو افسردہ رہی پھر وہ شگفتہ لہجے میں باتیں کرنے لگی۔ اُس نے شہناز کے حُسن و جوانی کی بہت تعریفیں کیں۔

"تم اتنی مدّت بعد کہاں عشو؟" — شہناز نے اُس سے پوچھا۔

"پاؤں کا چکّر ہے شہناز بی بی!" — عشو نے جواب دیا — "نہ جانے کہاں سے چلی تھی اور کہاں کہاں خجل خراب ہوتے پھر انہی گلیوں میں آگئی ہوں جن گلیوں نے مجھے پناہ دی تھی .... دوسری شادی نہیں کی؟"

"نہیں" — شہناز نے جواب دیا — "کیا کروں گی شادی کر کے؟"

"دماغ پھر گیا ہے تیرا" — عشو نے کہا — "میں کیسے مانوں کہ تم ابھی تک اکیلی ہو"۔

"سکندر کو کہاں غائب کیا تھا؟" — شہناز نے پوچھا۔

"اللہ جانے" — عشو نے کہا — "میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ میں نے اُسے مالوے کی حویلی سے نکال دیا تھا .... مالوہ تو بعد میں مارا گیا تھا۔ میرا

بھی کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ پھر گاؤں گاؤں پھرتی رہی"۔

"شادی کیوں نہ کر لی؟"

"یارانے لگانے والے تو بہت ملے تھے" — عشو نے کہا — "شادی کرنے والا کوئی نہ ملا۔ تنہا زندگی گزار دی ہے"۔

"اب کیسے آئی ہو؟"

"پرانی یادوں نے ستایا تو ادھر چلی آئی" — عشو نے کہا — "دیہات میں رہتے رہتے تنگ آگئی تھی۔ شہر میں گھوم پھر کر اس محلّے کی یاد آئی۔ دو تین گھروں میں گئی۔ سکندر کے مکان کے سامنے سے گزری تو قدم رُک گئے۔ سکندر کی ماں مجھے پناہ میں لے کر یہاں لائی تھی۔ وہ یاد آئی تو میرے آنسو نکل آئے۔ اس گھر میں میرے لئے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر تمہارے گھر آگئی"۔

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں گھر میں ہوں گی؟"

"نہیں" — عشو نے جواب دیا — "میرا تو یہ خیال تھا کہ تم نے دوسری شادی کر لی ہو گی۔ میں تو تمہاری ماں سے ملنے آئی تھی"۔

"وہ تو فوت ہو گئی ہے" — شہناز نے کہا۔

عشو نے اپنے دونوں ہاتھ بڑی زور سے اپنے سینے پر مارے۔ اُسے جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ شہناز کی ماں مر گئی ہے۔ اُس نے شہناز کی ماں کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ پھر شہناز سے اُس نے پوچھا کہ وہ اس جوانی کو لئے گھر میں کیوں بیٹھی ہے۔ شہناز نے مجھے سنایا کہ عشو کی ہمدردی اُسے اتنی اچھی لگی جیسے وہ ایسی ہی ہمدردی کی تشنگی محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد عشو جانے کے لئے اُٹھی تو شہناز نے اُسے پکڑ کر بٹھا لیا۔

"نہیں عشو!" — شہناز نے بے تابی سے کہا — "اتنی جلدی نہیں جانے دوں گی۔ اگر تم نے دل سے معاف کر دیا ہے تو میں کہوں گی کہ ماں کے بعد تم ہو جو مجھے ماں کی طرح اچھی لگتی ہو"۔

عشو بیٹھ گئی۔ شہناز نے اسے اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ شہناز نے اُسے

میرے متعلق کچھ نہ بتایا نہ عشو نے میرا ذکر کیا۔



شہناز نے عشو سے وعدہ لیا کہ وہ پھر آئے گی۔ عشو دو روز بعد آگئی۔ اس کے بعد عشو اپنی میٹھی باتوں اور ہمدردی کی بدولت شہناز پر چھا گئی۔

اس کے بعد عشو دوسرے تیسرے دن شہناز کے پاس آتی رہی۔ عشو نے اب شہناز پر زور دینا شروع کر دیا کہ وہ دوسری شادی کر لے اور اپنی جوانی کو تباہ نہ کرے۔

"عشو!" — ایک روز شہناز نے اُسے کہا — "کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی؟"

"میں تو یہی سمجھتی ہوں۔"

"نہیں عشو!" — شہناز نے کہا — "کچھ ماں کی وجہ سے کچھ اپنی وجہ سے بہت بدنام ہو گئی ہوں۔ وہی بات ہے جو تم نے ابھی کہی ہے کہ یارانہ لگانے والے تو بہت ہیں شادی کرنے والا کوئی نہیں۔"

ان دونوں کی بے تکلفی ایسے بڑھ گئی جیسے بچپن کی سہیلیاں ہوں۔ شہناز تنہائی کی ماری ہوئی تھی۔ اُسے عشو مل گئی جس کے سامنے وہ دل کا غبار نکال سکتی تھی۔

"شہناز!" — ایک روز عشو نے آکر کہا — "تم جانتی ہو میری پہنچ کتنی دُور تک ہے۔ ایک رشتہ تمہارے لئے دیکھا ہے۔ وہ خود خواہشمند ہے۔ کہتا ہے لڑکی ایسی ملے جس کے حُسن کا جواب نہ ہو۔ اپنے گھر اور عزیزوں کو بھول جائے .... شہناز! اگر شہزادی بن کر رہنا ہے تو میں بات آگے چلا سکتی ہوں۔"

"کون ہے وہ؟" — شہناز نے پوچھا۔

"اپنی دُنیا کا بادشاہ ہے" — عشو نے کہا — "بہت بڑا جاگیردار ہے۔ عمر میں تم سے پانچ چھ سال ہی بڑا ہوگا۔ پہلی بیوی مر چکی ہے۔ اب کہتا ہے کہ دوسری بیوی اپنی پسند کی کروں گا۔ پہلی بیوی سے وہ بالکل ہی خوش نہیں تھا۔ وہ کوئی ایسی خوبصورت بھی نہیں تھی اور بدھو سی لڑکی تھی۔"

"میرے گھر سے اُسے ملے گا کیا؟" — شہناز نے کہا — "اتنا بڑا جاگیردار میرا گھر دیکھ کر بھاگ جائے گا۔ کیا تم نے اُس کے ساتھ میرے متعلق بات کی ہے؟"

"نہ شہناز!" — عشو نے کہا — "تمہارے ساتھ بات کئے بغیر میں اُس کے ساتھ تمہاری بات کیسے کر سکتی تھی؟ تم چاہو تو میں بات کر لیتی ہوں۔ میں اُس کی خاص نوکرانی رہ چکی ہوں۔ اب بھی کوئی راز کا کام کرانا ہو تو مجھے بلاتا ہے اور میں ...."

"تم اُس کے ساتھ بات کرو عشو!" — شہناز نے کہا — "میری شادی کس نے کرنی ہے؟ میرے باپ کو تم جانتی ہو، میرے بھائیوں کو تم جانتی ہو۔ یہ تینوں میرا سودا کر سکتے ہیں میری شادی نہیں کر سکتے۔ اس شہر میں مجھے کوئی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اتنا انتظام مجھے خود ہی کرنا ہے۔ تم اُس کے ساتھ بات کرو لیکن اُسے بالکل صحیح بتا دینا کہ میرا گھر کیسا ہے، میں کیسی ہوں اور کوئی جہیز نہیں ہوگا۔ اُسے یہ بھی کہہ دینا کہ میرے محلے اور میرے گھر میں آکر وہ شرم محسوس کرے گا .... میں کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی" — شہناز نے ذرا سوچ کر کہا — "مجھے تم پر اتنا اعتبار ہے کہ میں نے تم سے نہیں پوچھا کہ وہ شکل و صورت کا کیسا ہے، قد کاٹھ کا اور طبیعت کا کیسا ہے؟"

"میں تمہیں اُس سے ملوا سکتی ہوں" — عشو نے کہا — "لیکن یہاں نہیں۔ شہر سے باہر کوئی جگہ بتاؤ۔ کہیں رُکنا یا بیٹھنا نہیں۔ تم دونوں ایک دوسرے کے قریب سے گزر جاؤ گے۔ موقع ہُوا تو بات بھی ہو جائے گی۔"

شہناز گلشن آراء کے گھر جایا کرتی تھی۔ اُس کا گھر شہر سے باہر تھا۔ درمیان میں کھیت آتے تھے۔ شہناز نے عشو سے کہا کہ وہ اُس جاگیردار کو کسی روز ان کھیتوں میں یا گلشن آراء کے گھر سے ذرا پرے درختوں کے جھنڈ میں لے آئے۔



دو روز بعد عشو آگئی اور شہناز کو بتایا کہ آج سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے اُس کا امیدوار آرہا ہے۔ عشو نے شہناز کے متعلق بات کرلی تھی اور وہ اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔

شہناز مقررہ وقت پر عشو کے ساتھ گلشن آراء کے گھر کی طرف چل دی۔ اُس نے کالا برقع اُوپر لے رکھا تھا۔ کھیتوں میں ایک وجیہہ آدمی کھڑا تھا۔ وہ شکل وصورت، لباس اور چال ڈھال سے جاگیر دار لگتا تھا۔ عشو کے کہنے پر شہناز نے برقعے کا نقاب اُٹھادیا اور برقعہ کھول کر اپنے پیچھے کرلیا۔ اسی طرح جاگیر دار اُسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔

وہ آگے کو چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شہناز اور عشو کے قریب سے گزرا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ شہناز اُسے دیکھ کر نہ جھینپی نہ شرمائی۔ جاگیر دار نے شہناز کو سلام بھی کیا۔

تین چار روز بعد عشو نے شام کے بعد دونوں کی ملاقات کرادی۔ شہناز گلشن آراء کے گھر سے آگے نکل گئی تھی۔ شہناز نے جاگیر دار کو اپنی مالی حیثیت اور اپنے گھر کی دگرگوں حالت بالکل ٹھیک ٹھیک بتادی۔

”تم وہی ہیرا ہو شہناز جس کی مجھے تلاش ہے“ —— جاگیر دار نے اُسے کہا —— ”مجھے تمہارا گھر نہیں چاہیئے، جہیز نہیں چاہیئے، مجھے تمہاری ضرورت ہے، خدا کی قسم، ہیروں اور جواہرات سے سجا کر اور ریشم میں لپیٹ کر رکھوں گا۔“

اگلی دو ملاقاتوں میں شہناز کے امیدوار نے ایسے جذباتی الفاظ بولے کہ شہناز کو یہ دنیا بہت خوبصورت نظر آنے لگی۔

”.... لیکن سکندر!“ —— اُس نے مجھے یہ کہانی سناتے ہُوئے کہا —— ”دُنیا کی خوبصورتی پر اور اس جاگیر دار کی مردانہ وجاہت پر آسیبی سائے پڑنے لگے۔ مجھے خیال آیا کہ مجھ سے جو منسوب ہُوا اور جس کے ساتھ ایک دو راتیں گزریں وہ زندہ نہ رہا یا اس پر ایسی آفت پڑی کہ اُس کا بیڑہ غرق ہوگیا۔ یہ آدمی مجھے بہت اچھا لگا۔ اتنا اچھا کہ میں اس کے ساتھ ویسے ہی چل پڑنے کو تیار ہوگئی لیکن مجھ پر خوف طاری ہوگیا۔ میں حمید اللہ کا انجام دیکھ رہی تھی۔ اب حمید اللہ جیسا ہی ایک

خوبصورت جوان مجھے چاہنے لگا تھا۔ میرے دل میں آئی کہ اسے بتادوں کہ میرے جس حُسن وجوانی پر اور جسم پر وہ مرمٹا ہے یہ آسیبی ہے مگر میں نے نہ بتایا۔ اپنے آپ کو تسلی دی کہ اس سے پہلے جو کچھ ہُوا وہ اتفاقات تھے۔ اب شاید ایسے نہ ہو۔“

آخری ملاقات میں جاگیر دار نے اُسے بتایا کہ وہ بارات لے کر یا چند ایک آدمی لے کر نہیں آئے گا۔ اُس کی تجویز یہ تھی کہ شہناز اُس کے ساتھ چلی چلے اور وہ نکاح پڑھوا لے گا۔ شہناز کو دُلہن بنانے اور رخصت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ایک روز اُس نے اپنے زیورات ایک پوٹلی میں باندھے، کپڑوں کے دو جوڑے ساتھ لئے اور گلشن آراء کے گھر چلی گئی۔

عشو نے اُسے وہاں سے پرے ایک جگہ ملنا تھا۔ شہناز گلشن آراء کے گھر سے نکلی اور اپنے گھر آنے کی بجائے اُدھر چلی گئی جہاں عشو اُس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ عشو سفید برقع ساتھ لائی تھی۔ اُس نے شہناز کا کالا برقع اُتروا کر اُسے پرانی قسم کا میلا سا سفید برقع اوڑھا دیا۔

اس سے کچھ دُور ایک پگڈنڈی تھی۔ اس پر ایک تانگہ کھڑا تھا جو اُسے بتایا گیا کہ جاگیر دار کا ہے۔ رات گہری ہوچکی تھی۔ تانگہ شہناز اور عشو کو شہر کے ریلوے سٹیشن پر لے گیا۔ عشو اُسے ایک اندھیری جگہ لے گئی۔ تھوڑی دیر بعد شہناز کا امیدوار آگیا۔

عشو وہیں رہ گئی اور جاگیر دار اُسے ریل گاڑی میں دُور کے سفر پر لے گیا۔

”میں حیران ہورہی تھی کہ یہ شخص اتنی دُور سے مجھے ملنے آتا رہا ہے؟“ —— شہناز نے مجھ سے کہا —— ”ریل گاڑی میں اُس نے مجھے انٹر کلاس میں اپنے ساتھ مردانہ ڈبے میں بٹھایا۔ میں نے اُس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے چہرے سے نقاب نہ اُٹھایا۔ نہ اُس نے میرے ساتھ کوئی بات کی نہ میں نے .... آخر گاڑی نے ہمیں منزل پر پہنچا دیا۔“

شہناز کو یہ شخص نواب کے محل میں لے گیا۔ بڑے گیٹ کے قریب پہنچ کر جاگیر دار نے شہناز سے کہا کہ یہ ہے ہماری منزل۔ شہناز دُور سے نواب کا محل دیکھ کر حیران رہ گئی اور خوشی سے پھُولے نہ سمانے لگی۔

وہ محل میں داخل ہوئی۔ دو عورتوں نے اُسے نہلا کر قیمتی کپڑے پہنائے اور اُسے شہزادی بنا دیا۔ اُس نے ان عورتوں سے بہت کچھ پوچھا۔ اُسے ہر سوال کا جواب ملا۔ رات کو اُسے پتہ چلا کہ جو کچھ بھی اُسے بتایا جاتا رہا ہے وہ سب جھُوٹ تھا اور وہ دھوکے میں آگئی ہے۔

وہ کمرہ حسین خواب سے زیادہ حسین تھا جس میں اُسے رات کو ایک پلنگ پر بٹھا دیا گیا۔ اُس وقت تک وہ اپنے آپ کو ایک جاگیر دار کی ہونے والی دُلہن سمجھ رہی تھی۔ وہ یہ امید لگائے بیٹھی تھی کہ جاگیر دار نکاح خوان اور دو گواہوں کو لے آئے گا۔ نکاح پڑھا جائے گا اور وہ اس محل کی ملکہ بن جائے گی۔

نکاح خواں، گواہوں اور جاگیر دار کی جگہ ایک بوڑھا آدمی کمرے میں داخل ہُوا اور اُس نے شہناز کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ شہناز نے مزاحمت کی۔ بوڑھے نے اُس کی خوش فہمی رفع کر دی اور اُسے خواب سے بیدار کر دیا۔ شہناز کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ ایک بوڑھے نواب کے ہاتھ بِک گئی ہے اور جسے وہ جاگیر دار اور اپنا امیدوار سمجھتی رہی ہے وہ بردہ فروش تھا اور عشوٗ اُس کی ایجنٹ تھی۔

عشو کے متعلق یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ شہناز کو ہی ورغلانے اُس کے شہر گئی تھی یا ویسے ہی اُس کے گھر چلی گئی اور اُسے دیکھ کر خیال آیا کہ شہناز تو بڑا قیمتی مال ہے۔

شہناز کا تڑپنا بیکار تھا۔ نوابوں کی اُس نے کہانیاں سُنی تھیں۔ اُس نے اس دھوکے کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور نواب کو قبول کر لیا۔ نواب نے اُسے بتا دیا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔

"تم خوش قسمت ہو جو یہاں آگئی ہو" —— نواب نے شہناز سے کہا —— "تمہارے حُسن اور اتنے دل کش جسم کی قدر میرے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں حرم

میں نہیں پھینک دوں گا۔ تم میری ڈھال بھی ہو تلوار بھی۔ بڑے بڑے انگریز افسر تمہیں سلام کریں گے۔ تم نے مجھے ایک بار پھر جوان کر دیا ہے۔"

"نواب صاحب!" —— شہناز نے کہا —— "میں آپ کا ہر حکم بجا لاؤں گی۔ میں جانتی ہوں میں یہاں سے بھاگ نہیں سکتی۔ آپ کو اپنے متعلق ایک بات بتا دیتی ہوں۔ میرے جس حُسن نے آپ کو پھر جوان کر دیا ہے یہ آسیب زدہ ہے۔ میرے جسم کی دلکشی میں نہ جانے کیا ہے کہ یہ میٹھا زہر بن گیا ہے۔ یہ جس کے بھی جسم سے لگا وہ کسی نہ کسی آفت کا شکار ہُوا۔"

نواب پر شراب کا اور نوابی کا نشہ طاری تھا۔ اُس نے بدمست سا قہقہہ لگایا۔

"یہاں جو آفت آئے گی۔ وہ ہمارا شکار ہو جائے گی" —— نواب نے کہا۔

شہناز بوڑھے نواب کی بے نکاحی ملکہ بن گئی۔

اُسے ٹریننگ دی گئی۔ اُس میں شرم و حجاب تو تھا نہیں۔ وہ نواب کے کام کی چیز ثابت ہوئی۔ اُس نے جب اپنے آپ کو قد آدم آئینے میں دیکھا تو اپنے آپ کو پہچان نہ سکی۔

"میری قسمت میں یہی کچھ لکھا ہے سکندر!" —— شہناز نے کہا اور اُس کے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگی —— "میں نے ان حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ شہناز کے پاس بیٹھ کر میں کیوں ایسے رُوحانی سکون سے سرشار ہو گیا تھا جس سے میں ہمیشہ ناآشنا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اسی سکون کی ضرورت تھی اور اس سے پہلے میں بے چین اور بے قرار رہا ہوں۔

بعض اُلجھنوں کو نہ سمجھنا ہی اُن کا علاج ہوتا ہے۔ تلخیوں اور نامرادی کا انسان عادی ہو کر اُس مقام پر جا پہنچتا ہے جہاں نامراد اور بے قرار رہنے میں ہی اُسے خوشی سی محسوس ہوتی ہے۔

میں شاید اُس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں ملال مسرّت کا بہروپ دھار لیتا ہے مگرات کی اُس تنہائی میں، ایک شاہانہ کمرے میں جس کی فضا عطر بیز تھی، جہاں دیکھنے والا کوئی نہ تھا، روکنے والا کوئی نہ تھا اور خوشبوئیں اشتعال انگیز تھیں، میں نے محسوس کیا کہ مسرّت سے ہمیشہ محروم رہا ہوں اور میری رُوح ہمیشہ پیاسی رہی ہے۔

جنت میں جاکر مجھے احساس ہُوا کہ میں تو جہنم میں پڑا رہا ہوں اور اسی کو جنت سمجھتا رہا ہوں۔

مگر کیوں؟ —— شہناز کو میں اس لئے بہن نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ میرے باپ کی بیٹی تھی۔ وہ ایک بدکار آدمی اور ایک بدکار عورت کے گناہ کی پیداوار تھی۔ اس میں اُس کا قصور تو نہیں تھا لیکن بزرگ کہتے تھے کہ جس کے خون میں گناہ کی ملاوٹ ہو اُس سے اچھائی اور خلوص کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے۔ اُس پر گناہ کا آسیب طاری رہتا ہے۔

شہناز اسی آسیب کی گرفت میں تھی حالانکہ وہ بدی کی زندگی سے کنارہ کش ہو چکی تھی۔ وہ تو میری دشمن تھی مگر اس کمرے میں وہ مجھ پر نشہ بن کر طاری ہو گئی۔ میری وارفتگی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ مجھے اپنی رام کہانی سُنا رہی تھی اور میں اُس کے ظاہری حُسن میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ اُس کے بالوں میں خاص قسم کی دل کشی تھی لیکن اُس رات اس کے بال کچھ ایسے نکھرے ہوتے تھے کہ میں نے دوچار بار بے اختیار اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنا چاہا لیکن اپنے آپ پر قابو پالیا۔

اُس کی آنکھوں کو اور اُس کے ہونٹوں کو تو میں پہلے بھی دیکھا کرتا تھا مگر اُس رات اُس کی آنکھوں میں سحر سا آگیا تھا جو مجھے مسحور کر رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر جو تبسم تھا وہ میری ایسی حسّوں کو جگا رہا تھا جن کی موجودگی سے ہی میں بیگانہ تھا۔

اُس نے کئی بار یُوں کیا کہ میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور باتیں کرتے کرتے میری انگلیوں کو مسلتی اور ان کے ساتھ کھیلتی رہی۔ مجھے پہلی بار شدت سے محسوس ہُوا کہ میں جوان ہوں، پھر جب نیند غالب آنے لگی تو جوانی

نے بیدار ہو کر اپنے وہ مطالبے میرے آگے رکھ دیئے جنہیں میں نظر انداز کرتا رہا تھا۔

وہ کیسی بے بسی تھی یا وہ کوئی نشہ تھا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ میں شہناز کے اتنے قریب چلا گیا ہوں جہاں اُس کے جسم کی بُوباس بھی میری ناک میں داخل ہو رہی ہے۔

"سکندر!" —— شہناز کی مخمور سی آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔

میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میرا سر شہناز کی گود میں تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ میرے ایک ہاتھ میں اور میرا دوسرا ہاتھ اُس کے بالوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ شہناز کی آواز پر میں اپنے آپ میں آگیا اور شہناز سے الگ ہو گیا۔

"اب شادی کرلو" —— شہناز نے مسکراتے ہوئے کہا —— "اکیلے بھٹک جاؤ گے۔"

میں نے چھوٹے سے بچے کی طرح اُس کی طرف دیکھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور کھول کر پھر دیکھا۔ وہ چہرہ شہناز کا نہیں میری امّی کا تھا۔ میرا پسینہ نکل آیا۔ شہناز نے شاید میرے چہرے کا تاثر پڑھ لیا تھا۔

"ہاں سکندر!" —— شہناز نے میرا ماتھا چُوم کر کہا —— "اتنا نہ گھبراؤ۔ شادی کرلو۔ دنیا میں تم واحد انسان ہو جس کی خاطر میں اپنی جان بھی دے دینے سے دریغ نہیں کروں گی۔"

میری نظروں میں شہناز کا روپ بدل گیا۔ میں خفت مٹانے کے لئے ہنس پڑا۔ میری ہنسی کھوکھلی تھی۔

میں سوچا کرتا تھا کہ آدمی کتنے کمزور ہوتے ہیں جو ایک خوبصورت عورت کے جال میں اپنے آپ کو اُلجھا کر دین اور ایمان سے اور اپنے ملک کی وفاداری سے بھی دستبردار ہو جاتے ہیں۔ اُس رات مجھ پر جو کیفیت طاری ہو گئی تھی، اس سے مجھے جواب مل گیا کہ مرد جو دنیا کو فتح کرنے کے ارادے باندھتا ہے کس طرح ایک عورت کی نشیلی آنکھوں سے اور ہونٹوں پر کھیلتے ہوئے تبسم سے گھائل ہو کر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

میں اپنے آپ میں آگیا لیکن یہ آسان نہ تھا۔ میں نے موضوع بدل دیا۔

◆

"شہناز!" —— میں نے کہا —— "مجھے تمہارے متعلق ایک خطرہ محسوس ہو رہا ہے ..... حمید اللہ خان جیل سے فرار ہو کر یہاں آیا تھا اور اپنے باپ سے بیس ہزار روپیہ لے گیا تھا۔ اُسے پتہ چل سکتا ہے کہ تم یہاں ہو۔ وہ ضرور آئے گا اور تم پر وار کرے گا۔ نواب کو تم بتا دینا ..... لیکن شہناز! ہو گا یوں کہ حمید اللہ خان نے آ کر نواب سے کہا کہ شہناز کو میرے حوالے کر دو تو نواب تمہیں اُس کے حوالے کر دے گا۔"

"کر دے!" —— شہناز نے بڑے اطمینان سے کہا —— "میں آرام سے اُس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ اگر دیکھا کہ وہ مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہے تو ہو سکتا ہے وہ اس سے پہلے ہی ختم ہو جائے۔ وہ اکیلا تو نہیں ہو گا۔ اُس کے دو چار ساتھی اُس کے ساتھ ہوں گے۔ تلجے کے دوستوں نے اُسے قتل کر ہی دیا تھا نا۔ حمید اللہ بھی اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔ میں یہ بندوبست کر سکتی ہوں۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتے وہ کیا کرے گا" —— میں نے کہا —— "میں نے تمہیں سنایا ہے کہ فرار کے بعد اُس کے ساتھ میری کہاں اور کیسے ملاقات ہوتی تھی۔ تمہارا ذکر آیا تو بات اُس نے انتقام کی ہی کی تھی لیکن اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ شہناز سامنے آگئی تو شاید میں کچھ بھی نہ کر سکوں۔ اُس نے یہ نہیں کہا تھا کہ شہناز نے مجھے پکڑوایا اور عمر قید دلائی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ شہناز نے میری محبت کا خون کیا ہے۔"

"سکندر!" —— شہناز نے کہا —— "اس شخص نے جس انداز سے مجھ سے محبت کی ہے اسے میں دیوانگی کہوں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عیاش نوابزادہ تھا اور اپنے باپ کی طرح خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ اس طرح کھیلتا تھا جس طرح بچے کانچ کی گولیوں کے ساتھ کھیلا کرتے ہیں۔ مجھے بھی اُس نے ایسی ہی لڑکی سمجھا تھا لیکن پہلی ملاقات میں اُس نے میرے ساتھ ایسا انداز

اختیار کر لیا جیسے میں دیوی ہوں اور وہ پجاری ....

"اور سکندر! میں اس حقیقت کو چھپا نہیں سکتی کہ میرے دل میں بھی اُس کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ اُسے میرے جسم کے ساتھ تو جیسے دلچسپی رہی ہی نہیں تھی۔ جذبات میں ڈوب جاتا تھا اور ...."

"تم نے اُسے دھوکہ دے کر مجھے وہاں سے چھڑایا" —— میں نے کہا —— "اور اُسے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا۔"

"میرے اندر سے ایک آواز اُٹھی تھی، جاؤ شہناز! اس لڑکے کو وہاں سے نکالو" —— شہناز نے کہا —— "اُس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہم دونوں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں، پھر بھی میں حمید اللہ کی محبت کو بھول گئی اور میرے دل نے کہا کہ سکندر نہیں تو میں بھی نہیں۔ یہ خون کی کشش تھی۔"

"گندے خون کی کشش" —— میں نے کہا۔

"جیسا بھی ہے، ہے تو ایک ہی!" —— شہناز نے کہا —— "سکندر! کیا تم نے کبھی محسوس کیا ہے کہ ہم دونوں معصوم سے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور ایک دوسرے کے سہارے بھٹکتے پھر رہے ہیں؟"

"جذباتی باتیں نہ کرو شہناز!" —— میں نے اکتاہٹ سے کہا —— "لوگ تلخ حقیقت سے بھاگ کر بڑے حسین جذبات اور تصورات میں جا پناہ لیتے ہیں لیکن میں جذبات اور ماضی سے بھاگ کر حقیقت میں پناہ لیا کرتا ہوں۔ خطروں میں کود جاتا ہوں ..... حمید اللہ خان کی بات کرو شہناز! میں ڈرتا ہوں وہ تم پر وار کر جائے گا اور میں تمہیں اُس سے بچا نہیں سکوں گا۔"

"اتنا غم نہ کرو سکندر!" —— شہناز نے کہا —— "مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ مجھ سے انتقام نہیں لے گا ..... اور سکندر! دل میں ایک بات آتی ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے سامنے آجائے تو اُسے نہ پکڑو؟"

"کیا تم ایسا ہی چاہتی ہو؟"

"ہاں سکندر!" —— شہناز نے کہا —— "یہ میرے دل کی آواز ہے لیکن تم یہ سوچ لو کہ تم پر حرف نہ آئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے بچانے کے جرم میں

تم پکڑے جاؤ۔"

"اگر میں اُس کے سامنے اکیلا ہوتا تو شاید میں اُسے چھوڑ دوں"—— میں نے کہا —"اُس نے مجھے چھوڑ دیا تھا شہناز!.... یہ تو اُس وقت دیکھوں گا جب حمید اللہ خان سے آمنا سامنا ہوگا۔ یہ بتاؤ کہ صبح نواب کو کیا بتاؤ گی؟"

"کیا بتاؤں گی؟"—— شہناز سوچ میں پڑ گئی پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی —"کہوں گی، یہ آپ نے میرے حوالے کیا کر دیا تھا! یہ تو بالکل سیدھا اور دیہاتی سا تھانیدار ہے۔ میں نے پیار پیار میں اُسے اتنی پلا دی کہ ساری رات بے ہوش پڑا رہا اور ہوش میں آیا تو اُسے ایسا تاثر دیا جیسے اُس نے ساری رات عیش کرتے گزاری ہے.... آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے خلاف کوئی ایسی ویسی رپورٹ نہیں لکھے گا۔ میں نے نقد بخشیش بھی دے دی ہے۔"

"شراب کہاں ہے؟"—— میں نے شہناز سے کہا۔

اُس نے الماری کھول کر ولایتی شراب کی بوتل دکھا دی۔



میں واپس اپنے ہیڈ کوارٹر میں آیا تو ایسے لگ رہا تھا جیسے عجیب سا خواب دیکھتا رہا ہوں جو پریشان کن تھا اور خوبصورت بھی۔ اپنے افسروں کو میں نے زبانی رپورٹ دی۔ انہوں نے جس اطمینان اور تحمل سے میری رپورٹ سُنی اور میں نے اس میں جو جھوٹ شامل کیا تھا اُسے بھی سچ مان لیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ انہیں کسی مُخبر نے اطلاع نہیں دی تھی کہ حمید اللہ نواب کے ہاں آیا ہُوا ہے۔ میرا وہاں جانا معمول کا ایک چھاپہ تھا۔

معمول کا چھاپہ تو انگریز افسروں کے لئے تھا، میرے لئے یہ ایک غیر معمولی تجربہ تھا۔ میں نے نواب کو یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ میں اس کے محل میں رقاص کی حیثیت سے رہ چکا ہوں اور وہ میں ہی تھا جو گلشن آرا کو قید خانے سے نکال کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

سلطان احمد میرا بڑا پیارا دوست تھا۔ میرے لئے وہ بہت پریشان تھا۔ میں افسروں کو رپورٹ دے کر فارغ ہُوا تو سلطان میرے ساتھ کمرے میں

آ گیا۔ وہ میرے چھاپے کی تفصیل سُننا چاہتا تھا جو میں نے اُسے سنائی۔

"سکندر!"—— اُس نے کہا ——"نوکری اور طریقے سے کرو۔ ان چکروں سے نکلو۔ حمید اللہ اور شہناز اُس دنیا کے لوگ ہیں جو سر سے اوپر تک گناہوں اور جرائم میں ڈوبی ہوتی ہے۔ تم نے اپنے دل میں ان دونوں کی ہمدردیاں پیدا کر کے اپنے لئے خطرناک مسئلہ پیدا کر لیا ہے۔ حمید اللہ اور شہناز پہلے کی طرح اکٹھے ہو جائیں گے۔ بغیر نکاح کے میاں بیوی بن جائیں گے اور انہیں یاد بھی نہیں رہے گا کہ سکندر نام کا کوئی شخص بھی ہُوا کرتا تھا جیسا کہ تم نے سنایا ہے کہ شہناز نے تمہیں کہا ہے کہ شادی کر لو۔ یہی ایک عقل کی بات ہے جو شہناز نے تمہیں کہی ہے اور تمہیں اس پر عمل کرنا چاہئے۔"

سلطان کی اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کبھی ایسے لگتا تھا جیسے میں نے اپنے آپ کو بڑی مضبوط زنجیروں میں جکڑ لیا ہے جو اب کھل نہیں سکیں گی اور کبھی یوں بھی محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کچے سے دھاگے ہیں جو کسی بھی وقت توڑ دوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان زنجیروں اور ان دھاگوں کو توڑنے کی سوچ ہی نہیں رہا تھا۔

کبھی ایسے لگتا تھا جیسے میرا یہ سارا رویہ ابنارمل ہے۔

میں جن حالات میں اور جس ماحول میں پل کر جوان ہُوا تھا اور پھر جن تاریک راہوں پر مجھے دھکیلا گیا وہ سب ابنارمل تھے۔ میرا ذہن نارمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔



چار یا پانچ دن گزرے ہوں گے کہ ایک اور اطلاع نے ہمیں چونکا دیا۔ ہم چار پانچ پولیس آفیسر انسپکٹر ڈولکاکس کے پاس بیٹھے ہوتے تھے کہ اردلی نے آکر اُسے کہا کہ ایس پی صاحب بلاتے ہیں۔ وہ گیا اور ہم تقریباً نصف گھنٹہ اس کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ وہ ہمیں لیکچر دے رہا تھا۔ ہمیں اُس کی واپسی تک وہیں بیٹھنا تھا۔

"مفرور قیدی حمید اللہ جال میں آ گیا ہے"—— انسپکٹر ڈولکاکس نے واپس

آکر ہمیں فاتحانہ لہجے میں کہا ۔۔۔ "اُس کے علاقے کے قریبی تھانے سے ٹیلیفون آیا ہے کہ حمید اللہ خان نواب کے محل میں آیا ہُوا ہے۔"

"پھر کیا کارروائی ہو گی صاحب بہادر!" ۔۔۔ ایک سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"کارروائی کا حکم اسی تھانے کو دے دیا گیا ہے" ۔۔۔ انسپکٹر ولکاکس نے کہا ۔۔۔ "اگر ہم یہاں سے پولیس بھیجتے تو وہاں تک پہنچتے اتنا وقت لگ جاتا کہ ہمارا شکار ہاتھ سے نکل سکتا تھا۔ اُسی تھانے کے سب انسپکٹر کو حکم دیا گیا ہے کہ جتنی بھی نفری اُس کے پاس ہے رائفلوں کے ساتھ محل پر بہت تیزی سے چھاپہ مارے اور ہم نے اُسے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ نواب کے محل میں داخل ہونے کے لئے رسمی آداب کی ضرورت نہیں۔ اگر دروازے اور کھڑکیاں بند ہوں تو رائفلوں سے کواڑ توڑ کر اندر چلے جائیں۔"

انسپکٹر ولکاکس نے اپنا لیکچر پھر شروع کر دیا لیکن اُس کا انداز کچھ بدل گیا تھا۔ ملزم اور قیدی تو مفرور ہوتے ہی رہتے تھے، ان کا تعاقب بھی ہوتا تھا۔ کہیں نہ کہیں کسی مفرور کی موجودگی کی اطلاع بھی آتی تھی اور پولیس بھی چھاپے مارتی تھی اور یہ ساری کارروائی معمول کے مطابق ہوتی تھی۔ پولیس کا یہی تو کام ہوتا ہے لیکن حمید اللہ معمولی مفرور نہیں تھا۔ اُسے نظر انداز کرنے کا یا اُس کی موجودگی کی اطلاع پر فوری اور تیز کارروائی نہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک ایسے شخص کو چھوڑا جا رہا ہے جو بہت بڑا ڈاکو بھی بن سکتا ہے یا بڑا ہی خطرناک دہشت گرد بھی۔

باقی سب انسپکٹر اس انگریز انسپکٹر کا لیکچر توجہ سے سُننے لگے یا یہ ظاہر کرنے لگے کہ وہ توجہ سے سُن رہے ہیں لیکن میری حالت کچھ اور تھی جو اتنی بگڑ گئی کہ دو مرتبہ میری زبان پر یہ الفاظ آگئے کہ صاحب بہادر، حمید اللہ میرا شکار ہے، مجھے جانے دیں لیکن میں نے اپنے اوپر جبر کیا۔ اگر میں کہہ بیٹھتا تو مجھے یہی جواب ملتا ۔۔۔ "شٹ اپ یُو ڈیم فُول!"

دوسرے دن انسپکٹر ولکاکس نے بڑے غصے میں یہ خبر سنائی کہ

حمید اللہ نکل گیا ہے۔ کچھ دیر بعد انسپکٹر ولکاکس نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔

"تمہارا شکار نکل گیا ہے" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "لیکن ہمارے مُخبر کی رپورٹ غلط نہیں تھی۔ تم وہاں جاؤ اور بہت محنت سے تحقیقات کرو کہ وہ کس طرح نکل گیا ہے۔ انکوائری کے لئے کسی سینئر افسر کو جانا چاہیئے تھا لیکن تم زیادہ مناسب ہو۔ تم اُس جگہ سے اور وہاں کے بہت سے لوگوں سے واقف ہو۔ تم نے نواب اور شہناز کے ساتھ بھی بہت باتیں کی ہیں اور ان کی سُنی ہیں۔ سب سے پہلے اُس علاقے کے ایس ایچ او سے پوچھنا کہ اُسے کس طرح رپورٹ ملی تھی اور اُس نے اپنی چھاپہ مار کارروائی کس طرح کی تھی ....

"ہمیں یہ بھی شک ہے کہ نواب نے یا نوابزادہ نے اُس ایس ایچ او کی جیب بھر دی ہو گی اور یہ رسمی سی کارروائی کر کے آگیا اور ہمیں رپورٹ دے دی کہ مفرور نکل گیا ہے۔ یہ ایس ایچ او اپنی زبان سے تو نہیں مانے گا کہ اُس نے رشوت لی ہے۔ یہ تمہیں اُس کی کارروائی سے پتہ چلے گا۔ وہ جو بیان دے گا وہ یاد رکھنا اور محل کے لوگوں سے بیان لے کر اُس کے بیان سے ملانا۔ مفرور نکل نہیں سکتا تھا۔ وہ گیٹ کے اندر جاتا دیکھا گیا ہے لیکن گیٹ سے نکلتا نہیں دیکھا گیا ... کیا وہاں ایسے آدمی ہیں جو تمہیں صحیح بات بتا دیں گے؟"

"ہاں صاحب بہادر!" ۔۔۔ میں نے جواب دیا ۔۔۔ "اپنے مخبروں کے علاوہ میں نے دو تین آدمیوں کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ ان کے علاوہ شہناز وہاں ہے۔ اُسے جو کچھ معلوم ہُوا وہ بتا دے گی .... لیکن صاحب بہادر! مجھے یہ ڈر ہے کہ حمید اللہ شہناز کو ساتھ ہی نہ لے گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شہناز کو ہی ساتھ لے جانے آیا ہو۔"

"جو کچھ بھی ہُوا ہے" ۔۔۔ انسپکٹر ولکاکس نے کہا ۔۔۔ "یہ تمہیں وہاں جا کر معلوم ہو گا۔ یوں کرو کہ تم ابھی روانہ ہو جاؤ۔ وہی دو کانسٹیبل اپنے ساتھ لے جاؤ جو پہلے تمہارے ساتھ گئے تھے .... اور دیکھو سکندر! تم بھی ہندوستانی ہو۔ تم نواب کے محل کے اندر جاؤ گے۔ اُس کا محل بہشت سے کم نہیں۔ اُس کے حرم میں ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت عورت ہے۔ وہاں شراب بھی

ہے اور دولت کا تو کوئی حساب ہی نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اس دریا میں بہہ جاؤ۔"

"میں جانتا ہوں صاحب بہادر!" ——— میں نے کہا ——— "نواب نے یہ جانے بغیر کہ میرا اور شہناز کا آپس کا پرانا تعلق ہے، شہناز کو پوری رات کے لئے میرے حوالے کر دیا تھا۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے شہناز سے بہت سی ضروری باتیں معلوم کر لی تھیں اور میں نے محل میں اُسے اپنا مخبر بنا دیا ہے۔ میں پتھر ہوں صاحب بہادر!"

"تم جو کچھ ہو، پتہ چل جائے گا" ——— انسپکٹر ولکاکس نے طنزیہ لہجے میں کہا ——— "ڈیوٹی میں گڑبڑ کرو گے تو پوری سزا پاؤ گے۔"

اُس نے مجھے اور بھی بہت سی ہدایات دیں اور میں روانہ ہو گیا۔

◆

میں اُڑ کر نواب کے محل میں پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے ریل گاڑی پر غصہ آ رہا تھا جو اتنی آہستہ چلتی تھی۔ میں بہت خوش تھا لیکن میں اپنے آپ کو اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا کہ میں کیوں اتنا خوش تھا۔ کیا اس لئے کہ میں حمیداللہ کے تعاقب میں جا رہا تھا یا اس لئے کہ میں شہناز کے پاس جا رہا تھا۔

میں متعلقہ تھانے میں پہنچ گیا۔ وہاں کا ایس۔ ایچ۔ او مجھے جانتا تھا۔ وہ اس لئے دوڑتا ہوا میرے استقبال کے لئے مجھ تک پہنچا کہ میں سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر تھا ورنہ وہ میرے باپ کی عمر کا تھا۔ وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گیا۔

"صوفی صاحب!" ——— میں نے اندر جاتے ہی اُس سے پوچھا ——— "آپ کو کس نے حمیداللہ کی محل میں آمد کی اطلاع دی تھی اور آپ کو جب ہیڈ کوارٹر سے کارروائی کا حکم ملا تو آپ کتنی دیر بعد وہاں پہنچے؟ کیا کارروائی کی، کیا دیکھا، پھر آپ کو یہ یقین کس طرح ہوا کہ مفرور نکل بھاگا ہے؟ مجھے پورا بیان دیں۔"

سب انسپکٹر صوفی عظمت اللہ سر جھکا کر سوچ میں پڑ گیا۔

"صوفی صاحب!" ——— میں نے کہا ——— "آپ سوچ کر بیان دیں۔ میں

بڑا سخت حکم لے کر آیا ہوں۔ میں نے محل میں جا کر بھی بیان لینے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ نواب کے باڈی گارڈز میں سابق فوجی اور پولیس کے سابق ملازم بھی ہیں۔ وہ مجھے صحیح طور پر بتا دیں گے کہ آپ کی کارروائی ٹھیک تھی یا ناقص تھی یا آپ نے دانستہ کارروائی کو ڈھیلا رکھا تاکہ مفرور کو نکل بھاگنے کا موقع مل جائے ...... میں اس کا خاص خیال رکھوں گا کہ آپ مسلمان ہیں اور آپ صوفی ہیں اور میں آپ کے چھوٹے بھائی کے برابر ہوں۔ اگر نواب نے آپ کی مٹھی گرم کر دی ہے تو میرے کان میں بتا دیں۔ میں ریکارڈ پر نہیں لاؤں گا۔"

"نہیں سکندر صاحب!" ——— اُس نے کہا ——— "اللہ کا دیا بہت ہے۔ آپ میرا بیان لے لیں پھر محل میں جا کر جتنے بیان آپ چاہتے ہیں لیں اور میرے بیان کی تصدیق یا تردید کر لیں۔"

"صوفی صاحب!" ——— میں نے بیان سے ہٹ کر شہناز کے متعلق پوچھنے کے لئے کہا ——— "نواب کے محل میں ایک عورت ہے جس کا نام شہناز ہے۔ کیا وہ بھی لاپتہ ہے؟ اگر آپ اُس کا نام نہیں جانتے تو کیا آپ کو ایسی رپورٹ ملی ہے کہ مفرور کے ساتھ ایک عورت بھی غائب ہو گئی ہے؟"

"نہیں" ——— صوفی نے جواب دیا ——— "اتفاق کی بات ہے کہ مجھے اس عورت کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ نام شہناز ہے۔ اُس نے چھاپے کے دوران مجھے بلا کر کہا تھا کہ اُسے مفرور حمیداللہ سے خطرہ ہے کہ وہ اُسی کو اُٹھا لے جانے آیا ہے اس لئے اُس کے دروازے پر ایک یا دو کانسٹیبل کھڑے کر دیئے جائیں۔ میں نے ایک کانسٹیبل اور نواب کا ایک باڈی گارڈ وہاں کھڑا کر دیا تھا۔ ملزم کے نکل جانے کے بعد میں نے جب کانسٹیبلوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا تو اس کانسٹیبل سے پوچھا تھا کہ نواب کی اس بیگم تک تو مفرور نہیں پہنچا؟ کانسٹیبل نے بتایا کہ وہ اُدھر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ خاتون محفوظ ہے۔"

یہ سُن کر مجھے تسلی ہو گئی۔ سب انسپکٹر صوفی عظمت اللہ نے تفصیل سے اپنا بیان دیا جس میں کم و بیش تین گھنٹے صرف ہو گئے۔ میں فوراً شہناز کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے ابھی تھانے کے چند اور آدمیوں کے بیان بھی

لینے تھے لیکن میں نواب کے محل کو چل پڑا۔

میں بڑے گیٹ میں داخل ہوا تو وہ مُخبر کھڑا نظر آیا جس نے حمید اللہ کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ میں سب کے سامنے اُس سے بات کرسکتا تھا۔ میں نے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ سیدھا نواب کے پاس جاؤں گا اور اُسے کہوں گا کہ وہ بالکل صحیح بیان دے دے ورنہ پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ اُس کے خلاف سخت کارروائی کرے گا۔ میں سیدھا نواب کے محل میں جا پہنچا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کس کمرے میں ملے گا۔ میں ایک راہداری میں جا رہا تھا کہ اچانک شہناز میرے سامنے آگئی۔ میں اکیلا تھا۔ اپنے دونوں کانسٹیبلوں کو باہر کھڑا کر آیا تھا۔

"کیوں آئے ہو سکندر؟" —— شہناز نے سنجیدہ سے لہجے میں پوچھا —— "تحقیقات کرنے آئے ہو کہ حمید اللہ خان کیسے نکل گیا ہے؟"

"ہاں شہناز!" —— میں نے کہا —— "پکی اطلاع ملی تھی کہ وہ محل میں موجود ہے۔ پولیس نے چھاپہ بھی بر وقت مارا تھا۔ میں یہ تحقیقات کرنے آیا ہوں کہ وہ واقعی آیا تھا اور اگر آیا تھا تو نکلا کیسے؟ کسی کی مدد کے بغیر وہ نہیں نکل سکتا تھا۔"

"ہاں وہ آیا تھا" —— شہناز نے کہا —— "اور وہ نکل گیا تھا۔"

"تم کیسے جانتی ہو؟"

شہناز میرے قریب آگئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر اور پیچھے دیکھا۔ میں اُس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی دیکھ رہا تھا جو پہلے اُس کے چہرے پر کبھی نظر نہیں آتی تھی۔

"اُسے میں نے نکالا تھا" —— شہناز نے کہا۔

مجھے ایسے لگا جیسے میرے خون کی گردش رُک گئی ہو۔

"حیران مت ہو سکندر!" —— شہناز نے کہا —— "اُسے میں نے اپنے کمرے میں چھپا لیا تھا پھر میں نے اُستادی یہ کی کہ اپنے کمرے کے بند دروازے کے سامنے پولیس کے ایک آدمی اور ایک باڈی گارڈ کو یہ کہہ

کر کھڑا کر دیا تھا کہ مجھے مفرور حمید اللہ سے خطرہ ہے۔ جب چھاپہ ختم ہو گیا اور پولیس کو یقین ہو گیا کہ مفرور محل کے اندر یا محل کے احاطے میں موجود نہیں تو میں نے اُسے نکال دیا۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس شہناز کو میں جانتا اور پہچانتا ہی نہیں۔ ایک سوال یوں میرے ذہن سے اُبھرا جیسے بل سے زہریلا سانپ نکلا ہو ——

"کیا میں شہناز کو گرفتار کر لوں؟"

میں شہناز کے سامنے یوں کھڑا تھا جیسے دلدل میں آ گیا ہوں اور دلدل میں دھنستا ہی چلا جا رہا ہوں۔ میرا سر جھک گیا تھا۔ یہ فرض اور جذبات کی دلدل تھی۔ شہناز غیر معمولی ذہن کی عورت تھی۔ میری طرح خدا نے شاید اُسے بھی ایک فالتو حِس دی تھی۔

"تم تو کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئے ہو سکندر!" —— شہناز نے کہا —— "تم اپنی کارروائی پوری کرو۔ پھر میرے پاس آجانا۔"

"کیا نواب کو معلوم ہے کہ حمید اللہ آیا تھا اور اُسے تم نے نکالا ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"نہیں!" —— شہناز نے جواب دیا —— "اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ پتہ چل جاتا تو حمید اللہ کو پکڑوا دیتا .... اُس نے کئی بار کہا ہے کہ وہ حمید اللہ کو پکڑوا دے گا۔ نواب انگریزوں کو ناراض کرنے سے ڈرتا ہے .... یہاں ہم کھڑے نہیں رہ سکتے سکندر! میں نے کھڑکی میں سے اتفاقیہ تمہیں آتے دیکھ لیا تھا۔ میں سمجھ گئی تم کیوں آتے ہو۔ میں تمہیں روکنے کے لئے ہی باہر نکلی تھی، اتفاقیہ تمہارے راستے میں نہیں آگئی تھی .... اب کیا کرو گے؟"

"نواب کے پاس جاؤں گا" —— میں نے جواب دیا —— "اُسے کہوں گا کہ حمید اللہ یہاں آیا تھا، وہ نکلا کیسے؟ میں نواب کو ملزم ٹھہراؤں گا کہ حمید اللہ کو اُس نے نکالا ہے۔ میں پہلے کی طرح اسے ڈراؤں گا، نوابی ختم کرانے کی دھمکیاں دوں گا۔"

"اور میں اُسے یہ کہہ کر کہ اس سب انسپکٹر کو میں سنبھالتی ہوں تمہیں اپنے کمرے میں لے آؤں گی" —— شہناز نے کہا —— "تمہیں اپنے پاس بٹھانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ میں تمہیں یہ واقعہ صحیح طور پر سناؤں گی۔"

شہناز وہاں سے چلی گئی اور میں نواب کے کمرے کے دروازے پر جا

کھڑا ہوا۔ دربان نے نواب کو اطلاع دی تو اُس نے مجھے فوراً بلا لیا۔ اُس کے بوڑھے چہرے پر نوابی رعونت کی بجائے شکست اور کسمپرسی کا تاثر تھا۔ پہلی ملاقات میں اُس نے کہا تھا کہ یہ اُس کی توہین ہے کہ ایک سب انسپکٹر اُس کے پاس تفتیش کے لئے آئے۔ اب وہ اُسی سب انسپکٹر کے استقبال کے لئے پانچ سات قدم آگے آگیا تھا۔ اُس نے ہاتھ ملانے کی بجائے مجھے گلے لگا لیا۔

"آ سکندر بیٹے!" —— اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا —— "اُس نواب زادے نے میرا تو جینا حرام کر دیا ہے۔ اب تو مجھے اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی ہے۔ خدا کے لئے کچھ کرو۔"

اُس کے تو آنسو نکل آتے تھے۔ شہناز مجھے بتا چکی تھی کہ نواب کو اتنا ہی پتہ چل سکا تھا کہ حمید اللہ آیا ہے۔ اُسے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کہاں چھپا رہا اور کس طرح نکل گیا، لیکن میں نے اُس سے اِس الزام میں بیان لینا تھا کہ حمید اللہ کو اُس نے پناہ دی ہے پھر اُسے یہاں سے نکال دیا ہے۔

"نواب صاحب!" —— میں نے کہا —— "آپ کے آنسو مجھے منوا نہیں سکتے کہ آپ نے حمید اللہ کو پناہ نہیں دی اور اُسے بھاگ نکلنے میں مدد نہیں دی۔"

اُس نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر مارے اور سر جھکا لیا، پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میں نے بچپن میں بادشاہوں کی اور اُن کے محلات کی کہانیاں سُنی تھیں۔ میں کسی بادشاہ کے محل کو اپنے تصور میں نہیں لا سکتا تھا۔ نواب کے اس خاص کمرے کو دیکھ کر مجھے کہانیوں والے محل یاد آتے۔ وہ محل ایسے ہی تھے۔ میں اس کمرے کے حُسن اور اس کی سجاوٹ کو بیان نہیں کر سکتا۔

"سکندر!" —— نواب ٹہلتے ٹہلتے رُک گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھیمی سی آواز میں بولا —— "میں نے تمہیں پچھلی بار ایسی قابلِ احترام حیثیت دے دی تھی جس کے تم اہل نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم نے اپنے آپ کو مجھ سے بھی بڑا سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ مت بھولو کہ تم معمولی سے سب انسپکٹر ہو اور میں نواب ہوں۔ میں آنکھ کے اشارے سے تم جیسے چھ سب انسپکٹروں کو گم کرا سکتا ہوں۔ تمہارے انگریز افسروں کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔ مجھ

پر یوں الزام مت لگاؤ جیسے میں تمہارے علاقے کا جیب تراش یا چور ہوں"—— اُس کی آواز دھیمی تھی لیکن اُس میں قہر بھرا ہوا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ——"میں تمہیں اُس شہر میں قتل کرا سکتا ہوں جہاں تمہاری سپیشل برانچ کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ تم میرے خفیہ ہاتھ کو نہیں جانتے۔"

"نواب صاحب!"——میں نے طنزیہ ہنسی ہنس کر کہا ——"آپ مجھے چیلنج کر رہے ہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ۔۔۔۔"

"سکندر!"—— اُس نے میری بات کاٹ کر کہا ——"میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ میرے ساتھ تمیز سے بات کرو۔ پھر میں تمہیں وہی عزت دوں گا جو پچھلی بار دی تھی۔ میں کہہ رہا تھا کہ حمید اللہ یہاں آیا ہو گا لیکن میں نے اُسے نہیں دیکھا۔۔۔ چاہو تو میرا بیان لے سکتے ہو۔"

"بیان تو مجھے لینا ہی ہے"—— میں نے کہا ——"آپ کے اس محل کے کئی اور افراد کے بھی بیان لوں گا۔ بہتر تھا کہ آپ مجھے چیلنج نہ کرتے۔ آپ نے یہ ثابت کرنا ہے کہ آپ کو حمید اللہ نہیں ملا تھا۔"



اُس نے جو بیان دیا وہ یوں تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ پولیس کی گارد دوڑتی آرہی ہے۔ وہ باہر نکلا۔ پولیس اُس کے محل کے ارد گرد پھیل رہی تھی اور ایک سب انسپکٹر (صوفی عظمت اللہ) اُس کے محل کے برآمدے میں داخل ہو رہا تھا۔

"نواب صاحب!"—— سب انسپکٹر نے اُسے کہا ——"نواب زادہ حمید اللہ خان کو ہمارے حوالے کر دیں۔ بڑا سخت حکم ملا ہے۔ اگر آپ اُسے میرے حوالے نہیں کریں گے تو میں محل کے ہر ایک کمرے کی تلاشی لوں گا اور میں عورتوں کے کمروں میں بھی جاؤں گا۔"

"نہیں صوفی صاحب!"—— نواب نے جواب دیا ——"میں نے اُسے نہیں دیکھا۔ تم جو مناسب سمجھتے ہو کرو۔ مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہے۔ وہ مجھ سے رقم بٹورنے آیا ہو گا۔ میرے باڈی گارڈوں کو بھی ساتھ لے لو اور اُسے ڈھونڈو۔"

نواب خوف سے کانپ رہا تھا۔ اتنے میں شہناز باہر آئی اور کہنے لگی کہ حمید اللہ اُسے قتل یا اغوا کرنے آیا ہو گا۔

"نواب صاحب!"—— شہناز نے خوف زدہ آواز میں کہا ——"میں اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھ جاتی ہوں۔ دو تین سپاہیوں کو میرے دروازے پر کھڑا کر دیں۔"

اس سے پہلے شہناز نے نواب کو بتا دیا تھا کہ اُس کا حمید اللہ کے ساتھ کیا تعلق رہا ہے اور یہ تعلق کس طرح ٹوٹا تھا لیکن اُس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اُس نے سکندر کو بچایا تھا۔

"اُسے پتہ چل گیا ہو گا کہ میں یہاں ہوں"—— شہناز نے نواب سے کہا —— "وہ مجھ سے انتقام لینے آیا ہے۔"

سب انسپکٹر نے یہ انتظام کیا کہ ایک کانسٹیبل اور نواب کے ایک باڈی گارڈ کو شہناز کے کمرے کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔ شہناز کمرے میں بند ہو گئی۔

نواب نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ پولیس کے کانسٹیبل محل اور اس سے ملحق دوسری عمارتوں وغیرہ کی تلاشی لیتے رہے۔ محل کا احاطہ بہت وسیع تھا۔ پولیس ہر جگہ گئی اور تلاشی لی لیکن حمید اللہ کہیں نظر نہ آیا۔ نواب خود بھی بھاگ دوڑ کرتا رہا۔ دن اسی میں گزر گیا۔ سب انسپکٹر صوفی کو یقین ہو گیا کہ حمید اللہ یہاں نہیں ہے تو وہ اپنی گارد لے کر واپس چلا گیا۔

بیان دیتے دیتے نواب کے آنسو نکل آتے۔ وہ کہتا تھا کہ وہ خود حمید اللہ کو پکڑے گا۔ اُس نے پولیس کے جانے کے بعد اپنے طور پر تحقیقات کی تھی۔ گیٹ کے پہرداروں کو اور ہر اُس شخص کو جس کی ذمہ داری تھی کہ دیکھے کہ محل کے احاطے میں کوئی اجنبی آیا ہے، نواب نے بہت گالیاں دیں۔ دو کو پندرہ پندرہ کوڑوں کی سزا بھی دی۔

اُسے اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ ایک آدمی جس کے چہرے پر نہایت اچھی طرح تراشی ہوئی داڑھی تھی اور اُس نے عالموں والا چغہ پہن رکھا تھا اور سر پر رومال تھا جو اُس کے کندھے تک پھیلا ہوا تھا، اندر آیا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ وہ اُس طرف گیا تھا جدھر خواجہ صاحب رہتے ہیں۔ دو آدمیوں نے بتایا کہ اس حلیے

اور لباس کے ایک آدمی کو محل کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔

میں اپنی جو بھی کارروائی اور تفتیش کر رہا تھا یہ محض رسمی تھی۔ میرا ذہن شہناز میں اُلجھا ہُوا تھا۔ اُس نے میرے لئے مشکل پیدا کر دی تھی۔ مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ اب شہناز حمید اللہ سے محفوظ ہو گئی ہے۔ اگر شہناز نے ہی حمید اللہ خان کو چھپایا اور بھگایا تھا تو اس کا یہ مطلب تھا کہ حمید اللہ خان شہناز سے انتقام نہیں لے گا۔

نواب مجھے قتل کی دھمکی دے چکا تھا لیکن خود ہی نادم ہونے لگا۔ وہ مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُس دھمکی کا ذکر نہ کیا اور اُسے کہا کہ وہ اُن تمام آدمیوں کو اکٹھا کرنے کا انتظام کرے جنہوں نے اُس اجنبی کو اندر آتے دیکھا تھا۔ پھر اُسے کہا کہ میں اُس کی بیگم شہناز سے تفتیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُسے تاثر دیا جیسے میں شہناز کو اُس کی بیگم سمجھتا ہوں۔

"ضرور ضرور!" —— اُس نے کہا —— "میں تمہیں اُس کے کمرے میں بھیج دیتا ہوں۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہو گی۔"



میں جب شہناز کے کمرے میں داخل ہُوا تو دروازہ بند کر دیا۔ شہناز اس طرح مجھ پر جھپٹی جیسے چیل مرغی کے چُوزے پر جھپٹتی ہے۔ اُس نے بازوؤں میں جکڑ کر اتنی زور سے بھینچا کہ میرا سانس رُکنے لگا۔ اسی طرح مجھے پلنگ تک لے گئی اور مجھے پلنگ پر بٹھا دیا۔ میں اُس کی اس وارفتگی سے پریشان سا ہو گیا۔ دیکھا، وہ رو رہی تھی۔

میں نے کچھ جذباتی باتیں کر کے اپنے آپ کو اُس سے آزاد کیا۔

"شہناز!" —— میں نے کہا —— "تم نے میرے لئے بڑا ٹیڑھا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ حمید اللہ خان تم تک پہنچا کس طرح اور تم نے اُسے بھگایا کس طرح؟ مجھے اپنے افسروں کو جھوٹی رپورٹ دینی پڑے گی۔ میں کیسے مان لوں کہ وہ دن کے وقت بھیس بدل کر آیا اور کسی کو پتہ ہی نہ چلا کہ حمید اللہ آیا ہے یا یہ کہ اس حُلیئے کا آدمی اندر آکر کہاں کہاں گھومتا پھرتا رہا؟"

"میں نے تمہارے لئے مسئلہ بنایا ہے یا جو کچھ بھی کیا ہے" —— شہناز نے کہا —— "وہ میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔ ہر بات جس طرح ہوتی سُنا دیتی ہوں۔ اس پر پردہ ڈالنا تمہارا کام ہے اور مجھے حمید اللہ خان تک پہنچانا بھی تمہارا کام ہے۔ میں نے اُس کے پاس جانا ہے۔"

"میں تمہیں یہاں سے کیسے نکال سکتا ہوں؟"

"یہ بعد میں سوچ لینا" —— شہناز نے کہا —— "پہلے اپنے دوسرے سوالوں کے جواب سُن لو۔"

آج اُس وقت کو جو برسوں پیچھے رہ گیا ہے اور اُس وقت کے واقعات کو یاد کرتا ہوں تو وہ الف لیلہ کی کہانیاں لگتی ہیں۔ میری کہانیاں پڑھنے اور سُننے والے بھی انہیں داستانِ طلسم ہوشربا سمجھیں گے لیکن جن لوگوں نے پیشہ ور ڈاکوؤں، رہزنوں، بردہ فروشوں اور دیگر جرائم پیشہ لوگوں کی زمین دوز دنیا دیکھی ہے، اور جنہوں نے نوابوں اور مہاراجوں کے محلّات کے اندر کچھ وقت گزارا ہے اور جو کسی وقت پولیس کی سپیشل برانچ میں رہے ہیں، اُن کے لئے یہ واقعات حیران کُن نہیں۔ یہ وہ حقیقتیں ہیں جو افسانوں سے زیادہ دلچسپ ہُوا کرتی ہیں۔ جب پولیس جُرم و گناہ کی اس دُنیا میں پکڑ دھکڑ کے لئے داخل ہو جاتی ہے تو یہ کہانیاں پُراسرار اور سنسنی خیز ہو جاتی ہیں۔

میں تو جُرم و گناہ کی اِن داستانوں کا ایسا کردار بن گیا تھا جس کے دوغلے پن نے اِن کہانیوں میں کوئی اور ہی رنگ بھر دیا تھا۔ میں انگریزوں کا وفادار ملازم تھا لیکن میں شہناز اور خواجہ صاحب سے بھی بے وفائی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے اِس روّیے نے ان کہانیوں کو اور زیادہ گمبھیر اور دلچسپ بنا دیا تھا۔

شہناز نے میرے دوسرے سوالوں کے جواب میں ایک ایسا واقعہ سُنا دیا جسے جذبات اور دلوں میں اُتری ہوتی محبت نے جنم دیا تھا۔ شہناز صبح بہت دیر سے جاگی تھی۔ نوابوں اور مہاراجوں کے محلّات میں راتیں جاگتیں اور دن سویا کرتے تھے۔ شہناز رات دو بجے کے بعد سوتی تھی۔ اُس نے مہمانوں کو شراب

پلاتی بھی تھی اور پی بھی تھی، اور پینا پلانا وہاں ایسے تھا جیسے غریب لوگ دال روٹی کے ساتھ پانی زیادہ پیا کرتے ہیں کہ زیادہ تر پیٹ پانی سے بھر جاتے اور آٹے کی بچت ہو۔

شہناز قدِ آدم آیئنے کے سامنے بیٹھی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بڑی آہستہ کھلا۔ آیئنہ دروازے کے بالمقابل تھا۔ شہناز نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بجائے آیئنے میں دیکھا۔ ایک دراز قد آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے لمبا جُبّہ پہن رکھا تھا۔ سر پر سفید کپڑے کی کھڑی ٹوپی اور اس کے اوپر بڑا لمبا چوڑا رومال ڈالا ہوا۔ اُس کی تراشی ہوئی سیاہ داڑھی اور چہرے پر جوانی کی چمک دمک نے اُسے بارُعب بلکہ مقدس شخصیت بنا رکھا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

اگر یہ کوئی عام سا گھر ہوتا تو شہناز ڈر جاتی۔ یہ ایک نواب کا محل تھا جس میں کوئی ایسا ویسا آدمی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ جو اس طرح بے تکلفی سے اندر آ گیا تھا، نواب کا پیرو مُرشد یا کوئی عالم ہو سکتا تھا۔ اسے نواب نے ہی بھیجا ہوگا۔

"آیئے!" —— شہناز نے اُٹھ کر اور اُس کی طرف مڑ کر کہا —— "تشریف رکھیئے۔"

وہ کھڑا رہا اور شہناز کو گھورتا رہا۔ شہناز اپنی جگہ کھڑی رہی۔

"کیا آپ کو نواب صاحب نے بھیجا ہے؟" —— شہناز نے پوچھا۔

"میں خود آیا ہوں" —— اُس نے کہا —— "اور میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔"

اس آدمی نے داڑھی اُتار دی۔ سر سے ٹوپی اور رومال بھی اُتار پھینکے۔

"حمیداللہ خان!" —— شہناز نے حیرت سے دبی ہوئی آواز میں کہا —— "کیا تم نواب صاحب سے مل آئے ہو؟"

"اُسے بھی مل لُوں گا!" —— حمیداللہ نے کہا —— "تمہارے ساتھ حساب برابر کرنے آیا ہوں۔ تم نے مجھے پھانسی کے تختے پر پہنچا دیا تھا۔ میں مفرور قیدی ہوں۔"

"انتقام لینے آئے ہو؟" —— شہناز نے یکلخت دلیر ہوتے ہوئے کہا —— "مجھے مر جانے کا ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوگا۔ میں اس زندگی سے تنگ آگئی ہوں.... لے لو انتقام!"

اچانک باہر کسی کی آواز سنائی دی —— "نواب صاحب کو اطلاع دو پولیس آئی ہے۔"

اس کے فوراً بعد برآمدوں اور راہداریوں میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"وہ آیا ضرور ہے۔"

"ادھر دیکھو۔"

"نواب صاحب! حمیداللہ خان آیا ہے!"

"آیا ہے تو غائب کہاں ہو گیا ہے!"

"تلاشی لو.... کوئی جگہ چھوڑی نہیں۔"

ایک ہڑبونگ تھی جو باہر بپا ہو گئی تھی۔

"یہ پولیس ہے" —— حمیداللہ خان نے شہناز سے کہا —— "کسی نے تھانے میں مخبری کر دی ہے کہ میں یہاں آیا ہوں۔ اس بہروپ میں بھی مجھے کسی نے پہچان لیا ہے" —— اُس نے جُبّے کے اندر سے ریوالور نکال کر کہا —— "مقابلہ کروں گا۔ مارا جاؤں گا پکڑا نہیں جاؤں گا" —— وہ کھڑکی کی طرف گیا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

"ٹھہرو!" —— شہناز نے اُسے آگے بڑھ کر روکتے ہوئے کہا —— "میں تمہیں چھپا سکتی ہوں۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہیں کوئی نہیں پکڑ سکے گا۔ ادھر آؤ۔ پلنگ کے نیچے ہو جاؤ۔"

"شہناز!" —— حمیداللہ نے کہا —— "سوچ لو میرے ہاتھ میں ریوالور ہے اور اس میں چھ گولیاں ہیں۔ مجھے پکڑوانے کی کوشش کرو گی تو چھ انسان مارے جائیں گے جن میں ایک تم ہو گی۔"

"وقت ضائع نہ کرو" —— شہناز نے اُسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا اور

اُس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر پلنگ کی طرف دھکیلتے ہُوتے کہا ——"پلنگ کے نیچے ہو جاؤ۔"

حمیداللہ خان پلنگ کے نیچے چلا گیا۔ شہناز نے پلنگ پوش کھینچ کر اس طرف زیادہ لٹکا دیا۔ اُس کے دماغ نے فوراً سوچ لیا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ وہ کمرے سے نکلی۔ اُسے ایک ہیڈ کانسٹیبل جاتا نظر آیا۔ شہناز نے اُسے اپنے پاس بُلایا۔

"تمہارے ساتھ کوئی انسپکٹر ہو گا"——شہناز نے اُسے کہا ——"اُسے میرے پاس بھیجو۔ اس مفرور قیدی سے سب سے زیادہ خطرہ مجھے ہے"——اُسے محل کا ایک باڈی گارڈ نظر آگیا۔ اُسے بلا کر کہا ——"نواب صاحب کہاں ہیں۔ انہیں کہو میرے پاس کسی کو بھیجیں۔"

سب انسپکٹر عظمت اللہ بھی آگیا اور نواب بھی۔ شہناز نے نواب کو الگ کر کے کہا کہ حمیداللہ خان اُس پر انتقامی وار کر سکتا ہے اس لئے اُس کے کمرے کے آگے ایک دو سپاہی کھڑے کر دیئے جائیں۔

نواب خود گھبرایا ہُوا تھا۔ اُس نے سب انسپکٹر سے ایک کانسٹیبل لیا اور اپنے ایک رائفل بردار باڈی گارڈ کو بلایا۔ دونوں کو شہناز کے کمرے کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔ شہناز کمرے میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اُس نے حمیداللہ کو پلنگ کے نیچے سے نکالا اور پلنگ پہ بٹھا لیا۔

"کیا اب تمہیں مجھ پر اعتبار آگیا ہے؟"——شہناز نے اُس سے پوچھا اور کہنے لگی ——"لیکن ایک بات سن لو حمید! میں نے تمہیں اس ڈر سے یہاں نہیں چھپایا کہ تم مجھ سے انتقام لو گے۔ اگر تم انتقام کے ارادے سے آئے ہو تو یہ ارادہ پورا کر لو۔ میں جب تک زندہ ہوں تمہیں گرفتار نہیں ہونے دوں گی۔"

"اتنا احسان کیوں کیا ہے مجھ پر؟"——حمیداللہ نے پوچھا۔

"تم واحد آدمی ہو جس کی محبت میرے دل میں اُتری ہوئی ہے"——شہناز نے کہا ——"میں تمہیں کبھی بھی دل سے اُتار نہیں سکی۔"

"عجیب محبت ہے"——حمیداللہ خان نے کہا —— "مجھے جیل تک پہنچا

دیا اور کہتی ہو مجھے تم سے محبت ہے۔"

"میں سکندر کو مرتا نہیں دیکھ سکتی تھی"——شہناز نے کہا ——"اُسے بچا لے کے لئے میں نے تمہیں پھنسا دیا۔"

"پھر اُس سے محبت زیادہ ہوئی نا!"——حمیداللہ نے کہا۔

"اُس کی محبت کچھ اور ہے حمید!"——شہناز نے کہا ——"وہ تمہاری جگہ نہیں لے سکتا ....سکندر اور میں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں، ہماری مائیں مختلف ہیں۔ اُس وقت جب میں تمہارے پاس تھی اور سکندر ہمارے پاس آیا تھا، مجھے معلوم تھا کہ میں سکندر کے باپ کی بیٹی ہوں لیکن سکندر کو معلوم نہیں تھا۔ یہ ایسا تعلق ہے جسے میں ناپاک نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ میں سکندر کے ایسے قرض کی مقروض ہوں جو میں ہر روز ادا کرتی رہوں تو بھی ساری عمر ادا نہیں ہو سکے گا۔"

حمیداللہ نے شہناز کی یہ باتیں سُنیں تو وہ گہری سوچ میں کھو گیا۔

"شہناز!"——اُس نے کچھ دیر بعد سوچوں سے سر اُٹھایا اور کہا ——"میں انتقام لینے آیا تھا۔ میں نے تمہیں یہیں قتل نہیں کرنا تھا۔ اپنے ساتھ لے جانا تھا اور تمہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر کہیں دُور لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ آنا تھا، لیکن شہناز تمہیں دیکھ کر میرے ارادے اور میری قسمیں ٹُوٹ گئی ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو محبت کی زنجیروں سے ہمیشہ آزاد رکھا ہے۔ کھلونوں کے ساتھ محبت نہیں کی جاتی شہناز! میں کھیلنا، توڑنا اور پھینک کر دوسرا کھلونا لے آنا جانتا تھا لیکن تم میری زندگی میں آئیں تو میں تمہارے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا... نہیں شہناز! ایسی باتیں کرنے کا یہ وقت نہیں۔ تم غلط سمجھو گی۔ تم کہو گی کہ میں اس لئے محبت کی باتیں کر رہا ہوں کہ تم مجھے چھپائے رکھو اور یہاں سے نکلنے میں مدد دو۔"



حقیقت یہ تھی کہ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت تھی اور یہی وجہ تھی کہ حمیداللہ خان کے دل سے انتقام کا ارادہ نکل گیا اور شہناز نے حمیداللہ کو چھپائے رکھنے اور وہاں سے نکلنے میں مدد دینے کا پکا ارادہ کر لیا۔ وہ ایک

دوسرے میں اس قدر جذب ہو گئے کہ انہیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ موت کے مُنہ میں بیٹھے ہیں۔ اب تو شہناز بھی مجرم تھی۔ حمید اللہ جیسے مفرور مجرم کو پناہ دینا سنگین جُرم تھا۔ وہ دونوں موت کے پیٹ میں بیٹھے تھے۔

دروازے پر دستک نے انہیں بیدار کر دیا۔ پلک جھپکتے حمید اللہ پلنگ کے نیچے چلا گیا اور شہناز نے دروازہ کھول دیا۔ نواب آیا تھا۔

"کیا وہ گرفتار ہو گیا ہے؟" —— شہناز نے اپنے چہرے پر اور لب و لہجے میں خوف کا تاثر پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"نکل گیا ہے" —— نواب نے نوابی لہجے میں کہا —— "مت ڈرو۔ وہ تم تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے اب اُسے پکڑنے کا انتظام پہلے سے زیادہ سخت کر دیا ہے۔"

"وہ آخر آپ کا بیٹا ہے نواب صاحب!" —— شہناز نے کہا —— "میں نہیں چاہتی وہ پکڑا جائے۔"

"بیٹا!" —— نواب نے قہر آلود آواز میں کہا —— "اس بیٹے نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا" —— وہ باہر کو چل پڑا۔ دروازے میں رُک کر اُس نے کہا —— "ایسا کوئی خطرہ تو نہیں پھر بھی دروازہ اندر سے بند رکھنا۔"

نواب چلا گیا اور شہناز نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ نواب نے شہناز کے ساتھ عام سے لہجے میں بات کی تھی جیسے کوئی اپنے نوکر سے رسمی طور پر پوچھا کرتا ہے، کہو بھئی کیا حال ہے۔ شہناز اُس کی زرخرید داشتہ تھی۔ اُس کے حرم میں اور عورتیں بھی تھیں۔ شہناز چونکہ ابھی نئی تھی اور وہ دلکش ہونے کے علاوہ ذہین اور چالاک بھی تھی اس لئے ابھی نواب کی توجہ اُس پر لگی ہوتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ تین سال بعد شہناز کو حرم کے کباڑخانے میں پہنچ جانا تھا۔

نواب کے جانے کے بعد حمید اللہ پلنگ کے نیچے سے نکل آیا اور شہناز کو اپنے ساتھ لگا کر لمبے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"پولیس اتنی جلدی کیسے پہنچ گئی تھی؟" —— شہناز نے پوچھا —— "ادھر تم آئے اُدھر سے پولیس آگئی۔"

"پولیس اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتی تھی" —— حمید اللہ خان نے کہا —— "مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ میں خواجہ صاحب کے ہاں چلا گیا تھا۔ انہیں مجھ سے بہت پیار ہے۔ میں انہیں اپنا باپ اور اپنا مُرشد سمجھتا ہوں۔ وہ پیارے انسان ہیں۔"

"میں نے انہیں دیکھا ہے" —— شہناز نے کہا —— "ملاقات نہیں ہوئی۔ سُنا ہے بڑے زبردست موسیقار ہیں۔"

"وہ موسیقار سے بڑھ کر بہت کچھ ہیں" —— حمید اللہ نے کہا —— "میں اُن کے پاس جاتا ہوں تو ساری دنیا کو بھول جاتا ہوں۔ آج بھی ایسے ہی ہُوا۔ پتہ ہی نہ چلا کہ اُن کے پاس بیٹھے دو گھنٹوں سے زیادہ وقت ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں محل کے احاطے میں داخل ہُوا تو کسی نے مجھے پہچان لیا اور اُس نے تھانے تک اطلاع پہنچا دی۔ تمہارے کمرے تک پہنچتے اتنا وقت گزر چکا تھا کہ اتنے وقت میں پولیس پہنچ گئی ...... میں نے یہ معلوم کرنا ہے کہ مجھے پہچانا کس نے تھا۔"

"کیسے معلوم کرو گے؟"

"اس جگہ میرے بھی کچھ ہمدرد ہیں" —— حمید اللہ نے کہا —— "انہیں معلوم ہے کہ میں ابھی محل کے احاطے میں ہی ہوں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہو گا کہ میں کہاں ہوں۔ انہی میں سے ایک نے مجھے اطلاع دی تھی کہ تم یہاں ہو۔"

"اُسے کیسے پتہ چلا تھا کہ نواب صاحب کے پاس آنے سے پہلے میرا تمہارے ساتھ تعلق تھا؟" —— شہناز نے پوچھا۔

"تم جب میرے پاس تھیں تو وہ دو بار میرے پاس جاگیر پر آیا تھا" —— حمید اللہ نے کہا —— "اُس نے تمہیں دیکھا تھا اور اُس نے تمہاری خواہش بھی کی تھی۔ اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی اور تم میری صرف داشتہ ہی ہوتیں تو میں اُس کی خواہش پوری کر دیتا..... وہ ایک ہی شخص ہے جسے معلوم ہے کہ میرا ٹھکانہ کہاں ہے..... اور دیکھو شہناز! شام کے بعد اُسے یہاں بلانا۔"

"کیا پیغام بھیجوں گی؟"

"وہ اصطبل کا انچارج ہے" —— حمید اللہ نے کہا —— "پیغام یہ بھیجنا کہ کل تمہیں سواری کے لئے گھوڑا چاہیئے، کہنا کہ اس سلسلے میں تم اُسے بلا رہی ہو۔"

سورج غروب ہُوا تو شہناز نے اپنی خادمہ سے کہا کہ وہ اصطبل کے انچارج کو بلا لائے۔ کہنا کل صبح شریف سا گھوڑا چاہیئے۔

وہ تو جیسے انتظار میں بیٹھا تھا۔ فوراً آ گیا۔ شہناز کو اُس کے آنے کی اطلاع ملی تو اُسے اندر بلا لیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ حمید اللہ خان پلنگ کے نیچے سے باہر آ گیا۔

"آپ ابھی تک یہیں ہیں!"—— اصطبل کے انچارج نے کہا —— "میں آپ کے لئے پریشان ہو رہا تھا۔"

"باقی باتیں پھر ہوں گی"—— حمید اللہ نے کہا —— "مجھے کیسے نکالو گے آفتاب؟"

"آدھی رات کے وقت!"—— آفتاب نے کہا —— "پچھلی دیوار پھاندنی پڑے گی۔ میں موجود ہوں گا۔ میرے ساتھ ایک سائیس ہوگا۔ ہم آپ کو دیوار پار کرا دیں گے۔"

اُنہوں نے وقت اور طریقہ طے کر لیا اور آفتاب چلا گیا۔ شہناز کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ رات کو نواب اُسے بلا لے گا۔ وہ اُسی وقت نواب کے پاس اس حالت میں گئی کہ جھکی ہوئی تھی، دونوں ہاتھ پیٹ پر تھے اور کراہ رہی تھی۔ نواب اُسے اس حال میں دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ شاید یہ سمجھا ہوگا کہ اس کے پیٹ میں کسی نے خنجر گھونپ دیا ہے اور خنجر گھونپنے والا حمید اللہ خان ہوگا۔ نواب اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"کیا ہو گیا ہے؟"—— اُس نے شہناز سے گھبراتے ہوتے لہجے میں پوچھا۔

"معلوم نہیں نواب صاحب!"—— شہناز نے کراہتے ہُوتے کہا —— "شاید ناف ٹل گئی ہے۔ سر بھی دَرد سے پھٹ رہا ہے۔"

"تو یہاں کیا لینے آئی ہو؟"—— نواب نے غصیلے سے لہجے میں کہا —— "میں خود پریشان ہوں۔ کیا تمہارے پاس خادمہ نہیں؟ اُسے بھیجو کہ ڈاکٹر کو لے آئے.... اور آج رات آرام کرو۔"

شہناز یہی چاہتی تھی۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے ہُوتے واپس آ گئی اور خادمہ کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلا لیا۔ حمید اللہ پلنگ کے نیچے چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے شہناز کو دیکھا اور

خادمہ کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ ڈاکٹر نے اُسے کہا تھا کہ وہ مکمل آرام کرے۔

خادمہ دوائی لے آئی جو شہناز نے رکھ لی لیکن کھائی نہیں۔

آدھی رات کے لگ بھگ حمید اللہ خان شہناز کے کمرے سے نکلنے کی تیاری کرنے لگا۔

"میں تمہیں یہاں سے جلدی نکلوا لوں گا"—— حمید اللہ خان نے اُسے کہا۔

"میں انتظار کروں گی"—— شہناز نے کہا —— "میں تو ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہنا چاہتی"—— وہ چُپ ہو گئی اور اُس کا چہرہ اُتر گیا۔ بوجھل سی آواز میں بولی —— "حمید! میرا جسم جس کے ساتھ لگا ہے وہ زندہ نہیں رہا"—— اُس نے حمید اللہ خان کو گِن کر وہ آدمی بتاتے جن کے ساتھ وہ رہی اور وہ یکے بعد دیگرے مارے گئے —— "تم نے مجھے اپنے پاس رکھا تو دیکھ لو تم پر کیا گزر رہی ہے۔ میں ڈرتی ہوں۔ تمہارے پاس آ گئی تو معلوم نہیں تم پر اور کیا قہر ٹوٹے .... نواب صاحب ابھی بچے ہوتے ہیں۔"

"یہ تمہارا وہم ہے شہناز!"—— حمید اللہ نے کہا —— "اگر پھر بھی کبھی ایسے ہُوا تو میں تمہیں ایک بزرگ کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ آسیبی اثر سے نجات دلا دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تم پر آسیبی اثر ہو۔"

حمید اللہ خان کمرے سے نکل گیا۔ شہناز دیوار تک اُس کے ساتھ نہیں جا سکتی تھی۔ وہ باقی رات پریشان رہی۔ صبح اُس نے خادمہ کو اصطبل کے انچارج آفتاب کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ آج گھوڑا نہیں چاہیئے۔

خادمہ نے واپس آ کر شہناز کو آفتاب کا پیغام دیا۔

"آپ اپنے گھوڑے کے متعلق فکر نہ کریں۔ سب کام ٹھیک ہو گیا ہے۔"

شہناز کو تسلی ہو گئی کہ حمید اللہ خان چلا گیا ہے۔



"میں اب یہاں نہیں رہوں گی سکندر!"—— شہناز نے یہ سارا واقعہ مجھے سُنا کر کہا —— "میں حمید اللہ خان کے پاس چلی جاؤں گی۔ وہ کہہ گیا ہے کہ مجھے یہاں

سے نکال لے جاتے گا۔ جس طرح حمید اللہ نے کہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو محبت کی زنجیروں میں جکڑنا نہیں چاہتا تھا، ایسے ہی میں بھی کسی کی محبت میں گرفتار ہونے والی نہیں تھی لیکن حمید اللہ کی محبت چوری چھپے دل میں داخل ہو گئی۔"

"کیا آفتاب تمہیں حمید اللہ تک نہیں پہنچا سکتا؟"

"شاید نہیں" ——— شہناز نے جواب دیا ——— "اگر یہ ممکن ہوتا تو حمید اللہ یہی انتظام کر دیتا۔"

"آفتاب کے ساتھ دوسرا آدمی کون تھا جس نے حمید اللہ خان کو باہر نکالا تھا؟"

"میں اُسے نہیں جانتی" ——— شہناز نے جواب دیا اور میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی ——— "سکندر! تم انہیں گرفتار کر لو گے؟"

"نہیں شہناز!" ——— میں نے جواب دیا ——— "انہیں گرفتار کیا تو تمہاری گرفتاری لازمی ہو جائے گی جو میں نہیں کروں گا۔ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ یہ دونوں کچے نکلے تو تمہیں بھی مصیبت میں ڈال دیں گے۔"

"میں نہیں جانتی یہ کیسے ہیں" ——— شہناز نے کہا ——— "آفتاب کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔"

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں نے بڑی گہرائی تک تفتیش کی ہے، دو تین دن وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ شہناز سے میں نے کہا کہ میں اُسے ملتا رہوں گا۔ شہناز میرے معاملے میں بہت جذباتی تھی۔ میں جانے کے لئے اُٹھا تو وہ میرے ساتھ لپٹ گئی اور دیوانہ وار میرا سر چُومنے لگی۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے اور اُس کے بازو مجھے اپنے شکنجے میں جکڑتے جا رہے تھے۔ اُس نے مجھ پر بھی رقت طاری کر دی۔

میں وہاں سے بوجھل دل سے نکلا۔ نواب کا دربان باہر کھڑا تھا۔

"آپ کے انتظار میں کھڑا ہوں" ——— اُس نے کہا ——— "نواب صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔"

میں نواب کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ وہ بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

"تم نے وہاں بہت وقت لگایا ہے" ——— نواب نے کہا ——— "کچھ پتہ چلا؟ ... اب تو یہ پتہ چلانا ہے کہ وہ یہاں سے نکلا کیسے!"

"آپ کی بیگم صاحبہ سے میں نے بہت کچھ پوچھنا تھا" ——— میں نے کہا۔

"بیگم صاحبہ نہ کہو سکندر!" ——— نواب نے کہا ——— "اسے میری ملازمہ سمجھو۔ فرق یہ ہے کہ اس کا کام ملازموں جیسا نہیں۔ اس کا نام شہناز ہے۔ اسے شہناز ہی کہو.... میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ رات کو نکلا ہے۔ میں اپنے طور پر سراغرسانی کر رہا ہوں۔ میں نے دیکھنا یہ ہے کہ وہ رات تک کس کے پاس چھپا رہا .... میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔"

اُس کی بگھی باہر کھڑی تھی۔ اُس نے مجھے اس میں بٹھایا اور کوچوان کو بتایا کہ کہاں جانا ہے۔ اُس کے محل کے اردگرد وسیع و عریض جگہ تھی جیسے کھیت ہوتے ہیں لیکن یہ کھیت نہیں تھے لان تھے جن میں درخت تھے۔ ہر لان میں پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ ان کے درمیان سڑکیں تھیں۔ دوسری طرف آبادی تھی۔ یہ محل کے ملازموں کے مکان تھے۔ وہاں مزارعوں کے بیوی بچے بھی رہتے تھے۔ اس تمام علاقے کے اردگرد دیوار تھی جس کی بلندی دس فٹ ہو گی۔ اس دیوار کے ذریعے نواب نے اپنی دنیا الگ کر رکھی تھی۔

بگھی خوشنما لانوں کے درمیان جا رہی تھی۔ لان ختم ہو گئے تو خالی جگہ آ گئی۔ کہیں کہیں گھاس تھی اور زیادہ تر جگہ خالی تھی۔ نواب کے کہنے پر بگھی اُس طرف مُڑی۔ تھوڑی ہی دُور جا کر بگھی رک گئی۔ نواب نے مجھے اُتار لیا۔ دیوار یعنی فصیل سامنے نظر آ رہی تھی۔ نواب نے مجھے زمین پر کھُرے دکھائے جو دیوار کی طرف جا رہے تھے۔ یہ تین آدمیوں کے تھے۔ میں جانتا تھا یہ کون تھے جو اِدھر سے گزرے تھے۔

ان کھُروں کو دیکھتے ہوئے ہم دیوار تک چلے گئے۔ وہاں کھُرے رُک گئے اور ایک دوسرے کے اُوپر آ گئے تھے۔ دیوار کے اوپر تقریباً چھ فٹ بلندی پر رگڑ کے دو نشان تھے۔ یہ نشان نواب کو نظر نہیں آتے تھے۔ میرے لئے بالکل واضح تھا کہ حمید اللہ کو یہاں سے دیوار کے پار کیا گیا ہے لیکن میں نواب کو گمراہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ شہناز کے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔

"اُسے رات کو یہاں سے نکالا گیا ہے" ــــ نواب نے کہا ــــ "مجھے اطلاع ملی ہے کہ آدھی رات کو تین آدمی اِدھر جاتے دیکھے گئے تھے۔"

"ناممکن!" ــــ میں نے کہا ــــ "نواب صاحب! وہ دن بھر کہاں چھپا رہا؟ پولیس نے کوئی گھر اور کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں تلاشی نہ لی ہو۔ آپ کے اپنے آدمی پولیس کے ساتھ تھے۔ وہ کہیں نہ ملا۔ آدھی رات تک وہ کہاں رہا؟ میں نہیں مان سکتا کہ آپ کی ناک کے عین نیچے کسی نے ایسی جرأت کی ہوگی کہ اتنے خطرناک مفرور قیدی کو چھپائے رکھا۔"

"پھر یہ کس کے پاؤں کے نشان ہیں؟" ــــ نواب نے پوچھا۔

"کسی کے بھی ہو سکتے ہیں" ــــ میں نے کہا ــــ "ہم یہ کیوں فرض کرلیں کہ یہ حمیداللہ خان کے اور اُن آدمیوں کے ہیں جنہوں نے اُسے نکلنے میں مدد دی ہے؟ پولیس کے اتنے زبردست چھاپے کے بعد کوئی اتنی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ آدھی رات کو حمیداللہ خان کو دیوار کے اُوپر سے گزار دیتا" ــــ میں نے نواب کے قریب ہوکر رازدارانہ لہجے میں کہا ــــ "نواب صاحب! اگر وہ سارا دن یہاں چھپا رہا ہے اور اُسے آدھی رات کے وقت نکالا گیا ہے تو یہ انتظام آپ کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔"

نواب کے جسم کے ساتھ میں نے جیسے بجلی کی ننگی تار لگا دی ہو۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے اگر میں پولیس کا افسر نہ ہوتا تو وہ اُسی وقت مجھے قتل کرا دیتا۔

"کیا تم اپنے افسروں کو یہ رپورٹ دو گے؟" ــــ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"نہیں!" ــــ میں نے کہا ــــ "نہ اتنا غصے میں آئیں نہ اتنا گھبرائیں۔ مجھے دو تین دن اور تفتیش کرنے دیں۔ میں آپ پر کوئی الزام نہیں آنے دوں گا۔ میں آپ سے صرف یہ کہوں گا کہ اُسے اگر آپ نے چھپا کر رات کو یہاں سے نکالا ہے تو مجھے بتا دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا۔"

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں!" ــــ نواب نے جھنجھلا کر کہا ــــ "میں تو اُسے اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں گا" ــــ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ــــ "تم میرے بیٹے ہو۔ میں نے پہلے بھی تمہیں کہا تھا کہ یہاں سے خالی ہاتھ نہ جانا لیکن تم خالی ہاتھ چلے گئے۔"

"نہیں نواب صاحب!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں آپ کے لئے جو کچھ کروں گا وہ انعام یا اُجرت کے بغیر کروں گا .... البتہ آپ کو محتاط رہنا چاہئے۔ اپنے اس علاقے کے حفاظتی انتظامات مزید سخت کریں۔"

"میں نے حمیداللہ کے کسی حمایتی کو پکڑ لیا تو اُسے زمین کے تختے سے اُٹھا دوں گا" ــــ نواب نے کہا۔

میری دلچسپی صرف یہ تھی کہ شہناز نہ پکڑی جائے، اور میری دلچسپی یہ بھی تھی کہ میں خود نہ پکڑا جاؤں کہ میں نے تفتیش میں بددیانتی کی ہے۔ میرے دماغ اور اعصاب پر بہت بوجھ پڑ گیا تھا۔ نواب کے ساتھ باتیں کرتے مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کہوں اور کیا کہہ رہا ہوں۔ کبھی تو ذہن خالی ہو جاتا کبھی خیالوں کا ہجوم آ جاتا۔

میں نواب کو وہاں سے واپس لے آیا۔ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ نواب کو میں نے کیا تاثر دیا ہے۔



رات کو نواب نے مجھے شہزادوں کی شان سے ایک کمرے میں رکھا۔ شہناز تھوڑی دیر کے لئے آئی۔ اُسے نواب نے میری دیکھ بھال کے لئے بھیجا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ حمیداللہ خان کو جس جگہ سے دیوار پار کرائی گئی تھی وہ جگہ نواب نے دیکھ لی ہے۔ شہناز پریشان نہ ہوئی لیکن مجھے کچھ پریشانی تھی۔

صبح ہوتے ہی میں خواجہ صاحب کے ہاں چلا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ حمیداللہ اُن کے پاس آیا تھا اور دو اڑھائی گھنٹے اُن کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ میں نے خواجہ صاحب کو بتایا کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔

"شہناز میں اتنی زیادہ دلچسپی لینا چھوڑ دو سکندر!" ــــ خواجہ صاحب نے

کہا ——"وہ کسی اور ہی دنیا کی عورت ہے۔ وہ حمید اللہ خان جیسے آدمیوں کے لئے پیدا ہوتی ہے۔ اگر تمہارے باپ کے گناہ کی پیداوار ہے تو اسے بہن کا درجہ نہ دو۔"

"خواجہ صاحب!" —— میں نے کہا —— "مجھے حمید اللہ کے متعلق کچھ بتائیں۔ کیا وہ شہناز سے انتقام لینے آیا تھا؟"

"یہاں اُس کے دوست موجود ہیں اور جاسوس بھی" —— خواجہ صاحب نے کہا —— "ان میں سے کسی نے اُسے خبر دی تھی کہ شہناز نواب کے پاس ہے۔ حمید اللہ خان اسی کے لئے آیا تھا لیکن اُس نے فیصلہ نہیں کیا تھا کہ اُسے یہیں ختم کر جائے گا یا اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اُس نے مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ نواب کے پاس جائے گا اور اُسے کہے گا کہ یہ عورت اُس کے حوالے کر دے۔"

"اُس نے ایسا نہیں کیا" —— میں نے کہا —— "یہی اُس سے غلطی ہوئی۔ وہ نواب کو قتل کی دھمکی دے کر کہتا کہ شہناز کو اُس کے حوالے کر دے تو نواب اُس کے حکم کی فوراً تعمیل کرتا۔ شہناز اُس کی بیوی تو نہیں۔"

خواجہ صاحب کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں۔ وہ حمید اللہ کے معاملے میں جذباتی ہوتے جا رہے تھے اور مجھے کہتے تھے کہ میں حمید اللہ کے متعلق غلط رپورٹ دوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ شہناز اور حمید اللہ خان کے درمیان کیا باتیں ہوتی تھیں اور شہناز نے اُسے کس طرح چھپائے رکھا تھا۔

"شہناز حمید اللہ خان کے پاس جانے کو بیتاب ہے" —— میں نے کہا —— "اگر وہ چلی جاتے تو اچھا ہے ورنہ حمید اللہ پھر کبھی اُس کی خاطر یہاں آجائے گا اور پکڑا جائے گا۔ اُس کا اپنا باپ اُسے پکڑا دے گا ..... کیا آپ کو معلوم ہے حمید اللہ رہتا کہاں ہے؟"

"معلوم ہے" —— خواجہ صاحب نے کہا —— "لیکن ابھی تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ میں شہناز سے ملنے کا موقع پیدا کروں گا اور اگر اُس نے چاہا تو میں اسے یہاں سے نکلوا کر حمید اللہ خان تک پہنچا دوں گا۔"

حمید اللہ کے متعلق خواجہ صاحب نے وہی باتیں شروع کر دیں جو وہ پچھلی ملاقات میں کر چکے تھے۔ اُن کے پاس بیٹھ کر مجھے روحانی سکون محسوس ہو رہا تھا۔ میں آدھا دن وہیں بیٹھا رہا اور دوپہر کا کھانا کھا کر وہاں سے نکلا۔



میں نے ابھی اپنے جاسوسوں سے ملاقات نہیں کی تھی جو نواب کے اپنے آدمی تھے۔ میں تھانے بھی گیا اور میں نے محل کے احاطے میں کام کرنے والے کئی آدمیوں سے پوچھ گچھ کی۔ میں دراصل وقت گزار رہا تھا۔ تھانے میں جا کر انسپکٹر ولکاکس کو ٹیلیفون پر اپنی کارگزاری سناتی۔

تین دن گزر گئے۔

میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگلے روز اپنے جاسوسوں کے ساتھ بات کر کے چلا جاؤں گا۔

اگلے روز میں گیٹ پر چلا گیا۔ وہاں جو آدمی ڈیوٹی پر تھے انہیں ایک ایک کر کے اپنے پاس بٹھایا اور پوچھ گچھ کرنے لگا۔ آخر میں اُس آدمی کو بلایا جو گیٹ کی ڈیوٹی پر رہتا تھا اور ہمارا جاسوس تھا۔ اُسی نے حمید اللہ خان کو اندر آتے دیکھا اور اُسے پہچان لیا تھا اور اُسی نے تھانے اطلاع دی تھی۔ اُس نے حمید اللہ کو گیٹ سے واپس جاتے نہیں دیکھا تھا۔

"میں آپ کو ایک اور رپورٹ دینا چاہتا تھا" —— اُس نے کہا —— "معلوم نہیں یہ آپ کے لئے اہم ہو سکتی ہے یا نہیں .... کل رات، یعنی یہ رات نہیں جو گزر گئی ہے اس سے پہلی رات نواب کے چار باڈی گارڈ دو آدمیوں اور ایک عورت کو گیٹ سے باہر لے جا رہے تھے۔ ان تینوں پر کمبل اس طرح ڈالے ہوئے تھے کہ وہ سر سے پاؤں تک ڈھانپے ہوئے تھے۔"

"وقت کیا تھا؟" —— میں نے پوچھا۔

"رات کے بارہ بج چکے تھے" —— اُس نے جواب دیا۔

"کیا اُن کے ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے تھے؟"

"کمبلوں میں اُن کے ہاتھ نظر نہیں آتے تھے" —— اُس نے جواب دیا

— "پھر بھی صاف پتہ چلتا تھا کہ اُن کے ہاتھ آزاد نہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہاتھ آگے کو بندھے ہُوتے تھے یا پیچھے۔"

"ان میں سے کسی کو تم نے پہچانا نہیں؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "اُن کے چہرے کمبلوں کے گھونگھٹ میں تھے .... میں جسے عورت کہہ رہا ہوں، ہوسکتا ہے وہ بھی آدمی ہی ہو لیکن مجھے اُس کی چال اور اُس کے سینڈل سے خیال آیا تھا کہ یہ عورت ہے۔"

"باڈی گارڈ واپس آگئے ہوں گے!"

"باڈی گارڈ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آتے تھے" — اُس نے جواب دیا — "اُن کے ساتھ کمبلوں میں لپٹے ہوتے آدمی نہیں تھے، عورت بھی ساتھ نہیں تھی .... دیکھ لیں، یہ رپورٹ آپ کے کسی کام آسکتی ہے یا نہیں۔"

میں نے اُسے فارغ کر دیا اور وہاں سے آگیا۔ میرا ذہن دُور پیچھے چلا گیا اور مجھے ایک رات یاد آگئی۔ میں اُس وقت نوجوان تھا اور اسی محل میں رقاص تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ مجھے اور گلشن آرا کو اسی طرح چار باڈی گارڈ ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھے اور ہمارے اوپر کمبل ڈالے گیٹ میں سے نکال کر لے گئے تھے۔ وہ ہماری زندگی کا گیٹ تھا جس میں سے ہمیں نکال کر لے جا رہے تھے۔

اپنے جاسوس کی یہ رپورٹ سُن کر مجھے خیال آیا کہ نواب کے حرم کی کوئی اور عورت اپنے آشنا کے ساتھ پکڑی گئی ہے۔ دوسرا آدمی جسے ان کے ساتھ لے جایا جا رہا تھا، ان کی ملاقاتیں کراتا ہوگا۔

مجھے نواب پر غصّہ آگیا۔ وہ اُتنا زیادہ بوڑھا ہوگیا تھا کہ تیز چلنے کے قابل نہیں رہا تھا پھر بھی جوان عورتوں سے اُس کا دل نہیں بھرا تھا۔ حرم میں تازہ اضافہ شہناز تھی۔ یہ عورتیں آشنائی پر مجبور تھیں۔ نواب کے بڑھاپے اور اُس کی قید سے فرار کا یہی ایک ذریعہ تھا کہ چوری چھپے اپنی دل لگی کا بندوبست کر لیتی تھیں۔

نفرت اور غصّے کا ایک طوفان تھا جو دل سے اُٹھا۔ میں نے ارادہ کر لیا

کہ نواب کو اس الزام میں پھانسوں گا کہ حمید اللہ خان کو اسی نے پولیس کے چھاپے سے بچایا اور رات کو بھگا دیا تھا۔

اچانک یہ خیال آیا کہ ایسا ہی تو نہیں ہوگیا کہ نواب کو پتہ چل گیا ہو کہ حمید اللہ کو آفتاب اور اُس کے ایک ساتھی نے یہاں سے نکالا ہے؛ میرا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا — "کہیں ایسا تو نہیں کہ جس عورت کو لے جا رہے تھے وہ شہناز تھی؟"

ان تینوں کو موت کے قید خانے میں بند کر آئے ہوں گے جہاں انہیں بھوکا اور پیاسا مرنا تھا۔ مجھے اور گلشن آرا کو خواجہ صاحب کے کہنے پر تاجا ڈاکو نکال کر لے گیا تھا، شہناز اور اُس کے دو ساتھیوں کو کس نے وہاں سے نکالنا تھا۔

میں نے حساب لگایا۔ ان تینوں کو قید میں چھتیس گھنٹے گزر گئے تھے شہناز بھوک اور پیاس سے اور موت کے خوف سے بیہوش ہو چکی ہوگی۔ میں دعائیں کرنے لگا کہ جس عورت کو موت کے قید خانے میں لے گئے ہیں وہ شہناز نہ ہو۔



میں سیدھا نواب کے پاس جا کر اُس سے پوچھ سکتا تھا کہ کل رات اُس نے کن دو آدمیوں اور ایک عورت کو موت کے قید خانے میں بھیجا ہے لیکن میں نے اپنے طور پر معلوم کرنا زیادہ بہتر سمجھا۔ اگر وہ تینوں کوئی اور تھے اور اُن کا تعلق حمید اللہ کے فرار کے ساتھ نہیں تھا تو میں نے اس چکر میں نہیں پڑنا تھا۔

نواب نے مجھے ایک ملازم دے رکھا تھا۔ میں نے جس کسی کو اپنے کمرے میں بلانا ہوتا تھا اُسے میں اس ملازم کو بھیج کر بلا لیتا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر ملازم سے کہا کہ وہ اصطبل کے انچارج آفتاب کو بلا لائے۔

ملازم گیا اور یہ اطلاع لے کر واپس آگیا کہ آفتاب پرسوں شام سے غیر حاضر ہے۔

مجھے اُس کے دوسرے ساتھی کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ شہناز کو میں اپنے کمرے میں نہیں بلا سکتا تھا۔ اس کے لئے نواب کی اجازت کی ضرورت تھی۔ میں نواب کے دروازے پر جا کھڑا ہُوا۔ دربان سے کہا کہ نواب صاحب کو اطلاع دے کہ سب انسپکٹر سکندر آیا ہے۔

مجھے نواب نے فوراً بلا لیا۔

"آؤ بیٹھو سکندر!" — نواب نے کہا — "تفتیش ابھی مکمل نہیں ہُوئی؟ .... ختم کرو بیٹے! اب حمید اللہ یہاں آیا تو نکل کر نہیں جاتے گا۔"

"شہناز سے صرف ایک بات پوچھنی رہ گئی ہے" — میں نے کہا — "میں آپ سے اجازت لینے آیا ہوں کہ شہناز کے کمرے میں چلا جاؤں۔"

میں نے دیکھا، نواب کے چہرے پر اضطراب اور پریشانی کے آثار نمودار ہُوئے۔

"میں زیادہ وقت نہیں لگاؤں گا" — میں نے کہا — "میں اُس کے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔"

"وہ شاید کہیں باہر نکل گئی ہے" — اُس نے کہا — "میں پہلے معلوم کر لوں کہ وہ گئی کہاں ہے۔"

"نواب صاحب!" — میں نے کہا — "وہ زر خرید داشتہ آپ کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جا سکتی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اُس سے نہ ملوں تو بتا دیں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ آپ پر حرف نہیں آنے دوں گا۔ مجھے بتا دیں آپ کے دل میں کیا ہے۔"

"میں بتانا نہیں چاہتا تھا" — اُس نے کہا — "لیکن سن لو سکندر! وہ لاپتہ ہو گئی ہے۔"

"اغوا ہوئی ہے؟"

"یہاں سے اُسے اغوا کرنے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟" — نواب نے کہا — "خود ہی کہیں لاپتہ ہو گئی ہے۔"

"اور آفتاب بھی لاپتہ ہو گیا ہے؟" — میں نے نواب سے پوچھا۔

"آفتاب کون؟" — نواب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آپ کے اصطبل کا انچارج!" — میں نے کہا۔

"وہ میرا معمولی سا ملازم ہے" — نواب نے غصیلی آواز میں کہا — "میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ میرے ملازموں کی فوج میں کون کہاں ہے؟ .... وہ کہیں باہر چلا گیا ہوگا۔"

"اُسے بلوا دیں" — میں نے کہا — "میں اُس سے آپ کی موجودگی میں دو تین باتیں پوچھوں گا۔"

"تم خود تفتیش کرتے پھر رہے ہو" — اُس نے کہا — "اس آدمی کو جس کا نام آفتاب ہے یہاں کیوں بلاتے ہو؟"

"کیا آپ تفتیش میں میرے ساتھ تعاون نہیں کریں گے؟" — میں نے پوچھا۔

"اور کتنا کچھ تعاون کروں؟" — نواب نے کہا — "کیا میں نے کوتاہی کی ہے؟"

"نواب صاحب!" — میں نے آہستہ سے کہا — "آفتاب اور شہناز جہاں ہیں میں اُس جگہ سے واقف ہوں۔ میں خود اُس جگہ رہ چکا ہوں۔ اپنی ایک بیگم گلشن آراء کو آپ بھولے تو نہیں ہوں گے۔ جس آدمی کو آپ نے اُس کے ساتھ اپنے اُس بھیانک قید خانے میں بند کر دیا تھا وہ میں تھا۔"

"وہ تم تھے؟"

"ہاں نواب صاحب!" — میں نے کہا — "وہ میں تھا .... اور میں گلشن آراء کو ساتھ لے کر نکل گیا تھا۔"

"تم کس طرح فرار ہُوئے تھے؟" — میں نے پوچھا۔

"کیا کریں گے آپ پوچھ کر؟" — میں نے کہا — "میں کہہ رہا ہوں کہ شہناز اور آفتاب مجھے وہیں ملیں گے۔ مجھے اُن کی ضرورت ہے۔"

"سکندر!" — نواب نے کہا — "ان کا حمید اللہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مجھے پریشان نہ کرو اور اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ وہ دونوں جہاں

ہیں انہیں وہیں رہنے دو۔"

"وہ اُسی قید خانے میں ہیں نا!"

"وہاں نہیں ہیں" ___ اُس نے بلند آواز میں کہا ___ "وہ وہاں نہیں ہیں۔ تم ایک سب انسپکٹر اور وہ بھی ہندوستانی اپنے آپ کو انگریز افسر سمجھ رہے ہو" ___ وہ اور زیادہ غصیلی آواز میں بولا ___ "اپنی اوقات میں رہو۔ جاؤ، میرے خلاف جو رپورٹ دینی ہے دے دو۔ میں گورنر اور وائسرائے تک پہنچ سکتا ہوں۔ میں تمہیں معطل کرا سکتا ہوں۔"

میں نے اُس کے ساتھ بحث مناسب نہ سمجھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ نواب اس الزام سے بری تھا کہ اُس نے حمیداللہ کو چھپایا اور بھگایا ہے۔ میں نے یہ ظاہر نہ کیا کہ مجھے اُس کا غصہ بُرا لگا ہے۔ میں جانے کے لئے اُٹھا۔

"اتنے ناراض اور پریشان نہ ہوں نواب صاحب!" ___ میں نے کہا ___ "میری ہمدردی آپ کے لئے ہے، کسی انگریز افسر کے لئے نہیں۔ میں نے آپ کے خلاف رپورٹ نہیں لکھنی۔ میں نے شہادت لے لی ہے۔ آپ پر کوئی الزام نہیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ مجھے آپ سے کوئی لالچ نہیں نہ میں آپ سے کوئی مطالبہ کروں گا۔"

"تم مطالبہ کر سکتے ہو" ___ اُس نے کہا ___ "اور میں ہر مطالبہ پورا کروں گا لیکن مجھے...."

"پریشان نہ ہوں نواب صاحب!" ___ میں نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا ___ "میں آج جا رہا ہوں۔ آپ صرف یہ خیال رکھیں کہ حمیداللہ خان پھر کبھی آجائے تو اُسے پکڑوا دیں۔ وہ آپ کے لئے مستقل خطرہ بنا ہُوا ہے۔"

وہ کچھ کہنے لگا تھا۔ میں نے اُس سے ہاتھ ملایا اُس کا شکریہ ادا کیا، خداحافظ کہا اور اُسے یہ تاثر دے کر وہاں سے آگیا کہ میں جا رہا ہوں۔

میں تھانے گیا اور سب انسپکٹر صوفی عظمت اللہ سے کہا کہ ایک جگہ چھاپہ مارنے کے لئے آٹھ کانسٹیبل، ایک اے۔ ایس۔ آئی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل

کو تیار کرے۔ وہیں سے میں نے کال بُک کرا کے اپنے ہیڈ کوارٹر کو فون کیا اور انسپکٹر ولکاکس کو مختصر رپورٹ دی۔ میں نے کامیابی سے اپنی رپورٹ میں جھوٹ کی آمیزش کی اور کچھ ایسا اشارہ دیا کہ حمیداللہ اپنے باپ کے پاس آیا تھا لیکن پولیس پہنچ گئی اور اُسے نواب نے کہیں چھپا دیا اور پھر اُسے نکال دیا۔

"صاحب بہادر!" ___ میں نے کہا ___ "آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ کو اپنی گزری ہوئی زندگی کی کہانی سنائی تھی۔ میں نے بتایا تھا کہ اس نواب نے مجھے اور اپنی ایک جوان بیگم کو اپنے بنائے ہوئے قید خانے میں بند کر دیا تھا۔ وہاں ہمیں مرنا تھا۔ نواب نے ایک عورت اور دو آدمیوں کو پرسوں اسی قید خانے میں بھیجا ہے۔ یہ کل رات کا واقعہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے حمیداللہ کے خلاف مخبری کی ہوگی .... صاحب بہادر! ان تینوں کو بچانا بہت ضروری ہے۔ ان سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" ___ انسپکٹر ولکاکس نے پوچھا ___ "کیا بہتر سمجھتے ہو؟"

"میں اُس خفیہ قید خانے پر چھاپہ مارنا چاہتا ہوں" ___ میں نے جواب دیا ___ "مجھے اجازت دیں کہ میں جس طرح بہتر سمجھوں چھاپہ ماروں اور سب انسپکٹر صوفی عظمت اللہ سے نفری لے لوں۔"

اُس نے مجھے اجازت دے دی اور یہ بھی کہا کہ مجھے کسی اور مدد کی ضرورت ہو تو میں فوراً فون کروں۔ میں نے اپنی گزری ہُوئی زندگی کی کہانی چار انگریز افسروں کو سنائی تھی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب مجھے پولیس میں بھرتی کیا گیا تھا۔ ان میں دو ایس۔ پی، ایک ڈی۔ ایس۔ پی اور ایک انسپکٹر ولکاکس تھا۔ میں نے نواب کے اس قید خانے کا ذکر اس امید سے پوری تفصیل سے کیا تھا کہ یہ چونک اُٹھیں گے اور اُسی وقت وہاں چھاپہ مارنے کا حکم دیں گے اور نواب کو قتل کے جرم میں گرفتار کر لیں گے لیکن انہوں نے پرواہ ہی نہ کی۔

ایس۔ پی میڈوز جو دہشت گردوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا، اس قید خانے کا ذکر سن کر ہنس پڑا تھا۔

"ہندوستانیوں کا دماغ درست کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا" —— ایس پی میٹ ورن نے کہا تھا —— "یہ نواب اور مہاراجے بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔"

اُس ڈی۔ ایس۔ پی نے بھی جس نے مجھے تاجے ڈاکو کے گھر سے پکڑا اور پولیس میں بھرتی کرا دیا تھا، اس قید خانے کے متعلق رائے دی تھی۔

"یہ نواب کا ریاستی معاملہ ہے" —— اُس نے کہا تھا —— "راجے، مہاراجے اور نواب تاجِ برطانیہ کے وفادار ہیں۔ ہم اُن کی وفاداری اور خدمات کو نہیں بھول سکتے .... تم ابھی بچے ہو۔ ان معاملوں کو تم ابھی نہیں سمجھ سکتے۔"

میں واقعی ان معاملوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن میں سمجھنا ضرور چاہتا تھا۔ ایک انسان جو خود انگریزوں کی رعایا میں سے تھا، انسانوں کا قاتل بنا ہُوا تھا اور اُس سے باز پُرس کرنے والا کوئی نہ تھا۔ میں جب ٹریننگ کے بعد سپیشل برانچ میں آیا تو انسپکٹر ولکاکس کے ساتھ کچھ بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ کسی ہندوستانی ماتحت کے ساتھ انگریز افسر کی بے تکلفی اتنی سی ہی ہوتی تھی کہ کام سے ہٹ کر صاحب بہادر کوئی بات سن لیا کرتا تھا ورنہ انگریز افسر اپنے برابر کے عہدے کے ہندوستانی افسر کو اپنا چپڑاسی سمجھا کرتا تھا۔

میں نے جب ایک دو کارنامے دکھائے تو انسپکٹر ولکاکس نے مجھے اور سلطان احمد کو اس قابل سمجھا کہ کبھی کبھی ہمارے ساتھ گپ شپ لگا لیا کرتا تھا۔ ایک روز اُسے خوش گپیوں کے مُوڈ میں دیکھ کر میں نے نواب کے قید خانے کا ذکر کیا اور پوچھا کہ وہ کون سے قانون کے تحت جسے چاہتا ہے اس قید خانے میں پھنکوا دیتا ہے۔

"میں نے وہاں کتنی کھوپڑیاں اور ہڈیاں دیکھی تھیں" —— میں نے کہا تھا —— "دیواروں پر گدھ بیٹھے رہتے تھے۔ آپ کی حکومت کا انصاف بہت مشہور ہے مگر میں اسے انصاف نہیں سمجھتا کہ ایک آدمی جس کی چاہے جان لے لے۔"

"صرف یہ نواب ہی نہیں، تم کسی بھی نواب، راجے یا مہاراجے کے ہاں

چلے جاؤ وہاں انسانوں کو قتل ہوتا دیکھو گے" —— ولکاکس نے کہا —— "ہر ایک کے طریقے مختلف ہیں۔ ان میں سے بعض نے اسی نواب جیسے قید خانے بنائے ہُوتے ہیں۔ دوسروں کا طریقہ یہ ہے کہ جسے مروانا ہوتا ہے اُسے اپنے آدمیوں کے ہاتھوں مروا دیتے ہیں۔ ان سب کی ایذا رسانی مشہور ہے۔ کسی کو بے روزگار کر کے اُسے بھکاری بنا دینا ان کے لئے معمولی سزا ہے۔"

"کیا حکومتِ برطانیہ نے انہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے؟" —— میں نے پوچھا تھا۔

"بعض قانون تحریر میں نہیں لائے جاتے" —— ولکاکس نے کہا تھا —— "ہم نے ہندوستان کے بہت سے علاقوں کو ریاستوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور ان مہاراجوں اور نوابوں کو ان کا حکمران بنا دیا ہے۔ یہ مہاراجے اور نواب برطانیہ کی شہنشاہی کے ستون ہیں۔ یہ اپنی رعایا کے پیٹ کاٹتے ہیں اور برطانیہ کا خزانہ بھرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خزانے بھی بھرنے ہوتے ہیں اس لئے یہ فرعون بنے رہتے ہیں۔ ہم نے اپنی عمارت کو مضبوطی سے کھڑا رکھنا ہے۔ ہم ان میں سے کسی ایک ستون کو بھی نہیں گرا سکتے۔ ہم ان کی خدمات دیکھتے ہیں۔"

وہ مجھے اور سلطان احمد کو یہ فلسفہ اس طرح سمجھا رہا تھا جیسے ہم بالکل جاہل اور گنوار تھے اور وہ ایسی بات کر رہا تھا جو آسمان سے اُتری تھی۔ اُس وقت تک میں نے ہندوستانی ریاستوں اور انگریزوں کی بادشاہی پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ ایک انگریز نے جب یہ باتیں کیں تو میں نے اپنے وجود میں لرزہ سا محسوس کیا۔ زیادہ گہرائی میں تو میں پھر بھی نہ جا سکا لیکن یہ احساس ضرور پیدا ہُوا کہ انسان پر انسان کا اتنا ظلم درندگی اور وحشی پن ہے۔

"اگر کسی وقت کسی نواب یا مہاراجے کا اس قسم کا قید خانہ پکڑا گیا تو اُسے فوراً گرفتار نہیں کر لیا جائے گا بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اتنے انسانوں کو قتل کر کے اس ریاستی حکمران نے شہنشاہِ برطانیہ کو کتنا فائدہ پہنچایا ہے اور اُس نے ہندوستان میں ہماری حکومت کو کتنا مضبوط کیا ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو" —— ولکاکس نے کہا —— "تم نے صرف اس نواب کو دیکھا ہے۔ یہ تو معمولی سا نواب ہے۔ اُس کی

ریاست اتنی چھوٹی ہے کہ اسے ہم ریاست سمجھتے ہی نہیں۔ بڑے نوابوں اور مہاراجوں کی ریاستوں میں جاکر دیکھو..... یہ تو بہت بڑے ہیں، جاگیرداروں کو دیکھ لو۔ انہیں شہنشاہِ برطانیہ کی وفاداری کے صلے میں جاگیریں دی گئی ہیں"—— وہ مسکرایا اور کہنے لگا —— "ہندوستان کے سیاسی لیڈر انہیں اپنے ملک کے غدّار کہتے ہیں۔ ہم انہیں اپنے ملک اور اپنے لوگوں سے غدّاری کا انعام دیتے ہیں۔ یہ جاگیردار بھی اپنے اپنے علاقے میں فرعون بن جاتے ہیں۔ ان کے بغیر کوئی حکومت نہیں چل سکتی۔ روپیہ پیسہ ان کے پاس ہوتا ہے۔ لوگوں پر ان کا اثر اور رعب ہوتا ہے۔ ہمیں روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے تو ان سے لے لیتے ہیں۔ فوج میں بھرتی کی ضرورت ہوتی ہے تو بھرتی ان سے لے لیتے ہیں"۔

انسپکٹر وِلکاکس نے تو ہمیں بڑا لمبا لیکچر دے ڈالا تھا جس نے میرے خیالوں میں ہلچل مچادی تھی لیکن انگریزوں کی نوکری نے اس ہلچل پر قابو پالیا تھا۔ آج جب وہ وقت اتنی دُور چلا گیا ہے کہ اُس تک میری آواز نہیں پہنچ سکتی، مجھے ایک انگریز کی باتیں یاد آرہی ہیں۔ اُس نے کہا تھا کہ نوابوں اور جاگیرداروں کے بغیر کوئی حکومت چل نہیں سکتی۔ میں آج اپنے ملک میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے نظامِ حکومت کی بنیادوں میں انگریزوں کی شہنشاہی کا فلسفہ رچا ہُوا ہے۔ پاکستان جاگیرداروں اور وڈیروں کے قبضے میں ہے۔ وہ اسمبلیوں میں ہوں یا اپنے گھروں میں بیٹھے ہُوتے ہوں، حکومت انہی کی ہوتی ہے اور قانون انہی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

میں عینی شاہد ہوں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ انگریزی راج میں انصاف تھا۔ انگریزی قانون کسی مجرم کو نہیں بخشتا تھا لیکن اس راج میں بھی مہاراجے، نواب اور جاگیردار موجود تھے جو قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے۔

انصاف صرف اسلام میں تھا جس کی نگاہ میں محتاج و غنی ایک تھے۔ قانون خلیفہ کے لئے بھی، امراء کے لئے بھی اور ایک ادنیٰ فرد کے لئے بھی ایک جیسا تھا لیکن آگے چل کر حکمرانی کے امیدواروں نے اسلامی قانون کو ہی نہیں اسلام کو ہی اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس میں سے انصاف کو نکال کر الگ

پھینک دیا۔

ہم نے انگریزوں سے لڑکر آزادی لی کہ ہم مسلمان ہیں، ہم دارالاسلام بنائیں گے مگر آزادی ملی اور اسلام کے نام پر حکومتوں کے بعد حکومتیں آنے لگیں تو پتہ چلا کہ انگریز اپنے نواب، نوابزادے، جاگیردار، سردار، خان اور ملک پیچھے چھوڑ گیا ہے جنہوں نے اپنے اپنے علاقوں کو اپنی اپنی ریاستیں بنا رکھا ہے اور وہاں جاکر قانون کھوکھلا ہوجاتا ہے۔

میں کہاں بہک گیا ہوں!

بوڑھا تو ہوگیا ہوں لیکن ایسا نہیں کہ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگوں اور زبان پر قابو ہی نہ رہے مگر آج بھٹک گیا ہوں۔ بات ہی کچھ ایسی چل نکلی ہے۔ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ آپ میرے پاس کہانی سُننے بیٹھے تھے۔ ہمہ تن گوش تھے اور میں نے آزادی اور غلامی کا انصاف اور بے انصافی کا اور اسلامی عدل کا فلسفہ چھیڑ دیا ہے جیسے میں کوئی عالم ہوں، زاہد اور پارسا ہوں۔

میں کچھ بھی نہیں۔

زاہد کی نظر مستقبل پر ہوتی ہے۔ وہ آگے دیکھتا ہے۔

گناہگار کی نظر ماضی پر ہوتی ہے۔ وہ پیچھے دیکھتا ہے۔

معلوم نہیں میں کیا ہوں۔ میں اپنے ماضی کا مستقبل ہوں۔ میں نے مستقبل کو پالیا ہے۔

میں مایوس نہیں... اپنے ماضی سے بھی، اپنے مستقبل سے بھی۔ مایوس تو میں کبھی بھی نہیں ہُوا تھا۔

میں کیا کہہ رہا تھا؟ ..... ہاں ..... انسپکٹر وِلکاکس نے مجھے بتایا تھا کہ نواب اور مہاراجے اگر اپنی رعایا کو قتل کرتے ہیں تو کرتے رہیں لیکن میں انگریز نہیں تھا کہ اس نواب کو بخش دیتا جس نے لوگوں کو اذیت ناک موت دینے کے لئے پہاڑیوں کے حصار کے درمیان جیل خانہ بنا رکھا تھا۔

اب میں نواب کے اس قید خانے پر چھاپہ مارنے جارہا تھا اور انسپکٹر

ولکاکس نے اجازت دے دی تھی۔ اس کی آواز میں ذرا سا بھی جوش و خروش نہیں تھا۔ میں جان گیا تھا کہ میں نے شہناز، آفتاب اور اُس کے ساتھی کو نواب کے قید خانے سے زندہ برآمد کر لیا یا اُن کی لاشیں برآمد ہوئیں تو نواب کے خلاف شاید کوئی بھی کارروائی نہ ہو۔ اُس کا کیس پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں جائے گا جہاں دیکھا جائے گا کہ اِس نواب نے تاجِ برطانیہ کو کتنا فائدہ پہنچایا ہے اور اپنی رعایا کا کتنا خون چوسا اور کتنا خون بہایا ہے۔ اگر اُس کی خدمات کا پلّہ بھاری ہُوا تو اُس سے تاوان وصول کر کے اُسے معاف کر دیا جائے گا لیکن میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے نواب کو خود گولی مار دوں گا یا کسی کانسٹیبل سے گولی مروا دوں گا اور اس قسم کی شہادت پیش کروں گا کہ نواب نے ریوالور نکال لیا تھا اور اپنے باڈی گارڈوں کو پولیس پر گولی چلانے کا حکم دیا تھا۔



"سکندر صاحب!" ——— سب انسپکٹر صوفی نے کہا ——— "چھاپے کے لئے پارٹی تیار ہے لیکن ایک بات کہوں گا۔ آپ ابھی بچے ہیں۔ آپ میں نوجوانی کا جو خون ہے، یہ آپ کو خطروں میں دھکیل رہا ہے۔ اس نواب سے آپ ٹکر نہ لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ یہ نواب انگریزوں کے اپنے آدمی ہیں۔"

"صوفی صاحب!" ——— میں نے کہا ——— "عمر اور تجربے کے لحاظ سے آپ میرے باپ ہیں۔ بے شک ہندوستانی نواب انگریزوں کے اپنے آدمی ہیں لیکن جو لوگ اس نواب کے ظلم اور وحشی پن کا شکار ہو رہے ہیں وہ ہمارے آدمی ہیں ..... ہمیں بہت جلدی وہاں پہنچنا ہے صوفی صاحب! نواب نے ایک عورت کو اپنے قید خانے میں بند کر رکھا ہے۔ میں اُسے زندہ نکالنے کی کوشش میں ہوں۔ میں نواب کو گرفتار کروں گا پھر انگریز جانیں اور نواب جانے ..... صوفی صاحب اگر اس کارروائی میں میری نوکری چلی گئی تو سکندر ڈاکو کا نام سارا ہندوستان سنے گا اور اُس کی شہرت اور دہشت انگلستان تک پہنچے گی۔"

"میرے عزیز بھائی!" ——— سب انسپکٹر صوفی نے میرے کندھے پر

ہاتھ رکھ کر کہا ——— "اب تو آپ کو چھاپہ مارنا ہی پڑے گا کیونکہ آپ اپنے ہیڈ کوارٹر سے اجازت لے چکے ہیں لیکن جذبات سے نہ سوچیں۔ ڈاکو تو آپ بن جائیں گے۔ آپ کی شہرت اور دہشت سمندر پار ولایت تک بھی پہنچ جائے گی لیکن آپ پر ہر وقت گرفتاری اور سزائے موت کی دہشت طاری رہے گی۔"

"پھر میں دہشت گرد بنوں گا" ——— میں نے کہا ——— "ٹیررسٹ بن کر انگریزوں کا اور نوابوں کا خون بہاتا رہوں گا۔"

"پہلے وہ کام کر لیں جس کی آپ نے اجازت لی ہے" ——— سب انسپکٹر صوفی نے کہا ——— "پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔"

میں واقعی جذبات کے غلبے میں آگیا تھا۔ میں نے جذبات کو جھٹک ڈالا اور سب انسپکٹر صوفی کے ساتھ دفتر سے نکلا۔ چھاپہ مار پارٹی تیار کھڑی تھی۔ سب کے پاس رائفلیں تھیں۔ ہتھکڑیاں بھی ساتھ تھیں۔ برآمدگی کے گواہوں کی ضرورت تھی۔ دو آدمیوں کا بندوبست سب انسپکٹر صوفی نے کر دیا۔

"مقابلے کا کوئی خطرہ نہیں" ——— میں نے چھاپہ مار پارٹی کو بتایا ——— "وہ ایک ویران علاقے میں جیل کی شکل کا احاطہ ہے۔ اس کے باہر دو یا چار آدمی پہرے پر گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ انہیں حراست میں لینا ہے پھر اس احاطے کے دروازے کا تالا توڑ کر اندر جانا ہے۔ مقابلے کا خطرہ تو نہیں لیکن وہ احاطہ نواب کا ہے۔ ہو سکتا ہے مقابلہ ہو جائے۔"

میں نے اس پارٹی کو تمام ہدایات دے دیں اور ہم چل پڑے۔ مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ نواب نے شہناز، آفتاب اور اس کے ساتھی کو وہاں سے نکال دیا ہو گا اور یہ ہو سکتا ہے انہیں قتل کرا دیا ہو۔



ہم دُور کا چکر کاٹ کر اُس طرف گئے جدھر وہ قید خانہ تھا۔ قید خانہ پہاڑیوں میں چھپا ہُوا تھا۔ میں جب اپنی پارٹی کے ساتھ اُس علاقے میں پہنچا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ علاقہ صرف دشوار گزار نہیں تھا ڈراؤنا بھی تھا۔ مجھے اور گلشن آراء کو آدھی رات کے وقت یہاں لاتے تھے اور تاجے ڈاکو نے آدھی رات کے

ہی وقت ہمیں وہاں سے فرار کرایا تھا۔ میں اب اس جگہ کو دن کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔

پھیکے سے رنگ کی پہاڑیاں تھیں جن پر ہریالی کا نام ونشان نہ تھا۔ ان کی شکلیں ڈراؤنی سی تھیں۔ تین پہاڑیوں کے درمیان قید خانہ تھا۔ ہمارے راستے میں گدلے پانی کا جوہڑ آگیا جس کے ارد گرد دلدل تھی۔ جوہڑ خاصا وسیع تھا۔ ہمیں ایک پہاڑی پر چڑھنا پڑا۔ یہ بڑا ہی تنگ راستہ تھا جس سے پاؤں پھسلتا تو آدمی لڑھکتا ہُوا جوہڑ میں جا پہنچتا۔

ایک طرف خشک سرکنڈوں کا جنگل تھا۔ میں پارٹی کے آگے آگے تھا۔ راستہ اوپر ہی اُوپر چڑھتا جارہا تھا۔ ہماری رفتار کم ہوگئی تھی کیونکہ پاؤں جما کر رکھنے پڑتے تھے۔ پھسلنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔ کچھ اور اُوپر جا کر راستہ نیچے کو جانے لگا۔

آخر ہم اُس جگہ پہنچ گئے جہاں سے ہمیں قید خانہ دکھائی دینے لگا۔ اس کی دیواروں پر گدھ بیٹھے ہُوتے تھے۔ انہیں دیوار پر بیٹھا دیکھ کر مجھے یہ اطمینان ہُوا کہ اندر جس کسی کو بھی بند کیا گیا ہے وہ زندہ ہے۔ مُردہ ہونے کی صورت میں گدھ زیادہ ہوتے اور وہ دیوار پر بیٹھے ہوتے نہ ہوتے۔

مجھے دو آدمی دکھائی دیتے جنہوں نے کندھوں سے رائفلیں لٹکا رکھی تھیں۔ وہ سنتری تھے جو دیوار کے باہر گشتی پہرہ دیتے رہتے تھے۔ وہ دُور تھے۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بلایا لیکن وہ اِدھر آنے کی بجائے دوسری طرف دوڑے گئے اور دیوار کی اوٹ میں غائب ہوگئے۔

مجھے ان کا ڈر نہیں تھا۔ وہ ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ میں دوڑ پڑا۔ دوڑتے دوڑتے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ پارٹی کو دیوار کے ارد گرد پھیلا دے اور سنتریوں کو پکڑ لے۔

میں بلندی سے اُتر گیا۔ دروازہ دوسری طرف تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا دروازے والی طرف گیا تو تین آدمی سنتریوں کے ساتھ بھاگے جا رہے تھے۔ میں نے انہیں رُک جانے کے لئے پکارا لیکن وہ رُکے نہیں۔ تھوڑا

آگے جا کر وہ سرکنڈوں میں چُھپ گئے۔ اے۔ ایس۔ آئی میرے ساتھ تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ چھ کانسٹیبل اپنے ساتھ لے کر سرکنڈوں کو محاصرے میں لے لے۔ میں خود قید خانے کے اندر جانا چاہتا تھا۔

سنتری تو وہاں موجود رہتے ہی ہوں گے۔ میں نے ان تین آدمیوں کے متعلق سوچا جو سنتریوں کے ساتھ بھاگ گئے تھے۔ کیا یہ کسی اور کو قید خانے میں بند کرنے کو لاتے تھے؟ دوسرا خیال بڑا بھیانک آیا — کیا یہ شہناز اور اُس کے ساتھیوں کو قتل کرنے آتے تھے؟

مجھ سے غلطی یہ ہوتی تھی کہ نواب کے ساتھ قید خانے کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ میں نے اس شک کا اظہار کر دیا تھا کہ اُس نے شہناز اور آفتاب کو موت کے قید خانے میں بھیج دیا ہے۔ میں نے بعد میں اُسے کہا تھا کہ میں اُس کے خلاف کوئی رپورٹ نہیں لکھوں گا اور میں نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ میں جا رہا ہوں لیکن وہ بوڑھا نواب بڑا کایاں آدمی تھا۔ چالاکی اور فریب کاری میں اُس کے آگے میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ میں اُسے دھوکہ دے رہا تھا کہ میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں اور میں جا رہا ہوں۔ میں نے جانا نہیں تھا۔ میں نے وہی کرنا تھا جو میں نے کیا کہ تھانے جا کر قید خانے پر چھاپے کا انتظام کیا۔

نواب میرے دھوکے کو پہلے ہی سمجھ گیا ہوگا۔ میں اُس سے رخصت ہُوا تو اُس نے یہ حکم دے کر اپنے آدمی بھیج دیتے ہوں گے کہ شہناز اور اُس کے دونوں ساتھیوں کو قتل کر دیا جاتے اور اُن کی لاشیں غائب کر دی جائیں۔ اُس نے اپنے خلاف شہادت ضائع کرنے کا انتظام کر دیا تھا۔

اے۔ ایس۔ آئی کانسٹیبلوں کو اکٹھا کرنے اور سرکنڈوں کا محاصرہ کرنے چلا گیا۔ میں نے ریوالور نکال لیا۔ اس میں چھ گولیاں تھیں۔ باقی گولیاں بیلٹ میں اور کچھ جیب میں تھیں۔ میں اس احاطے کے دروازے تک گیا۔ یہ لکڑی کا بڑا مضبوط دروازہ تھا۔ وہاں جو تالا لگا ہُوا تھا وہ کم وبیش ایک سیر وزن کا ہوگا۔ اسے کھولنا یا توڑنا بہت ہی مشکل تھا لیکن اللہ کی مدد ہمارے ساتھ تھی۔ تالا کھُلا ہُوا تھا اور اس

میں چابی لگی ہوئی تھی۔ ہمیں تالا کھلا ہوا اس طرح ملا کہ یہ تین آدمی اندر جانے کے لئے آتے تھے۔ انہوں نے تالا کھولا اور ہم پہنچ گئے۔ سنتریوں نے انہیں بتایا ہو گا کہ پولیس آرہی ہے اور وہ اتنی جلدی میں بھاگے کہ تالا کھلا چھوڑ گئے۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ اس کے پاس بھی ریوالور تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے پیچھے دیکھا میں اے۔ ایس۔ آئی کی کارگزاری دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کانسٹیبلوں کو سرکنڈوں کے اردگرد پھیلا رہا تھا۔ سرکنڈے کم از کم ایک سو گز دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ چوڑائی پچاس گز ہو گی۔

"راجن!"—— میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو پکار کر بلند آواز سے کہا—— "ایک کانسٹیبل کو پہاڑی پر چڑھا دو۔ وہ اوپر سے سرکنڈوں میں اچھی طرح دیکھ سکے گا۔ اسے کہو کہ یہ لوگ سرکنڈوں سے باہر نہ آئیں تو اوپر سے جو بھی نظر آتے اس پر گولی چلا دے..... انہیں صرف تین بار کہو کہ باہر آجائیں۔"

میں نے تالا اتار کر پھینک دیا۔ میں دو گواہ ساتھ لایا تھا۔ انہیں کہا کہ وہ ساری کارروائی دیکھتے رہیں کیونکہ انہیں عدالت میں گواہی دینی پڑے گی۔ دروازہ کھول کر میں ہیڈ کانسٹیبل اور دونوں گواہوں کے ساتھ اندر گیا۔ یہ ڈیوڑھی تھی۔ اس کی چھت سے جالے میلے کپڑوں کے چیتھڑوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ احاطہ کس صدی میں بنا تھا۔ دیواریں پتھروں کی تھیں اور ان پر کائی اگی ہوئی تھی۔ فرش پر بازوؤں ٹانگوں اور انگلیوں کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ ایک خشک کھوپڑی پڑی ہوئی تھی۔

آگے ایک اور دروازہ تھا جس کی زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے زنجیر کھولی اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اندرونی ماحول سے میں واقف تھا۔ اندر چند ایک درخت تھے۔ ایک طرف چھپر بنا ہوا تھا۔ مجھے سب سے پہلے شہناز نظر آئی۔ وہ چھپر کے نیچے اس کے ایک ستون کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھی تھی۔ یہ لکڑی کا ستون تھا۔ شہناز کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ اس قید خانے میں آتے اسے چالیس گھنٹوں سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔

اس کے دونوں ساتھی بھی نظر آگئے۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے

تھے۔ مجھے تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ شاید انہوں نے مجھے اس وقت دیکھا ہو گا جب میں محل کے احاطے میں تفتیش کرتا پھر رہا تھا اور اب ایک باوردی ہیڈ کانسٹیبل کو اور دو اور آدمیوں کو میرے ساتھ دیکھ کر وہ مجھے موت کا فرشتہ سمجھے ہوں گے۔



میں شہناز تک دوڑ کر پہنچا۔ اسے کندھوں سے پکڑ کر ہلایا۔ اس کا سر یوں ہلا جیسے گردن آدھی سے زیادہ کٹی ہوئی ہو۔ اس پر غشی طاری تھی۔ چالیس گھنٹوں سے زیادہ وقت ہو گیا تھا کہ اسے کھانے پینے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ اوپر موت کا خوف تھا۔ اس اذیت ناک کیفیت میں پیاس زیادہ لگتی ہے۔ خوف جسم کی نمی چوس لیتا ہے۔ میں یہاں اسی حالت میں رہ چکا تھا۔ گلشن آرا بھی تھی۔ میں مرد تھا اور میں نے موت کو ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا لیکن گلشن آرا کی حالت بڑی جلدی بگڑ گئی تھی۔

مجھے اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہاں حالت غشی تک پہنچی ہوئی ہو گی۔ میں پانی ساتھ نہیں لایا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ دوڑ کر باہر جاتے اور دیکھے، کوئی کانسٹیبل اپنے ساتھ پانی لایا ہو گا۔

ہیڈ کانسٹیبل دوڑ گیا۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر شہناز کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اس کے چہرے پر موت کی سفیدی آگئی تھی۔

"پہلے میری بات سن لو"—— مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔

میں نے دیکھا۔ وہی دو آدمی جو دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے تھے میرے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں سے آدھی جان نکلی ہوئی لگتی تھی۔ یہ آواز ان میں سے ایک کی تھی۔

"کہو بھائی!"—— میں نے کہا—— "سناؤ، کیا بات سنانی ہے؟"

"تمہارے پاس ریوالور ہے"—— ان میں سے ایک نے کہا—— "ہم دونوں خالی ہاتھ ہیں۔ تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہیں صرف شرم دلا سکتے ہیں کہ یہ عورت بے شک بہت خوبصورت اور بہت کشش والی ہے لیکن مر رہی ہے۔ آج نہیں تو کل مر جائے گی۔ اس کی بے حرمتی کرو گے تو خدا تمہیں بخشے گا

نہیں۔ خارش والے کُتے جیسی موت مرو گے۔ ہم اس کی عزّت بچانے کے لئے خالی ہاتھ جو بھی کر سکے کریں گے۔ مرنا تو ہے ہی۔ ریوالور کی گولی کی موت آسان ہو گی .... اس عورت نے مردوں سے زیادہ دلیری دکھائی ہے۔ ایک مفرور عمر قیدی کو اپنے پلنگ کے نیچے چھپاتے رکھنے کے لئے شیر جتنا بڑا دل چاہیئے اور تم بدکاری کی نیّت سے آ گئے ہو۔"

"تم دونوں میں آفتاب کون ہے؟"

"میں ہی ہوں" — میرے ساتھ بات کرنے والے نے کہا۔

"آفرین!" — میں نے کہا — "تم نہیں مرو گے۔ ہم تمہیں آزاد کرانے آتے ہیں۔"

"کیا نواب کو اپنے بیٹے کا خیال آ گیا ہے؟" — آفتاب نے طنزیہ کہا۔

"نہیں!" — میں نے کہا — "وہ اب خود ملزم ہے .... قتل کا ملزم .... اُسے اب ان سب کے قتل کا حساب دینا ہو گا جن کی ہڈیاں یہاں بکھری ہوتی ہیں۔"

"اس بوڑھے نواب کے جرائم کی فہرست بنے تو مجھ سے پوچھ لینا" — آفتاب کے ساتھی نے کہا۔

شہناز کے جسم نے حرکت کی اور اُس نے بڑی لمبی سانس چھوڑی۔ میں ڈر گیا۔ اسے میں شہناز کی آخری سانس سمجھا تھا۔ اتنے میں ہیڈ کانسٹیبل پانی کی دو بوتلیں اُٹھاتے دوڑتا آیا۔ تین چار کانسٹیبل اپنے ساتھ پانی کی فوجی بوتلیں لاتے تھے۔ میں نے ایک بوتل آفتاب کو دے دی اور اُسے کہا کہ ایک ایک گھونٹ وقفے وقفے سے دونوں پئیں۔ دوسری بوتل کھول کر شہناز کے مُنہ سے لگا تی۔ اُس کا مُنہ ذرا سا کُھلا ہُوا تھا۔ ہونٹ مٹی جیسے خشک ہو گئے تھے۔

یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا کہ پانی شہناز کے حلق میں اُتر رہا تھا۔ ذرا دیر بعد اُس کی آنکھیں تو نہ کُھلیں اُس کے ہونٹ کُھل گئے۔ میں نے قطرہ قطرہ ٹپکانے کی بجائے اب ذرا زیادہ پانی اُس کے مُنہ میں ٹپکا دیا۔ اُس نے گھونٹ نگل لیا۔

◆

اُس کی آنکھیں کُھلنے لگیں۔ پھر اُس نے اُوپر دیکھا۔

"سکندر!" — اُس نے ہلکی سی سسکی جیسی آواز میں کہا — "آخری وقت تم تصوّر میں آ گئے ہو" — اُس نے آنکھیں بند کر کے کہا — "یہی کافی ہے۔"

"شہناز!" — میں نے اُس کا گال تھپکاتے ہُوتے کہا — "آنکھیں کھولو۔ میں تصوّر میں نہیں آیا۔"

"پانی!" — اُس نے کراہتی ہُوئی آواز میں کہا — "جل گئی ہوں۔"

میں نے بوتل اُس کے مُنہ سے لگا دی اور وہ بے صبری سے پانی پینے لگی۔

"بس شہناز!" — میں نے بوتل اُس کے مُنہ سے ہٹاتے ہُوتے کہا — "ابھی اتنا پانی نہ پیو۔ خالی پیٹ تکلیف دے گا۔"

اُس نے آنکھیں پوری کھول دیں اور مجھے اپنے اُوپر جُھکا ہُوا دیکھا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے اُس کی گردن کے نیچے بازو رکھ کر اُسے اُٹھایا۔ وہ ہوش میں آ گئی تھی۔ اُس کا چہرہ میرے چہرے کے قریب تھا۔ اُس کے چہرے پر حیرت کا تاثر اُبھر آیا پھر اُس نے بیتابی سے بازو میری گردن کے گرد لپیٹ دیتے۔ اُس کا مُنہ میری گردن اور کندھے کے درمیان تھا۔ اُس کا ایک گال میرے گال کے ساتھ لگا ہُوا تھا۔ اس کے ریشم جیسے بال میرے چہرے پر پھیل گئے۔

میں جوان آدمی تھا۔ میری جوانی بے داغ تھی۔ خون کا جوش عروج پر تھا اور شہناز کے حُسن میں وہ نشہ تھا جس نے تاجے اور نوابزادہ حمید اللہ خان جیسے پتھروں پر وجد طاری کر دیا تھا۔ اُس کے جسم کے لمس اور بھینی بھینی بُو میں وہ تپش تھی جو ہیروں کو پگھلا دیتی تھی مگر مجھ پر کوئی اور ہی تاثر کوئی اور ہی نشہ طاری ہو گیا۔ میں بھول گیا کہ میں جوان ہوں یا یہ کہ میرے جسم کی بھی کوئی ضرورت ہے۔ مجھے پیاس سی محسوس ہوئی لیکن اس کا تعلق جسم کے ساتھ نہیں روح کے ساتھ تھا۔

میں جانتا تھا کہ اس وقت شہناز کو میرے جذباتی سہارے کی ضرورت ہے۔ میں نے اُسے موت کے مُنہ سے نکال لیا تھا، اب اُسے موت کے خوف سے نکالنا تھا لیکن مجھ میں کمزوری کا سا احساس پیدا ہو گیا تھا جیسے مجھے شہناز کے جذباتی سہارے کی ضرورت ہے۔

میرا ذہن مجھے دُور پیچھے بچپن میں لے گیا جب میری ماں کے گال میرے گالوں سے چپک جایا کرتے اور ماں کے بال میرے چہرے پر پھیل جایا کرتے تھے۔ میری کوئی بہن نہیں تھی۔ بیوی نہیں تھی نہ دل میں خواہش تھی۔

میں بھول گیا کہ میں کہاں ہوں۔ عجیب سا سکون اور اطمینان تھا جس نے مجھ پر خود فراموشی طاری کر دی تھی۔

شہناز کی سسکیوں نے مجھے اس طلسم سے بیدار کر دیا۔ میں نے اُس کا چہرہ اپنے سامنے کیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ شاید میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ ایسے لگا جیسے ہم دونوں بھٹکے ہُوئے بچے ہوں اور ایک تاریک جنگل میں ایک دوسرے کے ساتھ لگے ڈرتے اور روتے پھر رہے ہوں اور اندھیرے میں ڈراؤنی شکلیں دکھائی دے رہی ہوں۔

میں جذبات کی دلدل میں اُترنے لگا۔ باہر کے ایک دھماکے نے مجھے اُٹھا کر حقیقت میں پٹخ دیا۔ باہر ایک رائفل فائر ہوئی تھی۔ معلوم نہیں فائر کسی کانسٹیبل نے کیا تھا یا کسی سنتری نے۔

"اُٹھو شہناز!" — میں نے کہا — "میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔ اپنے سہارے چلنے کی کوشش کرو۔"

"میں چل سکوں گی" — شہناز نے کہا پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مجھ سے پوچھا — "انہیں بھی رہائی دلا رہے ہو؟"

"ہاں!" — میں نے کہا — "یہ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔"

"نواب نے ہمیں معاف کر دیا ہے؟" — شہناز نے پوچھا۔

"نواب!" — میں نے طنزیہ ہنسی ہنس کر کہا — "اب وہ انگریز افسروں کی جوتیاں چاٹ کر اُن سے معافی مانگے گا اور اُسے معافی نہیں ملے گی .... یہ باتیں پھر سناؤں گا .... باہر چلو .... اور تم دونوں بھی اس کے ساتھ چلو۔"

میں نے انہیں ڈیوڑھی میں کھڑا رہنے کو کہا کیونکہ باہر گولیاں چلنے

کا خطرہ تھا۔ میں گواہوں کو وہیں چھوڑ کر اور ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔



اے۔ ایس۔ آئی نے سرکنڈوں کے جنگل کا محاصرہ کرایا ہُوا تھا اور وہ اعلان کر رہا تھا کہ باہر آ جاؤ ورنہ کسی کو زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا میں وہاں چلا گیا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے مجھے بتایا کہ گولی اُس کانسٹیبل نے چلائی تھی جو پہاڑی کے اُوپر تھا۔ اُس نے اُوپر سے ایک بار پھر کہا کہ وہ سب اندر ہیں۔

"تم سب کو آخری بار خبردار کیا جا رہا ہے" — میں نے اعلان کیا — "دو منٹ میں باہر نہ آئے تو ہم اندر آ کر سب کو گولی مار دیں گے .... تمام کانسٹیبل فائر کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

یہ اعلان کر کے میں نے سرکنڈوں کے اندر ریوالور کی دو گولیاں فائر کیں۔ ایک گولی اوپر والے کانسٹیبل نے فائر کر دی۔

"گولی نہ چلاؤ" — سرکنڈوں سے آواز آئی۔

سرکنڈوں میں ہلچل پیدا ہوئی جو آگے بڑھتی آئی اور ایک سنتری باہر آیا۔ اُس نے رائفل پھینک دی۔ دو چار منٹ بعد دوسرا سنتری باہر آیا۔ اُس نے بھی رائفل پھینک دی۔

"اپنے ان ساتھیوں سے بھی کہو باہر آ جائیں" — میں نے سنتریوں سے کہا — "تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو گی"۔

اُن کے کہنے پر وہ تین آدمی بھی نکل آئے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اُن کے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔

"یہاں کیا کرنے آئے تھے؟"

"نواب صاحب نے حکم دیا تھا" — ایک نے جواب دیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا — "ہم تو حکم کے بندے ہیں حضور! نواب صاحب نے حکم دیا تھا کہ سنتریوں سے رائفلیں لے لینا اور قید خانے کے اندر جا کر اس عورت اور ان دونوں آدمیوں کو گولی مار دینا .... اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کی لاشوں کے

ساتھ وزنی پتھر باندھ کر اس پانی میں پھینک دینا۔ ہم ابھی پہنچے ہی تھے۔"

"تمہارے علاوہ اور بھی کوئی ہے یہاں؟"

"ایک اور تھا" — اُس نے جواب دیا — "وہ اُس طرف وزنی پتھر دیکھتا پھر رہا تھا۔ سنتریوں نے آواز دے کر بتایا کہ پولیس آگئی ہے تو وہ اُدھر سے ہی بھاگ گیا..... وہ واپس پہنچ چکا ہوگا۔"

"کیا تمہیں نواب نے بتایا تھا کہ پولیس کے آنے کا خطرہ ہے؟"

"ہاں حضور!" — اُس نے جواب دیا — "نواب صاحب نے ایسے ہی کہا تھا۔ کہتے تھے بہت جلدی پہنچو۔ جلدی پہنچنے کے لئے ہم گھوڑوں پر آئے تھے۔"

"گھوڑے کہاں ہیں؟"

"اُس طرف" — اُس نے قید خانے کی پچھلی طرف اشارہ کر کے کہا — "ہمارا چوتھا ساتھی شاید پیدل بھاگا ہے۔ ہمیں گھوڑا دوڑنے کی آوازیں نہیں سنائی دیں۔"

میں نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ گھوڑے یہاں لے آئیں۔ ان کی مجھے ضرورت تھی۔ شہناز، آفتاب اور اُس کے ساتھی کے لئے ڈیڑھ دو میل پیدل چلنا بہت مشکل تھا۔

"تم سب مت ڈرو!" — میں نے سنتریوں اور ان تین آدمیوں سے کہا — "تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ تم ہمارے گواہ ہو گے اور یہی بیان دو گے جو تم نے مجھے دیا ہے۔ تم پر کوئی الزام نہیں۔"

میں نے قید خانے کا دروازہ بند کیا۔ تالا لگایا اور چار کانسٹیبلوں کی وہاں ڈیوٹی لگا دی۔ ہیڈ کانسٹیبل کو ان کے ساتھ چھوڑا۔ انہیں کہا کہ ان کا کھانا، خیمہ اور دوسرا ضروری سامان پہنچ جائے گا۔

شہناز اور اُس کے ساتھیوں کو گھوڑوں پر سوار کیا اور ہم اس آپریشن کی کامیابی کی خوشی کے ساتھ چل پڑے۔

◆

میں نے راستے میں آفتاب کو سب سے الگ کر لیا اور دوسروں سے کہا کہ وہ آگے چلیں۔ میں نے آفتاب سے پوچھنا تھا کہ وہ پکڑے کس طرح گئے تھے۔ میں نے آفتاب کو گھوڑے پر سوار رہنے دیا اور خود اُس کے ساتھ پیدل چلتا رہا۔

آفتاب نے بتایا کہ اُسے معلوم تھا کہ حمید اللہ خان آرہا ہے۔ وہ اِس اطلاع پہ آیا تھا کہ شہناز نواب کے پاس ہے۔ حمید اللہ خان نے خواجہ صاحب کے پاس بہت وقت لگا دیا۔ یہ تو میں سُنا چکا ہوں کہ پولیس کا چھاپہ کس طرح پڑا اور حمید اللہ کس طرح شہناز کے کمرے میں چھُپا رہا۔

آفتاب بہت پریشان تھا کہ حمید اللہ گیا کہاں۔ حمید اللہ کے ساتھ اُس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ رات کو اُسے پیغام ملا کہ حمید اللہ شہناز کے کمرے میں ہے۔ شہناز کی خادمہ نے پیغام پہنچایا تھا۔ آفتاب نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ حمید اللہ کو دیوار پار کرانے کا منصوبہ بنایا۔ اُن کا یہ منصوبہ کامیاب رہا لیکن آفتاب کے ساتھ اُس کا ایک ہی ساتھی تھا۔ دوسرا پیٹ کے شدید درد کے اچانک حملے کی وجہ سے ساتھ نہ دے سکا۔

آفتاب بہت خوش تھا کہ اُس نے حمید اللہ خان کی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے لیکن دو ہی دن گزرے تھے کہ اُسے نواب نے بلایا۔ پھر اُس کے ساتھی کو بھی بلا لیا پھر شہناز کو بھی بلایا۔

"تم نے اُسے اپنے کمرے میں چھپائے رکھا" — نواب نے شہناز سے کہا — "اور رات کو نکال دیا۔ کیا یہ سچ ہے؟"

شہناز گھبرا گئی۔ نواب نے اُٹھ کر اُسے گھونسوں، تھپڑوں اور لاتوں سے بہت پیٹا۔ اُس نے کہہ دیا کہ اُس نے حمید اللہ خان کو اپنے نواب کا بیٹا سمجھ کر پولیس سے بچایا تھا۔

"وہ تمہیں لینے آیا تھا" — نواب نے کہا — "تم نے یہ احسان اگر مجھ پر کیا تھا تو مجھے بتا دیتیں کہ نواب صاحب، یہ رہا آپ کا بیٹا، اسے میں نے آپ کی خاطر بچایا ہے۔ تم نے مجھے دھوکہ دیا۔"

"نواب کو دراصل پوری اور صحیح رپورٹ مل چکی تھی" — آفتاب نے مجھے

سُنایا ——"مخبری کرنے والا ہمارا اپنا ساتھی تھا۔ اُس نے پیٹ درد کا بہانہ کیا تھا۔ وہ دراصل ڈر گیا تھا۔ نواب اپنی تفتیش کرتا رہا تھا۔ کسی طرح اُسے ہمارے اس ساتھی کا پتہ چل گیا۔ اسے بلا کر مارا پیٹا تو اس نے ہم سب کو پکڑوا دیا۔ نواب نے اُسے ہمارے سامنے کھڑا کر دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ نواب اتنی سخت سزا نہیں دے گا کیونکہ حمید اللہ خان اس کا اپنا بیٹا ہے لیکن وہ کہتا تھا کہ تم سب نے میری نوابی خطرے میں ڈال دی ہے۔ ہم دونوں مان گئے اور نواب نے ہمیں اس قید خانے میں بھیج دیا۔"

میں نے فیصلہ کر لیا کہ نواب کو حراست میں لے لوں گا۔ اُس کا جُرم یہ قید خانہ تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ انگریزوں نے نواب کو معاف کر دیا یا اس سے صرف تاوان وصول کر کے بات ختم کر دی تو میں نوکری سے استعفیٰ دے دوں گا۔

میں ان سب کو ساتھ لئے نواب کے محل میں گیا۔ اُس کے کمرے کے سامنے دربان کھڑا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ نواب صاحب کو میری اطلاع دے۔

"نواب صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں"—— دربان نے کہا ——"ایک حکیم صاحب اندر ہیں۔"

"پھر بھی انہیں اطلاع دو کہ سب انسپکٹر سکندر آیا ہے"—— میں نے حکم کے لہجے میں کہا۔

میں اتنی اونچی آواز میں بولا تھا کہ آواز اندر چلی گئی۔ ایک معزز صورت آدمی باہر آیا۔ اس کی خشخشی داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی تھی۔

"آپ ہیں سب انسپکٹر؟"—— اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"جی!"—— میں نے کہا ——"میں ہوں سب انسپکٹر سکندر!"

اُس نے مجھے بازو سے پکڑا اور اندر لے گیا۔ نواب دیوان پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے اُوپر چادر تھی۔ چہرہ ننگا تھا۔ اُس نے میری طرف نہ دیکھا۔

"السلام علیکم نواب صاحب!"—— میں نے کہا ——"آپ

کی طبیعت ..."

"آپ کو جواب نہیں ملے گا"—— مجھے اندر لے جانے والے نے کہا ——"نواب صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔"

"کیا یہ زندہ نہیں؟"

"نہیں"—— اُس نے جواب دیا ——"میں ان کا حکیم ہوں۔ ان کا ڈاکٹر بھی ہے۔ آج انہوں نے بلایا اور کہنے لگے کہ میں اپنی زندگی ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے پوچھا کیوں حضور؟ کہنے لگے میری شان و شوکت ختم ہو چکی ہے۔ پولیس ایسی جگہ جا پہنچی ہے جو مجھے سزائے موت یا عمر قید دلائے گی۔ مجھے کچھ لا دیں جو مجھے فوراً ہمیشہ کے لئے سلا دے۔"

جو چوتھا آدمی قید خانے سے بھاگ آیا تھا، اُس نے نواب کو اطلاع دی تھی کہ پولیس قید خانے تک پہنچ گئی ہے۔ نواب نے سزا سے بچنے کے لئے حکیم کو بلایا اور اُسے مجبور کر دیا کہ وہ اُسے بڑا تیز زہر لا دے۔ حکیم نے اُسے زہر لا دیا جو وہ پی کر فوراً ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

میں نے حکیم کو حراست میں لے لیا اور نواب کے ٹیلیفون سے اپنے ہیڈ کوارٹر کی کال بک کرائی۔ کال جلدی مل گئی اور انسپکٹر ولکاکس بھی مل گیا۔ میں نے اُسے یہ خبر اور کارگزاری سنائی۔

"تھانے سے مزید نفری منگوا کر محل کو اپنے قبضے میں لے لو"—— ولکاکس نے کہا ——"وہاں اب جانشینی پر خون خرابہ ہوگا۔ وہاں لُوٹ مار ہوگی۔ چوکنے رہو۔ محل کے اندر بلکہ تمام احاطے کے اندر کرفیو والی حالت پیدا کر دو۔ کسی کو باہر گھومنے پھرنے نہ دو۔ سب انسپکٹر صوفی کو اپنے پاس بلا لو۔ ہم آ رہے ہیں۔"

دھندلی راہیں

ایک آپ بیتی، طلسمِ ہوشربا، خونچکاں، ولولہ انگیز!



وقاص

پیش لفظ

سنسنی خیز اور جذباتی دُنیا میں زلزلے بپا کرنے والی کہانی ——
"دھندلی راہیں" —— کا تیسرا حصّہ پیش کیا جا رہا ہے۔

اگر آپ نے پہلے دو حصّے پڑھ لئے ہیں تو آپ یقیناً تیسرے حصّے کا انتظار بے تابی سے کر رہے ہوں گے۔ ہمیں اپنے قارئین کی بے تابی کا پوری طرح اندازہ ہے۔ یہ کہانی ہی ایسی ہے کہ ایک ہی بار ابتدا سے انجام تک پہنچ جانے کو جی چاہتا ہے۔ ہم نے قارئین کرام کو زیادہ انتظار کی زحمت سے بچانے کے لئے اس کہانی کو پانچ کی بجائے چار حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے تیسرے اور چوتھے حصّے کو زیادہ ضخیم کر دیا ہے۔ چونکہ کاغذ اور چھپائی کے سامان کی قیمتیں بے تحاشہ بڑھ گئی ہیں اس لئے تیسرے اور چوتھے حصّوں کی قیمتیں پہلے اور دوسرے حصّے کی نسبت زیادہ ہیں۔ ان کے صفحات میں جو اضافہ کیا گیا ہے اس سے اخراجات میں خاصا اضافہ ہُوا ہے۔

چوتھا حصّہ جو آخری حصّہ ہو گا، عنقریب پیش کیا جا رہا ہے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

نواب کا محل اور اُس کے اردگرد ملازموں کے کوارٹر اور مکان ایک الگ تھلگ کالونی تھی۔ اس کے ایک حصے کے اردگرد دیوار تھی۔ دیوار کے باہر بھی چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ ان میں وہ لوگ رہتے تھے جن کی روزی نواب کے ساتھ وابستہ تھی۔ اس تمام آبادی میں نواب کی موت کی خبر پھیل چکی تھی جس نے خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔ اس خوف و ہراس میں دہشت کا تاثر اُس وقت پیدا ہُوا جب ہرکاروں کے ذریعے یہ حکم نامہ سنایا گیا کہ کوئی فرد، بچہ یا بوڑھا، مرد یا عورت اپنے گھر سے تھوڑی سی دیر کے لئے بھی غیر حاضر نہیں ہو سکتا۔ سارے ماحول پر اور فضا میں ماتم کا تاثر صاف نظر آتا تھا۔

میں نے انسپکٹر ولکاکس کے حکم کے مطابق اس علاقے کے ایس ایچ او سب انسپکٹر صوفی عظمت اللہ کو بلا لیا اور اسے کہا کہ اس تمام آبادی میں خصوصاً دیوار کے اندر کے حصے میں کرفیو لگا دے۔ کرفیو پولیس نہیں لگا سکتی۔ مطلب یہ تھا کہ کوئی آدمی اپنی مرضی سے اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا نظر نہ آئے اور کوئی آدمی بڑے گیٹ سے باہر نہ جائے۔

سب انسپکٹر صوفی نے حکیم کو ہتھکڑی لگا دی۔ ادھیڑ عمر حکیم جو ایک معزز شخص تھا، چیختا اور چلاتا تھا کہ وہ کس جرم میں پکڑا گیا ہے۔ سب انسپکٹر صوفی نے اپنے دستور کے مطابق اُس دربان کو بھی حراست میں لے لیا جو حکیم کو بلانے کے لئے گیا تھا۔ حکیم اُس زہر کی پوری شیشی اُٹھا لایا تھا۔ اُس میں خاصی مقدار میں زہر موجود تھا۔ یہ بھی قبضے میں لے لیا گیا۔

"انسپکٹر صاحب!" ــــ حکیم ہاتھ جوڑتا اور رو رو کر کہتا تھا ــــ "میں نے خود نواب صاحب کو زہر نہیں دیا۔ اُنہوں نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ میری تو روزی نواب صاحب کے ہاتھ میں تھی۔"

"جناب حکیم صاحب!" ــــ صوفی نے اُسے کہا ــــ "میں یہ مان لیتا ہوں

کہ زہر آپ نے نہیں دیا، لیکن آپ یہ مہلک زہر اپنے پاس رکھ ہی نہیں سکتے تھے .... بہرحال ابھی تفتیش تو شروع ہی نہیں ہوئی۔ جب ہو گی تو آپ اپنا بیان دے دینا، لیکن آپ بڑی عزت والے اور بڑے مقدس ہنر والے ہیں۔ میں آپ کو یہ ابھی بتا دیتا ہوں کہ آپ پر یہ شک ہو گا کہ آپ نے کسی ایسے فرد، مرد یا عورت کے کہنے پر نواب صاحب کو زہر دیا ہے جو اُن کی نوابی کے جانشین بننا چاہتے تھے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ نوابوں کی خانگی دنیا میں کیسی کیسی خوفناک اور شرمناک سازشیں ہوتی ہیں۔"

بڑی ریاستوں کی اپنی پولیس ہوتی تھی لیکن اس نواب کی ریاست اتنی محدود تھی جسے تھانے کے ماتحت رکھا گیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ نواب تھانے سے ڈرتا تھا بلکہ عملاً تھانے والے نواب صاحب کے خوشامدی اور ناجائز طور پر وظیفہ خوار تھے۔ اگر نواب زندہ ہوتا اور یہاں کوئی اور واردات ہوتی ہوتی تو سب انسپکٹر صوفی کا رویہ بالکل مختلف ہوتا۔

میں اور سب انسپکٹر صوفی اُس کمرے میں گئے جہاں نواب کی لاش پڑی تھی۔ لاش کو دیکھ کر خدا یاد آ گیا۔ اُس کے چہرے پر نوابی جلال کی بجائے کرب اور تکلیف کا بڑا گہرا تاثر تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ شخص جو معلوم نہیں کتنے ہی انسانوں کی موت کا فرشتہ بنا تھا خود کس قدر اذیت میں مرا ہے۔ اُس کا ایک ہاتھ اپنی شہ رگ پر رکھا ہُوا تھا۔ یہ زہر کی تلخی کا پتہ دیتا تھا۔ اُس کا مُنہ کھلا ہُوا تھا مُنہ سے جھاگ پھوٹ رہی تھی۔ بڑھاپے میں بھی نواب کے چہرے کا رنگ جوانوں جیسا تھا اور اُس کی آنکھوں میں شباب کی چمک ابھی موجود تھی۔ اب بھی آنکھیں کھلی تھیں مگر چمک دمک بجھ کے رہ گئی تھی۔ ان آنکھوں نے نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کو دیکھا اور انہیں نواب کے حرم میں قید کر ڈالا تھا۔ اب یہ آنکھیں گناہوں کا اُجڑا ہُوا آشیاں بنی ہوئی تھیں۔

یہ لاش سراپا عبرت تھی۔

یہ ایک انسان ہزاروں انسانوں کا اَن داتا بنا ہُوا تھا۔ اس نے شاید کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک روز اس کے جسم کو لاش بننا ہے اور اس لاش

کو زہر اندر ہی اندر جلاتے گا۔

اس کے چہرے کا رنگ پھیکا نیلا ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی غیبی ہاتھ اس لاش کے چہرے پر لعنت کا لیپ کر رہا ہو۔

میں نے ایسے ہی ایک گناہگار انسان کی لاش پہلے بھی دیکھی تھی۔ وہ شہناز کی ماں تھی۔ میں نے اُس کے گناہوں کی ساری داستان آپ کو سنائی تھی۔ وہ گل سڑ کر مری تھی ـــــ اور نواب مر کر گل سڑ رہا تھا۔

"پوسٹ مارٹم جلدی ہو جانا چاہیئے۔"

سب انسپکٹر صوفی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں گناہ و سزا کی بھول بھلیوں میں بھٹک گیا تھا۔ میں نے چونک کر صوفی کی طرف دیکھا۔

"ہاں صوفی صاحب!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "لاش کا رنگ بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔"

"قبر میں اس کا جو حال کیڑوں نے کرنا تھا وہ زہر یہیں کر رہا ہے" ـــــ صوفی نے کہا۔

"فرعونوں کو بھی کیڑے کھا گئے تھے صوفی صاحب!" ـــــ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ـــــ "انسان اپنے آپ کو خدا کہہ تو لیتا ہے لیکن خدا بن نہیں سکتا۔"

سب انسپکٹر صوفی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوانے کا انتظام کرنے کے لئے باہر نکل گیا اور میں نواب کے سونے کے اس کمرے کو دیکھنے لگا۔ کمرے میں کچھ دیر پہلے ہندوستان کے بہترین عطر کی خوشبو تھی مگر اب زہر سے خراب ہوتی ہوئی لاش کی بدبُو عطر کی خوشبو کو نگلتی جا رہی تھی۔ گناہوں کا تعفن پھیل رہا تھا۔ کمرہ اتنا حسین کہ ساری عمر اس میں گزارنے کو جی چاہتا تھا۔ قالین ایسا جیسے دھنکی ہوئی روئی تہہ در تہہ بچھی ہو، مگر اب مجھے یہ کمرہ یوں لگ رہا تھا جیسے خدا نے بہشت کے کسی گوشے کو دوزخ میں تبدیل کر دیا ہو۔

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے کم و بیش چالیس میل دُور جانا تھا۔ انسپکٹر وِرکاکس اور دیگر افسروں کے آنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ میں نواب کے کمرے سے

نکل جانا چاہتا تھا لیکن مُنہ پھیرنے کے باوجود میری اپنی ہی ذات کی کوئی طاقت میرا مُنہ نواب کی لاش کی طرف پھیر دیتی تھی۔ میں نواب کے پلنگ کو دیکھنے لگا۔ میرے تصوّر میں گناہ کی راتیں آ گئیں جو نواب نے اس پلنگ پر گزاری تھیں۔

میں نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ گھوم کے دیکھا۔ میرے پیچھے شہناز کھڑی تھی۔

"تم اپنے کمرے میں رہو" ـــــ میں نے اُسے کہا۔

"نہیں دیکھنے آئی ہوں" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "اکیلے ڈر آتا ہے۔"

"اسے دیکھو!" ـــــ میں نے لاش کی طرف اشارہ کر کے کہا ـــــ "تمہارا ڈر دُور ہو جائے گا ....اسی سے ڈرتی تھیں نا! اب خدا سے ڈرو۔ اپنی ماں کو مرتے دیکھا تھا نا! اسے بھی دیکھ لو۔"

"نہیں" ـــــ شہناز نے ڈری ہوئی سی آواز میں کہا ـــــ "نہیں سکندر! ....میں اس کمرے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ تم بھی میرے ساتھ آ جاؤ۔"

"کچھ دنوں کے لئے مجھے بھول جاؤ شہناز!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میں جانتا ہوں کہ تم میں جرأت موجود ہے۔ ہمت سے کام لو۔"

میں نے اُسے کمرے سے نکال دیا، لیکن میں نے خود بھی محسوس کیا کہ میں اس کمرے میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکوں گا۔ میں بھی وہاں سے نکل آیا۔ دل پر ایسا بوجھ تھا کہ میں اس محل سے ہی بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن نوکری کی زنجیروں نے ایسا جکڑ رکھا تھا کہ میں اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

٥

نواب کی لاش کو اس طرح ریلوے سٹیشن پر پہنچایا گیا کہ اُسے سٹریچر پر ڈالا گیا جو نواب کے دواخانے سے ہی مل گیا۔ سٹریچر نواب کی دو گھوڑوں والی بگھی کی آمنے سامنے والی سیٹوں پر رکھا گیا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل نواب کے دو ملازموں کو ساتھ لے کر بگھی میں بیٹھے اور بگھی روانہ ہو گئی۔

یہ بگھی جدھر سے گزرا کرتی تھی اُدھر لوگ راستے میں رُک کر ماتھے پر ہاتھ رکھتے اور جھک جاتے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ نواب جب اس بگھی پر اپنی محدود سی ریاست میں سے گزرتا تھا تو بعض لوگ اس کے راستے میں دو زانو بیٹھ جاتے اور اتنا جھک جاتے تھے جیسے سجدہ ریز ہو گئے ہوں۔ اُس روز جب بگھی جا رہی تھی تو لوگ ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر نواب کی لاش کو دیکھنے کی کوشش کر تے تھے۔

میں خود بگھی کو جاتے دیکھتا رہا۔ ایک خیال میرے ذہن میں آیا کہ انسان کو انسان کا غلام بنا تے رکھنے کی یہ داستان ختم نہیں ہوگی۔ پہلے بھی دو نوابوں کی لاشیں یہاں سے نکلی ہیں۔ اب جس کمرے سے یہ ایک اور لاش نکلی ہے وہاں ایک اور نواب انسانوں کے خون پسینے اور عصمت و آبرو پر عیش و عشرت کرنے کے لئے آجائے گا۔

کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے کردار مر جاتے ہیں، کہانیاں ختم نہیں ہوتیں ..... وہ جو کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے ..... وہ دراصل ہزاروں دفعہ کا ذکر ہوتا ہے۔ سننے والے بدلتے رہتے ہیں اور سنانے والے بھی بدلتے رہتے ہیں۔

جب لاش گیٹ سے نکل گئی تو میں شہناز کے کمرے میں گیا اور اُسے بتایا کہ اُسے ایک بار پھر عدالت میں گواہ کے طور پر پیش ہونا پڑے گا۔ میں نے اُسے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا کہ اُس نے عدالت میں کیا کہنا ہے۔

"اور محتاط رہنا شہناز!" ___ میں نے کہا ___ "کہیں حمید اللہ کا ذکر نہ چھیڑ بیٹھنا۔ ہو سکتا ہے عدالت میں تم سے پوچھا جائے کہ حمید اللہ آیا تھا یا یہ کہ حمید اللہ آیا تھا اور فرار کس طرح ہُوا؟"

"مجھے ایک اور سوال کا جواب بتا دو" ___ شہناز نے مجھ سے پوچھا ___ "یہ تو مجھ سے پوچھا جائے گا کہ نواب نے مجھے اس قید خانے میں کیوں ڈالا تھا تو میں کیا جواب دوں گی؟"

"جواب یاد کر لو" ___ میں نے کہا ___ "تمہارے ساتھ جن دو آدمیوں کو

قید میں ڈالا گیا میں انہیں بھی سمجھا دوں گا۔ تمہارا جواب یہ ہوگا کہ نواب نے تم پر یہ الزام لگایا تھا کہ تم نے حمید اللہ کو پکڑوانے کی کوشش کی تھی ..... ظاہر یہ کرنا ہے کہ حمید اللہ کو نواب نے خود بلایا تھا اور تم نے مجھے اور انسپکٹر صوفی کو بتا دیا تھا کہ حمید اللہ یہاں ہے ..... اور تم نے یہ جھوٹ بھی بولنا ہے کہ نواب تمہیں حمید اللہ کے حوالے کرنا چاہتا تھا اور تم نے انکار کر دیا تھا اور اُس نے تمہیں اس کی سزا دی تھی۔"

یہ تو تفتیش اور مقدمے کی باتیں تھیں۔ پہلے تو میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ نواب کی موت خودکشی کی بجائے قتل کی واردات بھی ہو سکتی ہے۔ مہاراجوں اور نوابوں کی دنیا پُراسرار دنیا تھی۔ نواب یا مہاراجے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے عجیب و غریب چکر چلتے تھے اور جانشینی کے لئے تو بڑی ہی خوفناک سازشیں ہوتی تھیں۔ پُراسرار طریقے سے قتل کی وارداتیں تو اُس دنیا کا معمول تھا۔

میں نے شہناز کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ اُس کا اتنا حسین چہرہ مرجھا گیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے سر جھکا کر اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھ لیا۔ میں نے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اُس کا سر اُوپر کیا۔ آنسو اُس کے گالوں سے بہے جا رہے تھے۔ اُس نے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"میرا انجام کیا ہوگا سکندر!" ___ اُس نے کہا ___ "کیا خدا مجھے معاف نہیں کرے گا؟"

"اپنے دل پر اتنا زیادہ بوجھ نہ ڈالو شہناز!" ___ میں نے کہا ___ "ہم دُنیا کے اُس گوشے میں آگئے ہیں جہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔ ایسی جگہوں پر جو بھی آتا ہے وہ سنسنی خیز اور پُراسرار کہانیوں کا کردار بن جاتا ہے۔"

"تم مرد ہو سکندر!" ___ اُس نے کہا ___ "اور تم پولیس کے افسر ہو۔ اس سے بھی زیادہ بُرے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہو۔ مصیبتیں جھیل سکتے ہو۔ تمہارا تو حکم بھی چلتا ہے۔ میں عورت ہوں۔ میں کیا ..."

"میں کہتا ہوں اپنے آپ کو پریشان نہ کرو" ——— میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوتے کہا ——— "خدا کا شکر ادا کرو کہ میں تمہارے ساتھ ہُوں .... اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ خدا ہر بار مجھے تم تک پہنچا دیتا ہے۔"

"کبھی تمہیں دیکھتی ہوں تو کچھ اور ہی خیال آنے لگتے ہیں" ——— اُس نے کہا ——— "تم مجھے کمسن لڑکے نظر آنے لگتے ہو اور میں محسوس کرتی ہوں کہ تمہیں ان مصیبتوں سے بچاتے رکھنا میری ذمہ داری ہے۔ میں بیتاب ہونے لگتی ہوں کہ تمہیں اپنے سینے میں چھپا لوں، مگر سکندر! مجھے وہ وقت یاد آجاتا ہے جب تم کمسن تھے۔ میں نے اُس وقت تمہیں اپنے سینے میں چھپا لینے کی نہیں بلکہ اپنے سینے سے لگا لینے کی سوچی تھی .... وہ وقت یاد آتا ہے تو کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔"

"بھُول جاؤ شہناز!" ——— میں نے کہا ——— "یادوں اور تلخ سوچوں کو اُگل دو۔ اپنے ذہن کو اب آنے والے حالات کے لئے تیار کرو۔ ہو سکتا ہے میں تمہارے ساتھ ہی رہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم مجھے دو چار دن دیکھ ہی نہ سکو۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں باہر نکلا۔ تھانے کے ایک کانسٹیبل نے کہا کہ علاقہ ڈی۔ ایس۔ پی آیا ہے اور وہ مجھے بُلا رہا ہے۔ میں شہناز کو مزید تسلی دے کر چلا گیا۔ علاقہ ڈی۔ ایس۔ پی بھی انگریز تھا۔

"اندر کیا کر رہے تھے؟" ——— اُس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اُسے بتایا کہ میں اُس عورت کے پاس بیٹھا ہُوا تھا جو اس کیس میں گواہ ہے اور جسے میں نے نواب کے قید خانے سے نکالا ہے۔

"اُس کے پاس کیا کر رہے تھے؟" ——— اُس نے بڑے رُعب سے پوچھا۔

"صاحب بہادر!" ——— میں نے جواب دیا ——— "یہ عورت بہت ڈری ہوئی ہے۔ میں اُسے تسلی دے رہا تھا اور اُسے گواہی دینے کے لئے تیار کر رہا تھا۔"

"کسی عورت کے پاس مت بیٹھو" ——— اُس نے حکم کے لہجے میں کہا ——— "یہ تمہارا کام نہیں .... چلو میرے ساتھ۔"

۵

ڈی۔ ایس۔ پی مجھے اور سب انسپکٹر صوفی کو ساتھ لے کر اُس کمرے میں گیا جہاں شہناز بیٹھی ہوئی تھی۔ انگریز افسر کو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اُس وقت شہناز کو نہیں، اس ڈی۔ ایس۔ پی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے ڈی۔ ایس۔ پی کے چہرے پر ایسی تبدیلی دیکھی جیسے وہ شہناز کو دیکھ کر چونک پڑا ہو۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اُسے شک تھا کہ میں شہناز کے پاس اس لئے بیٹھا تھا کہ وہ بڑی حسین عورت ہے۔ یہ ڈی۔ ایس۔ پی بھی بڑی صاف اُردو بولتا تھا۔

"مت ڈرو" ——— اُس نے شہناز سے کہا ——— "ہم تمہارا بیان لیں گے ....

حمید اللہ خان ادھر آیا تھا؟"

"ہاں صاحب!" ——— شہناز نے جواب دیا ——— "آیا تھا۔"

"تم نے کہاں دیکھا تھا؟"

"نواب صاحب کے پاس بیٹھا ہُوا تھا" ——— شہناز نے جواب دیا ——— "مجھے نواب صاحب نے بلایا تھا اور کہا تھا کہ تم اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔"

"کیا نواب نے تمہارے ساتھ شادی کی تھی؟" ——— ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"نہیں" ——— شہناز نے جواب دیا ——— "نواب نے مجھے دھوکے سے اغوا کرا کے یہاں رکھا تھا۔"

"تم نے حمید اللہ کے ساتھ جانے سے انکار کیا تو تمہیں زبردستی اُس کے ساتھ کیوں نہ بھیجا گیا؟" ——— ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

"نواب نے مجھے کہا تھا کہ تمہیں بہت سخت سزا دوں گا" ——— شہناز نے جواب دیا ——— "میں نے پھر بھی اس کے ساتھ جانے سے انکار کیا اور میں نے

یہ بھی کہا کہ میرے ساتھ زبردستی کی گئی تو میں حمید اللہ کو پکڑوا دوں گی۔"

"نہیں" — ڈی۔ ایس۔ پی نے مُسکرا کر کہا — "یہ بیان ٹھیک نہیں۔ تم نواب کی حکم عدولی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں۔ اگر تم انکار کرتیں تو حمید اللہ خان تمہیں اُٹھا کر لے جا سکتا تھا... ٹھیک ہے .... فکر مت کرو۔ بیان ہو جائے گا۔"

ڈی۔ ایس۔ پی ایک بازو آگے کر کے ستھناز کے قریب چلا گیا اور بازو اس کی پیٹھ پر رکھ کر اُسے اپنے ساتھ لگا لیا پھر اُس کے کندھے پر تھپکی دے کر اُسے چھوڑ دیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے ایک بار پھر اُس نے پیچھے دیکھا۔ ہم باہر نکلے تو ڈی۔ ایس۔ پی نے اپنے ہاتھ سے دروازہ بند کیا۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے انگریزی میں کہا — "یہ بوڑھا حرامی اتنی خوبصورت لڑکیوں کو کیوں اپنے پاس رکھتا تھا؟" — وہ مجھ سے اور صوفی سے مخاطب ہُوا — "میں تم دونوں کو اس کمرے میں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا ... ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے صاحب بہادر!" — سب انسپکٹر صوفی نے نوکروں کی طرح جواب دیا۔

"کیوں صاحب بہادر!" — میں نے پوچھا۔

"اس کی خوبصورتی خطرناک ہے" — اُس نے کہا — "اور تم لوگ اس کے دھوکے میں آ سکتے ہو۔ ولایت میں اتنی خوبصورت عورت کم ہی دیکھنے میں آتی ہے .... اور تم!" — اُس نے خاص طور پر مجھے کہا — "اِس عورت سے زیادہ خطرناک ہو۔ میں کوئی عورت تمہارے حوالے کر کے تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔"

مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میرے جسم کے اندر آگ لگ گئی ہو۔ میں نے اپنے چہرے پر اور آنکھوں میں بھی تپش محسوس کی۔ یہ غصّہ تھا لیکن جس پر غصّہ آیا تھا وہ انگریز تھا اور وہ ڈی۔ ایس۔ پی تھا۔ یہ ایک غلام کا غصّہ تھا جو آقا پر آیا تھا۔ ایسا غصّہ باہر نہیں آیا کرتا۔

"ٹھیک ہے صاحب بہادر!" — میں نے اپنے آپ پر جبر کرتے ہُوئے کہا۔

یہ صاحب بہادر معلوم نہیں مجھے کیوں گھُور گھُور کر دیکھ رہا تھا۔ میں اسے اچھا لگ رہا تھا یا وہ مجھے مشتبہ سمجھ رہا تھا۔ میں نے یہ تو کئی بار محسوس کیا تھا کہ ہم لوگ انگریزوں کے غلام ہیں لیکن پہلی بار مجھ میں یہ احساس بیدار ہُوا کہ غلامی کتنی بڑی لعنت ہے۔ مجھے خواجہ صاحب کے الفاظ یاد آنے لگے۔ اُنہوں نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان کیا تھے اور کیا بنا دیئے گئے ہیں۔ اُنہوں نے مجھے مسلمانوں کے جہادِ آزادی کی تاریخ بھی سنائی تھی۔

خواجہ صاحب کی یہ باتیں سُن کر میں نے اپنے آپ کو بھی پہچان لیا تھا ہوں نے مجھے میری شناخت بتا دی تھی۔

آپ پوچھیں گے کہ میں اتنا ہی غیوّر تھا تو میں نے انگریزوں کی نوکر۔ چھوڑ کیوں نہ دی؟

میں اس سوال کا جواب ابھی نہیں دوں گا۔ آپ نہیں سمجھ سکیں گے س سوال کا جواب اُس وقت کے لوگ دے سکتے ہیں۔

اس ڈی۔ ایس۔ پی نے نواب کا کمرہ دیکھا۔ یہ پوچھنے سے پہلے کہ نواب کی لاش کہاں پڑی تھی اور لاش کس پوزیشن میں پڑی تھی یا وہ اس واردات کے متعلق کچھ پوچھتا، اُس نے نواب کے کمرے کی چیزیں دیکھنی شروع کر دیں۔ وہاں سجاوٹ کی ایسی ایسی چیزیں رکھی تھیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے ان میں سے بعض چیزیں اس انگریز ڈی۔ ایس۔ پی نے بھی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

نواب کے پلنگ کے قریب تکیے کی طرف ایک تپائی رکھی تھی جس کے پائے اس طرح تھے کہ دو شیر پچھلی ٹانگوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی اگلی ٹانگیں سیدھی تھیں۔ یہ ہاتھی دانت کے بنے ہوئے تھے۔ ان پر چوتھائی اِنچ موٹا شیشہ رکھا ہُوا تھا۔ اس پر ایک خوش نما صراحی بڑی لمبی گردن والی رکھی تھی اور شراب پینے والا ایک کپ تھا۔

تپائی پر ایک انگوٹھی پڑی تھی جس میں قیمتی پتھر جڑا ہُوا تھا۔ یہ بہت ہی قیمتی ہو گا کیونکہ یہ نواب کی انگوٹھی تھی۔ انگریز صاحب بہادر نے انگوٹھی اُٹھا کر اپنی ایک انگلی میں چڑھا کر ہمیں دکھائی۔ اُس نے انگریزی میں کسی پتھر کا نام لیا۔

"تمہاری زبان میں اِسے نیلم کہتے ہیں" — اُس نے ہمیں بتایا — "اگر میں ولایت میں اپنا مکان بیچ دوں تو بھی میں یہ پتھر نہیں خرید سکتا۔ یہ شیطان بہت امیر آدمی تھا" — وہ اچانک آقاؤں کے رُعب میں آگیا۔ بڑے بارُعب لہجے میں اُس نے ہم دونوں سے پوچھا — "تم دونوں نے یہاں سے کوئی چیز اُٹھائی تو نہیں؟"

"نہیں صاحب بہادر!" — سب انسپکٹر صوفی نے ایڑیاں بجا کر جواب دیا۔

"اور تم؟" — اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"صاحب بہادر!" — میں نے جواب دیا — "میں مفرور قیدی حمید اللہ خان کی اطلاع پا کر یہاں آیا تھا۔ نواب نے مجھے مُنہ مانگی رشوت پیش کی تھی۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں اس کے حرم میں جا کر کوئی لڑکی پسند کر لوں اور اُسے اپنے پاس رکھوں۔ نواب اتنا ڈرا ہُوا تھا کہ میں اس سے جو مانگتا وہ دے دیتا مگر صاحب بہادر! میں نے کچھ نہیں لیا۔"

"کیوں نہیں لیا؟" — ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا — "میں نہیں مانتا کہ تم نے اُس سے کچھ نہیں لیا۔ اگر نہیں لیا تو تم بیوقوف ہو۔"

"میں لے لیتا تو وہ مجھ سے غلط رپورٹ لکھواتا" — میں نے کہا — "میں اپنی ڈیوٹی میں بے ایمانی کرتا۔"

"تم انڈین لوگ عقل سے کام نہیں لیتے" — ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا — "یہ تمہیں جو کچھ دیتا تھا وہ لے لیتے اور ڈیوٹی میں بے ایمانی بھی نہ کرتے۔ اس شیطان نے یہ شان و شوکت اپنی محنت سے حاصل نہیں کی۔"

وہ باتیں کرتا کرتا باہر آگیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اُس نے نواب کی انگوٹھی اپنی

انگلی سے اُتاری نہیں تھی۔

* * *

انسپکٹر ڈلکاکس اور میرے ہیڈ کوارٹر کا کوئی انگریز افسر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ انہیں یہاں آنے کی کوئی جلدی نہیں۔ یہ ان کا کیس نہیں تھا۔ یہ اس علاقے کے تھانے کا کیس تھا چونکہ یہ ایک نواب کی موت کا کیس تھا اور اس کا تعلق حمید اللہ خان کے ساتھ بھی تھا اس لئے سپیشل برانچ کے افسروں کا آنا لازمی تھا۔

رات ہو گئی تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ صبح آئے گا۔ میں نے دیکھا، نواب کی انگوٹھی اُس کی انگلی میں تھی جو اُس کے ساتھ ہی چلی گئی۔ سب انسپکٹر صوفی بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ پولیس کی کچھ نفری ایک ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ میرے پاس رہ گئی۔

میں نے شہناز کے ساتھ کھانا کھایا اور میں خواجہ صاحب کے پاس چلا گیا۔ انہیں میں نے پریشانی کی حالت میں دیکھا۔

"نواب کی موت نے آپ کو مغموم کر دیا ہے" — میں نے کہا — "آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آپ کہاں جائیں گے۔"

"نہیں بیٹا!" — اُنہوں نے کہا — "جانا کہاں ہے۔ میں یہیں رہوں گا۔ پریشان اس لئے ہوں کہ حمید اللہ خان سزا یافتہ اور مفرور نہ ہوتا تو آج اپنے باپ کا جانشین ہوتا۔ اب اس کا چھوٹا بھائی سرکاری طور پر نواب بنے گا۔"

خواجہ صاحب کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ نواب کون بنے گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ علاقہ ڈی۔ ایس۔ پی نے میرے ساتھ کیا باتیں کیں ہیں اور مجھے اُس پر بہت غصہ ہے۔ میں نے اُنہیں یہ بھی بتایا کہ شہناز کو اس نے کس طرح دیکھا اور مجھے کیا کہا تھا، اور انہیں یہ بھی بتایا کہ ڈی۔ ایس۔ پی نواب کی انگوٹھی لے گیا ہے۔

"ابھی تو یہ ایک ڈی۔ ایس۔ پی آیا ہے" — خواجہ صاحب نے کہا — "کل دیکھنا یہاں کتنے انگریز افسر آئیں گے۔ میں یہیں بوڑھا ہُوا ہوں سکندر!

یہاں کوئی نہ کوئی انگریز افسر آیا ہی رہتا ہے۔ یہ یہاں عیش وعشرت کے لئے آتے ہیں۔ اب تو بڑا اچھا موقع پیدا ہو گیا ہے۔ ڈی۔ایس۔پی نے آج شہناز کو دیکھا ہے۔ کل آئے گا تو رات شہناز کے کمرے میں گزارے گا۔"

"ایسا نہیں ہونا چاہیئے خواجہ صاحب!" — میں نے کہا۔

"سکندر!" — خواجہ صاحب نے جھنجھلا کر کہا — "میں تمہیں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس عورت کو ذہن اور دل سے اتار دو۔ میں اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے بوڑھا نہیں ہو گیا۔ میں بھی تمہاری طرح جوان رہ چکا ہوں۔ کہتے ہیں کہ عورت مردوں کو انگلیوں پر نچا دیتی ہے لیکن میں نے جوانی میں بڑی بڑی حسین عورتوں کو انگلیوں پر نچایا ہے۔ میں موسیقی میں ہی نہیں ڈوبا رہا۔ میں تمہارے جذبات کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ شہناز کے حُسن کا جادو تم پر چل گیا ہے۔"

"نہیں خواجہ صاحب!"

"میں جانتا ہوں تم دونوں ایک ہی باپ کی اولاد ہو" — خواجہ صاحب نے کہا — "لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اُسے بہن نہیں کہتے اور وہ تمہیں بھائی نہیں کہتی .... اور میں یہ مان لیتا ہوں کہ شہناز کے معاملے میں تمہاری نیت صاف ہے، بالکل پاک ہے لیکن سکندر! جوانی اندھی ہوتی ہے اور جذبات عقل کو ماؤف کر دیتے ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ تم دونوں اندھے ہو کر بھول جاؤ گے کہ تم ایک باپ کی اولاد ہو۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا خواجہ صاحب!" — میں نے کہا — "آپ یہ نہ بھولیں کہ اُس نے حمید اللہ کو یہاں سے کس طرح نکالا ہے اور آپ کو حمید اللہ سے کتنا پیار ہے۔ شہناز خود نواب کے پاس نہیں آتی۔ وہ زندگی کو صحیح راستے پر چلانے کے لئے شادی کے دھوکے میں یہاں پہنچا دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُسے اب مرد کے جسم سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"تم کرنا کیا چاہتے ہو؟" — خواجہ صاحب نے پوچھا۔

"میں اسے انگریز افسروں سے بچانا چاہتا ہوں" — میں نے کہا — "ایک تو میں نے خود ڈی۔ایس۔پی کو اُسے بڑی غلیظ نظروں سے دیکھتے ہوئے

دیکھا ہے، اور اب آپ نے بھی کہہ دیا ہے کہ انگریز افسر یہاں آ کر من مانی کریں گے۔"

"تم اُسے کس طرح بچاؤ گے؟"

"اگر مجھے موقع مل گیا تو میں اسے آپ کے گھر چھوڑ جاؤں گا" — میں نے کہا اور پوچھا — "کیا آپ اسے یہاں چھپا لیں گے؟ .... میری خاطر۔"

"چھپا لوں گا" — خواجہ صاحب نے کہا — "لیکن یہ خیال رکھنا کہ کوئی دیکھ نہ لے ورنہ اُسے یہاں سے بلا لیں گے .... اور یہ بھی سوچ لو سکندر! وہ اس ہنگامے کی بڑی اہم گواہ ہے اور یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تمام گواہوں کو پیش کرو۔ تمہارے افسر اُسے بیان کے لئے بلائیں گے۔ وہ اسے اسی بہانے جتنے وقت تک کے لئے چاہیں اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔"

"خواجہ صاحب!" — میں نے کہا — "صرف اس ایک انگریز ڈی۔ایس۔پی کے رویے سے میری جذباتی حالت یہ ہو گئی ہے کہ میں اپنی نوکری بھی خطرے میں ڈالنے کو تیار ہوں۔ یہاں سوال صرف شہناز کا نہیں۔ میں اپنے وقار کو مجروح نہیں ہونے دوں گا۔ اس ڈی۔ایس۔پی کا صرف یہ پوچھنا کہ تم نے یہاں سے کوئی چیز اُٹھائی تو نہیں، میرے لئے بڑی ننگی گالی ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی مدد کی ضرورت پڑے تو آپ مدد کر دیں۔"

خواجہ صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ وہ میری جذباتی حالت سمجھ گئے تھے۔

"میں نے جو کچھ سوچا ہے، تم شاید اُس کے مطابق نہ چل سکو" — خواجہ صاحب نے کہا — "تم غالباً سمجھے نہیں کہ کتنا بڑا خطرہ مول لے رہے ہو۔ اگر شہناز کے معاملے میں تم نے انگریز افسروں سے ٹکر لے لی تو میں بتا نہیں سکتا کہ تمہارا کیا حال ہوگا۔ کیا تم فرار ہونے کے لئے تیار ہو؟"

"میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گے" — میں نے کہا — "مجھے بتائیں۔"

"ابھی نہیں" — خواجہ صاحب نے کہا — "ہو سکتا ہے کچھ بھی نہ ہو اور بہت کچھ ہونے کا خطرہ بھی ہے۔ میں اس کے مطابق بتاؤں گا کہ

تم کیا کرو۔“

باتوں باتوں میں رات آدھی گزر گئی۔ خواجہ صاحب کے کہنے پر میں وہیں سو گیا۔ صبح ابھی تاریک تھی جب ایک کانسٹیبل مجھے بلانے آیا۔ میں انہیں بتا آیا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کانسٹیبل نے بتایا کہ لاش آ گئی ہے اور سب انسپکٹر صوفی بھی آیا ہے۔ میں فوراً پہنچا۔ میرا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ اب سارے کام صوفی نے کرنے تھے۔ میں اس لئے وہاں چلا گیا کہ میں ڈیوٹی پر وہاں موجود تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا گیا تھا کہ موت زہر خورانی سے واقع ہوتی ہے۔ نواب کی لاش اُس کے وارثوں کے حوالے کر دی گئی۔ اُس کے وارثوں کا ایک ہجوم تھا۔ کئی تو اُس کے بیٹے تھے۔ کچھ اُس کی بیویوں کے اور بعض اُن عورتوں کے جنہیں نواب نے نکاح کے بغیر بیویاں بنا رکھا تھا۔

نواب کی لاش پر کوئی رونے والا بھی نہیں تھا۔ اُس کے لواحقین اور متعلقین کا ہجوم تھا لیکن کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں تھا۔ میں نے چند ایک جوان لڑکیاں بھی دیکھیں۔ اُن کے چہروں پر غم کا ہلکا سا تاثر بھی نہیں تھا۔ لاش آتے ہی اُس کے کفن دفن کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ وہ زندہ تھا تو سب مکھیوں کی طرح اُس پر بھنبھناتے تھے اور انعام و اکرام کے لالچ میں اُس کی جوتیاں چاٹتے تھے۔ اُس کے آگے رکوع و سجود کرتے تھے مگر اب وہ اُن کے لئے مُردار بن گیا تھا۔ وہ چیری پھاڑی ہوئی لاش تھا جسے بڑی جلدی قبر میں پھینک دینے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

وہ سترہ اٹھارہ برس عمر کا ایک خوبصورت نوجوان تھا جو قانون کے مطابق اُس کا جانشین تھا۔

”میرا نام مراد علی خان ہے“ ــــ اُس نے میرے پاس آ کر ہاتھ آگے بڑھایا اور کہا ــــ ”میں نواب کا بیٹا ہوں۔ اب ریاست کی ساری ذمہ داریاں میرے کندھوں پر آ پڑی ہیں ․․․․ آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟ ․․․․ مجھے بتانا۔“

دن کا ایک بج رہا تھا جب نواب کو دفن کر دیا گیا۔ اس سے گھنٹہ ڈیڑھ بعد علاقہ ڈی ایس پی آ گیا۔ سب انسپکٹر صوفی گواہوں کے بیان لیتا رہا۔ اُس نے نوابزادہ مراد علی خان سے پوچھا کہ اُسے کسی پر شک ہو کہ اُس کے باپ کو قتل کی نیت سے زہر دیا گیا ہے تو بتا دے۔

”بالکل نہیں“ ــــ نوابزادے نے جواب دیا ــــ ”کسی پر شک نہیں۔ میری طرف سے کوئی رپورٹ نہیں۔ حکیم صاحب ایسے آدمی نہیں۔ آپ میرا بیان لکھ سکتے ہیں کہ نواب صاحب نے خودکشی کی ہے۔“

”خودکشی لکھ لو“ ــــ ڈی ایس پی نے حکم دیا ــــ ”نوابزادہ صاحب کے اور دو تین ذمہ دار آدمیوں کے بیان لکھ کر کیس ختم کر دو“ ــــ اُس نے نوابزادہ کی طرف دیکھا اور مُسکرا کر اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا ــــ ”مبارک ہو مراد علی خان!“

مراد علی خان نے قہقہہ لگا کر ڈی ایس پی سے ہاتھ ملایا جیسے اُس کے باپ نے اپنی زندگی میں اُسے اپنی گدّی پر بٹھا دیا ہو۔ ڈی ایس پی چلا گیا۔

ہمیں وہ رات بھی وہیں گزارنی پڑی۔ اگلی صبح مجھے تھانے سے اطلاع ملی کہ میرے افسر آ رہے ہیں۔

دن کے ڈیڑھ بجے میرے ہیڈ کوارٹر کے تین انگریز افسر آ گئے۔ ایک میرا ایس پی تھا۔ دوسرا انسپکٹر ڈلکاکس اور تیسرا بھی انسپکٹر تھا۔ محل میں ایک بار پھر چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ شک تک نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کوئی انسان مر گیا ہے حالانکہ مرنے والا اہم شخصیت تھا۔

”سب انسپکٹر سکندر!“ ــــ انسپکٹر ڈلکاکس نے مجھے اپنے پاس بلا کر کہا ــــ ”کیا تم شہناز کے کمرے میں جا کر بیٹھتے رہے ہو؟“

”ہاں صاحب!“ ــــ میں نے جواب دیا۔

”کیا کرتے رہے ہو وہاں؟“ ــــ اُس کے لہجے میں انگریز دل والا رُعب

اور غصہ تھا۔

"ایک تو اُسے گواہی کے لئے تیار کرتا رہا ہوں"۔۔۔ میں نے جواب دیا ۔۔۔"وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ وہ بڑے خوفناک قید خانے میں رہی ہے۔ میں ۔۔۔۔"

"تم بدمعاشی کرتے رہے ہو"۔۔۔ وِلکاکس نے کہا ۔۔۔"شہناز بدمعاش عورت ہے۔ میں جانتا ہوں تم دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ تم کہتے ہو کہ اُسے دھوکے سے نواب کے پاس لایا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ خود نواب کے پاس آئی تھی"۔

"صاحب بہادر!"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔"آپ مجھے حکم دیں میں کیا کروں اور میں نے کوئی جرم کیا ہے تو اُس کی سزا دیں"۔

"اس علاقے کے ڈی ایس پی صاحب نے تمہاری اچھی رپورٹ نہیں دی" ۔۔۔ وِلکاکس نے کہا۔

"اُن کی رپورٹ غلط ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔

"شٹ اپ!"۔۔۔ وِلکاکس نے کہا ۔۔۔"ڈی ایس پی صاحب جھوٹ نہیں بول سکتا"۔

"اور جھوٹ میں بھی نہیں بول سکتا انسپکٹر صاحب بہادر!"۔۔۔ میرے لہجے میں جرأت اور تلخی تھی۔

"ہم تمہیں سپیشل برانچ سے نکال دیں گے"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔"تمہارا دماغ ٹھیک نہیں رہا"۔

یہ تھی غلامی۔ ایک انگریز ایک ایسے انگریز کی رپورٹ کو صحیح مان رہا تھا جو مجھے جانتا ہی نہیں تھا۔ علاقہ ڈی ایس پی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ میں نے سپیشل برانچ میں کیسے کیسے کارنامے کر دکھاتے ہیں۔ اُسے صرف یہ شک ہو گیا تھا کہ میں شہناز کے پاس بُری نیت سے جاتا ہوں۔ اُسے میرے اور شہناز کے تعلق کا علم ہی نہیں تھا لیکن وِلکاکس نے اُس کی رپورٹ کو سچ مان لیا اور مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

میں خاموش رہا لیکن میرے سینے میں طوفان اُٹھا جسے میں دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے افسوس اس پر ہو رہا تھا کہ انسپکٹر وِلکاکس کے ساتھ میری اور سلطان احمد کی دوستانہ بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔ اس ڈی ایس پی نے وہ ختم کرا دی تھی۔ پھر مجھے اس پر افسوس آیا کہ میں نے سروس کے ابتدا میں ہی جب میں ابھی ناتجربہ کار تھا، پختہ کار افسروں سے بڑھ کر کام کئے تھے، دہشت گرد گروہ توڑے تھے۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا مگر وِلکاکس نے میری اس کارکردگی پر بھی پانی پھیر دیا۔

مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے کوئی حادثہ ہونے والا ہے۔ میں غصے پر قابو پا لیا کرتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو غصے سے کبھی جلایا نہیں تھا لیکن یہ غصہ کچھ اور ہی طرح کا تھا۔ میں کُڑھا نہیں، دانت نہ پیسے اور میں پریشان بھی نہ ہُوا لیکن میں کچھ اس طرح محسوس کرنے لگا جیسے غصہ کوئی ایسی صورت اختیار کر رہا ہے جسے میں ابھی سمجھ نہیں سکتا۔



اس سے تقریباً دو گھنٹے بعد کا واقعہ ہے۔ میں نے خواجہ صاحب کو دیکھا۔ وہ محل کے ایک ملازم کے ساتھ تیز تیز چلتے آ رہے تھے۔ وہ اُس طرف چلے گئے جہاں کسی کمرے میں انگریز افسر بیٹھے ہُوتے تھے۔

کچھ دیر بعد خواجہ صاحب واپس آ گئے۔ میں ایک طرف اوٹ میں ہو گیا تاکہ خواجہ صاحب کے ساتھ باتیں کرتے کوئی افسر نہ دیکھ لے۔ خواجہ صاحب اِدھر ہی آ گئے۔

"میرے افسروں نے بلایا تھا خواجہ صاحب؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"ہاں!"۔۔۔ خواجہ صاحب نے آہ بھر کر کہا ۔۔۔"صاحب بہادر رات کو لڑکوں کا ناچ دیکھنا چاہتے ہیں۔ مجھے انتظام کرنے کا حکم ملا ہے"۔

"کیا کہہ رہے آپ خواجہ صاحب؟"۔۔۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا ۔۔۔"ابھی تو وہ بوڑھا پوری طرح قبر میں بھی نہیں اُترا"۔

"یہاں تو لاشوں پر بھی ناچ ہُوا کرتا ہے سکندر بیٹا!"۔۔۔ خواجہ صاحب نے

کہا —"پندرہ سولہ برس گزرے، نواب نے اپنی ایک بیگم کو زہر دلوایا تھا۔ اُدھر ایک کمرے میں بیگم کو دھوکے میں زہر دے دیا گیا تھا۔ وہ مر رہی تھی اور نواب صاحب باہر باغ میں دو انگریز افسروں کے اعزاز میں جشن منا رہے تھے۔ ناچ گانا ہو رہا تھا۔ دونوں انگریز افسر شراب میں بدمست نواب کے حرم کی ایک ایک لڑکی کو اپنے ساتھ بٹھاتے ہوتے بیہودہ حرکتیں کر رہے تھے۔ دوسرے دن بیگم کو خاموشی سے دفن کر دیا گیا۔"

"آج رات کا جشن تو مجھے بڑا ہی عجیب لگتا ہے"— میں نے کہا — "میرا ذہن تسلیم نہیں کر رہا۔"

"یہ مراد علی خان کا جشن ہوگا"— خواجہ صاحب نے کہا —"اُسے باپ کے مرنے کا غم تو نہیں خوشی ہے۔ اُسے نوابی مل گئی ہے۔ یہاں کسی کی موت کا ماتم نہیں کیا جاتا .... تم بھی یہیں ہو۔ رات کو اپنی آنکھوں دیکھ لینا۔ یہ انگریز افسر جو آئے ہیں، رات کو مہاراجہ اِندر بنے ہوتے ہوں گے .... اور سکندر! آج رات تم شہناز کو نہیں بچا سکو گے۔"

"میں اُسے بچانا چاہتا ہوں خواجہ صاحب!"

"کیوں پریشان ہوتے ہو سکندر!"— خواجہ صاحب نے کہا —"شہناز کہاں کی شریف عورت ہے۔ آج رات اُسے بھی عیش موج کرنے دو۔"

"یہ اُس پر زبردستی ہوگی خواجہ صاحب!"— میں نے کہا۔

"شراب کے دو گھونٹ اُس کے اندر جائیں گے تو سب بھول جائے گی" — خواجہ صاحب نے کہا —"وہ جو نہیں چاہتی وہ بھی چاہنے لگے گی۔"

"میں ایسا نہیں چاہتا خواجہ صاحب!"— میں نے کہا —"مجھے ان انگریز افسروں سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں برداشت نہیں کر سکوں گا کہ شہناز ان کی تفریح کا ذریعہ بنے"— اچانک میری ذات سے ایک شعلہ اُٹھا۔ میری زبان کانپنے لگی۔ میں نے کہا —"خواجہ صاحب! آپ نے کہا تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کا نہیں اور یہ انگریزوں کا بھی نہیں۔ آپ نے مجھے بتایا تھا کہ اس ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانا ہے .... کیا آپ انگریزوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں جو مجھے کہہ رہے ہیں کہ شہناز

کو ان انگریز افسروں کے پاس جانے دو اور اسے شراب پینے دو؟"

"آہستہ سکندر! آہستہ بولو"— خواجہ صاحب نے کہا —"مجھے بتاؤ میں شہناز کو کس طرح بچا کر رکھوں؟"

"اسے اپنے گھر میں چھپا لیں"— میں نے کہا۔

"شام کے بعد اُسے اس طرح میرے گھر لے آنا کہ کوئی دیکھ نہ سکے"— خواجہ صاحب نے کہا۔

ہم نے شہناز کو روپوش کرنے کا طریقہ سوچ لیا اور خواجہ صاحب چلے گئے۔



یہ جشن نہیں تھا، ناچ گانے کی محفل تھی۔ اس کا انتظام محل سے کچھ دُور ایک میدان میں کیا گیا تھا۔ رقص زیادہ تر لڑکیوں کا ہونا تھا۔ میں بھی ایسا ہی رقاص رہ چکا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ دو بہترین ناچنے والی لڑکیوں کا رقص بھی تھا۔ شام کو میں موقع محل دیکھ کر شہناز کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ پہلے کی طرح پریشان تھی۔ اُس کے پلنگ پر ریشمی ساڑھی پڑی تھی۔

"سُنا ہے آج رات نوابزادہ باپ کی موت کا جشن منا رہا ہے!"— میں نے کہا۔

"تھوڑی دیر ہوتی نوابزادہ آیا تھا"— شہناز نے کہا —"اُس نے مجھے یوں اپنے بازوؤں میں لے لیا جیسے میں اُس کے انتظار میں بے چین بیٹھی تھی۔ کہنے لگا کہ تم میری ہو۔ آج ایک انگریز صاحب نے تمہاری فرمائش کی ہے۔ کہتا تھا کہ یہ تو اس محل کا ہیرا ہے .... مجھے بتاؤ سکندر! میں کیا کروں۔ وہ تو کہہ گیا ہے کہ میں شام کا کھانا انگریز افسروں کے ساتھ کھاؤں گی۔ اُس نے بتایا ہے کہ چار یا پانچ اور لڑکیاں بھی ہوں گی۔ خادمہ یہ ساڑھی رکھ گئی ہے۔"

"خواجہ صاحب کا گھر جانتی ہو کہاں ہے؟"

"نہیں!"— شہناز نے جواب دیا —"یہ جانتی ہوں کس طرف ہے۔"

"اندھیرا ہو جانے دو"— میں نے کہا —"اوپر کمبل یا کھیس لے لینا میں

تم سے دُور آگے آگے جاؤں گا۔ تم میرے پیچھے آجانا۔ میں تمہیں خواجہ صاحب کے گھر میں داخل کر دوں گا۔"

"کیا یہ لوگ مجھے ڈھونڈیں گے نہیں؟" — شہناز نے پوچھا۔

"میں نے ابھی اور کچھ نہیں سوچا" — میں نے کہا — "ایک گھوڑے کا انتظام ہے۔ خواجہ صاحب نے حمید اللہ خان کے دوست آفتاب کو پیغام بھیج دیا ہوگا۔ وہ اصطبل کا انچارج ہے۔ ضرورت پڑی تو گھوڑا تیار ملے گا۔"

میں شہناز کے کمرے میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ علاقہ ڈی ایس پی اور انسپکٹر وِلکاکس نے شہناز کے کمرے میں جانا میرے لئے جرم بنا دیا تھا۔ میں جانتا تھا وہ اس وقت کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہ کوئی انکوائری نہیں کر رہے تھے۔ وہ عیش و عشرت کرنے آئے تھے۔ میں اور سب انسپکٹر صوفی اب اردلی بن گئے تھے اور اس انتظار میں برآمدے میں ٹہل رہے تھے کہ صاحب بہادر کا کوئی حکم آئے گا تو فوراً تعمیل کریں گے۔

محل کے تمام ملازم اُسی طرف اکٹھے ہو گئے تھے جہاں انگریز افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے خطرہ کم ہو گیا تھا کہ شہناز کو یہاں سے نکلتے کوئی دیکھ لے گا۔

۵

آخر وہ وقت آگیا۔ میں شہناز کے کمرے سے دُور کھڑا تھا۔ اُس کی خادمہ کو میں نے اُس کے کمرے میں جاتے دیکھا تو میں پریشان ہو گیا۔ خادمہ کی موجودگی میں وہ کمرے سے نہیں نکل سکتی تھی لیکن مجھے پوری امید تھی کہ شہناز کسی بہانے خادمہ کو چلتا کرے گی۔ شہناز بہت ہوشیار اور چالاک بن چکی تھی۔ وہ خطرہ بھی مول لے سکتی تھی۔

چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے خادمہ کو کمرے سے نکلتے دیکھا۔ اُس کے جانے کے چند منٹ بعد شہناز نے دروازے میں آکر دائیں بائیں دیکھا۔ میں زور سے کھانسا۔ شہناز نے میری طرف دیکھا اور کمرے میں چلی گئی۔

اب وہ باہر آئی تو اُس کے اُوپر چادر تھی جو گھُٹنوں سے نیچے تک چلی گئی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے برآمدے سے بھی نکل گئی۔ میں خواجہ صاحب کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں جس طرف جا رہا تھا اُدھر روشنی کم تھی۔ شہناز بھی محل کی روشنیوں سے جلدی نکل آئی۔ آگے درخت اور پودے تھے اور ایک جگہ باڑ بھی تھی جس نے شہناز کو چھپا لیا۔

پھر تاریک علاقہ آگیا۔ اس سے آگے خواجہ صاحب کا گھر تھا۔ پہلے میں وہاں پہنچا اور خواجہ صاحب کے گھر میں داخل ہو گیا۔ خواجہ صاحب نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ گھر میں نہیں ہوں گے اور اُن کا نوکر بھی نہیں ہوگا۔

شہناز بھی آگئی۔ میں نے اُسے اندر کے ایک کمرے میں بٹھا دیا اور وہ دروازہ بند کر کے باہر سے زنجیر چڑھا دی۔ میں نے شہناز کو تسلی دے دی تھی کہ وہ ڈرے نہیں۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اب وہ کسی بھی مصیبت کے لئے تیار رہے اور کوشش کی جائے گی کہ بھاگ چلیں۔

میں نے سوچے سمجھے بغیر کبھی کوئی کام نہیں کیا تھا۔ البتہ خطروں میں کُود جانا میری سرشت میں تھا لیکن شہناز کو چھپا کر میں نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس سے آگے کیا کروں گا۔ بہت بڑا خطرہ تھا جو میں نے مول لے لیا تھا۔ خود نوابزادہ مراد علی خان شہناز کو کہہ گیا تھا کہ ایک انگریز افسر نے اُس کی فرمائش کی ہے اور وہ انگریز افسروں کے ساتھ کھانا کھائے گی۔

کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ شہناز کو بلانے آتے ہوں گے اور نہ ملنے پر اُس کی تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہر جگہ شہناز کو تلاش کیا جاتا۔ مجھے پتہ چل رہا تھا کہ میں یہیں شہناز کے پاس ٹھہروں یا محل میں چلا جاؤں اور دیکھوں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور اس کے مطابق کارروائی کروں۔

خواجہ صاحب چلے گئے تھے۔ اُنہوں نے ناچنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو اور سازندوں کو تیار کرنا تھا اور محفل ختم ہونے تک انہیں وہیں رہنا تھا۔ انہوں نے ایک گھوڑے کا انتظام تو کر دیا تھا لیکن ابھی ہم نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ بھاگنے کی صورت میں ہم جائیں گے کہاں۔ ابھی تو یہ دیکھنا تھا کہ شہناز

کے لاپتہ ہونے کا شک مجھ پر کیا جا رہا ہے یا نہیں۔

مجھے بھولے سے بھی خیال نہ آیا کہ شہناز کو واپس اُس کے کمرے میں لے جاؤں اور اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دوں اور اپنی نوکری کو خطرے میں نہ ڈالوں۔ شہناز میرے لئے ایک چیلنج بن گئی تھی اور میرے لئے یہ ارادہ پتھر پر لکیر کی مانند ہو گیا تھا کہ شہنانہ کو انگریز افسروں کے پاس نہیں جانے دوں گا۔

میں محل کی طرف چلا گیا۔

۵

ایک کانسٹیبل نے مجھے بتایا کہ سب انسپکٹر صوفی مجھے ڈھونڈ رہا ہے۔ میں اُس کے پاس چلا گیا۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے؟" — صوفی نے پوچھا اور کہنے لگا — "ہمیں کھانے کے لئے بلایا جا رہا ہے .... شہناز کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ ایک نوکر کچھ پریشان سا دوڑتا پھر رہا تھا۔ میرے پاس رُک گیا اور اپنے آقاؤں کو، انگریز افسروں اور شہناز کو گالیاں دے کر کہنے لگا کہ نواب کی ایک فاحشہ نہیں مل رہی۔ کہتا تھا کہ یہ نواب زادہ ناچ گانا کرا کے اپنے باپ کی قتل کرا رہا ہے۔"

"ڈھونڈتے رہیں صوفی صاحب!" — میں نے کہا — "ہماری مجبوری ہے کہ یہاں موجود رہنا ہے۔ ایک منٹ یہاں ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

ہمارے لئے ایک اور کمرے میں کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے لئے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ بھوک ہی ماری گئی تھی۔ میرے ذہن پر شہناز سوار تھی اور میں بے خیالی میں کھانا کھا رہا تھا۔ ایک نہیں چار پانچ کھانے تھے۔ روسٹ گوشت بھی تھا۔ ایسی ضیافت تو میں خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن پیٹ اُن نوالوں کو قبول ہی نہیں کر رہا تھا جو میں زبردستی حلق میں ٹھونس رہا تھا۔

میں کھانا کھا ہی رہا تھا کہ ہمارے ہیڈ کوارٹر کے ایس پی کا اردلی جو اُس کے ساتھ آیا تھا، میرے پاس آیا اور میرے کان میں کہا کہ انسپکٹر وِلکاکس

مجھے بلا رہا ہے۔ میں کھانا چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ محل کے دوسرے حصّے میں ایک برآمدے میں کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ علاقہ ڈی ایس پی تھا۔

"شہناز کہاں ہے؟" — وِلکاکس نے مجھ سے پوچھا۔

"شہناز؟" — میں نے حیران ہو کر کہا — "وہ میرے پاس تو نہیں تھی صاحب! میں اُس کے کمرے میں بھی نہیں گیا۔"

"شہناز کہاں ہے؟" — اُس نے چھڑی کا سِرا میرے کندھے پر رکھ کر رُعب سے پوچھا — "تم جانتے ہو وہ کدھر چلی گئی ہے۔"

"میں کیسے جان سکتا ہوں صاحب بہادر!" — میں نے تحمّل سے کہا — "آج دوپہر کے بعد سے اب تک میں نے اُس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

"تم شام کو اُس کے کمرے میں گئے تھے" — وِلکاکس نے اپنی دو فٹ لمبی چھڑی آہستہ آہستہ میرے کندھے پر مارتے ہُوئے کہا — "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

میں نے اپنے کندھے کی طرف دیکھا جس پر وہ آہستہ آہستہ چھڑی مار رہا تھا۔

"انسپکٹر وِلکاکس صاحب!" — میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا — "میرے ساتھ زبان سے بات کریں چھڑی کے ساتھ نہیں۔ میں سن سکتا ہوں سمجھ بھی سکتا ہوں۔"

"اِسے لائن حاضر کر دو" — علاقہ ڈی ایس پی نے انگریزی میں وِلکاکس سے کہا۔ وہ مجھے یُوں گھُور رہا تھا جیسے مجھے کھا جائے گا۔

"میں اس کا اِدھر ہی بندوبست کر دوں گا" — انسپکٹر وِلکاکس نے طنزیہ کہا اور مجھ سے کہنے لگا — "سنو سکندر! ہم تمہیں ایک گھنٹہ وقت دیتے ہیں۔ شہناز کو ہمارے پاس لے آؤ۔ اگر ایک گھنٹے تک وہ نہ آئی تو تم ایک سنگین جُرم کے مُلزم ہو گے۔"

مجھے جو غصّہ آیا وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں ان دونوں انگریزوں کو

وہیں کھڑی کھڑی سنا سکتا تھا لیکن شہناز کا خیال آگیا۔ اپنے خلاف کارروائی ہونے سے پہلے شہناز کو اِدھر اُدھر کرنا ضروری تھا۔

دونوں افسر مجھے الٹی میٹم دے کر چلے گئے۔ مجھے خیال آیا کہ وِلکاکس جس وثوق سے مجھے کہہ رہا تھا کہ شہناز کو لے آؤ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے شہادت مل گئی تھی کہ میں شام کو شہناز کے کمرے میں گیا تھا اور اُسے میں نے ہی غائب کیا ہے۔ خواجہ صاحب سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ میرے سامنے ایک راستہ کُھلا تھا۔ گھوڑا تیار تھا۔ میں شہناز کو اس پر بٹھا کر بھاگ سکتا تھا لیکن اس راستے کی منزل کوئی نہیں تھی۔

میرے پاس ساٹھ منٹ تھے۔ اس قلیل وقت میں مجھے فیصلہ اور اس پر عمل کرنا تھا کہ میں شہناز کو اُس کے حال پر چھوڑ دوں یا اُسے ساتھ لے کر بے منزل راستے پر روانہ ہو جاؤں لیکن فیصلے سے پہلے خواجہ صاحب سے مشورہ لینا ضروری تھا۔

۹

میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ اُس کمرے میں جاتے جہاں ناچنے والے لڑکے تیار ہو رہے تھے۔ وہاں اُن کے استاد خواجہ صاحب ہوں گے۔ انہیں کان میں کہے کہ سکندر بلا رہا ہے۔

کانسٹیبل بیس منٹ بعد واپس آیا اور یہ خبر لایا کہ سب لوگ اُس جگہ جا کر بیٹھ گئے ہیں جہاں رقص وغیرہ ہو گا۔ انگریز افسر بھی بیٹھ گئے تھے اور شراب چل رہی تھی۔ کانسٹیبل کو خواجہ صاحب نہیں ملے تھے۔

میں نے خود ہی خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا اور اُس طرف سے رقص والے باغ کی طرف چل پڑا جدھر روشنی کم تھی۔ میں ابھی اُس جگہ سے دُور ہی تھا کہ سب انسپکٹر صوفی نے مجھے آواز دی۔ میں رُک گیا۔ وہ بڑی تیزی سے میری طرف آ رہا تھا۔

"سکندر بھائی!" — اُس نے میرے پاس آکر کہا — "ہم ڈوب مریں تو اچھا ہے۔"

"کیوں؟ ..... کیا ہوا؟"

"نواب کی ریاست کا ایک آدمی ہے" — صوفی نے مجھے بتایا — "یہیں کہیں کام کرتا ہے۔ وہ روتا ہوا میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ ایک انگریز افسر اُس کی جوان اور کنواری بیٹی کو اپنے ساتھ رقص کی محفل میں لے گیا ہے اور اُسے اپنے پاس بٹھایا ہوا ہے۔"

"افسر کون سا ہے؟"

"ہمارا علاقہ ڈی ایس پی!" — صوفی نے جواب دیا — "وارن صاحب ..... میں خود دیکھ آیا ہوں۔ اُس نے لڑکی کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر اپنے ساتھ لگایا ہوا ہے۔"

لڑکوں کا رقص شروع ہو چکا تھا۔ جس فضا میں نواب کی سانسیں ابھی تحلیل نہیں ہوئی تھیں، وہ فضا گھنگھروؤں اور طبلے کی تھاپ سے مرتعش ہو رہی تھی۔ صوفی کو اس لڑکی کے باپ نے بتایا تھا کہ وہ محل کے احاطے میں رہتا ہے جب کبھی ناچ گانا ہوتا تھا یہ لوگ ذرا دُور کھڑے ہو کر دیکھنے آجاتے تھے۔ یہ آدمی اپنی بیوی اور جوان بیٹی کو رقص دکھانے کے لئے لے آیا۔ وہ محل میں کوئی کام کرتا تھا اس لئے وہ دونوں کو ذرا دُور کھڑا رکھنے کی بجائے اِس طرف لے آیا۔

اُس وقت انگریز افسر اُس طرف جا رہے تھے جہاں رقص کا انتظام تھا۔

علاقہ ڈی ایس پی نے اس لڑکی کو دیکھ لیا۔ وہ غریب باپ کی بیٹی تھی لیکن خوبصورت تھی۔ اُس کا رنگ گورا تھا اور اُس کے کپڑے قیمتی یا ریشمی تو نہیں تھے لیکن صاف سُتھرے تھے۔ یہ انگریز افسر نشے میں تھے۔ علاقہ ڈی ایس پی کی نظر لڑکی پر پڑی تو ہنستے ہنستے لڑکی کے کندھے پر جا ہاتھ رکھا اور اُس کے باپ سے کہا کہ تمہاری بیٹی بہت خوبصورت ہے، ہم اسے ولایت لے جائیں گے۔ اس طرح ہنسی مذاق میں وہ لڑکی کو اپنے ساتھ رقص کی محفل میں لے جانے لگا تو اُس کے باپ سے کہا کہ تم فکر نہ کرنا، تمہاری بیٹی ابھی واپس آجائے گی۔

لڑکی کا باپ اس مذاق کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر

ڈی ایس پی سے کہا وہ غریب آدمی ہے اور اس کی لڑکی کو یہیں رہنے دیں۔ لڑکی کی ماں کچھ خوش تھی کہ ایک صاحب اُس کی بیٹی پر مہربان ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنے خاوند سے کہا کہ کوئی ہرج نہیں، صاحب اُسے ناچ گانا دکھانے لے جا رہا ہے، کسی کمرے میں تو نہیں لے جا رہا لیکن لڑکی کا باپ جو مسلمان تھا، بالکل پسند نہیں کرتا تھا کہ اُس کی نوجوان بیٹی ایک انگریز کے ساتھ جاتے۔ ڈی۔ ایس پی کے ساتھ تین اور انگریز افسر تھے۔ انہوں نے لڑکی کے باپ کو تھپکیاں دیں اور دوستانہ انداز میں لڑکی کو ساتھ لے گئے۔

سب انسپکٹر صوفی نے مجھے بتایا کہ اُس کا باپ ایک جگہ کھڑا رو رہا ہے۔ وہ لڑکی کو زبردستی تو نہیں لے گئے، لیکن غلامی کا یہ مطلب تو نہیں کہ بندر کی یہ نسل ہماری بیٹیوں کا کھیل تماشا بنائی پھرے۔

"صوفی صاحب!"— میں نے پوچھا —"کیا آپ کو معلوم ہے کہ لڑکی خوشی خوشی گئی ہے یا ڈی ایس پی اُسے گھسیٹ کر لے گیا ہے؟"

"میں نے اُس کے باپ سے پوچھا تھا"— صوفی نے جواب دیا —"وہ کہتا ہے کہ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔"

میرا دماغ پہلے ہی جل رہا تھا۔ یہ واقعہ سُن کر میں پاگل سا ہو گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ غصے نے مجھ پر قابو پا لیا۔ اسے آپ غیرت کہیں یا جو کچھ بھی کہیں، مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے یہ لڑکی میری سگی بہن ہو اور اس کی عصمت کی پاسبانی میرا فرض ہو۔

"صوفی صاحب!"— میں نے کہا —"میں بتا نہیں سکتا کہ میں کیا کروں گا۔ ایک بات کا خیال رکھنا۔ کسی کو یہ پتہ نہ چلنے دینا کہ آپ نے مجھے اس لڑکی کے متعلق کچھ بتایا تھا۔"

"سکندر!"— صوفی نے کہا —"تم کچھ زیادہ غصے اور جذبات میں آ گئے ہو۔ غصہ تو مجھے بھی کھا رہا ہے، لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اپنی ماں کی طرح یہ لڑکی بھی خوش ہو کہ اسے ایک انگریز افسر نے پسند کیا ہے۔"

"آپ ہی نے تو بتایا ہے کہ لڑکی اُس کے ساتھ گئی تو اس کی آنکھوں میں

آنسو اور چہرے پر گھبراہٹ تھی"— میں نے کہا —"صوفی صاحب! آپ کہتے ہیں کہ کچھ نہیں کر سکتے لیکن ہم یہ بھی تو نہیں کر سکتے کہ اپنی بیٹیاں ان فرنگیوں کے حوالے کر دیں.... آپ کچھ نہ کریں۔ اگر میں کچھ کر بیٹھوں تو جو میری مدد آپ کر سکتے ہیں کریں۔"

"تم نے سوچا کیا ہے؟"— صوفی نے پوچھا۔

"جو اللہ کو منظور ہو گا"— میں نے جواب دیا۔

میں صوفی کو وہیں چھوڑ کر اُس طرف چل پڑا جہاں رقص کی محفل گرم تھی۔



سب انسپکٹر صوفی نے مجھے آواز دی جو میں نے اس طرح سُنی جیسے مجھ پر نیم غشی طاری ہو۔ میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں کوئی اور نہیں تھا اور رقص کا سارا منظر اور تماشائی بڑی اچھی طرح نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف دو لمبے صوفے رکھے ہُوئے تھے۔ انگریز افسر اور نوابزادہ مراد علی خان اُن پر بیٹھے تھے۔ ہر انگریز کی بغل میں ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ یہ تو حرم کی لڑکیاں تھیں جن کا فرض اور پیشہ ہی یہ تھا کہ مہمانوں کے ساتھ لگ کر بیٹھیں، لیکن ڈی ایس پی کو دیکھا تو میں آگ کا شعلہ بن گیا۔ غریب کی بیٹی سیدھے سادے لباس میں تھی۔ وہ واقعی حسین لڑکی تھی۔ ڈی ایس پی نے اپنا بازو اُس کی کمر میں ڈال رکھا تھا اور لڑکی پرے ہٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دُور سے ہی پتہ چل رہا تھا کہ ڈی ایس پی نشے میں ہے۔

میں نے یہ سوچا کہ پیچھے سے جاؤں اور اس ڈی ایس پی کے کان میں کہوں کہ شہناز مل گئی ہے، لیکن وہ یہاں آنے سے گھبراتی ہے اس لئے ڈی ایس پی میرے ساتھ آئے۔ معلوم نہیں میری یہ سوچ کامیاب ہوتی یا ناکام، لیکن خدا نے بڑا اچھا سبب پیدا کر دیا۔ ڈی ایس پی کے ساتھ سپیشل برانچ کا ایس پی بیٹھا تھا۔ ڈی ایس پی نے اُس کے کان میں کچھ کہا۔ ایس پی مسکرایا اور اس نے سر ہلایا۔

یہ علاقہ ڈی ایس پی تھا جس کا نام وارن تھا۔ وہ اُٹھا، لڑکی کو بھی اُس نے اپنے ساتھ اُٹھایا اور پیچھے کی طرف چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ پیچھے اسی باغ کا ایک حصہ ہے جہاں درختوں پر چڑھی ہوئی بیلیں اور پودے بہت گھنے ہیں۔ ڈی ایس پی

لڑکی کو اُس طرف لے گیا۔ اُس طرف اندھیرا تھا۔ باغ کے اُس حصے میں سیر سپاٹے کے لئے کم ہی لوگ جاتے ہوں گے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ لڑکی کو اُدھر کیوں لے جا رہا ہے۔

میں وہاں سے ہٹا اور اندھیرے میں چلا گیا۔ کچھ آگے جاکر میں درخت پر چڑھی ہوئی بڑی گھنی بیلوں کی اوٹ میں رک گیا۔ ڈی ایس پی لڑکی کو ساتھ لئے بیلوں کی اس اوٹ کی دوسری طرف سے گزرا۔ لڑکی نے گھبراتی ہوئی آواز میں کہہ کر صاحب بہادر، میں اُدھر نہیں جاؤں گی۔

"فکر نہیں"۔۔۔ ڈی ایس پی نے بدمست آواز میں کہا ۔۔۔ "ڈرو مت۔ ہم پیسے دیں گے ..... ہم تمہیں ولایت لے جائیں گے۔"

"نہیں صاحب بہادر!"۔۔۔ لڑکی منت سماجت کر رہی تھی ۔۔۔ "میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے پیسے نہیں چاہئیں۔"

وہاں اندھیرا تو تھا لیکن دُور کی روشنیوں سے کچھ نظر آرہا تھا۔ میں نے بیلوں کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ لڑکی رُک گئی تھی اور ڈی ایس پی اُسے ابھی اور آگے لے جارہا تھا۔ آخر اُس نے لڑکی کو بازوؤں پر اُٹھا لیا اور کہا کہ اونچا مت بولو، ہم ماریں گے۔

بیس پچیس قدم آگے سیمنٹ کا بنا ہُوا ایک بنچ تھا۔ ڈی ایس پی نے لڑکی کو اس بنچ پر لٹا دیا، لیکن لڑکی اُٹھ بیٹھی۔ ڈی ایس پی نے پھر دھکا دے کر اُسے پیٹھ کے بل لٹا یا۔ لڑکی کے رونے کی آواز مجھ تک بھی پہنچی۔

میں پرائیویٹ کپڑوں میں تھا کیونکہ میں سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر تھا۔ میں نے پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کی ایک جیب میں ریوالور تھا۔ بائیں ران کے ساتھ میں نے خنجر باندھ رکھا تھا جسے بروقت نکالنے کے لئے میں نے پتلون کی بائیں طرف کی جیب پھاڑی ہوئی تھی۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ خنجر کے دستے پر جاتا تھا۔ میں نے ریوالور کی بجائے خنجر کا استعمال زیادہ مناسب سمجھا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا اور خنجر کھینچ لیا۔ اس کی نیام اُتار کر پتلون کی بیلٹ میں اُڑس لی اور خنجر دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔

میں پودوں کی اوٹ میں تیز چلتا اُن کے قریب پہنچ گیا۔ ڈی ایس پی نے لڑکی کو زبردستی بنچ پر لٹا کر ہاتھوں سے اُسے دبا لیا تھا۔ میں اوٹ سے نکلا۔ فاصلہ سات آٹھ قدم تھا۔ میں ڈی ایس پی کے پیچھے پہنچ گیا۔ وہ کھڑا تھا اور لڑکی پر جُھکا ہُوا تھا۔ میں نے اُس کی پیٹھ پر آہستہ سے تھپکی دی۔ وہ فوراً سیدھا ہُوا اور پیچھے کو مُڑا۔ اُس نے انگریزی میں بڑے غصے میں پوچھا کہ تم کون ہو۔

"سب انسپکٹر سکندر"۔۔۔ میں نے جواب دیا اور لڑکی سے جو اُٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی، کہا ۔۔۔ "جا لڑکی، بھاگ جا یہاں سے اور سیدھی اپنے گھر جا!"

لڑکی دوڑ پڑی۔ ڈی ایس پی نے اُس کی طرف دیکھا۔ دو قدم چلا۔ پھر رُک گیا اور انگریزی میں مجھے غلیظ ہندوستانی وغیرہ کہا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے دائیں ہاتھ کا مُکہ سیدھا باکسروں کی طرح مجھے مارا، لیکن مکہ ہَوا میں لگا کیونکہ میں جانتا تھا کہ انگریز کا پہلا وار یہی ہوتا ہے۔ میں اس کے لئے تیار تھا اس لئے میں نے مُنہ ایک طرف کر دیا اور مکہ میرے مُنہ کے قریب سے گزر گیا۔ وہ نشے میں تھا۔ اُس کا مُکہ ہَوا میں گیا تو وہ آگے کو جُھکا۔ اُس کا پہلو میرے پیٹ سے چند انچ ہی دُور تھا۔

میں نے اوپر سے خنجر کا وار ہاتھ پوری لمبائی تک اوپر لے جاکر پوری طاقت سے کیا۔ ڈی ایس پی کے مُنہ سے ہلکی سی آواز نکلی۔ میں نے خنجر دل کے مقام پر مارا تھا۔ وہ بڑا تندرست انگریز تھا۔ سیدھا ہُوا تو میں نے اُس کے آگے سے خنجر پوری طاقت سے پھر دل کے مقام پر ہی مارا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کا دل کٹ چکا ہے۔ اُس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ پہلے اُس کے گُھٹنے زمین پر لگے پھر وہ لڑھک گیا۔ اگر خنجر کے یہ دونوں وار دل پر نہ لگتے تو وہ اتنی جلدی نہ گرتا۔ میں نے اُسی کے کپڑوں سے خنجر صاف کیا۔ خنجر واپس ڈالا اور وہاں سے بڑے اطمینان سے چل پڑا۔



میں جس راستے وہاں تک گیا تھا اُسی راستے واپس آیا۔ رقص کی محفل عروج پر تھی۔ کسی کو گردوپیش کا ہوش نہیں تھا۔ میں نے خواجہ صاحب کو دیکھ لیا۔ وہ

اُس طرف کھڑے تھے جہاں سے وہ ناچنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو تیار کر کے آگے بھیجتے تھے۔ میں نے خواجہ صاحب کے کندھے پر جا ہاتھ رکھا۔ انہوں نے گھوم کے دیکھا۔ میں نے انہیں اشارے سے کہا کہ میرے ساتھ آئیں۔ خواجہ صاحب دانش مند انسان تھے۔ مجھے قناتوں کی اوٹ میں لے گئے۔ میں نے انہیں سنایا کہ میں کیا کر آیا ہوں۔ اُنہیں یہ بھی بتایا کہ میرے انگریز انسپکٹر نے مجھے ایک گھنٹے کی مہلت دی تھی کہ میں شہناز کو لا کر اُس کے حوالے کر دوں۔

خواجہ صاحب نے چونک کر میرے مُنہ کی طرف دیکھا اور کچھ دیر خاموش رہے۔

"خواجہ صاحب!" ——— میں نے کہا ——— "یہ نہ کہنا کہ سکندر! تُو نے جو کیا بہت بُرا کیا۔ آپ نہیں جانتے کہ میرے انسپکٹر نے جو مجھے، بہت چاہتا تھا کیسی کیسی ناقابلِ برداشت باتیں کہی ہیں۔"

"تم نے جو کیا اچھا کیا" ——— خواجہ صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ——— "اب تمہارا یہاں رُکنا ٹھیک نہیں۔"

"لیکن میں جاؤں گا کہاں؟"

"میں بتاتا ہوں" ——— خواجہ صاحب نے کہا ——— "میں تمہیں وہاں بھیج رہا ہوں جہاں کچھ عرصہ پہلے بھیجنا چاہتا تھا ... تم سیدھے حمید اللہ خان کے پاس پہنچو .... میں تمہیں وہ جگہ سمجھا دیتا ہوں۔ کم و بیش تیس میل دُور ہے۔ تمہارے پاس بہت وقت ہے۔ صبح سے پہلے پہلے تم منزل پر پہنچ جاؤ گے۔ چاند آدھی رات کے بعد اُوپر آتا ہے۔ تمہیں راستے میں دن جیسی روشنی مل جائے گی کیونکہ چاند پورا ہے۔"

خواجہ صاحب نے مجھے راستہ سمجھانا شروع کر دیا۔ موٹی موٹی نشانیاں بتائیں۔ گاؤں کا نام بتایا اور یہ بھی کہ اُس گاؤں میں پورے بیس گھر بھی نہیں۔

"اگر حمید اللہ خان وہاں نہ ملا تو؟"

"مل جائے گا" ——— خواجہ صاحب نے کہا ——— "وہیں ہوگا۔ نہ ہُوا تو اُس گاؤں کے کسی آدمی سے کہہ دینا کہ تم حمید اللہ خان کے مہمان ہو۔ اپنا نام بھی بتا

دینا۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگا، لیکن سکندر! یہ سوچ لو کہ وہ تمہاری عارضی پناہ نہیں ہوگی۔ تم اب ہمیشہ حمید اللہ کے ساتھ رہو گے۔ شاید میں بھی کسی وقت تمہارے پاس آؤں ... جلدی نکلو۔ گھوڑا گھر میں تیار ہے۔"

"اور شہناز؟"

"کیا یہ پوچھنے کی بات ہے؟" ——— خواجہ صاحب نے کہا ——— "شہناز کو اپنے آگے یا پیچھے گھوڑے پر بٹھاؤ اور نکلو .... ہاں، یہ سوچ لو کہ بڑے گیٹ میں سے تم کیسے نکلو گے۔"

"میرا خیال ہے ڈی ایس پی کے قتل کا ابھی کسی کو پتہ نہیں چلا" ——— میں نے کہا ——— "میں شہناز کو گھوڑے پر بٹھاؤں گا، خود آگے آگے چلوں گا اور گیٹ سے آرام آرام سے نکلوں گا۔ وہاں سب مجھے جانتے ہیں۔ مجھ سے کوئی نہیں پوچھے گا کہ گھوڑے پر کون ہے اور اسے کہاں لے جا رہے ہو۔"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے" ——— خواجہ صاحب نے کہا ——— "جب حمید اللہ کے پاس پہنچ جاؤ گے تو وہ سوچے گا کہ تم کیا کرو گے .... یہاں سے نکلو۔ جونہی پتہ چلا کہ ڈی ایس پی کی لاش فلاں جگہ پڑی ہے تو یہاں قیامت کا سماں بندھ جائے گا۔"

سوچنے کا اور مزید کوئی بات کرنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے فوراً نکل جانا چاہیے تھا۔ مشکل یہ تھی کہ شہناز کو بھی ساتھ لے جانا تھا۔ میری ذہنی حالت بگڑی تو نہیں تھی، بدل سی گئی تھی۔ کبھی میں دلیر ہو جاتا اور کبھی دل پر بوجھ سا آپڑتا اور چند لمحوں کے لئے یوں بھی محسوس ہوتا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ خوف نے بھی دل کو دبوچا کہ میں پکڑا جاؤں گا لیکن خوف کو میں نے یہ سوچ کر جھٹک ڈالا کہ میں پھانسی چڑھ جاؤں گا تو کیا ہو جائے گا۔ نہ بیوی تھی جس کے بیوہ ہونے کا افسوس ہوتا نہ بچے تھے جن کے یتیم ہونے کا رنج ہوتا۔ میرے پیچھے رونے والا کوئی نہیں تھا۔

میں خواجہ صاحب کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے ہٹ آیا۔

میں بہت تیز نہیں چل رہا تھا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ وہاں گھومنے پھرنے سے کوئی مجھ پر شک نہیں کر سکتا تھا۔ میں وہاں ڈیوٹی پر تھا۔

میں خواجہ صاحب کے گھر میں داخل ہو گیا۔ شہناز کو باہر نکالا۔ گھوڑا صحن میں بندھا ہوا تھا۔ اس پر زین کسی ہوئی تھی۔ گھوڑا اس لئے تیار نہیں رکھا گیا تھا کہ میں ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کر کے بھاگوں گا۔ خواجہ صاحب نے محسوس کر لیا تھا کہ مجھے شہناز کو ساتھ لے کر یہاں سے نکلنا پڑے گا۔ اب انہوں نے مجھے حمیداللہ خان کے ٹھکانے کا راستہ دکھایا تو مجھے خیال آیا کہ خواجہ صاحب نے مجھے حمیداللہ خان تک پہنچانے کا ارادہ پہلے ہی کر لیا تھا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے گھوڑا منگوا لیا اور تیار کر لیا تھا۔

میں حمیداللہ خان کے پاس نہ جانا چاہتا تو بھی مجھے جانا تھا کیونکہ میرا اور کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔

"شہناز!" ___ میں نے کہا ___ "بہت جلدی ... ہم یہاں سے جا رہے ہیں ... حمیداللہ خان کے پاس۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"شہناز!" ___ میں نے کہا ___ "راستے میں بتا دوں گا۔ فوراً باہر نکلو۔"

میں گھوڑے کو باہر لے آیا۔ شہناز کو اس پر سوار کرایا۔ میں نے باگ اُس کے ہاتھ میں دے دی۔ گھوڑا چلا تو میں اس کے آگے آگے چل پڑا۔ میرے کان محل کی طرف لگے ہوئے تھے۔ رقص کے سازوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس سے مجھے تسلی ہو گئی کہ ڈی ایس پی کے قتل کا ابھی کسی کو پتہ نہیں چلا۔

گیٹ پر گئے تو گھوڑے پر سوار شہناز کو اور مجھے دیکھنے کے سوا کسی نے کوئی بات نہ کی۔ شہناز نے چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ اُس کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے گیٹ کے پہرہ دار جانتے تھے کہ میں سی آئی ڈی کا افسر ہوں۔ مجھے کوئی روک نہیں سکتا تھا نہ مجھ سے پوچھ سکتا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور گھوڑے پر کون ہے، البتہ میرے بعد ڈی ایس پی کے قتل کے انکشاف پر ان لوگوں نے بیان دینے تھے کہ انہوں نے مجھے رات کو باہر جاتے دیکھا تھا اور ایک عورت گھوڑے

پر سوار تھی۔ ایسے بیان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

کچھ دُور تک میں گھوڑے کے آگے آگے چلتا رہا۔ یہ محل ایک کالونی تھی جو دیہاتی علاقے میں آباد تھی۔ آگے کھیت بھی تھے اور ویران علاقہ بھی جس میں گہرے اور وسیع کھڈ تھے اور چٹانیں بھی تھیں۔ ایک برساتی نالہ بھی وہاں سے گزرتا تھا۔ اس سے آگے ایک علاقہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے متعلق خواجہ صاحب نے بتا دیا تھا کہ کیسا ہے۔ راستے میں گاؤں بھی آتے تھے۔ میں نے ان سے دُور رہنا تھا لیکن ایسے راستے اور علاقے دیکھ کر ہی پتہ چلتا ہے کیسے ہیں۔ زبانی سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آتے۔

چاند ابھی اوپر نہیں آیا تھا۔ محل پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں گھوڑے پر شہناز کے پیچھے سوار ہو گیا۔ گھوم کر دیکھا۔ محل کی روشنیاں اس طرح نظر آ رہی تھیں جیسے اُفق کے اوپر آسمان میں الگ تھلگ پیلے پیلے ستارے ٹمٹما رہے ہوں، اور زمین و آسمان کے درمیان یہ شیطان کی آبادی ہو۔ نواب کی قبر پر چھڑکا ہوا پانی ابھی خشک نہیں ہوا اور اُس کا بیٹا جشن منا رہا تھا۔ شراب کی صراحیاں خالی ہو رہی تھیں اور حوا کی بیٹیاں کھلونے بنی ہوئی تھیں۔

میں یہ سب کچھ دیکھ آیا تھا پھر بھی یقین نہیں آتا تھا۔

گناہوں کی اس بستی میں ایک فرنگی کو قتل کر کے میں نے بُرا تو نہیں کیا تھا!

"تم نے کہا تھا ہم حمیداللہ خان کے پاس جا رہے ہیں" ___ شہناز نے کہا۔

"ہاں شہناز!" ___ میں نے کہا ___ "اب ہمیں وہیں پناہ ملے گی۔"

"کیوں؟" ___ شہناز نے پوچھا ___ "پناہ کا کیا مطلب ہے؟ تم مجھے چھوڑ کر واپس آ جاؤ گے نا!"

"نہیں" ___ میں نے کہا ___ "میں واپس آنے کے لئے نہیں جا رہا۔"

میں نے اُسے بتایا کہ میں کیا کر آیا ہوں۔ شہناز چونک کر پیچھے مُڑی۔ اُس کی پیٹھ میرے سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اُس نے چہرہ پیچھے کیا تو ہمارے گال ٹکرا گئے۔ علاقہ ڈی ایس پی نے شہناز کو دیکھ کر کہا تھا کہ اس عورت کا حُسن خطرناک

ہے۔ اُس نے غلط نہیں کہا تھا۔ اُس کا حُسن جسمانی تھا اور اب یہ جسم میرے ساتھ لگا ہُوا تھا اور میرے قبضے میں تھا۔ میں اس جسم کی تپش محسوس کر رہا تھا۔ اس میں کیا شک تھا کہ یہ جسم میری ملکیت تھا لیکن میرا ذہن بھی میرے قبضے میں تھا جس نے مجھے یہ سوچ دی کہ یہ جسم تیسری ذمّہ داری میں ہے۔

"یہ تُو نے کیا کیا سکندر؟" — شہناز نے گھبراتے ہُوتے سے لہجے میں کہا — "اتنی اچھی نوکری ضائع کر دی، اور قتل کے مفرور ملزم بن گئے۔"

"اگر تم وہاں نہ ہوتیں تو میں قتل نہ کرتا" — میں نے کہا — "وہ لڑکی مجھے قاتل بنانے کا بہانہ بنی تھی۔"

"اوہ سکندر!" — شہناز نے آہ لے کر کہا۔

گھوڑا اپنی چال چلا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی رفتار تیز کرنے کے لئے ہلکی سی ایڑ لگائی۔ تعاقب ہو سکتا تھا۔ وہ کاروں کا نہیں گھوڑوں کا زمانہ تھا۔ نواب کے اصطبل میں گھوڑے موجود تھے اور انگریز شہسوار ہوتے تھے۔ تعاقب کے علاوہ میرے سامنے تیس میل کی مسافت تھی۔ وہ کوئی سڑک یا پگڈنڈی نہیں تھی کہ میں اطمینان سے چلتا رہتا۔ میرے نیچے کوئی عام راستہ نہیں تھا۔ میں نے ایک ستارہ اپنے سامنے رکھ لیا تھا اور اس کی سمت پر چلا جا رہا تھا۔



انسان کیا ہے؟

وہی جو اُس کا ذہن ہے!

میرے ذہن کے دھارے کا رُخ بدل گیا تھا۔ شہناز میرے لئے کائنات کا ایک ذرّہ بن کے رہ گئی تھی۔

یہ کالی رات، یہ جنگل بیابان، اتنی حسین اور جوان عورت، ایک مرد، تندرست اور توانا — یہ ایک نسخے کے اجزا ہیں جو اکٹھے ہو جاتے ہیں تو بوتل سے جِن نکل آتا ہے جو بڑے حسین گناہ کا روپ دھار لیتا ہے، لیکن میں حسن و گناہ کی دنیا سے بہت دُور نکل گیا تھا۔

کہتے ہیں انسان بڑے مضبوط قلعے سر کر سکتا ہے، لیکن اپنا قلعہ نہیں توڑ سکتا۔

یہ خواہشوں کا قلعہ ہوتا ہے جو انسان اپنے اردگرد تعمیر کر کے اس میں قید ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں نے کبھی ایسے قلعے تعمیر نہیں کئے تھے۔

انسان ہوائی قلعے تعمیر کرتا ہے لیکن وہ غلطی یہ کرتا ہے کہ ان کے نیچے بنیادیں نہیں رکھتا۔ ہوائی قلعے مسمار ہونے کے لئے تعمیر ہوتے ہیں اور یہ وہ لوگ تعمیر کرتے ہیں جن کے سامنے جینے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

میں نے اپنے لئے ایک مقصد پیدا کر لیا تھا۔

"تم چپ کیوں ہو سکندر!" — شہناز نے کہا — "باتیں کرتے رہو۔ خاموشی سے مجھے ڈر آتا ہے۔"

"میرے سینے سے طوفان اُٹھ رہے ہیں شہناز!" — میں نے کہا — "میں انہیں دبانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

گھوڑا دوڑ رہا تھا اس لئے ہم ایک دوسرے کی بات اچھی طرح نہیں سن سکتے تھے۔ گھوڑے کو میں اور زیادہ تیز دوڑانا چاہتا تھا، لیکن شہناز ڈرتی تھی۔ کبھی کوئی گھاٹی اُترنی پڑتی تھی کبھی گھاٹی چڑھنی پڑتی تھی۔ شہناز کبھی پیچھے ہٹ کر میرے ساتھ چپک جاتی کبھی میرے دونوں بازو پکڑ لیتی۔

"شہناز!" — میں نے مُنہ اُس کے کان کے ساتھ لگا کر کہا — "اب ہر ڈر اور خوف ذہن سے نکال دو۔ میں جانتا ہوں تم میں جرأت کی کمی نہیں۔ اپنے آپ کو عورت سمجھنا چھوڑ دو۔"

میں نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ میں بڑ کا ایک بہت پرانا اور بہت زیادہ پھیلا ہُوا درخت دیکھ رہا تھا جو مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اندازے کے مطابق میں نے اتنا فاصلہ طے کر لیا تھا جو خواجہ صاحب نے بتایا تھا کہ طے کر لو گے تو بڑ کا ایک اتنا زیادہ پھیلا ہُوا درخت آ جائے گا جسے دیکھ کر تم حیران رہ جاؤ گے۔ خواجہ صاحب نے یہ بھی بتایا تھا کہ بڑ کے نیچے لمبا چوڑا تالاب ہے جس میں کنول کے پھول کھلے ہُوئے ہوں گے۔ چاند اُفق سے اُوپر آ گیا تھا۔ درخت

نظر آنے لگے تھے، لیکن بَڑ کا درخت کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ خواجہ صاحب کہتے تھے کہ وہ درخت اندھیرے میں بھی نظر آجاتا ہے اور اجنبی اسے بہت بڑی چٹان سمجھ لیتے ہیں۔

مجھے شک ہونے لگا کہ میں راستہ کھو بیٹھا ہوں۔ میں گھوڑے کو ایک ٹیکری پر چڑھا کر لے گیا اور ہر طرف دیکھا۔ جدھر سے چاند اُبھر رہا تھا اُس طرف ایک گول چٹان نظر آئی جو کم و بیش چھ میل دُور تھی۔ وہ بَڑ کا وہی درخت ہو سکتا تھا۔ میں نے اُس زمین کا جائزہ لیا جس پر میں کھڑا تھا۔ یہ کٹی پھٹی زمین تھی۔ بعض جگہ مجھے گھوڑا روکنا پڑتا تھا کیونکہ آگے ایسی ڈھلان آجاتی تھی جو ڈھلان نہیں بلکہ سیدھی دیوار ہوتی تھی۔ ہر چند قدم پر مجھے گھوڑا دائیں بائیں یا پیچھے موڑنا پڑتا اور راستہ دیکھ کر میں آگے بڑھتا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس زمین کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں جان گیا کہ میں غلط طرف آگیا ہوں۔

میں پیچھے گیا اور ایک موزوں جگہ سے گھوڑا اُس درخت کی طرف موڑا۔ مجھے پریشانی یہ ہوئی کہ بہت سا وقت ضائع ہو گیا تھا۔ مجھے صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے منزل پر پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ اب میں جس زمین پر جا رہا تھا یہ بھی ہموار اور چلنے کے لئے آسان نہیں تھی، لیکن میں خواجہ صاحب کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق محسوس کرنے لگا کہ اب میں صحیح سمت پر جا رہا ہوں۔

اچھی نسل کے گھوڑے کے لئے چھ میل کا فاصلہ کوئی فاصلہ نہیں ہوتا، لیکن زمین ایسی تھی کہ گھوڑا تیز چلایا نہیں جا سکتا تھا، دوڑانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم بَڑ کے اُس درخت تک پہنچ تو گئے لیکن میرے اندازے کے مطابق ڈیڑھ پونے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ چاند اور اُوپر آگیا تھا جس سے یہ سہولت پیدا ہو گئی تھی کہ راستہ اور گرد و پیش کا علاقہ نظر آنے لگا تھا۔

بَڑ کے نیچے گئے تو جو ہڑ دیکھا۔ یہ تو جھیل تھی۔ چاندنی میں پانی یُوں چمک رہا تھا جیسے پانی پر چاندی بکھری ہوئی ہو۔ کنول کے پھولوں کی اپنی بہار تھی۔

"سکندر!" — شہناز نے کہا — "کیا تمہارے دل میں یہ نہیں آئی کہ

باقی عمر اس پانی کے کنارے اور اس بَڑ کے سائے میں گزار دیں؟"

"دل میں تو بہت کچھ آتا ہے شہناز!" — میں نے آہ لے کر کہا — "لیکن ہم دونوں قدرت کے حُسن اور رنگینیوں سے محروم کر دیئے گئے ہیں .... تم ساری عمر گزارنے کی بات کرتی ہو، میرے دل سے پوچھو تو تمہیں آواز سنائی دے گی کہ باقی عمر اُس چھت کے نیچے گزارنا چاہتا ہوں جہاں میں پیدا ہُوا تھا اور جہاں سے میری ماں اور باپ کے جنازے نکلے تھے۔"

"نہیں" — شہناز نے یوں گھبرا کر کہا جیسے میں اُسے اندھے کنوئیں میں پھینکنے لگا تھا۔ وہ آگے بیٹھی بیٹھی تیزی سے پیچھے کو گھومی۔ اُس نے ایک ہاتھ میرے مُنہ پر رکھ دیا اور ایک بازو میری گردن کے گرد لپیٹ کر میرا گال اپنے گال سے لگا کر کہا — "وہ چھت مجھے یاد نہ دلاؤ۔ بھول جاؤ سکندر! اور مجھے بھی بھول جانے دو۔ وہ یادیں بڑی تلخ ہیں۔ مجھے بچھوؤں کی طرح ڈستی ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ وہ شہناز اُسی چھت تلے آکر مر گئی ہے۔"

"ویسے ہی گھر یاد آگیا تھا" — میں نے کڑوا سا گھونٹ نگل کر کہا — "انسان ہوں نا، کبھی کبھی جذبات اُمڈ آتے ہیں۔"

"میں نے وہ کینچلی اُتار پھینکی ہے" — شہناز نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "مجھے دوسرا جنم لینے دو۔"

جھیل پر چمکتی ہوئی چاندنی اور اس میں کنول کے پھُول کچھ دیر کے لئے مجھے حقیقی زندگی سے دُور لے گئے تھے۔ اچانک مجھے یاد آگیا کہ میں خود دوسرا جنم لے رہا ہوں۔ میں نے پتلون کی دائیں جیب پہ ہاتھ رکھا۔ اس میں ریوالور تھا۔ پھر میں نے بائیں ران پہ ہاتھ رکھا اور خنجر کو محسوس کیا جو میری ران کے ساتھ بندھا ہُوا تھا۔ جب یہ خیال آیا کہ اس خنجر کے ساتھ ایک فرنگی کا خون لگا ہُوا ہے تو مجھے اُس شکاری جیسی خوشی ہوئی جس نے تلوار سے شیر کا شکار کیا ہو۔ میرا سینہ پھیلنے لگا۔ خون کی گردش کچھ تیز ہو گئی۔ ایک غیبی ہاتھ نے مجھے جذبات اور جذباتی یادوں کی دلدل سے نکال کر بڑی سخت زمین پر کھڑا کر دیا۔

"ذرا اُتر کر تھوڑی دیر جھیل کے کنارے بیٹھ نہ جائیں؟" — شہناز

نے پوچھا۔

"نہیں" ——— میں نے جواب دیا ——— "اب منزل پر ہی جا کر بیٹھیں گے۔"

میں نے گھوڑے کو ہلکی سی ایڑ لگائی۔ باگوں کو جھٹکا دیا اور گھوڑے کو اُس سمت کر دیا جو مجھے خواجہ صاحب نے بتائی تھی۔

۵

چاند اتنا اُوپر آگیا تھا کہ کوئی گاؤں راستے میں آتا تھا تو وہ دُور سے ہی نظر آجاتا تھا۔ میں اُن سے دُور ہٹتا آگے بڑھتا گیا۔

پانچ سات میل کا مزید فاصلہ طے ہُوا ہوگا کہ شہناز نے کہا کہ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہے، ذرا اُترنا چاہتی ہے۔ میں نے گھوڑا روک لیا۔ جگہ وہ بھی خوبصورت تھی۔ سرسبز جگہ تھی۔ وہ جگہ نشیب میں تھی۔ اس کے ارد گرد ٹیلے دیواروں کی طرح کھڑے تھے۔

ہم دونوں گھوڑے سے اُترے اور ویسے ہی ادھر اُدھر چلنے لگے تاکہ ٹانگوں میں خون چل پڑے۔ ہم باتیں بھی کر رہے تھے۔ گھوڑا الگ کھڑا تھا۔ ہم دونوں ٹہلتے ٹہلتے بیس پچیس قدم دُور چلے گئے۔ واپس ہوتے تو دیکھا کہ ایک آدمی نے گھوڑے کی باگ پکڑی ہوئی ہے اور دو آدمی اُس کے ساتھ کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میں اور شہناز تیز تیز قدم اُٹھاتے اُن تک پہنچے۔ دو کے پاس کلہاڑیاں تھیں اور ایک کے پاس چھوٹی تلوار تھی۔ انہوں نے چہرے اس طرح چھپا رکھے تھے کہ جو پگڑیاں سروں پر تھیں اُن ہی کے پلو ٹھوڑی کے نیچے سے اُوپر گئے ہوتے تھے۔ اس سے اُن کے مُنہ نظر نہیں آتے تھے۔ ان میں سے ایک ہمارے قریب آیا اور اس نے شہناز کو بڑی غور سے دیکھا۔ چاندنی پوری طرح شفاف تھی جس میں شہناز کا چہرہ کچھ زیادہ ہی دلکش نظر آتا تھا۔ میں الگ چُپ چاپ کھڑا رہا۔

"بڑا قیمتی دانہ ہے اُستاد!" ——— شہناز کو دیکھنے والے نے اپنے ساتھیوں سے کہا ——— "اور گھوڑا بھی اچھا ہے۔"

اس کے دونوں ساتھی بھی ہمارے قریب آگئے۔ شہناز سرک کر میرے ساتھ لگ گئی۔ اُن دونوں نے بھی شہناز کو غور سے دیکھا پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے میری طرف دیکھا۔

"تم چلو دوست!" ——— اُن میں سے ایک نے مجھے کہا ——— "باقی سفر اکیلے اور پیدل طے کر لو۔ ہم تم سے اور کچھ نہیں مانگیں گے۔ پاس پلے جو کچھ ہے وہ بھی اور اپنی جان بھی لے کر چلے جاؤ۔"

اُس نے آگے ہو کر شہناز کو بازو سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچا۔ شہناز نے پاؤں جما لئے اور میرا بازو پکڑ لیا۔

"مت گھبرا لڑکی!" ——— ایک نے کہا ——— "ہم تجھے اسی گھوڑے پر بٹھا کر لے جائیں گے۔ تجھ جیسے ہیروں کی قدر اور قیمت ہم ہی جانتے ہیں .... یہ تمہارا جو کچھ بھی لگتا ہے اس کی زندگی چاہتی ہو تو بڑے آرام سے ہمارے ساتھ آجاؤ اور گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔"

"جاؤ شہناز!" ——— میں نے کہا ——— "ان کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" ——— شہناز نے مجھے کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں" ——— میں نے کہا ——— "جاؤ گھوڑے تک چلی جاؤ۔"

وہ سمجھ گئی کہ یہ میری کوئی چال ہے۔ وہ ان کے ساتھ چل پڑی۔ گھوڑا چند قدم دُور کھڑا تھا۔ تینوں پیٹھ پھیر کر شہناز کے ساتھ گھوڑے کی طرف چلے تو میں نے جیب سے ریوالور نکالا۔ دوسری جیب میں ہاتھ ڈال کر ران کے ساتھ بندھا ہُوا خنجر کھینچا اور گولی اس طرح فائر کی کہ ان میں سے دو آدمیوں کے درمیان جو فاصلہ تھا وہاں زمین پر لگی۔ میں ان میں سے کسی کو گولی نہیں مارنا چاہتا تھا۔ زمین پر فائر انہیں ڈرانے کے لئے اور یہ جتانے کے لئے کیا تھا کہ میں تینوں کی جان لے سکتا ہوں۔ تینوں بدک کر دائیں بائیں ہُوتے۔

"جہاں کھڑے ہو وہیں کھڑے رہو" ——— میں نے کہا ——— "اب اس ریوالور سے جو گولی نکلے گی وہ تم میں سے کسی کے جسم سے پار ہو جائے گی .... کلہاڑیاں اور

"تلوار پھینک دو۔"

اُنھوں نے میرے حکم کی تعمیل کی۔

"شہناز!"—— میں نے کہا —— "ان کی کلہاڑیاں اور تلوار اُٹھا کر میرے پاس آجاؤ۔"

شہناز کلہاڑیاں اور تلوار اُٹھا کر میرے پاس آگئی۔ میں شاہانہ اور فاتحانہ چال چلتا ہُوا اُن تک گیا اور اُنھیں کہا کہ چہرے ننگے کرو۔ اُنھوں نے چہرے ننگے کر دیئے۔

"کس کے آدمی ہو؟"—— میں نے پوچھا۔

"کسی کے بھی نہیں"—— ایک نے جواب دیا —— "بس ہم تینوں ہیں۔"

"میں تمہیں جینے کا حق نہیں دے سکتا"—— میں نے کہا —— "تم کمینے ہو۔ عورت پر ہاتھ اُٹھاتے ہو۔"

"غلطی ہوگئی یار!"—— ایک نے کہا —— "معاف کر دو۔"

"میں تم تینوں کو آگے پیچھے کھڑا کر کے ایک ہی گولی تم تینوں میں سے گزار سکتا ہوں"—— میں نے کہا —— "تم مجھے نہیں جانتے۔"

"اگر جانتے تو ایسی حرکت نہ کرتے"—— ان میں سے ایک اور نے کہا اور مجھ سے پوچھا —— "تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

"میرا پیشہ بھی یہی ہے"—— میں نے کہا —— "لیکن تم اس پیشے کی توہین کر رہے ہو۔"

تینوں ہنس پڑے۔

"نہیں"—— ایک نے کہا —— "ہم نہیں مانتے۔ تم کسی بڑے خاندان کے آدمی ہو۔ اسی لئے ہم تمہیں نہیں بتا رہے کہ ہم کون ہیں اور کس کے آدمی ہیں۔"

"اگر نہیں بتاؤ گے تو میں تم میں سے ایک کو گولی مار دوں گا"—— میں نے کہا —— "شہناز! تم ایک کلہاڑی ہاتھ میں رکھو اور اُن کے پیچھے کھڑی ہو جاؤ۔ ان میں سے کوئی ذرا بھی حرکت کرے تو گردن پر کلہاڑی چلاؤ۔"

شہناز اُن کے پیچھے ہوگئی۔ ایک کلہاڑی اور تلوار زمین پر رکھ کر ایک کلہاڑی اپنے ہاتھ میں رہنے دی۔ میں نے ریوالور کی نالی ان میں سے ایک کی کنپٹی پر رکھ دی اور اپنا سوال دہرایا کہ تم کس کے آدمی ہو۔ ان میں سے ایک بول پڑا۔

"یہ بتا دینا بھی بزدلی ہے"—— اُس نے کہا —— "اور نہ بتائیں تو .... تم اُسے گرفتار نہیں کرا دو گے؟"

"تم نام لو"—— میں نے کہا —— "میں کچھ بھی نہیں کروں گا۔"

"ہم ابھی اُس کے ساتھ شامل نہیں ہوتے"—— ایک اور بول پڑا —— "اُس نے ابھی کوئی واردات نہیں کی لیکن بڑا زبردست آدمی معلوم ہوتا ہے۔ سب اُسے مانتے ہیں۔ ہم بھی اُسے مانتے ہیں۔"

"میں کہتا ہوں اُس کا نام بتاؤ"—— میں نے کہا۔

میں نام پوچھنے پر اس لئے زور دے رہا تھا کہ مشہور ڈاکوؤں اور رہزنوں کے نام ہمارے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس علاقے میں کون بڑے نام والا ڈاکو ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا میرے لئے خطرہ بن سکتا تھا لیکن یہ تینوں اُس کا نام بتانے سے ڈرتے تھے۔ میرے بار بار ڈرانے سے اور ریوالور کی نالی اپنی کنپٹی پر دیکھ کر اُس آدمی نے نام بتا دیا۔

"حمیداللہ خان!"—— اُس نے کہا۔

میں نے ریوالور کی نالی پیچھے کر لی اور انہیں بتایا کہ میں اُسی کے پاس جا رہا ہوں اور وہ مجھے اُس تک پہنچا دیں۔ تینوں میری منتیں کرنے لگے کہ میں حمیداللہ خان کو یہ نہ بتاؤں کہ اُنھوں نے ہمیں روکا تھا۔

مجھے خوشی ہوئی کہ ہم حمیداللہ خان کے علاقے میں داخل ہو گئے تھے۔

۵

میرے اندازے کے مطابق ابھی بارہ چودہ میل کا فاصلہ باقی تھا لیکن یہ تینوں ہمیں ایسے راستے سے لے گئے کہ فاصلہ چھ سات میل سے زیادہ نہیں تھا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ حمیداللہ خان کہیں چلا گیا ہے اور یہ بتا کر نہیں گیا کہ واپس آئے گا یا نہیں۔ ہمیں یہ اطلاع دینے والا آدمی کوئی اور تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ

حمید اللہ خان اگر یہیں ہے اور اپنے آپ کو چھپائے رکھنا چاہتا ہے تو اُسے یہ بتا دو کہ سکندر آیا ہے اور اُس کے ساتھ شہناز ہے، لیکن اس آدمی نے پھر وہی الفاظ دہرائے کہ حمید اللہ خان چلا گیا ہے اور معلوم نہیں کہ واپس آتے یا نہ آتے۔

"ہم پھر واپس چلے جائیں؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اس طرح نہیں جانے دوں گا کہ تم میرے گھر کا پانی بھی نہ پیو۔ تم نے رات بھر سفر کیا ہے۔"

وہ مجھے اور شہناز کو کچے سے ایک مکان میں لے گیا۔ اُس نے ہمارا گھوڑا کہیں اور لے جا کر باندھ دیا۔ ہمیں ایک کمرے میں لے گیا۔ صبح ابھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ ہمارے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر کے آتا ہے۔

اُس کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد کمرے میں دو آدمی داخل ہوئے۔ اُن کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں۔ میں اُن کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ چپ چاپ میرے سامنے کھڑے تھے اور مجھے گھور رہے تھے۔ میں چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ شہناز جو دوسری چارپائی پر بیٹھی تھی، ڈر کر اُٹھی اور میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ان آدمیوں کی آنکھیں اور ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ اُن کی نیت ٹھیک نہیں اور ہم دھوکے میں یہاں آگئے ہیں۔ مجھے اطمینان اس بات کا تھا کہ ان کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔ میں بڑے آرام سے ریوالور نکال کر ان دونوں کو ختم کر سکتا تھا۔ میں نے اُن سے نہ پوچھا کہ وہ ہمیں کیوں اس طرح گھور رہے ہیں۔ مجھے زیادہ فکر شہناز کی تھی۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں میرے اور قریب آگئے اور اُنہوں نے کلہاڑیاں آگے کر لیں۔ اس میں کوئی شک نہ رہا کہ راستے میں جن تین آدمیوں کو میں نے زیر کر لیا تھا وہ یہیں اپنے ٹھکانے پر آتے تھے لیکن خیال مجھے یہ آرہا تھا کہ انہوں نے حمید اللہ خان کا نام کیوں لیا تھا۔ میں نے زیادہ سوچنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سیکنڈ میں ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔

"ریوالور پھینک دو" — میرے پیچھے سے آواز آئی۔ میں گھوما۔ شہناز نے

بھی اِدھر دیکھا۔

"حمید!" — یہ آواز شہناز کی تھی۔

وہ حمید اللہ خان تھا جو دوسرے دروازے سے اندر آیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ شہناز اُسے پہچان کر اُس کی طرف چل پڑی۔

"وہیں ٹھہرو" — حمید اللہ خان نے کہا — "سکندر بیوقوف ہے۔ اسے وہم ہو گیا ہے کہ یہ اسی عمر میں تجربہ کار پولیس افسر بن گیا ہے۔ کیا تم مجھے اس طرح گرفتار کرا سکو گے؟"

میں خاموشی سے حمید اللہ خان کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی گردن پر کوئی ٹھنڈی سی چیز محسوس کی۔ دیکھا۔ یہ کلہاڑی کا بلیڈ تھا جو پیچھے سے ایک آدمی نے میری گردن پر رکھ دیا تھا۔

"میں تمہیں گرفتار کروانے نہیں آئی حمید!" — شہناز نے حمید اللہ سے کہا — "کیا میں نے تمہیں گرفتار ہونے سے بچایا نہیں تھا؟"

"تم بڑی خوبصورت ناگن ہو" — حمید اللہ نے کہا — "پٹاری میں بند رہو تو بڑی اچھی لگتی ہو۔ تم ہی نے مجھ کو مفرور قیدی بنایا ہے اور تم نے ہی مجھے گرفتاری سے بچایا ہے، لیکن یہ تمہارے ساتھ کیوں آیا ہے؟"

"بتاتا ہوں بھائی!" — میں نے ریوالور اُس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا — "میں تمہارے پاس آگیا ہوں۔ خواجہ صاحب نے بھیجا ہے" — میں نے خنجر نکال کر حمید اللہ کی طرف پھینکا اور کہا — "اسے نیام میں سے نکال کر دیکھو اور سونگھو۔ اس پر خون لگا ہوا ہے۔"

"کس کا خون؟"

"ڈی۔ ایس۔ پی وارن کا" — میں نے جواب دیا۔

"یہ تو اُس علاقے کا ڈی۔ ایس۔ پی ہے" — حمید اللہ نے کہا۔

"ڈی۔ ایس۔ پی تھا" — میں نے کہا — "اب میں بھی مفرور قاتل ہوں۔ خواجہ صاحب نے مجھے تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔"

"خواجہ صاحب نے میری خواہش پوری کر دی ہے" — حمید اللہ خان

نے سکون کا سانس لے کر کہا ـــ "تمہیں شاید یاد نہ ہو، میں نے تمہیں ایک بار کہا تھا کہ تم آخر میرے پاس آؤ گے ..... میرے ساتھ آؤ۔"

وہ ہمیں اُس مکان میں سے ایک اور مکان میں لے گیا۔ کہنے لگا کہ اسے بہت زیادہ احتیاط کرنی پڑتی ہے جس پر شک کی کوئی وجہ نہ ہو اُس پر بھی شک ہو جاتا ہے۔

"اب بتاؤ" ـــ حمید اللہ خان نے ہمیں بٹھا کر کہا ـــ "کیا کر کے آئے ہو؟"

"پہلا کام تو یہ کیا ہے کہ شہناز کو ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس لے آیا ہوں" ـــ میں نے کہا ـــ "اور ایک خبر یہ لایا ہوں کہ نواب صاحب فوت ہو گئے ہیں۔"

حمید اللہ بیٹھے بیٹھے اُچھل پڑا اور اُس نے پوچھا کہ نواب کس طرح مرا ہے۔ میں نے اُسے پہلے تو یہ بتایا کہ اُس نے اپنے حکیم سے زہر لے کر خودکشی کی ہے۔ پھر اُسے تفصیل سے سنایا کہ اُس نے خودکشی کیوں کی ہے۔ شہناز اُس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ جب میں اُسے سُنا رہا تھا کہ نواب نے شہناز کو اور دو اور آدمیوں کو موت کے مُنہ میں ڈال دیا تھا اور میں نے انہیں وہاں سے تیسرے روز نکالا ہے تو حمید اللہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس نے اپنا ایک بازو شہناز کی کمر میں ڈال دیا اور اُسے اور قریب کر لیا۔ حمید اللہ کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اُس کے دل کو تکلیف پہنچی ہے۔

"سکندر!" ـــ اُس نے بڑی سنجیدہ اور جذباتی آواز میں کہا ـــ "تم شاید پوری طرح محسوس نہ کر سکو کہ تم نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔"

اُس کی اس بات سے اور انداز سے میں نے محسوس کیا کہ شہناز کے معاملے میں یہ شخص اُس سے کہیں زیادہ جذباتی ہے جتنا میں سمجھتا ہوں۔

"حمید اللہ!" ـــ میں نے کہا ـــ "اپنے ساتھ ذرا مضبوط قسم کے آدمی رکھو۔ تمہارے ان تین آدمیوں نے ریوالور دیکھ کر ہی تمہارا اتا پتہ بتا دیا اور مجھے تمہارے ٹھکانے پر لے آئے۔"

"میں ریوالور کی نالی تمہاری کنپٹی پر رکھ دوں تو تم بھی ہر سوال کا جواب دو گے" ـــ حمید اللہ نے مسکراتے ہوئے کہا ـــ "مجھے پتہ چل چکا ہے کہ تم یہاں کس طرح پہنچے ہو..... اور سکندر! ابھی میرا مسئلہ ہے کہ مجھے ابھی پکے آدمی نہیں مل رہے۔ اچھا ہوا کہ تم آ گئے ہو..... یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ کچھ کھا پی لو اور ذرا آرام کر لو۔"

"تو کیا اب شیطان کا وہ بچہ نواب بن گیا ہے؟" ـــ حمید اللہ خان نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

"ہاں" ـــ میں نے جواب دیا ـــ "تمہارا چھوٹا بھائی مراد علی خان اپنے باپ کی لاش پر جشن بھی منا چکا ہے اور اب وہاں ڈی ایس پی وارن کے قتل کی تفتیش اور سراغرسانی ہو رہی ہوگی۔"

"مراد علی خان زیادہ دن اس گدی پر نہیں بیٹھ سکے گا" ـــ حمید اللہ خان نے ایسے لہجے میں کہا جس میں کھوکھلا پن نہیں تھا بلکہ ایک چیلنج اور ایک عزم تھا۔ اُس نے کہا ـــ "مجھے اُس پر رحم آتا ہے۔ وہ اس نوجوانی کی عمر میں قبر میں اُتر جائے گا۔"

"حمید!" ـــ شہناز نے کہا ـــ "کیا تم اُس گدی کو ذہن سے اُتار نہیں سکتے؟ تم وہاں چند منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ اب وہاں آگ لگے، سیلاب آئیں اور جو کچھ بھی ہو، تمہیں اس سے کیا!"

"میں یہ پیغام ہندوستان کے وائسرائے تک پہنچاؤں گا" ـــ حمید اللہ خان نے کہا ـــ "کہ اس نواب کا جو بھی جانشین ہوگا وہ تین مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا ..... مراد علی خان کی ماں کے بَین وائسرائے تک پہنچیں گے۔ انگریزوں کے سوا اس خاندان کی داد فریاد سُننے والا کوئی نہیں۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلے گا کہ محل میں کیا ہو رہا ہے؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "شہناز کی بات مان لو اور اُس جگہ کو بھول جاؤ۔"

"تم یہیں ہو" ـــ اُس نے کہا ـــ "وہاں کی ہر خبر مجھ تک پہنچے گی .... تم دونوں تھکے ہوئے ہو۔ آرام کر لو .... شہناز! سکندر کو یہیں سو جانے دو۔ تم

میرے ساتھ آؤ۔"

"تمہارے ساتھ عمر گزارنے آئی ہوں"۔۔۔ شہناز نے کہا۔۔۔ "لیکن داشتہ بن کر نہیں۔ پہلے نکاح کا انتظام کرو۔"

[۵]

تین روز گزر گئے۔

ان تین دنوں میں حمید اللہ خان اور شہناز باقاعدہ نکاح پڑھوا کر میاں بیوی بن چکے تھے۔ حمید اللہ خان نے مجھے بتا دیا تھا کہ ڈاکو نہیں بنے گا بلکہ دہشت گرد بنے گا۔ اس سلسلے میں ہم نے ابھی تفصیلی بات نہیں کی تھی۔ تیسری رات کا ذکر ہے۔ میں، حمید اور شہناز بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ ایک آدمی آیا۔ حمید اللہ خان اُسے اُٹھ کر ملا اور میرے ساتھ اُس کا تعارف کرایا۔ وہ نواب کے محل سے آیا تھا۔ وہ محل میں ملازم تھا اور حمید اللہ خان کا جاسوس تھا۔ اُس کا نام وہاب تھا۔

"میں آپ کو جانتا ہوں سکندر صاحب!"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "آپ نواب کے ہاں تفتیش کے لئے آتے تھے۔"

"وہاں سے کیا خبر لاتے ہو؟"۔۔۔ حمید اللہ خان نے اُس سے پوچھا۔ اُس کے لہجے میں رُعب اور حکم کا رنگ تھا۔

"یہ تو آپ سکندر صاحب سے سُن چکے ہوں گے کہ نواب صاحب فوت ہو گئے ہیں"۔۔۔ اُس نے کہا۔

"اور میں یہ بھی سُن چکا ہوں کہ اُس علاقے کا ڈی۔ ایس۔ پی وارن قتل ہو گیا ہے"۔۔۔ حمید اللہ خان نے کہا۔۔۔ "اس کے بعد وہاں کیا ہوا ہے؟ کیا قاتل پکڑا گیا ہے؟"

"قاتل تو آپ کے پاس بیٹھا ہے نوابزادہ صاحب!"۔۔۔ وہاب نے کہا۔۔۔ "پولیس کو یقین ہو گیا ہے کہ ڈی۔ ایس۔ پی کے قاتل سکندر صاحب ہیں لیکن پولیس نے خواجہ صاحب کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا ہے اور آفتاب اس جرم میں پکڑا گیا ہے کہ اُس نے خواجہ صاحب کو اصطبل سے ایک گھوڑا دیا تھا

اور وہ گھوڑا غائب ہے۔ آفتاب بھی حوالات میں ہے۔"

وہاب بڑا ذہین آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے تفتیش کے دوران سراغرسانوں کی طرح جو جاسوسی کی تھی اس سے اُس کی ذہانت کا پتہ چلتا تھا۔ چونکہ محل میں قتل کی وجہ سے ہنگامہ بپا تھا اس لئے وہاں کوئی نظم و ضبط نہیں رہا تھا۔ نیا نواب نوجوان تھا اُسے ابھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوتے وہاب وہاں سے نکل آیا تھا۔ اُسے رپورٹ دے کر فوراً واپس چلے جانا تھا۔

اُس نے بتایا کہ ناچ گانے کی محفل جاری رہی تھی۔ ڈی ایس پی اُس لڑکی کو ساتھ لے کر محفل سے اُٹھ گیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے تو دوسرے انگریز افسروں میں سے ایک اُسے دیکھنے گیا کہ وہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔ وہ محل کے کسی کمرے میں نہ ملا۔ شہناز پہلے ہی لاپتہ تھی۔ مزید گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تلاش کرتے گزر گیا۔ اتفاق سے معمولی سے ایک ملازم نے بتایا کہ اُس نے ایک صاحب بہادر کو ایک لڑکی کے ساتھ باغ کے فلاں طرف جاتے دیکھا تھا۔

اُدھر گئے تو صاحب بہادر کی لاش اپنے خون میں ڈوبی اوندھے مُنہ پڑی تھی اور جس لڑکی کو ساتھ لے کر وہ گیا تھا وہ وہاں نہیں تھی۔ لڑکی کو ڈھونڈ نکالنا مشکل نہیں تھا۔ وہاں کے سب لوگ اُسے جانتے تھے۔ پہلا شک یہ کیا گیا کہ اس لڑکی کے باپ نے ڈی ایس پی کو قتل کیا یا کروایا ہے۔

لڑکی نے بیان دیا کہ مقتول اسے زبردستی بے آبرو کرنا چاہتا تھا۔ ایک آدمی اچانک آ گیا۔ اُس نے لڑکی کو کہا کہ وہ چلی جائے۔ وہ چلی گئی۔ کچھ دُور جا کر اُس نے پیچھے دیکھا۔ صاحب اور وہ آدمی اُسے اچھی طرح نظر نہیں آتے تھے کیونکہ وہاں اندھیرا تھا۔ اُسے ایسا لگا جیسے صاحب اور دوسرا آدمی لڑ رہے ہیں۔ لڑکی اور اُس کے باپ کو شاملِ تفتیش کر کے انہیں بہت پریشان کیا گیا۔ ناچ گانے کی تو کسی کو ہوش نہ رہی۔ انگریز افسر ہر کسی کے لئے آفت بن گئے۔ جس کسی پر شک ہُوا اُسے پکڑ کر مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ سب انسپکٹر صوفی وہیں تھا لیکن وہ انہیں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ گیٹ پر حکم گیا کہ گیٹ بند کر دیا جاتے

اور کوئی آدمی، عورت، بوڑھا یا بچہ باہر نہ نکلے۔

گیٹ پر جو پہرہ دار وغیرہ تھے ان میں ایک کانسٹیبل بھی تھا۔ اُن سے پوچھا گیا کہ کوئی باہر تو نہیں گیا؟ انہوں نے بتایا کہ میں ایک عورت کو گھوڑے پر بٹھاتے گھوڑے کے آگے آگے گیٹ سے نکلا تھا اور واپس نہیں آیا۔ گھوڑے کا ذکر آیا تو اصطبل میں جا کے دیکھا۔ وہاں ایک گھوڑا کم تھا۔ اصطبل کے انچارج آفتاب سے پوچھا کہ گھوڑا کون لے گیا ہے تو اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ تو اُس نے کرنا ہی تھا کیونکہ آفتاب حمید اللہ اور خواجہ صاحب کا آدمی تھا، لیکن کسی سائیس نے بتا دیا کہ گھوڑا آفتاب کی موجودگی میں گیا تھا۔

سائیس نے تو بتانا ہی تھا کیونکہ جس کی طرف اُنگلی اُٹھتی تھی، انگریز افسر پہلے اُسے اتنا مارتے پیٹتے تھے کہ وہ صرف بولنے کے قابل رہ جاتا تھا، پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔

وہاب نے تہہ تک جا کر تفتیش کی تفصیلات معلوم کر لی تھیں۔ میری اور شہناز کی گمشدگی شک پیدا کرتی تھی کہ ڈی ایس پی کا قاتل میں ہو سکتا ہوں لیکن کوئی اتنی بڑی وجہ معلوم نہیں ہو رہی تھی کہ میں اتنے بڑے انگریز افسر کو قتل کر دیتا۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ سب انسپکٹر صوفی نے یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ اُس نے مجھے کہا تھا کہ ڈی ایس پی ایک غریب لڑکی کو اپنے ساتھ ناچ دکھانے لے گیا ہے اور اُس کے ساتھ بیہودہ حرکتیں کر رہا ہے۔ وہ لڑکی میری شناخت نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہاں اندھیرا تھا۔ اُس سے پوچھا گیا کہ اُس آدمی کا حُلیہ کیا تھا جس نے اُسے کہا تھا کہ یہاں سے چلی جاؤ اور پھر اُس کی مقتول کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی۔

میں ڈی ایس پی کو قتل کر کے خواجہ صاحب سے ملا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے کسی نے خواجہ صاحب کے پاس نہیں دیکھا تھا، لیکن وہاب نے بتایا کہ ایک آدمی نے دیکھ لیا تھا۔ پھر ایک آدمی نے مجھے خواجہ صاحب کے گھر میں داخل ہوتے، گھوڑا باہر لاتے اور شہناز کو اُس پر سوار کراتے دیکھا تھا۔ خواجہ صاحب کو گرفتار کرانے کے لئے یہی شہادت کافی تھی کہ اصطبل کا گمشدہ گھوڑا اُن کے گھر سے نکلا تھا۔ خواجہ صاحب، آفتاب اور لڑکی کے باپ کو باقاعدہ حراست میں

لے لیا گیا۔

"سکندر صاحب!" —— وہاب نے یہ ساری تفصیلات سُنا کر کہا —— "تھانے سے مجھے جو کچھ پتہ چلا ہے وہ اس طرح ہے کہ آپ کو بھگوڑا اور نواب صاحب کے گھر کی ایک خاتون کے اغوا کا ملزم قرار دیا گیا ہے اور اس شک کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے کہ قتل بھی آپ ہی نے کیا ہو گا۔"

۞

"سکندر!" —— حمید اللہ خان نے کہا —— "تم تو نکل آتے ہو اور ہمارے بزرگ خواجہ صاحب شکنجے میں آ گئے ہیں۔ آفتاب کا بھی مجھے خیال ہے۔ اُس نے میرا بہت ساتھ نبھایا ہے اور وہاں سے مجھے آفتاب نے ہی فرار کرایا تھا۔ کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ ان دونوں کو یا خواجہ صاحب کو تھانے سے آزاد کرایا جا سکتا ہے؟"

"میں کیوں محسوس نہیں کرتا؟" —— میں نے کہا —— "میں تو یہاں تک کرنے کو تیار ہوں کہ یہ گھوڑا لے کر چلا جاؤں اور خواجہ صاحب اگر حوالات میں نہ ہوں، برآمدے میں یا ایس ایچ او کے دفتر میں موجود ہوں تو میں اُنہیں اتنی تیزی سے کندھوں پر اُٹھا کر اور گھوڑے پر بٹھا کر نکل آؤں کہ تھانے والوں کے سنبھلنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل آؤں۔"

"نہیں سکندر!" —— حمید اللہ نے کہا —— "یہ طریقہ صحیح نہیں۔ میں تم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں گا۔"

"مجھے کچھ بتاؤ خان صاحب!" —— وہاب نے کہا —— "میرے ذمے جو فرض ہو گا میں پورا کروں گا۔"

میری چھٹی حس بیدار ہو گئی اور خدا نے مجھے جو ذرا سی فالتو عقل دی تھی اُس نے مجھے ایک اشارہ دیا۔ میں نے سب انسپکٹر صوفی کے تھانے میں کئی گھنٹے گزارے تھے۔ میں نے دیکھا تھا کہ کوئی ملزم بیت الخلا میں جانے کی ضرورت محسوس کرتا تھا تو اُسے ہتھکڑی لگا کر ایک کانسٹیبل بیت الخلاء میں لے جاتا تھا جو سپاہیوں کی بیرک سے ذرا دُور تھانے کے احاطے کی دیوار کے ساتھ تھا۔

ہتھکڑی میں کسی حوالاتی کا فرار ہونا بعید از قیاس تھا۔ میں نے حمید اللہ کو یہ بات بتائی۔

"بڑا مشکل کام ہے" — حمید اللہ نے کہا — "لیکن یہ کام کرنا ضرور ہے"۔

"خان صاحب!" — وہاب نے کہا — "خواجہ صاحب پر تشدد ضرور کیا جا رہا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک انگریز ڈی ایس پی کے قتل کا انتقام لینے کے لئے انگریز ہندوستان کی آدھی آبادی کو بھی قتل کر دیں گے۔ یہ تو یوں سمجھیں کہ انگریزوں کا بادشاہ قتل ہو گیا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ خواجہ صاحب کو تشدد سے ہی نہ مار ڈالیں۔ آفتاب جوان آدمی ہے۔ وہ کچھ برداشت کر لے گا۔ خواجہ صاحب کے جسم میں اتنی طاقت کہاں رہ گئی ہے"۔

"وہاب بھائی!" — میں نے کہا — "میں دن کی روشنی میں خواجہ صاحب کو اُٹھا کر لا سکتا ہوں ....کیا تم ایسا انتظام کر سکتے ہو کہ خواجہ صاحب کسی خاص وقت کہیں کہ وہ بیت الخلاء میں جانا چاہتے ہیں۔ یہ مجھے پتہ چل جاتے۔ میں خواجہ صاحب کو وہاں سے اُٹھا کر لا سکتا ہوں"۔

"ہاں" — وہاب نے جواب دیا — "دو آدمی میرے ہاتھ میں ہیں جو تھانے کی خبر رکھتے ہیں۔ اگر صوفی صاحب چاہیں تو وہ اُن کے لئے مُخبری بھی کر دیتے ہیں۔ اگر خواجہ صاحب کو انگریز افسروں نے تفتیش کے چکر میں نہ ڈال رکھا ہو تو میں یہ انتظام کرنے کی پوری کوشش کروں گا ....خدا کی قسم! خواجہ صاحب کو میں اپنا باپ سمجھتا ہوں"۔

یہ کام آسان نہیں تھا، لیکن میں اور حمید اللہ اتنی جلدی ہمّت ہارنے والے نہیں تھے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ وہاب خاصا ذہین آدمی تھا۔ بعض لوگوں کی فطرت ایسی ہوتی ہے کہ اس قسم کے کاموں میں اور قانون شکنی میں اُن کا دماغ زیادہ کام کرتا ہے۔ ہم تینوں نے مل کر ایک سکیم بنا لی، لیکن کامیابی مشکوک نظر آتی تھی۔ سب سے زیادہ مشکل اور خطرناک کام یہ تھا کہ ہم اُس وقت تھانے کے پچھواڑے پہنچیں جس وقت خواجہ صاحب بیت الخلاء میں گئے ہوئے ہوں۔

وہاب اُس روز واپس چلا گیا اور وہ تیسرے روز ہمارے پاس آیا۔ وہ بہت سویرے ہمارے پاس پہنچ گیا تھا۔ اُس نے یہ خبر سنائی کہ خواجہ صاحب کو بیت الخلاء تک لانے کا انتظام ہو گیا ہے لیکن یہ کام اسی شام کرنا تھا۔ میں اس کام کے لئے خود جانا چاہتا تھا، لیکن حمید اللہ نے مجھے روک دیا۔ اُس نے پھر کہا کہ وہ مجھے ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اُس نے دو آدمیوں کو بلایا اور انہیں بتایا کہ وہ حمید اللہ کے ساتھ فلاں تھانے تک پہنچ جائیں گے۔ حمید اللہ خود اس مہم پر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اُس نے عام دیہاتی قسم کے کپڑے پہن لئے سر پر دیہاتی پگڑی رکھی اور چہرے پر اُس نے اپنی تیار کی ہوئی گوند لگائی اور اس پر ایک بکرے کی کھال کے لمبے بال چپکا کر قینچی سے تراشے۔ میں دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ حمید اللہ کا دماغ اس طرف کتنا اچھا چلتا ہے۔ اُس نے کپڑوں کے اندر ریوالور اور ایک خنجر رکھ لیا۔

وہاب کسی اور کی وساطت سے خواجہ صاحب تک یہ پیغام پہنچا آیا تھا کہ شام کو سورج غروب ہونے سے تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دوہرے ہو جائیں اور کہیں کہ بڑا سخت مروڑ اُٹھ رہا ہے اور وہ بیت الخلاء میں جانا چاہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم کرا لیا گیا تھا کہ خواجہ صاحب کی جسمانی حالت بہت بُری کر دی گئی تھی۔ وہ مانتے نہیں تھے کہ وہ رقص والی جگہ اُنہیں ملا تھا اور وہ یہ بھی نہیں مانتے تھے کہ اصطبل کا گھوڑا اُن کے گھر تھا۔

حمید اللہ میرا گھوڑا لے جا رہا تھا۔ میں نے اُس کا حُلیہ دیکھا تو یہ نہایت کامیاب بہروپ تھا۔ اُس کے دونوں ساتھی الگ الگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ وہ تھے ہی دیہاتی اور گمنام سے آدمی۔ وقت اور فاصلے کا حساب کر کے وہ تینوں روانہ ہو گئے۔ وہاب پہلے ہی جا چکا تھا۔ میں اور شہناز اُن کی کامیابی کی دُعا کرنے کے لئے پیچھے رہ گئے۔ میں بے تاب ہُوا جا رہا تھا کہ اس مہم میں مجھے جانا چاہیئے تھا۔

میں بڑی بے تابی سے منٹ اور سیکنڈ گنتا رہا۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے وقت آگے بڑھ ہی نہیں رہا۔ خدا خدا کر کے سورج غروب ہُوا۔ کبھی شہناز مجھ سے

پوچھتی کہ تمہارا کیا خیال ہے وہ پکڑے تو نہیں جائیں گے کبھی میں اُسے کہتا کہ معاملہ گڑ بڑ نہ ہو جائے۔ ہم دونوں کی ذہنی کیفیت ایسی ہو گئی کہ شام تاریک ہو گئی۔ کھانے کا وقت گزر گیا۔ ہمیں کھانے کا خیال ہی نہ آیا۔

ہمیں دُور سے گھوڑوں کے ٹاپ سنائی دیے۔ میں اور شہناز دوڑتے باہر نکلے اور گاؤں سے بھی آگے چلے گئے۔ ہماری نظریں اندھیرے کو چیر رہی تھیں۔ ہمیں گھوڑوں کے سائے دکھائی دینے لگے۔ میں اور شہناز اُس طرف دوڑ پڑے۔ یہ گھوڑ سوار پولیس کے آدمی بھی ہو سکتے تھے لیکن ہمارے ذہنوں پر حمید اللہ اور خواجہ صاحب سوار تھے۔ آخر وہی نکلے جن کا ہمیں انتظار تھا۔ خواجہ صاحب حمید اللہ کے آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے مُنہ سے بات بھی نہیں نکلتی تھی۔ انہیں گھر کے سامنے لے جا کر گھوڑے سے اتارا گیا اور سہارا دے کر اندر لے گئے۔ اُن پر ظالمانہ تشدّد کیا گیا تھا۔ اُن کے ہاتھ کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی جو اَب توڑنی تھی۔

حمید اللہ نے سنایا کہ اُس نے ایک آدمی کو تھانے کے احاطے کی پچھلی فصیل کے پاس کھڑا کر دیا اور خود ذرا دُور اس طرح رُک گئے جیسے کوئی مسافر ذرا ستانے کے لئے رُکے ہوں۔ سہولت یہ تھی کہ یہ دیہاتی علاقے کا تھانہ تھا اور یہ تھانہ ایک بڑے گاؤں سے ذرا باہر تھا۔ خواجہ صاحب نظر آئے۔ اُنہیں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر جُھکے ہُوئے تھے۔ ہتھکڑی ایک کانسٹیبل کے ہاتھ میں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے بیت الخلاء میں داخل ہُوئے۔ بیت الخلا کے چار پانچ حصے تھے۔ ان کے سامنے دیوار تھی۔ کانسٹیبل اور خواجہ صاحب بیت الخلاء میں داخل ہو گئے۔

احاطے کی فصیل اور بیت الخلاء کے درمیان دس بارہ قدم کا فاصلہ تھا۔ سکیم کے مطابق وہی آدمی جو فصیل کے ساتھ ٹہل رہا تھا، فصیل پھاند کر اندر چلا گیا۔ اُسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ تھانے کی عمارت اور اُس کے درمیان بیت الخلا حائل تھا۔ اُس آدمی کے ہاتھ میں دو اڑھائی فٹ لمبا ڈنڈا تھا جو خاصا موٹا تھا۔ اُس زمانے میں پولیس والے پگڑیاں باندھتے تھے۔ ہمارا آدمی بیت الخلاء والی جگہ داخل ہُوا تو کانسٹیبل کی پیٹھ اُس کی طرف تھی۔ اُس نے بڑی تیزی سے کانسٹیبل کی پگڑی پر

ہاتھ مارا۔ اُدھر پگڑی گری اِدھر اس آدمی نے اُس کے سَر کے پچھلے حصے پر بڑی تیزی سے دو ڈنڈے مارے اور کانسٹیبل غش کھا کر گر پڑا۔

خواجہ صاحب اسی انتظار میں بیت الخلاء میں بیٹھے تھے۔ وہ اُٹھے اور ہتھکڑی کی زنجیر اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لی۔ اُن سے اچھی طرح چلا تو نہیں جاتا تھا لیکن خطرے کے پیشِ نظر وہ ہمت کر کے تیز چلے اور دیوار پھاند آئے۔ آگے گھوڑے تیار تھے۔ حمید اللہ نے انہیں اُٹھا کر گھوڑے پر بٹھایا۔ خود پیچھے بیٹھا پھر ان لوگوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ اس طرح خواجہ صاحب ہمارے پاس پہنچ گئے۔ پہلا کام یہ کیا گیا کہ اُن کی ہتھکڑی توڑی گئی۔

"سکندر!" — خواجہ صاحب نے کربناک آواز میں آہستہ آہستہ کہا — "تم کئی خطروں میں سے گزرے ہو، لیکن اب جو خطرہ تم پر آیا ہے، اللہ ہی ہے جو تمہیں اس سے بچا لے۔"

"کیسا خطرہ خواجہ صاحب!" — میں نے پوچھا — "کیا ان فرنگیوں کو یقین ہو گیا ہے کہ ان کے ڈی ایس پی کا قاتل میں ہوں؟"

"نہیں" — خواجہ صاحب نے جواب دیا — "اُنہیں یہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ قتل بہت بڑی سازش ہے جس کے روحِ رواں تم ہو۔ تمہاری گرفتاری کے لئے انگریز ہندوستان کی زمین کھود ڈالیں گے۔ اب تمہیں بہت چوکنا رہنا پڑے گا۔"

اب ہم سب مفرور مجرم تھے۔ جُرم معمولی نہیں تھے۔ میں ایک انگریز ڈی ایس پی کا قاتل تھا اور اس کے ساتھ ہی میں پولیس کی نوکری سے بھگوڑا تھا۔ انگریز بادشاہ نے مجھے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا تھا۔ جونہی میں نے گرفتار ہونا تھا، انگریزوں نے رسمی سا مقدمہ چلا کر میرے گلے میں پھندا ڈال دینا اور نیچے سے تختے گرا دینے تھے۔ حمید اللہ خان تو سنگین جرم کی سزائے قید کے دوران جیل سے بھاگا ہُوا تھا اور اب خواجہ صاحب بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا، کہیں ڈاکہ نہیں ڈالا تھا، لیکن وہ ہماری سازش میں شریک تھے اور پولیس کی حراست سے فرار ہُوئے تھے۔ فرار بجائے خود جرم تھا اور اس کے ساتھ ہی کئی جرائم کا ثبوت بھی بن سکتا تھا۔

ہم تینوں آدمی زندگی کی مختلف راہوں کے راہی تھے۔ خواجہ صاحب موسیقی کی دنیا کے بادشاہ تھے اور عمر کی آخری منزل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ وہ جہاندیدہ اور دانشمند تھے۔

حمید اللہ خان نوابزادہ تھا جس کے انگ انگ میں نوابی عیاشی سمائی ہوئی تھی۔ اُس کی نگاہ میں بیوی اور داشتہ میں کوئی فرق نہیں تھا۔

بس وہ آوارہ غزال تھا جو اپنی ہی مشکِ نافہ کے تعاقب میں بھٹکتا پھر رہا تھا کوئی راہ نہیں، کوئی منزل نہیں تھی۔ نوابوں میں جا بیٹھا تو نواب تھا، کسی بھکاری کا ہمسفر ہُوا تو بھکاری تھا۔

ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم تینوں ایک منزل کا تعین کر کے ایک راستے پر چل پڑتے۔ منزل تو ہم تینوں کی ایک ہی تھی ـــ عمر قید یا تختۂ دار ـــ لیکن اُس منزل تک پہنچنے کے لئے ہمارے راستے مختلف بھی ہو سکتے تھے۔ اب یہی ہمارا مستقبل تھا۔

"سکندر!" ـــ شہناز نے دو ایک روز کے بعد مجھے الگ بٹھا کر کہا ـــ

"تم نے کبھی سوچا ہے ہمارا یہ سفر کہاں ختم ہو گا؟"

معلوم نہیں کیوں میری ہنسی نکل گئی۔ وہ عورت ذات تھی۔ میں اُسے یہ کہہ کر خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ ہمارا سفر جیل کے دروازے پر ختم ہو گا۔ عورت کتنی ہی چالاک کیوں نہ ہو وہ مرد کو اپنا محافظ سمجھتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ شہناز مجھے اپنا مونس و غمخوار اور پاسبان سمجھتی ہے۔ انجام جو ہونا تھا وہ تو ہونا ہی تھا، اس سے پہلے رونا اور رُلانا مجھے اچھا نہ لگا۔

"شہناز!" ـــ میں نے کہا ـــ "آج کی سوچو۔ آنے والے کل کا پہلے ہی غم لے کے نہ بیٹھ جاؤ..... اتنا زیادہ اُداس اور پریشان ہو جانا ٹھیک نہیں"

"میری پریشانی کچھ اور ہے سکندر!" ـــ شہناز نے کہا ـــ "اور اس کا شاید کسی کے پاس بھی علاج نہیں"

"وہ کیسی پریشانی ہے؟"

"تم تو جانتے ہی ہو" ـــ شہناز نے جواب دیا ـــ "میرے اُوپر یا میری ذات کے اندر وہ جو آسیبی اثر ہے اب مجھے پہلے سے زیادہ پریشان کرنے لگا ہے۔ تمہارے آبا نے مجھے اپنی بیوی بنایا تو اُن کا جو انجام ہُوا وہ تم نے دیکھ لیا ہے۔ تاجے ڈاکو کا انجام دیکھ لو۔ حمید اللہ اپنی جاگیر کا بادشاہ تھا لیکن مجھ سے اس کا دل لگا تو وہ آج مفرور مجرم ہے۔ اس کے نواب باپ کا انجام دیکھ لو۔ میں حیران ہوں کہ گلشن آرا کے خاوند نے صرف اتنا کہا تھا کہ شہناز، میں تیرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایسے حادثے کا شکار ہو گیا کہ جسمانی اور ذہنی لحاظ سے معذور ہو گیا"

"اب یہ پُرانے قصے کیوں دُہرا رہی ہو؟" ـــ میں نے کہا ـــ "یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔ اس لمحے تک جو کچھ بھی ہُوا ہے، اسے ذہن سے کھُرچ ڈالو"

"نہیں سکندر!" ـــ شہناز نے کہا ـــ "اصل رنج تو مجھے اب ہونے لگا ہے۔ میں نے تم سے چھپایا تو نہیں تھا کہ حمید اللہ کے ساتھ میری کتنی محبت ہے۔ چاہا تو میں نے تمہیں بھی تھا لیکن نیّت کچھ اور تھی۔ پھر ہمارا رشتہ ہی کچھ اور

نکلا۔ حمید اللہ پہلا آدمی ہے جس کی رفاقت میں میں نے پہلی بار سچی محبت کا ذائقہ چکھا ہے۔ اب ہم دونوں کی باقاعدہ شادی ہو گئی ہے۔ میں ڈرتی ہوں کہ میرا آسیبی اثر نہ جانے اسے اس سے بڑھ کر کیسے بُرے انجام تک پہنچائے گا۔ جب تنہائی میں بیٹھ کر سوچتی ہوں تو ایک ہی راستہ نظر آتا ہے.... خودکشی۔ میں حمید اللہ کی زندگی پر اپنی زندگی قربان کر دوں گی۔"

شہناز کی یہ پریشانی بجا تھی۔ کسی حد تک میں خود بھی پریشان ہو گیا۔ میں نے کہہ تو دیا تھا کہ یہ محض اتفاق ہے لیکن میں اسے اتفاق نہیں سمجھتا تھا۔ شہناز میں ضرور کوئی ایسا اثر تھا جو اُس کے ساتھ تعلق پیدا کرنے والے کو لے ڈوبتا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔

مجھے خواجہ صاحب کا خیال آگیا۔ وہ دانشمند انسان تھے۔ میں نے اُسی روز اُن کے ساتھ بات کی بلکہ شہناز کی زندگی کی ساری کہانی سنا دی۔ سنائی تو پہلے بھی تھی لیکن یہ تفصیلات نہیں سنائی تھیں جو اُس کے اِس پُراسرار اثر کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں۔

خواجہ صاحب کو تھانے میں پولیس کے انگریز افسروں نے ایسی ظالمانہ ایذا رسانی سے گزارا تھا کہ وہ بستر سے اُٹھ نہیں سکتے تھے۔ اُنہوں نے شہناز کو وہیں بلا لیا۔

"سکندر نے مجھے تمہاری پریشانی بتائی ہے"۔۔۔ خواجہ صاحب نے کہا ۔۔۔"کیا تم حمید اللہ خان کو سچے دل سے چاہتی ہو؟"

"ہاں خواجہ صاحب!"

"تم اسے کسی ذاتی فائدے کے لئے تو نہیں چاہتیں؟"۔۔۔ خواجہ صاحب نے پوچھا۔

"اس سے مجھے کیا ذاتی فائدہ مل سکتا ہے؟"۔۔۔ شہناز نے جواب دیا ۔۔۔ "کیا میں دیکھ نہیں رہی کہ اس شخص کا مستقبل تاریک ہو چکا ہے؟....اور خواجہ صاحب! میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اچانک ایک روز ہم سب پولیس کے گھیرے میں آئے ہوئے ہوں گے۔ حمید، سکندر اور ان کے ساتھی مقابلہ کریں گے۔ گھیرے سے نکلنے کی

کوشش کریں گے اور یہ دونوں مارے جائیں گے۔ پھر بھی مجھے حمید سے محبت ہے۔ یہ جب مارا جائے گا تو میں اُس کے ریوالور سے اپنے سر میں گولی مار لوں گی۔"

"خواجہ صاحب!"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔"صرف یہی نہیں کہ اسے حمید سے محبت ہے بلکہ حمید بھی اس کی محبت میں دیوانہ ہُوا جا رہا ہے۔"

"پھر کچھ نہیں ہوگا"۔۔۔ خواجہ صاحب نے کہا ۔۔۔"اگر تم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی والہانہ محبت ہے، اس میں بناوٹ اور غرض نہیں تو حمید تمہارے اُس اثر سے محفوظ رہے گا۔"

"محبت تو پہلے بھی تھی خواجہ صاحب!"۔۔۔ شہناز نے کہا ۔۔۔"جب ہم جاگیر پر تھے۔"

"اُس وقت تم میاں بیوی نہیں تھے"۔۔۔ خواجہ صاحب نے کہا ۔۔۔ "وہ گناہ کی زندگی تھی جس میں تم مطمئن تھیں۔ کیا تم نے کہا نہیں تھا کہ نکاح نہ ہُوا تو کیا؟"

"ہاں خواجہ صاحب!"۔۔۔ شہناز نے کہا ۔۔۔"میرا یہی خیال تھا۔"

"اور تمہاری شادی جب سکندر کے والد کے ساتھ ہوتی تھی تو تمہاری نیت کیا تھی؟"۔۔۔ خواجہ صاحب نے پوچھا ۔۔۔"تمہاری ماں نے کس نیت اور کس ارادے سے تمہاری شادی تمہاری عمر سے دُگنی عمر کے آدمی کے ساتھ کرائی تھی؟"

"بہت بُری نیت سے!"۔۔۔ شہناز نے جواب دیا ۔۔۔"ماں نے مجھے اپنے سانچے میں ڈھالا ہُوا تھا۔ میں نے سکندر کے باپ کا گھر خالی کرنا تھا۔"

"اور تم نے اس شخص کے باپ کی بیوی ہو کر کسی اور کو خاوند بنا رکھا تھا"۔۔۔ خواجہ صاحب نے کہا۔

"ہاں خواجہ صاحب!"۔۔۔ شہناز نے جواب دیا ۔۔۔"میں اپنی ماں کے راستے پر چل رہی تھی۔ میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے شرماؤں گی نہیں۔ میں

کہتی ہوں مجھے کوئی روحانی سکون دے دے۔"

"اور نیت سکندر کے والد کی بھی صاف نہیں تھی" ــــ خواجہ صاحب نے کہا ــــ "اُس نے تمہیں حسین لڑکی ہونے کی وجہ سے اپنی بیوی بنایا تھا۔ وہ تو اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی بھول گیا تھا" ــــ خواجہ صاحب نے مجھ سے کہا ــــ "کیوں سکندر؟ تم ہی نے مجھے بتایا تھا۔"

"ہاں خواجہ صاحب!" ــــ میں نے کہا ــــ "ایسے ہی ہُوا تھا۔"

"اور جہاں ایسا ہی ہوتا ہے وہاں سے خیر و برکت اُٹھ جاتی ہے میرے بچو!" ــــ خواجہ صاحب نے کہا ــــ "وہاں شیطان کا بسیرا ہوتا ہے، پھر وہاں یہی ہوتا ہے جو تمہارے ساتھ ہُوا اور پھر اُس آدمی کے ساتھ ہُوا جس نے تمہارے ساتھ جسمانی تعلق پیدا کیا۔"

"وہ تو ہُوا خواجہ صاحب!" ــــ میں نے کہا ــــ "اب کیا ہوگا؟ شہناز اپنے ساتھ جو اثر لیے پھرتی ہے یہ ہمیں بھی تباہ کر سکتا ہے۔ یہ حمید اللہ کے متعلق پریشان ہے۔ ایسی پریشانیوں میں لوگ پیروں اور عاملوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شہناز پر کسی نے کبھی اُلٹے تعویذ کرائے ہوں۔ لوگ اپنے دشمنوں پر ایسے خفیہ وار کیا کرتے ہیں کہ ان پر کالے جادو کا عمل کرا دیتے ہیں۔"

"شہناز کے معاملے میں یوں ہُوا ہوگا" ــــ خواجہ صاحب نے کہا ــــ "شہناز جیسی خوبصورت لڑکیوں اور اس کی ماں جیسی فتنہ پرداز عورتوں کے دشمن ضرور ہوتے ہیں لیکن میں نہ تعویذ دے سکتا ہوں نہ کسی تعویذ کا اثر توڑ کر سکتا ہوں۔ انسان اپنا پیر اور عامل خود ہوتا ہے۔ اعمال اچھے ہوں تو جزا ملتی ہے اور بداعمالیوں کی سزا ملتی ہے ....قدرت کے کچھ راز ایسے ہیں جنہیں انسان نہیں سمجھ سکتا۔ ظلم جو میرے ساتھ نوجوانی میں ہُوا تھا ویسا ہی میرے بیٹے تاجے کے ساتھ ہُوا۔ وہ ڈاکو بنا اور میں نے ساز و آواز کی دنیا میں وہ نام پیدا کیا کہ نوابوں سے داد پاتی۔ یہ وہ راز ہیں جنہیں بہت کم انسان پا سکتے ہیں۔ یہیں سے میں نے یہ بھید پایا ہے کہ انسان خود ہی بد ہے خود ہی نیک ہے۔"

"خواجہ صاحب!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں نے کون سی بدی کی تھی

جس نے مجھے آگ کے اس سمندر میں سے گذارا ہے؟"

"یہی تو راز ہے سکندر بیٹا!" ــــ خواجہ صاحب نے کہا ــــ "جہاں تک شہناز کی پریشانی کا تعلق ہے یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ خود ہی غور کرو کہ شہناز اپنے باپ کی بیوی بن گئی تھی۔ اس کی ماں جانتی تھی کہ تمہارا باپ اس کا بھی باپ ہے۔ اس سے اور بڑی بدی کیا ہوگی۔"

"پھر یہ سزا مجھے کیوں مل رہی ہے خواجہ صاحب؟" ــــ شہناز نے جھنجھلا کر کہا ــــ "میں ان فلسفوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ سمجھنا چاہتی بھی نہیں۔"

"نہ سمجھو شہناز بیٹی!" ــــ خواجہ صاحب نے شہناز کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ــــ "میں کون سے فلسفے جانتا ہوں جن میں تم اُلجھو گی۔ میں نے کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ انسانوں کو اور کروٹیں بدلتے حالات کو پڑھا ہے۔ میں تمہیں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ جسے تم اپنا آسیبی یا پُراسرار اثر کہتی ہو وہ رفع ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں یہ سمجھا رہا تھا کہ تم شیطان کے سائے میں زندگی کی منزلیں طے کرتی رہی ہو۔ اب اگر تم نے دل و جان سے حمید اللہ سے یا کسی اور سے محبت کر لی ہے اور تمہارے دل میں وہ محبت پیدا ہو گئی ہے جو بے غرض اور بے لوث ہوتی ہے اور جس کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے تو یقین کر لو کہ تم شیطانی اثرات سے آزاد ہو گئی ہو۔ سچی محبت ایک انسان سے ہو یا بنی نوع انسان سے، وہ خدا کو بھی عزیز ہوتی ہے۔ صرف جسم کو سامنے رکھو گی تو روح مرجھا جاتے گی۔"

"مجھے اپنے جسم سے نفرت ہو گئی ہے خواجہ صاحب!" ــــ شہناز نے کہا۔

"تم جو کچھ پاؤ گی اسی نفرت سے پاؤ گی" ــــ خواجہ صاحب نے کہا ــــ "اگر تمہاری ماں یہ خیال تمہارے ذہن میں لڑکپن میں ہی ڈال دیتی تو آج تم کسی بڑے اچھے اور باعزت گھرانے کی رانی ہوتیں، لیکن تم میں یہ پچھتاوا پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ تم کسی گھر کی رانی نہ بن سکیں۔ اب اپنے ذہن اور دل کو گناہوں سے اور اُلٹے سیدھے خیالوں سے پاک کر لو۔ سکندر کی آنکھوں میں دیکھو۔ تم اس کی آنکھوں کا سامنا نہیں کر سکو گی۔ اس میں خدا نے کوئی جادو نہیں بھرا۔ یہ پاکیزہ ذہن اور روح

کا پر تو ہے۔"

شہناز بڑے تیز ذہن کی عورت تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ خواجہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے اُس کے چہرے پر چمک سی دیکھی جیسے اُسے تسکین سی ہو گئی ہو کہ خواجہ صاحب نے اُسے نجات کا صحیح راستہ بتا دیا ہے۔

"خواجہ صاحب!" — شہناز نے کہا — "آپ کہتے ہیں کہ بُرے اور شیطانی خیالات کو ذہن میں نہ آنے دیا جائے، لیکن یہ لوگ، حمید اور سکندر ڈاکہ زنی کے سوا اور کیا کریں گے۔ ڈاکہ زنی بھی تو بہت بڑا گناہ ہے۔"

"نہیں" — خواجہ صاحب نے کہا — "یہ ڈاکے نہیں ڈالیں گے۔"

"پھر کیا کریں گے؟"

"سوچ لیں گے" — خواجہ صاحب نے جواب دیا — "اللہ کے بندوں کے سامنے کوئی اور راستے اور کوئی اور منزلیں بھی ہو سکتی ہیں۔"

۵

خواجہ صاحب نے اتنی زیادہ باتیں کی تھیں کہ اُن کا دم اُکھڑتا ہوا لگتا تھا۔ اُن کی جسمانی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ میں اُسی وقت اُن سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اُن کے ذہن میں ہمارے لئے کون سا راستہ اور کون سی منزل ہے، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ خواجہ صاحب کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور وہ ہماری خاطر غنودگی پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے اُنہیں سو جانے کو کہا اور شہناز کو ساتھ لے کر حمید اللہ کے پاس چلا گیا۔

میں نے حمید اللہ کو بتایا کہ شہناز کو کون سا مسئلہ پریشان کر رہا ہے اور خواجہ صاحب نے کیا کہا ہے۔

"اُنہوں نے ٹھیک کہا ہے" — حمید اللہ نے کہا — "سچ پوچھو تو مجھے اپنے انجام کا کوئی غم نہیں۔ تم تو جانتے ہی ہو سکندر، تم سے کیا پردہ!" — اُس نے شہناز کی طرف اشارہ کر کے کہا — "اس کے ساتھ مجھے ایسا عشق ہو گیا ہے کہ اس کی خاطر مجھے آگ کے شعلوں میں کودنا پڑے تو میں کود جاؤں گا۔"

شہناز مسکرا دی اور میں ہنس پڑا۔

"حمید بھائی!" — میں نے ہنستے ہوئے کہا — "خواجہ صاحب نے کہا ہے کہ تم دونوں نے بدمعاشی کی تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔"

"سکندر!" — حمید اللہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا — "میں بدمعاشیوں کی دنیا سے بہت دُور نکل آیا ہوں۔"

"ذرا کل کی بھی سوچو" — میں نے کہا — "ہمیں زندہ بھی رہنا ہے۔ کیا تمہارے پاس اتنی دولت ہے کہ ہم کچھ کئے بغیر زندہ رہیں گے؟ .... میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔"

"کچھ بھی نہیں" — حمید اللہ نے کہا — "صرف ایک دھوکہ ہے۔ یہ جو چند ایک آدمی میرے ساتھ لگے ہوتے ہیں اسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ میرے پاس بہت روپیہ پیسہ ہے اور میں تاریخ کا بہت مشہور ڈاکو ہوں گا۔ حقیقت یہ ہے سکندر! میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ ہم سب ڈیڑھ دو مہینے گزارا کر لیں گے، لیکن میں مطمئن ہوں۔ ہم نے یہاں شراب نہیں پینی، رنڈیاں نہیں نچانی، کوئی اور عیاشی نہیں کرنی۔ پیٹ ہی ہے نا! وہ تو دال سے بھی بھر جاتا ہے اور مرغن غذاؤں سے بھی ایسے ہی بھرتا ہے۔"

میں نے تو اپنے ذہن میں اپنے ایک راستے کا تعین کر لیا تھا، میں حمید اللہ کا ارادہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اُس سے پوچھا کہ اُس نے آخر سوچا کیا ہے۔

"زنجیریں توڑنی ہیں" — اُس نے کہا۔

"کس کی؟"

"ہندوستان کی غلام مخلوق کی" — حمید اللہ نے ایسے لہجے میں کہا جو اُس کا اپنا لہجہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔

میں اُس کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں پہلے کبھی خواجہ صاحب کی زبان سے سُن چکا تھا کہ حمید اللہ باہر سے کچھ اور، اندر سے کچھ اور ہے اور وہ انگریزوں اور نوابوں کے خلاف محاذ بنانے کی سوچتا رہتا ہے۔ اب میں نے اُس سے بات کی تو وہ خلافِ توقع کچھ زیادہ ہی سنجیدہ اور پُرعزم ہو گیا۔

"تم میرا ساتھ دے سکو گے سکندر؟"

اُس کا یہ سوال اتنا عجیب نہیں تھا جتنا عجیب مجھے یہ لگا کہ حمید اللہ کا چہرہ سُرخ اور آنکھیں گہری لال ہو گئی تھیں۔

"کیا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے حمید!" — میری جگہ شہناز نے کہا — "سکندر تمہارا ساتھ دے گا۔ اب تم ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دو گے تو اور کیا کرو گے۔"

"تم نے کیا پوچھا تھا سکندر!" — حمید اللہ نے پوچھا اور خود ہی بولا "ہاں تم پوچھ رہے تھے کہ اب ہم کیا کریں گے اور میں نے کہا تھا کہ ہندوستان کی غلامی کی زنجیریں توڑنی ہیں .... میں نے محسوس کیا ہے کہ تم شاید میرے اس ارادے پر کچھ حیران سے ہو گئے ہو۔ تمہیں شاید یاد نہیں رہا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میری ماں اس نواب کی بیوی تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اس نواب کا بیٹا نہیں۔ کاغذوں میں تو میں اسی کا بیٹا لکھا ہوا ہوں لیکن میری آنکھوں کی نیلاہٹ دیکھو۔ یہ آنکھیں ہندوستانی نہیں۔ یہ کسی انگریز کی آنکھیں ہیں۔ میرے چہرے اور جسم کا رنگ دیکھو۔ میرے بالوں کا رنگ دیکھو۔ سب کہتے ہیں یہ بڑا حسین چہرہ ہے۔ دوسروں کو میری آنکھیں، میرے گہرے بھورے بال اور میرا رنگ اچھا لگتا ہے، لیکن میں اپنی آنکھوں کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ کبھی ان آنکھوں کو غور سے دیکھتا ہوں تو ان آنکھوں میں مجھے اپنی ماں نظر آنے لگتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس نواب کا بیٹا نہیں۔ خواجہ صاحب نے ایک بار اشارہ سا کیا تھا کہ میری ماں کو تحفے کے طور پر کسی انگریز کے حضور پیش کیا گیا تھا۔"

"مہاراجوں اور نوابوں کے محلات میں یہ کوئی عجیب بات تو نہیں" — میں نے کہا۔

"دوسروں کے لئے عجیب نہیں" — حمید اللہ کہنے لگا — "لیکن اُس کے دل سے پوچھو جسے کوئی کہہ دے کہ تیری بہن یا ماں کو جوانی میں تحفے کے طور پر کسی کو دیا گیا تھا۔ میں جب یہ سوچتا ہوں تو میرا خون اُبلنے لگتا ہے۔ اُس وقت انتقام کا ارادہ مجھے باؤلا کر دیتا ہے۔ میری ماں کتنی مجبور تھی .... اور سکندر! میں اُس وقت لڑکا سا تھا جب میری ماں مر گئی تھی۔ وہ بیمار تو نہیں ہوتی تھی۔ رات بڑی

اچھی صحت میں سوئی تھی، صبح مری ہوئی پائی گئی .... اُسے مارا گیا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تم اپنی ماں کا انتقام لینا چاہتے ہو" — میں نے کہا۔

"صرف اپنی ماں کا نہیں" — حمید اللہ نے کہا — "میں اس ملک کی ہر مجبور ماں کی بے حُرمتی کا انتقام لوں گا۔ ان انگریزوں کا تختہ اُلٹ دوں گا۔ پھر یہ مہاراجے اور نواب یوں اپنی موت ہی مر جائیں گے جس طرح اُس درخت کی شاخیں سُوکھ کر ٹُوٹ ٹُوٹ کر خود ہی گرنے لگتی ہیں جس کی جڑیں کٹ گئی ہوں۔"

"خواب دیکھ رہے ہو حمید بھائی!"

"کبھی کبھی تم بچوں کی سی بات کہہ ڈالتے ہو" — اُس نے کہا — "خواب وہی پورے ہوتے ہیں جو پہلے دیکھے جاتے ہیں۔ کسی انگریز نے کبھی خواب ہی دیکھا تھا کہ ہندوستان پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ ہندوستان ہی نہیں اس قوم نے آدھی دنیا پر قبضہ جما رکھا ہے۔"

"خواجہ صاحب کو ذرا بہتر ہو جانے دو حمید بھائی!" — میں نے کہا — "اُن سے پوچھیں گے .... اس وقت سوچنے والا مسئلہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب کو تو ہم پولیس کی حراست سے نکال لائے تھے، آفتاب ابھی تک حراست میں ہے۔ خواجہ صاحب کو وہاں سے نکلے تین دن ہو گئے ہیں۔ آفتاب پولیس کی کتنی کچھ اذیتیں برداشت کر سکے گا۔ مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ وہ ہماری نشاندہی کر دے گا۔"

حمید اللہ خان کہتا تھا کہ آفتاب دھوکہ نہیں دے گا۔ میں کہتا تھا کہ آفتاب کو یہ غصہ بھی ہو گا کہ ہم نے اُسے فرار نہیں کرایا۔ معلوم نہیں اُسے احساس تھا یا نہیں کہ اب اُسے حوالات میں سے فرار کرانا ممکن نہیں رہا۔ وہ اب کسی حوالاتی کو بیت الخلا میں نہیں لے جاتے ہوں گے۔ اگر لے جاتے ہوں گے تو ایک حوالاتی کے ساتھ دو یا تین کانسٹیبل بھیجتے ہوں گے۔

اتنے دنوں سے نواب کے محل سے بھی کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ اطلاع لانے والا وہاب تھا۔ ہم اُس کے انتظار میں تھے۔

دو دن اور گزر گئے۔ پھر وہاب آ گیا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ محل کے علاقے میں وہاب کا کام ایسا تھا کہ اُس پر کوئی ایسی پابندی نہیں تھی کہ ہر وقت محل میں ملازموں کی طرح موجود رہے۔ اُس کی تین چار روز غیر حاضری کا بھی کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا۔

وہ شام کے وقت آیا۔ اُس کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ نہیں تھی جو ہُوا کرتی تھی۔ میں نے اُس کا چہرہ دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ شخص کوئی اچھی خبر نہیں لایا۔ آتے ہی وہ چارپائی پر اِس طرح گرا جیسے نڈھال ہو گیا ہو۔ کچھ دیر تو وہ بولا ہی نہیں۔

"میں جانتا ہوں تم کوئی بُری خبر لاتے ہو" — حمید اللہ نے کہا — "فوراً بولو۔"

"آفتاب مارا گیا ہے" — اُس نے غم سے بوجھل آواز میں کہا۔

"کیسے؟" — میں نے پوچھا اور اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا — "میں پہلے ہی کہتا تھا کہ وہ پولیس کی ایذا رسانی کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکے گا .... وہ پولیس سٹیشن میں مرا ہو گا۔"

"نہیں سکندر!" — وہاب نے کہا — "وہ فرار کی کوشش میں محل کی دیوار کے باہر مرا ہُوا پایا گیا تھا .... دو تین دنوں سے اُسے تھانے سے محل میں لے آئے تھے لیکن بظاہر وہ حراست میں نہیں تھا۔ اُسے ایک بڑا اچھا کمرہ دے دیا گیا تھا جس میں وہ شہزادوں کی طرح رہنے لگا تھا۔ دو جوان لڑکیاں اُس کی خدمت میں حاضر رہتی تھیں۔ اُسے شراب بھی دی گئی تھی۔ میرا کام ایسا ہے کہ محل کے اندر زنان خانے کے سوا ہر جگہ جا سکتا ہوں ....

"پرسوں کی بات ہے، میں اُس کے کمرے میں چلا گیا۔ میں حیران تھا کہ اُسے کس کارنامے پر یہ انعام دیا گیا ہے کہ اُسے شہزادوں کا درجہ دیا گیا ہے۔ مجھے یہ شک ہُوا کہ اُس نے تم سب کی نشاندہی کر دی ہے اور اقبالِ جرم کر کے وعدہ معاف گواہ بن گیا ہے۔ میں اسی شک کے پیشِ نظر اُس کے کمرے میں گیا تھا۔ میں نے ابھی اُس سے پوچھا بھی نہیں تھا کہ حوالات سے محل میں وہ کس طرح

پہنچا ہے، اُس نے خود ہی ساری بات بتا دی۔ اُس نے کہا کہ اُسے حوالات میں اتنا زیادہ مارا پیٹا گیا تھا کہ وہ کئی کئی گھنٹے بے ہوش رہتا تھا۔ اُس سے صرف یہ پوچھتے تھے کہ خواجہ صاحب، نواب زادہ صاحب اور سکندر کہاں ہیں۔ وہ نہیں بتاتا تھا ....

"آخر اُسے کہا گیا کہ وہ بے گناہ ثابت ہو گیا ہے اور انگریز افسروں نے اُس سے معافی مانگ لی کہ اُسے ناحق زدوکوب کیا گیا ہے۔ ان افسروں نے اُسے یہ کہہ کر محل میں بھیج دیا کہ اُس کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے اس کا ازالہ یوں کریں گے کہ اُسے ایک مہینہ شہزادوں کی طرح عیش و عشرت میں رکھیں گے ....

"آفتاب نے مجھے بتایا کہ وہ اتنا بے وقوف نہیں کہ اس چال کو سمجھ نہ سکے۔ وہ کہتا تھا کہ اُسے بے ہوش کر کے بھی اقبالِ جرم نہیں کروایا جا سکا تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے ایسی عیاشی مہیا کرو کہ اس کا دماغ خراب ہو جائے اور یہ اصل بات بتا دے۔ آفتاب نے مجھے بتایا کہ وہ شراب کی چار پانچ بوتلیں یہاں رکھ گئے ہیں لیکن ابھی تک اُس نے ایک گھونٹ بھی نہیں پیا حالانکہ وہ پینے پلانے والا آدمی تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ جانتا ہے کہ انگریز افسر کیا چال چل رہے ہیں۔ اُنہیں توقع یہ تھی کہ آفتاب مفت کی شراب اتنی زیادہ پی جائے گا کہ دل کی بات اُگل دے گا لیکن آفتاب اتنا پکا نکلا کہ شراب کا عادی ہوتے ہوئے بھی اُس نے شراب نہ پی۔"

"سُنا سکندر!" — حمید اللہ نے مجھے کہا — "میں نے کہا تھا نا، کہ آفتاب ہمیں دھوکہ نہیں دے گا؟"

"اُسے بڑی خوبصورت قید میں رکھا گیا تھا" — وہاب نے کہا — "لیکن وہ بڑا ہی پکا نکلا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میں فرار میں اُس کی مدد کروں گا، لیکن اُس نے مجھے روک دیا۔ کہنے لگا کہ تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے نہ میں تمہیں پکڑوانا چاہتا ہوں۔ کل صبح پتہ چلا کہ آفتاب کی لاش دیوار کے باہر پڑی ہے۔ اُسے دو گولیاں لگی تھیں۔ پیٹھ کی طرف سے لگی تھیں اور سینے سے نکل گئیں۔"

"مارا کس طرح گیا؟" ـــــ حمید اللہ نے پوچھا۔

"میں نے معلوم کیا ہے" ـــــ وہاب نے جواب دیا ـــــ "وہ اس غلط فہمی میں پڑا رہا کہ اُس پر کوئی پہرہ نہیں لیکن سی آئی ڈی کے دو آدمی معمولی سے نوکروں کے بھیس میں اُس کے دروازے پر اور اُس کی ہر حرکت پر نظر رکھتے تھے۔ جس طرح مجھے بتایا گیا ہے وہ یوں ہے کہ وہ رات کو کمرے سے نکلا۔ اُسے یہ یقین تھا کہ وہ باہر والے گیٹ میں سے نہیں نکل سکتا۔ کہتا تھا کہ وہاں ضرور پہرہ لگا ہوگا جو اُسے روک لے گا۔ وہ رات کو دیوار کے اُسی حصّے کی طرف چل پڑا جہاں سے ہم نے آپ کو نکالا تھا۔ آفتاب نے ایک رسّے کا انتظام کر لیا تھا جو اُس نے دیوار پر پھینکا۔ یہ ایک کِگر میں پھنس گیا۔ وہ دیوار پر پہنچ گیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ سی آئی ڈی کے آدمی چُھپ چُھپ کر اُس کے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ شخص کرے گا کیا....

"جب وہ رسّے کے ذریعے اوپر چڑھ رہا تھا تو دونوں آدمی اُسے پکڑنے کے لئے دوڑے۔ اُن کے پہنچنے تک وہ دیوار پر چڑھ چکا تھا اور رسّہ سمیٹ کر دوسری طرف پھینکنے والا تھا۔ ان دونوں آدمیوں کے پاس کپڑوں کے اندر چھپاتے ہُوئے ریوالور تھے۔ ان میں سے ایک نے آفتاب پر دو فائر کئے اور آفتاب دیوار کے باہر جا پڑا۔ فائر کرنے والا ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ اُسے حراست میں لے لیا گیا ہے کیونکہ آفتاب کو گولی نہیں مارنی تھی بلکہ زندہ پکڑنا تھا۔ وہ ڈی ایس پی وارن کے قتل کی واردات میں بڑا اہم گواہ تھا۔"

"تم یہ تو نہیں بتا سکو گے کہ پولیس اب کیا کر رہی ہے" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "اور محل میں کیا ہو رہا ہے۔"

"محل کی دنیا اپنے معمول پر آ گئی ہے" ـــــ وہاب نے جواب دیا ـــــ "انگریز افسر جا چکے ہیں۔ سب انسپکٹر صوفی خواجہ صاحب کے فرار کے سلسلے میں معطّل ہو چکا ہے اور ایک نیا تھانیدار آ گیا ہے۔"

"نئے نواب صاحب کا کیا حال ہے؟" ـــــ حمید اللہ نے پوچھا۔

"وہی جو نئے نوابوں کا ہُوا کرتا ہے" ـــــ وہاب نے جواب دیا ـــــ "پیتا

چلتا ہے جیسے اُسے معلوم ہی نہیں یا اُسے پرواہ ہی نہیں کہ اُس کی راجدھانی میں کیا ہو چکا ہے .... نوابزادہ صاحب! اب مجھے بتائیں کہ میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں۔"

حمید اللہ خان بڑی گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچّے سے مکان کے اس کمرے میں جس میں ایک دیا ٹمٹما رہا تھا، سکوت چھا گیا۔

"وہاب!" ـــــ حمید اللہ نے کہا ـــــ "کبھی تمہاری دوستی کی قیمت ادا کروں گا .... تم جانتے ہو کہ میں نے عہد کیا ہے کہ نوابی کی اس گدّی پر جو بھی بیٹھے گا اُس کے لئے یہ گدّی پھانسی کا تختہ بن جائے گی۔ تمہیں یاد ہے میں نے اپنے باپ کو جنگل میں پکڑا تھا جب وہ شکار کھیلنے گیا تھا اور اُس نے رات وہیں گزاری تھی۔"

"یاد ہے" ـــــ وہاب نے کہا ـــــ "میں تو ساتھ نہیں تھا۔ آپ ہی نے سارا واقعہ سنایا تھا۔ آپ کا یہ بھائی بھی شکار کا شوقین ہے بلکہ نواب صاحب کی نسبت زیادہ شوقین ہے۔"

"میں تمہیں یہی کہنے والا تھا" ـــــ حمید اللہ خان نے کہا ـــــ "اگر تمہیں دو تین روز قبل پتہ چل جائے کہ وہ شکار کھیلنے جا رہا ہے تو مجھے اطلاع دے دینا۔ اُس سے حساب بے باق کرنا ہے۔"

۵

میں آج کتنی آسانی سے اُن دنوں کی داستان سنا رہا ہوں جیسے یہ بچّوں کا کھیل تھا جو ہم نے کھیلا تھا ـــ اُسے قتل کر دیا، فرار ہو گئے، نواب سے حساب بے باق کرنا ہے، ہندوستان کو آزاد کرانا ہے، کسی کو فرار کرانا کسی کو ہلاک کرنا یہ سب نارمل ذہن کی باتیں نہیں اور یہ نارمل زندگی کا معمول نہیں لیکن انسان جلتی ہوئی کسی عمارت کے اندر پھنس جاتے، اور نکلنے کا راستہ نہ ملے، جل کر مر جانا یقینی نظر آنے لگے تو انسان خالی ہاتھوں سے لوہے کے دروازے اور کھڑکیاں توڑنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی توڑ بھی لیتا ہے، اُن کمروں میں سے بھی گزر جاتا ہے جن میں ہر چیز جل رہی ہوتی ہے، دوسری، تیسری اور کبھی چوتھی اور

پانچویں منزل سے بھی کُود آتا ہے، اور اگر زندہ رہے تو وہ اپنے کارنامے کو خود بھی تسلیم نہیں کرتا اور ایسا بُزدل بن جاتا ہے کہ باقی عمر دیا سلائی کے شعلے سے بدکتا اور ڈرتا رہتا ہے۔

کہتے ہیں انسان حالات کا غلام ہے۔

میرا تجربہ کہتا ہے کہ انسان حالات کو غلام بنا سکتا ہے۔

میری کہانی اسی لئے سنسنی خیز ہے کہ میں حالات سے ٹکرا گیا تھا۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حالات مجھ سے ٹکرا گئے تھے اور میں نے حالات کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔ محل یا محلے کی حدود میں جینے والوں کی زندگی میں سنسنی اور ہنگامے پیدا نہیں ہو سکتے۔

اور یہ بھی سن لیں کہ انسان کے اندر قوّت کے اور قوّتِ برداشت کے بے بہا خزانے موجود ہیں۔ یہ انکشاف میرا نہیں، یہ تو اللہ کی بتائی بات ہے۔ البتہ ایک نکتہ ہے جو سمجھ میں آجائے تو انسان پہاڑوں کے جگر چاک کر سکتا ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ جسم گناہ کی غلاظت سے اور ذہن غلیظ خیالات سے پاک رہے تو انسانی فطرت کی ساری قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔

ہٹائیں اس فلسفے کو۔ ویسے بھی ایک مفرور قاتل کے مُنہ سے فلسفہ اور پندو نصیحت اچھی نہیں لگتی۔ آپ تو کہانی سننا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو زندگی کے فلسفے کے ساتھ دلچسپی ہو تو واقعات اور حادثات آپ کو فلسفہ سمجھا دیں گے۔



وہ گاؤں جس میں ہم نے پناہ لی تھی چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں چھوٹے درجے کے لوگ رہتے تھے۔ انہیں چھوٹا اس لئے رہنے دیا گیا تھا کہ بڑے لوگ ان پر حکومت کر سکیں۔ اگر چور نہ ہوں تو تھانیدار بھی نہ ہوں۔ ہمارے ٹریننگ کے ایک اُستاد نے کہا تھا کہ تھانیدار کو تھانیدار رکھنے کے لئے معاشرے میں چوروں کا وجود لازمی سمجھا جاتا ہے۔

ایسے ہی ترقی یافتہ ذہن کے لوگ لاکھوں کروڑوں انسانوں کو صرف

اس لئے ذہنی پسماندگی میں رکھتے ہیں کہ اُن سے نواب مہاراجے، وزیرِ اعظم اور بادشاہ کہلا سکیں۔

وہ گاؤں جس میں ہم نے جا ڈیرے ڈالے تھے نوابوں، مہاراجوں اور حاکموں کے آگے جُھک کر سلام کرنے والے لوگوں کا گاؤں تھا۔ ڈاکوؤں کے لئے بڑی اچھی پناہ گاہ تھی۔ اس گاؤں کے لوگ ڈاکوؤں اور بڑے بڑے رہزنوں کو ایک تو اس لئے پناہ دیتے تھے کہ اُن سے ڈرتے تھے اور زیادہ تر اس لئے کہ ڈاکو اور رہزن انہیں پیسے دیتے تھے۔ وہاں ایسے ڈاکو بھی رہ گئے تھے جنہوں نے گاؤں کی ایک دو بیٹیوں کے جہیز بھی بنا دیئے تھے۔ گاؤں والے ڈاکوؤں کو پولیس کے چھاپے اور گرفتاری سے بچانے کے لئے اپنے دو تین آدمی گاؤں کے ارد گرد پہرے پر کھڑے رکھتے تھے۔

یہ میں اُس وقت کی بات سُنا رہا ہوں جب ڈاکوؤں کا بھی کچھ کردار ہوتا تھا، آج صاحب کردار بھی کسی نہ کسی رنگ میں ڈاکو اور رہزن ہیں۔

میں معصوم سے اُس گاؤں کی بات کر رہا تھا جہاں ڈاکو، رہزن اور ہم جیسے مفرور مجرم پناہ لیا کرتے تھے۔ زمین کا وہ خطہ بہت خوبصورت تھا ہر سُو ہریالی تھی۔ گاؤں کو سرسبز اور بلند ٹیکریوں نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ ٹیکریوں کے اوپر بھی گھنے درخت تھے، ان ڈھلانوں پر بھی اور ان کے درمیان بھی درختوں کی بہتات تھی۔ گھاس اونچی تھی۔ کہیں سرکنڈوں کا جنگل بھی تھا اور ان کے درمیان قدرت نے جوہڑ سا بنا رکھا تھا جو برسات میں پانی سے بھر جاتا پھر یہ دلدل، میں بدل جاتا تھا۔ پودے جو پانی میں اُگتے تھے وہ دلدل میں بھی کھڑے رہتے تھے اور یہ اتنے زیادہ ہوتے تھے کہ کسی اجنبی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ لمبوترے اور سبز پودے دلدل میں کھڑے ہیں۔ اکثر کوئی نہ کوئی انجان آدمی یا جانور دلدل میں دھنس کر رہ جاتا اور اُسے نکالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

ٹیکریوں کے پیچھے ایک طرف اونچی چٹانیں تھیں اور تین اطراف اِن لوگوں کی کھیتیاں تھیں کبھی کبھی رات کو شکار کے تعاقب میں دھاری دار شیر بھی ادھر آجاتا تھا۔ گاؤں سے دو تین میل دُور ایک وسیع و عریض جنگل شروع ہوتا تھا

جس میں ہرن، اڑیال اور نیل گائے کی خاصی تعداد گھومتی پھرتی تھی۔ وہاں جنگل کا بادشاہ بھی موجود تھا جسے ٹائیگر کہتے ہیں اور بھیڑیئے بھی تھے۔

یہ گاؤں قریب سے گزرنے والوں کو بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا وجود ایسی زمین پر تھا جہاں سے کوئی عام راستہ نہیں گزرتا تھا، اور اس کا وجود تھانے کے کاغذات میں تھا۔ علاقے کا تھانیدار اس گاؤں سے واقف تھا۔

گاؤں کی کُل آبادی اکیس گھر تھے۔ اس خوبصورت خطّے میں پیدا ہونے والے لوگ بھی خوبصورت تھے۔ لڑکیوں کے رنگ عام طور پر گورے یا پُرکشش گندمی تھے۔ کوئی ڈاکو اور رہزن یہاں پناہ لینے آتا تھا تو خوبصورت لڑکیاں، جوان عورتیں اُن کے سامنے جاتیں اور اُن کی دیکھ بھال کرتی تھیں لیکن مجرم ذہنیت کے یہ آدمی جو ڈاکو اور رہزن کہلاتے تھے انہیں ویسی ہی صاف نظروں اور نیت سے دیکھتے تھے جیسے وہ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو دیکھتے ہوں گے۔ وہ گاؤں والوں کو نقد انعام تو دے دیتے تھے لیکن سب سے بڑا انعام یہ ہوتا ہے کہ کسی کو عزّت دی جائے اور اُس کی عزّت کی حفاظت کی جائے۔

اس گاؤں میں نہ کوئی نمبردار تھا نہ چوکیدار۔ یہ کسی دوسرے گاؤں کی نمبرداری میں آتا تھا۔ یہاں سب نمبردار اور چوکیدار تھے۔ ان میں بوڑھے بھی تھے، جوان بھی اور ان میں کمسن لڑکے اور بچّے بھی تھے۔ وہ ہمارے پاس آتے تھے اور ہم ان کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے اور گپ شپ لگاتے تھے۔ انہوں نے کچّے کچّے تین مکان بنا رکھے تھے جو خالی پڑے رہتے تھے۔ یہ انہوں نے ہم جیسوں کے لئے بناتے تھے۔ اُن کی عورتیں بھی ہمارے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتیں جیسے ہم اسی گاؤں میں پل کر بڑے ہُوئے ہوں۔

کبھی تو جی میں آتی تھی کہ ہمیشہ کے لئے اسی گاؤں میں رہ جاؤں کہیں بھی نہ جاؤں اور ان لوگوں جیسی زندگی بسر کروں —— یہ پورا گاؤں مسلمانوں کا تھا۔

۵

کچھ دن اور اسی گاؤں میں گزُر گئے تھے۔ خواجہ صاحب اب چند قدم

اپنے سہارے چل لیتے تھے۔ میں انہیں اِس حالت میں دیکھتا تھا تو غصّے سے میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ میں انہیں اپنا پیر و مُرشد سمجھتا تھا اور میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ اُنہیں حوالات سے فرار کرا کے ہم نے بڑی نیکی کی ہے۔

ایک نئی لڑکی گاؤں میں آئی۔ صاف ستھرے رنگ کی جوان لڑکی تھی۔ اُس کے جسم کی ساخت میں عجیب سی کشش تھی۔ دیکھنے والا اُس سے نظریں ذرا مشکل سے ہی ہٹاتا تھا۔ میں نے پہلے اس لڑکی کو گاؤں میں نہیں دیکھا تھا۔ معلوم ہُوا کہ وہ اسی گاؤں کی لڑکی ہے اور اپنے سُسرال سے آئی ہے۔ اُس کی شادی ہُوتے ابھی چھ مہینے گزرے تھے۔

میں نے اُسے یوں دیکھا کہ میں گاؤں سے باہر نکل گیا تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے دم گھُٹنے لگا تھا۔ حمید اللہ اور شہناز میاں بیوی تھے۔ ایک دوسرے میں مگن رہتے تھے۔ خواجہ صاحب کو میں اُن کی جسمانی حالت کی وجہ سے پریشان نہیں کرتا تھا۔ انہیں آرام کی ضرورت تھی۔ حمید اللہ کے دو ساتھی الگ رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ میری ہم خیالی نہیں تھی۔ میں باہر نکل گیا۔

واپس آ رہا تھا تو یہ لڑکی اچانک میرے سامنے آگئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کہیں سے آ نہیں رہی تھی بلکہ اونچی گھاس کی اوٹ میں بیٹھی تھی یا درخت کے تنے کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور ایک تاثر اُس کی آنکھوں میں بھی تھا۔ میں اس قسم کی مسکراہٹ اور آنکھوں کے اِس تاثر کو بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ان میں تشنگی سی تھی۔ ایک مسکراہٹ وہ ہوتی ہے جسے ادبی زبان میں دعوتِ گناہ کہا جاتا ہے۔ اس میں آنکھوں کی مسکراہٹ بھی شامل ہوتی ہے لیکن اس لڑکی نے مجھے جو تاثر دیا وہ ایسا تھا جیسے یہ میرے ساتھ دل کی کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔

بعض بھکاری ایسے ہوتے ہیں جو مُنہ سے کچھ نہیں کہتے۔ کپڑوں اور حلیے سے بھکاری لگتے بھی نہیں لیکن وہ اپنے چہرے پر اور اپنی آنکھوں میں ایسا تاثر پیدا کر لیتے ہیں جیسے یہ آپ سے کچھ مانگ رہے ہیں یا اُن کے سینے میں کوئی دکھ ہے جو وہ آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ خود ہی رُک جاتے

ہیں۔ آپ انہیں یہ کہنا ہی نہیں چاہتے کہ بابا معاف کرو۔

کچھ ایسا ہی تاثر اس لڑکی کے ہونٹوں پر اور آنکھوں میں تھا جو اُس کے سارے ہی چہرے پر پھیل گیا۔ اُس کی طرف نہ دیکھنے کے ارادے کے باوجود میں اُس سے نظریں نہ ہٹا سکا اور میرے قدم رُکنے لگے۔ میں پہلے ہی یہ بتا چکا ہوں کہ اس لڑکی میں اتنی کشش تھی کہ اُس سے نظریں ہٹانے میں ذرا مشکل پیش آتی تھی۔

"تم بھی ان کے ساتھ ہو؟" —— میں جب اُس کے قریب پہنچا تو اُس نے پوچھا۔

"ہاں!" —— میں نے جواب دیا —— "میں بھی تمہارے گاؤں کا مہمان ہوں ..... یہاں کس لئے کھڑی ہو؟"

"تم کہاں گئے تھے؟" —— اُس نے پوچھا۔

"ویسے ہی باہر نکل گیا تھا۔"

"میں بھی ویسے ہی ادھر آگئی تھی" —— اُس نے کہا۔

اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر اُس کی نظریں میرے پاؤں سے اُوپر اُٹھیں۔ اُٹھتے اُٹھتے میری آنکھوں میں ٹھہر گئیں۔ میں بچّہ تو نہ تھا۔ اُس کی نظروں نے میری نظروں کو جو پیغام دیا وہ میں سمجھ گیا لیکن میں اُسے اس کے سوا کسی اور نظر سے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ میرے میزبانوں کی بیٹی ہے بلکہ یہ اُن کی بیٹی ہے جنہوں نے مجھے پناہ دی ہے۔ میں مسکرایا۔ یہ تشکریے کی مسکراہٹ تھی اور میں چل پڑا۔

"ٹھہرو" —— مجھے اُس کی سرگوشی سنائی دی۔

میں رُک گیا۔

"بہت جلدی میں ہو؟" —— اُس نے پوچھا —— "کیا جلدی ہے؟"

"جلدی یہی ہے کہ میں تمہارے پاس زیادہ دیر کھڑا نہ رہوں۔"

"کچھ دیر کھڑے رہو گے تو کیا ہو جائے گا؟" —— اُس نے پوچھا۔

"اچھا نہیں لگتا" —— میں نے کہا۔

"تمہاری بیوی ہے؟" —— اُس نے پوچھا۔

"نہیں" —— میں نے جواب دیا —— "بیوی ہوتی تو میں یہاں چھپا ہُوا نہ ہوتا۔"

اُس کی مسکراہٹ کچھ اور پھیل گئی اور اُس کی آنکھوں کا تاثر اتنا نمایاں ہو گیا جیسے کاغذ پر لکھے ہُوئے الفاظ پڑھے جاتے ہیں۔ میں کچھ اور کہے بغیر گاؤں کی طرف چل پڑا۔ میں جانتا تھا کہ لڑکی میرے پیچھے پیچھے نہیں آرہی اور وہ میری طرف ہی دیکھ رہی ہو گی لیکن میں بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی نظریں تیروں کی طرح میری پیٹھ میں اُتر رہی ہیں۔ گاؤں تک پہنچ کر میں نے پیچھے دیکھا۔ وہ مجھے نظر نہ آئی۔ وہ ہریالی کے سمندر میں ڈوب گئی تھی۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ لڑکی میرے ذہن و دل پر سوار ہو گئی۔ گھر میں داخل ہو کر میں نے محسوس کیا جیسے وہ بھی میرے ساتھ چُپکے سے اُس مکان میں آگئی ہو۔ اُسے ذہن سے نکالنا مشکل ہو گیا۔ لڑکی کے چہرے پر معصومیت تھی۔ وہ ایسی لگتی نہیں تھی۔ گناہ چہرے پر لکھ دیئے جاتے ہیں۔ پڑھنے کے لئے آنکھیں چاہئیں۔

٦

میں اُس رات بھی کچھ پریشان رہا۔ میں اپنے آپ کو یہ سمجھا رہا تھا کہ پھر کبھی اس لڑکی سے آمنا سامنا نہیں ہونا چاہئے۔ اپنے آپ کو کسی بات پر لانے کے لئے مجھے زیادہ تگ ودَو نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اس لڑکی کو ذہن سے نکالنے میں مشکل تو پیش آئی لیکن میں کامیاب ہو گیا اور سکون کی نیند سو گیا۔

صبح سویرے باہر نکل گیا۔ یہ میرا روزمرّہ کا معمول تھا۔ سورج ابھی ٹیکریوں کے عقب کی بلند چٹانوں کے پیچھے تھا جب میں واپس آرہا تھا۔ گاؤں کے کچھ آدمی اپنے کھیتوں کو چلے گئے تھے۔ میں دلدل کے کنارے والے سرکنڈوں کے قریب سے گزر رہا تھا کہ وہ کل کی طرح اچانک سامنے آگئی۔

"کھیتوں کو جا رہی ہو؟"

اُس نے آہستہ سے سر ہلایا کہ وہ کھیتوں کو نہیں جا رہی۔ اُس کے چہرے پر کل والا ہی تاثر تھا لیکن کل سے زیادہ گہرا اور نمایاں تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر

مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ ہونٹ آدھ کھلے تھے اور اس کی آنکھیں اُس بھکاری کی طرح بھیک مانگ رہی تھیں جو زبان سے نہیں بولا کرتا۔ میں چل پڑا۔

"آج بھی جلدی میں ہو؟"

"میں ہر روز اور ہر وقت جلدی میں ہوتا ہوں" ـــــ میں نے کہا۔

"کرتے کیا ہو؟" ـــــ اُس نے شرمیلی سی آواز میں کہا ـــــ "سارا دن بیکار بیٹھے رہتے ہو؟"

"تم پہلی لڑکی ہو جس نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کیا کرتا ہوں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کیا تمہیں معلوم نہیں؟"

"کیا تم ڈاکو ہو؟" ـــــ اُس نے پوچھا اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگی ـــــ "نہیں.... تم ڈاکو نہیں ہو سکتے۔"

"کیوں؟ میں ڈاکو کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"ڈاکو تم جیسے تو نہیں ہوتے" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "تم تو اتنے اچھے ہو۔"

میں اُس کے ساتھ اتنے زیادہ مکالمے بولنے کے لئے رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ میری نیت بالکل صاف تھی لیکن کوئی دیکھ لیتا تو اُسے یہی نظر آتا کہ میں گاؤں کی ایک نوجوان لڑکی کے پاس سرکنڈوں کی اوٹ میں کھڑا باتیں کر رہا ہوں۔ نیت تو کسی کو نظر نہیں آتی۔

"میری ایک بات مانو گی؟"

"تم حکم دو" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "ایک نہیں مجھ سے سو باتیں منواؤ۔"

"صرف ایک بات!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اس طرح مجھے راستے میں نہ روک لیا کرو۔"

"کیوں؟"

"کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتیں؟" ـــــ میں نے کہا ـــــ "کسی نے دیکھ لیا تو بہت بُرا ہوگا۔"

"کوئی نہیں دیکھ سکتا" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں تمہارے ساتھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں تم کیا چاہتی ہو۔"

"یہ تو اچھا ہے نا!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "تم خود ہی جانتے ہو میں کیا چاہتی ہوں۔"

میں کچھ اور کہے بغیر وہاں سے چل پڑا۔



اگلے روز وہ میرے گھر آگئی۔ ہمارے لئے روٹیاں اور مکھن لاتی تھی۔ اُس روز ہمیں کھانا دینے کی اُس کے گھر کی باری تھی۔ وہ زیادہ رُکی نہیں۔ ایک جگہ مجھے سمجھا کر کہنے لگی کہ میں آج شام سے پہلے اُسے وہاں ملوں۔

"دیکھو لڑکی!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "گاؤں کے دو تین آدمی گاؤں سے تھوڑی دُور پہرے پر گھومتے رہتے ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا تو ہمارا اعتبار اُٹھ جائے گا۔"

"تم آجانا" ـــــ اُس نے کہا۔

اب اُس کے لہجے میں حکم کا رنگ تھا۔ وہ چلی گئی۔ اس گاؤں کی یہ پہلی لڑکی تھی جس نے اس قسم کی باتیں کی تھیں۔ گاؤں کا ایک جواں سال آدمی میرا دوست بن گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ آگیا۔ میں نے اُس سے اس لڑکی کے متعلق پوچھا لیکن اس طرح پوچھا کہ شک نہ ہو۔

"میں نے اسے پہلے اس گاؤں میں نہیں دیکھا تھا" ـــــ میں نے کہا۔

"بے چاری پر بہت ظلم ہُوا ہے" ـــــ میرے دوست نے کہا ـــــ "ماں باپ نے ایک بڑے گاؤں میں ایک امیر خاندان میں بیاہی تھی کہ سکھی رہے گی مگر وہ گھر اُس کے لئے جہنم نکلا۔"

"غریب کی بچی کو انہوں نے نوکرانی سمجھ لیا ہوگا" ـــــ میں نے کہا۔

"نہیں" ـــــ میرے دوست نے کہا ـــــ "سُسرال نے تو اُسے

شہزادی بنا کے رکھا ہُوا ہے۔ اس نے جو کپڑے پہن رکھے ہیں وہ ہمارے گاؤں کی کوئی لڑکی خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا زیور دیکھو۔"

"پھر وہ گھر جہنم کیسے بنا؟"

"خاوند پگلا ہے" — دوست نے جواب دیا — "اُس کا دماغ بھی کام نہیں کرتا اور جسم سے بھی معذور ہے۔ دایاں بازو ٹیڑھا اور دائیں ٹانگ بھی ٹیڑھی ہے .... اس لڑکی کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہُوا ہے۔"

"دھوکا کیسے ہُوا؟" — میں نے پوچھا — "کیا لڑکے کو اس کے ماں باپ نے دیکھا نہیں تھا؟"

"نہ جی، دیکھا کہاں تھا!" — میرے دوست نے جواب دیا — "اس بے چاری کی قسمت اس طرح پھُوٹی کہ ایک امیر کبیر زمیندار شکار کھیلنے نکلا تھا۔ ایک زخمی ہرن کے تعاقب میں گھوڑا دوڑاتا وہ اس گاؤں کے قریب آن پہنچا۔ ہرن یہیں آگرا۔ یہ لڑکی، شمّو، کہیں ادھر ہی تھی۔ امیر شکاری نے اسے دیکھا اور پوچھا کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔ شمّو نے اپنے باپ کا نام بتایا۔ وہ شخص شمّو کے گھر آگیا۔ معلوم نہیں اُس نے شمّو کے باپ کو کیسے کیسے سبز باغ دکھائے کہ وہ مان گیا اور یہ زمیندار اپنے بیٹے کے لئے لڑکی کا رشتہ لے کر آگیا ....

"دھوکا یہ ہُوا کہ برات آئی تو سارے گاؤں نے دولہا کو دیکھ کر انگلیاں دانتوں تلے دبا لیں۔ سب شمّو کی قسمت پر حیران تھے کہ اسے کتنا امیر گھر اور کتنا خوبصورت دُولہا ملا ہے، لیکن لڑکی جب پہلی بار سُسرال سے واپس آئی تو وہ روتی ہوئی آئی۔ اُسے تو دولہا دکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ سہیلیوں نے اُسے بتایا ہوگا کہ دُولہا بہت خوبصورت ہے۔ اُس نے آکر ماں کو بتایا کہ اُس کا دُولہا پاگل ہے اور جسمانی لحاظ سے بھی معذور ہے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ دھوکا دینے کے لئے کسی اچھے بھلے لڑکے کو دُولہا بنا کر لاتے تھے۔"

"شمّو کے ماں باپ نے جا کر لوگوں سے کچھ کہا نہیں؟"

"گئے تھے" — میرے دوست نے جواب دیا — "اور چپ چاپ واپس آگئے تھے۔ ہم یہ سمجھتے رہے کہ اُن لوگوں نے ان کی بے عزّتی کر کے واپس

بھیج دیا ہوگا لیکن کچھ دنوں بعد یہ راز فاش ہوگیا کہ پاگل دُولہا کے باپ نے روپے پیسے سے ان لوگوں کے مُنہ بند کر دیے تھے۔ بھید لینے والے لے ہی لیتے ہیں۔ اُس گاؤں کے دو تین آدمیوں نے بتایا کہ پاگل لڑکے کو کوئی رشتہ نہیں دیتا تھا۔ اسے اس کا باپ اپنی بے عزّتی سمجھتا تھا۔ اُس نے دولت کے بل بوتے پر ایک خوبصورت لڑکی خرید لی جو کسی امیر گھرانے کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔"

"مجھے ڈر ہے کہ یہ لڑکی خراب ہو جائے گی" — میں نے کہا۔

"ابھی تک تو نہیں ہوئی لیکن کب تک اپنا آپ جلائے گی" — اُس نے کہا۔

میں نے اپنے دوست کو یہ نہ بتایا کہ وہ خرابی کے راستے پر چل پڑی ہے اور اُس نے اپنی پسند کے آدمی یعنی مجھ پر جال پھینکنا شروع کر دیا ہے۔ اس لڑکی کو آپ بدکار ہی کہیں گے لیکن اُس کی مجبوری دیکھیں۔ اُسے تو انتقاماً بھی بدکار ہو جانا چاہیئے تھا اور نفسیاتی طور پر بھی اُس کا خراب ہونا فطری امر تھا۔ میں اُس کے لئے کیا کر سکتا تھا۔ اُس نے مجھے خفیہ ملاقات کے لئے بلایا تھا لیکن میں نے نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔



اس دوران حمید اللہ اور شہناز کے ساتھ بھی میرا وقت گزرتا رہا اور خواجہ صاحب کے ساتھ بھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد حمید اللہ اور شہناز دروازے بند کر کے سو جایا کرتے تھے اور میں کبھی سونے کی کوشش کرتا کبھی بیدار رہنے کی۔ میرے لئے وقت گزارنا خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت شمّو آگئی۔ میں لیٹا ہُوا تھا۔ شمّو میری چارپائی کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔

"تم آئے نہیں" — اُس نے کہا۔

"شمّو!" — میں نے اُسے کہا — "مجھے اپنی بدنامی کا کوئی ڈر نہیں۔ میں تمہیں بدنام نہیں ہونے دوں گا .... اور شمّو! میں بدمعاش آدمی نہیں۔ میری آنکھیں اپنے اور پرائے کو پہچان لیتی ہیں۔ تمہارے ماں باپ کا یہ احسان میں

کیسے بھولوں گا کہ انہوں نے گاؤں والوں کے ساتھ مل کر ہمیں پناہ دی ہے اور ہماری خاطر گاؤں والے پہرہ بھی دیتے ہیں۔ میں تمہاری مجبوریوں کو سمجھتا ہوں۔ کیا تم طلاق نہیں لے سکتیں؟"

"صرف ایک بار طلاق کا نام لیا تھا" ——— اُس نے کہا ——— "باپ نے مجھے اتنا مارا پیٹا تھا کہ دو روز میں چارپائی سے نہیں اُٹھ سکی تھی .... کیا تم بھی مجھے انسان نہیں سمجھتے؟ تم عقل والے آدمی ہو۔ جسم کی ضرورتوں کو تو سمجھتے ہو گے۔"

"سب سمجھتا ہوں شمّو!" ——— میں نے کہا ——— "سب سمجھتا ہوں، لیکن میں اس گاؤں کو دھوکا نہیں دوں گا۔ تم اس گاؤں کی بیٹی ہو۔"

"میرا دل نہ توڑو" ——— اُس نے کہا اور لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور جب اُس نے میرے ہاتھ کو دبایا تو مجھے یوں لگا جیسے میرا ہاتھ لوہے کے شکنجے میں آ گیا ہو۔ کہنے لگی ——— "اگر تم میری خواہش پوری نہ کرنے کی قسم کھا بیٹھے ہو تو مجھے اپنے ساتھ رکھ لو۔ جہاں جاؤ گے، جس حال میں رہو گے، میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ سُنا ہے تم جیسے لوگ شادی کے بغیر ہی عورت کو ساتھ رکھ لیا کرتے ہیں۔"

"میں شادی کے بغیر کسی عورت کو ساتھ نہیں رکھوں گا" ——— میں نے کہا۔

اس کے بعد اُس نے ہر طرح سے مجھ سے اپنی بات منوانے کی کوشش کی اور میں نے اُسے ٹالنے کا ہر طریقہ آزمایا۔ اچانک اُس کے چہرے کا رنگ دہکتے ہوئے انگارے جیسا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

"اب میری سُن لے" ——— اُس نے دانت پیس کر کہا ——— "میں اُس حد تک پہنچ گئی ہوں جہاں عورت اور چڑیل میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ میں تجھے بخشوں گی نہیں" ——— وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر اُس نے دانت پیس کر مجھے گھورا۔ پھر باہر کو چل پڑی۔ دروازے میں رُک کر اُس نے کہا ——— "اب مجھ سے بچ کر رہنا۔"

وہ چلی گئی، لیکن میرا سکون تباہ کر گئی۔ میں اُس کی دھمکی سے نہیں ڈرا تھا۔ وہ ہمارا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ میرا سکون اس سوچ نے تہس نہس کر دیا تھا کہ انسان انسان پر کیسے کیسے ظلم کرتا ہے۔ ہم لوگ بدی کا بیج خود بوتے ہیں خود اسے پروان چڑھاتے ہیں پھر ہم بدی کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔

۵

دو روز بعد پتہ چلا کہ وہ اپنے سُسرال چلی گئی ہے۔ میں نے حمید اللہ اور شہناز کو شمّو کی ساری بات سنائی۔ حمید اللہ نے اُسی وقت اُس کے باپ کو بُلا لیا۔

"وہ کون ہے جس نے دھوکے سے تمہاری بیٹی کو اپنی بہو بنا لیا ہے؟" ——— حمید اللہ نے اُس سے پوچھا ——— "کیا تمہیں معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ لڑکا ناکارہ ہے؟"

"نہیں سرکار!" ——— اُس نے روتی ہوئی آواز میں جواب دیا ——— "میں لڑکے کے باپ کی باتوں میں آ گیا تھا، میں کہتا تھا کہ اونچا زمیندار ہے۔ بیٹی سُکھی رہے گی۔"

"کون ہے وہ؟"

اُس نے علاقے کے ایک بہت بڑے زمیندار کا نام لیا۔ حمید اللہ نے بتایا کہ وہ اپنی دنیا کا نواب ہے۔

"میں تو اُسے اچھا آدمی سمجھتا تھا" ——— حمید اللہ نے کہا اور شمّو کے باپ سے پوچھا ——— "اُس نے تمہیں پیسے دیتے تھے؟"

"بہت زیادہ سرکار!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "پیسوں کے علاوہ اُس نے مجھے دھمکیاں ایسی دی تھیں جو مجھ جیسا غریب آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری بیٹی کو طلاق ہو جائے؟" ——— میں نے پوچھا۔

"چاہتا تو ہوں حضور!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "لیکن اُس کے انتقامی وار سے بھی ڈرتا ہوں۔"

"ہم تمہاری مدد کریں گے" ——— حمیداللہ نے کہا۔

"سرکار!" ——— شمّو کے باپ نے کہا ——— "آپ نے ساری عمر ہمارے ساتھ تو نہیں رہنا۔ آپ تو اُڑتے پنچھی ہیں۔ آئے اور گئے۔ وہ تو میرے پورے خاندان کا خون بہا دے گا۔"

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ ہمیں اپنے متعلق کچھ پتہ نہیں تھا کہ آج یہاں ہیں تو کل کہاں ہوں گے۔ حمیداللہ نے اُسے کہا کہ اُسے جب کبھی ہماری ضرورت پڑے وہ بتا دے۔ وہ آنسو بہاتا ہُوا چلا گیا۔ یہ انسانی ہمدردی تھی جس کے تحت ہم نے اُس کے ساتھ یہ باتیں کیں ورنہ یہ ہمارا مسئلہ نہیں تھا۔ ہم خود اپنے لئے بڑا خطرناک مسئلہ بن گئے تھے۔

۵

چھ سات روز اور گزر گئے۔

میں، حمیداللہ اور شہناز خواجہ صاحب کے پاس بیٹھے ہُوتے تھے۔ وہ اب اپنے آپ کو تندرست سمجھنے لگے تھے۔ اُنہوں نے اپنے دل کو کچھ اس طرح زندہ رکھا ہُوا تھا کہ اپنی عمر سے بہت کم نظر آتے اور نوجوانوں جیسے کام بھی کرگزرتے تھے۔

"خواجہ صاحب!" ——— حمیداللہ نے کہا ——— "اب بتائیں کیا کریں۔ پیسے بھی ختم ہو رہے ہیں۔ گاؤں والوں کو بھی کچھ دینا ہے۔ اگر کام کا کوئی آدمی خریدنا پڑا تو اُس کی قیمت دینے کے لئے کچھ نہیں رہا۔"

"تم نے خود کیا سوچا ہے؟" ——— خواجہ صاحب نے پوچھا۔

"ڈکیتی کے سوا ہم سوچ ہی کیا سکتے ہیں!" ——— حمیداللہ نے جواب دیا ——— "ایک ذریعہ اور بھی ہے، لیکن اس کے لئے زیادہ وقت درکار ہو گا اور اُس کا کوئی خاص طریقہ سوچنا پڑے گا۔"

"وہ کون سا ذریعہ ہے؟"

"کیا میں نے اپنے نواب بھائی سے حصّہ وصول نہیں کرنا؟" ——— حمیداللہ نے جواب دیا ——— "آپ کہیں گے کہ یہ تو ناممکن ہے اور کوئی کارروائی کی بھی

تو بڑی خطرناک ہو گی لیکن خواجہ صاحب! میں اپنا نقد حصّہ وصول کر کے رہوں گا۔ کوئی طریقہ بھی سوچ لوں گا۔"

"تم لوگ کوئی باعزّت طریقہ نہیں سوچ سکتے؟" ——— شہناز نے پوچھا۔

"باعزّت طریقہ ایک ہی ہے" ——— حمیداللہ نے جواب دیا ——— "پھانسی کے تختے پر جا کر کھڑے ہو جائیں گے اور ہمارے مسئلے بڑی عزّت سے حل ہو جائیں گے ... تم تھوڑی دیر چُپ رہو۔"

ہم سب ہنس پڑے۔ ہماری ہنسی ایسی تھی جیسے ہم موت کے ساتھ چھیڑخانی کر رہے ہوں۔

"تم ٹھیک کہتے ہو حمید!" ——— خواجہ صاحب نے کہا ——— "ڈکیتی اور راہزنی کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں، لیکن یہ واردات کرو گے کہاں؟ .... کسی بھلے گھر کو نہ لُوٹ لینا۔ کوئی سُود خور ساہوکار دیکھو۔"

مجھے اچانک شمّو کا سُسر یاد آ گیا۔

"حمید بھائی!" ——— میں نے کہا ——— "شمّو کے سُسر کو اچھی طرح جانتے ہو؟ اگر میری رائے لیتے ہو تو میں اُس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لینے کا مشورہ دوں گا۔"

"شکار اچھا ہے" ——— حمیداللہ نے کہا ——— "میں اُسے اچھا آدمی سمجھتا تھا، لیکن اس گاؤں کی ایک لڑکی کو جو دھوکا اُس نے دیا ہے یہ گناہ بخشنا نہیں چاہیئے۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ اُس کے گھر میں روپے اور لوٹ گھڑوں میں رکھے جاتے ہیں۔"

"کیا وہاں واردات کرنے کے لئے گھر بھیدی کی ضرورت نہیں ہو گی؟" ——— میں نے پوچھا۔

"کوئی بھیدی مل جائے تو اچھا ہے" ——— حمیداللہ نے کہا ——— "کام آسان ہو جائے گا۔"

"شمّو یہ کام کر سکتی ہے" ——— میں نے کہا ——— "بلکہ وہ بڑی خوشی سے

یہ کام کرے گی، لیکن وہ تو جا چکی ہے۔"

"اُس کے بغیر بھی کام ہو جاتے گا"—— حمید اللہ نے کہا —— "سَر کے ساتھ لگی ہوتی ریوالور کی نالی گھر والوں کو ہی گھر بھیدی بنا دیا کرتی ہے"۔

ہم نے فیصلہ کر لیا کہ شمّو کے سُسر کے گھر کا ہی صفایا کیا جاتے گا۔ اپنے ایک آدمی کو وہاں بھیج کر اُس کے گھر کا محلِ وقوع دیکھنا تھا اور یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ رات کو رکھوالی والا کُتّا باہر ہوتا ہے یا نہیں۔

[۵]

باہر سے ہمیں دھماکے جیسی آواز سنائی دی —— "حق اللہ ہُو .... حق اللہ ہُو"۔

ہم سمجھے کہ یہ گاؤں کے کسی آدمی کی آواز ہو گی۔ باہر جا کر دیکھنے کی کوتی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوتی زندہ دل دیہاتی تھا۔ اس گاؤں کے لوگ حق اللہ ہُو کا ورد ذرا کم ہی کرتے تھے۔ میں باہر نکلا۔ وہ گاؤں کا آدمی نہیں تھا بلکہ بہت ہی غلیظ ایک پاگل تھا۔ سَر کے بال جو پسینے اور گرد سے مٹی کے رنگ اور رسّیوں جیسے ہو گئے تھے عورتوں کے بالوں جیسے لمبے تھے۔ داڑھی بھی لمبی تھی اور اس کا بھی حال سَر کے بالوں جیسا تھا۔ اُس کے مُنہ سے رال ٹپک رہی تھی جس سے داڑھی غلیظ ہو گئی تھی۔ کپڑے پھٹ گئے تھے۔ اُس کی شلوار پھٹتے پھٹتے گھٹنوں کے اُوپر چلی گئی تھی اور اس کے چیتھڑے لٹک رہے تھے۔

گاؤں کے لوگ اُس کی صدا پر باہر نکل آتے تھے۔ بچّے اُس کے قریب جا جا کر دیکھتے تھے۔ اُس نے مجھے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر رُک گیا۔ پہلے تو اُس نے مجھے دیکھا پھر مُنہ آسمان کی طرف کیا پھر ہاتھ پوری لمباتی میں اُوپر کر کے مُنہ سے بڑی لمبی "ہُو" کی آواز نکالی پھر بم کی طرح پھٹا —— "حق اللہ ہُو"—— اب اُس کی آواز میں پہلے سے زیادہ جوش اور زور تھا۔

وہ میرے قریب آ گیا۔ اُس نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا اور دوسرا ہاتھ اُوپر کر کے نعرہ لگایا —— "ست خیر .... ست خیر .... اللہ ....

اللہ ....مولا ای مولا"۔

وہ میرے قریب سے گزر کر میرے پیچھے چلا گیا میرے پیچھے حمید اللہ خان کھڑا تھا۔ پاگل نے اُس کے کندھے پر بھی ہاتھ مار کر نعرہ لگایا —— "باشا .... باشا" —— اُس نے ہاتھ آسمان کی طرف کر کے کہا —— "اللہ باشا .... اللہ باشا .... تُو باشا .... باپُو خیر۔ ماما خیر"—— اُس نے مُنہ اُوپر کر کے دھماکہ کیا —— "حق اللہ ہُو۔ حق اللہ ہُو"—— اور وہ چل پڑا۔

میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔

"سائیں بادشاہ!"—— میں نے کہا —— "تم تو اللہ والے ہو .... ایسے تو نہ جاؤ۔ اندر آؤ۔ پانی پیو۔ روٹی کھلاتے بغیر تو نہیں جانے دیں گے"۔

"سَت خیر .... سَت خَیر!"—— اُس نے مُنہ آسمان کی طرف کر کے کہا —— "باشا خَیر .... باپُو خَیر .... ماما خَیر"۔

وہ میرے ساتھ آ گیا۔ میں اُسے اُس کمرے میں لے گیا جس میں خواجہ صاحب چارپاتی پر لیٹے ہُوتے تھے اور شہناز ان کے پاس مُوہڑے پر بیٹھی ہوتی تھی۔ پاگل کو میں نے فرش پر بٹھا دیا۔

"بی بی خَیر"—— اُس نے پاگلوں کی طرح نعرہ لگایا —— "باپُو خَیر .... اللہ باشا" —— پھر وہی دھماکہ —— "حق اللہ ہُو"۔

"میں سائیں بادشاہ کے لئے پانی لے آؤں"—— میں نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔

صحن میں گاؤں کے چند آدمی اور بچّے آ گئے۔ میں نے سب کو باہر نکال کر دروازہ بند کر دیا اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا جہاں حمید اللہ اور شہناز رہتے تھے۔ میں آپ کو پھر بتا دوں کہ یہ کچّا سا مکان تھا جس کے تین کمرے تھے اور ایک رسوتی تھی۔ میں نے حمید اللہ کے تکیئے کے نیچے سے ریوالور نکالا۔ اُس کا سیلنڈر دیکھا۔ چھ گولیاں بھری ہوتی تھیں۔ میں ریوالور لے کر خواجہ صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ پاگل کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی اور وہ کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔

"سائیں بادشاہ!"—— میں نے اُس کے پیچھے کھڑے ہو کر کہا

—— "اُٹھو۔"

اُس نے بیٹھے بیٹھے پیچھے دیکھا۔ میں نے ریوالور کی نالی اُس کی ناک کے اوپر پیشانی کے ساتھ لگا دی۔ اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔

"تم اناڑی ہو یار!" —— میں نے اُسے کہا —— "کیا اُنہوں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ سکندر سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر ہے اور اُس نے بڑے مشکل کیس پکڑے ہیں؟"

"حق اللہ ہُو" —— اُس نے دھماکہ کیا اور پاگلوں جیسا قہقہہ لگا کر ریوالور کو پکڑنے لگا۔ میں نے ریوالور پیچھے کر لیا۔

"جانے دے یار، جانے دے" —— میں نے کہا —— "اب سیدھی بات پر آجا۔ اپنے کپڑے خود ہی اُتار دے۔ مجھے تمہارے کپڑے اتارنے پڑے تو میں کپڑوں کے ساتھ تمہاری کھال بھی اُتار لوں گا۔"

وہ بیٹھے بیٹھے میری طرف پورا گھوم گیا۔ کمرے میں سناٹا طاری ہوگیا۔ اس شخص کو بھی چُپ لگ گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر اُس مجرم جیسی سنجیدگی چھا گئی تھی جو عین موقعہ پر پکڑا جاتا ہے یا ایسی سنجیدگی اُس وقت چہرے پر آتی ہے جب ملزم اقبالِ جُرم کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔

میں اُس کے سامنے بیٹھ گیا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس نے اپنی آنکھوں کے ڈھیلے اِدھر اُدھر کئے لیکن میری آنکھوں نے اُس کی آنکھوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بالکل خاموش رہا۔ مجرم ایسی آنکھوں کا سامنا کر ہی نہیں سکتا۔

میں بات اُلٹی کر رہا ہوں۔ مجرم تو ہم تھے اور وہ ہمارے تعاقب میں آیا تھا۔ چونکہ وہ ہماری سلطنت میں آگیا تھا اس لئے میں اُسے مجرم سمجھتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اُس کے جرم کی سزا کیا ہے۔

"تمہاری ایکٹنگ ختم ہے میرے جانی!" —— میں نے ہنستے ہوئے کہا —— "نہیں بولو گے تو تمہیں گولی مار کر لاش یہیں کہیں دبا دیں گے اور ہم یہاں سے چلے جائیں گے، پھر پولیس کا محکمہ جس طرح ہمیں ڈھونڈ رہا ہے اسی طرح تمہیں بھی ڈھونڈتا پھرے گا" —— میں اُٹھا اور اُسے کہا —— "میں ابھی تین چار آدمی بلا کر تمہیں ننگا کروں گا پھر تمہاری اصلیت ننگی ہو جائے گی ..... چلو، اُٹھو" —— میں نے اُس کی کمر پر ہلکا سا ٹھڈا مار کر کہا —— "تم میرے محکمے کے آدمی ہو۔ میں تمہاری عزّت کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ اس طرح اُٹھا جس طرح ہارا ہُوا پہلوان آہستہ آہستہ اُٹھا کرتا ہے۔

"ہاتھ اوپر کرو۔"

اُس نے ہاتھ اُوپر کئے تو میں نے اُس کی قمیض جو بہت ہی غلیظ تھی، اُوپر اُٹھائی۔ پہلی چیز جو نظر آئی وہ ریوالور تھا جو چھوٹے سائز کا تھا۔ یہ ۲۲ بور کا ریوالور تھا جو ایک کپڑے میں لپٹا ہُوا اور شلوار کے نیفے میں اُڑسا ہُوا تھا۔ میں نے نکال لیا۔ اس میں گولیاں تھیں۔

نیفے سے ذرا اور اُوپر ایک چوڑی پٹی سی لپٹی ہوتی تھی۔ اس میں بھی کچھ اُڑسا ہُوا تھا۔ یہ کاغذ لگتے تھے۔ میں نے ان پر لپٹا ہُوا کپڑا اُتارا تو اس میں ایک فوٹو میرا تھا، ایک حمید اللہ خان کا اور ایک خواجہ صاحب کا —— میرا فوٹو تو میرے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھا۔ خواجہ صاحب کہتے تھے کہ اُن کا فوٹو اُن کے کمرے سے اُٹھایا گیا ہے اور حمید اللہ کے کئی فوٹو محل میں موجود تھے۔ ان تصویروں کے ساتھ سی آئی ڈی کے اس آدمی کا اپنا شناختی یا تعارفی کارڈ تھا جو اُسے محکمے کی طرف سے ملا تھا۔ اس پر اُس کا نام ارجن سنگھ سندھو لکھا ہُوا تھا۔ اُس کا عہدہ بھی لکھا تھا —— اسسٹنٹ سب انسپکٹر —— وہ سکھ تھا۔

"بیٹھ جاؤ" —— میں نے اُسے کہا۔

وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں کانوں کا بنا ہُوا ایک مُوڑھا رکھا تھا۔ میں نے ارجن سنگھ سے کہا کہ وہ موڑھے پر بیٹھے۔

"اپنے محکمے کے اے ایس آئی کو میں فرش پر نہیں بیٹھنے دوں گا" —— میں نے کہا۔

"پانی پلاؤ یار!" —— اُس نے مُوڑھے پر بیٹھ کر ہنستے ہوئے کہا —— "تمہاری حق اللہ ہُو نے میرا تو گلا ہی خشک کر دیا ہے۔"

اُس کے لئے ایک گھر سے لسّی منگوائی اور کہا کہ اُسے ہم اپنے ساتھ

کھانا کھلائیں گے۔

* * *

"کسی نے ہماری نشاندہی کی تھی یا خود ہی مُشک پہ آگئے ہو؟" — میں نے اُس سے پوچھا۔

"میں نے سپیشل برانچ کے ہیڈکوارٹر میں تمہاری بہت تعریف سنی ہے" — اُس نے کہا — "سب کہتے تھے کہ سکندر کے ہاتھ میں کوئی جادو ہے۔ یہ جادو میں نے آج دیکھ لیا ہے۔ ایک نمبر دار کے سوا میری اصلیت کا کسی کو بھی علم نہیں۔"

"ہیڈکوارٹر میں کب آئے تھے؟"

"میں جالندھر میں سی آئی ڈی میں تھا" — ارجن سنگھ نے جواب دیا — "وہاں دو ایسے ٹیررسٹ پکڑے جن کے متعلق سب کہتے تھے کہ انہیں زمین کھا گئی ہے۔ میں نے اِسی بہروپ میں انہیں زمین کے نیچے جاکر پکڑا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اُوپر سے حکم آیا کہ مجھے اس ہیڈکوارٹر میں بھیج دیا جائے۔ مجھے وہاں آئے ابھی آٹھ روز ہی ہوتے ہیں۔ آتے ہی ایس پی نے تمہارے پیچھے ڈال دیا .... ایک بات تمہیں بتاؤں سکندر؟"

"ارجن بھائی!" — میں نے کہا — "ایک نہیں سو باتیں بتاؤ، جھوٹ نہ بولنا۔ میرے ہاتھ سے تم پر ظلم نہیں ہونا چاہیئے .... ارجن سنگھا! خدا کی قسم، عزت سے رخصت کروں گا اور تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے اور ان میں سے کسی کو پکڑ نہیں سکو گے۔ بات وہ کرنا جو سچ ہو۔"

"یہ نوابزادہ حمید اللہ خان ہیں؟" — اُس نے حمید اللہ خان پھر شہناز کی طرف دیکھ کر کہا — "اور یہ شہناز ہوگی اور یہ بزرگ خواجہ صاحب ہوں گے۔"

"سب وہی ہیں جن کے پیچھے تم آئے ہو" — میں نے کہا — "تم وہ بات کرو جو کرنے لگے تھے۔"

"میں کہنے لگا تھا" — اُس نے کہا — "میں نے وہ دو ٹیررسٹ گرفتار

تو کرا دیئے ہیں لیکن میں اپنے آپ کو کوستا رہتا ہوں کہ میں نے ان دونوں کے ساتھ نہیں بلکہ سارے دیش کے ساتھ غداری کی ہے۔ ان میں ایک سکھ تھا اور دوسرا ہندو۔ انہوں نے عدالت میں جو بیان دیئے تھے، میں کہتا ہوں کہ انہوں نے انگریزوں کی بادشاہی کو ہلا دیا تھا۔ میں جب بیان دے رہا تھا تو وہ مجھے طعنے دے رہے تھے۔ جج کے بار بار کہنے پر بھی وہ مُنہ بند نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے کسی انگریز کی اولاد کہا اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ سکھ اے ایس آئی اپنی بہن کو انگریز افسروں کے بنگلوں میں بھیجتا ہے اور انعام کھاتا ہے۔ میں آئندہ کسی ٹیررسٹ کو نہیں پکڑوں گا۔"

"یہ باتیں بعد میں کریں گے یار!" — میں نے کہا — "پہلے یہ بتاؤ کہ ...."

"پہلے تم بتاؤ کہ تم نے مجھے کس طرح پہچانا ہے" — اُس نے کہا — "مجھے اس بہروپ میں کوئی نہیں پہچان سکتا۔"

"بہروپ میں صرف کپڑے ہی پردہ نہیں ڈال سکتے ارجن سنگھ!" — میں نے کہا — "تم نے اپنے جسم کا رنگ تو ٹھیک بنایا ہے۔ تمہارے اصلی رنگ کا پتہ ہی نہیں چلتا لیکن تم نے اپنے دانتوں کو دیکھا ہی نہیں۔ چمک رہے ہیں اور بالکل سفید ہیں۔ انہیں پیلا اور بہت مُیلا کر لینا تھا۔ تمہارا حُلیہ دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ تم نے تین چار دنوں سے روٹی نہیں کھائی اور تم مریض ہو لیکن تمہاری پنڈلیاں اور تمہارے بازو ایک کسرتی جسم کے بازو ہیں، پھر تم نے جس طرح مجھے غور سے دیکھا تھا اس سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم یہ نہیں جو بنے ہوتے ہو۔ پاگل کسی کو اس طرح نہیں دیکھا کرتے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ شک مجھے اس سے بھی ہُوا کہ یہ گاؤں راستے سے اتنا ہٹا ہُوا اور اتنا چھپا ہُوا ہے کہ کوئی پاگل ادھر نہیں آسکتا .... اب تم یہ بتاؤ کہ یہاں تک آئے کیسے!"

"ایک ہیڈ کانسٹیبل کے اشارے پر آیا ہوں" — اُس نے اُس گاؤں کا نام لیا جو شمّو کے سسرال کا گاؤں تھا۔ کہنے لگا — "وہاں کا یہ ہیڈ کانسٹیبل چھٹی پر آیا ہُوا تھا۔ شاید اس گاؤں کی ایک لڑکی اُس گاؤں بیاہی ہوئی ہے۔ اس

ہیڈ کانسٹیبل کو اُس کے تھانے سے سپیشل برانچ کے ہیڈ کوارٹر میں بلایا گیا تھا۔ وہ جب چھٹی کاٹ کر واپس گیا تو اُس نے تھانے میں ذکر کیا کہ اس گاؤں میں اِس اِس حلیے کے آدمی جو ڈاکو ہیں یا مفرور ہیں، چھپے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ ایک عورت بھی ہے جو بہت ہی خوبصورت ہے اور ساتھ ایک بوڑھا آدمی ہے۔"

"میں اِس لڑکی کو جانتا ہوں"—— میں نے کہا۔

"شمّو ہے نا!"—— حمید اللہ نے کہا۔

"میری ملاقات اِس ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ کرائی گئی تھی"—— ارجن سنگھ نے کہا —— "میں نے اُس سے گاؤں کا راستہ اور کچھ اور باتیں معلوم کرنی تھیں کیونکہ مجھے حکم ملا تھا کہ میں اِس گاؤں میں جا کر دیکھوں کہ یہ کون لوگ ہیں جو یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے چھپے ہوئے نہ ہی ہوں اور وہ مجرم بھی نہ ہوں۔ میں نے جب ہیڈ کانسٹیبل سے بات کی تو اُس نے بڑی بے تکلفی سے کہا کہ اُس نے دراصل رپورٹ نہیں کی تھی، اور وہ رپورٹ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے تھانے میں اپنے ساتھیوں کو اپنا ایک ناجائز معاشقہ سنایا تھا۔ ایک بڑی خوبصورت لڑکی نے جس کا خاوند پگلا ہے اور اُس کا ایک بازو اور ایک ٹانگ بھی بیکار ہے، ہیڈ کانسٹیبل نے فخر سے سنایا تھا کہ اس لڑکی نے خود اُسے بلایا اور معاشقہ شروع کیا تھا۔"

ارجن سنگھ کی باتوں سے یہ ظاہر ہوا کہ اس ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ ملاقاتوں کے دوران شمّو نے اُسے بتایا کہ اُس کے گاؤں میں ہم چھپے ہوئے ہیں۔ ہیڈ کانسٹیبل کو اُس نے ہمارے حلیے بھی بتا دیئے تھے۔ مجھے کوئی نہ بتاتا تو بھی مجھے معلوم تھا کہ ہمارے فوٹو سارے صوبے کے تھانوں میں بھیج دیئے گئے ہوں گے۔ ہیڈ کانسٹیبل کا انکشاف تھانیدار تک پہنچا تھا۔ تھانیدار نے اپنے علاقہ ڈی ایس پی تک پہنچایا۔ ڈی ایس پی نے اوپر اطلاع دی اور یہ رپورٹ سپیشل برانچ تک پہنچ گئی۔

خوبصورت عورت اور ایک بوڑھا آدمی بڑے صاف اشارے تھے۔

مجھے فوراً خیال آیا کہ شمّو نے مجھے جس انتقام کی دھمکی دی تھی وہ اُس نے لے لیا ہے۔ سپیشل برانچ نے ارجن سنگھ کو ہمارے فوٹو دیئے اور شمّو کے سُسرال کے

گاؤں اس ہدایت کے ساتھ بھیج دیا کہ وہاں کے نمبردار کے گھر کو اڈہ بنا کر اور اس بہروپ میں شمّو کے والدین کے گاؤں جاتے۔

ارجن سنگھ آ گیا۔ اگر میں نہ ہوتا تو ارجن سنگھ کو کوئی نہ پہچان سکتا۔ کوئی مجرم کتنا ہی تجربہ کار کیوں نہ ہوتا وہ ارجن سنگھ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ میں چونکہ خود روپ بہروپ کا ماہر تھا اور خدا نے دماغ بھی کچھ تیز دیا تھا اس لئے میں نے بہروپ کی باریکیاں دیکھ لیں اور ارجن سنگھ کو پکڑ لیا۔

شمّو نے انتقام لے لیا تھا۔ ارجن سنگھ نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور ہم نے ارجن سنگھ کو پکڑ لیا تھا۔ اب اگلا قدم اُٹھانا تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ ہم اس گاؤں میں نہیں رہ سکتے تھے، اور یہ بھی ظاہر تھا کہ ہم ارجن سنگھ کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ یہ صورتِ حال جو پیدا ہو گئی تھی اس سے نکلنے کا راستہ صرف میں تلاش کر سکتا تھا کیونکہ میں ہی تھا جو پولیس کے دماغ کو سمجھ سکتا تھا۔

بات پیچیدہ نہیں تھی۔ سیدھا راستہ تھا کہ اس گاؤں سے بھاگ چلو لیکن پولیس کو بڑا صاف اشارہ مل گیا تھا کہ ہم اس گاؤں میں ہیں۔ اگر ہم ارجن سنگھ کو غائب کر دیتے ہیں تو سب سے پہلے اس گاؤں کا نمبردار یہاں آتا جس کے گھر کو ارجن سنگھ نے اڈہ بنایا تھا۔ ارجن سنگھ اُس کو بتا کر آیا تھا کہ وہ فلاں گاؤں جا رہا ہے۔ نمبردار سرکاری آدمی تھا۔ ارجن سنگھ شام تک اُس کے پاس واپس نہ جاتا تو ارجن سنگھ کے پیچھے آنا اُس کا فرض تھا۔

نمبردار کو گمراہ کرنے کے لئے ہم گاؤں والوں سے یہ کام کرا سکتے تھے کہ نمبردار آتے اور پوچھتے کہ ادھر ایک پگلا آیا تھا تو اُسے کہہ دیں کہ ادھر کوئی پگلا نہیں آیا لیکن پولیس کو گمراہ کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ ایک اے ایس آئی کی گمشدگی پر پولیس نے اس گاؤں پر چھاپہ مارنا تھا اور گاؤں کے کسی دودھ پیتے بچے کو بھی نہیں بخشنا تھا۔ انگریز جب ظلم کرنے پر آتا تھا تو اپنی لپیٹ میں آتے ہوئے ہندوستانیوں کو کیڑے مکوڑے سمجھ لیتا تھا۔

ہم گاؤں کے لوگوں کو بچانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے میں نے

ارجن سنگھ کے ساتھ سودا بازی کرنے کی سوچ لی۔

"ارجن پیارے!" — میں نے اُس سے پوچھا — "تم زندہ رہنا چاہتے ہو یا زندگی سے تنگ آگئے ہو؟"

"اوئے سکندر!" — اُس نے سکھوں کی مخصوص بے تکلفی سے کہا — "یہ ظلم نہ کرنا یار! ابھی تو تین مہینے ہوتے ہیں دوسری شادی کی ہے۔ میری جوانی دیکھ۔"

"دوسری شادی کیوں کی ہے؟"

"پہلی مرگئی ہے" — اُس نے جواب دیا — "ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ مرگئی۔ دوسری شادی اُسی کی چھوٹی بہن کے ساتھ کی ہے۔ ابھی تین ہی مہینے گزرے ہیں۔ میں جالندھر میں تھا تو ہفتے میں ایک چکر گھر کا لگ جاتا تھا۔ اب اُسے یہاں لاؤں گا۔ تم اُسے دیکھو تو کہو، ارجن سنگھا نوکری چھوڑ دے اور اسی کو سامنے بٹھا کر دیکھتا رہ .... آنکھیں ہرنی جیسی ہیں اور ہے مورنی!"

"کوئی بات نہیں یار!" — میں نے کہا — "اُسے تم سے زیادہ اچھا خاوند مل جاتے گا۔"

"چاچا جی!" — ارجن سنگھ نے خواجہ صاحب کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا — "انہیں کچھ سمجھاؤ۔"

خواجہ صاحب ہنس پڑے۔ بولے کچھ بھی نہیں۔

"سردار جی!" — حمید اللہ نے کہا — "ہم تمہیں کیسے چھوڑ سکتے ہیں.... سکندر!" — اُس نے مجھ سے کہا — "اِس کا فیصلہ کرو، ورنہ پھنس جائیں گے۔"

"ارجن سنگھ!" — میں نے اُسے کہا — "تم یہ سُن کر آتے ہو نا کہ میرے ہاتھ میں کوئی جادو ہے!.... کوئی جادو نہیں۔ یہ میری عقل ہے اور جادو یہ ہے کہ میری ایک رگ فالتو ہے۔ وہ فیصلہ کروں گا جس تک تمہاری عقل نہیں پہنچ سکے گی.... کیا تمہیں کسی نے بتایا ہے کہ میں نے اُس ڈی ایس پی کو کیوں قتل کیا تھا؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "صرف اتنا سُنا تھا کہ ایک عورت کا چکر تھا اور وہ عورت بھی مفرور ہے .... وہ شاید یہی بی بی ہو گی!"

"وہ محل کے ایک غریب ملازم کی کنواری اور شریف بیٹی تھی" — میں نے کہا اور اُسے سنایا کہ اُس لڑکی کے ساتھ ڈی ایس پی نے کیا ذلیل سلوک کیا تھا اور پھر میں نے اُسے کہاں اور کس حالت میں جا کر قتل کیا اور ایک غریب لڑکی کی عزت بچائی تھی۔

"ارجن بھائی!" — میں نے کہا — "وہ میری کچھ نہیں لگتی تھی سوائے اس کے کہ وہ میرے ملک کی ایک بے بس لڑکی تھی۔ میں نے اُس کی عزت کی خاطر اپنی اتنی اچھی نوکری اور اتنا اچھا ریکارڈ خراب کیا۔ اتنے اچھے ریکارڈ پر میں نے زیادہ سے زیادہ دو سال بعد انسپکٹر ہو جانا تھا.... اور ان خواجہ صاحب کی طرف دیکھو۔ کیا یہ تمہارے دادا کی عمر کے نہیں؟ انہوں نے یہ جُرم کیا ہے کہ اس عورت کی جو تمہارے سامنے بیٹھی ہے، عزت انگریز افسروں سے بچائی ہے۔"

"یہ کون ہے؟" — ارجن سنگھ نے پوچھا۔

"یہ میری بڑی بہن ہے" — میں نے جواب دیا اور حمید اللہ کی طرف اشارہ کر کے کہا — "اور اس کی بیوی ہے۔"

"سچ کہتے ہو سکندر؟" — ارجن سنگھ نے حیران سا ہو کے پوچھا۔

"جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے ارجن!" — میں نے کہا — "اور میں ایسی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا کہ تمہیں یہ سارا بیان دوں۔ تم میرے ہاتھ میں آئی ہوئی ایک مکھی ہو۔ ایک سیکنڈ میں مسل کر پھینک دوں گا۔ میں تمہیں یہ بات پوری کی پوری اس لئے سُنا رہا ہوں کہ میں نے سُنا ہے اور میں جانتا بھی ہوں کہ سکھوں میں غیرت ہوتی ہے۔"

"شابا اوئے تیرے شیرا!" — ارجن سنگھ نے کہا اور ساتھ ہی میری ران پر بڑے زور سے ہاتھ مارا — "میں تیرے پیچھے جان دے دوں گا۔"

سکھوں میں غیرت ہوتی ہے یا نہیں، یہ ہر کسی کی اپنی اپنی رائے ہے لیکن سکھوں کی ایک رگ کہ میں جانتا تھا کہ سکھ کو پھونک دے دو تو اُس نے اُس کی

ماں بھی قتل کروا دو، لیکن میں اس سکھ کو خالی پھونک نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں اُس کے دماغ میں ایک بات ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری کوشش دراصل یہ تھی کہ سانپ بھی مر جاتے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ارجن سنگھ کو قتل کر کے گاؤں پر کیسی قیامت ٹوٹنی تھی۔

"میرے ساتھ سیدھی بات کرو" ——— ارجن سنگھ نے کہا ——— "تم تو جانتے ہو کہ ہم لوگ بڑا پکا جھوٹ بول سکتے ہیں۔ تم نے بھی جھوٹ بولے ہوں گے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم لوگ کیا کرو گے اور کہاں جاؤ گے۔ یہ میں تمہیں بتا دوں کہ مجھے زندہ رکھو یا مار ڈالو، تم اس گاؤں میں نہیں رہ سکو گے"۔

"تم پوچھتے ہو ہم کیا کریں گے" ——— میں نے ارجن سنگھ سے کہا ——— "ہم نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ یہ فیصلہ ہم کر چکے ہیں کہ اپنے ملک کے لوگوں کو لوٹیں گے نہیں، انہیں کچھ دیں گے .... ارجن سنگھا! فرض کر لو تم بھی ہمارے ساتھ ہو اور تم نے بھی مجھ جیسا جرم کیا ہے۔ بتاؤ، کیا کرو گے"۔

"میں بغیر سوچے ٹیررسٹ بن جاؤں گا" ——— اُس نے جواب دیا ——— "مجھ سے کوئی قسم لے لو، میں سچ کہتا ہوں کہ وہ دو ٹیررسٹ پکڑوا کر میں نے بہت بڑا جرم کیا ہے اور میں ہمیشہ شرمسار رہوں گا"

"اگر میں کہوں کہ ہم ٹیررسٹ گروہ بنائیں گے تو تم کیا کرو گے؟" ——— میں نے پوچھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ——— "میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ جو گروہ ہم بنائیں گے وہ معمولی سا گروہ نہیں ہوگا۔ دیکھ میرے بھائی! ہم مفرور ہیں۔ ہماری باقی عمر یہاں سے وہاں، وہاں سے کہیں اور فرار ہوتے، چھپتے اور بھاگتے گزرے گی۔ جب کبھی پکڑے گئے تو سیدھے پھانسی کے تختے پر کھڑے کر دیئے جائیں گے تو کیا یہ اچھا نہیں رہے گا کہ ملک کی خاطر اور ملک کی غلام مخلوق کی خاطر کچھ کر کے مریں؟"

"کیوں اچھا نہیں رہے گا" ——— ارجن سنگھ نے کہا ——— "اگر تم نے مجھے زندہ چھوڑ دیا اور پھر تم نے اپنا دہشت گرد گروہ بنا لیا تو ! باگرنتھ صاحب اور سارے گوروؤں کی قسم، ارجن سنگھ سرکار کی ایک رائفل اور ایک ریوالور سمیت تمہارے ساتھ ہوگا ... اور میں تمہیں بتا دوں سکندر! تم یہ کام کر سکتے ہو اور تمہارا

یہ نواب زادہ دوست بھی عقل والا معلوم ہوتا ہے"۔

اس سکھ اے ایس آئی نے تو ہمیں یہی یقین دلانا تھا کہ وہ ہماری مدد کرے گا کیونکہ اُس نے ہم سے اپنی جان چھڑانی تھی۔ میں اپنی مجبوری بیان کر چکا ہوں۔ اُسے زندہ چھوڑنے کا خطرہ مُول لینا ہی تھا۔ اگر میں بے حس، احسان فراموش اور جرائم پیشہ آدمی ہوتا تو یہی کرتا کہ اس سکھ کو پرے لے جا کر گولی مار دیتے اور خود وہاں سے نکل جاتے۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں گاؤں والوں کو کسی مصیبت اور آفت سے بچانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

میں نے اور حمید اللہ نے ارجن سنگھ کے ساتھ بہت باتیں کیں۔ بہت سی باتیں اُس نے بھی کیں۔ وہ ایک بات پر زور دیتا تھا کہ تم انگریزوں کی حکومت کے خلاف دہشت گردی کرو گے تو میں تمہاری مدد بھی کروں گا اور آخر تمہارے پاس آجاؤں گا۔ وہ اپنے ہیڈ کوارٹر میں جا کر یہ بیان نہیں دے سکتا تھا کہ اُس نے گاؤں میں کسی مفرور ملزم کو نہیں دیکھا کیونکہ ایک تو شمّو تھی جس نے ہیڈ کانسٹیبل کو بتایا تھا اور اب وہی شمّو اپنے بیان سے پھر نہیں سکتی تھی۔ اُدھر ہیڈ کانسٹیبل رپورٹ اُوپر تک پہنچا چکا تھا۔

آخر ارجن سنگھ نے ایک راستہ نکال لیا۔

"میرے دوستو!" ——— ارجن سنگھ نے کہا ——— "مجھے اگر اپنا بھائی سمجھتے ہو تو میں ایک راستہ دکھاتا ہوں۔ میں پہلے تو نمبردار کو ساتھ ملاؤں گا یا اُسے دھوکا دوں گا کہ تم لوگ اس گاؤں میں دو تین دنوں کے لئے رُکے تھے اور تم نے گاؤں والوں کو اتنا زیادہ ڈرایا تھا کہ وہ گھروں کے اندر دبکے رہے۔ میں یہی رپورٹ اپنے ہیڈ کوارٹر میں بھی جا کر دوں گا۔ اس سے یہ ہوگا کہ اس لڑکی کا بیان بھی درست ہوگا کہ اُس نے تمہیں دیکھا تھا۔ ہم ایک دیہاتی لڑکی سے امید نہیں رکھ سکتے کہ وہ پولیس کے سامنے یہ جھوٹ بولے گی کہ اُس نے ہیڈ کانسٹیبل کو ایسی بات کہی ہی نہیں تھی۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس گاؤں کے لوگوں کو اس بات پر تیار کرو کہ پولیس کے آفیسر یہاں آ کر ان سے تمہارے متعلق پوچھیں تو یہ لوگ یہ بیان دیں کہ تم لوگ یہاں آتے تھے اور تمہارے ساتھ دس بارہ آدمی

تھے اور یہ کہ تم سب نے گاؤں والوں کو بہت ڈرایا تھا اور کہا تھا کہ تم ان کی لڑکیوں کو اُٹھا کر لے جاؤ گے اگر وہ پکڑوانے کی کوشش کریں گے۔"

ہم سب نے ارجن سنگھ کے مشورے کو ہی مناسب اور موزوں سمجھا اور یہی فیصلہ کر لیا۔

"ارجن سنگھ!" — میں نے اُسے کہا — "یہ سوچ لے کہ ہمارے پنجے سے نکل کر اگر تم ہمیں دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے ہو اور تم نے بڑی اُستادی سے ہم سے جان بچالی ہے تو یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہو گی۔ میں نے تمہیں ابھی بتایا نہیں کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ ہم تمہیں سپیشل برانچ کے ہیڈکوارٹر سے اُٹھا لائیں گے۔ میں نے وہاں سروس کی ہے۔ وہاں میرے مرید موجود ہیں۔ میرے اشارے پر تمہاری گردن پر چھری پھر جائے گی۔"

"او تے سکندرا!" — ارجن سنگھ نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور مجھے جھنجھوڑ کر بولا — "مجھے دھمکیاں نہ دے۔ یہ نہ بھُول کہ میں سکھ ہوں۔ میں نے جو وعدہ کیا ہے وہ سُولی پہ کھڑا ہو کر بھی پورا کر دوں گا۔ اگر تُو اس پر خوش ہے کہ تُو نے مجھے ڈرا کر اپنا کام کرا لیا ہے تو یہ خوشی دل سے نکال دے۔ مجھے جو اُٹھانے آئے گا اُس کی ماں بھی اُٹھ جائے گی۔ اپنے دل کو مَیلا نہ کر۔ میں اپنے وعدے سے پھروں گا نہیں۔ تم یہ کام کر دو کہ گاؤں کے لوگوں کو سمجھا دو اور خود یہاں سے نکل جاؤ۔"

"جا ارجن سنگھ!" — میں نے اُس کا ریوالور اور کاغذات اُسے دے کر کہا — "یہ لے۔"

اُس نے ریوالور اور ہمارے فوٹو اور اپنا شناختی کارڈ میرے ہاتھ سے لے کر میرے ساتھ، حمید اللہ اور خواجہ صاحب کے ساتھ ہاتھ ملایا اور باہر کو چل پڑا۔

دروازے سے نکلنے لگا تو رُک گیا اور واپس آ گیا۔

"ایک بات تمہیں بتانی تھی" — اُس نے کہا — "تم جس شہر کے رہنے والے ہو وہاں تمہارے قریبی رشتہ دار رہتے ہیں۔ کون ہیں وہ؟"

"میری خالہ ہے" — میں نے جواب دیا — "اور اُس کی اولاد اور خاوند ہے۔"

"وہاں کی پولیس اُنہیں بہت تنگ کر رہی ہے" — ارجن سنگھ نے بتایا — "یہ مجھے ہیڈکوارٹر سے پتہ چلا ہے۔ تم خود پولیس کے افسر رہے ہو۔ تم جانتے ہو کہ مفرور ملزموں کے گھر والوں کو کس طرح تنگ کیا جاتا ہے۔ وہاں کا تھانیدار تمہاری خالہ کو اور گھر میں کوئی اور عورتیں ہیں تو ان سب کو بار بار تھانے بلا کر بٹھا لیتا ہو گا۔ پولیس والے جتنا کچھ شریف ہوتے ہیں وہ تم جانتے ہی ہو۔ معلوم نہیں تمہاری خالہ کے گھر پر کیسی مصیبت آئی ہوتی ہو گی... کچھ اس کا بھی بندوبست کر لو۔"

ارجن سنگھ مجھے یہ خبر سنا کر چلا تو گیا لیکن میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجھے اپنی خالہ زاد عذرا کا خیال آنے لگا۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ وہاں کی پولیس اُنہیں کس طرح پریشان اور ذلیل کرتی ہو گی۔ مفرور ملزموں کے رشتہ داروں کو بالائی افسروں کے حکم کے تحت اسی طرح تنگ کیا جاتا ہے۔ اُن کی فریادیں کوئی نہیں سُنتا۔ وہ جہاں بھی فریاد لے کے جاتے ہیں انہیں یہ جواب ملتا ہے کہ ملزم کو حاضر کرو۔ بعض اوقات آدھی رات کو پولیس ویسے ہی جا چھاپہ مارتی ہے اور کہتی ہے کہ اطلاع ملی ہے کہ ملزم آیا ہے یا آیا تھا۔ تھانیدار اپنی بدمعاشیاں چلاتے ہیں، عورتوں کی مجبوری سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور ہر طرح کی رشوت لیتے ہیں۔



ہم نے ارجن سنگھ کے جاتے ہی گاؤں کے چیدہ چیدہ پانچ چھ آدمیوں کو بلایا۔ اُنہیں پہلی بات یہ کہی کہ تین چار آدمی اونچی ٹیکریوں پر کھڑے کر دو کیونکہ خطرہ ہے کہ پولیس آتی ہو گی۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ یہ جو بگلا سا آدمی آیا تھا یہ سی آئی ڈی کا آدمی تھا اور ہو سکتا ہے کہ پولیس اس کے پیچھے پیچھے چھاپہ مارنے کے لئے آجائے۔

پھر انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ کسی وقت پولیس کے آدمی یا کوئی بھی آ جاتے اور پوچھے کہ ہم لوگ یہاں رُکے تھے تو تم کہنا کہ تم نے آتے دیکھے تھے، جاتے نہیں دیکھے۔ بہرحال جس طرح ہم نے طے کیا تھا وہ انہیں سمجھا دیا۔ پھر انہیں

کہا کہ ہم کچھ دنوں کے لئے یہاں سے غائب ہوجائیں گے۔ اُنہیں یہ بھی کہا کہ ہم اُن کا حق ادا کریں گے اور اتنا ادا کریں گے کہ اُن کی جھولیاں بھر دیں گے۔

حمید اللہ خان ہمیں ایک اور گاؤں میں لے جانا چاہتا تھا لیکن اس گاؤں کے ان آدمیوں نے ہمیں کہا کہ زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ پیچھے جو اونچی پہاڑیاں ہیں ان کے اندر قدرتی غار ہیں جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا کیونکہ کسی کو شک بھی نہیں ہوسکتا کہ کوئی وہاں چھپا ہُوا ہے۔

سورج غروب ہوتے ہی ہم وہاں سے نکلے۔ گاؤں والوں نے ہم سے کہہ دیا تھا کہ اس مکان میں کوئی چارپائی اور کوئی اور چیز جس سے شک ہو کہ یہاں کوئی رہتا رہا ہے اٹھالیں اور اندر مویشی باندھ دیں۔ گاؤں کا ایک آدمی ہمارے ساتھ تھا۔ ہمیں ڈیڑھ دو میل گاؤں سے دُور جانا پڑا۔ یہ علاقہ اونچی نیچی چٹانوں اور ٹیکریوں کا علاقہ تھا۔ گھنی جھاڑیاں، سرکنڈے اور کہیں کہیں دلدل تھی۔ غار تک پہنچتے رات تاریک ہو چکی تھی۔ ہمارے ساتھ گاؤں کا جو آدمی تھا وہ اس علاقے سے واقف تھا۔ اُس نے ہمیں ایک ایسے غار میں پہنچا دیا جو کشادہ بھی تھا اور اس کے سامنے ایک ٹیکری اور ٹیکری پہ اتنا سبزہ تھا کہ باہر سے معلوم نہیں ہوسکتا تھا کہ یہاں ایک غار ہے۔

میں یہ سنانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اس غار میں ہم نے سات آٹھ دن کس طرح گزارے۔ ابتدائی دَور کے انسان اسی طرح غاروں میں رہتے ہوں گے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہم نے کپڑے پہنے ہُوئے تھے اور گاؤں والوں کا کمال یہ کہ ڈیڑھ دو میل اتنے دشوار علاقے سے گزر کر ہمیں کھانا پہنچا دیتے تھے۔ ہم نے اسی غار میں نہیں رہنا تھا۔ وہاں ہم صرف یہ دیکھنے کے لئے گئے تھے کہ گاؤں میں پولیس یا پولیس کا جاسوس آتا ہے یا نہیں۔ ہمیں ہر روز گاؤں کا ایک آدمی جو کھانا لے کر آتا تھا خبر دے جاتا تھا کہ نہ کوئی باوردی پولیس والا آیا ہے نہ کوئی اجنبی۔ اس سے ہمیں یقین ہوگیا کہ ارجن سنگھ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ اگر وہ ہمیں دھوکا دیتا تو دوسرے ہی دن یا زیادہ سے زیادہ ایک دن بعد پولیس آجاتی۔ مفرور ملزموں کو

پکڑنے کے لئے پولیس سات آٹھ روز انتظار نہیں کیا کرتی۔ اس کام میں سات آٹھ منٹ بھی ضائع نہیں کئے جاتے۔

جب ہمیں یقین ہوگیا کہ اب چھاپہ نہیں پڑے گا اور خطرہ ٹل گیا ہے تو ہم واپس گاؤں میں آگئے، لیکن یہ بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ وہ جو آپ سنا کرتے ہیں یا اُس دُور کے ڈاکوؤں اور رہزنوں کی کہانیوں میں آپ پڑھا کرتے ہیں کہ فلاں ڈاکو اتنا عرصہ ایک گاؤں میں چھپا رہا وہ اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اس طرح چھپنے والوں کو بہت سے انتظامات کرنے پڑتے تھے۔ اپنے اردگرد جاسوسوں کا حصار قائم کر لیتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان کے ایک دو جاسوس متعلقہ تھانے پر بھی نظر رکھتے تھے۔ ایسے ہی انتظامات ہم نے بھی کر رکھے تھے۔ میں نے انتظام یہ کیا کہ گاؤں کے ایک عقلمند سے آدمی کو پیسے دے کر اُس شہر کو بھیج دیا جہاں سپیشل برانچ کا ہیڈکوارٹر تھا۔ میں نے اس آدمی کو سلطان احمد سے ملنے کے لئے بھیجا تھا۔

میں نے اُسے بڑی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ سلطان احمد تک کس طرح پہنچے گا۔ وہ لاہور کے ساتھ فیملی کوارٹر میں رہتا تھا۔ سلطان احمد سے کسی یار دوست یا رشتہ دار کا ملنا مشکوک نہیں ہوسکتا تھا نہ سلطان احمد پر کسی قسم کا شبہ کیا جاسکتا تھا۔

ہم جب گاؤں میں واپس آئے تو گاؤں والوں نے پہلے کی طرح پھر ہماری حفاظت کا انتظام کر دیا۔ شام کا وقت تھا۔ میں باہر نکلا اور ٹہلتے ٹہلتے گاؤں میں سے نکل گیا۔ میں نے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سُنی۔ گھوم کے دیکھا، شمّو آرہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ فوری طور پر دل میں یہ ارادہ آیا کہ اُس کا گلا گھونٹ کر دلدل میں پھینک دوں اور دلدل اسے اپنے پیٹ میں غائب کرلے گی۔ وہ جگہ ایسی تھی جہاں سے ہمیں گاؤں نظر نہیں آتا تھا نہ گاؤں والے ہمیں دیکھ سکتے تھے۔ شمّو بڑے تیز قدم اُٹھاتی چلی آرہی تھی۔ میں رُک گیا۔ اُس کے چہرے پر کچھ اور ہی تاثر تھا۔ یہ تاثر ویسا نہیں تھا جیسا میں اُس کی پہلی ملاقاتوں میں بیان کرچکا ہوں۔

"بدلہ لے لیا تُو نے؟" —— میں نے غصّے کو دباتے ہُوئے پوچھا۔

"نہیں" — اُس نے سر کو زور زور سے ہلاتے ہُوئے کہا — "مجھے خدا اور قرآن کی قسم ہے، میں نے بدلہ نہیں لیا"۔

"کیا تم جانتی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"ہاں، میں جانتی ہوں" — اُس نے کہا — "میں اپنے گاؤں میں تم سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے آئی ہوں۔ مجھے اُس گاؤں کے نمبردار نے چوری چھپے الگ بٹھا کر کہا تھا کہ تم نے ایک پولیس حوالدار کو یہ بتا کر بہت بڑی غلطی کی ہے کہ اس گاؤں میں مفرور ملزم چھپے ہُوئے ہیں۔ نمبردار کہتا تھا کہ اب تمہارے باپ کو بھی پولیس پکڑ کر لے جائے گی"۔

"پھر تم نے اُس حوالدار کو یہ راز کیوں دیا تھا؟" — میں نے پوچھا —

"اسی لئے راز دیا تھا ناکہ میں پکڑا جاؤں اور پھانسی چڑھ جاؤں"۔

اُس کی حالت پہلے سے زیادہ بُری ہوگئی اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔ کہنے لگی کہ ویسے ہی مُنہ سے نکل گئی تھی۔

"تم پکڑے تو نہیں جاؤ گے؟" — اُس نے روتے ہُوئے پوچھا۔

"میں پکڑا جاتا ہوں یا نہیں، تم اسے چھوڑو" — میں نے کہا — "مجھے اسی سے شک ہوتا ہے کہ تم نے بدلہ لیا ہے ورنہ تمہیں کیا پڑی تھی کہ پولیس کے ایک حوالدار کو یہ بات بتاتیں .... وہ تمہارا کیا لگتا ہے؟"

اس نے سر جھکا لیا۔ میں تو جانتا تھا کہ اُس کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔ اُس نے کچھ دیر بعد سر اُٹھایا۔

"خدا کے لئے مان جاؤ" — اُس نے کہا — "اب میں تمہارے ساتھ اس طرح کی کوئی بات نہیں کروں گی جو پہلے کی تھی۔ میں بہت دُکھی ہوں۔ میں پاگل ہو جاؤں گی یا کنوئیں میں کُود جاؤں گی .... کیا تم میرے دل کا حال جانتے ہو؟ معلوم نہیں خدا مجھے کون سے گناہ کی سزا دے رہا ہے۔ میرے گاؤں والے اب بھی مجھے شریف لڑکی سمجھتے ہیں۔ یہ پولیس حوالدار پہلا غیر مرد ہے جس کے ساتھ میں نے جھک ماری ہے۔ میرا دل روتا ہے"۔

"میں تمہیں اس بدی سے بچانا چاہتا تھا" — میں نے کہا — "تم نے

مجھے ایک جگہ بتا کر کہا تھا کہ وہاں آجانا۔ میں تمہیں پاک رکھنے کے لئے وہاں نہیں آیا تھا۔ ہر مرد تو ایسا نہیں ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے وہی بھیک جو مجھ سے مانگی تھی، وہ اُس حوالدار سے مانگ لی ہوگی۔ اس کے عوض تم نے اُسے یہ راز دے دیا کہ ہم یہاں چھپے ہُوئے ہیں"۔

"نہیں" — اُس نے کہا — "میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ایسے نہیں ہُوا۔ وہ مجھے چوروں اور ڈاکوؤں کی کوئی بات سُنا رہا تھا تو میرے مُنہ سے نکل گئی کہ ہمارے گاؤں میں بھی ڈاکو آتے ہُوتے ہیں۔ مجھے بعد میں بہت پچھتاوا ہُوا کہ میں نے اپنے گاؤں کا راز کھول دیا ہے"۔

اُس کے آنسو تو پہلے ہی بہہ رہے تھے، اچانک وہ اس طرح رونے لگی جس طرح کسی عزیز کی میّت پر عورتیں رویا کرتی ہیں۔ میں اُس کے پاس زیادہ دیر کھڑا نہیں رہنا چاہتا تھا لیکن اُس کی حالت دیکھ کر میں وہاں سے نہ ہلا۔ میں اُسے چُپ کرانے لگا۔ میں نے یہ مان لیا تھا کہ اُس نے انتقام نہیں لیا تھا۔

"کیا تم مجھے بدی سے بچانا چاہتے ہو؟" — اُس نے کہا — "اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ میں بیوہ ہو جاؤں اور میری دوسری شادی ہو جائے .... تم مجھے کس کس سے بچاؤ گے؟ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ تمہیں اُس نظر سے نہیں دیکھوں گی جس نظر سے پہلے دیکھا تھا۔ تم میرے دل کو بہت اچھے لگتے ہو۔ کیا میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟"

میں بیان نہیں کر سکتا کہ اُس وقت اُس کی حالت کیا تھی۔ خودکشی کے لئے اُس کے پاس معقول وجہ تھی۔ اُس کے سامنے اب یہی ایک راستہ تھا۔ وہ تو پناہ مانگ رہی تھی۔

"میں کہہ رہی ہوں کہ مجھے کس کس سے بچاؤ گے" — اُس نے کہا — "میرا اپنا سُسر میرے پیچھے پڑا ہُوا ہے۔ اُس نے مجھے صاف کہہ دیا ہے کہ میرا بیٹا تمہارے قابل نہیں، تم در پردہ میری بیوی بنی رہو .... میری ساس مر چکی ہے .... خدا کی قسم! اپنے سُسر سے مجھے ڈر آتا ہے۔ وہ مجھے ڈراتا نہیں، پیسے دیتا رہتا ہے۔ میرے ساتھ لاڈ پیار کرتا ہے۔ میں جب کہتی ہوں کہ اپنے ماں باپ کے پاس

جاؤں گی تو اُسی وقت گھوڑی پر بٹھا کر ایک آدمی ساتھ بھیج دیتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں نے اُس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے مروا دے گا یا ایسا الزام لگا دے گا کہ میں کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔"

اُس کی یہ بات سُن کر میرا جسم بڑی زور سے کانپا۔ غیر ارادی طور پر میرا دایاں ہاتھ اُٹھا اور آہستہ آہستہ اُس کے سر پر چلا گیا۔

"مت ڈرو" — میں نے کہا — "میں بہت جلدی تمہیں آزاد کرا لوں گا ..... اب چلی جاؤ اور آرام کی نیند سو جاؤ۔"

۶

میں شاید پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ شمّو کے پاس پاگل ہو جانے یا خودکُشی کر لینے کی مکمل وجوہات موجود تھیں اور میرے دل میں وہ محبت موجود تھی جو صرف ایک آدمی یا ایک عورت تک محدود نہیں ہوتی۔ اس کا دائرہ لامحدود ہوتا ہے۔ پوری کی پوری بنی نوع انسان اس دائرے میں سما جاتی ہے۔

یہ اسی محبت کا کرشمہ تھا کہ میں بھول ہی گیا کہ شمّو نے مجھے بدی کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ بدی کی راہ پر چل بھی گئی تھی اور میرے ذہن سے یہ غصّہ بھی نکل گیا کہ شمّو نے ہمیں گرفتار کرانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ میری نگاہ میں شمّو ایک مظلوم اور مجبور عورت بن گئی جسے خریدا گیا تھا۔ اُس کے ماں باپ کی عزّت اُس کے سُسر کی دولت سے ٹکر نہیں لے سکتی تھی۔ اس نوجوان لڑکی کو جل جل کر مرنا تھا۔

میرے متعلق یہ جو مشہور تھا کہ میرے ہاتھ میں کوئی جادُو ہے اور جسے بعض آدمی میرے آنکھوں کا تاثر کہتے تھے وہ دراصل یہی تھا کہ میرے دل میں بنی نوع انسان کی محبت اور ہمدردی تھی۔ جن آنکھوں میں گناہ کا پَرتو ہوتا ہے وہ آنکھیں جھکی رہتی ہیں کسی کا سامنا نہیں کر سکتیں۔ نگاہ پاک ہو تو تیر کا اثر رکھتی ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ میں نے جب تہیہ کر لیا کہ شمّو کو اس مصیبت سے اور اس بے حس اور بے رحم سُسر سے اور ذہنی اور جسمانی لحاظ سے معذور خاوند سے نجات دلانی ہے تو میں نے اپنے آپ میں ایسی قوّت محسوس کی جیسے میں پہاڑوں کو بھی

ریزہ ریزہ کر سکوں گا۔

اچانک مجھے اپنے شہر کا خیال آگیا جہاں میری خالہ اور عذرا پر نہ جانے کیا بیت رہی ہے۔ عذرا اگر میری خالہ زاد نہ ہوتی اور وہ کوئی اور لڑکی ہوتی جسے میری خاطر پریشان کیا جا رہا ہوتا تو میں اُس کی مدد کو بھی فوراً پہنچتا۔

میرے سامنے اب دو کام تھے۔ ایک یہ کہ شمّو کے سُسر کو ایسی ضرب لگانی تھی کہ شمّو پر اُس کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں آزاد کرا دوں گا۔ اس کا یہی ایک طریقہ تھا کہ اس کے خاوند کو اُس کے گھر ڈاکے کی واردات کے دوران قتل کر دیا جاتا لیکن مجھے خیال آگیا کہ اُس کا نہ تو دماغ کام کرتا ہے نہ اُس کا جسم کسی قابل ہے۔ اُس نے شمّو کو اغوا تو نہیں کیا تھا اور اُس بے چارے کو یہ بھی ہوش نہیں ہونی چاہیئے تھی کہ یہ لڑکی اُس کی بیوی ہے یا بیوی ہوتی ہی کیا ہے۔ بہرحال میں نے کچھ سوچ لیا تھا اور سوچا یہ تھا کہ اپنی ضرورت کے لئے ڈاکہ تو اُس گھر میں ڈالنا ہی ہے، اُس کا گھر خالی کر کے شمّو کے سُسر سے کہیں گے کہ اس لڑکی کو طلاق دو ورنہ تمہارے گھر میں دوسری واردات تمہارے قتل کی ہوگی۔

میں نے رات کو حمید اللہ اور خواجہ کے سامنے یہ مسئلہ رکھا اور انہیں بتایا کہ شمّو نے سادگی میں ہمارا راز کھول دیا تھا اور اب وہ خود پچھتا رہی ہے۔ میں نے اُنہیں یہ بھی بتایا کہ اُس کا سُسر دولت کے زور پر اس لڑکی کو عملاً اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے۔

"یہ کوئی مشکل کام تو نہیں سکندر!" — حمید اللہ نے کہا — "ہم نے پہلے ہی فیصلہ کر رکھا ہے کہ شمّو کے سُسر کا گھر خالی کرنا ہے۔ دو آدمی ہمارے ساتھ ہیں۔ انہیں کہیں گے کہ شمّو کے پگلے خاوند کو ختم کر دیں۔"

"نہیں" — میں نے کہا — "میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ کسی کو قتل نہیں کرنا۔ قتل اُسے کریں گے جس کے متعلق ہم سمجھیں گے کہ اسے جینے کا کوئی حق نہیں۔ خون اُس کا بہنا چاہیئے جس کے ہاتھ کسی مجبور کے خون سے رنگے ہوُئے ہوں۔"

اس مسئلے پر تھوڑی سی بحث ہوئی لیکن میں نے حمید اللہ کو بتا دیا کہ میں نے

جوکہہ دیا ہے میں اسی کا پابند رہوں گا۔

دوسرے دن صبح شمّو ہمیں روٹی اور دُودھ دینے آئی۔ میں نے اور حمید اللہ نے اُسے الگ بٹھا لیا۔ ڈاکے جیسی سنگین واردات کرنے والے شمّو جیسی سیدھی سادی اور کم فہم لڑکی کو نہیں بتایا کرتے لیکن ہم نے اُسے بتا دیا کہ دو تین دنوں بعد اُس کے سُسرال میں ڈاکہ پڑے گا۔ ہم نے اُسے بتانے کا خطرہ اس لئے مول لیا تھا کہ وہ اُس گھر سے جلی بیٹھی تھی، اور دعائیں مانگتی تھی کہ اس گھر کو آگ لگ جائے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اُسے ہم نے گھر بھیدی بنانا تھا۔

یہ سُن کر وہ بہت خوش ہوئی۔ اُس نے دوپٹہ اپنے ہاتھوں پر پھیلا کر ہماری کامیابی کے لئے دُعا کی۔

"دو تین دنوں بعد نہیں" ___ اُس نے کہا ___ "آج ہی رات یہ واردات کرو۔ میرے سُسر اور میرے خاوند کو قتل کر کے آنا۔ ساری عمر تمہیں دعائیں دوں گی۔"

"نہیں شمّو!" ___ میں نے کہا ___ "ہم کسی کو قتل نہیں کریں گے۔ تمہارا کام کر دیں گے۔ تمہیں وہاں سے طلاق دلا دیں گے۔"

"پھر وہ کام میں کروں گی" ___ اُس نے کہا ___ "میں جانتی ہوں وہ مجھے سیدھے ہاتھوں طلاق نہیں دے گا۔"

ہم نے شمّو کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ ہم اُس سے صرف بھید لینا چاہتے تھے۔ اُس سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اُس کے سُسر کی گردن پر چھُری رکھ کر اُسے کہو گے کہ مال نکال دے تو وہ تمہیں وہ مال دے دے گا جو اُس نے باہر رکھا ہُوا ہو گا۔ شمّو نے ہمیں ایک کوٹھڑی بتائی جس کے ایک کونے میں اُوپر تلے دو گھڑے رکھے ہُوتے تھے۔ ان گھڑوں کے نیچے کچے فرش میں ایک اور گھڑا دبا ہُوا تھا جس میں اُس کا سُسر اپنی دولت رکھتا تھا۔

شمّو کو ہم نے پکّا کر دیا اور اُسے کہا کہ وہ اگلے روز واپس سُسرال چلی جائے۔ اُس سے ہم نے پوچھ لیا تھا کہ مکان کے اندر کس طرح جایا جا سکتا ہے۔

میں نے جس آدمی کو اپنے ہیڈ کوارٹر والے شہر سلطان احمد سے ملنے کے لئے بھیجا تھا وہ اگلی صبح واپس آ گیا۔ سلطان اُسے بڑی آسانی سے مل گیا تھا۔

"سکندر بھائی!" ___ اُس نے کہا ___ "سلطان تمہارے لئے بہت پریشان ہے۔ وہ کہتا تھا کہ سکندر نے بہت بُرا کیا ہے۔ اُس نے اپنی زندگی تباہ کر لی ہے ..... میں نے اس سے پوچھا کہ اے ایس آئی ارجن سنگھ نے یہاں آ کر کیا رپورٹ دی تھی۔ سلطان نے بتایا کہ ارجن سنگھ نے بڑی صاف رپورٹ دی ہے۔"

اُس نے ارجن سنگھ کی وہی رپورٹ سنائی جس کا وہ وعدہ کر گیا تھا۔ سلطان نے میرے آدمی کو یہ بھی بتایا کہ ارجن سنگھ نے اُس کے ساتھ بھی بات کی تھی۔ سلطان نے ارجن سنگھ پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اُس کی میرے ساتھ دوستی تھی۔ سلطان نے کہا تھا کہ ارجن سنگھ نے اُس کے ساتھ ایسی باتیں کی تھیں جیسے میں ارجن سنگھ کا بڑا ہی پرانا دوست ہوں۔

"سکندر بھائی!" ___ اس آدمی نے کہا ___ "سلطان احمد نے تمہیں یہ پیغام بھی دیا ہے کہ تمہاری خالہ اور اُس کے گھر والوں کو پولیس پریشان کر رہی ہے۔ اگر کر سکتے ہو تو اس کا کوئی بندوبست کرو ..... اور سلطان نے کہا ہے کہ زندہ رہے تو ملیں گے ..... اور سلطان نے یہ بھی کہا ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑی تو پیغام بھیج دینا ..... سلطان نے ایک خبر یہ بھی سناتی ہے کہ اُس کے گھر پہلا بیٹا پیدا ہُوا ہے اور اُس کی بیوی لاجونتی نے بچّے کا نام سکندر رکھا ہے۔"

سلطان کا پیغام بڑا لمبا تھا۔ جب یہ سُنا کہ اُس کی بیوی نے بچّے کا نام میرے نام پر رکھا ہے تو میرے جذبات اُبل آئے۔ میں الگ کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور میرا ذہن مجھے دُور پیچھے وہاں لے گیا جب میں پیدا ہُوا تھا تو میری ماں نے میرا نام سکندر رکھا تھا۔ میں اپنے تصوّر میں آہستہ آہستہ بڑا ہونے لگا۔ مجھے یاد آیا کہ میں جب پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا تو پانچویں جماعت کے ماسٹر نے مجھے کہا تھا کہ

سکندرِ اعظم بن کر دکھاؤ تو بات ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ تم میں سکندرِ اعظم بننے کے جوہر موجود ہیں۔

سکندرِ اعظم ساری دنیا کو فتح کرنے کے لئے نکلا تھا اور آخر ہندوستان کا ایک تیر پہلو میں لئے یونان کو واپس چل پڑا تھا لیکن تیر جو اُس کے پہلو میں اُتر گیا تھا وہ نکل نہیں سکتا تھا۔ اس تیر نے اُسے یونان تک زندہ نہیں پہنچنے دیا تھا۔

وہ تو کسی ہندوستانی کا تیر تھا جس نے سکندر کو دشمن سمجھ کر اُس پر چلایا تھا، میں وہ سکندر ہوں جس نے ہندوستان کی محبت کا تیر اپنے سینے میں اُتار لیا تھا۔ مجھے کچھ ایسے نظر آنے لگا تھا جیسے یہی تیر میری موت کا باعث بنے گا۔

میں نے اپنے آپ کو بچپن کی خوبصورت دلدل سے فوراً نکال لیا۔

جو لوگ پیچھے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں وہ آگے نہیں بڑھ سکتے، بڑھتے ہیں تو ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔

ماضی ایک زنجیر ہے جو لپٹ جاتے تو دو گام چلنے بھی نہیں دیتی کبھی ماضی سانپ کی طرح ڈس لیتا ہے۔ انسان مرتا تو نہیں لیکن اُس کی صلاحیتیں، عزم اور حوصلے اس کے زہر سے سڑ جاتے ہیں۔

بچپن کی یادوں سے نکل کر میں نے آگے دیکھا۔ دُھند سی تھی۔ میں اس دُھند میں اپنی راہ تلاش کر رہا تھا کہ میں اچانک اُٹھ کھڑا ہُوا جیسے میری اپنی ہی کسی قوت نے مجھے گھسیٹ کر اُٹھا لیا ہو۔ ارادہ یہ دل میں آیا کہ میں اپنے شہر جاؤں گا۔

میں خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھا اور حمید اللہ کو بھی بلا لیا۔ میں نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ میں اپنے شہر چلا جاتا ہوں اور حمید اللہ ڈاکے کی واردات کا بندوبست کرے۔

"گرفتار ہونے کے لئے جاؤ گے وہاں؟" —— حمید اللہ نے پوچھا — "کیسے جاؤ گے؟"

"بہروپ میں جاؤں گا" —— میں نے جواب دیا —— "داڑھی تو میری بڑھ ہی آئی ہے، کچھ اور بھیس بدل لوں گا۔"

ہم نے پوری پلاننگ کر لی۔

۵

اُسی شام کو میں جب بھیس بدل کر نکلا تو آزمانے کے لئے میں گاؤں کے دو آدمیوں سے ملا۔ دونوں مجھے نہ پہچان سکے۔ جب سے میں ڈی ایس پی کو قتل کر کے وہاں سے نکلا تھا شیو نہیں کی تھی۔ ڈیڑھ دو مہینے گزر گئے تھے۔ میری داڑھی خاصی بڑھ آئی تھی۔ اپنے مُنہ پر، ہاتھوں، بازوؤں اور ٹانگوں پر ایک خاص قسم کی مٹی مل لی تھی جو وہاں ایک جگہ سے مل گئی تھی۔ کپڑے دیہاتی پہنے اور سر پر دیہاتیوں جیسی پگڑی اس طرح باندھی کہ کان بھی ڈھک گئے تھے۔ ایکٹنگ مجھے آتی تھی۔ میں پسماندہ اور گنوار قسم کے دیہاتیوں جیسی باتیں کر سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ کسی کے لئے مجھے اس بہروپ میں پہچاننا آسان نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اُس قسم کا معمولی آدمی بنا لیا تھا جس کی طرف کوئی دیکھتا ہی نہیں اور بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

چھوٹا سا ایک ریلوے سٹیشن اس گاؤں سے پندرہ سولہ میل دُور تھا۔ گاؤں کی ایک گھوڑی پر سوار ہو کر میں اُس سٹیشن تک پہنچا۔ گاؤں کا ایک آدمی ساتھ آیا تھا۔ وہ میرے والی گھوڑی لے کر واپس چلا گیا۔ ریل گاڑی کے لئے مجھے ڈیڑھ دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ یہ برانچ لائن کی گاڑی تھی جس نے آدھی رات کو مجھے مین لائن کے ایک سٹیشن تک پہنچایا۔ دو گھنٹے وہاں انتظار کرنا پڑا پھر دوسری گاڑی آئی تو اُس پر سوار ہُوا۔

اس گاڑی نے مجھے سورج غروب ہونے کے کچھ دیر بعد اپنے شہر پہنچا دیا۔ میں اسی گاڑی کو پکڑنے کی کوشش میں تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ گاڑی کس وقت وہاں پہنچتی ہے۔ میں اندھیرے میں ہی اپنے شہر میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ وہ اندھیرا مجھے مل گیا۔ میں تھانیدار کے گھر جانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھانیدار کہاں رہتا ہے۔ ایک مکان تھا جس میں اس تھانے کا ہر تھانیدار رہا کرتا تھا لیکن میں اُسی وقت وہاں نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اُس وقت تھانیداروں کے ہاں کوئی نہ کوئی آیا رہتا تھا۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ تھانیدار تھانے میں ہی نہ ہو۔ سنگین کیس کی

صورت میں تھانیدار پوری پوری رات تھانے میں ہی گزار دیتے تھے۔

میں کُبڑوں کی طرح چل رہا تھا۔ میں گھنٹہ ڈیڑھ ویسے ہی اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہا۔ ایک نانبائی کی دکان کے سامنے سے گزرا تو بھوک محسوس ہوئی۔ وقت بھی گزارنا تھا۔ دکان کے باہر بھی تین چار میزیں رکھی تھیں۔ بنچ بھی پڑے تھے۔ میں ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ کسی نے میری طرف دھیان ہی نہ دیا۔ ایک لڑکے نے آکر پوچھا تو میں نے اُسے کہا کہ روٹی کھانی ہے۔ اُس نے دو دالیں اور دو سالن گنوا دیئے اور پوچھا کیا کھاؤ گے۔ میں نے ایک سالن اور دو روٹیاں منگوالیں۔ کوئی میری طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور دن بھی سفر کیا تھا۔ تھرڈ کلاس میں اتنی گرد پڑی تھی کہ میں نے اپنا جو حلیہ بگاڑا تھا وہ میری مرضی کے مطابق اور زیادہ بگڑ گیا تھا۔

"شیخ جی!" — ایک آدمی نے جو چھوٹے سے اس ہوٹل کے مالک سے خاصا دُور بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا، بلند آواز سے پوچھا — "سکندر کی کوئی نئی خبر نہیں آئی؟ سُنا تھا اخبار میں کچھ آیا تھا۔"

"میں نے وہ خبر پڑھی تھی" — ہوٹل والے نے کہا — "بس اتنی سی خبر تھی کہ اُس کا کہیں سراغ ملا تھا لیکن پولیس گئی تو وہ وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔"

"دیکھو یارو!" — ایک اور آدمی بولا — "کتنے شریف باپ کا بیٹا قاتل اور ڈاکو نکلا۔"

"باپ کہاں کا شریف تھا جی!" — ایک اور نے کہا جو ہم سب سے دُور بیٹھا ہوا تھا — "وہ شریف ہوتا تو شہناز کے ساتھ شادی نہ کرتا۔"

"وہ تو جہاں کی مٹی تھی وہاں پہنچ گئی ہے" — ہوٹل والے نے کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے کہا — "کہیں کوٹھے پر بیٹھی ہوگی۔"

"جیسی ماں ویسی بیٹی" — ایک اور آواز آئی۔

"سکندر کے خالو کا گھر خواہ مخواہ بدنام ہو گیا ہے" — ایک آدمی نے کھانا کھاتے ہوئے کہا — "پرسوں رات بھی پولیس نے اُن کے گھر

چھاپہ مارا ہے۔"

"بڑے شرم کی بات ہے" — ایک اور آدمی نے کہا — "سکندر کی خالہ کی بیٹی جوان لڑکی ہے۔ مجھے ڈر ہے تھانیدار اُس پر ہاتھ صاف کر جائے گا..... یہ لڑکی سکندر کی منگیتر ہے۔"

"اب کہاں منگیتر رہا جی!" — ہوٹل والے نے کہا — "اب تو وہ لڑکی کسی اور کو دیں گے۔"

"اگر پولیس نے اس خاندان کا پیچھا نہ چھوڑا تو اس لڑکی کو کوئی قبول نہیں کرے گا۔"

"لڑکی کو قبول کرنے والا آگیا ہے" — ایک اور نے کہا — "وہ ہے نا، منشی مراتب علی کا بیٹا، ایوب!"

"ہاں ہاں" — میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے کہا — "وہ جو سب انسپکٹر ہو گیا تھا۔ سات آٹھ روز ہوئے وہ سزا کاٹ کر واپس آگیا ہے۔"

"وہ سکندر کے خالو کے گھر کے چکر لگا رہا ہے" — ایک نے کہا — "میں نے دو مرتبہ رات کو اُسے وہاں سے نکلتے دیکھا ہے۔"

"میں جانتا ہوں" — ایک اور نے کہا — "ایوب سکندر کی خالہ کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔"

میں کھانا کھا رہا تھا۔ لوگوں کی باتیں اور ان کا ایک ایک لفظ تیروں کی طرح میرے جسم اور میری رُوح سے پار ہوتا جا رہا تھا۔ میں ہوٹل والے کو جانتا تھا۔ باتیں کرنے والے دو تین آدمیوں کو بھی جانتا تھا۔ لوگوں کی یہ باتیں مجھے برداشت کرنی پڑیں۔ بندوق سے نکلی ہوئی گولی لگ جائے تو برداشت کی جا سکتی ہے، باتوں کے یہ تیر برداشت نہیں ہوتے۔ میری جذباتی اور ذہنی حالت ایسی ہو گئی کہ دل سے ارادہ اُٹھا کہ ریوالور نکال کر ان سب آدمیوں کو ختم کر دوں اور کہوں کہ میں اس شہر میں یہ ثابت کرنے آیا ہوں کہ میں بے غیرت نہیں ہوں، لیکن میں نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ کوئی ایک بھی نہیں تھا جو میرے حق میں بات کرتا۔

دوسری باتیں تو میں نے برداشت کیں لیکن ایوب کا میری خالہ کے گھر

آنا جانا مجھے عجیب سا لگا۔ اگر وہ عذرا کے ساتھ شادی کے خیال سے جاتا تھا تو کوئی برا نہیں تھا اور اگر وہ بُری نیت سے جاتا تھا تو میری برداشت سے باہر تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں ایوب کے گھر چلا جاتا۔ یہ میری غیر معمولی جرأت تھی کہ میں تھانیدار کے ساتھ دو باتیں کرنے کے لئے آ گیا تھا لیکن میں کوئی ایسا جن بھوت بھی نہیں تھا کہ بندے سے بندے کو دھمکیاں دیتا پھرتا اور پکڑا نہ جاتا۔ میں نے ایوب کو ایک کڑوا گھونٹ سمجھ کر حلق سے اُتار لیا۔

"بڑا تھانیدار جا رہا ہے" —— میرے کانوں میں آواز پڑی —— "آج تو پیدل جا رہا ہے۔ یہ تو سائیکل یا گھوڑے پر جایا کرتا تھا۔"

میں نے اُدھر دیکھا۔ سڑک قریب سے ہی گزرتی تھی۔ ایک ہندو تھانیدار اکیلا ہی جا رہا تھا۔ اُس کا گھر ڈیڑھ دو فرلانگ آگے تھا۔ میں نے ابھی تھوڑی سی روٹی کھائی تھی۔ باقی روٹی چھوڑ دی۔ ہوٹل والے کو پیسے دیتے اور وہاں سے ہٹ کر سڑک پہ ہو لیا اور تھانیدار کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ وہ بہت آگے نکل گیا تھا۔ میں تیز نہیں چل رہا تھا کیونکہ میں کُبڑا بنا ہوا تھا اور کُبڑے آدمی اتنا تیز نہیں چل سکتے۔



میں اسی طرح آہستہ آہستہ چلتا تھانیدار کے دروازے پر جا پہنچا۔ دروازے پر دستک دی تو اُس کا ایک آدمی باہر نکلا جو تھانیدار کا نوکر ہو گا یا کانسٹیبل ہو گا جو نوکر کا کام کرتا ہو گا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں تھانیدار صاحب سے ملنے آیا ہوں۔ اُس نے مجھے ڈانٹ دیا کہ وہ ابھی تھانے سے آتے ہیں اور مجھے اگر کوئی کام ہے تو میں صبح انہیں تھانے مل لوں۔

"بھائی میرے!" —— میں نے دیہاتیوں کی سادگی کے انداز میں کہا —— "مجھے اُن کے ساتھ کوئی کام نہیں۔ انہیں میرے ساتھ کام ہو گا۔ تم انہیں یہ کہہ دو کہ وہ آیا ہے۔"

وہ چلا گیا اور تھانیدار آ گیا۔ اتنی دیر میں وہ وردی اُتار کر اپنے کپڑے پہن چکا تھا۔

"کون ہو تم؟" —— اُس نے تھانیداروں جیسے رُعب سے پوچھا —— "کیا لینے آئے ہو؟"

"لالہ جی مہاراج!" —— میں نے پوچھا —— "آپ کا نوکر آیا تو اُس نے ڈانٹ دیا، آپ آتے ہیں تو ڈانٹ رہے ہیں۔ اگر مجھے غریب دیہاتی سمجھ کر دھتکارنا ہی ہے تو اندر نہ بٹھائیں باہر آ کر میری بات سُن لیں۔ میں ملزم نہیں، مشتبہ بھی نہیں اور میں کوئی سفارش لے کر بھی نہیں آیا۔ آپ کے کام سے آیا ہوں۔"

وہ کچھ کہے بغیر مجھے ڈیوڑھی میں لے گیا اور وہاں چارپائی پہ بٹھا دیا۔ پُرانی سی ایک کرسی گھسیٹ کر میرے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا، کہو کیا بات ہے۔

"لالہ جی!" —— میں نے اپنا مصنوعی کُبڑا پن سیدھا کرتے ہوئے کہا —— "میں سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر سکندر ہوں جس کا فوٹو آپ کے تھانے میں بھی پہنچ چکا ہے۔"

یہ ہندو تھانیدار ایسا بدکا جیسے اُس کی کُرسی کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ کُرسی کے بازوؤں پر مارے۔

"آرام سے بیٹھے رہو لالہ!" —— میں نے کہا —— "میری دلیری کی تعریف کرو کہ میں آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ یہ تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں بہروپ میں آیا ہوں اور شاید آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ میں اکیلا نہیں آیا ہوں لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں ہو گا کہ سکندر کیا چیز ہے اور کیا کر سکتا ہے۔"

"تم آئے کیوں ہو بھائی؟" —— اُس نے ایسے لہجے میں پوچھا جس میں دوستی کا تھوڑا تھوڑا رنگ ملا ہوا تھا۔

"میں واپس چلے جانے کے لئے آیا ہوں" —— میں نے کہا —— "لیکن میں چاہتا ہوں کہ جس طرح میں زندہ و سلامت واپس جاؤں گا اسی طرح میرے بعد آپ بھی زندہ سلامت رہیں..... لالہ جی! میرے سامنے زندگی اور موت کے درمیان سے گزرنے والا کوئی راستہ نہیں۔ میں اب ایک ہی بات جانتا ہوں، زندہ یا مُردہ۔ میں آپ سے کہنے آیا ہوں کہ آپ نے میرے خالو کے سارے خاندان کو پریشان کر رکھا ہے..... کچھ ملا آپ کو؟"

"وہ تو بھائی، حکم ملا ہے۔"

"میں جانتا ہوں لالہ جی!" —— میں نے کہا —— "میں بھی سب انسپکٹر ہوں۔ انگریز بادشاہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ دو قدم اُس طرف ہو جاؤ۔ ہم بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے دس قدم اُدھر ہو جاتے ہیں۔ آپ کو حکم ملا ہے کہ سکندر بھگوڑا اور مفرور ہے اور اس شہر میں اس کے جو رشتہ دار رہتے ہیں اُن پر نظر رکھو کیونکہ ہو سکتا ہے وہ کبھی ادھر آ نکلے۔ آپ نے پردہ دار عورتوں کو بھی تھانے بلانا شروع کر دیا۔ انہیں آپ تھانے بٹھاتے رکھتے ہیں۔ راتوں کو جا کر اُن کے گھر چھاپے مارتے ہیں۔"

"سکندر بھائی!" —— تھانیدار نے کہا —— "حکم ہی ایسا ملا ہے۔"

"حکم تو جیسا ملا ہے وہ میں جانتا ہوں" —— میں نے کہا —— "لیکن آپ انہیں حکم سے بڑھ کر اس لئے پریشان کر رہے ہیں کہ آپ ہندو ہیں اور آپ کو ایک مسلمان گھرانے کو پریشان کرنے کا موقع مل گیا ہے۔"

"نہیں سکندر بھائی!" —— اس نے کہا —— "میری مجبوری ...."

"جناب سب انسپکٹر صاحب!" —— میں نے اُس کی بات کاٹ کر ایک اور لہجے میں کہا —— "میں آپ کی مجبوریاں سُننے نہیں آیا۔ میں آپ کو یہ کہنے آیا ہوں کہ آج کے بعد نہ آپ اس گھر پر چھاپہ مارنے جائیں گے نہ اس گھر کے کسی فرد کو تھانے بلائیں گے۔"

"سکندر بھائی!"

"لالہ جی!" —— میں نے اُسے بولنے کی مہلت نہ دیتے ہوئے کہا —— "میں کہنے آیا ہوں، سُننے نہیں آیا۔ آپ تھانیدار ہیں۔ میں جانتا ہوں آپ یہ رپورٹ لکھ کر اُوپر بھیج سکتے ہیں کہ آپ نے ہر جائز اور ناجائز کوشش کر دیکھی ہے اور پوری تفتیش بھی کی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سکندر کا اپنے خالو خالہ وغیرہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، نہ یہ لوگ اُسے پناہ دینے پر آمادہ ہیں ... جس روز مجھے پتہ چلا کہ آپ نے میری بات کے خلاف عمل کیا ہے اُس روز یا اس سے اگلے روز آپ کے گھر کا کوئی بڑا ہی پیارا فرد ضائع ہو جائے گا۔ میں نے آپ کو آج زندہ رہنے کا موقع دیا ہے، آپ پورے دس منٹ اندھیرے میں میرے

ریوالور کی شُست میں رہے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اُوپر کے حکم کی پابندی کر رہے ہیں۔ صرف اس شہر میں ہی نہیں خود آپ کے تھانے میں میری آنکھیں اور میرے کان موجود ہیں۔"

میں اُٹھ کھڑا ہُوا اور اُسے کہا کہ میرے پیچھے آنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ یا اُس کا کوئی بھی آدمی میرے تعاقب میں آیا تو وہ زندہ اپنے گھر نہیں پہنچ سکے گا۔

میں نے ہاتھ آگے کیا۔ اُس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور میں وہاں سے نکل آیا۔ میں اُس کے چہرے پر خوفزدگی کے بڑے صاف آثار دیکھ رہا تھا۔ یہ نہیں کہ میں نے اُسے دھمکیاں دی تھیں یا وہ میرے الفاظ سے ڈر گیا تھا۔ وہ ڈرا اس انداز سے تھا جس سے میں نے یہ باتیں کی تھیں۔

۶

میں نے گلی کی نکڑ پر پہنچ کر پیچھے دیکھا۔ گلی خالی تھی۔ تھانیدار کے گھر سے کوئی بھی نکلتا ہُوا نظر نہ آیا۔ میں گلی کا موڑ گھوم کر تیز قدم چل پڑا۔ ان گلیوں سے میں واقف تھا۔ میں بڑی تیز تیز چلتا اُس چوڑی گلی میں پہنچ گیا جس نے مجھے شہر سے نکال دینا تھا۔ دُور کھمبے کے ساتھ ایک آدمی کھڑا نظر آیا۔ کھمبے کا بلب روشن تھا۔ میں فوراً اُکھڑا ہو گیا۔ پیچھے دیکھا۔ میرے تعاقب میں کوئی بھی نہیں آ رہا تھا۔

میں مصنوعی چال چلتا اس آدمی کے قریب پہنچ گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا تو مجھے دھچکا سا لگا —— وہ ایوب تھا۔ وہی ایوب جو سب انسپکٹر ہو گیا تھا اور جس نے مجھے حمید اللہ کے ہاتھوں مروانے کی بڑی گہری چال چلی اور اپنی تھانیداری سے ناجائز فائدہ اُٹھایا تھا۔ اسی جُرم میں اُسے دو سال سزائے قید ملی تھی جو وہ کاٹ کر واپس آ گیا تھا۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ اسے ملوں یا سیدھا نکل جاؤں لیکن مجھے نانبائی کی ہوٹل نما دکان پر لوگوں کی باتوں سے معلوم ہُوا تھا کہ یہ عذرا کی خاطر میری خالہ کے گھر جاتا ہے۔

میں اُس کے قریب جا کر رُک گیا۔ بدلی ہوئی آواز میں میں نے السّلام علیکم کہی اور اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

"آ گئے ایوب!" ــــ میں نے کہا ــــ "چلو اچھا ہُوا۔ اللہ کی طرف سے آئی ہُوئی یہ مشکل بھی کٹ گئی .... اب کیا ارادے ہیں؟"

"ابھی کچھ سوچا نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"تم نہیں پہچانو گے" ــــ میں نے کہا ــــ "میں کبھی کبھی یہاں آتا ہوں۔ اللہ خوش رکھے منشی مراتب علی کو .... میرے بڑے گہرے دوست تھے۔ تمہارے لئے بہت پریشان رہے ہیں۔"

"باپ کو اولاد کے لئے پریشان ہونا ہی پڑتا ہے" ــــ ایوب نے کہا۔

"اب اُن کی خدمت کرو" ــــ میں نے کہا ــــ "میں اُدھر جا رہا ہوں۔ تھوڑی دُور تک میرے ساتھ چلو گے؟"

وہ مجھے اپنے باپ کا دوست سمجھ کر میرے ساتھ چل پڑا۔ میں اُس کے ساتھ ایسی ہی پیار محبت اور اپنائیت کی باتیں کرتا رہا اور ہم گلی سے نکل گئے۔ آگے غیر آباد جگہ آ گئی۔ میں نے شہر کے ریلوے سٹیشن سے گاڑی میں سوار نہیں ہونا تھا۔ خطرہ تھا۔ تین ساڑھے تین میل آگے چھوٹا سا ایک سٹیشن تھا۔ میں نے وہاں سے گاڑی پکڑنی تھی۔

گلی سے نکل کر میں رُک گیا اور سیدھا ہو گیا۔ اب میں کُبڑا نہیں تھا۔

"ایوب بھائی!" ــــ میں نے اپنی آواز میں کہا ــــ "تم نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔ میں سکندر ہوں۔"

"سکندر؟" ــــ اُس نے ہڑبڑا کر کہا ــــ "تم؟ .... تم؟ ...."

"وہی سکندر جسے تم نے حمید اللہ سے مروانے کی کوشش کی تھی اور اپنی تھانیداری گنوا بیٹھے" ــــ میں نے کہا ــــ "تھانیداری ہی نہیں تمہاری شہرت اور عزّت بھی نہیں رہی۔"

"تم کہاں ہو؟" ــــ اُس نے پوچھا ــــ "کیا واقعی تم نے ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کیا ہے؟"

"تم نے جو سُنا ہے ٹھیک سُنا ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "میں جلدی میں ہوں۔ اچھا ہُوا تم مل گئے ہو۔ میری دو باتیں سُن لو۔"

میں نے بتایا کہ میں یہاں کیوں آیا تھا اور کیا کر چلا ہوں۔

"یہ تم نے کمال کر دکھایا ہے" ــــ ایوب نے کہا۔

"میرے خالو اور خالہ اور عذرا کو بتا دینا" ــــ میں نے کہا ــــ "انہیں کہنا کہ تمہاری عزّت کی خاطر میں نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا تھا۔ اب تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا .... اور ایوب! تم سُن لو۔ اگر تم عذرا سے شادی کرنے کے ارادے سے میری خالہ کے گھر جاتے ہو تو شادی کر لو۔ اگر انہیں دھوکا دینے کی کوشش میں ہو تو سوچ لو کہ تمہاری ماں اور باپ تمہاری موت کا غم برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

"غم نہ کر یار!" ــــ ایوب نے کہا ــــ "لیکن عذرا تو تمہاری منگیتر ہے۔"

"میں اپنی منگیتر تمہارے سپُرد کرتا ہوں" ــــ میں نے کہا ــــ "لیکن اس گھر کا داماد بننا، اس گھر کا چور نہ بننا۔"

اچانک ایوب میرے ساتھ لپٹ گیا۔ وہ مجھے چھوڑ نہیں رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سِسک سِسک کر رو رہا تھا۔

جب اُس نے مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے سے نکالا تو میں کچھ اور کہے بغیر وہاں سے چل پڑا۔

"سکندر!" ــــ اندھیرے میں اُس کی آواز سنائی دی ــــ "زندہ رہے تو ملیں گے۔"

میرے سامنے ساڑھے تین میل کی پیدل مسافت تھی۔ میں بہت تیز چل پڑا۔

انسان کیا سوچتا ہے کیا ہو جاتا ہے۔ میں خوش تھا کہ اپنی خالہ، عذرا اور اُن کے گھر کی عزت کو محفوظ کر چلا ہوں۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے یہ مہم سر کر لوں گا۔ یہ خطرہ بھی نظر آ رہا تھا کہ تھانیدار زندہ تھا جو اپنی بے عزتی کا انتقام لے سکتا تھا۔ میں نے اُسے دھمکیاں تو بہت دی تھیں لیکن مجھے ایسی توقع نہیں رکھنی چاہیئے تھی کہ وہ بالکل دبک جائے گا پھر بھی مجھے اطمینان سا تھا کہ میرا وار خالی نہیں گیا۔

پھر ایوب میرے ذہن پر سوار ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ اس شخص پر مجھے اعتبار کرنا چاہیے یا نہیں۔ اُس کے آنسو یاد آتے تو دل نے کہا کہ ایوب اپنے کئے پر نادم ہے مگر میں نے پولیس کے سوچنے کے انداز کے مطابق یہ شک ذہن سے نکالا نہیں کہ وہ انتقامی طور پر مجھے پکڑوا دے گا۔ میں نے اُسے بتایا نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔

مجھے بہر حال اس شہر سے بہت جلد نکل جانا تھا بلکہ صبح تک شہر سے دُور چلے جانا بہت ضروری تھا۔ میرا تعاقب ہو سکتا تھا۔

میرے نیچے کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ جھاڑیاں تھیں۔ اُونچی گھاس تھی اور درخت تھے۔ کوئی قدم پتھر پر جا پڑتا اور کوئی قدم چھوٹے سے گڑھے میں چلا جاتا۔ کبھی کسی درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ پر پاؤں آجاتا اور اس طرح جو کچھ میرے قدموں تلے آتا اُسے میں روندتا جا رہا تھا۔

میں نے شاید محسوس کیا تھا، یاد نہیں، کہ میرا پاؤں کسی نرم سی چیز پر پڑا تھا۔ بڑی زور کی شُوں کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی ایسے لگا جیسے کسی نے میرے ٹخنے میں بڑی زور سے خنجر مارا ہو۔ چونکہ اس سے پہلے میں نے شُوں جیسی آواز سُنی تھی اس لئے میں فوراً سمجھ گیا کہ سانپ نے ڈس لیا ہے۔ میرا پاؤں اس سانپ پر آگیا تھا۔ میں نے گھاس میں اُس کے رینگنے کی سرسراہٹ سُنی۔ کوئی شک نہ رہا

کہ یہ سانپ ہے جو مجھے ڈس کر جا رہا ہے۔ رات کا وقت تھا۔ چاندنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہوتی بھی تو درختوں کے سائے اور گھاس کی وجہ سے میں سانپ کو نہ دیکھ سکتا۔ میں نے اپنے سارے جسم میں ایک لہر سی یا برقی رَو سی بڑی تیزی سے پھرتی محسوس کی اور اس کے ساتھ ہی میں نے سر میں اتنی گرانی محسوس کی کہ مجھے چکر آ گیا۔

مجھے ٹریننگ میں بتایا گیا تھا کہ جنگل یا صحرا میں راستہ بھول جانے اور بھٹک جانے کی صورت میں کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ جنگل اور صحرا کے متعلق ہدایات مختلف تھیں اور برفانی علاقوں کے متعلق بالکل ہی مختلف۔ اس ٹریننگ میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ سانپ یا بچھو ڈس لے یا گرنے سے زخم آجائے، چوٹ آجائے، کوئی ہڈی ٹوٹ جائے تو کیا کرنا چاہیئے۔

میرے پاس ایک تھیلا تھا جس میں فسٹ ایڈ کا سامان تو نہیں تھا ضرورت کی کچھ چیزیں تھیں۔ مثلاً کپڑوں کا ایک فالتو جوڑا، ایک چاقو، ایک چھوٹی ٹارچ اور ایسی ہی دو تین چیزیں اور تھیں۔ میں نے بڑی تیزی سے تھیلے سے دو چیزیں نکالیں — ٹارچ اور چاقو۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ ٹخنے سے ذرا اُوپر سے خون پھوٹ رہا تھا۔ میں نے رومال سے خون صاف کیا تو چار جگہوں سے خون نکلا۔

اگر سانپ دو دانتوں سے کاٹے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے اس نے زہر نہیں چھوڑا۔ میرے ٹخنے پر چار دانتوں کے نشان تھے۔ دو اُوپر اور دو نیچے والے۔ سانپ جب چاروں دانتوں سے کاٹتا ہے تو اُوپر والے دو دانتوں سے زہر چھوڑتا ہے جو انسان کے خون میں شامل ہو جاتا ہے۔

میں تو زہر کا اثر فوراً محسوس کرنے لگا۔ سانپ کی صرف دہشت ہی انسان کو اَدھ مُوا کر دیتی ہے۔ میں نے دہشت کو قبول نہ کیا۔ چاقو سے اُس جگہ کو جہاں سانپ کے دانت لگے تھے اس طرح کاٹا کہ کراس کا نشان بن گیا۔ دونوں ہاتھوں سے زخم کے اُوپر سے ٹانگ کو دبایا اور دونوں ہاتھ نیچے کو سرکانے لگا۔ میں زخم سے خون نکال رہا تھا کہ زہر اُوپر نہ آجائے۔

ہاتھ زخم تک لے جا کر میں نے رومال کو مروڑا اور زخم سے دو تین انچ اُوپر رومال

کس کر ٹانگ کے گرد باندھ دیا۔ رسّی مل جاتی تو زیادہ بہتر تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں نے زہر کو اُوپر نہیں چڑھنے دیا اور اسے دبا کر نیچے لے آیا ہوں اور رومال سے اُوپر جانے کو روک دیا ہے۔

زخم سے میں نے بہت سا خون نکال دیا تھا لیکن میں اپنے جسم میں جو تلخی اور کمزوری محسوس کر رہا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ زہر اُوپر چلا گیا ہے۔ میں نے اس کی کچھ مقدار زخم کے راستے خارج کر دی ہو گی لیکن اس امید پر پانی پھر گیا کہ سارا زہر خارج ہو گیا تھا۔ کچھ زہر نکال دینے سے یہ امید رکھ سکتا تھا کہ میں فوراً نہیں مروں گا۔

میری موت یقینی تھی۔

۶

میں اُٹھا تو ایسا چکر آیا کہ میرے پاؤں اُکھڑ گئے اور میں ڈول گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آیا اور گزر گیا۔ دماغ ابھی کام کر رہا تھا۔ مجھے ایک خطرہ یہ بھی نظر آنے لگا کہ میں پکڑا جاؤں گا۔ ریلوے سٹیشن تک میرا پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق دو میل سے زیادہ فاصلہ ابھی باقی تھا۔

میں موت سے کبھی نہیں ڈرا تھا۔ میں نے کتنی بار کہا تھا کہ مر جاؤں تو اچھا ہے۔ میرے لئے زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں تھا لیکن موت بازو پھیلائے اپنی طرف آتے دیکھی تو میرے اندر جینے کی خواہش پیدا ہو گئی اور میں موت کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگا۔ کوئی پناہ اور کوئی راہِ فرار نظر نہیں آتی تھی —— اور زہر تیزی سے اپنا کام کر رہا تھا۔

یہ تو میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آگے نہیں جاؤں گا، مگر یہ سوال پریشان کرنے لگا کہ جاؤں کہاں؟ میں اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ وہاں سول ہسپتال تھا اور قریب ہی تھا۔ ایک ہندو اور ایک سکھ ڈاکٹر کے گھروں سے بھی میں واقف تھا۔ میں ایک حکیم کا گھر بھی جانتا تھا لیکن پکڑے جانے کے ڈر سے میں ان میں سے کسی کے ہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میں پولیس کی حراست میں مرنے سے ڈرتا تھا۔

خالہ کا گھر تھا۔ شہناز کا گھر تھا۔ ایوب تھوڑی ہی دیر پہلے ملا تھا۔ وہ مجھے پناہ دے سکتا تھا۔ کسی حکیم یا ڈاکٹر کو گھر بلا سکتا تھا لیکن موت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر بھی میں نے اس احساس کو زندہ رکھا کہ میں ان میں سے کسی کے بھی گھر پکڑا گیا تو پولیس اُسے ایک مفرور قاتل کو پناہ دینے کے جرم میں گرفتار کر لے گی۔

سینے میں ایسی جلن محسوس ہوئی جو شاید پیٹ سے شروع ہوئی اور حلق تک چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی پیاس اتنی شدت سے محسوس ہوئی کہ مُنہ خشک ہو گیا اور میں نے زبان اکڑتی ہوئی محسوس کی۔ میں نے اپنے آپ کو ہوش میں رکھنے کا تہیہ کر لیا اور سوچے بغیر کہ میں کہاں جاؤں گا، شہر کی طرف چل پڑا۔

اپنا گھر یاد آ گیا —— اپنی ماں یاد آ گئی —— اپنا باپ یاد آ گیا۔

میری قسمت اپنے باپ سے بہتر نہ تھی۔ اُسے بھی ایک ناگن نے ڈس لیا تھا۔

بچپن یاد آیا، بے فکری اور بے نیازی کے دن یاد آتے اور ان یادوں کے ساتھ ہی اشکوں کا کارواں چل پڑا۔

وہ پگلی یاد آئی جس نے کہا تھا کہ یہ بچہ آگ میں سے گزر کر اپنی منزل پر پہنچے گا.... وہ پگلی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ منزلوں کے راستوں میں سانپ بھی چھپ کے بیٹھے ہوتے ہیں۔

میں چلنے لگا۔ سوچ آئی کہ اِس آگ سے نکل جاؤں گا؟ .... نہیں .... زہر دماغ تک پہنچنے لگا تھا۔ میں نے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا۔ چلتے ہوئے سینے سے ہُوک سی اُٹھی —— "میرے خدا! یہ کس گناہ کی سزا ہے؟" —— خیال آیا، گناہوں سے پاک تو کوئی بھی نہیں۔ کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو گا —— حمید اللہ خان کی جاگیر پر ایک مزارعہ میرے اور شہناز کے ہاتھوں مرا تھا۔ وہ بے قصور تھا۔ اُس نے تو اپنے آقا کا حکم مانا تھا۔

پھر میں نے ایک انگریز افسر کو قتل کیا تھا لیکن اُسے میں گناہ نہیں سمجھتا تھا۔ ایک غریب کنواری کو اس ہوس کار انگریز سے بچانے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ زندہ نہ رہے۔

ہاں، یاد آ گیا.... ایک گناہ یاد آ گیا جس کا میں ارتکاب نہیں کر سکا تھا پھر بھی میں اتنی سی بھول کو گناہِ کبیرہ سمجھتا تھا کہ اس کا ارادہ میرے ذہن میں آیا تھا

...گلشن آرا یاد آگئی اور وہ رات یاد آگئی جب میں شیطان کے بہکانے میں آگیا تھا... نہیں، مجھے ایسے نہیں کہنا چاہیے۔ یہ میں تھا جو بہک گیا تھا۔ اپنے گناہوں کا ہار شیطان کے گلے میں ڈال دینا کم از کم مجھے تو اچھا نہیں لگتا۔ اگر کوئی مولانا شراب کے دو چار گھونٹ پی کر کہیں کہ میں شیطان کے بہکاوے میں آگیا تھا تو خدا انہیں بخش تو نہیں دے گا۔ دوزخ انہی کے انتظار میں ہے جو شیطان کے بہکانے میں آجاتے ہیں۔

ایک وہ گلشن آرا تھی جس نے نواب کے محل میں مجھے بلایا تھا۔ اُس وقت وہ حرص اور ہوس کا بڑا ہی حسین مجسمہ تھی۔ سراپا گناہ تھی۔ اُس کی نشیلی آنکھوں میں، اُس کے نیم وا ہونٹوں میں اور اُس کے دہکتے ہوئے رخساروں میں زہد شکن اشتعال انگیزی تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو اُس کی بھٹی میں پگھل جانے سے بچا لیا تھا۔

پھر وہ بھی گلشن آرا ہی تھی جو چھوٹے سے ایک گاؤں کے ایک کمرے میں میرے ساتھ تھی۔ وہ گناہوں کی دلدل سے اور حسن وجوانی کی سحر کاریوں سے نکل آئی تھی اور میں حرص و ہوس کا پیکر بن گیا تھا۔ گلشن آرا نے مجھے روکا تھا۔ مجھ پر کچھ اور ہی نشہ طاری تھا۔ میں نے گلشن آرا کی ایک بات بھی نہیں سُنی تھی۔

آپ کو یاد ہوگا میں نے یہ واقعہ آپ کو سنایا ہے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ گلشن آرا اس گناہ سے جو اُس کی نس نس میں رچا بسا تھا اس طرح بھاگے گی کہ اس دُنیا سے ہی اپنے وجود کو اُٹھا لے گی۔ وہ بھاگی تو میں اُس کے پیچھے گیا اور وہ دریا میں کود گئی۔

پھر وہ گلشن دیکھی جو شہناز کے گھر مجھے ملی تھی۔ نہ جانے وہ کون سی دُنیا میں پہنچ گئی تھی۔ اُس نے مجھے پہچان لیا تھا لیکن وہ رات یاد دلا کر اُس نے مجھے شرمسار نہیں کیا تھا۔ شرمسار تو میں ہو ہی گیا تھا۔ اب تو وہ سراپا تقدس تھی۔ میں اُس کے سامنے یوں پگھل گیا تھا جیسے بھٹی میں لوہا پگھل جاتا ہے۔ آج جب میرے جسم میں زہر بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا اور میرے دماغ کی نسوں میں اُترتا جا رہا تھا، میں نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ مجھے گلشن آرا کے گھر پہنچ کر اور سر اُس کے پاؤں میں رکھ کر اور معافی مانگ کر جان دے دینی چاہیے۔

میں نے یہ نہ سوچا کہ پولیس گلشن آرا اور اُس کے خاوند کو بھی مجھے پناہ دینے کے جرم میں گرفتار کر سکتی ہے۔ میں دراصل اب کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ صرف ایک خیال میرے ذہن میں پختہ ہو گیا تھا کہ مجھے اب صرف قبر میں پناہ ملے گی اس لئے میں نے کہیں پناہ ڈھونڈنے کا خیال ذہن سے نکال دیا تھا۔

گلشن اپنے خاوند کے ساتھ جس مکان میں رہتی تھی وہ شہر سے ہٹ کر تھا۔ درمیان میں چند ایک کھیت آتے تھے اور تھوڑی سی جگہ بنجر اور نشیبی تھی۔ یہ احساس ابھی مجھ میں زندہ تھا کہ گلشن کا خاوند ذہنی اور جسمانی لحاظ سے معذور ہے۔ آپ کو یاد ہوگا۔ گلشن آرا کا خاوند درویش سا آدمی تھا جسے لوگوں نے مرادیں پوری کرنے والا پیر بنا رکھا تھا۔ شہناز بھی اُس کے پاس جاتی رہتی تھی۔ اُس نے شہناز کے ساتھ جو باتیں کی تھیں وہ شہناز نے مجھے سُنائی تھیں۔ ان باتوں سے میں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ گلشن آرا کا خاوند پیروں کی طرح نام نہاد برگزیدہ نہیں بلکہ جہاندیدہ اور عقل و دانش والا آدمی ہے۔

وہ جو کچھ بھی تھا، جیسا بھی تھا میں نے اُس سے کیا لینا تھا۔ میں تو گلشن آرا کے قدموں میں جا گرنے کے لئے جا رہا تھا۔



میں جب سڑک پر پہنچا تو ایک لاری شہر سے آتی نظر آئی۔ ابھی دماغ میں کچھ سکت باقی تھی۔ میں سڑک سے پیچھے ہٹ گیا اور ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ لاری گزر گئی تو میں سڑک کے پار چلا گیا۔ اچانک مجھے چکر آیا۔ میں گرنے لگا اور ایسا لڑکھڑایا کہ دو تین قدم اپنے آپ ہی بائیں کو ہو گئے پھر اپنے آپ ہی آگے اور پیچھے ہوئے۔ میں نے سہارا لینے کے لئے ہاتھ پھیلاتے اور ہوا کو پکڑنے کی کوشش کی۔ میں گرا نہیں لیکن میری حالت ایسی ہو گئی کہ میں قدم آگے بڑھاتا تھا تو قدم پیچھے پڑتا تھا۔ مجھے یوں نظر آنے لگا جیسے گلشن آرا تک نہیں پہنچ سکوں گا۔

شاید یہی میری وہ فالتو حس یا قوّت تھی جس کا احساس مجھے خواجہ صاحب نے اور ایک دو اور بزرگوں نے بھی دلایا تھا۔ میں اب اسی قوّت کے بل بوتے پر چل رہا تھا، لیکن اسے چلنا نہ کہیں۔ یوں بھی ہونے لگا کہ پچھلا پاؤں آگے کرنے لگتا تو پاؤں دوسرے پاؤں سے ٹکرا جاتا، پھر ایسے ہُوا کہ میرے پاؤں آپس میں ٹکرائے اور میں گھٹنوں کے بل گِر پڑا لیکن ہاتھ زمین پر لگا کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

فاصلہ ایک میل سے کم تھا۔ میرے نیچے زمین ہموار نہیں تھی اور یہ کوئی باقاعدہ راستہ بھی نہیں تھا۔ زہر دماغ تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے ایک بار دایاں بازو معلوم نہیں کیوں اُوپر کرنا چاہا تو بازو اُوپر ہُوا ہی نہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میرا اعصابی نظام بیکار ہوگیا ہے اور ابھی مزید بیکار ہوگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آتا تھا اور اب یہ کالی سی گھٹا آنکھوں کے آگے سے جلدی نہیں ہٹتی تھی۔ میں دو چار قدم اس تاریکی میں اُٹھاتا تو پھر اجالا سا ہوجاتا اور میں چند قدم ٹھیک اُٹھاتا۔

میرا مُنہ کھُل گیا تھا۔ اس میں تھوک کی نمی ختم ہوچکی تھی۔ جب بھی منہ بند کرنے کی کوشش کی تو ایسے لگا جیسے کسی نے بے شمار کانٹے میرے منہ میں ڈال دیتے ہوں۔ مجھے خیال آیا کہ اب پانی مل بھی گیا تو میں پی نہیں سکوں گا۔

مجھے پیاسا مرنا تھا۔

خدا مجھے بڑی ہی اذیت ناک موت مار رہا تھا۔

میری مردانگی، میری جرأت اور بے خوفی ختم ہوچکی تھی۔ اپنے اُوپر قابو نہیں رہا تھا۔ میں نے بچّوں کی طرح بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ رونے سے کچھ تسکین سی محسوس ہونے لگی۔ انسان سر پر تاج رکھ کر سونے کے تخت پر بیٹھ جاتے اور فرعونوں کی طرح رعایا سے اپنے آگے سجدے کراتے اور اُس کے اشارے پر انسانوں کی گردنیں اُڑ جاتیں اور لوگ اُسے دیکھ کر خوفزدہ ہو کے راستے سے ہٹ جاتیں تو بھی انسانی فطرت میں خدا نے جو کمزوریاں رکھ دی ہیں وہ ایک نہ ایک دن اُسے شیر سے گیدڑ بنا دیتی ہیں اور جس کے اشارے پر رعایا کا خون بہہ جاتا ہے وہ ایک چیونٹی کو بھی مارنے سے ڈرتا ہے۔

میری حالت ایسی ہی ہوگئی تھی۔ خون میں زہر مل چکا تھا جس نے میرے عزم اور

میرے جذبے کو ختم کر ڈالا تھا۔

اب میں آپ کو اس سے آگے کے سفر کا جو حال سُناؤں گا وہ ایسے لگتا ہے جیسے میں نے خواب دیکھا تھا۔ کچھ یاد ہے کچھ ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور کچھ شاید فرض کر کے آپ کو سُنا رہا ہوں... میں ایک بار گرا تو کمزور سا ایک سہارا ملا اور اس کے ساتھ ہی سرسراہٹ اور کھڑکھڑ کی آواز سنائی دی۔ یہ مکئی کی فصل معلوم ہوتی تھی۔ میں اُٹھنے لگا تو پھر گھٹنوں کے بَل گر پڑا۔ اب تو ایسے لگتا تھا جیسے میں اُٹھ نہیں سکوں گا لیکن میں اُٹھا۔ معلوم نہیں میں نے راستہ کس طرح معلوم کر لیا تھا۔ یہ کھیتوں کے درمیان مینڈھیں تھیں جن پر میں جا رہا تھا۔ میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ میں صحیح سمت پر جا رہا ہوں یا میرا رُخ کسی اور ہی طرف ہے۔

اب یہ حال تھا کہ دو یا تین قدم بڑی مشکل سے اُٹھتے تھے اور میں گر پڑتا تھا۔ پھر مجھے یاد نہیں آرہا کہ میں کتنی بار اُٹھا، کتنی بار گِرا، میں شاید پیٹ کے بَل رینگتا بھی تھا اور خواب کی طرح یاد آتا ہے کہ میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بَل بھی چلا تھا۔ پھر اس طرح یاد آتا ہے جیسے میرے نیچے کنکریاں، پتھر اور بڑی سخت زمین تھی۔ جسم میں سُوئیاں چُبھ رہی تھیں۔

میں نے آخری بار جسم کی قوتوں کو یکجا کیا۔ آنکھیں پوری طرح کھولیں اور پاؤں پر چلنے کی کوشش کی۔ میں تو جیسے تیز و تند ہوا میں تیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے ایک مکان نظر آیا۔ اس کا دروازہ بھی دکھائی دینے لگا۔ دروازے کے دائیں اور بائیں کھڑکیاں بھی نظر آنے لگیں۔ یہ گلشن آراء کا گھر تھا۔ مسرّت کی لہر سی آئی لیکن آنکھوں کے آگے ایسی تاریکی آگئی کہ دماغ اس تاریکی کی نذر ہوگیا۔ کچھ ایسے یاد آتا ہے کہ میں دروازے تک پہنچ گیا تھا اور یہ بھی یاد آتا ہے کہ میں نے دروازے پر دستک دینے کے لئے ہاتھ اُٹھایا تھا لیکن ہاتھ اُٹھا نہیں تھا۔ پھر شاید میں کبھی نہ اُٹھنے کے لئے گر پڑا تھا

۶

میری آنکھ کھُلی۔ پہلا خیال یہ آیا کہ میں کہیں سو گیا تھا اور بڑا ہی خوفناک خواب

دکھا ہے۔ ایک لمحے کے لئے یہ خیال آیا اور گزر گیا کہ خواب میں سانپ کاٹے تو نہ جانے اس کی تعبیر کیا ہوتی ہے۔ فوراً ہی خیال آیا کہ یہ خواب نہیں تھا۔ سانپ نے مجھے کاٹا تھا مگر میرا دماغ تو بیکار ہو چکا تھا پھر یہ خیال کیسے آ رہے ہیں اور میں ابھی تک زندہ کیسے ہوں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔

میرے سامنے میرے قریب ہی دُھند میں کوئی انسان جھلملا رہا تھا جیسے کوئی جھیل کے کنارے کھڑا ہوا اور اُس کا عکس پانی میں نظر آ رہا ہو اور پانی میں ہلکی ہلکی لہریں اُٹھ رہی ہوں۔

میں نے آنکھیں بند کر کے پھر کھولیں تو دُھند کچھ صاف ہو گئی تھی اور مجھے یقین ہو گیا کہ میرے سامنے کوئی آدمی کھڑا ہے اور یہ آدمی پولیس کی وردی میں نہیں۔ موت کے بعد مجھے قید کا خوف تھا۔ میں نے آنکھیں ملیں۔ اُٹھنے لگا تو میں نے ایک تو یہ محسوس کیا کہ میں اُٹھ نہیں سکتا پھر یہ چلا کہ میں ایک کمرے میں ہوں اور پلنگ پر لیٹا ہُوا ہوں۔ میرے سامنے جو آدمی کھڑا تھا وہ اب بالکل صاف نظر آنے لگا۔ اُس کی ایک بغل کے نیچے بیساکھی تھی۔ مجھے پریشانی ہونے لگی کہ گلشن آراد کے گھر کی بجائے میں کسی اور گھر میں پہنچ گیا ہوں۔

میں اُس سے پوچھنے لگا کہ وہ کون ہے اور میں کہاں ہوں لیکن میری جو آواز نکلی وہ سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی۔

یہ کوئی معزز شخص لگتا تھا۔ سیاہ داڑھی جو بڑے سلیقے سے تراشی ہوئی تھی اُس کے چہرے پر بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ جوان تو نہیں تھا لیکن بوڑھا بھی نہیں تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں جو چمک دیکھی اور چہرے پر جو جلال سا دیکھا، اس سے میں مرعوب ہو گیا۔ مجھے کچھ ایسا اطمینان ہونے لگا کہ یہ شخص مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔ وہ میرے قریب آ گیا۔ اُس کی ایک ٹانگ میں نہ جانے کیا نقص تھا کہ وہ اس طرح بیساکھی کا سہارا لئے ہوتے تھا۔ وہ میرے قریب آ گیا۔

"ہلنے جُلنے کی کوشش نہ کرو" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "ذرا طاقت بحال ہونے دو .... تم نے شاید پوچھا ہے کہ میں کون ہوں اور یہ کون سی جگہ ہے" ـــــ اُس نے بڑی زور سے آواز دی ـــــ "گلشن! .... گلشن! یہاں آؤ۔"

دوسرے کمرے سے مجھے بڑے تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی جو میرے قریب آ رُکی۔ گلشن کا نام سُن کر ہی میرے جسم میں جان آ گئی تھی، لیکن گلشن کو اپنے اُوپر جھکا ہُوا دیکھا تو مجھے ایسا دھچکا لگا جیسے میں پھر بے ہوش ہو جاؤں گا۔ گلشن پلنگ پر دونوں ہاتھ رکھ کر میرے اُوپر جُھکی ہوئی تھی۔

"کیوں سکندر!" ـــــ گلشن نے میرے بالوں میں اپنی اُنگلیاں پھیرتے ہُوئے کہا ـــــ "کیا ہو گیا تھا؟"

جذبات کا ایسا تند و تیز ریلا آیا کہ میں نے گلشن کا وہ ہاتھ جو میرے سر پر تھا اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے پر رکھ لیا اور میں بے اختیار پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ گلشن میرے پاس بیٹھ گئی اور میرے مُنہ اور سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ اُس کے ہاتھ کے لمس میں اور انداز میں ماں کے پیار کا سُرور تھا۔ میری ماں جب مر گئی تھی تو میں رویا تھا۔ اتنی مدت بعد اُس روز میں رویا تو مجھے یوں قرار آنے لگا جیسے میرے سینے میں بڑا زہریلا غبار رُکا ہُوا تھا جو آنسوؤں کے راستے بہہ گیا ہے۔

"حوصلہ کرو سکندر!" ـــــ مجھے بیساکھی والے آدمی کی آواز سنائی دی ـــــ "میں نے تو سُنا تھا کہ تم بہت دلیر آدمی ہو۔"

میں بغیر پوچھے سمجھ گیا کہ یہ گلشن کا خاوند ہے۔

"مجھے سانپ نے ڈس لیا تھا" ـــــ میں نے کہا۔ اب میری آواز میں کچھ جان آ گئی تھی۔

"میں دیکھ چکا ہوں" ـــــ گلشن کے خاوند نے کہا ـــــ "یہ معجزہ ہے کہ تم یہاں آ گئے تھے اور میں نے تمہارا زخم دیکھ لیا تھا۔ اگر تم نے زخم سے کچھ اُوپر رومال نہ باندھا ہوتا تو میں اسے عام سی قسم کا زخم سمجھتا۔ تمہارے چہرے اور جسم کا رنگ دیکھ کر بھی مجھے یقین ہو گیا کہ تمہیں سانپ نے کاٹا ہے۔"

"میں یہاں تک پہنچا کیسے تھا شاہ صاحب؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "میں تو راستے میں بے ہوش ہو کر پڑا تھا۔"

"ہم ابھی جاگ رہے تھے" ـــــ شاہ صاحب نے جواب دیا ـــــ "ایسے آواز آئی جیسے دروازے کے ساتھ کوئی جانور یا آدمی ٹکرایا ہو۔ میں باہر نکلا تو ایک

آدمی کو دروازے میں اوندھے مُنہ پڑے دیکھا۔"

"ہاں، مجھے یاد آرہا ہے" — میں نے کہا — "میں آپ کے گھر تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے دروازے پر ہاتھ مارنے کے لئے ہاتھ اُٹھایا تھا لیکن بازو اُوپر اُٹھتا ہی نہیں تھا پھر ایسے ہُوا ہوگا کہ میں پیچھے یا دائیں بائیں گرنے کی بجائے آگے کو گرا اور دروازے کے ساتھ ٹکرا گیا ہوں گا۔"

"میں تو تمہیں جانتا ہی نہیں تھا" — شاہ صاحب نے کہا — "میں تمہیں کوئی اجنبی سمجھ کر اندر اُٹھا لانا ہی چاہتا تھا لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ میری ایک ٹانگ جسم کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ میں نے گلشن کو بلایا۔ لالٹین کی روشنی میں تمہیں دیکھ کر گلشن نے کہا کہ یہ تو سکندر ہے۔ گھر میں شہر کی دو عورتیں آئی بیٹھی تھیں۔ اُنہیں بھی بلا لیا۔ ان تینوں نے تمہیں اُٹھا کر پلنگ پر ڈالا ... تم یہاں کیوں آئے تھے؟ کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں سانپ کے ڈسے ہوئے کا علاج کر سکتا ہوں؟"

"نہیں شاہ صاحب!" — میں نے جواب دیا — "میں اس مقصد کے لئے نہیں آیا تھا ... میں خود نہیں سمجھتا کہ میں ادھر کیوں آگیا تھا ... اور جاتا بھی کہاں!"

"اپنی خالہ کے گھر تم کیوں نہیں گئے؟" — گلشن آرا نے پوچھا۔

"نہیں گلشن آپا!" — میں نے کہا — "میں وہاں نہیں جا سکتا" — میں چونک پڑا اور پوچھا — "وہ دو عورتیں کون تھیں جنہوں نے مجھے اٹھایا تھا؟ کیا وہ مجھے جانتی تھیں؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی" — گلشن نے جواب دیا — "اُنہوں نے تمہارا نام تو لیا نہیں تھا۔ شاہ صاحب نے انہیں اس کمرے میں زیادہ رُکنے بھی نہیں دیا تھا۔"

"وقت کیا ہوگا؟"

"دن کے گیارہ بجنے والے ہیں" — شاہ صاحب نے جواب دیا۔

"پھر مجھے بیہوش ہُوئے زیادہ وقت نہیں گزرا" — میں نے کہا — "رات شاید یہی وقت ہوگا جب سانپ نے مجھے کاٹا تھا۔"

شاہ صاحب ہنس پڑے اور بولے — "تم کل پورا دن پوری رات اور

آج اس وقت تک بیہوش رہے ہو۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تم زندہ رہو گے لیکن تمہاری ابھی زندگی لکھی تھی اس لئے میری دوائی کام کر گئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سانپ اتنا زیادہ زہریلا نہیں تھا۔ دیسی دوائیوں اور جڑی بُوٹیوں میں بہت اثر ہے۔ ایک سنیاسی کی میں نے کبھی بہت خدمت کی تھی۔ اُس نے مجھے تین چار جڑی بُوٹیوں کے نام بتائے تھے۔ ان میں دو ایسی ہیں جو یہاں کم و بیش ایک سو میل کے علاقے میں کہیں بھی نہیں ملتیں۔ صرف ایک جگہ ہے جہاں بڑی تلاش کے بعد ملتی ہیں۔ اگر تم فوراً میرے پاس پہنچ جاتے تو میں تمہیں اتنی دیر بے ہوش نہ رہنے دیتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس حالت میں بھی یہ دوائی کام کر گئی ... کیا اب تمہیں چکر تو محسوس نہیں ہوتے؟"

میں اب چکر محسوس نہیں کر رہا تھا بلکہ سر میں ذرا سی بھی گرانی نہیں تھی۔ دماغ سوچنے کے قابل ہو گیا تھا۔ ذہن بالکل صاف تھا البتہ جسمانی کمزوری اتنی تھی کہ میں اُٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے شاہ صاحب کو بتایا تو اُنہوں نے کہا کہ وہ مجھے شام تک اُٹھ کر بیٹھنے کے قابل بنا دیں گے اور اگلے روز میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔

۶

اسے اتفاق کہیں، معجزہ کہیں کہ میں گلشن سے اپنے گناہ بخشوانے اِدھر آ گیا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ شاہ صاحب سانپ کے ڈسے کا علاج اس طرح کرتے ہیں کہ مُردے میں جان ڈال دیتے ہیں۔ خدا کا یہ اشارہ میرے لئے بہت قیمتی تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ خدا مجھے کوئی بہت بڑا کام کرنے کے لئے زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ یہ خیال بھی آیا کہ خدا نے مجھے مزید امتحان میں ڈالنے کے لئے زندہ رکھا ہے۔

گلشن اپنے خاوند کے ساتھ میرے پاس بیٹھ گئی۔ وہ دُودھ لے آئی تھی جو چمچ سے وہ میرے مُنہ میں ڈالتی جا رہی تھی۔ سانپ کے ڈسنے کے بعد یہ پہلی غذا تھی جو میرے جسم میں جا رہی تھی۔ میں نے سُنا تھا کہ گلشن کا خاوند گھوڑے سے گر کر ذہنی طور پر مفلوج ہو گیا تھا اور ایک ٹانگ بھی ہڈی ٹوٹ جانے سے بیکار ہو گئی

تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ ڈیڑھ دو مہینے گزرے شاہ صاحب کی ذہنی معذوری ختم ہوگئی ہے البتہ ٹانگ نے جتنا ٹھیک ہونا تھا اتنا ٹھیک ہوگئی تھی، لیکن جسم کا بوجھ نہیں سہار سکتی تھی۔

"اب اپنے متعلق کچھ بتاؤ سکندر!" — شاہ صاحب نے کہا — "مجھے معلوم ہے کہ تم مفرور ہو۔"

"پہلے آپ مجھے ایک بات بتائیں" — میں نے پوچھا — "میں پرسوں سے یہاں ہوں۔ کیا آپ نے میری خالہ کو اطلاع نہیں دی؟"

"نہیں" — شاہ صاحب نے کہا — "میں جانتا تھا کہ تم مفرور ہو۔ سارا شہر جانتا ہے۔ یہ معلوم کئے بغیر کہ تم یہاں کیسے آئے تھے، میں کسی کو بھی تمہاری موجودگی کی اطلاع دینے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔"

یہ سُن کر مجھے اطمینان ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی میں شاہ صاحب کی دانشمندی کا قائل ہوگیا۔ میں نے انہیں پوری تفصیل سے بتادیا کہ میں یہاں کیوں آیا تھا اور کیا کر کے جا رہا ہوں۔

"ہاں سکندر!" — شاہ صاحب نے کہا — "اگر تم یہ کام کر چلے ہو تو بہت بڑا کام کر چلے ہو۔ تمہاری خالہ اپنی بیٹی کے ساتھ اور کبھی اکیلی یہاں آتی رہی ہے۔ بے چاری اب بھی کبھی آتی ہے اور رو رو کر کہتی ہے کہ میں کوئی ایسا تعویذ یا کوئی ٹونہ کروں جس کے اثر سے پولیس انہیں تنگ کرنا چھوڑ دے۔"

"پھر آپ نے اُن کے لئے کیا کیا شاہ صاحب!" — میں نے پوچھا — "آپ کے ہاتھ میں تو سُنا ہے کرامات ہیں۔"

"میں دعا کے سوا اور کیا کرسکتا تھا سکندر!" — شاہ صاحب نے کہا اور ذرا ہنس کر بولے — "معلوم نہیں لوگوں نے مجھے کرامات والا پیر کیوں بنا لیا ہے۔ میں تو اپنی ذات کے لئے اللہ اللہ کرنے والا درویش ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا کے ساتھ شاہ صاحب کا بڑا قریبی تعلق ہے جو عام لوگوں کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ شاید میری دعاؤں میں اثر ہے۔ جس کسی کے لئے بھی دعا کرتا ہوں جذبات میں ڈوب کر اور خدا کے حضور آنسو بہا کر کرتا ہوں .... لوگ بے چارے سہارے تلاش کرتے

پھرتے ہیں۔ اگر میں لوگوں کی عقیدت مندی کو دیکھ کر پیری مریدی کا چکر چلا دوں تو یہاں لوگوں کے پیسوں سے محل کھڑا کر لوں لیکن میں پیر نہیں۔ میں تو اللہ کے حبیبؐ کا مرید ہوں۔ مجھے اگر اللہ نے کوئی کرامت دی ہے تو وہ عشقِ رسولؐ کے صدقے دی ہے۔"

"شاہ صاحب!" — میں نے کہا — "کچھ تو آپ کے ہاتھ میں ہے جس پر لوگ کھچے ہوئے آپ کے پاس چلے آتے ہیں۔"

"یہی کچھ ہے جو میں نے تمہیں بتا دیا ہے" — شاہ صاحب نے کہا — "یا یہ ہے کہ دل و دماغ کو دنیاوی آلائشوں سے پاک رکھتا ہوں۔ دماغ کو اللہ کی راہ پر چھوڑ رکھا ہے۔ اِدھر اُدھر بھٹکتا نہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ دماغ وہ بھی سوچ لیتا اور باطن کی آنکھوں کو دکھا دیتا ہے جو لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ تم بھی کبھی آزما دیکھو۔"

"یہ بڑی گہری باتیں ہیں سکندر!" — گلشن نے کہا — "تم نے کیا جرم کیا تھا؟ مفرور کیسے ہوئے ہو؟"

میں نے انہیں بتایا کہ ایک غریب آدمی کی بیٹی کی عزت بچانے کے لئے ایک انگریز افسر کو قتل کیا تھا۔ میں نے ان دونوں کو یہ واقعہ تفصیل سے سنایا پھر یہ بھی سنایا کہ انگریز افسر شہناز کا بھی مطالبہ کرتے تھے اور میں اُسے اپنے ساتھ بھگا کر لے گیا تھا۔

گلشن آراء اور شاہ صاحب شہناز کا نام سُن کر حیران ہوئے کہ وہ کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ شہناز نے ایک نوابزادے کے ساتھ شادی کرلی ہے اور اُس کا نام حمید اللہ خان ہے تو گلشن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

شاہ صاحب کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ گلشن آراء کے ماضی سے واقف ہیں۔ میں نے گلشن کو بتایا کہ وہ گناہگار نواب اپنے ہی ہاتھوں مارا جا چکا ہے اور وہاں انگریز افسر رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔

"اللہ کی راہ سے بھٹکنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے" — گلشن آراء نے

کہا — "بے گناہوں کو گناہوں میں ڈبو دینے والوں کو خدا اتنی لمبی ڈھیل نہیں دیا کرتا۔"

"اب یہ بتاؤ سکندر!" — شاہ صاحب نے پوچھا — "کیا کرنا چاہتے ہو؟ کیا باقی عمر اسی طرح بھاگتے اور چھپتے گزارو گے؟ .... عموماً یوں ہوتا ہے کہ جس طرح تم نے نیک نیتی سے ایک جُرم کا ارتکاب کیا ہے اور فرار ہو گئے ہو اس طرح بعض آدمی جُرم کر بیٹھتے ہیں اور سزا سے فرار اس طرح حاصل کرتے ہیں کہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے جا ملتے ہیں۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ کسی شریف گھر میں تو انہیں پناہ نہیں مل سکتی .... تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

"ڈاکو نہیں بنوں گا شاہ صاحب!" — میں نے کہا — "انگریزوں نے میرے دل میں اپنے خلاف ایسی نفرت بھر دی ہے جو انتقامی جذبے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ آپ نے سُنا ہو گا کہ کچھ گروہ ہیں جو انگریزوں کے خلاف خفیہ کارروائیاں کر رہے ہیں۔ کہیں ریل گاڑی کے نیچے بم رکھتے ہیں۔ کہیں کسی بڑے انگریز افسر کو گولی مار دیتے ہیں۔"

"یعنی تم دہشت گرد بننا چاہتے ہو" — شاہ صاحب نے کہا۔

"جی ہاں" — میں نے کہا — "عجیب بات ہے شاہ صاحب! میں نے دہشت گردوں کے بڑے مضبوط اور خفیہ گروہ پکڑے ہیں اور اب میں خود دہشت گرد بن گیا ہوں لیکن ابھی یہ کام شروع نہیں کیا۔ پہلے تو اپنا گروہ بنانا ہے۔ ہندو خصوصاً بنگالی ہندو اس کام میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ہم الگ گروہ بنائیں گے اور زیادہ تر ہندوؤں اور سکھوں کو اس میں شامل کریں گے۔"

"نقصان اُٹھاؤ گے سکندر!" — شاہ صاحب نے کہا — "ہندو جو اپنے آپ کو انقلابی کہتے ہیں وہ انقلاب لانے میں کامیاب ہو بھی گئے تو اس ملک میں انگریزی راج کی بجائے ہندو راج ہو گا۔ اُن کے ساتھ اگر چند ایک مسلمان ہیں تو انہیں ہندو استعمال کر رہے ہیں۔ کامیابی کی صورت میں اپنے مسلمان ساتھیوں کو اگر جیلوں میں بند نہیں کریں گے تو اُنہیں دھتکار کر الگ کر دیں گے۔"

کم از کم اس بات پر میں شاہ صاحب سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ میں نے اُن سے زیادہ بحث نہ کی کیونکہ وہ موقع اس قسم کے بحث مباحثے کا نہیں تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ میں جلدی صحت یاب ہو جاؤں اور یہاں سے نکل جاؤں۔ میں نے اتنا ضرور محسوس کیا کہ شاہ صاحب بھی انقلابی خیالات کے آدمی ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان اختلاف صرف یہ تھا کہ وہ خالصتاً اسلامی انقلاب کی بات کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہندوستان مسلمانوں کا ملک ہے۔

۵

"میں کب تک ٹھیک ہو جاؤں گا شاہ صاحب؟"

"زہر نے تمہارے جسم کو بہت نقصان پہنچایا ہے" — شاہ صاحب نے کہا — "دوائی نے زہر کا اثر زائل کر دیا ہے۔ جسمانی طاقت کی بحالی میں چار یا پانچ روز لگ جائیں گے۔"

"کچھ اور بھی سوچا آپ نے شاہ صاحب!" — میں نے پوچھا — "میں مفرور قاتل ہوں، میری تصویریں تھانوں میں پہنچی ہوتی ہیں اور مجھے پناہ دینا کتنا بڑا جُرم ہے؟ .... آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں نہیں چاہوں گا کہ میری خاطر آپ کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچے۔ اگر اس گھر میں پولیس داخل ہو گئی تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا۔"

"سکندر!" — شاہ صاحب کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے — "تمہیں زندگی میں نے نہیں دی۔ زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے .... میں اگر پولیس سے ڈرنے والا ہوتا تو تمہیں اپنے دروازے سے اُٹھا کر جب اندر لایا تھا اور گلشن نے تمہارا نام بتایا تھا تو میں تھانے چلا جاتا اور کہتا کہ مفرور ملزم میرے گھر میں ہے .... یہ مسئلہ میرا ہے تمہارا نہیں۔ تمہیں روپوش رکھنا میرا کام ہے۔"

"شاہ صاحب!" — میں نے پوچھا — "آپ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو گئے ہیں؟"

"گلشن نے تمہارے متعلق مجھے کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں کہ میں نے تمہاری زندگی رو رو کر اللہ سے مانگی تھی" — شاہ صاحب نے کہا — "اور گلشن نے مجھے

کہا تھا کہ شاہ صاحب، اگر یہ ممکن ہو تو میری زندگی بھی سکندر کو دے دیں، اس نے اپنی زندگی مجھے دے دی تھی۔"

"شاہ صاحب!" — میں نے کہا — "میں نے آپ کو بتایا ہے کہ اس ہندو تھانیدار کو میں نے کس طرح دھمکیاں دی ہیں اور میں نے آپ کو یہ بھی بتایا کہ آگے ایوب مل گیا تھا جسے آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ابھی ابھی اُس کے متعلق بھی بات ہوتی تھی۔"

"ہاں ہاں" — شاہ صاحب نے کہا — "منشی مراتب علی کا بیٹا جو ابھی ابھی جیل سے نکلا ہے۔"

"میں مان نہیں سکتا شاہ صاحب!" — میں نے کہا — "کہ تھانیدار نے مجھ سے ڈر کر میرا تعاقب نہیں کیا ہوگا .... ایوب پر بھی مجھے بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اُس کی جذباتی حالت تو کچھ اور دیکھی تھی لیکن اُسے میں نے ہی پکڑوایا تھا۔ وہ انتقام لے سکتا ہے .... کیا آپ کسی قابلِ اعتماد آدمی سے معلوم کروا سکتے ہیں کہ تھانیدار میرے متعلق کیا کر رہا ہے اور ایوب کی نیت کیا ہے؟"

"نہیں سکندر!" — شاہ صاحب نے کہا — "یہاں تمہیں پکڑنے کے لئے کوئی نہیں آسکتا۔ اب یہ معلوم کرنا کہ کون کیا کر رہا ہے، بڑی خطرے والی بات ہے۔ مجھے میرا کوئی آدمی دھوکا نہیں دے گا لیکن میں ایسی توقع کسی سے بھی نہیں رکھ سکتا کہ وہ عقلمندی سے جاسوسی کرے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ جب تک تم صحت یاب نہیں ہو جاتے میں تمہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔"



اُس رات تک شاہ صاحب کے کہنے کے مطابق میں اُٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ اگلے روز میں چارپائی سے اُٹھا۔ گلشن آرا کی دلچسپیاں مجھ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ زیادہ تر وقت میرے ساتھ گزارتی تھی۔

"سکندر!" — اگلی رات وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور کہنے لگی — "کیا تم ساری عمر یونہی تنہا رہو گے؟"

"جو اللہ کو منظور ہو گا گلشن!" — میں نے کہا — "کل کیا ہو گا، مجھے کچھ

معلوم نہیں۔"

"تمہارے ساتھ ایک اور زندگی تباہ ہو رہی ہے" — گلشن نے کہا — "تمہاری خالہ زاد عذرا تین چار بار یہاں آتی ہے۔ شاہ صاحب نے تمہیں بتایا ہے کہ ماں بیٹی یہاں آتی رہتی ہیں۔ عذرا میرے پاس آتی ہے اور رو رو کر کہتی ہے کہ میں شاہ صاحب سے کہوں کہ وہ ایسا تعویذ دیں یا ایسی دعا کریں کہ سکندر واپس آ جاتے۔ میں نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے کہ سکندر بھاگا ہُوا قاتل ہے اور وہ سُولی پر کھڑا ہے اور اس کی ساری عمر یونہی گزرے گی اور جس روز وہ پکڑا گیا اُسے سیدھا سُولی پر کھڑا کر دیا جائے گا .... سکندر! عذرا نے یہاں تک کہا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ جنگلوں، بیابانوں اور غاروں میں رہنے کے لئے تیار ہے۔ تم ہی بتاؤ اُسے کیا کہوں۔ کیا یہ ٹھیک رہے گا کہ میں اُسے بلا لوں اور تمہارے ساتھ ملوا دوں؟"

"نہیں گلشن!" — میں نے کہا — "وہ جذباتی لڑکی ہے۔ اُس کے مُنہ سے بات نکل جائے گی کہ میں یہاں ہوں۔ مجھے اپنا ڈر نہیں۔ پکڑ لیں مجھے پھانسی دے دیں۔ مجھے ڈر یہ ہے کہ پولیس تمہیں اور شاہ صاحب کو بھی دھر لے گی۔"

"اُس کی ماں اُس کی شادی ایوب کے ساتھ کرنا چاہتی ہے" — گلشن نے کہا — "لیکن عذرا نہیں مانتی۔ کہتی ہے جب تک سکندر زندہ ہے میں کسی کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔"

"اب آئے تو ایک کام کرنا گلشن!" — میں نے کہا — "اُسے بتا دینا کہ میں یہاں آیا تھا اور میں نے اُس کے لئے یہ پیغام چھوڑا ہے کہ وہ ایوب کو قبول کر لے۔ اُسے یہ بھی بتا دینا کہ سکندر ایوب سے مل کر گیا ہے اور یہ کہہ گیا ہے کہ ایوب اب بالکل بدل گیا ہے۔ وہ اب لوفر اور بدمعاش نہیں رہا۔"

میں تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ مجھے زیادہ تر دودھ اور گھی دیا جاتا تھا۔ شاہ صاحب کے ساتھ ہندوستان کی غلامی، انگریزوں کی فریب کاری اور مسلمانوں کی حالتِ زار کے متعلق باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ میں تو شاہ صاحب کے سامنے طفلِ مکتب تھا۔ اُن سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ کبھی تو اُن کی باتوں سے یہ

ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خود کسی دہشت گرد گروہ کے آدمی ہیں۔ اُن کی باتوں میں فلسفے کا رنگ تو ہوتا تھا لیکن ان کی ہر بات قابلِ عمل بھی ہوتی تھی۔

سات آٹھ دن گزر گئے۔

شاہ صاحب کے ہاں عورتیں بھی آتی تھیں مرد بھی۔ اتنے زیادہ تو نہیں آتے تھے لیکن آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا لوگوں کے قدموں کی چاپ سنتا رہتا تھا۔ کبھی ایسا خیال بھی آجاتا تھا کہ ایک روز قدموں کی چاپ میرے کمرے میں آجائے گی اور یہ پولیس کے قدموں کی چاپ ہو گی گو شاہ صاحب پوری طرح مطمئن نظر آتے تھے لیکن میں پولیس کا آدمی تھا۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

آخر وہ ہو گیا۔

دروازے پر دستک میں نے بھی سنی تھی۔ میں نے دروازہ کھلنے کی آواز بھی سنی۔ ڈیوڑھی میں کسی کی باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔

"یہاں کوئی مفرور ملزم نہیں ہے" —— یہ شاہ صاحب کی آواز تھی جو خاصی بلند تھی۔

میں سمجھ گیا کہ کسی طرح مخبری ہو گئی ہے اور شاہ صاحب نے یہ الفاظ اس لئے اونچی آواز میں کہے ہیں کہ میں سن لوں اور کسی راستے سے نکل جاؤں۔ اس وقت تک میں مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا اور جسم میں وہی طاقت آگئی تھی جو ہوا کرتی تھی۔ میں جس کمرے میں تھا اُس کا کوئی دروازہ باہر کی طرف نہیں کھلتا تھا۔ یہ اندرونی کمرہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شاہ صاحب پولیس کو ڈیوڑھی میں تھوڑی دیر روکے رکھیں گے۔ میں وہ دھمکیاں سن رہا تھا جو شاہ صاحب کو دی جا رہی تھیں۔ وہ اُس ہندو تھانیدار کے سوا اور کون ہو سکتا تھا جسے میں نے دھمکیاں دی تھیں۔

"شاہ صاحب" —— تھانیدار کہہ رہا تھا —— "آپ قابلِ عزت انسان ہیں۔ میں آپ کی عزت کرنا چاہتا ہوں۔ میری ڈیوٹی میں دخل نہ دیں۔ میں جانتا ہوں ملزم یہیں ہے۔"

میں سمجھ گیا شاہ صاحب میرے نکلنے کا موقع پیدا کر رہے ہیں۔ مجھے اب زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں اب پہلے والی جسمانی حالت میں آچکا تھا۔ میں اس کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اُس کمرے سے صحن میں آگیا۔ اس مکان سے میں اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ رات کو میں چھت پر بھی چلا جاتا تھا اور میں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ کبھی یہیں سے بھاگنا پڑا تو میں کس راستے سے نکلوں گا۔

اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں اس کمرے کے قریب تھیں۔ گلشن وہیں کھڑی تھی۔ اُس نے مجھے کہا کہ اُوپر چلے جاؤ اور پچھواڑے سے کود جاؤ۔ وہ مجھے یہ راستہ نہ بتاتی تو بھی میں اسی راستے جا رہا تھا۔ گلشن نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے اُسے خدا حافظ کہا اور سیڑھیاں چڑھ گیا۔ مکان کے پچھواڑے کھیت تھے۔ میں منڈیر سے لٹکا اور کود گیا۔ کھیتوں میں فصل اونچی تھی۔ میں نے اُٹھ کر دو کھیتوں کے درمیان مینڈھ پر چلے جانا اور غائب ہو جانا تھا۔

میں کودا تو میری پوزیشن بیٹھنے والی ہو گئی۔ میں اُٹھا اور ابھی مڑا ہی تھا کہ دائیں اور بائیں سے دو رائفلوں کی نالیاں میرے پہلوؤں سے لگ گئیں۔

"خبردار!" —— ایک نے کہا —— "ہلنا مت"۔

یہ دونوں کانسٹیبل تھے۔ اُنہوں نے تھانیدار کو پکارا۔ میں نے بیک وقت دونوں رائفلوں کے اُوپر اتنی زور سے ہاتھ مارے کہ دونوں رائفلیں نیچے ہو گئیں اور دونوں کانسٹیبل اس جھٹکے سے ایک دوسرے کے قریب اور میرے سامنے ہو گئے۔ میں نے دونوں کی گردنوں پر ہاتھ رکھے اور انہیں زور سے نیچے کو جھٹکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دونوں رائفلوں پر پاؤں رکھ دیئے۔ اگر مجھے پکڑنے والے یہی دونوں ہوتے تو میں ان سے رائفلیں چھین کر نکل جاتا لیکن پیچھے سے دو بازوؤں نے مجھے کمر سے جکڑ لیا۔ یہ کوئی طاقت والا کانسٹیبل تھا۔ اُس نے مجھے اُٹھا ہی لیا اور اتنی زور سے ایک طرف کو پھینکا کہ میں دیوار کے ساتھ ٹکرا گیا۔

اتنے میں تھانیدار بھی آگیا اور میں ایک سب انسپکٹر، ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چھ پولیس کانسٹیبلوں کے نرغے میں تھا۔ جن کانسٹیبلوں کو میں نے دبا لیا تھا اُن

ہیں سے ایک نے مجھے گالی دی۔ ہندو تھانیدار نے اُسی قسم کی گالی اُسے دے کر چُپ کرا دیا۔

”آؤ سکندر بھائی!“ — تھانیدار نے ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا — ”یہ جانگلی ہیں۔ اچھے بُرے کی تمیز نہیں کرتے۔“

”لالہ بشمبر داس!“ — میں نے اس ہندو سب انسپکٹر سے کہا — ”سب کو بتا دے، کسی نے میرے ساتھ ذرا سی بھی بدکلامی یا بدتمیزی کی تو اُس کی خیریت نہیں۔ پھانسی تو مجھے چڑھنا ہی ہے۔ ایک دو اور کو مار دیا تو کیا فرق پڑ جائے گا۔“

”میرے ساتھ آ بھائی میرے!“ — سب انسپکٹر بشمبر داس نے میرا ہاتھ اس طرح پکڑا جیسے ملایا جاتا ہے اور دوستانہ بے تکلفی سے بولا — ”تم میرے ملزم نہیں ہو۔ میں نے تم سے کون سا اقبال جرم کرانا ہے۔ میرے لئے تم چھوٹے بھائی ہو۔ میں یہ نہیں بھولوں گا کہ تم بھی سب انسپکٹر ہو۔“

میں اُس کے ساتھ چل پڑا اور آہستہ سے اُسے کہا کہ مجھے ذرا اندر لے چلے۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ اُس نے میری عزت کی ہے تو میں اُس کی عزت کی خاطر بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔

”لالہ جی!“ — ہیڈ کانسٹیبل ہتھکڑی لے کر آ گیا اور تھانیدار سے پوچھنے لگا — ”ہتھکڑی لگا لوں؟“

”رہنے دو“ — تھانیدار نے کہا — ”کوئی ضرورت نہیں۔“

پچھواڑے سے گھوم کر ہم اندر چلے گئے۔ شاہ صاحب نے ہمیں اپنے خاص کمرے میں بٹھایا۔ صرف تھانیدار اندر آیا۔ اُس کے باقی تمام آدمی باہر کھڑے رہے۔

”لالہ بشمبر داس!“ — میں نے کہا — ”آپ شاہ صاحب کو بھی اس جُرم میں تھانے لے جائیں گے کہ میں اُن کے گھر سے پکڑا گیا ہوں؟“

”تم خود جانتے ہو“ — اُس نے کہا — ”یہ تو مجھے کرنا ہی پڑے گا۔“

”آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں“ — میں نے کہا — ”اور آپ اُس سے زیادہ کریں گے جو آپ کے اختیار میں ہے۔ میں نے آپ کے گھر جا کر آپ کو دھمکیاں دی تھیں۔ اس کا آپ انتقام تو ضرور لیں گے۔“

”تم نے بڑی گھٹیا بات کی ہے سکندر!“ — تھانیدار نے کہا — ”تم اگر اشتہاری ڈاکو ہوتے تو تمہارے ساتھ میرا رویہ کچھ اور ہوتا۔ تم نے مجھے دھمکیاں دے کر یہ بھی بتا دیا تھا کہ تمہارا جُرم کیا ہے اور تم نے یہ جُرم کیوں کیا ہے۔ میں تمہیں عزت اور غیرت والا آدمی سمجھتا ہوں لیکن میری مجبوریوں کو تم بڑی اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ میں کیا بتاؤں گا کہ میں نے تمہیں کہاں سے گرفتار کیا ہے؟“

”لالہ جی!“ — میں نے کہا — ”یہ کوئی مشکل کام تو نہیں۔ آپ رپورٹ میں یہ لکھ سکتے ہیں کہ آپ کو مُخبر نے یہ اطلاع دی تھی کہ اُس نے مجھے بازار سے گزرتے دیکھا ہے۔ اس رپورٹ پر آپ گارد لے کر میرے تعاقب میں آئے اور یہاں آ کر مجھے پکڑ لیا... میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔ میں ملزم ہوں اور پکڑا گیا ہوں۔ شاہ صاحب کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ آپ انہیں نہیں جانتے۔“

”میں کیسے نہیں جانتا!“ — بشمبر داس نے کہا — ”تم بُرا نہ منانا۔ اپنے پیروں کو تم جانتے ہو۔ بدمعاش ان کے ہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ میں اپنے علاقے کے ان تمام پیروں سے واقف ہوں۔ شاہ صاحب کے متعلق بھی میں جانتا ہوں۔ ان کے متعلق مجھے اچھی طرح پتہ ہے کہ یہ اُس قسم کے پیر نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم پہلے مشکوک آدمی ہو جو اس گھر میں آئے ہو، لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں انہیں چھوڑ کیسے دوں... ایک بات بتاؤ سکندر! تم سات آٹھ روز پہلے میرے پاس آتے تھے۔ میں خوش تھا کہ تم چلے گئے ہو اور میرے علاقے میں نہیں ہو۔ اب پھر کیا لینے آ گئے تھے؟“

”بشمبر داس جی!“ — میں نے کہا — ”میں گیا ہی نہیں تھا۔ میں آپ کو یہی بات سنانا چاہتا ہوں۔ یہ سُن کر آپ محسوس کریں گے کہ شاہ صاحب نے مجھے کس طرح پناہ دی تھی اور کس طرح میں نے یہاں نئی زندگی پائی۔“

میں نے سب انسپکٹر بشمبر داس کو سانپ کے کاٹنے سے لے کر شاہ صاحب

کے گھر پہنچنے تک کی ساری داستان سنادی۔

"شاہ صاحب!" ـــ بشمبر داس نے اُن سے پوچھا ـــ "کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ سکندر مفرور ملزم ہے؟"

"جی ہاں" ـــ شاہ صاحب نے بالکل سچ بولتے ہوتے کہا ـــ "مجھے معلوم تھا لیکن یہ میرے دروازے پر پناہ لینے کے لئے نہیں گرا تھا۔ یہ سانپ کے زہر سے مر رہا تھا۔ اسے بچانا میرا فرض تھا۔"

"یہ ٹھیک ہوگیا تھا تو اسے بھگا دیتے" ـــ بشمبر داس نے کہا ـــ "یا تھانے میں اطلاع دیتے کہ مفرور ملزم آپ کے پاس ہے۔"

"اس نے صبح چلے ہی جانا تھا" ـــ شاہ صاحب نے کہا ـــ "باقی رہا تھانے میں اطلاع دینا تو میرا جواب یہ ہے کہ آپ کا میں ملزم ہوں لیکن اپنے گھر آتے ہوتے بیمار مہمان کو پولیس کے حوالے کر دینا میرے لئے بہت بڑا گناہ ہے۔"

تھانیدار تھا تو ہندو لیکن میری بات سُن کر اُس کا انداز بدل گیا۔ شاہ صاحب نے اُسے رشوت پیش کی اور کہا کہ وہ اس سے زیادہ بھی دے سکتے ہیں۔

"شاہ صاحب!" ـــ تھانیدار نے کہا ـــ "میں یہ پیسے کبھی قبول نہ کروں لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرے ساتھ ایک حوالدار اور چھ سپاہی ہیں۔ اس جھوٹ میں کہ میں نے سکندر کو کہیں اور سے پکڑا ہے، انہیں بھی شامل کرنا پڑے گا۔ ان کا مُنہ بند کرنا ضروری ہے۔ میں ان کے لئے آپ کے یہ پیسے قبول کرلوں گا۔ کچھ اور پیسے دے دیں۔"

"لالہ بشمبر داس!" ـــ میں نے کہا ـــ "اگر آپ چاہیں تو اس رپورٹ میں یہ بھی شامل کرلیں کہ آپ نے مجھے بڑی مشکل سے اور بہت بڑا مقابلہ کر کے گرفتار کیا ہے۔ اس سے آپ کی اگلی ترقی کا راستہ کھُل جاتے گا۔"

"تھانے چل کر دیکھ لیں گے" ـــ بشمبر داس نے کہا ـــ "میں شاہ صاحب کو ایک دو باتیں سمجھا لوں .... شاہ صاحب! آپ دل میں یہ رکھ لیں کہ آپ کو معلوم تھا ہی نہیں کہ سکندر یہاں آیا اور پکڑا گیا تھا۔"

میں بھی چاہتا تھا کہ شاہ صاحب پر حرف نہ آتے۔ میں نے اپنے طور پر

فیصلہ کر لیا تھا کہ پولیس کی حراست سے بھاگوں گا۔ شاہ صاحب کی دی ہوتی رقم کام کر گئی۔ کچھ تھانیدار نے اپنی جرأت سے کام لیا۔ یہ سودا ذرا مشکل سے ہی طے ہُوا تھا۔ میں نے وہ مشکل بیان نہیں کی۔ پولیس کی باتیں پولیس والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔



وہ مجھے شاہ صاحب کے گھر سے لے آتے۔ میں نے باہر نکلتے ہی اپنے دونوں ہاتھ بشمبر داس کے آگے کر دیے اور کہا کہ وہ ہتھکڑی لگا لے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ہتھکڑی آگے کر دی۔ بشمبر داس میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا، پھر اُس نے سر ہلا دیا۔

"نہیں سکندر!" ـــ اُس نے آہستہ سے کہا ـــ "ہتھکڑی نہیں لگاؤں گا۔ معلوم نہیں کیوں تمہاری عزت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تم آخر سب انسپکٹر ہو۔ چلو۔"

ہم چل پڑے۔ جب ہم اُونچے فصل کے درمیان میں سے گزر رہے تھے تو میرے دماغ میں آئی کہ یہیں سے بھاگ نکلوں۔ رات کا وقت تھا۔ میں فصل سے ادھر اُدھر ہو جاتا تو وہ اندھوں کی طرح گولیاں چلاتے رہتے اور میں کہیں چھُپتا کہیں بھاگتا نکل جاتا لیکن اس ہندو تھانیدار نے مجھ پر اعتبار کیا تھا اور اس نے میری عزت بھی کی تھی۔ ایک تو یہ وجہ تھی کہ میں نے فرار کا ارادہ ترک کر دیا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ تھانیدار نے غصے میں آکر شاہ صاحب کو اور گلشن آرا کو دھر لینا تھا۔ میں نے فرار تو ہونا ہی تھا۔ اس کا موقع آرہا تھا۔ انہوں نے مجھے اسی تھانے کی حوالات میں نہیں رکھنا تھا۔ دو تین روز بعد ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو یا تین کانسٹیبلوں کے ساتھ مجھے ہتھکڑی سے باندھ کر میرے ہیڈ کوارٹر بھیج دینا تھا۔ یہ سولہ سترہ گھنٹے کا سفر تھا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اس سفر کے دوران بھاگوں گا۔ میں جانتا تھا کہ یہ کام انتہائی دشوار اور خطرناک ہے۔ چلتی گاڑی سے کُود کر میں شدید زخمی ہو سکتا تھا اور میں گر کر ریل گاڑی کے نیچے بھی آسکتا تھا اور میں پولیس گارد کی گولیوں کا نشانہ بھی بن سکتا تھا پھر بھی میں نے فرار کی کوشش کرنی ہی تھی۔

"لالہ جی!" ـــ میں نے تھانے کی طرف جاتے ہوتے اُس سے پوچھا ـــ

"مُخبری کس نے کی ہے؟"

"کسی نے تو کی ہو گی" ——— اُس نے مُسکرا کر جواب دیا ——— "نہ پوچھو تو اچھا ہے۔ میں کسی کو مروانا نہیں چاہتا۔"

میں نے بہت اصرار کیا لیکن اُس نے نہ بتایا۔

"ایوّب تو نہیں تھا؟" ——— میں نے پوچھا ——— "مجھے اُسی پر شک ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ میں نے ہی اُسے پکڑوایا تھا۔"

"نہیں" ——— اُس نے کہا ——— "ایوب نہیں تھا اور یہ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں .... میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ تم مجھے دھمکیاں دے کر میرے گھر سے نکلے تھے تو میں بہت دیر سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ تم جب میرے سامنے بیٹھے تھے۔ میں اُس وقت خالی ہاتھ تھا اور یہ تو میں مان ہی نہیں سکتا تھا کہ تم بھی خالی ہاتھ ہو گے۔ تم جب چلے گئے تو میں ریوالور لے کر باہر نکلا۔ مجھے معلوم نہیں تھا تم کدھر نکل گئے ہو۔ مجھے ایوب آتا نظر آیا۔ وہ میرے پاس تھانے میں آتا رہتا ہے بلکہ وہ میرا دوست بن گیا ہے۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ سکندر آیا تھا اور جھلک دکھا کر نکل گیا ہے۔ ایوب نے تمہارا نام سُن کر بڑی حیرت کا اظہار کیا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ سکندر کبھی سامنے آ گیا تو وہ پہلے اُسے گولی مارے گا پھر تھانے میں اطلاع دے گا کہ اُس نے ایک مفرور قاتل کو مار ڈالا ہے کیونکہ اُس نے مقابلہ کیا تھا۔"

"ہاں لالہ جی!" ——— میں نے کہا ——— "ایوب تو میرا جانی دشمن ہے۔"

"میں اُس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا تو شہر کا ایک اور آدمی ہمارے پاس آ کر رُک گیا" ——— بشمبر داس نے کہا ——— "اُس نے بتایا کہ اُس نے سکندر کو اُس طرف جاتے دیکھا ہے۔ اس آدمی نے اُس طرف اشارہ کر کے ایوب سے پوچھا کہ اُس نے سکندر کو نہیں دیکھا تھا؟ ایوّب نے کہا کہ وہ دیکھتا تو سکندر نکل کر نہ جاتا۔ میں اکیلا ہی کچھ دُور تک گیا اور واپس آ گیا۔ میں نے شہر سے ایک لاری نکلتے دیکھی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ تم اس لاری پر نکل گئے ہو گے۔ ایک ریل گاڑی کا بھی وقت تھا۔ میں نے تھانے جا کر ایک کانسٹیبل اور ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور ریلوے سٹیشن چلا گیا۔ اُن دونوں کو میں نے بغیر وردی ساتھ لیا تھا۔ ہم نے چھپ چھپ کر دیکھا۔ ریلوے سٹیشن کا ہر کونہ دیکھ ڈالا۔ گاڑی آئی تو ہم نے یہاں سے سوار ہونے والے مسافروں کو دیکھا، لیکن تم نظر نہ آئے۔"

[۵]

تھانے لے جا کر اُس نے مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ حوالاتیوں کو جو کھانا دیا جاتا تھا وہ شاید بھکاری بھی نہ کھا سکیں لیکن بشمبر داس نے میرے لیئے پُر تکلف ناشتہ بھیجا۔ مجھے اب حوالات میں بیٹھے ہی رہنا تھا۔ میں چُپ بیٹھ گیا لیکن میرا ذہن ہر وقت مصروف رہتا تھا۔ ایوب کے متعلق میرے شکوک رفع ہو گئے۔ یہ الگ بات تھی کہ میں پکڑا نہ جاتا لیکن ایوب تھانیدار کو یہ بتا سکتا تھا کہ میں اُسے ملا تھا اور میں فلاں طرف چلا گیا تھا۔

دن کے بارہ بج رہے تھے جب ایوّب کھانا اُٹھاتے حوالات کی سلاخوں کے سامنے آن کھڑا ہُوا اور بشمبر داس نے آ کر حوالات کا دروازہ کھولا۔ کھانا پُر تکلف تھا۔ حوالات کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ ایوب سلاخوں کے باہر کھڑا رہا۔

"مجھے لالہ بشمبر داس نے بتا دیا ہے کہ تم کس طرح پکڑے گئے تھے" ——— ایوّب نے کہا۔

حوالات کا سنتری پاس ہی کھڑا تھا۔ میں نے ایوّب کو آنکھ کا اشارہ کیا اور کوئی اور بات شروع کر دی۔ ایوب یہ کہہ کر چلا گیا کہ شام کا کھانا بھی وہی لائے گا اور یہ برتن لے جائے گا۔

مجھے چار روز اس حوالات میں رکھا گیا۔ اس دوران اس علاقے کا ڈی ایس پی مجھے دیکھنے آیا۔ اُس نے آتے ہی مجھ پر چڑھائی کر دی۔ وہ انگریز تھا اور بڑے سخت غصے میں تھا کہ میں نے ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کیا ہے۔ وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے وہ ہندوستان کا دیوتا تھا اور وہ حیران تھا کہ ایک ہندوستانی نے ایک انگریز افسر کو قتل کیا ہے۔

"ہم تم کو سزائے موت دیں گے" ——— اُس نے کہا ——— "پھر تم کو پتہ چلے گا کہ انگریز افسر کو قتل کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔"

"صاحب بہادر!"— میں نے کہا — "میں مر جاؤں گا تو پھر بھی انگریز افسر قتل ہوتے رہیں گے۔ جب تک انگریز یہاں ہیں ان کے قتل کا یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔"

"تم باغی ہو"— انگریز ڈی ایس پی نے کہا — "تم پر اتنی جلدی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے ساتھی کون کون ہیں۔ تم نہیں بتاؤ گے تو ہم تمہاری ہڈیاں توڑ دیں گے۔"

"اپنے وطن کے لئے یہ قربانی بڑی خوشی سے دوں گا صاحب بہادر!"— میں نے کہا۔

"تم بہت بیوقوف آدمی ہو"— اُس نے کہا اور چلا گیا۔

اُس شام بھی ایوّب آیا اور حسبِ معمول میرے لئے کھانا لایا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہے لیکن حوالات کا سنتری وہاں سے ہٹتا نہیں تھا اس لئے بات نہ ہو سکی۔

اس سے اگلے روز سب انسپکٹر بشمبر داس نے مجھے بتایا کہ آج رات مجھے اپنے ہیڈ کوارٹر میں بھیجا جا رہا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ڈی ایس پی کہہ گیا تھا کہ اسے کم از کم چار آدمیوں کی گارد میں بھیجنا اور راستے میں اگر یہ مرنے بھی لگے تو ایک منٹ کے لئے بھی ہتھکڑی نہ کھولی جائے۔

اُس روز بھی ایوّب کو خاص بات کرنے کا موقع نہ ملا لیکن عام سی باتیں اُس نے کیں جن میں اہم بات یہ تھی کہ میری خالہ اور عذرا کو پتہ چل گیا تھا کہ میں پکڑا گیا ہوں۔ صرف اُنہیں ہی نہیں، مجھے بتایا گیا کہ میری گرفتاری ایک سنسنی خیز خبر بن کر سارے شہر میں پھیل گئی ہے اور لوگ مجھے دیکھنے کے لئے تھانے میں آتے ہیں لیکن ایوّب کے سوا کسی اور کو تھانے کے احاطے میں اندر نہیں آنے دیا جاتا۔

"تم عذرا کے ہاں جاتے رہتے ہو؟"— میں نے ایوّب سے پوچھا۔

"ہاں!"— ایوّب نے جواب دیا — "پہلے کبھی کبھی جاتا تھا جب سے تم ملے ہو اور تم نے مجھے کہا ہے کہ عذرا کے ساتھ شادی کر لو، میں تقریباً روزانہ جاتا ہوں.... تمہاری خالہ کے ساتھ شادی کی بات پکّی ہو گئی ہے لیکن عذرا ہر وقت اُداس اور پریشان رہتی ہے۔"

"کیا تم اُسے تنہائی میں کبھی نہیں ملے؟"

"تین مرتبہ مل چکا ہوں"— ایوّب نے جواب دیا — "میں نے اُسے بتایا کہ تمہیں سکندر کبھی نہیں مل سکے گا تو اُس کے آنسو نکل آتے تھے۔ میرے متعلق اُسے کسی نے بتایا تھا کہ ایوّب بدمعاش آدمی ہے۔ میں نے اُس کا دل صاف کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔"

ایوّب جب مجھے یہ بات سنا رہا تھا تو میرا دل ایک اَن جانی سی مٹھی میں جکڑتا جا رہا تھا۔ میں نے کسی وقت یہ سوچا تھا کہ واپس آ جاؤں، عذرا کے ساتھ شادی کر لوں اور پولیس آفیسر کی حیثیت سے سیدھی سادی زندگی بسر کروں، لیکن پاؤں کا چکر ایسا تھا کہ میں اسی میں پڑا رہا۔ حالات اپنے آپ ہی مجھے اپنی لپیٹ میں لیتے رہے اور میں تیز آندھی میں آتے ہوئے تنکے کی طرح اُڑتا ہی رہا۔

"میں آج رات جا رہا ہوں"— میں نے آہستہ سے کہا۔

"اللہ مالک ہے"— ایوّب نے مُنہ سلاخوں کے قریب کر کے کہا — "راستے میں ہوشیار رہنا۔"

اُس نے سلاخوں سے ہاتھ آگے کیا۔ میں نے اُس سے ہاتھ ملایا۔ اُس نے میرے ہاتھ کو اس طرح دبایا جیسے مجھے کوئی اشارہ دیا ہو۔ میں اُس سے پوچھنے ہی لگا تھا کہ سنتری قریب آ گیا اور اُس نے بڑے ادب سے ایوّب سے کہا کہ ہاتھ اندر نہ کریں۔

[۶]

رات کو ریل گاڑی مجھے اپنے شہر سے لے کر چل پڑی۔ پیچھے سے ریل گاڑی کے ساتھ وہ بوگی بھیجی گئی تھی جس میں چھوٹا سا ایک کمپارٹمنٹ پولیس کے لئے ہوتا ہے اور اس میں قیدی ایک سے دوسری جگہ لے جاتے جاتے ہیں۔ گاڑی کی کھڑکیوں کے ساتھ سلاخیں لگی ہوتی ہیں۔ دروازوں کے شیشے والے حصّے کے ساتھ بھی سلاخیں لگی ہوتی ہیں۔ دروازے اندر سے مقفّل کر دیے جاتے ہیں اور چابیاں گارد کے انچارج کے پاس ہوتی ہیں۔ اتنے سخت انتظام کے باوجود قیدیوں کی ہتھکڑیاں نہیں کھولی جاتیں۔ میرے لئے تو خاص طور پر بڑا سخت حکم دیا گیا تھا۔

ایک انتظام یہ بھی کیا گیا تھا کہ مجھے یہ بتایا گیا کہ مجھے رات ساڑھے دس بجے کی گاڑی سے لے جایا جاتے گا لیکن سورج غروب ہوتے ہی مجھے حوالات سے ہتھکڑی لگا کر نکالا گیا اور ریلوے سٹیشن پر لے آتے۔ میرے ساتھ جو گارد تھی اس میں ایک ہندو ہیڈ کانسٹیبل تھا اور تین کانسٹیبل تھے جن میں ایک سکھ اور دو ہندو تھے۔ چونکہ میں مسلمان تھا اس لئے میرے ساتھ غیر مسلم گارد بھیجی گئی تھی۔ گاڑی ساڑھے چھ بجے میرے شہر سے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد ہیڈ کانسٹیبل نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اگلے سٹیشن پر کھانا کھائیں گے۔ میرے پاس خاصے پیسے تھے۔

"اپنا خرچ نہ کرنا بھائیو!" —— میں نے کہا —— "میرے پاس بہت پیسے ہیں۔ میں تمہیں کھانا کھلاؤں گا لیکن کسی چھوٹے سٹیشن سے نہیں۔ بڑا اسٹیشن اڑھائی تین گھنٹے بعد آتے گا۔ میں تمہیں اچھا سا کھانا کھلاؤں گا۔ تم اپنے پیسے بچاؤ اور واپس آ کر خوراک کا بل وصول کر لینا۔"

وہ بہت خوش ہُوتے۔ میں نے چونکہ ارادہ کر رکھا تھا کہ فرار ہونے کی کوشش کروں گا اس لئے اپنی گارد کو میں ذرا خوش رکھنا چاہتا تھا کہ حکم کے خلاف میری ہتھکڑی کچھ دیر کے لئے کھول دیں۔ ریل گاڑی بڑی تیز رفتار سے جا رہی تھی اور اس سے زیادہ تیزی سے میرا دماغ فرار کی ترکیبیں سوچ رہا تھا، پرکھ رہا تھا اور کوئی بہتر راستہ تلاش کر رہا تھا۔

مجھے ایک غم اور لگ گیا تھا۔ میں حمید اللہ اور خواجہ صاحب کو یہ بتا کر آیا تھا کہ بہت جلدی واپس آ جاؤں گا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ اپنے شہر میں رات کی گاڑی سے پہنچوں گا اور رات کو ہی تھانیدار سے ملاقات کر کے رات کی گاڑی سے ہی وہاں سے نکل آؤں گا۔ اس حساب سے مجھے پانچویں دن واپس اپنے ساتھیوں کے پاس ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے پانچ دن کا حساب اس طرح کیا تھا کہ دو دن جانے اور دو دن آنے کے اور ایک دن فالتو رکھ دیا تھا مگر میں نے حساب کیا تو مجھے وہاں سے نکلے دو ہفتے ہو چلے تھے۔

مجھے خطرہ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ حمید اللہ بے صبر سا آدمی ہے، وہ میرے پیچھے آ جاتے گا۔ میرے شہر میں اُسے کوئی پہچان تو نہیں سکتا تھا لیکن وہ ذرا سی لغزش

کر کے اپنے خلاف شک پیدا کر سکتا تھا۔ میں جب وہاں سے چلا تھا تو خواجہ صاحب نے بھی اور حمید اللہ خان نے بھی مجھے روکا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ پکڑے جاؤ گے لیکن میں آ گیا۔ مجھے یاد آیا کہ حمید اللہ نے چلتے چلتے یہ بھی کہا تھا، سکندر! تم اگر ان پانچ دنوں کے اندر نہ لوٹے تو میں تمہارے پیچھے آ جاؤں گا۔ میں اُسے منع تو کر آیا تھا لیکن وہ منع ہونے والا آدمی نہیں تھا۔

کبھی مجھے نظر آنے لگتا تھا جیسے ہمارا کھیل ختم ہو چکا ہے اور ہم ابتدا میں ہی انگریز کے قانون کے ہاتھوں ختم ہو جائیں گے۔ مختصر یہ کہ سوچ سوچ کر میرا سر دُکھنے لگا تھا۔

۵

گاڑی کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ میرا دل اس قدر بے تاب ہُوا کہ مجھے اگر ہتھکڑی لگی ہوتی نہ ہوتی تو میں پولیس کے ان چاروں آدمیوں پر حملہ کر دیتا۔ یہ ایک چھوٹے سے قصبے کا سٹیشن تھا۔ وہاں گاڑی رُک گئی۔ میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا ہُوا تھا۔ گاڑی کے شیشے اُترے ہُوتے تھے۔ سلاخوں کی وجہ سے میرے بھاگ نکلنے کا خطرہ نہیں تھا۔ اُس زمانے میں ریل گاڑیوں میں ذرا سا بھی رش نہیں ہوتا تھا۔ پلیٹ فارم پر چند ایک خوانچہ فروشوں کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا تھا۔

دو آدمی ٹہلتے ٹہلتے ہمارے سامنے سے گزرنے لگے۔ وہاں روشنی بہت تھوڑی تھی۔ میں نے ان دونوں کو پہچان تو لیا لیکن مجھے یقین نہ آیا کہ یہ وہی ہیں —— ایک تو حمید اللہ تھا اور دوسرا ہمارا ساتھی الطاف تھا —— الطاف ہمارا بڑا ہی ذہین اور بہت تیز ساتھی تھا۔ اُس میں بندر جیسی پھرتی اور چیتے جیسی جھپٹ تھی۔ میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ حمید اللہ نے حیران کُن جرأت کا مظاہرہ کیا۔ مجھے دیکھ کر رُک گیا اور بڑی زور سے "السلام علیکم" کہی۔ اُس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے دونوں ہاتھ آگے کئے۔ اس طرح ہمارا مصافحہ ہُوا۔ پھر الطاف نے ہاتھ ملایا۔

"انسپکٹر صاحب!" —— حمید اللہ خان نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا —— "یہ ہمارا یار غار ہے۔ اگر اجازت دیں تو اس کے ساتھ دو چار باتیں کر لیں۔"

اُس نے ہیڈ کانسٹیبل کو انسپکٹر کہا تھا اس سے ہیڈ کانسٹیبل خاصا چوڑا ہوگیا اور اُس نے بڑے افسروں کی طرح حمیداللہ خان کو اجازت دے دی کہ وہ میرے پاس کھڑا ہو کر باتیں کر سکتا ہے۔ حمیداللہ خان نے ایسی باتیں کیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے معلوم ہی نہیں کہ میں مفرور قاتل ہوں یا جیسے وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں ابھی تک سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر ہوں۔

میں نے حمیداللہ خان کے متعلق ہیڈ کانسٹیبل کو بتایا کہ بہت امیر کبیر ٹھیکیدار ہے اور اس کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ حمیداللہ خان ایک بات میرے ساتھ اور دو باتیں ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ کرتا تھا اور اُسے اتنی ہوا دیتا تھا کہ میں نے صاف طور پر دیکھا کہ ہیڈ کانسٹیبل غبارے کی طرح پھولتا جا رہا تھا حمیداللہ خان نے ایک کمال یہ کیا کہ جیب سے کچھ نوٹ نکالے۔ ہاتھ سلاخوں کے اندر کر کے دس روپے کا ایک نوٹ ہیڈ کانسٹیبل کے آگے اور پانچ پانچ روپے کے تین نوٹ تینوں کانسٹیبلوں کے آگے رکھ دیئے۔

اُن چاروں نے باچھیں کھلا کر اور جھپٹ کر نوٹ اُٹھائے اور جیبوں میں ڈال لئے۔ اُس زمانے کی یہ بہت بڑی رقم تھی۔

"کیوں بھائی!" — حمیداللہ خان نے پولیس گارد سے پوچھا — "آپ لوگوں نے کھانا کھا لیا ہے؟"

"نہ میرے یار!" — میں نے جواب دیا — "میں انہیں کہہ رہا تھا کہ تمہیں میں کھانا کھلاؤں گا، لیکن اگلا بڑا اسٹیشن آجائے تو وہاں سے اچھی قسم کا کھانا مل جائے گا۔"

"تم کیوں کھلاؤ گے؟" — ہمارا ساتھی الطاف بولا — "اب ہم تم سب کو کھانا کھلائیں گے۔"

یہ حمیداللہ، الطاف اور میری زبان کا جادو تھا جو چل گیا۔ ہم نے پولیس والوں پر اس طرح بھی اعتماد جمایا کہ حمیداللہ نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ میری ہتھکڑی کھول دے تاکہ میں آرام سے سفر کر سکوں۔ ہیڈ کانسٹیبل ابھی کچھ جواب سوچ ہی رہا تھا کہ میں بول پڑا۔

"نہیں نہیں" — میں نے کہا — "میں ہتھکڑی نہیں کھلواؤں گا۔ ان کا میرے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی انگریز کسی بڑے سٹیشن پر دیکھ لے تو ان پر کوئی مصیبت آپڑے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے ہیڈ کانسٹیبل کی بہت تعریفیں کیں۔

انجن نے وسل دی۔

"ہم ساتھ والے کمرے میں ہی بیٹھ جائیں گے" — حمیداللہ نے کہا — اور وہ ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گئے۔

یہ میل ٹرین تھی جسے اُس زمانے میں ڈاک گاڑی کہا جاتا تھا۔ کسی کسی سٹیشن پر رُکتی تھی۔ اب جو چلی تو سوا یا ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک اور قصبے کے سٹیشن پر رُکی۔ چونکہ وہ جنکشن سٹیشن تھا اس لئے بارونق تھا۔ وہاں انجن بھی تبدیل ہونا تھا اور برانچ لائن سے آنے والی گاڑی کا انتظار بھی کرنا تھا۔ حمیداللہ اور الطاف آئے اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ وہ کھانا لے آتے ہیں۔ مجھے یہ پریشانی ہونے لگی کہ یہ دونوں بہروپ میں نہیں تھے۔ اصل روپ میں ان کے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ میں نے اس خیال سے اپنے آپ کو تسلی دی کہ دونوں بیوقوف نہیں اور اناڑی بھی نہیں۔

مجھے ایک اور خیال آگیا کہ ہندو تو گوشت کھاتے ہی نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کھانے سے انکار کر دیں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ گوشت کھا لیں گے تو سکھ کانسٹیبل نے بڑے جوش و خروش سے کہا کہ یہاں کون دیکھتا ہے، جو آئے گا کھا لیں گے۔

"کھا لیں گے یار!" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "آنے دو۔"

تھوڑی ہی دیر بعد حمیداللہ اور الطاف کھانا لے آئے۔ وہ سٹیشن سے باہر ایک ہوٹل سے کھانا لائے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پلیٹیں اور گلاس بھی خرید لائے ہیں۔ کھانا کیا تھا، گوشت ہی گوشت تھا۔ اس کے علاوہ مُرغی بھی اور پولیس کے کام کی جو چیز وہ لائے وہ دیسی شراب کی دو بڑی بوتلیں تھیں۔

ہیڈ کانسٹیبل نے بڑی پھرتی سے جیب سے چابی نکالی، دروازہ کھولا اور کھانا اندر رکھوا لیا۔ میں نے گارد پر اپنا اعتماد مزید پکا کرنے کے لئے حمید اللہ اور الطاف سے کہا کہ وہ جلدی یہاں سے نکل جائیں کیونکہ یہ قابلِ گرفت ہے۔ میں ایک خاص مقصد کے لئے دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ حمید اللہ اور الطاف جب وہاں سے نکل رہے تھے تو میں اُن کے اور قریب ہو گیا۔ حمید اللہ نے نکلتے نکلتے میرے کان میں کہا — "مُرغی نہ کھانا۔"

میں سمجھ گیا۔

گوشت اور مُرغی اس قدر پُرکشش تھے کہ پولیس کے ان چاروں آدمیوں کو یہ بھی خیال نہ رہا کہ ان کے ساتھ ایک قیدی بھی ہے۔ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے تھوڑا سا گوشت ایک پلیٹ میں ڈال کر دو روٹیاں لیں اور الگ بیٹھ کر کھانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی چل پڑی۔ پولیس والوں نے سب سے پہلا دھاوا مُرغی پر بولا۔ پھر انھوں نے گوشت کا صفایا کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ شراب پیتے جا رہے تھے اور میں اُنہیں بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔

وہ کھانا کھا چکے تو سب سے پہلے ہیڈ کانسٹیبل نے کہا کہ اُسے نیند آ رہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ یہ نیند کیسی ہے۔

"او جوانو!" — ہیڈ کانسٹیبل نے جُھومتی ہوئی اور غنودگی کی ماری ہوئی آواز میں کہا — "ذرا جاگتے رہنا۔"

یہ اُس کی آخری آواز تھی جو میں نے سُنی۔ اس کے فوراً بعد تینوں کانسٹیبل تھوڑے تھوڑے وقفے سے سیٹوں پر اوندھے ہو گئے۔ انہیں کوئی ہوش نہیں تھی۔

حمید اللہ خان اور الطاف ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں جا بیٹھے تھے۔ جب میری گارد بیہوش ہو گئی تو میں سمجھ گیا کہ وہ اس کمپارٹمنٹ میں کیوں بیٹھ گئے تھے۔ آج بھی ریل گاڑیوں میں دیکھیں۔ ملحقہ کمپارٹمنٹوں کے پائیدان ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔ حمید اللہ، الطاف اور مجھ جیسے قد کا کوئی آدمی ٹانگ لمبی کرے تو اُدھر کے پائیدان سے اس طرف کے پائیدان پر آ سکتا ہے۔ دروازوں

کے ڈنڈے آسانی سے پکڑے جا سکتے ہیں۔ چلتی گاڑی سے ٹکٹ چیکر اسی طرح ایک سے دوسرے کمپارٹمنٹ میں جایا کرتے ہیں۔

میرے ہاتھ ہتھکڑی میں بندھے ہوئے تھے۔ اس کمپارٹمنٹ کے دو دروازے تھے جو آمنے سامنے تھے۔ دونوں مقفّل تھے اور چابیاں ہیڈ کانسٹیبل کی جیب میں تھیں۔ ہتھکڑی کی چابی بھی اُسی کے پاس تھی۔ میں اُس کی جیب سے چابیاں نکال سکتا تھا اور دونوں دروازے کھول سکتا تھا لیکن ہتھکڑی کو چابی لگانا ممکن نہیں تھا۔ جو کچھ بھی کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں اور اپنے ساتھیوں کو کس طرح اطلاع دوں کہ گارد بے ہوش ہو چکی ہے۔ گاڑی کی رفتار تیز تھی اور موڑ زیادہ تھے کیونکہ پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ گاڑی مڑتی تھی تو پاؤں پر کھڑا رہنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ایک بار گاڑی نے ایسا موڑ کاٹا کہ ہیڈ کانسٹیبل جو سیٹ پر پڑا تھا لڑھک کر فرش پر جا پڑا۔ مجھے خطرہ محسوس ہُوا کہ وہ گرنے کے دھچکے سے بیدار ہو جائے گا۔ میں نے ہتھکڑی کی زنجیر دوہری کر کے اپنے ہاتھ میں پکڑ لی کہ یہ اُٹھ رہا ہوگا تو زنجیر گھما کر اس کے سر پر ماروں گا۔ وہ سر سے ننگا تھا۔

میں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ مُردوں کی طرح پڑا رہا۔

دروازے پر بڑی زور کی دستک ہُوئی اور مجھے حمید اللہ کی آواز سنائی دی۔ میں اُس تک گیا۔ گرمی کی وجہ سے کمپارٹمنٹ کے شیشے نیچے تھے۔ یہ تو میں نے آپ کو بتایا ہے کہ کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں والے حصّے پر مضبوط سلاخیں لگی ہُوئی تھیں۔

"جلدی کر سکندر!" — حمید اللہ خان نے کہا — "چابی نکال دروازہ کھول۔ اگلا سٹیشن نہ آ جائے۔"

اُس زمانے میں پولیس نیکر پہنا کرتی تھی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کی نیکر کی جیب میں بڑی مشکل سے ہاتھ ڈالا کیونکہ کلائیوں پر ہتھکڑی چڑھی ہوئی تھی۔ ایک ہی بار دونوں ہاتھ جیب میں نہیں جا سکتے تھے۔ میں نے چابیاں نکال لیں اور وہ دروازہ کھول دیا جس کے سامنے حمید اللہ خان کھڑا تھا۔ وہ

اندر آگیا مگر ابھی کھلے دروازے میں کھڑا تھا۔

اُس کے پیچھے الطاف اس دروازے کے پائیدان پر آیا اور وہ بھی اندر آگیا۔ گاڑی اسی رفتار سے مُڑی۔ میں حمیداللہ خان سے ٹکرایا۔ وہ سنبھل نہ سکا اور الطاف کے ساتھ اتنی زور سے ٹکرایا کہ الطاف کھلے دروازے میں جاپڑا اور اُس کا سَر اور سینہ گاڑی سے باہر چلے گئے۔ وہ ابھی اُدھر کو ہی سرک رہا تھا۔ اگر حمیداللہ خان اُس کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹ نہ لیتا تو وہ گاڑی سے باہر جاپڑتا۔

اُسے گھسیٹ کر دروازہ بند کیا۔ حمیداللہ خان نے ہتھکڑی کی چابی میرے ہاتھ سے لے کر ہتھکڑی کھول دی۔ میں دوسروں کو ہتھکڑی لگایا کرتا تھا، اپنے ہاتھ پہلی بار ہتھکڑی میں بند ہوئے تھے۔ اتنا زیادہ وقت ہتھکڑی لگی رہی تو میری کلائیاں دُکھنے لگیں۔

میرے ان دو ساتھیوں کو اندازہ تھا کہ انگریزوں کے قانون کے یہ چار محافظ مُرغی کھا کر کتنی دیر بعد بیہوش ہوجائیں گے۔ اپنے اندازے کے مطابق حمیداللہ خان اس کمپارٹمنٹ کے دروازے پر آگیا تھا۔

۵

"اگلے سٹیشن پر رُکنے کے لئے گاڑی آہستہ ہو گی تو چلتی گاڑی سے اُترنا ہے" — حمیداللہ خان نے کہا — "لیکن سنبھل کر۔ گر کر زخمی نہ ہوجانا۔"

"معلوم نہیں اردگرد علاقہ کیسا ہے!" — الطاف نے کہا۔

"میں جانتا ہوں" — میں نے کہا — "چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں اور جنگل ہے۔ میں اِدھر سے کئی بار گزرا ہوں۔"

"ان کی رائفلیں لے لی جائیں" — حمیداللہ نے کہا۔

"نہیں" — میں نے کہا — "ہم جدھر جائیں گے رائفلیں شک پیدا کریں گی" — مجھے دھچکہ سا لگا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "میرا ریوالور وہیں رہ گیا ہے جہاں میں اتنے دن رہا تھا۔"

میں ریوالور ساتھ لایا تھا جو شاہ صاحب نے اپنے ٹرنک میں کپڑوں کے

نیچے رکھ دیا تھا۔ اگر انہوں نے عقل سے کام لیا تو ریوالور اور گولیاں کہیں پھینک دیں گے۔

"ایک رائفل ساتھ ہونی چاہیئے" — الطاف نے کہا — "ایک ریوالور ہمارے پاس ہے۔"

آخر فیصلہ ہُوا کہ ایک رائفل اور چاروں کا ایمونیشن ساتھ لے لیا جائے۔ ہم نے ایک رائفل اٹھالی اور چاروں کی بیلٹوں سے راؤنڈ نکال کر اپنے تھیلے میں ڈال لئے۔

"ٹھہرو دوستو!" — الطاف نے کہا — "انگریز بادشاہ بھی کیا یاد کرے گا۔"

ہیڈ کانسٹیبل فرش پر اوندھے مُنہ پڑا تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر سکھ کانسٹیبل اس طرح پڑا تھا کہ اُس کا ایک بازو نیچے لٹک رہا تھا۔ الطاف نے ہتھکڑی لی اور اس کا ایک کڑا سکھ کے لٹکے ہوئے ہاتھ کی کلائی پر چڑھا دیا اور دوسرا کڑا ہیڈ کانسٹیبل کی کلائی پر چڑھا کر چابی گاڑی سے باہر پھینک دی۔ پھر اُس نے ایک اور کانسٹیبل کو گھسیٹ کر اُن کے قریب کیا اور ہتھکڑی کے دوسرے سرے والا کڑا اُس کانسٹیبل کی بیلٹ میں گزار کر بیلٹ بند کر دی۔ اس طرح ہیڈ کانسٹیبل اور سکھ کانسٹیبل اس ہندو کانسٹیبل کے قیدی بن گئے۔

مجھے معلوم تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل کی جیب میں کاغذات ہیں جو میرے متعلق تھے۔ میں نے اُس کی جیب سے کاغذات نکال لے۔ میں نے وہ چِٹھی نکالی جس پر ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے میری سپیشل برانچ کے حوالے کر کے رسید لینی تھی۔ ان کاغذات کے ساتھ پِن بھی تھا۔ میں نے اس چِٹھی کی اُلٹی طرف لکھا:

"سرکارِ برطانیہ کے نام۔

تمہارے قانون کے محافظوں کا یہی انجام ہوگا۔ اگر یہ چاروں ہندوستانی نہ ہوتے تو زندہ نہ ہوتے۔ تمہارا قانون ہندوستان میں نہیں چل سکے گا۔ سکندر۔"

میں نے یہ کاغذ دوسرے کاغذات کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل کی جیب میں

ڈال دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ کم ہوتے ہوتے اُوٹر سگنل کے قریب اور کم ہو گئی۔ پہلے حمید اللہ خان اُترا۔ رائفل اُسی کے ہاتھ میں تھی۔ پھر میں اُترا۔ اُترنے کے لئے رفتار ابھی زیادہ تھی۔ مجھے کچھ دُور تک گاڑی کے ساتھ دوڑنا پڑا۔ آخر میں الطاف بھی اُتر آیا۔

انگریز کی ریل گاڑی ہمیں آزاد فضا میں اُگل کر آگے نکل گئی۔

میں اس علاقے سے ریل گاڑی پر چند مرتبہ گزرا تھا، اس علاقے کے اندر کبھی نہیں گیا تھا۔ میں اتنا ہی جانتا تھا کہ اندرونی علاقے میں پہاڑیاں ہیں جو زیادہ اُونچی نہیں اور جنگل ہے۔

"ہم اب کسی آبادی میں نہیں جا سکتے" ــــ حمید اللہ خان نے کہا ــــ "یہاں سے دُور نکل چلو۔ صبح تک ہمیں اس مین لائن سے بہت دُور ہونا چاہیئے۔"

"اپنے ٹھکانے تک کس طرح پہنچیں گے؟"

"پیدل!" ــــ الطاف نے جواب دیا ــــ "کم از کم ایک سَو میل پیدل چلیں گے، پھر لاری پکڑیں گے۔"

"اور یہ خیال رکھنا" ــــ میں نے کہا ــــ "ہمیں کم از کم ایک ہفتہ دُور رہنا پڑے گا، بلکہ اس سے زیادہ۔ آگے کسی نہ کسی بڑے سٹیشن پر پتہ چل جائے گا کہ قیدی فرار ہو گیا ہے اور گارد بیہوش پڑی ہے، یا وہ ہوش میں آکر خود ہی دیکھ لیں گے کہ انہیں ضیافت کتنی مہنگی پڑی ہے۔ چاروں گرفتار ہو جائیں گے۔ شراب کی بوتلیں وہیں پڑی ہیں۔ اُن پر یہ الزام ہو گا کہ ڈیوٹی کے دوران شراب پی کر مدہوش ہو گئے اور قیدی بھاگ گیا۔"

ہم جنگل کی طرف چلے جا رہے تھے۔ رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ ہمیں ریلوے سٹیشن کی، ریل گاڑی کی اور قصبے کی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔ انجن کی وِسل سُنائی دی اور گاڑی چل پڑی۔

ہم دو کم اونچی پہاڑیوں کے درمیان جا رہے تھے۔ ساون کی وجہ سے گھاس ہمارے گھٹنوں تک اونچی ہو گئی تھی۔ میں تھا تو بڑے مضبوط دل کا آدمی

لیکن سانپ کی دہشت مجھ پر آسیب کی طرح سوار ہو گئی تھی۔ اپنے ہی قدم سے گھاس میں سرسراہٹ ہوتی تھی تو میں بدک جاتا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے سکندر!" ــــ الطاف نے پوچھا۔

"ہر قدم کے نیچے محسوس ہوتا ہے کہ سانپ ہے۔"

"ہوش میں آ یار!" ــــ الطاف نے کہا ــــ "اس طرح تو تم جیتے جی مر جاؤ گے۔"

میں نے اس خوف پر قابو پانے کی کوشش شروع کر دی اور انہیں سنایا کہ میں اپنے شہر میں کس طرح پہنچا، ہندو تھانیدار سے کس طرح ملا، اُسے کیا کہا اور وہاں سے نکلا تو ایوب ملا پھر سانپ نے ڈس لیا اور میں شاہ صاحب اور گلشن کے دروازے پر جا گرا۔

"گلشن!" ــــ حمید اللہ خان نے ایسے کہا جیسے آہ لی ہو ــــ "کیا تم نے اُسے بتایا تھا کہ تم میرے ساتھ ہو؟"

"بتایا تھا" ــــ میں نے کہا ــــ "لیکن گلشن اب وہ گلشن نہیں رہی جو تمہاری محبت کی خاطر گھر سے نکل آئی تھی ۔۔۔۔ وہ دنیا کی دوستیوں اور دشمنیوں سے بہت دُور چلی گئی ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "میں اُس کے ہاں پناہ لینے نہیں گیا تھا، اُس کے قدموں میں سر رکھ کر جان دینے گیا تھا۔"

بہت دُور جا کر ہم بیٹھ گئے۔ رات کا آخری پہر تھا۔

لوہا پگھل جاتا ہے۔ اس سے زیادہ سخت فولاد ہے۔ وہ بھی پگھل جاتا ہے پھر اسے جس سانچے میں ڈھالو اُسی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کہتے ہیں انسان نہیں بدل سکتا۔ فطرت جو بھی شکل اختیار کر گئی قبر تک وہی رہتی ہے۔

میں نہیں مانتا۔ میرا تجربہ کچھ اور کہتا ہے۔ میں نے بعد میں بھی دیکھا ہے کہ انسان کو جب حالات اور واقعات کی بھٹی میں پھینک دیا جاتا ہے اور جب رنج والم اور تلخیوں کی آگ جلتی ہے تو انسان موم کی طرح پگھل جاتا ہے پھر وہ اپنے آپ کو ایک سانچے میں ڈھال دیتا ہے اور اُسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

کیا آپ مجھے تھوڑی سی دیر کے لئے فلاسفر بننے کی اجازت دیں گے؟ میں واعظ بننے کی کوشش نہیں کروں گا اور میں اپنی وکالت بھی نہیں کروں گا۔ میں تو یوں سمجھیں، بیان دے رہا ہوں ۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔ آپ اسے اقبالی بیان کہہ لیں۔

گناہوں کے سانچے میں ڈھل جانا تو بہت ہی آسان ہے مگر گناہوں کی دُنیا میں جا کر اپنے آپ کو کسی اور سانچے میں ڈھال لینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں مشکل ہوتا ہے۔ میں کچھ اور کہتا ہوں۔ انسان یہ سمجھ لے کہ گناہ جسمانی قوتیں ہی نہیں روحانی قوتیں بھی چُوس لیتا ہے تو انسان بھدّے اور بدصورت سانچے میں ڈھل جانے سے بچ جاتا ہے پھر وہ اگر حالات کا رُخ نہ بدل سکے تو بھی حالات اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

میں آپ کو ایک بات بتاؤں ۔۔۔ میں اُس وقت یہ فلسفہ نہیں جانتا تھا۔ میں دراصل کہنا یہ چاہتا ہوں کہ انسان ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ میں ماں باپ کا اکلوتہ اور لاڈلا بیٹا تھا مگر زمانے نے کیا کیا رنگ دکھاتے۔ حمید اللہ خان نواب کا بیٹا تھا صرف الطاف تھا جو جرائم پیشہ دنیا میں نہ جانے کب سے آیا ہُوا تھا۔ میں اور حمید اللہ خان اُسی کی سطح پر اُتر آتے تھے۔ مجھے وہ وقت آج بھی یاد ہے۔ مجھے

ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں پیدائشی مفرور قاتل ہوں اور میرے جینے کا واحد مقصد یہی ہے کہ گرفتاری سے بچنے کی کوشش کرنی ہے۔

مجھے اونگھ آتی اور میں لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ معلوم نہیں میں ایک منٹ سویا تھا یا ایک گھنٹہ، حمید اللہ خان نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

"ہوش میں رہو سب انسپکٹر!" ۔۔۔ الطاف نے کہا ۔۔۔ "اُٹھو اور چوکس رہو۔"

"مجھے جگاتے رکھنا ہے تو باتیں کرو" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "ایسی باتیں کرو جیسے ہم شکار کھیلنے آتے ہوں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ یہ بتاؤ کہ تم دونوں کس طرح میرے پیچھے آتے تھے۔"

"تم نے تو ہمارے لئے مسئلہ پیدا کر دیا تھا" ۔۔۔ حمید اللہ نے کہا ۔۔۔ "اتنے زیادہ دن گزر گئے تو ہم پریشان ہو گئے۔ یہی ایک صورت سمجھ میں آتی تھی کہ تم پکڑے گئے ہو یا پولیس مقابلے میں مارے گئے ہو۔"

"پھر تمہیں میرے پیچھے نہیں آنا چاہئے تھا" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "پکڑے جانے کی صورت میں تم مجھے رہا نہیں کرا سکتے تھے اور مارے جانے کی صورت میں تم مجھے زندہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ مجھے گرفتار کر کے کہاں لے گئے ہیں۔"

"خواجہ صاحب نے بھی روکا تھا" ۔۔۔ حمید اللہ خان نے کہا ۔۔۔ "وہ کہتے تھے کہ سکندر پکڑا گیا ہے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے لیکن شہناز نے میرا ناک میں دم کر دیا" ۔۔۔ حمید اللہ خان نے سنایا ۔۔۔ "وہ کہتی تھی کہ سکندر کو لے آؤ۔ میں نے اُسے کہا کہ سکندر اپنے گھر تو نہیں بیٹھا ہو گا کہ میں اُسے بازو سے پکڑ کر لے آؤں گا۔ ہو سکتا ہے وہ گرفتار ہو گیا ہو ۔۔۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ پولیس مقابلے میں ۔۔۔ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ شہناز نے میرے مُنہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگی، سکندر زندہ ہے۔ اُس پر کوئی ایسی ویسی بن گئی ہوتی تو میں بھی زندہ نہ ہوتی۔"

حمید اللہ خان خود بھی میرے لئے پریشان تھا لیکن اُسے میرے پیچھے آنے پر شہناز نے مجبور کیا تھا۔ وہ میرے لئے روتی تھی۔ حمید اللہ خان کو اُس سے

اتنی زیادہ محبت تھی کہ اُس کے آنسو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ محبت کی شدت کا اندازہ اس سے کریں کہ حمید اللہ خان نے اتنا بڑا خطرہ مول لے لیا تھا۔ الطاف کے ساتھ اُس کی دوستی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ وہ اُس کے ساتھ آگیا تھا ورنہ کوئی بھی اُس کے اس فیصلے کو نہیں مان رہا تھا کہ وہ میرے پیچھے آئے۔

ڈاکو، رہزن اور دیگر جرائم پیشہ لوگ اس اصول پر کام کیا کرتے تھے کہ ان کا کوئی ساتھی پکڑا جاتا تو باقی گروہ کھسک کر زیرِ زمین روپوش ہو جاتا تھا۔ اسی اصول پر میرے ساتھیوں کو عمل کرنا چاہیئے تھا مگر شہناز حمید اللہ کو چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ حمید اللہ نے اُسے بتایا کہ سکندر اب اپنے شہر میں نہیں ہوگا۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں بھی پکڑا جاؤں؟" — حمید اللہ نے اُسے کہا — "میں اگر پکڑا گیا تو انگریز مقدمہ چلائے بغیر مجھے گولی مار دیں گے۔"

"تم نہ جاؤ" — شہناز نے کہا — "میں چلی جاؤں گی۔ میرا دل کہتا ہے سکندر زندہ ہے اور وہ آجائے گا۔"

"میں تمہارے شہر سے واقف نہیں ہوں" — حمید اللہ نے اُسے کہا — "جاؤں گا کہاں؟ میں ہوٹل میں نہیں ٹھہر سکتا۔ پکڑا جاؤں گا۔"

"میرے گھر چلے جانا" — شہناز نے اُسے کہا — "میرے باپ اور بھائیوں کو بتا دینا کہ تم میرے خاوند ہو۔"

وہ روز بروز پاگل ہوتی گئی۔

"معلوم ہوتا ہے تم مجھے گرفتار کرانا چاہتی ہو" — ایک روز پھر حمید اللہ خان نے اُسے کہا۔

"میں کہتی ہوں تم مر جاؤ" — شہناز نے کہا — "مجھے سکندر چاہیئے۔ خاوند اور بھی مل جائے گا دوسرا بھائی نہیں ملے گا۔"

حمید اللہ خان نواب زادہ تھا، جاگیردار بھی تھا، بدمعاش اور ڈاکو بھی اُس کے ساتھ رہتے تھے اور پولیس پر بھی اُس کا اثر و رسوخ رہتا تھا۔ عورت کو تو مسل کر پرے پھینک دیا کرتا تھا لیکن شہناز کی محبت اُس کی ایسی کمزوری بن گئی تھی کہ اُس کی ہر بات کو وہ فرمان اور حکم سمجھتا تھا۔ وہ اُسی روز الطاف کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ الطاف ہی

اُس کا ساتھ دے سکتا تھا کیونکہ وہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے اور ان سے نکلنے کا تجربہ رکھتا تھا۔

الطاف تو اپنے اصلی روپ میں آیا تھا، حمید اللہ خان نے اپنے چہرے کو اس طرح بدل لیا تھا کہ ایک آنکھ پر سبز کپڑے کا گول ٹکڑا رکھ لیا تھا جس کے ساتھ دھاگہ بندھا ہوا اور دھاگہ سر سے پیچھے گیا ہوا تھا۔ میری داڑھی تو لمبی تھی، اُس کی داڑھی ڈیڑھ دو انچ ہوگی جو بڑی اچھی طرح تراشی ہوئی تھی۔ اُس نے مونچھیں پہلے ہی بڑھا رکھی تھیں، اب مزید بڑھا کر ان کی مروڑی ہوئی نوکیں اُوپر کر لی تھیں۔ اُس کے سر پر پگڑی تھی جو ہندو مہاراجوں جیسی تھی۔ یہ خاص طریقے سے باندھی جاتی تھی۔ باقی لباس ایسا تھا جیسے کوئی امیرزادہ ہو۔ اس بہروپ میں وہ ذرا اکڑا ہوا کر چلتا تھا۔ میرے شہر میں وہ اس بہروپ کے بغیر آیا تھا۔

"شہناز نے مجھے کہا تو تھا کہ میں اُس کے گھر جا کے ٹھہروں" — حمید اللہ خان نے مجھے سُنایا — "لیکن میں وہاں نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ شہناز نے ایک بار پہلے کبھی مجھے بتایا تھا کہ اُس کے بھائی آوارہ اور بدکار سے ہیں اور اُس کا باپ اپنے رنگ کا کمزور آدمی ہے۔ مجھے اچانک ایوب کا خیال آگیا۔ تم جانتے ہو وہ میرا دوست تھا۔ میں نے اُسے بہت مال کھلایا اور بہت عیش کرائی تھی۔ میں نے اُس کی قید کا حساب کیا تو خیال آیا کہ وہ گھر آگیا ہوگا لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ وہ گھر مل جائے گا۔

یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ جیل سے آکر کہیں اور چلا گیا ہو لیکن شہناز تمہارے لئے ایسی پاگل ہو چکی تھی کہ اُس نے میرا دماغ بھی خراب کر دیا۔"

"سانپ کے زہر سے بچ نکلنا بھی معجزہ تھا اور تمہارا آجانا بھی معجزہ تھا" — میں نے کہا — "میں دعائیں مانگتا تھا کہ تم میرے پیچھے نہ آجاؤ لیکن تم آگئے اور آتے بھی ایسے اندھیرے میں کہ تم جان ہی نہیں سکتے تھے کہ اس اندھیرے میں کیا ہے۔"

معجزہ تھا یا جو کچھ بھی تھا، حمید اللہ خان اور الطاف میرے شہر میں پہنچ گئے۔ حمید اللہ خان نے اپنی ایک آنکھ پر جو سبز کپڑا رکھا تھا وہ اُتار دیا۔ ایک آنکھ سے وہ اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کا وہ عادی نہیں تھا۔

میری طرح وہ بھی رات کی گاڑی سے میرے شہر میں پہنچے۔ دو آدمیوں سے اُنہوں نے ایوب کا گھر پوچھا۔ یہ بہت بڑا شہر نہیں تھا۔ قصبے جیسا شہر تھا جس میں ایک ہی تھانہ تھا۔ انہیں ایوب کا گھر مل گیا اور انہیں ایوب بھی مل گیا۔ یہ تو مجھے اندازہ تھا کہ ایوب حمید اللہ خان کو اپنے گھر دیکھ کر کتنا حیران ہُوا ہوگا۔ حمید اللہ کو وہاں جا کر خیال آیا کہ ایوب تو میرا دشمن ہے، دھوکہ نہ دے جائے۔ حمید اللہ خان کو یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ ایوب مجھے مل چکا ہے۔

حمید اللہ خان اور الطاف میری گرفتاری سے دو دن پہلے میرے شہر پہنچے تھے۔

"یہ کیا معاملہ ہے خان صاحب!"—— ایوب نے ہنستے ہُوئے کہا —— "کچھ دن گزرے سکندر اچانک مل گیا تھا، آج آپ آ گئے ہیں۔ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ آپ جیل سے فرار ہو گئے تھے۔ کیا سزا معاف کرا لی ہے؟"

"نہ بھائی!"—— حمید اللہ نے کہا —— "میں ابھی تک مفرور ہوں۔ اشتہاری مجرم ہوں ....گھبرانا نہیں، پناہ لینے نہیں آیا۔ میں سکندر کے پیچھے آیا ہوں۔"

"وہی پرانی دشمنی؟"—— ایوب نے پوچھا —— "اُسی نے آپ کو ...."

"نہیں!"—— حمید اللہ خان نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا —— "پرانی دشمنی نہیں، نئی دوستی ....سکندر میرا ساتھی ہے ....اور شہناز میری بیوی ہے۔ ہمارے جو ارادے ہیں وہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ سکندر تمہیں کہاں ملا اور کب ملا تھا اور وہ کہاں ہے؟"

میرے ساتھ ایوب کی مختصر سی جو ملاقات اور بات ہوتی تھی وہ اُس نے حمید اللہ خان کو سنا دی۔

"وہ چلا گیا تھا"—— ایوب نے کہا —— "یہاں کے تھانیدار سب انسپکٹر بشمبر داس کے ساتھ میری دوستی ہوگئی ہے۔ یہ دوستی میں نے خود ہی پیدا کی ہے۔ سزا یافتہ ہوں خان صاحب! سوچا پولیس کے ساتھ بنا کر ہی رکھوں تو اچھا ہے.... سکندر میرے ساتھ ایک دو باتیں کر کے چلا گیا۔ میں اپنے گھر کی طرف آ رہا تھا تو سب انسپکٹر بشمبر داس مل گیا۔ سکندر مجھے بتا گیا تھا کہ وہ اس تھانیدار کو دھمکیاں دے

آیا ہے کہ وہ اُس کی خالہ اور خالہ کی بیٹی کو پریشان کرنا چھوڑ دے ....

"بشمبر داس نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے سکندر کو تو نہیں دیکھا؟ میں نے صاف جھوٹ بولا کہ نہیں دیکھا بلکہ حیرت کا اظہار کیا کہ سکندر یہاں آیا تھا۔ ہم وہاں کھڑے ہی تھے کہ ایک اور آدمی ہمارے پاس آ کر رُک گیا اور یہ خبر سنائی کہ اُس نے سکندر کو اُدھر جاتے دیکھا ہے۔ میں حیران ہُوا کہ سکندر کی تو داڑھی تھی، اس آدمی نے اُسے کس طرح پہچان لیا۔ بشمبر داس اُدھر چلا گیا۔"

"کیا تم سکندر کو پکڑوانا نہیں چاہتے تھے؟"—— حمید اللہ نے پوچھا —— "وہ تو تمہارا دشمن تھا۔"

"نہیں خان صاحب!"—— ایوب نے کہا —— "خدا کی قسم اُسے دیکھ کر میرے تو آنسو نکل آتے تھے۔ میرے دل سے دشمنی نکل گئی تھی۔ اگر وہ میرے گھر آجاتا تو میں اُسے یہاں چھپا لیتا... میں اگلی صبح تھانے گیا اور سب انسپکٹر بشمبر داس سے پوچھا کہ سکندر ملا تھا یا نہیں۔ اُس نے بتایا کہ نہیں ملا تھا۔ یہ سُن کر مجھے خوشی ہُوئی۔"

"معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے"—— حمید اللہ خان نے کہا —— "کہیں اور نہ پکڑا گیا ہو.... اپنی خالہ کے گھر یا شہناز کے گھر تو نہیں گیا؟"

"نہیں"—— ایوب نے کہا —— "میں نے پوچھے بغیر سراغ لگانے کی کوشش کی تھی لیکن سراغ ملا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ وہاں نہیں گیا۔ معلوم ہوتا ہے سکندر کی دھمکیاں اثر کر گئی ہیں۔ بشمبر داس نے ان دونوں گھروں کو نہیں چھیڑا ورنہ وہ تو بہانے بنا بنا کر انہیں پریشان کرتا رہتا تھا۔"

یہ بات تو بالکل صاف ہوگئی تھی کہ میں وہاں نہیں ہوں۔ حمید اللہ خان بہت پریشان تھا۔ وہ صبح سے پہلے پہلے میرے شہر سے نکل آنا چاہتا تھا لیکن ایوب نے اُسے جانے نہ دیا۔ ان کی دوستی گہری تھی اور یہ وجہ بھی تھی کہ ایوب کو توقع تھی کہ وہ تھانے سے معلوم کرے گا کہ سکندر کہیں پکڑا گیا ہے یا نہیں۔ وہ کہتا تھا کہ سب انسپکٹر بشمبر داس کو اگر معلوم ہُوا تو وہ بتا دے گا۔

تیسرا دن طلوع ہُوا تو شہر میں یہ سنسنی خیز خبر پھیل گئی کہ سکندر شاہ صاحب کے گھر سے پکڑا گیا ہے۔ یہ خبر ایوّب کے گھر بھی پہنچ گئی۔ حمیداللہ خان اور الطاف نے سُنا تو ان پر سناٹا طاری ہو گیا۔ ایوّب تھانے سے پوری خبر لے آیا۔ بشمبر داس نے اُسے بتایا تھا کہ ایک عورت نے سکندر کو دیکھا تھا اور اُس کی نشاندہی پر پولیس نے شاہ صاحب کے گھر پہ چھاپہ مار کر اُسے پکڑا ہے۔

"میں نہیں مانتا" — حمیداللہ خان نے کہا — "اُسے پہچاننا آسان نہیں تھا"

"میں نے بھی نہیں مانا تھا" — ایوّب نے کہا — "لیکن خان صاحب! میں نے ایک چیز نوٹ کی ہے۔ سکندر کوئی سا بہروپ دھار لے وہ اپنی آنکھیں اور اپنی پیشانی کو نہیں چھپا سکتا۔ بشمبر داس نے مجھے اس عورت کا نام تو نہیں بتایا لیکن یہ بتا دیا تھا کہ اُس نے سکندر کو پہچانا کس طرح تھا....

"شاہ صاحب کے ہاں عورتیں تو جاتی ہی رہتی ہیں۔ یہ عورت بھی گئی تو اُس نے کہیں سکندر کی جھلک دیکھ لی۔ سکندر کمرے میں چلا گیا اور شاہ صاحب کی بیوی سکندر کے پیچھے ہی کمرے میں گئی۔ یہ کوئی چالاک عورت تھی۔ اُس نے کواڑ کی درز سے دیکھا یا دروازے کے ساتھ کان لگا کر سُنا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ سکندر ہے۔ شاہ صاحب کی بیوی نے اُس کا نام لے کر بلایا ہو گا۔ اس عورت نے اپنے خاوند کو بتایا۔ خاوند نے تھانیدار کو جا اطلاع دی"

"مجھے یہ بتاؤ" — حمیداللہ خان نے اُس سے پوچھا — "تھانیدار نے شاہ صاحب اور اس کی بیوی کو بھی گرفتار کر لیا ہو گا۔ مفرور ملزم کو پناہ دینا معمولی جرم تو نہیں"

"نہیں" — ایوّب نے جواب دیا — "بشمبر داس نے اسی لئے یہ سارا وقوعہ مجھے سنایا تھا کہ وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اُس نے سکندر کو شاہ صاحب کے گھر کے اندر سے گرفتار کیا ہے۔ وہ مجھ سے مشورہ لینا چاہتا تھا کہ وہ یہ غلط رپورٹ کس طرح لکھے اور پردہ کس طرح ڈالے"

"شاہ صاحب نے تھانیدار کی مُٹھی گرم کر دی ہو گی" — الطاف نے کہا۔

"یہ اُس نے مجھے تھوڑا ہی بتانا تھا" — ایوّب نے کہا — "میں بھی کسی کو نہیں بتا یا کرتا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ بشمبر داس نے شکار بھی مار لیا ہے اور جیب بھی گرم کر لایا ہے۔ میں نے اُسے مشورہ دے کر اُس کا حوصلہ پکا کر دیا اور کہا کہ اُوپر والوں کو مفرور ملزم چاہیئے .... لیکن اُس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ آدمی کون ہے جس نے تھانے اطلاع دی تھی"

"اب سکندر کو کہاں لے جائیں گے؟" — حمیداللہ نے ایوّب سے پوچھا۔

"یہاں تو نہیں رکھیں گے" — ایوّب نے جواب دیا — "میں معلوم کر لوں گا کہ اُسے کہاں اور کب بھیجا جائے گا"

ایوّب نے یہ پھُرتی دکھائی کہ اُسی روز وہ تھانے سے یہ اطلاع لے آیا کہ مجھے اپنی سپیشل برانچ کے ہیڈ کوارٹر میں بھیجا جائے گا اور یہ تو ظاہر تھا کہ ریل گاڑی سے جانا تھا۔ پھر ایوّب ہر روز تھانے جاتا رہا اور اُسے تازہ بتازہ خبریں سناتا رہا۔

حمیداللہ، الطاف اور ایوّب نے مجھے راستے میں سے فرار کرانے کی یہ ترکیب سوچی جس پر عمل کر کے اُنہوں نے مجھے فرار کرایا تھا۔ یہ میں آپ کو سُنا چکا ہوں۔ حمیداللہ نے کہا تھا کہ گارڈ کو شراب سے مدہوش کیا جائے گا لیکن ایوّب کہتا تھا کہ یہ بڑی کچی بات ہے۔ اگر وہ لوگ شراب کے عادی ہوتے تو وہ اتنا مدہوش نہیں ہوں گے کہ اُن سے چابی لے لی جاتے اور اُنہیں پتہ نہ چلے۔

"میں تمہیں ایک چیز لا دوں گا" — ایوّب نے کہا — "وہ پوڈر کی شکل میں ہو گی۔ تھوڑی سی بھی کھانے میں ملا دو گے تو کام پورا کرے گی۔ اس کا ذائقہ محسوس نہیں ہو گا"

دوسرے دن وہ کسی حکیم یا نہ جانے کس سے یہ دوائی لایا تھا۔ یہ بھی ایوّب کا کمال تھا کہ مجھے رات کی گاڑی بتائی گئی تھی لیکن بھیجا شام کی گاڑی سے گیا تھا۔ ایوّب نے صحیح گاڑی معلوم کر لی تھی۔ اس گاڑی کی روانگی کے وقت کے مطابق حمیداللہ اور الطاف ریلوے سٹیشن چلے گئے اور اس گاڑی میں سوار ہو گئے تھے۔

حمیداللہ نے مجھے بتایا کہ ریلوے سٹیشن پر انہوں نے مجھے دیکھا تھا۔ میں انہیں نہیں دیکھ سکا تھا۔

۵

انہوں نے مجھے فرار تو کرا لیا تھا، اب مسئلہ اپنے ٹھکانے تک خیریت سے پہنچنے کا تھا۔ انگریز نے تو زمین کے نیچے بھی اُتر کر ہمیں ڈھونڈنا تھا۔ یہ اُس کے لئے معمولی چوٹ نہیں تھی۔ فرار کی اتنی دلیرانہ اور ایسی منظم واردات نے تو انگریزوں کو یقین دلا دینا تھا کہ یہ گروہ منظم، تربیت یافتہ اور خطرناک ہے اور اسے فوراً پکڑنا لازمی ہے۔ ہمیں تو ہر جھاڑی اور ہر درخت کو پولیس سمجھنا تھا۔

"سکندر!" —— حمیداللہ نے کہا —— "معلوم ہوتا ہے ہمیں اُس گاؤں سے نکلنا پڑے گا"۔

"کوئی خطرہ؟"

"ہاں" —— حمیداللہ نے کہا —— "مجھے کچھ ایسا شک ہونے لگا ہے کہ نئے نواب کو ہماری اس گاؤں میں موجودگی کا علم ہو گیا ہے"۔

"اگر ہوتا تو اب تک وہ چھاپہ مروا چکا ہوتا" —— میں نے کہا۔

"نہیں" —— حمیداللہ نے کہا —— "وہاب نواب کے ارادے معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس نے اس پختہ شک کا اظہار کیا ہے کہ نواب خود مجھ سے انتقام لے گا۔ اُس میں جوانی کا جوش ہے"۔

"لیکن اُس کی تمہارے ساتھ کیا دشمنی ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"میں نے اُس تک اپنی یہ دھمکی پہنچا دی تھی کہ تم نوابی کا تاج زیادہ دن اپنے سر پر نہیں رکھ سکو گے" —— حمیداللہ نے کہا —— "یہ بھی اُس پر بہت بڑی چوٹ ہے کہ جن انگریزوں نے اُسے نواب بنایا ہے، اُن کے ایک افسر کو تم قتل کر آئے ہو۔ تم ہی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ شہناز کو اپنی داشتہ سمجھنے لگا تھا اور سب سے بڑی دشمنی تو یہ ہے کہ وہ مجھے اپنی نوابی کے لئے خطرہ سمجھتا ہے"۔

"اس کی کوئی پیش بندی کر لینی چاہیئے" —— میں نے کہا۔

"میں بھی انہیں یہ کہہ رہا ہوں" —— الطاف نے کہا۔

"وہاں چل کر سوچ لیں گے" —— حمیداللہ نے کہا —— "لیکن وہ جگہ ہمیں چھوڑنی پڑے گی"۔

صبح کی روشنی طلوع ہوئی اور ہم چل پڑے۔ اپنے آپ کو چھپا کر چلنے کے لئے وہ علاقہ نہایت اچھا تھا۔ پہاڑیوں کے اندر چار پانچ جھونپڑوں کا ایک گاؤں تھا۔ دُور سے دیکھا۔ بڑے غریب سے لوگ تھے۔ ہم اُن کے پاس چلے گئے۔ انہیں بتایا کہ ہم شکار کے لئے آئے ہیں، کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ معلوم نہیں وہ ہندو تھے، مسلمان تھے یا کون تھے۔ اُنہوں نے پراٹھے پکائے اور ان کے ساتھ تین گلاس دُودھ ہمارے آگے رکھ دیا۔ ہم نے اُن کی توقع کے خلاف انہیں خاصے زیادہ پیسے دیئے اور وہاں سے چل پڑے۔

ایک جگہ ذرا خطرناک آگئی۔ یہ دریا کا پتن تھا۔ وہاں پہچانے جانے کا خطرہ تھا، لیکن دریا ساون کی وجہ سے سیلابی تھا اس لئے دریا کے پار جانے والوں کا زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ میری نظر سی آئی ڈی کی نظر تھی۔ میں اپنی طرف دیکھنے والے ہر آدمی کے چہرے کو غور سے دیکھتا تھا۔ تجربہ ہو تو جاسوس اور خفیہ پولیس کی نظریں اور چہرے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ خاصا دُور دراز کا دیہاتی علاقہ تھا۔ پولیس کو شاید ایسا کوئی شک نہیں تھا کہ ہم اتنی دُور نکل جائیں گے۔ یہ تو کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم گاڑی سے کس مقام پر اُترے تھے۔

ایک عجیب واقعہ ہو گیا

میں نے کہا ہے کہ میں پتن پر کھڑے لوگوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک آدمی کو دیکھا۔ قدآور آدمی تھا۔ جسم کچھ دُبلا تھا۔ رنگ اتنا سانولا کہ اسے سیاہ کہا جا سکتا تھا۔ چہرہ کرخت سا جیسے غصے میں ہو۔ اس کے سر پر کُلّے پر باندھی ہوئی ململ کی طُرّے دار پگڑی تھی۔ اُس نے گردن مصنوعی انداز سے اکڑا رکھی تھی۔ اُس کی چال ڈھال سے پتہ چلتا تھا کہ فوجی ہے یا پولیس کا آدمی۔ ایسی اکڑ فوجی یا پولیس والے کی ہی ہُوا کرتی تھی۔ اُس کی عمر چالیس سال سے اُوپر تھی۔

اُس کے ساتھ ایک لڑکی تھی جو معصوم سی دیہاتن تھی اور اُس کی عمر بمشکل سترہ سال ہو گی۔ اس کا رنگ صاف سُتھرا تھا اور یہ رنگ سفیدی مائل تھا۔

چہرے کے نقش ونگار تو اچھے تھے لیکن چہرے پر بھولپن زیادہ اچھا لگتا تھا۔ اُس کے کپڑے بتا رہے تھے کہ اس کی شادی ابھی ابھی ہوئی ہے یا کسی کی شادی پر جا رہی ہے یا کسی کی شادی سے آ رہی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

دریا کے پار جانے والے مسافر ابھی کھڑے تھے۔ دو بڑی کشتیاں دریا کے کنارے بندھی ہوئی تھیں۔ ملاّح آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ یہ کشتیوں کی باری کا جھگڑا تھا۔ مجھے وہ لڑکی اتنی اچھی لگی کہ میں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ کرخت صورت آدمی کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ آدمی اُس کا باپ بھی ہو سکتا تھا لیکن اتنی اچھی شکل اور رنگ والی لڑکی کا باپ اتنا کالا اور کرخت نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

وہ دونوں الگ تھلگ کھڑے تھے۔ آدمی نے لڑکی کی طرف دیکھا تو میں نے آدمی کے چہرے کو غصّے سے اور زیادہ مکروہ ہوتے دیکھا اور اس کے ہونٹ ہلے۔ وہ مجھ سے دُور تھے۔ میں سُن تو نہیں سکا لیکن یہ سمجھ گیا کہ آدمی نے لڑکی پر غصّہ جھاڑا ہے۔ لڑکی جلدی سے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اُس نے لڑکی کو شاید آنسو پونچھنے کو ہی کہا ہوگا۔

ملاحوں نے فیصلہ کر لیا کہ کونسی کشتی پار جائے گی۔ اُنہوں نے ایک کشتی کی طرف اشارہ کر کے مسافروں سے کہا کہ کشتی میں بیٹھ جائیں۔ مسافر کشتی میں بیٹھنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ وہ آدمی چل پڑا لیکن لڑکی نہ چلی۔ آدمی نے پیچھے دیکھا اور لڑکی تک جا کر اُس کا بازو پکڑا اور اُسے گھسیٹا۔ لڑکی پاؤں آگے نہیں اُٹھا رہی تھی مگر اُس آدمی کے ایک جھٹکے سے لڑکی چل پڑی۔ وہ لڑکی کو گھسیٹتا ہُوا کشتی میں لے گیا۔

مَیں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ ان کے پیچھے گیا اور اس آدمی اور لڑکی کے سامنے بیٹھ گیا۔ لڑکی نے گھونگھٹ لٹکا کر سر جھکا لیا تھا۔ اُس کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ اتنا پتہ چلتا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ آدمی مسافروں کے سامنے لڑکی کو ڈانٹ کر چُپ نہیں کرا سکتا تھا لیکن غصّے نے اُس کے چہرے کو بگاڑ دیا تھا۔

کشتی چل پڑی۔

”بھائیو!“ —— ایک ملاّح نے اعلان کے انداز سے کہا —— ”خُدا کو یاد کرتے جانا، دریا سیلابی ہے۔“

سیلاب کی وجہ سے کشتی میں مسافر کم تھے۔ اُنیس بیس ہوں گے۔ لڑکی کے ساتھ والا آدمی حمیداللہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہُوئے تھا۔

”بھائی صاحب!“ —— میں نے اس آدمی کی نظریں حمیداللہ خان سے ہٹانے کے لئے اُس سے پوچھا —— ”آپ نے پہلے کبھی سیلاب میں دریا پار کیا ہے؟“

”کئی بار کیا ہے“ —— اُس نے جواب دیا اور پھر حمیداللہ کو دیکھنے لگا۔

وہ حمیداللہ خان کی طرف جُھک گیا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ —— اُس نے حمیداللہ سے پوچھا۔

”جمال بخت!“ —— حمیداللہ خان نے اپنا نام غلط بتا کر کہا —— ”فرمایئے ..... آپ کو شاید شک ہے کہ ہماری پہلے بھی کبھی ملاقات ہوئی ہے .... آپ کا شُغل؟“

”میں فوج میں ہوں“ —— اُس نے جواب دیا —— ”رسالے میں دفعدار ہوں .... مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں نے پہلے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟“

حمیداللہ خان نے غلط جگہ بتا کر کہا کہ وہ وہاں کا رہنے والا ہے۔

”کیا آپ اُس آدمی کا نام جانتے ہیں جس کی غلط فہمی میں آپ نے مجھ سے نام پوچھا ہے؟“ —— حمیداللہ نے پوچھا۔

”بڑی اچھی طرح جانتا ہوں“ —— اُس نے کہا —— ”اُس کا نام حمیداللہ خان ہے۔ وہ نوابزادہ ہے“ —— وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا —— ”آپ کوئی اور ہیں۔ آپ کی شکل وصورت اُس سے بہت ملتی ہے۔“

”آپ اُسے کہاں ملے تھے؟“ —— حمیداللہ خان نے پوچھا۔

"نہیں نہیں" ——— اُس نے ٹالنے کے انداز سے کہا ——— "آپ وہ نہیں ....معافی چاہتا ہوں۔"

ملاح بڑے لمبے بانس سے کشتی کھے رہا تھا اور کشتی کو سیلاب آگے بڑھنے نہیں دے رہا تھا۔ میں اس آدمی کو بار بار دیکھتا تھا جس نے حمیداللہ خان سے نام پوچھا تھا۔ جب حمیداللہ دوسری طرف دیکھ رہا ہوتا تو یہ آدمی حمیداللہ کو غور سے دیکھتا اور کبھی اُسے سر سے پاؤں تک دیکھتا۔

مجھے اس آدمی پر شک گزرا۔ اُس نے حمیداللہ خان کو ہی کہیں دیکھا تھا اور اب اُسے پہچان لیا تھا۔ وہ جس انداز سے اور جس طرح غور سے حمیداللہ خان کو دیکھتا تھا اس سے میرا شک پختہ ہونے لگا کہ یہ پولیس کا آدمی ہے۔ اُس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ میری طرف دیکھا ہی نہ تھا۔

کشتی میں بہت جگہ خالی تھی۔ میں حمیداللہ خان اور الطاف کے قریب سے سرکتا ہوا پرے چلا گیا اور اس آدمی کو دیکھنے لگا۔ وہ حمیداللہ خان کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ وہ میری طرف دیکھے۔ مجھے بہت انتظار کرنا پڑا۔ اُس کی نظریں میری طرف گھومیں تو میں نے اُسے سر سے اشارہ کیا کہ میرے پاس آئے۔ وہ آگیا۔

"آپ اس آدمی کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے؟" ——— میں نے نہایت دبی ہوئی آواز میں اُس سے پوچھا۔

"کیوں؟" ——— اُس نے پوچھا ——— "آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اس لئے کہ میں بھی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں" ——— میں نے کہا ——— "مجھے یہ آدمی مشکوک نظر آتا ہے۔"

"کیا یہ آپ کے ساتھ نہیں؟" ——— اُس نے پوچھا۔

"نہیں" ——— میں نے جواب دیا ——— "میں انہیں راستے میں ملا تھا... آپ کو کیا شک ہے؟ یہ کوئی مفرور ملزم تو نہیں؟ میں نے ایک تھانے میں اس کی تصویر لگی دیکھی تھی۔ کبھی یقین ہو جاتا ہے کہ وہ تصویر اسی کی تھی۔"

اس شخص کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں۔ میں جو جاننا چاہتا تھا وہ جان لیا ———

وہ حمیداللہ خان میں دلچسپی لے رہا تھا ——— میں یہی جاننا چاہتا تھا۔ مجھے شک ہونے لگا تھا کہ پولیس کا آدمی ہے لیکن وہ کہتا تھا کہ وہ فوج میں دفعدار ہے۔

"میں نے بھی نوابزادہ حمیداللہ خان کی تصویر ایک تھانے میں دیکھی تھی" ——— اُس نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ حمیداللہ خان کے لئے گورنمنٹ نے انعام کا اعلان کیا ہے" ——— میں نے کہا ——— "کیا آپ کو معلوم ہے؟"

"ہاں!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "لیکن انعام صرف پولیس والوں کو ملے گا اور ترقی بھی ملے گی۔ گورنمنٹ نے ابھی پبلک کے لئے کوئی انعام مقرر نہیں کیا۔"

"آپ کو کس طرح معلوم ہوا ہے؟"

"آنند بستی کے تھانے میں ایک ہیڈ کانسٹیبل میرا دوست ہے؟" ——— اُس نے جواب دیا ——— "اُس نے بتایا تھا... اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ پولیس کا ایک سب انسپکٹر ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کر کے رُوپوش ہو گیا ہے۔"

"اُس کا نام بتایا تھا آپ کے دوست نے؟" ——— میں نے پوچھا۔

"ہاں!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "اُس کا نام سکندر ہے۔"

اُس کی بھی تصویر اس تھانے میں آئی ہوگی؟

"نہیں" ——— اُس نے جواب دیا ——— "ابھی صرف حُلیہ آیا ہے، تصویر نہیں آئی .... اور اُس کے گھر کا ایڈریس آیا ہے" ——— اُس نے ایک اور بات کہہ کر مجھے ہلا ڈالا۔ اُس نے حمیداللہ کی طرف اشارہ کر کے کہا ——— "اس کے پاس جو رائفل ہے یہ شکاری رائفل نہیں یہ سرکاری رائفل ہے۔ اس پر ایک نشان ہے جو پولیس کا ہے۔ یہ کسی تھانے سے نکالی ہوئی رائفل ہے۔"

یہ سُن کر مجھے اپنی حماقت کا خیال آیا۔ ہم تو چاروں رائفلیں ساتھ لانا چاہتے تھے لیکن ایک ہی لائے اور یہ نہ سوچا کہ یہ اتنی بڑی رائفل ہے، پستول تو نہیں کہ شلوار میں اُڑس لیں گے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں حمیداللہ خان کے ہاتھ سے

رائفل لے کر دریا میں پھینک دیتا۔ وہ تو رائفل ہاتھ میں لئے شکاری نوابزادہ بنا ہُوا تھا۔

یہ آدمی مجھے فوجی نہیں لگتا تھا۔ پولیس کا آدمی تھا یا پولیس کا مخبر تھا۔ میں یہ سُن کر حیران نہیں ہُوا تھا کہ میرا حُلیہ اور ایڈریس اتنی دُور کے تھانوں میں پہنچ گیا تھا۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔

یہ شخص ہمارے لئے بہت بڑا خطرہ تھا۔ وہ حمیداللہ خان سے نظریں نہیں ہٹا رہا تھا۔ اُس نے دریا پار کرتے ہی حمیداللہ کو شک میں پکڑوا دینا تھا۔ حمیداللہ نے غلطی تو یہ کی تھی کہ پورے بہروپ میں نہیں تھا۔ اس آدمی کے سامنے میں اُسے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ہوشیار ہو جاتے مگر وہ ہوشیار کیسے ہوتا، رائفل اُسے کس طرح ہوشیار ہونے دیتی؟ اب تو ایسے لگ رہا تھا جیسے اس رائفل کی نالی حمیداللہ کے سینے کے ساتھ لگی ہُوتی ہے اور آواز آ رہی ہے ——— "ہینڈز اَپ"۔

"یہ لڑکی آپ کی بیٹی ہے یا بہن ہے؟" ——— میں نے اس آدمی سے پوچھا۔

"لاحول ولا!" ——— اُس نے کہا ——— "یہ میری بیوی ہے"۔

مجھے لڑکی پر ترس آنے لگا۔ وہ تو لڑکی کے باپ کی عمر کا تھا اور اتنا ہی مکروہ صورت تھا جتنی لڑکی معصوم سی اور بھولی بھالی سی تھی۔

"آپ نے شاید نئی نئی شادی کی ہے" ——— میں نے کہا ——— "پہلی بیوی؟"

"طلاق دے دی ہے" ——— اُس نے گردن اکڑا کر کہا ——— "فضول سی عورت تھی۔ شکل وصورت بھی ایسی ویسی ہی تھی"۔

۵

مجھے اس کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس کی پہلی بیوی کیسی تھی اور اُس نے کمسن لڑکی کے ساتھ شادی کر کے اچھا نہیں کیا۔ میرے دماغ پر تو یہ شخص ایک بڑا ہی ٹیڑھا مسئلہ بن کر سوار ہو گیا تھا۔ اس نے حمیداللہ خان کو پہچان لیا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ دریا کے پار جا کر اس سے کس طرح بچ سکتے ہیں۔

وہ اپنی بیوی کے پاس جا بیٹھا اور حمیداللہ کو دیکھنے لگا۔

اچانک کشتی اُوپر کو اُٹھی اور ہچکولے کھانے لگی۔ دریا کناروں پر چڑھا ہُوا تھا۔ ہم ابھی دریا کے درمیان تھے۔ کشتی کنارے کی طرف کم اور دریا کے بہاؤ کے ساتھ زیادہ جا رہی تھی۔

"پانی چڑھ رہا ہے بھائیو!" ——— ملاح نے اعلان کیا ——— "اللہ کو یاد کرو"۔

اب دونوں ملاح بانس دبا دبا کر کشتی کو کنارے کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پانی اتنا چڑھ گیا تھا کہ اب بانسوں کے اُوپر والے سرے ملاحوں کے ہاتھوں میں رہتے تھے اور بانس پانی میں چلے جاتے تھے۔ دریا کی تہہ بہت نیچے چلی گئی تھی۔

خطرہ یہ تھا کہ وہاں دریا کا پاٹ تنگ تھا۔ علاقہ میدانی ہوتا تو سیلاب کناروں سے باہر چلا جاتا اور اس کا زور ٹوٹ جاتا۔ وہ پہاڑی علاقہ تھا اور جدھر سے دریا آ رہا تھا وہ تو بڑے پہاڑوں کا کوہستان تھا۔ وہاں مینہ برستا تھا اور سیلاب اتنی تیزی سے آتا تھا کہ راستے میں آنے والے علاقوں کے لوگوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

جس کشتی میں ہم دریا پار کر رہے تھے اس کے ملاحوں نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ پیٹ کی خاطر خطرے مول لینے ہی پڑتے ہیں۔ سیلاب کی وجہ سے پتن کی رونق ختم ہو گئی تھی۔ کوئی بہت ضروری کام والا مسافر کشتی میں سوار ہوتا تھا۔ ملاحوں نے اپنے بچوں کے پیٹ تو بھرنے ہی تھے۔ پچاس مسافروں کی کشتی کے لئے پانچ سات مسافر مل جاتے تو ملاح انہی کو لے کر کشتی سیلابی دریا میں ڈال دیتے تھے۔ یہ کشتیاں تیل پٹرول سے تو نہیں چلتی تھیں۔ ملاحوں کی اپنی جسمانی توانائی صرف ہوتی تھی۔

کشتیاں بیچ دریا میں اُلٹتی بھی رہتیں اور مسافر ڈوبتے بھی تھے مگر پار جانے کا اور کوئی ذریعہ بھی نہ تھا۔ ایک ہی پُل تھا جو وہاں سے کم از کم پندرہ میل

دُور تھا۔ اُوپر ریل کی پٹڑی اور نیچے سڑک تھی۔ ملاحوں نے اُس روز ہمیں بھی خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اوپر پہاڑیوں پر مینہ برسا ہوگا۔ سیلاب میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ کشتی ملاحوں کے دو بانسوں پر زور دینے کے باوجود سیلاب کے ساتھ جا رہی تھی۔ ملاح اتنا زور لگاتے تھے جیسے وہ بانسوں کے ساتھ ہی دریا میں چلے جائیں گے مگر اب کشتی ان کے قابو سے نکل گئی تھی۔

کشتی کو لہریں اُوپر اُٹھا اُٹھا کر پھینکتی تھیں اور کشتی اتنی زیادہ دائیں اور بائیں کو جھکتی تھی کہ پانی اس کے کناروں سے اندر آجاتا تھا۔ مسافروں نے اُونچی آواز سے کلمہ شریف کا وِرد شروع کر دیا۔ دو دو مسافر دونوں ملاحوں کے پاس چلے گئے۔ اس طرح دونوں بانسوں کو تین تین آدمی تہہ میں دباتے اور کشتی کو دریا کے درمیان سے نکالنے کی کوشش کرتے تھے مگر بے سُود۔ سیلاب کشتی کو اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔



مسافر یوں پٹخے جا رہے تھے جیسے ڈبے میں دو چار چیزیں پڑی ہُوئی ہوں اور ڈبے کے اُلٹا سیدھا ہونے سے چیزیں اُلٹ پلٹ ہو رہی ہوں۔ مسافر اس طرح ایک دوسرے پر پٹخے جا رہے تھے جیسے کوئی دیو انہیں اُٹھا اُٹھا کر پھینک رہا ہو۔ لڑکی اور اُس کا خاوند تین چار بار ہم پر گرے اور ہم اُن پر جا پڑے۔

"آپ فوجی جوان ہیں"— میں نے لڑکی کے خاوند سے کہا —"آپ میں بڑی طاقت ہے۔ بانسوں پر آدمی تھک گئے ہیں۔ میرے ساتھ آئیں ہم دونوں بانس پکڑ لیتے ہیں۔"

بات گلا پھاڑ کر کرنی پڑتی تھی۔ ایک تو سیلاب کا شور تھا اور اس کے ساتھ مسافروں کا واویلا تھا۔ وہ اس قدر خوفزدہ ہو گئے تھے کہ اُنہوں نے کلمہ پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور شور بپا کر رہے تھے۔ میں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر کمسن لڑکی کے سیاہ رُو خاوند کو اتنی ہوا دی کہ وہ بھرے ہُوئے غبارے کی طرح پھٹنے پر آگیا اور وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ یہ مرد کی فطرت کا مظاہرہ تھا۔ میں نے اُس کی جو تعریفیں کی تھیں وہ اُس کی نئی دلہن بھی سُن رہی تھی۔ خاوند اُس کو دکھانے کے لئے کہ وہ طاقت کے لحاظ سے نوجوان ہے اُٹھا تھا۔ اُس کے ساتھ میں بھی اُٹھا۔

ہچکولا آیا تو ہم دونوں گر پڑے۔ وہ اُٹھا اور کشتی کے ایک سرے کی طرف چلا گیا۔ میں اُٹھا اور دانستہ حمیداللہ خان پہ گرا۔ اُس نے مجھے سہارا دیا۔

"کیا حماقت کر رہے ہو"— اُس نے مجھے ڈانٹتے ہُوئے کہا —"یہیں بیٹھے رہو۔ وہاں ملاحوں تک نہ چلے جانا۔"

"رائفل دریا میں پھینک دو"— میں نے اُسے کہا —"اس آدمی کو شک ہو گیا ہے۔ کشتی میں کھڑے ہو جاؤ.... کنارے پر.... کشتی زور سے ہچکولا کھائے گی تو رائفل ہاتھ سے چھوڑ دینا۔ راؤنڈ بھی پھینک دینا۔ میں اسے کچھ دیر اُدھر ہی رکھوں گا۔"

ساون کے بادل تو چھاتے ہی ہوتے تھے۔ اُن علاقوں میں ساون بہت برستا تھا۔ اچانک بادل مل کر گھٹا بن گئے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ندی نالے بہہ نکلے اور دریا میں گر کر سیلاب میں اضافہ کرنے لگے۔ گھٹا نے دنیا اندھیر کر دی۔

میں گرتا پڑتا کشتی کے آگے والے سرے پہ گیا۔ دو ملاح اور ان کے ساتھ چار آدمی تھے۔ ایک ملاح اور دو آدمی ایک بانس کو پکڑے ہُوئے تھے اور ایک ملاح اور دو آدمی دوسرے بانس کے ساتھ تھے۔ وہاں اتنے زیادہ آدمیوں کے کھڑا ہونے کی جگہ نہیں تھی۔ یہ تکون جگہ تھی۔ اس کے ارد گرد کوئی جنگلا یا رکاوٹ نہیں تھی۔

وہ سب بانسوں پر زور لگا رہے تھے لیکن سیلاب کشتی کو چھوڑ نہیں رہا تھا۔ مجھے اپنا، حمیداللہ خان اور الطاف کا کوئی غم نہیں تھا۔ ہم تیرنا جانتے تھے۔ اگر ہم ڈوب کر مر بھی جاتے تو کیا ہو جاتا۔ صرف شہناز تھی جو بیوہ ہو جاتی۔ میرے پیچھے نہ کوئی بیوہ ہونے والی تھی نہ کوئی یتیم ہونے والا تھا۔ میں پورے اطمینان میں تھا۔ اگر غم تھا تو صرف یہ تھا کہ ہم زندہ گرفتار نہ ہو جائیں۔

لڑکی کا خاوند اُوپر سکون جگہ پر چلا گیا تھا۔ میں اُسے وہیں رکھنا چاہتا تھا تاکہ اتنی دیر میں حمید اللہ خان رائفل اور راؤنڈ پھینک دے۔ میں جب اُس جگہ پر چڑھنے لگا تو دریا کا موڑ آگیا۔ ایک طرف کا کنارا چٹانی تھا اور سیلاب کا زور اس قدر زیادہ تھا کہ کشتی کنارے سے ٹکرائی اور پیچھے ہوتی واپس آتی اور ایک پہلو سے اُٹھی۔ ایک آدمی جو ملاحوں کو بانس دبانے میں مدد دے رہا تھا گھوم کر گرا اور دریا میں جا پڑا۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُسے سیلاب سے بچایا جائے۔ وہ لہروں میں دو تین بار دکھائی دیا اور غائب ہوگیا۔

اس آدمی کو دریا میں گرتا دیکھ کر میرے دماغ پر ایسا اثر ہُوا کہ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ میری فطرت ہی بدل گئی ہے اور میں نہ جانے کیا بن گیا ہوں۔ میں اوپر چلا گیا۔ لڑکی کا خاوند ایک ملاح کے ساتھ لگے ہوئے دو مسافروں کو پیچھے ہٹا رہا تھا۔

"تم دونوں ہٹ جاؤ" ——— میں نے اُن دو آدمیوں سے کہا ——— "تم بہت تھک گئے ہو۔"

"بیکار ہے مولوی صاحب!" ——— ملاح نے میری داڑھی دیکھ کر مجھے مولوی کہا۔ وہ کہہ رہا تھا ——— "بیکار زور لگا رہے ہیں۔ ڈیڑھ دو میل آگے پاٹ کھُل جاتا ہے۔ وہاں سیلاب پھیل کر کمزور ہو جاتا ہے۔ وہاں سے کنارے پر پہنچ جائیں گے۔"

"آؤ دفعدار صاحب!" ——— میں نے لڑکی کے خاوند سے کہا ——— "پکڑو بانس کو .... کوشش کرتے ہیں۔"

وہ آگے بڑھا۔ کشتی اُوپر اُٹھی پھر ایک طرف جھُکی۔ میں نے اس آدمی کو کشتی کے کنارے کی طرف کر دیا اور خود اُس کے ساتھ لگ گیا۔ کشتی لہروں کے رحم وکرم پر تھی۔ ایک طرف جھُکی اور بڑی زور کے ہچکولے سے مُڑی تو میں نے اُس آدمی کو اپنے کندھے اور کولہے سے دھکا دیا۔ وہاں تو ہلکے سے دھکے کی ضرورت تھی۔ دیکھنے والے تو بہت تھے لیکن کسی کو دیکھنے کی ہوش اور مہلت نہیں تھی۔

نفسانفسی کا عالم تھا۔

"اُسے پکڑو، گر رہا ہے" ——— ایک آدمی نے گھبرا کر کہا۔

وہ گر چکا تھا اور سیلاب کی ہیبت ناک موجیں اُسے نگل لینے کو لپک رہی تھیں۔ تیز بارش میں زیادہ دُور تک نظر نہیں آتا تھا اور اُس کے زندہ نکل جانے والا معاملہ بہت ٹیڑھا تھا۔

"اپنی جانیں بچاؤ" ——— ایک ملاح نے کہا ——— "چھوڑ دو بانسوں کو، پیچھے جاؤ۔ دو آدمی ضائع ہو چکے ہیں۔"

۶

ہم سب واپس آگئے۔ کشتی مضبوط تھی ورنہ اس کے تختے کھُل جاتے۔

ڈوبنے والے خاوند کی دلہن کانپ رہی تھی اور ہر ہچکولے کے ساتھ اِدھر اُدھر لڑھکتی تھی۔ اُسے ابھی معلوم نہیں تھا کہ اُس کا خاوند سیلاب میں گر پڑا ہے۔ خوف زدگی کی حالت میں وہ اپنے خاوند کی ہی پناہ لے سکتی تھی۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔

اُس نے دیکھا تھا کہ اُس کا خاوند میرے ساتھ گیا تھا۔

"وہ کہاں ہیں؟" ——— اُس نے اپنے خاوند کے متعلق مجھ سے پوچھا۔

"وہ دریا میں گر پڑا ہے" ——— میرے مُنہ سے نکل گیا ——— "ڈرو نہیں۔ کشتی نہیں ڈوبے گی۔"

اُس کا ردِعمل یہ تھا کہ اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں پھر اُس کا مُنہ کھُل گیا اور اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ بارش سے اُس کے کپڑے اُس کے جسم کے ساتھ چپک گئے تھے۔ کشتی نے اتنے زور سے کروٹ بدلی کہ لڑکی اُٹھی ہُوئی میرے اُوپر آ پڑی۔ میں نے اُسے سہارا دے کر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

"ڈرو نہیں" ——— میں نے کہا۔

"اب میں کہاں جاؤں گی؟"

"اپنے گھر جاؤ گی" ——— میں نے کہا اور اُس سے پوچھا ——— "کشتی میں تمہارے

گاؤں کا کوئی آدمی ہے؟"

"دو ہیں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "ایک عورت بھی ہے"۔

"اُن کے ساتھ چلی جانا"۔۔۔ میں نے کہا۔

وہ موقع ایسی ہی چھوٹی سچی تسلیوں کا تھا اور یہ زیادہ باتوں کا موقع نہیں تھا۔

ملاحوں نے بانس بیکار سمجھ کر ہاتھوں میں لے لئے اور بیٹھ گئے تھے۔ کشتی تو پہلے ہی سیلاب کے رحم و کرم پر تھی۔ تھوڑا اور فاصلہ اسی طرح اُٹھتے، گرتے اور لڑھکتے طے ہو گیا اور اس کے بعد ذرا سکون ہو گیا۔ کنارے دُور ہٹتے جا رہے تھے۔ ملاح اُٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں نے بانس پانی میں ڈالے۔ جب اُوپر سے بانسوں پر جسم کا دباؤ ڈالا تو کشتی ذرا سی اُدھر کو ہو گئی جدھر وہ کرنا چاہتے تھے لیکن سیلاب ابھی کشتی کو پوری طرح نہیں چھوڑ رہا تھا۔

کشتی کے اندر اتنا پانی آ گیا تھا کہ ٹخنے ڈوب جاتے تھے۔ کچھ دریا کا پانی اُچھل اچھل کر اندر آیا تھا باقی بارش کا پانی تھا۔ بارش ابھی تھمی نہیں تھی، ذرا کم ہو گئی تھی۔ اب یہ امید بندھ گئی تھی کہ کشتی کنارے لگ جائے گی لیکن ہمارا مسئلہ صرف کنارے لگنا نہیں تھا۔ ہماری ضرورت یہ تھی کہ کشتی ایسی جگہ کنارے لگے جو ویرانہ ہو، قریب کوئی آبادی نہ ہو۔

حمید اللہ خان نے رائفل دریا کے حوالے کر دی اور راؤنڈ بھی گرا دیئے تھے۔ مسافروں نے کشتی میں اپنی جو حالت بنا رکھی تھی اور جس طرح وہ لڑھکنیاں کھا رہے تھے اس سے حمید اللہ نے فائدہ اُٹھایا اور رائفل اور ایمونیشن کسی کو نظر آئے بغیر دریا بُرد کر دیا تھا۔

اب ایک ایک آدمی دونوں ملاحوں کے ساتھ لگ گیا۔ وہ مل کر زور لگاتے تھے تو کشتی پر اس کا اثر صاف معلوم ہوتا تھا۔ ایک مسافر نے اُس طرف دیکھا جدھر دریا جا رہا تھا۔

"کوشش کرو یہیں سے کشتی کنارے لگ جائے"۔۔۔ اُس نے ملاحوں سے کہا ۔۔۔ "آگے دریا پھر تنگی میں جاتا ہے"۔

"ہمیں معلوم ہے"۔۔۔ ایک ملاح نے کہا ۔۔۔ "انشاء اللہ ہم پہلے ہی کنارے لگ جائیں گے"۔

اللہ نے کرم کیا۔ کشتی کنارے سے لگ گئی۔ مسافر اُترنے لگے۔ وہ کوئی پتن نہیں تھا۔ کیچڑ تھا اور آگے گھاس تھی، درخت تھے اور علاقہ ویران تھا۔ بارش پھوہار بن گئی۔

لڑکی کو میں نے اپنے ساتھ رکھا۔ اُس کے رویے سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میرے ساتھ مانوس ہو گئی ہو۔ وہ میرا بازو پکڑ کر کشتی سے اُتری۔ میں اُسے کیچڑ میں سے گزار کر آگے لے گیا اور میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ دو آدمی اُس کے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ اُس نے ایک عورت کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ بھی اُس کے گاؤں کی رہنے والی ہے۔

"کیا وہ ڈوب کر مر گیا ہے؟"۔۔۔ لڑکی نے پوچھا۔

"ایسے سیلاب سے کوئی نہیں نکل سکتا"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "وہ پتن پر تمہیں کھینچ کھینچ کر کشتی تک لایا تھا۔ تم اُس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھیں؟"

"وہ مجھے اپنے گھر لے جا رہا تھا"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "ہماری شادی ہوئے ابھی آٹھ دن گزرے ہیں"۔

وہ دیہاتن تھی اور دیہاتی بے تکلفی سے بول رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کے ماں باپ نے اُسے اتنی بڑی عمر اور ایسے بدصورت آدمی کے ساتھ کیوں بیاہ دیا ہے؟

"پیسہ!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "میرے باپ نے اس کا پیسہ کھایا ہے اور دوسری وجہ یہ ہوتی کہ یہ وحشی آدمی پولیس میں حوالدار تھا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ پولیس کا کتنا رُعب ہوتا ہے"۔

"اچھا؟"۔۔۔ میں نے پوچھا ۔۔۔ "یہ فوج میں نہیں تھا؟"

"نہیں!"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "پولیس میں تھا۔ دس بارہ دنوں کی چھٹی آیا ہوا تھا اور مجھے اُس نے اپنے ساتھ لے جانا تھا"۔

"خدا نے تمہاری فریادیں سُن لی ہیں"۔۔۔ میں نے کہا۔

"اگر وہ واقعی ڈوب کر مر گیا ہے تو اُسے صرف میری آہ نہیں پڑی" —— اُس نے کہا —— "اسے آہ تو اُس عورت کی پڑی ہے جسے اس نے کسی قصور کے بغیر طلاق دی ہے۔"

"میں تمہیں تمہارے گاؤں کے آدمیوں کے حوالے کر دیتا ہوں" —— میں نے اُسے کہا —— "وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"میرا باپ پھر پیسہ کھا کر مجھے کسی ایسے ہی آدمی کے حوالے کر دے گا" —— اُس نے کہا۔

اس کا میرے پاس تو کوئی علاج نہیں تھا۔ میں اُس کے باپ کو یہ سمجھانے کے لئے اُس کے گاؤں نہیں جا سکتا تھا کہ وہ پھر کسی آدمی سے پیسے لے کر اپنی لڑکی کی شادی اُس کے ساتھ نہ کرا دے۔ لڑکی خوش تھی کہ وہ بیوہ ہو گئی ہے اور اصل خوشی تو مجھے تھی کہ میں نے ایک خطرے کو راستے سے ہٹا دیا تھا۔ وہ پولیس کا ہیڈ کانسٹیبل تھا مگر اُس نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ فوج میں دفعدار ہے۔

میں نے لڑکی کے گاؤں کے دونوں آدمیوں اور عورت کو بلایا اور لڑکی اُن کے حوالے کر دی۔ وہ اچھے لوگ معلوم ہوتے تھے۔

*

ہمیں پتہ چلا کہ ہم پتن سے چودہ پندرہ میل دُور ہو گئے ہیں۔ ہم نے ملاحوں سے پوچھا کہ قریب کوئی گاؤں یا قصبہ ہے؟

دو میل دُور ایک بڑا گاؤں بتایا گیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہُوا کہ ہم مین لائن کے قریب آ گئے ہیں۔ ہمارے کپڑے بھیگے ہُوئے تھے۔ انہیں خشک کرنا تھا اور آبادیوں سے دُور رہنا تھا۔ ہم کشتی کے مسافروں کو اس پریشانی میں چھوڑ کر چل پڑے کہ وہ واپس کس طرح جائیں گے۔

کیچڑ زیادہ ہو گیا تھا۔ اچھی طرح چلا نہیں جاتا تھا۔ بھوک نے بھی تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمیں ایک نقصان کا احساس ہُوا۔ کشتی میں سیلاب کے چھینٹے ہم پر پڑتے رہے تھے۔ بارش نے تو ہمیں کپڑوں سمیت نہلا دیا تھا اور

دریا سے نکل کر ہم کیچڑ میں جا رہے تھے۔ کپڑوں کا ایسا بُرا حال ہو گیا تھا کہ اب ہم معزز آدمی نہیں لگتے تھے۔

"نوابزادے!" —— میں نے حمید اللہ خان سے کہا —— "تم بچانے گئے تھے۔ اب ہمیں زیادہ محتاط ہونا پڑے گا۔"

"خدا نے یہ مدد تو کی کہ وہ ڈوب مرا ہے" —— الطاف نے کہا۔

"مدد تو خدا کی ہی ہوتی ہے" —— میں نے کہا —— "لیکن اُسے میں نے دھکا دیا تھا۔ اگر میں اس لڑکی کو بتاتا کہ اِس خاوند سے اُسے میں نے نجات دلائی ہے تو وہ بہت دعائیں دیتی۔"

میرے دونوں ساتھی بہت ہنسے لیکن میں مُسکرایا بھی نہیں۔ میں کسی کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ہم پگڈنڈی پر جا رہے تھے۔ بارش رُک گئی تھی اور دُھوپ نکل آئی تھی۔ وہ علاقہ کھڈ نالوں کا تھا۔ چُھپ کر بیٹھنے کی جگہیں بہت تھیں۔ پہلا مسئلہ روٹی کا تھا۔ ہمیں گاؤں نظر آنے لگا۔ ہم کچھ اور آگے جا کر ایک جگہ بیٹھ گئے اور الطاف سے کہا کہ وہ گاؤں سے روٹی لے آئے۔ وہ اشتہاری مجرم نہیں تھا اس لئے اُسی کا جانا بہتر تھا۔

وہ چلا گیا تو میں نے اور حمید اللہ خان نے ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہو کر کپڑے اُتارے اور نچوڑ کر پھیلا دیئے۔ ہم دونوں بالکل ننگے تھے۔ مجھے اُس دَور کے انسان یاد آ گئے جو حیوانوں کی طرح ننگے رہتے تھے۔ وہ ہم سے اچھے تھے۔ سب ایک جیسے تھے۔ اُن میں کوئی نواب نہیں تھا اور کوئی حاکم اور محکوم نہیں تھا۔ دولت نہیں تھی اس لئے لالچ بھی نہیں تھا۔ سب آزاد تھے۔ کوئی کسی کا غلام نہیں تھا۔

"سکندر!" —— حمید اللہ خان نے کہا —— "کپڑے پھاڑ کر ایک ایک ٹکڑا کمر سے باندھ لیتے ہیں اور سارے جسم پر، سَر اور مُنہ پر کیچڑ مل لیتے ہیں اور سیدھی سڑک پر چل پڑتے ہیں۔ لوگ ہمیں پاگل سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے۔ ہمیں اچھی طرح پہچاننے والے بھی نہیں پہچان سکیں گے۔"

"پہچان تو نہیں سکیں گے" — میں نے کہا — "لیکن پولیس پکڑ کر پاگل خانے بھیج دے گی۔ وہاں سے تو کوئی نہیں نکلنے دے گا۔"

۞

الطاف روٹیاں لے کر آگیا۔ اُس نے مٹی کا ایک پیالہ خرید لیا اور مٹی کی ایک ڈولی میں پانی بھی لے آیا تھا۔

کھانا کھا کر ہم نے کپڑے پہن لئے اور چل پڑے۔ تھکن بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی لیکن وہاں رُکنا ٹھیک نہیں تھا۔ آرام صرف رات کو کرنا تھا۔ ہم اس کوشش میں تھے کہ چار پانچ دن میں ریلوے لائن سے دُور دُور رہیں۔ ہم جانتے تھے کہ ریل گاڑیوں کی اور لاریوں وغیرہ کی چیکنگ ہو رہی ہوگی۔

چھُپ چھُپ کر چلنے کے لئے یہ علاقہ موزوں تھا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، ٹیکریاں اور ٹیلے تھے اور یہ علاقہ جنگلاتی تھا۔ ساون کی وجہ سے گھاس اونچی تھی اور جگہ جگہ سرکنڈے بھی تھے۔ ہم ان میں چلتے گئے کچھ برساتی نالے جن میں سیلابی پانی تھا، پار کئے۔ پانی تیز تو تھا لیکن گہرا نہیں تھا۔

ہم گیں ہانکتے چلے گئے اور سورج غروب ہوگیا۔ اب ہمیں پھر بھوک نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ اردگرد کوئی گاؤں نظر نہیں آتا تھا۔ الطاف نے ایک بلند چٹان پر چڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے بہت دُور دھوآں سا اُٹھتا نظر آیا۔ وہ کچھ کھانے کے لئے لانے چلا گیا۔

وہ علاقہ دیہاتی تھا۔ ہمارا حُلیہ ایسا تھا کہ جو بھی ہمیں دیکھتا وہ شک کرتا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ ہم نہ دیہاتی لگتے تھے نہ شہری۔ یہ ہمارے لئے بہت بڑی مشکل ہوگئی تھی۔ الطاف کو ہم نے پہلے بھی کھانا لانے کے لئے بھیجا تھا تو ہمیں پریشانی سی ہوگئی تھی کہ وہ شک میں ہی پکڑا نہ جائے۔ اب پھر ہم پریشان ہونے لگے کہ الطاف چلا تو گیا ہے، معلوم نہیں واپس آسکے گا یا نہیں۔

وہ واپس آگیا لیکن خالی ہاتھ آیا اور وہ بہت گھبرایا ہُوا تھا اور تقریباً دوڑتا ہُوا آیا تھا۔

"یہاں سے فوراً اُٹھو" — اُس نے کہا — "گاؤں میں قتل کی واردات

ہوگئی ہے اور وہاں پولیس آئی ہوئی ہے۔ مجھے شک ہے کہ مجھے دو تین آدمیوں نے دیکھ لیا تھا۔ وہاں ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھا تھا۔ میں وہیں سے واپس آگیا تھا۔ مجھے شک ہے کہ کوئی نہ کوئی میرے پیچھے آیا تھا۔"

ہم وہاں سے چل پڑے۔ گاؤں کی سمت سے ہم دُور ہٹ کر جا رہے تھے۔ شام گہری ہوگئی تھی۔ پھر بھی کچھ دُور تک نظر کام کرتی تھی۔ یہ علاقہ ویران تھا۔ ہمارے سامنے سرکنڈوں کا جنگل سا آگیا۔ ہم اس کے ایک پہلو سے گزرنے لگے۔ تھوڑی ہی دُور آگے گئے ہوں گے کہ ہمیں کسی کی باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم تینوں پھُرتی سے سرکنڈوں کے اندر چلے گئے۔ ہمارے چلنے سے سرکنڈے آواز پیدا کرتے تھے۔ ہم وہیں سرکنڈوں کے اندر بیٹھ گئے۔

آوازیں جو ہم نے سُنی تھیں اور جو ابھی تک سنائی دے رہی تھیں ہمارے قریب آرہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں اتنی قریب آگئیں جیسے کوئی ہمارے سر پر کھڑا بول رہا ہو۔

"معلوم نہیں کدھر نکل گیا ہے" — ایک آدمی نے کہا۔

"آدمی مشکوک تھا" — دوسرے نے کہا — "لیکن ملے گا نہیں معلوم نہیں کدھر نکل گیا ہے۔"

"ویسے ہی شک میں ہمیں دوڑا دیا۔"

"چلو تھوڑی دیر اور گھوم پھر کر واپس چلتے ہیں۔"

اُنہوں نے یہ باتیں ہمارے قریب کھڑے ہو کر کی تھیں۔ اُنہوں نے تھانیدار کو دو چار گالیاں دیں اور وہاں سے چل پڑے۔ ہم وہیں بیٹھے رہے۔ خطرہ تھا کہ وہ کچھ آگے جا کر اسی راستے واپس آجائیں گے۔

ایسے ہی ہُوا۔ وہ تھوڑی ہی دیر بعد اسی راستے سے واپس آئے اور گاؤں کی طرف چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ہم وہاں سے نکلے اور چل پڑے۔

۞

ہم تین گھنٹے بغیر رُکے چلتے گئے۔ ہمارے پیٹ خالی تھے، اس لئے

اور زیادہ چلنا دشوار تھا۔ ہم رُک گئے اور وہیں لیٹ گئے۔

سب سے پہلے میری آنکھ کھلی۔ میرے دونوں ساتھی گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ سورج چڑھ آیا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو جگایا۔ وہ گھبرا کر اُٹھے اور ہم پھر چل پڑے۔ تھوڑی ہی دُور آگے گئے ایک پگڈنڈی آگئی اور ایک بیل گاڑی آتی نظر آئی۔ ہم رُک گئے۔ بیل گاڑی قریب آئی تو اسے ہم نے روک لیا۔ ہمارے پوچھنے پر گاڑی والے نے بتایا کہ دو اڑھائی میل دُور ایک بڑا گاؤں ہے جو برانچ لائن کا ریلوے سٹیشن بھی ہے۔ وہ وہاں سے کوئی سامان لینے جا رہا تھا۔ ہم نے اُسے کچھ پیسے دیئے اور اُس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ہمیں یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔ ہم آخر کتنا پیدل چل سکتے تھے۔

بیل گاڑی نے ہمیں ریلوے اسٹیشن تک پہنچا دیا۔ یہ چھوٹا سا سٹیشن تھا اور گاؤں سے تقریباً ایک میل دُور تھا۔ گاڑی آنے والی تھی۔ بھوک نے ہمیں ادھ موا کر دیا تھا۔ وقت نہیں تھا کہ الطاف کو گاؤں میں بھیج کر روٹی منگواتے۔ اس دیہاتی سٹیشن پر کھانے کی صرف ایک چیز نظر آئی۔ یہ مکئی کے بھٹے تھے جو ایک آدمی انگاروں پر پکا رہا تھا۔ ہم نے دس بارہ بھٹے لے لئے اور مویشیوں کی طرح بے صبری سے کھانے شروع کر دیئے۔

پلیٹ فارم پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا کہ یہ گاڑی کہاں تک جائے گی۔ یہ ایک جنکشن تک جاتی تھی۔ یہ جنکشن سٹیشن بھی برانچ لائن کا تھا۔ وہاں سے گاڑی مین لائن تک جاتی تھی اور وہیں سے گاڑیاں برانچ لائن کے لئے بھی جاتی تھیں۔

گاڑی آئی۔ کوئی رش نہیں تھا۔ اُس زمانے میں گاڑیوں میں رش ہوتا ہی نہیں تھا۔ ہم جس ڈبے میں بیٹھے اس میں دس بارہ مسافر تھے۔ میں نے ڈبے میں بیٹھتے ہی ہر ایک مسافر کو غور سے دیکھا۔ وہ سب دیہاتی تھے۔ صرف ایک آدمی شہری سا لگتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ کسی جاگیردار کا بیٹا ہو۔ اُس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ میرے قریب بیٹھا ہُوا تھا۔ چہرے اور لباس سے وہ کچھ تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے جب اُس کی طرف دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے

نظریں چرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اُسے اور زیادہ غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔

ہم تو ہر آدمی کو شکی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس آدمی پر مجھے شک ہونے لگا۔ میں نے اب نظریں اُس کے چہرے پر جما دیں۔ اُس کا ردّ عمل یہ تھا کہ اس کے چہرے پر گھبراہٹ آگئی پھر وہ مُسکرایا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" — میں نے اس سے مُسکرا کر پوچھا۔

"کیا آپ نے مجھے پہچان لیا ہے؟" — اُس نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے مجھ سے پوچھا۔

"آپ کے سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مجھے جانتے ہیں" — میں نے کہا اور پوچھا — "ہم پہلے کہاں ملے تھے؟"

"میرا خیال ہے کہ مجھے غلطی لگ رہی ہے" — اُس نے کہا — "اگر آپ وہی ہیں تو اُس وقت آپ کی داڑھی نہیں تھی .... کیا آپ کا نام سکندر ہے؟ آپ اگر سکندر صاحب ہیں تو آپ سی آئی ڈی کے انسپکٹر ہوں گے"۔

میں اس شخص کی ذہانت اور نظر کی گہرائی پر حیران ہُوا۔ اُس نے مجھے ٹھیک پہچانا تھا۔ اس سے مجھے یہ پریشانی بھی ہونے لگی کہ داڑھی میرے چہرے کو چھپانے میں ناکام رہی ہے۔ میں نے اس شخص کو ٹالنا تھا۔ اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ میں نے قہقہہ لگایا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"آپ نے مجھے اُس محکمے کا افسر بنا دیا ہے جس سے مجھے سخت نفرت ہے" — میں نے کہا — "میں دیوبند میں مذہبی تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ یہ شاید مذہب کی کرامت ہے کہ میں موت کے مُنہ سے نکل کر آ رہا ہوں"۔

"کیوں؟" — اُس نے پوچھا — "کیا ہو گیا تھا؟"

"کشتی سے دریا پار کر رہے تھے کہ سیلاب آگیا" — میں نے جواب دیا — "کشتی بہت دُور جا کر کنارے لگی .... یہ دیکھیں میرے کپڑوں کا حال .... آپ کا نام؟"

اُس نے اپنا نام بتایا جس سے پتہ چلا کہ وہ ہندو ہے۔ میں نے اُس

سے پوچھا کہ جس سکندر کی اُسے غلط فہمی ہوئی ہے اسے وہ کس طرح جانتا ہے۔

"میں تو اُس کا نام بھی نہیں لینا چاہتا" — اُس نے کہا — "وہ شیطان قسم کا آدمی ہے۔ میں تو اُسے ہندوستان کا غدار کہوں گا۔"

اُس نے جب تفصیل سنائی کہ سکندر نے کیا غداری کی تھی تو یہ وہ کیس نکلا جو میں نے پکڑا تھا۔ یہ دہشت گردوں کا گروہ تھا۔ اس گروہ کے آدمیوں کو پکڑنے میں میرے دوست سلطان احمد نے بڑا اچھا رول ادا کیا تھا۔ میں یہ سارا کیس آپ کو سنا چکا ہوں۔ یہ شخص اسی گروہ کے ساتھ کچھ تعلق رکھتا تھا لیکن عدمِ ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا تھا۔ مجھے تو اس کی صورت یاد ہی نہیں رہی تھی۔

"کیا میری شکل وصورت اُس سکندر سے ملتی ہے؟"

"بہت ملتی ہے" — اُس نے جواب دیا — "آپ کی پیشانی، آنکھیں، ہونٹ اور دانت بالکل اُس سکندر جیسے ہیں۔ فرق صرف داڑھی کا ہے یا اب میں نے بہت بڑا فرق دیکھا ہے کہ آپ مذہب کے طالب علم ہیں اور وہ سکندر انگریزوں کا زرخرید غلام تھا۔"

"لعنت بھیجو اُس سکندر پر" — میں نے کہا — "میں تو دن رات سوچتا رہتا ہوں کہ ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے کس طرح آزاد کرایا جائے.... کیا آپ اب بھی اپنی خفیہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں؟"

اس سوال کے جواب میں وہ مسکرایا اور چُپ رہا۔ دہشت گرد اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا کرتے ہیں۔ اُس کی مسکراہٹ سے سمجھ گیا کہ وہ ابھی تک کسی دہشت گرد گروہ کے ساتھ ہے۔

"میں آپ کے سوال کا جواب نہ دوں تو آپ ناراض نہ ہونا" — اُس نے کہا — "میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہندو اور مسلمان اگر متحد ہو جائیں تو انگریزوں کو ہندوستان سے نکالا جا سکتا ہے۔ میں ہر ہندوستانی سے یہی بات کہتا پھرتا ہوں لیکن آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تو اتحاد ہے ہی نہیں، مسلمانوں میں آپس میں بھی اتفاق اور اتحاد نہیں۔ آپ بُرا نہ جانیں تو کہوں، مسلمانوں نے بہت سے فرقے بنا رکھے ہیں اور یہ فرقے ایک دوسرے کے

خلاف کام کرتے رہتے ہیں۔ شیعہ سُنی فساد تو ہر سال ہوتے ہیں۔ دونوں طرفوں کے کئی کئی آدمی زخمی ہوتے ہیں اور ایک دو آدمی مارے بھی جاتے ہیں۔ آپ مذہبی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اس لئے مجھے شک ہے کہ آپ بھی ہندوؤں کے خلاف ہو جائیں گے۔"

اُس نے بات بڑے کام کی کہی تھی۔ میں اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ مجھے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ میں خود دہشت گرد بننے کا ارادہ کئے ہوئے تھا۔ میرے دل میں ہندوستان کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے اس ہمسفر سے پوچھا کہ میں اگر کسی ایسے گروہ میں شامل ہونا چاہوں جو انگریزوں کے خلاف زمین دوز جنگ لڑ رہا ہو تو مجھے کیا کرنا چاہیئے اور کس کے پاس جانا چاہیئے۔

"آسان نہیں" — اُس نے کہا۔

"کیا آسان نہیں؟"

"کسی خفیہ گروہ میں شامل ہونا" — اُس نے جواب دیا — "یوں سمجھ لیں کہ انگاروں پر چل کر آپ کسی گروہ میں داخل ہوں گے۔"

"آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "آپ کسی گروہ میں شامل ہونے سے پہلے ہی پکڑے جائیں گے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ کو اتنا بھی احساس نہیں کہ جس کے ساتھ آپ بات کر رہے ہیں وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہو سکتا ہے" — اُس نے کہا — "وہ پولیس کا مُخبر بھی ہو سکتا ہے۔ اس ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنہوں نے غلامی اپنی روحوں میں اُتار لی ہے۔ وہ کسی انگریز افسر کی خوشنودی کی خاطر اپنے بھائیوں کا گلا گھونٹنے کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔"

گاڑی چلتی رہی، سٹیشنوں پر رُکتی رہی، مسافر اُترتے رہے، سوار ہوتے رہے اور ہم جنکشن سٹیشن تک پہنچ گئے۔ یہ پسنجر ٹرین تھی اس لئے آہستہ آہستہ

چلتی اور ہر سٹیشن پر رُکتی تھی۔ ہم اُترے۔ میرا ہمسفر بھی وہیں اُترا اور میرے ساتھ ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ پوچھنے کے باوجود اُس نے اپنا اَتا پتہ نہ بتایا۔

رات ہو چکی تھی۔

۵

یہ ذرا بڑا اسٹیشن تھا۔ ہمارے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ سٹیشن سے ہی ذرا بہتر کھانا مل گیا۔ وہاں سے گاڑی مین لائن سے بھی ملاتی تھی اور ایک برانچ لائن بھی وہاں سے نکلتی تھی۔ ہم نے برانچ لائن کی طرف نکل جانا مناسب سمجھا۔ آدھی رات کے بعد ایک گاڑی جاتی تھی۔ ہم اُس پر سوار ہو گئے۔ ہم تھرڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔

انجن نے وسل دی اور گاڑی چل پڑی۔ ہم چھوٹے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے تھے۔ گاڑی چلی تو ایک باوردی ہیڈ کانسٹیبل دروازے میں نمودار ہوا۔ اُس کے پیچھے دو باوردی کانسٹیبل چلتی گاڑی میں سوار ہوئے۔ ہم تینوں ساتھیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میری رگوں میں خون جم گیا۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ کسی نے ہماری مخبری کر دی تھی۔ وہ مخبر وہی ہندو ہو سکتا تھا جو پچھلی ریل گاڑی میں میرا ہمسفر تھا۔

"دوسرے دروازے سے نکل جائیں" —— حمید اللہ خان نے کہا —— "گاڑی کی رفتار ابھی کم ہے"۔

"نہیں ہم پر شک نہ ہوا تو بھی شک ہو جائے گا" —— میں نے کہا —— "دیکھو کیا ہوتا ہے"۔

اس ڈبے میں صرف تین اور مسافر تھے۔ تینوں اُوپر برتھوں پر چڑھ کر سو گئے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل اور دونوں کانسٹیبل دروازے میں کھڑے گپیں ہانک رہے تھے۔ تینوں نے ہماری طرف دیکھا تھا پھر آپس میں باتیں کرنے لگ گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اُن کے پاس رائفلیں نہیں تھیں اور ہیڈ کانسٹیبل کے پاس ریوالور نہیں تھا۔ اُن کے پاس ہتھکڑی بھی نہیں تھی۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے کہ پوری گارد ہماری گرفتاری کے لئے آئی ہو؟" ——

مجھے خیال آیا —— "اور وہ گاڑی کے کسی اور ڈبے میں ہو؟ .... یہ تینوں ہمیں روکے رکھنے کے لئے آئے ہوں گے"۔

گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تو تینوں دروازہ بند کر کے ہمارے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ہم تینوں کو دیکھا۔ وہ تینوں مسلمان تھے۔

"مولانا!" —— ہیڈ کانسٹیبل نے مجھ سے پوچھا —— "کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

اُس کا انداز تمسخر والا تھا۔

"دیوبند جا رہا ہوں حوالدار صاحب!" —— میں نے جواب دیا۔

"کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟" —— اُس نے پوچھا اور خود ہی بولا —— "گھر گئے ہوں گے"۔

"نہیں حوالدار صاحب!" —— میں نے کہا —— "میں اِدھر کا رہنے والا نہیں تبلیغی جماعت کے ساتھ آیا تھا"۔

یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ دیوبند مدرسے والے تبلیغی جماعتیں باہر بھیجا کرتے ہیں یا نہیں۔ اس پولیس حوالدار کو بھی معلوم نہیں تھا۔

"آپ کو تو ضرور معلوم ہو گا" —— میں نے کہا —— "کہ عیسائیوں کے پادری دیہات میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں۔ ہم اپنی تبلیغ کرتے ہیں کہ اسلام کی جڑیں مضبوط رہیں"۔

میں نے دیکھا کہ پولیس کے تینوں آدمی مرعوب سے ہو گئے۔

"آپ شاید کسی ڈیوٹی پر گئے تھے؟" —— میں نے پوچھا —— "یا ڈیوٹی سے آ رہے ہیں؟"

"ڈیوٹی پر ہیں مولانا!"

میں نے پولیس کی نوکری کی باتیں شروع کر دیں اور اس محکمے کی بہت تعریف کی۔ وہ تینوں باتیں کرتے رہے اور بات کا رُخ ایسا ہو گیا کہ ہیڈ کانسٹیبل نے وہ بات سنا دی جس کے لئے ہم بے تاب تھے۔

"مولانا!" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "ہماری نوکری ہے تو بڑے رعب والی۔ جدھر جاتے ہیں لوگ عزت کرتے ہیں، پیٹھ پیچھے خواہ گالیاں ہی دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی پولیس کا رعب خاک میں مل جاتا ہے .... کل کے اخبار نہیں دیکھے آپ نے؟"

"دیہات میں اخبار کہاں آتے ہیں" — میں نے کہا۔

اُس نے میرے شہر کا نام لے کر کہا — "وہاں کا رہنے والا سکندر نامی ایک آدمی ہے۔ وہ پولیس کی سپیشل برانچ میں سب انسپکٹر تھا۔ آپ سی آئی ڈی سمجھ لیں۔ اُس نے اپنے ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کر دیا اور فرار ہو گیا تھا۔"

"انگریز ڈی ایس پی؟" — میں نے حیران ہو کر کہا — "یہ تو اُس نے کمال کر دیا ہے!"

"کمال جیسا کمال جی!" — ہیڈ کانسٹیبل نے میرے قریب ہو کر آہستہ سے کہا — "کبھی وہ میرے سامنے آ گیا تو میں اُسے گرفتار نہیں کروں گا۔ کہوں گا، جا تو شیر ہے۔ جا، جنگل میں چلا جا اور شیر جیسی بادشاہی کر!"

"ہاں حوالدار صاحب!" — میں نے کہا — "شیر نہیں تو اور کیا ہے .... تو کیا وہ ابھی گرفتار نہیں ہوا؟"

"اور وہ گرفتار ہوگا بھی نہیں" — اُس نے کہا — "کل اخباروں میں اُس کی گرفتاری کے انعام کا اعلان ہو گیا ہے .... دس ہزار روپیہ اُس کے سر کی قیمت ڈالی ہے انگریز نے۔ اُس کو زندہ یا مُردہ پکڑنے والے کو دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کر کے میری قیمت اتنی زیادہ ہو گئی تھی .... دس ہزار روپیہ .... آج آپ اسے پانچ لاکھ روپیہ کہہ لیں۔

"اتنا زیادہ انعام مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی!" — میں نے کہا — "اتنا انعام بڑے نام والے اور خطرناک ڈاکوؤں کے لئے مقرر ہوتا ہے۔ یہ

شخص تو صرف ایک انگریز کا قاتل ہے۔"

"اصل بہادری تو اُس نے اب کی ہے" — حوالدار نے کہا — "تین چار دن گزرے اپنے شہر میں پکڑا گیا تھا۔ وہ بھیس بدل کر آیا تھا۔ پولیس کو مخبری ہو گئی۔ تھانیدار نے چھاپہ مارا اور اُسے گرفتار کر لیا۔"

"تھانیدار نے تو دس ہزار کما لیا!"

"نہیں مولانا!" — حوالدار نے کہا — "انعام اب مقرر ہوا ہے۔ یہ اس طرح ہُوا کہ اُسے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور تین کانسٹیبلوں کی گارد کے ساتھ ریل گاڑی پر بھیجا گیا تھا۔ غور کریں مولانا! اُسے پولیس کے ڈبے میں بٹھایا گیا تھا جس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوتی ہیں۔ اس ملزم کے ہاتھ ہتھکڑی میں بندھے ہوتے تھے۔ یہ رات کی گاڑی تھی۔ جناب ہُوا یہ کہ صبح گاڑی ایک چھاؤنی سٹیشن پر رُکی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ریلوے پولیس کو اطلاع دی کہ اُس کے ڈبے میں آتے ....

"ایک سب انسپکٹر دوڑا گیا۔ دیکھا کہ جو ہتھکڑی ملزم کو لگی ہوتی تھی اُس میں ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل بندھے ہوتے تھے اور ہتھکڑی کے دوسرے سرے والا کڑا ایک کانسٹیبل کی بیلٹ میں اور ملزم غائب تھا۔ ہتھکڑی کی چابی غائب تھی۔ گاڑی کے دروازے جو اندر سے بند تھے کُھلے ہُوتے تھے....

"ہیڈ کانسٹیبل ریلوے پولیس کے سب انسپکٹر کو کہہ رہا تھا کہ اُس کی بچت کی کوئی ترکیب کرے۔ پولیس والے پولیس والوں کی مدد کیا کرتے ہیں۔ ہیڈ کانسٹیبل یہ چاہتا تھا کہ سب انسپکٹر اُس کے اور کانسٹیبل کے ہاتھوں سے ہتھکڑی کھول دے۔ یہ ان کی بے عزتی کا باعث تھا کہ جو ہتھکڑی ملزم کو لگی تھی وہ اب اُن کے ہاتھوں کو لگی ہوتی تھی مگر چابی نہیں تھی۔ سب انسپکٹر کچھ بندوبست کر دیتا لیکن اچانک ایک انگریز انسپکٹر پولیس آ گیا اور ڈبہ کُھلا دیکھ کر اندر چلا گیا۔ اب ہیڈ کانسٹیبل کی مدد کون کرتا؟ ....

"جناب مولانا! ڈبے میں بُھنی ہُوئی مرغی اور بکرے کا بھنا ہُوا گوشت پلیٹوں میں پڑا تھا۔ روٹیاں تھیں۔ شراب کی ایک پوری بوتل تھی اور ایک میں

تھوڑی سی شراب رہ گئی تھی۔ انگریز انسپکٹر نے وہیں ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں کے بیان لئے اور پوچھا کہ اتنا مہنگا کھانا کہاں سے آیا اور شراب کدھر سے آگئی۔ جناب! وہ تو ڈیوٹی پر تھے۔ ہم لوگ ڈیوٹی پر دال روٹی کھاتے ہیں۔ یہ لوگ انگریز جیسا کھانا کھا رہے تھے۔"

"یہ نہیں پتہ چلا کہ ملزم فرار کیسے ہُوا؟" — میں نے پوچھا۔

"شراب نے وُحشت کر دیا ہو گا کم بختوں کو!" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "اور کیا ہو سکتا ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے کیا بیان دیئے ہیں۔ انگریز انسپکٹر نے ان کی ہتھکڑی نہیں کھولی۔ اسی طرح انہیں ریلوے سے پولیس کی حوالات میں لے گئے۔ دوسرے دن دو کانسٹیبلوں کو بھی گاڑی میں ہی ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ یہ سب گئے تین چار سال کے لئے جیل میں۔"

"اتنی زیادہ سزا؟" — میں نے کہا۔

"ملزم معمولی نہیں تھا مولانا!" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "اُس نے انگریز ڈی ایس پی کو قتل کیا ہے اور سُنا ہے کہ اُس نے کچھ وارداتیں اور بھی کی ہیں۔"

"پکڑا گیا تو انگریز افسر اُسے گولی مار دیں گے" — میں نے کہا۔

"وہ نہیں پکڑا جائے گا" — اُس نے کہا — "اُس کے متعلق مشہور ہے کہ اُس کے ہاتھ میں کوئی جادو ہے یا اُس کے قبضے میں کوئی جن ہے یا اُس کا پیر کامل ہے جس نے اُسے ایسا تعویذ دیا ہُوا ہے کہ وہ لوہے پر نظر جما دے تو لوہا کٹ جاتا ہے یا ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں وہ اتنا خوبصورت ہے کہ انگریز افسروں کی میمیں اُس پر عاشق ہو گئی تھیں۔ وہ اگر پکڑا گیا تو جیل کی دیوار توڑ کر نکل جائے گا۔"

پولیس اور فوج کے سپاہی یا حوالدار کے پاس یا کسی دیہاتی کے پاس بیٹھ جائیں تو وہ آپ کو ایسی ایسی گپ سنائے گا کہ آپ کے رونگٹے کھڑے کر دے گا۔ یہ لوگ اُس زمانے میں بھی ایسے ہی کرتے تھے اور آج بھی ان کی وہی عادت ہے کہ ذرا سی بات کو نہایت دلچسپ اور سنسنی خیز افسانہ بنا لیتے ہیں۔

میرے متعلق یہ ہیڈ کانسٹیبل مجھے ایسی باتیں سُنا رہا تھا کہ میں اپنے آپ کو جن بھوت سمجھنے لگا۔ اُسے چونکہ معلوم نہیں تھا کہ میں ریل گاڑی سے کس طرح فرار ہُوا تھا اس لئے وہ سُنی سنائی بات میں اپنے رنگ بھر رہا تھا۔

"کیا اُس کی تصویر آپ کے تھانے میں آئی ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"تصویر ابھی نہیں آئی" — اُس نے جواب دیا — "حلیہ آیا ہے۔ سروس میں اُس کی داڑھی نہیں تھی، اب لمبی داڑھی بتائی گئی ہے۔ سرکاری کاغذات میں اُس کے شناختی نشان جو لکھے ہُوتے ہیں وہ دو تل ہیں۔ ایک ٹھوڑی سے ذرا نیچے اور ایک پیٹھ کے درمیان میں اور زخم کا ایک پرانا نشان بائیں کُولہے پر ہے۔"

دونوں کانسٹیبل بھی کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ تینوں دو سٹیشن گزار کر اُتر گئے اور گاڑی چل پڑی۔

۶

اگلے روز کے گیارہ بجے کا وقت ہو گا جب گاڑی کا آخری سٹیشن آ گیا۔ وہاں سے گاڑی مین لائن تک جاتی تھی لیکن ہم نے اُدھر جانا خطرے سے خالی نہ سمجھا۔ ہیڈ کانسٹیبل کی باتوں نے ہمیں چوکنا کر دیا تھا۔ میری گرفتاری کا انعام مقرر ہو جانے سے ہمارے لئے خطرہ بڑھ گیا تھا۔ ہم نے دیہات کی طرف نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔

"میری مانو دوستو!" — الطاف نے کہا — "ایسے ہی دُور دُور ویرانوں میں چلتے چلو۔ میرا خیال ہے ہم نے آدھا سفر طے کر لیا ہے۔ جتنے دن لگتے ہیں لگ جائیں، گرفتاری سے بچنے کی کوشش کرو۔"

"پیچھے کی بھی پریشانی ہے طافے" — حمید اللہ خان نے کہا — "شہناز اور خواجہ صاحب ہمارے انتظار میں منٹ گن رہے ہوں گے۔ مخبری ہو گئی تو دونوں پکڑے جائیں گے۔ شہناز کی ذرا سوچو۔ خوبصورت عورت ہے۔ کہیں اپنے ہی یار دھوکہ نہ دے جائیں۔"

"ہم سیدھے تو نہیں پہنچ سکتے شہزادے!" — الطاف نے کہا — "پہلی غلطی سکندر نے کی کہ اپنے شہر چلا گیا اور دوسری غلطی تم نے کی کہ اس کے پیچھے آگئے۔ اپنی غلطیوں کی کچھ سزا تو بھگتنی پڑے گی۔"

یہ ایک بڑے گاؤں کا سٹیشن تھا۔ ہم وہاں سے نکل گئے اور ایک پگڈنڈی پر چل پڑے۔

"سکندر!" — حمید اللہ خان نے کہا — "تم نے سی آئی ڈی اور سپیشل برانچ کی خاص ٹریننگ لی تھی۔ کچھ اپنا کمال دکھاؤ۔"

"کیسا کمال؟"

"تمہاری داڑھی ہے" — اُس نے کہا — "تمہارے چہرے پر جوانی کا نور ہے۔ تمہاری آواز اثر والی ہے۔ ڈھونگ رچا سکتے ہو، ناٹک کھیل سکتے ہو۔ پیر بن جاؤ، مبلغ بن جاؤ۔ یہ دیہاتی لوگ ہیں ان پڑھ اور گنوار ہیں۔ پیروں فقیروں کو مانتے ہیں۔ ہم دونوں تمہارے چیلے بن جاتے ہیں۔ لوگوں کو تمہاری کرامات سنائیں گے۔ باقی کرتب دکھانا تمہارا کام ہے۔"

"فائدہ کیا ہوگا؟" — میں نے پوچھا۔

"فائدہ یہ ہوگا کہ جس گاؤں میں جائیں گے مسلمان سر آنکھوں پر بٹھائیں گے" — حمید اللہ خان نے کہا — "دو تین روز ایک گاؤں میں حلوے اور مرغ کھائیں گے پھر اس گاؤں والوں سے کہیں گے کہ اگلے گاؤں پہنچا دو۔ وہ گھوڑے، ٹٹو یا بیل گاڑی پر اگلے گاؤں پہنچا دیں گے۔"

"چلو" — میں نے کہا — "بن گئے پیر۔"

۶

ہم پگڈنڈی پر جا رہے تھے۔ سامنے سے ایک یکہ آ رہا تھا۔ خالی تھا۔ اُسے حمید اللہ نے روکا اور پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ ریلوے سٹیشن والے گاؤں جا رہا تھا۔ سٹیشن ہونے کی وجہ سے وہاں سے اُسے سواریاں مل جاتی تھیں۔

"شاہ صاحب کو اگلے گاؤں پہنچانا ہے" — حمید اللہ خان نے اُسے

کہا — "پہنچے والے مُرشد ہیں۔ پیسے دیں گے۔ دعا بھی دیں گے۔ موج میں آ گئے تو...."

"بسم اللہ، بسم اللہ!" — یکہ بان نے یکے سے کُود کر اترتے ہوئے کہا — "ہمیں تو دُعا چاہیئے حضور!" — اُس نے آگے آکر میرے گھٹنے چھُوئے اور ہاتھ ملایا۔ کہنے لگا — "آئیے حضور! یکہ حاضر ہے۔"

ہم یکے میں بیٹھ گئے۔ یہیں پہلا مسئلہ یہ پیدا ہوگیا ہے کہ یکہ بان مجھے اگلی سیٹ پر بٹھانا چاہتا تھا کیونکہ پیچھے بٹھا کر وہ کہتا تھا کہ اُس کی پیٹھ میری طرف ہو جائے گی تو یہ بہت بڑا گناہ ہوگا۔ اُس کی خواہش کے مطابق میں آگے بیٹھا۔ یکہ بان نے ایک ہی بار تین چار سوال کر ڈالے۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں کہاں کا ارادہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں اس طرح خاموش رہا جیسے میں مراقبے میں ہوں۔ حمید اللہ خان اور الطاف اُسے جواب دیتے رہے۔

"ہم بہت غریب ہیں حضور!" — یکہ بان نے بھکاریوں کے لہجے میں کہا — "صبح سے شام تک اپنا خون جلاتے ہیں اور اس جانور کا بھی خون خشک کرتے رہتے ہیں۔"

میں نے ہاتھ ذرا اُوپر اُٹھایا اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لے آیا۔ میں نے یکہ بان کے چہرے پر بدلتا ہُوا جو تاثر دیکھا اس سے میں جان گیا کہ میرا ڈھونگ کامیاب ہے۔

"ہم تو بندے بندے کے محتاج ہیں جناب شاہ صاحب!" — یکہ بان نے کہا — "گستاخی معاف حضور، مزے میں وہ رہتے ہیں جو انگریزوں کی ہتھکڑیاں اور لوہے کی سلاخیں بھی توڑ کر نکل جاتے ہیں .... رات کو نمبردار نے گاؤں والوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ ایک آدمی پولیس کی حراست سے چلتی گاڑی سے فرار ہوگیا ہے۔ اُس نے کسی انگریز افسر کو قتل کیا تھا۔ نمبرداروں کو کل تھانے بلایا گیا تھا۔ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ علاقے کے بچے بچے کو اطلاع کر دو کہ کوئی مشکوک آدمی کہیں گھومتا پھرتا نظر آئے اور جو اُس علاقے کا رہنے والا نہ لگے اُسے گھیر لو یا بٹھا کر باتوں میں لگا لو اور نمبردار کو اطلاع کرو۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

اُسے گرفتار کرنے والے کو دس ہزار روپیہ انعام ملے گا۔ یہ شک بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ اکیلا نہیں ہوگا۔"

"کیا اُس کا حلیہ بتایا گیا ہے؟" — حمید اللہ خان نے پوچھا۔

"ہاں جناب!" — اُس نے جواب دیا — "میں نے تو صرف یہ یاد رکھا کہ اُس کی داڑھی ہے اور وہ گورے رنگ کا خوبصورت جوان ہے.... مجھے حلیہ یاد رکھنے کی کیا پڑی ہے جناب! پکڑیں گے ہم اور انعام نمبردار لے جائے گا۔ غور فرمائیے جناب، جس نے انگریز افسر کو قتل کر دیا ہے اور وہ ہتھکڑیاں توڑ کر چلتی گاڑی سے بھاگ گیا ہے وہ کوئی معمولی ڈاکو نہیں ہوگا۔ اُسے جو پکڑوائے گا اُس کا سارا خاندان قتل ہو جائے گا۔"

میں بدستور مراقبے کی ایکٹنگ کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ ہم تو سیدھے خطرے میں جا رہے ہیں، لیکن مجھے امید تھی کہ پیری، فقیری کا بہروپ ہمیں بچا لے گا۔ ان خطروں کے ساتھ ساتھ ہی مجھے اس قسم کے خیال بھی آنے لگے کہ اس ملک کی مخلوق کتنی مجبور اور بے بس ہے۔ کسمپرسی کی یہ حالت مسلمانوں میں ہی پائی جاتی تھی۔ کاروبار ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے اور آپس میں تعاون بھی رکھتے تھے۔ میں نے شاید ہی کبھی کوئی ہندو بھکاری دیکھا ہو۔ بھکاری تھے تو مسلمان، دو وقت کی روٹی کی خاطر مشقت کرنے والے تھے تو مسلمان۔ جی حضوری کرنے والے تھے تو مسلمان اور سب سے بڑی ذلت تو یہ تھی کہ مسلمانوں پر پیروں نے اور مسجدوں میں مولویوں نے ایسا آسیب طاری کر رکھا تھا کہ یہ بے چارے یہ عقیدہ لئے بیٹھے تھے کہ اُن کے ہر مسئلے کا، ہر مشکل اور ہر مصیبت کا حل پیروں اور ملاؤں کے قدموں میں سر رکھنے میں ہے۔

ان مفلس دیہاتیوں میں صلاحیتوں کی کمی نہیں تھی لیکن مجھ جیسے پیروں نے اُن کی صلاحیتوں کو پھونکیں مار مار کر اور تعویذ دے دے کر سُلا دیا تھا۔ پڑھے لکھے لوگ اسے پسماندگی کہتے ہیں لیکن میں اسے مجبوری اور کسمپرسی کہا کرتا ہوں۔ اس یکہ بان کو صرف اتنا اشارہ دیا کہ یہ پیر ہے تو اُس نے یکہ

حاضر کر دیا اور اپنی مفلسی اور غلامی کا ذکر سب سے پہلے کیا۔ دیہاتی علاقے میں ہر کوئی عقیدے کے لحاظ سے اسی یکہ بان جیسا ہوتا تھا اور اب بھی ہے۔

ہم تینوں کا فائدہ اسی میں تھا اور وہ جو خاندانی گدی نشین بنے پھرتے ہیں اُن کا فائدہ بھی اسی میں ہوتا ہے۔



یکہ گاؤں میں داخل ہوا۔

یہ بہت بڑا گاؤں نہیں تھا اور اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا۔ میرے ساتھیوں نے راستے میں یکہ بان سے معلوم کر لیا تھا کہ اس گاؤں میں ہندوؤں کے دو تین گھر ہی ہیں باقی سب آبادی مسلمانوں کی تھی۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی حمید اللہ نے یکہ بان سے کہا کہ شاہ صاحب مسجد میں بیٹھنا پسند فرمائیں گے۔

گاؤں کے لوگوں نے ہمیں دیکھا تو اکٹھے ہو گئے۔ انہیں ابھی معلوم نہیں تھا کہ ہم کون ہیں۔ یکہ بان نے اُنہیں ڈانٹا اور بتایا کہ پیر صاحب تشریف لاتے ہیں، راستے سے ہٹ جاؤ۔ ایک معزز صورت آدمی آگے بڑھا۔ یکہ بان نے بتایا کہ یہ گاؤں کا نمبردار ہے۔ یکہ بان نے یکے سے اُتر کر نمبردار کے کان میں کچھ کہا۔ پہلے میں یکے سے اُترا پھر حمید اللہ اور الطاف اُترے۔ نمبردار آگے بڑھا میرے پاؤں چھوئے پھر گھٹنے چھوئے پھر اُسی طرح جھکے جھکے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میں نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ میں اشہدُ اللہ کا ورد کر رہا تھا۔

"سرکار مسجد میں بیٹھنا پسند فرمائیں گے" — حمید اللہ خان نے تعظیم سے کہا۔

"غریب خانہ حاضر ہے" — نمبردار نے کہا۔

"نہیں" — حمید اللہ خان نے کہا — "سرکار مراقبے میں ہیں"۔

اُن بے چاروں کو معلوم نہیں تھا کہ مراقبہ کیا ہوتا ہے یا کس طرح ہوتا ہے۔ مراقبہ تو کہیں بیٹھ کر کیا جاتا ہے لیکن ہم باہر کھڑے کھڑے کہہ رہے تھے کہ سرکار مراقبے میں ہیں۔

ایک جلوس تھا جو ہمیں مسجد تک لے گیا۔ میں نے اس جلوس کو چلتے ہی اس طرح ہپناٹائز کر لیا تھا کہ آہستہ سے نمبردار کے کان میں کہا کہ سب لوگ کلمہ شریف پڑھتے چلیں۔ میرے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ بڑی پیاری اور مقدس گونج اُبھرنے لگی۔ ایسا تاثر طاری ہو گیا جس سے میں خود متاثر ہُوا لیکن یہ خیال آیا کہ میں اللہ کے کلام کو دھوکہ دہی کا ذریعہ بنا رہا ہوں۔ میرا دل ایک خوف میں جکڑا گیا۔

میں یہ دعویٰ کبھی نہیں کروں گا کہ میں نے کوئی گناہِ کبیرا نہیں کیا تھا۔ دنیا میں کوئی انسان گناہوں سے پاک نہیں لیکن آج بھی وہ وقت یاد آتا ہے تو میں اپنے اللہ سے بخشش مانگتا ہوں۔ اسے میں گناہِ کبیرا سمجھتا ہوں کہ میں دھوکہ دہی میں اللہ کا کلام استعمال کر رہا تھا۔

یہ نوسر بازی اُس وقت کی ضرورت تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ کسی سے نذرانہ نہیں لوں گا اور سوائے دو وقت روٹی کے کسی پر کوئی بوجھ نہیں ڈالوں گا۔ سب سے بڑی لعنت تو یہ ہوتی تھی (جواب بھی ہے) کہ لوگ پیروں کی خدمت خاطر اور مُٹھی چاپی کے لئے اپنی عورتوں کو اُن کے پاس بھیج دیتے تھے۔ بے اولاد عورتیں اولاد کی خاطر پیروں کی باندیاں بن جاتی تھیں۔ میں نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ کسی جوان لڑکی یا خوبصورت عورت کو اپنے قریب نہیں آنے دوں گا۔

ہم مسجد میں جا بیٹھے۔ میرے نیچے بستر والے تین گدے بچھ گئے۔ تکیوں کا ایک ڈھیر میرے پیچھے لگ گیا اور گاؤں کے سارے ہی لوگ مسجد میں جمع ہو گئے۔ میں نے ایک نظر گھما کر سارے ہی چہرے دیکھ ڈالے۔ صرف ایک چہرہ تھا جس کے ماتھے پر شکن تھی اور وہ خفگی کے آثار لئے ہُوئے تھا۔ یہ چہرہ اس گاؤں کے امام کا تھا۔ اُس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا تھا۔ ہاتھ ملانے کے انداز سے میں سمجھ گیا تھا کہ میں نے اس کی سلطنت میں بے جا مداخلت کی ہے۔ اگر میں اُسے بتا دیتا کہ میں ایک دو دن ہی رُکوں گا تو وہ خوش ہو جاتا۔

لوگ ابھی تک کلمہ طیبہ کا وِرد ذرا اُونچی آواز میں کر رہے تھے۔ میں نے

حمید اللہ کو شہنشاہوں کے انداز سے اشارہ کیا کہ وہ میرے قریب آئے۔ وہ اُچھل کر میرے پاس آیا۔

"ایک تقریر کر ڈالو" — میں نے اُسے کان میں کہا اور اُس سے جو کچھ کہلوانا تھا وہ مختصراً بتا دیا۔

"بھائیو!" — حمید اللہ خان نے بیٹھے بیٹھے کہنا شروع کیا — "سیّد نُور شاہ چشتی سلسلۂ چشتیہ کے پیرِ طریقت ہیں۔ یہ اسلام کے اُن فرزندوں میں سے ہیں جو اپنا آرام اور سکون قربان کر کے اسلام کی خدمت کرتے پھرتے ہیں اور مخلوقِ خدا کے لئے اللہ کے حضور گڑگڑاتے ہیں۔ اللہ کا کرم ان کے ساتھ رہتا ہے۔ آپ لوگ قبلہ شاہ صاحب کے اور ہمارے کپڑے دیکھ رہے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے ہم قبروں میں سے نکل کر آتے ہیں۔ ہمارا یہ حُلیہ اُس دریا نے بنایا ہے جو یہاں سے ساٹھ ستر میل دُور ہے۔ ہم دریا پار کرنے کے لئے پتن پر پہنچے تو سیلاب آ گیا اور جو مینہ برسا ہے وہ یہاں تک بھی پہنچا ہو گا۔ کوئی ملاّح کسی قیمت پر کشتی دریا میں ڈالنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ سیلاب کی موجیں پہاڑوں جیسی تھیں ....

"ہم نے قبلہ شاہ صاحب کے حضور عرض کی کہ دریا اُتر جانے کا انتظار کریں۔ حضور نے فرمایا کہ میں تمہاری سنوں یا اللہ کے اشارے کو دیکھوں۔ پھر حضور نے فرمایا کہ تم دونوں دائیں بائیں سے میری قمیض پکڑ لو۔ ہم نے حضور کی قمیض پکڑ لی۔ حضور دریا میں اُتر گئے۔ سچ کہتا ہوں کہ مجھے امید نہیں تھی کہ ہم پار لگ جائیں گے۔ موجیں ہمیں اُوپر اُٹھا کر پھینکتی تھیں تو ہم پانی کے نیچے چلے جاتے تھے۔ ہم نے حضور کی قمیض نہ چھوڑی اور سیلاب میں سے اس طرح نکل آئے جس طرح مکھن سے بال نکالا جاتا ہے۔ نقصان یہ ہُوا کہ حضور کی دستار، عصا، تسبیح اور کچھ اور ضروری چیزیں، فالتو کپڑوں والا تھیلا سیلاب کے ساتھ بہہ گیا۔ پھر ہم اتنی تیز بارش میں کیچڑ میں چلتے آئے۔ کہیں ریل گاڑی میں بیٹھے۔ کہیں سے بیل گاڑی مل گئی اور یہاں تک پہنچے ہیں۔"

"ہم حضور کا نقصان پورا کریں گے۔"

"ہم نئے جوڑے حاضر کریں گے۔"

"میں تسبیح پیش کروں گا۔"

ایک شور مچا جو مسجد میں اُٹھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہ لوگ اپنی کھالیں اُتار کر بھی دے دیں گے۔ میں نے ہاتھ اُوپر کیا۔ خاموشی طاری ہوگئی۔ پھر حمید اللہ کو اپنے قریب کر کے اُس کے کان میں کچھ کہا۔

"بھائیو!" ــــ حمید اللہ نے اعلان کیا ــــ "حضور فرماتے ہیں مجھے کچھ نہیں چاہیئے، مجھے صرف جان کی ضرورت ہے تاکہ میں اللہ اور رسولؐ کے نام اور ایمان کی وہ خدمت کر سکوں جس کا حکم مجھے اللہ تبارک و تعالیٰ نے دیا ہے۔"

میں نے حمید اللہ کو پھر اپنے قریب کیا اور کان میں بتایا کہ وہ کیا کہے۔ حمید اللہ خان بڑا ذہین اور چرب زبان آدمی تھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ جاتا تھا۔

"بھائیو!" ــــ حمید اللہ خان نے کہا ــــ "حضور نے فرمایا ہے کہ میں صرف تین روز یہاں رُکوں گا۔ تمام مسلمان پانچوں وقت مسجد میں حاضری دیں۔ پھر حضور نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس گاؤں پر اللہ کی رحمت ہوگی۔ بے اولادوں کو اللہ اولاد عطا فرمائے گا اور بیماروں کو شفا ملے گی۔"

۶

اس گاؤں میں گزارے ہوئے ایک ایک منٹ کی تفصیل بڑی دلچسپ، مضحکہ خیز اور فکر انگیز ہے۔ میں یہ رُوداد ذرا مختصر سناؤں گا۔ اگر میں خود قرآن مجید ہاتھ میں لے کر اور مسجد میں کھڑے ہو کر لوگوں سے کہتا کہ میں پیر نہیں ہوں، مفرور قاتل ہوں اور میں نوسر بازی کر رہا ہوں تو بھی وہ نہ مانتے۔ اصل مسئلہ یہی ہے کہ لوگ اپنی مجبوریوں اور کم فہمی سے ایک عقیدہ خود ہی پیدا کر لیتے ہیں پھر اپنے آپ کو اس کی زنجیروں میں باندھ دیتے ہیں پھر وہ ان زنجیروں کو توڑنا بہت بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔

اگلے روز میرے لئے لٹھے کے کپڑے آگئے۔ ململ کی دستار بھی آگئی۔ نئی جُوتی بھی آگئی۔ ایک کی جگہ تین تسبیحیں آگئیں۔ میرے ساتھیوں کو بھی کپڑے وغیرہ مل گئے۔ میری بیٹھک کا انتظام نمبردار کے ہاں کیا گیا۔ سب سے بڑا مسئلہ

جو پیدا ہُوا وہ امامت کا تھا۔ لوگ تقاضا کرتے تھے کہ نماز باجماعت میں پڑھاؤں لیکن میں امامت کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے پہلے دن ہی کہہ دیا کہ میرے لئے حکم ہے کہ امام کی موجودگی میں امام کی جگہ کھڑے نہیں ہونا۔ اس سے یہ فائدہ ہُوا کہ امام مسجد خوش ہوگیا اور لوگ بھی مان گئے

مرادیں پوری کرانے والوں اور سلام کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ میں سب کے لئے دُعا کرتا تھا، پھونکیں بھی مارتا تھا اور میں نے تعویذ لکھنے بھی شروع کر دیتے تھے۔ میرے پاس مریض بھی لاتے گئے جن میں کچھ تعداد بچوں کی بھی تھی۔ ان کا ڈاکٹری علاج ہونا چاہیئے تھا لیکن وہاں دُور دُور تک کوئی ڈاکٹر نہیں تھا اور کوئی معمولی سا ڈسپنسر بھی نہیں تھا۔ کہیں کہیں کوئی خود ساختہ حکیم تھا جو مرض کو بگاڑ سکتا تھا، ٹھیک نہیں کر سکتا تھا۔

میں جب کسی مریض کی صحت یابی کے لئے دعا کرتا تھا تو اس میں کوئی فریب اور کوئی نوسر بازی نہیں ہوتی تھی۔ ایسی دعائیں میرے دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھیں لیکن میں سوچتا تھا کہ میں ایک گناہ کا ارتکاب کر رہا ہوں اس لئے خدا میری دعا قبول نہیں کرے گا۔

ایک عجیب واقعہ ہوگیا۔ ایک نوجوان ماں اپنے بچے کو لے کر میرے پاس آئی۔ یہ اُس کا پہلا بچہ تھا جس کی عمر تین یا چار مہینے تھی۔ بچے کو اینٹھن سی ہوتی تھی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں مُڑ جاتے تھے۔ یہ دَورہ اُسے تھوڑے تھوڑے وقفے بعد پڑتا تھا۔ جس طرح یہ لڑکی میرے آگے روئی تھی وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ مجھ پر ایسا اثر ہُوا کہ میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ کوئی ڈاکٹر ہوتا تو اُسے ٹھیک کر لیتا۔ اپنے آپ ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں اور میرے دل سے دُعا نکلی کہ خُدایا، مجھ پر کوئی مصیبت نازل کر دے اس بچے کی یہ مصیبت دُور کر دے۔

اگلی صبح لڑکی بچے کو لے کر آئی اور کہنے لگی کہ کل جب وہ میرے پاس آئی تھی، اس کے بعد اب تک بچے کو اینٹھن کا دَورہ نہیں پڑا۔ میں نے بچے کو دیکھا۔ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور اس میں تندرستی کے آثار بڑے نمایاں تھے اور ماں بہت ہی خوش تھی۔ اُس نے دو روپے میرے گھٹنے کے نیچے سرکا دیئے۔

میں نے روپے اُسے لوٹا دیتے اور کہا کہ میں دعائیں بیچتا نہیں ہوں۔ پھر اُسے کہا کہ وہ شکرانے کے نفل پڑھے اور کچھ پیسے کسی غریب حقدار کو دے دے۔

یہ دل سے نکلی ہوتی دُعا کا اثر تھا کہ بچہ ٹھیک ہوگیا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا، لیکن اسے میری کرامت کہا گیا اور یہ نوجوان ماں اور اُس کا خاوند میرے لئے چلتا پھرتا اور زبان سے بولتا اشتہار بن گئے۔ شام تک دوسرے گاؤں کے لوگ بھی پہنچ گئے۔

میرے کہنے پر حمید اللہ نے اعلان کیا کہ حضور شاہ صاحب کل صبح اگلے گاؤں کو روانہ ہوجائیں گے۔

"ہم حضور کو صبح خود ہی آکر لے جائیں گے" ——— محفل سے ایک آواز آئی۔

"نہیں" ——— ایک اور آدمی بولا ——— "پہلے ہمارا گاؤں آتا ہے ہم شاہ صاحب کو لے جائیں گے"

"حضور کل نہیں جائیں گے" ——— نمبردار نے کہا ——— "میں حضور کے قدموں میں سر رکھ کر التجا کروں گا کہ کچھ دن اور یہیں رہیں"

مجھے بولنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی کہ یہ لوگ آپس میں جھگڑنے لگے۔ میں نے جب جھگڑے کی صورتِ حال کا جائزہ لیا تو میں نے اعلان کروایا کہ ابھی میں چند دن اور یہیں رہوں گا۔ اس کے بعد میں فیصلہ کروں گا کہ میں کون سے گاؤں جاؤں گا۔

میں نے ایک بات نہیں بتائی۔ وہاں عقیدتمندوں کی محفل جمی رہتی تھی اور میں تھوڑی دیر کے لئے وعظ کیا کرتا تھا۔ لوگوں کے دلوں پر اثر کرنے والے الفاظ میرے پاس تھے اور میں انداز بھی جانتا تھا۔ میں زیادہ نہیں بولتا تھا۔ دن میں ایک دو مرتبہ اور ایک آدھ مرتبہ شام کے بعد میں مختصر سا وعظ کرتا تھا۔

اگلے روز ہمیں وہاں سے روانہ ہوجانا تھا لیکن میں نے ارادہ بدل دیا اس ڈھونگ سے ہمیں یہ فائدہ ہُوا کہ کسی نے ہمیں اجنبی سمجھ کر ہم پر

شک نہ کیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس طرح ایک ایک دو دو دن ہر گاؤں میں گزارتے اپنے ٹھکانے کے قریب پہنچ جائیں گے۔ ایک ہی جگہ زیادہ دیر رُکنا ٹھیک نہیں تھا۔

اگلا دن طلوع ہُوا اور معمول کے مطابق گزرنے لگا۔ میری شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی تھی۔ اُس روز میرے سلام کے لئے آنے والوں میں بہت اضافہ نظر آرہا تھا۔ رات کو جب ہم اکیلے تھے تو طے کیا تھا کہ ایک دن اور رُک کر چلے جائیں گے۔ اگر ہم عیش وعشرت کرنا چاہتے تو بہت کر سکتے تھے لیکن ہمارا ارادہ ایسا نہ تھا۔ گرفتاری کے علاوہ شہناز اور خواجہ صاحب کے متعلق بھی ہم پریشان ہو رہے تھے۔

سورج غروب ہوگیا۔ ہم نے گاؤں کے آدمیوں کے ساتھ مسجد میں باجماعت نماز پڑھی اور واپس نمبردار کے گھر آگئے۔ حسبِ معمول کھانا مرغن تھا۔ کھانا کھاتے ہی ہم صحن میں جا بیٹھے جہاں لوگ میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ میرے لئے گدّا بچھا دیا گیا تھا اور اُس پر تکیے رکھے تھے۔ یہ روزمرّہ کا معمول تھا کہ میں وہاں بیٹھتا تھا۔ لوگ میرے سلام کے لئے آتے تھے۔ پاؤں اور گھٹنے چھُو کر اور بعض میرے پاؤں پر سجدہ کر کے بیٹھ جاتے تھے۔ صحن میں تین چار لالٹینیں رکھ دی جاتی تھیں۔

میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ایک باوردی سب انسپکٹر نمبردار کے ساتھ صحن میں آیا۔ اُس نے جُوتے اُتارے اور میرے پاس آیا۔ وہ مسلمان تھا۔ اُس کے پاس ریوالور تھا۔ اُسے دیکھ کر میں بدکا لیکن اُس نے جُوتے اُتارے تو مجھے اطمینان ہُوا کہ وہ گرفتاری کے لئے نہیں، سلام کے لئے آیا ہے۔ کسی تھانیدار کا کسی پیر کے سلام کے لئے جانا عجیب بات نہیں تھی۔ بڑے بڑے مسلمان افسر بھی پیری مریدی کے قائل تھے۔

چار لالٹینوں کی روشنی اتنی کافی تھی کہ اس سب انسپکٹر کا چہرہ مجھے یاد آگیا۔ وہ اے ایس آئی بھرتی ہُوا تھا اور اُس وقت ٹریننگ سکول میں تھا جب میں اور سلطان احمد ٹریننگ کے لئے گئے تھے۔ وہ ٹریننگ میں ہم سے آگے تھا۔

ٹریننگ کے دوران سلام دُعا ہوتی تھی یا میس میں کچھ دیر اکٹھے ہوتے تھے۔ پھر یہ ہم سے پہلے ٹریننگ ختم کر کے چلا گیا تھا۔ اس کے بعد ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ اُس شام میں اُسے چھ سات سال بعد دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے فوراً پہچان لیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے داڑھی اور اتنی بڑی پگڑی میں نہیں پہچان سکے گا۔

وہ میرے سامنے آکر دوزانو ہُوا اور میرے پاؤں چھُوتے پھر میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اور میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چوما۔ میں نے بایاں ہاتھ اُس کی پیٹھ پر پھیرا۔

"حضور!" — اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "اپنے خادم کے لئے دعا فرمائیں۔"

"کوئی مشکل؟" — میں نے جلالی لہجے میں پوچھا — "کوئی مصیبت، کوئی مسئلہ؟"

"حضور!" — اُس نے کہا — "خادم ہندوؤں کے ساتھ سروس کر رہا ہے۔ وہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کوئی مسلمان اُٹھ نہ سکے اور ترقی نہ پا سکے۔ دعا فرمائیں کہ خادم ان کفار کے شر سے محفوظ رہے۔"

"اللہ کارساز ہے" — میں نے ہاتھ اُوپر کر کے کہا — "اپنی ڈیوٹی میں دیانتدار رہو۔ اللہ تمہارا حامی اور ناصر ہو گا۔"

وہ میرے سامنے بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ فرش پر ٹکا کر اور اپنا چہرہ میرے قریب کر کے بڑی غور سے مجھے دیکھا۔ پھر تیزی سے چہرہ پیچھے کیا۔ میں اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا جو بالکل ہی بدل گئے تھے۔ یہ تاثرات خادم والے نہیں رہ گئے تھے۔ یہ ایک تھانیدار کے چہرے کے تاثرات تھے جسے میں نے ہی کہا تھا کہ ڈیوٹی میں دیانتدار رہے۔

وہ پھر میری طرف جُھکا۔ میں جان گیا کہ یہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے اور میں فوراً جان گیا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ میں پہلے ہی محسوس کر رہا تھا اور ایک دو آدمیوں نے مجھے احساس دلایا بھی تھا کہ میرے چہرے کا رنگ

اور خدوخال ایسے ہیں جو صرف داڑھی سے چھپائے نہیں جا سکتے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" — میں نے آہستہ سے اُس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں حضور!" — اُس نے ایسی مسکراہٹ سے کہا جس میں مسکراہٹ والا تاثر نہیں تھا بلکہ طنز سی تھی۔

چہروں کے تاثرات پہچاننے کی تو مجھے خاص طور پر ٹریننگ دی گئی تھی۔ یہ تھانیدار عقل کا کورا معلوم ہوتا تھا۔ چاہئے تو یہ کہ وہ میرے پاس بیٹھا رہتا اور مریدوں کی طرح باتیں کرتا رہتا تاکہ مجھے محسوس ہی نہ ہوتا کہ اُس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ پھر وہ مجھے سلام کر کے مریدوں کی طرح اُلٹے پاؤں جاتا اور چند ایک کانسٹیبلوں کو ساتھ لا کر ہم تینوں کو گرفتار کر لیتا۔ اس کی بجائے اُس نے یوں کیا کہ یکلخت اُٹھ کھڑا ہُوا اور تھانیداروں کی طرح چلتا ہُوا اپنی جوتیوں تک گیا، جوتیاں پہنیں اور نمبردار کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔



وہ نمبردار کے ساتھ باہر نکلا تو میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ حمیداللہ اور الطاف کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اُٹھے تو میں نے انہیں اتنا ہی کہا کہ پہچانے گئے ہیں۔

"میرے بھائیو!" — میں نے اعلان کیا — "ہمیں اشارہ ملا ہے کہ مسجد میں جا کے بیٹھو۔"

ہم تینوں باہر نکلے۔ باہر جا کر دیکھا کہ تھانیدار کے ساتھ دو یا تین کانسٹیبل تھے۔ وہ شاید گشت کے بہانے "شاہ صاحب" کے سلام کے لئے آیا تھا۔ نمبردار بھی اُس کے پاس کھڑا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ چاند پورا نہیں تھا۔ بادل بھی چھائے ہُوئے تھے۔

"یہی وہ مفرور قاتل ہے" — تھانیدار کہہ رہا تھا — "سب کو باہر نکالو اور انہیں پکڑو۔"

ہم تینوں دوڑ پڑے۔ باہر کچھ اور لوگ بھی کھڑے تھے۔ ہمارے بھاگ اُٹھنے سے ان سب کو یقین ہو گیا کہ ہم نوسرباز ہیں اور میں دس ہزار روپے مالیت کا مفرور قاتل ہوں۔ مجھے اپنے پیچھے دوڑتے قدموں کی آہٹیں سنائی دینے

لگیں۔ ہم مُڑ کر ایک گلی میں داخل ہو گئے تھے۔ پیچھے سے ریوالور فائر ہُوا۔ میں نے اپنے قریب سے گزرتی گولی کا زناٹہ سُنا۔

"بکھر جاؤ" — میں نے کہا — "زندہ رہے تو ملیں گے۔ اکٹھے بھاگے تو گولی کسی نہ کسی کو لگ جائے گی۔"

یہ گلی ختم ہوتی تو میں دائیں طرف مڑ گیا اور میرے دونوں ساتھی آگے نکل گئے۔ اس کے بعد میں انہیں نہ دیکھ سکا۔ میں یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ میں گاؤں سے نکل جانے کی بجائے گاؤں کے اندر چلا گیا ہوں۔ دیہات کی خاموش فضا میں للکار گرج رہی تھی۔

"جو پکڑے گا دس ہزار روپیہ انعام پائے گا۔"

"جانے نہ دینا۔ ہمیں دھوکہ دے گئے ہیں۔"

"گاؤں کا گھیراؤ کر لو۔"

اس طرح کی للکار بار بار سنائی دیتی تھی۔ سارے گاؤں کی آبادی بھاگ دوڑ رہی تھی۔ نکل بھاگنا آسان نہیں رہا تھا۔ میں اسے اس گناہ کی سزا سمجھنے لگا کہ میں اللہ کے نام پر فریب کاری کر رہا تھا۔

میں گاؤں سے باہر کی طرف بھاگا تو چار پانچ آدمی سامنے کھڑے نظر آئے۔ میں ایک طرف چلا گیا۔ مجھے آواز سنائی دی کہ وہ جا رہا ہے۔ میں پھر ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے کچھ آدمی آئے۔ بائیں طرف ٹوٹی ہوئی ایک دیوار تھی جو پتھروں اور مٹی کی تھی۔ یہ کوئی گرا پڑا مکان تھا۔ میں اس کے اندر چلا گیا۔ گھٹا آگئی تھی جس سے اندھیرا ہو گیا۔ گلی میں قدموں کی آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ قدم اس دیوار کے قریب رُک گئے۔

"اندر جا کر دیکھ لو" — مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔

اس مکان کا برآمدہ تھا جو گرا ہُوا تھا اور ملبے کا ڈھیر تھا۔ میں بیٹھے بیٹھے سرکتا ملبے کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں سے میں نے پیچھے دیکھا تو ایسے لگا جیسے کمرہ بھی گرا ہُوا ہے اور پیچھے کی دیوار بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔ میں اور اندر چلا گیا۔ ایک آدمی آیا۔ وہ برآمدے کے ملبے تک بھی آیا اور وہیں سے اُس نے آواز دی کہ یہاں نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ آدمی چلا گیا۔ میں آہستہ آہستہ اندر سے نکلا اور برآمدے کے ملبے تک آگیا۔ ان آدمیوں کے قدموں سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ اِدھر اُدھر ہو گئے ہیں۔ میں ملبے سے نکل کر دیوار تک آگیا۔

"دو نکل گئے ہیں" — کچھ دُور سے مجھے آواز سنائی دی — "تیسرے کا پتہ نہیں چل رہا۔ وہ اندر ہی کہیں معلوم ہوتا ہے۔"

میں پھر گلی میں آگیا اور ایک طرف چل پڑا۔ میں اس گاؤں سے واقف نہ تھا اس لئے باہر جانے کے راستے معلوم نہیں تھے۔ میں نے پگڑی اُتار پھینکی تھی تاکہ میری پہچان ختم ہو جائے۔ گاؤں کے لوگ شاید گاؤں سے باہر نکل گئے تھے۔ گلیوں میں عورتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اچانک گیارہ بارہ سال کا ایک بچہ گلی کا موڑ مُڑ کر میرے سامنے آگیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سب لوگ کدھر نکل گئے ہیں، ایک آدمی اِدھر چھپا ہُوا ہے۔

"وہ گاؤں سے نکل گئے ہیں" — لڑکے نے مجھے پہچانے بغیر کہا۔

"کدھر سے؟"

اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں اُدھر کو چل پڑا۔ آمنے سامنے دو گھر تھے جن کے دروازوں میں عورتیں کھڑی تھیں۔ میں تیزی سے چلتا اُن کے درمیان سے نکل گیا۔ میرے عقب سے ایک عورت کی آواز آئی کہ یہی تو نہیں تھا۔

"وہ گرے ہُوئے مکان میں چھپا ہُوا ہے" — میں نے آواز بدل کر کہا — "اور سب لوگ گاؤں سے نکل گئے ہیں۔ تم سب اندر چلی جاؤ۔ کہیں تم پر وار نہ کر جائے۔"

میں اُن سے کچھ دُور تھا اور ساون کی گھٹا نے رات کی تاریکی میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس سے میں نے یہ فائدہ اُٹھایا کہ عورتوں کو اندر بھیج کر خود گاؤں سے نکل گیا۔

میرے سامنے مکئی اور جوار کی فصل کھڑی تھی۔ اس سے مجھے فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔ اچانک ایک خوف میرے دل پر بیٹھ گیا۔ یہ سانپ کا خوف تھا۔ سانپ اسی موسم میں بلوں سے باہر آتے اور زیادہ زہریلے ہو جاتے ہیں لیکن

میں نے اس خوف پر قابو پا لیا۔ مجھ پر اب سانپ سے زیادہ بڑا خوف تھا۔

٦

کھیت مجھ سے بیس پچیس قدم دُور تھے۔ اندھیرا تو تھا لیکن کسی اوٹ سے، کھیت سے ہی کوئی میرے راستے میں آسکتا تھا۔ مجھے دُور سے آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔

"سکندر!" — میرے اندازے کے مطابق ایک سو قدم دُور سے للکار سنائی دی — "سامنے آجاؤ .... کھیتوں میں سے نہیں نکل سکو گے۔ میری گولی سے نہ مرو۔"

یہ سب انسپکٹر کی للکار تھی۔

"وہ نکلا" — کچھ اور دُور سے کسی کی بڑی بلند آواز اُٹھی — "پانچ سات آدمی آگے ہو جاؤ۔"

دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک گولی فائر ہوئی۔ یہ ریوالور کا فائر تھا۔ ایسا لگا جیسے یہ گولی میرے سینے سے پار ہو گئی ہو۔ میرا کوئی ساتھی مارا گیا ہو گا مگر ہم ایک دوسرے کی مدد کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔

میں آہستہ آہستہ چلتا کھیتوں تک پہنچ گیا۔

"کون ہے اوئے!" — مجھے تھوڑی دُور سے آواز سنائی دی۔

"مت اتنا اُونچا بولو" — میں نے آواز بدل کر کہا — "پولیس کا سپاہی ہوں، ہوشیار رہو۔ وہ اِدھر کھیتوں میں ہی ہے۔"

بجلی چمک رہی تھی۔ میں نے دعا کی کہ بارش شروع ہو جائے۔ اُس علاقے کا ساون طوفانی ہوتا تھا۔ مینہ برستا تھا تو دو چار قدم چلا نہیں جاتا تھا۔ بارش کنکریوں کی طرح پڑتی تھی۔

مجھے کسی مینڈھ پر آدمیوں کے چلنے کی آہٹ اور بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں بیٹھ گیا اور آہستہ سے سرک کر فصل کے اندر ہو گیا۔ وہ آدمی ادھر ہی آرہے تھے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے میرے قریب سے گزر گئے۔ جب وہ

دُور نکل گئے تو میں آگے چل پڑا۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ میں نکل بھی گیا تو کہاں جا نکلوں گا اور جب دن کا اجالا پھیلے گا تو میں کہاں ہوں گا اور کہاں جاؤں گا۔

اللہ نے کرم کیا کہ بارش شروع ہو گئی اور فوراً ہی تیز ہو گئی۔ آنکھیں کھول کر چلنا محال ہو گیا۔ مجھے ایک بار پھر تھانیدار کی للکار سنائی دی —
"سکندر! کھیتوں سے باہر آجاؤ۔ سب راستے بند ہو چکے ہیں۔"
میں مینڈھ پر جا رہا تھا۔ بجلی چمکتی اور کڑکتی تھی اور بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک دو آدمی سامنے سے میرے ساتھ ٹکرا گئے۔ وہ ہنس پڑے۔

"ہوش سے چلو" — میں نے ڈانٹ کر کہا — "کہیں اُس باپ سے نہ ٹکرا جانا، اُس کے پاس پستول نہ ہُوا تو خنجر ضرور ہو گا .... چلو بھاگو یہاں سے!"

میرا کمال یہ تھا کہ میں گھبرایا نہیں۔ دل کو مضبوط اور دماغ کو حاضر رکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اندھیرے اور اتنی تیز بارش کی وجہ سے وہ مجھے دیکھ نہیں سکیں گے۔ میرا خیال ٹھیک نکلا۔ وہ کچھ کہے بغیر چلے گئے۔
"او بھائی!" — مجھے آواز سنائی دی۔
میں نے پیچھے دیکھا۔ وہ دونوں مجھے اچھی طرح نظر نہیں آتے تھے۔
"ٹھہر جا بھائی!" — اُن میں سے ایک نے کہا — "تُو ہے کون؟"
میں نے جیسے سُنا ہی نہ ہو۔ میں اس کھیت سے مڑا اور اُدھر کی مینڈھ پر چلنے لگا۔ میں دوڑا لیکن پاؤں پھسلتے تھے۔ میں تیز چلنے لگا۔ میں بار بار پیچھے دیکھتا تھا۔ بجلی چمکتی تھی تو کچھ نظر آجاتا تھا۔ وہ مجھے اپنے پیچھے آتے نظر نہ آتے۔

"سکندر!" — تھانیدار کی للکار پھر سنائی دی — "بہت بُری موت مرو گے۔"

اب اُس کی آواز اور زیادہ دُور سے آتی تھی اور بارش میں مدھم

سنائی دیتی تھی۔

"گاؤں والو!" ——— میں نے گلا پھاڑ کر کہا ——— "گھروں کو چلے جاؤ۔ تینوں کے پاس پستول ہیں۔ مارے جاؤ گے۔"

میں اسی مینڈھ پر چلتا گیا اور آگے اونچی نیچی زمین آگئی۔ وہاں تو چلا ہی نہیں جاتا تھا۔ بہت پھسلن تھی۔ زمین نیچے کو جا رہی تھی۔ میرے قریب پانی بہنے کا شور تھا۔ ایک بار میں پھسلا تو اس پانی میں جا پڑا۔ یہ تنگ سی جگہ تھی۔ پانی بہت تیز تھا۔ میرے لئے اُٹھنا مشکل ہو گیا۔ پانی مجھے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ میں اُٹھا اور پھر گر پڑا۔ آگے جا کر تنگ سی یہ نالی نالہ بن گئی۔ میں اُٹھا اور بڑی مشکل سے پاؤں جمائے۔ پانی میرے گھٹنوں تک آتا تھا لیکن اترائی کی وجہ سے اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ میں اس سے نکلنے کے لئے کنارے پر ہاتھ جماتا تھا تو ہاتھ پھسل جاتا تھا۔

مجھے ایک فائدہ ہُوا۔ پانی مجھے تیز رفتار سے خطرے سے نکال لے گیا مگر یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ یہ چھوٹا نالہ آگے جا کر بلندی سے آبشار بن کر نہ گرتا ہو۔ میرے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ اس سے نکلوں۔ میری خوش قسمتی تھی کہ ایک جھاڑی پر ہاتھ پڑ گیا اور میں اس کے سہارے باہر نکل آیا۔

۞

سردی نے جسم کو بیکار کرنا شروع کر دیا۔ بارش بہت ٹھنڈی تھی۔ مجھ پر کپکپی طاری ہونے لگی۔ یہ اطمینان ہونے لگا تھا کہ میرے تعاقب میں کوئی نہیں آ رہا۔ مجھے خیال آیا کہ تعاقب سے میں نکل آیا لیکن بارش سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں جدھر جا رہا تھا، بارش اُدھر سے ہی ترچھی آ رہی تھی۔

گرتے پڑتے معلوم نہیں کتنا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ مجھے ایک اور شور سنائی دینے لگا۔ اس سے میں واقف تھا۔ یہ سیلاب کا شور تھا۔ یہ کوئی برساتی نالہ تھا اور اس میں سیلاب آ گیا تھا۔ میں چلتا گیا۔ بجلی چمک کر راستہ دکھا دیتی تھی لیکن بارش اتنی تیز کہ نظر دُور تک کام نہیں کرتی تھی۔

کچھ اور آگے گیا تو پاؤں پانی میں ڈوبنے لگے۔ میں نالے تک پہنچ گیا تھا۔

قریب ایک درخت تھا۔ میں اس کے نیچے چلا گیا۔ درخت گھنا تھا اور تنا خاصا موٹا۔ میں تنے کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے یہ فائدہ ہُوا کہ اب بارش مجھ پر سیدھی نہیں پڑتی تھی اور اُوپر سے بھی بارش کا زور درخت روک رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ میں محسوس کرنے لگا کہ خون میری رگوں میں جم گیا ہے اور میں چل نہیں سکوں گا۔ پانی ٹخنوں سے اُوپر آ رہا تھا۔ بجلی بڑی زور سے چمکی اور جب اس کی کڑک سنائی دی تو میرا دل دہل گیا۔ اتنی تیز روشنی جیسے سورج چمک کر بجھ گیا ہو۔ بجلی کی چمک ایک آدھ سکنڈ کی ہوتی ہے۔ اتفاق سے میں نالے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں نالے کا پاٹ چوڑا تھا۔ اس سے مجھے اطمینان ہُوا کہ پانی گہرا نہیں ہو گا۔ ایک وجہ نالے کے پار چلے جانے کی تو صاف تھی کہ گرفتاری سے بچنا تھا اور درخت کے نیچے سے نکل جانے کی وجہ یہ تھی کہ بجلی عموماً درختوں پر گرا کرتی ہے۔ مجھے درخت کے نیچے زیادہ دیر کھڑا نہیں رہنا چاہیئے تھا۔ وہاں سے چل پڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رُک جانے سے سردی لگنے لگی تھی اور خون سرد ہو رہا تھا۔

میں نے خطرہ مول لیا اور نالے میں چل پڑا۔ پانی گھٹنوں تک آیا اور میں چلتا رہا۔ آگے پانی گھٹنوں سے اُوپر ہو گیا اور تیز بھی۔ میں نالے کے درمیان پہنچ گیا۔ پانی اور زیادہ تیز اور تُند تھا۔ ایسے نالوں کا بہاؤ درمیان میں تیز ہوتا ہے۔ میرے پاؤں اُکھڑنے لگے تھے۔ میں نے جسم کی پوری طاقت مرکوز کر لی اور چلتا گیا۔

اچانک میرے پاؤں اُٹھ گئے۔ گہرائی میری کمر تک ہو گئی تھی۔ میں نے تیرنا شروع کر دیا۔ میں اب اُٹھتی گرتی لہروں میں پہنچ گیا تھا اور پانی مجھے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ میں کنارے کی طرف تیر رہا تھا اور میرے بازو کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے بازو ڈھیلے چھوڑے تو پاؤں تہہ سے لگ گئے اور پانی کی گہرائی کمر اور گھٹنوں کے درمیان تھی اور وہاں پانی کا اتنا زور نہیں تھا جتنا درمیان میں تھا۔ میں چلتا ہُوا اگلے کنارے پر چلا گیا۔

بارش کچھ کم ہو گئی تھی لیکن ہوا چلنے لگی اور خاصی تیز چلنے لگی۔ میرے سر

سے پاؤں تک پانی ٹپک رہا تھا۔ کپڑے جسم کے ساتھ چپک گئے تھے۔ اس حالت میں ہوا برف کی طرح سرد لگتی تھی۔ میں نے چلتے رہنے کا ارادہ کر لیا تاکہ جسم میں حرارت رہے اور میں جس گاؤں سے بھاگا تھا وہاں سے دُور نکل جاؤں۔ تعاقب کا خطرہ ختم ہو چکا تھا لیکن قریب کہیں رُک جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

علاقہ بنجر اور ویران آ گیا تھا۔ وہاں نشیب اور گھاٹیاں تھیں جو مجھے تیز چلنے نہیں دیتی تھیں۔ پھسلن اتنی کہ میں ہر دس بارہ قدم پر پھسلتا اور گرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں گرتا ہوں تو اُٹھنے کے لئے مجھے زیادہ زور لگانا پڑتا ہے۔ جسم شل ہوتا جا رہا تھا۔

میں گرتا پڑتا چلتا ہی گیا اور سردی سے میرے دانت بجنے لگے۔ کنپٹیوں میں درد شروع ہو گیا، پھر جبڑوں میں درد ہونے لگا۔ میں نے جبڑوں کو ہتھیلیوں سے زور زور سے مَلا۔ بازو اُوپر نیچے کر کے اور گھما گھما کر جسم کو گرم کرنے کی کوشش کی لیکن بے سُود۔ میں اب قوتِ ارادی کے زور پر چل رہا تھا۔

بہت آگے جا کر میں نے پسلیوں میں درد محسوس کیا اور صاف معلوم ہونے لگا کہ جسم تپ رہا ہے۔ بخار کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔ یہ حالت خطرناک تھی۔ بیمار نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ علاج نہ ہونے سے بیماری بڑھ سکتی تھی اور مجھ پر غشی بھی طاری ہو سکتی تھی پھر گرفتاری یقینی تھی۔

میں نے اپنے آپ کو یہ یقین دلانا شروع کر دیا کہ میں بیمار نہیں ہوں اور یہ صرف ٹھنڈ کا اثر ہے مگر جسم اتنی تیزی سے نڈھال ہوتا گیا کہ خود فریبی کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ میں دُعا کرنے لگا کہ کہیں گُف یا غار مل جاتے جس میں چُھپ کر بیٹھ جاؤں لیکن وہ علاقہ گُفوں اور غاروں والا نہیں تھا۔

میری جسمانی حالت یہ ہو گئی کہ بہت زور لگا کر میں چل رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میں نے تین میل سے کچھ زیادہ فاصلہ طے کر لیا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ صبح تک کم از کم پندرہ میل دور نکل جاؤں۔ اب تو میں ارادے کے جوش سے ہی چل رہا تھا ——— اور اس احساس نے مجھے اور زیادہ بے حال

کرنا شروع کر دیا کہ میں نے اللہ کے نام پر اللہ کے گھر میں اللہ کا کلام ہاتھ میں لے کر جو فریب کاری کی تھی، مجھے اس کی سزا مل رہی ہے۔

سزا کی اذیت بڑھتی جا رہی تھی اور انجام بہت بُرا نظر آ رہا تھا۔

موسلا دھار بارش پھوہار بن گئی تھی لیکن زمین چلنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ تین اور چھوٹے چھوٹے برساتی نالے پانی میں چل کر عبور کئے۔



وقت کا احساس نہ رہا کہ کتنا گزر گیا ہے اور رات کتنی رہ گئی ہے۔ دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ کوئی بھی یاد نہ رہا۔ ساری دلچسپیاں اور سارے دُکھ اور رنج اپنی ذات پر مرکوز ہو گئے تھے۔

پھر ایسے ہُوا جیسے یہ احساس بھی مٹ گیا کہ میں کہاں چلا جا رہا ہوں اور کیوں چلا جا رہا ہوں۔ گرفتاری کا خوف میری ذات میں ہی کہیں گُم ہو گیا۔ میں اس طرح چلتا گیا جیسے چابی والا کھلونا ہوں اور چابی کے زور پر چلا جا رہا ہوں۔

رات تو تاریک تھی ہی لیکن کچھ وقت اور گزرا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ چند سیکنڈ بعد یہ اندھیرا ہٹ گیا اور رات کی تاریکی رہ گئی۔ پھر میرا سر ڈولا اور میں سنبھل گیا۔ جسم کی حالت ایسی ہو گئی جیسے مجھے لاٹھیوں سے پیٹا گیا ہو۔ سردی کے باوجود آنکھیں جل رہی تھیں اور چہرہ تپ رہا تھا۔

میں ایک بار سنبھلا تو پتہ چلا کہ میں گر پڑا تھا۔ میں اُٹھا اور قدم آگے کو بڑھایا تو قدم دائیں کو چلا گیا۔ دایاں قدم اُٹھایا تو قدم آگے ہی پڑا لیکن میں لڑکھڑا گیا اور بایاں پاؤں خود بخود ایک طرف پڑا اور میں گرنے سے بچ گیا۔

پھر میں اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا۔ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔



ہوش میں آیا تو خواب کا احساس ہُوا۔ آنکھیں کُھلیں اور بند ہو گئیں۔ معلوم نہیں کتنی دیر بعد آنکھیں کُھلیں۔ میں پیٹھ کے بل پڑا تھا لیکن میرے نیچے زمین نہیں بستر تھا۔ گھبرا کر اپنے ذہن کو بیدار کیا اور اپنے اُوپر چھت نظر آئی۔ وہاں دن کی روشنی تھی۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اُٹھ نہ سکا مگر میں زور لگا کر

اُٹھ بیٹھا اور دیکھا۔

یہ ایک دیہاتی مکان تھا۔ کمرے میں دو اور چار پائیاں بچھی تھیں۔ کارنس پر اور اِدھر اُدھر سلیقے سے چیزیں رکھی تھیں۔ ایک دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا اور اس میں سے دن کی روشنی آ رہی تھی۔ میں دروازے کی طرف دیکھتا رہا اور پہلی سوچ یہ آئی کہ میں پکڑا گیا ہوں اور باہر پولیس بیٹھی ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں دیکھے۔ کھلے ہوئے تھے۔ اپنے کپڑے دیکھے۔ بھیگے ہوئے نہیں تھے۔ کمر سے ایک چادر بندھی ہوئی تھی اور اوپر والا دھڑ بھی چادر میں تھا۔

میرا جسم جل رہا تھا۔ پسلیوں میں ایک مقام پر درد محسوس ہو رہا تھا اور جسم میں بھی درد کی کیفیت تھی۔ چہرہ جل رہا تھا۔ یہ بخار کی علامت تھی۔

کمرے میں ایک آدمی آیا۔ وہ دیہاتی تھا لیکن شائستہ آدمی لگتا تھا۔ اُس کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔ داڑھی چھوٹی تھی اور تراشی ہوئی تھی۔ وہ میرے پاس آیا اور میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا، پھر میری کلائی پکڑ کر نبض محسوس کی۔

"بخار ابھی تیز ہے" —— اُس نے کہا —— "لیٹے رہو۔ پسینہ آئے گا تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"یہ کون سا گاؤں ہے؟" —— میں نے پوچھا۔ میری آواز نحیف تھی۔

اُس نے گاؤں کا نام بتا کر مجھ سے پوچھا کہ میں کون سے گاؤں کا رہنے والا ہوں اور کہاں جا رہا تھا۔ میں نے وہی جھوٹ بولا جو میں بولتا چلا آ رہا تھا، یعنی دیوبند کا طالب علم ہوں۔ تبلیغی جماعت کے ساتھ آیا تھا اور سب اکیلے اکیلے اس علاقے میں مختلف گاؤں کو چلے گئے۔ میں نے اپنی سنائی کہ میں کشتی میں دریا پار کر رہا تھا کہ سیلاب آگیا اور کشتی کئی میل دور کنارے سے لگی۔

عجیب مجبوری تھی۔ ایک طرف میں خدا سے دروغ گوئی کی معافیاں مانگ رہا تھا اور دوسری طرف دروغ گوئی کا ہی سہارا لے رہا تھا۔ وہ مشہور کہاوت یاد آ رہی تھی کہ خدا قریب ہے، یا گھونسہ...... اُس وقت گھونسہ ہی قریب تھا اور

مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے پکڑا نہیں اور مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ دیوبند کا نام سنتے ہی اس شخص کا جو میرے پاس بیٹھا تھا، چہرہ پہلے جیسا نہ رہا۔ اس چہرے پر وہی تبدیلی آئی جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔

"الحمدللہ، یہ گاؤں مسلمانوں کا ہے" —— اُس نے کہا —— "کوئی ایک بھی گھر ہندوؤں کا نہیں...... آپ پہلے سے کچھ بہتر محسوس کر رہے ہیں؟"

"نہیں" —— میں نے جواب دیا —— "سر پھٹ رہا ہے، سینے میں درد زیادہ ہے اور جسم کے جوڑ کھل رہے ہیں۔"

"آپ کو بہت بُری ٹھنڈ لگی ہے" —— اُس نے کہا —— "یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں۔ گاؤں میں کوئی حکیم بھی نہیں۔ ہم خود ہی ڈاکٹر اور خود ہی حکیم ہیں۔ شفا اللہ کے اختیار میں ہے۔ دے دے تو اُس کا شکر ادا کرتے ہیں، نہ دے تو ہم کہتے ہیں کہ اللہ کو یہی منظور تھا...... آپ کو ہم نے بہت تیز کاڑھا پلایا ہے۔ پسینہ آگیا تو آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

پسینے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میری اپنی تشخیص تو یہ تھی کہ مجھے نمونیہ ہو گیا ہے۔ سانس لینے میں بھی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ میرا مسئلہ صحت یاب ہونے کا اتنا نہیں تھا جتنا بھاگ نکلنے کا تھا مگر میری جسمانی حالت مخدوش ہو گئی تھی۔

"میں یہاں تک کس طرح پہنچا ہوں؟" —— میں نے اس شخص سے پوچھا۔

"آپ ہمارے گاؤں سے تھوڑی ہی دُور بیہوش پڑے تھے" —— اُس نے جواب دیا —— "یہ آپ کی خوش نصیبی تھی کہ گاؤں کے دو آدمی کہیں سے آ رہے تھے۔ وہ تو آپ کو لاش سمجھے تھے۔ آپ کو سانس لیتے دیکھا اور یہ بھی کہ آپ اجنبی ہیں تو دونوں آپ کو اُٹھا لائے۔ میں ہی گاؤں کا بڑا ہوں۔ نمبردار کہہ لیں اور جو بھی آپ سمجھ لیں۔ گاؤں میں ہم سب ایک ہی برادری کے لوگ

ہیں۔ وہ آپ کو میرے گھر لے آئے۔"

اِس شخص نے جس کا نام قطب الدین تھا، میرے جسم کو ہاتھ لگایا تو بھیگا ہُوا ہونے کے باوجود جسم کو بہت گرم پایا۔ میرے کپڑے اتارنے ضروری تھے۔ قطب الدین نے دو آدمی ساتھ لے کر میرے کپڑے اُتارے اور مجھے میت کی طرح نہلا کر جسم خشک کیا اور دو چادریں لپیٹ کر مجھے اندر لٹا دیا۔ میں رات سے بے ہوش پڑا تھا اور اب دن کا پچھلا پہر تھا۔ قطب الدین پہلے میرے مُنہ میں پانی ٹپکاتا رہا۔ پانی میرے حلق سے نیچے جاتا رہا پھر اُس نے معلوم نہیں کیا کیا چیزیں ملا کر کاڑھا تیار کیا اور یہ بھی میرے مُنہ میں ٹپکایا اور میں نے بے ہوشی میں کاڑھا بھی پی لیا۔

۞

یہ میرے بس کی بات تو نہیں تھی لیکن میں اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ اب مجھ پر غشی طاری نہ ہو۔ قطب الدین میرے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ ایک عورت اُس کے ساتھ آن کھڑی ہوئی۔ وہ صاف سُتھرے کپڑے پہنے ہُوئے ایک جوان عورت تھی اور اُس کی عمر پچیس چھبیس سال لگتی تھی۔ یہ قطب کی بیٹی یا بہن ہو سکتی تھی۔ وہ خوبصورت عورت تھی۔ لڑکی کہوں تو بھی غلط نہ ہو گا۔ خوبصورتی تو نقش و نگار، قد کاٹھ اور سیدھے کھڑے جسم کی تھی لیکن اُس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جو کسی اور انداز سے متاثر کرتا تھا۔ یہ وقار کا تاثر تھا اور اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جس میں رُعب اور پاکیزگی کا تاثر تھا۔

"دُودھ میں شہد ڈال کر لے آؤ" — قطب الدین نے اُسے کہا — "دُودھ گرم ہو۔"

وہ چلی گئی تو میں نے قطب سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔

"میری بھانجی ہے" — اُس نے بتایا — "بیوہ ہے۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں بیاہ دی تھی .... سُسرال ساتھ والے گاؤں میں تھا۔ وہ لوگ اتنے اچھے نہ نکلے۔ لڑکے کا تو پہلے پتہ ہی نہ لگا کہ اندر اندر کیسی بُری عادتوں میں پڑا ہُوا ہے۔ لڑکی نے بتایا کہ رات کو آتا ہے تو اُس کے مُنہ سے ایسی بدبو

آتی ہے جو برداشت نہیں ہوتی۔"

"چرس پیتا ہو گا" — میں نے کہا۔

"کون سا نشہ ہے جو وہ نہیں کرتا تھا" — قطب نے کہا — "بعد میں پتہ چلا کہ اُس کی شادی اسی لئے کی گئی تھی کہ بُری عادتیں چھوڑ دے گا لیکن مولوی صاحب! بُری عادتیں کہاں چھوٹتی ہیں۔ وہ شادی کے قابل تھا ہی نہیں۔ ہم دھوکے میں آ گئے۔ اس لڑکی کو میں نے ہی پالا پوسا تھا۔ یتیم ہو گئی تھی .... اسے بیوہ ہُوئے تین سال ہو گئے ہیں۔ شادی کا نام سُنتی ہے تو رونے لگتی ہے۔"

"بچے؟"

"نہیں" — قطب نے جواب دیا — "بچہ ہُوا ہی نہیں۔ یہ بھی اچھا ہُوا .... کہتی ہے دوسری شادی نہیں کروں گی۔"

وہ دُودھ لے آئی۔ میں اُٹھ بیٹھا اور اُس کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا لیکن کمزوری اور بخار کی وجہ سے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس نے میرے ہاتھ سے پیالہ لے لیا اور قطب کی طرف دیکھا۔ قطب نے اُس سے پیالہ لے کر میرے مُنہ کے ساتھ لگا دیا۔ میں نے آہستہ آہستہ دُودھ پی لیا۔ جسم میں ذرا سی جان آ گئی۔

۞

وقت گزرنے لگا۔ قطب الدین نے رات کو بھی مجھے کاڑھا پلایا اور ایک پاؤڈر سا پانی کے ساتھ کھلایا۔ یہ کوئی دیسی دوائی تھی لیکن بخار اور سینے کا درد کم نہیں ہو رہا تھا۔

صبح قطب الدین کی بھانجی جس کا نام عائشہ تھا، دُودھ لے کر آئی۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے پیالہ لیا لیکن اسے قابو میں نہ رکھ سکا۔ عائشہ نے بے تکلفی سے پیالہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور اس طرح میرے پاس بیٹھ گئی کہ اُس کا ایک گھٹنا میری پیٹھ کے پیچھے تھا اور اُس نے مجھے اپنے جسم کا سہارا دے دیا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اُس نے پیالہ میرے مُنہ کے ساتھ لگا دیا۔

"آہستہ آہستہ" ــــ اُس نے ایسے پیار سے کہا جس میں ماں اور بہن کا تاثر تھا۔ پوچھنے لگی ــــ "آرام نہیں آیا؟ جسم تو آپ کا جل رہا ہے۔ سینے میں درد ہے؟"

اُس کے پوچھنے کے انداز کا اثر تھا یا میں اتنا بے بس ہو گیا تھا کہ میں نے سر ہلا کر بتایا کہ آرام نہیں آیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے آنسو بہہ نکلے۔ میں بچہ بن گیا۔ اپنے آپ پر قابو پانے کے باوجود میری سسکیاں نکلنے لگیں۔ عائشہ نے میرے پیچھے سے بازو آگے کر کے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"گھر یاد آ رہا ہے یا تکلیف زیادہ ہے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"میرا کوئی گھر نہیں" ــــ میں نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "میرا کوئی نہیں صرف اللہ ہے۔"

میں نے ہونٹ سی لئے۔ جذبات اُمڈ آتے تھے۔ ایک ہی بار نہ جانے کیا کیا زبان پر آ گیا تھا۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میرا سینہ بڑے ہی زہریلے غبار سے بھرا ہُوا ہے اور یہ آتش فشاں پہاڑ کے سینے میں رُکے ہوئے لاوے کی طرف پھُوٹ نکلنے کو بیتاب ہے لیکن میں نے آتش فشاں کا دہانہ کھُلنے نہ دیا۔ اگر میں زبان کو بے قابو کر دیتا تو نہ جانے کیا کچھ کہہ جاتا۔ اسے عائشہ غلط سمجھ سکتی تھی یا میں اپنی اصلیت سے پردہ اُٹھا دیتا۔

میری پیٹھ اُس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ میں ذرا آگے ہو گیا۔ اُس کے ساتھ لگے رہنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں اُس کی نیّت کو سمجھتا تھا۔ یہ اُس دَور کی نیّت تھی جو آج کے دَور میں ناپید ہے۔ اُسے کوئی غم نہیں تھا کہ اُس کا ماموں قطب الدّین آ جائے گا تو شک کرے گا اور بُرا جانے گا۔

عائشہ نے مجھے دُودھ پلایا اور چلی گئی۔

پھر یہ معمول بن گیا۔ قطب الدین مجھے دلیسی دوائیاں کھلاتا اور عائشہ مجھے دُودھ پلاتی تھی۔ دُودھ کے سوا میں اور کوئی غذا نہیں لے سکتا تھا۔ قطب میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا اور میری باتیں سنتا تھا۔ گاؤں کے دو تین آدمی میرے

پاس آتے تھے لیکن وہ مجھے دیوبند کا طالب علم سمجھ کر مجھ سے مرعوب تھے اس لئے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ ہاتھ ملاتے، میری صحت کے متعلق پوچھتے اور سامنے والی چارپائی پر بیٹھ کر مجھے دیکھتے رہتے تھے۔

میں عائشہ سے کہہ بیٹھا تھا کہ میرا کوئی گھر نہیں اور خدا کے سوا میرا کوئی نہیں۔ وہ دوسرے دن میرے پاس بیٹھ گئی تھی۔ اُس نے میرے گھر کے حالات مجھ سے پوچھے تھے۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ میں ماں باپ کی واحد اولاد تھا اور ماں اُس وقت فوت ہوئی تھی جب میں سات آٹھ سال کا تھا اور باپ اُس وقت فوت ہُوا جب میں پندرہ سولہ سال کا تھا۔ سوتیلی ماں بھی تھی جس کے بُرے سلوک سے تنگ آ کر میں گھر سے بھاگا اور خجل خراب ہوتا دیوبند چلا گیا تھا۔

عائشہ مجھے اپنے خاوند کی باتیں سناتی تھی اور اُس کے آنسو نکل آتے تھے۔

۶

چوتھے دن کا ذکر ہے۔ مجھے دیکھنے کے لئے گاؤں کا حجام آ گیا۔ اُس کے پاس اوزار تھے اور اُس کے پاس چھوٹے سائز کا آئینہ بھی تھا۔ میں نے مدت بعد آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ میرا تو حُلیہ ہی بگڑا ہُوا تھا۔ سر کے بال بڑھے ہوتے تھے، مونچھیں بے ترتیب ہو کر ہونٹوں پر آ گئی تھیں۔ داڑھی بہت بڑھ گئی تھی۔ یہ کسی مسلمان کی داڑھی نہیں تھی اور یہ مونچھیں بھی کسی مسلمان کی نہیں تھیں۔ میں نے حجام سے کہا کہ سر کے بال کاٹ دے اور مونچھیں اور داڑھی تراش دے۔

میری ہدایت پر وہ کام کرتا گیا۔ داڑھی بمشکل دو اِنچ رہنے دی۔ میرا چہرہ بیماری کی وجہ سے مرجھا گیا تھا لیکن تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی داڑھی اور مونچھیں مجھے بہت اچھی لگیں۔ مکمل طور پر بڑھی ہوئی داڑھی اور ہونٹوں پر آئی ہوئی مونچھیں میرے لئے بڑا کامیاب بہروپ تھا۔ میں خود اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتا تھا لیکن دماغ پر مسلسل تیز بخار نے ایسا بُرا اثر کیا تھا کہ میں اُس

بھروپ میں گھٹن اور گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔

قطب الدین نے بھی کہا کہ اب میرا چہرہ بہت اچھا لگتا ہے اور عائشہ کو بھی تراشی ہوئی چھوٹی داڑھی اچھی لگی۔

"میں تمہیں کہنا نہیں چاہتی تھی کہ داڑھی چھوٹی کرا دو اور مونچھوں کی کوئی شکل بناؤ"—— عائشہ نے کہا ——"میں ڈرتی تھی کہ تم بُرا جانو گے اور گناہ بھی ہو گا۔"

حُلیہ تو سنور گیا مگر بخار ذرا سا بھی کم نہ ہُوا۔ سینے کا درد اگر بڑھا نہیں تھا تو کم بھی نہیں ہُوا تھا۔ قطب الدین اور اُس کی بیوی تو جیسے مجھے اپنا اکلوتہ بیٹا سمجھتے تھے۔ عائشہ میرا سر دباتی رہتی، باتیں کرتی اور باتیں سُنتی رہتی۔ اس گاؤں میں شاید ابھی میری گرفتاری کا حکم اور انعام کا اعلان نہیں پہنچا تھا —— میں نے انہیں اپنا نام غلط بتایا تھا۔

پانچویں یا چھٹے دن بخار اور تیز ہو گیا یا بخار نے جسمانی طاقت پوری کی پوری کھا لی تھی کہ بار بار غشی آتی تھی۔ صاف محسوس ہونے لگا کہ جسم ختم ہو چکا ہے اور میں دو گھڑی کا مہمان ہوں۔ ایک بار غشی آئی یا بیداری کی حالت میں ہی مجھے اپنی ماں چارپائی کے قریب کھڑی دکھائی دی۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ چُپ تھی، اُداس تھی۔ اُس نے ہاتھ یوں میری طرف کئے جیسے میں ڈیڑھ دو سال کا بچّہ تھا اور وہ مجھے گود میں اٹھانا چاہتی تھی۔

ایک بار غشی میں اپنے باپ کو دیکھا۔ وہ اچھا بھلا تھا اور مُسکرا رہا تھا۔ میں نے اپنا گھر بھی دیکھا اور خیال آیا کہ میرے ابّو اور امّی اندر بیٹھے ہوتے ہیں اور میں باہر کھیل رہا ہوں۔

یہ موت کی نشانیاں تھیں۔ موت اُس کمرے کی دہلیز پر آ گئی تھی جس میں مَیں لیٹا ہُوا تھا۔ میری زندگی ختم تھی۔ مسرّت کی لہر سی میرے جسم میں پھر گئی۔ موت کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ میرے دل میں دنیا کی کسی چیز کا لالچ نہیں تھا۔ دُنیا سے رخصت ہونے کا مجھے ذرا سا بھی رنج نہیں تھا۔

(6)

رات کا وقت تھا۔ اُس وقت تک میں سو جایا کرتا تھا لیکن اُس رات نیند نہیں آ رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ میں بڑی لمبی نیند سونے جا رہا تھا۔ قطب الدین نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ وہ میرے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔

"میں صبح ایک گاؤں جاؤں گا"—— اُس نے کہا ——"وہاں ایک ہندو سیانا ہے۔ اُسے ساتھ لاؤں گا۔"

"نہ لائیں اُسے!"—— میں نے ایسی آواز میں کہا جو بہت دُور سے آتی لگتی تھی ——"میری منزل آ گئی ہے۔ مجھے اللہ کے حوالے کریں۔ آپ نے جس طرح میری تیمارداری کی ہے ایسے کون کرتا ہے! میں اس کا صلہ نہیں دے سکتا لیکن میں کچھ دے کر دُنیا سے رخصت ہوں گا .... میری قیمت دس ہزار روپے ہے۔ آپ یہ قیمت بڑی آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ قیمت آپ کو سرکارِ انگریزی سے ملے گی۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"—— اُس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ——"بخار دماغ کو چڑھ گیا ہے۔"

"ابھی ہوش میں ہوں"—— میں نے کہا ——"میری بات غور سے سُنیں۔ کیا آپ تک خبر نہیں پہنچی کہ ایک سب انسپکٹر جس کا نام سکندر ہے، ایک انگریز پولیس کپتان کو قتل کر کے فرار ہو گیا ہے اور اُسے زندہ یا مُردہ پکڑنے والے کو دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا؟"

"اُڑتی اُڑتی سی خبر سُنی تھی"—— قطب الدین نے کہا ——"لیکن میں نے ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے نکال دی تھی۔ میں اُس شخص پر اپنی جان قربان کر دوں گا جس نے انگریز پولیس کپتان کو قتل کیا ہے۔"

"اگر میں کہوں کہ وہ مفرور سب انسپکٹر سکندر میں ہوں تو آپ مان لیں گے؟"

"نہیں"—— اُس نے کہا۔

"وہ سکندر میں ہی ہوں"—— میں نے بڑی مشکل سے کہا ——"میری بولنے

کی طاقت ختم ہو رہی ہے۔ میری بات سن لیں اور مجھے اسی چارپائی پر اُٹھا کر تھانے لے چلیں اور دس ہزار روپیہ وصول کر لیں۔ میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں جو آپ کو پیش کروں۔ مجھے پولیس کے حوالے کر کے ....."

"اس سے آگے کچھ نہ کہنا" ـــــ قطب الدین نے کہا ـــــ "مجھے صرف یہ بتائیں کہ آپ نے اس فرنگی کو کیوں قتل کیا تھا؟"

میں نے اُسے پوری تفصیل سے سُنا دیا۔

"آفرین!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "ایک ہندوستانی ملازم کی لڑکی کی عزّت پر آپ نے اپنی نوکری، اتنا بڑا عہدہ اور اپنی زندگی قربان کر دی۔"

پھر میں نے اُسے سنایا کہ میں کس طرح اپنے شہر کس کام کے لئے گیا تھا اور ریل گاڑی سے کس طرح فرار ہوا ہوں۔

"اللہ آپ کو زندگی دے" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "آپ کیا اسی طرح چھُپتے پھریں گے؟"

"ارادہ تو یہ تھا کہ صرف چھُپتا نہیں پھروں گا" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میں انگریزوں کے لئے مصیبت اور قہر بنوں گا۔"

یہ سوچ کر کہ یہ شخص ٹیررسٹ یا دہشت گرد کا مطلب نہیں سمجھتا ہو گا اُسے سمجھایا کہ میں کیا کروں گا اور باقی عمر یہ جھُوٹ بولنے کی اللہ سے معافی مانگتا رہوں گا کہ میں دیوبند کا طالبعلم ہُوں۔

"آپ زندہ رہیں گے" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "اللہ آپ کو صحت یاب کرے، اس گاؤں کے تمام جوان آپ کے ساتھ ہوں گے۔ انگریزوں کے ساتھ میری خاندانی دشمنی ہے۔"

میں نے مُسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "یہ بڑا سنجیدہ معاملہ ہے ... میری عمر بیالیس سال ہے۔ میرے والد صاحب نوّے برس کی عمر میں فوت ہُوتے تھے اور میرے دادا پچانوے برس کی عمر میں اللہ کو پیارے ہُوتے تھے۔ وہ میرے والد صاحب کے بتلانے کے مطابق ۱۸۵۷ء میں جوان تھے۔

دِلّی اور آگرہ کے درمیان اُن کی اتنی زیادہ زمین تھی کہ وہ بہت بڑے زمیندار کہلاتے تھے۔ ہمارے پردادا فوت ہو گئے تھے۔ آپ نے کتابوں میں ۱۸۵۷ء کے غدر کے حالات پڑھے ہوں گے۔ مسلمان سپاہیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ انگریزوں اور مسلمانوں کی بہت لڑائی ہوتی تھی۔"

"میں جانتا ہوں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "پڑھا بھی ہے۔ سُنا بھی ہے۔"

"مگر مسلمانوں کو شکست ہو گئی" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "کچھ مسلمان سپاہی میرے دادا کی زمین پر چلے گئے۔ وہ چھُپنے کے لئے گئے تھے۔ انگریز انہیں باغی کہتا تھا اور باغی کو پناہ دینے کی اتنی ہی سزا تھی جتنی باغی کے لئے تھی یعنی موت لیکن دادا نے ان سپاہیوں کو چھُپا لیا۔ اس سے پہلے دادا نے جنگ کے دوران لڑنے والے مسلمانوں کو بے شمار گندم دی تھی۔ آخر انگریزوں کو پتہ چل گیا۔ اُنہوں نے دادا کو پھانسی کی سزا تو نہ دی، تمام زمین ضبط کر لی اور وہاں سے دادا اور اُن کے خاندان کو نکال دیا....

"دادا نے میرے والد صاحب کو سنایا تھا اور والد صاحب نے مجھے سنایا کہ دادا نے یہاں آ کر کچھ بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنایا پھر زمین خریدنی شروع کر دی۔ وہ اپنی آبائی جگہ سے نکالے گئے تو بہت سی رقم اور زیورات نکال لاتے تھے۔ اس سے وہ زمین خریدتے رہے اور دُنیا سے اُٹھ گئے۔ یہ گاؤں ہماری برادری نے آباد کیا تھا۔ انگریز نے حکم دیا کہ کسی مسلمان کو سرکاری نوکری نہ دی جائے۔ ہمارے خاندان کے لئے تو یہ حکم اور زیادہ سخت تھا۔ ابھی تک ہمارے گاؤں کے کسی بھی جوان کو فوج اور پولیس کی نوکری نہیں مل سکتی....

"ہم انگریز کے غلام ہیں لیکن اُس کے محتاج نہیں۔ میرے والد صاحب ہمیشہ ہمیں بتاتے رہے کہ انگریز ہمارا دشمن ہے۔ دشمنی بھی ایسی کہ اس صدی تک انگریز ہمارے گاؤں کی آبادی کو اور ہمارے خاندان کے بچّے بچّے کو مشتبہ سمجھتا رہا" ـــــ اُس نے کچھ واقعات سنائے اور کہا ـــــ "میں آپ جیسے مجاہد کو انگریزوں کی پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ میں انگریز افسر کو قتل کرنے والے کو پولیس کے حوالے کر کے دس ہزار روپے کا لالچ نہیں کروں گا۔"

اُس نے کچھ اور بھی کہا ہوگا لیکن میں غشی میں چلا گیا تھا۔

میں اس غشی سے بیدار ہُوا تو کمرے میں دن کی روشنی تھی اور قطب الدین میرے پاس بیٹھا تھا۔

"میں ہندو سیانے سے دوائی لے آیا تھا" — اُس نے کہا — "میں اُسے پیسے دے کر ساتھ لا سکتا تھا لیکن اس ڈر سے نہ لایا کہ وہ آپ کو پہچان نہ لے۔ اُسے تمہاری حالت بتائی تو اُس نے کہا کہ یہ نمونیہ ہے۔ میں ایک دوائی گھول کر آپ کے مُنہ میں قطرہ قطرہ ڈالتا رہا ہوں۔"

شام تک مجھے تین قسم کی دوائیاں دی گئیں اور سورج غروب ہونے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ بخار میں کمی آگئی ہے۔ اگلے دن مزید افاقہ محسوس ہُوا اور اُس سے اگلے دن اتنا پسینہ آیا جیسے میں برساتی نالے سے نکل کر آیا ہوں۔

تیسرے چوتھے روز سینے کا درد ختم ہو گیا اور بخار بھی نہ رہا۔ میں اب آسانی سے اُٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ عائشہ میری تیمارداری پہلے سے زیادہ والہانہ انداز سے کرنے لگی۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو چلے جاؤ گے؟" — اُس نے ایسے انداز سے پوچھا جیسے کہنا چاہتی ہو کہ ٹھیک ہو کر چلے نہ جانا۔

"آخر جانا ہے" — میں نے کہا۔

اُسے معلوم نہیں تھا کہ میں مفرور ہوں۔

"تم تو کہتے ہو کہ تمہارا کوئی گھر نہیں" — اُس نے کہا — "اور تمہارا اپنا کوئی بھی نہیں۔ یہیں رہ جاؤ۔"

یہ شاید بیماری کا اثر تھا کہ میں سوچنے لگا کہ کب تک بھاگا بھاگا پھروں گا۔ کوئی ایسی صورت بن جائے کہ میں یہیں رہ جاؤں اور اسی گاؤں میں کام کاج کرتے باقی زندگی گزار دوں۔

میں نے دیکھا کہ عائشہ نے میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے رکھا تھا اور اسے سہلا رہی تھی۔

"یہیں رہ جاؤ" — اُس نے التجا کے لہجے میں کہا — "ہم دونوں...."

وہ چُپ ہو گئی۔

"رہ جاؤں گا" — میں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے میں تھک کر ہار گیا ہوں۔

میں سمندری چٹان تو نہیں تھا کہ سمندر کی موجیں مجھ سے ٹکراتی اور قطرہ قطرہ ہوکر بکھرتی رہتیں اور میں روزِ اوّل کی طرح کھڑا رہتا۔ چٹانیں بھی گھستی اور کٹتی رہتی ہیں۔ میں تو گوشت پوست کا انسان تھا اور کیسے کیسے خوفناک طوفانوں سے گزر کر قطب الدین کے گھر تک پہنچا تھا، اور پھر ایسی بیماری نے آن دبوچا کہ میں موت کی دہلیز تک جا پہنچا۔ میں نے عائشہ سے جب یہ کہا تھا کہ میں نہیں رہ جاؤں گا اُس وقت میری حالت ایسے زخمی سپاہی کی سی تھی جو محاذ پر گر پڑتا ہے اور دشمن کے بڑھتے ہوئے ٹینکوں کو اپنی طرف آتے دیکھتا ہے مگر اپنے آپ کو کچلے جانے سے بچا نہیں سکتا۔

میرا یہ کہنا کہ نہیں رہ جاؤں گا ایک آہ تھی جو میرے سینے سے اُٹھی اور ہونٹوں سے پھسل گئی تھی۔ عائشہ کے ہونٹوں پر تو مسکراہٹ آگئی تھی لیکن میری مسکراہٹیں بخار میں جل کر راکھ ہوگئی تھیں۔ میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ عائشہ کی نیت کیا ہے۔ کیا وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی یا دوستی؟

اُس کی نیت کچھ بھی تھی، میری نیت میں کوئی فتور نہ تھا۔ مجھ کو یہ احساس بھی تھا کہ قطب الدین کو مجھ پر اتنا زیادہ بھروسہ ہے کہ اپنی جوان اور خوبصورت بھانجی کو میرے پاس اکیلے بیٹھنے سے نہیں روکتا تھا۔ میں اس بھروسے کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا تھا — اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں اُس وقت اپنے آپ میں تھا ہی نہیں۔ جذبات نیم مُردہ، ذہن نیم خفتہ اور میرا چٹان جیسا جسم ریت کا ٹیلہ بن گیا تھا۔

وہ لمحے آج بھی یاد ہیں۔ میرا ہاتھ عائشہ کے ہاتھوں میں تھا کہ میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں خوابوں کی دنیا میں چلا گیا۔ دُھندلے دُھندلے سے خواب تھے جو میں دیکھنے لگا، پھر ہر طرف پانی ہی پانی دیکھا۔ اس میں سے ایک چٹان

اُبھری ہوئی تھی اور میں اس پر کھڑا تھا۔ پانی شفاف تھا۔ اس میں مجھے سانپ دکھائی دینے لگے جو پانی کے اندر یُوں تیرتے پھرتے تھے جیسے زمین پر بل کھاتے دوڑتے ہیں۔ میں ڈر نہیں رہا تھا۔ سانپوں کے باوجود خواب پُرسکون تھا۔

آنکھ کھُلی تو دن کی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ میری جب آنکھ لگی تھی تو دن کی روشنی کمرے سے جا رہی تھی۔ میں کم و بیش بارہ گھنٹے سویا تھا۔ یہ صحت یابی کا اثر تھا۔ میں قطب الدین کو آواز دینا چاہتا تھا لیکن اتنی ہمت نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد وہ خود ہی آگیا۔ میں اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ قطب الدین نے آگے آکر مجھے سہارا دیا اور میں بیٹھ گیا۔ اُس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ میرے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔

”بخار نہیں ہے“ — اُس نے کہا

”کمزوری بہت ہے“ — میں لے کہا — ”ایسے لگتا ہے جیسے ہڈیاں پگھل گئی ہوں“

”سب ٹھیک ہو جائے گا“ — قطب الدین نے کہا — ”میں آپ کو ایک ....“

”نہیں چچا جان!“ — میں لے اُس کی بات کاٹتے ہوئے پہلی بار چچا کہا اور یہ بھی کہا — ”اب مجھے آپ نہ کہیں، تم کہا کریں“

”چلو، تم ہی سہی!“ — اُس نے ہلکی سی ہنسی سے کہا — ”میں کہہ رہا تھا کہ پریشان نہیں ہونا۔ یہاں تم محفوظ ہو“

”میں اپنے متعلق پریشان نہیں“ — میں نے کہا — ”اپنے ساتھیوں کے لئے پریشان ہوں۔ معلوم نہیں وہ پکڑے گئے تھے یا نکل گئے تھے“

”وہ کون سا گاؤں تھا جہاں سے تم پولیس سے بھاگے تھے؟“ — اُس نے پوچھا۔

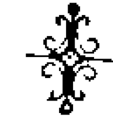
میں نے اُس گاؤں کا نام بتایا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے جب اُسے اپنی اصلیت بتائی تھی اُس وقت مجھ پر نزع کی سی کیفیت طاری تھی۔ میں لے اُسے ریل گاڑی سے فرار کا واقعہ سنایا تھا۔ مجھ سے بولا نہیں جاتا تھا اس لئے یہ

واقعہ بہت مختصر سنایا تھا۔

"تمہیں معلوم نہیں تم اُس گاؤں سے کتنی دُور آ گئے ہو" — اُس نے کہا — "پندرہ میل .... میں جلد ہی پتہ کرا لوں گا کہ تمہارے ساتھیوں کا کیا بنا تھا۔"

"پولیس یہاں تک آئے گی ضرور!" — میں نے کہا — "مجھے اپنا کوئی غم نہیں، خطرہ یہ ہے کہ آپ مجھے پناہ دینے کے جُرم میں پکڑے جائیں گے۔"

"اللہ مالک ہے" — اُس نے کہا — "ابھی اپنے آپ پر کوئی غم سوار نہ کرو۔ جسم میں جان واپس آنے دو .... ایک احتیاط کرنا۔ یہاں میری بیوی اور بھانجی ہے۔ انہیں یہی بتاتے رہنا کہ تم دیوبند کے طالب علم ہو .... تم جانتے ہو کہ عورت کوئی بات دل میں نہیں رکھتی۔"



میں تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ میں اس گاؤں میں محفوظ ہوں۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھا اور یہ زمین کے اُوپر تھا نیچے نہیں تھا۔ انگریزوں کی پولیس کی اور اُن کے مُخبروں کی نظروں سے کوئی گاؤں اور کسی گاؤں کا کوئی گھر چھُپا ہُوا نہیں تھا۔ اگر میں وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیتا تو مجھے یہ صورت بھی قبول کرنی تھی کہ میں چوہوں کی طرح سارا دن زمین کے نیچے چھُپا رہتا اور راتوں کو باہر نکلتا۔

میں نے جب غور کیا تو سوچ سے سوچ نکلتی آئی اور میرا سَر دُکھنے لگا۔ میں ابھی اتنا زیادہ سوچنے کے قابل نہیں ہُوا تھا لیکن مجھے اُس وقت سوچنا تھا اور اپنے متعلق کوئی فیصلہ کرنا تھا اور یہ فیصلہ بہت جلدی کرنا تھا۔ پولیس میرے پیچھے آئی تھی۔ پولیس مجھے پکڑ تو نہیں سکی تھی لیکن اُن لوگوں کو یہ تو اندازہ ہُوا ہو گا کہ میں کس طرف گیا ہوں۔ ہو سکتا ہے کسی کو پتہ ہی نہ چلا ہو کہ میں کس طرف گیا ہوں لیکن میرے لئے چوکنا رہنا بہت ضروری تھا۔

ایک مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ میں دماغ پر زور دے کر سوچتا تھا تو میرا سَر پھٹنے لگتا تھا پھر اپنے آپ ہی میری آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور میں گہری

نیند سو جاتا تھا۔

اسی طرح سوچتے، سوتے، جاگتے اور پریشان ہوتے پانچ چھ دن گزر گئے۔ ان پانچ چھ دنوں میں میرے جسم میں طاقت واپس آتی رہی۔ مجھے بڑی اچھی غذا کھلائی جا رہی تھی اور میری روح کو جو مقوی غذا مل رہی تھی وہ قطب الدین اور عائشہ کا خلوص اور پیار تھا۔ قطب الدین کی بیوی بھی میرے پاس آتی تھی، بیٹھتی تھی اور پیار سے باتیں کرتی تھی۔ وہ مجھ سے دو یا تین مرتبہ پوچھ چکی تھی کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں اور میں کیا کرتا ہوں اور میں شادی شدہ ہوں یا نہیں۔

"بیٹا!" — ایک روز قطب الدین کی بیوی نے پھر مجھ سے پوچھا — "تمہارا کوئی ٹھکانہ ہو گا۔ یہاں سے کہیں تو جاؤ گے۔"

"خالہ جان!" — میں نے جواب دیا — "میری روح بھٹک رہی ہے۔ یہاں سے نکلوں گا تو نہ جانے کدھر نکل جاؤں گا۔"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" — اُس نے پوچھا۔

مجھے یاد آیا کہ اس عورت نے پہلے بھی دو مرتبہ مجھ سے پوچھا تھا کہ میں شادی کیوں نہیں کرتا۔ میں بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ یہ ایک عام سا سوال تھا جسے میں نے سُنا اور ٹال دیا لیکن اُس روز میں نے محسوس کیا کہ یہ عورت بڑی سنجیدگی سے جاننا چاہتی ہے کہ میں شادی کیوں نہیں کرتا۔ میں نے اُسے پھر بھی ٹالنے کی کوشش کی۔

"شادی تو کر لو" — اُس نے کہا۔

"خالہ جان!" — میں نے ہنستے ہُوئے کہا — "آپ کو میری شادی کی اتنی فکر کیوں ہے؟ .... کہیں ٹھکانہ بن گیا تو شادی بھی کر لوں گا۔"

"سچی پوچھتے ہو بیٹا" — اُس نے کہا — "مجھے تمہاری اتنی فکر نہیں جتنی عائشہ کی ہے۔ یہ ہمارے پاس اپنے ماں باپ کی امانت ہے۔ میں کہتی ہوں کہ یہ کہیں اپنے گھر میں آباد ہو جاتے۔"

"کیا اس کے لئے کوئی رشتہ نہیں مل رہا؟"

"رشتے تو بہت ہیں بیٹا!" — اُس نے کہا — "لیکن یہ کسی کو قبول ہی

نہیں کرتی۔ پہلے خاوند نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے یہ اتنی دل برداشتہ ہوتی ہے کہ دوسری شادی کا نام لو تو صاف جواب دے دیتی ہے اور کہتی ہے کہ جیسا ایک دیکھا ویسے ہی دوسرے ہوں گے۔ صرف تم ہو جسے یہ اچھا سمجھتی ہے اور دل و جان سے تمہاری خدمت کرتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم ہی اسے سنبھال لو۔"

"میں یہاں مہمان ہوں خالہ جان!" ——— میں نے کہا ——— "میں ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا ....کیا عائشہ نے کوئی ایسی بات کی ہے؟"

"نہیں!" ——— اُس نے جواب دیا ——— "یہ میرا اپنا خیال ہے اور یہ میری خواہش بھی ہے .... مہمان کے ساتھ ایسی باتیں کرنی تو نہیں چاہئیں لیکن میں عائشہ کو دیکھتی ہوں تو اس کی جوانی مجھے پریشان کرنے لگتی ہے۔ ایک اور بات تمہیں بتاتی ہوں۔ گاؤں میں ایک جوان آدمی ہے۔ بڑا خوبصورت جوان ہے۔ وہ عائشہ کو چاہتا ہے۔ ہمارے گھر آتا رہتا ہے۔ عائشہ اُس کے ساتھ بڑی اچھی طرح بولتی چالتی ہے لیکن جب ایسی بات ہوتی ہے کہ عائشہ اُس کے ساتھ شادی کرے تو وہ بگڑ جاتی ہے۔"

یہ ایک زنجیر تھی جو میرے گرد لپٹی جا رہی تھی اور میں اس زنجیر سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے سامنے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ شادی تو میرے لئے کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ قطب الدّین کی بیوی کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میری اصلیّت کیا ہے۔ وہ مجھے دیو بند کا طالب علم سمجھ رہی تھی۔ میں نے اُسے گول مول سا جواب دے کر ٹال دیا۔

ان چند دنوں کے دوران قطب الدّین نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ نواب زادہ حمید اللہ خان اور الطاف کا کیا بنا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ان دونوں میں سے ایک آدمی مارا گیا تھا اور دوسرا نکل گیا تھا۔ اس خبر سے میرا دل بیٹھ گیا۔ یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ جو مارا گیا تھا وہ حمید اللہ تھا یا الطاف۔

"یہ سُنی سنائی بات ہے" ——— قطب الدّین نے کہا ——— "البتہ یہ بات پکّی ہے کہ گرفتار کوئی بھی نہیں ہو سکا تھا۔"

ایک اور ہفتہ گزر گیا تو میں تقریباً نارمل حالت میں آگیا۔ دن کے وقت میں کمرے میں ہی بند رہتا تھا، رات کو قطب الدّین کے ساتھ باہر کھیتوں کی طرف چلا جاتا تھا۔

"اب بتاؤ" ——— ایک روز قطب الدّین نے مجھ سے پوچھا ——— "تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ ہم شہروں سے دُور رہنے والے پس ماندہ لوگ ہیں۔ گھروں میں بیٹھ کر جوشیلی باتیں کر لیا کرتے ہیں۔"

میں نے اُسے بتایا کہ دہشت گرد کیا کیا کرتے ہیں۔

"میں نے ایسے دہشت گردوں کے کئی قِصّے سُنے ہیں" ——— اُس نے کہا ——— "بنگالیوں کے متعلق سُنا ہے کہ بم بناتے ہیں اور انگریز افسروں کو مارنے کے لئے ریل گاڑیوں کے نیچے رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے وائسرائے کو بھی ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی .... میرے خاندان نے بھی انگریزوں سے حساب چکانا ہے۔ تم نے کوئی ایسا گروہ بنایا تو اِس گاؤں کے کم از کم بیس جوان آدمی تمہارے ساتھ ہوں گے اور وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے۔ اشارہ کرو گے تو جلتی آگ میں کُود جائیں گے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔ اُدھر سرحد میں قبائلی پٹھان انگریزوں کے خلاف لڑ رہے ہیں اِدھر ہم لڑیں گے۔"

"نہیں چچا جان!" ——— میں نے کہا ——— "ہم پٹھانوں کی طرح نہیں لڑ سکتے۔ اُن کا اپنا ملک ہے جو تمام کا تمام پہاڑی ہے۔ وہاں انگریزوں کی حکومت نہیں۔ انگریز وہاں اپنی فوجیں لے کر جاتے ہیں۔ قبائلی پٹھان پہاڑیوں میں چُھپ چُھپ کر اُن پر فائرنگ کرتے اور غائب ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہم اُس طرح کی لڑائی نہیں لڑ سکتے۔ یہاں انگریزوں کی حکومت ہے اور قدم قدم پر انگریزوں کے مُخبر موجود ہیں۔"

قطب الدّین اسلامی جذبے کی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اُس کے پاس جذبات ہیں اور کچھ کرنے کا ارادہ ہے لیکن اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے وہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود ابھی واضح طور پر کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی تو اپنا گروہ بنانا تھا، اسے منظم

کرنا تھا۔ میرے سامنے سب سے پہلا کام تو یہ تھا کہ اپنے ساتھیوں تک پہنچوں لیکن یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ حمید اللہ خان اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا ہے یا نہیں اور کہیں ایسا تو نہیں کہ اُس ٹھکانے پر ہی پولیس کا چھاپہ پڑ گیا ہو اور وہاں میرے لئے جال بچھا ہُوا ہو۔

"میں جو بات کر رہا ہوں"۔۔۔ میں نے قطب الدین سے کہا۔۔۔ "یہ ابھی صرف بات ہے۔ میں اپنے دوستوں کے پاس پہنچوں گا تو بات آگے چل سکے گی لیکن مجھے یہ کون بتائے گا کہ میرے ساتھی وہاں موجود ہیں"۔

"میں بتاؤں گا"۔۔۔ قطب الدین نے کہا۔۔۔ "بولو یہ کام کس طرح کرنا ہے"۔

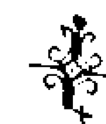
میں نے اُسے اُس چھوٹے سے گاؤں کا نام بتایا پھر یہ بتایا کہ وہ کون سے ریلوے سٹیشن سے کون سے ریلوے سٹیشن تک پہنچے اور وہاں سے لاری پر کہاں تک جائے اور کس سمت پیدل کہاں تک پہنچے۔

"لیکن وہاں جا کر کسی اور سے یہ نہیں کہنا کہ آپ نوابزادہ حمید اللہ خان سے ملنے آئے ہیں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اجنبی بن کر جانا جیسے آپ مسافر ہیں اور ذرا دم لینے اور پانی پینے کے لئے رُک گئے ہیں"۔

میں نے اُسے اُس مکان کی نشانیاں بتائیں جس میں ہم رہتے تھے اور اُسے کہا کہ وہ اندر چلا جائے۔ اُسے حمید اللہ خان کا، خواجہ صاحب کا اور شہناز کا حُلیہ سمجھا دیا۔ مجھے ایسا کرنا نہیں چاہئے تھا لیکن اس کے سوا اور کوئی ذریعہ بھی نہ تھا۔ مجھے قطب الدین پر اعتماد تھا لیکن وہ اناڑی اور جذباتی تھا۔

مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ حمید اللہ اور خواجہ صاحب اگر اُسے مِل گئے تو اس پر اعتبار نہیں کریں گے۔ میں اُسے رقعہ لکھ کر دے دیتا لیکن پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ میرے پاس اپنی کوئی نشانی بھی نہیں تھی جو میں اُسے دے دیتا۔ اُسے اُسی روز روانہ کر دیا۔

"آپ کل شام تک وہاں پہنچ جائیں گے"۔۔۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ "وہاں سے کسی آدمی کو ساتھ لے کر اگلی صبح وہاں سے واپسی کا سفر اختیار کریں۔ آپ چوتھے دن کی صبح یہاں آجائیں گے"۔



قطب الدین کے جانے کے بعد عائشہ میرے پاس زیادہ دیر تک بیٹھنے لگی۔ وہ جس انداز سے میری دیکھ بھال کرتی تھی اس میں مجھے ماں کے والہانہ پن اور بہن کے پیار اور ایثار کی بُو آتی تھی لیکن وہ ماں بھی نہیں بننا چاہتی تھی اور وہ میرے مُنہ سے بہن کا لفظ بھی نہیں سننا چاہتی تھی۔ وہ میری چارپائی پر بیٹھ جاتی تھی۔ بڑی بے تکلفی اور بے ساختگی سے باتیں کرتی تھی لیکن حرکتوں میں محتاط تھی۔

"عائشہ!"۔۔۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ "گھر میں ایک بزرگ عورت ہے۔ تمہارا یوں میرے پاس بیٹھنا اُسے اچھا نہیں لگتا ہوگا"۔

"اُسے اچھا لگتا ہے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "اُس نے مجھے صاف کہہ دیا ہے کہ میں تمہارے پاس بیٹھا کروں"۔

"وہ تو کہتی ہے کہ تم ہمیشہ کے لئے میرے پاس بیٹھ جاؤ"۔۔۔ میں نے کہا۔

"تم نے کیا کہا تھا؟"۔۔۔ اُس نے پوچھا۔

"میرا کوئی ٹھکانہ تو بن جانے دو"۔۔۔ میں نے کہا۔

"اسی کو ٹھکانہ سمجھ لو جہاں بیٹھے ہوتے ہو"۔۔۔ عائشہ نے تشنہ سی آواز میں کہا۔

میں نے سر جھکا لیا۔

"میں ایک بات تمہیں بتا دیتی ہوں"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "یہ نہ سمجھ لینا کہ میں جوان اور بیوہ عورت ہوں اور مجھے ایک مرد کی ضرورت ہے ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے ۔۔۔ اور وہ ساتھی تم ہو۔ تم مذہب میں ڈوبے ہوئے انسان ہو۔ قطب ماموں نے تمہارے متعلق کہا تھا کہ اسی عمر میں اس آدمی نے اللہ سے لَو لگا لی ہے اور اسے اپنی ذات کے نفع نقصان کا خیال ہی نہیں۔ ماموں کہتے ہیں کہ یہ آدمی وَلی کا رُتبہ بھی پا سکتا ہے۔ ماموں حیران ہوتے ہیں کہ تم اس بیماری سے بچ کیسے گئے ہو"۔

"تمہاری دعاؤں نے مجھے بچایا ہے"۔۔۔ میں نے کہا۔

"دعائیں تو بہت کی ہیں"— اُس نے کہا اور آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد بولی — "تم نے اپنا نام نہیں بتایا"۔

"قطب ماموں نے نہیں بتایا؟"

"نہیں!"

"نام اللہ کا ہوتا ہے"— میں نے کہا — "مجھے اللہ والا کہہ لیا کرو"۔

"میں نے بہت دُکھ جھیلے ہیں"— اُس نے کہا اور اُس کے آنسو بہنے لگے



اُس نے مجھے اپنی زندگی کا رفیق بنا لیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو یقین دلا لیا تھا کہ میں اُس کے ساتھ شادی کر لوں گا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ وہ مجھ پر چھا گئی تھی۔ اُس میں عجیب سی کشش تھی لیکن اُس کے خلوص اور پیار میں جو وقار تھا اس سے وہ اور زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔

"اس گاؤں میں تمہیں کوئی بھی آدمی پسند نہیں آیا؟"— میں نے پوچھا — "کسی نے بھی تمہارا رشتہ نہیں مانگا؟"

"رشتہ مانگنے والے تو بہت ہیں"— اُس نے کہا — "میں سب کو جانتی ہوں۔ میں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے۔ ان سب کی آنکھوں میں مجھے اپنا پہلا خاوند نظر آتا ہے۔ انہیں ایک خوبصورت بیوی چاہیئے .... ایک ہے جو اچھا لگتا تھا۔ اب نہیں"۔

"اب کیوں نہیں؟"

"کہتا ہے میں تمہارے پاس نہ بیٹھا کروں"— اُس نے کہا — "میں نے اُسے کہا کہ میں تمہیں خوبصورت مرد تو نہیں سمجھتی۔ بیمار مہمان کی خدمت تو فرض ہے لیکن اُس کی اپنی نیّت میں خرابی ہے اس لئے مجھے بھی بدنیّت سمجھتا ہے"۔

میں قطب الدین کے انتظار میں بے چین ہو رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق جس دن اُسے واپس آنا تھا وہ دن بھی گزر گیا۔ وہ نہ آیا۔ وہ اپنی بیوی

اور عائشہ کو کوئی اور کام بتا کر گیا تھا۔ شام کے بعد عائشہ میرے پاس آ بیٹھی۔

"عالی مجھ سے ناراض ہو گیا ہے"— اُس نے کہا۔

"عالی کون؟"

"وہ جو مجھے کہتا تھا کہ میں تمہارے پاس نہ بیٹھا کروں"— عائشہ نے جواب دیا — "اگر تم نہ آتے یا تم مجھے اُس سے زیادہ اچھے نہ لگتے تو میں اُسی کے ساتھ شادی کر لیتی۔ وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ آج دن کو ملا تو کہنے لگا کہ تم نے اپنے مہمان کے پاس بیٹھنا نہیں چھوڑا۔ میں نے کہا کہ نہیں چھوڑا اور چھوڑوں گی بھی نہیں۔ اُس نے مجھ پر ایسا بُرا الزام لگایا جو سُن کر میرا سارا جسم کانپنے لگا۔ میں نے اُسے کہا کہ اب میرے گھر میں قدم نہ رکھنا۔ اُس نے کہا کہ عائشہ پچھتاؤ گی۔ تمہارے اس مولوی کو میں جلا کر راکھ کر دوں گا اور تم میرے قدموں میں سر رگڑو گی"۔

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے اُسے کوئی لمبی چوڑی بات نہ کہی"— عائشہ نے جواب دیا — "میں نے اُسے کہا تھا کہ خدا کے سوا کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا تھا کہ تم اندر سے جو کچھ ہو وہ تم نے ظاہر کر دیا ہے.... لیکن ایک بات ہے جس کا مجھے ڈر ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک گاؤں ہے جس میں ایک شاہ رہتا ہے۔ وہ اُلٹے تعویذ کرتا ہے اور وہ کالا جادو بھی چلاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ عالی اُس کے پاس جاتا رہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ اس شاہ سے تمہارے خلاف کوئی اُلٹا تعویذ کرا دے گا"۔

میری ہنسی نکل گئی۔ یہ ہنسی اپنے آپ ہی نکلی تھی۔ میری حالت تو ایسی ہو گئی تھی اور میں ایسے شکنجے میں پھنس گیا تھا کہ میں ہنسی اور مسکراہٹوں سے محروم ہو گیا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا ہے جیسے میرے اندر کوئی اور طاقت موجود تھی جو عائشہ کی یہ بات سُن کر ہنس پڑی تھی۔

"ہنسو نہیں"— عائشہ نے کہا — "تمہیں شاید معلوم نہیں کہ جس پر کالا جادو چلتا ہے اُس کا کیا حال ہو جاتا ہے"۔

"جس کے دل میں خدا ہوتا ہے اُس پر دُنیا کا کوئی جادو اثر نہیں کرسکتا"—

میں نے کہا ——"دل میں خدا کی محبت کے ساتھ ساتھ خدا کے بندوں کی سچی محبت ہو تو اُلٹے تعویذ اُدھر ہی اُلٹ کر چلے جاتے ہیں جدھر سے آتے ہیں۔"

عائشہ میرے مُنہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر جو تاثر تھا اُس میں حیرت بھی تھی اور شاید طنز بھی تھی۔ قطب الدین نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ پسماندہ لوگ ہیں اور گھر بیٹھ کر جوشیلی باتیں کر لیتے ہیں۔ ان لوگوں کی پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ جس پر انہیں شک ہوتا تھا کہ خدا کے قریب ہے یا برگزیدہ ہے، اُس کے آگے جا سجدے کرتے تھے اور اپنی مرادیں، خواہشیں اور دشمنیاں اُس کے آگے جا رکھتے تھے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ جسے وہ خدا کا برگزیدہ پیر یا فقیر سمجھتے تھے وہ انہیں نظر آتا تھا مگر خدا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لئے کالے جادو اور اُلٹے تعویذوں کا سہارا لیتے تھے۔ نقصان پہنچانے کا یہ طریقہ ایسا تھا جس میں کوئی پکڑا نہیں جا سکتا تھا۔

ان لوگوں کی پسماندگی اور بے بسی کو دیکھ کر سیدھے تعویذ دینے والے پیروں اور اُلٹے تعویذ چلانے والے عاملوں نے اپنا بازار گرم کر رکھا تھا، بلکہ یہ کہنا غلط نہیں کہ دیہاتی علاقوں پر ان ہی لوگوں کی حکومت تھی۔ میں کسی پیر کے تعویذوں کے متعلق کچھ نہیں کہتا لیکن کالے جادو اور اُلٹے تعویذوں کے اثرات کو مانتا ہوں۔ یہ علم ہے جو بڑی ہی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں خاص قسم کا عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے رات رات بھر جاگنا پڑتا ہے اور نہ جانے یہ لوگ کیا کچھ کرتے ہیں کہ اُن کا جادو چل جاتا ہے۔

میں نے عائشہ کے دل سے کالے جادو کا خوف نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن اُس پر یہ خوف طاری ہی رہا۔



میرے دل پر جو خوف طاری ہو گیا تھا وہ یہ تھا کہ قطب الدین ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ جس دن اُسے واپس آجانا چاہیے تھا اس سے چار دن اور

زیادہ گزر گئے تھے۔ میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے یہ سوال پریشان کر رہے تھے کہ قطب الدین نے اتنے دن کیوں لگا دیتے ہیں؟ کیا وہ راستہ بھول گیا ہے اور حمیداللہ وغیرہ کے پاس نہیں پہنچ سکا؟ کیا وہ پکڑا گیا ہے؟

اگر عائشہ نہ ہوتی تو میں دم گھُٹنے سے مر جاتا۔ میں کمرے میں بند رہتا تھا۔ یہ تو ایک طرح کی قیدِ تنہائی تھی۔

ایک رات کا ذکر ہے۔ گاؤں کے لوگ سو گئے تھے۔ عائشہ میرے پاس بیٹھی ہوتی تھی۔ اب تو اُس کا یہ حال تھا جیسے میرے بغیر اُس کی زندگی اُدھوری رہ جائے گی۔ وہ بہت ہی جذباتی ہو گئی تھی۔ میں اُس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ جس نے میری اتنی خدمت کی ہے اُس کا دل توڑتا۔ میری یہ سوچ غلط تھی۔ ایک نہ ایک دن اُس کا دل ٹوٹنا ہی تھا، یا میرا دل ٹوٹنا تھا۔ عائشہ کی محبت کی دیوانگی مجھے ایسی حالت میں لے آئی تھی کہ اب میں بھی جب سوچتا تھا کہ یہاں سے ایک روز چلا جاؤں گا تو میں اپنے دل میں ایسی چبھن محسوس کرتا تھا جیسے زہریلا کانٹا بڑا گہرا اُتر گیا ہو۔

اُس رات عائشہ کا سحر مجھ پر ایسا طاری ہُوا کہ میں نے اپنی اصلیت سے پردہ اُٹھا دیا۔ میں نے کچھ سوچ کر یہ قدم اُٹھایا تھا۔

"عائشہ!" —— میں نے اُسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا ——"میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو۔ میں نے اپنے اُوپر پردہ ڈال رکھا ہے لیکن تمہاری محبت کی دیوانگی نے یہ پردہ چاک کر دیا ہے .... میں مذہب کا طالب علم نہیں ہوں۔ میں مفرور مجرم ہوں اور یہاں رُوپوش ہوں۔"

عائشہ بدک کر مجھ سے دُور ہٹ گئی جیسے پنجرے کا دروازہ کھُل گیا ہو اور چڑیا اُڑ گئی ہو۔ اُس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھنے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ اُس کا ردِعمل یہی ہو گا۔

"کیا تم نے میرے ماموں کو دھوکا دیا ہے؟" —— عائشہ نے نہایت آہستہ سے کہا لیکن اُس کے بولنے کے انداز میں جو قہر تھا وہ صاف نظر آ رہا تھا۔

"نہیں!" —— میں نے مسکراتے ہوئے کہا ——"انہیں میں نے پہلے

دن ہی بتا دیا تھا کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔"

"ڈاکو ہو؟" — عائشہ نے پوچھا — "رہزن ہو؟"

"نہیں!" — میں نے کہا — "اگر میں ڈاکو اور رہزن ہوتا تو تمہارے ماموں مجھے پہلے روز ہی پولیس کے حوالے کر دیتے۔ کیا تم ابھی تک نہیں سمجھیں کہ تمہارے ماموں نے مجھے اپنے گھر میں چھپایا ہُوا ہے؟ .... میں تمہیں جو راز دے رہا ہوں یہ مجھے نہیں دینا چاہیئے تھا۔ تمہارے ماموں نے بھی مجھے منع کیا تھا کہ میں یہ راز اُس کے سوا کسی کو نہ دوں لیکن محبت کا حکم کچھ اور ہے۔ میں تمہیں اس راز میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ میں نے تمہاری محبت کی کتنی قدر کی ہے۔"

"ماموں نے مجھے اتنا ہی بتایا تھا کہ گاؤں کے باہر کے کسی آدمی کو پتہ نہ چلے کہ تم یہاں ہو" — عائشہ نے کہا — "میں نے اور ممانی نے اُن سے نہیں پوچھا تھا کہ ایسی رازداری کیوں رکھی جا رہی ہے۔ ماموں کی طبیعت بڑی سخت ہے۔ ہم اُن سے اُن کی مرضی کے خلاف کوئی بات پوچھنے سے ڈرتی ہیں۔"

"یہ بات مجھ سے سُن لو" — میں نے کہا اور اُسے بتا دیا کہ میں نے کیا جُرم کیا ہے، کیوں کیا ہے اور اب کیا کروں گا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ جُوں جُوں میں بولتا جا رہا تھا عائشہ کے چہرے کی پیلاہٹ کم ہوتی جا رہی تھی اور اُس کے چہرے پر قدرتی رنگ واپس آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں جو خُون اُتر آیا تھا وہ واپس چلا گیا اور اُس کی آنکھوں کا حُسن واپس آ گیا۔ آخر اُس نے سکون کی آہ بھری اور وہ اپنی اصلی حالت پر آ گئی۔

"میرے ماموں بھی انگریزوں کے دشمن ہیں۔ وہ ایسی ہی باتیں کرتے رہتے ہیں جیسی تم نے کی ہیں" — عائشہ نے کہا — "اُن کی وجہ سے ہمارے گاؤں کا کوئی بھی آدمی، عورت یا بچّہ انگریزوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔"

"کیا تم نے کبھی انگریز دیکھا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"تین بار!" — عائشہ نے جواب دیا — "یہ انگریز یہاں سے گزر کر آگے

شکار کھیلنے گئے تھے۔ گاؤں میں شور مچ گیا تھا، فرنگی آتے، فرنگی آتے .... گاؤں کا بچّہ بچّہ باہر نکل آیا تھا۔ ہم سب نے اِن گوروں کو اس طرح دیکھا تھا جس طرح ہم خنزیر کو دیکھ کر مُنہ پھیر لیا کرتے ہیں .... ماموں نے ہمیں کئی بار سنایا ہے کہ ہمارا خاندان انگریزوں کو کیوں اپنا دشمن سمجھتا ہے۔"

"وہ ٹھیک کہتے ہیں" — میں نے کہا — "انگریز صرف تمہارے خاندان کے نہیں بلکہ وہ ہر مسلمان کے دشمن ہیں اور وہ اسلام کے بہت بڑے دشمن ہیں۔ اب تم سمجھ گئی ہو گی کہ تمہارے ماموں نے مجھے کیوں اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے اور انہوں نے کیوں تمہیں میرے پاس بیٹھنے کی اجازت دے رکھی ہے۔"

"کیا تمہارے ماں باپ کو معلوم ہے کہ تم نے کیا کیا ہے اور اگر تم پکڑے گئے تو تمہارا انجام کیا ہو گا؟" — عائشہ نے پوچھا — "تمہاری بہنیں بھی ہوں گی!"

میں نے اپنے دل کو پتھر بنا لیا تھا لیکن عائشہ نے ایسے لہجے میں یہ سوال کیا کہ ایک تیر میرے دل میں اُتر گیا۔ تب مجھے احساس ہُوا کہ دل کبھی پتھر نہیں بن سکتا۔ میرا سر جُھک گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ دیئے کی زرد پیلی روشنی دیواروں پر ناچ رہی تھی۔ میں نے اپنی ٹھوڑی کے نیچے عائشہ کا ہاتھ محسوس کیا۔ اُس نے بڑی آہستگی سے میرا سر اُوپر اُٹھایا۔

"آنسو؟" — عائشہ نے پوچھا — "ماں اور بہنیں یاد آ گئی ہیں؟"

"میری کوئی بہن نہیں" — میں نے جواب دیا — "ماں بھی نہیں۔ مجھے چھوٹا سا چھوڑ کر مر گئی تھی۔ باپ بھی نہیں۔ کوئی بھائی بھی نہیں۔ اکیلا رہ گیا ہوں۔"

عائشہ کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اُسے اپنی گزری ہوئی زندگی کی داستان سنا ڈالی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سینے میں زہریلا غبار بھرا ہُوا ہے اور اسے نکل جانا چاہیئے۔ یہ جُوں جُوں نکلتا جا رہا تھا میں سکون سا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے بہت دیر بعد محسوس کیا کہ میں عائشہ کے بازوؤں میں ہوں اور اُس

کی انگلیاں میرے بالوں میں رینگ رہی ہیں۔ مجھے ایسا سکون آیا جیسے میرا جسم چوٹیں کھا کھا کر ٹوٹ گیا ہوا اور کوئی اسے سہلا رہا ہو۔

"کیا اب سمجھ گئی ہو کہ تم جب شادی کی بات کرتی ہو تو میں خاموش کیوں رہتا ہوں؟" — میں نے کہا — "میں اپنے ساتھ تمہاری زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا۔"

"نہیں!" — عائشہ نے جذباتی لہجے میں کہا — "میری زندگی خراب نہیں ہوگی۔ میں تمہارے ساتھ جینا اور تمہارے ساتھ مرنا پسند کروں گی.... کیا تم چلے جاؤ گے؟"

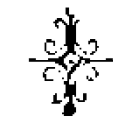
"اچھا قطب آئیں گے تو میں چلا جاؤں گا" — میں نے جواب دیا — "میں آؤں گا.... پھر بھی آؤں گا۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گی" — عائشہ نے کہا — "ساری عمر تمہارا انتظار کروں گی۔"

باہر والے دروازے پر دستک ہوئی اور طلسم ٹوٹ گیا۔ میں اور عائشہ یوں بدک کر ایک دوسرے سے دُور ہٹ گئے جیسے سنسناتا ہوا ایک تیر ہمارے درمیان سے گزر گیا ہو۔ رات کے اُس وقت کی دستک کوئی عام سی دستک نہیں تھی۔ مجھے اچانک قطب الدین کا خیال آگیا۔

"ماموں آگئے ہیں" — عائشہ نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"وہی ہوں گے" — میں نے کہا۔ عائشہ چلنے لگی تو میں نے اُسے روک لیا اور تیز تیز بولتے ہوئے کہا — "کوئی اور ہو تو اُسے کہنا کہ ماموں گھر میں نہیں ہیں اور کوشش کرنا کہ وہ جو کوئی بھی ہے اندر نہ آئے۔"



عائشہ باہر چلی گئی۔ میں نے دیا بجھا دیا۔ یہ پولیس بھی ہو سکتی تھی۔ دروازے پر دوسری بار دستک ہو چکی تھی۔ یہ مٹی اور پتھروں کا بنا ہوا مکان تھا جیسے دیہاتی علاقے کے مکان ہوتے ہیں۔ میں جس کمرے میں تھا اس کا صرف ایک دروازہ تھا۔ کوئی آجاتا تو میرے بھاگ نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ میں عائشہ کے

پیچھے پیچھے دبے پاؤں کمرے سے نکل گیا۔ باہر کے دروازے کے ایک طرف دیوار کے ساتھ خشک لکڑیوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ اس کے اُوپر دو تین ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں پڑی تھیں۔ چھپنے کے لئے یہ بڑی اچھی اوٹ تھی۔ عائشہ دروازے تک پہنچی تو میں لکڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ میں نے سوچا یہ تھا کہ عائشہ دروازہ کھولے گی تو دیکھوں گا کہ یہ کون ہے۔ اگر پولیس ہوئی تو وہ سیدھی اندر آئے گی اور میں اوٹ سے نکل کر دروازے سے اس طرح باہر نکل جاؤں گا کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ ضرورت بھی یہی تھی کہ پولیس کو پتہ نہ چلے کہ میں نے یہاں پناہ لے رکھی تھی ورنہ قطب الدین کی بیوی اور بھانجی کو بہت بُری سزا ملتی۔

عائشہ نے دروازہ کھولا۔ چاندنی بڑی ہلکی ہلکی تھی۔ ایک آدمی اندر آیا اور اندر آتے ہی اُس نے دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ میں لکڑیوں کی اوٹ سے دیکھ رہا تھا۔ یہ آدمی دیہاتی لگتا تھا لیکن اُس کا لباس ذرا مختلف تھا۔ اُس نے سر پر پگڑی لپیٹی ہوئی نہیں تھی بلکہ پگڑی جو زیادہ لمبی نہیں تھی لال رنگ کی ٹوپی پر لپیٹی ہوئی تھی۔ اُس کا پاجامہ کھلے پائنچوں والا تھا اور اُس کا کُرتہ بھی دیہاتیوں کے کُرتوں سے زیادہ لمبا تھا۔

"کون ہو تم؟" — عائشہ نے اُس سے پوچھا اور کہا — "قطب ماموں گھر میں نہیں ہیں۔ گھر میں کوئی آدمی نہیں۔"

"گھبرا مت لڑکی!" — اُس آدمی نے کہا — "اس گھر میں ایک آدمی موجود ہے۔ ہم اُس کے پاس آتے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں گھر میں کوئی آدمی نہیں" — عائشہ نے کہا — "اور تم زبردستی کر رہے ہو۔ میں باہر نکل کر لوگوں کو جگا دوں گی۔"

"لوگ آئیں گے تو ہمارے قدموں میں بیٹھ جائیں گے" — آدمی نے کہا — "ہم شاہ مغل ہیں۔ کیا تم نے ہمیں کبھی دیکھا نہیں؟ قطب الدین کی بیوی کو جگا۔ وہ ہمیں جانتی ہے۔ ہم اُس آدمی سے ملیں گے جو یہاں موجود ہے پھر ہم چلے جائیں گے۔"

یہ وہی مغل شاہ تھا جس کے متعلق عائشہ نے مجھے بتایا تھا کہ اُلٹے تعویذ اور کالا جادو کرتا ہے۔ وہ عائشہ کو ساتھ لئے اُس کمرے میں چلا گیا جس میں مَیں رہتا تھا۔ عائشہ نے دیا جلا دیا۔ دیئے کی روشنی میں مجھے نظر آرہا تھا کہ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عائشہ قطب الدین کی بیوی کو جگا لائی۔ یہ عورت بڑی تیزی سے دوسرے کمرے میں گئی تھی مگر مغل شاہ کو دیکھ کر وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ اُس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر مغل شاہ کو سلام کیا اور فرش پر بیٹھ گئی۔

میرا دماغ بڑی تیزی سے کام کرنے لگا۔ یہ شخص اچھی نیت سے نہیں آیا تھا۔ میری مخبری ہو گئی تھی اور مخبری کرنے والا یقیناً عالی تھا۔ اُس نے مغل شاہ کو بتایا ہو گا کہ اس گھر میں ایک مشکوک آدمی چھپا ہوا ہے اور اب مغل شاہ یہ دیکھنے آیا ہو گا کہ عالی کہاں تک سچ کہتا ہے۔ عالی کو شاید معلوم نہ تھا کہ انگریزوں نے میرے سر کی قیمت دس ہزار رکھی ہے لیکن مغل شاہ کو معلوم ہو گا۔

میں سوچنے لگا کہ مجھے بھاگ جانا چاہیئے یا دیکھ لینا چاہیئے کہ اس کے ساتھ پولیس تو نہیں۔ مجھے خیال آیا کہ پولیس آتی ہوتی تو اس گھر پر باقاعدہ چھاپہ مارتی۔ پولیس کو کیا ضرورت تھی کہ وہ پہلے کسی مُخبر کو اندر بھیج کر مفرور مجرم کو چوکنا کر دیتی۔

مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اسے عالی نے عائشہ کو ڈرانے کے لئے بھیجا ہو گا۔ عائشہ نے مجھے بتایا تھا کہ عالی نے اُسے دھمکی دی تھی کہ وہ اُسے بہت نقصان پہنچائے گا۔ عائشہ نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ عالی اس شاہ کے پاس جاتا رہتا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے ان دونوں عورتوں کو اکیلا چھوڑ کر بھاگنا نہیں چاہیئے۔

میں اوٹ سے اُٹھا اور نہایت آہستہ سے دروازہ کی زنجیر کھولی۔ ایک کواڑ ذرا سا کھول کر سر باہر نکالا۔ مجھے باہر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ میں باہر نکل گیا۔ اِدھر اُدھر جا کر دیکھا کوئی بھی نظر نہ آیا۔ میں اندر گیا اور دبے پاؤں اپنے کمرے کے دروازے کے ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر اندر کی باتیں سُننے لگا۔

قطب الدین کی بیوی اور عائشہ شاہ سے کہہ رہی تھیں کہ یہاں باہر کا کوئی آدمی نہیں ہے اور شاہ غصّے سے بول رہا تھا۔

"ہم تمہیں ایک بار پھر کہتے ہیں" — شاہ مغل نے کہا — "ہم کسی بُری نیت سے نہیں آئے۔ ہمیں اس آدمی سے ملا دو۔ اگر تم نے ہمیں ناراض کیا تو ہماری ایک پھونک اس گھر کو تنور بنا دے گی۔"

میں دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن ایسے لگتا تھا جیسے عائشہ اور اُس کی ممانی سجدے میں گر پڑی ہوں۔ اگر سجدہ نہیں کیا تو اُس کے پاؤں ضرور پکڑ لئے ہوں گے۔ وہ اُس کی منت سماجت کر رہی تھیں۔ قطب الدین کی بیوی تو رونے لگی تھی۔

"یا سرکار شاہ صاحب!" — عائشہ نے — "ہم غریبوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے!"

"تم جھوٹ بول رہی ہو" — شاہ مغل نے کہا — "ہم تمہاری زبان جلا دیں گے۔"

یہ دونوں عورتیں اور زیادہ منت سماجت پر آ گئیں۔

"ہم کسی خاص مطلب سے آئے تھے" — شاہ مغل نے کہا — "تم نے ہمارا کام خراب کر دیا ہے۔ ہمارے جنات ناراض ہو جائیں گے۔ وہ تم سے اپنے نقصان کا بدلہ لیں گے ... خیر ... ہم چلے جاتے ہیں لیکن جس طرح تم نے ہمارا دل دکھایا ہے اسی طرح اسے خوش بھی کر دو۔ تم اُٹھو مائی! دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔ تم یہیں رہو ... کیا نام ہے تمہارا ... عائشہ! ہم تمہیں بخش دیں گے۔"

کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔

اس شاہ کے آنے کا مقصد غالباً یہی تھا۔ اُس نے عائشہ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ عالی نے اسے بتایا ہو گا کہ عائشہ بڑی حسین لڑکی ہے اور وہ اُس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ شاہ مغل نے اپنے کالے علم اور عمل سے اس علاقے پر دہشت طاری کر رکھی ہو گی۔ وہ رات کے اس وقت عائشہ کے لئے ہی آیا ہو گا۔

یہ کوئی عجیب اور انوکھا معاملہ نہیں تھا۔ میرے لئے شاہ مغل کوئی عجوبہ نہیں تھا اور ان دونوں عورتوں کا خوفزدہ ہو کر اس شخص کے آگے گڑگڑانا،

روناا ور اُس سے معافیاں مانگنا حیران کُن نہیں تھا۔ وہ توپسماندگی کا زمانہ تھا۔ دیہات میں تعلیم تھی ہی نہیں۔ انگریز بادشاہ نے مسلمانوں کو دو کاموں پر لگا دیا تھا۔ ایک یہ کہ مسلمان فوج میں بھرتی ہوں اور دیہات میں جو رہ جائیں وہ کھیتی باڑی کریں اور فوج کو راشن سپلائی کریں۔ یعنی دیہات کے مسلمان سپاہی تھے یا کسان۔

ان سپاہیوں اور کسانوں کی قسمت پر انگریزوں نے مہر لگا کر پیروں اور عاملوں کے قدموں میں رکھ دی تھی اور یہ خدا کے ایلچی بن گئے تھے، اور یہ سپاہی اور کسان جو کچھ بھی مانگتے تھے وہ خدا سے مانگنے کی بجائے پیروں وغیرہ کے آستانوں اور مزاروں پر جاکر مانگتے تھے اور یہ پیر تعویذوں اور دعاؤں کی مُنہ مانگی قیمت لیتے تھے۔ ان میں ایک قیمت یہ بھی تھی جو شاہ مغل عائشہ سے لے رہا تھا۔ وہ قیمت مانگ نہیں رہا تھا حکم دے رہا تھا۔

وہ توپسماندگی کا دور تھا، آج بھی دُور دراز دیہات میں پیر دَورے پر نکلتے ہیں تو حکماً اپنے مریدوں سے اُن کی عزت وعصمت نذرانے کے طور پر وصول کرتے ہیں اور ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے گھروں کی عصمتوں کے نذرانے دینے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔



قطب الدین کی بیوی کمرے سے باہر آگئی اور میں کمرے کے اندر چلا گیا۔

"میں ہوں وہ آدمی جسے تم دیکھنے آتے ہو" —— میں نے شاہ مغل کے سامنے کھڑے ہو کر کہا —— "کہو کیا کہتے ہو؟"

اُس کا مُنہ کھُل گیا جیسے وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھا اور نظریں میرے چہرے پر جماتے ہُوئے آہستہ آہستہ میرے قریب آیا۔ میں اُس کے پورے جسم کی حرکت دیکھ رہا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ اسی طرح آہستہ آہستہ چلتا بڑی تیزی سے کپڑوں کے اندر سے ریوالور نکال لے گا۔ میں خالی ہاتھ تھا۔

اُس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھاتے۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ آگے کیا جسے اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر مصافحہ کیا پھر اُس نے میرا ہاتھ چُوما۔

"کیا رات کے اس وقت تم میرے ساتھ ہاتھ ملانے آتے ہو؟" —— میں نے اُس سے پوچھا۔

"اجازت ہو تو میں دل کی بات بیان کروں" —— اُس نے گھر کے نوکروں کے لہجے میں کہا پھر اُس نے عائشہ کی طرف دیکھا اور اُسے کہا —— "تُو یہاں سے چلی جا!"

عائشہ چلی گئی تو میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ فرش پر بیٹھنے لگا تھا۔ میں نے اُسے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔

"بے ادبی ہو گی" —— اُس نے کہا —— "آپ کی برابری کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

اُس کا یہ انداز مجھے پریشان کر رہا تھا۔ میں سمجھ نہ سکا کہ وہ مجھ پر طنز کر رہا ہے یا اُس کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ مجھے اپنے سر پر بٹھا کر پھانسنا چاہتا ہے؟ ایک خیال یہ بھی آیا کہ پولیس آرہی ہو گی اور یہ اس کوشش میں ہے کہ میں یہاں بے فکر ہو کر بیٹھا رہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں نے اُس کو سامنے والی چارپائی پر بٹھا دیا۔

"تم جو کوئی بھی ہو اور تمہارے ہاتھ میں جیسا بھی علم ہے، تم آدمی بدطینت ہو" —— میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا —— "کیا تم یہاں اس لئے آتے تھے کہ تمہیں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ دونوں عورتیں گھر میں اکیلی ہیں؟"

"نہیں سرکار!" —— اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا —— "میں آپ کی زیارت کے لئے آیا ہوں۔"

"مجھے کیا سمجھ کر آتے ہو؟" —— میں نے پوچھا —— "میں جنات کی مخلوق میں سے ہوں؟"

"خدا کی قسم، یہی سمجھ کر آیا ہوں" —— اُس نے کہا —— "حضور عرض کرلے

کی اجازت دیں۔"

"کہو!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں سُن رہا ہوں۔"

"مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ میرے استادوں کے اُستاد ہیں" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں نے آپ پر وہ چیز چلائی ہے جس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ آپ اس چیز سے واقف ہوں گے۔ دریاؤں کو روک دیتی ہے، پتھر پھاڑ دیتی ہے مگر آپ کو کچھ بھی نہیں ہُوا ..... میرا سائل میرے پاس آیا تو کہنے لگا کہ اُس نے اُلٹا ہی اثر دیکھا ہے۔ اُس نے مجھے مزید رقم دی اور میں نے پوری رات کا چلہ کاٹ کر آپ کے اردگرد آگ لگا دی۔ اس کا اثر فوراً ہونا چاہیئے تھا۔ آپ کو آگ کے بھوت ناچتے نظر آتے اور آپ یہاں سے بھاگ جاتے مگر سائل نے آکر بتایا کہ کچھ اثر نہیں ہُوا۔"

"تم نے کچھ کیا ہوتا تو اثر ہوتا" ــــ میں نے کہا ــــ "تم نے پیسے بٹورنے تھے بٹور لیئے۔"

"نہ سرکار!" ــــ اُس نے کہا ــــ "آپ کو پتہ چل چکا ہوگا۔ اس مکان کے پچھواڑے ایک جگہ سے لپائی اُکھڑی ہوئی ہے۔ میرے سائل نے بتایا تھا کہ اُس نے وہاں وہ چیز رکھی تھی۔ صبح دیکھ لینا حضور! ..... میں اس وقت رات کو اس لیئے آیا ہوں کہ گاؤں کا کوئی آدمی نہ دیکھ لے۔ آپ کے ہاتھ میں بڑی طاقت ہے سرکار! میرا چلایا ہُوا تیر کبھی خالی نہیں گیا تھا مگر آپ کو آنچ تک نہیں آئی۔ میں سلام کے لیئے حاضر ہُوا ہوں۔"

میں اُس کی بات سمجھ گیا۔ اُس نے باتوں میں کالے علم کی اصطلاحیں بولی تھیں جو میں نے پہلی بار سُنی تھیں۔ وہ مجھے کوئی برگزیدہ شخصیت اور کالے علم کا استاد سمجھ رہا تھا۔ میں یہ بھی جان گیا کہ مجھ پر یہ وار کس نے کرایا ہے۔ میں نے سوچا کہ اسے اسی غلط فہمی میں رکھوں کہ میں اس علم کا ماہر ہوں اور میں نے اپنے گرد حصار کھینچا ہُوا ہے۔

"اور میری ایک درخواست ہے سرکار!" ــــ اُس نے کہا ــــ "میرا تیر لوٹا ہی نہ دینا۔"

"مجھے تو محسوس تک نہیں ہُوا کہ میرے خلاف کسی نے ایسی کارروائی کی ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "ورنہ تیر واپس جاکر اُس کمان کو توڑ دیتے جس سے نکلے تھے ..... میں یہاں کسی اور سلسلے میں آیا ہوں۔ کچھ دن اور رہنا ہے پھر چلے جانا ہے۔ ڈرو نہیں۔ میری طرف سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ بتا دیتا ہوں کہ تم اناڑی ہو۔ اس سے آگے نہ بڑھنا۔ تم ناپاک نیّت کے آدمی ہو۔ کبھی اپنے ہی ہاتھوں مارے جاؤ گے۔"

"کیا سرکار معلوم کر سکتے ہیں کہ میرا سائل کون ہے؟" ــــ اُس نے پوچھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ لمبے لمبے سانس لیئے اور تھوڑی ایکٹنگ کر کے اوپر دیکھا۔

"اُس کے نام کا پہلا حرف عین ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "میں اُس کا پورا نام، اُس کی ماں کا نام، اُس کے باپ کا نام بتا سکتا ہوں لیکن ابھی میں اس طرف توجہ نہیں دے سکتا۔ توجہ دوں گا بھی نہیں۔"

وہ عالی کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں اور عائشہ اُسے مل جائے۔ میں شاہ مغل سے پوچھتا نہیں تھا کہ عالی نے صرف مجھ پر کالا علم چلوایا تھا یا عائشہ پر بھی۔ شاہ مغل تو یہ سمجھ رہا تھا کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔

"ہاں سرکار!" ــــ شاہ مغل نے کہا ــــ "اُس کے نام کا پہلا حرف عین ہے۔ وہ عالی ہے ..... لیکن سرکار! اُسے پتہ نہیں چلنا چاہیئے کہ میں نے اُس کا راز فاش کر دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں انہی لوگوں سے مال بٹورنا ہوتا ہے۔"

"تم اب جاؤ" ــــ میں نے اُسے کہا ــــ "میرے بیٹھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ فجر کی اذان کے وقت تک بیٹھنا ہے۔ میں تمہیں کسی وقت بلاؤں گا لیکن اب ہوشیار رہنا۔"

وہ اس طرح اُٹھ کھڑا ہُوا جیسے اُس کی رُوح پر میرا قبضہ تھا۔ اُس نے دُہرا ہو کر دونوں ہاتھوں سے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور چلا گیا۔

میں اُس وقت حیران ہُوا تھا کہ اس شخص کا کالا جادو مجھ پر ناکام کیوں رہا تھا۔ یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ اناڑی تھا۔ کالا جادو اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ خواجہ صاحب نے مجھے کہا تھا کہ مجھ میں کوئی ایسی طاقت ہے جو دوسروں کو مسحور کر لیتی ہے مگر دوسروں کے سحر سے محفوظ رہتی ہے۔

میں نے کبھی ادھر توجہ نہیں دی تھی۔ خواجہ صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ اپنے آپ کو صرف گناہوں سے ہی نہیں بلکہ گناہوں کے خیال سے بھی پاک رکھنا۔ میں نے یہ تجربہ کر دیکھا تھا۔ گلشن آرا کا واقعہ سُنا چکا ہوں۔

زندگی میں بہت آگے جا کر یہ راز کھلا تھا۔ پُراسرار اثرات اُن لوگوں پر ہوتے ہیں جو مانتے ہیں کہ پُراسرار اثرات ہُوا کرتے ہیں۔ وہ لوگ ان اثرات کا شکار ہوتے ہیں جن کی شخصیت میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ کسی ایسے انسان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو جس کے ضمیر پر گناہوں کا بوجھ پڑا ہُوا ہو تو اُس کی آنکھیں جُھک جائیں گی۔ میں نے اپنے ذہن کو صاف رکھا ہُوا تھا۔

یہ ایک فلسفہ ہے جس کی گہرائیوں تک میں کبھی نہیں گیا۔



شاہ مغل کے جانے کے بعد قطب الدین کی بیوی اور عائشہ میرے پاس آگئیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ عامل یہاں کیوں آیا تھا۔

"کیا تم یہ علم جانتے ہو بیٹا؟" —— قطب الدین کی بیوی نے پوچھا۔

"کچھ جانتا ہوں تو ہی بچ گیا ہوں" —— میں نے کہا —— "ڈرنا نہیں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ کے کلام کے سامنے نہ کوئی جادو ٹھہر سکتا ہے نہ کوئی اُلٹا تعویذ!"

صبح ہوئی تو قطب الدین کی بیوی میرے کمرے میں آئی۔ اُس کے ہاتھ میں مٹی کا بنا ہُوا انسانی بُت تھا جو چھ انچ کے قریب لمبا تھا۔ اس کے سر میں کیکر کے دو لمبے کانٹے اُترے ہُوئے تھے۔ دو کانٹے سینے میں، دو پیٹھ میں، دو پیٹ میں اور ایک ایک کانٹا کولہوں کے دونوں طرف اُترا ہُوا تھا۔ قطب الدین کی بیوی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ یہ میں بھی جانتا تھا کہ یہ کالے علم کا ایک

طریقہ ہے جو بہت ہی خطرناک ہے۔

میں نے اس بُت کو اپنے پاؤں تلے مسل ڈالا اور قطب الدین کی بیوی سے کہا کہ یہ مٹی اور کانٹے اکٹھے کر کے جلتے چولہے میں پھینک دے۔ جب وہ بُت کے ٹکڑے اور کانٹے اُٹھا کر چلی گئی تو میں نے عائشہ سے کہا کہ وہ کسی بہانے عامل کو یہاں لے آئے۔ اُس نے کہا کہ کوئی مشکل کام نہیں۔ عائشہ اُسی وقت چلی گئی۔ وہ واپس آئی تو عامل آگیا۔ میں نے اُسے اپنے کمرے میں بلا کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"عامل!" —— میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا —— "میرا کیا بگاڑ لیا ہے تُو نے؟"

اُس نے نظریں اِدھر اُدھر کیں لیکن انہیں میری نظروں نے گرفتار کر لیا۔

"کہو تو تمہارے تعویذ تم پر اُلٹے کر دوں؟" —— میں نے کہا —— "گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے اور اپنی ہی آگ میں جل جل کر مرو گے۔ مجھ پر کوئی جادو نہیں چل سکتا۔"

"آپ کو کس نے بتایا ہے کہ میں نے آپ پر جادو کرایا تھا؟" —— اُس نے پوچھا —— "شاہ صاحب نے بتایا ہوگا!"

"میں کسی شاہ صاحب کو نہیں جانتا" —— میں نے کہا —— "میں خود معلوم کر لیا کرتا ہوں۔"

میں نے اُسے ڈرانا شروع کیا تو وہ تڑپ اُٹھا۔ میں بولتا رہا۔ آخر اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"میں نے تم پر رحم کیا ہے کہ تمہیں بخش رہا ہوں" —— میں نے کہا —— "اگر تم نے کوئی بات یا حرکت میرے خلاف کی تو تمہارا سارا جسم پھنسیوں سے بھر جائے گا اور تمہاری زندگی حرام ہو جائے گی اور تم اس گاؤں سے بھاگ جاؤ گے۔"

وہ تو جانتا ہی نہیں تھا کہ اُس کی کرتُوت کے متعلق مجھے شاہ مُغل بتا گیا

ہے۔ وہ سمجھا کہ میں یہ علم جانتا ہوں اور مجھے اشارہ مل گیا ہے کہ اُس نے میرے خلاف یہ کارروائی ہے۔

اُس کی حالت ایسی خراب ہوتی کہ اُس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا اور اُس کا جسم کانپنے لگا۔ اتنے تنومند جوان کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہُوا اور مجھے اُس پر رحم بھی آیا۔ ان لوگوں پر توہمات کے ایسے آسیب طاری کر دیتے گئے تھے کہ ان کی جسمانی اور ذہنی قوتیں بیکار ہو گئی تھیں۔ میں کوئی ایسا علم نہیں جانتا تھا جس سے میں اُسے کوئی نقصان پہنچا سکتا۔ میں اُس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا بلکہ وہ میرے خلاف بہت کچھ کر سکتا تھا لیکن میں نے اپنے اُوپر کوئی آسیب طاری نہیں ہونے دیا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی وہم نہیں تھا اس لئے میں اُس سے زیادہ طاقتور تھا۔

"آج کے بعد میں تمہیں اس گھر میں نہ دیکھوں" —— میں نے اُسے کہا۔

وہ اُچھل کر اُٹھا اور باہر کو بھاگ گیا۔

"کیا تمہارے ہاتھ میں بھی یہ علم ہے" —— عائشہ نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ علم تمہارے ہاتھ میں بھی ہے" —— میں نے کہا —— "اس علم سے تم نہایت آسانی سے بچ سکتی ہو، شرط یہ ہے کہ تمہارا ایمان پکّا ہو اور تمہارے دل میں اللہ کا اور اُس کے رسولؐ کا عشق ہو۔"

عائشہ چہرے پر حیرت کا تاثر لئے میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے جو کچھ کہہ دیا ہے اور میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ عائشہ سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ یہ لوگ صرف اُس چیز کو مانتے تھے جسے وہ دیکھ سکتے تھے۔ خدا کو وہ اس لئے مانتے تھے کہ وہ مسلمان تھے۔ خُدا اور رسولؐ کو وہ اپنے مذہب کی نشانی کے طور پر مانتے تھے لیکن مصیبت اور ضرورت کے وقت وہ اُن کے پاس جاتے تھے جنہیں وہ دیکھ سکتے تھے، چھُو سکتے تھے، اُن کے ساتھ باتیں کر سکتے تھے اور اُن کی باتیں سُن سکتے تھے۔

میری اصل پریشانی یہ تھی کہ قطبُ الدین ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اُس کی بیوی اور عائشہ مجھ سے کئی بار پوچھ چکی تھیں کہ وہ کہاں گیا ہے اور کب آئے

گا۔ میں انہیں تسلّی دلاسہ دیتا رہتا تھا لیکن مجھے دلاسہ دینے والا کوئی نہ تھا قطب الدین کوئی ایسا کچا آدمی تو نہیں تھا لیکن وہ پولیس اور سی آئی ڈی کے جال میں کبھی نہیں آیا تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ وہ کہیں بھولے پن میں یا جذبات میں آ کر پھنس نہ گیا ہو۔ جذباتی آدمی بڑی جلدی دوسروں کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ انگریزوں کی سی آئی ڈی بہت ہوشیار تھی۔ اس کے تربیت یافتہ آدمی مُشتبہ کی نفسیات کو دیکھ کر اس کے مطابق بات کرتے تھے اور مُشتبہ اُن کے جال میں آجاتا تھا۔

شاہ منل کے واقعہ کے بعد دو دن اور گزر گئے۔

مغرب کی اذان کا وقت تھا۔ گاؤں کا ایک بزرگ اندر آیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہُوا تھا۔

"تھانیدار صاحب آتے ہیں" —— اُس نے میرے قریب آ کر سرگوشی میں کہا —— "کیا کرو گے؟"

میرا تو خون خشک ہو گیا۔ اس مکان سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ اگر رات ہوتی تو میں چھت پر چلا جاتا اور پچھواڑے کُود جاتا۔ شام تو ہو چکی تھی لیکن روشنی اتنی تھی کہ نظر دُور تک کام کرتی تھی۔ یہ بوڑھا آدمی جو اندر آیا تھا، اسے میں جانتا تھا۔ قطب الدین نے مجھے بتایا تھا کہ اُس کے بعد یہ بزرگ میرا خیال رکھے گا۔ اسے میری اصلیت کا علم تھا۔ قطب الدین میں اتنی عقل تھی کہ وہ بڑا اچھا انتظام کر گیا تھا، لیکن اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

"تھانیدار کے ساتھ کتنے سپاہی ہیں؟" —— میں نے بزرگ سے پوچھا۔

"وہ اکیلا ہے" —— بزرگ نے جواب دیا —— "وہ وردی میں نہیں گھوڑے پر سوار ہے۔"

وہ وردی میں نہیں تھا اور اگر وہ گھوڑے پر سوار تھا تو بھی میں اپنے آپ کو یہ تسلّی نہیں دے سکتا تھا کہ میں اُس سے محفوظ رہوں گا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ ویسے ہی گشت پر آیا ہو۔ یہ گاؤں اُس کے علاقے میں تھا لیکن میں اپنے آپ کو کوئی حسین فریب نہیں دے سکتا تھا۔

"اُس کا رُخ کدھر کو تھا؟" —— میں نے بزرگ سے پوچھا —— "کیا وہ اس

گھر کی طرف آرہا ہے؟"

"وہ ابھی گاؤں میں داخل ہوا ہے" ـــ بزرگ نے جواب دیا۔

دروازے پر دستک ہوئی اس کے ساتھ ہی مسجد سے اذان کی صدا اُٹھی۔ میں نے بزرگ سے کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ یہ دستک تھانیدار کی ہی ہوسکتی تھی مجھے معلوم تھا کہ وہ مسلمان ہے لیکن میں صرف اس بنا پر اُس سے بچ نہیں سکتا تھا کہ وہ میرا مسلمان بھائی ہے۔ مسلمان نے ہمیشہ مسلمان کو ڈنک مارا ہے لیکن میں اس تھانیدار کو اس بات پر غدار نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ ایک مفرور مجرم کو پکڑنے آیا ہے۔ یہ اُس کی ڈیوٹی تھی جو اُسے ہر قیمت پر پوری کرنی چاہیئے تھی۔

اب تو لمحوں کی بات تھی۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ میرے نکل بھاگنے کا راستہ بند ہوچکا تھا۔ مجھے پکا یقین تھا کہ اس تھانے میں بھی میری فوٹو آئی ہوئی ہوگی۔ اگر فوٹو نہ ہوئی تو مکمل حلیہ ضرور آیا ہوگا۔ میرے پاس سوچنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ فوری طور پر جو سوجھ آئی، میں نے اُسی پر عمل کیا۔

کمرے میں مصلّٰی پڑا تھا۔ دیوار کے ساتھ قطب الدین کی تسبیح لٹک رہی تھی۔ صحن میں باتوں کی آواز اُٹھ رہی تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے مصلّٰی فرش پر پھینکا اور تسبیح مصلّے پر رکھ کر نماز شروع کردی۔

دروازے میں کوئی آیا اور اُس نے کہا ـــ "نماز پڑھ رہے ہیں"

"ٹھیک ہے!" ـــ صحن سے کسی کی آواز آئی ـــ "میں یہیں انتظار کروں گا"

یہ آواز تھانیدار کی ہوسکتی تھی۔ اپنے حلیے کے متعلق مجھے معلوم تھا کہ میری آنکھیں، پیشانی اور دانت بہروپ میں بھی پہچانے جاسکتے ہیں۔ میں نے بڑی تیزی سے اپنے چہرے کو چھپانے کا بندوبست کیا تھا۔ بندوبست یہ تھا کہ سر پر جو کپڑا لپیٹا تھا اس سے پیشانی اور آنکھوں کا کچھ حصہ چھپ گیا تھا یعنی ابرو نظر نہیں آتے تھے۔ چادر کی بُکل یوں ماری تھی کہ چہرہ ہونٹوں تک

چھپ گیا تھا۔

یہ نماز بھی کیا نماز تھی۔ میں خدا کے حضور کھڑا تھا لیکن یہ احساس بھی تھا کہ میں نے خدا کے حضور کھڑا ہونے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اس سے مجھے خیال آیا مجھے خدا کی خوشنودی حاصل نہیں ہوگی۔ بہرحال میں نے یہ نماز اپنی زندگی کی آخری نماز سمجھ کر پڑھی۔ باہر وہ لوگ بیٹھے تھے جنہوں نے مجھے پکڑ کر پھانسی کے تختے پر لے جانا تھا۔

میں نے نماز کو طول نہ دیا۔ بہت کوشش کی کہ نماز یکسوئی سے پڑھوں اور دھیان خدا میں رکھوں۔ میں انسان تھا کوئی فرشتہ تو نہ تھا۔ میں یکسوئی قائم نہ رکھ سکا۔ البتہ اپنے دماغ کو حاضر رکھا۔ نماز ختم ہوئی۔ میں نے خدا سے یہ دعا نہ مانگی کہ تھانیدار اندھا ہوجائے اور میں یہاں سے نکل جاؤں۔ اس کی بجائے میں نے اللہ سے گناہوں کی بخشش مانگی۔

"باہر کون ہے؟" ـــ میں نے اُونچی آواز سے کہا۔

میں نے تسبیح ہاتھ میں لے لی اور اس کے دانے چلانے لگا۔ میں پڑھ کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ یہ میری ایکٹنگ تھی جو میں نے کچھ سوچے بغیر شروع کردی تھی۔ اتنا ہی یاد ہے کہ میں تھانیدار کے مسلمان ہونے کا فائدہ اُٹھا رہا تھا۔

ایک آدمی میرے پاس آکر فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے بائیں پہلو میں بیٹھا تھا۔ میں نے تسبیح کرتے کرتے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ پرائیویٹ کپڑوں میں تھا۔ سر پر کُلّے پر باندھی ہوئی طُرّے والی پگڑی تھی۔ نہایت اچھی طرح تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور اُس کی عمر چالیس سال سے شاید ذرا کم ہوگی۔

"فرمایئے!" ـــ میں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے میں اُس کی طرف توجہ مشکل سے دے رہا ہوں ـــ "کیسے تشریف لائے؟" ـــ میں نے اپنی آواز بدلی ہوئی تھی۔

"سلام کے لیئے حاضر ہوا ہوں" ـــ اُس نے کہا۔

وہ گزارش کرنے کے لہجے میں بولا تھا۔ میں سمجھ نہ سکا کہ وہ اس طرح

بھکاریوں کی طرح بول کر مجھ پر طنز کر رہا تھا یا شاہ مُغل اور عالی کی طرح مجھے پہنچ والا شخص سمجھ رہا تھا۔ میں تسبیح کے دانے پھینکتا رہا اور وہ چُپ بیٹھا رہا۔

”سلام کسی غرض کے لئے ہے یا ....“ میں نے بزرگوں کی طرح کہا۔

”حضور فارغ ہولیں تو عرض کروں!“ — اُس نے کہا۔

”آپ فرمائیں“ — میں نے کہا اور کھجور کے پتوں کے بنے ہوئے مصلّے پر ذرا ایک طرف سرک کر کہا — ”فرش سے ہٹ کر اِدھر بیٹھیں۔ اپنے کپڑے خراب نہ کریں“۔

”شکریہ حضور!“ — وہ مصلّے پر ہوگیا اور بولا — ”پتہ چلا تھا کہ اللہ نے آپ کو کرامات بخشی ہے“۔

”اللہ نے مجھے کیا بخشا ہے یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں“ — میں نے کہا — ”آپ اپنی بات کریں“۔

”ترقی رُکی ہوئی ہے“ — اُس نے کہا — ”گیارہ برسوں سے سب انسپکٹر ہوں۔ مجھ سے جونیئر انسپکٹر ہو گئے ہیں۔ بال بچے دار ہوں۔ ایک بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہے“۔

”ترقی کیوں نہیں ملی؟“ — میں نے پوچھا — ”رشوت کھاتے ہو؟“

”رشوت کھاتا تو آپ کے پاس کیوں آتا؟“ — اُس نے جواب دیا — ”دیہات کے علاقے میں تھانیدار تعینات ہو جاتے تو سو پچاس چلتے پھرتے جیب میں ڈال سکتا ہے لیکن نہیں حضور! دین دار ہوں۔ ایک پیسہ نہیں لیتا۔ تفتیش پر جاتا ہوں تو متعلقہ نمبردار سے کھانا کھا لیتا ہوں۔ ملزم فریق ٹہل سیوا کرتے ہیں۔ میں قبول نہیں کرتا .... ترقی اس لئے رُکی کہ ایک اینگلو انڈین ڈی ایس پی ناراض ہو گیا تھا۔ قتل کا ایک کیس تھا۔ میں نے قاتل کو پکڑ لیا تھا۔ اُس کی ایک بہن کا چکر تھا۔ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُسے میں نے تھانے میں پابند کیا ہُوا تھا“۔

”اِس اینگلو انڈین ڈی ایس پی نے اُسے دیکھ لیا ہوگا!“ — میں نے کہا۔

”ہاں حضور!“ — اُس نے کہا — ”وہ کافر دَورے پر آگیا۔ اُس نے لڑکی کو دیکھ لیا اور مجھے کہا کہ اسے ڈاک بنگلے میں بھیجو۔ میں نے کہا — ’صاحب بہادر! یہ کام کرنا ہوتا تو پولیس میں بھرتی ہونے کی بجائے رنڈی بازار چلے جاتے اور عورتوں کی دلالی کرتے‘ — وہ ناراض ہو گیا۔ اُس نے ویسے ہی کوئی وجہ پیدا کر کے مجھے لائن حاضر کرا دیا۔ ایس پی صاحب کے آگے پیشی ہوئی۔ میں نے ڈی ایس پی کی ناراضگی کی اصل وجہ بتا دی لیکن ڈی ایس پی نے ایس پی صاحب کے کان ایسے بھرے تھے کہ مجھے مُنہ کی کھانی پڑی“۔

اینگلو انڈین آدھے انگریز اور آدھے ہندوستانی ہُوا کرتے تھے یعنی ماں یا باپ انگریز ہوتا تھا۔ یہ نسل رنگ روپ کے لحاظ سے انگریز لگتی تھی لیکن یہ لوگ ذہنیت کے لحاظ سے خالص ہندوستانی ہوتے تھے۔ یہ تھانیدار جس کا نام اورنگ زیب خان تھا، مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اینگلو انڈین ذہنیت کے لحاظ سے کیسے ہوتے ہیں اور اس اینگلو انڈین ڈی ایس پی نے اُسے آگے چل کر بھی کس طرح نقصان پہنچایا۔ اورنگ زیب خان کو معلوم نہیں تھا کہ میں اُس کی بات بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔

اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ شخص میرے متعلق اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر آیا ہے کہ میں کالے علم کا عامل ہوں یا میرے ہاتھ میں کرامات ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو اسے شاہ مغل نے میرے متعلق بتایا ہوگا۔

”کیا آپ کو ترقی چاہیئے؟“ — میں نے اُس سے پوچھا۔

”ترقی تو حضور کبھی مل ہی جاتے گی“ — اُس نے کہا — ”میری اصل ضرورت پیسہ ہے“۔

”رشوت آپ کو قبول نہیں“ — میں نے کہا۔

”نہ حضور!“ — اُس نے کہا — ”رشوت سے بھوکا مر جانا بہتر ہے .... ایک ذریعہ ہے۔ اگر آپ کرم فرمائیں تو میرے دونوں کام ہو سکتے ہیں۔ پیسہ بھی مل سکتا ہے ترقی بھی .... دس ہزار روپیہ معمولی رقم نہیں ہوتی حضور!“

"دس ہزار؟" — میں نے پوچھا۔

"ہاں حضور!" — اُس نے کہا — "آپ کی نظرِ کرم چاہیئے۔ مجھے دس ہزار روپیہ مل سکتا ہے۔"

یہ تھانیدار بہت چالاک آدمی تھا۔ یہ اُن درندوں میں سے تھا جو شکار کو چیرنے پھاڑنے سے پہلے اُس کے ساتھ کھیلا کرتے ہیں۔ وہ میرے ساتھ مذاق کر رہا تھا۔ مجھ پر طنز کر رہا تھا۔ ابھی اُس نے مجھے یہ کہنا تھا کہ حضور! آپ ہیں دس ہزار روپے کا چیک۔ چلیے میرے ساتھ، میں آپ کو کیش کرا لوں۔

میری جگہ کوئی ذرا سا بھی کم عقل ہوتا تو اُس کا ردِ عمل کچھ اور ہوتا۔ وہ حماقت سے اپنا آپ ظاہر کر دیتا۔ پسینہ تو میرا بھی نکل آیا تھا۔ میرے لئے فرار ناممکن ہو گیا تھا پھر بھی میں نے اپنے ہوش و حواس کو ٹھکانے رکھا اور میں نے بھاگ نکلنے کے طریقے سوچنے شروع کر دیئے۔

"شاہ صاحب حضور!" — اُس نے کہا — "آپ کی خاموشی مجھے پریشان کر رہی ہے۔ دعا فرمائیں یا مجھے کوئی وِرد وظیفہ بتائیں۔ کوئی عمل کریں۔ مجھے کوئی عمل بتائیں۔ میرے بچّوں پر رحم کریں۔"

"خدا کے بندے!" — میں نے ذرا جھنجھلا کر کہا — "یہ دس ہزار روپے کا کیا ذکر ہے؟ مجھے بھی سمجھ لینے دو۔"

"آپ کو تو دنیا کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی حضور!" — اُس نے کہا — "پولیس کا ایک سب انسپکٹر ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کر کے مفرور ہے۔"

"نام کیا ہے؟"

"سکندر!" — اُس نے کہا اور میرے والد صاحب کا نام اور ذات اور پورا ایڈریس بتایا۔

اُس نے میرے تمام جرائم مجھے سنائے۔ ریل گاڑی سے فرار اور گاؤں سے فرار کی بھی تفصیل سنائی اور حُلیہ بھی بتایا۔

"ایک بات مشہور ہو گئی ہے" — اُس نے کہا — "کہتے ہیں اس شخص کے ہاتھ میں کوئی جادو ہے یا اُس کا پیر کامل ہے یا اُس کے مُرشد نے اُسے کوئی چیز دی ہوئی ہے۔ وہ گھیرے میں آجاتا اور اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے اُسے زمین نے نگل لیا ہو۔ بعض پولیس والے تو اُس سے ڈرتے ہیں۔"

"آپ چاہتے کیا ہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کے دربار میں کرامات ہے" — اُس نے کہا — "آپ کی نظریں کالے پردوں کے پیچھے بھی دیکھ لیتی ہیں کہ اُدھر کیا ہے اگر آپ مجھے بتا دیں کہ وہ کہاں ہے تو میں وہاں چھاپہ مار کر اُسے پکڑ لوں۔ دس ہزار روپیہ نقد ملے گا اور میری ترقی کُھل جائے گی۔"

"لیکن اُس کے ہاتھ میں جو طاقت ہے اس کا کیا کرو گے؟"

"وہ بھی حضور ہی کریں گے" — اُس نے کہا — "کوئی تعویذ، کوئی نقش عنایت فرما دیں جو اُس کی خفیہ طاقت کو کمزور کر دے۔"

میں نے انگلی سے فرش پر جو کچّا تھا، سیدھی ٹیڑھی لکیریں کھینچیں۔ ان کے گرد گول دائرہ کھینچا۔ کئی جگہوں پر شہادت کی اُنگلی رکھی۔ پھر تسبیح کے دانوں کو اِدھر اُدھر کر کے دیکھا۔

"وہ اِسی علاقے میں ہے" — میں نے کہا — "آپ کو سات روز انتظار کرنا پڑے گا۔ میں یہاں ایک اشارے پر آیا بیٹھا ہوں۔ یہ لوگ میرے کچھ نہیں لگتے۔ میں تو انہیں جانتا بھی نہیں تھا لیکن ہمیں جو اشارہ بلکہ جو حکم ملا تھا اس کے مطابق یہی جگہ بنتی تھی۔ کام سات دنوں میں ختم ہو گا۔ یہ میرا اپنا ایک عمل ہے جو حکم کے مطابق پورا کرنا ہے۔ آٹھویں روز میں رات کا چلّہ کاٹ کر آپ کو صحیح جگہ بتا دوں گا۔ چھاپہ مارنا اور پکڑنا آپ کا کام ہے۔"

"حضور!" — اُس نے کہا — "میں نذرانہ پیش کروں گا۔ ہزار دو ہزار یا جو آپ کہیں گے آپ کے قدموں میں رکھ دوں گا۔"

"مجھے پیسے کا لالچ ہوتا تو میں خود اُسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کرتا" — میں نے کہا — "لیکن مجھے دس ہزار روپے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ

دس ہزار آپ کا ہے۔ سات دن انتظار کر لو۔ آٹھویں دن کی شام اِس گھر کی دہلیز پر اُس وقت قدم رکھنا جب سورج اُفق میں آدھا اندر اور آدھا باہر ہو گا .... اب چلے جائیں۔"

"کوئی خدمت حضور؟"

"کچھ نہیں" ــــ میں نے کہا ــــ "میری خدمت بس یہ کرو کہ رشوت نہ لینا اور کسی کو ناحق تنگ نہ کرنا۔"

اُس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا، ہاتھ کو چُوما، اپنی آنکھوں سے لگایا اور چلا گیا۔

میں نے اپنا مُنہ ننگا نہیں کیا تھا۔ پیشانی سے بھی کپڑا نہیں ہٹایا تھا اور اُس کی طرف بہت کم دیکھا تھا۔ وہ مجبور انسان تھا۔ اُس نے جس انداز سے اپنی ضرورت اور مُراد پیش کی تھی وہ انداز دھوکے اور فریب والا نہیں تھا۔



وہ چلا گیا تو رات تاریک ہو چکی تھی۔ گاؤں کے جس بزرگ نے مجھے تھانیدار کے آنے کی اطلاع دی تھی وہ میرے پاس آ گیا۔

"کوئی خطرہ ہے؟" ــــ اُس نے پوچھا۔

"ٹل گیا ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "فکر نہ کریں۔"

میں نے اُسے تو کہہ دیا کہ فکر نہ کریں لیکن میری اپنی یہ حالت تھی کہ فکر میرے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔ اُس سے رات کو کئی بار میری آنکھ کُھلی۔ یہ یقین تو ہو گیا تھا کہ وہ خود ایک دھوکے کا شکار ہو کے آیا تھا لیکن یہ خیال آ ہی جاتا تھا کہ وہ مجھے دھوکہ نہ دے گیا ہو۔

قطب الدین کو آ جانا چاہیئے تھا۔ میں نے حمید اللہ خان تک پہنچنا تھا لیکن یہ معلوم کئے بغیر کہ وہ وہاں موجود ہے اور وہ جگہ ابھی تک محفوظ ہے مجھے وہاں نہیں جانا چاہیئے تھا مگر خبر لانے جو گیا تھا وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ مجھے سات دنوں کے اندر اندر یہاں سے نکلنا تھا کیونکہ آٹھویں روز تھانیدار نے پھر آنا تھا۔

دو دن اور گزر گئے ــــ اور قطب الدین کی بجائے میرا ایک ساتھی نور اللہ آ گیا۔ وہ بتیس تینتیس سال عمر کا پختہ کار جرائم پیشہ تھا اور حمید اللہ خان کا پرانا دوست تھا۔ اُن کی دوستی اُس وقت پکی ہوئی تھی جب حمید اللہ کی جاگیر آباد تھی۔

"میرا بھیجا ہُوا آدمی کہاں ہے؟" ــــ میں نے نور اللہ سے پوچھا ــــ "قطب الدین کیوں نہیں آیا؟"

"میرا خیال ہے تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں رہا!" ــــ اُس نے کہا ــــ "جس آدمی کو تم نے بھیجا تھا اُسے تمہارے سوا کون جانتا تھا۔ یہ پولیس کا مُخبر بھی ہو سکتا تھا۔ تم اپنی کوئی نشانی بھیج دیتے۔ پہلے تو قطب الدین ہمارے ٹھکانے کا راستہ بھول گیا اور بہت دُور نکل گیا۔ ایک دن اور ایک رات بھٹکتا رہا۔ اب میں اِدھر آیا تو میں بہت دُور نکل گیا۔ بڑی مشکل سے یہاں پہنچا ہوں .... قطب الدین پر ہم کیسے اعتبار کر لیتے؟ اُسے نوابزادے نے یرغمال میں رکھ کر مجھے بھیجا ہے۔ یہ دھوکہ بھی ہو سکتا تھا۔ ہم وہاں پہنچیں گے تو قطب الدین رہا ہو گا۔"

اُس نے تفصیل یوں سنائی کہ قطب الدین اُس گاؤں میں گیا تو حمید اللہ خان کا گھر پوچھا۔ اُسے بتایا گیا کہ یہاں کوئی حمید اللہ نہیں رہتا۔ خواجہ صاحب کا نام لیا تو بھی اُسے وہی جواب ملا کہ یہاں کوئی خواجہ صاحب نہیں، پھر اُس نے میرا نام لیا اور کہا کہ وہ ناز کے لئے میرا پیغام لایا ہے۔

"تم غلطی سے اس گاؤں میں آ گئے ہو بھائی!" ــــ ایک آدمی نے اُسے کہا ــــ "اس گاؤں میں ان ناموں کا کوئی آدمی نہیں رہتا نہ یہاں کوئی ناز ہے۔"

یہ سب وہاں موجود تھے۔ کسی نے حمید اللہ کو اطلاع دی کہ ایک اجنبی اُس کے متعلق پوچھتا پھر رہا ہے۔ حمید اللہ نے کہا کہ اُسے چلتا کرو۔ چنانچہ اُسے یوں چلتا کیا گیا کہ نور اللہ باہر جا کر قطب الدین سے ملا اور اُس سے پوچھا کہ وہ کسے ملنا چاہتا ہے۔ قطب الدین نے پھر حمید اللہ، خواجہ صاحب اور ناز کے نام لئے۔

"آپ یہاں غلطی سے آ گئے ہیں بھائی صاحب!" ــــ نور اللہ نے اُسے کہا ــــ "یہاں سے تین میل دُور ایسا ہی ایک گاؤں ہے۔ میں ان تینوں کو جانتا ہوں۔ یہ سب اُس گاؤں میں رہتے ہیں۔"

قطب الدّین کو نور اللہ نے ایک راستے پر ڈال دیا جو گاؤں کے ساتھ ہی پہاڑی علاقے میں سے گزرتا تھا۔ دراصل وہاں سے کوئی راستہ نہیں گزرتا تھا۔ قطب الدّین پہلے ہی پیدل چل چل کر چُور ہو چکا تھا وہ اُس طرف چل پڑا۔ وہ پہاڑیوں میں داخل ہُوا تو قریب سے کسی نے اُٹھ کر اُس پر کپڑا پھینکا اور دو آدمیوں نے اُسے دبوچ لیا۔

ان پہاڑیوں میں ایک غار تھا جس میں ہم نے روپوش ہونے کے لئے تین چار دن گزارے تھے۔ قطب الدّین کو اس غار میں لے گئے اور اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر وہاں ایک دن اور ایک رات پڑا رہنے دیا۔ اس کے بعد اُس کے پاس گئے اور اسے کہا کہ وہ سچ بولے کہ وہ کون ہے اور کس کا مُخبر ہے۔ پولیس کا یا نواب کا۔

مجھے یہ سُن کر بہت افسوس ہُوا۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اس قابلِ قدر آدمی کے ساتھ میرے ساتھی یہ سلوک کریں گے۔ وہ انہیں میری نشانیاں بتاتا تھا اور اُس نے انگریزوں کی دشمنی کی جو باتیں میرے ساتھ کی تھیں وہ اُن کے ساتھ بھی کیں لیکن حمید اللہ نہیں مانتا تھا۔

آخر انہوں نے دیکھا کہ قطب الدّین کا وہی بیان ہے جو اُس نے پہلے روز دیا تھا تو اُنہوں نے اُسے اپنے پاس رکھ لیا اور اُس کے بتاتے ہوئے راستے اور اتے پتے پر نور اللہ کو بھیج دیا۔



نور اللہ نے بتایا کہ حمید اللہ خان پولیس کے تعاقب سے نکل آیا تھا لیکن الطاف نہیں نکل سکا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ الطاف زندہ ہے یا مارا گیا ہے۔

مجھے اب بہت جلدی واپس جانا تھا۔ واپس تو جانا ہی تھا لیکن زیادہ جلدی

یہ تھی کہ حمید اللہ نے قطب الدین کو یرغمال میں رکھ لیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ میرے لئے اور نور اللہ کے لئے پریشان ہوں گے۔ مشکل یہ تھی کہ ہم اُسی وقت روانہ ہو جاتے تو بھی جلدی نہیں پہنچ سکتے تھے کیونکہ ہم عام قسم کے مسافر نہیں تھے کہ کھلے بندوں سفر کرتے۔ ہم نے بہت سا فاصلہ پیدل طے کرنا تھا اور چھُپ چھُپ کر جانا تھا۔ دو دن کا سفر ہمارے لئے دو ہفتوں کا ہو سکتا تھا۔

اس علاقے کے تھانیدار نے آٹھویں روز میرے پاس آنا تھا۔ اس کے متعلق عائشہ کو کچھ بتانا ضروری تھا۔ میں نے اُسے الگ بٹھایا۔

"دیکھو عائشہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں جا رہا ہوں۔"

عائشہ نے مجھے یوں چونک کر دیکھا جیسے میں نے اُس کے سینے میں خنجر مار دیا ہو۔ اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"مجھے جانا ہی تھا عائشہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں آؤں گا۔ یہ آدمی جو یہاں آیا ہے تمہارے ماموں کی خبر لایا ہے۔ جب تک میں نہیں جاؤں گا تمہارے ماموں تمہارے پاس نہیں آئیں گے۔ میں تمہیں ایک خاص بات سمجھانا چاہتا ہوں۔"

میں نے اُسے بتایا کہ تھانیدار میرے پاس کیوں آیا تھا اور میں نے اسے کیا کہا تھا۔

"وہ آٹھویں روز پھر آئے گا" ــــ میں نے کہا ــــ "اُسے کہنا کہ قبلہ شاہ صاحب اچانک ہی آ گئے تھے اور اچانک ہی چلے گئے۔ اُسے یہ بھی بتانا کہ قبلہ شاہ صاحب کی باتیں تمہارے ماموں کے ساتھ ہوتی تھیں اس لئے تمہیں اُن کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ یہ بتانا کہ قبلہ شاہ صاحب دن رات عبادت میں مصروف رہتے تھے۔"

قطب الدّین کی بیوی کو میری اصلیت کا علم نہیں تھا اس لئے اُس کے متعلق میں نے عائشہ کو کچھ باتیں سمجھا دیں پھر۔ میں نے اُس بزرگ کو بلایا جس نے مجھے تھانیدار کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ چونکہ وہ میرے راز سے واقف تھا

اس لئے اُسے بھی کچھ بتانا ضروری تھا۔ میں ان لوگوں کو اس لئے یہ باتیں سمجھا رہا تھا کہ کسی کو شک بھی نہ ہو کہ ان لوگوں نے مجھے یعنی ایک بڑے خطرناک مفرور مجرم کو پناہ دی تھی۔

اُس دن کا سورج غروب ہُوا اور تاریکی کا پردہ گر پڑا تو میں اور نور اللہ اس گاؤں سے نکلے۔ عائشہ کی جذباتی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ایسا ہونا ہی تھا۔ میں نے عائشہ کو اس طرح دل سے قبول نہیں کیا تھا جس طرح اُس نے کیا تھا۔ پھر بھی اُس سے رخصت ہوتے وقت میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی لیکن میں مجبور تھا۔ میرے پاؤں کا چکر ہی ایسا تھا کہ میری کوئی منزل نہیں تھی۔

نور اللہ نے یہ راستہ دیکھا تھا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ مجھے یہاں تک کس طرح لایا گیا تھا۔ ہم دونوں پیدل چلتے گئے۔ ہماری رفتار خاصی تیز تھی۔ تقریباً دو گھنٹوں بعد ہم برانچ لائن کے ایک سٹیشن پہ پہنچے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد گاڑی آئی اور نور اللہ نے ایک سٹیشن کے لئے ٹکٹ لئے۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ برانچ لائن تھی اور رات کا وقت تھا اس لئے گاڑی میں بہت کم مسافر تھے۔

نور اللہ کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ مفرور نہیں تھا خطرہ میرے لئے تھا۔ میں اسی علاقے سے پولیس کے گھیرے سے نکلا تھا اس لئے اس علاقے میں میرا نام مشہور ہو گیا تھا۔ گرمی کا موسم تھا اس لئے چادر یا کمبل اوپر نہیں لیا جا سکتا تھا۔ ہم نے خطرہ مول لیا اور ریل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ یہ گاڑی مین لائن تک جاتی تھی لیکن ہم مین لائن پر جانے سے گریز کر رہے تھے۔



برانچ لائن کی گاڑی ہونے کی وجہ سے اس کی رفتار بہت سست تھی اور یہ جہاں رُکتی تھی وہاں رُکی ہی رہتی تھی۔ اس نے ہمیں سحر کے وقت اُس ریلوے سٹیشن تک خیریت سے پہنچا دیا جہاں سے ہم نے ریل کا سفر ترک کر کے پیدل سفر شروع کرنا تھا۔ یہ کوئی چھوٹا سا قصبہ تھا۔ سٹیشن کے باہر دو یکے کھڑے تھے۔ ایک یکے میں بیٹھے۔ نور اللہ نے اُسے کوئی جگہ بتائی اور یکہ چل پڑا۔

سفر یہ بھی عجیب تھا۔ ہر درخت اور جھاڑی کے پیچھے پولیس کانسٹیبل کھڑا

نظر آتا تھا۔ جوں جوں سحر کی تاریکی چھٹتی جا رہی تھی دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی تو میں دلیر ہو جاتا اور کبھی دل یوں ڈوب جاتا جیسے یہ یکہ مجھے سیدھا جیل میں لے جا رہا ہے اور وہاں سے مجھے مقدمہ چلائے بغیر پھانسی کے تختے پہ کھڑا کر دیں گے۔

"بھائی وہ سکندر ڈاکو کا کچھ سراغ ملا ہے؟" ـــــ میں نے یکے والے سے پوچھا ـــــ "سنا تھا وہ اسی علاقے میں کہیں پولیس کے گھیرے میں آیا تھا۔"

"کیا صاحب! وہ گیا نکل گیا" ـــــ یکے والے نے کہا ـــــ "وہ کسی کے ہاتھ نہیں آ سکتا صاحب!"

تانگہ اور یکہ بان خبریں اور افواہیں پھیلانے میں خصوصی مہارت اور شہرت رکھتے تھے اور یہ بھی غلط نہیں کہ وہ پولیس کے ہیڈ کانسٹیبلوں اور کانسٹیبلوں کو تانگے یا یکے میں مُفت بٹھا کر اور انہیں سگریٹ پلا کر اندر کی خبریں حاصل کر لیتے تھے۔ ان میں وہ سنسنی خیزی کے لئے اپنی طرف سے اضافے کر کے دن بھر اپنی سواریوں کو سناتے رہتے تھے۔ آج بھی تانگے پہ ذرا لمبے سفر کے لئے بیٹھو تو تانگے والا کوئی دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی شروع کر دیتا ہے۔ سواری کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ تانگے والے نے اُسے اپنی کہانی میں اُلجھا کر گھوڑے کی رفتار سست رکھی ہوئی ہے تاکہ گھوڑا تھک نہ جائے۔

اس یکہ بان نے میرے متعلق ایسی باتیں کیں کہ مجھے شک ہونے لگا کہ یہ کسی جن بھوت کے متعلق بات کر رہا ہے۔

"پولیس کیا کہتی ہے؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "کیا وہ اسی علاقے میں ہے؟"

"نہ جناب!" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "وہ کانگڑہ کی طرف نکل گیا ہے۔ سرکار نے اُس کو گرفتار کرانے والے کو دس ہزار روپیہ انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ دس ہزار تو پورا خزانہ ہے جناب! لیکن دس ہزار کے عوض کوئی جان تو نہیں گنواتا۔ وہ جو پولیس کے گھیرے سے نکل جاتا ہے اُسے اور کون پکڑ سکتا ہے؟"

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پولیس میری تلاش میں سرگرم ہے یا کچھ ٹھنڈی پڑگئی ہے۔ سرگرم عمل سے مطلب یہ تھا کہ پولیس نے جگہ جگہ چیکنگ کا سلسلہ شروع کر رکھا ہوگا۔ یکّہ بان نے بتایا کہ چیکنگ کہیں بھی نہیں ہوتی۔

یکّے نے ہمیں وہاں تک پہنچا دیا جہاں نوراللہ نے اُسے کہا تھا۔ ہم اب پھر دیہاتی علاقے میں تھے۔ نوراللہ نے بتایا کہ کم و بیش بیس میل پیدل چلنا ہے پھر لاری میں سوار ہوں گے۔

ہم ایک پگڈنڈی پر ہو لئے اور چلتے گئے۔ ساون کے بادل منڈلا رہے تھے اور میں دعا کر رہا تھا کہ بارش نہ ہو۔ ڈیڑھ دو میل آگے جا کر ہم پگڈنڈی سے ہٹ گئے کیونکہ دو تین میل آگے یہ پگڈنڈی ایک بڑے گاؤں میں سے گزرتی تھی۔ خیال تھا کہ اس گاؤں میں تھانہ ہوگا۔ تھانہ نہ ہُوا تو چوکی ضرور ہوگی۔

ہم بالکل ٹھیک سمت کو جا رہے تھے۔ نوراللہ نے یہ علاقہ پہلے دیکھا تھا۔ چلتے چلتے ہم اونچے نیچے علاقے میں داخل ہو گئے۔ درختوں کی بہتات اور ہریالی کی وجہ سے یہ خطہ بہت خوبصورت تھا۔ ندی نالے بھی تھے۔ بعض میں پانی تھا۔ کسی پر لکڑی کا پُل تھا اور کسی میں سے بغیر پُل کے گزرنا پڑا۔

تھوڑی ہی دُور رائفل یا بندوق کا دھماکہ سُنائی دیا۔ ہم نے رُخ ذرا بدل دیا۔ گاؤں دُور دُور تھے۔ ہم نے رُخ تو بدل دیا تھا لیکن ایک گھاٹی اُترے تو تین آدمی اچانک سامنے آ گئے۔ ایک نے ہاتھ میں دونالی بندوق اور ایک نے ہاتھ میں مرے ہوئے پرندے اُٹھا رکھے تھے۔



جس کے ہاتھ میں بندوق تھی اُسے میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی ہندو تھا جو مجھے ریل گاڑی میں ملا تھا۔ اُس کے دہشت گرد گروہ کو میں نے ہی پکڑوایا تھا۔ میرے ساتھ میرا دوست سلطان احمد بھی تھا۔ اس گروہ کے افراد کو بڑی لمبی سزائیں دی گئی تھیں۔ دو کو عدم ثبوت کی بنا پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان دو میں یہ بھی تھا۔

ریل گاڑی میں اس نے مجھے داڑھی کے باوجود پہچان لیا تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو مذہب کا طالب علم ظاہر کر کے اسے یقین دلا دیا تھا کہ میں تبلیغی جماعت کے ساتھ اس علاقے میں آیا ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کا چہرہ اُس سی آئی ڈی انسپکٹر جیسا ہے جس نے ہمیں گرفتار کیا تھا۔ اُس کا نام سکندر تھا اور فرق صرف یہ ہے کہ اُس کی داڑھی نہیں تھی اور آپ کی داڑھی ہے۔

میں نے اسے چکّر دے لیا تھا اور یہ مان گیا تھا کہ میں سکندر نہیں ہوں۔ اس کے ساتھ میں نے بہت باتیں کی تھیں۔ مجھے شک تھا کہ یہ شخص اب بھی دہشت گرد گروہ کے ساتھ ہے۔ وہ تعلیم یافتہ آدمی تھا۔

اب وہ پھر میرے سامنے آ گیا اور اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے کوشش کی کہ اس کی طرف نہ دیکھوں لیکن اُس نے میری کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔

"آداب عرض مولانا!"—— اُس نے رُک کر کہا —— "ابھی تبلیغی دَورہ ختم نہیں ہُوا؟"

"نہ بھائی!"—— میں نے آگے ہو کر اُس سے ہاتھ ملایا —— "تھوڑا سا علاقہ رہتا ہے۔"

"اُس روز گاڑی میں ملاقات ہوئی تو آپ کی داڑھی لمبی تھی"—— اُس نے کہا —— "اب داڑھی اتنی چھوٹی کرا لی ہے۔ یہ زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

"آپ یہیں کہیں رہتے ہیں؟"—— میں نے پوچھا۔

"نہیں!"—— اُس نے جواب دیا —— "اپنے رشتہ داروں کے ہاں آیا ہُوا ہوں۔"

میں نے اُسے ٹالنے کے لئے ویسے ہی ایک دو باتیں کیں۔ اُس کے پاس زیادہ رُکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اُس نے گاڑی میں بھی مجھے پہچان لیا تھا لیکن اب اُس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جس میں مجھے کوئی معنی نظر آ رہے تھے اور اس مسکراہٹ میں طنز بھی تھی۔ اُسے اب پختہ شک ہُوا ہو

گا کہ میں سکندر ہوں۔

"مولانا!" ۔۔۔ اُس نے مجھے نوراللہ اور اپنے دوستوں سے پرے لے جاتے ہوتے کہا ۔۔۔ "مجھ سے نہ ڈریں۔ میرے دل میں دس ہزار کا کوئی لالچ نہیں۔ میں اپنے ہندوستانی بھائیوں کا نہیں، انگریزوں کا دشمن ہوں.... آپ سب انسپکٹر سکندر ہیں!"

"آپ مجھے سکندر کہہ کر ضرور گناہگار کریں گے!" ۔۔۔ میں نے ہنستے ہوتے کہا ۔۔۔ "گاڑی میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو بھی آپ نے یہی کہا تھا کہ میں سکندر ہوں!"

"اُس وقت میں نے آپ کے کہنے پر مان لیا تھا کہ آپ سکندر نہیں" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میں نے خود ہی سوچا تھا کہ سکندر تو اپنی نوکری پر ہوگا۔ شک مجھے اس لئے ہوا تھا کہ آپ بھیس بدل کر کہیں سی آئی ڈی کی ڈیوٹی پر جا رہے ہیں۔ پھر مجھے دو تین روز بعد معلوم ہوا تھا کہ آپ ایک انگریز پولیس آفیسر کو قتل کر کے مفرور ہیں۔ پھر آپ اپنے شہر میں گرفتار ہو گئے تھے اور ریل گاڑی سے فرار ہو گئے تھے۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ آپ کو زندہ یا مردہ پکڑنے والے کو دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ یہ سُن کر مجھے ریل گاڑی میں آپ کی ملاقات یاد آئی تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ وہ سکندر ہی تھا جو مجھے ملا تھا۔ آج آپ کو چھوٹی داڑھی میں دیکھ کر میں یقین سے کہہ رہا ہوں کہ آپ سکندر ہیں!"

"اگر میں کہہ دوں کہ میں سکندر ہوں تو آپ کیا کریں گے؟" ۔۔۔ میں نے پوچھا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا پھر میری طرف دیکھا۔

"پھر میں آپ کو آپ نہیں تم کہوں گا جس طرح دو گہرے دوست ایک دوسرے سے کہا کرتے ہیں" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میں تمہیں دوست نہیں بھائی کہوں گا.... اور سکندر بھائی! میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ اپنے چہرے کا کچھ کرو۔ اسے تم داڑھی سے نہیں چھپا سکتے۔ اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالو۔ جس طرح میں تمہیں پہچان کر بھی خبردار کر رہا ہوں اور دس ہزار روپوں پر لات

مار رہا ہوں اس طرح کسی اور ایسے آدمی نے تمہیں پہچان لیا جو تمہارا ملزم رہ چکا ہو یا تم نے اُسے سزا دلائی ہو تو وہ تمہیں گرفتار کرا دے گا۔"

"تم مجھ پر اتنا کرم کیوں کر رہے ہو؟" ۔۔۔ میں نے پوچھا ۔۔۔ "مجھے تو تمہارا نام بھی یاد نہیں رہا!"

"صرف اس لئے کہ تم نے ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کیا ہے" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میرا نام جگموہن ہے۔ مجھے معلوم نہیں تم نے اُسے کیوں قتل کیا تھا۔ اس کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارا کوئی جرم اُس ڈی ایس پی نے پکڑ لیا ہوگا اور تم نے بچنے کا یہ راستہ نکالا کہ ڈی ایس پی کو قتل کر دیا!"

"ایسا نہیں ہوا تھا" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "تم یہ بتاؤ کہ کیا کر رہے ہو!"

"وہی!" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "وہی جرم کرتا پھر رہا ہوں جس جرم میں تم نے مجھے پکڑا تھا.... دہشت گردی.... میں اب بھی ٹیررسٹ ہوں۔ اپنے گروہ میں اپنے جیسے قابلِ اعتماد جوان شامل کر رہا ہوں۔ ہمارا لیڈر کہیں اور ہے۔"

اُس کے دوست اور نوراللہ پریشان ہو رہے تھے کہ ہم دونوں نے الگ تھلگ بڑی لمبی باتیں شروع کر دی تھیں۔ میں ابھی جگموہن کے دوستوں پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جگموہن کا خیال کچھ اور تھا۔

"یہ دونوں میرے ساتھی ہیں" ۔۔۔ جگموہن نے کہا ۔۔۔ "انہیں بتا دینے میں کوئی خطرہ نہیں بلکہ انہیں بتا دینا ضروری ہے۔"

❋

ہم اکٹھے بیٹھ گئے۔ میں اتنا احمق تو نہیں تھا کہ ان ہندوؤں پر اپنا آپ ظاہر کر دیتا۔ میں نے اپنا پردہ اٹھا دینے کی ضرورت اس لئے محسوس کی تھی کہ میں بھی دہشت گرد بننے کا ارادہ دل میں لئے ہوتے تھا۔ مجھ جیسے مفرور قاتل عام طور پر ڈاکو، رہزن یا ٹھگ بنا کرتے اور اسی پیشے میں نام پیدا کیا کرتے تھے۔ سلطانہ ڈاکو پیدائشی ڈاکو تو نہ تھا۔ پولیس کے ایک انگریز افسر کی فرعونیت

نے اُسے ڈاکو بنایا تھا۔ مجھے پولیس کے ہی ایک انگریز افسر کی فرعونیت نے قاتل بنایا تھا۔ مجھے ڈاکو ہی بن جانا چاہیئے تھا لیکن میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ چھپ چھپ کر ہی باقی عمر گزارنی ہے تو اپنے ملک کے لئے کچھ کیا جائے۔ آخر میں پھانسی کے تختے پر ہی کھڑا ہونا ہے تو جان ملک کے تو کام آئے۔ اس روایت کو زندہ رکھا جائے کہ انگریزوں کو چین اور آرام سے حکومت نہ کرنے دی جائے۔

میں نے ایک ٹیررسٹ گروپ بنانا تھا۔ حمید اللہ خان کا بھی یہی ارادہ تھا۔ اس کے لئے جگموہن مجھے موزوں آدمی نظر آیا تھا۔ وہ ابھی تک انہی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ اُس نے مجھے پہچان بھی لیا تھا اور اپنا آپ بھی مجھ پر ظاہر کر دیا تھا۔ میں نے یہ بہتر سمجھا کہ اس کے ساتھ ابھی بات کر لی جائے۔

اُس نے پوچھا تھا کہ میں نے انگریز ڈی ایس پی کو کیوں قتل کیا تھا۔ ہم جب اکٹھے بیٹھے تو اُس نے اپنے دوستوں کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ نوراللہ نے چونک کر میری طرف دیکھا کہ یہ میں نے کیا حماقت کی ہے۔ میں نے اُس کی تسلی کے لئے جگموہن کا اُس کے ساتھ تعارف کرایا اور کہا کہ اب ہم ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔

میں نے جگموہن اور اُس کے دوستوں کو تفصیل سے سنایا کہ میں نے انگریز ڈی ایس پی کو کیوں قتل کیا تھا۔ میں نے حمید اللہ خان کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ وہ کس نواب کا بیٹا ہے۔

"ان نوابوں اور مہاراجوں کو بھی ختم کرنا ہے" — جگموہن کے ایک دوست نے کہا۔ "انہوں نے اپنی رعایا کو فاقہ کش بنا رکھا ہے"۔

"سکندر بھائی!" — جگموہن نے کہا — "ہمیں تم جیسے ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ ہم اب وائسرائے کی ریل گاڑی کو تباہ کریں گے۔ وہ اِن دنوں شملہ گیا ہُوا ہے۔ ہم نے اپنے جاسوس بھیجے ہوتے ہیں۔ اگر ہمیں پتہ چل گیا کہ وہ کب اور کس وقت واپس دلی آرہا ہے تو ہم ریلوے لائن پر بم رکھ دیں گے

لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس وقت وہاں سے چلے گا۔ اُس کے لئے سپیشل ٹرین چلتی ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ اُس کی سپیشل ٹرین یا ریل موٹر آتی ہے تو وہ اس میں نہیں ہوتا۔ اُس کی بوگی عام ریل گاڑی کے ساتھ لگا دی جاتی ہے"۔

"یہ تو بعد کی باتیں ہیں" — میں نے کہا — "اس وقت میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک گروپ میں کس طرح اکٹھے ہوں۔ میں نوابزادہ حمید اللہ خان کے ساتھ بھی تمہیں ملوانا چاہتا ہوں۔ یہ ملاقات کہاں ہو سکتی ہے؟ کیا تم ہمارے پاس آؤ گے یا ہم تمہارے پاس آئیں؟"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

میں نے اُسے بتا دیا اور اُس گاؤں کا راستہ بھی سمجھا دیا جہاں ہم رہتے تھے۔

"وہی جگہ بہتر رہے گی" — جگموہن نے کہا — "ہم ایک آباد گاؤں میں اکٹھے ہُوا کرتے ہیں یا ہم اپنے شہر میں میٹنگ کیا کرتے ہیں۔ تمہارا وہاں آنا ٹھیک نہیں۔ نہ گاؤں میں نہ شہر میں۔ تمہارے پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔ کبھی ہم آجائیں گے"۔

اُن کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں۔ ہم اس بات پر متفق تھے کہ ہندوستان کو دہشت گردی اور مسلسل تخریب کاری کے ذریعے آزاد کرایا جا سکتا ہے اور اس کام کے لئے ہمیں زیادہ سے زیادہ جوانوں کو تیار کرنا ہوگا۔



"تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے؟" — جگموہن نے پوچھا۔

"گاڑی سے اُترے تھے تو سٹیشن سے باہر آکر دُودھ کے ساتھ ایک ایک بند کھایا تھا" — میں نے جواب دیا — "اب دیکھ لو کیا وقت ہو گیا ہے۔ دوپہر گزر گئی ہے"۔

"میں تمہیں گاؤں میں نہیں لے جاؤں گا" — اُس نے کہا — "ہمارے ساتھ چلو۔ دو میل تک چلنا ہوگا۔ تم دونوں کو ایک جگہ بٹھا دیں گے اور ہم گاؤں سے تمہارے لئے کھانا لے آئیں گے"۔

بھوک پریشان کر رہی تھی۔ ہم اُٹھ کر اُن کے ساتھ چل پڑے۔

"سکندر بھائی!" — جگموہن نے کہا — "تم خالی ہاتھ تو نہیں ہو گے۔ ریوالور ہے؟"

"میں تو پولیس کی حراست سے بھاگا ہوں" — میں نے جواب دیا — "پولیس کی جو ایک رائفل ہاتھ آئی تھی وہ دریا میں پھینک دی تھی۔ اب خالی ہاتھ ہوں۔"

"یہ ٹھیک نہیں" — جگ موہن نے کہا — "تمہارے پاس ہر وقت ریوالور ہونا چاہیئے.... بھائی نور اللہ کے پاس تو کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔"

"کچھ بھی نہیں" — نور اللہ نے کہا۔

"ریوالور نہ سہی خنجر تو پاس رکھا کرو" — جگموہن نے کہا۔

نور اللہ کے پاس خنجر تھا۔ میں سمجھ نہ سکا کہ اُس نے کیوں کہا ہے کہ اُس کے پاس کچھ بھی نہیں۔

ہم چلے جا رہے تھے۔ علاقہ زیادہ کٹا پھٹا ہوتا جا رہا تھا۔ ہم تنگ سے راستے پر چل رہے تھے۔ جگموہن نے کہا کہ راستے سے ہٹ آؤ۔ وہ راستے سے ہٹ کر نشیب میں اُتر گیا۔ درخت زیادہ ہوتے جا رہے تھے اور گھاس اُونچی تھی۔ نشیب گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ اور آگے گئے تو نشیب مٹی کی دو ٹیکریوں کے درمیان گلی کی صورت اختیار کر گیا اور آگے جا کر درخت جو ٹیکریوں کی ڈھلانوں پر تھے، ہمارے اُوپر جھکے ہوتے نظر آنے لگے۔ یہ ایسی اوٹ تھی جہاں ٹیکریوں کے اوپر سے بھی ہم کسی کو نظر نہیں آ سکتے۔

جگموہن میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ میرے پیچھے ہو گیا۔ باقی سب ہمارے پیچھے تھے۔ میں جگموہن کی عقل کی تعریف کر رہا تھا کہ وہ مجھے دنیا کی نظروں سے چھپا کر لیے جا رہا ہے۔ راستے سے ہٹنے کا مطلب یہی تھا۔

"رُک جاؤ" — مجھے جگموہن کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ڈبل بیرل بندوق کی نالیاں میری پیٹھ کے ساتھ لگ گئیں۔ جگموہن نے کہا — "پیچھے نہ دیکھنا سکندر ہاتھ اُوپر اُٹھا لو۔"

اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے پیچھے آوازیں سنائی دیں۔ جگموہن کے کہنے کے باوجود میں نے پیچھے دیکھا۔ جگموہن کے ساتھیوں نے نور اللہ کو اس طرح جکڑ لیا تھا کہ اُس کا ایک بازو ایک نے اور دوسرا دوسرے نے پکڑ لیا تھا۔

"سامنے دیکھ سکندر!" — جگموہن نے بندوق کی نالیاں میری کمر میں دباتے ہوئے کہا — "تُو نے میرے ساتھیوں کو عمر قید دلائی تھی۔ اب تجھے پھانسی کے تختے تک پہنچاؤں گا۔ ہمیں پیسے کی بھی ضرورت ہے۔ دس ہزار نقد وصول کر کے اپنے لیڈر کے حوالے کر دوں گا۔"

مجھے خیال آیا کہ جگموہن نے مجھ سے اور نور اللہ سے پوچھا تھا کہ تمہارے پاس ریوالور یا خنجر ہے یا نہیں۔ اسی ارادے کے پیشِ نظر اُس نے پوچھا تھا۔

اُس نے میرے سر پر لپٹی ہوئی پگڑی اُتار لی۔

"یہ لو" — اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "یہ پگڑی پھاڑ ڈالو اور اس سے اُس کے (نور اللہ کے) ہاتھ پیٹھ پیچھے اور پاؤں بھی باندھ دو۔ باقی پگڑی سے اس کے (میرے) ہاتھ پاؤں باندھیں گے.... جلدی کرو" — اُس نے مجھ سے کہا — "تجھے گولی نہیں ماروں گا سکندر! تم دونوں کو باندھ کر یہاں لٹا دیں گے۔ میرا ایک دوست بندوق لے کر تمہارے سر پر کھڑا رہے گا اور میں چوکی سے پولیس کو لے آؤں گا۔ چوکی دُور نہیں۔"

"دیکھا سکندر!" — نور اللہ نے کہا — "تم نے سانپ کے بچوں پر اعتبار کیا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ جگموہن نے مجھے پیچھے کو گھمایا۔

"اپنے ساتھی کو دیکھ لے کس طرح باندھا جاتا ہے" — جگ موہن نے مجھے کہا۔

میں نے دیکھا۔ وہ دونوں ہندو نور اللہ کو گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے دونوں ہاتھ اُوپر تھے۔ میں نے بڑی تیزی سے حرکت کی۔ وہ یہ تھی کہ بایاں بازو نیچے کیا اور پیچھے کو گھمایا۔ یہ بازو بندوق کو لگا اور بندوق میرے

جسم سے ہٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں پیچھے کو مُڑا اور اپنا دایاں بازو گھمایا۔ میرا ہاتھ بند ہو کر مُکا بن گیا تھا۔ یہ مُکا جگموہن کے مُنہ پر ذرا بائیں طرف لگا۔ وہ ہٹا کٹا جوان آدمی تھا لیکن میرے مُکے نے اُس کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ میری اس حرکت میں تین یا چار سیکنڈ لگے ہوں گے۔

ایسا زوردار اور اچانک مُکا کوئی پیشہ ور باکسر ہی سہہ سکتا ہو گا۔ جگموہن پیچھے کو گر رہا تھا۔ اِس حالت میں وہ فائر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُس کے پیٹ میں لات ماری۔ اُس کے مُنہ سے "آہ" کی آواز نکلی اور بندوق اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔

اُدھر نوراللہ کو اپنے نیفے میں اُڑسا ہوا خنجر نکالنے کا موقع مل گیا۔ خنجر دیکھ کر وہ دونوں ہندو پیچھے ہٹے۔ میں نے بندوق اُٹھالی اور کارتوسوں کی بیلٹ جو جگموہن کے کندھے سے لٹک رہی تھی، آگے بڑھ کر لے لی۔ ہم دونوں نے تینوں کو اکٹھا بٹھا دیا۔

"کیا تم نے یہ نہیں سنا تھا کہ سکندر کو کوئی پکڑ نہیں سکتا؟" ــــ میں نے ان سے کہا۔

تینوں نے ہاتھ جوڑ کر روتی ہوئی سی آوازوں میں کہا کہ انہیں جان سے نہ ماروں۔

"تم بندوق بھی لے جاؤ" ــــ ان میں سے ایک نے کہا ــــ "کارتوس بھی لے جاؤ۔"

"ہمارے پاس جتنے پیسے ہیں یہ بھی لے لو" ــــ دوسرے نے کہا ــــ "ہم واپس چلے جائیں گے۔"

"بندوق مجھے دے سکندر!" ــــ نوراللہ نے کہا ــــ "انہیں زندہ نہیں چھوڑنا۔"

"میری پگڑی سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دو نُور!" ــــ میں نے کہا۔

نوراللہ نے پگڑی کو لمبے رُخ درمیان سے پھاڑا اور باری باری تینوں کے ہاتھ پیٹھوں کے پیچھے اور پاؤں باندھ دیئے۔ پگڑی تینوں کے لئے کافی

ہو گئی تھی، پھر بھی ایک ٹکڑا بچ گیا تھا۔ میرے کہنے پر نور نے اس ٹکڑے کے تین ٹکڑے کئے اور ایک ایک ٹکڑا تینوں کے مُنہ میں ٹھونس دیا۔

"اب تینوں پر ایک ایک کارتوس چلاؤ" ــــ نوراللہ نے کہا ــــ "سر میں نہ چلانا، پیٹ میں تاکہ تڑپ تڑپ کر مریں۔"

"نہیں نور!" ــــ میں نے کہا ــــ "جان سے مارنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں زندہ رہنے دو۔ کوئی اِدھر سے گزرے گا تو انہیں کھول دے گا۔ کوئی نہ آیا تو آج کل سانپ تو نکلتے ہی رہتے ہیں۔ سانپ کو سانپ ہی مارے تو اچھا ہے ..... چلو چلیں۔"

"بندوق ساتھ رکھو گے؟" ــــ نوراللہ نے پوچھا۔

"ہاں!" ــــ میں نے جواب دیا ــــ "ساتھ لے چلتے ہیں۔"

ہم وہاں سے چل پڑے۔ ابھی ہمارا بہت سفر باقی تھا۔

ہمارا جو سفر باقی تھا وہ اُسی طرح پُورا ہُوا جس طرح ہم نے پہلے سفر کیا تھا۔ یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں اپنے چہرے کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ اتنی لمبی داڑھی میں بھی میرا چہرہ اُن لوگوں کے لئے قابلِ شناخت رہتا تھا جنہوں نے مجھے دو تین مرتبہ دیکھا ہوتا تھا۔ جگموہن نے مجھے بڑی آسانی سے پہچان لیا تھا۔ اس وجہ سے مجھے اور زیادہ احتیاط سے سفر کرنا پڑا۔ پہلے کی طرح میں اور نُور اللہ دن کے وقت آبادیوں سے دُور دُور چلتے رہے اور رات کو ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے لاری مل گئی۔ لاری نے ہمیں ہماری منزل کے قریب پہنچا دیا۔ اس علاقے میں ہمیں زیادہ احتیاط کرنی پڑی کیونکہ میں خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ ایسی نشاندہی نہ ہو چکی ہو کہ ہم لوگ یہاں کہیں رہتے ہیں

شام کے بعد ہمیں پندرہ سولہ میل دیہاتی علاقے میں پیدل چلنا پڑا۔ آدھی رات سے کچھ پہلے ہم دونوں منزل پر پہنچ گئے۔ چھوٹا سا وہ گاؤں بالکل خاموش تھا۔ سب لوگ گہری نیند سوئے ہوتے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ ہم بڑے خطرے میں رہ رہے ہیں۔ جس طرح ہم کسی کو پتہ چلے بغیر گاؤں میں آ گئے ہیں اسی طرح ہمارے دشمن بھی آ سکتے ہیں اور پولیس بھی آ سکتی ہے۔ میں نے اپنے مکان میں داخل ہونے سے پہلے نُور اللہ سے اس خطرے کا اظہار کیا۔

"اللہ مالک ہے یار!" ——— نور اللہ نے لاپرواہی سے کہا ——— "ہم کون سے نواب ہیں جن کے ساتھ باڈی گارڈ ہر وقت رہیں گے اور رات کو جب ہم آرام فرما رہے ہوں تو وہ جاگ کر پہرہ دیتے رہیں۔ ہم انہی خطروں میں رہنے والے لوگ ہیں۔ تم تو اب آتے ہو، میں تم سے بہت پہلے کا ان خطروں میں زندگی گزار رہا ہوں۔"

"گاؤں کا ایک آدمی رات کو پہرے پر ہونا چاہیئے" ——— میں نے کہا ——— "اُسے تھوڑے سے پیسے دے دیا کریں گے۔"

"ایسی غلطی نہیں کریں گے" ——— نور اللہ نے کہا ——— "اگر رات کو پولیس کا کوئی آدمی یا کوئی ہمارا دشمن آ گیا اور اُس نے اس اکیلے آدمی کی شہ رگ پر خنجر کی نوک یا کنپٹی پر ریوالور کی نالی رکھ دی تو ہمارا آدمی سارے راز اُگل کر ہمیں پکڑوا دے گا۔"

میں نے اپنے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ خواجہ صاحب نے کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی اُنہوں نے بے تابی سے مجھے گلے لگا لیا۔ کواڑ کے پیچھے سے ہمارا ایک آدمی نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ جب بھی دروازے پر دستک ہوتی تھی تو ہم دروازہ اس طرح کھولتے تھے کہ ایک آدمی دروازے کے ساتھ کھڑا ہو جاتا تھا اور دوسرا آدمی دروازہ کھولتا تھا۔ دروازہ کھلتا تھا تو دروازے کے ساتھ کھڑا ہونے والا آدمی کواڑ کے پیچھے ہو جاتا تھا۔ وہ اس کام کے لئے تیار رہتا تھا کہ اندر آنے والا کوئی غیر ہو یا خطرناک ہو تو اُسے پیچھے سے دبوچ لیا جائے۔

سب سے زیادہ بیتابی سے تو مجھے شہناز ملی۔ اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا اور بہت زور سے بھینچا۔ اُس نے بہت دیر تک مجھے اپنے ساتھ لگائے رکھا۔ حمید اللہ خان بھی مجھے اسی طرح بغلگیر ہو کر ملا۔

وہاں ایک اور آدمی بھی تھا جسے دوسرے کمرے میں سے بلایا گیا تھا۔ وہ قطب الدین تھا۔ مجھے تو یہ توقع تھی کہ قطب الدین مجھ سے ناراض ہو گا کیونکہ یہاں اُس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا گیا تھا لیکن وہ مجھے خندہ پیشانی سے ملا۔

"چچا جان!" ——— میں نے اُسے کہا ——— "مجھے بہت افسوس ہے کہ میرے دوستوں نے آپ کو بہت پریشان کیا تھا۔ مجھے نور اللہ نے ساری بات بتا دی ہے۔"

"نہیں سکندر!" ——— قطب الدین نے کہا ——— "افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ اتنی زیادہ احتیاط ضروری ہے۔ اگر یہ لوگ احتیاط نہ کرتے تو

میں تم لوگوں سے مایوس ہو جاتا ..... پہلے میرے گھر کا حال احوال سناؤ۔"

"میں آپ کے گھر میں کچھ خطرہ پیدا کر آیا ہوں۔"

میں نے اُسے پوری تفصیل سے سنایا کہ اُس کی غیر حاضری میں اُس کے گھر میں کیا واقعات پیش آتے تھے۔ اُسے یہ بھی سنایا کہ ایک آدمی نے جس کا نام شاہ مغل تھا، کیا کیا تھا اور وہ کس طرح میرے پاس آیا تھا، پھر جس طرح اُس علاقے کا تھانیدار میرے پاس آیا اور میں نے اُسے جس طرح ٹالا تھا وہ بھی سنایا۔ یہ واقعات سن کر وہ بہت پریشان ہوا۔ اُسے زیادہ ڈر تھانیدار کا تھا۔

"اتنا نہ ڈریں" ــــ میں نے اُسے کہا ــــ "میں عائشہ کو اچھی طرح سمجھا آیا تھا کہ تھانیدار پھر آئے تو اُسے کہنا کہ شاہ صاحب اچانک ہی آگئے تھے اور اچانک ہی چلے گئے۔ میں نے عائشہ کو یہ بھی کہا تھا کہ تھانیدار سے کہنا کہ شاہ صاحب کی باتیں میرے ماموں کے ساتھ ہوتی تھیں اس لئے میں شاہ صاحب کے متعلق کچھ نہیں جانتی ..... اور چچا جان! یہ بھی خیال رکھنا کہ میں نے عائشہ کو اپنی اصلیت بتا دی تھی۔"

"کیا تم نے میری بیوی کو بھی اپنی اصلیت بتائی ہے؟" ــــ قطب الدین نے پوچھا۔

"نہیں!" ــــ میں نے جواب دیا ــــ "وہ بیچاری سیدھی سادی عورت ہے۔ انہیں بتانا مناسب نہیں تھا۔ عائشہ کو بتانا ضروری تھا ..... اب آپ یہ سوچ لیں کہ یہ تھانیدار سات آٹھ روز بعد آپ کے گھر آئے گا۔ اُسے یہی بتائیں کہ شاہ صاحب اچانک آگئے تھے اور جس وقت آئے اُس وقت اُنہوں نے کوئی وظیفہ کرنا تھا اور آپ نے اُنہیں اپنے گھر بٹھا لیا تھا ..... آپ کو جلدی اپنے گاؤں چلے جانا چاہیئے۔"

"یہ تو میں سنبھال لوں گا" ــــ قطب الدین نے کہا ــــ "مجھے یہ بتائیں کہ میں نے کیا کرنا ہے اور آپ لوگ کیا کریں گے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں کچھ جوان آدمی اکٹھے کر لوں گا لیکن انہیں ٹریننگ دینا آپ کا کام ہے۔ آپ جہاں بھی جائیں گے میں اور میرے جوان آپ کے ساتھ ہوں گے۔"

"اس سلسلے میں وہاں آپ کے ساتھ کچھ باتیں ہوتی تھیں" ــــ میں نے کہا ــــ "ابھی ہم نے صرف ارادہ کیا ہے۔ ہم جلدی ہی آپ کے پاس آئیں گے یا آپ کو کوئی پیغام بھیجیں گے۔"

"قطب بھائی!" ــــ خواجہ صاحب نے کہا ــــ "اس کام کو اتنا آسان نہ سمجھنا جتنا سمجھ رہے ہو۔ احتیاط کی تو بہت ضرورت ہے۔ اگر آپ جوش اور جذبات میں آگئے یا آپ کے جوانوں نے بلکہ کسی ایک بھی جوان نے ذرا سی بھی غلطی کر ڈالی تو سب اندر ہو جاؤ گے۔"

قطب الدین کو میں نے، حمید اللہ اور خواجہ صاحب نے کئی ایک باتیں سمجھائیں اور اُسے رات کو ہی رخصت کر دیا گیا۔



"حمید بھائی!" ــــ میں نے حمید اللہ خان سے پوچھا ــــ "سب سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ الطاف کہاں ہے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ وہ مارا گیا ہے لیکن بتانے والے کو یقین نہیں تھا کہ وہ واقعی مارا گیا ہے یا پکڑا گیا تھا۔"

"یقین کے ساتھ میں بھی نہیں کہہ سکتا" ــــ حمید اللہ نے جواب دیا ــــ "اُس گاؤں سے جب ہم بھاگے تو تم سے الگ ہو کر میں اور الطاف گاؤں سے نکل آئے تھے۔ کچھ دُور تک ہم اکٹھے رہے پھر تعاقب کرنے والے قریب آگئے۔

ہم ایسے راستے پر دوڑے جا رہے تھے جس کے بائیں طرف گہری کھائیاں تھیں۔ کھائیوں کا مجھے اس طرح پتہ چلا کہ الطاف کا پاؤں پھسلا اور وہ بائیں طرف گرا۔ میں ذرا سا رُکا۔ مجھے اُس کے گرنے کی آواز سنائی دی تو اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ سیدھا اور اُونچا ٹیلہ ہے یا اُس طرف گہری کھائی ہے۔ میں رُک نہیں سکتا تھا۔ پیچھے سے کسی کی آواز آئی کہ ایک نیچے جا پڑا ہے۔ میں وہاں سے دوڑ پڑا۔ آگے کٹی پھٹی زمین تھی۔ میں اس کے اندر چلا گیا۔ بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس سے مجھے بھاگنے میں دشواری تو محسوس ہوئی لیکن میرے پیچھے آنے والے دُور رہ گئے۔ اُن کے دُور رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ الطاف گہرائی میں گر پڑا تھا اور ہمارے پیچھے آنے والے اُسے پکڑنے کے

لئے چلے گئے ہوں گے۔"

"میرا خیال ہے وہ گر کر مر گیا یا مار دیا گیا ہو گا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اگر وہ زندہ پکڑا جاتا تو ہمارے اس ٹھکانے کی نشاندہی ہو چکی ہوتی۔"

"تم نہیں جانتے سکندر!"۔۔۔ حمید اللہ نے کہا۔۔۔ "الطاف اتنا کچا نہیں۔ وہ جان دے دے گا، دھوکہ نہیں دے گا۔"

حمید اللہ خان سُنا رہا تھا کہ وہ کس طرح واپس پہنچا اور شاید وہ یہ بتا رہا تھا کہ الطاف کیسا آدمی ہے لیکن میں ہوش و حواس کی دنیا سے نکل گیا تھا۔ اتنے لمبے سفر نے جسم کو توڑ پھوڑ دیا تھا۔ اگر یہ صرف سفر ہوتا تو یہ حالت نہ ہوتی۔ جو سفر میں نے کیا تھا اُس کا زیادہ تر اثر ذہن اور اعصاب پر پڑا تھا۔ مسلسل ایک خوف طاری رہا۔ اگر کہیں ذرا سا رُکے اور آنکھ لگی تو اس طرح تھوڑی سی نیند کی کہ ایک آنکھ کھلی رکھی۔

جب آنکھ کھلی تو اگلا دن آدھا گزر گیا تھا۔ کچھ دیر بعد سب کھانے پر اکٹھے ہوئے۔ اب میں نے اُنہیں سنانا تھا کہ میں قطب الدین کے گھر تک کس طرح پہنچا تھا اور کیا کیا واقعات پیش آئے اور کیسے کیسے آدمی ملے۔

"سکندر!"۔۔۔ شہناز بے اختیار ہو کر بولی۔۔۔ "خدا کے لئے اب کہیں نہ جانا"۔۔۔ اس کے ساتھ اُس کے آنسو نکل آئے۔

یہ وہ خون بول رہا تھا جو ہم دونوں کی رگوں میں مشترک تھا۔ مجھ پر جو بیتی تھی اور میں جس انداز سے سنا رہا تھا وہ کوئی مرد ہی برداشت کر سکتا تھا۔

"بزدل نہ بنو شہناز!"۔۔۔ حمید اللہ نے اُسے کہا۔۔۔ "اور مت بھولو کہ تم کس کی بیوی اور کس کی بہن ہو۔"

میں نے جگموہن کا ذکر خاص طور پر کیا اور اپنے ان ساتھیوں کو پوری تفصیل سے سنایا کہ اس سفر کے دوران وہ مجھے دو دفعہ کس طرح ملا تھا۔ وہ پہلی بار ملا تو اُس وقت حمید اللہ اور الطاف بھی ساتھ تھے۔ اُس وقت تو میں نے جگموہن پر اپنا آپ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ میں نے انہیں اپنی دوسری ملاقات سنائی۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے جگموہن پر اپنا راز فاش

کر دیا تھا تو حمید اللہ مجھ پہ برس پڑا۔ خواجہ صاحب نے بھی مجھے کہا کہ میں نے کم عقلی کا مظاہرہ کیا ہے۔

میں نے اُنہیں بتایا کہ میں اس غلطی کی سزا پا چکا تھا لیکن اپنے آپ کو بچا لیا۔ میں نے انہیں یہ واقعہ بھی سنایا کہ جگموہن مجھے اور نور اللہ کو کس طرح کھانے کے بہانے جنگل کے ایک دُور دراز گوشے میں لے گیا تھا۔ پھر میں نے انہیں بتایا کہ میں اور نُور اللہ کس طرح اُسے اور اُس کے دونوں ساتھیوں کو باندھ کر آ گئے ہیں۔

"کیا تم نے اُسے یہ ٹھکانہ بھی بتا دیا تھا؟"۔۔۔ خواجہ صاحب نے پوچھا۔

"ہاں خواجہ صاحب!"۔۔۔ میں نے جواب دیا۔۔۔ "میں نے یہ حماقت بھی کی ہے۔"

"اور تم نے سب سے بڑی حماقت یہ کی ہے"۔۔۔ خواجہ صاحب نے کہا۔۔۔ "کہ اُن تینوں کو زندہ چھوڑ آئے ہو۔"

"جہاں ہم اُنہیں پھینک آئے ہیں وہاں سے وہ زندہ نہیں آ سکتے"۔۔۔ میں نے کہا۔

"یہ تمہارا وہم ہے"۔۔۔ حمید اللہ خان نے کہا۔۔۔ "تم نے اُن کے ہاتھ پاؤں پگڑی سے باندھے ہیں جو آسانی سے کھولے جا سکتے ہیں۔"

"مجھے ایک اور شک بھی ہے"۔۔۔ خواجہ صاحب نے کہا۔۔۔ "بلکہ میں اسے یقین کہوں گا کہ دوسری مرتبہ یہ ہندو جس کا نام تم جگموہن بتاتے ہو اسی سکیم کے تحت تمہارے راستے میں آیا تھا۔ اُس نے تمہیں کہیں دیکھا ہو گا اور اُس جگہ تمہارے سامنے آیا جہاں سے وہ تمہیں اپنے مطلب کی جگہ تک لے جا سکتا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں انتقام لینا چاہتا تھا ورنہ وہ تمہیں کئی روز پہلے گرفتار کرا چکا ہوتا۔۔۔۔ تم نے ایک ہندو پر اعتبار کیا ہی کیوں؟"

"صرف اس لئے کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے اپنے گھر کو خیر باد کہہ چکا ہے"۔۔۔ میں نے جواب دیا۔۔۔ "میں نے اپنی سروس میں جو دہشت گرد پکڑے ہیں وہ سب ہندو ہیں اور ان میں دو ایک سکھ بھی تھے۔ ہمارا مقصد بھی

یہی ہے کہ اپنے ملک کو آزاد کرایا جاتے۔"

"تم عقلمند ہو سکتے ہو سکندر!" — خواجہ صاحب نے کہا — "اور تم ہم سب سے زیادہ عقلمند ہو لیکن تم نے وہ نہیں دیکھا جو میں نے اتنی لمبی عمر میں دیکھا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ہندو اور مسلمان ایک محاذ پر اکٹھے ہو جائیں اور بھائیوں کی طرح مشترکہ جنگ لڑیں۔ ہندو انگریز کی نسبت مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ تم شاید بھول گئے ہو۔ میں نے نواب کے ہاں تمہیں بتایا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے انگریزی راج کے خلاف بغاوت کر کے آزادی کی جنگ شروع کی تھی تو تمام ہندو راجے اور مہاراجے انگریزوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں اُس کے خلاف جتنے گواہ پیش ہوتے وہ سب ہندو تھے۔"

خواجہ صاحب نے مجھے کئی اور واقعات سُنا کر یہ ثابت کیا کہ ہندو مسلمان کا خونی دشمن ہے۔

"....اور ہندو ہندوستان کو آزاد کرانے کی جو کوشش کر رہے ہیں وہ اپنے لئے کر رہے ہیں" — خواجہ صاحب نے کہا — "وہ فرنگی راج کی جگہ ہندو راج لانا چاہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں سے ڈرتے ہیں۔ ان کے سیاسی اور مذہبی پیشوا اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے حاکم مسلمان تھے اور اگر انگریز چلے گئے تو مسلمان ایک بار پھر اپنی حکومت قائم کر لیں گے، اس لئے ہندو نہیں چاہتے کہ مسلمان آزادی کی جنگ میں شریک ہوں۔"

خواجہ صاحب بزرگ تھے، میں انہیں اپنا پیر اُستاد مانتا تھا، لیکن اُن کی یہ بات ماننے کو جی نہیں چاہتا تھا حالانکہ ایک ہندو نے مجھے ڈنک مار بھی دیا تھا۔ میں نے خواجہ صاحب کی مخالفت میں کچھ بھی نہ کہا کیونکہ اُس وقت حمید اللہ، خواجہ صاحب، نُور اللہ اور ہمارا ایک اور ساتھی جو وہاں موجود تھا سب کے سب میری اس حرکت پر ناراض تھے کہ میں نے اپنے ٹھکانے کی نشاندہی کر دی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ تینوں ہندو مرے ہوئے ہی وہاں سے اُٹھاتے جائیں گے کیونکہ وہ جگہ عام راستے سے بہت دُور تھی۔ میری اس بات کی تائید نور اللہ نے کی۔ نور اللہ نے یہ بھی کہا کہ وہ بزدل ہندو ہیں۔ وہ زندہ رہ بھی

گئے تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔



رات کو جب ہم اپنا پلان بنانے کے لئے بیٹھے تو خواجہ صاحب نے پہلی بات یہ کہی کہ ہمیں یہ ٹھکانہ چھوڑ دینا چاہیئے۔ اُن کی دُور بین نگاہیں کوئی خطرہ دیکھ رہی تھیں لیکن حمید اللہ خان اُن کی مخالفت کر رہا تھا۔

"یہ میرے اپنے لوگ ہیں" — حمید اللہ خان نے کہا — "آپ ان سے نہ ڈریں۔"

"نادان بچوں کی سی باتیں نہ کرو نوابزادے!" — خواجہ صاحب نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا — "یہ معصوم اور غریب سے لوگ ہمیں ڈاکو سمجھ کر ہم سے ڈرتے ہیں اور اس ڈر کے ساتھ ساتھ انہیں ان چند ٹکوں کی ضرورت ہے جو ہم انہیں دیتے رہتے ہیں۔ ایک نہ ایک دن ان ہی میں سے کوئی لالچ میں آکر ہمیں پکڑوا دے گا.... اور یہ کبھی نہ بھولو کہ ہمارے ساتھ ایک جوان اور خوبصورت عورت بھی ہے۔ مرد ہر طرح کی ذلت اور مصیبت برداشت کر سکتا ہے لیکن وہ اپنی عورت کو خراب ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ جو کچھ کرنا ہے فوراً کرو۔ اگر تم لوگ ایک بار میدانِ عمل میں آ گئے تو پھر کوئی ڈر باقی نہیں رہے گا۔ کئی آدمی تمہیں مل جائیں گے جس طرح قطب الدین مل گیا ہے۔ میں نے باتوں باتوں میں اُسے ٹھونک بجا کر دیکھا ہے۔ وہ مخلص آدمی ہے۔"

"خواجہ صاحب!" — حمید اللہ خان نے کہا — "پیسے ختم ہو رہے ہیں۔ پانچ سات دنوں تک ہم خالی ہو جائیں گے۔ کچھ اور کرنے سے پہلے پیسوں کا بندوبست کرنا ہوگا۔"

"کیا بندوبست کرو گے؟"

"کسی کا گھر خالی کریں گے" — حمید اللہ خان نے کہا — "ایک بندوبست تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رہزنی کریں لیکن ہم کسی کے اپنے خون پسینے کی کمائی اپنی جیب میں نہیں ڈالیں گے۔ کوئی ہندو ساہوکار دیکھیں گے۔ ان ساہوکاروں نے لوگوں سے سُود وصول کر کر کے تجوریاں بھری ہوتی ہیں۔"

"ایک اسامی پر میری نظر ہے" ——— میں نے کہا ——— "شمو کا سُسر .... حمید بھائی! میں نے پہلے بھی تمہیں ایک بار بتایا تھا۔ آپ بھی سُن لیں خواجہ صاحب! شمو کو آپ نے دیکھا ہے۔ کتنی خوبصورت لڑکی ہے لیکن اس کی مجبوری یہ ہے کہ غریب کی بیٹی ہے۔ اس کا سُسر مالدار زمیندار ہے۔ اُس نے شمو کو کہیں دیکھا اور اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اُس نے شمو کے باپ کو خاصی رقم دی تو اپنے بیٹے کی بارات لے آیا۔ وہ شمو کو بیوی نہیں بہو بنانے آیا تھا۔ بہو اس لئے کہ اُس کا بیٹا پگلا ہے۔ جسمانی لحاظ سے معذور ہے اور ذہنی لحاظ سے بھی۔ اُسے کس لے اپنی بیٹی دینی تھی ....

"اس پگلے کے باپ نے شمو کے ماں باپ کو یہ دھوکہ دیا کہ ایک بڑے خوبصورت جوان کو دُلہا بنا کر لے آیا۔ شمو نے پہلی رات اپنے اصل دُلہا کو دیکھا تو سر پیٹ لیا لیکن نکاح پڑھا جا چکا تھا۔ شمو اور اس کے ماں باپ اب کر بھی کیا سکتے تھے؟ شمو کے سُسر نے اُسے خوش رکھنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اُسے بڑے قیمتی ریشمی کپڑے اور بہت سا زیور دیا اور شمو کو یہ کھلی چھٹی بھی دے دی کہ وہ جب چاہے اپنے گاؤں ماں باپ کے پاس چلی جایا کرے۔ شمو کے سُسرال کا گاؤں شمو کے گاؤں سے بارہ تیرہ میل دُور تھا۔ وہ سُسر کی گھوڑی پر آیا جایا کرتی تھی ....

"خواجہ صاحب! یہ شخص جو شمو کا سُسر ہے، ایک اور بے غیرتی پر اُترا ہُوا ہے۔ وہ شمو سے کہتا ہے کہ میرا بیٹا تو ناکارہ ہے، تم در پردہ میری بیوی بنی رہو لیکن شمو نہ مانی۔ وہ ابھی تک نہیں مانی۔"

"شمو آتی ہوتی ہے" ——— حمید اللہ نے کہا۔

"آتی ہوتی ہے؟" ——— میں نے پُرمسرت لہجے میں کہا ——— "پھر سمجھو ہمارا کام ہو گیا۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں" ——— نور اللہ نے کہا ——— "شمو کے سُسر کے پاس پیسہ بے اندازہ ہے۔"

"شمو نے مجھے بتایا ہے" ——— میں نے کہا ——— "وہ گھڑے میں رقم رکھتا

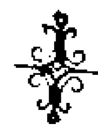
ہے، اور یہ ساری دولت اُس کی حلال کی کمائی نہیں۔ اُس کے اپنے مزارعے ہیں اور کچھ زمین بٹائی پر بھی دے رکھی ہے۔ مزارعوں کا بھی پیٹ کاٹتا ہے اور اُن کا بھی جنہیں اُس نے بٹائی پر زمین دے رکھی ہے۔ بدکار بھی ہے بدمعاش بھی ہے۔"

"اُس نے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر رکھنے کے لئے دو تین بدمعاش پالے ہُوتے ہیں" ——— نور اللہ نے کہا۔

"تم اُس کے گھر میں ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہو؟" ——— خواجہ صاحب نے پوچھا۔

"ہاں خواجہ صاحب!" ——— میں نے کہا ——— "حمید اللہ خان کے ساتھ کئی دن پہلے بات ہو چکی ہے اور اُن ہی دنوں شمو کے ساتھ بھی میں نے بات کی تھی۔ وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ رقم والے گھڑے تک وہ ہمیں پہنچا دے گی لیکن شمو کی ایک شرط ہے۔ وہ کہتی تھی کہ اُس کے خاوند اور سُسر کو بھی قتل کر دیا جائے۔ وہ بیوہ ہونا چاہتی ہے تاکہ کسی اور کے ساتھ شادی کر سکے۔ میں نے اُسے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم کسی کو قتل نہیں کرنا چاہتے۔ وہ گھر بھیدی بننے کو تیار ہے۔"

"صبح اُس سے بات کرو" ——— حمید اللہ خان نے کہا۔



میں نے صبح شمو کو بلایا اور الگ بٹھا لیا۔ اُس سے پوچھا کہ اُس کے سُسر کا رویہ کچھ بدلا ہے یا نہیں۔

"وہ تو مجھے دھمکیاں دے رہا ہے" ——— اُس نے جواب دیا ——— "کہتا ہے کہ میری بات پر نہیں آؤ گی تو تمہیں اغوا کرا دوں گا اور اغوا کرنے والے کسی شہر میں لے جا کر کوٹھے پر بٹھا دیں گے .... میں نے اُسے کہہ دیا ہے کہ جان سے مار دو، اغوا کرا دو، جو جی میں آئے کرو، سُسر باپ ہوتا ہے اور باپ کی بیوی نہیں بنوں گی۔"

میں نے اُسے بتایا کہ ہم اُس کے سُسر کو کیا سزا دینا چاہتے ہیں۔

"لیکن تمہاری مدد کے بغیر یہ کام مشکل ہو گا" ——— میں نے کہا ——— "پہلی

بات یہ بتاؤ کہ وہ گھڑا کہاں ہے جس میں وہ مال دولت رکھتا ہے۔"

"سب کچھ بتاؤں گی" — اُس نے کہا — "تم اُس کا سب مال دولت لُوٹ لو۔ اُس کے گھر کو آگ لگا دو لیکن اُسے اور اُس کے بیٹے کو قتل ضرور کرنا۔ مجھے بیوہ کر کے آنا۔"

"کر دیں گے" — میں نے کہا — "تم بتاؤ کہ مال کہاں ہے۔"

اُس نے بتا دیا اور گھر کے اندر کا نقشہ سمجھا دیا۔ گرمیوں کا موسم تھا اس لئے لوگ صحن میں سوتے تھے۔ شمّو اور اُس کا خاوند برآمدے میں اور اُس کا سُسر صحن میں سوتا تھا۔ یہ پکّا مکان تھا۔ گھڑا ایک کمرے میں رکھا تھا اور اس کمرے میں بیکار چیزیں اور کباڑ رکھا ہُوا تھا۔ کسی ناواقف آدمی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوتا تھا کہ اس گُوڑے کباڑ میں کہیں خزانہ پڑا ہُوا ہے۔

شمّو کا سُسر اپنے آپ کو پورے گاؤں کا مالک اور نواب سمجھتا تھا۔

شمّو نے بتایا کہ جب کبھی چوری ڈاکے کی بات ہوتی ہے یا کہیں واردات ہوتی ہے تو یہ شخص یہ ضرور کہتا ہے کہ میرے گھر میں کوئی ڈاکو داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

"ڈیوڑھی میں کوئی نوکر تو سوتا ہو گا" — میں نے کہا۔

"نہیں" — شمّو نے جواب دیا — "یہی تو میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ وہ کسی آدمی کو ڈیوڑھی میں نہیں رکھتا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ اُس کے گھر میں کوئی چوری یا ڈکیتی کی نیت سے نہیں آ سکتا۔ رکھوالی کے لئے ایک کُتّا ہے جو رات کو گھر سے باہر ہوتا ہے۔ وہ جس اجنبی کو دیکھتا ہے اُس پر بھونکتا ہے۔ خونخوار کُتّا ہے۔"

"اُس کے پاس شاید شکاری بندوق بھی ہے" — میں نے کہا۔

"وہ شکار کا شوقین ہے" — شمّو نے کہا — "لیکن بندوق رات کو اپنے پاس نہیں رکھتا۔ بندوق بڑے کمرے میں دیوار کے ساتھ لٹکتی رہتی ہے۔"

اس طرح میں نے اُس سے مکان کا تمام نقشہ معلوم کر لیا۔ مکان ایسا

تھا کہ اس میں نقب لگائے بغیر داخل نہیں ہُوا جا سکتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ شمّو اندر سے دروازہ کھول دے۔ میں نے اُسے بتایا تو اُس نے کہا کہ اُسے اشارہ مل گیا تو وہ دروازہ کھول دے گی۔

"اگر میرے سُسر کو قتل نہ کر سکو تو میرے خاوند کو ضرور قتل کر دینا" — اُس نے کہا۔

اُس کے ساتھ بات پکّی کر کے میں نے حمیداللہ خان کے ساتھ بات کی۔ اُس نے کہا کہ یہ واردات اُس کے پیشہ ور آدمی کریں گے۔

"اور انہیں حصّہ بھی دینا پڑے گا" — میں نے کہا — "گھر بھیدی موجود ہے۔ واردات ہمیں خود کرنی چاہیئے۔"

"یہ ہمارے ساتھی ہیں سکندر!" — حمیداللہ خان نے کہا — "ان کا پیشہ ہی یہی ہے۔ واردات ہم خود کریں تو بھی انہیں کچھ تو دیں گے ہی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شمّو کچّی عورت ہے۔ پہلے ہماری نشاندہی کر چکی ہے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ سکھ آیا اور ہماری باتیں اُس پر اثر کر گئیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم پکڑے جائیں، پھر اپنا اور میرا انجام جانتے ہو کیا ہو گا۔ اگر ہمارے ساتھی پکڑے گئے تو انہیں صرف ڈکیتی کی سزا ملے گی۔"

حمیداللہ خان ٹھیک کہتا تھا۔ اُس نے اُسی روز یہ انتظام کیا کہ نوراللہ کو کسی گاؤں ایک اور آدمی کو ساتھ لانے کے لئے بھیج دیا۔ وہ شام کے بعد آ گیا۔ واردات تین آدمیوں نے کرنی تھی۔ نوراللہ کے ساتھ اسی گاؤں کا ایک آدمی تھا جس میں ہم رہتے تھے اور تیسرا آدمی وہ تھا جسے نوراللہ ساتھ لایا تھا۔

اگلی صبح شمّو کو بلا کر کہا کہ وہ آج ہی اپنے سُسرال چلی جائے اور رات کو جاگتی رہے۔ اُسے قریب سے ہی ایک گیدڑ کے بولنے کی آواز آئے گی۔ وہ اُٹھ کر ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے کھول دے۔

"کوئی آواز نہ نکالنا" — شمّو نے کہا — "میرا سُسر اور خاوند سو جائیں گے تو میں اندر سے دروازے کی زنجیر اُتار دوں گی۔ تم خاموشی سے آنا۔"

تمہیں دروازہ کھلا ملے گا لیکن کُتّے کا کیا کرو گے؟ میں یہ تو نہیں کر سکوں گی کہ میرا سُسر اُسے باہر چھوڑ دے اور میں اُسے اندر باندھ دوں۔"

"اس کا بندوبست ہو جائے گا" — میں نے کہا — "تم وہاں چلی جاؤ۔"

ہم نے شمّو کو گھوڑی پر سوار ہو کر جاتے دیکھا۔ گاؤں کا ایک غریب سا آدمی اُس کے ساتھ جا رہا تھا۔ ہمیشہ وہی آدمی اُس کے ساتھ جایا کرتا تھا۔

نوراللہ پیشہ ور ڈکیت تھا۔ اُس نے کُتّے کا بندوبست یہ کیا کہ اپنے ایک ساتھی کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ دیہاتی علاقے میں مویشی تو مرتے ہی رہتے تھے جنہیں باہر پھینک دیا جاتا تھا۔ نوراللہ ایسے ہی کسی مُردار کی تلاش میں گیا تھا اور جگموہن کی بندوق اور کارتوس بھی ساتھ لے گیا تھا۔

وہ تین چار گھنٹوں بعد واپس آئے۔ اُن کے پاس بیل کا ایک سینگ تھا اور بندوق سے ماری ہوئی ایک فاختہ تھی۔ ان دونوں نے فاختہ کے پَر اُتار کر اس کے ٹکڑے کئے اور انہیں سینگ میں ڈال کر اچھی طرح دبا دیا کہ گر نہ پڑیں۔ یہ رکھوالی والے کُتّے کے لئے انتظام کیا گیا تھا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے تینوں روانہ ہوئے۔ میں اور حمیداللہ بھی اُن کے ساتھ گئے۔ ہم دونوں نے گاؤں سے تھوڑی دُور رُک کر اُن کا انتظار کرنا تھا۔ حمیداللہ خان کے پاس ریوالور اور میرے پاس دونالی بندوق تھی۔ خطرے کی صورت میں ہم نے اپنے اِن ساتھیوں کی مدد کو پہنچنا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ گاؤں والے ان کے تعاقب میں آئے اور ہماری طرف سے صرف ایک گولی فائر ہوئی تو تعاقب میں آنے والے بھاگ جائیں گے۔

نوراللہ اور اس کے ساتھیوں کو ہم نے مکان کے محلِ وقوع اور اندر کا نقشہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ ان تینوں کے پاس دو لمبے چاقو اور ایک خنجر تھا اور دو کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔ انہوں نے صرف رقم لانی تھی اور بندوق بمع کارتوس۔ زیورات کو ہاتھ نہیں لگانا تھا کیونکہ سُسر نے تمام زیور شمّو کو دے دیا تھا۔

انہوں نے یہ واردات جس طرح کی وہ ہمیں انہوں نے واپس آکر بتایا تھا۔

یہ میں تمہیں سُنا دیتا ہوں۔ مکان تلاش کرنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اس گاؤں میں دو پکے مکان تھے۔ دوسرا مکان چھوٹا تھا۔ بڑا پکّا مکان شمّو کے سُسر کا تھا۔ اُس کے دروازے میں کُتا بیٹھا ہُوا تھا۔ یہ تینوں ابھی کچھ دُور تھے کہ کُتّے نے آہستہ آہستہ غرّانا شروع کر دیا۔

نوراللہ وہ سینگ آگے کر کے کُتّے کی طرف آہستہ آہستہ گیا۔ اُس نے بتایا کہ کُتّا واقعی خونخوار تھا۔ سینگ کے اندر فاختہ کے گوشت کی بُو پر کُتّا قریب آگیا اور سینگ کو سُونگھنے لگا۔ نوراللہ ایک طرف چل پڑا۔ کُتّا اُس کے ساتھ گیا۔ ذرا پرے جا کر نوراللہ نے سینگ پندرہ بیس قدم دُور پھینک دیا۔ کُتّا دوڑا گیا اور سینگ میں سے گوشت نکالنے میں مصروف ہو گیا۔

واپس آکر نوراللہ نے آہستہ سے دروازے پر ہاتھ رکھا تو یہ اندر سے کھلا ہُوا تھا۔ تینوں اندر چلے گئے۔ شمّو کا سُسر صحن میں سویا ہُوا تھا اُسے جگایا گیا۔ چاندنی اتنی سی تھی کہ نظر ٹھیک کام کرتی تھی۔

"کون ہو اوئے؟" — شمّو کے سُسر نے بڑے رُعب سے کہا۔

"ہونٹ سی لو" — نوراللہ نے اُسے کہا — "اُٹھو اور برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔ اگر مرنا چاہتے ہو تو مُنہ سے آواز نکالو۔"

دوسرے دونوں آدمیوں نے شمّو اور اُس کے خاوند کو جگایا۔ شمّو تو پہلے ہی جاگ رہی تھی۔ شمّو سے کہا گیا کہ لالٹین جلائے۔ وہ لالٹین جلا کر لے آئی۔ شمّو کا خاوند بالکل پاگل تو نہیں تھا۔ اُس کے دماغ میں ذرا سا نقص تھا اور اُس کی ایک ٹانگ کچھی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ بھی ٹیڑھا تھا۔ اُس نے نُوراللہ اور اُس کے ساتھیوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ ہمارے ساتھی اُسے پکڑ کر اُس کمرے میں لے گئے جس میں روپوں والا گھڑا رکھا تھا۔ ایک آدمی شمّو کے سُسر کے سر پر کھڑا رہا۔ شمّو کو اندر لے گئے۔

ہمارے ساتھیوں کو گھڑا مل گیا۔ اُس زمانے میں سکّے زیادہ چلتے تھے۔ گھڑے میں نوٹ بھی تھے اور سکّے بھی۔ ان آدمیوں نے یہ سب ایک چادر میں ڈال کر باندھ لئے پھر دوسرے کمرے میں آکر بندوق دیوار سے اتاری۔ کارتوسوں

کی بیلٹ بھی وہیں لٹک رہی تھی۔ یہ بھی اُتاری اور باہر نکل آئے۔ خونخوار کُتا گھر سے دُور سینگ میں سے فاختہ کا گوشت نکالنے میں مصروف تھا۔

وہ گاؤں سے ابھی نہیں نکلے تھے کہ شمّو کے سُسر نے باہر آکر شور شرابہ کیا۔ ہمارے ساتھیوں کے پاس اتنا وزن نہیں تھا کہ وہ بھاگ نہ سکتے۔ اُنہوں نے تو صرف رقم اُٹھا رکھی تھی۔ وہ تینوں دوڑ پڑے۔ شمّو کے سُسر کا شور اور اُس کی للکار اتنی بلند تھی کہ گاؤں کے لوگ جاگ اُٹھے اور شور بڑھنے لگا۔ یہ تو سُسر نے دیکھ لیا تھا کہ ڈاکو کس طرف سے گاؤں سے نکلے ہیں۔ وہ اور گاؤں کے کچھ لوگ اُسی طرف سے گاؤں سے باہر ان کے پیچھے آئے۔ ہمارے ساتھی اتنا آگے نکل آئے تھے کہ اُن تک گاؤں والوں کو پہنچنا اتنا آسان نہیں تھا۔

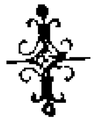
نور اللہ نے یہ عقل مندی کی کہ شمّو کے سُسر کی جو بندوق وہ اُٹھا لایا تھا اس میں دو کارتوس بھرے اور رُک کر پیچھے کی طرف دونوں کارتوس فائر کر دیئے۔ میں اور حمید اللہ خان اُن سے زیادہ دُور نہیں تھے۔ ہم اُن کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم یہ سمجھے کہ ہمارے ساتھی گھیرے میں آگئے ہیں۔ ہم دونوں آگے گئے۔ میں نے اپنی بندوق میں دو کارتوس ڈالے ہوتے تھے اور حمید اللہ خان کے ریوالور میں بھی گولیاں پڑی ہوتی تھیں۔ ہم دونوں نے ہوا میں فائر کئے۔ اتنے میں ہمارے ساتھی ہمارے پاس پہنچ گئے۔

"فکر نہ کرو" ــــ نور اللہ نے کہا ــــ "گاؤں کے لوگ میرے فائر پر رُک گئے تھے، پھر وہ آگے نہیں آئے۔ تمہارے فائر سے تو وہ واپس اپنے گھروں کو بھاگ گئے ہوں گے۔"

اُس زمانے میں ریوالور اور بندوق کسی کسی کے پاس ہوتی تھی اور جن کے پاس یہ ہتھیار ہوتے تھے وہ انہیں نمائش کے طور پر رکھتے تھے۔ اس گاؤں میں شمّو کا سُسر ہی ہو گا جس کے پاس شکاری بندوق تھی۔ گاؤں کے لوگ اُن ڈاکوؤں سے بہت ڈرتے تھے جن کے پاس بندوقیں یا ریوالور ہوتے تھے۔

ہم وہاں سے چل پڑے۔ ہمارے ساتھیوں نے ہمیں یہ تفصیل سنائی جو میں

نے پہلے ہی سُنا دی ہے۔ ہم راستہ بدل کر اپنے گاؤں پہنچے۔



ہم جس مکان میں رہتے تھے اُس کا دروازہ بند ہونا چاہیئے تھا لیکن دُور سے ہی ہم نے دیکھ لیا کہ دروازہ کُھلا ہُوا تھا۔ میں یہ سمجھا کہ خواجہ صاحب ہمارے لئے پریشان ہو کر باہر نکل گئے ہوں گے۔ یہ خیال بھی آیا کہ شہناز ہمارے انتظار میں ہمارے لئے پریشان ہو گئی ہو گی اور ہمیں دیکھنے کے لئے اُس طرف نکل گئی ہو گی جدھر ہم گئے تھے۔ مجھے کچھ غصّہ آ گیا۔ رات کو ہم دروازہ اس طرح کُھلا نہیں چھوڑا کرتے تھے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ دروازے پر جب دستک ہوتی تھی تو ہم کس طرح دروازہ کھولا کرتے تھے۔

ہم اپنے مکان میں داخل ہُوئے۔ دیا جل رہا تھا۔ ہم اُس کمرے میں گئے تو ایسا منظر دیکھا کہ مجھ جیسے سخت جان آدمی کو بھی چکر آ گیا۔ خواجہ صاحب، شہناز اور گاؤں کا وہ آدمی جسے ہم ان کے پاس چھوڑ گئے تھے خون میں لت پت پڑے تھے اور تینوں مرے ہُوئے تھے۔ خواجہ صاحب کی لاش چارپائی پر تھی، شہناز کی لاش دوسری چارپائی پر اس طرح پڑی تھی کہ اُس کا اُوپر والا دھڑ چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا اور گاؤں کے آدمی کی لاش دونوں چارپائیوں کے درمیان پڑی تھی۔

ہم نے تینوں لاشوں کو اچھی طرح دیکھا۔ تینوں کو خنجروں یا چاقوؤں سے مارا گیا تھا۔ خواجہ صاحب کے سینے میں دو چاقو لگے تھے اور اُن کا پیٹ بھی چاک تھا۔ شہناز کا بھی پیٹ چِیرا ہُوا تھا اور اُس کی شہ رگ کٹی ہوتی تھی۔ تیسری لاش پر بھی ایسے ہی زخم تھے اور اُس کا بھی پیٹ چاک کیا ہُوا تھا۔

مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ کمرہ لٹّو کی طرح بہت تیز گھوم رہا ہو۔ حمید اللہ کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ ہم دونوں چُپ چاپ کھڑے لاشوں کو دیکھنے لگے۔ دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ زبانیں بند ہو گئی تھیں اور جسم اِس طرح سُن ہو گئے تھے جیسے رگوں میں خون جم گیا ہو۔

"میرے نواب بھائی نے اپنی بے عزّتی کا انتقام لیا ہے" ــــــ

حمیداللہ خان نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا —— "اُسے اب کسی نے بتایا ہو گا کہ ہم لوگ یہاں رہتے ہیں۔"

"اور کون ہو سکتا ہے!" —— میں نے کہا —— "یہ اُسی کی انتقامی کارروائی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو وہ شہناز کو قتل نہ کرتا۔ ایسی خوبصورت عورت کو کون قتل کرتا ہے۔ ڈاکو یا رہزن ہوتے تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتے .... وہ ہمیں قتل کرنے آتے ہوں گے۔"

"نواب کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا" —— حمیداللہ خان نے کہا —— "اُس بدبخت نے یہ نہیں سوچا کہ میں اُس سے کتنا خوفناک انتقام لوں گا۔"

جس چارپائی پر خواجہ صاحب کی لاش پڑی تھی اُس کے تکیے کے نیچے سے ایک کاغذ کا کونہ مجھے نظر آیا۔ وہاں کاغذوں کا کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے ویسے ہی کاغذ کا کونہ پکڑ کر کاغذ تکیے کے نیچے سے نکالا اور دیکھا۔ اس پر لکھا تھا:

"سکندر۔ تم خوش قسمت ہو کہ یہاں نہیں تھے۔ ہم تمہارے لئے آئے تھے۔ یہ تمہاری بدبختی ہے کہ تم مجھے اور میرے دو ساتھیوں کو باندھ کر جنگل میں پھینک آئے تھے لیکن تم نے ہمیں زندہ رہنے دیا۔ تمہارے لئے بہتر یہ تھا کہ ہمیں جان سے مار آتے۔ جس روز تم نے مجھے میرے گروہ کے ساتھ گرفتار کرایا تھا، میں نے اُسی روز عہد کر لیا تھا کہ انتقام لوں گا۔ تمہاری پولیس نے مجھے بہت مارا پیٹا تھا۔ پھر تمہاری بدنصیبی یہ ہوئی کہ میں ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے بری ہو گیا۔ اب تم مفرور ہو۔ میں تمہیں گرفتار نہیں کراؤں گا، خود انتقام لوں گا۔ میری رگوں میں راجپوت باپ کا خون ہے۔ میں ہندوؤں کی اُس نسل میں سے نہیں جو دن رات پیسے ہی گنتے رہتے ہیں۔ یہاں آیا تو میں نے یہ نہیں سوچا کہ تم کتنے آدمی ہو گے۔ میں تمہیں قتل کرنے آیا تھا۔ اس بوڑھے آدمی نے کہا کہ سکندر میرا بیٹا ہے اور اس خوبصورت عورت نے کہا کہ سکندر میرا بھائی ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور ان دونوں کو ختم کر دیا۔ یہ تیسرا آدمی انہیں بچانے کے لئے آگے آیا تو ہم نے اسے بھی ختم کر دیا۔ یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم نے مجھے اپنا ٹھکانہ بتا دیا تھا۔ میں نے تمہیں اپنا ٹھکانہ نہیں بتایا تھا۔ اگر تم دہشت گرد

بننا چاہتے ہو تو اپنا ٹھکانہ اپنے باپ کو بھی نہ بتاؤ۔ یہ نہ سمجھنا کہ میرا انتقام پورا ہو گیا ہے۔ میں نے ابھی تمہیں قتل کرنا ہے۔ میں اسی علاقے میں رہوں گا اور تمہیں للکار کر قتل کروں گا۔ دُور سے گولی نہیں ماروں گا۔ مرنے کے لئے تیار رہو — جگموہن۔"

میں نے یہ کاغذ حمیداللہ خان کے ہاتھ میں دے دیا۔ میری حالت یہ ہو گئی کہ خون جو رگوں میں جم گیا تھا وہ کھولنے لگا۔ میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ بے چینی اتنی زیادہ ہو گئی کہ اپنے ہاتھوں پر اپنے گھونسے مارنے لگا اور پھر میں صحن میں جا کر بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر چلنے لگا۔ میں نے جگموہن کی دلیری کا اعتراف کیا۔ ایک تو وہ یہ سوچے بغیر آیا تھا کہ میرے ساتھ یہاں کتنے آدمی ہوں گے اور وہ خود بھی مارا جا سکتا ہے۔ اُس کی دلیری کا دوسرا ثبوت یہ تھا کہ اُس نے تین انسانوں کو قتل کر کے بڑے اطمینان سے اتنی لمبی تحریر لکھی تھی۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خوف اور خطرے کے نام سے ہی ناواقف ہوتے ہیں۔ جگموہن انہی لوگوں میں سے تھا۔ یہ بھی اُس کی دلیری اور مردانگی کا ثبوت تھا کہ وہ مجھے گرفتار نہیں کروا رہا تھا اور وہ مجھے للکار کر مارنا چاہتا تھا۔

حمیداللہ خان باہر آ کر مجھے بُرا بھلا کہنے لگا۔ اُس نے اور خواجہ صاحب نے پہلے ہی مجھے کہا تھا کہ میں نے اس ہندو کو اپنا ٹھکانہ بتا کر اچھا نہیں کیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

"انہیں تم نے مروایا ہے" —— حمیداللہ خان نے کہا۔

"حمیداللہ!" —— میں نے اُسے کہا —— "بہتر ہے کہ اپنی زبان بند کر لو۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا ہُوا ہے۔ اگر میرا ساتھ دینا چاہو تو یہ سوچو کہ اس خبیث ہندو سے کس طرح انتقام لیا جائے۔"

"وہ تو لینا ہی ہے" —— حمیداللہ خان نے کہا —— "میں تمہارا ساتھ کیوں نہیں دوں گا! اس شخص نے میری پہلی اور آخری محبت کا خون کر دیا ہے۔ اطمینان سے سوچو۔ پاگل بن کر کوئی کام سیدھا نہیں ہوتا۔ پہلا کام یہ کرنا ہے کہ صبح سے پہلے پہلے لاشوں کو دفن کرنا ہے۔"

نوراللہ اور اُس کے دونوں ساتھی الگ چُپ چاپ کھڑے تھے۔ اُنہوں نے کوئی رائے نہیں دی نہ کوئی مشورہ دیا۔ اتنا پتہ چلتا تھا کہ وہ اس حادثے سے لاتعلق نہیں اور وہ بھی غصّے میں ہیں۔

چھوٹے سے اس گاؤں پر گہری نیند کا غلبہ تھا۔ ابھی کسی کو پتہ نہیں چلا تھا کہ گاؤں میں کیا قیامت گزر گئی ہے۔ ابھی میری آنکھوں میں آنسو نہیں آتے تھے۔ سارے جسم کے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ میں صحن میں ہی بیٹھ گیا جیسے شکست کھا کر ہتھیار ڈال بیٹھا ہوں۔ میرے دل میں شہناز کی محبت تو تھی لیکن وہ مر گئی تو مجھے پتہ چلا کہ مجھے اُس سے بہت ہی زیادہ محبت تھی اور میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ اپنی گزری ہوئی ساری زندگی میری نظروں کے سامنے گھوم گئی۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ اپنے آپ کو ختم کر لوں لیکن مردانگی کے جوش نے مجھے زندہ رہنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر جذبات غالب آتے گئے۔

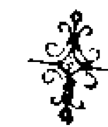
کیا شہناز کا یہی انجام ہونا تھا!

کیا خواجہ صاحب جیسے عظیم موسیقار کو یہیں آکر گمنامی میں مرنا تھا!

میرا انجام کیا ہوگا؟ میری منزل کہاں ہے؟ کیا میں بھی ایسی ہی موت مر جاؤں گا؟ —— یہ اور ایسے ہی کچھ اور سوال میرے ذہن میں آکر مجھے ڈسنے لگے۔ ہمت ٹوٹتی گئی اور ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دوں گا۔

"سکندر!" —— حمیداللہ خان کی آواز نے مجھے جذبات سے نکال دیا اور کہا —— "اُٹھو۔ گاؤں والوں کو جگانا ہے اور قبریں کھودنی ہیں ..... تین قبریں کھودنے میں بہت وقت لگے گا۔ ایک ہی گڑھا کھود کر اسے اتنا چوڑا کریں گے کہ تینوں لاشیں اس میں سما جائیں۔"

میں کچھ کہے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔



نوراللہ گاؤں کے آدمیوں کو جگا لایا۔ حمیداللہ اُنہیں گالی گلوچ کرنے لگا کہ اُنہوں نے ان کے گھر کا خیال نہیں رکھا۔ میں نے اُسے روک دیا۔ ہمیں ان

لوگوں سے اتنی زیادہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے تھی کہ وہ ساری رات جاگ کر ہمارے گھر کی رکھوالی کرتے رہتے۔ یہ ہماری غلطی بھی تھی کہ ہم انہیں بتا کر نہیں گئے تھے۔ دراصل یہ ہماری غلطی بھی نہیں تھی۔ ہم نے مصلحت کی بنا پر انہیں نہیں بتایا تھا۔

اب ہم نے انہیں یہ کہا کہ وہ تینوں لاشوں کے لئے ایک چوڑا اور گہرا گڑھا کھود دیں۔ ہمارے پاس لاشوں کو نہلانے کا اور کفنوں کا انتظام کرنے کا وقت نہیں تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ شمّو کے سُسرال کے گاؤں کے آدمی یہاں تک نہ پہنچ جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اُنہوں نے ہمیں ادھر آتے دیکھا ہو اور پولیس کو ہمارے پیچھے بھیج دیں۔ پولیس کے آنے کا خطرہ بھی تھا۔ صبح تک ہمیں یہ ٹھکانہ چھوڑ دینا تھا۔ کچھ دن ہمیں محتاط ہو کر اور چھُپ چھُپ کر رہنا تھا۔

گاؤں کے آدمی قبر کھودنے کے لئے چلے گئے اور میں اور حمیداللہ خان اندر گئے۔ شہناز کی لاش اُٹھا کر چارپائی پر ڈالی خواجہ صاحب کی لاش بھی چارپائی پر ڈالی پھر تیسرے مقتول کی لاش بھی چارپائی پر ڈالی اور یہ دیکھنے کے لئے قبرستان کی طرف چلے گئے کہ قبر کتنی کچھ کھدی ہے۔

وہ دیہاتی لوگ تھے۔ کھدائی کا کام بڑی تیزی سے کرتے تھے ہمارے جانے تک وہ تقریباً ایک گز گہری کھدائی کر چکے تھے۔ انہوں نے لمبائی خواجہ صاحب کے لمبے قد کے مطابق رکھی تھی اور چوڑائی بھی اتنی رکھی تھی جس میں تین لاشیں پہلو بہ پہلو سما سکتی تھیں۔ کچھ وقت اور لگا تو گڑھا تقریباً ڈیڑھ گز گہرا ہو گیا۔ ہم نے ان آدمیوں کو ساتھ لیا اور لاشوں کی چارپائیاں اُٹھا لائے۔

"لاشیں قبر میں رکھ دو" —— حمیداللہ نے کہا اور میری طرف دیکھا۔

"ہاں" —— میں نے کہا —— "دیر نہ کرو"

"ٹھہرو بھائیو!" —— گاؤں کے ایک بوڑھے آدمی نے کہا —— "کیا یہ مسلمان نہیں تھے؟ ..... غسل نہیں دیا، کفن نہیں پہنایا، جنازہ تو پڑھ لو"

"جنازہ کون پڑھائے گا؟" —— میں نے پوچھا۔

"میں پڑھاؤں گا" —— اُس بوڑھے آدمی نے کہا۔

ہم کُل بارہ چودہ آدمی تھے۔ اس بوڑھے آدمی کے پیچھے کھڑے ہو گئے

اور جنازہ پڑھا گیا۔ اس کے بعد ہم نے لاشیں اس مشترکہ قبر میں اس طرح رکھیں کہ درمیان میں خواجہ صاحب کی لاش تھی، ایک پہلو میں شہناز کی اور دوسرے پہلو میں تیسرے مقتول کی لاش رکھی پھر گاؤں والوں کو اشارہ کیا کہ مٹی ڈال دیں۔

تھوڑی دیر میں تینوں لاشیں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئیں اور ان پر مٹی کی بہت بڑی ڈھیری بن گئی۔

"قبر نہیں بنانی" ـــ میں نے کہا ـــ "مٹی کو اچھی طرح دبا دو اور جو بچ جاتے وہ اِدھر اُدھر بکھیر دو۔ قبر کا نشان نہ رہے۔"

ہم واپس آ گئے۔ میرے ذہن میں یہی ایک ارادہ تڑپ رہا تھا کہ جگموہن سے انتقام لینا ہے۔

"سکندر!" ـــ حمید اللہ نے کہا ـــ "دُکھ بہت ہے۔ میں اس چوٹ کو ہضم نہیں کر سکتا۔ انتقام لیں گے اور ضرور لیں گے لیکن مجھے یہ اطمینان ضرور ہُوا ہے کہ خواجہ صاحب اور شہناز ہمارے پاؤں کے ساتھ بندھا ہُوا ایسا بوجھ تھا کہ ہم کُھل کر چل بھی نہیں سکتے تھے۔ اب ہمیں کُھل کر چلنے کی آزادی مل گئی ہے۔"

میرا ذہن ابھی یہ سوچنے کے قابل نہیں تھا کہ جو حادثہ ہُوا ہے اس کا کوئی اچھا پہلو بھی ہے یا نہیں۔ میں تو جل رہا تھا۔ سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ یہ ٹھکانہ چھوڑنا تھا۔ جگموہن نے لکھا تو تھا کہ وہ مجھے گرفتار نہیں کرائے گا لیکن دشمن کا کچھ بھروسہ نہیں ہوتا کہ وہ کون سی چال چل جائے۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ بھی تھا کہ ہم نے ڈاکہ زنی کی تھی اور شمّو اُس گھر میں تھی جس گھر میں واردات ہوئی تھی۔ شمّو پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا وہ کچی عورت تھی۔

واپس آ کر ہم نے اس کمرے کو اس طرح صاف کروایا کہ خون کا کوئی نشان نہ رہنے دیا۔ پھر گاؤں والوں سے کہا کہ وہ اس مکان میں اپنے مویشی اور بھیڑ بکریاں چھوڑ دیں تاکہ صبح تک پتہ ہی نہ چلے کہ یہاں کوئی رہتا رہا ہے۔ ہم نے اب اس ٹھکانے کو چھوڑ دینا تھا لیکن ابھی دُور نہیں جانا تھا۔

ہمارے پاس قریب ہی ایک ٹھکانہ تھا۔ اس سے پہلے ہم کچھ دن اُس ٹھکانے میں گزار آئے تھے۔ گاؤں کے قریب ہی سے پتھریلی اور مٹی کی ڈھیریاں شروع ہو

جاتی تھیں جو ایک پہاڑی سلسلے کے ساتھ جا ملتی تھیں۔ ان پہاڑیوں کے اندر، اوپر اور نیچے ہر طرف گھنے درخت تھے، اُونچی گھاس تھی اور سرکنڈوں کا جنگل بھی تھا۔ ایک جگہ بارشوں کا پانی بھی جمع تھا۔ پہاڑیوں کے اندر قدرتی طور پر غار سے بنے ہوتے تھے جن میں چھوٹی غاریں بھی تھیں اور دو تین خاصی بڑی غاریں تھیں۔ یہ تھوڑا سا علاقہ ایسا تھا جیسے اس میں سے گزرنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ صرف تنگ سا ایک راستہ تھا جو پہاڑیوں کے اندر پہنچا دیتا تھا۔



صبح ہوتے ہی میں، حمید اللہ خان، نُور اللہ اور اُس کے دونوں ساتھی اپنا مختصر سا سامان اور بستر اُٹھا کر پہاڑیوں کے اندر چلے گئے۔ نُور اللہ اور اُس کے دونوں ساتھی ہماری طرح بھڑکے اور بپھرے ہوتے تھے۔ وہ اپنی اپنی عقل کے مطابق مشورے دے رہے تھے۔

رات کی واردات کی ساری رقم ابھی ہمارے پاس تھی۔ حمید اللہ نے غار میں پہنچتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ نُور اللہ اور اُس کے دونوں ساتھیوں کو اُن کے حصّے کی رقم دے دی۔ نور اللہ اور اُس کے ایک ساتھی نے جو ہمارے ساتھ رہتا تھا اپنے حصّے کی رقم واپس کر دی۔ وہ کہتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں اس لیے وہ اتنی رقم اپنے پاس رکھ کر کیا کریں گے۔ اُنہوں نے تھوڑی تھوڑی اپنے پاس رکھی۔ حمید اللہ نے ان کی واپس کی ہوئی رقم میں سے کچھ اور پیسے اُس آدمی کو دے دیئے جسے دوسرے گاؤں سے بلایا گیا تھا۔ اُس آدمی کا چہرہ بتاتا تھا کہ اُسے توقع نہیں تھی کہ اُس کے حصّے میں اتنی رقم آئے گی۔

"جب کبھی تم لوگوں کو میری ضرورت پڑے تو اشارہ کر دینا" ـــ اُس نے کہا ـــ "میرا جینا مرنا اب تمہارے ساتھ ہے۔"

اُسے ہم نے رخصت کر دیا۔ اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ شمّو کے سسرال والے گاؤں میں پولیس جو کارروائی کر رہی تھی، اُس کا پتہ چلانا تھا۔ نور اللہ کے متعلق ڈر تھا کہ اُسے اُس گاؤں کا کوئی آدمی پہچانتا نہ ہو۔ ہمارا دوسرا ساتھی ذرا دُور کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ اُسے بھی کوئی نہیں جانتا پہچانتا تھا۔ اُس نے خود ہی کہا کہ وہ اُس گاؤں جا کر دیکھ لے گا اور معلوم بھی کرے گا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں

اِس شخص پر بھروسہ تھا۔ خاصا چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ وہ اُسی وقت روانہ ہو گیا۔

میں اور حمید اللہ پیچھے رہ گئے۔ ہم دونوں کی جذباتی حالت ایک جیسی تھی۔ ہم اس سوال پر بحث کرنے لگے کہ جگ موہن کو کہاں ڈھونڈا جائے۔ ایک تو وہ علاقہ تھا جہاں جگ موہن مجھے ملا تھا۔ میرا خیال یہ تھا کہ وہ اُسی علاقے میں گھومتا پھرتا رہتا ہے لیکن اُس نے جو رقعہ پیچھے چھوڑا تھا اس میں اُس نے لکھا تھا کہ وہ مجھ پر وار کرے گا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہمارے علاقے میں موجود رہے گا۔ وہ دلیر ہی نہیں تھا عقل مند بھی تھا۔ وہ ہماری اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا رہا تھا کہ ہم قانونی طور پر اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ ہمارے تین افراد قتل ہو گئے تھے اور ہم تھانے نہیں جا سکتے تھے۔ تھانے جانے سے پولیس پہلی کارروائی یہ کرتی کہ مجھے اور حمید اللہ کو گرفتار کرتی اور تھانیدار میرے سر کی قیمت دس ہزار روپیہ انگریزوں سے وصول کر لیتا۔ جگ موہن اگر پکڑا بھی جاتا تو اُس کے خلاف قتل کا جرم ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس کا رقعہ کوئی ثبوت نہیں تھا۔

یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں، حمید اللہ یا نور اللہ یا ہم تینوں اکٹھے اُس علاقے میں نکل جاتے جہاں ہمیں جگموہن ملا تھا اور اُسے ڈھونڈتے پھرتے۔ اس طرح بھی ہمارے پکڑے جانے کا ڈر تھا۔

"غور کرو سکندر!" — حمید اللہ خان نے کہا — "تم جب سروس میں تھے تو تم نے جگموہن کے گروہ کو گرفتار کرایا تھا۔ تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ یہ شخص کہاں کا رہنے والا تھا اور تم نے اس کے گھر کی تلاشی بھی لی ہو گی"۔

"وہ پولیس ہیڈ کوارٹر والے شہر سے پندرہ سولہ میل دُور ایک قصبے کا رہنے والا ہے" — میں نے کہا — "لیکن تلاشی میں نے نہیں لی تھی سلطان نے لی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ سلطان نے واپس آکر مجھے بتایا تھا کہ جگموہن کی دو بہنیں بہت خوبصورت لڑکیاں ہیں"۔

"ہمارا کام ہو گیا" — حمید اللہ نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا — "تم قصبہ تو جانتے ہو نا، جگموہن کا گھر معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں۔ اگلی واردات اُس

کے گھر کریں گے۔ جو نقدی ہاتھ لگی وہ لے آئیں گے۔ اُس کی دونوں بہنوں کو نہیں تو ایک کو ساتھ لے آئیں گے اور اُس کے گھر کو آگ لگا کر آئیں گے"۔

میں نے حمید اللہ کی اس بات پر غور کیا تو یہ مجھے اچھی لگی۔ وہاں تک پہنچنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ قصبہ مین لائن پر تھا۔ انتقام لینے کے لئے ہم خطرہ مول لے سکتے تھے۔ میں نے حمید اللہ اور نور اللہ کے ساتھ اس تجویز پر عمل کرنے پر سوچنا شروع کر دیا۔

میں تو اُس وقت نیم پاگل تھا۔ میری عقل پر بھڑکے ہوئے جذبات کا قبضہ تھا۔ مجھے یہ صورت بڑی اچھی لگ رہی تھی کہ جگموہن کے گھر پر حملہ کر کے اُس کے خاندان کا اور مکان کا وہی حال کیا جائے جو حمید اللہ نے بتایا تھا لیکن یہ میری فطرت کے خلاف تھا۔ یہ ہندو کی فطرت تھی جس نے مجھ سے انتقام لینے کی بجائے ایک بوڑھے آدمی اور ایک عورت کو قتل کر ڈالا۔ میں کسی بے گناہ کو سزا دینے کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لیکن اُس وقت میں اسی پر غور کرنے لگا۔



سورج غروب ہونے کے کچھ دیر بعد ہمارا وہ آدمی واپس آ گیا جو شمّو کے سُسرال یہ دیکھنے گیا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے اس ساتھی کا نام اقبال تھا اور ہم اسے بالا کہا کرتے تھے۔ اُس نے یہ خبر سُنا کر ہمیں حیران کر دیا کہ شمّو کا خاوند رات کی واردات میں قتل ہو گیا ہے۔

"کیا کہہ رہے ہو بالے!" — میں نے اُس کی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے پوچھا — "تم ہی نے تو یہ واردات کی ہے۔ اُسے کس نے قتل کیا ہے؟"

"یہ نور اللہ تمہارے پاس بیٹھا ہے" — بالے نے کہا — "اس سے پوچھ لو۔ یہ اور میں اُس کمرے میں گئے تھے جس میں مال گھڑے میں رکھا ہوا تھا۔ وہ بڈھا لڑکا اندر آیا تھا اور کچھ نہ کچھ بکتا رہا تھا۔ ہم نے مال اُٹھایا پھر نور اللہ نے دیوار سے بندوق اتاری اور ہم نکل آئے۔ رات کو بھی تمہیں یہی سنایا تھا۔ اور ہمارا تیسرا یار اندر گیا ہی نہیں تھا، پھر ہمارے ساتھ باہر نکل آیا تھا"۔

"ہاں سکندر!" — نوراللہ نے کہا — "اُسے مارنے کی ہمیں کیا ضرورت تھی۔ تم نے بھی کہا تھا کہ کسی کو قتل نہیں کرنا۔ وہاں قتل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

مجھے کچھ اور شک ہونے لگا۔ میں اپنے ساتھیوں پر پورا اعتبار کرتا تھا۔ وہ ٹھیک کہتے تھے کہ کسی کو قتل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

"ایک بات بتاؤ" — میں نے نُوراللہ اور بالے سے پوچھا — "جب تم لوگ وہاں سے نکلے اُس وقت شمّو کہاں تھی؟"

"وہ اُسی اگلے کمرے میں تھی" — بالے نے جواب دیا۔

"اور اُس کا خاوند؟"

"وہ بھی شاید اندر ہی تھا" — بالے نے جواب دیا۔

"ہاں سکندر!" — نوراللہ نے کہا — "میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ اندر ہی تھا۔"

"پھر یہ شمّو کا کام ہے" — میں نے کہا — "حمید بھائی! تم جانتے ہو کہ شمّو نے ایک بار تمہیں اور کوئی دس بار مجھے کہا تھا کہ باپ بیٹے کو قتل کرنا ہے اور اگر باپ کو قتل نہ کرنا ہُوا تو بیٹے کو زندہ نہیں چھوڑنا۔ میں نے اُسے ایک بار بھی نہیں کہا تھا کہ ہم کسی کو قتل نہیں کریں گے۔ میں نے یہ بات اس لئے اُسے نہیں کہی تھی کہ کہہ دی تو ایسا نہ ہو کہ وہ ہمیں پھنسا دے یا کسی اور طرح سے دھوکا دے جاتے۔ اُس نے جب دیکھا کہ ہمارے آدمی اپنا کام کر کے جا رہے ہیں اور انہوں نے اُس کا کام نہیں کیا تو اُس نے موقع غنیمت جان کر اپنے خاوند کو مار ڈالا... بالے! کیا تمہیں یہ پتہ نہیں چلا کہ اُسے کس طرح قتل کیا گیا ہے؟"

"ہاں" — بالے نے جواب دیا — "میں نے یہ پتہ بھی کرایا ہے۔ اُس کے سر پر دو چوٹیں بتائی گئی تھیں اور یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ہاتھوں سے یا کپڑے یا رسّی سے اُس کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ اگر ہم اُسے قتل کرتے تو چاقو یا خنجر مارتے۔ ہمارے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ پہلے سر پر چوٹیں مارتے پھر گلا گھونٹتے۔"

اس طریقہ قتل سے یہ بات صاف ہوگئی کہ یہ ہمارے کسی آدمی کا کام

نہیں تھا۔

"کیوں بالے!" — میں نے اُس سے پوچھا — "شمّو کے متعلق تو تمہیں کچھ پتہ نہیں ہوگا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ قتل کا شک اُس پر کیا جا رہا ہو!"

"ایسا ہُوا تھا" — بالے نے جواب دیا — "لیکن اُس کے سُسر نے ایسا بیان دیا تھا جس سے شمّو پر جو شک تھا وہ صاف ہوگیا۔"

"تم یہ تمام خبریں بڑی جلدی لے آتے ہو" — میں نے بالے سے کہا۔

"پولیس کا جو حوالدار تھانیدار کے ساتھ آیا تھا وہ اپنا یار نکلا" — بالے نے جواب دیا — "اُس نے ساری باتیں بتائی ہیں۔ شمّو کے سُسر نے یہ بیان دیا کہ اُس کے بیٹے نے ڈاکوؤں کو بہت گالیاں دی تھیں اور وہ اُسے واردات والے کمرے میں لے گئے تھے۔ تھانیدار نے شمّو کے سُسر کو بتایا کہ اُس کے بیٹے کو ڈاکو قتل کر گئے ہیں۔ اس طرح شمّو کو اس شک سے رہائی مل گئی۔"

"تھانیدار نے کسی اور کو مُشتبہ بٹھایا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"اُس نے اِدھر اُدھر سے کچھ آدمیوں کو بلوا بھیجا ہے" — بالے نے جواب دیا — "لیکن بڑے مزے کی بات یہ ہو رہی ہے کہ شمّو کے سُسر نے اپنے کسی دشمن پر شک لکھوایا ہے کہ یہ واردات اُسے کنگال کرنے کے لئے اُس کے دشمنوں نے کی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ تھانیدار کی توجہ اُس طرف ہو رہی ہے۔"

میں بالے سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پولیس کی توجہ اس گاؤں کی طرف تو نہیں جس میں ہم رہتے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہم محفوظ ہیں۔ پھر بھی ہمیں چوکنا رہنا تھا اور یہ خبر بھی لیتے رہنا تھا کہ پولیس کا رُخ کس طرف ہے

پانچ چھ روز گزر گئے۔ ہمیں شمّو کے سُسرال والے گاؤں سے اطلاعیں ملتی رہیں۔ پولیس اُسی رات تھانے چلی گئی تھی۔ تھانے سے پتہ چلا کہ تھانیدار نے کئی لوگوں کو مُشتبہ بٹھا رکھا تھا۔ ان میں دو تین آدمی بھی تھے جن پر شمّو کے سُسر

نے شک کیا تھا۔ ابھی تک شک ہمارے گاؤں کی طرف نہیں ہوا تھا۔ شمو محفوظ تھی۔ اُسے ایک بار بھی تھانے نہیں بلایا گیا تھا۔ وہ اب گواہ تھی۔

ہمارے کھانے کا انتظام گاؤں والے کرتے تھے۔ ہمارے پاس اب خاصی رقم آگئی تھی۔ اس میں سے ہم نے گاؤں والوں کا حصّہ بھی نکالا اور انہیں دے دیا تھا اور انہیں کہا تھا کہ اب انہیں حصّہ ملتا رہا کرے گا۔ میں اور حمید اللہ خان رات کو گاؤں میں جایا کرتے تھے۔ اُن دنوں چاندنی پورے چاند کی تھی اس لئے پہاڑی جگہ سے گاؤں تک رات کو آنا جانا آسان تھا۔ راستہ اتنا تنگ اور اتنا دشوار تھا کہ اندھیری رات میں اس سے گزرنا خطرناک تھا۔ پاؤں پھسل جانے کی صورت میں آدمی پتھریلی چٹان سے لڑھکتا نیچے جاتا تھا۔ ایک جگہ نیچے پانی جمع تھا اور دلدل بھی تھی۔

ڈکیتی کی واردات کے پانچ چھ روز بعد کی ایک رات تھی۔ اُس رات حبس بڑھ گیا تھا۔ غار کے اندر گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ مَیں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ یہ گھٹن موسم کے حبس کی وجہ سے نہیں بلکہ اس گھٹن کا تعلق جذبات سے ہے۔ خواجہ صاحب اور شہناز کی جب یاد آتی تھی تو غم سے دل تو بوجھل ہوتا ہی تھا، تلخیاں کانٹوں کی طرح چبھتی اور دہکتے انگاروں کی طرح جلاتی تھیں۔ یہ انتقام کے جذبے کی تلخی تھی جس کی تسکین انتقام لے کر ہی ہو سکتی تھی مگر یہ خیال بہت ہی تلخ تھا کہ جس سے انتقام لینا ہے وہ نہ جانے کہاں تھا۔

اُس رات گھٹن اس قسم کی تھی جیسے کسی کے ہاتھوں نے میرا گلا گھونٹ رکھا ہو۔ دل پر کچھ ایسا بوجھ بھی تھا جس میں اضطراب بھی تھا اور ایسا خوف بھی جیسے کوئی واقعہ پیش آنے والا ہو یا آج رات کوئی اور حادثہ ہوگا۔

کبھی ایسے ہوتا ہے کہ حادثے سے پہلے ہی دل پر گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی ہے اور بےچینی سی پیدا ہونے لگتی ہے۔ بعض لوگ تو کہہ بھی دیتے ہیں کہ ایسے لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔

"حمید بھائی!" ——میں نے کہا —— "ذرا باہر نہ نکل چلیں۔ بڑی گھٹن ہے۔ تم حبس محسوس نہیں کر رہے؟"

"کر تو رہا ہوں" —— حمید اللہ خان نے کہا —— "لیکن اتنا نہیں .... ذرا حوصلے میں رہو سکندر! تم تو کبھی کبھی ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھتے ہو۔"

"سکندر بھائی!" —— نور اللہ نے کہا —— "تم تو ہندوستان کو آزاد کرانے کی باتیں کیا کرتے ہو۔ اتنی جلدی ہمت ہار بیٹھے؟"

"جائے جہنم میں تمہارا ہندوستان!" —— میں نے غصّے سے کہا —— "میں جب تک جگموہن کی شہ رگ اپنے ہاتھوں سے نہیں کاٹ لوں گا مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"نوابزادہ صاحب!" —— نور اللہ نے حمید اللہ خان سے کہا —— "اسے باہر لے جاؤ۔ اس کا غصّہ ٹھیک نہیں۔"

اپنے غصّے سے تو میں خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے کبھی غصّہ نہیں آیا تھا۔ حمید اللہ خان بھی شاید میرے غصّے سے پریشان تھا۔ رات خاصی گزر گئی تھی۔ ہمیں اُس وقت سویا ہوا ہونا چاہیئے تھا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ حمید اللہ خان میری خاطر اُٹھا اور ہم دونوں نور اللہ کو غار میں اکیلا چھوڑ کر باہر آگئے۔ ہم خالی ہاتھ گاؤں میں نہیں جایا کرتے تھے۔ میرے پاس بندوق اور حمید اللہ خان کے پاس ریوالور ہوتا تھا۔ اُس رات بھی ہمارے پاس یہ ہتھیار تھے۔

"گاؤں تک چلو گے حمید بھائی؟"

"سب سوتے ہوتے ہوں گے" —— اُس نے کہا —— "اس وقت جا کر کیا کرو گے؟"

"حمید بھائی!" —— میں نے کہا —— "تم تو جانتے ہو کہ مجھ میں ایک حِس فالتو ہے۔ آج یہ حِس کچھ زیادہ ہی بےچین ہو رہی ہے۔ نہ جانے میں کیوں محسوس کر رہا ہوں کہ گاؤں کا چکر لگا لینا چاہیئے۔"

"کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہو؟"

"لگتا ایسے ہی ہے" —— میں نے جواب دیا —— "ہمارا یہ ٹھکانہ کب تک چھپا رہے گا۔ ایک نہ ایک دن تو چھاپہ پڑنا ہی ہے .... جگموہن تو میرے دل میں کانٹے کی طرح اُتر گیا ہے۔"

"وہ چھاپہ ضرور پڑواتے گا" ــــ حمیداللہ خان نے کہا ــــ "تمہارا وجود نقد دس ہزار روپیہ ہے سکندر! اور وہ ہندو ہے"

"نہیں!" ــــ میں نے کہا ــــ "اُسے دس ہزار روپے کے ساتھ دلچسپی ہوتی تو جب یہاں آیا تھا تو اپنے ساتھیوں کی بجائے پولیس کو ساتھ لاتا"

"وہ تمہیں قتل کر کے اپنا انتقام لینا چاہتا ہے" ــــ حمیداللہ خان نے کہا ــــ "پھر وہ تمہاری لاش اُٹھا کر تھانے لے جاتے گا اور دس ہزار روپیہ وصول کر لے گا"



ہم دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے اُونچائی کے راستے سے گاؤں کی طرف بڑھتے گئے۔ وہ برسات کا موسم تھا اس لئے فضا میں گرد و غبار نہیں تھا۔ اس سے چاندنی بہت ہی شفاف تھی۔ چاند ہمارے پیچھے تھا اور ہم گھنے درختوں میں تھے۔ ایک ٹیکری کا ڈھلانی سرا گاؤں کے اندر جاتا تھا۔ ہم اس ٹیکری پر پہنچ گئے۔ گاؤں ہمارے قدموں میں تھا۔

"پیچھے ہو جاؤ" ــــ حمیداللہ خان نے مجھے بازو سے پکڑ کر پیچھے کر دیا اور سرگوشی میں بولا ــــ "درخت کے پیچھے ہو جاؤ اور گاؤں میں دیکھو"

میں نے دیکھا۔ شفاف چاندنی میں مجھے چار آدمی دکھائی دیتے۔ اس گاؤں کے جو تھوڑے سے مکان تھے یہ تقریباً نیم دائرے میں تھے۔ آگے اسی ٹیکری کی ڈھلان آجاتی تھی جس پر ہم کھڑے تھے۔ ہم ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ یہ چاروں آدمی دیہاتی نہیں لگتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے نوراللہ کے ساتھ قطب الدین کے گاؤں سے آتے جگموہن اور اُس کے دو ساتھیوں کو دیکھا تھا۔ اُن کے کپڑے، ڈیل ڈول اور قد ایسے ہی تھے۔

وہ سیدھے اُس مکان کے دروازے پر جا رُکے جس میں ہم رہتے تھے۔ ہمیں اُوپر سے اس مکان کا صحن دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں تینوں مویشی بندھے ہُوتے تھے۔

"یہ جگموہن ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "شکار خود ہی جال میں آ

گیا ہے"

"وہی ہُوا تو دُور سے گولی مار دیں گے" ــــ حمیداللہ خان نے کہا۔

"نہیں حمید بھائی!" ــــ میں نے کہا ــــ "گولی نہ چلانا۔ میں اسے زندہ پکڑوں گا پھر دیکھنا میں اسے کس طرح تڑپا تڑپا کر مارتا ہوں"

ابھی یقین نہیں تھا کہ یہ جگموہن ہے۔ لگتا وہی تھا۔ اگر پولیس کے آدمی ہوتے تو وُردی میں ہوتے اور باقاعدہ چھاپہ مارتے۔ حمیداللہ خان اور مجھ جیسے خطرناک اور مفرور مجرموں کو پکڑنے کے لئے پولیس کا چھاپہ شبخون کی مانند ہُوا کرتا تھا۔ یہ پولیس نہیں تھی اور یہ سی آئی ڈی کے آدمی بھی نہیں تھے۔

ہم دونوں نیچے اُترنے لگے۔ اُدھر دیکھا، جگموہن مکان کے اندر گیا۔ اُس کے پیچھے اُس کے دو ساتھی گئے۔ ایک باہر کھڑا رہا۔ ہم اُترتے گئے۔ ٹیکری کی ڈھلان سیدھی نہیں تھی۔ اس ٹیکری کے آگے ایک چھوٹی ٹیکری تھی۔ ایک سے اُتر کر دوسری پر چڑھنا اور اس سے اُترنا ہوتا تھا۔ ہم بڑی ٹیکری سے اُتر رہے تھے کہ جو آدمی باہر کھڑا تھا اُس نے ہمیں دیکھ لیا۔ ہم اُترے اور اگلی ٹیکری پر چڑھنے لگے۔

"جگموہن!" ــــ رات کے سناٹے میں ہمیں آواز سنائی دی ــــ "فوراً نکلو"

یہ باہر والے آدمی کی آواز ہوگی۔ اُس نے بلند آواز سے جگموہن کو نہیں پکارا تھا۔ یہ عام آواز تھی جیسے دو تین گز دُور کھڑے آدمی کو بلایا جاتا ہے۔ چونکہ وہاں سناٹا تھا اس لئے یہ آواز اس طرح سنائی دی جیسے ہمارے قریب کھڑے کسی آدمی نے ہمارے ساتھ بات کی ہو۔

ہم دوڑ کر اگلی ٹیکری پر چڑھے۔ باہر والا آدمی غائب ہو چکا تھا۔ اندر سے دو آدمی دوڑتے نکلے اور اس مکان کی نکڑ سے ہی مُڑ کر پیچھے چلے گئے۔ فاصلہ کم رہ گیا تھا۔ اتنا کم کہ چہرہ پہچانا جاتا تھا۔ آخر میں جو آدمی مکان سے باہر آیا وہ جگموہن تھا۔ اُس کی دلیری نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ دروازے میں ذرا سا رُکا۔ دائیں بائیں دیکھا اور دوسری طرف دوڑا۔ حمیداللہ خان نے اُس پر ریوالور فائر

کیا لیکن! اتنے فاصلے سے ریوالور کی گولی نشانے پر نہیں لگ سکتی تھی۔

"گولی نہ چلاؤ حمید!" ——— میں نے غصے سے کہا ——— "میرا شکار اب کہیں نہیں جا سکتا۔ مجھے زندہ پکڑنے دو اسے!"

اب یقین ہو گیا تھا کہ وہ جگموہن ہے۔ وہ مکانوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔ میں اور حمید اللہ خان تیز دوڑے۔ گولی جو حمید اللہ خان نے چلائی تھی اس سے گاؤں والے جاگ اُٹھے ہوں گے لیکن ان میں سے کوئی بھی باہر نہ آیا۔ انہیں آنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ جہاں گولیاں چلتی تھیں وہاں وہ کہیں دبک جانے یا بھاگ جانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔



مکانوں کے پیچھے قبرستان تھا، درخت بہت تھے اور اس کے گرد کھڈے تھے جن میں سے بعض گہرے اور بعض کم گہرے تھے اور گھاس زیادہ اونچی نہیں تھی۔ جگموہن کے ساتھی جس طرف گئے تھے اُدھر کھیتیاں تھیں جن میں ساون کی فصل کھڑی تھی۔ وہ تو چُھپ چُھپ کر بھاگ سکتے تھے لیکن جگموہن جس طرف گیا تھا وہاں فصل والا ایک بھی کھیت نہیں تھا۔

ہم دونوں قبرستان تک چلے گئے اور رُک کر کان کھڑے کر لیے۔ تھوڑی دیر بعد اچانک ہمارے دائیں سے دوڑتے قدموں کی آوازیں اُٹھیں اور کچھ دُور جا کر خاموش ہو گئیں۔

"جگموہن!" ——— میں نے للکار کر کہا ——— "سامنے آ جاؤ۔ گولی نہیں چلاؤں گا۔"

کوئی جواب نہ ملا۔

"گولی نہیں ماروں گا جگموہن!" ——— میں نے پھر اُسے للکارا ——— "سامنے آؤ، چاقو سے لڑو، خنجر سے لڑو۔"

اُدھر خاموشی رہی۔

ہمیں اندازہ تھا کہ قدموں کی آواز کہاں خاموش ہوئی تھی۔ حمید اللہ خان بائیں کو اور میں دائیں کو چلا گیا۔ ہمارے قدموں کی آہٹ ہمارے شکار کے

کانوں تک پہنچ رہی ہو گی۔ وہ چالاک اور ذہین آدمی تھا اور پھرتیلا بھی تھا۔ کچھ دیر بعد ہمیں سرسراہٹ سنائی دی۔ جگموہن رینگ رہا تھا یا پاؤں پر بیٹھا سرک رہا تھا۔ فوراً بعد تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ آگے گھاس اُونچی اور جھاڑیاں گھنی تھیں۔

ہم دونوں تیزی سے آگے بڑھے۔ آگے سرکنڈوں کا جنگل آ جاتا تھا۔ میں اُس طرف چلا گیا تا کہ وہ سرکنڈوں کے اندر نہ چلا جائے۔

"جونہی نظر آتے اس پر فائر کر دینا سکندر!" ——— حمید اللہ نے دُور سے کہا۔

"نہیں .... نہیں" ——— میں نے اُسے بلند آواز سے جواب دیا ——— "میں اس کافر کو زندہ پکڑوں گا۔"

میں سرکنڈوں کی طرف ہو گیا تھا۔ ان سے آگے ٹیکریاں تھیں۔ میں نے حمید اللہ خان کو گولی چلانے سے روکا تو تھا لیکن میں جانتا تھا کہ جگموہن اُسے نظر آیا تو حمید اللہ اُسے چھوڑے گا نہیں، گولی چلا دے گا۔

وہ پھر دوڑا۔ حمید اللہ خان نے ایک اور گولی فائر کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ اُس نے سمت کا اندازہ کر کے گولی چلائی تھی۔ جگموہن اُسے نظر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ تھوڑی دُور تک دوڑا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ چھوٹی ٹیکریوں کے درمیان چلا گیا ہے۔

"حمید بھائی!" ——— میں نے بلند آواز سے کہا ——— "اور آگے چلے جاؤ۔ اسے باہر نہ نکلنے دینا۔"

میں دعا کر رہا تھا کہ جگموہن حمید اللہ خان کو نظر نہ آئے۔ مجھے حمید اللہ کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں دوڑ کر ایک ٹیکری پر چڑھ گیا۔ آگے بڑی ٹیکری تھی۔ چاندنی بہت صاف تھی۔ چاند سر پر آیا ہوا تھا۔ تقریباً پچاس قدم دُور مجھے جگموہن دکھائی دیا۔ وہ جُھکا ہُوا آگے جا رہا تھا۔

"جگموہن! رُک جاؤ" ——— میں نے اُسے للکارا ——— "تم مجھے نظر آ رہے ہو۔ یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔"

وہ دوڑ پڑا اور دوسری طرف مُڑ گیا۔ میں دوڑتا ہُوا اُس کے پیچھے گیا۔ وہ ان ٹیکریوں سے نکل نہیں سکتا تھا۔



جگموہن کو یقیناً اندازہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور حمید اللہ خان کہاں ہے۔ میں اُسے کہہ تو رہا تھا کہ میں گولی نہیں چلاؤں گا لیکن اُسے مجھ پر اعتبار نہیں آ سکتا تھا۔ وہ مرنے کے لئے اپنے آپ کو میرے حوالے کیوں کرتا۔ اُسے امید تھی کہ وہ نکل جائے گا۔ وہ اسی کوشش میں تھا لیکن وہ ٹیکریوں اور چٹانوں کے پھندے میں جا رہا تھا۔ اُدھر سے وہ اُن پہاڑیوں میں جا رہا تھا جہاں ہم رہتے تھے۔ وہ اُس جگہ سے واقف نہیں تھا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ اُدھر ہی جائے۔ حمید اللہ خان اور میں ایسی پوزیشن میں تھے کہ اُسے اُسی طرف لے جا رہے تھے۔

وہ اُدھر جاتا رہا اور ہم دونوں اُس کی سرسراہٹ اور اُس کے قدموں کی آہٹ پر چلتے گئے۔ چلتے چلتے وہ ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں بہت بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوتے تھے۔ یہ تھوڑی سی جگہ تھی جہاں چھوٹے بڑے پتھر تھے اور اس جگہ کے اردگرد سرکنڈوں جیسی گھاس تھی۔ حمید اللہ خان معلوم نہیں کہاں تھا۔ میں ٹیکریوں کی اوٹ سے آگے نکلا تو جگموہن دکھائی دیا۔ فاصلہ کم نہیں ہُوا تھا۔ میں اُسے بڑی آسانی سے گولی مار سکتا تھا۔ ایک ہی کارتوس اُس کا کام تمام کر دیتا لیکن مجھے یقین تھا کہ اب میں اسے پکڑ لوں گا۔

وہ بڑے پتھروں کی اوٹ میں جانے لگا تو اُس نے ایسی چیخ ماری جس نے مجھے بھی ڈرا دیا۔ دو چار سیکنڈ اُس کی چیخ کی گونج بھی سنائی دیتی رہی۔ اُس نے ایک بار جھک کر نیچے دیکھا پھر وہ میری طرف دوڑا اور چند قدم بعد بیٹھ گیا۔ میں اُس کی طرف دوڑا۔ اتفاق سے میری نظر ذرا دائیں طرف گئی۔ کم و بیش ڈیڑھ گز لمبا سانپ تیزی سے پتھروں پر رینگتا جا رہا تھا۔ میں اس سانپ کو پہچانتا تھا۔ یہ وہ کوبرا تھا جس کے پھن کے پیچھے انگریزی کی وی بنی ہوتی ہوتی ہے۔ اس کا ڈسا ہُوا انسان چند منٹوں میں مر جاتا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ جگموہن کو اس سانپ نے ڈسا ہے۔ سانپ مجھ سے دُور نہیں تھا۔ میں نے بندوق کندھے سے لگائی۔ سانپ کو شست میں لیا اور پہلا ہی کارتوس کام کر گیا۔ سانپ وہیں رُک گیا اور بل کھاتے کھاتے بے حس ہو گیا۔ سانپ کو مارنا اس لئے ضروری تھا کہ ہم بھی اسی علاقے میں رہتے تھے۔

میں نے جگموہن کو بیٹھے ہوتے دیکھا۔ جب میں اُس تک پہنچا تو وہ ایک پہلو پر لڑھک گیا۔ اُس کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ وہ مر چکا تھا۔ اُدھر سے حمید اللہ خان دوڑتا آیا۔

"مر گیا ہے" —— میں نے حمید اللہ خان کو بتایا۔

"تمہاری گولی سے؟"

"نہیں حمید بھائی!" —— میں نے کہا —— "سانپ کو سانپ نے کاٹا ہے ..... میں نے اور نور اللہ نے جب اسے اور اس کے ساتھیوں کو باندھ کر جنگل میں پھینکا تھا تو نور اللہ نے کہا تھا کہ ان کے سروں میں ایک ایک گولی مار دو۔ میں نے نور اللہ سے کہا تھا کہ گولی نہیں ماریں گے۔ اس جنگل میں سانپ تو ہوں گے ہی، اچھا ہے کہ سانپ کو سانپ ہی کاٹے۔"

"خدا نے تمہاری بات پوری کر دی ہے" —— حمید اللہ نے کہا۔

"نہیں بھائی!" —— میں نے کہا —— "مزہ نہیں آیا۔"

ہم نے جگموہن کی تلاشی لی۔ اُس نے نیفے میں لمبا خنجر اُڑسا ہُوا تھا اور اس کی جیب میں سے تین سو اور کچھ روپے نکلے۔ خنجر اور روپے ہم نے اپنے پاس رکھے۔ جگموہن کی لاش کو اس طرح گھسیٹا کہ ایک بازو میں نے پکڑا اور دوسرا حمید اللہ خان نے۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس پتھریلی جگہ سے کچھ آگے پانی کا جوہڑ آجاتا ہے۔ وہ چونکہ برسات کا موسم تھا اس لئے اُس میں پانی زیادہ تھا۔ ہم نے لاش کو ڈبونا تھا۔ اس کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ لاش سے قمیض اُتاری۔ ایک وزنی پتھر قمیض میں باندھا اور قمیض کی آستینیں لاش کی کمر کے ساتھ باندھ دیں۔ لاش کو ہم گھسیٹتے ہوئے پانی تک لے گئے تھے۔ پھر اسے پانی میں پھینک دیا اور جگموہن ہمیشہ کے لئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"اب یہ سوچ لو سکندر!" ـــ واپس آتے ہوئے حمیداللہ خان نے کہا ـــ "اس کے ساتھی نکل گئے ہیں۔ اُنہیں ہمارے متعلق معلوم ہوگا کہ ہم مفرور ہیں۔ یہ تو مجھوہن تھا جو مضبوط دل گُردے والا تھا اور کہتا تھا کہ وہ تمہیں اپنے ہاتھ سے مارے گا۔ اس کے دوسرے ساتھیوں کی فطرت بالکل ہندوؤں والی ہو گی۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ پولیس کا چھاپہ مروائیں گے؟" ـــ میں نے پوچھا۔

"ہاں" ـــ حمیداللہ خان نے کہا ـــ "ہمیں پہلے ہی اس کا کچھ انتظام کر لینا چاہیئے۔"

"ایک انتظام تو یہ ہے کہ ہم اس علاقے سے بالکل ہی نکل جائیں" ـــ میں نے کہا ـــ "اور دوسرا انتظام یہ ہو سکتا ہے کہ صبح گاؤں میں آئیں گے اور سب کو پکا کر دیں گے کہ پولیس آئے تو صاف بتا دیں کہ یہاں تین چار آدمی آئے تھے جن میں ایک بوڑھا آدمی تھا، ایک بڑی خوبصورت جوان عورت بھی اور تین اچھے جوان آدمی تھے۔ اُنہوں نے گاؤں والوں کو ڈرایا اور دھمکایا کہ کسی نے مخبری کی تو اُسے گولی مار دی جائے گی۔ اُنہوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ گاؤں والوں نے دھوکا دیا تو تمام عورتوں کو خراب کریں گے۔"

"ٹھہرو سکندر!" ـــ حمیداللہ خان نے کہا ـــ "میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے۔ گاؤں والے یہ کہیں کہ ان میں سے دو یا تین آدمی کہیں باہر چلے گئے تھے۔ پیچھے یہ واقعہ ہُوا کہ معلوم نہیں کتنے آدمی آئے اور اُنہوں نے بوڑھے آدمی کو، عورت اور ان کے ایک جوان ساتھی کو قتل کیا اور چلے گئے۔ گاؤں والے یہ بھی کہیں کہ دوسرے دن اُنہوں نے تین لاشیں اس مکان میں پڑی ہوئی دیکھیں تو شام تک انتظار کرتے رہے کہ ان کے آدمی واپس آئیں گے۔ شام تک وہ نہ آئے تو گاؤں کے لوگوں نے ایک ہی قبر کھود کر تینوں کو دفن کر دیا۔ پھر یہ لوگ کہیں کہ قتل کی اس واردات کے بعد یہاں کوئی نہیں آیا ..... قبر کی نشاندہی پر پولیس ضرور قبر کھودے گی اور لاشیں دیکھے گی۔"

"یہ تو میں جانتا ہوں" ـــ میں نے کہا ـــ "یہ پولیس کی کارروائی ہے جو اس طرح ہوگی کہ وہ لاشوں کو اُٹھا لے جائیں گے۔ ان لاشوں کو بڑے افسر دیکھیں گے۔ لاشوں کی باقاعدہ شناخت ہوگی اور ان کا پوسٹ مارٹم ہوگا ..... اس نشاندہی سے بھی گاؤں والوں پر مصیبت آ سکتی ہے۔ پولیس ان سب پر یہ الزام عائد کر سکتی ہے کہ تین افراد قتل ہو گئے تو ان لوگوں نے تھانے میں اطلاع نہیں دی۔ تھانیدار نے اگر ان بے گناہ لوگوں کو اور زیادہ پریشان کرنا چاہا تو وہ ان پر یہ الزام بھی عائد کر دے گا کہ ان تینوں کو گاؤں کے آدمیوں نے قتل کیا ہے۔"

"یہ خطرہ تو ہے" ـــ حمیداللہ خان نے کہا ـــ "ہمیں کوئی نہ کوئی خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ گاؤں والوں کو ہم کہیں گے کہ جب پولیس آئے تو سب مل کر اتنا روئیں چیخیں اور اس طرح تھانیدار اور اُس کی پارٹی کے قدموں میں سجدے کریں کہ وہ سب متاثر ہو جائیں اور کہیں کہ یہ معصوم اور مظلوم لوگ ہیں۔"

"چلو، ایسے ہی کرتے ہیں" ـــ میں نے کہا ـــ "لیکن میں تمہیں یہ بتا دوں کہ پولیس آئی اور ہمیں پتہ چل گیا کہ پولیس گاؤں والوں کو تنگ کر رہی ہے تو ہم خاموش نہیں بیٹھے رہیں گے۔ ان بے چاروں نے ہماری بہت مدد اور خدمت کی ہے۔"

"دیکھو سکندر!" ـــ حمیداللہ نے کہا ـــ "ہم اس پوزیشن میں ہی نہیں کہ آنے والے کسی بھی واقعہ کی پیش گوئی کر سکیں یا آنے والے خطروں کی پیش بندی کریں۔ ذرا سوچو، ہم باہر کیوں نکلے تھے اور کیا ہو گیا۔ اب جو کچھ بھی ہوگا اچانک ہو گا۔ ہمیں قبل از وقت سوچنے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ اللہ پر چھوڑ دو۔ جو ہوگا اور جس وقت ہوگا اُس وقت سوچ لیں گے اور جو بہتر سمجھیں گے کریں گے۔"



ہم دونوں دوسرے راستے سے اپنے غار کی طرف چل پڑے۔ اچانک ایک درخت کے پیچھے سے ایک آدمی سامنے آیا۔ اچھا ہُوا کہ وہ بول پڑا ورنہ میری بندوق میں ابھی تک کارتوس باقی تھا۔ وہ نوراللہ تھا۔ گولیاں جو حمیداللہ

کے ریوالور سے نکلی تھیں اور میں نے جو ایک کارتوس فائر کیا تھا، ان کی آوازیں غار تک پہنچ گئی تھیں۔ نوراللہ کی آنکھ کھل گئی اور وہ دوڑتا ہُوا گاؤں تک پہنچا لیکن وہاں خاموشی دیکھ کر پیچھے ہی رُک گیا اور ہمارا انتظار کرنے لگا۔ اُس نے ہم سے پوچھا کہ گولیاں کیوں چلی تھیں۔ میں نے اُسے سارا واقعہ سنایا اور ہم اپنے غار میں چلے گئے۔

اگلی صبح روزمرّہ کے معمول کے مطابق دو آدمی ہمارے لئے پراٹھے اور لسی لائے۔ انہوں نے بتایا کہ رات کو گاؤں والے بہت پریشان رہے ہیں کیونکہ گولیاں چلی تھیں۔

"وہ کوئی ڈاکو تھے جو ادھر سے گزر رہے تھے" ——— میں نے جھوٹ بولا ——— "کہیں ڈاکہ ڈال کر آتے تھے اور خوشی سے اُنہوں نے گولیاں چلائی تھیں ... جب تک ہم یہاں ہیں تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم لوگوں پر کوئی مصیبت آ گئی تو ہم تمہاری مدد کو پہنچیں گے۔ ایک بات اچھی طرح سُن لو۔ کسی وقت پولیس آجائے یا کوئی مشکوک آدمی آجائیں اور تمہیں ڈرائیں تو کسی آدمی کو یا کسی لڑکے کو چوری چوری ہماری طرف دوڑا دینا"۔

کھا پی کر میں، حمیداللہ اور نوراللہ انہی آدمیوں کے ساتھ ان کے گاؤں میں چلے گئے۔ چار پانچ نو عمر لڑکوں کو گاؤں کے اردگرد بھیج دیا۔ اُنہیں کہا کہ وہ مویشیوں اور بکریوں کو ساتھ لے جائیں اور ہر طرف نظر رکھیں۔ ان میں سے ایک لڑکے کو اونچی ٹیکری پر چڑھا دیا۔ ان سب سے کہا کہ پولیس آتی نظر آئے تو جو لڑکا دیکھے وہ صرف اتنا کرے کہ اپنے قریب کے ساتھی کو دو دفعہ پکارے اور اگلا لڑکا اپنے کسی اور ساتھی کو اسی طرح اُس کا نام لے کر دو دفعہ پکارے اور کوئی لڑکا دوڑتا ہُوا گاؤں میں نہ آئے۔

پہرے کا یہ انتظام کر کے ہم نے گاؤں کے تمام آدمیوں کو جن کی تعداد پچیس چھبیس تھی اُسی مکان میں بلایا جس میں ہم رہ کر گئے تھے۔ ہم اندر اُس کمرے میں کچے اور گندے فرش پر ہی بیٹھ گئے جس میں خواجہ صاحب، شہناز اور ہمارا ایک ساتھی قتل ہوتے تھے۔ میری نظر اُس دیوار پر گئی جس کے ساتھ شہناز کی

چارپائی ہوتی تھی۔ گاؤں والوں نے خون تو صاف کر دیا تھا لیکن اُس دیوار پر مجھے خون کے چھینٹے دکھائی دیتے۔ گاؤں کے آدمی ابھی آ رہے تھے۔ سب کے آ جانے پر ہم نے بات کرنی تھی۔ میری نظریں خون کے ان چند ایک خشک قطروں پر جم گئیں جو دیوار پر چپک کر رہ گئے تھے۔

یہ شہناز کا خون تھا۔

یہ میرا خون تھا۔

یہ میرے باپ کا خون تھا۔

مجھے اپنا باپ یاد آگیا۔ پھر وہ وقت یاد آیا جب میرے باپ نے میرے بازوؤں میں آخری سانس لیا تھا۔ اُس کی قاتل شہناز تھی۔ مجھے خیال آنے لگا کہ خدا کی بے آواز لاٹھی نے شہناز کو کیا سزا دی ہے۔ گھر سے بے گھر ہوئی، کہاں کہاں ذلیل و خوار ہوتی اور کہاں آکر اپنے انجام کو پہنچی۔

شہناز ایک مجرم ذہنیت والی ماں کی بیٹی تھی۔ میرا گھر اُجاڑنے اور میرے باپ کو قتل کرانے کا جرم اس کی ماں کے کھاتے میں جاتا ہے۔ وہ بھی بہت بُری موت مری تھی۔ شہناز تو اُس کا ایک خنجر تھی یا یوں کہہ لیں کہ شہناز ایک میٹھا زہر تھی، ایسا زہر جو بڑی خوبصورت شیشی میں بند تھا۔ یہ خنجر اور زہر کی یہ شیشی شہناز کی ماں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ ماں جو موت مری وہ ایک خارش زدہ کُتّے کی موت تھی۔

شہناز اور اس کی ماں میں فرق صرف یہ تھا کہ شہناز کے دل میں میری محبت تھی اور وہ اپنے گناہوں پر پچھتاتی تھی اور اُس نے میری خاطر اپنے آپ کو سزا دینے کی بھی کوشش کی اور میری محبت کی اُس نے قیمت دینے کی ہمیشہ کوشش کی تھی۔ اگر میں اُسے کسی وقت کہتا کہ مجھے تمہاری جان کی ضرورت ہے تو وہ یہ پوچھے بغیر کہ کیوں، اپنی جان دے دیتی۔ اور جب اُسے پتہ چلا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی باپ کی اولاد ہیں تو اُس نے مجھے سگے بھائی جیسا پیار دیا اور کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شہناز کے روپ میں میری ماں دنیا میں واپس آگئی ہے۔

اُسے یاد کرنے والا میرے سوا اب کوئی بھی نہ تھا۔ اُس کی یادگار اُس کی محبت تھی جو میرے دل میں زندہ تھی یا خون کے یہ چند ایک قطرے تھے جو اس گمنام گاؤں کی ایک کچی دیوار پر خشک ہو گئے تھے۔

خون کے ان دھبوں نے کچھ دنوں بعد مِٹ جانا تھا۔

اُس کی جو محبت میرے دل میں تھی اسے میرے ساتھ ایک روز پھانسی پر چڑھ جانا تھا۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ اُس کے خون کے یہ خشک قطرے پہلے لاپتہ ہوتے ہیں یا میں ان سے پہلے پھانسی کے تختے پر کھڑا ہوتا ہوں۔

کبھی خیال آتا تھا، اور یہ خیال اُس روز بھی آیا کہ میری موت ابھی بہت دُور ہے۔ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک گناہگار بندہ تھا۔ اللہ کی اس کائنات کا حقیر سا ایک ذرہ تھا، لیکن خدا نے مجھے کتنی ہی بار موت کے مُنہ میں سے نکال کر پھر کارزارِ حیات میں پھینک دیا تھا۔ جگ موہن مجھے قتل کرنے آیا تھا۔ اللہ نے میرے ہاتھوں کو اُس کے خون سے پاک رکھا اور اس سے انتقام لینے کے لئے ایک زہریلا ناگ بھیج دیا۔

یہ سب کیا ہے؟

یہ سوال پہلے بھی چند بار میرے ذہن میں آیا تھا لیکن میں نے اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہی سوال اُس روز شہناز کے خون کے خشک قطرے دیکھ کر پھر میرے ذہن میں تڑپا اور میں اُس کے جواب کی جستجو میں اپنے ذہن کے ویرانے میں مارا مارا پھرنے لگا۔

"سکندر!" —— حمید اللہ کی آواز نے مجھے ذہن کے ویرانے سے گھسیٹ لیا۔ وہ کہہ رہا تھا —— "سب آ گئے ہیں۔ بہتر ہے تم ہی انہیں کچھ بتاؤ۔"

ان لوگوں کو ہم نے وہی باتیں ذہن نشین کرائی تھیں جو میں اور حمید اللہ خان پہلے ہی طے کر چکے تھے، وہ میں پہلے ہی آپ کو سُنا چکا ہوں۔

"ڈرنا بالکل نہیں" —— میں نے کہا —— "جب پولیس آتی نظر آئے تو کسی لڑکے کو اُدھر والے راستے سے ہماری طرف دوڑا دینا۔ ہم تمہارے ساتھ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم پولیس کے سامنے تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ تمہاری عزت کی خاطر اگر ہمیں اپنے آپ کو گرفتار کرانا پڑا تو ہم گرفتار ہو جائیں گے۔"

سب نے وعدہ کیا کہ جس حد تک برداشت کر سکتے ہیں کریں گے اور ایسا بالکل نہیں ہوگا کہ پولیس کو دیکھتے ہی کوئی ہماری نشاندہی کر دے۔

ہم نے انہیں کہا کہ اب جا کر کام کاج کرو۔



جب سب چلے گئے تو ہم تینوں باہر نکلے۔ ہمارا چوتھا ساتھی بالا ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ اُسے ہم نے مخبری کے لئے بھیجا ہُوا تھا۔ وہ کبھی شمّو کے سُسرال والے گاؤں میں جاتا تھا اور کبھی تھانے کا چکر لگاتا تھا۔

میری نظر شمّو کے گھر کی طرف اُٹھی۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شمّو اپنے دروازے میں کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ ہم تینوں اُس کی طرف چل پڑے۔ وہ ہمارے لئے بہت اہم تھی۔ ہم جب اُس تک پہنچے تو اُس کا باپ بھی آ گیا۔ وہ پہلے ہمارے ساتھ ہی تھا۔ میں شمّو سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ خود شمّو یہ ساری باتیں ہمیں بتانے کے لئے بے تاب تھی۔ اس کے لئے الگ تھلگ ملاقات کی ضرورت تھی، لیکن شمّو کے باپ نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ اُس نے ہمیں اندر چل کر بیٹھنے کو کہا۔

ہم تینوں اندر چلے گئے۔ شمّو اپنے ماں باپ پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اُن پر حکم چلایا کرتی تھی۔ اُس نے اندر لے جا کر ہمیں بٹھایا اور باپ کو کسی کام سے باہر بھیج دیا۔

"سب سے پہلے یہ بتاؤ شمّو!" —— میں نے اُس سے پوچھا —— "تمہارے خاوند کو ہمارے کون سے آدمی نے قتل کیا تھا؟"

"کسی نے بھی نہیں" —— شمّو نے ہلکی سی ہنسی ہنستے ہُوئے کہا —— "یہ کام میں نے خود کر لیا تھا۔ تم نے تو میری شرط نہیں مانی تھی۔ اتنی دولت وہاں سے اُٹھا لاتے اور میرا یہ ذرا سا کام بھی نہ کیا۔"

"تم نے اُسے کس طرح مارا تھا؟"

"جب دیکھا کہ تمہارے آدمی مال اور بندوق اُٹھا کر نکل گئے ہیں اور میرا کام نہیں ہُوا تو میں نے ارادہ کر لیا کہ یہ کام میں خود کروں گی"۔۔۔ شمّو نے کہا ۔۔۔ "خدا نے موقع بڑا اچھا دے دیا۔ میرا سُسر اندر آکر دیکھنے کی بجائے کہ ڈاکو کیا کچھ اُٹھا کر لے گئے ہیں، باہر کو دوڑ پڑا اور اُس نے شور مچا دیا۔ اِدھر میں نے دیکھا کہ میرا خاوند اُس کمرے میں تھا جس میں مال پڑا تھا۔ وہ پگلا ابھی وہیں کھڑا تھا اور واہی تباہی بک رہا تھا۔ وہاں کسی ٹوٹی ہوئی چارپائی کا ایک پایہ پڑا تھا۔ میں نے وہ پایہ اُٹھا کر اُس کے سر پر مارا۔ وہ چکرا کر گرنے لگا تو میں نے اُس کے سر پر ایک اور ضرب لگائی۔ وہ گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ مجھے یہ ڈر محسوس ہُوا کہ یہ دو ضربوں سے نہیں مرے گا۔ میں نے ہاتھوں سے اُس کا گلا دبایا۔ وہ ذرا سا تڑپا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔۔۔۔

"یہ کام کر کے میں یہ شور مچاتی باہر کو دوڑی کہ ڈاکو ظالم میرے خاوند کو مار گئے ہیں۔ اتنی دیر میں گاؤں کے کچھ لوگ جاگ کر باہر آگئے تھے اور کچھ آدمی تمہارے آدمیوں کے پیچھے دوڑے جا رہے تھے۔ میرا سُسر گاؤں کے ایک دو آدمیوں کے ساتھ اندر آیا۔ میں نے اپنے سینے پر اور اپنے منہ پر زور زور سے ہاتھ مارنے شروع کر دیئے کہ ظالم مجھے بیوہ کر گئے ہیں۔ کسی کو شک نہ ہُوا کہ یہ میری اپنی کارستانی ہے۔۔۔۔

"تھانیدار کو مجھ پر تھوڑا سا شک ہو گیا تھا۔ اُس نے اتنے زیادہ سوال مجھ پر کئے کہ میرا دماغ خراب ہو گیا۔ میں نے اُسے کہا کہ تم اس طرح مجھ پر جرح کر رہے ہو جیسے اپنے خاوند کو میں نے قتل کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ اُسے یہی شک ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اپنے خاوند کو کیوں قتل کرتی۔ اُس نے کہا کہ تمہارا خاوند تمہارے لئے ناکارہ تھا اور تم اُس سے پلّہ چھڑانا چاہتی تھیں۔ پھر تھانیدار نے اور بھی بہت سی باتیں پوچھی تھیں لیکن میرے سُسر نے مجھے بچا لیا۔ اُس نے بیان دیا کہ میرے خاوند نے ڈاکوؤں کو بہت گالیاں دی تھیں اور ڈاکو اُسے اندر کمرے میں لے گئے تھے۔ تھانیدار نے مجھ سے یہ بھی پوچھا تھا کہ جب ڈاکوؤں نے میرے خاوند کو قتل کیا اُس وقت میں کہاں تھی۔ میں

نے اُسے بتایا کہ میں اُسی کمرے میں تھی لیکن اُن میں سے ایک آدمی مجھے بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گیا تھا اور کہتا تھا کہ بندوق کہاں ہے۔ میں نے اُسے بندوق دکھا دی۔ پھر میں ڈر کے مارے اُسی کمرے میں دبکی رہی"۔

شمّو نے یہ بات ہمیں پوری تفصیل سے سنائی تھی۔ اس سے ہم نے یہ اندازہ کیا کہ یہ کس قدر چالاک اور خطرناک عورت ہے۔ حمید اللہ نے اُسے کہہ بھی دیا کہ ہمیں توقع نہیں تھی کہ وہ یہ کام اتنے اچھے طریقے سے کر لے گی۔

"یہ توقع مجھے خود بھی نہیں تھی"۔۔۔ شمّو نے کہا ۔۔۔ "میں تو دیہاتی لڑکیوں کی طرح بالکل سیدھی اور بدھو سی لڑکی ہوتی تھی، لیکن گناہگاروں میں جا کر میرے دماغ میں بھی گناہ آگئے۔ مجھ پر جو بیتی ہے وہ انسان کو پاگل بنا دیتی ہے یا عقل تیز ہو جاتی ہے اور انسان اپنا رستہ بنا لیتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے وہ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ میں نے اپنے سُسر کے پاؤں پر سر رکھا تھا اور اُسے کہا تھا کہ میری جوانی پر رحم کرو اور میری زندگی تباہ نہ کرو، تمہارے بیٹے کا دماغ بھی ٹھیک نہیں اور جسم بھی ٹھیک نہیں، لیکن وہ کہتا تھا کہ میرے بیٹے کو گولی مارو، میں تو اُس کے بہانے تمہیں اپنے لئے لایا ہوں"۔

"وہ تو ہمیں معلوم ہے"۔۔۔ حمید اللہ نے کہا ۔۔۔ "اب تمہارے سُسر کا رویّہ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟"

"رویّہ یہ ہے"۔۔۔ شمّو نے جواب دیا ۔۔۔ "کہ اُس نے تھانیدار کو کہہ دیا ہے کہ اس لڑکی پر میرا کوئی شک نہیں اور اِسے آئندہ تھانے نہ بلانا، لیکن ہر رات وہ مجھ سے اس مہربانی کی قیمت مانگتا ہے اور میں یہ قیمت نہیں دے رہی۔ پرسوں رات اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ مجھے اسی طرح ناراض رکھو گی تو میں تمہیں اس الزام میں پکڑوا دوں گا کہ میرے بیٹے کو تم نے قتل کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم اُسے اپنے قابل نہیں سمجھتی تھیں۔ میں نے ابھی تک تو اُسے ٹالا ہُوا ہے۔ کل رات میں نے اُسے کہا تھا کہ مجھے ایک دو دنوں کے لئے اپنے گاؤں جانے دو۔۔۔۔

"وہ کہتا ہے کہ میرے گھر میں اپنی مرضی چلاؤ۔ مجھ پر حکومت کرو، گاؤں میں

سر اونچا کر کے چلو، لیکن یہیں رہو اور سب کو یہ بتاؤ کہ تم اپنے خاوند کا گھر نہیں چھوڑنا چاہتیں۔ میں نے اُسے ٹالنے کے لئے کہہ دیا ہے کہ ایک پھیرا اپنے گاؤں کا لگا آؤں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک پھیرا نہیں تم جب چاہو چلی جاؤ اور اپنی مرضی سے واپس آؤ۔ گھوڑی تمہارے پاس ہے۔ نوکر موجود ہے۔"

"اگر اب تم واپس ہی نہ جاؤ تو تمہارا سُسر تمہارا کیا بگاڑ لے گا؟" — میں نے پوچھا۔

"میں اسی ارادے سے آئی ہوں" — اُس نے کہا — "لیکن میرے سر پر ہاتھ رکھنے والا کون ہے؟ میرا سُسر آکر میرے ماں باپ کو تنگ کرے گا۔"

"دیکھو شمّو!" — میں نے کہا — "تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ہم یہ احسان چکائیں گے۔ یہیں رہو۔ اگر وہ آجاتے اور تمہیں تنگ کرے تو اُسے کہنا کہ دو روز بعد آتے۔ اُسے اچھے طریقے سے ٹال دینا۔ اور وہ آتے تو کسی لڑکے کو ہماری طرف بھیج دینا۔ ہم یہاں تمہارے گھر نہیں آئیں گے۔ ہم اُسے راستے میں ملیں گے اور اُس وقت ملیں گے جب وہ واپس جا رہا ہو گا۔ اُس روز تم اُسے صاف جواب دے دینا کہ میرا تعلق تمہارے بیٹے کے ساتھ تھا۔ وہ مر گیا ہے اور تمہارے ساتھ میرا تعلق ختم ہو چکا ہے۔ وہ تمہیں اور تمہارے ماں باپ کو بڑی خطرناک دھمکیاں دے کر چلا جاتے گا اور وہ تمہارے ماں باپ کے خلاف کوئی نہ کوئی اوچھی کارروائی ضرور کرے گا، لیکن ہم راستے میں اُسے روک کر جو دھمکیاں دیں گے ان سے اُس کا دماغ ٹھکانے آجاتے گا۔"

اگلا دن گزر گیا۔ اُس روز بالا واپس آیا اور اُس نے بتایا کہ ہماری واردات کی تفتیش ڈھیلی پڑ گئی ہے اور یہ شک ابھی تک کسی کو نہیں ہُوا کہ واردات کرنے والے ہم ہیں۔

رات کو ہم حسبِ معمول گاؤں میں گئے۔ شمّو کو باہر بلا کر حال احوال پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اُس کا سُسر آج دن کو ہی آگیا تھا اور کہتا تھا کہ واپس چلو۔ شمّو نے اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اُسے ٹالا۔ شمّو کا باپ تو اُس کے آگے بولتا ہی

نہیں تھا۔ وجہ صاف تھی۔ وہ غریب اور بے آسرا آدمی تھا اور اُس نے شمّو کے سُسر کی نہ جانے کتنی رقم کھائی ہوئی تھی۔ شمّو نے اُسے کہا کہ وہ دو روز بعد آتے اور وہ اس کے ساتھ چلی جاتے گی۔

"اُس کے آنے کا وقت کیا ہوتا ہے؟" — میں نے شمّو سے پوچھا۔

"وہ سورج نکلنے سے پہلے گھر سے چل پڑتا ہے" — شمّو نے جواب دیا۔

"فکر نہ کرو شمّو!" — میں نے کہا — "وہ تمہارے گھر تک نہیں پہنچے گا۔"

"کیا تم اُسے ....؟" شمّو نے کہا۔

"نہیں" — میں نے اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا — "ہم اُسے زندہ رہنے دیں گے۔ اگر اُسے قتل کیا تو تم پھنس جاؤ گی۔"

دو روز گزر گئے۔

تیسری صبح میں اور حمید اللہ علی الصبح اپنے ٹھکانے سے نکلے اور اس پہاڑی جگہ میں سے ایک اور راستے سے باہر نکل کر اُس طرف چل پڑے جدھر سے عام راستہ گزرتا تھا۔ ہم نے ایک جگہ دیکھ رکھی تھی جو کسی کو روکنے یا گھات لگانے کے لئے زیادہ اچھی تھی۔ ہم بہت تیز چلے جا رہے تھے کیونکہ ہم نے اُس سے پہلے اُس جگہ پہنچنا تھا۔ اُس نے تو گھوڑی پر آنا تھا۔ میں نے اور حمید اللہ نے سروں پر پگڑیاں لپیٹ رکھی تھیں۔

ہم اُس جگہ پہنچ گئے۔ ہم چند منٹ دیر سے پہنچتے تو وہ آگے نکل جاتا۔ وہ ہمیں دُور سے آتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جگہ ذرا گہرائی میں تھی اور ہرے سرکنڈوں، اونچی گھاس اور درختوں کا جنگل تھا۔ ہم دوسری طرف سے اس نشیب میں داخل ہوتے اور پہلا کام یہ کیا کہ پگڑیاں اُتار کر اس طرح باندھیں کہ ہمارے سَر اور چہرے چُھپ گئے۔ صرف آنکھیں ننگی تھیں۔ حمید اللہ خان کے پاس ریوالور تھا اور میرے پاس جگموہن کی بندوق تھی۔ میں نے اور نور اللہ نے جگموہن سے یہ بندوق اُس وقت لی تھی جب ہم نے قطب الدین کے گاؤں سے آتے جگموہن اور اُس کے ساتھیوں کو باندھا تھا۔

شمّو کا سُسر گھاٹی اُتر کر نیچے آیا۔ ہم دونوں اُس کے راستے میں آ گئے اور اُس کی گھوڑی کی باگ پکڑ لی۔

"کیوں بھئی کیوں؟" — اُس نے پوچھا — "کیا کر رہے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟"

ہم نے اُسے کوئی جواب نہ دیا اور اُس کی گھوڑی کو راستے سے ہٹا کر جنگل کے اندر لے گئے۔ اُسے کہا کہ وہ گھوڑی سے اُتر آئے۔

"میری ایک بات سن لو دوستو!" — اُس نے گھوڑی سے اُترتے ہوئے کہا — "میری جیب خالی ہے۔ کچھ دن گزرے میرا گھر لُٹ گیا ہے، اور میرا ایک ہی بیٹا تھا جو قتل ہو گیا ہے۔ اگر اس سے پہلے تم مجھے روکتے تو میں تمہاری جھولی بھر دیتا۔ میں اپنے گاؤں کا نواب ہوں۔ اب یہ ایک گھوڑی ہے۔ اچھی لگتی ہے تو لے جاؤ۔"

"نواب صاحب!" — حمید اللہ خان نے کہا — "تم جا کہاں رہے ہو؟"

"اپنی بہو کو لینے جا رہا ہوں" — اُس نے کہا — "میرا گھر تو اُجڑ ہی گیا ہے۔"

"اُس بہو کو لینے جا رہے ہو جسے اپنی بے نکاحی بیوی بنانے کی کوشش کر رہے ہو؟" — میں نے پوچھا۔

اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور وہ کچھ نہ بولا۔

"اپنے مرے ہوئے بیٹے کی بیوہ کو داشتہ بنا رہے ہو؟" — حمید اللہ خان نے کہا — "ہم نے تمہیں لُوٹنے کے لئے نہیں روکا۔"

"کون ہو تم دونوں؟" — اُس نے دھیمی سی آواز میں پوچھا۔

"مت پوچھو ہم کون ہیں" — میں نے کہا — "پہلے تمہارا گھر خالی ہوا ہے اور تمہارا بیٹا قتل ہوا ہے۔ تم نہ بتاتے تو بھی ہمیں معلوم تھا کہ تمہارا گھر اُجڑ گیا ہے۔ اگر اُس لڑکی کو اپنے گھر رکھو گے تو تمہارے گھر کو آگ لگے گی اور تم قتل ہو گے۔"

"یہیں سے واپس چلے جاؤ" — حمید اللہ خان نے کہا — "اگر اس

لڑکی کے گاؤں جا کر تم نے اُسے دھمکیاں دیں تو زندہ اپنے گاؤں نہیں پہنچ سکو گے۔"

"تمہارا اس لڑکی کے ساتھ کیا تعلق ہے؟" — اُس نے ڈری ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

"تم وہ کام کرو جو ہم نے کہا ہے" — میں نے کہا — "قانونی طور پر بھی اس لڑکی پر تمہارا کوئی حق نہیں رہا۔ تم اُسے اور اُس کے باپ کو دھمکیاں دیتے ہو۔ اُس رقم کو بھول جاؤ جو تم نے اُس کے باپ کو دی تھی۔"

"ایک بات بتاؤ" — اُس نے پوچھا — "میرے گھر میں ڈاکہ تم نے تو نہیں ڈالا تھا؟"

"ہم نے تمہیں کہا ہے کہ ہم سے کچھ نہ پوچھو" — میں نے اُس سے کہا — "ہم تمہارے فائدے کے لئے کہہ رہے ہیں کہ یہیں سے واپس چلے جاؤ اور اپنا گھر اور اپنی جان بچاؤ۔ اس لڑکی کو بھول جاؤ اور تمہارا جو مال ڈکیتی میں جا چکا ہے اُسے بھی بھول جاؤ۔"

اُس کے گھر ڈکیتی کی واردات ہو چکی تھی، اور اُس کا بیٹا بھی مارا گیا تھا۔ نقصان کے علاوہ اُس پر دہشت سوار تھی۔ وہ پہلے ہی خوف کا مارا ہُوا تھا۔ اب وہ کانپنے لگا۔

"چلا جاتا ہوں" — اُس نے کہا۔

"گھوڑی پر سوار ہو جاؤ" — حمید اللہ خان نے کہا — "اور فوراً اپنے گاؤں پہنچو۔"

وہ بڑی تیزی سے گھوڑی پر سوار ہُوا اور وہ آہستہ آہستہ جانے کی بجائے گھوڑی کو ایڑ لگا کر ایک سیکنڈ میں غائب ہو گیا۔ گھوڑی سرپٹ دوڑتی گھاٹی چڑھ گئی۔ ہم نے اوپر آ کر دیکھا۔ وہ بہت دُور نکل گیا تھا۔

❖

ہم وہاں سے چلے اور شمّو کے گاؤں پہنچے۔ شمّو کے گھر گئے اور اُسے، اُس کے باپ اور اُس کی ماں کو بتایا کہ اب یہ شخص اس گاؤں میں نہیں آئے

گا۔ شمو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔

ہم اپنے خفیہ ٹھکانے پر جا پہنچے۔ اتنا پیدل سفر کر کے ہم تھک گئے تھے ہم بیٹ گئے۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ تیرہ چودہ سال عمر کا ایک لڑکا دوڑتا آیا۔ اس نے بتایا کہ گاؤں میں پولیس آئی ہے اور اس نے گاؤں کے تمام آدمیوں کو گھروں سے باہر نکال کر ایک جگہ اکٹھا کر لیا ہے اور عورتوں کو الگ کھڑا کر لیا ہے۔

"پولیس کے کتنے آدمی ہیں؟" ——میں نے پوچھا۔

"آٹھ نو ہیں" —— لڑکے نے جواب دیا۔

"وہ کچھ کہتے ہیں؟"

"سب کو گالیاں دے رہے ہیں" —— لڑکے نے کہا —— "دھکے مار مار کر گھروں سے باہر نکال رہے ہیں۔ میں ایک مکان کے پیچھے تھا۔ مجھے پولیس کے کسی آدمی نے نہیں دیکھا۔ میں تمہاری طرف دوڑا آ گیا۔"

یہ تھا ہمارا امتحان۔ گاؤں والوں نے ہمارے لئے جو قربانیاں دی تھیں اب ان کی قیمت ادا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ اپنے امتحان میں پورے اُترے تھے۔ اب ہماری باری تھی۔ میں نے جب یہ سُنا کہ پولیس نے عورتوں کو الگ کر لیا ہے تو میرا خون کھول اُٹھا۔ مجھے جو خطرہ نظر آیا وہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ بے گناہ اور پسماندہ لوگ پولیس کے رحم و کرم پر تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ انگریزوں نے میری اور حمید اللہ خان کی گرفتاری کے لئے تھانوں میں تعینات تھانیداروں کو بہت زیادہ اختیارات دے رکھے ہوں گے۔ ہم دونوں عام قسم کے ڈاکو اور معمولی سے مجرم نہیں تھے۔ انگریزوں نے اتنی زیادہ رقم کے انعام کا جو اعلان کیا تھا اسی سے اندازہ کریں کہ میں اُن کے لئے کتنا اہم اور کتنا خطرناک مجرم تھا۔ کوئی تھانیدار میری گرفتاری کے سلسلے میں کسی بے گناہ آدمی کو مار ڈالتا تو بھی انگریز اُس سے باز پُرس نہ کرتے۔

دیہات کے لوگ تو ویسے بھی پولیس سے بہت ڈرتے تھے، اس گاؤں والوں نے تو جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ حمید اللہ اور مجھ جیسے مجرموں کو پناہ دینا بڑا سنگین جرم تھا۔ پولیس کی اس نفری کے ساتھ جو انسپکٹر یا سب انسپکٹر تھا، وہ گاؤں کی کسی

لڑکی کو الگ لے جاتا تو گاؤں والے اُسے نہیں روک سکتے تھے۔ اُن میں اتنی ہمت اور جرأت نہیں تھی۔ مجھے شمو کا خیال آ رہا تھا۔ اس گاؤں میں تین اور نوجوان لڑکیاں تھیں۔

اس لڑکے کو جو ہمیں اطلاع دینے آیا تھا یہ معلوم نہیں تھا کہ پولیس تھانے کی ہے یا ہیڈ کوارٹر کی۔ لڑکے نے یہ دیکھ لیا تھا کہ کوئی انگریز افسر ساتھ نہیں تھا۔ لڑکے نے یہ بھی بتایا کہ پولیس کے پاس رائفلیں ہیں۔

"حمید بھائی!" —— میں نے کہا —— "اللہ کا نام لو اور چلو۔ آج ہم نے احسان چکانا ہے خواہ جان چلی جائے۔ اس سے پہلے کہ پولیس کسی لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالے، ہمیں وہاں پہنچ جانا چاہیئے۔"

مجھے کچھ ایسی توقع تھی کہ حمید اللہ خان پولیس مقابلے سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ وہ نوابزادہ تھا اور بہت بڑی جاگیر کا مالک رہ چکا تھا۔ اُس کی زندگی نوابی شان و شوکت اور عیش و عشرت میں گزری تھی۔ حالات نے اُسے اس غار میں لا پھینکا تھا۔ وہ نوابوں، مہاراجوں اور انگریزوں کے خلاف جو باتیں کرتا تھا وہ اس لئے کرتا تھا کہ اُس کے باپ نے اُس کے ساتھ بے انصافی کی تھی اور اُسے نوابی کی جانشینی سے محروم کر دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کو بدکار اور بے غیرت کہا کرتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اُس کے دل میں ہندوستان کی آزادی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

میں اس عمر میں نفسیات کے صرف نام سے واقف تھا۔ عمر میں بہت آگے جا کر میں انسان کی نفسیات کو سمجھنے لگا تھا۔ حمید اللہ خان کی نفسیات کا ڈھانچہ کچھ ایسا بن گیا تھا کہ اپنے آپ کو ابھی تک نوابزادہ سمجھتا تھا مگر غریب سے دیہاتیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر بڑی خوشی سے دال روٹی بھی کھا لیتا تھا۔ اُس کی شخصیت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔

"ہاں سکندر!" —— اُس نے کہا —— "اگر ان معصوم اور بے ضرر دیہاتیوں کی عزت کی خاطر میری جان چلی جائے تو یہ جیل میں گلنے سڑنے اور پھانسی چڑھ جانے سے تو بہتر ہے۔"

"یہ سوچ لو سکندر یا"—— نور اللہ نے کہا —— "ہمارے پاس صرف دو بندوقیں اور ایک ریوالور ہے اور اُدھر آٹھ رائفلیں ہیں اور انسپکٹر کے پاس پستول ہوگا۔ ہمارے پاس گولیاں اور کارتوس کم ہیں۔"

"گولیاں پولیس کے پاس بھی کم ہوں گی" —— میں نے کہا —— "وہ ایمونیشن کی پیٹی ساتھ نہیں لاتے۔ کانسٹیبلوں کے پاس تھوڑا تھوڑا ایمونیشن ہوگا اور انسپکٹر کے پاس ریوالور کی صرف اٹھارہ گولیاں ہوں گی۔ میں نے جو سوچا ہے اگر میں اس میں کامیاب ہوگیا تو گاؤں کے لوگ بچ جائیں گے۔ ہم زیادہ فائر نہیں کریں گے۔ ہم پولیس کی نسبت بہتر پوزیشن میں ہوں گے۔ ہم نے پولیس کے سامنے نہیں جانا۔"

میں نے انہیں بتایا کہ میری سکیم کیا ہے۔ حمید اللہ خان تیار ہوگیا اور ہم چاروں غار سے نکلے اور چل پڑے۔ ایک بندوق میرے پاس، دوسری نور اللہ کے پاس تھی اور حمید اللہ کے پاس ریوالور تھا۔ بالے کے پاس خنجر تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چل پڑا۔

میری کہانی پڑھنے اور سننے والے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ ہم پولیس کے ساتھ ٹکر لینے کے لئے اس طرح چل پڑے تھے جس طرح فلموں میں ہیرو یا ولن بڑھکیں مارتے ہوئے چل پڑتے ہیں۔ میں اپنی کیفیت سناتا ہوں۔ یہ وہ کیفیت ہے جو مرنے سے پہلے یا پھانسی کی طرف جاتے ہوئے انسان کی ہوتی ہے۔ خودکشی سے پہلے بھی انسان پر یہی کیفیت طاری ہوتی ہوگی۔ اُس محاذ پر لڑنے والے فوجی پر بھی یہی کیفیت طاری ہوتی ہوگی جس محاذ پر بڑی سخت لڑائی ہو رہی ہو اور جہاں موت ہی موت ہو۔

نفسیات کے عالم کہیں گے کہ نفسیاتی طور پر ہم نارمل نہیں تھے۔ میں اُن کی رائے سے اختلاف نہیں کروں گا۔ مجھ پر اور حمید اللہ خان پر ایسے اثرات کام کر رہے تھے جنہوں نے ہمیں نارمل نہیں رہنے دیا تھا۔ اسے نیم پاگل پن بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہم موت سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری ٹکر موت کے ساتھ تھی۔ اسی لئے ہم ہر چیلنج قبول کر لیتے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کی حفاظت

کو ہم نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔

بعض اوقات انسان اتنا زیادہ خوفزدہ ہو جاتا ہے کہ خوف اُسے دلیر بنا دیتا ہے

میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ جُوں جُوں گاؤں کے قریب ہوتا جا رہا تھا مجھ پر خودکشی سے پہلے والی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔



گاؤں کا جو نقشہ میں نے پہلے بیان کیا ہے، اسے ذہن میں لائیں۔ گاؤں کے آدھے مکان ایک بلند ٹیکری کے پیچھے اور اس کے ساتھ لگے ہوتے تھے اور باقی مکان نیم دائرے میں دائیں طرف اور سامنے تھے۔ اس ٹیکری پر چند ایک درخت ایک دوسرے کے قریب قریب تھے اور ان کے نیچے گھاس اونچی تھی اور جھاڑیاں بھی تھیں۔

ہم جب اس ٹیکری کے قریب پہنچے تو جھک کر چلنے لگے۔ نیچے سے ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ذرا آگے جا کر ہمیں بیٹھ کر پاؤں پر سرکنا پڑا۔ ایک جگہ جہاں سے ٹیکری کی اُدھر والی ڈھلان شروع ہوتی تھی ذرا گہری تھی۔ اسے کھڈ کہہ لیں۔ اس پر تین چار درخت ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ میں ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا اور نیچے دیکھا۔

وہاں سے گاؤں کی چھتیں اور صحن نظر آ رہے تھے۔ تمام عورتیں مکانوں کے سامنے ایک جگہ اکٹھی زمین پر بیٹھی تھیں اور ان پر ایک کانسٹیبل رائفل لئے پہرے پر کھڑا تھا۔

دائیں طرف والے مکانوں کے پیچھے کچھ دُور قبرستان تھا۔ گاؤں کے تمام آدمی وہاں تھے۔ کانسٹیبل وہاں کھڑے تھے۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک انسپکٹر تھا۔ اتنی دُور سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ سب انسپکٹر ہے یا انسپکٹر۔ اُس زمانے میں پولیس کی پگڑیاں ہوتی تھیں۔ اس تھانیدار کی پگڑی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔

گاؤں کے آدمی وہ قبر کھود رہے تھے جس میں ہم نے خواجہ صاحب، شہناز

اور اپنے ایک ساتھی کو دفن کیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ گاؤں والوں نے وہی بیان دیا ہے جو ہم نے انہیں بتایا تھا۔ ان کی نشاندہی پر قبر کھودی جا رہی تھی۔

ہم دیکھتے رہے۔ میری نظر اُس کانسٹیبل پر بھی تھی جو عورتوں کے پاس پہرے پر کھڑا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کانسٹیبل نے کسی عورت کے ساتھ چھیڑخانی کی تو میں اُس پر بندوق فائر کر دوں گا۔ میں نے موٹے چھرّوں والے کارتوس بندوق میں ڈال رکھے تھے مگر یہ کانسٹیبل اس طرح کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا جیسے ان عورتوں کے ساتھ اُسے ذرا سی بھی دلچسپی نہ ہو۔

قبرستان میں تین چار پائیاں بھی رکھی ہوتی تھیں۔ یہ لاشوں کے لئے تھیں۔ قبر کی کھدائی ختم ہو گئی اور لاشیں باہر نکالی جانے لگیں۔ انہیں دفن ہوتے ابھی سات آٹھ دن ہی گزرے تھے۔ لاشیں ابھی اتنی خراب نہیں ہوتی ہوں گی۔ اتنی دُور سے لاشوں کے چہرے نظر نہیں آتے تھے۔

لاشیں نکال کر چارپائیوں پر ڈال دی گئیں پھر چار چار آدمی چارپائیاں اُٹھا کر وہاں لے آئے جہاں عورتیں بیٹھی ہوتی تھیں۔ انسپکٹر نے گاؤں کے دو بوڑھوں کو اپنے پاس بلایا اور انہیں کچھ کہا۔ وہ شاید ان سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اتنی دُور سے سنائی نہیں دیتا تھا۔ بوڑھوں نے نہ جانے کیا جواب دیا۔ انسپکٹر نے ایک تھپّڑ ایک بوڑھے کے مُنہ پہ اور ایک دوسرے بوڑھے کے مُنہ پر مارا۔

انسپکٹر عورتوں کے پاس چلا گیا اور انہیں دیکھنے لگا۔ اُس نے شمّو کو بازو سے پکڑ کر اُٹھایا پھر باری باری تین نوجوان لڑکیوں کو اُٹھایا اور چاروں کو الگ کھڑا کر دیا۔ وہ ان کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہنے لگا۔ اُس نے یقیناً یہ کہا ہو گا کہ سچ نہیں بولو گے تو ان لڑکیوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جائے گا۔

تین چار آدمی آگے آئے اور چاروں ہاتھ جوڑ کر انسپکٹر کو کچھ کہنے لگے۔ انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل نے انہیں تھپّڑوں اور گھونسوں سے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ انہیں چھوڑ کر انسپکٹر نے کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا۔ اُس نے کچھ کہا بھی ہو گا۔ دو کانسٹیبل لڑکیوں کے قریب آئے اور اُنہیں دھکّے دے دے کر ایک طرف لے جانے لگے۔ لڑکیوں نے رونا شروع کر دیا۔ ان میں دو نے انسپکٹر کے قدموں میں بیٹھ کر اُس کے

پاؤں پکڑ لیے۔ انسپکٹر نے ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے لڑکیوں کے بازو پکڑے اور انہیں مکانوں کی طرف دھکیل دھکیل کر لے جانے لگا۔

میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں چونکہ پولیس میں رہ چکا تھا اس لئے میں جانتا تھا کہ یہ انسپکٹر کیا کر رہا ہے۔ وہ گاؤں والوں سے کہہ رہا تھا کہ وہ سچ بولیں ورنہ ان کی لڑکیوں کو خراب کیا جائے گا۔ پولیس کے تفتیشی افسر دیہاتی علاقے میں تفتیش کے دوران ایسی دھمکیاں دیا کرتے تھے اور بعض افسر اس دھمکی کو عملی جامہ بھی پہنا دیا کرتے تھے۔ یہاں بھی مجھے یہی کچھ ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"نُور!" ــــ میں نے نُور اللہ سے کہا ــــ "بیٹھ کر بندوق کندھے سے لگاؤ اور پولیس والوں کے سروں کے اوپر دونوں نالیوں کے کارتوس چلا دو۔ خیال رکھنا چھرّے انہیں نہ لگیں، سَروں کے اُوپر سے گزر جائیں۔"

"میں ریوالور سے ایک گولی چلاؤں گا" ــــ حمید اللہ خان نے کہا۔

"پھر یوں کرو" ــــ میں نے کہا ــــ "ریوالور دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اس طرح فائر کرو کہ گولی پولیس والوں کے قریب زمین پر لگے۔"

"کسی کو لگ گئی تو کیا ہو گا!" ــــ حمید اللہ نے کہا ــــ "ان میں سے ایک بھی مر گیا تو اچھا نہیں ہو گا۔"

"نہیں!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں پولیس مقابلہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے کچھ اور سوچا ہے۔"

"تو کیا وہ جوابی فائر نہیں کریں گے؟" ــــ نُور اللہ نے پوچھا۔

"کریں" ــــ میں نے کہا ــــ "ہم فائر کر کے کھڈ میں ہو جائیں گے .... زیادہ باتیں نہ کرو۔"

ہم نے موٹے چھرّوں والے کارتوس بندوقوں میں ڈال رکھے تھے۔ یہ جب کسی کے سر کے اُوپر سے یا دائیں بائیں سے گزرتے ہیں تو بہت بھیانک سناٹا پیدا کر جاتے ہیں۔ میرے اشارے پر پہلے نُور اللہ نے ایک پھر دوسرا کارتوس فائر کیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے دو کارتوس فائر کئے پھر حمید اللہ خان نے ریوالور

دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر ایک گولی فائر کی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی گولی کی گرد پولیس کے دو آدمیوں کے قریب زمین سے اُٹھی۔

انسپکٹر اور اُس کے آدمی اس طرح غائب ہو گئے جیسے وہاں آتے ہی نہیں تھے۔ کوئی کسی مکان کے اندر اور کوئی کسی مکان کے پیچھے چلا گیا۔ دھماکوں اور پھر سروں کے اُوپر سے گزرتے چھرّوں کی چیخوں نے اُن کا خون خشک کر دیا ہو گا۔ انسپکٹر اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا تھا کہ اپنے کانسٹیبلوں کو جوابی فائر کا حکم دیتا۔ اُس نے جان لیا ہو گا کہ گولیاں اُوپر سے آتی ہیں اور فائر کرنے والے بڑی اچھی اور محفوظ آڑ میں ہیں اور سامنے ہونا خود کُشی ہو گی۔

میں کھڑا ہو گیا اور ایک درخت کی آڑ میں ہو کر انسپکٹر کو للکارا۔

"تم گھیرے میں آتے ہوتے ہو"—— میں نے بلند آواز سے کہا —— "ہم اُوپر سے تمہارے ایک آدمی کو بھی زندہ نہیں رہنے دیں گے ....اگر انسپکٹر سامنے آجاتے تو ہم گھیرا اُٹھا لیں گے۔ ہمارے پاس ایمونیشن کے بکس بھرے ہُوتے ہیں ....آگے آؤ تھانیدار صاحب! ہمارے ساتھ بات کرو۔ یہ مردوں کا وعدہ ہے۔ ہم گولی نہیں چلائیں گے۔"

گاؤں پر سناٹا طاری رہا۔ گاؤں کے لوگ بھی مکانوں کے اندر چلے گئے تھے۔ سامنے میدان میں تین چار پائیوں پر خواجہ صاحب، شہنازا ور ہمارے ایک ساتھی کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں اُدھر سے جواب کا انتظار کرتا رہا۔

"مت ڈرو انسپکٹر!"—— میں نے ایک بار پھر اعلان کیا —— "زندہ رہنا چاہتے ہو تو پھر اِدھر اوپر آجاؤ۔"



ایک مکان کے پہلو سے انسپکٹر سامنے آگیا۔

"اِس ٹیکری کی طرف آجاؤ"—— میں نے کہا —— "میں تمہیں اُوپر بُلا رہا ہوں۔"

وہ واقعی دلیر آدمی تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ ٹیکری کی طرف چل پڑا۔ اُس نے ریوالور بیلٹ کے ساتھ لگے ہُوتے پوچ میں ڈال لیا۔ ہم تینوں اوٹ

میں رہے۔ خطرہ تھا کہ ہم میں سے کوئی سامنے ہُوا تو کوئی کانسٹیبل گولی مار دے گا۔ انسپکٹر ٹیکری کے دامن میں رک گیا۔ اُسے حمید اللہ خان ریوالور کی گولی سے مار سکتا تھا۔

"کیا میں اُوپر آؤں؟" —— اُس نے بلند آواز سے پوچھا —— "یا تم آؤ گے؟"

میں آڑ سے نکل کر سامنے ہو گیا۔ وہ بہت قریب تھا۔ میں نے دیکھا۔ وہ انسپکٹر ہی تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ اُس کے کندھے پر عہدے کا نشان دیکھا۔

"تم ہی اُوپر آجاؤ"—— میں نے کہا —— "تم جیسے دلیر آدمی کبھی کبھی نظر آتے ہیں۔"

وہ اُوپر آگیا۔ اُس کے چہرے پر تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی داڑھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ کمزور دل آدمی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس کے چہرے پر جلال سا تھا۔ اُس کے دل میں یہ خطرہ ضرور ہو گا کہ میں اُسے گولی مار دوں گا یا اُسے یرغمال بنا لوں گا، لیکن اُس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ نڈر اور بے خوف ہے اور وہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ حقیقت ہے کہ میں اُس سے متاثر ہُوا۔ وہ میرے سامنے آکر رُک گیا۔ میرے تینوں ساتھی اُٹھ کھڑے ہوتے۔ انسپکٹر نے ہم چاروں کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے ہمیں وہ کچھ بھی نہیں سمجھتا۔

"تم تو سکندر معلوم ہوتے ہو"—— اُس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا —— "کہو، مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"ہاں"—— میں نے کہا —— "میں سکندر ہوں۔ میں تمہارے ساتھ سودا کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے۔ وہ بزدل ہندو ہیں جو ایک بوڑھے آدمی کو، ایک عورت کو اور ایک اور بے گناہ اور نہتے آدمی کو قتل کر گئے ہیں۔ ان کا جو سرغنہ تھا اُس کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ اُس کی لاش اُس طرف پانی میں پڑی ہے۔"

"قتل کا پرچہ کراؤ"—— اُس نے کہا —— "میں انہیں آسانی سے پکڑ سکتا

ہوں۔ اُنہوں نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ایک ہی بار تین قتل کر آتے ہیں۔ اُنہوں نے تمہاری نشاندہی کی تھی۔"

"میں اتنا احمق نہیں کہ تھانے میں آکر پرچہ کراؤں اور خود گرفتار ہو کر پھانسی چڑھ جاؤں" — میں نے کہا — "جنہوں نے مرنا تھا مر گئے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ صرف یہ بات کرنا چاہتا ہوں کہ میرے گناہوں کی سزا ان معصوم لوگوں کو نہ دو۔ تم پُرانے انسپکٹر معلوم ہوتے ہو۔ تم تو جانتے ہو کہ ڈاکو کسی گاؤں میں ٹھکانہ کرتے ہیں تو اُس گاؤں والے ڈاکوؤں کو کیوں پناہ دیتے ہیں اور ڈاکو اُنہیں کیا قیمت دیتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے اس گاؤں میں پناہ لی تھی اور تم آکر ان کی ہڈیوں کو گھسیٹ رہے ہو۔ ہم نے جو گولیاں تمہارے سر کے اُوپر سے گزاری تھیں وہ تمہارے سینے میں سے بھی گزار سکتے تھے لیکن میں نے تمہاری پگڑی دیکھ لی اور اپنا یہ ایمان قائم رکھا کہ میرے ہاتھ سے کوئی مسلمان قتل نہیں ہوگا۔ میں تمہیں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان معصوموں کو تنگ نہ کرو۔ انہوں نے تمہیں کیا بیان دیا ہے؟"

اُس نے گاؤں والوں کا وہی بیان سنایا جو ہم نے انہیں بتایا تھا۔ یہ انسپکٹر اُن سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ تین آدمی کون تھے۔ گاؤں والے نہیں بتا رہے تھے۔

"میرے انسپکٹر بھائی!" — میں نے کہا — "میں اپنے جرم پر نادم نہیں ہوں۔ میں نے ایک غریب لڑکی کی عزت بچانے کے لئے ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کیا ہے۔ اب دہشت گرد بن کر انگریزوں کے خلاف زمین دوز جنگ لڑوں گا۔ ڈاکو نہیں بنوں گا، مظلوموں کا ساتھ دوں گا۔ تم بھی مسلمان ہو، ان بے گناہ اور مظلوم لوگوں کو تنگ نہ کرو۔"

میں بولتا چلا جا رہا تھا اور وہ پوری توجہ سے سُن رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" — انسپکٹر نے حمید اللہ خان کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"اگر تم اسے نہیں پہچانتے تو میں نہیں بتاؤں گا" — میں نے جواب دیا — "میں سکندر ہوں۔ خدا کی قسم، تم کہو گے کہ اس گاؤں کے لوگوں کی عزت کی

خاطر جان دے دو تو نکالو ریوالور اور میرے سینے میں گولی مار دو۔"

"میں نیچ ذات کا آدمی نہیں ہوں" — اُس نے طنزیہ لہجے میں کہا — "میں تمہاری یہ بات مان لیتا ہوں کہ ان بے چاروں کو تنگ نہ کروں، لیکن تم یہ کہو کہ چونکہ تم مسلمان ہو اور تم نے ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کیا تھا اور اب تم انگریزوں کے خلاف لڑنے کا ارادہ رکھتے ہو تو میں متاثر ہو کر تمہیں گرفتار نہیں کروں گا تو یہ امید دل سے نکال دو۔ میں تمہاری تعریف ضرور کروں گا۔ ذات تمہاری بھی نیچ نہیں ہے اور میں نے پہلے بھی تمہاری بہت تعریف سُنی ہے، لیکن تمہیں زندہ پکڑوں گا۔ دُور سے گولی نہیں ماروں گا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں انگریزوں کی غلامی میں خوش ہوں۔ میں نمک حرام نہیں کہلانا چاہتا، اور یہ بھی نہ سمجھنا کہ میں تمہارے ڈر سے یا موت کے ڈر سے تمہیں گرفتار نہیں کر رہا۔ میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔"

"تم مرد کے بچے ہو" — میں نے دل سے اُس کی تعریف کرتے ہوئے کہا — "میں اتنا اچھا ہوتا تو تمہیں ہم چاروں اُٹھا کر لے جاتے۔"

"یہ بھی سُن لو سکندر!" — اُس نے کہا — "جس دن میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کا ارادہ کر دوں گا، پہلے نوکری سے استعفیٰ دوں گا اور پھر اپنا ارادہ پورا کروں گا ... جانے دو ان باتوں کو۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ گاؤں والوں کو مزید پریشان نہیں کروں گا، لیکن مجھے جھوٹی رپورٹ پیش کرنی پڑے گی۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا کہ تینوں لاشوں کو دفن کرا دیتا اور واپس جا کر رپورٹ لکھتا کہ اس گاؤں میں کوئی مشکوک آدمی نہیں آیا، لیکن نشاندہی کرنے والے ہندو ہیں۔ وہ مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ تم خود سب انسپکٹر رہ چکے ہو۔ سب جانتے ہو۔ یہ لاشیں ساتھ لے جانی پڑیں گی اور گاؤں والوں کا بیان رپورٹ میں لکھ کر اپنی رائے یہ دوں گا کہ گاؤں والوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ دو تین آدمی کون تھے جو تین چار روز یہاں ٹھہرے تھے۔ میں اپنے ڈی ایس پی کو منوا لوں گا کہ گاؤں کے لوگ بجا طور پر خوفزدگی کے عالم میں ان کے مشکوک اشخاص کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔"

"ان ہندوؤں کا کیا کرو گے؟"

"وہ میں سنبھال لوں گا" — اُس نے جواب دیا — "میں اُن کے پاؤں تلے سے زمین نکال دوں گا۔ اُنہیں کہوں گا کہ پہلے تم اندر چلو، تم نے تین انسان قتل کئے ہیں۔ اس کے بعد وہ نہیں بولیں گے ..... اب کہو کیا ارادہ ہے؟"

"میں جو چاہتا تھا وہ تم نے پورا کر دیا ہے" — میں نے کہا اور ہاتھ آگے بڑھایا — "میں تم سے دوستوں کی طرح رخصت ہونا چاہتا ہوں۔"

"دوست نہیں، دشمن کہو" — اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور بڑی سنجیدگی سے بولا — "تمہیں شاید میں ہی گرفتار کروں گا۔"

"اپنا نام تو بتا دو۔"

"انسپکٹر فضل حسین" — اُس نے جواب دیا — "میں اس علاقے کا ایس ایچ او ہوں۔ زندہ رہنا ہے تو میرے علاقے سے نکل جاؤ۔"

"انسپکٹر فضل حسین!" — میں نے کہا — "تم نے کہا تھا کہ تم مجھے دُور سے گولی نہیں مارو گے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھی تمہیں دُور سے گولی نہیں ماروں گا .... جاؤ، لاشیں اُٹھا لے جاؤ اور ان عزبیوں کو بخش دو۔"

وہ ٹیکری سے اُتر گیا۔ ہم اُسے دیکھتے رہے۔ گاؤں میں پہنچ کر اُس نے اپنے کانسٹیبلوں کو بلایا، کچھ آدمی گاؤں سے لئے۔ گاؤں کے لوگوں سے کچھ کہا۔ سب لوگ اور عورتیں بھی اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ انسپکٹر فضل حسین نے تینوں چارپائیاں اٹھوائیں اور گاؤں سے نکل گیا۔

جرأت میں جادُو ہے۔ جادُو میں جرأت نہیں۔

جادُو گھر بیٹھ کر، کہیں چھُپ کر چلایا جاتا ہے۔ جرأت باہر آکر دکھائی جاتی ہے۔

میں نے اُس روز جرأت کا جادُو دیکھا۔ یہ انسپکٹر فضل حسین کی جرأت تھی۔ میں مفرور قاتل تھا۔ انسپکٹر فضل حسین کو مجھ پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ جب میری طرف پیٹھ کرکے جا رہا تھا تو میں اُسے گولی مار سکتا تھا۔ وہ مجھے چیلنج کرکے جا رہا تھا لیکن میں صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ میں اس شخص پر کارتوس فائر نہیں کر سکوں گا۔ اگر میری بندوق سے کارتوس فائر ہو بھی گیا تو یہ اس شخص کو نہیں لگے گا۔

یہ اُس کی جرأت کا جادُو تھا جس نے میرے ارادوں کو ہلا ڈالا تھا۔ اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تھی۔ اُس کے گہرے شربتی رنگ کی آنکھوں سے جیسے شعاعیں نکل رہی تھیں جو نظر تو نہیں آتی تھیں لیکن میں ان شعاعوں کو اپنی آنکھوں میں داخل ہوتا اور اپنی ذات میں سرایت کرتا محسوس کر رہا تھا۔

میری جرأت پامال ہو گئی تھی۔

میں اُسے اسی طرح خراجِ تحسین پیش کر سکتا تھا کہ بندوق جھکا لوں۔

"کیا تم احمق نہیں ہو سکندر؟" — ہم جب وہاں سے واپس آرہے تھے تو حمید اللہ خان نے کہا — "اسے گولی کیوں نہ مار دی؟ یہ انسپکٹر ہمارے لئے خطرہ بن گیا ہے۔"

"تجربے سے کچھ سیکھو سکندر!" — نور اللہ نے کہا — "اُس کافر جگموہن کو بھی تم نے زندہ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ جگموہن اور اس کے ساتھیوں کو باندھنے کی کیا ضرورت ہے؟ گولی مارو مگر تم نہ مانے۔ اب دیکھ لو۔ جگموہن کیا کر گیا ہے۔ اُس کے ساتھیوں نے کیا کر دکھایا ہے۔"

"دیکھا جاتے گا بھاتیو!"—— میں نے کھوکھلی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا— "کبھی کوئی دشمن بھی کام آجاتا ہے"—— میں نے دو چار سیکنڈ سوچ کر کہا —" اگر ہم اسے گولی مار دیتے تو انگریز پولیس افسر اس گاؤں کے بچوں اور بوڑھوں سے بھی انتقام لیتے۔"

یہ تو باتیں تھیں جو میرے دوستوں نے میرے ساتھ اور میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ کیں لیکن میں جو محسوس کر رہا تھا وہ ان باتوں سے بہت مختلف تھا۔

اب ہمارے سامنے بڑا پیچیدہ مسئلہ آگیا تھا۔ گاؤں والوں کے سر سے ابھی خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ خواجہ صاحب اور شہناز کی لاشیں شہادت دیتی تھیں کہ میں اس گاؤں میں رہا ہوں۔ حمید اللہ کی موجودگی کا بھی شک ہو سکتا تھا۔ میں حیران تھا کہ انسپکٹر فضل حسین انگریز افسروں سے کس طرح منواتے گا کہ جب پولیس کا چھاپہ پڑا اُس وقت میں یہاں سے جا چکا تھا؟

میں گاؤں والوں کے لئے پریشان تھا لیکن انہیں بچانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اب تو ہمیں اپنے آپ کو بچانا تھا۔ انسپکٹر فضل حسین تو دیکھ گیا تھا کہ ہم یہاں ہیں۔ وہ اگر اپنے افسروں کو نہ بتاتا کہ ہم اس علاقے میں موجود ہیں تو بھی انگریز افسر سمجھ جاتے کہ ہم ادھر ہی ہیں۔ بہرحال ہمیں اس علاقے سے نکلنا تھا لیکن جاتے کہاں؟ نوراللہ اور بالا نے دو جگہیں بتائیں لیکن وہ موزوں نہیں تھیں۔

میرا دھیان قطب الدین کی طرف چلا گیا۔ وہ جذباتی اور جسمانی طور پر ہمارے ساتھ تھا۔ وہ بڑا پکا آدمی تھا۔ اُس نے وثوق کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ گاؤں کے کئی ایک جوان آدمیوں کو ہمارے گروہ کے لئے تیار کر لے گا۔ میں نے سوچا کہ اُس کے گاؤں چلے چلیں لیکن وہاں خطرہ یہ تھا کہ اُس علاقے کا تھانیدار قطب کے گھر میں میرے پاس آچکا تھا۔ میں نے اُسے اپنا چہرہ تو نہیں دیکھنے دیا تھا پھر بھی خطرہ تھا کہ وہ مجھے پہچان لے گا۔ شاہ مغل اور علیا تو مجھے پہچانتے ہی تھے۔

اس گاؤں میں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس گاؤں سے ڈیڑھ دو میل دُور پہاڑیوں اور جنگلات کا علاقہ تھا۔ اس کا جائزہ لینا تھا اور یہ کام قطب الدین ہی کر سکتا تھا۔ میں نے حمید اللہ خان کے ساتھ بات کی تو فیصلہ ہوا کہ نوراللہ کو قطب الدین کے گاؤں بھیجا جاتے اور وہ قطب الدین کے سامنے یہ مسئلہ رکھے۔

نوراللہ اُس گاؤں کا راستہ جانتا تھا اور علاقے سے بھی واقف تھا۔ وہ ریل گاڑی اور لاری سے بھی سفر کر سکتا تھا کیونکہ وہ ہماری طرح مفرور مجرم نہیں تھا۔ وہ اُسی وقت روانہ ہو گیا۔



ہمیں اب بہت محتاط اور چوکنا ہو کے رہنا تھا۔ جن پہاڑیوں کے غار میں ہم رہتے تھے یہ علاقہ انسپکٹر فضل حسین کے تھانے کا تھا۔ وہ اس سے ضرور واقف ہوگا۔ تھانیدار اپنے علاقے کے چپے چپے سے واقف ہوتے ہیں۔ اُسے یہ شک ضرور ہوگا کہ ہم ان پہاڑیوں کے اندر چھپے ہوتے ہوں گے۔ ہم نے پہرے کا یہ انتظام کیا کہ گاؤں کے لڑکوں سے کہا کہ دن کے دوران ایک دو لڑکے اونچی ٹیکری پر رہا کریں اور پولیس آتی نظر آتے تو ہمیں اطلاع دے دیں۔

رات کو ہم ایسا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔ گاؤں والوں کو ہم پہلے ہی بہت پریشان کرا چکے تھے۔ انہیں مزید امتحان میں ڈالنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ بالے کو ہم نے جاسوسی کے لئے بھیج دیا۔ یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا کہ انسپکٹر فضل حسین جو لاشیں لے گیا ہے ان کا کیا بنا ہے۔

سات آٹھ دن گزر گئے۔

پولیس ادھر نہ آتی۔ بالا یہ خبر تیسرے دن ہی لے آیا تھا کہ تینوں لاشوں کو پولیس ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا تھا، پھر انہیں لاوارث قرار دے کر کہیں دفن کر دیا گیا۔

نوراللہ واپس آگیا۔ قطب الدین نے اُسے بتایا تھا کہ میں اُس کے گاؤں سے آگیا تو تھانیدار ساتویں آٹھویں روز قطب الدین کے گھر آیا۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میں ابھی ایک خاص وظیفے کے لئے یہاں رُکا ہوا ہوں اس لئے وہ سات آٹھ روز بعد آتے۔ سات آٹھ روز کے اندر اندر قطب الدین واپس اپنے گاؤں پہنچ گیا تھا۔

ساتویں روز تھانیدار اُس کے گھر آیا۔ میں وہاں نہیں تھا۔ اُس نے قطب الدین سے پوچھا تو اُس نے تھانیدار کو بتایا کہ قبلہ شاہ صاحب جس طرح اچانک آتے تھے اسی طرح اچانک چلے گئے ہیں۔ میں نے عائشہ اور قطب الدین کو جو بتایا تھا، انہوں نے وہی تھانیدار سے کہہ دیا۔

"تھانیدار نے قطب کو دوست بنا لیا ہے" — نُور اللہ نے ہمیں بتایا — "وہ تین چار مرتبہ قطب کے گھر آچکا ہے۔ عائشہ کے ساتھ مجھے الگ بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اُسی کی خاطر آتا ہے لیکن تھانیدار کی نیّت خراب نہیں۔ وہ عائشہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایک سال ہُوا اُس کی بیوی مر گئی ہے۔ عائشہ شاید اُس کے ساتھ شادی کر لے گی۔"

نور اللہ نے ایک اور بات بتائی جو اُسے قطب الدین نے سنائی تھی۔ یہ بات یوں ہوئی کہ ایک روز یہ تھانیدار قطب کے گھر آیا تو کہنے لگا کہ وہ بڑی ضروری بات کرنے آیا ہے۔

"یہ شاہ صاحب جو تمہارے گھر میں ٹھہرے تھے مشکوک لگتے ہیں" — تھانیدار نے قطب الدین سے کہا — "تم نے سُنا ہوگا کہ پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے ایک انگریز ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو قتل کر دیا تھا اور وہ پولیس کی حراست سے مفرور ہے، اور یہ شخص ادھر کے ایک تھانے کے علاقے میں نظر آیا تھا۔ تھانیدار نے اُسے پہچان لیا تھا لیکن وہ بھاگ نکلا۔ پولیس نے اُس کا تعاقب کیا تھا۔"

تھانیدار نے جیب سے ایک فوٹو نکال کر قطب الدین کو دکھایا۔ یہ میرا فوٹو تھا

"اس فوٹو میں اس کی داڑھی نہیں" — تھانیدار نے قطب سے کہا — "وہ جب پچھلے تھانے کے علاقے میں دیکھا گیا تھا تو اُس کی داڑھی تھی جو ذرا لمبی تھی۔ اب سُنا ہے کہ اُس کی داڑھی چھوٹی ہے۔ تم ذرا غور سے دیکھو داڑھی کے باوجود چہرہ پہچانا جا سکتا ہے۔"

"نہیں ہاشمی صاحب!" — قطب الدین نے یہ فوٹو اچھی طرح دیکھ کر تھانیدار

سے کہا — "داڑھی ہو یا نہ ہو، یہ چہرہ ہمارے شاہ صاحب کا نہیں ....آپ کے دل میں یہ شک کس نے ڈالا ہے؟"

"اُسی تھانیدار نے جس نے اس مفرور کا تعاقب کیا تھا" — تھانیدار نے جواب دیا — "میں سیشن کورٹ میں ایک مقدمے کی پیشی پر گیا تھا۔ وہاں اُس تھانیدار کے ساتھ ملاقات ہُوئی تو پیروں فقیروں کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے ان شاہ صاحب کا ذکر کیا تو وہ تھانیدار کہنے لگا کہ محتاط رہنا، ایک مفرور مجرم بھی اسی علاقے میں پیروں کے بھیس میں پھر رہا ہے، پھر اُس نے مجھے ساری بات سنائی۔"

"یہ کوئی بہروپیا نہیں تھا" — قطب الدین نے کہا — "آپ بھی اُن کے پاس آتے تھے۔"

"میں آیا تو تھا" — تھانیدار ہاشمی نے کہا — "لیکن میں اُن کا پورا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ ناک، ٹھوڑی اور داڑھی دیکھی تھی جو لمبی نہیں تھی۔ وہ اُس وقت وظیفے کی حالت میں تھے اور انہوں نے آدھے چہرے پر کپڑا ڈال رکھا تھا۔"

"میں کوئی بچّہ تو نہیں ہاشمی صاحب!" — قطب الدین نے کہا — "میرے پاس وہ اتنے دن رہے ہیں۔ میں نے اُن کا پورا چہرہ، ننگا سر اور پورا جسم دیکھا تھا۔ میرا یہ مکان ویسا ہی ہے جیسے پہلے ہُوا کرتا تھا۔ یہ کچا مکان ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور اس میں جو تھوڑا بہت سامان ہے، اس میں بھی کوئی کمی بیشی نہیں لیکن میں اس طرح محسوس کرتا ہوں جیسے یہ مکان محل بن گیا ہے اور اس میں اللہ کی رحمت اتنی آگئی ہے کہ میری روح بھی سکون محسوس کرتی ہے۔ اس طرح لگتا ہے جیسے مجھے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ یہ سب شاہ صاحب کے مبارک قدم کی برکت ہے۔ وہ مجھے دعا دے گئے ہیں۔ وہ جب یہاں سے چلے گئے تو میرے دل کو بہت دکھ ہُوا لیکن گھر میں اور میری روح میں اتنا سکون اور اطمینان ہے کہ کبھی مجھے اس طرح بھی محسوس ہوتا ہے جیسے شاہ صاحب یہیں موجود ہوں۔"

"میرا مسئلہ کچھ اور ہے قطب بھائی!" — ہاشمی نے قطب سے کہا — "میں شاہ صاحب کے پاس یہی مراد لے کر آیا تھا کہ اس مفرور کا کھوج لگا دیں۔ مجھے دس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔"

قطب الدین نے ہاشمی کا شک بڑی اچھی طرح رفع کر دیا۔ نور اللہ نے یہ بات سنائی تو اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہم وہاں نہیں رہ سکتے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں وہاں چلا جاتا اور جتنا عرصہ وہاں رہتا شاہ صاحب بنا رہتا لیکن ہم جہاں تھے وہاں سے نکلنا تھا۔

نور اللہ اُس گاؤں سے ڈیڑھ دو میل دُور پہاڑی اور جنگلاتی علاقہ بھی دیکھ آیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ چھُپ کر رہنے کے لئے اور قطب الدین کے آدمیوں کو ٹریننگ دینے کے لئے وہ جگہ اچھی ہے۔ قطب الدین نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ ہم سب اُس کے گاؤں میں جانے کی بجائے سیدھے اُس پہاڑی علاقے میں پہنچ جائیں۔ آگے قطب الدین ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کر دے گا۔

اُس زمانے میں ایک سہولت میسر تھی۔ آبادی آج کی نسبت بہت ہی کم تھی۔ آبادیاں بہت دُور دُور تھیں۔ دیہاتی علاقوں میں کوئی پکی سڑک نہیں تھی۔ کچے راستے تھے اور پگڈنڈیاں تھیں۔ ویران اور بیابان علاقوں سے کوئی انسان گزرتا ہی نہیں تھا۔ صرف تھانیداروں کو اپنے اپنے علاقوں سے واقفیت ہوتی تھی۔

ہم نے فیصلہ کر لیا کہ وہیں چلے چلتے ہیں۔



"حمید بھائی!" — میں نے ایک دو روز بعد حمید اللہ خان سے پوچھا — "تم کیا محسوس کر رہے ہو؟"

"کیوں پوچھتے ہو؟" — اُس نے پوچھا۔

"میں شاید تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں" — میں نے جواب دیا — "مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنے آپ کو بھولتا جا رہا

ہوں۔ اگر میری ذہنی اور جسمانی حالت یہی رہی تو میں اپنی شناخت خود بھی نہیں کر سکوں گا۔"

"پولیس تمہاری شناخت کر لے گی" — حمید اللہ نے سنجیدگی سے کہا — "تم اپنے آپ کو بھول سکتے ہو پولیس تمہیں نہیں بھولے گی۔ تم اپنے آپ کو بدلا ہُوا محسوس کرتے رہو، تمہارا فوٹو جو تمام تھانوں میں موجود ہے نہیں بدل سکتا .... اپنے آپ کو سنبھالو سکندر!"

"لیکن میں خواجہ صاحب اور شہناز کو کس طرح ذہن سے اُتار دوں!" — میں نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا — "میں جب تک جگموہن کے ایک ایک ساتھی کو اپنے ہاتھوں قتل نہیں کر لوں گا مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"تم مرواؤ گے" — حمید اللہ خان نے کہا اور ذرا سوچ کر بولا — "میری اپنی حالت تم جیسی ہی ہے۔ میں یہاں تک کہوں گا کہ میں انسانیت کی سطح سے گرتا جا رہا ہوں۔ میرے اندر درندگی پیدا ہوتی جا رہی ہے لیکن میں اس درندگی کا صحیح استعمال کروں گا۔"

ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ بالا آ گیا۔ وہ وہاں سے کوئی ایک میل دُور ایک جگہ دیکھ آیا تھا جو ہمارے لئے زیادہ موزوں اور محفوظ تھی۔ وہ کہتا تھا کہ ہم چل کر دیکھ لیں۔

"کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہاں کوئی انسان رہتا ہے" — بالے نے کہا — "اسی طرح کی پہاڑیاں ہیں۔ درختوں، گھنی جھاڑیوں، سرکنڈوں اور اونچی گھاس کا جنگل ہے۔ بالکل جیسے یہاں ہے ایسے ہی وہاں تھوڑی سی جگہ پانی جمع ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ اس پانی میں تین یا چار چھوٹے مگرمچھ ہیں۔ اس کے قریب سے ہی خطرہ مول لے کر اندر جا سکتے ہیں۔ پہاڑیوں میں اسی طرح ایک غار بنا ہُوا ہے جو اونچا بھی ہے اور زیادہ کھُلا بھی۔ پہاڑیوں کے اندر سے اگر آگے نکل جاؤ تو یہ پہاڑیاں دریا میں جا ختم ہوتی ہیں۔ وہاں دریا کا پانی پہاڑیوں کے اندر آ جاتا ہے۔ اُس طرف سے کوئی آدمی اندر نہیں آ سکتا۔"

"اگر ہمیں اُدھر سے بھاگنا پڑے تو کیا کریں گے؟" — حمید اللہ خان

نے پوچھا۔

"اُدھر سے تیر کر آ بھی سکتے ہیں اور تیر کر نکل بھی سکتے ہیں"—— بابے نے جواب دیا ——"میں یہ بتا رہا ہوں کہ کوئی مان ہی نہیں سکتا کہ ان پہاڑیوں کے اندر کوئی مشکوک اور مفرور آدمی چھپے ہوئے ہیں کیونکہ اُدھر دریا ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ دریا ہماری حفاظت کرے گا۔ اگر جنگل کی طرف سے کوئی اندر آ بھی گیا تو ہم دریا کی طرف سے نکل جائیں گے۔"

"رات کو چل کر دیکھیں گے"—— میں نے کہا۔

"نہیں!"—— بابے نے کہا ——"رات کو وہاں چاندنی کے باوجود کچھ نظر نہیں آئے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم رات کو اندر جائیں تو گھاس میں سے کوئی مگرمچھ ہم میں سے کسی کی ٹانگ پکڑ کر پانی میں گھسیٹ لے جائے۔ ابھی چلو۔ میں تمہیں ایسے راستے سے لے جاؤں گا جو دراصل راستہ نہیں ہے۔ اُس طرف جانے کا یہ فائدہ ہوگا کہ کوئی ہمیں دیکھ نہیں سکے گا"—— بالا یہ بات کہہ کر چُپ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ میں اُس سے پوچھنا ہی چاہتا تھا لیکن وہ بول پڑا ——"بھائی نوابزادے! ہم تمہاری دوستی پال رہے ہیں۔ تم نے ہماری بہت پرورش کی ہے لیکن یہ سوچو کہ ہم خالی ہاتھ گھوم پھر رہے ہیں اور پکڑے جانے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔"

"کیا میرا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہو؟"—— حمید اللہ نے پوچھا۔

"ایسا سوچو بھی نہیں"—— بابے نے کہا ——"مجھے اور نور اللہ کو ایک دو وارداتیں کر لینے دو۔ ہم نے اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور بچوں کو بھی روٹی کھلانی ہے۔ ہم نے شمو کے سُسر کے گھر جو واردات کی تھی، اُس کا آدھا مال گاؤں والوں کو دے دیا تھا۔ تم نے ہمیں حصہ تو پورا دیا تھا لیکن یہ رقم کب تک چلے گی!"

"ہاں نوابزادہ صاحب!"—— نور اللہ نے کہا ——"میرے دل میں بھی یہی بات تھی۔ تم کوئی اور ارادے باندھ رہے ہو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں لیکن ان ارادوں کے لئے بھی روپے پیسے کی ضرورت ہے۔ ہمیں کہیں ہاتھ

مارنا پڑے گا۔"

وہ ٹھیک کہتے تھے۔ میرا اور حمید اللہ خان کا تو کوئی تھا ہی نہیں جسے پیسوں کی ضرورت ہوتی، نور اللہ اور بابے کے کندھوں پر پورے پورے خاندان کا بوجھ تھا۔ ڈکیتی اور رہزنی ہی ان کا پیشہ تھا مگر ہم اُنہیں الگ تھلگ واردات کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے کیونکہ پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ ان میں سے کوئی پکڑا گیا تو پولیس اُس سے ایذا رسانی کے ذریعے ہماری نشاندہی کرا لے گی۔ یہ میں بھی اور حمید اللہ خان بھی محسوس کر رہا تھا کہ ہمیں بے شمار روپے پیسے کی ضرورت ہے۔ دہشت گردی کے لئے گروہ بنانے کی صورت میں بندوقیں اور ریوالور خریدنے تھے۔ دستی بم بنوانے تھے۔ ہمارے آدمیوں نے زخمی ہونا تھا۔ اُن کی مرہم پٹی کا سامان بھی خریدنا تھا اور کئی اور اخراجات تھے۔ رقم اکٹھی کرنے کا ذریعہ ڈکیتی ہی تھا لیکن ہم ڈکیتی کی واردات کسی بہت ہی امیر آدمی یا کسی ہندو ساہوکار کے گھر کرنا چاہتے تھے جہاں سے ایک ہی بار بہت سی رقم اور زیورات ہاتھ آ جائیں۔

"تین چار روز انتظار کرو"—— میں نے بابے اور نور اللہ سے کہا ——"پہلے وہ جگہ دیکھ لیں جو تم دکھانے آئے ہو۔ یہ جگہ اب محفوظ نہیں رہی۔ یہاں ہم اگر مال رکھتے ہیں اور چھاپہ پڑ جاتا ہے، ہم بچ بھی نکلتے ہیں تو مال ہاتھ سے جاتا ہے۔"

"جو جگہ میں تمہیں بتا رہا ہوں وہاں تم اونٹ اور ہاتھی بھی چھپا سکتے ہو"—— بابے نے کہا ——"اللہ کا نام لو اور ابھی اُٹھو۔"

اُس وقت صبح کے نو اور دس بجے کے درمیان کا وقت ہوگا۔ خطرہ تو ہم نے مول لینا ہی تھا۔ ایسے وقت کا انتظار بیکار تھا جس وقت خطرہ نہیں ہونا تھا۔ جب تک ہم زندہ تھے خطرہ ساتھ تھا۔ ہم دیہاتیوں جیسا لباس پہن کر چل پڑے۔ حمید اللہ خان کے پاس ریوالور تھا باقی سب کے پاس چاقو یا خنجر تھے۔ ہم بندوقیں ایک جگہ اونچی گھاس میں رکھ آتے تھے۔ بندوقیں لے کر چلنا مناسب نہیں تھا۔ اس سے دوسروں کی توجہ ہماری طرف ہوتی تھی۔

بالا ہمیں ایسی طرف لے جا رہا تھا جدھر زمین کٹی پھٹی تھی۔ گھاٹیاں گہرائیوں میں اُترتی اور چڑھتی تھیں۔ چھوٹے بڑے کھڈ بھی تھے۔ چونکہ برسات کا موسم تھا اس لئے سبزہ زیادہ تھا۔ ہم سے دُور دُور کسان کھیتوں میں نظر آتے تھے لیکن ہم کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔

"ذرا رُک جاؤ"— بالے نے ہمیں ایک نشیبی جگہ پر رُک کر کہا —"آگے پگڈنڈی ہے اور لوگ گزرتے رہتے ہیں۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔ میرے اشارے پر آگے آنا۔"

تقریباً آدھا فاصلہ طے ہو چکا تھا۔ ہم نیچے بیٹھ گئے۔ بالا اُوپر گیا اور ایک بہت بڑے تنے والے درخت کے ساتھ کھڑا ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ فوراً ہی نیچے آ گیا۔

"ایک انگریز اپنی میم کے ساتھ جا رہا ہے"— بالے نے ہمیں بتایا — "دونوں گھوڑوں پر سوار ہیں۔ اُن کے پیچھے پیچھے دو ہندوستانی جا رہے ہیں۔ وہ ان کے نوکر ہوں گے۔ ایک نے دو بندوقیں اُٹھا رکھی ہیں اور دوسرے کے سر پر کوئی سامان ہے۔ یہ صاحب شکار کے لئے جا رہا ہوگا۔ انہیں گزر جانے دو۔"

انگریز کا لفظ کانوں میں پڑا تو میں اور حمید اللہ اکٹھے ہی اُٹھے اور گھاٹی کی طرف دوڑے۔ انگریز کو ہم اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ ہم دونوں گھاٹی چڑھ کر اُسی درخت کے تنے کی اوٹ میں بیٹھ گئے جس درخت کے نیچے بالا جا کھڑا ہوا تھا۔ انگریز اور اُس کی میم اب قریب آ گئے تھے۔ پگڈنڈی بالکل قریب سے گزرتی تھی۔ اُن کے چہرے بڑی اچھی طرح نظر آ رہے تھے۔ دونوں جوان معلوم ہوتے تھے۔ عورت اس انگریز کی نسبت کم عمر لگتی تھی۔

"جانتے ہو یہ کیا ہے؟"— حمید اللہ خان نے مجھ سے پوچھا۔

"انگریز ہیں اور کیا ہے!"— میں نے کہا۔

"نہیں!"— حمید اللہ نے کہا —"یہ کیش ہے ..... نقد رقم ..... پچیس ہزار روپیہ نقد!"

"کیا کہہ رہے ہو!"— میں نے پوچھا۔

"اس عورت کو اگر ہم اغوا کر لیں تو اس کے عوض ہم پچیس ہزار روپیہ انگریزوں سے لے سکتے ہیں"— حمید اللہ خان نے کہا —"اسے ہم یرغمال بنائیں گے۔ ہمت کرتے ہو؟"

"کیوں نہیں!"— میں نے کہا —"لیکن اغوا کہاں سے کریں گے۔ دن کے وقت اغوا کی واردات نہیں ہو سکتی۔"

"یہ شیر کے شکار کو جا رہے ہیں"— حمید اللہ خان نے کہا —"مجھے معلوم ہے کہ یہ کہاں جائیں گے۔ یہاں سے پانچ چھ میل دُور ایک جنگل شروع ہوتا ہے جس میں پہاڑیاں بھی ہیں اور ایک دریا بھی وہاں سے گزرتا ہے۔ یہ دریا وہی ہے جس کا ذکر بالے نے کیا ہے۔ اُس علاقے میں ہرن، چیتل وغیرہ تو عام ہیں، وہاں شیر بھی مل جاتے ہیں۔ یہ دھاری دار شیر ہیں جنہیں ٹائیگر کہتے ہیں۔ اس انگریز کے ساتھ دو رائفلیں جا رہی ہیں اور ایک آدمی نے سامان بھی اُٹھایا ہوا ہے۔ ان کے گھوڑوں کے ساتھ بھی کچھ سامان بندھا ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک دو دن جنگل میں گزاریں گے۔ جنگل میں ڈاک بنگلہ بھی ہے۔ یہ وہاں ٹھہریں گے۔"

حمید اللہ خان مجھے جو بات سمجھا رہا تھا یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہندوستان میں ایسے بہت سے جنگل تھے جن میں مختلف جانور اور شیر پائے جاتے تھے۔ ان کا شکار انگریز افسر، نواب اور راجے مہاراجے کھیلا کرتے تھے۔ جو بھی جانور مارنا ہو اُس کے لئے لائسنس لینا پڑتا تھا اور صرف ایک جانور یا ایک شیر مارنے کی اجازت ملتی تھی۔ ایسی شکار گاہیں بہت وسیع بھی تھیں اور کم لمبی چوڑی بھی۔ یہ شکار گاہ جو حمید اللہ مجھے بتا رہا تھا کوئی بڑی شکار گاہ نہیں تھی۔ وہاں شیر تھے لیکن خاصی کم تعداد میں۔

میں بھی جانتا تھا کہ یہ انگریز اپنی بیوی کے ساتھ بڑے شکار کے لئے جا رہا ہے۔ انہوں نے رات ڈاک بنگلے میں گزارنی تھی۔ مجھے حمید اللہ کا ارادہ اچھا لگا۔ ایک انگریز عورت یا مرد کو یرغمال بنا لینے سے ہمیں بہت بڑی رقم مل

سکتی تھی لیکن یہ کام بہت ہی مشکل اور خطرناک تھا۔ اس کے تین مرحلے تھے۔ ایک اغوا کرنا دوسرا اُسے چھپا کر رکھنا اور تیسرا مرحلہ سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ یہ تھا انگریزوں سے رقم وصول کرنا۔ ہم یہ اطلاع پہنچا سکتے تھے کہ مغویہ ہمارے پاس ہے اور فلاں جگہ اتنے ہزار روپیہ پہنچا دو اور اپنا آدمی یا عورت لے جاؤ۔

انگریز اتنا کچا نہیں تھا کہ فوراً ہمارا مطالبہ پورا کر دیتا۔ وہ ہندوستانیوں کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ ان سے ڈر کر ان کی بات فوراً مان لیتا۔ انگریز ہندو بنیوں جیسے تھے۔ آسانی سے پیسہ ادا نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے دھوکہ دے کر ہمیں پکڑنے کی کوشش ضرور کرنی تھی اور ہم اس معاملے میں ناتجربہ کار تھے۔ اُس زمانے میں یرغمال رکھ کر پیسہ وصول کرنے کی وارداتیں نہ ہونے کے برابر تھیں، لیکن ہمیں رقم کی ضرورت تھی۔ حمید اللہ خان نے پچیس ہزار کہا تھا پچیس ہزار روپیہ آج کا پانچ چھ لاکھ روپیہ تھا بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

"کیوں؟" — حمید اللہ خان نے پوچھا — "کیا خیال ہے؟"

"خیال تو نیک ہے حمید بھائی!" — میں نے ذرا ڈھیلی سی آواز میں کہا — "اور ہم دونوں میں ہمت اور حوصلہ بھی موجود ہے لیکن یہ واردات ڈکیتی کی طرح آسان نہیں ہوگی۔ ہمیں اس کا ذرا سا بھی تجربہ نہیں .... پہلے یہ سوچو کہ اس عورت کو اغوا کس طرح کریں گے؟"

"یہ بھی سوچ لیں گے" — حمید اللہ خان نے جواب دیا — "تم بچے تو نہیں۔ سپیشل پولیس کے سب انسپکٹر رہ چکے ہو۔ اگر ہم نے اسے اغوا کر لیا تو اسے رکھیں گے اس جگہ جو ہم دیکھنے جا رہے ہیں۔ میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ یہ انگریز شکاری کم از کم آج کی رات ڈاک بنگلے میں گزارے گا۔ مجھے معلوم ہے ڈاک بنگلہ کہاں ہے۔ میں وہاں دو راتیں گزار چکا ہوں" — حمید اللہ خان بولتے بولتے چپ ہو گیا اور مسکراتے مسکراتے اُس پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ ذرا خاموشی کے بعد کہنے لگا — "خدا نے کیسی سزا دی ہے۔ میں اس ڈاک بنگلے میں آیا تھا تو وہاں کے نوکروں میں کھلبلی مچ گئی تھی کہ نواب زادہ صاحب آ گئے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ بخشش اور انعام کے لالچ میں ہر نوکر میری خدمت میں پیش پیش رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ آج دیکھ لو۔ میں مجرم بن کر اس ڈاک بنگلے میں اغوا کی واردات کرنے کی سوچ رہا ہوں۔"

"اور کچھ بھی نہ سوچو حمید بھائی!" — میں نے کہا — "اور یہ بھی نہ سوچو کہ تم کل کیا تھے۔ آج کی بات کرو۔"

"آج کی بات یہ ہے کہ اس انگریز عورت کو اغوا کرنا ہے" — حمید اللہ خان نے یہ بالکل ہی بدلے ہوئے لہجے میں کہا — "پہلے تو میں نے صرف سوچا تھا اور ارادہ کیا تھا، اب میرے سینے میں آگ بھڑک اُٹھی ہے .... چلو، پہلے وہ جگہ دیکھ لیں۔ اگر جگہ اس قابل ہوتی تو اسے اغوا کریں گے۔"

"ایسے نہیں حمید بھائی!" — میں نے کہا — "جذبات سے نہیں عقل سے سوچ کر فیصلہ کرو۔"

"تم بھی کچھ سوچو نا، سکندر!" — اُس نے کہا — "تم مجھ سے زیادہ بہتر سوچ سکتے ہو۔"

انگریز اپنی میم کے ساتھ بہت آگے نکل گیا تو ہم چل پڑے۔ ہم نے پگڈنڈی پر نہیں جانا تھا بلکہ اس سے گزر کر آگے نکل جانا تھا۔



ہم وہاں پہنچ گئے۔ وہ تو ڈراؤنا سا علاقہ تھا۔ وہاں بڑ کے درخت بھی تھے جو بہت پُرانے تھے۔ اُن کی اونچائی اور ان کا پھیلاؤ اتنا زیادہ تھا کہ رات کو پہاڑیوں کی طرح نظر آتے تھے۔ ان میں سے بارش نہیں گزر سکتی تھی۔ ان کے ساتھ ہی پہاڑی علاقہ تھا۔ ہم نے اسے ویسا ہی پایا جیسا بابے نے بیان کیا تھا۔ بالا ہمیں اونچی گھاس میں لے گیا۔ اس میں سخت سا کیچڑ تھا۔ اونچی گھاس اور گھنی جھاڑیوں نے ہمیں چھپا لیا۔ کچھ اور آگے گئے تو گھاس میں سے ایسی آوازیں اُٹھیں جیسے کوئی جانور اس میں سے گزر رہا ہو۔ ہم اس گھنی جھاڑی میں سے نکلے تو دیکھا، دو چھوٹے مگرمچھ گھاس میں کہیں آرام کر رہے تھے۔ ہماری باتوں سے اور گھاس اور جھاڑ میں سے گزرنے کی آوازوں سے ڈر کر پانی کی طرف دوڑے

جا رہے تھے اور ہم نے انہیں پانی میں ڈبکی لگاتے دیکھا۔

"بڑی خطرناک چیز ہے"— حمیداللہ خان نے کہا — "یہ ہیں تو گز گز ڈیڑھ ڈیڑھ گز لمبے اور لگتا ہے کہ ہمارے ڈر سے بھاگ گئے ہیں لیکن پانی میں اُتر کر دیکھو۔ تمہارا جسم تقسیم ہو کر ان کے پیٹوں میں غائب ہو جائے گا۔"

"اگر ہم نے اس جگہ اپنا ٹھکانہ بنایا تو یہ ہمارے محافظ ہوں گے"— میں نے کہا — "ہمارے تعاقب میں جو کوئی آئے گا وہ ان مگرمچھوں کی خوراک بنے گا۔"

ہم آگے بڑھے۔ درخت زیادہ ہوتے جا رہے تھے۔ ان میں ایسے درخت زیادہ تھے جو اونچے نہیں تھے۔ ان کی ٹہنیاں اُوپر اُٹھنے کی بجائے اطراف کو پھیلی ہوتی تھیں۔ ان کے نیچے سے جھک کر گزرنا پڑتا تھا۔ نیچے عام قسم کی اونچی گھاس کے ساتھ چوڑے اور لمبوترے پتوں والے پودے بھی تھے اور سرکنڈوں کی قسم کی گھاس کا جنگل بھی تھا۔ وہاں سے گزرنا ذرا مشکل تھا۔ یہی مشکل ہماری حفاظت کی ضامن تھی۔ البتہ ایک اور خطرہ مجھے محسوس ہونے لگا تھا۔ اس قسم کی جگہ جہاں دلدل بھی ہو، پانی بھی ہو اور گھاس وغیرہ اتنی گھنی ہو کہ چلا نہ جا سکے، وہاں ایک یا دو اژدہا بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ پندرہ سے بیس فٹ یا اس سے بھی زیادہ لمبے سانپ ہوتے ہیں جو چھوٹے جانور اور انسان کو سالم نگل لیتے ہیں۔ یہ پانی اور دلدل میں رہتے ہیں۔

"بالے!"— آگے جا کر میں نے بالے سے کہا — "میرا خیال تھا کہ تم میں اتنی عقل نہیں ہو سکتی لیکن تم نے یہ جگہ دریافت کر کے کمال کر دیا ہے۔ کیا اس میں داخل ہونے کا اور کوئی راستہ نہیں؟"

"تمہیں بتایا تو ہے"— اُس نے جواب دیا — "ایک طرف دریا ہے۔ اُدھر سے کوئی اندر آنے کی نہیں سوچے گا۔ پہاڑیوں کے اوپر سے کوئی آئے تو آ سکتا ہے۔"

"اوپر سے وہی آئے گا جسے معلوم ہو گا کہ ہم پہاڑیوں کے اندر چھپے ہوتے ہیں"— حمیداللہ خان نے کہا — "ایسی صورت پیدا ہو گئی تو ہمارے

پاس دو بندوقیں ہیں اور ایک ریوالور ہے۔ مقابلہ کریں گے"— وہ چُپ ہو گیا پھر اُس نے کہا — "ریوالور کی گولیاں اور بندوقوں کے کارتوس بہت تھوڑے ہیں .... خریدنے پڑیں گے .... سکندر!"— اُس نے مجھے کہا — "وہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ پیسہ چاہیئے۔"

"کر لیں گے"— میں نے کہا — "پہلے یہ جگہ دیکھ لو۔"

تھوڑی دیر بعد ہم اُس غار تک پہنچ گئے جو بالا دیکھ گیا تھا۔ یہ قدرت کا بنایا ہوا غار تھا۔ کسی زمانے میں دریا کی گزرگاہ یہی ہو گی۔ پانی نے یہاں ٹکرا ٹکرا کر یہ غار بنایا ہو گا۔ اس جگہ سے پہاڑ سخت پتھریلا نہیں بلکہ کچھ بھُر بھُرا تھا۔ غار دس بارہ گز چوڑا اور اڑھائی تین گز اونچا تھا۔ اس کا فرش تو ہموار تھا لیکن چھت سے لمبوترے پتھر اس طرح لٹک رہے تھے جیسے انسان یا ذبح کئے ہوئے بکرے لٹک رہے ہوں۔ غار جتنا چوڑا تھا اتنا ہی اندر کو گیا ہوا تھا۔

بدبُو بہت تھی۔ یہ گیدڑوں وغیرہ کی غلاظت تھی۔ بھیڑیئے بھی ہو سکتے تھے۔ اُس وقت ہم خود گیدڑ بھی تھے اور بھیڑیئے بھی۔ گیدڑوں کی طرح ہم چھُپتے پھرتے تھے اور جو دشمن ہمارے سامنے آجاتا تھا اُس کے لئے ہم بھیڑیئے بن جاتے تھے۔ ہم نے باقی عمر بدبُوؤں میں ہی گزارنی تھی اور درندوں، مگرمچھوں اور ناگوں کے ساتھ دوستی لگا کر رہنا تھا۔

"بول سکندر!"— حمیداللہ خان نے ایسے لہجے میں پوچھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے یہ جگہ پسند آگئی ہے — "یہ جگہ اچھی ہے یا وہ؟"

"مجھے تو یہ جگہ زیادہ اچھی لگی ہے"— میں نے کہا۔

"اس جگہ میں ایک خوبی اور ہے"— بالے نے کہا — "یہاں جن بھُوت رہتے ہیں۔ چڑیلیں اور بدروحیں بھی یہاں رہتی ہیں"— بالے نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا — "بعض لوگ ان پہاڑیوں کے قریب سے بھی نہیں گزرتے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ جو گِدھ بڑ کے درختوں پر بیٹھے ہیں یہ بدروحیں اور چڑیلیں ہیں اور مُردار ان کی غذا ہے۔ کوئی نہیں مانے گا کہ یہاں انسان چھُپے ہوتے ہیں۔"

"لیکن بالے!" ——— میں نے کہا ——— "ہمیں پکڑنے کے لئے لوگ نہیں آئیں گے، انگریز آئیں گے اور ان کی پولیس آئے گی۔ انگریز خود جن بھوت ہیں۔"

ہم لوگ جس جگہ کو ویران اور ڈراؤنی سی دیکھتے ہیں اس کے متعلق مشہور کر دیتے ہیں کہ یہاں جن بھوت رہتے ہیں۔ اگر اس جگہ کے متعلق بھی لوگوں کا یہی خیال تھا تو ہمیں صرف یہ فائدہ حاصل ہو سکتا تھا کہ اس علاقے کے کسی آدمی کا اندر آنے کا خطرہ نہیں تھا۔ یہ جگہ کوئی عجوبہ نہیں تھی۔ پہاڑی اور جنگلاتی علاقوں میں آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں ایسی کئی جگہیں ملیں گی۔

ہم نے وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارے پاس کوئی سامان تو تھا نہیں جو اُٹھا لانے میں دشواری ہوتی۔ دو بندوقیں وہاں رہ گئی تھیں اور کپڑوں کا ایک ایک جوڑا تھا اور دو بستر تھے۔ میں نے نوراللہ اور بالے سے کہا کہ وہ واپس جائیں اور کپڑے اور بندوقیں لے آئیں۔ مجھے اور حمیداللہ کو نہیں جانا چاہئے تھا کیونکہ پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ ہم نے ان دونوں کو خاص طور پر کہا کہ وہ گاؤں کے کسی آدمی کو پتہ نہ چلنے دیں کہ ہم وہ جگہ چھوڑ رہے ہیں۔



وہ دونوں چلے گئے تو میں اور حمیداللہ خان پہاڑیوں کے اندر کا علاقہ دیکھنے کو چل پڑے۔ درخت بہت تھے۔ نیچے سے لے کر پہاڑیوں کے اوپر تک درخت تھے۔ یہ پہاڑی علاقوں والے دیودار، چیل اور سفیدے وغیرہ جیسے درخت نہیں تھے۔ وہ کئی اقسام کے درخت تھے۔

ہم دونوں دریا تک چلے گئے۔ دو پہاڑیوں کے درمیان دریا کا پانی اندر آیا ہُوا تھا۔ وہاں پانی خاصا گہرا معلوم ہوتا تھا۔ برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے دریا طغیانی کی کیفیت میں رہتا تھا اس لئے پانی زیادہ اندر تک آیا ہُوا تھا۔ دونوں پہاڑیوں نے گلی سی بنا دی تھی جو دریا کے اندر چلی گئی تھی۔ اس سے ہمیں اطمینان ہو گیا کہ اس طرف سے کوئی اندر نہیں آ سکتا۔

نوراللہ اور بالے کی واپسی تک میں اور حمیداللہ خان اُس انگریز عورت

کو اغوا کرنے کے طریقے سوچنے لگے۔ حمیداللہ خان نے کہا یہ انگریز اگر شیر کے شکار کو گیا ہے تو اس کے لئے درخت پر مچان بندھے گی۔ انگریز رات کو مچان پر بیٹھے گا۔ نیچے بکرا یا بچھڑا بندھا ہُوا ہوگا۔

"میں یہاں تک کر سکتا ہوں" ——— حمیداللہ خان نے کہا ——— "کہ رات کو دبے پاؤں چلتے مچان کے نیچے تک پہنچ جاؤں اور بندوق اُوپر کر کے انگریز کو للکاروں کہ رائفل نیچے پھینک دے پھر نیچے آ جائے۔ عورت اُس کے ساتھ ہوگی۔ تم اور ہمارے دونوں دوست ساتھ ہوں گے۔ صاحب بہادر کو مچان سے اُترنا پڑے گا۔ اُس کی میم بھی نیچے آ جائے گی، پھر صاحب کو خنجر سے ختم کریں گے اور میم کو ساتھ لے آئیں گے۔ اُس وقت جنگل میں شیر کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ اگر شیر ہمارے سامنے آ گیا تو ہمارے پاس دو بندوقیں اور ایک ریوالور ہوگا۔ شیر کو ہم سنبھال لیں گے۔"

حمیداللہ خان نے اپنا پلان مجھے اچھی طرح سمجھایا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ صاحب اکیلا مچان پر جائے" ——— میں نے کہا ——— "اور اُس کی میم ڈاک بنگلے میں رہے ..... کیا کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے پتہ چلایا جا سکے کہ اس انگریز کا پروگرام کیا ہے؟"

"ذریعہ نوراللہ اور بالا ہیں" ——— حمیداللہ نے جواب دیا ——— "بالا تیز دماغ رکھتا ہے۔ اسے ڈاک بنگلے تک جاسوسی کے لئے بھیجیں گے لیکن جو طریقہ بھی اختیار کرنا ہے شام گہری ہونے تک ہمیں وہاں تک پہنچنا ہے۔ یہاں سے فاصلہ پانچ میل کے لگ بھگ ہے۔"

"حمید بھائی!" ——— میں نے کہا ——— "ہم یہاں آ تو گئے ہیں لیکن کھانے پینے کا انتظام کیا ہوگا؟"

"مٹی کے برتن منگوا لیں گے" ——— حمیداللہ خان نے کہا ——— "یہ کوئی مسئلہ نہیں۔"

اڑھائی تین گھنٹوں بعد نوراللہ اور بالا آ گئے۔ وہ بندوقیں اور کپڑے

وغیرہ لے آتے تھے۔ میں نے اور حمید اللہ خان نے اُن کے سامنے یہ مسئلہ رکھا کہ انگریز شکاری کے پروگرام کا پتہ کس طرح چلایا جاتے اور انگریز عورت کو کس طرح اغوا کیا جاتے۔ انہوں نے اپنے اپنے مشورے دیتے پھر بالے نے خود ہی کہا کہ وہ جاسوسی کے لیے جاتے گا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ جاسوسی کے لئے وہ کیا طریقہ اختیار کرے گا۔

اُس نے پانچ چھ میل دُور جانا تھا۔ وہاں بھی کچھ وقت لگانا تھا۔ پھر واپس آنا تھا۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ وقت بچانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ بالے کو یہ کہہ کر بھیج دیا کہ وہ جا کر اپنا کام کرے اور ڈاک بنگلے سے تقریباً نصف میل دُور مشرق کی طرف ایک جگہ ہمیں ملے۔ حمید اللہ خان ڈاک بنگلے اور اس کے ارد گرد کے علاقے سے واقف تھا۔ اُس نے بالے کو ایک جگہ کی نشانیاں بتائی تھیں۔

بالا روانہ ہو گیا اور اس سے کچھ دیر بعد میں، حمید اللہ خان اور نور اللہ بھی چل پڑے۔ اب بندوقیں بھی ہمارے پاس تھیں لیکن ان کی بیرلیں اور بٹ الگ کر کے ہم نے یہ ایک چادر میں لپیٹ لی تھیں۔ ہم بہت ہی محتاط ہو کر جا رہے تھے۔ ہم کسی عام گزرگاہ کے قریب بھی نہیں جاتے تھے۔ زیادہ تر ہم نشیبی جگہوں سے خشک برساتی نالوں کے اندر اندر سے گزرتے تھے۔ حمید اللہ خان کو ڈاک بنگلے کی سمت کا اندازہ تھا۔ وہ پہلے شکار کے لئے ادھر آ چکا تھا۔

ہم کم و بیش تین گھنٹے بعد اُس جگہ پہنچ گئے جو ہم نے بالے کو بتائی تھی۔ وہاں جا کر ہم بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دُور ایک گاؤں تھا۔ ہم نے نور اللہ کو بھیجا کہ وہاں سے کھانے کے لئے کچھ لے آتے۔ وہ چلا گیا تو میں اور حمید اللہ زبانی زبانی اغوا کی واردات کا ریہرسل کرنے لگے۔

نور اللہ گاؤں کے تنور سے روٹیاں اور مٹی کے پیالے میں دال لے آیا۔ گاؤں سے یہی کچھ مل سکتا تھا۔ اُس وقت بھوک نے ہمیں ایسی حالت تک پہنچا دیا تھا کہ یہ دال ہمیں کسی نواب کے گھر سے آتے ہوتے مرغن سالن

جیسی اچھی لگی۔ ہم نے دو روٹیاں اور کچھ دال بالے کے لئے رکھ دی۔

سورج غروب ہونے سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے بالا آ گیا۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیا خبر لایا ہے۔

"پکی خبر لایا ہوں"—اُس نے کہا—"میں سیدھا ڈاک بنگلے میں گیا۔ چونکہ وہاں ایک صاحب اپنی میم کے ساتھ آیا ہُوا تھا اس لئے ڈاک بنگلے کے ملازم موجود تھے۔ صاحب اور میم وہاں نہیں تھے۔ وہاں ایک اور آدمی تھا جو نوکروں کا میٹ معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا لینے آیا ہوں۔ میں نے اُسے کہا کہ میں نوکری کی تلاش میں آیا ہوں۔ اُس کے ساتھ ہی میں نے اپنی زبان کی اُستادی دکھائی جس سے وہ سمجھ گیا کہ یہ شخص دماغی طور پر بڑا اچھا ہے۔ اُس نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔"

یہ ہمیں معلوم تھا کہ بالے نے اپنی زبان کا جادو کس طرح چلایا ہوگا۔ اُس کی شکل و صورت بھی اچھی تھی۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ اُس کی باتیں ایسی دلچسپ تھیں کہ دوسرے نوکر بھی اُس کے پاس بیٹھ گئے۔ نوکری تو اُسے نہیں مل سکتی تھی کیونکہ وہاں کوئی جگہ خالی نہیں تھی، اُسے نوکری کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جس ضرورت کے لئے گیا تھا وہ پوری ہو گئی۔ نوکروں کو حکم ملا تھا کہ صاحب رات مچان پر گزارے گا اور اُس کی میم ڈاک بنگلے میں سوتے گی۔

باتوں باتوں میں بالے نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ رات کو ڈاک بنگلے کے باہر ایک چوکیدار ہوگا اور ایک نوکر نوکروں والے کمرے میں موجود رہے گا۔

ہمیں اسی خبر کی ضرورت تھی۔ بظاہر عجیب سا لگتا ہے کہ ایک انگریز عورت ڈاک بنگلے میں اکیلی تھی اور باہر صرف ایک چوکیدار اُس کی حفاظت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ ہم جو اُس دَور کے لوگ ہیں، اسے عجیب نہیں سمجھتے۔ اُن علاقوں کے دیہاتی لوگ کسان اور مزدور تھے اور وہ کمزور لوگ تھے۔ انگریز کو تو وہ بادشاہ سمجھتے تھے۔ اُن میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ رات کو کوئی بنگلے کے اندر آتا۔ اس کے مقابلے میں صوبہ سرحد میں انگریز اس قسم کی جرأت نہیں کرتے تھے کہ اکیلے

کہیں رات گزاریں۔ اگر کہیں کسی افسر کو اکیلے رات گزارنی پڑتی تو اُس کی حفاظت کے لیے پوری پلٹن اُس کی رہائش گاہ کے اردگرد پھیلا دی جاتی تھی۔ ہندوستان کے اُس علاقے کے لوگ بہت ہی مختلف تھے جہاں کی میں کہانی سُنا رہا ہوں۔ وہاں انگریز پہرے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔

"اب بات کرو سکندر!" — حمیداللہ خان نے مجھے کہا — "اب اس عورت کو ڈاک بنگلے میں سے اُٹھانا ہے۔"

"وہ جس کمرے میں سوتی ہے میں وہ بھی دیکھ آیا ہوں" — بالے نے کہا — "اُس کمرے تک میں تمہیں پہنچاؤں گا۔"

حمیداللہ خان کو معلوم تھا کہ شکاری رات کس وقت مچان پر جایا کرتے ہیں۔ ہم وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور رات ہوگئی۔ دُور سے ہمیں ڈاک بنگلے کے اندر جلتی ہوئی بتیوں کی روشنی نظر آرہی تھی۔ وہاں بجلی نہیں تھی۔ لالٹینیں اور تیل سے جلنے والے لیمپ استعمال ہوتے تھے۔ ہم وہیں بیٹھے ڈاک بنگلے کی روشنیوں کو دیکھتے رہے، پھر ہم اُٹھے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔

بہت دیر بعد ڈاک بنگلے کی بتیاں بجھنے لگیں۔ آخر میں صرف ایک کمرے میں روشنی باقی رہ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد یہ روشنی مدھم ہوگئی۔ اس سے ہم نے یہ مطلب لیا کہ انگریز عورت سونے لگی ہے اور اُس نے لیمپ مدھم کر دیا ہے۔ ہم چاروں آہستہ آہستہ اور آگے چلے گئے۔

❋

سرکتے سرکتے ہم ڈاک بنگلے کے بالکل قریب چلے گئے۔ وہاں خاموشی تھی۔ کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ اُٹھتے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ چاندنی رات تھی۔ آسمان پر ساون کے بادل منڈلا رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد چاند بادلوں میں چلا جاتا تھا۔ بنگلہ ذرا اُونچی جگہ پر تھا اور ہم نیچے ایک بڑے پُرانے درخت کے پیچھے بیٹھے ہوتے تھے۔ ہمیں بنگلہ بڑی اچھی طرح نظر آرہا تھا۔ قدموں کی جو آہٹ ہم سُن رہے تھے، وہ برآمدے کے اُس طرف آ گئی جدھر ہم چُھپے ہوتے تھے۔ وہ چوکیدار تھا جو آہستہ آہستہ ڈاک بنگلے کے

اردگرد ٹہل رہا تھا۔ اُس کے کندھے سے رائفل لٹک رہی تھی۔ ہم یہی دیکھنا چاہتے تھے کہ اُس کے پاس ہتھیار کیا ہے۔

"سکندر!" — حمیداللہ نے میرے کان میں سرگوشی کی — "اب بتاؤ کیا کریں۔ یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔"

میں نے حمیداللہ کو کوئی جواب دینے کی بجائے یوں کیا کہ قریب سے چھوٹا سا ایک پتھر اُٹھایا اور یہ پتھر بائیں طرف اس طرح پھینکا کہ ہم سے دُور گرا اور چونکہ یہ ذرا اونچی جگہ گرا تھا اس لیے اس طرح گرا کہ لڑھکتا ہُوا نیچے جانے لگا۔ چوکیدار رُک گیا، برآمدے سے باہر آیا اور جدھر پتھر کی آواز آئی تھی اُس طرف گیا۔ وہ ہم سے دس بارہ قدم دُور تھا لیکن وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ بائیں طرف ہمارے بالکل قریب بڑے تنے والا ایک درخت تھا اور جھاڑیاں سی بھی تھیں۔

چوکیدار ڈھلان پر رُک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں آہستہ سے اُٹھا اور بائیں طرف والے درخت کے تنے کی اوٹ میں جا کھڑا ہُوا۔ میں جھاڑیوں میں سے گزرا تھا اس لیے جھاڑیوں نے آواز پیدا کی۔ رات بالکل خاموش تھی۔ اس میں میرے دبے پاؤں کی آہٹ بھی سنائی دی۔ میں جانتا تھا کہ ایسے ہی ہوگا۔ چوکیدار تیزی سے میری طرف آیا۔ میں تنے کی اوٹ سے ایک آنکھ سامنے کرکے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کندھے سے رائفل کا سلنگ اُتارتا ہُوا درخت کے تنے کے قریب آیا تو میں نے بڑی تیزی سے دوسری طرف سے سامنے ہو کر دونالی بندوق کی نالیاں اُس کے پہلو کے ساتھ لگا دیں اور کہا کہ رائفل نیچے پھینک دو۔

اس ڈاک بنگلے میں ایسا واقعہ شاید پہلا ہُوا ہوگا جو اس چوکیدار کے لیے غیر متوقع تھا۔ اُس نے بڑے آرام سے رائفل پھینک دی اور ہاتھ جوڑ دیے۔

"میرے بچوں پر رحم کرو حضور!" — اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "مجھ غریب کو نہ مارئیو۔"

"مت ڈرو!" — میں نے بڑی دھیمی آواز میں کہا — "نیچے آجاؤ۔"

وہ سدھائے ہُوئے جانور کی طرح میرے پیچھے پیچھے نیچے آگیا۔ میں نے

اُس کی رائفل اُٹھا لی تھی۔ اُس نے چمڑے کی ایک بیلٹ باندھ رکھی تھی جس میں چمڑے کے چار پوچ تھے۔ ان میں رائفل کے راؤنڈ پڑے ہوتے تھے۔ میرے کہنے پر اُس نے بیلٹ اُتار کر میرے حوالے کر دی۔ خوف کے مارے وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ اُس نے جب میرے ساتھیوں کو دیکھا تو اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا۔

"اپنی جان بچاؤ اور ہم جو پوچھتے ہیں وہ بالکل صحیح بتا دو"— میں نے اُسے کہا —"یہ بتاؤ کہ ڈاک بنگلے میں کون کون ہے؟"

"میم صاحب سوئی ہوئی ہے"— اُس نے جواب دیا۔

"کون سے کمرے میں؟"

"اُس کمرے میں!"— اُس نے جواب دیا —"جس کمرے میں تھوڑی تھوڑی روشنی ہے ..... نوکروں والے کمرے میں ایک نوکر سویا ہُوا ہے۔"

"صاحب مچان پر ہے؟"

"ہاں حضور!"— اُس نے جواب دیا —"صاحب بہادر ایک اور آدمی کے ساتھ مچان پر ہے اور تین چار آدمی جنگل کی ہٹ میں ہیں۔"

"تم ڈرو نہیں"— میں نے اُسے کہا —"ہم تمہیں درخت کے ساتھ باندھ دیں گے اور اپنا کام کر کے چلے جائیں گے۔"

"مجھ پر رحم نہیں کرو گے میرے آقا؟"— چوکیدار نے التجا کی —"پولیس آ کر مجھ غریب کو گرفتار کر لے گی ..... ڈاک بنگلے میں ہے ہی کیا۔ یہاں کوئی خزانہ نہیں۔ یہاں سے کیا لو گے!"

"ہم اس میم کو اُٹھانے آئے ہیں"— میں نے کہا —"کھڑکیاں دروازے تو اندر سے بند ہوں گے۔"

"نہیں حضور!"— اُس نے کہا —"اُس طرف والی دو کھڑکیاں کھُلی ہیں۔ گرمی میں بند کمرے میں کیسے سو سکتے ہیں۔ یہاں کوئی ایسا خطرہ بھی نہیں تھا۔"

ایک دھماکہ سنائی دیا۔ اس کے فوراً بعد دوسرا دھماکہ ہُوا۔ ان دونوں دھماکوں کے درمیان شیر کی دھاڑ بھی سنائی دی۔ یہ دھماکے صاحب کی رائفل

کے تھے۔ اُس نے یکے بعد دیگرے دو راؤنڈ فائر کئے تھے اور شیر کی دھاڑ اُس کی زندگی کی آخری دھاڑ تھی۔ یہ دھماکے بہت دُور ہوتے تھے لیکن رات کے سناٹے میں یوں لگا جیسے رائفل ڈاک بنگلے کے اندر فائر ہوئی ہو۔ کچھ آوازیں اور بھی سنائی دیں۔ یہ اُن آدمیوں کی آوازیں تھیں جو جنگل کی ہٹ میں انہی دھماکوں کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ یہ ہٹ ایک چھوٹا سا مکان تھا جو ہر شکارگاہ کے اندر بنا ہوتا تھا۔ جب کوئی شکاری شیر کے شکار کے لئے رات کو مچان پر بیٹھتا تھا تو جنگل کے چند ایک ملازم یا شکاری کے ساتھ آئے ہُوئے اُس کے اپنے آدمی اس مکان میں انتظار میں بیٹھ جاتے تھے اور جونہی گولی چلتی تھی تو وہ یہ اشارہ پا کر کہ شیر مارا گیا ہے مچان کی طرف دوڑ پڑتے تھے۔

ہمیں ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ شیر کو مار کر فوراً ہی سب لوگ ڈاک بنگلے کی طرف آ جائیں گے۔ ہم نے چوکیدار کی پگڑی اُتاری جو خاصی لمبی تھی۔ اُسے پیٹ کے بل لٹا دیا۔ پگڑی کے ایک سرے سے اُس کے پاؤں باندھے اور اُس کے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کر کے پگڑی کے دوسرے سرے سے باندھ دیئے۔ ہم نے اُس کا مُنہ کھُلا رہنے دیا اور اُسے کہا کہ وہ مُنہ سے آواز نہ نکالے۔

"چوکیدار!"— یہ ایک عورت کی آواز تھی جو ڈاک بنگلے میں سے آئی۔ یہ میم صاحب کی آواز تھی۔

"بولو!"— میں نے چوکیدار کو آہستہ سے کہا —"کہو، آیا میم صاحب۔"

چوکیدار نے بلند آواز سے یہی جواب دیا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ عورت رائفل کے دھماکوں سے جاگ اُٹھی ہے اور وہ چوکیدار کو اس لئے بلا رہی ہے کہ چوکیدار جا کر یہ خبر لائے کہ صاحب نے شیر مار لیا ہے یا نہیں۔ یہ تو حمیداللہ خان نے بتا دیا تھا کہ شیر مارا گیا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ شیر اگر صرف زخمی ہُوا ہوتا تو کئی بار دھاڑتا۔

چوکیدار کے جواب کے ساتھ ہی میں ڈاک بنگلے کی طرف دوڑا۔ کمرے میں

روشنی جو مدہم تھی تیز ہو گئی۔ میرے ساتھ حمید اللہ خان تھا۔ ہم دوسری طرف گئے جدھر دو کھڑکیاں کھلی تھیں۔ کمرے میں دیکھا۔ عورت وہاں نہیں تھی۔ دروازے کے باہر سے یعنی سامنے والے برآمدے سے اُس کے قدموں کی آہٹ اُبھری۔ ہم دونوں اُس طرف گئے۔ اُس نے چوکیدار کو پھر پکارا۔

ہم اُس برآمدے میں پہنچے تو وہ اِدھر ہی آ رہی تھی۔ میرا اُس کے ساتھ ٹکراؤ تقریباً ہو گیا تھا۔ ہم نے اُسے بولنے یا سنبھلنے کی مہلت نہ دی۔ ہمارے ہاتھ میں ایک بڑا رومال تھا جو حمید اللہ کے پاس تھا۔ اُس نے بڑی ہی تیزی سے رومال پٹی کی طرح اُس کے مُنہ پر رکھا اور اُس کے سر کے پیچھے گانٹھ ڈال دی۔ اس دوران میں نے میَم کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ حمید اللہ کے مُنہ سے چلو کی آواز نکلی۔ میں نے میَم کو اوپر اُٹھایا اور کندھے پر اِس طرح ڈال لیا کہ اس کا اُوپر کا جسم میری پیٹھ کے ساتھ لٹک رہا تھا اور ٹانگیں میرے آگے تھیں۔ اُٹھانے کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ ہم دونوں دوڑ پڑے۔ اپنے دونوں ساتھی چوکیدار کے پاس ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم نے اُنہیں چلنے کو کہا۔ چوکیدار وہیں پڑا رہا۔



ہمیں توقع نہیں تھی کہ ہم یہ واردات اتنی آسانی سے کر لیں گے۔ حالات اپنے آپ ہی ہمارے حق میں ہو گئے اور ہم کامیاب ہو کر وہاں سے چلے۔ ہمیں توقع یہ تھی کہ میم سوئی ہوئی ہو گی اور اُسے اندر داخل ہو کر بستر سے اُٹھانا پڑے گا۔ یہ تو چوکیدار نے بتایا تھا کہ اُس طرف دو کھڑکیاں کُھلی ہیں، ورنہ ہم تو یہ سوچ کر گئے تھے کہ کوئی کھڑکی کُھلی ہوئی نہیں ہو گی، دروازہ بھی بند ہو گا اور ہمیں کسی ایک کھڑکی کے اُوپر اور نیچے کے شیشے توڑ کر اور ہاتھ اندر ڈال کر چٹخنیاں کھولنی پڑیں گی۔ یہ طریقہ زیادہ خطرناک تھا۔ شیشے توڑنے کی آواز پر یہ انگریز عورت جاگ اُٹھتی۔ وہ دروازے کے راستے باہر نکل کر شور بھی کر سکتی تھی اور بھاگ بھی سکتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اُس نے اپنے تکیے کے نیچے ریوالور رکھا ہوتا یا بندوق یا رائفل اُس کے پاس ہوتی اور وہ ہم میں سے کسی ایک

کو یا دونوں کو مار ڈالتی لیکن اللہ نے ہماری بہت مدد کی۔

کچھ اور آگے آئے تو نور اللہ نے میَم کو اُٹھا لیا۔ کچھ دُور تک ہم نے دوڑنا تھا، ہم دوڑتے گئے۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ صاحب اور میم صاحبہ گھوڑوں پر شکار پر آئے ہیں۔ صاحب نے اتنی جلدی ڈاک بنگلے میں نہیں آنا تھا لیکن اُس نے جس وقت بھی آنا تھا اور اُسے پتہ چلنا تھا کہ میم اغوا ہو گئی ہے تو اُس نے گھوڑوں پر ہمارا تعاقب کرنا تھا۔ اُسے یہ بتانے کے لئے کہ ہم میم صاحب کو کس طرف لے گئے ہیں، چوکیدار موجود تھا۔ اُس کی رائفل اور راؤنڈ ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

ہم نے کبھی دوڑتے کبھی چلتے کبھی دو تین منٹ کے لئے رُکتے اور میَم کو ایک سے دوسرے آدمی کے کندھے پر ڈالتے، تقریباً دو میل فاصلہ طے کر لیا۔ ہم سب بہت تھک گئے تھے۔ اس انگریز عورت کا وزن زیادہ نہیں تھا۔ وہ پُھرتیلے جسم کی جوان لڑکی تھی۔ اُس کی کمر تو جیسے تھی ہی نہیں لیکن اُس کا جتنا بھی وزن تھا اُس نے ہمیں تھکا دیا۔ ہم رُک گئے اور میَم کو زمین پر کھڑا کر دیا گیا پھر اُس کے مُنہ سے کپڑا کھول دیا۔

چاندنی میں جب اُس کا چہرہ دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو بہت ہی خوبصورت اور جوان لڑکی ہے۔ اُس کی عمر بائیس تیئیس سال تھی۔ وہ بادشاہ قوم کی بیٹی تھی، ہمیں غلام سمجھتی تھی اس لئے اُس نے انگریزی میں ہمیں بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا، پھر یہ سوچ کر کہ ہم انگریزی نہیں سمجھتے، اُس نے اُردو میں ہمیں کوسنا شروع کیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اردو بولنا نہیں جانتی۔ وہ اپنے لہجے میں بڑے غلط فقرے بول رہی تھی۔ یہ چند ایک فقرے تھے، وہ انہی کو دوہرا رہی تھی۔

"میڈم!" —— میں نے اُسے انگریزی میں کہا —— "ہماری زبان کے ساتھ اتنا بُرا سلوک نہ کرو۔ میں اور یہ (حمید اللہ خان) انگریزی سمجھتے اور بولتے ہیں۔ تم اپنی زبان میں بات کرو۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ تمہیں ہم سے چھُڑانے کے لئے کوئی نہیں آئے گا۔ اپنے آپ کو پریشان نہ کرو۔ ہم تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔ ہمارے ساتھ اپنے پاؤں پر چلی چلو، تمہارے ساتھ کوئی بُرا سلوک

نہیں ہوگا۔"

"میں تم ڈاکوؤں سے اچھے سلوک کی توقع نہیں رکھ سکتی" — اُس نے کہا — "تم نے مجھے خوبصورت لڑکی سمجھ کر اُٹھایا ہے۔ مجھے چھوڑ دو اور میرے ساتھ واپس چلو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کوئی گرفتار نہیں کرے گا۔ میں تمہیں پیسے دلواؤں گی اور تم آجانا۔ اگر تمہیں عورت کی ضرورت ہے تو کسی ہندوستانی لڑکی کو لے آؤ۔ ہندوستانی لڑکی کو اغوا کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم جس لڑکی کو پیسے دکھاؤ گے وہ تمہارے ساتھ آجاتے گی۔ مجھے پریشان نہ کرو، ورنہ تم سب کو سزائے موت مل جاتے گی۔"

میں اور حمید اللہ اکٹھے ہی ہنس پڑے۔

"تم ہماری قید میں بھی اپنے آپ کو شہزادی سمجھ رہی ہو" — حمید اللہ خان نے انگریزی میں کہا — "اور تم ہندوستان کی عورتوں کو طوائفیں سمجھتی ہو کہ جن کو جو کوئی پیسہ دکھاتے وہ اُس کے ساتھ چل پڑتی ہیں۔ ہندوستان میں غربت ہے۔ غربت اس لئے ہے کہ تمہاری قوم نے ہمارے ملک کا خون چوس لیا ہے۔"

"حمید بھائی!" — میں نے کہا — "اس کے ساتھ یہ باتیں وہاں چل کر کریں گے۔ اسے ابھی ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ پیدل چلے" — میں نے اُس انگریز لڑکی سے پوچھا — "تمہارا نام کیا ہے؟"

"ریتا!" — اُس نے جواب دیا — "ریتا گلبرٹ! میرا خاوند مسٹر گلبرٹ لیفٹیننٹ ہے۔"

"وہی جس کے ساتھ تم آتی ہو؟"

"ہاں وہی!" — اُس نے جواب دیا۔

میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ وہ اطمینان کے ساتھ ہمارے ساتھ چلی چلے۔ وہ بڑا لمبا سانس لے کر ہمارے ساتھ چل پڑی۔ وہ بار بار پوچھتی تھی کہ ہمارا مقصد کیا ہے اور میں اُسے بار بار تسلی دیتا تھا کہ اُس کے ساتھ اس کے سوا اور کوئی زیادتی نہیں ہوگی کہ وہ تھوڑے سے عرصے کے لئے

ہماری قید میں رہے گی۔

چلنے میں وہ بڑی تیز تھی۔ اُس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا اور اُس کے پاؤں میں سلیپر تھے۔ اگر اُس کے پاؤں میں اونچی ایڑی والے سینڈل ہوتے جیسے انگریز عورتیں پہنا کرتی تھیں تو وہ اتنی تیز نہ چل سکتی۔

ہم نے ایک میل اور فاصلہ طے کر لیا۔ ریتا چلتے چلتے اچانک میرے سامنے آگئی اور اُس نے دونوں بازو میرے گرد لپیٹ دیئے۔ وہ مجھے اپنے حسن و جوانی کا دھوکہ نہیں دے رہی تھی بلکہ کسی حد تک غصے میں تھی۔

"تم بتاتے کیوں نہیں کہ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" — اُس نے کہا — "بتا دو گے تو میں تمہارے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ کیا مجھے کسی کے ہاتھ بیچو گے؟"

"ہاں!" — میں نے رُک کر اور اُس کے بازو ہٹا کر کہا — "ہم تمہیں بیچیں گے۔"

"میں جانتی تھی" — اُس نے غصیلی اور طنزیہ آواز میں کہا — "میں انڈیا میں آتی تھی تو مجھے بتایا گیا تھا کہ ہندوستانی بھوکے اور وحشی ہیں، ان سے دُور رہنا۔ میں نے انڈیا کی تاریخ پڑھی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے ہماری بادشاہی کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور اُنہوں نے ہماری انگریز عورتوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا تھا۔ پھر ہماری حکومت نے باغی مسلمانوں کو بڑی سخت سزا دی تھی۔"

"اگر تم عورت نہ ہوتیں تو میں تمہیں کچھ اور جواب دیتا" — میں نے کہا — "تمہارے دل میں ہندوستانیوں کے خلاف نفرت پیدا کی گئی ہے، اور یہ جو تم نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی بات کی ہے یہ بالکل غلط ہے۔ تم نے وہ تاریخ پڑھی ہے جو تمہارے اپنے ملک کے لوگوں نے لکھی ہے۔ جسے تم بغاوت کہتی ہو وہ ہماری جنگِ آزادی تھی۔ صحیح تاریخ اور صحیح واقعات تو تمہیں میں سناؤں گا۔ تم ڈاکو اور فریب کار قوم کی بیٹی ہو۔ وحشی ہم نہیں، تمہاری قوم وحشی ہے اور اب ہم اس وحشی پن سے اپنے ملک کو آزاد کرائیں گے۔ تمہارا

اغوا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

"لیکن تم تو کہتے ہو کہ مجھے بیچو گے" — اُس نے کہا — "مجھے کہاں لے جا کر بیچو گے؟ کس کے ہاتھ بیچو گے؟"

"تمہارے خاوند کے ہاتھ!" — میں نے جواب دیا — "ہم پچیس ہزار روپیہ وصول کر کے تمہیں تمہارے خاوند کے حوالے کر دیں گے۔"

"پچیس ہزار روپیہ؟" — اُس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا اور کہنے لگی — "تمہیں شاید معلوم نہیں کہ پچیس ہزار روپیہ کتنی زیادہ رقم ہوتی ہے۔"

"کیا تم خوش نہیں ہو کہ ہم نے تمہاری قیمت کتنی زیادہ لگائی ہے؟" — حمیداللہ خان نے کہا — "یہ رقم نہ تمہارے ماں باپ دے سکتے ہیں نہ تمہارا خاوند۔ یہ تمہاری حکومت دے گی۔ جس روز ہمیں یہ رقم مل جائے گی اُس روز ہم تمہیں باعزت طور پر رہا کر دیں گے۔"

"تمہارے جسم کے ساتھ ہمیں کوئی دلچسپی نہیں" — میں نے کہا — "تم بھول جاؤ کہ تم خوبصورت اور جوان ہو۔ ہم ڈاکو، رہزن اور بردہ فروش نہیں۔ کیا تم نے ابھی تک محسوس نہیں کیا کہ ہم پڑھے لکھے اور شائستہ لوگ ہیں؟"

وہ خاموش ہو گئی اور اُس نے سر جھکا لیا۔ میں نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ وہ چل پڑی۔

"تم شائستہ آدمی معلوم ہوتے ہو" — اُس نے چلتے چلتے کہا اور نوراللہ اور بابے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا — "یہ دونوں کیوں خاموش ہیں؟ انہوں نے ابھی تک کوئی بات نہیں کی۔"

"یہ انگریزی نہیں جانتے" — میں نے جواب دیا — "یہ بھی اچھے آدمی ہیں۔"

"تم انڈیا میں کب آئی تھیں؟" — حمیداللہ خان نے اُس سے پوچھا۔

"ایک سال ہونے والا ہے" — اُس نے کہا — "مجھے بتایا گیا تھا کہ انڈیا ایک پُراسرار ملک ہے۔ میرے خاندان کے لئے تو یہ ملک منحوس ثابت ہوا ہے۔"

"اور ہم تم پر ثابت کریں گے کہ یہ ملک منحوس نہیں" — میں نے کہا — "کم از کم تمہارے لئے منحوس نہیں۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہی" — اُس نے کہا — "میرا بڑا بھائی یہاں قتل ہو چکا ہے۔ وہ ڈی ایس پی تھا۔ اُس کا قاتل آج تک گرفتار نہیں ہو سکا۔"

"تمہارے بھائی کا نام کیا تھا؟"

"وارن!" — اُس نے جواب دیا — "وہ یہاں ایک نواب کے محل میں قتل ہوا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اُسے کیوں قتل کیا گیا تھا۔"

وارن وہی ڈی ایس پی تھا جسے میں نے قتل کیا تھا۔

"کیا وہ نواب کے کسی کمرے میں قتل ہوا تھا؟" — میں نے پوچھا — "وہ نواب کے ہاں کیوں گیا تھا؟"

"نہیں!" — اُس نے جواب دیا — "وہ محل کے ایک لان میں رات کے وقت قتل ہوا تھا۔ وہ کسی انکوائری کے سلسلے میں نواب کے ہاں گیا تھا .... میرا خیال ہے کہ اُسے نواب نے قتل کرایا ہوگا۔ وہ پُراسرار حالات میں قتل ہوا تھا۔ قاتل مفرور ہے۔ وہ پولیس کی سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر تھا .... تمہارا مذہب کیا ہے؟"

"ہم چاروں مسلمان ہیں" — میں نے جواب دیا۔

"وہ سب انسپکٹر بھی مسلمان ہے" — اُس نے کہا — "ایسی جرأت صرف مسلمان کر سکتے ہیں۔"

"ہاں مسز گلبرٹ!" — میں نے کہا — "ایک غریب ہندوستانی لڑکی کی عزت بچانے کے لئے ایک انگریز ڈی ایس پی کو کوئی مسلمان ہی قتل کر سکتا تھا۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" — ریتا نے پوچھا۔

"میں تمہیں تمہارے بھائی کے قتل کی وجہ بتا رہا ہوں" — میں نے کہا۔

میں نے اُسے بتایا کہ اُس کا بھائی ڈی ایس پی کیوں قتل ہوا تھا اور کس

طرح قتل ہُوا تھا لیکن یہ نہ بتایا کہ اُس کا قاتل میں ہوں۔

"تم کس طرح جانتے ہو کہ ایسے ہُوا تھا؟" —— ریتا نے پوچھا۔

"سب کچھ بتاؤں گا مسز گلبرٹ!" —— میں نے کہا —— "ابھی کئی اور انگریز ڈی ایس پی قتل ہوں گے۔ وارن صاحب بہادر کو خدا نے مرنے کے بعد بھی نہیں بخشا۔ اُس نے ایک ہندوستانی لڑکی کی عزت برباد کرنے کی کوشش کی تھی۔ آج اُس کی بہن ہندوستانیوں کے قبضے میں ہے مگر ہم کمینے نہیں مسز گلبرٹ!"

ہم چلتے گئے۔ اُس سے پوچھا کہ وہ تھک گئی ہے تو اُسے اُٹھا لیں لیکن وہ چلتی گئی۔



ہماری جگہ جب ایک میل سے ذرا کم رہ گئی تو مجھے ایک احتیاط کا خیال آگیا۔ میں نے سب کو روک لیا۔

"مسز گلبرٹ!" —— میں نے ریتا سے کہا —— "ہمارا ٹھکانہ قریب آگیا ہے۔ وہاں تک ہم تمہاری آنکھیں باندھنا ضروری سمجھتے ہیں۔"

اُس نے پس و پیش کی لیکن میں نے اُس کی آنکھیں باندھ دیں اور اُسی طرح اسے کندھے پر ڈال لیا جس طرح ڈاک بنگلے میں سے اُٹھا کر لایا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے تک سب نے اُسے باری باری اُٹھایا اور ہم اپنے ٹھکانے تک پہنچ گئے۔

غار میں اندھیرا تھا۔ میرے سوا باقی تینوں دوست سگریٹ پیتے تھے۔ ماچسیں جلا جلا کر ہم نے ریتا کے لئے بستر بچھایا اور اُسے کہا کہ وہ بے فکر ہو کر سو جائے لیکن تین آدمیوں کے درمیان اکیلی جوان عورت بے فکر ہو کر نہیں سو سکتی تھی۔ وہ ہماری تسلیوں اور اچھے سلوک کے وعدوں کو قبول کرتی ہی نہیں تھی۔

رات تھوڑی رہ گئی تھی۔ ہم نے پہرے کی باری مقرر کر دی۔ پہلی باری میں نے اپنی رکھی اور باقی سب سو گئے۔ میں نے ایک گھنٹے کا اندازہ رکھا اور نوراللہ کو جگایا۔ وہ بندوق لے کر غار کے مُنہ میں بیٹھ گیا اور میں سو گیا۔

میری آنکھ اُس وقت کھُلی جب سورج طلوع ہو چکا تھا۔ بالا غار کے مُنہ

میں بیٹھا اونگھ رہا تھا، باقی سب سوتے ہوتے تھے اور ریتا بھی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ میں بالے کے پاس جا بیٹھا اور ہم باتیں کرنے لگے۔ سب سے پہلا انتظام تو کھانے پینے کا کرنا تھا پھر اس واردات کے آخری مرحلے کے متعلق سوچنا تھا۔ یہ اطلاع کیسے دینی ہے کہ لڑکی ہمارے پاس ہے اور پچیس ہزار روپیہ ادا کر کے لڑکی کو لے جاؤ؟ اطلاع کس طرح دینی ہے؟ لین دین کے لئے جگہ کونسی مقرر کی جائے؟ سب سے بڑا خطرہ تو اسی مرحلے میں تھا۔ پولیس نے ہمیں رقم کی ادائیگی کے جھانسے میں پکڑنے کی کوشش کرنی تھی۔

بالے نے یہ کہا کہ وہ کھانے پینے کا انتظام کر دے گا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ جہاں بھی جائے بہت ہی محتاط رہے کیونکہ ایک انگریز عورت کا اغوا معمولی سی واردات نہیں۔ انگریزوں کے مخبر دُور دُور تک پھیل رہے ہوں گے۔

اتنے میں ریتا جاگ اُٹھی۔ اُس نے گھبراہٹ کے عالم میں ہر طرف دیکھا۔ اوپر دیکھا پھر آہستہ آہستہ اٹھی اور ہمارے پاس آگئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن صاف پتہ چل رہا تھا کہ کس طرح کہے اور کیا کہے۔

"تمہیں کچھ وقت بھوکا رہنا پڑے گا" —— میں نے اُسے کہا —— "یہ ہمارا گھر نہیں۔ کچھ انتظام کر لیں گے اور یہ دیسی انتظام ہو گا جو تمہیں قبول کرنا پڑے گا۔"

"میں بھوکا رہنا پسند کروں گی لیکن میرے ساتھ کوئی بدمعاشی نہیں ہونی چاہئے" —— اُس نے کہا۔

"اگر بدمعاشی ہونی ہوتی تو رات کو ہو جاتی" —— میں نے اُسے کہا —— "تم ہم پر اعتبار کیوں نہیں کرتیں!"

"تم اس میں اپنی توہین نہ سمجھو" —— اُس نے کہا —— "تمہیں مجرم، ڈاکو اور جرائم پیشہ سمجھنا قدرتی امر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تم سب سے ڈرتی ہوں۔ اب کیا کرو گے؟ میری اطلاع کسی کو دو گے؟"

"کچھ کھانے پینے کا انتظام کر رہے ہیں" —— میں نے کہا —— "پھر سوچیں گے کہ اطلاع کیسے دیں ...... یہ خیال رکھنا ریتا! یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر ہم تمہیں کہہ دیں کہ جاؤ چلی جاؤ تو بھی اکیلی نہ جانا۔ میں تمہیں دکھا دوں

گا کہ یہاں کیسے کیسے خطرے ہیں۔"



یہ تو چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو اُس کے ساتھ ہوئیں۔ اُس کا خوف بجا تھا اور ہماری تسلیاں اور اچھے سلوک کے وعدے جھوٹے نہیں تھے۔ اُسے جب خیال آتا کہ ہم اُس کے بادشاہ کے غلام ہیں تو وہ غصّے میں بات کرتی تھی اور وہ دیکھتی کہ وہ تو ہماری قید میں اور ہمارے رحم و کرم پر ہے تو وہ منّت سماجت پر اُتر آتی تھی۔

بالے اور نوراللہ نے شام تک کھانے پینے کا انتظام کر دیا۔ ہم نے انہیں بہت سے پیسے دے دیئے تھے۔ وہ مٹی کی ہانڈیاں، رکابیاں اور پیالے لے آئے تھے۔ راشن بھی بہت اُٹھا لاتے تھے اور ایک کمال اُنہوں نے یہ کیا کہ دُودھ والی ایک بکری بھی خرید لاتے تھے۔ انہیں اِن چیزوں کے لئے تین میل دُور ایک بڑے گاؤں میں جانا پڑتا تھا۔ آدھا سامان وہ بکری پر لاد کر لاتے تھے۔

"اس گاؤں میں ہر کسی کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ ایک میم صاحب اغوا ہو گئی ہے" — نوراللہ اور بالے نے سنایا — "لوگ کہتے ہیں کہ پولیس پر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ واردات دوسرے تھانے کی ہے لیکن اس گاؤں کے تھانے میں بھی بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔"

گاؤں میں جو افواہیں پھیل گئی تھیں ان میں دلچسپ یہ تھیں کہ اس میم کو شیر پکڑ کر لے گیا ہے۔ ایک یہ بھی کہ اُسے سیتل ڈاکو کی بدروح نے اُٹھایا ہے۔ سیتل اِس جنگل کے علاقے کا بڑا زبردست ڈاکو اور رہزن تھا۔ وہ بہت ہی مالدار آدمی کے گھر واردات کیا کرتا تھا۔ دیہات کے لوگ اُس کی عزت پیروں کی طرح کیا کرتے تھے کیونکہ وہ ان لوگوں کا ہمدرد اور مددگار تھا۔ وہ دو سال پہلے پولیس کے گھیرے میں آگیا اور مارا گیا۔ انگریزوں نے اُس کی لاش اُس کے وارثوں کے حوالے نہیں کی تھی اور یہ بھی پتہ نہیں چلا تھا کہ اُنہوں نے لاش کہاں غائب کر دی تھی۔ لوگوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ سیتل کی بدروح جنگل

میں رات کو گھومتی پھرتی رہتی ہے اور کبھی شیر کے روپ میں آجاتی ہے۔ اس میم کو وہی اُٹھا لے گئی ہے۔

ایک افواہ یہ بھی تھی کہ میم اپنی مرضی سے ایک نواب کے ساتھ چلی گئی ہے۔ کسی نے یہ افواہ یوں اُڑائی کہ میم نے پہلے ہی اس نواب کے ساتھ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ اُس نے بھاگنے کا یہ موقع پیدا کیا کہ اپنے خاوند کے ساتھ شیر کے شکار کو گئی۔ رات کو اُس کا خاوند مچان پر چلا گیا تو وہ بھاگ گئی۔

لوگوں میں یہ عادت آج بھی ہے کہ کوئی واقعہ ہو جاتے تو ہر کوئی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ صحیح بات صرف وہ جانتا ہے۔ لوگ افواہیں گھڑنے اور سنسنی پیدا کرنے میں لطف محسوس کرتے ہیں۔ لیفٹیننٹ گلبرٹ کی بیوی کے اغوا کی خبر گاؤں میں پہنچی تو لوگوں نے اس میں اپنے رنگ بھرنے شروع کر دیئے۔ اغوا کرنے والے ان کے درمیان گھوم پھر رہے تھے اور ضرورت کی چیزیں خرید رہے تھے۔ غلام اور پسماندہ ہندوستانیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کسی انگریز عورت کو کم از کم کوئی ہندوستانی اغوا نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے صوبہ سرحد کے ایک پٹھان عجب خان نے وہاں کے انگریز ڈپٹی کمشنر کی جوان بیٹی کو اس طرح اغوا کیا تھا کہ اُسے اُس کے گھر سے اٹھا کر لے گیا تھا۔



اُس روز بالے اور نوراللہ نے مٹی کی ہانڈی میں آلو پکاتے اور روٹیاں بھی پکائیں۔ وہاں پرندے تو بہت تھے اور ہمارے پاس بندوقیں بھی تھیں لیکن ہم پرندوں پر کارتوس ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ ریٹا نے ہندوستانی کھانا کبھی نہیں کھایا تھا لیکن بھوک نے اُسے ہمارا کھانا کھانے پر مجبور کر دیا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اُسے یہ کھانا اچھا لگا۔

ہم چاروں دوست سر جوڑ کر بیٹھے اور اس مسئلے پر بات چیت کرنے لگے کہ ریٹا کی اطلاع کس کو دی جائے اور پچیس ہزار روپے کا مطالبہ کیسے کیا جائے۔ حمیداللہ خان نے کہا کہ اس ضلعے کے ڈپٹی کمشنر کے نام خط لکھ کر گاؤں کے لیٹر بکس میں ڈال دیا جائے۔ ہمارے پاس لفافہ نہیں تھا، ٹکٹ بھی نہیں تھے۔ کاغذ تھے

اور چھوٹی سی پنسل بھی تھی۔ حمیداللہ خان کہتا تھا کہ کاغذ پر لکھ کر اور اسے تہہ کر کے بیرنگ گاؤں کے لیٹر بکس میں ڈال دیا جائے۔

میں کہتا تھا کہ تہہ کیا ہُوا کاغذ ڈاکخانے والے ہی ضائع کر دیں گے۔ اگر یہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر تک پہنچ بھی گیا تو دفتر والے اسے مذاق سمجھیں گے۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ واردات کسی اور تھانے کے علاقے کی تھی اور جس جگہ ہم تھے یہ علاقہ انسپکٹر فضل حسین کے تھانے میں آتا تھا۔ جس گاؤں سے نوراللہ اور بالا سامان خرید کر لاتے تھے اس گاؤں میں اس تھانے کی ایک چوکی تھی۔ میں نے مشورہ دیا کہ انسپکٹر فضل حسین کے نام پیغام لکھا جائے اور اس کاغذ کو کنکر کے ساتھ باندھ کر رات کو فضل حسین کے تھانے میں پھینکا جائے۔

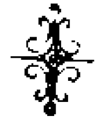
"یہ کام میں خود کر سکتا ہوں" ——— میں نے کہا ——— "میں رات کو تھانے کے قریب سے گزروں گا اور احاطے کے باہر سے کنکر کے ساتھ بندھا ہُوا کاغذ زور سے اندر پھینک دوں گا اور غائب ہو جاؤں گا۔ وہاں سے بھاگ آنے کا بہت وقت مل جائے گا۔"

پھر یہ مسئلہ سامنے آیا کہ کونسی جگہ لکھی جائے جہاں رقم پہنچائی جائے۔ بحث مباحثے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہی جگہ بتائی جائے لیکن اندر نہیں بلکہ ان پہاڑیوں کے دوسری طرف کوئی جگہ لکھی جائے جو اُس جگہ سے دُور ہو جہاں سے ہم اندر آئے تھے۔ میں یہ احتیاط کر رہا تھا کہ پولیس ہمارا یہ ٹھکانہ نہ دیکھ سکے۔ یہ توقع تو ہمیں رکھنی ہی نہیں چاہیئے تھی کہ کوئی ایسا طریقہ بھی ہو گا کہ انگریز بادشاہ دونوں ہاتھوں میں پچیس ہزار روپے کی تھیلی اُٹھاتے ہوئے آئے گا اور بڑے احترام سے ہمارے حوالے کر کے اپنی عورت ہم سے لے جائے گا۔ ہمیں اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا تھا اور یہ زندگی اور موت کا خطرہ تھا۔

آخر یہ فیصلہ ہُوا کہ آج ہی رُقعہ لکھا جائے لیکن اسے تھانے میں پھینکنے کے لئے میں نہیں جاؤں گا بالا جائے گا کیونکہ خطرہ تھا کہ میں پہچانا جاؤں گا۔ مجھے یہ لوگ اس لئے بھی بچانے کی کوشش کر رہے تھے کہ مجھے اپنا دماغ سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ حمیداللہ خان کے دل میں میری اتنی زیادہ محبت تھی کہ وہ مجھے

کسی فالتو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

ایک اور رات آئی اور اُس رات طوفانی بارش شروع ہو گئی۔



یہ تو طوفانِ باد و باراں تھا۔ پہاڑیوں کے درمیان جگہ تنگ تھی۔ نوکیلی چٹانیں بھی تھیں اور بعض چٹانیں اونٹوں اور ہاتھیوں کی شکلوں کی تھیں۔ درخت زیادہ تھے۔ تیز و تُند جھکڑ جب پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتے تھے تو چٹانوں اور درختوں سے ایسی چیخیں نکلتی تھیں جیسے بے شمار عورتیں اور بچے چیختے چلاتے اور دوڑتے جا رہے ہوں۔ جھکڑ کی تیزی ذرا کم ہوتی تھی تو صاف پتہ چلتا تھا کہ ہمارے غار سے باہر عورتیں رو رہی ہیں پھر یہ رونا چیخوں میں بدل جاتا تھا۔ اگر ہمارے دل مضبوط نہ ہوتے تو میں تسلیم کر لیتا کہ یہ جگہ بدروحوں اور چڑیلوں کا مسکن ہے اور آج یہ ہم میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گی۔

ان زناٹوں اور چیخوں کے ساتھ بجلی کی گرج اور چمک تھی۔ گرج تو مسلسل تھی اور جب یہ گرج دھاکہ بنتی تھی تو ایسے لگتا تھا جیسے پہاڑ پھٹ گیا ہو۔ جسم سر سے پاؤں تک لرز جاتے تھے اور پاؤں کے نیچے زمین ہلتی تھی۔

یہ طوفان جب شروع ہُوا تھا تو ہمیں ایک اور صورتِ حال کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔ گیدڑ، اُودھ بلاؤ، بھیڑیئے وغیرہ رات کو باہر نکلا کرتے ہیں۔ اُس رات بھی وہ باہر نکلے اور جب طوفان آ گیا تو ان میں سے بعض اپنے بلوں اور کچھاروں میں جانے کی بجائے اس غار میں پناہ لینے کے لئے دوڑے آتے جس میں ہم پناہ گزین تھے۔ ہم نے شور شرابہ کیا تو وہ بھاگ گئے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر چلتا رہا۔

طوفان اور بجلی کے دھماکوں نے رات کو خوفناک بنا رکھا تھا۔ بجلی مسلسل چمک رہی تھی۔ غار میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے دن جیسی روشنی ہو جاتی تھی۔ حمیداللہ خان سو گیا تھا۔ نوراللہ اور بالا الگ اکٹھے بیٹھے تھے اور میں غار کے ایک کونے میں دبکا ہُوا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ ریتا ڈر رہی ہو گی۔ وہ شاید خوف کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر سر کتی ہوئی میرے

پاس آ بیٹھی۔

"ڈر آتا ہے؟" — میں نے اُس سے پوچھا۔

"بہت!" — اُس نے جواب دیا۔

"کیا مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے بھی ڈر آتا ہے؟"

"کچھ کم ہو گیا ہے" — اُس نے جواب دیا — "میرا خیال ہے تم ان میں زیادہ شائستہ آدمی ہو۔"

"اگر ان میں کوئی ایک بھی شائستہ نہ ہوتا تو تم جیسی خوبصورت لڑکی کے ساتھ کچھ اور سلوک ہوتا" — میں نے کہا — "ہم چاروں کا ڈر دل سے نکال دو۔ ہمارے لئے تم ایک بے جان چیز ہو جسے ہم نے چوری کیا ہے۔ ہمیں مطلوبہ چیز مل جائے گی تو ہم یہ چیز اُس کے مالک کو واپس کر دیں گے۔"

"اور تم خوبصورت آدمی ہو" — وہ میرے قریب ہو گئی۔ میرے ایک بازو کو اپنے ہاتھ سے آہستہ آہستہ دباتے ہوئے بولی — "تمہارا جسم بہت اچھا ہے۔ تمہارا چہرہ آنکھیں اور بال یونان کے مردوں جیسے ہیں۔ تم یہ نہ بتاتے کہ تم ہندوستانی ہو تو میں تمہیں یونانی سمجھتی۔"

وہ میرے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اُس سرد رات میں مَیں اُس کے جسم کی گرمی کو محسوس کر رہا تھا لیکن میری ذات میں جو سردی تھی اسے یہ خوبصورت لڑکی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ وہ رہائی کے لئے مجھے اپنے حسن و جوانی کے جال میں پھانس رہی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" — اُس نے پوچھا۔

"سکندر!"

"سی کاندر" — اُس نے اپنے لہجے میں میرا نام دُہرایا — "ہندوستانیوں کے عجیب عجیب سے نام ہوتے ہیں۔ تمہارا نام آسان ہے۔"

"اگر سکندر کہنا مشکل ہے تو الیگزانڈر کہہ لو" — میں نے کہا — "سکندر کو تمہاری زبان میں الیگزانڈر کہتے ہیں .... لیکن یہ نہ کہہ دینا کہ میں الیگزانڈر کی نسل سے ہوں۔ وہ یونانی تھا۔"

"میرے بھائی کے قاتل کا نام بھی سکندر ہے" — ریتا نے کہا — "سُنا ہے کہ وہ بھی خوبصورت آدمی ہے .... تم نے کہا تھا کہ میرے بھائی کے قتل کے متعلق کچھ بتاؤ گے اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ اُس نے ایک غریب انڈین لڑکی کی عزت کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کی تھی۔"

"تم یہ تو جانتی ہو گی کہ وہ ایک نواب کے محل کے باہر قتل ہُوا تھا" — میں نے کہا۔

"میں اُس نواب کو جانتی ہوں" — ریتا نے کہا — "وہاں کوئی تقریب تھی۔"

میں نے اُسے بتایا کہ اس تقریب میں پولیس کے انگریز افسروں نے کیسی کیسی بدتمیزیاں کی تھیں اور کس طرح اُس کا بھائی محل کے ایک ملازم کی نوجوان بیٹی کو پکڑ کر محل کے ایک لان میں لے گیا تھا۔

"لڑکی اُس کی منّت سماجت کرتی تھی" — میں نے کہا — "لیکن تمہارا بھائی اُسے پیسوں کا لالچ دے رہا تھا اور زبردستی پر اُترا ہُوا تھا۔ پولیس کا ایک سب انسپکٹر جس کا نام سکندر تھا، لڑکی کو تمہارے بھائی سے چھڑانے کے لئے اُس کے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ بروقت پہنچ گیا اور اُس نے تمہارے بھائی کو قتل کر کے لڑکی کی عزت بچالی۔"

"میں اسے سچ نہیں مان سکتی" — ریتا نے کہا — "تم اس طرح بات کر رہے ہو جیسے تم وہاں موجود تھے۔ تم سنی سنائی سُنا رہے ہو۔"

"میں وہاں موجود تھا مسز گلبرٹ!" — میں نے کہا — "میں موقعہ کا گواہ نہیں .... میں قاتل ہوں .... ڈی ایس پی وارن کو میں نے قتل کیا تھا۔ میں سب انسپکٹر سکندر ہوں۔"

وہ اس طرح مجھ سے الگ ہٹ گئی جیسے میں نے اُسے ڈنک مار دیا ہو۔ یوں لگا جیسے رات اور زیادہ طوفانی ہو گئی ہو۔ طوفان کی چیخیں اور بجلی کی کڑک کچھ بڑھ گئی تھی۔

"وہ لڑکی تمہاری کیا لگتی تھی؟" — ریتا نے بہت دیر خاموش رہ کر پوچھا

"اس کے ساتھ میرے دو رشتے تھے" — میں نے جواب دیا — "وہ ہندوستان کی لڑکی تھی اور دوسرا رشتہ بہت ہی گہرا تھا۔ وہ مسلمان تھی۔"

"لیکن تمہیں کیا حاصل ہُوا؟" — ریتا نے پوچھا — "انڈیا کی پولیس کا اتنا قابل اور سینئر آفیسر مارا گیا اور تم اپنے عہدے اور اپنی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھے۔"

"وہ میرے ملک کی پولیس کا آفیسر نہیں تھا" — میں نے کہا — "وہ اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا تھا .... وہاں نواب کے محل میں جتنے بھی انگریز افسر تھے وہ سب مجھے سپیشل برانچ کا بڑا قابل سب انسپکٹر سمجھتے تھے۔ میں نے دہشت گردوں کے جو گروہ توڑے ہیں اور جتنے خطرناک دہشت گرد لیڈروں کو میں نے گرفتار کرایا ہے وہ انگریز افسر نہیں کرا سکتے تھے، لیکن مجھے وہ اپنا ایک دیانتدار اور وفادار غلام سمجھتے تھے۔ وہاں میری اپنی بہن بھی تھی۔ تمہارے انگریز افسروں نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں انہیں اپنی بہن پیش کروں۔"

"تمہاری بہن وہاں کیا کر رہی تھی؟" — ریتا نے پوچھا۔

"یہ ایک الگ داستان ہے مسز گلبرٹ!" — میں نے کہا — "ضروری نہیں کہ میں تمہیں اتنی زیادہ باریک اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی بتاؤں۔ اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ وہ نواب کے محل میں موجود تھی اور میں نے اُسے وہاں سے نکالنا تھا۔ تم انسپکٹر ولکاکس کو جانتی ہوگی۔ اُس سے پوچھ لینا۔ میں نے اپنی بہن کو وہاں سے نکال کر ایک جگہ چھپا دیا تھا۔ تمہارے افسروں نے اُس غریب ملازم کی بیٹی کو پکڑ لیا اور تمہارا بھائی شراب کے نشے میں بدمست اُسے الگ لے گیا۔"

"میرا خیال ہے کہ میرے بھائی کا یہ جُرم اتنا سنگین نہیں تھا کہ اُسے قتل کر دیا جاتا" — ریتا نے کہا۔

"مسز گلبرٹ!" — میں نے کہا — "تم ہمارے پاس کیا محسوس کر رہی ہو؟ .... کیا تم ڈر نہیں رہیں کہ ہم چاروں تمہارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو تمہارا بھائی اُس لڑکی کے ساتھ کرنا چاہتا تھا؟"

"ہاں" — ریتا نے جواب دیا — "تمہاری تسلی اور وعدوں کے باوجود

مجھے ڈر بھی ہے۔"

"غلام عورتوں کو بھی یہی ڈر ہوتا ہے" — میں نے کہا — "ہر عورت کو اپنی عصمت عزیز ہوتی ہے۔ غلاموں کو تو یہ ڈر ہر لمحہ رہتا ہے کہ اُن کی عصمت محفوظ نہیں .... ہماری ایک بدنصیبی تو یہ ہے کہ ہم غلام ہیں اور دوسری بدنصیبی یہ ہے کہ ہم تمہاری قوم کے غلام ہیں۔"

"ہماری قوم کی غلامی کو تم اتنا بُرا کیوں سمجھتے ہو؟"

"مسز گلبرٹ!" — میں نے کہا — "تمہاری قوم بدکار اور بے حیا ہے۔ اس ملک پر مسلمانوں نے بھی حکومت کی ہے .... پورے آٹھ سو سال .... میرے آباؤ اجداد نے ہندوؤں کی بے حیائی کو ختم کیا تھا۔ تمہاری قوم نے ہندوستانیوں کو یہی سبق دیا ہے کہ اخلاق اور کردار ضروری نہیں .... کیا یہ غلط ہے کہ تم اپنی عزّت مجھے دے کر رہا ہونا چاہتی ہو؟"

وہ ہنس پڑی۔

"تمہارے ماں باپ تو ہوں گے!" — اُس نے پوچھا — "کیا تم انہیں ملنے جاتے ہو؟ گرفتاری کے ڈر سے تم نہیں جاتے ہوگے۔"

"میرا کوئی بھی نہیں" — میں نے جواب دیا — "یہی تین دوست ہیں جو میرے سب کچھ ہیں، یا میں اُسے اپنے خون کا رشتہ دار سمجھتا ہوں۔ جو مظلوم ہوتا ہے .... میں تمہیں بھی مظلوم سمجھتا ہوں۔ تمہاری عزّت اور جان کی حفاظت میں اپنی جان دے دوں گا۔"

"تمہاری بہن اب کہاں ہے؟"

"وہ مر گئی ہے" — میں نے جواب دیا۔

"تم کب تک بھاگے بھاگے پھرو گے؟"

"میں بھاگ نہیں رہا" — میں نے جواب دیا — "میں صرف چھپ رہا ہوں۔ جنگ میں بڑے دلیر فوجی بھی چھپ کر فائر کیا کرتے ہیں۔ صرف ایک ہندوستانی لڑکی کی عصمت کو ایک انگریز سے بچا کر میری تسکین نہیں ہوتی میں ہندوستان کی عصمت کو تمہاری قوم سے بچانے کے لئے زمین دوز

جنگ لڑ رہا ہوں۔"

اُس کے ساتھ بہت باتیں ہوتیں۔ اُس میں شہنشاہی کی جو رعونت تھی وہ نکل گئی۔ میں تو کہوں گا کہ اُس کے خیالات ہی بدل گئے، اور یہ اس وجہ سے نہیں ہُوا کہ وہ قید میں مجبور تھی اور اُس پر خوف طاری تھا بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اُس میں عقل اور ذہانت تھی اور چونکہ وہ خود قید میں تھی اس لئے سمجھ گئی تھی کہ غلامی کتنی بڑی لعنت ہے اور غلامی سے آزاد ہونے کی جد وجہد کرنے والے لوگ کتنے عظیم ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ متاثر ہمارے سلوک سے ہوتی جو اُس کے لئے غیر متوقع تھا۔

"کیا تمہارے دل سے خوف نکل گیا ہے؟" — مَیں نے پُوچھا۔

"میرے دل سے بہت کچھ نکل گیا ہے" — اُس نے کہا — "مجھے معلوم نہیں تھا کہ انڈیا میں تم جیسے خود دار آدمی بھی موجود ہیں۔"

"وہ سب خود دار تھے جن کے متعلق تمہیں یہ بتایا گیا ہے کہ اُنہوں نے ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی تھی" — میں نے کہا — "غلاموں کی جنگِ آزادی آقاؤں کی نظر میں بغاوت اور دہشت گردی ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ تمہاری قوم کے خلاف ایک اور بغاوت شروع ہو چکی ہے ..... مسز گلبرٹ! تم سو جاؤ۔ ڈرو نہیں ..... نہ ہم سے ڈرو نہ طوفان سے۔"

اُس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ میں نے رسمی سی ایک دو باتیں کیں تو بھی وہ چُپ رہی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے ایک بار پھر کہا کہ سو جائے تو وہ لیٹ گئی۔ میرے پاس ایک چادر تھی وہ مَیں نے اُس پر ڈال دی۔

بجلی اس قدر زور سے کڑکی جیسے غار کے اندر بم پھٹا ہو۔ چمک اتنی جو سورج کی چمک سے دو تین گنا زیادہ تھی۔ رِیتا چیخ کر اُٹھی اور میرے ساتھ لپٹ گئی۔ وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔ میں نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اُس کی حالت ڈرے ہُوئے بچے کی سی ہو گئی تھی جو اپنی ماں کی گود میں پناہ لیا کرتا ہے۔

رات گزر گئی۔ نہ وہ خود سوئی نہ اُس نے مجھے سونے دیا۔ صبح طلوع ہو رہی

تھی جب مجھے اُونگھ آئی اور میری آنکھ لگ گئی۔ اُس وقت طوفان ختم گیا تھا۔

رِیتا بھی شاید اُسی وقت سوئی تھی۔ مجھے دوستوں نے جگایا۔ نور اللہ اور بالے نے پراٹھے پکاتے تھے۔ اُس دَور میں چائے کا رواج نہیں تھا۔ دیہات میں اکثر لوگ چائے کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ ہم چاروں میں صرف حمیداللہ خان چائے پیتا تھا۔ انگریز چائے کے عادی تھے اس لئے میں نے بالے سے کہا تھا کہ چائے کی پتی ضرور لائے جو وہ لے آیا تھا۔

رِیتا کے لئے ہم نے چائے تیار کی اور مٹی کے پیالے میں اُسے دی۔ وہ کچھ دیر پیالے کو ہر طرف سے گھما گھما کر دیکھتی رہی پھر اُس نے میری طرف دیکھا اور مسکرائی۔

"یہاں یہی کچھ ہے مسز گلبرٹ!" — میں نے کہا — "تمہیں یہی قبول کرنا پڑے گا۔"

"مجھے یہ اچھا لگ رہا ہے" — اُس نے کہا — "میں اس زمانے سے پیچھے چلی جانا چاہتی ہوں جب انسان اسی طرح غاروں میں رہا کرتا تھا۔ انسان جتنی ترقی کرتا چلا جاتا ہے اتنی ہی اپنے لئے مشکلات پیدا کر رہا ہے۔"

"پھر ہمارے ساتھ اسی غار میں رہو" — میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

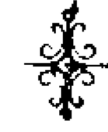
"اگر تم لوگ مجرم نہ ہوتے تو میں بڑی خوشی سے یہیں رہ جاتی" — اُس نے کہا۔

"فکر نہ کرو" — میں نے کہا — "ہم تمہیں بہت جلدی یہاں سے نکال دیں گے۔"

"لیکن یہ تمہارے خاوند اور تمہاری حکومت پر منحصر ہے کہ وہ تمہیں جلدی رہا کراتے ہیں یا نہیں" — حمیداللہ خان نے کہا — "تمہاری بادشاہی کے لئے پچیس ہزار روپیہ اتنی بڑی رقم نہیں۔"

"میرا خاوند اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا" — رِیتا نے کہا — "اگر میری حکومت کو رحم آگیا تو میرے لئے یہ رقم ادا کر دے گی۔ تم انہیں اطلاع دے دو۔"

ہم نے اُسی روز اطلاع بھجوانے کا فیصلہ کر لیا۔ بارش کی وجہ سے کیچڑ بہت زیادہ ہو گیا تھا پھر بھی ہم چاہتے تھے کہ اطلاع جلدی بھیج دی جائے۔



میں اور حمید اللہ کاغذ اور پنسل لے کر الگ جا بیٹھے اور انسپکٹر فضل حسین کے نام پیغام لکھنے لگے۔ ہم نے لکھا:

"انسپکٹر فضل حسین! تم نے مجھے چیلنج کیا تھا کہ تم مجھے پکڑو گے۔ اب موقع ہے، آؤ اور مجھے پکڑو۔ لیفٹیننٹ گلبرٹ کی بیوی میرے پاس ہے۔ یہ خط اپنے ڈی ایس پی کو پیش کر دینا اور اُسے کہنا کہ تمہیں اپنی عورت چاہیئے تو پچیس ہزار روپیہ ادا کر کے اپنی عورت کو لے جاؤ۔ یہ اس عورت سے پوچھنا کہ ہم نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں اخلاقی مجرم نہیں۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو مسز گلبرٹ کے جسم کے ساتھ اور اُس کی خوبصورتی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمیں پچیس ہزار روپیہ چاہیئے۔ میں یہ روپیہ عیاشی میں نہیں اُڑاؤں گا بلکہ تمہیں اور تم جیسے ہندوستانیوں کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں خرچ کروں گا۔ اگر تمہیں میری بات سمجھ نہ آئے تو اپنی پولیس فورس لے کر آجاؤ اور اپنے آقاؤں کی عورت کو ہم سے چھڑا لے جاؤ ـــ سکندر۔"

میں نے اس خط میں وہ جگہ بھی لکھی تھی جہاں رقم لا کر رکھنی تھی۔ یہ جگہ ہمارے ٹھکانے سے دُور اسی پہاڑی علاقے کے ساتھ تھی۔ ایک بہت بڑا درخت تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ رقم اس درخت کے نیچے ایک آدمی آگے آکر رکھ دے اور ہمارا ایک آدمی جا کر رقم کی تھیلی اُٹھا لے گا۔ مسز گلبرٹ اُس کے ساتھ ہو گی۔ ہمارا آدمی واپس آجائے گا اور مسز گلبرٹ رہا ہو کر چلی جائے گی۔

میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی یا ہمارے آدمی کو پکڑا گیا یا ہمارے آدمی کو دُور سے گولی مار دی گئی تو یہ سوچ لو کہ مسز

گلبرٹ ہمارے رینج میں ہو گی، ہم اُسے گولی مار دیں گے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ ہماری نفری خاصی زیادہ ہے اور ہمارے پاس رائفلیں اور ریوالور ہیں۔ اس کے علاوہ ہم اونچی جگہوں پر بڑی اچھی پوزیشن میں ہوں گے ہم کسی ایک آدمی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

میں نے یہ رقعہ تہہ کیا۔ اس کے ساتھ تقریباً آدھ پاؤ وزنی پتھر باندھا۔ انسپکٹر فضل حسین کا تھانہ کم و بیش چار میل دُور تھا۔ بالے نے رات کو یہ رقعہ لے جا کر انسپکٹر فضل حسین کے تھانے کے احاطے کے اندر پھینکنا تھا۔

ہم نے رقم لانے کا دن اور وقت بھی مقرر کر دیا تھا۔ اس کے مطابق ہم نے انگریزی حکومت کو چار دن کی مہلت دی تھی۔

غار سے باہر طوفانِ باد و باراں نے یہ حالت کر دی تھی کہ جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ کمزور درختوں کے ٹہن ٹوٹ گئے تھے۔ غار کے قریب ہی ایک پُرانے درخت کا بہت موٹا ٹہن ٹوٹ کر گرا ہُوا تھا۔ میں نے اسے دیکھا۔ جہاں سے یہ ٹوٹا تھا وہاں سے کالا ہو گیا تھا۔ یہ نشانی تھی کہ اس ٹہن پر بجلی گری تھی۔ رات کو جو سب سے زیادہ خوفناک دھماکہ ہُوا تھا اور سورج سے زیادہ چمک پیدا ہوتی تھی، وہ اس بجلی کی تھی جو اس درخت پر گری تھی۔

بالا اور نور اللہ کھانا پکانے میں مصروف تھے۔ انہوں نے بکری کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ یہ خاصا زیادہ دودھ دینے والی بکری تھی۔ بکری کو چرنے چگنے کے لئے کھُلا چھوڑا گیا تھا۔ اچانک ہمیں بکری کے بولنے کی ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے اُسے درندے نے پکڑ لیا ہو۔ بکری کی ایسی آوازیں اُس وقت نکلتی ہیں جب اسے ذبح کرنے کے لئے گرایا جاتا ہے۔ بالے نے کہا کہ بکری کو دیکھو، اسے کیا ہو گیا ہے۔

میں اور حمید اللہ خان اُس طرف گئے جدھر سے بکری کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ریتا بھی ہمارے پیچھے پیچھے آگئی۔ ہم اُس جگہ تک پہنچ گئے جہاں پانی جمع تھا اور اس کے ارد گرد دلدل تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہم نے چھوٹے مگرمچھ دیکھے تھے۔ اب تو اُس جگہ کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ یہ جو چھوٹا سا چھپڑ تھا

اب جھیل بنا ہُوا تھا۔ پانی زیادہ علاقے میں پھیل گیا تھا۔

ہم نے اپنی بکری کو دیکھا۔ وہ اس پانی کے کنارے جا پہنچی تھی اور دو مگرمچھوں نے اُسے اس طرح پکڑ رکھا تھا کہ اُس کی ایک ٹانگ ایک مگرمچھ کے مُنہ میں اور دوسری دوسرے مگرمچھ کے مُنہ میں تھی۔ وہ دونوں اسے گھسیٹتے ہُوئے گہرے پانی میں لے جا رہے تھے۔ ہم بکری کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ مگرمچھ اُسے گھسیٹتے ہُوئے پانی میں لے گئے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بکری پانی میں غائب ہو گئی۔ ہمارا دُودھ کا جو ذریعہ تھا وہ بھی گیا۔

"میں نے یہ تماشا پہلی بار دیکھا ہے"۔۔۔ ریتا نے کہا۔

ہم وہاں سے واپس آ گئے۔



شام کے بعد بالا پتھر کے ساتھ بندھا ہُوا رقعہ لے کر چل پڑا۔ نور اللہ بھی یہ کہہ کر اُس کے پیچھے چلا گیا کہ وہ بالے کو اکیلا نہیں جانے دے گا۔ ان دونوں کے پاس خنجر تھے۔ میں اور حمید اللہ وہاں تک اُن کے ساتھ گئے جہاں مگرمچھ تھے اور ایک اژدہا بھی تھا۔ ہم جب اس راستے سے اندر آتے تھے تو اُس وقت ہمیں تھوڑی سی جگہ خشک مل گئی تھی مگر اب پانی ہی پانی تھا۔ بالا اور نور اللہ پانی میں سے ہی گزرنے لگے تھے لیکن میں نے اُنہیں روک لیا کیونکہ مگرمچھوں کا خطرہ تھا۔ اُن دونوں کو پہاڑی کی ڈھلوان پر چڑھ کر اور بہت آہستہ آہستہ چلتے گزرنا پڑا۔

ہم واپس آ کر اپنے ساتھیوں کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ میں نے گزشتہ رات اپنے متعلق ریتا کو بتا دیا تھا کہ میں کون ہوں۔ اب اُسے حمید اللہ خان کے متعلق بھی بتا دیا کہ یہ نوابزادہ ہے۔ یہ بھی بتا دیا کہ اس نے ایک آدمی کو قتل کیا تھا اور اسے عمر قید کی سزا ہوتی تھی اور یہ جیل سے فرار ہو کر آ گیا تھا۔ حمید اللہ خان نے ریتا کو یہ بتانا شروع کر دیا کہ انگریزوں نے ان نوابوں اور مہاراجوں کو کیوں چھوٹی چھوٹی ریاستیں دے رکھی ہیں اور یہ لوگ اپنی رعایا کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔

"یہ نواب اور مہاراجے اپنی رعایا کے لئے فرعون بنے ہوتے ہیں"۔۔۔ حمید اللہ خان نے کہا۔۔۔ "ان کے محلات میں شراب پانی کی طرح بہتی ہے۔ ان کے کُتے بھی اُنہی جیسے کھانے کھاتے ہیں اور ان محلات کے سائے میں لوگ فاقہ کشی کرتے ہیں۔ تمہارے انگریز افسران محلات میں آ کر عیاشیاں کرتے ہیں"۔

"تمہارا بھائی بھی عیاشی کرنے آیا تھا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اور وہ مارا گیا"۔

"مت سناؤ مجھے بار بار!"۔۔۔ ریتا نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔ "میں یہ سُن سُن کر تنگ آ گئی ہوں۔ میرے بھائی نے جو گناہ کیا تھا اُس کی اُسے سزا مل گئی ہے۔ میں شرمسار ہوں"۔

"اپنی قوم کو بھی شرمسار کرو"۔۔۔ حمید اللہ خان نے کہا۔

"میں کچھ نہیں کر سکتی"۔۔۔ ریتا نے پہلے سے زیادہ جھنجھلاہٹ سے کہا۔۔۔ "میں اکیلی کیا کر سکتی ہوں .... میں تمہیں بتا دیتی ہوں کہ میں تم لوگوں سے بہت متاثر ہوتی ہوں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میری جان انڈیا کے کام آ سکتی ہے تو میں جان دے دوں گی۔ میں حیران ہوں کہ تم اتنے اونچے کردار کے آدمی ہو کہ جس قوم کو تم اپنا دشمن سمجھتے ہو اُس قوم کی ایک خوبصورت لڑکی تمہارے قبضے میں ہے اور تم اُسے اپنی معزز مہمان سمجھ رہے ہو۔ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ میں چار وحشیوں کے قبضے میں آ گئی ہوں اور میں بڑی ہی اذیت ناک موت مروں گی۔ میں یہی کر سکتی ہوں کہ تمہارے ساتھ رہوں اور انڈیا کی آزادی کے لئے جو جنگ تم لڑنا چاہتے ہو وہ میں بھی لڑوں"۔

"نہیں مسز گلبرٹ!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "ہم تمہیں کسی اور مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ ہم نے تمہیں پہلے ہی جس مصیبت میں ڈال رکھا ہے، اس پر ہمیں افسوس ہے۔ ہم نے تمہیں آلۂ کار بنایا ہے"۔

یہ ایک خاموش رات تھی۔ ہم اپنے دونوں ساتھیوں کے انتظار میں بے تاب تھے۔ وہ اتنے اناڑی تو نہیں تھے کہ پکڑے جاتے پھر بھی کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرا خطرہ اُس جگہ موجود تھا جہاں سے انہوں نے اس ٹھکانے میں اندر آنا تھا۔

وہ پہاڑ کی ڈھلان کے ساتھ ساتھ نکل تو گئے تھے لیکن خطرہ سا محسوس ہوتا تھا کہ واپسی پر وہ پھسل نہ جائیں۔

چاندنی بڑی صاف تھی لیکن جہاں سے انہوں نے گزرنا تھا وہاں پہاڑی کا سایہ پڑتا تھا اور وہاں درخت اتنے گھنے تھے جن سے اندھیرا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک بندوبست کرنے کی سوچی۔ ہم نے بہت سی خشک لکڑیاں غار میں اکٹھی کر لی تھیں۔ میں نے اور حمید اللہ نے کچھ لکڑیاں اٹھائیں اور وہاں تک چلے گئے جہاں سے ہمارے ساتھیوں نے گزرنا تھا۔ ایک موزوں اور ذرا بلند جگہ جا کر یہ لکڑیاں رکھیں اور انہیں آگ لگا دی۔ جوں جوں آگ زیادہ ہوتی گئی روشنی بڑھتی گئی۔ اس سے راستہ کچھ نظر آ ہی جاتا تھا۔

ہم وہیں کھڑے رہے۔ ریتا بھی ساتھ تھی۔ آخر ہمیں نوراللہ اور بالے کی باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے بلند آواز سے انہیں پکارا اور کہا کہ وہ آگ کو دیکھ کر اس کی سیدھ میں چلتے آئیں۔

وہ سنبھل سنبھل کر آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کام کر آئے ہیں۔



مقررہ دن تک جو دن گزرے وہ ویسے ہی گزرے جیسے پہلے گزر رہے تھے۔ ریتا ہم میں گھل مل گئی تھی۔ میرے ساتھ وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی تھی۔ وہ مجھ میں ایسی دلچسپی لیتی تھی جس میں دکھاوا نہیں تھا۔

مقررہ وقت سے دو گھنٹے پہلے ہم چاروں پہاڑیوں کے اندر اندر اُس جگہ پہنچ گئے جہاں ہم نے پوزیشنیں لے کر بیٹھنا تھا۔ ہمارے سامنے اور نیچے وہ درخت تھا جس کے نیچے گورنمنٹ کے کسی آدمی نے یا ریتا کے خاوند نے رقم لا کر رکھنی تھی۔ ہمارے سامنے کھلا علاقہ تھا۔ کہیں کہیں چھوٹے بڑے کھڈ بھی تھے۔ ہم ہر طرف دیکھ رہے تھے کہ پولیس یا فوج تو نہیں آ گئی؛ ہمیں ایسے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

صحیح وقت پر ایک انگریز جس نے فوجی وردی پہن رکھی تھی سامنے آیا۔ وہ جہاں سے سامنے آیا تھا وہاں دو تین ٹیکریاں سی تھیں اور اُن کے دائیں

بائیں کھڈ تھے۔ ریتا میرے ساتھ تھی۔ اُس نے بتایا کہ یہ جو آ رہا ہے اُس کا خاوند لیفٹیننٹ گلبرٹ ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔ میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُس زمانے میں کرنسی نوٹ کم ہوتے تھے اور روپے کے سکے زیادہ چلتے تھے۔ تھیلی جو لیفٹیننٹ گلبرٹ نے اُٹھا رکھی تھی وہ خاصی وزنی معلوم ہوتی تھی۔ اس میں پچیس ہزار روپے سکوں کی صورت میں تو نہیں آ سکتے تھے ان میں سکوں کے ساتھ نوٹ بھی ہوں گے۔

ریتا کے خاوند نے درخت کے نیچے آ کر تھیلی زمین پر رکھ دی اور پہاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔

ہم چاروں اکٹھے چھپے بیٹھے تھے۔ ہم میں یہ بحث شروع ہو گئی کہ ریتا کو ساتھ لے جا کر تھیلی اُٹھانے کون جائے۔ مجھے میرے ساتھی جانے نہیں دیتے تھے۔ حمید اللہ کو بھی نوراللہ اور بالے نے روک لیا۔ بالا یا نوراللہ جانا چاہتے تھے۔ حمید اللہ نے کہا کہ ہم ہر کام ان دونوں کے ذمے ڈال دیتے ہیں۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ اس خطرے میں بھی انہیں ہی بھیجا جائے۔

ہم اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے جو ریتا نہیں سمجھ سکتی تھی لیکن اتنا تو وہ سمجھتی تھی کہ ہم ایسے وقت کسی بحث میں اُلجھ گئے ہیں جب ہم میں سے کسی ایک کو فوراً نیچے جانا چاہیئے۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ ہم کس مسئلے پر بحث کر رہے ہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ ہم یہ فیصلہ کر رہے ہیں کہ ہم میں سے کون تھیلی اُٹھانے جائے۔

"میں جاتی ہوں"— ریتا نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم نہیں جا سکتیں"— میں نے کہا۔

"مجھ پر اعتبار کرو سکندر!"— ریتا نے کہا — "میں اپنے ہاتھ سے تمہیں یہ رقم دینا چاہتی ہوں"— یہ کہہ کر وہ بڑی تیزی سے نیچے اُتر گئی پھر اُس نے رُک کر پیچھے دیکھا اور بولی — "اگر میں اِدھر آنے کی بجائے اپنے خاوند کے ساتھ چل پڑوں تو تمہارے پاس دو بندوقیں، ایک رائفل اور ایک ریوالور ہے۔ میں اور میرا خاوند تمہارے رینج میں ہوں گے۔ تم بڑی آسانی سے ہمیں گولی

مار سکتے ہو۔"

پیشتر اس کے ہم اُسے روکتے یا ہم میں سے کوئی پیچھے جاکر اُسے پکڑتا وہ دوڑ پڑی۔ اُدھر سے اُس کا خاوند اُس کی طرف دوڑا۔

"دونوں بیوقوف ہیں" ــــ حمید اللہ خان نے کہا ــــ "جانتے ہوئے کہ ہم انہیں بڑی آسانی سے گولیوں سے اُڑا سکتے ہیں۔ یہ ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

حمید اللہ خان نے اپنا ریوالور دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے سامنے ہاتھ ایک بڑے پتھر پر ٹکاتے اور اُن دونوں کو شست میں لینے لگا۔ میرے پاس رائفل تھی جو ڈاک بنگلے کے چوکیدار کی تھی۔ میں نے رائفل سیدھی کر لی لیکن پیچھے کچھ اور ہی نقشہ دیکھا۔ ریتا کا خاوند ریتا کی طرف آرہا تھا۔ اُس نے ریتا کو بازوؤں میں لینے کے لئے اپنے بازو پھیلا رکھے تھے مگر ریتا اُس کے بازوؤں میں جانے کی بجائے اُس کے قریب سے گزر کر آگے چلی گئی اور تھیلی کے پاس جاکر تھیلی اُٹھالی۔ وہ تھیلی دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر ہماری طرف چل پڑی۔

لیفٹیننٹ گلبرٹ نے اُسے روک لیا لیکن وہ اُسے ایک طرف کر کے آگے آئی۔ لیفٹیننٹ گلبرٹ نے اُسے کمر سے پکڑا اور پیچھے کو گھسیٹا۔ ریتا اپنے آپ کو اُس سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیفٹیننٹ گلبرٹ نے ریوالور نکال لیا اور نالی ریتا کی طرف کر دی۔ فوراً بعد اُس نے جھپٹا مارا اور ریتا کے ہاتھ سے تھیلی لے لی۔ وہ دوسری طرف چل پڑا۔ اُس نے ریوالور بیلٹ میں اُڑس کر ریتا کو بازو سے پکڑا اور اُسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹنے لگا۔

اس صورتِ حال کو ہم فوراً سمجھ گئے۔ ریتا رقم ہمیں دینے کے لئے لا رہی تھی مگر اُس کے خاوند نے یہ دیکھ کر کہ اُسے اپنی بیوی تو مل ہی گئی ہے وہ اتنی رقم کیوں ہمیں دے، رقم کی تھیلی ریتا سے لے لی۔

"میں اسے نہیں چھوڑوں گا" ــــ حمید اللہ خان نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ریوالور فائر کر دیا۔

لیفٹیننٹ گلبرٹ کے ہاتھ سے رقم کی تھیلی گر پڑی اور اُس کے ہاتھ

سے ریتا کا بازو بھی چھوٹ گیا اور وہ اپنے بائیں کولہے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی اُس کی نیکر خون سے لال ہو گئی۔ گولی اُس کے بائیں کولہے میں لگی تھی۔ ریتا نے پہلے اپنے خاوند کو اُس کے پاس بیٹھ کر دیکھا کہ اُسے گولی کہاں لگی ہے۔ رقم کی تھیلی وہیں پڑی رہی اور ریتا خاوند کو سہارا دے کر درخت کے تنے کی اوٹ میں لے گئی۔ ہم نے دیکھا کہ اُس کا خاوند بائیں ٹانگ گھسیٹ رہا تھا۔

ہمیں لیفٹیننٹ گلبرٹ کی بڑی بلند آواز سنائی دی ــ "ایڈوانس"۔

"حمید بھائی!" ــــ میں نے حمید اللہ خان سے کہا ــــ "اس نے حملے کا حکم دیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فوج یا پولیس کی نفری ان کے ساتھ آئی ہے۔ ایڈوانس کا مطلب یہ ہے کہ آگے بڑھو۔ ہو سکتا ہے یہ ہمیں گھیرے میں لیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ انگریز اتنی سیدھی اور ڈرپوک قوم نہیں کہ ایک عورت کی خاطر ہمیں روپوں کی تھیلیاں دے دے گی۔"

انگریز کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ بہت ہی عقلمند قوم تھی۔ ہم اُن کی جس جوان لڑکی کو یرغمال کے طور پر استعمال کر رہے تھے اُسے انہوں نے جال میں دانے کے طور پر استعمال کیا۔

ہم وہاں سے اُٹھ کر پیچھے ہٹنے ہی لگے تھے کہ ایک اور منظر دیکھا جو ہمارے لئے عجیب اور حیران کن تھا۔ ریتا اپنے خاوند کو چھوڑ کر ہماری طرف آرہی تھی۔ رقم کی تھیلی اُس کے راستے میں پڑی تھی۔ اب میں نے اُسے رائفل کی شست میں لے لیا۔ توقع یہی تھی کہ وہ تھیلی اُٹھا کر واپس اپنے خاوند تک جائے گی۔ یہ اُس کی حماقت تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ادھر آتی ہے یا اُدھر جاتی ہے۔ اُس نے اپنے خاوند کی طرف ہی جانا تھا اور میری گولی نے اُسے خاوند تک نہیں پہنچنے دینا تھا، لیکن وہ تھیلی اُٹھا کر ہماری طرف دوڑ پڑی۔ وہ چار پانچ قدم ہی دوڑی ہوگی کہ اُس کے خاوند نے درخت کی اوٹ سے اُس پر ریوالور کی یکے بعد دیگرے دو گولیاں فائر کیں۔ ریتا کے ہاتھ سے تھیلی گری پھر وہ بھی گر پڑی۔

میں نے اُس کے خاوند پر گولی فائر کی۔ معلوم نہیں اسے لگی یا نہیں کیونکہ اُس کا ایک بازو، اس طرف کا کندھا اور تھوڑا سا سر میرے سامنے تھا۔

"سکندر!" ـــ حمید اللہ نے کہا ـــ "اُدھر دیکھو۔"

میں نے اُدھر دیکھا۔ فوج اور پولیس کی ملی جلی نفری دُور سے پہاڑی کے دائیں طرف بکھر کر آگے بڑھ رہی تھی اور کچھ نفری بکھری ہوئی سیدھی آگے آ رہی تھی۔ یہ گھیرے میں لینے کی ترتیب تھی۔ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہمارے پاس گولیوں اور کارتوسوں کی کمی تھی۔ اس کے مقابلے میں فوج کے پاس رائفلوں کے علاوہ جو خطرناک ہتھیار تھے وہ لائٹ مشین گنیں تھیں اور گرینیڈ بھی تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ صرف ہتھیار اور گولیاں اپنے ساتھ رکھو اور یہاں سے نکلو۔ میں نے انہیں دریا تک پہنچنے اور دریا میں کُود جانے کو کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اپنی اپنی جان بچانے کی کوشش کرنا اور کسی ساتھی کی مدد کے لئے نہ رُکنا ورنہ ایک کی بجائے دو آدمی مارے جائیں گے۔

ہم چونکہ پہاڑیوں کے اندر کے علاقے سے واقف تھے اس لئے ہم چاروں ہی اکٹھے اُس راستے سے نکلے اور تیز دوڑتے ہوئے غار تک پہنچے۔ وہاں سے دوڑے اور اُس جگہ پہنچے جہاں دریا پہاڑیوں کے اندر آکر مُڑ جاتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھیوں میں کوئی ایسا بھی ہے یا نہیں جو تیرنا نہ جانتا ہو۔ راستے میں ہمیں پہاڑیوں کے اندر ایک مشین گن کی تڑتڑ سنائی دی پھر ایک گرینیڈ پھٹا۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ فوج اندھا دُھند فائر کرتی چلی آ رہی ہے اور یہ نفری پہاڑیوں میں داخل ہو گئی ہے۔

"بھاگو دوستو!" ـــ میں نے کہا ـــ "زندہ رہے تو ملیں گے۔"

ہم چاروں دریا کی طرف دوڑ پڑے۔ میں سب سے آگے تھا۔ میری کمر سے راؤنڈوں والی بیلٹ بندھی ہوئی تھی۔ رائفل کا سلنگ اس طرح کندھے میں ڈال لیا کہ سلنگ ایک کندھے پر تھا اور رائفل اُلٹی طرف کی بغل کے ساتھ تھی۔ میں دریا میں کُود گیا۔

رات بھر بارش برستی رہی تھی۔ دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ دونوں پہاڑیوں کے درمیان تنگ سی جگہ میں پانی رُکا ہُوا سا تھا۔ میں آگے کو یعنی پانی کی طرف تیرنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن طغیانی کا زور مجھے پیچھے کو دھکیلتا تھا۔ یہ بہت بڑا خطرہ تھا۔ میری طاقت وہیں صرف ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا، میرے تینوں ساتھی پانی میں اُتر آئے تھے۔ میں کنارے کے ساتھ یعنی پہاڑی کے ساتھ ہو گیا۔ وہاں پانی کا زور کم تھا بلکہ وہاں سے پانی آگے کو جاتا تھا۔ میں نے بلند آواز سے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ بھی پہاڑی کے ساتھ ساتھ آگے کو تیریں۔ اس طرح میں دریا کے بہاؤ تک پہنچ گیا۔

جونہی میں دریا میں داخل ہُوا۔ دریا نے مجھے سنبھال لیا۔ اس سے مجھے یہ اطمینان ہُوا کہ فوج اگر یہاں تک آ بھی گئی تو اُس وقت تک دریا مجھے بہت دُور لے جا چکا ہو گا۔ ہُوا بھی ایسے ہی۔ مجھے تیرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ طغیانی کا زور اور موجیں مجھے اُٹھا اُٹھا کر آگے ہی آگے پھینکتی چلی گئیں۔

میں بتا نہیں سکتا کتنا وقت گزر گیا ہو گا۔ جب موجوں کی شدت میں کمی آگئی تو میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں دریا کا پاٹ پھیل گیا تھا جس سے طغیانی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ پہاڑی علاقہ دُور پیچھے رہ گیا تھا۔ میں کنارے کی طرف تیرنے لگا، لیکن پانی مجھے آگے ہی آگے لے جا رہا تھا۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ کسی آبادی کے قریب کنارے نہ لگوں۔ ایک جگہ مجھے بائیں طرف گھنا جنگل نظر آیا۔

میں اُدھر کو تیرنے لگا اور کنارے جا لگا۔ میرے ارد گرد گھنا جنگل تھا اور پانی جنگل کے اندر تک چلا گیا تھا۔ میں پانی میں چلتا چلتا خشکی پر پہنچا۔ جسم میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ ذرا گھوم پھر کر دیکھ سکتا کہ آگے اور دائیں بائیں کیا ہے۔ وہاں جنگل ہی جنگل تھا۔ میں نے اتنی ہمت کی کہ ایسی جگہ جا کر کھڑا ہُوا جہاں سے مجھے دریا کی پوری چوڑائی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس میں مجھے اپنا کوئی ایک بھی ساتھی نظر نہ آیا۔

میں تنہا رہ گیا تھا۔ رائفل، چند راؤنڈ اور کچھ پیسے میرے پاس تھے۔

وہ وقت آج خواب کی طرح یاد آتا ہے۔ ویرانہ تھا۔ ایک دوسرے سے دور دُور درخت تھے۔ ان میں کئی قسم کے درخت تھے۔ پیپل اور بُڑ کے درخت زیادہ تھے۔ بُڑ کے بعض درخت تو بہت ہی پُرانے تھے۔ بہت بڑے بڑے گنبدوں کی طرح تھے۔ بہت اُونچے اور پھیلے ہُوتے۔

اونچی نیچی چٹانیں بھی تھیں اور مٹی کے ٹیلے بھی تھے۔ موسم ساون کا تھا اس لئے ہری گھاس زیادہ نظر آ رہی تھی۔ کہیں کہیں بارش کا پانی جمع تھا۔

دُور ہرنوں کا ایک جوڑا نظر آیا اور وہیں کہیں غائب ہوگیا

آسمان پر سفید اور سلیٹی رنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ سورج چٹانوں سے اُوپر آگیا تھا۔ بادلوں کے سائے زمین پر رینگتے جا رہے تھے۔ منظر اچھا تھا لیکن مجھے ڈراؤنا سا لگ رہا تھا، اسی لئے میں نے اسے ویرانہ کہا ہے۔

میں ایک درخت کے نیچے لیٹا ہُوا تھا اور اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ سورج کو دیکھا تو میں سمجھا یہ نیچے جا رہا ہے لیکن سورج اوپر آ رہا تھا۔ وہ تو دن کا وقت تھا جب میں سیلابی دریا سے نکلا تھا۔ سورج سے میں نے اندازہ لگایا کہ نو بجے ہوں گے۔ اس سے یہ ظاہر ہُوا کہ میں گزشتہ روز سے یہاں پڑا تھا اور رات بھر یہیں پڑا رہا ہوں۔

میں اُٹھنے لگا تو مجھے چکر سا آیا۔ میرا ایک ہاتھ زمین پر جا لگا۔ اُدھر دیکھا۔ میرے ہاتھ کے نیچے زمین پر رائفل پڑی ہوئی تھی۔ میری کمر کے ساتھ چمڑے کی بُلیٹ بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ چار پوچ تھے جن میں رائفل کے راؤنڈ پڑے ہُوتے تھے۔

اب رائفل ہی میری ساتھی تھی۔ اسے دیکھ کر کچھ حوصلہ ہُوا۔

میں نے لاٹھی کی طرح رائفل کا سہارا لیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ چٹانیں، درخت

اور ٹیلے ایک چکر میں چل پڑے۔ پھر یہ سب دُھندلا گئے۔ میں نے قدم اُٹھایا تو ایسے لگا جیسے زمین نے میرا پاؤں جکڑ رکھا ہو۔ جسم میں پاؤں گھسیٹنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ میں بیٹھ گیا اور مجھ پر بے بسی کی کیفیت طاری ہوگئی۔

دائیں بائیں دیکھا تو آٹھ دس قدم دُور چھوٹے سے ایک گڑھے میں بارش کا پانی دکھائی دیا۔ پانی کو دیکھتے ہی مجھے پیاس کا احساس ہُوا جو بڑی تیزی سے شدید ہوگیا۔ مُنہ سوکھ گیا اور حلق میں کانٹے چُبھنے لگے۔ میں ایک بار پھر رائفل کا سہارا لے کر اُٹھا تو جسم کو پہلے کی طرح بے جان پایا لیکن مجھے پانی تک پہنچنا تھا۔ میرے جسم کو پانی کی ہی ضرورت تھی۔

میں رائفل کے سہارے قدم گھسیٹتا پانی تک پہنچ تو گیا لیکن ٹانگوں کی یہ حالت ہوگئی جیسے میں آٹھ دس قدم نہیں آٹھ دس میل چل کر پانی تک پہنچا ہُوں۔ پانی گدلا تھا۔ میں چُلو سے پانی پینے لگا اور پانی سے پیٹ بھر لیا۔ بڑی مشکل سے اُٹھا۔ جسم ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ ہوا تیز تھی۔ کچھ دیر دھوپ میں کھڑا رہا۔ اس سے جسم میں کچھ گرمی آئی اور بھوک پریشان کرنے لگی۔ میں وہیں کھڑا درختوں کو دیکھنے لگا۔ تقریباً بیس قدم دُور نیم کا ایک درخت نظر آیا اور میں اُس کی طرف چل پڑا۔

رانوں کے پٹھے اور پنڈلیاں اکڑ گئی تھیں۔ ٹانگوں میں کچھ جان آگئی تھی مگر چلنے میں بہت دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ نیم کے درخت تک پہنچا تو زمین پر پکی ہوئی نمبولیاں گری ہوئی تھیں۔ ان سے پیٹ نہیں بھر سکتا تھا۔ نمبولی کی تو گٹھلی ہی ہوتی ہے جو چُوس کر پھینک دی جاتی ہے۔ میں نمبولیاں اُٹھا اُٹھا کر چُوسنے اور گٹھلیاں اُگلنے لگا۔

میں جانور بن چکا تھا۔ پیٹ کے سوا میرے سامنے اور کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

پیٹ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتا۔ بادشاہ رعایا کو اسی لئے بھوکا رکھتے ہیں کہ رعایا مویشیوں کی سطح پر رہے اور بادشاہ کو دیوتا مانتی رہے۔

اُس وقت نیم کا پیڑ میرا دیوتا اور میرا اَن داتا تھا۔

پیٹ خالی ہو تو انسان کی ذات وقار سے بھی خالی ہو جاتی ہے۔

میں جھکا ہُوا ٹمبولیاں اُٹھا رہا تھا۔ کمر میں درد محسوس ہونے لگا۔ میں بیٹھ گیا اور پاؤں پر سرک سرک کر ٹمبولیاں چننے اور کھانے لگا۔



سورج اور اُوپر آ گیا تھا۔ میں اُٹھا تو جسم کی حالت کو بہتر پایا لیکن جسم میں آدھی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔ دماغ تو سوچنے سے معذور ہو گیا تھا۔ گدلا پانی اور ٹمبولیوں کا تھوڑا سا رس ملنے سے دماغ نے کچھ کچھ سوچنا شروع کر دیا۔

میں نیم کے نیچے ہی بیٹھ گیا۔ سوچنے کی حس بیدار ہوتی تو سب سے پہلے خوف نے دل پر قبضہ کیا۔ یاد آ گیا کہ میں ایک مفرور قاتل ہوں اور اب تو پہلے سے زیادہ خطرناک مجرم ہو گیا تھا۔ میں نے ایک انگریز عورت کو اغوا کیا، یرغمال میں رکھا اور یہ عورت بھی اور اُس کا خاوند بھی مارے گئے تھے۔ اب انگریزوں نے میری تلاش پہلے سے زیادہ تیز کر دی ہو گی۔

میں اکیلا تھا۔ اپنے تینوں ساتھی یاد آئے۔ ان کے متعلق مجھے یقین ہو گیا تھا کہ سیلاب میں ڈوب گئے ہیں۔ حمید اللہ خان نوابزادہ تھا۔ بیشک وہ جنگلوں اور بیابانوں میں بھٹکتا اور غاروں میں چھپتا پھر رہا تھا، اُس کے جسم میں طاقت بھی تھی لیکن میں اُس سے یہ توقع نہیں رکھ سکتا تھا کہ وہ اتنے تیز و تُند سیلاب میں تیر کر کنارے لگ جاتا۔ میرے دوسرے دو ساتھی، بالا اور نوراللہ تو جرائم پیشہ تھے۔ چرس اور دیسی شراب پی پی کر اُنھوں نے اپنے جسم کھوکھلے کر رکھے تھے۔ ان کے لیے تو اس سیلاب سے زندہ نکل آنا ممکن ہی نہیں تھا۔

مجھے جب اپنے ساتھی یاد آئے تو ذہن میں یادیں لَوٹ آئیں۔ یادیں دُھندلی تھیں اور ایسے لگ رہا تھا جیسے میں نے رات کو خواب دیکھا تھا جو ذہن سے اُتر گیا ہے اور اسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے سیلاب یاد آیا۔ موجیں اُوپر لے جاتی اور پٹختی تھیں اور میں ڈوب جاتا تھا۔ میں کنارے کی طرف تیرنے کی کوشش کرتا تھا مگر سیلاب اس قدر تُند تھا کہ ایک اینچ بھی دائیں یا بائیں نہیں ہونے دیتا تھا۔ مجھے ایسا خطرہ نہیں تھا کہ

ڈوب جاؤں گا۔ میں نے اپنے آپ کو سیلاب کے حوالے کر دیا اور ڈوبنے سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔

مجھے چوٹیں بھی آئی تھیں۔ ایک درخت بہتا آ رہا تھا۔ اس کا تنا تین چار بار میری پیٹھ پر لگا تھا۔ میں نے ڈبکی لگائی تو درخت اوپر سے گزر گیا تھا۔ دریا کے دو موڑ آئے تھے۔ وہاں کنارے اونچے اور چٹانی تھے۔ دونوں موڑوں پر میں ان کناروں سے ٹکرایا تھا۔ اتنے تیز و تُند سیلاب میں تو میں ایک تنکا تھا۔

جب دریا کا پاٹ پھیل گیا اور سیلاب کا زور ٹوٹ گیا تھا تو میں نے کنارے کی طرف تیرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اُسی وقت محسوس کر لیا تھا کہ میرے جسم کی طاقت بہت کم ہو گئی ہے۔ میں اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ میں کتنی دُور پہنچ گیا ہوں۔ جب میں تیرنے لگا تو بھی سیلاب مجھے آگے ہی آگے لے جا رہا تھا۔ کنارے لگتے لگتے ڈیڑھ دو میل تو میں ضرور آگے نکل آیا تھا۔ اس طرح میرے اندازے کے مطابق میں اُس پہاڑی علاقے سے کم و بیش پچیس میل دُور پہنچ گیا تھا۔

مجھے یاد آنے لگا کہ جہاں میں کنارے لگا اور سیلاب سے نکلا تھا وہ گھنا جنگل تھا اور اب جہاں میری آنکھ کھُلی یا میں ہوش میں آیا تو میں اُس جنگل میں نہیں تھا۔ ذہن پر زور دیا تو خواب کی طرح یاد آنے لگا کہ میں رائفل کو گھسیٹتا ہُوا آہستہ آہستہ چلتا رہا تھا۔ مجھ میں یہ احساس مر گیا تھا کہ کوئی مجھے دیکھ لے گا اور پکڑ لے گا۔

اس کے بعد میں نے یاد کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ بھی یاد نہ آیا کہ میں یہیں بیٹھا یا گرا تھا جہاں میں اب تھا یا میں نیند کی یا نیم غشی کی حالت میں چلتا ہی رہا تھا۔ مجھے اب اٹھنا اور دیکھنا تھا کہ میں کسی آبادی یا کسی راستے کے قریب تو نہیں۔ میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ قدم اُٹھایا تو میں نے محسوس کیا کہ میں چل سکوں گا۔ پیٹھ اکڑی ہوئی تھی اور میں پیٹھ میں درد بھی محسوس کر رہا تھا۔ سارے جسم کی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔



میں آہستہ آہستہ چل پڑا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ شاید ایک میل چلا ہوں گا۔ سورج سر کے اوپر آکر کچھ آگے نکل گیا تھا۔ اب دھوپ نے مجھے جلانا شروع کر دیا تھا اور پسینہ بھی بہنے لگا تھا۔ بہت کوشش کی کہ چلتا جاؤں لیکن ٹانگیں جواب دینے لگیں اور میں ایک ٹیلے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔

اب میرا دماغ اچھی طرح سوچ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہُوا کہ میں گزشتہ روز اور اس کے بعد پوری رات چلتا، گرتا اور لیٹتا رہا ہوں۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ سیلاب کی ٹھنڈ میری ہڈیوں میں اُتر گئی ہے اور دماغ کو بھی چڑھ گئی ہے

میں وہاں بیٹھا کچھ سوچنے لگا تھا کہ دو تین عورتوں کی ہنسی سنائی دی یہ آواز ٹیلے کی دوسری طرف تھی۔ میں سوچنے لگا کہ یہاں سے اُٹھ کر چھپ جاؤں بھاگ جاؤں یا دیکھوں کہ یہ عورتیں کون ہیں اور کیا یہ میری مدد کر سکتی ہیں؟ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ان عورتوں کے ساتھ ایک دو آدمی بھی ہو سکتے ہیں اور یہ آدمی میرے لیے خطرناک ثابت ہوں گے۔

میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ دو جوان عورتیں ٹیلے سے گھوم کر میرے سامنے آگئیں۔ اُن کا لباس خانہ بدوش قبائلیوں جیسا تھا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہیں۔ میں اپنے کپڑوں سے اپنے چہرے کی حالت کا اندازہ کر رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری آنکھیں پوری کھلی ہوئی نہیں۔

اگر یہ عورتیں شہری ہوتیں یعنی کسی شہر کی رہنے والی ہوتیں تو مجھے دیکھتے ہوئے آگے چلی جاتیں اور اگر یہ دیہات کی ہوتیں تو کچھ دیر رُکتیں، مجھے دیکھتیں اور چلی جاتیں۔ چونکہ یہ کسی خانہ بدوش قبیلے کی عورتیں تھیں اس لئے وہ چلے جانے کی بجائے میرے قریب آگئیں۔ خانہ بدوش عورتوں میں جھجک اور جھجک نہیں ہوتی تھی بلکہ اُن میں شرم اور حجاب کی بھی کمی ہوتی تھی۔ ان قبیلوں کی اپنی زبان ہوتی تھی لیکن دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ اپنے لب ولہجے میں اُردو بولا کرتے تھے

"کون ہو بھائی!"۔۔۔ ان میں سے ایک عورت نے پوچھا ۔۔۔ "یہاں

کیوں بیٹھے ہو؟"

"یہ تو شاید گدلے پانی میں سے نکل کر آیا ہے"۔۔۔ دوسری عورت نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "میں نے سیلابی دریا تیر کر پار کیا ہے"۔

"کون سا دریا؟"۔۔۔ ایک عورت نے پوچھا۔

"یہاں سے دُور تو نہیں"۔۔۔ میں نے جواب دیا ۔۔۔ "یہ تھوڑے سے فاصلے پر ہی تو ہے"۔

"یہاں قریب کوئی دریا نہیں"۔۔۔ ایک عورت نے کہا ۔۔۔ "تم شکاری ہو؟"

مجھ سے اچھی طرح بولا نہیں جاتا تھا۔ میں نے سر ہلا کر انہیں بتایا کہ میں شکاری نہیں۔

"سرکاری آدمی ہو؟"

میں نے پھر سر ہلایا کہ میں سرکاری آدمی بھی نہیں۔

دونوں نے اپنی زبان میں آہستہ آہستہ آپس میں باتیں شروع کر دیں۔ پھر دونوں نے میری طرف دیکھا۔

"پھر کیا ہو تم؟"۔۔۔ ایک عورت نے پوچھا ۔۔۔ "تمہاری حالت ٹھیک نہیں .... تم ڈاکو تو نہیں؟"

"پہلے یہ بتاؤ تم کون ہو؟"۔۔۔ میں نے ان سے پوچھا ۔۔۔ "تم کس قبیلے کی ہو یا گاؤں کی؟"

"ہم باوریے ہیں"۔۔۔ ایک نے جواب دیا ۔۔۔ "تھوڑی دُور ہمارا ڈیرہ ہے"۔

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو گی؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"یہ تو بتاؤ تم کون ہو؟"۔۔۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"گھبراؤ نہیں"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "میں ڈاکو نہیں۔ تم لوگوں کے کام

کا آدمی ہوں۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"میں شہر کا رہنے والا ہوں"— میں نے جواب دیا —"میرے ساتھ دو دوست تھے، وہ مجھے دھوکا دے گئے ہیں۔ اس وقت مجھے روٹی چاہیئے۔ میرے پاس پیسے ہیں۔ تم چاہو تو یہ پیسے تم لے لو۔"

"ہم تمہیں اپنے ساتھ اپنے ڈیرے پر لے چلیں گی"— ان میں سے ایک عورت نے کہا —"تم یہ سوچ لو کہ ہمارے آدمی بہت ہوشیار ہیں۔ اگر تم نے اُن کے ساتھ جھوٹ بولا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"مجھے کھانے کے لئے کچھ چاہیئے"— میں نے فاقے کی ماری ہُوئی نحیف آواز میں کہا —"جو کوئی مجھ پر یہ احسان کرے گا اُس کا میں ساری عمر غلام رہوں گا .... تم تو کہیں جا رہی تھیں۔"

"ہم نے کہاں جانا ہے!"— ایک نے جواب دیا —"ایک بُوٹی ڈھونڈ رہی ہیں۔ چلو تمہیں لے چلتی ہیں۔ ہم پھر آجائیں گی۔"

میں رائفل کے سہارے اُٹھا اور ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔



ہندوستان میں کئی ایک خانہ بدوش قبیلے تھے جو آبادیوں سے ذرا ہی دُور اپنے خاص قسم کے خیمے گاڑ لیا کرتے تھے اور مہینہ دو مہینے وہاں رہ کر کہیں اور چلے جاتے تھے۔ ان میں کچھ قبیلے جن میں باوریہ قبیلہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جرائم پیشہ تھے۔ بظاہر یہ کچھ اور کام کرتے تھے۔ بعض چھُریاں، چاقو اور قینچیاں بناتے تھے جو ان کی عورتیں شہروں میں گلیوں میں پھر پھر کر بیچتی تھیں۔ یہ لوگ رہزنی بھی کرتے تھے اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی کر جاتے تھے۔ ان کی عورتیں اور جوان لڑکیاں بھی مکمل طور پر بے حیا ہوتی تھیں۔ ان کے متعلق مشہور ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ پولیس کبھی ان میں سے کسی کے ڈیرے پر یعنی خیمہ گاہ پر چھاپہ مارنے جاتی تھی تو پولیس کو دُور سے دیکھ کر عورتیں تمام کپڑے اُتار کر ننگی ناچنے لگتی تھیں۔ اگر پولیس کے آدمی بہت ہی ڈھیٹ ہوتے تو

آگے چلے جاتے تھے پھر یہ عورتیں اُن کے ساتھ بیہودہ حرکتیں اور باتیں کر کے اُنہیں بھاگ جانے پر مجبور کر دیتی تھیں۔

ہمیں ٹریننگ کے دوران جرائم پیشہ قبائل کے متعلق خاص طور پر بتایا گیا تھا کہ یہ کیسے کیسے جرائم کا ارتکاب کس کس طریقے سے کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی قبیلہ کسی شہر کے قریب یا کسی بھی آبادی کے قریب جا ڈیرہ ڈالتا تھا تو وہاں جرائم کی رفتار تیز ہو جاتی تھی۔ ان لوگوں کے اپنے کچھ عقیدے تو تھے، لیکن ان کا کوئی مذہب نہ تھا۔ ان کی خوبصورت عورتیں شہروں میں عصمت فروشی تک بھی کر لیتی تھیں، لیکن یہ اس قدر دلیر اور لڑاکا ہوتی تھیں کہ شہر کے مرد بھاگ جاتے تھے۔

مختصر یہ کہ یہ لوگ کسی پہلو اعتماد کے قابل نہیں تھے۔ مثلاً میں رائفل لے کر اُن کی دو عورتوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ مجھے توقع یہ تھی کہ یہ لوگ کسی نہ کسی دھوکے میں میری رائفل غائب کر دیں گے اور جب میں ہوش میں آؤں گا تو ان کے ڈیرے سے دُور کہیں جنگل میں پڑا ہُوا ہوں گا۔ ان کے پاس رائفل اور ریوالور جیسے ہتھیار نہیں ہوتے تھے لیکن مجھ سے رائفل اُڑا کر وہ کسی ڈاکو کے ہاتھ بیچ سکتے تھے۔ ان کے پاس بانس کی موٹی موٹی لاٹھیاں ہوتی تھیں۔ وہ چوری کا مال یعنی رقم اور زیورات ان بانسوں کے اندر ڈال دیتے تھے اور دونوں سِروں پر لوہے کے خول چڑھا لیتے تھے۔ اس طرح لوگ اسے لاٹھی ہی سمجھتے تھے۔ یہ جانتے ہوتے بھی کہ یہ قبیلہ مجھے دھوکہ دے سکتا ہے، میں اس قبیلے کی دو عورتوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ دونوں عورتیں جوان تھیں اور خوبصورت بھی تھیں لیکن ان قبیلوں کی عورتوں کی خوبصورتی کچھ اور قسم کی ہوتی تھی۔ یہ نازک اندام اور صراحی دار گردن اور مخمور آنکھوں والی خوبصورتی نہیں تھی جسے شاعر اور ادیب مزے لے لے کر بیان کیا کرتے ہیں۔ اُس وقت میرا مسئلہ صرف یہ تھا کہ میرے پیٹ میں کچھ خوراک چلی جائے۔ ایک تو سیلاب نے مجھے پٹخ پٹخ کر مارا تھا۔ اس کے ساتھ اتنی دیر پانی میں رہنے سے ٹھنڈ نے میرے جسم کو نیم مُردہ کر دیا تھا اور اس پر بھوک نے یہ اثر کیا کہ چلنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ میں تو دو روٹیوں کی

خاطر رائفل بھی دے دینے پر تیار ہو گیا تھا۔

دونوں عورتیں بڑی تیزی سے چلی جا رہی تھیں۔ میں قدم گھسیٹتا بہت پیچھے رہ گیا۔ اُنہوں نے رُک کر پیچھے دیکھا۔ میں رائفل کے سہارے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ واپس آئیں۔ کوئی بات کئے بغیر ایک نے میری رائفل لے لی اور میرا ایک بازو اپنے کندھے پر رکھ لیا اور اپنا کندھا میرے کندھے کے نیچے کر لیا۔ دوسری نے میرا دوسرا بازو اپنے کندھوں پر رکھ کر میرے کندھے کے نیچے اپنے کندھے کا سہارا دے دیا اور اس طرح وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔

اس نسوانی سہارے نے میرے جسم کو تو سنبھال لیا اور میں چلنے میں آسانی محسوس کرنے لگا لیکن میری روح تڑپ اُٹھی۔ میں نے کبھی کسی سے سہارے کی اور ہمدردی کی بھیک نہیں مانگی تھی۔ میں نے اُس طوفانی رات میں بھی یہ خواہش نہیں کی تھی کہ کوئی مجھے پناہ دے دے جس رات عشو نے مجھے مالو کے ڈاکو کے گھر سے بھگایا تھا۔ اُس وقت میں لڑکپن کی عمر میں تھا۔ اب ان دو عورتوں نے میرے جسم کو سہارا دیا تو مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے انہوں نے میرا جنازہ اُٹھایا ہو۔

"سکندر!— مجھے اپنی ذات سے ایک آواز سنائی دی — "یہ ہو تم! .... جس جوانی تم پر فخر کرتے تھے وہ بس اتنی سی ہے کہ آج دو عورتوں نے تمہیں اس طرح اُٹھا لیا ہے جیسے تم اَسّی سال کے بوڑھے ہو۔"

ان عورتوں کے سہارے نے مجھے اور زیادہ کمزور اور نحیف کر دیا۔

سہاروں کے متلاشی اور ہمدردی کے بھکاری اپنی منزل پر نہیں پہنچا کرتے۔ اُنہیں وہ مُردار کی طرح اپنی منزل کی طرف لے جایا کرتے ہیں جو سہارا دیتے ہیں۔

سہارا صرف اللہ کا چاہیئے۔ اللہ کے بندوں کے سہارے جسم کا دم خم توڑ دیا کرتے ہیں۔

خیال آیا کہ میں تو انگریزوں کے خلاف زمین دوز جنگِ آزادی لڑنے کا عزم لئے ہوتے تھا۔ مجھے اپنے آپ پر افسوس ہُوا اور یوں لگا جیسے میں

اپنے آپ پر طنزاً ہنس رہا ہوں۔

"تیری منزل کہاں ہے سکندر؟"

اُس روز میرے پاس اس سوال کا جواب کوئی نہ تھا۔ ایک احساس تھا جو بڑی شدت سے پیدا ہُوا اور وہ یہ تھا کہ میں نے آخر ڈاکو یا رہزن بننا ہے اور پھانسی کے تختے تک پہنچوں گا یا پولیس مقابلے میں مارا جاؤں گا۔

میں نے ان دو عورتوں کے سہارے سے چلتے چلتے فیصلہ کر لیا کہ مجھے اس قبیلے میں پناہ مل گئی اور انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا تو میں ان کے جوان آدمیوں کو جرائم کے بہتر طریقے سکھا دوں گا اور ان کا اُستاد بن جاؤں گا۔ یہ ارادہ میرے ذہن میں تڑپنے لگا اور میں کچھ سکون محسوس کرنے لگا۔

درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے اس خانہ بدوش قبیلے کا ڈیرہ نظر آنے لگا۔ ہم کچھ اور قریب ہوئے تو قبیلے کے دو آدمیوں نے دیکھ لیا۔ وہ دوڑتے آئے۔ مجھے توقع تھی کہ وہ اپنی عورتوں کو ڈانٹیں گے کہ وہ ایک غیر مرد کو اپنے ساتھ لگا کر کیوں لا رہی ہیں لیکن انہوں نے فوراً ہی عورتوں کو مجھ سے الگ کیا اور مجھے اسی طرح سہارا دے دیا جس طرح عورتوں نے دیا تھا۔ یوں محسوس ہُوا جیسے یہ دو آدمی میرے منتظر تھے اور میرے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا۔ وہ خوش تھے کہ ان کی عورتیں شکار مار کر لائی ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنا شکار سمجھ لیا تھا۔

وہ آدمی یہ پوچھے بغیر کہ میں کون ہوں، مجھے کیا ہُوا ہے اور یہ عورتیں مجھے اِدھر کیوں لا رہی ہیں، مجھے آگے لے گئے۔ دو تین اور آدمی دوڑے آئے۔ اس طرح اُن کے ڈیرے میں داخل ہونے تک میرے ساتھ کم و بیش بیس آدمیوں، عورتوں اور بچوں کا جلوس اکٹھا ہو گیا تھا۔



وہ مجھے ایک خیمے میں لے گئے۔ زمین پر خشک گھاس بچھی ہوتی تھی۔ اوپر پرانی سی چٹائیاں رکھی تھیں اور اُن پر دریاں اور چادریں بچھی ہوتی تھیں۔ انہوں نے مجھے اس فرشی بستر پر لٹا دیا۔ میرا جسم چُور چُور ہو چکا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے بخار نہیں۔ سردرد بھی نہیں تھا۔ جسم دُکھ رہا تھا اور میں بہت

ہی نقاہت محسوس کر رہا تھا۔

میں لیٹ گیا اور مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی لیکن بھوک اتنی تیز تھی کہ نیند نہیں آتی تھی۔ تین چار آدمی میرے پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں عورتیں جو مجھے اپنے ساتھ لائی تھیں، خیمے میں آئیں۔ ایک نے چنگیر اُٹھا رکھی تھی۔ دوسری کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی۔ اُس نے چنگیر اور پلیٹ میرے قریب رکھی۔ میں اُٹھا اور یہ بھی نہ دیکھا کہ پلیٹ میں کیا ہے اور جو کچھ ہے وہ حلال ہے یا حرام، میں اُس پر ٹوٹ پڑا۔ موٹی موٹی چار روٹیاں تھیں جو توے پر پکی ہوئی تھیں اور ٹھنڈی تھیں۔ نارمل حالات میں ایسی ایک ہی روٹی کافی تھی لیکن میں بڑی تیزی سے اڑھائی روٹیاں کھا گیا۔ کھا چکا تو خیال آیا کہ میں نے جو کھایا ہے یہ سبزی تھی۔ پانی مٹی کے ایک بڑے سے پیالے میں تھا۔ ایک ہی سانس میں پیالہ خالی کر دیا۔

پانی پیتے ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ میں سو گیا تھا یا بیہوش ہو گیا تھا۔

آنکھ کھلی تو میرے خیمے میں مٹی کا ایک دیا جل رہا تھا۔ چند سیکنڈ تو میں سمجھ نہ سکا کہ میں کہاں ہوں۔ دماغ صاف ہُوا تو یاد آ گیا کہ میں کھانا کھا کر لیٹ گیا تھا۔ میں نے خیمے میں سے باہر دیکھا۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ کسی کُتے کے غرّانے کی ہلکی سی آواز آتی تھی۔ یہ ان خانہ بدوشوں کے رکھوالی والے کُتے تھے جو عام طور پر بھیڑیے کی نسل سے ہوتے تھے اور بہت ہی خونخوار۔

میرے پاس گھڑی نہیں تھی کہ وقت کا کچھ پتہ چلتا۔ میں نے خیمے سے باہر سر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ستاروں سے وقت کا اندازہ کیا۔ یہ آدھی رات کے لگ بھگ کا وقت تھا۔ میں پھر لیٹ گیا۔

جسم پہلے سے بہتر ہو گیا تھا اور دماغ اب اچھی طرح سوچ سکتا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے دایاں ہاتھ بستر پر پھیرا پھر بایاں ہاتھ جہاں تک جا سکتا تھا، پھیرا۔ میں اُچھل کر اُٹھا۔ میری رائفل وہاں نہیں تھی۔ میں نے بستر کے نیچے دیکھا۔ چھوٹے سے اس خیمے میں ہر طرف دیکھا۔ رائفل نہ ملی۔ میں نے ایمونیشن کی جو

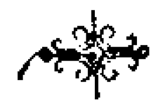
بیلٹ باندھ رکھی تھی، وہ بھی غائب تھی۔

مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ اب ان لوگوں نے یہ کرنا تھا کہ مجھے مار کر یا دھوکے میں کچھ پلا کر بیہوش کر دینا تھا اور کہیں دُور کسی کھڈ نالے میں پھینک آنا تھا۔ ایک ارادہ یہ دل میں آیا کہ اٹھوں اور دبے پاؤں یہاں سے نکل جاؤں لیکن ان کے کتوں کا خیال آ گیا جو ان کے ڈیرے کے اردگرد گھوم پھر رہے تھے۔ میں ان کے لئے اجنبی تھا۔ وہ مجھے چیر پھاڑ دیتے۔ ان کے ڈر سے میں خیمے میں ہی رہا اور میں کوشش کرنے لگا کہ جاگتا رہوں۔ مجھ پر کسی نہ کسی طرح حملہ ضرور ہونا تھا۔

میں اس ڈر سے بھی خیمے سے نہیں نکلتا تھا کہ ان لوگوں نے ضرور پہرہ بٹھایا ہو گا۔ ایک خطرہ یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ ان میں سے کسی نے مجھے پہچان نہ لیا ہو اور انہوں نے کوئی آدمی تھانے اطلاع دینے کے لئے بھیج نہ دیا ہو۔ ان لوگوں کے لئے دس ہزار روپیہ قارون کا خزانہ تھا۔

میں اذیت ناک اُلجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ رائفل اور ایمونیشن کے بغیر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ دماغ نے فرار کے کچھ طریقے سوچے لیکن فرار کے ہر راستے پر ان کے خونخوار کُتے اور ان کے پہرہ دار کھڑے تھے۔ اگر یہ لوگ میرے ساتھ مخلص ہوتے تو ان میں سے کوئی ایک آدھ آدمی میرے خیمے میں سوتا اور رائفل میرے پاس ہوتی۔

میں جال میں آ گیا تھا۔ نکلنا مشکل نظر آتا تھا۔ نیند اُڑ گئی۔ مجھے ان لوگوں کی روٹی بہت مہنگی پڑی تھی۔



باقی رات گزرتی گئی۔ میرے لئے ایک ایک منٹ ایک ایک گھنٹے کے برابر تھا۔ ان لوگوں کی خیمہ گاہ میں حرکت ہونے لگی۔ ان کے مُرغ کچھ دیر سے بانگیں دے رہے تھے، پھر ان کی بکریاں ممیانے لگیں۔ اُن کے دُودھ دینے کا وقت ہو گیا تھا۔ مجھے فجر کی اذان کی آواز کہیں سے بھی سنائی نہ دی۔ دُور کی آواز آنی چاہئے تھی، وہ بھی نہ آئی۔ اس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ دُور دُور تک

کوئی آبادی نہیں۔ وہ علاقہ ہندوؤں کی اکثریت کا تھا، لیکن جہاں صرف تین چار مسلمان ہوتے تھے، وہ فجر کی اذان ضرور دیتے تھے۔

میں گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ گیا

"تم جاگ رہے ہو؟"—— ایک عورت کی آواز آئی۔

میں نے دیکھا۔ خیمے میں اُن میں سے ایک عورت آکر بیٹھ گئی تھی جو مجھے اپنے ساتھ لاتی تھیں۔

"اب حالت کیسی ہے؟"—— اُس نے پوچھا۔

"اب تو ٹھیک ہوں"—— میں نے کہا —— "میری رائفل کس کے پاس ہے؟"

"جھری بابا کے پاس!"—— اُس نے جواب دیا —— "فکر نہ کرو۔ جھری بابا ہم سب کا دادا اور دیوتا ہے۔ وہ تمہیں اپنے پاس بلاتے گا یا تمہارے پاس آئے گا ...... تم نے بتایا نہیں تم کون ہو اور اس بیابان میں کس طرح آئے تھے اور تمہارا یہ حال کس طرح ہُوا ہے؟"

"جھری بابا کو بتاؤں گا"—— میں نے کہا۔

"تم سو نہ جاتے تو تمہیں ہم اپنے کسی آدمی کے کپڑے پہنا دیتے"۔ اُس نے کہا —— "میں تمہارے کھانے کے لئے کچھ لاتی ہوں۔"

وہ خیمے سے نکلی تو میں اُٹھا اور باہر نکل گیا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ قبیلہ جاگ اُٹھا تھا۔ اس عورت نے میرے دل سے خوف اُتار دیا تھا۔ اپنے جسم میں مجھے اب جان محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ ذرا دُور نکل جاؤں اور کسی چٹان پر چڑھ کر ہر طرف دیکھوں۔ میں اس علاقے کو دیکھنا چاہتا تھا۔

اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پیچھے دیکھا۔ ایک بوڑھا آدمی جس کی عمر ستر سال سے اُوپر تھی، آ رہا تھا۔ وہ میرے پاس آ رُکا اور میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔

"کل شام میں تمہارے پاس آیا تو تم سو گئے تھے"—— اُس نے کہا —— "اندر چلو۔"

ہم خیمے میں بیٹھ گئے۔ صبح کی دُھندلاہٹ سفید ہو رہی تھی۔ بوڑھے نے دیئے کو پھونک مار دی۔

"تم شاید جھری بابا ہو؟"—— میں نے کہا۔

"ہاں!"—— اُس نے جواب دیا —— "میں جھری بابا ہوں ..... تمہاری رائفل میرے پاس ہے۔ تمہارے پاس اس کا لائسنس ہوگا۔ یہاں چوری تو نہیں ہوتی پھر بھی میں نے رائفل اپنے پاس رکھ لی تھی۔ جب جاؤ گے تو لے جانا۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟ میرا آدمی تمہیں گدھے پر بٹھا کر گھر چھوڑ آئے گا۔"

"میں نہ جانا چاہوں تو مجھے اپنے پاس رکھ لو گے؟"—— میں نے پوچھا۔

"کیوں مذاق کرتے ہو"—— اُس نے مسکراتے ہُوئے کہا —— "تمہاری داڑھی سے پتہ چلتا ہے تم مسلمان ہو اور تمہارا چہرہ بتاتا ہے تم علم والے ہو ..... جتنے دن رہنا چاہو گے خوشی سے رہو ..... اس جنگل میں کس طرح آ نکلے تھے؟ ..... کیا ہو گیا تھا؟"

"جھری بابا!"—— میں نے کہا —— "میں تمہارے ساتھ صاف اور سچی بات کروں گا۔ تم باوریہ قبیلے کے سردار ہو اور میں پولیس میں سب انسپکٹر رہ چکا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم لوگ کیسی کیسی وارداتیں کرتے ہو۔"

اُس کے چہرے پر حیرت کا تاثر آ گیا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ یہ بوڑھا جو بظاہر گنوار اور پسماندہ ہے، دانشمند ہے اور تجربہ کار بھی ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ بہت باتیں کی تھیں اور اُس کی باتیں سُنی تھیں۔ اُس کے پاس کتابوں کا علم نہیں تھا، وہ کسی کالج اور یونیورسٹی میں نہیں گیا تھا لیکن اُس میں جو ذہانت تھی وہ کتابوں اور کالجوں میں کم ہی مل سکتی ہے۔ اُس نے انسانوں کو اور حالات کو پڑھا تھا اور مجھ جیسے کتنے پولیس افسروں کو انگلیوں پر نچایا تھا۔

اس قسم کے جرائم پیشہ لوگ بہت ذہین اور دانشمند ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی ذہانت اور دانشمندی غلط راستے پر چل پڑتی ہے لیکن ڈکیتی،

رہزنی اور نوسر بازی جیسے جرائم کے لئے غیر معمولی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد پولیس کو جُل دینے کے لئے عقل اور حاضر دماغی چاہیئے جو ان لوگوں میں بہت ہوتی ہے۔

میں نے جھری بابا میں کچھ خوبیاں دیکھ لی تھیں اور اس کے چہرے کو بھی پڑھ لیا تھا اس لئے میں نے بہتر سمجھا کہ اسے اپنے متعلق سب کچھ بتا دوں۔ وہ تو پہلے ہی مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا کیونکہ میں نے اُسے کہہ دیا تھا کہ میں پولیس افسر رہ چکا ہوں۔

"میرے ساتھ سیدھی بات کرو"— اُس نے کہا —"اگر تم سی آئی ڈی کے آدمی ہو تو ساری عمر پچھتاؤ گے اور اگر مجھ پر رعب ڈالنے کے لئے کہا ہے کہ تم سب انسپکٹر رہ چکے ہو تو یہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے .... اپنی اصلیت بتاؤ... اگر کسی مصیبت کے مارے ہُوئے اِدھر آ نکلے ہو تو بتا دو۔ مدد امداد کریں گے۔ جہاں جانا چاہو گے وہاں پہنچا دیں گے .... فوج کے بھگوڑے تو نہیں؟"

"نہیں باباجان! نہیں"— میں نے کہا —"میں نے جو کہہ دیا ہے وہی ٹھیک ہے۔"

"پولیس کے بھگوڑے ہو؟"

"نہیں"— میں نے جواب دیا —"تم نے کہہ تو دیا ہے کہ میری مدد امداد کرو گے لیکن میں تمہیں اصل بات بتاؤں گا تو گھبرا جاؤ گے۔ تم نے مجھے سی آئی ڈی کا آدمی کہا ہے لیکن تم خود سی آئی ڈی کے آدمی بن جاؤ گے۔ تم مخبری کرکے مجھے پکڑوا دو گے۔"

"بات کرو .... بات کرو"— اُس نے کہا —"تم نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ تم عام آدمی نہیں۔ اب پوری بات بتا دو۔ ہماری پناہ میں جو آجاتا ہے اسے ہم دھوکہ نہیں دیا کرتے۔"



میں ایسا کم عقل تو نہیں تھا کہ ایک اجنبی آدمی کو جو جرائم پیشہ بھی تھا

اپنا بھید دے دیتا لیکن میری اُس وقت حالت ایسی تھی کہ میں شاید اچھی طرح سوچ نہیں سکا تھا اور میں ایسی صورتِ حال میں پھنس گیا تھا کہ مجھے اپنا آپ ظاہر کرنا پڑا۔

"میں قاتل ہوں"— میں نے کہا —"بھاگا بھاگا پھر رہا ہوں۔"

"کسے قتل کیا ہے؟"

"ایک انگریز پولیس کپتان کو!"— میں نے جواب —"نہیں بتاؤں گا تو شاید تم خوش ہو گے۔"

"خوش تو بعد میں ہوں گا"— اُس نے کہا —"پہلے تو میں حیران ہو رہا ہوں کہ تم نے پولیس کپتان کو قتل کیا ہے .... کیا وجہ ہو گئی تھی؟"

"غور کرو جھری بابا!"— میں نے کہا —"تمہاری بیٹی کو کوئی زبردستی پکڑ کر جنگل میں لے جا رہا ہو اور لڑکی رو رہی ہو تو تم کیا کرو گے؟"

"اُس آدمی کا سر کھول دوں گا"— اُس نے کہا —"اس پولیس کپتان نے تمہاری بہن یا بیوی پر ہاتھ ڈالا تھا؟"

"نہیں"— میں نے کہا —"وہ میری کچھ نہیں لگتی تھی۔ وہ ایک غریب آدمی کی بیٹی تھی۔ میں سب انسپکٹر تھا۔ میں سی آئی ڈی کا سب انسپکٹر تھا۔ انگریز پولیس کپتان ساتھ تھا۔ وہ لڑکی کو زبردستی بے آبرو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں پاگل ہو گیا اور چاقو نکال کر اس انگریز کو قتل کر دیا۔ لڑکی کو بھگا دیا اور خود مفرور ہو گیا۔ میں نے ایک غریب اور بے آسرا لڑکی کی عزت پر اپنی جان، اپنا عہدہ اور اپنی نوکری قربان کر دی۔ اب میں اپنے گھر بھی نہیں جا سکتا۔"

"یہ رائفل کہاں سے لی ہے؟"— اُس نے پوچھا۔

"چوری کی رائفل ہے"— میں نے کہا —"پولیس کی ہے .... اُس روز سے بھاگتا اور چھپتا پھر رہا ہوں۔"

جھری بابا نے مجھ سے بہت سے سوال پوچھے۔ میں نے ہر سوال کا جواب غلط دیا۔ یہ بھی غلط بتایا کہ میں نے ڈی ایس پی کو کہاں قتل کیا تھا۔ یہ بھی نہ بتایا کہ میں ایک بار گرفتار ہو گیا تھا اور ریل گاڑی سے فرار ہُوا تھا، پھر میں جہاں جہاں

رہا اور مجھ پر جو بیتی وہ نہ بتاتی۔ حمید اللہ خان اور اپنے دوسرے ساتھیوں کا ذکر نہ کیا۔ انگریز عورت ریتا کے اغوا کا واقعہ بھی نہ سنایا اور یہ بھی نہ بتایا کہ میری گرفتاری پر دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ میں نے انہیں اپنا نام بھی غلط بتایا۔

"میں سیلاب میں سے نکلا ہوں" ــــ میں نے کہا ــــ "دریا کے پار خطرہ تھا۔ دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ میں اس میں کود گیا اور چار پانچ گھنٹے بہتا بہتا اس طرف پہنچا، پھر میں بے ہوشی میں چلتا رہا۔"

"اب کیا کرو گے؟"

"اس سوال کا جواب تم ہی دو جھری بابا!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں تو یہی کہوں گا کہ مجھے اپنے پاس رکھ لو اور مجھ سے اپنی خدمت کراؤ۔"

"تم میری کیا خدمت کر سکتے ہو؟" ــــ جھری بابا نے پوچھا۔

"بابا جان!" ــــ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ــــ "میں پولیس میں رہا ہوں۔ اگر میں تمہیں نہیں جانتا تو تم جیسے باوریوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کیا تم مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم شریف آدمی ہو، میں تمہاری یہ خدمت کر سکتا ہوں کہ جو تم کرتے ہو وہ میں بھی کروں گا۔ میں تمہاری یہ مدد کر سکتا ہوں کہ تمہیں بتاؤں گا کہ پولیس مجرموں کا سراغ کس طرح لگاتی ہے اور کس طرح پکڑتی ہے۔ میں ایسے طریقے سے ڈکیتی اور راہزنی کی وارداتیں کروں گا کہ پولیس کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ یہ واردات کس نے کی ہے .... میں اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہوں۔"

"پہلی بات یہ بتاؤ" ــــ اس نے کہا ــــ "میں تم پر اعتبار کس طرح کروں؟"

"کچھ دن اپنے پاس رکھ کر دیکھ لو" ــــ میں نے کہا ــــ "لیکن ایک بات بتا دیتا ہوں۔ میں چھوٹی چھوٹی وارداتیں نہیں کروں گا۔ مجھے چار پانچ ایسے جوان دے دو جن میں عقل ہو اور ان کے دل مضبوط ہوں۔ میں انہیں شاگرد رکھوں گا اور میں ان سے چلتی ریل گاڑیوں میں ڈکیتی کی وارداتیں کراؤں گا۔"

اس نے میرے ساتھ جرائم کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ ادھر ادھر کی

باتیں بھی ہوئیں۔ میں چونکہ جرم و سزا کی دنیا کا آدمی تھا اس لئے میرے منہ سے ایسی باتیں نکلتی رہیں جن سے وہ متاثر ہوا اور اسے یہ شک نہ ہوا کہ میں اناڑی ہوں اور مجھے کسی استاد کی ضرورت ہے۔

میرا عزم تو کچھ اور تھا۔ میں ڈاکو نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں نے انگریزوں کی بادشاہی کے خلاف لڑنا تھا، لیکن میرے اس عزم کو یہ لوگ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ان کے لئے آزادی اور غلامی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ آزاد لوگ تھے۔ آزاد ماحول اور آزاد فضاؤں میں رہتے تھے۔ انگریزوں کے خلاف انہیں صرف یہ شکایت تھی کہ یہ جرم کرتے تھے اور انگریزوں کی پولیس انہیں پکڑتی تھی۔ انگریزوں کے قانون کو یہ لوگ اپنے ملک کا قانون نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ ایسی بات کرنا بھینس کے آگے بین بجانے والا معاملہ تھا کہ دہشت گردی کے ذریعے انگریزوں کے خلاف لڑنا ہے۔ مجھے کچھ عرصے کے لئے پناہ کی ضرورت تھی جو یہیں مل سکتی تھی، لیکن یہ مجھے فارغ تو نہیں بٹھا سکتے تھے۔

"میرے پاس رائفل ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "اگر تم نے مجھے اپنے آدمی دے دیئے تو میں ایسی دو تین اور رائفلیں اڑا کر لا سکتا ہوں۔"

اس بوڑھے نے شاید یقین کر لیا تھا کہ میں اسے دھوکا نہیں دے رہا۔

"سن لڑکے!" ــــ اس نے کہا ــــ "میں خود ڈاکو رہا ہوں اور میری عقل دیکھ کہ ایک بار بھی نہیں پکڑا گیا۔ مال اسی ڈیرے میں آتا رہا۔ پولیس نے کئی بار چھاپہ مارا لیکن مال کی بھنک بھی نہ ملی۔ اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرا قبیلہ چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا ہے، لیکن مجھے مزہ نہیں آتا۔"

"مزہ آئے گا" ــــ میں نے کہا ــــ "مجھے آدمی دے دو۔"

"آدمی بہت ہیں" ــــ اس نے کہا ــــ "پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ تم کچھ کر بھی سکتے ہو یا نہیں۔ پھر تم نے دیکھنا ہے کہ میرے آدمی کوئی بڑی واردات کرنے کے قابل ہیں یا نہیں، لیکن یہ سوچ لو کہ تمہیں کسی بھی وقت اپنا گھر یاد آ جائے گا یا شہر کی زندگی یاد آ جائے گی تو تم رخصت ہو جاؤ گے یا یہ کہو گے

کہ کچھ دن گھوم پھر آؤں۔ اگر تم چلے گئے تو پکڑے بھی جا سکتے ہو۔"

"میں نے کہیں بھی نہیں جانا بابا جان!"—میں نے کہا—"دنیا میں دو تین دوستوں کے سوا میرا کوئی بھی نہیں۔ اپنا کوئی عزیز رشتہ دار بھی نہیں۔"

ہم اتنی دیر بیٹھے یہ باتیں کرتے رہے کہ دوپہر کا کھانا وہیں خیمے میں کھایا۔ میں نے دیکھا کہ جھری بابا کو اُس کا قبیلہ پیروں کی طرح مانتا تھا۔ اُس نے میرے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ میں کچھ دن اُس کے ساتھ رہوں اور اُس کے قبیلے میں گھُل مل جاؤں پھر اپنے مطلب کے کچھ آدمی اکٹھے کر لوں۔ تین چار آدمیوں کے نام تو اُس نے بتا دیئے اور کہا کہ ان پر ہر حالت میں بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

دن کا پچھلا پہر تھا جب اُس نے ایک آدمی کو بلا کر کہا کہ میرے لئے کپڑے لے آئے۔ پھر اُس نے مجھے کہا کہ میں نہا لوں اور کپڑے بدل لوں۔



میں جب نہا کر اور ان کے دیئے ہوئے کپڑے پہن کر جھری بابا کے سامنے گیا تو وہ کچھ دیر میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک اور پاؤں سے سر تک دیکھا۔ میں اُس کے چہرے پر حیرت کا تاثر دیکھ رہا تھا۔

"تم تو بہت خوبصورت جوان ہو"—اُس نے کہا—"سیلاب کی مٹی نے تمہارا حُلیہ بگاڑا ہُوا تھا۔ تمہاری داڑھی ذرا چھوٹی ہونی چاہیئے۔"

اُس نے اُسی وقت کسی کو آواز دی۔ ایک آدمی دوڑا آیا۔ وہ ان کا حجام تھا۔ اپنے بابا کے حکم پر اُس نے میری داڑھی تراش کر چھوٹی کر دی۔ میں نے اُس کے چھوٹے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو مجھے اتنی سی داڑھی اچھی لگی۔

"میرے قریب آجاؤ"—اُس نے کہا۔

میں اُس کے قریب سرک گیا۔

"ایک ضروری بات کرنی ہے"—اُس نے کہا—"پہلے یہ بتاؤ کہ تمہاری بیوی ہے؟ بچّے ہیں؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا بابا جان!"—میں نے جواب دیا—"اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں۔ میں نے شادی کی ہی نہیں تھی۔"

"اگر تم کبھی عورت کی ضرورت محسوس کرو تو مجھے بتانا"—اُس نے کہا—"میں تمہاری شادی کرا دوں گا۔ میرے اس ڈیرے میں کسی لڑکی پر نظر رکھ کر کوئی اُلٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھنا۔"

"ایسی حرکت کرنی ہوتی تو میں اب تک پکڑا جا چکا ہوتا"—میں نے کہا—"بابا جان اگر میں تمہیں بتاؤں کہ میں عورتوں سے کس طرح بچتا رہا ہوں تو تم مانو گے نہیں۔ تم سمجھو گے کہ یہ شرافت کا رعب جما رہا ہے۔"

"میں مان لیتا ہوں"—اُس نے کہا—"تم کچھ نہ سناؤ۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے قبیلے میں ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت اور جوان لڑکی ہے۔ میں جانتا ہوں یہ لڑکیاں شہر میں جا کر کیا کرتی ہیں۔ یہ ایسا بکاؤ مال بھی نہیں کہ جس نے پیسے کی جھلک دکھائی اُس کے پیچھے چل پڑیں۔ یہ تو بڑے بڑے استادوں کو بھی چکر دے آتی ہیں، لیکن تم بہت خوبصورت جوان ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی لڑکی تمہارے پیچھے پڑ جائے۔ اس سے بچنے کی کوشش کرنا۔ ہم لوگ ان معاملوں میں بڑے سخت ہیں۔ ایک تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اور دوسرا نقصان یہ ہو گا کہ تم کسی کام کے نہیں رہو گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں کسی کی دشمنی مُول لے لو۔"

میں نے اُسے تسلی دی کہ میں ان چکروں میں پڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔

"میں یہ مان لیتا ہوں کہ تم ان چکروں میں نہیں پڑو گے"—جھری بابا نے کہا—"لیکن ہماری عورتیں اتنی تیز ہیں کہ اُن میں سے کسی نے تمہیں چکر دینے کا ارادہ کر لیا تو تم اُس کے جال میں آنے کے سوا کچھ نہیں کر سکو گے۔"



تین چار دن ہی گزرے ہوں گے کہ پہلا جال مجھ پر آ گیا۔ میں نے ان تین چار دنوں میں قبیلے کے تمام آدمیوں کے ساتھ دوستی پیدا کر لی تھی اور اپنے مطلب کے چند ایک آدمی دیکھ لئے تھے۔ میں نے تمام جوان عورتوں اور جوان لڑکیوں کو بھی دیکھ لیا تھا۔ جھری بابا نے ٹھیک کہا تھا کہ اس قبیلے میں ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت لڑکی ہے۔ وہ شرمانے والی لڑکیاں نہیں تھیں۔ مردوں کی طرح کھل کر اور بے تکلفی سے بات کرتی تھیں

شام کا وقت تھا۔ میں ٹہلتا ٹہلتا ڈیرے سے کچھ دور نکل گیا۔ ایک جگہ مجھے بڑی خوبصورت لگی۔ اردگرد ہری بھری ٹیکریاں تھیں۔ ان کے نیچے اُوپر گھنے درخت تھے۔ ان کے درمیان سبزہ تھا۔ ایک بڑ کا درخت تھا جو بہت ہی پھیلا ہوا تھا۔ میں وہاں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے پیچھے قدموں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ اسی قبیلے کی ایک جوان لڑکی تھی جس کا نام پھولاں تھا۔ وہ بہت خوبصورت تو نہیں تھی، لیکن چہرے کے رنگ اور جسم کی ساخت کی وجہ سے دل کو اچھی لگتی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتی ہوئی میرے پاس آ کر رکی۔

"کیا کر رہے ہو یہاں؟" — اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"اور تم کیا لینے آئی ہو یہاں؟"

"تمہیں دیکھ کر آ گئی ہوں" — اُس نے جواب دیا۔

"فوراً چلی جاؤ" — میں نے کہا — "مجھے نمک حرام نہ بناؤ۔ میں جانتا ہوں تم میرے پیچھے کیوں آئی ہو۔"

"بڑے پتھر دل ہو" — اُس نے کہا اور جانے کی بجائے میرے اور قریب ہو گئی۔

میں نے اس لڑکی کو پہلے دیکھا تھا۔ اس کا انداز اور اس کی حرکتیں قبیلے کی دوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف تھیں۔ بعض اوقات مجھے شک ہوتا تھا کہ یہ اس قبیلے کی لڑکی نہیں بلکہ اسے اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے۔ بال شہری لڑکیوں کی طرح بناتی تھی۔ قبیلے کی عورتیں گھاگھرہ پہنتی تھیں لیکن پھولاں شلوار پہنتی تھی اور قمیص بھی۔ اُس کی چال ڈھال تہذیب یافتہ عورتوں کی طرح

تھی لیکن اُس کی باقی عادتیں انہی لوگوں جیسی تھیں جن میں وہ جنمی پلی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ شہری لڑکی بننے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے اُسے بڑی مشکل سے ٹالا۔ ٹالنا بہت ضروری تھا۔ میں ان لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی دھوکا بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں ابھی اس قسم کی عیاشیوں میں پڑنے کی حالت میں نہیں تھا۔

رات کو اُن عورتوں میں سے ایک جو مجھے یہاں لاتی تھیں، مجھے کھانا دینے آئی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بھی جوان عورت تھی اور شکل و صورت بھی اچھی تھی۔ چونکہ یہ لوگ پیدل کئی کئی میل چلتے تھے اور عورتیں بھی محنت اور مشقت کرتی تھیں اس لئے ان کے جسم بہت اچھے لگتے تھے۔ یہ عورت جو میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی، جسم کی ساخت کے لحاظ سے جاذبِ نظر تھی، لیکن اُس کے انداز میں کچھ ایسا خلوص اور کچھ ایسی بے ساختگی تھی کہ میں اُسے صرف احترام کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

"آج پھولاں کو دیکھا تھا" — اُس نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں دیکھا تھا؟" — میں نے اُس کا مطلب سمجھتے ہوئے پوچھا — "پہلے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا؟"

"پہلے کبھی اُس جگہ نہیں دیکھا تھا جہاں آج دیکھا ہے" — اُس نے کہا۔

"پھر اُسے کبھی وہاں نہیں دیکھو گی" — میں نے کہا — "تم نے یہ بات کیوں کہی ہے؟"

"اس لئے کہ پھولاں اچھی لڑکی نہیں" — اُس نے کہا — "ایسے لگتا ہے جیسے وہ ہم میں سے نہیں۔"

"ہو سکتا ہے وہ تم میں سے نہ ہو" — میں نے کہا — "تمہاری عورتیں شہروں میں جاتی رہتی ہیں اور میں جانتا ہوں کہ وہاں کیا کرتی ہیں۔ پھولاں کی ماں بھی اسی قبیلے کی عورت تھی۔"

"بات کچھ ایسی ہی لگتی ہے"— اُس نے کہا — "میں جو بات تمہیں بتا رہی ہوں وہ سمجھو۔ یہ لڑکی ہمارے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی۔ ہمیں تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ پھُولاں تمہیں چاہتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو شہزادی سمجھتی ہے۔"

بات وہی نکلی جو میں نے پہلے بھی کہی ہے کہ پھُولاں شہری لڑکی بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا اظہار اُس نے خود ہی دوسرے دن کر دیا۔ دن کا وقت تھا۔ قبیلے کے لوگ اِدھر اُدھر نکل گئے تھے۔ میں خیمے میں تھا۔ پھُولاں میرے لئے کھانا لاتی اور بیٹھ ہی گئی۔ اُس نے بڑی بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔ اُس نے ایک گلہ تو یہ کیا کہ میں اُس کے ساتھ بات نہیں کرتا پھر اُس نے اظہارِ محبت شروع کر دیا۔ اس کے لئے اُس نے تمہید باندھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ یہ اُس فضا کا اثر تھا جس میں وہ پل کر جوان ہوتی تھی۔ میں نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

"تم یہاں سے کب جاؤ گے؟"— اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گا"— میں نے جواب دیا — "اب ہمیشہ یہیں رہوں گا۔"

وہ اس طرح ہنسی جیسے میں نے مذاق کیا ہو۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں پھُولاں!"— میں نے کہا — "بھری بابا نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا ہے۔"

"تم یہاں کیسے رہ سکتے ہو؟"— اُس نے پوچھا — "یہ تو جنگلی جانوروں جیسی زندگی ہے۔ تم شہر کی زندگی چھوڑ کر یہاں کس طرح رہو گے؟ کیا تم شہر کے رہنے والے نہیں ہو؟"

"رہ لوں گا پھُولاں!"— میں نے کہا — "نہیں رہ سکوں گا تو چلا جاؤں گا۔"

"ابھی چلے جاؤ اور مجھے اپنے ساتھ لے چلو"— اُس نے کہا۔

جب اُس نے یہ بات کہی تو میں جان گیا کہ یہ لڑکی نارمل نہیں۔ مجھے یہ

شک بھی ہُوا کہ ان لوگوں نے اسے بچپن میں اغوا کیا ہو گا اور اپنے پاس رکھ لیا ہو گا اور اسی وجہ سے اسے خانہ بدوشوں کی زندگی اچھی نہیں لگتی۔

"تم چاہتی کیا ہو پھُولاں؟"— میں نے پوچھا۔

"میں شہر میں رہنا چاہتی ہوں"— اُس نے جواب دیا اور پوچھا — "کیا تم مجھے شہر کے کسی گھر میں آباد ہونے کے قابل نہیں سمجھتے؟ کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگتی؟ .... کیا تم شادی شدہ ہو؟"

"نہیں"— میں نے جواب دیا — "میں شادی شدہ نہیں ہوں .... تمہیں شہر کی چکا چوند اچھی لگتی ہے اور مجھے یہ سادہ سی زندگی پسند ہے۔"

"لعنت بھیجو اس زندگی پر"— اُس نے کہا — "مجھے اپنے ساتھ شہر لے چلو۔"

اُس کی باتیں ایسی احمقانہ تھیں کہ میں نے سنجیدگی سے سوچنا چھوڑ دیا اور اُسے ویسے ہی ٹال دیا۔ وہ ٹل تو گئی لیکن جتنا میں اُس کے متعلق غیر سنجیدہ تھا، اُس سے کہیں زیادہ وہ میرے متعلق اور میرے ساتھ شہر جانے میں سنجیدہ تھی۔



اُسی شام کو میں ٹہلتا ٹہلتا ذرا دُور نکل گیا تو پھُولاں وہاں پہنچ گئی۔ اُس نے پھر وہی باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اُسے ٹالنے یا دھتکارنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کی بجائے اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ میری باتیں ایسی تھیں جن سے وہ سمجھی کہ میں اُس سے متاثر ہو گیا ہوں۔

"روپیہ پیسہ نہیں تو کچھ بھی نہیں"— اُس نے کہا — "میں تمہیں دل کی بات بتا رہی ہوں۔ ہم لوگ گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ شہروں میں جاتے ہیں۔ کئی شہری جوان اور امیرزادے میرے سامنے آتے ہیں۔ وہ مجھے بلاتے تھے، لیکن میں سمجھتی تھی کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ میں اپنے دل میں کسی کی محبت کو بسانا چاہتی تھی اور میں کہتی تھی کہ وہ مجھ سے دلی محبت کرے اور میرے ساتھ شادی کر لے۔ ان میں سے کوئی بھی میرے دل کو اچھا نہ لگا۔ سب مطلب

کے یار تھے۔ تم ایک آدمی نظر آتے ہو جسے دیکھتے ہی میرے دل میں محبت پیدا ہو گئی ہے۔"

"لیکن پھولاں!" ـــ میں نے کہا ـــ "میں اتنا امیر تو نہیں۔ تمہیں تو کوئی امیر زادہ چاہیئے۔"

"میں تمہیں امیر بنا دوں گی۔"

"وہ کیسے؟" ـــ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"ہم لوگ جنگل کے بھیدی ہیں" ـــ اُس نے کہا ـــ "ہم سانپوں اور بچھوؤں میں رہتے ہیں۔ ایسے ایسے زہریلے سانپ دیکھے ہیں کہ ایسا سانپ کسی کو ڈس لے تو وہ ایک منٹ کے اندر اندر مر جاتا ہے۔ ہمیں سانپ اور بچھو ڈستے رہتے ہیں، لیکن ہم میں سے کوئی مرتا نہیں۔ ہمارے پاس ایسی جڑی بوٹیاں ہیں جو سب سے زیادہ زہریلے سانپ کے زہر کو بھی بیکار کر دیتی ہیں۔ قبیلے کی عورتیں جنگلوں میں پھرتی رہتی ہیں۔ وہ جڑی بوٹیاں ڈھونڈتی ہیں۔ ایک بوٹی ایسی ہے جو زمین کے نیچے ہوتی ہے۔ اس بوٹی کی خوبی یہ ہے کہ اسے لوہے پر رگڑو تو لوہا سونا بن جاتا ہے، لیکن یہ بوٹی ملتی نہیں، زمین میں موجود ہے۔ اس کی ایک دو نشانیاں ہیں۔ جہاں یہ بوٹی زمین کے نیچے ہوگی اُس جگہ بہت سے سانپ اور بچھو بھی ہوں گے۔ جس جگہ یہ بوٹی ہوتی ہے وہاں اوپر مٹی کا رنگ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ کئی بار ایسے ہُوا کہ بوٹی کا سراغ مل گیا۔ جس کسی نے وہاں سے زمین کھودی اُسے کالے بچھو یا اُڑنے والے سانپ نے ڈس لیا.... میں نے اس کا بھید پا لیا ہے۔ اگر تم ہمّت کرو تو یہ بوٹی مل سکتی ہے۔"

"کیا تم مجھے سانپوں سے مروانا چاہتی ہو؟" ـــ میں نے پوچھا۔

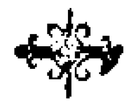
"نہیں" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "تمہارے پاس رائفل ہے۔ وہاں جا کر تم ایک یا دو گولیاں چلاؤ گے تو سانپ اور بچھو ڈر کر بھاگ جائیں گے یا زمین کے نیچے چلے جائیں گے۔ تم وہیں کھڑے رہنا۔ میں اپنے ہاتھ سے بوٹی نکالوں گی پھر ہم شہر چلے جائیں گے۔"

میرے لئے اُس کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں۔ میں اس طرح سُنتا رہا جس طرح چھوٹا سا بچہ کوئی سنسنی خیز کہانی سُنتا ہے۔ ان لوگوں میں اور دیہات کے لوگوں میں بھی اس قسم کی حکایتیں اور روایتیں بہت مشہور تھیں اور لوگ انہیں سچ مانتے تھے۔ اُڑنے والا سانپ بھی مشہور تھا جو کسی نے نہیں دیکھا تھا، لیکن سب کہتے تھے کہ اُڑنے والا سانپ ہوتا ہے۔

مجھے یقین ہو گیا کہ اس لڑکی کا دماغی توازن صحیح نہیں۔ میں نے اُسی رات جھری بابا سے پھولاں کے متعلق بات کی اور کہا کہ اس لڑکی کا دماغ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔

"دماغ تو اس کا ٹھیک ہے" ـــ جھری بابا نے کہا ـــ "باتیں پاگلوں جیسی کرتی ہے اس لئے اب شہر نہیں جانے دیتے۔ اب یہ بہت پریشان ہو گی کیونکہ کوئی شہر قریب نہیں۔ تم اس کی باتیں سن لیا کرو۔"

جھری بابا کی یہ بات سُن کر مجھے اطمینان ہُوا کہ اُس نے مجھ پر شک نہیں کیا۔



میں نے قبیلے کے چار پانچ آدمیوں کو ڈاکہ زنی اور رہزنی کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک روز جھری بابا نے مجھے کہا کہ اب کہیں کوئی بڑی واردات کر کے دکھاؤ۔

"اگر ڈاکہ زنی کی واردات کرنی ہے تو گھر بھیدی کی ضرورت ہے" ـــ میں نے کہا۔

"یہ کوئی استادی نہیں" ـــ جھری بابا نے کہا ـــ "میں گھر بھیدی کے بغیر ڈاکے ڈالتا رہا ہوں۔"

"چلو ایسے ہی سہی" ـــ میں نے کہا ـــ "میں تمہیں گھر بھیدی کے بغیر ہی کسی ساہوکار کا گھر خالی کر کے دکھاؤں گا۔"

طے یہ ہُوا کہ کچھ روز بعد ایک شہر میں کسی کے گھر ڈاکہ ڈالا جائے گا۔ اپنے دو آدمیوں کو شہر بھیجنا تھا جنہوں نے یہ دیکھ کر آنا تھا کہ کون سے گھر میں

واردات کی جاتی ہے۔

میں نے جس روز جھری بابا کے ساتھ پھولاں کے متعلق بات کی تھی اُس سے چار پانچ روز بعد کا واقعہ ہے کہ پھولاں میرے خیمے میں آئی۔

"میں تمہیں ایک بات سنانے آئی ہوں"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "اگر تم بُوٹی حاصل کرنے سے ڈرتے ہو تو میں تمہیں ایک اور ذریعہ بتاتی ہوں جس سے دولت مل سکتی ہے .... مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ ایک ڈاکو ایک انگریز افسر کو قتل کر کے بھاگا ہُوا ہے۔ انگریزوں نے اعلان کیا ہے کہ جو کوئی اس آدمی کو زندہ یا مُردہ پکڑ کر لائے گا اُسے دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا"۔۔۔

اُس نے حیرت سے آنکھیں کھول کر اور ہاتھ پھیلا کر کہا ۔۔۔ "دس ہزار روپیہ!... تم نے کبھی دس ہزار روپیہ دیکھا ہے؟ اتنی رقم سے دو گھڑے بھرے جاتے ہیں"۔

"لیکن یہ کون بتائے گا کہ وہ کہاں ہے؟"۔۔۔ میں نے پوچھا ۔۔۔ "یہ تو پتہ ہی نہیں کہ اُس کا نام کیا ہے، کہاں کا رہنے والا ہے اور اُس کا مذہب اور حُلیہ کیا ہے"۔

"میں تمہیں بتاتی ہوں"۔۔۔ پھولاں نے کہا ۔۔۔ "وہ مسلمان ہے۔ اُس کا نام سکندر ہے۔ خوبصورت جوان ہے اور اُس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی ہے.... اور میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ وہ اسی علاقے میں ہے"۔

پھولاں کی زبان سے یہ سُن کر میری حالت بگڑنے لگی، لیکن میں نے پھولاں پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں کتنا گھبرا گیا ہوں۔ ایک گھبراہٹ تو اس کی تھی کہ دس ہزار روپیہ انعام اس جنگل بیابان میں بھی میرے تعاقب میں پہنچ گیا تھا اور زیادہ حیرت اس پر ہوئی کہ اس خانہ بدوش لڑکی کو یہ ساری معلومات کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔

"تمہیں یہ باتیں کس نے بتائی ہیں؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"یہاں سے کچھ دُور شہر کے تین شکاری ایک جگہ بیٹھے ہوتے تھے"۔۔۔ پھولاں نے بتایا ۔۔۔ "میں اُدھر بُوٹی کی تلاش میں گئی تھی۔ ہماری عورتیں جنگل

میں جاتی ہی رہتی ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں روکتا۔ وہ تینوں شکاری اکٹھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ سکندر مل جائے تو سمجھو دس ہزار روپیہ مل گیا .... میں نے تمہیں اس ڈاکو کے متعلق جو باتیں بتائی ہیں یہ میں نے اُن سے سُنی تھیں"۔

میں نے اُس کی اس بات پر یقین نہ کیا۔ مجھے شک ہُوا کہ یہ ان شکاریوں کے پاس گئی ہو گی اور جس طرح یہ میرے ساتھ محبت کا اظہار کر چکی تھی اس نے اُن کے ساتھ بھی کیا ہو گا، لیکن میں سمجھ نہ سکا کہ انہوں نے یہ بات اسے کیوں بتائی ہو گی۔ میں نے اُس کی بات سن لی اور اُسے کہا کہ اس حُلیے کا کوئی آدمی کہیں نظر آیا تو میں اُسے پکڑ لُوں گا۔

پھولاں میرے خیمے سے نکل گئی اور میرا سکون اور اطمینان بھی اُس کے ساتھ ہی نکل گیا۔ دماغ میں یہی ایک کانٹا اُتر گیا کہ یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے اس خانہ بدوش لڑکی کو میرے متعلق بتایا ہے۔ یہ میں نے عقلمندی کی تھی کہ ان لوگوں کو اپنا نام غلط بتایا تھا۔



میں رات بھر سو نہ سکا۔ صبح ہوئی تو میں باہر نکلا۔ دیکھا کہ پھولاں کچھ دُور تیز تیز جا رہی تھی۔ اُس کی رفتار سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ روزمرّہ کے معمول کے مطابق نہیں جا رہی۔ مجھے کچھ شک ہُوا۔ میری رائفل میرے پاس آ چکی تھی جو میں نے بستر کے نیچے بچھی ہوئی گھاس کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ میں نے رائفل نکالی اور ایمونیشن کے پوچوں والی پیٹی کندھے کے ساتھ لٹکا کر چل پڑا۔

چھُپ کر چلنے کی بہت جگہیں تھیں۔ ٹیکریاں بھی تھیں۔ چٹانیں بھی تھیں اور کھڈ بھی تھے۔ میں نے پھولاں سے کچھ فاصلہ رکھا اور نظر اُس پر رکھی۔ وہ ایک ٹیکری کی اوٹ میں اوجھل ہو گئی۔ میں ٹیکری کے اوپر چلا گیا اور بیٹھ کر جھاڑیوں کی اوٹ سے دیکھا۔ تقریباً دو فرلانگ دُور درختوں کے ایک جھُنڈ کے نیچے چھوٹا سا خیمہ لگا ہُوا ہے۔ اُس کے قریب ایک درخت کے ساتھ خچر بندھی ہوئی تھی۔ تین آدمی خیمے کے باہر بیٹھے ہوتے تھے۔ ان کے سامنے آگ جل

رہی تھی اور آگ پر کوئی برتن رکھا ہُوا تھا۔ وہ کوئی امیرزادے تھے جو شکار اور پکنک پر آتے تھے۔ اُس زمانے میں کوئی امیرزادہ یا شہزادہ ہی اتنی دُور پکنک پر جایا کرتا تھا۔ میں دیکھتا رہا۔

پھولاں اُن کے پاس پہنچی۔ اُن میں سے ایک نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں ساری بات سمجھ گیا۔ اب یہ معلوم کرنا کہ یہ لوگ کون ہیں میرے لئے بہت ضروری ہوگیا تھا۔ میں ٹیکری سے اس طرح اُترا کہ وہ مجھے دیکھ نہ سکے۔ وہ پھولاں کے ساتھ مگن ہو گئے تھے۔ اُن کے قریب ایک اور ٹیکری تھی۔ میں اُس کی اوٹ میں ہو کر دبے پاؤں اُس کے اُوپر چلا گیا۔ یہ مٹی کی ٹیکری تھی اس لئے اس پر جو گھاس تھی وہ خاصی اونچی تھی۔ وہاں سے مجھے اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ تینوں نوجوان تھے اور امیر کبیر لگتے تھے۔

جس نے پھولاں کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا تھا وہ اُٹھا اور پھولاں کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھایا۔ وہ پھولاں سے کچھ کہہ رہا تھا جو مجھے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ پھولاں کو ایک طرف لے جانا چاہتا تھا مگر پھولاں اُس کے ساتھ چلتے ہُوئے جھجک رہی تھی۔ اُس کے دونوں ساتھی اُٹھے اور خیمے کے اندر چلے گئے۔ جب وہ باہر نکلے تو اُن کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ وہ ایک طرف کو چل پڑے۔ وہ شاید یہ تاثر دے رہے تھے کہ وہ جا رہے ہیں۔

جس نوجوان نے پھولاں کا بازو پکڑ رکھا تھا وہ اُسے خیمے تک لایا۔ وہ خیمے کے اندر جانا چاہتا تھا، لیکن پھولاں معلوم نہیں کیوں باہر ہی رُک گئی۔ وہ خیمے کے اندر نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ اُسے خیمے سے تھوڑی دُور لے گیا۔ وہ ایک اور ٹیکری کی اوٹ تھی۔ میں ٹیکری سے اُترا اور اُس ٹیکری کی اوٹ میں چلا گیا۔

وہ بڑی اچھی جگہ تھی۔ تین طرف بالکل قریب قریب ٹیکریاں تھیں۔ صرف ایک طرف سے جگہ کھُلی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ نوجوان پھولاں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور پھولاں اُس سے اپنا بازو چھُڑا رہی تھی۔ میں نے للکارا۔ دونوں نے میری طرف دیکھا۔ میں نے رائفل دونوں ہاتھوں میں لے کر اُس کی نالی اُس

نوجوان کی طرف کر رکھی تھی۔

"وہیں بیٹھ جاؤ" — میں نے اُسے کہا — "پھولاں! تم اِدھر آجاؤ"
— ذرا سوچ کر میں نے پھولاں سے کہا — "تم یہاں سے چلی جاؤ"

وہ چلی گئی تو میں نے اِس نوجوان کو غور سے دیکھا۔ اُس کی عمر اکیس بائیس سال تھی۔ وہ خوبرو نوجوان تھا۔ یہ خوبصورتی آج کل کے نوجوانوں جیسی نہیں تھی۔ اُس زمانے میں مردانہ خوبصورتی کا معیار کچھ اور ہوتا تھا، مثلاً دراز قد اور گٹھا ہُوا جسم۔ چہرے کے نقوش بعد میں دیکھے جاتے تھے۔ یہ نوجوان ہر لحاظ سے جاذبِ نظر تھا اور صاف پتہ چلتا تھا کہ مسلمان ہے۔

وہ بزدل اور ڈرپوک نہیں ہو سکتا تھا لیکن اُس جنگل اور ویرانے میں ایک خانہ بدوش نے اُس پر رائفل تان رکھی تھی۔ میں خانہ بدوشوں کے لباس میں تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ زبان بند ہوگئی اور چہرے پر ایسے تاثرات آگئے جیسے التجا کرنا چاہتا ہو کہ میں اُسے بخش دوں۔

"یہ لڑکی خود ہی ہمارے پاس آجاتی تھی" — اُس نے خوفزدگی کے لہجے میں رُک رُک کر کہا۔

میں اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ مجھے پھولاں کی عزّت بے عزّتی کا کوئی خیال نہیں تھا۔ یہ آدمی ٹھیک کہہ رہا تھا کہ پھولاں خود ان کے پاس آتی تھی۔ میں اس قبیلے کی عورتوں کو جانتا تھا۔ میں تو یہ دیکھنے آیا تھا کہ پھولاں کو کس نے بتایا ہے کہ سکندر نام کا ایک آدمی ایک انگریز افسر کو قتل کر کے بھاگا ہُوا ہے اور اس کی گرفتاری کے لئے دس ہزار روپیہ انعام مقرر ہے۔ میں نے اپنی حفاظت کا انتظام کرنا تھا۔

"تم نے لڑکی کو بھیج دیا ہے" — اُس نے کہا — "اُسے بُلا کر پوچھو۔ کہتی تھی مجھے شہر لے چلو اور میرے ساتھ شادی کر لو۔"

"اور تم یہاں اُسے شادی کرنے کے لئے لاتے تھے؟" — میں نے پوچھا۔

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کہاں سے آتے ہو؟"—— میں نے پوچھا —— "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"میں رہنے والا پنجاب کا ہوں"—— اُس نے جواب دیا اور ایک قصبے کا نام لے کر کہا—— "میرے والد صاحب وہاں کے تھانے میں انسپکٹر ہیں۔"

"کیا نام ہے اُن کا؟"

"فضل حسین!"—— اُس نے جواب دیا —— "انسپکٹر فضل حسین۔ تھانے کے انچارج ہیں۔"

انسپکٹر فضل حسین نام سُن کر مجھے دھچکہ لگا۔ یہ وہی انسپکٹر تھا جس نے مجھے چیلنج کیا تھا کہ وہ مجھے زندہ پکڑے گا۔ اُس نے مجھے اُس روز جس روز میرا اور اُس کا آمنا سامنا ہُوا تھا اس لئے نہیں پکڑا تھا کہ وہ میری شست میں تھا اور میں نے اُس پر گولی نہیں چلائی تھی۔

ایک ہی بار کتنی خیال ذہن میں آگئے جن میں ایک یہ تھا کہ اس نوجوان کو پکڑ کر یرغمال بنا لوں اور فضل حسین کو پیغام بھیجوں کہ تم مجھے زندہ پکڑنا چاہتے ہو، پہلے اپنے بیٹے کو مجھ سے زندہ چھڑواؤ لیکن پندرہ ہزار روپیہ نقد ساتھ لانا۔

پھر خیال آیا کہ اُس سے رقم نہ مانگوں، اس کی بجائے اُسے بلا کر کوئی اور سودا کروں، مثلاً یہ کہ وہ مجھے پکڑنے کا ارادہ دل سے نکال دے لیکن یہ خیال بھی آگیا کہ میں اکیلا ہوں۔ ان خانہ بدوشوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پولیس ان پر حملے کے انداز کا چھاپہ مار کر مجھے پکڑ سکتی تھی۔

"اور میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر ہوں"—— اُس نے کہا —— "جسے تم لوگ چھوٹا تھانیدار کہا کرتے ہو"—— یکلخت اُس کی آواز تھانیداروں جیسی ہو گئی۔ کہنے لگا —— "سوچ لو۔ میں چھوٹا تھانیدار ہوں اور میرا باپ تھانیدار سے بھی بڑا ہے۔ تمہارا قبیلہ اندر ہو جائے گا، اور یہ بھی سوچ لو کہ تمہاری جوان لڑکیوں کے ساتھ پولیس کیا سلوک کرے گی۔"

"پہلے یہ دیکھ لو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا"—— میں نے اُسے کہا اور آہستہ آہستہ اُس کی طرف چل پڑا۔ وہ اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا۔



"رائفل پھینک دو۔"

یہ ایک للکار تھی جو مجھے اپنے عقب میں سنائی دی۔ رگوں میں خون جم گیا۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے کو گھوما۔ یہ خطرہ بھی محسوس ہُوا کہ میں گھوموں گا تو یہ اے ایس آئی مجھے دبوچ لے گا۔ میں چوکنا ہو کر گھوما۔ وہ دو نوجوان تھے جو اس کے ساتھی تھے۔ وہ دونوں بندوقیں اُٹھا کر کسی اور طرف چلے گئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے اس ساتھی کو پھُولاں کے ساتھ اکیلا چھوڑنے کے خیال سے چلے گئے تھے۔ وہ اچانک آگئے تھے۔ میں نے پھُولاں کو وہاں سے بھیج کر غلطی کی تھی۔ اُسی نے ان دونوں لڑکوں کو بتایا ہوگا کہ اُن کا ساتھی پھنس گیا ہے۔

دونوں کے پاس دو نالی بندوقیں تھیں جو اُنہوں نے مجھ پر تانی ہوئی تھیں۔ زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے یہ فائدہ حاصل تھا کہ میں نے پولیس کی خصوصی ٹریننگ حاصل کی تھی۔

"رائفل پھینک دے جانگلی!"—— ایک نوجوان نے غصّے سے کہا —— "ہم تیری لاش یہیں دفن کر کے چلے جائیں گے۔"

عین اُس وقت انسپکٹر فضل حسین کا بیٹا میری طرف بڑھا۔ وہ مجھ سے رائفل لینے آیا تھا۔ میں نے رائفل دونوں ہاتھوں پر اُٹھا کر اُس کے آگے کر دی جیسے اُسے پیش کی ہو۔ میرے قریب آکر اُس نے اپنے ہاتھ آگے کئے تو میں نے رائفل اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لی اور آگے ہو کر اس کی نالی اے ایس آئی کے پہلو کے ساتھ لگا کر دبائی، پھر میں اچھل کر اُس کے پیچھے ہو گیا۔ ایک بازو اُس کی گردن کے گرد لپیٹ دیا اور بازو کا گھیرا تنگ کر کے رائفل کی نالی اُس کے دونوں ساتھیوں کی طرف کر دی۔

"اب چلاؤ گولی!"—— میں نے انہیں کہا۔

میں نے رائفل کی نالی اے ایس آئی کے پیٹ کی طرف کر لی۔

"بندوقیں وہیں پھینک دو" — میں نے انہیں کہا — "فوراً .... پہلی گولی اسے ماروں گا پھر ...."

وہ شہری لڑکے تھے۔ اُن کی کوئی ٹریننگ نہیں تھی۔ انہوں نے بڑے آرام سے بندوقیں زمین پر رکھ دیں۔

"اِدھر آؤ" — میں نے کہا — "یہاں بیٹھ جاؤ۔"

میں نے اے ایس آئی کو چھوڑ دیا اور تینوں کو اکٹھے بٹھا دیا۔ اُن کی بندوقیں اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لیں۔

"ہمیں بندوقیں دے دو گے؟" — اے ایس آئی نے کہا — "ایک میرے باپ کی اور دوسری اس کے باپ کی ہے۔"

"تم نے مجھے اپنے باپ کی اور اپنی تھانیداری کا رعب دکھایا تھا" — میں نے کہا — "تم اے ایس آئی کب بنے ہو؟"

"میں ڈائریکٹ اے ایس آئی بھرتی ہُوا تھا" — اُس نے جواب دیا — "میرے والد صاحب کو انگریز افسر بہت چاہتے ہیں۔ میں نے ٹریننگ ختم کرلی ہے اور میں بیس دِنوں کی چُھٹی آیا ہُوا ہوں۔"

"پھر کہاں جاؤ گے؟"

"مجھے اپنے والد صاحب کے تھانے کے ساتھ والے علاقے کے تھانے میں تعنیات کیا گیا ہے" — اُس نے جواب دیا — "انہوں نے بڑی کوششوں سے مجھے اس تھانے میں لگوایا ہے۔"

یہ تھانہ جو اُس نے بتایا تھا، ڈیرے سے تقریباً بیس میل دُور تھا۔

دوسرے دو جاگیرداروں کے بیٹے تھے۔ ان تینوں کا گہرا دوستانہ تھا۔ وہ یہاں تین چار دن رہنے کے لئے خیمہ لے کر آتے تھے۔ برتن بھی اپنے ساتھ لاتے تھے۔ یہ سارا سامان خچر پر لاد کر لاتے تھے۔ انسپکٹر مفضل حسین کے بیٹے کا نام مظفر حسین تھا۔

"یہ لڑکی تمہارے پاس کس طرح پہنچی تھی؟" — میں نے اُن

سے پوچھا۔

"سنو میرے بھائی!" — مظفر نے کہا — "تم اس لئے دلیر اور شیر بنے ہُوئے ہو کہ تمہارے ہاتھ میں رائفل ہے۔ چاہے مجھے گولی مار دو میں سچی بات ضرور کہوں گا .... ہماری یہی عورتیں اور یہی لڑکیاں شہر میں جاتی ہیں تو اسی طرح آدمیوں کو گھیر کر اُنہیں دھوکے دیتی ہیں اور اگر کوئی ہم جیسا روپے پیسے والا آدمی مل جاتے تو اپنا آپ بھی اُس کے حوالے کر دیتی ہیں۔ چونکہ تم اس علاقے میں ہو اس لئے اپنے آپ کو اتنا غیرت مند ظاہر کر رہے ہو۔"

"لیکن تم اسے دھوکا دے رہے تھے" — میں نے کہا۔

"تم اسے یہاں ہمارے سامنے بٹھا کر پوچھو" — مظفر نے کہا — "یہ آج دوسری دفعہ ہمارے پاس آئی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ہم نے اُسے اسی نظر سے دیکھا تھا جس نظر سے ہم اس قسم کی لڑکیوں کو شہروں میں دیکھا کرتے ہیں۔ یہ میرے پیچھے پڑ گئی اور محبت کی باتیں کرنے لگی۔ میں نے اس کے جواب میں اسی طرح کی باتیں شروع کر دیں۔ یہ کہتی تھی کہ میں ان لوگوں میں نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں نے اس کے ساتھ جھوٹا وعدہ کیا اور آج یہ پھر آگئی۔ اس میں شک نہیں کہ میں اسے اِدھر لا کر خراب کرنا چاہتا تھا۔"

میں نے پہلے بتایا ہے کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ یہ پھولاں کے ساتھ کیسا تعلق قائم کرنا چاہتے تھے۔ میں تو کوئی اور بھید لینے کی کوشش میں تھا، لیکن مجھے ذرا بچ کر بات کرنی تھی۔

"تم نے اس کے ساتھ یہ جھوٹ کیوں بولا ہے کہ ایک ڈاکو کسی انگریز افسر کو قتل کر کے بھاگا ہُوا ہے اور تم اُسے گرفتاری کر کے دس ہزار روپیہ انعام لو گے" — میں نے کہا — "اس قسم کا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میرے بھائی!" — مظفر بولا — "ہم تم سے اس لئے نہیں ڈرتے

کہ تمہارے ہاتھ میں رائفل ہے بلکہ اس لئے ڈرتے ہیں کہ تم بیوقوف آدمی ہو اور خواہ مخواہ ہی گولی چلا دو گے.... تم نے یہ کیا بات کی ہے کہ ہم نے اس لڑکی کے ساتھ کسی مفرور ڈاکو یا قاتل کی بات کی ہے۔ ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے اور یہ پاس بیٹھی سُن رہی تھی۔ ہم نے جو پرندے اُس روز مارے تھے وہ ہم پکا رہے تھے اور اسے کہا تھا کہ بیٹھو، تم بھی کھانا کھا کر جانا۔ یہ بیٹھی رہی اور ہم باتیں کرتے رہے۔"

"کوئی ایسا مفرور ڈاکو ہے؟" — میں نے پوچھا — "جس کا دس ہزار روپیہ انعام مقرر ہے؟"

"ہاں!" — مظفر نے جواب دیا — "اور یہ شک بھی ہے کہ وہ اسی علاقے میں ہے۔ اُس نے ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کیا تھا اور بھاگ گیا تھا۔ میرے والد صاحب نے قسم کھا رکھی ہے کہ اُسے گرفتار کریں گے۔"

مظفر کے دونوں ساتھی چُپ چاپ بیٹھے تھے۔ ہر بات مظفر کرتا تھا۔ اُس نے میرے متعلق ساری تفصیل سنائی۔ اُس کے باپ نے اُسے وہ واقعہ بھی سنایا تھا جب میرا اور اُس کا آمنا سامنا ہوا تھا۔

"اگر میں اُسے پکڑ لوں" — میں نے کہا — "تو کیا دس ہزار روپیہ مجھے ملے گا یا یہ انعام صرف پولیس والوں کے لئے ہے؟"

"یہ انعام ہر کسی کے لئے ہے" — مظفر نے جواب دیا — "اگر کوئی کُتا اُسے پکڑ لے گا تو اُس کے مالک کو دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔"

"اُس کا حُلیہ کیا ہے؟" — میں نے پوچھا — "اور اُس کی عمر کتنی ہو گی؟"

"میں نے اپنے والد صاحب کے تھانے میں اُس کی فوٹو دیکھی تھی" — مظفر نے کہا — "بہت خوبصورت جوان ہے، لیکن اس فوٹو میں اُس کی داڑھی نہیں۔ اب سُنا ہے کہ اُس نے داڑھی بڑھا لی ہے .... میں تمہیں غور سے دیکھتا ہوں تو تمہارا حُلیہ اور چہرہ اُس کے حُلیے کے عین مطابق نظر آتا ہے.... جانے دو اُسے۔ تم اُس کا حُلیہ جان کر کیا کرو گے!"

"میں غریب آدمی ہوں بھائی میرے!" — میں نے کہا — "اگر میں ہی اُسے پکڑ لوں تو دس ہزار روپیہ مل جائے گا۔"

میں خود محسوس کر رہا تھا کہ میں بڑے غصے اور دبدبے میں اُن سے باتیں کر رہا تھا اور اب میں بالکل ہی نرم ہو گیا تھا۔ اس نرمی کو انہوں نے بھی محسوس کیا اور وہ منتیں کرنے لگے کہ میں انہیں چھوڑ دوں۔

"میں نے تمہیں چھوڑنا نہیں تھا" — میں نے کہا — "لیکن تمہاری عمر دیکھتا ہوں اور تمہارے ماں باپ کا خیال آتا ہے تو دل میں رحم جاگ اُٹھتا ہے۔ بہتر ہے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر میری جگہ میرے قبیلے کا کوئی اور آدمی ہوتا تو وہ تمہارے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتا.... دیکھو مظفر! تم پولیس انسپکٹر کے بیٹے ہو اور تم دونوں جاگیرداروں کے بیٹے ہو۔ اپنے آپ کو فرعونوں کے بیٹے مت سمجھو اور یہ بھی نہ سمجھو کہ لوگ تمہاری تھانیداری کے آگے سجدے کریں گے اور تم دونوں اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ دولت سے تم کسی کی عزت بھی خرید سکتے ہو۔ عزت بیچنے والے موجود ہیں لیکن اپنی عزت پر خون بہانے والے بھی موجود ہیں۔ دیہاتی علاقے میں آ کر اپنے آپ کو اپنے آپ میں ہی رکھا کرو۔ جاؤ۔ اگر میرے قبیلے کے آدمی آ گئے تو تمہیں اس خیمے اور اس خچر کے بغیر جانا پڑے گا۔"

وہ تینوں اتنی تیزی سے اپنا سامان سمیٹ کر اور بندوقیں اُٹھا کر بھاگے جتنی تیزی سے فوجی بھی اپنا کیمپ نہیں سمیٹ سکتے ہوں گے۔ جانے سے پہلے میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ مظفر کی مدد کو اُس کے ساتھی کس طرح پہنچے تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ پھُولاں دوڑتی ہوئی اُن کے پیچھے گئی تھی اور اُنہیں بتایا تھا کہ مظفر کو میں نے پکڑا ہُوا ہے۔



وہ چلے گئے اور میں اپنے ڈیرے میں آ گیا، لیکن میں خاصا پریشان تھا۔ زیادہ پریشانی یہ تھی کہ میں خانہ بدوشوں کی زبان سے ناواقف تھا۔ ان کے لب و لہجے میں اردو یا پنجابی نہیں بول سکتا تھا، لیکن ان نوجوانوں میں سے

شاید کسی نے بھی میری اس خامی کو نوٹ نہیں کیا تھا۔ پھر بھی میں خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ انہوں نے نوٹ کر ہی نہ لیا ہو۔ میں جھری بابا کے پاس گیا۔ اُسے یہ سارا واقعہ سنایا اور بتایا کہ میں خطرے میں ہوں۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ پھُولاں شہر کے ان شکاری لڑکوں کے پاس جاتی رہی ہے اور اسی نے اس چھوٹے تھانیدار کے ساتھیوں کو میرے پیچھے لگایا تھا۔

"پھُولاں یتیم لڑکی ہے" — جھری بابا نے کہا — "اس کی صرف ماں ہی ماں ہے جو بےچاری بیمار پڑی رہتی ہے۔ یہ لڑکی اپنی ماں کو تڑپلے ہی نہیں باندھتی۔ میں اس کی عادتوں سے واقف ہوں۔ کتنی بار مجھ سے مار کھا چکی ہے۔ یہ کسی کے ساتھ شادی بھی نہیں کرتی۔ اس کی ماں مر گئی تو میں اس لڑکی کو کسی کے ہاتھ بیچ ڈالوں گا ....تم فکر نہ کرو۔ اگر پولیس یہاں آگئی تو تمہیں اس طرح چھپائیں گے جیسے تمہیں زمین نے نگل لیا ہو۔"

تیسری رات پولیس آگئی اور اس طرح آئی جس طرح اچانک آندھی آجاتی ہے اور کسی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ وقت آدھی رات سے ذرا پہلے کا تھا۔ خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں صرف کُتے جاگ رہے تھے۔ پہلے کُتے بھونکے پھر تین یا چار گولیاں فائر ہوئیں اور تمام قبیلہ جاگ اُٹھا۔ چاندنی رات تھی۔ ساون کی دُھلی ہوتی فضا میں چاندنی پوری طرح شفاف تھی۔ اس کے ساتھ بہت سی ٹارچیں تھیں جو پولیس والوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ پولیس کے دو تین آدمی بار بار للکار رہے تھے — "جہاں ہو وہیں رہو ....جو بھاگے گا اُسے گولی مار دی جائے گی۔"

ایک للکار اور سنائی دی — "سکندر! زندہ رہنا چاہتے ہو تو سامنے آجاؤ۔"

وہاں تو قیامت کی افراتفری اور بھگدڑ بپا ہوگئی تھی۔ عورتوں اور بچوں نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ پولیس کے آدمی خیموں کو اکھاڑ رہے تھے۔ تیز و تُند طوفان جیسا سماں تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہر چیز اُڑ رہی ہو۔ اتفاق سے میرا خیمہ ایک طرف تھا، درمیان میں نہیں تھا۔ میں نے رائفل اُٹھالی۔ اس کی

میگزین میں پانچ راؤنڈ ڈالے۔ میں پاؤں پر سرکتا خیمے سے نکلا اور خیمے کی اوٹ میں ہوگیا۔ پولیس کے آدمی خیموں کے اندر جاتے، خانہ بدوشوں کو مارتے، دھکے دیتے اور خیمے اُکھاڑتے آرہے تھے۔

میرے خیمے کی طرف دو کانسٹیبل آتے۔ میں خیمے کے دوسری طرف تھا۔ وہ خیمے کے اندر گئے تو میں بیٹھے بیٹھے خیمے سے پرے چلا گیا۔ قریب ہی ایک پرانا درخت تھا۔ میں اس کے تنے کی اوٹ میں ہوگیا۔ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ پولیس کی نفری کتنی ہے۔ اچانک ڈیرے کے وسط میں شعلے بلند ہونے لگے۔ یہ پُرانے کپڑوں کا بہت بڑا ڈھیر تھا۔ خانہ بدوش جب آبادیوں کے قریب ڈیرہ لگاتے تھے تو ان کے بچے اور عورتیں کُوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے چیتھڑے اکٹھے کرلاتی تھیں۔ انہیں دریا یا نہر میں دھو کر اور خشک کر کے شہر میں ہی یہ لوگ بیچ آتے تھے۔ ان کے خریدار آٹا پیسنے والی مشینوں کے مالک ہوتے تھے یا اسی طرح چھوٹے موٹے کارخانوں والے مشینیں صاف کرنے کے لئے یہ کپڑے خریدتے تھے۔ میں کپڑوں کا یہ انبار ہر روز دیکھا کرتا تھا۔ پولیس نے اس انبار کو آگ لگا دی تھی۔

ان شعلوں کی روشنی میں مجھے پولیس کے آدمی نظر آنے لگے۔ نفری زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے یہ صرف ایک تھانے کی نفری ہے۔ میں درخت کی اوٹ سے ہٹ کر پیچھے چلا گیا جہاں اونچی گھاس تھی۔ میں اتنی اچھی پوزیشن میں تھا کہ پولیس کے ایک ایک آدمی کو چُن چُن کر مار سکتا تھا لیکن میں تو نکل جاتا، پیچھے پورے کا پورا قبیلہ عمر بھر کے لئے قید میں ڈال دیا جاتا یا ان کے چیدہ چیدہ آدمیوں کو سزائے موت دے دی جاتی۔ میرے لئے ایک ہی راستہ تھا۔ وہ یہ کہ مجھے وہاں سے بھاگ جانا چاہیئے تھا۔ اب میں اس قبیلے کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔

صرف میں ہی خطرے میں نہیں تھا بلکہ پورا قبیلہ خطرے میں آگیا تھا۔ قبیلے کے بچنے کی یہی ایک صورت تھی کہ میں بھاگ جاتا۔ اس صورت میں پولیس یہ سمجھتی کہ میں یہاں نہیں تھا۔

ایک وجہ اور بھی تھی جو مجھے بھاگ جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ یہ کہ میں نے ان لوگوں کو اپنا نام سکندر نہیں بتایا تھا اور انہیں یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ میری گرفتاری پر انعام مقرر ہو چکا ہے۔ اب پولیس کی للکار سے قبیلے والوں کو میرا اصلی نام معلوم ہو گیا تھا۔ اگر میں یہاں رہتا تو یہی لوگ میرے دشمن ہو جاتے۔ انہیں پولیس یہ ضرور بتا کر جاتی کہ میری قیمت دس ہزار روپے ہے۔ ان لوگوں سے میں یہ توقع نہیں رکھ سکتا تھا کہ وہ دس ہزار پر لات مار کر مجھے اپنی پناہ میں رکھیں گے۔



میرے لئے اب یہی فیصلہ موزوں تھا کہ پولیس شبخون میں اُلجھی ہوتی تھی اس لئے میں نکل بھاگوں۔ میں وہاں سے پیچھے ہٹنے ہی لگا تھا کہ ایک آدمی دوڑتا ہوا میرے خیمے کے قریب آیا۔ جلتے ہوتے کپڑوں کی روشنی اتنی زیادہ تھی کہ میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ انسپکٹر مفضل حسین کا بیٹا اسسٹنٹ سب انسپکٹر مظفر حسین تھا۔ وہ کانسٹیبلوں کو للکار رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا کہ ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر لو۔ شور اتنا زیادہ تھا کہ مجھے امید نہیں تھی کہ مظفر جو حکم دے رہا تھا وہ کوئی سُن بھی رہا تھا یا نہیں۔

معلوم نہیں اُسے کیا سوجھی کہ وہ پیچھے ہٹتا ہٹتا میرے قریب آگیا۔ شاید وہ ڈیرے کے ارد گرد چکر لگا کر دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اُس سے بمشکل چار پانچ قدم دُور گھاس میں چھپا ہوا تھا۔ میں پاؤں پر سرک کر آگے ہوا۔ شور میں وہ میرے پاؤں کی سرسراہٹ نہ سُن سکا۔ میں ذرا اور آگے ہوا اور وہاں سے چیتے کی طرح اُچھل کر اُس پر جھپٹا اور اُس کی گردن اپنے بائیں بازو کے گھیرے میں جکڑ لی۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میں نے رائفل گھاس میں پڑی رہنے دی تھی کیونکہ اس سے ریوالور بھی چھیننا تھا۔

اُس نے بھی آخر کچھ ٹریننگ لی تھی۔ میں نے اُس کی گردن بازو کے شکنجے میں لی تو اُس نے دایاں ہاتھ جس میں ریوالور تھا پیچھے کو کیا۔ میں پہلے ہی چوکس تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ریوالور مجھ پر فائر کرے گا اور اس کا طریقہ یہی ہو سکتا تھا جو

وہ کر رہا تھا۔ میں نے اُس کی کلائی پکڑ لی اور اُس کی گردن پر بازو کا گھیرا اور تنگ کر دیا۔ میرا بازو اُس کی ٹھوڑی کے نیچے تھا۔ میں نے بازو ذرا اُوپر کر کے اُس کی ٹھوڑی کو اور زیادہ اُوپر کر دیا۔ اُس کا دم گھٹا تو ریوالور اُس کے ہاتھ سے نکل گیا جو میں نے اُٹھا لیا۔

قتل میری فطرت میں نہیں تھا۔ پھر مظفر جیسے نوجوان کو جو انگریزوں کے حکم پر اپنی جان کی بازی لگاتے ہوتے تھا، میں قتل کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں اُسے گھسیٹ کر پیچھے گھاس میں لے گیا اور بازو اُس کی گردن سے ہٹا دیا۔ اُس نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ میں نے ریوالور کی نالی اُس کی طرف کر رکھی تھی۔ چاندنی سیدھی میرے مُنہ پر پڑ رہی تھی۔

"اوہ!" — اُس نے کہا — "یہ تم ہو۔ میں تمہارے قبضے میں ہوں۔ یہ بتا دو کہ تم سکندر ہی ہو؟"

"ہاں" — میں نے جواب دیا — "میں ہی سکندر ہوں۔"

"پھر تم اچھے خاصے بیوقوف ہو" — اُس نے مجھ سے ڈرے بغیر کہا — "تم اپنے آپ کو باوریہ کہلاتے ہو اور اُردو پنجابی لہجے میں بولتے ہو۔ تمہاری زبان نے ہی تمہاری نشاندہی کی ہے۔"

"کیا تمہارے والد صاحب نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ سکندر کو کوئی نہیں پکڑ سکتا؟" — میں نے اُسے کہا — "وہ خود کیوں نہیں آتے؟ اُس سنگدل آدمی نے اپنے بیٹے کو مروانے کے لئے کیوں بھیج دیا ہے؟ .... اور پیچھے چلو۔"

وہ پیچھے ہٹا۔ میں بھی پیچھے ہٹا اور جُھک کر اپنی رائفل اُٹھائی پھر اُسے اتنی دُور پیچھے لے گیا جہاں ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں اُسے ایک درخت کے نیچے لے گیا اور اُس سے پوچھا کہ اُس کے ساتھ اور آفیسر کون ہے۔

"میرے تھانے کا سب انسپکٹر راجندر سنگھ ہے" — اُس نے جواب دیا — "وہ مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔"

"تم اُس کے پاس چلے جاؤ گے" — میں نے کہا — "میرے

ساتھ سیدھی سیدھی باتیں کرو۔ پہلے یہ بتاؤ۔ تم یہاں کس طرح آتے ہو؟ نشاندہی کس نے کی ہے؟"

"تم نے خود اپنی نشاندہی کی ہے" ـــ اُس نے کہا ـــ "تم سپیشل برانچ کے سب انسپکٹر رہے ہو مگر تم میں اتنی عقل نہیں کہ اپنی زبان ذرا بدل لیتے۔"

"وہ میں سُن چکا ہوں" ـــ میں نے کہا ـــ "تم شاید اپنے باپ کی شہ پر آتے ہو۔"

"ہاں!" ـــ اُس نے کہا ـــ "اُس روز یہاں سے ہم گئے تو میں نے اپنے والد صاحب کو بتایا کہ میں نے آج ایک باوریہ دیکھا ہے جو اُن کے لہجے میں نہیں بول سکتا اور اُس کا چہرہ ویسا ہی لگتا ہے جیسا آپ نے مجھے سکندر کا بتایا تھا۔ انہوں نے مجھ سے تمہاری آنکھوں، پیشانی، ہونٹوں اور چہرے کے رنگ کے متعلق کچھ باتیں پوچھیں۔ میں نے انہیں ہر ایک بات کا جواب دیا تو انہوں نے کہا کہ یہ سکندر ہو سکتا ہے۔"

اُس نے مجھے میرے چہرے، قد اور جسم کے متعلق تفصیلات سنائیں

"میری چھٹی کے ابھی چھ روز باقی تھے" ـــ مظفر نے کہا ـــ "والد صاحب نے مجھے کہا کہ اپنے تھانے میں چلے جاؤ اور باقی چھٹی منسوخ کرا دو۔ پھر وہ کہنے لگے کہ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ آتے اور سب انسپکٹر راجندر سنگھ کو بتایا کہ وہ مجھے کیوں لاتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں چھاپہ ماروں۔ اس سے مجھے تجربہ حاصل ہوگا اور اگر میں نے تمہیں پکڑ لیا تو یہ میرا ایسا کارنامہ ہوگا جس سے میری ترقی کا راستہ کھُل جاتے گا۔"

"تمہارے والد صاحب کیوں نہیں آتے؟" ـــ میں نے کہا ـــ "مجھے خود پکڑتے اور اپنی قسم پوری کرتے۔"

"اُن کا تھانہ دُور ہے" ـــ مظفر نے جواب دیا ـــ "یہ علاقہ ہمارے تھانے کا ہے ..... والد صاحب واپس چلے گئے تھے۔ سب انسپکٹر راجندر سنگھ نے اپنا ایک مخبر یہاں بھیجا تھا۔ اُس نے یہاں، باوریوں کے ڈیرے میں آکر

کہا تھا کہ وہ کُتے کا ایک بچہ خریدنا چاہتا ہے۔ تم اُسے نہیں دیکھ سکتے تھے، اُس نے تمہیں بڑی اچھی طرح دیکھا تھا۔ یہ کل کی بات ہے۔ واپس جا کر اُس نے پکا شک ظاہر کیا کہ یہ تم ہو یعنی مفرور قاتل تم ہی ہو۔ اس طرح میں اور سب انسپکٹر راجندر سنگھ چھاپہ مارنے آتے۔"



"اپنے والد صاحب کی کھوپڑی میں تھوڑی سی عقل ڈالو مظفر!" ـــ میں نے کہا ـــ "انہوں نے مجھے اپنا ذاتی دشمن سمجھ لیا ہے۔ آج انہوں نے تمہیں مروا دیا ہے لیکن میں ڈاکو نہیں۔ مجھ میں انسانیت موجود ہے۔ میں انہیں اُن کا بیٹا واپس کر رہا ہوں۔ میرے یہ الفاظ اُن تک پہنچا دینا کہ انسپکٹر فضل حسین صاحب، میں آپ کا بیٹا واپس کر رہا ہوں۔ اس وقت تمہاری جان میری اُنگلی کے نیچے ہے۔ ذرا سی اُنگلی ہلا دوں تو ریوالور کی گولی تمہارے سینے سے پار ہو جاتے گی لیکن میں گھٹیا اور اوچھا آدمی نہیں۔"

"میں تمہارا احسان مند رہوں گا" ـــ اُس نے کہا۔

"میں یہ احسان تمہارے والد صاحب پر اور تمہاری والدہ پر کر رہا ہوں۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے انگریز ڈی ایس پی کو ایک لڑکی کی عزت بچانے کے لئے قتل کیا تھا؟" ـــ اُس نے پوچھا۔

میں نے اُسے سارا واقعہ سنا دیا کہ میں نے ڈی ایس پی کو کیوں اور کس طرح قتل کیا تھا۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میں پولیس کے ہاتھ سے کتنی بار اور کس طرح نکلا ہوں۔

"اپنے والد صاحب سے یہ باتیں کرنا" ـــ میں نے کہا ـــ "انہیں کہنا کہ انگریزوں کی وفاداری میں کوئی خزانہ نہیں۔ میں نے دہشت گرد گروہ توڑے ہیں۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا۔ میں نے انگریزوں کی وفاداری میں ایسے ایسے کارنامے کئے تھے کہ انگریز افسر حیران رہ گئے تھے۔ میں نے ہندوستان میں انگریزوں کی بادشاہی کو دہشت گردوں سے محفوظ کر دیا تھا مگر

انگریزوں نے مجھے اپنا غلام ہی سمجھا اور مجھے حکم دیا کہ فلاں لڑکی کو ہمارے پاس لے آؤ....

"میری باتیں غور سے سنو مظفر! میں تمہاری جان لینا نہیں چاہتا، میں تم میں جان ڈالنا چاہتا ہوں۔ تم نوجوان ہو، مسلمان ہو، میں تمہاری غیرت کو جھنجھوڑ کر جگانا چاہتا ہوں۔ تمہارے والد صاحب انگریزوں کو خوش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ میرا بھی یہی اصول تھا کہ اپنے آقا کا نمک حلال کرو اور اپنے فرائض پر اپنی جان بھی قربان کر دو لیکن انگریز افسر جس لڑکی کو رات کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے وہ میری بہن تھی۔ میں نے اُسے چھپا دیا تھا۔ اس کے فوراً بعد ڈی ایس پی وارن نے ایک ہندوستانی ملازم کی بیٹی کو زبردستی اپنے ساتھ بٹھا لیا پھر اُسے ایک باغ کے اندھیرے گوشے میں لے گیا۔ میں نے پیچھے جا کر اُسے قتل کر دیا۔ غریب لڑکی اُس کی منتیں کر رہی تھی، رو رو کر کہہ رہی تھی کہ وہ کنواری رہنا چاہتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ اُس کی عصمت داغدار ہوتی میں نے اس انگریز ڈی ایس پی کو قتل کر دیا اور اپنی بہن کو جہاں چھپایا تھا وہاں سے ساتھ لے کر بھاگ اٹھا۔"

"بہن کہاں ہے؟"

"مر گئی ہے"— میں نے کہا —"اپنے والد صاحب سے کہنا کہ انگریز افسروں کو ضرور خوش کرو لیکن یہ سُن لو مظفر! اگر تمہاری بہن ہے تو اُسے انگریز افسروں کے سامنے نہ آنے دینا.... مظفر دوست! یہ ملک تمہارا ہے، یہ مٹی تمہاری ہے، اس مٹی کی عزّت تمہاری عزّت ہے، اس مٹی کی بے حُرمتی نہ کرو.... مجھے کیوں گرفتار کرنے آتے ہو؟.... بولو مظفر! کیوں؟.... اس لئے کہ میں نے اپنی بہن اور ایک غریب لڑکی کی عزّت کی حفاظت میں ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کیا تھا؟"

"میں تمہیں گرفتار نہیں کروں گا"— مظفر نے کہا —"میں والد صاحب کو یہ ساری باتیں بتاؤں گا.... لیکن سکندر! ایک بات کہوں گا، یہ نہ سمجھنا کہ اس وقت میری جان تمہارے قبضے میں ہے اس لئے یہ وعدہ کر رہا ہوں کہ تمہیں۔"

"ہر کسی کی جان اللہ کے قبضے میں ہے"— میں نے کہا —"میں اللہ کے قبضے میں ہوں۔ وہ اللہ ہی تھا جس نے مجھے کئی بار پولیس کے گھیرے سے نکالا ہے۔ میں جنگل میں پڑا مر رہا تھا تو اللہ نے انسانوں کے روپ میں فرشتے بھیج کر مجھے نئی زندگی دی۔"

"تم اب کرو گے کیا؟"— اُس نے پوچھا —"کیا اسی طرح بھاگتے اور چھپتے پھرو گے؟"

"کبھی اچھے حالات میں ملو گے تو بتاؤں گا"— میں نے کہا —"اپنے والد صاحب تک میرا پیغام پہنچا دینا۔"

خانہ بدوشوں کے ڈیرے میں شور کم ہو گیا اور اب یہ آواز بار بار بلند ہوتی تھی —"مظفر حسین کو دیکھو کدھر گیا ہے"— پھر یہ پکار سنائی دیتی تھی —"او مظفر!.... اوئے کہاں چلا گیا!"

"جاؤ مظفر!"— میں نے کہا —"وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔"

"میں انہیں کیا بتاؤں گا میں کہاں چلا گیا تھا؟"— اُس نے پوچھا۔

"کہنا تم ایک شک پر اونچی گھاس کی تلاشی لینے چلے گئے تھے"— میں نے کہا —"تم ابھی بچے ہو، یہ سکھ تھانیدار تمہاری بات مانے گا نہیں، پھر بھی یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرنا کہ سکندر یہاں نہیں تھا۔ ان باوریوں نے مجھے پناہ دی تھی۔ اگر تم انہیں کسی تکلیف سے بچا سکو تو مجھے خوشی ہو گی لیکن یہ تمہارے اختیار میں نہیں .... جاؤ، یہ لو اپنا ریوالور!"

اُس نے میرے ہاتھ سے اپنا ریوالور لیا اور مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ اُسے سب سے بڑی خوشی تو یہ تھی کہ میں نے اُس کی جان بخشی کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ اُس پر میری باتوں کا اثر ہوا تھا۔

"سکندر!"— اُس نے کہا —"تمہیں اب ان باوریوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہیئے۔ ان پر آج چھاپہ پڑا ہے تو کل بھی پڑے گا۔ تم تو چلے جاؤ گے، میں اپنے آپ کو مصیبت میں نہیں ڈال سکوں گا۔ یہ تو ان لوگوں سے پوچھا جائے گا

کہ وہ آدمی کہاں ہے جس کی داڑھی ہے اور رنگ گورا ہے۔ سکندر بھائی! تم یہاں سے نکلو۔ یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ انہیں اپنے حال پر چھوڑو ..... زندہ رہے تو ملیں گے۔"

وہ چلا گیا۔ میں وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ جب یہ سوچ آئی کہ اب کہاں جاؤں گا تو دل ڈوبنے لگا۔

میں وہاں سے کچھ اور دُور جا کر ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا، میں باوریوں کے ڈیرے کو دیکھ رہا تھا۔ پُرانے کپڑوں کے جلتے ہوئے انبار کے شعلے کم ہو گئے تھے اور باوریوں کا شور و غوغا جو ذرا ختم گیا تھا پھر بلند ہونے لگا۔ عورتوں کی چیخ و پکار سب سے زیادہ اُونچی تھی۔ پولیس ان کے آدمیوں کو ہانک کر تھانے لے جا رہی تھی۔ ان پر کسی نے رحم نہیں کرنا تھا۔ میں نے سنایا ہے کہ یہ خانہ بدوش جرائم پیشہ لوگ تھے۔ میں جانتا تھا تھانے میں ان کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میری وجہ سے ان لوگوں پر یہ مصیبت آن پڑی تھی۔ جھری بابا کا بار بار خیال آتا تھا لیکن میں ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

میں اب اپنے لئے بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں تنہا رہ گیا تھا اور میں اس علاقے میں اجنبی تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ علاقہ کیسا ہے۔ جہاں تک میں نے دیکھا تھا، یہ علاقہ ہموار اور میدانی نہیں تھا۔ رات نے تو مجھ پر پردہ ڈال رکھا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ رات گزر جائے گی تو میں کہاں چھپوں گا۔

میں ہمت ہار جانے والوں میں سے نہیں تھا لیکن صورت ایسی پیدا ہو گئی تھی جس نے مجھے بڑے ہی سخت امتحان میں ڈال دیا تھا۔ گھبراہٹ سی میرے دل پر بیٹھنے لگی۔ سب سے بڑا خطرہ میرے لئے پیدا ہو گیا تھا یا میں نے خود یہ خطرہ پیدا کر لیا تھا وہ یہ تھا کہ میں نے انسپکٹر فضل حسین کے بیٹے اسسٹنٹ سب انسپکٹر مظفر حسین پر اپنا آپ ظاہر کر دیا تھا اور اُسے کہا تھا کہ اپنے باپ سے کہنا کہ مجھے گرفتار کرنے کا خیال دل سے نکال دے۔ مظفر حسین نے اپنے باپ کو بتانا تھا اور باپ نے میری گرفتاری کے لئے اس علاقے کے تمام تھانوں کو اطلاع بھجوا دینی تھی کہ مفرور سکندر اس علاقے میں موجود ہے۔

میں نے وہاں سے کسی طرف چلنا تھا لیکن کس طرف؟

میرے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کس طرف جاؤں۔ صرف ایک سمت ایسی تھی جدھر مجھے نہیں جانا تھا .... پیچھے کو .... مجھے پیچھے نہیں جانا تھا۔

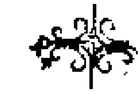
طارق بن زیاد نے اُندلس کے ساحل پر اُتر کر کشتیاں جلا ڈالی تھیں کہ مجاہدین کے ذہنوں سے واپسی کا خیال نکل جائے۔

میں نے ہندوستان کی ایک لڑکی کی عصمت کی خاطر ایک انگریز کو قتل کر کے اپنی کشتی جلا ڈالی تھی۔ میرے لئے واپسی کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ مجھے اب آگے ہی آگے جانا تھا۔

میں نے طارق بن زیاد کی مثال دے کر اسلام کے اس عظیم فاتح سپہ سالار کی توہین کی ہے۔ وہ اسلام کا پرچم یورپ کے سینے میں گاڑنے کے لئے گیا تھا

اور میں چوری کی ایک رائفل اُٹھائے قاتلوں اور ڈاکوؤں کی طرح چھپتا اور بھاگتا پھر رہا تھا۔ میں نے تو یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اور کہیں پناہ نہ ملی تو کسی بڑے ڈاکو کے پاس چلا جاؤں گا اور اُسے کہوں گا مجھے اپنے گروہ میں شامل کر لو۔

اس خیال سے کہ مجھے وہاں زیادہ دیر کھڑا نہیں رہنا چاہیئے، میں ایک سمت کو چل پڑا۔ ارادہ یہ کیا تھا کہ ساری رات چلتا رہوں گا اور تیز چلوں گا تاکہ اس علاقے سے نکل جاؤں۔ رائفل میرے لئے مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ اتنی بڑی رائفل کو چھپانا ناممکن تھا لیکن رائفل کو میں پھینک بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ضرورت کہیں بھی پڑ سکتی تھی۔



میں ساری رات چلتا رہا۔ جوانی کی نیند پر قابو پانا اور اپنے آپ کو بیدار رکھنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد نیند مجھ پر غلبہ پانے لگی۔ میں اور تیز چل پڑا۔ اس سے کچھ بیداری حاصل ہوئی لیکن آدھے گھنٹے کے لئے۔ آدھے گھنٹے بعد نیند پھر آنے لگی اور ٹانگیں تھکن محسوس کرنے لگیں۔

میں اپنے ذہن میں یہ تصور لے آیا کہ پولیس نے مجھے گھیرے میں لے کر گرفتار کر لیا ہے، مجھے سزائے موت سنائی گئی ہے اور مجھے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر کے میرے سر اور مُنہ پر کالی ٹوپی ڈال دی گئی ہے۔ پھر میں نے

اپنا جسم پھانسی سے لٹکتا ہُوا دیکھا۔

اس تصور سے میرے قدم تیزی سے اُٹھنے لگے۔ میں پھانسی سے بھاگ رہا تھا۔

میرے پیچھے زمین ہموار نہیں تھی۔ میں نے گھاٹیاں اُترا اور چڑھا تھا۔ بڑے لمبے لمبے کھڈ تھے۔ ایک برساتی نالے میں سے بھی گزرا جس میں کہیں کہیں پانی تھا۔ میں بلند زمین پر بھی چلا۔ کہیں کوئی روشنی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ یہ دیہاتی علاقہ ہے اور قریب کوئی قصبہ یا شہر نہیں۔ روشنیاں قصبوں اور شہروں میں ہُوا کرتی ہیں۔

میں کسی پگڈنڈی پر نہیں جا رہا تھا۔ مجھے ایسے ویرانوں کی ضرورت تھی جن میں سے انسان نہ گزرتے ہوں۔ مجھے شیروں اور چیتوں کا ڈر نہیں تھا۔ میں ان درندوں کا مقابلہ کر سکتا تھا مگر میں انسانوں سے ڈرتا تھا۔ میں نے کبھی مر جانے کی خواہش کی تھی مگر اب میں موت سے ڈر رہا تھا۔

کیا میں نفسیاتی طور پر کمزور ہو گیا تھا؟

کیا میں جوانی میں ہی بوڑھا ہو گیا تھا؟

یہ شاید تنہائی کا اثر تھا کہ میرے حوصلوں میں پہلے والا دم خم نہیں رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی یاد نے تو جیسے آدھی جان نکال لی تھی۔ یہ صرف ساتھی نہیں تھے، یہ تو سگے بھائیوں جیسے تھے۔ ماں باپ تو یاد ہی نہیں رہے تھے۔ خواجہ صاحب اور شہناز کی محبت نے پچھلے زخم مندمل کر دیئے تھے مگر جو زخم ان کی موت نے لگائے، ان سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ حمیداللہ خان بھی نہ رہا، بالا اور نوراللہ بھی نہ رہے تو خواجہ صاحب اور شہناز کی جدائی ایک زہر بن گئی۔ یہ زہر میرے رگ و ریشے میں سرایت کرتا جا رہا تھا اور میں صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ میری جسمانی توانائی گھٹتی جا رہی ہے۔

ایک خیال آگیا —— میرے ساتھی زندہ بھی تو ہو سکتے ہیں۔ میں نے انہیں ڈوبتے اور مرتے دیکھا تو نہیں تھا —— اس خیال نے مجھے سہارا دیا پھر اسی خیال نے ایک اُمید کی صورت اختیار کر لی۔ زندہ انسان زندگی کے کسی

نہ کسی موڑ پر مل ہی جاتے ہیں۔ میرے ساتھی مجھے مل جائیں گے۔ تینوں نہ ملے تو کوئی ایک تو مل ہی جائے گا۔

یہ ایک خوبصورت فریب تھا جو میں نے اپنے آپ کو دیا۔ فریب فرار کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔

خیالوں اور خواہشوں کو امید کا بہروپ دے کر میں چلتا گیا۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنا فاصلہ طے کر چکا ہوں۔ یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میرے آگے کیا ہے۔ میں بیداری کے خواب دیکھتا جا رہا تھا۔ یا میں چلتے چلتے سو گیا تھا۔

اچانک شڑاپ شڑاپ کی آوازوں نے مجھے خوابوں اور خیالوں سے بیدار کر دیا۔ میں ایک برساتی نالے میں سے گزر رہا تھا۔ اس میں ٹخنوں تک پانی تھا۔ میں رُک گیا اور دیکھا۔ اس نالے کے کنارے اونچے تھے۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں سے اور کس طرح نالے میں اُترا تھا۔ میں شاید سو گیا تھا یا خیالوں اور خوابوں میں کھو گیا تھا۔

میں پانی میں ہی چلتا گیا۔ زیادہ سے زیادہ گہرا پانی گھٹنوں تک تھا۔ میں جانوروں کی طرح پانی سے گزر گیا۔ کنارے پر چڑھا۔ یہ گلی سی تھی۔ دائیں اور بائیں مٹی کی دیواریں کھڑی تھیں۔ ان کے درمیان گھاٹی چڑھتی تھی جو میں چڑھ گیا۔

چاند نیچے چلا گیا تھا۔ مجھے اگر اچھی طرح نظر آ رہا تھا تو اس علاقے میں ٹیلے ہی ٹیلے تھے۔ درختوں کی کمی نہیں تھی۔

ایک طرف سے بھونکنے اور غرانے کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں اور دوڑتے قدموں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ اچانک بائیں طرف سے فٹ بال جیسی کوئی چیز میری ٹانگوں سے ٹکرائی اور میرے دونوں قدموں کے درمیان سے گزر گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک کتا اتنی زور سے میری ٹانگوں سے ٹکرایا کہ میں گر پڑا۔ کتا بھی رُک گیا۔ اس کے پیچھے ایک اور کتا آیا جو میرے قریب سے آگے گزر گیا۔ وہ جو میری ٹانگوں کے ساتھ ٹکرایا تھا وہ اُٹھا اور بڑے غصے سے دانت نکال کر مجھ پر غرانے لگا۔ اُس کا منہ چاند کی طرف تھا۔ یہ کتا نہیں بھیڑیا تھا۔ تب میں سمجھا کہ جو چیز میرے قدموں کے درمیان سے گزر گئی تھی وہ خرگوش تھا

اور دو بھیڑیئے اُس کے تعاقب میں تھے۔ ان میں سے ایک تو خرگوش کے پیچھے چلا گیا اور دوسرا مجھ پر غصہ جھاڑ رہا تھا کہ میں اُس کے راستے میں آ گیا تھا۔ میں نے رائفل لاٹھی کی طرح گھمائی۔ وہ دوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ پھر اُسے خیال آ گیا کہ وہ خرگوش کے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ اُدھر کو دوڑ پڑا۔ بھیڑیا اکیلا ہو تو حملہ نہیں کرتا۔ دو یا تین ہوں اور بھوکے ہوں تو انسان اُن سے بچ کر نہیں جا سکتا۔

میں آگے چل پڑا۔ میں بھی خرگوش ہی تھا اور بھیڑیوں سے بھاگتا پھر رہا تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں خرگوش نے مرنا تھا۔ میرے پکڑے جانے کا بھی یہی انجام تھا۔

مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں پیدا ہوتے ہی گھر سے نکلا اور کسی نامعلوم منزل کی جانب چل پڑا تھا اور میں چلتا ہی جاؤں گا، اُفق پیچھے ہی پیچھے ہٹتا جائے گا اور میری منزل سراب ہو گی جسے دیکھ دیکھ کر میں چلتا رہوں گا اور اُس منزل تک جا پہنچوں گا جو ہر انسان کی منزل ہے۔

چلتے چلتے چاندنی تاریک ہو گئی۔ چاند کی شمع بجھ گئی، گھُپ اندھیرا، اور میں اس اندھیرے سمندر میں ڈوب گیا۔

پھر دنیا روشن ہو گئی مگر اب چاندنی سفید نہیں پیلی پیلی سی تھی۔

میں زمین پر نہیں تھا، ایک درخت کی چوٹی پر تھا۔ درخت چیل یا سفیدے جیسا لمبوترا اور اونچا تھا۔ اس کے ٹہن نہیں، چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں تھیں۔ پتے بہت کم تھے۔ میں اس کی چوٹی پر بیٹھا تھا اور دو ٹہنیوں کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ درخت کانپ رہا تھا۔ میں نے نیچے دیکھا۔ ایک عورت زمین پر بیٹھی آہ و زاری کر رہی تھی۔ وہ کسی بہت بُری تکلیف میں مبتلا تھی۔

میری یہ حالت تھی کہ میں گرنے والا تھا۔ درخت ہل نہیں رہا تھا جیسے تیز جھکڑ میں درخت ہلا کرتے ہیں بلکہ درخت کانپ رہا تھا اور میں بہت ہی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال رہا تھا مگر سنبھلنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ میں درخت کی طرح خوف سے کانپ رہا تھا۔ ارد گرد ویرانہ تھا۔ سوائے ایک عورت کے جو نیچے آہ و زاری کر رہی تھی اور کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔

اس عورت نے مُنہ اُوپر اُٹھایا۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔

"امّی جان!" — میں نے چلّا کر اُسے پکارا۔

اُس نے دونوں ہاتھ زمین پر مارنے شروع کر دیئے۔

"امّی جان!" — میں نے اور زیادہ بلند آواز سے اُسے پُکارا۔

وہ اور زور سے زمین پہ ہاتھ مارنے لگی۔ زمین پر ہاتھ مارتے وہ سَر اِس طرح زمین تک لے جاتی تھی جیسے سجدے کر رہی ہو۔

میں اُترنا چاہتا ہوں، نہیں اُتر سکتا۔

مجھے تپش محسوس ہونے لگی جیسے زمین جل اُٹھی ہو اور درخت کو بھی آگ لگ گئی ہو۔ دُھواں سا اُٹھا جو میری آنکھوں کو لگا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ آنکھیں کھولیں تو درخت تھا نہ میری ماں تھی۔ میں زمین پر پڑا تھا اور دھوپ اتنی تیز تھی کہ آنکھیں نہیں کُھلتی تھیں۔ سورج سَر پر آگیا تھا۔ میں دو ٹیلوں کے درمیان لیٹا ہُوا تھا معلوم نہیں رات کس وقت میں چلتے چلتے گرا اور سو گیا تھا۔ رائفل میرے پاس زمین پر پڑی ہوئی تھی۔

میں نے سو تو بہت لیا تھا لیکن رات کے خواب کا خوف ایسا سوار ہُوا کہ جاگ کر بھی دل پہ طاری رہا۔ پھر ماں یاد آگئی۔ اُس کی آہ و زاری یاد آئی تو میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ماں کی روح میرے ساتھ ساتھ ہو اور وہ مجھے تکلیف میں دیکھ کر رو رہی ہو۔

میں بچہ بن گیا۔ بچہ تکلیف میں ہوتا ہے تو روتا ہے۔ میری ذات میں، میرے وجود میں ایک بچہ رونے لگا۔ مجھے اُس کے رونے کی آوازیں بڑی صاف سنائی دینے لگیں۔ یہ گمشدہ بچہ تھا۔ گھر کا راستہ بھول گیا تھا۔ بھٹکتا پھر رہا تھا۔ روتا اور بلبلاتا تھا۔

میں نے بچے کو پہچان لیا۔

اُس کے آنسو میری آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

ہچکیاں اُس کی تھیں اور سینہ میرا تھرکتا تھا۔

سکندر مر گیا تھا۔

انسان اتنا قوی ہے کہ چٹانوں کو توڑ سکتا ہے، اور انسان اتنا کمزور ہے کہ حالات کا ذرا سا جھٹکا اُسے توڑ پھوڑ دیتا ہے۔

میں توڑ پھوڑ کے لئے نکلا تھا مگر میں خود ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ میرے آنسو بہہ رہے تھے۔

میرے اردگرد درخت تھے۔ کچھ گھنے اور پھیلے ہوتے تھے۔ کچھ لمبوترے اور اوپر کو گئے ہوتے تھے۔ جھاڑیاں تھیں، سبزہ تھا کچھ دُور مٹی کی پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ دُور سے کسی کُتے کے بھونکنے کی آواز بھی نہیں آتی تھی جس سے میں سمجھتا کہ دُور یا نزدیک کوئی گاؤں ہے۔

بھٹکے ہوئے مسافر راتوں کو روشنیاں اور دن کو آبادیاں ڈھونڈتے ہیں کہ وہاں سے اپنی منزل کا پتہ ملے گا مگر میں وہ راہی تھا جو روشنیوں اور آبادیوں سے دُور بھاگتا تھا۔

میں ہاری ہوئی فوج کے ایک زخمی سپاہی کی طرح زمین پر اس طرح بیٹھا ہُوا تھا جیسے اُٹھ نہ سکوں گا۔ اچانک ایک دھماکہ سا ہُوا۔ جنگل کے تمام پرندے درختوں سے ایک ہی بار اُڑے۔ یہ دھماکہ ان کے اُڑنے کا تھا۔ یہ ہر قسم کے پرندے تھے۔ انہوں نے فضا میں اس قدر شور بپا کر دیا کہ میں زور سے بولتا تو مجھے اپنی آواز سنائی نہ دیتی۔ اس طرح پرندے اُس وقت اُڑا کرتے ہیں جب گولی فائر کی جاتی ہے مگر وہاں کسی نے بندوق یا رائفل نہیں چلائی تھی۔

میں نے اوپر دیکھا۔ پرندے بھگدڑ اور افراتفری کے عالم میں اُڑ رہے تھے۔ کچھ پرندے درختوں میں چھپتے اور پھر اُڑ جاتے تھے۔ مجھے ایک باز دکھائی دیا جو دُور اوپر ایک چکر میں اُڑ رہا تھا۔ وہ اپنی پسند کے پرندے کو دیکھ رہا تھا۔ پرندے اُس سے بچنے کے لئے اِدھر اُدھر اُڑتے پھرتے تھے۔

آخر باز غوطے میں آیا۔ میں نے اُس کے شکار کو دیکھا۔ وہ جنگلی کبوتر تھا۔ باز نے پنجوں سے اُس پر جھپٹا مارا۔ کبوتر کے بہت سے پَر اُڑے اور وہ فضا میں پھڑپھڑانے لگا۔ باز جھپٹا مار کر اُوپر چلا گیا تھا۔ کبوتر اُڑنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نیچے کو آ رہا تھا۔ باز ایک بار پھر غوطے میں آیا اور کبوتر کو پنجے مار کر اُوپر

سے گزر گیا۔ کبوتر کے بہت سے پَر ایک بار پھر اُس کے جسم سے الگ ہو کر اُڑے اور کبوتر پھڑپھڑاتا ہُوا تیزی سے نیچے آنے لگا اور آخر زمین پر آ رہا۔ وہ مجھ سے پچیس تیس قدم دُور گرا ہوگا۔ وہ میری طرف دوڑا مگر باز اوپر سے آیا اور اُس کی پیٹھ پر پنجے رکھ کر بیٹھ گیا۔ اب کبوتر اُس کا تھا۔

میں کبوتر کی بے بسی اور باز کی درندگی دیکھ رہا تھا۔ میں نے باز کی دلیری بھی دیکھی۔ اُس نے میری طرف دیکھا لیکن مجھ سے ڈرنے کی بجائے اُس نے اپنی ٹیڑھی چونچ سے کبوتر کا پیٹ چاک کرنا شروع کر دیا پھر کھانے لگا۔ وہ کھاتا بھی تھا اور میری طرف بھی دیکھتا تھا۔ میرے پاس رائفل تھی۔ میں اُسے بڑی آسانی سے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا لیکن گولی کا دھماکہ نشاندہی کر دیتا کہ یہاں کوئی آدمی ہے۔

باز نے کبوتر کو پنجوں میں اُٹھایا اور اُڑ گیا۔

یہ جنگل کا قانون تھا۔ خرگوش بھیڑیوں کا شکار ہو رہا تھا۔ کبوتر کو باز چیر پھاڑ رہا تھا۔ سمندر پار کی ایک قوم نے پورے ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔

مجھے انگریز ڈی ایس پی یاد آ گیا جسے میں نے قتل کیا تھا۔ ذرا یاد کریں کہ میں نے اُسے کیوں قتل کیا تھا۔ وہ جنگل کا قانون چلا رہا تھا۔

پولیس کا وہ افسر بھی انگریز تھا جس نے شہناز کو اپنے ساتھ رکھنے کا حکم دیا تھا۔ وہ بھی جنگل کا قانون چلا رہا تھا۔

نواب کے ہاں بھی جنگل کا قانون چل رہا تھا۔

مجھے اچانک ایک خیال آ گیا ـــــ کیا میں خرگوش ہوں جو بھیڑیوں سے بھاگتا اور چھپتا پھر رہا ہوں؟ ..... کیا میں کبوتر ہوں جسے کوئی باز فضا سے نوچ کر زمین پر پھینک دے گا اور پھر کھا جائے گا؟

نہیں ..... میں اتنا کمزور تو نہیں ..... میں بھیڑیا بنوں گا ..... میں باز بنوں گا۔

میرا جسم کانپا اور میں ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ جھک کر رائفل اٹھائی

اُس کی میگزین میں پانچ راؤنڈ تھے۔ قمیض اُٹھا کر دیکھا۔ چمڑے کی بیلٹ میری کمر سے بندھی ہوتی تھی جس میں رائفل کے تیس راؤنڈ تھے۔ میرے حوصلے تروتازہ ہو گئے۔ جسم میں جان آ گئی اور میں ایک سمت کو چل پڑا۔ بھوک کا احساس سا پیدا ہُوا لیکن میں نے دھیان نہ دیا اور چلتا گیا۔

یہ علاقہ تو بالکل ہی ویران اور بیابان تھا۔ کہیں زمین بہت ہی نیچے چلی جاتی تھی اور دُور تک مجھے اس نشیب سے گزرنا پڑتا تھا۔ ایسے بعض نشیبی علاقے خاصے چوڑے تھے جن کے دونوں طرف مٹی کی دیواریں سی کھڑی تھیں۔ میں ایسے ہی ایک نشیب میں سے اُوپر آیا تو زمین پتھریلی ہو گئی۔ مٹی کے ٹیلوں کی بجائے چٹانیں آ گئیں جو ریتلی اور بھربھری سی تھیں۔ درخت بہت کم ہو گئے اور گھاس کا تو نام و نشان بھی نہ تھا۔

آسمان پر ساون کے بادلوں کے ٹکڑے اُڑے جا رہے تھے۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ اس کی تپش مجھے پریشان کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد مجھے پیاس محسوس ہوتی۔ میں نے ایک چٹان پر چڑھ کر دیکھا۔ جہاں جہاں تک میری نظر جاتی تھی اسی طرح کی چٹانیں نظر آتی تھیں۔ ان میں بعض مخروطی تھیں جن کی چوٹیاں نوکیلی تھیں اور ان کے درمیان پتھروں کے ستون سے کھڑے نظر آتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ خطہ اس کرۂ ارض کا نہیں۔ ایسی جگہیں اکثر خوابوں میں نظر آیا کرتی ہیں جنہیں جاگ کر بیان نہیں کیا جا سکتا۔

سورج بالکل سر پر آ گیا تھا۔ جس چٹان پر میں کھڑا تھا وہ اس طرح تپنے لگی تھی جیسے میں تنور کے پاس کھڑا ہوں۔ چٹانیں جو دُور تھیں اُن سے شفاف سے شعلے نکلتے نظر آنے لگے تھے۔ میں چٹان سے اُتر رہا تھا کہ میرا پاؤں پھسل گیا۔ یہ سلوں کی چٹان تھی۔ میں لڑھکتا ہُوا نیچے آیا۔ جب اُٹھا تو دائیں ٹانگ سیدھی نہیں ہو رہی تھی۔ گھٹنے پر بڑی سخت چوٹ لگی تھی۔ میں نے ٹانگ سیدھی کی تو درد کی ٹیس اٹھی۔ میں اس خیال سے چل پڑا کہ ٹانگ گرم ہو گی تو سیدھی ہو جائے گی۔ سو ڈیڑھ سو قدم چل کر بھی ٹانگ سیدھی نہ ہوتی اور درد ناقابل برداشت ہو گیا۔

پیاس اور زیادہ بڑھ گئی۔ تیز چلنا مشکل ہوگیا۔ میں نے رائفل کو لاٹھی بنا لیا اور اس کے سہارے چلنے لگا۔ ہر قدم کے ساتھ پیاس تیز ہوتی جارہی تھی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھ کر خدا سے بارش مانگی لیکن میری دعائیں بے اثر ہو چکی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ ساون کا مہینہ گزر چکا ہے اور یہ بھادوں کے وسط کے دن ہیں جب بارش کم ہوجاتی ہے اور حبس بڑھ جاتا ہے۔ مجھے اب پانی کے دو گھونٹوں کی ضرورت تھی۔ کہیں گدلا اور گندا پانی مل جاتا تو میں وہ بھی پی لیتا۔

بعض جگہوں پر دو عمودی چٹانوں کے درمیان لمبی گلی سی بنی ہوتی تھی۔ میں جب ایسی گلی میں سے گزرتا تھا تو تپتی ہوئی چٹانیں میرے جسم کو جھلسا دیتی تھیں۔ ایسی ہی ایک گلی میں سے گزرتے مجھے حلق میں پہلا کانٹا چبھا۔ یہ پیاس کی شدّت کی علامت تھی۔ میرے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ اپنا پسینہ کسی طرح اکٹھا کر کے یہی پی لوں۔ میری دائیں ٹانگ بیکار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میں رائفل کے سہارے، ایک طرف ذرا جھک کر چلتا تھا۔ اس سے یہ ہُوا کہ مجھے کمر میں درد محسوس ہونے لگا۔ میری چلنے کی رفتار اور کم ہوگئی۔

تپتی ہوتی گلی میں سے باہر نکلا تو آگے سپاٹ میدان دیکھا۔ یہ میدان بھی پتھریلا تھا۔ چٹانیں بہت دُور ہٹ گئی تھیں۔ سارا علاقہ اس طرح خشک تھا جیسے ساون میں یہاں ایک بوند بھی نہ برسی ہو۔ وہاں پانی خواب میں ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ اس میدان کے آگے کیا تھا، نظر نہیں آتا تھا۔ شفّاف سے شعلے زمین سے اُٹھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے جو کچھ تھا چھُپا ہُوا تھا۔



میں نے ایک بار ایک ہندو یوگی کو دہکتے ہُوئے انگاروں پر ننگے پاؤں چلتے دیکھا تھا۔ وہ نو دس قدم انگاروں پر چلا تھا۔ اس کے بعد میں نے اور چند اور تماشائیوں نے اُس کے پاؤں دیکھے تھے۔ وہ بالکل ٹھیک تھے۔ میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ یہ کیا جادُو ہے۔

"کوئی جادو نہیں" ——— اُس نے جواب دیا ——— "میں بتاؤں گا تو تم مُورکھ بالک نہیں سمجھ سکو گے .... اگر یہ جادو ہے تو یہ تمہارے ہاتھ میں بھی ہے۔"

"کچھ بتائیں تو سہی مہاراج!" ——— میں نے اُس سے کہا تھا ——— "میں سمجھ جاؤں گا۔"

"سمجھ تو جاؤ گے" ——— اُس نے کہا تھا ——— "پر کر نہیں پاؤ گے۔ تیرا من پاپی ہے۔ پاپوں کی گٹھڑی سر پر اُٹھا کر تُو پھولوں اور کلیوں پر چلے گا تو بھی تیرے پاؤں جل جائیں گے۔ من کو پوتر رکھ اور آگ میں کُود جا۔ اس پاپی سنسار کی اگنی تیرے سر پر کو ٹھنڈی لگے گی۔ پگ پگ چلتا جا۔ تُو کہے گا کہ یہ اگنی نہیں جل ہے پر شرط ایک ہی ہے، تیرا من پاپی نہ ہو۔"

اُس یوگی کی باتیں یاد آئیں۔ پھر میں نے اپنے ماضی پر نظر ڈالی۔ من کو پاپی تو کبھی نہیں ہونے دیا تھا۔ مجھ پر بڑی ہی حسین تلواروں کے وار ہوئے تھے۔ سب کے سب اپنے اخلاق کی ڈھال پر روک لیتے تھے۔ پھر مجھے بچپن کی وہ پگلی یاد آئی جس نے مجھے میری ماں کی گود میں دیکھ کر کہا تھا کہ یہ بچّہ دلوں کو تڑپائے گا اور دلوں پر حکومت کرے گا، لیکن اسے آگ میں سے گزرنا پڑے گا۔ آگ سے گزر کر یہ دلوں کا بادشاہ ہو گا۔

آج میں آگ کے سمندر کے ساحل پر کھڑا تھا اور مجھے اس سمندر میں اُترنا تھا۔ میں تو پہلے ہی جل رہا تھا۔

میرا مستقبل زمین سے اُٹھتے ہُوئے پانی کے رنگ کے شفّاف شعلوں کے پیچھے چھپا ہُوا تھا۔ میں جان نہیں سکتا تھا کہ جو میری نظروں سے اوجھل ہے اور جس کی طرف میں بڑھتا جا رہا ہوں وہ تختۂ دار ہے یا سبزہ زار ہے۔ اُس وقت ضرورت ایک ہی تھی کہ مرنے سے پہلے دو گھونٹ پانی مل جائے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔

"خدائے ذوالجلال!" ——— میں نے بلند آواز سے کہا ——— "میں پاپی ہوں تو مجھے زندہ جلا دے۔ اگر تیری رحمت کا ایک ذرّہ میرے حصّے میں لکھا ہے تو وہ مجھے عطا کر دے۔ یہ تیرا بندۂ ناچیز نہ گناہ کر کے بھاگ رہا ہے نہ گناہوں کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔"

میں آگ کے سمندر میں اُتر گیا۔ چلا نہیں جاتا تھا۔ آسمان سے آگ برستی

محسوس ہو رہی تھی۔ زمین سے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ سامنے سے غیر مرئی شعلے مجھے جلانے کو لپک رہے تھے۔ رائفل بہت گرم ہو گئی تھی اور میں مجروح ٹانگ کو گھسیٹتا جا رہا تھا۔

میں نے خدائے ذوالجلال کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ میں اُس کی ذاتِ باری کو اپنے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا کہ خدا میرے ساتھ تھا بھی یا نہیں۔ میں نے اپنے احساس کو مرنے نہ دیا۔

خدا ایک احساس ہی تو ہے۔ محسوس کرو تو ساتھ ہے۔ شک میں پڑ جاؤ تو خدا کی ذات بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ میں نہیں جانتا دین کا عالم کیا کہتا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ خدا ہے اور ہر جگہ ہے۔ پاگل سا ایک آدمی یاد آتا ہے میں ایک ڈیوٹی پر جا رہا تھا تو وہ بلا ٹکٹ گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔ پھر اُس نے اللہ ہُو کا وِرد شروع کر دیا تھا۔

"او پگلے!" — میں نے اُسے پاگل سمجھ کر مذاق کے رنگ میں پوچھا — "اللہ کو کبھی دیکھا بھی ہے؟ .... کہاں ہے اللہ؟"

اُس نے اپنی سُرخی مائل پیلی آنکھیں جن میں چرس کا خمار تھا، میری نوجوان آنکھوں میں ڈال کر مجھے دیکھا اور کچھ دیر دیکھتا ہی رہا۔

"کیا کہا تھا تُو نے؟" — اُس نے سرگوشی میں پوچھا۔ اس سرگوشی میں متانت اور سنجیدگی تھی۔

"میں نے پوچھا تھا اللہ کہاں ہے؟"

"گناہگار سمجھتا ہے اللہ بڑی دُور ہے" — اُس نے کہا — "وہ ابھی نہیں پکڑے گا۔ پرہیزگار کہتا ہے، اللہ بہت قریب ہے، جزا بھی دیتا ہے سزا بھی دیتا ہے۔ اگر تُو اللہ کو دیکھنا چاہتا ہے تو اپنے دل کے پٹ کھول کر دیکھ۔ تجھے اللہ نظر آئے گا۔ وہ دُور بھی نہیں، قریب بھی نہیں۔ وہ تیری ذات میں ہے" — اُس نے مُنہ اُوپر کو اُٹھایا اور اُس کے مُنہ سے ایک دھماکہ نکلا — "حق اللہ ہُو"۔

یہ تو پُرانی بات تھی، میں جس حقیقت میں جا رہا تھا وہ جل رہی تھی اور جلا رہی تھی۔ میں جُوں جُوں چلتا گیا، میرا مُنہ کھُلتا گیا۔ یہ پیاس کی شدّت کا اثر تھا۔ باہر کی تپش میرے کھُلے ہُوئے مُنہ میں جانے لگی۔ میں مُنہ بند کرتا تھا تو حلق میں کانٹے اُترنے لگتے تھے۔ ایسی چُبھن کہ برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میں نے صحراؤں میں بھٹکے ہوئے مسافروں کی موت اور موت سے کچھ پہلے کے حالات اور واقعات پڑھے اور سُنے تھے۔ اُس روز میں خود ایسے ہی حالات کا شکار ہو رہا تھا۔ کچھ اور آگے جا کر میں نے محسوس کر لیا کہ میرا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ مجھے کوئی افسوس نہ ہُوا۔ میرے مرنے سے اس دنیا میں کوئی کمی نہیں آ جانی تھی۔ کسی عورت نے بیوہ نہیں ہو جانا تھا۔ کوئی ایسا بچّہ نہیں تھا جس نے میرے مرنے کے بعد یتیم ہو جانا تھا۔ مجھ سے جنہوں نے پیار کیا تھا وہ پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

پانی .... پانی .... پانی۔

پیاس میری کوئی خود فریبی کامیاب نہیں ہونے دے رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مرنے سے پہلے مجھے کیسی اذیت ملے گی۔ میں نے اپنے آپ کو ایک اور فریب دینے کی کوشش کی۔ میں نے عہد کیا کہ پانی مل بھی گیا تو نہیں پیوں گا۔ میں جلدی مر جانا چاہتا تھا۔

پانی .... پانی .... پانی۔

میرے وجود میں کوئی سِسک سِسک کر پانی مانگ رہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا وہ مجھ سے پانی مانگتا تھا اور میرا دل کہتا تھا کہ میں اس شخص کو پیاسا نہیں مرنے دوں گا۔

"تھوڑا صبر کرو" — میں نے اُسے کہا — "میں تمہیں پانی تک پہنچا دوں گا"۔

میں اس پیاسے کو تسلیاں دیتا چلا گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کتنی دُور تک پہنچ گیا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ میں ایک بار تو گرتے گرتے بچا تھا۔ میری ایک ٹانگ کا گھٹنا زمین کے ساتھ جا لگا تھا اور مجھے ایسے لگا تھا جیسے میرا گھٹنا سخت گرم

تو سے پرجا پڑا ہو۔ میں فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہُوا تھا پھرا یسے ہُوا کہ میں مُنہ کے بل گرا۔ اُس وقت تک میرے ہوش وحواس قائم تھے۔ زمین پر ہاتھ رکھ کر اُٹھنے لگا تو ہاتھ کے نیچے ایک پتھر آگیا۔ میں نے اتنی تیزی سے ہاتھ اُٹھایا جیسے دہکتا ہُوا انگارہ میں نے ہاتھ میں پکڑ لیا ہو۔ دونوں ہاتھوں سے رائفل کو پکڑا اور اس کے سہارے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ جب چلنے لگا تو میرا سر ڈول گیا۔ جسم میں ابھی جان باقی تھی۔ میں نے قدم گھسیٹنے شروع کر دیئے۔

یاد نہیں میں کتنے قدم اور چلا تھا کہ آسمان ایک چکر کھا کر نیچے آگیا اور آسمان پھر اُوپر چلا گیا۔ اب میں پیٹھ کے بل جلتے ہوئے پتھروں پر پڑا تھا۔ سورج آگے نکل گیا تھا، لیکن اُس کی تپش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں اُٹھنے لگا تو اُٹھا نہ گیا۔ پہلے ایک پہلو کے بل ہُوا پھر پیٹ کے بل پھر ٹانگیں سمیٹیں اور رائفل کا سہارا لے کر میں اُٹھا تو پھر گرنے لگا، لیکن سنبھل گیا۔ میں پھر چل پڑا۔

"جلدی، خداوند تعالیٰ!" ــــ میں نے آسمان کی طرف مُنہ کر کے کہا ــــ "میرے جسم میں جو تیری امانت ہے اسے جلدی نکال لے اور اس جسم کو جلنے دے۔"

میں نے بلند آواز سے کہنا چاہا تھا، لیکن بڑی مشکل سے مُنہ سے سرگوشی سی نکلی تھی جو میں خود بھی بڑی مشکل سے سُن سکا تھا۔

میں پھر چل پڑا۔

معلوم نہیں کتنے قدم چلا ہوں گا کہ مجھے اپنی نظروں پر دھوکے کا گمان ہُوا۔ سامنے چالیس یا پچاس گز دُور درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی چھوٹی سی ایک جھیل بھی دکھائی دی۔ خداوند تعالیٰ نے میری فریاد سُن لی تھی۔ میں دائیں ٹانگ میں درد کی شدت کے باوجود تیز چل پڑا۔ میں نے ایسا کوئی خوف محسوس نہ کیا کہ وہاں ایک یا ایک سے زیادہ آدمی بھی ہوں گے اور وہ مجھے پہچان لیں گے۔ میں پانی کی خاطر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہا تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ کسی نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو میں اُسے گولی مار دوں گا۔

میں اور تیز چل پڑا، لیکن درخت اور پانی اتنے ہی دُور رہے جتنی دُور اُس وقت تھے جب یہ مجھے نظر آتے تھے۔ میں چلتا گیا۔



میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آیا اور گزر گیا۔ یوں لگا جیسے کالی گھٹا کا ایک ٹکڑا سورج کے آگے سے گُزر گیا ہو۔ جب یہ گُزر گیا تو میں ایک سبزہ زار میں کھڑا تھا۔ وہاں درختوں کا وہی جھنڈ تھا۔ پانی تھوڑی ہی دُور تھا۔ اُس تک جلدی پہنچنے کے لئے میں تیز چلا تو اوندھے مُنہ گر پڑا۔ غشی سی آگئی۔

آنکھ کھُلی تو میرا سر کسی نرم چیز پر تھا اور کسی کے ہاتھ میرے ماتھے کو سہلا رہے تھے۔ میں نے اُوپر دیکھا۔ وہ ایک جوان عورت تھی جو شہزادی جیسی خوبصورت تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میں نے اُس کی آغوش سے اپنا سر اُٹھایا اور اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کون ہو تم؟" ــــ میں نے پوچھا۔

وہ ہنس پڑی اور اُس نے بازو لمبے کر کے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اوہ!" ــــ میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا ــــ "مینا! تم مینا ہو... کہاں چلی گئی تھیں۔ میرا گھر اُجڑ گیا۔ میں پردیسی ہو گیا۔ کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائیں اور تم نے کبھی آ کے پوچھا بھی نہیں۔"

"میں جانتی تھی تم ایک روز میرے پاس ہی آؤ گے" ــــ مینا نے کہا ــــ "تم آہی گئے۔ اب نہیں جانے دوں گی۔"

"مجھے پیاس لگی تھی" ــــ میں نے کہا۔

"اب تو نہیں لگی؟" ــــ اُس نے اپنی جانفزا مسکراہٹ سے کہا ــــ "میں نے تمہیں بہت سا پانی پلا دیا ہے۔ تم بے ہوشی میں پڑے تھے۔"

میں نے جھیل کی طرف دیکھا جس کا پانی شفاف تھا۔ میں نے مینا سے کہا کہ میں جھیل میں نہاؤں گا۔ ڈبکیاں لگاؤں گا۔ تیروں گا۔

"اُٹھو" ــــ مینا نے کہا ــــ "جھیل میں اُتر جاؤ۔"

میں اُٹھا، مینا کا بازو اپنے ہاتھ میں لیا اور اُسے اپنے ساتھ لے کر دوڑ پڑا۔ میں نے بڑی تیزی سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ مینا کا بازو پکڑے رکھا کہ اسے بھی اُٹھاؤں گا لیکن میرے ہاتھ میں مینا کا بازو نہیں بلکہ اپنی رائفل تھی اور میں تپتی ہوئی پتھریلی زمین پر پڑا تھا۔ وہاں کوئی درخت نہیں تھا۔ سبزہ بھی نہیں تھا اور مینا بھی نہیں تھی۔

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنی داستان کی ابتدا میں ایک بڑی حسین وجمیل لڑکی مینا کا ذکر بار بار کیا تھا۔ اسے میں حقیقت سمجھتا رہا تھا۔ وہ لڑکپن کا زمانہ تھا۔ پھر حالات نے مجھے خواجہ صاحب تک پہنچایا تو میں نے اُنہیں بتایا کہ مینا نام کی ایک بڑی ہی حسین لڑکی مجھے اپنے ساتھ اپنی پُراسرار دنیا میں لے جایا کرتی ہے۔ خواجہ صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ یہ لڑکی ایک تصور کے سوا کچھ بھی نہیں اور جب تم زندگی کی حقیقتوں میں داخل ہوتے تو مینا تمہارا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ خواجہ صاحب نے بڑی اچھی وضاحت کی تھی جو میں سمجھ گیا تھا اور میرے ذہن سے یہ تصور نکل گیا تھا۔

اب جب میری جسمانی اور نفسیاتی توانائی تقریباً ختم ہو چکی تھی تو میرے تحت الشعور سے مینا پھر سامنے آگئی مگر حقیقت نے مجھے بیداری کے اس خواب سے جگا دیا۔ وہ درخت، وہ سبزہ اور وہ جھیل ایک سراب تھا جو پیاسے صحرا نوردوں کو اپنے پیچھے دوڑاتا رہتا ہے اور آخر جان لے لیتا ہے۔



اب میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو میں نہ اُٹھ سکا، لیکن مجھے اس جہنم سے نکلنا تھا۔ میں نے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلنا شروع کر دیا۔ ہاتھ بھی جل رہے تھے اور گھٹنے بھی۔ جس گھٹنے کو چوٹ لگی تھی وہ اتنا پریشان کرنے لگا کہ میں اس طرح آگے کو بڑھ نہ سکا۔ میں نے رائفل کا سہارا لیا اور جسم میں جو ذرا سی طاقت رہ گئی تھی وہ استعمال کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ چلنے لگا تو چلا نہ گیا۔

پھر ایسے ہوا کہ تپش ذرا کم ہونے لگی اور مجھ پر ایک سایہ سا آگیا۔ اب

تو نظر بھی دُور تک کام نہیں کرتی تھی اور جہاں تک کام کرتی تھی وہاں تک مجھے یہ سایہ نظر آیا۔ دائیں طرف دیکھا تو سورج سلیٹی رنگ کے گہرے بادل کے پیچھے چلا گیا تھا اور یہ بادل اُوپر سے لے کر اُفق تک پھیلا ہوا تھا۔ تپش تو کم ہوگئی لیکن پیاس کا یہ عالم جیسے میرے رگ و ریشے میں بڑا ہی تیز زہر دوڑتا جا رہا ہو۔ یہ تلخی برداشت نہیں ہوتی تھی۔

میں ایک جگہ رُکا کھڑا تھا۔ تھوڑا سا بائیں طرف دیکھا تو چھوٹے چھوٹے چند ایک درخت دکھائی دیئے۔ زمین سے جو پانی کے رنگ کے شعلے اُٹھتے رہے تھے وہ اب نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے اُن درختوں کو بھی سراب سمجھا، لیکن پیاس نے ایسی حالت کر دی تھی کہ میں نے ان درختوں کو حقیقت سمجھا اور اپنے آپ کو اُس طرف گھسیٹنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے پاؤں کے نیچے جو زمین ہے وہ پتھریلی نہیں رہی۔ اس میں کچھ نرمی سی آگئی تھی۔

زمین نرم تھی یا سخت، مجھے اس کی نہیں بلکہ پانی کی ضرورت تھی

میں نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر کہہ نہ سکا۔ پیاس کی ماری ہوئی ایک آہ تھی جو نکل گئی۔

میں چلنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں گرا بھی، اُٹھا بھی اور اس طرح گرتے اُٹھتے میں ایک ایک انچ آگے بڑھتا گیا۔ معلوم نہیں یہ کیسا خطہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں واحد آدمی تھا جو اس خطے میں سے گزرا تھا۔ وہاں مجھے کوئی جانور بھی نظر نہ آیا۔ سر کے اوپر سے کوئی پرندہ بھی اُڑتا نہ گزرا۔ یہ شاید کسی ناکردہ گناہ کی سزا تھی کہ خدا نے مجھے اس راستے پر ڈال دیا تھا۔

اس سے آگے مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ کچھ یاد ہے تو وہ خواب کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کی طرح یاد ہے۔ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو یادوں پر دُھند سی چھا جاتی ہے پھر کچھ یاد نہیں آتا۔ معلوم نہیں میں کتنا چلا، کتنی بار گرا، شاید رینگا بھی تھا۔ یادیں وہاں سے ذرا صاف ہوتی ہیں کہ میں ٹھنڈی سی ایک جگہ پر پڑا تھا۔ میرے نیچے بڑی نرم زمین تھی۔ شاید میں بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا یا نیند نے مجھے گرا دیا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا میں ہوش و حواس میں آیا تو گھاس

پر پڑا تھا۔ میں تقریباً بیٹھا ہُوا تھا۔ میری پیٹھ کے پیچھے زمین اُبھری ہوئی تھی اور میں نے ٹانگیں آگے کو لمبی کی ہوئی تھیں۔

میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو مجروح ٹانگ اور کمر سے درد کی ٹیسیں اُٹھیں۔ میں جسم کے اندر بالکل خشک ہو چکا تھا۔ مُنہ کُھلا ہُوا تھا۔ حلق میں انگارے جل رہے تھے۔ زبان لکڑی کی طرح اکڑ گئی تھی۔ میں اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اُٹھا نہیں جاتا تھا۔ اگر تپش پہلے جیسی ہوتی اور میرا جسم پہلے کی طرح جل بھُن رہا ہوتا تو میں اُٹھنے کی کوشش نہ کرتا، مرنے کے لئے لیٹا ہی رہتا۔ مجھے آخر مرنا تھا، لیکن فضا میں تپش ختم ہو چکی تھی اور میں جس زمین پر پڑا تھا وہ ٹھنڈی تھی اور مجھ میں زندگی کے آثار ابھی باقی تھے۔ میرے دل میں جینے کی اُمنگ بیدار ہو گئی۔

میں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ میں پوری طرح لیٹا ہُوا ابھی نہیں تھا۔ میری پیٹھ ذرا اونچی جگہ کے ساتھ لگی ہوئی تھی پھر بھی اُٹھنے میں بہت دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ میں ایک پہلو کے بل ہُوا۔ ایک ہاتھ سے رائفل کا سہارا لیا اور جسم کا وزن بازوؤں کے ذریعے رائفل پر ڈال کر اُٹھا۔ میں اُٹھ تو کھڑا ہُوا لیکن میں رائفل پر جُھکا ہُوا تھا۔ جسم سیدھا کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ میں نے زور لگا کر جسم کو سیدھا کرنے کی کوشش کی تو میں آگے کو پیٹ کے بل گر پڑا۔ میں نے ابھی یہ نہیں دیکھا تھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے اردگرد کیا ہے۔

میں آگے کو پیٹ کے بل گرا۔ پیٹ کے نیچے زمین اُبھری ہوئی تھی جس طرح کی مینڈھ ہوتی ہے۔ میری پوزیشن یہ بن گئی تھی کہ اوپر کا دھڑ ایک طرف کو اور ٹانگیں دوسری طرف کو نیچے ہو گئی تھیں۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن اُٹھا نہ گیا۔ ہاتھ آگے کر کے زمین پر لگاتے تاکہ اُوپر اُٹھ سکوں۔ مجھے ایک عجیب سا دھوکہ ہُوا۔ میرے ہاتھ پانی میں چلے گئے تھے۔ میرا مُنہ اُسی طرف تھا۔ میں نے سر اُٹھا کر اُدھر دیکھا تو اپنی آنکھوں پر مجھے یقین نہ آیا۔ میرے سامنے بڑا صاف پانی جمع تھا جو

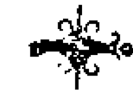
چار پانچ گز چوڑائی اور اتنی ہی لمبائی میں پھیلا ہُوا تھا۔ پانی کو دیکھ کر ہی میرے جسم میں طاقت عود کر آئی۔ میں نے اُٹھنے کی بجائے جسم کو آگے کی طرف دھکیلا اور میں سرکتا ہُوا پانی پر اس طرح جا پڑا کہ میرا مُنہ اور سر پانی میں چلے گئے۔ باقی دھڑ خشک جگہ پر رہا۔ میں نے پانی پینا شروع کر دیا، لیکن دو تین گھونٹ پی کر میں نے مُنہ پیچھے کر لیا۔ ٹریننگ میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ لمبے وقت کی پیاس کے بعد پانی ایک ایک گھونٹ آہستہ آہستہ پینا چاہیئے۔ اگر میں تیزی سے پانی پی پی کر پیٹ کو بھر لیتا تو پیٹ سے ایسا درد اُٹھتا جس سے موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ میں نے نہایت آہستہ آہستہ پانی پیا۔ پھر دیکھا کہ میرے اردگرد کیا ہے۔

میرے سامنے مٹی کی ٹیکری تھی جس پر کچھ درخت تھے اور سبز جھاڑیاں بھی تھیں۔ یہ جھاڑیاں کچھ دُور تک چلی گئی تھی۔ وہاں سبزہ خاصا زیادہ تھا۔ میں نے جو پانی پیا تھا یہ چشمے کا پانی تھا جو شاید چشمے کی تہہ میں سے پھُوٹتا ہو گا۔ ٹیکری کے ساتھ ساتھ چشمے کا پانی ایک نالی کی صورت میں آگے جاتا تھا۔ میرے دائیں اور بائیں بھی درخت تھے اور ہری بھری گھاس بھی تھی۔

پانی پیا تو میں پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ میں چونکہ پولیس میں رہا تھا اس لئے زمین کو سراغرسانوں کی نظروں سے دیکھا۔ میری ٹانگیں تھکی ہوئی تو تھیں ہی لیکن دایاں گھٹنا اچھی طرح چلنے نہیں دے رہا تھا۔ میں رائفل کے سہارے چشمے کے اردگرد زمین کو بڑے غور سے دیکھتا ہُوا گھوما۔ کسی انسان کے قدموں کے نشان نظر نہ آتے۔ قدموں کے جو نشان تھے وہ کُتے کے پنجوں جیسے تھے۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ یہ گیدڑوں اور بھیڑیوں کے ہو سکتے تھے۔ میں ان میں بڑے پنجوں کے نشان ڈھونڈنے لگا، لیکن مجھے کوئی بڑا نشان نظر نہ آیا۔ میں شیروں کے پگ ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ ان علاقوں میں دھاری دار شیر جنہیں ٹائیگر کہتے ہیں ضرور ہوں گے۔ ان میں مجھے ایسے کھُر بھی ملے جو بکریوں جیسے تھے، لیکن یہ ہرنوں کے ہو سکتے تھے۔ بہرحال میں نے یہ دیکھ لیا کہ یہاں میرے سوا کوئی انسان کبھی نہیں آیا۔

میں چشمے کی نالی کے ساتھ ساتھ کچھ دُور تک چلا گیا۔ زمین نرم تھی اور اس میں نمی بھی تھی۔ وہاں پاؤں کے نشان بڑے صاف آ سکتے تھے جیسے میں نے جانوروں کے دیکھے تھے۔ ان میں بھی مجھے انسانوں کے کھُرے نظر نہ آتے۔

میں آہستہ آہستہ ہاتھ اور پاؤں جماتا اور کچھ رائفل کا سہارا لیتا ٹیکری کے اُوپر چلا گیا۔ سب سے پہلی چیز یہ دیکھی کہ سورج اُفق تک پہنچ گیا تھا۔ اُس کی زرد روشنی میں مجھے جو خطہ نظر آیا وہ خوابوں جیسا تھا۔ دُور دُور تک ہر طرح کے درخت تھے۔ خودرو پودے بھی تھے۔ اونچی گھاس بھی تھی اور ایک طرف ہرے سرکنڈے بھی تھے۔ تھوڑی دُور ایک طرف مجھے درختوں کی صرف چوٹیاں نظر آئیں۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ وہاں زمین نیچے چلی گئی ہے یعنی درخت نشیبی علاقے میں ہیں۔ جہاں تک میری نظر کام کرتی تھی، کوئی آبادی نظر نہیں آتی تھی۔ اس سے آگے پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں جو میرے اندازے کے مطابق کم و بیش دس میل دُور تھیں۔



میں ٹیکری سے اُترنے لگا تو محسوس کیا کہ میں بہت بھوکا ہوں۔ بڑی مشکل سے میں ٹیکری سے اُترا۔ جُوں جُوں میری جسمانی حالت نارمل ہوتی جا رہی تھی اور دماغ سوچنے کے قابل ہوتا جا رہا تھا، بھوک تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میرے پاس رائفل تھی۔ میں کسی جانور یا پرندے کو مار سکتا تھا لیکن میں کچا گوشت نہیں کھا سکتا تھا۔ میرے پاس ماچس نہیں تھی کہ میں آگ جلا کر پرندے یا جانور کو بھُون سکتا۔ میں نے درختوں کو دیکھا۔ ان میں کوئی ایک بھی درخت پھلدار نہیں تھا۔ پیٹ بھرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا تھا خواہ میں گھاس ہی کھا لیتا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ مجھے اندھیرا پھیل جانے سے پہلے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ میں ایک طرف چلا گیا۔ وہاں تین چار چھوٹے چھوٹے درخت نظر آتے۔ یہ چھوٹی بیریوں کے درخت تھے جن کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بیر لگے ہُوئے تھے اور بہت سے بیر زمین پر پڑے تھے۔ میں نے بڑی تیزی سے انہیں چُن چُن کر مُنہ میں ڈالنا شروع کر دیا۔ میں نے ویسے ہی ایک بیر کو ہاتھوں میں

کھول کر دیکھا تو اس میں مجھے چھوٹا سا ایک کیڑا نظر آیا۔ مجھے یاد آیا کہ لڑکپن میں ہم اپنے شہر سے ذرا ہی باہر جاتے تھے تو اسی قسم کے درختوں سے جھاڑی بیر توڑ کر کھایا کرتے تھے۔ برسات کے موسم میں ان میں کیڑے پڑ جاتے تھے اور ماں باپ ہمیں ان بیروں کے قریب جانے سے بڑی سختی سے روکا کرتے تھے۔

میں نے ایک بیر میں کیڑا دیکھا تو اسے پھینک کر اپنے آپ سے یہ کہا کہ صرف اسی بیر میں کیڑا تھا باقی سب ٹھیک ہیں۔ میں بغیر دیکھے بیر کھاتا گیا۔

اُس وقت میں خود ایک کیڑا تھا جو اللہ کی زمین پر رزق تلاش کرتا اور اپنی جان بچاتا پھر رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنے میل چلا تھا۔ اپنے جسم کی حالت دیکھتا تھا تو لگتا تھا جیسے سینکڑوں میل مسافت طے کر آیا ہوں۔

جھاڑی بیر کھاتے کھاتے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میں وہیں لڑھک گیا۔ معلوم نہیں رات آدھی گزر گئی تھی یا کتنی گزر رہی تھی، میری آنکھ کھُل گئی۔ کسی نے میرے مُنہ پر ہاتھ پھیرا تھا یا نہ جانے کیا کیا تھا، میں نے کچھ نہ کچھ محسوس ضرور کیا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے دائیں بائیں دیکھا۔ تین بھیڑیے میرے قریب کھڑے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ان میں سے ایک نے میرے مُنہ کے ساتھ مُنہ لگا کر مجھے سونگھا تھا۔ بھیڑیا، گیدڑ، کُتّا اور گدھ زندہ آدمی کو خواہ وہ زخموں سے چُور اور بے ہوش کیوں نہ پڑا ہُوا ہو، نہیں کھاتے۔ اگر انسان مرا ہُوا ہو تو یہ سب اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ گدھوں اور بھیڑیوں میں ایک حس یہ بھی ہوتی ہے کہ جنگل یا ویرانے میں کہیں کوئی زخمی انسان گرتا پڑتا جا رہا ہو تو یہ ذرا دُور دُور رہ کر اُس کے ساتھ ساتھ چلتے جاتے ہیں۔ جونہی اُس کی سانسوں کا تسلسل ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے، یہ گوشت خور جانور آ جاتے ہیں اور اُسے کھانا شروع کر دیتے ہیں۔

بھیڑیوں نے مجھے سونگھ کر دیکھ لیا تھا کہ یہ آدمی تو زندہ ہے۔ میں انہیں دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ زمین سے پتھر اُٹھاتے اور اُنہیں مارے۔ وہ پیچھے تو ہٹے لیکن بڑے غصّے سے غرّانے لگے۔ پھر وہ اس طرح میرے

اردگرد آہستہ آہستہ چلنے لگے جیسے مجھ پر حملہ کرنا چاہتے ہوں۔ میں نے رائفل سیدھی کر لی اور سوچا کہ اب تو گولی چلانی ہی پڑے گی۔

دو بھیڑیئے میرے قریب آنے لگے۔ میں نے ایک دو قدم آگے ہو کر رائفل کو مزل سے پکڑا اور اسے لاٹھی کی طرح گھمایا۔ ایک بھیڑیا فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن دوسرا رائفل کے بٹ کی زد میں آگیا۔ اُسے بٹ لگا تو اُس کے مُنہ سے بڑی زور سے آواز نکلی اور وہ بھاگ گیا۔ میں دوڑ نہیں سکتا تھا تھوڑا سا آگے جاکر میں نے اسی طرح رائفل دوسرے بھیڑیوں کی طرف گھمائی تو وہ بھی بھاگ گئے۔ میں آسمان تلے زمین پر پڑا تھا۔ میں پھر وہیں لیٹ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے شیر کے پگ تو نہیں دیکھے لیکن ہو سکتا ہے کہ کوئی شیر ادھر آ ہی نکلے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ جاگتا رہوں، لیکن میں پھر لڑھک گیا اور میری آنکھ لگ گئی۔



موسلا دھار بارش نے مجھے جگا دیا۔ گھٹا سیاہ تھی اور بارش بہت تیز۔ وقت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنا پتہ چلتا تھا کہ رات گزر گئی ہے اور دن چڑھ آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تیز ہوا چلنے لگی۔ میرا جسم بہت کمزور ہو گیا تھا اس لئے مجھے سردی لگنے لگی۔ کل سارا دن میرا جسم جلتا رہا تھا اور آج سردی سے ٹھٹھرنے لگ گیا تھا۔ میں ایک درخت کے نیچے چلا گیا اور تنے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ بھوک نے پھر پریشان کرنا شروع کر دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد بارش تھمی۔ میں نے وہیں بیٹھے نہیں رہنا تھا۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ کہاں جاؤں۔ میں اُس طرف چل پڑا جدھر مجھے درختوں کی چوٹیاں نظر آتی تھیں۔ وہ نشیبی علاقہ تھا۔ اب تو ہر طرف پانی اور کیچڑ تھا۔ میں چلتا گیا۔ بادل پھٹ گئے تھے۔ کبھی بادلوں کا سایہ آجاتا، کبھی دھوپ نکل آتی۔

چلتے چلتے میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے نشیب شروع ہوتا تھا۔ نشیب گہرا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں کسی بڑے اُونچے مکان کی منڈیر پر کھڑا ہوں۔ یہ نشیب بہت وسیع تھا اور یہ مربع شکل کا تھا۔ اس کے اندر درخت بہت تھے۔

اس میں جگہ جگہ پانی رُکا ہوا تھا اور صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کے درمیان سے راستہ گزرتا ہے۔ میں نے دونوں طرف دیکھا۔ دونوں طرف گھاٹیاں نشیب میں اُترتی تھیں۔

میں نے دماغ پر بہت زور دیا، لیکن میں اس فیصلے پر نہ پہنچ سکا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیئے۔ نشیب کے اُوپر جدھر میں کھڑا تھا، ایک کھڈ تھا۔ اس کھڈ کے اندر بھی اور اوپر بھی درخت تھے اور وہاں جو گھاس تھی وہ بھی ذرا اونچی تھی۔ میں اُس کھڈ تک پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے اندر بھی گھاس تھی۔ میں اس میں اُتر گیا۔ اس کی شکل ایسی تھی کہ یہ کھڈ نشیب کی طرف سے کھُلا تھا۔ کھڈ میں بیٹھ کر نشیب کو دیکھا جا سکتا تھا۔ میں کھڈ میں اُترا تو میرے ٹخنے پانی میں ڈوب گئے۔ یہ پانی گھاس کے نیچے چھُپا ہوا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اُوپر سے پانی کھڈ میں آتا تھا اور کھڈ میں سے نشیب میں چلا جاتا تھا۔

میں فوراً باہر نکل آیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے کسی کی باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر ایک عورت کی ہنسی سنائی دی۔ میں پھر کھڈ میں اُتر گیا اور جو لمبی گھاس نشیب کی طرف تھی اسے ہاتھ سے ایک طرف کر کے دیکھنے لگا۔ باتوں اور ہنسی کی آوازیں قریب آرہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی گھوڑے کے ٹاپ بھی سنائی دینے لگے۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

گھوڑے کے ٹاپ خاموش ہو گئے اور باتیں سنائی دیتی رہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ جس کسی کی بھی آوازیں ہیں، وہ رُک گئے ہیں۔ میں کھڈ میں سے نکلا اور جھک کر نشیب کے کنارے تک پہنچا۔ وہاں دو درختوں اور کچھ جھاڑیوں کی اوٹ تھی۔ میں نے اس اوٹ میں بیٹھ کر دیکھا۔ ایک گھوڑی تھی جو رُکی کھڑی تھی۔ ایک جوان آدمی تھا جو لگتا دیہاتی تھا، لیکن اُس کے کپڑے اتنے اچھے تھے کہ وہ خوشحال دیہاتی تھا۔ اُس کے ساتھ ایک جوان عورت تھی جس نے ایک بچہ اُٹھا رکھا تھا۔ بچہ پانچ چھ مہینوں کا لگتا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ میاں بیوی ہیں۔ عورت بار بار بچے کا مُنہ چومتی تھی۔ بچے کا باپ ایک درخت کے نیچے چادر بچھا رہا تھا۔ چادر بچھ چکی تو عورت بیٹھ گئی اور بچے کو دودھ پلانے لگی۔ درخت کے

نیچے جگہ خشک تھی۔ کچھ دیر رُکنے کے لئے یہ جگہ موزوں تھی۔

آدمی نے گھوڑے کی زین سے ایک تھیلا کھولا۔ اس میں سے اُس نے ایک برتن نکالا اور چادر پر ایک اور کپڑا بچھا کر اس پر روٹیاں رکھیں میں اُنہیں دیکھتا رہا۔ اُنہوں نے یہ تو سوچا بھی نہیں ہو گا کہ اُنہیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ اس آدمی نے بیوی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی جس سے وہ زور زور سے ہنستی تھی۔

بچہ دودھ پی چکا تو دونوں اُس کے ساتھ کھیلنے لگے۔ بچے کا پیٹ بھر گیا تھا اس لئے وہ بہت خوش تھا۔ اسے انہوں نے چادر پر بٹھا دیا اور دونوں کھانا کھانے لگے۔ بچہ روٹی کی طرف لپکتا تھا اور دونوں اُسے پرے ہٹاتے اور ہنستے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور پیار و محبت بھی کرتے تھے۔

میں اُنہیں دیکھتا رہا اور مجھے خیال آیا کہ یہ ہے زندگی۔ میرے دل پر غم کا بوجھ آپڑا اور یادیں مجھے بہت پیچھے لے گئیں۔ کبھی میں بھی اسی طرح بچہ ہُوا کرتا تھا۔ میرے ماں باپ میرے ساتھ اسی طرح پیار کرتے ہوں گے۔ میں اُن کی خوشیوں اور محبت کا مرکز بنا ہُوا ہوں گا .... میں تصوّر میں اُس وقت کو دیکھنے لگا۔

یہ میاں بیوی اور ان کا بچہ اس طرح جھلملانے لگے جیسے میں کسی جھیل میں اُن کا عکس دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ دیر بعد محسوس ہُوا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ اُنہیں کھانا کھاتے دیکھ کر میرے خالی پیٹ میں اینٹھن سی محسوس ہوتی۔ بھوک ایک ایسی حقیقت تھی جس نے مجھے ماضی کے حُسن سے گھسیٹ لیا اور مجھے یاد دلا دیا کہ میں بھوکا ہوں اور مجھے کچھ کھانے کو نہ ملا تو میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اُن کے سامنے جو روٹیاں پڑی تھیں وہ پراٹھے تھے اور اتنے زیادہ تھے کہ مجھ جیسے چار آدمیوں کے لئے کافی تھے۔

بھوک نے مجھے انسانیت کے درجے سے گھسیٹ کر حیوانیت کی پستی

میں پھینک دیا۔ میں اس ارادے سے اُٹھ کھڑا ہُوا کہ نشیب میں اُتر کر ان کے سر پر جا کھڑا ہوں گا اور انہیں کہوں گا کہ تم اپنے بچے کو سنبھالو اور یہاں سے چلے جاؤ اور یہ کھانا یہیں پڑا رہنے دو۔ یہ سوچ کر میں وہاں سے چلنے لگا تو تیر کی طرح ایک خیال میرے دماغ میں پیوست ہو گیا .... نہیں .... نہیں .... وہ بہت خوش ہیں۔ میری رائفل سے ڈر کر وہ مجھے کھانا تو دے دیں گے، لیکن اُن کی خوشیاں اور اُن کے رُومان تباہ ہو جائیں گے۔

میرے گھر کی خوشیاں بھی اسی طرح لُٹ گئی تھیں۔ شہناز اور اُس کی ماں نے اسی طرح میرے گھر میں آکر کہا تھا کہ اس گھر میں جو کچھ ہے وہ ہمارا ہے اور تم یہاں سے چلے جاؤ۔

میں نے سوچا کہ میں اتنے معصوم بچے کی مسکراہٹوں کو برباد نہیں کروں گا۔

"تم بُزدل ہو سکندر!" —— معلوم نہیں یہ کس کی آواز تھی —— "تم اُنہیں قتل کرنے تو نہیں جا رہے .... تم پر کس نے رحم کیا تھا؟"

یہ ٹھیک ہے۔ میں انہیں قتل کرنے تو نہیں جا رہا تھا اور میں اُن کے مُنہ سے نوالہ چھیننے بھی نہیں جا رہا تھا۔ اُن کے پاس کھانا فالتو تھا یہ سوچ کر میں پھر چلنے لگا۔

دو قدم ہی اُٹھائے تھے کہ میں رُک گیا۔ مجھے خیال آیا کہ میرے ہاتھ میں رائفل اور میرا حُلیہ دیکھ کر وہ روٹی میرے حوالے کر دیں گے اور دل میں کہیں گے جا کتے! یہ لے روٹی اور چلا جا۔

ایک طرف بھوک تھی۔ دوسری طرف خودداری تھی۔ یہ دونوں چکّی کے دو پاٹ بن گئے اور میں ان میں پسنے لگا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آگیا۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ وہ اُٹھ کھڑے ہُوئے۔

میں نے اچھی طرح دیکھا کہ دو پراٹھے بچ گئے تھے۔ ماں نے بچے کو اُٹھایا اور باپ نے چادر، برتن اور روٹیوں والا کپڑا اس طرح اُٹھایا کہ دو پراٹھے زمین پر گر پڑے اور وہ چادر اور کپڑا وغیرہ تھیلے میں ڈال کر چلتے بنے۔ خاوند

نے بچّے کو اُٹھا لیا تھا اور بیوی گھوڑی پر سوار ہو گئی تھی۔ اُس نے لپک کر بچّے کو گود میں لے لیا تھا۔ خاوند نے لگام پکڑی اور وہ چل پڑے۔ وہ جس سمت روانہ ہوتے تھے، میں اُس کے اُلٹی سمت نشیب کے اُوپر اُوپر رائفل کے سہارے تیز تیز چل پڑا۔ میں اُن دو پراٹھوں کے لئے جا رہا تھا جو وہ پھینک گئے تھے۔ اُن کی منزل کہیں قریب ہی ہو گی ورنہ وہ پراٹھے یوں پھینک نہ جاتے۔ یہ کسی امیر خاندان کے معلوم ہوتے تھے ورنہ دیہات کے لوگ، روٹی کا ایک ذرّہ بھی زمین پر پڑا دیکھیں تو اُسے اُٹھا کر چُومتے ہیں، آنکھوں سے لگاتے ہیں اور کسی اونچی جگہ رکھ دیتے ہیں۔ یہ دونوں ابھی جوانی کی عمر میں تھے۔ اُن پر ازدواجی زندگی کے اوائل کے رومان طاری تھے۔ بہرحال اُنہوں نے اللہ کے دیتے ہوئے رزق کی بے ادبی کر کے اچھا کیا تھا یا بُرا، میں خوش تھا کہ وہ دو پراٹھے میرے لئے پھینک گئے تھے۔

میں اُن کے اُلٹی سمت اس لئے چلا تھا کہ میں نشیب میں اُتروں گا تو وہ نشیب میں سے نکل کر جا چکے ہوں گے۔ مجھے کچھ دُور جانا پڑا جہاں نشیب میں اُترا جا سکتا تھا۔ میں جب وہاں سے اُترنے لگا تو دیکھا کہ پانچ چھ کوّے درختوں سے اُتر کر پراٹھے کھا رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میرا خزانہ لُوٹ رہے ہوں۔ میں تیزی سے اُترنے لگا۔ یہ بھی خیال نہ رہا کہ بارش نے پھسلن کر رکھی ہے اور میں گھاٹی اُتر رہا ہوں۔ میرا پاؤں پھسلا۔ رائفل ہاتھ سے نکل گئی اور میں ایک پہلو کے بَل گرا پھر میں لڑھکنے لگا۔ میں نے رائفل کی پرواہ نہ کی۔ مجھے پراٹھوں تک پہنچنا تھا۔ پراٹھے ابھی دُور تھے اور کوّوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ میں نے ایک پتھر اُٹھا کر کوّوں کی طرف بڑی زور سے پھینکا۔ کوّے اُڑ کر دُور ہٹ گئے اور فوراً ہی پھر پراٹھوں پر ٹوٹ پڑے۔ میں رائفل کے سہارے کے بغیر لنگڑاتا ہُوا جا رہا تھا۔ میں نے اُنہیں ایک اور پتھر مارا۔

پھر میں چلتا جاتا، جُھکتا پتھر اُٹھاتا اور اُنہیں مارتا تھا۔ جب میں قریب پہنچا تو دو کوّے ایک پراٹھا اُٹھا کر اُڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر ایک نے پراٹھا چھوڑ دیا اور دوسرا اُسے اُٹھا کر درخت پر جا بیٹھا۔ زمین پر ایک پراٹھا

پڑا رہا۔ میں اُس کے اوپر جا گرا۔ کوّوں نے اس میں سے کچھ کھا لیا تھا۔ اس پر اُنہوں نے پاؤں بھی رکھے تھے۔ جگہ جگہ اس پر چونچیں بھی ماری تھیں، لیکن میں نے پراٹھا اُٹھایا اور تین چار نوالے بنا کر کھا گیا۔

اُوپر دیکھا تو چار پانچ کوّے ایک ٹہن پر بیٹھے وہ پراٹھا کھا رہے تھے جو ایک کوّا اُٹھا کر لے گیا تھا۔ میں نے اُنہیں پتھر مارے تو پراٹھا جو آدھا رہ گیا تھا نیچے آ پڑا۔ میں نے وہ بھی اُٹھا لیا اور اسے بھی کھا لیا۔



پیٹ کی آگ بہت حد تک سرد ہو گئی تب مجھے رائفل کا خیال آیا۔ دُور سے دیکھا، رائفل گھاٹی پر پڑی تھی۔ میں اُس طرف چل پڑا۔ جا کر رائفل اُٹھائی اور میں پھر اُوپر چلا گیا۔ نشیب میں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں تھا کیونکہ یہ گزرگاہ تھی۔ میرے پاس اس سوال کا جواب بھی نہیں تھا کہ میں اوپر کھڑا ہو کر کیا کروں گا۔

میں پھر اُسی کھڈ کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ یہ غالباً کمزوری کا اثر تھا کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں بیٹھ گیا۔ زمین گیلی تھی، لیکن میں انسان نہیں رہا تھا۔ میں گیلی زمین پر ہی لیٹا اور سو گیا۔ بہت دیر بعد میری آنکھ کھلی۔ میں نے نیچے دیکھا۔ بالکل اُسی جگہ جہاں وہ میاں بیوی بیٹھے تھے وہاں ایک آدمی چادر بچھائے اس پر لیٹا ہُوا تھا اور درخت کے ساتھ ایک گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ میں اس آدمی کو دیکھتا رہا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ گہری نیند سویا ہُوا ہے۔ میرے دماغ میں فوراً ایک سکیم آ گئی۔

میں نشیب میں اُترنے کے لئے چل پڑا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ اس آدمی سے گھوڑی لے لوں گا اور اس کے پاس جو پیسے ہوں گے وہ بھی لے لُوں گا پھر اس سے پوچھوں گا کہ قریب کون سا گاؤں اور شہر ہے اور اگر اس آدمی نے مزاحمت کی تو میں اس پر ہاتھ اُٹھانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔

میں گھاٹی سے اُتر کر اُس کی طرف جا رہا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ میرے پاؤں کی آہٹ اور بار بار رائفل کے بٹ کے زمین پر ٹکنے کی آواز نہ

آئے، لیکن کچھ نہ کچھ آواز پیدا ہو ہی جاتی تھی۔ میں اُس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ایک پہلو کے بل سویا ہُوا تھا۔ میری طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ اُسے میری موجودگی کا علم نہ ہُوا۔ میں نے دانستہ پاؤں سے آواز پیدا کی تو بھی وہ نہ جاگا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ مرا ہُوا ہی نہ ہو۔ میں نے اُس پر جُھک کر دیکھا تو اُس کی سانسیں چلتی ہوئی نظر آئیں اور یہ بھی نظر آیا کہ وہ بوڑھا آدمی ہے۔ اُس کی داڑھی لمبی تھی جو آدھی سے زیادہ سفید ہو چکی تھی۔

میں نے اُسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے زیادہ ضرورت گھوڑی کی تھی۔ میں گھوڑی تک گیا۔ اُس کی باگ درخت کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے باگ کھولی تو گھوڑی تین چار قدم پیچھے ہٹی اور آہستہ سے ہنہنائی۔ میں نے گھوڑی کے مالک کی طرف دیکھا۔ وہ گھوڑی کی آواز پر جاگ اُٹھا تھا۔ پھر وہ اُٹھ بیٹھا۔

"گھوڑی کیوں کھول رہے ہو بھائی؟" — اُس نے مجھ سے ایسے لہجے میں پوچھا جیسے کسی بچے سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کو نہ چھیڑو۔

"لے جا رہا ہوں" — میں نے کہا۔

"لے جانا" — اُس نے بیٹھے بیٹھے کہا — "میں تمہیں نہیں روکوں گا .... روک بھی کیسے سکتا ہوں! تمہارے پاس رائفل ہے۔ رائفل نہ ہوتی تو بھی تم جوان آدمی ہو اور میں بوڑھا ہوں۔"

شکل وصورت سے اور لباس سے یہ شخص معزز اور مہذب لگتا تھا۔ اُس نے بات کی تو اُس کا انداز پُروقار تھا۔ وہ کوئی معمولی سے ذہن کا آدمی نہیں لگتا تھا۔

"میرے پاس آؤ ذرا!" — اُس نے کہا — "گھوڑی کو اپنا سمجھو۔"

"آپ کے پاس آکر کیا کروں گا!"

"کچھ بھی نہیں" — اُس نے کہا — "تمہارے ساتھ دو باتیں کروں گا۔ پھر کہوں گا، بیٹا! یہ گھوڑی تم لے جاؤ.... اس طرح کہہ کر مجھے دلی خوشی ہو گی کہ میں نے اپنے بیٹے کو اپنی خوشی سے گھوڑی دی ہے۔ اگر تم اس دھونس سے گھوڑی

لے گئے کہ تم جوان ہو اور تمہارے پاس رائفل ہے تو میرے دل کو بڑا رنج ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ گھوڑی میں اپنی خوشی سے تمہارے حوالے کروں پھر تمہارے ضمیر پر یہ بوجھ نہیں پڑے گا کہ تم چور ہو۔ میں تمہیں چوری کے گناہ اور اس کی سزا سے بچانا چاہتا ہوں .... آجاؤ میرے پاس۔"

اُس کے الفاظ کا اثر تو تھا ہی، لیکن جس انداز سے اُس نے یہ الفاظ کہے اس میں جادو کا سا اثر تھا۔ میں نے گھوڑی کی باگ درخت کے تنے کے ساتھ باندھ دی اور آہستہ آہستہ چلتا بوڑھے کے قریب چلا گیا۔

"بیٹھ جاؤ یہاں" — اُس نے اپنے نیچے ایک دری سی بچھا رکھی تھی۔ اُس پر ہاتھ مار کر کہا۔

میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ میں اُس سے متاثر تو ضرور ہُوا تھا، لیکن میں ڈرا نہیں تھا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا۔ میرا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" — اُس نے پیار سے پوچھا۔

"معلوم نہیں" — میرے مُنہ سے نکل گیا — "کہیں نہ کہیں تو جاؤں گا ہی۔"

"سفر زیادہ ہے؟" — اُس نے پوچھا — "چل نہیں سکتے؛ لنگڑا کر کیوں چلتے ہو؟"

"گر پڑا تھا" — میں نے جواب دیا — "گھٹنے کو چوٹ آئی ہے .... آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"بستی سلطان" — اُس نے جواب دیا — "تین چار میل آگے ہے۔ میں وہاں کی مسجد کا خطیب ہوں۔"

"آپ تو بڑی گہری نیند سو رہے تھے" — میں نے کہا۔

"رات بھر جاگتا رہا تھا" — اُس نے کہا — "یہاں سے کچھ دُور ایک قصبہ ہے۔ وہاں کے لوگوں نے ایک جلسے میں بلایا تھا۔ عشاء کے بعد مسجد میں جلسہ شروع ہُوا۔ میں خطیب ہی نہیں، مبلغ بھی ہوں۔ میں نے ایسا موضوع شروع کر دیا کہ ساری رات گزر گئی۔ لوگ بھی دلچسپی سے سُنتے

رہے۔ یہاں ظہر کی نماز پڑھی تو آنکھ لگ گئی ...... جاؤ، گھوڑی لے جاؤ، لیکن خوش نہ ہونا کہ تم نے کسی سے گھوڑی چھینی ہے۔ یہ سمجھنا کہ باپ نے اپنے بیٹے کو گھوڑی دی ہے۔ کیا اس گھوڑی سے تمہاری ضرورت پوری ہو جائے گی؟"

"نہیں" —— میں نے اس طرح جواب دیا جیسے اُس نے مجھ سے اقبالِ جرم کروا لیا ہو —— "میری اس وقت ضرورت یہ ہے کہ کھانے کو کچھ مل جائے!"

"وہ دیکھو، گھوڑی کے ساتھ تھیلا بندھا ہُوا ہے" —— اُس نے کہا —— "وہ کھول لاؤ۔"

میں تھیلا کھول لایا۔ اُس کے کہنے پر میں نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ جب باہر نکالا تو کھانے کی کئی چیزیں میرے ہاتھ میں آگئیں جن میں مٹھائی بھی تھی۔ میں نے جس بے صبری سے کھانا شروع کر دیا اس طرح جانور ہی کھایا کرتے ہیں۔ وہ جہاندیدہ خطیب سمجھ گیا ہوگا کہ میں کئی روز کا بھوکا ہوں۔ میں جب کھا چکا تو اُس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"زین کی دوسری طرف پانی کی چھاگل بھی بندھی ہوتی ہے" —— اُس نے کہا —— "جاؤ پانی پی لو۔"

میں نے پانی پی لیا۔ گھوڑی کے پاس ہی کھڑے کھڑے میں نے اس خطیب کی طرف دیکھا تو مجھے ایسے لگا جیسے یہ خطیب نہیں بلکہ یہ خضر علیہ السلام ہیں جن کے قصے میں نے کئی بار سُنے تھے۔ میں بھی اس عقیدے کا قائل تھا کہ بھٹکے ہوئے بھوکے پیاسے مسافروں کو خضر علیہ السلام ملتے ہیں اور راستہ دکھاتے ہیں۔ مجھے اپنی نظریں بدلی بدلی سی محسوس ہونے لگیں۔ یہ شاید اس کا اثر تھا کہ میرے جسم کو صحیح غذا مل گئی تھی اور دماغ تک تازہ خون پہنچ گیا تھا۔ میں اس طرح آہستہ آہستہ چلتا اُس تک پہنچا جیسے اُس نے مجھے ہپناٹائز کر لیا ہو۔

میں اُس کے سامنے جا بیٹھا تب مجھے خیال آیا کہ یہ آدمی قابلِ احترام ہے بلکہ یہ آدمی ہے ہی نہیں۔

"آپ کون ہیں؟" —— میں نے اُن سے پوچھا اور کہا —— "آپ نے

اپنے متعلق غلط بتایا ہے کہ آپ خطیب ہیں۔ آپ خضر علیہ السلام ہیں اور ابھی آپ غائب ہو جائیں گے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تم نے مجھے خضر علیہ السلام کہا ہے" —— اُنہوں نے کہا —— "ورنہ بھوکے کو جس کسی سے روٹی مل جائے اُسے وہ خدا بھی کہہ دیتا ہے۔ بادشاہوں کے آگے درباری فرشی سلام کیوں کرتے ہیں؟ ...... صرف اس لئے کہ سلام کا انعام ملتا ہے۔ انسان کو بادشاہ جھکنے والے انسان بنایا کرتے ہیں۔ فرعون خود خدا نہیں بنے تھے۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو خدا اس لئے کہا تھا کہ سجدے کرنے والے موجود تھے ...... میں تمہیں گھوڑی اس لئے دے رہا ہوں کہ تمہاری ٹانگ تمہیں چلنے نہیں دیتی اور میں نے تمہیں روٹی اس لئے کھلائی ہے کہ تم بھوکے تھے۔ یہ خداوند تعالیٰ کا حکم ہے جس کی میں نے تعمیل کی ہے" —— وہ ہلکی سی ہنسی ہنس کر بولے —— "تم اپنے آپ کو اس لئے طاقتور سمجھتے ہو کہ تمہارے پاس رائفل ہے ...... سمجھنے کی کوشش کرو بیٹا! میں تم سے نہیں پوچھ رہا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کہاں جا رہے ہو۔"

"اگر آپ ہمدردی سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ میں کون ہوں اور کیوں بھٹکتا پھر رہا ہوں تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں" —— میں نے کہا —— "میں آپ کو یہ پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ میں پناہ ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"فوج کے بھگوڑے ہو؟"

"نہیں" —— میں نے جواب دیا۔

"مفرور ملزم ہو؟" —— اُنہوں نے پوچھا —— "ڈاکو تو نہیں ہو؟"

"مفرور ملزم ہوں" —— میں نے جواب دیا —— "ڈاکو نہیں ہوں۔"

"کیا الزام ہے تم پر؟"

"پولیس کے ایک انگریز افسر کو قتل کیا ہے" —— میں نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

میں نے اُنہیں پوری تفصیل سے سنا دیا کہ میں نے اُسے کیوں قتل

کیا ہے اور میں نے اُنہیں یہ بھی بتا دیا کہ میں ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنی جان وقف کر چکا ہوں۔

"الحمدُللہ" — اُنہوں نے کہا — "لیکن تمہارے گروہ میں صرف مسلمان ہیں یا ہندو اور سکھ بھی ہیں؟"

"ابھی تو کوئی بھی نہیں" — میں نے جواب دیا — "میں اپنا گروہ بناؤں گا جس میں ہندو اور سکھ بھی ہوں گے۔"

"میں نے اسی لئے تم سے پوچھا تھا کہ ہندو اور سکھ بھی تمہارے ساتھ ہوں گے" — اُنہوں نے کہا — "ہندو اور سکھ تمہارے ساتھ نہیں ہونے چاہئیں۔ میں جانتا ہوں ہندوستان میں کچھ لوگ دہشت گردی یعنی بموں کے دھماکوں اور انگریز افسروں کے قتل کی صورت میں آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں، لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ ہندو ہندوستان میں ہندو راج چاہتے ہیں۔ وہ جوشیلے اور جذباتی مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں اور انہیں ہندو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔"

"محترم!" — میں نے کہا — "ایک ہندو مجھے ڈنک مار چکا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ ایک ہی ہندو ایسا ہوگا۔"

میں نے انہیں جگموہن کا پورا واقعہ سنا دیا۔

"ہر ہندو ایسا ہی ہے" — انہوں نے کہا — "میں اتنا بوڑھا ہو گیا ہوں کہ تمہارا ہمسفر نہیں ہو سکتا لیکن تمہیں اُس راستے پر ڈال سکتا ہوں جو تمہیں صحیح منزل تک پہنچا دے گا .... میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ اپنے آپ کو لازم نہیں مجاہد سمجھو، لیکن عقل سے کام لینا، جذبات سے نہیں۔ تم مجھے جوشیلے اور جذباتی آدمی نظر آتے ہو۔"

اُنہوں نے اس موضوع پر بولنا شروع کیا تو میں اُن کا گرویدہ ہو گیا یہاں تک کہ میں نے اُنہیں اپنی زندگی کی ساری داستان سنا ڈالی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اُنہوں نے میری زندگی کی رُوداد سُن کر کچھ باتیں کیں۔ اُن کا انداز فلسفیانہ تھا، لیکن اُن کی ہر بات سمجھ میں آتی تھی اور دل

میں اُترتی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے صرف یہ بات اُن سے چھپائی کہ میری گرفتاری پر دس ہزار روپیہ انعام مقرر کیا گیا ہے۔

"تم نے اپنا نام سکندر بتایا ہے؟" — اُنہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں" — میں نے جواب دیا — "میرا نام سکندر ہے۔"

"انگریز بادشاہ نے تمہارے سر کی قیمت کچھ زیادہ تو نہیں رکھی" ... اُنہوں نے کہا — "دس ہزار روپیہ تو کچھ بھی نہیں۔"

"کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے؟"

"ہاں بھئی!" — اُنہوں نے جواب دیا — "معلوم ہے۔"

"میں آپ کو یہ بات نہیں بتانا چاہتا تھا" — میں نے کہا — "بتانا اس لئے نہیں چاہتا تھا کہ میں آپ سے کہنے والا تھا کہ چند دنوں کے لئے مجھے اپنے پاس رکھیں تاکہ میری ٹانگ چلنے کے قابل ہو جاتے اور میں کہیں اور نکل جاؤں۔"

"کیا اب مجھ سے پناہ نہیں مانگو گے؟"

"گستاخی معاف محترم!" — میں نے کہا — "دس ہزار میں بڑی طاقت ہے۔"

"طاقت ایمان کی ہوتی ہے پاگل!" — اُنہوں نے کہا — "اگر تم نے میرے ایمان کی قیمت دس ہزار لگائی ہے تو یوں سمجھو کہ تم نے مجھے یہ کہا ہے کہ تم خطیب نہیں، بہت بڑے بے ایمان ہو .... میرے ساتھ چلو گے؟"

میں اس سوال کا جواب فوراً نہیں دے سکتا تھا۔ وہ بے شک خطیب تھا اور میں اُس کی شخصیت سے متاثر بھی ہو گیا تھا، لیکن دس ہزار ایک خزانہ تھا۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا" — انہوں نے کہا — "اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تو وہ میری گھوڑی کھڑی ہے۔ اس پر سوار ہو جاؤ اور چلے جاؤ۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ میرے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

"میں خضر علیہ السلام نہیں ہوں" — اُنہوں نے کہا — "لیکن بھٹکے

ہوئے مسافر کو منزل تک پہنچا سکتا ہوں۔ تم گناہگار نہیں۔"

وہ ایک جادو تھا جو مجھ پر طاری ہُوا اور میں اُن کے ساتھ چل پڑا۔ اُنہوں نے مجھے گھوڑی پر سوار کرا دیا تھا۔



ہم راستے میں باتیں کرتے گئے اور ایک گاؤں میں داخل ہوئے۔ راستے میں جو بھی ملا اُس نے خطیب صاحب کو جُھک کر سلام کیا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئے جو مسجد کے بالکل قریب تھا۔ وہ اس گھر میں اکیلے رہتے تھے۔ اُن کا کوئی بیوی بچہ نہیں تھا، لیکن اُن کے پہنچتے ہی دو عورتیں آگئیں جنہوں نے باورچی خانہ سنبھال لیا۔ تین چار لڑکے بھی آگئے۔ یہ اُن کے شاگرد تھے۔ خطیب صاحب کا اپنا تو کوئی بھی نہیں تھا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا گھر آباد ہو گیا۔ اُنہوں نے مجھے نہانے کو کہا۔ جب میں نہا کر نکلا تو اُنہوں نے مجھے اپنے دُھلے دھلائے کپڑے دیئے، پھر میرا گُھٹنا دیکھا اور الماری سے ایک شیشی نکال کر گُھٹنے کی مالش کی اور اپنی بنائی ہوئی دو دوائیاں بھی مجھے کھلائیں۔ اُنہوں نے میری رائفل اندر کسی کمرے میں چُھپا کر رکھ دی۔

"سکندر بیٹا!" — اُنہوں نے کہا — "تم اس مکان میں نہیں رہو گے۔ مسجد کے اندر ایک کمرہ ہے جس کا دروازہ مسجد کے صحن میں کُھلتا ہے۔ میں تمہیں وہاں رکھوں گا۔"

رات کو اُنہوں نے مجھے اُس کمرے میں منتقل کر دیا۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ مسجد کے اندر رکھنے میں اُن کی کتنی دانش مندی تھی۔ اس کمرے کو مسجد والے حُجرہ کہتے تھے۔ میرا بستر فرش پر بچھایا گیا تھا۔ حُجرہ صاف سُتھرا تھا۔ اس میں ضرورت کی ہر ایک چیز رکھی تھی اور بغیر کواڑوں کی الماری میں قرآن مجید، سپارے اور ایسی ہی ایک دو مذہبی کتابیں رکھی تھیں۔

میری حالت ایسی تھی کہ میں بستر پر گر پڑا اور میری آنکھ لگ گئی۔

مجھے کوئی جھنجھوڑ رہا تھا۔ آنکھ کُھلی تو خطیب صاحب مجھے جگا رہے تھے۔

"مغرب کا وقت ہو گیا ہے" — اُنہوں نے کہا — "میں نے تمہیں

عصر کی نماز کے لئے نہیں جگایا تھا۔ تم سوتے ہوئے نہیں بلکہ بے ہوش پڑے تھے۔ مجھے تمہاری تھکن کا اندازہ تھا، لیکن اب اُٹھو، وضو کرو اور نماز کے لئے آجاؤ۔"

"اجازت دیں تو اذان میں دوں گا" — میں نے کہا۔

میں نے یہ بات بغیر سوچے کہہ دی تھی۔ میں نے کبھی اذان نہیں دی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ نماز پڑھے بھی ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ اُس روز نہ جانے دل میں یہ کیوں آئی کہ میں اذان دوں۔

"بسم اللہ!" — خطیب صاحب نے کہا — "اگر تم اذان دے سکتے ہو تو میں تمہیں مؤذن کی حیثیت سے مسجد میں رکھ لوں گا۔"

"محترم!" — میں نے کہا — "ایک انتہائی ضروری بات سن لیں پھر آپ جو حکم دیں گے اُس کی تعمیل کروں گا .... آپ مجھے مسجد میں رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں کون ہوں اور میرا مستقبل کیا ہے۔ کسی بھی روز کوئی مجھے پہچان لے گا اور میں پکڑا جاؤں گا۔ میں نے آپ کو سنایا تھا کہ میں جب بھی پکڑا گیا، اللہ نے مجھے رہائی دلا دی، لیکن میں مسجد میں پکڑا گیا اور پولیس کو یہ پتہ چل گیا کہ مجھے آپ نے پناہ دی ہے تو میں آپ کو بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جاؤں گا۔ یہ سوچ لیں۔ میں اپنی سلامتی کی خاطر آپ کی عزت و آبرو کو خطرے میں نہیں ڈالوں گا۔"

"پناہ دینے والا اللہ ہے سکندر!" — خطیب صاحب نے بے نیازی سے کہا — "وہ وقت آئے گا تو دیکھ لیں گے۔ باہر آؤ۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔"

میں باہر نکلا۔ وضو کیا اور خطیب صاحب کے اشارے پر اُس جگہ جا کھڑا ہُوا جہاں اُنہوں نے بتایا تھا کہ کھڑے ہو کر اذان دی جاتی ہے۔ میں نے کبھی اذان دی تو نہیں تھی، لیکن اذان کا ایک ایک لفظ ذہن میں محفوظ تھا۔

میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر جب چار مرتبہ اللہ اکبر ترنم سے اور بلند آواز سے کہا تو مجھے اپنی آواز اجنبی سی لگی۔ میں نے خود محسوس کیا کہ میری آواز میں

سوز ہے اور موسیقیت بھی ہے۔ اس کے بعد میں نے جو اذان دی وہ سرور کے عالم میں دی۔ میری آواز کا سوز بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

یہ مقدس الفاظ میرے سینے میں سے نکل رہے تھے۔ ذات کی گہرائیوں میں سے کہوں تو زیادہ موزوں ہوگا۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میری اذان میں میری آہیں اور فریادیں شامل ہیں۔ آخر میں جا کر مجھ پر رقت سی طاری ہوگئی، لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اذان ختم ہوئی تو دل میں آئی کہ ایک بار پھر اذان دوں میں وہیں کھڑا رہا۔ میں کہیں کھو گیا تھا۔

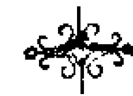
"جزاک اللہ، جزاک اللہ" ـــ دو تین آوازوں نے مجھے اس بے خودی سے بیدار کر دیا ـــ "کتنی میٹھی اور کتنی سُریلی آواز ہے۔"

تین چار آدمی اکٹھے مسجد میں داخل ہوئے۔

"اذان کس نے دی ہے؟" ـــ آنے والے ایک آدمی نے پوچھا

نمازیوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ اُنہوں نے داد دی اور اس کے ساتھ ہی جماعت کھڑی ہوگئی۔ میں نے جب خطیب صاحب کی قرآت سُنی تو مجھ پر وجد طاری ہوگیا۔

میں نے عشاء کی نماز بھی خطیب صاحب کے پیچھے پڑھی۔ مغرب کی نماز کے بعد اُنہوں نے مجھے بڑا اچھا کھانا کھلایا تھا۔ رات کو جب میں حجرے میں اکیلا تھا تو اپنے متعلق سوچنے لگا۔ بار بار یہی ایک خیال آتا تھا کہ میں باقی عمر اس مسجد میں ہی گزار دوں۔



پانچ چھ روز مسجد میں گزر گئے۔ میری دنیا حُجرے اور مسجد تک محدود تھی۔ میری رائفل اور راؤنڈ خطیب صاحب نے اپنے گھر میں چھپا لئے تھے۔ خطیب صاحب کو میں اپنا پیر و مُرشد تو مان ہی چکا تھا، لیکن کسی کسی وقت ذہن میں وہم سا اور ایک وسوسہ سا آ جاتا تھا کہ یہ دھوکہ ہی تو نہیں۔ ان چھ سات دنوں میں خطیب صاحب نے مجھے بہت سی باتیں سمجھائی تھیں۔ یہ میں نے پہلے آپ کو بتایا ہے

کہ اُن کا انداز وعظ جیسا نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ حقیقی زندگی کی باتیں کرتے تھے۔ اس طرح اُنہوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

"محترم اُستاد!" ـــ ایک روز میں نے اُنہیں کہا ـــ "میری رائفل اور گولیاں آپ اپنے پاس نہ رکھیں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ اعانت جرم میں اور مجھے پناہ دینے کے جُرم میں پکڑے جائیں گے" ـــ میں نے کہا ـــ "اگر میں نہ پکڑا گیا اور آپ کے گھر سے رائفل برآمد ہوئی تو بھی آپ بلا لائسنس اسلحہ اپنے پاس رکھنے کے جرم میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔"

وہ نہیں مان رہے تھے، لیکن میں پولیس کا آدمی تھا۔ قانون کو جانتا تھا۔ میں اُس رات اُن کے گھر گیا اور خود ہی رائفل اور راؤنڈ اُٹھا لایا اور حُجرے میں بستر کے نیچے ایک طرف رکھ دیئے۔ اُس کے اگلے ہی روز میں ظہر کی نماز باجماعت پڑھ چکا تو پیچھے دیکھا۔ میں اُس وقت تک زاہد اور پارسا بن چکا تھا، لیکن پچھلی صف میں مجھے ایک چہرہ نظر آیا جسے دیکھ کر میں مفرور قاتل اور ڈاکو بن گیا۔

پچھلی صف میں انسپکٹر فضل حسین وردی میں بیٹھا تھا۔

مجھے دھوکے کا جو خطرہ تھا وہ مسجد میں آ گیا تھا۔

انسپکٹر فضل حسین بڑی دُور کے ایک تھانے میں تھا۔ اُس کا یہاں آنا صاف بتاتا تھا کہ وہ میرے پیچھے آیا ہے۔ اُس نے مجھے دیکھا تو اُس کے چہرے پر جو تاثر آیا اور جس طرح اُس کی آنکھیں کُھل گئیں اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ خوش ہے اُس نے شکار مار لیا ہے۔

نمازی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ میں بڑی تیزی سے سوچنے لگا کہ میں یہاں سے کس طرح بھاگ سکتا ہوں۔ ایک ہی طریقہ تھا کہ میں ہرن کی طرح اُچھلتا اور پوری رفتار سے دوڑتا باہر نکل جاتا، لیکن ہُوا یوں کہ میں باہر نکلنے کے لئے چلا تو فضل حسین میری طرف آیا۔ فاصلہ تو کچھ تھا ہی نہیں۔ میرے آگے کچھ نمازی تھے جو نکل رہے تھے۔

"السلام علیکم!" — فضل حسین نے سلام کر کے ہاتھ آگے کیا۔

"وعلیکم السلام" — میں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے ساتھ مصافحہ کیا اور کہا — "آپ نے اپنا عہد پورا کر دیا ہے"۔

"شاید نہیں" — انسپکٹر فضل حسین نے کہا — "یہیں بیٹھ جاؤ"۔

میں نے مسجد کے دروازے سے باہر دیکھا۔ مجھے ایک ہندو کانسٹیبل اور ایک ہندو اے ایس آئی باہر کھڑے نظر آئے۔ خطیب صاحب نے دیکھا کہ ایک تھانیدار نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا ہے تو وہ تیز تیز چلتے ہم تک آ گئے۔ میں اُن کے چہرے پر گھبراہٹ دیکھ رہا تھا، وہ ہمارے پاس بیٹھ گئے۔

"یہ ہمارے مؤذن ہیں" — خطیب صاحب نے انسپکٹر فضل حسین سے کہا — "آپ شاید انہیں جانتے ہیں۔ ان کی اذان سُنی ہے کبھی؟"

"نہیں مولانا!" — انسپکٹر فضل حسین نے کہا — "میں نے ان کی اذان تو نہیں سُنی، لیکن انہیں جانتا ہوں .... کچھ زیادہ تو نہیں جانتا۔ دو تین مرتبہ ملاقات ہوئی تھی .... مولانا! آپ چلیں"۔

"آپ کہاں سے تشریف لاتے ہیں؟" — خطیب صاحب نے انسپکٹر فضل حسین سے پوچھا — "ہمارے تھانے کا تھانیدار تو کوئی اور ہے"۔

"اب میں ہوں" — فضل حسین نے کہا — "مجھے اس تھانے میں آئے چار پانچ روز گزر گئے ہیں۔ میں تھانے کا علاقہ دیکھنے کے لئے نکلا ہوں۔ یہاں آیا تو ظہر کا وقت ہو گیا اور میں نماز پڑھنے اندر چلا آیا۔ یہاں کا چھوٹا تھانیدار اور ایک حوالدار میرے ساتھ ہیں۔ وہ ہندو ہیں اس لئے باہر کھڑے ہیں .... آپ چلیں مولانا! میں ان کے ساتھ دو چار باتیں کر کے چلا جاؤں گا"۔

خطیب صاحب نے میری طرف دیکھا۔ پھر انہوں نے انسپکٹر فضل حسین کی طرف دیکھا۔ اُن کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔

"محترم اُستاد!" — میں نے اُن کی مشکل آسان کرنے کے لئے کہا — "آپ چلیں۔ میں آتا ہوں"۔

"مولانا!" — انسپکٹر فضل حسین نے کہا — "آپ کچھ ڈرے ڈرے سے لگتے ہیں۔ گھبرائیں نہیں"۔

میں نے اشارہ کیا تو خطیب صاحب اس طرح اُٹھ کر چل پڑے جیسے وہ جانا نہیں چاہتے تھے۔



"سکندر!" — انسپکٹر فضل حسین نے کہا — "میں اپنا عہد پورا نہیں کروں گا"۔

"کیوں؟" — میں نے پوچھا — "خدا سے ڈر گئے ہیں آپ یا اس لئے مجھے نہیں پکڑ رہے کہ ہم دونوں نے ایک امام کے پیچھے نماز پڑھی ہے؟"

"خدا کا ڈر تو ہر وقت دل میں رہتا ہے" — اُس نے کہا — "لیکن یہاں وجہ کچھ اور ہے .... تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اُس کا صلہ ہر باپ دل کھول کر دے گا .... تم نے میرے بیٹے کو پکڑ لیا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ تم اُسے مار ڈالو گے، لیکن تم نے اُسے چھوڑ دیا اور اُس کا ریوالور بھی اُسے لوٹا دیا"

"ایک بار نہیں" — میں نے کہا — "آپ کا بیٹا دو بار میرے قبضے میں آگیا تھا"۔

"اُس نے ایک ہی بار کا ذکر کیا تھا" — فضل حسین نے کہا — "یہ اُس رات کا ذکر ہے جب وہ باوریوں کے ڈیرے پر چھاپہ مارنے گیا تھا"۔

"یہ دوسری بار تھی" — میں نے کہا — "اس سے دو چار روز پہلے وہ اپنے دو دوستوں کے ساتھ شکار پر آیا تھا۔ انہوں نے وہیں ایک خیمہ گاڑ دیا اور باوریوں کی ایک جوان لڑکی کو ان تینوں نے بُری نیت سے اپنے پاس بٹھایا ہوا تھا۔ میں نے مظفر کو پکڑ لیا تھا۔ میرے پاس رائفل تھی۔ میں اُسے گولی مار سکتا تھا"۔

"تم اُسے کیوں گولی مارنے لگے تھے؟" — انسپکٹر فضل حسین نے پوچھا — "باوریوں کی لڑکی تمہاری کیا لگتی تھی؟"

"باوریوں نے مجھے پناہ دی تھی" — میں نے کہا — "میں نے مظفر کو

پکڑلیا۔ میں اُسے گولی مارنے ہی لگا تھا کہ اُس نے بتایا کہ وہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر ہے اور انسپکٹر کا بیٹا ہے۔ میں نے اُس کے باپ کا نام پوچھا تو اُس نے آپ کا نام لیا۔ میں نے اُسے گولی مارنے کا ارادہ بدل دیا۔ کیا اُس نے آپ تک میرا پیغام نہیں پہنچایا تھا؟"

"دوسری مرتبہ جب تم نے اُسے پکڑا تھا اور کچھ باتیں کہی تھیں تو وہ باتیں اُس نے مجھے بتاتی تھیں" — انسپکٹر فضل حسین نے کہا — "معلوم نہیں تم نے کس نیت سے اُسے چھوڑ دیا تھا، میں اسے اپنے اوپر تمہارا احسان سمجھتا ہوں۔ مظفر میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ میں اس کا یہ صلہ دیتا ہوں کہ تمہیں گرفتار نہیں کروں گا .... لیکن سکندر! تم یہاں سے چلے ہی جاؤ تو اچھا ہے۔ یہ میرا مشورہ ہے۔ تمہارا ایک ہی جگہ زیادہ دن رہنا ٹھیک نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ پھر ہماری ملاقات ہو تو میں تمہاری مدد کرنے کے قابل ہی نہ ہوں .... میں تمہارے ساتھ زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ باہر اے ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل کھڑے میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ میرے ساتھ ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

وہ مسجد سے نکلا ہی تھا کہ خطیب صاحب آ گئے۔ پتہ چلا کہ وہ اپنے گھر نہیں گئے، مسجد کے باہر ہی کھڑے رہے تھے۔ گھبراہٹ کے عالم میں میرے پاس آتے اور پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ میں نے اُنہیں بتایا تو اُن کی جان میں جان آئی۔

کبھی تو مجھے اطمینان ہوتا تھا کہ انسپکٹر فضل حسین کے دل سے میری دشمنی نکل گئی ہے، لیکن یہ وہم بھی کبھی آجاتا تھا کہ یہ شخص انگریزوں کا پکا غلام تھا اور اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ مجھے بخش دیتا۔ میں اُس کی ذہنیت کو جانتے ہوتے کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ میرے ساتھ وفا کرے گا یا نہیں۔ میں نے تو یہ بھی سوچ لیا تھا کہ پیشتر اس کے کہ اُس کی نیت خراب ہو جاتے، میں یہاں سے نکل جاؤں تاکہ خطیب صاحب پر کوئی اُفتاد نہ آ پڑے۔

تین ہی دن گزرے تھے کہ انسپکٹر فضل حسین پھر مسجد میں آیا۔ عشاء کی

نماز کے بعد کا وقت تھا۔ میں اپنے حُجرے میں تھا۔ وہ سیدھا میرے حُجرے میں آیا۔ وہ وردی میں نہیں تھا۔ میرے بستر پہ بیٹھ گیا۔ حُجرے میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔

"سکندر!" — اُس نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا — "تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا جس کا میں نے صلہ یوں دیا ہے کہ تمہیں گرفتار نہیں کیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میں نے تمہاری نیکی کا صلہ پوری طرح نہیں دیا۔ آج میں تمہاری نیکی کی قیمت ادا کرنے آیا ہوں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں" — میں نے کہا — "مجھے کسی قیمت کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں سکندر!" — اُس نے کہا — "میں ضروری سمجھتا ہوں کہ قیمت دوں۔"

"پھر دے دیں قیمت۔"

"میں تمہیں ایک قیمتی مشورہ دوں گا" — انسپکٹر فضل حسین نے کہا — "وہ یہ ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔"

"یہ تو میں بھی سوچ چکا ہوں" میں نے کہا۔

"تم نے کسی اور طرح سوچا ہوگا" — اُس نے کہا — "میری سوچ اور ہے۔ میں جن کا نمک کھاتا ہوں اُنہیں میں دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں نے تمہیں گرفتار کرنے کا جو عہد کیا تھا وہ توڑا نہیں۔ میں تم پر اس سے بڑا اور کوئی احسان نہیں کر سکتا کہ تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر بھی گرفتار نہ کروں۔ میں نے ایک بار تمہیں چھوڑ دیا تھا، دوسری بار بھی چھوڑ رہا ہوں اور یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ تیسری بار تم مجھے نظر آئے تو میں گرفتار کر لوں گا۔"

خطیب صاحب میرے حُجرے میں آ گئے۔ اُنہیں شاید کسی نے بتایا تھا کہ تھانیدار مسجد میں آیا ہے۔

"مولانا!" — انسپکٹر فضل حسین نے خطیب صاحب سے کہا —

"آپ نے ایک بڑے خطرناک مفرور ملزم کو پناہ دے رکھی ہے۔ میں آپ کا احترام کرتے ہوئے آپ کو یہ مہلت دیتا ہوں کہ آپ اسے جانے دیں۔ اسے مسجد میں نہ رہنے دیں۔ میں سمجھوں گا کہ میں نے اسے یہاں دیکھا ہی نہیں تھا۔"

"آپ مسلمان ہیں" ــــ خطیب صاحب نے کہا ــــ "یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ مسجد خانۂ خدا ہے۔ اس نے میرے گھر میں نہیں خدا کے گھر میں پناہ لی ہے۔ میرا گھر تو یہ ساتھ ہے۔ میں کسی مسلمان کو خدا کے گھر سے نہیں نکال سکتا۔"

"مولانا!" ــــ انسپکٹر فضل حسین نے کہا ــــ "میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں اُن کے حکم کا پابند ہوں جن کا میں نمک کھاتا ہوں اور جو مجھے میرے بال بچوں کی پرورش کے لئے تنخواہ دیتے ہیں۔"

"داروغہ صاحب!" ــــ خطیب صاحب نے کہا ــــ "میں اُس کے حکم کا پابند ہوں جو مجھے، آپ کو اور ہر کسی کو رزق دیتا ہے۔ جس مسجد میں آپ نماز پڑھتے ہیں اُسی مسجد میں اپنے دین کے دشمن کا حکم نہ چلائیں۔"

"میری بات سن لو انسپکٹر صاحب!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں نے پہلے روز آپ کو یہاں دیکھا تھا تو میں نے اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ جیسے لوگ بے مروّت ہوتے ہیں۔ آپ بھی اپنی ذہنیت کے ہاتھوں مجبور ہیں، لیکن میں اس وجہ سے نہیں گیا کہ آپ خطیب صاحب کو پریشان کریں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں" ــــ انسپکٹر فضل حسین نے کہا ــــ "کہ میں انہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"میری ایک بات پر غور کریں" ــــ خطیب صاحب نے اُسے کہا ــــ "میں مان لیتا ہوں کہ یہ شخص قاتل ہے، ڈاکو ہے اور اس میں ہر عیب ہے۔ اگر یہ اپنی زندگی کا راستہ بدل لیتا ہے اور باقی عمر اسی مسجد میں اللہ اللہ کرتے گزار دیتا ہے تو کیا آپ کو اچھا نہیں لگے گا؟ کیا آپ اسے اللہ کی عبادت

سے محروم کرنا چاہتے ہیں؟ .... اتنی جلدی نہ بھولیں کہ اس نے آپ کے اکلوتے بیٹے کو زندہ چھوڑ دیا تھا۔"

"لیکن آپ نہیں جانتے مولانا!" ــــ انسپکٹر فضل حسین نے کہا ــــ "اُس نے میرے بیٹے کی جان بخشی تو کر دی تھی، لیکن اُس کا مستقبل تباہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور اُس نے بہت بُرا اثر قبول کیا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" ــــ میں نے اُس سے پوچھا۔

"تم نے اُسے اپنے جیسا بنا لیا ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "تم نے اُس کے دماغ میں بغاوت کا کیڑا ڈال دیا ہے۔ تم نے اُس کے ذہن پر یہ نقش کر دیا ہے کہ یہ ملک ہمارا ہے اور انگریزوں کو یہاں سے نکالنا ہے۔"

"کیا یہ جھوٹ ہے؟" ــــ خطیب صاحب نے پوچھا ــــ "کیا آپ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ اس نے آپ کے بیٹے کو پکا مسلمان بنانے کی کوشش کی ہے؟"

"مولانا!" ــــ اُس نے کہا ــــ "آپ خوابوں اور خیالوں کی باتیں کرتے ہیں۔ میرے سامنے حقیقت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس ملک پر انگریزوں کا قبضہ ہے اور اس ملک کو ہم اُن سے نہیں چھڑا سکتے۔ چند ایک انگریزوں کو قتل کر کے آپ سوائے پھانسی کے کچھ نہیں پا سکتے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس نے میرے بیٹے کا دماغ اس قدر خراب کر دیا ہے کہ وہ مجھے غدار کہتا ہے۔ وہ مجھے یہاں تک کہہ چکا ہے کہ وہ نوکری سے استعفیٰ دے دے گا۔ وہ بار بار سکندر کا نام لیتا ہے۔ میں اُسے سمجھاتا ہوں تو وہ میری ایک نہیں سنتا۔ اُلٹا مجھے سمجھانے بیٹھ جاتا ہے۔ کیا اس شخص نے اُس کا مستقبل تباہ نہیں کر دیا؟"

"داروغہ صاحب!" ــــ خطیب صاحب نے کہا ــــ "یہ تو اپنی اپنی سوچ ہے۔ آپ مستقبل کی سوچتے ہیں اور سکندر عاقبت کی سوچتا ہے۔"

"آپ لوگوں کے دماغ خراب ہو چکے ہیں" ــــ انسپکٹر فضل حسین نے کہا اور غصّے سے اُٹھا۔ کہنے لگا ــــ "جو بات تم یہاں نہیں سمجھ سکتے وہ تم لوگ حوالات میں سمجھو گے۔ میں یہ کہہ کر جا رہا ہوں کہ اسے پھر یہاں دیکھا تو

گرفتار کرلوں گا۔ اسے یہاں سے نکال دو۔"

"اور میں آپ کو آخری بار کہہ رہا ہوں" —— خطیب صاحب نے کہا —— "کہ میں کسی کو خدا کے گھر سے نہیں نکال سکتا، اور میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ آپ اسے گرفتار کرنے کے لئے مسجد کے اندر آئے تو میں آپ کی جان کی اور اس گاؤں کے امن و امان کی ضمانت نہیں دے سکوں گا۔"

اُس نے خطیب صاحب کو، پھر مجھے گھُور کر دیکھا اور چلا گیا۔



میں اور خطیب صاحب کچھ دیر سر جھُکائے ہوئے خاموش بیٹھے رہے۔ انسپکٹر فضل حسین کی یہ بات غلط نہیں تھی کہ ہم خوابوں اور خیالوں کی باتیں کر رہے تھے اور اُس کے سامنے ایک حقیقت تھی۔ حکومت مسلمانوں کی نہیں تھی کہ پولیس مسجد کے اندر نہ آتی۔ میرے سامنے حقیقت یہ تھی کہ میں خطیب صاحب کو بچانا چاہتا تھا۔

"میں چلا جاتا ہوں" —— میں نے کہا۔

"نہیں" —— خطیب صاحب نے دو ٹوک لہجے میں کہا —— "تم نہیں جاؤ گے۔"

"مجھے اپنا کوئی غم نہیں محترم استاد!" —— میں نے کہا —— "میرے لئے زندگی اور موت ایک ہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ پر کوئی مشکل نہ آپڑے۔ اگر میری موجودگی میں اس تھانیدار نے یا کسی انگریز افسر نے یا کسی اور نے آپ پر ہاتھ اُٹھایا تو وہ قتل ہو جائے گا۔ مجھے اس گناہ سے بچائیں اور جانے دیں۔"

میں نہیں سمجھ سکا کہ خطیب صاحب نے کیا سوچا تھا۔ میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ مجھے روک کر غلطی کر رہے ہیں، لیکن وہ ہر بات فیصلے اور حکم کے لہجے میں کرتے تھے اور میں اُن کے حکم کے خلاف بول نہیں سکتا تھا۔

"تم آرام سے سو جاؤ سکندر!" —— انہوں نے کہا —— "میں کل خود تھانے جاؤں گا اور اس بدبخت تھانیدار کے ساتھ بات کروں گا۔"

اگلی صبح سورج نکلتے ہی خطیب صاحب تھانے چلے گئے۔ تھانہ چھوٹے

سے ایک قصبے میں تھا جو بستی سلطان سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ قصبہ اس علاقے کا تجارتی مرکز تھا۔ وہاں بہت بڑی منڈی تھی اور تمام تر تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔

خطیب صاحب اپنی گھوڑی پر گئے تھے۔ میرے اندازے سے وہ جلدی واپس آگئے۔

"کیا کہتا ہے؟" —— میں نے پوچھا۔

"کچھ دنوں تک وہ کچھ بھی کہنے یا کرنے کے قابل نہیں رہا" —— خطیب صاحب نے جواب دیا —— "اُس پر ایسی مصیبت آپڑی ہے کہ وہ چکرایا ہوا ہے .... اُس کے شہر میں ایک بڑے ساہوکار کے گھر ڈاکہ پڑا ہے اور ڈاکو ساہوکار کی نوجوان کنواری بیٹی کو اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ تمام بڑے بڑے ہندو تھانے میں جا بیٹھے ہیں اور وہ تمہارے فضل حسین کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ شام سے پہلے ڈاکوؤں کو پکڑو ورنہ ہم اوپر چلے جائیں گے .... یہ تو تم جانتے ہو سکندر کہ ہندو گورنر اور وائسرائے تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔"

"کیا آپ اُسے ملے تھے؟" —— میں نے پوچھا۔

"ہاں" —— انہوں نے جواب دیا —— "میں اُس کے دفتر میں چلا گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور میرے پاس آکر کہنے لگا، مولانا، اس وقت آپ چلے جائیں۔ میں جانتا ہوں آپ کیوں آئے ہیں۔ میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ ذرا فرصت مل جانے دیں پھر بات کروں گا .... میں وہاں سے چلنے لگا تو اُس نے کہا، مولانا! میرے لئے دعا کرنا .... میرے دل سے دعا نکلی، اللہ تیری ہر مشکل آسان کرے گا۔ یہ کہہ کر میں چلا آیا۔"

ڈاکہ زنی کی جیسی بھی سنگین واردات ہو جاتے، ایک ہی بار کئی آدمی قتل ہو جائیں یا کچھ ہی ہو جاتے، پولیس انسپکٹر یعنی تھانوں کے انچارج اس طرح گھبرایا نہیں کرتے جس طرح خطیب صاحب کے بتانے کے مطابق فضل حسین گھبراہٹ سے کانپ رہا تھا۔ اُس کی گھبراہٹ کی وجہ بڑی صاف تھی۔ ہندو اُس روز سے مسلمانوں کے دشمن ہیں جس روز ہندوستان کی فضا میں پہلی اذان

گونجی تھی۔ اس کے بعد ہندو زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہے۔ ہندوؤں کے ہاتھ میں صرف دولت ہی نہیں بلکہ انگریز بھی ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے۔ ہندوؤں کے اکثریتی علاقے میں کوئی مسلمان تھانیدار تعنیات ہو جاتا تھا تو ہندو اُسے نقصان پہنچانے کی ہر جائز اور ناجائز کوشش کرتے تھے۔ ذرا سا واقعہ ہو جاتا تو اسے وہ ہندو مُسلم فساد کی شکل دینے کی کوشش کرتے اور بالائی افسروں تک یہ رپورٹیں پہنچاتے تھے کہ مقامی تھانیدار مسلمانوں کی حمایت کر رہا ہے۔

ڈاکہ زنی کی اس واردات کا شکار ایک ہندو ساہوکار ہُوا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا تھا کہ یہ ہندو ساہوکار کانگرس کا مقامی لیڈر تھا اور تمام علاقے پر اس کا رعب اور رسوخ تھا۔ اُس کے گھر اتنی سنگین واردات ہوئی تو شہر کے اور اس علاقے کے سرکردہ ہندو تھانے میں اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے انسپکٹر فضل حسین سے کہا کہ وہ گورنر تک یہ رپورٹ پہنچائیں گے کہ نئے تھانیدار کے آتے ہی یہ جو واردات ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تھانیدار نے خود کروائی ہے اور واردات کرنے والے مسلمان ہیں اور یہ بھی کہ نیا تھانیدار تفتیش میں دانستہ کوتاہی کر رہا ہے۔

دوپہر تک اس سنگین واردات کی تفصیلات بستی سلطان میں بھی پہنچ گئیں۔ پھر نئی سے نئی خبریں گاؤں میں پہنچنے لگیں۔ لوگ بتاتے تھے کہ اس علاقے میں برسوں بعد ایسی واردات ہوئی ہے۔ مغرب کی نماز کے وقت دو نمازیوں نے بتایا کہ وہ شہر گئے تھے۔ وہاں سے پتہ چلا ہے کہ پولیس کپتان تھانے میں آیا تھا اور یہ بھی پتہ چلا ہے کہ پولیس کپتان نے تھانیدار کو تین چار دنوں کی مہلت دی ہے کہ اگر اُس نے ملزم نہ پکڑے تو اُسے معطل کر کے لائن حاضر کر دیا جائے گا۔

میں چونکہ پولیس میں رہ چکا تھا اس لئے میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کہ انسپکٹر فضل حسین کتنی بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ یہ تو واضح تھا کہ اتنی بڑی واردات کرنے والے معمولی وارداتیے نہیں تھے۔ وہ منجھے ہوئے ڈاکو ہی ہو سکتے تھے۔

اس قسم کے ڈاکوؤں کو پکڑنا تو بعد کی بات ہے اُن تک پہنچنا ہی محال ہوتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ میں اس شخص کی کیا مدد کر سکتا ہوں، لیکن میرے لئے تمام راستے بند تھے۔ میں خود مفرور ملزم تھا۔



چار یا پانچ دن گزر گئے۔ قصبے سے خبریں آتی رہیں۔ بستی سلطان کے ہندو بھی انسپکٹر فضل حسین کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ مسجد میں جو مسلمان نماز پڑھنے آتے تھے اُن سے کوئی نہ کوئی تھانے کی اور تفتیش کی صحیح خبر سنا دیتا تھا۔ خبر یہ تھی کہ انسپکٹر فضل حسین کو ذرا سی بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی اور وہ بہت ہی پریشان تھا۔ ساہوکار کو جو بہت بڑی چوٹ پڑی تھی وہ یہ تھی کہ اُس کی کنواری بیٹی اغوا ہو گئی تھی اور یہ اُس کی عزّت اور آبرو کا مسئلہ تھا۔

میں نے خطیب صاحب سے کہا کہ ہم اس شخص کی کوئی مدد نہیں کر سکتے اور کرنی بھی نہیں چاہیئے۔ جس طرح وہ مسجد میں آکر مجھے اور خطیب صاحب کو دھمکی دے گیا تھا اسے دیکھتے ہوئے ہمیں خوش ہونا چاہیئے تھا کہ وہ خود مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے، لیکن جس طرح ہندو اُس کے پیچھے پڑ گئے تھے یہ دیکھ کر ہم کہتے تھے کہ جو کچھ بھی ہے وہ مسلمان ہے۔

"محترم اُستاد!" ——— میں نے کہا ——— "کیا آپ اُس کے لئے دعا نہیں کریں گے؟ آپ کی دُعا بے اثر نہیں ہو سکتی"۔

"میں اُس کے لئے دعا کر چکا ہوں" ——— انہوں نے کہا ——— "اور یہ رسمی دعا نہیں تھی۔ میں اب بھی اُس کے لئے دعا کرتا ہوں۔ اللہ کی درگاہ میں اُمید ہے کہ میری دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ میں اللہ سے کہتا ہوں کہ اس تھانیدار کی ذات میں میری کوئی دلچسپی نہیں۔ میں کفار کے مُنہ بند کرنے کی دعا مانگتا ہوں"۔

اُسی رات کا واقعہ ہے۔ آدھی رات سے کچھ پہلے میں کسی کی چیخ و پکار سے جاگ اُٹھا۔ اُس رات حبس زیادہ تھا اس لئے میں نے مسجد کے صحن میں بستر ڈال لیا تھا۔ یہ بڑا اچھا اتفاق تھا۔ آنکھ کھلی تو کسی عورت کی چیخ و پکار سنائی دے رہی

تھی۔ رات کی خاموشی میں دوڑتے قدموں کی دھمک بھی سنائی دینے لگی۔ میں اُٹھا اور اس کے ساتھ ہی ایک عورت چیختی چلاتی مسجد کے اندر آ گئی میں دروازے کی طرف آ رہا تھا۔ وہ عورت میرے ساتھ ٹکرائی۔ اُس کے بازو میرے گرد لپٹ گئے اور وہ دوزانو ہو گئی۔

"مجھے ان سے بچالو" —— اُس نے روتے کانپتے اور چلاتے ہوئے کہا —— "انہوں نے مجھے میرے گھر سے اُٹھایا تھا۔ مجھے بھاگنے کا موقع مل گیا ۔۔۔۔"

وہ بول ہی رہی تھی کہ دو تین آدمی مسجد میں آ گئے۔

"مولوی صاحب!" —— ان میں سے ایک نے کہا —— "ہم مسجد کے اندر نہیں آتے۔ اس لڑکی کو باہر نکال دیں۔ یہ پاگل ہے ہماری اپنی لڑکی ہے۔"

"نہیں" —— لڑکی نے میرے ساتھ اور زیادہ لپٹتے ہوئے کہا —— "یہ جھوٹ کہتے ہیں۔ میں سیٹھ نروتم داس کی بیٹی ہوں۔"

سیٹھ نروتم داس وہ ساہوکار تھا جس کے گھر ڈاکہ پڑا تھا اور یہ اُس کی بیٹی تھی جسے واردات میں اغوا کیا گیا تھا۔

مسجد کے دروازے میں چار پانچ آدمی کھڑے تھے۔ لڑکی کے پیچھے دو یا تین آدمی آتے تھے۔ اب یہ چار یا پانچ ہو گئے تھے اور وہ للکار رہے تھے کہ یہ ہندو لڑکی ہے، اسے باہر نکالو۔ میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ ان میں سے ایک آدمی دروازے سے آگے آیا۔ میں اسے جانتا تھا۔ یہ اس گاؤں کا ہندو نمبردار تھا اور اس کے متعلق پتہ چلا تھا کہ زبردست بدمعاش آدمی ہے۔ تھانیداروں کے ساتھ بھی بنا کر رکھتا ہے اور نامی گرامی مجرموں کے ساتھ بھی اُس کی دوستی ہے۔

"مولوی صاحب!" —— اُس نے کہا —— "میں نمبردار ہوں۔ لڑکی کو باہر نکال دو۔ ہم مسجد کے اندر آ گئے تو گاؤں میں دنگا فساد ہو جائے گا۔"

میں نے اُس کی للکار کا یہ جواب دیا کہ لڑکی کو حجرے میں لے گیا۔ وہاں سے رائفل اُٹھائی جس کی میگزین میں ہر وقت پانچ راؤنڈ پڑے رہتے تھے۔

لڑکی کو تسلی دے کر بٹھا دیا اور دروازہ بند کر کے میں مسجد کے دروازے پر آ گیا۔ رائفل دیکھ کر سب پیچھے ہٹ گئے۔ مسجد کے سامنے بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ سب لڑکی کی چیخ و پکار پر جاگے تھے۔

"کسی میں ہمت ہے تو مسجد کے صحن میں قدم رکھے" —— میں نے للکار کر کہا —— "جس کسی کو یہ لڑکی چاہیے وہ تھانے چلا جائے۔ مسجد سے لڑکی نہیں ملے گی۔"

خطیب صاحب بھی دوڑے آئے اور میرے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ میں نے انہیں بڑی تیزی سے بتایا کہ کیا ہوا ہے۔ اُنہوں نے بھی اعلان کیا کہ مسجد سے لڑکی کسی کو نہیں ملے گی۔

یہ کہہ کر خطیب صاحب بڑی تیزی سے اپنے گھر چلے گئے جو بالکل ساتھ ہی تھا۔ ایک دو منٹ بعد واپس آ کر پھر میرے پاس کھڑے ہو گئے۔ اب فضا یہ بن گئی تھی کہ ہندوؤں نے کچھ بھی سمجھے بغیر اس مسئلے کو ہندو مُسلم کشیدگی کا رنگ دے دیا تھا۔ ہندو کہہ رہے تھے کہ مسلمانوں نے ایک ہندو لڑکی کو مسجد میں چھپا لیا ہے اور مسلمان اس بات پر مشتعل ہو رہے تھے کہ ہندو مسجد میں داخل ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ خطیب صاحب نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ انہوں نے ایک آدمی کو گھوڑی دے کر تھانے بھیج دیا ہے۔

"تم اندر چلے جاؤ" —— خطیب صاحب نے سرگوشی کی —— "رائفل اندر کہیں چھپا دو ۔۔۔۔ اندر والے کمرے میں صف کے نیچے رکھ دو اور واپس آ جاؤ۔"

میں نے ایسے ہی کیا۔



ایسے لگا جیسے خطیب صاحب نے جس آدمی کو تھانے بھیجا تھا وہ اُڑتا ہوا گیا تھا اور انسپکٹر مفضل حسین بھی جیسے اُڑتا ہوا پہنچا۔ وہ گھوڑا سرپٹ دوڑاتا آ رہا تھا۔ انسپکٹر مفضل حسین نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کشادہ گلی میں لوگوں کا ہجوم ہے اور کوئی آدمی اُس کے گھوڑے کے نیچے آ جائے گا۔ اُس وقت تک

صورتِ حال بہت ہی کشیدہ ہو چکی تھی۔ میں جانتا تھا کہ دنگا فساد بپا کرنے میں ہندو پہل کریں گے اور پھر سارا الزام مسلمانوں پر تھوپ دیں گے۔ وہ ہندوؤں کی اکثریت کا علاقہ تھا۔

انسپکٹر فضل حسین گھوڑے سے اُترا۔ مسجد کچھ اُونچی تھی۔ دروازے کے سامنے پانچ چھ سیڑھیاں تھیں۔ وہ ایک ہی بار پانچ چھ سیڑھیاں پھلانگ کر دروازے میں آگیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میری آنکھ کس طرح کھُلی اور کیا ہُوا ہے۔

"مجھے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی" ——— میں نے انسپکٹر فضل حسین سے کہا ——— "لیکن آپ کو ہندوؤں کی یلغار سے بچانے کے لئے اور آپ کو مسلمان سمجھ کر میں نے یہ خطرہ مول لیا ہے۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام جانے"

"تم اندر چلے جاؤ" ——— انسپکٹر فضل حسین نے کہا ——— "مسجد کے اندر سے مولوی صاحب کے گھر تک جا سکتے ہو تو چلے جاؤ۔ تم سب انسپکٹر رہے ہو۔ میری بات سمجھتے ہو گے۔ یہاں سے غائب ہو جاؤ"

میں اُس کی ساری سکیم سمجھ گیا۔ میں اندر گیا۔ ایک طرف سے مسجد کی دیوار پر چڑھا۔ وہاں سے ساتھ والی چھت پر چڑھ گیا۔ اس چھت سے آگے خطیب صاحب کا مکان تھا۔ میں اس کے صحن میں کُود گیا۔

میں بڑی لمبی تفصیلات کو ذرا مختصر کر کے سناتا ہوں۔ تفصیلات جو ہیں وہ پولیس کی کارروائیاں ہیں۔ یہ سُن کر آپ کیا کریں گے۔ یہ مجھے صبح معلوم ہوئیں۔ انسپکٹر فضل حسین نے لڑکی کو برآمد گی کے قاعدے قانون کے مطابق حُجرے سے برآمد کیا اور ظاہر یہ کیا کہ لڑکی نے مسجد میں پناہ لی تو خطیب صاحب نے اُسے حُجرے میں چھُپا دیا۔ اس سارے سلسلے میں رائفل کا کہیں ذکر نہ کیا گیا۔ معلوم ہُوا کہ لڑکی اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ اُس نے خطیب صاحب کو دیکھ کر کہا کہ یہی وہ مولوی صاحب تھے جنہوں نے اُسے پناہ دی تھی۔

رات ہی رات یہ بات صاف ہو گئی کہ لڑکی رات کو جس گھر سے بھاگی

تھی، اس کی اُس نے نشاندہی کی۔ یہ بستی سلطان کے ہندو نمبردار کا گھر تھا۔ لڑکی کو اغوا کر کے اس گھر کے ایک خفیہ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ اُسے اغوا کی رات ہی یہاں لے آئے تھے۔ نمبردار کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اُس نے بہت شور مچایا کہ لڑکی مسجد کے حُجرے سے برآمد ہوئی ہے اور اُسے لڑکی کے اغوا وغیرہ کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ اُس کی اس بات کو رد کرنے والی شہادت بہت تھی۔

ہندوؤں نے تھانے میں یہ بات بھی پہنچائی کہ ایک مولوی رائفل لے کر مسجد کے دروازے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ انسپکٹر فضل حسین نے واردات کی ایک اہم کڑی پکڑ لی تھی۔ اب اس کا پاؤں سب کے سروں پر آگیا تھا۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ جس شہادت کو چاہتا رد کر دیتا اور جو شہادت اُسے موزوں لگتی اُسے قبول کر لیتا۔

وہ دن بھی گزر گیا۔ میں خطیب صاحب کے گھر میں چھُپا رہا۔ میں مطمئن نہیں تھا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ ابھی پولیس آئے گی اور مجھے اور خطیب صاحب کو گرفتار کر کے لے جائے گی۔ مجھے خطیب صاحب کی زبانی خبریں مل رہی تھیں۔ اگلے روز یہ خبر ملی کہ نمبردار کی گرفتاری اور لڑکی کی برآمد گی کی اطلاع پولیس کپتان کو پہنچی تو وہ فوراً تھانے پہنچ گیا۔ پھر پولیس کپتان نمبردار کا گھر دیکھنے کے لئے آیا۔ لڑکی اُس کے ساتھ تھی۔ وہ مسجد میں بھی آیا۔ میں خطیب صاحب کے گھر میں بیٹھا ڈرتا رہا اور مجھے اطلاع ملی کہ پولیس کپتان اور انسپکٹر فضل حسین نمبردار کے ایک اور ساتھی کو گرفتار کر کے چلے گئے ہیں۔ میری رائفل اُسی رات جس رات لڑکی مسجد میں آئی تھی خطیب صاحب کے گھر میں پہنچ گئی تھی۔ اسے میں نے مسجد کے اندر والے کمرے میں ایک صف کے نیچے چھپایا تھا۔

پولیس کی کارروائیوں کا جو تھانے میں ہو رہی تھیں، باہر کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ واردات کے جو دوسرے پہلو تھے وہ خطیب صاحب کی زبانی معلوم ہو گئے تھے۔ سب کہتے تھے کہ نمبردار کی اُس ساہوکار کے ساتھ کوئی دشمنی تھی۔ دشمنی یہ بتائی گئی کہ نمبردار نے کچھ سال

پہلے ساہوکار سے کچھ رقم اُدھار لی اور اپنی کچھ زمین رہن رکھی تھی۔ ساہوکار اتنے سال وصولیاں کرتا رہا۔ آخر میں اُس نے نمبردار کی زمین اپنے نام کروا لی اور نمبردار سے کہا کہ قرض کی اصل رقم ابھی تک باقی ہے اور وہ جو ادائیگی کرتا رہا ہے وہ سُود تھا۔ اس پر ان دونوں کا جھگڑا ہُوا تھا۔ ساہوکار کو اندازہ نہیں تھا کہ نمبردار انتقام میں کس حد تک پہنچ سکتا ہے۔ نمبردار نے جب انتقامی وار کیا تو وہ تمام حدیں پھلانگ گیا۔

واردات ایک تجربہ کار ڈاکو کے گروہ سے کروائی گئی تھی۔ نمبردار نے صرف لڑکی کو اپنے پاس رکھا تھا۔ باقی تمام مال ڈاکوؤں کے حصے میں آیا تھا۔ گھر بھیدی نمبردار نے دیا تھا۔ یہ اُس کا بھیجا ہُوا نوکر تھا۔ ساہوکار نے پولیس کو بتایا تھا کہ نمبردار نے اُسے دھمکی دی تھی کہ قرض کی رقم ادا ہو چکی ہے۔ اس پر لکیر پھیر دو اور زمین کے کاغذات مجھے دے دو ورنہ زمین کے بدلے تمہاری کنواری بیٹی اُٹھوا دوں گا۔

معلوم ہوتا ہے ساہوکار نے یہ بات پولیس کو پہلے نہیں بتائی۔ اگر بتاتی ہوتی تو پولیس اسی بات پر نمبردار کو پکڑ لیتی۔ ہو سکتا تھا کہ نمبردار نے ایسی دھمکی دی ہی نہ ہو۔ جو لوگ دھمکیوں کو عملی رنگ دے سکتے ہیں وہ دھمکیاں دیا نہیں کرتے وہ چُپ رہتے ہیں اور پتہ اُس وقت چلتا ہے جب وہ انتقامی ارادے پورے کر چکے ہوتے ہیں۔

یہ تو اس واردات کی اور اس کی تفتیش کی اور اس کی نشاندہیوں کی تفصیلات ہیں جن میں سے کچھ مجھے معلوم ہوئیں کچھ معلوم نہ ہو سکیں۔ میری دلچسپی اس پر تھی کہ میں محفوظ ہوں یا نہیں۔ خطیب صاحب مجھے مسلسل تسلیاں دیتے جا رہے تھے۔ مجھے صرف یہ بات پریشان کرتی تھی کہ ہندوؤں نے میری رائفل دیکھ لی تھی۔ اتنا سا فائدہ ضرور حاصل ہُوا تھا کہ چاندنی تو تھی، لیکن چاند ذرا نیچے تھا۔ پھر مجھے تھوڑی سی تسلی اس سے ہوتی تھی کہ انسپکٹر فضل حسین نے خود مجھے وہاں سے کھسکا دیا تھا اس لیے میں یہ سمجھتا تھا کہ اُس کی نیت اور ارادے میرے حق میں ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوؤں کی

اس بات کو پولیس کپتان نے بھی قبول نہیں کیا تھا کہ ایک مولوی رائفل لے کر مسجد کے دروازے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ پولیس کپتان سے اس وجہ سے اسے ایک جھوٹا الزام سمجھا ہو گا کہ وہ جانتا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے خلاف بے بنیاد الزامات گھڑ کر کارروائیاں کرتے ہی رہتے ہیں۔



ایک رات جب میں اور خطیب صاحب سوتے ہوتے تھے، دروازے پر دستک ہوتی۔ خطیب صاحب کے ایک شاگرد نے دروازہ کھولا اور اندر آ کر اطلاع دی کہ تھانیدار صاحب آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں بہت پریشان ہُوا۔ خطیب صاحب باہر گئے اور انسپکٹر فضل حسین کو ساتھ لے کر اندر آ گئے۔

"کیا اب میری باری ہے؟" — میں نے انسپکٹر فضل حسین سے پوچھا۔

"نہیں سکندر!" — اُس نے جواب دیا — "کیا تم ایک مسلمان پولیس آفیسر کی حیثیت سے نہیں سمجھ سکتے کہ تم نے مجھے کس جال میں سے نکالا ہے؟ میری تو نوکری جا رہی تھی۔ بعید نہ تھا کہ مجھے اعانتِ جُرم میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جاتا۔ ہندوؤں نے اُوپر جا کر مجھ پر جو دباؤ ڈلوایا تھا اور جو دھمکیاں دی تھیں وہ میری برداشت سے باہر ہو گئی تھیں۔ تم نے مجھ پر بہت بڑا کرم کیا ہے۔ تم خود مفرور ملزم ہو۔ تمہارے دل میں یہ ڈر ہونا چاہیے تھا کہ تم پکڑے جاؤ گے۔ تم یوں کرتے کہ لڑکی جب چیختی چلاتی مسجد میں آئی تھی تم اُسے اُٹھا کر باہر پھینک دیتے اور مسجد کا دروازہ بند کر دیتے، لیکن تم نے میری خاطر اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دیا۔"

"لڑکی وہاں سے نکلی کیسے تھی؟" — میں نے پوچھا۔

"نمبردار کو خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ لڑکی اُس کے گھر میں پکڑی جائے گی" — فضل حسین نے جواب دیا — "اُس نے اُس رات دو آدمی اُس کام کے لیے بلاتے تھے کہ وہ لڑکی کو اپنے گاؤں میں لے جائیں۔ اگر لڑکی وہاں پہنچا دی جاتی تو پھر اُس کی برآمدگی ناممکن ہو جاتی۔ لڑکی کو جب نمبردار کے

گھر سے نکالا جا رہا تھا تو دروازہ کھلا دیکھ کر اُسے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ وہ گولی کی طرح وہاں سے نکلی اور باہر آکر چیخنے چلانے لگی۔ آگے جو کچھ ہوا وہ تمہیں معلوم ہے ....ہندوؤں نے تمہاری رائفل پر بہت شور مچایا تھا۔ میں نے ڈی ایس پی کو بتایا تھا کہ ہندو اِس سارے مسئلے کا رنگ بدلنا چاہتے ہیں۔"

"اب بتایئے" — میں نے پوچھا — "میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں" — فضل حسین نے جواب دیا — "تم ابھی نکل جاؤ ....خطیب صاحب! اب اسے نہ روکنا۔ میں اسے ایسی جگہ بھیج رہا ہوں جہاں اسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔"

وہ مجھے جہاں بھیج رہا تھا وہ چھوٹا سا ایک گاؤں تھا اور وہاں ان کے مربعے تھے جو انگریزوں نے اُس کے باپ کو انعام کے طور پر دیئے تھے اور وہیں کچھ زمین انہوں نے خود خریدی تھی۔ جب اُس نے اُس جگہ کا نام لیا تو میں نے اُسے بتایا کہ یہ میرے آبائی گھر سے بمشکل اسّی میل دُور ہے۔

"ہاں" — اُس نے کہا — "وہاں تمہیں میرے دو چھوٹے بھائی ملیں گے۔ میں تمہیں ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں۔ اس میں صرف اشارہ ہوگا۔ باقی اپنے متعلق سب کچھ میرے بھائیوں کو بتا دینا۔ پھر میں کبھی چھٹی آؤں گا یا مظفر چھٹی آئے گا تو تمہارا کچھ نہ کچھ انتظام کر دیں گے۔ وہاں تم بالکل محفوظ رہو گے۔ اُس گاؤں میں اور ارد گرد کے علاقے پر یوں سمجھ لو کہ میرے بھائیوں کی حکومت ہے۔ وہاں تک پہنچنا اور راستے میں پہچانے نہ جانا تمہارا کام ہے۔"

اُس نے خطیب صاحب سے کاغذ قلم لیا اور اپنے دونوں بھائیوں کے نام مختصر سا رقعہ لکھ دیا۔ اس میں اُس نے لکھا کہ یہ میرا اپنا عزیز ہے۔ یہ تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔

"رائفل ساتھ نہ لے جانا" — فضل حسین نے کہا — "اسے راستے میں چھپا نہیں سکو گے۔ یہ خطیب صاحب کے گھر میں رہے گی۔ ان پر کوئی بھی شک نہیں کر سکتا۔"

وہ مجھے کچھ اور باتیں بتا کر چلا گیا۔ رات کو ایک مسافر گاڑی تھلے والے قصبے کے سٹیشن پر رُکتی تھی۔ انسپکٹر فضل حسین بتا گیا تھا کہ اس گاڑی کے آنے میں کم و بیش ایک گھنٹہ باقی ہے۔ میں اُسی وقت روانہ ہو گیا۔ خطیب صاحب سے جس طرح میں رخصت ہوا وہ ایسے ہی تھا جیسے ایک بچے کو اُس کے ماں باپ سے چھین کر زبردستی کہیں لے جایا جا رہا ہو۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں اُن کی گھوڑی پر سٹیشن تک چلا جاؤں اور وہ گھوڑی واپس لانے کے لئے میرے ساتھ جائیں گے لیکن میں نے انہیں اتنی زحمت دینا مناسب نہ سمجھا۔ میں سٹیشن پہ اُس وقت پہنچا جب گاڑی سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے اُن پیسوں سے ٹکٹ لیا جو انسپکٹر فضل حسین مجھے دے گیا تھا۔

یہ ایک دن اور ایک رات کا سفر تھا۔ میں اُس شہر سے بھی گزرا جہاں سپیشل برانچ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اگلے روز شام کے وقت ریل گاڑی نے مجھے اُس شہر سے گزارا جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے آپ کو یہ نہیں سنایا کہ میرے دل پر اس سفر کے دوران کیسی کیسی چوٹیں پڑیں۔ مثلاً گاڑی جب میرے اپنے شہر کے سٹیشن پر رُکی تھی تو میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گاڑی میں بٹھائے رکھا تھا۔ میرے اندر سے اُٹھی ہوئی کوئی قوت مجھے باہر کو دھکیلتی تھی۔ اپنے گھر جانے کو دل تڑپتا تھا۔ جب گاڑی چلی تو مجھے بڑی اذیت کا سامنا ہوا جیسے مجھے زبردستی گھسیٹ کر لے جایا جا رہا ہو۔

میں آخری سٹیشن پر جا اُترا۔ وہاں سے ایک برانچ لائن گاڑی میں سوار ہوا اور جب انسپکٹر فضل حسین کے بتائے ہوئے گاؤں پہنچا تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ فضل حسین کے بھائیوں نے رقعہ دیکھ کر میری آؤ بھگت کی۔ وہ تو بہت ہی اچھے آدمی تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہم بڑے زمانے کے دوست ہیں۔ باقی جو رات رہ گئی تھی ہم نے باتیں کرتے گزار دی۔ میں نے اُنہیں اپنی ساری کہانی سُنا دی۔

"پروا نہ کر یار!" — فضل حسین کے ایک بھائی نے کہا — "یہاں تمہیں پکڑنے کوئی نہیں آئے گا۔"

انسپکٹر فضل حسین کا سب سے چھوٹا بھائی مجھ سے دو تین سال ہی چھوٹا تھا۔ ساری بات سُن کر اُس نے کہا کہ میرے آبائی شہر کے ساتھ اُس کی رشتہ داری ہے۔

"کیسی رشتہ داری؟" —— میں نے پوچھا۔

"میری بیوی وہاں کی رہنے والی ہے" —— اُس نے کہا اور چونک کر بولا —— "تمہارا نام سکندر ہے۔ کیا تم اونچی مسجد والے محلّے کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں" —— میں نے جواب دیا۔

"کیا قدیر احمد نام کے تمہارے کوئی خالو ہیں؟" —— اُس نے پوچھا۔

"میرے ایک ہی خالو ہیں" —— میں نے جواب دیا —— "اور اُن کا نام قدیر احمد ہی ہے۔"

"اُن کی بیٹی میری بیوی ہے" —— اُس نے کہا۔

"کون؟" —— میں نے چونک کر پوچھا —— "عذرا؟"

"ہاں" —— اُس نے جواب دیا —— "عذرا میری بیوی ہے، لیکن تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔ ہماری شادی اُس طرح نہیں ہوئی تھی جس طرح شادیاں ہوتی ہیں یعنی ہمارے بزرگ اس شادی میں شریک نہیں تھے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں اور کوئی مجھے ایسی بات سنا رہا ہے جس کا سر پیر ہی نہیں۔ بہت دیر تک میرے مُنہ سے بات ہی نہ نکل سکی۔

صبح طلوع ہو گئی تھی۔ انسپکٹر فضل حسین کا چھوٹا بھائی اندر گیا۔ تھوڑی دیر بعد میری خالہ زاد عذرا آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ جہاں تھی وہیں بُت بن گئی۔ مجھ پہ سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر عذرا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دھندلی راہیں

ایک آپ بیتی، طلسمِ ہوشربا، خونچکاں، ولولہ انگیز!



وقاص

پیش لفظ

"دھندلی راہیں" کا چوتھا اور آخری حصہ حاضر ہے۔
سچ کہئے، کیا ہمارا یہ دعویٰ غلط ہے کہ آپ یہ کہانی پڑھنے بیٹھ گئے تو پوری پڑھ کے ہی چھوڑیں گے؟

اس کہانی کے پہلے دو حصے قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے تو خطوط آنے لگے کہ یہ کہانی حقیقت ہے یا افسانہ!... ہم نے ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں دیا نہ کوئی صحیح جواب دیا جا سکتا ہے۔ یہ کہانی حقیقت بھی ہے افسانہ بھی۔ یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے حقیقت میں افسانے کی یا افسانے میں حقیقت کی ملاوٹ کی ہے۔ بات یہ ہے کہ انگریزوں کے دورِ حکومت کے جو خواتین و حضرات زندہ ہیں اور ان میں سے جنھوں نے دوسری جنگِ عظیم سے پہلے کا دور دیکھا ہے، اُن کے لیے یہ کہانی حقیقت زیادہ اور افسانہ کم ہے، اور پاکستان میں پیدا ہوئے والے لوگ اسے حقیقت کم اور افسانہ زیادہ سمجھیں گے کیونکہ آج وہ معاشرتی اقدار نہیں رہیں نہ وہ انسانی کردار رہا ہے۔ آج کا دور ملاوٹ کا دور ہے۔ صرف اشیائے خورد و نوش میں ہی نہیں، تہذیب و تمدن اور کلچر میں بھی ملاوٹ ہو گئی ہے اور لوگوں کے دین و ایمان اور کردار بھی خالص نہیں رہے۔ باتوں میں تصنّع اور دل میں مفاد پرستی ہے۔ پیار پیسے سے ہے انسانوں سے نہیں۔ بھائی بھائی کو فریب دے رہا ہے اور بیٹا باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ پذیرائی اُس کی ہے جس کے پاس پیسہ ہے۔ پیسہ نہیں تو قدر و منزلت بھی نہیں۔

یہ اُس دور کی کہانی ہے جب ڈاکوؤں اور رہزنوں میں بھی اخلاقی اور معاشرتی قدروں کی پاسداری ہوتی تھی۔ آج اخلاق اور اقدار کے علمبردار ڈاکو

اور لُٹیرے ہیں۔ جذبہ ایثار جو اُس دَور میں تھا وہ قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ آج بنی نوع انسان کی محبت اور جذبہ ایثار کا تصور ہی ناپید ہے۔

اچھے وقتوں کی حقیقت آج افسانہ لگتی ہے۔ آج کے لوگ نیکی اور بدی کی کشمکش کو سمجھ ہی نہیں سکتے کیونکہ آج بدی نے نیکی کے جذبوں کو نگل لیا ہے۔ اس کہانی میں آپ نے یہی کشمکش دیکھی ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ ہمیشہ جیت نیکی کی ہوئی۔ اب آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

اس کہانی کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ بے محل اور غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صحیح تبصرہ تو پڑھنے والے کریں گے۔ ہم آپ کے اور کہانی کے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں۔

اتنی سی درخواست ضرور کریں گے کہ کہانی آپ کو اچھی لگے تو اپنے دوستوں کو ضرور بتائیے گا۔

عنایت اللہ
مدیر "حکایت" لاہور

میں ساری رات کا جاگا ہُوا تھا۔ عذرا کو دیکھ کر میری نیند اور بھوک اُڑ گئی تھی، لیکن اپنے میزبانوں کے کہنے پر میں لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی ایسی آنکھ لگی کہ سارا دن سوتے گزر گیا۔ جب میں اُٹھا تو فضل حسین کے دونوں بھائی مجھے اپنی کھیتیاں دکھانے کے لئے باہر لے گئے۔

ان کا گھر بہت بڑی حویلی تھی۔ یہ حویلی گاؤں سے کچھ ہٹ کر تھی۔ وہیں سے ان کی کھیتیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ کچھ دُور ایک بڑا خوبصورت باغ تھا جس میں رہٹ لگا ہُوا تھا اور وہاں بھی چھوٹا سا ایک مکان بنا ہُوا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ اس قدر زیادہ اراضی اور وہ بھی اتنی زرخیز اراضی ہونے کے باوجود فضل حسین خود بھی نوکری کر رہا تھا اور اُس نے اپنے بیٹے کو بھی پولیس میں بھرتی کروا دیا تھا۔ یہ دراصل اُس زمانے کا دستور تھا۔ لوگ فوج اور پولیس کی نوکری کو پسند کرتے تھے۔ انہیں تنخواہ کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ عہدے حاصل کرنے کے لئے بھرتی ہوتے تھے۔

عذرا کے خاوند کا نام منور حسین تھا۔ وہ فضل حسین کا سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ اس سے بڑے کا نام تجمل حسین تھا۔ وہ دونوں میرے ساتھ تھے اور مجھے اراضی، ساتھ والے گاؤں اور وہاں کی مختلف شخصیتوں کے متعلق تفصیلات سُنا رہے تھے۔ میں ویسے ہی ہوں ہاں کرتا جا رہا تھا۔ میرے ذہن پر عذرا سوار تھی۔ مجھے ایسا افسوس نہیں تھا کہ وہ اس شخص کی بیوی بن گئی تھی۔ مجھے خوش ہونا چاہیئے تھا کہ میری خالہ زاد بہن اتنے بڑے زمینداروں کے گھر بیاہی گئی تھی۔ ان کے مقابلے میں ایوب کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی، لیکن مجھے یہ سوچ پریشان کر رہی تھی کہ عذرا کی شادی اس نوجوان امیرزادے کے ساتھ ہوئی کیسے۔ میں خود منور سے پوچھنا نہیں چاہتا تھا کہ یہ شادی کیسے ہوئی اور میں

محسوس کر رہا تھا کہ منور اس موضوع سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس کا خیال ہوگا کہ میں شاید بُرا مناؤں گا۔ میرے اس سوال کا جواب عذرا ہی دے سکتی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ عذرا مجھے تنہائی میں مل سکے گی یا نہیں۔

ٹہلتے ٹہلتے ہم باغ میں جا پہنچے۔ اس باغ میں پھلوں کے درخت تھے اور وہاں سبزیاں اُگائی جاتی تھیں۔ منور کا بڑا بھائی تجمل ذرا پرے کسی کام سے چلا گیا۔

"سکندر بھائی!" — منور نے مجھ سے پوچھا — "عذرا تمہاری منگیتر تھی؟"

"کبھی تھی" — میں نے اس طرح جواب دیا جیسے میری آہ نکل گئی ہو۔

"پھر تم نے اُس کے ساتھ شادی کیوں نہ کی؟"

"میں نے تمہیں اپنی زندگی کی ساری کہانی رات کو سنائی تھی" — میں نے جواب دیا — "زندگی سے طبیعت کچھ ایسی اچاٹ ہوتی کہ میں محسوس کرتا تھا کہ عذرا کو میں خوش نہیں رکھ سکوں گا۔ پھر میں مفرور ملزم ہو گیا۔ شادی کر لیتا تو اسے کہاں لئے پھرتا!"

"میرا خیال ہے یہ لڑکی تمہیں اچھی نہیں لگی" — منور نے کہا۔

"نہیں" — میں نے جواب دیا — "میرے راستے میں ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت لڑکی آئی ہے لیکن شادی کے لئے عذرا سے بہتر کوئی اور لڑکی نہیں دیکھی ... تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو" — منور نے کہا — "اس سے بہتر اور کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی۔"

"منور یار!" — میں نے شگفتہ سے لہجے میں پوچھا — "یہ شادی ہوتی کیسے؟"

"ہو گئی بھائی!" — اُس نے مسکراتے ہوئے کہا — "عذرا سے سُن لینا۔"

"لیکن تم نے کہا تھا کہ تمہاری شادی میں بزرگ شامل نہیں ہوتے تھے" — میں نے کہا۔

"عذرا سے سُن لینا سکندر بھائی!" — اُس نے کہا — "میں اپنی زبان سے بیان کرتا اچھا نہیں لگتا۔"

میں سمجھ نہ سکا کہ یہ نوجوان شرما رہا ہے یا کوئی خاص بات ہے جو وہ عذرا کی زبان سے ہی کہلوانا چاہتا ہے۔ اس لڑکے کے متعلق میری رائے یہ تھی کہ شرمانے والا نہیں۔ میں اُس میں وہ خود اعتمادی اور جرأت دیکھ رہا تھا جو دیہاتی علاقے میں بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کے بیٹوں میں ہوتی ہے۔ بعض میں خود اعتمادی اور جرأت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ مزارعوں اور دیگر لوگوں کے "خدا" بن جاتے ہیں۔ منور کے دماغ میں اِس جرأت کا کیڑا مجھے نظر آ رہا تھا۔ اسے رعب اور دبدبہ کہتے ہیں۔

تجمل واپس آگیا اور ہم گھومتے پھرتے رہے۔ وہ میرے لئے اجنبی تھے اور میں اُن کے لئے اجنبی تھا بلکہ اُن کے لئے بڑا دلچسپ اور سنسنی خیز اجنبی تھا۔ میں نے رات کو انہیں اپنی زندگی کی ساری داستان سُنا ڈالی تھی۔ وہ اب مجھ سے ایک ایک واقعہ کی تفصیل الگ الگ سُنتے تھے۔ میں انہیں اپنی ہی باتیں سُنا سُنا کر اُکتا گیا تھا۔

میرے دماغ پر دو خیال بُری طرح غالب آتے ہوتے تھے۔ ایک خیال عذرا کا تھا جو ایک سوال تھا کہ منور کے ساتھ اس کی شادی کس طرح ہوتی، اور دوسرا خیال بھی ایک سوال ہی تھا کہ میں یہاں کب تک رہوں گا اور کیا میں یہاں محفوظ رہوں گا؟

آپ نہیں سمجھ سکتے۔ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اس مفرور قاتل کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہے جس کی گرفتاری پر دس ہزار روپیہ انعام مقرر ہو اور اُس کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہ ہو اور جس کی گرفتاری کا مطلب ہو پھانسی۔ ایک پتا ہلتا ہے تو مفرور بدک جاتا ہے کہ پولیس آگئی ہے۔ میں نے کئی بار کہا ہے کہ موت کا مجھے ڈر نہ تھا۔ اس زندگی سے تو بہتر تھا کہ میں مر جاتا لیکن میں نے انگریزوں کا چیلنج قبول کر لیا تھا۔ مجھ میں ڈھیٹ پن تھا۔ اسے میں خودداری، غیرت اور وقار کہتا تھا۔ یہ میرا عزم تھا کہ میں اپنی آزادی پر کسی کو ہاتھ نہیں ڈالنے

دوں گا اور مقابلے کے بغیر شکست تسلیم نہیں کروں گا، اور ایک عزم یہ بھی تھا کہ اپنے ملک کے لئے کچھ کر کے مروں گا۔ اگر ملک کے لئے نہیں تو کسی مجبور اور مظلوم انسان کی نجات پر جان دوں گا۔

یہ تو میری سوچیں اور میرے عزم تھے۔ مجھے احساس تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اکیلے تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ایک گروہ کی ضرورت تھی۔ ہندوستان میں گروہ موجود تھے لیکن انہیں ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں اپنا گروہ بناتا لیکن دہشت گردی کے لئے خاص قسم کے آدمیوں کی ضرورت تھی جیسے میں تھا جس کا کوئی آگے تھا نہ پیچھے تھا۔ اس کام میں جوشیلے اور جذباتی آدمی نہیں چل سکتے تھے۔ ٹھنڈے مزاج والے دلیر آدمیوں کی ضرورت تھی جو عقل سے کام لینے والے آدمی ہوتے۔

انسپکٹر فضل حسین کے بھائیوں میں یہ رمق نہیں تھی۔



دوپہر کے بعد کھانا کھا کر تجمل اور منور کسی کام سے چلے گئے تھے کہ شام کو واپس آئیں گے۔

مجھے انہوں نے الگ کمرہ دے دیا تھا۔ جی میں آتی تھی کہ باہر نکل جاؤں اور فصلوں کی ہریالی کے سمندر میں تیرتا پھروں۔ دُور اُفق کا گول دائرہ نظر آرہا تھا۔ اُوپر آسمان کی شفاف نیلاہٹ، نیچے اُفق تک فصلوں اور درختوں کا سبزہ زار۔ کائنات کا حُسن نکھرا ہوا تھا۔ میں اکیلا باہر جا سکتا تھا مگر احتیاط لازمی تھی۔

میں نے اپنے آپ کو کمرے میں بند رکھا اور میرے دل پر بوجھ سا آپڑا۔ مجھ میں قید کا بڑا ہی تلخ احساس بیدار ہو گیا اور مجھے افسوس ہونے لگا کہ مجھے کائنات کے حُسن سے لُطف اندوز ہونے سے محروم کر دیا گیا ہے۔

میں پنجرے میں بند ایک پنچھی تھا۔

پنجرے کا دروازہ کھلا تھا مگر میرے بال و پر نُچے ہوتے تھے۔

میں سوچوں کی تلخیوں میں تڑپنے لگا۔ اسی جذباتی کیفیت میں عذرا کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔

اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور یہ مسکراہٹ اُداس تھی۔

"تم میرے پاس بیٹھ تو نہیں سکو گی عذرا!" — میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں بیٹھ سکوں گی!" — اُس نے کہا — "میں تمہارے پاس تھوڑی دیر بیٹھنے ہی آئی ہوں۔"

اُس کی آواز بوجھل تھی۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے اُس نے بوجھ اُٹھا رکھا ہو۔ وہ میرے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"تم خوش نہیں ہو" — میں نے کہا — "تمہیں یہ آدمی پسند نہیں یا یہ جگہ تمہیں اچھی نہیں لگتی؟"

"آدمی بھی اچھا ہے جگہ بھی دل کو اچھی لگتی ہے" — اُس نے کہا — "لیکن .... سکندر ا...." اُس نے سر جھکا لیا۔ میں چپ چاپ اُسے دیکھتا رہا۔

اُس نے دھیمی سی آواز میں کہا — "میں خواب کچھ اور دیکھتی رہی ہوں۔"

میں سمجھتا تھا وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اُس نے اپنے آپ پر یہ ظلم کیا تھا کہ خوابوں میں مجھے دیکھتی رہی تھی، اور یہ اُس کی بدنصیبی تھی کہ اُس نے اس حقیقت کو قبول نہیں کیا تھا کہ سکندر اب خواب و خیال کی دنیا میں گم ہو گیا ہے اور جب کبھی ملے گا خوابوں میں ہی ملے گا۔

عذرا کو معلوم نہیں تھا کہ اُسے میری لاش بھی نہیں مل سکے گی۔ میں نے پولیس یا فوج کی گولی سے مارے جانا تھا یا میری لاش پھانسی کے تختے سے اُتاری جانی تھی۔ انگریز حاکموں کا دستور تھا کہ باغیوں اور دہشت گردوں کی لاشیں وارثوں کو نہیں دیتے تھے۔ دفن بھی نہیں کرتے تھے۔ جلا کر راکھ کر دیتے تھے۔

کسی اور جگہ کسی اور وجہ سے مرنے کی صورت میں میری لاش کی قیمت دس ہزار روپے تھی۔ کوئی ہوشیار اور چالاک آدمی میری لاش تھانے لے جا کر دس ہزار روپے کا حقدار بن سکتا تھا۔

"میں جانتا ہوں عذرا!" — میں نے کہا — "میں جانتا ہوں تم کیا چاہتی تھیں اور کیا ہو گیا ہے لیکن یہ کیسے ہُوا!"

عذرا کو بھی منظور تھا" — اُس نے کہا — "میں مجبور تھی۔ تم جانتے ہو کہ میرے دل میں صرف تم تھے لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا یا تم نے حالات کو ایسا اُلٹایا کہ میں تمہاری صورت دیکھنے کو بھی ترس گئی" — وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی اور اُس کی آواز غم سے بوجھل تھی۔ وہ کہہ رہی تھی — "اُس وقت کی باتیں کیا سناؤں جب پولیس ہمارے پیچھے پڑ گئی تھی۔ کبھی ہم سب کو تھانے بلا لیا جاتا اور کبھی تھانیدار تین چار سپاہیوں کو لے کر ہمارے گھر آجاتا۔ وہ ہمیں ڈراتا تھا اور بے عزتی کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ بتاؤ سکندر کہاں ہے"

"پھر کیا ایسے نہیں ہوا تھا کہ پولیس نے اچانک تمہیں پریشان کرنا چھوڑ دیا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"ہاں" — اُس نے کہا — "ایوب نے ہمیں بتایا تھا کہ تم آئے تھے اور تم نے تھانیدار کو ڈرایا تھا۔ تم پکڑے بھی گئے تھے"

"جانے دو عذرا!" — میں نے اُکتاہٹ سے کہا — "چھوڑو اُس وقت کی باتوں کو۔ مجھے اپنی بات سناؤ"

"یہ جانتے ہوئے کہ تم مجھے نہیں مل سکو گے میں تمہیں دل سے نہیں اتار سکی" — عذرا نے کہا — "امی تمہارے لئے بہت روتی تھی۔ کہتی تھی کہ سکندر مجھے ملے تو میں اُسے اپنے سینے میں چھپا لوں .... لیکن سکندر! یہ تو جذبات کی باتیں تھیں، حقیقت یہ تھی کہ میری شادی ہونی چاہئے تھی۔ تمہارے ساتھ تو ہو نہیں سکتی تھی۔ امی نے عورتوں کو کہہ دیا کہ عذرا کی شادی سکندر کے ساتھ نہیں ہوگی ....

"امید تھی کہ ایک ہی بار دو تین رشتوں کے پیغام آجائیں گے مگر کوئی بھی نہ آیا۔ عورتوں نے ہمیں بتایا کہ لوگوں نے ہمیں شریف آدمی سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ کہتے تھے کہ لڑکی تھانے میں جاتی رہی ہے اور تھانیدار ان کے گھر آتا رہا ہے .... تم سمجھتے ہونا، سکندر!"

"ہاں عذرا!" — میں نے کہا — "میری وجہ سے تم بدنام ہو گئی تھیں"

"خدا کی قسم سکندر!" — عذرا نے کہا — "جب لوگوں نے مجھے بدنام کر دیا اور یہ بھی دیکھا کہ وہ عورت جو میری امی کو کہتی رہتی تھی کہ سکندر اب ادھر نہیں آئے گا، عذرا مجھے دے دو، اُس نے بھی ہمارے گھر آنا چھوڑ دیا تو میں خوش ہوئی کہ میری شادی ہوگی ہی نہیں .... میں تو خوش تھی لیکن ابو اور امی کو میرا غم کھانے لگا ....

"ایوب ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔ اُس نے ہر روز آنا شروع کر دیا۔ اُس نے میری امی سے کہا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ امی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی نے تو میری خواہش کی تھی۔ امی اور ابو نے سوچے سمجھے بغیر ایوب کے ساتھ بات پکی کر دی۔ میں اپنی ماں سے تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، اپنی سہیلیوں سے کہا کہ ایوب کے ساتھ میری شادی تو ہو جائے گی لیکن سکندر کو میں دل سے نہیں نکال سکوں گی ....

"سہیلیوں نے یہ بات اپنی ماؤں سے کہہ دی۔ ماؤں نے ایوب کے گھر تک پہنچا دی۔ ایک روز ایوب ہمارے گھر آیا۔ میں اتفاق سے گھر میں اکیلی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ تم اُسے کہہ گئے ہو کہ عذرا کے ساتھ شادی کر لینا اور اُسے خوش رکھنا۔ میں نے اُسے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس نے میرے ساتھ پیار اور محبت کی باتیں کیں۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ چلا جائے۔ میں گھر میں اکیلی ہوں۔ محلے کی کوئی عورت آگئی تو میں پہلے ہی بدنام ہوں، اور زیادہ بدنام ہو جاؤں گی ....

"وہ چلا تو گیا لیکن اُس کے ساتھ بات پکی ہو چکی تھی۔ میری سہیلیوں کے بھائی اور باپ انہیں بتایا کرتے تھے کہ ایوب کی زندگی کس طرح گزری ہے۔ پہلی خرابی تو یہ تھی کہ وہ سزا کاٹ کر آیا تھا اس لئے اُسے کہیں نوکری نہیں مل سکتی تھی۔ وہ آوارہ پھرتا رہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ایک کاروبار شروع کرنے والا ہے۔ میرے والدین پر یہ ظاہر کرتا تھا کہ اُس کے پاس بہت پیسہ ہے لیکن اصل بات یہ تھی کہ اُس کی دوستی شہر کے مشہور بدمعاشوں کے ساتھ تھی اور وہ جوا کھیلا کرتا تھا۔ پولیس کے ساتھ اُس کی دوستی تھی۔"

"اُس نے اب بھی کچھ کرنا تھا" —— میں نے کہا۔

"وہ اب پیچھے پڑ گیا کہ شادی کا دن مقرر کرو" —— عذرا نے کہا —— "میں پہلے تو گلشن بی بی کے گھر جایا کرتی اور اُسے کہا کرتی تھی کہ میرے لئے اور سکندر کے لئے دعا کرو۔ وہ دعا کرتی تھی لیکن خدا سنتا ہی نہیں تھا۔۔۔ تمہیں معلوم ہوگا، شہر سے تھوڑی ہی دُور ایک بزرگ ہُوا کرتے تھے۔"

"ریحان شاہ" —— میں نے کہا —— "لوگ انہیں پیر کہتے تھے لیکن انہوں نے کبھی پیری کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔"

"وہی!" —— عذرا نے کہا —— "وہ فوت ہو گئے تو لوگ اُن کے مقبرے پر جانے لگے۔ ہمارے محلے کی عورتیں بھی جایا کرتی تھیں۔ میں نے بھی وہاں جانا شروع کر دیا۔ میں تمہاری سلامتی اور واپسی کی دعائیں مانگتی اور یہ بھی کہ ایوب کے ساتھ میری شادی نہ ہو۔ اس مقبرے پر منوّر نے مجھے دیکھا۔ اس نے اپنے کسی آدمی یا عورت سے یہ کام کرایا کہ ہمارے محلے کی ایک غریب سی عورت کو ہاتھ میں لے لیا۔ اُس عورت نے میرے ساتھ بات کی کہ ایک بہت بڑے زمیندار باپ کا بیٹا میری خواہش کرتا ہے۔"

عذرا نے مجھے ساری بات سنائی کہ اس عورت نے کس طرح منوّر کو عذرا کے ذہن پر سوار کر دیا۔ وہ عذرا کو ایوب کی ایسی باتیں اور حرکتیں سنایا کرتی تھی کہ عذرا کے دل میں ایوب کی نفرت بیٹھ گئی۔ ایک روز عذرا ماں کو کہہ بیٹھی کہ وہ ایوب کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ پہلے تو ماں نے اُسے دو تھپڑ جماتے اور بُرا بھلا کہا پھر اُس کے باپ کو بتایا۔ باقی کسر باپ نے پوری کر دی۔ اُسے گھر میں قید کر لیا گیا۔ اُس کا باہر نکلنا بند ہو گیا اور شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔

یہ عورت عذرا کے گھر جاتی رہی۔ میں اِس عورت کو جانتا تھا۔ اب تو بوڑھی ہو گئی تھی۔ اُس کی جوانی آدمیوں کو اُنگلیوں پر نچاتے گزر گئی تھی۔ عذرا پر اپنا جادو چلانا اُس کے لئے مشکل نہ تھا۔ عذرا تو جذباتی لحاظ سے نارمل ہی

ہی نہیں تھی۔ آخر عذرا گھر سے بھاگ جانے کے لئے تیار ہو گئی اور ایک رات جب گھر والے سوئے ہوئے تھے، عذرا گھر سے نکل گئی۔

محلے کے ساتھ ہی منوّر دو گھوڑیاں لئے کھڑا تھا۔ اُس نے عذرا کو دوسری گھوڑی پر بٹھایا اور اُسے لے گیا۔

"اس کی ماں مجھے قبول نہیں کر رہی تھی" —— عذرا نے کہا —— "منوّر نے اسے کہا کہ وہ گھر سے چلا جائے گا۔ اس دھمکی سے ماں چُپ ہو گئی اور شادی ہو گئی ۔۔۔۔ منوّر مجھے دل سے چاہتا ہے لیکن سکندر! تمہیں دیکھ کر میرا دل اُکھڑنے لگا ہے۔ میں اپنے ماں باپ کو یاد نہیں کرتی، تم بہت یاد آتے ہو۔"

"نہیں عذرا!" —— میں نے کہا —— "میری یاد کو بھی ذہن سے نکال دو۔ اپنے دل کو اُکھڑنے نہ دو۔ میری زندگی دیکھ لو۔ اگر میں تمہارے ساتھ شادی کر لیتا تو تمہیں کہاں کہاں ساتھ لئے پھرتا۔"

میں نے اُس کے ساتھ بہت باتیں کیں اور اُسے کہا کہ وہ خوش قسمت ہے کہ ایوب سے نجات ملی اور منوّر جیسا خاوند مل گیا۔

وہ چلی گئی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے دل پر بوجھ لے کر گئی ہے۔

اُسے گھر سے نکلے چار مہینے ہو گئے تھے۔

اس جگہ سے میرا آبائی شہر تیس بتیس میل دُور تھا اور وہ ضلعے کا ہیڈکوارٹر تھا۔ اپنے شہر سے میں سینکڑوں میل دُور تھا تو اپنے ماں باپ زیادہ یاد نہیں آتے تھے۔ میری کوشش بھی یہی ہوتی تھی کہ انہیں یاد نہ کروں۔ اپنے ماضی سے رشتہ توڑ لینا ہی میرے لئے بہتر تھا لیکن قریب آکر پتہ چلا کہ ماضی میرے تعاقب میں میرے ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہے اور میں اس سے رشتہ نہیں توڑ سکوں گا۔ رہ رہ کر خواہش اٹھتی تھی کہ اپنے شہر جاؤں اور اپنی ماں اور اپنے باپ کی قبروں کی مٹی کو چُوموں۔ یہ خواہش میری روح کی ایک ضرورت بنتی چلی گئی اور جب یہ خواہش میرے دل میں انگڑائی لیتی تھی تو میرے جذبات اور احساسات اُس بچے جیسے ہو جاتے تھے جو اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا

ہو۔ اُس وقت مجھے اپنے آپ میں کمزوری کا احساس ہوتا تھا۔ میں کمزور نہیں ہونا چاہتا تھا۔

دن گزر رہے تھے۔ سوائے گپ بازی کے اور گھومنے پھرنے کے وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ میں چار پانچ دنوں میں ہی اُکتانے لگا۔ اس دوران عذرا مجھے ملتی رہی۔ مجھے ان کا سبزیوں کا باغ اچھا لگتا تھا۔ اس کے اردگرد پودوں کی گھنی باڑ تھی۔ باغ کے اندر بھی دو تین جگہیں ایسی تھیں جہاں جاکر آدمی دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہوجاتا تھا۔ یہ درخت تھے اور ان پر چوڑے پتوں والی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔

دوبار عذرا مجھے باغ میں ملی اور وہ میرے کمرے میں بھی آتی رہی۔

"کیا تم نے منّور کو بتایا تھا کہ تمہاری شادی ایوب کے ساتھ ہورہی تھی؟" — میں نے ایک روز عذرا سے پوچھا۔

"اُسے پہلے ہی معلوم تھا" — عذرا نے جواب دیا — "جس عورت نے مجھے منّور سے ملوایا تھا اُس نے اسے ایوب کے متعلق بتادیا تھا... تم نے کیوں پوچھا ہے؟"

"میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ منّور ایوب کو جانتا ہے یا نہیں" — میں نے جواب دیا۔

"نہیں جانتا" — عذرا نے کہا — "اتنا ہی جانتا ہے کہ میری اُس کے ساتھ شادی ہورہی تھی۔ منّور دراصل یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ایوب کے ساتھ میری براہِ راست بات چیت تو نہیں تھی۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ وہ ہمارے گھر آتا تھا لیکن میں اُس کے سامنے کبھی نہیں ہوتی تھی.... ہاں!.... ایک بات یاد آگئی ہے سکندر! میں نے منّور کو بتایا کہ ایوب کو میں پسند نہیں کرتی تھی تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ تم کسی اور کو تو ضرور پسند کرتی ہوگی۔ میں نے جواب دیا کہ ہاں، میری خالہ کا ایک بیٹا ہے، وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ میری شادی اُسی کے ساتھ ہونی تھی لیکن وہ ایک انگریز افسر کو قتل کرکے مفرور ہوگیا ہے اس لئے اُس کے ساتھ شادی نہ ہوسکی۔"

"منّور نے میرا نام پوچھا ہوگا" — میں نے کہا — "اس نے ضرور پوچھا ہوگا کہ میں کیا کرتا ہوں اور...."

"میں نے خود ہی تمہارا نام بتادیا تھا" — عذرا نے کہا — "اور یہ بھی بتایا تھا کہ سکندر خفیہ پولیس میں سب انسپکٹر تھا... میں تمہارے ساتھ بات یہ کرنا چاہتی ہوں کہ اب منّور نے دوبارہ مجھے کہا ہے کہ تم جس کے شادی کرنا چاہتی تھیں اور جو تمہیں بہت ہی پسند تھا وہ آگیا ہے.... میں نے اُسے ہنس کر کہا کہ آگیا ہے تو آنے دو، میں تمہاری بیوی بن چکی ہوں اور اب تمہارے مقابلے میں کوئی بھی مجھے پسند نہیں آسکتا۔ یہ سن کر بھی اُس نے کہا کہ تم اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہو۔"

"یہ شک مجھے بھی تھا" — میں نے کہا — "منّور کا تم پر یہ شک کرنا قدرتی بات ہے۔"

"میں نے اُسے کہا ہے کہ میں سکندر کو دیکھ کر ضرور خوش ہوئی ہوں" — عذرا نے کہا — "اور مجھے خوش ہونا چاہئے۔ وہ میری بڑی پیاری اور مری ہوئی خالہ کا بیٹا ہے.... لیکن میرا خیال ہے کہ اُس کے دل سے شک نکلا نہیں۔ تم یہ خیال رکھنا کہ اُس کے ساتھ میرے متعلق کوئی بات نہ کرنا۔ بڑا دلیر آدمی ہے۔ اس میں اتنا غصّہ تو نہیں لیکن کسی بات پر بگڑ جائے تو پھر کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔"

"تو پھر میرے پاس نہ آیا کرو" — میں نے کہا۔

"اگر میں اتنی ڈرپوک ہوتی تو یوں گھر سے نکل کر نہ آتی" — عذرا نے کہا — "یہ ضروری تو نہیں کہ وہ مجھ پر غصّہ جھاڑے گا تو میں غصّے کا جواب غصّے سے ہی دوں گی۔ پیار اور محبت کا بھی کچھ اثر ہوتا ہے۔ میں اگر اُس سے دب گئی تو وہ مجھے بھیڑ بکری سمجھ لے گا۔"

یہ تو میں دیکھ رہا تھا کہ عذرا وہ پردہ نشین عذرا رہی ہی نہیں تھی۔ اُس میں جرأت اور خوداعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی تھی پھر بھی میں نے اُسے سمجھایا کہ وہ کوئی احمقانہ حرکت نہ کر بیٹھے۔

منور نے اُسی رات شک کا اظہار کر دیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے کیا دیکھا ہے۔

"میں نے دو بار دیکھا ہے کہ تم باغ میں گئے اور وہ بھی وہاں پہنچ گئی" —منور نے کہا— "پھر میں نے اُسے تمہارے کمرے میں دو تین بار بہت دیر بیٹھے دیکھا ہے"

"اس کا ایک ہی علاج ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں" —میں نے کہا— "یا عذرا میرے کمرے میں نہ آیا کرے .... کہو، کیا کہتے ہو۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں قرآن کی اور خدا کی قسمیں کھاؤں تو یہ میری عادت نہیں، لیکن منورا میں تمہیں یہ بات کہہ دیتا ہوں کہ خدا نے تمہیں اس علاقے کی بادشاہی دی ہے لیکن آدمی اوچھے ہو۔ یہ مت بھولو کہ عذرا میرا خون ہے"

"نہیں سکندر بھائی!" —منور نے کہا— "میں اتنا اوچھا نہیں کہ گھر آئے مہمان کو کہوں کہ جاؤ چلے جاؤ، اور تم مہمان نہیں۔ ہم نے تمہیں پناہ میں رکھا ہوا ہے"

"لیکن منور!" —میں نے کہا— "میں تمہاری پناہ کو اس شرط پر قبول نہیں کروں گا کہ تم مجھ پر شک کرو اور میں تمہارے آگے سر جھکا کر رہوں۔ میں نے تو غیر عورتوں کو بھی اپنی ماں بہن کا درجہ دیا ہے، یہ تو ہے ہی میری بہن۔ تم مجھ پر نہیں میری بہن پر شک کر رہے ہو اور یہ میں کبھی برداشت نہیں کروں گا"

یہ باتیں میرے کمرے میں ہو رہی تھیں۔ وقت رات کا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور عذرا کمرے میں داخل ہوئی۔

"تمہیں شرم نہیں آتی منور!" —عذرا نے ایسے انداز سے منور سے کہا جیسے وہ اُس کا نالائق بیٹا ہو۔ کہنے لگی— "تم باہر نکلے تھے تو میں سمجھ گئی تھی کہ تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے"

"تمہیں کیا پتہ میں نے کیا باتیں کی ہیں؟" —منور نے کہا— "میں تو ویسے ہی سکندر کے پاس آگیا تھا"

"میں تمہارے پیچھے پیچھے آگئی تھی" —عذرا نے کہا— "اور تمہاری ساری باتیں دروازے کے ساتھ کھڑے ہو کر سنتی رہی ہوں۔ یہ میرا بڑا بھائی ہے۔ میں نے اسے خاوند بنانا تھا یا نہیں بنانا تھا۔ اب تم میرے خاوند ہو اور یہ میرا بھائی ہے۔ مجھے اس کے پاس آنے سے نہ روکنا"

منور کی ہنسی نکل گئی۔ ہو سکتا ہے میرے بعض قارئین نہ سمجھ سکیں کہ ایک ایسی لڑکی جو گھر سے نکل کر آئی تھی وہ منور جیسے جابر جوان کے ساتھ اس طرح رُعب سے بات کرے۔ یہ محبت کی ایک علامت ہوتی ہے۔ منور کی ہنسی ظاہر کرتی تھی کہ یہ وہ محبت ہے جو دلوں میں گہری اُتر جاتی ہے۔ منور نے عذرا کے رعب کو اور اُس کے غصے کو اپنی محبت میں جذب کر لیا تھا۔ منور نے مجھ پر جو شک کیا تھا وہ بھی قدرتی سی بات تھی۔ منور میرے مقابلے میں کوئی خوبصورت جوان نہیں تھا۔ اُسے شاید یہ وہم ہو گیا تھا کہ میں اُس سے زیادہ پُرکشش ہوں اس لئے عذرا مجھے پسند کرتی ہو گی۔

"سکندر بھائی!" —منور نے مجھے کہا— "اسے کچھ سمجھاؤ۔ یہ ہر وقت مجھ پر رُعب جماتی رہتی ہے"

"میں اس لئے رُعب جماتی ہوں" —عذرا نے منور کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا— "کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارے پیچھے گھر سے نکل آئی ہوں تو تمہاری زر خرید لونڈی بن گئی ہوں"

"مان لیا" —منور نے اُس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا— "تم چلو میں آتا ہوں"

"تم دونوں چلے جاؤ" —میں نے کہا۔

"چل اُٹھ" —عذرا اُٹھ کھڑی ہوئی اور منور کا بازو پکڑ کر اُسے بھی ساتھ لے گئی۔

یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ منور اور اُس کے گھر والے عذرا کو دبا کر رکھتے ہوں گے لیکن میں نے یہ منظر دیکھا تو مجھے اطمینان ہو گیا۔

اگلے روز عذرا میرے کمرے میں آئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ گھر جا کر منوّر نے اُسے ڈانٹا تو نہیں۔

"نہیں" — عذرا نے ہنستے ہوتے جواب دیا — "کہتا تھا کہ تم نے مجھے بہت شرمندہ کیا ہے۔ میں دراصل ڈر گئی تھی کہ غصّے میں آجاتے گا لیکن اُس نے میرا رُعب مان لیا۔"

"تم نے گلشن بی بی کا نام لیا تھا" — میں نے عذرا سے پوچھا — "وہ اور اُس کا خاوند کس حال میں ہیں؟"

"ٹھیک ٹھاک ہیں" — عذرا نے جواب دیا — "تم اُن ہی کے گھر پکڑے گئے تھے نا! دوسرے دن سارا شہر ان کے گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ کوئی بھی یہ نہیں مانتا تھا کہ گلشن بی بی کے شاہ صاحب نے کوئی جرم کیا ہے۔ صرف ایک دن پولیس اُن کے گھر رہی تھی۔ اس کے بعد کچھ بھی نہیں ہُوا۔ پھر یہ مشہور ہو گیا کہ سکندر چلتی ریل گاڑی سے پولیس کی حراست سے بھاگ گیا ہے تو شام تک یہ مشہور ہو گیا کہ شاہ صاحب نے سکندر کو ایسا تعویذ دیا تھا جو بازو پر باندھنے سے آدمی کسی کو نظر نہیں آتا ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ سکندر کو ہتھکڑیاں لگی ہوتی ہوں اور ریل گاڑی کے ڈبے کے دروازے پکے بند ہوں اور وہ نکل جاتا۔"

"نہیں عذرا!" — میں نے کہا — "شاہ صاحب نے مجھے کوئی تعویذ نہیں دیا تھا۔ یہ میری اپنی عقل اور ہمت تھی کہ میں نکل گیا۔ شاہ صاحب کی بزرگی اور دانشمندی میں کوئی شک نہیں لیکن پولیس نے انہیں اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ اُنھوں نے پیسوں سے تھانیدار کا منہ بند کر دیا تھا۔ یہ پیسے کی کرامت تھی۔"

عذرا کچھ دیر میرے پاس بیٹھی اور چلی گئی۔

اس سے اگلے دن سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں باہر بیٹھا ہُوا تھا۔ عذرا اور منوّر میری طرف آرہے تھے۔ جب وہ ذرا قریب آئے تو مجھے شک ہُوا کہ آپس میں لڑ کر آتے ہیں اور یہ مقدمہ مجھے سننا پڑے گا۔ دونوں کے چہروں پر جو تاثرات تھے اور جس انداز سے وہ چلتے آرہے تھے اُس سے صاف پتہ

چلتا تھا کہ کوئی خاص بات ہوتی ہے۔

"آپس میں لڑے ہو؟" — میں نے پوچھا — "یا ماں کے ساتھ لڑ کر آتے ہو؟"

"نہیں سکندر بھائی!" — منوّر نے کہا — "اِس سے سُنو کیا کہتی ہے۔"

دونوں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ گئے۔ میں نے عذرا سے پوچھا، کیا بات ہے۔

"میں نے آج ایوب کو دیکھا ہے۔ عذرا نے قدرے گھبراتی ہوتی آواز میں جواب دیا۔

"تمہارا دماغ صحیح ہے؟"

"ہاں سکندر!" — عذرا نے کہا — "کیا میں ایوب کی شکل بھول گئی ہوں؟"

"کہاں دیکھا ہے اُسے؟"

"میں باغ میں تھی" — عذرا نے جواب دیا — "میں اکیلی اُس طرف نکل گئی جدھر انگور کی بیلیں ہیں۔ وہاں جھاڑیوں کی باڑ زیادہ گھنی ہے۔ ایک سر باڑ کے پیچھے سے اُٹھا۔ اُس پر دیہاتیوں کی طرح پگڑی لپٹی ہوتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کا چہرہ نظر آیا۔ یہ ایوب کا چہرہ تھا۔ اگر ایوب ویسے ہی میرے سامنے آجاتا تو میں ذرا سا بھی نہ ڈرتی۔ لیکن جس طرح اُس کا چہرہ آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھا اس سے میں ڈر گئی۔ مجھ پر اس طرح خوف طاری ہُوا جیسے ایوب کہیں مر گیا ہے اور اُس کی بدروح یہاں آگئی ہے۔ یہ شک بھی ہُوا کہ یہ میری نظر کا قصور ہے۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور ہاتھوں سے آنکھیں مَل کر کھولیں۔ ایک دو سیکنڈ تو آنکھوں کے آگے اندھیرا رہا۔ جب آنکھیں روشن ہوئیں تو ایوب کا چہرہ غائب ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے دل کو مضبوط کیا اور دوڑ کر اُس جگہ گئی جہاں باڑ زیادہ گھنی نہیں۔ بیٹھ کر باڑ میں سے جھانکا۔ آگے علاقہ ویران ہے اور وہاں کھڈ بھی ہیں۔ ایک آدمی بہت تیز تیز چلتا اُدھر جا رہا

تھا۔ وہ رُکا اور اُس نے پیچھے دیکھا۔ سورج ڈوبنے والا تھا۔ دھوپ اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں نے اچھی طرح پہچان لیا۔ وہ ایوب تھا۔ اُس نے دیہاتیوں جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ نیچے چلا گیا پھر مجھے گھوڑا دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں وہاں سے فوراً چل پڑی اور منوّر کو بتایا۔"

"میں نے تو اُس کی کبھی شکل بھی نہیں دیکھی" — منوّر نے کہا — "یہ کہتی ہے کہ مجھے ذرا سا بھی شک نہیں کہ وہ کوئی اور تھا .... اُسے شاید اب پتہ چلا ہے کہ عذرا یہاں ہے۔"

"ہاں عذرا!" — میں نے اُس سے پوچھا — "تم نے اپنی امّی اور ابو کو کبھی اطلاع نہیں دی کہ تم یہاں ہو اور تم نے شادی کر لی ہے؟"

"نہیں" — عذرا نے جواب دیا — "اگر صرف ابو ہوتے تو اور بات تھی۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا نہیں کہ امّی ایوب سے پیسے اور کپڑے لیتی رہی ہے۔ اُس نے میری شادی طے نہیں کی تھی، میرا سودا کیا تھا ورنہ کوئی بھی اُسے اپنی بیٹی نہیں دے رہا تھا۔"

"یہ بتاؤ سکندر بھائی!" — منوّر نے کہا — "تم اُسے جانتے ہو۔ کیا ایوب میں اتنا دم ہے کہ وہ عذرا کو اٹھا کر لے جاتے یا اس پر کوئی وار کر جاتے؟"

"اُس نے پولیس میں نوکری کی ہے" — میں نے جواب دیا — "نوکری میں بھی وہ بدمعاشیاں کرتا رہا ہے۔ میں تو شہر میں رہا نہیں لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ نڈر آدمی ہے اور بدمعاشی سے باز نہیں آ سکتا۔"

"میں بتاتی ہوں" — عذرا نے کہا — "پولیس کے ساتھ اُس کا یارانہ ہے اور شہر کے مانے ہوئے بدمعاش اُس کے دوست ہیں .... اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایوب تھا جسے میں نے دیکھا ہے اور وہ مجھے ہی دیکھنے آیا تھا۔"

"مجھے اُس کے گھر کا اَتا پتا بتاؤ" — منوّر بولا — "میں دو آدمی ساتھ لے کر جاؤں گا، پھر دیکھوں گا کہ وہ ہماری زمین پر قدم رکھنے کی جرأت کس طرح کرتا ہے۔"

"نہیں منوّر!" — میں نے کہا — "یہ کام میں نے کرنا ہے۔"

"نہیں نہیں" — منوّر بولا — "تم پھنس جاؤ گے۔ تم پھنسے تو سمجھو ہمیشہ کے لئے گئے۔"

"تم مجھ سے زیادہ عقلمند نہیں" — میں نے منوّر سے کہا — "تم پھنس گئے تو اس کا مجھے بہت دُکھ ہوگا اور اس کے ساتھ ہی عذرا کی زندگی کی خوشیاں ختم ہو جائیں گی۔ اگر ایوب کا دوستانہ پولیس کے ساتھ اور بدمعاشوں کے ساتھ ہے تو وہ تمہیں ایسے جال میں پھنسائیں گے کہ تم کو ڈکیت اور رہزن بنا دیں گے۔ میں اگر پھنس بھی گیا تو کیا ہو جائے گا؟ .... میں نے تمہارے احسان کا صلہ بھی دینا ہے۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"دیکھو منوّر بھائی!" — میں نے کہا — "میں سی آئی ڈی کا سب انسپکٹر رہ چکا ہوں۔ میں نے اُس کے پاس جا کر یہ تو نہیں کہنا کہ تم وہاں کیا لینے گئے تھے۔ میں اُسے یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ میں یہاں رہتا ہوں۔ میں اُس کے ساتھ استادی طریقے سے بات کروں گا۔ یہ ضروری نہیں کہ میں تمہیں ذرا ذرا بات بتاؤں کہ میں اُس کے ساتھ کیا باتیں کروں گا۔ مجھے جانے دو میں سارا معاملہ ٹھیک کر دوں گا۔ جہاں زبان کام کر جاتے وہاں کلہاڑی چلانے سے کیا حاصل ہوگا؟ یہ میں جانتا ہوں کہ جس طریقے سے وہ آیا تھا وہ بدنیتی ظاہر کرتا ہے .... چلو بھائی تجمّل کے ساتھ بھی بات کرتے ہیں۔"

ہم منوّر کے بڑے بھائی تجمّل کے پاس گئے۔ اُسے ساری بات سنائی۔ وہ بھی مجھے روک رہا تھا کہ میں نہ جاؤں، لیکن میں جانتا تھا کہ یہ لوگ لٹھ بازی کے سوا کوئی اور کارروائی نہیں جانتے اور اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ پھنس جائیں گے۔

"تم میرے بڑے بھائی کی امانت ہو سکندر!" — تجمّل نے کہا — "تمہیں تو ہم اپنی جان پر کھیل کر بچا کر رکھیں گے۔"

میں نے اُن کی ایک نہ سُنی۔ میں نے اُنہیں کہا کہ میں کل رات شہر جاؤں گا۔

"تم لوگ ایک کام کرو" ــــ میں نے کہا ــــ "کل صبح اپنے تین چار نوکروں کی یہ ڈیوٹی لگاؤ کہ وہ باغ کے اردگرد اور کچھ دُور دُور اور کھیتوں کے علاقے میں بھی ویسے ہی گھومتے پھرتے رہیں اور اگر اُنہیں کوئی ایسا اجنبی نظر آئے جس کی آنکھیں ذرا سی سبز ہوں اور رنگ گورا ہو اُسے روکیں اور صرف یہ پوچھیں کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ یہیں ہے یا چلا گیا ہے۔ اگر وہ کوئی کارروائی کرنے آیا ہوگا تو کل پھر آئے گا۔ آج رات پہرے کا بندوبست کر دینا۔ کل کسی بھی وقت عذرا کو باغ میں بھیج دینا اور یہ شام تک وہیں رہے۔"

دوسرے دن میری ان ہدایات پر صحیح طریقے سے عمل کیا گیا۔ میں باہر نہ نکلا۔

دن گزر گیا۔ سورج غروب ہو گیا۔ میرے کہنے پر اُن تمام آدمیوں کو بلایا گیا جنہیں گشتی پہرے پر بھیجا گیا تھا۔ اُنہیں کوئی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ اس سے میں یہ سمجھا کہ ایوب کو کہیں سے اطلاع ملی ہوگی کہ عذرا یہاں ہے اور وہ دیکھنے آیا ہوگا کہ عذرا واقعی یہاں ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اُسے کس طرح پتہ چلا کہ اس وقت عذرا باغ میں ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کہیں چھپ کر دیکھتا رہا تھا۔ اُس نے دُور سے ایک عورت کو باغ میں جاتے دیکھا تو اُسے قریب سے دیکھنے کے لئے باغ کے قریب چلا گیا۔ میں نے اس سوال پر اپنا مغز نہ کھپایا کیونکہ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اُس کے ساتھ کیا باتیں کروں گا۔

شام کا کھانا کھا کر میں نے تجمّل سے کہا کہ اپنا ریوالور مجھے دے دے۔ اُس کے پاس لائسنس والا ریوالور تھا۔

وہ ریوالور نکال لایا۔ میں نے اس کے سلنڈر میں چھ گولیاں ڈالیں۔ ریوالور پوچ میں ڈال کر اس کی بیلٹ کُرتے کے اندر کمر سے باندھ لی۔ ان کے پاس ایک گھوڑا اور دو گھوڑیاں تھیں۔ گھوڑا نیزہ بازی کے لئے تھا۔ یہ تجمّل نے بڑے پیار سے رکھا ہُوا تھا اور وہ نیزہ بازی کا ماہر کھلاڑی تھا۔ میں نے اس گھوڑے کو

تیار کروایا اور اللہ کا نام لے کر گھوڑے پر سوار ہُوا اور سب کو خدا حافظ کہہ کر چل پڑا۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ میں درمیانی رفتار پر تین یا ساڑھے تین گھنٹوں میں شہر پہنچ جاؤں گا۔ تیس بتیس میل کا سفر تھا۔ راستہ مجھے معلوم تھا۔ یہ پگڈنڈی تھی، لیکن میں راستہ چھوٹا بھی کر سکتا تھا۔ گھوڑا جب چلا تو اس کی رفتار نے میرے حوصلے کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔



میں نے گھوڑے کو دوڑایا نہیں اور اسے آہستہ بھی نہ چلنے دیا۔ اس طرح گھوڑے نے مجھے میرے اندازے کے مطابق ساڑھے تین گھنٹوں میں شہر پہنچا دیا۔

ایوب کا گھر ہمارے محلے سے کچھ دُور تھا کہ ایک گھوڑ سوار آگے سے آتا نظر آیا۔ راتیں ابھی تاریک تھیں۔

"کون ہو بھائی؟" ــــ اُس گھوڑ سوار کی آواز آئی۔

"قریب آ کر دیکھ لو بھائی!" ــــ میں نے جواب دیا۔

جب دونوں گھوڑے پہلو بہ پہلو رُک گئے تو میں نے دیکھا کہ وہ پولیس کا آدمی تھا۔ اُس نے میری طرف جھک کر دیکھا۔

"آپ شاید تھانیدار ہیں" ــــ میں نے بزرگانہ سے لہجے میں کہا ــــ "گشت پر نکلے ہیں؟"

"ہاں مولوی صاحب!" ــــ اُس نے میری داڑھی کی وجہ سے مجھے مولوی صاحب کہہ کر مخاطب کیا اور بولا ــــ "معاف رکھنا گشت پر نکلا ہوں۔ اندھیرے میں پتہ نہیں چلا کہ یہ آپ ہیں۔"

"کوئی بات نہیں تھانیدار صاحب!" ــــ میں نے کہا ــــ "ڈیوٹی ایسے ہی کرنی چاہیئے ..... خدا حافظ۔"

اُس زمانے میں پولیس کے آدمیوں کے سر پر پگڑی ہوتی تھی۔ مسلمانوں کی پگڑی الگ ڈھنگ کی ہوتی تھی۔ میں نے پگڑی سے پہچانا کہ وہ مسلمان ہے۔ اُس نے بھی خدا حافظ کہا اور آگے نکل گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ

اندھیرا تھا۔

میں نے ایوب کے دروازے پر جا دستک دی۔ میں گھوڑے سے اُتر آیا تھا۔ دوسری دستک پر ایوب نے دروازہ کھولا۔

"کون؟"

"تمہارا پرانا یار" — میں نے کہا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور میں اُس کے ساتھ بغلگیر ہو گیا۔

"اوئے، تم سکندر ہو؟" — اُس نے مجھ سے الگ ہو کر دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے اور اشتیاق سے بولا — "تم کدھر آ نکلے یار؟ ٹھہرو؟ بیٹھک کھولتا ہوں" — وہ اندر جانے لگا۔

"ایوب بھائی!" — میں نے اُسے روک لیا۔ یہ میری ایکٹنگ تھی۔ میں نے کہا — "میں جا رہا ہوں۔ یہاں سے گزر رہا تھا، لیکن تمہیں سلام کئے بغیر میں آگے کیسے چلا جاتا۔ تمہیں دیکھ لیا ہے۔ دل خوش ہو گیا ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے جانے نہیں دے گا۔

"بکواس بند کر" — ایوب نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا — "تُو نے کون سی ڈیوٹی پر جانا ہے! میں بھلا تجھے جانے دوں گا؟"

اندر جا کر اُس نے بیٹھک کا دروازہ کھولا۔ پھر وہ میرے گھوڑے کو اندر لے گیا۔ اُس نے بتایا کہ گھر میں ایک بھینس ہے۔ وہ گھوڑے کو کھُرلی پر باندھ آیا۔

"پہلے یہ بتاؤ" — اُس نے بیٹھک میں آتے ہی کہا — "کھانا کھاؤ گے، دُودھ پیو گے؟ بھائیوں کی طرح بتا دو۔"

"دُودھ پی لوں گا" — میں نے کہا۔

وہ اندر گیا اور گرم دُودھ ایک بڑے پیالے میں لے آیا۔

"میری ماں کی آنکھ کھُل گئی ہے" — اُس نے کہا — "پوچھتی ہے کون آیا ہے۔ میں نے تمہارا انہیں بتایا۔"



ہمیں ملے بہت عرصہ گزر گیا تھا۔ ہم نے بہت سی باتیں کہنی اور سُننی تھیں لیکن میں بہت جلدی اپنے مطلب کی بات پر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے مجھ پر ایک ہی سانس میں کتنے سوال پوچھ ڈالے — "کہاں کہاں رہے؟ کیسے گزری؟ نوابزادہ کہاں ہے؟ کہاں سے آ رہے ہو؟ گھوڑا کہاں سے لاتے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ شہناز کی سناؤ" — وغیرہ وغیرہ۔

میں اُسے اُوٹ پٹانگ اور انتہائی مختصر جواب دیتا رہا۔

"جانے دو ان باتوں کو ایوب بھائی!" — میں نے کہا — "کہو، عذرا کے ساتھ کیسے گزر رہی ہے؟ یقیناً اچھی گزر رہی ہو گی .... اُسے بھی نہ بتانا کہ میں آیا ہوں۔"

"کہاں ہے عذرا؟" — اُس نے کہا — "وہ میرے گھر میں تو نہیں۔"

"اپنے گھر گئی ہوئی ہے؟"

"نہیں سکندر!" — اُس نے کہا — "وہ نہ میرے گھر میں ہے نہ اپنے گھر میں!"

"پھر کہاں ہے؟" — میں نے پوچھا — "قبرستان میں؟"

"میری اس کے ساتھ شادی نہیں ہوئی تھی" — ایوب نے کہا۔

"پھر کس کے ساتھ ہوئی؟"

"جس کے پیچھے وہ گھر سے بھاگ گئی ہے" — ایوب نے جواب دیا۔

"کیا کہہ رہے ہو ایوب بھائی!" — میں نے حیرت زدگی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا — "ذرا صاف بات کرو۔ عذرا کسی کے پیچھے بھاگ جانے والی لڑکی نہیں تھی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ اب تک عذرا اور تم دو بچوں کے ماں باپ بن چکے ہوں گے۔"

"پہلے تو اُس کی ماں نہیں مانتی تھی" — اُس نے کہا — "میں نے انہیں تمہارا پیغام دیا تھا کہ تم اب کبھی نہیں آؤ گے اور عذرا کی شادی ایوب کے ساتھ کر دو۔ میری ماں بھی ان کے گھر جاتی رہی۔ دوسروں سے پتہ چلا کہ عذرا

ی ماں کہتی ہے کہ ایوب جیل کاٹ کر آیا ہے اور نکما پھرتا رہتا ہے۔ میں نے اس عورت کو کھلانا پلانا شروع کر دیا۔ ایک عورت نے بتایا تھا کہ یہ اس کی کمزوری ہے۔ میں نے اُسے پورا ایک سال پیسے اور تحفے دیئے ....

"وہ راضی ہو گئی لیکن عذرا کے والد صاحب نہیں مان رہے تھے۔ میں نے بہت چکر چلائے، استادی نسخے بھی استعمال کیے مگر اُس نے بھی وہی نقص نکالا جو عذرا کی ماں نکالا کرتی تھی۔ وہ تو تمہاری خالہ کی بھی نہیں مانتا تھا۔"

"تم اس دوران عذرا سے نہیں ملے تھے؟"

"ملا تھا یار!" —— ایوب نے جواب دیا —— "وہ تو میرے ساتھ بات ہی نہیں کرتی تھی۔ میں اُسے کہتا تھا کہ سکندر مجھے کہہ گیا ہے کہ عذرا کے ساتھ شادی کر لینا۔ وہ کچھ بھی نہیں کہتی تھی۔ ایک بار اُس نے کہا کہ سکندر آ جائے گا۔ وہ کہے گا کنوئیں میں کُود جاؤ تو میں کنوئیں میں کُود جاؤں گی۔"

"کسی اور سے شادی کر لیتے۔"

"میں عذرا کو ہی چاہتا تھا" —— ایوب نے کہا —— "میں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ میں جاسوسی بھی کرتا رہا۔ تمہاری خالہ اپنی بیٹی کو کہیں اور دینا چاہتی تھی۔ تم خود سوچو کہ اتنی خوبصورت اور اتنی اچھی لڑکی کا رشتہ کون چھوڑ دیتا۔ رشتہ مانگنے والوں کی قطار لگ جاتی لیکن تمہارے فرار نے اور پولیس نے اس گھر کو بدنام کر کے رکھ دیا۔ جب تھانیدار نے ان کے گھر آنا اور تھانے بلانا چھوڑ دیا تو لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ عذرا رشوت کے طور پر تھانیدار کے پاس جاتی رہی ہے۔ میں جانتا تھا یہ بالکل جھوٹ ہے۔ لوگ بھی دیکھ رہے تھے کہ تم پکڑے گئے ہو اس لئے پولیس اب تمہارے خالو کے گھر نہیں آتی لیکن لوگوں کی زبان کون بند کر سکتا ہے! ....

"اس طرح اتنا زیادہ عرصہ گزر گیا۔ عذرا کی ماں کسی نہ کسی عورت کی زبانی اُن لڑکوں کے ماں باپ کو جو عذرا کے خواہشمند تھے پیغام بھیجتی رہی مگر کورا جواب ملتا رہا۔ جب عذرا کی ماں نے دیکھا کہ اُس کی بیٹی کو کوئی بھی قبول نہیں کر رہا تو اُس نے میری طرف دیکھنا شروع کیا، پھر تمہارا خالو بھی مان گیا۔ تم اندازہ

کرو کہ ان لوگوں نے مجھے کتنے سال انتظار کرایا کہ شادی کی تاریخ آج سے چار مہینے پہلے مقرر ہوئی۔"

"پھر شادی کیوں نہ ہوئی؟"

"شادی کی تاریخ میں کچھ دن باقی تھے کہ ایک صبح پتہ چلا عذرا گھر سے غائب ہے" —— ایوب نے جواب دیا —— "میں نہ مانا۔ میں نے تمہارے خالو اور خالہ سے کہا کہ تم لوگوں نے خود عذرا کو غائب کر دیا ہے۔ وہ دونوں قسمیں کھاتے اور روتے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ چلو تھانے رپورٹ لکھواتے ہیں لیکن تمہارا خالو کہنے لگا کہ لڑکی بالغ ہے۔ وہ خود گئی ہے اگر ہم نے رپورٹ کی اور پولیس نے لڑکی کا سراغ لگا لیا تو لڑکی کورٹ میں جا کر بیان حلفیہ دے دے گی کہ وہ بالغ ہے اور اپنی مرضی سے گھر سے نکلی ہے۔ اس سے ہماری بے عزتی ہو گی۔"

"تم سب انسپکٹر رہ چکے ہو ایوب بھائی!" —— میں نے کہا —— "تم نے دیکھا نہیں کہ عذرا خود گئی ہے یا اٹھائی گئی ہے؟ عذرا ایسی تو نہیں تھی۔ وہ تو خاموش سی لڑکی تھی۔"

"میں بھی اُسے خاموش اور سیدھی لڑکی سمجھتا تھا" —— ایوب نے کہا —— "اور میرا شک یہی تھا کہ وہ اٹھائی گئی ہے لیکن اُس کے ماں باپ کہتے تھے کہ رات کو کوئی اُسے اُٹھانے آتا تو کیا گھر کے کسی ایک فرد کی بھی آنکھ نہ کھلتی؟ .... میں نے تھانیدار کے ساتھ بات کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ لڑکی کے وارث رپورٹ نہیں لکھواتے تو تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟"

"میں حیران ہوں کہ میرے خالو نے ایسی بیوقوفی کیوں کی کہ اپنی بیٹی کی گمشدگی کی پولیس کو اطلاع نہ دی" —— میں نے کہا۔

"میرے دل میں ایک شک یہ آتا تھا کہ تمہارے خالو اور خالہ نے درپردہ اپنی بیٹی کا نکاح کسی کے ساتھ کر کے اُسے رات کو رخصت کر دیا ہے" —— ایوب نے کہا —— "اور دوسرا شک یہ کہ وہ اغوا ہوئی ہے لیکن اب چار مہینوں بعد، اُس کا سراغ مل گیا ہے۔ میں اُسے دیکھ آیا ہوں .... پرسوں ....

اُسے اپنی آنکھوں دیکھا ہے۔"

"کہاں؟"

اُس نے کجل اور منوّر کے گاؤں کا نام لیا اور کہنے لگا —"تم اُسے نہیں جانتے ہوگے.... انسپکٹر فضل حسین .... ہم دونوں کچھ عرصہ اکٹھے رہے تھے۔ عذرا اُس کے گھر ہے اور اُسے لے جانے والا اُس کا چھوٹا بھائی ہے۔ اُس نے عذرا کے ساتھ شادی کرلی ہے۔"

"وہاں لڑکی کس طرح جا پہنچی؟" — میں نے پوچھا اور کہا — "میں انسپکٹر فضل حسین کو تو نہیں جانتا، یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے علاقے کا بہت بڑا زمیندار ہے اور اس علاقے پر اُس کے بھائیوں کی حکومت ہے۔ میں ساتھ والے گاؤں میں دو دن رہا تھا.... ہاں یار! اب یاد آیا۔ مجھے ایک آدمی انسپکٹر فضل حسین کی زمینداری اور اُس کے بھائیوں کے رُعب داب کی باتیں سُنا رہا تھا تو اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ فضل حسین کا چھوٹا بھائی شہر سے ایک لڑکی نکال لایا ہے اور اُس کے ساتھ اُس نے شادی کرلی ہے .... وہ لڑکی عذرا ہوگی .... تمہیں اب کس طرح پتہ چلا ہے؟"

"یہاں ایک عورت ہے" — ایوب نے کہا — "جوانی میں اُس نے بڑے گل کھلاتے تھے۔ جوانی ڈھل گئی تو اُس نے چکر چلانے شروع کر دیئے۔ میرے ساتھ اُس کی اچھی بات چیت ہے۔ اکثر ملتی ملاتی رہتی ہے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ میں عذرا کے لاپتہ ہونے پر کتنا پریشان اور اداس رہتا ہوں۔ آٹھ نو دن گزرے اس عورت نے ایک گھر سے کچھ پیسے اور ایک سوٹ کا کپڑا چوری کرلیا۔ گھر والوں نے اسی پر شک کیا تھا۔ انہوں نے تھانے میں رپورٹ لکھوادی اور شک اس پر لکھوایا۔ اسے تھانے بلوایا گیا تو میرے پاس دوڑی آئی کہ میں تھانیدار سے اس کی سفارش کروں۔ اُس کا رونا دیکھ کر میرا دل موم ہوگیا۔ میں تھانے چلا گیا۔ یہاں سب انسپکٹر انور علی سیّد ایس ایچ او ہے۔ میں نے اُسے دوست بنایا ہُوا ہے۔ ویسے بھی وہ اچھا آدمی ہے....

"میں نے اُسے کہا کہ یہ غریب عورت ہے، اس کا خیال رکھنا۔ انور علی

نے کہا کہ اس نے چوری کی ہے تو اقبالی ہوجائے اور مال واپس کر دے۔ یہ عورت اتنی زیادہ ڈری ہوئی تھی کہ اُس نے مجھے کہا کہ پولیس سے بچالو تو میں تمہیں راز کی ایک بات بتاؤں گی.... میں نے اُسے اس طرح چھڑایا کہ اُس سے چوری کا مال دیا اور میں نے انسپکٹر انور علی سے کہہ کر اُسے چھڑوا لیا۔"

"پھر اُس نے راز کی بات بتائی؟"

"ہاں سکندر!" — ایوب نے کہا — "اُس نے راز کی ایسی بات بتائی کہ میرے سارے شک صاف کر دیئے۔ عذرا کو اسی عورت نے گھر سے نکالا اور انسپکٹر فضل حسین کے چھوٹے بھائی کے ساتھ بھیجا تھا۔ اس آدمی کا نام منوّر ہے۔ اس عورت نے منوّر اور عذرا کی ملاقات کرائی تھی۔ بہت تیز اور گھرے دماغ کی عورت ہے۔ تم اپنے آپ کو بڑا ہوشیار اور عقلمند سمجھتے ہوگے۔ اس عورت کے ساتھ تمہارا واسطہ پڑے تو تمہیں اس طرح نچا دے جس طرح بندر ڈگڈگی پر ناچتا ہے۔"

یہ میں عذرا کی زبانی سُنا چکا تھا کہ اس عورت نے اُس کا رابطہ منوّر کے ساتھ کس طرح کرایا تھا اور کس طرح وہ گھر سے نکلی اور منوّر کے ساتھ گئی تھی۔ بالکل یہی بات اس عورت نے ایوب کو سنائی۔



"اس طرح مجھے یہ پتہ چل گیا کہ عذرا اپنی مرضی سے گئی ہے" — ایوب نے کہا — "اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ کہاں ہے۔ میں اُسے ذہن اور دل سے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چار مہینے گزر چکے تھے لیکن میرے دل میں غصہ موجود رہا۔ یہ میری بے عزتی کی گئی تھی۔ جب مجھے پتہ چلا کہ عذرا اپنی مرضی سے گئی ہے تو غصہ جاگ اُٹھا۔ میں اس طرح محسوس کرنے لگا جیسے منوّر نے مجھے دھوکہ دیا ہے اور وہ عذرا کو مجھ سے چھین کر لے گیا ہے۔ اس سے زیادہ غصہ مجھے عذرا پر آیا۔ وہ تو یوں سمجھو کہ میرے مُنہ پر تھوک کر چلی گئی ہے۔"

"وہ تو گئی" — میں نے کہا — "اُس کی شادی بھی ہوگئی۔ اب کیوں اپنا خون جلاتے ہو؟ بھول جاؤ۔"

"یار تم بُرا نہ ماننا سکندر!" — ایوب نے کہا — "عذرا تمہاری خالہ زاد بہن ہے لیکن اُس نے جو حرکت کی ہے وہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اُس نے اتنا بھی نہ سوچا کہ میں نے کتنی لمبی مدت اس کا انتظار کیا ہے۔ میں اپنی بے عزتی کا بدلہ تو ضرور لوں گا۔"

"کیسے؟" — میں نے پوچھا — "مجھے بتاؤ پھر میں بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں ایک بد اخلاق عورت نے بتایا ہے کہ عذرا فلاں جگہ ہے۔ ہو سکتا ہے وہ وہاں نہ ہو۔ یہ عورت جھوٹ بھی تو بول سکتی ہے۔"

"عذرا وہیں ہے" — ایوب نے کہا — "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں اُسے پرسوں دیکھ آیا ہوں۔"

"کہاں؟" — میں نے انجان بن کر پوچھا — "کیا تم وہاں گئے تھے جہاں عذرا ہے؟ ..... فضل حسین کے گاؤں میں؟"

"میں دیہاتیوں کی طرح کھدّر کا لمبا سا کُرتہ اور کھدّر کی چادر باندھ کر اور سر پر ململ کی میلی سی پگڑی لپیٹ کر وہاں گیا تھا" — ایوب نے کہا — "میں ان کی زمینوں سے ذرا دُور گھومتا پھرتا رہا۔ کسی سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ شام کے وقت عذرا کو باغ کی طرف جاتے دیکھا۔ میں باڑ کے پاس چلا گیا اور اُسے قریب سے دیکھا۔"

"اُس نے تو تمہیں نہیں دیکھا ہوگا" — میں نے کہا۔

"شاید!" — اُس نے کہا — "اُس نے میری طرف دیکھا تو تھا۔ میرا خیال ہے اُس نے مجھے پہچانا نہیں ہوگا۔"

"کرو گے کیا؟" — میں نے پوچھا — "کیا عذرا کو یا منوّر کو قتل کرو گے؟ دُور سے گولی مارو گے؟"

"میں عذرا کو اُٹھانے کی کوشش کروں گا" — اُس نے کہا — "لیکن منوّر کہیں مل گیا تو پہلے اُسے اُٹھاؤں گا ..... ہو سکتا ہے اُسے قتل کر دوں۔"

وہ جب یہ بات کر رہا تھا تو صاف پتہ چل رہا تھا کہ ذہنی طور پر صحیح نہیں۔ وہ غصّے اور انتقام سے پاگل ہُوا جا رہا تھا۔ اس ذہنی کیفیت میں عقل کام

نہیں کیا کرتی۔

"ہوش میں آؤ ایوب بھائی!" — میں نے کہا — "تم اکیلے ہو اور وہ بہت بڑے زمیندار ہیں۔ اُن کے پاس نوکر ہوں گے، مزارعے ہوں گے اور ایسے زمینداروں نے جرائم پیشہ بدمعاشوں کو پالا ہُوا ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں نے اس خاندان کے متعلق بہت کچھ سُنا ہے ..... یہ بھی خیال رکھو کہ تم سزا یافتہ ہو۔"

"اگر پکڑا گیا تو مارا جاؤں گا نا!" — اُس نے کہا — "میں مرنے کے لئے تیار ہوں سکندر! یوں سمجھو کہ عذرا اب منوّر کی بیوی نہیں رہی۔"

"تم یہ بھول رہے ہو کہ عذرا میری بھی کچھ لگتی ہے" — میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا — "کہیں ایسا نہ ہو کہ تم عذرا پر کوئی اوچھا وار کر بیٹھو اور میں انتقام لینے آپہنچوں۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ میں اس زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔"

"اوہ!" — اُس نے فوراً لہجہ بدل لیا — "معاف کر دینا سکندر یار! میں واقعی بھُول گیا تھا کہ عذرا تمہارا خون ہے۔"

"مجھے صرف عذرا کا نہیں تمہارا بھی اتنا ہی درد ہے" — میں نے کہا — "حرام موت مارے جاؤ گے۔ تم سب انسپکٹر رہ چکے ہو۔ ٹھنڈے دل سے سوچو۔ کیا تم اتنا بڑا جرم کر سکو گے؟ کس طرح کرو گے؟ ..... ٹھنڈے ہو جاؤ اور شادی کر لو۔ تمہاری عمر زیادہ ہو رہی ہے۔"

وہ ذرا سا ٹھنڈا ہُوا تو میں نے اپنا لیکچر دینا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا یہی تھا کہ اسے باتوں میں ٹھنڈا کر دوں۔ میں نے اُسے انسپکٹر فضل حسین کے خاندان سے ڈرایا، کچھ نصیحتیں کیں اور بہت کچھ کہہ سُن کر اُسے قائل کر لیا کہ وہ اس انتقامی کارروائی سے باز آجائے۔

"تم نے مجھ پر ایک احسان کیا تھا ایوب بھائی!" — میں نے کہا — "تم نے ایک رات مجھے دیکھا تھا جس رات میں یہاں ہندو تھانیدار کو ڈرانے آیا تھا اور تم نے مجھے جانے دیا تھا۔ تم نے دوستی کا حق ادا کیا تھا۔ اب میں

دوستی کا حق ادا کر رہا ہوں۔ تم نے جو کارروائی سوچی تھی اگر یہ مجھے ٹھیک لگتی تو خدا کی قسم میں تمہارا ساتھ دیتا۔ یہ تو اچھا ہُوا ہے کہ میں اِدھر سے گزرتے تمہیں ملنے آگیا اور تم نے میرے ساتھ یہ بات کر دی ورنہ تم غصّے میں بیوقوفوں والی کارروائی کر بیٹھتے۔"

"ہاں سکندر!" — اُس نے آہ بھر کر کہا — "یہ اچھا ہی ہُوا ہے کہ تم آگئے۔ تم نے مجھے ٹھنڈا کر دیا ہے ....اب کہاں جاؤ گے؟"

میں نے ویسے ہی اُسے ایک جگہ بتا دی اور کہا کہ میرے دو دوست وہاں میرا انتظار کر رہے ہیں اور کل رات وہاں سے کہیں اور چلے جائیں گے۔

"بہت دیر ہوگئی ہے" — میں نے اُٹھتے ہوتے کہا — "لیکن تمہیں ملے بغیر میں آگے نہیں جا سکتا تھا۔"

وہ میرے ساتھ لپٹ گیا اور بہت ہی پیار سے اُس نے مجھے اپنے ساتھ لگاتے رکھا، پھر وہ گھوڑا باہر لے آیا اور میں سوار ہو کر چل پڑا۔

میں جب مفضل حسین کے کھیتوں میں داخل ہُوا اس گاؤں کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز اُبھری۔ ہر سُو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر ستارے ابھی ٹمٹما رہے تھے۔ فضا خاموش تھی۔ ہوا کی ہلکی ہلکی 'ساں ساں' دل کو اچھی لگتی تھی اور اس کے ساتھ اذان کے الفاظ کا تقدس اور موذن کی آواز کا سوز، روحوں پر وجد طاری کر رہا تھا۔ میں نے گھوڑا روک لیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے گھوڑا خود ہی رُک گیا ہو۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں موذن کی خوش الحانی کی لہروں پر اُڑا جا رہا ہوں۔

اذان تو میں نے ہزاروں بار سُنی تھی لیکن اُس روز کی اذان میں کوئی ایسا تاثر تھا کہ مجھ پر کوئی اور ہی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ نشے کی سی کیفیت تھی اور میں اس نشے سے پہلی بار آشنا ہُوا تھا۔ طلسماتی سا ایک تاثر تھا جو میری رگوں میں سرایت کرتا جا رہا تھا اور میں صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ ایک نرم و گداز ہاتھ میری دُکھی اور علیل روح کو سہلا رہا تھا۔

مجھ پر رِقت سی طاری ہونے لگی، اور اس کے ساتھ ہی یہ احساس بیدار

ہوتے لگا کہ میں اللہ کی ذات کے آگے شرمسار نہیں اور میں اپنا سامنا کر کے بھی شرمسار نہیں ہوتا۔

میرے ضمیر پر کسی گھناؤنے جُرم کا بوجھ نہیں تھا۔ اگر میں گناہگار ہوتا تو اذان سے میں یوں روحانی لطف و قرار حاصل نہ کر سکتا اور مجھ میں اتنی اخلاقی جرأت بھی نہ ہوتی۔

میں نے اذان ختم ہونے تک گھوڑے کو وہیں روکے رکھا۔ اذان ختم ہوتی تو گھوڑا جیسے اپنے آپ ہی چل پڑا ہو۔ میں اپنے آپ میں انوکھی سی قوت محسوس کر رہا تھا۔ مجھ پر خود فراموشی سی طاری تھی۔

"آگئے سکندر!" — تجمل کی آواز نے طلسم توڑ دیا — "ہم تو رات سوتے ہی نہیں۔ کبھی میں باہر نکل کر دیکھتا کبھی منور باہر نکلتا۔ بہت فکر تھا تمہارا۔"

میں گھوڑے سے اُترا۔ منور بھی باہر آگیا۔ صبح کا دھندلکا ابھی گہرا تھا۔ ہم اندر جا بیٹھے۔

"وہ ایوب ہی تھا" — میں نے انہیں بتایا — "اُسے اب پتہ چلا ہے کہ عذرا یہاں ہے۔ وہ خود دیکھنے آیا تھا تاکہ اُسے یقین ہو جاتے کہ عذرا یہاں ہے۔"

"بڑا اُستاد معلوم ہوتا ہے" — تجمل نے کہا — "اُس کا یہاں کوئی جاسوس ہوگا۔ وہ ایسے وقت باغ کے قریب آیا جب عذرا باغ میں تھی۔"

"کوئی اُستادی نہیں تجمل بھائی!" — میں نے کہا — "وہ سارا دن یہاں گھومتا پھرتا رہا۔ دُور سے اُس نے عذرا جیسی ایک عورت کو باغ کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ باغ کے قریب جا کر باڑ کے پیچھے چھُپ گیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ عذرا اُسے نظر آگئی۔"

"اُس کا ارادہ کیا ہے؟" — منور نے پوچھا۔

"بیوقوف آدمی ہے" — میں نے جواب دیا — "پہاڑ کے ساتھ ٹکر لینا چاہتا تھا۔ میں اُس کا دماغ درست کر آیا ہوں۔ اب وہ کچھ نہیں کرے گا۔"

"تم نے اُسے بتایا ہوگا کہ تم یہیں رہتے ہو" — عذرا نے کہا۔

"نہیں" — میں نے جواب دیا۔

میں نے انہیں بتایا کہ ایوب کے ساتھ میری کیا باتیں ہوئی ہیں اور میں نے اس پر یہ ظاہر کیا ہے کہ میں اُدھر سے گزر رہا تھا اور اسے ملنے آگیا ہوں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایوب کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرے گا اور میں اس لئے بھی مطمئن تھا کہ وہ اتنے بڑے زمینداروں کے خاندان سے ٹکر لینے کی جرأت نہیں کرے گا۔ وہ اکیلا آدمی تھا۔ وہ اتنی بڑی جرأت کر ہی نہیں سکتا تھا۔

تین دن گزر گئے۔

دن کا پچھلا پہر تھا جب میں نے عذرا کو باغ کی طرف جاتے دیکھا۔ اُسے باغ بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ تحمل کی بیوی کے ساتھ بھی باغ میں جایا کرتی تھی اور اکیلی بھی۔ اُس روز وہ اکیلی گئی۔ سورج غروب ہوگیا وہ نہ آئی۔ منور میرے پاس آیا۔

"سکندر بھائی!" — منور نے کہا — "میں عذرا سے کہتا ہوں کہ باغ میں اب اکیلی نہ جایا کرو لیکن وہ باز نہیں آتی۔ بڑی دیر سے گئی ہوئی ہے اور ابھی تک واپس نہیں آئی۔ رات ہو گئی ہے۔"

"پہلے کبھی شام کے بعد وہ باغ میں گئی یا وہاں رُکی رہی تھی؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں!" — منور نے جواب دیا — "ایسا تو اُس نے کبھی نہیں کیا تھا۔"

یہ چھٹی حس تھی یا ایک ہی خون ہونے کی وجہ سے میرا دل گھبرانے لگا اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ ہے اور عذرا خیریت سے نہیں۔ میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

"واپس آتے تو اسے تم کچھ سمجھاؤ سکندر!" — منور نے کہا — "میری تو وہ سنتی ہی نہیں۔"

"چلو، باغ میں چل کر دیکھتے ہیں وہ وہاں کیا کر رہی ہے" — میں نے کہا۔

میں اور منور باغ کی طرف چل پڑے۔ باغ گھر سے نصف میل سے کچھ زیادہ دُور تھا۔ گھر اور باغ کے درمیان کھیت تھے۔ باغ میں کام کرنے والا مزارعہ اپنے کنبے کے ساتھ باغ میں ہی ایک کچے مکان میں رہتا تھا۔

باغ میں جاکر اس مزارعہ اور اُس کے گھر والوں سے پوچھا کہ عذرا بی بی کہاں ہے؟

"چھوٹی بی بی؟" — مزارعہ کی بیوی نے حیران ہو کر پوچھا — "وہ گھر نہیں گئی؟ .... سورج ڈوبنے والا تھا جب وہ اُدھر چلی گئی تھی، پھر وہ ادھر نہیں آئی۔ ہم تو کہتے تھے کہ بی بی گھر چلی گئی ہے۔ پہلے وہ پینگ جھولتی رہی پھر ٹہلتے ٹہلتے اُدھر چلی گئی تھی۔"

اُس نے باغ کی جس طرف اشارہ کیا تھا وہاں مالٹوں کے درخت تھے اور ان سے آگے علاقہ ویران تھا۔ اُدھر بھی جھاڑیوں کی باڑ تھی لیکن گھنی نہیں تھی۔ اس میں سے آدمی گزر سکتا تھا۔ میں اور منور وہاں گئے۔ مزارعے کی لالٹین ساتھ لے گئے تھے۔

میں پولیس کے سراغرسانوں کی طرح لالٹین کی روشنی میں زمین کو کھوجنے لگا۔ وہاں زمین کچی تھی۔ اُدھر کوئی نہیں جاتا تھا۔ میں نے عذرا کا کھُرا دیکھ لیا۔ ہم اسے دیکھتے چلے گئے۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔

ایک جگہ میں رُک گیا۔ وہاں عذرا کا کھُرا رُک گیا تھا اور بڑے صاف نشان بتا رہے تھے کہ اس جگہ دو تین آدمی ناچتے کودتے رہے ہیں یا انہوں نے یہاں دھینگا مُشتی کی ہے۔ وہاں سے دو کھُرے باڑ کی طرف جا رہے تھے۔ ہم باڑ تک گئے۔ وہ باڑ اتنی کم تھی کہ اس میں سے گزرا جا سکتا تھا۔ ہم باڑ سے باہر نکل گئے۔ دونوں کھُرے جا رہے تھے۔ میں نے انہی کھُروں کو آتے بھی دیکھا۔

ہم انہیں دیکھتے چلے گئے۔ آگے زمین نشیبی تھی اور نیچے ہی نیچے جا رہی تھی۔ ایک جگہ گھوڑے کے کھُرے دیکھے۔ وہاں سے زمین پتھریلی شروع ہو جاتی تھی۔ ہم اور آگے نہ گئے۔

"عذرا اُٹھائی گئی ہے" — میں نے منوّر سے کہا۔

"ایوب وار کر گیا ہے" — منوّر نے کہا — "میں اُس کے گھر کے بچے بچے کو ختم کر کے دم لوں گا۔"

"آرام سے سوچو منوّر!" — میں نے کہا — "عذرا تمہاری بیوی تھی لیکن میرا اُس کے ساتھ خون کا رشتہ ہے ..... کہو، تھانے رپورٹ لکھواؤ گے؟ ..... میں کہیں چھپ جاؤں گا کیونکہ تھانے اطلاع دی تو پولیس آ جائے گی۔"

"پولیس کی مدد بزدل لیا کرتے ہیں" — منوّر نے کہا — "یہ کام ایوب کا ہی ہے۔ میں قانون کو اپنے ہاتھ میں لوں گا۔"

میرا دل نہیں مانتا تھا کہ ایوب نے یہ دلیرانہ واردات کرائی ہے۔ میں نے منوّر سے کہا کہ چلو، تحمل کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ مجھے اب یہ فکر پیدا ہو گیا تھا کہ منوّر بھڑکا ہوا اور صحیح معنوں میں آگ بگولہ بنا ہوا تھا اور فوری طور پر عذرا یا ایوب تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے وہ واپس نہیں آنے دے رہا تھا۔ میں اُسے کہتا تھا کہ تحمل کو بھی بتا دیں اور سوچیں کہ کیا کرنا ہے لیکن منوّر کہتا تھا کہ جو کھُرے دیکھے ہیں ان پر چلتے چلو۔ میں جانتا تھا کہ فوری طور پر کچھ بھی نہیں ہو سکے گا، اور آگے کھُرے بھی صاف نہیں۔

"پھر میں شہر جاتا ہوں" — منوّر نے کہا — "ریوالور لے کر جاؤں گا۔ سیدھا ایوب کے گھر جاؤں گا۔"

"تم نے اُسے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے" — میں نے کہا — "نہ تم اس کا گھر دیکھ سکو گے۔ غصّے میں کسی اور کو گولی مار آؤ گے۔"

میں نے بڑی مشکل سے اُسے اپنے ساتھ لیا اور گھر لایا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تحمل کا ردِ عمل کیا ہو گا اور گھر میں کیسی فضا بن گئی ہو گی۔ غم اتنا نہیں تھا جتنا غصّہ تھا۔ اس خاندان پر کسی نے یہ پہلا وار کیا تھا اور وار بھی بڑا ہی سخت کیا تھا۔ مرد تو انتقام کی باتیں کرتے ہی تھے، اس گھر کی عورتیں بھی انتقام کے سوا کوئی بات نہیں کرتی تھیں۔

"تحمل بھائی!" — میں نے کہا — "سب سے پہلے تو تھانے رپورٹ لکھواؤ۔"

"پھر ہماری غیرت کہاں گئی؟" — تحمل نے کہا — "لڑکی ایوب نے اٹھائی ہے۔ ہم لڑکی کے ساتھ ایوب کو بھی اُٹھا کر یہاں لائیں گے۔ تم ابھی تک پولیس والوں کی طرح سوچتے ہو۔ تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ ابھی ایوب کے گھر چلو؟"

"کیا ایوب تمہیں گھر مل جائے گا؟" — میں نے کہا — "وہ تھانیدار رہ چکا ہے۔ وہ لڑکی کو اپنے گھر نہیں لے گیا ہو گا۔ مجھے اب بھی یہ شک ہے کہ یہ واردات ایوب نے نہیں کی۔ ذرا مجھے کچھ سوچنے دو۔ عذرا میرے لیے غیر نہیں، میری خالہ کی بیٹی ہے۔ میرا خون ہے۔ اپنے خون کی بے عزتی کا انتقام لینا میرا فرض ہے۔"

"لیکن تم کہتے ہو تھانے جاؤ" — منوّر نے کہا۔

"تھانے نہ جاؤ" — میں نے کہا — "میں تمہاری بات مان لیتا ہوں، لیکن تم میری بات مان جاؤ۔ تم کہتے ہو کہ ایوب کو اُٹھا کر یہاں لائیں گے، میں کہتا ہوں کہ میں اس کی چھوٹی بہن کو اُٹھا لاؤں گا۔ تم لوگوں نے شاید مجھے بزدل سمجھ لیا ہے اور تم یہ بھی سوچ رہے ہو گے کہ میں چونکہ مفرور ملزم ہوں اس لیے ڈرتا ہوں۔"

"سکندر بھائی!" — تحمل نے کہا — "صبح ہوتے ہی تم یہ کام کرو کہ کھُرے دیکھو کس طرف جاتے ہیں۔ شاید انہی سے کچھ سراغ مل جائے۔"

باقی رات جاگتے گزر گئی۔ یہ گھر آتش فشاں پہاڑ بن گیا تھا۔ اسے اب پھٹنا تھا اور اس نے نہ جانے کتنے گھر تباہ کرنے تھے۔ میری کوشش یہ تھی کہ یہ لوگ غصّے میں سوچے سمجھے بغیر کوئی ایسی کارروائی نہ کریں کہ لڑکی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود کہیں پھنس جائیں۔ میری اپنی ذہنی اور جذباتی حالت اُن ہی جیسی تھی اور اب مجھے نظر آنے لگا تھا کہ میں گناہ سے بچ نہیں سکوں گا۔



صبح کا دھندلکا ابھی صاف نہیں ہوا تھا کہ میں، تحمل اور منوّر باغ میں چلے گئے۔ منوّر کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتا رہا ہے۔ میں دیکھ چکا تھا کہ منوّر عذرا سے دلی محبت کرتا تھا۔ اُس کے کندھے سے ریوالور کی بیلٹ لٹک رہی

تھی۔ تجمل کے پاس دونالی بندوق تھی۔ میں خالی ہاتھ تھا۔

باغ میں گئے تو مالی کو بھیج کر منوّر کے دو مزارعوں کو بلایا۔ یہ دونوں خاص مزارعے تھے۔ خاص کا مطلب ہے کہ وہ نام کے مزارعے تھے، وہ دراصل بدمعاش تھے اور قتل تک کر سکتے تھے۔ منوّر انہیں الگ لے گیا اور کچھ کہا۔ یہی کہا ہوگا کہ چھوٹی بی بی لاپتہ ہو گئی ہے۔

صبح کا اُجالا سفید ہو گیا تھا۔ میں نے رات کو لالٹین کی روشنی میں جو کھُرے دیکھے تھے وہ اب صاف نظر آ رہے تھے۔ یہ کھُرے باغ کے باہر ایسے علاقے میں چلے گئے جو ویران تھا اور یہ عام گزرگاہ نہیں تھی اس لئے کھُرے محفوظ تھے۔ میں کھُروں کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا لیکن عملی تجربہ نہیں تھا جیسا پیشہ ور کھوجیوں کو ہوتا ہے لیکن یہ کھُرے صاف تھے اور دیسی یعنی دیہاتی جوتیوں کے تھے۔ ان میں عذرا کا کھُرا نہیں تھا جو ثبوت تھا کہ اُسے اُٹھا کر لے جا رہے ہیں۔

یہ میں پہلے سُنا چکا ہوں کہ زمین نشیب میں اُتر جاتی تھی۔ وہاں گھوڑے کے کھُرے نظر آتے۔ ان کے قریب جو انسانی کھُرے تھے ان میں ایک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ بھی دیہاتی جوتی کا تھا لیکن دوسروں سے ذرا مختلف تھا۔ گھوڑا چلا اور دو کھُرے اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ ہم انہیں دیکھتے چلے گئے۔

آگے زمین کٹی پھٹی ہوتی تھی۔ کہیں چھوٹی اور کہیں لمبی دراڑیں تھیں اور جو جگہ ہموار تھی وہاں کنکریاں اور پتھر تھے۔ ہم کھُرے دیکھتے چلے گئے۔ میں آپ کو یہ بتا دوں کہ کھُروں سے ہم کسی کو پکڑ نہیں سکتے تھے۔ ہم پولیس کے آدمی نہیں تھے کہ کھُروں کے مولڈ تیار کر کے تھانے میں رکھ لیتے اور ملزموں کی شناخت میں انہیں استعمال کرتے۔ ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ آدمی کہاں تک گئے ہیں۔

کچھ دُور تک ہم چلے گئے اور ایک بہت وسیع قدرتی تالاب آ گیا۔ یہ جھیل جیسا تھا اس کے اردگرد درخت تھے اور خودرَو سبزہ تھا۔ اس کے قریب سے پگڈنڈی گزرتی تھی۔ دیہات کی دُنیا جاگ اُٹھی تھی۔ انسان اور مویشی باہر نکل

آتے تھے۔ تالاب سے ذرا پرے ایک گاؤں تھا۔ چھوٹا سا ایک گاؤں اور بھی تھا۔ ان کی آبادی اور ان کے مویشیوں نے کھُرے مٹا دیتے تھے۔

تجمل اور منوّر کو جاننے والے کئی لوگ تھے۔ وہ ملتے اور پوچھتے تھے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ ایک نے کہا، چوہدری صاحب شکار کو جا رہے ہیں؟

آگے جانا بیکار تھا۔ ہم وہاں سے واپس آ گئے۔ ہم ڈیڑھ پونے دو میل دُور نکل گئے تھے۔ کھُروں سے صرف یہ واضح ہوتا تھا کہ یہ گھوڑا شہر کی طرف نہیں گیا۔ کھُرے اُلٹی طرف گئے تھے۔ بالکل مشرق کی طرف۔ شہر مغرب کی طرف تھا۔

”سکندر!“ — تجمل نے چلتے چلتے میرے قریب آ کر کہا — ”اب تو میرا بھی شک کمزور پڑ گیا ہے کہ یہ واردات ایوب نے کیا ہے۔ لیکن وہ یہاں عذرا کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس علاقے میں اس کے کوئی دوست ہوں اور اُس نے یہ واردات ان سے کرائی ہو۔ کھُرے شہر کی طرف نہیں جاتے۔“

تجمل، منوّر اور میرے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ بڑی لمبی ہیں اور جس طرح وہ دن گزرا اور کس کے کیا تاثرات تھے، بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ گھر کے تمام افراد سارا دن اکٹھے بیٹھے رہے۔ کبھی تو سب بولنے لگتے اور کبھی ایسی خاموشی طاری ہو جاتی جیسے یہاں کوئی ہے ہی نہیں۔



اُس دن کا سورج بھی غروب ہو گیا۔

رات کا ابھی پہلا پہر ہی تھا۔ اُس وقت تک دیہات کے لوگ گہری نیند سو چکے ہوتے ہیں۔ تجمل اور منوّر میرے پاس بیٹھے ہوتے تھے۔ ہمیں نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ منوّر اچانک بھڑک اُٹھتا اور بے قابو ہو جاتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ ایوب کے گھر جاتے گا۔ تجمل اب کچھ سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا اور میرا ہم خیال ہو گیا تھا۔

”صرف آج رات دیکھ لو“ — میں منوّر کو سمجھاتا تھا — ”ایوب گھر نہیں ملے گا۔“

باہر سے بڑی بلند آواز آئی ـــ "چوہدری جی ۔۔۔ جلدی باہر آؤ چوہدری جی!"

ہم تینوں دوڑتے باہر گئے۔ دروازے کے باہر ایک چارپائی رکھی تھی۔ چار مزارعے پاس کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ چارپائی پر کوئی لیٹا ہوا تھا اوپر چادر پڑی تھی۔ منہ ننگا تھا۔

"چھوٹی بی بی ہے چوہدری جی!" ـــ ایک مزارعہ نے لالٹین اوپر کر کے کہا۔

وہ عذرا تھی یا اُس کی لاش تھی۔

"زندہ ہے چوہدری جی!" ـــ ایک اور مزارعہ بولا۔

میں نے عذرا کی نبض دیکھی۔ چل رہی تھی۔ دل پر ہاتھ رکھا۔ دھڑک رہا تھا۔ میں اُس پر جھکا ہوا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اُس کے ہونٹ ہلتے نظر آتے۔ وہ بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کا رنگ لاش کی طرح سفید تھا اور چہرے پر ہلکی ہلکی خراشیں تھیں۔ بال بکھرے اور نوچے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔

"اندر لے چلو" ـــ کسی نے کہا ـــ "اٹھاؤ چارپائی"

"ٹھہرو" ـــ میں نے کہا۔

میں نے چارپائی نہ اُٹھانے دی۔ نبض ڈوب رہی تھی۔ دل پر ایک بار پھر ہاتھ رکھا۔ مجھے اتنا تجربہ تو نہیں تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ زندگی کا دھاگا ٹوٹ رہا ہے۔ میں پولیس والوں کی طرح نزعی بیان لینے کی سوچ رہا تھا۔

"عذرا!" ـــ میں نے اُسے بلایا پھر منہ اُس کے منہ کے اور قریب کر کے کہا ـــ "عذرا .... میں سکندر ہوں۔ آنکھیں کھولو نا!"

اُس کی سرگوشی سنائی دی۔ میں نے کان اُس کے ہونٹوں کے قریب کر دیا۔

"ایوب" ـــ اُس نے سرگوشی کی ـــ "سکندر ایوب کو پکڑو"

اس کے بعد اُس کے منہ سے دو بار سی سی سنائی دی۔ وہ شاید سکندر کہنا چاہتی تھی لیکن اُس نے لمبی سانس چھوڑی۔ میں نے چونک کر کان اُس

کے ہونٹوں سے ہٹایا اور اُس کا چہرہ دیکھا۔ اُس کی آنکھیں پوری کھلیں اور آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔ اُس کے ہونٹ ذرا سے کھلے رہے اور وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔

عذرا کو چارپائی پر اُٹھا کر لانے والے مزارعوں نے بتایا کہ وہ سوتے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کی آنکھ کھلی۔ قریب کہیں گھوڑا ہنہنایا تھا۔ مزارعہ دوڑتا باہر آیا۔ باغ کے اندر سے دو گھوڑے دوڑے اور اُس طرف چلے گئے جس طرف باڑ بہت کم گھنی تھی۔ مزارعہ آگے چلا گیا۔ اُسے کسی کے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں۔

وہ واپس آیا اور لالٹین جلا کر لے گیا۔ باغ کے مکان میں رہنے والے سب مزارعے دوڑے گئے۔ دیکھا تو وہ عذرا تھی۔ انہوں نے ایک چارپائی خالی کی اور چارپائی لے جا کر اس پر عذرا کو ڈالا اور لے آئے۔

اب میری جذباتی حالت اُسی طرح ہو گئی جس طرح منوّر کی ہو گئی تھی اور میں اس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے ایوب سے کہا تھا کہ وہ کوئی انتقامی کارروائی نہ کرے تو وہ مان گیا تھا۔ یہ اُس کی چال تھی۔ اُس نے مجھے دھوکہ دیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں کہیں جا رہا ہوں اور واپس نہیں آؤں گا۔ اُس نے اپنا یہ بھیانک ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔



عذرا کی لاش کو اندر لے جا کر ایک اچھی چارپائی پر بستر بچھا کر ڈال دیا گیا۔ اُس کی لاش دیکھی تو پتہ چلا کہ اس پر تشدد کیا گیا تھا۔ یہ تو انہوں نے کرنا ہی تھا۔ دشمنی کی تسکین اسی طرح ہو سکتی تھی۔ عذرا کو واپس پھینک جانا ہمارے لئے چیلنج تھا۔

"عذرا نے کچھ کہا تھا؟" ـــ منوّر نے مجھ سے پوچھا۔

"ایوب!" ـــ میں نے کہا ـــ "ایوب کو پکڑنا ہے"

"ابھی چلو" ـــ منوّر نے کہا۔

"آج نہیں" —— میں نے کہا —— "کل رات!"

"اب تو یہ قتل کا کیس ہے" —— تجمل نے کہا —— "کیا کہتے ہو سکندر! لاش تھانے لے چلیں؟ ایاز کو گرفتار کرا دیں گے۔"

"نہیں" —— میں نے کہا —— "اپنی بے عزتی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ کوئی شہادت نہیں، کوئی ثبوت نہیں۔ ہم نے مرنے والی کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں لکھوائی تھی۔ اسے تمہارے مزارعے اپنے باغ سے اٹھا کر لائے ہیں.... اور تجمل بھائی! اب یہ پولیس کا نہیں، یہ میرا کیس ہے۔ یہ تم لوگوں کا کام ہے کہ عذرا کی موت کا جو اصل باعث ہے اس پر پردہ ڈالو۔ رات کا وقت ہے۔ ان چار مزارعوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔"



"لوگوں کو کیا بتائیں؟" —— منور نے پوچھا۔

میں نے دماغ پر ذرا زور دیا تو ایک بات دماغ میں آگئی۔

"لوگوں کو اور جو رشتہ دار موت کی اطلاع پر آئیں گے، انہیں بتانا کہ عذرا کبھی کبھی نیند میں اُٹھ کر چل پڑتی تھی" —— میں نے کہا —— "کہنا کہ رات کو یہ نیند میں چھت پر چلی گئی اور منڈیر سے گر پڑی اور فوراً ہی مر گئی ..... ان مزارعوں کو بھی سمجھا دو کہ کسی سے ذکر نہ کریں کہ عذرا کو باغ سے اٹھا کر لاتے ہیں۔ انہیں ڈرا دو کہ کسی کو پتہ چل گیا تو تھانے تک بات پہنچ جائے گی پھر پولیس انہیں گرفتار کر لے گی۔"

تجمل اور منور نے اُسی وقت گھر کی عورتوں کو سمجھا دیا اور مزارعوں کو بھی ڈرا دیا گیا۔

"بھائی فضل حسین اور مظفر کو تاریں دینی پڑیں گی" —— تجمل نے کہا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ انہیں اطلاع نہ دی جاتے؟" —— میں نے کہا۔

"کیوں؟"

"اگر انسپکٹر فضل حسین آگیا تو جو میں کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں ہو سکے گا" —— میں نے کہا —— "وہ آتے ہی پوچھے گا کہ تھانے رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی؟

گمشدگی کی رپورٹ کیوں نہیں دی؟"

"انہیں اطلاع نہ دینے کی ایک وجہ تو ہے" —— منور نے کہا —— "میں نے عذرا کے ساتھ شادی کی تھی تو ہماری ماں نے بھائی فضل حسین کو خط لکھوایا تھا کہ میں نے کس طرح شادی کی ہے۔ بھائی فضل حسین نے مجھے بڑا سخت خط لکھا تھا۔ اُنہوں نے لکھا تھا کہ تم نے سارے خاندان کی بے عزتی کر ڈالی ہے اور تم میرے لئے مر گئے ہو ..... اگر انہیں عذرا کی موت کی اطلاع نہ دوں اور وہ کبھی آئیں اور گلہ کریں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے کہ جس لڑکی کی وجہ سے آپ کے خاندان کی بے عزتی ہوتی ہے وہ مر گئی ہے۔"

یہ فیصلہ ہو گیا کہ انسپکٹر فضل حسین اور مظفر کو اطلاع نہیں دی جائے گی۔ رات کو رشتہ داروں کو اطلاع دینے کے لئے آدمی بھیج دیئے گئے۔



صبح تک میری جذباتی حالت یہ ہو گئی تھی کہ کوئی میرے ساتھ بات کرتا تھا تو مجھے غصہ آجاتا تھا۔ صبح تک ان لوگوں کے رشتہ دار اور گاؤں کے لوگ آگئے تھے۔ اگر میں ان لوگوں میں موجود رہتا تو میری ذہنی حالت اتنی خراب نہ ہوتی۔ تجمل اور منور نے مجھے گاؤں کی دوسری طرف اپنے کچے سے ایک مکان میں بھیج دیا تھا۔ مجھے اتنے زیادہ لوگوں کے سامنے نہیں آنا چاہیئے تھا۔ کچھ آدمی دُور سے آتے تھے۔ ان میں کوئی مجھے جاننے والا ہو سکتا تھا۔

مجھے جس مکان میں رکھا گیا تھا وہ غیر آباد مکان تھا۔ اس کے ایک کمرے میں فالتو بھوسہ رکھا ہُوا تھا۔ میرے کہنے پر رات کو ہی یہاں ایک پلنگ اور بستر پہنچا دیا گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اس میں قید کر لیا تھا۔ میں انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس کچے مکان کی تنہائی میں عذرا آنکھوں کے آگے سے ہٹتی نہیں تھی۔ شہناز کے مرنے کا مجھے اتنا افسوس نہیں ہُوا تھا جتنا دکھ عذرا کے مرنے کا تھا۔ جب خیال آتا تھا کہ میں عذرا کا جنازہ نہیں پڑھ سکوں گا تو میں تڑپ اُٹھتا تھا۔

عذرا مجھ سے تین چار سال چھوٹی تھی۔ مجھے اُس کی پیدائش اچھی طرح یاد تھی۔ میں نے اپنے ماضی کو ذہن سے اُتار دیا تھا لیکن عذرا مر گئی اور میں جالوں سے اَٹی ہوئی چھت والے ایک کمرے میں قید ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ ماضی سائے کی طرح میرے ساتھ لگا ہُوا ہے۔ مجھے بچپن کی باتیں سنائی دینے لگیں۔

جس رات عذرا نے پیدا ہونا تھا اُس رات میری ماں خالہ کے گھر رہی تھی۔ میں چھوٹا تھا اس لئے میں بھی ماں کے ساتھ تھا۔

"سکندرا" — صبح میری آنکھ کھُلی تو ماں نے مجھے کہا تھا — "تیری خالہ کی بیٹی پیدا ہوئی ہے۔"

"میں دیکھوں گا" — میں نے کہا — "کہاں ہے؟"

ماں مجھے اُس کمرے میں لے گئی جہاں خالہ لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے پہلو میں نوزائیدہ بچّی پڑی تھی۔ میں نے بچّی کے ہاتھ پکڑ لئے تھے اور میں اُس کی مٹھیاں کھولنے کی کوشش کرتا تھا اور مٹھیاں کھُلتی نہیں تھیں۔

آج برسوں بعد گزرے ہوئے وقت کی آوازیں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے ساتھ والے کمرے میں میری خالہ اور میری امی بیٹھی ہوئی بول رہی ہوں۔ مجھے اپنی خالہ کی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔

"نہ سکندری!" — خالہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا — "اس کی مٹھیاں ابھی نہیں کھلیں گی۔"

"امی جان!" — میں نے امی سے کہا تھا — "اس گڑیا کو گھر لے چلو۔"

"یہ تیرے ہی گھر جائے گی سکندری!" — خالہ نے کہا تھا — "اس کی مٹھیاں نہ کھول۔ تُو اس کی مٹھی میں آگیا تو نکل نہیں سکے گا۔"

میری امی اور خالہ بڑی زور سے ہنسی تھیں۔

آج ذہن کے آئینے میں وہ سب نظر آرہے تھے جنہوں میں میرے بچپن کو بڑا ہی حسین خواب بنایا تھا۔ اس گڑیا کا نام خالہ نے عذرا رکھا تھا۔

دو تین مہینوں بعد جب اس کی مٹھیاں کھُل گئی تھیں تو میں اُس پر اتنا جھک جایا کرتا تھا کہ میرا مُنہ اُس کے مُنہ کے ساتھ لگ جاتا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میرے سر پر لے جاتی اور میرے بال مُٹھیوں میں پکڑ کر کھینچا کرتی۔ اگر میرا گال اُس کے ہونٹوں تک پہنچ جاتا تو وہ میرا گال یوں چوسنے لگتی تھی جیسے ماں کا دودھ پی رہی ہو۔

میں اُس کے گالوں کو چوما کرتا تھا۔

اُس غلیظ کمرے کی تنہائی میں جس میں مجھے چھپایا گیا تھا، مجھے عذرا کے وہ روئی جیسے گال یاد آتے جنہیں میں چوما کرتا تھا تو میرا دھیان ماضی سے ٹوٹ آیا۔ میرے سامنے یہ عذرا تھی جس کے گالوں پر خراشیں تھیں، اور جب یہ خیال آیا کہ خراشیں کس نے ڈالی ہیں تو میرے وجود میں ہولناک دھماکہ ہُوا۔ ایسے لگا جیسے یہ کچا کوٹھا لرز گیا ہو۔

میں چارپائی پر لیٹا ہُوا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ خون میں اس قدر جوش آیا کہ دماغ برداشت نہ کر سکا۔ مجھے چکر سا آیا۔ میری مُٹھیاں بند ہو گئی تھیں۔ میں نے کمرے میں ہر طرف دیکھا۔ مجھے دیواروں نے نرغے میں لے رکھا تھا۔ اوپر چھت تھی جس میں درختوں کے ٹیڑھے میڑھے شہتیر لگے ہوئے تھے۔ اگر میں اپنے آپ پر قابو نہ پا لیتا تو میں دیواروں کو گھونسے مارنے شروع کر دیتا۔

میری یہ حالت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ میں کیسے کیسے حالات سے گزرا، سب سُنا چکا ہوں، میں کبھی یوں بے قابو نہیں ہُوا تھا۔

کیا میرے دل میں میری دانست کے بغیر عذرا کی محبت پرورش پاتی رہی تھی؟

کیا یہ خون کا اثر تھا؟

جو کچھ بھی تھا، میرے لئے آسیب بن گیا اور میں اب خود بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ میں کیا کر گزروں گا۔

میں نے اپنے گالوں پر نمی محسوس کی۔ ہاتھ لگا کے دیکھا۔ آنسو بہہ رہے

تھے۔ جی میں آتی دوڑتا جاؤں اور عذرا کی مُردہ مٹھیاں کھولوں۔ اُس پر جھک جاؤں اور اُسے کہوں، عذرا میرے بال مٹھیوں میں پکڑ کر زور سے کھینچو۔

انسان نڈر ہوتا ہے، جابر بھی ہو جاتا ہے، قہار بھی ہو سکتا ہے مگر اُس کی ذات میں ایک کمزوری موجود ہوتی ہے جو اُسے ڈر ڈر کر رینگنے والا ایک کیڑا بنا دیتی ہے۔

میں نے ایوب کی بہن کو اُٹھا لانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ یہ غیر معمولی دلیری کا کام تھا لیکن میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ آنسو تو بزدلوں کے بہا کرتے ہیں۔

میں کیا تھا؟ .... کیا بن گیا؟ .... میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ آج وہ لمحے یاد آرہے ہیں تو میں ان سوالوں کے جواب دے سکتا ہوں میں درندہ بنتا جا رہا تھا۔ یہ لاشعوری عمل نہیں تھا۔ اُس وقت مجھے درندگی اور وحشی پن ہی سکون دے سکتے تھے۔



اگلے روز میں اسی مکان میں رہا اور لوگ عذرا کو دفن کر آئے۔ وہ جس طرح خاموشی سے ماں باپ کے گھر سے نکلی اور منور کی بیوی بن گئی تھی، اسی طرح خاموشی سے اس گھر سے بھی نکلی اور قبر میں اُتر گئی۔ کسی عورت کے رونے کی آواز نہ آئی۔ کسی نے بین نہ کئے۔ عورتوں نے آنسو بہاتے ہوں گے۔ اُس کی موت پر رونے والا ایک میں تھا اور ایک منور۔

منور قبرستان سے سیدھا میرے پاس آگیا۔ اتنا زندہ دل اور نڈر نوجوان بجھ کے رہ گیا تھا لیکن اُس کے غم میں جو بجلیاں تڑپ رہی تھیں، میں اُن سے بے خبر نہ تھا۔

"اب بتاؤ سکندر بھائی!" —— اُس نے پوچھا —— "کیا کرنا ہے؟"

"وہ جو میں پہلے کہہ چکا ہوں" —— میں نے جواب دیا —— "ایوب اور اُس کی بہن کو اُٹھا کر یہاں لانا ہے .... یہ بتاؤ کسی کو عذرا کی موت پر کوئی شک تو نہیں ہوا؟"

"نہیں" —— منور نے جواب دیا —— "اس کا کوئی اپنا یہاں ہوتا تو شک کرتا۔ لوگوں کے لئے تو وہ لاوارث تھی" —— وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور یہ کہہ کر چلا گیا —— "میں تحمل کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔"

وہ باہر نکلا ہی تھا اور واپس آگیا۔ تحمل ادھر ہی آرہا تھا۔ وہ بھی یہی پوچھنے آرہا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اُسے بھی میں نے وہی جواب دیا جو منور کو دے چکا تھا۔

"میں تین آدمی ساتھ لے کر جاؤں گا" —— منور نے کہا —— "لیکن ہمیں اُس کا گھر کون دکھائے گا؟"

"تم نہیں جاؤ گے" —— میں نے کہا —— "میں جاؤں گا۔ مجھے تین آدمی اور چار گھوڑے دے دینا۔"

"نہیں سکندر!" —— تحمل نے کہا —— "تم پکڑے گئے تو سیدھے پھانسی کے تختے پر جاؤ گے۔"

"اسی لئے تو میں جانا چاہتا ہوں کہ میں پہلے ہی پھانسی کے تختے پر کھڑا ہوں" —— میں نے کہا —— "میرے پیچھے رونے والا کوئی نہیں۔"

کچھ دیر یہی بحث چلتی رہی آخر فیصلہ ہوا کہ میں اور منور جائیں گے اور ہمارے ساتھ دو آدمی ہوں گے۔ اسی رات جانا تھا۔ طے یہ ہوا کہ اگر ہم ایوب اور اُس کی بہن کو اُٹھا لانے میں کامیاب ہو گئے تو ایوب کو ایک اور مکان میں اور اُس کی بہن کو اس مکان میں رکھیں گے۔

پھر ہم ان دونوں کو اغوا کرنے کے طریقے سوچنے لگے۔ تین طریقے سوچے۔ آخر ایک طریقہ میرے دماغ میں آگیا جو میں نے ان دونوں کو بتایا اور اسی کو طے کر لیا۔



رات کا وہی وقت تھا جب چھ سات روز پہلے میں ایوب کے گھر کے دروازے پر پہنچا تھا۔ ہم نے گھوڑیاں محلے کے باہر کھیتوں میں کھڑی کر دی تھیں اور ایک آدمی کو ان کے پاس کھڑا کر دیا تھا۔ اسے میں نے کہہ

دیا تھا کہ اگر چوکیدار آ نکلے اور اُس سے پوچھے کہ وہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے تو وہ چوکیدار کے سَر پر لاٹھی مار کر بے ہوش کر دے۔

میں، منور اور اس کا ایک خاص مزارعہ محلے میں داخل ہوتے، چوکیدار کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ دوسری طرف نکل گیا تو ہم ایوب کے دروازے کے سامنے جا رکے۔ میرے دونوں ساتھی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔

ایوب نے دروازہ کھولا۔ میں نے اُسے باہر نہ آنے دیا تاکہ وہ میرے ساتھیوں کو نہ دیکھ سکے۔

"ایوب بھائی!" ——— میں نے دروازے میں داخل ہو کر اُسے اندر کو دھکیلتے ہوتے کہا ——— "باہر کھڑا رہنا ٹھیک نہیں۔ اندر چلو، میں تھوڑی دیر بیٹھوں گا اور چلا جاؤں گا۔ میں جلدی میں ہوں۔"

"آجاؤ، آجاؤ" ——— اُس نے کہا ——— "میں دروازہ بند کر لوں۔"

میں نے اُسے دروازے تک نہ پہنچنے دیا۔ میں راستے میں کھڑا رہا۔ میری سکیم کے مطابق منور اور اُس کا آدمی اندر آ گئے۔ میں نے ریوالور نکال لیا۔ نالی اُس کے سینے کے ساتھ لگا دی۔

"ایوب!" ——— میں نے کہا ——— "مُنہ سے آواز نہ نکالنا۔ مارے جاؤ گے۔"

"کیا کر رہے ہو سکندر!" ——— ایوب نے کہا ——— "ڈاکہ ڈالنے کے لئے تمہیں میرا ہی گھر..."

سکیم کے مطابق منور کے آدمی نے رومال جیسا ایک کپڑا مروڑ کر ہاتھ میں رکھا ہُوا تھا۔ جیسے اُسے بتایا تھا۔ اُس نے پیچھے سے کپڑا ایوب کے سَر کے اُوپر سے آگے کیا۔ میں نے کپڑا ایوب کے مُنہ میں کر دیا اور ہمارے آدمی نے اُس کے سَر کے پیچھے کس کر گانٹھ لگا دی۔

"آرام سے کھڑے رہو ایوب!" ——— میں نے کہا ——— "تڑپنا بیکار ہے۔"

ہمارے آدمی نے اُس کے ہاتھ پیٹھ پیچھے کئے اور منور نے ہاتھ رسّی سے باندھ دیئے۔

میں اور منور ڈیوڑھی سے اندر چلے گئے۔ گھر والے برآمدے میں سوتے ہوتے تھے۔ میرے پاس ٹارچ تھی جو روشن کی اور سوتے ہوؤں کو دیکھنے لگا۔

"ایوب!" ——— ایوب کی ماں کی آنکھ کھل گئی تھی ——— "کیا دیکھ رہے ہو؟" ——— وہ اُٹھ بیٹھی۔

منور کے پاس دونالی بندوق تھی۔ اُس نے بٹ بڑھیا کے سَر کے پچھلے حصے پر مارا تو وہ بستر پر لڑھک گئی۔ اس کے ساتھ والی چارپائی پر ایوب کی بہن سوتی ہوتی تھی۔ اُس کی بھی آنکھ کھل گئی لیکن وہ دیکھ نہیں سکتی تھی کہ اس کی ماں کے ساتھ کیا سلوک ہُوا ہے۔ وہ بھی اُٹھ بیٹھی اور حیرت سے ہمیں دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں ٹارچ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ اُسے روشنی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ سکتا تھا۔

اس لڑکی کا مُنہ اور ہاتھ باندھنے کا کام منور نے کیا۔ لڑکی تڑپتی تھی۔ میں نے اُسے جکڑ لیا۔ اُس کا مُنہ بھی باندھا گیا اور ہاتھ بھی۔

وہاں دو اور بستر بچھے ہوتے تھے۔ معلوم نہیں وہ کون تھے۔ اُن کی نیند اتنی گہری تھی کہ اُن کی آنکھ نہ کھلی۔ میں نے ایوب کی بہن کو اُٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا۔ ڈیوڑھی میں لے جا کر اُسے منور کے آدمی کے کندھے پر ڈالا اور اُسے باہر چلنے کو کہا۔

"ایوب بھائی!" ——— میں نے کہا ——— "اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ نہیں چلنا تو یہیں تمہارا کام کر جاؤں گا ... چلو۔"

اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ہم اُس کی بہن کو بھی لے جا رہے ہیں۔ شاید اس لئے وہ چل پڑا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ جان ہر جاندار کو پیاری ہوتی ہے۔ ایوب مجھے جانتا تھا کہ میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔

باہر نکلے۔ ہمارا ساتھی ایوب کی بہن کو اُٹھائے آگے آگے جا رہا تھا۔

ساتھ والی گلی سے چوکیدار نکلا۔ اندھیرے میں پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اُس نے ہمارے ساتھی سے پوچھا، کون ہو بھائی، یہ کیا اُٹھایا ہُوا ہے۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ چوکیدار ہے۔ میں آگے گیا۔ چوکیدار سے کہا، اِدھر آ اوئے۔ وہ جونہی میرے قریب آیا میں نے ایک گھونسہ اُس کے پیٹ میں مارا۔ وہ آگے کو جھکا تو ایک گھونسہ نیچے سے اس کے مُنہ پر مارا۔ میرے جسم میں طاقت تھی۔ اُس وقت تو میرے جسم کی ساری طاقت بیدار تھی کیونکہ میں چور تھا۔ میں نے صحیح سلامت وہاں سے بھاگنا تھا۔ چوکیدار راتوں کو جاگنے والا غریب آدمی تھا۔ اُس کے مُنہ پر گھونسہ پڑا تو اُس کے پاؤں زمین سے اُٹھے اور وہ قلابازی کی طرح پیٹھ کے بل گرا اور اُس کے پاؤں آسمان کی طرف ہو گئے۔ منّور نے اُس کے مُنہ پر بٹ مارنے کے لئے بندوق اُوپر کی۔

"نہیں منّور!" — میں نے اُس کی بندوق پکڑ کر کہا — "غریب آدمی اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہے۔ یہ آدھے گھنٹے سے پہلے نہیں اُٹھ سکے گا۔"



آدھا گھنٹہ گزر گیا تو ہم شہر سے بہت دُور جا چکے تھے۔ ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں آیا تھا۔ ایوب کی بہن کو میں نے اپنے آگے گھوڑے پر بٹھا لیا اور اس کے ہاتھ کھول دیئے تھے۔ میں نے ایک بازو اُس کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ وہ بول نہیں سکتی تھی کیونکہ اُس کا مُنہ بندھا ہُوا تھا۔ میرے پاس منّور کا گھوڑا تھا۔ اس پر کوئی شہسوار ہی سواری کر سکتا تھا۔ یہ گھوڑا آرام اور اطمینان سے تو چلنا ہی نہیں تھا۔ بڑا زبردست گھوڑا تھا۔ میرے آگے بیٹھی ہوئی لڑکی ڈرتی تھی کہ گر پڑے گی اس لئے وہ پیچھے ہٹتی اور اپنی پیٹھ میرے سینے کے ساتھ دبا کر رکھتی تھی۔

میں نے اُسے یہ نہیں کہا کہ مجھ سے ڈرو نہیں میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں نے اُسے ذرا سی بھی تسلّی نہ دی۔ میں اُس وقت ایک وحشی انسان تھا۔ مجھ میں رحم کا جو جذبہ تھا وہ ختم ہو چکا تھا یا یوں سمجھ لیں کہ ایوب اور اُس کی بہن

کے لئے میرے دل میں رحم کا نام و نشان نہ تھا۔ میں نے عذرا کا انتقام لینا تھا۔ یہ لڑکی جو میرے قبضے میں تھی ایک عورت تھی اور میں مرد تھا۔

ایوب کو منّور کے ایک آدمی نے آگے بٹھا لیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ صبح تک ایوب اور اُس کی بہن کے اغوا کی اطلاع تھانے پہنچ جائے گی اور چوکیدار نے جو دیکھا اور اُس کے ساتھ جو ہُوا وہ بیان کرے گا، ہمیں کسی نے پہچانا نہیں تھا لیکن پولیس نے تو زمین کی تہوں کو بھی کھوجنا تھا۔ میں پولیس کے دماغ سے سوچ رہا تھا۔ ایوب نے اکیلے عذرا کو اغوا نہیں کیا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک دو آدمی ضرور تھے۔ وہ خود تو پولیس کے سامنے نہیں جا سکتے تھے لیکن کسی اور کے ذریعے تھانے تک یہ شک پہنچا سکتے تھے کہ منّور کے خاندان کے ساتھ ایوب کی دشمنی ہے۔ اس شک پر پولیس یہاں آ سکتی تھی۔ میرا ابھی کسی کو پتہ نہیں چلا تھا کہ میں یہاں ہوں۔ بہرحال چوکس رہنے کی ضرورت تھی۔

گاؤں میں ہم اُس وقت پہنچ گئے جب کوئی بھی نہیں جاگا تھا۔ کسی کو اُس کے گھر سے اُٹھا لانا تو زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس کے لئے جرأت اور عقل کی ضرورت تھی۔ اصل مسئلہ اغوا کئے ہوئے آدمی یا عورت کو چھپائے رکھنے اور پکڑے نہ جانے کا تھا۔ منّور کے ہاں یہ سہولت میسّر تھی۔ اُن کا مکان گاؤں سے الگ تھلگ تھا اور اردگرد اُن کی کھیتیاں تھیں جو دُور دُور تک گئی ہوئی تھیں۔ ان کے کچے کوٹھے بھی تھے اور سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ ان کا اس علاقے پر رعب اور اثر تھا۔ لوگ اس خاندان کو عزّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ سلسلہ آج تک چل رہا ہے کہ اتنی بڑی زمینداری اور جاگیرداری میں نوکروں اور مزارعوں کی حیثیت فرعون کے غلاموں جیسی ہوتی ہے اور ان کی زندگی اور موت بھی زمیندار اور جاگیردار خاندان کے ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن منّور کے خاندان کا رویّہ مزارعوں وغیرہ کے ساتھ کچھ اور تھا۔ وہاں ان لوگوں کو عزّت حاصل تھی اور ان کی جوان بہو بیٹیوں کی عزّت محفوظ رہتی تھی۔ مزارعوں کو ان کا حق دیا جاتا تھا۔ اس سلوک کا یہ اثر تھا کہ اس خاندان پر مزارعے اور نوکر جاں کر

جانیں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، البتہ کوئی مزارعہ اپنی برادری میں کوئی بدمعاشی کر بیٹھتا تو اُس کا پھر اللہ ہی حافظ تھا۔ اُس کی ہڈی پسلی سلامت نہیں رہتی تھی۔

ایوب کو ایک کچے مکان کے ایک کمرے میں پھینک دیا گیا۔ یہ مویشیوں کا مکان تھا۔ صحن کشادہ تھا اور اس کے دو بڑے بڑے کمرے تھے اور ساتھ ایک کوٹھڑی تھی۔ اس میں ایوب کو رکھا گیا۔ یہ کوٹھڑی بھی ایک کمرہ ہی تھا۔ اس کا صرف دروازہ تھا جو صحن میں کھلتا تھا۔ کوئی کھڑکی اور روزن نہیں تھا۔ فرش پر گھاس پھونس بکھری ہوئی تھی اور کمرے میں بہت بدبو تھی۔ ایوب کے پاؤں بھی باندھ دیئے گئے۔

ایوب کی بہن کو میں اُس کمرے میں لے گیا جہاں مجھے چھپایا گیا تھا۔ اس کے بھی پاؤں باندھ دیئے گئے۔

رات گزر گئی تھی۔ ہم نے ایک آدمی کو ایوب پر اور ایک کو اُس کی بہن پر چوکیدار کھڑا کر دیا۔ انہیں کہا کہ وہ مکانوں کے صحن میں رہیں اور ان کے کمروں میں دیکھتے رہیں۔ منوّر سے کہا کہ چل کے سو جاتے ہیں۔ اس سے پہلی رات بھی ہم جاگتے رہے تھے۔ عذرا کی میت گھر میں رکھی تھی۔ گھر والوں نے تو جاگتے ہی رہنا تھا، میں وہاں سے دُور تھا تو بھی رات جاگتے گزار دی تھی۔

میں منوّر کے ساتھ چلا گیا اور ہم سو گئے۔



آنکھ کھلی تو سورج غروب ہونے کو تھا۔ عذرا کے ماتم پر جو دُور پار کے رشتہ دار وغیرہ آئے تھے وہ جا چکے تھے۔ ہم نے نہا دھو کر کھانا کھایا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ تجمّل اور منوّر نے مجھ سے پوچھا کہ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کریں۔

"انہیں فوراً قتل نہیں کرنا" — میں نے کہا — "یہ کام مجھے کرنے دو۔ ایوب کی بہن کو اُس کے سامنے خراب کریں گے.... کیا یہاں وہ سلاخ مل جائے گی جس کا سرا گرم کر کے گھوڑوں اور مویشیوں کے جسموں پر شناختی نشان لگایا کرتے ہیں؟"

یہ پیچ کس کی طرح ہوتی ہے۔ ان کے پاس یہ چیز تو نہیں تھی ایک بڑا پیچ کس مل گیا جو ایک فٹ سے زیادہ لمبا تھا۔ میں نے یہ لیا اور تجمّل اور منوّر کو ساتھ لے کر وہاں چلا گیا جہاں ایوب کو بند کیا ہوا تھا۔ وہاں جس آدمی کو پہرے پر بٹھایا تھا اُسے کہا کہ مٹی کا دیا لے آئے اور ایک کمرے میں لکڑیوں کے ٹکڑے رکھ کر آگ جلائے۔

دیا وہاں موجود تھا جو اس نوکر نے جلا دیا۔ لکڑیوں کے ٹکڑوں کی کمی نہیں تھی۔ اُس نے دوسرے کمرے میں اکٹھے کر کے آگ جلا دی۔ میں نے پیچ کس کا اگلا سرا آگ میں رکھ دیا اور دیا لے کر ہم تینوں ایوب والی کوٹھڑی میں چلے گئے۔ وہ دیوار کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کا منہ کھول دیا۔

منوّر کے سینے میں جیسے انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ چیتے کی طرح ایوب پر جھپٹا اور اُس کی گردن دبوچ لی۔ ایوب کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ میں نے اور تجمّل نے بڑی مشکل سے منوّر کے ہاتھوں سے اُس کی گردن چھڑوائی۔ منوّر پھنکار رہا تھا۔

"میں نے تمہیں پہلے کہہ دیا تھا کہ یہ کام میں نے خود کرنا ہے" — میں نے منوّر سے کہا — "یہ تو خود چاہتا ہے کہ اسے فوراً مار دیا جائے۔ تم دیکھنا میں اسے کیسی موت ماروں گا۔ اب میرے کام میں دخل نہ دینا۔"

میری اپنی حالت یہ تھی کہ ایوب کو دیکھتے ہی میرا سارا جسم اس طرح گرم ہو گیا تھا جیسے میرے اردگرد یا میرے اندر آگ لگ گئی ہو۔ یہ غصے اور انتقام کی انتہا تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میں بھی یہی کرنے لگا تھا کہ اس شیطان کی شہ رگ دبا دوں۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا تھا۔

"تم آخر مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہو؟" — ایوب نے پوچھا — اور کہنے لگا — "پیاسا تو نہ مارو۔ پانی کا ایک گھونٹ پلا دو۔"

میں اُس کے ایک پہلو کی طرف کھڑا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ اپنے آپ ہی اُٹھا اور یہ اُلٹا ہاتھ اتنی زور سے اُس کے منہ پر پڑا کہ اُس کا سر پیچھے دیوار سے جا لگا۔ میں نے نوکر کو آواز دی اور اُسے کہا کہ وہ پانی کا پیالہ بھر

کے لے آتے۔ پانی آیا تو میں نے نوکر سے کہا کہ پیالہ اس کے مُنہ کے ساتھ لگا دو۔ اس طرح ایوب نے پانی کا پورا پیالہ پی لیا۔ اُس کے اپنے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

"اب بتاؤ"— میں نے اُس سے پوچھا —"عذرا کے اغوا میں تمہارے ساتھ اور کون تھا؟"

"کیا کہہ رہے ہو سکندر!"— ایوب نے کہا —"مجھے تم ایسا آدمی سمجھتے ہو؟"

میں نے پہلے کی طرح ایک اور اُلٹا ہاتھ اُس کے مُنہ پر مارا۔

"اب بتاؤ"— میں نے کہا۔

وہ بولا تو نہیں، انکار میں زور زور سے دائیں بائیں سر ہلایا۔

میں کوٹھڑی سے نکل کر وہاں گیا جہاں نوکر نے آگ جلائی تھی اور اس میں پیچ کس رکھا تھا۔ پیچ کس نکال کر دیکھا۔ اس کا سرا لال ہو چکا تھا۔ میں یہ سکریو ڈرائیور لے کر واپس کوٹھڑی میں گیا اور ایوب کے سامنے بیٹھ گیا۔ انگارے کی طرح لال سُرخ پیچ کس کا سرا اُس کے ایک گال کے ساتھ لگا کر پیچھے کر لیا۔

ایوب کی چیخ نے کوٹھڑی کو ہلا کے رکھ دیا۔ جہاں یہ لوہا لگا تھا وہاں سے کھال جل گئی۔ ایوب تڑپ رہا تھا اور اُس نے مجھے احسان یاد دلانے شروع کر دیئے۔ مجھ پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ میں پیچ کس کا سرا پھر اس کے مُنہ کے قریب لے گیا۔ اُس نے زور زور سے سر دائیں بائیں مارنا شروع کر دیا۔ میں نے گرم سرا اُس کی گردن کے ساتھ لگایا اور ہٹا لیا۔

آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اُس نے کتنا درد محسوس کیا ہوگا۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پا رہا تھا۔ میرے دل میں یہ آتی تھی کہ لال انگارہ پیچ کس اُس کی شہ رگ پر رکھ دوں اور دباتا ہُوا اُس کی گردن سے پار کر دوں۔

"میں تیرے جسم کو ہر روز ایک ایک انچ جلاؤں گا"— میں نے جب یہ الفاظ کہے تو میں نے محسوس کیا کہ میرے دانت غصّے کی انتہا سے بج رہے تھے۔ یہ آواز میری اپنی نہیں لگتی تھی۔ میری زبان سے یہ الفاظ نکل رہے

تھے —"میں تیرا خون بہاؤں گا لیکن قطرہ قطرہ۔ تیرے ایک ایک بال کو آہستہ آہستہ جلاؤں گا۔ تیری گردن پر چھری پھیروں گا لیکن بہت آہستہ آہستہ۔ عذرا کی روح کو میں اسی طرح تسکین دے سکتا ہوں۔"

"عذرا مر تو نہیں گئی"— ایوب نے کہا —"کہاں ہے وہ؟"

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ شخص اس قدر ڈھیٹ مٹی کا بنا ہُوا ہے۔ اگر عذرا یہ کہہ کر نہ مرتی کہ ایوب کو پکڑو تو میں اس شک میں مبتلا ہو جاتا کہ ایوب بے گناہ ہے۔

میں نے گرم پیچ کس اُس کے سر پر رکھ دیا۔ وہاں سے اُس کے بال جلے پھر کھال جلی اور وہ بُری طرح تڑپنے لگا۔ میں نے پیچ کس ہٹا لیا۔

"ادھر آؤ"— میں نے نوکر سے کہا —"پہلے کی طرح اس کے مُنہ میں سے رسّی گزار کر سر کے پیچھے گانٹھ دے دو۔"

میں نے ایوب کے گال اور گردن پر جہاں پیچ کس رکھا تھا وہاں سے جگہ سُرخ ہو گئی تھی اور وہاں بڑے ہی بھدّے داغ بن گئے تھے۔ درد سے ایوب کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کیسی اذیت سے گزر رہا ہے۔

"سوچ لو ایوب!"— میں نے کہا —"ہم پھر آئیں گے.... یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ تمہاری بہن میرے پاس ہے۔"

اُس کا جسم زور سے تڑپا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نوکر رسّی سے اُس کا مُنہ بند کر چکا تھا۔

میں، منوّر اور تحمّل کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل آیا اور نوکر سے کہا کہ وہ ہوشیار اور چوکس رہے۔



ہم وہاں سے واپس آ رہے تھے تو میں نے ان دونوں بھائیوں کو کہا کہ اب میں ایوب کی بہن کے ساتھ حساب برابر کروں گا۔

"تم دونوں گھر چلو"— میں نے کہا —"میں اُسی مکان میں سوؤں گا۔"

"سکندر!" — تجمل نے چلتے چلتے رُک کر کہا — "عذرا کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے وہی سلوک ایوب کے خاندان کی ہر عورت کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ لیکن ہمارے خاندان کی ایک روایت ہے کہ یہاں کسی عورت پر صرف ہاتھ اُٹھانا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ ایوب کی بہن کا کوئی قصور تو نہیں۔ اسے ہم ایوب کی عزت خراب کرنے کے لئے اُٹھا لاتے ہیں ... خیال رکھنا سکندر!"

"وہ میری ماں نہیں لگتی" — میں نے کہا — "عذرا نے اگر منور کے ساتھ شادی کر لی بھی تو کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ منور کے ساتھ تو اُس کی شادی سے پہلے کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔"

"سکندر!" — تجمل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی سے کہا — "میں تمہارے غصے کو سمجھتا ہوں۔ بالکل جائز ہے، لیکن ..."

"تم دونوں گھر چلے جاؤ" — میں نے کہا۔ میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن میری زبان ہکلا گئی۔

وہ دونوں اپنے گھر چلے گئے اور میں اُس مکان میں چلا گیا جہاں ایوب کی بہن سائرہ کو رکھا گیا تھا۔ میری خاص قسم کی دستک پر نوکر نے دروازہ کھولا۔ ہم نے ان دونوں نوکروں کو ایسی دستک سمجھا دی تھی۔ میں کمرے میں گیا۔ سائرہ فرش پر بیٹھی تھی۔ اُس نے پیٹھ پلنگ کے ساتھ لگا رکھی تھی۔ اس کمرے میں لا کر اُس کے بھی پاؤں باندھ دیئے گئے تھے۔

میں نے اُس کے مُنہ سے رسّی کھولی۔ ہاتھ اور پاؤں بھی کھول دیئے۔ نوکر سے پانی منگوایا اور سائرہ کو پلایا۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ یہ تو بہت ہی خوبصورت لڑکی ہے۔

"بے غیرت کافر! داڑھی رکھ کر یہ کرتُوت" — سائرہ نے دانت پیس کر مجھے کوسنا شروع کر دیا — "مجھے کس گناہ میں اُٹھا لاتے ہو؟"

میں اس قدر غصے میں تھا کہ میں نے بڑی زور سے اُس کے مُنہ پر

تھپڑ مارا اور وہ تیورا کر گری۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر بڑی زور سے اٹھایا اور گھما کر پلنگ پر پھینک دیا۔

"تمام کپڑے اُتار دو" — میں نے کہا۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر غصے اور خوف کا جو گہرا تاثر تھا وہ یکلخت غائب ہو گیا۔ اُس کے ایک گال پر سُرخی قائم رہی جو میرے تھپڑ کا نشان تھا۔ میں پلنگ سے چار یا پانچ قدم دُور تھا۔

"میں نے کہا ہے کپڑے اُتار دو۔"

وہ آہستہ آہستہ میری طرف آئی۔ اُس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی۔ اس مسکراہٹ میں مجھے طنز صاف نظر آ رہی تھی۔

"تم مرد ہو" — اُس نے آہستہ سے کہا — "ہمت کرو خود میرے کپڑے اُتار کر دیکھو .... لیکن مجھے یہ بتا دو کہ تم نے مجھے اور میرے بھائی کو کیوں اغوا کیا ہے۔ اتنا تو میں سمجھتی ہوں کہ تم لوگوں نے صرف مجھے اپنی غرض سے اغوا نہیں کیا۔ میرے بھائی نے ضرور کچھ کیا ہو گا اور تم بدلہ لے رہے ہو۔"

"اُس نے تم جیسی ایک شریف لڑکی کو اغوا کیا اور اُسے خراب کر کے اس حالت میں پھینک دیا تھا کہ وہ مر گئی ہے" — میں نے کہا — "اور تم جانتی ہو وہ لڑکی کون ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"قدیر احمد کی بیٹی" — میں نے جواب دیا — "جس کے ساتھ ایوب شادی کرنا چاہتا تھا اور وہ گھر سے نکل گئی تھی۔"

"کون؟" — سائرہ نے حیرت سے پوچھا — "عذرا؟ وہ تو میری سہیلی تھی۔"

"ہاں" — میں نے کہا — "وہی عذرا۔"

"کیا وہ مر گئی ہے؟"

"ہاں" — میں نے جواب دیا — "ایوب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اُسے اغوا کیا، خراب کیا اور اُس کی لاش واپس پھینک گئے۔ ہم نے پولیس میں رپورٹ نہیں کی۔ انتقام خود لیں گے۔"

یہ سنتے ہی سائرہ اُلٹے قدم پیچھے ہٹنے لگی اور پلنگ پر یوں بیٹھ گئی جیسے گر پڑی ہو۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور میں آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھنے لگا۔

میں کیسے کیسے حالات سے گزرا ہوں، یہ سب آپ کو سُنا چکا ہوں۔ آج اُنہیں یاد کرتا ہوں تو کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ کتنی بار موت کے پیٹ سے نکلا ہوں۔ سیلابی دریا تیر کر پار کیا ہے۔ نواب کے اُس قید خانے میں سے بھی زندہ نکل آیا تھا جہاں گِدھ میرے مرنے کے انتظار میں میرے قریب آ بیٹھے تھے، پولیس کا گھیرا بھی توڑا ہے، لیکن ہر حالت میں اور ہر صورتِ حال میں جہاں موت اور گرفتاری یقینی تھی، میں نے اوسان خطا نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں نے موت کو قبول کر رکھا تھا، لیکن اُس رات جب ایک خوبصورت جوان اور بے بس لڑکی سے سامنا ہُوا تو میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ میں کسی ایسی کمزوری کا شکار ہو گیا ہوں جو میرے پاؤں اکھاڑ دے گی۔

وہ ایوب کی بہن تھی ....سائرہ ....وہ کیا تھی؟ ....کمزور سی ایک لڑکی جو میرے قبضے میں تھی۔ میں ایوب کے ہاتھوں عذرا کے انجام پر اس قدر مشتعل تھا کہ میں درندہ بن گیا تھا۔ مجھ پر وحشی پن کا غلبہ تھا۔ میں وہ انسان نہیں رہا تھا جس نے اس جیسی کئی لڑکیوں کی محبت کو اور دعوتِ گناہ کو ٹھکرایا تھا اور اپنے آپ پر فخر کیا تھا کہ مجھ میں گناہوں کے خیال کو مَسل دینے کی طاقت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوتی ہے، لیکن میں جب اس لڑکی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا تو میں محسوس کر رہا تھا کہ میں اپنے آپ اُس کی طرف نہیں جا رہا بلکہ کوئی طاقت مجھے اُس کی طرف گھسیٹ رہی ہے۔ یہ طاقت گناہ کی نہیں تھی۔

مجھے مرحوم خواجہ صاحب نے اور کچھ اور بزرگوں نے بھی بتایا تھا کہ میری آنکھوں میں یا میرے سراپا میں کوئی پُراسرار قوّت ہے جو دوسروں پر ہپناٹزم جیسا اثر کرتی ہے۔ میں کبھی بھی سمجھ نہیں سکا تھا کہ دوسروں پر یہ جو اثر ہوتا ہے وہ کیسا ہے۔ اُس رات جب سائرہ کے سامنے میں نے اپنے آپ پر پُراسرار سا

اثر محسوس کیا تو میں سمجھا کہ میرا اثر بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

یہ شاید اس کا اثر تھا کہ اُس نے مجھے کہا تھا ——"تم مرد ہو۔ ہمت کرو۔ خود میرے کپڑے اُتار کر دیکھو" —— یہ اُس کی مسکراہٹ کا بھی اثر ہو سکتا تھا جس میں طنز بڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ میں بڑا ہی دلیر مرد ہوں اور یہ لڑکی میرے قدموں میں گر پڑے گی۔ منت سماجت کرے گی اور رحم کی بھیک مانگے گی۔

اخلاقی جرأت ہو تو انسان شیروں اور چیتوں کو بھی بے بس کر سکتا ہے۔ جو کچھ بھی تھا وہ میرے لئے عجیب تھا۔ ایک معمہ سا تھا۔ کوئی ایسی بات تھی جو میری سمجھ سے بالا تھی۔ اُس کا نام سائرہ تھا۔ اگر ساحرہ ہوتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔

وہ پلنگ کی پائنتی کی طرف بیٹھ گئی تھی۔ میں تکیے کی طرف بیٹھ گیا اور اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کا سر جُھکا ہُوا تھا۔ اچانک اُس نے سر اُٹھایا اور میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے، اور معلوم نہیں اُس کی آنکھوں میں اور کیا تھا کہ میں اُن کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگا۔ شاید یہ احساسِ گناہ تھا۔

"اگر میرے بھائی نے ایک لڑکی کو بے آبرو کر کے قتل کر دیا ہے تو اُس کے گناہ کی سزا مجھے ملنی چاہیئے" —— سائرہ نے کہا —— "میں بغیر کسی ثبوت کے مان لیتی ہوں کہ میرے بھائی نے ایسا گناہ ضرور کیا ہوگا۔ وہ بدکار آدمی ہے۔ میں تو پہلے ہی اُس کے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہوں"۔

"تمہارا خاوند ہے؟"

"نہ ہے نہ کبھی ہوگا" —— اُس نے جواب دیا۔

"وہ کیوں؟"

"کوئی شریف گھرانہ مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں" —— سائرہ نے کہا —— "میری عمر چھبیس سال ہو گئی ہے۔ میری عمر کی لڑکیاں تین تین چار چار بچوّں کی مائیں بن چکی ہیں۔ میرے اس بھائی ایوب نے نہ اپنی عزّت رہنے دی نہ خاندان کی۔ اُس کی اگر عزّت ہے تو شہر کے بدمعاشوں اور چوروں ڈاکوؤں

میں ہے یا سُنا ہے کہ تھانے میں اُس نے اپنی عزّت بنا رکھی ہے۔ میرے لئے بدمعاشوں کے رشتے آتے ہیں جنہیں میری ماں دھتکار دیتی ہے۔ ہم لوگ اتنے بدنام ہیں کہ عذرا کی ماں نے اس کے رشتے کا وعدہ کر لیا تھا، لیکن عذرا کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کتنی شریف لڑکی تھی۔ اُس کے بھاگنے کی وجہ ہی یہی تھی کہ وہ ایک بدمعاش اور بدنام آدمی کی بیوی نہیں بننا چاہتی تھی"۔

"وہ تمہاری سہیلی تھی" —— میں نے سائرہ سے کہا —— "کیا تم نے اُسے کبھی کہا نہیں تھا کہ میرے بھائی کے ساتھ شادی نہ کرو یا میرے بھائی کے ساتھ ہی شادی کرو"۔

"نہیں" —— سائرہ نے جواب دیا —— "کبھی تو میں خوش ہوتی تھی کہ میری اتنی اچھی سہیلی میری بھابھی بن کے آ رہی ہے اور کبھی اپنے بھائی کے کرتُوت دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ عذرا جیسی اچھی لڑکی ایک بدکار آدمی کی بیوی بنے گی، لیکن عذرا کسی اور کو چاہتی تھی"۔

"میں جانتا ہوں" —— میں نے کہا —— "وہ اسی آدمی کے لئے گھر سے بھاگی تھی"۔

"نہیں" —— سائرہ نے کہا —— "وہ کوئی اور تھا۔ تم اُسے نہیں جانتے"۔

"کون تھا؟" —— میں نے پوچھا —— "میں اگر اُس کے باپ کا نام جانتا ہوں تو ہو سکتا ہے اُس آدمی کے ساتھ بھی جان پہچان ہو"۔

"وہ اُس کی خالہ کا بیٹا تھا" —— سائرہ نے کہا —— "عذرا اُس کی یاد میں رویا کرتی تھی۔ میں ہی اُس کی ہمراز تھی۔ وہ صرف میرے ساتھ اُس کی باتیں کیا کرتی تھی" —— اُس نے کچھ دیر سوچ کر مجھ سے پوچھا —— "تم عذرا کو کس طرح جانتے ہو؟ کیا اُس کے والد صاحب کے ساتھ سلام دعا ہے؟"

"میری طرف دیکھو" —— میں نے کہا —— "میری آنکھوں میں دیکھو۔ میری پیشانی دیکھو۔ فرض کر لو میری داڑھی نہیں ہے .... اور غور سے دیکھو"۔

اُس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں اور میں اُس کا چہرہ غور سے

دیکھنے لگا۔ میرا ذہن پیچھے ہٹتا گیا اور ایک دو لمحوں میں میں اُس عمر کو پہنچ گیا جس عمر میں مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ مجھے سائرہ کا اُس وقت کا چہرہ یاد آ گیا۔ اُس وقت سائرہ کی عمر تیرہ چودہ سال ہو گی۔ میں نے اسے عذرا کے ساتھ کئی بار دیکھا تھا۔ مجھے کئی باتیں یاد آ گئیں۔ اس لڑکی نے عذرا کے ساتھ مجھے چھیڑا بھی تھا۔ یہ بچوں کی سی چھیڑ خانی تھی۔

"تم؟ ..... تم؟" — سائرہ نے حیرت زدگی کے عالم میں پوچھا — "کیا تم سکندر ہو؟ ..... نہیں ..... سکندر تو بڑا بھولا بھالا لڑکا تھا ..... میں جانتی ہوں سکندر مفرور ہے ..... کیا تم ....؟"

"ہاں سائرہ!" — میں نے آہ لے کر کہا — "میں سکندر ہوں جس کی یاد میں عذرا رویا کرتی تھی۔"

"اگر تم وہ سکندر ہو تو مجھے کوئی ڈر نہیں" — سائرہ نے کہا — "اور اگر تم ڈاکو اور قاتل سکندر ہو تو مجھے اپنی قسمت پر رونا چاہیئے۔"

معلوم نہیں کیوں ..... شاید بچپن کی یاد سے مجھ پر جذباتی سی رقت طاری ہو گئی۔

"میں وہی سکندر ہوں" — میں نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے — "ڈاکہ بھی ڈالا ہے، قتل بھی کیا ہے، لیکن ڈاکو بھی نہیں ہوں، قاتل بھی نہیں ہوں۔"

"تم نے عذرا کے ساتھ شادی کیوں نہ کر لی؟"

"میں مفرور ہوں سائرہ!" — میں نے کہا — "میں جہاں کہیں بھی چلا جاؤں پھانسی کا پھندہ میرے گلے میں رہتا ہے۔ میں کسی لڑکی کی زندگی تباہ نہیں کر سکتا۔"

"لیکن میری زندگی تو تم نے تباہ کر دی ہے" — سائرہ نے کہا — "ہمارا گھر پہلے ہی بدنام تھا۔ اب اگر میں واپس چلی بھی گئی تو لوگ کہیں گے کہ خود کہیں چلی گئی تھی اور خجل خراب ہو کر واپس آ گئی ہے۔"

میرا خیال تھا کہ میرا دماغ بہت تیز ہے، لیکن میرے دماغ میں

اُس کے اس سوال کا جواب نہ آیا کہ اُسے بدنامی سے کیسے بچایا جا سکتا ہے۔

"کیا مجھے گھر واپس جانے دو گے؟" — سائرہ نے پوچھا اور کہنے لگی — "میری ماں رو رو کر پاگل ہو جائے گی۔ میرے لئے تو وہ روتی ہی رہتی ہے۔"

میں اُس کے اس سوال کا بھی جواب نہ دے سکا۔ معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا کہ میری نظریں اُس کے چہرے پر چپک کر رہ گئی تھیں۔ میں نے کچھ کہا تھا جو شاید بے معنی سے الفاظ تھے مجھے یاد نہیں رہے۔

مجھے تو جیسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں اس لڑکی کو کس نیّت سے یہاں لایا تھا۔ وہ درندگی اور وحشی پن جو مجھ پر طاری ہو گیا تھا وہ یُوں اُڑ گیا تھا جیسے سورج کی تپش سے شبنم اُڑ جاتی ہے۔ وہ پلنگ کے اُس کونے پر اور میں اس کونے پر بیٹھا رہا۔ اُس نے مجھ سے پوچھنا شروع کر دیا کہ میں نے اتنی عمر کہاں اور کس طرح گزاری ہے۔ میں اُسے مختصر سے جواب دیتا رہا لیکن اُس کے سوال ختم ہی نہیں ہوتے تھے۔ پھر ہُوا یوں کہ رات ختم ہو گئی۔

"سو جاؤ" — میں نے بڑے نرم لہجے میں اُسے کہا۔

وہ کچھ جھجک رہی تھی۔

"سائرہ!" — میں نے ایک بار پھر کہا — "سو جاؤ۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ لیٹ گئی اور لیٹتے ہی اُس کی آنکھ لگ گئی۔ میں کھڑا اُس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ایسے لگا جیسے میری روح نے اس چہرے کو ان آنکھوں کو ہمیشہ اپنے اندر محفوظ رکھا ہو۔



میں کمرے سے نکلا تو صبح طلوع ہو رہی تھی اور دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے صحن سے گزر کر باہر والا دروازہ کھولا۔ ایک نوکر دُودھ اور پراٹھے اٹھائے اندر آیا۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے چنگیر اور برتن لے لئے اور پھر

کمرے میں چلا گیا۔ سائرہ بڑی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے آوازیں دیں۔ وہ تو جیسے بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ بدک کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس کا اتنا دلکش رنگ پیلا پڑ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اُس پر کیسا خوف طاری ہو گیا ہے۔

"ذرا ہوش میں آؤ" ——— میں نے چنگیر اور دُودھ اُس کے آگے رکھ کر کہا ——— "یہ کھا لو، پھر سو جانا۔"

"تم نہیں کھاؤ گے؟"

میں بھی اُس کے پاس بیٹھ گیا اور ہم دونوں نے ناشتہ کر لیا اور میں نے اُسے کہا کہ اب وہ بے غم ہو کر سو جائے۔

اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اُسے مجھ پر شک ہو۔ میں کچھ اور کہے بغیر کمرے سے اور پھر اُس مکان سے نکل گیا۔ یہ بتانا ضروری نہیں کہ یہ مکان مشکوک افراد کو چھپانے کے لئے کس طرح محفوظ تھا۔ اس کا محل وقوع اور اس کی ساخت ایسی اور اس کا حال حلیہ ایسا تھا کہ غیر آباد لگتا تھا یا دیکھنے والے یہ سمجھتے ہوں گے کہ اس میں مویشی ہوں گے یا بھوسہ وغیرہ رکھا ہو گا۔

سائرہ نے تو مجھے شکی نگاہوں سے دیکھا ہی تھا، خود مجھے اپنے آپ پر شک ہونے لگا تھا۔ عذرا کے مرنے پر مجھ میں جو تبدیلی آئی تھی وہ ایسی تھی جیسے میں زہریلا ناگ بن گیا تھا مگر میں سائرہ کو سُلا کر باہر نکلا تو ایسے لگا جیسے میں وہ ناگ ہوں جس کا زہر مار دیا گیا ہو اور اب یہ ناگ سپیرے کی بین پر پھن پھیلا کر جھومتا رہا کرے گا۔

دیہات کے لوگ بہت سویرے جاگ اُٹھتے تھے۔ میں تجمّل اور منوّر کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ منوّر راستے میں ہی مل گیا۔ اُس کے چہرے پہ اُداسی کے بڑے گہرے آثار تھے۔ اس اداسی میں غصّے کا تاثر بھی تھا۔ منوّر تو زندہ دل آدمی تھا اور عذرا کی محبت اُس کی روح میں اُتر گئی تھی۔

"کیا تم نے عذرا کا انتقام لے لیا ہے؟" ——— اُس نے پوچھا اور میرے

جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگا ——— "تم اس لڑکی کو میرے حوالے کر دو۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"میں اسے اپنے ان تین آدمیوں کے حوالے کر دوں گا جو کسی پر رحم کرنا جانتے ہی نہیں" ——— منوّر نے کہا۔

"جانتے ہو تجمّل بھائی نے کیا کہا تھا؟" ——— میں نے کہا ——— "اُس نے تمہاری موجودگی میں کہا تھا کہ یہاں کسی عورت پر صرف ہاتھ اُٹھانا گناہ سمجھا جاتا ہے ..... اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس میں ایوب کی بہن کا کوئی قصور نہیں، ہم اسے ایوب کی عزت خراب کرنے کے لئے اُٹھا لاتے ہیں۔"

"تو کیا میں اسے اپنی بہن بنا کر یہاں رکھوں؟" ——— منوّر نے کہا۔

میں منوّر کی جذباتی حالت دیکھ رہا تھا، بہت بُری تھی۔ اس ذہنی حالت میں، اُسے کسی ایسی بات پر قائل کرنا جو اُسے پسند ہی نہیں تھی، بہت مشکل تھا۔ میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ میں اُس کے ساتھ بحث میں اُلجھا تو یہ میرے گلے پڑ جائے گا۔ میں اُس کے ارادوں کو رَد نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا تم بھول گئے ہو کہ عذرا میری خالہ زاد بہن تھی؟" ——— میں نے کہا ——— "میں تمہیں یہ بات کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میں عذرا کا خون کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میں نے تمہیں کہا ہے کہ انتقام کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ایوب کی بہن کو تم خراب کر دیا نہ کرو، وہ تو خراب ہو ہی چکی ہے۔ اب اگر ہم اُسے چھوڑ بھی دیں تو اُسے کون قبول کرے گا۔ لوگ کہیں گے کہ خود ہی کسی کے ساتھ چلی گئی تھی ..... منوّر بھائی! جس سے انتقام لینا ہے اُس سے انتقام لے رہے ہیں۔ یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تم ایوب کے خاندان کے بچے بچے کو قتل کر دو گے تو بھی عذرا تمہیں واپس نہیں ملے گی ..... میرے ساتھ آؤ۔ میں ایوب کو دیکھنے جا رہا ہوں ..... تجمّل بھائی کہاں ہے؟"

"وہ باغ کی طرف چلا گیا ہے" ——— منوّر نے کہا۔



میں منور کو اپنے ساتھ لے کر اُس مکان میں چلا گیا جہاں ہم نے ایوب کو رکھا تھا۔ اُس مکان کے صحن میں تین گھوڑیاں اور دو بھینسیں بندھی رہتی تھیں۔ یہ مکان ان ہی کے لئے تھا۔ اب ان کے ساتھ ہم نے ایوب کو باندھ دیا تھا۔

ہم دونوں اس مکان میں داخل ہوتے تو نوکر ایک بھینس کو دوہ رہا تھا۔ میں نے خود ایوب والے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ جاگ اُٹھا تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور وہ دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔

"سکندر!" — مجھے دیکھتے ہی اُس نے کہا — "خدا تمہیں بخشے گا نہیں۔"

معلوم نہیں میں اُسے کیا جواب دیتا کہ منور اُس پر جھپٹ پڑا۔ دو تین گھونسے اُس کے مُنہ پر مارے پھر اُس کے پہلوؤں میں بڑی زور زور سے ٹھڈ مارے۔ میں نے پیچھے سے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اور اس طرح اُس سے ایوب کو بچایا۔ ایوب کو دیکھ کر مجھے بھی منور جیسا غصہ آگیا تھا، لیکن میں مار پٹائی کا شوقین نہیں تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس شخص کو بھوکا اور پیاسا رکھ کر ترسا ترسا کر ماروں گا اور گزشتہ رات کی طرح پیچ کس کا سرا آگ میں لال کر کے ہر روز اس کے جسم کو تھوڑا تھوڑا داغوں گا۔ میں اُسے بڑی سخت اور ناقابلِ برداشت اذیت میں مارنا چاہتا تھا۔

"بچوں والی حرکتیں نہ کرو منور!" — میں نے منور کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا — "یہ کام جو تم نے کیا ہے، تمہارے نوکر بھی کر سکتے ہیں .... دُور کھڑے رہو۔"

منور نے میری بات مان لی۔ میں کچھ اور سوچ کر آیا تھا۔ میں ایوب کے ساتھ رات والا سلوک کرنا چاہتا تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ منور کا ایک گھونسہ اُس کے ہونٹوں پر پڑا تھا جس سے نیچے والا ہونٹ تھوڑا سا کٹ گیا تھا اور وہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک گھونسہ آنکھوں پر لگا تھا۔ آنکھ کے اردگرد

نیلاہٹ آگئی تھی اور وہ جگہ سُوجنی شروع ہو گئی تھی۔ میں ایک ہی دن اُس کا سارا خون نہیں بہانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اُس کے پہلو میں منور نے جس زور سے ٹھڈ مارے تھے ان کے درد کا میں اندازہ کر سکتا تھا۔ میں ایوب کے سامنے بیٹھ گیا۔

"تمہارے ساتھ جو آدمی تھے اُن کے نام اور پتے بتا دو" — میں نے کہا۔

"تم حرام کی اولاد ہو سکندر!" — ایوب نے کہا — "تم طوطا چشم ہو اور پکے جرائم پیشہ بن گئے ہو۔ نہ میں نے کچھ کیا ہے اور نہ میرے ساتھ کوئی آدمی تھا۔ بہتر ہے کہ میرے گلے پر چھُری پھیر دو۔"

"وہ تو پھیرنی ہی ہے" — میں نے مُسکرا کر کہا — "لیکن آہستہ آہستہ۔ تم اپنی زبان سے بولو گے۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ نوکر کو آواز دی۔ وہ آیا تو میں نے اُسے کہا کہ اسے تھوڑی سی روٹی کھلا دو۔ پانی بھی پلا دو۔

"ہاتھ کھول دوں سرکار!" — نوکر نے پوچھا۔

"ہاں" — میں نے جواب دیا — "پاؤں بندھے رہنے دو۔ ہاتھ کھول دینا۔ روٹی کھا لے تو پھر باندھ دینا۔"

"بھوکا مرنے دو اسے" — منور نے دانت پیس کر کہا۔

"تم نہیں سمجھتے منور!" — میں نے کہا — "میں اسے کچھ دن زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔"

نوکر روٹی لینے چلا گیا۔ اُس کے آنے تک میں ایوب کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور وہ مجھ پر غصہ جھاڑتا رہا۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ بڑی ڈھیٹ مٹی کا بنا ہُوا تھا۔ اُس کے دماغ سے ابھی تھانیداری نہیں نکلی تھی۔ نوکر روٹی لے آیا تو میں اور منور وہاں سے نکل آئے۔ نوکر کو بلا کر کہا کہ جب بھی وہ اندر اس کے پاس جائے ایک ڈنڈا اپنے ہاتھ میں رکھے۔



میں ساری رات کا جاگا ہُوا تھا۔ شب بیداری کے ساتھ عذرا کی موت کے غم نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ ہم دونوں جب وہاں سے نکلے تو تجمّل بھی آگیا۔ تھا تو وہ بھی غصّے میں، لیکن اُس نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا ہُوا تھا۔

"اس کی بہن کس حال میں ہے؟" — تجمّل نے پوچھا۔

"میں ساری رات اُس کے ساتھ جاگتا رہا ہوں" — میں نے جواب دیا — "وہ ساری رات روتی رہی ہے اور اپنے بھائی کو کوستی رہی ہے"۔

"تمہیں یاد ہے نا!" — تجمّل نے کہا — "میں نے تمہیں کیا کہا تھا؟"

"ہاں، یاد ہے" — میں نے کہا — "اگر تم ایسی بات نہ کہتے تو بھی میں اُس کے ساتھ کوئی ایسا ویسا سلوک نہ کرتا۔ اُسے صرف یہاں لے آنا ہی اُس کے لئے بہت بڑی اذیت ہے"۔

میں جسمانی طور پر تھکاوٹ تو محسوس کر ہی رہا تھا، لیکن میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میں وجود کے اندر سے بھی ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔ میں نے سو جانا بہتر سمجھا۔ میں دونوں بھائیوں کو باہر ہی چھوڑ کر اُس مکان میں چلا گیا جہاں میں سائرہ کو سُلا آیا تھا۔ میری مخصوص دستک پر نوکر نے دروازہ کھولا۔ اُس نے میرے پوچھے بغیر بتایا کہ وہ سوئی ہوئی ہے۔

اُس کمرے میں ایک ہی پلنگ تھا۔ صحن میں بان کی چارپائی پڑی تھی۔ میں نے اُٹھائی اور کمرے میں لے گیا۔ سائرہ اتنی گہری نیند سوئی ہوئی تھی کہ چارپائی دروازے کے ساتھ لگی تو بھی اُس کی آنکھ نہ کھُلی۔ میں نے کمرے کی دوسری دیوار کے ساتھ چارپائی رکھی اور اس پر لیٹ گیا۔ فوراً ہی میری آنکھ لگ گئی اور میں خوابوں کی دنیا میں جا پہنچا۔ بڑے ہی لمبے عرصے بعد اپنی امّی کو خواب میں دیکھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی ہیں اور میں حیرت کے عالم میں آہستہ آہستہ اُن کی طرف بڑھ رہا ہوں، لیکن چار پانچ قدم کا فاصلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ امّی کا چہرہ سائرہ کا چہرہ بن جاتا ہے۔ میں رُک جاتا ہوں اور یہ چہرہ میری امّی کے چہرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ میں پھر ان کی طرف بڑھتا ہوں۔ امّی دونوں بازو

پھیلا دیتی ہیں اور میں ان بازوؤں میں گر پڑتا ہوں۔

"اب واپس نہیں جائیں گی نا امّی!" — میں نے پوچھا۔

امّی مسکراتی ہیں اور کوئی جواب نہیں دیتیں۔ میں ادھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ یہ کوئی مکان یا کمرہ نہیں، وسیع قبرستان ہے۔ ہر طرف قبریں نظر آتی ہیں۔ میری امّی ایک پکی قبر پر بیٹھی ہیں۔ میں اُنہیں دیکھتا ہوں تو ان کا چہرہ ایک بار پھر سائرہ کا چہرہ بن جاتا ہے۔ پھر یہ منظر دھندلا جاتا ہے اور میں ایک سیلابی دریا میں تیرنے لگتا ہوں۔ سیلاب کی موجیں مجھے یوں اوپر نیچے کرتی ہیں جیسے ماں بچے کو بازوؤں پر اُٹھائے ہلارے دے رہی ہو۔ میں بہتا ہی چلا جاتا ہوں اور کہیں پہنچنے سے پہلے اس خواب پر پردہ گر پڑتا ہے۔

آنکھ کھُلی تو کمرہ روشن نہیں تھا، لیکن تاریکی بھی نہیں تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ دن گزر گیا ہے اور میں سارا دن سویا رہا ہوں۔ سائرہ پلنگ پر بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں فوراً اُٹھا اور باہر نکلا۔ سورج ابھی ابھی غروب ہُوا تھا۔ میں نے نوکر سے کہا کہ ہم دونوں کے لئے کھانا اور دودھ لے آئے۔



نوکر کھانا لے آیا تو میں نے دیا جلا دیا۔ میں نے پلنگ پر بیٹھ کر سائرہ کے ساتھ کھانا کھایا۔

ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے عجیب سا سرُور محسوس ہو رہا تھا۔ گھروں میں لوگ اسی طرح کھانا کھایا کرتے ہیں۔ میاں بیوی، بہن بھائی، ماں اور بیٹا اسی طرح اکٹھے بیٹھتے ہیں۔ میں تو گھریلو ماحول سے ناآشنا ہو چکا تھا۔ اُس رات ایک پرائی عورت کو اپنے سامنے بٹھایا تو ایسے محسوس ہُوا جیسے میری روح میں ایک تشنگی ہے جسے میں دباتا رہا ہوں۔ اُس شام جب سائرہ میرے سامنے بیٹھی تھی تو یہ تشنگی بڑی شدت سے اُبھر آئی۔ ہم دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے سینے میں ایک طوفان اُٹھ رہا ہے اور میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ یہ طوفان اگر رُک نہ سکا تو میں گھاس کی خشک پتی کی طرح اس کی لپیٹ میں آکر اُڑ جاؤں

گا ورنہ جانے یہ طوفان مجھے کہاں تک پہنچا دے۔

ہم نے کھانا کھا لیا اور نوکر چنگیر اور برتن لے گیا۔ میں نے باہر جا کر اُسے کہا کہ وہ چلا جائے۔ رات کو میں اس مکان میں اکیلا ہوا کرتا تھا۔ اب سائرہ آگئی تھی۔ میں پلنگ پر ہی بیٹھا رہا۔

"مجھے کب تک اس قید میں رکھو گے؟" — سائرہ نے پوچھا — "اور میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟"

"ابھی کچھ نہ پوچھو" — میں نے کہا — "میں ابھی یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا"

"ایک بات کہوں؟" — سائرہ نے کہا — "تم میرے ساتھ کھیل رہے ہو .... میری ایک بات مانو گے؟"

"سائرہ!" — میں نے کہا — "جو کہنا ہے کہہ دیا کرو۔ بار بار مت پوچھو کہ میں یہ کہوں یا میں وہ کہوں"

"میرا تم پر کوئی حق نہیں" — اس نے کہا — "کوئی دعویٰ نہیں۔ میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ تم سے اپنی بات منوالوں گی۔ میں جانتی ہوں میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ میں تمہاری کچھ نہیں لگتی، لیکن میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ جو بھی سلوک کرنا ہے وہ تم اپنے ہاتھوں کرنا۔ مجھے ان وحشی دیہاتیوں کے حوالے نہ کر دینا"

"اس کا مطلب یہ ہوا" — میں نے کہا — "کہ تم نے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا ہے"

"دل کی بات پوچھتے ہو تو یہ تمہیں اچھی نہیں لگے گی" — سائرہ نے کہا — "میں جیتے جی اپنے آپ کو کسی کے حوالے نہیں کروں گی۔ میرا خیال ہے کہ تم اپنے آپ کو بہت ہی خوبصورت جوان سمجھتے ہو، اور تم ہو بھی خوبصورت۔ کوئی لڑکی تم سے نہیں بھاگے گی۔ تم جوان لڑکی کی پسند کے مرد ہو، لیکن سکندر! مجھ سے ایسی امید نہ رکھنا۔ ہاں، زبردستی کر سکتے ہو۔ تم مرد ہو، طاقت والے ہو۔ میں عورت ہوں، لیکن اپنی آبرو کو بچانے کے لئے معلوم نہیں تمہارا کیا

حال کر دوں گی"

"سائرہ!" — میں نے مسکراتے ہوتے کہا — "تم جتنی خوبصورت ہو اتنی خوبصورت دھمکیاں دیتی ہو"

"ہوش میں آ سکندر!" — اُس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر اور میرے سر کو آہستہ سے جھنجھوڑ کر کہا — "جنہیں اپنی عزت پیاری ہوتی ہے اور جن میں غیرت ہوتی ہے اُنہیں خدا طاقت بھی دے دیا کرتا ہے۔ غیرت ہی طاقت ہوتی ہے۔ میں دھمکیاں نہیں دے رہی۔ میں تمہیں یہ بتا رہی ہوں کہ یہ نہ سمجھنا کہ بدمعاش بھائی کی بہن بھی اُسی جیسی ہوگی۔ میں نے اپنے آپ کو اس لئے پاک صاف رکھا ہوا ہے کہ شاید اسی کے صدقے خدا میرے بھائی کے گناہ بخش دے"

کیا آپ مان سکتے ہیں کہ مجھ جیسا آدمی جسے خدا نے جسمانی طاقت بھی دی تھی اور روحانی طاقت بھی، اس لڑکی سے مرعوب ہوگیا تھا؟ .... یقین جانیں کہ میں اگر اُس سے مرعوب نہیں ہوا تھا تو کوئی نہ کوئی ایسا اثر ضرور تھا جو میرے وجود میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ وہ تندرست لڑکی تھی۔ اُس زمانے کے قد کاٹھ کے مطابق بڑے اچھے قد والی تھی۔ اُس میں طاقت بھی تھی، لیکن وہ عورت تھی اس لئے کمزور تھی۔ میں اُس کی کلائی پکڑ کر مروڑ دیتا تو وہ بل کھا کر میرے قدموں میں گر پڑتی۔ میں اُسے جلانے والی لکڑی کی طرح اُٹھا کر چولہے میں بھی جھونک سکتا تھا۔ جس طرح اُس نے مجھے دھمکیاں دی تھیں اس کے جواب میں مجھے ایسے ہی کرنا چاہیئے تھا، لیکن اُس کی دھمکیاں مجھے کچھ اچھی لگیں۔

میں نے ایک بات غلط کہی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ اس لئے کمزور تھی کہ عورت تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ عورت کمزور نہیں ہوتی۔ اپنی طاقت کو اس لڑکی نے خود ہی بیان کر دیا تھا۔ یہ طاقت تھی عصمت اور غیرت۔ جس عورت میں یہ دونوں چیزیں ہوں وہ ایک نہیں دو تین آدمیوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

عورت ہی نہیں مرد کی طاقت بھی کردار میں ہوتی ہے۔ جو آدمی غیرت

کا دامن چھوڑ دے یوں سمجھو کہ اُس نے تلوار پھینک دی ہے۔ کردار، صداقت اور غیرت مل جل کر ڈھال بھی بنتی ہیں تلوار بھی۔

یہ طاقت مجھ میں تھی۔ پھر بھی میں اپنے اندر ایک کمزوری سی محسوس کر رہا تھا جسے میں نے اُس وقت محسوس کیا تھا لیکن سمجھ نہیں سکا تھا کہ یہ کیا ہے۔



"ایک طرف تو تم دھمکیاں دے رہی ہو" ——— میں نے ساترہ سے کہا ——— "اور دوسری طرف تم یہ کہہ رہی ہو کہ جس سلوک کی تمہیں توقع ہے وہ صرف میرے نامعقول ہو۔"

"تم ایسے تو نہیں تھے سکندر!" ——— اُس نے کہا ——— "تم جو زندگی گزار رہے ہو اس نے تمہاری عقل پر پردہ ڈال دیا ہے۔ تم میں اچھی اور بُری بات سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رہی۔ میں نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ میں تمہیں معلوم نہیں کیوں اپنا سمجھ رہی ہوں اور میں نے بزرگوں کا یہ قول سُنا ہے کہ اپنا قتل بھی کرے تو لاش چھاؤں میں پھینکتا ہے۔ ایک امید سی دل میں ہے کہ شاید تم مجھے اپنا سمجھ لو۔ اگر نہیں تو میں ایک بار پھر کہتی ہوں کہ ہمت کرو اور مجھے خراب کرنے کی کوشش کرو، لیکن ایک ایک آدمی میرے سامنے آنا۔ ایک سے زیادہ آدمی تو بڑے بڑے پہلوانوں کو بھی گرا لیتے ہیں۔"

"ساترہ!" ——— میں نے کہا ——— "میں تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا۔"

"بچاؤ گے تو مجھ سے دعا لو گے" ——— اُس نے جذباتی سے لہجے میں کہا ——— "تم شاید نہیں جانتے کہ ایک پاک عورت کی دعا اللہ تعالیٰ کتنی جلدی قبول کرتا ہے اور اس عورت کی بد دعا آگ بھی لگا سکتی ہے۔ میں تمہیں ڈرا نہیں رہی اور تم ڈرنے والے ہو بھی نہیں۔ میرے سامنے تمہارا کل رات والا چہرہ ہے۔ تم نے کہا تھا کپڑے اُتار دو۔ تمہارے اس چہرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تمہاری آنکھوں میں مجھے ابھی تک وحشی پن نظر آ رہا ہے۔ مُسکراتے ہو تو یہ مجھے بھیڑیوں والی مسکراہٹ معلوم ہوتی ہے۔ تم میرے جسم پر قبضہ کر سکتے ہو

دل پر نہیں۔"

اُس کی آواز میں اور بولنے کے انداز میں عجیب سا ٹھہراؤ تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر تبسم سا تھا۔ یہ تبسم وہ نہیں تھا جسے شاعر اور افسانہ نویس بڑے لذیذ اور دلکش الفاظ میں بیان کیا کرتے ہیں اور اسے حُسن کا ایک حصّہ لکھتے ہیں۔ ساترہ کے تبسم میں طنز تھی، چیلنج تھا۔ اُس کے لب و لہجے میں ایک غیبی طاقت کا تاثر مجھے صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اُس کا حُسن پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے اور اس حُسن میں طلسماتی سا تاثر پیدا ہو گیا ہے ——— مجھ پر ایسی خاموشی طاری ہو گئی جو میری عادت میں شامل نہیں تھی۔

"تمہاری خاموشی مجھے پریشان کر رہی ہے" ——— اُس نے میرے ایک گال کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا جیسے کسی بچے کو کوئی بات سمجھا رہی ہو۔

"ساترہ!" ——— میں نے آہستہ سے کہا ——— "مجھے کچھ سوچنے دو تمہاری باتیں مجھے بھڑکا رہی ہیں۔"

میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ مجھے غصّہ آنے لگا تھا۔ معلوم نہیں مجھے اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا یا اُس پر۔ میں اپنے آپ میں اضطراب سا محسوس کرنے لگا۔ میں اُسے اکیلا چھوڑ کر باہر نکل گیا اور کچھ دیر باہر گھومتا پھرتا رہا۔ میں اپنے آپ میں ہلچل سی محسوس کر رہا تھا لیکن یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ کیسی ہلچل ہے۔ میں شاید دو حصّوں میں کٹتا جا رہا تھا۔ اگر میں اس ارادے کو زندہ رکھتا کہ اس لڑکی سے عذرا کا انتقام لینا ہے تو میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ مشکل یہ پیدا ہوئی کہ اس لڑکی نے ایسی باتیں کیں جن کی مجھے توقع نہیں تھی۔ ایسی صورتِ حال میں لڑکیاں روتی ہیں، چیختی ہیں، چلّاتی ہیں، منتیں کرتی ہیں، قدموں پر گر پڑتی ہیں یا اپنے آپ کو مجبور سمجھ کر اپنا آپ اُن کے سپُرد کر دیتی ہیں جو انہیں اغوا کر کے لے آتے ہیں، لیکن اس کا ردِ عمل کچھ اور ہی تھا۔

میں اس مکان سے کچھ دُور جا کر ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جو ذرا اونچی تھی۔

وہاں سبزہ تھا۔ بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ کوئی کمزوری ایسی تھی جو میری ذات میں چھپی ہوئی تھی اور وہ لاشعوری طور پر اُبھر آتی تھی۔

میرے سامنے عذرا کا چہرہ آگیا۔ میرا خون کھول اُٹھا اور یہ ارادہ بیدار ہو گیا کہ میں وہی سلوک سائرہ کے ساتھ کروں گا۔

اس ذہنی کیفیت میں سائرہ میری آنکھوں کے سامنے آگئی تو میرے ارادے پر اوس پڑ گئی۔

سائرہ اگر روتی، چیختی چلاتی تو میری درندگی میں جان پڑ جاتی، لیکن اُس نے مجھے کچھ سمجھا ہی نہیں تھا۔

میں دو سوالوں میں اُلجھ گیا — میں کون ہوں؟ — میں کیا ہوں؟

میں خیالوں کی بھول بھلیوں میں نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا یا ایک ہی جگہ کولہو کے بیل کی طرح گھومتا رہا۔ مجھے وقت کا احساس نہ رہا۔ آج اتنا یاد ہے کہ میں خاصا زیادہ وقت وہیں بیٹھا رہا تھا۔ نیکی اور بدی چکی کے دو پاٹ بن گئے اور یہ پاٹ مجھے پیسنے لگے۔



میں چونک اُٹھا .... میں اُسی کمرے میں کھڑا تھا جس سے فرار حاصل کرنے کے لئے میں باہر نکل گیا تھا۔ کمرے میں دیا جل رہا تھا جس کی زرد پیلی روشنی میں اور تھرکتی لَو میں مجھے سائرہ پلنگ پر سوتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں اپنے خیالوں کی تلخی میں اُلجھا ہوا، اندر ہی اندر تڑپتا ہوا وہاں سے اُٹھ آیا تھا جہاں جا بیٹھا تھا اور اس مکان میں پہنچ گیا تھا۔ میرے دل پر گھبراہٹ کی لہر سی آئی اور گزر گئی۔

سائرہ بڑے اطمینان اور سکون کی نیند سوئی ہوئی تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں بہت دیر باہر بیٹھا رہا ہوں۔

سائرہ کے چند ایک بال اُس کے ایک رخسار پر آگئے تھے۔ گورے رخسار پر گہرے بھورے رنگ کے یہ چند ایک بال مجھے پریشان کرنے لگے۔

کچھ سوچے سمجھے بغیر میں آگے بڑھا اور ہاتھ سے یہ بال اُس کے رخسار سے ہٹا دیے۔ میں نے ایسی حرکت زندگی میں پہلی دفعہ کی تھی۔ مجھے اپنی امی کے بال یاد آتے جن کے ساتھ میں کھیلا کرتا تھا۔ جی میں آئی کہ میں ایک بار پھر اس لڑکی کے بالوں کو ہاتھ لگاؤں۔

اپنے آپ ہی میرا ہاتھ سائرہ کے سر پر چلا گیا اور میری اُنگلیاں اُس کے بالوں کے ساتھ کھیلنے لگیں۔ پھر میں نے اپنے آپ کو پلنگ پر بیٹھے ہوئے پایا۔ معلوم نہیں کس طرح سوتی ہوئی سائرہ کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں آگیا تھا۔ مجھے جب اس کا احساس ہوا تو میں نے نہایت آہستہ سے اُس کا ہاتھ اُس کے پہلو کے ساتھ رکھ دیا۔

وہ پیٹھ کے بل سوئی ہوئی تھی۔ میری نظریں اُس کے ماتھے سے پاؤں تک، اور پھر پاؤں سے ماتھے تک پھیلتی ہوئی چلی گئیں۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ میری سانسوں کا تسلسل اکھڑتا جا رہا ہے۔ دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی ہے اور میرا اوپر والا ہونٹ محسوس کر رہا ہے کہ سانسوں میں تپش بڑھتی جا رہی ہے۔

اچانک مکان کے باہر دروازے پر وہ مخصوص دستک ہوئی جس پر وہ دروازہ کھولا جاتا تھا۔ میں پلنگ سے اس طرح اُٹھا جیسے اپنے آپ کو زبردستی اُٹھایا ہو۔ کمرے میں سے بھی میں اس طرح نکلا جیسے اپنے آپ کو دھکیل کر نکال رہا ہوں۔ باہر والے دروازے تک میں قدم گھسیٹتا ہوا پہنچا اور دروازہ کھولا ... منوّر آیا تھا۔

"جلدی آؤ سکندر!" — اُس نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا — فوراً آؤ۔"

"کیا ہو گیا ہے؟"

"ایوب بھاگ گیا ہے" — اُس نے کہا۔

"بھاگ گیا ہے؟" — میں نے کہا — "تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

"جلدی نکل یار!" — اُس نے جھنجھلا کر کہا — "وہ میری گھوڑی بھی

لے گیا ہے۔"

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایوب میں اتنی عقل، ہمت اور طاقت ہے۔ میں باہر نکلا۔ باہر سے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور منور کے ساتھ دوڑ پڑا۔ دوڑتے دوڑتے اُس سے پوچھا کہ ایوب کس طرح بھاگا ہے اور یہ اطلاع کس طرح ملی ہے۔ اُس نے اتنا ہی کہا کہ نوکر تمہیں سنائے گا ...... ہم دوڑتے دوڑتے اُس مکان میں پہنچے جہاں ایوب کو رکھا گیا تھا۔ تجمل وہیں تھا۔ نوکر جو اُس مکان میں پہریدار کی حیثیت سے سوتا تھا وہ ڈرا سہما ہُوا وہیں کھڑا تھا۔

"وہ نکل گیا ہے" — تجمل نے کہا — "میں تمہیں بتاتا ہوں وہ کس طرح نکلا ہے"

"یہ میں بعد میں سنوں گا" — میں یکلخت سپیشل برانچ کا سب انسپکٹر بن گیا اور کہا — "پہلے یہ بتاؤ اُسے یہاں سے نکلے کتنی دیر ہو گئی ہے۔"

"وہ اسے (نوکر کو) مار کر نکلا ہے" — تجمل نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا — "یہ کچھ دیر بے ہوش پڑا رہا۔ اسے معلوم نہیں کہ یہ کتنی دیر بے ہوش رہا ہے۔"

میں نے نوکر سے دو چار باتیں پوچھیں تو میرا اندازہ یہ تھا کہ ایوب کو نکلے آدھ گھنٹہ ہو گیا ہے بلکہ آدھ گھنٹے سے خاصا زیادہ وقت گزر چکا تھا کیونکہ نوکر ہوش میں آ کر ان دونوں بھائیوں کو اطلاع دینے گیا۔ یہ دونوں سوتے ہوتے تھے۔ پھر منور میرے پاس آیا اور ہم دونوں اُس مکان تک گئے۔ فاصلے زیادہ تھے۔

"سکندر!" — منور نے کہا — "زین تو ہمارے گھر میں پڑی ہے۔ ایوب زین کے بغیر گھوڑی پر گیا ہے۔"

"اور لگام؟" — میں نے پوچھا۔

"میں دیکھتا ہوں" — نوکر نے کہا اور دیا لے کر دوسرے کمرے میں گیا۔ باہر آ کر بولا — "تینوں گھوڑیوں کی لگامیں اندر دیوار کے ساتھ ٹنگی ہوتی ہیں۔"

"وہ اتنا شاہسوار نہیں ہو سکتا کہ زین اور لگام کے بغیر گھوڑی سرپٹ

دوڑا کر فوراً شہر پہنچ جاتے" — میں نے کہا — "ان گھوڑیوں کی زینیں فوراً لاؤ۔"

اس مکان میں تین گھوڑیاں بندھی رہتی تھیں۔ اُن کی زینیں ان لوگوں نے اپنے گھر میں رکھی ہوتی تھیں۔ ایوب منور کی گھوڑی لے گیا تھا جو سب سے اچھی اور اعلیٰ نسل کی گھوڑی تھی۔ اس کے گلے میں جو رسہ تھا وہ گھوڑی کے ساتھ گیا تھا۔ ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر لگام کے بغیر گھوڑی کو سرپٹ دوڑانا آسان کام نہیں ہوتا پھر بھی بہت سا قیمتی وقت گزر گیا تھا اور زینیں ابھی نہیں آتی تھیں۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ ایوب شہر ہی گیا ہو گا اور ہم اُس کے پیچھے گھوڑیاں دوڑا دیں گے تو اُسے راستے میں جا لیں گے۔

زینیں آتے آتے کچھ اور وقت گزر گیا۔ تجمل نے نوکر کو کسی کی طرف دوڑا دیا تھا کہ اُس کی گھوڑی لے آئے۔



میں تجمل اور منور گھوڑیوں پر سوار ہوتے اور ایڑ لگا دی۔ کچھ دُور جا کر میں نے دونوں بھائیوں سے کہا کہ وہ دائیں بائیں کچھ دُور دُور ہٹ کر پھیل جائیں اور کچے پکے راستے کا کوئی خیال نہ کریں۔ خطرہ یہ تھا کہ رات کے سناٹے میں تین گھوڑیوں کے قدموں کی آوازیں دُور دُور تک سنائی دیتی تھیں۔ اس آواز سے ایوب راستہ بدل سکتا تھا یا کہیں چھُپ جاتا۔ بہرحال یہ ایک مجبوری تھی۔ ہم گھوڑیاں دوڑاتے گئے۔

آدھے سے زیادہ فاصلہ طے ہو گیا تو میں نے گھوڑی روک لی اور دونوں بھائیوں کو آوازیں دے کر اپنے پاس بلایا۔ میرا دماغ گھوڑیوں کی رفتار سے زیادہ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ایوب سیدھا شہر کے تھانے میں جائے گا اور وہاں ایک تو یہ اطلاع دے گا کہ اُسے اور اُس کی بہن کو اغوا کیا گیا تھا۔ پھر یہ بتائے گا کہ اُس کی بہن کہاں ہے اور تھانیدار کو سب سے زیادہ قیمتی اطلاع یہ دے گا کہ اغوا کرنے والا مفرور سب انسپکٹر سکندر ہے اور وہ اس جگہ موجود ہے۔

یہ اطلاع ملتے ہی شہر کے تھانے نے اس علاقے کے تھانے کو ٹیلیفون کرنا تھا پھر شہر کے تھانیدار نے اپنے ڈی ایس پی کو اطلاع دینی تھی کہ مفرور سب انسپکٹر سکندر اس وقت فلاں جگہ ہے۔ ڈی ایس پی نے حکم دینا تھا کہ اس علاقے کا تھانیدار شہر کے تھانیدار سے مل کر فوراً تجمّل اور منوّر کے گاؤں کو یا گھروں کو گھیرے میں لے لے اور بڑا زبردست چھاپہ مارے۔ اگر صرف اغوا کی واردات ہوتی تو تھانیدار صبح تک ٹال دیتے، لیکن میری نشاندہی ہو جانے پر پولیس نے فوراً حرکت میں آجانا تھا۔ چھاپے سے پہلے ہمیں تمام شہادت کو چھپانا یا ضائع کرنا تھا اور میں نے سائرہ کو ساتھ لے کر کسی ایسی جگہ چھپنا تھا جو چھاپے سے بچ سکتی تھی۔ یہ کام بڑی تیزی سے کرنا تھا۔ ایوب کے پیچھے شہر تک جانا بے کار تھا۔ اُس نے اپنے گھر جانے سے پہلے تھانے میں جانا تھا۔ وہ بھی سب انسپکٹر رہ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیا کارروائی کرنی ہے اور کتنی جلدی کرنی ہے۔

میں نے تجمّل اور منوّر کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ہم واپس آ گئے۔ وقت بہت تھوڑا اور کام زیادہ تھا۔ مویشیوں والے مکان میں واپس آ کر ہم نے نوکر سے کہا کہ وہ وہاں سے غائب ہو جائے اور جب پولیس آئے اور ایوب کی نشاندہی پر اس نوکر کو بلائے تو یہ نوکر کہیں نظر ہی نہ آئے۔

"اور تم دونوں بھائی سُن لو" — میں نے کہا — "جب پولیس آئے گی تو میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا۔ تم نے یہ کہنا ہے کہ اس مکان میں رات کو کوئی نوکر ہوتا ہی نہیں کیونکہ یہ علاقہ ہمارا اپنا ہے جہاں چوری چکاری کا خطرہ نہیں ہوتا" — مجھے اچانک ایک اور خیال آ گیا۔ میں نے دونوں بھائیوں سے کہا — "تم ایک یا دو عقلمند قسم کے مزارعوں یا نوکروں کو ساتھ لو اور سیدھے اپنے گاؤں کے تھانے پہنچو اور وہاں یہ رپورٹ لکھواؤ کہ کوئی تمہاری گھوڑی کھول کر لے گیا ہے۔ گھوڑی کا حلیہ وغیرہ لکھوانا۔ تھانیدار تم سے پوچھے گا کہ تمہیں کس طرح اور کس وقت گھوڑی کی چوری کا پتہ چلا ہے .... تمہارے ساتھ جو

ایک دو آدمی ہوں گے، وہ بیان دیں کہ وہ سوتے ہوئے تھے کہ ایک گھوڑی کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ دونوں دوڑتے ہوئے مویشیوں کے مکان میں پہنچے تو دیکھا کہ وہاں دو گھوڑیاں بندھی ہوئی تھیں اور تیسری گھوڑی جو سب سے زیادہ قیمتی تھی، وہ غائب تھی"۔

"یہ ٹھیک ہے" — تجمّل نے کہا — "تھانیدار اپنا یار ہے ہم نے اُسے بہت گھی اور مکھن کھلایا ہے۔ گندم کی جو بوریاں اُسے ہم دیتے ہیں اُن کا ہی کوئی حساب نہیں"۔

"اُسے تو جیسے کہیں گے وہ ویسے ہی کرے گا" — منوّر نے کہا۔

"پولیس کی دوستی پر اعتبار نہ کرنا" — میں نے کہا — "دوستی دوستی میں کہیں اُسے یہ نہ بتا دینا کہ میں یہیں چھپا ہوا ہوں .... اور جب تمہارے اس یار تھانیدار کو یہ پتہ چلے گا کہ مفرور سب انسپکٹر سکندر اس علاقے میں روپوش ہے تو وہ تمہاری دوستی یاری کو بھول جائے گا۔ دس ہزار روپے میں بڑی طاقت ہے اور یہ بھی سوچو کہ ان کا ڈی ایس پی اور ایس پی وغیرہ ان کے سر پر موجود رہیں گے۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ میں کتنا قیمتی مفرور ہوں۔ پولیس کی دوستی گھی اور مکھن تک ہی رہتی ہے۔ کوئی تھانیدار اپنی نوکری کو خطرے میں نہیں ڈالتا اور جہاں انعام ملنے کی امید ہو وہاں تھانیدار اپنے سگے بھائیوں کو بھی بھول جاتے ہیں"۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ ایوب پولیس کے ساتھ یہاں آئے گا؟" — تجمّل نے پوچھا۔

"لازمی طور پر آئے گا" — میں نے کہا — "تم فوری طور پر ایسے کرو کہ بڑے ہوشیار مزارعوں وغیرہ کو یہاں بلا لو۔ یہ آدمی ایسے ہوں جن پر تمہیں پورا پورا بھروسہ ہو"۔

میں نے جو کچھ سوچا تھا وہ عملی طور پر کرنے کے لئے بہت سا وقت درکار تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میں نے جس طرح سوچا ہے یہ کام اسی طرح ہو جائے گا۔ دشواری یہ تھی کہ وقت بہت تھوڑا تھا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ

جن آدمیوں کو بلایا تھا اُن کے آنے تک مویشیوں والے مکان سے وہ تمام شہادت مٹا ڈالی جس سے ایوب کی قید ثابت ہو سکتی تھی۔ مثلاً کمرے میں وہ دونوں رسیاں پڑی تھیں جن سے اُس کے ہاتھ اور پاؤں باندھے گئے تھے۔ ایک کمرے میں وہ لمبا پیچ کس پڑا تھا جس کا سرا گرم کر کے میں نے ایوب کے چہرے کو داغا تھا۔ جلی ہوئی لکڑیاں بھی پڑی تھیں۔ یہ سب چیزیں غائب کر دیں۔ نوکر جو اس مکان کے صحن میں سوتا تھا اُس کے ساتھ اُس کی چارپائی کو بھی غائب کر دیا۔

جس کمرے میں اُسے بند رکھا گیا تھا وہاں بھوسہ ڈال دیا گیا اور کچھ کوڑا کباڑ جو دوسرے کمروں میں تھا وہ بھی اس کمرے میں رکھوا دیا۔ یہ کام میں تجمل اور منور کرتے تھے۔

اتنے میں چھ سات آدمی آ گئے۔ ان میں دو آدمی وہ تھے جو ایوب اور اُس کی بہن کے اغوا میں میرے ساتھ تھے۔ میں نے ان آدمیوں کو بتانا شروع کر دیا کہ پولیس کے آجانے کی صورت میں اُنہوں نے کیا کہنا ہے۔

میں انہیں بتا رہا تھا کہ یہ کیا کہیں گے، لیکن مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اسی طرح کہیں گے جس طرح میں انہیں بتا رہا ہوں۔ پولیس نے ان کا بیان سن کر ہی مان نہیں لینا تھا۔ پولیس کے افسروں نے جرح بھی کرنی تھی اور بال کی کھال بھی اتارنی تھی۔ بہرحال کوشش پوری کرنی تھی۔ میں جو خطرہ محسوس کر رہا تھا وہ یہ سوچ کر اور زیادہ ہو جاتا تھا کہ ایوب بھی سب انسپکٹر رہ چکا تھا۔ مجھے اپنی کامیابی سو فی صد نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے ایوب کی بہن کو ساتھ لے کر چھپنا بھی تھا۔

"یہ سوچ لو بھائیو!" ــــ میں نے تجمل اور منور سے کہا ــــ "پولیس یہاں کا ایک ایک پتھر بھی ہٹا کر مجھے ڈھونڈے گی۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے یہاں کسی گھر میں بٹھا دو گے تو میں بچ جاؤں گا۔ کسی ایسے گھر میں مجھے اور اس لڑکی کو چھپاؤ جہاں پولیس کو شک نہ ہو۔"

تجمل اور منور نے ان آدمیوں کو جنہیں میں نے بیان سمجھائے تھے

ڈرایا دھمکایا اور کچھ لالچ بھی دیا۔ میں نے اپنے متعلق ان آدمیوں کو بتایا تھا کہ پولیس ضرور پوچھے گی اور یہ حیران ہو کر کہیں کہ اُنہوں نے اس حلیے کا آدمی یہاں کہیں نہیں دیکھا۔

ان آدمیوں سے الگ ہٹ کر تجمل اور منور نے میرے سامنے آپس میں طے کیا کہ مجھے اور سائرہ کو کہاں چھپانا چاہیئے۔ ان کی اراضی سے ہٹ کر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں زیادہ تر اُن کے مزارعے اور ان کی برادری کے لوگ رہتے تھے۔ ان کے خیال میں وہ گاؤں زیادہ محفوظ تھا۔ میں اُس مکان میں چلا گیا جہاں سائرہ سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے جگایا تو وہ گھبرا کر اُٹھی۔



"مت گھبراؤ سائرہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "میرے ساتھ آؤ۔"

"کہاں؟"

"جہاں تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہوگا" ــــ میں نے کہا۔

"کوئی نیا دھوکہ دے رہے ہو؟"

"سائرہ!" ــــ میں نے ذرا رُعب سے کہا ــــ "میرے ساتھ چلو۔ تم نے مجھے اپنا کہا تھا۔ میں تمہیں اپنا بن کر دکھاؤں گا۔ کوئی فالتو بات نہ کرنا۔"

صاف نظر آتا تھا کہ اُسے مجھ پر اعتبار نہیں، لیکن وہ مجبور تھی اس لئے ساتھ چل پڑی۔ اُس نے کچھ سوال کئے لیکن میں نے اُسے ہوں ہاں میں ٹال دیا اور کہا کہ وہ تیز چلتی چلے۔ جہاں ہم نے جانا تھا وہ جگہ کم و بیش ڈیڑھ میل دُور تھی۔ راستے میں تجمل کھڑا تھا۔ میں نے سائرہ کو کھڑا کر کے تجمل کو الگ کر کے کہا کہ منور سے کہہ آئے کہ اُس مکان میں جہاں سے میں سائرہ کو لا رہا ہوں، پلنگ اٹھوا دے اور وہاں کوئی نشان نہ رہنے دے۔"

"معلوم ہوتا ہے میرے امتحان کا وقت آگیا ہے" ــــ میں جب سائرہ کے پاس گیا تو اُس نے کہا۔

"دیکھ لینا" ــــ میں نے کہا ــــ "تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تو میں کیا کر

سکتا ہوں ..... میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں سائرہ، کہ یہاں سے تم بھاگ اٹھو یا چیخنا چلانا شروع کر دو تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دُور دُور تک جو لوگ یہاں رہتے ہیں اُن پر اس خاندان کا اثر و رسوخ ہے جن کے ہاں عذرا نے آ کر شادی کی تھی۔ یہاں تم کسی گھر میں چلی جاؤ گی تو گھر والے تمہیں انہی لوگوں کے پاس لے آئیں گے ..... تمہارے بھائی نے پہاڑ کے ساتھ ٹکر لی ہے۔"

"اس میں میرا کوئی قصور؟"

"یہ میں دیکھوں گا کہ تمہیں بلا قصور سزا نہ ملے" — میں نے کہا۔

وقت بہت گزر گیا تھا۔ اب مجھے ہر لمحہ یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ پولیس قریب پہنچ گئی ہے۔ میرا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ تجمل ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور سائرہ میری رفتار کے ساتھ خاصی تیز چل رہی تھی۔

آخر ہم اس گاؤں میں پہنچ گئے۔ تجمل نے پکے سے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی۔ پہلے ایک آدمی باہر آیا پھر دوسرا۔ تجمل انہیں ایک طرف لے گیا اور انہیں کچھ سمجھایا۔ وہ جب ہمارے پاس آئے تو تجمل نے کہا کہ اندر چلے جاؤ۔ ہم اندر چلے گئے۔ اچانک مجھے ایک اور خیال آ گیا۔ میں باہر کی طرف دوڑا اور تجمل کو آواز دی۔ وہ واپس جا رہا تھا۔

"تجمل بھائی!" — وہ میرے پاس آیا تو میں نے اُسے کہا — "اب تم دونوں تھانے چلے جاؤ اور گھوڑی کی چوری کی رپورٹ لکھواؤ اور ایک نہایت ضروری کام کرنا ہے۔ اپنے بڑے بھائی انسپکٹر فضل حسین کو تار دے دو کہ وہ فوراً پہنچے۔ یہ نہ لکھنا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔"

تجمل کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ ان پر کتنا بڑا طوفان آ جائے گا۔ یہ میں جانتا تھا۔ یہاں مجھے انسپکٹر فضل حسین نے ہی بھیجا تھا۔ اس سے مجھے امید تھی کہ وہ آئے گا تو مجھے اور زیادہ تحفظ مل جائے گا۔ اُس نے اپنے بھائیوں کو بھی بچانا تھا۔ مجھ جیسے مفرور ملزم کو چھپانا بہت بڑا جرم تھا۔ تجمل اتنی سی انگریزی پڑھا ہوا تھا کہ وہ تار لکھ سکتا تھا۔ میں نے اُسے الفاظ بتا دیئے۔ تار گھر وہاں سے گیارہ بارہ میل دُور تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ کسی سیانے آدمی کے ہاتھ تار

لکھ کر بھیج دے اور اُس آدمی کو سختی سے بتا دے کہ اُس کی واپسی تک پولیس یہاں پہنچ جائے اور اُس سے پوچھے کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے تو یہ نہ بتائے کہ وہ تار دے کر آ رہا ہے۔

تجمل چلا گیا اور میں واپس اس مکان میں آ گیا جہاں معلوم نہیں کتنے دن چھپے رہنا تھا۔



یہاں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ایوب نکلا کس طرح تھا۔ یہ مجھے اگلے روز بتایا گیا تھا۔ اُس مکان کے صحن میں ایک آدمی سوتا تھا۔ رات کو ایوب نے اُسے آوازیں دیں۔ یہ آدمی پہلے تو ٹالتا رہا، پھر ایوب کے بار بار بلانے پر اُٹھا اور جا کر دروازہ کھولا۔

"خاموش ہو جا" — اس آدمی نے ایوب سے کہا — "ورنہ مار مار کر بے ہوش کر دوں گا۔"

"میرے قریب آؤ" — ایوب نے کہا — "میں تمہارے ساتھ ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں تم کون سی ضروری بات کرو گے" — اُس آدمی نے کہا — "میں بتا دیتا ہوں کہ میں جن کا نمک کھاتا ہوں اُنہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔ تم سمجھتے ہو گے کہ یہ شخص غریب آدمی ہے جو روپے پیسے کے لالچ میں ہاتھ پاؤں کھول کر آزاد کر دے گا۔ اگر تمہارے دل میں یہ خیال آیا ہے تو اس خیال کو دل سے نکال دو۔"

ایوب دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے تھے جس سے نوکر کو یقین تھا کہ اُس کے ہاتھ بدستور بندھے ہوئے ہیں۔ اُس کے پاؤں آگے کی طرف تھے جن پر رسی اُسی طرح لپٹی ہوئی تھی جس طرح باندھی گئی تھی۔ نوکر دروازے میں کھڑا تھا۔

"میں تمہیں کوئی لالچ نہیں دوں گا" — اس نے نوکر سے کہا — "میں تمہارے مالکوں کے لئے ایک پیغام دوں گا۔"

"کیا پیغام؟"

"یہ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میرے ساتھ اور کون تھا" — ایوب نے کہا — "میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ کون کون میرے ساتھ تھا میں اور زیادہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔"

"بتا دو وہ کون تھے؟" — نوکر نے کہا۔

"پانی پلا دو" — ایوب نے کہا۔

ایوب دراصل اس کوشش میں تھا کہ نوکر اُس کے قریب آ جائے۔ وہ اُس کے قریب نہیں جا رہا تھا۔ اُسے اپنے پاس بلانے کے لئے اُس نے پانی مانگا۔ نوکر کو میں نے کہہ رکھا تھا کہ یہ جب بھی پانی مانگے، اُسے اپنے ہاتھ سے پانی پلا دیا کرے، لیکن اس کے ہاتھ نہیں کھولنے۔ نوکر نے گھڑے سے پیالے میں پانی ڈالا اور اُس کے قریب چلا گیا۔ اُس نے پیالہ اُس کے مُنہ کے ساتھ لگایا۔ اُس وقت نوکر اُس پر جُھکا ہُوا تھا۔

اچانک ایوب نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کئے اور بڑی دلیری سے ایک گھونسہ نوکر کے پیٹ میں مارا۔ پیٹ میں لگا ہُوا گھونسہ ذرا مشکل سے ہی برداشت ہوتا ہے۔ ایوب اُٹھا۔ نوکر پہلے ہی اُس پر جھکا ہُوا تھا۔ پیٹ میں گھونسہ لگنے سے وہ اور زیادہ دوہرا ہو گیا۔ ایوب اس طرح اُٹھا کہ نوکر کے دونوں ٹخنے پکڑے۔ خود اس کے نیچے رہا اور اس طرح نوکر اُس کے کندھوں پر چلا گیا۔ نوکر کا سر اور کندھے ایوب کی پیٹھ کی طرف تھے جدھر دیوار تھی۔ ایوب ایک دو قدم آگے ہو کر زور سے پیچھے ہٹا۔ نوکر کا سر اور کندھے دیوار سے لگے۔ ایوب نے یہ عمل تین چار مرتبہ کیا۔ نوکر انہی چوٹوں میں ہی رہ گیا۔

ایوب نے اُسے فرش پر پھینکا تو نوکر اُٹھ نہ سکا۔ کمرے کے کونے میں ایک کدال پڑی تھی۔ ایوب نے وہ کدال اُٹھائی اور اُلٹی طرف سے نوکر کے سر کے پچھلے حصے پر ماری۔ وہ اگر چاہتا تو نوکر کو کدال سے قتل بھی کر سکتا تھا، لیکن اُس میں پولیس والی عقل تھی۔ اُس نے نوکر کو بے ہوش کرنا ہی کافی سمجھا۔ نوکر جب ہوش میں آیا تو ایوب غائب تھا اور وہاں دو رسیاں پڑی تھیں۔

نوکر نے باہر نکل کر دیکھا تو سب سے اچھی گھوڑی غائب تھی۔

میں نے رسیاں دیکھی تھیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ایوب نے کمرے کے کونے میں کدال دیکھ لی تھی جو ہم میں سے کوئی بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ رات کو وہ سرک سرک کر کدال تک پہنچ گیا۔ کدال کے پھل کو اس نے کسی طرح سیدھا کر لیا اور اس کے اوپر رگڑ رگڑ کر رسّی کاٹ لی۔ بہت بعد میں مجھے پتہ چلا تھا کہ اُس نے پولیس کو یہی طریقہ بتایا تھا۔ پہلے اُس نے ہاتھوں کی رسّی کاٹی پھر پاؤں کی رسّی کھول لی۔

اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند ہوتا تھا ورنہ ایوب باہر آ جاتا اور سوئے ہوئے نوکر کے سر میں ضرب لگا کر بے ہوش کر کے نکل جاتا۔ اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس پوزیشن میں وہ بیٹھا رہتا تھا اُسی جگہ اور اُسی پوزیشن میں جا کر بیٹھ گیا۔ رسّی ویسے ہی ٹخنوں کے ساتھ لپیٹ لی اور ہاتھوں والی رسّی اپنے پیچھے چھپا لی اور ہاتھ اس طرح پیچھے کر لئے جیسے پیٹھ پیچھے بندھے ہوئے ہوں۔

اس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ ہماری ٹکر کسی معمولی دماغ کے آدمی کے ساتھ نہیں تھی۔ اگر میں مفرور ملزم نہ ہوتا تو میں فوری طور پر کوئی جوابی کارروائی کرتا۔ میری اس کمزوری نے مجھے بے بس کر رکھا تھا۔



اب اگر میں آپ کو یہ بتانے لگوں کہ میں تو اندر بند تھا اور یہ باتیں مجھے کس طرح معلوم ہوتیں اور کون سی بات کس نے بتائی تو آپ کے لئے خاصی بوریت پیدا ہو جائے گی۔ کوئی بات کسی بھی وقت معلوم ہوتی وہ میں آپ کو کہانی کی ترتیب سے سُنا دیتا ہوں۔

میں اور سائرہ جس مکان میں آ گئے تھے اس کے تین کمرے تھے۔ وہاں دو آدمی رہتے تھے۔ وہ دونوں بھائی تھے۔ ان میں ایک شادی شدہ تھا۔ اُس کی بیوی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھی۔ تجمّل نے اُسے کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ نہ کہے وہ اپنی بیوی کو واپس نہ لائے۔ ہمیں

جو کمرہ دیا گیا وہ صاف ستھرا اور الگ تھلگ تھا۔ میں نے ان دونوں آدمیوں کو الگ کر کے کہہ دیا تھا کہ میرے ساتھ انہیں جو بھی بات کرنی ہو وہ یا باہر کا کوئی بھی پیغام دینا ہو تو مجھے باہر بلا کر کریں۔ اس لڑکی کے ساتھ کوئی بات نہ کریں۔

صبح کا دھندلکا ابھی سفید نہیں ہوا تھا جب ان میں سے ایک آدمی نے مجھے باہر بلایا اور بتایا کہ تجمل کے ہاں پولیس آئی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ کسی کام کے بہانے اُدھر چلا جائے اور ہر طرف دیکھے اور آ کر بتائے کہ پولیس کتنی ہے اور اُدھر کیا ہو رہا ہے۔

اس سیدھے سادے معمولی سے دیہاتی نے کیا بتانا تھا۔ یہ لوگ تو پولیس کی وردی دیکھ کر ہی ڈر جایا کرتے تھے۔ میں آپ کو وہ باتیں سناتا ہوں جو مجھے معتبر ذرائع سے بعد میں معلوم ہوتی تھیں۔ ہوا یوں تھا کہ منور دو آدمیوں کو ساتھ لے کر گاؤں کے تھانے میں چلا گیا تھا۔ تھانہ ڈیڑھ پونے دو میل دور تھا چونکہ تھانیدار تجمل اور منور کا دوست تھا اس لئے وہ اسی وقت ان کے ساتھ موقع دیکھنے کے لئے آ گیا۔ اس خاندان سے اس تھانیدار کو گھی مکھن آٹا وغیرہ ملتا رہتا تھا۔

وہ اتنی دیر وہاں رہا کہ صبح طلوع ہونے لگی۔ اتنے میں اُس کے تھانے کا اے ایس آئی اور ایوب کے شہر کا تھانیدار ایک دو ہیڈ کانسٹیبلوں کے ساتھ آ گئے۔

ان کے ساتھ ایوب بھی تھا اور ان کے ساتھ منور کی گھوڑی بھی۔

اے ایس آئی اور شہر کے تھانیدار نے گاؤں کے تھانیدار کو الگ بلایا اور اُس سے کچھ کہا۔

"کیا یہ ہے تمہاری گھوڑی؟" — گاؤں کے تھانیدار نے تجمل اور منور سے پوچھا۔

"یہی ہے" — تجمل نے جواب دیا — "یہ گھوڑی کہاں سے ملی ہے؟"

اب پولیس کے ان افسران نے تجمل اور منور کو الگ کر لیا۔

"کیا آپ لوگوں نے اس شخص کو جو ہمارے ساتھ ہے، اس کے گھر سے اغوا کیا تھا؟" — شہر کے تھانیدار نے پوچھا — "اور کیا ان کی بہن آپ کے پاس ہے؟"

"انسپکٹر صاحب!" — تجمل نے حیرت زدگی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا — "کیا کہہ رہے ہیں آپ!" — اُس نے گاؤں کے تھانیدار سے کہا — "آپ انہیں بتائیں کہ یہ کہاں کھڑے ہیں اور کس کے ساتھ بات کر رہے ہیں۔ ہماری اتنی قیمتی گھوڑی چوری ہوئی اور یہ گھوڑی کو ساتھ لئے چلے آتے ہیں اور ہم پر اتنا ذلیل الزام تھوپ رہے ہیں کہ ہم نے اس شخص کو اغوا کیا تھا... یہ ہے کون؟... کوئی شہر کا آدمی لگتا ہے۔"

"یہ الزام میں نہیں تھوپ رہا" — شہر کے تھانیدار نے کہا — "یہ اس آدمی کا الزام ہے۔ میں اس کی رپورٹ پر آیا ہوں۔"

اتفاق سے دونوں تھانیدار مسلمان تھے۔ اے ایس آئی ہندو تھا۔ اگر یہ بھی مسلمان ہوتا تو بھی تجمل اور منور کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اتنے سنگین الزامات پر وہ پردہ نہیں ڈال سکتے تھے۔ انہوں نے اِس خاندان کی عزت کی خاطر کچھ مہلت دے دی۔ شہر کا تھانیدار سب انسپکٹر انور علی سید تھا اور وہ ایوب کا دوست تھا۔ گاؤں کے تھانیدار کا نام راجہ شیر خان تھا۔

دونوں نے آپس میں ذرا پرے جا کر صلاح مشورہ کیا اور تجمل سے کہا کہ وہ اُس کے گھر میں بیٹھ کر بات کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں بھائیوں نے دونوں تھانیداروں کو بیٹھک میں بٹھایا۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کے بڑے بھائی افضل حسین انسپکٹر پولیس ہیں" — سب انسپکٹر انور علی سید نے کہا — "اگر آپ نے میرے ساتھ تعاون نہ کیا اور مجھے مجبور ہو کر کوئی قدم اُٹھانا پڑا تو مجھے انسپکٹر افضل حسین کے آگے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ آپ پر کیا مصیبت آ پڑی ہے... آپ کا گاؤں پولیس کے گھیرے میں ہے۔ کوئی آدمی اس

گھیرے سے باہر نہیں جاسکتا نہ کوئی اندر آسکتا ہے۔ میرے ساتھ شہر سے گارد آئی ہے اور راجہ شیر خان کے تھانے سے گاردان کا اے ایس آئی لایا ہے۔"

"جناب شاہ صاحب!" — تجمل نے کہا — "آپ نے کیا سوچ کر ہمارا محاصرہ کر لیا ہے؟ کیا یہاں ڈاکوؤں کا ٹولہ رہتا ہے؟ اگر اس شخص نے جو آپ کے ساتھ آیا ہے، آپ کو یہ رپورٹ دی ہے کہ ہم نے اسے اور اس کی بہن کو اغوا کیا ہے تو یہ کس انگریز کی اولاد ہے کہ آپ نے ہمارے علاقے کے ارد گرد پولیس کھڑی کر دی ہے؟"

"یہ رپورٹ اس نے نہیں دی میرے بھائی!" — سب انسپکٹر انور علی سید نے کہا — "اِن دونوں کے اغوا کی رپورٹ اس کی ماں نے دی تھی۔ دو آدمی اس کے ساتھ آتے تھے۔ رپورٹ یہ تھی کہ ایوب اور اُس کی بہن کو زبردستی اغوا کر لیا گیا ہے۔"

"ایوب کون ہے؟" — منور نے انجان بنتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"یہ آدمی جو میرے ساتھ آیا ہے" — سب انسپکٹر انور علی نے جواب دیا۔

"یہ برآمد کہاں سے ہوا ہے؟" — منور نے پوچھا۔

"میں آپ کو ساری بات سناؤں گا" — سب انسپکٹر انور علی نے کہا — "پہلے مختصر بات سن لو اور مجھے جواب دو۔ پولیس کا ایک مفرور سب انسپکٹر یہاں موجود ہے۔ اسے میرے حوالے کر دیں۔ وہ اشتہاری ملزم ہے۔ وہ قاتل اور ڈاکو ہے اور اُس کے سر کی قیمت زندہ یا مُردہ دس ہزار روپیہ مقرر ہوتی ہے۔ وہ یہیں ہے یا آپ کو معلوم ہے وہ کہاں ہے۔ ایوب اور اس کی بہن کو اسی نے اغوا کیا ہے .... آپ لڑکی کو اور اس مفرور سب انسپکٹر سکندر کو میرے حوالے کر دیں ورنہ آپ کے گاؤں پر اور آپ کے گھر پر چھاپہ پڑے گا پھر میں ذرا سا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ پولیس تلاشی لیا کرتی ہے۔ آپ کی بہت بدنامی ہوگی۔"

"شاہ صاحب!" — تجمل نے کہا — "آپ کی جو نیت ہے وہ صاف الفاظ میں ہم پر ظاہر کر دیں۔ ہمارا کسی مفرور سب انسپکٹر کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ آپ ہم پر ذرا سی بھی مہربانی نہ کریں اور ہمارے گھر کی اور جس جس جگہ کی آپ تلاشی لینا چاہتے ہیں لے لیں۔ اگر کوئی مفرور ملزم یا اغوا کی ہوئی لڑکی آپ کو مل جاتے تو ہمیں گرفتار کر لیں، اور اگر یہاں سے کچھ بھی برآمد نہ ہُوا تو ہم آپ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے۔ ہم اپنے بھائی فضل حسین کو بلا لیں گے۔"

"راجہ صاحب!" — منور نے سب انسپکٹر راجہ شیر خان سے کہا — "آپ انہیں بتاتے کیوں نہیں کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں اور ہمارا دوستانہ کسی غنڈے بدمعاش کے ساتھ نہیں۔"

"اور راجہ صاحب!" — تجمل نے اُسے کہا — "ہم نے آپ کو اپنی گھوڑی کی چوری کی رپورٹ دی تھی۔ گھوڑی آگئی ہے لیکن آپ نے شاہ صاحب سے اتنا بھی نہ پوچھا کہ یہ گھوڑی کہاں سے ملی ہے۔"

"یہ تو میں نے پوچھنا ہی ہے" — سب انسپکٹر شیر خان نے کہا — "لیکن یہاں معاملہ ہی کچھ اور ہو گیا ہے" — اُس نے انور علی سید سے کہا — "شاہ صاحب! آپ انہیں بتا دیں کہ یہ شخص ایوب کیا کہتا ہے اور یہ گھوڑی اس کے ہاتھ کس طرح آئی ہے۔"



"میرے بھائی تجمل!" — سب انسپکٹر انور علی نے کہا — "مفرور سب انسپکٹر سکندر نے دو تین آدمیوں کے ساتھ ایوب اور اس کی جوان بہن کو اس کے گھر سے رات کے وقت اٹھایا اور انہیں گھوڑوں پر ڈال کر یہاں لے آئے۔ ایوب کو معلوم نہیں کہ اس کی بہن کو کہاں رکھا گیا ہے اور اب وہ کہاں ہے۔ وہ تمہارے قبضے میں ہے۔ ایوب کو سکندر نے تم دونوں بھائیوں کے ساتھ یہاں ایک مکان میں بند کر دیا۔ ایوب ابھی اس مکان کی

نشاندہی کرے گا۔"

"پہلے اس سے اُس مکان کی نشاندہی کرا لیں"— تجمل نے کہا — "اس کا جھوٹ یہیں ثابت ہو جاتے گا۔"

"چوہدری تجمل!"— سب انسپکٹر شیر خان نے کہا — "پہلے پوری کہانی سن لیں۔ شاہ صاحب آپ پر بہت بڑی مہربانی کر رہے ہیں کہ انہوں نے ابھی چھاپہ نہیں مارا۔ اتنا موقع کوئی تھانیدار نہیں دیا کرتا۔ اعزا کی پروا نہیں۔ اصل معاملہ مفرور سب انسپکٹر کا ہے۔ شاہ صاحب ڈی ایس پی تک کو رپورٹ دے آتے ہیں۔"

"اور ہو سکتا ہے ڈی ایس پی خود ہی آ جاتے"— سب انسپکٹر انور علی سید نے کہا — "میں اُس کے آنے سے پہلے کچھ تصفیہ کر لینا چاہتا ہوں"— وہ چُپ ہو گیا۔ اُس نے کچھ سوچا، سب انسپکٹر شیر خان کی طرف دیکھا پھر تجمل سے مخاطب ہُوا — "بھائی تجمل! سکندر کے سر کی قیمت دس ہزار روپیہ ہے۔ میں آپ کو ایک راستہ دکھاتا ہُوں۔ آپ بتا دیں کہ سکندر کہاں ہے۔ میں اُسے پکڑ لوں گا۔ آپ یہ بیان دیں کہ آپ اسے نہیں جانتے تھے۔ اس نے آپ کو غلط نام بتایا تھا۔ جُوں ہی آپ کو پتہ چلا کہ یہ تو مفرور سب انسپکٹر ہے تو آپ نے اسے گرفتار کرا دیا۔ میں آپ کو دس ہزار روپیہ دلا دوں گا۔ میں آپ کو ایسا بیان یاد کرا دوں گا جسے انگریز افسر فوراً قبول کر لیں گے۔"

"آپ اس شخص کی بات سنائیں"— تجمل نے کہا — "یہ آدمی کیا کہتا ہے جو آپ کے ساتھ آیا ہے اور اپنا نام ایوب بتاتا ہے۔ میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ ہمیں موقع دے رہے ہیں اور آپ ہمیں دس ہزار روپیہ دلانا چاہتے ہیں لیکن شاہ صاحب! میرے سامنے اس وقت اپنی اور اپنے خاندان کی عزت ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔"

سب انسپکٹر انور علی سید نے سنایا کہ ایوب یہاں سے کس طرح فرار ہُوا تھا۔ اُس نے بالکل وہی سنایا جو میں آپ کو سُنا چکا ہوں۔ ایوب نے شہر کے اس

تھانیدار کو سچا بیان دیا تھا۔ تجمل اور منور نے حیرت کا اظہار کیا اور پریشانی کی بڑی عمدہ ایکٹنگ کی۔

"اس طرح تمہاری گھوڑی اس کے ہاتھ آ گئی"— ایوب کے فرار کا واقعہ سنا کر سب انسپکٹر انور علی سید نے کہا — "اگر اس نے گھوڑی چوری کی ہوتی تو شہر میں جا کر گھوڑی کو اِدھر اُدھر کر دیتا لیکن یہ گھوڑی کے ساتھ تھانے میں آیا اور بتایا کہ وہ یہ گھوڑی وہاں سے لایا ہے جہاں اسے قید میں رکھا گیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ وہاں دو اور گھوڑیاں اور دو بھینسیں بندھی ہوتی تھیں۔"

"تم لوگوں نے رسّی سے اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیتے تھے۔ آپ دونوں میں سے کسی نے اسے مارا پیٹا بھی تھا اور سکندر نے لوہے کی ایک سلاخ کو لال گرم کر کے اس کے چہرے پر لگائی تھی۔ اس کا ثبوت اس کا چہرہ ہے۔ جہاں جہاں سلاخ لگائی گئی تھی وہاں جلنے کے نشان ہیں جو زخم بنے ہُوتے ہیں۔ ان سے پانی سا رِس رہا ہے۔ آپ نے اس کی کلائیوں اور ٹخنوں پر رسّیاں اتنی کس کر باندھی تھیں کہ وہاں رسیوں کے بڑے صاف نشان ہیں۔"

"کیا یہ شخص یہ نہیں بتاتا کہ اس کی اور ہماری آپس میں دشمنی کیا ہے؟"— منور نے پوچھا۔

"یہ مفرور سب انسپکٹر سکندر کے ساتھ اپنی پرانی دشمنی بتاتا ہے"— سب انسپکٹر انور علی سید نے کہا — "سکندر جب سروس میں تھا تو اُس وقت ایوب بھی پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ وہاں ان کی آپس میں کوئی دشمنی پیدا ہو گئی تھی۔ ایوب پر مقدمہ چلا تھا اور اسے دو سال قید کی سزا ملی تھی۔"

"اچھا!"— تجمل نے کہا — "یہ تو صاحب بہادر ایوب صاحب سب انسپکٹر بھی رہ چکے ہیں اور دو سال جیل میں بھی گزار آتے ہیں۔ پھر تو اُستاد ہیں ...لیکن شاہ صاحب اس ایوب کی ہمارے ساتھ کیا دشمنی ہے؟"

"اس نے آپ کی دشمنی کا نام نہیں لیا"— سب انسپکٹر انور علی سید نے کہا — "لیکن کوئی دشمنی ضرور ہے۔"

دشمنی تو موجود تھی۔ اس دشمنی کا باعث عذرا تھا۔ ایوب نے جس طرح عذرا کو اغوا کیا اور اُسے جس انجام کو پہنچایا تھا وہ سُنا چکا ہوں۔ اسی کے جواب میں ایوب اور اس کی بہن کو ہم نے اغوا کیا تھا لیکن ایوب دشمنی کی اس وجہ کا ذکر نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ اُس کا جُرم تھا۔ ادھر تجمّل اور منوّر بھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ایوب نے عذرا کو اغوا، بے آبرو اور قتل کیا ہے کیونکہ انہوں نے ہر کسی کو یہ بتایا تھا کہ عذرا کو ٹھے سے گر کر مری ہے۔ اگر عذرا کے قتل کی رپورٹ تھانے دے دی جاتی اور شک ایوب پر لکھوا دیا جاتا تو ایوب کے خلاف تو کچھ بھی ثابت نہ ہوتا البتہ ایوب اور ان دونوں بھائیوں کی دشمنی کی وجہ سامنے آ جاتی اور ایوب کہتا کہ تجمّل اور منوّر نے اُس پر شک کیا تھا جو ثابت نہیں ہو سکا تو انہوں نے انتقام لینے کی خاطر اُسے اور اُس کی بہن کو اغوا کیا ہے۔

"جناب شاہ صاحب!"—— تجمّل نے کہا —— "اور راجہ صاحب! آپ بھی غور کریں اور ہمیں بھی سمجھائیں۔ جس شخص کو ہم جانتے ہی نہیں اس کے ساتھ ہماری دشمنی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"معلوم ہوتا ہے اس کی دشمنی مفرور سکندر کے ساتھ ہی ہے"—— سب انسپکٹر انور علی سید نے کہا۔

"کہاں ہے سکندر؟"—— منوّر نے کہا۔

ان کے درمیان بہت باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے جب یہ باتیں سنائی گئی تھیں تو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ دونوں تھانیداروں کو شک سا ہو گیا تھا کہ معاملہ شاید کچھ اور ہے اور ظاہری طور پر کچھ اور بنایا جا رہا ہے۔ تجمّل اور منوّر نے بڑی اچھی ایکٹنگ کی تھی۔ سب انسپکٹر انور علی سید نے چھاپہ مارنا تھا جو ایک سنگین کارروائی ہوتی ہے۔ جرائم پیشہ لوگوں کے گھروں پر تو چھاپے مارے ہی جاتے ہیں جو اکثر ناکام بھی ہوتے ہیں یعنی کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا لیکن پولیس کے خلاف جرائم پیشہ افراد کی طرف سے کوئی احتجاجی آواز نہیں اٹھتی۔ یہ جاگیر اور جگہ ایک پولیس انسپکٹر اور اُس کے بھائیوں کی تھی جہاں

چھاپہ مارنے کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ انور علی سید نے ضرور سوچا ہو گا کہ یہاں چھاپہ ناکام ہو گیا تو اُس کے خلاف یہ لوگ قانونی کارروائی کر سکتے ہیں کہ اس تھانیدار نے ایک سزا یافتہ اور مشکوک چال چلن کے آدمی کے کہنے پر بلا جواز چھاپہ مارا ہے جس سے ایک معزز خاندان کی بے عزتی ہوتی ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ سب انسپکٹر انور علی سید نے تفتیش کے قاعدے اور ضابطے سے ہٹ کر کارروائی کی تاکہ شکوک پہلے رفع کر لے۔



اُس نے طریقہ یہ اختیار کیا کہ تجمّل اور منوّر کو باہر لے گیا اور ایوب کو بُلایا۔

"اوئے!"—— تجمّل نے ایوب سے یوں کہا جیسے وہ کوئی چھوٹا اور گھٹیا سا آدمی ہو —— "کون ہو تم؟"

"یہ تو شہر کا بدمعاش معلوم ہوتا ہے"—— منوّر نے کہا —— "اسے ایک روز کے لئے یہاں چھوڑ دو۔ اس کا دماغ درست کر دیں گے۔"

"او چوہدریو!"—— سب انسپکٹر انور علی سید نے کہا —— "اس کے ساتھ کوئی بات نہ کرو۔ اس کے ساتھ جو بات کرنی ہو گی وہ میں کروں گا۔"

"ہاں ایوب خان!"—— انور علی سید نے اُسے کہا —— "ہمیں اُس مکان میں لے چلو جہاں تم کہتے ہو کہ تمہیں بند رکھا گیا تھا۔"

ایوب نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اُس طرف چل پڑا جدھر وہ مکان تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہم ایوب کو رات کے وقت یہاں لاتے تھے اور وہ رات کے وقت ہی فرار ہوا تھا، لیکن وہ اس سے پہلے عذرا کو دیکھنے کے لئے بھیس بدل کر اس طرف آتا رہا تھا اس لئے اُسے اپنی قید والا مکان دکھانے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ وہ اس مکان تک پہنچ گیا۔

مکان کے دروازے کی باہر والی زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔ ایوب نے اشارے سے بتایا کہ یہ ہے وہ مکان۔ انور علی سید نے زنجیر اُتاری، دروازہ کھولا اور ایوب سے کہا کہ وہ اندر چلے اور وہ کمرہ دکھائے۔

وہ سیدھا اُس کمرے میں گیا۔ پیچھے پیچھے سب اندر گئے۔ ایوب نے وہ جگہ دکھائی جہاں اُسے پہلی رات بٹھایا گیا تھا اور اُس کے چہرے کو گرم پیچ کس سے داغا گیا تھا۔ اُس نے بیان دیا کہ کس طرح منور نے اُسے مارا پیٹا تھا اور اس کے ساتھ جو بھی سلوک ہُوا تھا وہ اُس نے بیان کیا۔ وہ چونکہ خود تھانیدار رہ چکا تھا اس لئے اُس نے ہر وہ تفصیل بیان کی جو پولیس کو تفتیش میں مدد دیتی ہے۔ پھر اُس نے بتایا کہ وہ کس طرح فرار ہُوا تھا۔

"وہ کدال کہاں ہے جس سے تم نے رسّی کاٹی تھی؟" — سب انسپکٹر انور علی سید نے پوچھا۔

ایوب کمرے کے اُس کونے کی طرف گیا جہاں کدال رکھی رہتی تھی لیکن اب وہاں نہیں تھی۔ اُس نے کہا کہ کدال یہاں سے اُٹھا لی گئی ہے۔

"اس کمرے میں یہ بھوسہ بھی نہیں تھا جو اب یہاں پڑا ہُوا ہے" — ایوب نے کہا — "اور یہ اتنی ساری چیزیں بھی یہاں نہیں تھیں۔ باہر صحن میں ایک آدمی سویا کرتا تھا۔"

انور علی سید نے تحمل کی طرف دیکھا۔

"شاہ صاحب!" — تحمل نے کہا — "آپ کہتے ہیں کہ یہ شخص رات کو یعنی چند گھنٹے پہلے یہاں سے فرار ہُوا ہے۔ فرار ہُوا ہے یا نہیں، یا یہ شخص اس کمرے میں بند تھا یا نہیں، یہ ایک الگ سوال ہے، لیکن یہ سوچیں کہ اس کمرے میں اتنے تھوڑے سے وقت میں یہ تبدیلی آگئی ہے کہ کدال بھی نہیں ہے اور بھوسہ اور دوسری چیزیں جو نہیں تھیں، وہ اب ہیں .... میں آپ کو ایک اور بات بتا دیتا ہوں کہ یہاں دو ہماری بھینسیں اور تین گھوڑیاں بندھی رہتی ہیں۔ یہ مویشی چونکہ ہمارے ذاتی استعمال کے ہیں اس لئے ہم یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں رات کو کوئی آدمی نہیں سوتا۔"

"اتنے قیمتی مویشی یہاں ہوتے ہیں" — سب انسپکٹر راجہ شیر خان نے کہا — "اور آپ ان کی چوکیداری کے لئے کسی آدمی کو یہاں نہیں سلاتے۔"

"یہاں سے کوئی مویشی کھول کر لے جانے کی جرأت نہیں کر سکتا" — منور نے کہا — "پہرے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔"

"یہ بھی ذہن میں رکھیں" — تحمل نے کہا — "لوگ دشمنی کی بناء پر ایک دوسرے کے مویشی چوری کرتے ہیں یا اُن کی کھُرلیوں میں زہر ڈلوا دیتے ہیں، لیکن ہماری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔ آپ اس علاقے میں دُور دُور تک چلے جائیں اور ہمارے متعلق پوچھیں۔ آپ ہماری تعریفیں ہی سُنیں گے۔ اگر کوئی تعریف نہیں کرے گا تو ہمیں بُرا بھی نہیں کہے گا۔"

"یہ گواہی تو میں بھی دیتا ہوں" — سب انسپکٹر شیر خان نے کہا — "شاہ صاحب! انہوں نے یہ بات بالکل صحیح کہی ہے۔"

سب انسپکٹر انور علی سید، سب انسپکٹر شیر خان کو ساتھ لے کر مکان کے تینوں کمروں میں گیا۔ ہر کمرے میں اُس نے خاصا وقت صرف کیا۔ وہ تجربہ کار آدمی معلوم ہوتا تھا۔

"ایوب خان!" — انور علی سید نے باہر آکر ایوب سے کہا — "تم کہتے ہو کہ تمہیں لال گرم سلاخ سے داغا جاتا تھا۔ تم خود تھانیدار رہے ہو۔ سلاخ کہیں دُور سے گرم کر کے تو نہیں لاتے ہوں گے یہیں گرم کرتے ہوں گے۔ تم خود ان کمروں میں اور صحن میں گھوم پھر کر دیکھو۔ کہیں آگ جلانے کا نشان ہوگا یا وہ سلاخ کہیں پڑی ہوئی ہو گی۔ ہم دو سب انسپکٹر دیکھ آتے ہیں۔"

"شاہ صاحب!" — ایوب نے کہا — "آپ سکندر کو نہیں جانتے۔ اُسے میں جانتا ہوں۔ وہ اتنا عقلمند آدمی ہے کہ ہم اُس کی عقل تک نہیں پہنچ سکتے۔ انہیں رات کو ہی پتہ چل گیا ہوگا کہ میں فرار ہو گیا ہوں تو سکندر نے تمام شہادت اور کھُرا کھوج مٹا دیا ہو گا۔"

"راجہ صاحب!" — تحمل نے سب انسپکٹر راجہ شیر خان سے کہا — "شاہ صاحب کو بتائیں کہ ہم گھوڑی کی چوری کی رپورٹ کرنے کس وقت آپ کے تھانے میں گئے تھے۔ پھر یہ سوچیں کہ ہم نے شہادت کس وقت غائب کی ہوگی۔ ہم آپ کے تھانے سے واپس آتے تو تھوڑی دیر بعد شاہ صاحب آ گئے۔ آپ نے آتے ہی یہ مکان دیکھا تھا۔ اس شخص کی کوئی اور بات نہیں

ملتی تو یہ سکندر سکندر کی رٹ لگا رہا ہے۔ ہم نے پہلی بار سکندر کا نام سُنا ہے۔"

"ایوب بھائی!" — انور علی سید نے کہا — "میں فرض
نے تمہیں اغوا کیا ہے، لیکن میری جگہ تم ہوتے تو کیا سب سے پہلے یہ معلوم کر کس دشمنی کی بنا پر انہوں نے یہ جرم کیا ہے؟ .... اب سکندر کا نام نہ لینا۔"

"شاہ صاحب!" — سب انسپکٹر راجہ شیر خان نے کہا — "آپ مجھ سے سینئر ہیں۔ میں آپ کے حکم کا پابند ہوں، لیکن ایک مشورہ دیتا ہوں .... ان تینوں کو آپس میں بحث مباحثہ کرنے دیں۔ پھر اس سے میں اور آپ اندازہ کریں گے کہ ان کی آپس میں کیا دشمنی ہے۔"

"پولیس کا یہ طریقہ تو نہیں ہوتا" — سب انسپکٹر انور علی سید نے کہا — "لیکن ایوب بھائی! میں اتنی سنگین کارروائی کرنے سے پہلے کچھ شکوک رفع کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں یقین کئے بغیر تمہاری ہر بات نہیں مانوں گا۔ اگر تم مجھے یقین دلا دو تو ان دونوں بھائیوں کو ہتھکڑیاں لگا کر الگ بٹھا دوں گا اور پھر دیکھنا کہ میں ان کے گھر کی اور ان کے مزارعوں کے گھروں کی کس طرح تلاشی لیتا ہوں۔ مجھے سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ دشمنی کیا ہے؟ یہ تو تم بھی سمجھتے ہو کہ اگر تمہیں واقعی اغوا کیا گیا ہے تو یہ انتقامی کارروائی ہے اور اگر تمہارا الزام غلط ہے تو تم ان سے انتقام لے رہے ہو۔"



سب انسپکٹر راجہ شیر خان کے کہنے پر تجمل نے وہیں چارپائیاں اور کرسیاں وغیرہ منگوا لیں۔ سب انسپکٹر انور علی سید نے تجمل سے کہا کہ وہ اپنی گھوڑی کو اندر بندھوا دے۔

"نہیں شاہ صاحب!" — تجمل نے کہا — "ہماری رپورٹ راجہ صاحب کے پاس لکھی ہوئی ہے۔ یہ گھوڑی یہاں سے چوری ہوتی ہے اور یہ گھوڑی آپ نے اس شخص کے قبضے میں دیکھی ہے۔ گھوڑی کو ابھی اپنے پاس رہنے دیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی کہ یہ کیا چکر بازی ہے۔"

"ہاں ایوب خان!" — آرام سے بیٹھ کر سب انسپکٹر انور علی سید نے ایوب سے کہا — "اب بات کرو۔ میں تم پر ثبوت کا بوجھ ڈال رہا ہوں۔ یہ کام کر دو۔ پھر میری کارروائی دیکھنا۔"

"بات یہ ہے شاہ صاحب!" — ایوب نے کہا — "ہمارے شہر کی ایک لڑکی تھی جس کا نام عذرا تھا۔ میں اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے والدین رضامند ہو گئے تھے، لیکن وہ لڑکی لاپتہ ہو گئی۔ مجھے اس کا افسوس تو ہونا ہی تھا لیکن زیادہ افسوس اس پر ہُوا کہ لڑکی کے باپ نے اتنا بھی نہ کیا کہ اُس کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے دے دیتا۔ میں نے انہیں بہت کہا تھا کہ وہ تھانے میں رپورٹ لکھوا دیں لیکن نہ لڑکی کی ماں مانتی تھی نہ باپ۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ پانچ چھ مہینے گزر گئے ....

"کچھ دن پہلے کا واقعہ ہے، آدھی رات کے وقت میرا دروازہ کھٹکا۔ میں باہر نکلا تو سکندر کھڑا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر حیران ہُوا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ کہیں آگے جا رہا ہے اور یہاں سے گزرتے اُسے میرا خیال آگیا اور سلام دعا کے لئے اُس نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اُسے تھوڑی دیر بٹھایا۔ عذرا اُس کی خالہ زاد بہن تھی۔ اُس کی شادی سکندر کے ساتھ ہونی تھی لیکن سکندر انگریز ڈی ایس پی کو قتل کر کے مفرور ہو گیا۔ اس طرح عذرا کے ساتھ اُس کی شادی کا سوال ہی ختم ہو گیا۔ اُس رات اُس نے میرے ساتھ عذرا کی باتیں بھی کیں۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ لاپتہ ہو گئی تھی ....

"کچھ دیر رُک کر سکندر چلا گیا۔ سات آٹھ روز بعد پھر اسی طرح آدھی رات کے وقت میرا دروازہ کھٹکا۔ میں باہر نکلا تو سکندر کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے دھکا دیا۔ میں دروازے کے اندر ہو گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے دو اور آدمی آ گئے۔ سکندر کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اُس کے ساتھ جو آدمی تھے انہوں نے میرے مُنہ پر ایک رومال باندھ کر میرے سر کے پیچھے گانٹھ دے دی۔ پھر انہوں نے میرے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ دیئے۔ اُس وقت میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ یہ آدمی تھا جس کا نام منوّر ہے" — اُس نے منوّر کی طرف اشارہ کر کے کہا — "اس

کے پاس دو نالی بندوق تھی۔ مجھے ڈیوڑھی میں چھوڑ کر یہ اندر گئے اور میری جوان بہن کو بھی اُٹھا کر لے آئے ....

"یہاں آکر انہوں نے مجھے اس کمرے میں بند کر دیا۔ انہوں نے مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں نے عذرا کو یہاں سے اغوا کرایا تھا اور اُس کی عزت خراب کر کے اُس کی لاش یہاں پھینک دی تھی۔ مجھے یہاں پتہ چلا کہ عذرا گھر سے بھاگ کر منوّر کے پاس آگئی تھی۔ یہ مجھے ان لوگوں نے بتایا تھا۔ مجھے شک یہ ہے کہ وہ مرگئی ہے یا انہوں نے خود اُسے مارا ہے۔ سکندر پہلی بار جب میرے گھر آیا تھا تو وہ دراصل یہی ٹوہ لگانے آیا تھا کہ عذرا میرے پاس تو نہیں آگئی۔ وہ دراصل یہاں سے بھی لاپتہ ہوگئی تھی۔ پھر وہ انہیں مل گئی ہوگی تو انہوں نے اُسے قتل کر ڈالا اور اس کا الزام مجھ پر لگایا۔ انہوں نے اس کا انتقام مجھ سے اس طرح لیا کہ مجھے بھی اور میری بہن کو بھی اغوا کر لیا۔"

ایوب کا یہ بیان ذرا لمبا تھا۔ میں نے آپ کی موٹی موٹی باتیں سنائی ہیں۔ اُس کے اس بیان سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس کی عقل پر پردہ پڑ گیا تھا حالانکہ وہ خود سابق تھانیدار تھا۔ وہ دراصل مجھے گرفتار کرانا چاہتا تھا اور اُس نے مجھے اپنے دماغ پر اتنا سوار کر لیا تھا کہ وہ محسوس نہ کر سکا کہ وہ ایسا بیان دے رہا ہے جو اُسی کے خلاف جائے گا۔



وہ بیان دے چکا تو دونوں تھانیداروں نے اُس پر جرح شروع کر دی، لیکن اس سے پہلے تجمّل اور منوّر نے ایسی ایکٹنگ کی کہ تھانیدار چُپ ہو گئے۔

"شاہ صاحب!" — تجمّل نے کہا — "اس شخص نے میرے چھوٹے بھائی کی بیوی کے متعلق جو باتیں کی ہیں، یہ میں نے صرف آپ دو تھانیدار صاحبان کی عزت رکھنے کے لئے برداشت کی ہیں ورنہ یہاں سے اس کی لاش اُٹھتی۔"

منوّر تو اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اس شخص کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ دونوں تھانیداروں نے بیچ بچاؤ کرایا۔

"یہ پکا بے غیرت شخص معلوم ہوتا ہے" — منوّر نے بڑے غصے سے کہا — "اِسے معلوم ہی نہیں کہ عزت کیا چیز ہوتی ہے۔ یہ مجھ جیسے عزت دار آدمی پر الزام لگاتا ہے کہ میں نے اس کے گھر جا کر اسے اور اس کی بہن کو اغوا کیا ہے۔ ایسی وارداتیں کمین ذات کے لوگ کرتے ہیں۔"

دونوں بھائیوں نے کچھ نہ کچھ بولنا اور غصہ جھاڑنا شروع کر دیا۔ تھانیداروں نے بڑی مشکل سے ان پر قابو پایا۔

"چلو، تم مجھے بتا دو" — سب انسپکٹر انور علی سیّد نے تجمّل اور منوّر سے کہا — "پہلے تم ہی بتا دو کہ یہ عذرا کا معاملہ کیا ہے۔"

"معاملہ بڑا صاف ہے شاہ صاحب!" — منوّر نے کہا — "یہ جس لڑکی کا نام لے رہا ہے، اس کے ساتھ میری اتفاقیہ ملاقات ہوگئی تھی۔ دوسری ملاقات ہوئی تو میرے کہنے پر وہ میرے ساتھ شادی پر آمادہ ہوگئی۔ وہ بالغ لڑکی تھی۔ ایک رات گھر سے نکل آئی۔ میں دو گھوڑیاں لے کر باہر کھڑا تھا۔ اسے یہاں لے آیا اور باقاعدہ طور پر شادی کر لی۔ کچھ دن ہوتے وہ کوٹھے پر چڑھی، منڈیر سے اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ گر پڑی۔ اُس کے سر پر ایسی چوٹ آئی کہ وہ مرگئی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ وہ رات کے وقت کوٹھے پر چڑھنے کی وجہ یہ تھی کہ اُسے کبھی کبھی نیند میں اُٹھ کر چلنے کا دورہ پڑتا تھا.... اب یہ شخص معلوم نہیں کس نیت سے کہہ رہا ہے کہ ہم نے اس پر قتل کا الزام لگایا ہے .... جناب شاہ صاحب! اگر ایسی بات ہوتی تو ہم اس شخص کے خاندان کے بچے بچے کو قتل کروا دیتے۔"

"ایوب خان!" — سب انسپکٹر راجہ شیر خان نے اُسے کہا — "پہلی بات تو یہ بتاؤ کہ سکندر معزز ملزم ہے اور تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ تمہیں آدھی رات کے وقت ملنے کے لئے گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہارا دوست ہے۔ اگر نہیں تو تم نے اس کے جانے کے فوراً بعد تھانے میں رپورٹ کیوں نہیں کی؟ .... تم سابق تھانیدار ہو۔ وہ جب تمہارے گھر سے نکلا تھا تو تم باہر جا کر چھپ چھپ کر دیکھتے کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ تم تھانے اطلاع دیتے تو پولیس بھی گھوڑوں پر سوار ہو کر اُسے پکڑ لیتی۔"

"آپ سکندر کو نہیں جانتے راجہ صاحب!" — ایوب نے کہا — "وہ بڑا زبردست آدمی ہے۔ جو آدمی چلتی ریل گاڑی سے پولیس گارد کو بیہوش کر کے نکل گیا تھا، وہ معمولی آدمی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کر وہ آسانی سے گرفتار ہونے والا آدمی نہیں۔ وہ گرفتار کرنے والا آدمی ہے۔ سروس میں اُس نے بڑے خطرناک دہشت گردوں کو اس طرح پکڑوا یا تھا جیسے اُس کے ہاتھ میں کوئی جادو ہو۔ میں اُس کے ہاتھ سے قتل ہونا نہیں چاہتا تھا۔"

"اب یہ بتاؤ" — سب انسپکٹر انور علی نے اُس سے پوچھا — "تم نے یہ ڈرامہ کس طرح سوچ لیا ہے کہ انہوں نے تم پر قتل کا الزام لگایا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ لڑکی کوٹھے سے گر کر مری ہے اور یہ کہہ رہے ہیں کہ یہاں کے کسی بھی آدمی سے پوچھ لیں۔"

"ہاں جی!" — تجمل نے کہا — "ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ دونوں صاحبان ہمارے گھر جا کر، پھر ہمارے رشتہ داروں کے ہاں جا کر، پھر علاقے کے کسی بھی گھر جا کر پوچھیں کہ میرے بھائی کی بیوی کس طرح فوت ہوئی تھی۔"

"ایوب خان!" — سب انسپکٹر انور علی سید نے کہا — "تمہارا یہ الزام بھی بہت ڈھیلا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اس کمرے میں بند کیا گیا تھا اور اب کہتے ہو کہ یہ کمرہ اب اُس طرح نہیں رہا جس طرح تمہاری موجودگی میں تھا۔ یہ دونوں بھائی اپنی گھوڑی کی چوری کی رپورٹ لکھوانے تھانے چلے گئے تھے۔ اس مکان میں کوئی آدمی بھی نہیں تھا تو اتنی جلدی اس مکان میں سے شہادت کس نے غائب کر دی؟"

"ہاں شاہ صاحب!" — تجمل نے اس طرح تڑپ کر کہا جیسے اُسے اچانک یہ بات یاد آگئی ہو — "ایک بات یاد آگئی ہے۔ میں اپنے ایک مزارعہ کو بلاتا ہوں۔ آپ کے آنے سے پہلے میرے اس مزارعہ نے کہا تھا کہ ایک آدمی نے یہ گھوڑی دیکھی تھی اور وہ کہتا تھا کہ مالکوں سے کہو کہ یہ گھوڑی مجھے دے دیں، میں پوری قیمت دوں گا .... میں اُسے بلاتا ہوں۔ وہ ایوب کو دیکھے کہیں ایسا تو نہیں کہ گھوڑی کو پسند کرنے والا آدمی یہی ہو؟ ...."

میں نہیں بیٹھا رہوں گا تاکہ کسی کو یہ شک نہ ہو کہ میں اس آدمی کو بلانے گیا اور راستے میں اُسے کہہ دیا کہ تم یہ بیان دینا۔"

ہم نے یہ انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا کہ ایک آدمی کو تیار کیا تھا کہ کسی موقع پر اُسے بلایا جائے گا اور ایوب کو دیکھ کر وہ کہے گا کہ اس آدمی نے گھوڑی دیکھی تھی۔ تجمل کو یہ شخص اچانک یاد نہیں آیا تھا بلکہ وہ موقع دیکھ رہا تھا کہ اس آدمی کا ذکر کرے۔ اُس نے نہایت عقلمندی سے یہ ایکٹنگ کی جیسے اُسے یہ آدمی اچانک یاد آگیا ہو۔ تھانیداروں کے کہنے پر اُس نے ایک نوکر کو بلایا اور اُسے کہا کہ فلاں آدمی کو بلا لائے۔

تھوڑی دیر بعد وہ آدمی آگیا۔

"کیوں بھائی!" — تجمل نے کہا — "جب میں اور منور گھوڑی کی چوری کی رپورٹ لکھوانے تھانے چلے گئے تھے تو تم نے ہمیں کیا کہا تھا؟"

یہ نوکر بڑی غور سے ایوب کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ایوب کے اور قریب ہو گیا اور اُسے اور اچھی طرح دیکھنے لگا۔

"چوہدری صاحب!" — اُس نے ایوب کی طرف اشارہ کر کے کہا — "وہ تو یہ آدمی تھا۔"

"میرے ساتھ بات کرو" — سب انسپکٹر انور علی سید نے اُسے کہا — "اس نے کیا کہا تھا؟"



اس آدمی نے وہ سارا بیان دے دیا جو میں نے بڑی محنت سے اسے یاد کرایا تھا۔ بیان یہ تھا کہ یہ نوکر گھوڑی کو ٹہلانے کے لئے باہر لے جایا کرتا تھا۔ ایک روز ایک آدمی اسے ملا اور گھوڑی کو بڑی غور سے دیکھ کر کہنے لگا کہ مالکوں سے کہو کہ اس گھوڑی کے جتنے پیسے مانگتے ہیں، میں دے دوں گا۔ یہ آدمی ایوب تھا۔ نوکر نے ایوب سے کہا کہ اس کے مالک ایسی ایک درجن گھوڑیاں خرید سکتے ہیں۔ وہ گھوڑی بیچیں گے نہیں۔ دو روز کے بعد وہ گھوڑی کو ٹہلانے کے لئے لے گیا تو ایوب پھر اُسے ملا اور پھر یہی بات کہی۔ نوکر نے

ایوب کو صرف یہ کہا کہ اُسے یہ گھوڑی نہیں مل سکتی۔ ایوب نے کہا کہ ایسی بات ہے تو گھوڑی کو سنبھال کر رکھنا۔ تیسری رات گھوڑی چوری ہو گئی۔

"یہ آدمی شہر کا رہنے والا ہے" — سب انسپکٹر انور علی سیّد نے نوکر سے کہا — "اس کا اس دیہاتی علاقے میں کیا کام؛ تم جھوٹ تو نہیں بول رہے؟"

"جنابِ عالی!" — نوکر نے بڑی پختہ آواز میں وہ بات بھی کہہ دی جو اُسے میں لے بڑھاتی تھی۔ اُس نے کہا — "اس علاقے کے دو بہت بڑے بدمعاش ہیں۔ میں اُن کے نام اور گاؤں نہیں جانتا۔ انہیں چہروں سے پہچانتا ہوں۔ یہ شخص اُن کے پاس آتا رہتا ہے اور میں نے اسے اُن کے ساتھ جاتے بھی دیکھا ہے۔"

ایوب نے اُچھلنا شروع کر دیا۔ وہ چیخنے چلانے لگا کہ یہ اس پر جھوٹا الزام لگایا جا رہا ہے لیکن نوکر بڑا پکا آدمی تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ایوب خود مانا ہُوا بدمعاش تھا اور تجمل اور منور کا خاص آدمی تھا۔

"مت چیخو ایوب خان!" — سب انسپکٹر انور علی سیّد نے کہا — "کوئی عقل کی بات کرو۔ تم جو کچھ ہو وہ میں جانتا ہوں۔ اب بھی سوچ لو۔ اپنے مُنہ سے کہہ دو کہ تم نے جھوٹ بولا ہے۔ اگر میں نے چھاپا مارا اور یہاں کی تلاشی لی اور کچھ بھی برآمد نہ ہُوا تو تم خود تھانیدار رہے ہو، اچھی طرح جانتے ہو کہ جھوٹی رپورٹ دے کر دوسروں کو خراب کروانے پر کون سی دفعہ لگتی ہے اور اس کی سزا کیا ہے۔ گھوڑی کی چوری کی سزا سے تو تم پھر بھی نہیں بچ سکو گے۔"

ایوب کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ کچھ کہنے لگا تھا کہ اُس کے ہونٹ کانپے، پھر اس نے ہچکی سی لی اور کچھ کہہ نہ سکا۔

"تم نے بہت بڑے پہاڑ سے ٹکر لی ہے ایوب!" — سب انسپکٹر راجہ شیر خان نے کہا — "پہلے سوچ لینا تھا کہ تم کن لوگوں سے ٹکر لے رہے ہو.... تمہاری قسمت!"

میں آپ کو وہ باتیں سُنا رہا ہوں جو مجھے بعد میں بتائی گئی تھیں۔ جتنے دن پولیس وہاں رہی تھی اتنے دن اُدھر سے کوئی بھی اس مکان میں نہیں آتا تھا جس میں مجھے اور ایوب کی بہن سائرہ کو چھپا کر رکھا گیا تھا۔ میں ہر لمحہ چوکس اور چوکنا رہتا تھا۔ میں چونکہ پولیس میں رہ چکا تھا اس لئے میں وہاں کے ہر آدمی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ہر آہٹ کو پولیس کی یا پولیس کے کسی مُخبر کی آہٹ سمجھتا تھا۔ تجمل اور منور شاید اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ان کی اتنی وسیع و عریض جاگیر پر جتنے لوگ کام کرتے ہیں وہ ان کے زرخرید غلام ہیں۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ انہی مزارعوں اور نوکروں چاکروں میں پولیس کے ایک دو مُخبر ضرور ہوں گے۔

میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ میں جس گھر میں رہ رہا تھا اس گھر کے افراد مکمل طور پر وفادار اور قابلِ اعتماد تھے۔ دو ہی تو آدمی تھے اور دو لڑکے بھاتی تھے۔ ایک شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی اپنے ماں باپ کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ اس آدمی کو کہہ دیا گیا تھا کہ ابھی وہ اپنی بیوی کو واپس نہ لائے۔

خطرہ ایک ہی تھا جسے میں ایوب کے گھر سے اُٹھا لایا تھا۔ یہ اُس کی بہن تھی۔ اغوا کی ہوئی عورت کو چھپا کر رکھنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اغوا کر لانا تو اتنا مشکل نہیں ہوتا۔ اغوا کر کے اُس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ چُپ چاپ بیٹھی رہے، خواب دیکھنے کے برابر ہوتا ہے لیکن سائرہ نے مجھ پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ میرے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں کرے گی۔ البتہ ایک اور لحاظ سے وہ میرے لئے خطرہ بن گئی تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ بھاگنے اور مجھے پھنسانے کی کوشش کرتی، اُس نے نہ بھاگنے کا ارادہ کر کے مجھے اپنا قیدی بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ اُس نے میرے لئے ایک اور مشکل پیدا کر دی تھی۔

وہ ایسی کوشش نہ کرتی تو بھی اُس کا بڑا پیارا اور پُر اسرار سا آسیب میرے اُوپر طاری ہو چکا تھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ وہ مجھ پر غالب آگئی تھی یا میں نے اُسے اپنے آپ پر غالب کر لیا تھا۔ مجھے اُس پر اتنا بھروسہ تھا کہ مجھ پر کوئی مصیبت آجاتی تو وہ میری خاطر اپنی جان پر کھیل جاتی۔ اُس میں اخلاقی جسارت تھی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ میرے ساتھ جسمانی تعلق رکھنے کی خواہشمند نہیں تھی۔ میں نے آپ کو پہلے سنایا ہے کہ اُس نے مجھے ایک بار چیلنج کیا تھا کہ میں اُس کے کپڑے اُتار کر تو دیکھوں۔ اُس وقت اُس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی تھی جس میں میرے لئے طنز نہیں بلکہ دھتکار تھی۔ میری مردانگی جواب دے گئی تھی۔ ایسی جرأت صرف اُس مرد یا عورت میں ہوتی ہے جس کے ذہن پر شیطان کا غلبہ نہیں ہوتا۔ پھر ایسے ہُوا کہ وہ میری ذات میں جذب ہونے لگی اور ایک بار تو اُس نے یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے جان سے مار کر باہر پھینک دو، میں خود تو یہاں سے نہیں جاؤں گی۔

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ میں انسان تھا، جوان تھا، تندرست و توانا تھا۔ سائرہ کو دیکھ کر اور اُسے اپنے اتنا زیادہ قریب پا کر میں نے ایک تشنگی سی محسوس کرنی شروع کر دی تھی۔ یوں بھی ہُوا کہ رات کو دِیئے کی ناچتی، تھرکتی پیلی روشنی میں سائرہ کو سوتے ہوئے دیکھا تو میں تپتے ہوئے صحرا میں جاتے ہُوئے اُس مسافر کی حالت کو سمجھ گیا جو بھٹک گیا ہو اور پانی کی ایک بوند کا بھی دُور دُور تک پتہ نہ ہو۔

پیاسے حلق میں کانٹے چُبھتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ میں اپنی روح میں چُبھن محسوس کرنے لگا تھا۔

سائرہ نے میری ذات میں اس احساس کو بیدار کر دیا تھا کہ میں ایک عورت کی رفاقت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔

عورت ماں بھی ہوتی ہے، بہن بھی اور بیٹی بھی اور عورت رفیقۂ حیات بھی ہوتی ہے۔

سائرہ کو میں دیکھتا تھا تو مجھے اُس کے چہرے میں اور اُس کے سراپا

میں عورت کے سارے ہی روپ نظر آجاتے تھے — اور یہ میرے لئے بہت بڑی مشکل پیدا ہو گئی تھی۔

میں بھٹک گیا ہوں۔ میں بات کچھ اور سنا رہا تھا اور یادوں کے جھکڑ مجھے کسی اور طرف لے گئے ہیں۔ آج سائرہ اس بڑھاپے میں جب کہ میرے ہاتھ بھی کانپتے ہیں، سَر بھی ہلتا ہے، یاد آتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے میں پھر سے جوان ہو گیا ہوں۔

اپنے آپ پر بڑی مشکل سے قابو پایا ہے۔ یادوں کے اتنے حسین جال سے بڑی مشکل سے نکلا ہوں اور آپ کو سناتا ہوں کہ پھر کیا ہُوا۔



میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ جو باتیں مجھے بعد میں معلوم ہُوتی تھیں وہ میں پہلے ہی سُنا دیتا ہوں تاکہ کہانی کا تسلسل قائم رہے۔

دونوں تھانیدار، سب انسپکٹر انور علی سید اور انسپکٹر راجہ شیر خان نے اس واردات کا سارا وزن ایوب پر ڈال دیا اور اُس نے جو جائز اور بالکل سچے الزام ہم پر عائد کئے تھے وہ واپس اُسی کے مُنہ پر جا لگے اور اُس کا رنگ روپ ہی اُڑ گیا لیکن ایوب سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ ہتھیار ڈال دے گا۔ وہ صرف تھانیدار ہی نہیں رہ چکا تھا بلکہ بڑا کائیاں اور بدمعاش قسم کا تھانیدار تھا۔ اُس کے شہر کا تھانیدار سب انسپکٹر انور علی سید عقل والا افسر تھا۔ اُس نے بھی محسوس کر لیا ہو گا کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے گول نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے آپ کو پہلے سنایا ہے کہ انور علی سید نے ایوب، تجمّل اور منوّر کو اکٹھے بٹھا لیا تھا اور یہ باتیں اس میٹنگ میں ہو رہی تھیں۔ انور علی سید تجمّل کو وہاں سے اُٹھا کر باہر لے گیا۔

"تجمّل بھائی!" — اُس نے کہا — "اس پر خوش نہ ہونا کہ ایوب ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ یہ نہ بھولنا کہ یہ شخص کسی اور قسم کا تھانیدار رہ چکا ہے اور اسے ذرا سا بھی موقع مل گیا تو یہ ہم سب کو نچا دے گا۔ میں پوری طرح مان نہیں رہا کہ ایوب نے ناٹک کھیلا ہے۔ اگر اس نے ایسا کرنا ہوتا تو کوئی اور طریقہ اختیار کر سکتا

تھا۔ ناٹک کھیلنے کے لئے شہر سے اتنی دُور یہاں آنا، اندر باندھی ہوئی گھوڑی کھول کر لے جانا اور چوری کی گھوڑی لئے ہوئے تھانے میں پہنچ جانا ناٹک نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ یہ بھی سوچو کہ مفرور سب انسپکٹر سکندر جو ملک کے ایک اور صوبے کا مفرور ہے یہاں اتنی دُور کیسے آ سکتا ہے۔ یہ تو ایوب بھی سوچ سکتا تھا کہ اتنی دُور کے مفرور کا نام لوں گا تو پولیس یقین نہیں کرے گی۔ اُس نے سکندر کو یہاں کہیں دیکھا ہے یا اس کے کسی دوست نے دیکھا ہے ورنہ یہ ایسا جھوٹ نہ بولتا جو ناقابلِ یقین ہوتا۔ اس نے تو یہ بھی کہا ہے کہ سکندر اس کے گھر آیا تھا۔"

"جنابِ شاہ صاحب!" — تجمل نے کہا — "میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ ہمارے گھر کی اور جس جس جگہ آپ چاہتے ہیں، اس جگہ کی تلاشی لیں۔ ہم نے سکندر کو جیب میں تو نہیں رکھا نہ ہم نے اُسے کسی ٹرنک یا سوٹ کیس میں رکھا ہُوا ہے لیکن میں آپ کو ایک بار پھر بتا دیتا ہوں کہ تلاشی میں کچھ برآمد نہ ہُوا تو......"

"چوہدری تجمل!" — سب انسپکٹر انور علی سیّد نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "ذرا ہوش میں آؤ۔ تم جو کچھ کہہ چکے ہو وہ میں نے سن لیا تھا اور میں نے جو کچھ کہا تھا وہ تمہیں یاد ہونا چاہیئے۔ یہ معاملہ معمولی سی واردات کا نہیں یہ ایسے مفرور ملزم کی گرفتاری کا معاملہ ہے جس کے لئے دس ہزار روپیہ انعام مقرر ہے۔ اس سے اندازہ کرو کہ انگریز اس کی گرفتاری کو کتنا ضروری سمجھتے ہیں۔ میں چھوٹی موٹی وارداتیں گول کر سکتا ہوں۔ یہ معاملہ میرے بس سے باہر ہے۔ کل تک پولیس کپتان بھی یہاں آ سکتا ہے۔ تلاشی تو میں نے ہر حال میں لینی ہے خواہ یہ رسمی ہی ہو۔ اگر میں یہ کارروائی نہیں کروں گا یعنی خانہ تلاشی نہیں لوں گا تو ایوب مجھے پھنسا سکتا ہے اور تمہارے علاقے کا یہ تھانیدار بھی افسروں کے کہنے پر یہی بیان دے گا کہ خانہ تلاشی نہیں ہوئی تھی۔ تمہارا بار بار یہ کہنا کہ کچھ برآمد نہ ہُوا تو تم میرے خلاف چارہ جوئی کرو گے یہ تمہارا وہم ہے۔ مفرور ملزم کو پکڑنے کے لئے پولیس کسی بھی وقت کہیں بھی بغیر وارنٹ کے چھاپہ مار سکتی ہے اور پولیس

کی اس کارروائی کے خلاف کسی کی شنوائی نہیں ہو سکتی...... اور یہ بھی خیال رکھو کہ میں تمہارے بڑے بھائی انسپکٹر فضل حسین صاحب کا بھی خیال کر رہا ہوں۔ ان کے ساتھ میری سلام دعا نہ ہوتی تو بھی ہم پولیس والے ایک دوسرے کا بہت خیال کرتے ہیں۔ میں تمہیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے راستے میں آنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں خود ہی تمہیں بچانے کے لئے ایوب کو چکر دے رہا ہوں۔ تم نے اگر ٹانگ اڑائی تو میں صحیح قسم کا تھانیدار بن کر دکھا دوں گا۔"

تجمل نے اچھا کیا کہ خاموش رہا۔ انور علی سیّد نے ٹھیک کہا تھا کہ پولیس کسی بھی مفرور ملزم کو پکڑنے کے لئے چھاپہ مار سکتی ہے اور ضروری نہیں کہ کچھ برآمد بھی ہو۔



میں جن دو بھائیوں کے گھر میں چھپا ہُوا تھا، ان میں سے ایک وہاں گیا ہُوا تھا جہاں پولیس نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ وہ دیکھنے گیا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ سورج غروب ہو چکا تھا جب وہ واپس آیا اور اُس نے مجھے بتایا کہ پولیس نے چوہدریوں کی حویلی کی خانہ تلاشی شروع کر دی ہے۔ منوّر نے موقع نکال کر اس آدمی کی زبانی مجھے یہ پیغام بھیجا تھا کہ پولیس تلاشی لے رہی ہے اور میں ہوشیار رہوں۔

مجھے یہ فائدہ حاصل ہو گیا تھا کہ رات آ گئی تھی۔ میں نے ان دونوں بھائیوں میں سے ایک کو گھر سے باہر یہ سمجھا کر بھیج دیا کہ دُور سے اُسے پولیس آتی نظر آئے تو وہ چھپتا ہُوا واپس آ کر مجھے بتائے۔ چاندنی صاف تھی۔ دُور سے آتا آدمی نظر آ سکتا تھا یا آنے والوں کی آوازیں سنائی دے سکتی تھیں۔

میں نے سائرہ سے کہا کہ وہ بھاگنے کے لئے تیار رہے۔

"بالکل تیار ہوں" — اُس نے کہا۔

"یہ سوچ لو سائرہ!" — میں نے کہا — "ایسا نہ ہو کہ پولیس کے آنے کی اطلاع ملے تو تم پولیس کی طرف اُٹھ دوڑو اور کہو کہ وہ جا رہا ہے سکندر!"

سائرہ آہستہ آہستہ میرے قریب آئی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرا

چہرہ تھام لیا اور چہرہ اوپر کر کے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس کی آنکھوں کے تاثرات کو میں اس طرح بیان کروں گا کہ اُس کی آنکھوں میں وہ محبت تھی جسے موت بھی فنا نہیں کر سکتی۔ اُس نے زبان سے کچھ بھی نہ کہا اور میں اس کی نظروں کا پیغام سمجھ گیا۔ میری ہنسی نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی میں نے محسوس

کیا کہ میری یہ بے اختیار ہنسی ایک نادان سے بچے کی ہنسی ہے جس کا کوئی مطلب نہیں ہوتا ....سائرہ ایک نشہ بن کر مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔

مجھے اچانک خیال آیا کہ یہ دھوکا بھی ہو سکتا ہے اور یہ لڑکی مجھ پر اپنے حسن کا جادو طاری کر کے مجھے پکڑوا بھی سکتی ہے۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ اس لڑکی نے اگر میرے ساتھ دھوکا کیا اور میں نے ضرورت سمجھی کہ اسے ختم کر دوں تو میں ایسا نہیں کر سکوں گا۔

انسان جب بھی مجبور ہوتا ہے، اپنے آپ سے ہی مجبور ہوتا ہے۔ دوسروں کی پیدا کی ہوئی مجبوریوں اور مشکلات پر انسان ہمت کرے تو قابو پا سکتا ہے۔ اپنا سب سے بڑا دشمن انسان خود ہی ہوتا ہے۔ میرے سامنے یہی مسئلہ آن کھڑا ہوا تھا۔

اس آدمی کو آگے بھیج کر میں بھی چھت پر جا کر بیٹھ گیا اور میں اس طرح بیٹھا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ سکے۔ سائرہ سے میں نے کہا تھا کہ وہ صحن میں رہے، لیکن کچھ دیر بعد وہ اوپر میرے پاس آگئی اور کہنے لگی کہ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔

باقی رات چھت پر بیٹھے اور اونگھتے گزر گئی۔ سائرہ زیادہ دیر تک نہ جاگ سکی۔ اُس نے میرے زانو پر سر رکھ لیا تھا اور کچے فرش پر لیٹ گئی اور گہری نیند سو گئی تھی۔ اُس کی اس قسم کی حرکتیں اور وارفتگی مجھے یقین دلاتی تھی کہ مجھے دھوکا نہیں دے گی پھر بھی میرے لئے ضروری تھا کہ چوکس رہوں۔



اس کے بعد مجھے جو خبریں ملیں اور وقتاً فوقتاً جو کچھ ہوتا رہا وہ میں آپ کو پہلے ہی سُنا دیتا ہوں۔

سب انسپکٹر انور علی سید نے سب انسپکٹر راجہ شیر خان کو ساتھ لے کر بڑی حویلی، اس سے ملحقہ مکانوں اور اُن مکانوں کی بھی تلاشی لی جہاں رات کو مویشی باندھے جاتے تھے اور بھوسہ، چارہ اور کھیتی باڑی کا سامان رکھا جاتا تھا۔ انور علی سید اُس مکان تک بھی گیا جہاں پہلے مجھے چھپایا گیا تھا اور جہاں میں نے سائرہ کو اپنے ساتھ رکھا تھا۔ اُس مکان کے باہر تالا لگا ہُوا تھا۔ اُس نے تالا کھلوایا اور سارے مکان میں گھوم پھر کر دیکھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اُس کمرے میں اُس نے زیادہ دیر لگائی جس میں مَیں اور سائرہ رہ چکے تھے۔ اس مکان سے باہر آکر وہ تجمل اور منوّر کو الگ لے گیا۔

"دونوں چوہدری غور سے میری بات سنو" — انور علی سید نے تجمل اور منوّر سے کہا — "تم نے شاید سوچا بھی ہو کہ میں اس مکان تک کیسے پہنچ گیا ہوں۔ تمہاری حویلی سے یہ مکان دُور ہے اور یہ اس گاؤں میں ہے۔ میں نے تم میں سے کسی سے نہیں پوچھا کہ یہ مکان تمہارا ہے۔ میں سیدھا اس مکان میں آیا ہوں۔ اس سے تمہیں معلوم ہو جانا چاہیئے کہ تمہاری اتنی لمبی چوڑی زمین کے نیچے کوئی آدمی ہے جو مجھے راستہ دکھا رہا ہے۔ میں ایک بار پھر تمہیں کہتا ہوں کہ مفرور ملزم کو میرے حوالے کر دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک خطرناک مفرور ملزم کو پناہ دینے کے جرم کے ساتھ ساتھ تم پر اغوا، حبسِ بیجا اور آبروریزی کے مقدمے بھی بن جائیں"۔

"مَیں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ آپ کا کوئی مخبر یہاں نہیں ہے" — تجمل نے کہا — "لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ کوئی مفرور ملزم یہاں نہیں ہے۔ اگر آپ کا شک رفع نہیں ہوتا تو آپ اپنے اُسی مُخبر سے راستے پوچھتے رہیں جو ہماری زمینوں کے نیچے سے آپ کی رہنمائی کر رہا ہے"۔

"تمہاری مرضی" — سب انسپکٹر انور علی سید نے کہا۔

میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ اس جاگیر میں پولیس کے ایک دو مُخبر ضرور ہوتے ہوں گے۔ جب میں نے یہ سُنا کہ یہ سب انسپکٹر وہاں تک پہنچ گیا تھا تو میں حیران تو بالکل نہ ہُوا، پریشان ضرور ہُوا کہ وہ جگہ تو ڈھکی چھُپی تھی اور

یہ شخص وہاں بھی پہنچ گیا تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ یہ مخبر اُس کے نہیں تھے کیونکہ وہ شہر کے تھانے کا ایس ایچ او تھا اور یہ علاقہ اُس کے تھانے کے علاقے سے دو تھانے دُور تھا۔ یہ مُخبر سب انسپکٹر راجہ شیر خان کے تھے۔

میرے لئے اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں اور زیادہ احتیاط کروں۔ رات کو یہ خانہ تلاشی ہوئی تھی۔ صبح انور علی سیّد راجہ شیر خان کے تھانے میں چلا گیا۔ وہ ایوب، تحمل اور منوّر کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ اُس نے تحمل سے کہا تھا کہ وہ گھوڑی رکھ لے۔ تحمل نے گھوڑی رکھنے سے انکار کر دیا اور کہا تھا کہ یہ گھوڑی چوری ہوئی ہے اور ملزم پولیس کے پاس ہے اور اُس نے اقبال جرم بھی کر لیا ہے کہ گھوڑی یہاں سے کھول کر لے گیا تھا۔

اگر آپ میری گزری ہوئی زندگی پر نظر ڈالیں اور وہ واقعات یاد کریں جو میں سُنا چکا ہوں تو آپ کو یاد آجائے گا کہ میں ایسے انتہائی دشوار حالات میں سے بھی گزرا ہوں جہاں کوئی عام آدمی شاید زندہ بھی نہ رہ سکے۔ میں جنگلوں میں سے تن تنہا رات کے وقت بھوکا پیاسا گزرا۔ سیلاب میں تیرتا دُور تک نکل گیا، لیکن اب جب کہ میں ایک مکان میں چھپا ہوا تھا، میرے ارد گرد دیواریں اور اُوپر چھت تھی اور میرے میزبانوں نے میری حفاظت کا انتظام بھی کر رکھا تھا، میں اتنا زیادہ بے چین اور پریشان تھا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہُوا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ میں کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ کبھی یہ افسوس بھی ہوتا تھا کہ میں اس معزز خاندان کے لئے مصیبت اور بے عزتی کا باعث بن گیا ہوں۔ میں ان کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی ذریعہ اور کوئی طریقہ سُوجھتا نہیں تھا۔ میں اب اس انتظار میں تھا کہ تحمل اور منوّر کا بڑا بھائی انسپکٹر فضل حسین آجائے۔ اُسے تار دیا جا چکا تھا۔



مجھے اطلاع ملی کہ انسپکٹر فضل حسین آگیا ہے۔ وہ اپنے گھر آیا تھا۔ اُسے

پتہ چلا کہ سب لوگ تھانے گئے ہیں تو وہ تھانے جا پہنچا۔ وہاں اُس کی دونوں تھانیداروں کے ساتھ جو باتیں ہوئیں وہ مجھے پوری تفصیل سے بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ وہ تو بہت ہی لمبی چوڑی باتیں تھیں۔ میں آپ کو آپ کی دلچسپی کی اور اپنی آپ بیتی کی ضرورت کی باتیں سُنا دیتا ہوں۔

انسپکٹر فضل حسین تھانے میں جاتے ہی دونوں تھانیداروں پر برس پڑا اور اُس نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔

"آپ کو کس طرح اطلاع ملی ہے؟" — انور علی سیّد نے فضل حسین سے پوچھا۔

"انہوں نے مجھے تار دیا تھا" — انسپکٹر فضل حسین نے جواب دیا — "مجھے یہ تو معلوم ہی نہیں کہ ہُوا کیا ہے۔ یہاں آکر پتہ چلا ہے کہ میرے گھر کی اور میرے نوکروں کے گھروں کی خانہ تلاشی ہوئی ہے .... اب بتاؤ کیا بات ہے" — اُس نے ایوب کی طرف دیکھا اور حیران سا ہو کے پوچھا — "آپ سب انسپکٹر ایوب تو نہیں؟ .... ہماری ملاقات کہیں ہوئی تھی؟"

"ایک دفعہ نہیں ہماری ملاقات چار یا پانچ دفعہ ہو چکی ہے" — ایوب نے کہا — "ایک دو بار ہم ڈسٹرکٹ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ملے تھے اور دو یا تین بار سیشن کورٹ میں ملاقات ہوئی تھی۔"

"اچھا اچھا" — انسپکٹر فضل حسین نے کہا — "آپ وہ ایوب تو نہیں جسے دو سال سزا ہوئی تھی؟"

"یہ وہی ہے" — سب انسپکٹر انور علی سیّد نے کہا۔

"یہاں کیا کر رہا ہے؟" — فضل حسین نے پوچھا۔

"اسی سے تو سارا فساد شروع ہُوا تھا" — سب انسپکٹر راجہ شیر خان بولا — "آپ ذرا بیٹھیں تو سہی۔ طبیعت کو ذرا ٹھنڈا کریں۔ ہم آپ کو سارا واقعہ سناتے ہیں۔"

"خدا کی قسم، فضل حسین صاحب!" — انور علی سیّد نے کہا — "مجھے ہر وقت آپ کا خیال اور لحاظ رہا ورنہ میں دونوں تھانوں کی نفری سے

یہاں چھاپہ مارتا۔ میں نے خانہ تلاشی بھی رات کے وقت کی ۔۔۔ اب آپ پورا وقوعہ سُنیں۔"

"میرے دونوں بھائی یہاں تھانے میں ہیں" ——— فضل حسین نے کہا ——— "مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ میرا ذہن بالکل خالی ہے۔ میں آپ دونوں تھانیداروں سے صرف یہ امید رکھوں گا کہ مجھے صحیح بات بتائیں۔"

انور علی سید نے اُسے تمام تر واقعہ سُنا دیا۔ یہ واقعہ سنانے سے پہلے اُس نے ایوب، تجمل اور منوّر کو اپنے دفتر سے باہر بھیج دیا تھا۔

"فضل حسین صاحب!" ——— انور علی سید نے سارا واقعہ سُنا کر کہا ——— "آپ مجھ سے سینئر ہی نہیں بلکہ میں نے دل میں آپ کو بڑے بھائی کا درجہ دے رکھا ہے۔ مجھے اور راجہ شیر خان کو پوری طرح احساس ہے کہ آپ ایک تو پولیس کے انسپکٹر ہیں اور دوسرے یہ کہ آپ معزز آدمی اور اس علاقے پر رعب داب رکھنے والے خاندان کے سربراہ ہیں اور جس شخص نے آپ سے ٹکر لی ہے یہ بڑے بُرے اخلاق کا سزا یافتہ آدمی ہے۔"

"لیکن آپ یہ سوچیں کہ سکندر کا میرے ساتھ یا میرے خاندان کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے" ——— انسپکٹر فضل حسین نے کہا ——— "میں تو خود اُسے ڈھونڈ رہا ہوں ۔۔۔۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں دس ہزار روپے کے لالچ میں اُسے پکڑنا چاہتا ہوں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اس مفرور نے مجھے چیلنج کیا تھا۔ وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور اُس نے پیغام بھیجا تھا کہ میں تمہیں دُور سے گولی نہیں ماروں گا، اُٹھا کر لے آؤں گا۔ میں نے اس کے جواب میں یہ پیغام اُسے بھیجا تھا کہ میں بھی تمہیں گولی نہیں ماروں گا، زندہ گرفتار کروں گا۔"

ان تھانیداروں کے درمیان وہی دلیل بازی ہوئی جو تجمل اور منوّر میری ہدایات کے مطابق کر چکے تھے۔ وہی باتیں ان سب نے دہرائیں۔

"میں آپ لوگوں کے ساتھ زیادہ بحث نہیں کروں گا" ——— فضل حسین نے کہا ——— "میں پولیس ہیڈ کوارٹر میں جا رہا ہوں اور وہاں بات کروں گا۔ آپ دونوں اپنی کارروائی جاری رکھیں۔ میرے بھائیوں کو گرفتار کرنا ہے تو

کریں۔ ایوب کو رہزنی کے الزام سے بری کرنا ہے تو کر دیں۔ باقی رہا ایک مفرور ملزم کو پناہ دینے کا الزام تو اس کے متعلق آپ نے جو بھی کرنا ہے کریں۔ میں جانوں اور ایس پی صاحب جانیں۔"

فضل حسین باہر کو چل پڑا۔ دونوں تھانیداروں نے اُٹھ کر اُس کو پکڑ لیا۔ پولیس والوں میں آج بھی یہ دستور ہے کہ ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اُس وقت یہ بھائی چارہ اور زیادہ گہرا ہُوا کرتا تھا۔

"یوں ناراض ہو کر نہ جائیں" ——— سب انسپکٹر انور علی سید نے فضل حسین سے کہا اور کرسی پر بٹھا دیا۔ کہنے لگا ——— "اس ایوب بدمعاش کو تو میں نہیں چھوڑوں گا حالانکہ میں نے اسے مخبری کی خاطر دوست بنایا ہُوا ہے، لیکن بھائی فضل حسین صاحب! اس رپورٹ کا کیا کروں کہ سکندر آپ کی جاگیر میں موجود ہے۔ آپ تجربہ کار ہیں۔ مجھے کوئی راستہ دکھائیں۔ آپ جانتے ہیں کہ سکندر عام قسم کا ڈاکو نہیں۔ وہ بڑا خطرناک مفرور ہے اور ایک ڈی ایس پی کو قتل کر کے بھاگا ہے اور پولیس کی حراست سے بھی نکل گیا تھا۔ کیا ایس پی اور ڈی ایس پی میری یہ بات مان لیں گے کہ وہ یہاں نہیں ہے؟"

"آپ نے خانہ تلاشی لے لی ہے نا!"

"بھائی فضل حسین صاحب!" ——— انور علی سید نے کہا ——— "یہ خانہ تلاشی جو میں نے لی ہے بالکل رسمی تھی۔ میں نے ابھی ایک اور علاقہ تو دیکھا ہی نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ سکندر اگر یہاں ہے تو اسے برآمد نہ کرائیں، اتنا ہی کریں کہ اُسے نکال دیں اور جھوٹ مُوٹ اُسے کہہ دیں کہ فلاں گاؤں میں وہ فلاں آدمی کے پاس چلا جائے۔ ادھر ہمیں بتا دیں۔ میں اُسے راستے میں پکڑ لوں گا۔ اگر وہ یہ بیان دے گا کہ آپ کے بھائیوں نے اسے پناہ میں رکھا تھا تو میں اس کے اس بیان پر لکیر پھیر دوں گا۔"

"شاہ صاحب!" ——— انسپکٹر فضل حسین نے کہا ——— "میں آپ کے ذہن سے جو شک نکالنا چاہتا تھا وہ نہیں نکلا۔ یہ تو سوچو میرے بھائی! اتنی دُور کا مفرور میرے بھائیوں کے پاس کیسے آ گیا۔ آپ نے خود مجھے بتایا ہے

کہ میرے بھائی نہ ایوب کو جانتے ہیں نہ سکندر کو۔ اگر میرے چھوٹے بھائی نے شہر کی ایک ایسی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی جس کے متعلق بعد میں پتہ چلا کہ مفرور سکندر کی وہ خالہ زاد بہن ہے تو اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ میرے چھوٹے بھائی کی شادی سکندر نے کروائی تھی اور اس رشتے کی وجہ سے میرے بھائی نے سکندر کو پناہ میں رکھا تھا ... آپ خلاصے سینئر سب انسپکٹر ہیں۔ راجہ صاحب بھی اناڑی نہیں۔ خود ہی غور کریں اور آپ نے جس علاقے کی خانہ تلاشی نہیں لی اُس علاقے میں بھی چلے جائیں ... اور میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میں ایس پی صاحب سے آپ کی کوئی شکایت نہیں کروں گا بلکہ آپ کی تعریف کروں گا کہ آپ کو مشکوک سی رپورٹ ملی تو اس پر بھی آپ نے فوراً عمل کیا۔ میں آپ دونوں کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالوں گا۔"



"پولیس کپتان آرہا ہے" — باہر سے کسی کی پکار سنائی دی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل دوڑتا راجہ شیر خان کے دفتر میں داخل ہُوا اور بولا — "پولیس کپتان آرہا ہے۔"

انسپکٹر فضل حسین کی بات وہیں رہ گئی اور تینوں دوڑتے ہوئے باہر نکلے۔ آج ملک کے صدر کی کوئی اتنی پرواہ نہیں کرتا جتنا رُعب اُس زمانے میں ایک انگریز ڈی ایس پی یا ایس پی کا ہُوا کرتا تھا۔ پولیس کپتان ایک بڑا ہی خوفناک لفظ تھا۔ پولیس کپتان جس علاقے میں جاتا تھا وہاں تو یوں لگتا تھا جیسے مویشیوں پر بھی سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ یہ ڈی ایس پی تو بڑا ہی سخت اور فرعونوں کی نسل کا انگریز افسر تھا۔

تینوں تھانیداروں نے پہلے تو اُسے سیلوٹ کیا۔ میں اس منظر کا عینی شاہد تو نہیں، لیکن میں جانتا تھا کہ سیلوٹ کر کے تینوں کس طرح اس انگریز پولیس کپتان کے آگے جُھکے ہوں گے۔ پولیس کپتان اُن کے سیلوٹ اور درباری طرز کے استقبال کو نظر انداز کرتے ہوتے تھانے کے دفتر میں چلا گیا۔ تینوں اُس کے پیچھے پیچھے گئے۔ سب سے پہلے اُس نے انسپکٹر فضل حسین

کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون ہے۔ انور علی سیّد نے اُسے تفصیل سے جواب دیا اور یہ بھی بتایا کہ اس واردات کا تعلق اسی کے بھائیوں اور اسی کے گھر کے ساتھ ہے۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بھائیوں نے مفرور سب انسپکٹر سکندر کو پناہ دی ہے؟" — ڈی ایس پی نے انسپکٹر فضل حسین سے پوچھا۔

"صاحب بہادر!" — فضل حسین نے جواب دیا — "آپ ان دونوں سب انسپکٹروں سے کارگزاری کی رپورٹ لے لیں۔ مجھے یہاں موجود رہنے کی اجازت دے دیں تو میں موجود رہتا ہوں۔"

"آپ ادھر موجود رہیں" — ڈی ایس پی نے کہا پھر سب انسپکٹر انور علی سیّد سے مخاطب ہُوا — "رپورٹ دو۔"

انور علی سیّد نے پولیس کی زبان میں اور پولیس کے انداز سے پوری رپورٹ پیش کر دی۔ پھر اُس نے سب انسپکٹر راجہ شیر خان سے کہا کہ وہ اپنی رپورٹ پیش کرے۔

"اور تم دونوں کو چوری کی گھوڑی کے سوا کچھ نہیں ملا" — ڈی ایس پی نے کہا اور انسپکٹر فضل حسین کی طرف دیکھا۔

"صاحب بہادر!" — فضل حسین نے کہا — "اب مجھے بولنے کی اجازت دیں" — ڈی ایس پی نے سر ہلایا تو فضل حسین نے کہا — "میں اپنی تعریف خود نہیں کروں گا۔ میرے ڈی ایس پی صاحب اور ایس پی صاحب بہادر سے پوچھیں کہ میں کیسا پولیس انسپکٹر ہوں اور میں نے کیسے کیسے خطرناک ملزموں کو پکڑا ہے۔ مفرور سب انسپکٹر سکندر کے ساتھ میرا دوستانہ تعلق کس طرح ہو سکتا ہے بلکہ اُس کے ساتھ میری ذاتی دشمنی پیدا ہو گئی ہے۔"

"تمہارے بھائیوں کی اُس کے ساتھ دوستی ہو گی" — ڈی ایس پی نے کہا۔

"وہ تو سکندر کو جانتے ہی نہیں صاحب بہادر!" — فضل حسین نے کہا — "ایک بار سکندر میرے تھانے کے علاقے میں آ گیا تھا اور مجھے بالکل

صحیح رپورٹ مل گئی تھی کہ وہ کس جگہ ہے۔ میں نے اُسی وقت اس جگہ کو گھیرے میں لے کر چھاپہ مارا تھا۔ سکندر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک پہاڑی کے اُوپر تھا۔ ان کے پاس بندوقیں اور ریوالور تھے۔ میں اپنی نفری کے ساتھ نیچے تھا۔ میرے ساتھ تھانے کی جو نفری تھی وہ بہت تھوڑی تھی۔ میری پوزیشن ہر لحاظ سے کمزور تھی۔ سکندر نے اُوپر سے فائر بھی کیا اور مجھے للکارا بھی اور وہ اوپر اوپر سے ہی دوسری طرف نکل گیا۔ اُس نے مجھے للکار کر کہا تھا کہ میں تمہیں گولی نہیں ماروں گا اور تمہیں زندہ اٹھا لاؤں گا۔ میں نے اس کی للکار کا یہی جواب دیا تھا کہ میں بھی تمہیں گولی نہیں ماروں گا اور زندہ گرفتار کروں گا ....

"دوسری دفعہ اُس کی موجودگی کی اطلاع ایک اور جگہ ملی۔ شاید صاحب بہادر نے یہ واقعہ سنا ہوگا کہ لیفٹیننٹ گلبرٹ صاحب کی میم صاحب اغوا ہو گئی تھی"۔

"ہم نے سُنا تھا" — ڈی ایس پی نے کہا — "وہ لیفٹیننٹ گلبرٹ کی میم صاحب تھی اور لیفٹیننٹ گلبرٹ مارا گیا تھا اور مرنے سے پہلے اُس نے اپنی میم صاحب کو گولی مار دی تھی .... کیا تم اُس کے ساتھ تھے؟"

"ہاں صاحب بہادر!" — فضل حسین نے جواب دیا — "مجھے لیفٹیننٹ گلبرٹ صاحب کے ماتحت کر دیا گیا تھا۔ اُس وقت بھی مفرور ملزم اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑی پر پوزیشن میں تھا۔ اُس نے وہاں بھی مجھے للکار کر کہا تھا کہ میں تمہیں گولی مار سکتا ہوں لیکن تمہیں زندہ رکھوں گا کہ مجھے پکڑو .... صاحب بہادر! آپ میرے تھانے کے علاقے کے تمام نمبرداروں اور مخبروں وغیرہ سے پوچھ سکتے ہیں کہ میں نے سب کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ سکندر کا سراغ لگائیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں نے سکندر کو پکڑ لیا تو دس ہزار روپیہ میں نہیں لوں گا بلکہ اُس آدمی کو دے دوں گا جو اُس کا سراغ دے گا"۔

انسپکٹر فضل حسین نے اسی طرح کے ایک دو واقعات اور سُنا کر ڈی ایس پی پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ مجھے اپنا ذاتی دشمن سمجھتا ہے۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا اور یہ تینوں تھانیدار بھی جانتے تھے کہ اس انگریز

ڈی ایس پی کو صرف میری گرفتاری کے ساتھ دلچسپی ہے۔ ایک گھوڑی کی چوری یا ایک عورت کا اغوا اُس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ تو اُسے معلوم تھا کہ تھانیدار ان وارداتوں کی تفتیش میں کوتاہی نہیں کریں گے اور اگر کریں گے تو سزا پائیں گے، لیکن گھوڑی اور ایوب کی بہن کا اغوا میرے ساتھ نتھی ہو رہا تھا اس لئے ڈی ایس پی ان دونوں وارداتوں میں بھی دلچسپی لینے لگا۔ اگر میرا ذکر نہ ہوتا تو ڈی ایس پی یہ کہہ کر چلا جاتا کہ ملزم فوراً پکڑو اور مجھے رپورٹ دو لہٰذا اس نے خود ہی بیان لینے شروع کر دیئے اور فضل حسین کو باہر نکال دیا۔ سب سے پہلے اُس نے ایوب کو اندر بلایا۔



یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ ایوب نے کیا بیان دیا تھا۔ اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کہے گا لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انگریز ڈی ایس پی نے اُس پر کیا جرح کی تھی۔

فضل حسین کو دفتر سے باہر بھیجتے ہوئے یہ نہیں کہا گیا تھا کہ وہ اپنے بھائیوں سے نہ ملے۔ اس سے اُس نے یہ فائدہ اُٹھایا کہ وہ بھائیوں کے پاس بیٹھ گیا اور بھائیوں نے اُسے صحیح واقعہ سُنا دیا اور میرے متعلق بھی بتا دیا کہ میں کہاں ہوں۔ فضل حسین نے انہیں بہت سی باتیں سمجھا دیں اور بتا دیا کہ ڈی ایس پی کو وہ کیا بیان دیں۔

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ تجمل اور منوّر نے میرے کہنے پر عذرا کے مرنے کی اطلاع فضل حسین کو نہیں دی تھی۔ اب فضل حسین نے منوّر سے پوچھا کہ اُس نے اُسے اطلاع کیوں نہیں دی۔

"آپ مجھ سے ناراض تھے کہ مجھے عذرا کے ساتھ شادی نہیں کرنی چاہیئے تھی" — منوّر نے جواب دیا — "آپ نے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ تم نے سارے خاندان کی بے عزّتی کر دی ہے۔ میں نے اسی لئے آپ کو اطلاع نہ دی کہ آپ نہیں آئیں گے"۔

"تم نے سکندر کی یہ بات مان کر غلطی کی ہے کہ تھانے میں رپورٹ نہیں کی" — فضل حسین نے کہا — "اگر تم رپورٹ دیتے تو تھانیدار فوراً پہنچ جاتا اور یہ الفاظ جو تمہاری بیوی نے سکندر سے کہے تھے کہ ایوب کو پکڑ لو، اگر یہی الفاظ راجہ شیر خان کے کان میں پڑ جاتے تو وہ اسے نزعی بیان کے طور پر لکھ لیتا اور یہی الفاظ ایوب کو سزائے موت دلا سکتے تھے۔"

"نہیں بھائی جان!" — تجمل نے کہا — "تھانیدار کے آنے تک وہ زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔"

یہاں سے تفتیش ایک اور راستے پر چل پڑی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایوب نے ڈی ایس پی کو بھی بیان دیتے ہوتے کہہ دیا تھا کہ عذرا کو منور نے خود قتل کیا ہے۔ چونکہ عذرا کا تعلق ایوب سے بھی بنتا تھا اور عذرا میری خالہ زاد بھی تھی اس لئے ڈی ایس پی نے اس نکتے کو پکڑ لیا اور وہ اسی پر زور دینے لگا۔ اُس نے تجمل کا بیان لینے سے پہلے یہ پوچھا کہ تمہارے بھائی کی بیوی کس طرح مری تھی۔ پھر اُس نے منور کا بیان لینے سے پہلے بھی اُس سے یہی سوال پوچھا تھا۔ دونوں بھائیوں کا ایک ہی جواب تھا کہ عذرا کبھی کبھی نیند میں چل پڑتی تھی اور وہ اسی کیفیت میں کہیں چھت پر چلی گئی اور گر پڑی۔

میں ان سب کے بیانات نہیں سنا رہا ورنہ ان بیانات کی ہی ایک کتاب بن جائے گی۔ انگریز ڈی ایس پی زیادہ گہرائی میں چلا گیا۔ اُس نے اُس نوکر کو بھی بلا لیا تھا جس نے پہلے یہ بیان دیا تھا کہ وہ گھوڑی کو ٹہلانے کے لئے لے جایا کرتا تھا اور اُسے ایوب ملا تھا اور ایوب نے گھوڑی خریدنے کی بات کی تھی پھر ایوب نے یہ الفاظ کہے تھے کہ گھوڑی کو سنبھال کر رکھنا۔ انور علی سید اور راجہ شیر خان نے اِس نوکر کا ذکر ڈی ایس پی کے ساتھ خاص طور پر کیا تھا۔ ڈی ایس پی نے اُسے بیان کے لئے بلایا۔ اس نوکر نے یہ بھی کہا تھا کہ ایوب کی دوستی اس علاقے کے دو بدمعاشوں کے ساتھ ہے جو شاید ڈکیتی کی وارداتیں بھی کرتے ہیں۔

اس نوکر سے ڈی ایس پی نے بیان لیا۔ بے شک وہ بڑا چالاک

اور ہوشیار آدمی تھا لیکن ایک انگریز ڈی ایس پی اور دو تھانیداروں کے سامنے اُس کی چالاکی نرم پڑ گئی۔ اُس سے یہ پوچھا گیا کہ وہ دو بدمعاش کون ہیں جن کے ساتھ ایوب کی دوستی ہے۔

اُس نے دو آدمیوں کے نام بتا دیئے۔ اتفاق سے وہ ان آدمیوں کو جانتا تھا اور ایک بار اُس نے ایوب کو ان کے ساتھ کہیں جاتے دیکھا تھا لیکن اُس وقت اس شخص کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ایوب کون ہے اور اس کا میرے ساتھ یا منور کی بیوی عذرا کے ساتھ کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ اُس نے ان دونوں کے نام بتا دیئے۔ اسے بالکل یقین نہیں تھا کہ عذرا کے اغوا اور آبروریزی کی واردات میں ان دونوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

یہ دونوں آدمی ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے اور یہ گاؤں تھانے سے ایک یا ڈیڑھ میل دُور تھا۔ انہیں اسی وقت بُلا لیا گیا۔ ڈی ایس پی نے دونوں تھانیداروں کو حکم دیا کہ جب یہ آدمی آئیں تو پہلے ان کی خوب مار پٹائی کی جائے پھر ان سے بیان لئے جائیں۔ اُس نے یہ حکم اس لئے دیا تھا کہ راجہ شیر خان نے یہ دونوں نام سُنتے ہی ڈی ایس پی کو بتایا تھا کہ یہ دونوں عادی مجرم ہیں اور سزا یافتہ بھی ہیں۔

وہ دونوں آئے تو ایک کو انور علی سید اور دوسرے کو راجہ شیر خان الگ لے گئے۔ چونکہ انہیں ڈی ایس پی نے حکم دیا تھا اس لئے اُنہوں نے ایذا رسانی کی حد کر دی۔ ان میں سے ایک نے اقبالی بیان دے دیا کہ عذرا کو اُس نے اپنے اس ساتھی اور ایوب کے ساتھ مل کر اغوا کیا تھا۔

"باغ میں سے لڑکی کو ایوب نے اٹھایا تھا" — اُس نے کہا — "پھر اُس نے لڑکی کو ہم دونوں کے حوالے کر دیا تھا اور خود شہر چلا گیا تھا۔"

"کیا ایوب آبروریزی میں شامل نہیں تھا؟"

"نہیں" — اس شخص نے جواب دیا — "ایوب اُس ٹھکانے تک گیا ہی نہیں تھا جہاں ہم نے لڑکی کو رکھا تھا۔ وہ لڑکی کو ہمارے حوالے کر کے اُسی وقت شہر چلا گیا تھا۔ وہ اس لئے ہمارے ساتھ نہیں رہا تھا کہ لڑکی اُسے

پہچان لے گی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ فوراً شہر جاکر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ وقوعہ کے وقت شہر میں تھا۔"

اُس نے یہ بیان بھی دیا کہ لڑکی پر انہوں نے ایوب کے کہنے پر بہت زیادہ تشدد کیا تھا اور ایوب نے انہیں کہا تھا کہ جب یہ مر جائے یا مرنے والی ہو جائے تو رات کے وقت اسے وہیں پھینک آنا جہاں سے اٹھائی تھی۔



سب انسپکٹر انور علی سید نے ڈی ایس پی کو اطلاع دی کہ اس ملزم نے اقبالِ جرم کر لیا ہے۔ اُس وقت ملزم کی حالت یہ تھی کہ وہ پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ڈی ایس پی کے کہنے پر اُس نے ایک بار پھر اپنا اقبالی بیان دیا۔

اس کا دوسرا ساتھی پتھر کا بنا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ نہیں مان رہا تھا۔ اُسے بھی ڈی ایس پی کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ بدستور انکار کرتا رہا۔

ایوب نے بھی ڈی ایس پی کے سامنے اس الزام کو تسلیم نہ کیا۔

ڈی ایس پی کے حکم سے ان دونوں کو ہتھکڑیاں لگا لی گئیں۔

اقبالی ملزم کے اس بیان پر کہ لڑکی کو وہ باغ میں پھینک گئے تھے، ڈی ایس پی نے کہا کہ ان لوگوں کے باغ میں اگر کوئی آدمی رات کو رہتے ہیں تو ان سب کو فوراً تھانے بلایا جائے۔

اس باغ میں تو پوری ایک فیملی رہتی تھی جس میں ایک عورت تھی، تین چار بچے تھے اور دو آدمی تھے۔ اصل بات چھپانے کا امکان ختم ہو گیا تھا۔ ان سب کو تھانے میں حاضر کیا گیا۔ یہ غریب اور نادار سے لوگ جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ ذرا سے رُعب کے نیچے آگئے اور انہوں نے بتا دیا کہ باغ میں لڑکی فلاں جگہ پڑی ہوتی تھی اور وہ اسے چارپائی پر ڈال کر بڑی حویلی میں لے گئے تھے۔

"کیا چوہدریوں نے تمہیں کچھ کہا تھا؟"

"ہاں حضور!" —— اس فیملی کے دونوں آدمیوں نے یہی جواب دیا —— "چوہدریوں نے یہ کہا تھا کہ کسی کو نہ بتانا کہ بی بی کو بیہوشی کی حالت میں باغ سے اٹھایا گیا تھا۔ ہم نے اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ اس معاملے میں خاموش رہیں۔"

ڈی ایس پی نے تجمل اور منور کو باری باری اندر بلایا اور انہیں باغ کے نوکروں کے بیانات بتا کر پوچھا کہ اب بتاؤ، اصل معاملہ کیا ہے۔

دونوں بھائیوں نے ان بیانات کو صحیح تسلیم کر لیا اور اس قسم کے بیان دیئے کہ یہ تو معلوم نہیں کیا جا سکتا تھا کہ لڑکی کو کس نے اغوا کیا تھا۔ اگر تھانے میں رپورٹ کرتے تو اپنی ہی بے عزتی تھی۔ ملزموں کا کوئی سراغ نہ تھا۔

"ہم عزت اور رعب والے لوگ ہیں" —— دونوں بھائیوں کا بیان تقریباً ایک ہی جیسا تھا —— "ہمارے ساتھ ایسا واقعہ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ ہماری کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں اس لئے ہم نے اپنی عزت کی خاطر خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔"

"تم لوگوں نے لڑکی کے اغوا کی رپورٹ بھی تھانے میں نہیں دی تھی" —— اُن سے پوچھا گیا —— "اس کی کیا وجہ ہے؟"

تجمل نے وہی وجہ دہرائی کہ وہ اپنی عزت کی خاطر چُپ رہے لیکن منور کا بیان ذرا مختلف ہو گیا۔

"مجھے لڑکی پر شک ہو گیا تھا" —— منور نے جواب دیا —— "مجھے خیال آیا کہ یہ میرے ساتھ گھر سے نکل آئی تھی حالانکہ اس کے ساتھ میری نہایت مختصر ایک ہی ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے شک یہ ہُوا تھا کہ میری بیوی جسے میں اچھے چال چلن کی لڑکی سمجھتا رہا تھا وہ دراصل ٹھیک نہیں تھی اور کسی اور کے ساتھ چلی گئی ہے۔ جب وہ اس حالت میں باغ میں پڑی ہوئی ملی تو میں سمجھا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہُوا ہے میں نے یقین کیا ہی نہیں تھا کہ اسے اغوا کیا گیا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے تھانے رپورٹ دینا ضروری نہ سمجھا۔ چونکہ اس کا کفن دفن میرا فرض تھا اس لئے میں نے اپنا فرض ادا کیا لیکن اس کی لاش

کو زیادہ دیر گھر میں نہیں رہنے دیا شام سے پہلے دفن کر دیا۔"

منور کا یہ بیان بالکل بے بنیاد تھا۔

صورتِ حال بڑی خطرناک ہو گئی تھی۔ جب یہ بیان ہو رہے تھے اُس وقت میں پنجرے میں بند پنچھی کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا کیونکہ مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اگر اُس وقت مجھے پتہ چل جاتا کہ انسپکٹر فضل حسین اور اس کے بھائیوں کے لئے یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے تو میں سائرہ کو ساتھ لے کر تھانے پہنچ جاتا اور ڈی ایس پی سے کہتا کہ ان سب کو چھوڑ دو اور مجھے گرفتار کر لو۔ فضل حسین نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا کہ اپنے گاؤں میں مجھے بھیج دیا تھا۔ بیشک اُس نے میرے اس احسان کا صلہ دیا تھا کہ میں نے اُس کے اکلوتے بیٹے کو زندہ چھوڑ دیا تھا اور اُسے کہا تھا کہ اپنے باپ کے پاس چلے جاؤ، لیکن میں ایسے اخلاق کا آدمی نہیں تھا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ان بھائیوں نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ فضل حسین کی یہ قربانی معمولی سی نہیں تھی کہ اُس نے دس ہزار روپے کو لات مار دی تھی۔ آپ شاید سوچ نہ سکیں کہ اُس وقت دس ہزار روپے کتنی بڑی دولت تھی۔ یہ کوئی معمولی قربانی نہیں تھی۔



اس دوران سائرہ نے میرے ساتھ ایسا رویہ اختیار کر لیا تھا جیسے میں اُس کا اکلوتا بچہ ہوں یا اکلوتا بھائی ہوں یا ایسا خاوند ہوں جو اسے منتوں اور مرادوں پر منتیں مان کر حاصل ہوا ہو۔ میں کمرے سے باہر نکلنے لگتا تھا تو وہ مجھے روک لیتی اور کہتی تھی کہ جب تک پولیس یہاں ہے باہر نہیں جانے دوں گی۔

"سکندر!" — ایک رات اُس نے بڑے ہی جذباتی انداز میں کہا — "کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں پولیس کے پاس چلی جاؤں اور اشتہار لکھ کر دے دوں کہ سکندر کی جگہ مجھے پھانسی دے دو؟ .... قانون ایسی اجازت دیتا ہے؟"

"نہیں سائرہ!" — میں نے ہنستے ہوئے کہا — "سزا اُسی کو ملتی ہے جو جرم کرتا ہے۔"

وہ اس قدر جذباتی ہو گئی تھی کہ میرا جواب سُن کر اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ معلوم نہیں وہ مجھ سے کس قسم کے رویے کی توقع رکھتی تھی، لیکن میں ان حالات میں اتنا جذباتی نہ ہو سکتا تھا نہ مجھے ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ سو جائے۔

وہ اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گئی۔ میں سمجھا وہ سو گئی ہو گی۔ میرا ذہن کچے سے اس مکان کی دیواریں توڑ کر تھانے پہنچ گیا۔ میرا خون کھول رہا تھا اور بے چینی کا یہ عالم کہ میں بار بار کروٹ بدلتا تھا۔ سو جانے کا تو سوال ہی ختم ہو گیا تھا۔ میرا ذہن اس قدر اُلجھا ہوا تھا کہ میں بھول ہی گیا کہ سائرہ بھی اس کمرے میں موجود ہے۔

میں نے اپنے ماتھے پر نرم سی کوئی چیز رینگتی ہوئی محسوس کی۔ میرا ہاتھ ماتھے پر گیا اور اس کے ساتھ ہی دھیمی سی آواز آئی — "سکندر!"

"سائرہ!" — میں بم کی طرح پھٹا — "تم سو کیوں نہیں جاتیں؟ مجھے اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتیں؟"

وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں بولا ہی بڑی زور سے تھا۔ وہ اپنے بستر پر جا بیٹھی۔ مجھے ذرا سا بھی افسوس نہ ہوا کہ میں نے ایک مجبور اور بے بس لڑکی کو ڈرا دیا ہے۔

معلوم نہیں کس وقت میری آنکھ لگ گئی اور معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا رہا۔

میری آنکھ کھُل گئی۔ سائرہ میرے پلنگ پر بیٹھی تھی۔

"کیا بات ہے سائرہ؟"

"ناراض ہو؟" — سائرہ نے ایسے پوچھا جیسے سسکی لی ہو۔

"تم سوئی نہیں؟"

"ایک گھنٹے سے تمہارے پاس بیٹھی ہوئی ہوں" — سائرہ نے کہا

— "تم شاید مجھے سمجھے نہیں"

مجھے اُس پر ترس آگیا۔

"نہیں سائرہ!" — میں نے کہا — "ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تم ابھی تک نہیں سمجھیں کہ ہم کتنی بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ میرا ذہن کسی اور طرف ہوتا ہے تو اُس وقت کوئی مجھے بلاتے تو غصہ سا آجاتا ہے۔"

اُس نے سکون کا لمبا سانس لیا۔

"مجھے غلط تو نہیں سمجھ رہے؟"

"نہیں سائرہ!" — میں نے جواب دیا — "اگر تم غلط ہوتیں یا میں غلط سمجھتا تو تم زیادہ دیر تک میرے پاس نہ رہتیں .... جاؤ اب سو جاؤ۔"

اُس نے میرے ماتھے پر اور سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے بستر پر چلی گئی۔ وہ چلی تو گئی لیکن مجھے یوں لگا جیسے میرے ارد گرد زنجیریں لپیٹ گئی ہو۔

میں نے ذرا مشکل سے ہی یہ زنجیریں توڑیں اور میرا ذہن پھر اس کمرے سے باہر نکل گیا۔



اگلے روز دوپہر کا وقت تھا کہ میں جن دو بھائیوں کے گھر میں چھپا ہوا تھا وہ اکٹھے واپس آئے۔ وہ صبح سویرے نکل گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انسپکٹر فضل حسین اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ واپس آگیا ہے۔ ان بھائیوں کو اس اطلاع کے علاوہ اور کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

میں سارا دن انتظار کرتا رہا کہ انسپکٹر فضل حسین میرے پاس آئے گا۔ وہ شام کے بعد جب رات گہری ہوگئی تو آیا۔ اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔

"تجمل اور منور کہاں ہیں؟"

"سب کا آنا ٹھیک نہیں تھا" — اُس نے جواب دیا۔

"تفتیش کہاں تک پہنچی ہے؟"

انسپکٹر فضل حسین نے مجھے یہ ساری روئیداد سنائی جو میں آپ کو سُنا چکا ہوں۔

"میرا خیال تھا کہ تم یہاں کچھ عرصہ تک محفوظ رہو گے" — اُس نے کہا — "پھر تمہارے فرار کی بات پرانی ہو جائے گی" — اُس نے سائرہ کی طرف دیکھ کر مجھ سے پوچھا — "کیا یہ ہے اُس کی بہن؟"

میرا جواب سُن کر اُس نے اس مکان میں رہنے والے آدمیوں کو آواز دی۔ دونوں دوڑے آئے۔

"اس لڑکی کو اپنے پاس بٹھاؤ" — انسپکٹر فضل حسین نے انہیں کہا — "اسے آرام سے بٹھانا۔ میں چلا جاؤں تو اسے یہاں بھیج دینا۔"

سائرہ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ ڈرے نہیں، ساتھ والے کمرے میں چلی جائے۔

"سکندر!" — سائرہ کے جانے کے بعد فضل حسین نے کہا — "معلوم نہیں تمہیں میرے بھائیوں نے بتایا ہے یا نہیں کہ ہمارے ہاں عورت کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لڑکی کو تم نے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے؟"

"جس رات اس لڑکی کو ہم یہاں لائے تھے۔ اُسی رات تجمل نے مجھے یہ بات کہہ دی تھی جو آپ نے کہی ہے" — میں نے کہا — "آپ فکر نہ کریں۔ اس لڑکی کے ساتھ میری اُس قسم کی دلچسپی ہے ہی نہیں۔ میرا دماغ کہیں اور اُلجھا ہوا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ اس معاملے میں وہ بہت ہی سنجیدہ تھا اور میرے ساتھ جیسے وہ اسی مسئلے پر بات کرنے آیا تھا۔

"یہ ہمارے خاندان کا ایک اصول ہے جو ایک روایت اور ایک ورثے کی طرح ہمیں ملا ہے" — انسپکٹر فضل حسین نے کہا — "اس علاقے پر ہمارا رُعب، ہمارا فیصلہ اور ہمارا اثر و رسوخ چلتا ہے .... سکندر!

رعب اور دبدبہ تو بدمعاشوں کا بھی ہوتا ہے بلکہ زیادہ ہوتا ہے لیکن ان کی عزت نہیں ہوتی۔ ہمارے رُعب میں عزت اور احترام بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کی عزت کی حفاظت کرتے ہیں۔ عورت خاندان کی عزت ہوتی ہے .... اور دوسروں کی عزت کا احترام کرنے والوں پر خدا راضی رہتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارا خاندان ہمیشہ مصائب اور مشکلات سے آزاد رہا ہے۔ ہم پر یہ جو مصیبت آگئی ہے، یہ بہت بڑی مصیبت ہے۔ منوّر کی بیوی کی موت نے ہمارے لئے بڑے ہی مشکل حالات پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ میں تمہیں سُناتا ہوں، پہلے ضروری بات کر لوں....

"تم دیکھ لینا سکندر! ہم ان بُرے حالات سے صاف نکل آئیں گے لیکن یہ تمہارے کردار پر منحصر ہے۔ اس لڑکی کو امانت سمجھ کر رکھنا ہے۔ یہ بے قصور ہے .... اور سکندر! تم مجھ سے چھوٹے ہو۔ تم مجھ سے زیادہ عقل والے ہو سکتے ہو لیکن ابھی تم نے وہ تجربہ حاصل نہیں کیا جو مجھے حاصل ہُوا ہے۔ ایک بات یاد رکھو۔ یہ خدائی اصول ہے بلکہ یہ قدرت کا قانون ہے جو بدل نہیں سکتا۔ عورت کو اپنے ذہن میں داخل کر لوگے تو جرأت اور شجاعت تمہاری ذات سے نکل جائیں گے۔ عورت کو تصور بنا کر ذہن میں رکھو یا اُس کے حسین جسم کو کھلونا بنا لو تو تم طاقتور ہوتے ہوئے بھی بُزدل ہو جاؤ گے۔"

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے یہ تجربہ ہو چکا تھا۔ میں نے آپ کو وہ واقعہ سنایا تھا جب ہمیں نواب کے قید خانے میں سے فرار کرایا گیا تھا اور ہم نے ایک گاؤں میں پناہ لی تھی۔ رات کو گلشن آرا میرے ساتھ اکیلی تھی تو مجھ پر شیطان غالب آگیا تھا۔ پھر یوں ہُوا کہ گلشن آرا کے جسم کو تو میں حاصل نہ کر سکا تھا مگر اپنی روح کو مجروح کر لیا تھا۔ ایک ایسے گناہ نے میری روحانی قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا جس کا میں نے صرف ارادہ کیا تھا۔

میں فضل حسین سے تفتیش کی روداد سُننا چاہتا تھا لیکن اس نے لیکچر شروع کر دیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ عورت کے معاملے میں میرا

کردار کیا ہے۔

"اب مجھے بتائیں کہ پولیس کیا کر رہی ہے" —— میں نے اُس سے پوچھا —— "اور ڈی ایس پی نے کیا کہا ہے؟ مجھے اطلاع مل گئی تھی کہ ڈی ایس پی آیا ہے۔"



"ڈی ایس پی چلا گیا ہے" —— انسپکٹر فضل حسین نے بتایا —— "تجمّل اور منوّر تھانے سے آگئے ہیں۔ ہو سکتا ہے دونوں کو گرفتار کر لیا جاتے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ منوّر کی بیوی کے اغوا وغیرہ کے جرم کا اقبال ایک ملزم نے کر لیا ہے۔"

"میں سمجھ گیا" —— میں نے کہا —— "ہمارے بھائیوں پر یہ الزام ہو گا کہ اُنہوں نے قتل کو چھپایا ہے۔ عدالت میں جا کر ملزموں کے وکیل یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اپنی بیوی کو منوّر نے خود قتل کیا ہے۔"

"ڈی ایس پی کہہ گیا ہے کہ ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں عذرا کی لاش نکالی جائے گی اور پوسٹ مارٹم ہو گا" —— فضل حسین نے کہا۔

"میرے متعلق بات کہاں تک پہنچی ہے؟"

"ڈی ایس پی کو صرف تمہارے ساتھ دلچسپی ہے" —— فضل حسین نے کہا —— "اُس نے کہہ دیا ہے کہ گھوڑی کی چوری اور عذرا کا قتل تھانے کا کیس ہے۔ اس کی تفتیش سب انسپکٹر راجہ شیر خان کرے گا اور ایوب اور اس کی بہن کے اغوا کا کیس سب انسپکٹر انور علی سیّد کے پاس رہے گا لیکن اس کیس پر ڈی ایس پی نے توجہ نہیں دی۔ اُس نے دونوں تھانیداروں سے کہا ہے کہ ایوب کی شکایت مشکوک معلوم ہوتی ہے، پھر بھی تفتیش تو ضرور ہو گی۔"

"انور علی سیّد کا رویّہ کیا ہے؟"

"اس کا رویّہ ہمارے حق میں ہے" —— فضل حسین نے کہا —— "اُس نے ڈی ایس پی کو رپورٹ دی ہے کہ اُس نے خانہ تلاشی میں کوئی جگہ

نہیں چھوڑی اور کھڑے فضل کے اندر بھی جاکر دیکھا ہے اور ارد گرد جہاں کہیں اُسے کُھلا یا بند مکان نظر آیا اُس نے اندر جا کر دیکھا ہے اور اُس نے اس تمام علاقے کی ناکہ بندی سختی سے کی تھی ..... میں اُسے پھر بھی ملوں گا۔ راجہ شیر خان تو اپنا آدمی ہے۔"

یہ تو بڑی لمبی باتیں ہیں جو اُس کے ساتھ ہوتی رہیں۔ میں آپ کو واقعات سناتا ہوں۔

"سکندر!" — فضل حسین نے کہا — "ان مقدموں کے فیصلے معلوم نہیں کیا ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ ایوب اور اس کے ساتھیوں کے خلاف عذرا کے اغوا اور قتل کے الزام ثابت نہیں ہو سکیں گے۔ کوئی موقعے کا گواہ نہیں۔ عذرا ہمارے باغ سے برآمد ہوئی تھی، لیکن سکندر! میں نے ایوب اور اُس کے ساتھیوں سے انتقام لینا ہے۔"

"میں نے انتقام ہی تو لیا تھا" — میں نے کہا — "اُس کی بہن کو اُٹھا لایا ہوں۔ ایوب کو بھی ہم اُٹھا لاتے تھے لیکن وہ بھاگ گیا۔ میں نے اسے بڑی ہی اذیت ناک موت مارنا تھا۔ میں نے اُس کے چہرے کو گرم لوہے سے داغنا شروع کر دیا تھا۔"

"میں ایک بار پھر کہتا ہوں سکندر!" — فضل حسین نے کہا — "انتقام اس کی بہن سے نہیں لینا۔ مجھے انور علی سید نے بتایا ہے کہ ایوب کا شمار شہر کے بدمعاشوں میں ہوتا ہے ظاہر ہے اس کی یہ بہن بھی ایسی ہی ہو گی۔"

"نہیں بھائی جان!" — میں نے کہا — "بڑے پکے اخلاق کی لڑکی ہے۔ اپنے بھائی سے بالکل اُلٹ" — میں نے فضل حسین کو تفصیل سے بتایا کہ سائرہ کے کردار کو میں نے کیسے پرکھا ہے۔ میں نے کہا — "یہ تو کہتی ہے کہ یہاں سے جاؤں گی ہی نہیں۔ کہتی ہے کہ میں بدنامی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ میرا بھائی مر جاتے تو مجھے خوشی ہو گی، اس نے میرے ماں باپ کی عزت خاک میں ملا دی ہے اور کوئی گھر میرا رشتہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔"

"اس کی بات بعد میں کریں گے" — فضل حسین نے کہا — "صرف یہ احتیاط کرنا کہ اس لڑکی کے دھوکے میں نہ آجانا ..... اصل بات یہ ہے سکندر! میں اپنے بھائی منور کی شادی پر خوش نہیں تھا لیکن اس کی بیوی مجھے پسند تھی یا نہیں وہ میرے بھائی کی بیوی تھی۔ اُسے اغوا کیا گیا، بے آبرو کیا گیا اور وہ ان کے تشدد سے مر گئی۔ میں ان قاتلوں کو جینے کا حق نہیں دے سکتا۔ اگر یہ بری ہو گئے تو میں نے انہیں سزائے موت دینی ہے۔"

"یہ سزا میں دوں گا" — میں نے کہا — "آپ یہ کام میرے سپرد کر دیں۔"

"نہیں سکندر!" — فضل حسین نے کہا — "تم میرے مہمان ہو۔"

"مجھ پر آپ کا احسان ہے۔"

"میں احسان کی قیمت نہیں لوں گا" — فضل حسین نے کہا — "میں نے احسان کے بدلے احسان کیا ہے۔ تم نے میرا اکلوتا بیٹا مجھے زندہ دے دیا تھا۔"

"بھائی جان!" — میں نے کہا — "میری جان پھانسی کے تختے پر رکھی ہوتی ہے۔ دس اور قتل کر دوں گا تو بھی ایک ہی بار پھانسی دیں گے۔ میرے پیچھے رونے والا بھی کوئی نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ تین بھائیوں میں سے کوئی ایک کم ہو جاتے۔ اگر آپ تینوں پکڑے گئے ....."

"ہم قتل ایسے طریقے سے کریں گے کہ لاشیں نہیں ملیں گی" — فضل حسین نے کہا — "قاتلوں کا سراغ نہیں ملے گا۔"

"جو کچھ بھی ہو گا وہ میں اپنے سر لوں گا" — میں نے کہا — "مجھے آپ کے اشارے کی ضرورت ہے۔"

"وہ وقت آنے دو" — فضل حسین نے کہا۔

"بھائی جان!" — میں نے کہا — "آپ یہ بھول رہے ہیں کہ عذرا میری خالہ زاد بہن تھی۔ میرا خون تھی۔ انتقام کا فرض مجھ پر عائد ہوتا ہے۔"

"یہ بعد میں دیکھیں گے" — فضل حسین نے کہا — "بہر حال یہ فیصلہ

ہے کہ ان تینوں کو دنیا کے تختے سے اُٹھانا ہے۔ ابھی تو مقدمے بھگتانے ہیں معلوم نہیں کیا بنے گا۔ میں صرف دس دنوں کی چھٹی آیا ہوں اور زیادہ چھٹی ملنی بہت مشکل ہے۔ میں دونوں تھانوں میں پورا انتظام کر کے جاؤں گا۔"

وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔



"میرا بھائی مظفر کہاں ہے؟" — میں نے اُس کے اکلوتے بیٹے کے متعلق پوچھا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مظفر انسپکٹر فضل حسین کا اکلوتا بیٹا تھا اور جب میں خانہ بدوشوں کے ساتھ تھا تو وہ میری گرفتاری کے لئے چھاپہ مارنے آیا تھا، لیکن بجائے اس کے کہ وہ مجھے گرفتار کرتا، میں نے اُسے گرفتار کر لیا تھا۔ میں نے اُسے اُس کے باپ کے نام پیغام دے کر چھوڑ دیا تھا۔ یہی وہ وجہ تھی کہ فضل حسین نے میرے احسان کا بدلہ یہ دیا تھا کہ مجھے اپنی جاگیر میں بھیج کر پناہ دی تھی۔

"ہاں سکندر!" — فضل حسین نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا — "یہ تو میں بھول ہی گیا تھا" — وہ بیٹھ گیا اور کہنے لگا — "تم نے اُس کا مستقبل تباہ کر دیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" — میں نے تڑپ کر پوچھا — "وہ خیریت سے تو ہے؟"

"ہے تو خیریت سے" — فضل حسین نے جواب دیا — "لیکن لائن حاضر ہے۔"

"کیا کیا ہے اُس نے؟"

"بالکل تم جیسی باتیں کرتا ہے" — فضل حسین نے جواب دیا — "تم نے اُس پر ایسا اثر چھوڑا ہے کہ وہ انگریزوں کا نوکر ہوتے ہوئے آزاد ہو گیا ہے۔ تھانے میں ہندوستان کو آزاد کرانے کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ تین

آدمی ڈاکہ زنی میں پکڑے گئے تو مظفر نے انہیں لیکچر دینا شروع کر دیا کہ تم لوگ ہندوستانیوں کو لوٹنے کی بجائے انگریزوں کے گھروں میں ڈکیتی کی وارداتیں کیوں نہیں کرتے اور اُن ریل گاڑیوں میں ڈاکے کیوں نہیں ڈالتے جن میں سرکاری خزانہ آتا جاتا ہے ..... تم جانتے ہو کہ اُس علاقے میں عادی ڈکیت اور رہزن زیادہ ہیں۔ یہ میرا بیٹا انہیں ہندوستان کی جنگِ آزادی کے لئے تیار کرتا رہتا تھا اور وہ اسے خوش کرنے کے لئے کہتے تھے کہ ہمیں یہاں سے نکلوا دیں پھر ہمیں بتائیں کہ کیا کرنا ہے۔"

"بچہ ہے" — میں نے کہا — "اُس میں میری طرح ذہنی پختگی نہیں۔"

"اور اب وہ پولیس کی نوکری کے قابل نہیں رہا" — فضل حسین نے کہا — "اُس نے عقل سے کام لینے کی بجائے جذبات سے سوچا اور ڈکیتی کے ایک کیس میں عدالت میں گواہی دینے گیا تو دانستہ غلط بیان دیا جو ملزموں کے حق میں جاتا تھا۔ کیس سیشن کورٹ میں تھا۔ سیشن جج نے ملزموں کو سزا کا فیصلہ سنا دیا اور اُس نے فیصلے میں یہ بھی لکھ دیا کہ اے ایس آئی مظفر نے دیدہ دانستہ کیس کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے خلاف محکمانہ کارروائی کی جائے۔ اس پر اُسے لائن حاضر کر دیا گیا اور اب اس کے خلاف محکمانہ کارروائی ہو رہی ہے۔ مجھے توقع یہی ہے کہ اُسے سروس میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔"

"آپ نے اُس کی سفارش نہیں کی؟"

"نہیں" — فضل حسین نے جواب دیا — "بلکہ میں نے پولیس ہیڈکوارٹر میں کام کرنے والے ایک انسپکٹر سے یہ کہہ دیا ہے کہ اسے سروس سے نکلوا دو ورنہ یہ کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے گا کہ اس کے خلاف بغاوت کا کیس بن جائے گا اور اس کی باقی عمر جیل میں گزرے گی یا تمہاری طرح مفرور ہو کر دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔"

"اُسے گھر ہی آنے دیں" — میں نے کہا — "میں اُسے سنبھال لوں گا۔"

"تم نے اُسے خاک سنبھالنا ہے"۔۔۔ فضل حسین نے کہا ۔۔۔"تم اُسے اور زیادہ بگاڑ دو گے۔"

فضل حسین یہ بات کہہ کر ہنستا ہُوا باہر نکل گیا اور سائرہ میرے پاس آگئی۔

"یہ کون ہے؟"۔۔۔ سائرہ نے پوچھا۔

میں نے اُسے بتایا۔

"یہ کیسا آدمی ہے؟"

"تمہیں اِس سے زیادہ اچھا آدمی شاید ہی کہیں نظر آتے گا"۔۔۔ میں نے جواب دیا ۔۔۔"تم اس کے پاس کچھ دیر بیٹھو گی تو کہو گی کہ یہ تو میرا سگا باپ ہے۔"



دوسرے دن مجھے اطلاع ملی کہ مجسٹریٹ پولیس کو لے کر آیا ہے اور وہ قبرستان میں چلا گیا ہے۔

یہ اطلاع مجھے تیر کی طرح لگی۔ عذرا کا بچپن، اُس کی جوانی اور اُس کی باتیں ایک فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے آگئیں۔ میں جانتا تھا کہ اُس نے اپنے ساتھ یہ ظلم کیا ہے کہ اپنے دل میں میری محبت پیدا کر لی ہے۔ پردیسی کا پیار ایک محاورہ ہے اور ایک بڑی ہی تلخ حقیقت۔ اس لئے پیار کیا تو اُس آدمی کے ساتھ جس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور جس کے ساتھ موت سائے کی طرح چل رہی تھی۔ مجھے جب پتہ چلا تھا کہ عذرا نے منوّر کے ساتھ شادی کر لی ہے تو مجھے دلی خوشی ہوئی تھی اور جب میں نے عذرا کو منوّر کی بیوی کے روپ میں دیکھا تھا تو میں اور زیادہ خوش ہُوا تھا کہ عذرا کو ایسی ازدواجی زندگی ملی ہے جو کسی خوش نصیب لڑکی کو ہی مل سکتی ہے۔ اُس نے میرے ہاتھوں میں دم دے دیا تھا۔ اتنا غم میں نے اپنی ماں کی موت پر جھیلا تھا۔ عذرا کی موت نے تو مجھے باؤلا کر دیا تھا۔ اس ذہنی کیفیت میں میں نے یہ دلیرانہ کارروائی کی تھی کہ ایوب اور اُس کی بہن کو اُن کے گھر سے

اُٹھا لایا تھا۔ اسے آپ دلیرانہ کارروائی نہ سمجھیں۔ یہ باؤلے پن کا یا پاگل پن کا مظاہرہ تھا۔ اس سے مجھے کچھ تسکین ہو گئی تھی، مگر یہ آواز کان میں پڑی کہ عذرا کو قبر سے نکالا جائے گا تو غم اور دُکھ سے میرا دل ڈوبنے لگا۔

"سکندر!"۔۔۔ سائرہ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرے پاس آ بیٹھی اور اُس نے پوچھا ۔۔۔"کیا بات ہے؟ میرا خیال ہے کہ ابھی جو آدمی تمہارے پاس آیا تھا وہ کوئی بُری خبر سُنا گیا ہے۔"

میں نے جب سائرہ کو بتایا کہ وہ کیا خبر سُنا گیا ہے تو اُس کے بھی آنسو بہنے لگے۔

"بے چاری کو قبر میں بھی سکون نہیں ملا"۔۔۔ سائرہ نے کہا ۔۔۔"وہ تو میری بہنوں جیسی سہیلی تھی..... سکندر! کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں جا کر عذرا کا مُنہ دیکھ لوں؟"

"نہیں سائرہ!"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔"اُسے پولیس نکال رہی ہے۔ کسی اور کو قبرستان کے اندر جانے کی بھی اجازت نہیں.... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ اُس کا چہرہ نہ ہی دیکھا جائے تو اچھا ہے۔ اُسے دفن ہوتے اتنے دن گزر گئے ہیں۔ میّت پھُول گئی ہو گی۔ اُس کا وہی چہرہ اپنے تصوّر میں محفوظ رکھو جو اُس کی زندگی میں تھا۔"

میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے ذہن سے اور اپنی آنکھوں کے سامنے سے عذرا کا ... ہٹا دوں جو مجھے اچھا لگا کرتا تھا، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

دل کے آئینے میں بہت صورتیں آئیں، یہ ماں ہے، یہ میرے ابّو ہیں، یہ شہناز ہے، یہ خواجہ صاحب ہیں اور اب ان میں ایک اور صورت کا اضافہ ہو گیا تھا۔

جب یہ خیال آیا کہ عذرا کے جسم کو چیرا پھاڑا جائے گا تو یوں لگا جیسے میرا وجود چھُریوں اور چاقوؤں سے کٹ رہا ہو۔

"سائرہ!"۔۔۔ میں نے بے بسی کے عالم میں کہا ۔۔۔"مجھ پر ایک کرم

کرو۔ مجھے غموں کے اس انبار سے باہر گھسیٹ لو۔"

وہ میرے پہلو کے ساتھ آن بیٹھی اور میرا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ پھر میں نے اُس کے پُرشباب گال کا لمس اپنے ماتھے پر محسوس کیا اور پھر میں نے اپنے ماتھے پر نمی بہتی ہوئی محسوس کی۔ یہ سائرہ کے آنسو تھے۔ میں بچہ بن گیا۔

اور میں بچوں کی طرح رونے لگا۔

"سکندر!" — سائرہ نے میرا سر اُٹھا کر اپنا چہرہ میرے چہرے کے قریب کر کے کہا — "تم تو مرد ہو۔ میں روؤں تو تم مجھے کہو کہ مت روؤ۔"

سائرہ کا چہرہ مجھے اُس جھیل میں عکس کی طرح نظر آ رہا تھا جس میں کسی نے کنکر پھینک دیا ہو۔ یہ عکس مجھے اپنی امی کا چہرہ لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کیفیت سے نکالا۔ اس میں سائرہ کی وارفتگی کی مدد بھی شامل تھی۔



شام سے کچھ پہلے اطلاع ملی کہ عذرا کی میت نکال کر لے گئے ہیں۔ دیہاتی علاقے میں پوسٹ مارٹم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ عذرا کی میت کو اُس شہر میں جانا تھا جہاں وہ پیدا ہوئی تھی اور جہاں سے دل میں نہ جانے کیسے کیسے غم چھپائے ہوئے اور ان پر شادی کی خوشیوں کا پردہ ڈالے منوّر کے ساتھ نکلی تھی۔ اُس کے ماں باپ کو معلوم نہیں تھا کہ ان کی بیٹی اس دنیا سے اُٹھ گئی ہے اور اب آخری بار اپنے شہر آ رہی ہے۔

وہ رات اُن راتوں جیسی بڑی لمبی رات تھی جو میں نے اپنی ماں کی موت کے بعد بچپن میں گزاری تھی۔

اگلی رات کو میت واپس آ گئی۔ یہ خبر منوّر لایا تھا۔

"عذرا کا مُنہ دیکھو گے؟" — منوّر نے بوجھل آواز سے پوچھا۔

"نہیں" — میں نے کہا — "تم نے اگر اُس کا مُنہ نہیں دیکھا تو نہ دیکھنا۔ یہ وہ چہرہ نہیں ہوگا جس پر تم مرمٹے تھے۔"

منوّر اتنا جذباتی تھا کہ وہ میرے ساتھ لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

سائرہ اسی کمرے میں بیٹھی تھی۔ منوّر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوتے بھی اور کمرے سے جاتے ہوتے بھی اُس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

رات کو عذرا کو دفن کر دیا گیا۔ ابھی یہ نہیں بتایا جا سکتا تھا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کیا ہے۔ یہ تھانے والوں کو ہی معلوم تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ صبح سویرے ہی فضل حسین تھانے چلا جائے گا اور معلوم کرے گا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کیا لکھا ہے۔

اگلے روز دوپہر کے وقت تجمل آیا۔ وہ بھی فضل حسین کے ساتھ تھانے گیا تھا۔ سب انسپکٹر راجہ شیر خان نے انہیں بتایا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ ملزموں کے حق میں جاتی ہے۔ رپورٹ میں لکھا تھا کہ جسم پر کوئی ضرب یا زخم نہیں اور میت کی اس حالت میں یہ معلوم کرنا کہ اس پر مجرمانہ حملہ ہوا تھا یا نہیں، ممکن نہیں رہا۔

میں پولیس میں رہ چکا تھا اس لئے میں جانتا تھا کہ مجرمانہ حملے کا ثبوت حملے کے فوراً بعد ہی مل سکتا ہے۔

"بھائی جان کا کیا حال ہے؟" — میں نے تجمل سے پوچھا۔

"وہ کہتے ہیں کہ اس رپورٹ پر تو ملزموں کو گرفتار بھی نہیں کیا جا سکتا" — تجمل نے جواب دیا — "لیکن راجہ شیر خان نے ایک ملزم کے اقبالی بیان پر ایف آئی آر بھی لکھ لی ہے اور تینوں ملزموں کی گرفتاری بھی درج کر لی ہے۔"

میری دانست یہ تھی کہ کیس ختم ہو چکا ہے۔ اقبالی بیان پر کیس نہیں بنایا جا سکتا۔ بنایا جائے تو عدالت میں جا کر کیس ناکام ہو جاتا ہے۔ اقبالی ملزم

لے یہ بیان ابھی تھانے میں دیا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ دفعہ ۱۶۴ کے تحت ملزم مجسٹریٹ کو اقبالی بیان قلمبند کراتا ہے یا نہیں۔

چونکہ سائرہ وہیں بیٹھی تھی اس لئے تجمل نے زیادہ باتیں نہ کیں اور چلا گیا۔



رات کو انسپکٹر فضل حسین آگیا اور پہلے کی طرح اُس نے سائرہ کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

"میں گھوڑی کے کیس کا بھی فیصلہ کر آیا ہوں" ___ اُس نے کہا۔

"کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟" ___ میں نے پوچھا ___ "اس کیس میں تو وہ دو تین سال کے لئے پھر اندر ہو سکتا ہے۔"

"نہیں سکندر!" ___ فضل حسین نے کہا ___ "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ سب انسپکٹر راجہ شیر خان ہمارا دوست ہے۔ اس نے دوستوں کی طرح میرے ساتھ اس کیس پر بحث مباحثہ کیا اور میں اُس کی باتوں کا قائل ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ گھوڑی کی چوری کا الزام ثابت کرنا کوئی مشکل نہیں۔ یہ جھوٹ بھی بولا جا سکتا ہے کہ سب انسپکٹر انور علی سید نے ملزم کو گھوڑی سمیت شہر میں پکڑا تھا۔ انور علی سید سے ہم کورٹ میں یہ جھوٹ بلوا سکتے ہیں لیکن ایوب اتنا کچا آدمی نہیں۔ وہ اپنی اور اپنی بہن کی گمشدگی کی رپورٹ جو اس کی ماں کے نام سے تھانے میں درج ہوئی تھی وہ کورٹ میں طلب کروا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ معاملہ ڈی ایس پی تک بھی پہنچ چکا تھا ..... تم خود غور کرو سکندر! کیا میرا یہ فیصلہ ٹھیک نہیں کہ ہم اس کیس کو یہیں پر ختم کر دیں؟"

"بالکل صحیح فیصلہ ہے" ___ میں نے کہا۔

"میں نے یہ فیصلہ کر دیا ہے" ___ انسپکٹر فضل حسین نے کہا ___ "اور میں تھانے سے گھوڑی لے آیا ہوں۔"

"راجہ شیر خان نے تو شاید ایف آئی آر بھی لکھ دی تھی" ___ میں نے پوچھا ___ "اس کا کیا بنے گا؟"

"وہ تو باقاعدہ تحریر لکھی گئی ہے" ___ فضل حسین نے کہا ___ "اس پر میں نے اور ایوب نے بھی دستخط کئے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ دونوں فریقوں نے معاملہ طے کر کے سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

"اچھا!" ___ میں نے کہا ___ "تو آپ کی ملاقات ایوب سے بھی ہوتی ہے۔"

"تم ملاقات کہتے ہو" ___ فضل حسین نے کہا ___ "اُسے بغیر ہتھکڑی کے شیر خان نے حوالات سے نکلوا کر اپنے دفتر میں بلایا اور کہا کہ اُس کے خلاف رسّہ گیری کا کیس ختم کر دیا گیا ہے۔ وہ تو میرے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے ہاتھ جوڑ کر مجھے کہا کہ میں اُسے بخش دوں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ میں بھی قانون اور قانونِ شہادت جانتا ہوں۔ میرے خلاف لڑکی کے اغوا وغیرہ کے الزام ثابت نہیں ہو سکیں گے۔ اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو میں ساری عمر آپ کا احسان مند رہوں گا اگر آپ معاف نہیں کریں گے پھر بھی میں بری ہو کر آجاؤں گا اور میرے دل میں آپ کے لئے عداوت بھری رہے گی۔"

انسپکٹر فضل حسین بڑے مضبوط دل والا اور بڑا کایاں آدمی تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کے ذہن پر ایوب کا عائد کیا ہوا یہ الزام سوار تھا کہ میں نے اور منّور نے اُسے اور اس کی بہن کو اغوا کیا ہے اور یہ بھی کہ میں ان لوگوں کی جاگیر میں کہیں چھپا ہوا ہوں۔

"دیکھو ایوب!" ___ انسپکٹر فضل حسین نے اُسے اپنے قدموں سے اُٹھا کر کرسی پر بٹھایا اور کہا ___ "اس خوش فہمی میں نہ پڑے رہو کہ تم بری ہو کر آجاؤ گے۔ تم خود ایس ایچ او رہ چکے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ قانونِ شہادت کا پیٹ کس طرح بھرا جاتا ہے۔ یہ بھی مت بھولو کہ اس وقت تین تھانیدار تمہارے خلاف ہیں۔ ایک میں ہوں، دوسرا تمہارے سامنے بیٹھا ہے اور تیسرا انور علی سید ہے۔ پھر یہ بھی سوچو کہ تم مجھ سے ٹکر لے سکتے ہو؟ میں تمہیں سیدھا راستہ بتاتا ہوں۔ میں اپنے بھائی راجہ شیر خان کی منت کروں گا کہ تمہارے خلاف اور تمہارے ان دوستوں کے خلاف شہادت اتنی

کمزور رکھے کہ کیس مجسٹریٹ کی عدالت سے ہی ڈسچارج ہوجاتے۔ اس کے بدلے تم نے یہ کرنا ہے کہ کورٹ میں یہ بیان نہیں دینا کہ تمہیں اور تمہاری بہن کو اغوا کیا گیا تھا اور اس کی رپورٹ تھانے میں درج ہے۔ اگر تم نے یا تمہارے وکیل نے عدالت میں یہ نکتہ اُٹھایا تو میں استغاثے کی شہادت اتنی خوفناک کردوں گا کہ تم اپنے ساتھی ملزموں کے ساتھ اگر پھانسی سے بچ گئے تو عمر قید ضرور پاؤ گے۔"

"چوہدری صاحب!" — ایوب نے فضل حسین سے التجا کی — "میری بہن کو چھوڑ دیں۔"

"تمہارے کیس کا فیصلہ ہوجانے کے بعد" — فضل حسین نے کہا — "میں قرآن ہاتھ میں لے کر حلفیہ کہتا ہوں کہ تمہاری بہن کو میرے بھائیوں نے اپنی بہن بنا کر رکھا ہُوا ہے۔ ہم کمینے لوگ نہیں۔ جب بہن تمہیں ملے گی تو اُس وقت تم مجبور ہوجاؤ گے کہ میرے بھائیوں کے پاس آکر ان کا شکریہ ادا کرو کہ انہوں نے تمہاری عزت کو اپنی عزت سمجھا تھا۔"

انسپکٹر فضل حسین یہ سودا بازی اور یہ باتیں سب انسپکٹر راجہ شیر خان کی موجودگی میں کر رہا تھا حالانکہ اُسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ایوب کی بہن یہاں نہیں اور نہ اُسے فضل حسین کے بھائیوں نے اغوا کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجہ شیر خان مکمل طور پر فضل حسین اور اُس کے بھائیوں کی مُٹھی میں تھا۔ ایوب بھی ضرور مرعوب ہُوا ہوگا اور اُس نے محسوس کر لیا ہوگا کہ علاقہ تھانیدار کو تو یہ لوگ اپنا نوکر سمجھتے ہیں۔ اسی کا اثر تھا کہ ایوب نے یہ سودا قبول کر لیا۔

"ایک اور ضروری بات" — فضل حسین نے ایوب سے کہا — "کورٹ میں سکندر کا ذکر نہ آئے۔"

"نہیں آئے گا" — ایوب نے کہا — "لیکن چوہدری صاحب! یہ تو آپ مانتے ہیں نا، کہ سکندر یہیں ہے اور مجھے میری بہن کے ساتھ اُسی نے اغوا کیا ہے۔"

"میں نے جو کہا ہے تم نے وہ کرنا ہے" — فضل حسین نے کہا — "بیکار باتیں مت کرو۔"

راجہ شیر خان نے بھی ایوب کو ڈرایا۔ وہ تو پہلے ہی ڈرا ہُوا تھا۔ اُس نے ہتھیار ڈال دیئے۔



"کیا تم سمجھے ہو سکندر!" — فضل حسین نے مجھے یہ ساری باتیں سُنا کر کہا — "یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ ان تینوں ملزموں کے خلاف یہ کیس ثابت نہیں ہوگا۔ ایک تو یہ وجہ ہے کہ میں نے ایوب کے ساتھ سودا کر لیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان تینوں کو ہم نے خود سزا دینی ہے۔ میں یہ کام اپنی اس چھٹی کے دوران ہی کرنا چاہتا تھا لیکن یہ تینوں حوالات میں بند ہیں۔ اتنی جلدی یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ میرے بھائی کر لیں گے۔"

"آپ چھٹی پوری کریں اور جائیں" — میں نے کہا — "کام ہوجاتے ... کیا آپ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی ہے؟"

"دیکھی ہے" — اُس نے جواب دیا — "بیکار رپورٹ ہے۔ اگر مجسٹریٹ حوصلے والا ہُوا تو اس کیس کو سیشن میں جانے ہی نہیں دے گا۔"

انسپکٹر فضل حسین چلا گیا اور سائرہ میرے پاس آگئی۔

"سکندر!" — سائرہ نے کہا — "کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گے کہ باہر کیا ہو رہا ہے اور میرا بھائی کہاں ہے؟"

"تمہارا بھائی اپنے ڈاکو ساتھیوں کے ساتھ حوالات میں بند ہے" — میں نے کہا — "پولیس کو ثبوت مل گیا ہے کہ ان تینوں نے عذرا کو اغوا کیا اور اُس کے ساتھ ایسا وحشیوں جیسا سلوک کیا کہ وہ مر گئی۔"

"انہیں سزا کیا ملے گی؟" — سائرہ نے پوچھا۔

"پھانسی" — میں نے جواب دیا۔

سائرہ چُپ رہی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اُس کے مرنے کا تمہیں دُکھ تو بہت ہوگا" — میں نے کہا —

"وہ تمہارا بڑا بھائی ہے، لیکن اُس کا جُرم دیکھو۔ اُس کا یہی انجام ہونا تھا۔"

"میں اپنی ماں اور اپنے باپ کے انجام کی سوچ رہی ہوں" —— سائرہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا —— "میرے لئے تو وہ رو رو کر بے حال ہو رہے ہوں گے۔ اگر اُن تک میں یہ اطلاع بھجوا سکوں کہ میں جہاں ہوں بالکل ٹھیک اور خوش ہوں تو شاید ان کی کچھ تسکین ہو جاتے .... کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"چند دن ٹھہر جاؤ" —— میں نے کہا —— "میں خود تمہیں وہاں چھوڑ آؤں گا۔"

"نہیں سکندر!" —— سائرہ نے کہا —— "میں تمہیں پہلے بھی ایک بار بتا چکی ہوں کہ اپنے گھر جانے کی بجائے میرے لئے مرجانا بہتر ہے۔ وہاں میرے لئے بدنامی اور طعنوں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا۔ میں نے اپنی اس عمر تک جو کمایا ہے وہ عزت اور آبرو ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ اگر تم مجھے زبردستی چھوڑ آؤ گے تو ظاہر ہے رات کو ہی لے جاؤ گے۔ صبح ہونے تک میں گھر سے پھر غائب ہوں گی اور میری لاش کسی کنوئیں میں سے ملے گی۔"

"مطلب یہ ہے کہ تم میرے لئے مصیبت بنی رہو گی" —— میں نے شگفتہ سے لہجے میں کہا۔

"پھر مجھے یہاں لانا ہی نہیں تھا" —— اُس نے بے تکلفانہ سے لہجے میں کہا۔

"سائرہ!" —— میں نے کہا —— "اگر ایوب کو پھانسی ہو جاتے یا وہ کسی کے ہاتھوں قتل ہو جاتے تو تمہیں دُکھ تو بہت ہوگا۔"

"سچ پوچھتے ہو سکندر؟" —— سائرہ نے کہا —— "ایسے بھائی کے مرجانے کا دُکھ مجھ جیسی کسی بہن کو نہیں ہوگا۔ میں صرف اپنے ماں باپ کی سوچتی ہوں۔"

سائرہ کے ساتھ ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں۔ میں آپ کو آئندہ پیش

آنے والے واقعات سناتا ہوں۔



اگلی رات اطلاع ملی کہ جس ملزم نے اقبالِ جرم کیا تھا اُسے مجسٹریٹ کے پاس اقبالی بیان قلمبند کرانے کے لئے بھیجا گیا تو اُس نے مجسٹریٹ سے کہا کہ وہ کوئی بیان نہیں دینا چاہتا نہ اُس نے کوئی جرم کیا ہے اور تھانے میں اُسے مار پیٹ کر منوایا گیا تھا کہ اس قسم کا اقبالی بیان دے دینا۔

یہ تو ہمیں پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ ملزم منحرف ہو جاتے گا۔ وہ کوئی شریف آدمی نہیں تھا بلکہ اُس کا پیشہ ہی جرائم تھا۔ قانونِ شہادت کو وہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اگر اس طرح کوئی ملزم دفعہ ۱۶۴ کے تحت بیان دینے سے انکار کر دے تو اُسے واپس پولیس کے حوالے نہیں کیا جاتا بلکہ اُسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس ملزم کو بھی جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جرم ثابت نہیں ہو سکتا۔

سب انسپکٹر راجہ شیر خان نے عدالت میں چالان بڑی جلدی پیش کر دیا۔ کیس میں جان تو تھی ہی نہیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ صاف تھی۔ ایک ملزم کے اقبالی بیان کا سہارا تھا۔ وہ بھی نہ رہا۔ اب صرف یہ دیکھنا تھا کہ کتنے دنوں بعد ملزم بری ہو کر باہر آتے ہیں۔

فضل حسین کی چھٹی پوری ہو گئی۔ وہ مجھے آخری بار ملنے آیا۔ پہلے کی طرح اُس نے سائرہ سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں چلی جائے۔

"آپ مجھے اپنے پاس کیوں نہیں بیٹھنے دیتے؟" —— سائرہ نے اُس سے پوچھا —— "میری قسمت کا فیصلہ آپ میرے سامنے کیوں نہیں کر دیتے ہیں؟"

"بیٹھ جاؤ" —— فضل حسین نے سائرہ سے کہا۔ وہ بیٹھ گئی تو فضل حسین کہنے لگا —— "تمہارے ساتھ ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ اگر تمہیں کسی نے پریشان کیا ہے تو مجھے بتاؤ۔ اگر تم سکندر کے سامنے بتانے سے ڈرتی ہو تو میرے ساتھ باہر چلو اور بتاؤ۔"

"نہیں" — سائرہ نے کہا — "میں تو یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتی" — اُس نے نہ جانے کی وہی وجہ بتائی جو وہ مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی۔

"اس قید سے تو تم ضرور پریشان ہو گی؟"

"جب تک سکندر میرے ساتھ ہے مجھے کوئی پریشانی نہیں" — سائرہ نے کہا۔

فضل حسین ہنس پڑا اور اُسے کہا کہ اُس کے خلاف کوئی بات نہیں ہو گی اور وہ تھوڑی سی دیر کے لئے دوسرے کمرے میں چلی جائے۔

وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"میں صبح کی گاڑی سے جا رہا ہوں" — فضل حسین نے مجھے بتایا — "مجھے اتنی جلدی چھٹی نہیں مل سکے گی۔ ان تینوں ملزموں کو اُڑا دینے کا کام تجمل اور منوّر کر وائیں گے۔"

"بھائی جان!" — میں نے کہا — "یہ کام ان کا نہیں۔ وہ انہیں اُڑا تو دیں گے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اندھا دُھند کوئی قدم اُٹھا بیٹھے تو پھنس جائیں گے۔ انہیں یہ کہہ جائیں کہ مجھے بتائے بغیر کچھ نہ کریں .... بہر حال آپ چلے جائیں میں سنبھال لوں گا۔ ایسے کام سوچ سمجھ کر کئے جاتے ہیں۔"

اگلی صبح پتہ چلا کہ فضل حسین چلا گیا ہے۔ تجمل اور منوّر اُس کے ساتھ گئے تھے۔ برانچ لائن کے ریلوے سٹیشن پر اُسے گاڑی پر چڑھا کر واپس آئے تو میرے پاس آ گئے۔ میرے اشارے پر سائرہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ فضل حسین اُنہیں بڑا پختہ فیصلہ دے گیا ہے کہ یہ تینوں ملزم بری ہو کر آئیں تو تینوں کو صاف کر دینا ہے۔

"ایوب تو شہر میں رہ جائے گا" — میں نے کہا — "اس علاقے میں دو رہ جائیں گے۔ انہیں ہم سنبھال لیں گے، لیکن ایوب کا کیا بنے گا؟"

"اُس کے گھر جا کر مار آئیں گے" — منوّر نے کہا۔

"میں نے اسی لئے بھائی جان سے کہہ دیا تھا کہ تم دونوں مجھ سے پوچھے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھاؤ" — میں نے کہا — "اگر تم ایوب کو اُس کے گھر جا کر

مار آؤ گے تو اگلے ہی روز پولیس تمہیں گرفتار کر کے لے جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہر کی پولیس کو معلوم ہے کہ ایوب کے ساتھ کس کی دشمنی ہے اور دشمنی کیا ہے .... اپنے آپ کچھ نہ کرنا ورنہ ایسے پھنسو گے کہ نکل نہیں سکو گے۔ ان تینوں کو غائب کر دینا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"یہی تو سوچنے والی بات ہے" — میں نے کہا — "مجھے سوچنے دو۔ انہیں باہر آ جانے دو۔"



اس کچے مکان کے قید خانے میں سوچنے کے سوا میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ کبھی یوں لگتا جیسے میں شیر ہوں اور مجھے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے اور کبھی اس احساس سے میرا دم گھٹنے لگتا جیسے میں پنجرے میں بند پنچھی ہوں اور میرے پَر کاٹ دیئے گئے ہیں۔ یہ ارادہ تو کئی بار پیدا ہوا کہ سب کو چھوڑ کر یہاں سے نکل جاؤں .... تجمل اور منوّر کو بھی، سائرہ کو بھی .... اور اُن جنگلوں میں جا کر جہاں انسان کا گزر نہ ہُوا ہو جنگلی جانوروں کی طرح آزاد پھروں۔

ایسا خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دوں اور اس اذیت ناک زندگی سے آزاد ہو جاؤں۔ میری سزا پھانسی تھی اور یہی میری نجات کا راستہ تھا، یہی میری منزل تھی جہاں میرے لئے سکون ہی سکون تھا۔ میں تختۂ دار پر بڑے فخر سے کھڑا ہو سکتا تھا۔ میں نے کسی عورت کی عزّت پر حملہ آور ہو کر اُسے قتل نہیں کیا تھا۔ میں نے تو ایک مجبور اور بے آسرا لڑکی کی عزت بچانے کے لئے اپنے ایک انگریز اعلیٰ افسر کو قتل کیا تھا۔ میں اُس لڑکی کو جانتا ہی نہیں تھا۔ اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ ہندوستانی لڑکی ہے۔

اگر مجھے کبھی یہ خیال آیا کہ چُھپ چُھپ کر زندہ رہنے کی بجائے اس زندگی کا خاتمہ کر لوں تو اس خیال کے ساتھ یہ پختہ ارادہ بھی دل سے اٹھا کہ کسی غریب سے آدمی کے گھر چلا جاؤں گا اور اُسے کہوں گا کہ میرے ہاتھ رسیوں سے باندھو اور مجھے تھانے لے چلو۔ میں بیان دوں گا کہ میں ایک جگہ سو یا

ہُوا تھا۔ اس آدمی نے مجھے پہچان لیا اور رسیوں سے باندھ دیا۔ اسے دس ہزار روپے دے دو۔

میں نے ڈرامہ سوچا ہُوا تھا اور دل ہی دل میں ریہرسل بھی کی تھی۔ میں مر کر بھی کسی کے کام آنا چاہتا تھا مگر ایوب نے مجھے زندہ رہنے پر اور اُسے زندہ رہنے کے حق سے محروم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہیں جس قانون نے معاف کر دینا تھا وہ میرا قانون نہیں تھا۔ میں نے خدائی قانون چلانا تھا۔ میں نے خدا کی لاٹھی بننا تھا جو چلتی ہے نظر نہیں آتی، اُس کی آواز نہیں ہوتی۔



ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ ایوب اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ بری ہو کر آ گیا۔ انہیں تو پہلی پیشی پر ہی بری ہو جانا چاہیئے تھا لیکن مجسٹریٹ نے تین تاریخیں دیں۔ پہلی پیشی پر سب انسپکٹر راجہ شیر خان کا بیان ہوا۔ صفائی کے وکیل نے جرح میں پہلا سوال یہ کیا کہ جن کی لڑکی اغوا ہوتی ہے کیا اُنہوں نے تھانے میں رپورٹ لکھوائی تھی؟

"نہیں" — راجہ شیر خان نے جواب دیا — "چونکہ یہ قتل کا کیس ہے اس لئے علاقہ ڈی ایس پی نے حکم دیا تھا کہ کیس درج کیا جائے پھر ایک ملزم نے اقبالی بیان بھی دے دیا تھا"

بڑی کچی بات تھی۔ اگلی پیشی پر پوسٹمارٹم کرنے والے ڈاکٹر کا بیان ہُوا۔ اُس نے وہی بیان دیا جو میں پہلے سنا چکا ہوں۔ اس پیشی پر تحمل اور منور کے بیان ہوتے۔ دونوں نے کہا کہ عذرا کوٹھے سے گر کر مری ہے۔ تیسری پیشی پر مجسٹریٹ نے تینوں ملزموں کے بیان لے کر مقدمہ ڈسچارج کر دیا۔

عام لوگوں کے لئے یہ کیس مضحکہ خیز نظر آتا ہے کہ لڑکی والے کہہ رہے ہیں کہ لڑکی قدرتی موت مری ہے اور عدالت میں پولیس تین ملزموں کو پیش کر رہی ہے کہ اُنہوں نے لڑکی پر اتنا تشدد کیا کہ وہ مر گئی لیکن قانون کے مطابق پولیس قتل کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ عدالت کے فیصلے سے صرف ملزم ہی بری نہیں ہوتے تھے بلکہ پولیس بھی بری الذمہ ہو گئی تھی۔

اس ایک مہینے کے دوران میری تنہائی کی ساتھی سائرہ تھی۔ وہ مجھ سے میری مفرور زندگی کی کہانیاں سنتی رہتی تھی۔ وہ ایسے انہماک سے سنتی تھی جیسے بچہ جنوں پریوں کے دیس کی کہانیاں سناکرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود سائرہ کے پاس بیٹھ کر بچہ بن جاتا تھا۔ وہ جونہی کوئی بات یا کوئی واقعہ سنانے کو کہتی تھی تو میں اُس بچے کی طرح بولنے لگتا تھا جسے ماسٹر نے کہا ہو کہ سبق سناؤ۔

"سکندر!" — ایک روز سائرہ نے مسکراتے ہوتے کہا — "ایک بات پوچھوں؟ ..... لیکن تم یہ بتاؤ گے نہیں۔ جھوٹ بولو گے"

"پوچھو تو سہی!"

"میں کیسے مان لوں کہ تمہارے تعلقات کبھی کسی عورت کے ساتھ نہیں رہے؟" — اُس نے کہا — "کیا کسی عورت سے تمہارا سامنا کبھی نہیں ہُوا؟"

"تم سے زیادہ خوبصورت اور جوان لڑکی اور کون ہو گی؟" — میں نے کہا — "تم میرے قبضے میں ہو۔ اگر میری نیت بگڑ جاتے تو کیا تم مجھے روک سکو گی؟ تم ہر وقت اور راتوں کی تنہائی میں میرے ساتھ ہوتی ہو، میرے ساتھ لگ کر بیٹھتی ہو۔ میرے دل کو اچھی بھی لگتی ہو ....."

"کیا ہر عورت کے ساتھ تمہارا رویہ یہی رہا ہے؟"

سائرہ نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں، ہر عورت کے ساتھ!" — میں نے کہا — "میں انگریز دل کے قانون کا مفرور ہوں۔ میں کسی حسین عورت کے سہارے اپنے آپ سے فرار نہیں ہونا چاہتا ... ہاں سائرہ! صرف ایک بار میری نیت خراب ہو گئی تھی۔ یہ وہ عورت تھی جس نے مجھے چاہا تھا۔ وہ محبت کی نہیں میرے جسم کی خریدار تھی۔ میں اُس سے بچتا رہا لیکن قدرت نے ہم دونوں کو ایک ہی منزل کے مسافر اور ہمسفر بنا دیا اور ایک رات میں اپنے آوارہ خیالوں میں بھٹک گیا۔ اسی قسم کا کمرہ تھا، ایسی ہی رات تھی، میں تھا اور وہ تھی۔ وہ

سو گئی تھی میں جاگ رہا تھا۔ میں اُسے اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے اُس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ جاگ اُٹھی اور جب اُسے میری نیت کا پتہ چلا تو وہ بھاگ اُٹھی اور باہر نکل گئی۔ میں اُس کے پیچھے دوڑا اور وہ دریا میں کُود گئی۔"

میں نے سائرہ کو گلشن آراء کا سارا واقعہ سنا دیا۔

"تم اُسے جانتی ہو سائرہ؟" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اُس کا نام گلشن ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" ـــــ سائرہ نے پوچھا۔

میں نے اُسے بتایا کہ یہ وہی گلشن ہے جو ہمارے محلے سے کچھ دُور رہتی ہے اور وہ شاہ صاحب کی بیوی ہے۔ سائرہ آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھنے لگی۔

"وہ تو برگزیدہ بی بی ہیں" ـــــ سائرہ نے کہا ـــــ "میں اُن کی مرید ہوں۔ عذرا بھی اُن کی مرید تھی۔ عذرا اُن کے ہاں جاتی رہتی تھی۔ میں اور عذرا کئی بار اُن کے ہاں اکٹھی گئی تھیں۔ ایک بار عذرا نے میری موجودگی میں اُن سے کہا تھا کہ وہ تمہارے لئے دعا کریں۔ اُس نے تمہارا نام لے کر گلشن بی بی سے کہا تھا کہ سکندر میرا منگیتر ہے اور میں سکندر کو ہی چاہتی ہوں۔ گلشن بی بی نے عذرا سے کہا کہ اُڑتے پنچھی کسی کے ہاتھ نہیں آیا کرتے، اور جس پنچھی کا آشیاں ہی نہ ہو وہ ساری عمر کا ساتھی نہیں بن سکتا۔ گلشن بی بی نے یہ بھی کہا تھا کہ سکندر کو بھول جاؤ اور کوئی بھی اچھا آدمی مل جائے اُس کے ساتھ شادی کر لو۔"

"اُس نے ڈوب کر نئی زندگی پائی ہے" ـــــ میں نے سائرہ سے کہا۔

بہت دیر گلشن آراء کی باتیں ہوتی رہیں۔

باتوں ہی باتوں میں ایک مہینہ گزر گیا اور مجھے اطلاع ملی کہ ایوب اپنے ساتھیوں کے ساتھ بری ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تجمل اور منور میرے پاس آ گئے۔

ہم جو کام کرنا چاہتے تھے اس میں مشکل یہ تھی کہ ایوب شہر میں تھا اور اُس کے ساتھی اپنے گاؤں میں۔ انہیں غائب کرنا تھا لیکن سب کو ایک ہی بار غائب کرنا ضروری تھا۔ تجمل اور منور میرے پیچھے پڑ گئے کہ یہ کام فوراً ہو جانا ہے۔ میں ان کے غصے کو سمجھتا تھا۔ میں اُن سے زیادہ غصے میں تھا، لیکن اتنے بڑے جرم کی پلاننگ بہت ضروری ہوتی ہے۔ ایک طرف میں انہیں ٹھنڈا کرتا تھا دوسری طرف میں سوچتا تھا کہ یہ کام کس طرح کیا جائے کوئی محفوظ طریقہ دماغ میں نہیں آتا تھا۔

میں آج بھی یہی محسوس کرتا ہوں کہ خدا خود ہی سبب بنا دیتا ہے۔ میں بہت دنوں سے ایک پہنچ والے بزرگ کے متعلق باتیں سن رہا تھا۔ میں سائرہ کے ساتھ جن دو بھائیوں کے مکان میں رہتا تھا وہ اُس کا زیادہ ذکر کرتے تھے اور دونوں اُس کے مرید تھے۔ دو تین اور آدمیوں سے بھی میں نے اس بزرگ کی باتیں اور کرامات سُنیں۔ اُس کا نام کرامت شاہ بتایا جاتا تھا۔ اس سارے علاقے میں وہ "سائیں کراماں والے" کے نام سے مشہور تھا۔

"چوہدری صاحب!" ـــــ ان دونوں بھائیوں نے مجھے تین چار مرتبہ کہا تھا ـــــ "اس جاگیر پر ہمیشہ اللہ کا کرم رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ میں نے بڑے چوہدری صاحب سے بھی کہا تھا کہ کسی منگل کے روز کراماں والی سرکار کو بلائیں۔ اگر کسی نے کوئی تعویذ جادو یا کالا علم چلایا ہُوا ہے تو وہ صاف ہو جائے گا۔"

میں نے ایک بار تجمل سے پوچھا تھا کہ یہ سائیں کراماں والا کوئی پیر ہے یا کیا چیز ہے۔ تجمل نے بتایا تھا کہ یہ کوئی پرانی گدی نہیں نہ ہی سائیں کراماں والا گدی نشین ہے۔ شاید دو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے کہ وہ خدائی اشارے پر یہاں کہیں چلہ کشی کے لئے آیا تھا اور اس نے کچھ ایسی کرامات دکھائیں کہ لوگوں نے اُسے یہیں رکھ لیا اور ایک بڑا اچھا مکان بھی دے دیا۔

یہ گاؤں جہاں کرامت شاہ رہتا تھا، جاگیر سے دس بارہ میل دُور تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ پیروں کی طرح مریدوں کے گاؤں اور گھروں میں نہیں جاتا، لیکن کبھی کبھی کسی گاؤں کے زیادہ تر لوگ اسے لینے جائیں تو وہ چلا جاتا ہے اور وہ صرف منگل کے روز جاتا ہے۔ اُس کی یہ دلچسپ شرط بھی مجھے بتائی گئی کہ منگل کے روز جاتا ہے اور اُسی روز واپس آجاتا ہے اور اگر اُس کے مرید یعنی میزبان اُسے روکنے پر مجبور کریں تو وہ ایک دو دنوں کے لئے نہیں رُکتا بلکہ اگلے منگل کے روز تک وہیں رہتا ہے اور شام کو واپس جاتا ہے۔

دو تین دن ہی گزرے ہوں گے کہ یہ دونوں بھائی جو میرے میزبان تھے بڑی خوشی خوشی میرے پاس آئے اور مجھے یہ خبر سنائی کہ سائیں کراماں والے اگلے گاؤں جا رہے ہیں اور وہ یہاں سے گزریں گے۔ یہ بھائی اتنے خوش تھے جیسے انہوں نے سب سے پہلے عید کا چاند دیکھ لیا ہو۔ جس گاؤں اُس نے جانا تھا وہ میری جگہ سے دو میل یا ذرا زیادہ تھا۔

میں نے اپنے خیالات آپ کو پہلے بھی بتاتے ہیں۔ میرے پیر اللہ کے رسولؐ تھے آپؐ کے بعد میں اولیائے کرام کو مانتا تھا لیکن کچھ مانگنا ہوتا تھا تو وہ میں اللہ کے دربار سے مانگتا تھا۔ میں ان دونوں بھائیوں کی خوشی پر ہنس رہا تھا۔ اُن کے پیر کے گزرنے میں ابھی دو تین دن باقی تھے۔



دو تین دن گزر گئے۔ ایک صبح ان دونوں بھائیوں نے دُھلے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ آج سائیں کراماں والے یہاں سے گزریں گے۔

"چوہدری صاحب!" — ایک بھائی نے کہا — "آپ باہر تو نہیں آسکتے۔ کواڑ ذرا سا کھول کر اُن کی زیارت ضرور کرنا۔"

"ہم سرکار کو ایک دو منٹوں کے لئے تو روک سکتے ہیں" — دوسرے بھائی نے کہا — "ہم اپنے دروازے میں کھڑے رہیں گے۔ جب سرکار

آئیں گے تو ہم اُن کے پاؤں میں بیٹھ جائیں گے۔ پھر اُٹھ کر اُن کے ہاتھ چومیں گے۔ آپ کواڑ کے پیچھے کھڑے ماتھے پر ہاتھ رکھ دینا۔ بس آپ کا سلام اُن تک پہنچ جائے گا۔"

"ایسے ہی کرنا" — میں نے کہا — "میں دروازے کے پیچھے کھڑا رہوں گا۔"

کراماں والی سرکار شاید سحری کے وقت ہی چل پڑی تھی۔ یہ دو بھائی میرے کمرے سے نکلے تو کچھ ہی دیر بعد باہر سے آوازیں آنے لگیں — "سائیں کراماں والے آرہے ہیں" — دونوں بھائی تیز دوڑتے میرے کمرے میں آئے اور یہ کہہ کر گولی کی طرح کمرے سے نکل گئے کہ آپ دروازے میں آجائیں۔

ان کے جانے کے بعد میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے سائرہ سے کہا کہ یہ لوگ اتنے مجبور اور پسماندہ ہیں کہ سمجھتے ہیں کہ ان کے تمام مسائل کا حل ان پیروں وغیرہ کے ہاتھ میں ہے۔

"تمہاری قسمت اسی لئے خراب ہے کہ تم پیروں اور بزرگوں کو نہیں مانتے" — سائرہ نے کہا — "کسی بزرگ کی مریدی کر لو۔ شاید انہی کے صدقے تمہاری مصیبت ختم ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ میرا بھائی بھی سائیں کراماں والے کا مرید ہے۔ دو تین بار اُس نے گھر میں ان کا ذکر بھی کیا تھا، لیکن اباجان ایک اور پیر کے مرید ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ میرے بھائی نے کتنا بڑا جرم کیا ہے۔ وہ تمہاری قید سے بھی نکل گیا، گھوڑی کی چوری سے بھی بری ہو گیا اور عذرا کے قتل سے بھی ایک مہینے میں بری ہو کر آگیا ہے۔ تم بھی ان کی بیعت کر لو۔"

"آؤ" — میں نے سائرہ سے کہا — "دروازے کے پیچھے کھڑے ہو کر کراماں والی سرکار کو دیکھتے ہیں۔ ان کو سلام کرنے سے کچھ حاصل ہو نہ ہو، یہ دونوں بھائی خوش ہو جائیں گے۔"

میں سائرہ کو ساتھ لے کر صحن میں گیا اور بڑے دروازے کے ساتھ

لگ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک راستہ تھا جو گاؤں کے باہر باہر سے گزرتا تھا اور یہ مکان اس راستے پر تھا۔ باہر کے شور سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سارے گاؤں کی آبادی باہر آگئی ہو۔ اس سے اس سائیں کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا تھا۔

مجھے کلمہ شریف کے وِرد کی گونج سنائی دینے لگی۔ بہت سے لوگ ایک آواز میں کلمہ شریف پڑھتے آرہے تھے۔ باہر جو بے ہنگم غل غپاڑہ سنائی دے رہا تھا وہ خاموش ہو گیا اور ان لوگوں نے بھی کلمہ شریف کا ورد شروع کر دیا۔ پھر تین چار آوازیں سنائی دیں —— "پیچھے ہٹ جاؤ۔ پیچھے ہٹ جاؤ"۔

تھوڑی ہی دیر بعد گھوڑے کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی اور کلمہ شریف کا وِرد بھی جاری تھا۔ یہ مقدس گونج مجھے بہت اچھی لگی بے اختیار میری زبان پر بھی کلمہ شریف آگیا اور سارا بلند آواز سے کلمہ شریف پڑھنے لگی پھر ایسے ہُوا جیسے میں اس مقدس گونج کے ساتھ بہہ رہا ہوں اڑا جا رہا ہوں۔

میں نے ایک کواڑ ذرا سا کھولا۔ میں صرف ایک آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں بھائی جو دروازے کے ساتھ لگے کھڑے تھے آگے ہو گئے اُنہوں نے سائیں کراماتاں والے کا گھوڑا روک لیا۔ وہ بڑے تندرست توانا گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑے پر سبز چادر پڑی ہوئی تھی اور اس چادر پر ستارے ٹانکے ہُوتے تھے۔ میں بڑی اچھی طرح سائیں کو دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے کی باگ جس آدمی کے ہاتھ میں تھی اُس کے چہرے پر صحت اور تندرستی کی رونق تھی۔ اُس کا رنگ گورا تھا اور اُس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ اُس کی داڑھی گہرے بادامی رنگ کی تھی جو سلیقے سے تراشی ہوتی تھی۔ سر پر پگڑی تھی جو کُلے کی بجاتے لال ٹوپی پر باندھی ہوتی تھی۔ اُس کے اُوپر بڑے سائز کا سبز رومال ڈلا ہُوا تھا جو کندھوں سے نیچے تک گیا ہُوا تھا۔

میرے میزبان بھائیوں نے سائیں کے گھوڑے کو روک لیا تھا۔ ان

دونوں نے سائیں کا ایک پاؤں جو رکاب میں تھا چُوما اور اس پر ماتھا رگڑا۔ اُن کی دیکھا دیکھی لوگ ٹوٹ پڑے۔ سب سائیں کے پاؤں پر ماتھا رگڑتے تھے۔ میں نے سائیں کو بڑی غور سے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر بھی رونق تھی اور اُس کے سراپا میں پیروں والا جلال تھا۔

مجھے یوں دھچکا لگا جیسے سامنے سے کسی نے مجھے دھکا دیا ہو۔

گورے رنگ اور نیلی آنکھوں والے جس آدمی نے گھوڑے کی باگ پکڑ رکھی تھی وہ بلاشک وشبہ نوابزادہ حمید اللہ خان تھا اور سائیں کراماتاں والا جو گھوڑے پر سوار تھا ہمارا دوست نور اللہ تھا۔

اگر میں اپنے آپ پر قابو نہ پالیتا تو میں دروازہ کھول کر دوڑ پڑتا اور ان دونوں کے گلے لگ جاتا۔ میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ دونوں مارے جا چکے ہیں یا گرفتار ہو گئے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ہم اُس جگہ جدا ہوتے تھے جہاں فوج اور پولیس کے ساتھ ہمارا مقابلہ ہُوا تھا۔ میں پیچھے ہٹتے ہٹتے سیلابی دریا میں کُود گیا تھا۔ کچھ دُور تک مجھے مشین گنوں کے فائر کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرے باقی ساتھی مارے گئے ہیں۔ میں ایک تو قدرتی طور پر گرا تھا اور مجھے ٹریننگ بھی ایسی ہی ملی تھی۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ میرے ساتھی مشین گنوں سے بچ کر دریا میں کُود آتے تو بھی زندہ نہیں نکل سکیں گے۔ سیلاب اچھال اچھال کر پھینکتا اور ڈبوتا تھا۔

ان دونوں کو زندہ دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوئی جتنی میرے میزبان بھائیوں کو اپنے سائیں کراماتاں والی سرکار کی آمد پر ہوئی تھی۔ ان دونوں بھائیوں کی مرادیں پوری ہوئی تھیں یا نہیں البتہ میری مرادیں سائیں کرامت شاہ اور اُس کے خاص مرید کو دیکھ کر ہی پوری ہو گئیں۔ میں پر کچھ حیران ہُوا کہ پہنچ والا بزرگ یا سائیں نور اللہ بنا تھا اور حمید اللہ اُس کے خاص مرید کا رول ادا کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حمید اللہ خان کے مقابلے میں نور اللہ زیادہ اچھا ایکٹر تھا اور زبان کا جادو چلانا جانتا

ان دونوں کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ میری طرح اشتہاری ملزم تھے۔ حمیداللہ جیل سے بھاگا تھا، لیکن اُس کی گرفتاری پر انعام نہیں تھا۔

حمیداللہ خان نے لوگوں کو دھکے دے کر پیچھے ہٹایا اور گھوڑا بڑھا۔ ایک جلوس تھا جو میری نظروں کے سامنے سے گزر گیا۔



میں نے سائرہ کو نہ بتایا کہ میں نے کیا دیکھا ہے۔

رات کو جب ہم کھانا کھا چکے تو تجمل آ گیا۔ اُس کا وہی سوال تھا کہ میں نے کیا سوچا ہے۔ میں نے اُسے وہی جواب دیا جو پہلے بھی کئی بار دے چکا تھا۔

وہ چلا گیا تو میں اُٹھا۔ دوسرے کمرے کے دروازے کے ساتھ کان لگائے۔ دونوں بھائیوں کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

"سائرہ!" — میں نے کہا — "تم نے کہا تھا کہ میں کسی کے ہاتھ پہ بیعت کر لوں۔ میں نے سائیں کراماتاں والے کو دیکھا تو میں نے اپنے دل پر ایسا اثر محسوس کیا جیسے اس بزرگ کی ہستی میری روح میں اُتر آئی ہو۔ میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ دن کے وقت تو میں نکل نہیں سکتا۔ رات کا وقت ہی ہے کہ میں جا سکتا ہوں۔"

"وہاں اور بہت سے لوگ ہوں گے" — سائرہ نے کہا — "کوئی تمہیں پہچان نہ لے۔"

"میں اپنے سر اور مُنہ پر چادر لپیٹ کر رکھوں گا" — میں نے کہا — "تم اکیلی ڈرنا نہیں۔ میرے ساتھ باہر تک آؤ۔ باہر کے دروازے کی زنجیر اندر سے چڑھا دینا اور دعا کرنا کہ میں ٹھیک ٹھاک واپس آ جاؤں۔"

"تم ٹھیک ٹھاک واپس آ جاؤ گے" — سائرہ نے کہا — "تم ایک پہنچ والی سرکار کے ہاتھ پر بیعت کرنے جا رہے ہو۔ وہ کرامات والے ہیں۔

تمہیں پہچاننے والے اندھے ہو جائیں گے۔"

میں نے ریوالور نکالا۔ اس میں چھ گولیاں ڈالیں اور نیفے میں اُڑ لیا۔ باقی گولیوں والی پیٹی کُرتے کے نیچے کمر سے باندھ لی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ گاؤں کس طرف ہے۔ میں اُس طرف چل پڑا۔



دیہاتی علاقے کی رات سنسان اور اُجاڑ تھی۔ میں پگڈنڈی پر جا رہا تھا۔ سوائے دو تین گیدڑوں کے جو میرا راستہ کاٹتے اور دوڑتے گزر گئے تھے کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ میرے لئے دو میل پیدل فاصلہ کچھ بھی نہ تھا۔

دیہات کے لوگ رات گہری ہوتے ہی گہری نیند سو جایا کرتے ہیں، لیکن اس گاؤں میں رات زندہ و بیدار تھی۔ لوگ گلیوں میں گھوم پھر رہے تھے۔ سائیں کراماتاں والے نے اس گاؤں کو بہت بڑا اعزاز بخشا تھا۔ اِرد گرد کے گاؤں کے لوگ بھی سائیں صاحب کے سلام کے لئے آئے ہوئے تھے۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ کراماتاں والی سرکار کس گھر میں ٹھہری ہوئی ہے۔ اس طرح میں ایک حویلی تک پہنچ گیا جو کسی خوشحال زمیندار کی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ سرکار صحن میں تشریف رکھتے ہیں۔

میں ڈیوڑھی میں سے گزر کر صحن والے دروازے میں پہنچا تو دو آدمیوں نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگے کہ سرکار کے آرام کا وقت ہو گیا ہے۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ اب اور کوئی نہ آئے۔

"میں سرکار کے گاؤں سے آیا ہوں" — میں نے کہا — "ایک ضروری پیغام لایا ہوں۔"

میرا جھوٹ کام کر گیا اور میں اپنے کراماتاں والے ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے جو چادر اُوپر لے رکھی تھی اس میں سے میری صرف آنکھیں اور ناک ننگی تھیں۔ نوراللہ پیر بنا بیٹھا تھا۔ اُس کے پیچھے گول تکیہ رکھا تھا۔ اُس سے ذرا ہٹ کر نواب زادہ حمیداللہ خان بیٹھا تھا اور قدمبوسی کرنے والوں کو ٹریفک پولیس کی طرح کنٹرول کر رہا تھا۔ میں نے قدمبوسی کرنے والوں

کی قطار میں بیٹھنے کی بجائے یہ جرأت کی کہ حمید اللہ کے پاس جا بیٹھا۔

"بھائی صاحب!"— حمید اللہ نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا— "وہاں جا کر بیٹھیں اور اپنی باری پر آئیں۔ سرکار نے سفر کیا ہے۔ انہوں نے آرام بھی کرنا ہے۔"

"میں تو آپ کے پاس آیا ہوں بھائی صاحب!"— میں نے سرگوشی کی اور اس طرح اُس کے پاس بیٹھ گیا کہ میری پیٹھ لوگوں کی طرف ہو گئی اور مُنہ اُس کی طرف رہا۔ میں مُنہ اُس کے مُنہ کے اتنا قریب لے گیا تھا کہ دونوں کی سانسیں ٹکرانے لگیں۔ میں نے سرگوشی میں کہا— "ذرا دیکھو"— میں نے چہرے سے چادر اس طرح ہٹائی کہ پیچھے والوں کے لئے یہ دُلہن کا گھونگھٹ بن گیا اور حمید اللہ خان نے مجھے اچھی طرح دیکھ لیا۔

حمید اللہ خان کھانسا اور اُس نے نور اللہ کی طرف دیکھا جو اس وقت "سائیں کرامتاں والے" تھا۔

نور اللہ نے جلالی سے انداز سے ہماری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ حمید اللہ کی کھانسی ان کا خاص سگنل ہے۔ میں نے چادر کو چہرے سے اور زیادہ ہٹا کر گھونگھٹ کو پھیلا دیا۔ نور اللہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس نے بازو میری طرف لمبا کر کے ہاتھ سے شہنشاہوں کی طرح اشارہ کیا جیسے وہ کسی غلام کو بلا رہا ہو۔

میں پاؤں پر سرکتا اُس کے قریب گیا۔ پیٹھ لوگوں کی طرف رکھی۔ نور اللہ کے سامنے جا کر اُس کے پاؤں پر سجدہ کیا۔ پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر چُوما۔ اُس نے میری پیٹھ پر تھپکی دی۔ میں نے اس طرح آہستہ آہستہ سر اُٹھایا کہ مُنہ نور اللہ کے مُنہ کے قریب لے گیا۔

"حرامزادے!"— میں نے سرگوشی کی— "پاؤں تو دھو لیا کرو۔ پسینے کی بدبُو آتی ہے۔"

میں اب اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے اور اس طرح مسکرایا جیسے پیر صاحب اپنے ایک ادنیٰ مرید

پر بہت خوش ہوتے ہوں۔ اُس نے حمید اللہ خان کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور آہستہ سے کہا کہ مجلس برخاست کر دی جائے۔

"بھائیو!"— نوابزادہ حمید اللہ خان نے کھڑے ہو کر اعلان کیا— "سرکار کے آرام کا وقت ہو گیا ہے اور سرکار کے ایک مصاحب خاص بڑی دُور سے تشریف لاتے ہیں۔ سرکار نے فرمایا ہے کہ اب آپ جائیں۔ فجر کی نماز کے بعد سرکار سب کو سلام کا موقع دیں گے۔ اب سرکار دعا فرمائیں گے۔ اللہ تبارک تعالیٰ اس گاؤں پر رحمت کا مینہ برسائیں گے۔"

نور اللہ نے ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھائے۔ میں نے بھی ہاتھ اُٹھائے۔ نور اللہ کچھ بڑبڑا رہا تھا اور وہ یقیناً اللہ اور رسولؐ کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ اور آگے اور اُوپر کر دیئے۔

"ابرِ رحمت برسا"— اُس نے بلند آواز سے کہا۔

حاضرین نے بلند آواز سے کہا— "آمین"۔

"رحمت۔ رحمت۔ برکت۔ شفقت"— نور اللہ کہہ رہا تھا— "اس گاؤں پر!"

"آمین!"

"ہر مسلمان پر، ہر ہندو، سکھ اور عیسائی پر!"

"آمین!"

اور نور اللہ نے کچھ بڑبڑا کر ہاتھ مُنہ پر پھیرے اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔



چند لمحوں بعد ہم حویلی کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ حمید اللہ اور نور اللہ کھانا پہلے ہی کھا چکے تھے۔ حویلی کا مالک ایک معمر زمیندار تھا جو حویلی پکی اور کشادہ تھی۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ شخص روپے پیسے والا ہے۔ اس کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ کمرہ سجا ہُوا تھا۔ کارنس پر چینی کے برتن سلیقے سے رکھے ہوتے تھے۔ دیواروں کے ساتھ شیشے اور فریموں میں "یا اللہ" "یا محمدؐ" "یا علیؑ مشکل کشا" اور خانہ کعبہ کی ایک تصویر لگی ہوئی تھی۔

معمر زمیندار عقیدت اور بندگی کا مجسمہ بنا دروازے میں کھڑا تھا۔

"سائیں کراماتاں والا" کسی مرید کے ساتھ براہِ راست ہمکلام نہیں ہوتا تھا۔ وہ حمیداللہ خان سے کچھ کہتا یا اشارہ کرتا اور حمیداللہ خان مریدوں کو بتاتا تھا کہ سرکار نے کیا کہا ہے۔

نوراللہ نے حمیداللہ کو اشارہ کیا۔ حمیداللہ نے معمر زمیندار سے کہا کہ وہ چلا جائے۔ زمیندار نے دونوں ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھے اور جس قدر جُھک سکتا تھا اس سے زیادہ جُھکا اور اسی پوزیشن میں وہ پیچھے کو چل پڑا۔ دروازے سے باہر جاکر وہ سیدھا ہُوا ہوگا۔ حمیداللہ خان نے دروازہ بند کرکے چٹخنی چڑھا دی اور اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر اتنی زور سے بھینچا جیسے میری پسلیاں توڑ دے گا۔ اُس نے چھوڑا تو نوراللہ نے دبوچ لیا۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم تینوں مر گئے تھے اور اگلے جہان میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ آپ اندازہ کرسکتے ہوں گے کہ ایک دوسرے کو مرا ہُوا سمجھ کر ہم ملے ہوں گے تو کس قدر خوش ہوں گے اور ہمارے تاثرات کیا ہوں گے۔ میری جو کیفیت تھی وہی اُن دونوں کی ہوگی۔ کیفیت یہ تھی کہ ایک ہی بار بے شمار خیالات اور گزرے ہُوئے دن ہجوم کرکے ذہن میں آگئے۔

ہم نے ایک دوسرے سے سب سے پہلا سوال یہ پوچھا تھا کہ تم اتنا عرصہ کہاں رہے اور آخری پولیس مقابلے سے کس طرح نکلے تھے، لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا اور وہ موقع بھی ایسا نہیں تھا۔ مجھے اُس گاؤں میں زیادہ دیر ٹھہرنا بھی نہیں چاہیے تھا جہاں باہر کے دیہاتیوں کا بھی ہجوم اکٹھا ہوگیا تھا۔

کوئی بعید نہیں تھا کہ سی آئی ڈی کے آدمی بھی اس ہجوم میں ہوں۔ پولیس کے مخبر تو بہرحال موجود تھے۔

"میرے دوستو!" — میں نے اُنہیں کہا — "یہ میں تم سے پھر کبھی سنوں گا کہ تم یہاں تک کس طرح پہنچے۔ پہلے میری سُن لو۔ میں ذرا مشکل میں بھی پھنسا ہُوا ہوں۔ اچھا ہُوا کہ تم مل گئے۔ مجھے تمہاری مدد کی بھی ضرورت ہے۔"

"مدد کیسی؟" — نوابزادہ حمیداللہ خان نے کہا — "ہمارے پاس آجاؤ۔ بات ختم۔"

"آنا تو تمہارے ہی پاس ہے" — میں نے کہا — "لیکن ایک کام کرنا ہے۔ میں بات لمبی نہیں کروں گا۔ مجھے واپس جانا ہے۔"

"بولو، بولو" — نُوراللہ نے کہا — "فوراً بولو۔"

میں نے اُنہیں مختصر طور پر سنا دیا کہ میں انسپکٹر فضل حسین کی اس پناہ تک کس طرح پہنچا تھا اور یہاں کیا واقعہ پیش آگیا۔ عذرا کے متعلق بتایا کہ وہ میری خالہ زاد تھی اور وہ منوّر کی بیوی کس طرح بنی اور ایوب نے اُسے کس انجام تک پہنچایا۔

"وہ بری ہوکر آگیا ہے" — حمیداللہ نے کہا — "ہمیں کل ہی اطلاع ملی ہے۔"

"کیا وہ تمہارے پاس آتا رہتا ہے؟"

"ہاں" — حمیداللہ نے جواب دیا — "کبھی کبھی آتا ہے۔"

"کیا اُس نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں یہاں ہوں؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "اس عرصے میں وہ ہمارے پاس نہیں آیا۔"

"میں نے ایوب کو اور اُس کے دونوں ساتھیوں کو اس طرح صاف کرنا ہے کہ نہ ان کا کوئی سراغ ملے نہ انہیں غائب کرنے والوں کا" — میں نے کہا — "اس سلسلے میں تمہاری مدد چاہیے۔"

"اُس کے ساتھیوں کا نام مرزا اور کُبا تو نہیں؟" — نُوراللہ نے پوچھا۔

"یہی نام ہیں" — میں نے جواب دیا — "میں نے اُن کے متعلق سب کچھ معلوم کرلیا ہے۔ مرزے کا نام مرزا رشید بیگ ہے اور کُبے کا نام یعقوب خان ہے اور میں ان کے گاؤں کو بھی جانتا ہوں۔"

"سکندر یار!" — حمیداللہ خان نے کہا — "یہ دونوں تو ہمارے خاص آدمی ہیں۔ ایسے کچھ اور آدمی ہیں جنہوں نے ہماری پیری مریدی کی بنیاد ڈالی"

مضبوط کی ہیں۔ لوگوں کو ہماری ایسی ایسی کرامات سناتے ہیں کہ دُور دُور سے لوگ اس اُلو کے پٹھے نُوراللہ کو سائیں کراماتاں والا سمجھ کر آجاتے ہیں۔"

"تم مجھے یہ ایک کرامت دکھا دو" ——میں نے کہا —— "میری یہی مراد ہے۔ یہ پوری کر دو۔"

"اور یہ تو تم جانتے ہی ہو" —— حمید اللہ نے کہا —— "کہ ایوب اپنا پُرانا یار ہے۔"

"کیا تم بیوقوف نہیں ہو نوابزادے!" —— میں نے کہا —— "تینوں تم دونوں کی اصلیت سے واقف ہیں۔ تینوں جرائم پیشہ ہیں۔ تینوں کا واسطہ پولیس سے پڑتا ہے۔ کسی بھی وقت یہ کسی سنگین جُرم میں پکڑے گئے تو پولیس کپتان کے ساتھ سودا کر کے تمہیں پکڑوا دیں گے۔ اس کی ایک مثال سامنے آچکی ہے۔ کُبے نے اقبالی بیان دے دیا تھا کہ ایوب اور مرزا نے عذرا کو اغوا کیا تھا اور پھر اُس پر تشدد کرتے رہے ہیں ... حمید بھائی اِن سانپوں پر اعتبار کر رہے ہو! انہیں غائب کرنا ضروری ہے۔"

"ایک سودا کرتے ہو؟" —— حمید اللہ نے پوچھا۔

"بولو۔"

"ایوب کی بہن دیتے ہو؟" —— حمید اللہ نے مُسکراتے ہُوئے پوچھا۔

"اُس کی طرف تم نے بدنیتی سے دیکھا تو تمہاری آنکھیں نکال دوں گا" —— میں نے جواب دیا —— "یہ پہلی لڑکی ہے جو میرے دل میں اُتر گئی ہے ... مذاق میں مت ٹالو۔ میری بات پر غور کرو۔"

"غور کر لیا ہے یار!" —— نوراللہ نے کہا —— "تم نے ٹھیک کہا ہے۔ ان پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ کیوں نوابزادے!"

"بات تو ٹھیک ہے بھائی!" —— نوابزادہ حمید اللہ نے کہا —— "ٹھیک نہ بھی ہو تو سکندر کی بات کو میں کیسے ٹال سکتا ہوں۔"

"تم دونوں یہاں کب تک ہو؟" —— میں نے پوچھا۔

"ہم اس طرح باہر کسی کے ہاں اتنا زیادہ نہیں جایا کرتے" —— حمید اللہ

نے جواب دیا —— "جائیں بھی تو منگل کی صبح جاتے ہیں اور اُسی شام واپس آجاتے ہیں۔ آج کا منگل گزر گیا ہے اس لئے ہم اگلے منگل تک یہیں رہیں گے۔"

"میں کل آؤں گا" —— میں نے کہا —— "کچھ سوچ کر رکھنا۔"

میں اُٹھا اور چل پڑا۔ میں نے یہ ملاقات بہت ہی مختصر سنائی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ اتنی نازک اور خطرناک باتیں کرنے سے میں جھجکا نہیں تھا۔ ایک تو ہم ایک ہی منزل کے مسافر تھے اور دوسرے یہ کہ ہم میں بہت ہی زیادہ پیار تھا۔ ہمارا ایک اور ساتھی بھی تھا جس کا نام بالا تھا۔ اس کے متعلق ان دونوں نے بتایا کہ کچھ پتہ نہیں کہ وہ کدھر نکل گیا ہے۔

میں جب واپس آرہا تھا تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں ہوا میں اُڑا جا رہا ہوں۔ واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو سائرہ بڑی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ میں جب اپنی چارپائی پر لیٹا تو اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ وہ اُٹھ کر میری چارپائی پر آبیٹھی اور پوچھنے لگی کہ سائیں کراماتاں والے سے ملاقات ہوئی ہے یا نہیں۔

"ہاں سائرہ!" —— میں نے کہا —— "میں ان کے ہاتھ پر بیعت کر آیا ہوں!"

"اب تم دیکھنا تمہاری مشکلیں آسان ہو جائیں گی" —— سائرہ نے کہا۔

صبح سویرے سویرے تجمّل اور منور آگئے۔ حسبِ معمول سائرہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ انھوں نے پھر وہی قصّہ چھیڑ دیا کہ میں نے کیا سوچا ہے۔

"بہت کچھ سوچ لیا ہے" —— میں نے کہا —— "میں نے تمہیں کئی بار کہا ہے کہ کسی کو قتل کرنا کوئی مشکل نہیں۔ اصل مسئلہ لاش اور جُرم کو چھپانے کا ہوتا ہے۔"

دونوں بھائیوں نے سائرہ کے متعلق بھی کچھ باتیں کیں۔ میں نے

انہیں کہا کہ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے۔ پہلے ایک کام کر لیں پھر اس کے متعلق سوچیں گے۔ اسے ابھی امانت ہی سمجھو۔ اُن کے جانے کے بعد دن گزارنا مشکل ہو گیا کیونکہ میں نے رات کو اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں کے پاس جانا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ دن فوراً گزر جائے۔ میں کچھ دیر صحن میں ٹہلتا رہا پھر سائرہ کے ساتھ گپ شپ ہوتی رہی اور اس طرح کچھ سوتے کچھ جاگتے دن گزر گیا۔ شام کا کھانا کھا کر میں چل پڑا۔ میرے دوستوں نے کہا تھا کہ میں دیر سے آؤں اس لئے میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔

اُس گاؤں میں وہی رونق تھی جو میں نے گزشتہ رات دیکھی تھی۔ میں حویلی میں سے گزر کر اندر چلا گیا اور گزشتہ رات ہی کی طرح لوگوں کی طرف پیٹھ کر کے حمید اللہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد حمید اللہ نے کل والا اعلان کیا اور مجلس برخاست کر دی۔ میں ان دونوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ابھی ہم نے بات شروع کی ہی تھی کہ دروازہ کھُلا اور جو آدمی اندر آیا اُسے دیکھ کر میں بھڑک اُٹھا —— وہ ایوب تھا —— مجھے دیکھ کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ کچھ دیر کمرے میں سکوت طاری رہا۔ حمید اللہ کے کہنے پر ایوب آگے آیا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"سکندر کو دیکھ کر اتنا گھبرا کیوں گئے ہو؟" —— نور اللہ نے ایوب سے پوچھا۔

"یہ اسی سے پوچھو" —— ایوب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کوئی خاص [illegible] ہو گئی ہے؟" —— حمید اللہ خان نے پوچھا —— "یا سکندر کو یہاں دیکھ کر حیران ہو گئے ہو؟"

"حمید بھائی!" —— ایوب بولا —— "اسے کہو میری بہن مجھے واپس کر دے۔"

"تمہاری بہن اس کے پاس کس طرح پہنچ گئی ہے؟" —— حمید اللہ خان نے پوچھا۔

"میں نہیں بتاؤں گا" —— ایوب نے کہا —— "اسی سے پوچھو۔"

"ایوب خان!" —— نور اللہ نے کہا —— "تمہاری بہن زندہ تو ہے پر تم نے جس طرح اس کی بہن کو مارا ہے وہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ کون برداشت کر سکتا ہے!"

میں خاموش بیٹھا سُن رہا تھا اور اپنے آپ کو کنٹرول کرنے میں مجھے بڑی ہی مشکل پیش آ رہی تھی۔ اگر میں اپنے قابو سے نکل جاتا تو ایوب کا وہیں گلا گھونٹ دیتا۔

"اس شخص سے ایک بات پوچھو" —— میں نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا —— "اس نے میری بہن کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور اس کی بہن نے مجھے پہلے روز ہی کہا تھا کہ وہ کنواری ہے اور اپنے بھائی کی طرح بدمعاش اور بدکار نہیں۔ اگر وہ واقعی کنواری ہے تو آج بھی وہ کنواری ہی ہے۔ میں نے اُسے ایک پاک امانت کی طرح سنبھال کر رکھا ہوا ہے اور ان لوگوں سے اس کی بہن کی عزت کو بچایا ہوا ہے جنہوں نے مجھے پناہ میں رکھا ہوا ہے اور وہ کہتے تھے کہ میں یہ لڑکی اُن کے حوالے کر دوں۔ اس شخص میں اتنی غیرت نہیں جتنی مجھ میں ہے۔ اس کی بہن کو میں نے اپنے شہر کی لڑکی سمجھ کر سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔"

میری اس بات پر ایوب کا ردِ عمل یہ تھا کہ وہ اُٹھا اور ہاتھ جوڑ کر میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"سکندر بھائی!" —— اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا —— "سارے شہر میں میری بے عزتی ہو رہی ہے۔ میرے ماں باپ مجھ پر لعنتیں بھیجتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہاری کرتوت نے ہماری پردہ دار اور شریف بیٹی کو اغوا کرایا ہے اور سارے شہر میں پورے خاندان کو رسوا کر دیا ہے۔"

"او تے بے غیرت!" —— میں نے ایوب سے کہا —— "میں نے تمہیں گھوڑی کی چوری کے مقدمے سے بچایا ہے اور جس مقدمے سے

تم بری ہو کر نکلے ہو وہ مقدمہ میں نے مضبوط نہیں ہونے دیا تھا۔"

"سکندر!" ـــ اس نے پھر میرے آگے ہاتھ جوڑے اور بولا ـــ "مجھے عذرا کا خون معاف کر دو۔"

میں نے حمیداللہ خان کی طرف دیکھا۔ وہ اور نوراللہ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ دونوں نے میری طرف دیکھا۔ ہم آپس میں آنکھوں کے ایسے اشارے سمجھ لیا کرتے تھے جو کسی اور کو نظر ہی نہیں آ سکتے تھے۔



"ادھر آ ایوب بھائی!" ـــ حمیداللہ خان نے کہا ـــ "یہاں بیٹھ" ـــ پھر اُس نے مجھ سے کہا ـــ "میری بات مان لینا سکندر! تمہاری بہن کی جس طرح لکھی تھی اس طرح وہ مر گئی ہے۔ تم اب ہر بھائی کی بہن کو قتل کر دو تو بھی تمہاری بہن نہیں مل سکتی۔ یہ بھی سوچو کہ وہ تمہاری سگی بہن نہیں تھی خالہ زاد تھی۔ ایوب کی بہن واپس کر دو۔ یاد کرو سکندر! اس نے ہماری مدد کی تھی اور ہم نے تمہیں ریل گاڑی سے پولیس کی حراست سے فرار کرایا تھا۔"

میں نے انکار کر دیا۔ حمیداللہ اور نوراللہ نے مجھ پر زور دیا کہ میں ان کی بات مان لوں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کوئی ڈرامہ بنا رہے ہیں۔ میں نے تین چار بار انکار کر کے کہا کہ جیسے تم کہتے ہو مان لیتا ہوں۔

"لیکن ایوب اپنی بہن کو لے گا کہاں سے؟" ـــ نوراللہ نے پوچھا اور خود ہی جواب دیا ـــ "اسے سکندر کے ٹھکانے پر نہیں جانا چاہئے۔ ورنہ انسپکٹر مفضل حسین کے بھائی اسے جان سے مار ڈالیں گے۔ اس کی بہن کو یہاں بھی نہیں آنا چاہئے ..... کیا خیال ہے حمید بھائی! باہر کوئی جگہ مقرر کر لیتے ہیں۔ سکندر لڑکی کو وہاں لے آئے گا اور ایوب کے حوالے کر دے گا۔"

"اس شخص کی ضمانت کون دے گا؟" ـــ میں نے ایوب کے متعلق پوچھا ـــ "یہ وہاں پولیس کو ساتھ لے آئے گا۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ

اپنے دونوں ساتھیوں مرزے اور کُبے کو ساتھ لے آئے گا۔"

"میرے سر پر قرآن مجید رکھو سکندر!" ـــ ایوب نے کہا ـــ "حلفیہ کہوں گا کہ میں اکیلا آؤں گا۔"

"اس کا بھی ہم انتظام کر دیتے ہیں" ـــ حمیداللہ خان نے کہا ـــ "ایوب بھائی! ہمارا بڑا پرانا یارانہ ہے۔ ہم ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ تم یوں کرو۔ کل رات مرزے اور کُبے کو یہاں لے آنا۔ ہم انہیں کچھ سمجھائیں گے۔ تم اپنی بہن کو لینے جاؤ گے تو مرزا اور کُبا تمہارے ساتھ ہوں گے۔ وہ دونوں سکندر کے پاؤں پکڑ کر اس سے معافی مانگیں اور وعدہ کریں کہ سکندر کے خلاف مخبری نہیں کریں گے ..... اور یہ سوچ لو ایوب! اگر تم میں سے کسی نے سکندر کے خلاف مخبری کی تو تم جانتے ہو کہ میں کیا کچھ کر سکتا ہوں۔"

"مجھ سے جو قسم لینا چاہتے ہو لے لو" ـــ ایوب نے کہا ـــ "مجھے بہن مل گئی تو میں سکندر کے پاؤں میں سر رکھ دوں گا اور مجھے جو شرط بتاؤ گے پوری کروں گا۔"

"پھر ایسے کرو" ـــ حمیداللہ نے ایوب سے کہا ـــ "ابھی اُٹھو مرزے اور کُبے کے گاؤں جاؤ اور انہیں کہنا کہ کل رات میرے پاس آ جائیں۔ اسی وقت آئیں تو بہتر ہے۔ تم خود اُن کے ساتھ آنا ..... اور تم بھی سُن لو سکندر! ایوب مجھے اتنا ہی عزیز ہے جتنے تم ہو۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو پھر سمجھ لو کہ تم سیدھے پھانسی کے تختے پر گئے۔ اگر تم پولیس کے ہاتھ سے بچ گئے تو ہمارے ہاتھ سے نہیں بچ سکو گے۔ ان لوگوں سے پوچھ لو، میری کیا پاور ہے اور میں ایک اشارے سے ایک گاؤں کو تباہ کر سکتا ہوں۔"

"نہیں حمید بھائی!" ـــ میں نے کہا ـــ "میں نے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کر کے دکھاؤں گا۔ تم مجھے جانتے ہو کہ میں دھوکہ دینے پر آتا ہوں تو اپنے دشمن کو خبردار کر کے دھوکا دیا کرتا ہوں۔ میں نے تو یہ سوچ لیا تھا کہ نہ میں خود گناہگار رہوں گا نہ اس کی بہن کو گناہگار ہونے دوں گا اور جس طرح میں اسے

اس کے گھر سے اٹھا لایا تھا اسی طرح قتل کر کے کہیں دفن کر دوں گا لیکن تم نے میرا ارادہ بدل دیا ہے اس لئے وہی کروں گا جو تم سب نے فیصلہ کر لیا ہے"۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں جن سے ایوب کو یقین ہو گیا کہ اسے بہن واپس مل جائے گی۔ میں نے ایسی ایکٹنگ کی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا اور مفرور ہونے کی وجہ سے مجبور ہوں۔ حمید اللہ اور نور اللہ نے مجھ پر رُعب جھاڑا بلکہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کی پھر حمید اللہ کے کہنے پر ایوب چلا گیا۔

"اب بتاؤ تم نے کیا سوچا ہے" —— میں نے نور اللہ اور حمید اللہ سے پوچھا۔

انہوں نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا اور ایک ایسی سکیم بتائی جو میرے دماغ میں نہیں آتی تھی۔ یہاں میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ عادی مجرم سے میری مراد چھوٹی موٹی چوریاں کرنے والے لوگ نہیں بلکہ میں نامی گرامی ڈاکوؤں، رہزنوں، نوسربازوں، نور اللہ جیسے مجرموں کی بات کر رہا ہوں جو دھوکہ دہی میں ایسی ایکٹنگ کرتے ہیں کہ انہیں اپنے ماں باپ بھی نہیں پہچان سکتے۔ یہ میں اُس دَور کی بات کر رہا ہوں جب جرائم پیشہ لوگوں کو پولیس کی یا جاگیرداروں وغیرہ کی شہ اور پناہ حاصل نہیں تھی اور انگریزوں کی پولیس انہیں پکڑنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیا کرتی تھی۔ پولیس کے افسر اپنی عقل استعمال کرتے تھے اور جرائم پیشہ لوگ عقل کی لڑائی لڑتے تھے۔

حمید اللہ تو نوابزادہ تھا اور بڑا ہی عقلمند تھا، لیکن جو عقل نور اللہ میں تھی وہ حمید اللہ میں نہیں ہو سکتی تھی۔ نور اللہ تو پیدائشی مجرم تھا۔ ان دونوں نے مل کر جو سکیم بنائی تھی وہ کسی عام آدمی کے دماغ میں نہیں آسکتی تھی۔ میں نے اُن کے ساتھ تھوڑی سی بحث کر کے اسی سکیم کو آخری شکل دے دی اور وہاں سے آگیا۔



گزشتہ رات کی طرح میں اپنے ٹھکانے پر پہنچا اور کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ سائرہ جاگ اُٹھی۔ اُس رات مجھے افسوس سا ہوا کہ سائرہ کو جب یہ پتہ چلے گا کہ اُس کا اکلوتا بھائی قتل ہو گیا ہے تو اس کا کیا حال ہو گا۔ سائرہ کے دل میں ایوب کی نفرت بھری ہوتی تھی، لیکن وہ آخر اُس کا بھائی تھا۔ اُڑتا اُڑتا سا خیال آیا کہ میں ایوب کے قتل کا ارادہ ترک کر دوں تو کیا ہو جائے گا لیکن میں نے اس خیال کو ذہن سے نکال دیا اور سو گیا۔

صبح جب تجمل میرے پاس آیا تو میں نے اُسے کہا کہ منور کو بھی بُلا لیں۔ منور کچھ دیر بعد آگیا اور میں نے انہیں بتایا کہ میں نے کیا سوچا ہے۔ لیکن میں نے انہیں یہ نہ بتایا کہ یہ سکیم کیسے بنی ہے اور اس میں کس کا دماغ کام کر رہا ہے۔ میں نے انہیں یہ بھی نہ بتایا کہ تینوں آدمی میرے جال میں پھنس جائیں گے۔

"لیکن سکندر!" —— تجمل نے کہا —— "تمہاری بات کچی سی معلوم ہوتی ہے۔ تمہیں کس طرح یقین ہے کہ ایوب تمہارے ہاتھ چڑھ جائے گا"۔

"مجھے اُس کی بہن نے بتایا ہے کہ ایوب سائیں کرامتاں والے کا مرید ہے" —— میں نے کہا —— "اور وہ ان کے پاس آتا رہتا ہے .... میں بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم دونوں مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ تم یہ کام کرو کہ مجھے چھ آدمی ایسے دو جو عقلمند ہوں اور جنہیں جرم کرنے کا تجربہ ہو اور جو تھانے میں جا کر یا تھانیدار کو دیکھ کر گھبرا نہ جائیں۔ اگر دو تین آدمی کسی اور گاؤں کے رہنے والے ہوں تو زیادہ بہتر ہو گا"۔

"تمہیں بڑے پکے آدمی ملیں گے" —— تجمل نے کہا اور پوچھا —— "وہ تمہارے پاس کس وقت پہنچیں؟"

میں نے رات کا وقت حساب کر کے بتایا اور کہا کہ ان میں سے تین چار کے پاس کلہاڑیاں ہونی چاہئیں اور باقیوں کے پاس لاٹھیاں ہوں۔



رات کو منور چھ آدمی لے کر میرے پاس آگیا۔ میرے کمرے میں وہ اکیلا ہی آیا تھا۔ آدمی باہر کھڑے تھے۔ میں باہر نکلا۔ آدمی دیکھے۔ ان کے ساتھ کچھ باتیں کیں اور میں اندر آگیا۔ ریوالور نیفے میں اُڑسا، گولیوں کی بیلٹ کُرتے کے نیچے باندھی۔ منور باہر نکل گیا۔ سائرہ کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

"میرا خیال ہے تمہاری زندگی کا معمول یہی ہے" ـــ سائرہ نے کہا ـــ "دن کو چھپے رہنا اور رات کو پستول لے کر نکل جانا .... کہاں جا رہے ہو؟ اچھا تو نہیں لگتا کہ ایسی بات زبان پر لاؤں لیکن کہہ دیتی ہوں۔ تم کہیں ڈاکہ ڈالنے جا رہے ہو؟" ـــ اُس نے آگے آکر دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا اور جذباتی لہجے میں بولی ـــ "تمہیں کبھی اپنے ابا جان یاد نہیں آتے؟ اپنی امی کو بھی بھول گئے ہو؟ اُن کا خون ایسا تو نہ تھا۔"

"میں بھی ایسا نہیں سائرہ!" ـــ میں نے اپنے دونوں بازو آگے کر کے اُسے اپنے قریب کر کے کہا ـــ "میں ڈاکہ ڈالنے نہیں جا رہا۔ کسی کا گھر خالی نہیں کروں گا، گھر بھر دوں گا۔ خود تو بے گھر اور بے ٹھکانہ ہو گیا ہوں، کسی کا گھر اُجاڑوں گا نہیں .... اور سائرہ! اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں کہ میں دن کو چھپا رہتا ہوں اور رات کو نکلتا ہوں۔ تم میرا ساتھ نہیں دے سکتیں سائرہ! کچھ دن اور یہاں رہو پھر میں ...."

"پھر بھی میں تمہارے ساتھ رہوں گی" ـــ اُس نے میری بات کاٹتے ہوتے فیصلہ سنا دیا ـــ "اگر مجھے اپنے پاؤں کی زنجیر سمجھتے ہو تو اپنے ہاتھوں مجھے مار ڈالو اور یہیں کہیں دفن کر دینا اور قبر کا نشان بھی نہ رہنے دینا۔"

بولتے بولتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ چُپ ہو گئی پھر وہ میرے ساتھ لپٹ گئی۔ اُس نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ اُس کی جذباتیت سے میں اتنا بے بس ہُوا کہ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ میں اس زنجیر کو نہیں توڑ سکوں گا۔

میں جلدی میں تھا۔ اگر منور اور اُس کے آدمی باہر انتظار نہ کر رہے

ہوتے تو میں سائرہ کو چھوڑ کر کہیں نہ جاتا، لیکن مجھے جانا تھا۔ میں سائرہ کے بازوؤں سے تو آزاد ہو گیا، لیکن باہر یوں نکلا جیسے اپنے آپ کو دھکیل کر باہر نکالا ہو۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میری زندگی ایسی ہے کہ مجھے حسن اور جذبات کی زنجیروں سے آزاد رہنا چاہیئے۔

باہر وہ لوگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ منور ضد کرنے لگا کہ وہ بھی میرے ساتھ جاتے گا لیکن میں نے اُسے روک دیا۔ یہ کام میرا ہی تھا۔ میں نے اُس سے صرف اتنا پوچھا کہ ان آدمیوں پر اعتبار کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔

"سرکار!" ـــ منور کے آدمیوں میں سے ایک بول پڑا ـــ "آپ ہمیں نہیں جانتے۔ ہم نے اس جاگیر کا نمک کھایا ہے اور ہماری پُشتیں اس جاگیر پر پلتی اور پھلتی پھولتی رہی ہیں۔ ہماری جانیں اور ہمارا مال اس جاگیر کے لئے ہے۔ کیا آپ ہمیں آگ میں کُود جانے کو کہیں گے؟ حکم دے کر دیکھیں۔"

باقی آدمیوں نے بھی منور کو بولنے کی مہلت نہ دی اور مجھے یقین دلایا کہ وہ جانیں لڑا دیں گے اور اگر پکڑے گئے تو سارا الزام اپنے سر لیں گے۔

میں انہیں ساتھ لے کر چل پڑا۔ ہم وہاں جا رہے تھے جہاں ایک وسیع نشیبی جگہ تھی۔ ایوب اور اس کے ساتھیوں نے وہاں پہنچنا تھا۔ اس نشیبی جگہ میں سے راستہ بھی گزرتا تھا۔ ہم چلتے گئے اور میں ان آدمیوں کو سمجھاتا گیا کہ کیا کرنا ہے۔ وہ تو میں انہیں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ راستے میں زبانی ریہرسل کراتا جا رہا تھا۔

میں اس علاقے سے واقف نہیں تھا۔ حمید اللہ خان اور ایوب نے جو نشانیاں مجھے بتائی تھیں میں ان کے مطابق اُسی رُخ پر جا رہا تھا۔ ان آدمیوں میں سے دو اُس جگہ سے واقف تھے اور ان میں ایک آدمی ایسا تھا جو ایوب کو پہچانتا تھا بلکہ بہت اچھی طرح پہچانتا تھا اور ان میں سے دو آدمی مرزے اور کُوبے کو بھی پہچانتے تھے۔



ہم جب اُس جگہ کے قریب پہنچے تو میں نے ان آدمیوں کو بٹھا دیا اور میں خود آگے گیا۔ چاندنی بڑی صاف تھی۔ نشیبی جگہ کی گھاٹی کے قریب پہنچ کر میں جھک کر آگے بڑھا۔ مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ جو سکیم حمید اللہ اور نور اللہ نے مجھے بنا دی ہے وہ کامیاب ہو گی یا نہیں۔ مجرمانہ سکیمیں چالیس پر کامیاب ہوتی ہیں اور خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ میں نے دیکھا۔ ایک درخت کے نیچے تین سیاہ سائے کھڑے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایوب تھا اور اُس کے ساتھ اُس کے دونوں ساتھی مرزا اور کوبا تھے۔ حمید اللہ نے ایوب سے کہا تھا کہ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کو اُس کے پاس لائے۔ حمید اللہ نے انہیں یہ کہنا تھا کہ وہ میرے پاؤں پکڑ کر مجھ سے معافی مانگے۔ اب وہ حمید اللہ اور نور اللہ سے مل کر آتے تھے۔ سکیم یہ تھی کہ ان تینوں کو اکٹھا کرنا ہے۔ ایوب کو یقین تھا کہ میں اس کی بہن اُس کے حوالے کرنے کے لئے آ رہا ہوں۔ میں نے تو آگے جانا ہی نہیں تھا۔

میں پیچھے ہٹا اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ ان کا شکار پہنچ گیا ہے۔ وہ نیچے چلے جائیں اور ایوب کو اچھی طرح پہچان کر وار کریں۔ غلطی سے کسی دوسرے کو نہ رگڑ دیں۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ گھاٹی اُتر کر گپ شپ لگاتے جائیں اور اُن کے قریب سے گزر جائیں۔ چند قدم آگے رُک کر انہیں دبوچ لیں۔ پھر وہ تمام کارروائی کریں جو میں نے انہیں بتائی تھی۔

وہ چل پڑے۔ میں اس نشیب کے کنارے پر جا کر بیٹھ گیا۔

یہ آدمی گھاٹی اُتر گئے۔ وہ تینوں چالیس پچاس گز دُور کھڑے تھے۔ میرے چھ آدمی خوش گپیاں لگاتے جا رہے تھے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کے قریب سے گزرے۔ چند قدم آگے جا کر یکلخت پیچھے کو پلٹے اور اُنہوں نے اُن تینوں کو دبوچ لیا۔

وہ سب درخت کے نیچے سے ہٹ کر سامنے آ گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایوب نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے اور وہیں دوہرا ہو گیا۔ پھر ایک آدمی نے اُوپر سے اُس کی پیٹھ میں چاقو مارا۔ میرے دوسرے آدمی مرزے اور

کُوبے کو نیچے گرا کر اُن کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ رہے تھے۔ اس سے پہلے میرے آدمیوں نے مرزے یا کُوبے کو پکڑ کر زور سے ایوب کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ یہ سکیم کی ایک کڑی تھی۔

انہوں نے اپنا کام صحیح طریقے سے کر لیا۔ ایوب الگ گرا پڑا تھا اور اُس کے دونوں ساتھیوں کو میرے آدمیوں نے باندھ دیا تھا۔ چار آدمی وہیں رہے اور دو آدمی تھانے کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے تھانہ دو اڑھائی میل دُور تھا۔ اُن کے جانے اور آنے میں خاصا وقت لگتا تھا۔ جو چار آدمی پیچھے رہ گئے تھے ان میں سے ایک میری طرف آیا اور گھاٹی چڑھ کر میرے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے رپورٹ دی۔

میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ سکیم کیا تھی۔ حمید اللہ اور نور اللہ نے یہ سکیم اس طرح بنائی تھی کہ ایوب کو اس جال میں لایا جائے کہ میں اس کی بہن اُس کے حوالے کر دوں گا۔ اُس کے دونوں ساتھیوں کو یہ جھانسہ دے کر اُنہوں نے ایوب کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ مجھ سے معافی مانگیں گے اور ایوب کا ساتھ بھی دیں گے۔ کیا یہ جائے گا کہ ایوب کی بہن کی بجائے پانچ چھ آدمی وہاں سے اس طرح گزریں گے جیسے رات کے مسافر ہوں اور کہیں جا رہے ہوں۔ یہ ان تینوں کو دبوچ لیں گے۔ یہ تو ظاہر تھا کہ ان کے پاس خنجر یا چاقو ضرور ہوں گے جو ان سے چھین لئے جائیں گے۔ ہمارے آدمیوں نے لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح ہونا تھا۔ چاقو اور خنجر کلہاڑیوں اور لاٹھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ہمارے ایک آدمی نے ایوب کے ساتھیوں کے چاقوؤں سے ایوب کا پیٹ چاک کرنا تھا۔ اس کے ایک ساتھی کو اُس کے ساتھ اس لئے ٹکرایا گیا تھا کہ ایوب کا خون اُس آدمی کے کپڑوں کے ساتھ لگ جاتے۔

دو آدمی تھانے کو چلے گئے تھے۔ انہوں نے تھانیدار سب انسپکٹر راجہ شیر خان کو یہ رپورٹ دینی تھی کہ وہ چھ آدمی اس راستے سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ دو آدمیوں نے ایک آدمی کو پکڑا ہوا ہے۔ یہ چھ آدمی آگے بڑھے کہ دیکھیں یہ کیا معاملہ ہے۔ اتنے میں ان دونوں میں سے ایک

نے تیسرے آدمی کو پیچھے سے پکڑا اور دوسرے نے اس کے پیٹ میں چاقو مارا۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دوہرا ہوا تو اُسے چاقو مارنے والے نے اُس کی پیٹھ میں چاقو مارا۔ اتنے میں ان چھ آدمیوں نے ان دو کو پکڑ کر انہی کی پگڑیوں سے باندھ دیا اور دو آدمی تھانے چلے آ گئے۔

میں چونکہ پولیس کے قاعدے قانون سے واقف تھا اس لئے میں نے اپنے چھ آدمیوں کو کچھ باتیں سمجھا دی تھیں، مثلاً جو چاقو انہوں نے استعمال کرنا تھا اس کے متعلق میں نے انہیں بتایا تھا کہ وہیں پھینک دیں اور اس کے دستے پر پاؤں رگڑ دیں تاکہ ان کی انگلیوں کے نشان مٹ جائیں اور یہ بھی ظاہر ہو کہ آلۂ قتل جائے وقوعہ پر پڑا پایا گیا۔

ایسی اور بھی کئی باتیں تھیں جن کا خیال رکھنا تھا لیکن جس شخص نے یہ سارا ڈرامہ کورٹ میں حقیقی قتل ثابت کرنا تھا اسے پہلے ہی تجمل اور منور نے ہاتھ میں لے لیا تھا — وہ شخص سب انسپکٹر راجہ شیر خان تھا — وہ تو پہلے ہی اس جاگیر کا خادم تھا۔ یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس خدمت کا معاوضہ اسے کیا ملتا تھا۔ دن کے وقت تجمل اور منور اس کے ساتھ معاملہ طے کر کے آ گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ تھانے میں یا اپنے گھر میں ہمارے دو آدمیوں کا انتظام کر رہا ہو گا۔

راجہ شیر خان کے لئے یہ قتل ثابت کرنا آسان تھا۔ اس نے شہادت میں مرزے اور کوبے کی ہسٹری جس میں پہلی سزائیں شامل تھیں پیش کر دینی تھی۔ یہ ثبوت تو اس کے تھانے کے ریکارڈ میں اور سیشن کورٹ میں موجود تھا کہ یہ تینوں ایک کیس میں پکڑے گئے تھے لیکن ثبوت نامکمل ہونے کی وجہ سے بری ہو گئے تھے۔ ان کا دوستانہ ثابت کرنا بھی مشکل نہیں تھا۔ ایوب تو پہلے ہی پولیس سے نکالا ہوا سزا یافتہ آدمی تھا۔

میں وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے اپنے آپ کو کسی کے سامنے نہیں کرنا تھا۔ مجھے صرف پولیس کا انتظار تھا۔



پولیس میں اتنی جلدی تو نہیں آ سکتی تھی لیکن راجہ شیر خان پہلے ہی تیار تھا اس لئے وہ اپنے عملے کے ساتھ میری توقع کے خلاف جلدی پہنچ گیا۔ میں اتنی دیر اُوپر ہی بیٹھا رہا۔ پولیس جائے وقوعہ پر پہنچی تو میں وہاں سے پیچھے ہٹا اور واپس چل پڑا۔ گاؤں سے دو تین فرلانگ دُور تجمل اور منور کھڑے مل گئے۔ وہ میرے لئے پریشان ہو رہے تھے اور وہ یہ سُننے کے لئے بھی بے تاب تھے کہ اس خونی کھیل کا انجام کیا ہوا۔

میں نے انہیں بتایا کہ جہاں تک میرے کام کا تعلق تھا وہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ سب انسپکٹر راجہ شیر خان کو پکا کئے رکھنا ان دونوں بھائیوں کا کام تھا۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ راجہ شیر خان پوری طرح ان بھائیوں کی مٹھی میں تھا لیکن اُسے یقین دلا دیا گیا تھا کہ سکندر یہاں نہیں۔

تجمل اور منور میرے ساتھ اُس مکان تک آئے جہاں میں رہتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ صبح تھانے جائیں گے لیکن میں نے انہیں کہا کہ وہ تھانے سے دُور رہیں۔ اگر جانا ہی ہے تو رات کو تھانیدار کے گھر چلے جائیں۔ وہ مجھے میرے ٹھکانے پر چھوڑ کر آگے نکل گئے۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سائرہ دروازے کے ساتھ لگی کھڑی ہے۔ اُس نے مجھے بازو سے پکڑا اور اندر لے گئی۔ دیا جل رہا تھا۔ سائرہ نے میرے منہ اور سر پر ہاتھ پھیرے اور یوں مجھے ہاتھوں سے دبانے لگی جیسے یقین کرنا چاہتی ہو کہ میں زندہ ہوں۔ وہ بہت ہی گھبرائی ہوئی تھی۔

"کیوں سائرہ!" — میں نے پوچھا — "کیا ہو رہا ہے تمہیں؟ اکیلے ڈر رہی تھیں؟"

"کچھ ہو گیا ہے سکندر!" — اُس نے کانپتی ہوئی سی آواز میں کہا — "میں تو سوتی ہی نہیں۔ آنکھ لگی تو ایسے لگا جیسے کسی نے میرے پیٹ میں چھری مار دی ہو۔ شاید میری چیخ نکل گئی ہو۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھی پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھ کر دوہری

ہوگئی۔ فوراً ہی ذہن بیدار ہوگیا تو خیال آیا کہ میں تو بالکل ٹھیک ہوں، لیکن یہ تسلی فوراً ہی ختم ہوگئی اور دل اتنا گھبرانے لگا کہ یہاں سے نکل بھاگنے کو جی چاہتا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم کہاں ہو تو میں وہاں پہنچ جاتی۔"

"میرے ساتھ رہنا ہے تو یہ ڈر اور یہ خوف ذہن سے نکال دو" — میں نے کہا — "میری زندگی وہم نہیں یہ بڑی خطرناک حقیقت ہے۔"

"نہیں سکندر!" — سائرہ نے کہا — "میں ڈرنے والی نہیں۔ میری آنکھ کھلی تو یہی خیال ذہن میں آیا کہ تمہیں کچھ ہوگیا ہے۔ چھری جو میرے پیٹ میں لگی تھی وہ میرے دماغ میں اٹک گئی۔ اللہ تجھے لمبی عمر دے مجھے یہ خیال آتا تھا کہ کسی نے تمہیں چھری مار دی ہو.... کچھ ہوا ضرور تھا سکندر! میرا دل اب بھی ٹھکانے نہیں آیا۔"

میں نے اسے تسلی دی کہ میں صحیح اور سلامت اس کے سامنے کھڑا ہوں لیکن اُس کے پیٹ میں جو چھری لگی تھی یہ خون کی کشش تھی۔ ایوب اس کا بھائی تھا۔ چھری بھائی کو لگی تو خواب میں وہ چھری بہن کے پیٹ میں اُتر گئی۔ میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ میرے پاؤں اُکھڑنے لگے۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

دوسرے دن مجھے خبر ملی کہ مرزا اور گُوبا قتل کے الزام میں پکڑے گئے ہیں اور ایوب کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی گئی ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ان دونوں کو سزا ہوتی ہے یا شہادت مشکوک یا کمزور ہونے کی وجہ سے بری ہوجاتے ہیں، لیکن اصل خطرہ یہ تھا کہ ان دونوں ملزموں نے عدالت میں یہ ضرور کہنا تھا کہ سکندر رہیں نہ ہے۔ ایوب نے بتایا ہوگا۔ یہ راجہ شیر خان پر منحصر تھا کہ وہ اتنے بڑے جھوٹ کو کس طرح سچ ثابت کرتا ہے۔ بہرحال بہت بڑا خطرہ میرے سر پر آگیا تھا۔

میں نے بڑے ہی خوفناک اور بھیانک خطروں کا مقابلہ کیا تھا۔ میری تو زندگی ہی مسلسل خطرے میں گزر رہی تھی جیسے ریل گاڑی ایک ایسی تاریک سرنگ میں داخل ہوگئی ہو جس کے متعلق معلوم ہی نہ ہو کہ یہ کہیں جاکر ختم ہوگی بھی یا نہیں، لیکن اب خطرہ ایسا آگیا تھا جس کے متعلق میں روز بروز پریشان ہوتا جارہا تھا — یہ تھی سائرہ!

یہ تو میں آپ کے سامنے اعتراف کرچکا ہوں کہ سائرہ ایک بڑے ہی حسین آسیب کی طرح مجھ پر طاری ہوچکی تھی اور میں محسوس کرنے لگا تھا کہ میری عقل بھی اس کے تابع ہوتی چلی جارہی ہے۔ یہ پہلی لڑکی تھی جس نے مجھ پر یہ طلسماتی اثر کیا تھا اور میں صاف طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ سائرہ میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں ویسا ہی بچہ بن جاؤں گا یا ویسے بچے کی مانند ہوجاؤں گا جیسا بچہ میں اُس وقت تھا جب میری ماں کے مُردہ جسم کو لوگ کفن میں لپیٹ کر میرے سامنے دفن کر آتے تھے۔

جو خطرہ میں محسوس کرنے لگا تھا وہ میری اپنی ذات سے ہی اُٹھ رہا تھا۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ ہوتی تھی اور میرے اتنا قریب ہو کر بھی وہ سمجھتی تھی کہ مجھ سے بہت دُور ہے اس لئے وہ میرے اتنا قریب آجاتی تھی کہ اُس کی سانسوں کی خوشبو میرے وجود میں داخل ہونے لگتی تھی اور مجھے یہ احساس دلاتی تھی کہ میں جوان ہوں اور میں آسمان سے اترا ہوا فرشتہ نہیں ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میرے اندر ایک کش مکش شروع ہوجاتی تھی۔ کوئی طاقت کوئی خیال میری ذات سے اٹھتا تھا اور مجھے سائرہ سے دُور ہٹ جانے پر مجبور کرتا تھا۔

اس خطرے کو تصور میں لائیں کہ ایسے کئی بار ہوا کہ میں گہری نیند سویا

ہُوا ہوں اور اپنے ماتھے، سر اور گالوں پر کوئی بڑی نرم اور ملائم چیز رینگتی محسوس کی اور میں جاگ اُٹھا۔ دیکھا، سائرہ میرے پلنگ پر میرے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ بولتی بہت کم تھی۔ میں کچھ کہتا تھا تو اُس کی آنکھوں میں پیار کی چمک آجاتی تھی یا آنسو آجاتے تھے۔ یوں بھی ہُوا کہ میں نے شدّت سے محسوس کیا کہ مجھے اس کمرے سے بھاگ جانا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک احساس میری ذات سے اُبھرتا تھا جو مجھے شرمسار کرتا تھا۔ یہ خاموش سی ایک لعن طعن ہوتی تھی جیسے میں اپنے ذہن میں گناہ کے خیالوں کی پرورش کر رہا ہوں۔

اُس رات کو میں نہیں بھولوں گا جس رات اس کمرے کا چھوٹا سا دریچہ کُھلا ہُوا تھا اور چاند اُفق سے اُوپر اُٹھ آیا تھا۔ جب چاند دریچے کے سامنے آیا تو اس کی شفاف چاندنی سوئی ہوئی سائرہ کے چہرے پر پڑنے لگی۔ باہر کی کسی آواز سے میری آنکھ کُھل گئی۔ شاید گیدڑوں کے پیچھے رکھوالی والے کتے دوڑے اور بھونکے تھے۔ میں نے سر گھما کر سائرہ کی طرف دیکھا۔ چاندنی میں اُس کا چہرہ بڑا صاف نظر آیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور مُنہ میری طرف تھا۔ میں نے ایسا ارادہ کیا تو نہیں تھا لیکن میں آہستہ آہستہ کروٹ بدل کر اُٹھ بیٹھا پھر پلنگ سے اُٹھا۔ پلنگ کی ہلکی ہلکی آوازوں سے سائرہ کی آنکھ کُھل گئی۔ میں اُس کی چارپائی کے قریب جا کھڑا ہُوا۔

"کیوں سکندر!"— سائرہ نے ہلکے سے تبسم سے پوچھا۔

میں کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ ایسا دھچکا لگا جیسے سامنے سے کسی ایسی چیز نے مجھے دھکا دیا ہو جو نظر نہیں آتی۔ میں حیرت سے سائرہ کے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ میرے مُنہ سے یہ لفظ نکل گیا تھا — "امّی!"— میں نے پہلی بار دیکھا کہ سائرہ کی پیشانی اور اُس کی آنکھیں اور اُس کے ہونٹ بالکل میری امّی جیسے تھے۔ مجھ پر نیند کا خمار طاری تھا۔ آپ یوں کہہ لیں کہ میرے شعور پر غنودگی طاری تھی اور لاشعور پوری طرح بیدار تھا۔ سائرہ کا پورا چہرہ مجھے اس طرح اپنی امّی جیسا نظر آیا جیسے یہ سائرہ نہیں، میری امّی ہو۔

حسن و جمال کے معاملے میں ہر مرد اور ہر عورت کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے اور جسے محبت کہتے ہیں وہ کسی ایسی وجہ سے ہوتی ہے جو ذہن لاشعور میں کہیں چُھپی ہوتی رہتی ہے۔ میں اُس رات سمجھا کہ سائرہ میرے ذہن اور دل پر کیوں حاوی ہو گئی ہے۔

سائرہ اُٹھ بیٹھی۔

"کیا سوچ رہے ہو سکندر!"— سائرہ نے کہا اور دوپٹہ اپنے سر پر لے لیا اور بولی — "بیٹھ جاؤ میرے پاس۔"

میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ میرا ایک ہاتھ اپنے آپ آگے بڑھا۔ دوسرے لمحے سائرہ کا آنچل میرے ہاتھ نے میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"میں تمہیں اپنی بیوی نہیں بنا سکوں گا سائرہ!"— میں نے ایسے کہا جیسے میں سسک رہا ہوں۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"— سائرہ نے بڑے پیار سے پوچھا — "کوئی خواب دیکھا ہے؟"

"ہم دونوں خواب دیکھتے ہی اس دُنیا سے اُٹھ جائیں گے"— میں نے کہا — "ہم بھٹکے ہوئے مسافر ہیں اور ہم دونوں کی راہیں دُھندلی دُھندلی ہیں۔ معلوم نہیں کہاں اس دُھند میں ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں یا اکٹھے ہی اس دُھند میں چھپی ہوئی کھائی میں جا گریں۔"

"کہتے رہو جو کہنا ہے"— سائرہ نے جذباتی لہجے میں کہا — "بیوی نہ بناؤ تو بھی رہوں گی تمہارے ساتھ ہی۔ خواب دیکھتے زندگی گزار جاؤں گی۔"

پھر ایسے ہُوا جیسے میری زبان گُنگ ہو گئی اور میری نظریں سائرہ کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ میں جو محسوس کر رہا تھا وہ میں نہیں کہہ سکتا تھا۔ شاید سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہوں، کیسے کہوں۔

"میرے ساتھ رہو سائرہ!"— میں نے لرزتی ہوئی سرگوشی میں کہا — "میں تمہاری پُوجا کیا کروں گا اور تمہیں اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی اس طرح دیکھا

کروں گا جیسے تم مجھ سے بہت دُور ہو۔"

پھر ایسے ہُوا کہ چاند دریچے سے جھانکتا ہُوا آگے نکل گیا۔ میں آہستہ سے اُٹھا اور اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ سائرہ جوان تھی۔ اُسے جوانی کی نیند نے مجھ سے بے خبر کر دیا۔

گناہ کرنے کے لئے جرأت چاہیئے لیکن گناہ نہ کرنے کے لئے اتنی زیادہ جرأت کی ضرورت ہوتی ہے کہ تمام تر ذہنی اور روحانی قوتوں کو اپنے آپ پر مرکوز کرنا پڑتا ہے۔



یہ تو ایک خطرہ تھا۔ اِس کے ساتھ ایک خطرہ اور پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا بھی تعلق سائرہ کے ساتھ تھا۔ اُس نے اُس رات خواب دیکھا تھا کہ اُس کے پیٹ میں کسی نے چھُری گھونپ دی ہے اور وہ ڈر کر جاگ اُٹھی تھی اور اُس نے مجھے اپنا خواب سنایا تھا۔ یہ تقریباً وہی وقت تھا جب اُس گاؤں سے کچھ دُور سائرہ کے بھائی ایوب کے پیٹ میں قاتل کی چھُری اُتر رہی تھی۔ بہن اپنی زبان سے اپنے بھائی کے خلاف نفرت کا اظہار کر سکتی ہے لیکن اُس کی روح بھائی کی محبت سے سرشار ہوتی ہے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ خون کا اثر تھا کہ چھُری بھائی کو لگی اور خواب میں وہی چھُری بہن کے پیٹ میں اُتر گئی اور وہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھی۔ میں جب واپس آیا تو وہ میری بلائیں لینے لگی تھی جیسے مجھے کچھ ہو گیا ہے۔

میں نے اُسے بہت تسلیاں دی تھیں اور کہا تھا کہ خوابوں سے نہیں ڈرنا چاہیئے۔ مجھے صحیح سلامت دیکھ کر اُسے کچھ چین تو آ گیا تھا لیکن صبح اُٹھتے ہی اُس نے پہلی بات یہ کہی تھی کہ اُس کے دل پر گھبراہٹ ہے اور وہ ایسے محسوس کر رہی ہے جیسے کچھ ہو گیا ہے یا کچھ ہو گا۔ میں نے پھر اُسے سمجھایا کہ یہ اس تنہائی کا اثر ہے اور یہ تنہائی قید کی مانند ہے۔ قید ذہن پر یہی اثر ہوتا ہے لیکن سائرہ کی ذہنی حالت اور دل کی گھبراہٹ کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کیفیت میں وہ میرا سہارا لیتی تھی اور میں تو کہ

اُن سے دُور رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ میرے لئے ایک اور مشکل پیدا ہو گئی تھی۔

میرا دماغ اس مسئلے میں اُلجھا ہُوا تھا کہ سب انسپکٹر راجہ شیر خان ان دو ملزموں — کُوبے اور مرزے — کو کس طرح ایوب کے قاتل ثابت کرے گا۔ یہ دونوں کوئی عام قسم کے دیہاتی نہیں تھے کہ قانونِ شہادت کو نہ سمجھتے ہوں۔ یہ تو پیشہ ور ڈکیت تھے۔ جرم اور جیل ان کا کھیل تھا۔ تھانیداروں کو اُنگلیوں پر نچانا ان کا فن تھا اور وہ قانونِ شہادت سے اچھی طرح واقف تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اُس جرم کا اقبال کر لیں گے جو اُن کے سوا کسی اور نے کیا ہے۔ بڑی مضبوط شہادت کی ضرورت تھی۔ مجھے پوری امید نہیں تھی کہ راجہ شیر خان ایسی شہادت اکٹھی کر لے گا۔

میں پولیس کے سب انسپکٹر کی حیثیت سے یہ سوچنے لگا کہ شہادت کیا ہو اور کس طرح حاصل کی جائے۔ ہمارے جن آدمیوں کو راجہ شیر خان نے عدالت میں عینی شاہدوں کی حیثیت سے پیش کرنا تھا وہ ایک کی بجائے چھ آدمیوں کو قتل کر سکتے تھے لیکن عدالت میں وہ صفائی کے وکیلوں کی جرح کا مقابلہ کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔

وہی ہُوا جس کا ڈر تھا۔ خطرہ ساون کی سیاہ کالی گھٹا کی طرح چڑھ آیا۔

اس واردات کے بعد تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ رات کو تجمّل اور منوّر میرے پاس آئے۔ سائرہ کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ دونوں گھبرائے گھبرائے سے لگ رہے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے اچھی خبر نہیں لائے ہو" — میں نے کہا۔

"ہاں بھائی!" — تجمّل نے کہا — "خبر اچھی نہیں۔ راجہ شیر خان آیا تھا۔ ابھی ابھی گیا ہے۔"

سب انسپکٹر راجہ شیر خان شام کے بعد چوری چھُپے ان دونوں بھائیوں کے پاس آیا تھا اور انہیں جو نئی صورتِ حال بتا گیا تھا وہ انہوں نے مجھے سنائی۔

یہ میں آپ کو اپنے الفاظ میں سُناتا ہوں۔

کُوبے اور مرزے کو پکڑ کر تھانے لے گئے تو رات کو شیر خان نے ہمارے آدمیوں کے بیان لئے۔ انہیں اُس نے عینی شاہد لکھا تھا اور ان میں سے اُن دو آدمیوں کو رپورٹ کنندہ بنایا تھا جو تھانے اطلاع دینے گئے تھے کہ فلاں جگہ دو آدمیوں نے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ یہ ڈرامہ تو گھڑا ہُوا تھا۔ شیر خان دراصل انہیں بٹھا کر یہ سمجھا اور پڑھا رہا تھا کہ وہ عدالت میں اپنے بیان اس طرح دیں۔ ان سے وہ بیان سُنتا بھی رہا، ان کی غلطیاں درست کرتا رہا اور ریہرسل کراتا رہا۔

یہ آدمی صبح کے وقت تھانے سے واپس آتے تھے اور انہوں نے تجمّل اور منوّر کو پوری رپورٹ دی تھی کہ رات تھانے میں کیا ہُوا۔

یہ لوگ تو تھانے سے آگئے اور تھانے میں شیر خان نے باری باری کُوبے اور مرزے کو اپنے پاس بٹھایا اور اُنہیں کہا کہ بہتر ہے وہ اقبالی بیان دے دیں۔ دونوں اُستاد جرائم پیشہ تھے۔ انہوں نے کوئی فریاد نہ کی بلکہ راجہ شیر خان کو چیلنج کیا کہ وہ ان کے خلاف جرم ثابت کر کے دیکھے۔

"تم جیسے بہت تھانیدار دیکھے ہیں راجے!" —— کُوبے نے کہا۔

"ہم ہمیشہ آپ کی حوالات میں نہیں رہیں گے راجہ صاحب!" —— مرزے نے اُسے کہا —— "دو چار دنوں بعد ہمیں جیل کی حوالات میں بھیج دیا جائے گا۔ چند دنوں بعد ہی آپ سُنیں گے کہ کُوبا اور مرزا نام کے دو حوالاتی جیل سے فرار ہو گئے ہیں۔ پھر اخباروں میں یہ خبر چھپے گی کہ راجہ شیر خان نام کا ایک سب انسپکٹر اور اُس کا پورا خاندان قتل ہو گیا ہے ..... ہوش میں آؤ راجہ صاحب!"

"اگر تم اقبالی بیان نہیں دو گے تو کیا تم بری ہو جاؤ گے؟" —— شیر خان نے دونوں سے کہا تھا —— "عدالت میں دیکھنا کہ تمہارے خلاف کیسی کیسی شہادت آتی ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اقبالی بیان دے دو گے تو پھانسی سے

بچا لوں گا اور مقدمہ ایسا بناؤں گا کہ تمہیں سیشن کورٹ سے عمر قید ملے گی اور اپیل میں تم شک کے فائدے سے بری ہو جاؤ گے۔"

وہ سارا دن شیر خان اور ان دونوں ملزموں میں یہی بحث مباحثہ چلتا رہا۔

"ایک سودا کر لو" —— شیر خان نے انہیں کہا —— "میں جو بیان بتاتا ہوں وہ مجسٹریٹ کو دے کر انگوٹھا لگا دو تو میں شہادت اتنی کمزور رکھوں گا کہ تم سیشن کورٹ سے ہی بری ہو جاؤ گے۔"

"تھانیدار صاحب!" —— ان میں سے ایک نے کہا —— "چوہدریوں کا ڈرامہ کھیلنے کے لئے کوئی اور آدمی پکڑ لے تھے جو کچھ بھی جاننے اور سمجھنے والے نہ ہوتے۔ ہمارے ساتھ تم نہیں کھیل سکتے۔"

سب انسپکٹر راجہ شیر خان کا مطلب یہ تھا کہ ان دونوں کو سزا نہ ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل مقصد ایوب کو صاف کرنا تھا وہ ہو گیا تھا اور دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ الزام تجمّل اور منوّر کی طرف نہ آئے۔ ہم نے اصل مقصد تو یہ پورا کرنا تھا لیکن میں نے آپ کو بتایا ہے کہ کُوبا اور مرزا بڑے تجربہ کار کھلاڑی تھے۔

راجہ شیر خان نے دونوں کو پھر حوالات میں بند کر دیا اور انہیں کہا کہ وہ سوچ لیں۔ شیر خان کا ارادہ یہ بھی تھا کہ انہیں ایذا رسانی کے ذریعے اپنی بات پر لے آئے گا لیکن ان دونوں کے لئے بڑی سخت ایذا رسانی کی ضرورت تھی کیونکہ یہ دونوں اس کا بھی اتنا تجربہ رکھتے تھے کہ اُن کے جسم پتھر ہو گئے تھے۔ رات کو شیر خان نے انہیں جگائے رکھا۔ انہیں دو ہیڈ کانسٹیبلوں کے حوالے کر کے پریشان بھی کیا لیکن یہ دونوں جہاں تھے وہیں رہے۔

یہ رات بھی ناکامی میں گزر گئی۔ اگلا دن بھی اسی طرح گزرا۔ انہوں نے کچھ کیا ہوتا تو وہ اقبالِ جرم کرتے۔ اصل مشکل تو یہ تھی کہ ان پر جھوٹا الزام عائد کیا گیا تھا اور شیر خان اُن سے اپنی مرضی کا بیان لینا چاہتا تھا۔ جب اُس نے

دیکھا کہ اس طرح بات نہیں بنتی تو اُس نے دونوں کو کچھ رقم پیش کی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ مقدمہ بہت ڈھیلا بنائے گا لیکن ان دونوں استادوں نے یہ پیش کش بھی ٹھکرا دی۔

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ شیر خان نے جو رقم پیش کی تھی وہ اُس نے تحمل اور منور سے لینی تھی۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ راجہ شیر خان نے چوہدریوں کا یہ کام پورا کرنے کا کیا م... منہ لیا تھا۔ اس معاوضے نے اُسے بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔

پتہ چلا کہ راجہ شیر خان اور ان دونوں جرائم پیشہ آدمیوں میں کش مکش جاری تھی کہ ڈی۔ ایس۔ پی جو بڑا سخت گیر انگریز تھا اچانک آ گیا۔ ہمارے وقتوں میں پولیس کے انگریز افسر اسی طرح کسی نہ کسی تھانے میں اچانک جا دھمکتے اور زیرِ تفتیش کیسوں کی فائلیں دیکھتے تھے۔ حوالات میں بند حوالاتیوں کو بھی دیکھتے اور اُن سے ایک دو باتیں بھی کر لیتے تھے۔ اُن کے یہ دَورے چھاپے کی قسم کے ہوتے تھے اور یہ محض رسمی نہیں ہوتے تھے۔ کسی بھی تھانیدار کی کوتاہی کو معاف نہیں کرتے تھے۔

سب انسپکٹر راجہ شیر خان کے تھانے میں ڈی ایس پی کا آنا اس لئے زیادہ ضروری تھا کہ اس علاقے میں ایک آدمی یعنی ایوب قتل ہُوا تھا اور اس آدمی نے لکھا تھا کہ مفرور سب انسپکٹر سکندر فلاں جگہ موجود ہے اور اُس نے اُس کی بہن کو اغوا کیا ہے۔ یہ الزام غلط تھا یا صحیح، اس سے شک ضرور پیدا ہوتا تھا۔ میں نے پہلے ہی تحمل اور منور کو خبردار کر دیا تھا کہ اُن کی جاگیر میں اور اِرد گرد کے علاقے میں پولیس کے مُخبر لگا دیئے جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جاگیر کے مزارعوں میں سے ہی ایک دو آدمیوں کو روپے پیسے کا لالچ دے کر مُخبر بنا لیا جائے۔



یہ انگریز ڈی ایس پی تھانے میں داخل ہُوا تو کُبا اور مرزا حوالات میں بند تھے۔ حوالات تھانے کے برآمدے میں تھی۔ انہوں نے سلاخوں میں

سے ڈی ایس پی کو دیکھ لیا اور اُسے پکارنے لگے۔

"پولیس کپتان صاحب بہادر!"

"حضور صاحب بہادر! پہلے ادھر آئیں۔"

"کپتان صاحب بہادر! پہلے ہماری فریاد سُن لیں۔"

ڈی ایس پی نے پہلے تو اُن کی طرف توجہ نہ دی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ حوالاتی اس طرح غل غپاڑہ کیا ہی کرتے ہیں اور اُن کی سب سے بڑی فریاد یہ ہوتی ہے کہ اُنہیں مارا پیٹا جاتا ہے اور کھانا اچھا نہیں دیا جاتا لیکن ان دونوں نے اتنا زیادہ شور شرابا کیا کہ ڈی ایس پی نے سب انسپکٹر راجہ شیر خان سے پوچھا کہ یہ دونوں کون ہیں اور کس الزام میں پکڑے ہوتے ہیں۔

راجہ شیر خان نے ڈی ایس پی کو بتایا کہ یہ ہسٹری شیٹر ہیں، سزا یافتہ ہیں اور ان کا پیشہ ڈکیتی ہے اور اب یہ سابق سب انسپکٹر ایوب کے قتل میں گرفتار ہوتے ہیں۔ یہ سن کر ڈی ایس پی نے کہا کہ دونوں کو باہر نکالو اور پیش کرو۔ ڈی ایس پی تھانے کے دفتر میں جا کر راجہ شیر خان کی کرسی پر بیٹھ گیا اور ان دونوں ملزموں کو اُس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اُس نے راجہ شیر خان کو اپنے پاس بٹھا لیا اور ملزموں سے کہا کہ وہ اپنی شکایت بیان کریں۔

کُبے اور مرزے نے اس طرح بولنا شروع کر دیا کہ کچھ بات کُبا کرتا آگے مرزا بولنے لگتا اور اس طرح انہوں نے ڈی ایس پی کو پوری بات سُنا ڈالی۔ اُنہوں نے اُسے سنایا کہ ایوب کو کس طرح قتل کیا گیا ہے اور کس طرح کچھ آدمیوں نے اُنہیں پکڑ لیا تھا یہ دونوں چونکہ تجربہ کار تھے، تھانیداروں اور ان سے بڑے افسروں کے ساتھ نڈر ہو کر بولنا جانتے تھے اور ویسے بھی چرب زبان تھے اس لئے اُنہوں نے انگریز ڈی ایس پی کو متاثر کر لیا اور وہ ان کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا۔

"کپتان صاحب بہادر!" —— کُبے نے کہا —— "ابھی ہم نے آپ کو صرف یہ بتایا ہے کہ ایوب کس طرح قتل ہُوا ہے۔ ہم نے آپ کو بڑی قیمتی

باتیں ابھی نہیں بتائیں۔ وہ یہ ہیں کہ اس علاقے کے ایک گاؤں برکت پورہ میں ایک پیر ہے جو سائیں کراماتاں والا کے نام سے مشہور ہے۔ اس علاقے کے مسلمان اُس کے مُرید ہیں۔ یہ اتنا زیادہ مشہور ہے کہ شہروں کے پڑھے لکھے لوگ بھی اس کی مُریدی میں شامل ہیں اور اس کے پاس آکر حاضری دیتے ہیں۔ اس پیر کے ساتھ اُس کا ایک مصاحب ہے جو ہر وقت اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ پیر کراماتاں والا دراصل ہندوستان کے کسی دُور کے صُوبے کا تجربہ کار اور سزا یافتہ ڈاکو، رہزن اور نوسر باز ہے۔ اس کا اصل نام نُوراللہ ہے ....

"اس کا جو خاص مصاحب بنا ہُوا ہے وہ دراصل ایک نواب زادہ ہے۔ اُس کا اصل نام نواب زادہ حمید اللہ خان ہے اور وہ اسی دُور کے صوبے کی ایک جیل سے مفرور ہے۔ اسے عمر قید کی سزا ملی تھی۔ اُس نے قتل کی واردات کی تھی۔ چونکہ آدمی روپے پیسے والا اور بہت بڑی جاگیر کا مالک تھا اس لئے جیل کے افسروں کو بہت سی رقم دے کر وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔"

"تم نے پہلے پولیس کو یہ اطلاع کیوں نہیں دی؟" — ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"صاحب بہادر!" — اس سوال کا جواب مرزے نے دیا — "ہماری ان کے ساتھ دوستی ہو گئی تھی۔ ہم دونوں پیر کراماتاں والے کی کرامات کی کہانیاں گھڑ کر دیہاتیوں کو اس طرح سناتے تھے کہ وہ بہت متاثر ہوتے تھے۔ نوراللہ اور حمید اللہ سے ہمیں اس کام کے بہت پیسے ملتے تھے۔ پھر ہم نے ان دونوں کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا تھا۔ یہ دونوں اپنے مریدوں سے اتنے زیادہ نقد نذرانے لیتے ہیں کہ یہ رقم اُن سے سنبھالی نہیں جاتی۔ مریدوں کی جوان بیٹیوں، بیویوں اور بہنوں کو پیری اور کرامات کے چکر میں لا کر جس طرح خراب کرتے اور رنگ رلیاں مناتے ہیں وہ الگ ہیں۔"

ان دونوں نے ڈی ایس پی کو تفصیل سے سنایا کہ ان کی مجرمانہ پیری کس طرح چلتی ہے۔ یہ تفصیلات نہ اس انگریز ڈی ایس پی کے لئے نئی تھیں نہ

آپ کے لئے نئی ہوں گی۔ میں کچھ پرانے وقت کی بات سُنا رہا ہوں لیکن یہ بات پرانی نہیں۔ آج بھی پیری مریدی کا سلسلہ اُسی طرح چل رہا ہے اور آج بھی لوگ اپنے اپنے پیر کے معجزے اور کرامات سناتے پھرتے ہیں۔ دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے مبالغہ آرائی بھی کرتے ہیں، مگر نہیں سوچتے کہ وہ مالی لحاظ سے ہی نہیں لُٹ رہے بلکہ اُن کی عزت و آبرو بھی لُٹ رہی ہے۔



ڈی ایس پی نے نوراللہ اور حمید اللہ خان کی اصلیت کی یہ روئیداد سُنی تو مسکرایا اور اس نے راجہ شیر خان کی طرف دیکھا۔

"یہ جھوٹ بولتے ہیں صاحب بہادر!" — راجہ شیر خان نے کہا — "میں آپ کو ان کا ریکارڈ دکھاتا ہوں۔"

"تم چُپ رہو" — ڈی ایس پی نے راجہ شیر خان کو ڈانٹ کر چُپ کرا دیا اور ان دونوں ملزموں سے کہا — "آگے بولو۔"

"ایک اطلاع اور ہے صاحب بہادر!" — گُوبے نے کہا — "ایوب خان جو قتل ہو گیا ہے ایک مفرور سب انسپکٹر کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس مفرور کا نام سکندر ہے۔ ایوب نے اس تھانیدار کو جو آپ کے پاس بیٹھا ہُوا ہے، بتایا تھا کہ یہ مفرور سکندر چوہدری فضل حسین سب انسپکٹر پولیس کی جاگیر میں موجود ہے۔ اُس نے ایوب کو اور اُس کی بہن کو اغوا کیا تھا۔ ایوب کو اس جاگیر میں ایک کچے مکان میں قید رکھا گیا تھا اور وہ ان ہی کی گھوڑی پر سوار ہو کر بھاگ گیا تھا لیکن اُس کی بہن ابھی تک اس جاگیر میں موجود ہے۔ ایوب کے قتل کی وجہ ہی یہی ہے کہ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ مفرور سب انسپکٹر یہاں موجود ہے۔"

"اور صاحب بہادر!" — اب مرزا بولا — "ایوب کو قتل کرانے میں پیر کراماتاں والے اور اُس کے دوست نواب زادہ حمید اللہ خان کا بھی ہاتھ ہے۔ سکندر اُنہیں ملا تھا۔ اُس وقت یہ دونوں یہاں ایک گاؤں میں آتے ہوتے تھے۔ ایوب بھی یہاں ان کے پاس آ گیا اور اُس کی سکندر کے ساتھ

ملاقات ہوگئی۔"

اُس نے پوری تفصیل سے سنایا کہ ایوب کو یہ دھوکہ دیا گیا تھا کہ سکندر اُس کی بہن کو رات کے وقت فلاں جگہ لے آئے گا اور اُس کے حوالے کر دے گا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ حمید اللہ اور نور اللہ نے ان دونوں کو بھی ایوب کے ساتھ جانے کو کہا تھا۔ پھر اُس نے سنایا کہ اس کے بعد کیا ہُوا۔

ڈی ایس پی نے ان دونوں سے کچھ باتیں پوچھیں اور اُنہیں حوالات میں بھیج دیا۔ اُس نے راجہ شیر خان سے پوچھا کہ اس کیس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ شیر خان نے تو یہی کہنا تھا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

"ہم جانتے ہیں"— ڈی ایس پی نے کہا —"جس علاقے میں کوئی بہت بڑا جاگیر دار رہتا ہے اُس علاقے کا تھانیدار دیانت دار رہ ہی نہیں سکتا۔ تم نے ان جاگیرداروں سے ضرور پیسہ لیا ہے۔"

میں تصور میں لا سکتا تھا کہ راجہ شیر خان نے کس طرح اپنی بے گناہی پیش کی ہوگی۔ ڈی ایس پی اور راجہ شیر خان کے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ تو بڑی لمبی ہیں، ان کا لب لباب یہ تھا کہ ڈی ایس پی کے ذہن میں یہ شک بیٹھ گیا تھا کہ ان دونوں ملزموں نے جو بیان دیتے ہیں اور جو انکشاف کئے ہیں یہ کسی نہ کسی حد تک صحیح ہو سکتے ہیں۔ ڈی ایس پی نے یہ فیصلہ تو نہ سنایا کہ وہ یہ کیس سی آئی اے کے سپرد کرے گا لیکن اُس نے اشارہ سا دے دیا کہ یہ کیس سی آئی اے کے پاس جا سکتا ہے۔

"ان دونوں کو ابھی یہیں رہنے دو"— ڈی ایس پی نے کہا —"ہیڈکوارٹر کے حکم کا انتظار کرو۔"

ڈی ایس پی چلا گیا۔ اس کا صحیح اندازہ میں ہی کر سکتا تھا کہ وہ راجہ شیر خان کو ہی نہیں بلکہ ہم سب کو کتنے بڑے خطرے میں ڈال گیا تھا۔ اب کسی بھی وقت میری گرفتاری کے لئے یہاں چھاپہ پڑ سکتا تھا۔ ایسے ہی چھاپے کا خطرہ حمید اللہ اور نور اللہ کے لئے بھی تھا۔ انہیں قبل از وقت

خبردار کرنا ضروری تھا۔

میں انگریز پولیس افسروں کے کام کرنے کا طریقہ جانتا تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ دو عادی مجرموں نے کوئی شکایت کی اور انگریز افسروں نے فوراً اُٹھ کر کارروائی شروع کر دی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ انگریز افسر وقت ضائع نہیں کیا کرتے اور یہ تو مجھے یقین تھا کہ یہ ڈی ایس پی اس کیس کو سی آئی اے کے حوالے ضرور کرے گا۔

جہاں تک نور اللہ اور حمید اللہ خان کی جعلی پیری مریدی کا تعلق تھا، یہ میں جانتا تھا کہ ڈی ایس پی اور اس کے اُوپر والے افسر بھی کوئی کارروائی کرنے سے پہلے کئی بار سوچیں گے کیونکہ انگریزوں کو خاص طور پر اپنی حکومت کی طرف سے تنبیہہ کی جاتی تھی کہ ہندوستانیوں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہ کریں۔ وہ پیر پرستی اور مزار پرستی کو بھی مسلمانوں کے مذہب میں شامل کرتے تھے۔ ہندوؤں کے سادھوؤں کو بھی دیکھا کرتے تھے کہ یہ عجیب و غریب بھیس بنا کر کیسی کیسی بدمعاشیاں اور حرام کاریاں کرتے ہیں لیکن انگریز افسران کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتے تھے۔

مجھے اتنا سا اطمینان ضرور تھا کہ پولیس نور اللہ اور حمید اللہ کے ٹھکانے پر چھاپہ نہیں مارے گی لیکن اپنے مُخبر اور جاسوس بھیج کر ان کی اصلیت کا سراغ ضرور لگایا جائے گا۔ یہ کام سی آئی ڈی یا پولیس کی سپیشل برانچ نے کرنا تھا۔ اگر کوئی جرائم پیشہ آدمی جعلی پیر بنا ہُوا تھا تو اس کی انگریزوں کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ انہوں نے صرف اُس وقت کارروائی کرنی تھی جب اس جعلی پیر کا کوئی مرید تھانے میں اُس کے خلاف کوئی شکایت پیش کرتا مثلاً یہ کہ اس پیر نے اُس کی بیٹی یا بہن یا کسی عورت کو اغوا کر لیا ہے یا حبس بیجا میں رکھا ہُوا ہے یا پیر نے دھوکے سے اُس کی کچھ رقم دبا لی ہے۔ اس صورت میں اس پیر کے خلاف قانونی کارروائی ہو سکتی تھی۔ اس صورت میں کہ اس کے تمام مرید اُس کے خلاف کوئی بات نہیں سُننا چاہتے تھے، اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی تھی۔

نوراللہ اور حمیداللہ خان کا معاملہ مختلف تھا۔ حمیداللہ خان جیل سے فرار ہُوا تھا اور وہ سزائے عمر قید کا قیدی تھا۔ اس کی گرفتاری ضروری تھی۔ نوراللہ کے متعلق یہ شک کیا جا سکتا تھا کہ وہ بھی مفرور ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایک یا ایک سے زیادہ وارداتوں کی تفتیش میں مطلوب ہو۔



"اب کیا ہوگا سکندر!" — تجمل نے مجھ سے پوچھا — "کیا پولیس یہاں چھاپہ مارے گی؟ ..... راجہ شیر خان ہمیں کہہ گیا ہے کہ جتنی مدد وہ کر سکتا تھا اُس نے کی ہے اور جتنی ہو سکے گی اُس سے زیادہ کرے گا لیکن یہ معاملہ اُس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اُس نے کہا کہ اپنا بندوبست پکا کر لو۔"

"اور دیکھو سکندر" — منوّر نے کہا — "ان دونوں نے جھوٹ کتنا بولا ہے۔ انہوں نے سائیں کراماتاں والے کو ڈاکو اور رہزن کہہ دیا ہے۔ کیا ان پر سائیں کراماتاں والے کی پھٹکار نہیں پڑے گی؟"

میری ہنسی نکل گئی۔

"نہیں پڑے گی" — میں نے کہا — "انہوں نے نوراللہ اور حمیداللہ خان کے متعلق جو انکشاف کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ سائیں کراماتاں والے کا اصل نام نوراللہ ہے اور میں ان کے ساتھ رہ چکا ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہو سکندر!" — منوّر نے کہا — "تم بھی پیروں کی توہین کرنے پر اُتر آتے ہو۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں" — میں نے کہا — "ایوب کے قتل کی سکیم ان دونوں نے ہی بنائی تھی اور کُبے اور سرزے کو ان دونوں کی استادی وہاں لے گئی تھی اور اس طرح ہمارا مطلب پورا ہو گیا۔"

تجمّل اور منوّر پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ یہ دونوں بھائی سائیں کراماتاں والے کے مرید تو نہیں تھے لیکن اُسے برگزیدہ پیر مانتے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے ساتھ ان کا تعلق کیا رہا ہے اور ہم پر کیا کیا گزری ہے۔

اُس وقت میرے سامنے یہ مسئلہ نہیں تھا کہ میں انہیں یقین دلاتا کہ نوراللہ جعلی پیر بنا ہُوا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کو ابھی اندازہ نہیں ہُوا تھا کہ جو صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے یہ کس قدر خطرناک ہے اور ہم سب کو کس انجام تک پہنچا دے گی۔ میں نے تو سیدھا پھانسی کے تختے پر جانا تھا۔ تجمّل اور منوّر مجھے پناہ دینے کے جرم میں چار یا پانچ سال کے لئے جیل میں جا سکتے تھے اور اگر یہ پتہ چل جاتا کہ فضل حسین بھی مجھے پناہ دینے میں شریک ہے تو اُس کی نوکری ختم ہونے کے علاوہ وہ بھی جیل میں چلا جاتا۔ میں ہی تھا جس نے سوچنا تھا کہ کیا کرنا چاہیئے اور جو کچھ بھی کرنا تھا بڑی تیزی سے کرنا تھا۔ ایک تو اپنا انتظام کرنا تھا کہ کہاں جا چھپوں۔ سائرہ کو بھی چھپانا تھا۔ اس لڑکی کے برآمد ہو جانے کی صورت میں تجمّل اور منوّر پر ایک اور دفعہ لگ جاتی۔ اتنا ہی ضروری حمیداللہ اور نوراللہ کو خبردار کرنا تھا۔ اُن تک میرا جانا اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنے ساتھ میری پناہ کا بھی بندوبست کر سکتے تھے۔ وہاں جا کر دیکھنا تھا کہ وہ کچھ کر بھی سکتے ہیں یا نہیں۔

میں نے تجمّل اور منوّر کو بتایا کہ ہمیں کیا کیا بندوبست کرنے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے اور سائرہ کو چھپانے کا بندوبست کر لیں گے، لیکن میں اب اُن کی سوچوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس معاملے میں وہ اناڑی تھے۔

"تم دونوں بھائی ایک بندوبست فوراً کر لو" — میں نے کہا — "چار پانچ صحیح معنوں میں وفادار اور قابلِ اعتماد آدمی اکٹھے کرو اور انہیں اپنی زمینوں کے باہر دُور دُور بھیج دو۔ وہ وہاں اس طرح گھومتے پھرتے رہیں جیسے اپنے کھیتوں میں کوئی کام کاج کر رہے ہیں۔ دُور سے پولیس کو آتا دیکھیں تو وہ فوراً تمہیں اطلاع دیں۔ اگر میں اور ایوب کی بہن یہاں نہ ہوتے تو پھر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر ہم دونوں کی یہاں موجودگی میں پولیس آ گئی تو مجھے فوراً اطلاع ملنی چاہیئے۔ میں اپنا اور اس لڑکی کا بندوبست کر لوں گا۔ یہ بھی اچھا ہے کہ تمام کھیتوں میں فصل ہے اور فصل کافی

اُونچی ہے۔"

"یہ لڑکی ہمیں دھوکہ دے سکتی ہے" — منور نے کہا۔

"نہیں" — میں نے کہا — "یہ لڑکی جان پر کھیل جاتے گی، دھوکہ نہیں دے گی۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ یہ عورت ہے۔ چھپنے چھپانے میں میرا ساتھ اتنی تیزی سے نہیں دے سکے گی جس تیزی کی ضرورت ہے۔ تم دونوں نے یہ خیال رکھنا ہے کہ پولیس کے سامنے گھبرانا نہیں۔ یہ بھی سوچ لو کہ اب پولیس آئی تو اس کی نفری اتنی زیادہ ہوگی کہ اس سارے علاقے کا محاصرہ کرلے گی۔"

"میں پیر کرامتاں والے کے متعلق سوچ رہا ہوں" — تجمّل نے کہا — "میں تو سوچتا تھا کہ اُن کے پاس جاؤں گا اور کہوں گا کہ یا سرکار، ہماری نجات کے لئے کچھ کرو، لیکن تم نے کوئی اور ہی بات سنادی ہے۔"

"خدا کا شکر ادا کرو تجمّل بھائی!" — میں نے کہا — "کہ وہ کرامتاں والا پیر اور سائیں نہیں ہے ورنہ تم اُس کی دعاؤں کے دھوکے میں مارے جاتے۔ تمہاری صحیح مدد یہی دونوں کریں گے۔ مجھے اور اس لڑکی کو اُنہوں نے سنبھال لیا تو اس ملک کی ساری پولیس فورس بھی آگئی تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی.... ہاں، ایک ضروری بات رہ چلی تھی۔ جن آدمیوں نے ایوب کو قتل کیا اور کُبے اور مرزے کو پکڑا تھا ان میں دو آدمی یہاں کے ہیں۔ انہیں کہیں باہر بھیج دینا۔ انہیں صبح ہی غائب کردو.... رات ابھی بہت ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ مجھے اپنی گھوڑی دو۔"



حمید اللہ اور نور اللہ جس گاؤں میں رہتے تھے وہ وہاں سے پندرہ سولہ میل دُور تھا۔ میں وہاں کبھی نہیں گیا تھا۔ منور اور تجمّل سے راستہ معلوم کیا اور میں روانہ ہوگیا۔ سائرہ کو میں بتا آیا کہ سائیں کرامتاں والے کے پاس جا رہا ہوں۔

جانے کا یہ کون سا وقت ہے؟" — سائرہ نے پوچھا۔

"پچھلی ملاقات میں اُنہوں نے مجھے یہی رات بتائی تھی" — میں نے جھوٹ بولا — "اور وقت بھی یہی بتایا تھا۔ انہوں نے مجھے کوئی خاص عمل بتانا ہے۔"

گھوڑی بڑی اچھی تھی اور رات خنک تھی۔ میری طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی۔ میں کھلی فضاؤں میں اُڑنے والا پنچھی تھا، لیکن حالات نے مجھے پنجرے کا پنچھی بنا دیا تھا۔ کھلی فضا نے مجھ پر ایسا خمار سا طاری کیا کہ میں اپنے آپ ہی اُس دور کی ایک غزل گنگنانے لگا۔ اچانک خیال آیا کہ میں آزاد نہیں ہوں اور مجھے صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے واپس اسی کوٹھڑی میں آنا اور قید ہوجانا ہے۔ میں نے گھوڑی کی باگ کو ذرا سا جھٹکا دیا اور ہلکی سی ایڑ لگائی۔ گھوڑی کی رفتار تیز ہوگئی۔

اُس گاؤں میں داخل ہُوا تو لگتا تھا جیسے یہاں کوئی آباد ہی نہ ہو۔ کُتے جاگ رہے تھے جنہوں نے بھونکنا شروع کردیا۔ اُن کی آواز پر ایک آدمی باہر آیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ سائیں کرامتاں والے کا ڈیرہ کون سا ہے۔

"میں تمہیں اُن کا ڈیرہ بتا دیتا ہوں" — اُس نے کہا — "لیکن اس وقت اُن کے دربار میں جانے کی نہ سوچنا ورنہ ان کے آدمی تمہیں گاؤں سے باہر نکال دیں گے۔"

اُس نے مجھے وہ گھر دُور سے دکھا دیا۔ میں وہاں گیا اور دروازے پر بڑی زور سے دستک دی۔ ایک آدمی نے دروازہ کھولا اور غصے سے پوچھا کہ کون ہو اور کیا لینے آتے ہو۔ میں گھوڑی سے اُترا۔

"سائیں جی کو جگاؤ۔"

"تم پاگل تو نہیں ہوگئے؟" — اس آدمی نے کہا — "دن کو آنا.... مصیبت کے مارے ہوتے معلوم ہوتے ہو یا تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں۔"

"سائیں سرکار سے کہو کہ وہ آیا ہے" — میں نے کہا — "میں اُن کا مُرید نہیں ہوں۔ میں اُن کے لئے بڑی دُور سے پیغام لایا ہوں۔ وہ میرا انتظار کررہے ہوں گے۔"

یہ آدمی پھر بھی اتنی جرأت نہیں کر رہا تھا کہ سائیں کرامتاں والے کو جگا دیتا۔ میں اُسے دھکا دے کر اندر چلا گیا اور پوچھا کہ وہ کون سے کمرے میں سوتے ہوتے ہیں اور اُسے یہ بھی کہا کہ وہ میری گھوڑی کہیں باندھ دے۔ یہ دیہات کے عام مکانوں سے بہتر مکان تھا۔ میں ڈیوڑھی میں سے گزر کر اندر چلا گیا۔ اُس آدمی نے ڈرتے ڈرتے مجھے ایک کمرہ دکھایا۔ میں نے اُس کمرے کا دروازہ زور سے دھکیلا۔ یہ بند نہیں تھا۔ کواڑوں کی زوردار آواز سے نوراللہ کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس نے بڑے غصّے سے پوچھا کہ کون ہو۔ اِس آواز سے میں نے پہچانا کہ یہ نوراللہ ہے۔ میں نے کواڑ بند کر دیئے۔

"بتی جلا نُورا!" — میں نے کہا — "اور اُسے بھی بلا لو۔"

لالٹین جل گئی۔ حمید اللہ ساتھ والے کمرے میں سویا ہُوا تھا۔ درمیان میں دروازہ تھا۔ ذرا دیر بعد حمید اللہ بھی آ گیا۔ مجھے دیکھ کر دونوں کچھ گھبرا تے۔

"خیریت تو ہے؟" — نوراللہ نے پوچھا — "وہ کام تو ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔ اس وقت کیسے آئے ہو؟"

میں نے اُنہیں تمام تر صورتِ حال سُنا دی۔ کچھ دیر کے لئے تو وہ بھی چکرا گئے، لیکن چکرانے سے کام نہیں چلتا تھا۔ ہم سوچنے لگے کہ کیا کرنا چاہیئے۔

"دراصل تم نے ہم سے ایک غلطی کرا دی ہے" — حمید اللہ خان نے کہا — "گوبے اور مرزے کے متعلق تم نے ایسی باتیں کی تھیں کہ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ان دونوں کو بھی اُڑا دو۔ ہم میں سے کسی نے بھی نہ سوچا کہ یہ دونوں کتنے ہوشیار اور چالاک ہیں۔ ان کی بجائے کسی سیدھے سادے آدمی کو اس جال میں لے آتے تو یہ مصیبت نہ آتی۔"

"اب یہ نہ سوچو کہ ہم نے غلطی کی ہے" — میں نے کہا — "اب یہ سوچنا ہے کہ ہمیں کہیں پناہ مل سکتی ہے یا نہیں۔"

"مل سکتی ہے یار!" — نوراللہ نے کہا — "ہم اتنے عرصے سے

یہاں بیٹھے ہیں۔ ہمیں ہمیشہ یہ خیال رہا کہ کبھی ایسی صورت پیدا ہو گئی جیسی اب ہو گئی ہے تو کہاں جائیں گے۔ ہم نے مصیبت کے وقت کے لئے ایک ٹھکانہ بنا رکھا ہے۔"

"مجھے بتاؤ میں کیا کروں" — میں نے پوچھا — "تمہارے پاس آ جاؤں؟ .... مجھے امید ہے کہ یہاں چھاپہ نہیں پڑے گا۔ یہاں پہلے سی آئی ڈی کا کوئی آدمی آئے گا۔ تم ذرا ہوشیار رہنا۔ میرے لئے سب سے بڑی مشکل ایوب کی بہن نے پیدا کر رکھی ہے۔"

"تم اُسے میرے حوالے کیوں نہیں کر دیتے؟" — حمید اللہ خان نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے" — میں نے کہا اور اُسے بتایا کہ میں اُسے کیوں کسی کے حوالے نہیں کر سکتا۔ پھر اُسے کہا — "میں اُسے وہاں بھی نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ وہ وہاں سے برآمد ہوتی تو وہ لوگ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ میں اُنہیں کسی تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ اُن کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔"

یہ تو بڑی لمبی باتیں ہیں جو ہم نے آپس میں کیں۔ حمید اللہ اور نوراللہ تجربہ کار تھے اور مجرمانہ امور کی مہارت رکھتے تھے۔ میری طرح وہ بھی ایسی ایسی خطرناک صورتِ حال سے نکل کر آتے تھے جو کوئی عام آدمی سُنے تو سُن کر ہی بے ہوش ہو جاتے۔ ہم نے بحث مباحثہ کر کے طے کر لیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

میں اُسی وقت واپس آ گیا۔ میں نے اب دو تین روز بعد یہاں آنا تھا۔



میں اُس وقت واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا جب صبح ابھی دُھندلی تھی۔

سائرہ نے بتایا کہ وہ رات بھر سو نہیں سکی اور وہ اکیلے ڈرتی رہی ہے۔ کہتی تھی کہ ذرا سی دیر کے لئے آنکھ لگتی ہے تو بڑے ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔

"سکندر!"— اُس نے کہا — "میرے دل پر کسی خوف کا یا آسیب کا اثر ہوگیا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہو۔"

"کچھ نہیں ہوگا سائرہ!"— میں نے ذرا اُکھڑی ہوئی آواز میں کہا — "کچھ نہیں ہوگا۔ دل کو مضبوط کرو۔"

میں اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ میں نے اُسے ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ اُس کا بھائی قتل ہو چکا ہے۔ نہ بتانے کی وجہ یہ تھی کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اب میں نے اُسے یہ بتا دینا ضروری سمجھا کہ میرے متعلق کسی نے مخبری کر دی ہے کہ میں یہاں چھپا ہوا ہوں۔ اُسے ذہنی طور پر تیار کرنا بہت ضروری تھا چنانچہ میں نے اُسے بتا دیا، لیکن اتنا ہی بتایا کہ میرے متعلق مخبری ہوگئی ہے اور یہاں سے نکلنا پڑے گا۔

"اب تم اپنے گھر چلی جاؤ۔"

"نہیں جاؤں گی"— اُس نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا — "اگر تم مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تو اپنے ہاتھوں میرا گلا گھونٹو، مجھے زہر دو یا جس طرح چاہے مجھے ختم کر دو اور مجھ سے آزاد ہو جاؤ۔"

اگر اُس کے ساتھ میرا روحانی لگاؤ پیدا نہ ہو جاتا تو میں شاید ایسے ہی کرتا جیسے وہ کہہ رہی تھی۔ میں خاموش ہوگیا۔

میں رات کا جاگا ہُوا تھا۔ لیٹا اور میری آنکھ لگ گئی۔ دن کے بارہ بج رہے تھے جب میری آنکھ کھُلی۔ سائرہ بھی سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے نہ جگایا۔ اس مکان میں ایک آدمی موجود رہتا تھا۔ اُسے کہا کہ وہ تجمّل یا منوّر کو بلا لائے۔ اُس نے بتایا کہ منوّر آیا تھا اور مجھے سویا ہُوا دیکھ کر واپس چلا گیا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد تجمّل آگیا۔

"راجہ شیر خان کا ایک پیغام آیا تھا"— اُس نے کہا — "کُبے اور مرزے کو سی آئی ڈی والے پولیس ہیڈ کوارٹر لے گئے ہیں۔ شیر خان نے کہا ہے کہ سکندر یا لڑکی یا کوئی مشکوک فرد جاگیر کے علاقے میں ہو تو اُسے دو دنوں سے زیادہ یہاں نہ رہنے دینا۔ اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ پولیس کے جو آدمی جو دونوں ملزموں کو لینے آئے تھے، ان میں سی آئی ڈی کا ایک ہیڈ کانسٹیبل اپنا آدمی تھا۔ اُس نے بتایا ہے کہ گواہ یعنی کُبا اور مرزا چونکہ خود نامی گرامی جرائم پیشہ ہیں اس لئے سی آئی اے سوچ سمجھ کر کارروائی کرے گی.... اب تم بتاؤ تم نے کیا بندوبست کیا ہے۔"

"میرا بندوبست ہو جائے گا"— میں نے جواب دیا — "لیکن تم لوگ چوکنے رہنا۔"



دو دن اور گزر گئے۔ میں نے اپنے طور پر زبانی ریہرسل کر لی تھی کہ پولیس کے اچانک آ جانے سے میں کیا کروں گا، یہاں سے کس طرح نکلوں گا اور کہاں جاؤں گا۔ سائرہ کو بھی میں نے یہ کارروائی سمجھا دی تھی اور رات کو اُسے باہر نکالا اور ایک کھیت کے اندر لے گیا اور اُسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ چھُپنے کا طریقہ کیا ہے اور کھیت کے باہر پتہ چلے کہ کوئی آدمی موجود ہے تو فصل کے اندر ہلنا جُلنا بالکل نہیں۔

ایک رات میں پھر گھوڑی پر سوار ہُوا اور نور اللہ اور حمید اللہ خان کے گاؤں گیا۔ اُس رات مجھے کسی نے نہ روکا۔ دروازہ کھولنے والے نے مجھے دیکھتے ہی میری گھوڑی کی باگ پکڑ لی اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

میں نے خاص طور پر دیکھا کہ وہ دونوں خوش تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میرے ہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے انہیں بتایا تو حمید اللہ خان نے یہ کہہ کر ایک عجیب و غریب ڈرامہ سُنا دیا کہ ادھر تو اللہ نے ایک کرم کر دیا ہے۔

ہُوا یوں کہ گزشتہ شام نور اللہ سائیں کرامتاں والے کے رُوپ میں دربار میں بیٹھا تھا اور مرید حاضری میں بیٹھے تھے۔ ایک نیا مرید آگیا۔ جوان سا دیہاتی تھا۔ نور اللہ کے پاؤں آ پڑا اور بہت رویا۔

"یا سائیں کراماتاں والے!" — اُس نے رندھی ہوئی آواز میں عرض کی — "میرے حال پر رحم کرو۔ دشمنوں نے میری بیوی کو اغوا کر لیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے دو بچے ہیں گھر میں بلبلا رہے ہیں۔"

"تمہیں کیسے پتہ ہے کہ وہ اغوا ہوئی ہے؟" — نوراللہ نے پوچھا — "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ خود ہی کسی کے ساتھ چلی گئی ہو؟ ..... یہ تو ہم دیکھ کر بتائیں گے۔ پتہ چل جائے گا کہ وہ خود گئی ہے یا لے جائی گئی ہے۔"

"سرکار!" — اس مفلوک الحال آدمی نے کہا — "وہ لے جائی گئی ہے اور لے جانے والے میرے دشمن ہیں۔ اُن کی پہنچ تھانے تک ہے۔ وہاں گیا تو تھانیدار نے بھی یہی کہہ دیا کہ تمہاری بیوی بدمعاش تھی۔ وہ خود ہی اپنے کسی یار کے ساتھ نکل گئی ہے ..... حضور کے ہاتھ میں بڑی کرامت ہے۔ اس ناچیز بندے کے حال پر رحم کریں۔ میں کوئی غریب آدمی نہیں ہوں۔ سرکار جو نذرانہ طلب کریں گے وہ قدموں میں رکھ دوں گا۔ میری کچھ زمین ہے وہ پیش کر دوں گا۔"

"مت گھبرا" — نوراللہ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "کرامات کرنے والا اللہ ہے۔ ہم کچھ نہیں لیں گے۔"

نوراللہ اپنی ایکٹنگ کا کمال دکھاتا رہا۔ تسبیح کے دانوں کا کرتب دکھایا۔ حمیداللہ پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔ یہ مرید کچھ ایسا متاثر ہوا کہ اُس نے دل کی ایک اور بات کہہ دی۔

"سرکار کراماتاں والے!" — اُس نے کہا — "میری قسمت میں جدائیاں ہی لکھی ہیں۔ چھوٹا سا تھا تو موت نے ماں باپ کو مجھ سے جدا کر دیا۔ بڑے ہو کر ایک یار بنایا تھا۔ اُس سے بھی جدائی ہو گئی۔ اُس کی جدائی بیوی کی جدائی سے زیادہ دکھ دے رہی ہے۔ سرکار صرف اتنا بتا دیں کہ وہ کہاں ہے یا صرف اتنا پتہ چل جائے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے زندہ اور سلامت ہے تو دل کو چین آ جائے گا۔"

"کون ہے وہ؟" — نوراللہ نے جھومتے ہوئے پوچھا — "کہاں

چلا گیا تھا؟"

"یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں چلا گیا ہے سرکار!" — اُس نے جواب دیا — "وہ پولیس میں ہوا کرتا تھا اور اُس کا نام سکندر ہے۔"

نوراللہ نے پہلے حمیداللہ کی طرف دیکھا۔ پھر اُس نے آنکھیں بند کیں۔ ہاتھوں کے عجیب وغریب سے اشارے کئے۔

"وہ گورے رنگ کا تو نہیں؟" — نوراللہ نے کہا — "اور ہمیں اُس کی آنکھیں بڑی خوبصورت نظر آ رہی ہیں۔"

"ہاں سرکار!" — اُس آدمی نے خوش ہو کر کہا — "آپ نے ٹھیک دیکھا ہے۔ اگر وہ سرکار کو نظر آ رہا ہے تو یہی بتا دیں کہ وہ خیریت سے تو ہے۔"

"کیا تمہیں اپنی بیوی چاہیئے یا دوست؟" — نوراللہ نے پوچھا — "ہم کوئی جادوگر نہیں۔ اللہ نے ایک کرامت عطا کی ہے۔"

"سرکار!" — اس آدمی نے کہا — "پہلے تو مجھے میرے بچوں کی ماں واپس کرا دیں۔ میں بہت دُکھی ہوں۔ بڑی دُور سے آیا ہوں۔"

"سرکار!" — حمیداللہ خان نے نوراللہ سے کہا — "اس کے دُکھ اس کے چہرے پر لکھے ہیں۔ اس نے تو میرا بھی دل دُکھی کر دیا ہے۔ اس پر کرم کر دیں۔"

"اسے اندر بٹھاؤ" — نوراللہ نے حمیداللہ سے کہا — "ہم آ کر دیکھیں گے کیا ہو سکتا ہے۔"

حمیداللہ اس آدمی کو ایک کمرے میں لے گیا۔ لے جاتے ہوئے اُسے کہا کہ تم خوش قسمت ہو کہ سائیں جی موج میں آ گئے ہیں ورنہ سرکار کسی کو اتنا وقت نہیں دیا کرتے۔

اُسے ایک کمرے میں داخل کر دیا اور حمیداللہ اُس کے بعد کمرے میں گیا۔



وہ آدمی کمرے میں داخل ہُوا۔ دو تین قدم آگے چل کر وہ رُکا اور اُس نے پیچھے دیکھا۔ حمیداللہ کے ہاتھ میں ریوالور تھا جو اُس نے اپنے کپڑوں کے اندر سے ایک دو سیکنڈ میں نکال لیا تھا اور اس کی نالی اُس آدمی کی طرف کر دی تھی۔

"سلطان!"— حمیداللہ نے دوسرا ہاتھ آگے کر کے کہا —"اپنا ریوالور میرے حوالے کر دو۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"— اس آدمی نے ڈرے ہوتے لہجے میں کہا —"آپ نے سلطان کسے کہا ہے؟ آپ کس کی غلط فہمی میں مجھ سے ریوالور مانگ رہے ہیں؟ میرے پاس ریوالور کہاں؟ میں غریب آدمی ہوں۔"

"تم پولیس کی سپیشل برانچ کے سب انسپکٹر سلطان احمد ہو"— حمیداللہ نے کہا —"اور سکندر کے دوست ہو۔ کیا تم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ میں تمہیں پہچان نہیں سکوں گا؟ میرے مقدمے میں تم کتنی بار میرے سامنے آتے تھے اور ہر بار بہت دیر تک میرے سامنے رہے تھے۔ میں نے تمہیں اور سکندر کو قتل کروانا تھا۔ تم ہی نے مجھے بے گناہ عمر قید دلائی تھی۔"

وہ میرا دوست سلطان احمد تھا جو میرے ساتھ سپیشل برانچ میں سب انسپکٹر ہُوا کرتا تھا۔ حمیداللہ کو سزا دلانے میں اُس کا بڑا ہاتھ تھا۔ اُس نے اب حمیداللہ کو بتایا کہ وہ وہاں سے تبدیل ہو کر اس ضلعے کے پولیس ہیڈکوارٹر میں آگیا ہے۔ اب تو وہ بہت ماہر ہو گیا تھا اس لئے اُسے سپیشل برانچ میں ہی رہنے دیا گیا۔

حمیداللہ خان اُس سے اُس کا ریوالور مانگ رہا تھا۔ سلطان ہنس پڑا اور بیٹھ گیا۔ حمیداللہ خان اُس کے جھانسے میں آنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ اب اُسے کہہ رہا تھا کہ اب تم یہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے اور پولیس کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔

"اگر صرف تمہارا معاملہ ہوتا"— سلطان نے کہا —"تو میں تمہیں صرف دیکھ کر واپس چلا جاتا اور رپورٹ دیتا کہ یہ مفرور نوابزادہ حمیداللہ خان ہی ہے، لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ سکندر بھی اس علاقے میں ہے۔ میں اُسے گرفتار نہیں ہونے دوں گا۔ اُسے ہر قیمت پر یہاں سے نکالوں گا۔ تم اپنا ریوالور اندر کر لو اور مجھ پر بھروسہ کرو۔"

اتنے میں نوراللہ بھی اندر آگیا اور انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔ نوراللہ نے بھی سلطان کے ساتھ طنزیہ باتیں کیں۔ سلطان انہیں کہتا تھا کہ وہ انہیں نہیں پکڑواتے گا۔

"ہم تم پر کیسے اعتبار کر لیں"— نوراللہ نے کہا —"ہمارے ساتھ تمہارا رشتہ ہی کیا ہے؟ تم پکڑے گئے ہو اور اب جان چھڑانے کے لئے ہمارے ہمدرد بن رہے ہو۔"

"میرا رشتہ سکندر کے ساتھ ہے"— سلطان نے کہا —"یہ رشتہ اتنا پکا ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کا نام سکندر رکھا ہے۔ اگر صرف اس نوابزادے کا معاملہ ہوتا تو میں اسے دیکھتے ہی واپس چلا جاتا اور کل اس وقت تک نوابزادہ سپیشل برانچ کی حوالات میں ہوتا، اور تم نوسربازی کے جرم میں پکڑے ہُوئے ہوتے۔ میں جانتا تھا کہ اگر تم یہاں ہو تو سکندر بھی یہیں کہیں ہو گا۔ اُس کے ساتھ میری دوستی خون کے رشتے سے زیادہ گہری ہے۔"

"تم اُسے بچا لو گے اور ہمیں پکڑوا دو گے"— حمیداللہ خان نے کہا۔

اس کمرے میں ایک عجیب صورت پیدا ہو گئی تھی۔ سلطان احمد کہہ رہا تھا کہ سکندر کی خاطر وہ اُن کے خلاف کوئی رپورٹ نہیں دے گا بلکہ وہ یہ رپورٹ دے گا کہ یہ وہ مفرور نوابزادہ حمیداللہ خان نہیں اور ساتھ کراتاں والا جعلی پیر نہیں، لیکن یہ دونوں بچے تو نہیں تھے کہ اُس کی باتوں میں آجاتے۔ سلطان احمد نے اُنہیں یہ بھی بتا دیا کہ سپیشل برانچ نے

اور کیا کیا کارروائی سوچی ہے۔ اس میں ایک تو یہ تھی کہ پولیس کی خاصی زیادہ نفری تحصیل اور متوٗر کے علاقے کو گھیرے میں لے کر اس طرح تلاشی لے گی کہ فصل کے اندر جا کر بھی دیکھا جائے گا۔ سلطان احمد نے اس چھاپے کا دن اور وقت بھی بتا دیا۔ اس کے باوجود یہ دونوں اُس پر اعتبار نہیں کر رہے تھے۔

"خدا کے لئے مجھے بتاؤ میرا دوست کہاں ہے" — سلطان احمد نے جذباتی لہجے میں کچھ غصہ بھر کر کہا — "میں نے اُسے چھاپے سے پہلے وہاں سے نکالنا ہے۔ اگر تمہیں ڈر ہے کہ میں تمہیں پکڑوا دوں گا تو یوں کرو کہ میں باہر نکلتا ہوں اور تم دونوں کسی بہانے یہاں سے نکلو اور غائب ہو جاؤ۔ میں نہیں دیکھوں گا کہ تم کس طرف گئے ہو۔ میں اکیلا آیا ہوں۔"

مختصر یہ کہ بڑی ہی مشکل سے ان دونوں نے سلطان احمد پر اعتبار کیا۔ یہ سلطان کا کمال تھا اور یہ اُس کے خلوص اور دیانتداری کا اثر تھا کہ حمید اللہ خان اور نور اللہ جیسے کایاں آدمی جو مجرمانہ زندگی میں ڈوبے ہوتے تھے، اُس کی بات مان گئے۔ وہ مجھ سے ملنے کو بے تاب تھا۔ انہوں نے اُسے یہ نہ بتایا کہ میں کل رات یہاں آؤں گا۔ سلطان احمد چلا گیا۔



میں آگیا تھا۔ انہوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا اور یہ بتایا کہ سلطان احمد آئے گا تو میرا پسینہ نکل آیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ بے شک سلطان میرا دوست تھا، لیکن وہ پولیس میں اتنا پرانا ہو چکا ہے جتنے عرصے میں خون کے رشتوں کے لئے بھی دل میں ہمدردی نہیں رہتی۔ مجھے یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ پہلے سلطان آئے گا۔ ہم کمرے میں بیٹھے ہوتے ہوں گے اور طوفان کی طرح پولیس آئے گی اور ہم تینوں کو پکڑ لے جائیں گے۔

"کیا تم نے کچھ سوچا ہے کہ اچانک پولیس آگئی تو کیا کرو گے؟" — میں نے اُن سے پوچھا۔

انہوں نے ایسی صورتِ حال کے لئے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ وہاں وہ پیر بنے ہوتے تھے۔ وہ کسی سے یہ کہہ بھی نہیں سکتے تھے کہ باہر پہرہ

دیں اور پولیس آئے تو انہیں خبردار کر دیں۔ انہوں نے اپنے لئے بہت بڑا خطرہ پیدا کر لیا تھا۔

میری پریشانی عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کروں۔ ان دونوں کو بُرا بھلا کہنے کے سوا میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان دونوں کو دو دو تین تین گالیاں دیں لیکن اس سے مجھے کوئی افاقہ نہ ہُوا۔ اتنی دیر میں ایک آدمی اطلاع لایا کہ جس آدمی کو آپ نے وقت دیا تھا وہ آگیا ہے۔ فوری طور پر میرے دماغ میں آئی کہ جونہی سلطان احمد اندر آئے، ہم تینوں اُسے دبوچ لیں، گلا گھونٹ کر اُسے مار ڈالیں اور پچھلے دروازے سے نکل جائیں۔ یہ تو ظاہر تھا کہ پولیس نے گھیرا ڈال کر سلطان کو اندر بھیجا تھا۔ ہمارے پاس ریوالور تھے۔ ہم نے مقابلہ کر کے باہر نکلنا تھا یا پولیس کی گولیوں سے مرنا تھا۔ میں نے عہد کر رکھا تھا کہ زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ اگر نکلنے کی صورت نظر نہ آئی تو ریوالور میں ایک گولی اپنے خاتمے کے لئے بچا کر رکھوں گا۔

میرا دماغ چکرانے پر آگیا تھا کہ سلطان احمد دیہاتی لباس میں کمرے میں داخل ہُوا۔ وہ میرا اتنا عزیز دوست تھا کہ اُسے دیکھ کر میرا دماغ ٹھکانے آگیا۔ سلطان مجھے دیکھ کر دروازے میں ہی رُک گیا اور اُس کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔

"سلطان!" — میں نے آہستہ سے کہا — "میں نے تیرے ہی ہاتھوں پھانسی کے تختے تک پہنچنا تھا!"

سلطان کی کھُلی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر ٹکٹکی باندھے رہیں۔ ان آنکھوں میں نمی سی نظر آنے لگی۔ پھر اُس کی آنکھیں دو جھیلوں جیسی ہو گئیں اور پھر ان آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سلطان کا ہاتھ بڑی تیزی سے اپنی قمیض کے اندر گیا اور اُسی تیزی سے ہاتھ باہر آیا۔ ادھر میں اپنا ریوالور نکالنے ہی لگا تھا کہ سلطان کا ریوالور پہلے نکل آیا۔ اُس نے اپنا ہاتھ اپنے سر سے اُوپر کیا اور ریوالور ایک پتھر کی طرح بائیں طرف کی دیوار پر دے مارا۔ ریوالور

دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گرا۔

اُس نے یہ حرکت اس قدر تیزی سے کی کہ میں اور حمید اللہ ابھی اپنے ریوالور نکال بھی نہ پاتے تھے۔ اگر وہ ہمارے ریوالور نکل آنے کے بعد اپنا ریوالور نکال کر پھینک دیتا تو ہم سمجھتے کہ وہ بدنیتی سے آیا تھا اور دو ریوالوروں کی نالیاں دیکھ کر اُس نے ہتھیار ڈال دیتے ہیں، لیکن اُس نے اپنا ہتھیار بڑی نفرت اور غصے سے پتھر کی طرح پھینک دیا تھا۔

اُس نے اپنے بازو پھیلاتے اور پہلے آہستہ آہستہ پھر تیزی سے میری طرف آیا۔ میں نے اپنا ریوالور اپنے نیفے میں اُڑس لیا اور اس پر اپنی قمیض کا پردہ ڈال دیا۔ دوسرے لمحے سلطان احمد اس طرح میرے ساتھ چپکا ہُوا مجھے اپنے بازوؤں میں بھینچ رہا تھا جیسے مجھے اپنے وجود میں جذب کر لینا چاہتا ہو۔ جذبات کی شدت سے وہ سسک سسک کر رو رہا تھا۔ کمرے میں سناٹا طاری تھا۔

ہم دونوں بہت دیر اسی حالت اور اسی کیفیت میں رہے۔ پھر ہم دونوں کو بیک وقت ہی یاد آگیا کہ ہم عید نہیں مل رہے نہ یہ دو بچھڑے ہُوتے دوستوں کے ملاپ کی تقریب ہے بلکہ ہم دونوں اپنے اپنے خطروں میں گھرے ہوتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو کر بیٹھ گئے۔ سلطان جذباتی آدمی تھا۔ میں پہلے اُس کے ماضی کی داستان سُنا چکا ہوں۔ وہ پیار کا پیاسا اپنے آپ کو خلق کا راندہ ہُوا اور دھتکارا ہُوا انسان سمجھتا تھا۔ اُس نے جب میرے ماضی کی داستان سُنی تھی تو اُس نے مجھے اپنا جڑواں بھائی کہہ دیا تھا۔ میں واحد شخص تھا جس سے اُسے پیار ملا تھا اور جو اُس کے جذبات اور احساسات کی کیفیت کو سمجھتا تھا۔ وہ سلطان مجھے پھانسی کے تختے پر کھڑا نہیں کر سکتا تھا بلکہ جب اُس نے بتایا کہ کیا سوچ کر آیا ہے اور اپنے انگریز افسروں کو کیا رپورٹ دے گا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ شخص میری جگہ اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر رہا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ سلطان، تم مجھے نہیں بچا سکو گے۔ اپنی نوکری، اپنی

بیوی اور اپنے دو بچوں کا مستقبل تباہ نہ کرو بلکہ مجھے ساتھ لے چلو اور ان کے لئے دس ہزار روپیہ وصول کرو۔ یہی ایک تحفہ ہے جو میں تجھے دے سکتا ہوں۔

سلطان احمد بہت بڑی قربانی دینے کا عہد کر چکا تھا۔

ہمارے درمیان بہت باتیں ہوئیں جو میں بعد میں سناؤں گا۔ سلطان کہہ رہا تھا کہ وہ ہم سب کو نکل جانے کا موقع دے گا، لیکن اب ہم تینوں میں سے یہ کوئی بھی نہ سوچے کہ ہم یہاں کچھ دن اور رہ سکیں گے۔

"سلطان!" — میں نے کہا — "میرا ایک مسئلہ اور ہے اور وہ ہے ایوب کی بہن" — میں نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ سائرہ کس طرح مجھ تک پہنچی ہے اور کس طرح وہ میری روح کی گہرائیوں تک پہنچ گئی ہے۔ میں نے اُسے کہا — "وہ اب اپنے گھر نہیں جانا چاہتی اور میں اُسے بھٹکنے کے لئے اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا"۔

سلطان کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا — "اُسے میں اپنے گھر پہنچا سکتا ہوں۔ وہ لاجو کے ساتھ رہے گی۔ پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے"۔

"سلطان بھائی!" — حمید اللہ خان بولا — "ہمارے متعلق بھی کچھ سوچا ہے یا اپنے یار کو نکال کر ہمیں پھنساؤ گے؟"

"سب سوچ لیا ہے بھائی!" — سلطان نے کہا — "تم یہاں سے نکل جاؤ گے تو میں اپنے ہیڈکوارٹر چلا جاؤں گا اور رپورٹ دوں گا کہ یہ واقعی مفرور نوابزادہ حمید اللہ خان ہے اور اس کے ساتھ ایک جرائم پیشہ آدمی نور اللہ ہے۔ اس طرح یہ ہوگا کہ میری رپورٹ صحیح ہوگی اور جب یہاں چھاپہ پڑے گا تو تم غائب ہو چکے ہو گے"۔

ہم نے اگلی رات پھر یہیں ملنے کا وقت طے کیا اور سلطان احمد چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد مجھے پھر اس پریشانی نے گھیر لیا کہ سائرہ کو میں کس طرح کہیں بھیجوں گا۔ سلطان احمد نے ابھی سوچ کر بتانا تھا کہ سائرہ کو کس طرح یہاں سے نکالے گا۔ سلطان احمد جاتے جاتے یہ بھی کہہ گیا تھا کہ وقت بہت تھوڑا ہے اور کچھ پتہ نہیں کس وقت کیا ہو جائے

سلطان احمد کے چلے جانے کے بعد کمرے میں ہم تین آدمی رہ گئے تھے — حمید اللہ خان، نور اللہ اور میں — لیکن ایسی خاموشی جیسے وہاں کوئی بھی نہ تھا یا جیسے ہم تینوں پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

"لو بھئی!" — حمید اللہ خان نے سکوت توڑا — "ہیری مُریدی کی عیاشی بھی گئی۔"

کمرے میں زندگی لَوٹ آئی۔

میں یادوں اور خیالوں سے بیدار ہو گیا۔ سلطان احمد نے اتنی مدّت بعد میرے سامنے آکر مجھے ماضی میں دُور پیچھے پھینک دیا تھا۔ اُس وقت کا ایک ایک لمحہ میری آنکھوں کے آگے سے فلم کی طرح گزرنے لگا۔ سلطان احمد کی پہلی اور آخری ملاقات کے درمیان جو دن گزرے تھے وہ میری زندگی کے بڑے ہی حسین دن تھے۔ ہم دونوں پیار کے پیاسے تھے اور ایک دوسرے کے لئے ہم پیار کے چشمے بن گئے تھے۔ اس کے باوجود مجھے توقع نہیں تھی کہ سلطان میرے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لے گا کہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دے گا۔ پکڑے جانے کی صورت میں اُس کی صرف نوکری نہیں جاتی تھی بلکہ مجھ جیسے مفرور قاتل کو بچانے کے جرم میں اُسے چودہ سال سزائے قید ملتی تھی۔

"نہیں" — میں نے حمید اللہ اور نور اللہ سے کہا — "نہیں میرے بھائیو! میں اس شخص سے اتنی بڑی قربانی نہیں لوں گا۔"

"پھر کیا کرو گے؟" — حمید اللہ نے پوچھا۔

"تم دونوں نکل جاؤ" — میں نے کہا — "میں سلطان سے کہوں گا کہ مجھے گرفتار کرلے۔ ایک تو اسے دس ہزار روپیہ ملے گا اور اسے ترقی بھی مل جائے گی۔ تم اس کی بیوی کو نہیں جانتے۔ وہ ہندو تھی۔ ہمارے پاس کسی

اور مقصد کے لئے آئی تھی لیکن اُس نے ہمیں اپنا مقصد بھی بتا دیا اور اپنا مذہب بھی چھوڑ دیا اور مسلمان ہو کر سلطان کے ساتھ شادی کر لی۔"

مجھ پر جذبات کا ایسا غلبہ تھا کہ میں اپنے ان دونوں دوستوں کو سنانا چاہتا تھا کہ لاجو کس طرح ہمارے پاس آئی تھی اور کس طرح وہ میرے اور سلطان کے سلوک سے متاثر ہوئی تھی۔ میں ہر ایک بات سنا کر دراصل اُن لمحات کو زندہ کرنا چاہتا تھا لیکن نور اللہ نے مجھے آگے بولنے نہ دیا۔

"عقل سے کام لے سکندر!" — اُس نے کہا — "سلطان کم عقل نہیں۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے سوچ سمجھ کے کر رہا ہے۔"

"تم جاؤ سکندر!" — حمید اللہ خان نے کہا — "کل آجانا۔"

"ہم یہاں سے جائیں گے کہاں؟" — میں نے پوچھا — "کہاں لے جاؤ گے مجھے؟"

"یہ ہم تمہیں بعد میں بتائیں گے" — حمید اللہ خان نے کہا — "ہمارا جو بھی انتظام ہے وہ بڑا ہی اچھا اور محفوظ ٹھکانہ ہے .... اور دیکھو سکندر! ان فضول جذبات سے نکلو۔ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ یہ مت بھولو کہ ہماری ٹکر انگریزوں کے ساتھ ہے۔"

میں وہاں سے نکل آیا۔ گھوڑی پر سوار ہوا اور اُس گاؤں سے بھی نکل آیا۔ میرے ذہن پر سلطان احمد سوار تھا۔ میں نے بڑے ہی مشکل اور انتہائی خطرناک حالات کا سامنا کیا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ مجھ میں کوئی مافوق الفطرت قوّت ہے جس کے سامنے کوئی خطرہ نہیں ٹھہر سکتا۔ میں یہ حالات و خطرات آپ کو سُنا چکا ہوں۔ میرے بعض کارنامے ایسے ہیں جنہیں آج یاد کرتا ہوں تو مجھے بھی یقین نہیں آتا اور ایسے لگتا ہے جیسے میں اپنے آپ سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ آپ تو ان پر یقین کریں گے ہی نہیں، لیکن جب حمید اللہ خان نے مجھے کہا کہ جذبات سے نکلو اور میں نے جذبات سے نکلنے کی کوشش کی تو میں نے محسوس کیا کہ میں بہت ہی کمزور آدمی ہوں۔

انسان چٹانوں کے جگر چاک کر سکتا ہے، اپنے آپ پر غلبہ نہیں

پاسکتا۔

اپنے ہی جذبات کے سامنے [illegible] اور مجبور ہو جاتا ہے۔

میں جذبات سے نکلنے کی کوشش کرتا [illegible] شدت سے یہ ارادہ ذہن سے اُٹھتا تھا کہ میں اپنے ٹھکانے [illegible] تے وہاں چلا جاؤں جہاں سلطان احمد ہے اور اُس سے کہوں [illegible] بچوں کے لئے دس ہزار روپیہ نقد تحفہ لایا ہوں۔

"جذبات سے نکلو سکندر!" ——— بار بار [illegible] اللہ خان کی یہ آواز مجھے سنائی دیتی تھی۔

میری ذات میں ایک جنگ شروع ہو گئی۔ کبھی تو میں ایسی اذیت میں مبتلا ہو جاتا جیسے میرا وجود رسّوں میں جکڑا ہوا ہو اور کچھ لوگ مجھے دائیں طرف اور کچھ لوگ بائیں طرف جھٹکے دے دے کر کھینچ رہے ہوں۔

میں پریشان ہو گیا۔ میری روح کراہنے لگی۔ میں نے لمبے لمبے سانس لئے اور اپنے ذہن کو خالی کر دیا۔ میں اُس قوت کے بکھرے ہوئے ٹکڑے یکجا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا جس کے متعلق مجھے کچھ لوگوں نے بتایا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی قوت ہے جو ہر کسی میں نہیں ہوتی، لیکن میں اس کوشش میں بُری طرح ناکام ہُوا۔

میں نے اپنے سر کو زور زور سے جھٹکے دیئے۔ میں بیدار ہو گیا اور دیکھا کہ گھوڑی رُکی ہوئی ہے۔ میں اس کی پیٹھ پر بیٹھا ہُوا ہوں اور میرا سر جھکا ہُوا ہے اور میری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ مجھے اپنے آپ پر رحم آ گیا۔

"موت و حیات کے اس کھیل کو یہیں پر ختم کرو سکندر!" ——— میری اپنی ذات سے آواز اُٹھی ——— "دوست کی محبت اور اُس کے ایثار کی قیمت ادا کر دو۔ جان دے دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس یا فوج کی گولیوں کی بوچھاڑ سے تمہاری جان ضائع ہو جائے۔"

ایک عزم تھا جو پختہ ہو کر اُٹھا تو میرے جسم کا انگ انگ بیدار ہو گیا۔ میری روح جو اذیت میں مبتلا ہو کر کراہ رہی تھی ہشاش بشاش ہو گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ تحمل اور منوّر کے پاس جا کر گھوڑی اُن کے حوالے کروں گا

اور اُن سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤں گا۔ وہاں سے میں نے سلطان کے پاس چلے جانا تھا۔

سلطان ایک گاؤں میں نمبردار کے گھر ٹھہرا ہُوا تھا۔ ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ سلطان احمد اس نمبردار کا دُور پار کا رشتہ دار ہے اور کچھ دنوں کے لئے اُس کے پاس آیا ہُوا ہے۔

میں نے گھوڑی کی باگ کو جھٹکا دیا اور ہلکی سی ایڑ لگائی۔ گھوڑی دوڑ پڑی۔ میں اب کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ میرے ذہن پر مسرت اور شادمانی کا غلبہ تھا۔ اِس مسرت کے ساتھ رات کی پُرسکون خنکی نے مجھے مخمور کر دیا۔

انسان موت کو قبول کر لے تو وہ رنج و آلام سے آزاد ہو جاتا ہے اور جب انسان کسی کی خاطر جان دے رہا ہو تو اُس پر بلکہ اُس کی روح پر ایسا ہی خمار طاری ہو جاتا ہے جیسا اُس وقت مجھ پر طاری تھا۔



میں نشے سے سرشار گھوڑی دوڑاتا چلا جا رہا تھا۔ میں اپنے آپ سے اور گرد و پیش سے بے خبر تھا۔ میں کئی موڑ مڑا تھا۔ گھاٹیاں اُترا بھی تھا اور چڑھا بھی تھا لیکن میں لاشعوری طور پر یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ میں اس کیفیت میں اپنے ٹھکانے کے علاقے میں داخل ہوا۔ میں نے اپنے ارادے کے مطابق تحمل اور منوّر کے پاس جانا تھا لیکن گھوڑی رُکی تو میں نے دیکھا کہ میں تحمل اور منوّر کے گھر کے سامنے نہیں بلکہ اُس کچے سے مکان کے سامنے کھڑا تھا جس میں سائرہ کے ساتھ میں رہتا تھا۔ میں نے وہاں سے گھوڑی موڑی تو مکان کا دروازہ کھلا اور سائرہ باہر آ گئی۔ گھوڑی کے قدموں کی آواز پر اُس کی آنکھ کُھلی تھی اور وہ دوڑتی باہر آ گئی۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں تھی۔ میں نے گھوڑی روک لی۔ سائرہ میرے قریب آ گئی اور اُس نے میری ٹانگ پکڑ لی۔

"اتنی دیر باہر نہ رہا کرو سکندر!" ——— سائرہ نے گھبراتے ہوئے

لہجے میں کہا ــــ "اکیلے ڈر آتا ہے، تمہارا فکر بھی رہتا ہے۔"

اچانک میرے ذہن میں ایک دھماکہ ہُوا۔ ساترہ تو میرے ذہن سے نکل ہی گئی تھی۔ وہ اچانک میرے سامنے آگئی تو میرا عزم میرے ذہن سے نکل گیا۔ ارادے جو باندھے تھے وہ متزلزل ہو گئے۔ میں گھوڑی سے بڑی تیزی سے اُترا اور ساترہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

اتنے میں اس گھر میں جو دو بھائی رہتے تھے ان میں سے ایک باہر آگیا۔ یہ ان دونوں بھائیوں کی ڈیوٹی تھی کہ رات کو چوکس رہا کریں۔ اُسے دیکھتے ہی میں نے اُسے کہا کہ ہم خود ہی ہیں اور وہ جا کر سو جاتے۔ اُس نے میرے کہنے پر گھوڑی کی باگ پکڑی اور اندر لے گیا۔ میں ساترہ کے ساتھ اندر چلا گیا۔

ساترہ کا بازو میری کمر میں اور میرا بازو اُس کی کمر میں تھا۔ ہم اسی طرح اندر چلے گئے اور ایک ہی پلنگ پر بیٹھ گئے۔ میں نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ میں اس لڑکی کو چھوڑ کر نہیں جا سکوں گا لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ہم نے جدا ہونا ہی تھا۔

"ساترہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "اگر حالات سے مجبور ہو کر میں کچھ دنوں کے لئے یا ذرا زیادہ عرصے کے لئے یہاں سے چلا جاؤں تو کیا تم اپنے گھر چلی جاؤ گی؟"

"نہیں!" ــــ ساترہ نے جواب دیا ــــ "میں قبر میں اُتر جاؤں گی اپنے گھر نہیں جاؤں گی۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ گھر میں میرے لئے سوائے بدنامی اور گھر کی قید کے کچھ نہیں رہا۔ تم نے شاید محسوس نہیں کیا کہ میں اب تمہارے بغیر کہیں بھی نہیں رہ سکتی۔ میں نے کل بھی تمہیں یہی جواب دیا تھا..... اب کیا حالات پیدا ہو گئے ہیں؟"

"سی آئی ڈی کو کسی طرح پتہ چل گیا ہے کہ میں یہاں چھپا ہُوا ہوں" ــــ میں نے کہا ــــ "اور سی آئی ڈی کو کسی مخبر نے یہ اطلاع بھی دے دی ہے کہ تم بھی یہیں ہو۔ اب کسی بھی وقت یہاں پولیس کا چھاپہ پڑے گا۔"

"کیا اتنی بڑی جاگیر میں ہم کہیں اور نہیں چھپ سکتے؟" ــــ ساترہ

نے کہا ــــ "تم خود ہی مجھے بتاتے رہے ہو کہ پولیس اچانک آگئی تو ہم اونچی فصل میں کس طرح چھپیں گے ..... کیا اب کوئی نئی بات ہو گئی ہے؟ یہ تو تم نے مجھے کل بھی بتایا تھا کہ کسی نے تمہاری نشاندہی کر دی ہے۔ تم پیر کراماتاں والے کے پاس گئے تھے کہ وہ تمہیں کوئی عمل بتائیں گے۔ کیا وہ تمہیں کوئی ایسا تعویذ نہیں دے سکتے جس سے ....."

"نہیں ساترہ!" ــــ میں نے کہا ــــ "اب تعویذوں کا وقت نہیں رہا۔ اب تعویذ نہیں ریوالور چلیں گے۔ گولیاں چلیں گی۔"

"نہیں سکندر!" ــــ ساترہ میرے اور قریب ہو گئی۔

میں کسی اور ہی کیفیت میں بول رہا تھا۔ ساترہ نے میرے پہلو کے ساتھ لگ کر اپنا بازو میرے گلے میں ڈال دیا تو میں چونک کر چُپ ہو گیا۔ میں نے اس لڑکی کو ڈرا دیا تھا۔ میں نے اُسے بتانا شروع کر دیا کہ اب کیا ہُوا ہے۔ اُسے حمید اللہ خان اور نور اللہ کی اصلیت نہ بتائی۔ یہ بتایا کہ میں سائیں کراماتاں والے کے پاس گیا تو وہاں اپنا ایک دوست مل گیا جو میرے ساتھ سب انسپکٹر ہُوا کرتا تھا۔ میں نے سلطان احمد کا نام بھی بتا دیا۔

"سلطان دیہاتیوں کے بہروپ میں تھا" ــــ میں نے کہا ــــ "ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ وہ مجھے الگ لے گیا اور اُس نے بتایا کہ سی آئی ڈی کے انگریز افسروں کو میرا پتہ چل گیا ہے کہ میں یہاں چھپا ہُوا ہوں۔ اُس نے کہا ہے کہ مجھے یہاں سے فوراً نکلنا چاہئے۔ میں نے اُسے تمہارے متعلق بتایا اور کہا کہ میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اُس نے کہا کہ وہ تمہیں اپنی بیوی کے پاس بھجوا دے گا۔"

ساترہ اکیلے کہیں بھی جانے پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے قائل کر لیا لیکن میں ابھی اُسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کیسے جائے گی کیونکہ سلطان کے ساتھ ابھی پوری بات نہیں ہوئی تھی۔

"کیا میں یہاں اکیلی نہیں رہ سکتی؟" ــــ ساترہ نے پوچھا ــــ "تجمل اور منور میرا خیال نہیں رکھیں گے؟"

"نہیں" —— میں نے اُسے جواب دیا —— "یہ دونوں بھائی تمہارے دشمن ہیں سائرہ! تمہارے بھائی نے منوّر کی بیوی کو جس انجام تک پہنچایا ہے وہ تم جانتی ہو۔ تمہیں تو انتقاماً اغوا کیا گیا تھا۔ انہوں نے تمہارے ساتھ وہی سلوک کرنا تھا۔ تم ان کے تشدد سے اب تک مر چکی ہوتیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ میں یہاں تھا۔ اگر میں تمہیں ان کے حوالے کر گیا تو سمجھ لو کہ میں تمہیں موت کے مُنہ میں دے چلا ہوں۔"

اُس کے چہرے کے حُسن پر خوف و ہراس کی گھٹا چھا گئی۔

"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں" —— میں نے اُس کے گال تھپتھپاتے ہوتے کہا —— "ان حالات کو تم نہیں سمجھ سکتیں۔ میں سمجھتا ہوں۔ اب تم نے ویسے ہی کرنا ہے جیسے میں کہوں گا۔"

میں نے سائرہ کو تو آمادہ کر لیا تھا لیکن میرا اپنا دل آمادہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں سائرہ کو کہیں اور بھیج دوں۔ میں اپنا گلا گھٹتا ہُوا محسوس کر رہا تھا لیکن مجھے زہر کا یہ گھونٹ پینا ہی تھا۔



تجمّل اور منوّر کو معلوم تھا کہ میں حمید اللہ اور نور اللہ کے پاس گیا تھا۔ دن کو وہ آگئے۔ ان کی شوخیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ انہوں نے گاؤں کے اردگرد اپنے آدمی مقرر کر دیئے تھے۔ میں نے انہیں سلطان احمد کے متعلق بتایا کہ وہ کون ہے اور کس بھیس میں حمید اللہ خان اور نور اللہ کو دیکھنے آیا تھا اور اُس کے ساتھ میری ملاقات ہو گئی۔

وہ تو صرف یہ پوچھتے تھے کہ خطرہ کتنا قریب آگیا ہے اور کیا ہو گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ خطرہ ہمارے صحن میں آگیا ہے اور اگر سلطان احمد میرا دوست نہ ہوتا تو ہم سب اس وقت پولیس کی سپیشل برانچ کی حوالات میں ہوتے۔ پولیس کے اچانک چھاپے بلکہ شب خون سے ہم بچ نہیں سکتے تھے۔

"آج رات فیصلہ ہو گا کہ کون کدھر جاتے گا" —— میں نے کہا —— "پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے کیا کرنا ہے۔"

رات کو ہیں فیصلہ کرنے کے لیے "سائیں کراماں والے" کے ڈال پہنچ گیا۔ سلطان اپنے بہروپ میں آگیا تھا۔ ہم نے کوئی رسمی بات نہ کی نہ جذبات کا اظہار کیا۔ اگلے لمحے کا پتہ نہیں تھا کہ کیا آفت لے کر آتے۔

"ایوب کی بہن میرے گھر جاتے گی" —— سلطان نے کہا —— "اُس کے ساتھ بڑا اپکا اور عقل مند آدمی جاتے۔ شہر جا کر وہ پولیس لائنز چلا جاتے اور وہاں کسی سے کہے کہ وہ میرا رشتہ دار ہے اور گاؤں سے اپنی بیوی کے ساتھ مجھے ملنے آیا ہے۔ ایوب کی بہن چادر اس طرح اوڑھے کہ اُس کا پورا چہرہ نظر نہ آتے .... مجھے کاغذ قلم دو۔ میں لاجو کے نام رُقعہ لکھ دیتا ہوں۔ یہ آدمی جب میرے کوارٹر میں پہنچے تو رُقعہ لاجو کو دے دے اور لڑکی کو اُس کے حوالے کر کے واپس آجاتے۔"

"لڑکی تو وہاں پہنچ گئی" —— میں نے کہا —— "لیکن تم نے سوچا نہیں کہ اُسے کب تک اپنے پاس رکھو گے۔ کون جانے میں کہاں ہوں گا۔ میں گرفتار بھی ہو سکتا ہوں، اور تم جانتے ہو کہ میں گرفتار ہو گیا تو جیل سے میری لاش ہی نکلے گی جو لاوارث سمجھ کر بغیر جنازے کے کہیں دفن کر دی جاتے گی۔"

"تمہاری زندگی ایسی نہیں کہ تم کل اور پرسوں کے متعلق آج ہی سوچ لو" —— سلطان نے کہا —— "کیا تم نے کبھی سوچا تھا یا کبھی ارادہ کیا تھا کہ تم ان لوگوں کے پاس آکر ٹھہر و گے یا ہم چاروں کی ملاقات یہاں ہو گی؟ .... تم آج کی سوچو سکندر! کل جو ہو گا اس کے متعلق کل سوچنا۔ یہ لڑکی میرے پاس تمہاری امانت رہے گی۔ اگر تمہارے ساتھ کوئی ایسی ویسی بن گئی تو میں لڑکی کو عزت اور حفاظت سے اُس کے گھر پہنچا دوں گا۔ ابھی تم اس چکر سے نکلو جس میں آگئے ہو۔"

حمید اللہ خان اور نور اللہ نے بھی سلطان احمد کی تائید کی۔

"اس لڑکی نے سکندر کی عقل بیکار کر دی ہے" —— نور اللہ نے کہا —— "میں یہ بات کہتا ہوں کہ لڑکی ہمارے حوالے کر دو۔ تم چاہتے ہو اسے

ساتھ رکھیں یا کہیں آگے چلا دیں۔ خواہ مخواہ اس مصیبت کو ساتھ لئے پھرتا ہے۔"

"مجھے اس دنیا سے اُٹھ جانے دو"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "تم جانتے ہو کہ میں جس ضد پر اٹک جاتا ہوں وہ پوری کر کے چھوڑتا ہوں۔ تم جو چاہے کہہ لو، میں اس لڑکی کو آدھے راستے میں نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ تو جرائم کی دنیا کی باتیں ہیں جو ہم نے بہت کیں۔ وہ سائرہ کو ایک خوبصورت مغویہ سمجھ رہے تھے لیکن میں سائرہ کو اپنے دل میں جو درجہ دے چکا تھا وہ میں آپ کو بتا چکا ہوں۔

حمید اللہ خان نے ایک کاغذ، دوات اور قلم سلطان کو دیا۔ ان لوگوں نے لیے بہت سے کاغذ رکھے ہوتے تھے۔ ان پر وہ تعویذ لکھا کرتے تھے۔ سلطان احمد نے لاجو کے نام رُقعہ لکھا۔ اس میں اُس نے سائرہ کا تعارف اس طرح لکھا کہ یہ لڑکی اُس کی دُور پار کی رشتہ دار ہے اور اسے اپنے گھر میں اس لئے رکھنا ہے کہ برادری میں دشمنی پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے اس لڑکی کے اغوا اور قتل کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس رُقعے میں سلطان نے لاجو کو کچھ اور ہدایات بھی لکھیں جن میں ایک یہ بھی کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ یہ لڑکی ہمارے گھر میں ہے۔

سلطان احمد نے یہ رُقعہ مجھے دے کر بتایا کہ میں سائرہ کو کیا بتاؤں کہ وہ لاجو کے ساتھ کس طرح کی باتیں کرے۔ سلطان نے مجھے یہ بھی کہا کہ میں سائرہ کو پکا کر کے بھیجوں۔

اس موضوع پر ہم میں کچھ دیر بحث مباحثہ ہُوا۔ یہ میری ضد تھی کہ میں سائرہ کو اُن کے گلے ڈال رہا تھا اور نہ اس لڑکی کو وہ بوجھ اور خطرہ سمجھ رہے تھے۔ آج ان دوستوں کی یاد میرا بڑا ہی قیمتی اثاثہ ہے۔ وہ میری محبت کی خاطر ہر طرح کا خطرہ قبول کر رہے تھے۔

"تم ابھی چلے جاؤ سکندر!"۔۔۔ سلطان احمد نے کہا ۔۔۔ "اگر ممکن ہو سکے تو آج ہی رات لڑکی کو روانہ کر دو۔ یہ تمہارا انتظام ہو گا کہ لڑکی اپنے شہر تک

کس طرح پہنچائی جائے گی۔ وہاں سے اُسے ریل گاڑی پر سوار ہونا ہے اور آگے سفر تقریباً ایک سو میل کا ہے۔ لڑکی کے شہر سے رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ایک پسنجر ٹرین گزرتی ہے۔"

"میں اُسے اُس کے شہر تک پہنچانے کا انتظام کر لوں گا"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "لیکن آج ہی رات اُسے بھیجنا ممکن نہیں۔ کل رات وہ چلی جائے گی۔"

"یہ سوچ لو سکندر!"۔۔۔ سلطان نے کہا ۔۔۔ "وقت بہت تھوڑا ہے۔ کل رات لڑکی ضرور نکل جائے اور اس کے بعد تم تینوں یہاں سے غائب ہو جاؤ۔"

"سلطان بھائی!"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "میں اُس وقت یہاں سے نکلوں گا جب میرا آدمی سائرہ کو تمہارے گھر چھوڑ کر واپس آ جائے گا۔"

"چلو، ایسے ہی سہی"۔۔۔ سلطان نے کہا ۔۔۔ "ایک دن اور رات مزید رُک جاؤ لیکن یہ سوچ لو کہ جتنا بھی وقت ضائع کرو گے اُتنا ہی خطرہ تمہارے قریب آ رہا ہے۔ مجھے ڈر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارا ڈی ایس پی اچانک نہ آن ٹپکے ..... اب تم لوگ مجھے یہ بتاؤ کہ جاؤ گے کہاں؟"

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟"۔۔۔ حمید اللہ خان نے پوچھا۔

"ہاں!"۔۔۔ سلطان نے کہا ۔۔۔ "میں اسے ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ اس لئے کہ مخبری ہو سکتی ہے۔ یہ مخبری مجھ تک بھی پہنچے گی۔ میں اس صورت میں تمہیں قبل از وقت اطلاع دے سکتا ہوں۔"

"دیبا نام سنا ہے کبھی؟"۔۔۔ حمید اللہ خان نے کہا ۔۔۔ "بڑا مشہور نام ہے۔"

"نہیں!"۔۔۔ سلطان نے جواب دیا ۔۔۔ "میں ابھی اتنے زیادہ ناموں سے واقف نہیں ہُوا۔"

میں بھی اس نام سے واقف نہیں تھا۔ حمید اللہ خان نے اس کا جو تعارف کرایا وہ یہ تھا کہ دیبا وہاں سے کم و بیش تیس میل دُور ایک ایسے

دیہاتی علاقے میں رہتا تھا جہاں اُس وقت تک کوئی پکی سڑک نہیں بنی تھی۔ کچی پگڈنڈیاں وہاں تک جاتی تھیں۔ وہ پہاڑی سا علاقہ تھا۔ زمین کی یہ حالت تھی کہ گہرے اور وسیع کھڈ اور برساتی نالے تھے۔ زمین کہیں اُونچی اور کہیں نیچے چلی جاتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور ٹیکریاں تھیں۔ علاقہ سرسبز اور گھنے اور ہر طرح کے درختوں والا تھا۔ حمید اللہ نے بتایا کہ وہاں جگہ جگہ پانی کھڑا رہتا ہے اور دلدل بھی ہے۔

یہ علاقہ جہاں زیادہ دشوار گزار ہو جاتا تھا وہاں چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ دیبا اس گاؤں میں رہتا تھا۔ اُس کا نام دبیر احمد تھا اور وہ دیبا کے نام سے مشہور تھا۔ کہنے کو تو وہ بڑا زبردست ڈاکو اور رہزن تھا لیکن وہ کسی اور ہی حیثیت اور کسی اور ہی قسم کا آدمی تھا۔ حمید اللہ نے مجھے بتایا کہ وہ ایک طرف تو نامی گرامی جرائم پیشہ لوگوں کا پیر و مُرشد تھا اور دوسری طرف باعزت لوگوں میں بھی ہر دلعزیز اور مقبول تھا۔ اُس سے لوگ ڈرتے بھی تھے اور اُس کی عزت بھی کرتے تھے۔

حمید اللہ نے سلطان کو دیبا کے متعلق مختصراً بتایا اور اُس کا گاؤں بھی اُسے سمجھا دیا۔

سلطان احمد وہاں زیادہ دیر نہیں رُک سکتا تھا۔ تمام باتیں طے کر کے وہ چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے حمید اللہ اور نور اللہ کے ساتھ کچھ ضروری باتیں کیں اور وہاں سے آ گیا۔



یہ روئیداد آگے سنانے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ دیبا کے متعلق آپ کو بتا دوں کہ حمید اللہ کے ساتھ اُس کی دوستی کس طرح ہوتی تھی۔ دیبا اُسی علاقے میں ہوا کرتا تھا جس علاقے میں حمید اللہ خان کی جاگیر تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے آپ کو سنایا تھا کہ حمید اللہ خان جب اپنی جاگیر میں ہوتا تھا تو اُس کا بڑا گہرا رابطہ دو تین نامی گرامی ڈاکوؤں کے ساتھ

تھا۔ یہ ڈاکو وارداتوں کا مال حمید اللہ کی جاگیر میں چھپاتے تھے۔ حمید اللہ ڈاکوؤں کو بھی اپنے پاس چھپا لیا کرتا تھا۔ ایک بار دیبا اپنے ایک دوست کے ساتھ حمید اللہ کے پاس گیا تھا۔ یہ ایک رسمی ملاقات تھی جو بڑی گہری دوستی کا رنگ اختیار کر گئی۔

یہ تقریباً اُس وقت سے ایک سال پہلے کا واقعہ ہے۔ دیبا نے بھی دو تین مرتبہ اپنا مال حمید اللہ کے پاس رکھا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ پولیس دیبا کے تعاقب میں تھی اور دیبا چھپتا چھپاتا حمید اللہ کی جاگیر میں پہنچ گیا۔ پولیس بھی وہیں آ گئی۔ حمید اللہ خان نے دیبا کو چھپا لیا۔ پولیس نے حمید اللہ کو ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ وہ دیبا کو باہر نکالے۔ حمید اللہ نے پولیس کی دھمکیوں کی ذرا سی بھی پروا نہ کی اور بہت بڑا خطرہ مول لے کر دیبا کو چھپائے رکھا۔

اس ایک واقعہ کے علاوہ ایک دو اور واقعات بھی ہوتے حمید اللہ خان نے ہر بار دیبا کو بچا لیا۔

دیبا کو جب تجربہ حاصل ہو گیا تو وہ اُس علاقے سے نکل آیا اور اس علاقے میں آ گیا جہاں وہ مستقل طور پر رہ رہا تھا۔ یہاں آ کر وہ ایک معزز آدمی بن گیا۔ اُس نے اپنا پیشہ نہ چھوڑا۔ اب وہ خود کم ہی کبھی کسی واردات میں شامل ہوتا تھا۔ وہ تو اپنی دنیا کا بادشاہ بن چکا تھا۔

حمید اللہ خان اور نور اللہ اُس کے پاس جس طرح پہنچے تھے وہ ان دونوں نے مجھے سنایا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہم نے ایک انگریز لیفٹیننٹ گلبرٹ کی بیوی کو اغوا کیا اور یرغمال بنا کر ایک غار میں رکھا ہوا تھا۔ ہم نے اس جواں سال انگریز عورت کی رہائی کے لیے جو رقم طلب کی تھی وہ ہمیں ادا کرنے کے لیے لیفٹیننٹ گلبرٹ آیا تھا لیکن دھوکے میں پولیس اور فوج کو بھی ساتھ لے آیا تھا۔ ہم نے مقابلہ کیا تھا۔ گلبرٹ مارا یا زخمی ہو گیا تھا اور اُس نے اپنی بیوی کو گولی مار دی تھی۔

ہم ایسی جگہ پوزیشنیں لیے ہوئے تھے جہاں سے ہم پولیس اور

فوج کی گولیوں سے بچتے اور پیچھے ہٹتے دریا میں اُتر گئے تھے۔ دریا میں طغیانی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا تھا اور بڑی دُور جا کنارے لگا تھا۔ میں جب دریا میں تھا تو میں نے مشین گن کے فائر کی آواز سنی تھی۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرے ساتھی مارے گئے ہیں۔ وہ مجھ جیسے تیراک نہیں تھے۔

میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ مشین گن کی ایک ہی بوچھاڑ نے انہیں ختم کر دیا ہے اور اُن کی لاشیں طغیانی میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہوں گی۔ پانی کی مخلوق نے کھا لی ہوں گی یا طغیانی نے انہیں کنارے پر اُگل دیا ہو گا اور درندوں کی خوراک بن گئی ہوں گی لیکن میرے ساتھی مجھے زندہ مل گئے۔ اُنہوں نے بتایا کہ طغیانی کی موجوں نے انہیں بچا لیا تھا۔ اگر دریا سکون میں ہوتا تو وہ بڑی اچھی طرح نظر آ جاتے اور بڑے آسان تارگیٹ بنتے۔ طغیانی نے ان کی یوں مدد کی کہ موجیں جوش و خروش سے اُٹھتی اور گرتی تھیں۔ پانی اُچھلتا تھا۔ میرے ساتھیوں کو ڈبوتا تھا اور انہیں دُور ہی دُور لے جا رہا تھا۔

وہ دُور جا کر ایسی جگہ کنارے لگے تھے جہاں تک دریا کے تین چار موڑ گزر گئے تھے۔ حمیداللہ خان اور نوراللہ اکٹھے کنارے لگے اور اکٹھے ہی رہے۔ تیسرے ساتھی ہا ہلے کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ یہ دونوں دریا سے دُور نکل گئے۔ میں دوسرے کنارے لگا تھا۔

ان دونوں کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ اشتہاری ملزم نہیں تھے اس لئے کسی تھانے میں ان کے فوٹو نہیں تھے۔ حمیداللہ خان کا معاملہ ذرا خطرناک تھا کیونکہ وہ مفرور سزا یافتہ قیدی تھا لیکن اُسے کوئی شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں کو دوسرا فائدہ یہ حاصل تھا کہ وہ دو تھے اور نوراللہ پکا واردات یا تھا۔ جو انتظام وہ کر سکتا تھا وہ حمیداللہ کے بس کا نہیں تھا۔ نوراللہ نے رہزنی کی دو وارداتیں کیں اور کم و بیش ایک مہینے کا خرچ نکال لیا۔

اگر میں ان کی لمحہ بہ لمحہ یہ روائیداد سنانے لگوں کہ وہ طغیانی سے نکل کر یہاں تک کس طرح پہنچے اور انہوں نے کس طرح "پیر کراماتاں والے" کی شہرت حاصل کی تو بات اتنی لمبی ہو جائے گی کہ میں جو آپ کو سنانا چاہتا ہوں وہ دھری رہ جائے گی۔ مختصراً یوں ہے کہ حمیداللہ کو دیبا یاد آ گیا۔ دیبا نے اُسے ایک بار پیغام بھیجا تھا کہ میں نے فلاں علاقے کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیا ہے، کبھی میری مدد کی ضرورت ہو یا میرے لئے کوئی کام ہو تو مجھے بتا دینا یا خود ہی چلے آنا۔

ان دونوں نے کپڑے وغیرہ سلوا لئے اور پوچھتے پوچھتے بہت دنوں بعد دیبا کے ٹھکانے پر اس طرح پہنچے کہ کچھ سفر پیدل طے کیا، کہیں تانگے یکے پر بیٹھ گئے اور کچھ فاصلہ لاری پر طے کیا۔

اگر نوراللہ اکیلا ہوتا تو اُس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ دیبے کے گروہ میں شامل ہو جاتا۔ یہی اُس کی زندگی تھی جو اُسے ایک بار پھر مل جاتی۔ حمیداللہ کے متعلق دیبے کو پہلی دفعہ پتہ چلا کہ وہ عمر قید پا کر مفرور ہے۔ پھر بھی دیبے نے اُس کی اتنی عزت افزائی کی کہ اُسے نوابزادہ ہی سمجھتا رہا اور یہ مشورہ نہ دیا کہ وہ بھی ڈکیت بن جائے۔ اس کی بجائے دیبے نے اُسے پیر بننے کو کہا۔ حمیداللہ خان نے یہ مشورہ بھی قبول نہ کیا۔

"اتنے مومن نہ بنو نوابزادے!" ــــ دیبے نے اُسے کہا ــــ "تم جیسا گناہگار اگر کہے کہ وہ کوئی جرم نہیں کرنا چاہتا تو میں کبھی نہیں مانوں گا کہ وہ شریف آدمی بن گیا ہے!"

"نہ دیبے اُستاد!" ــــ حمیداللہ نے کہا ــــ "شرافت اور بدمعاشی کی بات نہیں، بات یہ ہے کہ میں پیروں جیسی حرکتیں اور باتیں نہیں کر سکوں گا۔"

"کیوں نورے!" ــــ دیبے نے نوراللہ سے پوچھا ــــ "تم بھی پیر نہیں بن سکو گے؟"

"کیوں نہیں بن سکوں گا؟" ــــ نوراللہ نے جواب دیا ــــ "نوسربازی تو جیسی کہو گے کر لوں گا اُستاد! مسجد کا امام بنا دو، مندر کا پنڈت بنا دو، گُردوارے کا گرنتھی بنا دو .... اُستادوں کے حُقے بھرے اور اُن کے جُوتے کھاتے

ہیں۔ پیر بنا کر دیکھ لو۔ پولیس کپتان کی بیوی کو مرید بنا کے دکھا دوں گا۔"

نور اللہ بڑ نہیں ہانک رہا تھا۔ وہ ہر فن مولا تھا۔ کمسنی میں ہی وہ اس پیشے میں آگیا تھا۔ زبان کا جادو چلانا جانتا تھا۔ جسمانی اور ذہنی طور پر بہت تیز اور حاضر جواب تھا۔ حمید اللہ خان نے کہا کہ پیر اسے بنایا جاتے اور وہ اس کا خاص مصاحب بن جائے گا۔

"دیبے دوست!" — حمید اللہ خان نے کہا — "تمہیں یاد ہوگا جب تم میری جاگیر پر آیا کرتے تھے تو میں نے دو تین بار تمہارے ساتھ بات کی تھی کہ میں انگریزی راج کی بنیادیں ہلا دینا چاہتا ہوں اور میں ان نوابوں اور مہاراجوں کے محلات کو آگ لگا دوں گا۔ تم کہتے تھے کہ یہ کام کرنا ہی کرنا ہے اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ کام صرف ہم ڈاکو ہی کر سکتے ہیں۔ ... اب میرا یہ ارادہ زندگی کا مقصد بن گیا ہے اور اب تمہاری حیثیت بھی بہت مضبوط ہو گئی ہے۔ اب بولو، کیا ارادہ ہے؟"

"کچھ دولت اکٹھی کر لو" — دیبے نے کہا — "میرے ساتھ جتنے آدمی ہیں اور جتنے میرے مرید ہیں وہ سب ڈکیت اور رہزن ہیں۔ انہیں اس لائن پر چڑھانا مشکل تو نہیں لیکن خطرناک ہے۔ جب کبھی کوئی پکڑا گیا اور سی آئی ڈی نے اُسے اپنے شکنجے میں جکڑا تو وہ سلطانی گواہ بن جائے گا۔ اب تم آگئے ہو تو اس مسئلے پر بھی غور کر لیں گے، لیکن پیسہ بڑا ضروری ہے اور تمہارا کچھ نہ کچھ کرتے رہنا بھی ضروری ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ جو دولت اور جو عیاشی پیری میں ہے وہ شاید نوابی میں بھی نہیں۔ تم پیر بن کر اپنا اثر پیدا کر لو تو اپنے کسی مرید سے کہو گے کہ اپنی بیوی کو تھوڑی دیر کے لئے یہاں چھوڑ جاؤ تو وہ بڑی خوشی سے تمہارا حکم مانے گا ....

"تم اپنی قوم کی اس مجبوری کو اچھی طرح سمجھتے ہو کہ مصیبت کے وقت خدا سے پہلے اپنے پیر و مرشد کو پکارتی ہے۔ ان پیروں کو ہم سے زیادہ کون سمجھتا ہے۔ لوگوں نے یہ طریقہ آسان سمجھ لیا ہے کہ خود ہمت کرنے کی بجائے پیر کے پاس جاؤ اور تعویذ لے لو، پھر سارے مسئلے حل ہو جائیں گے

اور ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔"

"بدبختوں کا کوئی کام تو ہوتا نہیں" — حمید اللہ نے کہا — "پھر بھی مرید بنے رہتے ہیں اور اپنے اپنے پیر کے قدموں میں سجدے کرتے عمر گزار جاتے ہیں۔"

"یہ پیروں کا کمال ہے" — نور اللہ نے کہا — "یہی کمال ہم نے دکھانا ہے کہ کسی مرید کو جال سے نکلنے نہ دو۔ میں تمہیں یہ کمال دکھاؤں گا۔ میں نے دیکھا ہے کہ پیر اپنے مریدوں کو اتنا دھوکہ نہیں دیتے جتنا مرید اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتے ہیں۔"

اس طرح دیبا نے ان دونوں کو پیری مریدی کی طلسماتی دنیا میں داخل کر دیا۔ انہیں پیروں جیسے کپڑے اور چوغے وغیرہ سلا دیتے۔ نور اللہ کی ایکٹنگ دیکھی۔ حمید اللہ خان کو خاص مصاحبوں کی ایکٹنگ کی ریہرسل کراتی اور اپنے گاؤں میں ہی مشہور کر دیا کہ اس کے پاس بڑی پہنچ والے پیر آتے ہیں۔ دیبا نے اپنے جرائم پیشہ شاگردوں اور مریدوں کو اس پیر کی کرامات سنائیں اور انہیں دیہاتی علاقے میں پھیلا دیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ افواہ پسند ہیں۔ ایک افواہ پھیلتی ہے تو لوگ اس کی تردید یا تصدیق کی بجائے اس میں مزید رنگ بھرتے اور آگے چلاتے ہیں۔ نور اللہ "سائیں کراماں والا" بن گیا۔ اسے یہ نام دیبا نے دیا تھا۔

چند دنوں میں ہی ایک گاؤں سے سائیں کراماں والے کے لئے دعوت آئی کہ سرکار کراماں والے ہمارے گاؤں پر کرم کریں۔

پھر دعوتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ آخر ایک گاؤں میں نمبردار نے انہیں اچھا خاصا مکان دے دیا۔ یہی مکان تھا جس میں ہم بیٹھے ہوتے تھے اور جہاں میرا بچھڑا ہوا دوست سلطان مجھے ملا تھا۔

اب سائیں کراماں والا مجھے اور حمید اللہ کو اپنے ساتھ لے کر وہیں جا رہا تھا جہاں سے چلا تھا۔

یہ سارا قصہ سن کر مجھے تسلی ہو گئی کہ ہم جہاں جا رہے ہیں وہ مضبوط

اور محفوظ ٹھکانہ ہے۔



میں واپس گیا۔ فجر کی اذان کا وقت ہو رہا تھا۔ جب میں سائرہ کے پاس پہنچا تو وہ گزشتہ رات کی طرح گھبراہٹ کے عالم میں تھی۔ میں نے سونے کی بجائے سائرہ کو پاس بٹھا لیا اور اُسے بتایا کہ آج کی رات تو گزر گئی ہے، اب جو رات آئے گی اُسے ایک آدمی کے ساتھ میرے دوست سلطان احمد کے گھر چلے جانا ہوگا۔ میں نے اُسے ساری بات سمجھائی اور یہ بھی بتایا کہ وہ سلطان کی بیوی کو اپنے متعلق کیا بتائے گی اور کیا نہیں بتائے گی۔ میں نے اُسے لاجو کے متعلق بتایا کہ وہ سلطان کی بیوی کس طرح بنی تھی۔

"پھر تم کب آؤ گے؟" —— سائرہ نے پوچھا۔

"میں تمہیں ہمیشہ کے لئے تو وہاں نہیں بھیج رہا" —— میں نے کہا —— "میں جلدی تمہارے پاس آؤں گا یا تمہیں اپنے پاس بلا لوں گا۔ دل کو مضبوط رکھنا۔ میں نے کل رات تمہیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ ہم ایک ہی صورت میں اکٹھے رہ سکتے ہیں کہ تین چار روز اکٹھے رہیں اور پولیس چھاپہ مار کر مجھے گرفتار کر لے اور دو تین مہینوں بعد تمہیں اطلاع ملے کہ مفرور سابق سب انسپکٹر سکندر کو پھانسی دے دی گئی ہے۔"

"اللہ نہ کرے" —— سائرہ نے بے ساختہ کہا اور میرے ساتھ لپٹ گئی۔ اُس نے اپنا گال میرے گال کے ساتھ لگا کر رندھی ہوئی آواز میں کہا —— "تمہیں زندہ رکھنے کے لئے میں ہر طرح کی قربانی دے دوں گی۔ اللہ میری عمر بھی تمہیں دے دے۔ میں تم سے صرف یہ التجا کرتی ہوں کہ میرے ساتھ دھوکہ نہ کرنا۔ اس سے پہلے ہی اپنے ہاتھوں میرا گلا گھونٹ دینا یا اپنے ریوالور سے مجھے گولی مار دینا۔"

اُس نے مجھے بھی جذباتی بنا دیا۔ میں اُسے کوئی جواب دینا چاہتا تھا لیکن مجھ پر رقت طاری ہو گئی اور دل جیسے اُچھل کر حلق میں اٹک گیا ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں محسوس کرنے لگا کہ اُس کی جدائی میرے لئے

ناقابلِ برداشت ہو گی۔ میرے دونوں بازو اُس کے گرد لپٹ گئے۔

ہم چھوٹے چھوٹے دو بچوں کی مانند تھے جو گھر کا راستہ بھول گئے ہوں اور گھُپ اندھیری رات میں جنگل میں دبکے بیٹھے ہوں۔

"میں آؤں گا سائرہ!" —— یہ میری سرگوشی تھی جس نے مجھے بیدار کر دیا۔ میں ذرا جاندار آواز میں بولا —— "میں نے تمہارے پاس ہی آنا ہے۔ ذرا یہ مشکل وقت گزر جانے دو۔"

یہ جھوٹی تسلیاں تھیں۔ میں وعدے تو سچے دل سے کر رہا تھا لیکن یہ وعدے پورے کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔

وہ سوال پہ سوال کئے جا رہی تھی اور میں جھوٹے سچے جواب دیتا چلا جا رہا تھا۔ مجھ پر غنودگی بھی طاری ہو رہی تھی لیکن اُس روز بیدار رہنا تھا۔ دریچے سے صبح کی روشنی آنے لگی تھی۔ میں نے تجمل اور منور کو بلانا تھا۔

بلانے کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ خود ہی آ گئے۔ وہ اچھے خاصے گھبرائے ہوئے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر سائرہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ دونوں بھائی میرے مُنہ کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے مجھ سے کوئی بُری خبر کی ہی توقع رکھتے ہوں۔ میں نے انہیں پہلے اتنا ہی بتایا تھا کہ حمید اللہ خان اور نور اللہ میرے دوست ہیں اور ان کی پیری محض نوسر بازی ہے۔ گزشتہ رات میں نے انہیں سلطان احمد کے متعلق بتایا تھا کہ وہ کون ہے، میرا اُس کے ساتھ کیا تعلق تھا اور یہ تعلق ابھی تک قائم تھا۔ سلطان میری دوستی کا حق جس طرح ادا کر رہا تھا، وہ بھی میں نے انہیں سنایا تھا۔

"میرے اس دوست نے سائرہ کو اپنے گھر میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے" —— میں نے کہا —— "ایک عقل مند آدمی کی ضرورت ہے جو سائرہ کے ساتھ جائے گا اور اسے سلطان کی بیوی کے حوالے کر کے واپس آ جائے گا۔ یہ آدمی دیہاتی لباس میں ہو گا۔ وہ جب واپس آ کر بتائے گا کہ سائرہ کو صحیح ٹھکانے پر پہنچا آیا ہے، میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔

تم نے میرا اور سائرہ کا کھُرا کھوج نہیں رہنے دینا۔ یہاں سے یہ اچھی قسم کی چارپائیاں اٹھا لینا۔ اپنے آدمیوں کو تیار رکھنا۔"

میں نے انہیں جتنی ہدایات دینی تھیں دے دیں اور انہیں کہا کہ وہ سائرہ کے ساتھ جانے کے لئے مجھے ایک آدمی دے دیں۔

دونوں بھائیوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور ایک آدمی کو منتخب کر لیا۔ اُنہوں نے اس مکان میں رہنے والے ایک آدمی کو بلایا اور اُسے کہا کہ وہ فلاں آدمی کو اپنے ساتھ لے آئے۔

وہ آدمی آ گیا۔ اُس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ چِٹا اَن پڑھ دیہاتی تھا۔ میں نے اُس کی ذہانت اور ذہنی مستعدی کا اندازہ کرنے کے لئے اُس کے ساتھ کچھ باتیں کیں تو وہ مجھے ذہین لگا۔ تجمّل اور منوّر نے مجھے بتایا کہ یہ ظاہری طور پر بیوقوف لگتا ہے لیکن پختہ کار آدمی ہے۔

میں نے اُسے سمجھایا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ کئی بار ٹرین میں سفر کر چکا ہے۔ اُس نے جس ٹرین سے جانا تھا اُس کا وقت اُسے بتایا اور جس شہر جانا تھا وہ بتایا۔ میں اُسے پولیس لائنز کا راستہ سمجھانے لگا تو وہ بول پڑا۔

"مجھے معلوم ہے" — اُس نے کہا — "میرا ایک یار وہاں کانسٹیبل ہے۔ میں دو بار اُسے وہاں ملنے گیا تھا۔"

"اپنے اس یار سے دُور رہنا" — میں نے کہا — "وہ تمہیں ویسے



ہی مل گیا تو کیا کہو گے کیوں آئے ہو؟ تم نے کہا کہ سب انسپکٹر سلطان احمد میرا رشتہ دار ہے تو وہ شک کرے گا۔"

"نہیں کرے گا" — اُس نے کہا — "وہ میرے سارے رشتہ داروں کو تھوڑا ہی جانتا ہے۔"

"ہمارا مطلب یہ ہے کہ وہاں پھنس نہ جانا" — تجمّل نے اُسے کہا — "بہتر یہ ہو گا کہ کسی اور سے نہ ملنا۔ اس لڑکی کو سب انسپکٹر سلطان احمد

کی بیوی کے حوالے کر کے آ جانا۔"

اُس نے انہیں تسلی دی کہ وہ پوری ذمہ داری سے یہ کام کرے گا۔ اُسے ہم نے بھیج دیا۔



رات نو بجے ہوں گے کہ میں سائرہ کو ساتھ لے کر باہر نکلا۔ اُسے دیہاتی عورتوں جیسی چادر اوڑھا دی تھی اور اُسے ایک بار پھر بتا دیا تھا کہ وہ کہیں بھی اپنا چہرہ ننگا نہ کرے۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ رو رہی تھی۔

"تمہارا دل اپنے شہر میں داخل ہو کر دُکھے گا سائرہ!" — میں نے کہا — "تم اپنے شہر میں سے گزر کر ریلوے سٹیشن تک پہنچو گی۔ تانگہ شہر کے باہر تم دونوں کو اتار دے گا اور واپس آ جائے گا۔ میرا بھی یہی شہر ہے۔ ہم دونوں اس شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ اس شہر کی زمین تمہارے قدموں کو آگے نہیں بڑھنے دے گی۔ تانگے سے اُتر کر تم اپنے گھر کے قریب سے گزرو گی۔ اپنا گھر تمہیں اپنی طرف کھینچے گا لیکن دل کو مضبوط رکھنا۔"

کچھ دُور تانگہ کھڑا تھا۔ یہ تجمّل اور منوّر کا اپنا تانگہ تھا۔ اس کا گھوڑا بڑا تندرست اور تیز دوڑنے والا تھا۔ تانگہ ان لوگوں کا اپنا کوچوان لے جا رہا تھا۔ میں سائرہ کے ساتھ تانگے تک پہنچا تو تجمّل، منوّر اور وہ آدمی جو سائرہ کے ساتھ جا رہا تھا، تانگے کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے سائرہ کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اُسے خدا حافظ کہا۔ وہ میرے اور قریب ہو گئی۔ میں نے اُس کی پیٹھ سے ہاتھ اُٹھایا تو اُس نے چادر کے اندر سے ہی میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ اگر وہاں اور کوئی نہ ہوتا تو وہ میرے ساتھ لپٹ جاتی۔

میں نے اُسے ساتھ لے کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ اُس کے ساتھ جانے والا آدمی اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا اور تانگہ چل پڑا۔ میں تانگے کو جاتا دیکھتا رہا۔ بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکے۔ تانگے کو رات نے نگل لیا۔ گھوڑے کے پاؤں کی ٹپ ٹپ سنائی دیتی رہی۔ مجھے

یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ ہتھوڑی کی ضربوں کی آواز ہو اور یہ ضربیں میرے سر پر پڑ رہی ہوں۔

تانگے کی واپسی تک ہم لے جاگتے رہنا تھا۔ تانگہ اتنی جلدی واپس نہیں آسکتا تھا۔ میں تجمل اور منور کے ساتھ ہی رہا۔ انہوں نے کچھ رسمی اور جذباتی سی باتیں شروع کر دیں لیکن جس حقیقت کا ہمیں سامنا تھا اس کی شدت کو صرف میں ہی سمجھ سکتا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ پولیس یا انگریز افسر جو کچھ بھی کریں، تشدد کریں، دھمکیاں دیں، یہ تسلیم نہیں کرنا کہ اس جگہ کوئی مشکوک آدمی آیا تھا۔

"میرے عزیز بھائیو!" ——میں نے کہا —— "سائرہ چلی گئی ہے میں بھی چلا جاؤں گا لیکن میرا دھیان یہیں رہے گا۔ اگر مجھے پتہ چل گیا کہ تم لوگ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہو تو میں فوراً پہنچوں گا۔ اگر مجھے تمہیں بچانے کے لئے اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کرنا پڑا تو میں اپنے آپ کو قربان کر دوں گا۔"

"نہیں سکندر!" —— تجمل نے کہا —— "ہمیں اتنا گیا گزرا نہ سمجھو۔ ہم تو اب بھی تمہیں یہاں رکھنے کو تیار ہیں۔ تم کہتے ہو کہ پولیس تمہیں ڈھونڈ نکالے گی۔"

"مجھے اپنا غم نہیں" —— میں نے کہا —— "میں نے تو ایک روز پکڑے ہی جانا ہے۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ میں تمہاری ملکیت کے علاقے میں چھپا ہوا نہ ملوں کیونکہ میرے ساتھ تم بھی پکڑے جاؤ گے۔"

"ہاں سکندر!" —— تجمل نے کہا —— "آج مظفر کا خط آیا ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ اُس کے خلاف محکمانہ کارروائی ہو چکی ہے اور اُسے سروس سے نکال دیا گیا ہے۔"

"وہ گھر کب آ رہا ہے؟" —— میں نے پوچھا —— "کیا اُس نے کچھ لکھا ہے؟"

"وہ آ رہا ہے" —— تجمل نے جواب دیا —— "تین چار دنوں تک پہنچ جائے گا۔"

"میرے متعلق تو اُسے معلوم ہو گا ہی کہ میں یہاں ہوں" —— میں نے کہا —— "اُس نے میرے متعلق کچھ لکھا ہو گا۔"

"نہیں!" —— تجمل نے کہا —— "اُس نے تمہارا نام نہیں لکھا۔ اتنا ہی لکھا ہے کہ میرے دوست سے کہنا کہ میں جلد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"ہاں، یہ اُس نے میرے لئے ہی لکھا ہے" —— میں نے کہا —— "کاش وہ میری موجودگی میں آجاتا۔ میں اُس کے آنے تک یہاں نہیں رہوں گا۔ اچھا ہے کہ وہ آ رہا ہے۔ اُس کی موجودگی میں پولیس آئی تو وہ سنبھال لے گا۔"

کچھ دیر مظفر کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ تجمل اور منور اُس کے متعلق کچھ پریشان تھے۔ ان کا بڑا بھائی اور مظفر کا باپ انسپکٹر فضل حسین انہیں بتا گیا تھا کہ مظفر مجھ سے متاثر ہو کر باغی ہو گیا تھا۔ مظفر کے متعلق میں بھی پریشان تھا کیونکہ وہ جذباتی نوجوان تھا اور اُس نے اپنی عقل پر جذبات کو غالب کر رکھا تھا۔ اس وجہ سے وہ پکڑا بھی گیا اور سروس سے نکالا گیا تھا۔

"مظفر میرے بعد آئے گا" —— میں نے کہا —— "اُسے یہ سارا واقعہ سُنا دینا۔ اُسے سائیں کراماتاں والے کی اصلیت بھی بتا دینا .... اور اُسے یہ بھی بتا دینا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔"

"یہ تو تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں کہ تم کہاں جا رہے ہو" —— منور نے کہا۔

"یہ تو میں نے تمہیں بتانا ہی تھا کہ میرا اگلا ٹھکانہ کہاں ہو گا" —— میں نے کہا —— "کیا تم نے دیبا ڈاکو کا نام سُنا ہے؟"

"سنا ہے" —— منور نے کہا —— "لیکن اتنا زیادہ نہیں۔"

"اُس کی کچھ باتیں سُنی ہیں" —— تجمل نے کہا —— "بڑی عجیب سی باتیں کسی نے سنائی تھیں۔ بعض باتوں سے پتہ چلتا ہے جیسے وہ کوئی برگزیدہ درویش ہے۔ بعض باتوں سے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ بڑا

خطرناک ڈاکو ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑا معزز آدمی ہے۔"

"وہ جو کچھ بھی ہے" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "میں اُسی کے پاس جا رہا ہوں۔ مظفر کو بتا دینا۔"

میں نے اُنہیں دیا کا ٹھکانہ بتا دیا کہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ ہی انہیں بڑی سختی سے کہا کہ وہ کسی کو ذرا سا اشارہ بھی نہ دیں کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

"میں یہاں آؤں گا ضرور" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "جگہ تو بہت دُور ہے لیکن میں آؤں گا ضرور۔"

ہم باتیں کرتے رہے۔ ہم نے اتنی زیادہ باتیں کیں کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا کس طرح گزر گیا ہے۔ فجر کی اذان سے کچھ دیر پہلے تانگہ واپس آ گیا۔ کوچوان نے بتایا کہ اُس نے تانگہ شہر سے ذرا باہر روکا اور دونوں سواریوں کو اُتار دیا تھا۔ اس سے ہمیں یہ تسلی ہو گئی کہ سائرہ کم از کم اپنے شہر تک خیریت سے پہنچ گئی ہے۔ کوچوان نے شہر پہنچنے کا جو وقت بتایا تھا، اس سے ہمیں یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ وہ گاڑی کے وقت سے پہلے شہر پہنچ گئے تھے۔

رات تو گزر ہی گئی تھی۔ میں اپنے ٹھکانے پر چلا گیا اور سو گیا۔ جو آدمی سائرہ کے ساتھ گیا تھا وہ اگر بہت جلدی بھی واپس آتا تو آنے والی رات کو کسی بھی وقت پہنچ سکتا تھا۔ مجھے دراصل بیتابی سے انتظار اسی آدمی کا تھا۔ میں یہ خبر سُننا چاہتا تھا کہ سائرہ اس ٹھکانے تک پہنچ گئی ہے جہاں اُسے ہم نے بھیجا تھا۔

میں لیٹا اور میری آنکھ لگ گئی۔

۶

میں بڑی گہری نیند سویا ہوا تھا کہ کسی کے زور زور سے جھنجھوڑنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں اتنی گہری نیند سویا ہوا تھا کہ آنکھ کھلی تو ایسے محسوس ہوتا رہا جیسے مجھے خواب میں کوئی پکڑ کر زور زور سے ہلا

رہا ہو۔

"سکندر۔۔۔۔ سکندر!" ۔۔۔ مجھے آوازیں سنائی دیں ۔۔۔ "جلدی اٹھو سکندر!"

"کیا ہُوا ہے یار!" ۔۔۔ میں نے اونگھ کی حالت میں کہا۔

"معاملہ بگڑ گیا ہے۔"

اس آواز پر میں گیند کی طرح اُچھل کر اُٹھا۔ میرا ذہن اور میرے جسم کا رُواں رُواں بیدار ہو گیا۔ میرے پلنگ کے پاس تجمل کھڑا تھا۔ ساتھ والی چارپائی پر منور بیٹھا تھا اور وہ آدمی دروازے میں کھڑا تھا جو سائرہ کے ساتھ گیا تھا۔ میں ان سب کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ دن کے ساڑھے بارہ اور ایک بجے کے درمیان کا وقت ہو گیا تھا۔ یہ آدمی اتنی دُور سے اتنی جلدی واپس نہیں آسکتا تھا۔

"تم اتنی جلدی کیسے آ گئے ہو؟" ۔۔۔ میں نے سائرہ کے ساتھ جانے والے آدمی سے پوچھا ۔۔۔ "کیا اُسے ٹھکانے پر پہنچا آتے ہو؟"

"کہاں پہنچا آیا ہوں جی!" ۔۔۔ اُس نے مایوسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"آگے آجاؤ" ۔۔۔ تجمل نے اُسے کہا ۔۔۔ "انہیں پوری بات سناؤ۔"

اُس نے جو بات سنائی اُس سے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں اُس کا بیان اپنے الفاظ میں آپ کو سناتا ہوں۔

یہ آدمی سائرہ کے ساتھ تانگے سے اُترا اور کوچوان تانگہ واپس لے آیا۔ وہاں سے سائرہ نے اس آدمی کے ساتھ شہر میں داخل ہونا تھا اور شہر میں سے گزر کر ریلوے سٹیشن تک پہنچنا تھا۔ یہ سائرہ کا اپنا اور میرا شہر تھا جو دراصل ایک بڑا قصبہ تھا۔ اس کا شمار بڑے شہروں میں نہیں ہوتا تھا۔ میں اس شہر کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک پتھر سے واقف تھا۔ میں اس شہر کی گلیوں میں بھاگا دوڑا اور کھیلا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سائرہ کون سی

گلی میں داخل ہوگی اور یہ گلی کتنی دُور آگے جاکے کس طرف مُڑے گی اور پھر سائرہ کس طرف سے گزر کر بڑے بازار میں داخل ہوگی اور کتنا اور چل کر ریلوے سٹیشن تک پہنچے گی۔

یہ احتیاط میں نے کی تھی کہ تانگہ شہر میں نہ جاتے۔ جس وقت تانگہ شہر پہنچتا تھا اُس وقت شہر میں ویرانی کا عالم ہوگا۔ یہ تانگہ اتنا اچھا تھا کہ بازار کے ایک دو چوکیدار اُسے دیکھ لیتے پھر ریلوے سٹیشن پر بھی یہ لوگوں کی نظروں کو کھینچتا۔ پولیس کا کوئی آدمی بھی اُسے دیکھ سکتا تھا۔ ادھر یہ جاگیر پولیس کی نظروں میں آئی ہوئی تھی۔ اُدھر اس جاگیر کا تانگہ شہر میں دیکھا جاتا تو بڑا پختہ شک پیدا ہو جاتا۔

یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ اس احتیاط کا کوئی اور نتیجہ بھی نکل سکتا ہے۔

تانگے سے اُتر کر سائرہ اس آدمی کے ساتھ شہر کی گلی میں داخل ہوتی۔ آگے جاکر یہ گلی باہر کو مُڑتی تھی۔ بازار کی طرف جانے کے لئے اسی طرف مُڑنا تھا۔ یہی ایک گلی دائیں طرف سے اس گلی کے ساتھ ملتی تھی۔ یہ گلی اُس محلے کی طرف جاتی تھی جس میں میرا مکان تھا۔ وہاں سے گزر کر کچھ آگے دو موڑ مُڑ کر سائرہ کے گھر والا محلہ شروع ہوتا تھا۔ یہ دونوں جب اُس جگہ پہنچے جہاں یہ دو گلیاں ملتی تھیں تو سائرہ رُک گئی اور ہمارا آدمی چند قدم آگے نکل گیا۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو سائرہ وہاں رُکی کھڑی تھی۔ وہ سائرہ تک واپس آیا۔

"ہم نے اس طرف جانا ہے" ــــ اُس نے سائرہ سے کہا ــــ "مجھے راستہ معلوم ہے۔"

"نہیں!" ــــ سائرہ نے کہا ــــ "وہ راستہ ذرا لمبا ہے۔ میں اسی شہر کی رہنے والی ہوں۔ آؤ، میں تمہیں چھوٹے راستے سے لے چلوں گی۔"

ہمارا آدمی سائرہ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ سائرہ تیز تیز چلتی اور گلیوں کے موڑ مُڑتی ایک گھر کے دروازے پر رُک گئی۔

"مُڑ کر نہیں" ــــ سائرہ کے ساتھی نے اُسے کہا ــــ "کہیں ایسا نہ ہو کہ گاڑی نکل جائے۔"

اس شخص کو معلوم نہیں تھا کہ جس دروازے پر وہ رُکی ہے وہ اُس کے اپنے گھر کا دروازہ ہے۔ اس شخص کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اپنے گھر کے قریب سے کوئی بیگانوں کی طرح گزر کر نہیں جا سکتا۔ میں اتنے مضبوط اعصاب کا آدمی تھا اور میں نے اپنے گھر سے تعلق توڑ لیا تھا لیکن میں جب اس شہر میں گیا تھا تو میرے قدم اپنے آپ ہی مجھے میرے گھر والی گلی میں لے گئے تھے۔

اس آدمی نے جب مجھے یہ سنایا کہ سائرہ گلی سے دوسری طرف مُڑ گئی اور اپنے گھر کے سامنے جا رُکی تھی تو میں حیران نہیں ہوا تھا۔ میں نے جب سائرہ کو رخصت کیا تھا تو مجھے یہ خطرہ محسوس ہوا تھا کہ سائرہ اپنے گھر کے قریب سے کس طرح گزر جائے گی۔ اگر میں اُسے کتنی ہی سختی سے کہہ دیتا کہ وہ اپنے گھر نہ جائے تو بھی وہ یہ حرکت ضرور کرتی۔ یہ جذباتی معاملہ تھا۔ اگر مجھے بتایا جاتا کہ سائرہ اپنے گھر نہیں گئی تھی تو میں حیران ہوتا۔ اُس کے رُکنے پر میں ذرا سا بھی حیران نہیں ہوا۔

سائرہ نے اپنے دروازے پر بڑی زور سے دستک دی۔ اُس کے ساتھی نے اُسے ایک بار پھر کہا کہ وہ وقت ضائع نہ کرے لیکن سائرہ اُس سے لاتعلق ہو گئی تھی۔ اُس نے ایک بار پھر دروازے پر ہاتھ مارا۔ ہمارا آدمی اُسے زبردستی تو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ وہ صرف کہہ سکتا تھا اور کہہ رہا تھا۔

دروازہ کھلا۔ اس گلی کی بتی کچھ دُور آگے تھی۔ ہمارا آدمی دیکھ نہ سکا کہ دروازہ کس نے کھولا ہے کیونکہ ایک کواڑ کھلتے ہی سائرہ اندر چلی گئی تھی۔ یہ آدمی بہت پریشان ہوا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اُس کی پریشانی یہ تھی کہ وہ اپنے مالکوں کو کیا جواب دے گا۔ وہ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ وہ کیا کرے کہ سائرہ باہر آتی اور ہمارے آدمی سے کہا کہ وہ اندر آ جائے۔

"بی بی!" — اس آدمی نے منت سماجت کے لہجے میں کہا — "اگر گاڑی نکل گئی تو تم نہیں جانتیں کہ چوہدری مجھے اُلٹا لٹکا دیں گے۔"

ساترہ نے کچھ کہے بغیر اُسے بازو سے پکڑا اور ایسی بے تکلفی سے اندر لے گئی کہ یہ شخص سوچ بھی نہ سکا کہ اُسے اندر جانا چاہیئے یا نہیں۔ اندر لے جا کر ساترہ نے اُسے دروازے کے ساتھ ہی ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ میں اس کمرے سے واقف تھا۔ یہ ان کی بیٹھک تھی۔ میں جس رات ایوب سے ملنے گیا تھا تو اُس نے مجھے اسی کمرے میں بٹھایا تھا۔

اُسے کمرے میں بٹھا کر ساترہ اندر چلی گئی اور اندر سے اُسے عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ظاہر ہے کہ ساترہ کی ماں اپنی بیٹی کو دیکھ کر اور بیٹی اپنی ماں سے مل کر روتی ہوگی، لیکن اُس آدمی نے خاص طور پر بتایا کہ رونے والیاں اتنی زور سے رو رہی تھیں جیسے گھر کے کسی آدمی کے مرنے پر عورتیں رویا کرتی ہیں۔

یہ سن کر میں نے اُس آدمی سے پوچھا کہ وہ اچھی طرح بیان کرے کہ وہ کتنا اونچا رو رہی تھیں اور کیا انہوں نے کوئی بَین بھی کئے تھے۔

"ہاں چوہدری صاحب!" — اُس نے بتایا — "وہ تو ماتم والا رونا تھا .... میں نے یہ الفاظ کچھ کچھ سُنے تھے۔ معلوم نہیں یہ کس عورت کی آواز تھی۔ وہ بَین کر رہی تھی کہ ہائے کرموں جلی، تُو تو زندہ واپس آگئی ہے۔ پر تیرے بھائی کی لاش آئی تھی .... اس بَین پر دوسری عورت کی چیخیں سنائی دیں اور اُس کی یہ آواز بھی کہ ہائے میرا شیر جیسا وِیر .... اتنے میں باہر سے تین چار عورتیں دوڑتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ چوہدری صاحب! میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ بی بی ویسے ہی اندر چلی گئی تھی اور آگے اُس کے بھائی کی یا کسی عزیز کی میت پڑی ہوئی تھی۔"

میں سمجھ گیا۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ساترہ اپنے گھر کے قریب سے گزرتے اپنے گھر اور ماں باپ کی محبت کو دبا نہ سکی اور کھچی ہوئی اپنے گھر پہنچ گئی۔ اُسے اپنے بھائی ایوب کے انجام کا تو علم ہی نہیں تھا۔ اُس کی

ماں نے اُسے دیکھتے ہی پہلی خبر یہی سنائی ہوگی کہ اُس کا بھائی قتل ہوگیا تھا اور پولیس نے اُس کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد گھر بھیجی تھی۔ اتنے بڑے صدمے سے ساترہ نے تو چیخ چیخ کر محلہ اکٹھا کرنا ہی تھا۔

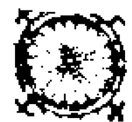
ہمارے آدمی کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ وہ بیٹھا رہے یا بھاگ اُٹھے۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ ساترہ اس گھر سے اغوا کی گئی تھی.... لیکن وہ اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ یہ معاملہ یعنی اس لڑکی کو اپنے شہر سے گزار کر ایک اور شہر پہنچانا مشکوک ہے۔ اُس نے آخر وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ وہ اُٹھنے ہی لگا تھا کہ ساترہ اُس کے پاس آئی۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی اور چہرہ لال سُرخ ہو رہا تھا۔

"تم واپس چلے جاؤ" — اُس نے ہمارے آدمی سے کہا — "اُن سے کہنا کہ ساترہ اپنے گھر پہنچ گئی ہے اور اُنہیں یہ بھی کہنا کہ کوئی فکر نہ کریں، اور وہ آدمی جو چوہدریوں کا مہمان ہے اور جس کے ساتھ میں رہتی تھی، اُسے میری طرف سے تسلی دینا اور اُسے یہ بھی کہنا کہ میرا بھائی ایوب قتل ہوگیا تھا اس لئے میں اب آگے نہیں جاؤں گی۔"

"بی بی جی!" — ہمارے آدمی نے اُسے کہا — "اگر آپ لکھنا پڑھنا جانتی ہیں تو کاغذ پر اپنے ہاتھ سے دو لفظ لکھ دیں۔ چوہدری بڑے سخت آدمی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ میری زبان پر اعتبار نہ کریں۔"

"تم چلے جاؤ" — ساترہ نے سسکتے ہوئے کہا — "اس وقت میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتی۔"

ہمارا آدمی وہاں سے نکل آیا۔ وہ رات کا ایسا وقت تھا کہ واپسی کے لئے اُسے کوئی سواری نہیں مل سکتی تھی۔ وہ پچیس میل پیدل تو واپس نہیں آسکتا تھا۔ اُس نے باقی رات ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے میں گزاری۔ صبح ایک لاری پر بیٹھا جو اُس گاؤں سے پانچ میل دُور سے گزرتی تھی۔ وہاں اُترا اور باقی سفر پیدل طے کیا۔



"اب بتاؤ سکندر!" ـــــ اس آدمی کو باہر بھیج کر تجمل نے مجھے کہا ـــ "کیا ایسا نہیں ہوگا کہ یہ لڑکی پولیس کو بیان دے دے گی کہ اسے ہم نے اغوا کر کے یہاں رکھا تھا؟"

"سوچنے دو بھائی!" ــــ میں نے کہا ــــ "ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اور یہ امید بھی رکھنی چاہیئے کہ کچھ بھی نہیں ہوگا .... مجھے سوچنے دو۔ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ لڑکی یہاں سے برآمد نہیں ہوتی۔ کوچوان کو اور اس آدمی کو جو اس کے ساتھ گیا تھا، کچھ دنوں کے لئے غائب کر دو۔ تم نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ میں نے یہ احتیاط کر کے کتنی عقلمندی کی تھی کہ تانگہ شہر کے اندر نہ جاتے۔"

میں نے ان دونوں بھائیوں کو تسلی تو دے دی، لیکن میں خود چکرا گیا۔ اس میں میرا غصہ بھی شامل تھا کہ سائرہ نے مجھے دلی محبت کا دھوکا دیا ہے۔ پھر یہ بھی خیال آتا کہ اس نے مجھے دھوکہ نہیں دیا۔ وہ تو یہاں سے جا ہی نہیں رہی تھی۔ یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ سائرہ اپنے شہر میں سے کس طرح مجبور ہو کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔

میرے دل میں سائرہ کی جو محبت پیدا ہو گئی تھی یہ ایک اور مشکل تھی۔

ایک بار تو یہ ارادہ پختہ ہو گیا کہ رات کو سائرہ کے گھر جا پہنچوں اور اسے کہوں، سائرہ! چلو میرے ساتھ، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن میرے لئے جو حالات پیدا ہو چکے تھے ان میں جذبات میں آجانا بڑا ہی خطرناک تھا۔ جذبات میں آکر سائرہ کے ہاں پہنچ جانا ایسا ہی تھا جیسے میں نے اپنے آپ کو تھانے میں پیش کر دیا ہے۔ یہ معاملہ بڑی گہری سوچ وبچار چاہتا تھا۔

مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ہم نے ایوب اور سائرہ کو اغوا کیا تھا تو تھانے میں اس کی ماں کے نام پر ان کے اغوا کی رپورٹ درج ہوتی تھی۔ اب سائرہ کی واپسی پر پولیس کو تو اطلاع ملنی ہی تھی کہ مغویہ واپس آگئی ہے۔ اس سے ایک صورت تو یہ پیدا ہو سکتی تھی کہ تھانیدار کیس کی فائل میں لکھ دیتا کہ بالغ لڑکی تھی، اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی تھی۔ واپس آگئی ہے۔ ایک صورت یہ

بھی پیدا ہو سکتی تھی جو ہمارے لئے خطرہ بن سکتی تھی کہ تھانیدار سائرہ سے پورا بیان لے کہ وہ کس طرح گئی تھی اور کس طرح واپس آئی ہے۔ اس صورت حال میں سائرہ یہ بیان دے سکتی تھی کہ اسے زبردستی اٹھا کر لے جایا گیا تھا اور فلاں جگہ رکھا گیا تھا اور اس طرح وہ واپس آئی ہے۔

اس دوسری صورت میں سب انسپکٹر انور علی سید انسپکٹر افضل حسین کی خاطر پردہ پوشی کر سکتا تھا، لیکن انسپکٹر افضل حسین کی جاگیر میری وجہ سے سپیشل برانچ کی نظر میں آئی ہوتی تھی اس لئے سب انسپکٹر انور علی سید سے توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ پردہ پوشی کرے گا۔ بہرحال میرے لئے پیش بندی لازمی ہو گئی تھی۔ میرا وہاں ایک منٹ کے لئے بھی سونا [illegible] تھا۔



مجھے ایک اور بات یاد آ گئی جس نے میری پریشانی میں اضافہ کر دیا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے سائرہ کو سلطان احمد کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا اور سلطان احمد کے ہاتھ کا لکھا ہوا رقعہ جو اس نے اپنی بیوی کے نام لکھا تھا، سائرہ کے پاس تھا۔ یہ ایسا ثبوت تھا جسے سلطان احمد جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ سلطان احمد کے ہاتھ کی لکھی ہوتی تحریر چھپ نہیں سکتی تھی۔ اس کے محکمے کی فائلوں میں اس کے ہاتھ کی لکھی ہوتی بے شمار رپورٹیں اور روزنامچے موجود تھے۔

سلطان احمد کے متعلق سوچ کر میرا تو پسینہ نکل آیا۔ میں تو اس کی خاطر گرفتار ہونے کا بھی عہد کر چکا تھا، مگر اب وہ میری وجہ سے بہت بڑے جال میں آ گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اب تک میرے شہر کے تھانے میں سائرہ کی واپسی کی اطلاع اور سلطان احمد کے ہاتھ کا لکھا ہوا رقعہ پہنچ چکا ہوگا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میری کیا حالت ہوتی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں۔ یہاں تک سوچ لیا کہ میں شہر چلا جاؤں اور سب انسپکٹر انور علی سید سے کہوں کہ وہ رقعہ ضائع کر دے اور مجھے گرفتار کر لے۔ اس ارادے کو میں نے یہ سوچ کر دبا لیا کہ انور علی سید کا کیا بھروسہ! وہ رقعہ بھی ضائع نہ

کرے اور مجھے گرفتار بھی کرلے۔

پھر میں نے اس پر غور کیا کہ آج رات ایک اور واردات کی جائے۔ وہ یہ کہ دو تین آدمی ساتھ لے کر ساترہ کے گھر چلا جاؤں اور ریوالور دکھا کر اُس سے پوچھوں کہ اُس کا کیا ارادہ ہے۔ اگر ابھی تک اُس کی واپسی کی اطلاع تھانے میں نہیں گئی اور رُقعہ بھی اُس کے پاس ہے تو اُسے ایک بار پھر اغوا کرلوں یا اُسے کہوں کہ مجھ سے بچنا ہے تو رُقعہ مجھے دے دو اور یہ بھی وعدہ کرو کہ تم پولیس کو یہ بیان دو گی کہ اپنی مرضی سے گئی تھی اور مرضی سے آگئی ہوں اور اگر اُس نے اُلٹا سیدھا بیان دیا تو اُس کے گھر پر ایک اور حملہ ہوگا جو بہت ہی بھیانک ہوگا۔

سوچ سوچ کر میری عقل جواب دے گئی۔ تجمل اور منوّر میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ کوئی نہ کوئی سوال کر ڈالتے اور گھبراہٹ کا اظہار کرتے تھے۔ مجھے جھنجلاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ میرا سَر دُکھنے لگا۔ میں نے اپنی اس بے بسی کو تسلیم کرلیا کہ میں اکیلا کچھ بھی نہیں سوچ سکتا۔

"مجھے اپنے دوستوں کے پاس جانا پڑے گا" — میں نے کہا — "ہمیں جو کارروائی کرنی ہے فوراً کرنی ہے لیکن میں دن کے وقت باہر نہیں نکل سکتا۔ کوچوان اور اس کے ساتھ جانے والے آدمی کو یہاں سے کہیں دُور بھیج دو اور کچھ آدمی اِدھر اُدھر پھیلا دو جو پولیس کو دُور سے آتا دیکھیں تو سب سے پہلے مجھے اطلاع دیں۔ میں قریب ہی فصل کے اندر چلا جاؤں گا.... ہاں .... ایک کام اور کرو۔ تم دونوں میں سے کوئی تھانے سب انسپکٹر راجہ شیر خان کے پاس چلا جائے .... کون جائے گا؟"

"میں جاتا ہوں" — منوّر نے کہا۔

"فوراً جاؤ" — میں نے کہا — "اور میری باتیں کان کھول کر سُن لو۔ وہاں اس طرح جانا جیسے تم اِدھر سے گزر رہے تھے اور سلام دعا کے لئے تھانے میں آگئے ہو۔ شیر خان تمہیں بیٹھنے کے لئے کہے تو کہنا کہ میں

تو ویسے ہی آگیا تھا۔ تمہارے چہرے پر یہ گھبراہٹ نہیں ہونی چاہیئے جواب ہے۔ کچھ دیر کے لئے بیٹھ جانا اور کہنا کہ آپ کے لئے کوئی دس سیر گھی اکٹھا ہوگیا ہے۔ پھر اُس سے پوچھنا کہ سی آئی ڈی کی کیا خبر ہے۔ اگر اگر اُس کے پاس کوئی نئی اطلاع ہوئی تو وہ تمہیں بتا دے گا۔ میرا خیال ہے کہ سب انسپکٹر انور علی سیّد نے کوئی کارروائی کرنی ہوئی تو وہ راجہ شیر خان کو فوراً اطلاع دے گا۔ اب تک شیر خان کو اطلاع مل چکی ہوگی۔"

"شاید نہیں ملی" — تجمل نے کہا — "اگر اُسے اطلاع ملی ہوتی تو وہ ہمیں خبردار کر چکا ہوتا۔ دس سیر گھی تو معمولی سی چیز ہے۔ ان دنوں تو ہم اُس کا پیٹ بھرا ہُوا رکھتے ہیں۔ مجھے پکّی امید ہے کہ وہ ہمیں دھوکے میں نہیں رکھے گا۔"

"اس پکّی امید کے دھوکے میں نہ رہنا تجمل بھائی!" — میں نے کہا — "میں جانتا ہوں اِن دنوں راجہ شیر خان کی جان پر بھی بنی ہوئی ہے۔ اُس کا کیس سپیشل برانچ کے پاس چلا گیا ہے اور ملزموں نے اُس پر الزام تھوپے ہوئے ہیں .... منوّر! تم اُس کے پاس جاؤ اور آکر مجھے بتاؤ کہ وہ کیا کہتا ہے۔"

منوّر اُسی وقت چلا گیا۔

اب جو ایک ایک لمحہ گزرتا تھا وہ ایک ایک گھنٹے کے برابر لگتا تھا۔ باہر سے کوئی آواز آتی تھی تو میں چونک اٹھتا تھا کہ پولیس آگئی ہے۔ اگر میرا اپنا ہی مسئلہ ہوتا تو میں وہاں سے کبھی کا غائب ہو چکا ہوتا لیکن مجھے ان دونوں بھائیوں کا زیادہ خیال تھا۔ ان کے حق میں ایک بات جاتی تھی۔ وہ یہ کہ لڑکی ان کے قبضے سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔ لڑکی ثابت کر ہی نہیں سکتی تھی کہ اُسے اُن لوگوں نے یا میں نے حبسِ بے جا میں رکھا تھا۔ میرے غائب ہو جانے کی صورت میں میری یہاں موجودگی بھی ثابت نہیں ہو سکتی تھی لیکن انگریز افسروں کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ان چوہدریوں کی جاگیر میں کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔

منور کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آیا۔ سب انسپکٹر راجہ شیر خان نے اُسے کوئی خبر نہیں سنائی تھی۔

میں ان دو بھائیوں کو جو احتیاطی تدابیر بتا تا جا رہا تھا وہ ان پر عمل کرتے جا رہے تھے۔ جُوں جُوں وقت گزرتا جا رہا تھا میں خطرہ زیادہ محسوس کر رہا تھا لیکن یہ سوچ بھی آنے لگی تھی کہ پولیس کو اب تک آجانا چاہیئے تھا۔

سورج غروب ہونے کو آگیا۔ دُور تک پولیس کا نام ونشان نہ تھا۔

ایک امید یہ تھی کہ سائرہ نے میرے ساتھ دھوکہ نہیں کیا، اور اس کے ساتھ یہ خطرناک خیال بھی آتا تھا کہ پولیس رات کو چھاپہ مارے گی۔ سائرہ نے اگر دھوکہ دیا ہی تھا تو اُس نے میری نشاندہی ضرور کی ہوگی۔ میں رات گہری ہونے



کے انتظار میں تھا۔

آخر شام ہوتی اور اندھیرا گہرا ہوگیا۔ میں نے بڑی تیزی سے کھانا کھایا۔ بھوک تو ماری ہی گئی تھی۔ میں نے گھوڑی لی اور اس پر سوار ہوکر اس علاقے سے نکل گیا۔ ریوالور میرے نیفے میں اُڑسا ہُوا تھا۔ میں اب اس حالت کو پہنچ گیا تھا کہ جس نے مجھے پکڑنے کے لئے میرے سامنے آنا تھا اُس نے میری گولی کا نشانہ بن جانا تھا۔ یہ حالت زخمی شیر کی ہوتی ہے۔ وہ مرنے سے پہلے حملہ کرتا ہے اور اس کا یہ حملہ حد درجہ خطرناک ہوتا ہے۔

یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔

مجھے موت کا ڈر نہیں تھا، میرا عزم یہ تھا کہ زندہ کسی کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔



میں جب "سائیں کراماتاں والے" کے گھر میں داخل ہُوا تو ان نوسر بازوں کا دربار لگا ہُوا تھا۔ مُرید زیادہ نہیں تھے۔ نور اللہ ہاتھ میں تسبیح لئے گاؤ تکئے کے ساتھ بیٹھ لگائے اور چہرے پر وجدانی کیفیت طاری کئے بیٹھا تھا۔ حمید اللہ خان بھی وہیں تھا۔ میں نے آگے جاکر نور اللہ کے گھٹنے

چھوئے اور سرگوشی کی کہ فوراً اندر چلو۔ میں پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

حمید اللہ نے دربار برخاست ہونے کا اعلان کیا۔ نور اللہ نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ ہر کسی نے ہاتھ اُٹھائے۔ نور اللہ نے بُڑبڑا کر ہاتھ مُنہ پر پھیرے اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ دونوں اندر کی طرف چل پڑے۔ حمید اللہ نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ اس طرح کیا کہ وہاں جو لوگ موجود تھے وہ دیکھ لیں کہ مجھے اندر چلنے کا حکم دیا گیا ہے۔

"خیریت تو ہے؟" ـــــ اپنے خاص کمرے میں جاکر نور اللہ نے مجھ سے پوچھا۔

"تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کوئی خاص گڑبڑ ہے" ـــــ حمید اللہ خان نے کہا۔

"ہاں بھائیو!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "معاملہ کچھ زیادہ ہی بگڑ گیا ہے۔"

میں نے انہیں مکمل تفصیل سے یہ واقعہ سنا دیا کہ سائرہ کس طرح ہاتھ سے نکل گئی ہے۔

"تم اپنے ساتھ ہمیں بھی بہت بُرے انجام تک پہنچاؤ گے" ـــــ نور اللہ نے کہا ـــــ "ایک طرف تم اتنے عقلمند ہو کہ ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ کسی انسان میں اتنی زیادہ عقل بھی ہوسکتی ہے اور دوسری طرف تم ایسی بیوقوفوں والی حرکت کر بیٹھتے ہو کہ انسان کو زمین اور آسمان کے درمیان لٹکا دیتے ہو۔ تم کسی مسجد میں جاکر بیٹھ جاؤ۔ ہم جانتے ہیں تم عورت کے معاملے میں بالکل صاف ہو لیکن عورت کے غلام بن کے رہ جاتے ہو۔ نواب زادے نے تمہیں کہا بھی تھا کہ یہ لڑکی ہمارے حوالے کردو لیکن تمہارے دماغ میں یہ بات نہ آئی۔ بہتر ہے کہ تم ہماری طرح گناہگار ہو جاؤ۔ اس طرح تمہارے دل میں یہ لیلیٰ مجنوں والی محبت پیدا نہیں ہوگی۔ پھر یہ ہوگا کہ تمہارے پاس آسمان سے اُتری ہوئی حور بھی آجائے گی تو تم چند دنوں میں ہی اُس سے اُکتا کر اُسے چلتا کرو گے، اس طرح اپنے ساتھ چپکا کر نہیں رکھو گے۔"

"اب سوچو کیا ہوگا؟" ـــــ حمید اللہ نے کہا ـــــ "تم بھی نکل جاؤ گے،

ہم بھی نکل جائیں گے اور سلطان احمد چودہ سال کے لئے اندر ہو جاتے گا۔ تم نے سوچا نہیں تھا کہ جس لڑکی کو تم نے سینے سے لگا رکھا ہے وہ ایوب کی بہن ہے۔ تم نے اس نسل کو نہیں پہچانا۔ اس لڑکی نے دھوکہ دینا ہی ہے۔ تم نے انتہائی خطرناک حرکت یہ کی کہ اُسے سلطان احمد کے متعلق بھی بتا دیا۔"

"سب کچھ سوچ چکا ہوں" ـــــ میں نے بڑے تلخ لہجے میں کہا ـــــ "یہ باتیں بے کار ہیں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے تھا اور کیا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اب میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ یہ بتاؤ اب کیا کرنا چاہئے .... ایک بات میرے دماغ میں آتی ہے۔ لڑکی رات دس ساڑھے دس بجے اپنے گھر پہنچی تھی۔ سارا دن گزر گیا ہے۔ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اپنے ٹھکانے سے چلا تھا۔ ابھی تک پولیس نہیں آئی۔ اس علاقے کے تھانے سے پتہ کروایا تھا وہاں بھی کوئی اطلاع نہیں پہنچی۔"

"اطلاع اوپر والی سپیشل برانچ میں پہنچ چکی ہوگی" ـــــ نوراللہ نے کہا ـــــ "یہ کیس تھانوں کا نہیں، یہ سپیشل برانچ کا کیس ہے۔"

"سلطان آتا ہی ہوگا" ـــــ حمیداللہ نے کہا ـــــ "اُسے آ لینے دو۔ وہ تو یہ خبر سن کر بے ہوش ہو جاتے گا۔ اُس کی مہربانی کو تم نے بہت بُری طرح ضائع کیا ہے۔"

"تم نے بھی کچھ سوچا ہوگا!" ـــــ نوراللہ نے کہا ـــــ "بتاؤ کیا کرو گے۔"

"بھاگوں گا نہیں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "سلطان احمد کو اس چکر سے نکالنے کے لئے مجھے اگر گرفتار ہونا پڑا تو ہو جاؤں گا۔ خدا کی قسم، میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ سلطان سے کہوں گا کہ وہ مجھے گرفتار کرلے اور گورنمنٹ سے دس ہزار روپیہ وصول کرلے۔ میں اس دوست کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ جنہوں نے مجھے پناہ دی تھی اور خطرہ مول لے کر مجھے چھپا کر رکھا ہوا ہے، وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔"

ہم تینوں اسی مسئلے پر باتیں کرتے رہے اور کم و بیش دو گھنٹے گزر گئے۔



سلطان احمد بھی آ گیا۔ وہ روزمرہ کی طرح سیدھا سادہ دیہاتی بنا ہوا تھا۔ اُس نے آتے ہی پوچھا کہ لڑکی چلی گئی ہے؟

میں نے جو داستان حمیداللہ اور نوراللہ کو سنائی تھی وہ سلطان احمد کو بھی سنا دی۔ اُس پر تو خاموشی طاری ہو گئی، پھر اُس نے بھی ویسی ہی باتیں شروع کر دیں جو حمیداللہ اور نوراللہ کر چکے تھے۔ میں نے اُسے روک دیا اور کہا کہ یہ بک بک بہت ہو چکی ہے اور یہ بک بک میں خود بھی اپنے ساتھ کر چکا ہوں۔

"پھر تم کس نتیجے پر پہنچے ہو؟" ـــــ سلطان احمد نے پوچھا۔

"میں اپنے آپ کو نہیں تمہیں بچانے کی سوچ رہا ہوں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میرے ساتھ کوئی فالتو بات نہ کرنا سلطان! میں نے جو سوچا ہے وہ میں تمہیں بتا دیتا ہوں .... ایک تو یہ ہے کہ میں اس لڑکی کو ایک بار پھر اغوا کرلوں۔ یہ میں کس طرح کروں گا، یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میرے ساتھ جانے والے آدمی موجود ہیں۔ میں پہلے اسی گھر سے ایوب اور اس لڑکی کو اٹھا لایا تھا۔"

"خطرناک کام ہے!" ـــــ سلطان احمد نے کہا ـــــ "اگر لڑکی پولیس کو بیان دے چکی ہوئی اور تم نے اُسے اغوا کر لیا تو پولیس سیدھی تمہارے ٹھکانے پر پہنچے گی۔ تم وہاں نہ ہوتے تو تمہارے میزبان کو پکڑا جاتے گا۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ اسپیشل برانچ میں تمہاری، اپنے ان دونوں دوستوں اور تمہارے میزبانوں کے متعلق کیا رپورٹ پہنچی ہوتی ہے .... کیا تم نے لڑکی کو ان دونوں کے متعلق بھی بتا دیا تھا کہ یہ جعلی پیر ہیں اور اصل میں کچھ اور ہیں؟"

"نہیں!" ـــــ میں نے جواب دیا ـــــ "یہ نہیں بتایا تھا بلکہ میں جب یہاں آتا تھا تو اُسے یہ بتا کر آتا تھا کہ سائیں کرامتاں والے کے پاس

سلام کے لیے جا رہا ہوں۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ میں سائیں صاحب کا باقاعدہ مرید ہو گیا ہوں۔"

"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا ہے" — سلطان نے کہا — "اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ تم یہاں پناہ لے سکو گے، لیکن تم تینوں کو یہاں سے جلدی نکل جانا چاہیے۔"

"نہیں سلطان!" — میں نے جھنجھلا کر کہا — "میں پناہ نہیں ڈھونڈ رہا۔ میں تمہیں ساری عمر کے لیے جیل میں پھینک کر نہیں جاؤں گا۔ میں جو کچھ بھی سوچ رہا ہوں وہ تمہیں اس پھندے سے نکالنے کے لیے سوچ رہا ہوں۔ میں جو کرنا چاہتا ہوں وہ مجھ سے سنو اور بتاؤ کہ یہ ٹھیک ہے یا غلط؟"

"تم نے اغوا کی جو سکیم بنائی ہے یہ بہت خطرناک ہے" — سلطان نے کہا۔

"میں لڑکی تک پہنچنا چاہتا ہوں" — میں نے کہا — "مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ لڑکی مجھے دھوکہ دے گی۔ میں خطرہ مول لے کر بھی اُس تک پہنچوں گا۔"

"کیا سیدھے اُس کے گھر جاؤ گے؟" — حمید اللہ خان نے پوچھا۔

"نہیں!" — میں نے کہا — "وہاں میرا ایک اور ٹھکانا ہے۔"

"میں جانتا ہوں تم اس شہر کے رہنے والے ہو" — حمید اللہ نے کہا — "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے کسی رشتہ دار کے گھر نہ جا پہنچنا۔"

"اپنے نہیں!" — میں نے کہا — "وہ تمہارے رشتہ دار ہیں۔"

"میرا کون ہے وہاں!" — حمید اللہ خان نے کہا۔

"کیا گلشن آرا کو بھول گئے ہو؟" — میں نے پوچھا اور کہا — "گلشن اور اُس کا خاوند پہلے بھی مجھے پناہ دے چکے ہیں .... میں نے سوچا یہ ہے کہ میں آج ہی رات نکل جاؤں اور گلشن کے پاس پہنچ جاؤں۔ ایوب کی بہن نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گلشن کے پاس جاتی رہتی ہے۔ میں گلشن سے کہوں

گا کہ وہ اس لڑکی کو اپنے گھر بلائے۔ وہ آئے گی اور میں اُسے گھیر لوں گا۔ گلشن اُسے پہلے نہیں بتائے گی کہ میں آیا ہوا ہوں۔"

"کیا گلشن آرا کا خاوند وہاں نہیں ہوگا؟" — سلطان نے پوچھا۔

"وہیں ہوگا" — میں نے کہا — "وہ اپنا ہم خیال ہے۔ قصہ بڑا لمبا ہے۔ وہ پھر سناؤں گا۔ وہ مجھے پناہ بھی دے چکا ہے اور فرار بھی کروا چکا ہے۔"

میری اس تجویز پر سب غور کرنے لگے۔ یہ تجویز انہیں اچھی لگی تھی۔ ضرورت یہ تھی کہ یہ معلوم کیا جائے کہ لڑکی نے پولیس کو کیا بیان دیا ہے اور کیا اُس نے کوئی نشاندہی بھی کی ہے۔

اچانک سلطان کا چہرہ چمک اُٹھا۔ وہ میرے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے بڑی زور سے میرے زانو پر ہاتھ مارا اور کہنے لگا کہ دماغ میں ایک بات آئی ہے۔

"تم نے لڑکی سے ہی پوچھنا ہے ناکہ اُس نے کیا بیان دیا ہے" — سلطان احمد نے کہا — "لیکن مشکل یہ ہے کہ تم یونہی یعنی اسی حالت اور حلیے میں اُس کے پاس نہیں جا سکتے .... جوتشی بن کر جاؤ۔ اُس محلے میں کچھ اور عورتوں کے ہاتھ دیکھو۔ انہیں غیب کی باتیں سناؤ پھر اس لڑکی کے دروازے پر دستک دو۔ آگے یہ تمہارا کمال ہے کہ لڑکی کو اندر سے بلا کر اپنے سامنے بٹھالو پھر اُس کے ساتھ سیدھی سیدھی بات کرنا۔"

"یہ طریقہ ٹھیک ہے" — میں نے کہا — "لیکن میرے پاس وہ کپڑے بھی نہیں اور چہرہ بدلنے کا سامان بھی نہیں۔"

"سب کچھ ہے" — سلطان نے کہا — "تم جانتے ہو میں کون سی ڈیوٹی پر آیا ہوا ہوں۔ بڑا سوٹ کیس میرے ساتھ ہے۔ اس میں سارا سامان موجود ہے۔ میں تمہیں جوتشی اور فال رمل دیکھنے والا بنا کر بھیجوں گا۔"

"کیا یہ انتظام اتنی جلدی ہو سکتا ہے کہ میں رات ہی رات یہاں سے نکل جاؤں اور صبح وہاں پہنچ جاؤں؟" — میں نے پوچھا۔

"تمہیں رات کو ہی روانہ کر دیں گے" — سلطان احمد نے کہا — "لیکن سکندر، ایک بار پھر سوچ لو۔ بہت بڑے خطرے میں جا رہے ہو۔ تمہیں اس ٹریننگ کی تو ضرورت نہیں کہ یہ کام کس طرح کرو گے اور لڑکی کے سینے سے اصل بات کس طرح نکالو گے لیکن خطرے کا اندازہ کر لو۔"

"خطرہ تو مول لینا پڑے گا ہی سلطان!" — میں نے کہا — "میں اب کسی کی جان بخشی نہیں کروں گا۔ اگر مجھے ضرورت محسوس ہوئی تو میں لڑکی کو وہیں گولی مار دوں گا۔ ریوالور میرے پاس ہوگا۔ جو کوئی مجھے پکڑنے کی کوشش کرے گا وہ زندہ نہیں رہے گا۔ مجھے امید ہے کہ میں دو چار آدمیوں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر نکل آؤں گا۔ مجھے تیار کر کے میرے شہر تک پہنچا دو۔ آگے جو ہوگا دیکھ لوں گا۔"

"سوچے سمجھے بغیر کچھ نہ کرنا" — سلطان نے کہا — "تمہیں بتانے کی ضرورت تو نہیں، لیکن بلاوجہ جوش اور جذبات میں نہ آجانا۔"

میں کوئی فلمی کہانی نہیں لکھ رہا۔ ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ جوتشی بن کر کہیں جانا کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ میں پولیس کی سپیشل برانچ میں رہ چکا تھا۔ پوری ٹریننگ حاصل کی تھی۔ مختلف بہروپ دھارنا ہماری ٹریننگ میں شامل تھا۔ آواز بدل لینا اور اپنے قدرتی لب و لہجے سے ہٹ کر بات کرنا ایک فن تھا جس کی مجھے مہارت حاصل تھی۔ سلطان بھی اپنی ڈیوٹی پر ایک بہروپ میں آیا تھا۔ وہ جب اپنی آواز بدل کر بات کرتا تھا تو اُس کے یار دوست بھی اس شک میں پڑ جاتے تھے کہ یہ شخص سلطان نہیں کوئی اور ہے۔

میں جس دَور کی بات کر رہا ہوں اُس دَور میں انگریزوں کی سی آئی ڈی کے ہندوستانی پولیس افسروں نے بہروپ دھار کر جعلی کرنسی بنانے والوں کو اور بم وغیرہ بنانے والوں کو بھی پکڑا تھا۔ میں آپ کو ایسے بہت سے واقعات سنا سکتا ہوں۔ سپیشل برانچ کے ایک ہندوستانی پولیس انسپکٹر نے جعلی کرنسی بنانے والے ایک گروہ کو اس طرح پکڑوایا تھا کہ وہ اُس گروہ میں شامل ہو گیا تھا اور دو تین مہینے اُن کے ساتھ جعلی

کرنسی بنانے میں مدد دیتا رہا اور پھر اس کرنسی کو بازار میں چلانے کا بھی کام کرتا رہا۔ آخر ایک روز اُس نے اس گروہ کو اس طرح پکڑوا دیا کہ کرنسی بن رہی تھی اور اوزار اور سکے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔

سلطان نے مجھے بہروپ کا مشورہ دیا تو نہ میں حیران ہُوا نہ حمید اللہ خان اور نور اللہ ہوئے۔ وہ بھی جانتے تھے کہ یہ بھی سی آئی ڈی کا ایک طریقہ ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سلطان احمد ایک بار حمید اللہ کی جاگیر پر جوتشیوں کے بھیس میں گیا تھا۔ اُس وقت حمید اللہ نوابزادہ اور بہت بڑا جاگیردار تھا۔ سلطان کا یہ بہروپ اتنا کامیاب تھا کہ اسی نے حمید اللہ کو زوال کی آخری حد تک پہنچایا تھا۔

بہروپ کا فیصلہ تو ہوگیا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں نے صبح کی روشنی سفید ہونے سے پہلے شہر پہنچنا تھا۔ میں اُس وقت جس گاؤں میں بیٹھا ہُوا تھا وہاں سے شہر کا فاصلہ کم تھا کوئی اٹھارہ یا اُنیس میل بنتا تھا۔ سلطان احمد نے جس گاؤں کو اپنا اڈہ بنایا ہُوا تھا وہ صرف دو میل دُور تھا۔ میں نے جس قسم کے کپڑے پہننے تھے وہ "پیر گراستاں والے" سے ہی مل گئے۔ موٹے کھدر کا سفید کُرتہ تھا۔ پاجامہ بھی ایسے ہی کپڑے کا تھا۔ اُس علاقے میں ایک خاص قسم کی دیسی جُوتی پہنی جاتی تھی۔ وہ بھی مل گئی۔ پگڑی بھی موجود تھی۔ یہ خاص انداز سے سر پر باندھنی تھی۔

سلطان احمد وہ ضروری چیزیں لانے کے لیے جانے لگا تو میں نے اُسے کہا کہ وہ میری گھوڑی لے جاتے۔ وہ گاؤں سے پیدل آیا کرتا تھا۔ دونوں طرف چار میل فاصلہ تھا۔ وہ میری گھوڑی لے گیا اور بڑی جلدی واپس آگیا۔ گلیوں میں پھرنے والے جوتشیوں اور نجومیوں کے پاس جو چیزیں ہوتی ہیں وہ سلطان لے آیا تھا۔ ایک پوتھی ایک سلیٹ اور دو پانسے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ موٹا سا ایک کانچ کا کالا کڑا تھا جو بازو میں ڈالنا تھا۔ کانوں میں ڈالنے کے لئے دو مُندریاں تھیں۔ میرے کان عورتوں کی طرح چھیدے ہوتے نہیں۔ یہ مُندریاں کانوں کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لیتی تھیں۔ کندھوں پر ڈالنے کے لئے ایک چارخانہ پیلے رنگ کا رومال تھا۔

میرے چہرے کا رنگ سپیدی مائل تھا اور داڑھی جو میں نے مستقل طور پر رکھ لی تھی گہرے بھورے رنگ کی تھی۔ سلطان احمد نے گوند سے اس داڑھی میں سیاہ اور کہیں کہیں سفید بال چپکانے شروع کئے تو بڑی مہارت سے میری داڑھی ایک ادھیڑ عمر آدمی کی داڑھی بن گئی۔ میرے چہرے کا رنگ بھی بدل دیا گیا۔ اسی طریقے سے ہاتھوں کا رنگ بھی بدلا گیا۔

میں نے اپنا چہرہ دیکھا تو میں اپنے آپ کو پہچان نہ سکا۔ سر پر جوتشیوں کی مخصوص قسم کی پگڑی تھی جس میں آدھے آدھے کان بھی ڈھکے ہوئے تھے۔

ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو سپیشل برانچ کا معمول تھا۔ آپ یہ ذہن میں رکھیں کہ میں نے جوتشیوں اور نجومیوں جیسا حُلیہ بنا لیا۔ مجھے آج بھی اپنے ایک انگریز انسٹرکٹر انسپکٹر ایل بی فلپس کے الفاظ یاد ہیں۔ اُس نے ٹریننگ کے دوران مختلف روپ دھارنے کی مشق کراتے ہوئے کہا تھا کہ مولوی، پنڈت، پیر، سادھو اور جوتشی نجومی کا بہروپ دھارنے میں تمہیں ایک فائدہ حاصل ہے جو یہ ہے کہ تمہارے ملک کے لوگ ان سب سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ ہاتھ دکھا کر قسمت کا حال بتانے والے کے آگے اپنا ہاتھ پھیلا دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ بہروپیا ہے۔ پنڈت اور پیر جعلی ہی ہو، لوگ اُس کے عقیدتمند ہو جاتے ہیں۔ انسپکٹر فلپس نے کہا تھا کہ تم اپنے ملک کے لوگوں کو آسانی سے بیوقوف بنا سکتے ہو بشرطیکہ تم انہیں باتوں سے متاثر کر سکو۔

میں لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لئے تیار ہو گیا ——— اور میں جنہیں بیوقوف بنانے چلا تھا وہ میرے اپنے شہر کے لوگ تھے۔



میں جب اس گاؤں سے نکلا تو میں معمولی سی ایک گھوڑی پر سوار تھا۔ یہ گھوڑی "پیر کراماتاں والے" کے ایک مرید کی تھی۔ میں اپنی گھوڑی ان کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ سلطان احمد وہاں سے چلا گیا تھا۔ اُس کے آخری الفاظ میرے

کانوں میں گونج رہے تھے۔

"تمہیں کوئی نہیں پہچان سکے گا سکندر!" ——— اُس نے کہا ——— "لیکن فکر یہ ہے کہ تمہاری ذہنی حالت صحیح نہیں۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھنا۔ اگر تمہارے پاس ریوالور نہ ہوتا تو بہتر تھا لیکن اس کے بغیر جانا بھی ٹھیک نہیں۔ ویسے ہی شک میں آ کر کسی پر گولی نہ چلا دینا۔"

ریوالور میرے نیفے میں اُڑسا ہُوا تھا۔ اس کے سیلنڈر میں چھ گولیاں تھیں اور دس گولیاں تھیلے میں تھیں۔ ایسا تھیلا جوتشیوں کے پاس ہوتا تھا جسے وہ کندھے کے ساتھ لٹکا کر رکھتے تھے۔

میں اکیلا جا رہا تھا۔ گھوڑی کمزور سی تھی لیکن اس کی چال ایسی تھی کہ اس نے مجھے صحیح وقت پر شہر پہنچا دینا تھا۔ میں دل ہی دل میں ریہرسل کرتا جا رہا تھا۔ صرف یہ سوال مجھے پریشان کر رہا تھا کیا سائرہ مجھے اکیلی مل سکے گی؟

میرے دل پر ذرا سا بھی خوف نہیں تھا۔ ذہن میں کوئی وہم اور وسوسہ نہیں تھا۔ میں موت کو قبول کر چکا تھا اور میں یہ ارادہ لے کر جا رہا تھا کہ میں زندہ واپس نہیں آؤں گا۔ یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آگے حالات کیا ہوں گے اور سائرہ مجھے مل بھی سکے گی یا نہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہوگا۔ ذہن اور دل پر کوئی بوجھ نہ رہنے دیا اور ذرا اُونچی آواز سے جوتشیوں کی طرح بولنا شروع کر دیا۔ میں آواز بدل کر بول رہا تھا۔ بولنے میں ہلکی سی ہکلاہٹ بھی پیدا کر لی۔

چہرے اور ہاتھوں کی جلد کو تو ایک محلول اور اس پر مٹیالے پوڈر کو مَل کر بگاڑ لیا تھا۔ چہرہ اس وجہ سے بھی مُردہ سا ہو گیا تھا کہ میں ساری رات سویا نہیں تھا اور اس سے پہلی رات بھی میں نہیں سو سکا تھا۔ وہ رات اُس آدمی کے انتظار میں گزر گئی تھی جو سائرہ کے ساتھ گیا تھا۔ وہ واپس آیا تو ایسی پریشانی لے کر آیا کہ میرے وجود کا جیسے خون ہی خشک ہو گیا ہو۔ میں اتنا پریشان تو کبھی بھی نہیں ہُوا تھا کیونکہ یہ خطرہ مجھ پر واضح نہیں تھا۔ خطرہ واضح صورت میں سامنے ہوتا تو میں ہنستے مسکراتے اُس کا مقابلہ کرتا۔ ان غیر یقینی

اور ڈھکے چھپے حالات نے مجھے اَدھ موا کر دیا تھا اور دو راتوں سے میں جاگ بھی رہا تھا۔ اس کا یہ اثر تھا کہ میرا چہرہ مرجھایا سا ہو گیا تھا۔

دُور سے مجھے اذان کی مقدس آواز سنائی دینے لگی۔ دیہات کی خنک اور صاف ستھری فضا میں تیرتی ہوئی اللہ اکبر اور اشہدُ اَن لا الٰہ الا اللہ کی صدائیں مجھ پر ایسا تاثر طاری کرنے لگیں کہ پہلے مجھ پر خمار سا طاری ہُوا پھر رقت طاری ہو گئی۔ اللہ مجھے کس طرف بلا رہا تھا اور میں کس طرف جا رہا تھا!

چور، رہزن اور ڈاکو رات کو جاگتے ہیں اور جب مسجد سے صدا اُٹھتی ہے الصلوٰۃُ خیرٌ من النوم تو وہ سو جاتے ہیں۔

کیا میں بھی انہی میں سے تھا؟

کیا میں ملعون اور مطعون تھا؟

خلق کا راندہ ہُوا تو میں تھا ہی، کیا میں اللہ کا دھتکارا ہُوا بھی تھا؟

میں ان سوالوں کے جواب نہیں دوں گا۔ کوئی دعویٰ نہیں کروں گا۔ یہ فیصلہ آپ پر چھوڑ رہا ہوں۔ میں تو مفرور تھا۔ میں پھانسی کے تختے سے بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ میری نگاہ میں اخلاقیات کے پیمانے بدل گئے تھے۔ نیکی اور بدی کا تصور بدل گیا تھا۔

آپ جو رائے قائم کرنا چاہتے ہیں کرتے چلے جائیں۔ یہ فتویٰ بھی دے دیں کہ اس شخص کا جنازہ حرام ہے تو بھی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ میرا جنازہ پڑھیں نہ پڑھیں، مر کے ہم سب کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے۔ اللہ ہی دلوں کے حال جانتا ہے اور وہی بہتر انصاف کرنے والا ہے۔



صبح کا اُجالا سفید ہونے لگا تو مجھے اپنا شہر دکھائی دینے لگا۔ رات کا پردہ ہٹ گیا تھا۔ یہ پردہ مجھ پر پڑا ہُوا تھا تو میں جرأت اور دلیری سے باتیں کرتا اور بڑے خوفناک ارادے باندھتا تھا۔ یہ پردہ اُٹھ گیا تو میری حالت اُس عورت جیسی ہونے لگی جسے بھرے بازار میں ننگا کر دیا گیا ہو اور وہ اپنے

بازوؤں اور ہاتھوں سے اپنے آپ کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہی ہو۔

عجیب سی کمزوری نے میرے اعصاب کو اور اعضا کو شل کر دیا۔ میں اس کمزوری سے آشنا نہیں تھا۔ میں نے اسے قبول نہ کیا۔

گھوڑی روک لی اور اُتر کر ٹانگیں سیدھی کیں، ذرا سی اُچھل کود کی، لمبے لمبے سانس لیے اور گھوڑی کی زین کے ساتھ بندھا ہُوا تھیلا کھولا۔ اس میں سے چھوٹی سی ایک شیشی نکالی۔ اس میں گلیسرین تھی۔ اس کے ساتھ لکڑی کی چھوٹی سی سلائی تھی۔ شیشی کا کارک اتار کر یہ سلائی گلیسرین میں ڈبوتی اور ایک آنکھ میں پھیر، گلیسرین میں ڈبو کر دوسری آنکھ میں پھیری۔

آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اوپر سے ہاتھوں سے خوب ملا۔ پانی بہتا رہا اور میں اسے صاف کر کے آنکھیں ملتا رہا حتیٰ کہ پانی بند ہو گیا۔ آنکھیں دیکھنے کے لیے میرے پاس آئینہ نہیں تھا، دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری آنکھیں سُرخ ہو گئی ہیں اور اب ان میں ہلکی ہلکی نمی رہے گی اور پپوٹے چپکتے رہیں گے۔ اس عمل سے میری آنکھوں کی وہ خوبصورتی اور انفرادیت ختم ہو گئی تھی جس سے میں بہروپ میں بھی پہچانا جاتا تھا۔

میری دوسری پہچان میرا مُنہ تھا، یعنی میرے ہونٹ۔ اس پہچان کو سلطان احمد نے میری مونچھوں پر بال جن میں چند ایک سفید تھے، چپکا کر مونچھوں کو ہونٹوں پر پھیلا دیا تھا۔ اُس زمانے میں اکثر ہندو اس قسم کی مونچھیں رکھتے تھے جن سے پورا منہ ڈھکا رہتا تھا۔

گھوڑی نے گھاس کا ناشتہ کر لیا تھا۔ میں بھوکا تھا۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

مسئلہ گھوڑی کا تھا۔ اسے کہیں باندھنا تھا۔ اگر میں گھوڑی اپنے ساتھ رکھتا تو بھی ٹھیک تھا۔ وہ گھوڑوں کا زمانہ تھا۔ گھوڑے کی حیثیت سائیکل جیسی تھی لیکن گھوڑی کو کہیں باندھنا زیادہ اچھا تھا۔



میں نے جس شہر میں جنم لیا اور جس شہر کی گلیوں میں دوڑا، کودا اور کھیلا

کرتا تھا وہ میری نظروں کے سامنے نکھرتا آرہا تھا اور میرے ذہن پر رنج والم کی گھٹا چھاتی چلی جارہی تھی۔ میں مفرور ملزم کی حیثیت سے پہلے بھی اپنے شہر میں آچکا تھا۔ اس شہر میں گزرے ہوتے دن مجھے یاد آتے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھی آتے تھے لیکن جو حالت اب ہوتی وہ پہلے نہیں ہوتی تھی۔ دل تڑپنے لگا کہ اپنی ماں اور اپنے باپ کی قبروں پر جاؤں اور اتنا روؤں کہ آنسوؤں کی شکل میں پگھل کر ان قبروں میں جذب ہوجاؤں یا اپنی امی کی قبر کھود کر اس میں اُتر جاؤں اور اپنے اوپر مٹی ڈال لوں۔ بچہ بن جاؤں اور امی کے پہلو میں جاکر ہمیشہ کی نیند سوجاؤں۔

یہ سب خواہشیں تھیں اور جذبات تھے۔ میں لے اپنے آپ کو ان کی دلدل سے بڑی مشکل سے نکالا اور اُس حقیقت کو سامنے لے آیا جس کا مجھے سامنا تھا۔ شہر سے باہر تین چار کچے مکان تھے۔ میں لڑکپن میں اسی شہر سے نکلا بلکہ نکالا گیا تھا اور اب میں پختہ کار مرد تھا۔ اتنے زیادہ سال گزر گئے تھے لیکن یہ کچے مکان ابھی ویسے کے ویسے ہی تھے جیسے میرے لڑکپن کے زمانے میں ہُوا کرتے تھے۔ مجھے یاد تھا کہ یہ کن کے مکان ہیں لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اِن میں سے کون کون مرگیا ہے۔

سب سے باہر والے مکان کے سامنے ایک بھینس کھُرلی پر بندھی ہوتی تھی اور ایک عورت کھُرلی میں چارہ ڈال رہی تھی۔ اُس کی عمر پنتالیس برس سے ایک دو سال زیادہ ہوگی کم نہیں ہوگی۔ میں اُس کے قریب گیا تو اُسے پہچان لیا۔ وہ بھاگاں تھی۔ اُس کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام یوسف تھا اور ہم اُسے یُوسا کہا کرتے تھے۔ یہ غریب سے لوگ تھے۔ بھینس کا دُودھ بیچتے تھے اور اس کا خاوند بازار میں آڑھتیوں کے پاس مزدوری کرتا تھا۔ اب بھی انہوں نے بھینس رکھی ہوتی تھی۔ ان کا بیٹا یُوسا چوتھی جماعت میرے ساتھ پڑھا۔ بہت نالائق لڑکا تھا۔ سوائے شرارتوں کے اور کچھ نہیں کرتا تھا۔ اُس نے سکول سے بھاگنا شروع کردیا تھا پھر وہ گھر سے بھی بھاگنے لگا تھا۔

میں بھاگاں کے قریب جارُکا اور گھوڑی سے اُترا۔ اُس نے

میری طرف دیکھا۔

"فقیر پردیسی ہیں" ــــ میں نے بدلی ہوئی آواز میں پیشہ ور جوتشیوں کے انداز سے کہا ــــ "فقیر کچھ لیں گے نہیں، کچھ دے کر ہی جائیں گے۔ ہم نے اس شہر میں جانا ہے" ــــ اتنا ہی کہہ کر میں نے بھاگاں کے چہرے پر نظریں جمادیں اور آنکھیں اس طرح سکیڑ لیں جیسے مجھے اچانک کچھ نظر آگیا ہو۔ میں نے ذرا آگے کو جھک کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور آہستہ سے کہا ــــ "ایک ہی بیٹا جَن کر کوکھ بانجھ ہوگئی؟ .... اور وہ جو ایک جَنا تھا وہ بھی کھوٹا سکہ نکلا۔ تُو خواب ہی دیکھتی رہ گئی کہ تیرا لال دیں۔ یہ بھی اُس نے پی لیں اور کہنے لگا کہ تُو نے ہمارا من راضی کیا ہے، ہم تیرے من کی خوشی پوری کریں گے ....

"اُس نے مجھے اپنے جھولے میں سے ذرا ذرا جتنے تین تنکے سے دیئے۔ کہنے لگا کہ ایک تنکا (لکھ) آج گھر جاکر منہ میں ڈال کر ایک پاؤ دُودھ پی لینا دوسرا تنکا پورے دو مہینے بعد لینا۔ پھر اُس نے کہا، جا، تُو ساری عمر یاد رکھے گا ....

"میں نے گھر آتے ہی دُودھ کے ساتھ ایک تنکا لے لیا۔ تنکا پیٹ میں جانے کی دیر تھی کہ میرے جسم کی طاقت دگنی ہوگئی۔ میں دو وزنی آدمیوں کو کندھوں پر اُٹھا کر اس طرح دوڑتا تھا جیسے دو چھٹانک وزن اٹھایا ہُوا ہو۔ ایک مہینے بعد دوسرا تنکا لیا تو میں لوگوں سے کہنے لگا کہ بھینسا لے آؤ، سانڈ لے آؤ، میں اس کی گردن مروڑ دوں گا ....

"پھر میری قسمت یُوں پھُوٹی کہ میں نے سوچا کہ تیسرا تنکا دو مہینوں بعد لینا ہے، کیوں نہ یہ فوراً لے لوں۔ میں نے یہ فوراً لے لیا۔ تنکا پیٹ میں گیا ہی تھا کہ میری کمر میں کڑاکا نکلا اور کمر دوہری ہوگئی اور جسم میں پہلا تنکا لینے سے پہلے جو طاقت ہُوا کرتی تھی وہ بھی نہ رہی۔ وہ دن اور آج کا دن، کمر سیدھی نہیں ہوتی اور پچھتا رہا ہوں۔"

یہ واقعہ سُنایا جاتا ہے کہ ایک درویش یا سنیاسی یا سادھو راستے

ہیں ملا۔ اُس نے کوئی چیز (عموماً تمباکو) مانگی جو اُسے دی تو وہ خوش ہو کر ایسی چیز دے گیا جس نے کایا پلٹ ڈالی۔ یہی کیفیت بھاگاں پر طاری ہو گئی۔ میں دس جماعت پڑھ کر دفتر میں بابو لگے گا اور تیرا یہ کچا کوٹھا اینٹوں کا پکا مکان بن جاتے گا۔"

بھاگاں بھینس کا چارہ ملانا بھول گئی اور اُس کی نظریں میرے چہرے پر یوں جم گئیں جیسے میں نے اُسے ہپناٹائز کر لیا ہو۔ ایک تو میرا بولنے کا انداز ایسا تھا جو کم علم اور توہم پرست لوگوں کو متاثر کرتا تھا اور دوسرا تاثر اس سے پیدا ہُوا کہ ایک اجنبی جسے بھاگاں نے پہلی بار دیکھا تھا کہہ رہا تھا کہ ایک ہی بیٹا جن کر کوکھ بانجھ ہو گئی۔

ایسے من گھڑت واقعات آج بھی سُننے میں آتے ہیں۔ اُس دَور میں تو یہ زیادہ سُنے سناتے جاتے تھے۔ یہ واقعہ دراصل ایک ہی ہے۔ اس میں افراد اور جگہوں کے نام بدلتے ہیں۔ ایسا ایک واقعہ میں آپ کو اپنے شہر کا سناتا ہوں۔ میں سکول پڑھتا تھا۔ ہمارے محلے میں غریب سا ایک آدمی ہُوا کرتا تھا۔ اُس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ اُس کی کمر دوہری ہو چکی تھی۔ وہ جھک کر چلتا تھا۔ اُس نے ایک کہانی مشہور کر رکھی تھی۔

کہانی یہ تھی ——— میری عمر چالیس سال ہو گئی تھی۔ میں ایک گاؤں سے واپس آ رہا تھا۔ سحر ابھی تاریک تھی۔ راستے میں بیٹھا ہُوا ایک سادھو مہنت مل گیا۔ اُس نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگا کہ نشے سے ٹوٹا ہُوا ہوں۔ تمباکو ختم ہے۔ تمہارے پاس ہے تو کش لگوا دو۔ میرے پاس بیڑیاں تھیں۔ میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک بیڑی اُسے دی، ایک خود سلگائی۔ اُس نے ایک ہی کش میں آدھی سے زیادہ بیڑی جلا ڈالی۔ میں نے اُسے دو اور بیڑیاں نے اُس کے چہرے پر چمک دیکھی۔ وہ دوڑتی ہوئی اندر گئی اور اپنے خاوند کو بلا لائی۔ اُس کے خاوند کے ساتھ بھی میں نے اُسی انداز سے باتیں کیں جس انداز سے بھاگاں کے ساتھ کی تھیں۔ دونوں مجھے اندر لے گئے۔ وہ تو میرے آگے پیچھے جاتے تھے۔

اُن کی باتوں سے پتہ چلا کہ اُن کا اکلوتا بیٹا پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا، لیکن اُس نے انہیں کبھی خط تک نہیں لکھا اور سُنا ہے کہ اُس نے اُدھر ہی شادی کر لی ہے۔

میں نے اوٹ پٹانگ اصطلاحوں میں جو عموماً اس قسم کے لوگوں کے سامنے بولا کرتے ہیں، چند باتیں کیں۔ دونوں کے ہاتھ دیکھے۔ سلیٹ پر دو بار نے پھینکے۔ پوتھی نکالی جو ہندی میں لکھی ہوئی تھی۔ ویسے ہی ستاروں اور بُرجوں کا حساب جوڑ کر انہیں بتایا کہ وہ ایک سال بعد اپنی بیوی کو لے کر آتے گا اور یہ مکان گرا کر انہیں پکا مکان بنوا دے گا۔

بھاگاں نے دو پراٹھے پکائے اور کم و بیش تین پاؤ دودھ پراٹھوں کے ساتھ میرے آگے رکھ دیا۔ میں نے انہیں کہا کہ میں ایک خاص کام کے لئے شہر آیا ہُوں اور میں گھوڑی انہی کی کھُرلی پر بندھی چھوڑ جاؤں گا۔ ان دونوں نے تو جیسے اللہ کا شکر ادا کیا ہو کہ ایک جوتشی نے انہیں خدمت کا موقع دیا ہے۔

میں تفصیلات نہیں سنا رہا۔ اگر میں یہی واقعہ تفصیل سے سناؤں اور اُسی انداز سے اور اُنہی اصطلاحوں میں سناؤں تو کئی لوگ یہ پڑھ کر ہی سمجھ بیٹھیں کہ میں واقعی جوتشی تھا۔ میں گھوڑی وہیں چھوڑ کر آگے چلا گیا۔



میں جب اپنے محلے میں داخل ہُوا تو سورج نکل آیا تھا بلکہ کچھ اوپر بھی آگیا تھا۔ دُکاندار اپنی اپنی دُکانوں پر چلے گئے تھے۔ باقی آدمی بھی اپنے کاموں کو روانہ ہو چکے تھے۔ آپ نے یہ دیکھا ہو گا کہ اس طرح کے پیشہ ور جوتشی اور نجومی محلوں میں اُس وقت پھیری لگانے آتے ہیں جب مرد گھروں میں نہیں ہوتے۔ وہ اپنے اپنے کاموں پر گئے ہوتے ہوتے ہیں اور گھروں میں صرف عورتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں اور انڈیا میں بھی عورتیں پابند، مجبور اور بے بس ہوتی ہیں۔ میں مڈل کلاس اور اس سے نیچے کے طبقے کی بات کرتا ہوں۔ ان طبقوں میں روپے پیسے کی تنگی ہمیشہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ

اس دنیا کی جسے آپ چار دیواری کی دنیا کہا کرتے ہیں، سیاست بازی اتنی گندی ہے کہ عورت اور مرد بھی آزادانہ طور پر جائز کام اور جائز فیصلے بھی نہیں کر سکتے میں کیا بات کروں، آپ معاشرتی حالات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ان احوال و کوائف میں جو انسانوں کے بس میں نہیں ہوتے، لوگ غیب کی مدد اور تکوں کے سہارے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

یہ کمزوری عورتوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہاں سے پیری مریدی کا سلسلہ شروع ہوا اور مجھ جیسے جوتشی بھی لوگوں کی اسی کمزوری اور مجبوری کی بدولت کامیاب ہوتے اور آج تک کامیاب ہو رہے ہیں۔ یہ بیچارے لوگ آنے والے وقت کے پردے چاک کر کے دیکھنے کو بے تاب رہتے ہیں کہ شاید آنے والا وقت اُن کے لئے اُن کے مسائل کا حل لے کر آتے اور اپنے ساتھ مسرت و شادمانی بھی لاتے۔

میں نے اپنے محلے کے پہلے گھر کے دروازے پر رُک کر جوتشیوں کی طرح صدا لگائی ——"رمل، فال، دلیل .... غیب کی بات بتاتے۔ قسمت کا حال دکھاتے!"—— اس کے ساتھ ہی میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

اندر سے ایک عورت بڑی تیز تیز چلتی آئی۔ وہ بوڑھی عورت تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھ پر جذبات کا ایسا غلبہ ہُوا کہ جی میں آئی میں آگے ہو کر اس عورت کے پاؤں پکڑ لوں اور اُسے کہوں کہ ایک بار پھر میرے گال اور میرا ماتھا چومو۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ امی کی وفات سے پہلے یہ عورت ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔ اسے میری امی سے بہت پیار تھا۔ میرے ساتھ بھی یہ بہت پیار کرتی تھی۔ میں اس عورت کے وہ بوسے ساری عمر نہیں بھولوں گا جو اس نے میری امی کی میت پر سے مجھے اُٹھا کر دیتے تھے۔ یہ عورت روتی تھی اور مجھے اس طرح بے تابی سے چومتی تھی جیسے مجھے چاٹ کر اپنے وجود میں جذب کر لینا چاہتی ہو۔

اس کے پیچھے پیچھے ایک جوان لڑکی ڈیوڑھی میں آئی۔ یہ اُس کی بہو معلوم ہوتی تھی۔ بیٹی نہیں تھی۔ اس کی دو بیٹیاں ہُوا کرتی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ

ان کی شادیاں ہو چکی ہوں گی اور وہ اپنے اپنے گھر میں ہوں گی۔

"جوتشی مہاراج!"—— اس خاتون نے کہا —— "یہ میری بہو ہے۔ شادی کو تین سال گزر گئے ہیں۔ ابھی تک کچھ ہُوا نہیں۔ ذرا اس کا ہاتھ دیکھیں۔"

انہوں نے مجھے ڈیوڑھی میں بٹھا لیا۔ میں نے اُس کی بہو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر میں نے اپنے فن کے کمالات دکھانے شروع کر دیتے اور اس دوران محلے کی ایک اور عورت آگئی۔ وہ ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ مجھے خوشی ہوتی کہ ایک اور چڑیا جال میں آگئی ہے۔

میں اس گھر کے پرانے حالات سے واقف تھا۔ سلیٹ پر پانسے پھینک کر جب اس خاتون کو اس کے خاندان کی پچھلی ہسٹری سناتی تو اُس کے آنکھوں کے ڈھیلے حیرت سے باہر آنے لگے۔ پھر جب میں نے اُسے آنے والے وقت کا حال سنانا شروع کیا تو صاف پتہ چلتا تھا کہ میرا ایک ایک لفظ اُس کے دل میں اُتر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں نے انہیں اولادِ نرینہ کی خوشخبری سناتی ہوگی۔ اس خاتون نے مجھے ایک روپیہ دیا۔ یہ فیس بھی تھی اور انعام بھی۔ اُس وقت گلیوں میں پھرنے والے جوتشیوں کی فیس بھی چار چھ آنے ہی ہُوا کرتی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں وہاں سے اُٹھتا، وہ عورت جو وہاں آگئی تھی، وہ اس طرح اُٹھی جیسے اُسے کوئی کام یاد آگیا ہو۔ میں اس عورت کو بھی جانتا تھا۔ میں جب اس گھر سے باہر نکلا تو سات آٹھ سال عمر کا ایک بچہ میرے پاس آیا اور ایک طرف اشارہ کر کے اُس نے کہا کہ وہاں چلیں۔ وہ اُس گھر سے چوتھا گھر تھا۔ میں وہاں پہنچا تو اُسی عورت نے میرا استقبال کیا اور مجھے اندر لے گئی۔

اس عورت کے متعلق مجھے کوئی خاص واقعہ یاد آرہا تھا، لیکن یہ ذہن سے اُتر گیا تھا کہ واقعہ کیا تھا۔ میں ذہن پر بہت زور دے رہا تھا۔ کوئی بڑا واقعہ اس گھر میں ہُوا تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ میرے آگے کر دیا۔ وہ سمجھتی ہو گی کہ میں اُس کے ہاتھ کی لکیریں پڑھ رہا ہوں، لیکن میں وہ واقعہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک ذہن میں روشنی سی چمکی اور مجھے یاد آگیا ہے۔ اس

وقت میری عمر تیرہ چودہ سال تھی۔

"خاوند نے پھر کبھی گھر سے تو نہیں نکالا؟" ـــــ میں نے پوچھا اور اُس کے ہاتھ کی ایک لکیر پر اُنگلی رکھ کر کہا ـــــ "اس لکیر نے تمہیں بچا لیا تھا ورنہ تمہیں طلاق ہو جاتی پر تمہارے بچے اچھی قسمت لے کر آتے ہیں۔"

"پھر تو اللہ کا فضل رہا" ـــــ اس عورت نے حیرت زدگی کے عالم میں جواب دیا اور مجھ سے وہی گھسے پٹے سوال پوچھنے لگی جو عورتیں نجومیوں سے پوچھا کرتی ہیں۔

مجھے یاد آ گیا تھا کہ اس کا خاوند وہمی اور جھگڑالو سا آدمی تھا۔ ایک بار اُس نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ یہ عورت چھوٹے چھوٹے دو بچوں کو اُٹھائے گلی میں بڑی زور زور سے روتی اور اپنے خاوند کو بُرا بھلا کہتی تھی۔ اس نے سارا محلہ اکٹھا کر لیا تھا۔

اسے بھی بیوقوف بنا کر میں آگے چلا تو ایک اور دروازے پر کھڑے ہو کر رمل فال، دلیل کی صدا لگائی۔ اس گھر کی عورتوں نے بھی اپنے ہاتھ دکھائے اور میں نے ان کی خاندانی ہسٹری سنا کر اُنہیں حیران کر دیا، وہاں دو عورتیں اور آگئیں۔ مجھے معلوم تھا ایسے ہی ہو گا۔ میرا اصل ٹارگیٹ ابھی دُور تھا۔ میں اسی لئے گھر گھر رُکتا اُس ٹارگیٹ کی طرف چلا جا رہا تھا کہ میری شہرت اور میری غیب دانی مجھ سے پہلے اُس ٹارگیٹ تک پہنچ جائے۔

پھر میرا اپنا گھر آ گیا۔ یوں لگا جیسے زمین نے میرے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اس گھر میں رہنے والوں سے بھی ملوں یا نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں کرایہ دار رہتے ہیں۔ دل بے تاب اور بے قرار ہو گیا کہ اپنے مکان کے اندر جاؤں اور ان در و دیوار کو ایک بار پھر دیکھوں لیکن اپنا دل جب ایک عجیب تکلیف دہ کیفیت میں جکڑا ہوا دیکھا تو میں تیزی سے اپنے دروازے کے سامنے سے گزر گیا۔ میرا یہ بہروپ کامیاب ہو رہا تھا۔ یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ایسا نہ ہو اپنے گھر کو دیکھ کر جذبات امڈ آئیں اور میرا دماغ کسی اور طرف چل پڑے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میں شاید زبان کی استادی بھول جاتا۔

میں تیز تیز قدم اُٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک زنانہ آواز نے مجھے روک لیا۔ میں نے پیچھے دیکھا۔ ایک عورت نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں مستانہ سی چال چلتا اُس تک پہنچا۔ وہ مجھے اندر لے گئی۔ وہاں بھی وہی ڈرامہ دُہرایا گیا۔ وہاں سے بھی کچھ پیسے ملے اور میں باہر نکلا۔



زمانہ بدل گیا ہے۔ انسان خلا میں پہنچ گیا ہے۔ سائنس گھر گھر پہنچ گئی ہے۔ لاکھوں اور کروڑوں کی جمع تفریق کیلکولیٹر کے ذریعے دو تین جماعتیں پڑھا ہُوا بچہ بھی کر سکتا ہے۔ زمانہ صحیح معنوں میں اُڑ رہا ہے، لیکن ہمارے لوگوں کی قسمت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

لوگوں کو آج کی خبر نہیں ہوتی، مگر وہ آنے والی کل کی باتیں پوچھتے ہیں قسمت میں اس لئے کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ لوگوں نے اپنی سوچوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ یہی ایک خواہش سینے سے لگائے پھرتے ہیں کہ کوئی آ کر یہ خوش خبری سُنا جاتے کہ آنے والا وقت تمہاری ہر خواہش پوری کر دے گا۔

ہم سوچتے نہیں، سمجھتے نہیں اور جدوجہد سے بھاگتے ہیں۔

یہ باتیں کوئی عالم فاضل کرے تو اچھا لگتا ہے۔ مجھے حق نہیں پہنچتا کہ میں علم و فضل کی باتیں اور پند و نصیحت کروں۔ آپ کہیں گے کہ جس معاشرے میں سکندر جیسے بہروپئے موجود ہوں وہ معاشرہ کس طرح ترقی کر سکتا ہے۔

میں اب ہر اُس گھر کی روئیداد نہیں سناؤں گا جہاں جہاں میں گیا اور عورتوں کو قسمت کا حال بتایا۔ میں آپ کو اُس گھر میں لے چلتا ہوں جس میں مجھے جانا تھا۔ وہ ساترہ کا گھر تھا۔ میں اُس گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازہ پر ہلکی سی دستک دی اور رمل فال دلیل کی صدا لگائی۔ ساترہ کی ماں دروازے میں آئی۔

"اپنے کو کوئی لالچ نہیں ہے بڑی بی!" ـــــ میں نے جذباتی اور قدرے مخمور سے لہجے میں کہا ـــــ "ہم تو اپنے استاد کے سلام کو جا

رہے تھے۔ وہ بہت بڑے جوتشی بابا ہیں۔ اس گھر کے آگے سے گزرے تو قدم رُک گئے۔ جو ہم دیکھ سکتے ہیں وہ تو نہیں دیکھ سکتی بڑی بی! اس گھر کے اوپر کالی گھٹا چھائی ہوتی ہے ..... کبھی اس گھر پر بجلی تو نہیں گری؟ کچھ ہوا ضرور ہے بڑی بی! اپنے کو کچھ لالچ نہیں ہے۔ استاد کا دیا ہوا ایک علم ہے۔ کوئی سیوا ہم کر سکتے ہیں تو دل کی بات کہو۔ تیرے ماتھے پر لکھا ہے کہ کل جو گزر گیا، وہ کلنک تھا۔"

بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کچھ نہ دینا بڑی بی!" ـــــ میں نے جذباتی لہجے میں کہا ـــــ "ایک پیسہ نہ دینا۔ من کی موج ہے۔ دل میں دُکھی بندوں کا درد ہے جو پوچھو گی جوتشی بابا بتائیں گے۔ شاید اس اندھیری رات میں تجھے کوئی راستہ دکھا دیں۔"

بڑھیا پر غم کا اتنا اثر تھا کہ اُس کے مُنہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ اُس نے سر کے اشارے سے مجھے اندر بلایا اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ مجھے اُسی کمرے میں لے گئی جس میں ایوب کے ساتھ میری ملاقات ہوتی تھی۔ مجھے بٹھا کر وہ اندر گئی اور واپس آئی تو سائرہ اُس کے ساتھ تھی۔ سائرہ کی آنکھیں سُوجی ہوتی تھیں اور اُس کی ناک لال سُرخ ہو گئی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ مسلسل روتی رہی ہے۔ اُسے دیکھ کر میں بے قابو ہو چلا تھا۔ اگر اپنے آپ پر قابو نہ پا لیتا تو میں اُٹھ کر اُسے گلے لگا لیتا اور اُسے کہتا کہ مجھے دھوکے میں نہ مرواؤ، میرے ساتھ تھانے چلو۔ وہاں میں یہ بیان دوں گا کہ مجھے اس لڑکی نے پکڑا ہے اور یہ دس ہزار روپے کی حقدار ہے۔

"پنڈت جی!" ـــــ سائرہ کی ماں نے دُکھی ہوتی سی آواز میں کہا ـــــ "وہ جو کالی گھٹا آپ نے اس گھر کے اُوپر دیکھی ہے، ٹھیک دیکھی ہے۔ ایک ہی بیٹا تھا وہ جوانی میں قتل ہو گیا ہے۔ اب یہ بیٹی رہ گئی ہے۔ قسمت اس کی بھی پھوٹ گئی ہے۔ اس کا ہاتھ دیکھ کر بتائیں کہ اس کا گھر کہیں آباد ہو گا یا نہیں۔"

"ہمیں مت بتا بڑی بی!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "یہ ہم بتائیں گے کہ کیا ہو چکا ہے اور کیا ہو گا ..... اپنا دایاں ہاتھ آگے کر ذرا!"

اُس نے دایاں ہاتھ میرے آگے پھیلا دیا۔ میں نے کچھ دیر نظریں جمائے رکھیں، لیکن اُس کی لکیریں دیکھنے کی بجائے میں یہ سوچ رہا تھا کہ سائرہ کے ساتھ علیحدگی میں بات کس طرح ہو سکتی ہے۔ ایک طریقہ دماغ میں آ گیا۔

"دل کو دُکھی نہ کرنا بڑی بی!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "جوتشی بابا بات کھری کریں گے۔ بُرا نہ جان لینا ..... تُو نے لڑکا ایک ہی جنا اور وہ بھی مُورکھ نکلا۔ ماں کی لکیروں میں بیٹا نظر آ رہا ہے۔ اُس کو بڑا رُتبہ ملا تھا۔ شاید کوتوال ہو گیا تھا پر لیکھ لکھنے والے نے بڑے اُلٹے لکھے۔ یہ روگ تیرے وجود میں اُتر گیا۔ اب اس بچی کی فکر کر" ـــــ میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا ہاتھ سائرہ کی طرف بڑھایا اور کہا ـــــ "لا بچی اپنا ہاتھ آگے کر۔"

سائرہ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں اُس کی لکیریں دیکھنے لگا اور اُس کے ہاتھ پر سر جھکاتا گیا۔ جب میرا مُنہ اُس کے ہاتھ کے قریب پہنچا تو میں نے بڑی تیزی سے منہ یوں پیچھے کیا جیسے یہ ہاتھ مجھے ڈس لے گا۔

"بڑی بی!" ـــــ میں نے سائرہ کی ماں سے کہا ـــــ "گھبرا نہ جانا۔ اس بچی کے ہاتھ پر ہمیں کچھ نظر آ گیا ہے جو ہم پہلے اسے بتائیں گے پھر تجھے بتائیں گے۔ ہم پر اعتبار کر اور ذرا اندر چلی جا۔ ہم ابھی تجھے بلائیں گے اور کوئی اچھی خبر ہی سنائیں گے۔"

سائرہ کی ماں میری باتوں سے سو فیصد متاثر ہو چکی تھی۔ میں نے جب اُسے کہا تھا کہ تیرا بیٹا شاید کوتوال ہو گیا تھا تو اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔ اُس کا یہ چونکنا میرے لئے امید افزا تھا کہ وہ مان رہی ہے کہ جوتشی بابا سب کچھ جانتا ہے۔ میں نے اُسے اندر چلے جانے کو کہا تو وہ فوراً اُٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔



"سائرہ!" ——— میں نے آہستہ سے کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ——— "میں سکندر ہوں۔"

اُس نے بدک کر میری طرف دیکھا۔

"کیوں؟" ——— میں نے پوچھا ——— "غصہ آگیا ہے یا حیران ہو گئی ہو؟"

میں اب اپنی قدرتی آواز میں بول رہا تھا اور سائرہ خاموش تھی۔

"یہ تم نے کیا کیا سائرہ!" ——— میں نے کہا ——— "تم نے سوچا نہیں کہ جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ تم اپنے گھر چلی گئی ہو تو میرے لئے کیا کیا پریشانیاں پیدا ہوئی ہوں گی ... لمبی باتوں کا وقت نہیں۔ جلدی جلدی بتاؤ کہ پولیس نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟ ..... وہ رُقعہ کہاں ہے؟ .... کیا تم محسوس نہیں کر رہیں کہ میں نے اپنے آپ کو کیسے خطرے میں ڈالا ہے اور تم تک پہنچا ہوں؟"

"کیا تم اس شک میں پڑ سکتے ہو کہ میں تمہیں دھوکہ دوں گی؟" ——— سائرہ نے بڑی پختہ آواز میں کہا ——— "وقت نہیں ورنہ میں پوری بات کرتی۔ اپنے گھر کے قریب آئی تو ماں کا خیال آگیا۔ اس سے آگے قدم اُٹھا ہی نہیں۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اس کا نتیجہ میرے لئے کیا ہوگا اور تمہارے لئے کیا ہوگا .... یہاں پہنچی تو پتہ چلا کہ ایوب بھائی قتل ہو کر دفن بھی ہو چکا ہے۔"

"یہ اُس آدمی نے مجھے بتا دیا تھا" ——— میں نے کہا ——— "میرے دل کو بہت صدمہ ہوا، لیکن میرے سوال کا جواب فوراً دو، وقت بہت تھوڑا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں پکڑا جاؤں۔"

"اباجان کو کسی نے مشورہ دیا تھا کہ تھانے اطلاع کر دو کہ ہماری بیٹی واپس آگئی ہے" ——— سائرہ نے بتایا ——— "اباجان تھانے چلے گئے۔ واپس آ کر امی کو بھی ساتھ لے گئے۔ تھانیدار نے دونوں سے بیان لکھوا کر دستخط کروا لئے کہ ہماری لڑکی اپنی مرضی سے گئی تھی اور واپس آگئی ہے ... اور اب ہمارا کیس ختم ہے۔ مجھے تھانے بلایا ہی نہیں گیا۔"

"وہ رُقعہ کہاں ہے؟" ——— میں نے پوچھا ——— "وہ رُقعہ سلطان احمد

کو مروا دے گا۔"

"وہ میں نے سنبھال کر رکھ لیا ہے" ——— سائرہ نے کہا ——— "شاید پھر کبھی کام آ جائے۔"

"فوراً لے آؤ" ——— میں نے کہا اور اُسے رقعہ میرے حوالے کرنے کا ایک طریقہ بھی بتا دیا۔ پھر کہا ——— "امی کو بلا لو۔"

"نہیں سکندر!" ——— سائرہ نے جذباتی سے لہجے میں کہا ——— "کچھ دیر اور باتیں کرو۔"

"وقت نہیں سائرہ!"

"پھر کبھی آؤ گے؟" ——— اُس نے کہا ——— "میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔ اس گھر اور اس محلے میں مجھ پر جو بیت رہی ہے وہ تم نہیں جانتے۔"

"آؤں گا سائرہ!" ——— میں نے کہا ——— "ضرور آؤں گا۔"

"میں انتظار کروں گی" ——— سائرہ نے میرا ہاتھ تھام کر کہا ——— "ساری عمر تمہارا انتظار کروں گی۔"

وہاں سے اُٹھنے اور واپس آنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، لیکن مجھے وہاں سے اُٹھنا تھا۔ وہاں سے آنا تھا۔ میرے کہنے پر سائرہ اندر گئی اور اپنی ماں کے ساتھ واپس آئی۔ اُس کی مُٹھی بند تھی، لیکن اُس کے انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی نے ایک روپے کا سکہ پکڑ رکھا تھا۔ میں اُسے بتا چکا تھا کہ وہ مجھے رُقعہ کس طریقے سے دے گی۔ میں نے اپنا تھیلا کھولا جیسے اس میں سے کوئی چیز نکالنے لگا ہوں۔ سائرہ نے اپنا ہاتھ تھیلے میں ڈال دیا۔ جب اُس کا ہاتھ تھیلے سے باہر آیا تو ایک روپیہ اور ایک رُقعہ میرے تھیلے میں پڑے ہوتے تھے۔ میں نے روپیہ نکال کر سائرہ کو دے دیا۔

"جوتشی بابا دُکھی لوگوں سے کچھ نہیں لیا کرتے" ——— میں نے جوتشیوں کی آواز اور لہجے میں کہا ——— "ہم اپنی مرضی سے رُکے تھے۔ تم نے ہمیں بلایا تو نہیں تھا" ——— میں نے سائرہ کی ماں سے کہا ——— "یہ بچی بڑی بھاگوان ہے بڑی بی! لوگوں کی باتوں پر نہ جانا۔ پنچھی اُڑ گیا تھا۔ دیکھ اپنے گھونسلے میں آگیا

ہے پر یاد رکھ، یہ ہجرے کا پنچھی نہیں۔ یہ تجھے کچھ دے گی کچھ لے گی نہیں۔ گھٹا چھٹ رہی ہے۔ چنتا نہ کر۔ دن پھر رہے ہیں۔"

میں نے اس طرح کی چند اور باتیں کیں۔ میری زبان چلتی رہی، سائرہ کے آنسو بہتے رہے۔ میں جانے کے لئے اُٹھا۔ سائرہ نے بہت کہا، کچھ کھا پی لو جوتشی بابا! میں نے وہی جواب دیا کہ دُکھی لوگوں کے گھر کا پانی پینا بھی پاپ ہے، ہم پھر آئیں گے۔

میں نے اپنے آپ کو گھسیٹ کر وہاں سے نکالا اور دوسرے راستے سے شہر سے نکل آیا۔ میں اُس گھر گیا جس کے دروازے پر گھوڑی باندھ آیا تھا۔ اُنھوں نے پھر مجھے پراٹھے کھلائے۔

میں گھوڑی پر سوار ہُوا اور وہاں سے چل پڑا۔

شہر سے کچھ دُور جا کر راستہ مجھے برساتی نالے میں لے گیا جو خشک ہو رہا تھا۔ نالے میں سے گھاٹی اوپر جاتی تھی۔ میں گھاٹی چڑھ گیا۔ گھوڑی کو روک کر گھوم کے دیکھا۔ وہ جگہ بلند تھی۔ گھوڑی پر سوار ہونے کی وجہ سے میں اور زیادہ بلند ہو گیا تھا۔ پورا شہر نظر آرہا تھا۔ وہ گلی صاف دکھائی دے رہی تھی جو دو گلیوں سے مل کر میرے گھر کو جاتی تھی۔

اتنا حسین شہر! اس کے اوپر آسمان کی نیلاہٹ میں بادلوں کے سفید اور بعض مٹیالے ٹکڑے آہستہ آہستہ تیر رہے تھے۔ کبھی تو ایسے لگتا جیسے میں یہ شہر سینما کی سکرین پر دیکھ رہا ہوں، اور کبھی ایسے جیسے یہ کسی مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر ہو۔

میں اپنی اس وقت کی حالت اور حیثیت کو بھول گیا۔ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میں مفرور قاتل ہوں اور لوگ میرے قریب سے گزر رہے ہیں۔ میں ایک بچہ بن گیا تھا جو اس شہر میں پیدا ہُوا تھا، اس شہر کی گلیوں میں بھاگا دوڑا تھا۔ میں تصور میں بھاگتا دوڑتا اپنی گلی میں پہنچ گیا اور بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔

میری نگاہیں شہر میں گھومتے پھرتے درختوں کے ایک جھنڈ میں جا کر رُک گئیں۔ وہاں بہت سے درخت تھے۔ دو مقبروں کے گنبد بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ قبرستان تھا۔ میری امی اور میرے ابو اُن گھنے درختوں کے سائے میں سوتے ہوتے تھے۔ ایسے لگا جیسے وہ دونوں وہاں بیٹھے ہوتے ہوں۔ درخت اور مقبرے جھلمل جھلمل کرنے لگے اور دُھندلا گئے۔ مجھے خواب کا دھوکہ ہُوا جیسے میں خواب میں اپنے شہر اور قبرستان کو دیکھ رہا ہوں۔

"السلام علیکم!"

اس آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔ میں نے بڑی تیزی سے آنکھوں میں آئے ہوتے آنسو پونچھ ڈالے اور سلام کرنے والے کو دیکھا۔ وہ السلام علیکم

کہہ کر میرے پاس سے گزر گیا تھا۔ وہ کوئی مسلمان تھا جس نے السلام علیکم کہہ کر سُنتِ رسولؐ پوری کی تھی۔ میں وعلیکم السلام نہیں کہہ سکا تھا۔ میں جذبات اور احساسات کی جھیل میں اُترا ہُوا تھا۔ باہر کی دنیا کا مجھے کوئی ہوش نہ تھا۔

ماضی ہر انسان کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ میں ماضی کو دُور پیچھے پھینک کر بہت آگے نکل گیا ہوں مگر اپنے شہر کو دُور کھڑا دیکھ رہا تھا تو ماضی نے لپک کر مجھے دبوچ لیا اور میری قوتیں سلب کر لیں۔ میں نے جس دل کو پتھر بنا لیا تھا وہ آگ کے قریب رکھے ہوئے موم کی طرح پگھل رہا تھا۔

میرے وجود کے اندر تار ٹوٹ ٹوٹ کر گِر رہے تھے۔

میں پگھل رہا تھا۔

اپنے آپ کو وہاں سے یوں ہٹایا جیسے کوئی کسی کو پکڑ کر گھسیٹ رہا ہو۔

گھوڑی چل پڑی، لیکن اس کے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے اپنے آپ پر جبر کر کے چل رہی ہو۔ میں بار بار پیچھے دیکھ رہا تھا۔ گزرے ہوئے وقت کے لمحے چیونٹیوں کی طرح میرے جسم پر رینگ رہے تھے۔

کچھ اور آگے جا کر پیچھے دیکھا تو میرے اور میرے شہر کے درمیان زمین حائل تھی۔ راستہ مجھے نیچے لے گیا تھا۔ مجھے قریب کے درخت، اونچی گھاس اور اُبھری ہوئی زمین دکھائی دے رہی تھی۔ میں اپنے آپ میں آنے لگا پھر بھی ذہنی کیفیت ایسی تھی جیسے آدمی جاگ اُٹھتا ہے لیکن جس خواب سے وہ بیدار ہوتا ہے وہ خواب اُس کے ذہن میں موجود ہوتا ہے اور بیداری میں بھی کچھ دیر وہی خواب دیکھتا رہتا ہے۔



آگے علاقہ میدانی تھا۔ میں ایک چوڑی پگڈنڈی پر جا رہا تھا۔ اکّے دُکّے آدمی میرے قریب سے گزر رہے تھے۔ جو بھی میرے قریب سے گزرتا تھا وہ مجھے غور سے دیکھتا تھا۔ مجھے ایسا کوئی ڈر نہ تھا کہ کوئی مجھے پہچان لے گا۔

وہ مجھے نجومی اور جوتشی سمجھ کر دیکھتے تھے جیسے اُن کی قسمت میرے ہاتھ میں تھی اور میں اُن کے ہاتھوں کی ٹیڑھی لکیریں سیدھی کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔

پگڈنڈی کے کنارے بڑ کا ایک پُرانا درخت تھا۔ اس کے سائے میں ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کے قریب ایک چھوٹی سی گٹھڑی رکھی تھی۔ اُس کی داڑھی کی سفیدی بتاتی تھی کہ ضعیف العمر ہے۔ میں جُوں جُوں اُس کے قریب ہوتا گیا اُس کا چہرہ نکھرتا گیا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے کپڑے دُھلے دھلائے تھے۔ اُس نے سادے سے کُلّے پر ململ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ وہ دیہاتی نہیں لگتا تھا۔ اگر دیہاتی ہی تھا تو کسی مسجد کا امام تھا۔ اُس کا چہرہ مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ اُس کا چہرہ نورانی سا تھا۔

میں اُس کے قریب سے گزر رہا تھا تو میری نظریں اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے باگ کھینچ کر گھوڑی کو روک لیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے گھوڑی کو میں نے نہیں کسی اور نے باگ کھینچ کر روک لیا ہو۔ میں گھوڑی سے کُود کر اُترا اور گھوڑی کو کھُلا چھوڑ دیا۔ وہ گھاس چرنے لگی۔ میں اس معزز صورت بوڑھے کے سامنے جا بیٹھا۔ السلام علیکم کہہ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔ اُس نے بے دلی سے اور نہایت آہستہ آہستہ اپنا دایاں ہاتھ آگے کیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" —— اُس نے پوچھا۔

میں نے ویسے ہی کچھ کہہ دیا۔

"کیا کام کرتے ہو؟" —— اُس نے پوچھا اور میرا جواب سُنے بغیر کہنے لگا —— "رملی معلوم ہوتے ہو۔"

"ہاں مولوی صاحب!" —— میں نے کہا —— "میں رملی ہوں۔ ہاتھ دیکھتا ہوں۔ پچھلی باتیں اور آنے والے وقت کے حالات بتا سکتا ہوں۔"

"اگر تم اس لالچ میں میرے پاس بیٹھ گئے ہو کہ تمہیں اپنا ہاتھ دکھاؤں گا تو آگے نکل جاؤ" —— اُس نے مسکراتے ہوئے کہا —— "اب مجھے آنے والے وقت کے کیا حالات بتاؤ گے! قبر کے کنارے پہنچ چکا ہوں .... اور پھر میں

اس ڈھکوسلے کو مانتا بھی نہیں۔"

"ہر کوئی ایک سا نہیں ہوتا محترم بزرگ!" — میں نے جوتشیوں کے لہجے میں کہا — "آپ میرے لئے اجنبی ہیں۔ کہیں تو گزرے ہوتے وقت کی باتیں بتا سکتا ہوں۔"

"معاف کرو بھائی!" — اس نے کہا — "میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔"

"کچھ مانگ تو نہیں رہا بزرگو!" — میں نے کہا — "ذرا دم لینے کے لئے بیٹھ گیا ہوں۔ آپ کا ایک پیسہ بھی مجھ پر حرام ہے۔"

میں نے اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پھیلایا اور اُس کی لکیریں غور سے دیکھنے لگا۔

"کیا اب بھی آپ بچوں کو پڑھاتے ہیں؟" — میں نے پوچھا — "مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لئے غلط جواب نہ دینا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ آپ سکول میں بچوں کو پڑھاتے ہیں یا مسجد میں۔"

"سکول میں پڑھاتا رہا ہوں" — اُس نے کہا۔

میں نے اُس کی لکیروں کو اور غور سے دیکھا، پھر اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"آپ کا نام نون سے شروع ہوتا ہے" — میں نے کہا — "نام تو ہر مسلمان کا پاک ہوتا ہے، لیکن آپ کا نام خاص طور پر پاک ہے کیونکہ اس میں لفظ احمد آتا ہے ..... اب اپنا پورا نام آپ خود بتا دیں۔"

"نذیر احمد!" — اُس نے جواب دیا — "لوگ مجھے مولوی نذیر احمد کہتے ہیں۔"

"مولوی صاحب!" — میں نے اُس کی ہتھیلی پر ایک جگہ اُنگلی رکھ کر کہا — "ایک صدمہ صاف نظر آرہا ہے ..... آپ کا بچہ فوت ہو گیا تھا۔"

"ہاں!" — اُس نے کہا — "وہ چار سال کی عمر میں مر گیا تھا۔"

اُس کے پاس اُس کی چھڑی پڑی ہوتی تھی جو بید کی تھی۔ میں نے چھڑی اُٹھالی اور اُسے دیکھا۔

"یہ چھڑی آپ کی جوانی کی یادگار ہے" — میں نے کہا اور اُس سے پوچھا — "آپ کا بیٹا مجید تو زندہ ہی ہو گا۔"

"تم مجھے کس طرح جانتے ہو؟" — اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"میں نہیں" — میں نے ہنستے ہوتے کہا — "میرا علم آپ کو جانتا ہے۔ آپ کی عمر جو گزر گئی ہے وہ آپ کے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ آپ کے گھر کا ہر ایک فرد جو زندہ ہے اور جو زندہ نہیں ہے آپ کی آنکھوں میں موجود ہے۔"

وہ خاموشی سے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوتے تھا جیسے وہ میری بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ مجھے ایسے انداز سے دیکھ رہا تھا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کیا دیکھ رہے ہو میرے بزرگوار!" — میں نے کہا — "آپ نے میرے علم کو ڈھکوسلا کہا ہے، لیکن آپ ماننا نہیں چاہتے کہ میرے علم میں صداقت ہے۔"

"صداقت ضرور ہے" — اُس نے کہا — "لیکن تمہارے علم میں نہیں۔ تم مجھے جانتے ہو۔ میں تمہیں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم جوتشی نہیں ہو، تم نجومی بھی نہیں ہو۔ تمہارا اپنا ستارہ گردش میں آیا ہُوا ہے ..... کیا تم میرے پاس پڑھے ہو؟"

میں ہنس پڑا جیسے اُس کی بات کا مذاق اُڑایا ہو۔

"مجھے گنوار اور احمق نہ سمجھو لڑکے!" — اُس نے کہا — "میری عمر دیکھو۔ اتنی عمر دھوپ میں بیٹھ کر غنودگی میں نہیں گزاری۔ تم شاید میری بات نہ سمجھ سکو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں صرف خداوند تعالیٰ پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ غیب کا حال وہی جانتا ہے" — اُس نے اپنا کانپتا ہُوا ہاتھ اوپر کر کے شہادت کی اُنگلی اوپر اُٹھائی اور کہا — "آنے والے وقت کی خبر وہی دے سکتا ہے ..... تم نے اِسے پیشہ بنا لیا ہے۔ تم باتوں سے دل موہ سکتے ہو۔

بس یہ تمہارا کمال ہے۔ مجھے تم بیوقوف نہیں بنا سکتے" — اُس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا — "تم مجھے اور میرے خاندان کو کس طرح جانتے ہو؟ .... مجھے سچ بتا دو گے تو تمہارا کچھ نہیں بگڑ جاتے گا۔ نہیں بتاؤ گے تو میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔"

سچ بات میرے ہونٹوں تک آگئی تھی، لیکن میں نے ہونٹوں تک آئی ہوئی بات کو نگل لیا۔ وہ دانشمند تھا۔ اُس کی آنکھیں بڑھاپے نے سفید کر دی تھیں۔ ان آنکھوں میں نور کی چمک بُجھ گئی تھی لیکن جب وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا تھا تو میں اپنے جسم میں بجلی کا ہلکا سا جھٹکا محسوس کرتا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے شعاعیں سی نکلتی محسوس ہوتی تھیں جو میری آنکھوں کے راستے میرے وجود میں اُتر جاتی تھیں۔

جوتشیوں، نجومیوں اور رُمل فال والوں کو نہ اُس زمانے میں لوگ اس طرح جھٹلاتے تھے نہ آج جھٹلاتے ہیں۔ آپ خود جانتے ہیں کہ لوگ اپنے آپ کو فریب دینا چاہتے ہیں۔ جوتشی بہروپیا ہی ہو تو بھی وہ ان کی امیدوں کے ٹمٹماتے چراغوں کو روشن کر دیتا ہے۔ ان پیشہ ور نجومیوں اور رملیوں کا یہی کمال ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی نفسیاتی خامیوں اور بدبختیوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ تاریکیوں میں انہیں خوش بختی کی مصنوعی سی کرن دکھا دیتے ہیں۔ کوئی اَن پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ، جوتشی کے آگے اپنی ہتھیلی ضرور پھیلاتا ہے، لیکن اس بزرگ نے مجھے جھٹلا دیا۔

اُس کی دُور بین نگاہوں اور عقل و دانش نے دیکھ لیا تھا کہ میں جوتش اور علم نجوم میں کورا ہوں۔ اُس نے مجھے بہروپیا تو نہ کہا پیشہ ور ہی کہا، لیکن وہ جان گیا تھا کہ میں فریب کار ہوں۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے کس طرح معلوم کر لیا تھا کہ یہ بوڑھا بچوں کو پڑھایا کرتا تھا اور اُس کا نام نون سے شروع ہوتا ہے اور نام میں لفظ احمد بھی ہے اور یہ بھی کہ اُس کا بیٹا مجید تو زندہ ہوگا؛ جہاں تک مجھے یقین ہے علم نجوم ایسی باتیں نہیں بتا سکتا۔ میں یہ سب باتیں بتا سکتا تھا کیونکہ میں اس بزرگ کو جانتا تھا — یہ ہمارا پہلی جماعت

کا مولوی نذیر احمد تھا۔ میری تعلیم کی بسم اللہ اسی کے ہاتھوں میں ہوئی تھی۔ وہ ہماری گلی کے آخری مکان میں رہتا تھا۔ یہ مکان اُس کا اپنا تھا۔

میں اُسے گیارہ بارہ سال بعد دیکھ رہا تھا۔ اُسے پہچاننا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ وہ مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ میں اُس وقت لڑکا سا تھا جب اغوا ہو کر اس گلی سے غائب ہُوا تھا۔ اب میری داڑھی تھی اور میں نے چہرے پر ذرا سی گاچنی مٹی بھی مل ہوئی تھی، لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ یہ ظاہر ہو جاتی۔

مجھے اُس کے پاس رکنا ہی نہیں چاہتے تھا لیکن میری زندگی میں روشنی کا وہ پہلا مینار تھا۔ میرے لئے علم وفضل کا پہلا دروازہ اسی بزرگ نے کھولا تھا لیکن اس دروازے میں داخل ہو کر میں خوش نہیں ہُوا تھا۔ میں رویا تھا۔ اپنے باپ کو میں اپنا دشمن سمجھتا تھا جو ہر روز مجھے بچوں کے ہجوم میں چھوڑ آتا تھا۔ میں اپنی ماں پر حیران ہوتا تھا کہ وہ میرے باپ کو اس حرکت سے روکتی کیوں نہیں کہ وہ مجھے ہر صبح بچوں سے بھرے ہوتے کمرے میں چھوڑ آتا ہے — یہ پہلی جماعت کا کمرہ تھا۔

میری عمر چھ سال تھی، لیکن ماں سے دُور جا کر میں دُودھ پیتا بچہ بن جایا کرتا تھا۔ آپ بھی پہلی جماعت میں داخل ہوتے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا آپ پہلے دن کتنا روتے تھے۔ آپ کو اپنے والدین پر بہت غصہ آتا ہوگا۔ میری حالت آپ سب سے زیادہ بُری تھی۔ کلاس روم پولیس کی حوالات جیسا لگتا تھا۔

مولوی نذیر احمد پہلی جماعت کا استاد تھا۔ اُس زمانے میں اُستاد پیار نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ تھپڑوں اور لاتوں کی زبان میں بات کیا کرتے تھے، لیکن مولوی نذیر احمد روتے بچے کے لئے مجسم پیار تھا۔ میرے ساتھ تو وہ اتنا پیار کرتا تھا جیسے میں اُسی کا بچہ تھا۔ میں جب بہت روتا تھا تو وہ مجھے گود میں بٹھا لیا کرتا تھا۔ میری امی اُس سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ دوسرے تیسرے دن شام کو ہمارے گھر آتا اور ہنس ہنس کر میری امی اور ابو کو سناتا کہ میں آج کلاس میں کس طرح رویا تھا۔ وہ میری طرح رو کر دکھاتا تو میں بہت ہنسا کرتا تھا۔ سکول میں اُسی نے میرا دل لگایا تھا۔

اس کے بعد بھی جب میں اگلی کلاسوں میں چڑھتا گیا مولوی نذیر احمد کا پیار میرے لئے کم نہ ہُوا ۔ وہ غریب آدمی تھا ۔ پہلی جماعت کے اُستاد کی تنخواہ کتنی کچھ ہو گی لیکن پیار اور وقار کی دولت سے وہ مالا مال تھا ۔

میں جب برسوں بعد اُس کے قریب سے گزرا تو اُسے پہچان کر میں ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا ۔ گھوڑی سے اُتر کر جب اُس کے سامنے بیٹھا تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے نہیں رُکنا چاہیئے تھا ۔ میں اُس کے ہاتھ چُومنے کو بے تاب ہو گیا تھا ۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا اور اُس پر یہ ظاہر کیا کہ میں جوتشی ہوں لیکن وہ مجھے جوتشی مان ہی نہیں رہا تھا ۔



"کیا تم مسلمان ہو؟" ـــ مولوی نذیر احمد نے مجھ سے پوچھا ۔

"جی !" ـــ میں نے کہا ـــ "میں مسلمان ہوں ۔"

"پھر کوئی اور کام کرو" ـــ اُس نے کہا ـــ "نوسر بازی چھوڑ دو ۔ جن کی امیدوں کے سہارے ٹوٹ گئے ہیں انہیں جھوٹے سہارے نہ دو ۔ دل میں بنی نوع انسان کی محبت پیدا کرو ۔ تم تو مجرمانہ زندگی گزار رہے ہو ۔ مجھے بھی تم نے اپنا شکار سمجھ لیا تھا لیکن مجھے خدا نے جو دیا ہے میں اُسی میں خوش ہوں ۔ میں ہمیشہ مطمئن رہا ہوں ۔ مجھے کسی جوتشی اور رمّال کی یہ پیش گوئی اچھی نہیں لگتی کہ میری قسمت میں دولت لکھی ہے ۔ ذرا اللہ سے دل لگا کے دیکھو ۔"

اُس کے بولنے کے انداز میں ایسا اثر تھا کہ میں بھول گیا کہ میں بہروپیا ہوں ۔ وہ کوئی اور ہوتا تو میں شاید اُس کا اثر قبول نہ کرتا ۔ اس بزرگ کا پہلے ہی مجھ پر اثر تھا ۔ میں نے کندھے پر خاصا لمبا چوڑا ایک رومال ڈال رکھا تھا ۔ میں نے اپنے چہرے پر پسینہ محسوس کیا اور اس رومال سے چہرہ پونچھ ڈالا ۔ میں مولوی نذیر احمد میں اتنا جذب ہو گیا کہ مجھے یاد نہ رہا کہ میں نے چہرے اور ہاتھوں پر تھوڑی سی مٹی اس طرح مل ہوئی ہے کہ اُس نے میرے چہرے کا اصل رنگ چھپا رکھا ہے اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ میں نے مٹی سے اپنا رنگ بدلا ہُوا ہے ۔ یہ خاص قسم کی مٹی تھی ۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" ـــ مولوی نذیر احمد نے پوچھا ۔

میں نے اپنا نام کچھ اور بتایا ۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تم مجھے اور میرے گھر کے افراد کو کس طرح جانتے ہو" ـــ اُس نے کہا ـــ "میرے بیٹے مجید کو کس طرح جانتے ہو؟ اب یہ نہ کہنا کہ یہ تمہارے علم کا کمال ہے ۔ جس طرح تم اپنے چہرے کے قدرتی رنگ کو نہیں چھپا سکے اسی طرح تم اپنے باطن کو بھی مجھ سے نہیں چھپا سکو گے ۔ تم خدا کے بندوں کو دھوکہ دے سکتے ہو خدا سے اپنی اصلیت نہیں چھپا سکتے ، تم مجھ سے اپنا آپ نہیں چھپا سکے خدا سے کیا چھپاؤ گے .... میں تمہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں ۔"

"کوشش کریں" ـــ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

"میری یہ آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں" ـــ اُس نے کہا ـــ "لیکن روح کی نظر تیز ہو گئی ہے ۔ نگاہ پاک ہو ، دل میں اللہ اور اللہ کے بندوں کی محبت ہو تو انسان بڑی دُور تک اور بڑی گہرائی تک دیکھ سکتا ہے ۔ تمہارا ماتھا ، تمہاری ناک اور ہونٹ دیکھ کر مجھے ایک آدمی یاد آتا ہے ۔ اللہ مغفرت کرے ۔ فوت ہو گیا ہے .... اور تمہاری آنکھیں دیکھ کر مجھے اُس آدمی کی بیوی یاد آتی ہے ۔ ظاہری طور پر تو وہ بہت خوبصورت تھی لیکن اُس کی روح اور اُس کی سیرت اُس سے زیادہ حسین تھی .... جانے دو ۔ میں تمہیں پہچاننے کی کوشش نہیں کروں گا ۔ کیا کروں گا پہچان کر ! اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ تم گمراہ ہو تو دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہو ۔ تمہیں دیکھ کر دو بڑے اچھے انسان یاد آ گئے ہیں ۔"

آپ نے دیکھا ہو گا کہ ضعیف العمری میں جا کر انسان بولنے لگتا ہے تو بولتا ہی چلا جاتا ہے ۔ آج میری اپنی کیفیت یہی ہے ۔ ذہن بات سے بات نکالتا چلا جاتا ہے اور یاد ہی نہیں رہتا کہ بات شروع کہاں سے ہوتی تھی ۔ بوڑھے آدمی کی بچی کھچی طاقت زبان میں آ جاتی ہے ۔ زبان اُسے

گزرے ہوتے زمانے میں لے جاتی ہے اور بہت دُور لے جاتی ہے۔

یہی کیفیت مولوی نذیر احمد پر طاری ہو گئی تھی۔ اُسے گزرے ہوتے وقت کے کچھ اچھے لوگ یاد آ گئے تھے۔ اُس نے میرے بہروپ کو ایک طرف رکھ دیا تھا اور وہ یادوں کی دنیا میں چلا گیا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں جذبات کی دنیا میں چلا گیا تھا۔ میں کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے میں درختوں کی چھاؤں میں نہیں بلکہ اس معمر بزرگ کے سائے میں بیٹھا ہُوا ہوں اور میری تھکی ماندی کچلی مسلی ہوئی روح کو سکون اور اطمینان مل رہا ہے۔



"اتنے اچھے لوگ دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے اُٹھ گئے" اُس نے کہا۔

"کون لوگ؟" — میں نے پوچھا۔

"وہی میاں بیوی" — اُس نے کہا — "تمہارا ماتھا، آنکھیں اور ہونٹ دیکھ کر مجھے وہ دونوں یاد آ گئے ہیں .... تم سن کر کیا کرو گے! میری عمر اچھے لوگوں میں گزری ہے اور اب اچھی یادوں میں گزر رہی ہے۔ تم مجرمانہ ذہنیت کے آدمی ہو۔ تمہیں ایسی باتیں اچھی نہیں لگیں گی۔"

"نہیں بزرگو!" — میں نے کہا — "میرا پیشہ جیسا کیسا بھی ہے، میں بُرا آدمی نہیں ہوں۔ آپ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ آپ اپنی بات اُدھوری نہ چھوڑیں۔ میں سُن رہا ہوں۔"

"مَیں تمہیں پہچان بھی لوں گا تو کیا ہو گا" — اُس نے کہا۔

"مَیں آپ کا تجربہ دیکھنا چاہتا ہوں" — مَیں نے کہا — "مجھے یہ پتہ چل جاتے گا کہ میرا تجربہ کامیاب ہے یا ناکام!"

"خدا کی باتیں خدا ہی جانے!" — اُس نے کہا — "میں نے لوگوں کے بچوں کو علم کے راستے پر ڈالا۔ ان میں آج کوئی کسی سرکاری دفتر میں بابو ہے، کوئی تھانیدار ہے، کوئی فوج میں عہدیدار ہے اور کوئی علم کے راستے پر ایسا چلا کہ علم و فضل کی منزلیں طے کرتا عالم فاضل بن گیا مگر میرا اپنا بچہ

غنڈہ اور بدمعاش نکلا۔"

"کون؟ .... مجید؟" — میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"ہاں .... مجید" — اُس نے کہا۔

"کہاں ہے وہ؟" — میں نے پوچھا — "کیا کرتا ہے؟"

"یہیں ہوتا ہے" — اُس نے جواب دیا — "اُس کا وقت تکئے پر گزرتا ہے۔ جُوا کھیلتا ہے۔ پولیس کا مُخبر بھی ہے .... گھر آتا ہے۔ گھر میں پیسے دیتا ہے۔ میرے ساتھ، اپنی ماں کے، چھوٹے بھائی کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کرتا بلکہ گھر کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہے لیکن یہی کافی نہیں ہوتا۔ اصل چیز عزت ہے۔ خاندان کا ایک وقار ہوتا ہے۔ اسی سے خاندان جانا پہچانا جاتا ہے لیکن میری بدنصیبی یہ ہے کہ میرا خاندان میرے بیٹے کی مجرمانہ زندگی سے پہچانا جاتا ہے۔ لوگ مجھے مولوی نذیر احمد تو کہتے ہیں، لیکن میرا تعارف یوں بھی کراتے ہیں کہ یہ مجید بدمعاش کا باپ ہے۔ مجید کے دبدبے کی وجہ سے کوئی میرے گھر کی طرف بُری نظر سے دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن میری بدنامی تو ہوتی ہی ہو گی۔ میرے لئے یہی دُکھ بہت ہے کہ میں اپنے بیٹے کو کیا بنانا چاہتا تھا اور وہ کیا بن گیا۔"

وہ کچھ دیر اپنے بیٹے کی گمراہی کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اُسے یاد دلایا کہ اُسے ایک میاں بیوی یاد آتے تھے جن کے چہروں کے نقوش میرے چہرے سے ملتے جُلتے تھے۔ مجھے شک ہو رہا تھا کہ وہ میرے ہی والدین کی بات کرنے لگا تھا۔ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ میری امّی اور ابو کے ساتھ اُس کے تعلقات اتنے گہرے تھے کہ وہ ہمارے گھر آتا رہتا تھا اور میری امّی اُس سے پردہ نہیں کرتی تھی۔



"ہاں .... تم نے یاد دلا دیا ہے" — مولوی نذیر احمد نے کہا — "بات کسی اور کی شروع کی تھی اور اپنا بیٹا سامنے آ گیا۔ اپنے بیٹے کا ذکر بے مقصد نہیں آیا تھا۔ میں تمہیں بتا رہا تھا کہ باپ کیا ہوتا ہے اور بیٹا کس راستے پر چل

نکلتا ہے۔ یہ جو میاں بیوی مجھے یاد آتے ہیں، ان کا ایک بیٹا تھا۔ وہ سُنا ہے قاتل اور ڈاکو بن گیا ہے اور مفرور ہے اور پولیس اُسے ڈھونڈ رہی ہے۔ یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ انگریزوں نے اُس کے سَر کی قیمت دس ہزار روپیہ مقرر کی ہے۔ وہ بڑے شریف ماں باپ کا بیٹا تھا لیکن کسی اور ہی راستے پر چل پڑا۔"

"کیا اُس کا باپ واقعی شریف آدمی تھا؟" — میں نے پوچھا — "کیا آپ اُس باپ کو شریف آدمی کہیں گے جس نے اتنی زیادہ عمر میں ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کرلی تھی؟"

"اُس لڑکے کی ماں کے مرنے کے بعد اُس گھر کی شکل وصورت ہی بدل گئی تھی" — مولوی نذیر احمد نے کہا — "میں اُس وقت کی بات کررہا ہوں جب اُس لڑکے کی ماں زندہ تھی" — اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پوچھا — "تم انہیں کس طرح جانتے ہو؟"

"میں اگر آپ کو جانتا ہوں تو انہیں بھی جانتا ہوں" — میں نے کہا — "اس گھر کی کوئی ایک بھی بات مجھ سے چھُپی ہوئی نہیں .... کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ لڑکا اپنے گھر سے کس طرح نکلا اور وہ ڈاکو کس طرح بنا اور کیا وہ لڑکی شریف تھی جس کے ساتھ اُس کے باپ نے شادی کی تھی؟"

"نہیں!" — اُس نے جواب دیا — "نہ وہ لڑکی شریف تھی نہ لڑکی کی ماں شریف تھی۔ سُنا تھا کہ لڑکے کو اُنہوں نے ہی گھر سے نکالا یا نکلوایا تھا۔ اس گھر کی شرافت کا تو تختہ ہی اُلٹ گیا تھا۔"

اُس نے میرے گھر کی باتیں شروع کردیں۔ اُس کے ساتھ وہ اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کرتا چلا جارہا تھا۔ اُس نے کتنی بار میرا نام لیا اور نام بھی اس طرح لیا جیسے میں کوئی فرشتہ تھا یا آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق تھا۔ اُسے میرے متعلق کئی باتیں صحیح معلوم تھیں اور کچھ باتیں غلط تھیں جو اُس نے افواہوں کے طور پر ادھر اُدھر سے سُنی تھیں۔ ایک طرف وہ مجھے قصوروار سمجھتا تھا کہ میں قاتل اور ڈاکو بن گیا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے دل میں

میری ہمدردی تھی۔ اُس نے یہاں تک کہا کہ سکندر مجھے مل جاتے تو میں اُسے ایسا چھُپا کر رکھوں کہ اُس کی مُشک بھی کسی تک نہ پہنچے۔

"اُس گھر کے سامنے سے جس میں چھوٹا سا یہ خوبصورت اور نیک سیرت کُنبہ آباد تھا، اب بھی گزرتا ہوں تو میرے قدم رُکنے لگتے ہیں" — اُس نے کہا — "ایسے لگتا ہے جیسے وہ بھولا بھالا سا سکندر اپنی ماں کے پاس بیٹھا ہے اور اس گھر میں خوشیاں ناچ رہی ہیں" — اُس کی آواز پر رقت طاری ہو گئی اور وہ خاموش ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے — "وہ اب مجھے کبھی نہیں ملیں گے۔ سکندر بھی نہیں ملے گا۔"

میں پتھر کا بُت تو نہ تھا۔ مولوی نذیر احمد نے پہلے ہی مجھ پر جذباتیت طاری کردی تھی، اب اُس نے ایسی باتیں کیں کہ میں اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ بہت روکا لیکن میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

اُس نے اپنے آنسو پونچھ کر میری طرف دیکھا۔ اپنا رعشہ گیر ہاتھ میری ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور میرا چہرہ اُوپر اُٹھا کر اپنا مُنہ میرے مُنہ کے قریب لے آیا۔

"تم سکندر تو نہیں؟" — اُس نے پوچھا — "تم نے اپنے خلاف کوئی شک رہنے نہیں دیا۔ تم مجھے اور میرے گھر کے ہر فرد کو جانتے ہو اور تم نے سکندر کے گھر کی جو باتیں کی ہیں وہ ٹھیک کی ہیں۔ اب تمہیں دیکھتا ہوں تو تمہارے چہرے کے ہر نقش میں تمہارے ماں باپ کی بڑی صاف جھلک نظر آتی ہے۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ سکندر فقیروں اور سنیاسیوں کا بھروپ دھار کر کبھی کبھی اپنے شہر میں آتا ہے۔ یہ تو میں صاف طور پر دیکھ رہا ہوں کہ تم نے جوتشیوں کا بھیس بدلا ہُوا ہے .... تم تو یہی کہو گے کہ تم سکندر نہیں ہو۔"

میرے دل کا پتھر موم کی طرح پگھل گیا۔ میں نے لپک کر مولوی نذیر احمد کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلے اس ہاتھ کو بے تابی سے چُوما پھر آنکھوں سے لگایا پھر ایسے ہُوا جیسے میرے ہاتھ میں اپنی مری ہوتی

ماں کا ہاتھ ہو یا اپنے ابّو کا مُردہ ہاتھ۔ میں اُس عمر میں پہنچ گیا جب میری امّی کی میت صحن میں پڑی تھی۔ میں اُس عمر کے بچّے کی طرح رو پڑا پھر میری ہچکی بندھ گئی۔ میں نے کچھ دیر بعد محسوس کیا کہ مولوی نذیر احمد آہستہ آہستہ میری پیٹھ پر تھپکیاں دے رہا ہے۔ میں جب سے اس گھر سے پہلی بار نکلا تھا تو اس طرح رویا تھا۔

میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میں تھک گیا ہوں، اتنا زیادہ کہ میں جس اندھیری راہ پر چلا جا رہا تھا اُس پر دو قدم اور نہیں چل سکوں گا۔

شکست خوردگی کا ایسا احساس مجھ میں کبھی پیدا نہیں ہُوا تھا۔ اُس روز یہ احساس اچانک اُٹھا اور مجھے مُنہ کے بل گرا دیا۔

معلوم نہیں کتنا وقت گزر گیا تھا کہ میں کچھ سنبھلا اور مولوی نذیر احمد کے گھٹنے پر رکھے ہُوئے اُس کے ہاتھ سے اپنا مُنہ اُٹھایا۔

"مولوی صاحب!" — میں نے سسکتے ہوئے کہا — "میں سکندر ہوں"۔

اُس نے ایک ہاتھ میری پیٹھ پر رکھا اور میری طرف جُھک کر میرا ماتھا چُوم لیا۔

ایک تو وہ جہاندیدہ اور تجربہ کار آدمی تھا کہ اُسے مجھ پر شُبہ ہو گیا تھا اور دوسرے یہ کہ میں نے خود ہی جذبات میں آکر اپنا آپ ظاہر کر دیا تھا۔

پھر میرے اور اُس کے درمیان بہت باتیں ہوئیں۔ اُس کی باتوں میں پیار ہی پیار تھا اور وہ مجھے پند و نصیحت بھی کرتا تھا۔ میں تو صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہوں اور میری عقل میں بھی کچھ سوچنے کی تاب نہیں رہی۔

"مولوی صاحب!" — میں نے کہا — "میں آپ کے پیار کی قیمت نہیں دے سکتا۔ آپ کی کچھ خدمت کر سکتا ہوں .... مجھے تھانے لے چلیں اور وہاں پر یہ بیان دیں کہ آپ نے مجھے پکڑا ہے۔ آپ کو دس ہزار روپیہ مل جائے گا"۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر کے مجھے جو روپیہ ملے گا اس سے مجھے خوشی ہو گی؟" — اُس نے کہا — "یہ بھی تو سوچو کہ پولیس کس طرح یقین کرے گی کہ اُس ملزم کو مجھ جیسے بوڑھے نے پکڑا ہے جو ریل گاڑی میں سے پولیس کی حراست میں سے نکل گیا تھا۔ تم یہاں سے چلے جاؤ سکندر! ... یہاں سے چلے جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں کوئی اور پہچان لے اور تم پکڑے جاؤ ورنہ یہ گناہ میرے کندھوں پر ہو گا"۔

اُس وقت میری جذباتی اور ذہنی کیفیت ایسی ہو گئی تھی کہ میں سچے دل اور پورے عزم سے یہ چاہتا تھا کہ مولوی نذیر کو دس ہزار روپیہ مل جائے لیکن وہ جو ایک غریب آدمی تھا اور جس کے لئے صرف دس ہزار روپیہ ہی بہت بڑی رقم تھی، میرے پیچھے پڑ گیا کہ میں فوراً وہاں سے غائب ہو جاؤں۔ اُس نے مجھے اُٹھا کر ہی دم لیا۔

میں اس طرح وہاں سے اُٹھا جیسے میرے کندھوں پر کئی من وزن رکھا ہُوا ہو۔ رکاب میں پاؤں رکھ کر میں گھوڑی پر سوار ہونے لگا تو میں نے اپنے وجود میں اس قدر کمزوری محسوس کی کہ اپنا جسم گھوڑی پر پھینکنا دشوار ہو گیا۔

میں سوار ہُوا اور گھوڑی چل پڑی۔ پیچھے دیکھا، میرا بزرگ اتالیق وہیں کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلایا۔ اُس کا ہاتھ آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھا اور اُس کا بازو درخت کی خشک ٹہنی کی طرح ہوا میں ہلنے لگا۔ میں اپنے آپ کو بڑی ہی مشکل سے وہاں سے لایا۔ اس کا ایک طریقہ یہ اختیار کیا کہ گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ اس سے گھوڑی دوڑ پڑی۔ یہ معمولی سی اور بالکل عام سی گھوڑی تھی۔ اتنی تیز تو نہیں دوڑ سکتی تھی پھر بھی یہ جتنا دوڑی اتنا ہی کافی تھا۔ یہ مجھے اپنے شہر اور مولوی نذیر احمد سے بہت دُور لے گئی۔

بہت آگے جا کر میں نے دوڑتی گھوڑی پر پیچھے مُڑ کر دیکھا تو مجھے درختوں اور سبزہ زار اور اس میں گھرے ہوئے ایک گاؤں کے سوا کچھ بھی

نظر نہ آیا۔ میں نے گھوڑی کی باگ کھینچ لی اور گھوڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی طاقت مجھے پیچھے کی طرف کھینچ رہی ہے۔ اس کیفیت سے نکلنے کے لئے میں اپنا دھیان اپنے دوستوں، حمید اللہ، نور اللہ اور سلطان احمد کی طرف لے گیا۔

میں سمجھتا تھا کہ میرے ذہن سے بچپن کے نقوش دُھل گئے ہیں لیکن بچپن کے اُستاد سے ملا تو مجھ پر انکشاف ہُوا کہ نہ صرف یہ کہ میرے ذہن میں بچپن کے نقوش موجود ہیں بلکہ یہ کہ میرا بچپن زندہ ہے۔

کہنے کو اور سنانے کو تو بے شمار باتیں ہیں۔ قلم چل پڑتا ہے تو بے لگام گھوڑے کی طرح رُکتا ہی نہیں میں بھی تو اُنہی بوڑھوں میں سے ہوں جو بولنے لگتے ہیں تو انہیں اپنی زبان پر قابو نہیں رہتا، لیکن یہاں معاملہ جذبات کا تھا۔ کسی کی زبان بند کی جا سکتی ہے اُس کے جذبات پر کوئی قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ جذبات اور احساسات کا اپنا ایک قانون ہے۔

انسان اپنے جذبات کا قیدی ہوتا ہے۔

میں اپنے متعلق ایسا نہیں سمجھتا تھا لیکن مولوی نذیر احمد کی باتیں سُنیں، اُس کی زبان سے اپنی امّی اور ابّو کا نام سُنا تو مجھ پر انکشاف ہُوا کہ میں انگریزوں کے قانون کا مفرور ہوں لیکن اپنے جذبات کی زنجیروں کو میں نہیں توڑ سکا۔

اپنے بیٹے مجید کے متعلق مولوی نذیر احمد نے کہا تھا کہ وہ گھر میں پیسے دیتا ہے، گھر کی ہر ضرورت پوری کرتا ہے، گھر کے ہر فرد کی عزّت کرتا ہے لیکن باپ کو دُکھ یہ تھا کہ بیٹا نیک نام نہیں تھا اور اُس کی وجہ سے باپ کی بدنامی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے مولوی نذیر احمد کو میرے ماں باپ یاد آ گئے تھے کہ اتنے اچھے ماں باپ کا بیٹا قاتل، ڈاکو اور مفرور نکلا۔

مولوی نذیر احمد نے ایسی باتیں کہہ دی تھیں جو تیروں کی طرح میرے دل میں اُتر گئیں اور میں محسوس کرنے لگا کہ میری ذات میں کوئی انقلاب آ رہا ہے یا میری قوتیں سلب ہو رہی ہیں یا میرے عزائم کی بنیادیں ہل

رہی ہیں۔

میں نے کہا ہے کہ کہنے اور سُنانے کو بے شمار باتیں ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو میرے اور مولوی نذیر احمد کے درمیان ہوتی تھیں، لیکن یہ میں آپ کو نہیں سناؤں گا۔ آپ کی دلچسپی کہانی کے ساتھ ہے۔

کہانی کیا ہوتی ہے؟ — چند ایک واقعات کا تسلسل۔ لوگ انہی واقعات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اُن کی بلا سے کوئی مرے کوئی جئے، وہ کہانی سُننا چاہتے ہیں۔ قتل کی واردات ہو جاتی ہے۔ مقتول قبر میں اور قاتل پھانسی کی کوٹھڑی میں پہنچ جاتا ہے تو لوگوں کے لئے دونوں ایک دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی کے کردار بن جاتے ہیں۔ پھر کوئی اور قتل ہو جاتا ہے تو پچھلی کہانی بڑی پُرانی ہو جاتی ہے۔

میں اپنی جو آپ بیتی سنا رہا ہوں یہ واقعات ہیں۔ انہی کو آپ کہانی کہتے ہیں۔ اگر آپ اصل کہانی سُننا چاہتے ہیں تو میرے سینے میں جھانک کر دیکھیں۔ میرے جذبات پڑھنے کی کوشش کریں۔ ظاہری حالات کو تو میں کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا جو آدمی موت کو قبول کر لیتا ہے، حالات اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ انگریز کے قانون کو قبول نہیں کروں گا اور انگریز کی عدالت سے سزائے موت نہیں لوں گا۔ اصل کہانی میرے جذبات کی ہے۔ اس کے ساتھ آپ کو یقیناً دلچسپی نہیں ہو گی۔ میں اتنا ہی کہوں گا کہ میں جذبات کے سمندر میں ڈوب ڈوب کر اُبھرا اور اُبھر اُبھر کر ڈوبا ہوں۔ مثلاً مولوی نذیر احمد نے میرے جذبات کے سمندر میں ایسا تلاطم بپا کر دیا تھا کہ میرا ڈوبنا اور ڈوب کر کبھی نہ اُبھر سکنا تقریباً یقینی ہو گیا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے میری گھوڑی پر بھی میری اداسی اور جذباتی کیفیت کا اثر ہو گیا تھا۔ اُس کی چال مری مری تھی۔ میں نے اُسے بڑی زور سے ایڑ لگائی اور باگ کو اتنی زور سے جھٹکا دیا جیسے مجھے اس کیفیت میں مبتلا کرنے کی ذمّہ دار یہی گھوڑی تھی۔ اگر یہ گھوڑی منّور اور تحمّل کی ہوتی تو ہَوا سے باتیں کرنے لگتی۔ یہ معمولی سی گھوڑی تھی۔ دوڑ تو پڑی، لیکن رفتار اتنی نہیں تھی

جتنی میں چاہتا تھا۔ میں بہت جلدی اُس علاقے سے نکل جانے کی کوشش میں تھا جہاں تک میرے شہر کی بُو محسوس ہوتی تھی۔

مجھ پر ایسی کیفیت طاری تھی جیسے میں اپنے آپ سے بھاگنے کی کوشش میں ہوں۔ گھوڑی تھک کر خود ہی آہستہ ہوگئی تھی۔ میں نے اس گھوڑی پر مزید زیادتی نہ کی اور اسے اپنی چال چلنے دیا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا تو مجھے اندازہ ہُوا کہ میں نے بہت فاصلہ طے کر لیا ہے۔ وہ گاؤں جسے حمید اللہ خان اور نور اللہ نے اپنا اڈہ بنا رکھا تھا بمشکل تین میل رہ گیا تھا۔

جس طرح مولوی نذیر احمد مجھے دُور دو تین درختوں کے جھُنڈ کے نیچے بیٹھا نظر آیا تھا اسی طرح مجھے ایک آدمی پگڈنڈی کے کنارے ایک درخت کے نیچے کھڑا نظر آیا۔ دو آدمی اُس سے ہٹ کر ایک اور درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ سلطان احمد تھا۔ جو دو آدمی اُس سے ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے وہ اُسی کے آدمی ہو سکتے تھے۔ سلطان دیہاتی لباس میں تھا۔ اُس کی شیو بڑھی ہوئی تھی، کپڑے میلے کچیلے تھے۔ یہ ایسا حُلیہ تھا کہ اُس کے قریب سے گزرنے والے اُس کی طرف دیکھتے ہی نہیں تھے۔

میں اُس کے قریب پہنچ گیا اور گھوڑی سے اُترا۔

"آؤ جوتشی جی!" ـــ سلطان نے قدرے اُونچی آواز میں کہا ـــ "آؤ بیٹھو۔ کہاں جا رہے ہو؟"

میں اس طرح زمین پر بیٹھ گیا جیسے بہت تھکا ہُوا ہوں۔ وہ دو آدمی جو ذرا پرے بیٹھے ہوتے تھے، میرے قریب آ گئے۔ میں نے سلطان اور اُس کے ساتھیوں کی طرف توجہ نہ دی۔ میرا انداز بے نیازی اور بے پرواہی کا سا تھا۔

"سگریٹ بیڑی پیو گے جوتشی جی!" ـــ سلطان نے کہا۔

"نہ بابا!" ـــ میں نے بے رُخی سے کہا ـــ "اپنے کو ایسا کوئی بُرا چسکا

نہیں۔ پھر کسی کے ہاتھ سے کچھ کھانا پینا ہمارے لیے حرام ہے۔"

"جوتشی جی!" ـــ سلطان نے درخواست کے سے لہجے میں کہا ـــ "کوئی اور خدمت بتائیں۔"

"پر تُو میری خدمت کرنے پر کیوں تُلا ہُوا ہے؟" ـــ میں نے کہا۔

"میں چکر میں آیا ہُوا ہوں" ـــ سلطان نے اپنا دایاں ہاتھ میرے آگے کر کے کہا ـــ "ہاتھ دیکھ کر کچھ بتا دیں۔"

میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک ڈالا۔ اُس نے ہاتھ پھر آگے کر دیا۔ میں نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اُس کے دونوں ساتھیوں نے باری باری منت کی کہ میں اس کا ہاتھ دیکھوں۔ میں نے بڑے غصے سے سلطان کا ہاتھ پکڑ کر اُس کی ہتھیلی پھیلائی اور دو چار سیکنڈ دیکھ کر اُس کا ہاتھ پھر جھٹک ڈالا۔

"مت پوچھو" ـــ میں نے سلطان سے کہا ـــ "پچھتاؤ گے۔ لکیریں اُلجھ گئی ہیں۔"

"بتا دو جوتشی جی!" ـــ سلطان نے کہا ـــ "قسمت جیسی بھی ہے بتا دو۔ جتنے پیسے آپ مانگیں گے، دوں گا۔"

"تُو جس کے پیچھے پھر رہا ہے وہ تیرے ہاتھ نہیں آئے گا" ـــ میں نے کہا۔

"میں کس کے پیچھے پھر رہا ہوں جوتشی جی!" ـــ اُس نے پوچھا۔

"میں نے ابھی تیرا ہاتھ غور سے نہیں دیکھا" ـــ میں نے کہا ـــ "تُو کسی عورت کے پیچھے پھر رہا ہوگا یا دولت کے لالچ میں تیرے پاؤں میں چکر آ گیا ہے، پر یہ کوئی بات نہیں۔ جھلک جو تیرے ہاتھ کی دیکھی یہ تیرا ایک ذاتی معاملہ ہے۔ کیا تُو پسند کرے گا کہ ان دو آدمیوں کے سامنے میں تیرا بھید کھول دوں؟"

"ہم اُٹھ جاتے ہیں جوتشی جی!" ـــ سلطان کے ایک ساتھی نے کہا اور اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ کر بولا ـــ "چل بھائی! ہم دُور ہٹ جاتے ہیں۔"

وہ دونوں اُٹھ کر وہیں جا بیٹھے جہاں سے اُٹھ کر آئے تھے۔



میں نے سلطان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آگے کو جھک گیا۔

"یہ دونوں کون ہیں؟" — میں نے سرگوشی میں سلطان سے پوچھا۔

"سپیشل برانچ کے کانسٹیبل ہیں" — اُس نے جواب دیا — "میرے ساتھ آئے ہیں۔ یہ تمہیں نہیں پہچانتے۔"

"یہاں کھڑے کیا کر رہے تھے؟" — میں نے پوچھا۔

"تمہاری پریشانی یہاں لے آئی ہے" — سلطان نے جواب دیا — "یہ تو مجھے اندازہ تھا کہ تم اتنی جلدی واپس نہیں آسکو گے، لیکن یہ خیال آتا تھا کہ تم اپنے شہر گئے ہو اور تم نے ایوب کی بہن سے بھی ملنا ہے تو میں ایسا پریشان ہوا کہ ان دونوں کو ساتھ لے کر ادھر آگیا۔ انہیں یہ بتا کر لایا ہوں کہ ملاتے ہیں ذرا گھومنا پھرنا ہے اور آتے جاتے لوگوں کو دیکھنا ہے .... تم فوراً مجھے بتاؤ کہ کیا کیا کر آئے ہو۔ کوئی خطرہ تو نہیں؟"

"نہیں" — میں نے کہا — "مست رہو۔"

میں اتنی دبی ہوئی آواز میں بول رہا تھا کہ اُس کے ساتھیوں تک آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں باتیں کچھ اور کر رہا تھا، لیکن میرے ہاتھوں اور سر کی حرکتیں ایسی تھیں جیسے جوتشی قسمت کا حال بتا رہا ہو۔ میں نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔ اس میں سے سلیٹ اور پوتھی نکالی، لیکن میں نے جو چیز نکالنی تھی وہ رُقعہ تھا جو سلطان نے اپنی بیوی کے نام لکھ کر دیا تھا اور وہ میں نے سائرہ کو دے دیا تھا۔ میں نے وہ رُقعہ جو تہہ کیا ہوا تھا، سلطان کے آگے پھینک دیا اور ویسے ہی اُس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی اُنگلی سلیٹ پر رکھ دی۔ سلطان نے رُقعہ مروڑ کر اپنے ہاتھ میں دبا لیا۔ میں نے اُس کے چہرے پر اطمینان کا تاثر دیکھا۔

میں نے اُسے سنایا کہ سائرہ سے میں کس طرح ملا تھا اور اُس

کے ساتھ کیا باتیں ہوئیں۔

"سلطان!" — میں نے کہا — "میں تو بیکار ہوتا جا رہا ہوں۔ جی میں آتی ہے کہ سائرہ کو ساتھ لے کر کہیں دُور جنگلوں میں نکل جاؤں۔"

میں نے اُسے سائرہ کی جذباتی حالت بتائی۔

"جذبات سے نکلو سکندر!" — سلطان نے کہا — "مجھے ڈر ہے کہ تم جذبات کے جال میں آکر پھانسی کے تختے تک پہنچ جاؤ گے .... اگر ہمت ہے تو کہیں بہت ہی دُور نکل جاؤ۔ بنگال ہے۔ صوبہ سرحد ہے۔ برما بھی جا سکتے ہو لیکن وہ بھی انگریزوں کی بادشاہی میں ہے ....زیادہ باتوں کا وقت نہیں۔ پہلے تم اُٹھو اور گھوڑی پر سوار ہو کر چل پڑو۔"

"ان کانسٹیبلوں کو کیا بتاؤ گے؟"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں" — سلطان نے کہا — "انہیں سنانے کے لیے میں بات بنا لوں گا .... آج رات وہاں سے نکل جاؤ اور دیبے کے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ۔"

"سلطان بھائی!" — میں نے کہا — "تم مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہو کہ تم پر حرف نہیں آئے گا؟ مجھے تمہارا فکر ہے۔"

"میں پہلے بتا چکا ہوں" — اُس نے کہا — "میں کل اُس گاؤں میں جاؤں گا۔ تم تینوں وہاں نہیں ہو گے میں نمبردار اور دیگر لوگوں سے پوچھوں گا کہ سائیں کراماں والا کہاں چلا گیا ہے۔ ظاہر ہے ان میں سے کسی کو معلوم نہیں ہو گا۔ میں رپورٹ دوں گا کہ یہ سائیں نوسرباز تھا اور اُس کے ساتھ جو معتمدِ خاص تھا وہ نوابزادہ حمید اللہ خان ہی تھا اور وہ گاؤں والوں کو بتائے بغیر رُوپوش ہو گئے ہیں۔"

میں بھی سپیشل برانچ میں سب انسپکٹر رہ چکا تھا۔ میں نے بڑی جلدی جلدی اُسے ایک دو مشورے دیئے۔ اس دوران میری حرکتیں جوتشیوں والی تھیں .... میں نے سلیٹ اور پوتھی وغیرہ تھیلے میں ڈالی اور اُٹھ کر گھوڑی کی طرف چل پڑا۔

"جوتشی جی!" —— سلطان احمد جیب سے کچھ پیسے نکال کر کہنے لگا —— "یہ لیں۔ کچھ تو قبول کر لیں"۔

"نہیں!" —— میں نے گھوڑی پر سوار ہو کر کہا —— "کچھ نہیں لیں گے۔ ہم نے جو بتایا ہے، وہ کرنا۔ دن پھریں گے پر وقت لگے گا۔ تو بھی کیا یاد کرے گا"۔

میں نے گھوڑی کو اپنے راستے پر ڈال دیا۔

میں جب "سائیں کراماں والے" کے گاؤں میں داخل ہوا تو سورج غروب ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کے مکان میں داخل ہوا تو ایک آدمی نے مجھے کہا کہ سائیں جی اپنے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اسی آدمی نے باہر جا کر گھوڑی کی زین اتاری اور اسے جہاں باندھنا تھا وہاں لے گیا۔

حمید اللہ اور نور اللہ بے صبری سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں بھوک سے مرا جا رہا تھا۔ سارا دن کچھ نہیں کھایا تھا۔ ان دونوں سے کہا کہ کھانا منگوائیں۔ میں نے انہیں اپنی کارگزاری سنائی تو ان کی جان میں جان آئی۔ یہ بھی بتایا کہ سلطان احمد سے ملاقات ہو گئی ہے اور اس کا رقعہ اسے دے دیا ہے۔

"کیا اس حسینہ کو دماغ سے نکال آئے ہو؟" —— حمید اللہ خان نے کہا —— "کیا نام ہے اس کا؟ ..."

"سائرہ!" —— میں نے کہا —— "نہیں بھائی! وہ میرے دماغ سے نہیں نکلے گی"۔

"پھر اللہ کرے گا جلدی پھانسی پاؤ گے" —— نور اللہ نے کہا۔

میں ہنس پڑا اور بات ہنسی میں ٹالی، لیکن میرا دل رو رہا تھا۔ میں نے تسلیم کر لیا تھا کہ میں سائرہ کو دل سے نہیں اتار سکوں گا۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سائرہ جب میرے ساتھ اکیلی رہتی تھی تو راتوں کی تنہائی مجھے بہت آزمائش میں ڈال دیا کرتی تھی، اور ایسے بھی ہوا کہ وہ سوتی ہوتی تھی۔ دریچے سے شفاف چاندنی اس کے چہرے اور سینے پر پڑ رہی تھی۔ میں

جاگ رہا تھا۔ اسے دیکھا تو میں اس طرح اٹھ کر سوتی ہوتی سائرہ کے پلنگ پر جا بیٹھا جیسے لوہے کا چھوٹا سا ٹکڑا طاقتور مقناطیس سے کھچا ہوا اس کے ساتھ جا چپکتا ہے۔

میں آپ کو یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سائرہ کی آنکھیں میری ماں کی آنکھوں سے اتنی زیادہ ملتی تھیں کہ میں اس کی آنکھیں دیکھتا تو یہی کہتا کہ یہ جس عورت کی بھی آنکھیں ہیں وہ میری ماں ہے۔ سائرہ کی مسکراہٹ تو سو فیصد میری ماں کی مسکراہٹ تھی اور اس کے چہرے کا تاثر ایسا تھا کہ چاندنی میں اس کا چہرہ مجھے اپنی ماں کا چہرہ لگا۔ اس سے یہ ہوا کہ میں شیطان کے قبضے سے آزاد ہو گیا اور سائرہ کی محبت جو میرے دل میں پیدا ہوتی تھی، اس میں تقدس شامل ہو گیا۔ میں سنا چکا ہوں کہ سائرہ سے میں نے کہا تھا کہ میں تم سے دور نہیں رہ سکوں گا لیکن میں تمہیں بیوی نہیں بنا سکوں گا۔

میں ہی بہتر جانتا ہوں کہ سائرہ کے گھر سے میں نکلا کس مشکل سے تھا۔ یوں کہہ لیں کہ اپنے آپ کو گھسیٹ اور دھکیل کر وہاں سے نکالا تھا۔

"اچھی طرح سن لو سکندر!" —— حمید اللہ خان نے کہا —— "آج رات ہم زندگی کی ایک اور سرنگ میں داخل ہو رہے ہیں۔ نہ جانے یہ سرنگ کہاں جا ختم ہو گی اور آگے کیا ہو گا۔ ہم دریا کے پاس جا رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ وفا کرے گا؛ وہ میرا احسان تو مانتا ہے لیکن اس کے گروہ میں اور آدمی بھی ہیں۔ معلوم نہیں کون کیسا ہے"۔

"یہ مجھے کیوں بتا رہے ہو!" —— میں نے کہا —— "میں جانتا ہوں ہم وہاں جا رہے ہیں"۔

"یہ اس لئے بتا رہے ہیں کہ تم واپس اپنے آپ میں آجاؤ" —— نور اللہ نے کہا —— "خدا نے تمہیں جو جرات، عقل اور طاقت دی ہے اسے سنبھال کر رکھو۔ اس پر عشق کا نشہ طاری نہ کرو۔ عورت کو پاؤں کی زنجیر نہ بناؤ۔ جو عورت تمہارے دل کو اچھی لگے اسے دل میں نہ اترنے دو۔ اسے گوشت اور ہڈیوں کا مجسمہ سمجھو۔ دل بہلاؤ اور اسے بھول جاؤ"۔

"مرد ہو یار!" — حمید اللہ نے کہا — "مرد ہی رہو۔ تمہارے عشق نے ہمیں اور سلطان کو تو مروا دیا تھا۔ اس تجربے سے سبق حاصل کرو۔"

"اگر پھانسی کے تختے پر کھڑا ہونے کا شوق ہے تو ساترہ کے گھر چلے جاؤ" — نور اللہ نے کہا — "لیکن ہمیں نہ پکڑوا دینا۔"

"یہ تم نے کیا بیکار بکواس شروع کر دی ہے" — میں نے انہیں ٹالنے کے لئے کہا — "کیا تم مجھے بچہ یا اناڑی سمجھتے ہو؟ چلنے کی تیاری کرو .... اگر دیبا کے کسی آدمی نے ہمارے ساتھ گڑبڑ کی تو دیبا اس شخص کو پھر کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔"

میں نے یہ بات کہہ تو دی لیکن میری جذباتی کیفیت اتنی بگڑی ہوئی تھی جسے میرے ان دوستوں نے محسوس کر لیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ہم جو زندگی گزار رہے تھے اس میں جذبات اُس زہر کی مانند تھے جو جسم میں داخل ہو کر جسم کو کھا جاتا ہے۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش شروع کر دی۔

رات کو ہمیں یہاں سے نکل جانا تھا۔

"سائیں کراماں والے" نے اعلان کر دیا تھا کہ آج رات وہ دربارِ عام منعقد نہیں کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے لوگوں تک اپنے خاص مریدوں کی معرفت یہ بات بھی پہنچائی تھی کہ آج رات کسی گھر کا کوئی فرد گھر سے باہر نہ نکلے نہ چھت پر چڑھے کیونکہ جنات کا ایک ٹولہ رات کسی بھی وقت گاؤں کے اوپر سے گزرے گا۔ لوگوں کو بتایا گیا کہ سائیں جی کے جو جن مرید ہیں انہوں نے سائیں جی کو یہ خبر دی ہے۔

اگر کوئی صاحب یہ سوچیں کہ میں کہانی بنانے کے لئے یہ بات کہہ رہا ہوں اور یہ بات حقیقی نہیں ہو سکتی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ صاحب اپنے معاشرے خصوصاً دیہاتی معاشرے کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ وہ تو جہالت کا زمانہ تھا دیہات میں تعلیم نہیں تھی۔ تعلیم کی بجائے توہم پرستی تھی۔ آج دیہاتی علاقوں میں بھی سکول اور کالج کھل گئے ہیں لیکن توہم پرستی، پیر پرستی

اور مزار پرستی اتنی ہی ہے جتنی جہالت کے زمانے میں تھی۔ آج بھی ہسٹیریا، مرگی، جسمانی تشنج کو جنات کا قبضہ، آسیب، پکڑ اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ وہ میڈیکل سائنس کو لات مار کر اپنے پیر کی بات مانتے ہیں۔

میں نے حمید اللہ خان اور نور اللہ کی دانشمندی کی داد دی کہ اُنہوں نے شام کے بعد لوگوں کو گھروں میں قید رکھنے کا کتنا اچھا اور مؤثر طریقہ سوچا تھا۔ اب ہم کسی کو پتہ چلے بغیر گاؤں سے نکل سکتے تھے۔

اُس وقت اُس مکان میں صرف دو آدمی تھے جو "سائیں کراماں والے" کی خدمت کے لئے موجود تھے۔ اُس نے دونوں کو بلایا۔

"اوئے گھوڑیاں تیار ہیں؟" — نور اللہ نے اُن سے پوچھا۔

"تیار ہیں سرکار!" — ایک نے جواب دیا۔

"تم دونوں اپنے گھروں کو چلے جاؤ" — نور اللہ نے کہا — "جنوں کے گزرنے کا وقت ہو گیا ہے۔ ہم تینوں گاؤں کے باہر جا کر پہرہ دیں گے" — نور اللہ نے حمید اللہ اور مجھ سے سائیں کراماں والے کے انداز سے کہا — "تم دونوں ڈر نہ جانا۔ مجھے ساتھ دیکھ کر جنات تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ میں ان جنات کو یہاں نہیں اُترنے دوں گا۔"

"آپ ساتھ ہوں گے تو کیا ڈر ہے" — حمید اللہ نے کہا۔

دونوں آدمیوں کے چہروں پر خوف تھا۔ وہ کمرے سے نکل گئے۔

میرے پاس اپنے جسم اور کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ میری متاع ایک ریوالور تھا اور اس کی چند ایک گولیاں۔ حمید اللہ خان اور نور اللہ کے پاس بہت کچھ تھا۔ انہوں نے مریدوں سے جو دولت کمائی تھی وہ اُنہوں نے چھپا کر رکھی ہوئی تھی۔ ان میں زیورات بھی تھے۔ ان کے اپنے کپڑے تھے۔ میرے پاس جوتشیوں کے بہروپ کا سامان تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا وہ ہم نے دو گٹھڑیوں میں باندھا۔ ٹرنک یا سوٹ کیس نہیں اٹھائے جا سکتے تھے کیونکہ ہم گھوڑیوں پر جا رہے تھے۔

ہم جب اس مکان سے نکلے تو نور اللہ نے آہ بھر کر کہا — "پیری

کی شان بھی گئی۔"

اِن دونوں نے بادشاہوں جیسی عیش و عشرت کی تھی۔ لوگوں کے دلوں اور روحوں پر حکومت کی تھی، ایک سے ایک بڑھ کر حسین مریدنی تھی، "معرفت" کی شراب بھی تھی۔ اُس رات شاہانہ شان و شوکت بھی ختم ہوگئی عیش و عشرت بھی۔

"مت افسوس کر نورا" ــــ حمید اللہ خان نے کہا ــــ "جہاں جائیں گے عیش کریں گے۔"

باہر تین گھوڑیاں ایک درخت سے بندھی کھڑی تھیں ہم نے گٹھڑیاں ان کی زینوں کے ساتھ باندھیں اور گھوڑیوں پر سوار ہو گئے۔ گاؤں کی یہ کیفیت تھی جیسے ہم تینوں کے سوا وہاں کوئی چوتھا انسان نہیں تھا۔ دیہات کے لوگ تو شام کا کھانا کھاتے ہی سو جایا کرتے تھے لیکن کوئی تو کہیں آتا یا کسی گلی میں سے گزرتا نظر آجاتا تھا۔ اُس رات تو کُتے بھی کہیں غائب ہو گئے تھے۔

گھوڑیاں چل پڑیں۔

"تمہیں شاہ سلیمان کی قسم ہے، اس گاؤں پر رحم کرنا" ــــ اچانک نور اللہ نے بلند آواز سے کہا جیسے اعلان کر رہا ہو ــــ "ان لوگوں نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ اُوپر سے گزر جانا۔"

یہ کہہ کر نور اللہ نے مُنہ اُوپر کر کے ایسی لمبی آواز نکالی جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہ ہوائی حملے کے سائرن جیسی بھی تھی، اور اس میں کسی کُتے کے رونے کی آواز بھی شامل تھی اور اس میں کچھ تاثر چیخوں کا بھی تھا۔ آواز میں اُتار چڑھاؤ بھی تھا اور اس لمبی ہُوک میں خوف کا تاثر نمایاں تھا۔

"ہوشیار.... گاؤں والو ہوشیار!" ــــ نور اللہ نے اعلان کیا ــــ "اللہ کو یاد کرو۔ کلمہ شریف پڑھو۔ درود شریف پڑھو .... ہندو بھائی بہنیں ہری کرشن کے بھجن گاؤ .... خطرہ گزر رہا ہے۔"

گھوڑیاں چلی جا رہی تھیں اور نور اللہ اپنا فراڈ چلاتا جا رہا تھا۔ گاؤں قبرستان بنا ہُوا تھا ــــ اور ہم گاؤں سے نکل گئے۔



گاؤں سے دُور جا کر میرے دوستوں نے مجھے بتایا کہ دونوں سارا دن سوچتے رہے تھے کہ گاؤں سے کس طرح نکلا جائے کہ گاؤں کے کسی آدمی کو پتہ نہ چلے اور کوئی یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ ہم کس طرف گئے ہیں۔ یہ ترکیب نور اللہ کے دماغ میں آئی تھی۔ اور یہ پوری کامیاب رہی۔

اُس زمانے میں لوگ عوام نہیں رعایا کہلاتے تھے۔ یہ لوگ تاجِ برطانیہ کی رعایا تھے۔ رعایا کو گنوار اور ان پڑھ اسی لئے رکھا جاتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکیں اور بادشاہ سلامت من مانی کرتے رہیں۔ تعلیم بھی آئی، زمانہ بھی بدل گیا، قدیم سے جدید ہو گیا۔ لوگ رعایا کی بجائے عوام بن گئے، لیکن ان کی قسمت نہیں بدلی اور آج بھی بادشاہ اسی فریب کارانہ کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ عوام کچھ بھی نہ سمجھ سکیں۔

ملک کے حکمران اور ہیں، لیکن اصل بادشاہی پیر، ڈاکو اور مجھ جیسے عامل اور جوتشی کرتے ہیں۔ فریب دہی کا ایک گورکھ دھندہ ہے جس میں عوام اُلجھے ہوتے ہیں۔ کبھی وہ سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ سمجھ گئے ہیں، لیکن یہ لاعلمی کی انتہا ہے کہ نہ سمجھتے ہوتے بھی سمجھیں کہ وہ سب کچھ سمجھ گئے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کا تیار کیا ہُوا گورکھ دھندہ ہے جو مجھ سے، نوابزادہ حمید اللہ، نور اللہ اور دیبا سے بہتر لوگ ہیں۔ عوام کو اندھیرے میں رکھنے کی مجرمانہ حرکت کو سیاست کہہ لیں، جمہوریت کہیں یا اندھی عقیدت کہہ لیں، اصل مقصد یہ ہے کہ عوام کو لاعلمی کی تاریکی میں رکھا جائے، لیکن چرب زبانی ایسی ہو کہ اس تاریکی کو وہ اُجالا سمجھیں۔

اس ایک گاؤں کو بیوقوف بنا کر نور اللہ نے کوئی کمال نہیں دکھایا تھا۔ وہ تو پورے کا پورا معاشرہ ہم جیسوں کے ہاتھوں بیوقوف بنا ہُوا تھا۔ لوگ گھروں میں دبکے رہے کہ جنات اُن کے اُوپر سے گزر جائیں گے۔ ان بیچاروں کو معلوم نہیں تھا کہ اصل جنات تین ہیں جو اُن کے گاؤں سے دُور گزر گئے ہیں۔

ہماری منزل کم و بیش تیس میل دُور تھی۔ ہم دیبا کے پاس جا رہے

تھے۔ اس سے پہلے میں سُنا چکا ہوں کہ دیبا کیا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ ڈاکوؤں اور رہزنوں کا اُستاد اور پیر تھا، لیکن شریفوں کے معاشرے میں وہ ایک باعزت اور نیک نام آدمی تھا۔ حمید اللہ خان اور نور اللہ نے اُسے پہلے ہی پیغام بھجوا دیا تھا کہ اُن کے لئے ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ اُنہیں اُس کے پاس آنا پڑے گا۔ دیبا نے انہیں کہا تھا کہ جب ضرورت پڑے وہ آجائیں۔
ہم گپ شپ لگاتے، کچھ سنجیدہ، کچھ غیر سنجیدہ باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔

صبح طلوع ہونے سے بہت پہلے ہمیں وہاں تک پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ تینوں گھوڑیاں اچھی تھیں۔ کچھ دُور تک انہیں دوڑا بھی لیتے تھے۔ اس طرح ہم صبح کاذب کے وقت اُس علاقے میں داخل ہو گئے جس میں دیبا کا ٹھکانہ تھا۔

جب ہم اُس علاقے میں پہنچے تو یہ جانتے ہوتے کہ حمید اللہ خان اور نور اللہ اس جگہ سے واقف ہیں، میں نے انہیں کہا کہ ایسی جگہ کون رہتا ہو گا جہاں سے گزرنا ہی محال ہے۔ یہ تھوڑا سا علاقہ پہاڑی سا تھا۔ اس میں اونچی نیچی چٹانیں تھیں ..... یہ چٹانیں زیادہ تر پتھریلی نہیں تھیں۔ وہاں اُوپر نیچے درختوں کی بہتات تھی۔ سبزہ بھی زیادہ تھا۔ وسیع کھڈ اور برساتی نالے بھی تھے۔ میں نے کئی جگہوں پر رُکا ہُوا پانی دیکھا۔ چاند پچھلے پہر کا تھا اس لئے روشنی کافی تھی ورنہ رات کے وقت وہاں سے گزرنا ممکن نہیں تھا۔ چلتے چلتے نور اللہ نے اپنی گھوڑی ہم سے آگے کر لی۔

"اب ذرا سنبھل کر سکندر!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "حمید اللہ تو اس جگہ سے واقف ہے۔ تم ذرا ہوش میں رہنا۔ اگر گر پڑے تو بہت دُور نیچے تک چلے جاؤ گے یا دلدل میں جا پڑو گے جہاں سے تمہیں نکالا بھی نہیں جا سکے گا۔"

میں پہلے تو نہ سمجھ سکا کہ اتنا زیادہ ڈرنے کی کیا ضرورت ہے، لیکن کچھ آگے گئے تو مجھے محسوس ہُوا کہ نور اللہ نے اچھا کیا تھا کہ مجھے خبردار کر دیا تھا۔ ہم ایک ایسے راستے پر جا رہے تھے جو کوئی راستہ نہیں تھا بلکہ قدرت نے ایک دیوار سی کھڑی کر دی تھی جس پر ہم جا رہے تھے۔ پیچھے تو کشادہ راستہ تھا، لیکن آگے یہ اتنا تنگ ہو گیا اور اُوپر کو جانے لگا کہ اس کی شکل

دیوار جیسی ہو گئی جس پر سنبھل کر چلنا بھی مشکل نظر آتا تھا۔ بائیں طرف دیکھا کم وبیش تیس فٹ نیچے چاندنی میں پانی چمک رہا تھا اور دائیں طرف نیچے چھوٹے چھوٹے درخت تھے۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ اس طرف جو گہرائی ہے اُس کی تہہ کتنی دُور ہے اور تہہ میں کیا ہے۔ ہر قدم پر محسوس ہوتا تھا کہ گھوڑی کا پاؤں پھسل جائے گا اور یہ دائیں یا بائیں گر پڑے گی۔

یہ راستہ بلند اور تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ آگے جا کر یہ راستہ دائیں طرف کو گھوم گیا۔ اس کے دونوں طرف نیچے سے جو درخت اُوپر کو آتے ہوتے تھے، اُن کے ٹہن اور ڈالیاں اُوپر آ کر راستہ روک رہی تھیں۔ وہاں سے گھوڑی پر سوار رہ کر گزرنا بڑا ہی خطرناک تھا۔ نور اللہ نے کہا کہ یہاں اُترنا پڑے گا۔ ہم اُترے۔ کہیں سے ہمیں راستے میں آتے ہوتے ڈال کے اُوپر سے گزرنا پڑا کہیں ڈالیوں کو اُوپر اُٹھا کر خود بھی گزرے اور گھوڑیوں کو بھی گزارا۔ ایک گھوڑی ڈالیوں سے بدکتی تھی۔ یہ خطرہ صاف نظر آنے لگا تھا کہ یہ گھوڑی پھسل کر نیچے جا پڑے گی۔ بڑی مشکل سے راستہ بناتے ہم درختوں کی رکاوٹوں میں سے گزر گئے۔ آگے جا کر یہ راستہ کشادہ ہوتے ہوتے بہت ہی پھیل گیا۔ آگے کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم ایک چٹان پر تھے جہاں سے نیچے اُترنے لگے نیچے سبزہ یعنی اونچی گھاس زیادہ تھی۔ یہ ایک میدان سا تھا جو کھُلتا جا رہا تھا۔ تھوڑا اور آگے گئے تو ہم چھوٹے سے ایک گاؤں میں داخل ہو چکے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ باقاعدہ یعنی سرکاری طور پر کوئی گاؤں نہیں۔ پندرہ سولہ مکان تھے۔ ان میں سے ایک میں دیبا رہتا تھا۔

ہم جب وہاں پہنچے تو معلوم ہُوا کہ دیبا گہری نیند سویا ہُوا ہے۔ اُس کے ایک آدمی نے ہماری گھوڑیاں کہیں لے جا کر باندھ دیں اور ہمیں کہا کہ ہم بھی سو جائیں۔ ہم تھکے ہوتے تھے۔ چارپائیوں پر لیٹے اور سو گئے۔



تقریباً تین گھنٹے بعد ہم دیبا کے پاس بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ تندرست و توانا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اُس کے قد کاٹھ اور چہرے کے رنگ اور نقوش میں

کشش تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اُس کا نام دبیر احمد تھا اور دیبا کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ہنس مکھ اور ملنسار طبیعت کا آدمی تھا۔ حمید اللہ نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ ہماری نشان دہی کس طرح ہوئی ہے۔ ہم نے سلطان احمد کا ذکر خاص طور پر کیا اور اُسے بتایا کہ اُس نے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔

"پولیس کا کوئی افسر اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتا"۔۔۔ دیبا نے کہا ۔۔۔ "تم جیسے مفرور مجرموں کو پکڑوا کر دوسرے انعاموں کے علاوہ وہ انسپکٹری کی ترقی پا سکتا تھا، لیکن اُس نے اپنی نوکری کو بھی خطرے میں ڈال دیا.... اب بتاؤ کیا ارادے لے کر آئے ہو؟"

"ایک ارادہ تو یہ ہے کہ اب تمہارے ساتھ ہی رہیں گے"۔۔۔ نوراللہ نے کہا ۔۔۔ "باقی ارادے تمہارے ہیں۔ تم ہی بتاؤ کیا کریں"۔

"میں نے تمہیں کسی مسجد کا امام تو نہیں بنانا"۔۔۔ دیبا نے کہا ۔۔۔ "تم نے بھی وہی کرنا ہے جو میرے دوسرے آدمی کر رہے ہیں .... کیوں نوابزادے!"۔۔۔ دیبا نے حمید اللہ سے پوچھا ۔۔۔ "وارداتیں کرو گے؟"

"نہیں دیبے بھائی!"۔۔۔ حمید اللہ نے جواب دیا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہارے دماغ سے نوابی ابھی نکلی نہیں"۔۔۔ دیبا نے کہا ۔۔۔ "میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ کہو گے تو ساری عمر مہمان رکھوں گا۔ پھر بھی یہ سمجھوں گا کہ تمہارے احسان کا صلہ پورا نہیں کیا"۔

"نہیں دیبے!"۔۔۔ حمید اللہ نے کہا ۔۔۔ "ایسا نہ سوچو۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ ہم یہاں فارغ بیٹھنے کے لئے نہیں آئے۔ فارغ بیٹھا بھی نہیں جاتا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب تم میری جاگیر پر آیا کرتے تھے تو تم نے دو یا تین مرتبہ تمہارے ساتھ اپنے ارادوں کا ذکر کیا تھا"۔

"ہاں ہاں"۔۔۔ دیبا نے مسکراتے ہوئے کہا ۔۔۔ "یاد ہے۔ تم اپنے باپ کی نوابی سے تنگ تھے اور تمہارا ارادہ یہ تھا کہ انگریزوں کی بادشاہی کو اکھاڑا جائے جنہوں نے یہ نوابیاں، اور مہاراجوں کے راجواڑے بنا تے

ہیں .... مجھے تمہاری وہ سب باتیں یاد ہیں"۔

"اُس وقت میں اکیلا تھا"۔۔۔ حمید اللہ نے کہا ۔۔۔ "اب میرے ساتھ ایک شیر دل آگیا ہے۔ یہ ہے وہ سکندر جس کی بہادری کی کہانی میں نے تمہیں کچھ دن پہلے سنائی تھی۔ دیکھو، کیسا عجیب اتفاق ہے کہ میرا یہ جگری یار مجھے کہاں آن ملا ہے"۔

دیبا نے میری پیٹھ تھپتھپائی اور میری تعریفیں کرنے لگا۔

"تم جیسے آدمی پہاڑوں سے بھی ٹکر لے لیا کرتے ہیں"۔۔۔ دیبا نے کہا ۔۔۔ "میں تمہیں تجربے کی ایک بات بتاتا ہوں۔ یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ تم ہمیشہ ہی کامیاب رہو گے۔ ہر مشکل سے کامیابی سے نکلتے جانا انسان کو کمزور بھی کر دیا کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کوئی بھی مشکل اُس کے لئے مشکل نہیں۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو کمزور سمجھ لیا کرو اور یہ ارادہ کیا کرو کہ ابھی اور طاقت کی ضرورت ہے .... کیا تم بھی انگریزوں کے خلاف لڑنا چاہتے ہو؟"

"ارادہ تو یہی ہے"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "لیکن زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا نہیں ملتا جہاں پاؤں جما کر کھڑا ہو سکوں۔ جہاں جاتا ہوں وہاں کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے اور وہاں سے بھاگنا پڑتا ہے"۔

"ایسے ہی ہوگا سکندر!"۔۔۔ دیبا نے کہا ۔۔۔ "اور ایسے ہی ہوتا چلا جائے گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے دماغ میں یہ کیڑا کس نے ڈالا ہے کہ تم یا تم جیسے دو چار سو آدمی بھی اکٹھے ہو کر انگریزوں کی بادشاہی کو ہندوستان سے اکھاڑ سکیں گے؟"

"دیبے بھائی!"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "تم مسلمان ہو۔ میرا خیال تھا کہ تمہارے اندر یہ جذبہ ضرور ہوگا کہ انگریزوں نے یہ ملک مسلمانوں سے لیا تھا اور یہ انگریزوں سے واپس لینا ہے"۔

"میرے جذبے کی بات کرتے ہو؟"۔۔۔ دیبا نے مسکراتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں ایک رہزن کا بیٹا ہوں۔ وہ بھی ایک ڈاکو کا بیٹا تھا اور سُنا ہے کہ اُس کا باپ بھی چور اُچکا ہی تھا .... میرا کوئی مذہب نہیں سکندر! اگر میرا کوئی

مذہب ہے تو اُس مذہب کا اصول یہ ہے کہ اپنے سے کمزور انسانوں کے دل دُکھی نہ کرو۔ رُعب اور دبدبہ اُس پر جھاڑو جو تم پر رُعب جھاڑنے کی کوشش کرے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دیبا ڈاکوؤں کا سردار ہے، لیکن یہ کوئی بھی نہیں کہے گا کہ دیبا بُرا آدمی ہے۔ میں سب کے کام آتا ہوں۔ تم یہاں رہ کے دیکھو گے کہ اس جگہ سے دس کوس دائیں، دس بائیں، دس اُوپر اور دس کوس نیچے کے علاقے میں انگریزوں کی نہیں میری بادشاہی ہے۔ یہاں انگریزوں کا نہیں میرا قانون چلتا ہے، لیکن میں لوگوں کے دلوں کا بادشاہ ہوں۔ اگر یقین نہ آتے تو میں تمہیں دو گاؤں بتاؤں گا۔ ایک گھر ایک گاؤں میں دوسرا گھر دوسرے گاؤں میں ہے۔ ایک بار ایک گھر کی اتنی خوبصورت اور کنواری لڑکی میرے پیچھے آگئی تھی جتنا حُسن تم نے ایک لڑکی میں نہیں دیکھا ہوگا۔ اگر میرا کوئی خدا ہے تو میں اُس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس لڑکی کو میں نے ساتھ لیا اور اس کے ماں باپ کے حوالے کر آیا۔ ایسے ہی دوسرے گاؤں کی ایک لڑکی نے کیا تھا۔ اگر میں چاہتا تو اُن دونوں لڑکیوں کو بیویاں بنا کر رکھ لیتا۔"

"دیبے یار!" — حمیداللہ نے کہا — "بیوی تو یہ سکندر بھی کسی کو نہیں بناتا۔ تم کوئی اور بات کرو۔"



میں بار بار یہ تذکرہ نہیں چھیڑنا چاہتا کہ میں کیوں انگریزوں کے خلاف تھا اور حمیداللہ خان کے دل میں انگریزوں کے خلاف کیسا زہر بھرا ہُوا تھا۔ یہ میں پہلے ہی تفصیل سے سُنا چکا ہوں۔ انگریزوں کے خلاف حمیداللہ خان کے جذبے کا اندازہ اس سے کریں کہ اُسے میں نے اس حال تک پہنچایا تھا۔ آپ کو وہ واقعہ یاد ہوگا کہ اُس کے آدمی خزانے والی ریل کار لُوٹنے کے لئے گئے تھے اور یہ جال میرے ہاتھوں بچھایا گیا تھا جس میں لا کر اُس کے تمام آدمیوں کو میں نے مروا دیا تھا پھر اُسے قاتل بھی میں نے ثابت کرایا تھا حالانکہ وہ مقتول میرے ہاتھوں مرا تھا۔ شہناز میرے ساتھ تھی۔ حمیداللہ کے دل میں میرے خلاف دشمنی اور انتقام کا جذبہ ہونا چاہیئے تھا، لیکن اُس نے

اپنے دل میں میری محبت کو زندہ رکھا اور دشمنی انگریزوں کی برقرار رکھی۔ یہ صرف اس لئے تھا کہ میں انگریزوں کے خلاف دہشت گردی اور تخریب کاری کی جنگ لڑنا چاہتا تھا۔

دیبے کو ہم نے قائل کرنا شروع کر دیا کہ وہ ہمیں دہشت گردی کا اڈہ اپنے ہاں بنانے دے۔ وہ قائل نہیں ہو رہا تھا۔ خاصی دلیل بازی کے بعد وہ مان گیا۔ جب اُس نے بات کی تو مجھے پتہ چلا کہ اُس کا علم ہم سے کم نہیں اور اُس میں جذبہ بھی موجود ہے۔

"تم کامیاب نہیں ہو سکو گے" — اُس نے کہا — "کیا میں نہیں جانتا کہ ہندوستان میں کچھ گروہ یہ کام کر رہے ہیں؟ وہ معلوم نہیں کب سے لگے ہوتے ہیں، لیکن گرفتار ہونے، سزائے قید اور سزائے موت لینے کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکے۔ اُنہیں پکڑوانے والے اپنے ہندوستانی بھائی ہیں۔ ویسا ہی گروہ تم بنا لو گے اور ایک روز تمہارا اپنا ہی کوئی آدمی تمہاری مخبری کر کے تمہیں پکڑوا دے گا۔"

"میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں" — میں نے کہا — "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ سارے گروہ متحد ہو جائیں تو کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔"

"ہاں، میں یہی کہنا چاہتا ہوں" — دیبا نے کہا — "لیکن ہوگا نہیں۔"

"ہو جائے گا" — حمیداللہ خان نے کہا — "ہم اپنا گروہ بنا کر دوسرے گروہوں سے ملیں گے اور سب کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے" — دیبا نے کہا — "تم لوگوں سے چھُپتے پھرتے ہو اور میں لوگوں میں گھومتا پھرتا ہوں۔ دہشت گردوں کے جن گروہوں کو میں جانتا ہوں، ان میں تینوں قوموں کے آدمی یعنی مسلمان، ہندو اور سکھ شامل ہیں۔ زیادہ تعداد ہندوؤں کی ہے، لیکن سکھ اور مسلمان نہیں جانتے کہ وہ ہندوؤں کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہندو دہشت گرد سکھوں اور مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں اور اُنہیں بتاتے ہیں کہ ہندوستان آزاد

ہوگا تو تینوں قوموں کی مشترکہ حکومت ہوگی، لیکن ہندوؤں کے لیڈر صرف ہندو راج کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ظاہر طور پر وہ دہشت گردی کے خلاف باتیں کرتے ہیں، لیکن اُن کا درپردہ تعلق ان دہشت گرد گروہوں کے ساتھ ہے۔ میں یہ جو کہتا ہوں کہ میرا کوئی مذہب نہیں یہ میں ویسے ہی نہیں کہتا۔ جس روز میں نے یہ اعلان کر دیا کہ میں مسلمان ہوں اُس سے اگلے روز ہندو مجھے گرفتار کرا دیں گے۔ ایک بہت بڑا ہندو ساہوکار مجھے دھمکی دے بھی چکا ہے۔"

"وہ کون ہے یار؟" — نوراللہ نے پوچھا — "کیا تم نے اُس کی دھمکی برداشت کر لی ہے؟"

"ہاں بھائی!" — دیبا نے کہا — "برداشت کر لینا ہی بہتر سمجھا۔ اُس کے متعلق میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ ہندوؤں کو مالی مدد بھی دے رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف بھی درپردہ کچھ کر رہا ہے" — دیبا بولتے بولتے اچانک چُپ ہو گیا اور مُنہ چھت کی طرف کر کے کچھ سوچنے لگا۔ یکلخت سر نیچے کر کے اُس نے ہم تینوں کو باری باری دیکھا اور بولا — "دوستو! ایک کام کرو۔ تم اپنا گروہ بناؤ اور یہ سوچ لو کہ تمہیں روپے پیسے کی بہت ضرورت ہوگی۔ بم بنانے کے لئے بارُود بھی چاہیئے۔ کچھ لوگوں کو پیسے دے کر ساتھ ملانا پڑے گا .... سوچو کہ اتنی رقم کہاں سے حاصل ہو سکتی ہے۔"

"ڈکیتی کی وارداتیں کریں گے" — میں نے کہا — "لیکن کسی ایسی اسامی پر ہاتھ صاف کریں گے جس نے دوسروں کا خون چُوس چُوس کر اپنا گھر بھرا ہُوا ہوگا۔ ایسا نہیں کہ جس نے حلال کی کمائی کا پیسہ پیسہ جمع کیا ہُوا ہو اور ہم اُسے لُوٹ لیں۔"

"میں تم سے یہی کہلوانا چاہتا تھا" — دیبا نے کہا — "جن اسامیوں کا تم شکار کھیلنا چاہتے ہو ان میں ایک یہ ہندو ساہوکار ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اگر تمہیں میری بات سمجھ میں آتی ہے تو پہلے اس کے گھر

کی صفائی کرو۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو مالا مال ہو جاؤ گے۔"

زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں یہی کچھ کرنا تھا۔ مجھے اپنے ارادے پورے ہوتے نظر آنے لگے تھے۔ میں نے دیبا سے کہا کہ وہ ہماری راہنمائی اور مدد کرے۔ اُس نے کہا کہ وہ اپنے آدمی دے گا اور پوری مدد کرے گا۔

اُس نے ایک مدد یہ کی کہ اپنے ایک آدمی کو یہ کہہ کر اس ہندو ساہوکار کے گاؤں بھیج دیا کہ اُس کے مکان کو اچھی طرح دیکھ آئے اور اندر کی جتنی باتیں معلوم کی جا سکتی ہیں معلوم کرے۔

یہ دیبا کا جاسوس تھا۔ اُسے جس کام کے لئے بھیجا جا رہا تھا، اُس کا اُسے تجربہ تھا۔ وہ جانتا تھا اُسے کیا معلوم کرنا ہے اور کس طرح معلوم کرنا ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ معلومات کس مقصد کے لئے درکار ہیں۔ وہ اُسی وقت چلا گیا۔ ہندو ساہوکار کا گاؤں وہاں سے پندرہ سولہ میل دُور تھا۔

جس گاؤں کو نوراللہ اور حمیداللہ خان نے "سائیں کراماں والے" کا اڈہ بنا رکھا تھا، وہاں بھی اپنا ایک جاسوس بھیجنا تھا۔ سلطان احمد کی رپورٹ پر سپیشل برانچ نے وہاں چھاپہ مارنا تھا۔ یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ پولیس وہاں آتی ہے یا نہیں اور اگر آتی ہے تو کیا کر رہی ہے۔ یہ خطرہ تھا کہ پولیس ہمارے تعاقب میں نہ آ رہی ہو۔ ہم نے دیبا سے کہا تو اُس نے اگلی صبح ایک آدمی کو ہدایات دے کر اُس گاؤں کو روانہ کر دیا۔

ساہوکار کے گاؤں کو گیا ہُوا آدمی تیسرے دن واپس آیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ یہ لوگ بہت ذہین ہوتے ہیں اور زمین کے نیچے کی بھی جاسوسی کر لیتے ہیں لیکن اس قسم کے مکان کی جاسوسی آسان نہیں تھی جو قلعے کی طرح تھا۔

یہ آدمی اندر کی کچھ ضروری معلومات لے آیا تھا۔ مکان خاصا بڑا تھا۔ اس کے اردگرد دس بارہ فٹ اونچی دیوار تھی۔ دیوار کے اوپر والا حصّہ گولائی میں تھا۔ یہ گولائی سیمنٹ سے بنائی گئی اور اس میں شیشے کے گلاس اور بوتلیں توڑ کر ان کے ٹکڑے لگاتے ہوتے تھے۔ آپ نے مکانوں کی حفاظت کا یہ انتظام

اکثر دیکھا ہوگا۔ شیشے کے ٹکڑے گیلے سیمنٹ میں کھڑے لگا دیتے جاتے ہیں۔ سیمنٹ خشک ہوتا ہے تو یہ ٹکڑے اس میں مضبوط ہو جاتے ہیں پھر کوئی چور ڈاکو دیوار نہیں پھاند سکتا۔

مکان کے اندر جو دو منزلہ حویلی تھی، رات کو ایک خونخوار بُولی کتا کھلا رہتا تھا۔ بیرونی حفاظتی دیوار اور اس میں گھرے ہوئے مکان کے درمیان دس بارہ فٹ فاصلہ تھا۔ کتا اس جگہ دیوار کے اندر رہتا تھا۔ مکان کے ایک برآمدے میں دو چوکیدار سوتے تھے۔ وہ رات کو پہرہ نہیں دیتے تھے بلکہ ایک برآمدے میں سوتے رہتے تھے۔

یہ مکان گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ہمارا جاسوس مکان کے ارد گرد کا علاقہ بھی اچھی طرح دیکھ آیا تھا۔ اُس نے کچھ اور معلومات بھی لے لی تھیں۔ دیبا نے اُسی وقت واردات کی سکیم تیار کر لی۔

ڈاکہ زنی کی واردات کے لئے تین آدمی دیبا کے مقرر ہوئے چوتھا نور اللہ اور پانچواں میں تھا۔ دیبا نے حمید اللہ سے بھی کہا تھا کہ وہ ڈاکہ زنی کا تجربہ حاصل کرنے کے لئے ساتھ جائے لیکن اُس نے جانے سے انکار کر دیا۔ اُس میں بہت سی خوبیاں تھیں، لیکن ایک خامی یہ تھی کہ وہ جسمانی لحاظ سے پھرتیلا نہیں تھا۔ اُس کا دماغ خاصا تیز تھا۔ وہ نواب زادہ تھا۔ ہر قسم کی بدمعاشی اور بدکاری کر سکتا تھا، لیکن ڈاکہ زنی اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔

میرے پاس اور نور اللہ کے پاس ریوالور تھے۔ ہمارے باقی تین ساتھیوں کے پاس خنجر اور بڑی خوبصورت کلہاڑیاں تھیں۔ ہم آدھی رات سے کچھ پہلے گھوڑیوں پر سوار ہوئے اور چل پڑے۔ پندرہ سولہ میل کا فاصلہ تھا جو ہم نے ڈیڑھ پونے دو گھنٹوں میں طے کر لیا۔ دیبا کے ان تین آدمیوں میں سے ایک ہمارا گائیڈ تھا۔ اُس نے راستے میں ہمیں بتایا تھا کہ ساہوکار کا مکان کیسا ہے۔ رکھوالی والے کُتے کو اُس نے دیکھا تھا۔ اُس نے کئی بار کہا کہ یہ بُولی کُتا (بُل ڈاگ) ہے۔ اسے دیکھ کر ہی خوف طاری ہو جاتا ہے اور وہ بہت ہی خونخوار لگتا ہے۔

دیبا نے اس خونخوار کُتے کا انتظام کر دیا۔ یہ بیل، بھینس یا گائے کی ہڈی تھی جو سات آٹھ انچ لمبی اور اندر سے خالی تھی۔ اس میں دیبا نے بندوق سے ایک چیل مار کر اس کا گوشت ہڈی میں بھر دیا تھا۔ گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کئے گئے تھے اور یہ ٹکڑے دُودھ میں بھیگے ہوتے تھے۔ اس دُودھ میں بڑا تیز زہر ملا ہوا تھا اور زہر کا ذائقہ مارنے کے لئے دُودھ کو گُڑ سے میٹھا کیا گیا تھا۔ گوشت کے ٹکڑے پورا ایک دن اس دُودھ میں ڈوبے رہے تھے۔ کچھ زہر ہڈی پر بھی مل دیا گیا تھا۔ ہڈی دیبا کے ایک آدمی نے کپڑے میں لپیٹ رکھی تھی۔

وہ خاصا بڑا گاؤں تھا۔ ساہوکار کا مکان گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ یہ ڈیڑھ دو کنال میں پھیلی ہوئی حویلی تھی۔ بیرونی دیوار نے جو رقبہ گھیر رکھا تھا وہ ملا کر حویلی تین کنال سے کم نہیں تھی۔ ایسے ساہوکار دیہات میں اس لئے رہتے تھے کہ دیہات کے لوگ زیادہ قرضے لیتے تھے۔ زیادہ تر مقروض مسلمان ہوتے تھے۔ وہ بیاہ شادیوں، ماتم اور چالیسویں پر بے دریغ خرچ کرنے کے لئے قرض لیتے تھے۔ مقدمہ بازی بھی انہیں ہندو ساہوکاروں کا مقروض رکھتی تھی۔ ان اَن پڑھ لوگوں کو ساہوکار خوب لُوٹتے تھے۔ ہر ماہ سُود وصول کر لیتے اور اصل رقم وہیں کی وہیں رہتی بلکہ بڑھ بھی جایا کرتی تھی۔

یہ ساہوکار تو ساہوکاروں کا ساہوکار تھا۔ اُس کا شہروں میں بھی کاروبار تھا۔ اُس زمانے میں بنک تو تھے لیکن بہت کم۔ لوگ گھروں میں روپیہ پیسہ چھپا کر رکھتے تھے۔ یہ ساہوکار حویلی کے ارد گرد دیوار کھڑی کر کے، دیوار پر بوتلوں کے ٹکڑے جما کر، دو چوکیدار اور ایک کُتا رکھ کر اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اُس کا خزانہ محفوظ ہے اور کوئی اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔

اس گاؤں سے دو تین فرلانگ دُور ٹیلے اور کھڈ تھے اور خشک نالہ بھی تھا جس کے کنارے اونچے تھے۔ ہمارا گائیڈ ہمیں وہاں لے گیا۔ گھوڑیوں کو وہاں ایک درخت کے ساتھ باندھا اور ہم پانچوں وہاں سے چل پڑے۔

میں نے کہا کہ گھوڑیوں کے پاس ایک آدمی کا ٹھہرنا ضروری ہے۔

"پرواہ نہ کر بھائی!" —— دیبا کے ایک آدمی نے کہا —— "پانچ گھوڑے کھول کر کوئی نہیں لے جائے گا۔ جو دیکھے گا وہ کہے گا کہ ان کے مالک قریب ہی ہوں گے اور وہ پانچ ہوں گے ایک نہیں ہوگا۔"

آپ کسی ماہر نفسیات یا عادی مجرموں کی نفسیات کے کسی ماہر سے پوچھیں تو وہ آپ کو بتائے گا کہ پیشہ ور مجرموں کی ذہانت اور فہم و فراست اوسط درجہ لوگوں سے خاصی اوپر ہوتی ہے۔ آج کل تو چوری ڈکیتی وغیرہ آسان ہو گئی ہے کیونکہ پشت پناہی حاصل ہو جاتی ہے۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اُس وقت مجرم کو کوئی معاف نہیں کرتا تھا۔ انگریزوں کی حکومت تھی۔ پولیس مجرم کو پکڑ کر ہی دم لیتی تھی۔ ان حالات میں پیشہ ور مجرم خصوصاً ڈکیت عقل کے ایسے ایسے مظاہرے کرتے تھے کہ پولیس چکرا جاتی تھی۔ اُس وقت جرائم کا یہ حال نہیں تھا کہ ہر آٹھواں آدمی کسی نہ کسی طریقے سے مجرم ہے۔ اُس وقت عادی مجرم بہت کم ہوتے تھے اور وہ انسان کی نفسیات کو اَن پڑھ ہونے کے باوجود سمجھتے تھے۔

ہم پانچوں گاؤں کے باہر کی طرف سے ساہوکار کے مکان کے قریب چلے گئے۔ وہاں مٹی کی ایک دیوار سی تھی جو چار پانچ فٹ اُونچی ہو گی، ہم اس کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ ہمیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ دونوں چوکیدار حویلی کے باہر ایک برآمدے میں سویا کرتے ہیں۔ یہ ہمیں دیبا کے جاسوس سے پتہ چلا تھا۔ اس سے آپ اندازہ کریں کہ ان ڈاکوؤں کے مُخبر اور جاسوس کتنے تیز اور ذہین ہُوا کرتے تھے۔

ہمارے پاس ایک تو وہ ہڈی تھی جس کے اندر گوشت بھرا ہُوا تھا۔ ایک کمبل تھا جو ہم نے دیوار کے اُوپر لگے ہُوئے بوتلوں کے ٹکڑوں کے اُوپر پھینک کر دیوار پھاندنی تھی۔ ان دونوں چیزوں کے علاوہ ہمارے پاس اپنے اپنے ہتھیار تھے۔

آپ نے شاید پہلے بھی سُنا ہو گا کہ ڈاکو رکھوالی والے کُتوں کے لئے

یہ انتظام کیا کرتے تھے کہ کسی مرے ہوئے جانور کے سینگ میں گوشت بھر کر ساتھ لے جاتے اور رکھوالی والے کُتے کو اس کی مُشک دے کر پرے پھینک دیتے تھے۔ کتا دوڑ کر سینگ تک پہنچتا اور اس میں گوشت نکال لینے کی کوشش کرنے لگتا تھا۔ سینگ میں سے گوشت نکلتا نہیں تھا اور کُتا اس امید پر سینگ کو بھنبھوڑتا رہتا تھا کہ گوشت اب نکلا کہ نکلا۔ گوشت نکلتا نہیں تھا اور کُتا سینگ کو چھوڑتا بھی نہیں تھا۔ اتنی دیر میں ڈاکو اپنا کام کر جاتے تھے اور کُتا سینگ میں سے گوشت نکالنے میں لگا رہتا تھا۔ بعض ڈاکو سینگ کی بجائے کسی مرے ہوئے جانور کی ٹانگ کی ہڈی استعمال کرتے تھے۔

دیبا نے گوشت میں زہر ملانا اس لئے ضروری سمجھا تھا کہ اُسے بتایا گیا تھا کہ کُتا بہت ہی خونخوار نسل کا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہڈی کو چھوڑ کر ہمارے آدمیوں پر ٹوٹ پڑے۔ چوکیدار تو سوتے رہتے تھے لیکن یہ خونخوار کُتا حویلی اور اس کے اردگرد بیرونی دیوار کے درمیان کُھلا پھرتا رہتا تھا۔



آدھی رات کے بعد چاند اور اُوپر آ گیا تھا۔ چاندنی اتنی شفاف تھی کہ حویلی کی اینٹیں الگ الگ نظر آتی تھیں اور بیرونی دیوار کے اوپر بوتلوں کے کانچ کے جو ٹکڑے لگے ہوئے تھے وہ چمک رہے تھے۔ چاندنی میں چمکتے ہوئے تو یہ بڑے اچھے لگتے تھے، ان میں سے رنگ برنگی شعاعیں سی نکلتی تھیں لیکن یہ بڑی ظالم چیز تھی۔ ان پر ہاتھ رکھ کر دیوار پر چڑھتے تو یہ ہاتھ کو قیمے کی طرح کاٹ کر جسم کا سارا خون اِن زخموں سے نکال دیتے۔ یہ ہمارے راستے میں ایک خطرناک رکاوٹ تھی۔ اس کا ہم نے انتظام کر رکھا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ انتظام کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔

ایک اور مشکل نظر آ رہی تھی۔ وہ یہ کہ اس حویلی کے اوپر بھی ایک منزل تھی۔ یہ دو بالائین کمرے تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ اوپر کے کسی کمرے سے کوئی

ہمیں دیکھ لے گا۔ اتنے دُور دراز دیہات میں یہ دومنزلہ حویلی محل جیسی لگتی تھی۔ یہ دولت کی نمائش تھی ورنہ یہ ساہوکار سیدھا سادہ پکا مکان بنا سکتا تھا۔ دیہات میں ایسا محل بنانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ہندو ساہوکار اس گاؤں کا اور اس کے اردگرد جو چند ایک گاؤں تھے، ان کا بھی مہاراجہ بنا ہُوا تھا۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوتی اور کوئی خطرہ نہ ہوتا۔ ان رکاوٹوں کو عبور کرنا اور خطروں کا مقابلہ کرنا تھا۔

ہمارے پاس جو کمبل تھا وہ خاصا موٹا اور لمبا تھا۔ ہم نے اسے چوڑائی کے رُخ تہہ کیا۔ کرتے کرتے یہ تقریباً تین فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا رہ گیا اور یہ اچھی خاصی گدی بن گئی۔ چوکیدار جس طرف سوتے ہُوتے تھے ہم اس کے بالمقابل والی دیوار کے قریب چلے گئے۔ وہاں یہ ذرا سی سہولت مل گئی کہ چاند دوسری طرف ہونے کی وجہ سے اس طرف دیوار کا سایہ تھا۔ اُس زمانے میں آدمیوں کے قد خاصے لمبے ہوتے تھے۔ چھ فٹ قد تو ایک عام سی بات تھی۔ میرے ساتھیوں کے قد تقریباً اتنے ہی تھے۔ میرا قد ان سے ڈیڑھ دو انچ زیادہ ہی ہوگا۔

میں دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر کھڑا ہوگیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں پھنسا کر ہاتھ اپنی ناف کے قریب رکھے۔ نوراللہ نے کہا کہ وہ پہلے اوپر جائے گا۔ اُس نے تہہ کیا ہُوا کمبل اپنے سر پر رکھا، زہریلے گوشت والی ہڈی ہاتھ میں لی اور ایک پاؤں میرے جُڑے ہُوئے ہاتھوں پر رکھ کر اُوپر اُٹھا۔ اُس نے اپنا دوسرا پاؤں میرے کندھے پر رکھا۔ اُس کا سر دیوار کے اوپر تک پہنچ گیا تھا۔ اُس نے سر پر رکھا ہُوا کمبل دیوار پر لگے ہوئے بوتلوں کے ٹکڑوں پر رکھ دیا۔ وہ ذرا اور اُوپر اُٹھا۔ اُسے یہ دیکھنا تھا کہ کُتا کہاں ہے۔ بعد میں اُس نے بتایا کہ اُسے کُتا نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ کہیں بیٹھا یا سویا ہُوا ہوگا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ کُتا ساری رات حویلی کے اردگرد گھومتا پھرتا ہی رہتا۔ رکھوالی والے کتے کہیں بیٹھ جائیں یا سو

جائیں تو بھی وہ بے خبر نہیں ہوتے۔ ہلکی سی آواز پر بیدار ہو جاتے ہیں اور فوراً اُدھر جاتے ہیں جدھر سے آواز آتی ہے۔ نوراللہ نے مُنہ سے بلی کی آواز نکالی۔ دوسری بار آواز نکالنے سے کُتا جو کہیں پرے بیٹھا تھا اِس طرف آگیا۔ نوراللہ نے اُسے دیکھتے ہی ہڈی اُس کی طرف پھینک دی۔ کُتے نے ہڈی کو سُونگھا اور اسے مُنہ میں لے لیا۔ نوراللہ ایک پاؤں میرے ہاتھوں پر اور دوسرا میرے کندھے پر رکھے ہُوتے دیکھتا رہا۔

ہڈی میں گوشت کے ٹکڑے ڈھیلے سے ڈالے گئے تھے تاکہ یہ ذرا سی کوشش سے آہستہ آہستہ نکلتے رہیں اور کُتے کے مُنہ میں جاتے رہیں۔ دیبا نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ گوشت کا ایک ہی زہریلا ٹکڑا بھی پھینکا جا سکتا تھا لیکن خطرہ یہ تھا کہ کُتا اسے سُونگھ کر چھوڑ دیتا۔ ہڈی ہر کُتے کی مرغوب چیز ہوتی ہے۔ اسے اس کُتے نے مُنہ میں لینا ہی تھا۔ ہڈی کے اوپر بھی زہر اور گُڑ ملا ہُوا تھا۔ اگر کُتا گوشت نہ کھاتا تو ہڈی پر ملا ہُوا زہر ہی اُس کے لئے کافی تھا۔ بہر حال یہ اب کُتے پر منحصر تھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔

بعد میں نوراللہ نے بتایا کہ کُتے نے ہڈی کا ایک سرا مُنہ میں لے کر چبانا شروع کیا۔ گوشت کے دو چار ٹکڑے اُس کے حلق سے اتر ہی گئے ہوں گے۔ زہر اتنا تیز تھا کہ کُتا جو بڑے اشتیاق سے ہڈی مُنہ میں اُچھال اُچھال کر چبا رہا تھا ڈھیلا سا پڑ گیا۔ دو تین منٹ بعد اس کا مُنہ جُھک گیا۔ اُس کے مُنہ سے ہڈی گر پڑی۔ اُس نے ایک بار پھر ہڈی کو سُونگھا اور اُسے مُنہ میں لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ نڈھال سا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ آدھا سا اُٹھا اور گر پڑا پھر ایک طرف کو لڑھک گیا۔

"آجاؤ بھائی!" —— نوراللہ نے آہستہ سے کہا اور اُوپر کو اُٹھتے ہُوتے بولا —— "کام ہوگیا ہے۔"

نوراللہ کمبل کی گدی کے اُوپر جا کر دیوار کے ساتھ اندرونی طرف لٹکا اور نیچے کو کُود گیا۔ میرے باقی تین ساتھی بھی باری باری میرے ہاتھوں اور کندھوں پر پاؤں رکھ کر نوراللہ کی طرح دیوار کے اندر اُتر گئے۔ آخری

آدمی کمبل کے گدّے پر اس طرح پیٹ کے بل لیٹا رہا کہ اُس کی ٹانگیں اندر کی طرف اور بازو باہر کی طرف تھے۔ مَیں نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑے، پاؤں دیوار کے ساتھ جماتے اور اس طرح مَیں اتنا اُوپر اُٹھ گیا کہ میرے ہاتھ دیوار کے اُوپر جا پہنچے۔ میری ساتھی دوسری طرف اُتر گیا۔ اس کے بعد میں کمبل کی گدّی کے اُوپر سے گزرتا دوسری طرف کُود گیا۔ کمبل وہیں رہنے دیا۔ بوتلوں کے ٹکڑے کمبل کی گدّی کے نیچے دبے رہے۔

ہم ایک دوسرے کے پیچھے حویلی کے ساتھ ساتھ دوسری طرف گئے۔ ادھر ایک برآمدہ تھا۔ دبے پاؤں آگے ہو کر دیکھا۔ دو چارپائیوں پر دو آدمی چادریں تانے گہری نیند سوتے ہُوتے تھے۔ انہیں جگایا۔ چاندنی سیدھی اُن پر پڑ رہی تھی۔ دونوں اُٹھے۔ دونوں کے سامنے ایک ایک ریوالور تھا۔ سب سے پہلے اُن کی نظر ریوالوروں پر ہی پڑی پھر انہیں کلہاڑیاں نظر آئیں۔ انہوں نے ہم سب پر نگاہیں دوڑائیں۔ لیکن وہ ہم میں سے کسی کا بھی چہرہ پہچان نہیں سکتے تھے کیونکہ ہمارے چہرے پگڑیوں میں چھُپے ہُوتے تھے۔ ان میں سے ہماری صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔

دیبا کے ایک ساتھی نے اُنہیں کہا کہ وہ اُونچی آواز نہ نکالیں اور ہم جو پوچھتے ہیں وہ بتا دیں۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ دیتے اور بزبانِ خاموشی جان بخشی کی التجا کی۔ ہمارے ایک ساتھی نے اُن سے پوچھا کہ ہم اندر کس دروازے سے جائیں اور یہ کہ گھر والے کہاں کہاں سوتے ہوتے ہیں اور ان کی تجوری کون سے کمرے میں ہے۔

انہوں نے اپنی جانیں بچانے کے لئے ہماری پوری رہنمائی کی۔ انہوں نے بتایا کہ تجوری لوہے کی بنی ہوتی ہے اور یہ ایک کمرے کی دیوار میں فٹ کی ہوتی ہے صرف دروازہ نظر آتا ہے۔

ہم نے ان دونوں کے مُنہ اُن کی ہی چادروں سے پٹیاں پھاڑ کر باندھ دیتے پھر ایک چارپائی کی ادوائن کاٹ کر دونوں کے ہاتھ اُن کی پیٹھوں کے پیچھے کر کے باندھ دیتے پھر ان کے پاؤں بھی باندھ دیتے۔

ہم حویلی کے ایک اور طرف چلے گئے۔ ایک کمرے کے دروازے پر دستک دی اور ہم سب دروازے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گئے۔ کچھ دیر انتظار کر کے دروازے پر پھر دستک دی۔ ایک دو منٹ بعد دروازہ کھُلا اور ایک آدمی باہر آیا۔ اُسے ہمارے ایک ساتھی نے دبوچ لیا۔ مَیں نے اُسے ریوالور دکھا کر نالی اُس کے سر کے ساتھ لگا دی اور اُسے کہا کہ وہ چُپ رہے پھر اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ وہ اُن کا باورچی تھا اور رات کو باورچی خانے میں ہی سوتا تھا۔ اپنے سر کے ساتھ لگی ہوتی ریوالور کی نالی کو محسوس کرتے ہوتے اور چار نقاب پوشوں کو دیکھ کر اُس نے ہمیں ہر وہ بات بتائی جو اُس سے ہم نے پوچھی۔

اب اگر میں تفصیل سے سنانا شروع کر دوں کہ ہم کس طرح کمروں میں داخل ہوتے، کس کو کس طرح جگایا اور گھر کے ہر فرد کا ردِ عمل کیا تھا اور ہم اُس آہنی تجوری تک کس طرح پہنچے جو دیوار میں نصب تھی، اسے کس طرح کھلوایا، اس کا صفایا کیا تو بات بہت لمبی ہو جاتے گی اور اس میں کوئی نئی بات بھی نہیں ہو گی۔ ایسی بہت سی کہانیاں آپ نے پڑھی اور سُنی ہوں گی۔ میں آپ کو صرف ایک واقعہ سناتا ہوں۔

میرے ساتھی ساہوکار کو جگا کر اور اُس کے سینے پر پستول کی نالی رکھ کر اور اُسے چمکتی ہوتی کلہاڑیاں دکھا کر اُس کے ہاتھوں تجوری کھلوا چکے تھے۔ ہم نے دو لالٹینیں اور ایک لیمپ جلا لیا تھا۔ میں لے ایک لالٹین اپنے ہاتھ میں لے لی اور ایک اور کمرے میں چلا گیا۔ میرے ساتھی شاید ایک غلطی کر رہے تھے۔ اس حویلی میں گھر کے کچھ اور افراد بھی تھے جو دوسرے کمروں میں تھے۔ اُن کی طرف کوئی نہیں گیا تھا اور یہ بہت بڑا خطرہ تھا۔ گھر کا کوئی بھی آدمی چپکے سے باہر نکل جاتا اور گاؤں والوں کو مدد کے لئے اکٹھا کر سکتا تھا۔ میں اس خطرے کے پیشِ نظر ریوالور اور لالٹین اُٹھاتے دوسرے کمرے دیکھنے کے لئے چل پڑا تھا۔

میں ایک کمرے میں داخل ہُوا۔ یہ کوئی بیٹھک یا ڈرائنگ روم

کی قسم کا کمرہ تھا۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ صوفہ نما کرسیاں تھیں اور کمرہ سجا سجایا تھا۔ میں اس کمرے میں دیکھ رہا تھا کہ میرے عقب سے آواز آئی —— "ریوالور پھینک دو۔"

میں پیچھے کو مڑا۔ اُدھر ایک دروازہ تھا۔ دروازے میں میری عمر کا ایک جوان آدمی دو نالی بندوق کا بٹ کندھے سے لگائے اور نالیاں میری طرف کئے کھڑا تھا۔ اگر میں ریوالور سیدھا کر کے اُس پر گولی چلاتا تو میرے ریوالور سے گولی نکلنے سے پہلے وہ مجھ پر یکے بعد دیگرے دو کارتوس فائر کر سکتا تھا۔ میرا دماغ تیزی سے سوچنے لگا کہ میں کیا کروں۔ ایک ترکیب یہ ذہن میں آئی کہ ریوالور اُس کی طرف پھینک دوں اور اگر وہ ریوالور اُٹھانے کے لئے جھکے تو میں چیتے کی طرح جھپٹ کر اُس کے اوپر جا پڑوں لیکن یقین نہیں تھا کہ وہ ریوالور اُٹھانے کے لئے جھکے گا۔

خدا نے ایک اور سبب پیدا کر دیا۔ ایک جوان اور بڑی ہی حسین لڑکی جس کے چہرے پر خوف و ہراس تھا، اُس آدمی کے ساتھ آن کھڑی ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس آدمی نے ایک بار پھر کہا کہ ریوالور پھینک دو۔ وہ مجھ سے بارہ چودہ قدم دُور تھا۔ مدہم سی ایک امید پر میں نے ریوالور فرش پر پھینک دیا لیکن اُس کے قریب نہیں بلکہ اپنے قریب پھینکا۔ اُس نے کہا کہ گولیوں والی بیلٹ بھی پھینک دو۔ میں نے بیلٹ بھی ریوالور کے قریب پھینک دی۔

میں نے جس امید پر ریوالور پھینکا تھا وہ پوری ہوتی نظر آنے لگی۔ یہ اس طرح ہُوا کہ اس آدمی نے اپنے ساتھ لگی ہوئی لڑکی سے کہا کہ وہ ریوالور اور بیلٹ اُٹھا لائے، لیکن لڑکی ڈرتی تھی۔ اس آدمی نے اُسے ڈانٹ کر کہا کہ بُزدل مت بنو، اسے میں نے نشانے میں لیا ہُوا ہے۔ ذرا سا ہلا تو میں اسے اُڑا دوں گا۔

لڑکی ڈرتے جھجکتے آہستہ آہستہ آگے آئی اور وہ جُھک کر ریوالور اور بیلٹ اُٹھانے لگی۔ وہ ریوالور کو ہاتھ لگانے سے بھی ڈرتی تھی۔ میں نے اس آدمی

کے پیچھے دیکھا اور ویسے ہی ہاتھ اُوپر کر کے ایک اشارہ کیا.... اُس کے پیچھے کچھ بھی نہیں تھا، لیکن میرے اشارے سے وہ سمجھا کہ اُس کے پیچھے کوئی آدمی آ رہا ہے۔ انسانی فطرت کے عین مطابق اُس نے پیچھے دیکھا۔ میں گولی کی طرح جھپٹا اور ریوالور پر جھکی ہوئی لڑکی کو کمر سے اپنے بائیں بازو میں جکڑ لیا۔ میں نے ایک سیکنڈ میں فرش سے ریوالور اُٹھا لیا۔ بندوق والے نے اِدھر دیکھا تو صورتِ حال کچھ اور بنی ہوئی تھی۔ لڑکی کی پیٹھ میرے سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور وہ میرے بائیں بازو کی مضبوط گرفت میں تھی۔ میں نے ریوالور کی نالی لڑکی کی کنپٹی کے ساتھ لگا دی تھی۔

"بندوق میری طرف پھینک دو" —— میں نے بڑے آرام سے کہا —— "یہ لڑکی یہیں مرے گی یا میرے ساتھ جائے گی۔"

وہ لڑاکا اور جنگجو نسل کا آدمی نہیں تھا۔ وہ ساہوکارہ کرنے والا ہندو تھا اور وہ پیسے کو ہی سب کچھ سمجھتا تھا۔ اُس نے برخورداری سے بندوق میرے آگے پھینک دی اور ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر منتیں کرنے لگا کہ میں اس لڑکی کو چھوڑ دوں۔ یہ اُس کی بیوی تھی اور صرف چار مہینے پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔

اتنے میں نوراللہ مجھے ڈھونڈتا اس کمرے میں آیا۔ فوراً بعد ہمارا ایک اور ساتھی آ گیا۔ انہوں نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ ہمیں صرف نقد رقم اور زیورات کی ضرورت تھی۔ کوئی اور چیز یا کپڑے اُٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ نوراللہ مجھے کہہ رہا تھا کہ باہر نکلو۔ اُس نے بندوق اُٹھا لی۔ میں نے لڑکی کو چھوڑا اور فرش پر پڑی ہوئی اپنی بیلٹ اُٹھائی اور میں نوراللہ کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میں نے اتنا دیکھا کہ اس کمرے میں ہمارا ایک اور ساتھی آ گیا تھا۔

ہم بیرونی دیوار والا آہنی گیٹ کھول کر باہر نکلے۔ نوراللہ نے ایک بوری سی اُٹھا رکھی تھی۔ کہنے لگا کہ باقی ساتھی آ رہے ہیں، ہم گھوڑیوں تک چلتے ہیں۔ اُس نے جو بوری اُٹھا رکھی تھی وہ وزنی تھی۔ ایک طرف سے میں

نے پکڑ لی اور ہم تیز تیز چلتے گئے۔ پیچھے دیکھا تو اپنے ساتھی نظر آئے۔ میں اور نوراللہ گھوڑیوں تک پہنچے، بوری ایک گھوڑی کی زین کے پیچھے باندھی اور ہم سوار ہو گئے۔

جب ہمارے باقی تین ساتھی ہم تک پہنچے تو دیکھا کہ ان میں سے ایک نے ایک لڑکی کو کندھے پر اُٹھا رکھا ہے۔ لڑکی تڑپ رہی تھی اور وہ رو تی تھی۔ لڑکی کو زمین پر کھڑا کیا تو دیکھا یہ وہی لڑکی تھی جسے میں نے اپنی ڈھال بنایا تھا۔

"اسے کیوں اُٹھا لاتے ہو؟" — میں نے کہا — "چھوڑ دو اسے۔"

"چُپ رہو سکندر!" — نوراللہ نے مجھے کہا — "یہ ان کا کام ہے۔ ان کے کام میں دخل نہ دو۔"

میں چُپ تو ہو گیا، لیکن میں نے تہیہ کر لیا کہ اس لڑکی کو دیبا کے پاس نہیں رہنے دوں گا اور اسے آزاد کر دوں گا۔

دیبا کے تینوں آدمی ہنس پڑے۔ میں گھوڑی سے اُتر آیا۔

"تمہارا یار شریف آدمی معلوم ہوتا ہے" — ان میں سے ایک نے نوراللہ سے کہا۔

"شاید ابھی تک اپنے آپ کو سی آئی ڈی کا سب انسپکٹر سمجھ رہا ہے" — دوسرا بولا۔

ان کا تیسرا ساتھی لڑکی کو ایک گھوڑی کی طرف لے جانے لگا۔ وہ اُسے گھسیٹ رہا تھا اور لڑکی رو رہی تھی۔

"میرے دوستو!" — میں نے ان تینوں سے کہا — "اگر اُستاد دیبا کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہ ہوتا تو میں تمہیں بتاتا کہ لڑکی کو کس طرح لے جاتے ہو۔"

لڑکی بیٹھ گئی۔ وہ آگے نہیں جاتی تھی۔ دیبا کے ایک آدمی نے لڑکی کے بال پکڑ کر اوپر کھینچا۔ میں آگے بڑھا اور اس آدمی کو زور سے دھکا دیا۔ وہ پیچھے جا پڑا۔

"اُٹھو" — میں نے لڑکی سے کہا — "مت ڈرو ..... اُٹھو" — میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا۔ وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی — "میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ میری موجودگی میں کوئی بھی تمہارے جسم کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔"

"مجھے واپس کیوں نہیں بھیج دیتے؟" — اُس نے روتے ہُوئے کہا۔

"میں جو کہتا ہوں وہ کرو" — میں نے مشفقانہ سے لہجے میں آہستہ سے کہا — "میری زبان پر اعتبار کرو، ورنہ یہ تمہیں ماریں گے، گھسیٹیں گے۔"

لڑکی نے پہلے بھی سُن لیا تھا کہ میں نے دیبا کے آدمیوں سے کہا تھا کہ لڑکی کو چھوڑ دو۔ وہ مجھے اپنا ہمدرد تو نہیں سمجھ سکتی تھی۔ مَیں ڈاکو تھا اور اُس نے دیکھا تھا کہ میں نے کس طرح اُس کے گھر میں اُسے دبوچا اور اُس کے خاوند سے بندوق لے لی تھی۔ لڑکی مجھے معمولی سا چور نہیں بلکہ تجربہ کار اور خطرناک ڈاکو سمجھتی تھی، لیکن بات جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے اُس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ میں نے یہ اثر لڑکی پر دیکھا اور وہ میرے ساتھ چل پڑی۔

نوراللہ گھوڑی پر سوار تھا۔ میں نے لڑکی کو اُٹھایا اور نوراللہ کے پیچھے بٹھا دیا۔

"مجھے پیچھے سے پکڑ لے لڑکی!" — نوراللہ نے لڑکی سے کہا — "ڈرو نہیں۔"

میں نے جسے دھکا دیا تھا وہ میرے پاس آیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھیوں کے پاس لے گیا۔

"ہم نے تمہارے متعلق بہت کچھ سُنا ہے سکندر بھائی!" — اُس نے کہا — "سُنا ہے کہ تم کچھ عجیب سے آدمی ہو لیکن خیال رکھنا کہ ہم تم سے زیادہ عجیب ہیں۔"

"یہ تو اور زیادہ اچھا ہے" — میں نے مسکراتے ہوئے کہا — "استاد دیبا نے مجھے میرے دو ساتھیوں کے ساتھ پناہ دی ہے۔ اُس نے ہمیں یہ بھی کہا ہے کہ ساری عمر میرے ساتھ رہو۔ میں اُس کا یہ احسان نہیں بھول سکتا۔ اسی لئے میں نے تمہیں صرف دھکا دیا ہے۔ اگر اُستاد دیبا کا لحاظ نہ ہوتا تو تم اس طرح میرے سامنے زمین پر کھڑے نہ ہوتے۔ میں تمہیں بیہوشی کی حالت میں واپس لے جاتا۔"

"سکندر بھائی!" — ایک اور بولا — "آپس کی دشمنی اچھی نہیں ہوتی۔ ہم نے اکٹھے رہنا ہے۔"

"یہ باتیں کرنے کی یہ جگہ نہیں" — میں نے کہا — "گاؤں والوں

کا شور تمہیں سنائی نہیں دے رہا؟ ... میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ میں دوست بنایا کرتا ہوں دشمن نہیں۔ میرے ساتھ دوستی رکھنا۔"



ہم سب گھوڑیوں پر سوار ہوتے اور چل پڑے۔ گاؤں کے لوگ ہمارے تعاقب میں آنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ یہ واردات کسی بڑے ڈاکو کی ہے اور ڈاکوؤں کے پاس بندوقیں اور پستول ہیں، پھر بھی ہمیں زیادہ نہیں رُکنا چاہیے تھا۔ نوراللہ لڑکی کو پیچھے بٹھائے ہم سے آگے جا رہا تھا۔

"اس لڑکی کا کیا کرو گے؟" — مَیں نے دیبا کے ساتھیوں سے پوچھا۔

"اس کے سُسر سے اس کی قیمت مانگیں گے" — ایک نے جواب دیا۔

"قیمت نہ ملی تو؟"

"اسے بیچ دیں گے" — مجھے جواب ملا — "دیکھو تو کتنی قیمتی لڑکی ہے۔ یہ اتنی خوبصورت نہ ہوتی تو ہم یہ وزن اپنے ساتھ نہ لاتے۔ اتنی حسین لڑکی پہلے کبھی دیکھی ہے؟ ... تم اس کے محافظ کیوں بن گئے ہو؟"

"پکڑے جانے کے ڈر سے!" — میں نے جواب دیا — "اس کی قیمت مانگو گے تو پکڑے جانے کا خطرہ زیادہ ہوگا۔ میں یہ کام ایک بار کر چکا ہوں۔ ایک انگریز کی نوجوان بیوی کو ڈاک بنگلے سے اغوا کیا تھا اور پولیس کو خفیہ اطلاع دی تھی کہ اتنی رقم دو اور اپنی عورت لے جاؤ۔ رقم آگئی لیکن ساتھ ہی پولیس بھی آگئی اور پولیس کے ساتھ فوج بھی تھی۔ یہ تو ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہم نکل آتے تھے۔ ہماری پوزیشن پہاڑیوں کی وجہ سے اچھی تھی اور پیچھے دریا تھا۔ ہمارا ایک ساتھی وہیں رہ گیا تھا۔ مارا گیا ہوگا۔ نوابزادہ انور نوراللہ میرے ساتھ تھے۔ ہم وہیں سے جدا ہوتے تھے اور اتنی مدت بعد ملے ہیں۔"

"اسے بیچنے میں تو کوئی خطرہ نہیں" — ان میں سے ایک اور

نے کہا۔

"ہماری نشاندہی ہو سکتی ہے" — میں نے کہا۔

"ہم اسے بازار میں تو نہیں بیچیں گے" — اُس نے کہا — "کسی نواب کو دیں گے اور جھولی بھر کر رقم لیں گے۔"

"اور کچھ دن تو استاد دیبا اسے اپنے پاس رکھے گا" — میں نے کہا — "ایسی نوجوان اور حسین لڑکی کو وہ شاید اپنے پاس ہی رکھ لے گا۔"

"نہیں!" — مجھے جواب ملا — "وہ بھی کچھ کچھ تم جیسا ہی ہے۔ کہا کرتا ہے کہ عورت پر اور کمزور آدمی پر ہاتھ نہ اُٹھاؤ ..... یہ لڑکی تو ہمارا اپنا مال ہے۔"

میں نے ہنس کر ٹال دیا لیکن یہ ارادہ میرا ایمان بن گیا تھا کہ اس لڑکی کو ان کے پاس نہیں رہنے دوں گا۔ میں اُن کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا گیا اور ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ دیبا اور حمید اللہ خان جاگ رہے تھے۔

مال دیبا کے آگے رکھ دیا گیا جو اُس نے کھول کر دیکھا تو اُس کا چہرہ چمک اُٹھا۔

"ایک ہیرا ابھی لاتے ہیں اُستاد!" — اُس کے ایک آدمی نے کہا — "باہر ہے۔"

"تم باز نہیں آتے!" — دیبا نے بات سمجھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا — "لاؤ اسے!"

لڑکی کو اندر لایا گیا تو دیبا نے لڑکی کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"یہ تو کنواری لڑکی ہے" — دیبا نے کہا — "اِسے کیوں اُٹھا لاتے ہو؟"

"ساہوکار کی بہو ہے اُستاد!" — اس کے ایک آدمی نے کہا — "کیوں لڑکی؟ شادی کب ہوئی تھی؟"

"چار مہینے ہوتے ہیں" — لڑکی نے جواب دیا۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

دیبا نے اپنے آدمیوں کو ایسی نظروں سے دیکھا جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اُسے اُن کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ اُس نے کہا کہ لڑکی کو دوسرے کمرے میں بٹھایا جائے۔ ایک آدمی اُسے اپنے ساتھ لے جانے لگا تو لڑکی نے تڑپنا شروع کر دیا۔ وہ کچھ اور سمجھ رہی تھی۔

"چلی جاؤ" — دیبا نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — "اُس کمرے میں اور کوئی نہیں جائے گا۔"

لڑکی اُس آدمی کے ساتھ چلی گئی اور وہ آدمی واپس آگیا۔ میری طرح دیبا نے بھی اُن سے پوچھا کہ وہ لڑکی کا کیا کریں گے۔ انہوں نے وہی جواب دیا جو مجھے دیا تھا۔

"استاد!" — ان میں سے ایک نے کہا — "ہمیں اور کچھ نہ دو، یہ لڑکی دے دو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم نے ہم سے یہ واردات کیوں کرائی ہے۔ تم یہ مال ان کے لئے رکھنا چاہتے ہو۔ یہ مال انگریزوں کے خلاف استعمال ہوگا۔ ہم اس میں سے کچھ نہیں لیں گے۔ اس لڑکی کو ہم اپنے لئے لاتے ہیں۔"

"تم کیا کہتے ہو بھائیو!" — دیبا نے حمید اللہ خان، اور نور اللہ سے مخاطب ہو کر پوچھا — "میں اپنے اڈے کو بے برکت نہیں کروں گا۔"

اُن تینوں نے دیبا کی منت سماجت شروع کر دی۔ وہ کہتے تھے کہ انہوں نے اتنا زیادہ خطرہ مول لے کر اتنی بڑی اسامی پر ہاتھ مارا ہے۔

"میری مانو استاد!" — میں نے کہا — "اگر یہ لڑکی کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں تو انہیں کرنے دو۔ بیچنا چاہیں تو بیچنے دو لیکن لڑکی جتنے دن یہاں ہے یہ میرے ساتھ رہے گی۔"

"تم کہاں کے صوفی یا ولی ہو؟" — دیبا نے طنزیہ کہا۔

"یہ صوفی بھی نہیں ولی بھی نہیں" — حمید اللہ نے کہا — "لیکن

عورت کے معاملے میں یہ پتھر یا برف ہے۔"

"ہاں اُستاد!" — نوراللہ نے ہنستے ہوئے کہا — "اس کی شادی ہوگئی تو اس کے بچے کوئی اور ہی پیدا کرے گا۔ بیوی کو بھی ماں بہن بنا کر رکھے گا۔"

"اِس معاملے میں اس نے ہمیں کئی بار پریشان کیا ہے" — حمیداللہ خان نے کہا اور کچھ واقعات سنا دیئے۔

"کبھی تمہیں اپنی زندگی کی کہانی سناؤں گا دیبا اُستاد!" — میں نے کہا — "مجھ سے ایک بھُول ہو چکی ہے اور آج تک سزا بھگت رہا ہوں۔ ایک بڑی خوبصورت عورت پر نیت خراب کی اور اُسے ایک کمزور عورت سمجھ لیا تھا مگر وہ مجھ سے زیادہ طاقت والی نکلی۔"

میں نے اُسے گلشن آرا کا پورا واقعہ سُنا دیا۔ اُس رات کی پوری واردات سنائی جس رات ایک گاؤں میں گلشن آرا میرے ساتھ اکیلی تھی۔

"وہ دریا میں ڈوب کر اُبھری تو خدا کے زیادہ قریب ہوگئی" — میں نے کہا — "اور میں اُبھر اُبھر کر ڈوبتا ہوں۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ خدا نے مجھے ایک ایسی طاقت دی ہے جو پہاڑوں کو ریزہ ریزہ اور پتھر کو موم کر سکتی ہے لیکن گناہ کے صرف ارادے نے مجھ سے یہ طاقت چھین لی۔"

"پھر اس لڑکی کو تم اپنے ساتھ رکھو" — دیبا نے کہا اور اپنے آدمیوں سے پوچھا — "اب تم بتاؤ کہ اس لڑکی کی قیمت کس طرح وصول کروگے؟"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اُستاد!" — اُس کے ایک آدمی نے کہا — "لڑکی ہمارے پاس رہنے دو۔"

"میں نے کہہ نہیں دیا کہ لڑکی تمہارے پاس نہیں رہے گی؟" — دیبا نے کہا — "یہی بہت ہے کہ میں نے تمہیں اجازت دے دی ہے

کہ اس لڑکی کی قیمت وصول کرلو، لیکن مجھ سے پوچھے بغیر اپنی ترکیبیں نہ لڑانا ورنہ ہم سب کو لے ڈوبو گے۔"

"ہم اتنے کچے تو نہیں اُستاد!" — ایک نے کہا — "وہاں ہمیں ایک نہ ایک آدمی تو چھوڑنا ہی پڑے گا جس نے روز بروز یہ خبریں دینی ہیں کہ پولیس کیا کر رہی ہے۔ اس آدمی کو ایک رُقعہ لکھ کر دیں گے کہ بیس ہزار روپیہ دو اور لڑکی لے لو۔ یہ تسلی رکھو کہ لڑکی جب تک ہمارے پاس ہے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی اور اگر تم نے ہمیں رقم ادا نہ کی تو لڑکی کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے بیچ دیں گے۔ تمہاری عزت اسی میں ہے کہ اپنی لڑکی کو خود ہی خرید لو۔"

"وہ رقم کہاں پہنچائے گا؟" — دیبا نے پوچھا — "اور کس طرح پہنچائے گا؟ یہ سوچ کر مجھے جواب دو کہ وہاں دیہاتیوں کے لباس میں پولیس بھی پہنچ سکتی ہے۔"

"اس سوال کا جواب تم خود دو اُستاد!" — اُس کے آدمی نے کہا — "تم کس چیز کے اُستاد ہو۔"

"میں سوچ کر بتاؤں گا" — دیبا نے کہا — "اب جاؤ اور سو جاؤ... اور تم سکندر! لڑکی کے کمرے میں چلے جاؤ۔"

میں جب لڑکی کے کمرے میں داخل ہُوا تو وہ یوں سُکڑنے لگی جیسے بھیڑ بھیڑیے کو دیکھ کر اور بھاگنے کا راستہ نہ پا کر سُن سی ہو جاتی ہے۔

ہم ساری رات کے جاگے ہُوئے تھے۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ میری آنکھ کھُلی تو آدھا دن گزر چکا تھا۔ لڑکی چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ اُس نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔ اُس نے بتایا کہ ایک ادھیڑ عمر عورت آئی تھی جس نے اُس سے پوچھا تھا کہ کھانے کے لئے کچھ لے آئے؟ اس لڑکی نے سر ہلا کر انکار کر دیا تھا۔ میں باہر نکلا اور ایک آدمی سے کہا کہ وہ ہمارے لئے کچھ لے آئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد پراٹھے اور دُودھ کے دو پیالے آ گئے۔ میں

نے لڑکی سے کہا کہ کچھ کھا پی لے، لیکن وہ یوں بیٹھی رہی جیسے اُس نے سُنا ہی نہ ہو۔ یہ خوف کا اثر تھا۔ اُسے مجھ پر اتنا اعتبار کرنا بھی نہیں چاہیئے تھا۔ میں نے اُس سے اُس کا نام پوچھا تو اُس نے لیلاوتی بتایا۔

"دیکھو لیلا!" —— میں نے کہا —— "تم ڈرتی رہو، روتی رہو، سوائے اپنے آپ کو کھانے کے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم جس بات سے ڈرتی ہو وہ ہونی ہوتی تو رات کو ہی ہو جاتی۔ میں نے تمہاری طرف دیکھا تھا اور میں سو گیا تھا۔ میں نے تمہیں ان لوگوں سے بچا کے رکھا ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ اُٹھی اور میری چارپائی پر آ بیٹھی۔ میرے کہنے پر اُس نے کھانا پینا شروع کیا، لیکن بار بار میرے مُنہ کی طرف دیکھتی تھی۔ پھر اُس نے تیزی سے کھانا شروع کر دیا۔

"یہ پراٹھے مسلمان عورت کے ہاتھ کے پکے ہوئے ہیں؟" —— لیلا نے پوچھا۔

اُس کے اس سوال سے مجھے خیال آیا کہ ہندو مسلمانوں کو اتنا ناپاک سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاتھ کا کھانا تو دُور کی بات ہے کسی ہندو کے جسم کے ساتھ کسی مسلمان کا ہاتھ لگ جاتے تو وہ نہانا ضروری سمجھتا ہے کیونکہ اس طرح اُس کا جسم ناپاک ہو جاتا ہے۔ میں جس دَور کی بات سنا رہا ہوں اُس وقت ہندو اس معاملے میں کٹّر تھے۔

"لیلا!" —— میں نے اُس سے پوچھا —— "کیا یہاں بھی تم مسلمانوں کو ملیچھ سمجھو گی؟"

"نہیں" —— اُس نے بڑی زور سے سَر ہلا کر کہا —— "تم سمجھے نہیں۔ میں نے اس لئے پوچھا ہے کہ اس قسم کے پراٹھے صرف مسلمانوں کے گھروں میں پکتے ہیں اور اتنا دُودھ مسلمان ہی پیا کرتے ہیں۔"

"تم اتنے بڑے ساہوکار کی بہو تھیں" —— میں نے کہا —— "کھانے پینے کی تو تمہیں کوئی کمی نہیں ہو گی۔ تمہارا باپ بھی تمہارے سُسر جیسا سیٹھ ہوگا۔"

"میرے سُسر کے پاس دولت ہی دولت ہے، دل نہیں" —— لیلا نے کہا —— "وہاں چھوٹے چھوٹے خشک پُھلکے، دالیں اور سبزیاں پکتی ہیں۔ گوشت کھانے کو پاپ سمجھتے ہیں۔ صبح چھوٹی چھوٹی پُوریاں پکتی ہیں ..... تم نے میرے باپ کو دولت مند کہا ہے۔ وہ دولت مند نہیں۔ یہ سمجھ لو کہ خوشحال ہے۔ نہ کسی سے کچھ لینا نہ کسی کا کچھ دینا۔ میرے سُسرال کے مقابلے میں تو میرا میکہ بھکاری سا لگتا ہے۔"

"پھر یہ شادی کیسے ہوئی؟"

"میں اس کے بیٹے کو پسند آ گئی تھی" —— اُس نے جواب دیا —— "میرا باپ اتنے امیر کبیر گھر میں مجھے نہیں دینا چاہتا تھا، لیکن کاروبار کے معاملے میں میرا باپ اس ساہوکار کا مقروض ہو گیا تھا۔ سُود پہ سُود چڑھ رہا تھا۔ میرے سُسر نے میرے باپ سے کہا کہ وہ پہلے قرض کا سُود معاف کر دے گا اور میری شادی کے اخراجات اور جہیز کے لئے مزید قرض دے گا۔ میرا باپ اس لالچ میں آ گیا اور مجھے اس گھر میں بیاہ دیا..... میں نے اتنا اچھا کھانا کبھی نہیں کھایا تھا۔"

"اگر تم نے گوشت نہیں کھایا تو پھر اس دنیا میں کیا لینے آئی تھیں" —— میں نے ہنستے ہوتے کہا۔

"میں نے گوشت کھایا ہے" —— اُس نے کہا اور نمایاں طور پر چونک پڑی اور بولی —— "نہیں ..... میں نے ویسے ہی کہہ دیا ہے۔ میں نے کہاں گوشت کھایا ہو گا۔"

میں بھی ہنس پڑا۔ اُس نے یقیناً گوشت کھایا تھا۔ یہ بات اُس کے مُنہ سے نکل گئی تھی، لیکن اُس پر ہنسی کا پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں سمجھ گیا۔ ایسا ہوتا تھا کہ کسی ہندو لڑکی کے تعلقات کسی مسلمان کے ساتھ ہو جاتے تھے تو وہ چوری چُھپے لڑکی کو گوشت ضرور کھلاتا تھا۔ لیلا نے بھی اسی طرح کبھی گوشت کھایا ہو گا، لیکن میں اس بات کو گول کر گیا۔

"یہاں میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟" — اُس نے پوچھا پھر کچھ سوچ کر بولی — "تم بھی تو اتنے نیک نہیں ہو سکتے۔"

"کیا تمہارا سسر تمہیں یہاں سے چھڑانے کے لئے بیس ہزار روپیہ دے دے گا؟" — میں نے پوچھا۔

"بیس پیسے بھی نہیں دے گا" — لڑکی نے فوراً جواب دیا — "اُسے کوئی کہہ دے کہ اپنی اس بوڑھی بیوی کے دو روپے لے لو اور یہ ہمیں دے دو تو وہ بیوی کو گھر سے نکال دے گا اور دو روپے لے کر اُس تجوری میں رکھ دے گا جو تم لوگوں نے توڑی ہے ..... تم نے یہ کیوں پوچھا ہے؟"

"یہ لوگ تمہاری قیمت لے کر تمہیں چھوڑیں گے" — میں نے جواب دیا۔

"اگر انہیں قیمت نہ ملی تو کیا ہوگا؟"

"میں ابھی کچھ بتا نہیں سکتا" — میں نے جواب دیا — "لیکن میں تمہیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

اُس کے آنسو نکل آئے اور اُس نے سر جھکا لیا۔ میں نے اُس کی ٹھوڑی اُوپر اُٹھائی۔

"میں نے تمہیں کہا ہے کہ رو رو کر اپنے آپ کو پریشان نہ کرو" — میں نے کہا۔

"تم نہیں سمجھتے" — اُس نے کہا — "اب میں واپس چلی جاؤں تو مجھے سسرال والے گھر میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ کہیں گے کہ یہ مسلمانوں کے پاس رہ آئی ہے اس لئے کسی ہندو گھر میں داخل ہونے کے قابل نہیں رہی۔ اگر انہیں یقین دلایا جائے کہ مجھے ہندو لے گئے تھے تو بھی وہ نہیں مانیں گے۔"

"تمہارا خاوند تو بہت پریشان ہوگا" — میں نے کہا — "تم جیسی خوبصورت لڑکی کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کے لئے ....."

"میرے خاوند کی بات کرتے ہو" — اُس نے کہا — "وہ مجھ جیسی کئی لڑکیوں کے ساتھ کھیل چکا ہے، لیکن لڑکیاں کون سی؟ ..... نوکرانیاں اور اُن غریب لوگوں کی لڑکیاں جو ان کے مقروض ہیں۔ ان کے گھر صرف وہ نوکرانی ٹھہرتی تھی جو چال چلن کی انہی جیسی ہوتی تھی۔ میرے خاوند کی ہمیشہ کوشش رہتی ہے کہ نوکرانی جوان ہو اور شکل وصورت چاہے کیسی ہی ہو۔ اگر یہ شخص اتنا دلیر اور جوان مرد ہوتا تو اُس کے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی، وہ تمہیں گولی مار دیتا، لیکن وہ گولی چلانے سے ڈرتا تھا پھر اُس نے تم سے پستول اور پیٹی پھینکوا لی، لیکن خود آگے ہو کر پستول اور پیٹی اُٹھانے کی بجائے اُس نے مجھے کہا کہ تم آگے ہو کر اُٹھاؤ۔ میں تو آگے جانے سے ڈرتی تھی، لیکن میں اُس سے بھی ڈرتی تھی ..... سچ پوچھتے ہو، یہ شخص مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔"

اُس نے بے تکلفی سے اور بلا جھجک بولنا شروع کر دیا تھا، لیکن میں ابھی اُس پر بھروسہ نہیں کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس حالت میں لڑکی یہ کیوں کہہ رہی ہے کہ اُسے اپنا خاوند اچھا نہیں لگتا۔ وہ دراصل یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں اُسے اچھا لگتا ہوں۔

"تم سے ایک بات پوچھوں؟" — اُس نے کہا — "تم میرے اتنے ہمدرد بن گئے ہو ..... کیوں؟ مجھے کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ تم تو ڈاکو ہو۔"

"ایسے سوالوں کے جواب زبانی نہیں دیئے جا سکتے" — میں نے کہا — "تمہیں خود پتہ چل جائے گا ..... میں جانتا ہوں تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں اور میری بات پر عمل کرنا کہ یہاں کسی اور کے ساتھ اس طرح باتیں نہ کرنا جس طرح تم نے میرے ساتھ کی ہیں۔ اسی کمرے میں رہنا۔ زیادہ سے زیادہ اس صحن میں چل پھر لینا۔ میرے سوا اس کمرے میں اور کوئی نہیں آئے گا۔"



میں دیبا کے پاس چلا گیا۔ حمید اللہ اور نور اللہ بھی اُس کے پاس

بیٹھے ہوتے تھے۔ اُنہوں نے اس لڑکی کے متعلق میرے ساتھ مذاق کئے۔ اس طرح کچھ دیر رات کی واردات کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ایک آدمی کو واردات والے گاؤں بھیج دیا گیا ہے۔ وہ رات کو کسی وقت واپس آکر پولیس کی کارگزاری سناتے گا۔

اتنے میں ایک آدمی آگیا۔ وہ اُس گاؤں میں گیا ہوا تھا جو "سائیں کراماتاں والے" کا گاؤں مشہور تھا۔

"ہاں بھائی!" — دیبا نے اُس سے پوچھا — "وہاں کیا حالات ہیں؟"

"ٹھیک ہی معلوم ہوتے ہیں" — اُس نے جواب دیا — "لیکن ہوشیار اور چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ وہاں پولیس آئی تھی۔ اُسی شام انگریز پولیس کپتان بھی آیا تھا۔ پولیس نے سائیں کراماتاں والے کے گھر کی تلاشی لی تھی۔ پورا ایک دن اسی مکان کے ایک کمرے میں نمبردار سے تفتیش ہوتی رہی۔ نمبردار جب باہر نکلا تو اُس کی حالت بتاتی تھی کہ اُس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوا۔ پولیس نے اُس کی ہڈیاں ٹھونکی تھیں۔ ساری رات پولیس مُشتبہوں کو اس مکان میں باری باری بلا کر پوچھ گچھ اور مار پٹائی کرتی رہی۔ اگلے دن بھی یہ سلسلہ چلا۔ پولیس کپتان تو چلا گیا تھانیدار پولیس کی گارد کے ساتھ وہیں رہا اور اُس سے اگلے روز وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اس طرف دُور تک آیا جس طرف سے ہمارے یہ بھائی بند آتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے آگے تھانیدار کو اور کوئی کُھرا کھوج نہیں ملا۔ اس لئے واپس چلا گیا۔ رات کو پولیس واپس چلی گئی ہے۔"

"گاؤں کے لوگ کیا کہتے ہیں؟" — دیبا نے اس آدمی سے پوچھا۔

"جتنے مُنہ اتنی باتیں" — اُس نے جواب دیا — "زیادہ تر لوگ تو کہتے ہیں کہ انگریز بادشاہ کو دیکھو کہ ہمارے پیروں کے دربار میں جوتیوں سمیت پھرتے رہے۔ چند ایک لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ سائیں کراماتاں والا بڑا استاد نوسرباز تھا۔ یہ باتیں کرنے والے ہندو اور سکھ ہیں۔"

میں نے اس آدمی سے کچھ باتیں پوچھیں۔ اس سے مجھے تسلی ہو

گئی کہ سلطان احمد محفوظ ہے اور اس پر کوئی شُبہ نہیں ہُوا۔ میرے پوچھنے پر اس آدمی نے بتایا کہ گاؤں میں یہ بات بھی سُنی گئی کہ سائیں کراماتاں والے کے پاس ایک مفرور ڈاکو اور قاتل آیا تھا اور یہ بات ایک سی آئی ڈی کے تھانیدار نے معلوم کی تھی۔ سی آئی ڈی کا یہ تھانیدار بھیس بدل کر سائیں کراماتاں والے کا مُرید بننے آیا تھا۔ اُس نے معلوم کر لیا کہ یہ لوگ جعلی پیری مُریدی کر رہے ہیں۔ دراصل انہوں نے اس جگہ کو اپنا اڈہ بنا رکھا تھا۔

سی آئی ڈی کا یہ تھانیدار سلطان احمد تھا۔ سلطان احمد ذہین آدمی تھا۔ اس میں فہم و فراست کی کمی نہیں تھی لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس میں ایثار کا جذبہ اتنا زیادہ ہے کہ اپنی نوکری کو، اپنی بیوی اور بچے کو بھی داؤ پر لگا دے گا۔ اگر وہ مجھے پکڑوا دیتا تو اُسے دس ہزار روپیہ انعام کے علاوہ ترقی بھی مل جاتی۔ میں نے اُس سے اتنی زیادہ قربانی نہیں مانگی تھی، لیکن اُس نے قربانی دی اور مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں اُسے اس قربانی کا صلہ دینے کے قابل نہیں تھا۔

دیبا کے آدمی نے کہا تھا کہ پولیس کے مُخبر اور سی آئی ڈی کے آدمی اس علاقے میں گھومتے پھرتے رہیں گے۔ دیبا نے اس کا یہ بندوبست کیا کہ تین چار آدمیوں سے کہہ دیا کہ اس گاؤں کے اردگرد کوئی بھی آدمی ملے تو اُس سے پوچھو کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ اگر اُس پر شک ہو تو اُسے پکڑ کر اُس کی آنکھوں پر کپڑا باندھو اور یہاں لے آؤ۔

یہاں میں ایک بات کہنا چاہوں گا۔ میں دیبا کے متعلق اس طرح بات کر رہا ہوں جیسے وہ اس علاقے کا سلطان تھا یا وہ نواب تھا اور اُسے کسی کا ڈر نہ تھا۔ وہ ڈاکوؤں کے بڑے تجربہ کار اور خطرناک گروہ کا سردار تھا اور وہ مجرم تھا۔ اُس کے اپنے انتظامات ایسے تھے کہ وہ پکڑا نہیں جاتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ چھپا ہُوا تھا اور اُس پر ہر وقت گرفتاری اور بڑی لمبی سزا تے قید اور سزا تے موت کا آسیب طاری رہتا تھا۔

ایک ایسے ساہوکار کا گلا کٹ جانا جو اثر و رسوخ والا بھی تھا معمولی سی واردات نہیں تھی۔ اُس وقت تو معمولی وارداتوں کی تفتیش بھی تن دہی سے ہُوا کرتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس علاقے کے تھانیدار کی جان پر بنی ہوتی ہوگی، علاقہ ڈی ایس پی بھی آیا تھا اور تھانیدار جو ہندو تھا، گاؤں والوں کے لئے وحشی بنا ہُوا تھا۔ اُسے جس پر ذرا سا بھی شُبہ ہوتا تھا اُسے نمبردار کی ڈیوڑھی میں بند کر کے بے دردی سے زدوکوب کرتا تھا۔

تھانیدار نے دو آدمیوں اور ایک نوکرانی کو پکا مشتبہ بٹھایا ہُوا تھا۔ ان دو آدمیوں میں ایک ساہوکار کے گھر کا نوکر تھا اور دوسرا آدمی جو ابھی نوجوان تھا لیلا کا بھائی تھا۔ لیلا کا میکہ اسی گاؤں میں تھا۔ لیلا کے بھائی کا نام رمیش تھا۔ اُسے اس لئے پکڑا گیا تھا کہ وہ آوارہ اور بدمعاش تھا۔ اُس کا یارانہ رجسٹرڈ بدمعاشوں کے ساتھ تھا۔

ہمارا آدمی جو وہاں گیا تھا وہ رمیش کو جانتا تھا۔ جاننے کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا آدمی بھی کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ وہ بدمعاش اور پیشہ ور مجرموں کی دنیا کا آدمی تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ رمیش کس پائے کا بدمعاش ہوگا۔ اس اندازے کے ساتھ مجھے حیرت ہوئی کہ ایک ہندو ایسا بدمعاش کس طرح بن گیا کہ پولیس نے اُسے ڈکیتی کے شُبے میں پکڑ لیا؛ اس کا باپ پکا ہندو اور پکا بنیا تھا۔ یہ تو مرمٹ کر گزارہ کرنے والی نسل تھی۔

"وہ تو مسلمانوں میں جنا پلا تھا" -- ہمارے آدمی نے بتایا -- چھوٹا سا تھا تو اُس نے مسلمانوں کے بچوں کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ یہ مسلمان کسانوں کے بچے تھے۔ رمیش ان کے ساتھ کھیتوں میں چلا جاتا تھا اور سارا سارا دن ان کے ساتھ رہتا۔ اس کا باپ اُسے گھسیٹ گھسیٹ کر گھر لے جاتا اور اُسے مارتا پیٹتا بھی تھا۔ بچہ اور زیادہ ڈھیٹ ہوگیا۔"

میں ساری بات سمجھ گیا۔ میں پولیس میں رہا تھا اور پھر میں ڈاکوؤں، رہزنوں اور نوسربازوں کی دنیا میں آ گیا۔ میں نے ایسے چند ایک بڑے خطرناک دس نمبریئے بدمعاش دیکھے تھے جو ہندو تھے۔ ہندو کی یہ فطرت

ہے کہ وہ بے وفا، بددیانت، فریب کار اور مکار ہوتا ہے بدمعاش نہیں ہوتا۔ بدمعاشی کے لئے جرأت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہندوؤں میں نہیں ہوتی۔ ہندو لاٹھی اور کلہاڑی نہیں چلایا کرتا، وہ زمین کے نیچے سے وار کر کے زمین کے نیچے نیچے کہیں غائب ہو جاتا ہے۔

میں نے جتنے بھی (جو اتنے زیادہ نہیں تھے) ہندو دس نمبریئے بدمعاش اور ڈاکو دیکھے ہیں وہ بچپن سے ہی مسلمانوں یا سکھوں کی طرف مائل ہو گئے تھے اور ان میں گھُل مل گئے۔ بدمعاش وہ اس طرح بنے کہ مسلمانوں اور سکھوں کی دوستی سے اُن کے ذہنوں میں وسعت پیدا ہوتی اور ان کے باپوں بھائیوں اور سرکردہ ہندوؤں نے انہیں مارا پیٹا۔ بعض کو مندروں میں پنڈتوں کے پاس لے گئے۔ اس طرح ان لوگوں نے اُن کے دلوں میں اپنے خلاف نفرت پیدا کی بلکہ اپنے مذہب کے خلاف نفرت پیدا کی اور وہ باغی ہو گئے۔

میں نے شنکر نام کا ایک ہندو دیکھا تھا جس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے باپ کا نہیں بلکہ ایک سکھ کا بیٹا ہے۔ دلچسپ یہ ہے کہ اُسے یہ بات اُس کے باپ نے یعنی اُس کی ماں کے اصل خاوند نے بتائی تھی۔

میں اب رمیش کی طرف آتا ہوں۔ وہ لیلا کا بدمعاش بھائی تھا اور اونچے درجے کا بدمعاش تھا۔ ہمارے آدمی نے بتایا کہ رمیش کو رات کو ہی پتہ چل گیا تھا کہ اُس کے بہنوئی کے گھر ڈاکہ پڑا ہے اور اُس کی بہن اغوا ہو گئی ہے۔ رمیش اپنے بہنوئی کے گھر گیا۔ اس کے ساتھ رمیش نے جو باتیں کیں وہ معلوم نہیں کیا ہوں گی۔ صبح ہوئی تو وہ للکار للکار کر کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے بہنوئی کے گھر کا پورا مال واپس لائے گا مگر بہنوئی نے اُس کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اُسی کو مشتبہ لکھوا دیا اور پولیس نے اُسے بٹھا لیا۔

وجہ یہ ہوئی کہ لیلا کی شادی ساہوکار کے بیٹے سے ہوئی تو رمیش نے اُس کے گھر جانا شروع کر دیا۔ لیلا کے خاوند اور خاوند کے باپ نے اُس کا اپنے گھر آنا جانا پسند نہ کیا اور لیلا سے کہا کہ وہ اپنے بھائی کو یہاں آنے

سے منع کر دے۔ لیلا نے رمیش کو یہ بات بتائی تو رمیش نے لیلا کے خاوند کے ساتھ بات کی۔ خاوند نے اُسے اپنے مقابلے میں غریب اور بدمعاش سمجھ کر اس پر رُعب جھاڑا اور اُسے یہ بھی کہا کہ وہ مسلمانوں اور سکھوں کا دوست ہے۔

اس مسئلے پر ان میں جھگڑا ہو گیا۔ رمیش بدمعاشی اور غنڈہ گردی پر اُتر آیا۔ لیلا کے سُسر نے اپنے آدمیوں سے رمیش کو پٹوا دیا پھر تھانے میں اُس کے خلاف ایسا طوفان کھڑا کیا کہ اُسے تھانے بلا کر پٹائی کی گئی۔ رمیش کو اس کا افسوس تو ہونا ہی تھا۔ اس نے لیلا کے خاوند اور سُسر کو للکار کر کہا تھا کہ وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لے گا۔

یہ واقعہ ڈاکے سے تقریباً ایک مہینہ پہلے کا تھا۔ ساہوکار نے اس پر شُبہ کرنا ہی تھا، تھانیدار نے بھی اُس پر شُبہ کیا اور اُسے بٹھا لیا بٹھانے کا مطلب یہ تھا کہ تھانے میں اُس کی ہڈیاں توڑی جا رہی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اُسے گھر بھیدی سمجھا رہا تھا۔ یہی سلوک گھر کے نوکر اور نوکرانی کے ساتھ ہو رہا تھا۔

اس کے علاوہ ہمارا آدمی یہ خبر لایا کہ پولیس گھوڑوں کے کھُروں کو دیکھتی دُور تک آئی تھی۔ ہم گھوڑیوں کے کھُرے تو نہیں چھپا سکتے تھے لیکن کھُروں کو راستے میں گم کرنے کا ہم نے انتظام کر لیا تھا۔ دیبا کا دماغ بہت تیز تھا۔ اُس نے واردات کے لیے جانے اور آنے کا جو راستہ بتایا تھا وہ ایک ندی تھی جس میں اُن دنوں اتنا ہی پانی تھا کہ گھوڑیوں کے گھٹنوں تک، کہیں اُن کے ٹخنوں تک پہنچتا تھا۔ یہ راستہ کم از کم تین میل لمبا ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ دو میل تو ندی کے اندر اندر جانا تھا۔

پولیس گھوڑیوں کے کھُروں پر آئی اور ایک جگہ یہ کھُرے گھاٹی اُتر کر ندی میں چلے گئے۔ کھوجی ندی کے پار گئے تھے مگر انہیں کوئی کھُرا نہ ملا۔ تھانیدار انہیں دُور تک لے گیا۔ اُس نے کہا کہ گھوڑے ندی کے اندر اندر گئے ہیں لیکن کئی جگہوں پر دیکھا۔ انہیں ہر جگہ مایوسی ہوئی۔

دیبا کے آدمیوں کو ڈیڑھ دو میل دُور ایک گھاٹی معلوم تھی جو ندی میں اُترتی تھی۔ وہ اس وجہ سے ہمارے لئے فائدہ مند تھی کہ قریبی گاؤں کے مویشی صبح وہاں سے اُترتے تھے۔ بھینسیں ندی میں بیٹھتیں اور انہیں اُوپر لے جاتے تھے۔ اُوپر پگڈنڈی تھی جس سے لوگ اور مویشی گزرتے تھے۔ رات کے کھُرے صبح کو مویشیوں اور لوگوں کے پاؤں کے نیچے لاپتہ ہو جاتے تھے۔

پولیس کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ واردات تجربہ کار ڈاکوؤں نے کی ہے اور انہوں نے کھُرے غائب کرنے کا پکا انتظام کیا تھا۔ نوکر، نوکرانی اور رمیش کو پولیس گھر بھیدی سمجھ رہی تھی۔ رمیش پر شک زیادہ تھا۔ گاؤں کے بعض آدمی یہ بھی کہتے تھے کہ رمیش نے خود ہی اپنی بہن کو غائب کیا ہے۔

ہمارے آدمی نے گاؤں میں کسی سے بھی دیبا کا نام نہیں سُنا۔



ہمارے اس آدمی کا اس گاؤں میں کوئی دوست تھا۔ یہ اُسے سہولت حاصل تھی۔ اُسے اگلے دن پھر بھیج دیا گیا۔

لیلا میرے ساتھ ہوتی تھی۔ اُس نے تین چار راتیں میرے ساتھ تنہا رہ کر دیکھ لیا تھا۔ اُسے یقین آ گیا تھا کہ میں اُس کے ساتھ وہ سلوک نہیں کروں گا جس کا اُسے ڈر تھا۔ اتنے دن میرے سوا کوئی آدمی اس کمرے میں ذرا سی دیر کے لئے بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے یہ دیکھا کہ وہ کبھی کبھی مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتی تھی۔ اب وہ میرے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتی تھی۔

"لیلا!" —— میں نے اُس کے گاؤں کی خبریں سُن کر رات کو اُس سے پوچھا —— "تمہارا بڑا بھائی بھی ہے!"

"ہاں، ہے" —— اُس نے کہا —— "تمہیں کس نے بتایا ہے؟ میں نے تو نہیں بتایا۔"

"کیسا آدمی ہے؟"

"پہلے یہ بتاؤ کیوں پوچھتے ہو" — لیلا نے پوچھا — "وہ خیریت سے تو ہے؟"

"بالکل خیریت سے ہے" — میں نے کہا — "ہمارے جاسوس تمہارے گاؤں میں موجود ہیں۔ انہوں نے تمہارے بھائی کا نام لیا تھا۔"

"مجھے ایک ڈر ہے" — لیلا نے کہا — "میرے خاوند اور خاوند کے باپ کے ساتھ میرے بھائی کی دشمنی تھی۔ وہ اسے اپنے گھر میں نہیں آنے دیتے تھے۔ لڑائی جھگڑا بھی ہوا تھا۔ انہوں نے میرے بھائی کو پٹوایا تھا پھر اسے تھانے بھی لے گئے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔"

"کیا تمہارے بھائی میں اتنی جرأت اور طاقت ہے؟"

"بہت!" — لیلا نے کہا — "مجھے خود یہ شک ہوا تھا کہ تم لوگوں کو میرا بھائی لایا ہے اور اس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔"

"پھر تو تم بھی اسے اچھا نہیں سمجھتی ہو گی" — میں نے کہا — "سنا ہے وہ مسلمانوں کا دوست ہے۔"

"میں تو اس پر اپنی جان بھی قربان کر دوں گی!" — لیلا نے کہا — "مجھے اس کی یہی بات اچھی لگتی ہے کہ وہ مسلمانوں کا دوست ہے۔ بدمعاشی میں وہ بہت بدنام ہو رہا ہے۔ پولیس کے ساتھ اس کی بڑی اچھی بات چیت ہے .... میں مسلمانوں کو اچھا سمجھتی ہوں۔"

اس نے مسلمانوں کی خوبیاں بیان کیں جو میں نے توجہ سے نہیں سنیں۔ وہ ہندو دل والی تھی۔ میرے دل پر اپنا اثر ڈالنا چاہتی تھی۔ اس کا یہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ وہ مسلمانوں کی اور میری تعریفیں کرے۔

میں نے اسے بتایا کہ اس کے بھائی کو پولیس لے گئی ہے۔ میں اس کے ساتھ زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ وہ بھی کم ہی بولتی تھی۔ اس رات اس نے اپنے بھائی کی بہت باتیں سنائیں۔ اسے اپنے بھائی کے ساتھ

اور بھائی کو اس کے ساتھ بہت محبت تھی۔ میں ویسے ہی ہوں ہاں کرتا رہا۔ اس کے بھائی کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں سو گیا۔



دو ایک دن اور گزر گئے۔

دیبا کے وہ تین آدمی جو لیلا کو اٹھا لاتے تھے دن کے وقت مجھے ملتے اور اس کے متعلق پوچھتے تھے۔ وہ میرے ساتھ لیلا کے متعلق اس طرح باتیں کرتے تھے جیسے میں نے اسے بیوی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ اس سلسلے میں مذاق نہیں کرتے تھے نہ شکایت کرتے تھے نہ یہ کہتے تھے کہ میں نے ان کے مال پر قبضہ جما رکھا ہے۔ انہوں نے فرض کر لیا تھا کہ اغوا کی ہوئی عورت کو جرائم پیشہ لوگ اپنی بہن بنا کر نہیں رکھا کرتے لہٰذا میں نے اس ہندو لڑکی کو اسی مقصد کے لئے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ وہ دیبا سے ڈرتے بھی کوئی شکایت نہیں کرتے تھے۔

وہ تجربہ کار ڈکیت تھے لیکن لیلا سے جس طرح وہ بیس ہزار روپیہ کمانا چاہتے تھے یہ ان کی عقل کی دسترس سے باہر تھا۔ ایک تو انہیں طریقہ نہیں آتا تھا۔ دوسرے یہ کہ بیس ہزار روپیہ معمولی رقم نہیں تھی۔ اس دور میں یہ تو کسی نواب کا خزانہ سمجھا جاتا تھا۔

"سکندر بھائی!" — ایک روز ان تینوں میں سے ایک نے جس کا نام جبار تھا، کہا — "لڑکی جب تک یہاں ہے اسے بے شک تم ہی اپنے پاس رکھو۔ عیش موج کرو۔ یہ ہمارے کچھ نہیں لگتی۔ ہمیں کوئی طریقہ بتاؤ جس سے ہمیں رقم مل جائے۔ اتنے تمہارے سامنے ہمیں اجازت دے دی تھی۔ عقل جو تم میں ہے ہم میں نہیں۔ ہم تمہارے متعلق پہلے اتنا ہی جانتے تھے کہ تم سی آئی ڈی کے انسپکٹر ہوا کرتے تھے اور ایک انگریز پولیس کپتان کو قتل کر کے مفرور ہو۔ کل نور اللہ نے تمہاری بہت ساری باتیں سنائی ہیں۔ تم تو کوہ قاف کے جن ہو .... کوئی طریقہ بتاؤ استاد!"

میں انہیں پہلے بھی اس سلسلے میں بہت کچھ بتا چکا تھا۔ اب پھر بتایا، اور زور دے کر کہا کہ اس کام میں پکڑے جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

"پھر اسے کہیں بیچ آئیں؟" — جھارے نے پوچھا۔

"نہیں!" — میں نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ بیچنے کے لئے میں تمہیں لڑکی نہیں دوں گا" — میں نے کہا۔

"ایسا تو نہ کرو استاد!"

"لڑکی واپس اپنے گھر چلی جائے تو مجھے بہت خوشی ہوگی" — میں نے کہا — "چاہے اس کا تمہیں ایک لاکھ روپیہ مل جاتے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ لڑکی کو مفت نہیں جانے دوں گا، لیکن اسے بکنے نہیں دوں گا .... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ دریا استاد بھی تمہیں یہ اجازت نہیں دے گا کہ لڑکی کو کسی کے ہاتھ بیچ دو۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے اڈے اور اپنے پیشے کے لئے یہ بہت بُرا شگون ہوگا۔"

"پھر اس کے باپ سے اس کی قیمت لینے کی کوشش کی جائے؟" — اس نے پوچھا۔

"ہاں!" — میں نے جواب دیا — "اس طریقے سے جتنے مرضی ہے پیسے کما لو، لیکن کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔ ابھی وہاں پولیس تفتیش میں بہت گرما گرمی دکھا رہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رُقعہ پھینکتے ہی پکڑے جاؤ .... اور سن لو جھارے، اگر تمہیں مجھ پر کوئی شک ہے تو ابھی لڑکی مجھ سے لے جاؤ، لیکن میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ تم لڑکی کو اس طرح نہیں رکھ سکو گے جس طرح میں نے رکھا ہوا ہے۔"

"نہیں سکندر!" — اس نے کہا — "تم نے لڑکی کو جس طرح بھی رکھا ہوا ہے، اپنے پاس ہی رکھو۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں کوئی سیدھا طریقہ بتا دو۔"

"پھر کچھ دن ٹھہر جاؤ۔"



اُسی رات کا ذکر ہے کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھا کر کمرے میں آیا تو لیلا لیٹی ہوئی تھی۔ اُسے اسی کمرے میں کھانا دیا جاتا تھا۔ وہ کھانے کے معاملے میں بہت ہی خوش تھی۔ اُس شام مختلف پرندے پکاتے گئے تھے جو گاؤں والوں نے جال سے پکڑے تھے۔ ایسے کھانے تو اس لڑکی نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

اُس رات میرا دماغ بہت ہی مصروف تھا۔ میں اُس روز اپنے متعلق کچھ زیادہ ہی سوچتا رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں میرے دل پر یہ خدشہ سا بیٹھ گیا تھا کہ میں ڈاکہ زنی کی اس واردات میں پکڑا جاؤں گا۔ اس کے ساتھ یوں ہُوا کہ سائرہ یاد آگئی۔ سائرہ تو ہر روز ہی یاد آتی تھی۔ میں لیلا کو دیکھتا تھا تو ایسے لگتا تھا جیسے کمرے میں سائرہ بھی موجود ہو۔ اُس روز سائرہ کچھ اس طرح یاد آئی کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ آج رات گھوڑی لے کر نکل جاؤں گا اور سائرہ کو دیکھ کر صبح سے پہلے پہلے واپس آجاؤں گا لیکن میں نے اپنے اس ارادے پر قابو پا لیا تھا۔

میں جب کمرے میں داخل ہُوا تو میری ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ لیلا کی طرف دھیان دیئے بغیر لیٹ گیا اور ذرا سی دیر بعد آنکھ لگ گئی۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی جس کی بتی مدھم کی ہوتی تھی۔

میری آنکھ کُھل گئی۔ مجھے کسی نے آواز دے کر یا ذرا سا ہلا کر جگایا تھا۔ آنکھ کھلی تو لیلا کو اپنی چارپائی کے بازو پر بیٹھے دیکھا۔ میری آنکھ کُھل چکی تھی۔ لیلا نے اپنا ایک ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا۔ مجھے سائرہ یاد آگئی۔

"تم سوئی نہیں تھیں؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں!"

"کیا بات ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"ڈر لگتا ہے" — اُس نے دبی دبی سی زبان میں کہا۔

"کیسا ڈر؟" — میں نے کہا — "یہاں کوئی جن بھوت نہیں اور یہ جو آدمی یہاں رہتے ہیں اس کمرے میں آنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے"۔

"نہیں" — لیلا نے کہا — "وہ ڈر میرے دل سے نکل گیا ہے۔ میں ڈری اس لئے ہوں کہ تم کمرے میں آتے اور چپ چاپ لیٹ گئے۔ میں سمجھی کہ ضرور کوئی بات ہے اور یہ میرے لئے اچھی نہیں ہو گی .... میرے ساتھ باتیں کرتے رہا کرو۔ تم ہی تم ہو۔ تم بھی چپ ہو گئے تو میں خوف سے ہی مر جاؤں گی"۔

"سو جاؤ" — میں نے کہا — "مت ڈرو۔ جب تک تم میرے ساتھ ہو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں"۔

"نہیں" — اُس نے کہا — "میرے ساتھ باتیں کرو۔ میں اپنی چارپائی پر چلی جاتی ہوں"۔

وہ اپنی چارپائی پر چلی گئی۔ مجھے اُس کی یہ حرکت اتنی اچھی لگی جیسے وہ کوئی نادان سا بچہ ہو۔ وہ جب میری چارپائی پر آ بیٹھی تھی تو میں کچھ اور سمجھ بیٹھا تھا۔ اُس کے اُٹھ جانے سے مجھے اطمینان ہوا۔ اُس کا یہ مطالبہ قدرتی تھا کہ اُس کے ساتھ باتیں کرتا رہا کروں۔

"آج تم کوئی بات سناؤ" — میں نے کہا۔

"میں کیا سناؤں؟" — لیلا نے مایوسی کے لہجے میں کہا — "میں تو اپنے متعلق سوچتی رہتی ہوں۔ اپنے تو لیکھ بھی اتنے بُرے لکھے گئے کہ جو لوگ بل کو اچھے نہیں لگتے تھے ماں باپ نے اُنہی کے حوالے

"تمہیں کوئی اور اچھا لگتا ہو گا" — میں نے ہنستے ہوئے کہا "لڑکا ہو یا لڑکی، ہر کسی کی اپنی پسند ہوتی ہے"۔

"اگر تمہیں بتاؤں گی تو تم نہیں مانو گے" — اُس نے کہا۔

"بتاؤ تو سہی" — میں نے کہا۔

"وہ ایک مسلمان ہے" — لیلا نے کہا — "ہمارے گاؤں سے کچھ دُور ایک اور گاؤں میں رہتا ہے"۔

اُس نے ایک مسلمان کا نام لیا۔ نام خلیل تھا۔ شادی سے ایک سال پہلے اس کی پہلی ملاقات خلیل کے ساتھ ایک خوفناک واقعہ کے ذریعے ہوئی تھی۔ لیلا لڑکیوں کے ساتھ ندی پر جایا کرتی تھی۔ یہ وہی ندی تھی جو آگے آ کر دُور ہٹ جاتی تھی اور واردات کی رات ہم اس میں سے گھوڑیاں گزار کر لاتے تھے۔ یہ ندی لیلا کے گاؤں کے قریب سے گزرتی تھی۔ ندی کے پار کچھ دُور خلیل کا گاؤں تھا۔

ایک صبح لڑکیاں ندی پر گئیں۔ اُوپر کہیں بارش ہوتی ہو گی۔ اچانک پانی کا ریلا آ گیا۔ اتنی تیزی سے پانی کی سطح بلند ہوئی کہ ان میں سے دو تین لڑکیاں جو کنارے کے قریب تھیں دوڑ کر گھاٹی پر چڑھ گئیں لیکن دو لڑکیاں ندی ہی میں رہیں۔ وہاں پاٹ تنگ اور کنارے دیواروں کی طرح اُونچے تھے۔ دونوں طرف گھاٹیاں تھیں جہاں سے لوگ اوپر نیچے آتے جاتے تھے۔ لڑکیاں ریلے میں بہنے اور ڈوبنے اور چیخنے چلانے لگیں۔ عین اُس وقت ایک نوجوان گھوڑی پر سوار گھاٹی پر نمودار ہوا۔ اُس نے گھوڑی سے چھلانگ لگائی اور اسی طرح اُوپر سے پانی میں کُود گیا۔ اُس وقت تک وہ پانی جو بڑا اچھا لگتا تھا اور گھٹنوں تک گہرا تھا، طغیانی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

یہ نوجوان دو لڑکیوں کو نکال کر لے آیا، لیکن اُس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ کسی درخت کا ٹوٹا ہوا ٹہن یا خشک لکڑی ہو گی جس پر اُس کا ماتھا لگا ہو گا۔

دونوں لڑکیاں بے ہوشی کی حالت میں تھیں۔ اُن کے پیٹ میں پانی اتنا نہیں گیا تھا جتنا اُن پر سیلاب کی دہشت کا اثر تھا۔ یہ نوجوان دونوں کو اپنے کندھوں پر ڈالے ہوتے گاؤں میں لے گیا۔ سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا اور اس نوجوان کی ہندوؤں نے بڑی خاطر و مدارت کی اور اس کے زخم پر

پٹیاں وغیرہ بھی باندھیں۔ گاؤں کے لوگ اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ خلیل تھا اور اپنے گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار کا بیٹا تھا بلکہ مسلمانوں میں سب سے بڑی زمینداری اسی کے باپ کی تھی۔ خلیل اُس زمانے کے مردانہ حسن اور جسم کا ایک نمونہ تھا۔ لیلا نے مجھے بتایا کہ دونوں لڑکیوں کے باپ خلیل کو انعام کے طور پر پیسے پیش کر رہے تھے۔ خلیل نے ہنس کر انعام نہ لیا۔ اُس کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔

جب خلیل لڑکیوں کو ندی سے نکال کر لایا تھا تو جو لڑکیاں پہلے ہی ندی سے نکل کر آ گئی تھیں اُن میں سے صرف لیلا وہاں موجود تھی۔ باقی دو لڑکیاں گاؤں کو بھاگ گئی تھیں۔ اس طرح لیلا خلیل کے قریب رہی تھی۔ اُس وقت خلیل کی عمر بائیس تیئس سال تھی۔ دونوں بے ہوش لڑکیوں کو اُس کے کندھے پر ڈالنے میں لیلا نے اُس کی مدد کی تھی۔

خلیل لیلا کے گاؤں کی طرف سے جا رہا تھا۔ لیکن ندی میں طغیانی کی وجہ سے اُسے گاؤں میں رُکنا پڑا۔ وہ رات گاؤں کے ایک مسلمان کے گھر میں رہا۔ صبح تک طغیانی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ریلا جو اچانک آیا تھا وہ گزر گیا تھا۔ خلیل جب اپنے گھر کو روانہ ہونے لگا تو اُس نے لیلا کو دیکھا جو کچھ دُور کھڑی تھی اور وہیں کہیں غائب ہو گئی تھی۔

خلیل جب گھاٹ اُتر کر گھوڑی کو ندی میں ڈالنے لگا تو قریب سے ہی لیلا اُٹھی اور اُسے دیکھنے لگی۔

"اب پھر یہاں آ گئی ہو" — خلیل نے اسے مسکراتے ہوئے کہا — "ڈوبنا چاہتی ہو؟"

"نہیں" — لیلا نے شرماتے ہوئے کہا — "تمہیں دیکھنے کے لئے رُک گئی تھی۔"

یہ اُن کی پہلی ملاقات تھی جو لیلا نے دانستہ کی تھی۔ اس کا صرف یہ کہہ دینا کہ تمہیں دیکھنے آئی تھی، ایک ایسا اظہارِ محبت تھا جس کے لئے مزید الفاظ کی ضرورت نہیں تھی۔ اس ملاقات میں اتنی سی ہی بات ہوئی۔ اس کے

بعد دونوں خود ہی میل ملاقات کا انتظام کرتے رہے۔ میں ان تفصیلات میں نہیں جا رہا۔ اتنا ہی سنا دیتا ہوں کہ خلیل امیر زمینداروں کا بیٹا ہونے کی وجہ سے کسی خوف اور خطرے کو پلّے نہیں باندھتا تھا۔ اُس نے لیلا کے ساتھ طے کر لیا تھا کہ وہ اُسے گھر سے نکال لے جائے گا اور اُسے مسلمان کر کے اُس کے ساتھ شادی کر لے گا۔ لیلا بالکل یہی چاہتی تھی۔ وہ گھر سے نکلنے اور مسلمان ہونے کے لئے تیار ہو گئی۔

میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ لیلا نے پہلے روز میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ اُس نے گوشت کھایا ہے اور فوراً بعد ہی کہا تھا کہ نہیں کھایا۔ مجھے اُسی وقت شک ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کا میل ملاقات کسی مسلمان کے ساتھ ہے۔ اب اُس نے بتایا کہ خلیل نے اُسے گوشت کھلایا تھا۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ اپنے بھائی رمیش کو وہ اسی لئے اتنا زیادہ چاہتی تھی کہ رمیش کی دوستی مسلمانوں کے ساتھ تھی۔

لیلا کہتی تھی کہ یہ ناجائز تعلقات والی بات نہیں تھی۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ خلیل کو پتہ چل جائے کہ میں کہاں ہوں تو مجھے یہاں سے نکالنے کے لئے وہ اپنی جان بھی دے دے گا۔

لیلا نے بتایا کہ ساہوکار اُس کا رشتہ اپنے بیٹے کے لئے مانگ رہا تھا۔ لیلا نے خلیل کے ساتھ ملاقات کا بندوبست کیا۔ ندی کے پار ایک جگہ ان کی ملاقات ہوتی لیکن کسی نے دیکھ لیا اور لیلا کے باپ کو بتا دیا۔ رمیش کو یہ بات نہ بتائی گئی۔ لیلا گھر گئی تو باپ نے اُسے بُرا بھلا کہا اور اُسی رات ساہوکار سے کہہ آیا کہ شادی جلدی کر لو۔ شادی تو پندرہ سولہ روز بعد ہوتی لیکن یہ پندرہ سولہ روز لیلا پر پہرے لگے رہے۔ اُسے گھر میں قید رکھا گیا۔



لیلا نے اپنی محبت کی یہ داستان ایسے جذباتی انداز سے سنائی کہ مجھے رہ رہ کر سائرہ یاد آتی۔ لیلا کے آنسو کئی بار بہہ نکلے۔ اُس نے مجھے بھی جذبات کی لپیٹ میں لے لیا اور میرے بھی آنسو نکل آتے۔ اُس نے مجھے

یہ داستان بلاوجہ نہیں سناتی تھی۔ ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے سینے کا غبار ہلکا کرنا چاہتی تھی اور اس نے غبار ایسا ہلکا کیا کہ آدھی رات گزار دی۔

دوسری اور اصل وجہ یہ تھی جو اُس نے مجھے یہ سارا قصہ سُنا کر بتائی۔

"جانتے ہو میں نے یہ بات تمہیں کیوں سنائی ہے؟" — اُس نے پوچھا اور خود ہی جواب دیا — "اگر تم میرے اتنے ہی ہمدرد ہو تو مجھے خلیل تک پہنچا دو یا اس تک یہ اطلاع پہنچا دو کہ میں کہاں ہوں۔ میں اب اپنے ماں باپ کے گھر نہیں جانا چاہتی۔ تمہیں پہلے بتایا تھا کہ میں جس رات آئی تھی اُسی رات واپس چلی جاتی تو بھی میرا خاوند مجھے یہ کہہ کر گھر سے نکال دیتا کہ یہ مسلمانوں کے پاس رہ کر آئی ہے۔ وہ نہ بھی نکالے تو میرے دل میں اُن لوگوں کی اتنی نفرت بھری ہوئی ہے کہ میں وہاں جاؤں گی ہی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ میرا بھائی ہے جو مجھے قبول کرے گا۔ کیا تم میرا یہ کام کر دو گے؟"

"دیکھو لیلا!" — میں نے اُسے کہا — "یہ تو تم نے دیکھ لیا ہے کہ میں نے تمہیں ان لوگوں سے بچا لیا ہے۔ یہ لوگ تمہیں بیچنا چاہتے ہیں اور میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ میں اس کام کے لئے تمہیں ان کے حوالے نہیں کروں گا۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ تم اپنے گھر چلی جاؤ۔ تمہارا یہ کہنا کہ تمہیں خلیل تک پہنچا دوں یا اُسے یہ بتا دوں کہ تم کہاں ہو، یہ ایسے ہی ہے جیسے میں نے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو ہتھکڑیاں لگا دی ہیں۔ پھر بھی مجھے سوچنے کا موقع دو۔ شاید میں کوئی راستہ نکال لوں۔"

وہ آہستہ آہستہ اُٹھی اور میری چارپائی پر آ بیٹھی۔

"اتنی عقل مجھ میں ہے کہ تمہاری بات کو پوری طرح سمجھ سکتی ہوں" — اُس نے کہا — "میں جانتی ہوں کہ جو کام میں نے تمہیں بتایا ہے یہ کتنا خطرناک ہے۔ میری مجبوری دیکھو کہ میں تمہیں اس کے عوض کچھ بھی نہیں دے سکتی۔ میں نے جو زیور پہن رکھا ہے یہ لے لو۔"

"نہیں لیلا!" — میں نے کہا — "مجھے ایسا کوئی لالچ نہیں۔ ڈکیتی کی یہ واردات جو ہم نے کی ہے وہ زیور اور دولت کی خاطر نہیں کی۔ یہ پھر کبھی

بتاؤں گا کہ ہم نے ساہوکار کو کیوں لُوٹا ہے۔"

"تو پھر میں ہوں" — اُس نے کہا — "میں نوجوان اور خوبصورت لڑکی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی مرد کے لئے اس سے بڑا اور کوئی انعام نہیں ہوتا۔ میں اپنے جسم کو خلیل کی امانت سمجھتی ہوں، لیکن تمہارے لئے اس امانت میں تھوڑی سی خیانت کر سکتی ہوں۔ میرا یہ کام کر دو۔"

"کیا تم ابھی تک نہیں سمجھیں کہ مجھے تمہارے جسم کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں؟" — میں نے کہا — "میرا اپنا جسم کسی کی امانت ہے۔ میں اُن مردوں میں سے نہیں ہوں جو عورت کے حسین جسم کو دنیا کا سب سے بڑا انعام سمجھتے ہیں۔ میں جو کچھ بھی کر سکوں گا وہ تمہارے لئے ضرور کروں گا۔ اس کا مجھے یہ انعام ملے گا کہ میری رُوح کو خوشی حاصل ہو گی .... میری بات سمجھتی ہو لیلا!"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی آنکھوں سے لگایا پھر میرے ہاتھ کو چُوما اور میرا ہاتھ اس طرح آہستہ آہستہ سے میری زانو پر رکھ دیا جیسے یہ کوئی بڑی متبرک اور مقدس چیز ہو۔ وہ زبان سے کچھ کہہ نہ سکی۔ میں اُس کے جذبات کو سمجھتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھی اور اپنی چارپائی پر جا بیٹھی۔

کچھ دیر بعد میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب میں سائرہ کو دیکھا۔ بڑا اُداس خواب تھا۔ ایک ندی تھی۔ میں اس کنارے اور سائرہ اُس کنارے کھڑی تھی۔ ہم دونوں بڑے ہی اُداس اور مایوس ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

صبح آنکھ کھُلی تو لیلا ابھی تک گہری نیند سو رہی تھی۔ پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا یہ تھا کہ میں ایسے حالات کس طرح پیدا کر سکتا ہوں کہ معصوم سی اس لڑکی کو خلیل تک پہنچا سکوں۔



دو دن اور گزر گئے تو ہمارا وہ آدمی جو لیلا کے گاؤں گیا تھا، واپس آیا۔ اُس نے بتایا کہ پولیس نے تمام مُشتبہوں کو چھوڑ دیا ہے اور رمیش کو بھی

شبے اور الزام سے بری کر دیا ہے۔ اس آدمی کو یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ پولیس کو کوئی اور اشارہ یا سراغ ملا ہے، ان لوگوں کو چھوڑ دیا گیا ہے یا پولیس نے تفتیش میں دیکھا ہے کہ یہ لوگ بے قصور ہیں۔

ہمارے آدمی نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ پولیس کو کسی اور ڈاکو پر شبہ ہو گیا ہے۔ اس سے ہمیں یہ اطمینان ہُوا کہ پولیس کی توجہ کسی اور طرف ہو گئی ہے لیکن ہمارا یہ اطمینان غلط بھی ہو سکتا تھا کیونکہ دیبا کا گروہ بھی مشہور تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ کسی روز اچانک پولیس کی پوری گارد آ کر دیبا کے ٹھکانے کو گھیرے میں لے لے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر دیبا نے اپنے دو تین مخبروں کو اِدھر اُدھر ڈیوٹی پر لگا دیا۔ ان مخبروں نے یہ بھی دیکھنا تھا کہ پولیس کے مخبر اس علاقے میں سرگرم ہیں یا نہیں۔

چند روز اور گزر گئے۔ دیبا نے اب ایک اور آدمی کو واردات والے گاؤں جانے کو کہا۔ یہ آدمی جھارا تھا جانے سے پہلے وہ میرے پاس آیا۔

"سکندر بھائی!" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں اُس گاؤں جا رہا ہوں۔ کیا یہ ٹھیک رہے گا کہ تم مجھے رُقعہ لکھ دو جو میں ساہوکار کے گھر پھینک دوں گا؟ اس پر لکھو کہ بیس ہزار ادا کرو اور لڑکی لے لو۔"

"وہ رقم کہاں آ کر ادا کرے گا؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"یہ تم بتاؤ۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں اتنی رقم نہیں ملے گی" ــــ میں نے کہا ــــ "پہلے یہ معلوم کرنا ہے کہ ساہوکار یا لڑکی کا باپ رقم دیں گے؟ میں تمہیں یہ معلوم کرنے کا طریقہ بتاتا ہوں۔"

میں نے اُسی سے سگریٹ کا خالی پیکٹ لیا۔ حمید اللہ خان کے پاس پنسل تھی۔ وہ لی اور ساہوکار کے نام بائیں ہاتھ سے یہ تحریر لکھی:

"اگر تمہیں لڑکی واپس چاہیئے تو بیس ہزار روپیہ ادا کر دو اور لڑکی لے لو۔ اگر اتنی رقم ادا کرنے پر تیار ہو تو اپنی حویلی

کے باہر والے گیٹ پر چھوٹا سا سفید کپڑا لٹکا دینا۔ پھر تمہیں ہماری طرف سے اطلاع ملے گی کہ رقم کہاں آ کر ادا کرنی ہو گی۔ وہیں تمہیں لڑکی مل جائے گی۔ اگر نہیں تو لڑکی کو بازار میں بیچ دیا جائے گا۔"

میں نے یہ تحریر جھارے کو پڑھ کر سنائی اور اُسے کہا کہ ساہوکار نے باہر والے گیٹ کے ساتھ کپڑا باندھ کر رضامندی کا اظہار کیا تو پھر میں اُسے سوچ کر لکھوں گا کہ رقم کہاں لائے۔

میں نے دراصل جھارے کو ٹالا تھا۔ وہ رُقعہ سُن کر خوش ہو گیا۔

"اس رُقعے کے ساتھ مضبوط دھاگہ یا رسّی باندھو" ــــ میں نے اُسے کہا ــــ "اور دھاگے کے ساتھ ایک کنکر یا ٹھیکری باندھو۔ اسے چھپا کر ساتھ لے جاؤ۔ تم نے ساہوکار کا مکان دیکھا ہُوا ہے۔ مکان گاؤں کے باہر ہے۔ چلتے چلتے یہ رُقعہ دیوار کے اُوپر سے اندر پھینک دینا لیکن سامنے کی طرف سے جدھر باہر والا گیٹ ہے۔ یہ احتیاط کرنا کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔"

میں نے اُسے یہ رُقعہ تہہ کر کے دیا۔ وہ خود عقل والا تھا۔ اُسے اتنی زیادہ ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہنسی خوشی چلا گیا۔ وہ کہتا تھا کہ اتنی خوبصورت لڑکی کو واپس لینے کے لئے ایک ساہوکار کے لئے بیس ہزار روپیہ زیادہ رقم نہیں مگر جھارے نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ساہوکار کے گھر جو دولت تھی وہ ہم اُٹھا لائے ہیں۔



رات کو لیلا نے پھر خلیل کا قصہ چھیڑ دیا۔

"تم شاید میرا کام نہیں کرو گے" ــــ اُس نے کہا۔

"تم نادان ہو لیلا!" ــــ میں نے کہا ــــ "تم یہ نہیں سوچ رہیں کہ میں تمہیں خلیل کے پاس چھوڑ آیا تو وہ گرفتار ہو جائے گا۔"

"میں اُس کے پاس پہنچتے ہی مسلمان ہو جاؤں گی" ــــ لیلا نے کہا

——اور کہوں گی کہ میں اپنی مرضی سے اس کے پاس آئی تھی اور مسلمان ہو کر اس کے ساتھ شادی کر لی ہے۔"

"تم اغوا ہوئی تھیں لیلا!" —— میں نے کہا —— "تمہارے سسرالی گھر میں ڈاکہ پڑا تھا۔ پولیس تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔ پتہ چلے گا کہ تم خلیل کے پاس ہو تو پولیس اُسے اس الزام میں گرفتار کرے گی کہ وہ ڈاکوؤں کے ساتھ تھا۔ اُس سے پولیس پوچھے گی کہ اُس کے باقی ساتھی کون ہیں اور کہاں ہیں۔ ظاہر ہے وہ نہیں بتا سکے گا۔ پولیس یہ سوچ کر کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے، اسے مار مار کر بیہوش کر دے گی۔ تمہیں بھی پولیس پکڑ کر تھانے لے جائے گی۔ ہو سکتا ہے تمہارا سسر تم پر یہ الزام لگا دے کہ اُس کے گھر میں تم نے ڈاکہ ڈلوایا ہے۔ تم روپے پیسے اور زیورات کی طرح چوری کا مال ہو۔ تم جس کسی کے قبضے سے برآمد ہو گی وہ ڈاکہ زنی اور اغوا کے جرم میں پکڑا جائے گا .... کیا تم خلیل کو اس مصیبت میں ڈالنا پسند کرو گی؟"

وہ سوچ میں کھو گئی۔

"تم اُسے اطلاع تو دے دو" —— اُس نے کہا —— "وہ مجھے کہیں چھپا لے گا۔"

وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اُسے یہ نہ بتایا کہ اُس کے سسر کے گھر اُس کی قیمت کا رُقعہ جا رہا ہے۔



جھارا دو دن واپس نہ آیا تو ہمیں اُس کے متعلق فکر پیدا ہوا۔ میں نے دیبا کو بتا دیا تھا کہ میں نے اُسے رُقعہ لکھ دیا تھا اور اُسے بتایا تھا کہ رُقعہ کس طرح اندر پھینکے۔

"پھر وہ پکڑا گیا ہے" —— دیبا نے کہا —— "تم نے اُسے رُقعہ دے کر اچھا نہیں کیا۔"

دیبا نے اُس آدمی کو بلایا جو پہلے ساہوکار کے گاؤں جایا کرتا تھا۔ اُسے کہا کہ وہ وہاں جائے اور جھارا کا پتہ کرے۔

یہ آدمی اگلے روز شام کو واپس آیا۔ جھارا اُس کے ساتھ تھا۔ وہ مزید جائزہ لینے کے لئے وہاں رُک گیا تھا۔ اُس نے پوری رپورٹ دی۔

اُس نے دن کے وقت موقع دیکھ کر رُقعہ اندر پھینک دیا۔ یہ اُس نے چلتے چلتے پھینکا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ تین چار گھنٹے گزرے ہوں گے کہ ساہوکار گھر سے آیا۔ وہ بلند آواز سے کہہ رہا تھا کہ یہ دیکھو ڈاکو کس طرح میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔

لوگ اُس کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ جھارا بھی چلا گیا۔ اُس نے ساہوکار کے ہاتھ میں پھاڑے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ پر لکھا ہوا رقعہ دیکھا۔ اس کے ساتھ کنکری بندھی ہوئی تھی۔ ساہوکار نے تحریر پڑھ کر لوگوں کو سنائی۔ لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ اُن پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ وہ پہلی بار اس قسم کا واقعہ دیکھ رہے تھے۔

"ہوشیار ہو جاؤ گاؤں والو!" —— ساہوکار نے کہا —— "آج ہماری لڑکی گئی ہے کل کسی اور کی اُٹھائی جائے گی اور اُس سے اسی طرح لڑکی کے عوض رقم طلب کی جائے گی .... میں ایک دمڑی نہیں دوں گا۔ وہ میری بیٹی نہیں، پھر میں رقم دوں کہاں سے؟ گھر تو ڈاکو پہلے ہی خالی کر گئے ہیں میرا۔"

"تھانے جاؤ سیٹھ جی!" —— لوگ اُسے کہنے لگے —— "یہ رُقعہ تھانے جا کر دکھاؤ۔"

"تھانے تو میں ضرور جاؤں گا" —— ساہوکار نے کہا —— "لیکن میں لڑکی کے بدلے ایک کوڑی نہیں دوں گا۔ لڑکی کے بھائی نے میرا گھر لُٹوایا ہے اور اپنی بہن کو اپنے ساتھ لے گیا ہے اور اب اس طریقے سے مجھے کوڑی کوڑی کا محتاج کرنا چاہتا ہے .... اور دیکھو لوگو! پولیس نے اُسے چھوڑ دیا ہے۔"

"بکواس بند کر دو سیٹھ!" —— کسی نے للکار کر کہا —— "میں تیرا گھر لُٹواتا، تو لُوٹنے والے کو یہ بھی کہتا کہ اس سیٹھ کو بھی ختم کر آنا۔ بے غیرت! تیری بہو

اٹھائی گئی ہے۔ وہ تیرے بیٹے کی بیوی ہے اور کہتا ہے کہ تو ایک کوڑی نہیں دے گا اور وہ تیری بیٹی نہیں .... جا کر تھانے میں پوچھ کر مجھے کیوں چھوڑ گیا ہے۔"

وہ لیلا کا بھائی رمیش تھا۔

"دیکھو لوگو!" — سیٹھ واویلا بپا کرنے لگا — "یہ کس طرح مجھ پر دھونس جما رہا ہے۔"

"میری سنو گاؤں والو!" — رمیش نے کہا — "یہ بوڑھا اور اس کا بیٹا غریبوں کی بیٹیوں کو خراب کرتے ہیں۔ میں ان کی دو نوکرانیوں کو یہاں بلاتا ہوں۔"

رمیش کا باپ رو رو کر اُس کے آگے ہاتھ جوڑ رہا تھا کہ وہ چُپ ہو جائے لیکن رمیش بدمعاش تھا اور اُس نے تھانے میں بہت مار کھائی تھی۔ پھر اُس کی بہن اٹھائی گئی تھی۔ وہ واہی تباہی بک رہا تھا اور باپ کی منت سماجت پر بھی چُپ نہیں ہو رہا تھا۔ ساہوکار اُس سے ڈرتا تھا۔ وہ تھانے چلا گیا۔

بھارا اگلے روز بھی وہیں رہا۔ اُسے پتہ چلا کہ لیلا کے باپ اور ساہوکار میں جھگڑا ہوا ہے۔ ساہوکار کہتا تھا کہ وہ لیلا کو واپس لینے کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں دے گا اور لیلا کا باپ اُسے کہتا تھا کہ اُس کی بیٹی اُس کے گھر سے اغوا ہوئی ہے۔ وہ اغوا کرنے والوں کے ساتھ سودا بازی کرے۔ شاید وہ تھوڑی رقم پر راضی ہو جائیں اور وہ اُس کی بیٹی واپس لے آئیں۔ ساہوکار اُس کی بات ہی نہیں سُنتا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ تمہاری بیٹی ہے، رقم ادا کرو اور بیٹی واپس لے لو۔

پولیس گاؤں میں نہیں آئی۔

بھارا کو بہت مایوسی ہوئی۔ وہ گاؤں میں رُکا رہا۔ ہمارا دوسرا آدمی گیا اور اُسے واپس لے آیا۔ دیبا کو یہ ساری بات سنائی گئی تو دیبا نے ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ ہنستا ہی رہا۔

"اُستاد!" — بھارا نے کہا — "عجیب آدمی ہو۔ ہمارے نقصان پر ہنستے ہو۔"

"ارے پاگل!" — دیبا نے کہا — "تجھے اتنی سی بات پہلے سمجھ میں نہیں آئی کہ ہندو اپنی بیوی چھوڑ دیتا ہے پیسہ نہیں چھوڑتا۔ اب دیکھ لیا تو نے، ساہوکار کے بیٹے نے اپنی بیوی کی پرواہ نہیں کی۔"

"پھر اس لڑکی کا کیا کروں؟" — بھارا نے پوچھا۔

"ذرا صبر کرو!" — دیبا نے جواب دیا۔



دوسرے دن کا واقعہ ہے۔ میں، حمیداللہ اور نوراللہ باہر دیبا کے پاس بیٹھے ہوتے تھے کہ گاؤں کے ایک لڑکے نے جس کی عمر چودہ پندرہ سال تھی، آکر بتایا کہ ایک آدمی آرہا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ یہ آدمی کس جگہ تک پہنچ گیا ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں راستہ اُوپر آتا تھا اور دیوار کی طرح ہو جاتا تھا۔ اس کے ایک طرف تقریباً تیس فٹ نیچے پانی جمع تھا اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے درختوں کی چوٹیاں تھیں۔ یہ جگہ اتنی گہری تھی کہ اس طرف گرنے والا بچ نہیں سکتا تھا۔ آگے راستہ ذرا کشادہ تو ہو گیا تھا لیکن درخت جو نیچے تھے اُوپر آکر ان کے ٹہن راستے میں آتے تھے۔

"یہ کوئی مخبر ہو گا۔ یہاں تک اور کوئی نہیں پہنچ سکتا" — دیبا نے کہا — "جو کوئی بھی ہے، اُسے پکڑ کر یہاں لے آؤ۔"

دو آدمی چلے گئے اور کچھ دیر بعد ایک جوان آدمی کو ساتھ لے آئے۔ وہ بڑی اچھی بلکہ کشش والی شکل و صورت کا دراز قد آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر کوئی ایسا ڈر نظر نہیں آتا تھا کہ اُسے ان دو آدمیوں نے پکڑ لیا ہے اور نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک ہو۔

ہمارا جو آدمی بھارے سے پہلے ساہوکار کے گاؤں جایا کرتا تھا وہ اس آدمی کو دُور سے آتا دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ تو رمیش ہے" — اُس نے کہا — "اس لڑکی کا بھائی ہے ...."

استاد!" — اُس نے دیبا سے کہا — "تم نے اسے یہاں بلا کر غلطی کی ہے۔ کہہ دیتے کہ جو کوئی ہے اُسے ....."

"آنے دو۔ آنے دو" — دیبا نے بات کاٹتے ہوئے کہا — "کیا یہ ہم سب کو کھا جائے گا؟"

آنے والا ہمارے پاس آگیا۔ میں پہلی بار رمیش کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے اس کی باتیں سُنی تھیں۔ وہ ہندو لگتا ہی نہیں تھا۔ اُس کی عمر چھبیس ستائیس سال تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اُس کی مونچھیں مسلمانوں جیسی تھیں۔ اُس نے کپڑے بھی مسلمانوں جیسے پہن رکھے تھے۔ وہ اس طرح آرہا تھا جیسے کچھ دیر پہلے یہیں سے اُٹھ کر گیا ہو۔

ہم سب اُسے گھُور گھُور کر دیکھ رہے تھے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ دیبا اسے کیا کہتا ہے یا اس کے لئے کیا حکم دیتا ہے لیکن رمیش نے دیبا کے ساتھ اس طرح بے تکلفی سے ہاتھ ملایا جیسے اس کے ساتھ اُس کی پُرانی دوستی ہو۔ اُس نے ہندو ہونے کے باوجود السلام علیکم کہا پھر ہم سب سے ہاتھ ملایا اور کسی کے کہے بغیر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"تمہارا نام رمیش ہے" — دیبا نے کہا — "سُنا ہے تم اپنے علاقے کے بدمعاش ہو؟"

"تمہارا خادم ہوں اُستاد!" — رمیش نے مسکراتے ہوئے کہا — "تمہارے بہت قِصّے سُنے ہیں۔"

"کیسے آئے ہو؟" — دیبا نے پوچھا — "زندگی سے تنگ آگئے ہو؟"

"اُستاد!" — رمیش نے پہلے کی طرح مسکراتے ہوئے کہا — "میرا خیال ہے زندگی سے تنگ تم خود آئے ہوئے ہو" — اُس نے سب کو باری باری دیکھا۔ اُس کی نظریں جھارا پر ٹھہر گئیں۔ تھوڑا سا مشکوک انداز میں دیکھا اور اس کی طرف اشارہ کر کے رمیش نے کہا — "اس جیسے آدمی پر تم نے بھروسہ کئے رکھا تو جلدی کالا پانی پہنچ جاؤ گے۔ کیا یہ تمہارا شاگرد

ہے استاد؟ دن دیہاڑے سیٹھ کی حویلی میں رُقعہ پھینک رہا تھا۔ تم خوش قسمت ہو کہ اسے صرف میں نے دیکھا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اسے پکڑوا دیتا۔ پھر اس نے یہ بیوقوفی کی کہ سیٹھ (ساہوکار) کو جب رُقعہ ملا تو وہ باہر آکر شور شرابہ کرنے لگا۔ لوگ اکٹھے ہو گئے تو میں نے تمہارے اِس بالکے کو دیکھا۔ لوگوں میں کھڑا تھا۔ میں آگے ہو کر اسے پکڑ لیتا اور لوگوں سے کہتا کہ رُقعہ اِس نے پھینکا تھا تو تم جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ یہ مجھے اتنا پکا نظر نہیں آتا کہ ایک دن سے زیادہ پولیس کی مار برداشت کر سکے۔"

رمیش نے بتایا کہ جب جھارا نے ساہوکار کی حویلی میں رُقعہ پھینکا اُس وقت وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ رمیش کچھ دُور ایک درخت سے لگا کھڑا تھا۔ وہ کسی کے انتظار میں تھا۔ جھارا نے جب حویلی میں رُقعہ پھینکا تو رمیش کو کچھ بھی شک نہ ہُوا۔ جھارا آگے جا کر رمیش کے قریب سے گزرا۔ اُس لئے پھر بھی رمیش کو نہ دیکھا۔ رمیش نے اُسے اچھی طرح دیکھا۔

پھر جب ساہوکار نے رُقعہ باہر لا کر سارے گاؤں کی آبادی کو اکٹھا کر لیا تو رمیش بھی وہاں آگیا۔ اُس نے جھارے کو بھی وہاں اتفاق سے دیکھ لیا۔ تب رمیش کو یاد آیا کہ اس شخص نے حویلی میں کچھ پھینکا تھا اور اگر کچھ پھینکا تھا تو وہ یہی رُقعہ تھا۔

میں نے سنا یا ہے کہ ساہوکار نے سارا الزام رمیش پر تھوپ دیا۔ رمیش نے ساہوکار کو بُرا بھلا کہا۔ اس کا رمیش پر یہ اثر ہُوا کہ اُس نے جھارا اور اس کے پھینکے ہوئے رُقعے کے متعلق اپنا خیال اور ارادہ بدل دیا۔



"سوچو اُستاد!" — رمیش نے یہ بات سُنا کر کہا — "مجھ پر سیٹھ جھوٹا الزام لگا رہا تھا۔ میں پہلے ہی پولیس کی اتنی مار کھا ئی تھی کہ میں دو بار بیہوش ہُوا تھا۔ مجھے سوچنا چاہیئے تھا کہ اب سیٹھ رُقعے کا الزام بھی میرے مُنہ پر مل رہا ہے اور یہ تھانے جا رہا ہے تو پولیس ایک بار پھر مجھے بلا کر

اُسی چکی میں پیسنا شروع کر دے گی۔ میرے لئے آسان ترکیب یہ تھی کہ تمہارے اس آدمی کو پکڑوا دیتا اور پولیس اس سے اقبال کرا لیتی لیکن میں نے ایسا نہیں سوچا۔ میرا دماغ کسی اور طرف ہو گیا۔ میں نے اس آدمی کو نظر میں رکھ لیا۔"

"پہلے یہ بتاؤ" — دیبا نے پوچھا — "تم نے اسے پکڑوایا کیوں نہیں؟"

"اپنی بہن کی خاطر!" — اُس نے جواب دیا — "سیٹھ نے اعلان کر دیا تھا کہ یہ لڑکی اُس کی بیٹی نہیں، ایک پیسہ نہیں دے گا۔ پھر مجھے یہ خوشی تھی کہ سیٹھ کا گھر خالی ہو گیا ہے .... دیبا اُستاد! میری نیت دیکھو۔ سیٹھ کے گھر ڈاکہ پڑا۔ میری بہن اغوا ہو گئی تو میں اس کے گھر پہنچا اور للکار کر کہا کہ سیٹھ، میں ڈاکوؤں کو پکڑوں گا۔ میں نے سچے دل سے بھڑک کر یہ بات کہی تھی لیکن سیٹھ نے پہلا مشتبہ مجھے ہی لکھوا دیا اور پولیس نے میری ہڈیاں توڑ دیں .... تم ہی بتاؤ اُستاد! میرا باپ بیس ہزار روپیہ کہاں سے دے گا؟"

"تمہاری بہن ہے کہاں؟" — دیبا نے پوچھا۔

"تمہارے پاس ہے اُستاد!" — رمیش نے کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے رمیش!" — دیبا نے کہا۔

"پہلے میری بات سُن لو اُستاد!" — رمیش نے کہا — "میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ تم نے بیس ہزار کا مطالبہ کیا ہے۔ میں اپنی بہن کو مفت نہیں لے جاؤں گا سودا کروں گا۔ تم رحم کرو گے تو رقم کچھ کم کر دو گے۔ میں رقم دے کر بہن کو لے جاؤں گا، لیکن مجھ سے یہ سُن لو کہ میں یہاں تک کس طرح پہنچا ہوں۔ تم بھی اُستاد ہو، میری اُستادی دیکھو۔"

"کیا تمہیں تھانے میں پھر نہیں بلایا گیا؟" — دیبا نے پوچھا — "سیٹھ نے وہاں جا کر ضرور کہا ہو گا کہ رُقعہ تم نے پھینکا ہے۔"

"نہیں!" — رمیش نے جواب دیا — "تھانیدار کو پہلے ہی یقین ہو گیا تھا کہ اِس ڈکیتی کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔"

"اب بات کرو" — دیبا نے کہا۔

"بات یہ ہے اُستاد!" — اُس نے کہا — "میں نے تمہارے اس آدمی کو نظر میں رکھا۔ یہ جہاں ٹھہرا ہُوا تھا میں وہاں اردگرد موجود رہا۔ یہ شخص باہر نکلتا تھا تو میں دیکھتا تھا کہ کدھر جاتا ہے۔ دو بار یہ سیٹھ کے مکان کے قریب سے گزرا۔ گاؤں کے چند ایک آدمی جہاں اکٹھے ہو جاتے تھے یہ اُن کے پاس جا کھڑا ہوتا اور اُن کی باتیں سُنتا پھر اُن کی باتوں میں شامل ہو جاتا۔"

رمیش نے جبارے کی تمام کارگزاری سنائی اور جبارے اُس آدمی کی طرف اشارہ کیا جو جبارا کو دیکھنے گیا اور اسے واپس لایا تھا۔

"اسے میں جانتا ہوں" — رمیش نے کہا — "اس کے متعلق مجھے ہمیشہ شک رہا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ یہ کس کے ساتھ ہے لیکن یہ شبہ بڑا پکا تھا کہ خود اگر اُستاد نہیں تو کسی اُستاد کا آدمی ضرور ہے۔ اسے میں نے تمہارے اس آدمی کے ساتھ دیکھا تو میرا شک اور پکا ہو گیا۔"

"ٹھہرو ذرا!" — دیبا نے کہا — "گاؤں میں کسی نے یا تھانیدار نے کبھی میرا نام لیا ہے؟"

"دوسروں کی بات کیا کروں اُستاد!" — رمیش نے کہا — "یہ شبہ میرے دل میں ہر وقت رہا کہ یہ واردات تمہاری ہے۔ گاؤں میں دو آدمیوں نے تمہارا نام لیا تھا۔ بڑے تھانیدار کے مُنہ سے تو نہیں سُنا، چھوٹا تھانیدار کہتا تھا کہ دیبا ہاتھ صاف کر گیا ہے۔ میں نے کسی سے سُنا تھا کہ بڑا تھانیدار کہتا ہے کہ لڑکی اغوا نہ ہوتی تو میں بھی کہتا کہ ہمارا ملزم دیبا ہے۔ دیبا عورت پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ اسی لئے اُس نے تفتیش جُورے کی طرف موڑ دی ہے .... جُورے کو تم جانتے ہو اُستاد! وہ جہاں بھی ڈاکہ ڈالتا ہے وہاں سے ایک جوان لڑکی کو ضرور اُٹھاتا ہے۔"

یہ اُس زمانے کی باتیں ہیں جب کوئی کوئی ڈاکو اور رہزن ہوتا تھا اور یہی اُس کی شہرت ہوتی تھی۔ ہر ڈاکو کا اپنا ایک طریقۂ واردات ہوتا تھا۔ اسی سے شُبہ ہوتا تھا کہ یہ واردات فلاں کی ہے۔ مثلاً ایک ڈاکو پچھواڑے کی دیوار میں نقب لگا کر اپنے آدمیوں کے ساتھ اندر جایا کرتا تھا اور ایک

ڈاکو دیوار پھاند کر اندر جاتا تھا۔ بعض ڈاکو مکان کے پچھواڑے سے کمند پھینک کر اُوپر جاتے اور مکان کے اندر اُترتے تھے۔

ایسے ہی دیبا کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ لڑکیوں کو اغوا نہیں کرتا تھا اس واردات میں ہمارے ایک ساتھی کے دماغ میں آگئی کہ لڑکی بہت خوبصورت اور قیمتی ہے اور وہ لڑکی کو اٹھا کر لے آیا۔ اس سے دیبا کو غصّہ تو بہت آیا لیکن اُسے فائدہ یہ حاصل ہُوا کہ ایک تجربہ کار تھانیدار نے اُس پر شک نہ کیا اور شک اُس پر کیا جو ڈاکہ زنی کی واردات وہیں کرتا تھا جہاں دوسرے مال کے ساتھ اُسے ایک جوان اور خوبصورت لڑکی نظر آتی تھی۔ اُس علاقے سے کچھ دُور جورا ڈکیت اس جُرم میں مشہور تھا۔

"استاد!" — رمیش سُنا رہا تھا — "تمہارے یہ دونوں آدمی میرے گاؤں سے واپس چلے تو میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ یہ تو اپنے راستے پر آرہے تھے اور میں ان سے دُور بائیں طرف نیچی زمین پر چلتا آیا۔ کچھ دُور چل کر میں اوپر جاتا اور بیٹھ کر انہیں دیکھ لیتا۔ مجھے کھڈوں میں بھی اُترنا پڑا۔ تم نے وہ زمین دیکھی ہوتی ہے۔ وہاں کوئی راستہ نہیں۔"

"ہاں بھائی میرے! میں سمجھ گیا" — دیبا نے کہا — "تم یہاں تک پہنچ گئے اور میں یہ بھی مانتا ہوں کہ یہ تمہاری بہت بڑی دلیری ہے کہ تم یہاں تک بھی آگئے ہو۔ کوئی نیا آدمی یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ کوئی آ بھی جائے تو راستے ہی سے واپس چلا جائے گا کیونکہ اُسے یقین ہی نہیں آئے گا کہ ایسی جگہ کے اندر کوئی انسان رہتا ہو گا۔"

"یقین مجھے بھی نہیں آیا تھا اُستاد!" — رمیش نے کہا — "لیکن میں نے تمہارے ان دونوں آدمیوں کو اِس دشوار گزار جگہ میں داخل ہو کر غائب ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے سُنا تھا کہ دیبا ایسی جگہ رہتا ہے جہاں تک سانپ بھی نہیں پہنچ سکتا۔ دیکھ لو اُستاد! میں پہنچ گیا ہوں ..... اور یہ بھی سوچو کہ میں تمہارے ان دونوں آدمیوں کو وہیں پکڑوا سکتا تھا اور میں یہ بھی کر سکتا تھا کہ اپنے ساتھ پولیس کی گارد لے آتا۔ کیا تم مجھے اِس کا انعام نہیں

دو گے؟"

"ضرور دوں گا" — دیبا نے کہا — "لیکن اتنی جلدی نہیں۔ تم مجھے اُستاد کہتے ہو۔ تم جانتے ہو گے کہ کسی نئے اور مشکوک آدمی پر اعتبار کر لینا کوئی اُستادی نہیں۔"

"مجھے میری بہن دے دو اُستاد!" — رمیش نے کہا — "میں چلا جاؤں گا۔"

"تم تو بچوں جیسی باتیں کرتے ہو" — دیبا نے کہا — "کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ اپنی بہن کو لے کر گاؤں جاؤ گے تو اطلاع ملتے ہی تمہیں بہن سمیت تھانے طلب کر لیا جائے گا، پھر جانتے ہو کیا ہو گا؟"

"ہاں اُستاد!" — رمیش نے کہا — "تھانیدار سب سے پہلا سوال یہ کرے گا کہ یہ لڑکی کہاں سے آئی ہے۔ میں اس کا یہ جواب دوں گا کہ میں اپنی بہن کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا تو یہ مجھے بڑی بُری حالت میں ایک جگہ اِدھر آتی ہوئی مل گئی ..... میں اپنی بہن کو بھی یہ بیان یاد کرا دوں گا۔"

"نہیں رمیش!" — دیبا نے کہا — "تم پولیس کی مار کھا سکتے ہو۔ یہ لڑکی تھانے کی دہشت سے ہی بول پڑے گی ..... میں تمہیں لڑکی نہیں دے سکتا۔ مجھے تو ابھی یہ بھی یقین نہیں آیا کہ تم خود آئے ہو یا پولیس کے مخبر بن کر آئے ہو۔"

"تمہیں بیس ہزار روپیہ چاہیئے اُستاد!" — رمیش نے ذرا غصّے سے کہا — "مجھے تھوڑی سی مہلت دے دو۔ اگر کچھ رعایت کر سکتے ہو تو کر دو۔ میں کہیں ڈاکہ ڈال کر تمہیں رقم لا دوں گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری بہن کے ساتھ یہاں کیا سلوک ہو رہا ہو گا۔"

میں نے دیبا کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ایسی تبدیلی آگئی جیسے اُس کے جسم سے خون اُڑ گیا ہو۔ اُس کا رنگ صاف طور پر پیلا پڑ گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔

"رمیش!" — میں نے اُسے کہا — "تمہاری بہن جس طرح یہاں

آ تی تھی ہم نے اُسے اُسی طرح رکھا ہُوا ہے۔ اُستاد اگر تمہیں اُس سے ملنے کی اجازت دے دے گا تو تمہارا یہ شک تمہاری بہن رفع کرے گی۔"

رمیش نے دیبا کو یہ جو آخری بات کہہ دی تھی، یہ دیبا کے لئے بے عزتی کا باعث تھی۔ اُس نے جھارے اور اُس کے دونوں ساتھیوں کو جنھوں نے لیلا کو اغوا کیا تھا بے طرح گالیاں دینی شروع کر دیں۔ رمیش پر اُسے غصّہ نہیں تھا۔ رمیش تو یہ سمجھ کر بات کر رہا تھا کہ لیلا کو دیبا کے کہنے پر اغوا کیا گیا ہے اور بیس ہزار روپیہ دیبا کا مطالبہ ہے۔

"میں ان تینوں کو اپنے ساتھ رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا" — دیبا نے کہا جو میرے لئے نیا انکشاف تھا — "میں نے کسی بھی وقت ان پر اعتبار نہیں کیا تھا، لیکن اب میرا دماغ ایسا پھرا کہ ایک واردات ان سے کرا لی۔ دیکھ لو میری کتنی بے عزتی ہوتی ہے" — دیبا رمیش سے مخاطب ہُوا — "رمیش! تم میرے مُنہ پر تھوک دو تو بھی برداشت کر لوں گا۔ تمہاری بہن کو میں نے اغوا نہیں کرایا۔ تمہیں بہن سے ملوا دوں گا۔ اُسے میں نے ان تین جانوروں سے الگ رکھا ہُوا ہے، لیکن یہ سُن لو کہ اب تم بھی میرے قیدی ہو۔ میں اُس وقت تک تمہیں یہیں رکھوں گا جب تک مجھے یہ یقین نہیں ہو جاتا کہ تم پولیس کے مُخبر نہیں ہو۔"

"مجھے منظور ہے اُستاد!" — رمیش نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "ساری عمر تمہارا غلام رہوں گا۔ صرف یہ بتا دو کہ میں جب یہاں سے واپس جاؤں گا تو میری بہن میرے ساتھ ہو گی۔"

"تمہاری بہن ہر وقت تمہارے ساتھ رہے گی" — دیبا نے کہا — "لیکن جب یہاں سے جاؤ گے تو اُس وقت کے حالات دیکھ کر بتاؤں گا کہ بہن تمہارے ساتھ جائے گی یا نہیں۔"

"وہ نہیں جائے گی تو میں بھی نہیں جاؤں گا" — رمیش نے کہا۔

"مجھے منظور ہے" — دیبا نے کہا — "لیکن یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ باقی عمر پچھتاؤ گے اور بہن کو ڈھونڈتے رہو گے.... سکندر!"

— دیبا نے مجھے کہا — "اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس کی بہن سے ملوا دو پھر اسے اپنے ساتھ رکھو۔"

میں رمیش کو اپنے ساتھ لے گیا۔ بہن بھائی بڑے ہی جذباتی انداز سے ملے۔

"رمیش بھائی!" — لیلا نے اُسے میری طرف اشارہ کر کے کہا — "یہ شخص اوتار ہے۔"

آپ تصوّر کر سکتے ہیں کہ ایسے موقع پر کیا کچھ کہا سُنا گیا ہو گا۔ بہن بھائی تو خوش تھے ہی، اور وہ ساہوکار کے لُٹ جانے پر زیادہ خوش تھے۔ میں ان دونوں کو خوش دیکھ کر خوش ہو رہا تھا، لیکن اُسی شام میری خوشی پر آسیب سا طاری ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ شام کے وقت جھارے نے مجھے بلایا۔ میں اُس کے پاس گیا۔

"سکندر دوست!" — جھارے نے کہا — "تم اُستاد کو بتا دو، جو جی میں آئے کرو۔ اس لڑکی کو ہم اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔ یہ ہمارا مال ہے۔ اُستاد نے ہماری بہت بے عزتی کی ہے۔ اسے ہم پر اعتبار بھی نہیں۔ پھر ہمارا یہاں رہنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے، لیکن لڑکی کو لے کر جائیں گے اور ضرورت پڑی تو رمیش کا بھی خون ہو جائے گا۔"

"ہوش میں آؤ جھارے!" — میں نے کہا۔

"ہم ہوش میں آ چکے ہیں" — جھارے نے کہا اور چلا گیا۔

میں سوچتا رہ گیا کہ دیبا کو بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہاں خون خرابہ ہو گا اور اس اڈے کی خیر نہیں۔



ایک تو میں نے جھارے اور اُس کے ساتھی کا یہ چیلنج قبول کر لیا کہ وہ لیلا کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور اسے وہ یہاں سے لے جائیں گے اور اگر ضرورت پڑی تو رمیش کا خون ہو جائے گا۔ دوسری طرف مجھ میں کمزوری کا احساس پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ یہ کمزوری جسمانی نہیں تھی۔ میں ذہنی طور پر تھکا تھکا سا محسوس کرنے لگا، اور کبھی یوں بھی لگتا تھا جیسے میری روح تھک گئی یا زندگی سے بیزار ہو گئی ہو۔ یہ احساس زیادہ دیر قائم نہیں رہتا تھا۔ اس کیفیت کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے جیسے کوئی مسافر بڑی لمبی مسافت طے کر کے تھکنے لگا ہو اور منزل ابھی دُور ہو۔

منزل کی کشش مسافروں کو اپنی طرف گھسیٹتی رہتی ہے۔ میری تو منزل ہی کوئی نہیں تھی۔ آگے بڑھنے کی کوئی کشش ہی نہیں تھی۔

ایک عزم تھا۔ ایک عہد تھا لیکن تکمیل کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی بجائے میں آہستہ آہستہ ڈاکو بنتا جا رہا تھا۔ میرا عزم اور عہد ایک ہی تھا — انگریزوں کے خلاف زمین دوز جنگ — دہشت گردی، تباہ کاری اور تخریب کاری — مَیں جانتا تھا کہ مَیں اکیلا یا وہ گروہ جو مَیں تیار کروں گا، انگریزوں کو ہندوستان سے بھگا نہیں سکے گا۔ انگریزوں کی حکومت آج کی جمہوریت جیسی نہیں تھی۔ وہ ایک بادشاہی تھی، شہنشاہی تھی اور ہندوستان اس شہنشاہی کے قبضے میں تھا۔ ہم عوام نہیں رعایا تھے۔ بغاوت کی سزا موت تھی۔ ہم جسے جنگِ آزادی کہتے تھے وہ انگریزی راج کی نگاہ میں بغاوت تھی — محکوم قوم کی جنگِ آزادی حاکم قوم کے لئے دہشت گردی اور تخریب کاری ہوتی ہے۔

مَیں یہ جانتا تھا کہ میں انگریزوں سے اپنا ملک آزاد نہیں کرا سکوں گا۔ میں پکڑا جا سکتا ہوں۔ مارا جا سکتا ہوں لیکن میں نے سوچا تھا کہ اپنے

پیچھے نقوشِ پا چھوڑ جاؤں گا۔ ایک جذبہ چھوڑ جاؤں گا اور میرے بعد آنے والے اس جذبے کو اپنے سینوں میں رکھ لیں گے اور میرے نقوشِ پا کو دیکھ کر آزادی کے راستے پر کچھ اور آگے چلے جائیں گے۔ پھر یہ ورثہ اور آگے چلے گا اور اس طرح اس قفس کے طائر آزاد ہونے کو تڑپتے پھڑپھڑاتے رہیں گے اور وہ دن طلوع ہو گا جب وہ اس قفس کو توڑ لیں گے۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے۔

اُس وقت ہندوستان میں ایسی تنظیمیں بنی ہوئی تھیں جو دہشت گردی کی جنگ لڑ رہی تھیں۔ یہ میں آپ کو شروع میں سُنا چکا ہوں۔ ان کے متعلق میں اس لئے زیادہ جانتا تھا کہ اُن کا سراغ لگانا اور انہیں پکڑنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ یہ تو میں تفصیل سے سُنا چکا ہوں کہ میں نے کس طرح دہشت گرد گروہوں کو پکڑا تھا۔ وہ چند ایک افراد تھے جو پکڑے گئے تھے، ان کے گروہ ابھی تک موجود تھے اور سرگرم بھی تھے۔

اب میں خود دہشت گرد بن گیا تھا۔ میں اب بڑی شدّت سے محسوس کر رہا تھا کہ ان لوگوں کو اکٹھا کروں۔ میں نے دیکھا تھا کہ یہ گروہ اپنے اپنے طور پر کام کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے واقف ہوں گے لیکن ایک دوسرے سے بہت دُور دُور رہتے تھے۔ ان کی منزل تو ایک ہی تھی لیکن ہر ایک نے اپنا اپنا راستہ اختیار کر رکھا تھا۔ یہ راستے صرف کٹھن ہی نہیں تھے بلکہ یہ راستے گہری گھاٹیوں اور چٹانوں کے درمیان سے گزرتے تھے۔ انہیں ایک راستے پر ڈالنا ضروری تھا۔

یہ سورج کی بکھری ہوئی کرنیں تھیں۔ سورج کی بکھری ہوئی کرنوں کو آتشیں شیشے کے ذریعے ایک نقطے پر مرکوز کر دیں تو آگ لگا دیتی ہیں۔ میں بکھری ہوئی ان کرنوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنا چاہتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ کام بہت ہی مشکل ہے لیکن انسان کچھ کرنے پر آ جاتے تو ناممکن کے لفظ کو ڈکشنری سے صاف کر سکتا ہے، لیکن میری پوزیشن یہ تھی

کہ ابھی اپنا بھی کوئی ٹھکانا نہیں بنا تھا۔ یہ ایک ایسی وجہ تھی جس نے میرے اندر تلخی پیدا کر دی تھی۔ شاید اسی تلخی کا اثر تھا کہ میں اپنے آپ میں کمزوری یا تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔

تھکن کے احساس کی یہ وجہ بھی ہو سکتی تھی کہ میں ایک اور جنگ لڑ رہا تھا۔ یہ ایسی محاذ آرائی تھی جو میرے اپنے ہی خلاف تھی۔ پہلے سائرہ میرے ساتھ رہی۔ وہ حسین تھی، میں جوان تھا اور راتوں کی تنہائی تھی۔ اس کے ساتھ سائرہ کی وارفتگی بلکہ خود سپردگی بھی تھی۔ میں فرشتہ نہیں ایک انسان تھا اور انسان اپنی کمزوریوں کا غلام ہوتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ انسان کی وہ کمزوریاں جو اُس کی فطرت کے تقاضوں اور مطالبوں کے مطابق ہوتی ہیں وہ اُسے مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ ہتھیار ڈال دے۔

میں اُن چند ایک انسانوں میں سے تھا جو ہتھیار ڈالنے سے پہلے اپنی جان دے دیا کرتے ہیں لیکن جان دینے سے پہلے اُنہیں جو جنگ اپنے خلاف لڑنی پڑتی ہے وہ بڑی ہی اذیت ناک اور صبر آزما ہوتی ہے۔ کئی بار میرے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا لیکن میں نے اپنے آپ کو اذیت میں ڈال کر دامن بچا لیا۔

سائرہ گئی تو لیلا آگئی۔ یہ ہندو لڑکی بھی سائرہ جیسی دلکش تھی اور عمر میں اُس سے چند سال چھوٹی تھی۔ اس لڑکی نے بھی اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا تھا اور اُس نے مجھے رشوت یا انعام کے طور پر اپنا جسم پیش بھی کیا تھا۔ اس طرح اُس نے مجھے پھر اُسی جہنم میں پھینک دیا تھا جس سے میں سائرہ کو اُس کے گھر بھیج کر نکلا تھا۔

انسان ثابت قدم رہے تو اس سے زیادہ دشوار صورتِ حال سے بھی نکل آتا ہے۔ یہ بہت ہی مشکل کام ہے لیکن ذہن کو اپنے قابو میں رکھا جاتے تو مشکلیں آسان ہو جایا کرتی ہیں۔ میں نے لیلا کے معاملے میں یہ سوچ لیا تھا کہ یہ لڑکی میرے کردار سے متاثر ہوتی ہے۔ اُسے توقع کچھ اور تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ درندوں کی کچھار میں آگئی ہے لیکن میرے

وجود میں اُسے ایک انسان نظر آگیا۔ یہاں بھی راتوں کی تنہائی تھی اور باز پُرس کرنے والا کوئی نہ تھا۔

لیلا اگر ہندوستان میں آج بھی زندہ ہے تو وہ اب بھی مجھے یاد کرتی اور سوچتی ہو گی کہ سکندر اگر درندہ نہیں تھا تو انسان بھی نہیں تھا۔ اُسے یہ بتانے والا کوئی نہیں تھا کہ میں جلتے تنور میں پڑا رہا ہوں اور اپنے آپ کو انسانیت کی سطح پر رکھنے کے لئے مجھے اپنے جذبات کا قتلِ عام کرنا پڑا تھا۔



لیلا ابھی تک میرے پاس تھی اور میری یہ جنگ ختم نہیں ہوتی تھی۔ میں اب یہاں سے بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ شک بھی ہونے لگتا تھا کہ دیبا مجھے ڈاکو بنانا چاہتا ہے۔

میں اب صاف طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ میں راستے سے بھٹک گیا ہوں۔

میں نے یہ بھی سوچا کہ لیلا سے توجہ ہٹا لوں۔ اُس کا اپنا بھائی اُس کے پاس آگیا تھا۔ اب یہ فرض اُس کے بھائی کا تھا کہ لیلا کو ان آدمیوں سے بچا کر رکھے جو اُسے اپنا مال سمجھ کر بیچنا چاہتے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو قائل کر لیا کہ لیلا کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔

لیلا اور اُس کا بھائی رمیش الگ کمرے میں سوتے تھے اور مَیں اس کمرے کے قریب ہی ایک الگ کمرے میں رہتا تھا۔

جس روز جھارا نے مجھے کہا تھا کہ وہ لیلا کو یہاں سے لے جائیں گے اس کے دو روز بعد رمیش میرے پاس آبیٹھا۔ اُس نے بتایا کہ جھارا اور اُس کے ساتھی نے اُسے بھی دھمکی دی ہے۔

"اپنے دماغ کو ٹھکانے رکھ جھارے!" — رمیش نے اُسے کہا تھا — "کیا تُو اپنی بہن کو ڈاکوؤں کے حوالے کر دے گا؟"

"میں نہیں جانتا کہ یہ تمہاری بہن یا ماں ہے" — جھارے نے کہا

—— "ہم نے اس لڑکی کو اغوا کیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ اغوا کوئی آسان واردات نہیں ہوتی۔ ہم نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا تھا۔ ہم اس لڑکی کو بیچیں گے اور تم جانتے ہو کہ یہ ہمارا پیشہ ہے۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے" —— رمیش نے کہا —— "لیکن اب بہن میرے پاس ہے اور وہ تمہیں نہیں مل سکتی۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔"

"تم جو کچھ بھی ہو ہم نہیں جانتے" —— جھارے نے کہا —— "اگر تمہیں اپنی بہن اتنی ہی پیاری ہے تو بیس ہزار روپیہ دے دو اور بہن کو لے جاؤ۔"

"سکندر بھائی!" —— رمیش نے یہ بات سنا کر کہا —— "میں بڑے چکر میں آگیا ہوں۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ استاد دیبا سے بات کی جائے؟"

"نہیں!" —— میں نے کہا —— "دیبا پہلے ہی بہت پریشان ہے۔ وہ ان لوگوں کو اغوا کی اجازت دے کر پچھتا رہا ہے۔ اس کے پاس یہ جھگڑا نہ ہی لے جایا جائے تو بہتر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی الٹا سا فیصلہ کر دے۔ یہ اس کی بادشاہی ہے۔ وہ جو فیصلہ کرنا چاہے کر سکتا ہے اور اپنا فیصلہ منوا بھی سکتا ہے ..... میں خود سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔"

میں نے رمیش کو تسلی دے دی۔ اسے مجھ پر بھروسہ تھا کہ میں اس کی پوری مدد کروں گا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ ان کی مدد کروں یا انہیں ان کے حال پر ہی چھوڑ دوں۔ یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میں خواہ مخواہ دوسروں کے مسئلے اپنے ذمے لے لیا کرتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس مسئلے سے الگ کر لیا۔

❂

دو یا تین دن گزرے ہوں گے۔ رات کا وقت تھا۔ شاید آدھی

رات گزر گئی تھی۔ میں بڑی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی نرم و نازک سی چیز میرے ماتھے پر رینگ رہی تھی۔ میں نے بڑی تیزی سے اپنا ہاتھ اپنے ماتھے پر مارا۔ یہ کسی کی انگلیاں تھیں جو میرے ماتھے پر رینگ رہی تھیں۔ میں نے اس ہاتھ کو پکڑ لیا تو یہ پتلی پتلی، نازک سی انگلیاں میری انگلیوں میں الجھ گئیں اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میری چارپائی پر تکیے کے قریب لیلا بیٹھی تھی۔

"اپنے بھائی کو سوتا چھوڑ آئی ہو؟" —— میں نے کہا۔

"ہاں!" —— لیلا نے سرگوشی میں کہا —— "اس کی فکر نہ کرو۔"

"ہوش میں آؤ لیلا!" —— میں نے کہا —— "رمیش مجھ پر اعتبار کرتا ہے۔ میں اس کے اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔"

"پہلے پہل میں تمہیں غلط سمجھتی تھی" —— لیلا نے کہا —— "اب تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میں نے تمہیں ایک جوان آدمی سمجھنا چھوڑ دیا ہے اور تم مجھے ایک جوان لڑکی سمجھنا چھوڑ دو ..... دل گھبرا رہا تھا۔ بار بار نیند کھل جاتی تھی اس لئے تمہارے پاس آگئی ہوں۔"

"پھر بھی لیلا!" —— میں نے کہا —— "رمیش شک کر سکتا ہے۔ تم چلی جاؤ۔"

"چلی جاؤں گی" —— لیلا نے کہا —— "تمہارے پاس بیٹھ کر دل کو تسکین سی ہوتی ہے۔ میں اپنے بھائی کو دھوکہ نہیں دوں گی لیکن اس کے ساتھ میں وہ باتیں نہیں کر سکتی جو تمہارے ساتھ کر لیتی ہوں۔"

باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں لیلا سے کچھ دور بیٹھا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر میں ذرا اور پیچھے سرک گیا۔ چاندنی رات تھی۔ کھلے ہوئے دروازے اور دریچے سے چاندنی کمرے میں آ رہی تھی جس سے کمرہ روشن تھا۔

"سکندر!" —— یہ رمیش کی آواز تھی۔ میرے کمرے میں آگیا اور بولا —— "لیلا ادھر آئی ہے؟"

میں پریشان ہوگیا اور میرا پسینہ نکل آیا۔ ایسے لگا جیسے میں چوری کرتے پکڑا گیا ہوں۔ ریلا بیٹھی رہی۔

"آؤ بھیا!" — ریلا نے رمیش سے کہا — "نیند نہیں آرہی تھی۔ یہاں آبیٹھی۔"

"تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں کتنا پریشان ہوں گا" — رمیش نے کہا۔

"میں بھی اسے یہی سمجھا رہا تھا" — میں نے کھسیانے سے لہجے میں کہا — "اسے تم ہی کچھ سمجھاؤ.... جاؤ ریلا! ..... رات کو باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔ تم جانتی ہو کہ یہاں تمہارے دشمن موجود ہیں۔"

رمیش اور ریلا کچھ دیر میرے پاس بیٹھے رہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ چلے گئے۔ میرے دل پر ابھی یہ بوجھ باقی تھا کہ رمیش کو مجھ پر شک ہوگا اور وہ مجبوری کے تحت چپ ہے۔ رات گزر گئی تو میں نے صبح اُسے اپنے پاس بٹھا کر شک رفع کرنے کی کوشش کی۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں کوئی شک نہیں لیکن میں اپنے آپ میں بے اطمینانی سی محسوس کرتا رہا۔



دو دن اور گزر گئے۔ آدھی رات سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ رمیش نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ میں گھبرایا ہوا اُٹھا۔

"ریلا یہاں نہیں آئی؟" — رمیش نے پوچھا۔

"نہ رمیش!" — میں نے کہا — "یہاں تو نہیں آئی۔"

"پھر وہ گئی" — رمیش نے کہا۔

میں اُٹھا اور رمیش کو ساتھ لے کر اُس کے کمرے میں گیا۔ سب سے پہلے ریلا کی چارپائی کے نیچے دیکھا۔ اُس کی جوتی وہاں نہیں تھی۔ اس سے مجھے یہ پتہ چلا کہ لڑکی کو اٹھا کر نہیں لے جایا گیا۔ میں رمیش کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں گیا اور وہاں سے ریوالور اُٹھا لیا۔ اگر لڑکی غائب ہو

گئی تو یہ کام تمہارے اور اُس کے ساتھی کا تھا۔ میں نے نتائج کو سوچے بغیر یہ فیصلہ کر لیا کہ ان دونوں کو گولی مارنی پڑی تو مار دوں گا۔

ہم دونوں وہاں گئے جہاں وہ دونوں رہتے تھے۔ دونوں وہاں نہیں تھے۔ پھر ہم اُس جگہ گئے جہاں گھوڑیاں اور گھوڑے بندھے رہتے تھے۔ دو گھوڑیاں غائب تھیں۔ ہم نے حمید اللہ خان اور نور اللہ کو جگایا اور اُنہیں بتایا کہ تمہارا اور اُس کا ساتھی لڑکی کو لے گئے ہیں۔ میں نے اُنہیں یہ بھی کہا کہ مال دیکھ لیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ وہاں بھی ہاتھ مار گئے ہوں۔

"وہاں تک اُن کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا" — نور اللہ نے کہا — "وہ لڑکی کو لے گئے ہیں۔ اب خطرہ یہ ہے کہ یہ دونوں شاید نشاندہی نہ کریں لیکن لڑکی پکڑی گئی تو نشاندہی ہوجاتے گی۔"

یہی اصل خطرہ تھا۔ لڑکی کے ساتھ اگر کسی کو دلچسپی تھی تو وہ صرف رمیش تھا جس کی وہ بہن تھی۔ ہمیں لڑکی کے ساتھ صرف یہ دلچسپی تھی کہ وہ اس علاقے سے باہر نہ جاتے ورنہ ہم سب پکڑے جائیں گے۔ ان دونوں آدمیوں نے موقع بڑا اچھا دیکھا تھا۔ ایک ہی روز پہلے دیبا اپنے دَورے پر نکل گیا تھا۔ وہ بظاہر معزز آدمی تھا۔ اُس کے تعلقات بہت سے لوگوں کے ساتھ تھے۔ کبھی کبھی وہ میل ملاقات کے لیے چلا جایا کرتا تھا۔ ہماری موجودگی میں وہ پہلی بار نکلا تھا۔

دیبا کے دو تین آدمی وہاں موجود تھے۔ انہیں بھی ہم نے جگا لیا اور اس مسئلے پر غور کرنے لگے کہ کیا کیا جاتے۔ یہی ایک بات ہر کسی کے دماغ میں آتی تھی کہ ان کا تعاقب کیا جاتے لیکن یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کس طرف گئے ہیں اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ انہیں یہاں سے نکلے کتنا وقت گزر گیا ہے۔ ہم سب کا اس ڈھکے چھپے ٹھکانے سے باہر نکل جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ ساہوکار کے گھر ڈاکے اور اغوا کی واردات کی وجہ سے تمام علاقہ مخبروں اور بغیر وردی پولیس کے آدمیوں کی نظر میں تھا۔ ہم سب پکڑے جا سکتے تھے۔

ہم سب اپنے ٹھکانے کے علاقے میں گھومے پھرے۔ وہاں سے کوئی سراغ نہ ملا۔

کچھ دیر بعد ہمیں بہت دُور سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ شہری نہیں دیہاتی علاقہ تھا۔ وہ سناٹے اور سکوت کی دُنیا تھی۔ رات کی خاموشی میں بہت دُور کی آواز قریب کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ یہ شادی کے گولے بھی ہو سکتے تھے لیکن وہ وقت شادی کی آتش بازی کا نہیں تھا۔ آدھی رات بہت دیر ہُوئی گزر چکی تھی۔ اُس وقت دیہات کے لوگ بڑی گہری نیند سوتے ہُوتے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ میں گولیوں کی آواز کو پہچانتا تھا۔

"کیا ان دونوں کے پاس ریوالور تھے؟" — میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

"اگر دونوں کے پاس نہیں تو ایک کے پاس ریوالور تھا" — دیبا کے ایک پُرانے آدمی نے جواب دیا۔

مجھے ویسے ہی خیال آیا کہ ان دونوں کا پولیس مقابلہ نہ ہو گیا ہو۔ دیہاتی علاقے میں اس قسم کی فائرنگ غیر معمولی بات تھی۔

اب ہم قیاس آرائیوں کے بغیر اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ رات گزر گئی۔ رمیش بہت بے چین اور بے قرار تھا۔ اُسے اپنی بہن کا غم کھا رہا تھا اور ہم اس لئے پریشان تھے کہ نشاندہی ہو جائے گی اور پولیس اچانک آکر ہمارے ٹھکانے کو محاصرے میں لے لے گی۔ مجھے رات کی فائرنگ پریشان کر رہی تھی۔ دیبا وہاں نہیں تھا۔ اس علاقے سے وہی واقف تھا۔ وہی کوئی بہتر فیصلہ کر سکتا تھا۔ اُس نے ابھی دو تین روز اور نہیں آنا تھا۔

ہم نے یہ انتظام کیا کہ اونچی چٹانوں پر ہر طرف ایک ایک آدمی کو بٹھا دیا۔ یہ چار آدمی تھے۔ ان کے ذمے یہ کام تھا کہ ہر طرف نظر رکھیں۔ ہر ایک کے پاس ایک ایک بانسری تھی۔ جس کسی کو کوئی خطرہ نظر آتا تھا اُس نے

بانسری بجانی تھی۔

ہم اگلے دن چوکس اور ہوشیار رہے اور دن گزر گیا۔



رات گہری ہو چکی تھی۔ چاند ابھی ابھی اُبھرا تھا۔ ہم ابھی سوتے نہیں تھے۔ فضا میں ایک خطرہ منڈلاتا نظر آ رہا تھا۔ ہم اکٹھے بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی واقعہ یا حادثہ ہونے والا ہو۔

کچھ وقت اور گزرا تو ہمیں گھوڑے کے ٹاپ سنائی دینے لگے۔ ہم سب پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ہمارے کان ایک آواز سننے کے لئے کھڑے ہو گئے لیکن یہ آواز نہیں آ رہی تھی۔ ہم سب تیار ہو گئے۔ ایک ہیجانی سی کیفیت تھی جو ہم پر طاری ہوتی جا رہی تھی۔

گھوڑے کے ٹاپ بلند ہوتے گئے اور اس کے ساتھ ہی وہ آواز سنائی دی۔ یہ ایک خاص قسم کی آواز تھی جو ہمارا ہر ساتھی باہر سے آتے وقت ذرا دُور سے مُنہ سے نکالتا تھا۔ یہ آواز سُن کر بھی ہمیں اطمینان نہ ہُوا۔ مُخبری ہو جانے کی صورت میں پولیس کو یہ پتہ بھی چل سکتا تھا کہ ہمارے آدمی اس طرح کی آواز نکال کر اس ڈھکی چھپی جگہ میں داخل ہوتے ہیں۔

دیبا کے دو آدمی اُس طرف چلے گئے جدھر سے آواز آتی تھی۔ گھوڑا اُسی طرف سے آ رہا تھا۔ یہ کوئی اور آدمی بھی ہو سکتا تھا۔ ہمارے اعصاب کھچے تنے ہوتے تھے۔ اب ایسی آہٹیں سنائی دینے لگیں جیسے آنے والا اس علاقے میں داخل ہو چکا ہو۔ ہمارے لئے ایک ایک منٹ ایک ایک گھنٹے کے برابر ہو رہا تھا کہ اتنے میں ہمارے ایک ساتھی کی آواز سنائی دی — "اُستاد ہے"۔

دو چار منٹ بعد دیبا ہمارے پاس پہنچ گیا۔ وہ خاصا خوش طبع آدمی تھا لیکن اُس وقت وہ سخت غُصّے میں تھا۔ سلام دعا کی بجائے اُس نے گالیاں بکنی شروع کر دیں۔ ہم اُس سے پوچھتے تھے کہ اُسے کیا ہو گیا ہے لیکن اُس کی زبان پر گالی گلوچ کے سوا کچھ نہیں آتا تھا — ہم سب خاموشی

سے سُنتے رہے۔

"وہ لڑکی کہاں ہے؟" — آخر دیبا نے پوچھا — "کیا تمہیں معلوم ہے؟ ..... اور وہ دو کُتے کہاں ہیں؟ ..... کیا تمہیں معلوم ہے؟"

"وہ رات کو لڑکی کو ساتھ لے کر نکل گئے تھے" — میں نے جواب دیا — "رمیش اتنی گہری نیند سویا رہا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کی بہن کو دو آدمی لے گئے ہیں۔"

"وہ اُسے کمرے سے نہیں لے جا سکتے تھے" — رمیش نے کہا — "وہ باہر نکلی ہوگی اور یہ آدمی اُس کے انتظار میں ہوں گے۔"

"رمیش!" — دیبا نے کہا — "میں تمہاری بہن کی کیا تعریف کروں۔ میرا خیال ہے کہ تم میں اتنی عقل اور جرأت نہیں ہوگی جتنی تمہاری بہن میں ہے۔"

"دیبا اُستاد!" — میں نے قدرے جھنجھلا کر کہا — "تمہیں جتنی گالیاں یاد تھیں وہ سب دے چکے ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ لڑکی کہاں ہے۔ تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم اسے کہیں دیکھ آتے ہو۔"



دیبا نے ہمیں ایک عجیب قصہ سُنا دیا۔ اُس نے ابھی واپس نہیں آنا تھا، لیکن ایسا واقعہ ہو گیا کہ وہ واپس آگیا۔ گزشتہ رات وہ رمیش کے گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا تھا۔ وہاں ٹھہرنے کا مقصد دراصل یہ تھا کہ ساہوکار کے گھر کی واردات کی تفتیش کا خفیہ جائزہ لینا تھا۔ اگلے روز دوپہر سے کچھ پہلے دیبا وہاں سے کسی اور گاؤں کے لیے روانہ ہونے والا تھا کہ تھانے سے ایک کانسٹیبل آگیا۔ کسی مخبر نے تھانے اطلاع دے دی ہوگی کہ دیبا گاؤں میں آیا ہوا ہے۔ کانسٹیبل نے اُسے کہا کہ تھانیدار بُلا رہا ہے۔

دیبا بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اُسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اُس کی غیر حاضری میں اُس کی بادشاہی میں کیا واقعہ پیش آگیا ہے۔ اُسے خیال

آیا کہ تھانیدار اُس سے پُوچھ گچھ کرے گا اور ہو سکتا ہے شاملِ تفتیش بھی کر لے۔ دیبا پاتے کا آدمی تھا۔ وہ تھانے چلا گیا۔

"دیبے بھائی!" — تھانیدار نے دوستانہ لہجے میں کہا — "کچھ مدد کرو۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ سیٹھ (ساہوکار) کے گھر کس نے واردات کی ہے۔ اگر یہ تمہاری واردات ہے تو آؤ بات کر لیں۔ اپنے صرف دو آدمی مجھے دے دینا، واردات خواہ آٹھ آدمیوں نے کی ہو، تمہارا نام نہ کاغذوں پر آنے دوں گا نہ زبانی کوئی تمہارا نام لے گا۔"

"سُنا ہے اس واردات میں ایک لڑکی بھی گئی ہے" — دیبے نے کہا۔

"ہاں گئی ہے" — تھانیدار نے کہا۔

"کیا آپ نہیں جانتے کہ میں نے یا میرے کسی بھی آدمی نے عورت پر کبھی ہاتھ نہیں اُٹھایا؟" — دیبا نے کہا — "اگر کوئی پکا ثبوت یا شہادت ہے تو مجھے پکڑ لو۔"

"تمہارے دو آدمی رات کو مارے گئے ہیں" — تھانیدار نے کہا۔

"وہ کون ہیں؟" — دیبا نے پوچھا۔

"لاشیں ہسپتال گئی ہوئی ہیں" — تھانیدار نے کہا — "آئیں گی تو دیکھ لینا۔"

"دیکھ کیا لوں!" — دیبا نے کہا — "میرا کوئی آدمی نہیں مارا گیا۔"

"دیبے اُستاد!" — تھانیدار نے کہا — "میں تمہارے ہر ایک آدمی کو جانتا ہوں۔ جھارا تمہارا آدمی تھا۔ شریفا تمہارا آدمی تھا اور سیٹھ کی بھورلیلا تمہارے پاس رہی ہے۔"

میں تھانیدار اور اس ڈاکو کے تمام مکالمے نہیں لکھ رہا۔ ان کے درمیان بہت باتیں ہوتی تھیں۔ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ دیبے کے

پاتے کے اُستاد ڈاکو تھانیداروں کو اُنگلیوں پر نچانا جانتے تھے اور انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ دیبا تو تھا ہی اُستاد۔ وہ تھانیدار کو ٹال رہا تھا۔ تھانیدار اُٹھا اور باہر نکل گیا۔ دو چار منٹ بعد واپس آیا تو اُس کے ساتھ لیلا تھی۔

دیبے نے لیلا کو دیکھا تو وہ اندر سے کانپنے لگا۔ لڑکی اُسے بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔ تھانیدار نے لیلا کو دیبا کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"لیلا!"— تھانیدار نے دیبا کی طرف اشارہ کر کے کہا —"اس آدمی کو تم پہچانتی ہو۔ تم اس کے ساتھ رہی تھیں"۔

لیلا دیبے کے چہرے پر نظریں گاڑے دیکھتی رہی۔ دیبے کی پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا، وہ کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا۔

"ڈرو مت لیلا"— تھانیدار نے کہا —"اب تم اس کے قبضے میں نہیں ہو۔ کہہ دو کہ اس نے تمہیں اپنے قبضے میں رکھا اور اغوا کیا تھا"۔

لیلا نے تھانیدار کی طرف دیکھا اور سر نفی میں ہلا دیا۔

"نہیں"— لیلا نے کہا —"میں نے اس آدمی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں اس کے قبضے میں نہیں رہی"۔

لڑکی کا اتنا کہنا تھا کہ دیبا تھانیدار کے پیچھے پڑ گیا۔ تھانیدار کچھ شرمسار ہُوا۔

"پنڈت جی مہاراج!"— دیبا نے تھانیدار سے کہا —"اب میں آپ کو ایک بات بتا دیتا ہوں۔ ایسی بیوقوفی نہ کرنا کہ اس لڑکی کی مار پٹائی شروع کر دو اور اس سے کہلوا لو کہ یہ میرے پاس رہی ہے ....کیوں لڑکی! یہاں تمہیں کسی نے پریشان تو نہیں کیا؟ مارا پیٹا تو نہیں؟"

"نہیں دیبے بھائی!"— تھانیدار نے کہا —"مارنے پیٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تمہیں صحیح بات بتا دیتا ہوں ....اس تھانے کی

اُس چوکی کو تم جانتے ہو۔ وہاں تین کانسٹیبلوں کے ساتھ اے ایس آئی گشت پر تھا۔ اس نے دو گھوڑے آتے دیکھے تو سواروں کو پکارا۔ سواروں نے رُخ پھیر لیا۔ تب اے ایس آئی نے دیکھا کہ ایک گھوڑے پر دو سوار ہیں اور دوسرا سوار شاید عورت ہے۔ اے ایس آئی بھی گھوڑے پر تھا اور کانسٹیبل پیدل جا رہے تھے۔ چونکہ میرے علاقے میں بہت بڑی واردات ہو چکی تھی اس لئے کانسٹیبلوں کے پاس رائفلیں تھیں اور اے ایس آئی کے پاس ریوالور تھا۔ اے ایس آئی نے اپنا گھوڑا گھوڑ سواروں کے پیچھے ڈال دیا۔ سوار ایک ٹیلے کے پیچھے ہو گئے۔ کانسٹیبلوں نے دوڑ کر اس جگہ کو گھیرے میں لے لیا۔

اے ایس آئی نے ایک بار پھر للکارا اور یہ کہا کہ اگر تم لوگ سامنے نہ آئے تو گولی مار دوں گا۔ اس کے جواب میں ٹیلے کے پیچھے سے ریوالور کی ایک گولی فائر ہوئی جو اے ایس آئی کے قریب سے گزری۔ اس سے کوئی شک نہ رہا کہ یہ ڈکیت ہیں اور یہ کسی عورت کو لے جا رہے ہیں۔

اے ایس آئی نے کانسٹیبلوں کو فائر کا حکم دے دیا اور خود بھی ریوالور ہاتھ میں لے کر ٹیلے کی طرف بڑھا۔ دونوں آدمی فائر کرتے رہے۔ کچھ دیر دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ آخر ملزموں کی طرف خاموشی ہو گئی ....

"آگے بڑھے تو دونوں آدمی مرے پڑے تھے۔ دونوں کو تین تین چار چار گولیاں لگی تھیں۔ گھوڑے کچھ دُور چلے گئے تھے اور لڑکی ٹیلے کے ایک طرف دبکی بیٹھی کانپ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اے ایس آئی نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ وہ یہی لڑکی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ سیٹھ کی بہو ہے اور یہ دو آدمی اسے زبردستی وہاں سے اُٹھا لائے تھے۔ اے ایس آئی اسے تھانے لے آیا اور میں نے اس کا بیان لیا۔ یہ کہتی ہے کہ اسے کچھ پتہ نہیں کہ اسے کہاں لے گئے تھے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے گئے تھے اور اب آنکھوں پر پٹی باندھ کر کہیں اور لے جا رہے تھے۔

تھانیدار نے دیبا کو لڑکی کا پورا بیان سنایا اور یہ بھی بتایا کہ اس نے لڑکی سے کیا پوچھا تھا۔ میں حیران ہوں کہ لیلا نے میرے کردار کا اور دیبے کے سلوک کا اتنا بڑا صلہ دیا جس کی توقع اتنی ناتجربہ کار، کم عمر اور گھریلو لڑکی سے نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ تھانیدار نے اُسے مارا پیٹا تو نہیں تھا، لیکن پریشان بہت کیا تھا۔

تھانیدار نے دیبا کو یہ بھی بتایا کہ اُس نے علی الصبح مُورے ڈاکو کو بلایا تھا۔ لڑکی نے اُسے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ تھانیدار نے یہ بھی بتایا کہ اُس نے لیلا کے سُسر یعنی ساہوکار کو بلایا تھا تاکہ وہ تصدیق کرے کہ یہی اُس کی بہو ہے جو اغوا ہوئی تھی، لیکن اُس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اُسے اپنے گھر نہیں لے جائے گا کیونکہ یہ ڈاکوؤں کے پاس رہ آئی ہے اور ڈاکو یقیناً مسلمان ہوں گے۔ ساہوکار نے لڑکی کو ناپاک قرار دے کر اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

دیبا کی جان میں جان آئی اور وہ وہاں سے آگیا، لیکن تھانیدار نے اُسے چار پانچ گھنٹے تھانے میں رکھا۔ لڑکی کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ظاہر ہے اُس نے لڑکی کو چکر دینے کی بہت کوشش کی ہوگی۔ بہرحال میں اس لڑکی کے کمال پر حیران ہوں کہ وہ اپنے انکار پر ڈٹی رہی۔

دیبا جھارے اور شریفے کی لاشیں دیکھ کر آیا تھا اور بہت خوش تھا کہ وہ اپنے انجام کو پہنچے۔ خوش تو ہم سب تھے کہ ہم بچ گئے تھے۔ کبھی کبھی دل کو دھڑکا سا لگتا تھا کہ لڑکی گاؤں میں ہے اور ایسے ہو سکتا ہے کہ تھانیدار، ساہوکار اور اُس کے اپنے ماں باپ اُس پر دباؤ ڈالیں اور وہ دیبے کے ٹھکانے کی نشاندہی کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

رمیش نے جب یہ سُنا کہ اُس کی بہن گھر پہنچ گئی ہے اور سُسر نے اُسے اپنے گھر لے جانے سے انکار کر دیا ہے تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا کہ وہ اپنی بہن کے پاس جا رہا ہے۔

"رمیش!" — دیبا نے بڑے تحمل سے رمیش کا ہاتھ پکڑا اور اُسے

بٹھا کر کہا — "تمہارا چلے جانا ہمارے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"دیبے اُستاد!" — رمیش نے دیبے کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا — "اگر بہن تھانے میں کھڑی ہو کر تمہیں بچا سکتی ہے تو بھائی تم پر اپنی جان بھی قربان کر دے گا .... مجھے نظر آ رہا ہے کہ میں تمہارے ہی پاس واپس آؤں گا۔ مجھے جانے دے استاد! میں اپنی بہن کے پاس نہ ہُوا تو یہ خطرہ ہے کہ اُسے پریشان کر کے کوئی اُلٹی سیدھی بات اُس کے مُنہ سے اگلوا لیں گے۔"

رمیش کی اس بات میں خاصا وزن تھا۔ میں نے اور حمید اللہ خان نے کہا کہ اسے جانے دو۔

"دیبے اُستاد!" — رمیش نے کہا — "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اُس ساہوکار کو خوش کرنے کے لئے تمہیں پکڑا دوں گا جس نے مجھے مُشتبہ لکھوا کر پولیس سے میری ہڈیاں تڑوائی ہیں اور جو میری بہن کو ناپاک کہہ کر اُسے قبول کرنے سے انکاری ہے؟ تم نے اُس کا گھر خالی کیا ہے۔ میں اُس کے محل کو آگ لگانا چاہتا ہوں۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ میں ڈاکوؤں کو پکڑوں گا، لیکن اُس نے مجھے ہی ڈاکو کہہ کر پولیس کے حوالے کرا دیا۔"

رمیش ہم سب سے ہاتھ ملا کر جب جانے لگا تو میں نے اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔



خدا نیک نیتی کا اجر ضرور دیتا ہے۔ میں لیلا کے ساتھ نیک نیت رہا۔ وہ میرے ساتھ نیک نیت رہی۔ اس کا خدا نے یہ اُجر دیا کہ وہ بکنے سے بچ گئی اور اُس نے ہمیں گرفتاری سے بچا لیا۔ خدا نے ایک کمسن لڑکی کو اتنی عقل عطا کر دی کہ میں اور میرے ساتھی بچ گئے۔ میں اگر گرفتار ہو جاتا تو ڈکیتی کی یہ واردات ثابت نہ ہوتی تو بھی میں سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچ جاتا۔

چونکہ رمیش بھی چلا گیا تھا اور لیلا پہلے ہی وہاں موجود تھی اس لئے خطرہ بھی موجود تھا۔ وہ آخر ہندو تھے اور گاؤں میں انہیں کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں تھی۔ ساہوکار انہیں بہت خراب کر سکتا تھا۔ رمیش کے پاس دو ہی راستے تھے۔ گاؤں سے بھاگ جاتا یا ہماری نشاندہی کر دیتا۔ دیبے نے اپنے ایک آدمی کو رمیش کے گاؤں بھیج دیا جس نے وہاں کے حالات پر نظر رکھنی تھی۔ ادھر ہم نے بلند جگہوں پر پہریدار کھڑے کر دیتے تھے۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ ہر صبح میں یہ احساس لے کر بیدار ہوتا تھا کہ آج کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور ہو گا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وقت کی رفتار بہت ہی سست ہو گئی ہے۔ صرف فراغت ہی انسانی ذہن کو خراب کر دیا کرتی ہے لیکن فراغت کے ساتھ اس قسم کی غیر یقینی کیفیت بنی ہوئی ہو جو ہمارے لئے بن گئی تھی تو ناقابلِ برداشت ذہنی اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ میری حالت اور زیادہ خراب ہو رہی تھی کیونکہ حالات کے تیز و تند تھپیڑوں سے یہاں تک پہنچا تھا جب کہ میرا راستہ اور میری منزل کہیں اور تھی۔

میں ایک روز اتنا پریشان اور بیتاب ہوا کہ دیبا کے پاس جا بیٹھا۔

"استاد!" — میں نے کہا — "تم جانتے ہو میرے ارادے کیا ہیں۔ انہی ارادوں کی خاطر ہم نے یہ واردات کی ہے۔ اب مجھے کوئی راستہ دکھاؤ۔ مال بھی ہمارے پاس آگیا ہے۔"

"کیا تم میں اتنی عقل نہیں؟" — دیبا نے کہا — "صرف ارادے باندھ لینے سے کام نہیں ہو جایا کرتے۔ کچھ خود بھی سوچو۔"

"میں نے سوچ لیا ہے استاد!" — میں نے کہا — "مجھے کسی ٹھکانے پر پہنچا دو۔"

"میں اسی ٹھکانے پر جا رہا تھا، لیکن راستے میں تمہاری لیلا نے جکڑ لیا" — دیبا نے کہا — "میں دو تین آدمیوں کو جانتا ہوں۔ ان کا اپنا ایک گروہ ہے اور وہ بھی مجھے جانتے ہیں۔"

"ہندو ہیں یا مسلمان؟"

"سب ہندو ہیں" — دیبا نے کہا — "سکندر! ارادے میرے بھی وہی ہیں جو تمہارے ہیں۔ تم جوان آدمی ہو۔ اپنے ارادوں کا ذکر جوانی کے جوش میں آکر کرتے ہو۔ میں بڑھاپے میں داخل ہو چکا ہوں، میں ذرا کم ہی بولا کرتا ہوں۔ ارادہ میرا بھی یہی ہے کہ اپنے ملک کی خاطر کچھ کر کے مروں، شاید اسی کی بدولت خدا میرے اور میرے دادے پردادے کے گناہ بخش دے۔ مجھے ہندوؤں پر بھروسہ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اور حمید اللہ خان اس گروہ میں داخل ہو جاؤ، پھر آہستہ آہستہ ہم مسلمانوں کو اکٹھا کر کے اس گروہ میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ کر لیں گے۔"

"کیا ہندو اور مسلمان مل کر یہ جنگ نہیں لڑ سکتے؟"

"میں نے تمہیں پہلے دن بتایا تھا" — دیبا نے کہا — "ہندو اور مسلمان نہیں مل سکتے۔ ہندو تمہارا ساتھ دیں گے لیکن جہاں ان کا اپنا مقصد سامنے آئے گا تو ان کی وفاداری تمہارے ساتھ نہیں بلکہ اپنے مقصد کے ساتھ ہو گی۔ اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جو گروہ خفیہ طور پر کام کر رہے ہیں ان میں ہندو بھی ہیں، مسلمان اور سکھ بھی ہیں، لیکن ہندو اور مسلمان کی دشمنی اتنی قدیم ہے اور اتنی گہری اتری ہوتی ہے کہ اسے ختم کرنا ممکن نظر نہیں آتا، پھر بھی تم اس گروہ میں شامل ہو جاؤ۔ پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے، لیکن ذرا یہ ساہوکار والا معاملہ رفع دفع ہو لینے دو۔"

انتظار کرنا ہی مناسب تھا۔ اس کے سوا اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ مجھے یہ سن کر بہت کوفت ہو رہی تھی کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے مل کر اپنے ملک کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ ایک ہندو نے مجھے بھی ڈنک مارا تھا۔ آپ کو جگ موہن یاد ہو گا۔



ابھی دس دن ہی گزرے تھے کہ ایک رات رمیش لیلا کو ساتھ لئے آگیا۔ اس نے عقلمندی یہ کی کہ شام کا اندھیرا گہرا ہوا تو گاؤں سے چلا تھا۔

اس سے یہ فائدہ ہُوا کہ ان دونوں کو گاؤں سے نکلتے کسی نے بھی نہ دیکھا۔ میرے کمرے تک بھی وہ اس طرح پہنچے کہ کسی کو پتہ نہ چلا۔ اُنہوں نے مجھے جگایا تو مَیں ہڑبڑا کر اُٹھا۔ انہیں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ مَیں نے اُنہیں اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور باقی رات ان کے ساتھ جاگتے گزر گئی۔ بہن بھائی اپنا گاؤں ہمیشہ کے لئے چھوڑ آتے تھے۔ انہوں نے اپنی پوری داستان سناتی۔

رمیش جب اپنے گاؤں پہنچا تو جو بھی اُسے ملا اُس نے یہی ایک سوال پوچھا کہ وہ اتنے دن کہاں رہا۔ اُس نے سب کو بتایا کہ وہ ساہوکار اور پولیس کے ڈر سے چلا گیا تھا۔ وہ اپنے گھر گیا تو اُسے اپنے ماں باپ اداس اور پریشان نظر آتے۔ لیلا الگ مایوسیوں کا مجسمہ بنی بیٹھی تھی۔ رمیش کو دیکھ کر اُس کے آنسو نکل آتے۔

"اس لڑکی نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا" — باپ نے کہا۔

"کیا یہ خود ڈاکوؤں کے ساتھ گئی تھی؟" — رمیش نے پوچھا۔

رمیش نے اتنی سی بات کہہ کر ہونٹ جکڑ لئے۔ وہ ماں باپ کو یہ بتانا مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اُس جگہ رہ آیا ہے جہاں ڈاکو لیلا کو لے گئے تھے۔

"مَیں انہیں سو بار بتا چکی ہوں کہ وہ مجھے اٹھا کر لے گئے تھے" — لیلا نے روتے ہوتے کہا — "آنکھیں بند کر کے لے گئے تھے اور آنکھیں بند کرکے ہی کہیں اور لے جا رہے تھے کہ پولیس مل گئی۔ یہ میرے ساتھ اس طرح سلوک کر رہے ہیں جیسے مَیں خود ان کے ساتھ گئی تھی۔"

رمیش اور لیلا نے مجھے بتایا کہ لیلا کو پولیس نے مارا پیٹا تو نہیں، لیکن اسے کھڑا کر کے کئی گھنٹے پوچھ گچھ کرتے رہے تھے۔ جب اس کے سُسر کو تھانے سے اطلاع ملی کہ اُس کی بہو آگئی ہے تو سُسر نے نہ صرف یہ کہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ تھانیدار سے یہ کہا کہ یہ خود ڈاکوؤں کے ساتھ گئی تھی اور ڈاکہ اسی نے ڈلوایا ہے اور یہ اُن کی

گھر بھیدی بنی تھی۔ ساہوکار نے یہ بھی کہا کہ اسے مار دیکھو تو یہ بتا دے گی کہ یہ کہاں سے آئی ہے۔

تھانیدار لیلا سے یہ پوچھ رہا تھا کہ جہاں اُسے رکھا گیا تھا وہ جگہ کیسی تھی اور ارد گرد کا علاقہ کیسا تھا۔ لیلا ایک ہی بیان پر قائم رہی کہ اُسے کچھ پتہ نہیں۔

"آخر میں تھانیدار ساہوکار سے تنگ آگیا تھا" — لیلا نے مجھے سنایا — "ساہوکار تھانیدار کو میری موجودگی میں حکم دیتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ یہ سلوک کرو اور اس سے یہ پوچھو، وغیرہ وغیرہ .... تھانیدار نے مجھے ساہوکار سے تنگ آکر چھوڑا تھا۔"

لیلا نے اپنے ماں باپ کے پاس جانا تھا۔ وہاں گئی تو ماں باپ نے اُسے اس طرح دھتکار دیا جیسے اُن کے گھر میں کوئی مسلمان داخل ہو گیا ہو۔ اُسے یہ حکم دیا گیا کہ وہ رسوئی کے اندر قدم نہ رکھے۔ رسوئی باورچی خانہ ہوتی تھی اور چولہے اور چولہے کے ارد گرد کی جگہ کو یہ لوگ چوکا کہتے تھے۔ کوئی ناپاک آدمی چوکے کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔ لیلا کے برتن الگ کر دئیے گئے تھے۔ اُس کے ماں باپ نے تو یہ مان لیا تھا کہ اُسے ڈاکو اٹھا لے گئے تھے، لیکن اُنہیں یہ بھی یقین تھا کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ رہی ہے اس لئے کسی ہندو گھرانے میں رہنے کے قابل نہیں رہی۔

یہی نہیں، لیلا کی سہیلیوں نے بھی اُس سے نظریں پھیر لیں۔ لیلا اپنے پڑوس کے ایک گھر میں گئی تو اُسے صاف کہہ دیا گیا کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔ لیلا کو اتنا زیادہ ذلیل و رسوا کرنے میں ساہوکار کا ہاتھ زیادہ تھا۔ اُس نے سارے گاؤں میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ اس واردات میں لیلا کی اپنی مرضی شامل تھی۔ لیلا نے خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن امید کی ایک کرن ابھی باقی تھی — یہ خلیل تھا جو لیلا کو دل و جان سے چاہتا تھا اور لیلا اُسے دل دے بیٹھی تھی۔ دونوں فیصلہ کر چکے تھے کہ لیلا گھر سے نکل جائے گی اور خلیل اسے مسلمان کر کے شادی کر لے گا، لیکن ان دونوں کو کہیں

اکٹھے دیکھ لیا گیا اور باپ نے لیلا کی شادی ساہوکار کے بیٹے کے ساتھ کردی۔

لیلا یہ تو جانتی تھی کہ خلیل کا گاؤں کون سا ہے اور کس طرف ہے، لیکن وہ اکیلی وہاں تک نہیں جا سکتی تھی۔ اکیلی چلی تو جاتی لیکن خلیل کے ساتھ پہلے مل کر لینا ضروری تھا۔ خلیل کبھی کبھی اس گاؤں سے گزرا کرتا تھا۔ اس گاؤں سے گزرنا ایک بہانہ ہوتا تھا۔ وہ کہیں رُک جاتا اور لیلا اُس کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ اب لیلا روزانہ کبھی چھت پر اور کبھی دروازے میں کھڑے ہو کر خلیل کی راہ دیکھتی تھی یا وہ ندی پر چلی جاتی تھی جہاں خلیل کے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

جس روز رمیش ہم سے رخصت ہو کر اپنے گاؤں گیا اس سے دو روز پہلے لیلا ندی کے کنارے کھڑی تھی۔ وہاں کنارے دیواروں کی طرح اونچے تھے۔ وہیں سے ایک گھاٹی اُوپر چڑھتی تھی۔ نیچے گھاٹی کے ساتھ ہی بڑی اچھی اوٹ بنی ہوئی تھی۔ لیلا اس اوٹ میں کھڑی تھی کہ خلیل گھوڑی پر سوار دوسری طرف سے گھاٹی اُترتا نظر آیا۔ لیلا دوڑ کر اُس کے راستے میں جا کھڑی ہوئی، لیکن اُس نے دیکھا کہ خلیل کے چہرے پر خوشی کا تاثر آنے کی بجائے بیزاری کا تاثر آگیا۔ اُس نے گھوڑی ندی میں سے گزاری تو ٹیڑھی سی آنکھوں سے لیلا کی طرف دیکھا۔

لیلا نے اپنے بھائی کی موجودگی میں مجھے سنایا کہ وہ خلیل کی ان ٹیڑھی نظروں کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اُس نے گھوڑی اس لئے روک لی تھی کہ لیلا نے آگے ہو کر گھوڑی کی لگام تھام لی۔

"گھوڑی سے نہیں اُترو گے خلیل؟" — لیلا نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

خلیل نے سر کو دائیں بائیں ہلایا جس کا مطلب تھا نہیں۔

"میں آگئی ہوں خلیل!" — لیلا نے کہا — "میرے سُسر نے میرے لئے اپنے گھر کے دروازے بند کر لئے ہیں۔ خاوند نے بھی ...."

"میں مجبور ہوں لیلا" — خلیل نے بے رُخی سے کہا۔

"مجھے اب مسلمان سمجھو خلیل!" — لیلا نے کہا — "کہو تو میں ابھی تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ میں اپنا وعدہ پورا کر رہی ہوں، تم اپنا وعدہ پورا کرو۔"

"یہ وعدے تمہاری شادی سے پہلے کے تھے" — خلیل نے کہا — "پھر تم کسی اور کی بیوی رہیں اور اب تم اتنے دن ڈاکوؤں کے پاس گزار کر آئی ہو۔"

"نہیں خلیل!" — لیلا نے کہا — "وہاں مجھے تم جیسا ایک مسلمان مل گیا تھا۔ وہ بہت نیک آدمی تھا۔ اُس نے ...."

خلیل نے باگ کو جھٹکا دیا اور گھوڑی چل پڑی۔ لیلا اُسے بلاتی رہ گئی اور خلیل کی گھوڑی گھاٹی پر چڑھ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی — اُمید کی آخری کرن بھی بجھ گئی۔

اُس وقت تک لیلا نے رمیش سے یہ بات پوشیدہ رکھی ہوئی تھی۔ اُس کا غمخوار صرف رمیش تھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ کمرے میں جا کر وہ چارپائی پر گری اور اتنی روئی کہ اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ اُسے نہ ماں نے بہلایا نہ باپ نے۔ رمیش باہر سے آگیا۔ اُس نے لیلا کو روتے ہوئے دیکھا تو اُس کے پاس بیٹھ گیا اور اُسے بہلانے لگا۔

"اب مجھے مر جانے دو بھیا!" — لیلا نے کہا — "ایک پناہ تھی، وہ بھی نہیں رہی۔"

"کونسی پناہ؟" — رمیش نے پوچھا۔

لیلا نے اُسے خلیل کی محبت، اُس کے اور اپنے وعدے اور اب اُس کی بے رُخی کی تفصیل سُنادی۔

خلیل تو پرایا تھا، لیلا کو اپنے سگے ماں باپ نے دھتکار دیا تھا۔ پاکستان میں پیدا ہونے والی نسلوں نے ہندو کو قریب سے نہیں دیکھا۔ ان کے لئے ماں باپ کا، سُسر اور خاوند کا لیلا کے ساتھ یہ سلوک عجیب اور ناقابلِ

یقین ہر گا۔ ہمارے لئے یہ عام سی بات ہے۔ ہندو تنگ نظر ہوتا ہے اور جذبات سے خالی۔ نوجوان بیوہ کو بھی یہ لوگ دھتکار کر الگ پھینک دیتے ہیں۔ کبھی یہ بیوہ کو اُس کے خاوند کے ساتھ زندہ جلا دیا کرتے تھے۔

لیلا کی ماں نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی آشرم میں چلی جاتے یا باقی زندگی ہردوار جا کر مندر میں گزارے لیکن لیلا اپنے مذہب کو دل سے اُتار چکی تھی۔ رمیش نے جب دیکھا کہ لیلا کے لئے اپنے گھر میں بھی پناہ نہیں تو اُس نے لیلا سے کہا کہ چلو دیبا کے پاس چل کر رہتے ہیں۔ رمیش کے لئے بھی گاؤں میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ لوگ اُس کی بہن کی باتیں کرتے تھے۔ ساہوکار رالگ ان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا رہتا تھا۔

"میں بہن کو کہیں ٹھکانے لگا کر اس سیٹھ کا اور اس کے بیٹے کا پتا کاٹ دوں گا" — رمیش نے کہا — "انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"



مجھے توقع تھی کہ دیبا رمیش اور لیلا کو قبول نہیں کرے گا۔ مَیں نے دیکھا تھا کہ دیبا اپنے گروہ کے درمیان عورت کے وجود کو برداشت نہیں کرتا تھا لیکن اُس نے رمیش اور لیلا کو ایسے پیار سے اپنے پاس بٹھایا جیسے بڑی مدت کے بچھڑے ہُوتے اپنے عزیز اُسے مل گئے ہوں۔ مَیں نے صبح اُسے بتایا تھا کہ رات کو رمیش اپنی بہن کو ساتھ لے کر ہمیشہ کے لئے ہمارے پاس آگیا ہے۔

"کہاں ہیں وہ؟" — دیبا نے اشتیاق سے کہا — "لے آؤ انہیں ...یہاں لے آؤ۔"

میں دونوں کو دیبا کے پاس لے گیا۔ دیبا تو جیسے اُن کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ رمیش سے ہاتھ ملا کر اُس نے لیلا کو گلے لگا لیا پھر اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ دیکھنے میں لیلا کا باپ لگتا تھا لیکن خوش طبع اتنا کہ جوانوں سے زیادہ زندہ و بیدار نظر آتا تھا۔

"تجھے وہ لے کس طرح گئے تھے؟" — دیبا نے لیلا سے پوچھا —

"کیا سوتی ہوئی کو اُٹھا لیا تھا؟"

"نہیں" — لیلا نے جواب دیا — "میں سوتی ہوئی نہیں تھی۔ آنکھ کھُلی تو دل پر گھبراہٹ آگئی۔ میں باہر نکلی کہ کھُلی ہوا میں جا کر بیٹھوں گی۔ وہ شاید میرے انتظار میں تھے۔ میں باہر نکل کر چند قدم ہی چلی تھی کہ پیچھے سے میرے سَر اور مُنہ پر ایک کپڑا آپڑا، پھر ایک ہاتھ میرے مُنہ پر آگیا۔ میری آواز نہیں نکلتی تھی۔ اُنہوں نے ایک کپڑا میرے مُنہ پر اور ایک میری آنکھوں پر باندھ دیا اور مجھے گھوڑے پر بٹھایا اور ایک آدمی میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ میں تو دیکھ ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ کس راستے سے یہاں سے نکلے اور کس طرف جا رہے تھے۔ جس آدمی نے مجھے اپنے آگے بٹھایا ہُوا تھا، اُس نے کچھ دُور جا کر کہا کہ تمہارا مُنہ کھول دوں گا، آنکھیں بند رہیں گی۔ شور نہ کرنا۔ یہاں تمہاری مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔ اُس نے میرے مُنہ سے کپڑا کھول دیا تو مَیں نے اُس سے پوچھا کہ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ اُس نے کہا مت ڈرو۔ جہاں جاؤ گی وہاں رانی بن کر رہو گی ...

"مَیں نے منّت سماجت نہ کی۔ بے فائدہ تھا۔ میرے پیچھے بیٹھا ہُوا آدمی میرے ساتھ چھیڑ خانی کرتا جا رہا تھا اور مَیں پتھر بن گئی تھی جیسے مَیں کچھ محسوس ہی نہیں کر رہی تھی .... بہت دُور نکل گئے تو دوسرے آدمی نے کہا، جھارے! وہ دیکھ۔ بائیں کو مُڑ جا .... جھارے نے کہا کہ وہی ہوں گے۔ قریب آئے تو گولی مار دیں گے .... کچھ دیر بعد انہیں کسی نے للکارا۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں کو یہ شک تھا کہ وہ تمہارے آدمی ہیں جو ان کے پیچھے آئے ہیں۔ پہلی گولی جھارے نے چلائی تھی اور اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ سکندر ہُوا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ جھارے نے گھوڑی سے اُتر کر مجھے بھی گھوڑی سے اُتارا اور کہا کہ چھُپ جاؤ، بھاگنا نہیں ورنہ ماری جاؤ گی لیکن دونوں مارے گئے۔"

"تم شیر کی بچّی ہو لیلا!" — دیبے نے اُس کی کمر میں بازو ڈال کر اور اُسے قریب کر کے کہا — "مَیں تو سمجھا تھا کہ تم نے ہمیں پکڑوا

دیا لیکن ...."

"مَیں نے سکون کے جو دن دیکھے ہیں یہیں دیکھے ہیں" — لیلا نے کہا — "اگر تم انے میں میرے جسم کو کاٹنا شروع کر دیتے تو بھی میں یہی کہتی کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ مَیں کہاں تھی۔"

لیلا کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا اور بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اُس کے حُسن کو سورج کی روشنی میں دیکھا اور پورے چاند کی چاندنی میں بھی دیکھا تھا۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی لیکن اب تو اُس کا حُسن دوبالا ہو گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر جو رونق تھی وہ اُس کی رُوح کا پَرتو تھا۔ پہلے اُس کا چہرہ نظر آتا تھا۔ اب اُس کی رُوح بھی نظر آنے لگی تھی۔

لیلا کے ساتھ ایک مسئلہ بھی ہمارے سامنے آگیا۔ اتنے آدمیوں میں ایک جوان لڑکی کا رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ کسی نہ کسی کے ساتھ اُس کی شادی ہو جانی چاہیے تھی۔ میری نظر حمید اللہ خان پر تھی۔ اُسی شام جب رمیش اور لیلا اپنے کمرے میں تھے میں نے دیبا کے سامنے یہ مسئلہ رکھا اور کہا کہ حمید اللہ خان لیلا کے ساتھ شادی کرلے۔ حمید اللہ خان تو پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔

"کچھ دن ٹھہر جاؤ" — دیبا نے کہا — "اس لڑکی کو کسی نہ کسی کی بیوی بن کر ہی رہنا ہوگا .... ذرا ٹھہر جاؤ۔"

رمیش سے پوچھنا ضروری تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ بات کی۔

"ہم لوگ ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس آگئے ہیں" — رمیش نے کہا — "تم جو فیصلہ کرو گے مجھے منظور ہے۔ ہمارا کوئی مذہب نہیں رہا۔ اب تو مَیں پیار اور محبت کو مذہب سمجھتا ہوں۔ دوستوں اور ساتھیوں پر قربان ہو جانا ہمارا مذہب ہے۔"



لیلا کے ساتھ اگر کوئی مسئلہ وابستہ تھا تو وہ میرا مسئلہ نہیں تھا کہ مَیں اُس کے لئے پریشان ہوتا۔ مَیں تو اب ایک ہی مسئلے میں اُلجھ گیا تھا کہ دیبا مجھے دہشت گردوں کے کسی گروہ کے پاس پہنچا دے۔ میں پہلے اپنے جذبات

اور تاثرات بیان کر چکا ہوں۔

"نوابزادے!" — مَیں نے حمید اللہ خان سے کہا — "کب تک یہاں پڑے رہو گے؟ مجھے تو یہ نظر آرہا ہے کہ ہم کسی روز ڈاکوؤں کے ساتھ پکڑے جائیں گے اور حرام موت مریں گے۔ تم تو اس طرح اطمینان سے بیٹھ گئے ہو جیسے تمہارے ارادے بدل گئے ہیں۔"

"نہیں سکندر!" — اُس نے کہا — "میرے ارادے نہیں بدل سکتے۔ دیبا دو چار دنوں بعد جا رہا ہے۔ واپس آکر بتائے گا کہ ہمیں وہ لوگ کہاں ملیں گے.... لیکن سکندر! پہلے اس لڑکی کے ساتھ شادی تو کرا دو۔"

مجھے یاد آگیا کہ حمید اللہ خان میں وہی جذبہ ہے جو مجھ میں ہے لیکن وہ نوابزادہ بھی ہے اور خوبصورت لڑکیاں اس کے لئے کھلونا ہُوا کرتی تھیں اور اب اُس نے ایک اور خوبصورت لڑکی دیکھ لی ہے۔ میں اتنا تنگ آچکا تھا کہ مَیں نے حمید اللہ خان کو اپنے ذہن سے اُتارنا شروع کر دیا۔ مَیں اُس کی دوستی سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ ہماری دوستی دلوں کی گہرائیوں میں اُتری ہوتی تھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ حمید اللہ کی توجہ لیلا پر مرکوز ہو گئی ہے اور جب تک وہ اسے حاصل نہیں کر لے گا وہ کسی اور طرف نہیں دیکھے گا۔

مَیں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ دیبا لیلا کے ساتھ کچھ زیادہ ہی پیار کرنے لگا تھا۔ مَیں جوتش اور نجوم کے علم سے تو واقف نہیں تھا، لیکن آنے والے وقت کی جھلک سی مجھے نظر آجاتی تھی۔ خدشہ سا نظر آنے لگا تھا کہ یہ لڑکی دیبے اور حمید اللہ خان میں چپقلش پیدا کر دے گی۔ اس کی پیش بندی صرف اس طرح ہو سکتی تھی کہ لیلا کی شادی فوری طور پر حمید اللہ خان کے ساتھ کر دی جائے۔

"لیلا!" — مَیں نے لیلا کو الگ لے جا کر کہا — "تم نے اگر ان لوگوں کے ساتھ رہنا ہے تو فوراً حمید اللہ خان کے ساتھ شادی کر لو۔ اس شخص کو تم

چور اور ڈاکو نہ سمجھنا۔ یہ نوابزادہ ہے اور بہت ہی اچھے لوگوں میں سے ہے۔"

میں نے حمید اللہ خان کے متعلق اُسے بہت سی باتیں بتائیں۔ میں چونکہ اُسے لیلا کے دل میں بٹھانا چاہتا تھا اس لئے حمید اللہ خان کے متعلق کچھ مبالغہ آرائی بھی کی، لیکن یہ نہ بتایا کہ یہ مفرور، سزا یافتہ مجرم ہے۔ لیلا سُنتی رہی اور سُنتے سُنتے اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"میں جانتا ہوں کہ تم کیا محسوس کر رہی ہو"— میں نے کہا —"جسے تم خوابوں اور خیالوں میں دیکھتی رہی ہو وہ تمہیں دھوکہ دے گیا ہے۔ تم جب حمید اللہ خان کی بیوی بن جاؤ گی تو چند دنوں میں خلیل کو بھول جاؤ گی۔"

"نہیں سکندر!"— اُس نے کہا —"خلیل کو میں دل سے اُتار چکی ہوں۔ اچھا ہُوا کہ اُس نے اپنا آپ پہلے ہی ظاہر کر دیا ہے۔ اگر وہ مجھے اپنے گھر لے جا کر خراب کرتا تو میں کہیں کی نہ رہتی۔ اب میں نے تمہیں دل میں بٹھا لیا ہے، لیکن تم مجھے کسی اور کے حوالے کر رہے ہو۔"

"میں اُڑتا پنچھی ہوں لیلا"— میں نے کہا اور اُسے بتا دیا کہ میں مفرور ہوں اور پھانسی کا پھندا میرے گلے میں پڑا ہُوا ہے جو کسی بھی وقت تنگ ہو کر میری جان لے لے گا — میں نے کہا —"تم جیسی ہی ایک لڑکی ہے جو میرے انتظار میں اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں اُسے کبھی نہیں مل سکوں گا اور وہ یہ بھی جانتی ہے کہ میرے دل میں کوئی اور عورت اُس کی جگہ نہیں لے سکے گی .... میں خلیل نہیں ہوں لیلا، اس وہم میں نہ پڑ جانا۔"

یہ تو میں پہلے ہی دیکھ رہا تھا کہ لیلا میری طرف مائل تھی، لیکن میں نہ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے والا تھا نہ کسی اور کو۔ بڑی مشکل سے میں نے لیلا کو قائل کر لیا کہ وہ حمید اللہ خان کے ساتھ بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اُدھر حمید اللہ خان سے کہا کہ وہ لیلا کے قریب ہو جائے۔

میں نے دیبا کو مجبور کرنا شروع کر دیا کہ وہ میرا راستہ بنائے۔ دیبا تو پہلے ہی اس کام کے لئے جا رہا تھا، لیکن لیلا کے گاؤں رُک گیا اور ایسے

حالات پیدا ہو گئے کہ اُسے واپس آنا پڑا۔ اب اُسے کہا تو وہ دوسرے ہی دن چلا گیا۔

اُس کی غیر حاضری میں حمید اللہ خان نے لیلا کو اپنے ساتھ بے تکلف کر لیا۔



دیبا تین روز بعد واپس آیا۔ وہ اُس گروہ کے لیڈروں کے ساتھ بات کر آیا تھا جس کا اُس نے پہلے ذکر کیا تھا۔ اُس نے اُن کا جو ٹھکانہ بتایا وہ ایک قصبہ تھا جو ہمارے ٹھکانے سے ستائیس، اٹھائیس میل دُور تھا۔ اچھی نسل کے گھوڑے پر رات کے اندر اندر وہاں جایا اور واپس بھی آیا جا سکتا تھا لیکن اپنی اصلیت کو چھپاتے رکھنے کے لئے گھوڑے پر نہیں جانا چاہیے تھا۔

"تمہیں پیدل چلنا پڑے گا سکندر!"— دیبا نے کہا —"تم ایک بالکل غریب اور بھکاری سے دیہاتی کے بہروپ میں جاؤ گے۔ جوان آدمی ہو۔ یہ فاصلہ کوئی زیادہ فاصلہ نہیں .... اس گروہ کے تمام ممبر ہندو ہیں سوائے دو کے جو سکھ ہیں۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا کہ یہ بڑا مضبوط گروہ ہے۔ ان کا مخبری کا نظام اتنا اچھا ہے کہ ریل گاڑیوں کے صحیح وقت انہیں معلوم ہو جاتے ہیں۔ ریل گاڑیوں سے میری مراد ملٹری سپیشل ٹرینیں ہیں جن کے چلنے اور راستے میں رُکنے کا کسی کو پتہ نہیں ہوتا لیکن اس گروہ کے آدمی ریلوے میں بھی ملازم ہیں جو اُنہیں ملٹری سپیشل ٹرین کی روانگی وغیرہ کے صحیح اوقات بتا دیتے ہیں۔ اس گروہ کا کام ملٹری سپیشل ٹرینیں تباہ کرنا ہے۔"

"کیا اب تک اُنہوں نے کوئی فوجی سپیشل ٹرین تباہ کی ہے؟"

"نہیں"— دیبا نے جواب دیا —"اب تک وہ دوسری جگہوں پر بموں کے دھماکے کرتے رہے ہیں۔ اب وہ فوجی ریل گاڑیوں کی تباہی

کا پلان بنا رہے ہیں۔ مَیں نے تمہیں پہلے بتایا تھا کہ نیا گروہ بنانا آسان نہیں۔ قابلِ اعتماد آدمیوں کو اکٹھا کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس گروہ کی بنیاد مضبوط ہو چکی ہے۔ تم اس میں شامل ہو جاؤ، پھر ہم مسلمانوں کو اکٹھا کر کے اس میں شامل کرتے جائیں گے۔ اب میری یہ بات غور سے سُن لو کہ تم وہاں ہندو بن کر جاؤ گے۔ مَیں نے وہاں تمہارا نام موہن داس بتایا ہے۔"

"دیبے اُستاد!" — مَیں نے کہا — "ہندوؤں کے رسم و رواج کے متعلق تو مَیں بہت کچھ جانتا ہوں، لیکن اُن کے مذہب سے مَیں پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرا بھید کھُل جائے۔"

"نہیں کھُلے گا" — مَیں نے کہا — "یہ خیال رکھنا کہ بے خبری میں السلام علیکم، خدا حافظ، فی امان اللہ، جیسے اللہ کو منظور ہو گا یا اس قسم کے وہ تمام الفاظ جو صرف مسلمانوں کے مُنہ سے نکلا کرتے ہیں وہاں تمہارے مُنہ سے نہ نکلیں۔ اگر کوئی ایسی بات مُنہ سے نکل ہی جائے اور کوئی تم پر شک کرے تو کہنا کہ میں کسی مذہب کو نہیں مانتا اور میرے لئے اللہ اور بھگوان، مندر اور مسجد ایک برابر ہیں ..... تم سی آئی ڈی کے افسر ہو، یار! کئی ڈھنگ کھیل سکتے ہو۔"

"یہ فکر نہ کرو اُستاد!" — مَیں نے کہا — "مَیں سنبھال لوں گا۔"

دیبا نے مجھے کچھ اور ضروری باتیں بھی بتائیں اور اُس نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ پھر ایک انتہائی ضروری بات یہ بتائی کہ جہاں کہیں مہاتما گاندھی کی تصویر سامنے آئے تو ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر تصویر کو پرنام کرنا۔

ایک دو باتیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ دیبا نے مجھے ستائیں اٹھائیس میل پیدل جانے کو کہا تھا۔ اُس زمانے میں اکثر لوگ اتنا سفر پیدل کیا کرتے تھے۔ دیہاتی علاقے میں سوائے گھوڑے ٹٹو کے کوئی اور سواری نہیں ہوتی تھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُس وقت فوج آج کی طرح کے ٹرکوں اور جیپوں وغیرہ میں اِدھر اُدھر نہیں جایا کرتی تھی بلکہ فوج کی یونٹیں ریل گاڑیوں

پر ایک سے دوسری چھاؤنی تک جاتی تھیں۔ ان ریل گاڑیوں کو ملٹری سپیشل ٹرین کہا جاتا تھا۔ اگر یہ گروہ ملٹری سپیشل ٹرینوں کو تباہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو یہ بہت بڑا کام تھا اور یہ کام مجھے بہت پسند تھا۔

"میرے متعلق انہیں تم نے کیا بتایا ہے؟" — مَیں نے دیبے سے پوچھا۔

"ہاں، یہ تو مَیں بھول گیا تھا" — دیبے نے جواب دیا — "مَیں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ تم مفرور ملزم ہو کیونکہ یہ بھی بتانا پڑتا کہ تم مسلمان ہو۔ مَیں نے انہیں یہ بتایا ہے کہ تم پولیس میں اے ایس آئی بھرتی ہُوئے تھے، لیکن تم انگریزوں کی غلامی برداشت نہ کر سکے اور ٹریننگ کے بعد نوکری چھوڑ کر گھر آ گئے تھے ..... اگر وہ تم سے پوچھیں کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو تو کہنا کہ مَیں ابھی کچھ نہیں بتاؤں گا اور یہ بھی کہہ دینا کہ مجھے تم پر اعتبار آ گیا تو سب کچھ بتا دوں گا ..... لیکن سکندرا تم میرے آدمی ہو۔ وہ تمہیں آزمانے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے۔"



مَیں دو روز بعد سورج نکلنے سے بہت پہلے ایسا غریب دیہاتی بن چکا تھا جس کی طرف دیکھنے کی کوئی آدمی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔ میری داڑھی سلیقے سے تراشی ہوتی تھی۔ مَیں نے مُنہ پر اور داڑھی پر مٹی ڈال کر مٹی جھاڑ دی تھی۔ سر پر پھٹی ہوئی پگڑی لپیٹ لی تھی۔ موٹے کھدر کا کُرتہ ایک دو جگہوں سے پھٹا ہُوا اور مرمت کیا ہُوا تھا۔ موٹے کھدر کی چادر باندھی ہوئی تھی۔ پاؤں میں کئی بار مرمت کی ہوئی دیسی جُوتی تھی۔ ہاتھ اور پاؤں چھپائے نہیں جا سکتے تھے۔ ان پر بھی میں نے مٹی ڈال کر مٹی جھاڑ دی تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی۔

دیبے، حمیداللہ خان اور نوراللہ نے بڑی گہری نظر سے دیکھا۔ ان کے کہنے پر میں نے اس قسم کے دیہاتی کے لہجے میں باتیں کیں۔ سب مطمئن ہُوئے اور میں چل پڑا۔

میرے کُرتے کی جیب میں ایک سیاہ رومال تھا جو میں نے اُس ٹھکانے پر پہنچ کر اپنے گلے میں ڈال لینا تھا اور ایک جگہ رُک کر بار بار آسمان کی طرف دیکھنا تھا۔ میرے کندھے پر جو چادر تھی، اس کے ایک کونے میں تین پراٹھے اور بُھنا ہُوا قیمہ بندھا ہُوا تھا۔ پراٹھوں کے درمیان ریوالور رکھ لیا تھا جس میں چھ گولیاں تھیں۔ بیس گولیاں چادر کی ڈب میں تھیں۔ اسی ڈب کے ساتھ ایک خنجر اُڑسا ہُوا تھا۔

میں آگے بڑھتا گیا اور سورج اُوپر اُٹھتا آیا اور کچھ دیر بعد مَیں رمیش اور لیلا کے گاؤں میں سے گزر رہا تھا۔ کسی نے بھی میری طرف نہ دیکھا۔ میں گاؤں کے باہر سے بھی گزر سکتا تھا، لیکن اپنی واردات والے گاؤں میں سے گزرنا مجھے زیادہ اچھا لگا تھا۔ میں ساہوکار کی حویلی کے قریب سے گزرا اور اس گاؤں سے نکل گیا۔

اس گاؤں سے تقریباً ایک میل دُور گیا ہوں گا کہ سامنے سے چار گھوڑے آتے نظر آتے۔ اگلے گھوڑے پر ایک انگریز سوار تھا اور وہ پولیس کی وَردی میں تھا۔ وہ یقیناً اُس علاقے کا ڈی ایس پی تھا۔ اُس کے پیچھے والے گھوڑے پر ایک انگریز پولیس انسپکٹر سوار تھا اور پچھلے دو گھوڑوں پر دو کانسٹیبل سوار تھے۔ مَیں اسی راستے پر جا رہا تھا۔ مَیں نے اپنے آپ کو تھوڑا سا کُبڑا رکھا ہُوا تھا۔ گھوڑے جب میرے قریب آئے تو مَیں راستے سے ہٹ کر رُک گیا۔ لاٹھی زمین پر رکھ دی اور جب گھوڑے میرے بالکل قریب آ گئے تو میں غلاموں کی طرح یا پاگلوں کی طرح ہنسا پھر ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا اور پھر مَیں بالکل ہی دُہرا ہو گیا۔ گھوڑے میرے قریب سے گزر رہے تھے۔ مجھے آواز سنائی دی — "سلام سلام"۔

یہ انگریز ڈی ایس پی کی آواز ہو سکتی تھی۔ اُس نے میرے غلامانہ فرشی سلام کا جواب دیا تھا اور آگے نکل گیا تھا۔ وہ ڈی ایس پی ایسی ہی نسل کا تھا جسے میں نے قتل کیا تھا۔

گھوڑے خاصے آگے نکل گئے تو میں سیدھا ہُوا اور اُن کی طرف

دیکھا۔ اگر پولیس کے دو ہندوستانی ساتھ نہ ہوتے تو شاید میں ان دونوں انگریز افسروں کو پیچھے سے گولی مار کر بھاگ جاتا۔ وہاں میرا تعاقب کرنے والا کوئی نہ تھا۔ مَیں اپنی راہ لگ گیا۔

سورج جب سَر پر آیا تو مَیں نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ تھوڑا آگے جا کر ایک گاؤں کے کنوئیں سے پانی پیا اور اپنے راستے پر ہو لیا۔ مجھے اچانک خیال آ گیا کہ ڈی ایس پی واردات والے گاؤں جا رہا ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ساتھیوں کی نشاندہی ہو جاتے۔ رمیش اور لیلا کا گاؤں سے غائب ہو جانا پولیس کی نظر میں بے معنی نہیں ہو سکتا تھا، لیکن مَیں کر بھی کیا سکتا تھا۔ مَیں اپنے راستے پر چلتا گیا۔

میں ایک گاؤں کے قریب سے گزر رہا تھا تو ایک آدمی جو کپڑوں اور شکل وصورت سے خوشحال زمیندار لگتا تھا ایک عورت کے ساتھ گاؤں سے نکلا۔ دونوں تیس سال کی عمر کے لگ بھگ تھے۔ آدمی کے ہاتھ میں گٹھڑی تھی۔ مَیں اُن کے ذرا آگے ہو گیا۔ اس آدمی نے مجھے آواز دی۔ مَیں نے رُک کر پیچھے دیکھا۔

"کدھر جا رہے ہو؟" — اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"حکم چوہدری صاحب!" — مَیں نے چوہدریوں کے بیوقوف سے نوکروں کی طرح کہا — "مَیں تو بڑی دُور جا رہا ہوں"۔

"اگلے گاؤں تک یہ گٹھڑی لے چلو" — اُس نے کہا — "پیسے دوں گا"۔

مَیں نے اُس کے ہاتھ سے گٹھڑی لے لی اور اُن کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ انہوں نے جب آپس میں باتیں شروع کیں تو مَیں جلدی ہی سمجھ گیا کہ یہ بے چارے بے اولاد ہیں اور کسی پیر کے ہاں یا کسی مزار پر جا رہے ہیں۔

"اگر سائیں کراماں والا مل جاتا تو ہم پر اللہ کا کرم ہو جاتا" — آدمی نے کہا — "لیکن اُس گاؤں کے کسی آدمی کو پتہ نہیں کہ سائیں جی کدھر نکل گئے ہیں" — اُس نے پیچھے مُڑ کر مجھے کہا — "او تے، تُو نے سائیں کراماں

والے کا نام کبھی سُنا ہے؟"

"ہاں چوہدری صاحب!" — میں نے جواب دیا — "مَیں تو تین بار اُن کے دربار میں سلام کے لئے گیا تھا... آپ اُن کے پاس پہنچ جائیں تو خالی ہاتھ واپس نہ آئیں۔ یہی تو ان کی کرامت ہے کہ بے اولاد عورت کی گود ہری کر دیتے ہیں، لیکن چوہدری صاحب! انہیں کوئی ایسا خدائی اشارہ ملا کہ کسی کو بتائے بغیر غائب ہو گئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ مکّہ مدینے چلے گئے ہیں۔ اللہ کی اللہ ہی جانے۔"

"دیکھ بھائی!" — اُس نے پیچھے کی طرف اشارہ کر کے کہا — "وہ ہے میرا گاؤں۔ جب کبھی تمہیں پتہ چلے کہ سائیں کراماں والے فلاں گاؤں میں ہیں تو میرے گاؤں میں آنا۔ چوہدری نُور پوچھ لینا اور مجھے بتانا" — اُس نے جیب سے ایک روپے کا سکّہ نکالا اور مجھے دے کر کہا — "جب خبر لاؤ گے تو پورے پانچ روپے دوں گا۔"

"جو حکم چوہدری صاحب!" — میں نے اُس کے ہاتھ سے ایک روپیہ لیتے ہوئے کہا۔

اگلا گاؤں آ گیا۔ چوہدری نُور نے میرے ہاتھ سے گٹھڑی لی اور چار آنے دیئے۔ اُن دنوں غریب آدمی کے ہاں چار آنے میں چار دن گوشت پک سکتا تھا۔

اس دلچسپی نے میری تھکن دُور کر دی اور میں چلتا گیا اور اُس پگڈنڈی تک پہنچ گیا جس پر یکّے قصبے تک جاتے تھے۔ میں وہاں رُک گیا۔ کچھ دیر بعد ایک یکّہ آ گیا جس میں ابھی دو سواریوں کی گنجائش تھی۔ میں اس میں سوار ہُوا اور جو چار آنے چوہدری نُور نے دیئے تھے وہ یکّے والے کو دے دیئے۔ میرے پاس اپنے پیسے کافی تھے۔



سورج غروب ہونے میں ابھی تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا جب میں قصبے کے بازار میں آٹا پیسنے والی ایک مشین والی دکان کے سامنے کھڑا

تھا۔ مَیں نے سیاہ رومال گلے میں ڈال لیا تھا اور میں بار بار آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ تقریباً ایک آدھ گھنٹے بعد ایک جوان سا ہندو میرے قریب آن کھڑا ہُوا اور وہ بھی اُوپر دیکھنے لگا۔

"آج گرمی کچھ زیادہ نہیں؟" — اُس نے کہا۔

"یہ موسم گرمی کا تو نہیں" — میں نے کہا — "لیکن گرمی ہے۔"

"موہن داس!"

"ہاں" — میں نے کہا۔

"دیبے نے بھیجا ہے؟"

"ہاں" — مَیں نے جواب دیا۔

"میرے پیچھے پیچھے آؤ" — اُس نے کہا اور چل پڑا۔

وہ مجھے ایک گنجان محلّے کے ایک مکان میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا۔ کھانے کے دوران اُس نے کہا کہ تمہاری داڑھی مسلمانوں جیسی ہے۔

"اس داڑھی سے مَیں مسلمان بھی بن جایا کرتا ہوں اور سکھ بھی" — مَیں نے کہا — "یہ داڑھی بڑے کام کی چیز ہے۔"

یہ ہندو اس گروہ کے لیڈروں میں سے ایک تھا۔ اُس کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں۔ چونکہ دیبا نے اُسے میرے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا اس لئے اُس نے مجھے آزمانے کے لئے کوئی تردّد نہ کیا اور ہم کام کی باتیں کرنے لگے۔ رات کو اسی گھر میں تین اور آدمی آ گئے۔ وہ بھی ہندو اور اسی جیسے جوان آدمی تھے۔ وہ سب تعلیم یافتہ تھے۔ مَیں نے اپنے متعلق یہی بتایا کہ مَیں اے ایس آئی بھرتی ہو گیا تھا اور نوکری چھوڑ آیا ہوں۔ میں نے ان کے سامنے جو تقریر کی وہ اتنی جوشیلی اور پُروقار تھی کہ وہ مجھے بھی لیڈر ماننے لگے۔

"مَیں اس وقت تک بہت کام کر چکا ہوں" — مَیں نے کہا — "یہ تفصیلات بعد میں سناؤں گا۔ ابھی اتنا ہی بتاؤں گا کہ مَیں پولیس کی نظر میں

ہوں اور مجھے بڑا خطرناک ٹیررسٹ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مَیں نے داڑھی رکھ لی تھی۔ اب میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ کیا کر سکتے ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ تم گروہ کی کمانڈ کر سکتے ہو" — اُن میں سے ایک نے کہا — "تم بڑے اچھے وقت آئے ہو۔ دو روز بعد گورا رجمنٹ کی ملٹری سپیشل ٹرین گزر رہی ہے۔ ہم نے اس کی روانگی کا وقت معلوم کر لیا ہے اور ہم نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ جہاں ہم نے ریلوے لائن میں بم رکھنا ہے وہاں گاڑی کس وقت پہنچے گی۔ روانگی کے سٹیشن پر اور راستے کے ایک سٹیشن پر ہمارے آدمی موجود ہیں جو ریلوے کے ملازم ہیں۔ وہ ہمیں صحیح وقت ایک بار پھر بتا دیں گے۔"

وہ اس گاڑی کو تباہ کرنا چاہتے تھے جو بہت بڑا کام تھا۔ چھ سات سَو نفری کی گورا رجمنٹ کو تباہ کرنا انگریزوں پر بہت بڑی چوٹ تھی۔ ایسی تباہ کاری کا سلسلہ کامیابی سے چلتا رہتا تو انگریزوں کے پاؤں اکھاڑے جا سکتے تھے۔

ہم نے تفصیلات طے کر لیں۔ میرا دماغ ان کاموں میں بڑے کام کی چیزیں سوچ لیتا تھا۔



اگلی صبح دو لیڈر قسم کے آدمی مجھے قصبے سے تقریباً آٹھ میل دُور لے گئے۔ ایک کے پاس دو نالی اور دوسرے کے پاس ایک نالی بندوق تھی اور ہم شکار کے بہانے وہاں گئے تھے۔ اُس جنگل میں سے ریلوے لائن گزرتی تھی۔ لائن خاصی بلندی پر تھی اور وہاں موڑ تھا۔ وہ علاقہ کچھ پہاڑی سا تھا۔ وہاں کئی موڑ تھے۔ میرے ساتھیوں نے مجھ سے پوچھا کہ بم کہاں رکھنا چاہیئے۔ ریلوے لائن پر ٹہلتے ٹہلتے میں نے ایک موڑ کا انتخاب کیا اور ایسی جگہ دیکھی جو انجن کے ڈرائیور کو موڑ کاٹ کر ہی نظر آ سکتی تھی۔ وہاں پہنچ کر اور یہ دیکھ کر کہ آگے ریلوے لائن اُڑی ہوتی ہے، وہ گاڑی کو نہیں روک سکتا تھا۔

ہم نے بندوقوں سے چند ایک پرندے مارے جو ہم شہر تک نہیں لا سکے۔ راستے میں ہی پھینک آئے کیونکہ ہندو گوشت نہیں کھاتے۔ اس کا افسوس مجھے ہی ہونا تھا اور بہت ہی افسوس ہُوا۔

رات کو اطلاع آئی کہ گاڑی اگلے دن کے ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان اس مقام سے گزرے گی جو ہم نے بم کے لئے منتخب کیا تھا۔ بم اسی گھر میں رکھے تھے جس میں مجھے ٹھہرایا گیا تھا۔ مَیں نے پہلی بار اُن کا بم دیکھا۔ اُن کے پاس ایسے تین بم تھے۔

مَیں نے غور سے دیکھا۔ جو بم ریلوے لائن پر رکھنا تھا وہ ذرا بڑا تھا۔ یہ گول سا ڈبہ تھا جو چھ اِنچ سے کچھ زیادہ لمبا اور تقریباً چار اِنچ چوڑا تھا۔ اس کے اندر جو بارُود بھرا ہُوا تھا وہ خاصا وزنی تھا۔ اس کے وزن سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تو ہماری توقع کے خلاف زیادہ تباہی مچائے گا۔

"اس میں بارُود کون سا ہے؟" — مَیں نے پوچھا۔

"یہ تو ہمیں معلوم نہیں" — مجھے جواب ملا۔

"اگر یہ ڈائنامیٹ ہے تو ریلوے لائن کے ٹکڑے ہوا میں اُچھال دے گا" — مَیں نے کہا — "اور وہاں گہرا گڑھا بن جائے گا۔"

"جنہوں نے یہ بم بنایا ہے" — ایک نے کہا — "وہ کہتے ہیں کہ ایسی ہی تباہی کرے گا جیسی تم بتا رہے ہو۔"

اُن لوگوں کا پروگرام یہ بھی تھا کہ جب گاڑی اُلٹ جائے گی تو دُور سے ریوالوروں سے اُن گوروں پر گولیاں چلائی جائیں گی جو گاڑی میں سے بچ کر نکلیں گے۔



دوسری صبح میرے علاوہ پانچ آدمی اُسی جنگل میں پہنچ گئے جہاں ہم گزشتہ روز گئے تھے۔ تین کے پاس ریوالور تھے۔ ہم ویسے ہی جنگل میں گھومتے پھرتے رہے۔ ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا جو ہم ساتھ لاتے تھے اور جب گاڑی کے گزرنے کا وقت قریب آیا تو مَیں نے لائن پر بم رکھنا اپنے

ذمے لیا اور باقی آدمیوں کو مختلف بلند جگہوں پر پھیلا کر پوزیشنوں میں بٹھا دیا۔ ان میں سے تین آدمیوں نے گوروں پر گولیاں چلانی تھیں۔

دُور سے انجن کی وِسل کی آواز سنائی دی۔ میرے اندازے کے مطابق گاڑی ابھی چار میل دُور تھی۔ میں بم لے کر اُس موڑ کے قریب جا پہنچا۔ ایک چٹان کے پیچھے سے کالا دُھواں اُٹھتا نظر آیا۔ میں نے ریل کی پٹڑی پر کان رکھا تو مجھے ریل گاڑی کی ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ محسوس ہوتی۔ چند منٹ اور انتظار کیا تو انجن کی وِسل سنائی دی۔ آواز سے اندازہ ہُوا کہ انجن ایک میل سے زیادہ دُور نہیں۔ مَیں نے بم ایک پٹڑی کے نیچے رکھ دیا۔ جیب سے ماچس نکالی۔ بم کی بتی چھ سات انچ لمبی تھی۔

مَیں نے ماچس جلائی اور بتی کو آگ لگا دی۔ وہاں دیکھنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ مَیں بہت تیز دوڑا اور اپنے لئے جو جگہ منتخب کی تھی وہاں تک پہنچنے سے پہلے بم پھٹ گیا۔ دھماکہ تو بڑا زوردار تھا۔ میری اُس طرف پیٹھ تھی کیونکہ مَیں آگے کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ مَیں نے تصور میں دیکھا کہ پٹڑی کے ٹکڑے ہوا میں اُڑ رہے ہیں اور وہاں گہرا گڑھا بن گیا ہے۔ مَیں نے تصور میں ہی دیکھا کہ انجن گڑھے میں گرا اور تیز رفتار گاڑی کے ڈبے ایک دوسرے کے اُوپر چڑھ گئے اور پھر لڑھکتے ہُوئے نیچے آ گئے۔

مَیں بلندی پر اپنی پوزیشن پر پہنچا اور پیچھے دیکھا۔ ریل گاڑی اپنی رفتار سے دوڑی جا رہی تھی اور اس موڑ سے گزر کر آگے نکل گئی۔ مَیں نے اپنی آنکھیں ہاتھوں سے ملیں اور پھر دیکھا۔ انجن نے ایک بار پھر وِسل دی۔ مجھے یوں لگا جیسے انجن نے ہمارا مذاق اُڑایا ہو۔ وہ تمام ڈبوں کو گھسیٹتا آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ چھ سات سو گورے خیروعافیت سے گزر گئے۔

جب ریل گاڑی بہت دُور نکل گئی تو مَیں سر جھکائے ہُوئے اپنی پوزیشن سے اُترا اور آہستہ آہستہ چلتا وہاں تک گیا جہاں میں بم رکھ آیا تھا۔ وہاں بم نہیں تھا۔ جہاں یہ پھٹا تھا وہاں سے وہ پتھر اُڑ گئے تھے جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ رکھے ہوتے ہیں۔ پٹڑی جُوں کی تُوں موجود تھی۔

مَیں وہاں سے واپس آیا۔ میرے ساتھی بھی آ گئے۔ میں نے انہیں بہت ہی ذلیل کیا۔ کچھ گالیاں بھی دیں اور وہ بم بنانے والوں کو بُرا بھلا کہنے لگے۔

ہم واپس آ گئے۔ میں نے اپنے خنجر سے دوسرے بموں کے ڈبے توڑ کر دیکھے۔ ان میں وہ بارُود بھرا ہُوا تھا جو شادی کے گولوں میں استعمال ہوتا ہے۔

سب پریشان ہو گئے۔ مَیں نے انہیں کہا کہ مَیں اب واپس جاتا ہوں۔ ڈائنامیٹ والا بم لاؤ اور کسی اور ملٹری سپیشل کا انتظار کرو۔ مَیں نے انہیں یہ بھی کہا کہ جب تمہیں وہ بم مل جائے اور کسی ملٹری سپیشل کے گزرنے کی اطلاع ملے تو مجھے بلا لینا۔

"کیا تم دریا تک اطلاع پہنچا سکتے ہو؟" —— مَیں نے پوچھا۔

"بڑی آسانی سے" —— مجھے جواب ملا۔

اگلی صبح مَیں پھر غریب سا دیہاتی بنا ہُوا واپس آ رہا تھا۔

واپسی کے سفر میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ میں جس راستے گیا تھا اُسی راستے واپس آ رہا تھا۔ میرے قریب سے گزرنے والے میری طرف دیکھتے بھی نہیں تھے۔

لوگ لباس کو دیکھتے ہیں۔ لباس جتنا قیمتی اور بھڑکیلا ہوتا ہے لوگ اتنا ہی زیادہ دیکھتے ہیں، متاثر اور مرعوب ہوتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ اس لباس کے اندر جو انسان ہے وہ کتنا کچھ قیمتی ہے یا اُس کی کچھ قیمت ہے بھی یا نہیں۔ شیر کی کھال اوڑھ کر گدھا شیر نہیں بن سکتا لیکن لوگ کھال دیکھتے ہیں۔

میرے قریب سے گزرنے والے لوگ میرے لباس کی وجہ سے یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہے تھے کہ میں کون ہوں۔ میرے لباس کی قیمت دس روپے بھی نہیں تھی لیکن میری قیمت دس ہزار روپے تھی۔ میں ذرا سا کُبڑا ہو کر چل رہا تھا جیسے مفلسی اور مشقت نے میرا جسم توڑ ڈالا ہو۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ میرے قریب سے گزرنے والے مجھے اِس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ مجھے دیکھتے۔ میری ضرورت یہی تھی کہ مجھے کوئی پہچاننے کی کوشش نہ کرے۔

میں نے کچھ فاصلہ یکّے پر طے کیا تھا۔ میرے علاوہ پانچ سواریاں تھیں اور یکّے والا تھا۔ جگہ ہونے کے باوجود مجھے سواریوں نے جگہ نہیں دی تھی۔ میں نیچے بیٹھا تھا اور میں نے سر گھٹنوں میں دے لیا تھا۔ یکّے سے اُتر کر باقی سفر پیدل طے کیا تھا۔

واپسی کا سفر اس لحاظ سے مختلف تھا کہ ناکامی کے احساس نے میری رُوح کو پژمُردہ اور میرے جسم کو بے جان سا کر دیا تھا۔ میں ایسے محسوس

کر رہا تھا جیسے یہ ناکامی میری کسی غلطی سے ہوئی ہے۔ میرے دل پر اتنا بوجھ تھا کہ میرا مصنوعی کُبڑا پن مجھے قدرتی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس بوجھ نے میری کمر دوہری کر دی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ یہ غلطی میری نہیں تھی اور مجھے خوش ہونا چاہیئے کہ ایک گروہ مل گیا ہے جس کے پاس وسائل ہیں اور اس کے پلان کارگر ہیں۔ اس گروہ نے تو مجھے اپنا کمانڈر بھی تسلیم کر لیا تھا۔ مجھے دیبے کے اس ارادے پر بھی خوش ہونا چاہیئے تھا کہ وہ میرا ہم خیال تھا اور وہ اس گروہ میں مسلمانوں کو شامل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ سوچنا چاہیئے تھا کہ اُس کے ارادے کو عملی شکل کس طرح دی جا سکتی ہے، مگر دل پر جو بوجھ تھا وہ بڑھتا جا رہا تھا۔

میں نے اس ناکامی کو ذہن سے اُتارنے کی بہت کوشش کی لیکن بے سُود۔ سوچوں اور خیالوں میں کش مکش شروع ہو گئی۔ میں اپنے ذہن کو ہمیشہ اپنے قابو میں رکھا کرتا تھا لیکن اُس روز ذہن بھٹک گیا اور مجھ پر بیزاری سی طاری ہونے لگی جو اتنی بڑھی کہ میں اپنے مشن کی ناکامی کو بہت بُرا شگون سمجھنے لگا۔

بیزاری یاس انگیز ہو گئی اور ذہن پر مایوسی کی سیاہ گھٹا چھا گئی۔ میں چلا جا رہا تھا۔ میری رفتار سُست تو نہیں تھی لیکن ایسے لگتا تھا جیسے میں قدم گھسیٹ رہا ہوں اور میں منزل سے دُور ہی کہیں گر پڑوں گا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ مجھ پر کسی نے جادُو یا تعویذ کر دیا ہے۔ میں توہمات کو قبول نہیں کیا کرتا تھا لیکن جادُو اور اُلٹے تعویذوں کو میں مانتا تھا۔ اسے کوئی کالا علم، کوئی جادُو اور کوئی اُلٹے تعویذ کہتا ہے۔ میں نے ایسے کئی کیس دیکھے تھے، عمر میں آگے چل کر بھی دیکھے ہیں اور ایسے کیس آپ نے بھی دیکھے ہوں گے۔ کسی کے گھر میں پتھر گرنے لگتے ہیں یا کپڑوں کو آگ لگتی ہے۔ پیشہ ور عامل اور پیر وغیرہ کہتے ہیں کہ یہ جنّات کی کارستانی ہے۔ عامل وغیرہ متاثرہ گھر میں ڈیرے ڈال دیتے اور ان لوگوں کی مجبوری

اور مظلومیت سے خوب مال بٹورتے ہیں۔ درحقیقت یہ کالا علم ہے جو دشمنی کی بنا پر کسی پر چلایا جاتا ہے۔

یہ کالا جادو بعض بیویاں اپنے خاوندوں اور اُن کی ماؤں پر بھی کراتی ہیں کہ وہ ان کے زیر رہیں۔ بعض لڑکوں کی ساسیں انہیں اپنے تابع رکھنے کے لئے عاملوں کے پاس جاتی ہیں کہ وہ ان کے دامادوں پر اُلٹے تعویذ کریں۔ مَیں آپ کو اپنا مشاہدہ بتاتا ہوں)۔ یہ علم ہر اُس آدمی کے پاس نہیں ہوتا جو اپنے آپ کو عامل یا شاہ جی یا پیر کہلاتا ہے۔ نوّے فی صد سے زیادہ عامل اور شاہ جی نور اللہ اور حمید اللہ خان جیسے ہوتے ہیں جن کے پاس صرف ایک جادو ہوتا ہے اور یہ زبان کا جادو ہے۔ اگر کالا علم اتنا آسان ہوتا کہ ہر کوئی اسے سیکھ کر چلا سکتا تو لوگ گھروں میں بیٹھے اپنے دشمنوں کو تباہ کرتے رہتے۔ ہر روز لاکھوں کے گھروں میں پتھر پڑتے اور گھر نذرِ آتش ہوتے رہتے۔

مجھ پر یہ وہم طاری ہونے لگا کہ یہ کوئی پُراسرار اثر ہے جس نے میری جسمانی طاقت سلب کر لی اور میرا دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہا۔ انتہائی خطرناک صورتِ حال میں بھی حالت کبھی یوں نہیں بگڑی تھی بلکہ خطروں میں میری ڈھکی چھپی قوتیں بھی بیدار ہو جایا کرتی تھیں مگر اُس روز اپنے ٹھکانے کو واپس جاتے ہوئے میری وہ قوتیں جو ہر وقت بیدار رہا کرتی تھیں وہ بھی کہیں ڈھک چھُپ گئیں اور میرے لئے اپنی زندہ لاش کو گھسیٹنا محال ہُوا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے وہم نہیں بلکہ یقین ہونے لگا تھا کہ کسی نے مجھ پر کالا جادو کر دیا ہے۔ مَیں اتنا زیادہ تھکا ہُوا تو نہیں تھا۔

اگر یہ جادُو یا اُلٹے تعویذ کا ہی اثر ہے تو یہ کس نے کرایا ہے؟ میرا ایسا دشمن کون ہے؟

مَیں ان سوالوں میں اُلجھ گیا۔ پہلے تو ساہوکار کا خیال آیا جسے ہم نے لُوٹا تھا۔ پولیس ابھی تک ہمارا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ وہ مایوس ہو چکا ہو گا

اور اُس نے کالے جادُو کے کسی ماہر سے کہا ہو گا کہ وہ ڈاکوؤں کا اتا پتہ معلوم کرے۔ اگر یہ نہ کر سکے تو وہ جو کوئی بھی ہیں وہ تباہ ہو جائیں۔

یہ سوچ کر کہ کالا جادُو کسی کو اپنے زیر کرنے یعنی کسی کا دل جیتنے کے لئے بھی کیا جاتا ہے، میرا دھیان کسی اور طرف نکل گیا۔ آج وہ وقت یاد آتا ہے تو مجھے شرمندگی سی محسوس ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے کہ میں کیسا احمق اور وہمی ہو گیا تھا۔ دراصل مجھ میں کوئی تبدیلی رونما ہو رہی تھی جسے میں اُس وقت کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مجھے اپنے ارادے پورے ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے اور عمر گزرتی جا رہی تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ میں تنہا تھا۔ انسانی فطرت کے کچھ مطالبے ایسے ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا ہی پڑتا ہے۔ انہیں دبا لو تو یہ سمجھ لو کہ بارُود میں چنگاریوں کو کسی نے چھپانے کی کوشش کی ہو۔ میں کچھ ایسی ہی کوشش کر رہا تھا۔ مَیں ایک تشنگی کو دبا رہا تھا یا ٹال رہا تھا۔

جب مجھے یہ خیال آیا کہ کوئی میرے دل پر قبضہ کرنے کے ڈھنگ کھیل رہا ہے تو اچانک سائرہ میرے ذہن میں آ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے وہ میرے قریب ہی کہیں موجود ہو یا میرے تعاقب میں آہستہ آہستہ چلی آ رہی ہو۔

اُس کی موجودگی کا احساس اتنا شدید اور حقیقی ہو گیا کہ مَیں نے پیچھے دیکھا پھر دائیں بائیں دیکھا۔ مَیں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ یہ وہم ہے۔

دُور دُور تک سبزہ زار پھیلا ہُوا تھا۔ میری نظریں اس تمام وسعت میں گھُوم گئیں۔ مجھے سائرہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔ تب مَیں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ جیسے سائرہ میرے وجود میں داخل ہو گئی ہو۔ میں جس جسمانی کمزوری کی زد میں آ گیا تھا وہ ایک روحانی تشنگی بن گئی اور مجھے بالکل اُس پیاسے صحرا نورد کی طرح جسے صحرا میں سراب نظر آتے ہیں، ہر سُو سائرہ ہی نظر آنے لگی۔

اگر سائرہ نے مجھے ڈاکوؤں اور رہزنوں کی دنیا سے نکال لینے کے

لیتے اور اپنے پاس بلانے کے لئے کسی سے مجھ پر کالا جادو یا اُلٹے تعویذ نہیں کراتے تھے تو اُس کی یاد اور اُس کا تصوّر مجھ پر ایک جادو بن کر سوار ہوگیا تھا۔ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

یہ تو میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میرے دل میں سائرہ کی محبت پیدا ہوگئی تھی لیکن مجھے پہلی بار احساس ہُوا کہ میں سائرہ کی محبت کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہوں۔

میری روحانی تشنگی اتنی بڑھی کہ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ میرا وجود تڑپ رہا ہے یا میرے وجود کے اندر کوئی قید ہے اور میں اُسے پیاسا مارنے کی سزا دے رہا ہوں۔

سائرہ کے ساتھ مجھے اپنی امّی یاد آگئی۔ میں نڈھال سا ہوگیا۔ اتنا نڈھال کہ میں نے پیٹھ درخت کے ساتھ لگا کر سر پیچھے پھینک دیا۔ میرا سر دائیں بائیں اپنے آپ ہی آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ یہ بے بسی اور تنہائی کی انتہا ہوتی ہے۔



مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ میں ان تصوّروں سے کتنی دیر بعد نکلا۔ میں جب حقیقی دنیا میں آیا تو اپنے آپ کو ایک ویرانے میں سے گزرتا پایا۔ یہ نشیبی علاقہ تھا۔ میں لاشعوری طور پر وہاں تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے چونک کر گرد و پیش کو دیکھا۔ مجھے خدشہ سا محسوس ہُوا کہ میں اصل راستے سے بھٹک گیا ہوں۔ مجھے یاد آگیا کہ جاتے ہوتے میں اس نشیب میں سے گزرا تھا۔ میں سیدھے راستے پر جا رہا تھا اور میں نے ابھی واپسی کا آدھا راستہ طے کیا تھا۔

سائرہ ایک بار پھر میرے خیالوں میں آگئی اور میں اُس کے متعلق سوچتا ہُوا چلتا گیا۔ میں سوچ یہ رہا تھا کہ سائرہ نے اگر اب تک شادی نہیں کی تو اُسے شادی کرلینی چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اُس کے بھائی ایوب کی وجہ سے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اغوا ہوئی اور بہت دن

ڈاکوؤں کے پاس رہی، معلوم نہیں کسی نے اُسے قبول کیا بھی ہوگا یا نہیں۔ یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ میرے پاس رہی تھی اور میں نے اُس کی عصمت کو خدا کی امانت سمجھا تھا۔ یہ تو منوّر اور تجمّل کو بھی شک ہوگا کہ میں نے سائرہ کو اپنی داشتہ بنا کر رکھا تھا۔

اگر سائرہ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی تو یہ میرا گناہ تھا۔ وہ میرے گناہ کی سزا بھگت رہی تھی۔

سائرہ کی شادی کے متعلق سوچتے سوچتے مجھ میں رقابت کا جذبہ پیدا ہونے لگا جو اتنا بڑھا کہ میں بڑی شدّت سے محسوس کرنے لگا کہ سائرہ کی شادی کسی اور کے ساتھ ہوگئی تو میں برداشت نہیں کرسکوں گا۔ یہ خیال بھی آیا کہ سائرہ بھی کسی اور کو نہ قبول کرے گی نہ برداشت کرے گی۔

مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں اُس کالے جادو کو سمجھ گیا ہوں جو مجھ پر سوار ہوگیا ہے۔ اگر یہی جادو تھا تو میں نے اس کے اثر میں سے نکلنے کی کوشش نہ کی۔

میں بھوک سے بے حال ہُوا جا رہا تھا۔ میں اپنے ساتھ کھانے کو کچھ بھی نہیں لایا تھا۔ مجھے وہ گاؤں نظر آنے لگا تھا جہاں ساہوکار رہتا تھا۔ یہ ریلا اور رمیش کا گاؤں تھا۔ وہیں سے مجھے کھانے کو کچھ مل سکتا تھا۔ بھوک کی شدّت نے مجھے تیز چلنے پر مجبور کردیا۔ گاؤں دُور نہیں تھا۔ میں وہاں پہنچ گیا۔ یہ خاصا بڑا گاؤں تھا۔ مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں جتنی ہی تھی۔ ایک آدمی سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ گاؤں کے اندر ایک تنور ہے جہاں سے دال اور روٹی مل سکتی ہے۔

اس تنور پر پہنچا تو وہاں تنور پر ادھیڑ عمر عورت بیٹھی تھی۔ یہ تنور اُسی کا تھا۔ اُس کے پاس تین آدمی بیٹھے تھے۔ وہ روٹی کا وقت نہیں تھا ورنہ وہاں بہت سی عورتیں ہوتیں۔ تنور سے مجھے روٹیاں اور چنے کی دال مل گئی جو میں کھانے بیٹھ گیا۔ میں چونکہ اجنبی تھا اس لئے تنور پر بیٹھے ہوتے آدمیوں نے دیہات کے رواج کے مطابق مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں سے

آیا ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے جھوٹ بولا اور اُنہیں سوال کا جواب مل گیا۔

"سُنا تھا یہاں بڑے سیٹھ کے گھر ڈاکہ پڑا تھا!" — مَیں نے کہا — "یہ شاید ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ یہ کس ڈاکو کی واردات ہے"۔

"نہیں بھائی!" — ایک آدمی نے جواب دیا — "کچھ پتہ نہیں چلا"۔

"پتہ تو سب کو ہے" — ایک اور آدمی بولا — "سیٹھ کے اپنے بیٹے کے سالے رمیش نے اُس کا خزانہ خالی کر دیا ہے"۔

"سُنا ہے وہ گاؤں سے بھاگ گیا ہے" — میں نے کہا — "رمیش اپنی بہن کو بھی ساتھ لے گیا ہے نا! ..... کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ جوڑے کی واردات ہے"۔

"اللہ کی اللہ جانے بھائی!" — ایک نے کہا — "سیٹھ کے پاس کون سی حلال کی رقم تھی۔ بہی کھاتے میں اُلٹی سیدھی لکیریں ڈال کر حرام خور نے لوگوں سے سُود اکٹھا کیا ہُوا تھا یا ڈنڈی مار کر دولت اکٹھی کر رکھی تھی"۔

"بعض لوگ دیبے کا نام بھی لیتے ہیں" — مَیں نے کہا۔

"نام تو لوگوں نے ڈاکوؤں کا ہی لینا ہے" — ان میں سے ایک نے کہا — "لیکن اصل ڈکیت اپنی بہن کو ساتھ لے کر گاؤں سے غائب ہو گیا ہے۔ پولیس کو ان کا کھُرا کھوج بھی نہیں ملا"۔

میری کوشش یہ تھی کہ ان آدمیوں سے کچھ پتہ چل جاتے کہ پولیس نے تفتیش کا رُخ کس طرف موڑا ہُوا ہے لیکن انہیں پولیس کی کارگزاری کا کچھ علم نہیں تھا۔ یہ غریب اور سادہ سے کسان تھے۔ یہ وہی باتیں سنا تے تھے جو انہوں نے کسی سے سُنی تھیں۔ اس سُنی سنائی میں افواہیں زیادہ تھیں۔ مَیں نے ان کی باتوں سے اخذ کیا کہ زیادہ تر لوگ یہ کہتے ہیں کہ ڈکیتی کی یہ واردات رمیش نے کی ہے اور وہ تجربہ کار ڈاکوؤں کو لایا تھا اور لیلا نے گھر بھیدی کا کام کیا ہے۔

مَیں نے کھانا کھایا، پانی پیا اور وہاں سے چل پڑا۔

مَیں جب اُس ڈھکی چھُپی جگہ میں داخل ہُوا جہاں دیبا کا ٹھکانہ تھا تو رات شروع ہو چکی تھی۔ مَیں نے مُنہ سے وہ مخصوص آواز نکالی جو اس جگہ داخل ہونے سے پہلے نکالی جاتی تھی۔ یہ ایک کوڈ تھا جسے صرف دیبا کے آدمی جانتے تھے۔ مَیں رکاوٹیں عبور کرتا دیبا کے پاس پہنچ گیا۔ حمیداللہ خان اور نُوراللہ اُس کے پاس بیٹھے ہُوئے پینے پلانے میں لگے ہُوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہُوئے کہ مَیں خیریت سے واپس آگیا ہوں۔

"دیبے اُستاد!" — مَیں نے کہا — "تمہارے یار ہیں تو عقل والے اور تعلیم یافتہ بھی ہیں لیکن ہیں بالکل سیدھے"۔

"تم یہ بتاؤ کچھ کر کے بھی آتے ہو یا سیر سپاٹا کر کے آگئے ہو" — دیبا نے کہا — "وہ کہتے تھے کہ ریل گاڑیاں تباہ کریں گے"۔

"ریل گاڑیاں پٹاخوں کے بارُود سے تباہ نہیں ہُوا کرتیں" — مَیں نے کہا اور اُنہیں پورا واقعہ سنا دیا پھر کہا — "میں انہیں کہہ آیا ہوں کہ ڈائنامیٹ کا بندوبست کریں اور مجھے بُلا لیں"۔

ہم کچھ دیر اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ مَیں تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

صبح اگر لیلا مجھے نہ جگاتی تو شاید میں سارا دن سویا ہی رہتا۔ میں ستائیس اٹھائیس میل پیدل چل کر آیا تھا۔ لیلا نے میری غیر حاضری کو کچھ زیادہ ہی محسوس کیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ بڑی بے صبری اور بے تابی سے میری منتظر تھی۔ اس بے تابی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ صرف مجھے اپنا ہمدرد اور غمخوار سمجھتی تھی اور دوسری وجہ یہ کہ اُس نے مجھے کچھ خبریں سنانی تھیں۔

"سکندر!" — لیلا نے پوچھا — "یہ کیسے لوگ ہیں؟ ..... یہ تمہارا اُستاد دیبا اور حمیداللہ خان جس کے متعلق تم نے کہا تھا کہ نوابزادہ ہے"۔

"کیوں؟" — مَیں نے پوچھا — "اُنہوں نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا؟"

"نہیں سکندر!" — اُس نے جواب دیا — "اُنھوں نے اُس طرح پریشان تو نہیں کیا جس طرح مرد اپنے قبضے میں آئی ہوئی عورتوں کو پریشان کیا کرتے ہیں، لیکن اُنھوں نے میرے ساتھ جو رویّہ اختیار کیا اور جو باتیں کی ہیں ان سے میں پریشان ہو گئی ہوں .... سچی بات بتاؤں، دونوں میرے ساتھ پیار اور محبت کی باتیں کرتے ہیں، لیکن دونوں نے کوئی اُلٹی سیدھی بات نہیں کی۔ حمید اللہ خان کی نیت کو تو میں اس لئے سمجھتی ہوں کہ تم نے کچھ ایسا اشارہ کیا تھا کہ حمید اللہ خان کے ساتھ شادی کر لوں۔ بھائی رمیش کی مرضی بھی کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔ حمید اللہ خان شادی کا ہی ارادہ دل میں رکھ کر محبت کا اظہار کرتا ہے، لیکن اس کی باتوں میں مجھے بناوٹ سی لگتی ہے اور مجھے یہ بھی شک ہے کہ اُسے میرا چہرہ اور میرا جسم اچھا لگتا ہے۔"

"حمید اللہ خان اچھا آدمی ہے لیلا!" — میں نے کہا — "تمہارے لئے یہی آدمی موزوں ہے۔ تمہیں شادی کرنی ہی پڑے گی۔ کسی ایک کی بیوی بن جاؤ گی تو عزت سے رہو گی ورنہ وہ وقت جلدی آئے گا کہ تمہیں یہاں ہر کسی کی بیوی بن کے رہنا پڑے گا۔ تمہارے لئے حمید اللہ خان ہی اچھا آدمی ہے۔ اُس نے اچھے دن دیکھے ہیں۔ اگر اُسے تمہارے جسم اور ظاہری حُسن کے ساتھ محبت ہے تو یہ بھی اچھا ہے کیونکہ حمید اللہ خان کو یوں سمجھو کہ ہیرے کا سوداگر ہے اور ہیروں میں اصل ہیرے کی پہچان رکھتا ہے۔ تمہاری قدر وہی کر سکتا ہے ورنہ باقی سب تمہیں اپنے قبضے میں آئی ہوئی ایک ایسی خوبصورت لڑکی سمجھیں گے جس کی آہ و فریاد سننے والا کوئی نہیں .... دیبا کیا کہتا ہے؟"

"اُس کے پیار میں مجھے اپنے باپ کا پیار محسوس ہوتا ہے" — لیلا نے کہا — "حالانکہ میرے باپ نے میرے ساتھ کبھی پیار نہیں کیا تھا۔"

"کس قسم کا پیار کرتا ہے؟" — میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرتا" — لیلا نے جواب دیا — "دن کو کسی وقت بلا لیتا ہے۔ اپنے پاس بٹھاتا ہے۔ کبھی میرے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے اور سب سے پہلے یہ پوچھتا ہے کہ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں۔ پھر بچوں کی طرح پیاری پیاری سی باتیں کرتا ہے۔ میں دو دن اُسے نہ ملی تو اُس نے بلایا۔ پرسوں کی بات ہے۔ میں باہر بیٹھی ہوئی تھی تو میرے پاس آ گیا اور کہنے لگا کہ تم اتنے دن کہاں رہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے بلایا ہی نہیں تو وہ کہنے لگا کہ بلائے بغیر بھی کبھی آ جاؤ۔ اتنے میں رمیش بھی آ گیا۔ دیبا ہمارے پاس بیٹھ گیا .... سکندر! میں نے تو سُنا تھا کہ دیبا بڑا جابر آدمی ہے اور پولیس والے بھی اس کے ساتھ سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں۔ یہ سُن سُن کر میں بھی دیبا سے ڈرتی تھی، لیکن میں اس کے پاس ہوتی ہوں تو وہ بچہ سا بن جاتا ہے اور جب وہ اس حالت میں میرے ساتھ باتیں کرتا ہے تو مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"تم نہیں جانتیں لیلا!" — میں نے کہا — "تم دیکھ رہی ہو کہ دیبا کی زندگی تنہائی میں گزر رہی ہے۔ وہ چاہے تو اپنے ارد گرد دوستوں کا ایک ہجوم اکٹھا کر لے، لیکن اس ہجوم میں بھی وہ تنہا ہوتا ہے .... تم شاید تنہائی کا مطلب سمجھیں نہیں۔"

"نہیں"

"میں سمجھاتا ہوں" — میں نے کہا — "اس شخص کی زندگی عورت سے خالی نہیں رہی، لیکن کوئی ایسی عورت نہیں جسے یہ اپنی کہہ سکے۔ اپنی سے مراد اپنی بیوی ہوتی ہے، اپنی ماں ہوتی ہے، بہن اور بیٹی اپنی ہوتی ہے۔ ان کا پیار رُوح کی پیاس بجھا دیتا ہے، لیکن دیبا ان سے محروم رہا۔"

"ہاں سکندر!" — لیلا نے کہا — "مجھے یاد آیا۔ میں نے ایک روز دیبا کے کمرے سے ایک جوان عورت کو نکلتے دیکھا تھا۔ دیبا نے اپنے کمرے کا دروازہ کبھی بند نہیں کیا، لیکن یہ عورت جب اُس کے کمرے سے نکلی تو دروازہ بند تھا۔"

"اس گاؤں کی کوئی عورت ہو گی" ــــ مَیں نے کہا۔

لیلا کی ان باتوں سے میں دیبے کی نفسیات سمجھ گیا۔ اگر لیلا کے متعلق اُس کی نیت خراب ہوتی تو اُسے روکنے کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ لیلا جیسی جوان لڑکیوں کے ساتھ وہ گول گول باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا۔ اگر لیلا اُسے بُری نیت سے اچھی لگتی تو وہ اُسے اپنے پاس بلا کر کمرے کا دروازہ بند کر لیتا۔ لیلا کے ساتھ اُس نے جو باتیں کی تھیں، اُن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں لیلا کی وہ محبت بیدار ہو گئی ہے جو اُس نے اس عمر تک کسی کے ساتھ نہیں کی تھی۔ دیبا واقعی جابر اور زبردست آدمی تھا، لیکن محبت ایک ایسی کمزوری ہے جو پتھر دل آدمی کو بھی موم کر دیا کرتی ہے۔

لیلا دیبا کی باتیں سُنا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ دیبا لیلا سے یہ کہہ بیٹھے کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیلا نے انکار ہی کرنا تھا۔ پھر یہ بتانا مشکل تھا کہ دیبا کا ردِعمل کیا ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک خدشہ یہ بھی محسوس ہُوا کہ حمید اللہ خان بھی لیلا کو چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ دو آدمیوں کے درمیان ایک عورت کے آجانے سے کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ یہ رقابت نہ دیبا کے لئے اچھی تھی نہ حمید اللہ کے لئے نہ ہی اس خفیہ اڈے کے لئے۔

"ایک بات بتاؤ لیلا!" ــــ مَیں نے پوچھا ــــ "تمہیں دیبا اچھا لگتا ہے یا حمید اللہ؟"

"میرے دل کی بات پوچھتے ہو؟" ــــ لیلا نے جواب دیا ــــ "تم ہو تو مجھے کوئی بھی اچھا نہیں لگتا، لیکن تم عجیب آدمی ہو۔"

"مَیں تمہیں جو باتیں کہہ چکا ہوں وہ بار بار مجھ سے نہ کہلواؤ" ــــ مَیں نے کہا ــــ "مجھے صرف یہ بتاؤ کہ دیبا اور حمید اللہ خان میں سے تمہیں کون اچھا لگتا ہے۔"

"اچھا تو دیبا ہی لگتا ہے" ــــ لیلا نے جواب دیا ــــ

"مَیں پہلے بتا چکی ہوں کہ اُس کے پیار اور باتوں میں مجھے باپ کی شفقت ملتی ہے۔"

"اگر وہ تمہیں کہے کہ میرے ساتھ شادی کر لو تو بھی وہ تمہیں اچھا لگے گا؟"

"نہیں سکندر!" ــــ لیلا نے جواب دیا ــــ "وہ ایسی بات نہیں کہے گا۔ وہ بوڑھا تو نہیں، لیکن اُس کی عمر مجھ سے تقریباً دُگنی ہے.... اب تو مَیں اُس کے بلاتے بغیر ہی اُس کے پاس چلی جاتی ہوں۔"

لیلا یہ باتیں سُنا کر چلی گئی اور میں کچھ خدشوں اور خیالوں کے بھنور میں پھنس گیا۔ سوچتے سوچتے میرا دل ایک بار پھر عجیب سے بوجھ کے نیچے آ گیا اور مجھے صاف طور پر محسوس ہونے لگا کہ کوئی اَن ہونی ہونے والی ہے۔ بعض اوقات آنے والے حادثے کا اشارہ سا مل جاتا ہے۔ میرا دل جب زیادہ گھبرانے لگا تو میں دیبا کے پاس چلا گیا۔



حمید اللہ خان اور نور اللہ ابھی سوتے ہوتے تھے۔ دیبا جاگ اُٹھا تھا۔ ان لوگوں کی دنیا میں دن اور رات میں کوئی تمیز نہیں تھی۔ یہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے تھے۔

"آؤ سکندر بھائی" ــــ دیبا نے کہا ــــ "اچھا ہُوا تم آ گئے۔ مَیں اُن لوگوں کے پاس خود بھی جاؤں گا اور انہیں کہوں گا کہ وہ اُس بارُود کا انتظام کریں جس کا تم نام لیتے ہو.... کیا نام ہے اُس کا.... ہاں.... ڈائنامیٹ.... وہ انتظام کر لیں گے.... بڑی مضبوط پارٹی ہے۔ میں واپس آکر تمہیں بتاؤں گا۔"

ہم دونوں کچھ دیر اس دہشت گرد گروہ میں مسلمانوں کو شامل کرنے اور پھر اس گروہ کو زیادہ مضبوط بنانے کی باتیں کرتے رہے۔

"لیلا بڑی اچھی لڑکی ہے" ــــ دیبا نے کہا ــــ "میرے پاس آتی رہتی ہے۔ رمیش کو ہم پر اعتبار آ گیا ہے۔ اُسے یقین ہو گیا ہے کہ یہاں

اُس کی بہن کی عزت محفوظ ہے۔"

"مجھے اس کی صرف عزت کا ہی خیال آتا ہے اُستاد!" — مَیں نے کہا — "اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ اس لڑکی کی شادی فوراً حمید اللہ خان کے ساتھ کر دی جائے۔"

مَیں نے دیکھا کہ دیبا ذرا سا چونکا اور اُس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جو اُس کے لئے حیرت کا باعث ہو یا اُسے میری بات اچھی نہ لگی ہو۔ یہ تو میں دیکھ رہا تھا کہ دیبا نے بڑے اشتیاق سے لیلا کا نام لیا تھا۔

"ہاں، ہاں!" — دیبا نے یوں کہا جیسے بیدار ہو کر بولا ہو۔ اُکھڑے اُکھڑے سے لہجے میں کہنے لگا — "تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس لڑکی کی شادی ہو جانی چاہیئے .... ہاں، ہاں .... شادی ضرور ہونی چاہیئے" — دیبا چُپ ہو کر سوچ میں پڑ گیا پھر اچانک بولا — "لیکن سکندر! کیا تم حمید اللہ خان کو اس لڑکی کے قابل سمجھتے ہو؟"

"ایسی باتیں نہ سوچو اُستاد!" — مَیں نے کہا — "میرا مطلب صرف یہ ہے کہ لڑکی نوجوان ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ یہ کسی ایک آدمی کی ملکیت میں چلی جائے تو کوئی خطرہ نہیں رہے گا ورنہ اتنے سارے آدمیوں میں یہ لڑکی دشمنی کا باعث بن جائے گی۔ تم جانتے ہو اُستاد! تم سب کچھ سمجھتے ہو۔"

"ہاں، ہاں سکندر!" — دیبا نے کہا — "میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔"

دیبا کے بولنے کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ اس طرح سوچ سوچ کر اور اٹک اٹک کر نہیں بولا کرتا تھا۔ مَیں جان گیا کہ لیلا دیبا کے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔ مَیں جتنی دیر اُس کے پاس بیٹھا رہا وہ لیلا کی ہی باتیں کرتا رہا۔ اُس نے صاف الفاظ میں تو نہ کہا لیکن پتہ چلتا تھا کہ لیلا کو حمید اللہ خان یا کسی اور کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے یہ خیال

آیا کہ دیبا اگر لیلا کو اتنا زیادہ چاہتا ہے تو کیا وہ اس کے ساتھ شادی کرے گا یا اسے داشتہ بنا کر رکھے گا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ دیبا لیلا کو اپنے قبضے میں کس حیثیت میں رکھتا ہے۔ مَیں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں رقابت کا ڈرامہ نہ چل پڑے۔ آپ جانتے ہیں کہ رقابت کا انجام کیا ہوتا ہے۔

اس کے بعد حمید اللہ خان سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے بھی لیلا کے سوا اور کسی موضوع پر بات نہ کی۔ اُس نے بتایا کہ لیلا اس کے ساتھ اتنی بے تکلف نہیں ہوتی جتنی وہ چاہتا ہے۔

"میں اُس کی شادی تمہارے ساتھ کرا دوں گا" — مَیں نے کہا — "پھر تم خود ہی اُسے سنبھال لینا .... یہ کوئی مسئلہ نہیں نوابزادے! میرے ساتھ اصل مسئلے کی بات کرو۔ دیبا اُن لوگوں کے پاس جائے گا اور انہیں کہے گا کہ ڈائنامیٹ کا انتظام کریں۔"

"پہلے شادی ہو جانے دو یار!" — حمید اللہ خان نے ایسے انداز سے کہا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اُسے لیلا کے سوا کسی اور چیز کے ساتھ دلچسپی نہیں۔

"معلوم ہوتا ہے تم مجھے تنہا چھوڑ رہے ہو" — مَیں نے کہا — "تم شاید جانتے ہو گے کہ لیلا میرے سوا کسی اور کو نہیں چاہتی۔ اپنے بھائی کو سوتا چھوڑ کر آدھی رات کو اُٹھ کر میرے پاس آجاتی ہے۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو اور اُس کی ایسی والہانہ محبت کو ٹھکرانا مجھ جیسے جوان آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی، لیکن مَیں صرف اپنے مشن کی خاطر لیلا کو ٹھکرا رہا ہوں۔ تمہارا بھی یہی مشن ہے۔"

حمید اللہ خان نے قہقہہ لگایا اور کہا کچھ بھی نہیں۔

"معلوم ہوتا ہے تم پھر سے نواب بن گئے ہو" — مَیں نے کہا — "شاید تم اِس ٹھکانے کو مستقل ٹھکانا بنانا چاہتے ہو۔ مجھے صاف بتا دو حمید اللہ! .... اور مَیں تمہیں صاف بتا دیتا ہوں کہ دیبا تمہیں ساری

عمر یہاں نہیں رہنے دے گا۔ اگر یہیں رہنا چاہو گے تو دیبا کے آدمیوں کے ساتھ تمہیں ڈکیتی اور راہزنی کی وارداتیں کرنا پڑیں گی۔ ایک نہ ایک روز تم پکڑے ہی جاؤ گے تو کیوں نہیں تم ایسے کام میں پکڑے جاؤ کہ اس ملک کے لوگ تمہیں ایک ہیرو کا درجہ دیں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو سکندر!" — اُس نے غیر سنجیدہ سے لہجے میں کہا — "میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن ریلا کو میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا۔ مجھے شک ہے کہ دیبا نے بھی اس لڑکی پر نظر رکھی ہوئی ہے۔"

میں نے حمید اللہ خان کے ساتھ کچھ باتیں کیں لیکن وہ ان باتوں میں سنجیدہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پتہ یہی چلتا تھا کہ اُس نے اپنے ارادے بدل دیئے ہیں۔ جس کسی کے ذہن پر عورت سوار ہو جاتی ہے اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ عورت کا صرف تصور ہی انسان کو بیکار کر دیتا ہے، یہ تو جیتی جاگتی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

مجھے یہ خیال بھی آگیا کہ حمید اللہ خان جب ہندوستان کی آزادی کی باتیں کیا کرتا تھا تو اُس کے سامنے اُس کا باپ تھا جو نواب تھا۔ میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ اُس کے باپ نے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ حمید اللہ خان اپنے باپ کی نوابی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ دہشت گردی کے ذریعے انگریزی راج کو ختم کیا جا سکے تو نوابیاں خود ہی ختم ہو جائیں گی۔ اب اُس نے سوچ لیا ہو گا کہ یہ مہم آسان نہیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ زندگی کے جو دن باقی ہیں وہ عیش موج میں گزارے جائیں۔

"حمید اللہ خان!" — میں نے کہا — "ذرا دُور کی سوچو۔ میرا ساتھ نہ دو لیکن یہ سوچ لو کہ دیبا اگر ریلا کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے تو تم ریلا سے نظریں ہٹا لینا ورنہ نتائج بہت خطرناک ہوں گے ... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ دیبا جیسے کتنی اُستاد بھی تمہارے خلاف ہو گئے تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ دوستی کا حق ادا کروں گا اور تمہارے لئے جان بھی دے دوں گا۔"

"میں تمہاری دوستی سے تو دستبردار نہیں ہوں گا سکندر!" — اُس نے کہا — "میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ ہم تو جنم جنم کے ساتھی ہیں۔"

میں دل پر ایک بوجھ سا لئے وہاں سے اُٹھا اور اپنے کمرے میں آگیا۔



ریلا تو میرے ساتھ چپک کے رہ گئی تھی۔ وہ میرے لئے ایک مسئلہ اور ایک آزمائش بن جاتی تھی اور اُس کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھتی تھی۔ جسمانی طور پر اتنا قریب ہو کر میں ذہنی طور پر اُس سے دُور ہٹنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ میرے لئے کٹھن آزمائش بن جاتی تھی۔ میں اُس وقت اپنی آنکھوں کے سامنے سائرہ کو اور اپنی زندگی کے مشن کو لے آتا تھا۔

ایک رات سائرہ کی اتنی یاد آئی کہ میرے آنسو نکل آئے۔ وہ دن اور وہ راتیں یاد آئیں جو میں نے اُس کے ساتھ گزاری تھیں۔ منور اور تجمل بھی بہت یاد آئے اور اس کے ساتھ مظفر بھی یاد آگیا۔ میرا ذہن مظفر پر رُک گیا۔ آپ کو سنا چکا ہوں کہ انسپکٹر فضل حسین کا یہ چھوٹا بھائی مظفر مجھ سے کتنا متاثر تھا۔ اتنا زیادہ متاثر کہ اُس نے اپنی نوکری کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ اُسے محکمانہ کارروائی کے نتیجے میں پولیس کی نوکری سے سبکدوش کر دیا تھا۔ میں جب اُن لوگوں کی جاگیر میں رہتا تھا تو امید تھی کہ وہ آ جاتے گا لیکن مجھے وہاں سے نکلنا پڑا اور میں اُس کے آنے سے پہلے وہاں سے نکل آیا تھا۔ وہ میرے بعد پہنچا ہو گا۔

منور، تجمل اور مظفر سے ملنے کے لئے میں بے تاب ہو گیا۔ ان لوگوں نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ میں انہیں تمام عمر نہیں بھول سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں اتنی دُور ایک غریب کسان کے بھیس میں چلا گیا تھا اور واپس بھی آگیا ہوں تو میں اسی بھیس میں منور اور تجمل کے پاس جا سکتا ہوں۔ میرے ذہن میں سائرہ بھی تھی۔ میں اُس کے متعلق بھی

معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کس حال میں ہے اور اُس کی شادی ہوتی ہے یا نہیں۔

منور اور تحمل کو دیبا کے ٹھکانے کا علم تھا۔ وہ دیبا کو جانتے تھے۔ میں اُنہیں بتا آیا تھا کہ میں حمید اللہ اور نور اللہ کے ساتھ دیبا کے پاس جا رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہاں آئیں۔ میں نے اُن کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔ دوسرے ہی دن دیبا کے ساتھ بات کی تو اُس نے کہا کہ میں چلا جاؤں۔ میرے متعلق اُسے یہ تسلی تھی کہ میں اپنے متعلق کہیں بھی کوئی شک پیدا نہیں ہونے دوں گا۔

میں نے اگلے ہی روز وہی بہروپ دھار لیا جس بہروپ میں میں دہشت گردوں کے پاس گیا تھا۔ اب میں نے اس بہروپ میں یہ اضافہ کیا تھا کہ ایک آنکھ پر دھاگے سے موٹی سبز پٹی باندھ کر آنکھ پر رکھ لی تھی اور دھاگہ سر کے پیچھے باندھ لیا تھا۔ اس کے اوپر میلی کچیلی سی، پگڑی سر پر لپیٹ لی تھی۔ پہلے کی طرح چہرے اور داڑھی پر مٹی ڈال کر جھاڑ لی تھی۔ ہاتھوں، پاؤں اور ٹانگوں پر بھی مٹی ڈالی اور جھاڑ لی تھی۔ موٹے کھدر کے کپڑے تھے جو بہت ہی میلے تھے۔ مختصر یہ کہ میرا بہروپ مکمل تھا۔ پہلے کی ہی طرح ایک خنجر اور ایک ریوالور کپڑوں کے اندر چھپا ہوا تھا۔

میں اُس وقت روانہ ہوا جب صبح ابھی دھندلی تھی۔



سورج نکلنے تک میں کم و بیش پانچ میل کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اس علاقے میں مجھے زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت تھی کیونکہ یہ ہماری وارداتوں کے علاقے تھے۔ اس علاقے میں حمید اللہ خان اور نور اللہ کی نوسر بازی چلتی رہی تھی۔ اس سے آگے انسپکٹر فضل حسین کی جاگیر تھی جس کے متعلق یہ رپورٹ اُوپر تک پہنچ گئی تھی کہ میں یہاں پناہ لئے ہوتے ہوں۔ اسی علاقے میں سارہ کا بھائی ایوب قتل ہوا تھا۔ یہ علاقہ

اس لئے خطرناک ہو گیا تھا کہ ان تینوں وارداتوں یعنی نوسر بازی، ایوب کا قتل اور اس علاقے میں میری موجودگی میں سے کسی ایک واردات کا بھی سراغ نہیں ملا تھا۔ نوسر بازی اتنا سنگین جرم نہیں تھا لیکن یہ سنگین اس وجہ سے ہو گیا تھا کہ نوسر باز حمید اللہ خان تھا جو عمر قید پا کر جیل سے مفرور تھا۔ دوسرا نور اللہ تھا جس کے متعلق پولیس کو اطلاع ملی تھی کہ کسی دوسرے صوبے کا نامی گرامی ڈاکو ہے اور وہ متعدد وارداتوں میں مطلوب ہوگا۔

میرے لئے خطرہ یہ تھا کہ پولیس کے مخبر موجود تھے۔ ان وارداتوں کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔

میں چلتا گیا اور "سائیں کراماتاں والے" کے گاؤں میں جا پہنچا۔

مجھے گاؤں کے باہر باہر سے گزرنا چاہیئے تھا لیکن اپنی دلچسپی کی خاطر گاؤں کے اندر چلا گیا اور میں اُس مکان کے سامنے جا رُکا جہاں نور اللہ سائیں کراماتاں والا بنا ہوا حمید اللہ کے ساتھ رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ مکان آباد ہو چکا ہوگا لیکن اس مکان کے دروازے پر اور باہر والی دیوار پر سبز جھنڈے بانسوں کے ساتھ بندھے ہوتے لگے تھے۔ صحن کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ ایسی صفائی نظر آتی جو دیہات میں کبھی دیکھنے میں نہیں آتی۔ اندر سے دیواریں چونے سے سفید کی ہوتی تھیں۔

ایک آدمی دو عورتوں کے ساتھ آیا۔ ان سب نے دروازے کے باہر جوتے اُتارے اور اندر چلے گئے۔ میں دروازے میں کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ ایک کمرے میں چلے گئے۔ یہ غالباً وہ کمرہ تھا جس میں حمید اللہ اور نور اللہ رہتے تھے۔ میں ان کے پاس اسی کمرے میں آیا تھا۔ سلطان احمد کے ساتھ اسی کمرے میں ملاقات ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ آدمی عورتوں کے ساتھ باہر آیا۔ تینوں پیٹھیں میری طرف یعنی باہر والے دروازے کی طرف کئے ہوتے اُلٹے قدم دروازے

تک آئے اور باہر آکر جُوتے پہنے اور چلے گئے ۔

اندر سے ایک ملنگ نکلا۔ یہ ویسا ہی ملنگ تھا جس قسم کے آج کل آپ خانقاہوں اور قبرستانوں کے تکیوں پر دیکھا کرتے ہیں۔ وہ میرے پاس آرُکا۔

"کیوں بھائی!" — اُس نے کہا — "سلام کے لئے آتے ہو؟"

"ہاں سائیں جی!" — مَیں نے بالکل اَن پڑھ اور سیدھے سادے دیہاتیوں کی طرح مرعوب ہو کر جواب دیا — "سائیں کراماتاں والے کے سلام کے لئے حاضر ہُوا ہوں۔ کیا وہ اندر ہیں؟"

"نہیں بھائی!" — ملنگ نے کہا — "وہ تو خدائی اشارے پر کہیں چلے گئے ہیں۔ اُن کی رُوح مبارک یہیں ہے۔ اندر چلے جاؤ۔ سلام کر کے آجانا۔ پیٹھ نہ کرنا۔ کچھ نذر نیاز بھی اندر رکھ آنا۔ جُوتی یہیں اُتار جاؤ۔"

میں جُوتی اُتار کر اندر چلا گیا اور اُس کمرے میں جا گُھسا جہاں ہماری ملاقاتیں ہُوا کرتی تھیں۔ کمرے کے وسط میں اینٹوں کا ایک چبوترہ سا بنا ہُوا تھا۔ یہ تین سیڑھیوں جیسا تھا۔ ہر سیڑھی پر دیے رکھے ہوتے تھے جن میں چند ایک جل رہے تھے۔ چبوترے کے نیچے مٹی کی پرات رکھی تھی جس میں بہت سے پیسے پڑے ہوتے تھے۔

اس چبوترے کو لوگ سلام کرنے کے لئے آتے تھے، دیے جلاتے تھے اور پیسے بھی رکھ جاتے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ پیسے کس کی جیب میں جاتے تھے۔ مجھے شک تھا کہ یہ مکان نمبردار نے "سائیں کراماتاں والے" کو دیا تھا۔ یہ پیسے اُسی کی جیب میں جاتے ہوں گے اور اس ملنگ کو یا ایک دو آدمیوں کو حصّہ مل جاتا ہوگا۔ یہ بھی کوئی بعید نہیں تھا کہ نمبردار نور اللہ کو اصلی اور برگزیدہ سائیں کراماتاں والا سمجھتا ہو۔ وہ سمجھتا تھا یا نہیں، مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس گاؤں کے لوگ

ہی نہیں بلکہ جہاں جہاں تک سائیں کراماتاں والے کا چرچا تھا، وہاں سے لوگ اس یقین کے ساتھ اس چبوترے کو سلام کرنے آتے تھے کہ سائیں جی کی رُوح یہیں ہے اور وہ خود کوہ قاف پر چلے گئے ہیں اور ایک نہ ایک دن واپس آجائیں گے۔

مجھے امید ہے کہ میری یہ آپ بیتی پڑھنے والے لوگوں کی سادگی اور پسماندگی اور توہم پرستی پر حیران نہیں ہوں گے۔ آج کے سائنسی اور ایٹمی دَور میں بھی ہمارے ملک میں بھی یہی نوسر بازی چل رہی ہے۔ جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی خانقاہیں بنی ہوتی ہیں۔ ہر خانقاہ کی ایک ایک کہانی ہے۔ ان کہانیوں کا لب لباب یہ ہے کہ یہاں فلاں پیر صاحب نے ایک رات قیام فرمایا تھا اور یہ کہ یہاں فلاں پیر صاحب کی بیٹھک ہُوا کرتی تھی۔ اس طرح ہر ایسی جگہ کسی نہ کسی من گھڑت روایت کے ذریعے کسی پیر سے وابستہ ہوتی ہے۔ ایسی جگہیں ہائی وے پر ہوتی ہیں۔ بسوں اور ویگنوں وغیرہ کے ڈرائیور وہاں پیسے پھینکتے ہیں اور کسمپرسی اور پسماندگی کے مارے ہوتے دیہاتی وہاں سلام اور سجدے کرتے ہیں اور نوسرباز خوب کماتے ہیں۔

مَیں نے یہ منظر اُس گاؤں میں دیکھا۔ اُس کمرے میں شراب چلا کرتی تھی۔ بے اولاد عورتیں اولاد لینے آتی تھیں اور اس کمرے میں ہر طرح کی بدکاری ہوتی تھی، لیکن لوگ اس جگہ کو مقدس سمجھ کر سلام کرنے آتے تھے۔

میں اس چبوترے کے اردگرد گھوما اور باہر نکل آیا۔ مَیں اُلٹے قدم چلتا باہر کے دروازے تک پہنچا۔ مَیں اُلٹے قدم اس لئے چلا تھا کہ ملنگ نے یا کسی اور نے دیکھ لیا کہ مَیں نے اس کمرے کی طرف پیٹھ کر دی ہے تو وہ میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کرے گا۔

مَیں نے گاؤں کے تین چار آدمیوں کے ساتھ سائیں کراماتاں والے کے متعلق بات کی تو وہ اپنی انگلیاں چُوم کر اور آنکھوں کو لگا کر سائیں کراماتاں والے کا نام لیتے تھے۔

"جس دن وہ یہاں سے گئے ہیں وہ اس گاؤں کا بہت ہی بُرا دن تھا" — ایک آدمی نے کہا اور تین چار آدمیوں کے نام لے کر اُس نے بتایا — "فلاں کی بھینس اچھی بھلی تھی۔ کھڑے کھڑے کانپی اور گر کر مر گئی۔ دوسرے روز فلاں آدمی کا بچہ کوٹھے سے گر کر مر گیا۔ نمبردار کی گھوڑی کا مُردہ بچھڑا ہُوا۔ لوگوں نے رات کو گاؤں کے اندر کالے ناگوں کا ایک جوڑا پھرتے دیکھا۔ اگلی رات نمبردار نے لوگوں کو بتایا کہ رات کو اُسے سائیں کراماں والے خواب میں ملے ہیں اور کہہ گئے کہ جس کمرے میں وہ سوتے اور عبادت کرتے تھے وہاں دیئے جلتے رہا کریں اور لوگ وہاں سلام کے لئے حاضری دیا کریں۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ اس مکان کو صاف سُتھرا اور پاک رکھا جائے کیونکہ رات کو ہماری رُوح وہاں عبادت کے لئے جاتی ہے۔ نمبردار کے کہنے پر گاؤں والوں نے مکان کو اندر سے صاف کیا۔ چُونا لا کر سفیدی کی، پھر جا کر گاؤں میں امن و امان ہُوا۔"

میری کہانی بہت پرانی ہو گئی ہے، لیکن یہ باتیں، یہ حکایتیں اور روایتیں پرانی نہیں ہوتیں۔ دیہات میں اور شہروں میں بھی یہ آج بھی سُنی سنائی جاتی ہیں۔

میں اس گاؤں سے نکلا اور آگے کو چل پڑا۔



عصر کی نماز کا وقت ہو گا جب میں منوّر اور تحمّل کی جاگیر پر پہنچ گیا۔ اُن کے گھر کے آگے پہنچا تو منوّر باہر کھڑا تھا۔ وہ شاید کہیں جا رہا تھا۔ میں نے اپنا انداز وہی رکھا جو اس بہروپ میں ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے پیٹھ میں تھوڑا سا کُبڑا پن پیدا کر رکھا تھا۔ منوّر نے میری طرف دیکھا تو بے رُخی سے پوچھا کہ میں کون ہوں اور کیوں آیا ہوں۔

"آپ کے سلام کے لئے حاضر ہُوا ہوں چوہدری صاحب!" — میں نے یتیموں اور مسکینوں جیسی آواز میں کہا۔ میں نے آواز بالکل ہی

بدل لی تھی۔

"ہمارے سلام کی کیا ضرورت آپڑی ہے تجھے؟" — منوّر نے کہا — "بیٹھ جاؤ کہیں۔ کھانا مل جائے گا۔"

"آپ کے بچے جیتیں چوہدری جی!" — میں نے اور زیادہ مسکین بنتے ہُوئے کہا — "دو چار پیسے مل جائیں تو آپ کے بچوں کو دعائیں دوں گا۔"

"اِس جسم کو ہلاتے کیوں نہیں؟" — منوّر نے کہا — "اپنے ہاتھ پاؤں ہلاؤ اور کما کر کھاؤ۔ نوکری کرنی ہے تو یہیں رہ جاؤ۔"

"میں یہاں رہ کر گیا ہوں جی!" — میں نے کہا — "آپ کو یاد نہیں رہا۔ آپ بادشاہ ہیں چوہدری جی! ہم جیسے غریبوں کو آپ کیسے پہچان سکتے ہیں .... میرا نام سکندر ہے چوہدری منوّر جی! تم تو پہچاننے سے انکاری ہو۔"

منوّر یوں بدکا جیسے اُس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار کے ساتھ لگ گیا ہو۔ حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھتا آہستہ آہستہ میری طرف آنے لگا۔ میں نے اُسے کہا کہ میرے قریب نہ آئے۔ اندر چلا جائے اور میں اُس کے پیچھے آ جاؤں گا۔ وہ میری بات سمجھ گیا اور اپنے مکان میں داخل ہو گیا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا اُس کے پیچھے اندر چلا گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ میرے گلے لگ گیا اور اپنے بازوؤں میں مجھے اتنی زور سے بھینچا جیسے میری پسلیاں توڑ دے گا۔

پھر وہ مجھے ڈیوڑھی کے ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ مجھے بٹھا کر باہر گیا اور کسی کو تحمّل کو بلا لانے کے لئے دوڑا دیا۔ کچھ دیر بعد تحمّل آ گیا۔ وہ بھی مجھے منوّر کی طرح ملا۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم نے کتنی باتیں اور کیسی باتیں کی ہوں گی۔ اُنہوں نے مجھے میرے جانے کے بعد کی باتیں سنائیں اور میں نے انہیں سنایا کہ یہاں سے جا کر میں نے کیا کیا اور کہاں رہا۔ میں نے ساہوکار

کے گھر کی ڈاکہ زنی کی واردات کا ذکر نہ کیا۔ مظفر کے متعلق اُنہوں نے بتایا کہ وہ گھر آگیا تھا اور اب انسپکٹر فضل حسین کے پاس گیا ہُوا ہے۔ فضل حسین نے اُسے یہاں زیادہ دیر نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ انقلابی باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر کہ وہ کچھ کئے بغیر بغاوت کے جرم میں پکڑا جائے گا اُسے اپنی نگرانی میں رکھنے کے لئے ساتھ لے گیا تھا۔

"اور اب سُنو اپنی سائرہ کی بات!" — تجمل نے کہا — "ہمیں ہر وقت سائرہ کی طرف سے خطرہ رہتا تھا کہ پولیس نے ابھی تک اُسے خفیہ نگرانی میں نہ رکھا ہُوا ہو۔ تم نے ہمیں یقین دلا دیا تھا کہ سائرہ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ تم اُس سے مل کر آتے تھے لیکن ہم نے اور زیادہ احتیاط کے لئے اس کے ساتھ تعلق قائم رکھا۔"

"کیا تم دونوں اُسے ملے تھے؟"

"نہیں" — تجمل نے جواب دیا — "پہلے منوّر شہر گیا اور دن کی روشنی میں ایوب کا گھر معلوم کر کے دیکھ آیا۔ ایوب کا گھر معلوم کرنا مشکل نہیں تھا۔ قتل ہو جانے کی وجہ سے ہر کوئی اُس کے گھر سے واقف تھا۔ دوسرے دن منوّر اپنے ایک آدمی بختے کو ساتھ لے کر گیا۔"

مَیں اس آدمی کو جانتا تھا۔ اس کا نام بختاور تھا اور اُسے بختا کہتے تھے۔ بہت ہی چالاک اور چرب زبان آدمی تھا۔ یہ آدمی بھکاری بن کر منوّر کے ساتھ گیا تھا۔ تجمل نے سنایا کہ سائرہ کے گھر کی گلی میں جاکر دُور سے منوّر نے اس آدمی کو سائرہ کا گھر دکھایا اور خود وہاں سے غائب ہو گیا۔ اس آدمی نے ایکٹنگ کا کمال دکھایا۔ سائرہ کے دروازے پر صدا لگائی۔ یہ اُمید نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ سائرہ ہی باہر آئے گی لیکن وہی باہر آئی۔ لوگ بھکاریوں کو تھوڑا سا آٹا یا تھوڑی سی روٹی دیا کرتے تھے لیکن سائرہ نے اس بھکاری کو ایک پیسہ دیا۔ اُس دَور کا پیسہ آج کے چار آنے کے برابر ہُوا کرتا تھا۔

"مجھے تجمل اور منوّر نے بھیجا ہے" — بختے نے آہستہ سے سائرہ سے کہا — "وہ تمہاری خیر خیریت معلوم کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی تکلیف یا پریشانی ہو تو ہمیں بتاؤ .... پولیس والے تو تنگ نہیں کرتے؟"

"نہیں!" — سائرہ نے جواب دیا — "اندر آجاؤ۔"

وہ اندر چلا گیا۔ سائرہ نے اُسے ڈیوڑھی میں بٹھا لیا۔

"سکندر کہاں ہے؟" — سائرہ نے پوچھا۔

"چلا گیا ہے" — بختے نے کہا — "معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے"

"پھر آنے کو نہیں کہہ گیا؟"

"نہیں!" — بختے نے جواب دیا — "شاید کبھی آ ہی نکلے۔"

"اگر آئے تو اُسے کہنا تمہیں سائرہ نے بلایا تھا" — سائرہ نے کہا — "تجمل اور منوّر سے کہنا کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں اور مجھے کچھ نہیں چاہئے .... تم کبھی کبھی آجایا کرو۔"

بختا اس کے بعد دوبارہ وہاں گیا۔ سائرہ اُسے اندر بٹھاتی اور اُس کی خاطر تواضع کرتی تھی۔ تجمل نے مجھے بتایا کہ دو روز پہلے بختا شہر کسی کام سے گیا تھا۔ وہ سائرہ کے گھر چلا گیا۔ اُسے سائرہ نہ مل سکی۔ وہ کہیں گئی ہوئی تھی۔ سائرہ کی ماں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بختا سائرہ کے پاس آتا رہتا ہے۔ وہ دُکھیاری ماں تھی۔ اُس کا بیٹا (ایوب) پہلے دو سال کے لئے جیل چلا گیا اور تھانیداری بھی گئی پھر قتل ہو گیا۔ بیٹی اغوا ہو گئی۔ واپس آئی تو اُس نے ماں کے لئے نیا ہی مسئلہ کھڑا کر دیا۔

وہ بختے کو بٹھا کر اُس کے آگے رونا رونے لگی۔

"میرے بھائی!" — اُس نے بختے کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا — "سائرہ سے کہو کہ شادی کر لے۔ مَیں تو ڈرتی تھی کہ اس کا رشتہ کوئی بھی نہیں مانگے گا لیکن ایک جگہ سے پیغام آیا ہے۔ جائیداد والے لوگ ہیں۔ محل جیسی اُن کی حویلی ہے۔ ایک ہی اُن کا لڑکا ہے۔ باپ کے

بعد وہ ساری جائیداد کا اکیلا مالک ہوگا لیکن سائرہ مان نہیں رہی"۔

"کیا کہتی ہے؟" — بختے نے پوچھا۔

"کہتی ہے سکندر واپس آجائے گا" — ماں نے کہا — "وہ تو مفرور ہے۔ پولیس اُس کے پیچھے ہے۔ سُنا ہے سرکار نے اُس کے سَر کی قیمت دس ہزار روپیہ مقرر کی ہے۔ اگر وہ ابھی جاتے اور سائرہ سے شادی کر بھی لے تو پکڑے جانے کا خطرہ ٹل تو نہیں جاتے گا۔ وہ شہر میں آئے گا تو پکڑا جائے گا لیکن وہ کچھ سُنتی ہی نہیں۔ کہتی ہے کچھ نہیں ہوگا، سکندر آئے گا اور مجھے لے جائے گا"۔

سائرہ کی ماں نے اُس کی ایسی باتیں سنائیں جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ذہنی لحاظ سے نارمل نہیں رہی۔ اُس کی ماں بختے کو اپنا ہمدرد سمجھتی تھی اور اُس کا اپنا سینہ رنج و الم سے بھرا ہوا تھا اس لئے اُس نے اپنا سارا حالِ دل اور سائرہ کا ذہنی اور جذباتی معاملہ بختے کو سنا ڈالا۔

"جتنی وہ عبادت کرتی ہے اس سے تو مجھے بھی یقین ہو جاتا ہے کہ اسے سکندر مل جائے گا" — سائرہ کی ماں نے کہا — "محلے کے پانچ سات بچے صبح و شام یہاں آتے ہیں اور سائرہ انہیں قرآن مجید کا سبق دیتی ہے۔ گھر کے کام کاج میں پوری دلچسپی لیتی ہے۔ زیادہ تر وقت عبادت میں گزارتی ہے۔ آدھی رات کے بعد تک نماز کے بعد ورد وظیفہ کرتی ہے۔ سحری کے وقت پھر مصلّے پر بیٹھی ہوتی ہے۔ کوئی بھکاری دروازے پر آکر صدا لگاتے تو خود باہر جاکر اُسے ایک پیسہ دیتی ہے۔ خیرات دے کر خوش ہوتی ہے"۔

"روتی رہتی ہوگی!" — بختے نے کہا۔

"نہیں!" — ماں نے کہا — "روتی نہیں، اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رہتی ہے۔ مَیں نے اسے کئی بار اکیلے بیٹھے ہنستے ہوئے بھی دیکھا ہے جیسے کوئی اس کے سامنے بیٹھا ہوا ہو اور وہ اس کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہا ہو۔ دن میں آٹھ دس مرتبہ کسی نہ کسی بہانے

سکندر کا نام لیتی ہے"۔

"اسے کسی پیر یا عامل کے پاس لے جائیں" — بختے نے کہا — "وہ کوئی تعویذ دھاگہ دیں گے یا کوئی عمل کریں گے یا آپ کو بتائیں گے۔ اللہ کرے گا کہ لڑکی کا دماغ صحیح ہو جائے گا"۔

"اس لڑکی میں ایک اور خرابی ہے" — سائرہ کی ماں نے کہا — "کسی پیر اور مُرشد کو اور کسی عامل کو مانتی ہی نہیں۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں میرے بھائی! ..... وہ صرف ایک شاہ صاحب کو مانتی ہے۔ انہیں بھی نہیں بلکہ اُن کی بیوی کی مرید ہے۔ اُن کی بیوی گلشن بی بی سارے شہر کی عورتوں میں مشہور ہے۔ وہ بہت کم بولتی ہے اور جو بات مُنہ سے نکالتی ہے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ سائرہ کو گلشن بی بی جس وجہ سے اچھی لگتی ہے وہ مَیں جانتی ہوں۔ گلشن بی بی سائرہ کے ساتھ سکندر کی باتیں کرتی رہتی ہے"۔

یہ گلشن بی بی وہی گلشن آرا تھی جس کا میری زندگی میں بہت زیادہ عمل دخل رہا ہے۔ اُس کا پورا قصّہ سُنا چکا ہوں۔

تجمل مجھے سائرہ کی باتیں سنا رہا تھا تو میرا سینہ جذبات کی شدّت سے پھٹنے لگا۔ میں اتنا ہی جانتا تھا کہ سائرہ کے دل میں میری اتنی زیادہ محبت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے لیکن میں نے یہ کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ میرے معاملے میں وہ اتنی زیادہ جذباتی ہو جائے گی کہ اس کا ذہن ابنارمل ہو جائے گا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایوب جیسے آدمیوں کی بہنیں عموماً شریف نہیں ہُوا کرتیں۔ اس کے علاوہ سائرہ پر جو گزری تھی اُس کا ردِّ عمل یہ نہیں ہونا چاہیئے تھا جس کا اظہار وہ کر رہی تھی۔ لوگوں نے اُسے بدنام کر دیا تھا۔ کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ جو لڑکی اغوا ہو کر گئی اور اتنے دن غیروں میں گزار کر آئی ہے وہ پاک صاف ہو گی۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نیّت کا پھل دیتا ہے۔ سائرہ نے ہمیشہ اپنی نیّت صاف رکھی اور دھیان خدا کی ذات میں رکھا۔ خدا نے

اُسے اس کا یہ اجر دیا کہ وہ اغوا ہوتی تو خدا نے میرے دل میں رحم ڈال دیا اور اس کے ساتھ ہی اُس کی محبت میرے دل میں ڈال دی اور میں اُس کی عصمت کا محافظ بن گیا۔

میں نے تجمّل سے کہا کہ وہ بخشے کو بلاتے۔ بخشا آیا تو میں نے اُس سے وہ باتیں پھر سنیں جو تجمّل مجھے سنا چکا تھا۔ میں نے تھانیدار کی طرح کئی سوال پوچھے۔ اس طرح وہ باتیں بھی مجھے معلوم ہوئیں جو بخشے نے تجمّل کو نہیں سنائی تھیں۔ یہ باتیں سُن کر میں تڑپ اُٹھا۔ اس تڑپ سے اس ارادے نے سر اُٹھایا کہ میں سائرہ سے ملنے جاؤں گا۔ میں نے اُس کے پاس ہمیشہ کے لئے چلے جانے کا یا اُس کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ میں اُس کے ساتھ رہ سکتا ہی نہیں تھا۔ میں اُسے نارمل حالت میں لا کر کسی کے ساتھ شادی کر لینے پر آمادہ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے تجمّل اور منوّر کو اپنا ارادہ بتایا اور کہا کہ میں ابھی جانا چاہتا ہوں۔ اُنھوں نے اس اطمینان کا اظہار کیا کہ اس حُلیے میں مجھے کوئی نہیں پہچان سکتا لیکن اُنھوں نے مجھے اُسی وقت جانے کی اجازت نہ دی۔ کہتے تھے کہ میں کم از کم ایک رات اُن کے ساتھ گزاروں۔ میں خود چاہتا تھا کہ اتنے پیارے دوستوں کے پاس کچھ اور وقت گزرے۔ میں رُک گیا۔ انھوں نے مجھے نہلایا دُھلایا اور میری خاطر تواضع حد سے بڑھ کر کی۔ پوری رات باتیں کرتے گزر گئی۔



صبح مُنہ اندھیرے میں پھر اسی بہروپ میں اپنے شہر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ تجمّل اور منوّر مجھے اپنی گھوڑی دے رہے تھے جو میں نے قبول نہ کی۔ میں جس حُلیے میں تھا اس حُلیے جیسے مُفلس دیہاتی اتنی اچھی نسل کی گھوڑیوں پر سوار نہیں ہُوا کرتے۔ اگر میں ایسے گھوڑی پر سوار ہوتا تو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا اور پکڑا جاتا۔ میرے لئے پیدل چلنا ہی محفوظ اور بہتر تھا۔

میں نے اس گاؤں سے اس شہر تک گھوڑی پر سفر کیا تھا۔ اتنا لمبا سفر گھوڑی پر ہی کیا جا سکتا تھا لیکن اب میں اپنی مجبوری کے تحت پیدل جا رہا تھا۔ یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ اگر سائرہ کی کشش نہ ہوتی تو میں اتنا زیادہ نہ چل سکتا۔ گزشتہ روز بھی میں نے خاصا لمبا پیدل سفر کیا تھا لیکن اب میری ٹانگوں میں گزشتہ روز سے زیادہ طاقت آ گئی تھی۔ میرے ذہن پر سائرہ سوار تھی۔

سورج سر پر آ گیا تو میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور وہ کھانا کھول کر کھانے لگا جو منوّر اور تجمّل نے میرے سفر کے لئے خاص طور پر پکوایا تھا۔ کھانا کھا کر مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں ساری رات کا جاگا ہُوا اور گزشتہ روز کا تھکا ہُوا تھا۔

ذرا سستانے کے لئے میں وہاں لیٹ گیا اور فوراً ہی میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب میں سائرہ کو اور اپنی امّی کو دیکھا۔ دونوں اکٹھی کھڑی تھیں اور مجھے بازو پھیلا کر بلا رہی تھیں لیکن میں اُن تک نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ میرے اور اُن کے درمیان ایک ندی حائل تھی جس میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ میں ندی کے اس کنارے پر اِدھر اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا کہ ندی میں کہیں سے ایسی جگہ نظر آ جائے جہاں سے میں ندی پار کر لوں لیکن میں جس جگہ بھی رُکتا اور ندی میں اُترنے لگتا وہاں سے لہریں اُٹھتیں اور میری طرف لپکنے لگتیں اور میں پیچھے ہٹ آتا۔ میں آخر ندی میں کُود گیا اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کُھل گئی۔ میں گھبرایا ہُوا اُٹھا۔ ذہن پر ابھی تک خواب کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے اپنے اِردگِرد دیکھا تو مجھے احساس ہُوا کہ میں عالمِ خواب میں تھا۔

میں اُٹھا اور چل پڑا۔ مجھے ہر لمحہ یہ احساس رہا کہ میری امّی اور سائرہ میرے قریب ہی کہیں موجود ہیں یا میرے ساتھ چلی آ رہی ہیں۔ آپ نے میری اس داستان میں دیکھا ہو گا کہ جب کبھی سائرہ میرے

تصور میں آتی تھی تو اس تصور میں میری امی کا آنا لازمی ہوتا تھا۔ میں نے اس تحریر میں اپنی امی اور سائرہ کی وابستگی واضح کی تھی جو مختصراً یہ ہے کہ سائرہ کے ہونٹ، آنکھیں، مسکراہٹ اور چہرے کا تاثر میری امی جیسا تھا۔

ان تفصیلات کو چھوڑیں، مختصر بات یہ ہے کہ سائرہ ایک مقناطیس تھی اور میں لوہے کا کمزور سا ذرّہ تھا جو مجبور اور بے بس ہو کر اُس کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔

دن کا پچھلا پہر تھا جب میں اُس بلند زمین تک پہنچ چکا تھا جہاں سے مجھے اپنا سارا شہر نظر آ رہا تھا۔ میری رفتار اور تیز ہو گئی۔ تھکن کا احساس مٹ گیا۔ میرے قریب سے لوگ گزرتے رہے تھے لیکن میں نے انہیں دیکھنے کی اور اپنے آپ کو اُن سے چھپاتے رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ میں کچھ دیر کے لئے بھول گیا تھا کہ میں دس ہزار روپے کی مالیت کا مفرور ملزم ہوں اور فوراً پہچانا جا سکتا ہوں۔ میں احمقانہ حد تک بے خوف و خطر چلا جا رہا تھا۔ میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ میں نے جو بہروپ دھار رکھا تھا اس حلیے کے حقیقی آدمی اتنا تیز نہیں چلا کرتے۔ وہ اتنا تیز چل ہی نہیں سکتے۔ مفلسی اور کسمپرسی اُن کے پاؤں کی بیڑیاں بنی رہتی ہیں۔ مجھے محتاط ہونا چاہیئے تھا لیکن میں احتیاط سے لاپروا ہو گیا تھا۔



میں اُس گلی میں داخل ہو گیا جو آگے جا کر دائیں اور پھر بائیں کو مُڑ کر سائرہ کے گھر تک پہنچا دیتی تھی۔ میں اس سے پہلے بھی جوتشیوں کے بہروپ میں اس گلی میں آیا تھا تو مجھ پر جذبات کا ایسا غلبہ ہُوا تھا کہ میرے آنسو نکل آتے تھے۔ میں ان گلیوں میں کھیل کُود کر جوان ہُوا تھا۔ میں جب جوتشی بن کر یہاں آیا تھا تو مجھے اپنے بچپن کے قہقہے اور دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ یہ عالمِ خیال کی اور میرے ماضی کی آوازیں تھیں لیکن اتنی حقیقی جیسے میں واقعی ہی یہ آوازیں سن رہا تھا

مگر اب جب میں ایک مفلس کسان اور نیم فاقہ کش انسان کے بہروپ میں اس گلی میں داخل ہُوا تو میں نے کچھ بھی محسوس نہ کیا۔ نہ بچپن کی یاد آئی نہ میں ماضی کی طرف گیا۔ صرف ایک اشتیاق تھا کہ میں سائرہ کے پاس جا رہا ہوں۔

میں نے اس گلی میں دو بوڑھی عورتیں اور تین بوڑھے آدمی دیکھے جنہیں میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ ایک آدمی میری عمر کا میرے قریب سے گزر گیا۔ یہ میرا ہمجولی تھا۔ ہم اکٹھے سکول جایا کرتے اور سکول سے آ کر اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ میرا یہ ہمجولی غربت کی وجہ سے چھٹی جماعت سے آگے نہیں پڑھ سکا تھا۔

میں نے ان سب کو دیکھا۔ ان میں سے کسی نے بھی میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا ــــ اور میں سائرہ کے دروازے پر جا رُکا۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور آواز بدل کر صدا لگائی کہ ایک بھوکا سوالی چوہدریوں کے دروازے پر آیا ہے۔

ایک دو منٹ بعد سائرہ باہر آئی۔ میں دروازے کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔ میرے بہروپ میں سبز کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی تھا جو میں نے ایک آنکھ پر باندھا ہُوا تھا۔ جب سائرہ دہلیز پر آئی تو میں نے اُوپر دیکھا۔ اُس نے ایک پیسہ میری طرف بڑھایا۔

"نہ بی بی!" ــــ میں نے مریل سی آواز میں کہا ــــ "مجھ غریب نے پیسوں کا کیا بنانا ہے۔ میں تو بھوک سے مر رہا ہوں۔ میں در در پر صدا لگا کر بھیک مانگنے والا نہیں ہوں۔ تم ایک روٹی دے دو گی تو اس پر اللہ کا شکر ادا کر کے اپنی راہ لگ جاؤں گا۔"

"ڈیوڑھی میں آجاؤ" ــــ سائرہ یہ کہہ کر اندر چلی گئی۔

میں ڈیوڑھی میں فرش پر جا بیٹھا اور ہاتھ لمبا کر کے دروازہ بند کر دیا۔

"یہ لو!" — ساترہ کی آواز پر میں نے دیکھا۔

ساترہ نے میرے آگے پیتل کی ایک تھالی رکھی۔ اس میں ماش کی دال تھی۔ پلیٹ کے قریب اس نے چھوٹی سی چنگیر رکھی تھی جس میں تنور کی ڈیڑھ روٹی تھی۔

"یہ دوپہر کی بچی ہوتی روٹی ہے" — ساترہ نے کہا — "دیکھ لو، بہت ہے؟"

میں نے اُوپر دیکھا۔ مجھ پر رقت طاری ہوگئی تھی۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا جو میں کہہ نہ سکا۔ ساترہ کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ بیٹھ جائے۔ وہ بیٹھ گئی۔

"تمہیں دیکھ کر بھوک مٹ گئی ہے" — میں نے آہستہ سے جذباتی آواز میں کہا۔

ساترہ نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"پہچانا نہیں ساترہ؟" — میں نے کہا اور آنکھ سے سبز کپڑے کی ٹاکی ہٹا دی۔

"سکندر؟" — ساترہ کے مُنہ سے سرگوشی نکلی — "سکندر ہو تم؟"

ساترہ کا سراپا میری آنکھوں کے سامنے جھلملانے لگا جیسے ساکن جھیل میں کسی نے کنکر پھینک دیا ہو۔

"سکندر!" — مجھے ساترہ کی بلند اور بے تاب سرگوشی سنائی دی۔

میرے دونوں ہاتھ ساترہ کے ہاتھوں میں آ گئے۔ آنسوؤں کی جھلملاتی دھندلاہٹ میں مجھے ساترہ کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے میرے ہاتھوں کو چُوما پھر آنکھوں سے لگایا پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور میرے بازو کھینچ کر مجھے بھی اُٹھا لیا۔ روٹی وہیں پڑی رہی اور وہ مجھے ڈیوڑھی کے ساتھ والے کمرے میں لے گئی۔ یہ وہ کمرہ تھا جہاں میں ایوب سے ملا تھا۔ ساترہ پر جذبات کا ایسا غلبہ تھا کہ وہ میرے گلے لگ گئی اور

اُس نے بچوں کی طرح رونا اور بلبلانا شروع کر دیا۔ میری اپنی جذباتی حالت اُس جیسی ہو رہی تھی۔ ہم دونوں کو احساس ہو گیا کہ ساترہ کی ماں کمرے میں آگئی ہے۔ میں ساترہ سے الگ ہونے کی کوشش کرنے لگا لیکن ساترہ مجھے چھوڑ نہیں رہی تھی۔

"کون ہے یہ ساترہ؟" — ساترہ کی ماں نے قدرے غصیلی آواز میں پوچھا۔

"سکندر ہوں خالہ جان!" — میں نے ساترہ کی ماں کی طرف مُڑ کر کہا۔

ساترہ مجھ سے الگ ہوگئی اور مجھے ایک کُرسی پر بٹھا دیا۔

"یہی سکندر ہے امّی جان!" — ساترہ نے اپنی ماں سے کہا — "بیٹھ جاؤ امّی اور اللہ کا معجزہ دیکھو۔"

"پہلے یہ بتاؤ سکندر!" — ساترہ کی ماں نے پوچھا — "لوگ یہ کیوں کہتے ہیں کہ میرے بیٹے کو تم نے قتل کیا تھا؟"

"نہیں امّی!" — ساترہ نے ذرا اُونچی آواز میں کہا — "میں تمہیں کتنی بار بتاؤں کہ ایوب بھائی کا قاتل سکندر نہیں۔ تمہیں سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں لیکن تم اپنی بیٹی کی زبان پر اعتبار کرنے کی بجائے لوگوں کی باتوں کو سچ مانتی ہو۔"

میں نے ساترہ کی ماں کو ایوب کے قتل کی ایک جھوٹی کہانی سُنا دی اور ساترہ نے میرے جھوٹ کو سچ سمجھ کر تائید کر دی۔

"امّی جان!" — ساترہ نے اپنی ماں سے کہا — "کسی کو یہ نہ بتانا کہ سکندر آیا ہے یا آیا تھا۔ وجہ تمہیں معلوم ہے۔"

"مجھے تم اتنی کم عقل سمجھتی ہو!" — ساترہ کی ماں نے درشت لہجے میں کہا۔

ساترہ کی ماں کے ساتھ جو باتیں ہوئیں، ان کا میں نے ردِعمل دیکھا اور اُس نے جو مختصر سی دو چار باتیں کیں اس سے مجھے اندازہ ہوا جیسے

غموں اور دکھوں نے اُس کی دماغی حالت کمزور کر دی ہو۔ مجھے سائرہ پر اتنا رحم نہ آیا جتنا اُس کی ماں پر آیا۔

"سکندر بیٹا!"—— سائرہ کی ماں نے منت سماجت کے لہجے میں کہا —— "اسے کچھ سمجھاؤ۔ میں اس کے فرض سے سُرخرو ہونا چاہتی ہوں لیکن یہ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ صرف تمہارا نام لیتی ہے۔ اگر تم ہمیشہ کے لئے آگئے ہو تو اس کا ہاتھ تھام لو۔ مَیں تم دونوں کو اجازت دیتی ہوں۔"

"مَیں اسے سمجھانے کے لئے ہی آیا ہوں خالہ جان!"—— مَیں نے کہا —— "مَیں ہمیشہ کے لئے نہیں آیا۔ آپ جانتی ہیں کہ مَیں اُڑتا پنچھی ہوں۔"

"سکندر بیٹا!"—— سائرہ کی ماں نے جذباتی سے لہجے میں کہا —— "تم ہو تو سکندر ہی لیکن سکندر لگتے نہیں۔ مجھے تو تمہارا وہ چہرہ یاد ہے جب تم بھولے بھالے سے لڑکے تھے اور مَیں ہر روز تمہیں اس گلی میں سے گزرتا دیکھا کرتی تھی"—— اُس کے آنسو بہہ نکلے اور رقت نے اُس کی زبان بند کر دی۔

اُس نے میری امی اور میرے ابو کی باتیں کیں۔ ہمارے گھر کو یاد کیا اور میرے لڑکپن کے وقت کی باتیں کرتی رہی۔ سائرہ نے اُسے کہا کہ وہ کھانے کا بندوبست کرے۔ وہ اُٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔



"مَیں تم سے زیادہ کچھ نہیں پوچھوں گا سائرہ!"—— مَیں نے کہا —— "مَیں تمہارے متعلق سب کچھ سُن کر آیا ہوں۔ تجمل اور مستور کا جو آدمی تمہارے پاس آتا ہے اُس نے مجھے تمہاری ساری باتیں بتائی ہیں۔ مَیں ان لوگوں سے بہت دُور چلا گیا ہوں۔ بھیس بدل کر ان سے ملنے آیا تھا۔ ان کے پاس آکر تمہاری جذباتی حالت معلوم ہوئی تو مَیں

اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر تمہارے پاس آگیا.... اپنے آپ کو سنبھالو سائرہ! مَیں تو جرم کر کے بھاگا بھاگا پھر رہا ہوں، تم اپنے آپ کو بے گناہ سزا نہ دو۔ مَیں تمہیں نہیں مل سکوں گا۔"

"تم مجھے نہیں مل سکو گے تو مَیں کسی اور کو نہیں مل سکوں گی"—— سائرہ نے پُرعزم لہجے میں کہا —— "مَیں جانتی ہوں تم مجھے کیا کہو گے۔ مَیں تمہیں پہلے ہی بتا دیتی ہوں کہ تمہاری پند و نصیحت نہیں سُنوں گی۔ تم آجاؤ گے سکندر! تم آجاؤ گے۔"

"اگر تم نے کبھی لاش کو زندہ ہوتے دیکھا ہے تو مَیں شاید تمہارے پاس آجاؤں گا"—— مَیں نے کہا —— "حقیقت کو دیکھو سائرہ!.... اگر میرے ساتھ شادی کر کے تم تین چار مہینوں بعد بیوہ ہو جانا چاہتی ہو تو مولوی کو بلوا لیتے ہیں۔ وہ نکاح پڑھا دے گا۔ مَیں نہیں رہوں گا۔"

"مَیں تمہیں چھپا کر رکھوں گی"—— سائرہ نے کہا —— "کسی کو پتہ نہیں چلنے دوں گی کہ تم یہاں ہو۔"

سائرہ کی اس دلیل سے اندازہ کریں کہ وہ حقیقی زندگی سے یا حقائق سے کتنی دُور چلی گئی تھی۔

"گلشن بی بی کو تم جانتے ہو نا!"—— سائرہ نے کہا —— "وہ بھی کہتی ہیں کہ اللہ کے دربار میں کوئی کمی نہیں۔ اللہ کو یاد کرتی رہو۔ تمہاری مرادیں پوری ہو جائیں گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اللہ کو صرف یہ نہ کہتی رہنا کہ مجھے سکندر چاہیئے بلکہ یہ کہنا کہ یا خداوند تعالیٰ، مجھے آپ کی خوشنودی چاہیئے۔ پھر وہ کہتی ہیں کہ اپنے آپ کو اور اپنے خیالوں کو پاک رکھنا، پھر تمہیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو جائے گی اور اللہ تبارک و تعالیٰ تمہاری ہر مراد پوری کریں گے۔"

میری کوشش یہ تو نہیں تھی کہ گلشن نے اسے جو بتایا تھا، میں اُس کے خلاف بات کرتا۔ گلشن نے اُسے بالکل صحیح بات کہی تھی۔ یہ بالکل واضح تھا کہ میں اُسے نہیں مل سکتا تھا لیکن گلشن نے اُسے جس

راستے پر ڈال دیا تھا وہ بہت خوبصورت اور پُرسکون راستہ تھا۔ اس میں سائرہ کے لئے ایک امید بھی اور روحانی سکون۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ سائرہ کو احساس اور خیال ہی نہیں رہا تھا کہ وہ جوان لڑکی ہے اور جوانی کے کچھ مطالبے بھی ہوتے ہیں۔ مَیں نے پہلے بتایا ہے کہ سائرہ کے خراب ہونے کا امکان زیادہ تھا۔ یہ امکان گلشن آرا نے ختم کر دیا تھا۔ سائرہ خود بھی غلط راستے پر چلنے والی لڑکی نہیں تھی۔ گلشن آرا نے اُس کی نیت کو بالکل ہی دھو ڈالا تھا۔

مَیں نے اُسے یہ یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ مَیں اسے صرف ایک صورت میں مل سکتا ہوں کہ سورج سوا نیزے پر آجاتے اور زمین پر ایسی نفسا نفسی پیدا ہو جاتے کہ کسی کو کسی کا خیال ہی نہ رہے، لیکن سائرہ کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی وہ بدستور قائم رہی۔ پھر یہ مسکراہٹ ایسی صورت اختیار کر گئی جیسے میرے استدلال کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ وہ میری ہر بات کو سُنی اَن سُنی کر رہی تھی۔ پھر اُس نے یہ انداز اختیار کر لیا کہ مَیں اُسے جو بات بھی کہتا، وہ اُنگلی آسمان کی طرف کر کے مُسکرا دیتی۔

مَیں ہار گیا۔ مَیں یہ تو جانتا تھا کہ یہ لڑکی ساری عمر کا کنوارپن قبول کر لے گی لیکن خراب نہیں ہو گی۔ مجھے خطرہ یہ نظر آرہا تھا کہ ذہنی طور پر وہ ابنارمل تو ہو ہی گئی تھی، اس سے اگلا مرحلہ پاگل پن کا تھا۔ اس نے اور دو چار سال بعد پاگل ہو جانا تھا، پھر یہ بتانا مشکل تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ مجھے جب اپنی شکست کا احساس ہُوا تو مجھے سائرہ کے والد کا خیال آیا۔ مَیں نے سائرہ سے پوچھا کہ اباجی کہاں ہیں۔ اس کے جواب میں سائرہ نے ہاتھوں اور سَر کا ایسا اشارہ کیا جیسے اُسے معلوم نہیں اور اُسے پروا بھی نہیں کہ وہ گھر ہیں یا کہیں گئے ہُوتے ہیں۔

اتنے میں سائرہ کی ماں کمرے میں آئی۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ سائرہ کے اباجان کہاں ہیں۔

"کیا بتاؤں بیٹا، وہ کہاں ہیں"— سائرہ کی ماں نے جواب دیا — "انہیں تو بیٹے کا غم لے ڈوبا ہے۔ اُوپر اس بیٹی کا دُکھ۔ وہ اللہ کا بندہ تو جیسے زمین پر ہے نہ آسمان پر۔ آج تیسرا دن ہے، وہ گھر سے نکلے ہیں۔ کسی نے ایک پہنچ والے بزرگ کا پتہ دیا تھا۔ اُن کے پاس گئے ہیں۔ گھر ہوتے ہیں تو بھی لیٹے ہوتے چھت کی طرف دیکھتے رہتے ہیں"— ماں اتنا ہی کہہ سکی پھر اس کے آنسو بہنے لگے۔

"سکندر!"— سائرہ نے کہا — "انہیں کہو کہ مجھے اس طرح پریشان نہ کریں۔ مَیں انہیں کہتی ہوں کہ اللہ کے سامنے کوئی بزرگ نہیں لیکن یہ خانقاہوں اور مزاروں پر ماتھے رگڑتے ہیں اور معلوم نہیں کہاں کہاں سے تعویذ لا کر اور پانی میں گھول گھول کر مجھے پلاتے رہتے ہیں"۔

"دیکھا، سکندر بیٹا!"— ماں نے کہا — "یہ پیروں فقیروں کو نہیں مانتی۔ مَیں تو یہ کہتی ہوں اور اس کے مُنہ پر کہتی ہوں کہ یہ پیروں کی بددُعا ہوتی ہے.... ہمارے اصل پیر کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کہاں چلے گئے ہیں۔ میرا ایوب بیٹا اُن کا مرید تھا۔ مَیں نے اپنے ایک رشتہ دار کو اُن کے گاؤں بھیجا تو وہ یہ خبر لایا کہ سائیں جی کہیں چلے گئے ہیں اور شاید واپس نہ آئیں.... تم نے بھی شاید اُن کا نام سُنا ہو گا۔ وہ سائیں کرامتاں والے کے نام سے مشہور ہیں"۔

پہلے تو مجھے خیال آیا کہ اس عورت کو "سائیں کرامتاں والے" کی اصلیت بتا دوں، لیکن میں اس بُڑھیا کو یہ دھچکا نہیں لگانا چاہتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ مانے گی ہی نہیں کہ سائیں کرامتاں والا ایک جرائم پیشہ آدمی تھا۔

رات ہو گئی تھی۔ ماں بیٹی نے مجھے کھانا کھلایا۔ خاصا پُرتکلف کھانا تھا۔ کھانا کھا کر میں رخصت ہونے لگا تو سائرہ نے یہ ضد شروع کر دی کہ مَیں رات وہیں گزاروں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے انکار کو وہ مان گئی اور مَیں وہاں سے چل پڑا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مَیں نے اپنے آپ کو اُس

گھر سے دھکیل کر باہر نکالا تھا۔ قدم آگے بڑھتے ہی نہیں تھے لیکن مجھے وہاں سے رخصت ہونا ہی تھا اور میں اپنے شہر سے نکل آیا۔



صبح کا دُھندلکا ابھی چھٹا نہیں تھا جب میں تجمل اور منور کے پاس پہنچ گیا۔ ناشتہ اُن کے ساتھ کیا اور سو گیا۔ میں نے ساری رات پیدل سفر کیا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے دوپہر کے کھانے کے وقت جگایا۔ مجھے وہاں زیادہ دیر نہیں رُکنا چاہیئے تھا۔ انگریزوں کی پولیس ایسی کم عقل تو نہیں تھی کہ اسے ابھی تک شک ہوتا کہ میں یہیں چھپا ہُوا ہوں گا، لیکن میں جب یہاں رہا تھا تو مجھے یقین سا ہوگیا تھا کہ یہاں پولیس کے مخبر موجود ہیں اور وہ جو کوئی بھی ہیں وہ اس جاگیر کے مزارعوں اور نوکروں میں سے ہیں۔ یہ معلوم کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ کون ہیں۔

دونوں بھائی مجھے ایک دو دنوں کے لئے روک رہے تھے۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ نہ ہی رُکوں تو بہتر ہے۔ وہاں سے میں بوجھل دل سے چل پڑا۔ میرے خیالوں میں صرف سائرہ تھی۔ وہ میری خاطر اپنی جوانی تباہ کر رہی تھی۔ وہ ایک درخشاں اُمید پر زندہ تھی۔ وہ ایک سراب کے پیچھے چلی جا رہی تھی۔ اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ دھندلی راہ پر چل رہی ہے اور یہ دُھند گہری ہوتی جائے گی، چھٹے گی نہیں۔

میں انہی سوچوں میں ڈوبا ہُوا چلتا گیا اور رات کو اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ سب گہری نیند سوئے ہُوئے تھے۔ میں اپنے کمرے میں گیا اور چارپائی پر گر پڑا۔ نیند اور تھکن کا غلبہ ایسا تھا کہ بھوک کا احساس ہی نہ رہا۔ صرف اتنا احساس تھا کہ رات گزر چکی ہے اور یہ اندھیرا سحری کا ہے۔

میں اگلے روز اُس وقت جاگا جب سورج بہت آگے نکل گیا تھا اور کچھ دیر بعد اسے ڈوب جانا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں میں جا بیٹھا۔ وہ بیتابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے انہیں اپنے سفر کی روداد سنائی۔

"تم پتھر ہو" — حمید اللہ خان نے سائرہ کے متعلق باتیں سُن کر مجھے کہا — "اُسے ساتھ لے آتے اور اپنے ساتھ رکھتے۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو گنوا کر اُس کی باتیں کرتے تمہیں شرم آنی چاہیئے"۔

کچھ دیر ہنسی مذاق بھی چلا پھر ہم سب کھانے پر بیٹھ گئے۔ رمیش بھی ہمارے ساتھ کھانا کھایا کرتا تھا۔ اُس نے یہ دیکھنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی تھی کہ یہ گوشت جو اسے کھلایا جا رہا ہے، گائے کا ہے یا بکرے کا۔ وہ اپنے مذہب سے دستبردار ہو چکا تھا۔ لیلا کے لئے کھانا کمرے میں جاتا تھا۔



اُسی رات کا ذکر ہے، میں ابھی لیٹا ہی تھا کہ لیلا آگئی۔ کمرے میں دیا جل رہا تھا۔

"تمہیں ایک بات بتانے آئی ہوں" — اُس نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا — "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ دیا میرے ساتھ بہت پیار کرتا ہے۔ مجھے اس کا پیار اچھا لگتا ہے کیونکہ اُس کے پیار میں مجھے باپ کی شفقت کی جھلک نظر آتی ہے۔ کل دوپہر کا واقعہ ہے کہ میں ٹہلتے ٹہلتے دیا کے کمرے کے سامنے سے گزری تو اُس نے مجھے دیکھ لیا اور کمرے میں بلا لیا۔ میں اُس کے پاس جا بیٹھی۔ پہلے تو وہ ہر روز کی طرح میرے سر پر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا، لیکن کل اُس نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں اُس کی نیت کو سمجھتی ہوں اس لئے میں نے بُرا نہ جانا"۔

جہاں تک دیے کا تعلق تھا، میں نے بھی اُس کی اس حرکت کو بُرا نہ سمجھا کہ اُس نے لیلا کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ دیا تو وہ آدمی تھا جس نے اپنے پورے گروہ کو کہہ رکھا تھا کہ کسی عورت کو اغوا نہیں کرنا نہ کسی عورت پر ہاتھ اُٹھانا ہے لیکن لیلا نے مجھے جو بات سنائی وہ انسانی فطرت کی بہت بڑی کمزوری کا قصہ ہے۔

"لیلا!" — دیبا نے کہا — "مَیں نے بہت سوچا ہے اور میں بھی یہ کہتا ہوں کہ تمہاری شادی جلدی ہو جانی چاہیئے، لیکن جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ تم حمید اللہ خان کی بیوی بن جاؤ گی تو میں محسوس کرتا ہوں کہ میں برداشت نہیں کر سکوں گا کہ تم کسی اور کی ملکیت میں چلی گئی ہو۔"

"کیوں اُستاد!" — لیلا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بچوں کی سی شوخی سے پوچھا — "کیا تم میری شادی پر خوش نہیں ہو گے؟"

"نہیں لیلا!" — دیبے نے کہا — "مجھے دکھ ہوگا۔"

دیبے نے لیلا کو اپنے اور قریب کر لیا اور اپنا ایک گال لیلا کے بالوں پر رکھ دیا۔ لیلا نے ذرا سی بھی مزاحمت نہ کی۔

"اگر تم خوش نہیں ہو تو میں شادی نہیں کروں گی" — لیلا نے کہا۔

"میں شادی سے نہیں روک رہا لیلا!" — دیبے نے کہا — "تمہاری شادی ضرور ہوگی لیکن .... لیکن .... لیلا! .... مَیں نے کہا تو تم ناراض ہو جاؤ گی۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے اُستاد؟" — لیلا نے کہا — "مَیں نے سُنا ہے کہ تم حکم دیا کرتے ہو اور کسی کی تم سُنتے ہی نہیں۔ کہو نا، کہنا کیا چاہتے ہو؟ میں ناراض نہیں ہوں گی۔"

"اگر میں تمہیں کہوں کہ تمہاری شادی میرے ساتھ ہوگی تو بھی تم ناراض نہیں ہو گی؟" — دیبے نے پوچھا۔

"ناراض ہو جاؤں گی تو تمہارا کیا بگاڑ لوں گی؟" — لیلا نے کہا — "حیران ضرور ہوں گی۔ یہاں تمہارا راج ہے۔ تمہارا حکم چلتا ہے۔ میں تمہارے قبضے میں ہوں۔ یہاں وہی ہوتا ہے جو تم چاہتے ہو۔"

"ہاں لیلا!" — دیبے نے کہا — "یہاں میرا حکم چلتا ہے لیکن میرا حکم جسموں پر چلتا ہے دلوں پر نہیں۔ مجھے تمہارا جسم نہیں دل چاہیئے۔ جسم تو میں خرید بھی سکتا ہوں۔ خریدے بھی ہیں لیکن مجھے داشتہ نہیں

بیوی چاہیئے۔ ایسی بیوی جس کے دل میں میری محبت ہو۔ اگر تم اپنے دل میں میری محبت پیدا کر سکو تو میری بیوی بن جاؤ۔ اگر تم دلی محبت نہ دے سکو تو میں تمہیں شادی کے لئے مجبور نہیں کروں گا۔"

لیلا نے اُسے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ اُسے دیبا سے یہ توقع نہیں تھی۔ مَیں بھی یہ سُن کر حیران ہُوا لیکن اس لئے نہیں کہ دیبا نے لیلا کے ساتھ شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا بلکہ حیرت اس پر تھی کہ وہ لیلا سے محبت کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مَیں یہ بھی جانتا تھا کہ ساتھ جو چھوٹا سا گاؤں تھا وہاں کی ایک جوان عورت تیسرے چوتھے روز، عموماً شام کے بعد دیبا کے پاس آیا کرتی تھی۔ اُس کی عمر تیس سال سے کچھ زیادہ تھی اور وہ خوبصورت عورت تھی۔ وہ دیبے کی داشتہ تھی۔

"اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو تو میں کہوں گی کہ تمہاری عمر میری عمر سے دُگنی ہے" — لیلا نے دیبا سے کہا — "اور مَیں یہ بھی کہوں گی کہ مَیں تمہارے پیار میں اپنے باپ کی جھلک دیکھتی رہی ہوں حالانکہ میرے باپ نے میرے ساتھ کبھی پیار نہیں کیا تھا۔"

"میں عورت کا نہیں عورت کے پیار کا پیاسا ہوں" — دیبا نے کہا — "مَیں نے شادی کی تھی لیکن بیوی جھگڑالو نکلی۔ وہ خوبصورت تھی لیکن مَیں نے اُس کے ماتھے پر ہمیشہ شکنیں دیکھیں، اُس کے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ نہ دیکھی۔ نہ کوئی بات مانتی تھی نہ یہ بتاتی تھی کہ اُس کے دل میں کیا ہے۔ مَیں نے اُس کی مار پٹائی شروع کر دی۔ اس سے اولاد بھی نہ ہوتی۔ مَیں نے چار سال غصّے اور لڑائی جھگڑوں میں گزارے اور ایک روز اُسے طلاق دے دی....

"پھر شادی کا نام نہیں لیا لیلا! مَیں اس عمر تک عورت کے بغیر نہیں رہا لیکن میں پیار کی نقد قیمت دیتا رہا ہوں۔ تمہیں مَیں نے پہلے بھی دیکھا تھا جب تم یہاں اغوا ہو کر آئی تھیں۔ اُس وقت تمہارے حُسن اور نوجوانی کا مجھ پر کچھ اثر نہیں ہُوا تھا لیکن تھانے میں جس دلیری سے

جھوٹ بول کر تم نے ہمیں گرفتاری سے بچایا ہے اس سے میں تمہارا غلام ہو گیا ہوں .... اور لیلا! مجھے اگر زیادہ نہیں تو ایک بچہ چاہیئے۔ میں تو پتھر تھا لیلا لیکن اب یوں لگتا ہے جیسے تھک گیا ہوں اور پیاس سے مرا جا رہا ہوں۔ عمر کو نہ دیکھو لیلا!"

لیلا پر کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر اُس نے اچانک اپنے بازو دیبا کے گلے میں ڈال دیئے۔ عین اُس وقت دیبا کی داشتہ آگئی۔ لیلا دیبا سے الگ ہو گئی۔ داشتہ کچھ کہے بغیر چلی گئی۔

"اس کی پروا نہ کرو لیلا!" — دیبے نے کہا — "یہ تو میری زرخرید نوکرانی ہے۔"

لیلا نے دیبا کو ہاں یا نہ میں جواب نہ دیا۔ صرف یہ کہہ کر وہاں سے اُٹھ آئی کہ میں آؤں گی۔

لیلا نے مجھے بتایا کہ شام کو رئیس دیبا کی محفل میں جا بیٹھا۔ لیلا کمرے میں اکیلی تھی۔ یہ عورت اُس کے کمرے میں آئی۔ لیلا نے کہنے کے باوجود وہ بیٹھی نہیں۔

"دیکھ لڑکی!" — اس نے کھڑے کھڑے لیلا سے کہا — "آج کے بعد میں تمہیں اس حالت میں دیبا کے ساتھ نہ دیکھوں۔"

"دیکھ لو گی تو کیا کرو گی؟" — لیلا نے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کروں گی" — عورت نے کہا — "تم یہاں نہیں ہو گی .... باز آجاؤ۔ میں دوسری بار تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔"

وہ چلی گئی۔ یہ رقابت تھی۔ یہ عورت دیبا کو اپنی ملکیت سمجھتی تھی۔

"تم نے دیبا کے متعلق کیا سوچا ہے؟" — میں نے پوچھا۔

"تمہارے بعد مجھے دیبا اچھا لگتا ہے" — لیلا نے جواب دیا — "اُس نے پیار کی جو قیمت مانگی ہے وہ دے دوں گی۔ میں اُس کے ساتھ شادی کر لوں گی .... تم کیا کہتے ہو؟"

"دیبا کے ساتھ شادی کر لو" — میں نے کہا۔

"مجھے اس عورت سے ڈر آنے لگا ہے" — لیلا نے کہا۔

"اس سے مت ڈرو" — میں نے کہا — "دیبا کو پتہ چلا کہ اس عورت نے تمہیں دھمکی دی ہے تو دیبا اس کی ہڈی پسلی ایک کر دے گا۔"

میں نے لیلا کے فیصلے کی تائید کر دی تو وہ مطمئن ہو گئی۔ دیبا کی داشتہ اس شادی کو نہیں روک سکتی تھی لیکن مجھے ایک اور خطرہ نظر آنے لگا تھا۔ یہ حمید اللہ خان کا خطرہ تھا۔ وہ بھی لیلا کا امیدوار تھا بلکہ اُسے یقین تھا کہ لیلا کی شادی اُسی کے ساتھ ہو گی۔ مجھے خیال آیا کہ اسے جب پتہ چلے گا کہ لیلا دیبے کی بیوی بنے گی تو حمید اللہ خان کا ردِ عمل شدید ہو گا۔ ڈر یہ تھا کہ حمید اللہ خان دیبے کے ساتھ جھگڑا نہ مول لے لے۔

لیلا چلی گئی تو میں حمید اللہ خان اور نور اللہ کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ لیلا مجھے جو باتیں سنا گئی تھی وہ میں نے انہیں سنائیں۔ نور اللہ تو ہنس پڑا لیکن حمید اللہ خان کی طبیعت میں گرمی آگئی۔ کہنے لگا کہ وہ دیبے سے بات کرے گا۔

"حمید اللہ بھائی!" — میں نے اُسے کہا — "تم نوابزادے نہیں مفرور سزا یافتہ مجرم ہو۔ یہاں کا نواب دیبا ہے۔ یہ اس کی مہربانی ہے کہ تمہاری دوستی کا حق ادا کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کے رحم و کرم پر ہیں۔ یہ ہم تینوں کو گرفتار کرا کے پولیس کی ہمدردی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر دیبا اس لڑکی کو داشتہ بنا کر رکھنا چاہتا تو تم بھی لڑکی کے ساتھ درپردہ دوستی کر سکتے تھے لیکن یہاں مسئلہ جذبات کا ہے۔ دیبا جذبات کی قربانی نہیں دے گا۔"

"جانے دے نوابزادے!" — نور اللہ نے اُسے کہا — "کچھ دن شرافت سے گزار لے۔"

"میں اپنا ٹھکانہ بنا رہا ہوں" — میں نے کہا — "وہاں جو جی میں آئے کرنا۔"

"نورا!" — حمیداللہ خان نے نوراللہ سے کہا — "کہیں اور چلتے ہیں اور پیری مریدی کا کاروبار کرتے ہیں" — اُس نے ذرا سوچ کر مجھے کہا — "سکندر! اگر ہمارا یہ کاروبار پہلے کی طرح جم گیا تو ہم تمہارا ساتھ بھی دے سکیں گے۔ اپنے گروہ کے دو چار آدمیوں کو اپنے پاس چھپا لیں گے۔ پیری کا اڈہ جم گیا تو اس میں ہاتھی بھی چھپ جاتے ہیں۔"

یہ تو بعد کی باتیں تھیں کہ ہم اپنا کوئی الگ ٹھکانہ بنائیں گے یا دیبا کے ساتھ ہی رہیں گے۔ میرا اپنا فیصلہ یہ تھا کہ دیبا کے ساتھ رہیں گے۔ دہشت گردی کے پروگرام میں وہ میرا ہم خیال ہے۔ یہ میں پہلے سُنا چکا ہوں۔ فوری طور پر یہ مسئلہ درپیش تھا کہ حمیداللہ خان کے دل سے رقابت نکالی جائے تاکہ اس میں اور دیبے میں دشمنی پیدا نہ ہو۔ دیبا اتنا گھٹیا آدمی نہیں تھا کہ دشمنی میں حمیداللہ خان کو گرفتار کروا دیتا۔ وہ اسے ہمیشہ کے لئے غائب کرا سکتا تھا۔

بہرحال حمیداللہ خان سمجھ گیا اور اُس نے لیلا کے ساتھ شادی کرنے کا خیال دل سے نکال دیا۔

اگلی صبح دیبا میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ وہ تین چار دنوں کے لئے باہر جا رہا ہے اور وہ دہشت گرد گروہ کے لیڈروں سے مل کر آئے گا۔



دیبا تیسرے دن واپس آگیا۔ اُس نے مجھے کہا کہ مَیں فوراً روانہ ہو جاؤں۔

"یاد رکھنا سکندر!" — دیبے نے کہا — "وہاں تمہارا نام موہن داس ہے۔ اس گروہ کو میں نے یہی بتا رکھا ہے کہ تم کٹر ہندو ہو۔ ذات کے تم برہمن ہو اور سیاسی طور پر تم مہاسبھائی ہو .... یہ نہ بھولنا!"

مَیں نے دیبا کی زبان سے پہلی بار سیاسی اور مہاسبھائی کے نام سُنے۔ مجھے اطمینان ہُوا کہ وہ صرف ڈاکوؤں کا سردار ہی نہیں بلکہ سیاسی

پارٹیوں سے بھی واقف ہے۔ اُس نے مجھے بلاوجہ ہندو مہاسبھائی ظاہر نہیں کیا تھا۔ یہ پارٹی مسلمانوں کو ہندو بنانے میں پیش پیش تھی بلکہ ہندوؤں کی اس پارٹی کا مقصد ہی یہی تھا کہ مسلمانوں کو پیار اور محبت سے، کوئی لالچ دے کر دہشت گردی سے بھی ہندو بنایا جاتے اور ہندوستان سے اسلام کا خاتمہ کیا جاتے۔ ظاہری طور پر اس پارٹی کے لیڈر ہندو مُسلم اتحاد کی باتیں کرتے تھے اور درپردہ اسلام کی جڑیں کاٹتے تھے۔ مجھے مہاسبھائی ظاہر کر کے دیبے نے اس دہشت گرد گروہ میں میری اہمیت بڑھا دی تھی۔

"یہ بڑا مضبوط ٹولہ ہے سکندر!" — دیبے نے اس دہشت گرد گروہ کے متعلق کہا — "اُنہوں نے ڈائنامیٹ کا انتظام کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ڈائنامیٹ صرف فوج کے پاس ہوتا ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ فوج سے یہ حاصل کیا جا سکے۔ معلوم نہیں یہ ڈائنامیٹ کہاں سے لے آئیں ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے" — مَیں نے کہا — "کوئلے کی کانوں میں ڈائنامیٹ استعمال ہوتا ہے۔ کان کو آگے چلانے کے لئے اور نئی کان کی کھدائی کے لئے ڈائنامیٹ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ پہاڑ کا خاصا حصّہ اُڑا دیتا ہے۔ یہ لوگ وہاں سے ڈائنامیٹ لاتے ہوں گے۔ ہندوستان میں کوئلے کی کانیں موجود ہیں۔"

"چلو، جہاں سے بھی لاتے ہیں" — دیبے نے کہا — "تم اُن کے پاس چلے جاؤ۔ ایک دو کام ہیں جو اُنہوں نے تمہارے ذمّے رکھے ہیں۔"

دیبا جب میرے ساتھ دہشت گردی کی باتیں کرتا تھا تو وہ مجھے بالکل ہی بدلا ہُوا انسان لگتا تھا۔ وہ دو شخصیتوں کا مالک تھا۔ دونوں شخصیتیں مضبوط تھیں۔ میرا خیال ہے کہ اُس کی شخصیتوں میں کبھی کشمکش نہیں ہوتی تھی۔

"ایک آسامی اور دیکھی ہے" — دیبے نے کہا — "تم واپس

آ گئے تو وہاں بھی واردات کرا دیں گے۔ پتہ چلا ہے کہ مال بہت ہے۔"

دیبا دہشت گردی کے لئے جو دراصل جنگِ آزادی تھی، مال اکٹھا کر رہا تھا۔ ساہوکار کے گھر سے ہم جو مال لاتے تھے وہ جُوں کا تُوں پڑا تھا۔ یہ بھی ہم نے اپنے مشن میں خرچ کرنا تھا۔



میں اگلی صبح کے دھندلکے میں اُس قصبے کو روانہ ہو گیا جہاں دہشت گرد گروہ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ میں اُسی بہروپ میں تھا جس میں پہلے گیا تھا۔ یہ ایک غریب کسان کا بہروپ تھا اور آنکھ پر سبز کپڑے کی ٹاکی دھاگے سے باندھی ہوتی تھی۔

میں مسرور تھا کہ اپنے مشن پر جا رہا تھا میرے ذہن میں انگریزوں کی ایک ملٹری سپیشل ٹرین کے ڈبے پٹڑی سے لڑھک رہے تھے، ہوا میں اُڑ رہے تھے اور گورے فوجی مر رہے تھے۔ میں نے ایسی تباہ کاری کی سکیمیں سوچنی شروع کر دیں۔ یہ خیال بھی آیا کہ یہ گروہ ہندوؤں کا ہے، اس میں مسلمانوں کو کس طرح داخل کیا جاتے گا۔ حمیداللہ خان کا خیال آیا تو مجھے افسوس ہوا۔ اُس نے اِس مشن میں دلچسپی ختم کر دی تھی۔ وہ ایک بار پھر پیری مریدی کی باتیں کرنے لگا تھا۔ اُس نے اِس نوسر بازی میں خوب عیش کی تھی۔ اس سے اُس کا دماغ راستے سے ہٹ گیا تھا۔

دیبا ارادے کا پکا تھا۔ مجھے اُس پر بھروسہ تھا۔ اُس نے جو کہا تھا وہ اُس نے کر کے بھی دکھا دینا تھا۔ میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے لئے مسلمانوں کو زمین دوز جنگِ آزادی کے لئے اکٹھا کرنا تھا۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ یہ الیکشن نہیں تھے کہ جگہ جگہ مجمع لگا کر تقریریں کرتے اور جلوس نکالتے اور لوگوں کو پولنگ سٹیشنوں پر لے جاتے۔ وہ انگریزوں کی حکومت تھی اور ہم نے اس حکومت کے خلاف بغاوت کرنی تھی۔ بغاوت کے لئے کسی کو اُکسانا اور

ترغیب دینا بھی اتنا سنگین جُرم تھا جس کی سزا عمر قید تک دی جا سکتی تھی۔ عملاً بغاوت کرنے کی سزا پھانسی تھی۔

پھانسی تو مجھے چڑھنا ہی تھا۔ مجھے پھانسی نہیں ڈرا سکتی تھی۔ میں نئی نئی سکیمیں سوچتا جا رہا تھا۔ میں نے دیبے کو ذہن میں رکھا ہُوا تھا۔ اچانک لیلا اور حمیداللہ خان کا خیال آ گیا۔ میرا دل ایک خوف کی گرفت میں آ گیا۔ دل کا ڈوبنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ حمیداللہ خان لیلا کے معاملے میں ضرور کوئی حماقت کر بیٹھے گا اور دیبا اُسے نہیں بخشے گا پھر نہ جانے کیا ہو جاتے۔

خیال آیا کہ لیلا مجھے چاہتی ہے۔ اس خیال نے مجھے سائرہ یاد دلا دی اور اس کے ساتھ ہی مجھ پر رنج والم کی گھٹا چھا گئی۔ میں اُس کی جو ذہنی حالت دیکھ آیا تھا وہ مجھے پریشان کرنے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اُس کے گھر جب اُسے کہا تھا کہ مجھے ذہن اور دل سے اتار دے کیونکہ میں پھانسی کے تختے پر کھڑا ہوں تو اُس نے کہا تھا کہ بیوی تمہاری ہی بنوں گی اور جس روز تمہیں پھانسی دیں گے اُس روز میں بھی چھت کے ساتھ رسہ باندھ کر لٹک جاؤں گی۔

"سکندر!" — میں جب اُس کے گھر سے رخصت ہونے لگا تو اُس نے مجھے کہا تھا — "جب تمہیں پھانسی دینے لگیں تو وصیت کرنا کہ تمہاری لاش میرے گھر پہنچا دیں، پھر میرے گھر والے میری لاش بھی تمہارے ساتھ دفن کر دیں گے۔"

سائرہ کی یہ باتیں میرے ذہن میں گونجنے لگیں۔ میں نے دھیان دوسری طرف کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن سائرہ کی آوازیں بلند ہوتی گئیں اور مجھ پر یاسیت طاری ہونے لگی۔ میں ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں۔ میری یہ داستان پڑھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ میں سائرہ کی یاد سے اس لئے اداس ہو جاتا تھا کہ میں اُسے حاصل نہیں کر سکتا تھا بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ سائرہ کا یہ حال اور اُس کا انجام مجھے پریشان کر دیتا تھا۔

اگر میری دلچسپی سائرہ کے جسم کے ساتھ ہوتی تو مَیں بڑی آسانی سے اُسے اپنے ساتھ رکھتا۔ شادی بھی کر لیتا اور اپنے دل سے یہ کہتا کہ زندگی کے جو چند دن باقی ہیں عیش موج کر لو۔ گرفتار ہو گئے تو سائرہ جانے اور اس کا کام جانے۔



پہلے بھی مَیں اسی لئے راستے پر گیا تھا اور اسی پر واپس آیا تھا، لیکن اب میری کیفیت ایسی تھی جیسے لاشعوری طور پر چلا جا رہا ہوں۔ مَیں نے کئی بار سَر کو زور زور سے جھٹکے دیے اور زندہ و بیدار ہو کر چلنا چاہا۔ تباہ کاری کی جو سکیمیں مَیں نے سوچی تھیں وہ پھر سے ذہن میں لانے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ میرا ذہن دو حصّوں میں بٹ گیا۔ بیک وقت دو قسم کے خیالات آنے لگے۔ ایک وہ جو میرے پاؤں کی بیڑیاں بن رہے تھے اور دوسرے وہ جو مجھے آگے کو دھکیل رہے تھے۔

یہ کیفیت سمٹ سمٹا کر اس وہم پر آگئی کہ کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ ہونے والا ہے جو کبھی بھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ مَیں نے پہلے ہی ذکر کیا ہے کہ پچھلے مشن کی ناکامی مجھے ایک بُرا شگون محسوس ہونے لگی تھی۔ اب پھر وہی وہم میرے ذہن پر قابض ہو گیا۔ یہ ذہنی کیفیت اچھی نہیں تھی۔ میرا ذہن صاف ہونا چاہئے تھا کیونکہ میں بہت بڑے بلکہ ایک مقدّس مشن پر جا رہا تھا۔

اسی ذہنی کیفیت میں ایک جگہ بیٹھ کر مَیں نے وہ روٹی کھا لی جو مَیں اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ آگے جا کر اُسی گاؤں سے پانی پیا جہاں کا ایک آدمی چوہدری نُور اپنی بیوی کے ساتھ مجھے ملا تھا اور اُس نے اپنی گٹھڑی میرے سَر پر رکھ دی تھی کہ اگلے گاؤں تک لے چلو۔

مَیں اُس جگہ تک پہنچ گیا جہاں سے یکّے پر قصبے تک پہنچنا تھا۔ یکّہ مل گیا۔ جب سواریاں پوری ہوئیں تو چل پڑا اور اس [illegible] نے مجھے منزل پر پہنچا دیا۔ مَیں قصبے کے اندر جا کر آٹا پیسنے والی مشین کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ چند

ہی منٹ گزرے تھے کہ اس گروہ کا لیڈر جوگندر پال میرے پاس آن کھڑا ہُوا۔ ہم نے ہاتھ ملانے سے گریز کیا کیونکہ وہ سیٹھ تھا اور میں اُس کا نوکر لگتا تھا۔ وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا اور مَیں اُس کے پیچھے پیچھے گیا۔ پچھلی دفعہ میں اسی کے گھر ٹھہرا تھا۔

اُس کے گھر میں داخل ہُوا تو ہم بغلگیر ہو کر ملے۔ اُس نے مجھے ایک اور کمرے میں بٹھایا اور میرے لئے کھانے کا انتظام کرنے چلا گیا۔

"کیا تم مجھے وہ ڈائنامیٹ دکھا سکتے ہو؟" — مَیں نے کھانا کھاتے ہُوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں!" — جوگندر نے جواب دیا — "دو ڈائنامیٹ مَیں نے گھر میں چھپا کر رکھے ہُوئے ہیں۔ مَیں لاتا ہوں۔"

وہ جُوتوں کا ایک ڈبہ اُٹھا لایا اور کھول کر مجھے دکھا دیا۔ اس میں ڈائنامیٹ کے دو سلیب پڑے ہُوئے تھے۔ یہ گوندھی ہوتی سخت مٹی جیسے تھے۔ اگر یہ گلی میں پھینک دیئے جاتے تو کوئی بھی ان کی طرف دھیان نہ دیتا۔ بچے اسے گوندھی ہوئی چکنی مٹی سمجھتے۔ اسے پھاڑنے کے لئے ڈائنمو ایکسپوڈر استعمال ہوتا تھا جو ایک بیٹری سے چلتا تھا۔ دوسرا طریقہ بتی کا تھا۔ بتی کا ایک سرا ڈائنامیٹ میں ڈالا جاتا اور دوسرا ذرا دُور تک لے جا کر آگ لگائی جاتی اور جب آگ ڈائنامیٹ تک پہنچتی تو یہ اتنے زوردار دھماکے سے پھٹتا تھا کہ ارد گرد خوفناک تباہی بپا کر دیتا تھا۔ آج بھی ڈائنامیٹ استعمال ہوتا ہے اور استعمال کے طریقے یہی ہیں۔

جوگندر نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ اسے پھاڑنے کے لئے بتی استعمال کی جائے گی۔ ڈائنمو ایکسپوڈر حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ لوگ [illegible] خاصی لمبی بتی ساتھ لے آتے تھے۔ میں نے جوگندر سے کہا کہ وہیں [illegible] آتے جہاں سے لایا ہے۔

"آج رات یہاں اپنے کچھ آدمی اکٹھے ہوں گے" — جوگندر پال

نے کہا --- "صرف تمہارا انتظار تھا۔ پچھلی بار تم آتے تو جس کسی نے بھی تمہیں دیکھا اور تمہاری باتیں سُنیں وہ ابھی تک تمہاری تعریفیں کر رہا ہے۔ سب تم سے متاثر ہیں۔"



اسی مکان کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں رات کھانے کے بعد گیارہ آدمی اکٹھے ہوگئے۔ دو ادھیڑ عمر ہندو تھے۔ باقی سب نوجوان اور جوان تھے اور یہ سب ہندو تھے۔ سب نے مجھے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا پھر اس طرح ہاتھ ملایا جیسے میں ہی ان کا لیڈر ہوں۔ ایک ادھیڑ عمر ہندو نے بات شروع کی۔

"یہ خیال رکھنا کہ کوئی آدمی اونچا نہ بولے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "دروازے اور کھڑکیوں سے آواز باہر نہ جاتے"۔۔۔ اُس نے پچھلے مشن کی ناکامی کا ذکر کیا اور اس کی وجہ ناتجربہ کاری بتاتی اور یہ بھی کہ بارُود تیار کرنے والوں پر اعتماد کیا گیا۔ اس کے بعد اُس نے کہا۔۔۔ "اب ہمارا انتظام پکا ہے۔ تم سب جانتے ہو کہ ڈائنامیٹ آگیا ہے۔ یہ ریلوے لائن پر اُسی جگہ رکھا جاتے گا جہاں پہلے ہم نے بم رکھا تھا۔ وہی جگہ موزوں ہے"۔۔۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور بولا ۔۔۔ "بھائی موہن داس! صرف تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارا شکار کیا ہے۔ باقی سب جانتے ہیں۔ چھاؤنی سے ایک پٹھان رجمنٹ ملٹری سپیشل ٹرین پر کسی دوسری چھاؤنی کو جارہی ہے۔ اس کی نفری کم و بیش چھ سَو ہے۔ تقریباً بارہ افسر انگریز ہیں۔ یہ گاڑی اس موڑ سے آگے نہ جاتے۔"

"کیا آپ لوگ ہندوستانی رجمنٹ کو تباہ کریں گے؟"۔۔۔ مَیں نے پوچھا اور کہا ۔۔۔ "بارہ انگریز افسروں اور ان کی ریل گاڑی کو تباہ کرنے کے لئے کیا آپ چھ سو ہندوستانیوں کو بھی ہلاک کر دیں گے؟"

"موہن داس!"۔۔۔ تقریر کرنے والے نے کہا ۔۔۔ "مجھے تو بتایا گیا تھا کہ تم مہا سبھائی ہو۔ مَیں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ مَیں

لئے کہا ہے کہ یہ پٹھان رجمنٹ ہے اور یہ سب مسلمان ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ انگریزوں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی ہمارا ٹارگیٹ ہیں؛ مجھے چھ سَو گوروں کو تباہ کرنے کی اتنی خوشی نہیں ہوگی جتنی چھ سَو مسلمانوں کو تباہ کر کے ہوگی۔"

مجھے شدید دھچکا لگا، لیکن میں نے اپنے ردّعمل کا اظہار نہ کیا۔

"مَیں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے متعلق آپ لوگوں کا رویّہ کیا ہوگا"۔۔۔ مَیں نے کہا ۔۔۔ "آپ کی بات سُن کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔ مَیں یہ سمجھتا رہا ہوں کہ ہم مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلیں گے۔"

"مسلمانوں کو ساتھ لے کر ہم قبرستان چلیں گے"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "اور اُنہیں وہاں دفن کریں گے۔"

"انگریزوں سے پہلے تو ہم مسلمانوں کو ختم کریں تو زیادہ بہتر ہوگا" ۔۔۔ ایک اور ادھیڑ عمر ہندو بولا ۔۔۔ "ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ گئو ماتا کا ہتیاچار کرنے والوں کو ہم صرف اس صورت میں اس ملک میں رہنے کا حق دیں گے کہ وہ ہندو ہو جائیں اور گنگا اشنان کر کے ہماری طرح پوتر (پاک) ہو جائیں۔"

"مَیں تو اس صورت میں بھی انہیں قبول نہیں کروں گا"۔۔۔ تقریر کرنے والے نے کہا ۔۔۔ "کیوں موہن داس! اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ ہمارا مقصد کیا ہے۔ مسلمان ہندوستان کو اپنا ملک بنانا چاہتے ہیں اور ہم آہستہ آہستہ مسلمانوں کی نسل کو ہی ختم کر دیں گے۔"

اس کے بعد مسلمانوں اور اسلام کے خلاف جوان لوگوں نے زہر اُگلنا شروع کیا تو میرا خون کھول اُٹھا۔ مجھے یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا، لیکن میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اسلام کے خلاف جو اشتعال انگیز باتیں کیں انہیں احاطۂ تحریر میں لانے کو بھی میں کفر سمجھتا ہوں۔ انہوں نے جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اُڑانا شروع کیا تو میرا ہاتھ اپنے نیفے پر

چلا گیا جہاں مَیں نے خنجر اُڑسا ہُوا تھا۔ میرا ریوالور جوگندر پال نے اندر ایک ٹرنک میں رکھ دیا تھا۔

"نہیں سکندر!" —— میری عقل نے میرا ہاتھ روک کر کہا —— "مارے جاؤ گے۔ ابھی ٹھنڈے ہو جاؤ۔ سکون سے بیٹھ کر سوچنا۔"

یہ اجلاس بہت دیر جاری رہا۔ مَیں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا، لیکن میرے ذہن میں بار بار یہ تصوّر آتا تھا کہ چھ سو پٹھان لہولہان ہو کر تڑپ رہے ہیں اور میری نظروں کے سامنے مر رہے ہیں۔ کبھی میرا دھیان تمام تر ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف چلا جاتا۔ پھر مَیں اس سوچ میں گم ہو جاتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اجلاس کی کارروائی میں بھی شریک رہا۔ کئی بار مجھ سے مشورے لئے گئے اور مَیں نے اس طرح مشورے دیئے جیسے میں بالکل نارمل ہوں۔ وہ سب مجھے تجربہ کار تخریب کار سمجھتے تھے، لیکن ذہنی طور پر مَیں اُن سے کٹتا جا رہا تھا۔

اجلاس ختم ہو گیا۔ سب رخصت ہو گئے اور جوگندر پال لے مجھے میرا کمرہ دکھا دیا۔ مَیں نے بڑا لمبا سفر پیدل طے کیا تھا۔ جسم ٹوٹا ہُوا تھا، لیکن سونے کے لئے لیٹا تو مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں آج رات سو نہیں سکوں گا۔ ذہن میں بلکہ کمرے میں ان اسلام دشمن کفّار کی آوازیں گونج رہی تھیں اور مجھے اشتعال دلا رہی تھیں۔ مَیں نے یہ فیصلہ کیا کہ کوئی بہانہ مل جائے تو میں اس مشن میں ان کے ساتھ نہ جاؤں۔ مَیں اپنے سامنے چھ سو مسلمانوں کا خون برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ساری رات سوچتے اور تڑپتے گزر گئی۔



صبح جوگندر پال میرے کمرے میں آیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے حلوہ پوری کا ناشتہ بھی آ گیا۔ رات کو اجلاس میں بتایا گیا تھا کہ آج دوپہر تک پکی خبر ملے گی کہ گاڑی چھاؤنی سے کس دن اور کس وقت روانہ ہو گی۔

مَیں چونکہ ساری رات سو نہیں سکا تھا اس لئے جوگندر پال سے کہا کہ مَیں اتنا زیادہ تھکا ہُوا ہوں کہ دن کو بھی آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ مَیں کمرے میں ہی رہوں تو ٹھیک ہے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور مَیں ناشتے کے بعد سو گیا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت جوگندر پال نے مجھے جگایا اور بتایا کہ پٹھان رجمنٹ چار روز بعد روانہ ہو گی۔

"کیا یہ پکّی خبر ہے؟" —— مَیں نے پوچھا۔

"سولہ آنے پکّی!" —— جوگندر پال نے جواب دیا —— "ہمارے آدمیوں نے وہاں جا کر یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ پٹھان رجمنٹ سامان باندھ رہی ہے اور جس رجمنٹ نے اس کی جگہ چھاؤنی میں آنا ہے اُس کی ایڈوانس پارٹی پہنچ گئی ہے۔"

مَیں نے کھانا کھا لیا۔ جوگندر پال پھر اپنی مشین پر چلا گیا اور میں بڑی ہی تلخ سوچوں میں گم ہو گیا۔ شام کو طبیعت اس قدر زیادہ بگڑ گئی کہ میں باہر نکل گیا۔ جوگندر پال نے مجھے کھلا پاجامہ اور ایک لمبا کُرتہ دے دیا تھا اور سر پر رکھنے کے لئے وہ ٹوپی تھی جو ہندو پہنا کرتے تھے۔ مَیں قصبے کی گلیوں میں ہی گھوم پھر کر واپس آ گیا۔

میں پلنگ پر لیٹا تو یُوں لگا جیسے پلنگ کو آگ لگی ہوئی ہو۔ آدھی رات سے بہت بعد تک میری حالت یہ رہی کہ میں لیٹتا تھا، اُٹھتا تھا، کمرے میں ٹہلتا تھا پھر لیٹ جاتا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اس طرح آدھی رات کے بعد میں سو گیا۔

صبح اُٹھا تو اللہ نے پہلا خیال میرے دل میں یہ ڈالا کہ یہاں سے کھسک جاؤں۔ کھسک جانے کا بہانہ بھی دماغ میں آ گیا۔ مَیں نہا دھو کر فارغ ہُوا تو جوگندر پال ناشتہ لے آیا۔

"جوگندر بھائی!" —— مَیں نے کہا —— "ابھی تین دن باقی ہیں۔ مَیں یہاں پڑا کیا کروں گا۔ جس چھاؤنی سے گاڑی آ رہی ہے وہاں میرے

قریبی رشتہ داروں کا گھر ہے۔ وہ ہمیشہ گلہ کرتے ہیں کہ مَیں اُن کے ہاں کبھی نہیں آیا۔ اگر مَیں ابھی لاری یا گاڑی پر نکل جاؤں تو شام کو واپس بھی آسکتا ہوں۔ اگر اُنہوں نے روک لیا تو کل صبح آجاؤں گا۔"

"ہاں بھائی!" — جوگندر پال نے کہا — "جاؤ۔ شام کو آ سکتے ہو تو آجانا نہیں تو کل سہی۔ ریوالور لے جاؤ گے؟"

"نہ بھائی!" — میں نے بڑی دُور کی سوچ کر جواب دیا — "شہر کا معاملہ ہے۔ کہیں پکڑا ہی نہ جاؤں۔ تم جانتے ہو بغیر لائسنس اسلحہ اپنے پاس رکھنے کی کیا سزا ہے۔"

ناشتے کے بعد میں وہاں سے نکلا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ واپس دیبا کے پاس جاؤں گا اور اُسے بتاؤں گا کہ مَیں ان لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ میرا خیال تھا کہ دیبا کو معلوم نہیں تھا کہ اس گروہ کے خیالات اور ارادے کیا ہیں۔ مَیں نے جوگندر پال سے کہا تھا کہ مسلمانوں کے متعلق ہمارے ارادے بڑے خطرناک ہیں، لیکن دیبا مسلمان ہے۔ جوگندر پال نے کہا تھا کہ دیبا کا کوئی مذہب نہیں۔

میں ریلوے سٹیشن تک چلا گیا کیونکہ دیہاتی علاقے کو جانے والے یکّے وہیں سے ملتے تھے۔ ایک یکّے میں دو سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ مَیں بھی بیٹھ گیا اور سواریاں پوری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک پسنجر ٹرین آکر رُکی۔ ایک ڈبے میں صرف فوجی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس زمانے میں ہندوستانی فوجیوں کی پگڑیاں ہوتی تھیں۔ سکھوں کی پگڑیاں تو الگ ہی ہوتی تھیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی پگڑیوں میں بھی فرق ہوتا تھا۔ مسلمانوں کی پگڑیوں کا اکڑا ہُوا شملہ ہوتا تھا۔ یہ فوجی جو ڈبے میں بیٹھے تھے سب مسلمان تھے۔ مَیں یکّے میں بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ ایک سے ایک خوبصورت جوان تھا۔

میری نظریں ان پر جم گئیں اور میرے ذہن میں بڑی زور کا دھماکہ ہُوا اور یہ ڈبہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ مجھے ان خوبصورت مسلمان

فوجیوں کی لاشیں بکھری ہوئی نظر آرہی تھیں۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا پھر اُجالا ہوگیا۔ یہ خدائی اشارہ تھا یا نہ جانے کیا تھا کہ مَیں یکّے سے کُود آیا۔ دوڑتا ہُوا ٹکٹوں والی کھڑکی کے سامنے گیا اور اُس چھاؤنی کا ٹکٹ لیا جہاں سے پٹھان رجمنٹ نے آنا تھا۔ میں نے ٹکٹ لیا ہی تھا کہ انجن نے وسل دی۔ میں دوڑتا ہُوا پلیٹ فارم پر گیا اور چلتی ہوئی ریل گاڑی پر سوار ہوگیا۔

یہ گاڑی چھاؤنی کی طرف جارہی تھی۔ مَیں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنی جان کی بازی لگادی تھی۔ میں پولیس کی سپیشل برانچ کا آدمی تھا۔ ٹریننگ اور تجربہ میری مدد کر رہا تھا۔ مَیں نے فیصلہ یہ کیا تھا یا آپ یوں سمجھ لیں کہ خداوند تعالیٰ نے میرے دماغ میں یہ فیصلہ ڈالا تھا کہ چھاؤنی جا کر پٹھان رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر سے ملوں گا اور اُسے بتا دوں گا کہ فلاں مقام پر گاڑی تباہ کی جانے گی۔ چھ سو پٹھانوں کو بچانے کے لئے مجھے اپنی جان دینی تھی۔ میں نے یہ بتانا تھا کہ مَیں کون ہوں اور ان لوگوں تک کس طرح پہنچا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہی تھا کہ مَیں نے گرفتار ہونا تھا اور پولیس کو مفرور قاتل مل جانا تھا۔

میں نے یہ فیصلہ کیا تو یوں محسوس ہُوا جیسے میں بڑے لمبے عرصے سے بڑے تیز بخار میں جل رہا تھا اور اب بخار اُتر گیا ہے۔ ایسا جسمانی اور روحانی سکون مَیں نے کم ہی کبھی محسوس کیا تھا۔

وہاں سے چھاؤنی تقریباً تیس میل دُور تھی۔ یہ پسنجر ٹرین تھی جس نے ہر سٹیشن پر رُکنا تھا۔ دو گھنٹے بعد گاڑی نے مجھے چھاؤنی کے سٹیشن پر پہنچا دیا۔ میں جب گاڑی سے اُترا تو خیال آیا کہ پٹھان رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر سے ملنے کی بجائے کیوں نہ بریگیڈ کوارٹر میں جاؤں اور بریگیڈ کمانڈر سے ملوں۔ مَیں راستہ پوچھتا بریگیڈ ہیڈکوارٹر جا پہنچا۔



سنتری نے مجھے باہر ہی روک لیا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں بریگیڈ کمانڈر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ سمجھا کہ مَیں کچھ عرض کرنے آیا ہوں اور کچھ میرا حُلیہ بھی ایسا ہی تھا کہ انگریز بریگیڈ کمانڈر کے ساتھ میرا کوئی تعلق بنتا ہی نہیں تھا۔ مَیں نے سنتری سے کہا کہ میں اپنے کسی ذاتی کام سے نہیں آیا۔ میرا کام سرکاری ہے۔ مَیں صرف بریگیڈ کمانڈر کے ساتھ بات کروں گا۔ یہ سُن کر سنتری مجھے ایک دفتر میں لے گیا اور ایک ہندوستانی صوبیدار کے حوالے کر دیا۔ میں اُسے بھی نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں کیوں آیا ہوں۔ وہ مجھے ایک اور دفتر میں لے گیا جس کے باہر لکھا تھا — سٹاف کیپٹن — پہلے وہ خود اندر گیا پھر باہر آ کر اُس نے مجھے اندر بھیجا۔ میرے سامنے ایک جواں سال انگریز کیپٹن بیٹھا تھا۔

"کیا مانگتا؟" — اُس نے مجھ سے پوچھا۔

مَیں نے انگریزی زبان میں بات کی اور اُسے کہا کہ وہ مجھے فوراً بریگیڈ کمانڈر کے پاس لے چلے۔ میں نے نیفے میں خنجر اُڑسا ہُوا تھا۔ وہ نکال کر سٹاف کیپٹن کی میز پر رکھ دیا اور اسے انگریزی میں کہا کہ میں انتہائی اہم خبر لایا ہوں جو صرف بریگیڈ کمانڈر کو بتانی ہے۔

یہ انگریز کیپٹن مجھے ایک اور دفتر میں لے گیا جس کے باہر لکھا تھا — بریگیڈ میجر — وہ ادھیڑ عمر انگریز تھا۔ اُس کے ساتھ کچھ باتیں ہوئیں تو وہ بریگیڈ کمانڈر کے پاس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد مجھے بریگیڈ کمانڈر کے دفتر میں داخل کر دیا گیا۔

بریگیڈ کمانڈر کم بیش پینتالیس سال کی عمر کا تھا۔ اُس نے گھُور کر مجھے دیکھا۔ مَیں نے اُس کے ساتھ بھی انگریزی میں بات کی۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ اتنے میں میرا خنجر بھی اس کے دفتر میں آ گیا۔ میں نے بریگیڈ کمانڈر کو پوری تفصیل سے بتایا کہ جو پٹھان رجمنٹ یہاں سے جا رہی ہے۔ اس کے راستے میں فلاں جگہ ریلوے لائن پر ایک طاقتور ڈائنا میٹ رکھا ہو گا جو اُس وقت پھٹے گا جب انجن کا ڈرائیور بریک نہیں لگا سکے گا۔

مجھے ایسی توقع نہیں تھی کہ یہ بریگیڈیئر میری بات سُنتے ہی اُٹھ دوڑے گا۔ اُس نے مجھے شکی نگاہوں سے دیکھا اور بہت سے سوال پوچھے۔ ان میں دو سوال بہت اہم تھے — "تم کون ہو؟ ..... اپنے ساتھیوں سے غداری کیوں کر رہے ہو؟"

مَیں نے اُسے صاف بتا دیا کہ مَیں کون ہوں۔ میں نے بتایا کہ مَیں پولیس کی سپیشل برانچ میں سب انسپکٹر ہُوا کرتا تھا۔ میں نے جو ٹیررسٹ پکڑے اور اُن کے جو گروہ توڑے تھے وہ پوری تفصیل سے بتاتے پھر بتایا کہ مَیں نے ایک انگریز ڈی ایس پی کو قتل کیا تھا۔ لیفٹیننٹ گلبرٹ اور اُس کی بیوی کا بھی واقعہ سنایا اور یہ بھی بتایا کہ میری گرفتاری کے لئے دس ہزار روپیہ انعام مقرر ہے۔ مَیں نے کمال یہ کیا کہ حمید اللہ خان، نور اللہ اور دیبے کا ذکر ہی نہ کیا۔ میں نے جہاں جھوٹ بولنا تھا وہاں کامیابی سے جھوٹ بولا۔

بریگیڈیئر کے لئے یہ معاملہ حیران کُن تھا کہ میں یہ جانتے ہوئے کہ پکڑا جاؤں گا تو پھانسی چڑھوں گا، اس دہشت گرد گروہ کی نشاندہی کر رہا تھا۔ اُس نے دو انگریز افسروں کو بلایا۔ ان میں ایک ملٹری پولیس کا اور دوسرا یقیناً انٹیلی جنس کا تھا۔ بریگیڈیئر نے انہیں مختصراً بتایا کہ مَیں کون ہوں اور کیا اطلاع لایا ہوں۔ اُنھوں نے وہیں مجھ سے پوچھ گچھ اور جرح شروع کر دی۔ انہیں میرے بیان پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کیا تم ہوش و حواس میں یہ بیان دے رہے ہو؟" — ایک انگریز افسر نے پوچھا — "کیا تمہارا دماغ بالکل ٹھیک ہے؟"

مَیں نے انہیں یقین دلایا کہ مَیں بقائمی ہوش و حواس یہ بیان دے رہا ہوں۔

"تم شاید انعام کے لالچ میں ہو" — بریگیڈیئر نے کہا — "اور تم یہ انعام مانگو گے کہ تمہارے جرائم معاف کر دیئے جائیں۔"

"نہیں سر!" — مَیں نے کہا — "جان بخشی تو دُور کی بات ہے

میں آپ سے چند روپے بھی انعام میں نہیں لوں گا۔ میں حکومتِ برطانیہ کو نہیں اپنے اللہ اور اپنے ضمیر کو خوش کر رہا ہوں۔ یہ ٹیررسٹ مجھے ہندو سمجھتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ کسی ایسی گاڑی کو تباہ نہ کیا جائے جس میں ہندوستانی فوجی سوار ہوں۔ اس ریل گاڑی میں پٹھان رجمنٹ جا رہی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ انگریزوں سے زیادہ ہم مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔"

میں نے بریگیڈیئر کو سنایا کہ وہ پٹھان رجمنٹ نہیں بلکہ مسلمان رجمنٹ سمجھ کر تباہ کر رہے ہیں۔ میں نے اسے وہ تمام باتیں سنائیں جو اُنہوں نے کی تھیں۔

"میں اپنے مذہب اور اپنے رسولؐ کی توہین برداشت نہیں کر سکتا"— میں نے کہا —"اور میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ پٹھانوں کو نقصان پہنچے۔ میری رپورٹ سے آپ کو جو فائدہ حاصل ہوگا وہ آپ جانتے ہی ہیں۔ غور کریں کہ اس گروہ نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ پٹھان رجمنٹ اس چھاؤنی سے فلاں چھاؤنی میں جا رہی ہے اور ملٹری سپیشل فلاں وقت چلے گی۔"

میں نے اُسے سنایا کہ اس سے پہلے ایک گورا رجمنٹ کی ملٹری سپیشل بچ کر نکل گئی ہے۔ اس کی بھی اُسے تفصیل سنائی۔

بریگیڈیئر کے دفتر میں جو افسر موجود تھے وہ دو تین موقعوں پر ہنس پڑے۔ میں جس طرح مخبری کر رہا تھا یہ عجیب سا معاملہ تھا۔ آج میں اُس وقت کو یاد کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ میں نے کیا کیا تھا لیکن میری اُس وقت کی ذہنی اور جذباتی کیفیت ایسی تھی جس کے زیرِ اثر میں نے یہی کرنا تھا۔

بریگیڈیئر نے میرے آگے اُس علاقے کا جہاں ریلوے لائن میں ڈائنامیٹ رکھنا تھا، فوجی نقشہ رکھ دیا اور کہنے لگا کہ وہ جگہ بتاؤ جہاں ڈائنامیٹ رکھا جائے گا۔ میں نے نقشہ دیکھا اور اُس جگہ پر انگلی رکھ دی

بریگیڈیئر نے مجھے باہر بھیج دیا۔ باہر ملٹری پولیس کے دو گورے کھڑے تھے، وہ میرے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ میں حراست میں ہوں۔ معلوم نہیں بریگیڈیئر نے اپنے اُوپر والوں کے ساتھ ٹیلیفون پر بات کی تھی یا نہیں۔ اُس نے اپنے افسروں کے ساتھ صلاح مشورہ تو کیا ہی ہوگا۔

ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت گزر گیا تھا جب مجھے اندر بلایا گیا۔ بریگیڈیئر نے مجھے ہدایات دیں جو مختصراً یوں تھیں کہ مجھے واپس بھیج دیا جائے گا۔ ادھر سے ملٹری سپیشل اُسی وقت روانہ ہوگی جو وقت اس گروہ کو معلوم ہوا تھا۔ میں اس گروہ کے تمام آدمیوں کو اُس جگہ اکٹھا کرنے کی کوشش کروں۔ ڈائنامیٹ میں خود ریلوے لائن کے نیچے رکھوں لیکن بتی کو آگ نہ لگاؤں۔ گاڑی گزر جائے گی تو فوج اس گروہ کے آدمیوں کو گھیرے میں لے لے گی۔

میں نے انہیں بتایا تھا کہ جب گاڑی لائن سے اُتر جائے گی اور پٹھان جو گاڑی میں سے نکلیں گے اُن پر فائرنگ کی جائے گی۔

"تم اب چلے جاؤ"— بریگیڈیئر نے کہا —"اگر ہماری کارروائی کامیاب رہی تو تمہاری سفارش کریں گے کہ تمہیں سزائے موت نہ دی جائے۔"



میں شام کی گاڑی سے واپس چلا گیا۔ جوگندر پال کے گھر پہنچا۔ وہ سویا ہوا اُٹھا۔ میں نے اُسے کہا کہ کل رات کو وہ اپنے لیڈروں کے ساتھ میری ملاقات کرا دے۔

اگلی رات چار آدمی آ گئے۔ میں انہیں اس بات پر لانا چاہتا تھا کہ گروہ کے تمام آدمی یا زیادہ سے زیادہ آدمی ساتھ چلیں اور زیادہ تر آدمیوں کے پاس بندوقیں اور ریوالور ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ پہلے ڈائنامیٹ پھٹے گا اور وہاں سے ریلوے لائن اکھڑ جائے گی اور پھر اگر ٹھابن جاتے

گا۔ انجن گڑھے میں گرے گا۔ رفتار کی وجہ سے گاڑی کے ڈبے انجن پر اور ایک دوسرے پر چڑھ جائیں گے اور ٹوٹیں گے بھی۔ ان میں سے وہ فوجی جو زیادہ زخمی نہیں ہوں گے وہ ڈبوں سے نکلیں گے۔ ان پر دُور سے فائر کرنا ہے، اور جب لوگ آنے لگیں تو ہر کسی لے الگ الگ وہاں سے نکلنا ہے۔

لیڈروں نے میری مخالفت کی۔ کچھ وقت بحث مباحثہ ہُوا اور مَیں نے اپنی تجویز منوالی۔ گروہ کے آدمیوں کی کل تعداد تیرہ بتائی گئی۔ یہ سب قصبے میں موجود تھے۔ ان کے پاس تین شکاری بندوقیں اور دو ریوالور تھے۔ بندوقوں کے تو لائسنس تھے لیکن ریوالور بلا لائسنس تھے۔ مَیں نے انہیں کہا کہ میرا ریوالور بھی ان ہی میں سے کوئی لے لے کیونکہ جب ڈبے ایک دوسرے پر چڑھ کر گریں گے تو میں فوجیوں کی جتنی رائفلیں اُٹھا سکا اُٹھا کر جنگل میں بھاگ جاؤں گا اور یہ اُونچی گھاس میں رکھ کر اُوپر گھاس ڈال دوں گا پھر ہم رات کو جا کر رائفلیں اُٹھا لائیں گے۔

میری یہ بات سن کر سب بہت خوش ہوئے۔ اُنہوں نے سوچا ہی نہیں کہ مَیں جو کہہ رہا ہوں یہ عملی طور پر ممکن نہیں۔ اگر میں نیک نیت ہوتا تو انہیں یہ مشورہ دیتا کہ ڈائنامیٹ کے دھماکے کے ساتھ ہی وہاں سے غائب ہو جانا ہے۔ فوجیوں کی رائفلیں اُٹھا کر بھاگ جانا صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ یہ فلمی منظر ہوتا اور فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہوتی اور میں اس کا ہیرو ہوتا۔ پھر تو میں ریل کی ایک بوگی گھسیٹ کر جنگل میں لے جاتا اور اس میں جتنے فوجی ہوتے انہیں اکیلا ہی ختم کر دیتا۔

میں نے ایسی ہی چند اور باتیں کیں۔ وہ تو پہلے ہی مجھ سے متاثر تھے اب اور زیادہ متاثر ہوئے۔ میں انگریزوں کی دشمنی کی بات کم اور اسلام دشمنی کی زیادہ کرتا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے بعد یہ میٹنگ برخاست ہوئی۔

ہم اگلی رات بھی اکٹھے ہوئے۔ ان کی تعداد تیرہ تھی۔ انہیں آخری ہدایات دینی تھیں اور حوصلہ افزائی بھی کرنی تھی۔ اگلے روز پٹھان رجمنٹ کی ملٹری سپیشل ٹرین گزر رہی تھی۔ مَیں نے سب کو ہدایات دیں اور انہیں بتایا کہ وہ کل کس طرح وہاں تک پہنچیں گے۔



ریل گاڑی کو دو اور ڈھائی بجے کے درمیان اُس مقام سے گزرنا تھا جو ڈائنامیٹ کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ وہ جگہ شہر سے کم و بیش آٹھ میل دُور تھی۔ اُس علاقے میں ٹیکریاں، چٹانیں اور پہاڑیاں تھیں اور جنگل تھا۔ یہ علاقہ دُور دُور تک ایسا ہی تھا۔ اس کے اندر کوئی آبادی نہیں تھی۔

گروہ کے آدمی اس طرح وہاں پہنچے کہ دو تین آدمی ایک شکاری بندوق لے کر صبح سویرے چل پڑے جیسے شکار کھیلنے جا رہے ہوں۔ ایک دو سائیکلوں پر وہاں پہنچ گئے۔ میں جوگندر پال اور اُس کے ایک ساتھی کے ساتھ الگ وہاں پہنچا۔ ہم تینوں بھی شکاری بن کر گئے تھے۔ ہم سب مختلف سمتوں سے مقررہ جگہ پہنچے۔

جس طرح بریگیڈیئر سے طے ہُوا تھا اُسی طرح میں نے ان آدمیوں کو دو ٹیکریوں پر درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں پھیلا کر بٹھا دیا۔ اپنا ریوالور ان میں سے ایک کو دے دیا۔ انہیں آخری ہدایت دی کہ جب ریل کی بوگیاں گریں گی اور جو فوجی ان میں سے نکلیں گے اُن پر فائر کرنا ہے۔ شکاری بندوقوں والوں کو بتایا کہ وہ نمبر ایک کارتوس استعمال کریں اور نشانہ لے کر فائر کریں۔

ان دونوں ٹیکریوں کے پیچھے ایک چٹان تھی اور اس کے پیچھے ان سے بلند پہاڑیوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔

آخر انجن کی وسل سنائی دی۔ میں اکیلا ڈائنامیٹ، بتی اور ماچس لے کر ٹیکری سے اُترا اور ریلوے لائن تک جا پہنچا جس جگہ ڈائنامیٹ

رکھنا تھا وہ اس گروہ کے آدمیوں کو نظر نہیں آتی تھی کیونکہ وہاں مٹی کا ایک ٹیلہ تھا۔ میں اس ٹیلے کی اوٹ میں جاکر بیٹھ گیا۔ میں گاڑی کا انتظار کم اور کسی اور کا انتظار زیادہ کر رہا تھا۔

ریل گاڑی کا انتظار تو ختم ہو چکا تھا۔ اسے اس جگہ تک آنا ہی نہیں تھا جہاں میں کھڑا تھا۔ ریل گاڑی تقریباً ڈیڑھ میل پیچھے رک گئی تھی۔ انجن کی وِسل ایک اشارہ تھا کہ گاڑی آگئی ہے اور رُک گئی ہے۔ میں نے ٹیلے کی اوٹ سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے نظر نہیں آرہے تھے کیونکہ سب اپنی اپنی اوٹ میں تھے۔ دراصل میں کسی اور کو دیکھ رہا تھا۔

آخر وہ بھی مجھے نظر آگئے۔ وہ گورا رجمنٹ کی ایک کمپنی تھی جس نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے انتظامات کے تحت علی الصبح چٹان اور پہاڑیوں کے درمیان گھات میں بیٹھ جانا تھا۔ یہ انتظام مجھے بتا دیا گیا تھا اور میں نے اس گروہ کے آدمیوں کو اس طرح پوزیشن میں بٹھایا تھا کہ پیچھے سے فوجی آکر انہیں آسانی سے پکڑ لیں۔ میں ٹیلے کی اوٹ سے اُدھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے گورے فوجیوں کے پیچھے دار ہیٹ ٹیکریوں کے پیچھے سے اُبھرتے ہوتے نظر آتے۔ اس کے ساتھ ہی گروہ کے تمام آدمی اپنی اپنی اوٹ سے اُٹھے۔ میں نے ان میں سے دو کو ٹیکری سے دوڑ کر اُترتے ہوتے دیکھا۔ باقی سب پکڑے گئے۔ ٹیکری سے جو دو اُترے تھے انہیں شاید گورے نہ دیکھ سکے۔ ٹیکری کے نیچے جھاڑیاں اور درخت اتنے گھنے تھے کہ آسانی سے رُوپوش ہوا جا سکتا تھا۔

ان میں سے ایک مجھے نظر آگیا۔ وہ جوگندر پال تھا جو اس گروہ کا روحِ رواں تھا۔ میں ایسا جوش میں آیا کہ میں ٹیلے سے باہر آکر اس کے پیچھے دوڑا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ وہ یہی سمجھا ہوگا کہ میں بھی اسی کی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اُس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اور تیز دوڑوں۔ میں اُس تک پہنچ گیا اور پیچھے سے اُس کی گردن اپنے

بازو کے گھیرے میں لے لی۔

"ارے بیوقوف!" — اُس نے کہا — "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا تم کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔" میں نے کہا اور حماقت یہ کی کہ یہ بھی کہہ دیا — "کافر کے بچّے! ہم مسلمان ہیں۔"

وہ میری عمر کا جوان تھا۔ اُس کے جسم میں بھی طاقت تھی۔ اُس نے نیفے میں سے ریوالور نکال لیا۔ اُس کی گردن ابھی تک میرے بازو کے گھیرے میں تھی۔ میں نے بازو کا گھیرا اور تنگ کر دیا اور اُس کا ریوالور والا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی اور اُس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا، لیکن اس کا وہ بازو پوری طرح میرے ہاتھ میں نہیں آرہا تھا۔

میں نے اس دھینگا مشتی میں یہ دیکھ لیا کہ تین گورے ہماری طرف دوڑے آرہے تھے۔ میں نے انگریزی میں انہیں للکار کر جلدی پہنچو۔ اتنے میں جوگندر پال کا ریوالور والا ہاتھ نیچے چلا گیا۔ ریوالور کی نالی میری بائیں ٹانگ کی طرف تھی۔ اس نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی میرے گھٹنے میں سے گزر گئی۔ دو تین منٹ تو میں نہ گرا اور اسے بھی نہ چھوڑا بلکہ اُس کی گردن پر آگے سے بازو اتنا زیادہ دبایا کہ اُس کا سانس رُکنے لگا۔ میں نے اپنا ریوالور کسی اور کو دے دیا تھا۔ میں نے جوگندر پال کے پیٹ میں گھونسے مارے۔ اتنے میں گورے پہنچ گئے اور اُنہوں نے اُسے پکڑ لیا۔ میں اس ٹانگ پر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ گولی نے گھٹنے کا جوڑ کاٹ دیا تھا۔ میں نے گرتے گرتے ایک گورے کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اُس نے مجھے سہارا دیا۔ میں نے نیچے دیکھا۔ گھٹنے سے نیچے تک سفید پاجامہ لال ہو چکا تھا اور خون میری ٹانگ پر بہتا محسوس ہو رہا تھا۔



دو گوروں نے مجھے اُٹھا لیا۔ ان کی کمپنی کے ساتھ فسٹ ایڈ کا انتظام بھی تھا۔ ایک جگہ لٹا کر انہوں نے میرے گھٹنے کے ہر طرف

پٹیوں کے پیڈ رکھ کر اُوپر پٹیاں کس دیں لیکن سب بیکار تھا۔ میں جان گیا تھا کہ جوڑ کٹ گیا ہے اور اس جوڑ کی سب سے زیادہ اہم ہڈی بھی کٹ گئی ہے۔ یہ گھٹنے کا سامنے والا ڈسک تھا۔ میں ساری عمر کے لئے معذور ہو گیا تھا۔

اُس وقت انفنٹری پیدل چلا کرتی تھی، لیکن یہ کمپنی اُس زمانے کے قدیم قسم کے ٹرکوں پر آئی تھی۔ خون اتنا تیزی سے بہہ گیا تھا اور درد بھی اتنا شدید تھا کہ میں نے ہوش میں رہنے کی بہت کوشش کی مگر غشی آ ہی گئی۔

میں جب ہوش میں آیا تو میں چھاؤنی کے فوجی ہسپتال کے ایک الگ کمرے میں پڑا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ایک ہندوستانی نرسنگ سپاہی میرے پلنگ کے پاس کھڑا تھا اور میرے بازو کے ساتھ خون کی نالی لگی ہوئی تھی۔ میں نے کروٹ بدلنے کی کوشش میں ٹانگوں کو ہلایا تو بائیں ٹانگ میں مجھے کچھ تبدیلی سی نظر آئی۔ میں نے بایاں پاؤں ہلانا چاہا تو تیر کی طرح ایک خیال آیا اور یہ تیر میرے دل میں اُتر گیا — میری بائیں ٹانگ گھٹنے سے کاٹ دی گئی تھی۔ میں نے نرسنگ سپاہی سے پوچھا کہ میری ٹانگ کاٹ دی گئی ہے؟ اُس نے بڑے اُداس سے تاثر سے آہستہ آہستہ سر اُوپر نیچے ہلایا جس کا مطلب تھا کہ ہاں میری ٹانگ کٹ چکی ہے۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ان آنسوؤں میں میری گزری ہوئی زندگی کی پوری فلم چل گئی۔

"اللہ کو یہی منظور تھا" — نرسنگ سپاہی نے کہا — "اللہ کا شکر ادا کریں کہ آپ زندہ ہیں .... ٹانگ کہاں زخمی ہوئی تھی؟"

"میں نے پٹھان رجمنٹ کو تباہی سے بچایا ہے" — یہ الفاظ بغیر سوچے سمجھے میرے مُنہ سے نکل گئے — "میں نے مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن کو پکڑوایا ہے۔"

میرے ان الفاظ نے آبِ حیات کا کام کیا۔ آنسو خشک ہو گئے۔

جسم میں نقاہت کا جو احساس تھا وہ مٹ گیا۔ ٹانگ کٹ جانے کا جو رنج تھا، وہ مسرت میں بدل گیا۔ مسرت بھی ایسی کہ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی، لیکن نرسنگ سپاہی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور بولا کہ ہلنا نہیں۔ وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا کہ وہ میرے ہوش میں آنے کی اطلاع دینے جا رہا ہے اور میں اسی طرح پڑا رہوں۔

دو انگریز افسر کمرے میں آئے۔ دونوں میجر تھے۔ ایک میڈیکل افسر تھا اور دوسرا کسی یونٹ کا معلوم ہوتا تھا۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔ میڈیکل افسر نے مجھ سے کچھ باتیں پوچھیں اور میرا معائنہ کیا۔ اُس کے انداز میں شفقت سی تھی۔

دوسرے میجر نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں ٹھیک ہوں۔ اُس نے افسوس کا اظہار کیا کہ میں ایک ٹانگ سے معذور ہو گیا ہوں۔ میں نے رسمی طور پر کہا کہ مجھے کوئی افسوس نہیں۔

اس کے بعد جو کارروائیاں ہوئیں وہ میں تفصیل سے نہیں سناؤں گا کیونکہ وہ بہت طویل ہیں۔ مختصراً یوں سمجھ لیں کہ میں بہتر ہونے لگا۔ بہتر تو ہونا ہی تھا کیونکہ مجھے بے شمار تازہ خون دیا گیا تھا اور غذا اتنی اچھی دی گئی کہ میں لمحہ بہ لمحہ تندرست ہوتا چلا گیا۔ البتہ میرا ذہن کبھی تلخ اور کبھی بڑے اچھے خیالوں سے بھر جاتا اور کبھی یہی تلخ اور شیریں خیالات کا میدان جنگ بن جاتا۔ کبھی خیال آتا کہ میں نے جو کیا اچھا کیا ہے اور کبھی یہ خیال بھی آ جاتا کہ میں نے غداری کی ہے، لیکن جب ان ہندوؤں کی باتیں اور اُن کے عزائم یاد آتے تو مجھے فتح کا احساس ہونے لگتا۔

کمرے کی تنہائی میں مجھے سائرہ بھی یاد آتی، لیلا بھی اور دوسرے ساتھی بھی۔ کبھی دیا کو یاد کر کے شرمندگی کا احساس ہوتا۔ اُس نے تو یہی کہنا تھا کہ میں نے غداری کی ہے۔

یہ خیال بھی آتا تھا کہ میں پکڑا گیا ہوں اور انہی ہندوؤں کے ساتھ مجھے بھی پھانسی دی جائے گی۔ عجیب بات ہے کہ جب میں سوچتا تھا کہ مجھے پھانسی دی جائے گی تو مجھے ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوتا تھا۔ میں کچھ کر کے پھانسی چڑھ رہا تھا۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔

اس کمرے میں میرے پاس وہی بریگیڈیئر بھی آیا، پھر ایک میجر جنرل بھی آیا۔ انہوں نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا، اور بہت تعریف کی۔ میجر جنرل نے خاص طور پر کہا کہ تم کو انعام ملے گا۔ اس کے بعد بیان لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ملٹری پولیس کے انگریز افسروں کو یہ سہولت حاصل تھی کہ میں انگریزی بول سکتا تھا۔ پھر ایک اور انگریز آیا جو وردی کی بجائے پرائیویٹ کپڑوں میں تھا۔ وہ اُردو بڑی اچھی بولتا تھا۔ اُس نے میرا بیان لیا اور اس طرح جرح کی جس طرح عدالت میں کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اُس نے کہا کہ جو لوگ پکڑے گئے ہیں ان کے خلاف ایک خاص عدالت میں مقدمہ چلے گا۔ اس انگریز نے بتایا کہ وہ اس مقدمے میں پراسیکیوٹر (سرکاری وکیل) ہوگا۔ اُس نے مجھے کچھ ہدایات بھی دیں۔



ایک مہینے سے کچھ زیادہ دن گزرے ہوں گے کہ میری ٹانگ کا زخم ٹھیک ہوگیا اور مجھے دو بیساکھیاں دے دی گئیں۔ میں نے ابھی تک کسی انگریز افسر سے نہیں پوچھا تھا کہ میرے اپنے مقدمے کا کیا بنے گا نہ یہ کہا تھا کہ میں نے جو کارنامہ کر دکھایا ہے اس کے عوض مجھے معاف کر دیا جائے۔ اتنے سنگین جرائم معاف نہیں ہو سکتے تھے۔ صرف دو مثالیں ایسی تھیں کہ انگریزوں نے ایسے ہی دو سنگین جرائم کے مجرموں کو معاف کر دیا تھا۔ میں یہ دونوں کہانیاں سُنا کر اپنی بات کو لمبا نہیں کرنا چاہتا۔ یہ سمجھ لیں کہ انگریز بادشاہ تھا اور آپ جانتے ہیں کہ بادشاہ کیا نہیں کر سکتے۔

مجھے ہسپتال سے گورا رجمنٹ کی بارکوں میں لے گئے اور ایک کمرے میں رکھا جس میں میرے لئے ہر سہولت موجود تھی۔ کمرے کے ساتھ ہی غسل خانہ اور بیت الخلا تھا جس میں میری سہولت کے لئے کموڈ رکھ دیا گیا تھا، لیکن میں زیرِ حراست تھا۔ کمرے کے دروازے پر ایک گورا سنتری رائفل لئے کھڑا رہتا تھا۔

دہشت گردی کے ان ملزموں کے لئے ایک سپیشل ٹربیونل مقرر کیا گیا جس میں تمام افسر انگریز تھے۔ ملزموں کی طرف سے دو ہندو وکیل پیروی کے لئے آتے تھے۔ مقدمہ شروع ہوا۔ میری شہادت بھی ہوتی۔

مقدمے کے دوران مجھے پتہ چلا کہ ان سب کے گھروں کی تلاشی لی گئی تھی اور اسلحہ بارود برآمد ہوا تھا۔ ان میں سے ایک کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا گیا تھا۔ اُس نے ان تمام آدمیوں کی نشاندہی کر دی تھی جو اس گروہ کو رجمنٹوں کی نقل و حرکت بذریعہ ریل گاڑی اور ان کی روانگی کے اوقات کی صحیح اطلاعیں دیتے تھے۔ اس طرح انگریزوں کی حکومت کے لئے ایک بڑا ہی خطرناک زمین دوز گروہ زمین کے اُوپر آگیا۔ وہ آدمی بھی پکڑے گئے جن سے ان لوگوں نے ڈائنامیٹ لیا تھا۔ وہ دو آدمی تھے۔

بڑا ہی گرما گرم مقدمہ تھا۔ دونوں وکیلوں نے بہت زور لگایا سب سے زیادہ لمبی جرح شاید مجھ پر ہوئی تھی۔ پورے دو دن جرح جاری رہی تھی لیکن سپیشل کورٹ یا ٹربیونل کا مطلب یہ تھا کہ ملزموں کو کسی قیمت پر بری نہیں کیا جائے گا اور شک کا فائدہ جو ملزم کو ملا کرتا ہے وہ حکومت خود لے گی۔

ہر روز سماعت ہوتی تھی۔ ڈیڑھ ماہ بعد فیصلہ سُنا دیا گیا۔ تمام ملزموں کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی اور بیس بیس ہزار روپیہ جرمانہ بھی کیا گیا۔ عدم ادائیگی جرمانہ مزید پانچ پانچ سال سزائے قید سنائی گئی۔ جوگندر پال نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ اُس کے پاس ریوالور بلا لائسنس تھا۔ اُسے چالیس سال سزائے قید دی گئی۔ سب کو عمر قید تو بغاوت

کے جُرم میں دی گئی تھی۔ ہر ایک پر ایک ایک دو دو دفعات مزید لگائی گئی تھیں۔ ان کی سزائیں الگ تھیں۔

مجھے ابھی اُسی کمرے میں رکھا گیا۔ میں کمرے کا دروازہ کُھلا رکھ سکتا تھا لیکن ایک سنتری دروازے پر موجود رہتا تھا۔ میں تو بیساکھیوں پر چلتا تھا۔ فرار کا خطرہ ہی نہیں تھا۔

بارہ تیرہ دن گزرے ہوں گے کہ مجھے ایمبولنس میں بٹھا کر بریگیڈ ہیڈکوارٹر لے گئے اور بریگیڈ کمانڈر کے دفتر میں داخل کر دیا۔ بوڑھا بریگیڈیئر اُٹھ کر میری طرف آیا اور بڑی گرمجوشی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ مجھے بٹھا کر خود اپنی کرسی پر بیٹھا۔

"تم آزاد ہو" — اُس نے مسکرا کر کہا۔

مَیں نے اُس کی طرف سوالیہ اور حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"وائسرائے نے منظوری دے دی ہے" — بریگیڈیئر نے کہا — "تم اگر مختلف جرائم میں مطلوب نہ ہوتے تو شہنشاہِ معظّم تمہیں زرعی زمین اور نقد انعام دیتے لیکن قتل جیسا جرم، اور وہ بھی ایک برٹش آفیسر کا قتل، معاف ہو جانا بہت بڑا انعام ہے۔"

"یس سر" — مَیں نے کہا — "اس سے بڑا اور انعام کیا ہو سکتا ہے کہ مجھے میری زندگی واپس دے دی گئی ہے۔ مَیں اپنی ٹانگ کٹ جانے کو اپنے جرائم کی سزا سمجھوں گا۔"

"تم نے برٹش ایمپائر کے لئے ٹانگ کٹوائی ہے" — اُس نے کہا — "اور تم نے ایسے خطرناک ٹیررسٹ گروہ کو پکڑوایا ہے جس کی جڑیں بہت دُور تک پہنچ گئی تھیں اور پھیل رہی تھیں ..... اب یہ بتاؤ تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ تمہیں ایسکارٹ کے ساتھ وہاں پہنچایا جائے گا۔"

مجھ پر مسرّت اور ملال کا ایسا غلبہ ہُوا کہ بولا نہ گیا۔ مَیں نے گھونٹ سا

نگل کر اپنے شہر کا نام لیا۔

دوسرے دن میں ایک مسلمان نائک اور ایک سپاہی کے ساتھ ریل گاڑی میں سوار ہُوا۔ یہ میرا واپسی کا سفر تھا۔



میں جب اپنے شہر کے ریلوے سٹیشن پر اُتر کر دو فوجیوں کے ساتھ تانگے میں سوار لوگوں کے درمیان سے گزر رہا تھا تو مجھے جاننے والے بھی دُور کھڑے دیکھتے رہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ سمجھتے تھے کہ میں گرفتار ہو گیا ہوں اور مجھے شناخت کے لئے یا کسی اور تفتیشی کارروائی کے لئے لایا گیا ہے۔

اپنے محلے میں جہاں تک تانگہ جا سکتا تھا وہاں تک لے گیا، سائرہ کے گھر تک میں بیساکھیوں پر گیا۔ اب میں فوراً پہچانا جاتا تھا کیونکہ مَیں نے داڑھی صاف کرا دی تھی اور ہلکی ہلکی مونچھیں رہنے دی تھیں۔

مَیں سائرہ کے گھر میں دستک دیئے بغیر داخل ہو گیا۔ دونوں فوجی باہر کھڑے رہے۔ سائرہ صحن میں اپنی ماں کے ساتھ چارپائی پر بیٹھی تھی۔ دونوں نے میری طرف دیکھا اور دونوں کے چہروں پر حیرت اور خوف کے تاثرات آ گئے۔ پہلی نظر میں وہ مجھے نہیں پہچان سکتی تھیں۔ میں داڑھی اور آدھی ٹانگ کے بغیر تھا۔

"سکندر!" — سائرہ کی ماں کے مُنہ سے سرگوشی نکلی۔

"اللہ نے تمہاری دعائیں قبول کر لی ہیں سائرہ!" — مَیں نے کہا — "میں آ گیا ہوں۔ ہمیشہ کے لئے آ گیا ہوں۔ تمہارے سجدے، وظیفے اور چلّے رائیگاں نہیں گئے۔"

سائرہ دوڑ کر آئی اور گھٹنے ٹیک کر اُس نے میری کٹی ہوئی ٹانگ پکڑ لی پھر دونوں بیساکھیوں پر ہاتھ پھیرے، پھر اپنی ماں کی موجودگی کو نظر انداز کر کے وہ میرے ساتھ لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مَیں نے اُسے بتایا کہ میرے ساتھ دو فوجی آتے ہیں۔ انہیں

رخصت کرنا ہے۔

سائرہ کی ماں فوراً باورچی خانے میں چلی گئی۔ میں نے نائک اور سپاہی کو کمرے میں بٹھایا اور انہیں کھانا کھلا کر رخصت کیا۔ پھر سارا محلہ سائرہ کے گھر پر ٹوٹ پڑا۔ میری خالہ بھی آئی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتی تھی لیکن سائرہ اور اُس کی ماں نہ مانیں۔ شہناز کے بھائی بھی آئے اور شام کو گلشن آرا اپنے خاوند کے ساتھ آئی۔

رات کو مَیں نے سائرہ، اُس کے باپ اور اُس کی ماں کو سنایا کہ میں کس طرح بخشا گیا ہوں۔



تیسرے روز گلشن آرا کا خاوند میرا اور سائرہ کا نکاح پڑھا رہا تھا۔

یہ ایک خاموش تقریب تھی۔ محلے والوں کو پتہ نہ چلا کہ اس گھر میں شادی ہوئی ہے۔

اُسی شام تھانیدار آ گیا۔ انسپکٹر انور علی سید یہاں سے جا چکا تھا۔ اُس کی جگہ انسپکٹر عمر دین آیا تھا۔ اُسے سرکاری طور پر اطلاع مل گئی تھی کہ مجھے معافی مل گئی ہے۔ اُسے یہ حکم بھی ملا تھا کہ مجھ پر نظر رکھے کہ میں اب کیا کرتا ہوں اور کہاں جاتا ہوں۔ پولیس نے مجھے تین چار مہینے مشتبہ کی حیثیت سے دیکھنا تھا۔ انسپکٹر عمر دین کو معلوم تھا کہ میں سپیشل برانچ میں سب انسپکٹر تھا، اس لئے وہ میرے ساتھ احترام سے پیش آیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اب کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کر سکتا نہ کہیں جا سکتا ہوں۔

"مَیں تمہاری پوری کہانی سے واقف ہوں" — انسپکٹر عمر دین نے کہا — "تمہارے ساتھ ایک نوابزادہ حمید اللہ خان بھی تھا۔ وہ بھی مفرور ہے۔"

"یہ تو بڑی پرانی بات ہے" — مَیں نے جھوٹ بولا — "اُس سے الگ ہوتے مدت ہو گئی ہے۔ معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے۔"

"جیل چلا گیا ہے" — انسپکٹر عمر دین نے کہا — "لیکن ابھی

مقدمہ ختم نہیں ہُوا۔"

"کس طرح پکڑا گیا ہے؟"

"ایک بڑے زبردست ڈاکو کے ساتھ پکڑا گیا ہے" — انسپکٹر عمر دین نے کہا۔

"کیا نام ہے اس ڈاکو کا؟" — میں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

"دیبا!" — اُس نے جواب دیا۔

"اوہ!" — میرے مُنہ سے اوہ نکل گئی۔ میں نے پوچھا — "آپ کو یہ تو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کیسے پکڑے گئے ہیں۔"

"عورت کے چکر میں!" — انسپکٹر عمر دین نے کہا۔

دیبا کے علاقے کے تھانیدار کی ملاقات انسپکٹر عمر دین سے پولیس کے ضلع ہیڈکوارٹر میں ہوئی تھی۔ وہ تھانیدار بہت خوش تھا کہ اُس نے بہت بڑا شکار مارا تھا۔ اُس نے دیبا کو پکڑا۔ وہاں سے ساہوکار کے گھر کی ڈکیتی کا مال برآمد ہُوا۔ وہیں سے حمید اللہ خان پکڑا گیا جو مفرور قیدی تھا۔ نور اللہ پکڑا گیا جو اپنے علاقے کی دو تین سنگین وارداتوں میں مطلوب تھا۔

اس تھانیدار نے انسپکٹر عمر دین کو دیبا وغیرہ کی گرفتاری کی جو کہانی سنائی اس کے پس منظر کو میں جانتا تھا۔ دیبا نے قریبی گاؤں کی ایک جوان عورت کو داشتہ بنا کر رکھا ہُوا تھا لیکن دیبا لیلا کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ مَیں نے آپ کو سنایا ہے کہ اس عورت نے لیلا کو دیبا کے ساتھ دیکھ لیا تھا اور بعد میں لیلا کو دھمکی دی تھی کہ وہ دیبا سے دُور رہے مگر دیبا نے میرے چلے جانے کے بعد لیلا کے ساتھ شادی کر لی۔

اس عورت نے دیبا کو بُرا بھلا کہا اور لیلا کو ڈرایا دھمکایا۔ دیبا نے اُسے کچھ رقم دی جو اُس نے دیبا کے مُنہ پر دے ماری۔ دیبا نے اُسے مارا پیٹا اور کہا کہ وہ اُس کے پاس نہ آیا کرے۔ دو ہی دن گزرے تھے کہ پولیس کی بہت سی نفری نے اس علاقے کو گھیرے میں لے لیا اور چھاپہ

مارا۔ وہاں سے کوئی بھی نہ بھاگ سکا۔ سب پکڑے گئے اور مال برآمد ہُوا۔ لیلا اور رمیش بھی پکڑے گئے۔ ساہوکار نے کہا کہ لیلا نے گھر بھیدی کا کام کیا ہے اور رمیش بھی ڈاکوؤں کے ساتھ تھا۔ لیلا اور رمیش کی دیبا کے پاس موجودگی اُن کے خلاف الزام ثابت کرتی تھی۔

یہ چھاپہ دیبا کی داشتہ نے انتقامی طور پر مروایا تھا۔ وہ دیبا سے مار پٹائی کرا کے تھانے چلی گئی اور اُس نے دیبا کے ٹھکانے کی نشاندہی کی تھی۔

چار مہینے اور گزر گئے تو اخباروں میں خبر پڑھی کہ دیبا کو سزائے موت ملی ہے۔ عدالت میں اس کے اپنے آدمیوں نے اُس کے خلاف قتل کی دو وارداتیں ثابت کر دی تھیں۔ حمید اللہ خان پہلے ہی عمر قیدی تھا۔ اب اُس کی سزا میں فرار کے جرم میں چار سال کا اضافہ ہو گیا۔ لیلا کو ڈیڑھ سال اور رمیش کو چار سال سزائے قید دی گئی۔ نور اللہ کو آٹھ سال قید ملی۔ اس طرح ان کی بھی کہانی ختم ہو گئی۔

آج میں اسی پلنگ پر لیٹا ہُوا ہوں جس پر میرے ابا فوت ہوتے تھے۔ سائرہ کے بال دُودھ جیسے سفید ہو گئے ہیں۔ میں سائرہ کے ساتھ شادی کر کے اپنے مکان میں آ گیا تھا۔ عمر اسی مکان میں گزر گئی ہے۔ گلشن آراء کو فوت ہُوئے ایک مدت گزر گئی ہے۔

سائرہ کے ساتھ زندگی بڑی اچھی گزری ہے۔ سائرہ کی امی اور ابا فوت ہوتے تو اُس نے اپنا مکان بیچ ڈالا۔ میں نے یہ پیسہ اپنی دکان میں لگا دیا تھا۔ ہمارے بچوں نے جوان ہو کر مجھے کاروبار سے ہٹا کر گھر بٹھا دیا۔ زندگی کے جو دن باقی ہیں وہ اپنے بچوں کے بچوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے گزر جائیں گے۔